[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

DUE DATE

Cl. No. Acc. No.

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

سب رس



اردو عبر

ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

رجسٹرڈ نمبر (M3950)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)
نشان پتہ آصفیہ (۱۵۳)

اردو نامہ

یعنی

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ماہنامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری سنہ ۱۹۴ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکشؔ — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہدؔ — عبدالحفیظ صدیقی (بی اس سی)

معین الدین احمد انصاری

دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

مشاہیرِ اردو کا تاریخی گروپ

فرش پر بیٹھے ہوئے :- (۱) سر عبد القادر (۳) حافظ ساجد علی وکیل اورنگ آباد (۴) ظفر عمر۔

کرسیوں پر سامنے :- (۱) غلام محمد منشی (۲) سر اکبر حیدری (۳) وقار الملک (۴) حکیم محمد اجمل خاں (۵) حالی (۶) عزیز مرزا (۸) مرزا محمود علی خاں (۹) منشی محبوب عالم۔

کرسیوں پر دوسری صف :- (۱) علی الدین حسن (۲) شبلی (۳) پروفیسر ارنلڈ (۴) نذیر احمد (۵) نواب ابوالحسن خاں۔

کرسیوں پر تیسری صف :- (۱) ظفر علی خاں (دستار میں) (۲) سر محمد اقبال (۳) نور المنیب اللہ حیدرآبادی (شملے میں)

پیچھے کھڑے ہوئے :- (غلام محمد منشی سے حکیم اجمل خاں تک) (۱) ابوالحسن (۲) خواجہ غلام الثقلین (شملے میں) (۳) حبیب الرحمٰن خاں شروانی

پیچھے کھڑے ہوئے :- (منشی محبوب عالم کے پیچھے) (۱) قاسم دین (شملے میں) (۲) مصطفیٰ علی وکیل جالنہ۔

وسط میں استادہ :- ظفر علی خاں کے پیچھے ستون سے لگے ہوئے غلام جیلانی۔ نور المنیب اللہ کے پیچھے شرف الحق۔

نوٹ :- اس اہم تاریخی گروپ کے اصحاب کے پہچاننے میں سر عبد القادر اور مولوی نور المنیب اللہ صاحب وکیل نے سب سے کی جو مدد کی ہے اس کے لئے ادارہ مشکور ہے۔
یہ تصویر اگرچہ پہلے سب رس بابت جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکی تھی لیکن مولوی نور المنیب اللہ صاحب کی مدد اور مشورہ ہی کی وجہ سے دوبارہ بڑی بنا کر چھاپی جا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب کے نام معلوم ہو سکیں اور جو نام غلط لکھ دیئے گئے تھے ان کی تصحیح ہو سکے۔



مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ

فہرست مضامین

کایا پلٹ

(میکش صاحب ورڈز ورتھ کی نظموں کا آزاد منظوم ترجمہ کر رہے ہیں کایا پلٹ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (شاہد)

… ڈھونڈنے والے!

…ے کا ترانا"

…زاد نگاہی

فطرت کے حسیں رخ سے نقابوں کو ہٹا دے

وہ دیکھ حسیں شام کی رنگین جوانی — کمسنوں کو سناتی ہے بہاروں کی کہانی
وہ دامن کہسار میں جھرنے کا ترنم — تتلی کے وہ چھو لینے سے کلیوں کا تبسم
جگنو میں جھلکتا ہے یہ نور کا اشارا — لیتے ہوئے مخمور فضاؤں کا سہارا

کر دفن کتابوں میں غم لا متناہی — وہ دیکھ کہ لی طائر رنگیں نے جماہی
پیپل کی لچکتی ہوئی ٹہنی کو جھکا کر — آکاش پہ تاروں کو بلاتا ہے وہ گا کر
سوگند مری روح کی یہ مست ترانے — دنیا میں لٹاتے ہیں مسرت کے خزانے
دیکھ ان میں حیات آفریں نکہتوں کی روانی — سن ان میں خرد بخش فطرت کی کہانی

ان نغموں میں گم ہو کے تمنائے اثر سیکھ — تسخیر جہاں کے لئے انداز نظر سیکھ
خوابیدہ دماغوں کو جگاتے ہیں یہ نغمے — فطرت کی طرف دل کو بلاتے ہیں یہ نغمے

بکھرے ہوئے پھولوں کی بھی اک ہلکی سی جنبش — ہے بربط تحقیق کا اک نغمۂ دانش
انساں کی حقیقت کا کھلا راز ہے گویا — اک دور سے آئی ہوئی آواز ہے گویا

یہ عقل فریب آشنا تخیل کی دشمن — انساں کے لئے "محنت فردا" کی ہے الجھن
یہ عقل سیہ داغ ہے فطرت کی جبیں پر — پھینکی ہوئی اک آگ ہے فردوس بریں پر
اس عقل کے ہاتھوں سے بگڑ جاتی ہے ہستی — زنجیر تعین میں جکڑ جاتی ہے ہستی
اس عقل و خرد کو رہِ فطرت میں گنوا دے — آزاد نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے

اٹھ اور یہیں اپنے لئے مانگ لے "وہ دل"
ہر شے میں نظر آئے جسے "علم کا حاصل"

میکش

اداریہ

"سب رس" کی زندگی کا تیسرا سال "اُردو نمبر" سے شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سال میں اس کی ترقی جس صحت بخش طریقے سے ہوئی ہے، اس کا اظہار یہاں بے ضرورت ہوگا اس لیے کہ "سب رس" ارباب ملک سے ہمیشہ قریب تر رہا ہے اور ملک کے دماغوں سے نکلے ہوئے علمی و ادبی سرمائے کو ملک کے دماغوں تک پہنچانے میں اُس کی پُرخلوص کوشش قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔

یورپ کی موجودہ صورت حال صحافت کے لیے صبر آزما بن گئی ہے۔ اشیاء کی غیر معمولی گرانی نے ظاہری معیار کو پست کر دیا ہے اور ارباب صحافت کے لیے اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ چندہ میں اضافہ یا موجودہ چندہ کا بدل۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ خدمت ادب کی راہ میں کسی عذر کو خواہ وہ حقیقت سے قریب ہی کیوں نہ ہو "سنگ گراں" باور کرائیں۔ اسی احساس کے پیشِ نظر ہم نے اپنے اعلانات کے مطابق "اُردو نمبر" کو شاندار بنانے کی کوشش کی ہے اور سب رس کا روایاتی معیار باقی رکھا ہے بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس کو بلند تر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سرورق "اُردو نمبر" کے لیے سرورق کا انتخاب یقیناً ایک نازک کام تھا۔ اس لیے کہ ادبیات کے جدید دور نے "ظاہر و باطن" کی حدیں ملا دی ہیں جس طرح ادب اور زندگی کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اچھی کتاب نام ہے، اپنے موضوع، انداز بیان اور دیدہ زیبی کا۔ ایک بدنما پھول، اپنی خوش بُو کے باوجود گیسوؤں کی زینت نہیں بن سکتا۔ ہم نے جب موزوں سرورق کے متعلق غور کیا تو ہمارے تصور میں جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی وہ حسین و شاندار عمارت آئی جو اپنی طرز تعمیر میں تہذیب و تمدن کا ایک سرمایہ رکھتی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے ترقی اُردو میں جو حصّہ لیا ہے وہ عہد آفریں ہے۔ کلیۂ فنون کی عمارت ہند و مسلم تہذیبوں کے امتزاج کا خوش گوار نمونہ ہے اور اس عمارت کا افتتاح اُردو کے سب سے بڑے محسن اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے فرمایا ہے۔ یہی وہ غیر معمولی خصوصیات ہیں جن کے باعث اُردو نمبر کے سرورق پر جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی تصویر ہی موزوں ترین سمجھی گئی۔

یہ تصویر جو "اُردو نمبر" کے سرورق پر دکن کی "خدمت اُردو" کے نمایاں ثبوت میں شایع کی جا رہی ہے، اصل میں چاندی کے اس کیسکٹ کا عکس ہے جو پندرہ ہزار روپیے کے صرفے سے تیار ہوا اور بارگاہِ سلطان العلوم میں افتتاح کلیۂ فنون کے موقع پر گزرانا گیا۔ کلیۂ فنون کی عمارت چونے اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کا یہ نمونہ چاندی سے تیار کیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں عثمانیین کے دلوں کا سکون پرور اضطراب، روح کا تقدس اور علم و عمل کی پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ فن کاروں کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے حُسن کو حقیقت سے ہم آہنگ کر دیا۔

تصویریں "اُردو نمبر" کی مناسبت سے اس کی تمام تر تصویریں یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں جیسا

کبھی اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اس واقعے کا اظہار ہم صرف یہ بتانے کے لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں "سب رس" کتنا عزیز ہے اور ہم اس کو مقبول و مفید بنانے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

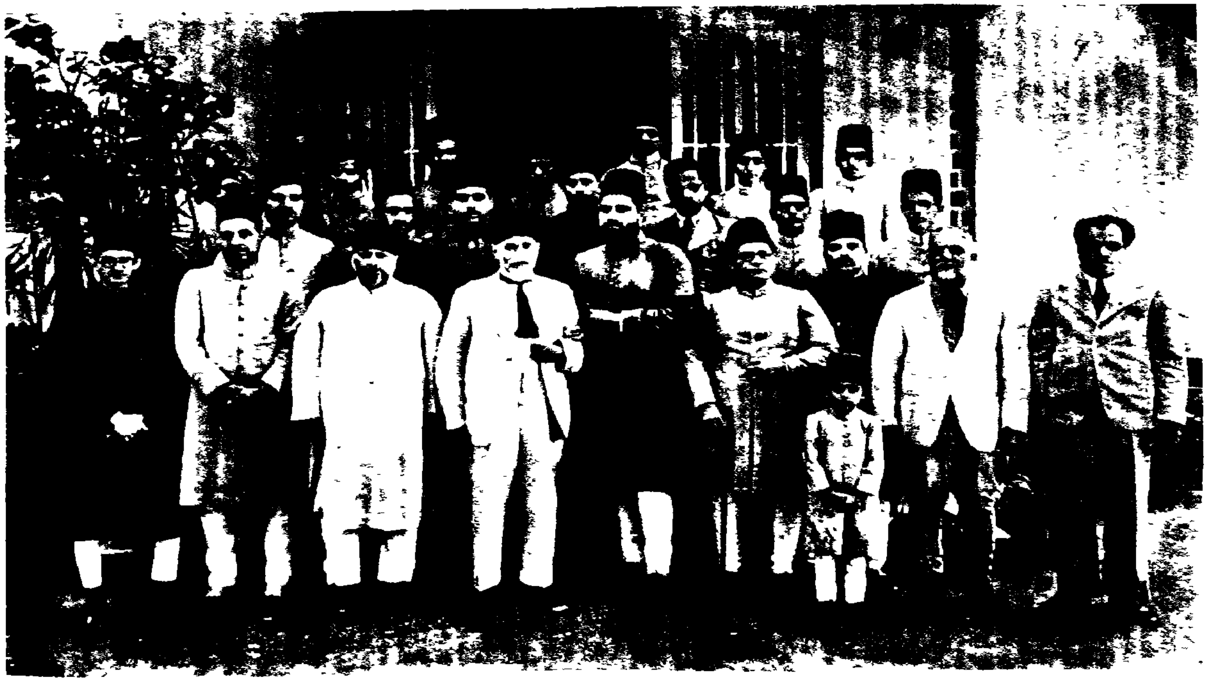
مشاہیرِ اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط۔ ادبیات میں مکتوبات کی خاص اہمیت ہے۔ اس لیے کہ مکتوبات زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں کاتب بے تکلفی کے ساتھ اپنی زندگی کے عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ مکتوب چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھا جاتا اس لیے اس میں سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ اسی لیے مشاہیر کے خطوط کا ذخیرہ ہر زبان میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ اُردو میں بھی مکتوبات کے بعض مجموعے شائع کیے گئے ہیں۔ آپ کو اس نمبر میں مشاہیرِ اُردو کے سولہ غیر مطبوعہ خطوط ملیں گے جو پہلی دفعہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ شبلی، داغ، ...... عطیہ بیگم، گرامی، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور ممتاز علی وغیرہ کے نام اور کام سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ یہ مکاتیب اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو اکثر مشاہیرِ اُردو کی غیر مطبوعہ تحریریں جمع کر رہا ہے اور اسی ذخیرے سے چند اُردو خطوط اُردو نمبر کے لیے حاصل کیے گئے ہیں۔

اُردو پروفیسروں کے حالات اُردو ادب کی تاریخ، ان خاموش خدمت گزاروں کے تذکرے کے ... ہیں اپنی زبان ... ن خدمت ... لی ہے۔ دیوان انشا پردازوں ... کو کسی طرح نہیں بھلا سکتے۔

... ن ... زبانی ... ہے نیز ادیبوں انشا پردازوں اور شاعروں کی ... بخش تربیت ہوتی ہے۔ اس نمبر میں ہم نے ہندوستان کی مختلف جامعات کے اساتذۂ اُردو کے حالات و خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات نے اپنے حالات ... نہیں کیے ورنہ یہ تذکرہ ... ہو جاتا ... تکمیل کا یہی طریقہ ... گیا ہے کہ ... شائع کیا جائے "... ادبیاتِ اُردو" ... ایک کتاب شائع کر رہا ہے جس میں گزشتہ اساتذہ کے حالات و خدمات کا تذکرہ بھی شریک رہے گا۔

حصۂ نظم و نثر اُردو نمبر کا حصۂ نظم پُر تنوع اور بلند پایہ ہے۔ اس کے لیے اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں خاص طور پر حاصل کی گئی ہیں۔ جلیل، امجد، علی منظور، ماہر، ساغر، حفیظ جالندھری، شفقی اورنگ آبادی، احسان دانش، خنجر، مخدوم، جذبی وغیرہ کی غزلوں اور نظموں میں جو قدیم اور جدید طرزِ شاعری کے نمونے ہیں، آپ اُردو شاعری کے مختلف رجحانات دیکھیں گے۔

حصۂ نثر میں ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے شامل ہیں، جو "سب رس" کے لیے خاص طور پر حاصل کیے گئے ہیں۔



ڈاکٹر زور ۔ احسن یار جنگ ۔ سید عارف الدین ۔ عزیز یار جنگ ۔ بہادر یار جنگ ۔ سر عبدالقادر ۔ محمد اکرام ۔ سیف علیخان ۔ ہاشمی
اقبال علی پروفیسر سروری ۔ ظہیر الدین احمد ۔ پروفیسر سید محمد ۔ ناصر الدین احمد ۔ پروفیسر فضل حق ۔ ڈاکٹر امیر علیخان
عارف علی ۔ کمال علی ۔ پروفیسر مجید صدیقی ۔ سراج الدین احمد ۔ عبدالحفیظ ۔ حمید الدین شاہد

مرزا فرحت اللہ بیگ، ایم اسلم، ماہر القادری، علامہ ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری، پروفیسر عبد القادر سروری کے علاوہ متعدد ایسے اصحاب کی قلم کاری کے نتائج آپ کو اس نمبر میں ملیں گے جنھوں نے اپنی زندگی خاص خاص موضوعوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

سب رسی معلومات

اس نمبر سے بچوں کے ضمیمہ کے علاوہ ایک اور ضمیمہ معلومات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں عام فہم طریقے سے تازہ معلومات فراہم کی جائیں گی۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے ایک طرف وقت کو تنگ بنا دیا ہے اور دوسری طرف رفتار زمانہ سے واقف رہنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضمیمہ ان طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہوگا جو امتحانات مقابلہ کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں سائنس اور دیگر جدید علوم کے علاوہ مقابلہ کے امتحانوں کی ضروریات اور اطلاعیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اس ضمیمہ کی ترتیب کا کام مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی بی، ایس سی کے سپرد کیا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضمیمہ ان اصحاب کے لیے جو اپنی مصروفیتوں کے باعث مطالعہ کے لیے بہت کم وقت دے سکتے ہوں، کارآمد ہوگا۔

ادارہ ادبیات اردو

بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے باعث اس وسیع کام کو جس کی انجام دہی مرکزی ادارے کے لئے دقت طلب ثابت ہو رہی تھی، شعبہ واری تقسیم کے ذریعے سے پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح اب تک شعبۂ زبان، شعبۂ تالیف و تراجم، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن، شعبۂ تنقید، شعبۂ سائنس، شعبۂ امتحانات، شعبۂ نسواں، شعبۂ اطفال اور شعبۂ طلبہ قائم ہو چکے ہیں۔ اور ادارہ کے کام میں تنظیم کے ساتھ وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کے علم دوست اور اہل ذوق خواتین و اصحاب کی معاونت سے ان شعبوں نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبہ اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ یہ شعبے نہ صرف مختلف مسائل پر غور و خوض کرتے ہیں بلکہ ان کی جانب سے خاص موضوع پر کتابیں تصنیف و تالیف کروائی جا رہی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ یہاں ادارے کی شعبہ جاتی مصروفیتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں لیکن ادارہ سے ہم سفارش کر رہے ہیں کہ وہ ایک کتابچہ شائع کرے جس میں ادارے کی مکمل روداد ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ نے حیدرآباد میں اپنے خلوص عمل اور ذوق کار سے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کی عملی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے ایسے کتابچے کی اشاعت ارباب ملک کو یہ واقف کرانے کے لئے ضروری ہے کہ ادارے نے اب تک کیا کیا؟ اور اب وہ کیا کر رہا ہے؟

ایک وسیع کتب خانے کے قیام کی اسکیم جس میں تمام قدیم و جدید اردو کتابیں ہوں زیر غور ہے تاہم فی الحال ادارہ کے دفتر ہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتب خانہ میں دکنی مخطوطات کا بھی ایک قابل لحاظ ذخیرہ ہے۔ ملک کے وہ اہل ذوق اصحاب جو زبان کی خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں، اس کتب خانے کے لئے قلمی و مطبوعہ کتابیں فراہم کرنے میں مدد دیں تو یقین ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں اور اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک مشکل حل ہو جا سکتی ہے۔

اردو زبان حیدرآباد کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لیے
اس کے ہر دیہات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن بلدہ سے
زیادہ اہلِ دیہات میں اشاعتِ اردو کا کام اس لئے ہونا چاہیے کہ
..... وہ شہر سے دور ایسے گوشوں میں اپنی زندگی گزار رہے
ہیں جو شہری سہولتوں سے محروم ہے۔ ادارہ کی شاخیں اب تک
اورنگ آباد، محبوب نگر، جالنہ اور عثمان آباد میں قائم ہو چکی ہیں۔
اور توقع ہے کہ حیدرآباد کے ہر گوشے میں اس کی شاخ
قائم ہو جائے گی۔ ہم اضلاعی شاخوں سے بلند آہنگ توقعات
وابستہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اضلاع
میں رہ کر اضلاع کی ضروریات سے بہت زیادہ واقف ہیں۔
ہم چاہتے ہیں کہ ان کی پُرخلوص کوشش سے حیدرآباد کے ہر
گوشے میں اردو ادب عام ہو جائے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ
جاہلیت کے خلاف ایک مستحکم محاذ قائم کیا جائے۔

یہ کوئی دقت طلب کام نہیں ہے اگر ارادہ میں پختگی
مزاج میں استقلال اور دل میں خلوص ہو۔ ادارہ نے شعبہ
امتحانات قائم کر کے ایک راہِ عمل کھول دی ہے۔ اس لئے انہی
شاخوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو ادارے کے
امتحانات کی تیاری کے لئے آمادہ کریں اور ترغیب و مدد سے
انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

شاخ محبوب نگر۔ صدر مولوی سید تقی صاحب بلگرامی بیرسٹر اعلیٰ
ناظم عدالت ضلع۔ نائب صدر۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب صدیقی
بی اے ال ال بی۔ معتمد۔ مولوی حسن علی مرزا صاحب وکیل۔ شریک معتمد
مولوی عمر علی صاحب فاروقی وکیل۔

[illegible] ہمت راؤ صاحب
[illegible] صاحب سروت بی اے ال ال بی
[illegible] صاحب بی اے ال ال بی وکیل۔
ڈاکٹر [illegible] صاحب سول سرجن۔ سید [illegible] علی صاحب
مہتمم تعلیمات۔ مولوی سالم مسدوسی صاحب۔ مولوی عبدالعزیز صاحب
گتہ دار۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب آواز گتہ دار۔

شاخ جالنہ۔ صدر۔ مولوی افضل علی صاحب وکیل ہائیکورٹ
معتمد۔ مولوی افضل عابدی صاحب [illegible] مہتمم مولوی سید عمر صاحب
مولوی فاضل۔ کتب خانہ دار مسٹر غازی۔

نشرگاہ حیدرآباد

موجودہ زمانے میں نشریات نے جو غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے وہ
محتاجِ تشریح نہیں۔ ریڈیو تفریحی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے
تمدنِ حاضرہ میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ برق کی ترسیلی
قوت نے صوتی لحاظ سے ایک عالمی ارتباط پیدا کر دیا ہے
اور اس کی وجہ سے دنیا کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے
اتنے قریب ہو گئے ہیں جتنے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔
ریڈیو نے ملک و قوم کی خدمت کے نئے راستے کھول دئے ہیں۔
جس طرح فلم سے تعلیم و تہذیب کی اشاعت میں مدد لی جا سکتی ہے،
اسی طرح ریڈیو کے ذریعے سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ تعمیری
کام لیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو سے جو خدمات ہو سکتی ہیں ان میں
خدمتِ زبان بھی ہے۔ دنیا بھر کی نشرگاہوں سے ادبی پروگرام
کی نشر عوام میں "ادبی ذوق" پیدا کر رہی ہے۔ چونکہ ریڈیو کا
راست تعلق عوام سے بھی ہے اس لئے ذریعۂ نشر وہی زبان
ہو سکتی ہے جو عوام کی مشترکہ زبان ہو۔ بدقسمتی سے ہندوستان
میں زبان کے مسئلہ کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے اور یہ بحث ختم ہوتی
نظر نہیں آتی کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہے یا ہندی!

افسوس ہے کہ ادبی تعصبات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک کرن بھی ایسی نہیں جو انتہا پسندوں کو ایک مقام پر لا سکے۔ لیکن جب "آل انڈیا ریڈیو" نے اپنے سننے والوں سے دریافت کیا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کرتے ہیں تو زیادہ خطوط اردو (ہندوستانی) کی تائید میں وصول ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہندوستان کے فنون لطیفہ اپنے میں ہندوستانی تمدن کی روح رکھتے ہیں اسی طرح اردو بھی ہندوستان کے مشترکہ تمدن کی نشانی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ ابھی تک خارزار سیاست میں نہیں الجھا ہے اور "سیاسی دیوانگی" کا داؤں ہمیشہ چٹ ہی پڑا ہے۔ اردو حیدرآباد کی قومی اور ملکی زبان ہے۔ اس لئے اردو کی خدمت نہ صرف ملک و قوم بلکہ اپنی حقیقی تہذیب کی خدمت ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کا کل ہند بنیادوں پر حال ہی میں افتتاح ہوا ہے۔ لیکن وہ اردو کی جو خدمت کر رہی ہے قابل مبارکباد ہے ہمارے ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے، ہماری دفتری زبان اردو ہے، ہمارا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہمارا ذریعۂ نشر بھی اردو نہ ہو۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نشرگاہ کی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ اردو کے موجودہ رجحانات کا صحیح عکس ہے۔ اس کو ہندی نوازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ فارسی و عربی آمیز اردو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ملک کے تمام حقیقت شناس باشندوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زبان ہماری زبان ہے۔ ہم نشرگاہ حیدرآباد سے استدعا کریں گے کہ وہ بے جا اعتراضوں کو درمیان میں لائے بغیر زبان کے معاملہ میں موجودہ حکمت عملی ہی پر کاربند رہے تاکہ پروگرام کو زیادہ سے زیادہ۔ لوگ سنیں اور سمجھیں۔

چونکہ نشرگاہ حیدرآباد کی تقریریں عوام میں ایک علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں اس لئے ادارۂ ادبیات اردو نے ان کو مقررین صاحبان کی اجازت سے اپنے ماہنامہ سب رس میں یا کتابوں کی صورت میں شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "سائنس کے کرشمے" شائع ہو چکی ہے۔ جس کو ادارہ کے مخلص رفیق میر حسن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سائنس کے کرشموں پر ملک کی قابل ہستیوں کی عام فہم تقریریں جمع کی گئی ہیں۔

سب رس کی مجلس ادارت نے تصفیہ کیا ہے کہ جولائی ۱۹۴۲ء میں "سب رس" کا ایک "فضائی ادب نمبر" شائع کیا جائے جس میں ان نشری تقریروں کا انتخاب پیش کیا جائے جو اب تک نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں۔ ہم آئندہ شمارے میں اس نمبر کے متعلق تفصیل کے ساتھ عرض کرنے کے قابل ہو سکیں گے، فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ ایسا تنوع، شاذ ہی آپ نے کسی رسالہ میں دیکھا ہوگا جیسا کہ سب رس کے فضائی ادب نمبر میں ہوگا۔

جامعہ عثمانیہ جامعہ گزشتہ چند دنوں تک غیر معمولی علمی چہل پہل کا مرکز بنا رہا۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت کا افتتاح اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے بہ نفس نفیس فرمایا۔ جس عمارت کی بنیاد حضور شاہانہ نے اپنے دست مبارک سے رکھی ہو اور جس کا افتتاح خود حضور شاہانہ فرمائیں، وہ یقیناً علم و عمل کی پرورش کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اس موقع پر ارباب جامعہ اور طلبائے انجمن اتحاد کی جانب سے بارگاہ شاہانہ میں عقیدت مندانہ سپاس نامے پیش کرنے کی عزت حاصل کی گئی۔ ان سپاس ناموں کا

... ... عثمانین کی زندگیوں کے لئے

خسروی عنایت فرمایا گیا۔ اس سرزمین پر جہاں علم نامانوس زبانوں کی قید سے آزاد کیا گیا" اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تشریف آوری ایک فال نیک ہے جس نے عثمانئین کے جذبۂ عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔

کلیۂ فنون کی جدید عمارت میں افتتاح کے بعد ہی دو شاندار علمی اجتماعات ہوئے۔ ایک تو ماہرین فلسفہ کی کانفرنس اور دوسرا ماہرین ریاضی کی کانفرنس۔ ان دونوں کانفرنسوں میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے مندوبین جمع ہوئے تھے جنھوں نے جامعۂ عثمانیہ کی سرپرستی میں اپنے فنون کے متعلق غور و خوض کیا۔ ان دونوں کانفرنسوں کے لئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنے لطف و کرم سے پیامات کامیابی عطا فرمائے۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت نے اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں دو ایسے شاندار اجتماعات دیکھے جو شاید ہی کسی جامعہ کو آٹھ دن کی قلیل مدت میں نصیب ہوئے ہوں گے۔

طلبائے جامعہ کی جانب سے حسب معمول اس سال بھی "یوم جامعہ" منایا گیا لیکن اس کی ایک اہم خصوصیت ایسی ہے جو دوسری ایسی تقریبوں سے اسے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ مشاعرہ میں والاشان حضرت معظم جاہ بہادر شجیع کی تشریف آوری ہے۔ شہزادۂ والاشان نے جامعہ کے مشاعرہ کی صدارت قبول فرما کر خانوادۂ شاہی کی ان پیہم عنایات کا ایک اور نمایاں ثبوت دیا جو جامعۂ عثمانیہ پر ہمیشہ مبذول رہی ہیں۔ فرزندان جامعہ کے شعری رجحانات زندگی

... "ادارۂ ادبیات اردو"

... ... جا بجا جھلک دکھائی دیتی

... انہی دنوں میں شائع ہوئی۔ ان شعری

... میں شاہزادۂ والاشان کی دلچسپی

... ... اردو شاعری پر دکن کے روایاتی الطاف شاہانہ کا زندہ ثبوت ہے، بلاشبہ معاون ثابت ہوگا۔

"انجمن طیلسانئین عثمانیہ" ملک کی واحد انجمن ہے جس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ اراکین ہیں۔ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ انجمن طلبائے قدیم اور انجمن طیلسانین کو ایک مرکز پر لا لینے سے کیا کوئی ایسے نقصان کا امکان ہے جو ان دونوں انجمنوں کے مفادات کو متصادم کر دے گا۔ ہم ہمیشہ سے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اصحاب کو ایک ہی مرکز پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ بہرحال جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں انجمنیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سرگرم عمل ہیں تو ہمیں اس کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ عثمانی طیلسانوں کی کانفرنس، اس سال اورنگ آباد میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت ادارۂ ادبیات اردو کے ایک موسس مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی نے کی۔ اور جس کا افتتاح حضرت بسالت جاہ بہادر نے فرمایا۔ نواب بسالت جاہ بہادر کو ملک کی تعلیمی ترقی سے جو گہری دلچسپی ہے اس کا ثبوت ان کی مصروفیتوں سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

انجمن کی معاشی کمیٹی نے گزشتہ سال کی طرح، اس سال بھی باغ عام میں ایک عظیم الشان صنعتی نمائش منعقد کی ہے۔ اس قسم کی نمائشیں نہ صرف ملکی صناعوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں بلکہ اربابِ ملک کے دلوں میں بھی ایک احساس ترقی پیدا کرتی ہیں۔

دکن کی صنعتوں کا زوال ہماری سرد مہریوں کا نتیجہ ہے۔ اور آج جبکہ نظام زندگی کی بنیاد معاشی مسائل پر قائم ہے ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ پیدائش دولت کے بغیر ہماری تہذیب ترقی نہ کر سکے گی۔ معاشی کمیٹی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ملک کی صنعتوں کو ارباب حکومت کے سامنے پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملکی صنائع کا داغ دل، دراصل ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

فلموں کی زبان

ہندوستان کے طول و عرض میں فلموں کی زبان کے متعلق چہ میگوئیاں زمانے سے جاری ہیں۔ اور فلموں کو دیکھنے والوں نے افسوس کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ اکثر فلموں کی زبان کا پلہ اس غیر مانوس زبان کی طرف جھکا ہوا ہے جس کو کم از کم اہل حیدرآباد سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فلم میں بھی وہی زبان استعمال ہونی چاہیے جو ہماری مشترکہ زبان ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے نہیں تیار کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ایک طولانی بحث ہے جس کو ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اردو سے محبت رکھنے والوں کا کیا یہ مقدس فرض نہیں ہے کہ وہ ایسے فلموں کی حوصلہ افزائی کریں جو اردو کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کے انکاری جواب کا ہمیں گمان تک نہیں۔ ہم ہندی نژاد فلمی کمپنیوں کی نیتوں پر حملہ کئے بغیر اپنی زبان اور اس کے ذریعے سے اپنے تمدن کی حفاظت کے دل سے آرزومند ہیں۔ یہی وہ احساس تھا جس کے تحت مسٹر سہراب مودی کا جب وہ اردو نواز دکن میں آئے تو خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا وہ سہراب مودی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدمت گزار اردو کی حیثیت سے ہمارے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ذاتیات کی الجھنوں میں الجھ کر خدمات کو فراموش کر دینا کوئی ایسی قابل تعریف بات نہیں جس کو ہنگامہ آرائی کے لئے بہانہ بنایا جائے۔ "کون کیا ہے" کا سوال "کس نے کیا کیا؟" کے درمیان کیوں لایا جائے۔ جو لوگ اردو کے سہارے جیتے ہیں وہ تعصبات ظاہری میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظرانداز نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں اس کا دلی افسوس ہے کہ غلط فہمی یا کسی اور بنا پر اس بارے میں عوام کی رائے کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ بہرحال یہ ایک وقتی چیز تھی، لیکن کام قدر حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسٹر سہراب مودی کی حیثیت صاف ہے اور اردو کے متعلق انھوں نے جو خیالات اپنی نشری تقریر میں ظاہر کئے ہیں، ان کی وجہ سے ان کی عزت اردو دنیا میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

امدادی سرمایۂ جنگ

گزشتہ مہینے امدادی سرمایہ جنگ کے لئے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت 'ادارۂ ادبیات اردو' کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس پرنس آف برار نے فرمائی۔ یورپ کی نازک صورت حال، ایک عالمی تشویش کا باعث بن گئی ہے اس لئے ساری دنیا کے امن و امان کو آمری قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مخالفین نبرد آزما ہیں۔ امن و امان کے تحفظ کا جذبہ یقیناً ایک مقدس جذبہ ہے اس لئے ان کی امداد ضروری ہے جو ہماری سلامتی کے لئے اپنی سلامتی کو خاطر میں لائے بغیر لڑ رہے ہیں اس جلسہ میں ہز ہائنس پرنس آف برار کے علاوہ شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر، سر یمین السلطنت ہز ایکسلنسی سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر، اور نواب سالار جنگ بہادر نے بھی تقریریں فرمائیں۔ یہ جلسہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلا جلسہ ہے جس کے اسٹیج سے ایک ہی وقت میں ملک کی بلند پایہ شخصیتوں نے اہل شہر کو مخاطب کیا۔

اور نواب کمال یار جنگ بہادر ملک کے ان گنے چنے امرا
میں سے ہیں جو ملک و قوم کا حقیقی درد رکھتے ہیں۔ خصوصاً
دکن کے قحط زدہ غریبوں کے لئے انھوں نے حال ہی میں جو
پُرخلوص کوششیں کی ہیں کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ اس لئے
ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس کی صدارت کے لئے ان کا
انتخاب اربابِ کانفرنس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔ ہم نواب
کمال یار جنگ بہادر کو پُرخلوص مبارک باد دیتے ہوئے ان سے
یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی ملک و قوم کی تعمیری خدمت
میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ کانفرنس میں جو تحریکیں منظور ہوئیں
ان میں سب سے زیادہ اہم شمالی ہند کی جامعات اور خاص
طور پر جامعہ علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور جہاں
ابھی تک اردو کی تعلیم اختیاری مضامین کے طور پر نہیں دی جارہی
ہے وہاں اس کا انتظام کرنے سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع
ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنے تمام وسائل سے کام لے کر اس تحریک
کو عملی جامہ پہنائے بغیر چین نہیں لے گی۔

انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ

دہلی میں "انجمن ترقی اردو" کی منتقلی کے بعد حیدرآباد
میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے۔ "انجمن ترقی اردو" نے
اردو کی ترقی و اشاعت میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا ہے۔ اور ایسے
وقت میں جب کہ اردو ہندی کشمکش بڑھتی جارہی ہے اردو کی
حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس انجمن کو حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے
ایک جش قرار رقم سالانہ امداد کے طور پر دی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں

اس کی شاخ کے معتمد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی
... یامعی میں ہندوستان بھر
... ان سے ہماری خوش گوار توقعات بندھی تھیں
حال ہی میں ایک شگوفہ چھوڑا گیا اور وہ یہ کہ
... اور ادارۂ ادبیات اردو میں اختلاف
ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے بنیاد افواہ کیوں پھیلائی گئی
اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اردو اکاڈمی
جامعۂ ملیہ دہلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکاڈیمی
الہ آباد، اردو مرکز لاہور کی طرح ادارۂ ادبیات اردو بھی انجمن
ترقی اردو یا کسی اور ایسی انجمن کے ساتھ تعاون عمل کرنے ہمیشہ
تیار رہا جس کا مقصد اردو کی خدمت گزاری ہے۔ انجمن ترقی اردو
ہندوستان بھر میں اردو کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کو برقرار
رکھنے کی جوان تھک کوشش کر رہی ہے وہ غالباً دوسری کسی
انجمن سے ممکن نہیں۔ انجمن کے اغراض کی تکمیل کے لئے جس قدر
زیادہ شاخیں قائم کی جائیں اچھا ہے لیکن اس سے یہ لازم
نہیں آتا کہ دوسرے ادارے جن کے نام ہم نے اوپر گنا
دئے ہیں وہ اپنی برسوں کی کارگزاری اور اس کے لازمی
وجوبات (Obligations) کے ساتھ اپنا وجود ختم کردیں۔

انعامی مضامین کا اعلان

سب رس ۱۹۳۹ء کے بہترین مضامین کے لئے

حسب ذیل اصحاب نے انعامات عطا فرمائے ہیں۔ انعامات
دینے کا تصفیہ ایک مجلس کے سپرد کیا گیا ہے جس کا نتیجہ
فروری ۱۹۴۲ء کے سب رس میں شایع ہوگا۔

(۱) اصلاحی مضمون یا افسانہ:- محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا۔

(۲) ضمیمۂ سب رس دیکھو بھالا کے لئے بہترین مضمون یا افسانہ یا نظم۔
نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار۔

(۳) سب رس کا بہترین علمی ادبی مضمون:- ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
میکش



پہلی صف ۱۔ اشک۔ ۲۔ ذکی ۳۔ قریشی ۴۔ زور ۵۔ اکبر ٦۔ رشدی
دوسری صف ۷۔ مخدوم ۸۔ وجد ۹۔ رگھونندن راج سکسینہ ۱۰۔ باقی
تیسری صف ۱۱۔ مہندر راج سکسینہ ۱۲۔ شکیب ۱۳۔ میکش

اردو ادب کا مطالعہ

زبان خواہ مادری ہو یا غیر مادری ادب خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان سب کے مطالعہ کے اصول اور تحصیل کے طریقے تقریباً متحد ہیں۔ متمدن اقوام مادری زبان کو بغیر کسی خاص کاوش کے حاصل کر لینے کو فطری طریقہ سمجھتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس کو ہم فطری طریقہ سمجھتے ہیں اس میں ہماری اکتسابی قوت کا حصہ کہاں تک شریک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان خواہ وہ آغوشِ مادر میں سیکھی جائے یا استاد کے سایۂ شفقت میں بغیر تکرار و اعادہ کے حاصل نہیں ہوتی۔ بچہ ولادت کے وقت کوئی زبان بولتا ہوا نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولتا ہے جن [illegible] سے دوچار ہوتا ہے ان کی آواز اور زبان وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار لگاتار سنتا رہتا ہے جتنی آوازیں اس [illegible] جتنی زیادہ اس کے دماغی اعصاب پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ جب بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زبان ہلا سکے تو سب [illegible] الفاظ کو استعمال کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ الفاظ کو جملوں کے ذریعہ ادا کرتا ہے۔ اس طریقِ تحصیل کے تحت میں اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اعادہ و تکرار کا نفسیاتی پہلو سامنے آئے گا۔ جن جملوں کو بچہ بار بار سنتا ہے ان کا کچھ عرصہ بعد بلا تامل اور بلا اختیار اپنی زبان سے اعادہ کرتا ہے۔

اس طور سے اور انہیں اصول کی بنا پر جب ہم کسی غیر زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو مفرد الفاظ اور مکمل جملوں کو بار بار دہراتے اور انہیں کو لکھ کر مشق و مزاولت پیدا کرتے ہیں۔ مادری اور غیر مادری زبان کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مادری زبان کے سننے اور بولنے کے موقعے ہم لوگوں کو بہ نسبت غیر مادری زبان کے زیادہ ملتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو نوجوان کسی غیر ملک میں جا کر کسی خاندان میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو وہ جلد تر وہاں کی زبان اور اس کے روزمرہ اور محاورں پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ ہم اس بین اصول کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں کہ زبان اور ادب خواہ وہ کسی ملک کا ہو اکتسابی ہے نہ کہ وہبی۔ انفرادی استعداد، ذہانت اور طباعی کا اثر ادب کی تحصیل اور تخلیق میں اکثر پایا جاتا ہے۔ مگر ان فطری صلاحیتوں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص محض ذکاوت اور طباعی کے بھروسے پر رہ کر بغیر محنت اور کسب کے زبان پر قدرت حاصل کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کد و کاوش اور بغیر محنت و جانفشانی کے کوئی علم یا ادب حاصل نہیں ہو سکتا۔

عرصۂ دراز تک اردو زبان کی تحصیل اور صحت کا دار و مدار اہلِ زبان ہونے پر غلط فہمی سے مانا جاتا تھا۔ جو لوگ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہوتے انہیں کو یہ طغرائے کمال حاصل تھا کہ وہ صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے اہل سمجھے جاتے۔ اس کمزور نظریہ کی سب سے اردو زبان کی ترقی کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی معمولی ذہانت اور عقل و فہم کا انسان اگر کافی توجہ اور تندہی سے کسی ادب کا عموماً اور اردو کا خصوصاً بالاستیعاب مطالعہ کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کچھ عرصہ میں اس پر قابلِ رشک قدرت نہ حاصل کر لے۔ ہمارے ادیبوں میں اکثر و بیشتر جن کو لکھنؤ یا دہلی کے شہری ہونے کا فخر نہیں حاصل تھا باوجود اس امر کے وہ آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور ان کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔ شبلیؔ، حالیؔ، نذیر احمد، عبدالماجد دریابادی

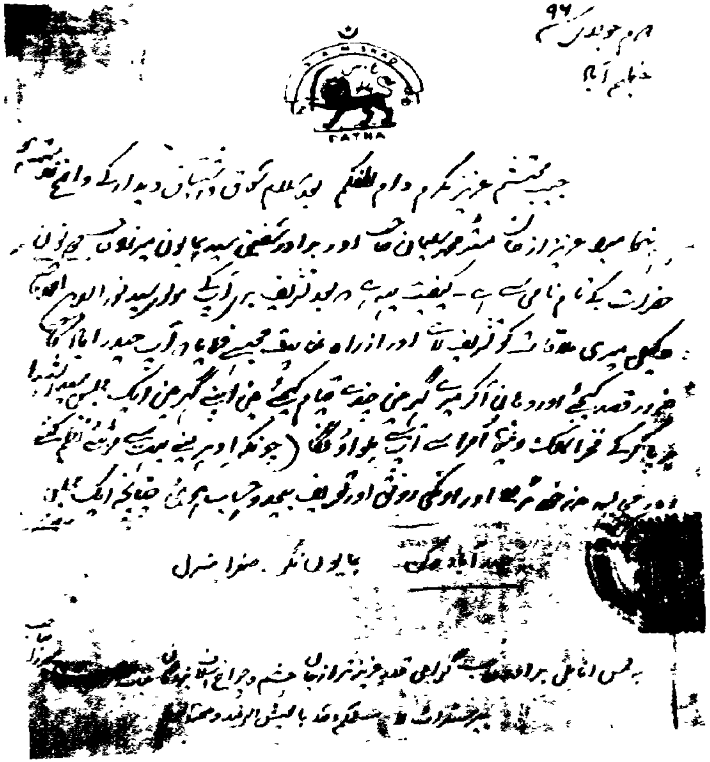
اس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کو یہ معلوم ہو کہ ہماری دنیا ہمارے جذبات اور خیالات کا عکس ہوا کرتی ہے جس کی طبیعت مضمحل یا پژمردہ نہ ہوئی ہو وہ اس شعر سے بھلا کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

میری آخری تجویز یہ ہے کہ ادب اردو کا مطالعہ بے لاگ سچائی اور ذہنی ایمان داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ادیب اور ناقد جب کسی سے خوش ظن ہوتے ہیں تو اس کے کلام کے ہر پہلو کی تعریف کرتے ہیں خواہ بلند پایہ کلام نہ ہو اسی طرح سے اگر وہ کسی سے بدظن یا ناخوش ہوتے ہیں تو اس کا کلام خواہ کتنا ہی پرمعنی اور پرمغز کیوں نہ ہو پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے یہ رویہ اصول تنقید کے منافی ہے۔ کلام کو پرکھتے وقت اس کے حسن و قبح پر یکساں نظر ڈالنی چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم شاعر سے خوش ظن ہیں یا بدظن۔ ذاتی مناقشات اور اختلاف رائے کو پس پشت ڈال کر اور اپنے رذیل جذبات پر قدرت حاصل کر کے ہم کو ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تنقید کا بے لاگ اصول یہ ہے کہ جس کلام میں جتنے محاسن ہیں ان کو سراہیں اور ان کی ادبی خوبیوں اور باریکیوں کو منظر عام پر لاویں اور جتنے معائب ہوں ان کو بلا کم و کاست اور بغیر کسی تحقیر و تذلیل کے مہذب طریقے سے جتا دیں [illegible] زیادہ نقصان ہمارے ذاتی مناقشات [illegible] غیر ضروری اختلافات پر ضرورت سے زیادہ [illegible] ایک دوسرے کے کلام کی منصفانہ قدر نہ کریں گے اور ذہنی ایمان داری کو [illegible] نہ بنائیں گے ہماری زبان اور ادب کی ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ بغیر باہمی ہمت افزائی اور قدر دانی کے [illegible] اپنی محنت اور جاں کاہی کے ثمرہ سے ہم کو فیض یاب کر سکتے ہیں۔

م حفیظ سیّد



میر حسن ایم اے



عکس خط شاد عظیم آبادی



محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا



صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

دکنی بولی

(یہ مضمون آکاشوانی نشر گاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا تھا۔)

دکنی بولی آج اردو زبان کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اپنے آغازی دور میں اور اس کے بعد بھی کئی سو سال تک اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وہ زبان ہے جو گولکنڈہ، بیجاپور اور دکن کی دوسری سلطنتوں میں ایک عرصے تک تعلیم یافتوں کی معیاری تحریری اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے رائج کرتی رہی ہے۔

دکنی زبان کی ماہیت اور اس کے نشو ونما کے خاص حالات پر غور کرنے کے لئے اردو زبان کی تاریخ میں سیکڑوں سال پیچھے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اردو زبان جیسا کہ سب جانتے ہیں، فارسی بولنے والے مسلمانوں اور کھڑی بولی بولنے والے ہندوؤں کے پنجاب میں میل جول کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں سلطان محمود غزنوی کی حکومت بڑے عرصے تک قائم رہی اس کے بعد محمد غوری کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی اردو کے خدوخال موہوم ہی رہے۔ اور اس میں انفرادیت یا شخصیت کا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

خلجیوں کے دور میں اردو جس نے پنجاب میں جنم لیا تھا علاء الدین خلجی کے ساتھ دکن پہنچی۔ یہاں اس کی پرورش شمال سے بالکل مختلف اور دکنی طبائع کے میلانات کے مطابق جداگانہ قسم کے ماحول اور اثرات کے تحت ہوئی۔ دکن کی یہ اردو دکنی کہلانے لگی۔

دکنی زبان نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے عروج کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ اس میں سوا ڈیڑھ سو سال تک ادبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمال میں اردو صرف بول چال کی زبان تھی، علم و ادب شعر و شاعری یہاں تک کہ خط و کتابت کی زبان بھی ایرانی تھی۔ شمال میں اردو سے بے توجہی اور ایرانی کے فروغ کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں صدیوں تک ایرانی علماء اور شعراء کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ اور سرکاری زبان بھی ایرانی ہی تھی جسے ہندوؤں کے لئے بھی ملازمت کے لئے ضروری قرار دے کر راجہ ٹوڈرمل نے ترقی کی رفتار اور تیز کر دی۔

برخلاف اس کے دکن کے حالات شمال سے مختلف رہے۔ ہندوستان کے اس حصے پر زیادہ تر یورشیں شمال ہی کی طرف سے ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس زمانے میں بند صیاچل کو عبور کر کے دکن پہنچنا بڑی زحمت کا باعث ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی سلطنتوں میں سالہا سال تک امن رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے اور ایک مخلوط دکنی تمدن کی بنیادیں قائم ہوئیں۔

اردو زبان اور ادب کے دکن میں فروغ پانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی عدالتی اور سرکاری زبان دکنی تھی۔ اس کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بیشتر بادشاہ نہ صرف خود عالم اور اہل قلم تھے بلکہ علم و ادب کی سرپرستی بھی بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔

خیالات کے

جو اصنافِ شعر مثلاً قصیدہ،

اس عہد کے مشہور شاعروں میں غواصی، ابن نشاطی، طبعی، جنیدی، سعدی، نوری، شاہی، مرزا، طالب، مؤمن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن میں سے بعض کے کلام کے نمونے "اردو شہ پارے" میں شایع ہو چکے ہیں۔

مرثیہ گوئی کو اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ کیونکہ شعرا مرثیہ گوئی کو دین اور دنیا دونوں کی بہتری کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مرثیے سنا سنا کر ایک طرف درباروں میں انعام پاتے تھے اور دوسری طرف انھیں ثواب اور نجات کی بھی امید تھی۔

بیجاپور کے عادل شاہی دربار کے شاعروں میں نصرتی، ہاشم، مرزا، امین، شاہ ملک اور مومن قابل ذکر ہیں۔

دکنی دور کی نثری تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت ملا وجہی کی "سب رس" کو حاصل ہے۔ جو سنہ ۱۰۴۵ھ میں یعنی آج سے تقریباً تین سو سال قبل لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے۔

ملا وجہی سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ کا درباری شاعر تھا۔ سب رس اسی بادشاہ کے حکم سے شایع ہوئی۔ قدیم دکنی اردو نثر کے بعض نمونے اس سے پہلے کے بھی ملفوظات اور مذہبی رسائل کی شکل میں ملے ہیں۔ لیکن "سب رس" ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے۔ اس سے پہلے کی کسی کتاب میں ایسی خوبیاں پائی نہیں جاتیں، جو گولکنڈہ کے اس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ سب رس کا موضوع حسن و دل کا قصہ ہے جو تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ نثر مقفیٰ ہے اس کے باوجود زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔ وجہی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر دکنی زبانوں مثلاً تلنگی اور مرہٹی کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کئے ہیں۔

دکنی ادب کی ترقی کے سلسلے میں اس وقت تک جن لکھنے والوں کا ذکر ہوا تقریباً ان سب کی شہرت بیسویں صدی کے اوائل تک مقامی رہی۔ دکن کا پہلا شاعر جس کا کلام نہ صرف سارے دکن میں مقبول ہوا بلکہ جس نے بندھیاچل کو عبور کر کے شمالی ہندوستان کو بھی مسخر کر لیا ولی تھا۔ ولی اورنگ آبادی کا کلام جب شمال پہنچا تو اہل کمال نے اس کی دل سے قدر کی۔ یہ ولی ہی کا اثر تھا کہ شمال میں حاتم، آبرو، آرزو اور دوسرے اساتذہ نے پہلی دفعہ اردو میں شعر کہنا شروع کیا جس کا ثبوت خود ان کے کلام سے ملتا ہے۔ ولی کے اثرات سے دکنی الفاظ اور محاورے شمالی ہند کے متقدمین کے کلام میں کثرت سے داخل ہوئے اور اپنی دل آویزی اور انوکھے پن کی وجہ سے ادب میں ایسے رچ گئے کہ متوسطین کے کلام میں بھی اس کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

شمال میں اردو نویسی کو مزید تقویتیں بھی ہوئی جب شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گولکنڈہ کے شاہی کتب خانہ کی نادر دکنی کتابیں دلی پہنچیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ادبی ذوق رکھنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اردو شعر و نثر کا دور شمال میں بھی شروع ہو گیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شمال اور جنوب کے درمیان کی رکاوٹیں روز بروز دور ہوتی گئیں۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی آسانیوں نے دور افتادہ مقامات کو بھی گویا ایک دوسرے سے قریب کر دیا، جس کی وجہ سے ہندوستان کے سارے حصوں کی انفرادیت اور مقامی خصوصیات پر کل ہند اثرات حاوی ہونے لگے۔

بہت جلد وہ زمانہ آگیا جب کہ دکنی ادبی زبان کے لئے ناموزوں ہو گئی اور ناموزوں سمجھی جانے لگی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند اور خاص طور پر دلی اور لکھنؤ کی زبان نے معیاری زبان ہونے کا امتیاز حاصل کر لیا۔ اس انقلاب کی وجہ صاف ہے جو یہ ہے کہ جس حصہ ملک کے اہل قلم تصنیف و تالیف میں پیش پیش رہتے ہیں وہیں کی زبان معیاری اور قابل تقلید بن جاتی ہے۔

دکن میں جس وقت تک علم و ادب کا زور تھا دکنی معیاری زبان بنی رہی مگر اس کا دائرہ مختلف وجوہات کی بنا پر بہت بڑی حد تک محدود ہی رہا۔ اور جب شمال میں ایک سے ایک بڑے اور باعظمت شاعر اور نثر نگار پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو کو غیر فانی بنا دیا تو انہیں کی زبان لازمی طور پر ادبی زبان کے رتبہ پر پہونچ گئی۔

معیاری اردو نے شمالی ہند میں جنم لیا لیکن آج وہ تمام جغرافی پابندیوں سے آزاد ہو کر سارے ہندوستان کے تعلیم یافتوں اور انشا پردازوں اور شاعروں کی زبان ہے۔ دکنی اپنی خاص دل کشیوں کے باوجود ایک مقامی بولی ہو کر رہ گئی ہے اس کے بولنے والوں میں دکن کے دیہات کے رہنے والے اور شہروں اور اضلاع کے ان پڑھ باشندے ہیں۔ تعلیم یافتوں کے اثر سے شہر کے عوام کی زبان تو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے لیکن بعض اضلاع والوں کی زبان باہر کے اثرات سے اس وقت تک اس قدر محفوظ ہے کہ ان سے باتیں کرنے میں "سب رس" پڑھنے کا لطف آجاتا ہے۔

بازاری دکنی بڑی پر لطف بولی ہے جو دکن اور خاص طور پر ریاست حیدرآباد کے شہری علاقوں میں بے تکلف رائج ہے۔

میر حسن

فاتحۂ سالانہ

عورتیں آئی ہیں کثرت سی سے واں
بلکہ رہ گئی ہے کم خالی

یہ جو پھیلا ہوا سامان ہے بریانی کا
فرض کرتی ہے ادا اس کی نگہبانی کا

اک یہی فرض نہیں اس کے فرائض میں ابھی
آئی کوئی عزیزہ تو یہ ملنے کو گئی

عورتیں خاص عزیزوں میں کم ایسی ہوں گی
جو کسی خاص سبب ہی سے نہ آئی ہوں گی

کام بھی کرتی ہے باہر بھی کئے جاتی ہے
[illegible] سنجیدہ خیالی کی لئے جاتی ہے

۲

حیرت انگیز ہے اس کا "عمل آرا" عالم
زعفران حل کبھی کرتی ہے کھرل میں پیہم

گوشت بھنوائی ہے بیٹی کی مدد سے گاہے
جو ہو خود دار وہ اوروں سے مدد کیوں چاہے

دیگ کے نیچے کبھی آگ یہ بھڑکاتی ہے
چہرہ تپتا ہے تو دم بھر کو سرک جاتی ہے

کبھی یخنی کے مصالح کی یہ لیتی ہے خبر
غرض آتی ہے نظر گاہ ادھر گاہ ادھر

جب کسی کام میں دیتی ہے بہو اس کا ساتھ
کام کرتی ہوئی کر لیتی ہے کچھ کام کی بات

یاں بہو منتظرِ حکم ہے باہر بیٹا
دل کسی کام میں اس کا نہیں ہوتا بیٹا

۳

عمر چالیس سے گو تک بھگ ہے مگر اس پر بھی
نظر آتی ہے یہ فی الحال جواں ہمت ہی

چلن اس غم زدہ بی بی کا شریفانہ ہے
سبق آموزِ جہاں عصمتِ ریحانہ ہے

زخمِ دل ہے اسے سانحۂ ہجرِ دوامِ شوہر
آہ کس طرح بھلا دیتی یہ نامِ شوہر

کون یاد آئے گا پھر گر نہ اسے یاد کیا
جس نے اکیس برس ہر جہتی ساتھ دیا

بست و یک سالہ رفاقت کا اثر کیا کہنا
اس کو آساں ہے اب اس کی ہی دھن میں رہنا

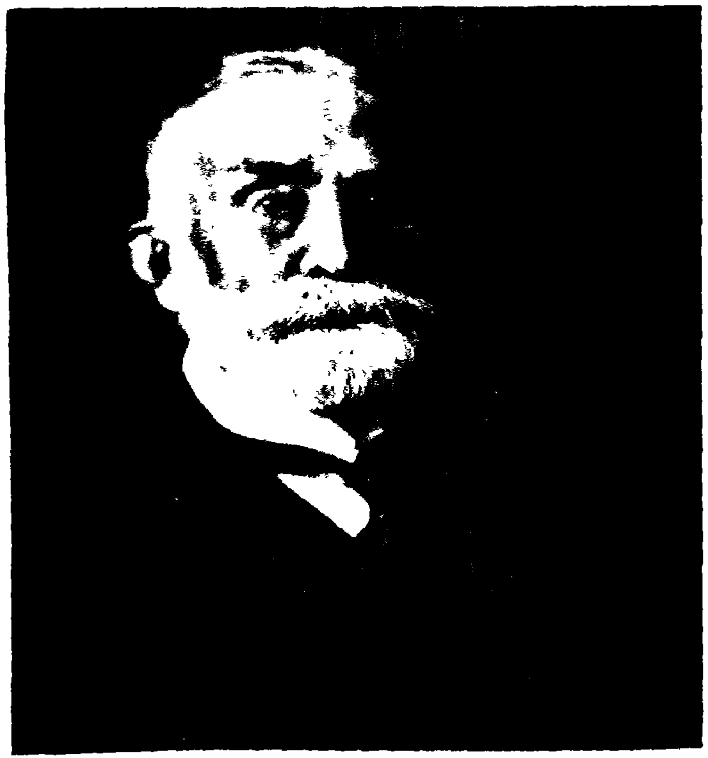
پختہ کارانہ تصور یہ ہیں اس کے سب ڈھنگ
ایک تصویر میں برسوں سے بھری جاتی ہے رنگ

یہ مناتی ہے جس انداز سے یومِ شوہر
اس کے ہر سال ہوا کرتے ہیں چرچے گھر گھر

علی منظور



سر سید احمد خاں



نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی



مرزا فرحت اللہ بیگ



مرزا اسد اللہ خاں غالب

حیدر آباد تا دلّی

ایک انگریزی مثل ہے کہ "بعض واقعات قصہ کہانیوں سے بڑھ جاتے ہیں" حیدر آباد سے چلتے وقت مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ خود مجھے پیش آنے والا ہے۔

چھتیس ۳۶ گھنٹے کے لگاتار سفر سے وحشت تو ضرور تھی مگر یہ کیا خبر تھی کہ راستے میں یہ وحشت دہشت کا رنگ اختیار کر لے گی۔ ۲۷ نومبر کو گھر سے چلا اسٹیشن پر یار دوست چھوڑنے آئے۔ گھنٹی بجی گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے چیخ ماری۔ پہیوں نے گردش کی۔ گاڑی چلی اور ہم حیدر آبادی سے دلّی والے بننے شروع ہو گئے۔ بعض دوستوں نے دور ہی سے سلام علیک کھینچ ماری۔

بعض ریل کے ساتھ ساتھ چلتے اور ہاتھ ملاتے رہے۔ مگر کہاں تک ذرا سی دیر میں "ایک میں تھا ایک خدا کی ذات تھی" معلوم نہیں مسافروں کو مجھ سے کیا دشمنی تھی کہ ایک بھلا آدمی بھی میرے درجے میں نہیں آیا۔ اور حیدر آباد سے لگا کر دہلی تک میں رہا اور چار قدم لمبا اور تین قدم چوڑا درجہ بعض مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خالی درجہ پا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو اگر وہ واقعہ پیش آئے جو مجھے پیش آیا ہے تو یقین مانیے کہ وہ خالی درجے میں بیٹھنے سے اتنا ہی ڈریں جتنا یو، پی کے زمیندار آج کل نئے قانونِ اراضی سے ڈر رہے ہیں۔

ہاں صاحب تو، خیر، گاڑی چلی ہم کھڑکی میں سے جھانکتے اور دیکھتے رہے کہ فلاں صاحب کا گھر سامنے سے گزر گیا، فلاں صاحب کا بنگلہ نکل گیا۔ خیرت آباد کا اسٹیشن آیا حسین ساگر جنکشن آیا اور گھس گھس گھس گھس کر کے ریل سکندر آباد پہونچ ہی گئی۔ کہنے کو تو یہ گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس کی دُم ہے، مگر شاید ہی کوئی اسٹیشن ہوگا جہاں یہ سستا نہ لیتی ہو۔ شوال کی پانچویں تھی۔ تھوڑی سی دیر میں چاندنی غائب ہو گئی۔ اس لئے ناچار کچھوے کی طرح گردن کھڑکی سے اندر کر لی جھلملیاں چڑھا دیں۔ بستر پر سے کوئلے کے ریزوں کو جھٹکا اور چادر اوڑھ سونے کی تیاری کی۔ مگر جو شخص رات کے گیارہ بارہ بجے سوتا ہو اس کو بھلا نو بجے نیند کیوں آنے لگی تھوڑی دیر لوٹتے پوٹتے خیال آیا کہ اوہو ابھی تک نماز تو پڑھی ہی نہیں لاؤ وہ بھی پڑھ لیں۔ غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہو گئے مگر ریل کے جھٹکوں کی وجہ سے بیٹھ جانا پڑا۔ خیر نماز تو ہو گئی مگر کیسی ہوئی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کتاب اٹھائی کہ شاید پڑھنے ہی میں کچھ وقت کٹ جائے مگر سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ اس وقت خیال آیا کہ یار اگر اس وقت افیون ساتھ ہوتی تو مزا آ جاتا۔ میں اوپر کے درجے میں سفر کرنے والوں کو صلاح دیتا ہوں کہ وہ سفر میں اپنے ساتھ افیون کی دو چار گولیاں رکھ لیا کریں تاکہ اگر سفر دور کا ہو اور درجہ خالی ملے تو یہ گولیاں" داشتہ آید بکار" بن سکیں۔

جعفر زٹلی فرماتے ہیں "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" سوچے کہ لاؤ افیون نہ سہی سگریٹ ہی سے اس کمی کو پورا کریں۔ ڈبہ پاس تھا کھولا اور سگریٹ پر سگریٹ دھونکنے شروع کیے۔ لیکن اس کے دھوئیں نے دماغ میں وہ خشکی پیدا کی کہ رہی سہی نیند اور بھی اڑ گئی۔ دس بجے قاضی پیٹھ پہونچے۔ وہاں ہماری گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس میں جڑنے والی تھی اور اس گاڑی کے آنے میں دیر تھی اس لئے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا مگر یہ چہل قدمی

مدراس کی گاڑی ان اور ہم سفر ... چلنے شروع ہوئے۔ یہاں جس حصۂ ملک میں سے ریل گزرتی ہے اس میں انسانوں سے زیادہ جانور آباد ہیں اور چونکہ وہ مسافروں کو اتارنے چڑھانے بہت کام آتے ہیں اس لئے یہ اسٹیشن اکثر سنسان کف دشت میدان بنے رہتے ہیں ہاں اگر کبھی کوئی شیر یا چیتا ادھر آ نکلتا ہے تو ذرا چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بہرحال ریل چلتی رہی اور ہم بنچ پر لوٹ مارتے رہے۔ اسٹیشن آتا تو کھڑکی کھول کر ذرا جھانک لیتے اور اگر کوئی اللہ کا بندہ نظر آجاتا تو اسی سے پوچھ بھی لیتے "بھئی یہ کون سا اسٹیشن ہے" مگر وہ ذاتِ شریف کچھ ایسے لہجے میں جواب دیتے کہ اس کا سمجھنا ہماری عقل سے باہر ہوتا۔ خدا خدا کر کے رات کے چار بجے بلہارشاہ اسٹیشن آیا اور اس وقت ذرا طبیعت بحال ہوئی کہ چلو اب صبح قریب ہے اور کچھ نہیں تو کم سے کم آدمیوں کی شکلیں تو دکھائی دیں گی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد پورب میں شفق کے کنارے سرخ ہونے اور پھٹ سے صبح ہو گئی۔ اس روز صبح ہونے کی جس قدر خوشی مجھے ہوئی ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی رات کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاعر شبِ فراق اور عالمِ تنہائی کا رونا اس قدر کیوں روتے ہیں مگر جب دیکھو تن تازہ مونچھوں پر تاؤ دیتے نظر آتے ہیں۔ ریل میں اس رات کے گزارنے کے بعد یہ مسئلہ بآسانی حل ہو گیا اور پتہ چلا کہ واقعی شبِ فراق ان بیچاروں پر سخت گزرتی ہے مگر صبح کی آمد پھر ان کو جیسے کا ویسا کر دیتی ہے۔

... رھے کا اسٹیشن آیا ان کا ... آمدنی بہت بڑھا دی ہے۔ ذرا کہیں ... مرے بار واردھے کر۔ یہاں ہم نے وہ کنکنا بادامی رنگ کا پانی پیا جس کو عرفِ عام میں چائے کہا جاتا ہے۔ کوئی بیس برس کی بات ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شخص کافی بیچنے آتا اور بڑے سخت لہجے میں آواز لگایا کرتا تھا کہ "کافی ایٹ گرم" چنانچہ اس کا نام ہی "کافی ایٹ" پڑ گیا تھا۔ خوب بکری ہوتی تھی مگر خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ اس نے یہ چلتا ہوا دھندا چھوڑ ہمارے ہاں نوکری کر لی۔ ایک دن سب نے اس سے فرمائش کی کہ کافی بناؤ۔ اس نے پانی دیگچی میں چڑھا، خدا معلوم کیا کیا الا بلا ڈال کافی بنا ہمارے سامنے لا رکھی۔ آپ یقین مانیے کہ اس کافی کے نسخے تو دس بارہ اجزا مگر اس میں بُن نام کو نہ تھے۔ اسی نمونے کی وہ چائے ہوتی ہے جو اسٹیشنوں پر ملتی ہے اور زہر مار کی جاتی ہے۔

میں پالیٹکس سے ہمیشہ دور رہتا ہوں مگر خبر نہیں کہ یہ واردھے کی چائے کا زور تھا یا وہاں کی آب و ہوا کا اثر کہ ایک دفعہ ہی میرے خیالات پولیٹیکل ہو گئے اور ان خیالات کا وہ زور بندھا کہ بڑی مشکل سے یہ نعرہ ساڑھے نو بجے ناگپور کے سنتروں کی ترشی سے اترا۔ میں ہر اس مسافر کو جو ناگپور پر سے گزرتا ہے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اسٹیشن پر سنتروں کی جو ٹوکریاں بکنے آتی ہیں ان کو ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں ورنہ بھئی وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی" اسی طرح سمجھ لو کہ "ہر وہ چیز جو ان ٹوکریوں میں ہوتی ہے سنترہ نہیں ہوتی" ہم لوگ بھی

ایک ٹوکری خریدی۔ پہلے بارہ آنے مانگے گئے آخر جب ریل چلنے لگی تو دو آنے پر تصفیہ ہوا۔ چلتی گاڑی سے ہم نے دوانی باہر پھینکی اور اس نے سنتروں کی ٹوکری اندر لڑھکا دی ٹوکری میں سے جو سنترے نکلے ہیں وہ بس دیکھنے کے قابل تھے۔ کھانے کے کام کے تو تھے نہیں۔ ہاں خاصہ بھلا چنگا اچار تھا۔ اوپر کی تہ ذرا اچھی تھی، سوچے کہ چلو دو آنے میں چھ سنترے ہی کیا بُرے رہے۔ ایک کو چھیلا، پھانک کو صاف کیا، بیج نکال کر پھینکے، پھانک منہ میں رکھی اس کے بعد کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ کھٹاس افعل التفضیل کے صیغہ کے ساتھ منہ میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ میں بغیر سوچے سمجھے کلی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دانت بیکار ہو گئے ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

دشنام ہو کے ترش وہ مجھ کو ہزار دے

یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اگر جاڑے میں استاد مرحوم ناگپور کے سنترے کھاتے تو ہرگز یہ شعر نہ لکھتے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کونسے عاشق ہیں جو جاڑے میں ناگپور کے سنترے کھائیں اور اس ترشی سے ان کا نشۂ عشق ہرن نہ ہو جائے۔

ناگپور سے آگے جو اسٹیشن پڑتے ہیں ان کو معناً اسٹیشن کہا جا سکتا ہے کہ وہاں گاڑی ٹھیرتی ہے ورنہ بغیر دوربین کے ان کو دیکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہاں سنترے ہر جگہ ملتے ہیں اور خدا کے فضل سے کھائے بھی جاتے ہیں بھلا ناگپور کے سنتروں کا مزہ چکھنے کے بعد میری کیا ہمت ہو سکتی تھی کہ ان کے خریدنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا۔ اس لئے دور ہی سے ان کا نظارہ کرتا اور کھانے والوں کے کام و دہن کی تعریف کرتا رہا۔ وقت کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا اس لئے ناول نکالا ایک آدھ صفحہ پڑھا تھا کہ پان کا خیال آیا یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جب تک پان منہ میں نہ ہو میں نہ کچھ لکھ سکتا ہوں اور نہ پڑھ سکتا ہوں۔ دانتوں کی حالت مجھے معلوم تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا ڈبیا میں سے پان نکالا، ڈرتے ڈرتے منہ میں رکھا، پان منہ میں رکھنا تھا کہ دانت "کر کر" کرنے لگے آخر پوپلوں کی طرح منہ چلایا۔ تھوڑی دیر میں ترشی کا اثر خدا خدا دور ہوا اور پڑھنے میں دل لگنے لگا کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ پیٹ نے فریاد بلند کی کہ "بیار ید ہرچہ دارید" کھانے کی گاڑی ریل میں لگی ہوئی تھی دوسرے ہی اسٹیشن پر کھانا منگوایا۔ یہ تو خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیسی کیا کیا چیزیں۔ مگر بھوک کا وہ زور تھا کہ "زرخوردن" کی گردان کرتے کرتے ساری رکابیاں صاف کر دیں۔ اس کے بعد اطمینان ہوا۔ پان کھایا۔ سگریٹ سلگایا اور ناول پڑھنا شروع کیا۔ پانچ بجے اٹارسی پہونچے۔ یہاں خوب ڈٹ کر چائے پی۔ ہوشنگ آباد پہونچے پہونچے شام ہو گئی۔ سات بجے بھوپال آیا یہاں میرے ایک عزیز اپنی عنایت سے بہت مرغن کھانا لائے کھانا اپنی رکابیوں میں الٹ ان کی پلیٹیں ان کے حوالے کیں۔ بھوپال سے نکلنے کے بعد خیال آیا کہ کھانا کھا کر اب لوٹ مارو۔ چوبیس پچیس گھنٹے کے جاگے ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیمار پڑ جاؤ۔ کھانا کھایا عشاء کی نماز پڑھی۔ کھڑکیاں چڑھائیں۔ دروازوں کے کھٹکے لگائے روشنی گل کی کمبل تانا اور اپنے آپ کو نیند میں ڈالا۔ نیند تو راہ دیکھ ہی رہی تھی جھٹ آنکھ لگ گئی۔

خدا معلوم وہ کونسی جگہ تھی کیا وقت تھا کہ ایک دم واز کی کھڑکی پٹ سے گری اور اس آواز کے ساتھ ہی میری

اور ایک صاحب سیاہ اور لوٹ ... ب
ایک پستول ہاتھ میں لئے اندر تشریف لائے اندر آکر انھوں نے
بجلی تو نہیں کھولی ہاں ان کے دوسرے ہاتھ میں جو چھوٹی
سی بیاٹری تھی اس کو روشن کیا۔ مگر روشنی کا رُخ نیچے
کی طرف رکھا اور نہایت متانت سے کہا کہ "اٹھیے" میں
اٹھ بیٹھا کہنے لگے "لاؤ تمھارے پاس کیا ہے" میں نے
کہا "تین روپے چھ آنے نو پائی اور دلی کا ٹکٹ" کہنے لگے۔
"مذاق کرتے ہو" میں نے کہا "جناب والا ایسی حالت میں
کیا کوئی بھلا آدمی مذاق کرسکتا ہے" مگر نہ معلوم یہ کیا بات
تھی کہ باوجود ایسا نازک موقعہ ہونے کے ان حضرت کا اثر
مجھ پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ پستول ایک خطرناک
چیز ہے مگر جب یہ یقین ہوجائے کہ یہ کسی پلپلے آدمی کے
ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا ڈر ورکچھ نہیں رہتا۔ میں اسی
ادھیڑبن میں تھا کہ انھوں نے پھر ذرا اونچی آواز میں کہا
"نکالتے ہو یا نہیں" میں نے کہا "بہت اچھا نکالتا ہوں"
یہ کہہ کر میں ذرا جھکا بنچ کے نیچے میرا کالا پمپ شوز پڑا
تھا وہ میں نے اٹھایا اور ایک دفعہ ہی زور سے کہا کہ
"ہیں! یہ دروازہ میں کون ہے" میری اس آواز پر انھوں نے
دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے پمپ شوز کے پچھلے حصے کو
مٹھی میں دبا اور اس کی نوک سامنے کرکے کہا "رکھ دو
پستول نہیں تو گولی ماردوں گا" اب جو وہ میری طرف
مڑکر دیکھتے ہیں تو ایک زبردست پستول ان کے سینے
کی طرف ہے۔ بیاٹری کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی اس لئے

... ... بہ سکے آہستہ سے اپنا
...نے والے بنچ پر ڈال دیا بیاٹری نیچے
...نوں ہاتھ اونچے کرکے کھڑے ہوگئے
میں نے بنچ پر سے ان کا پستول اٹھایا اٹھ کر بجلی کا بٹن
دبایا۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان کے پستول سے زیادہ
میرا جوتا بکار آمد ثابت ہوا۔ میں نے بہت ڈانٹ کر کہا
"سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ" وہ حضرت یا تو اس زور دن سے
آئے تھے یا تھر تھر کانپنے لگے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے
اٹھ کر چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچوں کہ انھوں نے رونا شروع
کیا اور کہا کہ "خدا کے لئے زنجیر نہ کھینچیے میں گاڑی سے
کود کر جان دیدوں گی" "ہیں! جان دیدوں گی" ایں چہ
معنی دارد۔ میں نے کہا کہ "تم ہو کون" انھوں نے کہا "عورت"
میں نے کہا "نام" کہا "راسخہ" میں نے کہا "سبحان اللہ
آپ کو دیکھئے آپ کے کرتوتوں کو دیکھئے۔ اللہ کی بندی
تجھے گھر میں بہو بیٹی بن کر بیٹھنا تھا یا اس طرح ڈاکے ڈالتے
پھرنا" کہنے لگی "مصیبت سب کچھ کراتی ہے اور رفتار زمانہ
سب کچھ سکھاتی ہے" میں نے کہا "نقاب اتارو" کہنے لگی
"نہیں" میں نے کہا "نہیں! تو اچھا میں زنجیر کھینچتا ہوں"
آخر ناچار ہوکر بچاری نے نقاب اٹھائی خاصی اچھی شکل کی
جوان عورت تھی مگر آنکھوں کے نیچے کی کالی کالی لکیریں
بتا رہی تھیں کہ مصیبت زدہ ہے۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے
کو دیکھتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے تیور دیکھ کر سمجھ
گئی کہ میرا ارادہ اس کو پولیس کے حوالے کرنے کا نہیں ہے
کیونکہ وہ ایک دفعہ ہی کھڑی ہوگئی اور کہا کہ "خدا حافظ"
میں نے پستول کا رُخ اس کی طرف کرکے کہا کہ "بیٹھ جاؤ"

اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا کہ "پہلے پستول کو تو دیکھ لیجئے کہ یہہ چلتا بھی ہے یا نہیں آپ نے جوتے کے پستول سے لکڑی کا پستول چھین کر کوئی بڑا کمال نہیں کیا ہے۔"
اب جو میں نے غور سے پستول کو دیکھا تو واقعی لکڑی کا ٹکڑا تھا. گو شکل صورت میں عین مین پستول تھا میں نے کہا "کچھ ہرج نہیں پستول کام دے یا نہ دے. میرے ہاتھ پاؤں تو کام دیتے ہیں اب بیٹھتی ہے یا میں اٹھوں" یہہ سن کر وہ بیٹھ گئی اور کہنے لگی "آخر اس سے آپ کا مطلب" میں نے کہا کہ "میں تمہاری داستان سننا چاہتا ہوں" پوچھا "یہ کیوں" میں نے کہا "مضمون لکھنے کو" کہنے لگی "تو اچھا آپ مضمون نگار ہیں اور آپ کا اسم شریف" میں نے کہا "فرحت اللہ بیگ" کہنے لگی "اوہو آپ ہی مرزا صاحب ہیں' آداب عرض کرتی ہوں آپ کے مضمون پڑھتی تھی. آپ کو دیکھنے کا شوق تھا چلو وہ بھی اللہ نے پورا کردیا. اجی مرزا صاحب! میں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں ایک مصیبت زدہ عورت ہوں. ایف اے تک تعلیم پائی ہے. چھوٹی عمر میں شادی ہوئی، دو ہی برس کے بعد وہ مرگئے. سسرال والوں نے ان کے مرنے کا سبب مجھ کو ٹھیرایا' الزام یہ تھا کہ میں سسرال والوں پر بھاری ہوئی کہ ایک ہی سال میں ایک چھوڑ چار کو کھاگئی، میکے میں آکر رہی وہاں سوتیلے بھائیوں نے ٹکنے نہ دیا. آخر ایک بھلے آدمی سے نکاح کرلیا وہ اللہ کے فضل سے ڈاکو نکلے' دن کو گھر میں رہتے اور رات کو خدا معلوم کہاں کہاں جاکر ڈاکہ ڈالتے. مجھے بچپن ہی سے ڈاکوؤں اور سراغ رسانوں کے قصے پڑھنے کا شوق تھا. میں ان کے سر ہوگئی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلا کرو. پہلے تو وہ "نہیں نہیں" کرتے رہے لیکن بعد میں راضی ہوگئے اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں مجھے گھوڑے کی سواری بھی آگئی اور چلتی ریل میں چڑھنے اترنے کی مشق بھی ہوگئی. ابھی ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ نیار گنج کے گاؤں والوں نے ان کو گھیر لیا اور گولی مار کر شہید کردیا." میں نے کہا "شہید کردیا کی بھی بہت ہوئی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ جہنم واصل کردیا" کہنے لگی "مرزا صاحب دیکھئے خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں مگر ان کے متعلق اگر آپ نے کوئی برا لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے کہا "تو بیگم صاحبہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ایک ڈاکو کی تعریف کروں" کہنے لگی "ساری دنیا ڈاکو ہے کوئی اپنی عقل سے دنیا کو لوٹتا ہے. کوئی اپنے ہاتھ پاؤں کے زور سے. ایک کی آپ تعریف کرتے ہیں اور دوسرے کی مذمت ورنہ ہیں دونوں ڈاکو" میں نے کہا "اللہ رے تیری منطق' اچھا اس جھگڑے کو تو چھوڑو اور اپنا قصہ ختم کرو" کہنے لگی "اس کے بعد اب قصے میں رہ ہی کیا گیا ہے. ان کے مرنے کے بعد سال بھر تک تو اپنی جمع پونجی پر گزارہ کرتی رہی جب وہ ختم ہوگئی تو میں نے اکا دکا مسافروں کو لوٹنا شروع کیا. چنانچہ خوش قسمتی سے آج آپ سے نیاز حاصل ہوگیا. اچھا اب اجازت ہے" میں نے کہا "راسخہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم شریف اور تعلیم یافتہ ہوکر اپنی ڈاکہ زنی پر فخر کرتی ہو" کہنے لگی "اجی مرزا صاحب' مثل مشہور ہے کہ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے رذیل سے ڈرنا چاہیے. مگر میں کہتی ہوں کہ یہ دونوں ایسے خطرناک نہیں ہوتے جتنے بگڑے ہوئے تعلیم یافتہ شریف یقین

وہ تو کہو کہ خدا نے بے زبان رکھی ہیں ...
کبھی کبھا کر خدا معلوم اپنا کیا حال کر لیتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ
پیشہ چھوڑ دو۔ میں آج ہی چھوڑے دیتی ہوں مگر میرے
کھانے پینے کا تو بندوبست کر دو" میں نے کہا" پھر کسی
سے نکاح کر لو" کہنے لگی "کس سے؟ آپ سے" میں نے کہا۔
"مجھ سے نکاح کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ میری بیوی
پکی مغلانی ہے۔ اس نے تو جوتے سے پستول کا کام لیا تھا اگر
وہ بیل سے استرے کا کام لے گی" یہ سن کر اس نے ایک
قہقہہ مارا اور کہا" مرزا صاحب آپ کی باتوں میں آج
مزا آ گیا۔ ہاں لائیے سیدھے ہاتھ سے اب کچھ دلوائیے۔
خدا کی قسم میرے پاس کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے کل
بھوکی ہوں" میں نے بٹوہ کھول اس کے سامنے کر دیا بٹوہ
میں کئی نوٹ تھے مگر اس اللہ کی بندی نے صرف دو روپے
نکال لئے اور کہا" شکریہ" چلو چلتے چلتے آپ پر بھی ہاتھ صاف

...ل سے
...بھی کیا اثر ہے گا۔ چلتے چلتے
...ما کر لے گئی۔ میں سوچتا تھا کہ
...بار اور جب شریف زادیاں اس طرح ڈاکہ ڈالنے پر اتر
آئی ہیں تو یہ دنیا کیا رنگ پکڑنے والی ہے۔
گھبرا کر بنچ سے اٹھا کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کا
کھٹکا اندر سے لگا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یا الٰہی
یہ کیا معاملہ ہے بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا
کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ میرے چوبیس گھنٹے تک جاگنے،
ثقیل غذا کھانے اور سخت بنچ پر پڑے رہنے کا نتیجہ
ہے۔ ورنہ شریف زادیاں تو شریف زادیاں ہی
ہوتی ہیں ان کو بھلا ایسے کاموں سے کیا واسطہ لیکن
یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے بٹوے میں سے دو روپے
کیونکر کم ہو گئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

دردناک مشاہدہ

(۱۹ نومبر کو انارکلی چوک نیلا گنبد لاہور کا ایک چشم دید واقعہ۔ احسان دانش کے پانچویں مجموعہ کلام "نفیرِ فطرت" کا ایک ورق)

کل صبح ایک شخص پریشان و مضمحل
پامالِ روزگار، مسرت سے دور تر

بیٹھا تھا اک دوراہے پہ غم میں گھرا ہوا
سانسوں میں جا رہی تھی کھنچی خاکِ رہ گزر

ٹوٹی سی ٹوکری میں سنگھاڑے لیے ہوئے
چلا رہا تھا "پیسے کے لے جاؤ سیر بھر"

گاہک مگر نہ کوئی بھی آتا تھا اُس کے پاس
حسرت سے اُٹھ رہی تھیں نگاہیں اِدھر اُدھر

۲

اتنے میں ایک شخص رجسٹر لیے ہوئے
باشان و باشکوہ و بانداز کر و فر

اس کی طرف بڑھا تو یہ سمجھا وہ نامُراد
"میری نوا سے گرم گئی تا دل و جگر"

لیکن یہ جب سنا "ابے محصول کر ادا
"بیٹھا ہے صبح صبح دوراہے کو گھیر کر"

منہ رہ گیا کھلا کا کھلا، سانس رُک گئی
اُٹھی نہ جھک کے سوگ میں ڈوبی ہوئی نظر

اُس ششدری کے بعد لرزتی زبان سے
کہنے لگا "ہو آپ کا رتبہ بلند تر"

"آیا ہوں جب سے ایک بھی گاہک نہیں نصیب"
"میں کیا کروں نہیں مری تقدیر سازگر"

"محصول سے کہاں مجھے انکار کی مجال
"مہلت ہو اس قدر کہ جب آپ آئیں لوٹ کر"

سا کی نوکری
چپ تھا غریب ضعف سے تھامے ہوئے کمر

۳

یہ ہے یہاں غریب کا معیار زندگی
یہ غم زدوں کے حال پہ ہے لطف کی نظر

یہ قدر آدمی کی یہاں آدمی کو ہے
شرمائیں جس کو دیکھ کے جنگل کے جانور

خجستہ کا سیوں کی مدارات الاماں!
یہ نامرادیوں پہ عنایات الحذر!!

یہ فاقہ مستیوں پہ سخاوت کی بارشیں!
ناداریوں پہ یہ یہ کرم ملئے اہل زر!!

یہ ملک میں ہے عزت باشندگان ملک
محصول دے سکیں تو کریں زندگی بسر

یہ زندگی پہ جور و ستم ہائے زندگی!
یہ دور خود نما "کہ بشر کا خدا بشر"!!

مذہب غلام، روح غلام، آبرو غلام
آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

احسان دانش

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مکمل سرگذشت اور ان کے اردو
روح غالب خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب
کیا ہے اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے کیمبرج، صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔
اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔
غالب کے حالات زندگی جس خوبی اور اجمال کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک کسی سوانح غالب میں نہیں شائع ہوئے۔
صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم قیمت عہ

موجودہ اردو شاعری

آج کل کی اردو شاعری گرد و پیش کے اثرات کے لئے جس قدر کشادہ آغوش بن گئی ہے' ایسی کسی زمانے میں بھی نہیں تھی۔ وہ تمام قومی اور ملکی سیاست' عالمی معاشی اور سیاسی افراتفری' نظری اور علمی علوم کی توسیع اور حسن کاری کے اگلے تخیلات کی تبدیلیاں' جن سے ہماری قومی زندگی متاثر ہو رہی ہے' ان کا تھوڑا بہت عکس' ہماری موجودہ شاعری میں بھی اتر رہا ہے۔

موجودہ شاعری کے پس منظر میں' دو واقعات' بے حد نمایاں اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے اہم واقعہ' مغربی قوموں سے ہمارا تصادم ہے۔ جس کا انجام بالآخر' ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی صورت میں ہوا۔ لیکن یہ انجام ہماری شاعری کے لئے چند اہم تحریکوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ انگریزی تسلط کے بعد ہماری شائستہ زندگی کا رخ' ایران سے' انگلستان کی طرف پھر گیا۔ ہمارے خیالات' اعتقادات' رہنے سہنے کے طور طریق غرض ہر چیز میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ہمارے ادبی تخیلات پر بھی پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ بدلی ہوئی فضا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ہم کو جو جد و جہد کرنی پڑی' اس کا تھوڑا بہت اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا۔ اس زمانے میں' نئی روشنی کو ہماری زندگیوں میں داخل کرنے کا باعث' اس عصر کے اولین مصلح' سرسید احمد خاں بنے' اور اس تحریک کو شاعری میں' داخل کرنے کا باعث آزاد اور ان سے بڑھ کر حالی تھے۔

حالی کی تحریک کا مقصد' اردو شاعری کو اس کے مخصوص فنی تخیلات سے ہٹانا تھا۔ اس میں ان کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ' فنِ شعر کے نظریہ میں ایک ہلچل برپا ہو گئی اور ہماری شاعری' نیچرل شاعری' قومی شاعری جیسی تحریکوں اور سادہ طرزِ بیان سے روشناس ہوئی۔ لیکن شعر کی صنفیں اور شکل و صورت ابھی تک معرضِ بحث میں نہیں آئی تھی۔ حالی' مروجہ شاعری کے مضامین کے ساتھ' ردیف اور قافیہ کی "اوگھٹ گھاٹیوں" سے بھی بیزار تھے۔ لیکن ان کی عملی ذہنیت اصنافِ شعر کو چھیڑنے کا مشورہ نہیں دیتی تھی۔ تاہم یہ تخم بھی بویا جا چکا تھا' اور طوفان راہیں تلاش کر رہا تھا۔ ایسے میں' دوسرا اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ یورپ کی جنگِ عظیم تھی۔

اس اہم عالمی حادثہ کا اثر' ہماری شاعری پر شاید براہِ راست نہیں پڑا' اس جنگ کے بعد سے' عالمی سیاست میں جو گتھم گتھا ہو گئی تھی' اس کے سبب ہم ان اثرات سے' بے تعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس جنگ کا اثر دنیا پر کس قدر' دور رس ثابت ہوا' اس کا پورا پورا اندازہ ابھی تک بھی نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ سے جہاں بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوا' اور دولت مند قومیں مفلس ہو گئیں' وہیں' مشرقی قوموں کے دلوں میں آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ترکی انقلاب نے راستہ اور بھی ہموار کر دیا۔ اور یورپ' اور خاص کر انگریزوں کی برتری کا طلسم ہمارے ذہنوں سے ٹوٹنے لگا۔ یہی زمانہ ہماری شاعری میں' قومی جوش اور حبِ وطن کے ترانوں کا زمانہ ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے رہنمائی کی' اور چکبست' سرور اور نوجوان شعرا کی ایک بڑی تعداد ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ اقبال کا مشہور ترانہ اس احساس کو جگانے میں' بلاشبہ "بانگِ درا" ثابت

جنگ کا زمانہ ... ں ...
مابعد جنگ اثرات کا پیدا کردہ ہے۔

جنگ کے بعد دنیا سمٹ کر اتنی قریب ہو گئی کہ دنیا کی ساری قومیں ایک دوسرے کی ہمسایہ بن گئیں۔ دوران جنگ میں، اس معیت کو جلد سے جلد یکسو کرنے کے لئے علمائے سائنس کے جو ذہن تیزی سے کام کر رہے تھے۔ بعض وقت تمام حدوں کو توڑ کر آگے نکل گئے، اور یوں تو بہت سی اچھی بری چیزوں کو وہ وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ لیکن، دنیا کو قریب تر لانے میں، جن سے بہت مدد ملی، وہ ہوائی جہازوں کی ترقی اور لاسلکی کی ایجاد ہے۔

جنگ عظیم میں جو جانی نقصانات ہوئے، ان کے اثرات، وہیں پر ختم ہو گئے، لیکن اس کے مالی نقصانات بہت دور رس ثابت ہوئے۔ اس حادثے نے جیتنے والے اور ہارنے والے، سب کو یکساں مفلس بنا کر چھوڑا۔ جنگ کے زمانے میں امن کے خوش گوار خواب دیکھنے والوں کے لئے جنگ کے بعد کا زمانہ اور بھی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ معاشی ابتری کی وجہ سے، ان کی زندگی کے سارے نظامات درہم برہم ہو گئے تھے۔ فطرتاً ان کا سب سے بڑا نصب العین معاشی ترتیب بن گئی۔ جنگ کی تلخیوں نے، ان کے مذہبی جذبے کو خدا اور اس کی دنیا کے نظام کے خلاف انتقام کے جذبے میں تبدیل کر دیا، اگلی گھریلو زندگی کی راحتیں اب خواب و خیال ہو گئیں اور، صنفی تعلقات میں نیکی، بدی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ ان کی حسن کاری کا سارا تناظر بھی چوپٹ ہو گیا، جس کا اثر، تعمیر کاری مصوری اور شاعری غرض تمام فنونِ لطیفہ میں نمایاں ہے

... ں ... روہ لوگ اپنے آپ کو
... ہنگ بنانے کے لئے بیٹھیں، تو
... ایں ... ت ہوئی، حیات کے نئے نئے
نظامات ترتیب دینے پڑے، اشتراکیت، اشتمالیت، فاسطیت، جیسی تحریکیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کے علما نے بھی، اس معاملے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اور حیاتیات نفسیات، معاشیات، اور سائنس کے عالموں کی تحقیقات نے، زندگی کے لئے بہرحال، سہارا پیدا کر دیا۔ جو نئی معاشرہ انھوں نے ترتیب دی، اس کا دارومدار معاشیات پر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے وسیلے، کلوں اور دوسری مصنوعات کی صورت میں فراہم کئے گئے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے، ایسے اجتماعی نظریے وجود میں آئے جن کی بدولت، فرد، ایک nonentity بن کر رہ گیا۔ ہم بھی چونکہ اس عالمی کل کے جز بن گئے تھے ان تمام تحریکوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔

ان تحریکوں کو ہمارے درمیان اور بھی چلتا کرنے میں، ہمارے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے جو اب انگریزی برتری کا ہوا دور ہونے کے سبب یورپ کی جامعات کو بھی علم و فن کا اسی طرح مرکز سمجھ کر جانے لگے جس طرح وہ اس سے پہلے صرف انگریزی جامعات کو سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف یورپ کی اہم زبانوں اور ان کے علوم و فنون سے بہرہ ور ہو گئے، بلکہ وطن لوٹتے ہوئے ان کی نئی نئی تحریکوں کے اثرات بھی ساتھ لیتے آئے۔ اس کا اشتراکی اور بعض وقت اشتمالی نظامِ حیات ان کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ نظر ثابت ہوا۔

ان عالمی تحریکوں کے علاوہ ہم اپنے ذاتی ملکی اور قومی مسائل سے بھی دوچار ہیں، جن میں سب سے اہم مغربی یلغاروں سے اپنے آپ کو بچانا اور اپنی قومی انفرادیت اور آزادی پر قابو پانا ہے۔

ان تمام تحریکوں کے اثرات اور ان کے ردعمل کا سب سے بڑا مظہر اس عصر کے شاعر اعظم اقبال کی شاعری ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا رہ گیا ہوگا جس کو ان کی فکر نے نہ چھیڑا ہو۔ لیکن اور نوجوان شعرا کی طرح وہ، ان تحریکوں کی نظر فریبیوں پر قانع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے وسیع علم اور ان کی دقیق نظر نے کسی تحریک کو چھان بین اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کرنے نہیں دیا۔ ان کی دوررس نگاہیں "دم کٹی لومڑی کے فلسفہ" کی تہ تک آسانی سے پہنچ گئیں۔ انھیں صاف نظر آگیا کہ یورپ کا سارا نظام کھوکھلی عمارتوں پر تعمیر ہوا ہے۔ اور جو چیزیں ضرورت زمانہ کی مجبوریوں سے وجود میں آئی ہوں، ان کا ہر حالت میں پائدار ہونا ضروری نہیں ہے۔ انھیں مغالطوں کو دور کرنے اور پائدار اہمیت کی چیزوں کی نظر جانے کی تلقین کے لئے انھوں نے اپنی ساری شاعرانہ، الہامانہ اور مصلحانہ قوتیں بلکہ اپنی ساری زندگی وقف کردی۔ فرد کی حیات اور اس کی خودی کو وہ ایک اتفاقی چیز نہیں سمجھتے تھے، اور جنگ کے مابعد اثرات نے جو موقتی فضا پیدا کردی تھی، اس کے حل کے ساز و سامان کو وہ اٹل نظام زندگی نہیں تصور کرسکتے تھے۔ جمہوریت جیسی کہ عام طور پر یورپ میں رائج ہے ان کی نظر میں ایک ایسی طرز حکومت تھی، جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" قومیت کا احساس بھی، وقتی فرقہ بندی کے جوش و خروش کا نتیجہ تھا۔ اصل چیز، انسانیت ہے۔ بین قومیت، جو دراصل "قومیت" کے مفروضہ کا نتیجہ ہے، ظاہر ہے، بے بنیاد چیز ہے۔ مجلس اقوام، ایک "داشتۂ پیرک افرنگ" اور "کفن چوروں" کی ایک محفل ہے۔ غرض اقبال نے تمام مسائل حاضرہ کی ترجمانی کی ہے۔ اور ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہیں کے الفاظ میں "ضرب کلیم" ہے یعنی اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف"۔

اقبال جتنے بڑے شاعر تھے، اتنے ہی بڑے مفکر بھی تھے۔ انھوں نے انسان کے لئے جو نظام حیات ترتیب دیا تھا، اس کے تمام خد و خال انھوں نے واضح کردیے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری اجزا سے نہیں بلکہ ان کی ترتیب سے جانچی جانی چاہیے۔

نئی تحریکوں میں، اشتراکیت کی طرف وہ اپنے مخصوص اعتقاد کے سبب مائل تھے، جس کا ثبوت ان کی کئی نظمیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ زباں زد "پنجاب کے کسان سے" ہے۔ اور یہی نظام حیات، ہمارے نوجوان شعرا میں سے اکثروں کو بھی بہت پسند ہے۔

اقبال کی سی وسیع نظر، ظاہر ہے کہ عام شعرا کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اسی لئے ان میں سے ہر ایک ان تحریکوں کا اثر اپنی اپنی بساط کے مطابق لیتا ہے۔ اور ان کی ترجمانی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کرنے میں بھی وہ فطرتاً مجبور ہیں۔

ایک چیز جو آج کل کی شاعری کے معیار پر برا اثر ڈال رہی ہے وہ صحافت کی گرم بازاری اور طباعت کی آسانیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے پیش رس کا زمانہ عام ہو گئے ہیں۔ اس "کثیر پیداوار" کے دور میں، اچھے اور

پائدار دلچسپی رکھنے ...

ہوگئی ہے اور ان کے لئے یہ فضا سازگار نہیں ہے۔ اسی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام سطح سے ابھرنے کے لئے شاعر بعض وقت عجیب و غریب اسالیب اور انداز بیان کا اختراع کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ لیکن اس بدیع اسلوب کے اختراع کا سہرا وہاں ان شعرا کے سر ہے جو الفاظ کی عام بے قدریوں سے جل کر انتقام لینے کے لئے ان کے استعمال کے عجیب عجیب انداز وضع کر رہے ہیں۔ اس سے یورپی شاعری کا ایک بڑا حصہ نہایت ادق اور عوام کی سمجھ بوجھ سے باہر ہوگیا ہے۔

زبان کے ابتدائی کارناموں کی تحقیقات کا بھی خاصہ اثر اس زمانے کی شاعری پر پڑ رہا ہے۔ موجودہ شعرا میں ایک خاصہ گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو شاعری کو قدیم زمانے کی سادہ اور سلیس زبان اور انداز بیان کی طرف لوٹانا چاہتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی کہنے کو تو حالی سے ہوئی تھی کیونکہ وہ میر کی سادہ زبان کو اپنا مطمح نظر سمجھتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں یہ کوئی تحریک نہیں بنی تھی۔ اسماعیل میرٹھی اور شوق قدوائی نے اپنے ذوق کی بدولت اس اصول کی پیروی کی تھی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کے ہاتھوں میں یہ ایک شدید تحریک بن گئی۔ اور انتہا پسندوں کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہوگئی جو میر اور ولی کی زبان سے بھی آگے بڑھ کر برج بھاشا کی نقل اتارنا چاہتی ہے۔

آج سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے ہمارے ایک رسم و قیود سے بیزار شاعر نے "غزل" کی تنگنائی کی شکایت کی تھی، اور اس میں مرثیہ اور قصیدے کے عناصر بھی

[...] بیان کے لئے وسعت چاہتا تھا لیکن قدامت پسندوں کی گراں گوشی کے لئے یہ صدا بے اثر ثابت ہوئی۔ ایک اور آزادہ رو شاعر نے متقبل شاعری میں انہی صنفوں میں پیش کی وہ بھانڈ سمجھا گیا۔ حالی نے اسے محسوس کیا لیکن وہ قدیم اصناف کی اصلاحات اور توسیع کے خیال سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن موجودہ زمانے میں اس تحریک کے برپا ہونے کی بہت سہولت موجود تھی اس میں کچھ تو زبانوں کے بولنے والوں کی عام ذہنی وسعت کا تقاضا تھا اور کچھ قدیم قیود کی سختیوں کا ردعمل۔ چنانچہ آج کل کی شاعری میں صورت شعر کے لحاظ سے جو نئی نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کو حصر کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اقبال اور جوش جیسے درمیانی مسلک پر چلنے والے شعرا مسلسل غزل قطعہ یا مثنوی کے قافیہ کی ترتیب کو قائم رکھ کر خیال کے اٹھان کے لحاظ سے ان کے ٹکڑے کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن انتہا پسند انہیں سرے سے سامنے سے ہٹا دیتے ہیں۔

یہ تحریک دراصل "قدیم زبان کی طرف رجعت" کی تحریک کے دوش بدوش چلی ہے۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں مرحوم اور ان کے دبستان کے شاعروں نے عروض و قوافی کی قیدوں کو سرے سے توڑ دیا ہے۔ عظمت اللہ خاں ہندی اوزان کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اور انہوں نے ایسی بہت سی نظمیں سرانجام کیں کہ ان کی بدولت وزنوں کے اختراع کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اور اب ہندی پنگل اردو شعر کے مسلّم اوزان میں داخل ہوگیا ہے۔ موجودہ عصر کے مقبول شعرا جیسے حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، احسان بن دانش، روش صدیقی، حافظ غازی پوری

اس طرح کی نظمیں لکھنے میں بڑی دست گاہ رکھتے ہیں۔ ہندی وزن کے علاوہ، فارسی بحروں میں بھی وہ حسب ضرورت ترمیم کر لینے کو برا نہیں سمجھتے۔

اگلے اساتذہ کے مسلّم اوزان استعمال کرنے والے شعرا بھی، بعض وقت قافیہ کے تمام ضوابط کی پابندی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس سے بلا شبہ اردو شاعری کی صنفوں میں توسیع ہو گئی ہے اور اردو میں بہت سی مترنم بحریں استعمال ہونے لگی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز شاعر کے ذوق پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کے غلط استعمال سے، بہت سی ایسی چیزیں بھی شاعری کے نام سے معرض وجود میں آ رہی ہیں۔ جن کا شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایک خاص صورت نظم کی جو مقبول ہے، وہ ایک طرح کا ستزاد ہے۔ جس میں، خیال کے ٹکڑوں کے لحاظ سے چھوٹے بڑے مصرعے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کی نظمیں، غنائی شاعری میں بہت استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور یہ قدیم شاعری کے یکساں لب و لہجہ کے مقابلہ میں ایک پسندیدہ جدت ہے۔

اس طرح اردو شاعری کی موجودہ پیداوار پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ آج کل کی شاعری میں ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے اتنی وسیع تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی شاعری کو بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جتنا انقلاب ہماری شاعری میں رونما ہو چکا ہے اتنا ہمارے واقعی حالت میں شاید پچاس سال کے بعد بھی نہ ہو سکے گا۔ اور یہ ہمارے ذہنی تاثرات کی موجودہ تاریخ ہے۔

عبدالقادر سروری

غزل

ضرور تا کافر محبت۔ حقیقتاً دیندار بھی ہوں
زمانہ مصلحت پرستی میں لائق اعتبار بھی ہوں

خموش ہوں بے قرار بھی ہوں، اسیر زلف بہار بھی ہوں
میں شاعر دل فگار ہی کیا، مصور حسن کار بھی ہوں

نظر نظر اس کی یوں چھلکتی ہے جیسے سلمائے پاک دامن
ادا ادا کہہ رہی ہے عصمت مآب و عفت شعار بھی ہوں

تری محبت تری پرستش میں دل پہ قابو نہیں ہے مجھ کو
تری محبت تری پرستش میں صاحب اختیار بھی ہوں

عیاں ہے دنیا پہ میری ہستی مٹے مٹے ہیں نقوش ہستی
نقوش ہستی نظر کو حائل نہ ہوں تو اک شاہکار بھی ہوں

بہار آتے ہی میرے "ہونے" سے باغباں کس کھٹک رہا ہے
نہیں الجھتا میں دامنوں سے تو کیا قباحت کہ خار بھی ہوں

محاسن انتظار محبوب پر دلائل کی کیا ضرورت
وفائے وعدہ سے باخبر ہو کے، مائل انتظار بھی ہوں

مری ہی تخلیق ہے زمانہ میں خوش مذاقی و کور ذوقی
میں رحمت روزگار بھی ہوں میں زحمت روزگار بھی ہوں

چمن کے پھولوں سے دل لگانے کا بزدلی سے نہیں تعلق
اگر چمن کو مری ضرورت پڑی تو میں جاں نثار بھی ہوں

یہ مجھ پہ آزادیوں کی بنیاد رکھنے والوں کو کیا ہوا ہے
انھیں تو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ میں استوار بھی ہوں

شناور گنگ شعر جتنے ہیں شاد، گرمانتے ہیں مجھ کو
تو ایک "تالاب میں فراہم" جو میں انھیں ناگوار بھی ہوں

نظم کے پیش خاکے | نظم ہماری زبان میں ایک مربوط اور مسلسل صنفِ سخن کا نام ہے۔ یہ ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے غزل سے بالکل مختلف ایک مستقل صنفِ سخن ہے، جس کو جدید ادب میں روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اردو میں اس کا خاکہ عہدِ قدیم ہی سے پڑ چکا تھا۔ قدیم دکنی ادب کے نمونے تمام تر مثنویوں کی شکل میں ملتے ہیں خاورنامہ یوسف زلیخا، چندر بدن مہیار، قصۂ بہرام وحسن بانو اس دور کی مشہور مثنویاں ہیں، ان مثنویوں سے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا اردو مثنویوں کی تاریخ لکھنے والے کا کام ہے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ ہم آج جس صنفِ سخن کو نظم کہتے ہیں، اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ان مثنویوں کی شکل میں قدیم دکنی ادب میں تیار ہو چکا تھا۔

نظیر اکبرآبادی | نظیر اکبرآبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو جدید طرز اور نئے رنگ سے پیش کیا۔ نظیر نے اپنی نظموں کے موضوعوں کے لئے ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی معاشرت کا انتخاب کیا۔ الفاظ کا جتنا ذخیرہ نظیر کی نظموں میں ملتا ہے اتنا میر انیس کے علاوہ غالباً کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ نظیر کے اکثر وبیشتر الفاظ آج کل متروکات میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کے اسلوب ان کی زبان اور ان کی نظموں کے موضوعوں پر بہت سارے اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ نقاد کا کام ہے کہ ان کی تائید یا تردید کرتا رہے لیکن ایک مورخ کی نظر میں نظیر اکبرآبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے منظرکشی اور واقعہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس طرح اپنے لئے ایک مستقل شاہراہِ سخن تیار کرلی۔

نے منظرکشی اور جذبات نگاری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن خود میر انیس نے نظم کی ایک خاص صنف کو اپنی شاعری کا محور بنا لیا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری تاریخی حیثیت سے اردو مرثیے اور اردو کی ڈرامائی شاعری سے متعلق ہو جاتی ہے۔ بہر حال میر انیس کی منظر نگاری اور جذبات نگاری کو جدید نظم کے پیش خاکے کا اہم جزو سمجھنا چاہیے۔

عہدِ حالی | انیس کے بعد نظم کے پیش خاکے مختلف حیثیتوں سے مختلف شاعروں کے ہاں نمودار ہوتے رہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے جس وقت انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کی بنا ڈالی ہوگی تو ان کا وجدان شعری غیر شعوری طور پر ان پیش خاکوں سے متاثر رہا ہوگا۔ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں میر حسن کی مثنوی کے دلچسپ مرقعے میر انیس کے مرثیوں کے مناظر اور ان کی جذبات نگاری یہ سب ان کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ اور ان کے ذہن میں ان اجزا کی مدد سے جدید نظم کی عمارت کی تعمیر ہو رہی ہوگی۔ مختصر یہ کہ آزاد کی تحریک نے جدید شاعری کے سب سے بڑے علمبردار اور اس عہد کے سب سے بڑے قومی شاعر حالی کے شعور کو بیدار کر دیا اور ہماری زبان میں ان دونوں بزرگوں کی کوششوں سے اس صنفِ سخن کی مستقل بنیاد پڑی جس کو ہم آج نظم سے تعبیر کرتے ہیں، حالی چونکہ سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے بے حد متاثر تھے، یہ اصلاحی تحریکات ان کی شاعری کا ایک اہم جزو بن گئی۔ حالی کی نظمیں چونکہ ان کے دل سے نکلی تھیں وہ براہِ راست دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں



خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی



اکبر حسین اکبر الہ آبادی



شبیر حسن جوش ملیح آبادی



ابو الاثر حفیظ جالندھری



غلام ہمدانی مصحفی



شیخ ابراہیم ذوق



خواجہ میر درد

قوم پر حالی کے پیام کا کیا اثر ہوا یہ ایک علٰحدہ بحث ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو بیدار کر دیا۔ حالی کی شاعری مسلمانوں کے تنزل کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔

شبلی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء | حالی کی نظمیں اصلاحی مقاصد کے لیے اس قدر موثر اور مقبول ثابت ہونے لگیں کہ شبلی جیسے سنجیدہ عالم اور مورخ کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی پڑی، شبلی چونکہ فطرت سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے ان کو اپنی شاعری کے لیے کسی ذہنی کاوش سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ شبلی نے تاریخ اسلام کے بعض دلچسپ اور سبق آموز واقعات نہایت کامیابی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ان کی مثنوی صبح امید تاریخی اور ادبی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء | اسمٰعیل میرٹھی دبستانِ حالی کے ایک ممتاز پیرو ہیں، انھوں نے بہت سی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہی ہیں، یوں کہنے کو اسمٰعیل بچوں کے شاعر تھے لیکن اسلوب کی شگفتگی اور سلاست کے اعتبار سے ان کی نظمیں ہر مذاق اور ہر طبیعت پر یکساں اثر رکھتی ہیں۔

اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء | اکبر ہماری زبان کے سب سے بڑے طنز نگار Satirist تھے۔ انھوں نے جس لطیف طنز کی زبان میں بنا ڈالی اس کے آپ موجد اور آپ ہی منتہی تھے، ان کی شاعری ہماری بڑھتی ہوئی مغربیت کے خلاف ایک احتجاج تھی، اکبر اپنے دور کے واحد نمائندہ شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو اس عہد کے سارے ذہنی رجحانات نظر آتے ہیں اس میں ہم کو اس عہد کی مغرب پرستی اور اس کے ردِ عمل دونوں ملتے ہیں، مغربیت کے خلاف اکبر کے یہی جذبات زیادہ قوت کے ساتھ اقبال کی نظموں میں جلوہ گر ہوئے۔ اس اعتبار سے مشرق کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اکبر کی شاعری کی ہی صدائے بازگشت ہے۔

چکبست لکھنوی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء | اس عہد کے ایک اور ممتاز نظم گو شاعر چکبست لکھنوی ہیں۔

چکبست کی نظمیں منظر نگاری اور وطن پرستی کے جذبات کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک ممتاز اور رفیع مقام رکھتی ہیں، چکبست کی منظر کشی اور جذبات نگاری کے اسلوب پر میر انیس کا نمایاں اثر ہے۔

شوق ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء اور نظم طباطبائی ۱۸۵۳ء تا ۱۹۳۳ء | شوق اور نظم بھی اس عہد کے نظم نگار شاعروں میں قابلِ ذکر ہیں، شوق کی جذباتی نظمیں بے حد دلچسپ ہیں، نظم طباطبائی کی شاعری قدیم اور جدید تحریکات کا سنگم ہے گرے کی مشہور نظم گورِ غریباں ان کا غیر فانی کارنامہ ہے نظم طباطبائی اور عبد الحلیم شرر مرحوم نے اردو میں قافیہ مبرا (بلینک ورس) کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن یہ مساعی غیر مشکور ثابت ہوں۔

عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء تا ۱۹۲۷ء | تقریباً اسی دور کے ایک اور ممتاز شاعر عظمت اللہ خاں گذرے ہیں، انھوں نے بڑی شاعرانہ طبیعت اور حسن کارانہ مذاق پایا تھا وہ ایک خاص طرز کے موجد اور تنہا مالک تھے، ان کی نظموں پر ہندی شاعری کا بڑا اثر تھا۔ ان کے الفاظ مترنم اور اسلوب بے حد من موہن ہوتا تھا۔

تسلیم | مولوی وحید الدین سلیم عظمت اللہ خاں اور جوش ملیح آبادی

سے بے حد متاثر ہے [illegible] حصے میں شروع کی ان کی نظموں میں جوش اور روانی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔

عہدِ اقبال | اقبال (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء) اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی۔ اور ان کی شاعری کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر سارے ادب پر پڑ رہا تھا۔ اقبال بلاخوف تردید اردو کے بلکہ ساری ایشیائی زبانوں کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی حیات اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اقبال کی شاعری نے اردو کے ہر چھوٹے اور بڑے شاعر کو متاثر کیا ہے اور ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح ان کی فکر سے اکتساب کیا ہے اور ان کی شاعری کی تقلید کی ہے۔

جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء | جوش غالباً موجودہ عہد کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول نظم گو شاعر ہیں۔ جوش و سرمستی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جوش ملیح آبادی اپنے مسلک اور عقائد کے اعتبار سے اقبال سے بالکل مختلف ہیں لیکن ان کی طرزِ فکر اور ان کے اسلوب پر اقبال کا اثر ضرور ہے۔ جس سے شاید وہ خود باخبر نہیں ہیں۔ جوش نے نہایت آزاد اور بیباک شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی نظموں میں ایک بے اعتدالی اور بے آہنگی سی پائی جاتی ہے لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ جوش شاعرِ انقلاب بھی ہیں اور شاعرِ شباب بھی۔ انقلاب کے لئے ان کے پاس اقبال کی طرح کوئی مستقل فلسفہ یا پیام نہیں تھا۔ وہ دیکھتے ہیں اس انقلاب [illegible] جوش اور ہنگامہ [illegible] انہوں میں [illegible] نظر آتی ہے۔ اقبال جس انقلاب کے متمنی ہیں وہ ایک وجدانی انقلاب ہے جس کا وہ ایک مکمل نصاب اپنے فلسفے میں پیش کرتے ہیں۔ اقبال شاعر بھی تھے اور مفکر بھی لیکن جوش شاعر اور صرف شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی شاعری [illegible] زیادہ [illegible] ان کی جذباتی اور [illegible] شاعری [illegible] کو ان کی حیاتِ ادبی کا غیر فانی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

علی اختر | حیدرآباد دکن کے علی اختر عہدِ حاضر کے نظم گو شاعروں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سب سے بلند شاعرانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی نظمیں تفکرِ عمیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کا ہر شعر ایک مستقل دعوتِ فکر ہوتا ہے ان کی نظمیں "میلارمے" (فرانسیسی شاعر) کی نظموں کی طرح عوام کے لیے چیستاں بن کر نہیں رہ جاتیں۔ ان کا کلام غیر شعوری طور پر ایک دلکش نغمہ بن کر دل کی لہروں میں اتر جاتا ہے۔ اقبال کا صحیح اثر علی اختر سے زیادہ کسی شاعر نے قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا حسن ان کی فکر اور ان کے اسلوب کی ہمواری اور ہم آہنگی ہے، فارسی ترکیبوں کے استعمال کا سلیقۂ جمیل علی اختر سے زیادہ عہدِ حاضر کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔

سیماب اکبرآبادی | سیماب اکبرآبادی اس عہد کے ایک اور ممتاز صاحبِ طرز نظم گو شاعر ہیں، انھوں نے آگرہ اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ سیماب کے دبستان کے شاعروں میں ساغر نظامی، منظر اعجاز اور شاہد خاص طور سے



حافظ نذیر احمد



شبلی نعمانی



عبدالحلیم شرر



راشد الخیری



ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے ۔ ڈی لٹ

قابلِ ذکر ہیں۔

ماہر القادری | ماہر القادری بھی اس دور کے ایک ممتاز اور خوش فکر نظم گو شاعر ہیں، اصلاحی اور شبابی دونوں قسم کی نظمیں ماہر کے کلام میں موجود ہیں، یہ نظمیں حسن خیال اور حسن بیان کا نہایت دلکش اور اچھوتا نمونہ ہیں۔

احسان بن دانش | احسان بن دانش عہد حاضر کے سب سے بڑے انقلابی شاعر ہیں، ان کی انقلابی شاعری کوئی رسمی شاعری نہیں بلکہ ان کی اپنی بپتا ہے۔

ان کے علاوہ، اختر شیرانی، روش صدیقی، حفیظ، طالب اللہ عدم، مجاز، ابوالفرح سلام، مخدوم عثمانیہ، میکش عثمانیہ، ساز عثمانیہ، علی منظور، زیبا، اوجد، جان نثار اختر، الطاف شہدی، اثر صہبائی اور فطرت واسطی ہماری زبان کے مشہور نظم گو شاعر ہیں ان کا کلام اس عہد کا بیش بہا ادبی سرمایہ ہے۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کی تعمیر ان ہی ہاتھوں سے ہونے والی ہے۔

عمر مہاجر

یاد

(۱)

جب چاند ستارے ہنستے ہیں رنگین نظارے ہنستے ہیں
خاموش اندھیری راتوں میں معصوم شرارے ہنستے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۲)

جب سخت اندھیرا ہوتا ہے جب سارا عالم سوتا ہے
اور پریم کی ویراں نگری میں دل چپ کے چپکے روتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۳)

جب نینن گنگا بہتی ہے اور پریم کہانی کہتی ہے
جب بگلے اڑتے رہتے ہیں اور ندیا بہتی رہتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۴)

جب پریم تپسّا ہوتی ہے اور "شاما" گا کر روتی ہے
تاروں کی سندر چھاؤں میں جب پریم کی دنیا سوتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۵)

جب بادل شور مچاتا ہے الفت کے ترانے گاتا ہے
جب ساون بھادوں ملتے ہیں شہنائی سنکھ بجاتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۶)

اک نور کا گھیرا ہوتا ہے رنگین سویرا ہوتا ہے
جب دیپک بجھنے لگتا ہے معدوم اندھیرا ہوتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۷)

جب چپکے چپکے تارے ہوتے ہیں خاموش اشارے ہوتے ہیں
جب کلیاں ہنستی رہتی ہیں معصوم نظارے ہوتے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

انسب کلیانوی
(بمبئی)

۱۹۲۱ء میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا جس کا عنوان "ہماری آخیر خواب گاہ" تھا۔ جو رسالہ النساء میں چھپا اس میں یہ بتایا تھا کہ ہم اپنے رہنے کے لئے تو عالی شان عمارتیں بناتے ہیں۔ اور ہمارے بعد ہمارے مزار پر جانور لوٹا کرتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قبرستان بہت بری حالت میں رہتے ہیں ہم کو چاہیے اپنی زندگی ہی اپنی آخیر خواب گاہ بنالیں وہاں چمن و باغ ہو جس کی جو حیثیت ہو اسی طرح کا انتظام پہلے سے کرنا چاہیے۔ دہلی کا قبرستان نمائش گاہ بنا ہوا ہے۔ اور پانڈیچری کا بھی قبرستان قابل دید ہے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اپنی آخیر خواب گاہ خوبصورت بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

مضمون تو لکھا تھا مگر میں نے خود اس پر عمل نہیں کیا۔ البتہ جہاں ہمارا مزار بنایا جائے گا وہ زمین سوچ لی تھی مگر مقبرہ وغیرہ نہیں بنایا تھا۔ اب سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لئے نہایت خوبصورت مقبرہ بنایا ہے اور مقبرے کے اندر تاریخیں جو ان کے انتقال پر لوگوں نے لکھی ہیں وہ آئینے کے چوکھٹوں میں لگوا کر آویزاں کردی ہیں۔ سرہانے مزار کے سنگ مزار پر حضرت اقدس و اعلیٰ دام اقبالہ کی فرمودہ تاریخ "در جنت ہمایوں ہم رفت" کندہ کروادی ہے اس کے نیچے خان بہادر احمد علی خاں صاحب کی لکھی ہوئی ۱۳۵۷ھ ہجری تاریخ کندہ کی ہے۔

مرحوم کے مزار کے بازو میں میں نے اپنا مزار بھی کھدوا کر تیار رکھا ہے میں نے اپنا سنگ مزار بھی کندہ کرنے ۔۔۔ مام مقبرے میں سنگ مرمر کا ۔۔ب مزار کی عبارت یہ ہے۔

یا رحیم

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ

"مزار صغرا ہمایوں مرزا بنت حاجی کپتان ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سنہ پیدائش سنہ وفات"

ہر کس وسیلہ دارد و ما بے وسیلہ ایم
مارا وسیلہ نیست بجز ذات پاک تو

اس کے نیچے جگہ چھوڑ دی ہے مرے بعد جو کوئی تاریخ لکھے وہ اسی جگہ کندہ کی جائے گی۔

جب میں نے سنگ مزار لکھنے دیا تو دوکان دار صاحب نے ہمدردی سے کہا ابھی جلدی کیا ہے خدا نہ کرے آپ کیوں اپنا سنگ مزار کندہ کروا رہی ہیں۔ میں نے کہا آپ اس سے کیا آپ کندہ کر دیجئے انھوں نے چار روز میں کندہ کر کے دینے کا وعدہ کیا اور آج پانچ ماہ ہوتے ہیں نہ دیا۔

دوکان دار صاحب جن کا نام صفدر علی صاحب ہے مجھ سے کہہ رہے ہیں آپ کا سنگ مزار لوگ دیکھا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی میں سنگ مزار بنالیں"۔ آپ کے سنگ مزار کی وجہ میرے بہت سے پتھر فروخت ہو رہے ہیں اس لئے میں ابھی تو آپ کا سنگ مزار نہیں دوں گا۔" یہ سن کر مجھے ہنسی آئی کہ لو میرا سنگ مزار اشتہار کا کام کر رہا ہے دوسروں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ میرا خیال آج سے نہیں ایک زمانے سے بھی ہے۔ میں نے کہ مقبرہ سے

وہ کفنی سنہ ۱۹۱۸ئہ میں منگائے تھے۔ مری پھوپی صاحبہ مرحومہ اور خالہ صاحبہ مرحومہ جب کہ معظمہ جا رہی تھیں۔ ان کے ذریعہ منگائے تھے جو زمزم کے پانی سے دھوئے گئے تھے ایک تو مرحوم کے کام آیا ایک میرے انتظار میں رکھا ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا

حسرت

مہتاب کے جلووں سے منور ہیں فضائیں　　بے خود کئے دیتی ہیں سکوں ریز ہوائیں
جھرمٹ میں ستاروں کے قمر جھوم رہا ہے　　فطرت کی جبیں خواب سحر چوم رہا ہے

چھایا ہوا ہر ذرۂ عالم پہ سکوں ہے
بگڑا ہوا لیکن مرا اندازِ جنوں ہے

تڑپاتا ہے یہ درد میں ڈوبا ہوا منظر　　بے حال ہوا جاتا ہے حالِ دلِ مضطر
سہما ہوا دل رو نگھٹے تھرّائے ہوئے ہیں　　احساس پہ طوفانِ الم چھائے ہوئے ہیں
ہنستا ہوا نظروں میں مری آتا ہے کوئی　　جذبات کے شانوں کو ہلا جاتا ہے کوئی
اشکوں میں تڑپتے ہوئے بیتاب شرارے　　ہر سانس نکلتا ہوا آہوں کے سہارے
کروٹ ہی بدلتا رہا میں نیند نہ آئی　　دشمن کو بھی اللہ نہ دے دردِ جدائی
اک جانِ حزیں اور یہ سختی ارے توبہ　　لٹتی ہوئی ارمانوں کی بستی ارے توبہ
بجھتی ہوئی یہ شمعِ جوانی کوئی دیکھے　　دل چیر کے حسرت کی کہانی کوئی دیکھے
سوگند تمھیں سوزِ محبت کے اثر کی　　سوگند تمھیں بڑھتے ہوئے دردِ جگر کی
آہوں کی قسم اشک کے طوفاں کی قسم ہے　　قسموں پہ مچلتے ہوئے پیماں کی قسم ہے

آؤ بھی کہ اب صبر کا یارا نہیں مجھ کو
تم بن کوئی جینے کا سہارا نہیں مجھ کو

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

ہر قوم کے ... زبان ...

ہے، زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک
اس میں ادبی ذخیرہ کثرت سے فراہم نہ ہو، ادبیات کی
ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی وسعت اور زبان کی
ترقی ہوتی ہے، وہ قوم اور وہ ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ
اور مہذب کہلاتا ہے جس میں ادبیات کا کافی ذخیرہ
ہو، یہ تصور کرنا چاہیے کہ "ادب" ایک کسوٹی ہے جس پر
ہر زبان کو پرکھا جاتا ہے۔

"لٹریچر" یا ادبیات میں کئی چیزیں شامل ہیں
مثلاً "شاعری" "مضمون نگاری" افسانے، ناول،
ڈرامے اور خطوط وغیرہ، ان ہی عنوانوں کے تحت ہم
یہاں کچھ صراحت کریں گے۔

شاعری

ادب کی ایک اہم شاخ شعر گوئی ہے
نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے،
بہ نسبت نثر کے نظم زیادہ موثر ہوتی ہے۔

نظم کا احاطہ نہایت وسیع ہے، اگر نظم میں مذہب
اور اخلاق کو بیان کیا جا سکتا ہے تو پھر اسی نظم کے
قالب میں تاریخ اور سوانح بھی بیان کی جا سکتی ہے،
نظم کے جامے میں فلسفہ اور تصوف کے نکات پیش کئے جا سکتے
ہیں، تو پند و نصیحت بھی بیان کی جا سکتی ہے۔ نظم میں
رزم و بزم کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، مناظر قدرت
کی نیرنگی اور خوش نمائی، فطرتی اشیاء کی ترجمانی
نظم کی صورت میں بہتر سے بہتر طریقے سے ہوتی ہے،
قوم اور ملک کو بیدار کرنے، جوش و ہمت دلانے،
ابھارنے کے لئے نظم ہی موزوں
میدان جنگ میں بہادری و دلاوری
کے جوہر دکھانے کی ترغیب نظم ہی سے وابستہ ہوتی
ہے، اگر نظم کے ذریعہ ہنسایا جاتا ہے تو اسی میں مرثیہ
اور نوحہ کہہ کر رلایا جاتا ہے، اگر کسی کی مدح اور
ستائش کر کے آسمان پر چڑھایا جا سکتا ہے، تو کسی کی
ہجو کہہ کر اس کو تحت ثریٰ پر پہونچایا جا سکتا ہے، غرض
شاعری یا نظم نگاری سے بیسیوں کام لئے جا سکتے
ہیں۔

اردو شعر گوئی میں خواتین دکن نے جو حصہ لیا
ہے اس کی تفصیلی وضاحت اس مختصر مضمون میں
دشوار ہے، البتہ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر
میں ایک سو سے زیادہ خواتین شعر گوئی کی حیثیت
سے پیش ہو سکتی ہیں، جن میں سے کئی خواتین شعر
گوئی کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کا کلام
پسندیدہ اور شائستگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، ان کی
شاعری اکثر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری شاعر خواتین کا کلام قدیم طرز کی شاعری تک
محدود نہیں ہے، بلکہ جدید خیالات اور جدید طرز کی
شاعری میں بھی وہ خاصہ حصہ لیا کرتی ہیں، اگر ان کے
کلام میں قدیم طرز کی عشق و عاشقی، گل و بلبل، شاہد
ساقی، کی داستانیں اپنی رنگین و شیریں بیانی،
جدت آفرینی اور زبان کی لطافت کے لحاظ سے
قابل ستائش ہوتی ہے، تو جدید طرز کی شاعری جو
ملک اور قوم کو بیدار کرتی، مناظر قدرت اور نیچر کی

ترجمانی کرتی ہے، خیالات کی بلند پروازی اور جدت، زبان کی صفائی اور سادگی، اسلوب بیان کی ندرت اور نزاکت کے لحاظ سے قابل داد ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں جن خواتینِ دکن نے شاعر کی حیثیت سے نام و نمود پیدا کیا ہے اور جن کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، ان میں سے بعض کا مختصر تعارف اس موقع پر بے محل نہیں ہو سکتا اس خصوص میں سب سے پہلے ملکۂ دکن حضرت دلہن بادشاہ بیگم کا اسمِ گرامی پیش ہوگا جو اعجاز تخلص کے ساتھ شعر کہتی ہیں، آپ دکن کی پہلی ملکہ ہیں جو اردو میں طبع آزمائی فرماتی ہیں۔

اس کے بعد بشیر النساء بیگم بشیرؔ رابعہ بیگم رابعہ منظور فاطمہ بیگم سردارؔ رحمت بیگم اسیرؔ نوشابہ خاتون نوشابہ، لطیف النساء بیگم لطیفؔ وغیرہ کا نام لینا چاہیئے جو اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں،

بشیرؔ کو نظم نگاری اور غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ ہے، ان کے کلام کا مجموعہ عنقریب شایع ہونے والا ہے، رابعہ بیگم کو فطرتی اشیا کی ترجمانی کا خاصا سلیقہ ہے، ان کی نظمیں قابلِ قدر ہوتی ہیں، اسیرؔ اور سردارؔ کو غزل گوئی وغیرہ میں اچھی مہارت ہے، ان کے کلام میں زبان کی لطافت اور رنگینی کے جوہر پائے جاتے ہیں، نوشابہ خاتون جامعۂ عثمانیہ کی پہلی بی اے خاتون ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "موجِ تخیل" کے نام سے شایع ہو چکا ہے، نوشابہ خاتون کا کلام سوز و گداز کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہوتا ہے، لطیف النساء بیگم نے بچوں کے لئے نظم لکھنے کی اچھی مشق کر لی ہے۔

ان کے علاوہ بیسیوں خواتین ہیں جن کی شاعری قابلِ داد اور لایق ستایش ہوتی ہے، ان کے نام بھی طوالت کا موجب ہوں گے۔

مضمون نگاری

ادب کا ایک شعبہ مضمون نگاری ہے، جو ساری ادبی کوششوں کا نچوڑ ہوتا ہے، نثر کے ذریعہ سنجیدہ اور متین مسائل سمجھائے جا سکتے ہیں، تحقیقات اور انکشافات کو واضح طور پر ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔

مضمون نگاری کے بیسیوں اقسام اور بیسیوں موضوع ہیں، ادب کی جو گراں بہا اور بیش قیمت خدمت مضمون نگاری کے ذریعہ ہو سکتی ہے وہ ایک حقیقتِ نفس الامر ہے۔

خواتین دکن نے نثر نگاری کے ذریعہ اردو ادب کی جو خدمت انجام دی اور دے رہی ہیں اس کی صراحت طویل صفحات کی خواہاں ہے، اس موقع پر ہم صرف نثر نگار خواتین کے نام بھی پیش نہیں کر سکتے چہ جائے کہ ان کے کارناموں کی تفصیل کی جائے، البتہ بعض ممتاز نثر نگار خواتین کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی ادبی خدمتیں فروگذاشت نہیں کی جا سکتیں۔

اس خصوص میں سب پہلے طیبہ بیگم مرحومہ کا نام لینا چاہیئے اگرچہ وہ آج زندہ نہیں ہیں مگر انھوں نے جو داغ بیل ڈالی تھی، جو بنیاد قائم کی تھی، وہ آج مستحکم ہو چکی ہے اور بار آور ہو کر پھول پھل رہی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسواں کی جانب سے ان کے اعلیٰ اور بلند پایہ

مضامین [illegible]

اس تفصیل میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام لینا ضروری ہے جن کی اب تک چودہ پندرہ کتابیں مختلف عنوان کے تحت شایع ہو چکی ہیں اور مضامین جو مختلف رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے ان کی ادبی دلچسپی اور انہماک ہر آئینہ مستحق تقلید ہے۔

اس کے بعد جہاں بانو بیگم نقوی لطیف النساء بیگم اور سکینہ بیگم کے ناموں کی صراحت بھی ضروری ہے، جہاں بانو بیگم کے ادبی دلچسپ اور پر از معلومات مضامین دکن اور ہندوستان کے رسالوں میں تعریف کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، رسالہ شہاب کے حصہ نسوان کی ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ جو ادبی خدمت انجام دے رہی ہیں وہ مستحق ستایش ہے، اسی طرح سکینہ بیگم مدیرۂ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کے داعی کی حیثیت سے جو ادبی کام کر رہی ہیں وہ ہر طرح تعریف و توصیف کے قابل ہے۔

حیدرآباد اور ہندوستان کے زنانہ اور مردانہ رسالوں اور اخبارات میں بیسیوں خواتین دکن کے مضامین جو مختلف موضوع پر ہوتے ہیں تعریف و ستایش کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، ان مضامین کی زبان صاف، اسلوب بیان پسندیدہ اور طرز نگارش دلچسپ ہوتا ہے، دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین جو نام و نمود مضمون نگاری کی حیثیت سے پیدا کر رہی ہیں وہ ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

ناول اور افسانے

نظم سے جس طرح انسانی دل پر اثر ہوتا ہے اسی طرح پیرایے میں کسی تاریخی، اخلاقی یا معاشرتی پہلو کو بیان کرنا خاص طور پر موثر ہوتا ہے، خشک فلسفیانہ مضامین سے بڑھ کر افسانے زود اثر ہوتے ہیں، انسانی فطرت اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کے دماغ کے لیے عمدہ عمدہ غذا میسر ہو اور ان کی دلبستگی کے لیے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں زیادہ تر ان کے ابنائے جنس کے واقعات اور حالات اس طرح بیان کیے گئے ہوں جو یا تو سچ معلوم ہوتے ہوں یا ایسے ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

ناول ایک فوٹو یا آئینہ ہے جس میں زمانہ گزشتہ کے حالات اور موجودہ زمانے کے واقعات اصلی رنگ و روغن میں نظر آتے ہیں، واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب سے پلاٹ بنتا ہے، اس میں حرکت، روانی اور جوش پایا جانا چاہیے۔

پلاٹ کی طرح کردار نگاری ہے، جن اشخاص کا اس میں ذکر ہوتا ہے، ان کی پوری تفصیل اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ انسان کی طرح چلتے پھرتے کام کرتے بولتے زندہ معلوم ہوں، قصہ کے اشخاص کا تعلق جس زمانے اور جس مقام سے ہوتا ہے، اس زمانہ اور مقام کی تمام خصوصیات سے ناول نگار کو واقف ہونا چاہیے تاکہ اس وقت کے رسم و رواج تمدن اور تہذیب کا پورا پورا حال اس ناول سے معلوم ہو سکے، غرض جو قصہ ناول یا افسانے میں بیان کیا جائے وہ ہر طرح اصلی معلوم ہو، اس کا کوئی پہلو فطرت کے خلاف نہ ہو۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم د

خواتین کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی، اور ہم بہ مسرت کہہ سکتے ہیں کہ خواتینِ دکن نے اس قسم کی ادبی خدمت بھی انجام دی ہے۔

"انوری بیگم" اور [illegible] کے نام سے دو ناول ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اصلاحِ معاشرت کے لئے لکھی گئی ہیں، ان میں حیدرآباد کے تمدن تہذیب کی سچی اور اصلی [illegible] کھینچی گئی ہے، حقوقِ نسواں تعلیمِ نسواں، پرانے توہمات و تعصبات، رسم و رواج روزمرہ کے کام کاج، بیکار اور فرصت کے مشاغل وغیرہ امور بہت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔

ان دونوں ناولوں کی مصنفہ مرحومہ طیبہ بیگم ہیں جن کا [illegible] ان کے پہلے ہو چکا ہے۔ صغرا بیگم ہمایوں [illegible] کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلچسپ اور مفید ہیں۔

مختصر افسانے

موجودہ زمانہ میں مختصر افسانوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس قسم کا بڑا ذخیرہ ہر زبان کے ادبیات میں فراہم ہو گیا ہے۔ طویل ناول کے بجائے مختصر افسانے جو چند اوراق میں ختم ہو جاتے ہیں زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

ناول اور افسانے کے لئے جو امور ضروری ہیں وہی مختصر افسانوں کے لئے درکار ہیں۔ مختصر افسانے مختلف عنوان اور موضوع پر لکھے جاتے ہیں، اردو زبان میں اب اس قسم کا ادبی ذخیرہ کافی حد تک فراہم ہو گیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس امر کی صراحت ناگزیر ہے کہ ایسے افسانوں کی تعداد (جو ہر حیثیت سے قابلِ ستائش اور لائقِ داد ہوں) کم ہے، اور چند ہی افسانہ نگار کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مختصر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان کی کئی خواتین متعارف کی جا سکتی ہیں جن میں مسز حجاب امتیاز علی کا نام اس عنوان میں سرِ فہرست ہونا چاہئے، جو دنیائے اردو میں اپنے خزینۂ افسانہ نگاری کے باعث امتیاز رکھتی ہیں، مسز حجاب کی پیدائش اور ابتدائی پرورش حیدرآباد میں ہوئی اور پھر مدراس کی سرزمین میں انھوں نے افسانہ نگاری میں امتیاز حاصل کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کئی خواتین مختصر افسانے قلمبند کرتی ہیں، ان کے ترجمے اور طبع زاد دونوں افسانے ہوتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواتینِ دکن کے افسانے ہر طور قابلِ ستائش ہیں اور ان میں کوئی خامی نہیں ہوتی، اس قسم کا دعویٰ کرنا ابھی قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب افسانے لکھنے کی ضرور کوشش کی جا رہی ہے، اور توقع ہے کہ آئندہ بہترین نتائج رونما ہو سکیں۔

دخترانِ جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین کے دسیوں نام اس عنوان میں بیان کئے جا سکتے ہیں، خصوصاً جہاں بانو بیگم کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، جن کے افسانوں کا مجموعہ "رفتارِ خیال" کے نام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

ڈرامے

ادبیات کی ایک اہم شاخ ڈرامہ نگاری ہے، اس خصوص میں اردو زبان میں ایسا ذخیرہ بہت کم ہے، جس پر فخر کیا جا سکے، اچھے ڈراموں کی شدید ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب پنجاب، دہلی اور حیدرآباد میں اس کی جانب توجہ کی گئی ہے۔

پنجاب اور دہلی کے قطع نظر حیدرآباد میں اس کا

میں شایع نہیں ہوا ہے مگر بعض رسالوں میں ایسے
کا بہترین نمونہ

[illegible] تعارف اس عنوان میں
رسالہ شہاب میں اکثر

ہیں جو اپنی خوبیوں کے باعث عام مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

بعض حیدرآبادی خواتین نے بھی اس کی جانب توجہ کی ہے، اور دو چار مختصر ڈرامے لکھے ہیں، مگر یہ ڈرامے ایسے نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے، البتہ مس جیسی نندی کا نام ضرور لیا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر جارج نندی کے ایک انگریزی ڈرامہ کو اردو کا لباس پہنایا ہے اور بمبئی ٹاکیز نے کسی قدر ترمیم کے بعد "عزت" کے نام سے اس کو فلم میں پیش کیا ہے، مس جیسی نے اس کے علاوہ بھی چند ڈرامے قلمبند کئے ہیں مگر ہنوز ان کو شایع نہیں کیا ہے۔

خطوط ادب کا ایک جزو خطوط بھی ہے، ہر زبان کے ادبیات میں اس کا بھی ذخیرہ ہوتا ہے اگرچہ آج تک عورتوں کے خطوط کا کوئی مجموعہ اردو زبان

شایع ہوئے ہیں ہمارے ادبیات میں گراں قدر اضافہ کا موجب ہوتے ہیں۔

آخر پر "ادارۂ ادبیات اردو" کے شعبۂ نسواں کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے، جس کی صدر رابعہ بیگم، اور معتمد سکینہ بیگم، اور ارکان جہاں بانو بیگم، سارہ بیگم اور لطیف النساء بیگم ہیں، توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ادبی ادارہ اپنے پُرجوش اور مستعد کارکنوں کی دلچسپی کے باعث خواتین دکن میں نئے خیالات نئی امنگیں پیدا کرنے میں اپنی آپ نظیر ہوگا۔

ہمارے اس مضمون سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتین دکن بھی اردو ادب کی خدمت گزاری میں کسی اور ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ان کے خدمات قابلِ قدر اور لایق تحسین ہیں، اور امید ہے کہ آنے والی نسل کے لئے اپنا اچھا نمونہ اور شاندار نقش چھوڑ جائیں۔

نصیر الدین ہاشمی

نذرِ دکن (باتصویر) دکن کے متعلق خواتینِ دکن کے رشحاتِ قلم کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے خاص ذوق اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے عورتیں اور مرد دونوں مستفید ہو سکتے اور سرزمین دکن کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں صنفِ نازک کے مذاق کی نفیس تصویریں بھی ہیں صفحات ۴۰، قیمت مجلد عہ

من کی جیا محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ خواتین اور خصوصاً موجودہ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ اس کو ہر گھر میں ہر وقت موجود رہنا چاہیے۔
صفحات ۸۰، قیمت مجلد ۸ر

دکن کے چند کایستھ شعراء

جب انقلاباتِ روزگار نے شمال میں اردو کے لئے کوئی آسرا نہ رکھا، تو پھر یہ بیچاری اسی آغوش میں چلی آئی جہاں اس سے بہت زمانہ قبل اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ سرزمینِ دکن ہمیشہ اردو کے لئے سازگار رہی اور یہیں اس نے اپنے عہد کے خوبصورت ترین گل بوٹے نکالے چنانچہ یہ صحت بخش آب و ہوا اس کی خلط کے عین موافق تھی پھر اس کو سرسبز کرنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ اب یہاں سے قطب شاہوں کا وہ شفیق سایہ اٹھ چکا تھا، جس نے ایک عرصۂ دراز تک اس کو نظرِ بد سے بچائے رکھا۔ اس کی داشت و پرداخت جان سے زیادہ کی، اور صحیح معنوں میں پروان چڑھایا لیکن ان کی بجائے اب یہاں ایک ایسے خانوادۂ علم دوست کی بارگاہ تھی جو اردو نوازی میں قطب شاہوں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اس نازوں کی پلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی سرپرستی میں جگہ دی۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ یہی تو ہوئی کہ تقریباً ایک صدی تک حیدرآباد کی مجلسیں عاشقانِ اردو کا جمگھٹ بنی رہیں۔ اور اس عرصے میں وہ محفلیں گرم ہوئیں جن کی یاد اودھ اور لال قلعہ کی صحبتوں سے پہلو زنی کرتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی۔ رتن ناتھ سرشار۔ نذیر احمد دہلوی۔ عبدالحلیم شرر۔ نواب محسن الملک۔ امیر مینائی۔ مرزا داغ جس شمع کی ضیا پاشیوں پر دور دور سے شیدا ہو کر آئے۔ دکن کی مہمان نواز زمین نے ان احباب کی یہاں بڑی قدر کی۔ دربارِ آصفی نے ان کی توقیر بڑھائی۔ اور زبردست اعزاز عطا کئے۔

اسی زمانہ میں خود اس مردم خیز ملک نے اپنے یہاں ایسے ایسے جید عالم اور بڑے بزرگ پیدا کئے جن کے فیض قدم سے دکن فن و ادب کا مرجع بن گیا۔ شیر محمد خاں ایمان۔ مہاراجہ چندو لال شاداں۔ حافظ میر شمس الدین فیض۔ راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ میر احمد علیخاں عصر، حفیظ الدین پا تراب علی زور۔ بہاری لال رمز۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد بجولال تمکین، اس دور کی چند ممتاز شخصیتیں ہیں۔

یہ زمانہ سچ پوچھئے تو دکن کے ادبی مذاق کا اصل محرک ہے۔ اس لئے کہ اس عہد میں یہ بزرگ ہستیاں مذہب اور قوم کی ظاہری کسوٹی پر نہیں جانچی گئیں۔ بلکہ ملک نے انہیں اپنے ذاتی جوہر کی بنا پر پرکھا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی اس زبان کے سنوارنے میں برابر کا حصہ لیا اور کبھی تنگ نظری یا مذہبی کدورت کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی۔

ان لوگوں میں طبقۂ کایستھ بہت نمایاں تھا۔ اور یہ اس کے لئے کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اگر حقیقت کا اظہار بے جا تعلی نہیں ہے۔ تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمدن کے ہر دور میں اور ہر زمانہ میں جب امن آشتی نے ملکوں میں فن و ادب کو تازہ کیا یہ قوم اپنی فطری قابلیت سے پیش پیش رہی۔ اور اپنی طبیعت کے جواہر خفتہ کو چمکایا۔

راجگان و سلاطین سلف کی طرح شاہانِ آصفیہ نے بھی اس فرقہ کی قابلیتوں کو پہچانا۔ اور ان کی خاص سرپرستی فرمائی۔ انہیں کسب معیشت سے جو ایک فن کار کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ مانع ترقی ہوتا ہے تقریباً آزاد کر دیا۔ اور موقع بموقع ان کی قدر و منزلت میں کوتاہی نہ کی۔ اس کا راست یہ اثر ہوا کہ اس قلیل عرصے میں اس گروہ میں بعض

چنانچہ اردو گو شعرائے قدیم راجہ محبوب نواز ونت باقی رائے جوالا پرشاد فاضل۔ راجہ سری پرشاد احقر۔ راجا انبا پرشاد ہنر۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظم۔ رائے شنکر پرشاد فضل اور شعرائے جدید میں رائے گرسرن لی آزاد۔ راجہ شنکو راج بہادر عالی۔ رائے محبوب راج محبوب۔ رائے شنکر پرشاد رہبر۔ رائے گھوبیر پرشاد شوق۔ فارسی گو شعرا میں بجو لال تمکین۔ راجہ جی ونتی راجہ لکھن لال ساقی۔ رائے جوالا پرشاد فاضل۔ انبا پرشاد حکم وغیرہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

ان اصحاب بزرگ کے علاوہ اور بھی ایسے بلند حیثیت شاعر گزرے ہیں جنہیں ایک قوم اپنی کوتاہ واقفیت دوسرے عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہاں چھوڑ رہا ہوں "اگے مصروفیتوں نے دم لینے دیا" تو خیال ہے کہ ایک علٰحدہ تذکرہ کی صورت میں اس یاد رفتہ گاں کو تازہ کیا جائے انشاء اللہ

(۱) **باقی**۔ راجہ محبوب نواز ونت گردھاری پرشاد باقی

راجہ باقی جو اپنے زمانے کے نہایت بلند پایہ شاعر اور انشا پرداز گزرے ہیں، حضرت شمس الدین فیض کے حلقہ تلامذہ میں سے تھے۔ باقی کا خاندان دکن کے ان قدیم خاندانوں میں سے ہے جو حضرت آصفجاہ نظام الملک کے ساتھ دہلی سے اورنگ آباد آیا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں مقیم رہنے کے بعد جب رائے راجا رام ابن رائے دولت رائے کو دربار آصفی سے چھتیس ۳۶ کارخانوں کی تنقیح و نگرانی کا کام عطا ہوا، تو ۱۱۹۸ھ میں انہوں نے محلہ جیندر کا پور عرف حسینی علم میں ایک مکان خریدا اور مستقل ڈیوڑھی کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ وہ خود

ح کرتے ہیں

رد یدند چندے در شہر اورنگ آباد

مت پذیر بلدہ حیدرآباد شدند

رائے راجا رام بن رائے دولت رائے جد اعلیٰ راقم آثم بخدمت استفنائے تحاویل خاف مانی کہ کار تنقیح سی وشش کارخانجات سرکار آصفی میباشد در عہد نظام الملک عز مقیاز میداشتند و در سنہ یک ہزار یکصد و نود و ہشت ہجری در محلہ حسینی علم عرف جیندر کا پور یک قطعہ حویلی بجہت برائے اقامت خود خرید نمودہ مقیم شدند"

اسی ڈیوڑھی میں وہ بتاریخ یکم رجب ۱۲۴۳ھ پیدا ہوئے اس خاندان کے اکثر اراکین صاحب مناصب و خطابات ہوئے ہیں۔ چنانچہ پیشگاہ نواب سکندر جاہ بہادر۔ نواب ناصر الدولہ بہادر۔ نواب افضل الدولہ بہادر سے اس خاندان کی مسلسل عزت افزائی ہوتی رہی خود راجہ باقی تا دم مرگ خدمات جلیلہ اور مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ باقی نے حضرت محمد علی صاحب عاشق سے فارسی پڑھی اور دونوں نوشتوں میں انہیں حضرت شمس الدین فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ جن خدمات پر باقی فائز رہے اور اپنے فرائض جس خوش اسلوبی سے بجالاتے رہے انہیں سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر مصروف انسان تھے۔ چنانچہ ان کی کثیر التعداد تصانیف اور کلام کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ایسے ہی حالات میں کیا ہم سے اس کا عشر عشیر بھی ہو سکتا ہے؟

ان کی تصانیف تیس ۳۰ سے زیادہ ہیں اور یہ فارسی اردو۔ ہندی۔ تین زبانوں میں پھیلی ہوئی ہیں جب ان کتابوں کے عنوان اور مضامین پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ باقی کو علاوہ فن شاعری کے کس قدر علوم و فنون میں دخل تھا۔

فن شاعری۔ عروض و قافیہ۔ انشاء۔ حساب۔ حکمت۔ لغت
خواص الاشیاء۔ فلکیات۔ سفرنامے۔ مذہبیات۔ بجن۔ پوتی
پران۔ یہ چند عنوان ہیں جن پر باقی نے خامہ فرسائی کی ہے
اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات خواجہ میر درد
کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اردو میں خواجہ صاحب کی رباعیوں
کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ ان رباعیات
کو جو تصوف اور فلسفہ کے گراں بہا جواہر سے مالا مال ہیں۔
ایک ایسی زبان میں منتقل کرنا تھا جو فارسی کے مقابل میں ابھی
بچہ ہی تھی۔ پھر بھی اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے
کہ باقی اس باب میں کس قدر کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مشتے نمونہ
از خروارے۔

درد
بر جرم گر اعتراف خواہی کردن + دل را اے درد صاف خواہی کردن
یارب تو کریم و من گنہگار توام + دانم آخر معاف خواہی کردن

باقی
مجرم ہوں اعتراف کرتا ہوں صاف + کیا منہ ہے جو چاہوں میں اپنا انصاف
یارب تو کریم ہے گنہگار ہوں میں + تقصیر معاف ہوگی تقصیر معاف

درد
آں جلوہ بدید یار خواہد گردید + رازش ہمہ آشکار خواہد گردید
ما آئینہ ایم خود پرست است نگار + ناچار دوچار خواہد گردید

باقی
اک دن دیدار یار ہو جائے گا + راز اس کا خود آشکار ہو جائیگا
میں آئینہ ہوں نگار حسن پرست + ناچار کبھی دوچار ہو جائیگا

درد
ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم + گم کردہ رہ شناختن می آیم
چوں شعلہ کجا رسیدنم منظور است + پیوستہ برون خویشتن می آیم

باقی
معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں + بھولا ہوا راستہ ہے گھبراتا ہوں
شعلہ کی طرح کہیں یہ پہنچا ہوگا + یوں آپ سے باہر جو نکل جاتا ہوں

باقی کا کلام نہایت سلیس و سادہ ہے گو بعض وقت مناسبات
و رعایات لفظی پر جو اس عہد کے مذاق کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ زیادہ
زور دیتے ہیں۔ شعر میں ایک کے لئے چار چار مناسبتیں لکھنا،
دور دور کی بندشیں، ایہام و صنعت لفظی کی بھرمار اس زمانہ کی
خصوصیت تھی۔ باقی بھی اس رو سے بچ نہ سکے۔

چشم بلبل سے بنا دو مرے مرقد کا غلاف + جس میں سب جانیں کہ عاشق تھا کسی گلرو کا
لفظ بسمل جائے بسم اللہ تھا تیرا سبق + تونے مکتب ہی میں سیکھے خوں کیا استاد کا
اس کی مژگاں کا تصور نہ کر اے دل زنہار + کیوں تو بوتا ہے یہ اپنے لئے ناداں کانٹے
کس کے ہے لب شیریں کی ہمسری کی سزا + جو نیشکر کے جدا بند بند کرتے ہیں

بعض وقت اسی گورکھ دھندے میں بھی وہ ایسے
دربائے مضمون نکال لاتے ہیں کہ ان کی قادر الکلامی پر یقین ہو جاتا ہے

نیم جاں خنجر قاتل سے میں تڑپا جو بہم + بولی شمشیر نہ گھبرا ترے سر پہ میں ہوں

لیکن ان کے سرمایہ سخن پر اجمالاً نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا
کہ وہ اس دھارے میں ہمعصر شعرا کی طرح بہہ نہیں جاتے بلکہ
سلاست و شستگی کا دامن برابر تھامے رہتے ہیں۔
ملاحظہ ہو کس قدر صاف زبان ہے۔

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب + ہائے غم ہائے سبوہائے شراب
میرے زخموں سے جو پھاہا اترا + بن گیا پنبۂ مینائے شراب

دریا سے موج موج ہے دریا نہیں الگ + ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم
عارض یار نہیں عکس فگن پانی میں + گل شاداب کا ہے جو لا چمن پانی میں

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پونچھے ہوتے + دیکھتے پھر یہ مرا دیدۂ تر کیا کرتا
پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر + دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

سلامت زبان دیکھئے۔

دل میں تو لگی ہے آگ اس کو + کیوں پانی سے گھر بہا رہے ہو

ماہ نو جھکتا ہے مجرے کے لئے مہ بان پہنچے سا در پہ دیئے

باقی نے ماہ صفر ۱۳۱۴ھ بعارضہ وجع مفاصل بلدہ میں انتقال کیا۔

(۲) رائے جوالا پرشاد فاضل

رائے جوالا پرشاد فاضل سررشتہ داران سکھان راجہ موہن لال جاگیردار و خزانچی کے صاحبزادے ہیں۔ محلہ حسینی علم دیوڑھی راجہ موہن لال میں ۱۲۶۲ھ کے قریب پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی محمد علی عاشق سے حاصل کی باوجود تحقیق کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شعر میں انہیں کس سے تلمذ تھا

رائے جوالا پرشاد فاضل کا خاندان دکن کے نہایت قدیم اور ممتاز گھرانوں میں سے شمار ہوتا ہے ان کے والد رائے موہن لال خزانچی بڑے با سطوت رئیس ہوئے ہیں۔ ان کے نانا راجہ سری پرشاد نواب ناصر الدولہ کے اتالیق اور معتمد تھے اس کے علاوہ سررشتہ سکھان بھی انہیں کے تفویض تھا۔

فاضل بچپن سے ہی نہایت طباع و ذہین تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے۔ اور لب و لہجہ میں عجمیوں سے ٹکر لیتے تھے سنا ہے کہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے عربی میں حضرت غفران مکان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا لیکن ان کا کوئی شعر اس زبان میں میری نظروں سے اس لئے نہیں گزرا کہ ان کا تمام سرمایہ سخن امتداد زمانہ اور دیمک کے نذر ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ دو تین فارسی غزلیات۔ چند قصائد اور دو ایک اردو شعر اس بربادی سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ سکے ہیں وہ میرے یہاں محفوظ ہیں۔

فاری کی قابلیت کا اس سے پتہ چلیگا

ری میں وہ ضرب المثل ہو چکی ہے اور

اہل الدین اپنے روزمرہ کو ان کی مثال دیتے ہیں۔

یہ چند شعر ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں۔ لیکن ناظرین یہ جان لیں کہ یہ شعر منتخب نہیں ہیں بلکہ ان کے خرمن سخن کے وہ چند ریزے ہیں جو زمانہ کی تباہی سے بچ رہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک میں نے سنا ہے فاضل فارسی زیادہ کہنے کے عادی ہیں۔

مدام جلتا ہوں کوئی خبر نہیں لیتا + کسی غریب کی شمع سر مزار ہوں میں
مٹا دیے ہے جوہر مری کدورت نے + چھپا ہوں گرد میں اپنی وہ شہسوار ہوں میں

جگہ کوئی در جاناں کے بہتر میں سمجھا تھا + وہاں اٹھنے نہ دیگا یہ مقدر میں نہ سمجھا تھا
دن جوانی کے گئے بجھ گیا اب دل فاضل + پھیر کر شمع کو ہم بھی تھے جلنے والے

فاضل نے ۱۳۲۳ف میں بعارضہ بخار بمقام جاگیر گھٹا ویل انتقال کیا

(۳) راجہ ایسری پرشاد۔ احقر

راجہ ایسری پرشاد احقر راجہ باقی کے برادر زادے اور راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی کے عم زاد بھائی ہیں۔ احقر بہت کم سن ہی تھے کہ ان کے والد رائے خوب چند کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت ان کے شفیق چچا راجہ باقی کی زیر سرپرستی ہوئی۔

شعر و سخن کا مذاق اس خاندان میں ایک عرصہ سے موجود تھا۔ ان کے جد رائے چمن لال ایک زبردست انشا پرداز تھے۔ جنہوں نے فن انشاء پر مبسوط کتاب لکھی ہے راجہ چمن لال ساقی ایک بڑے مورخ اور شاعر گزرے ہیں انہوں نے شائد سب سے پہلے رباعیات عمر خیام کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مزید براں تاریخ لچھمن لال کے بھی یہی مصنف ہیں۔

آخر شاعری میں لکھنو لال تاب لکھنوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن راجہ باقی کی فیض صحبت کا ان کے کلام پر اثر پڑا۔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت نے انہیں دفتر فوج باقاعدہ کی تنظیم پر مامور کیا تھا۔ نیز ان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک آخر اسٹیٹ کا کاروبار دیکھتے رہے۔ بدقسمتی سے جوانی میں ہی آخر کو ایک پیچیدہ مرض لاحق ہو گیا چنانچہ اسی مرض موت کی تشخیص کے لئے مدراس گئے تھے کہ سنہ ۱۳۱۸ھ میں انہوں نے وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

نمونتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوشش دیدۂ گریاں کو نہیں جانتے کیا ✦ نوح کے صد طوفان کو نہیں جانتے کیا
کوئی کہتا ہے فلک اسکو کوئی ابر سیاہ ✦ دود آہ دل سوزاں کو نہیں جانتے کیا
ابرو و عارض دلدار کا معتوں نہیں کون ✦ ماہ نو مہر درخشاں کو نہیں جانتے کیا
میں بھی اک بندۂ آخر ہوں نمک خوار ترا ✦ میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

افسوس کہ باوجود تلاش کے ان کا کلام بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

(۴) ہنر رائے انبا پرشاد ہنر

انبا پرشاد ہنر بمقام بلدہ حیدرآباد سنہ ۱۲۷۰ف میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ کے حسب قاعدہ ان کی ابتدائی تعلیم خانگی مکتب میں ہوئی۔ لیکن نوعمر انبا پرشاد نے بہت جلد ہی اپنے ہم سبقوں میں امتیاز پیدا کر لیا۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کی۔ اور خطاطی میں جو قدما کے یہاں ایک مستقل فن شمار ہوتا تھا اچھی مہارت پیدا کر لی۔ چنانچہ ہنر کا دیوان جو خود انہوں نے اپنے قلم سے نہایت خوبصورت نستعلیق میں لکھا تھا حال حال تک محفوظ تھا۔ مگر افسوس کہ وہ کسی حادثہ کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ اس لئے ان کے دو چار شعر حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔

کیوں نہ ہو امن پہ حال رو اسے انور آئینہ ✦ صاف کہہ دیتا ہے جو کہنا ہو منہ پر آئینہ
تھی ہی رخ کی صفائی جب کہ آنکھ تھک گئی ✦ کو رہو جاتا ہے پیدا کر کے جوہر آئینہ
دید رہی ہے تمہارے روئے روشن کی نصیب ✦ بن گیا ہے اپنے طالع کا سکندر آئینہ

ہنر بارگاہ آسمان جاہی میں سررشتہ دار افواج تھے نیز انہیں صرف خاص مبارک سے منصب بھی ملتا تھا سنا ہے شاعری میں انہیں نواب خیرات علیخاں تحسین سے تلمذ تھا۔ ہنر نے ۶۲ سال کی عمر پائی اور سنہ ۱۳۳۵ف میں بعارضہ درج مفاصل انتقال کیا۔

نظم ۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظم سنہ ۱۲۷۲ف میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد بسلسلۂ ملازمت شمالی ہند سے مدراس آئے اور یہیں خاندان والاجاہ کی سلسلہ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ ان کے جد رائے سندر لال ہشتم شادی خانہ نواب والاجاہ اور رئیس شہر تھے۔ جب اس خاندان کا ستارا ڈوب گیا۔ تو ان کے صاحبزادے رائے منی دھر حیدرآباد آئے۔ جہاں انہیں بارگاہ آصفیہ سے منصب عطا ہوا۔ نظم پیشکاری سرکار عالی میں خدمت مددگاری پر مامور تھے اور یہاں ارباب اقتدار کی نظروں میں انہوں نے بحیثیت ایک متدین و منتظم عہدہ دار کے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ بزمانۂ مدارالمہامی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جب صیغہ اصلاح مصارف قائم ہوا تو اس اہم صیغہ پر بطور خاص نظم کا انتخاب عمل میں آیا۔

نظم ایک نہایت ہی خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے چنانچہ وہ ان معدودے چند افراد میں تھے جنہوں نے اپنی جوانی میں اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا اور مرتے دم تک اس پر اڑے رہے۔ ایک عرصہ تک وہ بزم تہذیب کے معتمد کی حیثیت علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر آل انڈیا ہندو لیگ

... حضرت ... بعد ... ...
خاص قدرت حاصل تھی۔ اس عہد کا مشہور ادبی پرچہ "دبدبۂ آصفی"
جو حضرت صوفی شاد کی زیر نگرانی اور ایک عرصہ تک پنڈت
رتن ناتھ سرشار کے زیر ادارت نکلا کرتا تھا۔ انہیں کے زیر
اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اور وہ خود اس رسالہ کے لئے برابر مضامین
لکھا کرتے۔ شعر گوئی میں شمالی ہند کے اکثر رسالوں سے مذاق
سخن ... وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ شاعری میں انہیں
حضرت ... سے تلمذ حاصل تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ حضرت حافظ شمس الدین فیض سے بھی غائبانہ عقیدت تھی
اس لئے کہ ان کے یادگاری مشاعروں میں بڑی پابندی سے
شریک ہوتے اور ان کی مدح میں اکثر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے

لامکاں سے اگر مکانِ فیض ۔ عرشِ اعظم ہے آستانِ فیض
وہی دیکھا جو کہہ گئے حضرت ۔ لبِ اعجاز تھی زبانِ فیض
اب بھی ہیں فیضیاب اہلِ کن ۔ یہی باقیض تھی زبانِ فیض
کیوں نہ ان کی غزل ہو سلکِ گہر ۔ کہ تھا گنجِ گہر دہانِ فیض
اٹھ گیا لطفِ شاعری آزاد ۔ رہ گئی لب پہ داستانِ فیض

نمونۂ کلام یہ ہے۔

دل لگا کر سب سے کہتے پھرتے ہو ہم لٹ گئے ✦ نظر یہ بھی ہیں بھلا کوئی طریقے پیار کے
درد و غم رنج و الم نالہ و فریاد و فغاں ✦ رات دن ان سے رہا کرتی ہے صحبت میری
خیر اتنا تو کیا جذبۂ الفت نے اثر ✦ کہ مقر تو ہیں وہ سب سے مرے تڑپانے کے

آزاد رائے گردھری لال آزاد۔

آزاد کے آباؤ اجداد غدر کے بعد بلدہ حیدرآباد آئے
اور دیگر خاندانوں کی طرح یہیں کے ہو رہے ان کے والد
رائے راج لال ... بڑے اچھے شاعر اور صاحبِ ذوق
... ... ان کی تربیت کا خاص خیال رکھا
... اساتذہ سے دلوائی۔ آزاد کے جد کا
... ... ان کے چچا مہاراج لال ... ایک بڑے
بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ اس لئے شعر و سخن کا مذاق انہیں
ورثہ میں ملا۔ یہ سنہ ۱۳۱۱ھ میں بمقام بلدہ دیوڑھی راجہ راجان شیوراج
دھرم ونت پیدا ہوئے اور اب بھی یہیں مقیم ہیں۔

آزاد بڑے خوش اخلاق۔ بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج
آدمی ہیں۔ ... بھی خوب کہتے ہیں چنانچہ عمر خیام کی رباعیوں
ایک سلیس ترجمہ انجام عنوان سے شائع کیا ہے۔ فارسی اور اردو
دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کے
مشاعروں میں برابر پابندی سے شریک رہتے ہیں۔ ان کی
ایک مثنوی الشمس بھی جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے
قابل دید ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آغاز رواں گشتن ایں زریں طاس ۔ انجام روانی مہ و خور کیا ہے
وانجام خرابی جنس نیک اساس ۔ بربادی کائنات کا راز کیا ہے
دانستہ نمی شود بمعیار عقول ۔ آتی نہیں کچھ عقل میں آخر یہ بات
سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس ۔ جچتا نہیں ساز پر جو یہ سر کیا ہے

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر میں حشر بپا ہوگا نیا اک آزاد ✦ بے نقاب آج وہ محشر میں چلے آتے ہیں
واعظ نا اہل نہ مجھ سے کدھر کو خیال ہے ✦ زندگی کی بات تجھ کو سمجھنی محال ہے
فریب نظر یہ مکان و زماں ہے ✦ طلسمات کا کارخانہ ہمارا

مثنوی الشمس جو ابھی ابھی چھپی ہے اپنی سلاست بیان
کی وجہ سے قابل دید ہے۔ اس میں آزاد نے ایک
سائنٹفک یا نیم سائنٹفک مضمون کو نظم میں منتقل کرنے کی
کوشش کی ہے۔

عالؔی راجہ نرسنگھ راج بہادر عالؔی

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالؔی راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقؔی کے فرزند اکبر ہیں۔ وہ بمقام بلدہ سنہ ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے برگزیدہ والد کی طرح سلسلۂ خدامانِ بارگاہِ آصفی میں منسلک ہیں۔ راجہ باقؔی کو ہمیشہ اپنی اولاد کا غم رہا۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی بھر صدموں سے متاثر رہے۔ حسن اتفاق کہ بنارس کے ایک خدارسیدہ بزرگ سوامی بھاسکر آنند سرسوتی نے عالؔی کے لئے دعا کی اور باقؔی کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس لڑکے کی رسم بسم اللہ اور شادی بنارس میں ہی ان کے پاس کی جائے۔ چنانچہ یہ دونوں رسمیں وہیں ادا ہوئیں۔

جب والد کا سایہ سر سے اٹھا تو عالی نہایت کم سن تھے اور ان نوعمر کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں تھیں چھوٹے بھائی محبوب راج کا ابھی بچپن تھا۔ اسٹیٹ نااہل کارکنوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس لئے اس افراتفری میں عالؔی نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی اور اپنے برادر صغیر کی تربیت کا جس قدر بھی خیال رکھا وہ انھیں کی ہمت اور حوصلہ کا کام تھا۔ بحیثیت شاعر عالؔی صاحب مذاق خوش فکر ہیں شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جو بات کہتے ہیں سیدھی اور صاف کلام میں لگاوٹ بناوٹ کو دخل نہیں دیتے۔

زندہ مہوش ہیں مگر کیسی ؛ کر رہے ہیں شعور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ ؛ نہیں اچھی غرور کی باتیں

میں نہا دھو کے ہوا پاک ہر اک عصیاں سے
اشکِ خجلت جو مرے دیدۂ تر سے نکلا

کون کہتا ہے کہ تو خوگر بیداد نہیں
مجھ میں پہلی سی مگر طاقتِ فریاد نہیں

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بیتابیاں
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھ کر مداوا ہوگیا

رباعی ملاحظہ ہو۔

پوشیدہ ہے گر جلوہ عیاں تیرا ہے
کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن
کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے۔

کلام میں تصوف کا نقش زیادہ واضح ہے اور اس کو مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ جیسے صوفی کی فیض صحبت اور استاد جلیؔل کے ذاتی اثر نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ اصناف سخن میں زیادہ تر غزل اور رباعی ہیں لیکن سب میں ان کا مخصوص رنگ برابر قائم ہے۔

محبوبؔ ۔ رائے محبوب راج محبوبؔ

رائے محبوب راج محبوبؔ راجہ محبوب نواز ونت باقؔی کے چھوٹے فرزند اور راجہ نرسنگھ راج عالی کے برادر خورد ہیں۔ وہ ایک نہایت جامہ زیب اور وجیہہ انسان تھے طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی۔ چنانچہ حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کی وجہ سے وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ انہیں انتہا سے زیادہ دوست رکھتے اور ایک منٹ کے لئے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

محبوب سنہ ۱۳۱۲ھ میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار راجہ باقؔی نے اپنے مالک مجازی کے حسب ارشاد

فراغت پائی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ عالیہ میں داخل کیا گیا۔ جہاں انہیں گوناگوں حالات کی وجہ سے میٹرک کے بعد ہی تعلیم ختم کر دینی پڑی۔

محبوب کے کلام کی خصوصیت ان کی زبان ہے وہ نہایت سلیس و شستہ لکھتے ہیں۔ بحریں چھوٹی چھوٹی اور بندشیں چست ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی اچھا داستان گو عشق و محبت کی کہانی نہایت موثر اور چبھتی ہوئی زبان میں سنا رہا ہے۔

آفت میں بلائیں فتنہ گر کی ؛ کچھ خیر نہیں دل و جگر کی
تھا عشق کا مرحلہ نہ آساں ؛ سر دے کے مہم یہ ہم نے سر کی
اللہ رے درازئ شب ہجر ؛ ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

سنبھالو کہ کشو اب شیشہ و جام ؛ گھٹا چھائی ہے ساون کی جھڑی ہے
گلے مل لو کہ سوز غم کے ہاتھوں ؛ چراغ زندگی بس دو گھڑی ہے
قدم کیوں کر اٹھیں کوچے سے تیرے ؛ یہاں تو حسن کی مٹی گڑی ہے

مضامین اور ندرت بیان دیکھئے۔

جاں بلب شوق شہادت میں تھے ہم ؛ تیغ قاتل کی مسیحا ہو گئی
خواب میں آتے ہو پھر بھی نگاہ شوق سے ؛ ایک پردہ سا ہے کہ چھپتے ہو نکل کر سامنے

ستم کا دیکھ کر انداز ہوتی ہے خوشی ہم کو
کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

انہیں استاد فصاحت جنگ بہادر جلیل سے تلمذ حاصل

...ری سنہ ۱۹۴۳ء

...نے فارسی کی اور
یہ عین ہنگام شباب میں اس
دنیا ... ہو گئے۔

رہبر — حکیم رائے ست گرو پرشاد رہبر

حکیم ست گرو پرشاد رہبر رائے بنکٹ پرشاد صاحب مرحوم منصبدار و سررشتہ دار افواج نظم جمعیت سرکار عالی کے فرزند ہیں آپ بتاریخ ۶ ربیع صفر سنہ ۱۳۱۱ھ بروز جمعہ بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ رہبر بچپن ہی سے شاعری کی جانب مائل تھے طبیعت رسا اور فطرت رنگین پائی تھی اور چونکہ نہایت تیز فہم طباع واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جوہر بہت نو عمری ہی میں چمک گیا۔

حسن اتفاق کہ ان کی تعلیم علامہ عبدالرزاق نیشاپوری جیسے جید عالم کے یہاں ہوئی جو فارسی اور عربی میں اپنے عصر کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ اور شعر و سخن ان کے خاندان کا خاص مذاق تھا۔ اس لئے نو عمری سے ہی اس ماحول نے شاعرانہ مزاج کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

... اور ادب سے ایک گونہ فراغت ملی تو انہیں مفید الانام ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے انٹرنس تک اپنی تعلیم ختم کی اور چونکہ حکمت سے بھی طبعی لگاؤ تھا۔ اس لئے مدرسہ طبیہ سرکار عالی میں شریک ہو کر اس فن کی تکمیل کر لی۔ فن شاعری میں انہوں نے استاد عصر حضرت سید علی احمد زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔

رہبر کایستھوں کے ایک قدیم اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباء و اجداد والا جاہان مدراس کے عہد میں خدمات جلیلہ پر فائز اور صاحب خطابات و مناصب

ہوئے ہیں۔ حیدر آباد آنے کے بعد بھی یہاں ان لوگوں کو سرفرازیوں اور اعزاز خاص سے نوازا گیا۔ یہی گزشتہ خاندانی تمکنت کی بو باس جو رہبر کے دماغ میں اب تک بسی ہوئی ہے انھیں اہل دولت و امارت کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی سے دور رکھتی ہے اور یہی احساس خودداری ہے جو انھیں کسی کے آگے بے محل جھکنے سے روکتا ہے۔

طبیعت نہایت غیور اور تنہائی پسند ہے۔ علاوہ منصبدار ہونے کے انھیں سرخانۂ مبارک میں منسلک خدمت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے غزل زیادہ کہتے ہیں گو دیگر اصناف کی بھی ان کے سرمایۂ سخن میں کمی نہیں۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس نوجوان شاعر نکتہ رس کے کلام کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ دیکھئے اگر موقع ملے تو اس فرض کو بجا لاؤنگا۔ رہبر کی زبان اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ بے اختیار منہہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

کب خوف ہجر یار نہ تھا وصل یار میں ؛ کس دن خزاں کی یاد نہ آئی بہار میں

پرہیز مکیشی ہے ہو فصل بہار میں ؛ یہ احتمال رحمت پروردگار میں

کانٹوں میں ہے خلش بگلوں میں ہے رنگ و بو ؛ کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں

دم گھٹ نہ جائے ضعف جنوں کچھ تو رحم کر ؛ ثابت ابھی ہے اپنا گریباں بہار میں

حرم تیرا گھر بتکدہ تیرا مسکن ؛ ہے تفریق شیخ و برہمن میں کیسی

زحمت اٹھاؤ کیوں نظر قہر ڈال کے ؛ رکھدوں میں آپ اپنا کلیجہ نکال کے

اے شوق فروشی عشاق مژدہ باد ؛ بیٹھے ہیں وہ تنے ہوئے خنجر نکال کے

مضمون آفرینی ملاحظہ ہو

توڑ دیتے ہیں ذوق آزادی میں تار نفس ؛ روح کو اس قید سے آزاد کر لیتا ہوں میں

کھینچ کے آجاتے ہیں وہ جذب تصور کے نثار ؛ ایک نئی دنیائے خیال آباد کر لیتا ہوں میں

یاس اور امیدوں کا کھلونا ہے یہ دل ؛ شاد کر لیتا ہوں میں ناشاد کر لیتا ہوں میں

رباعی میں اُن کا اپنا رنگ مخصوص ہے۔

دنیا میں بری رہ نہ برا در چلنا ؛ ہشیار خبر دار سنبھل کر چلنا

رہنا ہے اگر بزم طرب میں رہبر ؛ شیشہ کی طرح سر کو جھکا کر چلنا

شوق۔ رائے رگھبیر پرشاد شوق

رگھوبیر پرشاد شوق. بی۔اے عثمانیہ بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر بزرگوار رائے ست گرو پرشاد رہبر کی طرح فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے خاندانی استاد علامہ عبدالرزاق نیشاپوری سے حاصل کی۔

۱۳۴۸ف میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کا امتحان فلسفہ لے کر کامیاب کیا۔ اور دفتر پولیس بلدہ میں ملازم ہوگئے۔ انھیں عروض اور فن شعر کی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم ست گرو پرشاد رہبر سے ملی۔ اور شعر و سخن کا مذاق بھی انہیں کی فیض صحبت سے چمکا۔

کرشمے بھی تیرے اے سوز الفت کیا نرالے ہیں

کسی جا شمع بننا اور کہیں پروانہ ہو جانا

ظاہر ہیں اور نہاں میں عیاں ہر نہاں میں آپ

مسکن گزیں بتائیے ہیں کس مکاں میں آپ

آنکھیں ہوں گر تو گھر میں ہے لیلیٰ حجاب قیس

کیا ڈھونڈتے ہیں نجد کی ریگ رواں میں آپ

یوں جو ہر ایک سے الجھتی ہے۔ کس کے دامن کا خار ہے دنیا

بدقسمتی سے عرصہ ۲ سال ہوا کہ بعارضہ خلل دماغ علیل ہیں۔ ورنہ نہ جانے دکن کے اس نوجوان شاعر سے فن شعر کی کس قدر خدمت ہو سکتی۔ **مہندر راج سکسینہ**

جس نے سوچا کہ اب "حسن و عشق" کی منزلیں ختم ہو چکیں۔ مغربی سیلاب اور زمانے کا انقلاب اب اس کا مقتضی نہیں کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے لہٰذا شاعری کو قوم اور وطن کی بیداری کا ایک ذریعہ بنانا چاہیے چنانچہ حذف اور اضافے کئے گئے اور اس شاعری کو جدید شاعری سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اس جدید شاعری کا آغاز قومی شاعری سے ہوا۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا کس زمانے سے ہوئی مگر یہ کہنا بجا نہیں کہ اس کا سنگ بنیاد حالی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ حالی پہلے پہلے تو اسی ڈگر پہ چلے جس پر شیفتہ، مومن وغیرہ چل چکے تھے لیکن نہیں تو ایک جدید اسکول کا بانی ہونا تھا۔ اس وقت اردو شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور یہیں سے اس کا RENAISSANCE یعنی دورِ نہضت شروع ہوا۔ اسلامی سلطنت کی دیا خاموش ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی زندگی اور سیاسیات میں ایک انقلاب کی ضرورت تھی۔ حالی نے مسدس لکھی اور اپنی قوم کی زندگی میں حیات کی گرمی اور حرکت پیدا کی۔ شمع سے شمع جلتی ہے۔ حالی کی 'برکھا رت' اور 'حبِ وطن' نے اکبر، چکبست، اقبال اور جوش جیسے شاعر پیدا کئے۔

اکبر نے اپنے بے شمار مزاحیہ قطعوں اور نظموں سے مغربی تہذیب کی برائیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا۔ چکبست نے ہندوستان کی بہارِ رفتہ اور عظمتِ قدیم کا ذکر کر کے عوام کے دلوں میں حس اور قوت پیکار پیدا کی۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان پستی و گمراہی کی ضلالت میں گھرا ہوا تھا اور ایک ایسے بڑے قومی شاعر کی ضرورت رہا تھا جو ہمیں جادۂ اعتدال کی طرف [illegible] چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال [illegible] جس نے ہم کو نئی تہذیب کے اثراتِ بد سے آگاہ کر کے ایک شاندار مستقبل کے لئے آمادہ کیا۔ ہمارے دلوں میں ہماری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسلاف کے کارنامے سنا کر ہمارے سرد اور منجمد خون میں روانی پیدا کی۔

اقبال کی قومی شاعری کو تین عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ وطنی ۲۔ اسلامی ۳۔ بین قومی

اقبال اور وطنیت:۔ اقبال نے جب آنکھ کھولی اس وقت ہندوستان مغربی طرزِ تمدن اور مغربی افکار سے آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ بہتیرے ناعاقبت اندیش اس رو میں بہہ گئے اور مغرب کی اندھی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس کھو دیا۔ یہ ماحول تھا جو اقبال کی شاعری پر اثر انداز ہوا اور اقبال کو وطنیت کی رو میں بہا لے گیا۔ بانگِ درا کا صفحہ صفحہ اسی ماحول کا پرتو ہے "بانگِ درا" کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے ہمالیہ ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا اور فخر کرتا ہے۔ یہ نظم قطع نظر بلندیِ تخیل اور جدتِ تشبیہات کے ایک اچھوتا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے اور اس کے لفظ لفظ سے 'حبِ وطن' کی بو آتی ہے پھر جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بڑھتی جاتی ہے۔ چند صفحوں کے بعد "صدائے درد" کے عنوان سے ایک چھوٹی نظم ہے۔ شاعر شدتِ دردِ دل سے چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اسے محیطِ آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں
اختلاطِ موجۂ و ساحل سے گھبراتا ہوں

پھر ایک اور نظم تصویرِ درد ہے جس میں شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا افسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

چند ہی ورق اُلٹنے کے بعد ترانہ ہندی آتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظم کو وہ مقبولیت حاصل ہے جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہے۔ اس کا ایک ایک شعر حُبِ وطن میں رنگا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی نیا شوالہ ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایسے نئے شوالے کی تعمیر کی طرف اشارہ ہے جہاں پرستارانِ وطن کا سر جھک جائے۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں

اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو۔ نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی وطنی شاعری ختم ہوگئی۔ بعد میں یہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا گیا اور آخر میں عجمی خم اور حجازی بادہ ہی رہ گئی۔

اقبال و اسلامیات:- قوموں میں ایک نہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے افراد اپنے آپ کو منصب انسانیت سے گرا کر ضلالت و گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ایک ایسا دور آیا کہ ان کی انسانیت اپنے مرکز اصلی سے ہٹ کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ بہ پیچ وادیوں میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگی۔ اقبال نے اسے محسوس کیا اور اپنی شاعری کا رخ جس کا آغاز وطنیت سے ہوا تھا اسلام کی طرف پھیر دیا۔ مسلمانوں میں ایک نئی روح ڈال دی اور ایک ایسا صور پھونکا کہ اکثر اُٹھ بیٹھے اور جو نہ اٹھے وہ کم از کم چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس اُسے خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است ؛ صدائے من درائے کاروان است

اقبال کے کلام کا بڑا ذخیرہ اسلامیات کے متعلق ہے۔ اقبال نے اسلامی شاعر کی حیثیت سے مذہب و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ اس صنف کی ابتدائی نظمیں بجد پرجوش اور ولولہ انگیز ہیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" اسی وصف کی مخصوص نظمیں ہیں۔

یورپی اقوام نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی جس کا

سیرت کی صحیح تحدید صرف اسی وقت ہوتی ہے جب اس جغرافی حدود سے پرے نکل جائے یعنی انہوں نے تنگ وطنیت کو ملتِ اسلامیہ کی بنیاد میں پر رکھنا درست نہیں سمجھا۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند ٭ بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

مردے اندر جہاں افسانہ شد ٭ آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند ٭ آدمیت گم شد و اقوام ماند

کوئی قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے علمی قویٰ شل ہو جاتے ہیں اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ اقبال نے اسلام کی عظمت و برتری کی ایسی تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی حیران رہ گئے کہ واقعی ہمارا اسلام بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور ہمارا یہ رتبہ ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ٭ فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور ٭ کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

بعض وقت اقبال کے اندر ایک ایسے سخت قسم کا فرقہ وارانہ رجحان (Communalistic Tendency) پیدا ہو جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے جہاد فی سبیل اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بانگ درا کی نظمیں "بلال" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں" اور ضرب کلیم کی "جہاد" "اسلام" "مسلمانوں کا زوال" اور "ہندی اسلام" پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم "اذان" کے دو شعر ملاحظہ ہوں کتنے اثر آفریں ہیں۔ یہ نظم اقبال نے قرطبہ (اسپین) میں لکھی تھی۔

بن باد و اذاں میں نے
دئے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
طلسم شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شباب

اقبال اور بین قومی تاثرات:۔ اقبال نے ان مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن سے اور نہ ان کے مذہب اسلام سے ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر "ضرب کلیم" میں پائی جاتی ہیں مثلاً "نپولین کے مزار پر" اور "مسولینی" وغیرہ میں بین قومی سیاسیات پر اقبال نے جن افکار کا اظہار کیا ہے ان میں شاعرانہ تخیل کے ساتھ انسانیت کا شرف بھی بدرجۂ اتم موجود ہے "بالشویک روس" "ابی سینیا" "مسولینی" "سیاسیات فرنگ" "جمعیت اقوام" اور "مشرق" قابل ذکر ہیں۔ مسولینی پر اقبال کی نظم بال جبریل میں بھی ہے اور ضرب کلیم میں بھی۔ موخر الذکر نظم "مسولینی" میں انھوں نے مسولینی کی تعریف تو نہیں کی لیکن معترضین یورپ پر ایک زبردست اعتراض ضرور کیا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارتگری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال نے دول یورپ کی پکار اور چیخ کی حقیقت خوب سمجھی تھی وہ نفسیات یورپ کے ماہر تھے۔ خونریزی اور بدامنی کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قائم کی گئی اور دنیا نے یقین کیے

طور پر سمجھ لیا کہ اب امن ہی امن رہے گا۔ لیکن اقبال سیاست افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

زمانہ جانتا ہے کہ اقبال کی پیشین گوئی حرف بہ حرف کتنی درست ثابت ہوئی۔ واقعات نے بتا دیا کہ ارباب سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں چل سکتی۔ آج ہماری یہ "امن کی دیوی" کس کس مپرسی کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکلجائے

اقبال کی شاعری کا چراغ گل ہوتے ہوتے یہ قومی شاعری عوام میں بھی آ چکی تھی۔ لہٰذا اس میں نئی شاخوں اور نئی راہوں کا اضافہ ہوا۔ مفلس اور بے روزگاروں کی زندگی پر تنقید اور تبصرے ہونے لگے۔ نظموں کے ذریعہ مزدور کسان اور سرمایہ داروں کی کشاکش کا معمہ سلجھانے اور بیان کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ طبقہ کسان اپنی جہالت، بے مائگی کے سبب سوسائٹی میں خواہ کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو پھر بھی اس حقیقت سے گریز نہیں کہ اسی کی ذات پر ہماری ساری طمانیت اور شادمانیٔ حیات کا دارومدار ہے اقبال نے اس مقدس طبقہ کی طرف ہندوستان کی توجہ منعطف کرائی تھی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوشؔ، سیمابؔ، احسانؔ دانش نے بھی اپنے قدم بڑھائے۔ محل سے نکل کر جھونپڑوں میں چراغ جلائے۔ مفلسوں کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ کسان کی بدحالی پر دنیا کو ہمدردی کے لئے مائل کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں جوشؔ کا قدم سب سے آگے ہے۔ جوش کی ایک نظم کسان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جھٹپٹے کا زرد رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار

...ھر میں ایک نا ... پھر ...

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

اسی عنوان پر سیماب اکبرآبادی کے بھی چند اشعار دیکھئے۔ مزدور کی حالت کا نقشہ کس فطری انداز میں کھینچا گیا ہے

گرد چہرے پر پسینہ میں جبیں ڈوبی ہوئی۔
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارِ گراں۔
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا۔
ہانپتا، گرتا، لرزتا ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع سارے کنبے کا خیال
ایک لمحہ بھی نہیں فکرِ معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اسے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع ہے کسی کا شاہکار
گو ہے تیرے ہی طرح انسان پر مقہور ہے۔
دیکھ آ دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

صرف کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ غریبوں کے وہ طبقے بھی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے ایک ... بسر رہے تھے۔ ...نے نہایت دل کش پیرائے ...رنا شروع کردیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض شعرا مثلاً احسان دانش کو اتنا انہماک ہوگیا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی طبقے کو اپنا موضوع شاعری بنالیا ہے۔ ان کی ایک نظم "خانہ بدوش" کے کچھ اشعار دیکھئے۔

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کا کسی کو شہر میں رہنا نہیں پسند دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں
تاریخ ہند کے یہ پریشاں ہے ورق یہ یادگارِ ضعف تمدن کی داستاں
برباد ہیں ذلیل ہیں رسوا ہیں خوار ہیں القصہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں
جن کے مکاں پہ تیغ کے پرچم تنے موج ریز
وہ پھر رہے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں

الطاف مشہدی کی ایک انقلابی نظم "قربانی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں
گلے کو چومنے والی حسیں تریں باہیں
دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں
کسی کی ہوش ربا و جنوں فروش نگاہ
ہماری پاک محبت کا اولیں گناہ
وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا آؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا
جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔

علی احمد (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد راقم کو شمالی ہندوستان میں سفر کرنے کا موقع ملا اُس چند روزہ سفر کی بعض باتیں یاد رہ گئیں اور اس امید میں ان کو قلم بند کر رہا ہوں کہ وہ شاید بعض لوگوں کی تفریحی مطالعہ کی مستحق ہوں، یا ان لوگوں کے لئے کام کی باتیں ثابت ہوں جنہیں ادبیات اور تمدن سے دلچسپی ہے۔

سب سے زیادہ جس چیز سے مجھے ناگوار حیرت ہوئی وہ شمالی ہند کی مغرب زدگی اور انگریزیت پسندی ہے چنانچہ خاص دوآبے میں جو نہ صرف ہندستانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بلکہ اردو کا وطن ہے اور کئی ہندستانی زبانوں اور تمدنی تحریکوں کا سرچشمہ ہے معمولی معمولی لوگ بلا وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کر کے اپنی مغرب زدگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ ادھر دس بارہ برس سے ہندستانی زبانوں کا عروج ہو رہا ہے کئی صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہو گئی ہے ممکن ہے کہ حالات کچھ بہتر ہو گئے ہوں، لوگوں کی معاشی اور مالی حالت کے ساتھ (خیال ہوا کہ) شائد زبان بھی سنبھل گئی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ تمدنی اور زبانی نقطۂ نظر سے ہم میں احساسِ کمتری کے متعدد آثار پائے جاتے ہیں، اور ہم اس ضبط کی وجہ سے اپنی ذاتی تذلیل کر رہے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں لکھ رہا ہوں اور میرا مقصد اظہار حقیقت اور دعوتِ اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری یا وعظ پسندی

تاج محل کے ایک موروثی خادم کو میں نے کسی دوسرے شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ :-

" وہ اس ٹری کے پرے ہے"!

ٹری ؟؟؟ عجب !! یہ کیا ؟؟ .... درخت !! جس ملک کے چھوٹے بڑے سب اسی خبط میں مبتلا ہوں کہ بے وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کر کے اپنی ادھوری تعلیم کا رعب گانٹھیں تو پھر اُن کم سمجھ اَن پڑھوں کا کیا قصور اگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت جتانے کے لئے دو چار انگریزی لفظ سیکھ رکھے ہوں۔؟

ایک خان بہادرؒ کے ہاں مہمان تھا۔ ان کے ایک ملاقاتی سوٹ پوش، گلوری چباتے ہوئے۔ موٹر سے اترے، رسمی طور پر میرا بھی تعارف کرایا گیا۔ ان میں باتیں ہونے لگیں۔ میں ایک خاموش سننے والے کی حیثیت سے مجبوراً بیٹھا رہا۔ گھر کی بیماری اور عدم فرصت کا ذکر ہوا ایک نے کہا:-

" میری وائف کو اِن دنوں بہت کام تھا اور وہ آپ کے ہاں ملنے نہ آسکیں"۔

جواب ملا :-

میری وائف کو بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔

نہ جانے ..... میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف دکن کے مغرب زدہ خبطیوں کا شیوہ ہے کہ بیوی کو بیوی کہتے انہیں شرم آتی ہے ..... وائف کہتے شرم نہیں آتی مگر اب معلوم ہوا کہ وندھیاچل کے پرے بھی مغربیت کا اندھا جنون روزمرہ کی گفتگو کو غارت کر رہا ہے۔

لاہور میں غضب کی سردی تھی مگر پنجابیوں کے

گرمی اور ہیجان میں اتنی تازگی پیدا کی کہ بیرونی سردی زیادہ اثر نہ کر سکی۔ مختلف طبقوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا وہاں والوں کے حسن سیرت کو دیکھ کر انہوں کے متعلق جو مغالطہ تھا وہ دور ہو گیا۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور وزیر داخلہ خضر حیات ٹوانہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کھدر پوش راجہ صاحب محمود آباد کے درشن نصیب ہوئے۔ پنجابیوں کی پگڑیاں بڑی بانکی ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی جسمانی صحت اور سڈول بدن پر وہ اور بھی زیادہ بانکے معلوم ہوتے ہیں۔ حسن صحت، حسن صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے پنجابیوں میں متعدد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اردو نوازی، اچھی طباعت، خوشنویسی، اچھی کتابت اور عمدہ جلد سازی میں لاہور سے بڑھنا تو بڑی بات ہے کوئی اس سے ہمسری بھی نہیں کر سکتا۔ غالب کے دیوان کے جیسے عمدہ مصور اور خوشنما اڈیشن پنجاب نے شائع کئے ہیں، وہ نہ صرف اردو بلکہ سارے ہندستان کے لئے قابل فخر ہے۔

حیدرآبادی "تانگا" اور جھٹکا متوسط طبقے کی عام سواریاں ہیں جو آگرہ اور اودھ کے تانگوں اور اکوں سے زیادہ تکلیف دہ اور بدنما ہیں۔ قاضی پیٹھ سے ورنگل تک خاصہ [illegible] میل کا فاصلہ ہے۔ مجبوراً اسی جھٹکے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے جلدی تھی، جھٹکا خراب تھا، راستہ بدتر تھا۔ ٹٹو کمزور تھا مگر انعام کی توقع اور پیسہ کی لالچ کسی طرح چابک کو تھمنے نہیں دے رہی تھی اور جھٹکا مقابلتاً تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ چابک کی آواز، پتھریلی سڑک پر پہیوں کی صدائیں خاصہ لطف دے رہی تھیں

ہمارے قریب سے ایک صاحب بہادر سوٹ بوٹ پہنے چلے جا رہے تھے۔ جھٹکے والے نے ملائم لہجے میں کہا

"بچئے صاحب! ہٹئے جناب!"

تھوڑی دیر بعد ایک سفید پوش صاحب کاندھے پر رومال ڈالے راستے سے گزر رہے تھے۔ جھٹکے والے نے صاف آواز میں کہا۔

"چلو صاحب! ہٹو میاں!"

چوراستے کے قریب ایک شخص لنگی پہنے معمولی لباس پہنے دکھائی دیا۔ جھٹکا گزرنے سے پہلے ہی وہ جا سکتا تھا مگر جھٹکے والے نے زور سے کہا۔

"سرکو جی! دیکھتے نہیں ہو؟"

ذرا آگے بڑھتے ہی ایک غریب کمل پوش نظر آیا وہ بھی راستے سے گزرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے والا آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے للکار کر کہا۔

"ہٹ بے! اندھے!!"

وہ بیچارہ سہم کر خاموش ہو گیا اور اس طرح آنکھ بچا کر نکل گیا گویا اس نے کوئی جرم کیا تھا اور سزا سے بچ گیا۔ ان کی مرعوبیت ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی ایک مثال سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری معاشرت کس طرح مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان مختلف طبقوں کے افراد کے ساتھ جھٹکے والے بھی کس طرح سلوک کیا کرتے ہیں۔

نسیم پریچاں

ہندوستان کی زبان

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی !

ہندوستان جو گئے ایام میں جنت نشان کہلاتا تھا اب اس کو اگر غلامستان کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا۔ غلامستان محض اس لئے نہیں کہ اس ملک پر ایک مدت سے بدیسی لوگ حکمران ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہندوستانی کہلانے والوں کی ذہنیت کچھ اس قدر پست ہو گئی ہے کہ یہاں سوائے ذلت اور ادبار کے اب اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک جھگڑا ختم نہیں ہونے پاتا کہ محبانِ وطن اور قوم پرست بزرگ دوسرا جھگڑا کر دیتے ہیں۔

اس ملک کی سب سے بڑی بد قسمتی تو یہ ہے کہ یہاں چپہ چپہ پر مختلف مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ روزِ ازل سے غلامی، فرقہ بندی، اور قومی بغض و عناد نے اس ملک والوں کو یار و اغیار کی نگاہوں میں رسوا کر دیا ہے اور رہی سہی کسر اس زبان کے سوال نے پوری کر دی ہے۔ خدا بخشے شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

بہت ممکن تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں نہ کہیں اخوت نظر آتی نہ ہمدردی پائی جاتی نہ لوگوں میں میل ملاپ ہوتا ایک کی ٹاگر دوسرے سے علیحدہ ہی رہتی۔ لیکن قدرت کو چونکہ کچھ بھلے دن بھی دکھانے تھے اس لئے اس نے ہندوستان والوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کے لئے ایک ایسی زبان پیدا کر دی جس کی طفیل یہاں کچھ یک رنگی سی نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ کچھ روزمرہ کی ضروریات بھی اس امر کی متقاضی تھیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جو سب کے لئے آسان اور قابلِ قبول ہو۔ تو جناب ! یہ مشکل اردو زبان نے حل کر دی۔ اردو زبان کی نشوونما ہندو اور مسلمان دونوں کے ہاتھ سے ہوئی، اور دونوں نے مل کر اسے عروج پر پہنچایا اور آج بلادِ مشرق میں اردو کو وہی حیثیت حاصل ہے جو مغربی ممالک میں فرانسیسی زبان کو۔ اردو زبان کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں ہندو اور مسلمان ادبا اور شعرا اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں اور آج بھی جب کہ زبان کا جھگڑا ہندو قوم کے رہنماؤں کی تنگ نظری کی بدولت ایک ناگوار کشیدگی کی صورت اختیار کر رہا ہے اردو زبان کے ہندو ادبا اور شعرا اس کی خدمت سے غافل نہیں۔

خیال تو کیجئے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف الخیال لوگ آباد ہوں، جہاں فرقے فرقے کا مذہب علیحدہ ہو، رسم و رواج بھی الگ الگ ہوں، جن کی تہذیب اور تمدن میں زمین اور آسمان کا فرق ہو، جو اپنے قومی اور سیاسی مفاد کے لئے علیحدہ علیحدہ اکھاڑے بنا رہے ہوں، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ملک کی اکثریت ایک زبان بولنے یا سمجھنے والی ہو تو اس سے زیادہ اس زبان کی ہمہ گیری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں لے دے کر ایک زبان ہی تو ایسی چیز ہمارے پاس ہے جس سے ہمارا آپس میں کچھ میل جول نظر آ رہا ہے۔ ورنہ خود غرضی اور قوم پرستی کا جز خوفناک حربہ یارانِ وطن استعمال

[illegible]ری سنہ ۱۹۴۰ء

[illegible]بان کو مٹانے والے رہی ہے قوم [illegible]ستان

ہیں جو ہندوستان [illegible] ہیں علامہ اقبال علیہ الرحمہ کیا خوب

[illegible] گئے ہیں ۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مجھے اس وقت یہ بتلانا مقصود نہیں کہ اردو زبان کیسے بنی۔ مجھے تو کچھ اس کے متعلق عرض کرنا ہے کہ اردو زبان پر اعتراض کرنے والے کون بزرگ ہیں اور اس کی تہہ میں [illegible] ہے۔

اردو زبان پر اعتراض کرنے والے حضرات ہمارے [illegible] آڑ لے کر اردو پر برس رہے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں رہ [illegible] ان دونوں قسم کے لوگوں کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے [illegible]۔ بھائی بند ان کی اس قسم کی تفرقہ انگیز چالوں سے متنفر نظر آنے لگے ہیں۔ ہندوؤں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم نے اردو کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔

بنگالی زبان کا اردو کے بعد ہندوستان میں دوسرا درجہ ہے۔ بنگالی میں علم و ادب کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔ بنگال والوں نے بڑے نامور ادیب، شاعر اور باکمال آدمی پیدا کئے ہیں لیکن اردو کے خلاف آج تک اس قوم نے کبھی کسی قسم کی ناپاک کوشش نہیں کی بلکہ اکثر بزرگ اس کوشش میں ہیں کہ بنگال میں بھی اردو زبان کا رواج عام ہو جائے۔ جس طرح اردو کئی ایک زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے اسی طرح بنگالی زبان میں فارسی اور عربی کے [illegible] ہیں جنھیں بنگالیوں نے اپنا لیا ہے۔ جیسے روز کی بجائے "روج"، کباب کی بجائے "کاباب"، جانور کی بجائے "جنوور" یا ہماری ارکا "کاری گر"، یا مزدور کا "موجور"، یا ہفتہ کی بجائے "ہوپتا"۔ اسی طرح عربی کے الفاظ دیکھئے کس طرح بنگالی بن گئے ہیں۔ "نافس" کا "ناکس"، "غسل" کا "گسل"، "ترقی" کا "ترکی"، ضبط کا "جبت"، "مضبوط" "مجبوت"، "حضور" کا "ہجور" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مرہٹی، گجراتی یا تلنگی بولنے والوں کی طرف سے بھی کبھی اس قسم کا مطالبہ یا خواہش نہیں کی گئی۔ یہ سودا صرف ہمارے ہندو دوستوں کے سر میں سمایا ہے گو اس فرقے کے اکثر سمجھ دار بزرگ اس تحریک کے خلاف ہیں اور آواز محض گاندھی صاحب کے تقدس کی خاطر اس کے خلاف بلند نہیں کرتے۔

اردو کے خلاف کثیر خیال کے ہندو تو ایک مدت سے اونگی بونگی بول رہے تھے لیکن جب سے کانگرس برسرِ اقتدار آئی ہے اس روز سے ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے کا مرض بہت ترقی کر گیا ہے۔ یہ سب کانگرس کے اقتدار کی برکات ہیں جو آج اس ملک میں واردھا اور ودیا مندر ایسی ناپاک اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ ان اسکیموں کا صرف ایک مطلب ہے یعنی مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کو ملیا میٹ کیا جائے۔ ہم تو یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں!

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس لے پنجۂ جنوں کو آخر ناخن عطا کر ہی دیئے۔ اور اسی وحشت نے کہیں سرسوتی کی پوجا کہیں بندے ماترم کا گیت کہیں کچھ اور کہیں کچھ فتنے برپا کر دیئے۔ کانگرس نے حکومت سنبھالتے ہی جو پر پرزے نکالے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر زبان پر بار بار یہ آتا تھا کہ ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

تو جناب! یہ ان لوگوں کے لئے [illegible] ہے جنھیں ملک کی بہتری کانگرس کے اقتدار میں نظر آرہی ہے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ [illegible] کا سوال [illegible] کرنے والے وہی محترم لوگ ہیں جو کانگرس کے کرتا دھرتا کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں وہی اردو ایسی عالمگیر زبان کے خلاف محض اس لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ ایک تو بقول جناب گاندھی یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے پنڈت مالویہ صاحب کو یہ خوف دامنگیر ہو رہا ہے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنی قوم میں اردو کی مخالفت کا بیج بو دیا۔ افسوس ؎

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

"ہندی" کو راشٹر بھاشا کا درجہ دینے والے ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھیں کہ "ہندی" کی ملک میں حیثیت کیا ہے۔ اردو کے مشہور رسالہ ساقی (دہلی) میں "سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر" کے عنوان سے جناب سید ابوالقاسم صاحب سرور کے نام سے گذشتہ دو تین مہینوں سے ایک بہت دلچسپ اور پُر از معلومات مضمون شایع ہو رہا ہے۔ ساقی بابت نومبر میں سرور صاحب نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے جو اعداد و شمار (جو غالباً کسی مغربی محقق کے ممنونِ منت ہیں) دیئے ہیں اس سے "ہندی" کی زبوں حالی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد		نام زبان	بولنے والوں کی تعداد
۱۔ اردو	آٹھ کروڑ پچاس لاکھ (یہ اندازہ بالکل غلط ہے)		۷۔ گجراتی	پچانوے لاکھ
۲۔ بنگالی	تین کروڑ نوے لاکھ		۸۔ اوڑیا	ستر لاکھ
۳۔ مرہٹی	ایک کروڑ ستر لاکھ		۹۔ کنڑی	پچاس لاکھ
۴۔ تلنگی	ایک کروڑ ستر لاکھ		۱۰۔ ملیالم	پچاس لاکھ
۵۔ پنجابی	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ	یہ غلط ہے پنجاب میں کم و بیش پونے دو کروڑ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔	۱۱۔ سندھی	چالیس لاکھ
۶۔ تامل	ایک کروڑ تیس لاکھ		۱۲۔ ہندی	تیس لاکھ

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کانگرس کی اپنی چھان بین سے بھی اردو کی مقبولیت آشکارا ہوتی ہے۔ کانگرسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں اردو بولنے والے شمار کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ حالانکہ یہ تمام غلط ہے، یعنی کانگرسی ادھم بھائی پروپیگنڈا کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی آبادی صرف آٹھ کروڑ بتلائی جا رہی ہے کوئی آج سے نہیں بلکہ نصف صدی سے یہ دروغ بیانی جاری ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی گیارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی کم و بیش تینتیس کروڑ ہے اور آج اس ملک میں ۲۴ اور ۲۵ کروڑ آدمی اردو بولنے سمجھنے والے موجود ہیں۔

اور سنئے! اس ملک میں ۱۰۲۹ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۱۰ ہندی کے ہیں اور ۳۱۸ اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ یہ تو رہی ہندوستان کی حالت اب ذرا بیرون ہند بھی اردو کی مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔

افغانستان، ایران	۱۰ لاکھ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔	
	عرب و عدن	پچانوے لاکھ
	یورپ اور امریکہ	بیس لاکھ
گلگت، بلخ اور ختن	پچاس لاکھ اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔	
	جاپان اور سنگاپور	پانچ لاکھ
	دیگر اسلامی علاقے	بیس لاکھ

اب ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر ذرا "ہندی" کے علم برداروں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں بھیا! ہندی کا ڈھونگ رچانے کے کیا معنی! خیر! یہ تو رہیں دور کی باتیں۔ ابھی تھوڑے روز ہوئے آل انڈیا بمبئی ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ریڈیو سننے والوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام پسند کریں گے۔ اس کا نتیجہ جو سرکاری طور پر شائع کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

بمبئی:- اردو یعنی ہندوستانی ۲۵۶۰ - انگریزی ۲۵۳۲ - گجراتی ۱۷۴۲ - مرہٹی ۱۵۳۹ - ہندی ×

اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں ریڈیو پروگرام تیار کیا جائے تو آپ کس زبان میں ریڈیو سننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب سنئے!

اردو (ہندوستانی) ۳۶۵۰ - انگریزی ۱۷۴۷ - گجراتی ۹۲۰ - مرہٹی ۵۳۵ - ہندی ×

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے بھی یہی پوچھا گیا ان صوبوں سے زبان کے متعلق جو جواب ملا

اس سے اردو کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کلکتہ:- اردو ۳۵۵۹ - انگریزی ۱۷۵۴ - بنگال ۲۹۹ - ہندی ×

دہلی:- اردو ۳۸۴۸ - انگریزی ۱۷۳۶ - ہندی ×

مدراس:- اردو ۳۵۲۵ - انگریزی ۱۸۷۱ - تامل ۳۹۴ - تلنگی ۲۱۹ - ہندی ×

ان اعداد شمار سے یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان کو ملیا میٹ کرنے کا جنون صرف ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔ دوسری اقوام ہندوؤں کی ہم نوا نہیں اردو زبان کے خلاف صوبۂ متحدہ میں جس کاوش سے کوشش ہو رہی ہے اس کی مثال دوسری جگہ شاید نہ ملے۔ کانگرس والوں سے کچھ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ خالص ہندو قوم کی نمائندہ ہے۔ لیکن افسوس تو مسلمانوں پر ہے جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے ؎

عاقبت منزل ما وادیِ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

ابھی پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن دہلی والوں نے جو اردو کی گت بنائی ہے اور جس جس طرح اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی وہ کسی سے کچھ چھپی ہوئی نہیں۔ سنتے تو یہ تھے براڈ کاسٹنگ کا محکمہ بھی سرکاری محکمہ ہے۔ لیکن دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر نے تو قولاً اور فعلاً یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ خالص کانگرسی محکمہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں نشر ہوئی ہیں۔ اس میں ہندی کے اور ایسے ایسے من گھڑت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں سن کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے بات چیت کر رہے ہیں۔ خیال تو فرمایئے کہ

"ایکا" (اتفاق) "ہتھیار بند جھانہ"۔ "ڈھڑا و ڈھڑ"۔ "چناؤ"۔ "پچھمی فرنٹ"۔ "سندیسہ"۔ "راج دھانی"۔ "پورب، پچھم، اتر، دکن"۔ "اڑان" (پرواز) "سناہی والا مال"۔ "موقع چھانٹنا"۔ "ڈبکنی کشتی"۔ "صلح کے بیان کی سواگت"۔ "ڈپلومیٹک حلقوں کی آتے جاتے"۔ "مانگیں" (مطالبہ) "لیکھت"۔ "لکھت پڑھت"۔ "میرٹھ میں شانتی ہوگئی"۔ "پرکھت کا وقت"۔ "لڑائی بند کرنے کی مانگ"۔ "بہتری ثابت کرنے والے" وغیرہ وغیرہ الفاظ اگر رام راجیہ کے دور میں ہندو جاتی کی حکومت استعمال کرتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ابھی تو دہلی دور والا معاملہ ہے۔ ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور اردو کے بہی خواہ اس قسم کی "غیر مہذب زبان" کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اگر اسی کا نام "ہندوستانی" ہے تو پھر یہ ہندوؤں کو ہی مبارک ہو۔ لطف تو یہ ہے کہ گاندھی صاحب کو "اردو" نام بھی ناپسند ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر صلح اور اہنسا کے دیوتا کو ہمسایہ قوم سے بغض نہ ہو تو اور کس کو ہو۔ آپ نے زبان کا نام "ہندوستانی" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن جناب گاندھی کو کوئی اتنا تو بتلا دے کہ "ہندوستانی" تو انگریزوں کا دیا ہوا نام ہے۔ آپ تو انگریز کی ہر چیز سے متنفر ہیں یہ نام کیوں پسند آگیا آپ کو۔

اردو زبان کے خلاف جو یہ نفرت پھیلا[illegible] ... [illegible] فی الحقیقت صرف سیاسی جذبہ کارفرما ہے۔ انگریزوں نے کسی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے کانگریس کو ذرا ڈھیل دے دی تھی جس سے اس کی رسّی اور بھی دراز ہوگئی۔ اور گھر بیٹھے یہ لوگ رام راجیہ کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جناب آج ہندوستان میں رام راج قائم ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ اسلامی تہذیب اور تمدن پر کس کس طرح کلہاڑا چلایا جاتا ہے۔

اردو ایسی عالمگیر و شگفتہ زبان جس میں ہر پڑھے لکھے آدمی کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے لفظی نزاکت لطافت دلکشی اور دلکشی حاصل ہو سکے اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اپنی ذہنیت کی پستی کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ فارسی ایک بے حد دلآویز اور دلکش زبان ہے لیکن اردو میں شائستگی اور دلکشی اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے ایسا ہی غلط اور بے معنی ہے جیسے بنارس کے ایک پنڈت نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا

"مہاراجہ بکرماجیت اور بابر بادشاہ میں کئی معرکے ہوئے لیکن جیت ہمیشہ مہاراجہ بکرماجیت کی ہی ہی"

پنڈت مدن موہن مالویہ کی کوششوں سے نہ صرف ہندو مہاسبھائیوں نے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو دیس نکالا دیا تھا۔ لیکن ہندو مسلم کی [illegible] کے تقدس نے یہ آگ اب ہر جگہ لگا دی ہے اور آپ اپنے دامن کی ہوا سے اسے تیز سے تیز تر کئے جا رہے ہیں۔ [illegible] گاندھی صاحب نے ناگپور میں یہ کہہ کر پوری کر دی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں وہ سب لوگ جو اردو ہندی کی آویزش کے ذمہ دار ہیں مصلح قوم اور محب وطن کہلانے کے مستحق نہیں۔ زبان سے ملک و ملت کی شان نظر آتی ہے۔ آپس میں اخوت اور اتحاد کا رشتہ استوار رہتا ہے۔ اس لئے جو قوم یا جو فرقہ یا جو شخص اس مقدس رشتہ کی جڑ کاٹنے والا ہو ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ کسی ملک کی آزادی کے لئے اس کی زبان کا ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ اور زبان کا اختلاف غلامی کی دلیل۔

اردو زبان پر یارانِ وطن کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان "عقل کے پتلوں" نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ عام بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور ادبی زبان اور عام بول چال میں کوئی احمق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ استعمال کرے۔ لیکن جہاں ادبی شگفتگی مدنظر ہو وہاں ان الفاظ کا استعمال کرنا بھی ضروری ہوگا۔ پھر ہر لکھنے والے کی اپنی اپنی طرز ہوتی ہے۔ کوئی سادہ الفاظ استعمال کر کے زبان میں چاشنی اور لطافت پیدا کرتا ہے کوئی عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ سے اپنی تحریر کو مزین کرتا ہے۔

لیکن ہندی کو تو یہ بات بھی حاصل نہیں۔ اور حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ بقول جناب گاندھی ہندی وہ زبان ہے جو کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اس پر یہ دعویٰ کہ ہندی ہی ہندوستان کی راشٹر بھاشا کہلا سکتی ہے جس قدر مضحکہ خیز ہے سب پر عیاں ہے۔

ہندوستان کی زبان کو ہم "ہندوستانی" تب کہہ سکتے تھے جب کہ تمام ملک میں ایک ہی قوم و ملت کے لوگ آباد ہوتے۔ پھر آج تک یہ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ "ہندوستانی" کیا ہوگی کیسی ہوگی۔ ڈاکٹر تارا چند۔ بابو راجندر پرشاد اور علامہ کیفی نے ہندوستانی کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جو تقریریں نشر کی تھیں۔ اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جدید "ہندوستانی" اردو اور ہندی کے بیچ کا راستہ" لے گی۔ لیکن ان تینوں بزرگوں نے اس بیچ کا راستہ لینے والی زبان کی مثال تو ایک بھی نہ دی۔ جس سے اس جدید ہندوستانی کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ ہاں! ہندو قوم جو زبان چاہتی ہے اس کی مثال میں مسٹر سمپورنانند کی وہ تقریر پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں کی تھی اور جسے مسلمان تو رہے درکنار اکثر ہندو بھی نہ سمجھ سکے تھے۔

یاران وطن کی اردو زبان کے خلاف سرگرمیاں تو اب شاید حشر تک بھی ختم نہ ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ کب تک خاموش رہیں گے۔ اردو کی حمایت اور ترویج کے لئے انجمنوں کا قیام ہے تو ایک نیک فال، لیکن کچھ کام بھی تو ہونا چاہئے۔ اردو زبان کے حامیوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اردو کے خلاف ہر تحریک کو کچلنے کے لئے سینہ سپر رہیں۔ خواہ یہ تحریک جناب گاندھی کی طرف سے ہو یا کسی کانگرسی جماعت کی طرف سے۔ افراد کا جمود قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور آج اردو زبان کے ہوا خواہوں کا یہی جمود اردو زبان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ مصلحتوں کا وقت نہیں بلکہ اب اردو زبان کی لاج اور آبرو کا سوال ہے۔ اور اس لاج اور آبرو کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ عمل کی ضرورت ہے۔ باتوں کا وقت ہو چکا۔ آپ نے اردو کی ترویج کے لئے انجمنیں تو قائم کریں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کی انجمنوں نے عملی کام بھی کچھ کیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

ایم اسلم

مدراس میں اردو (مجلد) اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد (عہ/)

جب آلودہ جلوے تھے شباب انگیز رومان تھا
مری نظروں کی دولت تھی کہ حسن کار یزداں تھا

چمن کا ذرہ ذرہ لے رہا تھا ایک انگڑائی
ترے جلوے کی رعنائی میں گم سارا گلستاں تھا

نگاہ درد پرور کی خلش کیا خاک کم ہوتی
تری رنگینیاں تھیں اور مرا معصوم ایماں تھا

میں ہر قیمت پہ لے سکتا ہوں وہ جاں آفریں لمحے
کہ جب پہلے پہل ل کر کوئی مجھ سے پشیماں تھا

چمن کا پتہ پتہ بن گیا تصویر ناکامی
ترے جانے سے پژمردہ گلستاں کا گلستاں تھا

وہ پہلی چاندنی تھی وہ مرے پہلو میں بیٹھی تھیں
مرے اس چاند سے لیکن فلک کا چاند لرزاں تھا

وہ اپنے حسن سے بڑھ کر مری چاہت پہ نازاں تھیں
مری نظریں اور اپنی کامرانی میں خود بھی حیراں تھا

منوہر کے حسیں سائے لب جو گود میں کوئی
مگر اب یاد کرتا ہوں تو اک خواب پریشاں تھا

کوئی خوابیدہ تھا قیصری مری آغوش رنگیں میں
فلک پر چاندنی تھی یا گلستاں کا گلستاں تھا

قیصری

"ورڈزورتھ اور اس کی شاعری" اردو ادبیات اردو کی اولین کتاب ہے جو آج سے پانچ سال پہلے شائع ہوئی۔ یہ کتاب مولانا سلیمان ندوی کی رائے میں جدید قسم کی بہترین سوانح عمری ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اس کو ۱۹۳۴ء کی بہترین اردو کتاب سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کے ہر شاعر کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور حضرت نیاز فتح پوری کا ارشاد ہے کہ مشرق اور مغرب کی ادبیات کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک خاص چیز ہے۔

اس دوران میں اردو شعر پر ورڈسورتھ کے اثرات ایک حد تک نمایاں ہو گئے۔ موضوع، اسلوب اور زبان کی سادگی کا جو رنگ مغربی شاعری اور خاص طور پر ورڈزورتھ سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے اپنانا شروع کیا تھا اس کے اثرات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

عنقریب ورڈسورتھ اور اس کی شاعری کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ شائع ہونے والا ہے۔ اس میں مکیش صاحب کی بعض نظمیں بھی شامل ہوں گی۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو شعر کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھ کر ورڈسورتھ کی ترجمانی کی گئی ہے

ادب اور ذوق

(ایک مغربی صاحبِ ذوق کی مفید تصنیف کا پہلا باب ترجمے کی صورت میں پیش ہے۔ اس کے پڑھنے سے ادب والوں اور "بے ادبوں" دونوں کے دل پر شاید کچھ اثر ہو)

سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ راستے سے ایک غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اگر عموماً نہیں تو اکثر حضرات ادبی ذوق کو ایک نفیس تحصیل اور اکتساب سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے حاصل کرنے سے وہ اپنے آپ کو مکمل کر لیں گے اور ایک صحیح سوسائٹی کے رکن بننے کے اہل ہو جائیں گے۔ وہ دراصل ادب سے ناواقفیت رکھتے ہیں اور اپنی ناواقفیت سے اس طرح شرمندہ بھی ہیں جس طرح وہ کسی اعلیٰ اور مہذب تقریب میں آدابِ مجلس سے اپنی لاعلمی کی بنا پر محجوب رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح ناقابل اور مشوش پاتے ہیں جس طرح کسی سواری نہ جاننے والے شخص کو یکایک گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے کہا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کے لئے دنیا میں بعض چیزوں کو جاننا یا ان کے متعلق معلومات رکھنا ضروری ہے اور ان میں سے ایک ادب ہے۔ انھوں نے شائستگی کے ساتھ لباس پہننا سیکھ لیا ہے، وہ ہر موقع پر شائستگی اور تہذیب کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کے روزانہ اور ضروری مسائل سے کماحقہ واقف ہیں۔ محنت اور کوشش سے وہ اپنے اوقاتِ فرصت میں کچھ تحصیل و اکتساب بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ امر بھی اُن کے لئے حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب سے واقفیت کو ہر باعزت اور خوددار انسان کا ذاتی سرمایہ اور لازمہ قرار دیں۔ مصوری ضروری نہیں۔ موسیقی ضروری نہیں۔ لیکن ادب سے تعلق رکھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ادب ایک دلفریب ترغیب اور دل بہلائی ہے۔ گویا ادبی ذوق کے دو مقاصد ہوئے۔ ایک صحیح تہذیب کا صداقت نامہ بننا، دوسرے ایک خانگی مشغلہ ثابت ہونا۔ ریاضیات کے ایک نوجوان پروفیسر نے جو ریاضیات اور کھیل کا ماہر، شطرنج میں خطرناک، وایولین بجانے میں مشاق تھا ایک دفعہ کتاب سے متعلق میری گفتگو سن کے کہا "جی ہاں مجھے بھی ادب کی تحصیل کرنی چاہیے"۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میں اسے حاصل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے دوسری چیزوں پر تو چھاپہ مارا ہے، اب ادب کی طرف بھی کچھ توجہ کروں گا۔"

یہ رجحان یا وہ خیال جو اس کے مماثل ہو، سراسر غلط ہے۔ اس شخص کے لئے جو واقعی ادب کو سمجھ سکتا ہے، اور یہ جان سکتا ہے کہ ادب کا مقصد اور عمل کیا ہے، اس قسم کے رجحانات محض مضحکہ خیز ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی ذوق کی تکمیل میں ان سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔ جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک تحصیل و اکتساب سمجھتے، اور ادب کو ایک تفریح اور ترغیب قرار دیتے ہیں، وہ نہ اکتساب میں کامیاب ہوں گے اور نہ اس نیم اکتسابیت سے کوئی تفریح کا کام لے سکیں گے۔ یہ ایک اور بات ہے کہ یہ ترغیب دوسری ترغیبات سے زیادہ مکمل ہے اور یہ تحصیل و اکتساب مہذب انسانیت کی عام دیوانگی کو موثر بنانے میں دوسرے قسم کی تحصیلات سے بہت زیادہ قوی اور دلکش ہے۔ ادب "ایک اضافہ" یا ایک ضروری لاحقہ نہیں بلکہ حیاتِ کامل کی اصل اور روح ہے۔ میں اس موقع پر فصیح و بلیغ اور جذبات انگیز جملے قطعاً استعمال نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی خطبے اور مبالغے سے کام لینا چاہتا ہوں۔ تاہم میں حق بجانب ہوں گا اگر میں کہوں کہ جس انسان کا ادب کی آزادی کا سامنا نہ ہو، وہ درحقیقت اپنے خوابِ غفلت سے جاگا ہی نہیں ہے۔ وہ ابھی پیدا ہی نہیں

جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو جو ادب کے

[illegible] کی اور مستے واقف ہیں اور [illegible] زیادہ اور کوئی امر تکلیف نہیں دے سکتا کہ وہ ہزاروں افراد کو اس ترغیب میں مبتلا دیکھیں کہ وہ زندہ ہیں' حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ زندگی سے صرف اتنا قریب ہیں جتنا موسم سرما میں ایک ریچھ ہوتا ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ادب کیا چیز ہے؟ نہیں' کاش میں ایسا کر سکتا مگر میں نہیں کر سکتا' نہ کوئی اور کر سکتا ہے۔ اس راز پر صرف ہلکی سی روشنی ڈالی جا سکتی ہے' یا کچھ اشارے کئے جا سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں میں بھی صرف اس کی طرف اشارہ کرونگا۔ اس کے لئے میں آپ کو آپ کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف واپس لے جاؤں گا یا مستقبل کی طرف بڑھا دوں گا۔

آپ کو وہ شام یاد ہے جب کہ آپ اپنے ایک بے تکلف اور جانی دوست کے ساتھ تفریح کر رہے تھے۔ آپ کا وہ دوست آپ کا رازدار تھا' آپ اُس سے کوئی بات چھپا نہ سکتے تھے۔ اس شام کو آپ اس سے ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جو آپکے دل و دماغ پر پورا قبضہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو آپ کو اس کی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ آپ پر ایک والہانہ جوش سوار تھا۔ چونکہ آپ کا دوست ہمدرد بھی تھا اور فرزانہ بھی' وہ ایک باعزت خواہش اور ذوق جستجو کے ساتھ آپ کی خوشامد بھی کر رہا تھا اس لئے آپ اس واقعے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ جیسے جیسے زیادہ اعتماد اور رازداری کا جذبہ پیدا ہوتا گیا' آپ اصل واقعہ کے قریب ہوتے گئے' حتیٰ کہ آپ نے ایک تہلکہ آمیز سرگوشی کے ساتھ کہہ ہی دیا "میرے دوست' وہ لڑکی حسن کا معجزہ ہے"! اس لمحے اور ساعت میں آپ ادب کی سلطنت میں موجود تھے۔

مجھے اس کی تشریح کرنے دیجئے۔ یہ سچ ہے کہ لفظ "معجزہ" کے عام مفہوم کے اعتبار سے وہ لڑکی حسن کا معجزہ نہ تھی۔ آپ کے وفادار دوست نے کبھی اسے اتنا حسین نہیں سمجھا اور نہ ان چالیس ہزار نظارہ بازوں نے سمجھا تھا جو اسے دیکھا کرتے تھے۔ وہ صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کے لئے شہر ٹرائے جلایا نہیں گیا تھا۔ ایک لڑکی کو معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر آپ ایک لڑکی کو معجزہ کہیں گے تو دنیا کی ہر معمولی چیز کو بھی اسی نام سے یاد کیا جا سکے گا۔ لیکن ٹھیک ہے' آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنا چاہیے۔ کائنات کے بے انتہا معجزات میں سے آپ کو صرف ایک کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت آپ اپنی ایجاد اور انکشاف سے مسرور تھے اس انکشاف کو دوسرے تک پہنچانے کے لئے آپ میں ایک قدرتی ولولہ موجود تھا۔ آپ کو کسی چیز کے زبردست حسن کا قوی احساس ہو گیا تھا اور آپ اس جذبے کو اپنا بنانے پر مجبور تھے۔ آپ کسی چیز کے متعلق جذبات اور خواہشات سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ سارے بنی نوع انسان سے ہٹ کر اس ایک ہستی کی طرف کھنچ آئے تھے۔ اب آپ اپنے جذبے اور اظہار کا وہ اثر ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے دوست پر ہوا۔ معاملہ تھا کہ لڑکی ایک معجزہ نہیں ہے۔ کوئی اور شخص اسے مجبور کر سکتا تھا کہ اس معجزے پر ایمان لائے۔ لیکن آپ نے اپنے نظارے کی طاقت اور ایمان داری سے اور اپنے دوست کو اپنے نظارے میں شریک کرنے کے جوش اور ولولے سے' بہت دیر تک اس غریب

یہ محسوس کرنے اور سمجھنے پر مجبور کیا کہ لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ اب تک اس کے اعجازِ حسن کی طرف سے آنکھیں بند کیئے ہوئے تھا۔

اس منزل پر آپ ادب پیدا کر رہے تھے۔ آپ زندہ تھے۔ دنیا کے تھوڑے سے حسن اور اعجوبیت کی طرف آپ کی آنکھوں پر پٹی نہیں تھی' آپ کے کان بہرے نہ تھے۔ آپ کے اندر ایک ایسی قوت تھی جو آپ کو اپنے جذبے کے اظہار پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ آپ کے لئے کافی نہ تھا کہ آپ اسے دیکھیں یا سنیں۔ آپ کے لئے ضروری تھا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں اور سنیں۔ دوسروں کو جگانا لازم تھا' اور آپ نے جگایا۔ یہ ممکن ہے ـــ گو مجھے یقین کامل نہیں ہے ـــ کہ دوسرے ہی روز یا دوسرے مہینے آپ کا وفادار دوست کسی اور لڑکی کو دیکھے اور فوراً محسوس کرے کہ وہ بھی معجزۂ حسن ہے۔ یہ ادب کا اثر ہے!

ادب کے بنانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے کائنات کے اعجاز نیرنگ و حیرت کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑے معمار وہ ہیں جن کا مطمح نظر بہت زیادہ وسیع اور جن کا احساس بہت زیادہ شدید ہے۔ آپ کی تیز نگاہی کا ایک ٹکڑا ممکن ہے اتفاقی ہو اور عارضی بھی' لیکن ان کی زندگی ایک طویل نیرنگ' ایک مسلسل حسرت ہے جو ہمیشہ اس امر سے انکار کرتی رہی کہ دنیا ایک اُداس جگہ ہے۔ اگر آپ بھی یہ سمجھنے اور معلوم کرلینے کے قابل ہوں کہ دنیا ایک اُداس جگہ نہیں ہے تو کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی؟ اگر آپ کو بھنواروں اور غاروں سے نکال کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ آپ زندگی کے صحیح لذت اور کیف سے لطف اندوز ہوں' اور آپ کی اس خوبصورت شیروانی کے نیچے ایک سچا دھڑکنے والا دل پیدا ہو تو کیا آپ اسے کوئی بات نہ سمجھیں گے؟ ادب کے معمار آپ کو ان چیزوں کا حریف اور مدِ مقابل بنا دیتے ہیں!

ادبی مطالعے کا مقصد یہ نہیں کہ اوقاتِ فرصت بہلائے جائیں۔ اس کا مقصد اپنے آپ کو جگانا' زندہ کرنا' ہمدردی' مسرت اور فہم و ادراک' اخذ و جذب کی صلاحیتوں کو زیادہ قوی بنانا ہے۔ اس کا منشا صرف ایک گھنٹے کو متاثر کرنا نہیں بلکہ چوبیس گھنٹوں کو متاثر کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات کا رخ اور نوعیت ہی بدل دے۔ ادب کا سمجھنا اور اسے پسند کرنا دنیا کو سمجھنے اور پسند کرنے کے مرادف ہے۔ اس کے سوا اس میں کوئی اور معنی نہیں ہیں۔ اس میں زندگی کے بے جوڑ اور علٰحدہ ٹکڑوں کو جوڑنا نہیں بلکہ پوری زندگی کو ایک مربوط اور جامع نقشے میں دیکھنا ہے ادب کی روح ربط اور اتحاد ہے۔ ادب قندیل اور ستاروں کو ملاتا ہے اور تصور اور عکس کے جادو سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک بڑی چیز کا حسن درحقیقت ایک چھوٹی چیز میں ہے۔ وہ اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ حسن کا انکشاف کیا جائے یا ساری چیزوں کو ایک ہی مرکزِ خیال پر لایا جائے' بلکہ وہ علت و معلول' سبب اور نتیجے کے قانون کا پتہ چلا کر ایک قسم کی اخلاقی فہم و ادراک پیدا کرتا اور اسے ہم پر مسلط کرتا ہے۔ اس کی تشفی اور تسکین دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ایک غیر مشکوک دلکشی کو بے نقاب کرتا ہے' دوسرے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہماری قسمت بھی کائنات کے ساتھ ہے۔ یہ ایک انکشاف کرنے والے شخص کی زبردست پکار ہے جو ہمدردیاں بانٹتی اور ایک ہی اشارے میں ہمدردیاں حاصل بھی کرنا چاہتی ہے۔

کسی شاعر کے دیوانوں کے قدیم نسخے ٹٹولنے' کسی ڈرامہ نگار کے مضمون کے ماخذ معلوم کرنے' یا علم عروض کی تاریخ لکھنے' یا ان

ں انسان تھے اس امر کا

، کا مقصد کیا ہے اور یہ کس کے لئے

ہے اور ادبی ذوق کا مطلب یہ ہے کہ

ہم اس ذریعے کو اپنی اعلیٰ تر زندگی کے لئے کتنی خوبی سے استعمال کر سکتے ہیں؟ جو لوگ زندہ نہیں رہنا چاہتے، جن کو محسوس کرنے سے زیادہ دل بہلائی کی خواہش ہے، وہ براہ کرم ادب کو خیرباد کہہ دیں۔ یہی ان کی عقلمندی ہو گی۔ بقول ایک عمدہ شاعر کے پاکیزہ مصرعے کے "بیٹھے ہوئے سند ہوئے کہ بارہا ایک معمولی جھاڑی کا نظارہ، جو جلال ایزدی سے معمور ہو" شاید ان کو حواس باختہ بنا دے گا:

محمد عبد القیوم خان باقی

دُعا

آپ بھی بے حجاب ہو مجھ کو بھی بے حجاب کر — جامِ مئے حیات کو چشمۂ آفتاب کر

ڈوب رہی ہے نبضِ دل سانس کہیں الٹ نہ جائے — سینۂ آب و خاک کو عرصۂ انقلاب کر

میری دعائے نیم شب اور یہ سوز و تاب و تب — میرے چمن میں جلوہ سلسلۂ سحاب کر

عشق ہے محوِ آب و رنگ عقل ہے محوِ خار و سنگ — حسنِ ازل کا واسطہ حسن کو بے نقاب کر

منزلِ بے خودی میں یہ مرحلۂ خبر کہاں! — حسن جوابِ حسن ہے عشق کو لاجواب کر

تشنہ ہے روحِ زندگی گل ہے چراغِ بندگی — مجھ کو پیامِ تازہ دے مجھ کو عطا کتاب کر

درد ہے رازِ کائنات یہ جو نہیں تو کچھ نہیں — عشرتِ رنگ پر نہ جا درد کا انتخاب کر

میری حیات کا جمال تیرے شباب کا خیال — ہستیٔ ناتمام کو نقش گرِ شباب کر

کاوشِ خستہ دل ہوں میں صنعتِ رنگ و بو ہے تو
غنچۂ ناشگفتہ کو پھول بنا گلاب کر!

کاوش

گُل بُوٹے

کسی کے ہیر اپریل اور مئی کے گرم تقاضوں سے تنگ آکر پور سے ایک جگ کے بعد پچھلی گرمیوں میں بنگلور کے لئے ہم نے رختِ سفر باندھا! اس تقریب میں ہماری بیچاری پانچ سال کی نئی فورڈ "پر بھی آفت آئی وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوئی۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں ہمارا "کاروان" کچھ موٹر میں اور کچھ ریل میں صبح سویرے بنگلور چل پڑا، شہر سے کوئی چونسٹھ میل موٹر میں چلنے کے بعد ہم محبوب نگر پہنچے یہاں ہم سب نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ناشتہ کیا اور چلے اسٹیشن ماسٹر سے ملنے۔ کرنول کے قریب جو ندیاں آڑے آتی ہیں ان کو پار کرنے کے لئے ہم نے چار روز پہلے ہی ریلوے ٹرک اپنی موٹر کے لئے محفوظ کرالیا تھا، اسٹیشن ماسٹر سے مل کر ہم نے اپنی موٹر کو ٹرک میں بٹھادیا، سب کے ٹکٹ کرنول تک کے خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں ٹہلنے لگے

ساڑھے نو بجکر کچھ منٹ پر ٹرین آئی، ہم سب اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہوگئے، اور دھویں کی گاڑی ہمیں اڑاتی ہوئی کرنول چلی، ہمارے ڈبے میں ہمارے سوا دو اور مسافر تھے ایک صاحب اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے کوئی موٹی سی کتاب بہت غور سے پڑھ رہے تھے اور کچھ گنگنا بھی رہے تھے دوسرے صاحب نیچے کی سیٹ پر ٹائمز آف انڈیا دیکھ رہے تھے، ہم اپنی تنہائی کو بری طرح محسوس کر رہے تھے، اتنے میں اوپر والے صاحب دھم سے نیچے کود ے اور "السلام علیکم" کہہ کر ہمارے بازو بیٹھ گئے۔ اب جو ہماری نظر ان کی کتاب پر پڑی تو اس پر سنہری حرفوں میں "دیوانِ حافظ" لکھا دیکھا، اس دیوان کو ان کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی وقعت ہماری نظروں میں بہت بڑھ گئی، ہم نے موصوف سے سوال کیا۔

"کیا حافظ سے آپ کو خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے؟"

فرمایا "جی ہاں! میں ان کے دیوان کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کر رہا ہوں"!!

انگریزی میں دیوان حافظ کا "منظوم" ترجمہ سنکر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور موصوف کی لیاقت کی دھاک ہم پر خوب بیٹھ گئی، ہم یہ چاہتے ہی تھے کہ اس منظوم ترجمے کے سننے کی سعادت ہمیں نصیب ہو کہ اتنے میں موصوف نے ہم سے پوچھا۔

"کیا کوئی غزل کا فی البدیہہ منظوم ترجمہ سناؤں؟"

ہم نے عرض کیا "چشم ما روشن دلِ ما شاد! نیکی اور پوچھ پوچھ!! ضرور ارشاد ہو"!!!

فرمایا "حافظ کی غزل کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں! بہت مشکل کام ہے!! اس کے لئے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے"!

ہم نے کہا "اسمیں کیا شک! پہلے تو ترجمہ کرنا ہی کچھ آسان کام نہیں ہے اور پھر حافظ کا انگریزی میں اور پھر منظوم ترجمہ!! واقعی یہ کارے دارد این...... ..
از تو آید و مرداں چنیں کنند"!!!

مسکرا کر جواب دیا "کوئی پچیس برس کی مشق کے بعد یہ کام مجھ کو اب آسان معلوم ہوتا ہے، پہلے میں نے اردو غزلوں کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کرنا شروع کیا،

[illegible] ارشاد ہوا۔

"دل غمدیدہ حالش بہ شود دل بد مکن
وین سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور"

The condition of this sor-
-row seen heart will be-
-come better, dont make the
heart bad. This noisy
head will come back with
luggage, swallow not sorrow

اس ترجمہ میں "لگیج" کی ہم دل ہی دل میں داد دے رہے تھے
کہ تیسرا شعر ارشاد ہوا۔

"در بیابان گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خار مغیلاں غم مخور"

If you wish to strike foot
in jungle in fondness
for Kaba. If Babool thorns
take you to task swallow
not sorrow

ارشاد ہوا" اس منظوم ترجمہ کو قافیہ سے بے نیاز رکھا گیا ہے
Swallow not Sorrow اس کی ردیف
ہے، قافیہ لگانے کی کوشش کی گئی تھی مگر یہ دیکھکر کہ شعر وزن سے
گر جاتا ہے صرف ردیف ہی پر قناعت کی گئی۔"

غرضکہ موصوف نے پوری غزل کا ترجمہ چند منٹوں میں
اسی طرح "بڑی روانی" سے کر ڈالا اور ہماری رائے پوچھی!
ہم ششدر رہ گئے اور "لسان الغیب" ہماری زبان سے
بے ساختہ بول اٹھے "جزاک اللہ فی الدارین خیرا" سچ تو یہ ہے

پھڑک اٹھے، دیکھئے حافظ مرحوم کی روح کو ایصال ثواب
اور تین قل ہو اللہ پڑھکر بخشتا ہوں اور پھر "شاخ نبات" کی قسم
دیکر کتاب کھولتا ہوں اور جو غزل نکلے اوس کا ترجمہ فی البدیہ
سناتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور بسم اللہ کہکر کتاب کھولی
غزل نکلی۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزان شود روزے گلستان غم مخور

اس شعر کا آپ نے انگریزی میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے وہ
سچ مچ ایک "شاہکار" ہے، ملاحظہ ہو!

The last gousuf will come
back to Kan-an swallow-
not sorrow.

The cottage of sorrow
will become a flower
garden one day swallow not
sorrow

اس "فی البدیہ" ترجمہ کو سن کر ہم نے اپنے پر قابو رکھنے
کی جو کوشش کی تو ہمارے جسم میں کچھ عجیب "ارتعاش" پیدا
ہوا ہم نے اپنے پیٹ کو اچھی طرح پکڑ لیا کہ کہیں جوشِ مسرت سے بل نہ پڑے
معلوم نہیں "کنار آب رکن آباد" گلگشت کرنیوالے حضرت
حافظ کی روح پر کیا گزرتی اگر وہ انگریزی داں ہوتی! ہم نے
پلٹ کر ٹائمز آف انڈیا پڑھنے والے ہمسفر کی طرف جو دیکھا تو
ان کے چہرہ کو اخبار کے ورقوں سے ڈھکا ہوا اور ان کے بھاری بھرکم
جسم کو کچھ عجیب وضع سے ہلتا ہوا پایا۔ اس اثنا میں موصوف

کہ آپ نے انگریزی اور فارسی شاعری دونوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس ترجمہ کا نسخہ انشاء اللہ کسی دن لندن کے عجائب خانہ میں پہنچ جائیگا"!

تو آپ کی رائے ہے کہ اس ترجمہ کی کاپیاں چھپوائی جائیں؟ ہم نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" اس ترجمہ کی تو کم سے کم دس ہزار کاپیاں چھپوا لینی چاہیے"۔

اس وقت ٹائمز آف انڈیا والے ہمارے ساتھی نے اپنا چہرہ اخبار کے ورقوں سے جو باہر نکالا تو ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں کچھ سرخ ہو گئی ہیں اور ان میں پانی کھیل رہا ہے! غالباً وہ اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں ایسا منظوم ترجمہ کرنے کی لیاقت نہیں تھی! یہ معلوم کر کے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ قابل مترجم صاحب بھی گرمیاں گزارنے بنگلور جا رہے ہیں، بنگلور میں آپ نے اور ترجمہ سنانے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنا بنگلور کا پتہ نہیں دیا اور ہم سے وعدہ لیا کہ کسی دن اُن کا ترجمہ سننے ضرور آئیں، چنانچہ بنگلور میں کئی مرتبہ ہم نے ان کا ترجمہ بڑے مزے لیکر سنا۔ انشاء اللہ کبھی ناظرین سب رس کے ملاحظہ میں اس ترجمے کے چند نمونے پیش کرینگے۔

سب رس زندہ صحبت باقی

آج ہم ان دقتوں کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ایک بزرگوار اپنے "آخری" امتحان میں رونق افروز تھے، اُردو کا پرچہ بڑی پھرتی سے لکھ رہے تھے کیونکہ "پدری زبان جو ٹھہری"!!! ایک گھنٹہ پہلے ہی آپ نے پرچے گارڈ کے حوالہ کر دئے اور امتحان کے ہال سے نکل کر ادھر ادھر گلگشت کرنے لگے آخر بڑے انتظار کے بعد ایک ساتھی باہر آئے، دونوں میں پرچہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی، آپ نے کہا۔

آج کا پرچہ بھی کچھ تھا! مجھ کو تو سو میں سو نمبروں کی امید ہے!! ساتھی نے اپنا پرچہ دیکھکر کہا "مجھ کو پچاس نمبروں سے زیادہ کی امید نہیں ہے کیونکہ بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، کہئے آپ نے اس شعر کا مطلب کیا لکھا؟ ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

ارشاد ہوا "تم بھی عجب احمق ہو! ارے اتنے آسان شعر کا مطلب تمھاری سمجھ میں نہ آیا!! سنو! شاعر کہتا ہے، لوگ مضامین کی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں کہ گویا ندی نالوں کو رسّوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں"!!!

ایک صاحب نے اپنی سنہ ۱۹۲۰ء کی بڑی سیڈان "ڈاج" "موٹر کار برائے فروخت ہوتی ہے" کا ایک چھوٹا سا بورڈ سامنے کے آئینہ پر لٹکایا ہے اور موٹر کو صحن میں ایک درخت کے نیچے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو "سکنڈ ہینڈ" کار کی ضرورت تھی، ایک واقف کار کی حیثیت سے ہم ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل کرنے پر مجبور کئے گئے اور چلے موٹر دیکھنے کوئی تین بجے ہونگے کہ ہم دونو دردولت پر پہنچے۔ وہاں ایک "مرد معقول" سے آمنا سامنا ہوا۔ ٹھگنا سا قد، گندمی دھوپ چھاؤں رنگ، چمڑا ہڈیوں پر مڑھا ہوا، گال سے زیادہ کن پٹیاں پچکی ہوئیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں بڑے بڑے کان، پیچدار ناک، چگی ڈاڑھی، موٹا ہفت پیوند پاجامہ، باریک ململ کا نسبتاً اُجلا ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اس پر پرانا چمڑے کا چور بازاری بلٹ، سر پر ایک لچھے دار پرانی جو کسی زمانے میں غالباً سالو کے رنگ کی ہوگی بہت ڈھیلی شاگرد پیشہ کی پگڑی۔ ان حضرت سے معلوم ہوا کہ سرکار خاصہ پر ہیں"!

اتنے میں آواز آئی "کیا ہے مدار صاحب کون ہے؟"

"مدار صاحب" گویا ہوئے "سرکار دو حضرات موٹر دیکھنے بولے ہیں!"

ارشاد ہوا "اچھا دیکھو بولو"!

ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ "مدار صاحب" کے سرکار نہیں بھائی دے رہے ہیں ہمیں سے بول رہے ہیں۔ جب حسب الحکم ہم موٹر کے پاس لائے گئے۔ موٹر کیا تھی جہاز تھا۔ وہ گرمرد [illegible] وقت کی "مدار صاحب" تھی اندر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں۔ ایک گل موچھ، داڑھی ہیٹ زدگوشتہ "سرکار" براجمان ہیں۔ لٹھے کا تہمد اور کرتہ پہنے ہوئے جیب [illegible] بال صفا ہے اور ہاتھوں میں [illegible] کے [illegible] چھلے ہیں۔

اب یہ عقدہ کھلا کہ یہ کارتی "سروش غیب" تھے۔ انہوں نے بالکل سچ کہا تھا کہ "سرکار نماز پڑھ رہے ہیں"۔ موٹر میں ایک تپائی تھی۔ کچھ تپائی پر اور کچھ گدے پر رکابیاں کٹورے رکھے پڑے تھے۔ باریک چاول ابلے ہوئے، شتقاب، خمیری روٹیوں کا [illegible] تلا ہوا مچھلی، مسالہ دار قتلے، بھنا ہوا گوشت، دو چار لال مرچ کے سالن، بالائی، شکر۔ یہ تھا وہ "لیٹ لنچ" جو سرکار اڑا رہے تھے اور خوب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ قریب میں پاندان تھا، جس کی ڈبیہ تھی، ہاتھ کا میلا رومال تھا اور کچھ ہٹ کر ایک پست قد، جسیم، آتش بسر نیچوان [illegible] کی جنبش لب پر بولنے تیار کھڑا تھا۔

جوں ہی سرکار نے ہمیں دیکھا ارشاد ہوا "سلام و علیکم" اور اس طرح کہ "و علیکم" "کا" "کم" باہر نہ نکل سکا، اس وجہ سے کہ سرکار کے "لقمہ" نے اس کو بیچ میں دھر لیا

سلام عرض کرتے ہوئے موٹر کو چلا کر دیکھنے کی [illegible] قدر گڑگڑاتے ہوئے فرمایا "کیا میری موٹر چلتی نہیں سمجھ رہے ہیں؟ ذرا ٹھہرو! ڈرائیور ابھی گر گیا ہے آتے ہی چلا کر بتاتا ہوں!"

اس "ذرا ٹھہرو" کی تکلیف ہمارے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے ہم نے لب چباتے ہوئے عرض کیا "اجازت ہو تو ہم خود چلا کر دیکھ لیتے ہیں"

بھڑکتے ہوئے فرمایا "نہیں جی او [illegible] ہاتھ پڑا ہی چلتی ہے"

یہ سن کر ہم لاجواب ہو گئے اور اس ملاقات کو جلد ختم کرنے کی نیت سے کھسیانے ہوتے ہوئے قیمت دریافت کی۔

ارشاد ہوا "بیچوں گا تو نہیں ہاں کیا قیمت کہ بیچوں گا سوا [illegible] نہیں بول سکتا"

ہم نے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہوئے آداب عرض کیا اور لوٹنے لگے۔ "مدار صاحب" چند قدم ہمارے ساتھ آئے اور احتیاطاً ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"بڑی بیگم صاحب کی کنڈی کروائیں۔ ابی گرم ہیں۔ پھر کو آؤ!"

"باغبان"

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ۱۱۰ صفحات قیمت [illegible]، غزنین کی فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ۔

سلطان محمود کی ادبی سرپرستیاں اور اس کے دربار کے شعراء کے حالات اور کلام پر تبصرہ فارسی زبان پر ان شعراء کی کاوشوں کا اثر وغیرہ



جون آف آرک کی زندگی کے چار دور

جون آف آرک

(فرانس کی اس مشہور دوشیزہ کے حالات زندگی پر ادارہ کی طرف سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جا رہی ہے جس کے تعارف کے طور پر یہ مضمون درج ہے۔)

مشرق اپنی مردہ پرستی کی وجہ سے بدنام ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ بہت کم خوش نصیب صاحب کمال ایسے گذرے ہیں جن کی قدر ان کی زندگی میں کی گئی۔ لیکن یہ کمزوری صرف ایشیائی ممالک تک محدود نہیں۔ یورپ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں گو ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں فرانس کی ایک باعصمت دوشیزہ کی کہانی لکھی جاتی ہے جو بقول "راسکوپ تھیبیر" اپنی زندگی میں ایک بدکار بعملی روح اور انسانیت کے لئے باعث ننگ سمجھی جاتی تھی لیکن مرنے کے بعد صاحب کشف و کمال اور مقدس ہستی سمجھی گئی اور اس کی پوجا کی جانے لگی۔

آج سے تقریباً پانسو سال پہلے متعدد لڑائیوں کے بعد فرانس پر انگلستان کی سیادت قائم ہوگئی۔ تخت کا جائز وارث فرار ہو کر پائیٹیر یہ چلا گیا اور اس کی ماں نے سفارش کر کے تخت و تاج انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

فرانس کی ابتری اور بربادی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن ایک گڈریے کی لڑکی نے جس کا نام جون تھا چند ہی سال میں فرانس کو پھر آزادی دلا دی۔

فاتح اعظم نپولین کے وطن کی خاک سے یوں تو بہت سی بڑی ہستیاں اٹھیں اور فرانسیسی بلانویس افسانہ نگاروں نے بہتیرے مکمل اور نصب العینی تخیلی کردار پیدا کئے۔ لیکن کوئی تاریخی یا افسانوی شخصیت جون کی بلندی پر نہیں پہنچ سکی۔

جون آف آرک کے واقعات شروع سے آخر تک کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ آج مادیت کے چرچے کی وجہ سے بہت کم لوگ ان پر یقین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون آف آرک ایک روز اپنے گاؤں میں گلہ بانی کر رہی تھی کہ ایک غیبی آواز اس کے کان تک پہنچی جو یہ تھی "جا، فرانس کو آزاد کر اور روئن میں شہزادہ ڈافن کو تاج پہنا"

اس آسمانی حکم کے سنتے ہی یہ لڑکی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور اس کو سارا واقعہ سنایا۔ باپ نے مسکرا کر کہا "پاگل ہو گئی ہے"۔ وہ خاموش ہو گئی۔ لیکن خدائی آواز روزانہ سوتے جاگتے اس کے کانوں میں پڑتی رہی یہاں تک کہ لوگ مذاق اڑاتے اور اسے پاگل بناتے ہی رہے لیکن وہ ایک درباری رئیس کے توسط سے ڈافن تک پہنچ گئی۔ ڈافن کو جون آف آرک کے دعوؤں کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے پہلا امتحان اس طرح لیا کہ اپنی جگہ ایک اور شخص کو بٹھا کر خود درباریوں میں جا بیٹھا۔ لیکن شہزادہ اور اہل دربار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جون جس نے کبھی شہزادے کو نہیں دیکھا تھا سیدھا اسی کے پاس پہنچ گئی اور اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ اور بھی آزمائشیں ہوئیں جس کے بعد فوج کی کمان جون کے حوالے کی گئی۔

جون نے چاند سلطانہ کی طرح مردانہ اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ ہتھیار لگائے اور شہزادے کے دئیے ہوئے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نکلی۔ دشمنوں سے جہاں جہاں مقابلہ ہوا اس نے انہیں شکست دی۔ ایک لڑائی میں تیر سے زخمی

جنوری ۱۹۴۰ء

ب بڑھاتی رہی۔ دوست

لے جاری رہے اور کامیابیاں

خدائی احکام کی تعمیل کے یہ اہم مدارج طے ہو چلے۔ اب صرف حق تسلیم باقی تھی۔ جون نے شہزادے سے کہا کہ وہ "روین" چل کر تاج و تخت سنبھالے لیکن شہزادہ ڈرا ہوا تھا۔ بقول شخصے اس کا باپ پاگل اور ماں دغاباز تھی۔ جون کے بارے میں دنیا بھر کے شبہات اس کے دل میں تھے۔

بالآخر شہزادہ راضی ہوگیا اور اس کو ساتھ لے کر جون آف آرک "روین" پہونچی۔ تاج ڈافن کے سر پر رکھا اور یہ کہہ کر کہ آسمانی احکام کے مطابق اس کے فرائض پورے ہو چکے ہیں، اپنے گاؤں کو واپس جانے کی اجازت چاہی۔ کاش اس کی اجازت جون کو مل جاتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈافن نے جون کے عزیزوں کو جاگیر اور منصب سے سرفراز اور جون کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔

جون کے بارے میں لوگوں کے شبہات بڑھتے گئے انھوں نے علی الاعلان کہنا شروع کیا کہ جون ساحرہ ہے اور اس نے سفلی ارواح کی مدد سے فوق الانسان مہمیں سر کی ہیں۔ صداقت کے آفتاب پر کذب اور افترا کے کالے کالے بادل چھانے لگے یہاں تک کہ تاریکی پھیل گئی۔ علما اور رہادیان مذہب نے بھی عوام کی ہاں میں ہاں ملائی یہاں تک کہ فرانس نے —— جون کے وطن نے ... اس سرزمین نے جس کے لئے جون نے اپنی جان کو خطرات میں ڈال دیا تھا اور جس کی محبت کا خون جون کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا —— اپنے اس محسن کو سولہ ہزار پاؤنڈ قیمت لے کر انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

جون کی زندگی کے ڈرامے کا تیسرا ایکٹ سنگین حزنیوں سے بھی کہیں زیادہ دردناک ہے کہا جاتا ہے کہ عدالت اندھی ہوتی ہے اس قول کا اطلاق سب سے زیادہ اس عدالت پر ہوتا ہے جس میں جون پر مقدمہ چلایا گیا۔ بڑے بڑے ماہرین قانون اور انسان دشمنوں نے قسم قسم کے سوالات کر کے اور جرح کے ذریعہ جون کو پھانسنا چاہا لیکن حقیقت ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔ توہم پرست اور کمزور اعتقاد کے لوگوں نے اس کو سحر سامری سمجھا۔ آخر کار خود عدالت کے منشی کا بیان ہے کہ جون کے بیانات میں جرمانہ تحریف کی گئی۔ دنیا کی اس عظیم الشان ہستی کے لیے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

بڑے آدمیوں کی موت بھی بڑی ہی ہوتی ہے جون کو سولی نہیں دی گئی۔ اسے زہر نہیں کھلایا گیا۔ اس کا سر نہیں کاٹا۔ اس لئے کہ جو گناہ فرانس کو آزاد کر کے اس نے کئے تھے ان کی سزا دینے کے لئے یہ سارے عام طریقے غیر مناسب سمجھے گئے۔

شہر روئین کے ایک پبلک مقام پر جون کے لئے چتا تیار ہوئی۔ اور آن کی آن میں فرانس کی یہ موہنی مورت بھڑکتے ہوئے شعلوں میں چھپ گئی۔ ہزاروں آدمی کھڑے دیکھ رہے تھے اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے

شعلے بیٹھ گئے اور آگ راکھ بن کر چاروں طرف اڑنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی گھر لوٹے کہ ایک بدکار کاہنہ کا خاتمہ ہوگیا۔

لیکن یہ لوگ غلطی پر تھے۔ ان شعلوں نے جون کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کی عظمت اور تقدس میں ہمیشہ کے لئے چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت کے چہرے سے کذب و افترا اور توہمات کے پردے جلد جلد اٹھنے لگے اور جون کی عظمت کی کرنیں سارے فرانس میں پھیلنے لگیں۔ جون آف آرک سینٹ جون کہلانے لگی۔ فرانسیسی اس کے نام پر جان دیتے ہیں۔ جون آف آرک فرانس کے غیر فانی ادیبوں، مصوروں اور مورت سازوں کا موضوع بن گئی۔ آج بھی پیرس کی شاہراہ پر جون آف آرک کا مجسمہ فرانسیسیوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزادی پانی اور ہوا کی طرح تمام قوموں کا فطری حق ہے۔

میر حسن

اردو

اے جمال پیکر ہندوستان — تیرا عالم میں رہے اونچا نشاں

اے کہ پالا ہے بزرگوں نے تجھے — آفتیں سہہ کر اٹھا کر سختیاں

مر گئے پر تجھ کو زندہ کر گئے! — داستاں تیری ہے کتنی خونچکاں

پھر یہ کیسے ہم سے دیکھا جائیگا — کوندتی ہوں تیرے سر پر بجلیاں

لوح ہستی سے مٹانے کی تری — دشمنوں میں ہوتی ہیں سرگوشیاں

کوئی یہ پیغام پہنچا دے انہیں — کوششیں بے سود محنت رائیگاں

تجھ کو حاصل ہوگئی اقبال سے — سربلندی اور عمر جاوداں

تو نہ ڈر مطلق کہ حق ہے تیرے ساتھ — ہیں ترے فرزند بھی لاکھوں جواں

جن کا دل سیماب جن میں جوش ہے — بازوؤں میں زور جیسے پہلواں

اختروں کی طرح تابندہ تمام! — جن سے روشن ہیں زمین و آسماں

آنچ آئے تجھ پہ یہ ممکن نہیں — تیرے دم کے ساتھ ہے ہم سب کی جاں

شور عابدی (گلبرگہ)

کی جدید اردو مطبوعات کی فن وار فہرست ہر مہینہ رسالہ "سب رس" میں درج ہوا کرے۔ ماہ جنوری ۱۹۳۹ء سے اس فہرست کی اشاعت پابندی سے ہو رہی ہے "سب رس" کی صرف دو تین اشاعتوں میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ فہرست درج نہ ہو سکی۔

اس فہرست کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین سب رس کو مختلف مضامین کی مطبوعات میں سے اپنے ذوق کی کتابیں انتخاب کرنے کا پہلا موقع ملے۔ اس کے علاوہ مصنفین، مؤلفین اور ناشرین کو بھی اس فہرست کی اشاعت سے استفادہ کا موقع ملتا ہے، وہ اس طرح کہ ان کی تصنیف تالیف اور مطبوعات کی نشر و اشاعت ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں جہاں "سب رس" کی رسائی ہوتی ہے بلا کسی معاوضہ کے ہوا کرتی ہے۔

زیر نظر فہرست میں کوشش کی گئی ہے کہ آخر ستمبر ۱۹۳۹ء تک کی جملہ اردو کتابوں کی تعداد فن وار درج ہو، چونکہ آخر سہ ماہی ۱۹۳۹ء کی مطبوعات کی فہرست اس وجہ سے لکھی نہ جا سکی کہ اس نمبر کی کتابت ماہ نومبر ہی میں شروع کر دی گئی۔ اس لئے آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات بھی اس فہرست میں شریک کر لی گئی ہیں تاکہ پورے ایک سال کے اعداد و شمار سے ناظرین کو واقفیت ہو۔ اس فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں، مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

... ۱۹۳۹ء تک
شاعری، فلسفہ، تاریخ، ادب، مذہب، اخلاقیات، ریاضیات، نفسیات، نسوانی ادب و خانہ داری وغیرہ وغیرہ پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے

سوانح ۴۳، افسانہ ۱۰۲، ڈراما ۱۵، شاعری ۱۲۶، فلسفہ ۳، تاریخ ۱۶، ادب ۱۹۰، طب ۴۸، سیاسیات ۲۵، قانون ۴۲، مذہب ۱۵۷، اخلاقیات ۴، ریاضیات ۶۹، سفرنامہ ۳، نفسیات ۴، نسوانی ادب و خانہ داری ۲۵، لغات ۴، صنعت و حرفت ۴، معاشیات ۲، تعلیم ۲، متفرق ۹۳،

اس طرح ایک سال میں جملہ ۱۰۶۷ اردو کی کتابیں شائع ہوئیں۔ ادب، مذہب اور شاعری پر سب سے زیادہ کتابیں طبع ہوئیں ان کے بعد افسانہ تاریخ اور سوانح کا نمبر رہا۔ ریاضیات پر بھی کافی کتابیں نکلیں۔ ان نسبتوں سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تفصیل فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سوانح

(۱) حیات عثمانی (سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہ ہفتم کے حالات) از شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ۴۰۰ صفحات قیمت ۵؎

(۲) ہٹلر اعظم (ہر ہٹلر کی سوانح عمری) از پروفیسر چندر شیکھر شاستری ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد ۳؎

(۳) اشرف السوانح (اشرف علی صاحب تھانوی کی سوانح عمری) ۲۹۸ صفحات ۔

(۴) تذکرہ وقار (نواب وقار الملک مرحوم کی سوانح) ۳۸۸ صفحات قیمت عالہ

(۵) محمد علی جناح (جناح کے حالات) از عبدالعزیز صاحب (۲۵۶) صفحات۔

(۶) سخنوران دکن (عہد عثمانی کے شعرا کا تذکرہ) از سید تسکین صاحب عابدی ۴۸۴ صفحات قیمت سے

(۷) اتاترک۔ باتصویر (مصطفےٰ کمال مرحوم کی سوانحعمری) از محمد مرزا صاحب آزاد ۲۷۰ صفحات قیمت عالہ

(۸) روح غالب۔ باتصویر (غالب کی سوانحعمری) از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور ۲۴۰ صفحات قیمت عالہ

(۹) مشاہیر ہند (چند مشہور لوگوں کے حالات) از سید بادشاہ حسین صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت عہ

(۱۰) حیات و کلیات اسمٰعیل باتصویر (محمد اسمٰعیل صاحب کی سوانح عمری مع مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب سیفی ۶۷۰ صفحات قیمت للعہ

(۱۱) سرسید (سوانحعمری) مرتبہ انصار الحق صاحب ۴۶ صفحات قیمت ۵/

(۱۲) عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول و دوم باتصویر (مشہور سیاسی رہنماؤں کے حالات) ۲۵۶ صفحات قیمت عع

(۱۳) سیرت سید احمد شہید (سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح عمری) از سید ابوالحسن علی صاحب ۴۶۴ صفحات قیمت عالہ

(۱۴) آب حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کے حالات) از آغا محمد اشرف صاحب ۱۴۴ صفحات قیمت عہ ۴/

(۱۵) رحمۃ للعلمین جلد اول (آنحضرت کے حالات) از قاضی محمد سلیمان صاحب۔ ۴۶۴ صفحات قیمت عالہ

(۱۶) مشاہیر پولیس (پنجاب پولیس کے چند افسروں کے کارنامے) از مرزا فرید الدین بیگ صاحب ۳۹۱ صفحات

(۱۷) رئیس قادیان حصہ اول (مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے حالات) ۲۱۴ صفحات

(۱۸) شہید مکسوینی (آئرش محب وطن کی سوانحعمری) ۲۴۱ صفحات

(۱۹) سیرت اقبال از محمد طاہر صاحب فاروقی ۳۴۹ صفحات قیمت سے

(۲۰) حیات اقبال (مرتبہ تاج کمپنی لاہور) ۱۵۲ صفحات قیمت عہ

(۲۱) میری جد و جہد (ہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ) ۲۶۵ صفحات قیمت عالہ

(۲۲) حضرت امام حسینؓ کی مختصر سوانح عمری) از ظفر حسن صاحب ۲۳۲ صفحات

(۲۳) کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی کتاب کا ترجمہ) ۸۸ صفحات قیمت عالہ

(۲۴) واقعات اظفری (مترجمہ محمد حسین صاحب محوی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔ قیمت عالہ

(۲۵) رسول پاک (از عبدالواحد صاحب سندھی) ۱۲۵ صفحات قیمت ۸/

(۲۶) میری کہانی میری زبانی (سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم بیرسٹر کی خود نوشت سوانح) مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ ۲۲۸ صفحات قیمت سے

(۲۷) شاہ نعمت اللہ ولی از یم۔ اے حنیف ۸۰ صفحات - ۱۴/

(۲۸) خود نوشت سرگزشت (مسولینی کے حالات) ۲۸۶ صفحات قیمت عہ ۱۲/

(۲۹) تذکرہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (از مولوی فضل اللہ صاحب) ۲۴۰ صفحات۔ قیمت عالہ

(۳۰) محمد علی جناح (از احسان اللہ صاحب کرمانی) ۲۸۰ صفحات قیمت ۱۰/

(۳۳) شعراے پنجاب (پنجاب کے موجودہ شعرا کے حالات معہ نمونہ کلام) مرتبہ ملک محمد باقر صاحب رضوانی ۳۰۶ صفحات قیمت عہ

(۳۴) ہلال و صلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح) از ایم اسلم صاحب ۲۰۵ صفحات قیمت عا

(۳۵) گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید ابن حسن صاحب شارق ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲

(۳۶) مشاہیر عالم (سولہ مشاہیر کے حالات) از کے سی حمید بیرسٹر ۲۴۲ صفحات قیمت عہ

(۳۷) وداع راشد (حیات راشد کا آخری باب) رزاق الخیری ۹۰ صفحات قیمت ۸

افسانے

۱۔ محبت کا فسانہ (از لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی۔ ۳۴۴ صفحات قیمت عا

۲ ۔ ربیعہ (از خالد ادیب خانم مترجمہ عبدالرسیم صاحب شبلی ۲۴۴ صفحات قیمت عہ۔

۳۔ پس پردہ (سات مختصر افسانے) از چندر بھوشن سنگھ صاحب۔ ۱۲۸ صفحات قیمت عہ

۴۔ گئودان (ناول) از منشی پریم چند صاحب ۶۵۰ صفحات قیمت عا۔ مکتبہ جامعہ ۔ دہلی۔

۵۔ میری کہانی! سنئے گا؟ از سید علی صاحب شاکر ۱۲۵ صفحات قیمت عہ

...بلیپ صاحب

...د صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۸۔ لالہ رخ باتصویر۔ جدید ایڈیشن مترجمہ لطیف الدین احمد صاحب۔ قیمت مجلد عا

۹۔ ساز ہستی (افسانہ) از عبدالاحد صاحب فرودن ۱۹۰ صفحات

۱۰۔ خدائی راج اور دوسرے افسانے۔ از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عہ

۱۱۔ افسانۂ بابل از سردار محمد اقبال صاحب سیف ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۲

۱۲۔ شب غم از میاں ایم۔ اسلم صاحب قیمت عہ

۱۳۔ پریت افسانے حصہ دوم از گوربخش سنگھ صاحب ۲۵۵ صفحات۔

۱۴۔ ہاشمی دوشیزہ حصہ اول و دوم (عہد عباسی کا تاریخی ناول) از محمد صادق حسین صاحب ۴۰۸ صفحات

۱۵۔ خودکشی کی انجمن (اسٹونس کے ناول سوئی سائڈ کلب کا ترجمہ) از عبدالمجید خاں سالک ۲۰۴ صفحات

۱۶۔ زندگی کے کھیل (مختصر افسانے) از لطیف الدین احمد صاحب ۱۶۰ صفحات قیمت عہ

۱۷۔ تسخیر استنبول (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۲۵۶ صفحات۔

۱۸۔ جنت اور جہنم (ناول) از کرشن چندر صاحب قیمت عا

۱۹۔ باسی پھول۔ (افسانے) از سید علی عباس صاحب حسینی ۳۰۰ صفحات۔ قیمت عہ

۲۰۔ طلسم خیال۔ (افسانے) از کرشن چند صاحب ۲۵۰

صفحات قیمت ۸/

۲۱۔ قطرات شبنم (افسانے اور ادبی مضامین) از لالہ گوردھن داس صاحب ۱۴۰ صفحات قیمت ۸/

۲۲۔ خون ملت (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۲۷۶ صفحات قیمت ۸/

۲۳۔ بیسویں صدی کی سیاہکاریاں (عبرت خیز افسانے) از ایس۔ ایس منور صاحب ۱۰۲ صفحات قیمت عه

۲۴۔ سعی ناکام اور دیگر افسانے از امتہ الرفیق صاحبہ ۱۲۰ صفحات

۲۵۔ منزل۔ از علی سردار صاحب جعفری قیمت ۱۲/

۲۶۔ انوکھے افسانے (جاسوسی افسانے) از شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی ۲۰۰ صفحات

۲۷۔ کاشانہ نادر (ناول) از عطاء الرحمن صاحب عطا ۲۴۸ صفحات قیمت ۸/

۲۸۔ اندھی دنیا۔ (کہانیاں) از اختر انصاری صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت عه

۲۹۔ لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۲ صفحات قیمت عه

۳۰۔ خواب فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عه

۳۱۔ ماہ درخشاں (ناول) از بیگم مرزا احمد علی صاحب ۵۵۰ صفحات قیمت مجلد عا/

۳۲۔ قاتل (مختصر افسانے) از میاں محمد اسلم صاحب ۲۵۶ صفحات

۳۳۔ طلسم حیات (کہانیاں) از منظور حسین صاحب ماہر القادری ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد عا/

۳۴۔ جواہرات (اخلاقی افسانے) از چودھری افضل حق صاحب ۲۲۴ صفحات

۳۵۔ پری اور دیگر افسانے) از راحت آرا بیگم صاحبہ ۱۲۸ صفحات

۳۶۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ (اخلاقی افسانے) از سید عباس علی صاحب حسینی قیمت عہ/

۳۷۔ وفا کا پتلا ("دی ریڈن آف آرسین لوپن" کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۲۷۲ صفحات قیمت عا/

۳۸۔ خاموش حسن (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) ۲۳۲ صفحات قیمت ۸/

۳۹۔ فریبی ڈاکو (جاسوسی ناول) از راجہ رام صاحب ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲/

۴۰۔ لعل مقدس (دی اکیوزڈ پرنسس کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۲۳۲ صفحات قیمت عا/

۴۱۔ سونے کی دنیا (جدید طرز کے افسانے) از رشید صاحب قریشی ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد عه

۴۲۔ بحری طوفان (ناول) از نعیم اللہ صاحب کوثر ۴۰۰ صفحات

۴۳۔ مسلمان مجاہد (ناول) از خواجہ نذیر احمد صاحب ۸۰ صفحات

۴۴۔ معیار محبت اور دیگر افسانے (از سیاح سنائی صاحب جزو ۲۷۰ صفحات قیمت عه

۴۵۔ سحر فرانس (مولیبان کے افسانوں کا ترجمہ) از طاہر قریشی صاحب ۲۲۵ صفحات قیمت ۸/

۴۶۔ انمول کہانیاں (بارہ انقلابی افسانے) از شوکت عثمانی صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲/

۴۷۔ کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے مضامین) از سید بانجہازی صاحب ۱۷۶ صفحات قیمت عه

۴۸۔ ایک کہانی۔ چہاردیسوں کی زبانی) از نیاز۔ ل۔ احمد علی عباس وغیرہ

۵۰ - محبت کی چھاؤں (افسانے) از مرزا اعجاز حسن بی۔ ا
۱۳۲ صفحات قیمت عہ
۵۱ - ڈاچی (افسانے) از اپندر ناتھ اشک ۲۰۸ صفحات
قیمت عمہ
۵۲ - صدائے جرس (افسانے) از والدہ سراج الدین ظفر
۳۰۰ صفحات قیمت عہ
۵۳ - افسانۂ پدمنی (از رانی پدمنی کے فسانہ کی مورخانہ
تحقیق) از احتشام الدین ایم۔ اے ۱۵۰ صفحات قیمت عمہ

ڈرامے

۱ - ریڈیو ڈرامے (۸ ڈراموں کا مجموعہ از فضل حق صاحب
قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عمہ
۲ - انارکلی (تیسرا ایڈیشن) از سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے
۱۹۸ صفحات قیمت عہ
۳ - تسلیم (ایک ڈراما) از سید مظہر علی صاحب گیلانی ۱۹۸ صفحات
قیمت ۶ر
۴ - پہلا شراب کار (ٹالسٹائی کے ڈرامہ کا ترجمہ) از محمد
یونس صاحب سلیم ۴۰ صفحات قیمت ۴ر
۵ - بے انصافی کا انصاف (عدالتوں کی بے انصافیاں)
از پنڈت دیودت صاحب شرما ۳۱۰ صفحات قیمت عمہ

شاعری

۱ - باغی (باغیانہ نظمیں) از جاذ قریشی صاحب ۱۲۵ صفحات قیمت عمہ

...از سید ابوالفتح
...رف ۱۲۰ صفحات قیمت عمہ
...ہرلال صاحب ضیا فتح آبادی۔

۴ - نیرنگ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از پنڈت
اندرجیت صاحب شرما ۲۱۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۵ - افکار سلیم (وحید الدین صاحب سلیم کی نظمیں) مرتبہ محمد
اسمٰعیل صاحب پانی پتی ۳۱۸ صفحات قیمت عا
۶ - دیوان بیدار (میر محمدی صاحب بیدار کا مجموعۂ کلام) مرتبہ
محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی قیمت عہ
۷ - جنون و حکمت (رباعیات کا مجموعہ) از جناب جوش ملیح آبادی
قیمت ۓ
۸ - آہنگ (نظمیں) از اسرار الحق صاحب مجاز ۱۰۴ صفحات
قیمت عمہ
۹ - الخیام (عمر خیام کی رباعیوں کا اردو ترجمہ) از رائے
گورسرن لال صاحب آزاد قیمت ۱۲ر
۱۰ - میخانۂ الہام (مجموعہ کلام) از جناب شاد عظیم آبادی قیمت ۸ر
۱۱ - ارمغان حجاز (علامہ اقبال کا آخری کلام) قیمت ۸ر
۱۲ - نغمۂ حرم (نظمیں) از اختر صاحب شیرانی قیمت ۱۲ر
۱۳ - آہ کے سو شعر از ڈاکٹر سید محمد صفدر صاحب آہ قیمت ۸ر
۱۴ - ترجمان الغیب (حافظ کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ) از
محمد احتشام الدین ایم اے ۳۲۲ صفحات قیمت ۱۲ر
۱۵ - آہنگ رزم (رزمیہ نظمیں) از جناب قمر انبالوی ۴۸ صفحات
قیمت ۸ر
۱۶ - تصویر کشمیر (نظمیں) از جناب حفیظ جالندھری۔ قیمت ۸ر
۱۷ - خمخانۂ ازل (نعتیہ کلام) از محمد یونس صاحب خلیل ۷۰ صفحات قیمت عمہ

۱۸ - نغمۂ نور (غزلیں اور نظمیں) از جناب بہزاد لکھنوی .. ۲ صفحات
قیمت عـہ
۱۹ - بادۂ فطرت (مجموعۂ کلام) از میر زیدی صاحب ۲۸۸
صفحات قیمت ۱۲ر
۲۰ - حدیثِ حسن (نظمیں) از تمیم احمد صاحب فطرت قیمت عـہ
۲۱ - اربعہ عناصر (رباعیات) از حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر
۲۰۸ صفحات قیمت عـہ
۲۲ - حرف و حکایات (نظمیں) از جناب جوش ملیح آبادی
۲۴۸ صفحات قیمت عہ
۲۳ - تجلی نور (مرثیوں کا مجموعہ) از جناب نور لدھیانوی
۱۰۴ صفحات
۲۴ - دیوانِ ثاقب (از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی
۵۵۰ صفحات قیمت عاں
۲۵ - تصویر احساس (مجموعہ کلام) از الطاف مشہدی صاحب
قیمت عاں
۲۶ - ارمغان جذب حصہ دوم (رباعیات) از ڈاکٹر گوندرا صاحب
جذب ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۲۷ - کلیات بحری (قدیم دکھنی شاعر) مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب
۲۱۳ صفحات قیمت سے
۲۸ - ریاضِ حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس صاحب
رضوی ۲۰۰ صفحات
۲۹ - نغمۂ نانک (مجموعہ کلام) از نانک چند صاحب نانک
لکھنوی ۲۵۲ صفحات
۳۰ - تمثیلی مشاعرہ (مشہور قدیم شعراء کا کلام ڈرامائی طرز میں)
از پنڈت کیفی صاحب ۱۰۰ صفحات قیمت عـہ
۳۱ - سرودِ جاوید (مثنوی سحر البیان پر تبصرہ) از شمس الحسن صاحب
شمس ۲۰۴ صفحات
۳۲ - جوہر تخلیق (شاہنامہ کی ایک جنگ کا منظوم ترجمہ) از سید
محمد علی صاحب ختم ۸۰ صفحات قیمت ۸ر
۳۳ - شہنشاہ نامۂ اسلام (آنحضرتؐ اور خلفاء کے غزوات)
۲۱۵ صفحات
۳۴ - تنقیدی مضامین (شعراء کے کلام پر تنقید) از ایم ایم
ہاشمی صاحب و فیاض حسین صاحب زیدی -
۳۵ - سنہری بانسری (مجموعہ کلام) از سید انور حسین صاحب آرزو
۲۰۰ صفحات قیمت عاں
۳۶ - چراغاں (مجموعہ کلام) از جناب احسان دانش ۲۳۲
صفحات قیمت عہ
۳۷ - آتش خاموش (مجموعہ کلام) " ۲۰۰ صفحات قیمت عـہ
۳۸ - نفیر فطرت " " " ۲۰۰ صفحات قیمت عـہ
۳۹ - جادۂ نو (قطعات) " " قیمت ۸ر
۴۰ - نوائے کارگر (مجموعہ کلام) " " ۳۶۸ صفحات قیمت عاں
۴۱ - تفصیل غالب (دیوانِ غالب کی شرح) از جناب احسان
دانش قیمت عـہ
۴۲ - خضر عروض (علم عروض کی الجھنوں کا حل) از جناب احسان
دانش قیمت ۸ر
۴۳ - فرحت دل (منتخب اشعار) از خان بہادر عبداللہ خاں
۱۷۲ صفحات قیمت عہ
۴۴ - معارف جمیل (مجموعہ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶
صفحات قیمت عہ
۴۵ - گل نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم
قیمت عاں
۴۶ - جذبات بسمل با تصویر (مجموعہ کلام) از منشی سکھ دیو پرشاد

۴۸ - ...
معین الدین قریشی و عبدالقیوم خاں باقی ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲؍
۴۹ - عرفانیات فانی (کلیات) از شوکت علی خاں فانی قیمت ۲؍
۵۰ - خونناب دل (مجموعہ کلام) از شعیب احمد ندرت سیدھی
قیمت ۱۰؍
۵۱ - خمخانہ (مجموعہ کلام) از گوبرسن بی آزاد ۲۱۶ صفحات قیمت ۲؍
۵۲ - متاع اقبال (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ابوطہ عبدالواحد
قیمت ۱۲؍
۵۳ - قلقلہ (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از حاجی لق لق قیمت ۱۲؍
۵۴ - برق و باراں (انقلابی نظمیں) از تمیم کرمانی قیمت ۱۲؍
۵۵ - کائنات دل (نظمیں) از منور لکھنوی ۲۵۰ صفحات
۵۶ - اقبال اور اس کا پیغام (شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر
تصدق حسین خالد قیمت ۸؍
۵۷ - یاد حکمت (حکمت اور ان کی شاعری پر مضامین) از پنڈت
انند نرائن ملا ۱۷۰ صفحات

فلسفہ

(۱) فہم انسانی (ہیوم کی مشہور کتاب کا ترجمہ) ۴۹۴ صفحات
۲ - خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ)
از عبدالمالک صاحب ۱۹۰ صفحات قیمت ۱۲؍
۳ - فلسفۂ حسن از رستم صاحب ۱۹۲ صفحات
۴ - حیات کیا ہے (حیات کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر
تبصرہ) قیمت ۱۲؍

ح

... کی تاریخ از سید حسن صاحب برنی
۴۵۱ صفحات
۲ - تاریخ مدینہ منورہ از غلام دستگیر صاحب نامی ۱۴۸ صفحات
۳ - بوہیں (فرقہ اسماعیلیہ کی تاریخی حالات) از علی محمد خاں صاحب صفحات قیمت
۴ - دنیا کی کہانی (تاریخی تقاریر کا مجموعہ) از پروفیسر محمد مجیب صاحب
۲۲۰ صفحات قیمت ۱۰؍
۵ - مسلمانوں کا روشن مستقبل (تین سو برس کی تاریخ) از سید
طفیل احمد صاحب علیگ ۶۰۸ صفحات قیمت ۲؍
۶ - تاریخ گولکنڈہ با تصویر (مشہور تاریخی قلعہ گولکنڈہ کے
حالات) از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ۲۸۰ صفحات قیمت
۷ - شجرۂ آصفیہ (شجرۂ خاندان آصفی) از حکیم سید شمس اللہ صاحب
قادری ۵۰ صفحات مع متعدد شجرے قیمت ۵؍
۸ - مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ (اسلامی سیاسیات
کی تاریخ) از عبدالوحید خاں صاحب ۲۵۴ صفحات
۹ - تاریخ نظم و نثر از آغا محمد باقر صاحب ۳۱۶ صفحات
۱۰ - مرقع ملتان از سید محمد اولاد علی صاحب گیلانی ۱۴۴ صفحات
۱۱ - مدراس میں اردو - از نصیرالدین صاحب ہاشمی ۲۰۰ صفحات
قیمت مجلد ۲؍
۱۲ - تاریخ ائمہ (انبیائے کرام و ائمہ طاہرین کے حالات)
از سید علی حیدر صاحب ۴۰۰ صفحات قیمت ۲؍
۱۳ - تاریخ اسلامی ہند از جناب نیاز فتحپوری ۲۴۴ صفحات
قیمت ۱۲؍
۱۴ - تاریخ ملت (ایام جاہلیت سے خلافت راشدہ تک کی
کی تاریخ) از مسلم صاحب دہلوی ۳۲۸ صفحات

۱۵۔ برطانوی ہند کی تاریخ اور اس کے مورخین۔ از ڈاکٹر
سر شفاعت احمد خاں صاحب ۱۰۳ صفحات
۱۶۔ انقلاب حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف
خاں صاحب ۔ ۶۰ قیمت ۱۲ر

ادب

۱۔ پیام اقبال (علامہ اقبال کے پیام پر مضامین) ۳۰۰
صفحات قیمت عہ
۲۔ صحرا نوردی کے خطوط از مرزا ادیب صاحب ۵۰۰
صفحات قیمت عمر
۳۔ مضامین فراق از خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق
۱۶۰ صفحات قیمت عمر
۴۔ مضامین رشید (مزاحیہ) از رشید احمد صاحب صدیقی
۲۲۳ صفحات قیمت عہ
۵۔ مضامین فلک پیما از خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب
۳۰۰ صفحات قیمت عہ
۶۔ فلکش (مزاحیہ مضامین) از سید ابو طاہر داؤد صاحب
۲۵۶ صفحات قیمت عمر
۷۔ مطائبات (فکاہی مضامین) از چراغ حسن صاحب
حسرت ۲۱۶ صفحات عمر
۸۔ جوہر اقبال (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
وغیرہ قیمت عمر
۹۔ بکھری ہوئی پتیاں (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری صاحب
مرحوم قیمت عمر
۱۰۔ مقالات شبلی جلد ہشتم از مولانا شبلی نعمانی مرحوم ۲۰۲ صفحات
۱۱۔ مکاتیب مہدی (مہدی حسن صاحب کے خطوط) مرتبہ مہدی
بیگم صاحبہ ۳۰۲ صفحات قیمت ے
۱۲۔ قطرات شبنم (مجموعہ مضامین) از گوردھن داس صاحب
بی۔ اے ۱۴۴ صفحات
۱۳۔ تاریخ و تنقید (مضامین کا مجموعہ) از پروفیسر عابد حسن صاحب
۲۲۴ صفحات قیمت عمر
۱۴۔ شمع راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب
۱۱۵ صفحات قیمت ۱۰ر
۱۵۔ نوجوان اور مفلسی (اصلاحی مضامین) از سید صابر حسین صاحب
قیمت ۱۰ر
۱۶۔ ہندوستانی (ریڈیو تقاریر) از ڈاکٹر تارا چند صاحب
وغیرہ قیمت ۱۲ر
۱۷۔ راز و نیاز۔ از سلطان احمد صاحب۔ جودی قیمت عمر
۱۸۔ موتی (اقوال کا مجموعہ) از سید یوسف صاحب بخاری
۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۱۹۔ محاورات اردو۔ از حافظ عبدالکریم صاحب مفتون ۱۴۴
صفحات قیمت ۸ر
۲۰۔ اصلاح ادب (اردو زبان کی غلطیاں) از غلام
حیدر صاحب
۲۱۔ نقوش سلیمانی (مضامین، تقاریر کا مجموعہ) از مولانا
سلیمان صاحب ندوی ۴۷۶ صفحات قیمت عالہ
۲۲۔ مقالات ہاشمی۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۴۶۴ صفحات
قیمت عالہ
۲۳۔ مجنوں کے خطوط از عطاء الرحمن صاحب عطا علیگ
۳۰۰ صفحات قیمت عا
۲۴۔ سہرا حلقہ (ایک خاتون کے خطوط) از ناظر صاحب
کاکوری ۸۰ صفحات

...متعلق ۱۲۵۲ صفحات

۲- ... مرتبہ حکیم عبدالغنی صاحب جونی

۱- تحفۂ نایاب (مجرب نسخے) از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۵۴۴ صفحات قیمت

۲- شاہراہ تندرستی (صحت و امراض کا ترجمہ) از لالہ بہاری لال صاحب ۱۲۰ صفحات

۴- بچوں کی بیماریاں از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عمہ

۵- طبیب نسواں معہ رہنمائے زناں از حاجی اسعد علی صاحب ۱۹۲ صفحات

۶- اسرار جیلانی از حکیم غلام جیلانی صاحب ۱۰۴ صفحات

۷- پالٹ ڈاکٹر (دوسرا ایڈیشن) از ... صاحب ۱۰۳ صفحات

۸- کفیل صحت از محمد خلیل شاہ صاحب ۹۰ صفحات

۹- نیا علم شفا بخشی (نواں ایڈیشن) از ... ۵۲ صفحات

۱۰- گنجینۂ طبیب حصہ چہارم از حاجی صغریٰ صاحب ۹۶ صفحات

۱۱- گلزار صحت از حکیم وزیر چند صاحب ۱۸ صفحات

۱۲- دستور الصحت عرف دیہاتی چٹکلے (چند مجرب نسخے) از سید مصطفٰے علی صاحب ... متعلقہ لکھنؤ

۱۳- گریہ شاستر (ضبط تولید اور زچہ و بچہ کی حفاظت) ۲۰۵ صفحات

۱۴- مرقع جمیل از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۲۲۸ صفحات

۱۵- تہذیبی نسخے (تہذیب نسواں کے نسخوں کا مجموعہ) ۱۰۲ صفحات

۱۶- ... (... کے تجربات) ۱۲۶ صفحات قیمت ۲ر

سیاسیات

۱- حکومت خود اختیاری اور ہندوستانی مسلمان از طفیل احمد صاحب ۳۲ صفحات

۲- ترقی جمہوریہ (ترکی کی سیاست) از محمد احمد صاحب ... ۲۴ صفحات

۳- ... حیدرآباد کے ... مرتبہ سید یوسف علی صاحب عثمانی ۱۰۴ صفحات قیمت ۱ر

۴- تحریک ترقی مملکت آصفیہ از خواجہ سید احمد صاحب ... ۳۲ صفحات قیمت ۶ر

۵- سیاسیات کی پہلی کتاب از محمد عاقل صاحب ایم اے ۱۰ صفحات ۵

۶- مسلمانان ہند کی سیاست وطنی از محمد امین صاحب زبیری ۲۱۶ صفحات قیمت ۱۰ر

۷- شیطان کا انتقام (دورحاضر کے سیاسی حالات) از محمد جلال الدین صاحب اشاک ۵۰ صفحات قیمت عمہ

۸- جمعیتہ الاقوام پر ایک نظر (جمعیتہ الاقوام کے مقاصد اور عمل کا جائزہ) ۱۰ صفحات

۹- متاع حق (اسلامی سیاست) از سید امیر احمد صاحب ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۰ر

۱۰۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) از سندباد جہازی قیمت عمہ

قانون

۱۔ قانون اسٹامپ حصہ اول از گردھاری صاحب ساگر ۴۴۴ صفحات

۲۔ آئین حکومت ہند (دوسرا ایڈیشن) از عبدالمجید خاں صاحب سالک بی۔ اے۔ ۴۲۰ صفحات

۳۔ تحفہ نمبر ۳ (قانون وراثت) از رلیا رام صاحب ۱۹۲ صفحات۔

۴۔ میڈیکل جورس پروڈنس از محمد سلیمان صاحب قریشی ۱۱۰ صفحات

۵۔ معاشدار (سطح معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ راؤ صاحب وکیل نظام آباد قیمت ۸ر

دینیات

۱۔ مذاہب اور انسانیت (بارہ مختلف مذاہب کے اصول) از لالہ ہردیال صاحب ۲۸۰ صفحات قیمت عمہ

۲۔ اظہار حقیقت از مجبور صاحب چشتی ۱۴۰ صفحات

۳۔ بچوں کے لئے رامائن از پروفیسر رام سروپ صاحب ۲۲۸ صفحات

۴۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا ترجمہ) از برج لال سنگھ صاحب بیدی ۲۲۲ صفحات

۵۔ جیون چرتر (مذہبی ہدایات) از سوامی بھگوان سنگھ صاحب ۳۰۰ صفحات

۶۔ ید بیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر مضامین) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ۱۴۰ صفحات

۷۔ تاثیرات قادیان از ملک فضل حسین صاحب ۲۴۴ صفحات

۸۔ گیتا امرت (ماخوذ از بھگوت گیتا) از چودھری روشن لال صاحب ۲۳۸ صفحات قیمت ۶ر

۹۔ فن تفسیر از مرزا عزیز صاحب قیصانی ۲۰۰ صفحات

۱۰۔ ہندوستانی اسلام (دو خاص مذاہب کی تاریخی حیثیت) از قاضی اظہار الدین صاحب ۵۰ صفحات قیمت ۶ر

۱۱۔ مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ) ۹۶ صفحات قیمت ۴ر

۱۲۔ اسلامی نظام تعلیم از ریاست علی صاحب ندوی ۱۵۶ صفحات

۱۳۔ نعرۂ توحید از سری سچدانند سدگرو یوگی راج ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ پیام امین (کلام اللہ کی تدوین اور اس کی تعلیم) دوسرا ایڈیشن از محمد عبداللہ صاحب منہاس ۱۴۰ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ایم۔ اے ۲۶۲ صفحات قیمت عا

۱۶۔ مقدس قانون۔ از ناصرالدین رشید ترابی قیمت ۱۰ر

۱۷۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب پر تبصرہ) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر

اخلاقیات

۱۔ انسان (انسان اور انسانیت کے متعلق) از کاشی ناتھ رام صاحب چاولہ ۳۰۰ صفحات قیمت ۸ر

۲۔ مخزن اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ صاحب سبحانی

۱۔ فہمیہ حساب حصہ دوم از ایم اے نذیر صفحات ۱۸۶
۲۔ کرشنا سکینکل گائیڈ از پنڈت کشن چند صاحب ۲ دار ۔۔۔

سفرنامہ

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو ۔ مرتبہ حضرت اللہ صاحب کرمانی ۔ ۵ صفحے
۲۔ سیر کشمیر ۔ از کورراج بلونت سنگھ صاحب ۲۲۶ صفحات قیمت عہ
۳۔ اندرون ہند خالدہ ادیب خانم کی انگریزی کتاب ان سائڈ انڈیا کا اردو ترجمہ از سید ہاشمی قیمت سے

نفسیات

۱۔ مظاہر نفسیات از ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ۴۸ صفحات قیمت عا

نسوانی ادب و خانہ داری

۱۔ نذر دکن ۔ (سب رس کے دکن نمبر کا ضمیمہ نسواں) مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۴۰ صفحات قیمت عہ
۲۔ بڑھاپے کی برکتیں اور عورت از خواجہ عبدالحمید صاحب دہلوی ۹۶ صفحات قیمت عہ
۳۔ علم خانہ داری از محترمہ ممتاز شاہنواز صاحبہ ۲۰ صفحات قیمت عہ
۴۔ گلزار درخشاں (دستکاری کے متعلق) از آر ۔ کے درخشاں صاحبہ قیمت عہ
۵۔ ہندوستانی کشیدہ کاری ۔ از مس امۃ اللہ قیمت عہ

نانا نذیر احمد صاحب

۔ ۱۲/

یڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب

۱۲ ۔

۸۔ توبۃ النصوح (جدید اڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۲۰ صفحات قیمت ۱۲/
۹۔ مسلمان عورت کے حقوق از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۱۲/
۱۰۔ ساجن موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۴/
۱۱۔ من کی بیتا (اصلاح معاشرت) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ۔ ایم ۔ اے ۸۸ صفحات قیمت ۸/
۱۲۔ محکومیتِ نسواں (حقوقِ نسواں) از معین الدین صاحب انصاری قیمت عہ
۱۳۔ مکمل باورچی خانہ از فہمیدہ خاتون صاحبہ ۔ فرحت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱/
۱۴۔ سوتیلی ماں ۔ از رابعہ بیگم صاحبہ شعبۂ نسواں ادارہ ادبیات اردو ۵۶ صفحات قیمت ۴/

لغات

۱۔ فرہنگِ عامرہ ۔ (عربی، فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) از محمد عبداللہ خاں صاحب قریشی ۸۰۲ صفحات قیمت عا
۲۔ مبادی اللغات (اردو لغت) از فیض محمد صاحب ۹۱ صفحات

صنعت و حرفت

۱۔ روپئے بنانے کی مشین (صابن سازی فوٹوگرافی وغیرہ)

ازیم۔آر انند ۱۱۲ صفحات

۲۔انڈین ماسٹر آف کرافٹ با تصویر (لباس کی کتر بیونت) قیمت عہ

۳۔ وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۶ صفحات قیمت ۸ر

۴۔ لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۸ صفحات قیمت ۸ر

۵۔ صنعت وحرفت کے قیمتی راز از مہانندجی قیمت عہ

۶۔ ہندوستان کی صنعت وتجارت از منت اللہ صاحب رحمانی ۱۲۰ صفحات

معاشیات

۱۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔ از ڈاکٹر زین الدین احمد صاحب ۱۵۰ صفحات قیمت ۸ر

۲۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا از محمد عاقل صاحب ۱۱۲ صفحات

تعلیم

۱۔ رہنمائے اساتذہ از لیلارام صاحب ۲۵۶ صفحات

۲۔ بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب ۲۴۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی۔ اے قیمت ۸ر

متفرق

۱۔ کرشمۂ روحانی از محمد شریف صاحب ۹۶ صفحات

۲۔ تلوار (متعلق شمشیر زنی) از کپتان اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶ر

۳۔ لذت شادی۔ از بی چندر صاحب بکل ۱۶۰ صفحات

۴۔ کالاعلم۔ (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔

۵۔ ترکاری۔ از جی۔ ایم ملک صاحب ۸۰ صفحات

۶۔ معلم پٹوار از آغا نثار احمد صاحب ۴۴ صفحات

۷۔ چوپائے اور انسان از موہن لال صاحب ۶۷ صفحات

۸۔ انسداد گداگری از سلطان محمد صاحب قیمت ۴ر

۹۔ اسلامی سپہ گری از عبدالکریم صاحب قیمت عہ

۱۰۔ سکھی کسان از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد ۱۹۳ صفحات عہ

۱۱۔ بوٹیچریہ (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۲۰۹ صفحات قیمت ۹ر

۱۲۔ گرہست جیون (") ۵۰ صفحات قیمت ۲ر

۱۳۔ یورپ کے تاثرات (انگلیسی اہل قلم کے تاثرات) مرتبہ بدر شکیب بی۔ اے ۱۹۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ مغربی تصانیف کے اردو متراجم از میر حسن ایم اے ۱۴۳ صفحات قیمت ۴ر

۱۵۔ نئے مسائل (فکر وعمل کی نئی راہیں) از محمد مغوث الدین بی۔ اے قیمت ۸ر

مرزا سیف علی خاں

میں ہے بلکہ ضلع سے پیدا مقصد

اس صنعت سے ہے جسے گھٹیا درجے کے شعرا اپنے [illegible] میں [illegible] سے خوش مذاق اصحاب ظرافت پیدا کرنے کے لئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صنعت کا دوسرا نام رعایت لفظی ہے اور عام طور پر اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن کو دوسرے الفاظ کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً کسی کا شعر ہے کہ

سن کے چرچا غیر سے جاتے چھچھوندر چھوڑ دی
گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا

یہاں چھچھوندر چھوڑنے کے معنی شگوفہ چھوڑنے کے ہیں اور ٹوٹے کے معنی نقصان کے ہیں مگر چھچھوندر اور ٹوٹا آتش بازی کے نام بھی ہیں اس لئے گھر جلا، چھچھوندر اور ٹوٹا ضلع کے الفاظ ہیں اور ان میں ایک دوسرے سے مناسبت ہے

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے، وہ ایک سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے کہ

جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے جج کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور ہم غریبوں پر چشم عنایت چاہیے۔ جج نے کہا کہ ہم سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ملزم نے کہا کہ یہ تو حضور کی عین منصفی ہے

اس کی دوسری قسم میں الفاظ اس قدر کھینچ تان کر بٹھائے جاتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں مثلاً امانت کا یہ مشہور شعر ہے کہ

ہم کو جو زہر غیر کو مصری کی ڈلی ہو
ایسی نہ بات آپ زباں سے نکالئے

یہاں دوسرے مصرع میں نہ بات کا لفظ زباں سے نکالتے وقت نبات ہو جاتا ہے جس کے معنی مصری کے ہیں اور زہر، مصری، نبات، یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

آپ نے وہ شعر تو سن لیا جس میں زبردستی کھینچ تان کر ضلع باندھا گیا تھا اب ایک چھوٹی سی اسی نمونے کی گفتگو بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب استرہ خریدنے گئے۔ دوکاندار نے قیمت زیادہ بتائی۔ خریدار نے کہا کہ میاں تم تو مونڈھتے ہو (یعنی دوکان دار کو حجام بنایا)، دکاندار نے تڑسے جواب دیا کہ حضور ہم اس طرح سے مونڈھتے ہیں اور آپ اُس طرح سے مونڈھتے ہیں (یہاں "اُس طرح" سے تلفظ کرتے وقت اُسترے سے ہو جاتا ہے)

ابتدا میں شعرا نے اس دل بہلانے والی صنعت کو اس خوبی سے پیش کیا کہ ہر شخص اس پر لٹو ہو گیا

چند روز کے بعد بازار میں چل نکلی اور ایسی چلی کہ ہر شخص اس کا سودائی بن گیا۔ اس لئے بعض شعرا نے تو اس قدر گریز کی کہ اس کو حدود شاعری سے ہی خارج کر دیا اور بعض نے اس قدر وسعت دی کہ کشورِ شعر سخن کا رکنِ اعظم بنالیا۔

غالب کی مشہور و معروف غزل کا مصرع ہے کہ "ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں" اکثر ضلع بازوں کا خیال ہے کہ یہاں ہیہات، پاؤں کی مناسبت سے ضلع کے طور پر بٹھایا گیا ہے۔

مگر ان کے بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں ضلع جگت کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ کلام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کا یہ شعر مجھے دور و دراز سے کھینچ کر لایا ہے پھر یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی   میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ یہ شعر غالب کا نہیں تھا اور اسد کی رعایت سے شیر کو کہاں خاطر میں لاتے تھے اس لئے استاد مسکرائے اور کہا کہ جناب جس بزرگ کا یہ شعر ہے ان پر بقول ان کے رحمت خدا کی اور یہ میرا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔

غالب سے پیشتر بھی اکثر شعرا نے ضلع بولنے والوں پر چوٹیں کی ہیں۔ چنانچہ سودا فرماتے ہیں۔ کہ

پکڑی جو تو رے نے کہیں کھیتی سے چڑیا   سمجھا کہ نہیں باز کوئی مجھ سا کلاں گیر
استاد کی ان کے ہے انھوں کو یہ نصیحت   لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر
اتنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ   بے پنجہ و ناخن نہ لکھو دودھ کو تم شیر
جب تک کہ نہ منظوم ہو پاسنگ و ترازو   باندھو نہ کبھی شعر میں تم لفظ شکم سیر

یہاں پنجہ، ناخن، شیر، پاسنگ، ترازو، اور شکم سیر یہ سب ضلع کے الفاظ جنہیں اعتراض کے پردے میں لکھ کر استاد نے خود اپنا ذوقِ سلیم بھی بتا دیا ہے۔

بہر حال اس لے دے کے باوجود اس وقت ہزاروں غزلیں ہزاروں قصیدے اور ہزاروں مثنویاں اس صنعت میں بھری پڑی ہیں اور پھر ضلع بازوں نے تو وہ دریا بہائے ہیں کہ شعرا کے کارناموں پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔

جس طرح اکثر لوگ بیت بازی اور دوسرے مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح بعض اصحاب ضلع بازی میں اپنا وقت گزارتے رہتے ہیں جہاں دو آدمی مل کر بیٹھے اور ضلع شروع ہوگیا۔ مثلاً کسی صاحب نے حقہ پیتے پیتے سرکایا اور یار لوگوں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا۔ اب حقہ سے متعلق جتنی چیزیں ہیں دماغ سے اترنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حقہ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں۔

اپنا کوئی ہمدم ہے نہ دمساز دمدمے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی۔ این گلِ دیگر شگفت بندہ ہر دم تازہ

ی میں دے
۔ جاتے ہوئے باہر ٹک گئے
خ۔ سوختہ جاں۔ زنجیر پا۔ خشک و تر
۔ تو لگائے رہو۔ فقیر کا جھنبل

وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم کہ ظرافت کا عنصر اور تفنن طبع کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر برمحل اور برموقع کسی گفتگو کے سلسلہ میں مسلسل یہ الفاظ بٹھا دئے جائیں تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے بلکہ ملازمہ کی آڑ میں جو چاہو کہہ جاؤ بقول شخصے سات خون معاف ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم آپ کو چند قصے سناتے ہیں جن میں ضلع کا چٹخارہ دے کر ظرافت پیدا کی گئی ہے وہ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ایک صاحب کسی چرب زبان جوتے والے کی دکان پر پہنچے دکاندار نے کہا کیا حکم ہوتا ہے خریدار نے کہا کہ ایک جوڑے کی ضرورت ہے۔ دکاندار نے کہا کہ حضور تو نری کا چاہتے ہونگے۔ خریدار نے کہا کہ مجھے وصلی کا درکار ہے۔ ذرا خوش رنگ اور مضبوط تلے کا ہو۔ دکاندار نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ یہ چند جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھئے وہ جوتے جو آپ کے سامنے پڑے ہیں خوش رنگ بھی ہیں مضبوط بھی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت سستے پڑیں گے۔ خریدار نے قیمت دریافت کی تو کچھ زیادہ بتائی۔ اس پر خریدار نے کہا کہ آج کل تو آپ لوگ بے حساب کھانے لگے ہیں۔ اول تو صرف چار آنے جوتا کھاتے تھے مگر اب تو کیفیت کہ آپ ایک ایک روپیہ جوتا کھاتے ہیں اور پھر بھی آپ کا پیٹ نہیں بھرتا۔

دکاندار نے کہا حضور! ہم اپنے جوتے زبردستی کسی کے سر تھوڑی مارتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ اگر پسند ہو تو یہ حاضر ہیں ورنہ جہاں آپ کو سستے پڑیں وہاں جا کر آپ بخوشی لے سکتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

ایک حجام کا لڑکا کسی بڑے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے منتظم دفتر پر جرمانہ ٹھوک دیا۔ منتظم صاحب جوش میں بھرے ہوئے ان کے گھر پہنچے اور کہا کہ سرکار نے تو الٹے استرے سے میرا سر مونڈھ دیا۔ افسر صاحب نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ منتظم صاحب نے کہا کہ اب اور کیا سوچوں، صاف صاف کہتا ہوں پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری ڈاڑھی مونچھیں حقے کے پانی سے مونڈھ دیجئے گا۔

اسی طرح ایک عرب کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بارش کے موسم میں کسی ظریف کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رستے میں ظریف نے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ جواب دیا کہ مطر پوچھا کنیت، اس نے کہا کہ ابو الفیض پھر ظریف نے پوچھا کہ

تمہارے باپ کا کیا نام ہے اس نے جواب دیا کہ ابو الغیث پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ سحاب پوچھا کنیت۔ جواب دیا کہ ام آبحر ظریف یہ سن کر رک گیا اور کہا کہ ذرا ٹھیر جا۔ میں ابھی ایک کشتی لے آتا ہوں۔ ورنہ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ ظریف کے منہ سے یہ نعرہ سن کر وہ ترنم سے پانی پانی ہوگیا

کسی ظریف کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی درویش کے ہاں مہمان ٹھیرا۔ درویش کا مکان بہت پرانا تھا اور چھت میں سے چٹ چٹ کی آوازیں آتی تھیں۔ ظریف نے گھبرا کر پوچھا کہ خیر تو ہے، قبلہ یہ کیا ماجرا ہے؟ درویش نے کہا کہ ڈرو مت میرے گھر کی کڑیاں ذکر و تسبیح کرتی رہتی ہیں ظریف نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسی ذکر و اذکار میں کہیں ان کو حالت وجد نہ پیدا ہو جائے اور وہ رقص کرکے سجدے میں نہ آپڑیں تو پھر اس وقت اس گنہگار کا کیا حشر ہوگا۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختنہ کیا اور احباب کو دعوت دی مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا۔ استاد ذوق بھی مدعو تھے کھانا کھا کر صحن میں آبیٹھے۔ اتنے میں میزبان پان لئے ہوئے آئے۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دست مبارک سے گلوری کھلانا واجب ہے۔ ذوق نے کہا کہ ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پائیے۔ ختنے کی ضیافت اور خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا کہ ظرافت یہ ظرافت یہ کہ کھلایا بھی تو خصتی پلاؤ

شاہ نصیر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ کے کسی معرکے کے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

خال پشت لب شیریں ہے عسل کی مکھی روح فرہاد لیٹ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ، استاد کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے دوسرے شعر پر کہا کہ حضور یہ مکھی تو ٹھیک نہیں بیٹھی۔ غزل ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنھیں چاشنی سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اٹھائیں گے ہاں جنھیں حسد کے صفرے کا زور ہے ان کا جی بھی متلائے گا اور ردیں بھی ہوں گی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شائع ہوکر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ہے

لیا

ملی

نگاہوں کی ہے [illegible]
نزاکت کی پتلی لطافت کی کاں

امیروں کی آنکھوں کا تارا بنی　　غریبوں کے دل کا سہارا بنی
رہی امتیازات سے بے نیاز　　ہراک دل ہراک بزم میں سرفراز
ہوا اس کی شہرت کا پرچم بلند　　نگاہوں میں سب کی ہوئی ارجمند
عرب سے فصاحت کا آیا خراج　　اور اس میں لطافت تھا امتزاج

جو فارس سے آئی رباب و چنگ
تو ہندی نے بھی نذر کی جلترنگ

تبسم پہ اس کے ستاروں کو ناز　　ترنم پہ اس کے ہزاروں کو ناز
یہ پاکیزگی ۔ یہ توازن ۔ یہ شان　　یہ اس کا سنورنا یہ اس کی اٹھان
ہراک کی نگاہوں میں جچتی گئی　　دلوں میں لہو بن کے رچتی گئی
اٹھی تھی جو اس محترم خاک سے　　لگی چشمکیں کرنے افلاک سے
لئے رنگ قوس قزح سے کبھی　　کبھی منبع کہکشاں تک گئی
ستاروں سے ان کی چمک چھین لی　　قمر سے غمِ دل کی تسکین لی

فلک سے ملی وسعتِ بے کنار
ہوا حسن خورشید از خود نثار

ہراک جلوہ پیشِ نظر ہے یہاں　　ہراک دلفریبی کا گھر ہے یہاں
ہراک حسن اس بزم میں باریاب　　ہراک ذرہ اس بزم میں آفتاب

زمیں زاد ہے آسماں جاہ ہے
وطن کی ترقی کی شاہ راہ ہے

ہراک مسلم کو اس کا ہے اعتراف　　کہ اردو کا دامن ہے کانٹوں سے صاف
نہ الجھن نہ مشکل نہ بے مائیگی　　یہ وسعت ۔ یہ ایجاز یہ سادگی
نہ مشرق نہ مغرب کی ہے کوئی قید　　کہ دونوں ہیں اس کی نگاہوں کے صید

زمانے کی ہر خوبصورت زباں اسے پیش کرتی ہے کچھ ارمغاں
ہر اک حلقہ میں سب کو آئی پسند ہر اک دور میں یہ رہی سر بلند
ہر اک ملک میں اس کا سکہ رواں کہ دنیا سمجھتی ہے اردو زباں
میسر ہوا اس کو رنگ قبول
کہ ہیں اس میں ہر ایک گلشن کے پھول

ہمیں کیوں نہ اردو سے ہو اتنا پیار ساعت نے پایا اسے خوشگوار
رتن ناتھ سرشار اس کے اسیر پرستار اس کے انیس و دبیر
امیر اور حکمت کی ترجماں نسیم اور غالب کی پیاری زباں
ہمارے تمدن کی بانی ہے یہ
حقیقت میں ہندوستانی ہے یہ

یہی آشتی کی ہے آئینہ دار اسی پر ترقی کا ہے انحصار
اسے ہاتھ سے جانے دینگے نہ ہم اسے کوئی غم کھانے دینگے نہ ہم
بزرگوں کا پیارا نشاں ہے یہی
ہماری مقدس زباں ہے یہی

عبدالعزیز فطرت
(راولپنڈی)

گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔

میکش کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ
کتاب کی تقسیم کئی حصوں پر ہے مثلاً حرکت و حیات، سکون و اضطراب
ماضی و حال، حال و قال عقیدت و یقیں، شباب و شعر وغیرہ بعض بعض
نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

"صدق" لکھنو بابت یکم جنوری سنہ ۱۹۳۹ء صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس، کاغذ اعلیٰ قسم کا جلد پر سنہری نام

(قیمت عہ)

تے ہیں اور وہی بھولی باتیں جب دہرائی جاتی ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بالکل نئی اور اچھوتی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ با تاریخ اپنے کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اس کے دہرانے کو محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کے انقلابات اور واقعات کا حال سینما کے پردے سے ملتا جلتا ہے دیکھی ہوئی تصویریں تھوڑے الٹ پھیر کے ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں اور فریب خوردہ نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کوئی جدید فلم دکھایا جا رہا ہے۔ حوادث و انقلابات کے ان مناظر کو دیکھ کر ایک مشہور فلسفی بے اختیار پکار اٹھا کہ :-

"دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔!"

تمدن و تہذیب کو نئے ہوئے نقوش جب ابھرتے ہیں، تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی جدید تہذیب کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ دنیا پرانے ملبے سے نئی عمارتیں بنا کر اکڑنے لگتی ہے۔ آج دنیا تہذیب و علم کی جن "جدید شاہراہوں" پر گزر رہی ہے، وہ سب گزشتہ تہذیبوں کے روندے ہوئے راستے ہیں۔ آج ہم محکمۂ آب رسانی کے حسنِ انتظام پر فخر کرتے ہیں، مگر آج سے کئی ہزار سال قبل یونان کے مشہور مورخ ہیرو ڈوٹس نے بابل کے شہر میں لپٹتے ہوئے فوارے اور ڈھلکتے ہوئے آبشار دیکھے تھے۔ جن لوگوں نے بیدر (دکن) کے قلعہ کو دیکھا ہے وہ اس زمانے کے "واٹر ورکس" کے حسن انتظام کا ضرور اعتراف کرینگے۔

سینما کو دورِ جدید کی ایجاد بتایا جاتا ہے، مگر ڈریپر کی مشہور کتاب Conflict between Religion & Science "معرکۂ مذہب و سائنس" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں متحرک تصویروں کا رواج تھا، اور حسین و جمیل رقاصاؤں کے نغمہ و رقص کے ساتھ ساتھ، متحرک تصویریں ذوقِ نظارہ کو تسکین بخشتی تھیں محکمۂ اکتشافات اثری کی کوششوں کی بدولت، قدیم نوادر منظرِ عام پر آ کر، تہذیب و تمدن کی کڑیوں کو ملا رہے ہیں۔ اور دنیا کو اپنے حافظہ کی کمزوری کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ چیز کبھی تھی ہی نہیں آپ کی بھول چوک سے "ہوئی بات"، "انہوئی" نہیں ہو سکتی۔ عدمِ علمِ شئے سے وجودِ شئے کی نفی نہیں ہوتی۔

فکر و خیال کی یکسانی

تمدن و تہذیب اور علم و ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمدن و تہذیب کی طرح علم و ادب کے نقوش بھی مٹتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ قدیم افکار نئے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں اور وہی نغمے جو فضا میں گونج چکے ہیں، مختلف دھنوں اور سروں میں اس انداز میں گائے جاتے ہیں جیسے یہ پہلے پہل سامعہ نواز ہوئے ہیں۔ فکر و خیال کی جو شراب روم و یونان کے میکدوں میں کھنچی تھی، وہی شراب بھارت ورش کی بھٹیوں پر جوش کھاتی ہوئی نظر آتی ہے، ایک دو آنچ کی البتہ کسر رہ گئی ہے، مگر اس سے

شراب کی اصلیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ روم کی رزمیہ شاعری فردوسی کے شاہنامے سے ٹکراتی ہے، اور ہومر اور ورجل کے نغموں کی گونج ایران میں سنائی دیتی ہے۔ اگر دنیا کے قدیم لٹریچر کا تاریخی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت پہلے کہی ہوئی باتیں کس کس انداز میں دہرائی گئی ہیں، اور یہ "توارد" اپنے اندر کس قدر عمومیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان قوم و نسل کے امتیاز و اختلاف کے باوجود فکر و تصور کے مرکز پر آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ گرد و پیش اور ماحول سے متاثر ہوکر محسوسات کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے، مگر فکر و خیال کی تان ایک ہی حقیقت پر آکر ٹوٹتی ہے۔ عرب کی لیلیٰ، ایران کی شیریں، ہندوستان کی شکنتلا اور مصر کی قلوپطرہ پر شاعروں اور ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اصطلاحات کے فرق کے سوا بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔ ایک ہی نغمہ مختلف دھنوں میں زبانوں سے نکلا ہے، اور ایک ہی شراب مختلف پیمانوں میں ڈھلی ہے۔

پرانے چراغ

ہماری موجودہ "اردو غزل" تو ہمارا سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ اس کی داغ بیل بھی بہت پہلے پڑ چکی ہے۔ اور نہ صرف فکر و خیال بلکہ الفاظ اور ترکیب کے اعتبار سے بھی ہمارے پیش رو غزل گو شعرا شعر و ادب کی وادیوں کو ہموار کر گئے، فکر و خیال کے چراغ جلا گئے ہیں۔ ہم ان ہی چراغوں کی روشنی میں منزل طے کر رہے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم کو اس اجالے کا پورے طور پر احساس نہیں ہوتا، مگر اجالا تو اپنی جگہ پر ہر حال قائم و ثابت ہے۔ ان ہی پرانے چراغوں کے آس پاس ہم بھی کچھ شمعیں روشن کر رہے ہیں، اور آنے والی نسلیں اپنے کو ہم سے زیادہ روشنی میں پائیں گی۔

"ولی دکنی کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں، حالانکہ آج سے دو سو سال قبل اس نے کہا تھا"

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے
بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغ گل

خیال و فکر کی قدرت کے علاوہ، الفاظ کے استعمال سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ شعر ہمارے ہی دور کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہے۔

میر محمد تقی میر کے اس شعر کا جواب

اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
اڑ گئے آئینہ کے توتے سے

مشکل ہی سے پیش کیا جاسکے گا۔ ہم کو آج اپنی نظموں پر بہت ناز ہے، مگر میر کے اس شعر کے لطف کو کوئی نظم پھیکا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روح القدس، شاعروں کی تائید کرتا ہے، تو میر کا یہ شعر اس تائید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے اس شعر کو پڑھ کر

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

بہت سے ہمارے شعروں کو اسی کی صدائے بازگشت سمجھا گیا ہے۔

داغ کا یہ شعر :۔

لذت سیرِ دگر چشم تماشا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا بھی پلٹا لے گی

انقلابی شاعروں کے لئے آج بھی دلیلِ راہ بن سکتا ہے اور "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے بہت زیادہ قوت اس شعر میں پائی جاتی ہے۔

امیر مینائی کے اس شعر پر :۔

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

آج بھی روح جھومنے لگتی ہے۔ اس دور کے بہترین مصور کا قلم باغ و بہار کو تو دکھا سکتا ہے۔ مگر بہار کو خوشی کے جھولوں میں کس طرح جھلائے گا۔!

میں نے غالب کے اشعار کو قصداً پیش نہیں کیا اور وہ اس لئے کہ ان کے فکر و خیال کی روح تو ہماری شاعری کے پیکر میں دوڑ رہی ہے اور کوئی شاعر محسوس یا غیر محسوس طور پر غالب کی شاعری کے تاثرات سے نہیں بچ سکتا۔

ماہر القادری

من کی دنیا حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔

ہر افسانہ رعنائی اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہونگے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہونگے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد (عہ)

اردو شاعری

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شاعری ہے کیا چیز۔ مختلف لوگوں نے مختلف طور پر شاعری کی تعریف کی ہے۔ یہاں پر ان تمام تعریفوں کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ شاعری کی تعریف سادے لفظوں میں یہ ہو سکتی ہے۔ کہ نثر تو ذہنی اور جذباتی تصورات کے سیدھے سادے اظہار کا نام ہے اور شاعری ایسے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو کلام موزوں بن جاوے۔ مگر پھر بھی شاعری کا اصلی نقشہ اس تصویر میں نہیں ملتا۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ شاعری کا میدانِ عمل وہی ہے جو ایک نثار کا ہے رزم ہو یا بزم، جذبۂ قومیت ہو یا جوشِ مذہبی، ذہنی تخیلات ہوں یا مشاہداتِ کائنات ہر چیز میں جس حد تک نثر کا دخل ہے اسی حد تک شاعری کا بھی ہے سوال یہ ہے کہ پھر اظہار کے یہ دو مختلف انداز و بیان کیوں وجود میں آئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جہاں صنف نثر موثر نہ ہو وہاں دوسری صنف یعنی شاعری سے کام لیا جائے۔ دیکھئے شیکسپیر۔ ہومر۔ ورجل اور گوئٹے کے ہم عصر صدہا نثار تھے مگر ان کی قوم کے تمدن میں جس انقلاب کی ضرورت تھی وہ ان سے نہ ہو سکا اس کام کو ان شعرا نے انجام دیا۔ انصاف اور رحم کے نقشے یا انسانی کیریکٹر اور تاثرات کے خاکے جس طرح شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں کھینچے ہیں یا قومی جذبے کے متعلق اسکاٹ نے جو نظمیں لکھی ہیں، یا قدرتی مناظر کا ورڈسورتھ نے جو نقشہ کھینچا ہے، ان کا بیان ایک نثار کتنی ہی خوش اسلوبی سے نثر میں کیوں نہ کرے ان شعرا کی طرح اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس طرح موسیقی شعر کی خوبیوں پر سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے اسی طرح نثر شعر کے سانچے میں ذہنی تخیلات کے اثرات کو دوبالا کر دیتی ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظم و نثر کا یہ فرق، قافیہ اور ردیف کی وجہ سے ہوتا ہے خدا جانے کتنے اثرات کا مجموعہ ہے جن سے مل کر شاعری نثر سے بالکل جدا اور اس سے بہت بلند تر اور ایک اچھوتی چیز بن جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری ایک ایسی قوت ہے جس کا اظہار جذبات کے ہر شعلے پر اثر پذیر ہے خواہ وہ ارتقائے ذہنی ہو خواہ مصوری جذباتِ جمالیت خواہ جوشِ ملی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان شعبوں پر شاعری کا نثر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اثر ہے۔

مذکورہ بالا معیار کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم شاعری کے اس مفہوم کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ آیا ہم اردو شاعری سے یہ کام لے رہے ہیں یا نہیں۔ اور آیا ہماری شاعری ہمارے انسانی اور قومی ارتقا کی ترجمان ہے یا نہیں۔ گزشتہ صدی کے دورِ شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے شاعری کے اعجاز سے کہاں تک کام لیا ہے۔ تعمیری جذبے سے بے نیاز، روح پرور نغموں سے خالی، مفروضی نقطۂ نظر سے ناکارہ، اور موضوعی حیثیت سے بھی مصنوعی اور دقیانوسی۔ یہ ہے پرانی داستان ہماری شاعری کی بدقسمتی سے ہمارے شعرا کا میلانِ طبع صرف تغزل کی طرف رہا۔ اور جو نظری مجسمہ حسن، اظہارِ جذبات کا مرکز بنا رہا۔

... تو معشوق ... اور دوسرے جانب جو جسمہ انہار تغزل کو تیار کیا گیا وہ عجائب خلقت ... ہے

... لب سرخ و زرد
... دانہ یاقوں میں
... و دندان پر مسی

... کی دھڑی اور یاقوں کی سرخی قدیم سنگارکے تصور کو بھی تہ و بالا کیں ... یہ ... نقاب ... ذقن۔ انار پستان یہ تو نسوانی علامات ہیں۔ مگر ساتھ ہی معشوق سبزہ خط ... ہوتا ہے ... ظلم و جور ... اعدا کے ساتھ سر بازار آوارہ گردی، تیغ آزمائی تیر افگنی، قتل و غارت گری وغیرہ اس کی صنف قوی سے ہونے کا ثبوت ہے۔ علیہ اس معشوق عجیب کا یہ ہے کہ صراحی کی طرح لمبی گردن لکھنو کی ... نازک ... بالکل معدوم یا بال کی طرح باریک لب کوزہ قند و نبات دنداں سلک مروارید ... آنکھیں نرگس بیمار پلکیں تیر و نشتر بھویں شمشیر و خنجر رخسار آفتاب جبین ماہتاب زلف بل کھائی ہوئی ... سیاہ ... سبزہ زار۔ غرض کہ ایشیائی شاعری کے اس خیالی معشوق کو شالی جامہ پہنا کر کسی بزم شاعرہ میں پیش کر دیا جائے تو ہمارے عشق زدہ کمزور دل شعرا چیخ مار کر بیہوش ہو جائیں اور جری و بہادر ... دل ہنستے ہنستے ٹوٹ جائیں اور معشوق صاحب کی وہ گت بنائیں کہ پھر وہ اپنے عاشق شعرا کے خواب و خیال میں بھی آنے کی جرات نہ کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ آج ہر چیز ... کی ضرورت ہے مگر ہمارے شعرا اپنے حسن و عشق کے تخیل میں واقعیت اور حقیقت سے ... واسطہ نہیں رکھتے۔ تمام تشبیہات و تلمیحات اور حسن و عشق کے فرضی لوازمات ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے ماحول اور محسوسات کو مطلقاً تعلق نہیں۔ اگر کہیں مناظر کی جھلک بھی نظر آتی ہے تو ایسی جن سے ہماری نگاہیں آج تک محروم ہیں اور نا آشنا۔ غیر ملکی مناظر کے لئے جن سے ہمیں مسرت حاصل نہیں ہو سکتی اپنے ملکی و ماحولی مناظر کی طرف اب تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ اردو غزل میں اس کی ہمیشہ سے اجازت دی گئی ہے کہ ایک ہی غزل میں متفرق خیالات ہوں لیکن اب یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے کہ ایک ہی غزل میں متضاد خیالات بھرے جاتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے جو ہماری غزلیں غیر فطری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک ہی سانس میں دو متضاد جذبے کیسے ہو سکتے ہیں۔ میرا مطلب تغزل کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے اور اصلی تغزل انسان کے صحیح جذبات کا صحیح آئینہ ہوتا ہے۔ اور جہاں اور اصناف سخن ایک ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں اس کی استقامت اور استقلال

پر زلزلہ لانا دشوار ہے لیکن ہمارے شعراء افراط تفریط کے شکار ہوئے اور محض تغزل اور وہ بھی غیر فطری تغزل کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا رکھا اور دوسرے اصنافِ سخن سے بالکل غافل رہے۔

ابتدا میں تو کچھ توجہ قصیدوں اور مثنویوں کی طرف رہی لیکن ان اصناف سے جو اصلی کام لینا چاہیے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ اور نظموں کی طرف تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مناظر قدرت کی تصویر کشی سے مستفید ہوئے نہ جذبات ملی و ملکی قوم میں یہ پیدا کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ زبان کے ابتدائی دور میں اس کی صفائی و روانی پر توجہ غالب رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری زبان میں بھی ہوا۔ گو تخیل کا معیار بلند نہ ہوا۔ لیکن اس دور کے بعد دنیائے شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ نجم الدولہ دبیر الملک غالب دہلوی کی صورت میں طلوع ہوا جس نے اپنی شاعری کی بنیاد فلسفۂ حیات اور رموز زندگی کی مستحکم زمین پر قائم کی۔ خیالات کی بلندی جذبات کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ اس نے ان حقائق کی تصویر کھینچی جو انسانیت کا مرکز نگاہ بننے کے قابل تھے دو اور شعراء انیس و دبیر اصلی معنوں میں شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے اپنی فکر طبع کو محدود رکھا۔ منظر کشی واقعہ نگاری اور جذبات کی تصویریں اتارنے میں یہ دونوں شعراء نے داد سخن دی لیکن ان کے یہاں بین فطرت سے وہ ہم آہنگی اور قرب عنقا ہے جو ورڈسورتھ (Wordsworth) شیلی (Shelley) یا بائرن (Byron) کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

غالب کی روش پر چلنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی لیکن وہ ایک ایسی شاہراہ پیدا کر گئے تھے جو معدوم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں سنجیدہ طبقے نے اس شاہ راہ پر گامزنی کی کوشش فرمائی اور اس نے اب خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس طبقے کے شعراء نے جذبات حسن و عشق اور فلسفۂ حیات کی حقیقت آگیں تصویر دکھلانے میں جو سعی فرمائی اس سے تغزل میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے ان میں سے خاص طور پر فانی۔ جگر اور حسرت ہیں۔ بے معنی تغزل سے ہٹانے میں پہلی سعی جس شاعر کی وہ مولانا حالی ہیں۔ قومی ادبار کی تصویر ان کے سامنے تھی قومی درد ان میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ ابل پڑا اور اس نے ان سے مسدس ایسی نایاب چیز لکھائی۔ نیز اسی طرح کی اور نظمیں جن کو پڑھ کر قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور عمل کا احساس ہوتا ہے پھر چکبست نے ایسے دلچسپ پیرایے میں قومی ترانے گائے کہ اس نے قومیت ملکیت، اور وطنیت کا جوشِ جنوں پیدا کر دیا۔ فلسفۂ زندگی کو طنزیات کے تحت میں لاکر بیان کرنے میں اکبر الہ آبادی نے جو کمال دکھایا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن ان کا مسلک "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" نہ تھا اس لئے قوم کی ذہنی ارتقا میں ان کی شاعری ایک سنگِ گراں ثابت ہوئی۔

حالی کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ آسمانِ شاعری پر علامہ اقبال نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک ایسا پیغام ہم کو پہنچایا جس سے ہماری نظر حقیقتِ انسانی پر پڑی اور ہم سب

ساتھ ہی ساتھ

ترقی پسندی کا ثبوت ادبی جرائد

انداز بیان ملا۔ اور مجھ

سے امید ہوتی ہے کہ اردو

ہری۔ حقیقت پسندی …

شاعری ایک ہمہ گیر اور مکمل شاعری کی حیثیت حاصل کرے گی۔

شاعروں اور شاعری کے بڑے بڑے کارنامے صفحات تاریخ پر موجود ہیں۔ دنیا کے بہت سے عظیم انقلاب شاعری کے رہین منت ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابھی ہمارا ذہن شعریت سے خالی نہیں ہے اور ہم اس صنف سخن سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔ آج ان ممالک میں جہاں صنعتی اور فنی ارتقا حاوی ہو گئے ہیں، وہاں شعراء رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جاتے ہیں چنانچہ اس وقت یورپ میں یہ صورت ہے کہ بلند پایہ ادیب۔ محقق، سیاست داں اور صحیفہ نگار تو وافر تعداد میں موجود ہیں مگر شکسپیر، ملٹن، ورڈز ورتھ اور … جیسا نابغہ نہیں پیدا کر سکا۔ اس لئے ہمارے شعراء کو اس حقیقت سے آشنا ہو جانا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت کو غنیمت سمجھیں اور حقیقی شاعری کا جذبہ ملک میں پیدا کریں۔ جوش جوانی اور عیش پرستی کا ذکر اس قوم کے لئے زیبا ہے جس کو عیش و راحت کی زندگی میسر ہو۔ لیکن جو قوم ایسی ہو کہ اس کے بیشتر افراد کو ایک وقت شکم سیری میسر نہیں اور مصائب اور آفات کے ہجوم سے مہموم و مغموم ہیں اس کے شعراء کو یہ کیونکر زیب دے سکتا ہے کہ خیالی تعشق اور رندی اور بدمستی کے راگ الاپتے رہیں۔

ملک و ملت زبانِ حال سے فریادی ہیں کہ ہم کو زندگی کے اصلی مقصد کی تلاش ہے۔ اقتصادی، معاشی، مذہبی، اخلاقی اور تمدنی و معاشرتی آزادی کی ضرورت ہے لہذا ان امور کے حصول کے لئے تمام قومی طبقات کے ساتھ طبقۂ شعراء کو بھی میدانِ جد و جہد میں آکر اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

نجم الدین احمد جعفری
(الہ آباد)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست اس کتاب کو مجلس طیلسانین عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کو مولوی علی محسن صاحب نے اپنے ام اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ اہل اردو کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہو گا۔

تعداد صفحات (۲۰۴) قیمت عا/

اظہارِ مسرت

دکن کی شاہزادیوں کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی پر دکن کی مختلف انجمنوں کی طرف سے جو مبارکباد کا جلسہ بتاریخ ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۹ء منعقد ہوا تھا اس میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے بھی اس کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے اور اس شعبہ کی اراکین نے جو نظمیں پڑھیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بہارِ تازہ ز مغرب بہ ایں دیار آمد　　نبیرۂ شہہ عثمانِ کامگار آمد
منغمے کہ فخامت ز روئے او پیداست　　بہ بر گرفتہ جہاں دُرِ شاہوار آمد

زما پیام رسانند کسے بہ شاہِ دکن
برار بہ تازہ بہ شہزادۂ برار آمد

۲

تعالیٰ اللہ! دعائیں اپنی یہ تاثیر لائی ہیں　　بخیر و عافیت شہزادیاں یورپ سے آئی ہیں
نہ تھی تشویش تک بھی جنگِ موجودہ تباہی کی　　ہمیں تو فکر رہتی تھی فقط ارکانِ شاہی کی
مساجد، خانقاہوں، شاہراہوں اور مکانوں سے　　نکلتی تھی دعائے واپسی لاکھوں زبانوں سے
مقامِ جنگ سے جب تار وحشت ناک آتے تھے　　ستارے آسمانِ سلطنت کے جھلملاتے تھے
کسی اخبار میں گر "واپسی" عنوان نظر آتا　　گماں فی الفور اپنا شاہزادوں کی طرف جاتا
کبھی جب نشرگہ سے تازہ کچھ اعلان ہوتا تھا　　دلوں میں جاں نثاروں کے بپا طوفان ہوتا تھا
دعائیں مانگنے کو اجتماعِ عام ہوتا تھا　　ہر اک فرطِ خضوع سے لرزہ براندام ہوتا تھا
نکلنے بھی نہ پاتی خاکِ سجدہ تک جبینوں سے　　کہ اٹھ کر پوچھتے تھے کیفیت اخبار بینوں سے
امید و بیم کی یہ کشمکش ہر دم ستاتی تھی　　نہ دن کو چین ملتا تھا، نہ شب کو نیند آتی تھی
سفینہ اپنی تقدیروں کا گردابِ بلا میں تھا　　قبیلہ آصفِ سابع کا اک جوکھم فضا میں تھا
بفضلِ رحمتِ پروردگار آخر وہ دن آیا　　رعایائے دکن نے "مژدہ آمد" بھی سن پایا
خدا کا شکر ہے جاتی رہیں بیتابیاں اپنی　　ہجوم شوق سے لبریز ہے اب داستاں اپنی
ریاضِ آصفی میں شادمانی کے ثمر آئے　　بخیر و عافیت سرکار کے لختِ جگر آئے
کرم پویاں پویان و مغتنم در کنار آمد　　دُرِ شہوار با شہزادۂ ملکِ برار آمد

جلالِ ترکمانی از معظم جاہ پیدا شد
فرِ نیلوفری بنگر برنگِ تو ہویدا شد

بشیر النساء بیگم بشیر

تھیں نہاں حسرتیں جو ... اپنی ... زادیں
منہ پہ تھیں ہر ایک کے   اڑ رہی ہوائیاں
دل تھے صرفِ رنج و غم   ہاتھ سوئے آسماں
تھی دعا ہر ایک کی   ... سے ... جاں

— ۲ —

خیریت سے آئیں وہ   خیریت سے آئیں وہ
دل کی اجڑی بستیاں   آ کے پھر بسائیں وہ
اپنے دم سے ملک کو   گلستاں بنائیں وہ
کیف اور سرور کی   ندیاں بہائیں وہ

— ۳ —

بدلیاں دعاؤں کی   تب فلک پہ چھا گئیں
جوشش تبسم کی   جنتیں بھی آ گئیں
... کی تشنگی   اس طرح بسا گئیں

... العالمین

— ۴ —

پھر دکن کی سرزمیں   نازشِ ارم بنی
خیریت سے آئے وہ   لو تھی جن کی لگ رہی
سب ہی جن کے منتظر   دل میں جن کی یاد تھی
جو دکن کے ناز ہیں   شان اپنی جنس کی

— ۵ —

برکتِ درود نے   کر دیا ہے غم غلط
ہر دکن کے فرد سے   یاس درد و وہم غلط
لوحِ دل سے ہو گئے   معنئ الم غلط
گردشِ جہان کی   فکرِ بیش و کم غلط

— ۶ —

پھر وہی چہل پہل   پھر وہی ہے چہچہے
پھر وہی ہنسی خوشی   پھر وہی ہیں قہقہے
جشن ... کا   کم نہ ہو خدا کرے

دورِ انبساطیہ
با خدا سدا رہے

لطیف النساء بیگم

ریلوں کی اردو

ہماری بدترین کمزوریوں میں ہماری غفلت، لاپروائی، پست ذہنیت اور احساس کمتری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب اور زبان کی بربادی گوارا کر رہے ہیں۔ اس بربادی کے اتنے ثبوت دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ تباہی کی یہ نشانیاں دوآبے میں نظر آرہی ہیں اور اس تباہ کاری کو وہی اہلِ زبان گوارا کرتے ہیں جن کی زبان شستہ اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ مجھے بھی علم ہے کہ ریلوں پر ہمارا زور نہیں، آئینی اعتبار سے ریلوے کے کاروبار میں ہمارا عمل دخل نہیں، مگر یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ریلوے بورڈوں میں جتنے ہندوستانی افراد ہیں (چاہے وہ حکومت کے نمائندہ ہوں یا تجارتی اداروں کی طرف سے نمائندگی کر رہے ہوں) اگر وہ متحدہ طور پر ہندوستانی زبانوں کی تحقیر کی مخالفت کریں تو اس خرابی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے۔

مجھے خیال تھا کہ کانگریسی راج قایم ہونے کے بعد تحریری زبان سنبھل جائے گی، سرکاری محکمے زبان کی فصاحت اور پاکیزگی نہیں تو کم از کم صحت کا خیال ضرور کریں گے مگر نہیں وہی پرانا ڈھرا قایم تھا، پرانی بدتمیزیاں موجود تھیں، پرانی زبان کشی جاری تھی۔ بعض گاڑیوں کے نئے نئے ڈبوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، ہر چیز کی ظاہری حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ابھی ابھی یہ ڈبے بنے ہیں، ہر چیز نئی تھی، جابجا ضروری اعلانوں کی تحریریں بھی نئی تھیں صرف —— زبان پرانی تھی! وہی زبان جو صاحب بہادر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ ایک اعلان تھا کہ۔

"مسافروں کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے کہ جب گاڑی چلتی رہے تب گاڑی کے دروازے : کھول رکھیں یا اپنے جسم کے کسی حصے کو کھڑکی یا دروازے کے باہر نہ رکھیں کیونکہ یہ دونوں عادتیں خطرناک ہیں"

خط کشیدہ لفظوں پر غور کیجیے۔ اس سے زیادہ مہمل عبارت اور کیا ہو سکے گی؟ وہ بھی اس ریلوے کی جو اردو اور ہندی کے گہواروں میں ڈولتی ہے، اردو کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی ہے، دوآبے کی دولت سے مالا مال ہو رہی ہے اور ٹھیک بیچ دہلی کی زبانی ٹکسال لال قلعہ میں سے گزرتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو یا معلوم بھی رہا ہو تو بھول گئے ہوں کہ دہلی سے غازی آباد کو جو ریل جاتی ہے وہ شاہانِ دہلی کی قیام گاہ اکبر کے بنائے ہوئے قلعے اور بہادر شاہ ظفر کی آماج گاہ میں سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور اس ریل کی تعمیر کے وقت محض سہولت اور —— کفایت کی خاطر لال قلعے کی دیواروں کو توڑ تاڑ کر ہموار کیا گیا اور رہتی دنیا کے سامنے اپنی بربریت اور غارت پسندی کا ثبوت دیا گیا! غرض، لال قلعہ ٹوٹا، اس میں سے ریل گزری، انگریزی مطلق العنانی کا بھی خاتمہ ہوا مگر ریلوں کی زبان نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! کیا کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ اس قسم کے مہمل جملے کا کہ

"اپنے جسم کے کسی حصے کو باہر نہ رکھیں!"

کیا مطلب ہے؟ اس قسم کے بے معنی اور لغو اعلانوں کا کیا فائدہ؟ کیا اردو کے شیدائی، ہندی کے پریمی، ہندستانی کے دلدادہ

توسیع زبان کا

ر رہے ہیں :

احساس نہیں تو ریلوے کے ممبر ریلوے بورڈوں سے ا ر د ...

یہ ایک ہی اعلان نہیں جسے نظر انداز کیا جاتا۔ اس قسم کے ہزاروں اعلان انگریزی شفاخانوں تار گھروں سرکاری دفتروں اور ریل کے ڈبوں میں نظر آتے ہیں تعجب ہے کہ اردو کی ستیاناسی اسی صوبے میں کی جائے جو اردو کا وطن ہو اور ــــ اہل زبان خاموش بیٹھے رہیں ؟! الہ آباد میں "ہندستانی اکیڈمی" اعظم گڑھ میں "دار المصنفین" قرول باغ میں "اردو اکاڈمی" ہو۔

"ہندی پرچارنی سبھا" کا مسکن بنارس ہو اور انجمن ترقی اردو کا صدر مرکز دہلی میں ہو پھر بھی اس صوبے میں زبان کی توہین آمیز اور حقارت انگیز عبارتیں گوارا کی جائیں!؟ ایک طرف تو سرکاری اور قومی یونیورسٹیوں اور کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور درس گاہوں میں صحیح زبان سکھائی جا رہی ہے، اردو کے استادوں اور اردو کے پروفیسروں پر ملک و قوم کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف سرکار کے محکموں میں، سرکار کی ریلوں میں اردو کی ناقدری ہی نہیں اردو کا ستیاناس اور غارت گری ہو رہی ہے اور ہم آپ خاموش بیٹھے فلسفہ بگھار رہے ہیں!!

جعفر حسن

نغمۂ اردو

اظہارِ مطالب کی جو تو جان ہے اردو
ہر ایک ترا دل سے ثناخوان ہے اردو

جس بزم میں کرتی نہیں تو نغمہ سرائی
کچھ شک نہیں وہ بزم بھی سنسان ہے اردو

رکتی ہی ترقی تری؟ ہوں لاکھ مخالف
دشمن بھی ترا تجھ سے پریشان ہے اردو

کب شستہ و صاف ایسی کوئی اور زبان ہے
کہنے میں سمجھنے میں بھی آسان ہے اردو

کیا تجھ سے کوئی اور زباں کی ہو حکومت
تو شکر کہ قوم کی پہچان ہے اردو

بن جائے گی کچھ روز میں شیرازۂ اقوام
وسعت میں تری اس کا بھی امکان ہے اردو

سرمایہ کیوں علم و ادب کا ہو۔ کہ تیرا
سلطانِ علوم آج نگہبان ہے اردو

اک روز تو ہو جائے زباں سارے جہاں کی
بس دل میں تمکیں کے یہی ارمان ہے اردو

میر حسن علیخان تمکین

اُردو کے خاموش خدمت گذار

موجودہ زمانے میں "روشناس خلق" وہی ہستیاں ہیں جن کو سیاست یا کسی دوسری معرکتہ الآرا تحریک سے نزدیکی تعلق ہو شعراء اور بعض سربرآوردہ مصنفین بھی رسالوں، تذکروں اور سوانح کے طفیل سے اپنی زندگی اور کام کو عوام تک پہنچا دیتے ہیں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے تذکروں کو بھی شوق اور تعظیم سے پڑھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی لوگوں کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوتی رہی ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ان قابل قدر ہستیوں کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتا جن کو قوموں کی تعمیر میں بہت بڑا دخل ہے۔ جن کی مخلصانہ کوشش ہماری نسلوں کے ذوقِ عمل و تحصیل علم کو اکساتی ہیں۔ اور ایسے افرادِ قوم کی ذہنی نشوونما ان کے ذمہ ہوتی ہے جن سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہوتی ہیں دنیا کا کوئی شخص استاد کی گرانمایہ خدمت سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے سوتے ابلتے ہیں جن سے انسانیت کی کھیتی ہری ہوتی ہے۔ یہی وہ انسان نما خضر ہیں جو ہزاروں بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لگاتے ہیں اور نئی نئی شاہراہیں کھولتے ہیں افسوس ہے کہ یہی لوگ زمانے کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ محمد علی جناح اور گاندھی جی کے استاد کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے ان کی زندگی اور طبیعت و اخلاق کے بنانے میں کیا حصہ لیا تھا؟ ہاں ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی زندگیوں کے ایک چھوڑ کئی ایڈیشن نکل سکتے ہیں۔ ان کی حیات کے ہر دور سے لوگ واقف رہیں گے۔ کب فلاں نے فلاں سے ملاقات کی۔ فلاں کی زندگی میں تبدیلی کب پیدا ہوئی۔ غرض کہ ممکنہ معلومات سے ہر شخص واقف ہونا چاہتا ہے۔

میتھو آرنلڈ نے سچے ہیرو کے لقب کو صرف استاد کے لئے مختص قرار دیا ہے اس کے نزدیک اساتذہ صرف اکیلے ہی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہتے بلکہ ایک کاروان کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور تاوقتیکہ ان سب اہل کاروان کو منزلِ مقصود پر پہنچا نہیں دیتے ان کی محنت ٹھکانے نہیں لگتی۔ اساتذۂ اُردو جس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں وہ خود ہماری پستی اور ناقدرشناسی کی دلیل ہے۔ ان اساتذہ کی صحیح عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ان ہی کی کوششوں اور تربیت سے ہر قسم کی علمی و ادبی صلاحیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ استاد ہی کی صحیح تربیت کسی کو شاعر، کسی کو افسانہ نگار اور کسی کو خادم قوم بننے کا موقع دیتی ہے۔ اس مضمون کے شائع کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ صرف اساتذۂ اُردو ہی کے سر ساری عظمتوں کا سہرا ہے بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ ان خاموش خدمت گذاروں کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے یہ میری پہلی کوشش ہے اگر اس میں مجھے کامیابی ہوجائے، اور اُردو کے موجودہ استادوں سے میں اُردو دنیا کو متعارف کراسکا تو میں کوشش کروں گا کہ ایسے اصحاب کے حالات بھی جمع کروں جو اُردو کی تعلیم دیتے ہوئے اپنی زندگیاں ختم کرچکے ہیں

اُردو زبان کی مقبولیت اور وسعت روزافزوں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اس زبان کو بہت بڑی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے اس جامعہ میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اور وہ تمام مغربی علوم و فنون جو غیر زبانوں میں مقید تھے اب آزاد ہیں اس لئے اُردو کے استاد بھی اس دور میں پہلے سے زیادہ توجہ، روشناسی اور قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔

اُردو کے ان بہی خواہوں اور سرپرستوں کی گنتی انگلیوں پر کی جاسکتی ہے اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ادارہ

جنوری ۱۹۴۰ء

۔۔۔ قارئین

۔۔۔ اس کو بہت

۔۔۔ اساتذہ صاحبان سے خط و کتابت

۔۔۔ صاحب نے خط پر میری

مستدعا پر توجہ کرنے کے لیے شخصی اثر و تعلق سے کام لیتے ہوئے سفارش کی لیکن اکثر اساتذہ صاحبان نے روایتی "عدم توجہی" اور "لاجوابی" سے کام لیا۔ بعض نے نہایت ہی مختصر حالاتِ زندگی کے روانہ کرنے پر اکتفا کی۔ بعض نے تصویر بھیجنے سے معذوری ظاہر کی۔ اور اکثروں نے "میرے حالاتِ زندگی کچھ قابلِ ذکر نہیں" ۔ "ایک ۔۔۔ نے ۔۔۔ کے ۔۔۔ اس لئے معذور ہوں" "میں ایک خاموش کارکن ہوں" لکھ کر مجھے مایوس کر دیا۔ دوبارہ اس سلسلے میں یاد دہانی کی گئی تو کچھ زیادہ توجہ سے کام لیا گیا۔ اور اس کے لئے میں سب سے پہلے ڈاکٹر زور کا اور پھر جملہ اساتذہ صاحبین کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ دوسروں کے نزدیک "خاموش کارگزاری" اور "عزلت گزینی" چاہے جس نظر سے بھی دیکھی جائے بحیثیت اردو ادب کے ایک مخلص طالب علم اور سوانح نگار کے میں اس کو ایک ادبی "رجعت پسندی" سے تعبیر کروں گا۔ اس مضمون میں اگر یکل ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایسی ایسی گمنام ہستیاں آپ کے پیشِ نظر رہیں گی جن کی زندگی کا ایک ایک باب ہدایت اور رہنمائی کا دفتر لئے ہوئے ہے

ان ہی خواہانِ اردو کی زندگیاں جن منزلوں سے گزریں، جو جو مراحل ان مستقل مزاج اصحاب کو برداشت کرنے پڑے، جس کس مپرسی اور عزلت گزینی کی حالت میں انھوں نے اپنی زبان اور ادب کی خدمت کی ان سب کو نظروں میں رکھتے ہوئے کون ہے جو خاموش خدمت گذاری اور مستقل مزاجی کا درس نہیں لے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مضمون جملہ اساتذہ صاحبان کی زندگیوں پر روشنی نہ ڈال سکے گا۔ بہر حال اسے ایک ابتدائی کوشش سمجھئے۔ موقع ملے تو ایک مستقل تذکرہ اس موضوع پر ترتیب دیا جا سکے گا۔ اس وقت جن اصحاب کے حالات مہیا ہو سکے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ایل ٹی ۔ (لکھنو)

۲۔ سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد)

۳۔ ڈاکٹر ایم حفیظ سید صاحب ایم اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ۔ ڈی لٹ ۔ ایل ٹی (الہ آباد)

۴۔ مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم ۔ اے (اسمٰعیل کالج جوگیشوری ۔ بمبئی)

۵۔ مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم ۔ اے ۔ مولوی فاضل ۔ ادیب فاضل ۔ دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

۶۔ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ یونیورسٹی)

۷۔ مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم اے ۔ ال ال بی (کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ)

۸۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے (کلیہ بلدہ ۔ جامعہ عثمانیہ)

(۱) مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ۔ ایم اے ۔ ایل ٹی ۔ (لکھنو یونیورسٹی)

آپ نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، اس میں اگر تمول نہ تھا تو پریشان حالی بھی نہ تھی۔ قسمت نے آپ کو ایسے زمانے میں پیدا کیا



پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی



پروفیسر سید مسعود حسن رضوی



شبلی نعمانی ـ اکبر الہ آبادی
نظم طباطبائی ـ شوق قدوائی



پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید

جب کہ عزت و وقار کا کاروان آپ کے برگزیدہ اور اولوالعزم بزرگوں کے ساتھ کوچ کرچکا تھا ۔ آپ گردِ کاروان سے کاروان کی عظمتوں کا اندازہ کرنے کے لئے پیدا ہوئے ۔ میراث میں وہ خاندانی ثروت و دولت نہ ملی البتہ چند سرکاری کاغذ زمانے کی دست برد سے محفوظ تھے یہی اس خاندان کی گزشتہ ترقی اور عروج کی یادگار تھے ۔ وہ لوگ بھی نہ رہے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس خاندان کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھا ۔ ان کاغذات میں آپ کے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہائے چوکی خاص" میں سے تھے ۔ اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے ۔ سید عزیز علی کی ایک بڑی جاگیر نواح گورکھپور میں تھی ۔

آپ کے والد سید مرتضیٰ حسن مرحوم ایک عالم بزرگ اور حاذق طبیب تھے ۔ ان کا وطن اودھ کے ضلع اناؤ میں قصبہ نیوتنی تھا ۔ حصولِ علم کے لئے کشاں کشاں لکھنؤ آئے ۔ جہاں سے بہرائچ پہنچے ۔ مسعود حسن صاحب رضوی کا مقام پیدائش بہرائچ اور تاریخ ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ ہے
آپ کے والد کا خیال تھا کہ آپ طب اور علوم اسلامی میں دستگاہ حاصل کریں ۔ لیکن اردو نے آپ کو اپنی خدمت کے لئے منتخب کرلیا تھا ۔
آپ کی عمر ابھی نو ہی برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ بے کسیوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔ سرپرست کی موت نے سارے حوصلے پست کردیے ۔ بڑے بھائی صاحب [illegible] تھے ۔ آپ کی آئندہ فلاح و بہبود کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا اور وہ آپ کے تعلیمی مصارف کے کفیل ہوتے ۔ ایک بیوہ ماں کی اشک شوئیوں اور تسلیوں نے علم کے شوق کو آنسوؤں کی زد میں بہہ جانے سے روکا اور حصولِ علم کی آگ کو افسردگی کی راکھ میں بجھنے نہ دیا ۔ اور برابر آپ کی ہمت بندھاتی رہیں ۔ آپ کی تعلیمی زندگی اصل میں آپ کی والدۂ محترمہ کی بدولت پروان چڑھی ۔

آپ کی ذاتی استعداد اور دماغی صلاحیت کو بھی آپ کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے ۔ اسکول کے ہر امتحان میں اول آتے اور سال بہ سال ترقی پاتے ۔ آٹھویں درجے میں پہنچے تو درد سر کا عارضہ لاحق ہوگیا اور اب تک یہ درد سر پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ [illegible] میں ایک آدھ دفعہ ضرور سر اٹھاتا ہے سر کے درد کے ساتھ تبخیر معدہ کی شکایت بھی پیدا ہوگئی ۔ تو آپ کو سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے میں سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا ۔ بعض بہی خواہوں نے مشورہ بھی دیا کہ جان ہے تو تعلیم بھی ہے ۔ مگر جو قدم تعلیم کی راہ میں آگے بڑھے وہ رکے اور نہ پیچھے ہٹے ۔ آپ نے اس بیماری کی حالت میں بھی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۱۶ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کا امتحان کامیاب کرلیا ۔ بی اے کے بعد ام اے کا داخلہ لیا ۔ ایک سال ادبیات انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہوسکے ۔ اسی سال آپ پر ہیضے کے مہلک حملے ہوئے ۔ زندگی تھی بچ گئے ۔ اور اس دفعہ آپ کے شوقِ تعلیمی کو بیماری کے آگے سرد ہونا پڑا ۔

اسی اثناء میں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک جگہ نکالی گئی ۔ کام یہ تھا کہ صوبہ میں جتنی کتابیں بھی شائع ہوں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری اخبار (یو۔پی۔ گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے ۔ اور عوام کے رجحان کا اندازہ کرنے کے لئے تبصرے لکھے جائیں ۔ جس سے رپورٹ کے لئے مواد فراہم ہوسکے ۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں آپ کا تقرر اس خدمت پر ہوگیا ۔ اور آپ لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے ۔ اس ملازمت کی بدولت آپ کی نظر سے ہر تازہ کتاب گزرتی ۔ اور مطالعہ کا جو شوق آپ کی فطرت میں تھا اس کی پوری بھڑاس نکلتی ۔ ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں آپ کی

جنوری ۱۹۴۸ء

۱۹۲۲ء میں

۔ آپ کا

امتحان اس امتیاز کے ساتھ
کامیاب کیا کہ آپ کو یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ آپ کی فارسی قابلیت بھی مسلم ہے۔ ۔۔۔ میں آپ نے ایرانی زبان کی تحصیل و تکمیل کے ارادے سے ایران کا سفر بھی کیا۔

۱۹۴۳ء سے ان دونوں اہم زبانوں کے پروفیسر ہیں اور دونوں شعبوں کی صدارت آپ ہی کے تفویض ہے۔ آپ کی موجودہ تنخواہ ساڑھے آٹھ سو ہوا ہے۔ آپ کو قدیم اور نادر کتب کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ ادبیات سے جو گہرا لگاؤ آپ کی طبیعت کو ہے وہ اُردو کی توسیع و اشاعت کا ضامن ہے۔ لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھان چھان کر اور بڑی عرق ریزی کے بعد آپ نے اپنے کتب خانے میں نادر کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کر لیا۔ قدیم تذکرے اور خطوط کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی تصانیف جتنی آپ کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ان کی تعداد چالیس بیالیس کے قریب ہے۔

شاعری آپ کے لئے اگرچہ "ذریعۂ عزت" نہیں پھر بھی جذبات کے اظہار کی خاطر اس کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ آپ کے اشعار جذباتی اور بالکل فطری ہوتے ہیں۔ خاص کر بچوں کے لئے آپ جو نظمیں لکھتے ہیں وہ بہت مفید ہیں اور اردو ادب کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔
خرابیٔ صحت نے آپ کے علمی انہماک میں بہت کچھ رخنہ ڈالا۔ پھر بھی آپ کی قلمی کاوشیں کافی تعداد میں منظر عام پر آچکی ہیں۔
آپ کی ایک تصنیف "ہماری شاعری" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ دوسری اور ادبی کوششیں یہ ہیں جو اُردو کے لئے ایک قابل قدر اضافہ ہیں " امتحان وفا، فرہنگ امثال، فیض میر، مجالس رنگین، دبستان اُردو، روح انیس، نظام اُردو، جواہر سخن جلد دوم۔ ان کے علاوہ کئی ایک تنقیدی مضامین مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے زیر تصنیف "تاریخ مرثیہ" ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہوگی۔ آپ نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے بڑی کاوش سے مرثیوں اور مرثیہ نگاروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ ان میں تقریباً تین سو مرثیہ نگاروں کے کہے ہوئے مرثیے شامل ہیں
آپ کی دیگر علمی و ادبی مصروفیتیں بھی قابل ذکر ہیں آپ "ہندوستانی اکیڈیمی" کے ممبر ہیں اور اکیڈیمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی۔ کئی سال تک انجمن اُردو کے سکریٹری رہے اور انجمن کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں ایک ادبی جلسہ اور ایک ادبی نمائش کی۔ آپ نے جن مختلف علمی و ادبی انجمنوں میں مقالے پڑھے ان کے نام یہ ہیں۔ آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس، آل انڈیا شاعر کانفرنس، مسلم اکیڈیمی وغیرہ۔ مسلم اکیڈیمی لکھنؤ کے سکریٹری، نائب صدر اور صدر بھی رہ چکے ہیں۔

جناب مسعود حسن صاحب رضوی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مسلّمہ ماہر اور ادیب ہیں آپ کی ذات سے اُردو کو بالخصوص ایک بیش بہا امداد اور ترقی کی توقع ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب موصوف کی بیشتر مصروفیتیں اسی کے لئے وقف ہیں۔ ہندوستان کی وہ تمام انجمنیں جنھیں اُردو کی ترویج و توسیع سے دلچسپی ہے آپ کی خدمات کو حاصل کرنا اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے لازمی سمجھتی ہیں۔ آپ کی ہر دلعزیزی، علمی تبحر، اخلاق کی برگزیدگی۔ ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو ایک ایسے درجے پر پہنچا دیتی ہیں جہاں پہنچنا ہر بہی خواہ اُردو کا مقصد ہوتا ہے۔

(۲) کیپٹن سید ضامن علی صاحب ام اے (الہ آباد یونیورسٹی)

سید ضامن علی صاحب ۱۸۹۶ء میں قصبۂ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان گردیز سے ہے یہ خاندان اپنی عزت و وقار کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے اکثر افراد ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اس خاندان نے علم و ادب کے بہی خواہ بھی پیدا کئے۔ آپ کے جد امجد سید نوروز علی صاحب فارسی کے اسکالر اور ہندی کے زبردست شاعر تھے اور شاہان اودھ کے عہد میں ناظم سلطنت جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے۔ ضامن علی صاحب کا ننھیال اور ددھیال علم و فضل اور جاہ و منصب دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ آپ کے ماموں میر علی عباد صاحب سیناؔ ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے آپ کے والد سید واجد علی صاحب بھی اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔

سید ضامن علی صاحب کی آنکھیں ایسے ماحول میں کھلیں، جس میں علم و ادب کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کا مکتب آپ کا گھر ہی تھا۔ بچپن کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ علامہ سید جواد صاحب اور مولانا شیخ فدا حسین سے شرفِ تلمذ رہا۔ علوم شرقیہ کی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ البتہ انگریزی تعلیم کے آغاز کے بعد سے آپ کو مختلف مقامات سے امتحانات پاس کرنے پڑے آپ نے آگرہ سے انٹرمیڈیٹ اور الہ آباد سے بی اے اور ام اے کی اسناد حاصل کیں۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں گریجویٹ ہونے کے بعد ہی الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور کچھ دنوں بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے بھی نامزد کئے گئے لیکن علم و ادب کی خدمت کے شوق نے آپ کو اس کام سے بیزار کر دیا اور آپ نے ایونگ کرسچن کالج میں فارسی کا پروفیسر بننا پسند کیا۔ اور کم و بیش چھے سال تک اس کالج میں اپنا فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی پروفیسر جناب ناصری مرحوم جب بجنور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے تو یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور جب اس یونیورسٹی میں پہلے پہل شعبۂ اُردو کھولا گیا تو آپ ہی اس کے صدر مقرر کئے گئے آپ کی علمی قابلیت، طریقۂ تعلیم اور حسن خلق کا ہر شخص معترف ہے اور آپ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں

آپ کی دماغی صلاحیتوں کو شاعرانہ ماحول ملا۔ علم و ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آپ بچپن ہی سے اس آب حیات کے پیاسے تھے اور اپنی تمام کوششوں کو حصول اور خدمت علم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے آپ کی شاعری حضرت ضیاؔ کے فیض صحبت کی مرہونِ منت ہے۔ یونیورسٹی کے لکچروں کے علاوہ آپ اُردو کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اُردو زبان اور ادب پر آپ نے ایک زبردست اور عالمانہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈمی اور سپرو کمیٹی کی رپورٹ پر پیش کیا گیا۔ تاریخ زبان اور اُردو ادب پر اس مقالے کے پڑھنے سے کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔

قصائد، سلام، رباعی، مرثیے بھی آپ کی طبع موزوں اور فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے ایک تاریخی مقالہ "واقعات کربلا" پر اورنٹیل کانفرنس میں پڑھا۔ علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ اور وہی لوگ آپ کی کاوش اور محنت کی داد دے سکیں گے۔ اس مقالہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔

مرثیہ نگاری آپ کا مرغوب موضوع ہے۔ آپ نے اس کی تحقیق و تاریخ کی ترتیب کا کام شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد اس صنف پر سیر حاصل مواد منظر عام پر آجائے گا۔ آپ کی دوسری تصانیف "سیر کشمیر اور گوہر سیلون" ہیں۔ ان کتابوں میں سیر کشمیر اور سیلون کے حالات درج ہیں۔

جنوری ۱۹۴۰ء

[illegible]

[illegible]

وقت دیتے ہیں اور لوزمنٹ

آپ کی گرانمایہ خدمات اُردو کے لئے ایک بیش بہا اضافہ [illegible] کتابیں جلد شائع ہو کر منظرِ عام پر آسکیں۔

(۳) ڈاکٹر ایم حفیظ سیّد صاحب۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ال ٹی الٰہ آباد یونیورسٹی

میرے پہلے عریضے کے جواب میں صاحب موصوف نے لکھا "مجھے افسوس ہے کہ میرے یہاں اپنی کوئی تصویر موجود نہیں [illegible] تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہے۔ میرے حالات نہایت مختصر ہیں [illegible] الٰہ آباد یونیورسٹی میں اُردو [illegible] ایم اے کی [illegible] کو پڑھاتا ہوں۔" اس اختصار نے مجھے مایوس سا کر دیا اس صورت میں آپ کے مفصل حالات زندگی اور کام [illegible] میرے بس کی بات نہ تھی۔ جانتا تھا کہ صاحب موصوف "گمنامی کی زندگی کو شہرت اور ناموری پر ترجیح دیتے ہیں" لیکن دوسری دفعہ پھر اسی سلسلے میں یاد دہانی کی۔ بارے جواب خط کے ساتھ تصویر بھی وصول ہوئی۔ حالات اور کام "کافی" کے بجائے صرف "مختصر" [illegible] گئے۔ جس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔

آپ کے والد کا نام نظر حسن اور وطن ضلع غازی پور ہے۔ ضلع کے زمینداروں میں ان کا شمار تھا۔ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے خود بھی ایک "خوب کہنے والے" شاعر تھے۔ نظر تخلص کرتے تھے۔ ایک مثنوی "جلوۂ طور" انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم [illegible] کی [illegible] الٰہ آباد کے سکول اور کالجوں میں بی اے کی تعلیم پائی بی اے کی ڈگری لینے کے بعد آپ نے الٰہ آباد ٹریننگ کالج سے ال ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کر لی۔ دس سال تک مختلف مدارس اور کالجوں میں ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۵ء سے الٰہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کی لکچراری پر مامور ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی اور ۱۹۳۳ء میں ڈی لٹ کی ڈگری جامعہ ماپل لئے سے حاصل کی۔

آپ نے حصولِ علم اور تحقیقاتی کام کے لئے بہت دور دراز سفر کئے۔ ڈی لٹ کی ڈگری فرانس کی ایک قدیم یونیورسٹی "ماپل لئے" سے حاصل کی۔ آپ کو فلسفہ و تصوف سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ درس و تدریس میں آپ کا تجربہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ لندن سے ٹیچرس ڈپلوما حاصل کیا۔ الٰہ آباد کے ال ٹی ہیں۔ اور عمر کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیمات کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں۔

آپ کی ادبی کاوشیں، مقالوں، مضمونوں اور کتابوں کی صورت میں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ آپ نے صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی اپنے علمی شغف اور تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

[illegible]

[illegible] شاہ جام

قاضی محمود بحری یہ کتاب (A mystic poet of 12 th century) کے عنوان سے مستقل طور پر انگریزی میں بھی لکھی گئی ہے

کلیات قاضی محمود بحری - مع مقدمہ تشریح اور فرہنگ - یہ ڈاکٹر صاحب کا نہایت معرکتہ آلارا اور اہم کارنامہ ہے جس میں دکنی سلطنتوں کے آخری دور کے شاعر بحری کے کلام کو بڑی تحقیق کے ساتھ شایع کیا گیا ہے - یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا - کیونکہ قدیم اُردو کے قلمی نسخوں کو پڑھنا اور متروک الفاظ کو سمجھنا بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی مشکل ہے - اس کلیات کی اشاعت نے ڈاکٹر سید صاحب کو اُردو کے بلند پایہ محققوں کی صف میں ممتاز جگہ دے دی ہے -

"دکن کی اُردو شاعری" - (یہ مضمون نگار میں چھپا تھا) "بنگالی شعرائے اُردو" - "یوروپین شعرائے اُردو" (زمانہ کانپور)

"غالب کے کلام کا مطالعہ" (الہ آباد یونیورسٹی میگزین)

اسی طرح حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، دیوان جہاں وغیرہ پر آپ کے مضامین شایع ہوئے - فرانسیسی میں آپ نے ایک کتاب "آپٹی میزم ان انڈین تھاٹ" (ہندوستانی تخیل میں رجائیت) شائع کی ہے -

آپ کئی انجمنوں کے معتمد اور ممبر ہیں - کئی کمیٹیوں کے سرگرم کارکن اور جسٹات "Barreau" مجالس کے ممبر بھی ہیں - الہ آباد آگرہ اور یوپی کی اکثر تعلیماتی کمیٹیوں کے مشیر اور ممبر ہیں - اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر آپ کا شمار شمالی ہند کے سربرآوردہ ماہرین تعلیم میں ہو سکتا ہے آپ نے ہندوستان اور دیگر مقامات کا سفر کیا، صوبجات بمبئی، متوسط اور یوپی کے مختلف مدارس کا معائنہ کیا اور وہاں کے اصول تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کیں اُردو زبان اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور فن تعلیم پر بھی آپ کے پچاسوں مضامین اکثر انگریزی اُردو رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں - آپ کی ذات اُردو اور سررشتہ تعلیم کے لئے بے حد غنیمت ہے -

صاحب موصوف کی تصنیفات اور مضامین اُردو زبان کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں - مشاہیر اُردو ادب جن کے جواہر پاروں کو صرف سطحی نظروں سے جانچا جاتا تھا، آپ نے ایک ایسے انداز میں روشناس کرایا ہے جس سے ان کی عظمتوں پر ہر پہلو سے روشنی پڑتی ہے - اور وہ منور گوشے جن پر کور ذوقی نے پردے ڈال رکھے تھے روشن نظر آتے ہیں - آپ نے شاہ برہان الدین جانم، قاضی محمود بحری، محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، غالب اور دوسرے شعرا اور مصنفین کا جس غائر نظری سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کے بعد جس انداز سے ان پر اپنے خیالات اور ان کے محاسن کو پیش کیا ہے، اس سے آپ کی تنقیدی صلاحیتوں اور قوت اخذ و تحقیق کا اندازہ ہو سکتا ہے - دکن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے - شمالی ہند میں دکن کے قدیم شاعروں کو روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے قدیم زبان کو سمجھنا اور اس پر کام کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے -

(۴) مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ام اے - (اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی)

ولادت ۶ر جون ۱۹۰۱ء - مقام ولادت ارموری - ضلع چاندہ - آپ کے والد ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب ارموری کے سرکاری ڈاکٹر تھے - آپ زیدی واسطی سید ہیں اور سادات بارہا سے خاندانی تعلق رکھتے ہیں جو فرخ سیر کے زمانے سے دیسنہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں سکونت پذیر رہے -

آپ کی ابتدائی تعلیم مرہٹی سے ہوئی چنانچہ اس زبان میں ورناکلر فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوئے - اس کے بعد قرآن شریف، اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم پائی - ۱۹۰۹ء میں آپ کو دارالعلوم ندوہ بھیج دیا گیا - آپ ندوہ میں چار سال تک رہے - اس دوران میں آپ اپنی جماعت میں ہر سال اول آتے رہے - اور ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے - آپ مولانا شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں

جنوری ۱۹۲ء
ت تے آپ ان سے

میں کامیاب کئے اور وظائف

بیم قطع کرنا پڑا آپ ۱۹۲ء میں

دارالمصنفین اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں آپ کی دلچسپیاں زیادہ تر علمی و تحقیقی رہیں۔ اس دوران میں ترک موالات کا ہنگامہ کچھ کم ہوا۔ آپ نے پھر تعلیم کی طرف توجہ کی اور بی اے میں شرکت کی۔ ۱۹۲۴ء میں بی اے کا امتحان آنرز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اور یونیورسٹی کے جملہ طلبا میں اول رہے۔ یونیورسٹی نے وظیفہ عطا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں ام اے فارسی و عربی بھی درجہ اول میں پاس کیا اور سب میں اول رہے۔ اس صلے میں یونیورسٹی نے طلائی تمغہ اور ڈیڑھ سو روپے کی کتابیں دیں

سلسلۂ تعلیم کو ختم کرنے کے بعد آپ علمی خدمت میں منہمک ہوگئے اور دارالمصنفین کا کام کرتے رہے اور اپنی بیش بہا خدمات سے اُردو اور دارالمصنفین کو مستفیض کیا ساتھ ہی مختلف رسائل کو مضامین بھی روانہ کرنے لگے۔ آپ ۱۹۳ء میں گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ اُردو کے سچے بہی خواہ اور خدمت گذار ہیں صوبہ کی انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری ہیں۔ آج کل آپ ایک نہایت ہی گرانمایہ اور اہم کتاب کے لکھنے میں مصروف ہیں اس کتاب کی اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے یعنی "گجرات میں اردو" اور یہ صاحب موصوف کی دس سالہ تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہو گی۔ ۱۹۳ء سے آپ اسمٰعیل کالج بمبئی یونیورسٹی کے اُردو کے استاد ہیں۔ رقعات عالمگیری کی دوسری جلدوں کی ترتیب کا کام بھی آپ کے پیش نظر ہے دوسری علمی مصروفیتوں کے ذکر میں آپ یونیورسٹی کے اُردو بورڈ کے رکن اور اردو ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ہیں۔

نجیب اشرف صاحب ندوی کا نام اُردو کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کی کتابیں اور مضامین اہمیت اور معلومات کے اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور آپ ہندستان کے اچھے محققین اور ادیبوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پاتے ہیں۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ جو منظر عام پر آچکا ہے رقعات عالمگیر اور ان کا معرکۃ الآرا مقدمہ ہے جس کی ترتیب و تالیف نے آپ کو ایک بلند پایہ محقق ثابت کر دیا۔

(۵) مولٰنا محمد طاہر صاحب فاروقی ام اے۔ مولوی فاضل، ادیب فاضل، دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

مولٰنا السنہ اربعہ (عربی، فارسی، اُردو، انگریزی) کے مستند اور متبحر عالم ہیں۔ اور ساتھ ہی ہومیوپیتھک کے امتحان ایچ ایل، ایم، ایس کے سند یافتہ اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ ہندوستان کی مختلف جامعات سے آپ نے امتیازی کامیابی حاصل کی لکھنؤ سے دبیر کامل، الہ آباد سے منشی کامل اور مولوی فاضل پنجاب سے مولوی عالم اور ادیب فاضل کی اسناد حاصل کیں اور تقریباً پندرہ سال سے اردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ پانچ چھے سال سے آگرہ کالج میں صدر شعبۂ اُردو فارسی ہیں۔

آپ کے اکثر مضامین رسائل میں طبع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے طلبہ کے لئے متعدد نصابی کتب لکھیں۔ ان کے علاوہ چند قابل ذکر تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) سیرت مولٰنا محمد علی۔ مولٰنا کی وفات کے بعد ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے فاروقی صاحب ہی نے یہ مختصر لیکن جامع سیرت لکھی

اس کتاب میں مصنف نے بعض ایسے حالات بھی لکھے ہیں جو خاندانی ذرائع سے حاصل کئے گئے۔ فاروقی صاحب کو مولانا سے ایک خاص تعلق، اپنے والد کی طرف سے تھا۔ مولانا اور فاروقی صاحب کے والد محمد محسن مرحوم بڑے گہرے دوست تھے۔ اور اسی دوستانہ کی وجہ سے فاروقی صاحب کو بعض ایسی معلومات بہم پہونچیں جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسلوب بیان نہایت عمدہ اور محققانہ شان لئے ہوئے ہے۔ مولانا کی سیرت پر ایک تشفی بخش اور کامل ریویو کیا گیا ہے۔ ہندستان میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سرکار دوعالم۔ حضور سرور کائنات صلعم کی مختصر سیرت پاک ہے جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہی نام انتخاب کیا ہے لیکن فاروقی صاحب کی کتاب بہت پہلے طبع ہوچکی ہے۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی زندگی کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے طرز بیان نہایت موزوں اور موضوع کے شایانِ شان ہے۔

ادبیات ایران نو۔ ایران کی جدید شاعری کو ہندستان میں روشناس کرنے کے لئے پروفیسر فاروقی نے شعرائے ایران کے نظم و نثر کے مختلف نمونے جمع کرکے پیش کئے ہیں اور موجودہ ایران کی ذہنی کش مکش اور رجحان کو ایک مبسوط مقدمہ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب پر مختلف جامعات کے پروفیسر صاحبان نے بڑی اچھی تنقیدیں کی ہیں۔

سیرت اقبال یہ کتاب فاروقی صاحب کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن فاروقی صاحب نے اقبال کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے۔ اور آپ کی کتاب کو "اقبالیات" میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولانا فاروقی بزم اقبال آگرہ کے بانی بھی ہیں۔ اسی بزم کی سرپرستی میں دو شاندار جلسے "یوم اقبال" اور "یوم اردو" کے ترتیب دئے گئے۔ اس بزم کے پیش نظر دو مقاصد ہیں ایک تو یہ کہ زبان اُردو کی خدمت اور دوسرا پیغام اقبال کی اشاعت۔

جامعۂ اُردو۔ مولانا فاروقی کی تحریک سے بزم اقبال کی سرپرستی میں آگرہ میں ایک اُردو یونیورسٹی کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے جس کو سر محمد یعقوب ممبر کونسل ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ خواجہ غلام السیدین کی سرپرستی حاصل ہے۔ فاروقی صاحب اس کے رجسٹرار ہیں۔ جامعہ مذکورہ کی نگرانی میں تین امتحانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل۔ اس تحریک کا اولین مقصد ترویج و خدمت اُردو ہے۔ فاروقی صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کو مشکور اور کامیاب دیکھنے کی آرزو ہر بہی خواہ اُردو کے دل میں ہونی چاہئے۔

(۶) پروفیسر حامد حسن صاحب قادری۔ (آگرہ)

میرے خط کے جواب میں، جس میں میں نے صاحب موصوف سے تصویر، حالات زندگی اور کام کا خاکہ روانہ کرنے کی درخواست کی تھی آپ نے تحریر فرمایا ہے "آپ مجھ سے مری تصویر اور حالات مانگتے ہیں۔ میں تصویر کے جواب میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ

"مجھ کو دیکھو میری تصویر میں کیا رکھا ہے" نہ یہ کہ

"ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا"

تصویر کھنچوانے سے مجھے پرہیز نہیں۔ لیکن دوا کے طور پر گوارا کرلیتا ہوں اب کئی سال سے کوئی تصویر نہیں کھینچی۔ اس لئے بھیجنے سے معذور ہوں مجھے نہ صرف تصویر کی عدم وصولی کا بلکہ آپ نے حالاتِ زندگی بیان کرنے میں جس اختصار سے کام لیا ہے اس کا بھی ذکر کردینا چاہئے۔ میں

...غل ہے۔

...اپ ہی کے تفویض ہے۔

...مضامین، نظموں اور غزلوں

سے مزین رہتے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے، ایک انگریزی ناول کا خلاصہ مرتب کیا۔ جسے اخبار پھول نے چھپوایا۔ اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک تین چھوٹی کتابیں گلدستۂ اخلاق، رفیق تنہائی اور حسینین لکھیں ۱۹۰۶ء سے آپ نے میدانِ صحافت میں باقاعدہ قدم رکھا۔ آپ کی نظمیں اور مضامین زمانہ، مخزن، علی گڑھ منتھلی وغیرہ جیسے مقتدر رسائل میں طبع ہونا شروع ہوئے اور علمی طبقہ میں آپ ایک اچھے شاعر اور کامیاب انشاپرداز سمجھے جانے لگے۔

آپ نے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک بچوں کا ایک پرچہ "اخبار سعید" نکالا اور اسی اخبار کے سلسلہ میں "بچوں کا کتب خانہ" جاری کیا اور بچوں کے لئے متعدد اخلاقی کتابیں لکھیں۔ آپ کی مختلف چھوٹی اور بڑی تصنیفات ایک کثیر تعداد میں ہیں۔ جن میں سے اکثر مختلف صوبوں اور محکموں کے نصاب میں جاری اور رائج ہیں۔ بالخصوص شعبۂ تعلیم سے متعلق اور طلبہ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے بعض بہت قیمتی اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں یہاں میں آپ کی چند مشہور تصانیف و تراجم کا نام دے دینا ضروری سمجھتا ہوں (۱) باغبان۔ یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" کا ترجمہ ہے جو مکملن کمپنی کی فرمائش پر کیا گیا، ترجمہ رفتہ و شستہ اُردو میں ہے (۲) الکھیل اور زندگی۔ یہ کتاب بھی مکملن کمپنی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ (۳) فطرت اطفال۔ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے طبع کیا۔ (۴) کمال داغ۔ داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب ایک مبسوط ناقدانہ اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ ہے۔ (۵) تاریخ مرثیہ گوئی۔ اپنی کتاب میں مختصراً مرثیہ کی ابتدا اور عروج کے حالات بیان کئے ہیں اور مرثیہ سے متعلق جملہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ (۶) تاریخ و تنقید ادبیات اُردو۔ شعر و ادب اُردو کے متعلق تاریخی و تنقیدی مضامین اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ مزید براں ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں "اردو، ہندی، ہندستانی" کے مسئلہ پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب "داستان تاریخ اُردو" کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں اردو کی مکمل تاریخ مل سکتی ہے اور بعض گم نام ہستیاں جنھیں دوسرے تذکروں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے منظر عام پر آجاتی ہیں۔ اور مصنف کو بعض ذرائع سے ایسے ناپید نسخے بھی ملے ہیں جنھیں اُردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً فضلی کی "کربل کتھا"

آپ کی مرتبہ دوسری اور بہت سی کتابیں ہیں۔ جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر آپ کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعے۔ ناول اور تنقیدی و تاریخی تحریریں شامل ہیں۔ ان مرتبہ کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) مرأت سخن۔ (۲) دفتر تواریخ (۳) صید و صیاد (۴) تذکرہ ہمایوں وغیرہ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اُردو کے لئے ایک اضافہ ہیں تقریباً ہر موضوع پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور یہی خصوصیات آپ کو اپنے دوسرے ہمسروں سے ممتاز بناتی ہیں، زمانہ ایسے باہمت اور لایق اصحاب کے لئے مواقع مہیا کرے تو اردو ادب کی کم مایگی کا بہت کچھ ازالہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی علمی انہماک میں بسر ہوئی



پروفیسر سید محمد



پروفیسر عبدالقادر سروری



میرزا لطیف علی خاں
کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو



خواجہ حمید الدین شاہد
مہتمم مدیر سب رس و ادارۂ ادبیات اردو

بچپن ہی سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک کئی قابل قدر کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

(۷) عبدالقادر صاحب سروری ام اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

حیدرآباد کی علمی بیداری جامعہ عثمانیہ کے چند ہونہار فرزندوں کی مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔ انھیں ادیبوں اور انشا پردازوں کی کوششوں نے دکن کو علم و ادب کا مرکز اور ایک خاص اہمیت کا مالک بنا دیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا شمار بھی انہیں ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے حیدرآباد کی علمی دنیا میں انقلاب کی روح پھونکی جن کی تالیفات اور تصانیف نے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جو بجا طور پر اُردو کا "دورِ نشاط" کہلایا جا سکتا ہے۔ صاحب موصوف نے تنقید، ترتیب، اور انشا پردازی کے لئے نئے اصولوں اور انوکھے اسلوب اختیار کئے اور تشنگانِ علم و ادب کے لئے نئے نئے راستے کھول دئے۔ حیدرآباد کے اکثر ادیب اور انشا پرداز کسی نہ کسی طرح آپ کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سروری صاحب کی شہرت حیدرآباد تک ہی محدود نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں آپ کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال مجھے علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ وہاں میرے ایک دوست زیرِ تعلیم تھے۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی علمی فضا میں کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب موصوف کے شاگرد ہونے کی سعادت نے مجھے جس "لطفِ خاص" کا مستحق قرار دیا، اس سے میں آپ کی عظمتوں کا اور بھی معترف ہوا۔ سروری صاحب کی گرانمایہ تصنیف "جدید اردو شاعری" نے آپ کو اکثر یونیورسٹیوں میں ایک فاضل ادیب کی حیثیت سے روشناس کیا ہے۔ علی گڑھ میں اسی کتاب کو "نصابی کتب" کا درجہ حاصل ہے۔ وہیں مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ حیدرآباد علمی حیثیت سے چاہے کتنا ہی آگے ہو، حسن شناسی اور قدردانی کے میدان میں اس نے قدم نہیں اٹھائے۔ سروری صاحب علم و ادب کی خدمت میں اپنی پوری صلاحیتوں کو وقف کئے ہوئے ہیں اور صلہ و تحسین کا خیال کئے بغیر خدمتِ علم و ادب میں مصروف ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۳۲۱ھ میں حیدرآباد دکن کے محلہ سلطان شاہی میں ہوئی۔ یہ مشہور قطب شاہی محلہ حیدرآباد کے اکثر علماء و فضلا کا مسکن رہ چکا ہے۔ یہیں کے ادبی ماحول میں آپ کی ذہنی صلاحیتوں نے ایک خاص رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ آپ کے والد ماجد حاجی محمد سرور قادری، معاشدار اور بڑے پابند اوقات بزرگ ہیں۔

آپ کے جدِ امجد حضرت سرور سلطان کشمیر سے تشریف لائے تھے انہیں بزرگ کی نسبت سے آپ سروری کہلاتے ہیں۔ حضرت سرور سلطان ایک باخدا بزرگ تھے۔ حیدرآباد آکر نوبت پہاڑ پر چلہ نشین ہوئے اور ارادتمندوں اور اہلِ غرض کو اپنی روحانی برکات سے مالا مال کرتے رہے۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ کا مزار اسی پہاڑ پر بنایا گیا اور آج تک آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے انھیں بزرگوں کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے سروری صاحب نے میدانِ علم میں قدم رکھا۔ آپ کے والد انگریزی تعلیم کے مخالف تھے وہ آپ کو مشرقی علوم و فنون کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت نے آپ کو اُردو کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ نے ہر قسم کی قربانی قبول کی۔ اور ایک ایسی منزل میں قدم رکھا جہاں دشواریاں سدِ راہ تھیں۔ اور سب سے بڑی مصیبت سرپرستوں کی توجہ سے محرومی تھی۔ اس پر بھی آپ نے جدید علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد بنایا۔ ایک ادیب کی زندگی کو جن "روایتی" مصایب سے دوچار ہونا پڑتا ہے آپ کی قسمت میں بھی تھیں۔

" درس دیا کرتے تھے۔

ئی اسکول"

ابتدائی منزلوں میں ہو چکا تھا

ے سٹی کالج حیدرآباد کا قدیم

اور مشہور کالج ہے حیدرآباد قانون ادیب ۔۔۔ ہو "مفید الانام" کے بعد آپ

مدرسہ فوقانیہ بلدہ میں شریک ہوگئے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ حاصل کیا۔ اُردو، فارسی آپ کے اختیاری مضامین رہے۔ مولانا وحید الدین سلیم کی شاگردی میں آپ کے علمی جوہر اجاگر ہونے لگے۔ آپ مولانا کے چہیتے شاگرد تھے۔ مولانا کی جوہر شناسی نے آپ کی ہر قسم کی رہنمائی کی اور جب رخصت پر تشریف لے جا رہے تھے تو مولانا نے اُردو کی مددگار پروفیسری کے لئے آپ ہی کی سفارش کی۔ اسی سفارش اور ذاتی قابلیت کی بناء پر آپ موجودہ عہدے پر مامور ہوگئے۔

سروری صاحب ام اے۔ ایل ایل بی ہیں۔ ان دونوں امتحانوں میں امتیازی درجہ سے کامیابی حاصل کی۔ ام اے میں ساری یونیورسٹی میں دوم اور ال ال بی میں درجہ اول اور بعض مضامین میں اول رہے۔ قانون کے امتحان کی کامیابی کا اثر آپ کی ادبی مصروفیتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر جدید مطبوعات کے "مقدمے" آپ نے لکھے ہیں "مقدمے" لکھنے میں سروری صاحب کو خاص کمال حاصل ہوگیا ہے۔ آپ کی علمی مصروفیت قابل تقلید ہے۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے بعد آپ کا بیشتر وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے۔ کالج میں بھی آپ اسی طرح مصروف رہتے ہیں۔ آپ جو کچھ لکھتے ہیں احتیاط اور کاوش سے لکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کی تحریر میں روانی بے ساختگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جو قابل تعریف ہے۔ سروری صاحب کی کتابیں مختلف موضوع پر مشتمل ہے۔ آپ کے مرغوب موضوع، تنقید، افسانہ نگاری تاریخ اور مثنوی ہیں۔

"جدید اردو شاعری" کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ کتاب آپ کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر ہندستان کے مختلف مقتدر جرائد نے بلندپایہ تنقیدیں کی ہیں اور یہ اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ جدید اُردو شاعری کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مستند تنقیدی کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے موجودہ زمانے کے شاعرانہ رجحانات کا عمدگی سے پتہ چلتا ہے۔ اور اُردو شاعری کی مکمل تاریخ سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس کے لکھنے میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں

سروری صاحب ہندستان کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں آپ کے افسانے سنجیدہ ظرافت کے نمونے ہوتے ہیں اکثر رسائل آپ کے افسانوں کو چھاپنا اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی جز وبھی آپ کے افسانوں میں شریک رہتا ہے، اور جس خوبی سے آپ ان مسائل کو سلجھاتے اور پیش کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے آپ کے افسانوں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اور اسی فن سے متعلق آپ کی دو کتابیں "دنیائے افسانہ" اور "کردار اور افسانہ" شایع ہو چکی ہیں۔ نیز آپ نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ رسالہ "مکتبہ مجلہ" کے ایڈیٹر بھی کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں۔ "حیدرآباد کی تعلیمی ترقی" یہ کتاب اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ آپ نے کئی مشہور قدیم کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے

جن میں قابل ذکر، مثنوی پھول بن، از ابن نشاطی - کلیات سراج اورنگ آبادی - مثنوی قصۂ بے نظیر، از صنعتی بیجاپوری - ان کتابوں کے سلسلے میں آپ نے خاص تحقیقی کام کیا ہے - اور ہر ایک پر مبسوط اور مفصل مقدمہ مع تشریح کے سپرد قلم کیا ہے -

آپ ادارۂ ادبیات اُردو کے سرگرم ارباب کار میں سے ہیں اور عالی جناب ڈاکٹر زورؔ کے دست راست ہیں - ادارہ کے شعبۂ امتحانات و تنقید کے معتمد بھی ہیں -

آپ کی ذات سے اُردو کو بڑی بڑی امیدیں ہیں اور بالخصوص حیدرآباد کا ادبی ماحول آپ کے وجود کو بہت غنیمت سمجھتا ہے - آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ آپ نوجوان انشاپردازوں اور بالخصوص افسانہ نگاروں کی صحیح تربیت دماغی کرتے ہیں اور ان کے رجحان کے مطابق ان کو ایک راستے پر ڈال دیتے ہیں اب تک کئی افراد آپ کی ان کوششوں سے متمتع ہوکر "افسانوی دنیا" میں شہرت حاصل کر چکے ہیں -

(۸) سیّد محمد صاحب ام اے (عثمانیہ)

سید محمد صاحب ۱۹۰۶ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے - ابتداً مدرسہ مفید الانام میں شریک ہوئے - اس مدرسے سے مڈل کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا اور سٹی ہائی اسکول میں شرکت کی ۱۹۲۲ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کیا اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ بدرجۂ اعلیٰ کامیاب کیا اور اُردو میں صد فی صد نمبر لئے - ۱۹۲۶ء میں بی اے اور ۱۹۲۸ء میں ام اے کی ڈگری حاصل کی - مولنا سلیم کے زمرۂ تلامذہ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل رہا - اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اُردو میں اول آتے رہے -

آپ کا تعلیمی دور بے حد شاندار رہا - خصوصاً اُردو میں جو امتیازات آپ کو شروع ہی سے حاصل رہے وہ شاہد ہیں کہ آپ کو اُردو سے خاص اور فطری لگاؤ ہے - زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو تحریر و تقریر کے مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور ہر مقابلہ میں آپ اول آتے -

سٹی کالج کے ادبی ماحول کو آپ ہی کی ذات سے زندگی حاصل ہے - کئی نوجوان آپ کی تربیت کے زیر اثر ادبی دنیا میں روشناس ہیں - حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سید محمد صاحب کا درجہ بہت بلند ہے - آپ نے اپنی گرانمایہ تصانیف کے ذریعہ ایک مقتدر ادیب اور محقق کی شہرت حاصل کرلی ہے - آپ کی سب سے پہلی تصنیف "ارباب نثر اردو" ہے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اُردو نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے - ہر مصنف کے متعلق نہایت تحقیق کے ساتھ مواد جمع کرکے سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے - اس کتاب کو علمی حلقے میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کئی جامعات کے اُردو کے اعلیٰ امتحانات میں شریک نصاب کی گئی ہے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں -

سید محمد صاحب ۱۹۲۸ء سے سٹی کالج کے اُردو کے لکچرار ہیں - اس دوران میں آپ نے طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور پھر ان کی ادبی رہنمائی کرنے میں خاص محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ سٹی کالج اب بھی اپنی "مردم خیزی" کی شہرت کو برقرار رکھ سکا - صاحب موصوف کا بیشتر وقت علمی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے - آپ کئی انجمنوں کے سرگرم کارکن ہیں - مجلہ طیلسانین کے رکن ادارت اور معتمد ہیں اور آپ کے اکثر مضامین مقتدر رسائل میں شایع ہوا کرتے ہیں

ایمان سخن۔ شیر محمد خاں ایمان سے کلام ۱/۔ ۔ ۔

یادگار ولی۔ بابائے ریختہ کے جشن یادگار کا مجموعہ

قواعد فارسی۔ راست اصول تعلیم پر فارسی کی ابتدائی قواعد

مرقع اُردو۔ اردوئے جدید کے نظم و نثر کا انتخاب

ان کتابوں کو بڑے سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ ایک تنقیدی مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ ہوجاتا ہے۔

مثنویات میر۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب اردو میں داخل ہے۔ قواعد فارسی اور دوسری کتابیں اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ سید صاحب کو قدیم اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے آپ معتمد ہیں۔ حال ہی میں آپ کی مرتبہ دو نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ملک الشعرا نصرتی کی مثنوی گلشن عشق اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا نایاب دیوان۔

سید صاحب کی تحریر میں تنقیدی شان ہوتی ہے۔ طرز نگارش سادہ اور سلیس ہوتی ہے اور آپ کے قدرت بیان کی شاہد۔ حیدرآباد کے موجودہ دور میں اُردو ادب کے سچے خدمت گذار اور بہی خواہ ڈھونڈے جائیں تو جناب ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری اور جناب سید محمد صاحب پر ہی نظریں اٹھتی ہیں۔ اور دکن میں یہی "ارباب نثر اُردو" کہلانے کے مستحق ہیں۔

رشید قریشی

سب رس

کا

"فضائی ادب" نمبر

مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوگا

اس نمبر میں نشرگاہ حیدرآباد کی نشر شدہ تقاریر کا معیاری انتخاب شائع کیا جارہا ہے۔

ملک کے مشاہیر کی اپنے خاص موضوعوں پر دلچسپ اور عام فہم تقریریں

اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ نمبر قابل دید ہوگا۔

نصرتی کا سنہ وفات

بیجاپور کے قدیم اردو شاعروں ملا نصرتی کو غزل، قصیدہ، اور مثنوی وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں کمال حاصل تھا اور وہ اپنے تمام ہم عصر شاعروں میں اپنی دل پذیر طرزِ نگارش اور بلند فکر کی وجہ سے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت رکھتا ہے۔ اس کی رزمیہ مثنوی علی نامہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے اور اردو ادب میں اپنی طرز کی ایک لاجواب شاہکار ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں بہت زیادہ مشہور ہوتی ہیں، ان کے حالات و واقعات زندگی کے متعلق طرح طرح کے اختلافات مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں نظر آتے ہیں اور عجیب بے سروپا باتیں مشہور ہوجاتی ہیں۔ نصرتی کا بھی یہی حال ہے۔ کسی نے اس کو برہمن بتایا ہے اور کسی نے بیجاپور کی بجائے کرناٹک کو اس کا وطن قرار دیا ہے۔ اس کی تصانیف اور ان کی تاریخوں نیز اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی کئی اختلاف موجود ہیں۔

غزلوں اور متفرق کلام کے علاوہ اس کی تین مثنویاں مستقل ہیں۔ ایک گلشنِ عشق[1]، دوسری علی نامہ اور تیسری تاریخِ اسکندری۔ ان میں سے پہلی مثنوی گلشنِ عشق کا سنہ تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے اور اس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔

علی نامے کی تاریخ تصنیف مولف اردوئے قدیم نے ۱۰۷۱ھ بتائی ہے اور وہ اس بنا پر ہے کہ اس مثنوی میں پنالے کے قلعہ کی فتح کا ذکر ہے اور خود نصرتی نے اس فتح کا جو مادۂ تاریخ نکالا ہے اس سے ۱۰۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تذکرۂ شعرائے دکن کے مولف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ بتایا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں علی نامے کے نسخے کو دیکھنے کے بعد آخر الذکر تاریخ سے اتفاق کیا ہے اور اپنے رائے کی تائید میں عجائب خانہ برطانیہ کے قدیم اور معتبر نسخے میں جو شعر تاریخی درج ہے وہ بھی نقل کر دیا ہے۔

لکھا شہ میں جس جو دکراس ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

تاریخ اسکندری کا سنہ تصنیف مولوی عبدالحق صاحب کے مملوکہ نسخے کے بموجب ۱۰۸۳ھ ہے۔ بظاہر یہ نصرتی کے آخری مستقل تصنیف ہے۔ اسی سنہ کے اوائل میں اس کے مربی علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور اس کا کمسن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۰۹۷ھ میں فتح بیجاپور کے بعد عالمگیر کے حکم سے قید کر دیا گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنی کتاب نصرتی میں لکھتے ہیں۔

"نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ فتوت نے اپنے تذکرۂ ریاضِ حسینی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں

---

[1] مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گلشنِ عشق اور علی نامہ دونوں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اول الذکر کو راقم نے اور موخر الذکر کو مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترتیب دیا ہے۔

... ن عبدالجبار مرحوم

... علاج امیں کہاں سے

... بیجاپور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا تھا۔"

یہ سچ ہے کہ تذکرہ شعرا ... نسبت اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن
خطاب ملک الشعرا پانے کے بارے میں ان کا بیان فتوت سے بالکل ایک۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

" علی نامہ ختم کرنے کے بعد نصرتی کو علی عادل شاہ نے خلعت اور ملک الشعرائی کا خطاب عطا فرمایا تھا۔" عام طور پر اردو کے تذکرے نصرتی کے ذکر سے خالی ہیں اور فتوت کے سوا کسی اور روایت سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے دکن کی مفتوحہ سرزمین کے دکنی گو شاعر کی اس طرح قدر افزائی کی ہوگی۔ اورنگ زیب کی افتادِ طبیعت، فاتحانہ شان اور ادب و دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی طبعی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے فتوت کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علی نامہ جیسی بلند پایہ رزمیہ مثنوی لکھنے پر جس میں رزم و بزم کے بے نظیر مرقعوں کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں ایسے بلیغ قصیدے بھی ہیں جو فارسی کے اعلیٰ درجے کے قصائد کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں، بہادر اور ادب پرور بادشاہ نے نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا ہو۔

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے پر نصرتی کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ	جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے	یوں کہے نصرتی شہید اہے

"نصرتی شہید اہے" سے ۱۰۸۵ برآمد ہوتے ہیں۔ اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۰۹۲ھ ہے اور یہ بہت ہی قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نصرتی کی آخری مثنوی ۱۰۸۳ھ کی لکھی ہوئی ہے اور فتوت کا روایت بھی غور طلب معلوم ہوتی ہے۔ نصرتی کے متفرق کلام مثلاً رباعیات وغیرہ سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ انقراض دولت بیجاپور کے بعد زندہ رہا ہوگا اس سے بحالات موجودہ اس قطعے کی بنا پر اس کا سنہ وفات ۱۰۸۵ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قطعے سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصرتی پر کسی نے تلوار سے حملہ کیا تھا اور وہ اس صدمے سے شہید ہوا۔

سید محمد



ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

ڈاکٹر زورؔ

"میں نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر زورؔ کی کسی برائی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ محض اس لئے کہ مجھے ان میں برائی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ناقدین اسے عقیدت سے تعبیر نہ کریں اور میں یہ سوچتا رہا کہ کوئی بات ایسی مل جائے جس کے ذریعے سے ان کی کسی برائی کو ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ مضمون مکمل ہوگیا لیکن "عیب جوئی" کی ناکام کوشش نکتہ چینوں کا منہ بند کرنے کے لئے اس "گناہ بےلذت" کے ارتکاب سے قاصر رہی۔ جب مضمون "سب رس" میں چھپنے کے لئے "نگرانی" کی زد میں آیا تو انھوں نے "اپنی نگرانی" سے "جائز" فائدہ اٹھا کر اسے چھاپنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا لیکن مادرِ جامعہ جانتی ہے کہ میں ایک "گستاخ شاگرد" رہا ہوں۔

میری گستاخی بعض اوقات حد تعینات کی پروا نہیں کرتی۔ اُن کی "خو" اور میری "وضع" میں ایک تصادم ہوا اور جس کا نتیجہ ظاہر ہے یعنی "نگران کار" سے بچ کر "مدیر" کا یہ مضمون "سب رس" کے صفحات پر ایک کی نیکی اور دوسرے کا جرم بن کر نمایاں ہوگیا۔ ناقدین خوش ہوں کہ میں نے ڈاکٹر زورؔ کی ایک برائی ظاہر کردی اور ڈاکٹر زورؔ معاف فرمائیں کہ میں نے اپنی گستاخی کا اظہار کردیا۔" میکش

ایک زمانے سے خیال تھا کہ ڈاکٹر زورؔ پر مضمون لکھوں۔ اس لئے کہ اس غلط نواز اور ظاہر پرست ملک میں جب تک اپنے محسنوں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی ہم صحت بخش مستقبل کی تعمیر نہ کرسکیں گے۔ کورانہ "شخصیت پرستی" بلاشبہ ایک کمزوری ہے۔ لیکن کسی نصب العینی انسان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا بہرحال ضروری ہے۔ کھیت نہر سے پانی لے کر پانی نہیں اگاتا بلکہ اس پانی سے ایک لہلہاتی ہوئی فصل تیار کرتا ہے۔ "انفرادیت" کو کھوئے بغیر بھی انفرادیت میں بلندی پیدا کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں ہمیشہ بڑی ہستیوں ہی سے عظمت کا سبق لیتی رہی ہیں۔ میری نظر میں ڈاکٹر زورؔ کے نام سے دکنی مستقبل کے لئے بھی ایک "نصب العینی ہستی" ملی ہے۔ جس کی روح میں لطافت اور دل میں جذبۂ عمل ہے جو ماضی سے کچھ حاصل کر رہی ہے اور مستقبل کو کچھ دے رہی ہے جس نے مشکلات پر قابو حاصل کرکے ایک ماحول پیدا کیا' اور جو آگے بڑھتے ہوئے ایک وسیع تر ماحول تیار کر رہا ہے۔ ہماری جدید نسلیں اگر ان میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے تو' اس نصب العینی ہستی کو ضرور سامنے رکھیں گی۔

میں ڈاکٹر زورؔ کو صرف نثر نگار کی حیثیت سے دیکھوں تو میرا یہ زاویۂ نگاہ سطحی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اقبال کو کوئی صرف شاعر کہہ دے، اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرنے والا صرف اس کے شعروں پر جھوم کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی روح میں' اپنی فکر میں' اور اپنی زندگی میں ایک انقلاب محسوس کرتا ہے۔ شعر نہیں بلکہ شعر کے ذریعے سے جو انقلاب پیدا ہوا وہی اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ کامیابی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر زورؔ کی نثر نگاری نہیں بلکہ ان کی وہ تحریر جس نے دائرۂ عمل پیدا کیا' ان کی وہ گفتگو جو ہمیشہ پیامِ عمل دیتی رہی ہے' اور ان کی بے پناہ مصروفیتیں' اور دوسروں کو مصروف رکھنے کی کوششیں اصل میں ایک مضمون کا عنوان بننے کے قابل ہیں اس لئے کہ دکن کے نوجوان ادیبوں میں خود اعتمادی اور ذوقِ عمل پیدا کرنے میں انہی کا حصہ رہا ہے۔

سید غلام محمد شاہ قادری صاحب کے
بارک ۱۳۲۲ھ کو پیدا ہوئے۔

تعلیم عربی و فارسی سے دار العلوم میں شروع ہوئی۔ اور بعد کو سٹی کالج میں شریک ہوئے۔ اس سال مرتبہ (۱۹۲۵ء) میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے مضامین فارسی اور اردو میں اول آئے۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ام اے کی ڈگری لی اور اس دفعہ بھی اول آئے۔ ان امتیازی کامیابیوں کے پیش نظر حکومت نے یورپی وظیفہ دیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۷ء میں یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کی ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی ہوئے۔ اردو کے آغاز و ارتقا پر ایک مقالہ لکھا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج لندن میں صوتیات کی تعلیم حاصل کی ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقاتی کام پیرس کے مشہور دارہ صوتیات انسٹی ٹیوٹ دی فونیٹک میں ختم کیا۔ جو پیرس ہی سے انگریزی میں "ہندوستانی صوتیات" کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ اس زمانے میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور جیسی زبانوں کے درس "سوربون یونیورسٹی پیرس" میں حاصل کئے۔ ۱۹۳۰ء میں یورپ سے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اور اب تک یہی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۳

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ "ڈاکٹر زور نے سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۵ء میں "روح تنقید" لکھی جب کہ وہ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ "روح تنقید" فن تنقید پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد ان کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔ مثلاً

(۱) تنقیدی مقالات۔ اس کتاب میں عملی تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے اردو کے بہترین ادیبوں اور کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں درج ہیں۔ یہ کتاب کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲) اردو کے اسالیب بیان۔ یہ اصل میں اردو نثر نگاری کی تاریخ ہے جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) اردو شہ پارے۔ اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ نمونے شامل ہیں جو یورپ و ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کمیاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

(۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ گزشتہ تیس سال سے اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید و مکمل تذکرہ۔

(۵) سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ غزنین کے فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا دلچسپ تذکرہ جسے معلومات آفریں ہے۔

(۶) ہندوستانی صوتیات (انگریزی) اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

(۷) ہندوستانی لسانیات۔ اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح جس کے پہلے حصے میں علم لسان کے مقاصد، فوائد، تاریخ اور زبان کی اہمیت، ارتقا اور تشکیل سے متعلق اصولی معلومات ہیں اور دوسرے حصے میں اردو کے آغاز، ارتقا، ادبی بولیوں اور اردو کی ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کر کے اردو ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) فن انشا پردازی۔ مضمون نگاری اور انشا پردازی کے اصول اور فن تحریر میں تکمیل کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۹) طلسم تقدیر۔ زوال گولکنڈہ کے وقت کا ایک نیم تاریخی افسانہ ہے جو انتہا مقبول ہوا کہ دوسرا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے۔

(۱۰) سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو دلچسپ افسانوں کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۱) گولکنڈے کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ ہے۔

(۱۲) روح غالب۔ غالب کے خطوط کے ادبی حصے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شایع کئے گئے ہیں۔

(۱۳) سرگزشت غالب۔ غالب کی دلچسپ اور مستند و مکمل سوانح عمری جو اصل میں روح غالب کا ابتدائی حصہ ہے۔

(۱۴) گلزار ابراہیم۔ اردو کے مشہور تذکروں گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کا مجموعہ۔ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

(۱۵) گارساں دتاسی مشہور محسن اردو کے حالات اور تصنیفات پر تبصرہ (مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی)

(۱۶) دیوان زادہ حاتم۔ دہلی کے مشہور شاعر کا کلام اور حیات (۱۷) متاع سخن۔ کلام عزیز کا انتخاب مع حالات۔

(۱۸) بادۂ سخن۔ کلام مائل کا انتخاب مع حالات۔ (۱۹) کیف سخن۔ کلام کیفی کا انتخاب مع حالات۔

(۲۰) فیض سخن۔ کلام فیض کا انتخاب مع حالات۔ (۲۱) مرقع سخن دو جلدیں۔ دکن کے بہترین شاعروں کا تذکرہ جس کی ترتیب نہایت اعلیٰ پایہ ہے اور جس میں مختلف اصحاب سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھوا کر شامل کئے گئے ہیں۔

(۲۱) مکتوبات شاہ عظیم آبادی۔ بہار کے استاد سخن کے مکتوبات مع مقدمہ۔

ان کتابوں کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں اور سیکڑوں مضامین جو بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں یورپ اور ہندوستان کے معیاری رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی نثر عام فہم اور سادہ ہوتی ہے جس میں روانی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں، جامعات کے نصابوں میں شریک ہیں، قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اس لئے ان کے نثری نمونے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ میں ان کے مکتوبات سے جو میرے نام ہیں بعض عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خط لکھتے وقت اس کو چھپوانے کا خیال پیش نظر نہیں رہتا اور اسی لئے خط میں کسی کے اصلی اسلوب کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"اردو شاعری میں ہندستانی عنصر" اچھا موضوع ہے۔ اس پر مواد جمع کرتے رہیے۔ جتنا زیادہ مواد جمع ہو کتاب اتنی ہی شاندار ہو گی اور آپ کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ کوشش کیجیے کہ دن کے بعض خاص اوقات روزانہ"

آئے گا"

ب ہی"

مہ ختم ہو گئی اور آج دنیا"

ے تو کبھی مایوسی اور"

" ناکامی کا شکار نہ ہوا اور جو لوگ آج آپ کو کامیاب اور سرخرو نظر آ رہے ہیں آپ ہیں جانے کہ ان میں کتنے ایسے"
" ہیں جن کو ابتداء میں بڑی بڑی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں اور رشک، حسد اور مخالفتیں اور سختیاں اور فضا کی"
" ناموافقتیں سب آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہیں اگر انسان ذرا ہمت و استقلال اور صبر و شکر سے کام لے۔"
" اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ آپ ضرور ایک روز"
" اردو ادب کے جگمگاتے ستارے بنیں گے اگر آپ ہمت و استقلال اور محنت و مطالعہ جاری رکھیں اور کبھی برخود"
" غلط نہ ہوں بلکہ خواہش مند ہیں کہ ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے"

" ہم سب کی اور ہماری کیا تمام ملک کی عرصۂ دراز کی خواہش 'سب رس' کی شکل میں پوری ہوئی ہے اور ہم اگر خدا"
" اور توجہ اور محنت سے کام کریں تو یقین ہے کہ یہ کامیاب رہے گا۔ ہم کو ابھی سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے"
" بلکہ موجودہ حالات سے سبق لے کر آئندہ کے لئے استحکام اور قوت پیدا کر لینی چاہیے۔ خاص کر آپ کے لئے یہ بڑی"
" آزمائش کا وقت ہے۔ اگر اس میں آپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو یاد رکھئے آئندہ کے لئے بڑا خراب اثر پڑے گا اور"
" کوئی نیا اور اچھا کام شروع کرنے کی خواہش نہ ہوگی"

" آپ کی ذات سے ملک کی اور ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہے کہ آپ سرخرو رہیں۔"
" میں نے جو مشکلات اور موانعات پیش کئے ہیں وہ اس لئے پیش نہیں کئے کہ ان کو سن کر آپ پست ہمت ہو جائیں"
" اور ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ اس لئے کہ آپ میں شدائد کے مقابلہ کی قوت پیدا ہو اور آپ موجودہ سے زیادہ سرگرمی"
" دکھائیں۔ ناامیدی اور پست ہمتی ان لوگوں سے ہمیشہ دور رہتی ہے جن کے سینے خلوص اور جذبۂ خدمت گزاری سے"
" معمور ہوں اور جن کے کام محض اپنے ملک کی بہبودی اور زبان کی فلاح پر مشتمل ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دل میں"
" خلوص اور بے غرضی کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ آپ ہر اس کام میں اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے"
" شریک ہو جاتے ہیں جو ملک کے کسی پہلو سیاسی، علمی، ادبی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا"
" جذبۂ عمل آپ کو مایوس ہونے دے۔ کام کرنے والوں اور مخلص خدمت گزاروں کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی"
" ہیں۔ ان کا راستہ اتنا صاف نہیں ہوتا جتنا ان غرضی بندوں کا ہوتا ہے جو محض نام و نمود یا ذاتی اغراض کی خاطر سرگرمی"
" دکھاتے ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کے لوگوں کی شہرت یا قدر و منزلت دیرتک"

" ہوتی ہے جب تک عروج ہے یا ان کا زور چل سکتا ہے وہ سرخرو رہتے ہیں۔ ایک زمانہ جلد یا دیر سے ایسا آتا ہے جب"
" اُن کی قلعی کھل جاتی ہے۔"

" ہمارا کام محض خلوص کی وجہ سے اور خدمتِ ملک کی خاطر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ہم"
" بالکل مجبور نہ کر دئے جائیں۔ ورنہ ہماری ساری قوتیں اس کام کو جاری رکھنے کے لئے وقف رہیں گی۔ ہمارے"
" اہل ملک ابھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم کو زیادہ توجہ اور محنت اور ایثار کی ضرورت ہے"
" میری دلی خواہش ہے کہ آپ ایک کامیاب انشا پرداز اور شاعر بنیں اور ملک کے جمود اور غفلت کو دور کرنے"
" میں کامیاب ہوسکیں۔ میری بہترین توقعات آپ کے ساتھ ہیں۔"

" خط وصول ہوا۔ میری ہمشیرہ عزیزہ کی علالت اور وفات کا مجھ پر بے حد اثر ہے۔ میری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ "
" اس قدر قریبی عزیز مجھ سے جدا ہوا ہے۔ بہرحال مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔"
" آپ اپنی صحت کا خیال رکھئے۔ صحت سب سے اہم ہے اور اسی صحت اور مشغولیت کی خاطر رسالہ بھی نکالا "
" گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے رسالہ کا سب کام آپ کے حسب منشا انجام پا رہا ہے۔"
" آپ کی تقریر اخبار میں چھپی تھی۔ بہت اچھی اور پختہ اور شائستہ ہے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی"

کیا اس اسلوب تحریر میں ایک اردو ادب کو ترقی دینے والے اور اردو دانوں میں ادبی ذوق کو عام کرنے والے سرگرم عمل انسان کی روح نہیں بول رہی ہے؟

۴

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی کتابوں اور ان کے ذوق عمل کے بارے میں ملک کے مشہور انشا پردازوں نے ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے اچھی رائیں دیں۔ چنانچہ پروفیسر وحید الدین سلیم نے لکھا تھا کہ :-

" اگرچہ وہ بظاہر چپ چاپ دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ اور ان کا دماغ علمی خیالات میں ہر وقت مصروف ہے"
" اردو و فارسی کے ادب سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ عجب نہیں کہ اگر ان کی یہی مشغولیت اور دماغی سعدی رہی تو وہ"
" اردو انشا پردازوں کے دائرے میں خاص طور سے ممتاز خیال کئے جائیں اور دکن کو ان کی ذات پر ناز کرنے کا موقع"
" حاصل ہو۔"

عبد الحلیم شرر لکھنوی نے لکھا تھا کہ :-

" روح تنقید آپ نے بڑی محنت اور قابلیت سے لکھی ہے۔ میں آپ کی اس کوشش کو بہت ہی قابل قدر تسلیم کرتا ہوں "
" اور اردو لٹریچر کی جانب سے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"... یہ ... ہے۔"

نیاز فتحپوری نے لکھا تھا کہ :-

"جناب زور کا اردو پر احسان عظیم ہے کہ انھوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی۔"

مولانا عمادی نے لکھا تھا کہ :-

"اپنے موضوع پر اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب کہی جا سکتی ہے۔"

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔"

غرض کہاں تک لکھئے۔ یورپ کے چند مشہور مستشرقین کی بھی ان کے بارے میں رائے دیکھئے کیونکہ بعض لوگ اپنوں سے زیادہ غیروں کی رائے کو مستند سمجھتے ہیں۔

پروفیسر لائیڈ جیمس صدر شعبہ صوتیات نے لکھا کہ :-

"مسٹر ایس جی ایم قادری نے اس مدرسہ میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے سال انھوں نے عام صوتیات پر میرے "
" درسوں میں شرکت کی۔ انگریزی صوتیات کی عملی جماعتوں میں یہ حاضر رہے اور میری ذاتی نگرانی میں انھوں نے "
" اردو کی صوتیات پر کام کیا جس میں دکنی صوتیات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔"
" اس عرصہ میں یونیورسٹی کالج کی انگریزی صوتیات کی بعض جماعتوں میں بھی وہ شریک رہے اور میری "
" نگرانی میں انھوں نے اپنی زبان کا تجزیہ کیا۔ یہ کام جب تکمیل کو پہونچے گا تو علم زبان میں ایک گرانقدر اضافہ "
" ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی ایم اے۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو و ہندی اور پروفیسر ولکنسن ناظم شعبۂ مشرقی برٹش میوزیم نے لکھا کہ :-

"مسٹر قادری کا مقالہ ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اپج ہے۔ یہ برٹش میوزیم، دفتر وزیر ہند، اڈنبرا یونیورسٹی "
" قومی کتب خانۂ پیرس کے کتب خانوں کے تحقیقاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ "
" ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہ تھی۔"

" نظم و نثر کے بہت سے ایسے کارناموں کا ذکر اس میں موجود ہے جو کسی اور ایسے تذکرے میں موجود نہ تھے "
" جو اس وقت تک شایع ہوا ہو۔ موجودہ تذکروں کی غلطیاں اس میں درست کر دی گئی ہیں۔ مسٹر قادری اردو کے "
" مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اردو لسانیات یا انڈو آرین فیلالوجی پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس سے "

" انھیں بڑی بصیرت حاصل ہوئی ہے ۔ ان کے مقالے کے وہ حصے بہت دلچسپ ہیں جن میں اردو کی ابتدائی "
" شکلوں پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ مقالہ علم میں ایک حقیقی اضافہ ہے خصوصاً اس کے وہ حصے جن میں دکنی اور شمالی "
" ہند کی زبان کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ جو دکنی صوتیات، ابتدائی دکنی ادب، پنجابی سے اردو کے تعلق "
" اور شمال میں اردو کے ابتدائی کارناموں سے متعلق ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ مصنف کئی اور گرانقدر تصنیفیں شایع کریں گے "

پروفیسر آر، ایل ٹرنر ناظم اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز نے لکھا کہ :-

" انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لکچر دیے تھے ان میں سید محی الدین قادری شریک رہے ۔ میں نے "
" دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انھیں اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے ۔ مجھے اس کا اندازہ خاص طور پر "
" اس وقت ہوا جب میں نے ان سے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے اس حصہ کی نسبت تبادلۂ خیال کیا جو انھوں نے "
" لسانیاتی پہلوؤں پر لکھا ہے ۔ اس مطالعہ کی تیاری کے لیۓ ابتدائی سنسکرت کے درس کی جماعتوں میں بھی "
" شریک رہے اپنے پچھلے مطالعہ اور اس مطالعہ سے جو انھوں نے یہاں آنے کے بعد کیا اردو کی تقابلی تاریخی "
" تحقیقات کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی بہت ضرورت تھی ۔"

پروفیسر سیمپسن سابق پرنسپل نظام کالج و نگران کار طلبہ حیدر آباد نے لکھا کہ :-

" وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص اس پر حرف نہیں رکھ سکتا ۔"

۵

ایک مضمون اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے اب تک ملک کے مختلف اداروں کی تخلیق، تعمیر اور تکمیل میں گرمجوشانہ حصہ لیا ہے ۔ مجلۂ عثمانیہ، مجلۂ مکتبہ، ارتقا، اور مجلۂ طیلسانین کی اجرائی میں ان کی کوششوں کو نہیں بھلایا جا سکتا ۔ مختلف چھوٹی بڑی انجمنوں کی سرپرستی اور صدارت کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ " ادارۂ ادبیات اردو " کی تشکیل ہے ۔ یہ ادارہ جیسا کہ اردو داں طبقہ جانتا ہے روز افزوں ترقی پذیر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس ادارہ کے لیۓ اپنی حیات عمل وقف کر دی ہے ۔ ان کی مسلسل دلچسپیوں اور مستقل سرگرمیوں کے باعث اس نے اب تک کئی معیاری کتابیں شایع کی ہیں اور اپنے اطراف اہل ملک کا ایک وسیع طبقہ پیدا کر دیا ہے جو ترقیٔ اردو کے لیۓ بے غرض خدمات انجام دے رہا ہے " سب رس " اسی ادارہ کا ترجمان ہے ۔ دکنی مخطوطات کی اشاعت کے لیۓ سٹی کالج کے یوم وَلی کے بعد ایک مجلس مقرر کی گئی اس مجلس کے روحِ رواں بھی ڈاکٹر زور ہی ہیں ۔ اس مجلس نے بھی بعض نایاب کتابیں شایع کر دی ہیں اور کئی کتابیں زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں ۔ وہ انٹرنیشنل فونیٹک اسوسی ایشن کے واحد مسلمان رکن ہے جو ہندستان کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ ان کا یہی شغف اور ذوق ہے جس کے باعث وہ ہندوستان بھر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ چنانچہ حیدر آباد کے باہر بھی کئی اداروں نے ان کے علم و عمل سے فائدہ اٹھایا، کئی عظیم الشان جلسوں کی انھوں نے صدارت کی انجمن ترقیٔ اردو سے متعلق کئی مسائل کے حل میں مدد دینے کے لیۓ ان کو مدعو کیا گیا اور ان کی تصنیفات کئی ہندستانی جامعات کے نصاب میں داخل ہیں ۔ الغرض حیدر آباد میں اور حیدر آباد کے باہر ان کی شہرت ان کی قوت عمل نے پیدا کی اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے وہ ترقیٔ اردو میں زیادہ قوت کے ساتھ اپنی عملی صلاحیتوں کو صرف کر رہے ہیں ۔

جنوری ۱۹۴۰ء

[illegible] ماننا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے
[illegible] عادات کو زندہ جاوید بنانے کے لئے
[illegible] ہے۔ میں یہاں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ انھوں نے دکن کے اس مخصوص تمدن کو جدید رجحانات کے تیز رو دھارے پر بہا جا رہا
بچانے کی کوشش کی۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے دکن کی قدیم ادبیات کو [illegible] دکن ترقی اردو میں
کتنی صدیوں سے [illegible] ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے [illegible] میں ایک قابل قدر اضافہ
کیا بلکہ میں صرف ان کے ذوقِ عمل اور خلوصِ خدمت پر یہاں زور دوں گا [illegible] ان
کی ایک قابل لحاظ جماعت پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر زور حیدرآباد کی ان چند ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے بے سواد [illegible] گلستان [illegible] ایک چشمہ پیدا کیا۔ ایسا چشمہ جس کا [illegible] پانی سارے ریگستان کو ایک گلستان میں بدل دیتا ہے۔ ان ایام کی یاد ابھی ذہنوں سے نہیں گئی ہے جب دکن کے "بے زبانوں" کی راہ میں فلک بوس پہاڑ تھے۔ ان کی آواز سانس بن کر نکلتی تھی اور سانس بن کر سینے میں دفن ہو جاتی تھی۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی تھی کہ دکن اور صرف دکن ہی وہ مقام ہے جس نے اردو کی مستقل سرپرستی کا [illegible] اس وقت بھی جب کہ قطب شاہی زمانہ حکومت میں [illegible] نثر و نظم کو زندہ جاوید [illegible] کے قافلہ کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ [illegible]

ڈاکٹر زور ملک کے ان گنتی کے فرزندوں میں ہیں جنھوں نے [illegible] لکھتے وقت ان کا ہاتھ کانپے نہ قلم تھرایا بلکہ وہ [illegible] جرأت رندانہ کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا کہ اہل دکن "بے زبان" نہ [illegible] خود اعتمادی کا یہی مستحکم احساس ہے جس سے ڈاکٹر زور نے جدید حیدرآباد کی خدمت زبان و ادب میں روحِ عمل پھونک دی اور اب جب کہ وہ دلوں سے مرعوبیت دور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ترقی اردو کے لئے ان کی جدوجہد تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد میں یوں تو بہت سے ایسے اصحاب ملیں گے جو انفرادی طور پر اردو کی پرخلوص خدمت کر رہے ہیں لیکن اس کی اشاعت اور ترقی کی منظم کوشش کا مرکز صرف ڈاکٹر زور کی ذات ہے۔

میکش

پیارے وطن کی پیاری

اُردو ہے سب کی پیاری، اُردو ہے سب کی پیاری — پیارے وطن کی پیاری، یعنی زباں ہماری
قومی یگانگت کا پیغام دینے والی — اک خوشگوار خدمت انجام دینے والی
اک یادگار ہے یہ بیتے ہوئے دنوں کی — الفت بھرے دنوں کی بھولے ہوئے دلوں کی
بچھڑے ہوئے دلوں کو آپس میں ہے ملاتی — پردے کو غیریت کے بالکل ہے یہ اٹھاتی
پھر رشتۂ اخوت اُردو ہی جوڑتی ہے — بھائی بنا کے "ہم"[1] کو اُردو ہی چھوڑتی ہے

ملکی زباں یہی ہے، قومی زباں یہی ہے
اپنا جہاں یہی ہے، ہندوستاں یہی ہے

اُردو میں کیا نہیں ہے کیا کیا نہ ہوگا اس میں — جلوہ نما نہیں کیا دنیا کی سب زبانیں؟
اُردو میں ہے نزاکت، اُردو میں ہے لطافت — اُردو میں ہے فصاحت، اُردو میں ہے بلاغت
اُردو میں ہے روانی، اُردو میں ہے سلاست — اُردو میں ہے ملاحت، اُردو میں ہے حلاوت
اُردو میں ہے متانت، اُردو میں ہے طلاقت — اُردو میں ہے تقدس، اُردو میں ہے صداقت
اُردو میں وسعتیں ہیں ہندوستاں سے زیادہ — اُردو کی شہرتیں ہیں ہندوستان سے زیادہ
اُردو کی رفعتوں پر ہے سرنگوں فلک بھی — وہ خوبیاں ہیں اس کی ہوں تر زباں ملک بھی
اس پر بھی تم کو اُردو بھاتی نہیں ہے حیرت! — شاید نہیں وطن کی دل میں تمھارے چاہت

پیارے وطن کی ہر شئے جاں سے عزیز تر ہے
اُردو کے مٹنے کو پھر کیوں یہ شور و شر ہے؟

سُلیمان اریب

[1] ہندو مسلمان۔

اُردو کا ذکر ہو اور دنیا میر تقی میر کو بھول جائے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ میر پر بہت سے مقالے نکل چکے ہیں۔ یونہی سہی۔ مگر آج ہم میر کا ہی ذکر کرینگے۔ خواہ موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے۔ شیلے کہتا ہے " ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو غم آگیں جسیات کا اظہار کریں"۔ کتنا سچ کہتا ہے۔ واقعی ؎

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
طپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

اسی جاذبیت و کشش نے آج میر کو قلمروئے سخن کی صدارت پر متمکن کر دیا ہے۔ فرماں روایان ادب نے میر کو اُردو غزل گویوں کا سرتاج تسلیم کر لیا ہے۔ وہ ایک عاشق کی زبان سے اس کی روداد قلب کا اظہار کرتے ہیں۔ میر کے اندوہناک جذبات میں شدت غم، داخلی اور مایوسی کا پیچ و تاب شامل ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ " خاموش انسانوں کے قلب میں غموں کی کتنی پراسرار گہرائیاں پوشیدہ ہیں" ابونواس نے سچ کہا تھا " قدرت خداوندی سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک عالم ایک ہی شخص میں پیدا کر دے"

یونان کی ایک بہت پرانی کہاوت ہے " مصوری شاعری صامت ہے اور شاعری مصوری ناطق"۔ اگر شاعری فی الحقیقت " مصوری ناطق" کو کہتے ہیں تو ہم میر کو

ہیں۔ اور یوں بھی

ہے " شاعری دماغ کو بلند کرتی

نظر میں اُردو زبان کے بہترین

شعرا میں غالب اور میر ہیں۔

انسانی جذبات و احساسات ہی شاعری کی اصل روح رواں ہیں اور اگر ہل صاحب کی رائے سے اتفاق کیا جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔

میر بزرگانے اکبر آباد سے تھے۔ لیکن ان کے رشتے ناتے سے اس وقت ہم کو بحث نہیں۔ ہم ایک طائرانہ نگاہ ان کے زندگی کے انوکھے حالات پر ڈالتے ہیں۔ اب اس نگاہ میں ہمیں جو کچھ بھی مل جائے اس کو قلم بند کر دیا جائیگا، ان کے میر تخلص کرنے پر ان کے والد بزرگوار نے انھیں منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤگے لیکن ان کے سید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کی مسکینی و غربت، صبر و قناعت، تقویٰ و طہارت ایک شخصیت کرتے ہیں اور یہ اوصاف خود ایک شہادت ہیں میر کی سیادت کے۔ رہا زمانے کا۔ اس نے کس کو چھوڑا ہے۔ کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

آزاد کہتے ہیں " ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا۔ مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب بن کر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہرات اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔

اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑا دیا۔ ہندوستان میں
یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو
تحفے کے طور پر شہر سے شہر لے جاتے تھے۔"

میرؔ اپنی نازک مزاجی اور بد دماغی میں بڑی شہرت
رکھتے تھے۔ باوجود فلاکت و نحوست کے جو اہلِ کمال کا
سرمایۂ زندگی ہے ان کے دماغ ہی نہ ملتے۔ وہ کسی کو
خاطر میں نہ لاتے۔ وضعداری کو نباہنے کا فن انھیں
خوب یاد تھا۔

دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امراء و شرفا کی
محفلوں میں اب ان کی جگہ خالی رکھتا تھا مگر بقول آزادؔ
"خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔" ناقدری
نے ان کا دل توڑ دیا اور اسی اجڑے ہوئے دل کو لیے
ہوئے یہ دلّی کو خیرباد کہتے ہیں۔ وہی دلّی جس پر انھوں
نے کبھی اس طرح سر دھنا ہے :-

؎ دلی کے جو تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اسی دلّی کے کھنڈر ہو جانے پر یوں کفِ افسوس ملتے
ہیں ؎ اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اب یہاں سے میرؔ لکھنؤ چلے ہیں۔ ذرا اس لطیفہ کو
آزادؔ سے سنیے :-

"جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔
ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا
حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے بات کی۔
یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر
اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے کہ صاحب
قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھیے۔ مگر
باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔
راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب
بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

لکھنؤ پہنچ کر ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا یہاں
ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ صبر نہ آیا۔ جی مچل گیا۔ اسی وقت
ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا پہنچے۔ اپنی وضع قطع
سے ایک قدیم مُلّا سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ ان کے
عجیب و غریب سج دھج دیکھ کر حاضرین محفل میں ہنسی کے
ساغر چلنے لگے۔ لوگ سرگوشیوں میں اپنے قہقہے چھپانے
لگے۔ میرؔ صاحب ایک تو غریب الوطنی کا الم لیے ہوئے
تھے۔ دوسرے ناقدرئ زمانہ کے ہاتھوں دلگیر و
دل گرفتہ۔ ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع ان کے
سامنے آئی تو پھر سب نے ان کی طرف ٹکٹکی لگا دی۔
کسی نے وطن پوچھا۔ میرؔ تو بھرے ہی بیٹھے تھے۔ فی البدیہہ
یہ مشہور قطعہ سنا دیا۔ ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سارے ہنسنے والے اس درد بھرے موثر کلام کو سن کر
کھسیانے ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارے شہر میں

جن میں سے بعض تو بہت دلچسپ ہیں۔ ... ایک دن نواب صاحب موصوف نے ان سے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ... کہ کل آپ نے فرمائش کی اور آج حاضر کر دے۔ اس فرشتہ ... طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجئے گا۔

ایک دن نواب صاحب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو انھیں حوض کے کنارے رنگین مچھلیوں سے کھیلتا دیکھا۔ ناک بھوں سکیڑ لیا۔ نواب حسب معمول انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔ انھوں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ نواب کھیلتے بھی جاتے تھے۔ سنتے بھی جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے۔ وہ کہتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر سنا کر میر خاموش ہو گئے اور بولے پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں میں مشغول ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہو گا آپ متوجہ کر لیگا۔ میر صاحب بھلا کہاں تاب لا سکتے تھے۔ ان کے دکھی من کے لیے یہ فقرہ ایک تازیانہ تھا۔ غزل جیب میں ڈال گھر کا راستہ لیا اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد بازار میں نظر آئے۔ نواب کی

... نے بلوا دیا"۔ ... صاحب ... بھی تشریف بھی نہیں لاتے"۔ ... بازار میں باتیں کرنا آپ شرفا ... ہے۔ غرض بدستور گھر بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں عمر بسر کی۔ نوّے برس کی عمر پائی۔ امرا کی تعریف و توصیف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ توکل و قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا پھر شاید خود بینی و خود پسندی جو انھیں لیے دیے رہتی تھی۔ ... ان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔

میر کے دیوان میں یوں نام کو سنتر دو بہتر نشتر ہیں۔ لیکن بقول "آزاد" یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس یہ کہہ اٹھتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے"

غزل گوئی میں میر جس مقام پر پہنچے ہیں وہاں تک اب کسی کی رسائی ناممکن ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک عجیب انداز دکھاتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں "حقیقت میں یہ انداز انھوں نے میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا"۔

یہاں پر ان کے کلام کا ایک مختصر سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

عشق کا گھر ہے میر سے آباد ایسے پھر خانماں خراب کہاں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

ؔ آب حیات

لیجے جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

اس تبکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہیں یاں

مجھ دیوانے کی مت ہلا زنجیر　　کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

کہتا ہے کون میر کو بے اختیار رو
ایسا تو روکہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
لگ اٹھتی آگ سب ارض و سما میں

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

رشک یوسف ہے آہ وقت عزیز
عمر اک بار کاروانی ہے

تشو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

کٹتی ہے دیکھیے یوں عمر کب تک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

ہوگئی شہر شہر رسوائی　　اے مری موت تو بھلی آئی
مصائب اور تھے پر دل کا جانا　　عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
سرکسو سے فرو نہیں ہوتا　　حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

میں چراغ صبح گاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے

کہاں تک لکھوں۔ ایسے بیسیوں نشتر ہیں۔ اب انھیں کے ایک شعر پر یہ داستان ختم کردی جاتی ہے۔ ؎

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

جہاں بانو بیگم

...ل نہیں ہے مجھ کو دلبر ہے

بس اب راضی جو تی سے اس پہ مر مٹا ہوں ہر ... ...ں ہے موت کا ڈر ہے

ہوا کرتے ہیں ظلم و جور بھی دلکش حسینوں کے جو سب کے واسطے ہے عیب ان کے حق میں زیور ہے

میں بے دل ہوں، وہ دل دار۔ میں بے آس وہ آسا مجھے کیا خاک یاری۔ ایک مفلس اک تو انگر ہے

گل اندا موں سے مل کر دل پہ وہ چوٹیں اٹھائی ہیں کہ باغِ دہر کا ہر پھول میرے حق میں پتھر ہے

عدو نے بھی اڑا لیں ہیں ادائیں دل دکھانے کی ستمگر جو تری صحبت میں بیٹھا ہے ستمگر ہے

نہیں کوئی کسی کا دوست بازی گاہِ دنیا میں یہاں ہر ایک اپنے داؤ پہ ہے اپنے ڈھب پر ہے

بُرا کہتا ہے جب اس سے بُرا دیکھا نہیں جاتا نصیحت گر اگر دشمن سے بُرا ہے تو وہ بہتر ہے

وہ دینے میں نہیں رُکتا ہے لیکن اور کیا مانگوں ضرورت سے زیادہ ہے مجھے جو کچھ میسر ہے

وہ مُردے جن کو اُس کے حکم پر جینا نہیں آتا وہی کہتے ہیں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے

نہیں بڑھتے ہیں اپنی حد سے زندے ہوں کہ مُردے ہوں سب اُتنے پاؤں پھیلاتے ہیں جتنی اُن کی چادر ہے

یہ دو باتیں ہیں بس اے چارہ گر آگے تری مرضی جو غم نکلے تو اچھا ہے جو دم نکلے تو بہتر ہے

وہ چاہے سننے والوں کے لیے بے جوڑ باتیں ہوں پڑھانے والے نے جو کچھ پڑھایا مجھ کو ازبر ہے

نہیں کی میں نے مال و جان و ایماں کے لیے کوشش تو اِن کے بدلے وہ مل جائے جو اِن سب سے بڑھ کر ہے

پلا ساقی کہ باقی عمر بے ہوشی میں کٹ جائے یہ میرے سر کا چکر اب مری قسمت کا چکر ہے

طلسمِ شارعِ عامِ محبت کھل نہیں سکتا کہ ایسا صاف رستہ اور پھر ٹھوکر پہ ٹھوکر ہے

ہر اک چھالا ہے شاہد گرمیٔ سوزِ محبّت کا کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زباں پر ہے

میں اُس کو دیکھتا ہوں آئینہ کیا ہے سکندر کیا جو آئینہ کا آئینہ سکندر کا سکندر ہے

نہ پوچھو ہائے بیمارانِ غم کی زندہ درگوری اِسی پر جی رہے ہیں موت کا اک دن مقرر ہے

ہیں کم سے کم زیادہ سے زیادہ عشق کے معنی سمجھنے والوں کو اک لفظ ہے بے سمجھوں کو دفتر ہے

شہیدانِ محبت زندۂ جاوید ہوتے ہیں جو سب کے واسطے ہے گور اِن کے واسطے گھر ہے

صفی کو طفلِ مکتب جانتے ہیں اس لیے شاعر

کہ ہر اک شعر اس کا بچے بچے کی زباں پر ہے

صفی (اورنگ آبادی)

صاحبزادہ میکش کی کتابیں

گریہ و تبسم

"گریہ و تبسم" کے نوجوان مصنف صاحبزادہ میکش کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پاکیزہ ادبی ذوق سے اہلِ ملک بخوبی واقف ہیں۔ "گریہ و تبسم" کے متعلق چند رائیں جو یہاں نقل کی جا رہی ہیں، یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ اُردو ادب کی دنیا میں اپنا ایک شاندار مستقبل رکھتے ہیں۔

"ادبی خدمت گزاروں کی شستہ و منتخب جماعت کے ایک رکن میکش صاحب بھی ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ۔ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔" (مولٰنا عبد الماجد دریابادی)

"صاحبزادہ میکش کا شمار ان نوجوان شعرا، میں ہے جو اپنے شاعرانہ وجدان کو محض ادبیات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جنہوں نے اپنے لیے خیال و بیان کے کچھ نئے میدان بھی پیدا کر لیے ہیں۔ نوجوان حیدر آباد کی شاعری میں جو ذوقِ جدید پیدا ہو رہا ہے، اسی کا نقیب گریہ و تبسم ہے۔"
(قاضی عبد الغفار)

"آپ کے اشعار غیر معمولی صداقت اور جذبۂ محبت سے مملو ہیں۔ ملک و مالک کے ساتھ سچی اور بے غرض وفاداری ان سے عیاں ہے۔ جب تک دل میں کسی چیز کی محبت نہ ہو زبان اور قلم سے ایسے احساسات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے۔"
(محمد عبد الرحمٰن خاں سابق صدر جامعہ عثمانیہ)

"شاگردوں کے ادبی انہماک اور ادبی خدمات سے خوشی ہوتی ہے اپنے کلام پر مبارکباد قبول کیجیے۔"
(مرزا حسین علی خاں وائس پرنسپل جامعہ عثمانیہ)

"میکش کی شاعری کے پیچھے اُردو شاعری کی وہ تمام تحریکات کام کر رہی ہیں جو میر، غالب، اقبال اور جوش کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی ہیں، ان کے کلام کی سادگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ دماغ سے نہیں بلکہ دل سے شاعری کرتے ہیں۔ موضوع اور نقاطِ نگاہ عصر حاضر سے ہم آہنگ اسالیب قدیم اساتذۂ سخن سے مشابہ، یہی ہے خاص انداز جس کو میکش ترقی دے رہے ہیں۔" (عبد القادر سروری)

"گریہ و تبسم جدید اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس نوجوان شاعر کی کما حقہٗ قدر کی گئی تو اُردو زبان مستقبلِ قریب میں ایک اچھے شاعر سے بہرہ مند ہوگی۔" (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

کاغذ کی ناؤ

صاحبزادہ میکش خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ چنانچہ اُن کے حزنیہ ڈراموں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" ثابت کرتا ہے کہ وہ ادب کے ترقی پسند منصر پر بھی اپنی قوت نگارش صرف کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کی تیسری کتاب "کھوئے ہوؤں کی جستجو" عنقریب شائع ہوگی اس کتاب میں قطب شاہی حیدر آباد کے متعلق نیم تاریخی نظمیں ہونگی جن میں سے بعض "سب رس" کے دکن نمبر میں شایع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال نے

بھی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاندار ماضی بھی دفن ہیں [illegible]
بلکہ وہ عظیم تر مستقبل کی بنیاد بنتا ہے۔ زیر طبع

اُلٹی گنگا : صاحبزادہ میکش کی چوتھی کتاب ان کے [illegible] ڈراموں کا مجموعہ ہوگی۔ اس مجموعہ میں بھوت، بدگمانی اور الٹی گنگا جیسے ڈرامے شریک ہیں۔ ان ڈراموں میں [illegible] زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آواز کی دنیا" نے آواز میں زندگی کو سمٹا دیا ہے۔ موصول آلے ابھی "صورت نمائی" کے قابل نہیں ہوئے ہیں آواز کے [illegible] سے منظر کی تصویر پیش کرنا نشر نگار کا سب سے بڑا کمال ہے۔ صاحبزادہ میکش کے غنائیوں (Musical Features) نے جو نشر گاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں، ہندوستان کے ہر خطے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ "نغموں کی وادی" ان کے نشر شدہ غنائیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس مجموعہ میں طوفان کی رات، اندھی بھکارن، پھولوں کی خواب گاہ، نغموں کی وادی اور دوسرے غنائیے شامل رہیں گے۔ (زیر طبع)

کنول : آخر میں ہم صاحبزادہ میکش کی غزلوں، نظموں بلکہ اور گیتوں کے دوسرے مجموعے کا تذکرہ کریں گے جو زیر ترتیب ہے۔ اس مجموعے کی "دنیائے شباب و شعر" کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

نظم ہندوستان کے دو بند :۔

دھوپ سے جھلسے ہوئے بچے پاؤں کے ستم جس کی ننھی سی ناسمجھی ہوئی اور آنکھوں میں نم
جیسے کچی نیند سے نازک پیولوں کے درم جیسے میناتے تھی کچل میں مکر جبر و ظلم

جیسے گہری فکر میں بچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے بن میں جا نکلے، جیسے دریا میں حباب
جیسے [illegible] جیسے مفلس کا شباب
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستان

نظم "اقبال کے مزار سے" چند شعر :۔

ایمان کی تفسیر فلک [illegible] سمجھے تو پلٹ آئے بلندی پہ زمانہ
بے تابی فطرت کی سکوں بخش کہانی شعلوں سے نمائی ہوئی شبنم کی روانی
الہام میں تکمیل حقیقت کی [illegible] شاہین کی پرواز مجاہد کی نوا میں
سوئی ہوئی قسمت کو جگاتا ہوا نغمہ یہ سانس کو ہنگامہ بناتا ہوا نغمہ
بت خانے کی طرف دیکھ کے مسکاتا ہوا دل سوکھی ہوئی کھیتی پہ برستا ہوا بادل
اک روح جو انسان کو انسان بنا دے
اک درد جو جذبات کو ایمان بنا دے

نظم "پرچھائیاں" (تین بند)

کس وقت سے ہوا ہے احساس زندگانی
لو میں تمھیں سنا دوں اس وقت کی کہانی
ہلکی سی چاندنی میں لہرا کے رات رانی تاروں سے کہہ رہی تھی جب عشق کی کہانی
لے کر نئی امنگیں آئی نئی جوانی
نزدیک پا کے مجھ کو جب دور ہو رہی تھیں مہندی کی باڑ میں تم مستور ہو رہی تھیں
بچپن بنی ہوئی تھی معصوم نوجوانی
پرچھائیوں سے اپنی گھبرا کے آگئیں تم سینے پہ ہاتھ رکھ کر دل میں سما گئیں تم
شرما رہی تھی مجھ سے سہمی ہوئی جوانی
اس رات سے ہوا ہے احساس زندگانی
اب یاد آگئی نا! بھولی ہوئی کہانی

مہتمم "سب رس"

غزلیات

فکر و نظر

مشاہداتِ جمال اور کم نگر کے لئے
یہ انکشاف ہیں مخصوص دیدہ ور کے لئے

نہ پوچھ کب سے ہوں بیتاب اس نظر کے لئے
جو ہو سکے نہ جدا اِک عمر بھر کے لئے

بڑھا نہ بانگِ فغاں ضبطِ سوز کر جل جا
نمود و رقص کا موقع نہیں شرر کے لئے

تری لطیف تجلی نظر میں بھر بھر کر
بنا رہا ہوں نئے آئینے نظر کے لئے

فضا خموش، ستارے اداس، پھیکا چاند
یہ اہتمام شبِ عیشِ مختصر کے لئے

یہ چھپ چھپا کے نظر بازیاں تو رسمی ہیں
روش نہیں کوئی ایجاد کر نظر کے لئے

وہ نالہ کر جو لبِ حسن پر فغاں بن جائے
وہ آہ کیا جو بھٹکتی پھرے اثر کے لئے

ہے شوقِ دید کسی ڈھب سے دیکھ ہی لوں گا
لگا نہ قید کوئی میری چشمِ تر کے لئے

نمو و لالہ، ضیائے قمر، فروغِ شفق
یہ جتنے رنگ ہیں دھوکے ہیں سب نظر کے لئے

مطالباتِ وفا میں شریک ہوں دونوں
کروں میں نالہ، دعا تم کرو اثر کے لئے

ترے خیال میں بت ذہن میں بتخانے
یہ سجدے بار نہ ہو جائیں سنگِ در کے لئے

شباب کا تو نہیں ہوش، ہاں خیال یہ ہے
کہ ایک نیند سی آئی تھی رات بھر کے لئے

پھر آئے عالمِ ہستی میں انقلاب اعجاز
کہ منتظر ہے نظر عالمِ دگر کے لئے

اعجاز صدیقی
مدیر شاعر آگرہ

ستم ڈھا رہے ہیں

تبسم تھا اس ناز سے ان کے لب پر — [illegible] بھی [illegible] جھلکا رہے ہیں
نہیں وجہ جنبش درد دل ہو — تمھاری ہی جانب کھنچے جا رہے ہیں
خوشی کا سماں ہے ہنسی گلفشاں ہے — خبر آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں
بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ — یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں
ہے آباد میرے تصور کی دنیا — حسیں آ رہے ہیں حسیں جا رہے ہیں

جلیل ان کے صدقے جو صہبائے رنگیں
پلا کر مجھے ہوش میں لا رہے ہیں

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

رضوانیات

حیا رخصت ہوئی شوخی اٹھاتی ہے نقاب ان کا — الٰہی خیر رخصت ہو رہا ہے اب حجاب ان کا
کشش ہے یہ محبت کی کہ ہے یہ بھی حجاب ان کا — جو مجھ سے روز بڑھتا جا رہا ہے اجتناب ان کا
دلِ مرحوم کی کیا اب وفائیں یاد آئی ہیں — ہوا جاتا ہے کیوں محبوبِ حسن کامیاب ان کا
جفائیں ہو رہی ہیں پردۂ صبر آزمائی میں — کرم بھی ہوتا ہے مجھ پر باندازِ عتاب ان کا
سوالِ وصل پر پہلو سے اٹھ کر روٹھے جاتے ہیں — شکیب و صبر کا دشمن ہے یہ رنگِ عتاب ان کا
ہمیں سے ہو رہی ہیں چھیڑ کی باتیں بھی محفل میں — ہمیں دشمن بھی ہیں اور پھر ہمیں سے ہے حجاب ان کا
نگاہِ واپسیں بس رحم کر بیٹھا نہیں جاتا — یہ منہ کو دیکھ کر رونا یہ حالِ اضطراب ان کا
لکھی ہیں خط میں وہ باتیں نہیں جو میری قسمت میں — مری تقدیر کا لکھا ہوا آیا جواب ان کا
اٹھائی جا رہی ہے اس طرح تمہیدِ محشر کی — قیامت کا نمونہ بن کے آتا ہے شباب ان کا
نگاہِ قہر میں شوخی ذرا آواز میں تیزی — لئے ہے ساتھ میں لاکھوں ادائیں اک عتاب ان کا



علامہ سر شیخ محمد اقبال مرحوم



نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

مزے کے آئے دن امید ابن عشق کی راتیں
کہ ہم آغوش ہوتا ہے لڑکپن سے شباب ان کا

امید رضوی بریلوی

غزل

اور دل توڑکے جانے والے ۔ دل کی بات بتاتا جا — اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا
میری چپ رہنے کی عادت ۔ جس کارن بدنام ہوئی — اب وہ حکایت عام ہوئی ۔ سنتا جا شرماتا جا
تجھکو ابرآلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے — بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا ۔ بہلاتا جا
یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے آتا کی — شکرِ نعمت بھی کرتا جا ۔ دامن بھی پھیلاتا جا
دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی — ذوقِ طلب ۔ ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا!
نغمے سے جب پھول کھلینگے چننے والے چن لینگے
سننے والے سن لینگے ۔ تو اپنی دھن میں گاتا جا

حفیظ جالندھری

غزل

نہیں بہار ہی کچھ زمزمہ سرائے بہار — کلی کلی کا چٹخنا بھی ہے صدائے بہار
ریاضِ دہر میں ہوں میں مثالِ نکہتِ گل — مجھے اڑائے لئے پھرتی ہے ہوائے بہار
دبی نہ آگ جدائی کی سیر باغ سے بھی — غضب ہے اور بھی بھڑکا گئی ہوائے بہار
لگادے لکھکے یہ کوئی مزارِ بلبل پر — شہیدِ غمزۂ گل کشتۂ ادائے بہار
ہزاروں حسن برستے ہیں غنچۂ گل پر — نہ جانے کون ہے صورت گرادائے بہار
بڑے مزے میں ہیں وہ لوگ باغِ عالم میں — جو آشنائے خزاں ہیں نہ آشنائے بہار
چمن میں جوشِ نمو سے نکھر کے رنگِ گلاب — ہوا ہے روکشِ رنگینیٔ حنائے بہار
زوال ایک کا ہے دوسرے کو وجہ عروج — جو انتہائے خزاں ہے وہ ابتدائے بہار
چمن میں آکے ذرا جامہ زیبیاں دیکھو — گلوں کے جسم پہ پھبتی ہے کیا قبائے بہار
ہنسادے بادِ صبا گدگدا کے غنچوں کو — اٹھادے آج ذرا پردۂ حیائے بہار
ابھی تو ان کا شباب اور گل کھلائیگا — ابھی تو نامِ خدا سے یہ ابتدائے بہار

یں رات دن رلا آ بہار

بنتے ہیں ہائے بہار

زاں یا چمن میں آئے بہار

نہیں ہے ... ہے ... رہبیوں کو
ہنسی ہے بیچولوں کے لب پہ خموش ہیں غنچے
بقدر فہم جو سمجھے ہیں مدعائے بہار

جو مجھ سے کوئی سنے تو سناؤں اے خنجر
عجیب قصۂ دلکش ہے ماجرائے بہار

میر یاور علی خنجر

بہاراں

بادِ صبا یہ جھومتی آتی ہے کس دیار سے
جیسے شمیم پھٹ پڑے سینۂ لالہ زار سے

گاہ چمن میں جھومنا، گاہ چمن کو روندنا
کیف اڑا کے لائی ہے موجِ خرامِ یار سے

پھر ہو نمودِ زندگی موجِ خرامِ یار سے
حشر یہیں بپا کریں کون اٹھے مزار سے

برق سی کوند کے نئے اٹھنے لگے شرار سے
میری نگاہ لڑ گئی جب بھی نگاہِ یار سے

ضبطِ نظر نہ ہو سکا عشق کرشمہ کار سے
بڑھ کے نقاب الٹ دیا روئے حسینِ یار سے

منزلِ رنگ و نور سے مرحلۂ بہار سے
مثلِ نظر گذر رہی جا عالمِ اعتبار سے

فقر کو میرے ہے بہرے دولتِ لالہ زار سے
جنسِ جنوں بھی ہو تو میں بھیک نہ لوں بہار سے

موڑ گئے منہ بہار سے پھیر کے رخ ہزار سے
کھیل رہی ہیں نکہتیں، اُن کے گلے کے ہار سے

زلف میں یاسمن کے پھول، موسمِ گل کے وہ رسول
توڑے ہوئے بہار کے چھینے ہوئے بہار سے

روح نہ تھی نسیم میں، جان نہ تھی بہار میں
کچھ بھی نہ تھا کنار میں، وہ جو اٹھے کنار سے

جوشِ نمو کو گل پہ گل لالہ پہ لالہ دیکھ کر
روحِ جنوں ابل پڑی خم کدۂ بہار سے

فطرتِ حسن و عشق کی ہائے رے بیقراریاں
میں جو ہوں ناشکیب سا، وہ بھی ہیں بیقرار سے

آج یہ ڈوبتے ہوئے نجمِ سحر نے کیا کہا
خون سا کچھ ٹپک پڑا دیدۂ انتظار سے

حسن ہی کو نہیں گلہ عشق بھی تنگ آ گیا
ان کو رلا رلا دیا شکوۂ بار بار سے

دل سے کسی کی یاد بھی کرتی ہے یوں ہی شوخیاں
جیسے صبا الجھ پڑے گل کدۂ بہار سے

خود وہ الجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

ساغر خام کار پی، بادۂ مشکبار پی
بادہ نہیں بہار پی میکدۂ بہار سے

ساغر نظامی

غزل

مآلِ زندگانی ہے محبت کیش ہو جانا　　دلیلِ کامرانی آفتیں در پیش ہو جانا
ہمارا حاصلِ ہستی یہی ہے حضرتِ ناصح　　جگر مجروح - سر آشفتہ اور دل ریش ہو جانا
ہمیں مطلب نہیں ہے نیک و بد سے کیشِ الفت میں　　رقیبوں کو مبارک ہو مآل اندیش ہو جانا
کسی کو دیکھ کے دل نے اگر سیکھا تو یہ سیکھا　　جفا سہنا - وفا کرنا - محبت کیش ہو جانا
جنہیں ہو عشقِ صادق روک سکتا ہی نہیں انکو　　مصیبت ہائے گوناگوں کا گردوپیش ہو جانا
محبت اول و آخر ہے دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو　　مبارک عاشقوں کو عاقبت اندیش ہو جانا

رہو دنیا میں دنیا سے الگ اے حضرتِ عابد
وگرنہ کونسا دشوار ہے درویش ہو جانا

قاضی محمد زین العابدین عابد

غزل

ہنس رہا ہوں لبِ مجبور پہ فریاد نہیں　　کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں
کیا کہوں کس لئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں　　دل میں اک تیر ہے پیوست تری یاد نہیں
کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے　　وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں
کیا مرے خواب میں آنے کا بھی قدغن ہے تمہیں　　قید ہے جسم میں تو کیا روح بھی آزاد نہیں
چاندنی کا گلستاں پھول گھٹائیں نغمے　　کیا یہ سب میری تمنا کی ہیں روداد نہیں
یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب　　اور وہ نکہتِ صحرا جو چمن زاد نہیں
یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں　　منظرِ حسن کہ "منت کشِ" بہزاد نہیں

یاد ہے چھاؤں میں تاروں کی وہ سرگوشیاں
اور وہ شکوۂ قدرت کہ ہم آزاد نہیں

وجاہت حسین عندلیب شادانی
(ڈھاکہ)

۔۔۔ادوں

۔۔۔دوں

۔۔۔دوں

اچھا ہے کہ سہرے مرے بیکار نہ جائیں
شبنم کو جو کرنوں کی لڑی سے میں پرو دوں

ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے
ذروں کے لیے عشق کا آسمان بنا دوں

ہر حسن کے ظلم کو یہ جور کو سہہ کر
مطلب ہے کہ نظروں کی ہوئی بات کو بھلا دوں

ہنس ہنس کے وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے تھے
[illegible]

ساغر کی کھنک قلقل مینا میں سمو کر
[illegible]

گلشن جسے کہتے ہیں وہ آتشکدہ بن جائے
میں آتش گل کو ... ہوا دوں

جس نظم پہ ماہر کو بہت داد ملی تھی
کہئے تو وہی نظم ترنم سے سنا دوں

ماہر القادری

غزل

ہمارے اشک خونیں کی روانی دیکھتے جاؤ
لہو کا ہے لہو پانی کا پانی دیکھتے جاؤ

ہوئی ہے شادئ مرگ آج تم سے ملنے والوں کو
تماشا ہے وفورِ شادمانی دیکھتے جاؤ

تمہاری رہگزر میں قتل ہو کر بسمل آئے ہیں
ادھر آؤ تو مردوں کی بے زبانی دیکھتے جاؤ

تمہارے دیکھنے والوں کا دم اب تو لبوں پر ہے
اثر لایا ہے کیا سوز نہانی دیکھتے جاؤ

نہ دیکھو آئینہ جاتے ہوئے دشمن کی محفل میں
تم اپنا حسن اپنی نوجوانی دیکھتے جاؤ

نہیں ہے بے سبب طوفان آنا دیدۂ تر کا
مری حالت کی ہے یہ ترجمانی دیکھتے جاؤ

معین کے شعر سن کر بندہ پرور تم بھی خوش ہو گے
ذرا اس کی طبیعت کی روانی دیکھتے جاؤ

معین

غزل

اے پیکرِ خیال نگاہوں پہ چھا کے دیکھ
میرا عیارِ ذوقِ نظر آزما کے دیکھ

جنت نظر ہے منظرِ رنگینیٔ جہاں
آنکھوں سے امتیاز کا پردہ ہٹا کے دیکھ

کتنی [illegible]
اک بار دل میں شمعِ محبت جلا کے دیکھ

ناز نظر [illegible]
لایا ہوں [illegible] مسکرا کے دیکھ

ہمدم نگاہِ ناز عجب کام کر گئی
تیور بدل گئے دلِ بے مدعا کے دیکھ

شعبانِ عشق سیلِ حوادث پہ چھا گیا
اے حسن تو بھی زحمتِ طوفاں اٹھا کے دیکھ

سکندر علی وجد

"کچھ نہیں" کے دو پہلو

جنہیں عشق سے واسطا کچھ نہیں
انہیں حسن سے کیا ملا؟ کچھ نہیں

جہاں زہد خشک آگیا اس جگہ
محبت، مروت، وفا کچھ نہیں

خدا جانے کس دل سے کہتے ہیں لوگ
حسیں اور ان کی ادا کچھ نہیں

[illegible]
شبِ ماہ میں بھی مزا کچھ نہیں

نظر میں نہیں کہکشاں ستارے اگر
تو ہر خندۂ خوش نما کچھ نہیں

نظر کے ہیں دھوکے مناظر اگر
تو پھر یہ چمن یہ فضا کچھ نہیں

حکیموں پہ حیرت نہ ہو کیوں مجھے
بڑھا علم تو کہہ دیا کچھ نہیں

نہ ساقی نہ ساغر نہ شاہد نہ باغ
مآل ان کی تحقیق کا کچھ نہیں

(۲)

وجود ان کا میری نظر میں بھی کیا
عدم ہے، عدم کے سوا کچھ نہیں

کہوں کیسے ہستی کے گلزار میں
فنا ہی فنا ہے بقا کچھ نہیں

میں خواہشِ حسن سے ہوں سوا حسن کے
مری زیست کا مدعا کچھ نہیں

مزے اہلِ دل لے رہے ہیں سب ... نہیں
یہ ساقی یہ ساغر یہ شاہد یہ باغ حلاوت ہے دل میں کیا کچھ نہیں

علی منظور

میری ہمسائی

حسین نغموں سے زندگی ہیں دریچہ میں مسکرا رہی تھیں
شباب انگڑائی لے رہا تھا جبین نور بن چمک رہی تھی
وہ نوجوانی کی داستانیں پیامِ عشرت سنا رہی تھیں
گلاب کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں سارے مہک رہی تھی
ندیم! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

عجیب منظر عجب سماں تھا مری نگاہوں کے عین آگے
لطیف ہونٹوں پہ تھا تبسم جمال افروز خواب آسا
بہار کی چاندنی میں جیسے دکھائی پڑتے ہیں چاند تارے
نظر سے مستی ٹپک رہی تھی شراب آسا شباب آسا
ندیم! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

نگاہِ بد سے خدا بچائے بہارِ تصویر سامنے تھی
ملاحتوں میں صباحتوں میں رخِ حسیں جگمگا رہا تھا
جمیل خوابوں کی گویا میرے حسین تعبیر سامنے تھی
ادائے دوشیزگی کے صدقے شباب بھی گنگنا رہا تھا
ندیم! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

محبوب حسن جگر (عثمانیہ)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

ادارۂ ادبیات اُردو نے مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط اور تحریروں کے جمع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ اس وقت تک متعدد کرم فرماؤں نے اردو ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیگر مشاہیر کے بھی سیکڑوں خطوط او تحریریں عنایت کی ہیں جن میں سے صرف چند خطوط اس اُردو نمبر میں شایع کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوط میں نمبر ۱، معصومہ بیگم مرزا حسین علی خاں صاحب نمبر ۲، ۴، ۵، ۸ اور ۹ سکینہ بیگم سید رحمت اللہ صاحب کے ۳، ۱۰ تا ۱۶ صغریٰ بیگم سید ہمایون مرزا کے اور ۶، ۷ .... ڈاکٹر زور کے عطیہ ہیں۔

شبلی نعمانی کے خطوط

بنام طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی بنت عماد الملک

مکرمہ من - تسلیم

کل میں نواب عماد الملک بہادر سے ملا اور اتفاق سے کل ہی میرے نام ایک خط خواجہ صاحب کا ولایت سے آیا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ریاست سے تو امداد ممکن نہیں لیکن خواجہ صاحب کو لکھ دو کہ بہت جلد (یعنے دس پندرہ دن کے بعد) ہم لوگ ان کے مشن کے لیے ایک معقول ماہوار رقم مہیا کر دیں گے۔ جناب نواب صاحب موصوف اور مولوی انوار اللہ صاحب مل کر اس کام کو کریں گے۔

لکھنے کے لیے میں حاضر ہوں۔

خواجہ صاحب کا خط مع اپنی تائید کے کسی اخبار میں شایع کروں گا۔

شبلی شہریور ۱۳۱۳ف
(کاچی گوڑہ)

بنام طیبہ بیگم (بنت عماد الملک)
بھوپال

مکرمہ من

تسلیم۔ خواجہ کمال الدین کے لیے جو کچھ یہاں کر سکا اس کی اطلاع دے چکا ہوں۔

اس وقت یہ تحریر ہے کہ "ظل السلطان" خاص خواتین کا پرچہ ہے اور حضور سرکار عالیہ کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ اس لیے آپ کبھی کبھی اس میں کچھ لکھا کریں تو بہت منت ہوگی۔

شبلی ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء

بنام سید ہمایون مرزا بیرسٹر ایٹ لا

مکرمی

ہم لوگ نیلام جا رہے ہیں۔ اگر آپ کے سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلیے۔

شبلی ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء

طیبہ بیگم کے خطوط

بنام لیڈی سر آسمان جاہ

جناب بیگم صاحبہ معظمہ و محترمہ دام عنایتہا

بعد تسلیم عرض خدمت گرامی ہے کہ اگر ۱۵ ماہ محرم

ہال اور اس کے اندر کا پانچ باقی سب کمرے بند رکھے جائیں۔ اگر چودہ تاریخ سے اجازت ہو جائے تو پردہ کا انتظام کروا دیا جائے۔ مولوی شبلی صاحب جو ایک مشہور و معروف لکچر دینے والے ہیں، اشاعت اسلام پر لکچر دینگے۔ سامنے کے اسٹیج پر وہ رہینگے اور اس کے مقابل کے دروں پر پردہ باندھ دیا جائے گا۔

اگر ہال کی اجازت دلوادی جائے تو میں نہایت ممنون ہونگی۔ ۱۵ محرم کو اتوار کا روز بھی رہے گا۔ دفتر بھی بند رہیگا۔

طیبہ بیگم

بنام عزیز فاطمہ بیگم شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا

جناب ہمشیرہ صاحبہ

آپ کا مضمون ماشاء اللہ نہایت عمدہ ہے۔ اُردو تو آپ ہمیشہ سے پُرزور لکھتی ہیں مگر جہاں خدا کا ذکر ہو پھر وہاں کا کیا کہنا ہے۔ اُبلا ہوا دل چھلک پڑتا ہے۔ آپ تو عشق اللہ میں صوفیوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے مضمون میں صرف جو بات کانوں کو ناگوار گذرتی ہے وہ میرا ذکر ہے۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ بہت سی وجوہ ہیں۔ صرف اس کو انکسار نہ سمجھئے۔ عندالملاقات کہونگی۔ خدا ہم کو آپ کی دعوت میں شریک

طیبہ بیگم

داغ دہلوی کے خطوط

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ ڈل

مہربان من

آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ آپکے اُستاد شاگرد فیض صاحب نے بہت خوب بنائی ہے۔ غزل کی تعریف، آپ کی طبیعت کے ... رسا کی اور ان کی اصلاح کی داد دیتا ہوں اس میں کہیں گنجائش اصلاح نہیں ہے نسخہ جو ممکن ملے اس کو آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔

ہیچمدان فصیح الملک داغ دہلوی

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ ڈل

الحمدللہ کہ خیریت سے ہوں۔ روزہ رکھ رہا ہوں۔ کمترین صاحب صفائی چادر گھاٹ سے جھگڑا ہے۔ مثانہ کے درد کے واسطے دوا بھجوادو پہلی دوا مفید ہوئی۔ فقط

گرامی کے خطوط

بنام نواب قادر نواز جنگ بہادر

ہوشیارپور۔ پنجاب

عالی جناب نواب قادر نواز جنگ بہادر

تسلیم۔ آپ کی صورت دل نواز، آپ کی سیرت وفاطراز، آپ کا مکان دلفریب، آپ کا وہ

خلق گرامی نواز، گرامی کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

حضرت قاضی صاحب کو کہہ دیجئے کہ گرامی کو صوبہ صاحب بہادر کا جذبۂ اخلاص حیدرآباد میں کھینچ رہا ہے۔ بفضلِ خدا فروری کے مہینے میں گرامی نواب قادر نواز جنگ بہادر کی مجلس سماع میں حاضر ہو جاوے گا۔

گرامی حضرت قاضی صاحب کی محبت کا دلدادہ ہے۔ اور صوبہ صاحب بہادر کا رہینِ منت سیالکوٹ ۵

گرامی چند رباعیاں بھیجتا ہے۔ مجھے امید ہے نواب قادر نواز جنگ بہادر پسند فرماویں گے۔

راقم۔ گرامی

بنام مولوی سید احمد

حضرت سید صاحب

رطب و یابس لکھ دیا گیا ہے۔ طول بے معنی ہوتا ہے۔ ہرچہ گیرید مختصر گیرید۔ دو شعر نکال دئے گئے۔ خط کھینچ دیا گیا ہے۔ خوشخط لکھوا لیجئے۔

راقم۔ گرامی

راشد الخیری کا خط

بنام صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

عزیزہ محترمہ۔ سلام مسنون

میں خود آپ سے اسوقت ٹیلیفون پر گفتگو کرتا کہ آپ کا پرچہ پہنچا۔ کھانا یہاں بھی آپ کا ہے اور وہاں بھی۔ اصلی چیز آپ کی محبت، خلوص اور فدائی ہے جس کا میں ممنون ہوں، بیگم راشد الخیری آج دہلی جارہی ہیں اور ان کا جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ یکم اکتوبر سے نیا سیشن شروع ہوتا ہے اور روپیہ کی تعداد دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے وہ آپ کے ہاں چا پی چکی ہیں۔ میں دو دفعہ چا پی چکا ہوں اگر آپ کی رائے میں کھانا نہایت ضروری چیز ہے تو میں حاضر ہوں اور آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں کسی روز آ کر بغیر اطلاع جو موجود ہوگا کھا پی لوں گا۔

نواب معین الدولہ بہادر سے اس وقت ملنے جا رہا ہوں امید ہے روپیہ مل جائیگا۔

بیگم مرزا یار جنگ صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں شاید آج کل میں آجائیں۔

میں ابھی ایک ہفتہ اور ٹھہرونگا روانگی سے قبل یہاں کا حساب پریس میں بھیجکر آپ سے انشاءاللہ ملتا ہوا جاؤنگا۔

سید ہمایوں مرزا صاحب کی خدمت میں سلام علیک فرما دیجئے۔　　دعاگو

راشد الخیری

نواب امداد امام اثر کے خطوط

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

کیمپ بڑکاڈ انڈی　　　　مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۱۳ء

مجمع فضائل و جود و نیل خلاصۂ خاندان مصطفوی و مرتضوی دام مجدکم

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ محبت نامہ وارد ہوا۔ دریافت خیریت سے مسرت قلبی حاصل ہوئی۔ خدائے تعالیٰ آپ کو ترقی اقبال کے ساتھ حی و قائم رکھے۔

سامان ... تنقیح ...

اس وقت تک بلاؤں سے نجات نہیں ملی ہے۔ دو مہینے سے ہز ہائنس نواب صاحب فرمانروائے رامپور کا مہمان ہوں۔ یہاں تقریب شکار سے ہمرکاب آیا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کب تک وطن کو معاودت کرسکوں گا۔ وطن کی یہ حالت ہے کہ دس مہینے سے نیورہ نہیں گیا ہوں۔ میں اپنی پریشانیوں کو کیا عرض کروں۔ آپ کی تصنیف تشریف گیا میں ہے ساتھ نہیں ہے۔ اُس پر ریویو لکھنے کا مجھے کوئی موقع حاصل نہیں ہے۔ البتہ گیا جاکر تعمیل حکم کرسکونگا۔ اس وقت امیدوار معافی ہوں۔ فقط زیادہ حد ادب

دعاگو

امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبکلہ۔ گیا۔ صوبہ بہار

مورخہ ۳ ۔ فروری ۱۹۲۰ء

قبلہ وکعبہ جناب عمو جی صاحب مدظلہ العالی۔

بعد بجاآوری مراتب تسلیم و کورنش عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت بندگان حضرت کا درگاہ الٰہی سے طالب۔ ورود سرفراز نامہ نے افتخار دارین بخشا۔ امور ضروری ذیل میں گزارش ہوتے ہیں۔

میری شومی بخت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ بندگان حضرت پٹنہ تشریف لاویں اور میں شرف قدمبوسی سے محروم رہ جاؤں۔ اگر تشریف آوری مجھے

میں حاضر

... کا کیا جواب ہے۔

چکا ہوں۔ ایسی حالت میں کیا امید ہوسکتی ہے کہ پھر شرف اندوز ملازمت ہوسکونگا۔

میری چند تصنیفات تو ضرور شایع ہوچکی ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ کہاں سے دستیاب ہوسکتی ہیں میرے پاس میری تصنیفات کے نہ کوئی قلمی نسخے موجود ہیں اور نہ کوئی چھپے ہوئے نہیں ارشاد میں مطلق دیر نہ ہوتی مگر کیا کروں مجبور ہوں۔

بحضور جناب چچی صاحبہ مدظلہا۔ آداب و تسلیم عرض ہے اور میری اہلیہ بھی آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔ بچوں کی طرف سے آداب و تسلیم قبول ہو۔

مجھے حصول ملازمت کی بیحد تمنا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ پیرانہ سالی مانع نقل و حرکت ہے، تعجب یہی ہے کہ اب تک کیونکر زندہ ہوں، خاص کر حسین امام مرحوم کی رحلت کے بعد فقط

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبکلہ۔ گیا۔

مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۲ء

جناب عمو جی صاحب قبلہ وکعبہ دام ظلہ العالی۔

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ ورود سرفراز نامہ نے سرفراز و ممتاز فرمایا۔ دریافت خیریت مزاج عالی سے اطمینان قلبی نصیب ہوا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ

قبول ہو۔ شرف قدم بوسی کی تمنا احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ کیا کروں کوئی امر اپنے اختیار کا نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔ اس لیے کہ پایانِ عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ صرف فرمانِ خداوندی کی دیر ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ نے ایسی کروٹ لی ہے کہ اکثر افراد کو اپنی جگہ سے جنبش کرنی دشوار ہو رہی ہے۔ یہ زمانہ امرا گردی کا آیا ہے۔ مگر ہم غربا بھی اُن کے شریکِ حال ہو رہے ہیں۔ اب اس دیار کی حالت قابلِ عرض نہیں رہی ہے اور روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اہلِ غیرت خودکشی سے اپنی آبرو کو بچا سکیں تو بچا سکیں، ورنہ اور کوئی ذریعہ حفظانِ آبرو کا نظر نہیں آتا ہے۔ خیر۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔ بالیقین میں نے اپنی عمرِ طویل میں کسی زمانے کا ایسا رنگ نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا ہوں۔

اہلیہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں اور بحضور جناب حضرت چچی اماں صاحبہ مدظلہا آداب و تسلیم کے پہونچا دینے کی مستدعی ہوتی ہیں۔ نحیف کی استدعا بھی یہ ہے۔ دنیا میں جس قدر خیریت ممکن ہے میرے جمیع متعلقان کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہے پریشانی عام کی اور بات ہے فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبگلہ۔ گیا۔ مورخہ ۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

حضرت عم قبلہ و کعبہ مدظلہ العالی۔ بعد گزارش آداب

تسلیم عرض ہے کہ شرف بخشی کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتا ہوں، قرینِ پذیرائی ہو۔ یہاں یا صوبۂ بہار میں علی امام سلمہٗ کی خدمت حیدرآباد کا مذکور ابھی تک سننے میں نہیں آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر تمام تر بے بنیاد ہے۔ ایک مہینے کا عرصہ ہوتا ہے کہ موصوف یہاں آئے تھے مگر حیدرآباد کا کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ مجھے حاضری کی بڑی تمنا ہے، خاص کر ایسی حالت میں کہ پایانِ عمر کو پہونچ گیا ہوں۔ مگر بہت موانع درمیان میں حائل دکھائی دیتے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ سفرِ آخرت کے پہلے شرف قدم بوسی حاصل کر لیتا۔

بیگم صاحبہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔ ہم لوگوں کی طرف سے بحضور جناب چچی اماں صاحبہ مدظلہا آداب و تسلیم فرما دیجیئگا، سایۂ عاطفت ممدود زیاد فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کا خط

بنام صغریٰ بیگم سید ہمایوں مرزا

لاہور۔ جمعرات۔ ۲۹ دسمبر سنہ ۲۸ء

پیاری بیٹی صغریٰ۔ بعد دعاہائے فراوان واضح ہو کہ تمہارا محبت نامہ ملکر بے انتہا خوشی ہوئی۔ چونکہ تم نے مجھے یہ لکھا ہے کہ آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھیں۔ اس لیے میں یہ خط بیٹی ہی کی طرح لکھ رہا ہوں۔ میں پہلے بھی تم کے نقطہ سے خط و کتابت

اب ابھی میں جان کر پھر ...
جس طرح اپنی پیاری وحیدہ کو خط لکھا کرتا تھا۔
اللہ تعالیٰ تمھیں مع اپنے شوہر محترم کے خوش اور
خیریت سے رکھے اور حکیم نابینا صاحب کا علاج
راس لائے کہ آپ پورے تندرست ہوکر وطن کو جائیں۔
میں ضرور آتا مگر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے اطلاع
آئی کہ سید نذر الباقر صاحب والد مسز سجاد حیدر کا
یک بیک حرکت قلب کے بند ہوجانے سے انتقال
ہوگیا۔ میں وہاں جانے والا ہوں۔ مگر تمھاری
موجودگی ہی میں مجھے سخت قبض ہوگیا تھا جو بعد
جاری رہا۔ اس سے میں بہت ڈرتا ہوں اور
یہ سفر میں زیادہ ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے
ہیں کہ جلاب لینے کے بعد جاؤ۔ مگر جلاب سے
میرے امعا میں بہت گڑبڑ ہوجاتی ہے۔ میں
غذا سے درستی کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساگ پر
زیادہ زور دے رکھا ہے اور موٹے آٹے کا حریرہ
گڑ کا کھاتا ہوں۔ اس میں گھی ڈال کر قبض دُور
ہوجائے تو میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں جاؤں۔

تمھارے جانے کے بعد ہمارا گھر بہت سُونا
سُونا معلوم ہونے لگا۔ بالکل سُنسان، خاموش
اور بے رونق۔ مگر رفتہ رفتہ اپنی قدیمی بے رونقی کا
عادی ہوجاؤنگا۔

... شرم سے ہاتھ
... بیا بار بار یاد
... نھیں پھر بلالو۔
... ے ملائے اور دونوں جانب
خیریت رکھے۔

مسز شاہ نواز نے اب تک کوئی فارم نہیں
بھیجا حالانکہ میاں حمید نے انھیں خط بھی لکھا۔
مہربانی کرکے تم انھیں تاکیدی خط لکھ دو اور یہ لکھو
کہ "میں سید ممتاز علی صاحب اور مسز حمید سے
وعدہ کرچکی ہوں کہ مسز شاہ نواز بچی کو ضرور داخل
کروادینگی۔ پس آپ مجھے ان کے آگے شرمندہ نہ
کرائیں اور جلد انتظام داخلہ کے کرکے بچی کو خود ساتھ
لے جائیں۔ میں بے انتہا شکر گزار ہوں گی۔"
اس طرح کا خط اپنے دوسرے حالات کے ساتھ
جلد لکھ دیجئے۔

سید صاحب محترم کے اشعار اور لکچر نما
تقریریں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش میرا حافظہ ہو
اور ان جواہر ریزوں کو محفوظ رکھ سکتا۔ ان سے
مل کر دل بہت ہی خوش ہوا۔ اس نمونے کا بیرسٹر
پنجاب میں تو ایک بھی نہیں۔ یہاں کے بیرسٹروں
میں تو بوٹ سوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں نہایت
بدمذاق، ناسخن شناس، بے علم ہیں۔ ان میں
صاحب لوگیت کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ آپ کے
شوہر محترم کو تادیر سلامت باکرامت رکھے۔
کاش حیدرآباد نزدیک ہوتا اور میں آسانی سے

مل سکتا۔ یا تم دس بارہ برس پہلے میری بیٹی بنی ہوئی تھیں
تو پیاری بیٹی اب ختم کرتا ہوں۔ قلم سے بوجہ رعشہ
لکھ نہیں سکتا۔ پنسل سے بہت آہستہ آہستہ بمشکل سے
لکھا جاتا ہے۔ اتنا لکھنے میں ایک گھنٹے سے کم نہیں
لگا۔ ثریا تم دونوں کو آداب کہتی ہے اور سب عزیز
سلام کہتے ہیں۔ حمید بیرسٹر صاحب کو بہت یاد کرتے
ہیں۔ عزیزی حیدر صاحب کو بھی میرا سلام شوق
پہنچا دیجئے۔ اب بالکل رخصت محبت کے ساتھ

ممتاز علی

مکرر آنکہ۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ چائے
کا وقت ہو گیا تھا۔ میرا کوئی آدمی چائے بنانے والا
نہ تھا۔ دلہن نے اوپر سے چائے بھیجی ہے اور
ساتھ کچھ پکوان۔ میں خط بند کرنے نہ پایا تھا کہ
چائے آگئی۔ میں نے یہ بھی خط میں درج کر دیا۔
لو اب تو سچ مچ ختم۔ والدعا۔

ممتاز علی

شاد عظیم آبادی کا خط

بنام سید ہمایوں مرزا

دوم جولائی سنہ ۰۹ء عظیم آباد

حبیب محتشم عزیز مکرم دام لطفکم بعد سلام
شوق و اشتیاق دیدار کے واضح خدمت ہو یہ خط
میرا عزیز از جان مسٹر محمد سلیمان صاحب اور برادر
شفیق سید ہمایوں میرزا صاحب دونوں حضرات کے
نام نامی سے ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ بعد تشریف بری
آپ کے مولوی سید نورالدین احمد صاحب وکیل میری
ملاقات کو تشریف لائے اور از راہ عنایت مجھ سے
فرمایا کہ آپ حیدرآباد کا ضرور قصد کیجئے اور وہاں
آکر میرے گھر میں چندے قیام کیجئے میں اپنے گھر
میں ایک مجلس سید الشہدا برپا کر کے فخر الملک
وغیرہ امرا سے آپ سے ملوا دوں گا (چونکہ ادھر
میں نے بہت سے مرثیے نظم کئے اور مجالس میں
خود پڑھے اور ان کی رونق اور تعریف بے حد و
حساب ہوئی چنانچہ ایک مجلس عظیم الشان میں
اکثر حضرات بیرسٹر بھی شریک تھے اور یک زبان
ہو کر بے حساب داد دی اسلئے ہمارے نوابمیاں
کو بہت جوش پیدا ہوا اور یہ صلاح دی)
اور سکے جواب میں اپنے عزیز مسٹر سلیمان صاحب
کی رائے ظاہر کی کہ بغیر خط سفارشی مسٹر پلوڈن صاحب
کے آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا! ایں ہمہ آج میں صاحب
کمشنر بہادر سے ملنے گیا تھا چونکہ چند روز بعد لفٹنٹ
گورنر آنے والے ہیں ایک قطعہ اُن کے ورود کے لئے
حسب معمول نظم کر کے کمشنر صاحب کو دکھانے گیا
تھا مجھ سے بے اختیار خود کہنے لگے کہ آپ کے لئے
ہم حیدرآباد جانا بہت پسند کرتے ہیں اگر آپ
کہئے تو ہم مسٹر پلوڈن صاحب کو چھٹی لکھ دیں
بشرطیکہ آپ جانے پر مستعد ہوجئے میں نے کہا
کہ میرے دو عزیز بیرسٹر بالفعل حیدرآباد میں پریکٹس
کرتے ہیں میں اُن سے صلاح کر کے آپ کی خدمت
میں عرض کروں گا۔
اس وقت یہ خط اس لئے آپ کی خدمت میں

کافی ہوگا یا اور کچھ بندوبست کریں یعنی کلکتہ جاکر
اور اور انگریزوں سے بھی کہیں۔
(۲) اگر کمشنر صاحب سے خط لکھوائیں تو اُس کا
کیا مضمون ہو۔
(۳) اپنے لڑکے کو ساتھ لائیں یا نہیں مشکل
یہ ہے کہ بغیر لڑکے کے زیادہ قیام میرا ناممکن ہوگا۔
(۴) ایسی حالت میں میرے خرچ آمد و رفت
کو پانچ سو روپے کافی ہونگے یا نہیں۔
(۵) لباس کس قسم کا وہاں درکار ہے، مطلب
یہ ہے کہ جو لباس کی قطع ہے وہ بدلنا ناممکن مگر قسم
پارچہ کیا ہو۔
(۶) مولوی خدا بخش خاں صاحب سے امید
نہیں، شاید حافظ صاحب بھی کچھ معین ہوں تو
اپنے وہاں آنے کی خبر اُن کو خواہ مولوی سید حسن صاحب
کو دینا چاہئے یا نہیں۔
(۷) رزیڈنٹ کے ذریعے سے مکان قیام مجھے
مل سکتا ہے یا نہیں۔
امید ہے کہ آپ لوگ خوب سوچ بچار کر اس کا
جواب تحریر فرما کر مجھ کو مشکور احسان فرمائیے تاکہ
اگر میرے ہزار پانچ سو خرچ ہوں تو بیکار نہ جائیں۔
یہاں گرمی کی شدت ہے ایک دو بار پانی برسا
ہے مگر کافی نہیں ہے۔

آپ کا دعاگو
علی محمد شاد غفرلہٗ

رباعیات

(۱)

گر گل کی ہوس ہے تو اُلجھ خاروں سے
لے درس حقیقت کا تو افسانوں سے
احساس غم و درد مٹا دے یاں تک
کہ نغمہ کی پیدا ہو ترے نالوں سے

(۲)

یوں ہمدمو! مشکل کو تم آساں کر لو
بجلی کو نشیمن کا نگہباں کر لو
چھوڑو کوئی اچھی سی نشانی اپنی
مرنا ہے یہاں جینے کا ساماں کر لو

(۳)

اے دوست بتا دے مجھے کچھ رازِ حیات
قبل اس سے کہ اڑ جائے یہ شہبازِ حیات
کس نے چھیڑا ہے اور کیونکر چھیڑا ؟
دلچسپ ہے بسکہ نغمۂ سازِ حیات

(۴)

سننے کو نصیحت تجھے خود گوش نہیں
غفلت میں تو مدہوش ہی کچھ ہوش نہیں
دیتے ہیں خبر خزاں کی گل گلشن میں
گویا ہے زبانِ غنچہ خاموش نہیں

منشی محمد عطا اللہ عطاؔ

سب رس معلومات

(ضمیمہ سب رس)

غازی مصطفےٰ کمال پاشا جو ۱۸۸۱ء میں سیلونیکا میں پیدا ہوئے، بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ انھوں نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا، اور ان کے والد علی رضا کروڑگیری کے ایک معمولی عہدہ دار تھے جو ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے، مگر اس ہونہار بچے کے سر پر اس کی والدہ زبیدہ کا سایہ تھا جو مصطفےٰ کے لئے بڑی نعمت تھی۔ زبیدہ نے سب سے پہلے ایک قدیم مکتب میں مصطفےٰ کی تعلیم کا انتظام کیا تاکہ اس کو مذہبی باتوں سے پوری واقفیت ہو جائے۔ اس کے ایک سال بعد مصطفےٰ ایک ثانوی مدرسے میں منتقل کئے گئے جہاں ان کی ذاتی قابلیت اور پوشیدہ جوہر نے ان کو تعلیمی وظیفے اور "کمال" کے لقب سے سرفراز کیا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصطفےٰ کمال کو تعلیم کی نسبت درج سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ وہ مدرسہ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور سیلونیکا کے ایک فوجی مدرسے میں شریک ہو گئے۔ یہاں انھوں نے زیادہ دلچسپی اور انہماک سے کام کیا، اور بہت سے امتیاز حاصل کئے۔

جس زمانے میں مصطفےٰ سنِ شعور کو پہنچے وہ ایک پُرآشوب زمانہ تھا۔ ترکی کی فضا پر ظلم وجور، ذلت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں عثمانی ترکوں کی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ سلطان سلیم اور سلیمان کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہ کر سکتی تھی۔ سات سرزمینیں اور سات سمندر ان کے قبضے میں تھے۔ مگر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ علم و تدبر کے مالک تعیشات کے غلام بن گئے۔ سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی اور حکومت نااہلوں کے ہاتھوں میں آگئی جن کا شعار ظلم و جبر اور مکر و رعوام کو کچلنا تھا۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے۔ برطانیہ نے مصر دبا لیا، اور فرانس نے تیونس۔ بلقان کی ریاستیں ایک ایک کرکے آزاد ہو گئیں۔ روس کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی موقع ملتا قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا۔ خود سلطنت میں عیسائی اقلیتیں یورپی حکومتوں کے بل بوتے پر آئے دن آمادۂ فساد رہتیں۔ نیز سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی اور قرضوں پر حکومت کا کام چلتا تھا۔ ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سپرد کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو غیر ملکی آباد تھے وہ ترکی قوانین سے بالاتر تھے اور یہ ذلت واستبداد کی انتہا تھی۔ پھر ۱۸۷۷ء کی جنگ میں جو روس اور ترکی کے درمیان ہوئی تھی، ترکی کے ماتھے پر "بیمار یورپ" کا دل خراش دھبہ لگ چکا تھا۔ اس ابتری کی تمام تر ذمہ داری سلطان عبدالحمید پر تھی، مگر اس کے باوجود وہ ظل اللہ کے نام سے پوجے جاتے تھے، اور مذہبی طبقے اس کے مظالم کی تائید میں تھے۔ لیکن ملک کے نوجوان جن پر ملک کو تباہی سے بچانے کی بڑی ذمہ داری تھی

اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے لگے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی بہت سی انجمنیں قائم ہوگئیں اور ان کی یہ کوشش ہونے لگی کہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ نوجوان مصطفےٰ کمال پر نئے خیالات اور نئی تحریکوں کا جنھیں بڑی حد تک بیرونی انتداب اور انقلاب فرانس کا ردّ عمل سمجھنا چاہیے بہت زیادہ اثر پڑا اور کمال نے "ترقی پذیر جماعت" میں شرکت کرلی جو ایک بہت بڑی خفیہ جماعت تھی اسی خفیہ جماعت سے کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اس وقت تک کمال نے فوجی مدرسوں سے فراغت حاصل کرلی تھی اور اب بائیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ کی جنگی اکاڈیمی میں لفٹنٹ ہوگئے تھے اس زمانے میں کمال کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر جس چیز کا پڑا وہ ایک ممنوعہ کتاب "وطن" تھی۔ کمال نے اس کتاب کا پرچار کیا، اور اس پر تقریریں کیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادارت میں ایک اخبار بھی جاری کیا جو ببانگ دہل حکومت کی مخالفت کرتا تھا مگر نوجوانوں کی سرگرمیاں زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکیں چنانچہ ۱۹۰۵ء میں مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھی پکڑ لئے گئے۔ کمال کو فوج میں لفٹنٹ بناکر وطن سے دُور دمشق بھیج دیا گیا، مگر یہاں ان کو اپنی جدوجہد کے لئے زیادہ آزادی ملی چنانچہ "وطن" کے نام سے ایک انجمن بنی اور فوج کے نوجوان افسر اس میں شریک ہوئے اسی سلسلے میں کمال سیلونیکا پہنچے، مگر چونکہ حکومت کے جاسوسوں کو اس کی خبر ہوگئی تھی اس لئے وہ بھاگ نکلے چند دنوں بعد فوجی وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں اور کمال سیلونیکا کی فوج میں آگئے جو انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا اب انھوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، اور موجودہ دو بڑی خفیہ انجمنوں یعنے "آزاد جماعت" اور "ترقی پذیر جماعت" کو متحد کردیا کمال اس نئی "انجمن اتحاد و ترقی" کے سرگرم رکن بن گئے اور انور و جمال کے ساتھ کام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انجمن "اتحاد و ترقی" اتنی طاقتور ہوگئی کہ ۱۹۰۸ء میں سلطان دستوری حکومت قائم کرنے پر مجبور ہوا، اور ایک پارلیمنٹ بنادی گئی۔ بعد میں سلطان نے اپنے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو انھیں معزول کردیا گیا، اور وہ نظربند ہوگئے اب ملک کے نوجوانوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور نااہل لوگ برطرف ہوگئے۔

مگر اس نئے دَور کو شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ملک پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے! اس نازک وقت میں جبکہ ترکی فوج منظم نہ ہوسکی تھی اور ترکوں کے پاس سمندری بیڑا بھی نہ تھا، اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا۔ جوں توں کرکے انور اور مصطفےٰ کمال طرابلس پہنچے اور عربوں کی مدد سے دشمنوں کو روکنا چاہا۔ وہ اس طرف متوجہ ہی تھے کہ بلقان کی مملکتوں نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کردی۔ ترکوں نے تو دونوں جگہ مقابلہ کیا مگر ان کو ہر محاذ پر شکست ہوئی، اور ترکوں نے جن لوگوں پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں ذلتیں اٹھانی پڑیں۔ انور اور کمال طرابلس سے وطن واپس آئے تو کمال کو اور زیادہ مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا کیونکہ اب سلطنت کے سیاہ و سپید کے مالک انور، طلعت اور جمال ہوگئے تھے اور پارلیمنٹ صرف نام کو باقی تھی۔ ان تینوں نے کمال کو نظرانداز کردیا

جنوری ۱۹۱۶ء

۔۔میں جنگ عظیم

ن تو سوفیا ہی میں رہنے دیا۔

پہنچے اور چند دنوں بعد صحت

ہوئی تو ان کو درہ دانیال کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ برطانوی توپیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں، مگر مصطفیٰ کمال کی حیرت انگیز شجاعت اور جنگی مہارت نے معجزہ دکھایا اور بے بس ترکوں نے دُنیا کی زبردست سلطنت کو شکست دی چنانچہ انگریز درہ دانیال سے بُری طرح پسپا ہوئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال کا نام خوب چمکا مگر مشکل یہ تھی کہ کمال کے حریف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ مگر دوسری طرف جنگ طول کھینچی تو جرمنوں کے ساتھ ترک بھی ہر محاذ پر شکست کھانے لگے۔ عربوں نے بغاوت کر دی اور عراق و فلسطین کی طرف سے انگریزوں نے پیش قدمی شروع کی۔ اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے کمال کو ہدایت ہوئی کہ فلسطین کے محاذ جنگ پر روانہ ہو جائیں مگر فلسطین میں دشمن کا روکنا آسان نہ تھا۔ کمال پیچھے ہٹتے گئے اور فلسطین، دمشق اور حلب سب ہاتھ سے نکل گئے مگر مسلسل شکستوں کے بعد جب وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے موجودہ ترکی سرحد پر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اب ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا اور وطن کی سرزمین پر دشمنوں کے ناپاک قدم نہیں آسکیں گے مگر اس وقت تک عارضی صلح کا اعلان ہو چکا تھا چنانچہ جنگ رُک گئی اور کمال قسطنطنیہ آ گئے۔

مصطفیٰ کمال کی غیر معمولی قابلیت اور ان کے پوشیدہ جوہر کے ساتھ ساتھ انھیں کچھ غیبی امداد بھی تھی چنانچہ ایک موقع پر جب ان کے دشمن کی گولی لگی تو انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا اور انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی جیب سے ایک گھڑی نکال ڈالی جو گولی کی زد سے ٹوٹ گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے موقعوں پر یہ خطرے سے بال بال بچ گئے۔ اس کے معنے صاف طور پر یہ تھے کہ قدرت کو کمال کے ہاتھوں ترکی کی خدمت کروانی منظور تھی۔
مگر مشکل یہ تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مصطفیٰ کمال کے لئے بہت سی گتھیاں تھیں۔ سلطان وحیدالدین نے برطانیہ کے ساتھ سازش کر لی تھی۔ دشمنوں کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں اور ان کے جہاز آبنائے باسفورس پر جمے ہوئے تھے۔ یہ ایسا نازک موقع تھا کہ ملک میں ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ انور پاشا وغیرہ ترکی سے بھاگ گئے تھے اور اب پرانے عافیت پسندوں کا راج دوبارہ قائم ہو گیا تھا جو ترکی کے اقتدار کو کھو کر انگریزوں کی غلامی اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کٹھن گھڑی میں مصطفیٰ کمال اُٹھے اور ملک کے نوجوانوں کو جن کی رگوں میں زندگی اور حمیت کا خون دوڑ رہا تھا، ایک جگہ جمع کیا۔ یہ نوجوان جن پر ایک بھاری ذمہ داری تھی اپنی قوم کو موت سے بچانے کی فکر کرنے لگے۔ اسی اثناء میں مصطفیٰ کمال مشرقی مقبوضات کے قائدِ اعلیٰ بنے اور انگورہ کی طرف بھجوائے گئے تاکہ وہ عارضی صلح کی شرائط کے بموجب فوج کو برخاست کر کے ہتھیار جمع کر لیں۔ اس موقع کو مصطفیٰ کمال نے

بہت غنیمت جانا اور انھوں نے فوج کی تنظیم شروع کردی اور اپنے ہم وطنوں کو آنے والے غلامی کے عذاب سے ڈرایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "مرد بیمار" نے پھر سے کروٹ لی اور اپنا علاج آپ کرنے پر تیار ہوگیا چنانچہ سلطنت کے ہر طبقے اور سمت کے لوگ مصطفےٰ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ زندگی کی اس نئی روح سے سلطان وحید الدین اور اتحادی گھبرائے مگر کمال ان کے قابو سے باہر ہوچکے تھے۔ مجبور سلطان نے اتحادیوں کی شہ پر کمال اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا اور شیخ الاسلام نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ کے ہمدرد ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے، مگر اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ عین اس وقت عہدنامہ سیورے کا اعلان ہوا۔ اس کی روسے ترکی کے سب مقبوضات اس سے چھین لئے گئے، قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ مانا گیا، سمرنا یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کی مختصر سرزمین ترکی کے حصے میں رہی۔ ان زیادتیوں کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ ترک قوم اب اپنے زندگی اور موت کے سوال کو حل کرنے کھڑی ہوگئی اور تمام ترکوں نے کمال کا ساتھ دیا۔ سیواک کے مقام پر اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ عبدالمجید خاں کے احکام کو ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا۔

ادھر یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھنا شروع کیا، اور ترکوں کو پیچھے ہٹاتے نئے پایۂ تخت انگورہ کے قریب تک پہنچ گئے۔ اس پر ترکوں کے خون نے جوش کھایا اور سقاریہ کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اکیس دن کی معرکہ آرائی کے بعد ترکوں نے فتح حاصل کی اور انھوں نے سمرنا تک کا علاقہ یونانیوں سے دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور انگریزوں کو مقابلہ کی دعوت دی مگر انگریز جو ابھی جنگ عظیم کے بعد سستانے نہ پائے تھے، ترکوں سے نہ لڑسکے اور انھوں نے صلح کی بنیاد ڈالی چنانچہ معاہدۂ لوزان میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطنیہ پر پھر سے پرچم ہلال لہرانے لگا اور باسفورس سے انگریزوں کے جہاز نکال دئے گئے۔ یورپی علاقے کو بھی انھوں نے حاصل کر لیا اور تمام اجنبی مراعات ختم کردیں۔ ترکی کے حدود معین کئے اور ایک جمہوری دستور سے ملک کو سرفراز کرکے پارلیمنٹی حکومت قائم کردی جس کا صدر مقام انقرہ (انگورہ) قرار پایا۔ مصطفےٰ کمال ترکی کے پہلے صدر ہوئے اور انھوں نے صحیح معنوں میں ملک کی قیادت کی۔

اسے مصطفےٰ کمال کی اولوالعزمی ہی کہنا چاہیے کہ دوسال کے اندر ترک قوم پھر سے زندہ ہوگئی اور اپنے پیر پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔ کمال سب سے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اتحادیوں کے بنائے ہوئے معاہدے کو ٹھکرایا اور دوسری مظلوم قوموں کو زندگی کا سبق دیا۔ دوسال کی قلیل مدت میں یورپ کے "مرد بیمار" کو جس کے ہاتھ پیر بالکل شل ہوچکے تھے، طاقتور قوموں کی صف میں اس طرح لاکر کھڑا کر دیا کہ اچھے سے اچھے مرد تندرست اور ہر بڑی طاقت کا مقابلہ کرسکے، کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ کمال کا معجزہ تھا۔ ترکی کی زندگی اور موت کا سوال

... سمجھتا ہے۔ چنانچہ جب ترکی پر مصیبت آئی اور ایک طرف ...

... اسلامی دنیا میں

... بیدار ہو گئے تھے، مگر جب

... اسلام کی آنکھوں کا تارا بن گیا

... دنیا کی دوسری قوموں کو بھی زندہ

رہنے کا طریقہ بتایا اور یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ مسولینی نے انہی سے بصیرت حاصل کی اور ہٹلر نے انہی کے نقش قدم پر چل کر معاہدۂ ورسائے کے پرخچے اڑا دیئے اور اپنی قوم کو اس قابل بنا دیا کہ ورسائے میں زیادتیاں کرنے والوں سے پورا بدلہ لے سکے۔

کمال کی کامیابی کا بڑا راز ان کی سیاسی حکمت عملی اور خارجی مسلک میں ہے۔ ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے باہر سے اطمینان حاصل کرنا ضروری تھا اور اسے کمال اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے دشمنوں اور دوستوں سبھی کو اپنا ہموار بنانے کی کوشش کی۔ روس سے جس کے ساتھ ترکوں کی بہت پرانی اور قومی دشمنی تھی، دوستی کی۔ مگر قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس دوستی کے باوجود اشتمالیت کی مسموم ہوائیں ترکی کا رخ نہ کر سکیں۔ یونان جس نے ترکوں کو پریشان کیا تھا اور جو بعد میں ترکوں سے پٹ چکا تھا، اس سے صلح صفائی کی اور راہ و رسم پیدا کیا۔ برطانیہ اور فرانس سے جو ترکی کے سخت دشمن تھے اور جنھوں نے ترکی کو پریشان کر کے اس کے بہت سے علاقے دبا لئے تھے، اب کمال نے دوستی کر لی بلکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرانس سے اپنے بہت سے مطالبات بھی منظور کرا لئے۔ پھر جرمنی سے بھی دوستی قائم رکھی اور روس و برطانیہ کی دوستی کے باوجود جرمنی کے ساتھ اچھے تعلقات برابر قائم رکھنا ترکوں کی بڑی حکمت عملی سمجھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس انوکھے مسلک کی وجہ سے کمال کو ترکی کی اندرونی اصلاح کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ کمال نے ترکی کے کندھے سے استبداد کا جوا اتار پھینکا تھا اور ترکوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی مگر اب نئی زندگی کے ساتھ ترکی کو ایک نئے جسم کی بھی ضرورت تھی۔ ترکوں کا جسم قومی انحطاط سے کمزور پڑ گیا تھا۔ سالہا سال کی مسلسل جنگوں سے ملک کا برا حال ہو گیا تھا۔ غیر ملکی تجارت اور صنعت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ زراعت پیشہ اب سپاہی بن گئے تھے اور ملک کی زراعت ختم ہو رہی تھی۔ سرمایہ دار طبقہ عیش پسند زندگی کے سبب زمین کی پیٹھ کا غیر ضروری بوجھ ہو گئے تھے۔ ملک میں تعلیم نہ تھی۔ علما دہریت کے دشمن اور اپنے مفاد کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے آمادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ترکی کے ایسے جسم کو بدلنا کمال کے لئے ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے ترکی قوم کو نئی زندگی اور نئی روح کے ساتھ ایک نیا قالب بھی دیا جو نئی زندگی

برسوں کی انتھک کوششوں، خونریزیوں، سازشوں، بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کمال کو ملی تھی اس زندگی کی بقا کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا جس جذبے نے طرابلس اور بلقان کی جنگیں سر کیں، اور جس روح نے درہ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی، وہی جذبہ اور وہی روح اب ترکی کے نئے جسم کی تعمیر میں کارفرما ہوگئی۔ کمال نے دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وطن کی خاطر انھوں نے اپنے دشمنوں اور دوستوں دونوں کو کچلا، اور اگر یہ سنگدلی اور سختی تھی تو نئے جسم کی تعمیر کے لئے یہ ضروری تھی۔ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا، علماء کا زور توڑا جو قوم کی زندگی کے لئے وبال بن چکے تھے جو لوگ مذہب کی آڑ میں ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے تھے، وہ گولی کا نشانہ بنے، پیر، مجاور، صوفی اور بھک منگے فقیر جو قوم کا خون چوس رہے تھے، سب ختم ہوئے۔ بے حس عوام میں وطنیت کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا، کمال نے ان میں حب وطن پیدا کیا جو ایمان کا جزو ہے۔ عوام جاہل تھے ان کو علم سے سرفراز کیا۔ عیسائی مشنریوں کا سدباب کیا جو قوم کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ ترکوں میں زراعت کا شوق پیدا کیا اور زرعی تعلیم کا بڑا انتظام کیا۔ لوگوں کو قانون کے ذریعہ صنعت و حرفت کے قابل بنایا۔ بچوں اور بڑوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا۔ عورتوں کو جو پردے میں بیٹھ کر عمریں ضائع کرتی تھیں کاروبار میں لگایا۔ پرانی چیزوں کو بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کمال نے ان کے خلاف بغاوت کی اور سب پرانی چیزیں ختم ہوئیں۔ ترکی ٹوپی اور پردہ سب رخصت ہوئے۔ حتیٰ کہ ترکوں کو پیام سلام کے نئے طریقے بتائے گئے اور پرانے عاجزی کے سلام بدل گئے، اور موسیقی جو صرف رونے دھونے کے جذبات پیدا کر سکتی تھی ختم ہوئی اور اس میں نئی زندگی آگئی۔

کمال اتاترک کے تمام کارنامے ترکی کی شاندار تاریخ کے زرین ورق ہیں۔ ان کی عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت ہر قدم پر اپنا لوہا منواتی تھی۔ ان کے کام بڑے تھے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اس جمود کو جو صدیوں سے اسلام کی روح کو مسخ کر رہا تھا، توڑ دیا اور نئی نسل پر بہت بڑا احسان کیا۔ ان کی بڑائی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ جو ان کے دشمن تھے وہ دوست بن گئے اور جو انھیں کافر کہتے تھے وہ "مرد مومن" کہنے لگے۔ وہ صحیح معنوں میں مرد مومن تھے اور مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کے بہت بڑے محسن۔ ۲۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کی روح ترکوں کے زندہ قالب میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کی ذات جس نے خود جل کر افق اسلام کو روشن کیا، نوجوانوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں اور آرزوئیں پیدا کرتی رہے گی جو ان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(عبدالحفیظ صدیقی)

یہ سوال کہ ہمارے غذا ۔۔۔ بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے کیونکہ
ہماری غذا جن عناصر اور مرکبات پر مشتمل ہے وہ بظاہر بہت حقیر معلوم ہوتے ہیں اور ایک عام انسان کا خیال اس طرف
جا بھی نہیں سکتا کہ یہ چیزیں ہماری غذا کے اجزا ہوں گی لیکن ایک سائنس داں کی نظر جو ہر وقت کسی نہ کسی شے کے
تجزیہ اور ترکیب کی تلاش میں رہتی ہے ہر چیز کو اپنے خاص انداز سے دیکھتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اکثر دفعہ
بال کی کھال بھی نکال لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری غذا کا سوال ہماری اولین توجہ کا محتاج ہے۔ اگر ہم کو یہ نہ معلوم ہو
ہماری غذا کی ترکیب کیا ہے اور غذا کا ہر جزو ہماری زندگی پر کیا اثر رکھتا ہے تو یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہوگی اور
اپنے آپ پر ایک بڑا ظلم۔ بات یہ ہے کہ جو اجزا ہماری غذا کو بناتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص فعل
ہوتا ہے اور ہر جزو ہمارے جسم کے کسی نہ کسی عضو کی خدمت کرتا ہے۔ اگر ہماری غذا میں کسی جزو کی کمی ہو جائے تو
اس کے نتائج کسی نہ کسی بیماری یا کسی عضو کی کمزوری کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک محتاط اور
حکمی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غذا کی ترکیب معلوم کی جائے اور اس کے مفید اجزا سے فائدہ اٹھایا جا

ہماری غذا حسب ذیل اشیا پر مشتمل ہوتی ہے:-

(۱) پروٹین :- یہ ان مرکبات کا نام ہے جن کے اجزا کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندھک
عناصر ہیں اور ان کو نائٹروجنی مرکبات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پروٹین کا فعل یہ ہوتا ہے کہ جسم کی بافتوں کو
قوی بنائے اور اگر ان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے دور کرے۔ پروٹینی غذا میں انڈا، البیومن،
گوشت، گیہوں، دودھ، مٹر، چنے اور دالیں ہیں۔

(۲) کاربوہیڈریٹ :- یہ ایسے مرکبات کا نام ہے جو صرف کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں
اس کے ماخذ سبزی اور ترکاریاں ہیں اور اس کا فعل یہ ہے کہ یہ توانائی پیدا کرتا ہے اور حرارت غریزی اا
چربیاں بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔
مثالیں :- نشاستہ خواہ کسی اناج سے ہو، شکر۔ دودھ کی شکر اور جگر سے حاصل کیا ہوا نشاستہ۔

(۳) چربیاں :- ایسے مرکبات جو کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ حرارت ا
توانائی پیدا کرتے ہیں۔
مثالیں :- مسکہ، گھی، اور دوسرے نباتی تیل۔

(۴) معدنی نمک :- ان میں معمولی نمک یا سوڈیم کلورائیڈ سب سے اہم ہے۔ اس کی بدولت ہیڈروکلورک ترشہ پیدا ہوتا ہے جو ہضمی رس کے لئے ضروری ہے۔ چونے کے فاسفیٹ بھی جو غذا کے اہم نمکوں سے ہے اہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے اور لوہے کے نمک بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہی سے خون کا سُرخ مادہ یعنے ہیموگلوبن پیدا ہوتا ہے۔

(۵) پانی :- غذا ہضم ہو جانے کے بعد پانی اس ہضم شدہ غذا کو حل کرتا ہے اور غذا کی تحلیل میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا بڑا فعل یہ ہے کہ خون کو سیال حالت میں رکھتا ہے اور اخراج میں مدد کرتا ہے۔

(۶) ویٹامن :- یہ ان اشیا کا گروہ ہے جو ہماری غذا کے سب سے اہم اجزا ہیں اور جو ہماری صحت اور نشو و نما کے لئے بیحد ضروری ہیں۔ ویٹامن کی ترکیب ابھی تک اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکی۔ بگران میں بہت سے ایسے ہیں جن کو کیمیائی اور فعلیاتی لحاظ سے اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ اب تک کوئی چھ ویٹامن دریافت ہوئے ہیں:- اے، بی (یا بی)، بی (یا جی) سی، ڈی اور ای۔ ان میں کے چار یعنے ویٹامن بی، بی، سی اور ڈی اب کیمیاوی طور پر الگ کرلئے گئے ہیں۔ تمام ویٹامن فعلیاتی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اور ہر ایک کے جداگانہ افعال ہیں۔ یہ سب تازہ غذا میں موجود ہوتے ہیں۔ (ع۔ ح۔ م) (نوٹ:- ویٹامن پر ایک تفصیلی مضمون آئندہ اشاعت میں آئے گا)

آئندہ امتحانات

امتحان مقابلہ برائے انڈین ملٹری اکاڈیمی اور رائل انڈین نیوی:-

انڈین ملٹری اکاڈیمی ڈیرہ دون اور رائل انڈین نیوی میں شرکت کے لئے فیڈرل پبلک سرویس کمیشن کی طرف سے ایک امتحان لیا جائے گا جو ۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء سے دہلی میں ہوگا۔ ملٹری اکاڈیمی کے لئے امیدواروں کی عمر ۱۸ سال سے کم اور ۲۰ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے، اور انڈین نیوی کے لے ۱۷ سال سے کم اور ۱۹ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے۔ شرکت کے لئے درخواستیں ۲۶ جنوری ۱۹۴۰ء تک فیڈرل پبلک سرویس کمیشن کے دفتر میں وصول ہو جانی چاہئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساڑھے سات روپیے فیس بھی بھجوانی ضروری ہے۔ انتخابات کے بعد پچاس روپیے داخل کرنے ہوں گے۔ اس امتحان کی شرائط یہ ہیں کہ امیدوار شادی شدہ نہ ہوں۔ منتخب امیدواروں کے ضامنوں کو ہر طرح کی ذمہ داری لینی چاہیے کہ امیدوار کے والدین یا سرپرست ٹریننگ سے متعلق امیدوار کی تمام مالی ضروریات پوری کریں گے، اور اگر کسی وجہ سے امیدوار ملازمت کو قبول نہ کرے تو وہ اس پوری رقم کی پابجائی کریں گے جو امیدوار پر خرچ کی گئی ہے۔

شرکت کی درخواستیں اور تواعد امتحان مقامی حکومتوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور حیدرآباد کی حد تک حسب ذیل پتوں سے :-

سکرٹری صاحب، رزیڈنٹ بہادر، رزیڈنسی حیدرآباد

ٹینس کھیل کے امتیازات :-

ڈیویس کپ کے نتائج :-

سنہ ۱۹۳۲ء میں .... فرانس نے امریکہ کو شکست دی —— ۳-۲

سنہ ۱۹۳۳ء میں .... انگلستان نے فرانس کو شکست دی —— ۳-۲

سنہ ۱۹۳۴ء میں .... انگلستان نے ممالک متحدہ امریکہ کو شکست دی —— ۴-۱

سنہ ۱۹۳۵ء میں .... 〃 〃 〃 〃 〃 —— ۵-۰

سنہ ۱۹۳۶ء میں .... انگلستان نے امریکہ کو شکست دی —— ۳-۲

سنہ ۱۹۳۷ء میں .... ممالک متحدہ امریکہ نے انگلستان کو شکست دی —— ۴-۱

حسب ذیل ومبل ڈن ٹینس میں ممتاز رہے :-

سال	سنگلز (مرد)	سنگلز (عورتوں کا)
سنہ ۱۹۳۳ء	جے کرافورڈ (آسٹریلیا)	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ امریکہ)
سنہ ۱۹۳۴ء	ایف پیری (انگلستان)	مسز ڈروتھی راؤنڈ (انگلستان)
سنہ ۱۹۳۵ء	〃 〃 〃	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)
سنہ ۱۹۳۶ء	〃 〃 〃	مس ایچ جیکبس (ممالک متحدہ)
سنہ ۱۹۳۷ء	ڈونال بج (ممالک متحدہ)	مس ڈی۔ راونڈ (برطانیہ)
سنہ ۱۹۳۸ء	〃 〃 (〃)	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)

حسب ذیل باکسنگ میں ممتاز ہیں :-

فلائی ویٹ　　(۱۱۲ پونڈ) —— بیٹر کین (انگلستان)

بنٹم ویٹ (۱۱۸ پونڈ) سکسٹو اسکوبارل۔ فدر ویٹ (۱۲۶ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ویٹ (۱۳۵ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ ولٹر ویٹ (۱۴۷ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ مڈل ویٹ (۱۶۰ پونڈ) فریڈ اپاشلی (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ہیوی ویٹ (۱۷۵ پونڈ) ایف۔ ایچ۔ لوئیس (ممالک متحدہ)۔ ہیوی ویٹ (زائد از ۱۷۵ پونڈ) جو لوئی (ممالک متحدہ)

ڈربی:۔ ۱۹۳۲ء۔ اپریل دی ففتھ (مالک مسٹر ٹی۔ وال)۔ ۱۹۳۳ء۔ ہائی پیرین (مالک لارڈ ڈربی)۔ ۱۹۳۴ء ونڈ سر لیاڈ (مالک مہاراجہ راج پیپلا)۔ ۱۹۳۵ء۔ بہرام (مالک ہز ہائنس آغا خان)۔ ۱۹۳۶ء۔ محمود (" ہز ہائنس آغا خان)۔ ۱۹۳۷ء۔ مڈ ڈے سن (" مسز جی۔ بلر) ۱۹۳۸ء۔ بوئی روسل۔ ۱۹۳۹ء۔ بلیو پیٹر (مالک لارڈ روز بیری)۔

مہدی جنگ ٹینس:۔ حیدرآباد میں ۱۳ر دسمبر سے مہدی جنگ ٹینس چمپین شپ ٹورنمنٹ کے کھیل شروع ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور کھلاڑی نمبر (۱) غوث محمد اور نمبر (۲) افتخار، اور ان کے علاوہ نارائن راؤ اور راما راؤ وغیرہ بھی اس میں شریک تھے۔ ۱۶ر دسمبر کو غوث محمد (ہندوستان نمبر ۱) اور افتخار احمد (ہندوستان نمبر ۲) کے درمیان سنگلز کا فائنل ہوا۔ غوث نے افتخار کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۷ر دسمبر کو سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کا کھیل ہوا جس میں سجاد نے مقصود علی خاں کو شکست دی۔ اس کے بعد ڈبلز کا مقابلہ ہوا جس میں غوث، افتخار اور نارائن راؤ و راما راؤ نے حصہ لیا۔ غوث اور افتخار نے پہلا سٹ ۶۔۴ پر دوسرا ۶۔۲ پر لیا۔ تیسرا سٹ نارائن راؤ اور راما راؤ نے ۷۔۵ پر لیا، اور چوتھے سٹ میں غوث اور افتخار نے ۶۔۴ سے کامیابی حاصل کی اور اس طرح فائنل جیت گئے۔

(بقیہ مضمون "حالات حاضرہ") روس کے حصے میں یہ علاقے آئے:۔ یوکرین، وہ علاقے جہاں سفید روسی آباد ہیں اور رومانیہ ہنگری کی سرحدوں کے قریب کا وہ ضلع جہاں پولستانی تیل کا مخزن ہے۔ اور اس کے علاوہ پولستان کے باقی حصے جرمنی کو ملے اس تقسیم کا اثر یوربی سیاست پر:۔ (۱) اتحادی روس کے مخالف ہوگئے (۲) جرمنی کے حصے میں پولستان کا زیادہ علاقہ آیا مگر پٹرول کے قیمتی ذخائر روس کی ملکیت میں آگئے (۳) روس کی سرحدیں ہنگری اور رومانیہ سے مل گئیں اور یہ صورت حال بلقان کے لئے بہت خطرناک تھی لیکن ترکی کے اتحادیوں کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے بلقان میں روس کی سرگرمیاں ابھی شروع نہ ہوسکیں اور اس نے بالٹک کی مملکتوں کی طرف توجہ کی۔

بالٹک کی مملکتیں:۔ موجودہ جنگ سے روس نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ بحر بالٹک روس کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے روس کی نظریں بالٹک کی مملکتوں پر ایک عرصے سے لگی ہوئی تھیں۔ اب بین قومی صورت حال کی نزاکت سے روس کو اچھا موقع ہاتھ آگیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے بالٹک کی تمام مملکتوں کو ہضم کیا جائے۔ سب سے پہلے روس نے اسٹونیا، لٹویا اور لتھونیا کے ساتھ باہمی تعاون کے معاہدے طے کئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس کو اپنی قلعہ بندیوں اور ہوائی و بحری مرکزوں کی تعمیر کے لئے ان مملکتوں میں جگہ مل گئی۔ جرمنی کی قلت کو جو لٹویا میں...... ۵ کی تعداد میں مشتمل تھی ہٹلر کے حکم کی بنا پر ۴۸ گھنٹوں کے اندر ان مملکتوں سے چلے جانا پڑا۔ ان لوگوں کو ہٹلر نے پولستان میں بسانا چاہا، اور جرمنی کی اقلیتیں جو بلقان میں آباد تھیں ان کو بھی پولستان میں آکر بس جانے کا حکم ملا۔

م ااات م اض م

چار مہینے ہوئے ہیں
قلعہ بندی کرنی

شروع کی جو اگست کے مہینے میں مکمل ہوگئی اور ۲۳ اگست کو ڈانزگ کے نازی لیڈر ہر فورسٹر "آزاد شہر ڈانزگ" کے صدر بھی بنا دئے گئے۔ چونکہ یہ پولستان کی بندرگاہ تھی اس لئے یہ ایک دست درازی کے مترادف تھا۔
نازیوں کی اس نقل وحرکت کے صاف معنے یہ تھے کہ ہٹلر جمہوری مملکتوں کو دعوتِ مقابلہ دے رہا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ پولستان، برطانیہ اور فرانس جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔ جمہوری مملکتیں پولستان کو بچانا اس وجہ سے اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ از روئے معاہدہ وہ اس کے ساتھ تھیں، اور پولستان کی شکست ایک طرح سے جمہوری مملکتوں کی شکست تھی۔

پہلی ستمبر کو تو ایک نیا شگوفہ کھلا۔ ہر فورسٹر نے مجلس اقوام کے عطا کردہ دستور کو منسوخ کر دیا اور اس اعلان کے بعد کہ اب ڈانزگ جرمنی سے ملحق ہو چکا ہے، ڈانزگ میں نازی دستور کا نفاذ کر دیا۔ اس کے جواب میں ہٹلر نے اس الحاق کی توثیق کر دی اور فورسٹر کو ڈانزگ کا صدر اعلیٰ بنا کر اس کے تمام نظم ونسق کا اسے ذمہ دار قرار دیا۔ ڈانزگ کے الحاق کے بعد اسی روز نازی فوجیں پولستانی "گذرگاہ" میں داخل ہوگئیں اور اس کے بعد طیاروں نے وارسا پر بمباری شروع کر دی۔ ۴۸ گھنٹوں کے اندر پولستان پر کوئی ۹۴ ہوائی حملے ہوئے اور پولستانی شہر اور دیہات پر خوب بم برسائے گئے۔ پولستانیوں کے دل ناتواں نے بھی مقابلہ کیا اور بجائے اس کے کہ ہٹلر کی شرطوں کو مان لیں اور غلامی کی زندگی اختیار کریں، بہادروں کی طرح لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ مگر یہ ناتواں اور زبردست کا مقابلہ تھا۔ انگریز اور فرانسیسی راست پولستان کی مدد نہیں کر سکے چنانچہ اس دلیری کے باوجود پولستانی بہادر جرمنوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولستان ختم ہوگیا اور جرمنی و روس نے، جو بعد میں جرمنی کے ساتھ اتحاد کر کے مشرق کی طرف سے پولستان میں گھس آیا تھا اس ملک کے حصے بخرے کر لئے۔

اتحادی:-

پولستان پر حملہ ہوتے ہی انگریز اور فرانسیسیوں نے بھی جرمنی کے ساتھ لڑائی کے لئے کمر باندھی برلن کے

انگریز سفیر مسٹر ہنڈرسن نے ستمبر کی پہلی تاریخ سے چوتھی تک جرمنی اور برطانیہ کے مابین سمجھوتہ کرانے کی پوری کوشش کی مگر ان کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس بنا پر ۳ ستمبر کو دن کے سوا گیارہ بجے برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان جدید حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کی وزارت میں بعض ضروری تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی جس کے حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوئے :۔

مسٹر چیمبرلین، صدر اعظم۔ سر جان سائمن، چانسلر آف دی اکسچیکر وزیر مالیات۔ لارڈ ہیلی فاکس، وزیر خارجہ۔
لارڈ چیٹ فیلڈ، وزیر مدافعت۔ مسٹر چرچل، امیر البحر۔ مسٹر ہور بلیشا، وزیر جنگ۔
سر چارلس کنگسلی وڈ، وزیر ہوائیہ۔ سر سیمول ہور، لارڈ پریوی سیل۔ سر جان اینڈرسن، نائب لارڈ پریوی سیل

ان کے علاوہ مسٹر ایڈن وزیر مقبوضات بنائے گئے جن کو کابینہ میں بیٹھنے کا خاص دیا گیا۔ اور لارڈ ہینکی وزیر بلا قلمدان مقرر ہوئے۔

برطانیہ کے ساتھ فرانس نے بھی ۳ ستمبر کو اعلان جنگ کر دیا اور جرمنی کے خلاف بحری، بری اور ہوائی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ فرانسیسی فوجیں زیگفرید لائن کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھانے لگیں۔ عربی علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے، ہٹلر کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور جمہوری مملکتوں کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کر دی۔ جو عربی ملک برطانیہ کے زیر اقتدار تھے انھوں نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ شام، ٹیونس، ماورائے زوردان، عراق، مصر اور فلسطین سب اتحادیوں کے ساتھ ہو گئے۔ سلطنت برطانیہ کے قلمرؤں نے بھی اس آڑے وقت میں ساتھ دیا۔ چنانچہ آسٹریلیا، کناڈا اور نیوزی لینڈ نے سب سے پہلے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ جنوبی افریقہ میں جنرل ہرٹزگ کو جو اس لڑائی میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے، ناکامیابی ہوئی چنانچہ اس قلمرو نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اور برطانوی ہند کی طرف سے وائسرائے بہادر نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ ہندوستان برطانیہ کی تائید کے لئے تیار ہے۔ چند دنوں بعد ترک بھی انگریزوں سے متحد ہو گئے لیکن ان کے علاوہ بعض مملکتیں غیر جانبدار بھی ہیں اور وہ یہ ہیں :۔

سیام، جاپان، اطالیہ، اسپین، ممالک متحدہ امریکہ، مکسیکو، آئرستان اور بلقان، اسکان ڈی نیویا اور بالٹک کی مملکتیں۔

جرمنی کی آب دوزیں :۔

جنگ کے پہلے دو ہفتوں میں جرمنی کی آب دوز کشتیاں بہت سرگرم عمل تھیں چنانچہ ۳ ستمبر کو برطانیہ کا بڑا جہاز "اتھی نیا" ڈبو یا گیا۔ جہاز کے (۱۴۰۰) آدمیوں میں نصف سے زائد ڈوب گئے اور باقی لوگوں کی جان

بہ مشکل بچائی گئی۔ ایک اور جہاز جس کا نام "کرے جبس" ہے، دو آب دوزوں کے حملے کا شکار ہوا۔ مسٹر چرچل کے بیان
... سے ایک طویل جنگ
... سال کی جنگ
شکست نہیں کھا سکتا اور
سامنے ہوا تھا۔"

جرمنی کی کابینۂ جنگ جس کی تشکیل ۳۱ اگست کو ہوئی حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی:۔
فیلڈ مارشل گوئرنگ، صدر۔ ہر ہس، ہٹلر کے نائب۔ ہر فرک، مختار کل (نازی نظم و نسق کے)
ڈاکٹر فنک، مختار امور معاشی ڈاکٹر لیامس، وزیر مملکت و صدر رائش چانسلری جنرل کیٹال سپہ سالار

جرمنی میں گرفتاریاں:۔

۸ نومبر کی رات میں جب ہٹلر میونچ کے ہال سے جرمنوں کے ایک بڑے مجمع کو مخاطب کر کے واپس ہوا تو اس کے
۰ امنٹ بعد ایک بم کا حادثہ ہوا جس میں ہٹلر تو بچ گیا لیکن چھ آدمی مرے اور ۶۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ ہٹلر نے خود
تحقیقات کی اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جرمنی میں بہت سے آدمیوں نے جنگ کے خلاف پروپگنڈا کرنا شروع
کیا تھا اس لئے ہٹلر اس قسم کا پروپگنڈا کرنے والوں کو گرفتار کرنے لگا چنانچہ تقریباً (۱۸۰) آدمی قید کر لئے گئے۔
سابق قیصر جرمنی کے چوتھے لڑکے شہزادہ اگسٹ ولہلم کو بھی شبہہ کی بنا پر گرفتار کیا گیا جرمنی کے سابق سپہ سالار
فیلڈ مارشل فان بلومبرگ اور دوسرے پرانے فوجی عہدہ دار بھی گرفتار ہوئے بلکہ ایک غیر مصدقہ خبر کی رو سے
بلومبرگ کو گولی سے مار دیا گیا اور اس کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔

پراگ کے ہنگامے:۔

پراگ بھی سیاسی آشوب سے خالی نہیں ہے چنانچہ یہاں سیاسی شورش کی بنا پر چند طالب علم گرفتار ہوئے تھے
جب اس کے خلاف دوسرے طلبا نے احتجاج کیا تو تقریباً ۱۲۰۰ طالب علم گرفتار کر لئے گئے اور فوجی قانون نافذ
کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پراگ میں ایک دن کے اندر ۱۲۴ چک قید کئے گئے۔ ...۸ طلبا کو گرفتار کیا گیا اور ۲۰۰۰
مسلح آدمی زیر حراست ہیں۔

اطالوی کابینہ:۔

اطالوی کابینہ میں بھی بعض اہم تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کابینہ کے وزیروں نے
استعفےٰ دے دیا۔ سینیر اسٹیریس جو فاشسٹی جماعت کے معتمد ہیں مستعفی ہو گئے اور ان کو فاشسٹی فوج کا چیف آف دی اسٹاف

بنادیا گیا ہے۔ مارشل گریزیانی چیف آف دی آرمی اسٹاف۔ سینیر الفیری سفیر، جنرل ٹروزی وزیر اطالوی افریقہ مقرر ہوئے اور سینیر رسّ ساندرو، پاپولر کلچر کے وزیر بنائے گئے۔

روس کا مسلک :-

جس وقت ڈانزگ کا سوال پیدا ہوا تھا اور جرمنوں نے ڈانزگ کو بغیر لڑائی کے ہضم کرنا چاہا تو برطانیہ اور فرانس کو روس کے آئندہ مسلک کے متعلق تشویش ہوگئی۔ انھوں نے روس کو اپنی "امن پسند برادری" میں شامل کرنا چاہا تھا اور اس سلسلے میں ان جمہوری مملکتوں کے نمائندے ایک عرصے سے روس کے ساتھ گفت وشنید میں مصروف تھے لیکن بدقسمتی سے حالات نے ایک نازک صورت اختیار کرلی اور اتحادیوں کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، کیونکہ اچانک یہ معلوم ہوا کہ روس نے جرمنی کے ساتھ ایک معاہدہ عدم اقدام پر دستخط کردئے ہیں اور برطانیہ، فرانس کو جرمنی سے لڑنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اگرچہ جمہوری مملکتوں نے اس عدم اتحاد کی ذمہ داری روس پر عائد کی مگر روسی وزیر خارجہ مولوٹوف نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ برطانیہ اور فرانس اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں کیونکہ انھوں نے بات چیت میں بہت سا وقت لے لیا۔ روس اس شرط پر جرمنی کے خلاف معاہدہ میں شریک ہونا چاہتا تھا کہ اس میں بالٹک کی مملکتیں یعنے لیتھونیا، لٹویا، اسٹونیا اور فن لینڈ بھی شریک ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مملکتوں کو حفاظت کی ضمانت دی جائے مگر چونکہ وہ آزاد مملکتیں تھیں اس لئے وہ اس قسم کی ضمانت کے لئے راضی نہ ہوئیں اور اتحادیوں کی بات چیت کے ناکام رہنے کا سبب بن گئیں۔ روس نے اتحادیوں کے سامنے جو دوسری شرط پیش کی وہ یہ تھی کہ روسی فوجوں کو ڈانزگ تک جانے کے لئے پولستان میں سے حق راہ دیا جائے تاکہ روس جرمنی کے خلاف عملی طور پر پولستان کی مدد کرسکے، مگر پولستان اس شرط پر تیار نہیں ہوا اور اسی بنا پر روس نے پولستان کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ اس نازک صورت حال سے ہٹلر نے فائدہ اٹھایا اور روس سے معاہدۂ عدم اقدام پر دستخط کرالئے۔

روس اور جرمنی کا معاہدہ عدم اقدام :-

روس اور جرمنی کے معاہدۂ عدم اقدام سے پہلے برلن میں ان دونوں مملکتوں کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ بھی طے پایا تھا جس پر ۲۰/ اگست کو دستخط ہوگئے۔ اس معاہدے کی رو سے جرمنی نے سات سال کے لئے روس کو بیس کروڑ مارک پانچ فی صد شرح سود سے قرض دے دئے تاکہ روس دو سال کے اندر جرمنی سے سامان خریدے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ جرمنی دو سال کے اندر روس سے اٹھارہ کروڑ مارک کی پیداوار خام خریدے، اور معاہدۂ عدم اقدام ماسکو میں ۲۳/ اگست کو طے پایا جس پر مولوٹوف اور فان ربن ٹراپ نے اسٹالن اور جرمن سفیر فان شولن برگ کے سامنے دستخط کئے۔ یہ معاہدہ سات دفعات پر

مشتمل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔ اس مدعا کے لئے کہ جرمنی اور روس کے درمیان امن قائم رہے اور اس قدیم رشتے کی بنا پر جو اپریل ۱۹۲۶ء کے معاہدہ غیر جانبداری کے وقت قائم ہوا تھا، جرمنی اور روس کی حکومتوں کے مابین ذیل کا معاہدہ طے پایا:۔ (۱) فریقین معاہدہ ایک دوسرے پر کسی قسم کا دباؤ ڈالیں گے [illegible] حملہ کر سکیں گے۔ (۲) اگر فریقین معاہدہ میں سے کوئی فریق
...کسی طرح مدد نہیں
...جن معاملات میں دونوں کا
...سری طاقتوں کے کسی ایسے
...اگر دونوں کے درمیان
کسی قسم کا اختلاف یا کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو دونوں مل کر ان جھگڑوں کو دوستانہ طریق پر طے کریں گے اور اگر ضرورت ہو تو ایک کمیشن کے ذریعہ ان مسائل کو حل کیا جا سکے گا۔ (۶) اس معاہدے کی مدت دس سال ہوگی، اگر اختتام مدت سے ایک سال پہلے کوئی فریق اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ دوسرے فریق کو اس کی اطلاع دے، ورنہ مدت معاہدہ میں خود بخود پانچ سال کی توسیع ہو جائے گی۔ (۷) اس معاہدے کی برلن میں بہت جلد توثیق کی جائے گی اور توثیق سے متعلق دستاویزات کا تبادلہ بھی وہیں ہوگا۔

اس معاہدے کے اثرات:۔ روس اور جرمنی کے اس معاہدے کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ یورپی طاقتوں کا توازن بگڑ گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترازو کا پلڑا کچھ جرمنی کی طرف جھک گیا۔ فاشسٹی حلقوں میں بھی اس معاہدے کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاہدے کی بنا پر اطالیہ اور جرمنی کی دوستی تقریباً ختم ہوگئی اور جاپان، جرمنی سے برہم ہوگیا۔ ادھر اسپین سے جنرل فرانکو نے اس معاہدے سے ناراضگی ظاہر کی اور ہٹلر کی دوستی چھوڑ دی۔ روس کو یورپی سیاست میں عمل دخل کا اچھا موقعہ مل گیا۔ روس کو دوست بنانے کی وجہ سے جرمنی کو پولستان کے حملے میں بڑی مدد ملی۔

پولستان کی تقسیم:۔ جب پولستان جرمنی کے مقابلے میں برسرپیکار تھا تو مشرق سے سرخ فوجیں پولستان میں داخل ہوگئیں۔ روس کے پولستان میں گھس آنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کو یوکرین وغیرہ کی قلتوں کی حفاظت کرنی ضروری تھی۔ جب روسی پولستان میں داخل ہوئے تو ان کی کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ چنانچہ ان لوگوں نے پولستان کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ سرمایہ دار اور زمیندار گرفتار کر لئے گئے اور پولستانی عہدہ داروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ جرمنی اور روس دونوں حکومتوں نے مل کر پولستان کو آپس میں بانٹ لیا۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۱۸۲)

عہد آفرین مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔ اڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی (عثمانیہ)

مستقبل

چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آ رہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آ رہی ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
نہ سلطانئ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
اڑاتا ہوا پرچمِ زندگانی
سناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جلو میں ظفرمندیاں شادمانی
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے

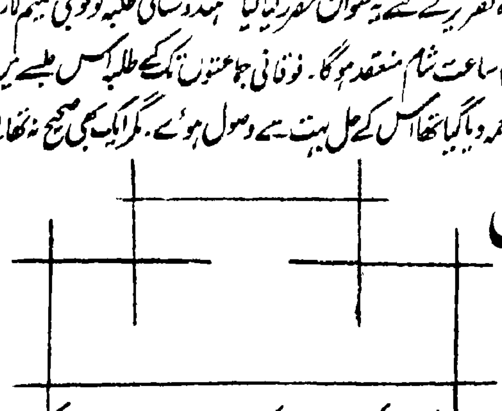
مخدوم محی الدین



سبرس کا اردو نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے اسے شائع کیا ہے اس میں زیادہ تر مضامین اردو ہی سے متعلق ہیں تاکہ آپ انہیں پڑھیں اور اپنی زبان کی ترقی کے لیے کوشش کریں۔ اردو دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اس نے بہت کم مدت میں کافی ترقی کی ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مشترکہ زبان ہے جسے ہر شخص بول سکتا اور سمجھ سکتا ہے اردو سے متعلق تفصیلی حالات آپ کو سب رس پڑھنے سے معلوم ہوں گے اردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے ترقی دیں اسی مقصد کے لیے ۲۵ دسمبر ۱۹۳۹ء شام میں ۵ بجے ادارہ کے ایک نئے شعبہ کا قیام عمل میں آیا جس میں طبقۂ فوقانیہ تک کے طلبہ شریک تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، معتمد ادارہ نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی ایک ننھے طالب علم نے "بچے کی دعا" سے جلسہ کا آغاز کیا پھر صدر نشین نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اس کے بعد انتخابات عمل میں آئے۔ رحیم الدین صاحب ظہیرآبادی نائب صدر، معین الدین احمد انصاری معتمد، مجید احمد صاحب فاروقی نائب معتمد، اراکین کابینہ شعیب اللہ خاں صاحب، حبیب احمد صاحب، محمد علی صاحب عادل، خدا بخش صاحب سلیم، عارف علی صاحب انصاری، عبدالرزاق صاحب۔ محی الدین علی صاحب معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور اس کے بعد مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آئندہ تقریر کے لیے یہ عنوان مقرر کیا گیا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے"۔ جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف م ۱۹ جنوری ۱۹۴۰ء بوقت ۴ ساعت شام منعقد ہوگا۔ فوقانی جماعتوں تک کے طلبہ اس جلسے میں شریک ہوسکتے ہیں۔

معمہ کا صحیح حل

نومبر کے پرچے میں جو معمہ دیا گیا تھا اس کے حل بہت سے وصول ہوئے۔ مگر ایک بھی صحیح نہ تھا اسی وجہ سے انعام کسی کو نہیں دیا گیا۔



اردو نمبر کو آپ نے کیسے پایا ہمیں معلوم کیجیے

نوٹ: جن خریدار اصحاب کے چندے ختم ہوگئے ہیں۔ براہ کرم وہ جلد از جلد نئے سال کا چندہ روانہ کردیں معین الدین احمد انصاری





پیدائش ۱۸۴۶ء لسان العصر سید اکبر حسین اکبر آبادی وفات ۱۹۲۱ء

ان کا کلام طنزیہ ہوتا ہے جس کی کامیاب ابتدا اردو میں انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ سماج کو انھوں نے اس طرح ہنسایا کہ دل رونے لگا۔



پیدائش ۱۸۶۸ء مصورِ غم علامہ راشد الخیری وفات ۱۹۳۶ء

اردو کے پہلے نثر نگار تھے طرزِ تحریر دردانگیز اور تاثیر سے بھرا ہوا۔ عورتوں کی اصلاح اور ترقی ان کے پیشِ نظر تھی۔

پیدائش ۱۸۳۷ء شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی وفات ۱۹۱۴ء

سرسید کے گہرے دوست تھے۔ انہیں کے کہنے پر مسدس لکھی جس نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکایا۔ جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔



پیدائش ۱۸۱۷ء محسنِ قوم سرسید احمد خاں وفات ۱۸۹۸ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد ڈالی ان کی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف تھی۔ قوم کو غدر کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچایا۔



پیدائش ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۹۳۸ء



پیدائش ۱۸۳۶ء وفات ۱۹۱۲ء

شمس العلماء حافظ نذیر احمد

اردو ناول نگاری میں زندگی کو جنیا قرآن شریف اور کئی انگریزی کتابوں کا یادگار ترجمہ کیا اچھے ادیب۔ اچھے مقرر

سر شیخ محمد اقبال

ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ قومی اصلاح سے شاعری شروع کی جو آگے چل کر انسانیت کی اصلاح کے لئے مستقل پیغام بن گئی۔ زمانہ صدیوں بعد ہی ایسا شاعر پیدا کر سکے گا۔



پیدائش ۱۸۴۴ء مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی وفات ۱۹۱۷ء

بچوں کے شاعر تھے۔ ان کی نظمیں اردو ادب میں اضافہ ہے۔ مناظرِ فطرت اور قدرت کی کا اردو ادب میں سب سے پہلے پیش کر

اردو

[illegible] بلحاظ [illegible] ہو مری زبانی

[illegible] ہوئی ہے

[illegible] دنیا میں ہے بڑھایا

[illegible] ہے چلی ہے اردو

[illegible] فلک پہ لایا

"جنت نشانیوں کی" ہے مادری زباں یہ — مشرق کے کارواں کی واحد ہے سارباں یہ

غالبؔ نے اس کی عظمت غالب جہاں میں کر دی — شعر و ادب میں جس نے اک روحِ تازہ بھر دی

مومنؔ، انیسؔ، سوداؔ اردو کے پاسباں تھے — یہ ان کی ہم زباں تھی وہ اس کے ہم زباں تھے

شبلیؔ[1]، نذیرؔ[2]، سیدؔ[3]، آزادؔ[4]، میرؔ، حالیؔ — اردو کے گلستاں میں ان سب نے جان ڈالی

انشاؔ، ترابؔ، آتشؔ، ناسخؔ، ظفرؔ سبھوں نے — امکان کے موافق خدمات کیں زباں کی

اقبالؔ نے بھی اپنا خونِ جگر دیا تھا — اردو کا جس نے گلشن سرسبز کر دیا تھا

ندویؔ[5]، نیازؔ[6] و حقؔ[7] سے پھولی بہارِ اردو — اور "شیخ چاندؔ"[8] بھی تھے خدمت گزارِ اردو

احسانؔ[9]، جوشؔ[10]، اخترؔ[11]، مرزا ادیبؔ، شبلیؔ[12] — کرتے ہیں نگہ بانی اردو کی سرزمیں کی

ماہرؔ[13] و ساحرؔ، امجدؔ[14] ماہر ہیں اپنے فن کے — سرسبز کرنے والے اردو ترے چمن کے

مخدومؔ، وجدؔ، بیکسؔ اردو کے نغمہ خواں ہیں — زورؔ[15] اور سروریؔ[16] اس گلشن کے باغباں ہیں

ڈر ہے کہ ہوں نہ عریاں تیرے زبان گیسو — ہندی[17] سے ہو رہی ہے مٹ بھیڑ تیری اردو

پر ہے یقین زاہدؔ عالم میں یہ رہے گی
بن کر زبانِ عالم پھولے گی اور پھلے گی

باقر علی زاہد

شبلی نعمانی[1]، نذیر احمد[2]، سر سید[3]، ابوالکلام آزاد[4]، سلیمان ندوی[5]، نیاز فتحپوری[6]، عبدالحق[7]، شیخ چاند[8]، احسان دانش[9]، جوش[10]، اختر شیرانی[11]، شبلی بی کام[12]، ماہر[13]، امجد[14]، ڈاکٹر زور[15]، عبدالقادر سروری[16]، موجودہ ہندی[17] اردو نزاع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ اول اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔ اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہیے۔ مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم اے۔ ایل ایل بی ریسرچ اسکالر قیمت عہر

۱۸۰

ہمیں اردو سے کیوں محبت ہونی چاہیئے؟

پیارے بچو! تمھیں اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی بہن سے، اپنے دوستوں سے محبت ہے۔ تم ان سے بات چیت کرکے ہنس بول کے خوش ہوتے ہو۔ یہی بات چیت تمھاری ان کی محبت کو بڑھاتی ہے۔ جو تمھارے دل میں ہوتا ہے تم ان سے کہتے ہو اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں تم سے کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے لیئے سوچو کہ تمھارے ماں باپ، تمھارے بہن بھائی، تمھارے دوست تم سے بولنا چھوڑ دیں تو تمھیں کتنی تکلیف ہو؟ زندگی کا لطف آدھا رہ جائے۔ تم یہ محسوس کرو گے کہ تمھاری کوئی بہت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ تمھاری محبت اور دوستی کا رشتہ تمھاری بات چیت ہے۔ جب سے تم نے ہوش سنبھالا بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے جب تم بالکل بچے تھے تم نے اپنی پیاری ماں سے اپنے پیارے ابا سے اپنے چھوٹے بڑے بہن بھائیوں سے اردو میں بات چیت کی۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ اردو سے تمھیں محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو محبت کے جتنے رشتے اب تک تم نے ایک دوسرے سے باندھے ہیں، ان میں سے ایک بھی نہ ہوتا۔

اب ذرا ایک بات اور سوچو تم اپنی اماں سے کھانے پینے کی چیزیں مانگتے ہو اپنے ابا سے بازار سے اچھے اچھے کھلونے اور کپڑے منگاتے ہو۔ بازار جاکر طرح طرح کی چیزیں خریدتے ہو۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہو۔ ان کی باتیں سمجھتے ہو اور انھیں اپنی باتیں سمجھاتے ہو۔ تمھاری زندگی کی ساری ضرورتیں ایک دوسرے سے بول کر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اگر تم بول نہ سکتے تو تمھیں کتنی دقت ہوتی۔ تمھیں کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے کپڑے، کھیلنے کے کھلونے اور اسی طرح کی اچھی اچھی چیزیں ملنے میں کتنی دقت ہوتی۔ تم گونگوں کی طرح اشارے کرتے۔ کبھی کوئی تمھارے اشارے سمجھتا اور کبھی نہ سمجھتا۔ تمھیں الجھن اور تکلیف ہوتی کہ جو کہہ رہے ہو اسے دوسرا سمجھ نہیں سکتا یا جو کچھ تم سے کہا جارہا ہے وہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔ محبت اور ضرورت کے یہ سارے رشتے اس زبان کی وجہ سے قائم ہیں جو تم دن رات ایک دوسرے سے بولتے ہو، جسے تم پیدا ہونے کے بعد سے اب تک اپنی ماں کی گود میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کر سیکھا۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ اس زبان سے محبت کریں۔ اردو ہی کی بدولت تمھیں زندگی کی یہ ساری خوشیاں اور نعمتیں ملی ہیں۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ تم اس کو دل وجان سے زیادہ پیاری سمجھو۔

تم میں سے ہر ایک نے مدرسے میں پڑھا ہے۔ کورس کی کتابیں مثلاً تاریخ جغرافیہ اور حساب کے علاوہ تم نے طرح طرح کی کام کی باتیں پڑھی ہیں۔ اور روز بروز نئی باتیں سیکھیں۔ بتاؤ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو تمھیں یہ پیاری پیاری باتیں کیسے معلوم ہوتیں۔ تم "بچوں کی دنیا" اور "سب رس" پڑھتے ہو۔ اچھی اچھی نظمیں اچھے اچھے قصے۔ اچھے اچھے لوگوں کے حالات دنیا کی نئی نئی باتیں تمھیں معلوم ہوتی ہیں اور تمھارا وقت کتنی دلچسپی سے کٹتا ہے۔ تم واقعی کتنے خوش قسمت ہو۔

...ار جو کہ وہ بچے جو اردو سبق نہیں پڑھ سکتے۔ کتنے بدنصیب ہیں کہ انھیں یہ اچھی اچھی باتیں نہیں معلوم ہوتیں۔ انھیں نصیحت کی ... سے ... مان سکتے۔ اور اس لئے ان کی زندگی ... بت کرتے ہیں۔ ... سکھی ہیں۔ اب بتاؤ تمھیں

اردو میں ہزاروں ... لکھی گئی تھیں اور کچھ اب سے سیکڑوں برس پہلے ... جو اچھے لکھنے والے ہوئے انھوں نے اردو میں ایک سے زیادہ عمدہ کتابیں لکھیں۔ یہ سب لکھنے والے اب مر گئے مگر انھوں نے جو اچھی باتیں کہی تھیں وہ ان کتابوں کے ذریعہ سے اب تک تمھارے پاس موجود ہیں۔ تمھارے ان بزرگوں نے پرانے زمانہ میں تمھارے ملک میں کیا کیا ترقیاں کیں۔ اسے کس کس طرح اچھا بنایا۔ انھوں نے کیا کیا کہ دنیا آج تک ان کا نام عزت سے لیتی ہے۔ یہ سب باتیں تمھیں ان پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ تم اگر انھیں پڑھوگے تو تمھیں اپنے پیارے ملک کی ترقی کا حال معلوم ہوگا تم ان باتوں کو پڑھ کر اپنے ملک پر فخر کروگے۔ تمھیں خوشی ہوگی تم دوسرے لوگوں کے آگے عزت اور فخر کے ساتھ سر اٹھا کر کہہ سکوگے۔ تمھارے دل میں اپنے ملک کی سچی محبت پیدا ہوگی۔ بتاؤ کہ جو کتابیں پڑھ کر تمھارے دل میں اتنی اچھی اچھی باتیں پیدا ہوں ان سے تمھیں محبت ہونی چاہیے یا نہیں؟ تم کہوگے کہ ہاں ضرور ہونی چاہیے۔ اگر تمھارے دل میں یہ خیال اچھی طرح جم جائے گا تو تم خود اردو سے محبت کرنے لگوگے۔

پیارے بچو! اردو سے محبت کئے بغیر نہ تمھاری زندگی اچھی بن سکتی ہے نہ تم ملک کی سچی خدمت کے قابل بن سکتے ہو۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کے لوگ اقبال، اکبر، مہاتما گاندھی، جواہر لال اور ابوالکلام آزاد کی طرح تمھارے نام پر فخر کریں تو تم پہلے اپنی پیاری اردو سے محبت کرو کہ اس کی مدد سے دنیا کے بہت بڑے آدمی بن جاؤ۔

ماخوذ از "بچوں کی دنیا"

زبان اردو کی ترقی

رمن راج سکسینہ
(سٹی کالج)

اردو زبان میں علوم و فنون کی کمی ہے لیکن پھر بھی دوسری زبانوں کے خیالات سے اردو کے دامن کو لبریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی اور بہبودی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی زبان سے بھی محبت کریں اور ہر ممکن طریقے سے اسے ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اردو زبان میں ادب کے بیش بہا ذخیرے میں گے۔ اور اس دریا میں بھی بہت سے موتی دستیاب ہوں گے۔ اگر ہماری زبان میں کسی چیز کی کمی ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیے اور اسے دوسری زبانوں کی طرح ترقی یافتہ بنانا چاہیے۔ اردو زبان کو اگر ہم ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ خیالی مضامین سے پرہیز کریں اور اس کے دامن کو اپنی تیزیٔ طبع سے رنگ برنگ کے پھولوں سے بھر دیں۔ جن کی خوشبوؤں سے لوگوں کے

داغ معطر ہو جائیں۔ ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو انگریزی علوم فنون کے خزانوں سے الا مال ہیں۔ اور ہماری زبان کو اس سے معمور کر رہے ہیں دراصل ہماری زبان کی ترقی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو دونوں خزانوں پر قابض ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہماری التجا ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اس پر عمل کرنے سے امید ہے کہ اس میں علوم فنون کے دریا ابل پڑیں گے۔

محمد عین الدین جنیدی
(گلبرگہ)

لکھیں تو کیسے لکھیں

خیال تو ہوتا ہے کہ مضمون لکھیں مگر لکھیں تو کیسے لکھیں۔ پہلے تو عنوان کا سوچنا ہی مشکل ہے۔ اور جب عنوان مل گیا تو اب یہ فکر دامنگیر ہے کہ آغاز کیسے ہو۔ خیر جوں توں کر کے جب مضمون شروع کیا مشکل سے چند سطریں ہی لکھی گئی تھیں کہ اندر سے آواز آئی جمیل میاں، خالہ جان آئی ہیں۔ پردے لیجاؤ۔ خالہ جان کو آثار نے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آیا۔ دیکھا کہ قلم کی پتی ٹوٹی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ میرا چھوٹا بھائی خلیل کمرہ میں آیا تھا۔ میں نے تاڑ لیا کہ یہ ان ہی کی کارگزاری ہوگی۔ میں امی کے پاس گیا اور کہا کہ خلیل نے میرے قلم کی پتی توڑ دی ہے۔ مجھے دوسری پتی منگا دیجئے۔ امی کہنے لگیں۔ یہ سو ہی تو دیے تھے۔ تجھے کسی چیز کے رکھنے کا سلیقہ کہاں ہیں۔ ہمیشہ یہی رونا ہے آج پتی غائب کل قلم غائب اور پرسوں کاپی غائب ادہر سے آتے ہو پیسے دیجئے ادہر سے آتے ہو پیسے دیجئے پڑوسن کے لڑکے سردار میاں کو دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے ہمیشہ اپنی ہر چیز سلیقے سے رکھتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ ہمیشہ یہ غائب وہ غائب۔ اتنے میں خالہ جان بھی آگئیں اور کہنے لگیں۔ جمیل تو بہت اچھا لڑکا ہے ہمارے ہاں کا شیطان نعیم تو ان سے بدتر ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ وہ دفتر جانے کی تیاری میں تھے اور آپ سیکل لے کر اسکول چل دیے۔ آخر ان کو پیدل ہی جانا پڑا۔ بڑی دیر بعد پتی آگئی میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خدا جانے امی اور خالہ جان میں کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ امی میری شکایتیں کرتیں اور خالہ جان اپنے لڑکے نعیم کی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ تمام خیالات منتشر ہو چکے تھے آخر بڑی مشکل سے آدھا صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ خالہ جان آئیں اور کہنے لگیں۔ کونسے اسکول میں پڑھتے ہو بیٹا اور کس کلاس میں۔ اتنے میں امی بھی آگئیں اور کہنے لگیں کہ چار بج چکے ہیں اب تک راموکا پتہ نہیں۔ ابا کی سیکل ہے دوڑ کر سودا تو لا دو۔ سچ کہتا ہوں۔ سودے کا نام سنتے ہی میرا تو سر درد پڑ گیا مجبور تھا سیکل لے کر (معظم جاہی) مارکٹ پہنچا۔ سودا لے کر واپس ہو رہا تھا مگر تمام خیالات مکان میں تھے کہ ایک مضمون لکھنے کا موقع ملتا ہے کہ نہیں۔

یکایک مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اب جو آنکھ کھولتا ہوں تو معلوم ہوا کہ دواخانہ میں ہوں۔ اور ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید موٹر سے ٹکر ہو گئی ہوگی ــــ یہ مضمون لکھنے کا نتیجہ ہے۔ اب آپ ہی کہیے کہ مضمون لکھیں تو کیسے لکھیں۔

سید سجاد حسن (دارالعلوم ہائی اسکول)

ہماری زبان

... زبان میں خط ہے کسی زبان میں نہیں

... ہیں۔ ان قوموں

لیکن ان کے بولنے اور

ہر حصے کے لوگ سمجھ سکیں۔

انگریزوں نے "ہندستانی"

کا نام دیا، جو آج بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ "ہندوستانی" کا نام اردو کو اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی عام زبان ہے، جس طرح ایران کی زبان کو ایرانی، عرب کی زبان کو عربی، چین کی زبان کو چینی اور جاپان کی زبان کو جاپانی کہتے ہیں۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یوں تو ہر زبان میں دوسری زبانوں کے کچھ نہ کچھ الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مخلوط کا لفظ ایسی زبان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر بنے۔ لیکن جن زبانوں سے مل کر بنی ہو ان میں سے کسی میں ضم نہ ہو جائے۔ بلکہ ایک تیسرے نام سے علاحدہ اور آزاد حیثیت اختیار کرے۔

اردو شمالی ہندوستان کی پرانی زبان پراکرت اور فارسی سے مل کر بنی ہے۔ لیکن اس کا نام نہ تو پراکرت ہے اور فارسی۔ بلکہ وہ ایک تیسرے ہی نام سے مشہور ہوگئی یعنی اردو کہلانے لگی۔ مخلوط زبانیں دو قوموں کے میل ملاپ سے بنتی ہیں۔ ہندوستان کی حد تک یہ دو قومیں — ہندو اور مسلمان ہیں۔ اور دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترک قومی زبان، اردو یا ہندوستانی ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی زبان ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی ترقی میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے سوائے کسی اور زبان میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

اردو یا ہندوستانی میں۔ فارسی، عربی، سنسکرت، پراکرت، ہندی، پنجابی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، اور تامل، ترکی، عبرانی، یونانی، پرتگالی، انگریزی وغیرہ کے بھی الفاظ ہیں اور ان زبانوں کے الفاظ کو۔ اردو نے اپنا لیا ہے۔

سنسکرت۔ درشن، روپ۔ **پراکرت۔** راو، رانا۔ **ہندی۔** سونا، سنا۔ **گجراتی۔** ننھا۔ **مارواڑی۔** ہل۔ **ترکی۔** انا۔ **انگریزی۔** گلاس، جنگل، کوٹ، کاروان۔

سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب کہا ہے۔ "اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔" راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ اردو میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے — ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اردو کی ترقی اور اشاعت میں حتی المقدور کوشش کرے۔ تاکہ اردو کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو۔

اشرف عابدی

اردو ادب کی ابتدا و ارتقاء

ادب اور زندگی دو ایسے لازم و ملزوم عناصر ہیں جن میں ایک کا وجود دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔ زندگی گویا ایک آئینہ ہے اور ادب اس کا عکس۔ ادب زندگی کی لطافتوں، رنگینیوں اور انقلابات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر انقلاب انگیز واقعہ جو کسی قوم کی تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اس قوم کے ادب پر بھی اپنے نقوش ثبت کرتا ہے۔ چنانچہ ادبیاتِ اردو کی تاریخ بھی ہمیشہ ہندوستان کے انقلابات، کشمکشوں اور عروج و زوال کے واقعات سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہی۔ چنانچہ اس نے جس ماحول اور فضا میں پرورش پائی ہے اور ترقی کی ہے اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔

قدرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ ایک بچہ ہمیشہ بچہ نہیں رہ سکتا۔ اس قانونِ فطرت کا اطلاق کائنات کے ذرے ذرے پر ہوتا ہے اس لئے کسی ملک کی زبان اور ادب بھی اس قانون کی عملداری سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اردو زبان نے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے شروع کر دیے۔ لیکن یہ کچھ عجیب بات ہے کہ شمالی ہند جہاں سب سے پہلے اردو کی تخلیق عمل میں آئی وہاں اس کی رفتار ترقی کچھوے کی رفتار سے زیادہ سست رہی۔ البتہ جنوبی ہند میں یہ زبان بہت پھلی پھولی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے دکن کو اردو کا وطن کہا جاتا ہے۔

دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے تصنیفی اور تالیفی دور شروع ہو چکا تھا۔ لوگ ادب کتابی کی طرف جوق جوق رجوع ہونے لگے تھے۔ کچھ تو بادشاہوں کی سرپرستی اور کچھ اس زمانے کی علمی فضا ان دونوں نے مل کر سرزمینِ دکن پر اردو ادب کے بہت سے عالم پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز خواجہ بندہ نوازؒ سر آمد اقران و امثال ہیں۔ آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف "معراج العاشقین" ادبیاتِ اردو کے اولین کارناموں میں سے ہے۔ یہ کتاب ۱۳۹۸ء میں لکھی گئی اور اس کتاب کا طرزِ انشا ابتدائی اردو کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ "پیر منع کیے سوں پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی مشاہدے کے کانسے میں میکائیل کی مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر پیلانا سگن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرنا تو آتے بھی طبیب ہو جائے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی، ماٹی میں پانی، ماٹی میں آگ، ماٹی میں بارا، ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصر اں کا واجب الوجود ہو جائے تو معرفت تمام ہوا۔"

بعض محققین نے امیر خسرو کی لغت "خالق باری" کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے لیکن امیر خسرو کی اس تصنیف میں بھاشا اور فارسی اس تناسب سے ملائی گئی ہے کہ یہ تصنیف اردو کہلانے کی مستحق نہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ امیر خسرو ہی نے پہلے پہل بھاشا اور فارسی کو ملانا شروع کر دیا تھا لیکن ان کے اشعار، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا فارسی پر اس قدر بھاری تھی کہ اس نئی زبان کو ہندی کہا جاتا تھا جیسا کہ خود حضرت امیر خسرو کو اس کا اعتراف ہے۔

یہ "ہندی زبان" خانہ ہم بیت گھر ہے
چو خوت و خطر نیم ہم نرکس ڈر ہے

بہرحال اس لحاظ سے "معراج العاشقین" ہی ادبیات اردو کی پہلی کتاب ہے۔ "معراج العاشقین" کے بعد حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے علم تصوف پر تیس سے زائد کتابیں لکھیں۔ اسی زمانے میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے ایک عزیز سید محمد عبد اللہ حسینی ... نوازؒ کے شغل تصنیف و تالیف

... بیت نوا بجا را اور اس طرح

... میراں جی شمس العشاق

... امین الدین بیجاپوری نے

۱۶۱۰ء میں معراج علی بھی مشہور و معروف ادبی ... ہے۔ ... کی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردو رفتہ رفتہ دکن کے ہر باشندے کے دل میں اپنا گھر کرتی رہی۔ بہادر شاہ کے طوطے کا قصہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ سلطان نصیر الدین ہمایوں نے بہادر شاہ حاکم گجرات و دکن پر چڑھائی کی۔ بہادر شاہ کا ایک نمک حرام سردار رومی خاں ہمایوں سے جا ملا۔ بہادر شاہ کی شکست کے بعد مال غنیمت کے ساتھ بہادر شاہ کا چہیتا طوطا بھی لایا گیا۔ جونہی طوطے نے رومی خاں کی صورت دیکھی چیخ اٹھا۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"

اس قصے سے صرف اتنا اظہار مقصود ہے کہ اردو نے دکن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی نہ صرف کتابی ادب بلکہ بول چال میں بھی دکن شمالی ہند سے بہت آگے تھا۔ شمالی ہند چونکہ ہر دور میں بیرونی حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا رہا اس لئے وہاں کی تہذیب و تمدن ادب اور زبان کو ترقی کا موقع کم ملا۔ البتہ دکن دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حملہ آوروں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اس پر ہمیشہ امن کا دیوتا حکمران رہا۔ اس لیے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ادب اور زبان نے بھی ترقی حاصل کرنی شروع کی نیز دکن میں اردو کو ہمیشہ شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ عادل شاہی اور قطب شاہی فرمانرواؤں نے زبان اور ادب کی ترقی میں اپنی ساری توجہات صرف کردیں۔ ان کی سرپرستی نے نہ صرف اردو کو اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا سکھایا بلکہ بہت سے شاعر مصنفین اور مولفین بھی پیدا کئے۔ بادشاہ اور سلاطین خود شاعر اور عالم ہوتے تھے۔ چنانچہ عادل شاہی خاندان اور قطب شاہی مملکت کا تقریباً ہر فرمانروا عالم فاضل اور شاعر گذرا ہے۔ ان کے دربار علما و فضلا شعرا اور ادیبوں کا مرجع بنے رہتے تھے۔ چنانچہ نصرتیؔ، وجہیؔ، غواصیؔ، شاہ ملک، ابن نشاطیؔ، رستمیؔ، امینؔ، سیواؔ، مومنؔ اور ہاشمیؔ دربار گولکنڈہ اور بیجاپور کے "نورتن" کہلاتے ہیں۔ ان شعرا اور انشا پردازوں نے اپنے آپ کو صرف درباری شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ قلمی کاوشوں نے بھی اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کرتے رہے۔ چنانچہ نصرتیؔ کا "علی نامہ" وجہیؔ کی "سب رس" اور قطب مشتری" ابن نشاطیؔ کی "پھول بن" فائز کا منظوم قصہ "رضوان شاہ" امین بیجاپوری کی "جوہر الاسرار" کے نام آج تک ادبیات اردو میں بڑی فخر کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ انہی عادل شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں اردو سرکاری اور دفتری زبان بنائی گئی اس کے بعد پھر کیا تھا اس زبان نے

خوب ہاتھ پاؤں نکالے۔

سلاطین بیجاپور کی طرح سلاطین گولکنڈہ نے بھی اردو ادب کی بے لوث خدمت کی خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اردو مملکت گولکنڈہ کی مقبول عام زبان تھی۔ بادشاہ خود اردو کا ایک قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ ادیب تھا۔ اس نے اردو شاعری میں حسن و عشق، تصوف و معرفت کے علاوہ انسانی معاشرت پر بھی نظر دوڑائی شادی بیاہ، ہولی بسنت، صراحی و پیالہ کا مکالمہ، کالی گوری کا مکالمہ وغیرہ۔ قلی قطب شاہ معانی تخلص کرتا تھا۔ اس نے اردو ادب میں اپنی ایک یادگار کلیات کی شکل میں چھوڑی ہے۔ اکبر کے دربار کے نورتنوں کی طرح اس کے دربار کے بھی "رتن" بہت مشہور و معروف ہیں۔ ملا وجہی ان سب میں ممتاز و نمایاں ہے۔ اس نے دو معرکتہ الآرا تصانیف "سب رس" اور "قطب مشتری" تصنیف کیں "سب رس" اردو نثر کی شاہکار تصنیف ہے اور قطب مشتری ایک نہایت اعلیٰ مثنوی ہے۔ سب رس صرف ایک علمی کاوش ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی اردو کی صرف و نحو کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس دور کے بعد ولی، جعفر، سالک، فضلی، نطقی، احمد، اشرف، ہاتفی وغیرہ پیدا ہوئے شعر و سخن کا سیلاب آیا ان کا بچا کچا مال و متاع دیوان اور کلیات کی شکل میں اردو ادب کو ملا۔ ولی ان تمام شعرا میں ممتاز اور نمایاں شخصیت کا حامل تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں شمالی ہند میں اردو نے ترقی کے منازل طے کرنے شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے بہت سے شعرا آج تک اردو ادب کے مربی و محسن سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم، نجم الدین آبرو، شرف الدین علی خاں فغاں، محمد شاکر ناجی، مرزا رفیع سودا قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں بہتر شیخ ظہور الدین حاتم تھے۔ مرزا رفیع سودا انہی کے شاگرد تھے۔ ان ارباب اردو نے شاہ جہاں آباد (دہلی) میں اردو کو اتنی ترقی دی کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کو "اردو کا شیراز" کہا جانے لگا۔ چنانچہ سرسید لکھتے ہیں۔

"یہ زبان اب اتنی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہ جہاں آباد سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے"۔

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جس نے شاہ جہاں آباد کو بسایا۔ اس کے عہد تک اردو صرف بول چال کی زبان تھی، کتابی ادب سے لوگ بے بہرہ تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۱۴۵ھ سے قبل کسی کتاب کا نام نہیں سنا گیا۔ البتہ ۱۱۴۵ھ میں شاہ فضل اللہ فضلی نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے نام سے اردو نثر کی پہلی کتاب لکھی جس میں واقعات شہادت کربلا مندرج ہیں۔ شمالی ہند میں فضلی کی اس کتاب کو اردو نثر کی اولین تصنیف اور فضلی کو اردو نثر کا باوا آدم تسلیم کیا گیا ہے۔ فضلی کی اس تصنیف میں ہمیں پاکیزہ اردو نظر آتی ہے جو حال حال کے زمانے تک بھی ہندوستان میں رائج تھی۔

اس تصنیف کے بعد سے شمالی ہند میں تصنیفی و تالیفی شغل دھڑلے سے شروع ہو گیا۔ ۱۱۹۶ھ میں مرزا رفیع سودا نے "دیباچہ دیوان مرثیہ" لکھا۔ مرزا رفیع سودا کا طرز فضلی کی طرز انشا سے بالکل مختلف ہے۔ رفیع اس قسم کی عبارت آرائی کرتے تھے۔

"مضمون سینے میں پیش از مرغ نہیں کہ ہو پیچ نفس کے بس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش داور کے"

... لکھا ہے۔ نہ شعری تاریخ گوئی کے موجد بھی رفیع سودا ہیں

... کوئی سرپرست

... ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء میں

... غرض کے تحت دہلی تک

... انگریزوں کو ہندوستان

... قایم کیا گیا ... فورٹ ...

ہندوستانی زبان اور ہندوستانی معاشرت سے روشناس کرایا جائے۔ مقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو نے اس کے دامنِ عاطفت میں پرورش پائی اور خوب ترقی کی بلکہ فورٹ ولیم کالج ہی دراصل حقیقی معنوں میں اردو کا سرپرست رہ چکا ہے۔ اس کالج کی بنا ایک ایسی قوم نے ڈالی جس کے لٹریچر کی وسعت اظہر من الشمس ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے لٹریچر کو اردو میں منتقل کرے لیکن چونکہ ہندوستانی انگریزی ادب سے بے بہرہ اور ناواقف محض تھے اس لئے یہ ارادہ خواب بن کر رہ گیا۔ البتہ اس قوم کی کوششوں سے اس دور کے مصنفین نے فارسی اور عربی تراجم شروع کئے۔ میر شیر علی افسوس نے "گلستان" کا ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے شایع کروایا۔ مولوی شاہ عبد القادر نے قرآن شریف کا ترجمہ "آرایش محفل" کے نام سے پیش کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر گلکرسٹ پرنسپل فورٹ ولیم کالج نے جو اردو کا محسن اعظم سمجھا جاتا ہے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی جو "ادبیات اردو میں" رسالہ گلکرائسٹ کے نام سے مشہور ہے۔ غرض ڈاکٹر گلکرائسٹ کی مسیحا نفسی سے اردو کے قالب میں نئی روح پھونکی گئی۔

پہلے پہل تو فورٹ ولیم کی اردو کا رجحان زیادہ تر قصوں اور افسانوں کی طرف تھا چنانچہ ابتداً جتنی تصانیف پیش کی گئیں وہ سب حسن و عشق اور گل و بلبل کے رومانوی قصے تھے۔ لیکن بعد میں گلکرائسٹ کی کوششوں سے فورٹ ولیم تاریخ اور تذکرہ نویسی میں بھی کبھی پیچھے نہ رہا۔ شیر علی افسوس کی "آرایش محفل" حیدری کی "تاریخ نادری" مظہر علی خاں ولا کی "تاریخ شیر شاہی" اور سینی کی "تاریخ آسام" اس دور کی نہایت معتبر اور مستند تاریخیں ہیں۔ اس کالج کے عہد میں سب سے پہلی مرتبہ پتھر کے چھاپے خانے قایم کئے گئے جن کی وجہ سے تصنیف و تالیف میں غیر معمولی سرعت پیدا ہوگئی۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد نے اردو کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن انھوں نے اردو ادب کے لازمی عنصر نظم کو فراموش کر دیا۔ اسے اردو نظم کی خوش قسمتی سمجھئے کہ قدرت نے اس کی بقا کے لئے ولی، میر، مصحفی، انشا، آتش، ذوق، غالب اور نظیر کو پیدا کیا۔ انھوں نے اردو نظم کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا اور اس کو کبھی نثر سے پیچھے نہ رہنے دیا۔ پہلے پہل اردو میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں فارسیت کا بہت زیادہ غلبہ تھا۔ شاعر اور ادیب عمداً اپنی قابلیت کے مظاہرے کے لئے فارسی کے الفاظ زبردستی اردو میں ٹھونستے تھے۔

سرسید اور محمد حسین آزاد ہی وہ اشخاص ہیں جنھوں نے اردو کو سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ سرسید اور محمد حسین آزاد کا نذیر احمد حالی اور شبلی نے بھی ساتھ دیا چنانچہ تاریخ ادبیات اردو میں انھیں "اردو کے عناصر خمسہ" کہا گیا ہے۔ ان تمام کی تحریریں اتنی آسان اور دلکش عبارت میں لکھی ہوئی ہیں کہ ایک معمولی اردو داں بھی بخوبی پڑھ سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔ شروع شروع میں یہ طرز انشاء مقبول نہ ہو سکی چنانچہ رجب علی سرور جیسے ادیب نے اس سلاست اور سادگی کا مذاق اڑایا۔ لیکن ان عناصر خمسہ کی سعی پیہم سے یہ بیل جلد جلد منڈھے چڑھنے لگی۔ سرسید، نذیر احمد اور شبلی نے اگر نثر میں انقلاب پیدا کیا تو آزاد اور حالی نے پرانی اور گنجلک شاعری کا خاتمہ کیا اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ آزاد اور حالی نے حسن و عشق اور گل و بلبل کے قصوں سے اپنے قلم کو ناآشنا رکھا۔ ان کی شاعری کی ہر تان فطرت پرستی، حقایق اور حیات انسانی کے واقعات پر ٹوٹتی تھی۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے جدید طرز کی پہلی نظم "شب قدر" ۸ مئی ۱۸۷۴ء انجمن پنجاب کے جلسہ میں پڑھی جو کرنل ہالرائیڈ کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اردو میں اسی قسم کی شاعری کا آغاز ہوا۔ حالی اور دوسرے ہم عصر شعرا نے آزاد کا تتبع شروع کیا۔ نیز اس جدید رنگ کی شاعری کی آبیاری کرنے والوں میں اکبر، اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست، تلوک چند محروم اور جوش ملیح آبادی بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تو وہ اس کی قوم سے اس کے ماحول (..................) سے متعلق ہوتا۔ نظم کی طرح نثر میں بھی سرسید، نذیر احمد، شبلی اور غالب کی وجہ سے انقلاب ہوا خصوصاً غالب نے اردو زبان کو آسان بنانے میں بڑی مدد دی۔ ان کی عبارت میں سادگی بے تکلفی، بے ساختگی اور لطف پایا جاتا ہے۔ ان کے مکاتب اردو ادب میں "اردوئے معلیٰ" کے نام سے معروف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "خطوط نویسی" دراصل مرزا غالب کی ایجاد ہے۔

یہ سب کچھ انہی ارباب نثر کی کوششوں و مساعی کا نتیجہ ہے کہ ادبیات اردو آج اس قدر مالا مال نظر آتی ہے موجودہ دور کو اگرچہ کہ اردو کے انتہائی عروج کا دور نہیں کہا جا سکتا مگر پھر بھی یہ دور اردو کے شاندار مستقبل کا ضامن ہے ادبیات اردو کے بازار میں آج ہمیں سیکڑوں یوسف انوار میں لپٹے نظر آتے ہیں چنانچہ اردو شاعری میں جگر، جوش، حفیظ اور امجد کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔

اعلیٰ پایہ کے علمی ادبی مضامین اور تحقیقی مقالے لکھنا تو بابا مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور مولوی عبدالغفار صاحب سروری کا حصہ ہے۔

جدید افسانہ نگاری کے متعلق ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جدید افسانے سارے انگریزی ادب کی پیداوار ہیں اور اردو کے انشاء پرداز مغربی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے ٹیگور کے اثر کو اردو میں رائج کیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں کے متعدد ترجمے شائع کیے۔ عنایت اللہ دہلوی مستقل طور پر انگریزی تصانیف کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ اسی طرح جلیل قدوائی، ممتاز گورکھپوری، امتیاز علی تاج

صادق الخیری، حجاب امتیاز علی، اختر حسین رائے پوری اور علیگڈھ و جامعہ عثمانیہ کے اکثر اصحاب قلم انگریزی، فرانسیسی اور
بہ ... کو رائج کر رہے ہیں ۔

خواجہ حسن نظامی

... صدیقی کا ممنون احسان ہے ۔
... م ہوگا کہ اردو ادب ابھی
عالم طفولیت سے گزر رہا ہے ۔ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو ... ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
نیز ہندوستان کے اکثر رسائل و اخبارات اردو ادب کے تمول و ارتقا کی ممکنہ کوششیں کر رہے ہیں، ان کی
یہ قابل قدر مساعی یقین دلاتی ہیں کہ اردو ادب کا مستقبل نہایت شاندار اور درخشاں ہے ۔

ابراہیم حسین جلیس
(گلبرگہ)

کاغذی دوات

اک بچے نے بنائی جو اک کاغذی دوات
خوش ہوگیا کہ سب سے ہے اچھی مری دوات

ماں سامنے ... تھی بولا کہ اماں جان
یہ دیکھئے دوات کی میری انوکھی شان

... کیا بات ہے مری
ہوتی ہے دیکھ دیکھ کر اس کو بڑی خوشی

اس میں سیاہی بھر کے میں لکھوں گا اب سبق
معنی لکھوں گا ان کے جو الفاظ ہیں ادق

ماں نے کہا یہ سن کے کہ اچھی ہے یہ دوات
لیکن میں تم سے کہتی ہوں بیٹا اب ایک بات

یہ کاغذی دوات فقط دیکھنے کی ہے
جو کام دینے والی ہو وہ تو نہیں یہ شئے

لکھو پڑھو تمھارے یہی کام آئے گا
لکھ پڑھ کے بیٹا تو اس کا ہے پھر پوچھنا ہی کیا

لکھ پڑھ گئے تم جو سونے کی بنواؤ گے دوات
اس وقت پھر کچھ اور ہی ہوگی تمھاری بات

اب کاغذی بنا کے دوات اس قدر ہو شاد
جب علم سیکھ لوگے تو بر آئے گی مراد

صنعت بھی اچھی چیز ہے تم یہ بھی سیکھ لو
چھوڑو نہ کاہلی سے ہنر اور علم کو

علم و ہنر کو سیکھ کے جو طاق ہو گئے
بیٹا! وہ لوگ شہرۂ آفاق ہو گئے

محنت اٹھا کے سیکھا ہے جن لوگوں نے کمال
ہے وہ کمال ان کے لئے دولت اور مال

میں خوش ہوں تم کو علم کا صنعت کا شوق ہے
اس کا اٹھاؤ لطف کہ اچھا یہ ذوق ہے

علم و ہنر سے عزت انساں جہاں میں ہے
فیاضؔ اس سے بڑھ کے نہیں اور کوئی شئے

ابوالفیض فیاضؔ
(ولیدکنڈہ)

بوڑھا سادھو



شام ہو رہی تھی۔

بوڑھا سادھو چلا جا رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کی جھولی میں دو چار سڑے گلے آم تھے۔ کندھے پر پوٹلی، دائیں ہاتھ سے کندھے پر سنبھالا ہوا ایک لکڑی کا — موٹا کالا سا — ڈنڈا! داڑھی الجھی ہوئی۔ ذرا سفید مگر مٹیالے بال۔ بالوں میں دھول۔ گڑھے میں دھنسی ہوئی آنکھیں اور...... اور ہاں، تکان سے لڑکھڑاتے ہوئے پیر! جھکے ہوئے کندھوں پر گویا وہ مصیبت کا بوجھ لادے چلا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کر اس نے دیکھا، سامنے ہی دو نوجوان چلے آ رہے تھے۔ سفید ڈھیلے پاجامے لمبے انگریزی وضع کے بال اور منہ میں سگار!

"بابوجی کا بھلا ہو......" بھکاری نے نہایت عاجزانہ انداز میں کہا۔

نوجوانوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ غصے سے ایک نے کہا "سر پر چڑھ آتا ہے اندھے؟ منہ سے مانگتے مانگتے نیت نہیں بھری؟"

"ارے یار، یہ تو بدمعاش معلوم ہوتا ہے!" دوسرے نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

بوڑھا سادھو اپنی جگہ دنگ کھڑا رہ گیا، دونوں کو جاتے دیکھتے ہوئے!

لمبی سانس لے کر پھر چل دیا۔ حالانکہ اس کے پیروں میں وہ طاقت باقی نہ تھی۔ کندھے کا بوجھ بھاری محسوس ہوتا تھا۔ بے عزتی کے بارے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا!

سامنے دیکھا، ایک ادھیڑ عورت ایک بوڑھے کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔

بھکاری نے سوچا، عورت کا دل مرد کی طرح لوہے کا نہیں ہوا کرتا۔ وہ رحم دل ہوتی ہے۔ شاید...... وہ ٹھہر گیا۔ عورت نے دیکھا اور دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"مائی......!" سادھو نے کہا۔

بھوں چڑھا کر عورت نے کہا "اتنی بڑی پوٹلی تو بھر لی ہے، اس سے بھی تیرے پیٹ کی آگ نہیں بجھتی؟"

بوڑھے نے ہاتھ بتا کر کہا "ارے باپ رے، ڈنڈا جا تو دیکھو اس کا!"

سادھو نے دیکھا بوڑھی کے ہاتھ میں سونے کی چمکدار چوڑیاں، کڑے نہ معلوم اور کیا کیا ہیں!

سادھو کی آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ شاید اس میں کندھے کے بوجھ کو سنبھالنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ مجبوراً وہ چلتا ہی رہا۔ چلنا تو تھا ہی۔ شام قریب تھی اور رات سے قبل اس کو ندی کے کنارے پہنچنا تھا۔ ورنہ......؟

اور ندی؟ کتنی دور پر تھی وہ! دو...... تین...... یا...... اور زیادہ میل؟ سادھو نے ہمت کر کے اپنی رفتار تیز کی۔

تھکے ماندے لڑکھڑاتے پیروں میں ٹھوکریں لگتی تھیں مگر وہ چلتا ہی جاتا تھا!

کسی بچی کی سریلی آواز اس کے کان میں پڑی۔ دیکھا کہ حسین معصوم لڑکی اپنی ہمجولیوں سے کھیل رہی ہے۔

سادھو رک گیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی کا کنارا کتنا دور تھا!

پھر بھی بوڑھا سادھو سب کچھ بھول کر اس حسین لڑکی کو
تکتا رہا ہنستے ہوئے.

آج ..... وہ ڈنڈے والا ..... بچوں کا چور ... اُف!
اس کا سر چکرانے لگا.
..... آنکھوں میں اندھیرا
سا چھا رہی تھی!
تھا! ڈنڈے والا... اُف... بدمعاش!
... آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر سنبھلنے کی

منہ سے چیخ نکل گئی "ارے ...!
رات ہو گئی تھی. سادھو آہستہ آہستہ قدم بڑھائے
چلا جا رہا تھا، سایہ کی طرح، بے ہوش سا!
زندگی کے لمبے لمبے پچاس سال..... تب ہاں،
وہ بھی بچہ — ایسا ہی بچہ — تھا! ... ہوگا. مگر اب؟
تین دن کا بھوکا بدن کام کرنے سے انکار کر رہا تھا!
اتنی تھکان اور اس درجہ کمزوری کا اس کو احساس
ہو رہا تھا کہ شاید وہ پچاس سال سے چل ہی رہا ہے!

ہا یا!
مگر ٹھوکر لگی، اور ..... گر پڑا.

صبح لوگوں نے معلوم کیا کہ سادھو — ایک بوڑھا
سادھو — مرا پڑا ہے! اس کی پھٹی پوٹلی سے کچھ
چیزیں ادھر اُدھر جھانک رہی ہیں. اور وہ ڈنڈا پکڑے
ہوئے ہے مضبوطی سے!

ین ین کٹی
(گنگ گری)

اردو

ہر اک زباں سے اچھی اردو زباں ہماری
کہتے ہیں اس زباں کو پیر و جواں ہماری

بے خود بنا ہی دے گی نغمے سنا سنا کر
جذبات کے وہ اے دل پیاری زباں ہماری

مٹنا ترا ہے مشکل جب تک کہ دم میں دم ہے
پیاری زباں ہے اردو جانِ جہاں ہماری

اغیار گو ہوں دشمن مطلق نہ خوف کھا تو
کیا جانے تیری عظمت کیا جانے شاں ہماری

اقبال اور حالی گویا تھے یوں ولی بھی
پیاری ہے جاں سے ہم کو اردو زباں ہماری

اردو کی شان و شوکت دیکھی ہے جب سے اے درد
کہتا ہے ہو کے قرباں ہندوستاں ہماری

حسین شریف درد
(سٹی کالج)

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

میر حسن ایم اے کی کتابیں

ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری۔ میر حسن صاحب ام اے ملک کے ان لائق فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ ان کی علمی وادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلی کتاب "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" لکھی اور اسی کتاب سے "ادارۂ ادبیات اردو" کے اشاعت کتب کا سرگرم و شروع ہوتا ہے۔

ورڈز ورتھ کے متعلق ملک کے جرائد و مشاہیر کی رائیں اس کے مصنف کی پہلی کوشش کی غیر معمولی کامیابی کا ثبوت ہیں۔

"ورڈس ورتھ انگریزی ادب کا معیاری شاعر ہے جناب میر حسن نے اس کو اردو داں طبقے سے روشناس کیا ہے"
"مولف نے یہ ایک اچھا طریق سوانح نگاری اختیار کیا ہے۔ اگر اسی رنگ پر وہ دوسرے باکمال شعرائے یورپ کو"
"روشناس کرنے میں کامیاب ہو جائیں جیسا کہ ان کا مقصد ہے تو اردو کی ایک مفید خدمت انجام دیں گے۔ (مولانا سلیمان ندوی)

"مولوی میر حسن صاحب نے اس کتاب میں نہایت خوبی و جامعیت کے ساتھ انگلستان کے اس مشہور شاعر"
"کی حیات اور کلام اور اس کے معاصرین اور عہد حاضر کے انگریزی اور اردو شاعروں پر اس کے اثرات تنقیدی"
"نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں۔ اسلوب بیان اس قدر دلکش اور دلاویز ہے کہ بے اختیار مصنف کے حق میں"
"......دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔" (مشیر دکن)

"سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علیحدہ ہے اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ہے اس لئے نہایت پسندیدہ ہے۔"
"بہ حیثیت مجموعی ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہے۔" (ہندوستانی الہ آباد)

"جامعۂ عثمانیہ کی بدولت حیدرآباد اور اس کے متعلقات میں خوش فکر اور نوجوان انشا پردازوں کی ایک ایسی"
"اولوالعزم جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ہمہ وقت اردو ادب کی توسیع و ترقی کی فکر میں منہمک ہے۔ اسی جماعت میں"
"......میر حسن صاحب بھی ہیں۔ قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لے کر یہ کتاب مرتب"
"کی ہے۔ اردو داں پبلک خصوصاً شعرا کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔" (دیانرائن نگم بی اے)

"موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اس کے موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور"
"مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر متقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت"
"کے ساتھ قابل قدر ہے۔" (نیاز فتح پوری)

"میر حسن صاحب نے یہ بہت قابل قدر کام کیا ہے۔ میر حسن صاحب کی محنت قابل شکر اور لائق قدر ہے۔ نظم کا"
"ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اردو شعرا کو یہ"
"کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔" (پروفیسر اسیٹ)

"کتاب اچھی اور بہت اچھی ہے اور بہت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ ورڈسورتھ کی شاعری کے اثرات اردو شاعری پر کیسے

"نئے دور پر آپ نے کامیابی کے ساتھ دکھائے ہیں۔ ہوشمند طبیعتیں ضرور ورڈسورتھ کے کلام کا مطالعہ اب اس نقطۂ نظر سے"

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

"ایک دلچسپ"

"اجو پروفیسر قاضی محمد حسین"

"وہ کہتے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ

کے سانچے میں جو آزادیٔ فکر و عمل ڈھلتی ہے اس کی تعمیر ایسے ہی طلباء کی تعمیری جد و جہد سے ممکن ہے۔"

"ورڈزورتھ اور اس کی شاعری کی دوسری اشاعت سات سال بعد نظر ثانی اور اضافوں کے بعد عمل"

"میں لائی جا رہی ہے۔ اس میں ورڈزورتھ کی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی شریک رہے گا جو صاحبزادہ میکش نے"

"کیا ہے"

مغربی تصانیف کے اردو تراجم۔ میر حسن صاحب کی دوسری کتاب جو حال میں شایع ہوئی ہے مغربی تصانیف کے اردو تراجم سے متعلق ہے۔ پروفیسر سروری نے سچ فرمایا ہے کہ "نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مغربی زبانوں کی تصانیف اور تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا مبسوط تذکرہ کیا گیا ہے ۱۸۰۱ء سے ۱۹۱۶ء تک کے اردو ادب کا یہ پہلو ہر اس شخص کے لئے باعث دلچسپی ہوگا جو ترقیٔ اردو کے متمنی ہیں۔

سائنس کے کرشمے۔ "سائنس کے کرشمے" ان نشری تقاریر کا مجموعہ ہے جو نشرگاہ حیدرآباد سے علمی موضوعوں پر نشر ہو چکی ہیں۔ میر حسن صاحب نے ان کو ترتیب دے کر عوام کو علمی موضوعوں سے واقف ہونے کا ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔

حسب ذیل کتابیں مرتب ہو چکی ہیں اور زیر طبع ہیں

بچوں کی کہانیاں۔ اردو زبان میں بچوں کے لئے تعمیری ادب کی کمی کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ان تمام خدمت گزاران ملک کے نزدیک یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی تلافی کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ مساعی کا آغاز ہونا چاہیے۔ میر حسن صاحب نے شستہ اور سلیس کہانیوں کا مجموعہ بچوں کے لئے مرتب کیا ہے جو عنقریب شایع ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف۔ صنف لطیف کے مسائل پر صنف لطیف کے افکار کا مجموعہ۔ میر حسن صاحب نے ملک کی صاحب فکر خواتین کے مضامین ایک مجموعہ کی صورت میں مرتب کئے ہیں۔ ان مضامین میں خواتین کے مسائل پر خواتین ہی نے عام فہم اور سلیس زبان میں روشنی ڈالی ہے۔

تاریخ ادب انگریزی۔ اردو ادب کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو داں مختلف ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخ سے واقف ہوں۔ انگریزی ادب نے جو ترقی کی ہے وہ اردو ادب کی ترقی کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ اسی تعمیری احساس کے تحت میر حسن صاحب کئی سال سے انگریزی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ قابلِ قدر کتاب جلد شایع ہو جائے گی۔

پرویں۔ " پرویں " ایک دلچسپ ڈراما ہے جس میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے زندگی اور محبت کے ایک نازک مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محبت کی بے اختیاری جذبۂ ایثار کو پامال نہیں کر سکتی۔ محبت اور ایثار در اصل ایک ہی جذبہ ہے۔ محبت کی انتہائی شکل ایثار کی تعبیر کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں اسی کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

"حق محبوب" اور دوسرے ڈرامے۔ زندگی کی سنجیدگی بعض وقت قہقہوں کا ماحول ڈھونڈتی ہے۔ میر حسن صاحب ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ اس کتاب میں ان کے مزاحیہ مختصر ڈرامے جمع کیے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں تبسم اور قہقہہ زندگی کے نازک پہلوؤں سے ہم آہنگ نظر آئے گا۔

اللہ نے بچا لیا۔ جدید ادب میں مختصر قصوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ میر حسن صاحب مختصر قصے لکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ " اللہ نے بچایا " کتاب کا جس قدر دلکش نام ہے، اسی قدر دلچسپ افسانے اس میں ملیں گے۔

مہتمم "سب رس"

کون کیا ہیں

وقت کی اس ضرورت کو محسوس کر کے کہ ملک کی مشہور اور قابل شخصیتوں کے حالات کا یکجا جمع ہو جانا از بس ضروری ہے " دکن نیوز " کی مجلس انتظامی نے طے کیا ہے کہ " کون کیا ہیں " کے نام سے ایک نہایت ہی عظیم الشان کتاب ترتیب دی جائے جو زمانہ حاضرہ کی معیاری تاریخ سمجھی جائے گی۔

اس کتاب میں ملک کے قابل اہل قلم، قومی کارکن، علماء و مشائخین، امراء، جاگیردار و وکلاء، حکماء، شعراء اور عہدہ داران ملکی غرض ہر طبقہ کی ایسی شخصیتوں کے حالات ان کی تصاویر کے ساتھ ہوں گے جن کی زندگیاں قابلِ تقلید نمونہ بن سکتی اور جو اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جملہ مراسلت مجلس انتظامی " دکن نیوز " بازار سدی عنبر سے کیجائے

غ گر ... گار رجسٹرڈ (۱۱۱) ... دولت آصفیہ

متعلق تحقیق وسند صاحب و تجربہ تام ... ملاحظہ فرمائیے

عالیجناب ڈاکٹر نواب ارسطو یار جنگ بہادر

یہ فرماتے ہیں کہ روغن گیسو نگار رجسٹرڈ نمبر (۱۱۱) کے نسخہ کو میں بطور خود دیکھا اور اس کی آزمایش بھی کیا یہ روغن دماغ کے لئے مفید اور بالوں کی درازی و سیاہی اور پائیداری کے لئے فائدہ مند ہے جسکی میں تصدیق کرتا ہوں۔

عالیجناب ابن منصور حکیم محبوب علی خان صاحب اول مددگار

نظامیہ شفاخانہ سرکار عالی۔ یہ فرماتے ہیں کہ یہ تیل نہایت عمدہ رنگین و خوشبودار اور فرحت بخش امید ہے کہ استعمال کرنے کے بعد تجربہ بتلا دیگا کہ موجد کا امتیاز ضرور قابل ستایش ہے خدا کرے جلد غیر ممالک میں بھی روغن گیسو نگار ہر دلعزیز ثابت ہو۔

عالیجناب الحاج حکیم محمود خان صاحب (ساکن) نامپلی

یہ فرماتے ہیں کہ روغن گیسو نگار میری تجویز سے جو تقویت دماغ اور سر کے بالوں کی درازی و ان سیاہی کا ضامن ہونے کے علاوہ ہمہ شگوار عطریت بھی رکھتا ہے جو میرا تجربہ ہے اور ہر موسم میں استعمال عورت و مرد کے لئے مفید ہے۔

علامۂ وقت مولانا حکیم ابو الفدا محمود احمد صاحب مرحوم

سابق معتمد انجمن اطبائے دکن طبی بورڈ و ممتحن طبیہ کالج سرکار عالی کی یہ رائے یادگار رہیگی۔ روغن گیسو نگار جس کو علامہ قاضی صاحب صدیقی و قاضی غلام محی الدین صاحب نے خاص اہتمام سے تیار کیا ہے اسکے نسخہ کو میں نے دیکھا تمام عمدہ اجزا ہیں اور ترکیب بھی خاص ہے دماغ کی قوت اور بالوں کے لئے سب اچھی چیزیں ہیں امید کہ اہل ملک قدر کریں گے اور اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔

قیمت شیشہ کلاں ——— شیشہ خورد

تیار کردہ محمد غلام قادر صدیقی و قاضی غلام محی الدین کارخانہ معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن سے خرید فرمائیے

(مندرجہ ذیل مقامات سے بھی دستیاب فرماسکتے ہیں)

دواخانہ الحاج حکیم محمود خان صاحب نامپلی۔ انجمن صدر محاسبی سرکار عالی حیدرآباد بوت ہوز پتھر گٹی۔ صدر مخزن کارخانہ روغن گیسو نگار معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن

نور اللغات

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر الشعرا حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھا اس کے ایک عرصہ کے بعد حضرت نیر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے داد تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشریح و تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ۔ غرض لغت کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیان اردو کی قدر دانی کی مستحق۔

دو رائیں

مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے ال ال بی
بڑی تقطیع (۸، ۲۹) صفحات قیمت مجلد (للعہ)

اردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغت سے افضل ہے مرتب نے اسے بیحد محنت جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے امید ہے کہ اہل علم و زبان داں حضرات اس کی قدر کما حقہ کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔

"زمانہ"

نور اللغات...... جلد اول الف۔ ب صفحات (۶۴۲)، قیمت عـہ
" "...... جلد دوم پ سے خ " (۵۱۴) " للعہ

مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے ال ال بی
بڑی تقطیع (۸، ۲۹) صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو کے تمام مروجہ الفاظ محاورات ضرب الامثال دخیل کلمات کا پورا استقصا کیا گیا ہے اور شعرا و اساتذہ کے کلام نظم و نثر پر ہر جگہ استناد کیا گیا ہے دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جس قدر اثر پڑتا ہے متعدد مثالوں سے سمجھایا ہے۔

"نگار"

نور اللغات...... جلد سوم د سے ق صفحات (۶۹۲) قیمت عـہ
" "...... جلد چہارم ک سے ی " (۱۰۳۲) " للعہ

صدر دفتر :- مکتبہ جامعہ قرول باغ، نئی دہلی

شاخیں :- (۱) جامع مسجد دہلی (۲) لوہاری دروازہ لاہور (۳) پرنسس بلڈنگ بجے جے اسپتال بمبئی

آپکی قوت ارادی کا بہترین حل

روغن آملہ (ٹریڈ مارک)

تقویت دماغ درازی گیسو۔ بالوں کو سیاہ، نرم و چمکدار بنانا۔
گرتے ہوئے بالوں کو ازسرنو پیدا کرنا۔ یہ اسکی بہترین خصوصیات ہیں۔ ہمیشہ استعمال فرمائیے

قیمت شیشہ کلاں ۱۴؍ ہر گھر میں اس کی ضرورت ہے شیشہ خورد ۱۲؍

تیار کردہ روح تازہ کمپنی چمن گوڑہ شاہ علی بنڈہ کمان حیدرآباد دکن

آجکل

امراء۔ روسا۔ حکام۔ پروفیسر۔ بیرسٹر۔ وکلا۔ طلبا۔ اور دیگر دماغی کام کرنے والے حضرات و سیٹھ۔ ساہوکار اور معزز بیگمات سکندر ہیئر آئیل کو فرحت و سکون اور اصلاح عوارض دماغی کیلئے بہ اہتمام خصوصیت سے استعمال فرما رہے ہیں نہ صرف تیل کی جملہ خصوصیات کا حامل ہے بلکہ ایک مستند خوشبودار دوائی بھی ہے۔ اپنے پسندیدہ تیل کا استعمال ترک نہ کیجئے بلکہ اسکے صرف دس قطرے اسمیں شامل کر لیجئے کر حکمت ایک ہی دریا کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک خاص چیز ہے رجسٹر سرکار آصفیہ (۲۷۸) قیمت فی بکس ۵ روپیہ

ملنے کے مقامات

جناب سید عبدالرزاق گلزار حوض۔ شاہ میر حسن عابد روڈ۔ جے۔ اے کریم سکندرآباد۔
شفاخانہ ڈاکٹر بخار عقب دیوڑھی اقبال الدولہ وچھتہ بازار (حیدرآباد دکن)


SPECIAL OFFER
۱۵ فیصد رعایت
یوری جیول سے مرصع یور۔ اعلیٰ درجہ کے نمونے نہایت مضبوط۔
خول نمایاں۔ سوئیاں وہندسے۔ تین سال کی گیارنٹی گولڈ۔
رولڈ گولڈ۔ اور کرومیم۔ میں مل سکتی ہیں۔
جلال اینڈ سنس
گورنمنٹ وریلوے سپلایرس ماہرین مرمت
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن (صدر دفتر مدراس)

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

نشان ٹپہ برطانیہ (M3956)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلسِ ادارت

جلد ۳ شمارہ ۲

فروری سنہ ۱۹۴۰ء

فہرستِ مضامین

---

(۱) اردو تصنیف و تالیف اور انشا پردازی کا ذوق رکھنے والے اصحاب ادارہ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ ادارہ کے مختلف شعبوں میں ہر موضوع اور ہر فن کے ماہرین موجود ہیں جو خوشی سے مدد دیتے ہیں۔

(۲) اردو زبان سے متعلق جو بھی کام ہو اس کے بارے میں ادارہ ادبیات اردو کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

(۳) اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو کے بہی خواہ جو بھی مفید تجویزیں اور مشورے ادارہ میں روانہ کرتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور ان کو بہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوائیے

(۵) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ کیجئے۔

(۶) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارے سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

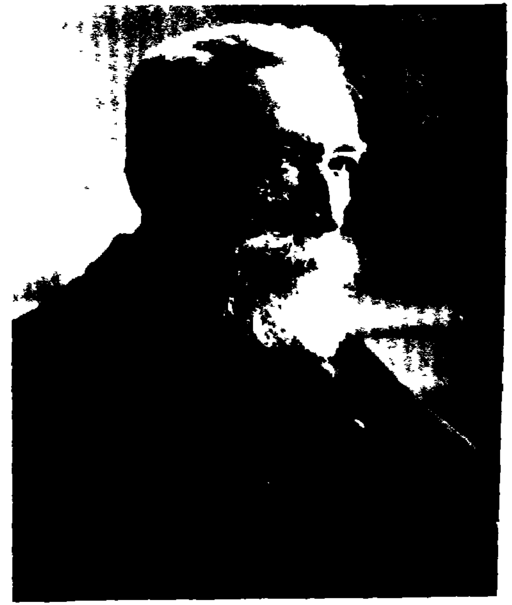
(۷) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر اکثر پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

سب رس کی قیمت .... چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸ر

بچوں کے سب رس کی قیمت .... ایک روپیہ سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸ر

سب رس معلومات کی قیمت ....

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفریں پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد دکن سے شائع ہوا۔



اناطول فرانس



موپاسان

اداریہ

سب رس کے "اردو نمبر" کا اہل ذوق نے جس طرح "خیر مقدم" کیا ہے، اس سے ہمارے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اور ہمارا یہ ایقان مستحکم ہوگیا ہے کہ خدمت گزاری اور خلوص کی قدر کرنے والے ہمارے ملک میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے معاونین سے اگر یہ توقع کریں کہ وہ "سب رس" کی اشاعت میں ہماری مدد کریں گے تو بے جا نہیں اس لئے کہ "سب رس" "ادارۂ ادبیات اردو" کا رسالہ ہے "ادارۂ ادبیات اردو" اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے قائم کیا گیا ہے اور "اردو" ہم سب کی زبان ہے۔ آپ ہم مل کر یہ کوشش کریں گے کہ "سب رس" زیادہ سے زیادہ اردو داں اصحاب کی نظر سے گزرے۔ اگر اس طرح ہم نے اپنی زبان کی تھوڑی بہت خدمت کر لی تو یقین مانئے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا۔

اس حقیقت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سب رس کی اجرائی کسی مالی مفاد کی تمناؤں کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد خدمت زبان و ادب اور صرف خدمت زبان و ادب ہے۔ "سب رس" اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا اس کے ثبوت میں اس کی ہندوستان گیر مقبولیت پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نے نہ صرف اہل ذوق احباب کی، اوقات فرصت میں چارہ گری کی اور اردو داں حلقہ میں اپنی دلچسپی اور تنوع کے باعث مطالعہ کا شوق پیدا کیا بلکہ نوخیز ادیبوں کی ایک امید افزا جماعت بھی پیدا کی اور اس طرح اردو سے محبت پیدا کرنے اور اردو کو آگے بڑھانے میں اس کی ناچیز خدمتیں، لائق ستائش نہ سہی، بھلائی بھی نہیں جا سکتیں۔

ہو سکتا ہے کہ آپ "سب رس" کے گزشتہ یا موجودہ معیار کو کسی وجہ سے پسند خیال فرمائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں کسی ایسے رسالے "کا نقشہ ہو جو آپ کے ذوق کی تکمیل کر سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "سب رس" میں آپ کو کچھ خامیاں نظر آتی ہیں اور آپ ان خامیوں کو گوارا نہ فرماتے ہوں لیکن ہم آپ سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "سب رس" کو ایک ایسے نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جو یقیناً موجودہ حالات کے اعتبار سے قابل لحاظ ہے۔ "سب رس" ایک طرف تو اہل ذوق کے لئے کچھ دینا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ ان عوام کو اردو کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے جو بلندی سے گھبراتے ہیں ظاہر ہے کہ پستیوں سے ان کو بلندی کی طرف لیجانا آسان نہیں ہے۔ اس لئے "سب رس" ان کا اس طرح ساتھ دے رہا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ "سب رس" کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے بلندی کی طرف چلیں۔ تاہم ہم آپ کے گراں قدر مشوروں کو "سب رس" کی ترتیب میں ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے اس لئے آپ ضرور ہمیں مطلع کیجئے کہ آپ "سب رس" میں کیا چاہتے ہیں؟

گزشتہ شمارے میں ہم نے "سب رس" کے "فضائی ادب نمبر" کا تذکرہ کیا ہے جو جولائی میں شائع ہوگا۔ یہ نمبر دراصل ایک ضمیمہ ہوگا جس کو سب رس کے معمولی شمارہ سے علحدہ شائع کیا جائے گا، اور یہ ضمیمہ خریداران "سب رس" کو رعایتی قیمت پر دیا جائے گا۔ اس ضمیمہ

کے لئے کئی اصحاب نے ریڈیو کے مختلف پہلوؤں پر خاص مضامین لکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایسے مضامین ہوں گے
ہے کہ ناظرات یقیناً خوش ہوں گے۔ پھر ایک بار ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "ایسا تنوع آپ نے شاید ہی کسی رسالے میں دیکھا ہوگا

مسلسل ہو چکا تھا۔ ہم نے
ماہ ہو جاتیں۔ اس کانفرنس
سر سید محمد مندومین کی حیثیت
سے اس میں شریک ہوئے۔ موجودہ زمانے کو جہاں ہی نام [illegible] ہوں کا زمانہ" بھی کہا جاسکتا
ہے لیکن بہت کم کانفرنسیں "نشستند وگفتند و برخاستند" سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے قابل صدر
کی رہنمائی میں "آل انڈیا اردو کانفرنس" نے اردو کی ترقی واشاعت سے متعلق کئی مسائل پر غور کیا۔ ہندوستان کی مختلف جامعات
میں "جامعۂ عثمانیہ" کے تجربہ سے فائدہ اٹھاکر اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے متعلق جو قرارداد منظور کی گئی ہے اس کو ہم بہت
زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ "انجمن ترقی اردو" اس قرارداد کو عملی طریقے سے صورت پذیر کرنے میں اپنی تمام قوتوں
سے کام لے گی۔ آل انڈیا ریڈیو" کی زبان کے بارے میں بھی اس کی تحریک وقت کی صحیح آواز ہے۔ اردو کی طباعت میں ٹائپ کے
استعمال کی اس کانفرنس نے ترغیب دی ہے لیکن جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے کانفرنس نے رسم الخط کے بارے میں کوئی
حل پیش نہیں کیا۔

اردو مطبوعات کی نمائشیں

"نمائشیں" اگر ان کا مقصد تعمیری ہو، ملک کے صحیح رجحانات پیش کرنے کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے حیدرآباد میں "اردو مطبوعات" کی وقتاً فوقتاً نمائشیں کرکے اہل ملک کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملک کے نوجوان اہل قلم خدمت زبان و ادب میں سرگرم عمل ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ذہنی بلندی کے ساتھ ابھی تک ایک "احساس پستی" ہے اگرچہ یہ احساس پستی رفتہ رفتہ دور ہوتا جارہا ہے تاہم ان اصحاب کو جو ملک وقوم کی خدمت کرتے ہیں چاہئیے کہ زیادہ سے زیادہ اہل ملک کو اس قسم کی نمائشیں دیکھنے کی ترغیب دیں۔ تاکہ غیر محسوس طور پر ان کے دلوں سے "مرعوبیت" دور ہو جائے۔

دوسری چیز جس کی کمی ہمارے ملک میں ہے وہ نشر واشاعت کی افادیت سے عدم واقفیت ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کسب علم کے لئے طالبانِ علم لاکھوں میل کا سفر پیدل کرتے تھے۔ اب خود علم کو طالبان علم تک پہنچانے کا زمانہ آگیا ہے۔ جب تک کوئی شخص "کسی چیز" سے واقف نہ ہو، وہ کس طرح اسے حاصل کرے گا۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کو عام کرنے کے لئے موثر نشر واشاعت کی طرف توجہ کریں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو اس کام کے لئے وسیع ادارے قائم ہیں لیکن ہم میں سے اکثر اب تک یہ خیال کرتے ہیں کہ "اشتہار" معائب پر محاسن کی نقاب ڈالنے کا نام ہے پروپاگنڈے

کی قوت آج کل سب سے زیادہ قوی قوت ہے جس پر دنیا کا پہیا گھوم رہا ہے۔ اگر ہم نے اس قوت کو دیانت داری کے ساتھ استعمال نہیں کیا تو سمجھ لیجئے کہ گوشۂ گمنامی ہی ہمارا جنم بھوم ہوگا اور گوشۂ گمنامی ہی ہماری منزل۔

جدید مطبوعات کی فہرست | جب سے "ادارۂ ادبیات اردو" میں شعبۂ تنقید قائم ہوا ہے "سب رس" میں ہر ماہ جدید مطبوعات کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔ اور اس کام کو ادارہ کے ناظم کتب خانہ نواب سیف علی خاں صاحب خوش سلیقگی اور دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس قسم کی فہرستوں کو شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل ملک جدید مطبوعات سے واقف ہوتے رہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کام کو اچھی نظروں سے دیکھا جارہا ہے۔ "سب رس" کے اردو نمبر میں ۱۹۳۹ء کی مطبوعات کو بہ اعتبار موضوعات ایک فہرست کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نواب سیف علی خاں صاحب نے اس فہرست کے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے "اس فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں، مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے" لیکن اس کے باوجود بہت سی ایسی مطبوعات ہوں گی جن کا اندراج اس فہرست میں نہ ہوسکا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اردو کے تمام اہل قلم اپنی کتابوں کا ایک ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کو دے دیا کریں۔ تاکہ ایسی فہرستیں مکمل ہوا کریں۔ اگر ایسا انتظام ہوگیا تو ہر سال ادارہ کی جانب سے ایک ایسی کتاب کی اشاعت کا انتظام بھی ہوسکتا ہے جس میں نہ صرف کتابوں کے نام ہوں گے بلکہ ان کا تعارف بھی کرایا جائے گا۔

ادارہ کی خبریں | ۱۹۴۰ء کے ساتھ ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے دسویں سال میں قدم رکھا ہے۔ گزشتہ نو سال کی تاریخ اور اس ادارہ کی خاموش خدمات کے متعلق ایک باتصویر کتاب شائع ہو رہی ہے جس میں اس ادارہ کے مختلف شعبوں کے حالات و کام اور اس ادارہ کی مطبوعات کی نوعیت اور دیگر خصوصیتیں تفصیل کے ساتھ درج کی جارہی ہیں۔ جن اصحاب کو حیدرآباد کے اس مخلص اور خاموش خدمتگذار اردو کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے دلچسپی ہو وہ یہ کتاب دفتر ادارہ سے مفت حاصل کرسکتے ہیں۔

شعبۂ نسواں | اس اثنا میں ادارہ کے اس شعبہ کے دو جلسے ہوئے۔ اس کا سالانہ جلسہ قریب میں خاص اہتمام سے منایا جارہا ہے — اس کے دسویں اجلاس میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ محترمہ سارا بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ اور محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے شرکت کی۔ شعبہ کے مدرسۂ تعلیم بالغات کے لئے نصابی کتب اور رضاکارانہ کام کرنے والوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا گیا۔ مسز محمد یونس صاحب، مسز عزیز علی صاحب اور مس غلام پنجتن صاحب سے مدرسہ میں رضاکارانہ کام کرنے کی استدعا کی جائے۔ اجلاس ماہانہ اور اجلاس سالانہ کے بارے میں بھی مشورہ کیا گیا۔ ادارہ کے اراکین ۱۹۴۰ء میں اضافہ کرنے کے لئے یہ شعبہ خاص دلچسپی لے گا۔ محترمہ عظیم النساء بیگم صاحبہ کے افسانے اور ناول رائے دینے کے لئے اراکین شعبہ کو دئے گئے تاکہ ان کی طباعت کے بارے میں کوئی تصفیہ کیا جاسکے۔ شہزادیاں والا تبار کی یورپ سے واپسی کے سلسلہ میں حیدرآباد کی نسوانی انجمنوں نے جو جلسہ خیر مقدم کیا تھا اس میں اس شعبہ کی جانب سے بھی شہزادیوں کو پھول پہنائے گئے۔

اور نظمیں پڑھی گئیں جو جنوری کے سب رس میں شائع ہو چکی ہیں ۔

شعبۂ زبان | اس شعبہ کا ایک جلسہ ۱۴ ڈسمبر ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری، مولوی نورالحسن صاحب، پروفیسر

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب معتمد شعبہ نے

کا ایک جز ابھی باقی ہے ۔

نی الفاظ اور محاوروں کی فہرست میں

واد طلب کیا جائے ۔

مل فہرست مرتب کی جائے ۔

یہ کام پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی نورالحسن صاحب اور نواب مرزا سیف جی جان صاحب نے اپنے ذمہ لیا ۔

(۳) ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے حیدرآباد کی دفتری اُردو کے متعلق جو مواد جمع کیا ہے اس کو ایک اصلاحی نوٹ کے ساتھ وہ آئندہ جلسہ میں پیش کریں گے دیگر اراکین سے استدعا کی گئی کہ وہ بھی اس سلسلہ میں مزید مواد ڈاکٹر صاحب کے ہاں روانہ کریں ۔

متفقہ طور پر طے پایا کہ مندرجہ ذیل امور کی جانب متعلقہ محکموں کو خاص طور پر توجہ دلائی جائے ۔

(۱) محکمہ ریلوے سرکار عالی کی جانب سے اسٹیشنوں اور ریلوے بس اسٹانڈ پر ناموں وغیرہ کی جو تختیاں لگائی جاتی ہیں وہ بدخط اور غلط رسم خط میں ہیں ۔ نیز ریلوے کی جانب سے جو اعلانات شائع کئے جاتے ہیں یا ریل کے ڈبوں اور اسٹیشنوں پر لگائے جاتے ہیں وہ باعتبار زبان اور رسم خط درست نہیں ہوتے ۔ ادارہ ہذا ان امور کے سلسلہ میں محکمۂ مذکور کو اردو زبان کی اصلاح و خوبی اور خوشخطی ملحوظ رکھنے کی طرف توجہ دلاتا ہے ۔

(۲) جس طرح شمالی ہند میں ریلوے کے وقت نامے انگریزی کے سوا اردو زبان میں بھی شائع کئے جاتے ہیں، بعینہٖ ممالک محروسۂ سرکار عالی کے ریلوے کے وقت نامے انگریزی کے سوا اردو زبان میں بھی شائع کئے جائیں ۔ قابل دید اور تاریخی مقامات کے متعلق ریلوے کے شائع کردہ کتابچے بہت عمدہ اور مفید ہیں لیکن ان کی مقبولیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے اگر وہ اسی اہتمام کے ساتھ اردو زبان میں شائع کئے جائیں ۔

(۳) سرکاری دواخانوں میں تختیاں اور اطلاعیں بالعموم انگریزی زبان میں لکھی جاتی ہیں ۔ ناظم صاحب طبابت و مہتمم صاحب دواخانہ عثمانیہ کو توجہ دلائی جائے کہ یہ تختیاں وغیرہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی ہوں تاکہ مریضوں اور ان کے ساتھیوں وغیرہ کو دریافت و اطلاع میں سہولت ہو ۔

(ان سب امور کے متعلق معتمد صاحب شعبہ نے مراسلت شروع کر دی ہے ۔)

شعبۂ تنقید | اس ماہ شعبۂ تنقید نے اپنے معمولی جلسوں کے علاوہ ایک جلسۂ عام بھی کیا جس میں مولوی مخدوم محی الدین صاحب نے نیا ادب کے عنوان پر ایک دلچسپ تقریر کی اور مولوی محمد عمر صاحب مہاجر اور دیگر حاضرین نے اس تقریر کے سلسلہ میں ایسے سوالات کئے جن پر تبادلہ خیال کرنے کی وجہ سے حاضرین کی معلومات میں اضافہ ہوا ۔ شعبۂ تنقید نے بڑے اچھے کام کا آغاز کیا ہے اور توقع ہے کہ اس کے ایسے علمی جلسے ملک میں ذوق صحیح کی نشو و نما میں بڑی مدد دیں گے ۔ مخدوم محی الدین صاحب کا مضمون انشاءاللہ سب رس کی آئندہ اشاعت میں شائع کیا جائے گا ۔

شعبۂ سائنس | اس شعبہ کا ایک جلسہ ۱۴ جنوری کو منعقد ہوا۔ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب، پروفیسر سید محمد علی خاں صاحب، مولوی فیض محمد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ ادارہ اور شعبہ کے اغراض و مقاصد پر تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ (۱) اس شعبہ کا ایک عام جلسہ ۲۰ جنوری کو طلب کیا جائے جس میں سائنس سے متعلق اہم مضامین اور دیگر مسائل پر غور کیا جائے گا (۲) عام فہم زبان میں مفید اور دلچسپ موضوعوں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی جائیں چنانچہ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب نے "چند مفید پودے"، پروفیسر محمد علی خاں صاحب نے "سحر آفریں شعاعیں"، ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب نے "زہریلی گیس اور جنگ" اور مولوی فیض محمد صاحب نے "آبدوز کشتیاں"، "پرواز" اور "پانی کی کہانی" لکھنے کا ذمہ لیا۔ اس شعبہ میں یوں تو سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اکثر اصحاب شریک ہیں لیکن اس کی مشاورتی کمیٹی میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر رام لال صاحب، ڈاکٹر منور علی صاحب اور پروفیسر یونس وفا قانی صاحب بھی شامل ہیں۔

مجلس امتحانات اردو | اس مجلس کا ایک جلسہ ۱۳ جنوری کو مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی غلام ربانی صاحب، مس حبیبی ندوی، مولوی ظہیر الدین احمد صاحب، مولوی عبد المجید صاحب صدیقی، ملا فخر الحسن صاحب، مولوی سید محمد صاحب، پنڈت نرسنگ راؤ صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور عبد القادر سروری صاحب معتمد مجلس نے شرکت کی۔ معتمد صاحب نے گزشتہ جلسہ سے اس وقت تک جو کام ہوا تھا اس کی تفصیل سنائی جو حسب ذیل ہے۔

(۱) امتحان کے اعلان کے ساتھ ہی ریاست اور بیرون ریاست کے ہر حصہ سے استفسارات اور قواعد کی طلبی کے خطوط آنے لگے چنانچہ اب تک تین سو سے زیادہ خطوط اور درخواستیں وصول ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ حیدرآباد سے آئے ہوئے خطوط میں بلدہ کے علاوہ اضلاع اور تعلقات کے خطوط ہیں۔ اور بیرونی ریاست میں سنبھل پور (اڑیسہ) فیروزآباد (یوپی)، بمبئی۔ بنگلور۔ پنجاب۔ بریلی۔ گجرات۔ دھارواڑ سے متعدد خطوط اور درخواستیں وصول ہوئی ہیں۔

(۲) بعض اداروں جیسے۔

شاخ ادارہ ادبیات اردو۔ اورنگ آباد۔ جالنہ۔ محبوب نگر۔ کلیانی کیل۔ عثمان آباد۔ اور درسگاہ علوم شرقیہ یاقوت پورہ میں تعلیم کا انتظام ہو چکا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ گجرات اور بمبئی میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور پنجاب میں ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی ادارے کے امتحانات کے لئے مختلف مقامات پر مرکز قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول الذکر نے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ امتحانوں کے لئے ہزار کے قریب امیدوار فراہم کریں گے۔

اس کے بعد تصفیہ طلب امور پیش کئے گئے اور طے پایا کہ

(۱) اردو عالم میں اختیاری مضمون خوشنویسی کا وہی ہوگا جو مطبوعہ قواعد کے ص ۱۳ ص ۱۴ پر درج ہے۔

(۲) اردو عالم میں طبقۂ اناث کے لئے اختیاری مضمون وہی ہوں گے جو مطبوعہ نصاب نامہ میں درج ہیں۔

(۳) امتحانات کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے ہر عمر کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

(۴) بلدہ سے باہر مرکز امتحان قائم کرنے کے لئے (۲۵) امیدواروں کی قید ضروری ہے۔

... سے ساتھ تجارت نہیں کر سکے گا۔

سے اہم اُردو دانی کی پہلی کتاب ہے
ب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ایک نمونہ
ہے اور تصویروں اور ضخامت کے باوجود

ادارہ نے محض اُردو کی خدمت کی خاطر اس [illegible] صرف دو روپے [illegible] اُردو کی توسیع و اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں وہ یقیناً اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اور اپنے بچوں عزیزوں اور ملازمین کو اردو سکھانے کے لئے اس سے بہتر کتاب انہیں مل نہ سکے گی۔ ہم ادارہ اور خاص کر مولوی سجاد مرزا صاحب کو اس اہم کتاب کی ترتیب پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ارسطو جاہ اعظم الامرا دکن کے ایک عظیم الشان قائد اور مدبر تھے۔ ان کے حالات زندگی اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ادارہ نے عوام کے لئے مشاہیر کی سوانحعمریوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں اب تک سالار جنگ اعظم، سر سید احمد خان، اور نظام الملک آصفجاہ کے حالات زندگی شائع ہو چکے تھے۔ ارسطو جاہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسکے مرتب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی ہیں اور اس کتاب کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے صرف اس کے مصنف کا نام ہی کافی ہے پروفیسر صدیقی صاحب کی کتاب تاریخ گولکنڈہ گزشتہ سال ادارہ کی طرف سے شائع ہو کر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ارسطو جاہ اس کے مقابلہ میں ایک بہت چھوٹی کتاب ہے لیکن موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور مفید ہے اسکی قیمت صرف چھ آنے رکھی گئی ہے تاکہ عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی | شاد اردو کے ایک برگزیدہ شاعر اور ادیب تھے ان کے کلام کا پہلا مجموعہ مولانا سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اتفاق سے ان کے بہت سے خطوط اور قلمی مسودے محترمہ صغریٰ بیگم ہمایون مرزا کی عنایت سے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ کے لئے موصول ہوئے ہیں۔ ادارہ کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب نے شاد کے کوئی ستر خطوط مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ یہ خطوط اردو زبان اور ادب کی تاریخی معلومات سے معمور ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اکثر خطوط بیس بیس پچیس پچیس مطبوعہ صفحات تک پھیلے ہیں۔ اس کتاب میں شاد کے ایک خط کا عکسی فوٹو بھی شائع کیا گیا ہے کتاب نہایت مبسوط اور تین سو سے زیادہ صفحات پر شائع ہوئی ہے قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے رکھی گئی ہے۔

ادبی تحفے | اس اثنا میں ادارہ کے کتب خانہ میں متعدد جدید اردو مطبوعات وصول ہوئی ہیں ان کے علاوہ مولوی سید محمد صاحب نے دیوان مظہر جانِ جاناں کا ایک قلمی نسخہ اور مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام نے مختلف رسالوں کے ۲۴ شمارے اور مولوی ہاشم علی خاں صاحب نے ۱۱ قدیم کمیاب رسالے تحفۃً عنایت کئے ہیں۔ ادارہ کی طرف سے نواب مرزا اسیف علی خاں صاحب ناظم کتب خانہ ان سب اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نوٹ: ۔ افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ادارہ کی شاخوں کی روئدادیں شائع نہ ہو سکیں۔

ادارہ

یادِ ایامِ عشرتِ فانی

(ہماری کالج کی زندگی)

جب ہم انگریزی پڑھتے تھے تو جولیس سیزر کا یہ فقرہ بھی نظر سے گزرا تھا کہ Veni. Vidi. Vici ہوا یہ کہ جب جولیس سیزر فرانس فتح کر چکا تو اس نے اپنی فتوحات کی اطلاع روم کو انہی تین الفاظ میں دی تھی جس کے معنی ہیں "میں آیا۔ میں نے دیکھا اور میں نے فتح کر لیا" چنانچہ میں بھی اپنے دہلی آنے کا خلاصہ اس طرح بیان کر سکتا ہوں۔ میں آیا میں نے دہلی دیکھی اور لکچر دینے کی مصیبت میں پھنس گیا۔

خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ میرے عزیز دوست مولوی غلام یزدانی صاحب جہاں کہیں موقع ملتا ہے اپنی محبت سے مجھے ایسی ہی دشواریوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ ٹانگ باندھ کر تین ٹانگ کی دوڑ دوڑوں۔ وہ خود ماشاء اللہ بہت اونچی جگہ پہنچ گئے۔ دنیا میں بہت کچھ مشہور ہو گئے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ مجھے بھی رسی ڈال کر اوپر کھینچ لیں۔ مگر حضرات۔ مجھے ترقی کا اتنا شوق نہیں جتنا گرنے کا ڈر ہے۔ بہر حال جب یہاں تک آ گیا ہوں تو پھر کچھ عرض کئے بغیر یہاں سے جانے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ مضمون ایسا لیتا ہوں کہ جس سے مجھے مرتے دم تک دلچسپی رہے گی۔ اور اس زمانے کے واقعات بیان کرتا ہوں۔ جب دہلی ہماری تھی اور ہم دہلی کے تھے۔

یہ کچھ انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص اپنے زمانے کو اچھا سمجھتا ہے۔ اگر کوئی بڑھا ہے تو وہ

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

کا خیال کر کے چالیس پچاس برس پہلی باتوں کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اب کا زمانہ بھی کوئی زمانہ ہے زندگی کا مزہ ہمارے بچپن اور جوانی میں تھا کوئی جوان ہے تو وہ دربار دہلی کے بعد کے واقعات بیان کر کے اپنے زمانے کو اچھا کہتا ہے۔ کیا کروں۔ میں بھی اس فطرتِ انسانی سے مجبور ہوں اور آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ طالب علمی کا جیسا مزا ہمارے زمانے میں تھا۔ وہ اب نہیں رہا اس جوش نے مجھے اپنے مضامین میں "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" کے عنوان سے اپنے مدرسے کی زندگی کے حالات لکھنے پر مجبور کیا۔ اور یہی جوش اب مجھے اپنے کالج کے حالات بیان کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

حضرات! پڑھائی لکھائی پہلے بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے ایک جماعت میں چند طالب علم ہوتے تھے اور اب پڑھنے والوں کی زیادتی مدرسے اور کالج کے بڑے بڑے کمروں کو بھی چھوٹا کر دیتی ہے۔ پہلے مدرسہ اور کالج میں اتنے طالب علم ہوتے تھے کہ استاد اور پروفیسر نہ صرف ان کی ترقی تعلیم کو دیکھ سکتے تھے بلکہ ان کے ساتھ میل جول رکھ کر ان کے عادات اور اطوار کو بھی درست کر سکتے تھے۔ اور اب طالب علم اور استاد ایسے بیگانے ہو گئے ہیں کہ ان کا ایک دوسرے کے پاس سے گزرنا ہی مشکل ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ پاس سے گزر بھی گئے تو ان کے ٹکرا جانے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔ پہلے ہر استاد اور ہر پروفیسر ہر لڑکے کے حالات اور اس کے عادات و اطوار سے واقف

... لڑکا اس کی جماعت
... ہے۔ البتہ ہم دور سے
کالج میں وہی پرانا طریقہ رائج

میں اپنے مضمون میں آگے چل کر دکھاؤں گا کہ ہمارے پروفیسروں نا رہت تاج کے کمروں میں کیا تھا۔ اور ان کمروں سے نکلنے کے بعد کیا تھا۔ میں مشن کالج دہلی کا تعلیم یافتہ ہوں پہلے اس کالج کے پرنسپل مسٹر رائٹ تھے۔ میں اس زمانہ میں کالج میں نہ تھا۔ مگر خدا معلوم کیا بات ہے کہ باوجود بے انتہا شریف اور ہمدرد شخص ہونے کے لوگ ان سے خوش نہ تھے۔ ظاہر میں تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندو کالج کے جانی دشمن تھے۔ اور پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ میں ان کے اس فقرے نے کہ

The Hindu college is a standing disgrace to the punjab University

(ہندو کالج پنجاب یونیورسٹی کی کھلی ہوئی توہین ہے) ذرا دہلی والوں کو ان سے بدظن کر دیا تھا۔ مگر انھوں نے خود اپنے کالج اور خاص کر کالج کے فیلڈ کے لئے جو کچھ کیا وہ مشن کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ان بچارے کا انتقال ایک دفعہ ہی ہوگیا۔ مسٹر ہیوبرٹ وہیز پرنسپل ہوئے اور مسٹر ڈے انگریزی کے پروفیسر ہو کر آئے۔ کسی شخص نے اسی زمانے میں یہ باذاق فقرہ کہا تھا۔

جب اس کالج میں راستی (Wright) تھی تو یہاں (wrong) ہر چیز غلط تھی اب (Day) دن ہے تو انشاء اللہ رات (Night) ہی ہو جائے گی۔ زمانے نے اس فقرہ کو مذاق سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اور مسٹر ڈے نے نہ صرف کالج بلکہ ساری دہلی میں وہ اثر پیدا کیا کہ ایسا اثر اور کسی پروفیسر کو نصیب ہونا مشکل ہے۔ راستہ کے بچے جنھوں نے شاید ان کی شکل بھی پوری طرح نہ دیکھی ہوگی۔ ان کے نام کو اس طرح جوش دلی سے لیتے تھے گویا مسٹر ڈے ان کے بڑے پرانے دوست ہیں جو انگریز ان بچوں کے سامنے سے گزرا وہ مسٹر ڈے ہوگیا۔ میں نہیں کہتا کہ ان کو پڑھانے میں کوئی خاص مہارت یا ملکہ تھا۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کی محبت اور ان کا برتاؤ لڑکوں کو خود شوق سے پڑھنے پر مجبور کرتا تھا اور اس کا وہ نتیجہ ہوتا تھا کہ شاید اچھے سے اچھا پروفیسر بھی وہ نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ حضرات! محبت کی مار بڑی سخت مار ہوتی ہے جو کام محبت سے نکل سکتا ہے وہ سر مغزی سے نہیں نکل سکتا۔ اس لئے استادوں سے میری یہ گزارش ہے کہ وہ طالب علموں سے محبت کریں اور طالب علموں سے یہ عرض ہے کہ وہ اس محبت کی قدر کریں اس کے بعد میں بھی دیکھوں کہ کس طرح طالب علم تعلیم میں ترقی نہیں کرتے۔ رکھ رکھاؤ میں ترقی نہیں کرتے۔ کھیلوں میں ترقی نہیں کرتے اور سب سے زیادہ یہ کہ عادات اور اطوار میں ترقی نہیں کرتے۔

مسٹر ڈے میں دوسری خاص صفت تقریر کی تھی۔ ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ ان کی تقریر میں مواد کتنا ہے مگر ان کا جو نقطۂ خیال ہوتا تھا اس کو وہ اپنے الفاظ کے زور اور قوتِ بیان سے دلوں میں اتار دیتے تھے۔ ان کو بھی اپنے طریقہ تقریر پر ناز تھا۔ کہا کرتے تھے: میں آئرلینڈ والا ہوں۔ اور (Drozor) ہوں۔ آج کل وہ آئرلینڈ میں بشپ ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہاں جا کر ان کی تقریر سنوں۔ مگر

"آغا چہ کنم کار ہائے دنیا نمی گزراند"

مسٹر ڈے کی تیسری خصوصیت ان کا شوقِ تعلیمِ جسمانی تھا۔ وہ کیمبرج کے مشہور کھلاڑی تھے۔ کرکٹ، فٹ بال، کشتی رانی غرض بہت سے کھیلوں میں وہ انعام پا چکے تھے۔ وہ ہم سب کو بھی اپنا ہی جیسا بنانا چاہتے تھے۔ کوئی کھیل نہ ہوگا جس میں وہ حصہ نہ لیتے ہوں۔ ان کے جوش کا یہ حال تھا کہ ریل میں ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہے۔ کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری، وہ فٹ بال لے کر اترے اور پلیٹ فارم ہی پر فٹ بال شروع کر دی۔ مسافر ہیں کہ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں، نئے مسافروں کو گاڑی تک جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ سودا بیچنے والے پریشان ہیں۔ گارڈ سیٹیاں بجا رہا ہے۔ لیکن یہاں کھیل کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ کالج کے کمروں میں مسٹر ڈے ضرور پروفیسر بنے رہتے تھے۔ اور بڑا رعب دکھاتے تھے مگر فیلڈ میں آئے اور لڑکوں میں اس طرح مل جل گئے گویا وہ بھی طالب علم ہیں۔ کپتان کی اس قدر عزت اور فرمانبرداری کرتے تھے کہ کوئی لڑکا بھی کیا کرے گا۔ مسٹر ڈے جمعرات کے روز وعظ کے لئے جایا کرتے تھے لیکن جانے سے پہلے کپتان سے ضرور اجازت لیتے تھے۔ اس روز خود کھیلتے نہیں تھے صرف فیلڈ کرتے تھے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ کھیلے اور چل دئے۔

کوئی ۱۵ برس کی بات ہے کہ میں دہلی گیا تھا۔ اس زمانے میں مشن کالج کا میچ دہلی متحد (Delhi Combined) سے ہونے والا تھا۔ کالج کے بعض پرانے لڑکوں کو بھی شریک کر لیا گیا تھا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی اور میں راضی ہو گیا۔ پہلے ہی روز کالج کے میدان میں گیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دو صاحب بہادر آئے۔ آتے ہی ایک نے پیڈ باندھے اور جو لڑکا کھیل رہا تھا اس کو اشارہ کیا۔ وہ ہٹ گیا اور یہ صاحب جا کر کھیلنے لگے جب یہ تھک گئے تو ان کے ساتھی نے ان کی جگہ لی اور وہ بھی اچھی طرح کھیل کر ہٹے۔ دونوں نے کوٹ پہنے اور فیلڈ سے چل دئے۔ میں نے کپتان صاحب سے پوچھا کہ یہ دونوں حضرات کون تھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب تو کالج کے پروفیسر ہیں اور دوسرے ان کے دوست۔ میں نے کہا آپ سے اجازت لئے بغیر ان کو کھیلنے کا کیا حق تھا۔ اور اگر کھیلے بھی تھے تو پھر انھوں نے فیلڈ کیوں نہیں کیا۔ اس کا جواب کپتان صاحب نے ایسا دیا کہ مجھے سن کر حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے کہ مرزا صاحب یہ پروفیسر ہیں یہ ہمیشہ اس طرح آتے ہیں اور کھیل کر چلے جاتے ہیں۔ بھلا ہم ان کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا تو حضرت آپ کو ایسے کھیلنے والے ایسے پروفیسر مبارک ہوں۔ میں ایسی جگہ کھیلنا نہیں چاہتا جہاں کرکٹ کے میدان میں بھی کپتان صفر ہو اور جہاں پروفیسر اور طالب علم کا فرق قائم رہے۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا اور باوجود لوگوں کے اصرار کے اس میچ میں شریک نہیں ہوا۔

ہمارے کالج کے پرنسل مسٹر ہیربرٹ ویر تھے۔ یقین مانئے ان سے سب کا دم نکلتا تھا۔ وہ زبان سے نہیں پڑھاتے
[illegible] وہ حضرت مسمریزم جانتے
[illegible] تھوڑا اسی سکنے بعد

[illegible] ہے کہ لمبان اور چوڑان کے
لحاظ سے اس وزن کا تقسیم انسان [illegible] ہوتے ہیں تو لمبان کم ہوجاتی ہے اور بعض لمبے ہوتے ہیں تو چوڑان گھٹ جاتی ہے۔ چونکہ مسٹر ہیربرٹ ویر کی چوڑان کچھ تھی ہی نہیں اس لئے اندازہ کرلیجئے کہ ان کی لمبان کیا ہوگی۔ تمام دنیا میں پیدل پھر آئے تھے اور ہے بھی یہ کہ اتنی بڑی ٹانگیں ہونے پر دنیا کا چکر کاٹ آنا کیا بڑی بات ہے۔ ایک دفعہ ان کی تیز رفتاری سے ہم بھی مار کھا چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ فال سٹاف سوسائٹی کی outing ہوئی۔ قرار پایا کہ تغلق آباد میں جاکر ہیملٹ کا ڈراما پڑھا جائے۔ سوسائٹی کے سارے ممبر ایک دن پہلے ہی چل دئے۔ رہ گئے کون کہ میں اور مسٹر غلام یزدانی۔ ہم دونوں میں ٹھہری کہ رات کے دو بجے چلو صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچ جائیں گے۔ وہاں ناشتہ کریں گے وہاں سے نکل کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں تغلق آباد پہنچ جانا کیا مشکل ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ بڑی اس بلا کی پڑ رہی تھی کہ پناہ بخدا اگر ہم دلّی والے اس سردی کو کیا خاطر میں لانے والے تھے۔ دلّی سے نکلے اور دو ہی بجے رات کو نکلے۔ موٹے موٹے اورکوٹ پہنے کانوں سے گلوبند لپیٹے اورکوٹ کی جیبوں میں چبینا بھرا اور چل میرے بھیا قطب کو۔ شہر میں تو ایسی سردی نہیں معلوم ہوئی مگر اجمیری دروازہ سے نکل کر مزا آگیا۔ کان تو خیر چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑ گنج سے نکلتے نکلتے ناک غائب ہوگئی۔ وہاں سے ذرا سرپٹ بھاگے اور خدا خدا کرکے صفدر جنگ پہنچ گئے۔ مقبرہ کے سامنے گاڑی بان گاڑیاں کھولے الاؤ جلائے مزے سے بیٹھے حقے پی رہے تھے۔ ہم دونوں بھی وہاں جا بیٹھے جب جاکر ذرا سردی دبی۔ ابھی آدھا راستہ باقی تھا اور صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچنا تھا۔ اس لئے پھر اٹھے اور چبینا پھانکتے آگے بڑھے۔ کچھ کچھ صبح ہو رہی تھی کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس آ پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ والے ابھی آرام خاص میں ہیں۔ طبیعت گرائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی صلاح ہوئی کہ چلو ان سے پہلے تغلق آباد پہنچ جائیں۔ یہ خیال آنا تھا کہ اس پر عمل ہونے لگا۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے کہ ہم دونوں نے یہ مہم بھی سر کرلی۔ اب اس کے بعد کا واقعہ اگر بیان کروں تو شاید مسٹر غلام یزدانی شرمائیں۔ مگر میں سچی بات کہنے سے گھبرانے والا آدمی نہیں ہوں، اور جب مجھے اپنی طالب علمی کے واقعات بیان کرنے ہیں تو پھر کسی چیز کو کیوں چھپاؤں۔ تو ہاں۔ سنئے، ہوا یہ کہ کالج میں جب کوئی میچ ہوتا تھا تو شہر کے کسی نہ کسی انگریز کی طرف سے دعوت ہوتی تھی۔ دعوت میں توس ہوتے اور توسوں پر ولایتی مکھن اب یہ ہماری عدم واقفیت سمجھو یا بے وقوفی۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ شہر میں توسوں پر جو مکھن استعمال ہوتا ہے اس میں اور گاؤں کے مکھن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تغلق آباد کے

گاؤں میں جاتے ہی پوچھا کہ یہاں مکھن ملتا ہے۔ معلوم ہوا ملتا ہے۔ ایک گوالی کو روپیہ دیا کہ روپیہ کا مکھن دو اس نے پورے تین سیر مکھن کا ایک زبردست گولا کاغذ میں لپیٹ حوالہ کیا۔ اب جو ذرا سا توڑ کر منہ میں رکھا تو کچھ نہ پوچھو۔ نہ اگلتے بنتی تھی اور نہ نگلتے۔ خیال تھا کہ مکھن لے جا کر سوسائٹی کے سکرٹری کو دیں گے چاء کے وقت کام آئے گا۔ مگر اس مکھن کے مزے نے مزا کرکرا کر دیا۔ واپس کرنا چاہا تو اس گوالی نے واپس لینے سے انکار کیا۔ آخر "زر خورون" پر عمل کر کے تھوڑا بہت کھایا اور باقی وہیں پھینک کر چلے آئے۔

خیر یہ تو قصہ معترضہ ہوا۔ اب مسٹر ہیوبرٹ ویر کے چلنے کا حال سنو۔ سہ پہر تک سوسائٹی کے ممبر تغلق کی قبر پر اودھم مچاتے رہے۔ کوئی ۴ بجے ہوں گے کہ مسٹر ہیوبرٹ ویر نے کہا کہ مجھے آج ۶ بجے وعظ کہنا ہے میں تو جاتا ہوں کوئی میرے ساتھ چلتا ہے۔ بھلا ہم دونوں کیا دبنے والے تھے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ اس میرے اللہ کے بندے نے قلعہ سے نکلتے ہی جو لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے تو میرا اور مسٹر غلام یزدانی کا فشار ہو گیا۔ ہم دونوں بھاگتے تھے مگر وہ حضرت ہم سے دو چار قدم آگے ہی رہتے تھے۔ پسینہ ناک سے ٹپکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ آخر بھاگتے دوڑتے اچھلتے کودتے کالکا جی تک آ ہی گئے۔ یہاں صاحب نے فرمایا "میں آگے جاتا ہوں۔ تمھاری وجہ سے میری منزل کھوٹی ہو رہی ہے اب تک تو میں دہلی کے قریب پہنچ چکا ہوتا۔" ہم نے کہا "بسم اللہ کیجیے۔ اب ہم میں چلنے کا دم نہیں ہے"۔ وہ تو یہ کہہ روانہ ہوئے اور ہم نے کنوئیں کے پاس آ کر اوورکوٹ اتارے۔ پانی پیا۔ ذرا دم لیا جب کہیں جا کر اوسان درست ہوئے۔ ہمارے وہاں پہنچنے کے ذرا ہی دیر بعد سوسائٹی کے دو ممبر سائیکلوں پر وہاں آئے۔ پانی پیا اور روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن ان سے معلوم ہوا کہ مسٹر ہیوبرٹ ویر ان کو راستے میں کہیں نہیں ملے۔ گویا ان کی رفتار نے ہم دونوں کو تو ہرایا ہی تھا ان سائیکل والوں کو بھی نیچا دکھایا۔

مسٹر ہیوبرٹ ویر کے پڑھانے کا رنگ مسٹر ڈے کے رنگ سے بالکل مختلف تھا۔ تیار ہو کر آتے تھے اور چاہتے تھے لڑکے بھی اسی طرح تیار ہو کر آئیں۔ لڑکے اس جال سے نکلنا چاہتے تھے مگر مسٹر ہیوبرٹ ویر کی آنکھوں کا زور ان کو محنت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ بہرحال مسٹر ڈے اور مسٹر ہیوبرٹ ویر کے پڑھانے میں یہ فرق تھا کہ ایک محبت سے پڑھاتے تھے اور دوسرے محنت سے۔

مسٹر ہیوبرٹ ویر کے اس پڑھانے کے شوق نے ایک دفعہ ہم لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ امتحان کا زمانہ قریب آ گیا تھا مگر مسٹر ڈے اس زمانے میں بھی کسی نہ کسی ٹیم سے کرکٹ میچ کر لیتے تھے۔ مسٹر ہیوبرٹ ویر نے ان سے تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں یہ کیا کہ ایک نادری حکم نافذ کر دیا کہ میچ کے روز کالج کو چھٹی نہیں دی جائے گی۔ صرف میچ میں کھیلنے والے جا سکتے ہیں۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اس حکم کے بعد پہلا ہی میچ دہلی کی یوروپین ٹیم سے آ کر پڑا۔ ساڑھے دس بجے سے کھیلنے کا وقت تھا اور وہ گھنٹہ پرنسپل صاحب ہی کا تھا۔ کھیلنے والوں میں سے دو اس جماعت میں تھے۔ میں اور رام کشور۔ یہ رام کشور وہی ہیں

کوئی چیز ہے اور ہم نے بلا وجہ دب دبکر اپنے آپ کو ذلیل کر لیا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ بھٹنڈہ کے اسٹیشن پر ہوا۔ ہم لاہور جا رہے تھے۔ دوسرے روز یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں کرکٹ میچ کھیلنا تھا۔ مسٹر اینڈ روز بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمارے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے زبردستی ان کو سکنڈ کلاس میں بٹھایا تاکہ ہماری آزادی میں کھنڈت نہ پڑے۔ انٹر کی ایک ہی گاڑی تھی۔ ساری کی ساری [illegible] لئے ایک [illegible] درجہ میں ہم تین لڑکے تھے۔ میں، بلند اقبال

[illegible] بج رہا ہے اور ایک

[illegible] مرزا۔ فورا دروازہ

[illegible] ب سے پہلے اور

[illegible] نہ دیا۔ اسی کشمکش

[illegible] میں کسی نے اس کو گالی دے دی۔ گالی دینا تھا کہ حسین مرزا طاچ مار اس کا [illegible] ہو کے شیر کی طرح جا پڑا۔ اس کا اس طرح گرنا اور سب لڑکوں کا درجے کھول بھر بھر کر کے باہر نکلنا خوب چلی۔ مسٹر اینڈ روز اپنے درجہ کی کھڑکی میں سے یہ تماشہ دیکھتے اور شاباش۔ شاباش کہتے رہے۔ لڑکوں کے مقابلہ میں بھلا یہ برات والے کیا ٹکنے والے تھے۔ "ملاکی دوڑ مسیت" پر عمل کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ وہ صاحب بہادر چند سپاہیوں کو لے۔ گاڑی کی طرف آئے اور آتے ہی گڑبڑ مچانی شروع کی۔ پولیس والوں کو حکم دیا کہ سب لڑکوں کو گاڑی سے اتار دیا جائے۔ کارروائی اسی نوبت پر پہنچی تھی کہ مسٹر اینڈ روز گاڑی سے اترے۔ آہستہ آہستہ آئے اسٹیشن ماسٹر کے گلے پر ہاتھ رکھا اور کہا "چلے چلو۔ یہ میری ٹیم ہے" شاید اسٹیشن ماسٹر کے تجربے میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی انگریز نے ہندوستانیوں کا اس طرح ساتھ دیا ہو۔ وہ ذرا پیچھے ہٹے اور بلند اقبال سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں۔ بلند اقبال نے کہا مسٹر اینڈ روز۔ اس وقت تک گورنمنٹ میں مسٹر اینڈ روز کے اثر اور زور سے سب واقف ہو چکے تھے اس لئے اسٹیشن ماسٹر صاحب یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ وہ تو ادھر گئے اور مسٹر اینڈ روز نے غصہ میں پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا۔ وہ ٹہل ہی رہے تھے کہ شادی والوں میں سے ایک بڑے میاں نے مجھ سے آکر کہا "میاں ہمارے پاس انٹر کے ٹکٹ ہیں ہم تھرڈ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دولہ کو اپنے پاس انٹر میں بٹھالو" میں نے کہا۔ کیا ہرج ہے۔ بٹھا دو۔ ہماری تمھاری خدانخواستہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ زبردستی بات بڑھ گئی" ان بڑے میاں نے دولہ کو بلایا۔ اور ہمارے درجے میں بٹھا دیا۔

ہم نے بھی اس کے لئے پورا ایک بنچ خالی کر دیا۔ دولہ کو وہاں بیٹھے تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مسٹر اینڈ روز ٹہلتے ہوئے ہمارے درجے کے پاس سے گزرے۔ جھک کر دیکھا تو دولہ میاں کو پورے ایک بنچ پر قابض پایا۔

ہنس کر ذرا اونچی آواز میں کہا "اچھا شریروں۔ میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد تم اس کو ٹھونکنے والے ہو" شادی والوں میں بعض لوگ انگریزی جانتے تھے وہ ہمارے سر ہو گئے کہ دولہ کو اتار دو۔ ہم نے بہت سمجھایا کہ صاحب نے مذاق سے یہ فقرہ کہا ہے مسٹر اینڈر روز نے بھی ہماری تائید کی اور کہا کہ لڑکے کو بیٹھا رہنے دو۔ میں نے صرف اس وجہ سے دخل دیا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر حکومت کا زور دکھلانے آیا تھا۔ اگر سیدھی طرح کہتا تو میں خود جگہ دلوا دیتا۔" مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ آخر دولہ کو ہمارے درجہ میں سے اتار تھرڈ کلاس میں ٹھونس دیا۔

اس سفر میں ایک بہت ہی اہم واقعہ خاص لاہور میں پیش آیا۔ ہوا یہ کہ وہاں فورمن کرسچین کالج اور ڈی' اے' وی کالج میں فٹ بال میچ تھا۔ یہ میچ چیفس کالج کے میدان میں ہوا۔ اسی زمانے میں ان دونوں کالجوں میں سخت دشمنی تھی اور خبر نہیں کہ ڈی۔ اے۔ وی کالج والے پروفیسر ڈیورنڈ کے کیوں اس قدر مخالف ہو گئے تھے۔ اب رہا کھیل تو کھیل میں دونوں ٹیمیں برابر کی ٹکر کی تھیں۔ بہرحال کھیل شروع ہوا۔ میدان کے آدھے حصہ کو ایک کالج والے اور آدھے کو دوسرے کالج والے گھیرے ہوئے تھے۔ جب گیند ادہر آتی تو ادہر والے لائن کو عبور کر میدان میں جھک آتے۔ اور جب ادہر گیند ادہر جاتی تو ادہر والے بڑھ جاتے۔ یہ ضرور ہے کہ تماشائیوں کا یہ طریقہ اچھا نہیں تھا۔ مگر جوش کو کیا کیا جائے۔ جوش میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ اس سال اس ٹورنمنٹ کے سکرٹری مسٹر رابرٹسن تھے۔ انھوں نے یہ غلطی کی کہ سائیکل پر سوار ہو۔ ہاتھ میں چھوٹا سا چابک لے۔ لوگوں کو لائن سے پرے ہٹانا شروع کیا۔ لوگوں نے پہلے تو ان کی اس زیادتی کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ مگر بدقسمتی سے ڈی۔ اے۔ وی کالج پر ایک گول ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کالج کے ساتھ والوں کا جوش بڑھ گیا۔ اس کے بعد جو سکرٹری صاحب کا ادہر سے گزر ہوا اور انھوں نے چابک کا استعمال کیا تو بس قیامت آگئی۔ وہ لکڑی چلی کہ خدا کی پناہ۔ ہمارے کالج والے بھی ایک طرف کھڑے یہ سیر دیکھتے رہے۔ بہرحال ٹیلیفون دیا گیا پولیس آئی۔ جب کہیں جاکر یہ لڑائی ختم ہوئی۔ گرگئی کے سر پھوٹ گئے بہت سے تھوڑی تھوڑی چوٹیں کھا کر میدان سے بھاگے۔ گواہوں میں ہمارے نام بھی لکھے گئے۔ کیونکہ ہم ہی ایسے تماشائی تھے جن کو کسی فریق سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ معاملہ "پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ میں پیش ہوا۔ وہاں فورمن کرسچین کالج کے پرنسپل مسٹر یونگ کا زور تھا۔ انھوں نے ڈی۔ اے۔ وی کالج کو ۲ سال کے لئے ٹورنامنٹ سے خارج کر دینے پر زور دیا۔ اور شاید اپنی رائے کو منوانے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ہیمفریز پنجاب یونیورسٹی کے کسی عہدہ دار کے ساتھ ہمارے کالج میں آئے اور پرنسپل صاحب کی اجازت سے ہمارے بیان قلمبند کرنے چاہیے مگر مسٹر اینڈر روز نے کہا کہ پہلے میرا بیان لیا جائے کیونکہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو لڑکوں کے بیان بھی لئے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے جو بیان دیا ہے وہ ان کی غیر جانبداری اور ان کے خیالات کا آئینہ ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں ٹورنامنٹ کے سکرٹری صاحب پر اس جھگڑے کا سارا الزام لگا دیا۔ اور سب سے زیادہ اس پر زور دیا کہ چونکہ ڈی۔ اے۔ وی کالج خاص

ہندوستانیوں کا کالج ہے اس لئے اس کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ سکرٹری صاحب چابک سے اس کالج کے لڑکوں کو مار گئے اور وہ اس کا بدلہ نہ لیتے۔ سکرٹری صاحب کا ساتھ فورمن کرسچین کالج والوں نے دیا۔ اس لئے یہ جھگڑا ہوا۔ اس میں ڈی۔ اے۔ وی کالج والوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کے [illegible] اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

[illegible] کی خودداری کو صدمہ

[illegible] امن کا گہوارہ

[illegible] وجہ ہے کہ ان سے

مسٹر اینڈ روز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا۔ معلوم [illegible] کی "ان میموریم" کا پڑھانا ان کے ذمہ تھا ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں ایک صفحہ کی جو انتہائی نظم ہے اس کو انھوں نے تین دن میں ختم کیا۔ تصوف اور ویدانت کے اصول بیان کرتے اور حضرت امام غزالی ابن عربی مولانا روم اور گیتا کے حوالے دیکر جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے تو آنکھیں کھل جاتی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان چیزوں کو جمع کیا ہے اور کس خوبی سے اپنی کتاب میں داخل کیا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ان امور میں ابھی یورپ والے ہم ایشا والوں سے کتنے پیچھے اور ہمارے کس قدر خوشہ چین ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی شخصوں کو دیکھا۔ ایک مسٹر اینڈ روز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی صاحب مرحوم کا بھی یہی حال تھا وہ حماسہ معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ کے مختلف ادیبوں کے مقولے بیان کرتے تھے۔ اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو یورپ والوں نے ہم سے لے کر اس طرح ادا کیا ہے۔ ان دونوں کا پڑھانا صرف امتحان پاس کرانے کے لئے نہیں تھا۔ عالم بنانے کے لئے تھا اور ان دونوں سے پڑھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان کی عزت علمیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی وجہ سے۔

الغرض ہمارے تین طرح کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ہیوبرٹ ویر کہتے تھے دماغی ترقی کرنے کے لئے "پڑھو۔ پڑھو اور پڑھو" مسٹر ڈے کہتے تھے جسمانی ترقی کے لئے "کھیلو۔ کھیلو اور کھیلو" اور مسٹر اینڈ روز فرماتے تھے کہ اپنی عزت قائم کرنے کے لئے "لڑو۔ لڑو اور لڑو" چونکہ کالج میں طلبا کی تعداد کم تھی۔ اس لئے ہر پروفیسر کے گرد تھوڑے تھوڑے طالب علموں کا ایک ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا اور ہر پروفیسر نے اپنے ذمہ ان لڑکوں کے اخلاق و عادات درست کرنے کی بھی ذمہ داری لے لی تھی۔ کالج میں ملتے تھے۔ فیلڈ میں ملتے تھے۔ گھر پر بلا کر ملتے تھے اور گھر پر آکر ملتے تھے چنانچہ مسٹر اینڈ روز جیسے نامی شخص باوجود اپنی سیاسی مصروفیتوں کے بمبئی سے مدراس جاتے ہوئے صرف مجھ سے اور غلام یزدانی صاحب سے ملنے کے لئے

حیدرآباد میں اترے ہیں اور جب کبھی مسٹر ڈے سے میرے متعلق مشن کالج کے پروفیسر لکھ کر کچھ پوچھتے ہیں تو وہ ایسا جواب دیتے ہیں کہ ان کے مجبوب بھرے الفاظ دیکھکر ان پروفیسر صاحبان کو بھی تعجب ہوتا ہے۔

غرض کہاں تک سناؤں۔ وقت کم اور داستان زیادہ ہے اس لئے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ جب تک پڑھانے والے پڑھنے والوں سے محبت کا برتاؤ نہ کریں گے جب تک ان کی خود داری کو قائم نہ کریں گے۔ جب تک ان کے اطوار و عادات کا خیال نہ رکھیں گے اور ان کی جسمانی ترقی کو بھی تعلیم کا ایک جزو نہ سمجھیں گے اس وقت تک یہ کبھی نہ کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنے فرض کو پوری طرح انجام دیا اور جب تک پڑھنے والے ان پڑھانے والوں کی محبت کی قدر نہ کریں گے جب تک اپنی دماغی تعلیم کے ساتھ اپنی صحت جسمانی کا خیال نہ رکھیں گے اور جب تک یہ نہ سمجھیں گے کہ خود داری بھی ایک بڑا انسانی جوہر ہے اس وقت تک نہ دنیا میں ان کی قدر ہوگی اور نہ یہ کہا جا سکے گا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

غزل

دل نے کیا دیکھا نگاہِ یار میں　　رنج کی باتیں بھی کہہ دیں پیار میں
لختِ دل ہیں دیدۂ خوں بار میں　　سو گئے تھے ہم خیالِ یار میں
کیا کرشمے تھے ترے دیدار میں　　ہم تماشا بن گئے بازار میں
آپ روٹھے ہیں تو تم بھی ہیں خفا　　قول میں وہ تھا نہ یہ اقرار میں
اے دل اپنے دیکھنے والے کو دیکھ　　کیا دھرا ہے روزنِ دیوار میں
رحم کر اے گریۂ بے اختیار　　آنکھ نیچی ہے ہماری چار میں
اور بھی مجرم بناتی ہیں مجھے　　تیرے غصہ کی نگاہیں پیار میں
مجھ کو روتا دیکھ کر کہنے لگا　　آج شاید بڑھ گئی مقدار میں
یار لوگوں سے یہ سنتا ہوں صفیؔ
بکتے ہیں معشوق اب بازار میں

صفیؔ اورنگ آبادی

تصویر کا بوسہ

ے افسانوی کمرے میں ندی کنارے والے

مرطوب پر لیٹ ہوائیں مجھ پر ایک سرور ... ...
کر رہی تھیں، اور میں جذبۂ شعریت میں ڈوبی ہوئی ہمہ تن
افسانہ لکھنے میں محو تھی، نہ معلوم سلمیٰ کب سے میرے کمرے میں
آکھڑی تھی، مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ اب جب کہ اس نے
میرے کندھے ہلائے، میں چونک پڑی۔
کون سلمیٰ ؟ تم، ارے کب سے یہاں ہو،
پندرہ منٹ تو ہوئے، کرسی سرکا کر وہ میرے مقابل بیٹھ گئی،
اس کا پھول جیسا چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا تھا، اور
اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی مسرت کا اظہار کر رہی
تھیں۔
کیسے ٹپک پڑی ؟ —— میرے اس بے تکے سوال پر وہ
اٹھی، اور فرط محبت سے میری باہوں میں اپنے دونوں
ہاتھ حمائل کردے —— تمول ! اس نے اپنا خوبصورت
سر میرے منہ کے قریب لا کر کہا " خوش خبری سنانے کے لئے۔
خوش خبری ! میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا، کیسی خوش خبری ؟
مٹھائی کھلانی پڑے گی تمھیں،
آخر بات کیا ہے سلمیٰ ! میں نے اشتیاق کے لہجے میں
اس کا بازو تھام کر کہا —— جو یوں بدحواس چلی آئی "

بڑی کام کی بات ہے ! اس کا لہجہ شرارت آمیز تھا، تم
سنو گی تو تڑپ جاؤ گی،
کہنے کی بات ہے تو کہہ ڈالو —— اصرار نہ کرواؤ سلمیٰ،
... —— تو منظور ہے ——
نے قدرے بگڑ کر
ے شرط، شرط، جا میں
و نے تو میرے سارے
ے پھر میں ایک کتاب
اٹھا کر یونہی دیکھنے لگی۔
ہوں —— بڑی آئی افسانہ لکھنے والی، نہ بولیں گی مجھ سے،
یہ کہہ کر وہ شہر بہ میری مسہری پر جا کر لیٹ گئی ——
معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا، سلمیٰ چند دنوں پہلے
سے یہ کہہ گئی تھی، اب کی چھٹیوں میں اس کے بھیا علی گڑھ
سے آنے والے ہیں، شاید وہ مجھے ان کے آنے کی خبر دینے
آئی ہو، اس اچانک خیال کے آتے ہی میرے دل میں
ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی، اور میں اس نامعلوم
خوش خبری سننے کے لئے مضطرب سی ہو گئی،
میری اچھی ! میں نے سلمیٰ کے کندھے ہلا کر کہا، کیا خفا ہو گئیں،
اچھی تمول سے، بولو، روٹھ گئی کیا ؟
میں نے اسے گدگدی کر کے خوب ہنسا دیا،
" بھیا، آگئے " اور ہر سلمیٰ کی زبان سے نکلا —— ادھر
میرا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا،
کب ؟ ایک لذت آمیز خلش مجھے بےچین کر رہی تھی، میرا
سارا بدن پسینہ میں تر ہو گیا،
آج ہی صبح کی ٹرین سے —— سلمیٰ نے جواب دیا ——

اور آتے ہی تمھیں پوچھا!

سلّو! ــــ میں نے اپنے آپ کو عجیب اضطراب کی حالت میں سلمیٰ کی آغوش میں گراتے ہوئے کہا، مجھے خبر نہ تھی، اس وقت مجھ سے کیا حرکات سرزد ہو رہے ہیں، جذبات کے ہجوم میں میں بے قابو سی ہو چلی تھی، ایک لذت آمیز خیال نے محبت کی آغوش میں تھپک تھپک کر مجھے بہت جلد سُلا دیا ــــ

ہوش آنے پر میں نے دیکھا ــــ سلمیٰ کمرے سے غائب ہے، اور میرے ہونٹ نہ معلوم کب سے ایک "کاغذی پیکر" کو مس کر رہے تھے ــــ یہ ایک تصویر تھی، مردانہ حسن کا مکمل نمونہ ــــ خوابوں اور خیالوں کا مرکز ــــ میرے رومانوی دنیا کے ہیرو ــــ آہ کون؟ ــــ میری پیشانی شرم کے احساس سے بھیگ گئی، ــــ وہی سلمیٰ کے خوبصورت بھیا، اقبال صاحب ــــ

میں نے تصویر کو بے خیالی میں نہیں ــــ بلکہ بیدار ہونے پر جذبۂ الفت سے بے خود سی ہو کر کئی مرتبہ چوما ــــ سینے اور آنکھوں سے لگایا ــــ اس تصویر کو سلمیٰ اپنے ساتھ لائی تھی ــــ مجھے غافل پا کر چپکے سے اس نے تصویر کو میرے ہونٹوں پر رکھ دیا ــــ اور جلدی ــــ شریر کہیں کی ــــ

چند لمحوں تک میری مشتاق نگاہیں، اس حسین و جمیل مرقعے کی بلائیں لیتی رہیں، آہ تصویر کتنی خوبصورت کتنی دل موہ لینے والی ــــ جو آنکھوں میں بیک وقت مستی اور بجلی لئے ہوئے ہے، اس کے خوشنما ہونٹ تبسم کا بے بہا خزانہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں، میرے دل میں عجیب و غریب خیالات کا طوفان بپا تھا، تصویر دیکھتے ہوئے میرا دل ان واقعات کا اعادہ کر رہا تھا، جن سے متاثر ہو کر ہمارے دل ایک دوسرے کی شراب محبت کے لئے تشنہ تھے، اگرچہ واقعات اتفاقات پر مبنی تھے، جو فطری طور پر وقوع میں آئے، مگر میری روح اب ان واقعات کے احساس سے غرق غرق ہونے لگتی ہے ــــ بات یہ ہوئی! ــــ

امتحانات ختم ہو چکے تھے ــــ اور نتیجہ شائع ہونے میں دو ایک دن باقی تھے ــــ میں پیانو کے پاس بیٹھی ہوئی ایک دردبھرا میٹھا گیت گا رہی تھی ــــ شاید ــــ

"وہ ہنس ہنس کے دھکے دئے جا رہے ہیں"
فریب تمنا دئے جا رہے ہیں (ماہر القادری)

اس اثنا میں سلمیٰ اچانک میرے کمرے میں داخل ہوئی، اور کہنے لگی ــــ

بتول! کل نتیجہ شائع ہوگا،

میں نے کہا ــــ جھوٹی کہیں کی ــــ

اس پر سلمیٰ نے زور دے کر کہا ــــ بہن ــــ اقبال بھیا کہہ رہے تھے ــــ کل نتیجہ شائع ہوگا ــــ انھوں نے سررشتہ سے سنا ہے ــــ

میں نے سلمیٰ کی بات کی پھر تردید کی ــــ وہ برابر یہی کہتی تھی ــــ کل نتیجہ ضرور شائع ہوگا ــــ غرض آدھ گھنٹہ تک ہمارے درمیان تکرار ہوتی رہی ــــ آخر سلمیٰ ہار مان کر اپنے گھر چلی گئی ــــ

دوسرے دن سلمیٰ پھر آ موجود ہوئی، اس وقت وہ خوشی کا مجسمہ بنی ہوئی تھی، آتے ہی وہ فوراً مجھ سے چمٹ گئی ــــ

"بتول اب ہم دونوں پاس ہو گئے"

ارے، میری زبان سے تعجب و مسرت کا ملا جلا کلمہ نکلا ــــ

کب؟ ــــ

ممیا نے کہا، وہ یونیورسٹی کے نوٹس ہال میں ہمارا نتیجہ دیکھ
آئے ہیں۔ اور پھر مسٹر شرما سے بھی ہماری کامیابی کی تصدیق
... آ ... سلمیٰ نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

کی مسرت میں ہنستے بولتے رہے — دوسرے ...
اخبار میں ہمارا نتیجہ شائع ہوا —

اس کامیابی کی خوشی میں سلمیٰ نے اپنے گھر ایک
شاندار دعوت ترتیب دی، جہاں بڑی تعداد میں کالج
کے لوگ اور اس کے عزیز و اقارب مدعو تھے،

دعوت کے ایک دن پہلے ہی سلمیٰ نے مجھے اپنے یہاں بلا
رکھا تھا، میں اور سلمیٰ کی ایک رشتہ کی بہن نوشابہ دعوت
کی تیاریوں میں لگے رہے،

سرِشام مہمانوں کی آمد شروع ہوئی، ان کا استقبال
اور بٹھانے کا انتظام میرے ذمہ کیا گیا تھا، باہر مردانہ میں
صرف اقبال صاحب ہی منتظم کی حیثیت سے مصروف تھے،
گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک مہمانوں کی سربراہی ہوتی رہی انداخدا
کرکے دس بجے کہیں یہ دعوت کا سلسلہ ختم ہوا۔

سلمیٰ سر کے درد کی وجہ سے اپنے کمرے میں چلی
گئی، نوشابہ مجھے اصرار کے ساتھ پائیں باغ میں لے گئی،
اور وہاں پہونچ کر ہم دونوں ایک خوشنما فوارے
کے پاس بیٹھ کر چاندنی رات کا لطف اٹھانے لگے، نوشابہ
نے رائے پاس کی کسی طرح یہاں سلمیٰ کو گھسیٹ لائیں،

میں نے بھی اس کے خیال کی تائید کی، بات تو تم نے دل کی
کہی مگر نوشابہ! وہ اس وقت نہ آسکے گی۔ اس کی طبیعت
ٹھیک نہیں —
گ
نوشابہ بولی، تم اُسے

... میں نے جواب دیا،
... ور آئے گی، نوشابہ نے
... ئے بھیجا —

سلمیٰ کے کمرے کے قریب پہونچ کر میں نے اس کے کمرے
میں روشنی دیکھی —
شریر کہیں کی، میں نے اپنے دل میں کہا — یہ ابھی
سر کے درد کا بہانہ کرکے جاگ رہی ہے، دبے پاؤں میں
دروازے تک پہونچی، اور کواڑ کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔
کمرے میں کوئی نہ تھا، میں بے دھڑک اندر داخل ہوئی، یہ
دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کمرہ بحیثیت مجموعی
مردانہ ساز و سامان لئے ہوئے ہے، ایک طرف کونے میں
بڑی شیشہ دار الماری کتابوں سے پھٹی پڑی ہے، سنگار میز
جس پر کنگھا، برش، تیل لیونڈر اور نہ جانے کیا کیا رکھا
ہوا ہے، اس کے قریب ایک چھوٹی سی میز پر انگریزی
قسم کا باجا بھی دھرا ہوا ہے — میری کے قریب والی
چوبی سرکلی میز پر چند انگریزی اردو رسالے نیم وا حالت
میں بکھرے ہوئے اپنے مالک کی عدم موجودگی کا ثبوت
دے رہے ہیں، ان رسائل کے قریب ہی ایک چھوٹی سی
خوبصورت کافوری فریم میں جڑی ہوئی، مردانہ وضع کی
تصویر رکھی ہوئی تھی۔ تصویر حد درجہ دلکش اور جاذب نظر

تھی، میرے ہاتھ بلا ارادہ اس تصویر کی طرف بڑھے چند سکنڈ میں تصویر میرے ہاتھ میں تھی، پاکیزہ، نورانی چہرہ، مغربی ملبوس میں میری مشتاق نظروں کو دعوتِ حسن دے رہا تھا ـــــ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ، اپنی دلفریب اداؤں کے ساتھ میرے دل کی گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا تھا، ایک دبی ہوئی آہ میرے منہ سے نکل کر رہ گئی۔ بے ساختگی میں، میں نے تصویر کو چومنے کی جرأت کی، اُف خدا ـــ مجھ پر ایک بجلی سی گر پڑی، میں پسینہ میں نہا گئی ـــــ مہین سی قہقہہ کی آواز نکل کر میرے دل کے تار دل سے ٹکرا گئی ـــــ میں نے دیکھا ـــــ اقبال صاحب دروازے کے پاس کھڑے مسکرا رہے ہیں، یہ اُن کا کمرہ تھا، جو میں غلطی سے یہاں پہونچی ـــــ ایک ارتعاش ـــــ سر سے پاؤں تک مجھ پر طاری تھا، تصویر فوراً میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی، اور اس کا شیشہ نیچے گر کر چور چور ہو گیا ـــــ میں نے فوراً اپنی دونوں آنکھیں میچ لیں اور چہرہ ہاتھوں سے ڈھانک لیا ـــــ میں ایک پتھر کی مورت کی طرح ساکت و سامت کھڑی ہوئی تھی ـــ

آپ ـــــ آپ گھبرائیے نہیں، اقبال صاحب نے قریب آکر نیچے گری ہوئی اپنی تصویر کو اٹھا کر کہا لیجیئے اس شیشے سے نازک اور قیمتی وہ شئے ہوتی ہے جسے "دل" کہتے ہیں، انھوں نے اپنی تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے یہ جملہ کچھ ایسی حالت میں ادا کیا کہ میں کر رہ گئی، سنئے، ایسی بیسیوں تصویریں آپ کے خوبصورت ہاتھوں کا کھلونہ بن سکتی ہیں اقبال صاحب کے جملوں کا ایک ایک لفظ مجھ پر بجلیاں گرا رہا تھا ـــــ انھوں نے میرے کندھے پکڑ کر کرسی پر لا بٹھایا۔

اور خود میرے سامنے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے ـ دیکھیئے، آپ پریشان تو نہ ہوں گے ـــــ اسے اپنا گھر سمجھیئے آخر ہم سلمیٰ کے بھیا ٹھیرے نا ـــــ میں عجیب مشکل میں آپھنسی تھی ـــــ خوف و حیا کے مارے میری جان گھٹی جا رہی تھی، اور دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا ـــــ

بولیئے آپ چپ کیوں ہیں ـــــ پھر انھوں نے مجھ سے سوال کیا، ان کا خوبصورت چہرہ ہمدردی کے ہلکے سے نقوش لئے ہوئے حد درجہ دلکش نظر آرہا تھا ـــــ

مجھے افسوس ہے، میں نے انتہائی شرم محسوس کرتے ہوئے کہا، آپ کی تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا، کوئی پروا نہیں، آپ کے سامنے اصلی زندہ تصویر تو موجود ہے، میں ان کے اس چست جملے سے جھینپ سی گئی، لیکن وہ تصویر ـــــ میں کچھ کہتے کہتے رک گئی ـــــ شرم کا جذبہ مجھ پر غالب آگیا ـــــ آپ کو پسند ہے، انھوں نے بلند لہجہ میں جملے کی تکمیل کی ـــــ

کیوں نہیں ـــــ ایک مانوس آواز مجھے سنائی دی سلمیٰ اور نوشابہ کمرے کے باہر کھڑی ہنس رہی تھیں۔

سلمیٰ، اس کے بھیا نے کہا ـــــ یہاں آؤ، تمھاری سہیلی کمرے کی پہچان میں بڑی غلطی کھائی ہیں؟

ہاں بھیا! ـــــ وہ شرارت کی پتلی جواب میں یہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی، غلطی نہ سہی جان بوجھ کر آگئی تو کیا ہوا؟ اب یہ ہماری "بھابی جان" بنیں گی نا ـــــ

اقبال صاحب اپنی بہن کا جواب سن کر مسکرا کر چل دیے۔ اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی ـــــ

انسان جب بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے ـــــ بے اختیار

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ یہی حالت میری ہوئی —— سلمیٰ نے جب مجھے آبدیدہ دیکھا —— بےساختہ وہ مجھ سے چمٹ گئی —— اور میں دیر تک اس کے سینے سے چمٹ کر مسرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے آنسو بہاتی رہی۔

صابر کوسگوی

اتصال

کا خواب

لہک

خال کی ظلمت جبیں کا نور عارض کی بہار
[illegible] رو کی دھار

عشق کی قیمت جفا کی تیغ تقدیرِ وفا
آبِ حیواں سمِ قاتل دردِ دل دل کی دوا

سازِ قدرت کی صدائے دلنشیں و دل نواز
چارۂ دردِ محبت مایۂ سوز و گداز

خالقِ ذوقِ نظر پروردگارِ دردِ دل
رونقِ عرشِ بریں تزئینِ بزمِ آب و گل

عشق کی پرچھائیوں میں ملنے والی آرزو
سوزِ دل سوزِ جگر میں جلنے والی آرزو

جنسِ ارزانِ مصر کی یعقوب کا خوابِ حسیں
کوہکن کا زورِ بازو نجد کا محمل نشیں

مہرِ عالمتاب کی ضو ماہ کی تابندگی
چومتی ہے جس کی پیشانی کو روحِ بندگی

پر فضا میدان کی خاموشیوں کا رازداں
چاندنی راتوں کی برنائی کا تنہا پاسباں

رقص فرماتا ہے گاہے منظرِ کہسار میں
پھول بن کر کھیلتا ہے دامنِ گلزار میں

چھین لیتا ہے دلوں سے مایۂ صبر و سکوں
بخشتا ہے زندگی کو لذتِ ذوقِ جنوں

ذرہ ذرہ سے عیاں ہے ذرہ ذرہ میں نہاں
ہر طرف بکھری ہوئی ہی جس کی رنگیں داستاں

مسکراتا مدبھری آنکھوں میں آتا ہے کبھی
بجلیاں بن کر نگاہوں میں سماتا ہے کبھی

سانس لیتی ہے جوانی جب بھری برسات کی
جب خموشی دل کو گرماتی ہے بھیگی رات کی

وجد کرتی ہیں بہاریں جب وفورِ جوش میں
اک تصور بن کے آتا ہے مرے آغوش میں

رشید احمد

صنعتی کی ایک مثنوی

"گلدستہ"

اگست کے سب رس میں پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نے صنعتی کی مثنوی قصۂ تمیم انصاری پر دوبارہ روشنی ڈالی ہے کہ آج سے تقریباً دس سال پہلے وہ اس موضوع پر اپریل ۱۹۳۲ء کے معارف میں اظہار خیال کر چکے ہیں، میرا خیال تھا کہ اس عرصہ میں ان کو صنعتی کی دوسری مثنوی کا علم ہو چکا ہوگا لیکن مضمون میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے، اس لئے اس موقع پر فائدہ اٹھا کر میں اس شاعر کی دوسری مثنوی سے ناظرین کو تعارف حاصل کرانے کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

یقیناً یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تاریخ کی کتابیں، تذکرے اور خود اس کی دو مثنویاں اس کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں پھر بھی یہ غنیمت ہے کہ قصۂ تمیم انصاری سے اس کے عہد کا تعین ہو سکتا ہے۔[1]

صنعتی کی یہ دوسری مثنوی جو گلدستہ کے نام سے موسوم ہے ایک ایسے قصہ سے ماخوذ ہے جو شائد ہندوستان میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز رہا ہے، کیونکہ اس وقت تک اس کو مختلف اشخاص نے اردو نظم یا نثر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے عوام و اطفال کے لئے کسی چیز میں دلچسپی پیدا کرنے کا آسان ترین نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ اس تخیل کو حکایتی یا رومانی لباس میں پیش کیا جائے۔ اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہ، اعتقاد، روایات اور عام معلومات کو عوام تک پہنچانے کی یہ سعی ہے۔ ایک شہزادی اپنی شادی کے لئے یہ شرط لگاتی ہے کہ جو شخص میرے سوالات کا جواب دے گا میں اس کو اپنا رفیق حیات بنانے کی عزت بخشوں گی اور جو ناکام رہے گا وہ قدیم افسانوں کی روایات کے مطابق جان و مال کھو بیٹھے گا۔ مختلف شاہزادے قسمت آزمائی کرتے اور جان کھوتے ہیں تاآنکہ ہیرو جوابات دے کر گوہر مراد کو حاصل کرتا ہے۔ یہ تمام سوالات عموماً مذہبیات سے متعلق ہیں۔ فارسی سے ترجمہ کر رہا ہے، لیکن مجھے انتہائی تلاش کے باوجود اس کا فارسی نسخہ نہیں ملا، لیکن اس سلسلہ میں ایک اور چیز نظر سے گزری جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ نہ صرف فارسی و اردو بولنے والوں میں مقبول تھا بلکہ فرانس و انگلستان میں بھی متعدد اشخاص نے ترجمے اپنی اپنی زبان میں کیے ہیں۔

الف لیلہ کے جواب میں انگریزی میں ایک صاحب نے فارسی افسانوں کا ایک مجموعہ "ہزار یک روز" کے نام سے شائع کیا ہے ان کا نام جسٹن، ایچ، میک کارتھی (Justin. H. Mccarthy) ہے انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کا پہلا فرانسیسی ترجمہ فرانسیسی مستشرق Petis de la croix نے ۱۷۱۰ء میں Mille et un jours کے نام سے شائع کیا تھا، اس کے بعد اس کے دوسرے ترجمے اسی زبان میں شائع ہوئے، اسی طرح ان افسانوں کو انگریزی میں سب سے پہلے D.P. نے ۱۷۱۴ء میں شائع کیا اور اس کے بعد دوسرا ترجمہ ۱۷۳۸ء میں Ambrose. Philips کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر مسٹر جسٹن نے ۱۸۹۲ء میں اپنا ترجمہ شائع کیا، ان کی کتاب کے حصہ اول میں یہ قصہ ۲۸۱ - ۱۷۱ یعنی ۱۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

[1] اس قسم کے اردو قصے گجرات میں لکھے گئے ہیں (۱) ناز میں وبیجان ۱۱۱۲ء، (۲) قصہ جوہر و قاضی ۱۱۴۲ء۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ یہی حالت میری ہوئی ——— سلمیٰ نے جب مجھے آبدیدہ دیکھا ——— بے ساختہ وہ مجھ سے چمٹ گئی ——— اور میں دیر تک اس کے سینے سے چمٹ کر مسرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے آنسو بہاتی رہی۔

صابر کوسگوی

نصال

کا خواب

لہک

ایزدی کی پیشانیاں

خال کی ظلمت جبیں کا نور عارض کی بہار
کاکلوں کا پیچ گیسو کی شکن ابرو کی دھار

عشق کی قیمت جفا کی تیغ تقدیر وفا
آبِ حیواں سمِ قاتل دردِ دل، دل کی دوا

سازِ قدرت کی صدائے دلنشیں و دل نواز
چارۂ دردِ محبت مایۂ سوز و گداز

خالقِ ذوقِ نظر پروردگارِ دردِ دل
رونقِ عرشِ بریں تزئینِ بزمِ آب و گل

عشق کی پرچھائیوں پر مٹنے والی آرزو
سوزِ دل سوزِ جگر میں جلنے والی آرزو

جنسِ ارزانِ مصر کی یعقوب کا خوابِ حسیں
کوہکن کا زورِ بازو نجد کا محمل نشیں

مہرِ عالمتاب کی ضوِ ماہ کی تابندگی
چومتی ہے جس کی پیشانی کو روحِ بندگی

ہر فضا میدان کی خاموشیوں کا رازداں
چاندنی راتوں کی برنائی کا تنہا پاسباں

رقص فرماتا ہے گاہے منظرِ کہسار میں
پھول بن کر کھیلتا ہے دامنِ گلزار میں

چھین لیتا ہے دلوں سے مایۂ صبر و سکوں
بخشتا ہے زندگی کو لذتِ ذوقِ جنوں

ذرہ ذرہ سے عیاں ہے ذرہ ذرہ میں نہاں
ہر طرف بکھری ہوئی ہیں جس کی رنگیں داستاں

مسکراتا مدبھری آنکھوں پر آتا ہے کبھی
بجلیاں بن کر نگاہوں میں سماتا ہے کبھی

سانس لیتی ہے جوانی جب بھری برسات کی
جب خموشی دل کو گرماتی ہے بھیگی رات کی

وجد کرتی ہیں بہاریں جب وفورِ جوش میں
اک تصور بن کے آتا ہے مرے آغوش میں

رشید احمد

صنعتی کی ایک مثنوی

"گلدستہ"

اگست کے سب رس میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے صنعتی کی مثنوی قصۂ تمیم انصاری پر دوبارہ روشنی ڈالی ہے کہ آج سے تقریباً دس سال پہلے وہ اس موضوع پر اپریل ۱۹۳۲ء کے معارف میں اظہار خیال کر چکے ہیں میرا خیال تھا کہ اس عرصہ میں ان کو صنعتی کی دوسری مثنوی کا علم ہو چکا ہوگا لیکن مضمون میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے اس لئے اس موقع پر فائدہ اٹھا کر میں اس شاعر کی دوسری مثنوی سے ناظرین کو تعارف حاصل کرانے کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

یقیناً یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تاریخ کی کتابیں تذکرے اور خود اس کی دو مثنویاں اس کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں پھر بھی یہ غنیمت ہے کہ قصۂ تمیم انصاری سے اس کے عہد کا تعین ہو سکتا ہے۔

صنعتی کی یہ دوسری مثنوی جو گلدستہ کے نام سے موسوم ہے ایک ایسے قصہ سے ماخوذ ہے جو شاید ہندوستان میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز رہا ہے کیونکہ اس وقت تک اس کو مختلف اشخاص نے اردو نظم یا نثر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے عوام و اطفال کے لئے کسی چیز میں دلچسپی پیدا کرنے کا آسان ترین نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ اس چیز کو حکایتی یا رومانی لباس میں پیش کیا جائے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہ، عقاید، روایات اور عام معلومات کو عوام تک پہنچانے کی یہ سعی ہے۔ ایک شہزادی اپنی شادی کے لئے یہ شرط لگاتی ہے کہ جو شخص میرے سوالات کا جواب دے گا میں اس کو اپنا رفیق حیات بنانے کی عزت بخشوں گی اور جو ناکام رہے گا وہ قدیم انسانوں کی روایات کے مطابق جان و مال کھو بیٹھے گا۔ مختلف شاہزادے قسمت آزمائی کرتے اور جان کھوتے ہیں تا آنکہ ہیرو جوابات دے کر گوہر مراد کو حاصل کرتا ہے۔ یہ تمام سوالات عموماً مذہبیات سے متعلق ہیں۔ فارسی سے ترجمہ کر رہا ہے لیکن مجھے انتہائی تلاش کے باوجود اس کا فارسی نسخہ نہیں ملا لیکن اس سلسلہ میں ایک اور چیز نظر سے گزری جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ نہ صرف فارسی و اردو بولنے والوں میں مقبول تھا بلکہ فرانس و انگلستان میں بھی متعدد اشخاص نے ترجمے اپنی اپنی زبان میں کیے ہیں۔

الف لیلہ کے جواب میں انگریزی میں ایک صاحب نے فارسی افسانوں کا ایک مجموعہ "ہزار یک روز" کے نام سے شائع کیا ہے ان کا نام جسٹن، ایچ، میک کارتھی (Justin H. Mccarthy) ہے انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

اس کتاب کا پہلا فرانسیسی ترجمہ فرانسیسی مستشرق Petis de la Croix نے ۱۷۱۰ء میں Mille et un jours کے نام سے شائع کیا تھا، اس کے بعد اس کے دوسرے ترجمے اسی زبان میں شائع ہوئے، اسی طرح ان افسانوں کو انگریزی میں سب سے پہلے D.R. [illegible] نے ۱۷۱۴ء میں شایع کیا اور اسکے بعد دوسرا ترجمہ ۱۷۳۸ء میں Ambrose Philips کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر مسٹر جسٹن نے ۱۸۹۲ء میں اپنا ترجمہ شایع کیا، ان کی کتاب کے حصہ اول میں یہ قصہ ۲۸۱ - ۱۷۱ یعنی ۱۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

علہ اس قسم کے دو قصے گجرات میں لکھے گئے ہیں (۱) ناز میں و نیجان ۱۱۲۰ھ (۲) قصہ جور دو قاضی ۱۱۹۲ھ

اس ترجمے میں ہیرو کا نام ظلف بن طہمورث شاہ خاں قبیلہ انگائس تاتار (؟) اور ہیروان کا نام توران دخت بنت التون خاں شاہ ہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ اگرچہ ہر کتاب میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ فارسی سے ترجمہ ہے لیکن کسی دور میں بھی پورا واقعہ تو خیر [illegible] ایک بھی [illegible] ہیں اسی لئے مختصراً ان کا حال لکھتا ہوں۔

اس کتاب کا نسخہ کتب خانہ طیبہ جامعہ عثمانیہ [illegible] میں اس کا ذکر قصہ زلیخائے ثانی کے نام سے کیا ہے[1] لیکن لائق مرتب نے مثنوی سے ایسا کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ خود مصنف نے یہ نام رکھا تھا مگر میرے نسخہ میں قصہ یوسف ثانی کا نام [illegible] فتح کا رکھا ہوا ہے۔

تب فتح نے دل میں کیتی فکر کر یوسف ثانی تب قصہ دیگر

اگرچہ مثنوی میں سنہ تصنیف درج نہیں ہے لیکن اسباب تصنیف کے سلسلہ میں فتح نے جو حالات بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں یہ مثنوی بارھویں صدی ہجری کے ربع اول میں لکھی گئی ہے فاضل مرتب نے وجہ تصنیف کا خلاصہ دیا ہے لیکن جو نتیجہ میں نکالنا چاہتا ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشعار سامنے رہیں وہ یہ ہیں:-

اب سنو فتح کی باتاں سب عیاں (۱) گودھرہ کے شہر میں کیتا بیاں
بیٹھے تھے ایک دن جمع مسجد ملیں (۲) کو بوڑھے اور جوان چھوٹے ننھے
شہر میں آیا تھا ایک محمد میا (۳) ان نکالا یو زلیخا کا قصہ
تب فتح نے دل منے کیتی فکر (۴) ایسی دوجی ہندی باندھو اب دیگر
چار بتیاں ساقی کی بولا تمام (۵) ایسے خوش میٹھے زلیخا کے کلام
سنتا تھا محمد امین کور چشم (۶) مجکو سو تب مسجد منے دیتی قسم
سن محمد توں فتح مجیس یہ بات (۷) گودھرہ کے بیچ تو ہے نیک ذات
اس زلیخا کا میں باندھا ہوں قصہ (۸) اے فتح اس بات میں تو سخن کیا لکھا

تب فتح نے دل میں کیتی فکر کر (۹) یوسف ثانی تب قصۂ دیگر

فتح محمد گودھرہ کا رہنے والا تھا، یہ گجرات کا مشہور شہر ہے آج سے چند سال پہلے تک وہ ایک ضلع کا صدر مقام تھا، لیکن اب یہ علاقہ بھروچ میں ملا دیا گیا ہے ایک دن مسجد میں "بوڑھے جوان چھوٹے ننھے" سب جمع تھے کہ ایک نووارد محمد میاں نے یوسف و زلیخا کا قصہ بیان کیا اس کو سن کر فتح کو خیال ہوا کہ کیوں اس کو "ہندی باندھوں اب دیگر" فتح کی طبیعت حاضر تھی، اس نے اسی وقت چار بتیاں ساقی کی بولا تمام" اسی مجمع میں محمد امین بھی موجود تھا جب اس نے فتح کا یہ ارادہ اور مستعدی دیکھی تو فتح سے کہا کہ "اس زلیخا کا میں باندھا ہوں قصہ" اس لیے تکلیف نہ فرمائیے۔ اس پر فتح نے طے کیا کہ وہ علی الرغم امین یوسف ثانی تب قصہ دیگر" لکھے گا۔ آئیے ایم

[1] فہرست مخطوطات صفحہ ۱۷۵۰۶

دیکھیں کہ یہ امین مصنف یوسف زلیخا کون ہے اور اس کا گودھرا سے کیا تعلق ہے۔ خوش قسمتی سے امین کی مثنوی کا بھی ایک نسخہ میرے پاس ہے اور جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنے یورپ کے دکنی مخطوطات میں بھی اس کا مفصل حال لکھا ہے اس نے اس مثنوی میں لکھا ہے:-

گیارہ سو کے اوپر تو جو گزرے ؛ برس ہجرت محمد مصطفٰی کے
بتیاں چھ نبیس سوا و تیس اوپر ؛ لکھیں گودھرے کے بیچ خوشتر[1]
جمادی اولیں (کذا) اتوار کے روز ؛ اتھی تاریخ دوجی دلسوں افروز

یہی وجہ ہے کہ امین اپنی مثنوی کی زبان کو گجری یا گرجری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ امین نے اپنی مثنوی ۱۱۰۹ھ میں لکھی تھی اور وہ اس قدر عام نہیں ہوئی تھی کہ خود اس شہر کے فتح جیسے شاعر کو اس کا علم تھا، یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امین کی مثنوی کو مرتب ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا اور فتح نے اپنی مثنوی سال بھر میں مرتب کی، اس لئے اس کا زمانہ ۱۱۱۲ھ–۱۱۰۹ھ کے درمیان اندازاً مقرر کیا جا سکتا ہے لیکن مزید احتیاط کے لئے میں نے ۱۱۲۵ھ تک وسعت دیدی ہے فتح کی مثنوی میں تقریباً ۱۱۰۰ اشعار ہیں اور یہ دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

بادشاہ تھا ایک اگلے روزگار ؛ دولت و نعمت تھی اس کی بےشمار - (۲) قصۂ ملکۂ مصر۔ مصنفہ محمود۔ ہیرو کا نام = عبد العلیم (عالم ہندوستانی)
کہ تھا ایک عالم ہندوستان میں ؛ کتنیک دن کے بعد از خبر سن انیں = اوک اس کوں اس بات کا کام تھا ؛ سو عبد العلیم اس کے تئیں نام تھا

ہیروئن کا نام = ملیکہ بنت سلطان فیروز شاہ، بادشاہ مصر

دھرے نام فیروز سلطان شاہ ؛ اتھا مصر کے تخت کا بادشاہ ملیکہ اچھے نام اوس نار کا ؛ اتھا شور جگ میں اس نار کا

تعداد اشعار ۴۵۶ = تعداد سوالات ۴۲ - اس قصے کے نسخے عام ہیں۔ سروری صاحب کی فہرست میں بھی اس کا ذکر ہے، لیکن میں اس قصہ کو عاجز کی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں ہوں میرا خیال ہے کہ یہ محمود ہی کا قصہ ہے۔ اور ۱۱۱۲ھ در اصل فارسی کتاب کے خاتمہ کا ترجمہ ہے، بہرحال اس موضوع پر کسی دوسری صحبت میں عرض کروں گا، یہ مثنوی شائع بھی ہو چکی ہے اور اسی شائع شدہ نسخہ میں یہ عبارت درج ہے:-

" نسخہ منظوم در سوال و جواب تصنیف اثیف شاعر مسعود میاں محمود وحید عصر۔ الموسوم بہ قصۂ ملکۂ مصر۔

(باقی آئندہ)

سید نجیب اشرف ندوی

---

[1] ہاشمی صاحب کے یہاں دوسرا شعر یوں ہے۔

بتیاں چالیس سو پھر چودہ اور سو ؛ میں لکھا گودھرے کے بیچ کس کو

ہندوستان میں اسلامی تعمیر کاری

مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے پر ان کے سامنے یہ ایک اہم مسئلہ تھا کہ اپنے لئے جائے رہائش
... کرنی تھی اور ان کی کوئی بھی
ن رہائش اور مساجد
ریگروں کو لے کر ان سے
حل کرنے میں ان
ہندوستان میں ملتی
قدیم عمارات کو ہی اپنے مطالب کے مطابق ... ...
ہیں۔ اسی سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے ایک تو یہ کہ ان کے اندر ملکۂ فن تعمیر بالکل الگ تھا دوسرے ان کی تہذیب و تمدن
بالکل مختلف تھے۔ عہد اسلامی کا صحیح عمارت جو ابتدائی زمانے کی ابھی تک اسی حالت میں موجود ہے جس سے ہم مسلمانوں کے صحیح
جذبۂ تعمیر کا اندازہ کر سکیں وہ دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام ہے جس کے بلند محراب ہیں اور اس کا قطب منار یا زینہ برائے اذاں تیار
کیا گیا۔ مسجد قوت الاسلام کو قطب الدین ایبک نے تعمیر کی اور قطب منار کی تکمیل شمس الدین التمش نے کی ان آثاروں سے
بخوبی مسلمانوں کے صحیح فن تعمیر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب کہ ان کے قدیم ہندو مندر کے آثاروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے
جو ابھی تک اس مسجد و صحن میں ستون وغیرہ کا کام دیتے ہیں بلکہ نظریہ مکان و زمان اسلامی فن تعمیر بھی بخوبی سمجھ میں آجائے گا امیر خسرو
نے اس مسجد کی تفصیل جو دی ہے اس میں گنبد وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے گو وہ آج موجود نہیں ہیں ورنہ ہم ابتدائی گنبد کی بناوٹ کا
مشاہدہ کر سکتے۔ اس کے بعد ہی علاؤالدین خلجی کا زمانہ آیا تو اس نے اس مسجد قوت الاسلام کے ساتھ جنوب مشرقی کونہ پر ایک
دروازہ قائم کیا جس کی محرابیں اور نقش و نگار زیادہ زیبائی ہیں وہی گھریا محرابیں اور انہی محرابوں پر کتبات اور گردبندی ہے
مسلمانوں کی تعمیرات میں ایک امر قابل لحاظ رہا ہے وہ ان کا زیبائشی پہلو ہے اور اس میں ان لوگوں نے اس قدر جدتیں کیں کہ
خاص طور پر نقوش اسلامی شمار ہونے لگے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو مذہباً کسی قسم کی تصاویر کے بنانے سے طبعاً نفرت
ہو چکی تھی اس لئے ان کے اس جذبے نے دو امور میں زیادہ اظہار کیا ایک تو کتبات کی مختلف طرز تحریر جو نسخ۔ طغرا۔ ثلث وغیرہ
میں ظاہر ہے اور دوسرے منظم نقش و نگار جو اس سے قبل نہ تھے اور یہ نقش و نگار بالکل رسمی تھے جیسے انگریزی میں Orna-
mentation کہتے ہیں۔ غرض کہ یہ امور شروع سے ہی ترقی پذیر رہے اور آگے چل کر ہر ایک سلطنت اور ہر ایک مقام
کے ساتھ مسلمانوں کا طرز تعمیر بھی خاص ہی صورت اختیار کرتا رہا مگر ان کے اصول جو ایک دفعہ وضع ہو چکے تھے وہ ان میں
برابر بدرجۂ اتم سرایت کرتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ کچھ مختلف مقام و مختلف سلطنتوں کی تعمیرات نے مختلف اسماء اختیار کر لیے
مگر اصولاً سب ایک ہیں۔ ان سب کو الگ الگ بیان کرنا بلکہ ان کی ایک ایک عمارت کو بیان کرنا ایک ایک مستقل کتاب کا
حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں تغلق طرز تعمیر کو دیکھ کر غیر ممالک کا سیاح نورین سے تشبیہ دیتا ہے مگر جب غور سے

دیکھتا ہے تو بالکل محراب و گنبد کے اصولوں پر قائم ہے۔ اسی طرح ہر ایک شاخ اپنی آپ ہی مختلف خصوصیات پر حاوی ہے مسلمانوں نے فن تعمیر میں جو جدتیں کیں وہ زیادہ تر مساجد اور مقابر میں ہیں اور ان میں کوئی ان کے سامنے مذہبی قیود و اصول تعمیر میں نہ تھیں اس لئے انھوں نے محض نفس عمارت یعنی ضرورت عمارت کو مدنظر رکھ کر اس کے اندر وہ وہ جدتیں کیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے حالانکہ اس کے برعکس اہل ہنود کی عمارات میں نہ ہی مذہبی قیود اور وہی بندشیں شامل حال ہیں جن کی وجہ سے بعض محققین نے اعتراض بھی کیا ہے کہ جب تعمیر کاران روایات اور قیود سے باہر نہیں آسکتا تو پھر وہ کیسے اپنے جذبات کو دخل دے سکتا ہے غرض کہ مسلمان کا صحیح جذبہ خداداد جذبہ لطیفیات ان تعمیرات سے بخوبی عیاں ہے اور ان کی تعمیرات کو دیکھ کر ایک محقق نے یہاں تک کہہ دیا کہ مکان کو تعمیر کر لینا کوئی فن تعمیر میں شامل نہیں ہے کیونکہ یہ ضرورت کو پورا کرنا ہے بلکہ روضہ کی تعمیر کرنا اور اس میں اپنے جذبات کو نہاں کرنا فن تعمیر ہے جس طرح شاعر اپنے جذبات کو غزل و قصیدہ و مدح میں ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس قدر بھی اسلامی روضے نظر آئیں گے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ہر ایک میں بانی کے صحیح جذبات کی آئینہ داری ہے جو وہ صاحب روضہ کے لئے رکھتا تھا اور اس میں کیا کیا جدتیں کیں جو کسی عہد میں نہیں ملتیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہماری ہمسایہ قوم اپنے مذہبی روایات سے مجبور ہے کہ اپنے گزشتگان کا کوئی ایسا روضہ تعمیر کر سکے بلکہ ان کی تمام جدت کا اظہار ان کے مندر میں ہے جو بالکل روایات کے پابند ہیں۔ آپ بخوبی اس نظریہ کے تحت شروع سے لے کر آج تک کے اسلامی مقابر کا ملاحظہ کریں تو اس سے بہت سے انکشاف ہوں گے۔ دہلی میں محمد تغلق کا کا مقبرہ۔ شمس الدین اتکہ خاں کا مقبرہ۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ۔ صفدر جنگ کا مقبرہ اسی طرح آگرہ میں اکبر کا روضہ۔ اعتماد الدولہ کا مقبرہ۔ ممتاز الزمانی کا روضہ اور دکن میں بہمنی روضے بریدشاہی روضے عادلشاہی روضے قطب شاہی روضے بھی اسی نظریہ کے تحت آپ کو ملیں گے غرض کہ ایک ہی مقام پر اس قدر مختلف روضے ملیں گے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے مگر ان میں ایک امر ضرور قابل مطالعہ ہے وہ ان کے گنبد اور دیگر حصص عمارت ہیں جن کا ارتقاء برابر ابتدا سے ہوتا رہا۔ خاص کر مغل دور ضرور توجہ کا محتاج ہے جنھوں نے اس ملک میں آکر کافی دیر حکومت مرکزی کی اور قریب قریب تمام ہندوستان کو زیر کر لیا مگر ان کی توجہ تعمیرات میں زیادہ تر آگرہ دہلی تک ہی رہی اس لئے ان کے کارناموں کو بھی مطالعہ و مشاہدہ کرنا چاہئے ایک امر کا افسوس ضرور ہے کہ عام طور پر تعمیرات اسلامی کا تفصیلی بیان ہمیں اس عہد کی کتب میں بہت کم ملتا ہے اس لئے ہمیں اپنے انفرادی مشاہدات پر ہی قیاس کرنا چاہئے اور ان کے تہذیب و تمدن کے علاوہ جذبات حسن و عشق کا اندازہ کرنا چاہئے مغل گنبد یا ہندوستانی گنبد کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جس قدر بھی یہاں نظر آتے ہیں ان کے نمونے کم و بیش ایران و توران و عراق میں ملتے ہیں اور خاص کر اسی ضمن میں گور امیر یعنی روضہ امیر تیمور سمرقند بیان کرنا لازمی ہے جس کی بنا دراصل ایک مسجد بی بی خانم زوجہ امیر تیمور کے نام بنانے سے ابتدا ہوئی اور اس میں بعد میں امیر تیمور اور غالباً بی بی خانم خود اس میں دفن ہوئیں اور یہ روضہ اس قدر مشہور ہوا کہ اسے گور امیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں دو امور قابل ملاحظہ ہیں ایک تو نیچے کا سرداز جس میں اصل قبور ہیں اور ایک اس کا

دوہرا قمقمہ نما گنبد ہے جس سے پیشتر ہم اس قسم کی عمارت دمشق وغیرہ میں دیکھتے ہیں اور اس قسم کے گنبدوں کے حالات
سیاح کے سفرناموں میں پڑھتے ہیں چونکہ امیر تیمور فتح کی غرض سے ملک شام میں رہا اس لئے اغلب ہے کہ بہت سے ایسے
کاریگر ہمراہ لے کر آیا بلکہ اس قسم کا بیان ہمیں اس کے عہد کی تاریخوں سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں مغلوں کے گنبد بھی
ہمیں دوہرے بلب نما ملیں گے جس کی مثال ہمارے سامنے ہمایون کا گنبد پہلا گنبد ہے اور اس کے بعد بھی بے شمار گنبد
... محل آگرہ کے گنبد کو امرودی گنبد لکھا ہے غرض کہ
یک مربع شکل جس کے
بالکل انھیں روایات
ہیں تو یہ کسی غیر اسلامی
صدیوں پیشتر ابراہیم
عمارت سے ...
سامانی کا روضہ بخارا میں موجود ہے جو قبل محمود غزنوی تیار ہو چکا تھا اور اس کا ... بیجاپور ... شاہ کے گول گنبد کا
صحیح نمونہ ہے اگرچہ موخرالذکر دنیا بھر میں سب سے بڑا گنبد مانا جا چکا ہے۔ غرض کہ مسلمانوں نے روضوں کی تعمیر میں وہ وہ جدتیں
کیں کہ صاحب بصیرت حیران رہ جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً مطالعہ کیا جائے تو اس کے اندر مسلمانوں کی صحیح
تہذیب و تمدن جسے آج ثقافت کہتے ہیں نہاں پائیں گے۔ یہ عجیب امر ہے کہ جو سب سے زیادہ مرغوب شئے دنیا میں ہوتی
اسی کے دوسرے لوگ مختلف حیثیت سے مالک بن جاتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ مختلف حیثیت سے اسے اپنا معشوق تصور
کرنے لگتے ہیں مگر فنون لطیفہ میں یہ جذبہ رشک و شوق کے حدود سے نکل کر حسد کے درجے تک آجاتا ہے اور اسی حاسدانہ
جذبات کے تحت پھر اس میں نقائص بھی تلاش کرنے لگتے ہیں مگر یہ بھی مسلمہ ہے کہ اس معشوق کے مسلمہ حسن پر کوئی حرف گیری
بھی نہیں کرسکتا یہی واقعات تاج محل آگرہ کے ساتھ پیش آئے ہیں شاہجہاں نے اپنی چاہتی بیوی ممتاز محل کا روضہ آگرہ میں دریائے
جمنا کے کنارے تعمیر کیا اور اس کو مجموعی حیثیت فن تعمیر میں ہفت عجائبات روزگار میں ایک شمار کیا جاتا ہے۔ اور ایک
مصور نے جذبات سے متاثر ہو کر یہ بیان کیا کہ شاہجہاں کی آنکھوں سے جو آنسو ممتاز کی وفات پر بہے تھے ان میں سے ایک منجمد
ہو کر یہ روضہ مرمریں میں منتقل ہو گیا جو دراصل صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی اس سے محض جذبات عشق کا تعلق ہے اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ
اس سے پیشتر ایسا کوئی روضہ ہندوستان میں تیار نہیں ہوا تھا جس کو ہم اسے نقل یا شبیہ کہہ سکیں بغیر کسی حجت کے یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ
اس کا اصل معمار شاہجہاں خود تھا جس کے بے شمار شواہد ملتے ہیں کہ وہ اس فن کو ابتدا ہی سے خوب سمجھتا تھا اور اس کو فنی حیثیت سے
خوب دسترس تھا اس لئے یہ بالکل عقل تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ خود ہی اپنی چاہتی بیوی کا روضہ ایک نمونہ حسن و عشق تیار
کرسکتا تھا ایک پادری مینرق نے بیان کیا ہے کہ اس کا معمار ایک وینس کا باشندہ جیرونیمو ویرونیو تھا اور یہ روایت اس نے
کسی اور کی زبانی نقل کی ہے۔ یہ اطمینان سے باور کرلینا چاہئے کہ یہ پادری مینرق۔ اس کا راوی کا سٹر اور یہ خود جیرونیمو ویرونیو
ایک سیاسی سازشی ہیں مغلوں کے خلاف ہوگلی کلکتہ میں بالکل اسی زمانے میں شریک تھے اور ان کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور تحقیق نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ پھر ایک اور فرانسیسی اوستن ڈی بورڈو کو اس کا معمار بیان کیا ہے۔ اس کے متعلق محض اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ یہ شخص بذات خود برہانپور سے قبل انتقال ممتاز گو اپرتگیزوں کے ہاں ایک سیاسی امر میں سفیر بنا کر ارسال کیا گیا تھا اور وہیں اس کو کسی نے قتل کر دیا تھا تو ان کا تعلق تاج کی عمارت سے ہرگز نہیں ہے۔ احمد وحامد دو معمار شاہجہاں کے عہد میں بہت مشہور تھے ان کا ذکر ہمیں عہد شاہجہانی کی دہلی کی عمارات کے ضمن ملتا ہے جو تاج کی تعمیر کے شروع ہونے سے آٹھ سال بعد بنیاد رکھی گئی مگر ان کا ذکر تاج کے ضمن میں نہیں ملتا ہاں ضرور ہے کہ لطف اللہ مہندس ولد احمد معمار لاہوری نظم میں بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد احمد نے تاج تعمیہ کیا ہم ابھی خاموش ہیں جب تک کوئی اور شواہد اس ضمن میں تصدیق نہ کرتے۔ ایک اور استاد عیسیٰ کا نام پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے تاج محل کا نقشہ وغیرہ تیار کیا۔ یہ وثوق سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ عیسیٰ نامی شخصیت بالکل ایک افسانہ ہے اور اسے تاج کی تعمیر سے کوئی دخل نہیں ہے۔

عیسیٰ کا نام ۱۸۲۵ء سے اوپر نہیں جاتا اور آگرہ کالج کے لڑکوں نے جو ایک فرمائش پر آگرہ عمارات کی گائڈ تیار کی اس میں اس کا نام ملتا ہے اور اسے اس وقت انگریزی میں ایک عیسائی لکھ کر پیش کر دیا گیا۔ غرض وہ مخطوطے جو آگرہ میں تیار ہوئے اور ان میں ایک فہرست کاریگران وغیرہ ہے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اور اصل عمارت کے صحیح مطالعہ میں سد باب ہیں۔

تاج کی تعمیر میں اس کے نقش ونگار بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں جن کو اصطلاح میں پرچیں کاری کہا گیا ہے جس کی تشریح یوں ہے کہ مختلف قیمتی پتھر سنگ مرمر کی سطح پر کھود کر بھرا تے گئے ہیں اور اس کو بعضوں نے ان کی اصلیت کا بنایا ہے واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قدیم عمارات میں یہ کام ملتا ہے جس کے نمونے احمد آباد کی قدیم مساجد اور مانڈو میں مقبرہ ہوشنگ شاہ میں موجود ہیں بلکہ یہ بھی کہدینا چاہئے کہ مسلمانوں سے قبل یہ کام ہندوستان میں ہرگز نہیں تھا اگرچہ اٹلی میں یہ کام بھی دسویں صدی ہجری کے دوران میں شروع ہوا اور اس کے اصول فن ممکن ہے ایک ہی ہوں مگر ہندوستانی پرچیں کاری سے وہ بہت حیثیتوں سے مختلف ہے۔ دہلی کے ایوان عام میں جو یہ کام جھروکہ نشین ظل الٰہی کے قطعات میں ملتا ہے وہ خالصًا اٹلی اصلیت کا ہے اور یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کس نے یہاں لاکر یہ قطعات لگا دیئے حالانکہ اس حصۂ عمارت کی تفصیل جو معاصرانہ کتب میں دی ہے وہ بالکل موجودہ سے مختلف ہے ان تمام امور میں کسی غیر ملکی کو اعزاز کاریگری یا معمار تاج کہتے ہوئے ذرا تامل سے کام لینا چاہئے اور خصوصیت سے کام کی روایات پر نظر ڈالنی چاہئے کہ کیا یہ کام کسی مغربی ماہر فن کے بس کا بھی ہے۔ یہاں پھر اعادہ کیا جاتا ہے کہ در اصل تاج کا معمار شاہجہاں خود تھا اور اس کا صحیح نمونہ گور امیر یعنی روضہ امیر تیمور سمرقند تھا جو اس سے صد سال پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔ ایک امر یہ بھی قابل توجہ ہے کہ فنون میں زیادہ تر صنعت کی خوبیوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے تاکہ ان کو دیکھ کر اصل سرور اور تزکیۂ نفس ہو سکے جو ان اصلی نمونہ فنون کا مقصد ہونا چاہئے ورنہ ان جزویات میں پڑ کر عام مسرت اور اصل مقصد دونوں فوت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حسن کار حسین اشیا کا خالق ہوتا ہے اور حسن کا یہ مقصد ہے کہ حسن کار کو پس پردہ ڈالدے اور حسن کاری کو ظاہر کر دے۔

(ڈاکٹر) عبداللہ چغتائی

نقّاد

رات بھر بیٹھ کے اک غم کی حکایت لکھی
خونِ دل سے دلِ وحشی کی شکایت لکھی

یہ حکایت تھی مرے سوزِ دروں کی ہمدم
یہ شکایت تھی مرے حالِ زبوں کی ہمدم

اپنے اشکوں کو تھا لفظوں میں پرویا میں نے
وحشتِ دل کو تھا شعروں میں سمویا میں نے

... تھا مرے تبسّم کا اثر
... رکھتا ہے
... بے رحم جگر
... بنانے میں نے
... رنوں میں مرے

بجلیاں طور ... ...

لے کے پہنچا میں اسے حضرتِ نقّاد کے پاس
جی میں خوش تھا کہ چلو اپنے اُستاد کے پاس

بزم میں اور بھی نقّاد کئی بیٹھے تھے
شاعروں کے لیے جلّاد کئی بیٹھے تھے

میں نے آہستہ سے کی اپنی حکایت آغاز
جس میں جذبات و تخیّل کے تھے لاکھوں اعجاز

کوئی سنتا ہی نہ تھا واں تو کہانی میری
مفت برباد گئی شعلہ بیانی میری

تپشِ دل کو یہ نقّاد بھلا کیا جانیں
لے کو فریاد کی صیّاد بھلا کیا جانیں

آشنا آنکھ نہیں جن کی گہرباری سے
جو کہ زندہ ہیں فقط ایسی اداکاری سے

جو سمندر کے تلاطم سے گزرتے ہی نہیں
ورطۂ غم میں کبھی آن کے گرتے ہی نہیں

جن کے سینوں میں نہیں لذّتِ احساسِ الم
جن کے ہاتھوں میں نہیں عشق کا رنگیں پرچم

جن کو تخلیق کی تکلیف کا احساس نہیں
جن کو کلیوں کے چٹکنے کی صدا راس نہیں

ایسے حضرات کی اس دور میں نقّادی ہے
آسماں! خوب یہ طرزِ ستم ایجادی ہے

اشک (عثمانیہ)

نقدِ سخن! نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے اردو زبان و ادب اور شعر و سخن سے شغف رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ شمع ہدایت ثابت ہوگا۔ اور سخن فہمی اور ذوقِ شعر میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

"تنقید ایک سخن سنج اور صاحب نظر کے قلم سے نکلی ہوئی ہے اس میں زبان اور شاعری سے متعلق بہت سے ادبی نکات آگئے ہیں جن کا مطالعہ نو مشق شعراء میں ادبی بصیرت پیدا کرے گا۔" سلیمان ندوی

رسالہ سب رس۔ کا مطالعہ نہ صرف آپ کے لمحات فرصت کو خوشگوار بنانے میں کامیاب ثابت ہوگا بلکہ آپ کے ذوقِ ادب کی تشفی کا بھی ضامن ہے۔

گل بوٹے

اللہ پاک اچھا رکھے ہماری اس نیک بخت بہن کو جس کے طفیل میں ہمیں ایک بڑی بھاری "پکنک" میں شرکت کی عزت نصیب ہوئی۔ کوئی چھ مہینے سے اس پکنک کی تیاریاں جاری تھیں، تاریخیں ٹھیرائی جا رہی تھیں، مقام پسند کئے جا رہے تھے مگر کوئی نہ کوئی مشکل ایسی نکل آتی تھی کہ بات جمنے نہ پاتی تھی۔ "آخر تنگ آمد بجنگ آمد" ہماری بہن نے ایک دن یہ اعلان کر ہی دیا کہ دوسرے ہی دن صبح سویرے شہر کے سب سے بڑے تالاب پر ان کے عزیز، قریب کے لوگ اور سہیلیاں اپنا اپنا توشہ لے کر حاضر ہو جائیں، اس پکنک کو "پاٹ لک" قرار دیا گیا تھا اور ہر ایک کے ذمہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیز کر دی گئی تھی۔

جانا تو بہت سویرے ٹھیرا تھا مگر ہماری بھی نیلی اور "وقت کی پابند" گھر والیوں کے انتظام کی یہ خوبی تھی کہ ٹھیک بارہ بجے ہمارا قافلہ چل پڑا اور کوئی آدھے گھنٹے کے اندر "یہ گنگا جمنی" پارٹی تالاب پر پہنچی، یہاں ہمارے ایک "بلبلی" بھائی نے جو ہم سے چند منٹ پہلے پہنچے تھے ہوشیاری یہ کی کہ بے منظر مسافر بنگلہ کی جگہ عالی شان "گسٹ ہوس" ایک روز کے لئے کرایہ پر لے لیا تھا، ان کی اس حرکت پر ہم میں سے بعض نے ناک بھوں چڑھائی مگر لے دے کر آخر میں سبھوں نے کرایہ میں شرکت قبول کی ورنہ ظاہر ہے کہ بھائی صاحب کی ذات اور جائیداد پر پوری ذمہ داری پڑ جاتی۔

تالاب پر پہنچتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اسکول اور کالج کی بعض لڑکیوں نے وہ دھما چوکڑی کی اور اودھم مچائی کہ گھر سر پر اٹھا لیا، ہمارے ایک نازک مزاج دوست کو دل کی دھڑکن شروع ہو گئی، اس پارٹی میں ایک پولیس کے افسر بھی تھے۔ انھوں نے ان شریر لڑکیوں کو "اپنی" ایک ایسی ڈانٹ بتائی کہ سب کی سب سہم گئیں، ان کی بیگم ان سے دو قدم آگے بڑھ کر چھت پر پہنچ گئیں اور ساری لڑکیوں کو نیچے اتار کر ادھر ادھر منتشر کر دیا، جب لڑکیاں دفع ہو گئیں تو ہمارے دوست کی جان میں جان آئی اور جان بچی لاکھوں پائے، وہ کمرے سے باہر آئے اور لڑکیوں کو دور جنگل میں اچکتی کودتی، پھدکتی پھلانگتی دیکھ کر فرمانے لگے

"بھئی ان میں وہ لڑکی بھی ہے جس کی بات چیت ہم سے ہو رہی ہے، مگر ہم نے اب تک اس کو نہیں دیکھا! بھلا بن دیکھے کیسے بیاہ کر لیں"؟

ہم نے جواب دیا "دور سے ہم تم دونوں دیکھ سکتے ہیں مگر پرکھنے کے لئے تو نزدیک سے دیکھنا ہوگا! اور یہ کیسے ہوگا"؟

"بھئی کچھ ہی کیوں نہ ہو آج تو ہم انھیں اچھی طرح دیکھیں گے، چال ڈھال، بات چیت، رنگ ڈھنگ، بال بھنوری چہرہ مہرہ غرض ان کی ہر چیز کو ٹھونک بجا کر دیکھیں گے مگر ذرا آپ بھی ساتھ رہنا، آپ کی رائے کی ضرورت ہوگی۔"

ہم نے کہا "دوست! آخر آپ کس طرح" ان کو پرکھیں گے!

فرمایا "آپ کو ہمارے ذہن رسا کی داد دینی ہوگی، ابھی ابھی ایک نہایت آسان تدبیر سمجھ میں آئی ہے، وہ سامنے بڑ کا جو بڑا سا پیڑ کھڑا ہے اس پر آپ ہم چڑھ جائیں گے اور

ہماری "پولیس" بھابی جان سے کہیں گے کہ سب لڑکیوں کو اس کے نیچے ہانک کر لائیں اور اس لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رہیں جس سے ہماری نسبت ہو رہی ہے، کیوں کیسی ترکیب ہے"؟

... سوجھ"!!

راضی ہو گئیں اور ہمیں لڑکیوں کو دیکھنے!

ہم دونوں درخت پر چڑھ گئے اور اپنے کو پتوں میں اچھی طرح چھپا لیا، ہمارے دوست نے اپنے گلے سے دوربین نکال لی اور لگے اس کو اپنی نظر سے ملانے! اتنے میں "بھابی جان" ہنستی بولتی، اچکتی پھدکتی لڑکیوں کو لئے درخت کی طرف آ رہی تھیں! ہمیں تو اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے لڑکیاں برابر دکھائی نہیں دے رہی تھیں آپ نے ہنستے ہوئے اچھل کر فرمایا

"وہ دیکھئے! یقیناً وہ وہی لڑکی ہے جس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بھابی جان آ رہی ہیں"!! دوربین ہمیں دیکر کہا "ذرا غور سے دیکھئے تو! رنگ روغن اصلی ہے یا معاملہ پوڈر زدہ ہے"؟

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا، بھلا اتنی دور سے پوڈر کیا سوجھائی دیتا، ہم نے دوربین واپس دیکر کہا۔

"بھئی ان سے بیاہ تو آپ کا ہوگا! ہماری پسند کس کام کی"!!

اب لڑکیاں درخت کے قریب آ گئی تھیں، آپ نے دوربین سے دیکھ کر کہا

"لڑکی بری نہیں ہے! ناک نقشہ کی تو اچھی معلوم ہوتی ہے چھریرہ بدن، اونچی پیشانی، آنکھیں غزالی تو نہیں ہیں مگر خیر بری بھی نہیں، ستواں ناک عنابی ہونٹ، ہر تو بری نہیں معلوم ہوتی،

...ریاں موجود ہیں تو تھیں

...پٹ بیاہ کر لو!!!

...ہماری امی جان کچھ عجیب

...طرح مزاج ہیں! برسوں سے ہمارے لئے دلہن تلاش کر رہی ہیں، سارا ہندوستان چھان مارا مگر کوئی لڑکی ان کی آنکھوں میں جچتی ہی نہیں! کچھ نہ کچھ عیب نکال بیٹھتی ہیں، ہم تو اب بیزار ہو گئے آخر کیا بڑھاپے میں بیاہ کریں گے؟ نہیں بھئی نہیں!! اب ہم نہیں ٹھہر سکتے، بس اس لڑکی سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ کیوں آپ کی کیا رائے ہے"؟

"کیوں آپ کی کیا رائے ہے": کمبخت ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا، اتنے میں لڑکیاں درخت تلے آ گئیں آپ نے سب پر ایک "طائرانہ" نظر ڈال کر فرمایا

"بھئی ہماری نظر میں تو ان میں سے ایک لڑکی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتی! ہم کو تو بس وہی پسند! اپنی پسند کو کیا کریں!! کہئے آپ کی کیا رائے ہے"؟

ہم نے کہا "دوست! تم نے تو ان کو پسند کر لیا آخر ان کی پسند بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ ذرا تم خود کو بھی تو پسند کرا لو"!!

اس وقت ایک چیل اچانک ہمارے دوست کی سن ہیاٹ پر جو آپ نے اوپر کی ڈالی پر رکھ دی تھی، آ بیٹھی! اس خیال سے کہیں چیل نہ اڑا دے آپ نے اچک کر جو ٹوپی کو پکڑنا چاہا تو دوربین ہاتھ سے چھوٹ گئی اور لڑکیوں کے بیچوں بیچ آ رہی۔ ایک کالی سی چیز درخت پر سے گرتی دیکھ کر لڑکیاں چیختی چلاتی بھاگ نکلیں اور ادھر چیل پنجوں میں آپ کی سن ہیٹ لیے اڑنے لگی! کبھی آپ اوپر سن ہیاٹ کو دیکھنے میں کبھی نیچے دوربین کو!! اور کبھی چیختی بھاگتی جاتی ہوئی لڑکیوں کو!!! اتنے میں کسی لڑکی نے چیل کے پنجوں میں سن ہیاٹ دیکھ لی اور لگی چیخنے

"سن ہیاٹ! وہ دیکھو سن ہیاٹ چیل لیے جا رہی ہے"!!!

ہمارے قافلہ میں ایک مسٹر شکاری بھی تھے انہوں نے بندوق اٹھا کر جو چیل پر فائر کیا تو چیل نہیں مری مگر سن ہیاٹ اوس کے پنجوں سے چھوٹ گئی۔ اب لڑکیاں دور جا چکی تھیں، ہم دونوں درخت پر سے اترے۔ دوربین کو ہم نے جو اٹھا کر دیکھا تو اوس کے دونوں دیدے پھوٹ چکے تھے اور ٹوپی چیل کے پنگل اور چھروں کی مار سے چھلنی ہو گئی تھی۔ یہ نقصان اس کام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا جس کو ہمارے دوست نے آج انجام دیا تھا، برسوں کا مسئلہ منٹوں میں حل ہو گیا ورنہ معلوم نہیں آپ کو کتنے برس اور پاپڑ بیلنے پڑتے!

کوئی دو بجے ہوں گے کہ کھانا میز پر چنا گیا، لڑکیوں کے لیے علاحدہ انتظام کیا گیا تھا، بیویاں ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں، جن بیویوں نے اس "پاٹ لک" میں حصہ لیا تھا ان کے ناموں کے اعلان کے ساتھ میز پر ڈشیں آنے لگیں۔ اس گنگا جمنی پارٹی میں کوئی تیس آدمی ہوں گے ان سب کے لیے ایک بہن نے سولہ "شکم پرے" جن میں آدھا گوشت اور آدھا چنے کا آٹا تھا اور جن کے پیٹ مسالہ سے خالی تھے، خاص طور پر تیار کر کے لائے تھے، کسی نے دو سیر باریک چاول ہی ابال لائے تھے، کسی نے کھٹی دال پر ہی قناعت کی تھی، کسی نے کھارے بیگن خوب مرچ ڈال کر پکائے تھے جس کو لوگ اچار کی طرح کھا رہے تھے۔ اور اس طرح کفایت شعار بیویوں نے اپنی "آخر بینی" کا ثبوت دیا تھا۔ بعض فضول خرچ بیویوں نے آٹھ دس مرغ کے کباب اور دو چار سیر کے کوفتے لا کر اپنی "عاقبت نااندیشی" ظاہر کی تھی۔ جب میٹھے کی باری آئی تو سب کی سب ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں

چاء کے دودھ کی "کاغذی" بالائی کی ایک پلیٹ دو تین تولے شکر کے ساتھ سامنے آئی، اس کے چکھنے والے دو چار ہی تھے مگر دیکھتے رہے باقی سب!!!

کھانے کے بعد ایک پارٹی پچیسی کھیلنے بیٹھ گئی بڑے جوش و خروش سے ہتھے پڑنے لگے شرط یہ تھی کہ جو پارٹی ہارے فی کس دو روپے دینا ہوگا۔ قسمت تو دیکھیے کہ پارٹی رہی ہاری جس کے ہم بھی ممبر تھے۔ جیتنے والی پارٹی پہلے تو جیت کی خوشی میں خوب چیخ پکار مچائی اور پھر لگی ہارنے والوں سے روپیہ وصول کرنے! اس تقریب میں بڑی دھینگا مشتی ہونے لگی مگر کسی نے بھی شرط پوری نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہارنے والوں کی چیزیں غائب ہونا شروع ہوئیں

کسی کی ٹوپی غائب تو کسی کا جوتا، کسی کی شیروانی کہیں روپوش ہو گئی
تو کسی کا کوٹ، کسی کا پاندان رفو چکر ہوا تو کسی کی اگالدان
... آخر میں جب مارنے والی پارٹی

جس میں لے دمہ بھی انھوں نے ...
کا لحاظ کر کے دوا نے والی ایک عدد بسکٹ کو کافی سمجھا تھا
اور شکریہ نا بھول گئی تھیں۔ ادھر ادھر چائے کی تلاش میں
نوکر دوڑے بڑی مشکل سے دو چار تولہ اور تالی جنجبیر چائے
کی شدید بد عادت تھی صرف ان ہی کی حد تک چائے کو محدود
کر دیا گیا، البتہ بسکٹ خاص مقدار میں تھے سبھوں نے
بسکٹ والی بہن کا شکریہ ادا کیا اور خالص مسکہ کے نمکین بسکٹ
کھا کر ہم نے تالاب کا میٹھا پانی پیا اور چلے سب کے ساتھ
گلگشت کرنے!

کبھی ہم سے چھپنے والی لڑکیاں آگے آگے چلتی تھیں
اور ہم ان کے پیچھے دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر رہتے
تھے اور کبھی ہم آگے چلتے تھے اور لڑکیاں صرف اس قدر
پیچھے رہتی تھیں کہ ان کی بات چیت ہم اچھی طرح سن سکتے
تھے مگر نہ ہم انھیں دیکھتے تھے اور نہ وہ ہم پر نظر ڈالتی تھیں
ہمارے دوربین والے دوست اب بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر عینک کے اندر سے برابر لڑکیوں کو گھور رہے تھے، بیچارے
نظر کی کمزوری کی وجہ سے اس جھرمٹ میں اس لڑکی کو
نہ پہچان سکے جس کے کارن انھوں نے اپنی دوربین کی دونوں

آنکھیں پھوڑ لی تھیں۔
لڑکیاں چمن میں پہنچتے ہی جھولے پر چڑھ گئیں اور باری باری
سے دو دو گھڑی جھولنے لگیں، ہم اور ہمارے دوست ایک
... لگے، جب آپ کی منگیتر
... ہمارے دوست کے

لالہ جھولا

"... جھولا"

پہلے تو ہمارے دوست اس شعر پر خوب پھڑکے مگر منہ پھلا کر کہا
واہ کیا خوب! ہم آپ کو بلبل دکھائی دے رہے ہیں!!
ہم نے کہا "آپ تو بس جھٹ خفا ہیں! بات کو سمجھنے
ہی نہیں!!! جی آپ بلبل ہیں اور وہ "گل"!!! آیا کچھ سمجھ
کی بیچ میں"؟

اس جملہ پر اس زور سے قہقہہ لگایا کہ سارا چمن زعفران
زار بن گیا اور لڑکیاں جھولے پر سے کود کود کر بھاگنے لگیں!
اب اندھیرا ہو گیا تھا چاند کے نکلنے میں بہت دیر تھی
اس لیے سبھوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔
اس پکنک کے کوئی پندرہ دن بعد ہمارے دوست
دولہا بنے اپنی دیکھی بھالی دلہن کے گھر پر رونق افروز
تھے ہمارے مشورہ پر عمل کر کے اس طرح انھوں نے
چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر لیا اور اپنی تلون مزاجی بھابی
کو ہمیشہ کے "آل انڈیا چکر" سے نجات
دلادی!!

"باغبان"

کھوئے ہوئے لمحات

یاد ہے، یاد ہے بیداری کسی کی اب تک — پھانس آخر یہ مرے دل میں رہے گی کب تک
اپنے کھوئے ہوئے لمحات کو پاؤں کیسے — بھول جائیں مجھے لیکن میں بھلاؤں کیسے
کروٹیں لینے لگے ہائے وہ سوتے سوتے
میری بے چینیاں بڑھنے لگیں چپکے چپکے

صبحِ خفتہ پہ وہ انوار کا مائل ہونا — مرمریں جسم کی پریوں کا تھا نازل ہونا
ماہِ دوہفتہ کا محرومِ صباحت ہونا — جھلملاتے ہوئے تاروں کا وہ رخصت ہونا
بادِ مسرور کا وہ آپ سے باہر ہونا — حرکتِ زیست کا ہر چیز سے ظاہر ہونا
کتنا جانسوز تھا سورج کا ابھرنا توبہ!
جیبِ تسکین کا مری اور بکھرنا توبہ!

چوڑیاں بجنے لگیں ہاتھوں کی اب تو پیہم — شوق و ارمان کا اللہ رے مضطر عالم
آنکھیں کھولیں مجھے دیکھا تو بہت شرمائے — مری دزدیدہ نگاہی سے بہت گھبرائے
میں بھی اٹھا کہ چلوں منظرِ فطرت دیکھوں
جلوۂ حسن کی پاکیزہ نزاکت دیکھوں

میں نے دیکھا کہ ہیں وہ زلفوں کو سیدھا کرتے — میری قسمت کی سیاہی کو ہیں یکجا کرتے
عریاں سینہ کو چھپاتے ہوئے لی انگڑائی — اور پھر اس طرح اٹھے کہ قیامت آئی
فتنے ٹھوکر سے جگاتے وہ چلے اور چلے — حوصلے میرے بڑھاتے وہ بڑھے اور بڑھے
گوری باہیں مری گردن میں حمائل کردیں
مجھ میں اللہ میں خود بینیاں حائل کردیں

سلیمان ادیب

جدید مطبوعات

(۱) زندگی (حیات انسانی پر تبصرہ) از چودھری افضل حق قیمت عالہ
(۲) دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل از ظہیر احمد نسری قیمت عہ
۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲
قیمت ۶
(۷)
(۸) انتخاب الہلال (مولانا آزاد کے مضامین) مرتبہ ادبستان لاہور قیمت ۸
(۹) ید بیضا (اسلامی و معاشرتی مضامین) از ڈاکٹر نجم الدین احمد قیمت ۸
(۱۰) تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت سے
(۱۱) تاریخ اخلاق اسلامی از عبد السلام ندوی قیمت عال
(۱۲) پیام شباب (بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ) قیمت عصہ
(۱۳) ایک معمولی سی عورت (آسکر وائلڈ کے ڈرامہ کا ترجمہ) از صغیر احمد خان قیمت عصہ
(۱۴) انقلابی افسانے۔ از گوپال متل بی۔ اے قیمت عہ
(۱۵) مفروض قوم۔ از مسلم بی۔ اے (۲۱۱) صفحات قیمت عہ
(۱۶) دنیا ایک کہانی ہے (افسانے) از شانتی نرائن پوری (۱۹۰ صفحات) قیمت ۶
(۱۷) مہاتما سقراط۔ از ڈیوتا سروپ بھائی پرمانندجی (۲۰۲ صفحات) قیمت عہ
(۱۸) تاریخ مسلم لیگ۔ از منشی ندیم صہبائی (۱۹۲ صفحات) قیمت ۸
(۱۹) قوم کی آواز (گاندھی جی کی تقریریں اور ان کے سفر کے حالات) از سید عابد حسین ۴۹۴ صفحات قیمت عہ
(۲۰) سوراجیہ کا راستہ از نراین دت سہگل ۲۰۸ صفحات قیمت عہ
(۲۱) چاند سورج کی چوری (افسانہ) از محمد رحیم الدین حسن (۶۰ صفحات) قیمت ۱۴
(۲۲) گلستان خیالی (رسالہ جوہر نسواں کا خاص نمبر) مرتبہ غدیر فاطمہ ۱۹۱ صفحات قیمت عہ
(۲۳) سائنس کے کرشمے از میر حسن ایم۔ اے ۱۱۲ صفحات قیمت عصہ
(۲۴) مکتوبات شاد عظیم آبادی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۲۰۰ صفحات) قیمت عالہ
(۲۵) ارسطو جاہ از عبد المجید صدیقی ۶۴ صفحات قیمت ۶

مرزا سیف علیخاں

ہوڑہ ایکسپریس

آرہا تھا میں نجیب آباد سے لاہور کو
کر رہا تھا یاد دل ماضی کے دھندلے دور کو
یوں گرجتی جا رہی تھی سرد ویرانوں میں ریل
کھیلتے ہوں دوزخی جس طرح انگاروں سے کھیل
آندھیوں کے سامنے بڑھتی خرامِ ناز سے
منتظر لوگوں کو چونکاتی ہوئی آواز سے
توڑتی جنگل کی خاموشی صدائے تیز سے
ہانکتی تاریکیوں کو نور کی مہمیز سے
پٹڑیاں گونجی ہوئیں دہشت فزا جھنکار سے
جنگلوں میں زلزلہ سا آہنی رفتار سے

چرخ پر تارے زمیں پر یہ چراغانِ رواں
ایک ساکن کہکشاں اک چلتی پھرتی کہکشاں

سینۂ صحرا کو لرزاتی ہوا سے کھیلتی
زلزلوں کو لوریاں دیتی فضا سے کھیلتی
بھاگتی، رکتی، جھپٹتی، زلف بکھراتی ہوئی
خارزاروں پر دھوئیں کے ابر پھیلاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں دھوئیں کی چاشنی دیتی ہوئی
اونچی نیچی راہ میں انگڑائیاں لیتی ہوئی
سینۂ گنگا پہ دلکش راگنی گاتی ہوئی
چوٹ کھائے اژدہے کی طرح بل کھاتی ہوئی

گاہے ویرانوں میں گاہے بستیوں میں آگئی
رات کی تاریکیوں کو منتشر فرما گئی

تان لیتی اور برساتی ہوئی شعلوں کے راگ
ہر نفس پر تیز تر کرتی ہوئی سینے کی آگ
دامنِ کہسار میں بھرتی ہوئی شعلوں کے پھول
حال و مستقبل تبسم پاش اور ماضی ملول
جا رہی تھی ہونکتی رفتارِ محشر خیز سے
پھاندتی نالوں کو اندازِ جنوں انگیز سے
لوٹتی راتوں میں اُف بجتے ہوئے دریا کے پل
آگ کا غصہ دھوئیں کی برہمی لوہے کا غل

سبز و سرخ آئینوں کی تابانیوں کو دیکھتی
جنگشنوں پر نور کی ارزانیوں کو دیکھتی
حاکموں کے حکم کی تعمیل پر مرتی ہوئی
آگئی لاہور، ہوڑہ سے سفر کرتی ہوئی

مسیح الحسن تقا نقوی البخاری

بجنور ہاؤس بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور

دعوتِ نظر

میں ہی میں ہوں کوئی ہشیار کہے جاتا ہے — وہ ہی وہ ہیں کوئی سرشار کہے جاتا ہے
... — اس کا نادان "انا" بھی ہے متاعِ ہمہ اوست

... بیداری
... اب سمجھیں
... تی انجام
... ہم میں

اک خودی تھی سو کیا اس کو بھی غفلت کے سپرد — زندگی ... دریا برد
اس طرف دیکھ فریسان اروپا کی نمود — آج بالذات جو قائم ہے وہ ان کا ہے وجود
رازِ تقدیر کھلا ان کے عمل سے ان پر — اپنے در پے ہے فقط بے عملی کا چکر
حسن کاری کا مذاق ان سے ہوا آئینہ — نئی دنیا کا یہ منظر ہے نیا آئینہ
ایسی وحدت پہ نہ ہو کس لئے کثرت شیدا — ایک منزل سے ہیں ہفتاد منازل پیدا
ان کی دنیا ہے نئی اپنی پرانی دنیا — بن گئی اپنے لئے رام کہانی دنیا
اور باتوں میں تو کیا خاک ملے گی جدت — جب زباں میں بھی گوارا نہیں کوئی جدت
چشم بر راہ نظر آتے ہیں وہ نقد نگار — جن کی فطرت کو ابھی سے نہیں بالکل سروکار
نئی ترکیب اگر ان کو کہیں مل جائے — برہم اتنے ہوں کہ پامال زمیں ہل جائے

پھر یہ ہیں اور ادب سوز مداراتیں ہیں
(علامہ اقبالؒ) "کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں"

سید علی منظور

مرقعِ سخن (جلد اول) یہ دکن کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبا و فارغین اور اہلِ قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دو کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اسکی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعراء کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہمعصر دکنی اور شمالی ہند کے شعراء کے نام دید یے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایانِ دکن اور قدر دانانِ ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔

(صفحات (۳۹۲) تصاویر (۴۵) قیمت مجلد (ﺻﮧ)

تنقید و تبصرہ

نقوشِ سلیمانی یہ کتاب مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑہ کی اردو زبان اور ادب سے متعلق تقریروں تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے اور رائل سائز کے تقریباً ۵۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے ڈیڑھ سو صفحات میں مختلف خطبے درج ہیں۔ ان کے بعد دو سو صفحات میں مقالے اور آخر میں تقریباً سو صفحات میں مقدمے شامل ہیں۔ یہ سب تحریریں اردو زبان اور ادب کے متعلق مفید معلومات اور کارآمد مشوروں سے معمور ہیں۔ اس کی قیمت عالی ہے۔ پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی علامہ شبلی نعمانی کے بعد اردو کے واحد ادیب ہیں جن کا اسلوب نہایت سنجیدہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود خشک نہیں ہونے پاتا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا نقطۂ نظر اردو زبان سے متعلق کہیں کہیں مولویانہ ہو جاتا ہے جیسا کہ خود اس کتاب "نقوشِ سلیمانی" کے نام سے ظاہر ہے جس کو دیکھتے یا سنتے ہی عام طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شاید تعویذ گنڈوں یا اوراد و وظائف کی کوئی کتاب یا بیاض ہوگی۔ اس ایک خصوصیت کے قطع نظر پوری کتاب اردو کے متعلق مفید معلومات سے مملو ہے۔ اس کے مصنف کی نظر اردو ادب کے علاوہ ہماری زبان کے بھی بعض اہم پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ مثلاً جب انھوں نے اردو ادب کے متعلق تاریخی معلومات کا اظہار کرتے وقت قدیم اردو یا دکھنی ادب اور اس کے شعراء و مصنفین کا بھی تذکرہ کیا ہے زبان پر نظر ڈالتے وقت بعض ایسے لسانی اور صوتی پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے جو پرانے تعلیم یافتہ اصحاب کے پیش نظر نہیں رہتے بلکہ جدید ترین تحقیقات اور محققانہ نقطۂ نظر سے اردو زبان پر کام کرنے والوں کے زیرِ بحث آتے ہیں۔

یہ کتاب قابلِ قدر ہے نہ صرف اس لئے کہ اس کے مصنف علومِ اسلامی کے ایک ایسے بلند پایہ محقق ہیں جن سے اردو پر کام کرنے کی توقع نہیں ہوسکتی تھی، بلکہ اس لئے بھی لائقِ ستائش ہے کہ عہدِ حاضر میں کسی اردو مصنف نے اپنی زبان کے لسانی اور صوتی پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں کی ہے حالانکہ اسی کی آج کل بے حد ضرورت ہے۔

"ق"

میری کہانی میری زبانی حجم ۲۲۸ صفحات قیمت (عہ) ۔ یہ مولوی سید ہمایوں مرزا مرحوم بیرسٹرایٹ لا کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔ جس کو ان کی بیگم صاحبہ محترمہ صغرا بیگم نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اس کتاب میں مرحوم نے بہت ہی دلچسپ اور مفید باتیں قلمبند کی ہیں۔ ہمایوں مرزا مرحوم صوبۂ بہار کے ایک صاحبِ فضل و کمال خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے والد سید شاہ الفت حسین فریاد پٹنہ کے صاحبِ ذوق رئیسوں میں سے تھے اور مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد سرزمینِ عظیم آباد نے ایسا بلند مرتبہ شاعر عالم و فاضل اور صاحبِ ذوق نہیں پیدا کیا۔ ان کے شاگردوں اور فیض یافتوں میں نواب امداد امام اثر اور سید علی محمد شاد بہادر شاد کے نام لے دینا ہی کافی ہے۔ ایک صاحبِ فیض کے فرزند ہونے کے علاوہ ہمایوں مرزا مرحوم میں یہ خوبی بھی تھی کہ انھوں نے نہ صرف خود تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا بلکہ اپنی جوان ہمت رفیقۂ زندگی کی تصنیف و تالیف میں بہت بڑا حصہ لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صغرا ہمایوں مرزا کی عظیم الشان ادبی زندگی ان کے قابلِ فخر شوہر کی ہمت افزائیوں اور مشوروں ہی کی رہینِ منت ہے جس کا خود محترمہ کو اعتراف ہے۔

ایک ایسے شخص کے خود نوشتہ حالات یقیناً قابلِ مطالعہ ہیں افسوس ہے کہ یہ کتاب مصنف مرحوم کے آخر عمر تک کے حالات پر مشتمل نہیں ہے۔ اور اس میں ہمایوں مرزا صاحب نے اپنے ذاتی حالات سے زیادہ اپنے زمانہ کے واقعات اور معاشرت کے متعلق معلومات ...

نام ونمود اور خودنمائی سے بھاگتے تھے۔ اور یہ اگرچہ ایک خوبی ہے لیکن ان کی رفیقۂ حیات نے اس کو ان کے فطری حجاب اور جھجک سے تعبیر کیا ہے۔ اور کوشش کرتی رہی ہیں کہ ان کے اس عیب کو اپنے کاموں اور نامہ وری کے ذریعے سے دور کریں۔ جو اصحاب عظیم آباد کی معاشرت ... ضرور اس کتاب کا مطالعہ کریں جس طرح مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب ... کی تہذیب و تمدن کو محفوظ

"ق"

... تقریباً ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے

... تحت مرتب کیا گیا ہے۔

اس کا مقدمہ کلیم الدین احمد صاحب نے لکھا ہے ... عظیم الدین صاحب کی ہر عمر کی کئی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں وہ ایک کہنہ مشق اور معمر شاعر ہیں جدید طرز کی نظمیں لکھنے میں بھی انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے بہت سے اچھے شاعر ابھی اردو دنیا میں پوری طرح سے معروف نہیں ہیں اور ضرورت ہے کہ ہر صوبے کے خدمت گزارانِ اردو کی خدمات کو شائع کرکے منظر عام پر لایا جائے۔ کلام کے نمونے کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

پھر بہار آئے گی پھر جوش میں سودا ہوگا   زخمِ دیرینہ سے پھر خون ٹپکتا ہوگا

کیا کوئی موت ہے غفلت کہ نہ چونکا جائے   زندگی ہے تو سنبھلنے کا تقاضا ہوگا

ہے کفِ خاک میں امکانِ دو عالم پنہاں   اس کا ذرہ کبھی دریا کبھی صحرا ہوگا "ق"

محاوراتِ اردو حجم ۴۴ صفحات قیمت ۸ر پتہ پریم بک ڈپو سہارن پور۔ اس چھوٹی سی کتاب میں مولوی حافظ عبدالکریم صاحب مفتون نے طلبائے مدارس کے استفادہ کی غرض سے بہت سے اردو محاوروں کو حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ کیجا کرکے ان کے معنی اور ان کے استعمال کے طریقے بتائے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کی اردو میں بے حد کمی ہے اور اردو محاوروں کی ایک مبسوط و مکمل فرہنگ کا مرتب ہونا بھی ضروری ہے۔ مفتون صاحب نے یہ کام طلبہ کے استفادہ کے لئے کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کوئی صاحب اسی طرح اردو کے پورے محاورے بھی معانی اور طریقۂ استعمال کی وضاحت کے ساتھ مرتب کریں۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے۔ اور ایک شخص کے بس کی بات بھی نہیں اور جب تک ایسا مبسوط و مکمل کام نہ ہولے پیشِ نظر کتاب ہی ہماری قدر دانی کی مستحق ہے۔ اعلیٰ اردو جماعتوں کے طلبہ کے علاوہ عام اردو داں اصحاب بھی اس کتاب سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ "ق"

دیوانِ ثاقب حجم ۰۵ ۵ صفحات قیمت (عہ) پتہ محمود آباد ہوس قیصر باغ لکھنؤ۔ گزشتہ نمبر میں ہم نے سلسلۂ یادگار مہاراجہ محمود آباد کی ایک کتاب "گیس کا دماغ" پر تبصرہ کیا تھا۔ دیوانِ ثاقب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مرزا ذاکر حسین ثاقب قزلباش لکھنوی عہدِ حاضر کے مشہور و معروف اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مہاراجہ محمود آباد قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اردو تصانیف تالیف کی اشاعت کا ایک مفید سلسلہ قائم کیا اور اس کی طرف سے ثاقب جیسے پختہ مشق شاعر کا کلام شائع کیا۔ ثاقب زبان میں میر کی پیروی کرتے ہیں۔ اور تخیل کا جہاں تک تعلق ہے غالب تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ چونکہ خود بھی اکبر آبادی الاصل ہیں اس لئے اپنے پیش رو میر اور غالب کی خصوصیات یا تو اکتساباً پیدا کیں یا فطری طور پر وطن کے تعلق سے ان میں بھی پیدا ہوگئیں۔ وہ زیادہ تر غزل گو

ہیں اور نام و نمود کے لالچ کے باوجود نظم گوئی میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وہ میر و غالب کی خصوصیات کو کیسی خوبی سے نباہتے ہیں۔

کم سمجھتا ہے محبت میں فنا ہو جانا — دل کی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا
دامِ الفت نے قفس مجھ کو دکھایا آخر — خوف کہتا تھا کہ گلشن سے ہوا ہو جانا
زندگی ہے ترے بڑھنے ہی تلک اے زلفِ دراز — چوم کر ان کے قدم میری بلا ہو جانا
ڈھونڈتا ہے چمنِ عشق میں کیا فصلِ بہار — خون رلوائے گا زخموں کا ہرا ہو جانا
لطفِ آزادیٔ دل ان کی اسیری میں ہے — اک نئی قید ہے زنداں سے رہا ہو جانا
جیتے جی آئے قیامت تو مزہ ہے ثاقب — دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

دیوانِ ثاقب کی ترتیب کا ایک عیب ضرور قابلِ ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس میں اصل دیوان سے زیادہ جگہ ان تبصروں، تقریظوں اور دیباچوں کو دی گئی ہے جو کلامِ ثاقب کے متعلق لکھے یا لکھوائے گئے ہیں۔ ثاقب ایسے شاعر نہیں ہیں کہ ان کا کلام بہت سے وکیلوں اور مددگاروں کی مدح سرائیوں کے بغیر شایع نہیں ہو سکتا۔ اس میں صرف ان کے حالاتِ زندگی کو شامل کرنا چاہیے تھا اور یہ تمام تبصرے اور تقریظیں جو اس کے ساتھ شایع ہوئی ہیں، وہ اگر اس دیوان کی بجائے اردو کے مختلف ماہ ناموں میں شایع کی جائیں تو بہتر ہوتا کیونکہ ان کو پڑھ کر لوگ دیوانِ ثاقب کی طرف متوجہ ہوتے۔ "ق"

محبت کی چھاؤں حجم ۱۳۲ صفحات قیمت عہ۔ مرزا اظفر الحسن صاحب بی اے عثمانیہ کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو کسی دلنواز کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اور ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ اس کا تعارف پروفیسر سروری صاحب نے لکھا ہے جو قصہ نگاری کے فن کے متعلق ایک خاص بصیرت رکھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس ادارہ کی طرف سے شایع کئے ہوئے پہلے مجموعہ "من کی دنیا" کی طرح "محبت کی چھاؤں" بھی نوجوانی کے البیلے پن اور شباب کی رعنائیوں سے مالا مال ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ "من کی دنیا" کا مصنف اپنے محبوب کو دور سے دیکھتا ہے اور اس کے الھڑپن سے اس کو سابقہ نہیں پڑا۔ محبت کی چھاؤں کا مصنف اپنے دلنواز سے کھیلتا ہے اور بعض جگہ اس کے ناز و انداز کا مضحکہ بھی اڑاتا ہے۔ اس کے افسانے زندگی سے بہت قریب ہیں وہ بات میں بات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مکالمے شگفتہ اور بے باک ہیں۔ اس کا دلنواز کسی کالج کا نیم تعلیم یافتہ بت طناز ہے جس میں نہ اداے کافرانہ ہوتی ہے اور نہ شانِ دلبرانہ۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار قدیم طرز کے عاشقوں اور عقیدت مندوں کے شیوے کے برخلاف اس کو جگہ جگہ چھیڑتا اور برابر کی چوٹ کرتا چلا جاتا ہے۔

افسانوں کا یہ مجموعہ صحیح معنوں میں اُس ماحول کا ترجمان ہے جس میں آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگیاں بسر ہو رہی ہیں۔ جن نوشابوں نے اس کوچے میں کبھی قدم رکھا ہے۔ وہ جب ان افسانوں کو پڑھیں گے تو انھیں ان میں سے اکثر خود اُن کی آپ بیتی نظر آئیں گے۔ اور جو لوگ اس دور سے گزر چکے ہیں وہ ان افسانوں کے مطالعہ سے معلوم کریں گے کہ مرزا اظفر الحسن صاحب تقلیدی مصنف یا افسانہ نگار نہیں ہیں۔ ان میں جدت اور قوتِ تخیل کی ایسی فراوانی ہے کہ قدیم طرزِ افسانہ نگاری سے ہٹ کر انھوں نے اپنے لئے ایک نیا میدان

نکال لیا ہو نہ تو جدید شاب یاتی اور بیک گونہ عریاں ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے اور نہ قدیم عشق عاشقی کے افسانوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب یقیناً مقبول ہو گی۔ "ق"

مقالاتِ ہاشمی یہ کتاب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے ان علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو گزشتہ دس سالوں میں لکھے اور مختلف رسائل میں شایع کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین اردو ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔

... [illegible] ... کی ترتیب و تدوین میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے جو اصحاب اپنی زبان اور ادب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے

ہیں لی اور نہ مولف ہی

... جس کی وجہ سے مطالعہ

... ہو رہا ہے اور کہاں سے

شروع ہو رہا ہے۔ اگر اسی طرح ... [illegible] ...

اس کتاب کا پیش لفظ مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہے اور جیسا ان کا عام اسلوب ہے اس میں بھی شگفتگی اور دلچسپی کی فراوانی ہے۔ اس کتاب کے اکثر مضامین محققانہ ہیں اور اعلیٰ اردو جماعتوں کے طلبہ اور تاریخ و تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کو ان سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ کتاب چھوٹی کراؤن سائز کے ۲۶۴ صفحات پر چھپی ہے اور مجلد ہے۔ قیمت عالیہ۔ "ق"

اردو ہندی اٹھائیس صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں اردو کے مشہور ادیب ام اسلم نے اردو ہندی کے معرکۃ الآرا مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اصل میں اسلم صاحب نے رسالہ ساقی میں ایک مضمون شایع کیا تھا جس کو کچھ اضافہ کے ساتھ اب کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو کی ان چھ تقریروں کا تبصرہ ہے جو ملک کے چند نامور بزرگوں سے فروری ۱۹۳۹ء میں "ہندستانی کیا ہے" کے عنوان پر کرائی گئی تھیں۔ اسلم صاحب نے ان سب پر نہایت صحتِ ذوق کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اس لئے اس پر جو بھی قلم اٹھاتا ہے اس کو خواہ مخواہ ان سیاسی اور مذہبی جھگڑوں کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے جن کی وجہ سے یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اسلم صاحب نے اردو کی تائید میں بعض اچھے نکات پیش کیے ہیں۔ اردو والے ان کی ضرور داد دیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندی والے ان کو ماننے کے لیے تیار ہو سکیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سوال ادیبوں اور شاعروں یا بحث و مباحثے سے طے ہونے والا نہیں ہے۔ زمانہ اور قوت و سیاست ہی اس کو سلجھائے گی۔ اور جو قوم سیاست کے داؤ پیچ اور قوت کی افزایش سے زیادہ کام لے گی اسی کی اس بازی میں جیت رہے گی۔ "ق"

ہندستانی یہ بھی چوبیس صفحات کا ایک رسالہ ہے جس کے لکھنے والے سید مہدی حسین صاحب عثمانیہ ہیں اور جو بزم ادب عثمان شاہی کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ یہ بھی آل انڈیا ریڈیو کی ان تقریروں کو سن کر یا پڑھ کر لکھا گیا ہے جو "ہندستانی کیا ہے؟" کے عنوان پر کرائی گئی تھیں۔ اس کے مولف نے بھی بڑی محنت کے ساتھ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب اردو کا ذوق رکھنے والے ان مسائل سے دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ بزم ادب قابل مبارک باد ہے کہ اس نے اپنے کام کا آغاز اس رسالہ کی

اشاعت سے کیا ہے۔ "ق"

جذباتِ شاکر حصہ اول سید عزیز حیدر صاحب شاکر تلمیذ جناب بسمل صاحب واسطی کی چند غزلوں کا گلدستہ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاکر صاحب کی طبیعت میں روانی اور جوش بلا کا موجود ہے اور چونکہ وہ اسی جوش کے عالم میں شعر کہتے ہیں اس لئے زبان اور خیال کی مناسبت کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ اگر یہ اسی طرح مشق سخن جاری رکھیں اور اپنی ہر غزل کو چھپانے کے خیال سے نہ لکھیں تو اچھے غزل کہنے والوں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔ "ق"

حیات و کلیاتِ اسمٰعیل مصنفہ خان بہادر محمد اسلم سیفی رائل تقطیع ۴۱۶ صفحات، نفیس کتابت اور طباعت، مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت للعہ۔ اسمٰعیل میرٹھی اردو شاعری میں ایک نئی طرز کے موجد تھے، یوں تو انھوں نے قدیم اساتذہ کے انداز میں بھی کلام سرانجام کیا ہے، لیکن ان کا بیش بہا سرمایہ ان کی وہ نظمیں ہیں، جن کے مخاطب، بظاہر کم عمر بچے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ ہر عمر اور ہر مذاق والوں کے لئے یکساں دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے بعد اردو کے وہ سب سے پہلے شاعر ہیں، جن کی نظموں میں ہندوستان کی دیہی زندگی کے حقیقی اور دلکش نظارے، موجود ہیں۔

پیش نظر کلیات ان کے پورے کلام پر حاوی ہے۔ اسمٰعیل، حالی کے دبستان کے پیرو تھے، اور قدیم طرز کی وہ حالی سے زیادہ شد و مد کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی غزل میں اخلاق کا عنصر زیادہ اور عشق و محبت کا عنصر کم ہے۔ انگریزی نظموں کے اولین منظوم اردو ترجمے یا ان کی تقلید میں نظمیں لکھنے کا سہرا اسمٰعیل ہی کے سر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسمٰعیل، حالی کی کوششوں سے بہت متاثر تھے، لیکن انھوں نے کبھی حالی کی لفظاً یا معناً تقلید نہیں کی بلکہ اپنی اپج سے کام لے کر، اردو میں ایک خاص طرز کے موجد بنے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید طرز میں آزاد کا انداز انھیں زیادہ پسند تھا، چنانچہ بعض نظموں، مثلاً "آب زلال" وغیرہ میں، آزاد کا رنگ پایا جاتا ہے۔

اسمٰعیل نے بہت وسیع موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں، اور ان میں بعض معرکۃ الآرا بھی ہیں، جیسے "آثار سلف" "جریدۂ عبرت" وغیرہ لیکن کچھ تو انھیں شعر و سخن کا وہ ماحول نصیب نہیں ہوا جو حالی اور آزاد کو حاصل تھا، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت ایک خاص طرز کی شاعری پر جم گئی تھی، ان کی ایسی نظمیں جو تاریخ یا اخلاق کے اعلیٰ تر موضوعوں پر لکھی گئی ہیں، نشیب و فراز سے خالی نہیں ہیں۔ اسی لئے اردو میں وہ پایہ حاصل نہ کر سکیں، جو ان کی اولین اور چھوٹی چھوٹی نظموں کو حاصل ہوا۔

اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر کی ایک مبسوط سوانح عمری اور سلیقے سے مرتب کئے ہوئے ایک کلیات کی سخت ضرورت تھی۔ اور یہ شاعر اور اردو ادب دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ یہ کام شاعر کے قابل فرزند کے ذریعہ انجام پایا۔ خان بہادر محمد اسلم سیفی نے اس قابل قدر کارنامے کی ترتیب میں جس محنت اور ذوق کا ثبوت دیا ہے، وہ اسی طرح کے دوسرے کام کرنے والوں کے لئے نمونے کا کام دے گا اور مولانا اسمٰعیل کی شاعری کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اردو ادب میں باقی رہے گا۔ مرتب نے سوانح پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ، شاعری پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اور جیسا کہ ایک سعادت مند فرزند سے توقع ہو سکتی ہے، ہر جگہ احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔

اردو کے بہت سے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح، اسمٰعیل کی حیات کے ایک نفسیاتی مطالعے اور ان کی شاعری پر ایک بسیط اور غیر جانب دارانہ تنقید کی ضرورت ہے تاکہ ان کا صحیح پایہ اردو شاعری میں متعین ہو جائے۔ راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ یہ کام اسمٰعیل کے کلام کے ایسے انتخاب سے بھی

ایک حد تک پورا ہو سکتا ہے، جو ان کی عظمت کی بنیاد ہے اور جس میں اسمٰعیل کا کوئی ہمسر نہیں۔ "ع س"

تصویرِ احساس رائل سائز ۲۹۶ صفحے مطبوعہ عالمگیر الکٹرک پریس۔ ناشر اردو اکیڈیمی پنجاب۔ لاہور قیمت عا۔ یہ پنجاب کے نوجوان شاعر الطاف مشہدی کی نظموں کا مجموعہ ہے، جس کی ابتدا میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا مقدمہ اور مسٹر کرشن چندر کا ایک دیباچہ اور محترمہ مس نواب ذکیہ سلطانہ صاحبہ ذکی کا دوسرا دیباچہ ہے۔ مصنف نے اپنی شاعری کے متعلق بعض مشہور لوگوں اور اپنے دوست ... پنڈت کیفی کا مقدمہ کافی تھا، دیباچہ کی اصطلاح کا استعمال بھی عجیب طرح پر

...ات پر حاوی ہیں اور زیادہ
...بکہ جگہ بلند پایہ شاعری کی
...دنے لگے گا۔ نامانوس اندازِ بیان

کی چند مثالیں یہ ہیں۔

"مرے نورِ نظر، جامِ شہادت جلد خالی کر"۔　　جامِ شہادت پینا، محاورہ ہے۔

مرا بھائی ہو سینے میں انی لینے پر آمادہ　　سینہ میں انی لینا، نامانوس خیال ہے سینہ پر وار لینا، یا سینہ سپر کرنا ہوتا تو بہتر تھا۔

جگر کی قاش کے خنجر سے باطل کو جھکانے پر　　جگر کی قاش کا خنجر۔ غیر فطری استعارہ ہے۔ یہی نامانوس اندازِ بیان یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا چاہتا ہے، لیکن مشق کے ساتھ ساتھ، سلاست بڑھتی جائے گی۔

الطاف مشہدی کا تخیل سطح سے بلند ہوتا ہے تو نہایت عمدہ شعر نکلتے ہیں، مثلاً پہلا ہی شعر

"قاضی الحاجات ہم کو بھوک سے کرے نڈھال　　ہو مصائب کی فراوانی سے جینا تک محال"

اور اس کے بعد کے اکثر اشعار شاعر کی ذاتی فکر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے اشعار اکثر نظموں میں موجود ہیں۔ بہر حال یہ مجموعہ بہت دلچسپ ہے اور غور اور توجہ سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔ "ع س"

سر سالار جنگ اعظم حجم ۴۴ صفحات قیمت ۱؍ پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ سر سالار جنگ اول کی یہ مختصر سوانح عمری مولوی ابو المکارم فیض محمد صاحب بی اے نے بہت اچھی لکھی ہے یہ کتاب بچوں کے لئے بہت کار آمد ہے۔ بچوں کو یہ کتاب ضرور پڑھانا چاہیے تاکہ ان کو معلوم ہو کہ سالار جنگ کون تھے اور انھوں نے کیا کیا کام کئے۔ انھوں نے غدر کے زمانے میں برٹش انڈیا کی بہت مدد کی اور جب میر محبوب علیخاں مرحوم سابق نظام دکن کسنی میں تخت نشین ہوئے تو سالار جنگ اول نے حیدرآباد کی سلطنت کو بہت سنبھالا اور جو جو اصلاحات کیے وہ قابلِ داد ہیں۔ "ص"

سر سید احمد خاں حجم ۱۶ صفحات قیمت ۲؍ پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس میں سر سید احمد خاں مرحوم کے مختصر حالات ہیں۔ گو سر سید کے نام اور ان کے کام کے خیال سے یہ کتاب بہت ہی مختصر ہے لیکن لڑکوں اور لڑکیوں کے پڑھانے اور اسکول کے نصاب میں شریک کرنے کے لئے بہت اچھی ہے سر سید مرحوم سچے مسلمان

تھے گو ان کو لوگ کافر کہا کرتے تھے اور طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہ ہاری، مسلمانوں کی خدمت برابر کرتے گئے جو کالج انھوں نے قایم کیا تھا اس کا فیض اب تک جاری ہے۔ سچائی اور صداقت سے جو کام کیا جاتا ہے اس کو کوئی مٹانا بھی چاہے تو نہیں مٹ سکتا۔ سرسید کا یہ خیال تھا کہ سب آپس میں مل کر رہیں اس لئے وہ انگریزوں کے بھی دوست تھے اور ہندوؤں کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ "ص"

دو بھائی "دو بھائی" نامی ایک کتاب ۶۲ صفحے کی سید احسن صاحب ام اے (علیگ) نے شایع کی ہے۔ یہ ایک فرضی افسانہ ہے جس میں دو بھائی کا قصہ ہے ایک امیر بھائی غریب بھائی کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور خود دھوکا کھا جاتا ہے بہت سی باتیں جادوگری وغیرہ کی عقل کے خلاف ہیں یہ افسانہ پرانے زمانے کی کہانیوں کی طرح لکھا گیا ہے لیکن دلچسپ ہے اس کتاب کی قیمت ۴؍ ہے ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ "ص"

انیس نسواں یہ رسالہ ماہانہ دہلی سے زیر ادارت شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر مسز شیخ محمد اکرام صاحب نکلتا ہے لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے مضامین بھی اچھے ہیں مضمون نگار اچھے اچھے لوگ ہیں سر عبدالقادر صاحب کے مضامین بھی رہتے ہیں شیخ محمد اکرام صاحب کسی زمانے میں مخزن اور عصمت کی ادارت کرتے تھے۔ اس رسالہ میں قرآن شریف کے سوروں کے معنی نہایت دلچسپ طریقے سے لکھے جاتے ہیں۔ ہر پڑھے لکھے شخص کو یہ رسالہ پڑھنا چاہیے۔ قیمت سالانہ ؎ ملنے کا پتہ۔ دفتر انیس نسواں دہلی۔ "ص"

مغربی تصانیف کے اردو تراجم از مولوی میر حسن صاحب ام اے مجلد عہ؍ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے سلسلۂ مطبوعات کی مختصر مگر مفید کتاب ہے ہماری جدید ادبیات اردو کی ابتدا بیشتر مغربی تصانیف کے تراجم سے ہوئی ہے مگر ادبیات اردو میں کوئی ایسی مستقل تالیف موجود نہ تھی جو ان تراجم کے تاریخی اور تدریجی نشوونما پر روشنی ڈالتی ہو۔ مولوی میر حسن صاحب ام اے قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کی اس کمی کو پورا کر کے اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ قابل مصنف نے مواد جمع کرنے میں کافی محنت اٹھائی ہے یہ ان کے پانچ سال کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

مضمون کتاب کی ترتیب میں موزونیت ہے۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ام اے ال ال بی کے مقدمہ کے بعد مولف کا دیباچہ ہے۔ مضامین کی تقسیم حسب ذیل ادوار میں کی گئی ہے۔

پہلا دور (۱) قدیم ترین تراجم سنہ ۱۸۰۰ع تا ۱۸۴۲ع (۲) ۱۸۴۲ع تا ۱۸۷۷ع (۳) ۱۸۷۷ع تا ۱۹۱۷ع (۴) ۱۹۱۷ع تا عصر حاضر

ہر دور کی جملہ اجتماعی اور انفرادی کوششیں نہایت شرح و بسط سے بتلائی گئی ہیں۔ مگر بعض بعض اہم کتابیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

(۱) تاریخ ابین مترجمہ سید محمد احمد خاں مطبوعہ سنہ ۱۸۴۷ع (۲) تاریخ روسیہ ترجمہ پنڈت رتن ناتھ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ (۳) تاریخ سوڈان ترجمہ سید سجاد حسین سنہ ۱۸۹۶ع (۴) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر بعہد شاہ جہاں و اورنگ زیب ترجمہ سید محمد حسین صاحب مطبوعہ سنہ ۱۸۹۸ع (۵) اورنگ زیب مصنفہ اسٹینلی لین پول ترجمہ مولوی محمد لطیف صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۰۰ع (۶) پروفیسر ویمبری کا سفرنامہ ترجمہ منشی محبوب عالم صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۰۳ع (۷) مستقبل اسلام مصنفہ پروفیسر ویمبری ترجمہ ظفر عمر سنہ ۱۹۱۰ع (۸) تاریخ ابوالبشر مصنفہ پروفیسر رڈپاتھ ترجمہ مفتی محمد انوار الحق صاحب سنہ ۱۹۱۰ع۔

ان سب کتابوں کا تذکرہ چھوٹ گیا ہے اور معلوم نہیں کہ تحقیق کرنے پر اس قسم کی اہم کتابیں کس قدر زیادہ دریافت ہو جائیں ابھی مطبوعہ

مختلف صوبوں کے چھاپے خانوں نے مغربی تراجم میں جو حصہ لیا ہے ان کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس کے علاوہ جو کتابیں درج کی گئی ہیں ان کی باضابطہ حروف تہجی کے لحاظ سے کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے۔ اگر یہ دی جاتی تو کتاب بہت زیادہ مفید ہوتی۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں ماخذ کی فہرست دی ہے مگر متن کتاب میں کہیں ان کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے اور جن کے حوالے
صفحہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اگر آیندہ
لئے بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔
ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں

منیجر تاج کمپنی نے مختصر دیباچہ
لکھا ہے۔ فہرست مضامین نہیں دی ی ہے
وضع کے آٹھ فوٹو اور ان کے
ہاتھ کے لکھے ہوئے خط کو شامل کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں ایک مصرعہ پورا غلط اور غیر موزوں شایع ہوگیا ہے۔ دیکھئے صفحہ ۳۰ اس کو یوں ہونا چاہیے۔

"جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے"

ناشر نے دیباچہ میں اس مختصر کتاب کے شایع کرنے کا مقصد اقبال اور اقبال کے فلسفے سے عوام کو روشناس کرانا بتایا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبالؒ کی زندگی کا تعلق ہے اس میں حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ مگر اقبالؒ کا فلسفہ جس کا جاننا عوام کے لئے نہایت ضروری ہے تشنہ ہے۔ اقبال کے اسرار خودی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر اقبال نے اسلامی توحید اسلامی اجتماع میں فرد کی اہمیت پر جو روشنی ڈالی ہے اس کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ اقبال کی دوسری نظمیں مثلاً رموز بے خودی، زبور عجم، جاوید نامہ وغیرہ کا خلاصہ نہیں دیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی شاعری کے نشو ونما کو تفصیلی طور پر ظاہر کیا گیا ہے اقبالؒ کی اردو اور فارسی زبان دانی کے امتیازی خصوصیات دیگر شعرا سے مقابلہ کرکے بتلائے گئے ہیں مگر اسلامی فلسفہ کے ایک خاص انداز کا خود اقبال کے ذہن میں کس طرح نشو ونما ہوا ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔

جاوید نامے کے دانتے کی تقلید میں لکھے جانے کی تردید کرتے ہوئے قابل مصنف نے معراج کے واقعات کو ان سب کا ماخذ اصلی قرار دیا ہے مگر عربی ادب کا مشہور شاہکار ابوالعلا المعری کا رسالہ الغفران کا ذکر نہیں کیا گیا جو بالکل جاوید نامے کے طرز کی کتاب ہے اور جس کی تقلید کرنا اقبالؒ کا جائز حق ہے۔ اور قرین قیاس ماخذ ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبالؒ کے سوانح اس میں کافی تفصیلات سے مہیا کر دی گئی ہیں جن کا پڑھنا نہایت مفید ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں

رجسٹرڈ ایم (۳۹۵۰)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

نشان ڈپیا صفیہ (۱۵۳)

سب رس معلومات

چندہ سالانہ ایک روپیہ
علاوہ محصول ڈاک

فی پرچہ ا/ ۲ ۱۶

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کے ماہنامہ سب رس کا ضمیمہ

شمارہ ۲	فروری سنہ ۱۹۴۰ء	جلد ۱

فہرست مضامین

[illegible] مقبول رسالہ سب رس [illegible] مشاہیر کی زندگیاں، عام فہم سائنس کے متعلق [illegible]
[illegible]

چند مشاہیر

مصنف تھی۔ آرتھر شوپن ہائر کا باپ بنک کا کاروبار کرتا تھا، اس نے اپنے لڑکے کو انگلستان اور فرانس بھیجا تاکہ وہ اپنے خاندانی پیشے میں عملی تجربہ حاصل کرے۔ وہاں سے واپس آکر شوپن ہائر نے بنک کے کاروبار کو سنبھالا لیکن اس کے والد کی موت کے بعد ہی اس نے اس کاروبار کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد شوپن ہائر نے گوتھا اور رویمر کے مدرسوں میں شرکت کی۔ ان مدرسوں میں اس نے قدیم زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۰۹ء میں وہ جامعہ گوٹنگن میں شریک ہوا شوپن ہائر نے فشتے کے لکچروں سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد برلن پہنچ کر اس نے طبی اور طبعی علوم سے گہری دلچسپی لینی شروع کی۔

وہ تند مزاج، افسردہ طبیعت اور بدگمان آدمی تھا اس کی اسی افتادِ طبیعت نے اُسے مردوں یا عورتوں سے دیرپا اور بھروسہ کے قابل تعلقات قائم کرنے سے باز رکھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے اُس سے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اب اپنے رہنے سہنے کا علحدہ انتظام کرے۔ شوپن ہائر پر اپنی ماں کے اس طرزِ برتاؤ کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے اسی لئے شادی کے مسئلے پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت ایک بے سمجھ جانور ہے خباثت اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کا کام صرف بچے پیدا کرنا ہے، ایسے بچے جو دنیا میں تباہیاں پھیلاتے ہیں اور اس طرح دنیاوی آلام و مصائب کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھتے ہیں۔ اس کا فلسفہ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب

ہے۔ اس نے اپنے
ہمدراستوار کرنے کی
ت بن گئی ہے شوپن ہائر کے

نزدیک زندگی ... ہے ... ایک عام گیر کورانہ ارادے کی پیداوار ہیں ایک تاریک اور بے مقصد ارادہ حیات ہر طرح وجود پذیر ہونے میں کوشاں ہے۔ رنج و مصیبت، دُکھ اور درد اس کی لازمی پیداوار ہیں۔ چونکہ ایک اندھا ارادہ زندگی کی اصل ہے اس لئے اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ شوپن ہائر کا خیال تھا کہ بدھ مت اور ویدانت کی بھی یہی تعلیم ہے۔ زندگی کی کشمکش سے نکل جانا سب سے اعلیٰ اور صحیح مقصد ہے۔"

شوپن ہائر کا انتقال ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء میں ہوا۔

جان ولف گانگ فان گوئٹے

جان ولف گانگ فان گوئٹے ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو بمقام فرانک فرٹ آن دی مین پیدا ہوا۔ اس کا باپ نہایت درجہ قابل آدمی تھا۔ گوئٹے مستقل مزاج، محنتی، اصول کا پابند اور مضبوط کیرکٹر کا آدمی تھا۔ اُس نے ایک باعزت زندگی بسر کی۔ وہ اطالوی ادب اور آرٹ کا شیدائی تھا۔ گوئٹے نے بھی اپنے والد کی طرح قانون کی ڈگری حاصل کی اور اپنے وطن میں وکالت

کرنی شروع کی لیکن اُسے اس پیشے سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تخلیقی ذہانت نے اُس کی توجہ ادب اور آرٹ کی طرف پھیر دی۔ اس نے جب شکسپیر کی تصنیفیں پڑھیں تو اس کے دل میں رقابت کا سا جذبہ پیدا ہوا۔ اپنا پہلا ڈراما گوئٹز Goetz اس نے ۱۷۷۳ء میں ختم کیا۔ ہیوبٹر کی وجہ سے گوئٹے کو قیافہ شناسی کے علم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ۱۷۷۴ء میں گوئٹے نے اپنا ناول ورتھر لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی زندگی پر اسپینوزا کے فلسفے کا گہرا اثر تھا۔ اسپینوزا کی کتاب "اخلاقیات" نے گوئٹے کی بےچین روح کو سکون بخشا۔ گوئٹے کو علوم طبیعی سے بھی بے حد شغف تھا۔ علم طبقات الارض، معدنیات، تقابلی علم تشریح اعضا، اور نباتیات سے اسے بے حد دلچسپی تھی۔ اُس کا شمار ان مفکرین کے پیشروؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے دنیا کے سامنے ارتقا کا نظریہ پیش کیا۔

۱۷۹۱ء میں ویمر کے درباری تھیٹر کا انتظام گوئٹے کے سپرد ہوا۔ اس نے تھیٹر کے کاروبار سے بہت دلچسپی لی۔ گوئٹے کی ہدایتوں نے بعض ذہین مردوں اور عورتوں کی صلاحیت اداکاری کو بہت جلا دی اور وہ اعلیٰ درجے کا فن کار ہو گیا۔ ۱۷۹۴ء میں شلر اور گوئٹے ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ ان دونوں ادیبوں اور شاعروں میں دوستی کا مضبوط رشتہ شلر کی موت تک قائم رہا۔ جو ۱۸۰۵ء میں واقع ہوئی۔

اکتوبر ۱۸۰۶ء میں جینا کی لڑائی ہوئی اس کے ایک دن بعد نپولین ویمر میں داخل ہوا۔ ۱۸۰۸ء میں نپولین اور گوئٹے کانگریس آف ارفرٹ کے موقع پر ملے۔ نپولین نے گوئٹے کی کتاب ورتھر سے متعلق اس سے تبادلۂ خیال کیا۔ مصر کی مہم میں بھی یہ کتاب نپولین کے ساتھ تھی۔ ایک مرتبہ گوئٹے نے اپنے دوست ایکرمان سے کہا کہ نپولین نے اس کی کتاب ورتھر کو اس طرح پڑھا تھا جس طرح عدالت فوجداری کا جج اپنے فیصلے کو پڑھتا ہے۔ ورتھر سے متعلق اسی اسپرٹ میں اس نے گوئٹے سے گفتگو بھی کی تھی۔

جرمنی کے ادیبوں اور شاعروں کا سرتاج گوئٹے، حافظ کے کلام سے بھی متاثر تھا۔ حافظ ہی کے کلام سے متاثر ہو کر اس نے بعض عشقیہ نظمیں لکھیں جن کا مجموعہ ۱۸۱۹ء میں West Östlicher Divan کے نام سے شائع ہوا۔ گوئٹے نے اپنے مشہور ڈرامے "فاوسٹ" کے دوسرے حصے کی تکمیل ۱۸۳۱ء میں کی۔ اس کی موت کے بعد یہ حصہ چھپ کر شائع ہوا۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو مختصر سی علالت کے بعد مادرِ گیتی کا یہ قابل فخر سپوت اس دنیا سے رحلت کر گیا۔

فریڈرک ولھلم نٹشے

فریڈرک ولھلم نٹشے ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک پادری کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس غیر معمولی انسان کو روکن کی سرزمین نے جنم دیا، جو لیپزگ کے قریب واقع ہے۔ اس کی تعلیم کی ابتدا شلپ فورٹا میں ہوئی۔ بون اور لیپزگ کی جامعات میں اس نے اعلیٰ تعلیم کے لئے شرکت کی۔ نٹشے نے ابھی طیلسان بھی حاصل نہیں کی تھی کہ بیسلے یونیورسٹی میں قدیم زبانوں کی پروفیسری پر اس کا تقرر ہو گیا۔ یہاں اس کے شاندار ادبی کارنامے رفتہ رفتہ فلسفیانہ رنگ اختیار کرنے لگے۔ پروفیسری پر اس کا تقرر ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اسے وظیفہ دے دیا گیا۔ اس لئے کہ وہ ذہن اور جسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وظیفہ پانے کے دس سال بعد تک اس نے سخت اذیت میں زندگی بسر کی لیکن وہ اس عرصے میں اپنے کام سے مطلق غافل

نہیں رہا۔ نطشے نے اس زمانے میں اپنے فلسفے کی وضاحت کے لئے نہایت عمدہ مضامین لکھے۔ زیادہ تر ان ہی مضامین پر اس کی شہرت کی بنیاد قائم ہے۔ ۱۸۸۸ء کے آخر میں وہ بالکل دیوانہ ... ۱۹۰۰ء ... کی حالت میں

"ماورائے خیر و شر" اور "زوال زرتشت" اس کی دو مشہور تصانیف ہیں۔

کونٹ لیو ٹالسٹائے

لیو ٹالسٹائے روس کے ایک مقام یسنایا پالیانا میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق روسی امرا کے ایک قدیم گھرانے سے تھا۔ ٹالسٹائے کی جوانی رنگین تفریحوں میں بسر ہوئی جب ان مشاغل سے اس کی طبیعت سیر ہو چکی تو وہ فوج میں بھرتی ہو گیا اس کے بعد اسے کریمیا کی جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ اسی جنگ کے زمانے میں ٹالسٹائے نے لکھنا شروع کیا۔ کریمیا کی لڑائی کے خاتمے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا ہے۔ ٹالسٹائے کی یہ ابتدائی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ غور و فکر کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اسی زمانے سے اشتراکیت کی جانب اس کا رجحان ہو چلا تھا۔ زار الکزنڈر دوم کی ترقی پسندی نے بھی اس کی انسانیت دوستی کے جذبے کو ابھارا، اور ٹالسٹائے نے سماج کی اصلاح کے موضوع پر دل کھول کر لکھنا شروع کیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی شادی ہوئی۔ متاہل زندگی اس نے اپنی جاگیر میں بسر کی۔ اس کے دو ناول "جنگ اور امن" اور "اناکری نینا" Anna KARENINA بہت مشہور ہیں۔ ٹالسٹائے کا انتقال ۲۰ر نومبر ۱۹۱۰ء میں ... تشکیل میں تشدد سے ... شدد سے۔ سرمایہ داری سے بھی زیادہ سخت

ہنرک ابسن

ہنرک ابسن جنوبی ناروے میں اسکین کے مقام پر پیدا ہوا ابتدا میں اس نے دوا سازی کا کام شروع کیا۔ پھر صحافت کی جانب توجہ کی اور بعد میں برگن کے Ole-Bulls Theatre کا ڈائرکٹر ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اسے کرسچینیا کے نیشنل تھیٹر کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ یہ تھیٹر ۱۸۶۲ء میں دیوالیہ ہو گیا۔ ابسن نے اس کے بعد ڈرامے لکھنے شروع کئے Love's Comedy اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب معاصرانہ زندگی پر ایک زبردست چوٹ ہے اس کی اشاعت نے ابسن کے ہمعصروں کو اس کا مخالف بنا دیا۔ ہمعصروں کی مخالفت، نیشنل تھیٹر کا دیوالیہ ہو جانا، جرمنی اور ڈنمارک کی لڑائی میں ناروے کا ڈنمارک کی مدد نہ کرنا، یہ ایسے تکلیف دہ اور دل شکن واقعات تھے جنھوں نے ابسن کو اپنے ہم وطنوں سے بیزار کر دیا، اور وہ ۱۸۶۴ء میں ناروے سے چل پڑا۔ ۱۸۹۲ء تک اس نے مختلف مقامات پر سکونت اختیار کی۔ روم، ڈریسڈن اور میونچ میں وہ

زیادہ عرصے تک ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد وہ کرسچینا لوٹ آیا۔ اس کی واپسی پر ناروے کی حکومت نے بادل ناخواستہ اس کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کی ایک کتاب ۔ The Doll's House بہت مشہور ہے۔ ابسن کی وجہ سے یورپ میں ڈراما نگاری کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ برنارڈشا پر اس کا گہرا اثر ہے۔

اناطول فرانس

اناطول فرانس انیسویں صدی کا مایۂ ناز ادیب ۱۸۴۴ء میں پیرس کے ایک غریب کتب فروش کے گھر پیدا ہوا۔ ادبی زندگی کے ایک طویل دَور میں اس نے شہرت کے اوج کمال کو پالیا تھا لیکن کچھ عرصے سے اس کے عروج کی ہر تابناکی ماندہ پڑگئی ہے۔ اناطول فرانس کا اسلوب بیان شستہ اور پاکیزہ ہے اس کا طنز جو موجودہ نسل کے لئے بیزار کن ہے بعض اوقات والٹیر کے طنز سے بھی زیادہ چبھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اناطول فرانس ایک قنوطی ادیب اور فلسفی ہے، اس کا نہ تو خدا پر یقین ہوتا ہے اور نہ ہی فطرت انسانی کی اچھائی پر۔ وہ لینن اور بالشویوں کا طرفدار تو ہے لیکن اشتراکیت یا اشتمالیت کو انسانی زندگی کی بنیادی خرابیوں کا مداوا نہیں سمجھتا۔

اس کے خیال کی انتہائی بلندی، انسانی فطرت کی گہرائیوں سے اس کی واقفیت، اس کا کلچر، اس کی خدا داد فطانت، معاصرانہ زندگی پر اس کا طنز، اس کا مختصر اور جامع اسلوب بیان اسے فرانسیسی طنز نگاروں اور ادیبوں کی صف اول میں

جگہ دیتے ہیں۔ اس کی دو کتابیں تائیس اور جزیرہ پنگوین بہت مشہور ہیں۔

موپاسان

گئی ڈی موپاسان ۵ اراگست ۱۸۵۰ء کو نارمنڈی میں پیدا ہوا گستاو، سفلا پرٹ نے پہلے پہل اسے لکھنے پر مائل کیا۔ اس کے بعد مسلسل دس برس تک موپاسان فرانسیسی ادب کو نوازتا رہا۔

دنیا کے باعظمت افسانہ نگاروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر کی مصوری میں اسے کمال حاصل ہے۔ اس کی بصیرت اشیا کو ان کے اپنے اصلی رنگ میں دیکھتی ہے۔ اس کا طرز نگارش بے داغ، اثر انگیز، مختصر اور جامع ہوتا ہے۔ اس کی تحریر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں ملتا جو غیر ضروری ہو۔ موپاسان جو دیکھتا ہے بغیر کسی رنگ آمیزی کے وہی بیان کرتا ہے۔ وہ ایسی تصویریں کھینچتا ہے جو کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ ۱۸۹۲ء میں وہ دیوانہ ہوگیا تھا، اور اس کے ایک سال بعد ہی پاگل خانے میں اس کی موت واقع ہوئی۔

میر عزیز الحق بی۔ اے (عثمانیہ)

انگریز اور انگریزی

انگریز انگلستان کے اصلی باشندے نہیں ہیں جس طرح کہ ہندوستان کی اصلی قوم دراوڑی خیال کی جاتی ہے اور آریا قدیم نووارد ہیں اسی طرح انگریز بھی قدیم نووارد ہیں۔

جہاں تک کہ قیاس ممکن ہے انگریزوں کو انگلستان آئے ہوئے پندرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔

انگریزوں نے جزائر برطانیہ میں قدم رکھا تو انھوں نے

... خطہ قطعات

...

مسکن تھے جن کی ہڈیاں برآمد کی جاکر شہادت میں پیش کی جارہی ہیں۔ اسی پُرخطر خطۂ زمین میں ... باشندے رہتے تھے۔

اس زمانے کو مورخین نے "عہد ماقبل تاریخ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کوئی مورخ بھی اس زمانے کی صحیح تاریخ نہیں بتا سکتا، لیکن اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ حالت آج سے ہزاروں برس پہلے کی تھی! اس زمانے کی تاریخ کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو غار ملتے ہیں جس میں لاشیں، آلات اور ہتھیار پائے جاتے ہیں جس سے اس زمانے کے تمدن وطرز رہائش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض مقامات پر پتھر کھڑے ہوئے پائے گئے ہیں اور بعض جگہ اور دوسری نشانیاں دست یاب ہوئی ہیں جس میں سالسبری کے میدان میں اسٹون ہینگ کے پتھروں کا عظیم دائرہ بھی شامل ہے۔

اگر ہم عہد ماقبل تاریخ کے باشندے کو دیکھنا چاہیں تو صرف تصور کی مدد سے دیکھ سکتے ہیں:۔ بندر سے زیادہ مشابہ، پست قد، کافی طاقتور، چوڑا سینہ، لانبے ہاتھ، گھنے بال، بھوری اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، ننگا جسم، چوڑے چوڑے پنجے دار ہاتھ کے، اور بڑے بڑے دانت اس کو ایک ڈراونی شکل میں پیش کرتے تھے۔ یہ اس انسان کا حلیہ ہے جو ان گورے چٹے نازک حسین انسانوں سے پہلے آباد تھا۔ اگر ہم چاہیں تو ان باشندوں کو برٹینس کہہ سکتے ہیں۔

...سے ہوتی ہے جب کہ روم کا
...ل اپنے لشکر جرار کے ساتھ
... کا ... کرتے ہوئے
...ن ہیں ہے۔ اس وقت تک

برٹینس ... انھوں نے فرانس کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرلئے تھے۔ وہ دھات کا استعمال اور کپڑا بننا بھی جانتے تھے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ اپنے قبیلے یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھے۔ انھوں نے بہادری سے رومیوں کا مقابلہ کیا ... کی وجہ سے جولیس سیزر اور اس کے جانشینوں کو ان کے مطیع کرنے میں زیادہ عرصہ لگا۔

اہل روم بہت ہی مستقل مزاج اور ضدی ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی کام کا قصد کرتے ہیں تو بغیر اس کو پورا کئے نہیں چھوڑتے اور یہی وجہ تھی کہ جب تک رومی اس عادت پر قائم تھے، کامیاب رہے۔ چنانچہ ان کی اسی مستقل مزاجی کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام باقی ہے۔ برطانیہ تقریباً پانچ سو برس تک ان کے آہنی پنجے میں پھنسا رہا، اور جب اہل روم شمالی حصے کو فتح نہ کرسکے، اور وہاں کے جنگجو وحشی قبائل ان کے مطیع نہ ہوئے تو انھوں نے اپنی سلطنت کو ایک دیوار کے ذریعے ان وحشی قبائل سے جدا کردیا۔ بعد میں یہ قبیلے مختلف ناموں سے یاد کئے جانے لگے ان میں زیادہ تعداد پکٹس اور اسکاٹس کی تھی۔

سلطنت روم میں رفتہ رفتہ زوال شروع ہوا، اور جب

وہ بہت کمزور ہوگئی تو اس عظیم الشان سلطنت کی کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ روم کے زوال پر سب سے پہلے برطانیہ نے فائدہ اٹھایا چنانچہ اہل برطانیہ خود مختار ہوگئے اور رومی اس قدر مجبور ہوگئے کہ وہ خود ۴۱۰ء قبل مسیح میں برطانیہ سے دست کش ہوگئے۔

اس وقت برطانیہ کی عجیب حالت تھی، نہ اس کے بازوؤں میں طاقت تھی اور نہ کوئی قوت اس کی محافظ و مددگار۔ اس کی مثال بالکل ایک زخمی شکار کی تھی جس کو رومیوں نے زخمی کیا تھا، اس لئے کوئی دوسرا شکاری اس کو آسانی سے اپنے قبضے میں لاسکتا تھا! اس موقع سے شمال کے وحشی قبائل نے فائدہ اٹھایا اور جنوب کے سارے زرخیز علاقے پر قابض ہوگئے۔ اس مجبوری میں ان کی نظر انگریزوں پر پڑی جو پہلے ان کے دشمن تھے۔ لیکن موقع کی نزاکت کی وجہ اب انھی لوگوں کی مدد مانگنی پڑی تاکہ ان وحشی قبائل کے جور و ستم سے نجات ملے۔ انگریز تو موقع ہی کی تاک میں تھے، فوراً مدد پر آمادہ ہوگئے۔ اس طرح انگریزوں نے برطانیہ میں قدم رکھا اور قدیم امن پسند باشندوں کو ان وحشی قبائل سے بچایا۔

انگریز کسی خاندان یا قبیلے کے لوگ نہ تھے بلکہ یہ خانہ بدوش تھے جو سمندروں میں ادھر ادھر پھرا کرتے تھے اور جہاں آرام ملتا وہیں بس جاتے۔ ان میں بڑے قبیلے انگلیس، سیاکسن، اور جوٹس تھے۔ ان کے مسکن جرمنی کے دریاؤں کے دہانے تھے اور یہ لوگ اپنی کشتیوں میں جو بہ دے اور جیبو سے چلتے پھرتے رہتے تھے۔

ان لوگوں سے جو کچھ توقع کی گئی وہ پوری ہوئی اور یہ ان وحشی قبائل کو نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس مقام کو سرسبز و شاداب دیکھ کر وہ آباد ہوگئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی آنے کی دعوت دی۔ ایک صدی یعنی ۴۴۹ء تا ۵۴۷ء قبل مسیح تک انگریز قبائل مصروف جنگ رہے، اور وہ اس طرح برطانیہ میں آباد ہوگئے۔ انگریز بعد میں محنتی اور امن پسند باشندے ثابت ہوئے لیکن ان کی جہاز رانی سے دلچسپی قائم رہی بلکہ ایک حد تک ترقی کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزوں میں آج بھی جہاز رانی کا شوق باقی ہے اور وہ درجہ اول کے جہاز راں ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادب میں جس قدر بلند پایہ کتابیں ہیں وہ تقریباً سب کی سب بحری حالات اور سفرناموں پر مشتمل ہیں۔

چار پانچ صدی تک تو انگریز اطمینان سے غاصبانہ قبضہ جمائے رہے لیکن اس کے بعد انھیں بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا! اس سلسلے میں ناروے کے باشندوں کی یورش بہت اہم ہے۔ وہ ۱۰۶۶ء میں ولیم فاتح کے ماتحت ہیسٹنگز پر لنگر انداز ہوئے اور بہت جلد سارے جزیرے پر قابض ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہر طاقتور قوم اپنے حصول مقصد کے لئے دوسری کمزور قوموں کو کچل ڈالتی تھی لیکن ولیم کی کامیابی ایک سپاہی کے کارنامے سے زیادہ اہم نہ تھی جو انگریز قوم کو نقصان نہ پہنچا سکی۔ چنانچہ اس کا انجام یہ ہوا کہ انگریزوں نے اپنی طاقت کے ذریعے فاتح نارمنوں کو مغلوب کرلیا، اور برطانیہ صرف انگریزوں کا رہا، اور یہی انگلستان[1] کہلاتا ہے۔

انگلستان اپنی زبان، جوش، ہمت، سیاست نیز رسم و رواج میں متعدد تبدیلیاں جائز رکھ کر آدھی دنیا پر

---

[1] اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہوگی کہ اس نو وارد قوم میں فرقہ انگلیس کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے یہ ملک انگلستان، مشہور ہوا۔ قوم کا نام حوادث زمانہ سے بدلتا ہوا انگریز ہوگیا۔

قابض ہوگیا، اور خوشامدیوں نے ایک صحیح مقولہ گھڑ دیا کہ:۔ "سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا"۔ نارمنوں کے حملہ کو انگریزی زبان کی نشو ونما میں بہت کچھ دخل ہے۔

اس زبان کا ... س ... Pig کے Pork کہنے لگے اور بجائے Sheep کے Mutton استعمال ہونے لگا، اور Calf کی بجائے Veal مستعمل ہوا۔ جب انگریز جرمنی سے آکر آباد ہوئے تو ان کی زبان میں جرمن الفاظ کی بہتات تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جرمن زبان ہی کی کوئی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اسی کو آج کل قدیم انگریزی Old English یا انگلوسیاکسن Anglo-Saxon کہتے ہیں۔ یہ جدید انگریزی کی ابتدا تھی اور فرق صرف املا Spelling کا تھا۔ ہماری موجودہ انگریزی کے ضروری الفاظ اسی زبان سے ماخوذ ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری بول چال کے اہم الفاظ یہ ہیں جن کے بغیر ہم انگریزی زبان میں اپنا مقصد کسی طرح بھی ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ الفاظ بہت عام ہیں Write, Water, Earth, Women, Man, Dog وغیرہ ہفتے کے ناموں میں بھی ہم کو انگلوسیاکسن Anglo-Saxon کے مذہب کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو متعدد خداؤں کو پوجتے تھے مثال کے طور پر اتوار کے دن کو سورج کا دن تسلیم کیا گیا، اس لئے اس کو سن ڈے کہنے لگے۔ پیر کے دن کو چاند کا دن مانا گیا جس کی وجہ سے اس کو من ڈے کہا گیا۔ منگل کا دن اندھیرے کے خدا ٹیوز سے منسوب کیا گیا اس لئے اس کو ٹیوز ڈے کہنے لگے۔

... وہ انگریزی زبان کی ابتدا تھی۔ ... مارے مارے پھرتے تھے ... کے مقاصد اور تخیلات ... کے اظہار کے لئے وہ بالکل ... انھیں کوئی نئی چیز معلوم ہوتی تو اس کے اظہار کے لئے یا تو نئے الفاظ وضع کئے جاتے یا دوسری زبانوں سے ماخوذ لئے جاتے۔ پہلی صورت مشکل تھی اور انھیں دوسری صورت ہی میں آسانی نظر آتی تھی۔

سب سے پہلا واقعہ جو انگریزی زبان میں نئے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا وہ عیسائیت کی ابتدا تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ سینٹ آگسٹائین ۵۹۷ء کینٹ کے مقام پر وارد ہوئے اور ان بے دین انگلوسیاکسن کی بڑی تعداد کو عیسائی بنایا۔ یہ صرف طرز عبادت میں تبدیلی نہ تھی بلکہ اس سے خیالات میں بھی بڑا انقلاب ہوا کیونکہ عیسائی مذہب کے خیالات ان بے دین لوگوں کے خیالات سے بالکل جدا تھے۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ قدیم انگریزی میں Charity کے لئے کوئی لفظ نہ تھا۔ قدما نے اس لفظ کی بجائے Lufu استعمال کیا جس کے معنی Love کے ہیں لیکن یہ لفظ اس خیال کے لئے موزوں نہ تھا اس لئے آخرکار لاطینی زبان کا لفظ ہی استعمال ہونے لگا اس طرح بہت سے الفاظ جو انھیں عبادت کے دوران میں استعمال کرنے پڑتے تھے لاطینی زبان سے لینے پڑے یا یونانی زبان کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ Bishop, Priest, Altar وغیرہ یونانی اور لاطینی سے ماخوذ ہیں۔

(باقی آئندہ)

شریف النساء بیگم

اترا ہوا دریا

کس قدر اترے ہوئے دریا کا ساحل ہے اداس
دیکھ کر یہ منظر عبرت فزا دل ہے اداس

اب نہ وہ جوش تلاطم ہے نہ موجوں میں خروش
صورت شہر خموشاں ہے فضا ساری خموش

خامشی پرور سماں ساحل سے تا ساحل ہوا
فتنۂ محشر خرامی کا اثر زائل ہوا

راہ میں جس کی گرے نخل تناور کٹ کے بل
اب اسی کی سرزمیں پر ہے نیستاں کا عمل

جوشِ وحشت ہو چکا تندی گئی تیزی گئی
ساغرِ صہبائے بدمستی کی لبریزی گئی!

سرکشی موجوں کی باقی ہے نہ وہ آوارگی
ہر طرف چھائی ہے اک افسردگی بیچارگی

یادگار ورطۂ مضطر نہیں جز گرد باد
اب یہاں کوئی اٹھاتا سر نہیں جز گرد باد

یہ خموشی اور یہ رفتار میں آہستگی
یوں ہے جیسے غرق ہو دریائے حیرت میں کوئی

جائے حیرت ہے یہ حالت قلزم زخار کی
ہو گئے دونوں کنارے پسلیاں بیمار کی

ہو گئے ناپید یکسر ورطہ و موج و حباب
جس طرح پیری میں مر جاتے ہیں ارمان شباب۔

وقت آنے پر چڑھیگا پھر یہ دریا ایک دن
پھر وہی جوش تلاطم اس میں ہوگا ایک دن

زندگی اس وقت جو پہلوئے دریا میں نہیں
دامن کہسار ہے یا آسماں اس کا امیں

وقت پر اس کی امانت پھر اسے مل جائے گی
زندگی کی لہر ساحل تا بہ ساحل جائے گی۔

اس میں ہوں گے پھر ہویدا ورطہ و موج و حباب
آہ پیری سے مگر واپس نہیں آنا شباب!

تلوک چند محروم

آب دوز کشتیاں

ذیل میں جناب ابوالمکارم فیض محمد صدیقی صاحب بی۔ اے۔ ڈپ۔ ریڈ (عثمانیہ) کا ایک دلچسپ مضمون ہدیہ ناظرین ہے موصوف سائنس کے مضامین کو عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی بہت کامیاب کوشش کرتے ہیں اور ان کو اس کا خاص ملکہ ہے آپنے اسی موضوع پر ایک مفید کتاب بھی لکھی ہے جو ادارہ ادبیات کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔" (اڈیٹر)

جنگ عظیم میں آب دوز کشتیوں کا نام جرمنوں سے کچھ اس درجہ وابستہ ہو گیا کہ عام طور پر ان کو جرمنوں کے دماغ ہی کی پیداوار سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ یہ ایک امریکی ایجاد ہے اس کو پروان چڑھانے میں جان پی ہالینڈ اور سایمن لیک کا نمایاں حصہ رہا، اور انھیں کو موجودہ آب دوزوں کا حقیقی موجد سمجھا جاتا ہے۔ ہالینڈ آئرلینڈ کا باشندہ تھا۔ سب سے پہلی آب دوز کشتی ڈیوڈ بشنیل نے بنائی، اس کا نام "ٹرٹل" تھا۔ اس کی شکل سگار کی سی تھی، یہ بہت چھوٹی سی کشتی تھی اور ... گھنٹے تک ایک انسان ... جہاز "ایگل" کو ڈبونا ... ہی۔ ... دوزوں کی تیاری کا ... عظیم تک مسلم نہ ہو سکی۔

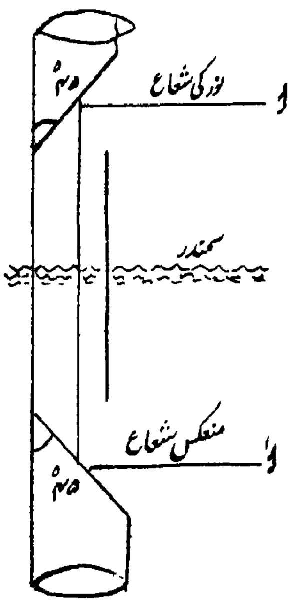
جب ... بحری جہازوں پر حملہ کرنے کے لئے آب دوز کشتیوں سے کام لینا شروع کر دیا اس کے بعد ہی انگلستان، امریکہ، فرانس اور جرمنی نے سرعت کے ساتھ آب دوز بنا ڈالے چنانچہ برطانیہ کے پاس ۲۶۰ فٹ لمبی اور ۲۲½ فٹ چوڑی آب دوز تھی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد چند سال تک آب دوز کی تیاری اور ترقی میں جمود سا پیدا ہو گیا لیکن اس کے بعد پھر سے اس طرف توجہ کی جانے لگی چنانچہ ۱۹۲۶ء میں امریکہ نے V1 آب دوز بنائی جس کا طول ۳۴۱ فٹ اور عرض ۲۷ فٹ تھا اس کا وزن ۲۱۶۴ ٹن۔ اسی طرح سے برطانیہ نے ایسے آب دوز بنائے کہ وہ آب دوز جنگی جہاز معلوم ہوتے تھے اس میں ۱۲" دہانہ کی توپیں لگی ہوئی تھیں اور تارپیڈو کی چار نالیاں تھیں، ساتھ ہی اس کے اس کی بحری گشت کا دائرہ کئی ہزار میل تھا۔

گذشتہ چند سالوں میں تو آب دوز کی ساخت میں حیرتناک ترقی ہو گئی ہے اور اب مختلف حکومتوں کے پاس بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی آب دوزیں موجود ہیں۔ پہلے اکہرے خول کے آب دوز بنائے جاتے تھے لیکن اب بالعموم دوہرے خول کے

آب دوز موجود ہیں۔ ان کی شکل بالعموم جہاز کی سی ہوتی ہے۔ طول (۳۰۰) اور (۴۰۰) فٹ کے درمیان ہوتا ہے۔ وزن بھی دو اور تین ہزار ٹن کے درمیان۔ ان کی شکل بالعموم لمبوتری ہوتی ہے۔ طول کے مقابلہ میں عرض بہت کم ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی مشنری سے آراستہ ہوتی ہیں۔ ان کے درمیان میں ایک حصہ گول گنبد نما ہوتا ہے جسے "گنبد گرداں" کہتے ہیں۔ اس میں حملہ کرنے والا افسر بیٹھتا ہے، اسی حصے میں توپیں لگی ہوتی ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو سطح آب پر آکر جنگی جہاز کا مقابلہ کرسکے۔ آب دوز کے مختلف حصوں میں پانی داخل ہوسکتا ہے جو خاص طور سے اس مقصد کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ پانی بھرنے سے آب دوز کی کثافت بڑھ جاتی ہے اور وہ تیزی سے اندر ڈوبتی ہے۔ اس میں اس امر کا انتظام ہوتا ہے کہ جس گہرائی پر چاہیں اسے روک سکتے ہیں۔ آب دوز سطح آب پر ڈائسیل انجن کی بدولت چلتے ہیں اور جب پانی کے اندر ہوتی ہیں تو برقی مورچہ (بیاٹری) کے ذریعہ چلتی ہیں۔ اسی لئے آب دوز کے لئے کافی برقی قوت درکار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈائسیل انجن سے گیسیں پیدا ہوتی ہیں جن کا خارج ہوجانا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ جب آب دوز پانی کے اندر ہوتی ہے تو یہ گیسیں خارج نہیں ہوسکتیں اس لئے کہ پانی کا دباؤ گیسوں کے دباؤ سے زیادہ ہوتا ہے اور وہ باہر نکل نہیں سکتیں اس لئے کہ یہ انجن پانی کے اندر ناقابل عمل ہوتا ہے اس لئے اندر برقی مورچہ سے کام لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آب دوز کو پانی کے اندر زیادہ عرصہ تک نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ برقی مورچوں کو بھرنے کے لئے کشتی کو سطح آب پر لا کر ڈائسیل انجن چالو کرنا پڑتا ہے تاکہ برقی مورچے بھر جائیں۔ پہلے پہل تو اسی باعث ان کی بحری گشت کا دائرہ بہت محدود تھا لیکن اب اعلیٰ مشنری کی بدولت ان کی کارکردگی اور دائرہ عمل کی وسعت میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے۔

آب دوز کی آنکھ اس کا منظر بین ہوتا ہے۔ جب آب دوز پانی کے اندر ہوتی ہے تو باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لئے اسی آلہ سے کام لیتے ہیں۔ اس آلہ کا اصول بالکل معمولی ہے۔ یہ ایک دھاتی نل پر مشتمل ہوتا ہے، اس کے دونوں جانب ایک ایک آئینہ نلی کے ساتھ ۴۵° کا زاویہ بناتے ہوئے رکھا جاتا ہے۔ شعاع نور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آئینے سے جس زاویہ پر ٹکراتی ہیں دوسری طرف آئینے میں زاویہ پر مڑ جاتی ہیں اس لئے جب ادھر کے آئینے پر شعاع سیدھی آکر پڑتی ہے تو وہاں سے منعکس ہوکر نیچے کے آئینے پر پڑتی ہے اور ابتدائی شعاع کے متوازی منعکس ہوجاتی ہے، اس طرح سے ہم ا کو نیچے کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس معمولی سے آلے کو منظر بین کہتے ہیں۔



بچے فٹ بال کا میاچ دیکھنے یا سیر و تفریح کے وقت کسی جھاڑی کے پیچھے کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے یہ آلہ خود بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ اسی اصول پر آب دوز میں منظر بین لگائے جاتے ہیں۔ ان میں اصول تو یہی ہوتا ہے لیکن اس میں نزاکتیں زیادہ پیدا کردی جاتی ہیں تاکہ چیزیں صاف اور اچھی طرح سے دکھائی دیں۔ منظر بین کے بغیر آب دوز کی

دنبہ باریک ہے۔

آب دوزیں بالعموم دشمن کے جہازوں پر تارپیڈو سے حملہ کرتی ہیں تارپیڈو اس کے دونوں پہلوؤں میں آگے اور پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔ تارپیڈو کی شکل سگار کی سی ہوتی ہے۔

... اور فی ... ایک ااکھ روپے سے

اور ۸۰۰ گز ہوتی ہے۔ آب دوز ہی بالعموم ...

جنگی یا دوسرے جہاز پر حملہ کرتی ہے۔ جب تارپیڈو جہاز سے ٹکراتا ہے تو سخت دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور جہاز پھٹ جاتا ہے چنانچہ موجودہ جنگ ہی میں رائل اوک اور کریجیس جیسے مشہور جنگی جہاز تارپیڈو کا نشانہ بن کر پارہ پارہ ہوگئے۔ یہ بڑا خطرناک حربہ ہے اور جنگی جہاز اس سے بچنے اور اس کی مدافعت کرنے کے لئے پوری قوت صرف کرتے ہیں۔

ابوالمکارم فیض محمد صمدانی

ویٹامن (حیاتین)

ویٹامن وہ مادے ہیں جو مختلف کھانے پینے کی چیزوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ہماری صحت اور نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اگرچہ ان اشیا کی ترکیب اور ان کے افعال اب تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر کی پہچان ان کے

کیمیاوی اور فعلیاتی خواص کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ اب تک کوئی چھ ویٹامن دریافت ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں:- الف، ب (یا ب ۱)، ب ۲ (یا گ)، ج، د اور ی۔ ان میں سے چار یعنے ب ۱، ب ۲، ج اور د اب کیمیاوی طور پر الگ کر لئے گئے ہیں۔ تمام ویٹامن اپنے خاص اور جداگانہ افعال انجام دیتے ہیں

... ائے جاتے ہیں۔

... ل میں وجود ہوتا ہے،

... مچھلی کے تیل، انڈے کی

...

افعال:- یہ ویٹامن ... ہ ... دینات ... تولید ... جاتا ہے۔ جسم کی بیرونی ساخت ... کے افعال کو ... اور ... اور متعدی امراض کے مقابلہ میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ ویٹامن انسان کو ... غذا میں نہ ملے تو اس کے یہ نتائج ہوں گے:- یعنے اس کے نہ ہونے سے ... نشو و نما موقوف ہو جاتی ہے بلکہ کمزوری ... شب کوری پیدا ہوتی ہے جلد خشک ہو جاتی ہے یا ایسی کھردری ہو جاتی ہے جیسے مینڈک کی۔ آشوب چشم اور آنکھ، ناک، حلق، شش، معدے، آنت اور جلد کی بیماریاں اور بولی و تناسلی نظام کی خرابی بھی اسی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ویٹامن ب ۱ یا ب ۱ اینورین:-

اس ویٹامن کے ماخذ خمیر، اناج، پھلیاں، سبز ترکاریاں، انڈے، پنیر، مچھلیاں، گردے اور جگر وغیرہ ہیں۔

افعال:- کاربوہیڈریٹ کے تعاملات اسی ویٹامن کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ویٹامن ب اعصاب و عضلات کی بالیدگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ اگر کسی کو ویٹامن ب زیادہ دن تک نہ ملے تو

اس کے اثرات یہ ہوسکتے ہیں یعنے بھوک غائب ہوجائے گی، وزن کم ہوجائے گا اور ہاضمہ خراب ہوجائے تو تعجب نہیں معدے کی بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ تکان زیادہ محسوس ہوگی اور اعصابی کمزوری پیدا ہوجائے گی۔ بیری بیری نام کی بیماری بھی اس وٹامن کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وٹامن ب۲ (جی) :-

اس کے ماخذ خمیر، دودھ، سبز ترکاریاں، انڈے، گوشت، گردہ اور جگر ہیں۔

افعال :- جلد کی صحت اسی وٹامن کی بدولت قائم رہتی ہے اور ہضمی اور عصبی نظام کی تندرستی بھی اسی سے برقرار رہتی ہے اگر وٹامن ب۲ عرصے تک نہ مل سکے تو اس کے یہ نتائج ہوسکتے ہیں یعنے نمو موقوف ہوجاتا ہے، زبان، منہ اور جلد کی خرابیاں، معدے اور آنتوں کی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور "پلاگیرا" نام کی بیماری اسی وٹامن کی کمی کا بڑا نتیجہ ہے۔

وٹامن ج۔ اسکاربک ترشہ :-

سنترس اور دیگر میوہ جات، کچی ترکاریاں، سرخ مرچ، تازہ دودھ اور جگر اس کے ماخذ ہیں۔

افعال :- یہ ایک تعدیلی عامل ہے اور باقی تنفس میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خون کی شریانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس وٹامن کی کمی سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں :- اسہال، خون جلد کی ملائمت اور مسوڑوں کی خرابی، ہڈیوں کی نرمی، جوڑوں کی بیماریاں، اور آنتوں کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، قوت مدافعت کم ہوجاتی ہے۔ "اسکروی" نام کی بیماری بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وٹامن د۔ کالسی فرال :-

یہ ایک کیمیاوی مرکب آرگسٹرال کی اشعاعیت سے حاصل کیا جاسکتا ہے انسانی جسم سے براہ راست یا اس کی مصنوعی اشعاعیت سے بھی یہ وٹامن حاصل کیا جاتا ہے مچھلی کے جگر کے تیل، انڈے کی زردی، مکھن، جگر اور گردے میں پایا جاتا ہے۔

افعال :- کلسیم فاسفیٹ اسی وٹامن کے ذریعہ اپنے افعال انجام دیتا ہے۔ وٹامن د خون میں کلسیم اور فاسفیٹ کی مقداروں کو برقرار رکھتا ہے اور ہڈیوں اور دانتوں میں کلسیم کو اچھی طرح جما دیتا ہے۔ اگر اس وٹامن کی کمی ہوجائے تو اس کے اثرات یہ ہوسکتے ہیں یعنے ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت ناقص ہوجاتی ہے۔ ہڈیاں نرم و نازک ہوجاتی ہیں اور ان میں کجی اور بدشکلی پیدا ہوتی ہے۔ ہڈیوں کی بیماری "رکٹس" اور دانتوں کی بیماری "کیریز" بھی اسی وٹامن کی کمی کا نتیجہ ہے نیز اعصاب اور عضلات کی کمزوری اور تنفسی بیماریوں کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے۔

وٹامن ی :- اس کی کیمیاوی ساخت اب تک معلوم نہ ہوسکی۔ اناج، سلوۃ، آبی کرس اور مولاسس وغیرہ ترکاریوں اور نباتی تیلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ عورتوں میں رحم کے افعال کی حفاظت کرتا ہے اور مردوں میں تخم خلیوں کو پختہ بناتا ہے۔

(ح۔ ص)

کھیل

دنیا کے ہیوی ویٹ چمپین

جیک ڈیمپسی۔ ۱۹۱۹۔ ۱۹۲۶ء   جین ٹنی۔ ۱۹۲۶۔ ۱۹۲۹ء
میکس اسملنگ۔ ۱۹۳۰۔ ۱۹۳۲ء   جیک شارکی۔ ۱۹۳۲۔ ۱۹۳۳ء
پریمو کارنیرا۔ ۱۹۳۳۔ ۱۹۳۴ء   میکس بےئر۔ ۱۹۳۴۔ ۱۹۳۵ء
جے۔ براڈک۔ ۱۹۳۵۔ ۱۹۳۷ء   جو لوئیس۔ ۱۹۳۷۔ ۱۹۳۹ء

دنیا تاریک ہے۔

آب دوزیں بالعموم دشمن کے جہازوں پر تارپیڈو سے حملہ کرتی ہیں۔ تارپیڈو اس کے دونوں پہلوؤں میں آگے اور پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔ تارپیڈو کی شکل سگار کی سی ہوتی ہے۔ اس کا وزن کوئی ۵ ٹن ہوتا ہے اور قیمت ایک لاکھ روپیے سے زیادہ۔ اس کے سامنے کے حصے میں . . . ۱ پونڈ کی ایک دھماکو شئے ہوتی ہے جسے ٹرائی نائٹرو لین کہتے ہیں۔ اس حصے کے پیچھے دبی ہوئی ہوا کا خانہ اور پھر اس کو چلانے والا انجن ہوتا ہے۔ تارپیڈو کی رفتار بالعموم ۵۰ ناٹ (ایک ناٹ = ایک میل اور ۸۰۰ گز) ہوتی ہے۔ آب دوز کشتی بالعموم ۵، ۶ سو گز سے جنگی یا دوسرے جہاز پر حملہ کرتی ہے۔ جب تارپیڈو جہاز سے ٹکراتا ہے تو سخت و تند دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور جہاز پھٹ جاتا ہے چنانچہ موجودہ جنگ ہی میں رائل اوک اور کریجیس جیسے مشہور جنگی جہاز تارپیڈو کا نشانہ بن کر پارہ پارہ ہوگئے۔ یہ بڑا خطرناک حربہ ہے اور جنگی جہاز اس سے بچنے اور اس کی مدافعت کرنے کے لئے پوری قوت صرف کرتے ہیں۔

ابوالمکارم فیض محمد صدیقی

وٹامن (حیاتین)

وٹامن وہ مادے ہیں جو مختلف کھانے پینے کی چیزوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ہماری صحت اور نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اگرچہ ان اشیا کی ترکیب اور ان کے افعال اب تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر کی پہچان ان کے کیمیاوی اور فعلیاتی خواص کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ اب تک کوئی چھ وٹامن دریافت ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں:- ا، ب (یا ب)، ب ۲ (یا گ)، ج، د اور ی۔ ان میں سے چار یعنی ب، ب ۲، ج اور د اب کیمیاوی طور پر الگ کرلئے گئے ہیں۔ تمام وٹامن اپنے خاص اور جداگانہ افعال انجام دیتے ہیں اور یہ سب کے سب قدرتی غذاؤں میں پائے جاتے ہیں۔

وٹامن ا:-

یہ وٹامن پردوں کی کیروٹینی بافتوں میں موجود ہوتا ہے، اور یہ زیادہ تر سبز اور زرد ترکاریوں، مچھلی کے تیل، انڈے کی زردی، دودھ، مکھن، کریم اور پنیر میں ہوتا ہے۔

افعال:- یہ وٹامن نشو و نما میں مدد دیتا ہے اور تولید کو بڑھاتا ہے۔ جسم کی بیرونی ساخت اور ان کے افعال کو برقرار رکھتا ہے اور متعدی امراض کے مقابلے میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ وٹامن انسان کو عرصے تک غذا میں نہ ملے تو اس کے یہ نتائج ہوں گے۔ یعنی اس کے نہ ہونے سے نہ صرف نشو و نما موقوف ہوجاتی ہے بلکہ کمزوری اور شب کوری پیدا ہوتی ہے جلد خشک ہوجاتی ہے یا ایسی کھری ہوجاتی ہے جیسے مینڈک کی۔ آشوب چشم اور آنکھ، ناک، حلق، شش، معدے، آنت اور جلد کی بیماریاں اور بولی و تناسلی نظام کی خرابی بھی اسی سے پیدا ہوسکتی ہے۔

وٹامن ب (یا ب ۱ اینورین):-

اس وٹامن کے ماخذ خمیر، اناج، پھلیاں، سبز ترکاریاں، انڈے، پنیر، مچھلیاں، گردے اور جگر وغیرہ ہیں۔

افعال:- کاربوہیڈریٹ کے تعاملات اسی وٹامن کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وٹامن ب اعصاب وعضلات کی بالیدگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ اگر کسی کو وٹامن ب زیادہ دن تک نہ ملے تو

اس کے اثرات یہ ہوسکتے ہیں یعنے بھوک غائب ہو جائے گی، وزن کم ہو جائے گا اور ہاضمہ خراب ہو جائے تو تعجب نہیں معدے کی بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ تکان زیادہ محسوس ہوگی اور اعصابی کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ "بیری بیری" نام کی بیماری بھی اس ویٹامن کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ویٹامن ب ۲ (یا گ):-

اس کے ماخذ خمیر، دودھ، سبز ترکاریاں، انڈے، گوشت، گردہ اور جگر ہیں۔

افعال:- جلد کی صحت اسی ویٹامن کی بدولت قائم رہتی ہے اور ہضمی اور عصبی نظام کی تندرستی بھی اسی سے برقرار رہتی ہے۔ اگر ویٹامن ب ۲ عرصے تک نہ مل سکے تو اس کے یہ نتائج ہوسکتے ہیں، یعنے نمو موقوف ہو جاتا ہے، زبان، منہ اور جلد کی خرابیاں، معدے اور آنتوں کی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور "پلاگیرا" نام کی بیماری اسی ویٹامن کی کمی کا بڑا نتیجہ ہے۔

ویٹامن ج۔ اسکاربک ترشہ:-

سٹرس اور دیگر میوہ جات، کچی ترکاریاں، سرخ مرچ، تازہ دودھ اور جگر اس کے ماخذ ہیں۔

افعال:- یہ ایک تعدیلی عامل ہے اور بافتی تنفس میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خون کی شریانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس ویٹامن کی کمی سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:- اسہال خون، جلد کی ملائمت اور مسوڑوں کی خرابی، ہڈیوں کی نرمی، جوڑوں کی بیماریاں، اور آنتوں کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قوت مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ "اسکروی" نام کی بیماری بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ویٹامن د۔ کالسی فرال:-

یہ ایک کیمیاوی مرکب آرگسٹرال کی اشراقیت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انسانی جسم سے براہ راست یا اس کی مصنوعی اشراقیت سے بھی یہ ویٹامن حاصل کیا جاتا ہے۔ مچھلی کے جگر کے تیل، انڈے کی زردی، مکھن، جگر اور گردے میں پایا جاتا ہے۔

افعال:- کلسیم فاسفیٹ اسی ویٹامن کے ذریعہ اپنے افعال انجام دیتا ہے۔ ویٹامن د خون میں کلسیم اور فاسفیٹ کی مقداروں کو برقرار رکھتا ہے اور ہڈیوں اور دانتوں میں کلسیم کو اچھی طرح جما دیتا ہے۔ اگر اس ویٹامن کی کمی ہو جائے تو اس کے اثرات یہ ہوسکتے ہیں، یعنے ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت ناقص ہو جاتی ہے۔ ہڈیاں نرم و نازک ہو جاتی ہیں اور ان میں کجی اور بدشکلی پیدا ہوتی ہے۔ ہڈیوں کی بیماری "رکٹس" اور دانتوں کی بیماری "کیریز" بھی اسی ویٹامن کی کمی کا نتیجہ ہے۔ نیز اعصاب اور عضلات کی کمزوری اور تنفسی بیماریوں کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے۔

ویٹامن ی:- اس کی کیمیاوی ساخت اب تک معلوم نہ ہوسکی۔ اناج، صلوٰۃ، آبی گرین اور مولا کر ادنیہ ہشرہ زیول اور نباتی تیلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ عورتوں میں رحم کے افعال کی حفاظت کرتا ہے اور مردوں میں تخم خلیوں کو پختہ بناتا ہے۔

(ح۔ س)

کھیل

دنیا کے ہیوی ویٹ چمپین

جیک ڈیمپسی ۔ ۱۹۱۹۔۱۹۲۶ء　جین ٹنی ۔ ۱۹۲۶۔۱۹۲۹ء

میک اسملنگ ۔ ۱۹۳۰۔۱۹۳۲ء　جیک شارکی ۔ ۱۹۳۲۔۱۹۳۳ء

پریمو کارنیرا ۱۹۳۳۔۱۹۳۴ء　میکس بے ئر ۔ ۱۹۳۴۔۱۹۳۵ء

جے۔ براڈک ۔ ۱۹۳۵۔۱۹۳۷ء　جو لوئیس ۔ ۱۹۳۷۔۱۹۳۹ء

ٹیبل ٹینس کے چمپین

۱۹۲۷ء آر جیکوبی (ہنگری)۔ ۱۹۲۸ء ز ریڈ۔ مک لو ونز (ہنگری)

۱۹۲۹ء فریڈ پیری (انگلستان)۔ ۱۹۳۰ء وی بارنا (ہنگری)

۱۹۳۱ء ایم ٹزا بوڈوس (ہنگری)۔ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۵ء وی۔ بارنا (ہنگری)

۱۹۳۶ء ایس۔ کولار (چیکوسلواکیا)۔

وائٹ من کپ

(انگلستان اور امریکہ کی عورتوں کے درمیان بین قومی ٹینس کے مقابلے)

۱۹۳۳ء امریکہ۔ ۴ میچ میں بمقابلہ ۳ کے کامیاب ہا (فارسٹ ہلس)

۱۹۳۴ء ״ ۔ ۵ میچ میں بمقابلہ ۲ کے ״ (ومبلڈن)

۱۹۳۵ء ״ ۔ ۴ میچ میں بمقابلہ ۳ کے ״ (فارسٹ ہلس)

۱۹۳۶ء ״ ۔ ۴ میچ میں بمقابلہ ۳ کے ״ (ومبلڈن)

۱۹۳۷ء ״ ۔ ۶ میچ میں بمقابلہ ۱ کے ״ (فارسٹ ہلس)

۱۹۳۸ء ״ ۔ ۵ میچ میں بمقابلہ ۲ کے ״ (ومبلڈن)

۱۹۳۹ء ״ ۔ وان کرام (جرمنی)۔

سنگلز (مرد)۔ ۱۹۳۷ء ڈی۔ بج (ممالک متحدہ)، ۱۹۳۸ء ڈی۔ بج، ۱۹۳۹ء وان کرام (جرمنی)

ڈبلز (مرد)

۱۹۳۴ء جی۔ ایم۔ لاٹ، اور ایل۔ بی۔ اسٹوفن

۱۹۳۵ء جے۔ ایچ۔ کرافورڈ، اور اے۔ آر۔ کواسٹ

۱۹۳۶ء جی۔ پی۔ ہیوز، اور سی۔ آر۔ ڈی۔ ٹکی (انگلستان)

۱۹۳۷ء ڈی۔ بج، اور جی۔ ماکو (ممالک متحدہ)

۱۹۳۸ء ״ ״ ״ ״

۱۹۳۸-۳۹ء کی فہرست کل ہند رنکنگ

عورتیں ہر (۱) مسز بولانند (۲) مس لیلا رو (۳) مسز جے۔ بی۔ بلیک من (۴) مس ایم۔ ایچ۔ ڈو بانش (۵) مس ایم۔ وڈ کاک (۶) مسز آر۔ ایم۔ فوٹ (۷) مس ایل۔ وڈ برج۔

مرد:۔ (۱) غوث محمد (۲) ساہنی (۳) کپور (۴) رنبیر سنگھ (۵) وائی۔ سنگھ (۶) بی۔ ٹی۔ بلیک اور جے۔ ایم۔ مہتا (۷) ایس۔ سی۔ بٹی (۸) ایس۔ اے۔ عظیم اور ایچ۔ ایل۔ سونی (۹) ٹی۔ کے۔ راما نائم۔

حیدرآباد میں ٹینس کے مقابلے ۲۰-۲۱ جنوری کو عہدی جنگ بازی گاہ پر ٹینس کے دلچسپ مقابلے ہوئے۔ پہلا کھیل افتخار اور پنچ سے دیوگوسلاویا نژاد کے درمیان ہوا جس میں آغرا اللہ کرنے ۶-۴، ۶-۲ سے کامیابی حاصل کی اس کے بعد غوث محمد اور منک دیوگوسلاویہ نمبر ۲ کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس میں منک ۴-۶، ۶-۴، ۶-۱ سے جیت گئے تیسرا کھیل ڈبلز کا تھا جس میں غوث، افتخار اور پنچ منک نے حصہ لیا اس میں غوث، افتخار نے ۱۰-۸، ۶-۴ سے کامیابی حاصل کی۔ ۲۱ جنوری کو جو کھیل ہوئے وہ

علاوہ بہت قابل تعریف تھے اس میں پہلا کھیل غوث اور پنچ [illegible] کے درمیان ہوا جس میں [illegible] ۶-۴، ۶-۲، ۶-۴ [illegible] کامیابی حاصل کی اس کے بعد افتخار اور منک کے درمیان کھیل ہوا جس میں پہلا سٹ ۱ افتخار نے [illegible]

حالاتِ حاضرہ

روس اور فنستان

اسٹونیا، لٹویا اور لتھونیا پر مسلط ہونے کے بعد روس نے فنستان کی طرف توجہ کی۔ روس یہ چاہتا ہے کہ اس کو بحر بالٹک میں آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کرنے کا اختیار مل جائے، اور اس کے لئے آلینڈ پر توجہ ہونا ضروری ہے۔ آلینڈ، سویڈن اور فنستان کے درمیان بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیروں کا مجموعہ ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے پہلے فنستان روس کے ماتحت تھا اور ۱۹۱۷ء میں یہ روس سے الگ کر دیا گیا تھا لیکن اسی زمانے سے اس کی واپسی کا مسئلہ روز بروز اہم ہوتا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں آلینڈ کے لئے تقلیل اسلحہ کا سوال اٹھا اور اس کے متعلق فنستان اور سویڈن نے ایک سمجھوتہ کر لیا جس پر بڑی اور چھوٹی مملکتیں جن کا بالٹک میں مفاد تھا، راضی ہو گئیں۔

۱۹۳۸ء میں فنستان نے آلینڈ میں قلعہ بندی کرنی چاہی جس کے ۱۹۲۱ء والے سمجھوتے میں ترمیم کی ضرورت تھی چنانچہ

اس نے نہ صرف سوئڈن کو راضی کر لیا بلکہ بڑی مملکتوں کو بھی جنھوں نے پچھلے سمجھوتے پر دستخط کئے تھے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن روس کے اختلاف سے ڈر کر مجلس اقوام نے فنستان کو اسلحہ بندی کی اجازت نہیں دی موجودہ جنگ یورپ میں جب روس کو ہاتھ پیر مارنے کا اچھا موقع مل گیا تو اس نے بالٹک کی چھوٹی مملکتوں کے ساتھ معاہدات طے کر لئے جن کی رو سے اہم مقامات پر قلعہ بندی کرنے اور بحری و ہوائی مرکز قائم کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا لیکن بالٹک میں روسی اقتدار کی تکمیل کے لئے فنستان پر قبضہ کرنا بھی روس کے لئے ضروری تھا اس سلسلے میں روس اور فنستان کے درمیان کئی مرتبہ گفتگو ہوئی اور پاساکیوی کے تحت فینی وفد کئی مرتبہ ماسکو ہو آیا مگر اس کے باوجود کوئی خوش گوار نتیجہ بر آمد نہیں ہوا سویٹ حکومت کا مطالبہ تھا کہ کریلا میں بحری مرکز قائم کرنے کے لئے اسے چند جزیرے مل جائیں لیکن فنستانی وزیر اعظم کا جاندر اس پر راضی نہ ہوئے اور بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ۳۰ر نومبر سنہ ۳۹ء کو روس نے اپنی بری، بحری اور ہوائی طاقتوں سے فنستان پر حملہ کر دیا اور ہلسنکی پر بم باری ہونے لگی فنستان نے بھی مقابلے کی ٹھانی اور اگرچہ فنستانی حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور مشہور اشتراکی ایم ٹیانر نے نئی حکومت بنائی مگر فنستان کے بڑے جاں نثار فیلڈ مارشل مینا ہیم اعلیٰ فوجی کمان وار بنے اور ۲۵ لاکھ فنستانی روس کے ۱۷ کروڑ سپاہیوں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور گو فنستان روس کے مقابلے میں بہت حقیر ہے لیکن اس نے روس کا ایسا مقابلہ کیا کہ خود روس بھی ششدر ہو کر رہ گئے۔

یورپی دول

روس کے اس حملے کے اثرات یورپی دول پر بھی پڑے چنانچہ روس کی اس پیشقدمی سے ہسپانیہ اور اطالیہ میں ناراضی کا اظہار ہونے لگا اور سوویٹ حکومت پر ملامت کی جانے لگی اگرچہ اطالیہ سرکاری طور پر غیر جنبہ دار رہا مگر اطالوی باشندوں کی ہمدردیاں فنستانیوں کے ساتھ ہیں اور روس کی دست درازیوں پر نفرت کر رہے ہیں. ہسپانیہ میں تو حکومت نے ایک قرارداد منظور کر لی جس میں روس کی اس حرکت کو وحشیانہ بتایا گیا. ظاہر ہے کہ ان حالات میں جرمنی کے پرانے دوست اس کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ روس اس کے ساتھ ہے چنانچہ اطالیہ اور اسپین اب جرمنی کے بالکل مخالف ہیں اور یہ ماسکو کی دوستی کا صلہ ہے جو ہٹلر کو ملا۔

فوجی کارروائیاں

سوویٹ فوجوں نے تین طرف سے فنستان پر حملے کر دئے ایک تو جنوب میں خلیج کریلیا کی طرف سے، دوسرا مشرق میں کریلیا کی لانبی سرحد پر، اور تیسرا شمال میں ضلع پٹ سامو کی طرف سے چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ صرف شمالی رُخ سے سوویٹ حملہ کامیاب رہا اور جنوب میں مینارہیم لائن پر بہت مضبوطی کے ساتھ جمے رہے۔ مشرقی رُخ سے روس کی یہ کوشش تھی کہ کولاجروی اور سوموسلمی کی طرف خلیج بوتھنیا تک آگے بڑھ جائیں اور اس طرح فنستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں مگر اس کوشش میں بھی روسیوں کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی روس کی سب سے بڑی کامیابی آرکٹک کے خطے میں ہوئی جہاں اس نے پٹ سامو جیسی اہم بندرگاہ پر قبضہ کر لیا لیکن اس کا یہ منصوبہ کہ جنوب میں مینارہیم لائن کی طرف سے اندر گھس جائے اور فنستان کے بڑے اور اہم شہروں پر قبضہ کرے خاک میں مل گیا کیونکہ روسی فوج کو پہلی شکست خلیج کریلیا ہی میں ہوئی جہاں سے وہ مینارہیم کو توڑ دینا چاہتی تھی۔ یہاں فنستانیوں نے موسمی حالات سے فائدہ اٹھایا اور روسیوں کو منہ کی کھانی پڑی اس پر روس کھسیانی بلی کی طرح کھمبا

توجہ نے لگا اور یہ اعلان کر دیا کہ میانرہیم لائن زیگفریڈ لائن کی طرح بہت مستحکم ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ روسی فوج کی ناکامی کا بڑا سبب خود اس کی غیر منظم حالت ہے۔

روس کی پریشانی

فنستان جیسے چھوٹے ملک کی حیرت انگیز جرات روس کے لئے بہت پریشان کن ہے کیونکہ اس کی غیر معمولی مزاحمت کی وجہ سے اسٹالن کے منصوبوں میں رکاوٹ پڑ گئی بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ سُرخ فوج کی کمزوریوں کا حال دنیا کو معلوم ہو گیا اگر اسٹالن کی فوجیں فنستان کی مہم میں کا ... ہی ہو جائیں تو یہ یقینی ہے کہ دوسری چھوٹی مملکتوں کو جن پر ... میں حملہ کرنا چاہتا ہے مقابلے کی ہمت ہو جائیگی۔ چنانچہ فنستان کے بہادرانہ اقدام سے رومانیا کو بہت ہمت ہو گئی اور اگر روس رومانیا کی طرف رُخ کرے تو وہ ضرور مقابلے کے لئے کھڑا ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹالن اسکینڈنیوی مملکتوں سے جو فنستان کی مدد کر رہی ہیں بہت برہم ہو گیا، اور برلن روسی سفیر ناروے اور سوئیڈن کو دھمکانے لگا کہ وہ اپنی غیر جانبداری کے مسلک سے ہٹ رہے ہیں۔

فنستان کی مشکلات

فنستان کی طویل سرحد پر جو روس کے ساتھ ملی ہوئی ہے ہر جگہ سے حملہ کیا گیا تھا اور فنستان کو ایسی فوج کا مقابلہ کرنا تھا جو تعداد میں اس کی فوج سے کہیں زیادہ تھی۔ روسیوں نے منرہیم پر اپنی پوری توجہ لگا رکھی تھی اور جھیل لاڈوگا کے شمال مشرق کی طرف سے آگے بڑھنے گئے، مگر فنستانیوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا اور روسیوں کو اس جگہ ہزیمت ہو گئی۔ بلکہ فنستانی فوجیں پیشقدمی کر کے خود روسی علاقے میں جولانیاں دکھانے لگیں فیلڈ مارشل منرہیم نے اپنی پوری قوت منرہیم لائن پر لگا دی اور یہی فنستان کے لئے مفید تھا۔ مگر شمال اور مشرق کی طرف سے روس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی اس طرف سے روسیوں کی یہ کوشش تھی کہ فنستان کو سوئیڈن سے بالکل الگ کر دے۔ اس کے لئے انھوں نے سومو سلمی کو فتح کر لیا اور خلیج بانھنیا کی طرف بڑھتے ہوئے اولو پر بھی قبضہ کر لیا۔ شمال میں سالا، اور کولاجروی بھی روسی قبضے میں آگئے اور کیمی جروی کے قریب ریل کے ایک اہم مرکز پر بھی جہاں سے سوئیڈن کی امداد پہنچتی تھی، قبضہ کر لیا گیا نیز سوویٹ فوجیں پٹساموکے جنوب میں بھی بڑھنے لگیں۔ اب مارشل میانرہیم نے اپنی محفوظ فوج سے کام لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو شکست کھا کے پیچھے ہٹنا پڑا، اور فنستانی فوج نے سالا کو دوبارہ حاصل کر لیا اب فنستانیوں کی ہمت اور بڑھ گئی، وہ ہر محاذ پر روسیوں کا مقابلہ کرنے لگے اور روسی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں فنستان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ موسمی حالات نے اس کا ساتھ دیا اور ایک منظم فوج اور میانرہیم جیسے ماہر فن اس کی پشت پناہ ہیں۔

مسٹر ہور بلی شا

جنوری کے دوسرے ہفتے میں برطانوی کابینہ میں ایک تبدیلی ہو گئی، یعنے برطانیہ کے وزیر جنگ مسٹر ہور بلی شا نے استعفیٰ دے دیا انھوں نے برطانوی فوج کی تنظیم میں بڑا حصہ لیا تھا اور ان کی اہم خدمات کا کئی مرتبہ اعتراف بھی کیا گیا۔ مگر یہ بات ضرور تعجب انگیز ہے کہ وزیر جنگ فوج کے نئے عہدہ داروں کے ساتھ کام نہ کر سکے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لارڈ گارٹ سے ان کو اختلاف تھا اور حال میں جنرل آئرن سائڈ سے بھی جو شاہی جنرل اسٹاف کے صدر ہیں، مسٹر ہور بلی شا کی مخالفت ہو گئی غالباً انھی اختلافات کی وجہ سے مسٹر ہور بلی شا نے استعفیٰ دے دیا اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مسٹر چمبرلین نے کابینہ میں ان کو ایک دوسرا عہدہ دینا چاہا لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور وزیر اعظم کو ان کا استعفیٰ منظور کرنا ہی پڑا اگر کابینہ کی اس تبدیلی کے کسی طرح یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ برطانیہ جنگ کی نسبت کوئی کمزوری دکھائے گا انگلستان میں جنگ کی سرگرمیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور فرانس میں اتحادی فوجوں کے اعلیٰ کماندار جنرل گیملین ہیں جن کی مدافعت جنگ کے مسلک میں کوئی تبدیلی نہ ہوسکے گی خود مسٹر ہور بلی شا کو جنگ کے جاری رکھنے کے متعلق کوئی اختلاف نہیں تھا اس طرح ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ جنگ کو برابر جاری رکھے گی۔

عہد آفرین مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔ اڈیٹر عبد الحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی چند مطبوعات

گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس پر ماہرین متعلقہ اردو کے مشہور مبصرین نے گراں قدر آرا کا اظہار فرمایا ہے ۔ صاحبزادہ میکش ایک ہونہار شاعر ہیں جنہوں نے اپنے ذوق رسا اور اپنی فطری شاعرانہ قوتوں کے باعث جدید شاعری میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے ۔ آپ گریہ و تبسم کے ذریعہ "شباب و شعر" کو اپنی حقیقی صورت میں جلوہ گر پائیں گے ۔ ضرور پڑھیے دیدہ زیب طباعت ، خوبصورت جلد ۔ قیمت (عاں) روپیے ۔

مغربی تصانیف کے اردو تراجم ۔ میر حسن ام ۔ اے کا وہ تحقیقاتی مقالہ ہے جس پر انہیں ارباب جامعہ عثمانیہ نے ام ۔ اے کا طیلسان عطا کی ۔ قابل مصنف نے نہایت محنت و کاوش سے اس کتاب میں ایسا قیمتی مواد جمع کیا ہے ، جو اردو میں تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے رہنمائی کا باعث ہو سکتا ہے ۔ ان تمام اصحاب کے لئے جو زبان کے ارتقاء میں تراجم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے اس کتاب کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں مجلد قیمت (عہ) روپئے

محبت کی چھاؤں ۔ حیدرآباد کے ہونہار فسانہ نویس مرزا ظفر الحسن بی ۔ اے کے دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے "محبت کی چھاؤں" میں شباب کی پرچھائیاں شباب و محبت کو اپنی طرف کھینچتی ہیں ۔ نوجوانوں کے حقیقی جذبات اپنے نفسیاتی تیور اظہار کے ساتھ "محبت کی چھاؤں" میں مچلتے نظر آتے ہیں ۔ "محبت کی چھاؤں" میں محبت کے جلوے ہیں ۔ "محبت کی چھاؤں" محبت سے بنائی گئی ہے ۔ "محبت کی چھاؤں" زندگی ہر اور زینت زندگی کا جلوہ بے باک ۔ دیدہ زیب سرورق ۔ مجلد قیمت (عہ) روپیے

سائنس کے کرشمے ۔ میر حسن ام ۔ اے نے سائنس سے متعلق ملک کے ماہرین سائنس کی ان تقریروں کو جو نشر گاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں ، کتابی صورت میں مرتب کیا ہے نثری ادب کی یہ خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ عام فہم ہوتا ہے سائنس کے مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے ۔

" سائنس کا ہر کرشمہ " اصطلاحوں کی دنیا میں ہمارے لئے "کرشمہ" بنا رہتا ہے لیکن جب ہم اسے سمجھ جاتے ہیں ۔ تو وہ ایک عام چیز نظر آتا ہے ۔ جو لوگ اصطلاحوں سے گھبرا کر سائنسی ادب کا مطالعہ نہیں کرتے وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں قیمت (۱) آنے

کاغذ کی ناؤ ۔ صاحبزادہ میکش کی چھ مسائلی تمثیلوں کا مجموعہ ہے ۔ دنیا کے تلاطم خیز سمندر میں غریبوں کی زندگی ایک کاغذ کی ناؤ ہے جو تصورات اور امیدوں کے پتوار سے چلائی جاتی ہے لیکن مصائب و آلام کے تھپیڑے اسے ہمیشہ کے لئے مذاق کر دیتے ہیں ڈراما اور شعریت کو کہیں آپ ہم آہنگ دیکھنا چاہتے ہیں تو " کاغذ کی ناؤ " ضرور پڑھیے جس میں زندگی مجسم درد بنی ہوئی نظر آئے گی ۔ قیمت ( ) روپیے

سب رس کتاب گھر (خیریت آباد)

"بچوں سے"

اردو نمبر تو تم نے ضرور پڑھا ہوگا اکثروں نے اس کی تعریف میں خطوط بھیجے ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ سب رس کی آئندہ ترقی کا دارومدار بھی آپ ہی لوگوں پر ہے۔ اردو نمبر میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جن کا سب سے اچھا مضمون، افسانہ یا نظم سنہ ۱۹۳۹ء کے سب رس کے پرچوں میں چھپی ہو ان کو نواب سیف علی خاں صاحب ناظم کتب خانہ ادارہ کی جانب سے انعام دیا جائے گا۔ سب سے اچھا مضمون "حامد کا امتحان" ہے اس لئے یہ مضمون انعام کے قابل سمجھا گیا۔

سٹی کالج کے وسطانیہ کے طلبہ نے ان کے ایک جلسہ کی روداد بھیجی ہے اس سے پہلے بھی ان کی ایک روداد چھپ چکی ہے۔ یہ بچوں کی ایک اچھی انجمن ہے اس انجمن میں اکثر چھوٹے بچے ہیں اور اکثر ان میں ہمارے مضمون نگار بھائی ہیں مثلاً حبیب شمس وغیرہ جن کے مضامین اکثر آپ نے سب رس میں پڑھے ہیں۔ ان لڑکوں نے حال ہی میں اپنے ایک لڑکے کا تعزیتی جلسہ منایا اکثروں نے تقریریں کیں اور بعضوں نے اس لڑکے پر نظمیں سنائیں جلسہ کامیاب رہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کی روداد کا صرف ہم خلاصہ چھاپ رہے ہیں کیونکہ بعض بچوں نے لکھ بھیجا ہے کہ سب رس مختصر پرچہ ہے اور اگر روداد چھپنے لگیں تو مضامین کم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اسکول کے بچوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے اور ان لوگوں کی طرح اپنے اسکول میں انجمن قائم کر سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے جلسہ کی روداد مختصر کر دی ہمارے شعبۂ طلبہ کا ایک جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف کو احمدیہ جوبلی ہال واقع افضل گنج شام میں ۵ بجے رحیم الدین ظہیر آبادی نائب صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا ہم نے طلبہ کی آسانی کے لئے یہ تصفیہ کیا ہے کہ آئندہ سے جلسے تمام مذکورہ ہی پر منعقد ہو۔ امید کہ طلبہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس دن مباحثہ کا عنوان تھا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے" محرک خدا بخش سلیم تھے اور مخالف تہنیت علی خاں تھے دونوں نے تائید میں اور مخالفت میں بہت اچھی تقریریں کیں پھر عبدالمجید نے عنوان کی تائید کی۔ رائے لی گئیں اور تصفیہ پایا کہ "ہندوستانی طلبہ کے لئے فوجی تعلیم لازمی ہے" آخر میں صدارتی تقریر ہوئی جس میں صدر جلسہ نے کافی روشنی ڈالی۔ ایک نظم اور پھر معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور ایک جلسہ ۲۶ اسفندار کو ہوا جس میں پروفیسر سید محمد صاحب ایم۔ اے "ہمارے طلبہ اور ہماری زبان" پر تقریر کی اس کی روداد آئندہ مہینہ کے سب رس میں شائع کی جائے گی۔

معین الدین احمد انصاری

انعامی معمہ: تین ۳ دیا سلائیوں کی مدد سے تین ۳ مثلث متساوی الاضلاع بناؤ؟

صحیح حل پر [illegible] "انعام میں دی جائے گی نیز یادہ صحیح حل موصول ہونے پر قرعہ اندازی سے انعام نکالا جائیگا۔

خواجہ معین الدین (گلبرگہ)

ایماندار ریڈ انڈین

ایک دفعہ ایک بوڑھے ریڈ انڈین نے ایک یورپین دوکاندار سے کچھ چیزیں مول لیں۔ جب وہ چیزیں لے کر اپنے خیمہ (ڈیرے) کو واپس آیا اور چیزوں کے گٹھے کو کھول کر دیکھا تو اس میں دوکاندار کے کچھ روپے بھی نظر آئے۔ "میں بہت ہی خوش نصیب ہوں!" آپ سے اس نے کہا اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس رقم سے بہت سی چیزیں مول لوں گا۔

جب رات ہوئی تو ریڈ انڈین سونے چلا گیا لیکن اسے رات بھر نیند نہیں آئی کیونکہ تمام رات اسے روپیوں کا خیال آتا رہا۔ اس نے کئی دفعہ پکا ارادہ کیا کہ "میں اس رقم کو اپنے ہی قبضہ میں رکھوں گا اور دوکاندار کو ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔" مگر اس کے بعد ہی اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اس کے اندر سے کہہ رہا ہے کہ "تمھیں یہ روپے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے بلکہ ان کو اصلی مالک کے پاس پہونچا دینا چاہیے۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح ریڈ انڈین یورپی دوکاندار کے پاس گیا اور اس کی رقم اس کو دے دی۔

دکاندار نے حیرت سے پوچھا کہ "تم نے یہ رقم اپنے لئے کیوں نہیں رکھ لی؟" ریڈ انڈین نے جواب دیا کہ میرے اندر دو آدمی بولتے معلوم ہوتے تھے۔ ایک آدمی کہتا تھا کہ "تم یہ روپیے رکھ لو۔ دوکاندار کو کبھی اس کا پتہ نہ چل سکے گا کہ تم ہی نے روپئے لئے ہیں۔" لیکن دوسرا آدمی میرے اندر سے کہتا تھا کہ "یہ رقم تمھاری نہیں ہے، دوکاندار اس کا مالک ہے اسی کو دے دو۔" تب پہلا آدمی کہتا کہ "تم روپئے رکھ لو کسی کو مت دو۔" پھر فوراً ہی دوسرا کہتا شروع کرتا کہ "نہیں نہیں تم ان روپیوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ تم کو چاہیئے کہ دوکاندار کو واپس دے دو۔"

ان دونوں خیالوں یا آدمیوں نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا۔ اب میں روپئے آپ کو دیتا ہوں۔ آج دونوں آدمی میرے اندر باتیں نہیں کریں گے اور میں آرام سے سو سکوں گا۔

سب سے بھائی اور بہنو! تم حیران ہو کر دریافت کرو گے کہ کہیں آدمی کے اندر سے بھلا آواز بھی آتی ہے۔ ہم تمھیں بتا دیتے ہیں کہ یہ دو آوازیں یا دو خیال جو اس ریڈ انڈین کے دل میں پیدا ہو رہے تھے دراصل یہ نیکی اور بدی کے محرک یعنی پیدا کرنے والی آوازیں ہیں۔ وہ آدمی یا وہ آواز جو کہتی تھی کہ "تمھیں یہ روپے اصلی مالک یعنی دوکاندار کو واپس کر دینے چاہیں"۔ وہ نیکی کی آواز تھی۔ ذرا تفصیل سے سمجھو تو یہ ہے کہ تمھارے دل میں ہمیشہ دو قوتیں پیدا ہوتی ہیں ایک قوت نیک کام کرنے کو کہتی ہے دوسری برا کام کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ اب اس قوت کو جو کہ ریڈ انڈین کے اندر نیکی کرنے کا حکم دیتی تھی ہم اسے ضمیر کہتے ہیں۔ اگر تم اپنے ضمیر کی آواز پر ہر کام کو انجام تک پہونچاؤ تو تم دنیا میں کامیاب رہو گے اور تمھارا دین بھی بہتر رہے گا مگر جب تم اپنے ضمیر کے خلاف یعنی اس ریڈ انڈین کے دل میں جو قوت برائی کا کام کرنے یعنی روپیہ لے لینے کی تحریک کرتی تھی اس کے کہنے پر چلو گے تو تم دنیا میں ذلیل ہو جاؤ گے اور کوئی ترقی نہیں کر سکو گے، اسی طرح ضمیر کے خلاف کرنے سے تم دین بھی اپنے لئے خراب پیدا کر لو گے۔

دیکھو! ایک جاہل، اور بالکل اجڈ وحشی جو کہ تمھاری مانند عالی شان عمارتوں میں نہیں رہتا بلکہ پتوں کی جھونپڑی یا چمڑے کے خیمہ (ڈیرے) میں اپنی زندگی گذارتا ہے وہ اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کر کے کس طرح ایک یورپین کے دل میں عزت پیدا کر لیتا ہے میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ جب کبھی تمھیں ایسے مواقع

"بچوں سے"

اردو نمبر تو تم نے ضرور پڑھا ہوگا اکثروں نے اس کی تعریف میں خطوط بھیجے ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ سب رس کی آئندہ ترقی کا دارومدار بھی آپ ہی لوگوں پر ہے۔ اردو نمبر میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جن کا سب سے اچھا مضمون، افسانہ یا نظم ۱۹۳۹ء کے سب رس کے پرچوں میں چھپے ہو ان کو نواب سیف علی خاں صاحب ناظم کتب خانہ ادارہ کی جانب سے انعام دیا جائے گا۔ سب سے اچھا مضمون "حامد کا امتحان" ہے اس لئے یہ مضمون انعام کے قابل سمجھا گیا۔

سٹی کالج کے وسطانیہ کے طلبہ نے ان کے ایک جلسہ کی روئداد بھیجی ہے اس سے پہلے بھی ان کی ایک روئداد چھپ چکی ہے۔ یہ بچوں کی ایک اچھی انجمن ہے اس انجمن میں اکثر چھوٹے بچے ہیں اور اکثر اس میں ہمارے مضمون نگار بھائی ہیں مثلاً حبیب شمس وغیرہ جن کے مضامین اکثر آپ نے سب رس میں پڑھے ہیں۔ ان لڑکوں نے حال ہی میں اپنے ایک لڑکے کا تعزیتی جلسہ منایا اکثروں نے تقریریں کیں اور بعضوں نے اس لڑکے پر نظمیں سنائیں جلسہ کامیاب رہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کی روئداد کا صرف ہم خلاصہ چھاپ رہے ہیں کیونکہ بعض بچوں نے لکھ بھیجا ہے کہ سب رس مختصر پرچہ ہے اور اگر روئداد چھپنے لگیں تو مضامین کم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اسکول کے بچوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے وہ ان لوگوں کی طرح اپنے اسکول میں انجمن قائم کر سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے جلسہ کی روئداد مختصر کر دی ہمارے شعبۂ طلبہ کا ایک جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف کو احمدیہ جوبلی ہال واقع افضل گنج شام میں ۵ بجے رحیم الدین ظہیر آبادی نائب صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا ہم نے طلبہ کی آسانی کے لئے یہ تصفیہ کیا ہے کہ آئندہ سے جلسہ مقام مذکور ہی پر منعقد ہو۔ امید کہ طلبہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس دن مباحثہ کا عنوان تھا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے" محرک خدا بخش سلیم تھے اور مخالف نعمت علی خاں تھے دونوں نے تائید میں اور مخالفت میں بہت اچھی تقریریں کیں۔ میر عبدالمجید نے عنوان کی تائید کی۔ رائے لی گئیں اور تصفیہ پایا کہ "ہندوستانی طلبہ کے لئے فوجی تعلیم لازمی ہے" آخر میں صدارتی تقریر ہوئی جس میں صدر جلسہ نے کافی روشنی ڈالی۔ ایک نظم اور صدر معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور ایک جلسہ ۲۶ اسفندار کو ہوا جس میں پروفیسر سید محمد صاحب ایم۔اے "ہمارے طلبہ اور ہماری زبان" پر تقریر کی اس کی روئداد آئندہ مہینہ کے سب رس میں شائع کی جائے گی۔

معین الدین احمد انصاری

انعامی معمہ: تین ۳ دیا سلائیوں کی مدد سے تین ۳ مثلث متساوی الاضلاع بناؤ؟

صحیح حل پر "سونیل چال" انعام میں دی جائے گی۔ زیادہ صحیح حل وصول ہونے پر قرعہ اندازی سے انعام نکالا جائے گا۔

خواجہ معین الدین (گلبرگہ)

ایماندار ریڈ انڈین

ایک دفعہ ایک بوڑھے ریڈ انڈین نے ایک یورپین دوکاندار سے کچھ چیزیں مول لیں۔ جب وہ چیزیں لے کر اپنے خیمہ (ڈیرے) کو واپس آیا اور چیزوں کے گٹھے کو کھول کر دیکھا تو اس میں دوکاندار کے کچھ روپے بھی نظر آئے۔ میں بہت ہی خوش نصیب ہوں! اپنے آپ سے اس نے کہا اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس رقم سے بہت سی چیزیں مول لوں گا۔

جب رات ہوئی تو ریڈ انڈین سونے چلا گیا لیکن اسے رات بھر نیند نہیں آئی کیونکہ تمام رات اسے روپیوں کا خیال آتا رہا۔ اس نے کئی دفعہ پکا ارادہ کیا کہ میں اس رقم کو اپنے ہی قبضہ میں رکھوں گا اور دوکاندار کو ایک روپیہ بھی نہ دوں گا۔ "مگر اس کے بعد ہی اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اس کے اندر سے کہہ رہا ہے کہ "تمھیں یہ روپے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے بلکہ ان کو اصلی مالک کے پاس پہونچا دینا چاہیے۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح ریڈ انڈین یورپی دوکاندار کے پاس گیا اور اس کی رقم اس کو دے دی۔

دکاندار نے حیرت سے پوچھا کہ "تم نے یہ رقم اپنے لئے کیوں نہیں رکھ لی؟"۔ ریڈ انڈین نے جواب دیا کہ میرے اندر دو آدمی بولتے معلوم ہوتے تھے۔ ایک آدمی کہتا تھا کہ "تم یہ روپے رکھ لو۔ دوکاندار کو کبھی اس کا پتہ نہ چل سکے گا کہ تم ہی نے روپے لئے ہیں۔" لیکن دوسرا آدمی میرے اندر سے کہتا تھا کہ "یہ رقم تمھاری نہیں ہے، دوکاندار اس کا مالک ہے اسی کو دے دو۔" تب پہلا آدمی کہتا کہ "تم روپے رکھ لو کسی کو مت دو۔" پھر فوراً ہی دوسرا کہنا شروع کرتا کہ "نہیں نہیں تم ان روپیوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ تم کو چاہیے کہ دوکاندار کو واپس دے دو۔"

ان دونوں خیالوں یا آدمیوں نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا۔ اب میں روپے آپ کو دیتا ہوں۔ آج دونوں آدمی میرے اندر باتیں نہیں کریں گے اور میں آرام سے سو سکوں گا۔

سب ہی بھائی اور بہنو! تم حیران ہو کر دریافت کرو گے کہ کہیں آدمی کے اندر سے بھلا آواز بھی آتی ہے۔ ہم تمھیں بتا دیتے ہیں کہ یہ دو آوازیں یا دو خیال جو اس ریڈ انڈین کے دل میں پیدا ہو رہے تھے دراصل یہ نیکی اور بدی کے محرک یعنی پیدا کرنے والی آوازیں ہیں۔ وہ آدمی یا وہ آواز جو کہتی تھی کہ تمھیں یہ روپے اصلی مالک یعنی دوکاندار کو واپس کر دینے چاہئیں"۔ وہ نیکی کی آواز تھی۔ ذرا تفصیل سے سمجھو تو یہ ہے کہ تمھارے دل میں ہمیشہ دو قوتیں پیدا ہوتی ہیں ایک قوت نیک کام کرنے کو کہتی ہے دوسری برا کام کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ اب اس قوت کو جو کہ ریڈ انڈین کے اندر نیکی کرنے کا حکم دیتی تھی ہم اسے ضمیر کہتے ہیں۔ اگر تم اپنے ضمیر کی آواز پر ہر کام کو انجام تک پہونچاؤ تو تم دنیا میں کامیاب رہو گے اور تمھارا دین بھی بہتر رہے گا مگر جب تم اپنے ضمیر کے خلاف یعنی اس ریڈ انڈین کے دل میں جو قوت برائی کا کام کرنے یعنی روپیہ لے لینے کی تحریک کرتی تھی اس کے کہنے پر چلو گے تو تم دنیا میں ذلیل ہو جاؤ گے اور کوئی ترقی نہیں کر سکو گے، اسی طرح ضمیر کے خلاف کرنے سے تم دین بھی اپنے لئے خرابی پیدا کر لو گے۔

دیکھو! ایک جاہل، اور بالکل اجڈ وحشی جو کہ تمھاری مانند عالی شان عمارتوں میں نہیں رہتا بلکہ پتوں کی جھونپڑی یا چمڑے کے خیمہ (ڈیرے) میں اپنی زندگی گذارتا ہے وہ اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کر کے کس طرح ایک یورپین کے دل میں عزت پیدا کر لیتا ہے میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ جب کبھی تمھیں ایسے مواقع

پیش آئیں تو تم اطمینان کے ساتھ نیکی کی طرف جھک جاؤ گے اور ایمانداری کے خلاف کوئی کام نہ کرو گے۔

سید خدا بخش سلیم

"عادت"

بھائیو! والٹر اسکاٹ نامی انگریز ادیب کا نام ادبی دنیا میں جس احترام کیساتھ لیا جاتا ہے وہ تو تمھیں معلوم ہے۔ مگر آج میں تم سے اس کی ایک عادت کے متعلق کچھ بیان کروں گا۔

والٹر اسکاٹ لڑکپن ہی سے نہایت ذہین و ذکی تھا۔ اپنی ذہانت کی بدولت جماعت میں ہمیشہ اول رہتا تھا۔ اس کی جماعت میں ایک دوسرا لڑکا بھی بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ جو اسکاٹ کی امتیازی کامیابی پر رشک کرتا اور ہمیشہ اس سے آگے بڑھ جانے کی سعی کرتا تھا۔ اسکاٹ نے اس کو کبھی بڑھنے نہ دیا لیکن اسکاٹ کو ایک عادت یہ تھی کہ جب ماسٹر صاحب اس سے سوال کرتے تو جواب دیتے وقت عموماً وہ اپنے کوٹ کے بٹن ہاتھ کی انگلیوں سے نیچے اوپر کرتا تھا۔ جب اسکاٹ کی اس عادت سے دوسرا چالاک لڑکا واقف ہو گیا تو اس نے خیال کیا "اگر میں اس کے بٹن کاٹ ڈالوں تو ضرور ہے کہ وہ اپنی عادت کے موافق بٹن دیکھے گا اور جب بٹن غائب رہیں گے تو لازماً اس کا خیال بٹن کی طرف مائل ہوگا اور وہ بہتر طریقہ پر جواب ادا نہ کر سکے گا تو میں اس سوال کا جواب بہتر طریقہ پر ادا کر کے پہلا درجہ حاصل کر لوں گا"۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کو اپنی کامیابی کی امید ہو گئی۔

دوسرے دن جب ماسٹر صاحب نے اسکاٹ سے سوال کیا تو اسکاٹ نے حسب عادت انگلیوں سے بٹن نیچے اوپر کرنا چاہا مگر اس کے ہاتھ بٹن سے محروم تھے کیونکہ دوسرے چالاک لڑکے نے کچھ دیر قبل اس کی بے خبری کے عالم میں بٹن کاٹ ڈالے تھے۔ چنانچہ اسکاٹ کا خیال بٹن کی طرف منتقل ہو گیا جس کی وجہ وہ سوال کا جواب بہتر طریقہ پر نہ دے سکا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس چالاک لڑکے نے سوال کا جواب اسکاٹ سے بدرجہا بہتر ادا کر کے پہلا درجہ حاصل کر لیا۔

عزیز بھائیو! اب تو آپ نے جان لیا ہوگا کہ اسکاٹ کو انگلیوں کی مدد سے بٹن نیچے اوپر کرنے کی کس قدر معمولی عادت تھی مگر اس نے اس حقیر عادت کی وجہ اپنا اتنا کھو دیا۔ کوئی عادت خواہ کتنی ہی حقیر اور معمولی ہو مگر اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دانت چبانا، ناخن کترنا، گردن ٹیڑھی کرنا، انگلیاں چٹخانا وغیرہ ایسی عادتیں ہیں جو بظاہر بالکل معمولی ہوتی ہیں مگر یہ اپنا بہت بڑا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اس قسم کی عادتیں نہ صرف کمسن بچوں میں ہی ہوتی ہیں بلکہ بعض ذی شعور اصحاب بھی ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مجھے ایک واقعہ یاد ہے جبکہ ایک معزز ہستی نے ایک ایسی ہی معمولی عادت کی وجہ خفت اٹھائی۔ ہمارے گاؤں میں ایک باوقار اور صاحب ثروت آدمی تھے جنھیں ایک عادت یہ تھی کہ جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھتے تو کرسی کو آگے پیچھے ہلاتے تھے۔ ایک وقت صاحب موصوف ایک جلسہ میں شریک تھے۔ مقرر دوران تقریر کہہ رہا تھا کہ آنجناب نے بھی رنگ میں آکر کرسی کو آگے پیچھے ہلانا شروع کر دیا۔ سوئے اتفاق سمجھئے یا مولانا کی شومئی قسمت کہ کرسی کا توازن قائم نہ رہا اور کرسی گر پڑی اور جناب نے بھی زمین پر آکر ہی دم لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجلس کی فضا حاضرین محفل کے قہقہوں سے گونج اٹھی بعض زندہ دل اصحاب نے تو تالیاں بجا کر مبارکباد بھی دی ہو۔

عادت کی عموماً دو بڑی قسمیں ہیں (۱) اچھی عادتیں (۲) بری عادتیں۔ لڑکوں کے لئے اچھی عادتیں علی الصباح اٹھنا، ہر کام کا وقت پر کرنا اور اپنے خالق و آقائے حقیقی کی عبادت کرنا وغیرہ

وغیرہ ہیں اور بری عادتوں میں چند تو اوپر بیان کردی گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جنہیں کم و بیش ہر شخص جانتا ہے۔ لڑکوں میں عموماً اچھی عادتوں کے بجائے بری عادتیں ہی پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے جب کبھی ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم میں کوئی بری عادت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو دور کریں اور اس کے بجائے اچھی عادت کو جگہ دیں۔ مثل مشہور ہے "عادی بننا آسان ہے مگر اس سے چھٹکارہ پانا مشکل ہے" ایسی صورت میں ہمارا اولین فرض یہی ہے کہ ہم پہلے ہی سے اپنے آپ کو اچھی عادتوں کا خوگر بنا لیں تاکہ بعد میں ندامت اور خفت اٹھانی نہ پڑے اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا احترام، عزت و توقیر محض ہماری عادتوں پر موقوف ہے۔

محمد عبد القادر فاروقی (حمایت نگری)

"جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"

ارے بچے! اس غریب چڑیا کو پتھر کا نشانہ نہ بناؤ" پیچھے سے ایک بوڑھا آدمی چلا اٹھا۔

کیوں جناب۔ لڑکے نے کہا اس چڑیا کی عمدہ آواز کو سننے کی مجھ میں تاب نہیں اسلئے میں اس کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔

بوڑھا۔ ہاں سچ ہے۔ اس کی آواز تو خداداد ہے۔ اس کا کیا قصور۔ خدا کی دی ہوئی چیز ہر ایک کو پیاری ہے کیا انسان۔ کیا حیوان ہر ایک خدا کا شکر بجالاتے ہیں۔ جس نے ہم سب کو ایسی ایسی چیزیں عطا کی ہیں کہ جن کو ہم لکھ سکتے ہیں، گن سکتے ہیں جس طرح تمھاری آواز تم جیسے انسانوں کو پیاری ہے اسی طرح اس چڑیا کی آواز اس کے ہم جنسوں کو پیاری ہے کبھی کسی کو بری نظر سے نفرت دیکھو۔ بچے! تم ابھی نادان ہو۔ ان باتوں کو تم کیا جانو۔ خدا نے تم کو قوت دی ہے اس کو کسی اچھے کام میں صرف کرو۔ یہ نہیں کہ غریب بے زبان پرندوں کا اپنی قوت سے کام تمام کرو۔ تم کو کوئی شخص گرا دے یا گالی دے تو تمھیں غصہ آجائے گا اور تم اس سے بدلہ لینے کی ہزاروں کوشش کرو گے اور بدلہ لئے بغیر خاموش نہ ہو گے۔

لڑکا۔ اجی جناب۔ رہنے دیجئے اپنی تقریر کو۔ میں یہاں جی بہلانے آیا ہوں اور آپ ہیں کہ میرے کام میں خلل انداز ہو کر نصیحت کر رہے ہیں۔

بوڑھا۔ بیٹا۔ تم نہیں سمجھتے۔ تم جس کو کھیل سمجھے ہوئے ہو وہ اس چڑیا کی موت ہے تم کوئی ایسا کھیل کھیلو جس سے سب لوگ تم سے خوش ہوں۔ معصوم پرندوں کو مارنے سے لوگ تم سے کبھی خوش نہ ہوں گے۔ بلکہ تم سے نفرت کرینگے۔

لڑکا۔ واہ! آپ بھی خوب کہتے ہیں" لوگ مجھ سے نفرت کریں گے"۔ یہ آپ کی بھول ہے سب یہی کہیں گے کہ دیکھو بچہ کتنا ہوشیار ہے۔ چڑیوں کا شکار کرتا ہے۔ شوق تو اچھا ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ جب بڑا ہوگا تو شیر جیسے بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرے گا

بوڑھا۔ یہ تو تمہارا خیال ہے لیکن ان معصوم پرندوں کو مارنا کتنا گناہ ہے۔ اس چڑیا نے تمہیں کیا نقصان پہونچایا ہے جو تم اس کو مار رہے ہو۔

جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے رشتہ دار کتنا افسوس کرتے ہیں۔ یہ تو شاید تم پر بھی گزری ہوگی۔ چڑیا کے گھر والے بھی ہونگے اگر یہ بیچاری تمھارا شکار بن جائے تو وہ خوب رنج کریں گے زمین و آسمان ایک کردیں گے۔ ہم ان کی باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کے مصیبت کے دکھڑے نہیں سن سکتے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں تم شکار کی گھات میں رہ کر خود شکار نہ بن جاؤ۔

لڑکا۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔

بوڑھا۔ تم ان باتوں کو کیا جانو۔ مثل مشہور ہے "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دوسروں کی

برائی کرنا چاہو تو پہلے تم خود برے ہوگے۔ نیکی کروگے تو تمھارا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔ اور ہر شخص تمھیں عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

لڑکا۔ اچھا ... آپ کا مطلب۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کسی دوسرے کو سمجھائیے۔

بوڑھا۔ میرے بچے! تم ابھی نادان ہو۔ جب بڑے ہوگے تو تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تمھیں اس وقت اس کی قدر ہوگی۔ اب کھیل کود میں ان سب باتوں کو بھلا رہے ہو۔ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ پتھر الٹا تمھیں نقصان نہ پہونچائے۔

لڑکا۔ کہیں پتھر واپس بھی آتا ہے۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں

بوڑھا۔ ہاں واپس آسکتا ہے۔ اگر تم نہیں سمجھے تو آؤ میں تم کو سمجھاتا ہوں۔ (لڑکا نزدیک آجاتا ہے اور کان لگا کر سنتا ہے۔)

بوڑھا۔ ۵۰ سال پہلے میں تم جیسا ایک بچہ تھا۔ ہر روز پرندوں پر پتھر پھینکا کرتا تھا۔ اس روزانہ کی مشق سے میں ایک کامیاب نشانہ باز بن گیا۔ میرا کوئی پتھر بھی خالی نہ جاتا تھا۔ میرے مکان کے پہلو میں ایک بوڑھے آدمی کا مکان تھا وہ ضعیفی کی وجہ سے کوئی کام نہ کرسکتا تھا۔ ہر روز میں اس کا کام کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھا۔ اس مکان کی چھت میں کسی چڑیا نے ایک گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس میں اس کے دو بچے بھی تھے جب ماں آتی تو وہ چیں چیں کا شور کرتے اور ماں کی چونچ سے دانہ لینے کی کوشش کرتے۔ ایک دن وہ چڑیا ایک کھمبے پر بیٹھی ہوئی تھی میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس کی بھولی بھالی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے یہ اظہار ہو رہا تھا "مجھے کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ"۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ میرے دل میں یہ بات سمائی کہ چلو آج اسی چڑیا کو نشانہ بناؤں۔ دیکھوں تو میرا نشانہ پہلا سا ہے یا نہیں۔ میں نے ایک ایک پتھر نے اس کو دے مارا چڑیا کی گردن ٹوٹ گئی زمین پر آرہی۔ اور تڑپ تڑپ کر اپنی جان دی۔ میں خوش تھا لیکن جب میں نے اس کو تڑپتے دیکھا تو مجھے بہت صدمہ ہوا میں پچھتانے لگا کہ کیوں میں نے اس بیچاری کی جان لی ع

اب پچھتائے ہوت کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اب چڑیا کا کام تمام ہوگیا اب رنج کرنے سے کیا حاصل۔

اس کا جوڑا "چڑا" تمام دن اس کے اطراف چکر لگاتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کے لئے خوب رویا۔ اور خوب ہی ماتم کیا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے بہت افسوس کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے میرے سینہ میں نشتر چبھو دیا۔ میرا رنج کرنا اس وقت کا ہی تھا بلکہ ہمیشہ کا ہی رونا میں نے مول لیا۔ میں نے یہ واقعہ اس شخص سے نہ کہا لیکن اسے کسی طرح سے معلوم ہوگیا تھا۔ اور وہ مجھ سے کچھ نہ کہا۔ میں اب اس قابل نہ رہا کہ اس کو اپنی صورت دکھا سکوں۔ مجھے جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے اور تمام جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دیکھو میرے بچے! اسی معمولی نشانہ سے مجھے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں نے جیسا کیا تھا مجھے ویسا ہی بدلہ ملا "جیسا کروگے ویسا بھروگے" میرا بھی یہی حال ہوا۔

لڑکا یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور پتھر زمین پر پھینک دیا۔

اس طرح بیچاری چڑیا کو کوئی تکلیف نہ پہونچی — اور لڑکے کو آیندہ کے لئے نصیحت ہوگئی۔

میا رام پرشاد

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰ M
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۴)
اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی
معین الدین احمد انصاری

(۱) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیدیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہوجاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد سے شائع ہوا

اداریہ

دانائے راز ۱۹۳۸ء کا ایسا ہی اپریل تھا، جس نے ہم سے اقبال کو چھین لیا، اس عرصہ میں اقبال کے جوش اور ولولہ کی روح جو اس کے کلام کی صورت میں موجود ہے، اور جب تک دنیا، زندگی کی محتاج ہے، موجود رہے گی، ترقی پسند ذہنیتوں پر اپنا اثر بڑھاتی رہی۔ آج، اقبال کے پرستار اتنے زیادہ ہو گئے ہیں، جتنے کہ اس کی زندگی میں بھی نہ تھے۔ اس کی موت اصل میں بے روح زندگیوں پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ جب موت نے اس کی آنکھیں بند کیں، تو زندگی نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم اس کی بچی ہوئی شراب کی طرف ساغر بہ کف، بڑھنے لگے —— بڑھ رہے ہیں —— بڑھتے جائیں گے۔

اقبال کے کلام اور اس کی زندگی پر اہل ہند نے کافی توجہ کی اور شاید ہی کسی مشرقی شاعر پر اس قدر ادب، شایع ہوا ہو، جس قدر کہ اقبال پر شایع ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال، مستقبل کا شاعر تھا، اس نے انسانیت کا جو نصب العینی کردار اپنے کلام کے ذریعے سے تخلیق کیا ہے، وہ ایسا نہیں ہے جو آواز بن کر ختم ہو جائے۔ اس کا پیام، بانسری کی سریلی تان نہیں، بلکہ صور اسرافیل ہے۔ اس نے لوری نہیں دی بلکہ شانہ ہلا ہلا کر جگا یا۔ اس نے سکون کی تلقین نہیں کی بلکہ "حرکت و حیات" کا نعرہ لگایا —— یہ "اضطراب مسلسل" جس کی طرف کلام اقبال، رہنمائی کرتا ہے، "زندگیٔ دوام" سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جیسے جیسے خواب سے نیم خوابی اور نیم خوابی سے بیداری پیدا ہوتی جائے گی، اقبال کے کلام کا اثر بھی بڑھتا جائے گا۔ اس کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں کئی معلوم و نامعلوم منزلیں پوشیدہ ہیں۔ اس لئے فکر و نظر جیسے جیسے ان گہرائیوں میں اترتی جائے گی، اس کو ہر لمحہ نیا طور نظر آئے گا اور ہر نئے طور پر نئی برق تجلی۔ اقبال، پیمانوں کو دیکھ کر شراب تقسیم کرتا ہے، جس کا جتنا پیمانہ ہو، اتنی ہی شراب لیتی ہے اور جتنی شراب لیتی ہے اتنا ہی نشہ حصہ میں آتا ہے —— دنیا، اقبال کے کلام سے جس قدر قریب ہوتی جائے گی، اس کی کشش اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔

گنبدِ شاہ سراج اورنگ آباد میں حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کا گنبد نہایت بوسیدہ حالت میں تھا، ادارہ کی تحریک پر مولوی غلام احمد خاں صاحب سابق صوبہ دار نے اس کی ترمیم کے لیے کارروائی کا آغاز کیا تھا اور اب مولوی عبد الباسط خاں صاحب صوبہ دار نے اپنی ذاتی نگرانی میں اس کو مکمل کر دیا ہے۔ ادارہ ان دونوں اصحاب کا شکر گذار ہے۔ اس گنبد کی تصویریں زیر نظر شمارے میں شایع کی جا رہی ہیں۔

دکنی اور دیہاتی شاعری حیدر آباد میں دکنی اور دیہاتی زبان میں شاعری کرنے کا خبط بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ہر شاعر جو شاعرہ میں داد حاصل کرنا چاہتا ہو، زبان کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے پہلے جب نذیر احمد دہقانی، غلام علی اور اعجاز حسین کھٹا نے ان زبانوں میں شعر کہنے شروع کئے تھے تو ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ادبی مسخروں کی ایک جماعت پیدا کی جائے۔ جن اصحاب نے، دہقانی، علی اور کھٹے کی نظمیں سنی ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے ہنسی ہنسی میں سننے والوں کے دلوں میں چٹکیاں بھی لی ہیں۔ زبان سے قطع نظر ان کی بلندیٔ فکر، پروازِ تخیل، اور وسعتِ نظر نے سونے والوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری کا کمال چھلکے میں نہیں بلکہ مغز میں پوشیدہ ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ہماری محفلوں میں اہل نظر اتنے نہیں ہوتے جتنے کہ تماشائی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کو اکثروں نے مذاق سمجھ کر قہقہوں کا خراج دیا اور اب ان کے مقلد، ان کے کلام کی مقبولیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہر روز ایسا شاعر پیدا ہو رہا ہے جس کی کھوپڑی دبی ہوئی ہے اور جس کی زبان تتلاتی ہے۔ اسے کون سمجھائے کہ صرف دکنی یا دیہاتی زبان مقبولیت کا راز نہیں ہے بلکہ مقبول ہونے کی وہ صلاحیت ہے جو دلوں کی آواز کو دلوں میں اتارتی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ دکنی اور دیہاتی شاعری کی یہ وبا کہیں دہقانی، علی اور کھٹے کے مقاصد کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اور ملک ایک عام تاثر کی

بنا پر ایسے اچھے شاعروں کی بلند فکری سے محروم نہ ہو جائے، جیسے کہ دہقانی، علی اور کھنّا ہیں۔ اس لئے اربابِ ذوق کو اس خوش فکری کے خلاف ایک حوصلہ شکن محاذ بنانا چاہئے جو ہماری زبان کو بگاڑ رہی ہے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ وہ دکنی اور دیہاتی زبانیں جو اپنا کشکولِ شعری لئے مشاعرے میں "واہ واہ" کی بھیک مانگتی ہیں، دکن کے کسی دیہات میں بھی نہیں بولی جاتیں اور جو زبان بولی جاتی ہے اس سے ہمارے یہ شاعر واقف بھی نہیں۔

نذرِ دکن جنوری کے رسالۂ اردو میں تنقید و تبصرہ کے عنوان کے تحت ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کا مضمون "نذرِ دکن تنقید کی آگ میں" پڑھ کر ہمیں سخت تعجب ہوا۔ اگر اس پر مؤلف کا نام نہ ہوتا تو ہم اور ہماری طرح ہر ایک یہی سمجھتا کہ کسی خام کار اور نوسیکھ مضمون نگار نے خواتین کی انشار پردازانہ قوتوں سے جل کر اپنے احساسِ کمتری کا اظہار اس مضمون کی شکل میں کیا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ ڈاکٹر صاحب کے اس جوشِ تحریر کی بنیاد کیا ہے۔ جس کتاب کو انھوں نے بنیاد قرار دے کر اپنی ساری بھڑاس نکالنے کی کوشش کی ہے وہ رسالۂ سب رس بابت جنوری ۱۹۳۸ء کا ضمیمہ ہے۔ اس میں خواتین کے وہ مضامین شائع ہوئے ہیں جو سب رس کے دکن نمبر کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اور تنقید نگار کا اردو میں اپنی "کنواری کوشش" کے آزمانے کے لئے اس کتاب کا انتخاب کرنا! اُن کے حسنِ انتخاب کی دلیل ہے۔

یہ تو انتخاب ہوا لیکن اس چھ جزو سے بھی کم صفحات کی کتاب پر انھوں نے کتنے صفحے سیاہ کئے ہیں! اس سے دوگنی سائز کے (۱۲) صفحے تو سامنے ہیں نہ معلوم کتنے اور باقی ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے احساسِ تناسب کا ثبوت ہے۔ تنقید میں "باقی دارد" ایک جدت ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا عنوان "نذرِ دکن تنقید کی آگ میں" سنجیدہ تنقید نگاری کے لب و لہجے سے کس قدر بعید ہے نہ معلوم یہ آگ ان کے دل میں کہاں سے پیدا ہوئی اور کیوں پیدا ہوئی؟ ایک معقول اور سنجیدہ تنقید نگار پہلے دماغ میں آگ کیوں سلگا لیتا ہے، کسی آتش گیر اور شعلہ فشاں دماغ سے کیا کسی معقول اور تعمیری تنقید کی توقع ہو سکتی ہے؟

ہم یہ دیکھ کر ایک تبسم کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر یہ ابتدائی اصول ان کے دائرۂ علم میں ہوتا تو وہ اپنی تنقید کا عنوان کم از کم یہ نہ رکھتے! پھر ماشاء اللہ سے عمر بھر میں پہلی بار تنقید پر قلم اٹھایا اور پہلی ہی کوشش میں یہ عدمِ توازن اور مغلوب الغضبی کی آگ!

قبل اس کے کہ کوئی تنقید کے میدان میں اپنے غضب ناک گھوڑے کو بے لگام چھوڑے کیا کسی اصول تنقید کی مشق اور واقفیت کی ضرورت نہیں ہے، جس کی شکایت دکن کے مصنفین و مصنفات سے کی گئی ہے کہ وہ مشق کئے بغیر ادبی میدان میں کود پڑتے ہیں۔

یہ ایک معمولی سی بات ہے جو ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ کتاب کی نوعیت جس قدر علمی ہوتی ہے تنقید کا لب و لہجہ اسی قدر سنجیدہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی پہلے ہی سے کسی وجہ کی بنا پر پل پڑنے پر تیار بیٹھا ہوا ہو تو پھر اس سے کسی طرح کے توازن کی کہاں توقع ہو سکتی ہے۔ اس اصول کے تحت کہ ایک آتش فشاں تحریر کی تفصیل پر نظر ڈالنا علمی شان کے خلاف ہے ہم دل سے نہیں چاہتے تھے کہ اس تنقید کی غلطیوں پر نظر ڈالیں۔ لیکن پھر یہ خیال ہوتا ہے ایک پڑھے لکھے آدمی کو تھوڑا سا آگاہ کر دینا ایک قسم کی علمی نیکی ہوگی۔

تنقیدی اسلوب اور ادبی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس کتاب پر تنقید کی جا رہی ہے اسی کی حد تک اعتراض کئے جائیں، اسی کے نقائص بتائے جائیں۔ لیکن یہاں نام تو نذرِ دکن کا دیا ہے اور اپنے الٹے سیدھے بیانات کو ثابت کرنے کے لئے نقاد نے ایسے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جن میں سے اکثر کو نذرِ دکن تو کجا ادبیاتِ اردو کی کسی دوسری کتاب سے بھی تعلق نہیں۔

اس مضمون میں بعض اعتراض کے ساتھ کہیں [illegible]

مختصر فقروں کو توڑ مروڑ کر ادبی غلطیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے تو کہیں مضمون نگاروں کو جو حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین ہیں "خود پسند"، "خود فریب" اور "مبتدی انشا پرداز" وغیرہ قرار دیا ہے۔ تنقید کا منشا محض مخالفت اور ذاتی عناد معلوم ہوتا ہے، اس میں تعمیر و اصلاح کو ذرا بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ادارۂ ادبیات اردو سے بعض غرض پرست اصحاب ناراض ہیں اور اس کے مختلف شعبوں خصوصاً شعبہ نسواں کی مساعی (جس کی بدولت یہاں کی خواتین میں انشا پردازی اور مضمون نگاری و محنت و مطالعہ کا ذوق روز بروز بڑھ رہا ہے) انہیں سخت ناگوار معلوم ہو رہی ہے لیکن ہمیں کم سے کم ڈاکٹر جعفر حسن صاحب سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے جذبۂ خود نمائی کے اس طرح کے اظہار سے کسی کے ذاتی اختلاف کو اس درجہ ناخوش گوار اور غیر علمی انداز میں منظر عام پر لانا پسند کریں گے۔ تعجب ہے کہ رسالۂ اردو کی سنجیدگی اور متانت نے اس مضمون کی اشاعت کیسے روا رکھی؛ سچ ہے مخالفت انسان کو انجان بنا دیتی ہے۔

ہندی والوں کی باہمی رواداری اور زبان کی خدمت کا شوق ہم لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کے مضمون کے خلاف ہمارے پاس متعدد مضامین وصول ہوئے ہیں۔ بعض میں ان پر اسی طرح کی سخت چوٹیں کی گئی ہیں جیسی کہ انھوں نے کی ہیں، بعض میں سنجیدگی سے ان کی اکلوتی کتاب پر تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مضامین خواتین کے قلم سے ہیں اور ان میں ڈاکٹر صاحب کے اوصاف انشا پردازی کا پردہ عجیب طریقہ پر چاک کیا گیا ہے۔ لیکن ہم ان سب مضمون نگاروں سے معذرت چاہتے ہیں، ہمیں ڈاکٹر صاحب پر اس طرح کے حملے کرنے مقصود نہیں کہ ان کو اپنی کتاب کی وجہ سے جس نمود و نمائش کا موقع نہیں ملا تھا وہ اب اس تنقید کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تخلیقی کام مشکل ہے اور تخریبی آسان پھر تخلیقی کام میں نمود و نمائش کا موقع کہاں! اگر یہ پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ وہ شعبۂ نسواں کی دوسری کتابوں نذر دلی، من کی بتیا، سوتیلی ماں، سوانح محمد حسین آزاد وغیرہ کو چھوڑ کر سب رس کے ضمیمہ کو اپنے تمام تر سرمایۂ خردہ گیری کا شکار بنا دیں گے اور رائلٹی کا پرمٹ کر دیں گے تو ہم شعبۂ نسواں کو رائے دیتے کہ نذر دکن کو دکن کی بجائے انہیں کے نام سے معنون کر دیں۔ کیونکہ انھوں نے ہندی نظم کا انتخاب چھاپ کر اردو دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اور زیر نظر تنقید میں غالب کو شیفتہ کا شاگرد بتا کر اپنی ادبی معلومات کا شاندار ثبوت دیا ہے۔!!

ممکن ہے کہ ہم آئندہ کسی اشاعت میں محض علمی اغراض کے تحت ایک دو سنجیدہ مضمونوں کو جن میں ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ تنقیدی مضمون اور کتاب منتخبات ہندی کلام کا تنقیدی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے شایع کریں اور ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ دیں کہ وہ تنقید کی آگ میں اپنی تحریروں کے سونے کو بھی ڈال کر دیکھ لیں شاید اس میں کچھ کھوٹ نظر آئے۔ ہمیں ان سے ہمدردی ہے کہ اس تنقید سے ان کے فہم و ذوق کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ کیونکہ انھوں نے اس میں خواتین کے مضمونوں سے متعدد لفظوں اور ترکیبوں کو نقل کر کے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وہ ان سے ناواقف ہیں حالانکہ یہ وہ الفاظ ہیں جن کو ہر اردو پڑھا لکھا شخص استعمال کرتا ہے اور خاص کر دکن میں جہاں اردو اور فارسی صدیوں سے تحریری زبان رہی ہے ان لفظوں کو مرد اور عورتیں سب سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ اردو کا کوئی ادیب ایسا نہ ہوگا جو فارسی اور عربی لفظوں کے خلاف اس شدت سے جہاد کرنا چاہتا ہو غرض اس تنقید میں ایسی عجیب اور مبتدیانہ باتیں لکھی ہیں کہ ان کو دیکھ کر وہ مثل یاد آتی ہے کہ کوا ہنس کی چال چلا تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ جو لوگ اپنا میدان چھوڑ کر دوسروں کے میدان میں ریس کرنے کے لئے محنت اور مشق کئے بغیر کود پڑتے ہیں ان کا یہی نتیجہ ہوتا ہے ——

ادارہ کی خبریں

گزشتہ شمارے میں جگہ کی قلت کی وجہ سے شعبوں کی روداد میں شریک نہ ہو سکیں، ہم شعبوں کے داعیوں سے معافی چاہتے ہیں۔ اس اثنا میں جن شعبوں کے جلسے ہوئے ان کی مختصر سی تفصیل یہ ہے۔

شعبۂ سائنس کا ایک جلسہ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر کیمیا نظام کالج کے مکان پر منعقد ہوا جس میں معتمد صاحب شعبہ کے علاوہ پروفیسر سید محمد یونس ذوالفقاری، شاہ محمد صاحب، فیض محمد صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت کی۔ سائنس سے متعلق عام کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ پیش ہوا اور شعبہ کی طرف سے جو کتابیں زیر ترتیب ہیں ان کی رپورٹ دی گئی۔ چنانچہ ان میں سے دو کتابیں آب دوز کشتیاں اور سرنگ اور پانی کی کہانی چھپ چکی ہیں، یہ باتصویر ہیں اور ان کے سرورق سہ رنگی، دیدہ زیب بنائے گئے ہیں، ہر ایک کتاب کی قیمت باوجود متعدد تصاویر کے صرف چھ چھ آنے رکھی گئی ہے۔

شعبۂ نسواں اس عرصے میں اس شعبہ کے دو اجلاس ہوئے جن میں سے پہلا ۱۰ فروری ۴۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں رابعہ بیگم صاحبہ، لطیف النساء بیگم صاحبہ، جہاں بانو بیگم صاحبہ، بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر اور سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ نے شرکت کی، شعبہ کے مدرسۂ بالغات کے نظم و نسق، طالبات کی حاضر باشی، تعلیمی ترقی، اور تعداد کے اضافے سے متعلق تفصیلی طور پر تبادلۂ خیال کیا گیا جس سے مدرسہ کی مجموعی حالت اطمینان بخش ثابت ہوئی، سوزن کاری کا کام سکھانے کے لئے محترمہ ملکہ بیگم صاحبہ سے استدعا کی گئی تھی اور وہ ایک عرصے سے اعزازی طور پر دلدہی سے یہ کام انجام دے رہی ہیں، پکوان سکھانے کے لئے مسز یونس صاحب اور نٹنگ (بننا) سکھانے کے لئے مسز نجم الدین صاحب نے رضاکارانہ کام کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔

شعبہ کے سرمایہ میں اضافہ کے لئے ربیع الاول کے اوائل میں ایک کانسرٹ کرنا طے پایا جس کے بعد شعبہ کا اجلاس عام منعقد کیا جائے گا۔ عظیم النساء بیگم صاحبہ کے افسانوں کو منتخب کر کے بعد نظر ثانی ادارہ کی طرف سے شائع کرنے کی تجویز منظور ہوئی، اس شعبہ کی طرف سے جو کتاب محمد حسین آزاد کے سوانح حیات پر زیر طبع تھی وہ اس مہینے میں شائع ہو چکی ہے، یہ اردو کے اس بلند پایہ انشا پرداز اور ادیب کے حالات زندگی پر پہلی محققانہ اور مبسوط تالیف ہے اور اس کی ترتیب پر اس کی مصنفہ ج نقوی صاحبہ ایم اے قابل مبارکباد ہیں۔

شعبۂ امتحانات کی ذیلی مجلس کا ایک اجلاس ابھی منعقد ہوا جس میں مولوی سجاد مرزا صاحب نائب صدر، ڈاکٹر زور صاحب اور پروفیسر سروری صاحب نے شرکت کی، اس میں اردو امتحانات کے امیدواروں کے لئے نصاب سے متعلق تقریروں کا پروگرام مرتب اور منظور ہوا، چنانچہ اس کی بناء پر ختم مارچ تک نو تقریریں ہو چکی ہیں اور اپریل میں حسب ذیل تقریریں کوا پر ٹیو ہال سائچہ توپ میں شام کے ۶½ بجے ہوں گی۔

پنجشنبہ ۴ اپریل شبلی اور موازنہ انیس و دبیر۔ سعادت علی صاحب رضوی ایم اے
دوشنبہ ۸ اپریل جوش کی شاعری اور فکر و نشاط۔ مخدوم محی الدین صاحب ایم اے
دو تقریریں پنجشنبہ و جمعہ ۱۱ و ۱۲ اپریل نفسیات جذبات (فلسفۂ جذبات عبدالماجد) صلاح الدین صاحب ایم اے
یکشنبہ ۱۴ اپریل آزاد اور آب حیات:۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے
سہ شنبہ ۱۶ اپریل مقالات سائنس:۔ فیض محمد صاحب بی اے ڈی پی ایڈ
جمعہ ۱۹ اپریل چکبست کے مضامین:۔ سید محمد صاحب ایم اے
یکشنبہ ۲۱ آئین حکومت:۔ عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔
جمعہ ۲۶ اپریل:۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ سراج الدین صاحب ایم اے
دو تقریریں پنجشنبہ و جمعہ ۹ و ۱۰ مئی معاشیات (ڈاکٹر ذاکر حسین) ناصر علی صاحب ایم اے

شعبۂ امتحانات قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اتنی اچھی مبسوط تقریروں کا انتظام کیا، جو نہ صرف ادارہ کے امتحانوں کے امیدواروں ہی کے لئے بلکہ ان متعدد اصحاب کے لئے دلچسپی اور علمی و ادبی تغذیہ کا کام دے رہی ہیں جن کو اردو ادب سے لگاؤ ہے۔

شعبۂ زبان

اس کا ایک اجلاس یکم مارچ کو منعقد ہوا، اس میں قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی سید محمد صاحب، نواب سیف علی خاں صاحب، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، پروفیسر سروری صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب اور ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی معتمد شعبہ نے شرکت کی جو تحریکیں پیش اور منظور ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں

(۱) عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ دفتری مراسلت میں انگریزی کا استعمال بلاوجہ بڑھایا جا رہا ہے جو سرکاری احکام اور منشاء کے بالکل خلاف اور جس سے اردو زبان کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے، یہ ادارہ اردو زبان کے بہی خواہوں اور سرکاری عہدہ داروں کو سرکاری احکام اور مقاصد کی تکمیل کی طرف توجہ دلاتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ آئندہ بجز ناگزیر صورتوں کے ہمیشہ اردو زبان کے استعمال کو لازمی قرار دیا جائے گا۔ اراکین سے استدعا کی گئی کہ وہ انفرادی طور پر انگریزی کے بیجا استعمال کی مثالوں سے ادارہ کو مطلع کرتے رہیں۔ مذکورہ قرارداد کو مقامی اخباروں میں شایع کر دیا گیا ہے۔

(۲) جمال الدین حیدر صاحب کی پیش کردہ فہرست جو دکھنی الفاظ اور محاوروں پر مشتمل ہے قاضی عبدالغفار صاحب کی نظر ثانی کے بعد پیش ہوئی۔ اور سابقہ فیصلہ کے تحت ڈاکٹر رضی الدین صاحب کے ہاں بھیج دی گئی، نیز اس سلسلہ میں حسب ذیل حضرات سے مراسلت کرنے کا تصفیہ ہوا، آغا حیدر حسن صاحب، راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر، قاضی میر لطف علی صاحب عارف۔ چنانچہ ان کے یہاں مراسلے روانہ کر دیے گئے ہیں۔

(۳) اردو زبان کی سلاست و روانی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ غیر زبانوں کی جمع اور ترکیب بلا ضرورت استعمال نہ کی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے اردو کے مقررہ اصول کی پابندی کی جائے یہ قرارداد بھی بالاتفاق منظور ہوئی اور مقامی اخباروں میں بھی شایع ہو چکی ہے۔

شعبۂ طلبہ

اس کے جلسوں کا تذکرہ صفحہ [illegible] پر درج ہے۔

ادارہ کی شاخیں

افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ادارہ کی جملہ شاخوں سے متعلق اس شمارے میں بھی تفصیلی معلومات نہیں شایع ہو سکیں، اس مہینہ ۱۲ مارچ کو گلبرگہ میں بمقام محبوب کلب ادارہ کی ایک نئی شاخ قائم کرنے کے لئے جلسہ منعقد ہوا جس میں گلبرگہ کے صوبہ دار صاحب، اول تعلقدار صاحب، تحصیلدار صاحب، سعید الزماں صاحب لکچرار کالج، عبدالوہاب صاحب قاضی گلبرگہ، معراج الدین صاحب گتہ دار کے علاوہ متعدد مقامی اصحاب نے شرکت کی۔ سید محمود حسین صاحب معتمد نے ادارہ کی تاریخ اور کاموں پر روشنی ڈالی اور گلبرگہ میں دو مہینہ سے اس سے متعلق جو کام ہو رہا ہے اس کا اظہار کیا۔ تبادلۂ خیال کے بعد گلبرگہ میں باضابطہ طور پر شاخ کا افتتاح، ایک کی تجویز اور طرز کار اور دیگر امور طے پائے جس کی تفصیل مقامی اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔

کتب خانہ

اس ماہ ادارہ کے کتب خانے میں حسب ذیل عطیے وصول ہوئے جن کا منجانب ناظم صاحب کتب خانہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے، سید محمد ہادی صاحب ناظم بائے اسکوٹ اور ورزش جسمانی حسب ذیل پندرہ کتب اور آٹھ مختلف رسائل۔

۱۔ بست سالہ عہد حکومت۔ ۲۔ آئین قیصری۔ ۳۔ تاریخ نراب۔ ۴۔ تاریخ گلزار شاہی۔ ۵۔ تذکرۂ اعرابی۔ ۶۔ سچی محبت۔ ۷۔ نشتر۔ ۸۔ تاریخ خاندان عثمانیہ۔ ۹۔ سرگزشت لینسڈون۔ ۱۰۔ آئینۂ عرب۔ ۱۱۔ فتنہ۔ ۱۲۔ سفرنامہ قسطنطنیہ عراق و ایران۔ ۱۳۔ اقوام ٹرکی۔ ۱۴۔ سیر ظلمات۔ ۱۵۔ میکدۂ ناز۔

قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام ۲۲ مختلف رسالے۔ پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے ثمرۃ الادب جلد اول مکمل۔ اردوئے معلی اور ترقی کے چھ چھ شمارے۔

ادارہ دوسروں کی نظر میں

علامہ سلیمان ندوی

گزشتہ ماہ جب حیدرآباد تشریف لائے تھے

تو ادارہ کا معاینہ بھی کیا تھا۔ واپسی پر انھوں نے مارچ کے **معارف** میں اپنے سفر حیدرآباد کے تاثرات لکھے ہیں جن میں ادارہ کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"یہاں اردو کا ایک اور ادارہ بھی دیکھا جس کا نام ادارۂ ادبیات اردو ہے' اس کے چلانے والے زیادہ تر جامعۂ عثمانیہ کے نوجوان گریجویٹ ہیں جن کی سربراہی پروفیسر زور' عبدالقادر سروری عبدالمجید صدیقی وغیرہ کر رہے ہیں' دو تین ہی سال کے عرصہ میں اس ادارہ نے سو کے قریب کتابیں شائع کر دی ہیں کچھ کتابوں اور اردو کے قدیم اخباروں کا سرمایہ بھی جمع ہو گیا ہے' اردو کے ہر دور کے شاعروں' مصنفوں اور ادیبوں کے مرقع بھی رکھے ہیں' اردو کی تاریخ کے نقشے بھی نہایت خوبصورتی سے بنائے ہیں۔"

سب رس کا اردو نمبر

اردو نمبر کے متعلق کئی صاحب ذوق اصحاب کے خطوط وصول ہوئے ہیں۔ لیکن خانگی خطوں کا شائع کرنا ہمیں کچھ پسند نہیں۔ یہاں آگرہ کے مشہور رسالہ **شاعر** نے اپنے فبروری کے شمارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کو نقل کیا جاتا ہے۔

"سب رس ارض دکن کا سب سے وقیع اور بلند ماہنامہ ہے جسے ادارۂ ادبیات اردو کے مقتدر اراکین کی سرپرستی حاصل ہے زیر نظر' اردو نمبر اردو سے متعلق مضامین کا ایک اچھا اور یادگار مجموعہ ہے متعدد معیاری' ادبی مضامین اس نمبر میں نظر آتے ہیں مثلاً اردو ادب کا مطالعہ' موجودہ اردو شاعری' اردو کے نظم گو شعرا' اردو ادب اور قومی شاعری' ہندوستان کی زبان' ادب اور فن' اردو شاعری اور کلام غالب' خدمت گزار' ذکر میر' مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط وغیرہ۔ حصہ نظم متنوع اور بلند ہے جس میں اکثر جدید [illegible] [illegible]

[illegible] ماہر القادری' عندلیب شادانی' سکندر علی وجد جیسے ممتاز شعرا کی نظمیں [illegible] مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ ایک یادگار مرقع ہے اور بھی بہت سے قدیم و جدید شعرا اور ادبا کی ۴۰ تصاویر ہیں جو حقیقتاً ادارہ نے بڑی کوشش سے مہیا کی ہوں گی۔ یہ نمبر اس قابل ہے کہ ہر صاحب ذوق اس کا مطالعہ کرے' اردو ادب و شعر سے متعلق اس میں کافی مواد ہے۔"

بچوں کا سب رس

ہمارے اس بڑے سب رس کے علاوہ اس کے دو ضمیمے علیحدہ مستقل رسالوں کی صورت میں بھی شائع ہوتے ہیں جن میں سے ایک بچوں کا ضمیمہ ہے۔ یہ ضمیمہ چھوٹے بچوں ہی کے لئے نہیں بلکہ وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں کے طلبہ کے لئے بھی شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں بچوں اور طلبہ کے لئے ایسے دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں چھپتی رہتی ہیں جو غیر درسی مطالعہ کا ذوق بڑھانے میں مدد دیتی ہیں۔

بعض اصحاب نے اس خیال سے کہ یہ بالکل چھوٹے بچوں کا پرچہ ہے اس کے بعض مضمونوں کے متعلق ہمیں توجہ دلائی ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کی استطاعت سے زیادہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کیونکہ اس کے بعض مضمون وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلبہ ہی کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔

طلبا اور بچوں میں سب رس کا یہ چھوٹا پرچہ بہت مقبول ہوا اور اس کی تعداد اشاعت اب بڑے پرچے کے قریب قریب پہنچ گئی ہے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔

سب رس معلومات

سب رس کا یہ ضمیمہ عام علمی دستہ اصحاب اور کالجوں کے ان طلبہ کے لئے نکالا جا رہا ہے جو مقابلوں کے امتحانات میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ بعض اصحاب ایسے ہیں جو غزلوں' نظموں اور افسانوں سے زیادہ ٹھوس معلومات کے مضمون پسند کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ضمیمہ جاری کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے چند ہی شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ بھی بہت مقبول ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی قیمت بھی [illegible] ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔




گنبد شاہ سراج اورنگ آبادی

(ادارہ کی ترمیم و تعمیر کے بعد)

(رمضان ۱۳۵۸ھ سے قبل)

سراج اورنگ آبادی

(تکیہ، مکان اور عرس کے متعلق چند معلومات)

حضرت سید شاہ سراج کی وفات کے بعد ان کا تکیہ اور مکان ان کے خلیفہ شاہ چراغ صاحب کے قبضہ میں آیا۔ اور ان کے بعد ان کے فرزند مقبول چراغ صاحب کے اور مقبول چراغ صاحب کے بعد ان کے فرزند روشن چراغ صاحب کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر کے اولاد نہ تھی اور وہ اتنے مفلس ہو گئے تھے کہ تکیہ کی حصار بندی و حفاظت اور شاہ سراج صاحب کا عرس بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ اپنی ماں کی بیماری میں مکان رہن رکھا دیا تھا اور جب ماں کا انتقال ہو گیا تو ان کا دل بھی اچاٹ ہو گیا ادھر تکیہ کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی اس لئے انھوں نے بیس ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو آٹھ آنے کے ایک کاغذ مہر پر ایک دستاویز بنام سید جعفر شاہ صاحب ولد سید کریم شاہ صاحب خلیفہ نقشبندی لکھ دیا جس میں لکھا ہے کہ۔

"من کہ روشن چراغ ابن مقبول چراغ مالک درگاہ و مکان دار حضرت سید شاہ سراج قدس سرہٗ ساکن محلہ ڈیوڑھی بازار من محلات بلدہ اورنگ آباد ام

چوں نوشتہ می دہم و اقرار صحیح و واثق می نمایم برایں معنی کہ خدمت تولیت درگاہ موصوف کہ بر کنارہ نالہ پنچ کنواں واقع است بلا تسہیم و شراکت احدے از بزرگاں من مقر تا حال شدہ می آید و زمین درگاہ شریف و اشجار آنبہ و تمر ہندی وغیرہ واقع آنجا در قبض و تصرف می داشتم چوں دریں ولا بہ باعث ابتری مزاج خود و نہ بودن ادائی شرط خدمت تولیت درگاہ شریف خرابی و ابتری از حد گردید کہ تعویذ مزار بزرگاں و حصار وغیرہ آنجا منہدم گشتہ۔

و بہ نظر تہی دستی و مفلوکی آئندہ ہم طاقت استواری و درستی آں نمی دارم لہٰذا بہ رضا و رغبت خود بلا اجبار و اکراہ روبروئے گواہاں مندرجہ ہذا اسمی سید جعفر شاہ ولد سید کریم شاہ خلیفہ نقشبندی را متولی درگاہ موصوف مقرر کردہ مالک و مختار گردانیدم۔ الی آخرہ"

اس کاغذ پر جن گواہوں کے نام ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ قربان شاہ خادم مقبول علی شاہ (مہر ۱۲۶۶ھ) (۲) غلام محمد صدیقی (مہر ۱۲۸۷ھ) (۳) محمد ہاشم مشروع باف ساکن شاہ بازار (۴) محمود نواز خاں نیازی (مہر ۱۲۸۰ھ) (۵) میر تقی علی (مہر ۱۲۷۰ھ) (۶) غلام غریب (۱۲۸۴ھ) قنبر ولد سیدی قاسم (مہر ۱۲۸۲ھ) میر امام الدین ولد شاہ ظہور الحق۔ نادعلی شاہ ارشاد۔ مرتضیٰ شاہ صدر سرگروہ وغیرہ

اس کے سات روز بعد روشن چراغ صاحب نے اور ایک دستاویز لکھ دیا جس پر ان کی مہر بھی ہے۔ اور اس میں اس بات کا سید جعفر شاہ ولد سید کریم شاہ صاحب کو مجاز گردانا ہے کہ اپنے اختیار سے آراستگی مزار اور عود و گل کا انتظام کریں اور یہ کہ۔

"ہر چہ نذر و نیاز زائرین و دفن مردگان و ثمر اشجار وغیرہ ہر چہ وصول آید نصف متولی و نصف من مقر گرفتہ باشم"

اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں کسی کو فقیر بناؤں تو وہ میرے بعد متولی صاحب کی اجازت سے درگاہ شریف میں جاروب کشی وغیرہ کر سکتا ہے۔ اور بغیر ان کی اجازت درگاہ کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے سکے۔

اس دستاویز پر حسب ذیل اصحاب کی گواہیاں ہیں۔ (۱) سیدی قمر مشروع باف (۲) مرزا محمد علی بیگ سوار علاقہ کوتوالی (۳) محمد ہاشم مشروع باف (۴) احمد بخش۔

یہ دستاویز ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو لکھا گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں گیارہ سال بعد کے ایک اور دستاویز کا ذکر کرنا ضروری ہے جو دو آنے کے کاغذ مہور ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء پر لکھا گیا ہے اس میں سید کریم شاہ خلیفہ نقشبندی نے ۲۴ صفر المظفر ۱۳۰۰ھ روز جمعہ کو ایک وصیت نامہ لکھا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ

"آمدنی تکیہ حضرت سید شاہ سراج صاحب قدس سرہٗ دبار امرائی ..... یا رقم آن ...... وصول شود منجملہ آن یک حصہ بہ سید جعفر و یکے بہ سید عبدالرزاق فرزندانم و یک حصہ بہ زوجہ ام گرفتہ باشند"..... الیٰ آخرہٖ"

اس دستاویز پر ان گواہوں کے دستخط یا مہر ہیں۔

محمود نواز خاں نیازی۔ مرزا سنگی بیگ رسائی دار اور غلام نبی۔

اس وصیت نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اصل میں سید کریم شاہ صاحب نقشبندی نے شاہ سراج صاحب کی درگاہ اور تکیہ کی تولیت خود حاصل کر کے اس کا دستاویز اپنے فرزند سید جعفر صاحب کے نام لکھوا لیا تھا اور بعد کو اپنی وصیت میں اس خیال سے کہ کہیں اس تکیہ کی آمدنی صرف ایک ہی فرزند سید جعفر کے قبضہ میں نہ چلی جائے دوسرے ورثا (یعنی اپنے دوسرے فرزند سید عبدالرزاق تیسرے سید اکبر اور اپنی زوجہ) کے نام بھی لکھ دیے۔ اس خاندان کے شجرۂ نسب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سید جعفر صاحب لاولد فوت ہوئے اور اسی تکیہ میں مدفون ہیں۔

ان دستاویزوں کے علاوہ شاہ سراج صاحب کے سالانہ عرسوں کے موقعوں پر جو اخراجات ہوتے تھے ان کی فردہائے حساب بھی موجود ہیں جو ہماری نظر سے گذرے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ تک شاہ سراج صاحب کا مکان موجود تھا چنانچہ ایک فرد اخراجات پر لکھا ہے۔

"خرچ حساب مکان کھپریل درگاہ حضرت سید شاہ سراج صاحب قدس سرہٗ العزیز۔

دروازہ۔ استاد دروازہ۔ بالنہا۔ بند ہائے۔ چھوائی تراٹے۔ کویلو چہار ہزار فی ہزار ۴ روپیہ وغیرہ۔ جملہ (عـ۱۲/۵)"

ایک دوسری فرد (بلے) مورخہ ۱۵ شوال ۱۲۹۰ھ میں عرس کے اخراجات لکھے گئے ہیں۔ جن میں ایک چیز بڑی دلچسپ ہے، اس زمانہ میں بھی عرس کے وقت فقیروں کو گانجہ اور گڑ اکو دیا جاتا تھا۔ اس دفعہ عرس میں جملہ دس روپیہ صرف ہوئے تھے۔ اور مکان کی تعمیر میں چودہ روپے ۱۲۹۱ھ کے عرس کا بھی حساب موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بیس روپے آٹھ آنے (عـ۲۰) صرف ہوئے تھے۔ ان تمام حسابات کے دیکھنے سے اس زمانہ کی ارزانی اور نرخ اشیاء سے متعلق بڑی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً گیہوں روپے کو بیس سیر، مونگ کی دال بارہ سیر وغیرہ۔

یہ تمام تفصیل مجھے درگاہ حضرت شاہ سراج کے موجودہ متولی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب لکچرار میڈیکل کالج کی عنایت سے حاصل ہو سکی۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ حضرت شاہ سراج کے آج سے ستر سال قبل کے اعراس کے تذکرے کے وقت مجھے یکایک یہ خیال آیا کہ ہم نے بھی سفر اورنگ آباد کے وقت ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر سروری صاحب، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، مولوی محمد ابراہیم صاحب انجینیر اورنگ آباد، اور عبدالرزاق صاحب وغیرہ کے ساتھ حضرت شاہ سراج کے

مزار پر جو غلاف اور چادر گل چڑہائی تھی اس روز بھی ۱۴ شوال ہی تاریخ تھی یہ ان کی وفات کی تاریخ ہے اور اسی تاریخ عرس ہوا کرتا تھا۔ یہ نہ معلوم حسن اتفاق تھا یا شاہ سراج صاحب کی کرامت! غرض اس طرح ایک طویل عرصہ یعنی تقریباً ساٹھ ستر سال کے بعد پھر حضرت شاہ سراج صاحب کے سالانہ عرس کی ابتدا ارکان ادارہ ادبیات اردو کے ہاتوں سے ہوئی اور توقع ہے کہ آئندہ بھی سالانہ عرس ہوا کرے گا اور کیا تعجب کہ جس طرح یوم ولی منایا گیا کسی روز یوم سراج بھی اسی اعلیٰ پیمانہ پر منایا جائے۔

سید محی الدین قادری زور

محسوسات

عشق کی زندگی کو کیا کہئے　　　اپنی قسمت، کسی کو کیا کہئے
اک ذرا سی امید پر یہ حال　　　آدمی کی خوشی کو کیا کہئے
سامنے اشک ریز ہے شبنم　　　مسکراتی کلی کو کیا کہئے
پرسش حال دل ہی ہنس ہنس کر　　　اس کی ظالم ہنسی کو کیا کہئے
حسن پر اعتماد چارہ گری!　　　عشق کی سادگی کو کیا کہئے
ان کی چلمن کو چھو رہی ہے نگاہ　　　جرأت عاشقی کو کیا کہئے
موج باد صبا بھی کانپ اٹھی　　　زلف کی برہمی کو کیا کہئے
ان کے رخ پر نظر نہیں جمتی　　　چاند کی روشنی کو کیا کہئے

وہ پشیماں سے ہو گئے ماہر
آپ کی شاعری کو کیا کہئے

ماہر القادری

اشتہار بازی

فارسی زبان کا ایک پرانا اور مشہور مقولہ ہے کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر مشک اچھا ہے تو اس کی مہک آپ ہی خریداروں کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔ عطار کے کہنے سننے سے کیا حاصل۔ غور کیجئے تو اس مقولہ سے دو باتیں بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہیں ایک تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں یعنی مشرقی قوموں میں اشتہار بازی کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چنانچہ یہ "بازی" کا لفظ جو اشتہار کے ساتھ لگا ہوا ہے خود برائی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے ہنر یا کمال یا اپنی بنائی ہوئی کسی چیز کا چرچا کرے تو کہتے ہیں کہ وہ بڑا "اشتہار باز" ہے دوسری بات اس مقولے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگلے زمانے کے لوگ اشتہار بازی کو سرے سے ایک فضول سی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر چیز اچھی ہے تو آپ اپنے گاہک پیدا کر لے گی۔ ڈھول پیٹنے یا نقارہ بجانے سے کیا حاصل۔

بات دراصل یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے ہمارے ملک کی جو حالت تھی اس میں اشتہار بازی کی کچھ زیادہ گنجائش تھی بھی نہیں۔ ذرا ایک چھوٹے سے قصبہ کی حالت کو اپنے ذہن میں لائیے۔ میاں جلاہے کپڑا بنتے ہیں اور قصبہ والے ہی اسے خریدتے ہیں۔ سنار اپنے قصبہ ہی کی خاتونوں کے لئے زیور بناتا ہے۔ موچی سارے قصبے کے لئے جوتے تیار کرتا ہے۔ انہیں میں میاں عطار بھی ہیں۔ اپنا "طبلہ" کھولے بیٹھے ہیں۔ کہیں سے نیا مال، معلوم نہیں کتنے مہینوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد آیا ہے، اس میں مشک بھی ہے۔ خوشبو کی لپٹ آ رہی ہے ہر راہ چلتے کا دماغ تازہ ہوتا ہے۔ آبادی ہی کتنی ہے، لوگ آپس میں اسکا چرچا کرتے ہیں۔ آتے ہیں اور خرید لے جاتے ہیں۔ میاں عطار کو نہ اس کی ضرورت کہ دوکان پر سائن بورڈ لگائیں، نہ اس کی حاجت کہ دوڑے ہوئے کسی چھاپے خانے میں جاکر اشتہار چھپوائیں کہ "آگیا، آگیا، نافۂ آہوئے ختن آگیا، فوراً فرمائش کیجئے ورنہ پھر پچھتانا پڑے گا"

یہ تو چالیس پچاس برس پہلے کا نقشہ تھا لیکن ذرا آج کل کی حالت کو دیکھئے۔ ریل، جہاز، ہوائی جہاز، ڈاک، اخبار، تار اور سب سے زیادہ اس ریڈیو نے جس کے ذریعہ ہم آپ سے باتیں کر رہے ہیں ہماری دنیا کو بہت چھوٹی بنا دیا ہے، اور گاؤں گاؤں کا ناتہ سمندر پار کے ملکوں سے جوڑ دیا ہے۔ پردیس کے بیوپاری جنھوں نے ہمارے دیس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہر جہاز سے مال یہاں لا رہے ہیں۔ اخباروں کے کالم میں، رسالوں کے صفحوں میں، اسٹیشن پر، شہر کی دیواروں پر، بجلی کے کھمبوں پر، جہاں دیکھئے رنگ برنگی لفظوں یا تصویروں میں کوئی نئی چیز ہمیں اپنی طرف بلا رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ چائے کا اشتہار ہے، ایک بہت لمبی ڈاڑھی والے بزرگ کھڑے ہیں، پاس ہی چائے کی گرما گرم پیالی رکھی ہوئی ہے۔ اس میں سے بھاپ نکل رہی ہے، اور یہ لکھا گیا ہے کہ "گرم چائے پیو، بہت دن جیو" خوب! بہت خوب!! کسی راہ چلتے سے پوچھ دیکھئے کہ میاں تم بھی چائے پیتے ہو، جھٹ کر جواب دے گا کہ "جی ہاں، پیتے کیوں نہیں ہیں، روز صبح لپٹن کی چائے پیتے ہیں" اب جو ذرا کرید یئے کہ "بھائی یہ لپٹن صاحب کون ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں" تو یہ کہہ کر چلتا ہوگا "کہ بھلا یہ سب باتیں ہم کیا جانیں۔ ہم نے تو ان کا نام سنا ہے۔ ان کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے" یہ حالت اب گاؤں گاؤں ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر آج کل ہمارے عطار اس دھوکے میں رہیں کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید" تو ان کا حشر کیا ہو۔ دوکان رہے کہ بند ہو جائے۔ اب تو مشک کی خوشبو سے زیادہ عطار کی گویائی کی ضرورت ہے۔ اب وہ قصبہ کی چھوٹی سی گھٹی ہوئی دنیا کہاں رہی۔ اگلے لوگ نیزہ تلوار سے ملک فتح کرتے تھے۔ آج کل کے تاجر اشتہار سے یہ کام

لیتے ہیں. کوئی نئی چیز بنی نہیں کہ ہوا کے پروں اور بجلی کی لہروں پر اڑکر اس کی خبر سارے جہاں میں پھیلی، انجان واقف کار بنے، ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا اور گھر بیٹھے پلندے کے پلندے اشتہاروں کے آن موجود ہوئے. اب کونسا نصیبہ ایسا ہے جہاں برما کا مٹی کا تیل، امریکہ کی ا (Dietz) کی لالٹین، جاپان کے شیشہ آلات اور کپڑا، جرمنی کے رنگ نہیں پہونچے ہیں، اور سچ پوچھو تو یہ ساری کرامت اشتہار بازی کی ہے. ہر سال دنیا کا اربوں روپیہ اس مد میں خرچ ہوتا ہے. ایک ہاتھ سے جاتا ہے، دوسرے ہاتھ سے ایک ایک کے چار چار لاتا ہے. امریکہ والوں نے تو اسے ایک علم بنالیا ہے. سیکڑوں کتابیں اس پر لکھی گئی ہیں. ہمارے ملک کے تاجر ابھی اس کے گر سے زیادہ واقف نہیں ہوئے ہیں. اشتہاروں کے خلاف ابھی پرانی جھجک باقی ہے اور جہاں یہ جاتی رہی ہے. وہاں رہبری کے ذریعے نہیں. زیادہ تر بے تکے بے اصولی اشتہار چھپتے ہیں، نہ تجارت بڑھتی ہے، نہ گاہک قالو میں آتے ہیں، بلکہ گاہکوں نے تو قسم سی کھا رکھی ہے کہ کسی اشتہار کو سچا سمجھیں ہی گے نہیں.

اشتہار کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کا نام، اس کی اچھائی اس کے بنانے والے کا نام مشہور ہوجائے، لوگوں کو اس کا علم ہوجائے. پرانا انگریزی مقولہ ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" اس میں اتنا اور اضافہ کردینا چاہیے کہ "علم ضرورت کا باپ ہے" آپ کہیں گے کہ یہ کیسے سنیئے، بھلا کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ آج کل یہ جو بے شمار "ضروریات" پیدا ہوگئی ہیں جیسے موزہ، رومال، بنائن، فاونٹن پن، الکٹرک ٹارچ، سیفٹی ریزر، صابن (اور خواتین معاف کریں) پاؤڈر، روج، لپ اسٹک، کریم یہ ہماری ضروریات کی فہرست میں کب اور کہاں سے آئیں. مثلاً ہم نے اپنے بچپن میں تو فاونٹن پن کا نام بھی نہ سنا تھا، اب آج کل کے صاحبزادے مدرسہ میں پہونچے نہیں کہ فاونٹن پن کی ضرورت اجی ضرورت ہی نہیں بلکہ شدید طلب انھیں پیدا ہوئی. بات یہ ہے کہ پہلے کسی پھلے مانس کا ذہن اس طرف لڑا، اس نے ایک قلم بنایا، اشتہاروں نے اس کا چرچا کچھ اس طرح کیا کہ جس نے پڑھا یہی کہا کہ واقعی اس چیز کی تو بہت ضرورت تھی، چلیئے وہ ضرورت بن گئی. ایسی بیسیوں چیزیں ہیں کہ محض ان کا علم ہونے سے ان کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے. اگلے لوگ سیدھے سادھے تھے. جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی انہی کو تیار کرتے تھے. آج کل کے عقل کے پتلے پہلے چیز بناتے ہیں اور پھر کچھ اس ڈھب سے ہوے سامنے لاتے ہیں کہ بقول ارشاد

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہمیں اس کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے. یا پہلے اگر مدھم تو اب تیز ہوجاتی ہے. ہوشیار اشتہار باز پڑھنے والے کی ضروریات کو سمجھ کر اس کی دکھتی رگ پکڑ لیتا ہے. تصویروں سے تخیل کو اکسا کر، کبھی ہمارے خود نمائی کے جذبے کو بھڑکا کر، کبھی کبھی (لیکن بہت کم) دلیلوں سے کام لے کر، کبھی کسی بڑے آدمی کا نام لے کر ہماری خواہشات کو شہ دیتا ہے اور ہمیں خریداری پر مائل کر دیتا ہے. ایک اچھے اشتہار کی سب سے پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لے. اس غرض کے لئے طرح طرح کی ترکیبوں سے کام لیا جاتا ہے، ٹائپ کا بڑا چھوٹا ہونا، عنوان کی دل کشی، تصویریں، یہ سب باتیں توجہ کھینچنے میں مدد دیتی ہیں. ہم بے اختیار اسے دیکھتے ہیں. لیکن مہربان محض متوجہ کرلینا ہی تو کافی نہیں ہے. کوئی بات ایسی بھی تو ہونی چاہیئے کہ وہ چیز اور اس کے بنانے والے یا بیچنے والے کا نام ہمارے حافظہ میں محفوظ رہے اور وقتِ ضرورت یاد آجائے. ہمارے ہندوستانی اشتہار باز ہمیں آکر دھوکا کھا جاتے ہیں وہ اپنی عجیب وغریب سرخیوں سے ہماری توجہ تو حاصل کر لیتے ہیں،

لیکن اسے قایم نہیں رکھ سکتے۔ ان کا اشتہار صرف بے اختیار دیکھ لیا جاتا ہے، لیکن پڑھا اور سمجھا نہیں جاتا۔ ان کے عنوانات میں اور جس چیز کا وہ اشتہار دیتے ہیں اس میں کوئی ربط نہیں ہوتا مثلاً بہت دنوں تک بعض اردو اخباروں میں ایک اشتہار نکلتا رہا۔ "آنکھیں کھل گئیں جب چاند نظر آیا" جو شاید سرمہ کا اشتہار تھا، لیکن یہ یاد نہیں کہ کون سا سرمہ تھا، اور کون صاحب اسے بیچتے تھے۔ اس طرح سے ایک اور اشتہار چھپتا تھا جس کی سرخی یہ ہوتی تھی۔ "گورنر بگڑ گیا" پڑھنے والا فوراً اسے دیکھتا تھا لیکن جب تھوڑی دور آگے چل کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گریموفون کے رکارڈ کا اشتہار ہے اور گورنر سے مراد خدانخواستہ لاٹ صاحب نہیں بلکہ باجے کا وہ کلّہ ہے جس میں سوئی لگائی جاتی ہے تو بجائے رغبت کے طبیعت میں ایک طرح کی ضد پیدا ہوتی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ محض توجہ کھینچ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ اشتہار میں اس کی صفت بھی ہونی چاہیئے کہ وہ حافظہ میں قائم رہے۔ اب ذرا دیر کے لئے بعض انگریزی اشتہاروں کی تاثیر پر غور کیجئے۔ کسی سے پوچھ دیکھئے کہ بھائی صابن کون کون سے اچھے ہوتے ہیں۔ جھٹ سے پیرس، لکس، کیبوتی کیبرا، پام آلیو، سن لائٹ وغیرہ کے نام لے دے گا۔ دانتوں کے ولایتی منجنوں کے بارے میں دریافت کیجئے تو کالی نوس، کال گیٹ، پیپسوڈنٹ اور ابھی کچھ دنوں سے "میک لین" کے نام فوراً ذہن میں آئیں گے۔ چاہ کے ناموں میں سے لپٹن اور بروک بانڈ اور دارجیلنگ ٹی اسے یاد آئیں گے گلیکسو اور اوولٹین کے نام ان پڑھ عورتوں کی زبانوں پر بھی چڑھ گئے ہیں۔ بات کیا ہے! صرف یہ کہ ان چیزوں کے اشتہار دینے والے نفس انسانی کے اس بھید سے واقف ہیں کہ لکھی ہوئی چیز وہی یاد رہتی ہے جس میں جدت یا انوکھا پن ہو، جس میں شدت یعنی اپیل کی قوت ہو، جس میں فطرت یعنی ہماری کسی فطری خواہش سے کام لیا گیا ہو، جس میں کثرت ہو یعنی جو بار بار نظر سے گزرے یہاں تک کہ حافظہ کا جزو بن جائے۔ ان چاروں خصوصیتوں میں سے یعنی جدت، شدت، فطرت، کثرت، ہر ایک ایسی ہے کہ اس پر ایک ایک مضمون تیار ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمیں اتنی فرصت کہاں ہم تو محض دو چار باتیں آپ کو بتا کر آپ سے رخصت ہوجائیں گے۔ انوکھے پن کی کچھ مثالیں ہم نے آپ کو بتائی ہیں۔ جدت کا اندازہ کرنا ہو تو "میک لین ٹوتھ پیسٹ" کے اشتہاروں کا مطالعہ کیجئے، ایک شخص دوسرے سے پوچھتا ہے "کیوں آج میک لین لگایا یا نہیں" وہ اسے مسکرا کر جواب دیتا ہے "دیکھ لیجئے نا" تصویریں ہمیشہ بدلی ہوئی ہوتی ہیں، اشتہار پڑھنے والے میں ایک خوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے، اور یہ سب کیوں؟ محض اس لئے کہ میک لین کا نام ذہن میں اٹکا رہے اور "وقت ضرورت کام دے"۔ اشتہار کی دوسری صفت شدت چھاپے کے چھوٹے بڑے کرنے، پورے صفحے یا آدھے صفحے میں اشتہار دینے، اور سیاہی اور سفیدی کی دھوپ چھاؤں دکھا کر پیدا کی جاتی ہے، یہ دو چیزیں یعنی جدت اور شدت توجہ بھی کھینچتی ہیں اور حافظہ میں بھی مدد دیتی ہیں ان کے بارے میں امریکہ میں بے شمار تجربے کئے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اخبار اور رسالے اشتہارات کی اجرت انچوں کے حساب سے لگاتے ہیں۔ اس لئے اس تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جتنی جگہ اشتہار میں خرچ ہوتی ہے اس کی کمی زیادتی کا توجہ اور حافظہ پر کیا اثر پڑتا ہے، چنانچہ اسکاٹ نے مختلف سائز کے یعنی پورے صفحے، نصف صفحے، پاؤ صفحے اور صفحے کے آٹھویں حصے کے ۱۰۰ اشتہارات ایک کتاب کی صورت میں جمع کرکے ۵۰ آدمیوں کے حوالے کئے اور ان سے کہا کہ دس منٹ کے اندر تم ان سب اشتہاروں کو دیکھ جاؤ اور اس کے بعد یہ کہو کہ یہ اشتہار کن کن چیزوں کے تھے۔ اس تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ پورے صفحے کا اشتہار دینے والا اگرچہ نصف صفحہ والے سے

دوگنا خرچ کرتا ہے لیکن جہاں تک حافظہ میں محفوظ رہنے کا تعلق ہے وہ دگنے سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اسی طرح پورے صفحہ والا چوتھائی صفحہ والے سے چوگنا خرچ کرتا ہے لیکن چھ گنا زیادہ کامیاب ہوتا ہے اور آٹھویں حصہ والے سے آٹھ گنا زیادہ خرچ کرتا ہے لیکن چالیس گنا زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے تجربے کرنے کا ابھی کسی کو بھی خیال نہیں آیا ہے۔

اب ہم اشتہار کی سب سے اہم خصوصیت یعنی اس کے فطرت کے مناسب ہونے سے بحث کرتے ہیں اصل میں یہی چیز اشتہار کی جان ہوتی ہے یعنی ایسے جذبات سے کام لینا اور ایسی خواہشوں کو اکسانا جو اس خاص چیز کے خریداروں کو خریداری پر مائل کریں۔ ہر کامیاب اشتہار باز پہلے پڑھنے والے کی توجہ حاصل کرتا ہے پھر اس کی خواہشات کو اکساتا ہے اور پھر اس کا انتظام کرتا ہے کہ یہ خواہش مدھم نہ پڑے بلکہ تیز ہی ہوتی جائے۔ ہم نے ہندوستان کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار (the Illustrated weekly) کے ایک تازہ پرچے کے اشتہاروں کو گنا تو اس کے ۱۷۰ اشتہاروں میں سے ۷۷ یعنی تقریباً ۵۰ فیصدی صحت و تندرستی کے متعلق تھے اور ۲۰ فیصدی یعنی ۳۴ حسن و زینت کے متعلق۔ اس کے بعد ضروریات خورد و نوش اور کاروباری اعلانات کا نمبر تھا۔ وجہ ظاہر ہے انسان کو سب سے زیادہ عزیز اپنی تندرستی ہوتی ہے، اور پھر جذبۂ خودنمائی کا شوق ہے، اور یہ شوق عورتوں میں مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اچھے اشتہار کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ محض اشاروں اشاروں میں ہماری کسی خواہش کو شہ دیتا ہے، اگر اس کی مخاطب عورتیں ہیں تو ان کے مناسب حال تصویریں دی جاتی ہیں۔ اگر نوجوان ہیں تو عبارت اور تصویریں دوسری ہوتی ہیں۔ پیٹنٹ دواؤں کے اشتہار اس طرح دئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے میں اپنی صحت کے متعلق تجسس پیدا ہو جائے۔ بناؤ سنگھار کی چیزوں کے اشتہار ایسے ہوتے ہیں کہ عورتوں کا جی بے اختیار ان چیزوں کو آزمانے کو چاہے۔ امریکہ میں ڈاکٹر ایڈورڈ کے۔ اسٹرانگ نے اس بارے میں متعدد تجربے کئے ہیں کہ مختلف فطری خواہشات میں سے ایسی کون سی ہیں جن سے اشتہار بازی میں زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ہوٹلوں اور چائے خانوں کے بیس اشتہار جمع کرکے انھیں یونیورسٹی کے پچاس طالب علموں کے حوالہ کیا کہ وہ انھیں پڑھ کر ان کی ترغیبی قوت کو لکھیں یعنی یہ کہ اگر خود خریدار ہوتے تو سب سے پہلے کس دوکان پر جاتے پھر کس پر، اور پھر کس پر۔ ان تجربوں کی بناء پر ڈاکٹر اسٹرانگ نے یہ نتیجہ نکالا کہ سب سے زیادہ ترجیح پاکی و صفائی کو دی گئی، اس کے بعد ان اشتہارات کا نمبر تھا جنھوں نے ڈاکٹروں کی تصدیق دی تھی کہ یہاں کی چیزیں خالص ہوتی ہیں۔ تیسرے نمبر پر وہ اشتہارات تھے جنھوں نے ذائقہ اور صحت کی طرف اشارا کیا تھا۔ چوتھے نمبر پر وہ اشتہارات تھے جن میں کاروبار کے قدیم اور مشہور ہونے کا ذکر تھا۔ پانچویں نمبر پر وہ اشتہارات تھے جن میں ارزانی کی طرف اشارہ تھا، چھٹے وہ تھے جنھوں نے کسی مشہور آدمی کا حوالہ دیا تھا۔ ان تجربوں کا ایک نقص یہ ہوتا ہے کہ ان سے جو نتیجے نکالے جاتے ہیں وہ صرف ایک خاص گروہ کے لئے صحیح ہوتے ہیں، مثلاً اگر یونیورسٹی کے طالب علموں کی بجائے یہی تجربہ فوج کے سپاہیوں یا کارخانے کے مزدوروں پر کیا جاتا تو شاید نمبروں کی ترتیب بالکل مختلف ہوتی، تاہم ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اشتہار کی ترغیبی قوت کیا ہے اس قسم کے تجربے بہت مفید ہوتے ہیں اور ان کی بناء پر اشتہارات کی تصویریں اور عبارتیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اشتہارات میں اگر دلیل کی بجائے تخیل سے کام لیا جائے اور کسی جذبے کو اکسایا جائے تو اس کی اپیل زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ اسی طرح سے اشتہار کی چوتھی صفت یعنی کثرت کے متعلق بھی مشہور ماہر نفسیات -

(Psychological) ڈاکٹر منسٹر برگ نے تجربے کئے ہیں۔ ان کا مقصد یہ دریافت کرنا تھا کہ مختلف سائز کے اشتہارات کتنی مرتبہ چھپیں کہ سب سے زیادہ حافظہ میں باقی رہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ایک ہی اخبار میں چوتھائی صفحے کا اشتہار اگر چار مرتبہ چھپے تو پورے صفحے کے ایک مرتبہ چھپنے والے اشتہار سے ۵۰ فیصدی زیادہ یاد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر تجربے کئے جا چکے ہیں، مثلاً یہ کہ سرورق یعنے پہلے صفحے کا اشتہار زیادہ یاد رہتا ہے یا بیچ کے اور آخری صفحے کا، تجربے سے معلوم ہوا کہ پہلے اور آخری صفحے کے اشتہار زیادہ یاد رہتے ہیں، اسی طرح سے وہ اشتہار جو اخبار میں مضامین اور خبروں کے بیچ بیچ میں ہوتے ہیں بہ نسبت ان کے زیادہ یاد رہتے ہیں جو الگ تھلگ کونوں پر یا اشتہاروں کے لئے جو صفحے مخصوص ہیں ان پر ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا یہ چیز بھی تجربے کے قابل ہے کہ کن چیزوں کے اشتہار روزانہ اخباروں میں کامیاب ہوتے ہیں، کن کے ہفتہ وار اخباروں میں، اور کن کے ماہانہ رسالوں میں۔

میری ان باتوں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اشتہار بازی کی اہمیت آج کل کاروبار کے لئے کتنی زیادہ ہے اور آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس میں کوئی پہلو اخلاقی برائی کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذریعہ تجارتی ترقی کا ہے۔ ہمارے ملک کی بے شمار صنعتیں ایسی ہیں جو محض اس وجہ سے گمنامی کی حالت میں ہیں کہ کما ینبغی اشتہار بازی کے اصولوں سے ان میں کام نہیں لیا جاتا۔ خود ہماری اس ریاست میں حیدرآباد کے ٹن، بیدر کا چاندی کا کام، اورنگ آباد کا ہمرو مشروع وغیرہ ایسی صنعتیں ہیں کہ اگر ان کا اشتہار دیا جائے تو ان کی خریداری جو آج کل مقامی ہے پھیل اور بڑھ سکتی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہمارے باکمال اپنے ہنر پر پردہ ڈالیں۔ انھیں میدان میں آنا چاہیے اور اپنی جگہ خود پیدا کرنا چاہیے۔ البتہ ضرورت اس کی ہے کہ پہلے اشتہار بازی کے اصولوں کی واقفیت حاصل کی جائے۔ اس کے متعلق اور تجربے کئے جائیں اور جو ذریعہ بہتر نظر آئے انھیں استعمال کیا جائے، بدقسمتی سے ہماری دیسی زبانوں کے اخبارات کی اشاعت بہت محدود ہوتی ہے اور چھپائی اور تصویروں کا مناسب انتظام نہیں ہے، مقامی استعمال کی چیزوں کے لئے ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور جو چیزیں عام مذاق کی ہیں اور ہر جگہ مقبول ہو سکتی ہیں ان کے اشتہار کے لئے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار اور رسالے استعمال کئے جائیں، خواہ کسی زبان کے ہوں۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں اصول اشتہار بازی پر کتابیں تیار کی جائیں اور ہمارے ملک میں نفسیات داں حضرات اس بارے میں تجربے کریں اور اپنے معلومات سے ہمارے تاجروں اور شہروں کو فائدہ پہونچائیں۔

(تقریر حیدرآباد ریڈیو)

سید وہاج الدین احمد شمیم

مغنیہ

جس زمانہ میں کہ وہ نوجوان حسین نظر آتی تھی، اور آواز میں بلا کی رنگینی تھی، ایک روز اس کا شیدائی نکولے، مغنیہ کے گرمائی مکان کے باہر کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ناقابل برداشت گرمی تھی اور دم رک رہا تھا۔ نکولے نے ابھی ابھی ناشتہ سے فراغت حاصل کی اور گھٹیا قسم کی پورٹ (Port) کی ایک پوری بوتل حلق کے نیچے اتاری تھی، جس کی وجہ سے کچھ بدمزگی اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دونوں مضمحل اور اس انتظار میں تھے کہ جونہی دن کی گرمی میں کچھ کمی ہو تو سیر کیلئے کہیں نکل پڑیں۔

یکایک دروازہ پر اتفاقاً گھنٹی بجنے لگی۔ نکولے کوٹ اتارے ہوئے، سلیپر پہنے، جو بے تکلفی کے ساتھ دراز تھا، چوکنا ہو کر اچھل پڑا، اور تجسسانہ نگاہوں سے لیشا کو دیکھنے لگا۔

"یہ خطوط رساں ہے یا لڑکیوں میں سے کوئی آئی ہوگی" مغنیہ نے کہا۔

خطوط رساں یا لیشا کی کوئی سہیلی، نکولے کو اس مقام پر دیکھ لے تو اس کی اسے کوئی پروا نہیں، تاہم احتیاطاً اپنا لباس سمیٹ کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا، اس اثناء میں لیشا دروازہ کھولنے دوڑی۔ دروازہ پر کوئی خطوط رساں تھا نہ کوئی سہیلی، بلکہ ایک اجنبی نوجوان خوبصورت عورت شریف خواتین کی طرح لباس پہنی ہوئی استادہ تھی اس کو دیکھ کر لیشا کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

اجنبی کا چہرہ زرد تھا اور سانس ایسی پھولی ہوئی جیسے کہ وہ کوئی اگھرے آثار سے چڑھاؤ کی طرف دوڑتی ہوئی آئی ہو۔

"کون ہو، کیا چاہتی ہو؟" لیشا نے پوچھا۔

خاتون کی زبان سے فوری کوئی جواب نہیں نکلا۔

وہ ایک دو قدم آگے بڑھی۔ خاموشی کیساتھ کمرہ کا جائزہ لیا، اور اس انداز سے نیچے بیٹھ گئی کہ ایسا معلوم ہوا تھکاوٹ اور ماندگی، یا شاید کسی بیماری کی وجہ سے وہ کھڑی نہیں ہو سکتی؛ جب اس نے کچھ بولنے کی کوشش شروع کی تو بڑی دیر تک اس کے زرد ہونٹ کانپتے رہے، اور کوئی صاف لفظ ادا نہ ہو سکا۔

"کیا میرے شوہر یہاں موجود ہیں؟ آخر کار اپنی بڑی بڑی آنکھیں جن کے سرخ پلک آنسوؤں سے تر تھے، لیشا کی طرف اٹھاتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

"شوہر؟ لیشا نے آہستہ سے کہا۔ اور اس پر ایسا خوف چھا گیا کہ ہاتھ پیر شل معلوم ہونے لگے۔

"کیسا شوہر؟ اس نے کچھ کانپتے ہوئے دہرایا۔

"میرے شوہر ... نکولے"

"نی ... نہیں، خاتون میں ... میں کسی شوہر کو نہیں جانتی۔"

ایک منٹ خاموشی میں گذر گیا۔ اجنبی نے دستی سے اپنے زرد ہونٹوں کو کئی بار چھوا، اور اپنی اندرونی بے چینی کو چھپانے کیلئے سانس روکتی رہی۔ اس وقت لیشا ستون کی طرح بے حس و حرکت و صامت کھڑی ہوئی، خوف و استعجاب کیساتھ اس کو تک رہی تھی۔

"تو تم یہ کہتی ہو، وہ یہاں نہیں ہیں؟" خاتون نے پوچھا، اس مرتبہ اس کا لہجہ تحکمانہ، اور لبوں پر طنز آمیز تبسم تھا۔

"آپ جس شخص کے متعلق دریافت کر رہی ہیں میں ... میں اسے نہیں جانتی۔"

"تم خطرناک، کمینی اور بدچلن ہو۔ ..." اجنبی نے لیشا کو نہایت حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں ...... تم نہایت خطرناک ہو۔ میں بہت خوش ہوں کہ میں، تمھیں صاف صاف آخر یہ سنا سکی!"

خاتون اور اس کا میلا لباس، غضبناک آنکھیں اور نرم و نازک سفید انگلیاں، یہ سب لیتا پر ہیبتناک اثرات طاری کر رہے تھے۔ اس کے مقابل لیتا اپنے بھولے ہوئے گال، داغدار ناک اور پیشانی پر کے گھنگریالے بال، جو کنگھی سے پیچھے کی طرف کبھی الٹائے نہیں جا سکتے؛ ان کی وجہ سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ نازک اندام ہوتی، صورت پر غازہ کی مالش نہ ہوتی اور پیشانی پر گھنگریالے بال نہ ہوتے تو شاید وہ معزز نظر آنے میں کامیاب ہوتی؛ اور اس پر اس اجنبی خاتون کے روبرو کھڑے ہونے میں خوف و خجالت محسوس نہ کرتی۔

"میرے شوہر کہاں ہیں؟" خاتون نے کہنا شروع کیا۔ "وہ یہاں ہیں یا نہیں ہیں، گو مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے، لیکن تمھیں سنا دینا میرا فرض ہے کہ رقم کا تغلب ہوا ہے، اور وہ نکو کے کی تلاش کر رہے ہیں۔ ۔۔۔ وہ یقیناً ان کو گرفتار کر لینگے۔ یہ تمہاری کارگزاری ہے۔"

خاتون اٹھ کھڑی ہوئی اور غیظ و غضب کی حالت میں کمرہ میں ٹہلنے لگی۔ لیتا نے اس کی طرف دیکھا، پر اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

"کہیں نہ کہیں پتہ چل جائے گا اور آج وہ گرفتار ہو جائینگے" خاتون نے کہا، اور ایک آہ بھری جس کی صدا میں اس کا اضطراب و تنفر سنائی دیتا تھا۔ "جس نے انھیں اس خوفناک نوبت تک پہنچا دیا اس کو میں خوب پہچانتی ہوں! ذلیل بھٹار اک گینا! نفرت انگیز، آوارہ گرد، بھنگنی!" خاتون ناک بھوں چڑھائے کراہیت سے کہہ رہی تھی "میں بے سہارا ہوں، اے رذیل عورت سن رہی ہے تو! میں لاچار ہوں، تجھ سے تیری حالت بدرجہا بہتر ہے۔ ہاں ایک وجود ہے جو میری اور میرے بچوں کی حفاظت کریگا! اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے! وہ عادل ہے! ہر آنسو اور شب بیداریوں کی سزا تجھے ضرور دیگا۔ ایک وقت آئے گا جب تو یاد کرے گی! ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔"

پھر خاموشی چھائی رہی۔ خاتون اپنے ہاتھ مروڑتے ہوئے کمرہ میں ٹہلتی رہی۔ اور ادھر لیتا کی یہ کیفیت کہ خالی الذہن اس کو گھور رہی تھی۔ خاتون کی تقریر کا مطلب خاک بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا، اور کسی خوفناک انکشاف کا انتظار کر رہی تھی۔

"مجھ کو اس معاملہ کا کوئی علم نہیں ہے، خاتون!" یہ کہکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم جھوٹ بک رہی ہو!" خاتون نے چیخ کر کہا اور غصہ سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کو دیکھا۔ "میں اس معاملہ سے خوب واقف ہوں! ایک کافی عرصہ سے میں تمھیں جانتی ہوں۔ اور یہ امر بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ گزشتہ پورے مہینہ سے روزانہ وہ تمھارے ساتھ گزار رہے ہیں۔"

"ہاں بالکل ٹھیک، تو پھر کیا ہوا! میرے ہاں کئی ایک آتے جاتے ہیں، لیکن میں کسی کو جبر کر کے تو نہیں بلاتی۔ وہ اپنی مرضی کے مختار ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

"میں تمھیں صاف طور سے کہتی ہوں کہ رقم کے غائب ہونے کا ان لوگوں کو پتہ چل گیا ہے۔ انھوں نے دفتر میں رقمی تغلب کیا ہے! آپ جیسی ذات شریف کی خاطر، ہاں تمھاری وجہ سے انھوں نے واقعی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ سن رہی ہو" خاتون نے مستحکم لہجہ میں کہا "شاید تمھارے پاس اصول و ضوابط کی کوئی وقعت نہیں ہے، تمھاری زندگی کا مقصد لوٹنا اور نقصان پہونچانا ہے۔ لیکن کوئی تمہیں اس قدر گئی گذری تصور نہیں کر سکتا کہ جس میں انسانی احساس کا شائبہ تک بھی نہ ہو! ان کی بیوی ہے بچے بھی ہیں۔۔۔۔ اگر ان کو جلا وطنی کی سزا ملجائے تو ہم بھوکوں مر جائینگے

بچے اور میں .... تم نے کچھ سمجھا! اس وقت بھی ان کو بچا لینے اور ہم کو تباہی و بدنامی سے محفوظ رکھنے کا موقع حاصل ہے۔ اگر میں آج ہی ان لوگوں کو نوسو روبلس (ایک سکہ) ادا کر دوں تو پھر ان پر وہ دست اندازی نہیں ہو سکے گی۔ دیکھو صرف نوسو روبلس!"

"کیا، نوسو روبلس؟" لیشا نے نرم لہجہ میں پوچھا "میں .... میں بالکل نہیں جانتی .... میں نے نہیں لئے ہیں۔"

"نوسو روبلس کے لئے میرا سوال نہیں ہے .... تمہارے پاس رقم نہیں ہے تو مجھکو اس سے سروکار بھی نہیں ہیں تو تم سے کوئی اور چیز طلب کر رہی ہوں۔ مرد عموماً تم جیسی عورتوں کو قیمتی چیزیں دے بیٹھتے ہیں۔ میرے شوہر نے تمھیں جو چیزیں دی ہیں بس وہی مجھ کو واپس ملجائیں۔"

"بیگم صاحبہ، انھوں نے آج تک کوئی چیز تحفۃً مجھ کو نہیں دی!" لیشا نے اصل معاملہ کو بھانپتے ہوئے دلگیر طرز میں کہا۔

"تو رقم کہاں چلی گئی؟ انھوں نے اپنی، اور میری اور لوگوں کی رقم لٹا دی .... تو آخر گئی کہاں؟ میری التجا سنو! جوش و غصہ میں بہت کچھ برا بھلا میں نے تمہیں سنا دیا۔ اس کیلئے میں صدق دلی سے معافی چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن تم میں ہمدردی کی اہلیت ہے، تو اس خستہ حالت میں تھوڑی دیر کیلئے میری جگہ اپنے کو موجود سمجھو اور دیکھو! سنو، ان چیزوں کی واپسی کیلئے میں تم سے التجا کرتی ہوں!"

"ہوں!" کی آواز لیشا کے منہہ سے نکلی، اور اس نے اپنے شانے ہلائے۔ "میں بخوشی واپس کر دیتی، لیکن خدا گواہ ہے کہ انھوں نے تحفۃً کوئی چیز مجھکو کبھی نہیں دی یہ میری ضمیر کی آواز ہے، اس پر یقین کیجئے۔ تاہم آپ کا خیال درست ہے اگرچہ کہ" مغنیہ نے گھبراہٹ سے کہا، "دو چھوٹی چیزیں انھوں نے لاکر دی تھیں۔ اگر تم چاہو تو، یہ میں ضرور واپس دے دوں گی۔"

لیشا نے اپنے سنگار خانہ کے ایک دروازہ کو کھینچا اور سونے کی ایک کھوکھلی چوڑی اور ایک معمولی انگوٹھی جس پر یاقوت جڑا ہوا تھا نکالی۔

"بیگم صاحبہ، لیجئے!" اس نے چیزیں پیش کرتے ہوئے ملاقاتی سے خطاب کیا۔ خاتون چونک کر کانپ گئی اور ذلت محسوس کی۔

"تم مجھ کو دے کیا رہی ہو؟" اس نے کہا "میں کوئی بھیک نہیں مانگ رہی ہوں، بلکہ وہ چیزیں طلب کر رہی ہوں جو تمہاری ملکیت میں داخل نہیں ہیں۔ وہ چیزیں جو تم نے اپنی شرمناک زندگی کی طفیل ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے شوہر سے لوٹ لیں .... وہ کمزور، ناخوش انسان .... پنجشنبہ کو جس وقت تمہیں میرے شوہر کے ساتھ بندرگاہ پر چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا، تو تم قیمتی زیورات اور چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ لہذا ان طفلانہ حرکات سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اب تم سے آخر مرتبہ مطالبہ کرتی ہوں کہ وہ چیزیں دیتی ہو یا نہیں؟"

"تم عجب عورت ہو، میری بات پر" لیشا نے برا مانتے ہوئے کہا "یقین کیجئے کہ بجز اس چوڑی اور چھوٹی سی انگوٹھی کے تمہارے بکولیو نے کوئی چیز مجھکو نہیں دی۔ وہ صرف میٹھے کیک لاکر دیتے رہے"۔

"میٹھے کیک!" اجنبی ہنس پڑی۔ "بچوں کے لئے گھر میں سوکھے ٹکڑے بھی نصیب نہیں، اور تمہارے لئے میٹھے کیک مہیا کئے جاتے ہیں۔ خیر! تو وہ تحائف واپس نہ کرنے کا تم نے مصمم ارادہ کر لیا ہے"؟

کوئی جواب نہ ملنے کی وجہ سے خاتون پیچھے بیٹھ گئی اور خلا میں گھورتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"اب کیا کیا جائے؟" خاتون نے کہا "اگر مجھ کو نوسو روبلس نہ ملے تو وہ برباد ہو جائیں گے اور ساتھ ہی بچے اور خود بھی تباہ ہو جاؤں گی۔ کیا اس کمینی عورت کو قتل کر دوں یا گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے

اس تک پہونچوں۔"

خاتون نے اپنی دستی سے چہرہ کو زور سے دبایا اور سسکیاں بھرنے لگیں "میں تمہاری منت کرتی ہوں!" اجنبی کی سسکیوں میں سے لیشا کو یہ الفاظ سنائی دئے "تم نے میرے شوہر کو تباہ و برباد کر دیا...... تمھیں ان کا تو کوئی احساس نہیں ہے" لیکن بچے ..... ہائے بچے ...... معصوم بچوں نے کیا گناہ کیا ہے؟"

لیشا نے چھوٹے بچوں کو گلی کوچہ میں کھڑے ہوئے بھوک پیاس سے بلبلاتے ہوئے حالت میں تصور کیا۔ اور خود اس کی سانس بھی رقت سے پھول گئی۔

"میں کر ہی کیا سکتی ہوں بیگم؟" اس نے کہا۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں ایک ذلیل عورت ہوں اور میں نے کسی کو تباہ کر دیا ہے ...... خدائے قادر مطلق کو حاضر ناظر جان کر تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ انھوں نے مجھکو کچھ بھی نہیں دیا ہے ..... ہماری جماعت میں صرف ایک لڑکی ایسی ہے کہ جس کا چاہنے والا دولتمند ہے۔ باقی ہم سب ایک کشمکش کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کولے اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور شریف آدمی ہیں، اسی لئے ان کی آمد و رفت میرے لئے مرغوب خاطر ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شریف آدمیوں کو خوشامد کرنے کیلئے ہم مجبور ہیں"

"میں ان چیزوں کا مطالبہ کر رہی ہوں! وہ چیزیں میرے حوالے کر دو ...... میری حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے .... میں خود کو عاجز بنا رہی ہوں ...... اگر تم چاہتی ہو تو میں دو زانو ہو کر التجا کرتی ہوں!"

خوف و ہراس سے نیکر لیشا نے اپنے ہاتھ ہلائے۔ یہ زیدہ اور خوبصورت لیڈی، جس کی رفتار و گفتار سے ایسی شان و تمکنت ٹپک رہی تھی کہ گویا وہ اسٹیج پر ہے۔ لیشا کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے مرتبہ و حیثیت کو بالائے طاق رکھکر ضرور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے آجائے گی۔ اور اپنے کو حلیم و مسکین بناتے ہوئے۔ اس ضعیفہ لڑکی کو اور بھی ذلیل و خوار کرے گی۔

"اچھا تو میں چیزیں دے دیتی ہوں" عجلت سے آنکھیں پوچھتی ہوئی لیشا نے کہا "یہ کولے نے نہیں دیں .... بلکہ اور لوگوں نے عنایت کی تھیں۔ خیر مجھے آپ کی خوشی منظور ہے۔"

لیشا نے میز کے اوپری دراز کو کھینچا، الماس کی ایک کلغی، مونگے کا نکلیس، چند انگوٹھیاں اور چوڑیاں نکال کر تمام لیڈی کے حوالے کر دیں۔

"آپ کا اصرار ہے تو یہ لیجئے لیکن یہ واضح رہے کہ تمہارے شوہر سے مجھکو کوئی چیز ملنصیب نہیں ہوئی۔ یہ لے لو اور مالدار بن جاؤ،" خاتون کے دو زانو ہونے کی دھمکی سے متاثر ہو کر لیشا بے تحاشا کہے جا رہی تھی۔ "فی الواقعہ اگر تم ایک لیڈی اور اس کی جائز بیوی ہو تو انھیں اپنی گرہ میں باندھ رکھو۔ پھر میں یہی کہوں گی: میں نے دعوت دے کر انھیں نہیں بلایا، وہ اپنی مرضی سے چلے آتے ہیں۔"

خاتون نے اپنی پراشک آنکھوں سے زیورات کو دیکھا پرکھا اور کہا "یہ ساری چیزیں تو نہیں ہیں ...... ان سب کی قیمت بمشکل پانسو روبلس ہوگی۔"

لیشا نے کچھ جذبہ کیا تھ دراز میں سے سونے کی گھڑی سگار کیس اور چند بٹن نکالے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا: "اب میرے پاس کچھ نہیں رہا ...... تم خود تلاش کر سکتی ہو۔"

طاقاتی نے ایک سرد آہ بھری، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زیورات کو دستی میں باندھ لیا اور بغیر ایک لفظ کہے یا سر ہلائے باہر چلی گئی۔

بازو کے کمرہ کا دروازہ کھلا اور نکولے صاحب اندر تشریف لائے۔ وہ بالکل زرد اور گھبراہٹ سے اس کا سر جھکرا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید اس نے نہایت کڑوی کوئی چیز حلق کے نیچے اتاری ہے، آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"جناب کیا کیا تحفے آپ نے مجھ کو لا دیئے؟"

لیشا اس پر برس پڑی "اس قسم کی خواہش کے اظہار کا آپ نے موقع ہی کب آنے دیا؟"

"تحفے ... ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے!"

نکولے نے کہا اور اپنے سر کو زور سے ہلایا۔ "افسوس! تیرے سامنے وہ زار زار روئی اور اپنے کو حقیر حیثیت میں پیش کیا ..."

"میں تم سے دریافت کر رہی ہوں کہ تم نے مجھ کو کیا تحفے تحائف لا دیئے؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"میرے خدا! وہ، جو کہ نہایت شریف، خوددار اور نیک سیرت خاتون ہے، ایک فاحشہ کے سامنے اپنے گھٹنوں کے بل چلنے تیار ہوگئیں! اور میری وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی! گویا رضا خوشی سے یہ نوبت پہونچی!"

اس نے اپنے سر کو زور سے جھنجوڑا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔

"نہیں، میں اس کے لئے اپنے کو ہرگز ہرگز معاف نہیں کر سکتا! ذلیل عورت، میرے سامنے سے دفع ہو جا"۔

لیشا سے دور ہٹتے، کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کو دور ڈھکیل کر، پیچ و تاب کھاتے ہوئے چلا اٹھا۔ "وہ دو زانو ہونے آمادہ ہوگئیں ...... وہ بھی تیرے سامنے۔ آہ میرے خدا!"

اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، اور لیشا کو حقارت سے ڈھکیلتے ہوئے باہر چلا گیا۔

لیشا زمین پر گر گئی، اور زور سے آہ و بکا کرنے لگی۔ جو چیزیں اس کے قبضے سے نکل گئیں اس کا بیحد صدمہ تھا اور اس کے تمام جذبات مجروح تھے۔ اس وقت اس کو تین سال پیشتر کا ایک تکلیف دہ واقعہ بھی یاد آگیا جبکہ کسی تاجر نے اس کو بلا وجہ پیٹ دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"انطون چیخوف" (ترجمہ) ایس۔ پی انصاف

دکن نمبر ہزاروں روپے کے صرفہ سے تیار کیا گیا ہے اکثر تصاویر نادر و نایاب ہیں جو پہلی مرتبہ شائع کی گئی ہیں مضامین نظم و نثر نہایت بلند پایہ اور اعلیٰ معیار کی ہیں۔ تاریخ اور خصوصاً دکنی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس سے بہتر ذخیرہ معلومات ایک کتاب میں شائع نہیں ہوا۔

تعداد صفحات (۱۶۸) تعداد تصاویر (۷۸) قیمت (عالی)

(۲) "دکن کی ایک مکمل تاریخ ہے جس کی موجودگی میں کسی اور تاریخ کی ضرورت نہیں رہتی۔ دکن سے متعلق کوئی ایسا پہلو باقی نہیں رہا ہے جس پر مضامین نہ ہوں۔ ادارۂ ادبیات اردو کو اس خاص نمبر کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں"۔

اعجاز صدیقی مدیر (رسالہ شاعر آگرہ جنوری ۱۹۳۹ء)

"فلسفہ کی شکست"

یورپ سے واپسی کے بعد پروفیسر شمیم کا حلقۂ احباب محدود ہونے لگا، کالج کے اوقات گذار کے وہ سیدھا مکان کا راستہ لیتے اور کافی پی کر لائبریری روم میں داخل ہوتے، جہاں وہ رات گئے فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ میں لگے رہتے، یا اکثر دفعہ انہیں رات بھر مصروفِ مطالعہ دیکھا گیا صبح جب وہ کمرے سے باہر نکلتے ایک بیمار کی مانند مضمحل اور کمزور دکھائی دیتے۔ آنکھیں نیند سے مغلوب ہو کر اندر کو دھنسی ہوئی ہوتیں، سر کے بال منتشر حالت میں ان کی شکن آلود پیشانی پر پڑے ہوتے۔ ایک موٹا سا حرٹ ہمیشہ ان کے ہونٹوں کی گرفت میں رہتا جو تنہائی میں بڑی حد تک، فلسفیانہ مسائل کے حل کرنے میں ان کا معاون ثابت ہوتا۔

پروفیسر شمیم اس وقت اپنی عمر کی اٹھائیسویں منزل طے کر رہے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد کافی جائداد ان کے ترکہ میں آئی، تعلیم کے ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد بہت جلد وہ یورپ روانہ ہوئے۔ جہاں تین سال کی مدت میں کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے ہندوستان واپس ہوئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انھیں ایک انگریز دوست کی توسط سے مدراس کی ایک کالج میں پروفیسری کی جگہ مل گئی۔

مختصر سا معمولی مکان اور بڈھا عیسائی ملازم جو زیادہ تر اور کھانسی کا شکار ہو کر تمام رات اپنے مالک کی طرح "فلسفہ حیات" کی گتھی سلجھانے میں لگا رہتا۔ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی سمجھا گیا۔

شادی کے متعلق پروفیسر کے کچھ عجیب خیالات تھے۔ ان کی اپنی لغت میں "عورت" کا حسین و جمیل لفظ محض بے کیف سا رہ گیا تھا۔

یورپ کے دوران سفر میں بیسیوں مرتبہ انھیں "جنس لطیف" کی ملاقاتوں کا موقع ملا۔ مگر حسن و شباب کے طلسمی اثرات ذرا بھی شمیم کے دل کو متاثر نہ کر سکے، اور نہ کوئی تبدیلی ان کے خیالات میں واقع ہوئی، وہ زیادہ تر اپنا وقت حصول تعلیم کے لئے بڈھے خشک مزاج پروفیسروں کی صحبت میں گزارا کرتے، ہندوستان آکر بھی پروفیسر شمیم نے اپنی محدود سوسائٹی میں ایک جوشیلی تقریر کر کے ان نفرت انگیز جذبات کا اظہار کر ڈالا، جو ایک حد تک ان کی عادت ثانیہ بنکر سینے میں پرورش پا رہے تھے۔

مس پال مین اس کالج میں معلمہ تھی۔ خدوخال اور روپ رنگ کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھی، اس کی بادہ فروش آنکھیں دوشیزگی کا ملکوتی جذبہ لئے ہوئے دیکھنے والوں کی نظروں کو مخمور سا بنا دیتیں، اس کے احمریں ہونٹ ہمیشہ تبسم کا خزانہ لئے ہوئے، سڈول، گداز شانے بڑی دلفریبی کے ساتھ حسن کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔

مس پال کو کالج میں ملازم ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اپنے حسن و شباب کی بدولت کافی دل خرید لئے تھے، اس کا حسن شعراء اور افسانوں کا موضوع بنا رہتا بحیثیت ایک زمرہ میں ہونے کے پروفیسر شمیم بھی حسن کی آتشیں شعاعوں کی زد سے نہ بچ سکے۔ کبھی کبھی ان سے مڈبھیڑ ہو جاتی، مس پال مسکراہٹ کے ساتھ ان سے مصافحہ کرتی، اور دلبرانہ انداز کے ساتھ خیریت پوچھتی، شمیم بے چینی کی حالت میں ایک تلخ مسکراہٹ لئے ہوئے "تھنک یو" کہتا ہوا اپنی کلاس میں چلا جاتا، مس پال دوران ملاقات میں ہمیشہ اپنے نسوانی حربہ سے کام لینے کی کوشش کرتی، لیکن پروفیسر شمیم کے معاملہ میں ہر دفعہ اسے ناکامی کی صورت

دیکھنی پڑتی، اس نے اپنے دل کو مطمئن بنانے کے لئے کالج کے پروفیسروں سے بعض حالات و خیالات معلوم کر لیے تھے۔

جنوری کے پہلے دن "کالج ڈے" کا شاندار جلسہ ترتیب دیا گیا جس میں بڑی تعداد میں معزز عہدہ دار اور شہر کے بعض ممتاز حضرات و خواتین مدعو کی گئی تھیں۔

پروفیسر شبنم نے ایک مختصر سی افتتاحی تقریر کی جو فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے جامع اور موزوں الفاظ سے پُر تھی، تقریر کے
۲ اختتام پر پروفیسر نے حاضرین جلسہ سے مس پال کا تعارف کروایا۔

"عورت اور کائنات" کے عنوان پر مس پال نے ایک بسیط تقریر کی۔ دنیا کی تاریخ کو اس نے الٹ ڈالا۔ خدا اور رسول کے احکام پیش کرتے ہوئے آسمانی صحیفوں کا حوالہ دیا گیا، ادیبوں اور فلسفیوں کے اقوال کو دہرا کر ایک مدلل بحث کی، مذہب اور پابندیوں سے بالکل آزاد ہو کر نفسیاتی پہلو اختیار کئے گئے۔ اور یہ ثابت کر دکھایا کہ دنیا کا چپہ چپہ صنف نازک کے زریں کارناموں سے مملو ہے۔ آج بھی ان کے احسان عظیم سے دنیا والوں کی گردنیں خم ہیں، تقریر میں ایک جادوگری تھی، جو محفل کے ہر فرد کو متاثر کئے بغیر نہ رہی، مسلسل ایک گھنٹہ تک موزوں اور دلکش پیرایہ میں "عورت اور کائنات" پر بحث کر کے مس پال نے یہ ثابت کیا کہ عورت کے ایک ادنیٰ اشارے پر آج بھی ہٹلر اور مسولینی کے بلند ترین حوصلے ڈگمگا سکتے ہیں، اس کی ذرا سی بات پر دنیا کا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے لیکن موجودہ دور کے بعض افراد کی تنگ خیالی نے عورت کو ایک بے کیف اور مہمل سی چیز سمجھ رکھا ہے۔ یہ ان کی کم روانی کا نتیجہ ہے، ان کے اپنے نزدیک عورت محض ایک غیر دلچسپ کھلونا ہے، مرد کے نفسانی گندے جذبات صنف نازک کی لطیف ترین احساسات سے کھیلنے اور مجروح کرنے کے متمنی رہتے ہیں، کوشش [illegible] سمجھ سکتے اور اس راز

کو معلوم کر سکتے۔ کہ عورت قدرت کا ایک بہترین شاہکار ہے ایک اچھوتا تخیل ہے۔ زندگی کا راز ہے لیکن مرد، نفس کا بندہ ہوس کا پجاری کبھی عورت کے راز کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔

تقریر حد درجہ دل پذیر اور متاثر کن تھی، مجمع پر ایک سکوت آمیز وجد طاری تھا، شمیم کچھ بے چینی کی حالت میں اپنی مرضی کے خلاف یہ تقریر سنتا رہا۔ نفرت انگیز طیش میں ڈوبے ہوئے جذبات بے تابانہ اس کے سینے میں مچل رہے تھے، اس نے چاہا مس پال کی تقریر کی منہ توڑ تردید کرے لیکن تقریر ختم ہوتے ہی مجمع منتشر ہو گیا۔

اضطراب کی حالت میں شمیم کسی سے ملے بغیر اپنے گھر روانہ ہوا، راستہ بھر وہ تقریر کے موضوع اور پہلو پر غور کرتا رہا۔

کتنی مہمل سی بے کیف تقریر ہے اس نے تھکے ہوئے لہجہ میں ایک صوفہ پر دراز ہو کر کہا، عورت، قدرت کا بہترین تخیل زندگی کا راز، جھوٹ غلط، نہیں، بلکہ گناہ کی پتلی تباہی و بربادی کی جڑ، شیطان کی مرید، عورت، ہاں عورت، وہ دیر تک یونہی بڑبڑاتا رہا، اور پھر اٹھ کر کمرے کی فرش ناپا کیا۔

نہ جانے اور کتنی دیر وہ ان خیالوں میں الجھا رہتا لیکن ملازم کی مداخلت نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔

حضور، جان نے مودبانہ عرض کیا، کوئی لڑکی باہر کھڑی آپ سے ملنے کی متمنی ہے، کوئی لڑکی کون؟ اس کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا۔ اور بڑھ کر طشتری میں رکھے ہوئے کارڈ کو اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ مس شیرین پال، وہ زیر لب گنگنایا۔

شمیم چند ثانیوں تک کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے، ملاقاتی کارڈ اس کی انگلیوں کی گرفت میں تھرتھرا رہا تھا، اس نے ایک بار پھر کارڈ کا جائزہ لیا ملازم ابھی تک اس کے حکم کا منتظر تھا، سرکار، اس نے ڈرتے ہوئے کہا،

ہاں اُسے اندر بھیج دو ۔ شمیم نے چرٹ کو روشن کرنے کے بعد کہا ۔

ایک منٹ میں لڑکی اس کے مقابل کھڑی تھی، رنگین ملبوسات میں لپٹا ہوا مجسمہ حد درجہ حسین دکھائی دے رہا تھا، حسن و شباب کی رعنائیاں رنگ و بو کی جھرمٹوں میں چھپی ہوئیں فلسفی کے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھیں شرابی آنکھوں سے ایک کیف آور مستی ابل رہی تھی اور احمریں ہونٹوں پر تبسم کی شوخ و شنگ دوشیزہ ناچ رہی تھی، مصافحہ کے بعد شمیم نے اسے ایک صوفہ پر جگہ دی اور خود مقابل والی نشست پر بیٹھ گیا،

معاف کیجئے، مس پال نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا، میں مخل تو نہیں ہوئی، آپ مصروف ہوں گے۔ کوئی مضر و فیت نہیں اس نے دھویں کے چھلے بناتے ہوئے اطمینان کے لہجے میں کہا، فرمائیے آپ نے کیسی زحمت کی،

یونہی، حسین دوشیزہ نے تبسم کو نمایاں کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں آپ کو پندرہ منٹ دے سکتا ہوں، فلسفی نے کہا،

اوہ ۔ پندرہ منٹ تو بہت زیادہ ہیں، صرف ایک منٹ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کافی ہے ۔

شکریہ، نوجوان فلسفی کا منہ حیرت کے مارے نیم وا ہو گیا، کس امر کا خاتون ۔

یہی آپ نے، اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں ۔ تقریر سننے کی زحمت جو گوارا فرمائی، ایک خفیف حقارت آمیز قہقہہ کے ساتھ شمیم نے کہا، بس اتنی سی بات، میں سمجھتا ہوں آپ نے کھلے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا، مجھے ایسے شکریہ کی ضرورت نہیں، جو محض، بے کیف اور مہمل تقریر پر مبنی ہے لڑکی کا حسین چہرہ ایک بارگی اتر گیا، اس نے اپنی توقع نہیں، بلکہ یقین کے ساتھ سمجھ لینا چاہئیے، شمیم کا لہجہ متانت میں ڈوبا ہوا حقارت آمیز تھا، مس پال کے جذبات کو ٹھیس لگی، تو کیا مجھے اپنے شکریہ کے الفاظ واپس لینے پڑیں گے؟ اس نے کچھ بے بسی کے عالم میں کہا ۔

ہاں خاتون حسین مفکر نے جواب دیا، مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے،

لڑکی رخصت ہونے کے لئے کھڑی ہوئی،

اچھا گڈ بائی ۔

مجھے افسوس ہے، شمیم نے مصافحہ کرتے ہوئے طنز آمیز لہجہ میں کہا، آپ ناکام لوٹ رہی ہیں ۔

لڑکی کچھ کہے بغیر وہاں سے روانہ ہوئی ۔

دو دن سے پروفیسر شمیم کی موٹر کارخانہ میں پڑی ہوئی تھی وہ ٹیکسی یا ٹرام کے ذریعہ کالج آتے جاتے رہے، آج بھی وہ کالج کے اوقات گزار کر ٹرام کے انتظار میں کالج کے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے، اس اثناء میں مس پال کی موٹر ان کے قریب سے گزری ۔

ہلو مسٹر شمیم، مس پال نے گاڑی کو بریک کرتے ہوئے کہا، کس کا انتظار ہو رہا ہے ۔

ٹیکسی کے لئے یہاں کھڑا ہوں ۔ پروفیسر نے جواب دیا۔

آئیے میری کار آپ کو گھر پہونچا دے گی

نو، تھینک یو ۔۔۔ پروفیسر نے معذرت چاہی ۔

چلئے، آپ تکلیف نہ کریں، مس پال اپنی موٹر سے اتر پڑیں، نفرت تو آپ کو ہم لوگوں سے ہے ۔ اس غریب موٹر سے تو نہیں ..

شمیم نے کچھ جواب نہ دیا مجبوراً اُسے موٹر میں سوار ہونا پڑا ہمارا مرتبہ پروفیسر حسن کی توجہ [illegible] شباب

کی رعنائیاں رنگ وبو کی نکہتوں میں بسی ہوئیں فلسفی کے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لے رہی تھیں،

پروفیسر ایک سکتہ کے عالم میں چپ چاپ بیٹھا ہوا اپنے دل گدگدانے والے خوبصورت ہاتھوں کو تک رہا تھا، اس کی کیف وجستجو میں ڈوبی ہوئیں نظریں کبھی کبھی ان حسین رخساروں سے ٹکرا جاتیں جو دلفریبی کا نمونہ لیئے ہوئے ایک کیف آور منظر پیش کر رہے تھے، مجھے یہیں اترنا ہے پروفیسر نے ایک کتب فروش کی دوکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اوہ ـــ کوئی فلسفہ کی کتاب خریدنی ہے آپ کو ـ

بریک کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پروفیسر کے جسم سے چھو گیا، شمیم کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑی، اس نے فوراً اپنا بدن سکیڑ لیا، اور کار سے اتر پڑا ـــ موٹر تیزی کے ساتھ نکل کر بھیڑ میں گم ہوگئی، شمیم کے گھر پہونچنے تک گیارہ بج چکے تھے، وہ خلاف معمول اتنی دیر باہر رہا، رات کا کھانا بھی اس نے ایک ہوٹل میں کھالیا اور سینما کا پہلا کھیل دیکھ کر گھر روانہ ہوا۔

رات اس نے نہ تو فلسفہ کا مطالعہ کیا، نہ کوئی ادویات و سمیات کا تجربہ کیا ـ

اس وقت اس کا دل و دماغ ایک عجیب الجھن میں پھنسا ہوا تھا، ایک رنگین پیکر اس کا مرکز تصور بنا ہوا تھا، وہ ایک عجیب و غریب مسئلہ حل کرنے میں محو تھا شائد زندگی کا راز ـــــــ سکون و مسرّت کا ساحل جو کبھی اس سے کوسوں دور نظر آ رہا تھا، آج اس کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا ایک طمانیت بخش سکون آمیز خیال اپنے دل و دماغ میں لیئے بستر سے اٹھا، شاید تاریکی میں دھندلی سی روشنی کی لہر، جو زندگی کے پیچیدار تاریک راستوں میں رہبر کا کام دے سکے" وہ عورت اور اس کی محبت تھی"

وہ خود اپنی اس اچانک تبدیلی پر حیران تھا جس نے یک بیک اس کے خیالوں کی دنیا میں ہیجان پیدا کر دیا، ایک انقلاب جو اسے اپنے آپ کو فوراً بدل ڈالنے پر مجبور کیا ـ

کالج سے واپسی کے وقت ایک بار پھر پروفیسر شمیم مس پال کے برابر موٹر میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے، اس وقت ان کا دل نہایت مسرّت کے ساتھ سکون کے "تالاب میں تیر رہا تھا" تمام رات ان کے کمرے میں لائٹ جلتی رہی وہ فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ نہیں بلکہ "عورت کی حسین و جمیل معیت" میں بسر کر رہے تھے، صبح ہونے تک انھوں نے حقیقی مسرت و زندگی کا راز معلوم کر لیا ـ

صبح مس پال جب پروفیسر کے کمرے سے نکلی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک تسخیر آمیز جذبہ اور ہونٹوں پر کامرانی کا تبسم رقص کر رہا تھا، اس نے اپنے عزیز ترین جوہر کی قربانی کر کے پروفیسر سے "فلسفہ کی شکست" منوالی ـــ

صابر کوسگوئی

تاش کی دنیا

کسی زمانے میں ایک بہت دور سمندر میں ایک سنسان جزیرہ تھا جہاں تاش کی سلطنت میں تاش کے بادشاہ، رانیاں، اکے اور غلام رہا کرتے تھے۔ دہلے اور نہلے بھی دو دن اور نہیوں اور دوسرے افراد کے ساتھ ایک عرصہ دراز سے وہاں رہ پڑے تھے لیکن مشہور درباری پتوں کی طرح یہ دورخی نہ تھے۔

اکا، بادشاہ، اور غلام یہ تین ذاتیں سب سے اعلیٰ تھیں۔ جو تھی ذات ادنیٰ پتوں کے امتزاج سے بنائی گئی تھی۔ دوئے اور تینے سب سے ادنیٰ درجہ کے تھے۔ ان پنج ذات پتوں کو اعلیٰ ذات کے درباری پتوں کے ساتھ ایک ہی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔

بلاشبہ اس جزیرے کی سلطنت کے قوانین اور ضابطے عجیب و غریب تھے۔ ہر ایک فرد کا مخصوص درجہ ایک ایسے زمانے سے متعین چلا آتا تھا جس کی یاد تک فراموش ہو چکی تھی۔ ہر شخص کو اپنی مفوضہ خدمت انجام دینی ہوتی تھی، اس کے علاوہ انھیں اور کچھ نہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ مقررہ ضوابط کے مطابق جہاں کہیں جاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

تاش کی سلطنت میں کسی کو بھی سوچنے کا کوئی موقع نہ تھا کسی کو کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت تھی اور نہ کسی کو کسی نئے موضوع پر بحث ہی کرنے کی حاجت۔ تمام شہری بغیر ایک دوسرے سے بات کئے، ایک سر رفتار میں گھومتے رہتے۔ گر پڑتو گر پڑ کوئی آواز تک نہ نکلتا تھا۔ وہ اپنی پشت کے بل لیٹ جاتے، اور ہر ایک اوپر آسمان کی طرف اپنی منقطع صورت جمائے، دائماً گھورتا رہتا۔

تاش کی سلطنت میں حیرت ناک خاموشی چھائی رہتی تھی۔ قناعت اور توکل دونوں ان کے تمدن و وجود میں مکمل تھے۔ شور و غل یا ہنگامہ وہاں کبھی نہیں ہوا جوش و خروش کے مظاہرے وہاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

بحر بے کراں اس جزیرے کو اپنی آغوش میں لئے کبھی نہ ختم ہونے والے راگ میں لوری سناتا اور اپنی موجوں کے سفید ہاتھوں سے اسے سینکڑوں نرم تھپکیاں دیتا تھا۔ وسیع و عریض آسمان، انڈے سینے والے پرندے کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرح اس جزیرے پر جس میں لشیبی جھنڈ تھے، محیط تھا۔ بہت دور افق میں ایک گہری نیلی لکیر دوسرے کنارے کا پتہ دیتی تھی لیکن اس کامل سکوت کو توڑنے والی لڑائی جھگڑے یا ہنگامے کی کوئی آواز تاش کے جزیرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

(۲)

سمندر پار، بہت دور اس دوسرے ملک میں ایک نوعمر شہزادہ رہا کرتا تھا جس کی ماں ایک غم نصیب ملکہ تھی۔ یہ ملکہ بادشاہ کی چشم التفات سے محروم ہو گئی تھی، اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ ساحل سمندر پر رہا کرتی تھی۔ شہزادہ اپنا لڑکپن اپنی بے کس ماں کے ساتھ بیٹھتے، اپنی تمناؤں کا عظیم جال بنتے ہوئے تنہائی اور بے کسی میں گزار رہا تھا۔ وہ اڑنے والے گھوڑے، سانپ کے پھن کے ہیرے جنت کے گلاب اور طلسمی رستوں کی تلاش میں جانے یا تیرہ دریا، سات سمندر پار "اوگرے"[1] کے قلعہ کو جہاں حسن کی شہزادی سویا کرتی ہے، ڈھونڈ نکالنے کی تمنا کیا کرتا تھا۔

---

[1] اوگرے (Ogre) بالک دیو مالا کی رو سے وہ خون خوار دیو جن کا گزارا انسانی گوشت پر ہے ۱۲ (مترجم)

مکتب میں، سوداگر کے بیٹے سے اس نے بیرونی سلطنتوں کے قصے سنے ۔ کوتوال کے لڑکے سے اسے چراغ کے موکلوں کے کارنامے معلوم ہوئے ۔ جب آسمان پر بادل چھا جاتے، بارش ہونے لگتی تو وہ اپنے گھر میں سمندر کی طرف منہ کرکے بیٹھ جاتا اور اپنی غم نصیب ماں سے کہتا: "اماں مجھے کسی بہت دور کے ملک کی کہانی سناؤ۔"

اور اس کی ماں اپنے بچپن کی سنی ہوئی ایک عجوبہ روزگار ملک کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان سناتی جہاں حسن کی شہزادی رہا کرتی تھی ۔ نوجوان شہزادے کا دل ہجوم تمنا سے بیٹھنے لگتا، وہ مکان کے صحن میں بیٹھا باہر سمندر کی طرف دیکھتا رہتا، اپنی ماں کی عجیب و غریب داستان سنتا جاتا اور اس دوران میں بارش ہوتی رہتی اور بھورے بادل آسمان پر چھائے رہتے ۔

ایک دن سوداگر کا بیٹا شہزادے کے پاس آیا اور بے دھڑک کہنے لگا "دوست، میری پڑھائی ختم ہوگئی ۔ اب میں اپنی قسمت آزمانے بحری سفر پر جا رہا ہوں ۔ میں تمھیں خدا حافظ کہنے آیا ہوں ۔"

"شہزادے نے کہا: "میں تمھارے ساتھ چلوں گا ۔"

اور کوتوال کے لڑکے نے کہا: "سچے اور قابل اعتماد ساتھیو، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے ۔ میں بھی تمھارا ساتھ دوں گا ۔"

نوجوان شہزادے نے اپنی غم نصیب ماں سے کہا "اماں" میں اپنی قسمت آزمانے سفر پر جا رہا ہوں جب میں واپس آجاؤں گا تو یقیناً مجھے آپ کے غم غلط کرنے کی کوئی کوئی سبیل معلوم ہوگی ۔"

اس طرح تینوں ساتھی سفر پر روانہ ہوگئے ۔ بندرگاہ میں سوداگر کے بارہ جہاز لنگر ڈالے کھڑے تھے، تینوں ساتھی سوار ہوگئے ۔ جنوبی ہوائیں چل رہی تھیں، بارہ جہاز چل پڑے اسی تیزی سے جیسے شہزادے کے دل میں تمناؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا ۔

سیپ گھونگھے کے جزیرے میں انھوں نے گھونگھوں سے ایک جہاز بھر لیا ۔ صندل کے جنگل کے جزیرے میں انھوں نے دوسرا جہاز صندل سے بھر لیا اور مونگے کے جزیرے میں انھوں نے تیسرے جہاز میں مونگے بھر لیے ۔

چار برس کی مدت میں انھوں نے اور چار جہاز بھرے، ایک ہاتھی دانت سے، ایک مشک سے، ایک لونگ سے، اور ایک جوز سے ۔

لیکن جب یہ سب جہاز بار کر لیے گئے تو ایک زبردست طوفان اٹھا ۔ سب کے سب جہاز ڈوب گئے اور ان میں بھری ہوئی اشیا، صندل، مشک، ہاتھی دانت، لونگ اور مونگے سمندر میں تہ نشین ہوگئیں ۔ وہ جہاز جس میں یہ تینوں ساتھی سوار تھے، ایک جزیرے کی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا لیکن اس کے تینوں سوار صحیح سلامت ساحل پر پہنچ گئے ۔

یہی وہ مشہور تاش کا جزیرہ تھا جہاں اکّے، بادشاہ، رانی اور غلام نہلوں، دہلوں اور دوسرے تمام اراکین اپنے قوانین کے مطابق رہا کرتے تھے ۔

(۳)

اب تک اس جزیرے کی خاموشی میں مخل ہونے والی کوئی بات واقع نہیں ہوئی تھی ۔ نہ کوئی نئی بات کبھی پیش آتی تھی ۔ بحث مباحثہ کی بھی کبھی نوبت نہ آتی تھی ۔

اور اب، یکایک، یہ تین ساتھی، جنھیں سمندر یہاں لا پھینکا تھا، نمودار ہوئے ـــــ اور عظیم مباحثہ شروع ہوا۔ نزاع کے تین اہم نقاط تھے۔ پہلا یہ کہ یہ اجنبی کس ذات سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا انہیں دربار کے پتوں کا مرتبہ حاصل ہے؟ یا یہ محض نیچ ذات کے لوگ تھے جنھیں ہیلوں اور دہلوں میں شمار کیا جائے؟ کوئی نظیر بھی ایسی موجود نہ تھی جس سے اس اہم مسئلہ کا فیصلہ کیا جاتا۔

دوسرے یہ کہ ان کی قومیت کیا تھی؟ کیا ان کا صاف رنگ روپ اور درخشاں چہرہ پان کی طرح تھا یا ان کا رنگ پھول کی طرح سیاہ تھا؟ اس مسئلہ پر بڑی زوردار ردوقدح ہوئی۔ جزیرے کے شادی بیاہ کے طور طریق اور اس کے پیچیدہ قوانین کا انحصار اسی مسئلہ کے عمدہ حل پر تھا۔

تیسرے یہ کہ یہ کیا غذا کھائیں گے، کس کے ساتھ رہیں گے اور کس کے ساتھ سوئیں گے؟ کیا ان کے سر شمال مغرب کی طرف رکھے جائیں گے یا جنوب مغرب کی طرف یا محض جنوب مشرق کی طرف؟ تاش کی سلطنت میں ایسے طویل نازک مسائل پر اس سے پہلے کبھی مباحثہ نہیں ہوا تھا۔

اور ادھر تینوں ساتھیوں کا بھوک سے برا حال ہونے لگا انہیں کسی نہ کسی طرح غذا ملنی ضروری تھی۔ چنانچہ یہ مباحثہ اپنی لامتناہی خاموشی اور وقفوں کے ساتھ جاری تھا اکہ لوگوں نے اپنی مجلس طلب کی اور اپنی ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی کہ اس مسئلہ کا کوئی دقیانوسی حل دریافت کیا جائے۔ ادھر تو یہ کارروائیاں ہو رہی تھیں اور ادھر تینوں ساتھی جو کچھ مل سکتا تھا کھا رہے تھے، ہر کوزہ کو بی پی کا خالی کر رہے تھے اور تمام قوانین توڑ رہے تھے۔

دو ٹے لوٹے بیٹے تک اس وحشیانہ طرز عمل سے کانپ اٹھے۔ تینوں نے کہا "دوسے بھائیو، یہ لوگ تو بالکل بے حیا ہیں!" اور دوؤں نے کہا "تینے بھائیو، یہ لوگ تو صاف طور پر ہماری ذات سے بھی نیچ ذات کے معلوم ہوتے ہیں!"

کھانے سے فارغ ہوئے تو تینوں ساتھی شہر میں گھومنے کے لئے نکل پڑے۔

جب انھوں نے متفرق اور متفکر لوگوں کو اپنے افسردہ جلوسوں میں منقطع اور سنجیدہ چہروں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو شہزادہ، سوداگر کے لڑکے اور کوتوال کے لڑکے کی طرف پلٹا پھر اپنا سر پیچھے کی طرف ڈال کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

شاہی سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اکا چوک کے اطراف اور غلام گودی کے اندر یہ عجیب، کبھی نہ سنی ہوئی ہنسی ـــــ وہ ہنسی جو خود اپنے آپ پر حیران تھی، خاموشی کے اس عظیم خلا میں دوڑ گئی۔

اپنے اطراف ایسی بھیانک خاموشی دیکھ کر کوتوال کے لڑکے اور سوداگر کے بیٹے کا خون ہڈیوں کے اندر جم گیا۔ وہ شہزادے کی طرف پلٹے اور کہنے لگے: "دوست، یہاں سے چل دینا چاہئے۔ ان خوفناک بھوتوں کے ملک میں ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہرنا چاہئے"۔

لیکن شہزادے نے کہا "دوستو، یہ لوگ تو آدمیوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے میں انہیں نیچے اوپر اور الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا ان کی رگوں میں زندگی کے گرم خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے یا نہیں"۔

(۴)

ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور جزیرے کی ساکن دنیا تقریباً بغیر کسی آواز کے جیسی کی ویسی ہی رہی۔ تینوں ساتھی نہ تو کسی قاعدے کی پابندی کرتے تھے اور نہ کسی

قانون کی۔ نہ بیٹھنے میں، نہ کھڑے رہنے میں، نہ چلنے میں نہ پشت کے بل لیٹنے میں ـــــ کسی بھی چیز کو وہ ٹھیک طرح انجام نہیں دیتے تھے۔ برخلاف اس کے جب کبھی وہ ان چیزوں کو آئین و آداب کے تحت، عین قوانین کے مطابق ہوتا دیکھتے تو دل کھول کر ہنستے۔ ان ازلی قوانین کی دائمی سنجیدگی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

ایک دن بڑے درباری بنئے سوداگر کے بیٹے کوتوال کے لڑکے اور شہزادے کے پاس آئے۔

"کیوں"، انھوں نے مہین آواز میں پوچھا "آپ لوگ قوانین کے مطابق حرکت نہیں کرتے؟"

تینوں ساتھیوں نے جواب دیا "کیونکہ یہی ہماری مرضی ہے۔"

دربار کے تینوں نے کھوکھلی، گونجتی ہوئی آواز میں جیسے کوئی طویل خواب سے آہستہ آہستہ جاگتا ہے، یک زبان ہوکر کہا "مرضی! بتائیے مرضی کون ہے؟"

وہ سمجھ نہ سکے کہ مرضی کیا ہے لیکن آہستہ آہستہ پورا جزیرہ اس سے واقف ہونے لگا۔

نور کی پہلی شعاع ان کے خانۂ دل میں دوڑ گئی جب انھوں نے شہزادے کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ جان لیا کہ وہ ایک ہی صف میں اس سمت کے خلاف بھی جا سکتے ہیں جس سمت میں اس سے قبل وہ حرکت کرتے چلے آئے تھے۔ پھر انھوں نے ایک اور تعجب خیز انکشاف کیا کہ پتوں کا دوسرا رخ بھی ہے جسے انھوں نے اب تک غور سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تھی انقلاب کی ابتدا۔

اب کہ انقلاب شروع ہو چکا تھا تینوں ساتھی انھیں مرضی کے اسرار و رموز سے عمیق تر طور پر آشنا کرنے کے قابل تھے۔ رفتہ رفتہ پتے محسوس کرنے لگے کہ زندگی کا انحصار قوانین پر نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے شاہانہ اختیار کے استعمال میں ایک اندرونی اطمینان محسوس کرنے لگے۔

لیکن مرضی سے اسی پہلی ہی ٹکر میں تاش کی پوری گڈی آہستہ آہستہ ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور پھر زمین کے برابر ہوگئی۔ یہ نظارہ ایسا تھا جیسے کوئی بڑا اژدہا بڑی دیر کے بعد جاگ رہا ہو، جیسے وہ اپنی بےگنتی کنڈلیوں کو اپنے جسم کو ایک جھٹکا دے کر کھول رہا ہو۔

(۵)

اس وقت تک پان، حکم، پھول اور اینٹ کی رانیاں پردے کے پیچھے یا تو خلا پر اپنی نظریں جمائے بیٹھی تھیں، یا ان کی آنکھیں زمین پر لگی ہوئی رہتی تھیں۔

اور اب یکایک، موسم بہار کی ایک دوپہر کو پان کی رانی نے چھپے پردے ایک لمحہ کے لئے اپنی تابناک سیاہ بھویں اٹھائیں اور اپنے گوشۂ چشم سے شہزادے پر ایک نظر ڈالی۔

"اللہ اکبر!" شہزادہ چلا اٹھا "میں سمجھتا تھا کہ یہ سب نقش کی ہوئی تصویریں ہیں لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ بہرحال یہ تو عورتیں ہیں۔"

پھر نوجوان شہزادے نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنے قریب بلایا اور فکرمند لہجہ میں بولا "دوستو، ان عورتوں میں ایک ایسی دلکشی ہے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جب میں نے رانی کی سیاہ، روشن آنکھوں کی ایک ایسی نظر دیکھی جو دل میں نئے احساسات اور جذبات کا چراغ روشن کرنے والی تھی مجھے ایک نو زائیدہ دنیا میں صبح کی دھیمی شعاع کا سا احساس ہوا۔"

دونوں ساتھیوں نے ایک واقف کارانہ مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا اور کہا "کیا واقعی ایسا ہی ہے، شہزادے؟"

اس دن سے یان کی رانی کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ اس نے حقیقی معنی میں قاعدے اور قانون کو رسوا کن انداز سے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا۔ مثلاً اگر صف میں اس کی جگہ غلام کے بازو تھی تو اس کی بجائے وہ بالکل اتفاق سے اپنے آپ کو شہزادے کے بازو کھڑا پاتی۔ اس پر غلام چہرے کو حرکت دئے بغیر سنجیدہ آواز میں کہتا "رانی تم نے غلطی کی"۔

غریب یان کی رانی کے سرخ گال سرخ تر ہو جاتے لیکن شہزادہ مردانہ وار اس کی گلوخلاصی کے لئے آتا اور کہتا "نہیں! کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ آج سے میں غلام بنتا ہوں!"

اب یہ ہونے لگا کہ ہر ایک یان کی خطاکار رانی کی غلطیاں درست کرنے کی کوشش کرتا ہوا خود بھی غلطیاں کرنے لگا۔ اکوں نے اپنے آپ کو بادشاہوں کے پہلو میں پایا۔ بادشاہ غلاموں میں گڈمڈ ہوگئے۔ نہلوں اور دہلوں نے ایسا انداز اختیار کیا گویا وہ بڑے درباری ہستیوں میں سے ہیں۔ دُوئے اور تینے خفیہ طور پر اس جگہ پر قبضہ جمائے ہوئے دیکھے گئے جو خاص طور پر چوں اور پنجوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسی بدنظمی پیدا کرنے والی افراتفری دیکھی نہیں گئی تھی

تاش کے جزیرے میں بہار کے کئی موسم آئے اور گئے تھے۔ بہار کی مغنیہ کوئل سال بہ سال اپنے نغمہ سناتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اس نے خون کو اس طرح گرمایا نہیں تھا جیسے کہ اب گرمایا تھا۔ گذرے ہوئے دنوں میں سمندر اپنا لامتناہی راگ الاپا ہی کرتا تھا، لیکن اس سے قانون کا ازلی عدم تنوع ثابت ہوتا تھا۔ اور اب یکایک اس کی موجیں اپنی چمک دمک، اپنے درخشاں سائے، اور اپنی لاتعداد آوازو

میں قلب محبت کی عمیق ترین آرزوؤں کی شرح کر رہی تھیں!

(۶)

کہاں ہیں اب ان کے منقطع، مدور، باقاعدہ اور مطمئن چہرے! ادھر ایک بیمار عشق کا چہرہ ہے جس پر محبت کی ساری حسرتیں برس رہی ہیں۔ ادھر ایک دل ہے جو ندامت اور پشیمانی سے دھڑک رہا ہے۔ ادھر ایک جان ہے جو شکوک اور توہمات کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ نغمہ اور آہِ سرد، مسکراہٹ، آنسو انہیں سے ساری فضا معمور ہے زندگی کی ہر طرف نمود ہے، دل ٹوٹ رہے ہیں، جذبات کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

ہر شخص اپنی ہی شکل و صورت کے متعلق سوچ رہا ہے اور مقابلہ دوسروں سے کر رہا ہے۔ پھول کا اکا آپ ہی غلطاں و پیچاں ہے، حکم کا اکا بس مشکل ہی سے حسین کہلایا جا سکتا ہے "لیکن" وہ کہتا ہے "جب میں سڑک پر نکلتا ہوں تو دیکھو لوگوں کی نظریں میری طرف کیسی لگی رہتی ہیں"۔ حکم کا بادشاہ کہہ رہا ہے "یہ کیا بات ہے کہ پھول کا اکا یہاں ہمیشہ گردن پھلاتا اور مور کی طرح اکڑتا پھرتا ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ ساری رانیاں اس کے عشق میں مری جا رہی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ــــ" یہاں وہ رک جاتا اور آئینہ میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتا۔

لیکن رانیوں کی حالت سب سے گئی گذری تھی۔ انھوں نے اپنا سارا وقت نہلوں کی مدد سے بننے سنورنے میں گزارنا شروع کیا۔ نہلے ان کے حقیر ذلیل غلام بن گئے۔ ایک دوسرے پر ان کے چبھتے ہوئے طعنے اس سے بھی زیادہ دل خراش تھے۔

جوان آدمی بے حس و حرکت درختوں کے نیچے بینچوں پر بیٹھے رہتے اور جنگل کے سائبان میں اپنے بازوؤں کو

بھلائے پڑے رہتے۔ کنواری لڑکیاں ہلکے نیلے ڈوپٹے اوڑھے ٹہلتی ہوئی اتفاقاً اسی جنگل کے انہی درختوں کے انہی سائبان میں چلی آتیں، اور ادھر ادھر اس طرح دیکھتیں جیسے کہ انھوں نے وہاں کچھ دیکھا ہی نہیں، اور ایسی بن جاتیں جیسے وہ کسی کو دیکھنے کے لئے آئی ہی نہیں ہیں۔

پھر ان نوجوانوں میں سے کوئی ایک نوجوان جو زیادہ جری ہوتا جنون کے دورے میں کسی ایک نیلے کپڑے پہنی ہوئی کنواری کے قریب جانے کی ہمت کرتا۔ لیکن جب وہ جاتا تو اس کی زبان یاری نہ کرتی۔ پھر یہ لب، بیوقوف بنا وہیں کھڑا رہتا اور ایسا وقتِ سعید نکل جاتا۔

سروں کے اوپر کوئلیں کوک رہی تھیں نسیم شمال کے شوخ جھونکے، بالوں سے اٹکھیلیاں کرتے، کانوں میں کانا پھوسی کرتے اور خون میں نغمہ کی آگ لگاتے چل رہے تھے درختوں کی پتیاں زیر لب سرسراتی ہوئی مسرت کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ اور سمندر نے کبھی نہ رکنے والی آوازیں عشق تکمیل کامل میں عورت اور مرد کی ساری بےزبان تمناؤں کا طوفان اٹھا رکھا تھا۔

یہی تین ساتھی تھے جنھوں نے دنیائے دانش کی خشک و بے آب نہروں میں ایک نئی زندگی کا سیلاب بہا دیا تھا۔

ہر چند کہ سیلاب اپنے شباب پر تھا لیکن اس میں ایک وقفہ کی نمو بھی تھی، جیسے اٹھتی ہوئی موجیں ٹوٹ کر کف نہ بنیں اور ہمیشہ کے لئے اسی طرح کھڑی رہیں۔ کوئی بات علی الاعلان نہ کہی جاتی تھی۔ اگر ایک محتاط قدم آگے بڑھتا تو دو پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ ہوائی قلعوں یا بالو کی فصیلوں کی طرح لوگ اپنی ناتمام آرزوؤں کا نیا رنگ لگاتے

نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے اور زبان گنگ، ان کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور سرد لہراں سے ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

شہزادے نے دیکھا کہ یہ علامتیں کچھ ٹھیک نہیں۔ اس نے جزیرے کے ہر ایک باشندے کو طلب کیا اور کہا "تمام رباب اور طبلے، قرنے اور ڈھول یہاں لے آؤ، ہم سب مل کر انہیں بجائیں گے اور مسرت کی تانیں اڑائیں گے کیونکہ آج رات بان کی رانی اپنے بر کا انتخاب کرے گی!"

چنانچہ تبلے اور دہلے اپنے بربط اور بانسریاں بجانے لگے، اٹھوں اور سنتوں نے اپنے طنبورے اور سارنگ کا رنگ جمایا اور دونے اور تیسے بھی دیوانہ وار اپنے ڈھول پیٹنے لگے۔

جب نغمہ سرائی کی یہ لہر چلی تو اس نے ایک ہی جھونکے میں تمام سرد آہوں اور دلگیریوں کو بہا دیا۔ اور پھر قہقہوں اور لفظوں کا ایسا طوفان اٹھا! جزائر زندانہ کے مظاہرے تھے اور ان کے جواب میں بناوٹی انکار، گپ شپ اور رنگ رنگ چہل پہل اور ہنسی مذاق۔ گویا یہ کسی گھنے جنگل کے درمیان ایک گرمائی مکاں میں پتیوں اور ٹہنیوں کے جھومنے، ملنے، سرسرانے اور سائیں سائیں کرنے کے مشابہ تھا۔

لیکن بان کی رانی ایک گلابی دوپٹہ اوڑھے اپنے خفیہ "برگ پوش" میں خاموش بیٹھی گانے بجانے کی اس ہنگامہ خیز آواز اور ہنسی مذاق کے اس شور و غل کو سن رہی تھی جو اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو شہزادے کو اپنے سامنے زمین پر بیٹھا اس کے چہرے کو تکتا ہوا پایا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور مسرت کی ایک اندرونی لہر کے

ساتھ وہ کانپتی ہوئی نیچے جھک گئی ۔

شہزادے نے تمام دن موجیں مارتے ہوئے سمندر کے کنارے پر ٹہلتے ہوئے گزارا ۔ اس کے دل میں رانی کی پریشان نظریں اور اس کے چہرے کے متوحش آثار سمائے ہوئے تھے اور اس کا دل امید وصال میں بری طرح دھڑک رہا تھا ۔

اسی رات کو، خوش نما پوشاکوں میں ملبوس نوجوان مرد اور کنواری لڑکیاں اپنے مسکراتے چہروں کے ساتھ قصر کے دروازے پر منتظر کھڑی تھیں ۔ قصر کا ہال جادو کے قمقموں سے جگ مگا رہا تھا، اور موسم بہار کے پھولوں سے اس کی تزئین و آرایش کی گئی تھی ۔ پان کی رانی خراماں خراماں داخل ہوئی اور اس کے استقبال کے لئے سارا مجمع اٹھ کھڑا ہوا ۔ اپنے ہاتھ میں چنبیلی کا ایک ہار لے وہ شہزادے کے آگے نظریں نیچی کئے کھڑی ہوگئی ۔ اپنے منتخب کردہ بر کے گلے میں ہار ڈالنے کے لئے شرم و حیا سے اس کے ہاتھ اٹھتے نہ تھے ۔

لیکن شہزادے نے اپنا سر جھکا دیا اور ہار کھسک کر اپنی جگہ پر آگیا ۔ نوجوان مرد اور کنوری لڑکیاں اس کے انتخاب کا بے صبری سے سانس روکے انتظار کر رہی تھیں ۔ اور جب انتخاب ہوگیا تو سارا مجمع مجنونانہ خوشی سے اچھلنے کودنے لگا ۔ ان کی چیخ اور پکار کی صدائیں جزیرے کے ہر حصہ میں اور سمندر میں بہت دور جہازوں تک سنائی دیں ۔ اس سے پہلے تاش کی سلطنت میں ایسا ہنگامہ کبھی نہ ہوا تھا ۔

اور وہ شہزادے اور اس کی دلہن کو لے کر چلے، انھیں تخت پر بٹھایا اور قدیم جزیرۂ تاش میں ان کی رسم تاج پوشی فوراً عمل میں آئی ۔

اور شہزادے کی ماں، غم نصیب ملکہ، بہت دور سمندر کے دوسرے کنارے کے جزیرے سے اپنے بیٹے کی نئی سلطنت میں سونا منڈھے ہوئے جہاز میں بیٹھ کر آئی ۔

اور اب شہری باشندے قوانین کی سخت زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق نیک ہیں یا بد، یا دونوں ہیں ۔

سید مبارز الدین احمد

(ٹیگور کے ایک افسانے کا ترجمہ)

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات اور ان کی علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے ۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے ۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنیوں کا تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گی ۔

"تاریخ گولکنڈہ" باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں ۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ([illegible])

رائج اُردو کی اصلاح

ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ زبان کی مجلس نے اپنے ایک جلسہ میں یہ طے کیا کہ حیدرآباد میں آج کل جو تحریری زبان رائج ہے اس کی اصلاح کی طرف ادارہ کو توجہ کرنی چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ادارہ میں جو تجویزیں پیش ہوئیں ان کی توضیح اور تشکیل کے لئے تنقیدی مضمون شایع کئے جائیں تاکہ مضمون نگار اور عام اہل قلم اپنی زبان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

یہ بہت ضروری ہے کہ ایسی تنقیدیں ذاتیات میں الجھے بغیر ہونی چاہئیں تاکہ کہیں سرے سے وہ مقصد ہی فوت نہ ہو جائے جو ادارہ کے پیش نظر ہے یعنی ٹھنڈے دل سے زبان پر غور کرنا اور تنقید کا فرض ایک جراح کی طرح انجام دینا نہ کہ قصاب اور جلاد کی طرح۔ ذیل کی مختصر تنقید اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ صاحب مضمون کا یہاں حوالہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ اور دوستانہ طور پر ان سے اس تنقید کی اجازت لے لی گئی زیر تنقید مضمون رسالہ سب رس میں شائع ہوا ہے اور حیدرآباد کے ایک نامور ادیب کا تحریر کیا ہوا ہے اس لئے ہم نے اس کو حیدرآباد کی آج کل کی بہترین تحریر کا نمونہ سمجھ کر انتخاب کیا ہے۔ چونکہ تنقید صرف زبان کے نقطہ نظر سے مقصود ہے۔ اس لئے مضمون کے صرف چند فقرے ادھر ادھر سے نقل کیے جائیں گے۔ اس کا خیال رہے کہ یہ صرف ہمارے نئے قائم کئے ہوئے اصولوں کی زد میں آتے ہیں اور چونکہ یہ اصول نئے ہیں اور ابھی عام طور پر تسلیم نہیں کیے گئے اس لئے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ

ہم نے جس لفظ یا ترکیب کو اصلاح کے قابل سمجھا ہے اس کو لکھ کر مضمون نگار نے در اصل کوئی غلطی کی ہے ہماری اصلاح صرف سفارش کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱) غیر ضروری فارسی اضافتیں اور عطف

جیسا کہ اصل مضمون میں لکھا گیا ہے	جو ہم تجویز کرتے ہیں
آسانی کار	کام میں آسانی یا کام کی آسانی
مجلس ادارت	ادارت کی مجلس
علمی و ادبی معیار	علمی اور ادبی معیار
فلاح و بہبود	فلاح اور بہبود
شعبۂ زبان اردو	اردو زبان کا شعبہ
حالات زندگی	زندگی کے حالات
خزائن فنون لطیفہ	فنون لطیفہ کے خزانے
بکمال مہربانی	کمال مہربانی کے ساتھ (کمال مہربانی بغیر اضافت کے اردو کی ایک عمدہ ترکیب)
مستحق مبارک باد	مبارک باد کے مستحق
نتیجۂ قلم	قلم کا نتیجہ
معتمد شعبۂ نسواں	عورتوں کے شعبہ کا یا کی معتمد
اہل ملک	ملک والے
(۲) غیر ضروری فارسی اور عربی لفظ اور ترکیبیں اور جمعیں	
جدید	نئی
ہر ماہ	ہر مہینے
نسوانی فلاح	عورتوں کی فلاح
اہم مسائل	اہم مسئلے
معاونین کا شکریہ	معاونوں کا شکریہ

مناظر کی تصاویر	منظروں کی
شمارہ	نمبر رائج ہوچکا ہے اور زیادہ سہل ہے پھر اس عربیت کی کیا ضرورت ہے۔

۳- محاورے کی غلطیاں

زخموں میں چور ہوگیا ــــ زخموں سے چور ہوگیا

اگر اہل قلم ہماری تجویزوں کو پسند کریں تو ان سے امید ہے کہ اپنی تحریروں میں ان باتوں کا خیال رکھیں گے اور اپنی زبان کو جہاں تک ہو سکے سہل بنائیں گے غیر زبانوں کے جو لفظ اور ترکیبیں اردو کا گوشت پوست بن گئی ہیں وہ ہمارے سر آنکھوں پر ہیں وہ لفظ جن کے لئے اردو میں لفظ موجود ہے اور وہ ترکیبیں جو اردو کے ایک آریائی زبان ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کے موافق نہیں ان سے پرہیز کریں گے۔

ضیاء الدین

محمود گاواں کے مزار پر

سکوتِ موت طاری ہے زمینوں آسمانوں میں
لہو رو رو کے سورج چھپ گیا ہے کوہساروں میں

کوئی رازِ عدم شاید نہاں ہے اس خموشی میں
ہوا کی آہ و زاری میں، فضا کی بے خروشی میں

فرشتے تیرے مدفن پر صفِ ماتم بچھاتے ہیں
تری درماندگی پر نور کے آنسو بہاتے ہیں

طلسمِ خواب باندھا ہے تقدس کی ہواؤں نے
تبسم سا کیا پیدا فرشتوں کی دعاؤں نے

"یہاں آکر زمیں نے آسماں کی ہمسری کرلی
یہاں مٹی نے حاصل دو جہاں کی سروری کرلی"

یہاں آکر مسلماں کے لہو نے زندگی پائی
فنا میں زیست پائی، زیست کی تابندگی پائی

یہاں ہر مردِ مومن کے لئے عبرت کا ساماں ہے
یہاں مٹی کے ذروں میں پیامِ زیست پنہاں ہے

محمد نعیم الدین صدیقی

کیج کے حالات

کیج تعلقہ مومن آباد کا ایک قصبہ ہے۔ پہلے یہ ضلع بیڑ کا تعلقہ تھا لیکن جدید ضلع بندی میں یہ تعلقہ قصبہ ہو چکا۔ یہ قصبہ عہد قدیم سے ہے گو زمانۂ ماضی کے آثار اب پائے نہیں جاتے لیکن اب زمین سے جو اشیا برآمد ہو رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر کوئی ڈیڑھ ہزار سال اوپر کا ہے ایک سال کا عرصہ ہوا کہ تاج الدین" راج گھر بنانے کے لئے دیوار کا پایہ کھود رہا تھا کہ ایک "دیوی" زمین سے برآمد ہوئی جس سے پتہ چلا کہ یہ "جینوں" کے وقت کا شہر ہے چنانچہ اس دیوی کو ایک سو روپے میں جین لوگوں نے خرید کر "کنھل گری" (جو ضلع عثمان آباد میں جین لوگوں کا مندر ہے) لیجا کر رکھا۔ ویجناتھ اور اس کی بہن جوگی، کیگی، کنڈ کالی، کالکائی بہیں کے باشندے تھے ویجناتھ پرلی چلا گیا کنڈ کالی بیڑ اور کالکائی نیکنور چلی گئی۔ کیگی کیج ہی میں رہی اور جوگی نے مومن آباد میں اپنی بود و باش اختیار کی تین سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ زمین سے ایک پتھر برآمد ہوا جس پر سنسکرت زبان میں الفاظ لکھے ہوئے تھے لیکن ایک راج نے اس کو صاف کیا اور مسجد جامع کے منبر پر لگا دیا عہد گزشتہ میں یہاں کفرستان زیادہ ہونے کی وجہ سے حضرت قاضی الاولیا، خواجہ مہذب الدین صاحبؒ قدس سرہٗ العزیز تشریف لائے اور اشاعت اسلام میں ہمہ تن مشغول رہے آپ نبیرہٗ حضرت بابا شیخ فرید گنجشکرؒ ہیں اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی دہلوی سے خرقۂ خلافت حاصل فرمایا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں جو چودہ سو اولیاء کرام کی پالکی دکن میں تشریف لائی تھی آپ انھیں چودہ سو اولیائے کرام کے قاضی تھے اور آپ کو قاضی الاولیاء کا خطاب حضرت محبوب الٰہی دہلوی سے عطا ہوا۔ اس سے پتہ چلا کے آپ کتنے زبردست منصف تھے۔ حضرت شمشاد کوچک جن کی زیارت گاہ بیڑ میں ہے آپ ہی کے خلیفہ ہیں۔ حضرت شہنشاہ کوچک کا مفصل حال میں نے اپنے بیڑ کے مضمون میں تحریر کیا ہے۔

حضرت گیسو دراز بیڑ سے حضرت شہنشاہ کوچکؒ سے استفادہ حاصل فرما کر بطرف گلبرگہ راہی ہو رہے تھے کہ اتفاق سے آپ کا گزر کیج کی طرف ہوا۔ حضرت قبلہ کے ہمراہیوں نے فرمایا کہ یہاں حضرت قاضی الاولیا خواجہ مہذب الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز تشریف رکھتے ہیں اور آپ حضرت شہنشاہ کوچک کے مرشد ہیں تو آپ نے فرمایا کہ "جس کے مرید کا یہ حال ہو اس کے مرشد کا پوچھنا کیا" یہ جملہ فرما کر آپ سرحد سرحد ہوتے ہوئے گلبرگہ شریف تشریف لے گئے۔ آپ کی بیوی صاحبہ کا نام "مدنی صاحبہ" تھا ان کے بطن سے ایک صاحبزادے "حضرت قاضی شفاء الدین صاحبؒ" تھے اور حضرت قاضی شفاء الدین صاحبؒ کا مرید خاص شہنشاہ سلطان محمد تغلق تھا۔ جس زمانے میں حضرت قاضی الاولیاءؒ کا وصال مبارک قریب تھا اس وقت آپ کے فرزند ارجمند حضرت شفاء الدین صاحبؒ بیجاپور میں مقیم تھے۔

حضرت قبلہ کا خیال تھا کہ خلافت اپنے فرزند ارجمند کو دیں جب آپ نے آواز دی کہ کون حاضر ہے" تو شہنشاہ کوچک نے فرمایا کوچک حاضر ہے" اس کے بعد آپ نے حضرت شہنشاہ کوچک کو خلافت دے دی آپ کا وصال مبارک ۱۳۳۷ھ میں ہوا۔ بعد وفات آپ کے حضرت قاضی شفاع الدین صاحبؒ تشریف لے آئے اور آپ کی ایما سے گنبد مبارک تیار ہوگیا۔ آپ نے چند سال رہ کر داعی اجل کو لبیک فرمایا گنبد مبارک میں حضرت قاضی الاولیاؒ اور آپ کی بیوی "مدنی صاحبہ" اور آپکے فرزند استراحت فرمارہے ہیں۔ آپ کی موجودہ کرامت زبان زد خاص و عام ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قاضی ھذب الدین سچے جو کھاے سو نیچے، قاضی ھذب الدین لال، نہ رہے مکھی نہ رہے بال"۔ مکھی کھانے کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہہ لے تو انشاءاللہ تعالیٰ اسے "قے" ہرگز نہیں ہوگی۔ کھانے کے پیشتر ہی یہ لفظ کہے جائیں تو بہتر ہے آپ کے گنبد مبارک کے اندر مکھی نہیں جاسکتی۔ ایک سال کا واقعہ ہے کہ ایک شخص چند مکھیاں پکڑ کر "قند سیاہ" کے ساتھ رومال میں رکھ کر گنبد مبارک کے اندر لایا اور رومال کھولا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کے مکھیاں ندارد۔ اس کا اعتقاد زیادہ ہوگیا۔ توبہ توبہ کیا دوسری کرامت یہ کہ ایک سال کیچ میں پانی نہیں پڑا یہاں کے ہندوؤں نے علی الصباح نہا دھو کر ایک ایک گھڑا ندی سے پانی لاکر درگاہ میں اس لئے ڈالا کہ حضرت قبلہ دعا فرمائیں۔ اسی دن چار بجے پانی ایسا پڑا کہ ندی نالے ایک ہو گئے۔

آپ بڑے عابد و زاہد تھے لیکن باوجود متقی و پرہیزگار ہونے کے "سماع" کا شوق بہت رکھتے تھے۔ اس خاکسار کا حضرت قبلہ سے سلسلہ نسب پدری سولھویں پشت پر جا ملتا ہے آپ کی ادائی خدمت کے لئے حضرت عالمگیرؒ نے "سائیگاوں" اور "بوبلیا کی باڑی" جاگیر بھی عنایت کی تھی لیکن سو سال کا عرصہ ہوچکا ہے کہ آپس کی برادری میں تقسیم پر جھگڑے ہوئے اور اس ضمن میں ایک بھائی نے ایک بھائی کو مار ڈالا اور اس بنا پر حکومت نے وہ جاگیر اپنے قبضۂ اقتدار میں کر لی۔ لیکن اس جاگیر سے کوئی حصہ درگاہ کو نہیں ملا۔ میری گورنمنٹ سے مودبانہ عرض ہے کہ یہ جاگیریں پھر بحال فرمادی جائیں تاکہ مستحقین اپنے حقوق کو پہنچیں۔

آپ کے گنبد مبارک میں جو محل کی چاندنی ہے اس کو میرے ایک عزیز اسعدالدین دوم تعلقدار (جو اب انتقال فرماچکے ہیں) نے چڑھایا تھا تقریباً یہ چاندنی ۵ؒ روپیہ میں تیار ہوئی۔ آپ کے غلاف مبارک کے نیچے ہر روز روپیہ نکلا کرتا تھا اور وہ جاروب کش لے لیا کرتا تھا اب روپیہ نکلنا بند ہوچکا اس لیے کہ جاروب کش نے اس روپیہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ جاروب کش کی اب کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔

گنبد مبارک کے باہر آپ کے استاد استراحت فرما ہیں آپ کی مزار شریف کے پاس ایک خاص خوبی یہ دیکھی گئی کہ ایک چھوٹا سا چنبیلی کا درخت ہمیشہ ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے چاہے موسم گرما ہو یا موسم خزاں۔ ۱۳۰۹ف کے قحط میں بھی یہ درخت سوکھا نہیں آپ کی پالکی کے ساتھ جو بھوئی آئے تھے وہ بھی فرش کے نیچے مدفون ہیں۔

(۲)

(الف) درگاہ شریف کے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر حضرت سید سادات صاحبؒ آرام فرما رہے ہیں

آپ بڑے پائے کے بزرگ ہیں اور آپ حضرت قاضی الاولیاؒ کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ آپ کی مزار شریف حضرت قاضی الاولیاؒ کی مزار شریف سے جانب مشرق و شمال واقع ہے۔

(ب) درگاہ شریف کے جانب مشرق اور ایک سید سادات کی زیارت گاہ ہے آپ حضرت قاضی الاولیاؒ کے ہمراہ ہی تشریف لائے تھے۔

(ج) جب ملک عنبر اُس وقت مرتضٰی نظام شاہ دوم کی تاجپوشی پر بندہ میں کر کے جانب فتح آباد چلا تو کیج میں سخت معرکہ ہوا۔ اسی لئے حضرت سید سادات صاحب کے پاس ہی "گنج شہیداں" واقع ہے۔ ان شہیدوں کے مزاروں میں ایک اہل دل کی بھی مزار شریف ہے جن کا نام معلوم نہیں پہلے مزار شریف زمین دوز تھی لیکن اب تعویز بنوا دیا گیا ہے۔ آپ جلالی بزرگ ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کے مزار پر پاوں دیدے تو بس اس کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک وہ شیرینی لاکر فاتحہ نہ دے اور معافی چاہے۔ یہاں قبروں کی بے حرمتی بہت ہوتی ہے مختلف گاؤں کے راستے شہر خاموشاں ہی سے گزرتے ہیں۔ جس میں سے گھوڑا گاڑی وغیرہ بھی آتے جاتے ہیں گورنمنٹ سے استدعا ہے کہ سررشتہ امور مذہبی کو توجہ دلائی جائے۔

(د) درگاہ کے دو میل کے فاصلے پر جانب مغرب محمد کبیرؒ کی زیارت گاہ ہے آپ حضرت خواجہ صاحب کے جاروب کش تھے آپ کا زمانہ ۸۷۰ھ کا ہے۔

(ہ) درگاہ کے جانب جنوب ایک فرلانگ کے فاصلے پر "ندی لینڈی" ہے اس ندی میں ایک چھوٹا سا کنواں بھی ہے۔ اس کنوئیں میں سے حضرت قاضی الاولیاؒ کے مزار مبارک تک سرنگ چلی گئی ہے اب زمانے کے انقلاب کی وجہ سے یہ کنواں مفقود ہو چکا ہے اور ممکن ہے آیندہ آنے والی نسلوں کو یہ یاد بھی نہ رہے گا کہ یہاں کنواں تھا۔

(و) درگاہ کی جانب شمال تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر حضرت پیر کوچکؒ تشریف رکھتے ہیں۔ آپ حضرت قاضی الاولیاؒ کے ساتھ ہی تشریف لائے تھے۔

(ز) درگاہ شریف کے جانب مشرق کچھ فاصلے پر حضرت بوڑکے باوا" استراحت فرما ہیں آپ کا زمانہ ۱۲۹۲ھ کا ہے۔ اہل ہنود زیادہ عقیدت رکھتے ہیں آپ کی کرامت یہ ہے کہ ایک سال کیج کے جنگل میں چوہے بہت ہو گئے تھے کسانوں نے آپ کے مزار شریف کے نیچے سے پتھر اٹھایا اور اس پتھر کو جنگل کے ایک گوشہ میں رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چوہے جنگل سے نیست و نابود ہو گئے۔

(ح) درگاہ شریف کے چار فرلانگ کے فاصلہ پر جانب مشرق حضرت اسمٰعیل صاحبؒ کی مزار شریف ہے آپ کا زمانہ بھی ۱۰۲۰ھ کا ہے۔ آپ اپنے ساتھ ہمیشہ طوطے مرغیاں بلی اور کتے رکھتے تھے اور سب کو ایک ہی برتن میں کھلاتے تھے۔ اب بھی ایک بزرگ مجذوب سالک زندہ ہیں آپ کا کام یہ ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھیں [illegible] کتوں کو لے کر پھریں اور ان کو روٹی کھلائیں کتوں کی خدمت میں ان کا دن گزر جاتا ہے۔

ایک دن مجھے حضرت نے اپنے رومال میں سے ایک جواری کا سوکھا پیڑا نکال کر کہا کہ فوراً کھالو۔ میں نے لیا اور فوراً کھالیا۔ اس پیڑے میں اس بلا کی حلاوت تھی کہ ابھی تک میری زبان پر اس کا چسکا ہے۔

(ط) درگاہ شریف کی جانب مغرب ایک فرلانگ کے فاصلے پر عیدگاہ بنی ہوئی ہے۔ تقریباً اس عیدگاہ کو بن کر تین سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ عیدگاہ میں سمجھتا ہوں کہ صوبہ اورنگ آباد میں بے نظیر ہے۔ کسی اور مقام پر مجھے ایسی عیدگاہ نظر نہیں آئی عیدگاہ کے پاس ہی ایک زبردست میدان واقع ہے جو کہ تفریح کے لیے نہایت ہی پرفضا ہے۔ اگر حکومت پبلک کی تفریح کی خاطر پارک بنائے تو یہ پارک اپنی نظیر آپ ہوگا۔ لیکن یہ زمین انعامی اور بنجر ہے حکومت اس کا معاوضہ دے کر پارک بنا سکتی ہے۔ یہاں ایک پتھر کنواں کا بنا ہوا ہے تقریباً ڈیڑھ سو سال کا ہے یہاں کی شئے کوئی مشہور تو نہیں البتہ آم مشہور ہیں۔ ضلع بیڑ میں تین مقام ایسے ہیں جہاں آم کے درخت بکثرت ہیں پہلا مقام تو نیک نور ہے جو تعلقہ بیڑ میں واقع ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں ایک لاکھ آم کے درخت ہیں۔ دوسرا مقام سائیگاؤں جاگیر تعلقہ مومن آباد میں ہے یہاں بھی آم بکثرت ہیں اور تیسرا نمبر اسی مقام کا ہے۔ یہ تینوں مقام علی الترتیب یکے بعد دیگرے آم میں مشہور ہیں۔ موسم میں آم فیصد ایک آنہ دو آنہ فروخت ہوتے ہیں۔ یہاں ایک عام کا درخت مشہور ہے جس کا نام "کھجوری" ہے یہ درخت غالباً دو سو سال کا ہے۔ ندی کے کنارے ہے بہت سا حصہ تو گر گیا ہے۔ اب صرف تھوڑا باقی ہے میرے والد صاحب قبلہ یہ آم ایک سال ناندیڑ لے آئے (کیونکہ ہم اس وقت ناندیڑ میں مقیم تھے) تو ناندیڑ کے قاضی مولوی غلام نبی صاحب نے (جو میرے پھوپی زاد بھائی ہوتے ہیں) جناب منظور جنگ بہادر اول تعلقدار ناندیڑ کو تحفتاً آم دیا۔ صاحب معز نے کھانے کے بعد یہ فرمایا کہ "قاضی صاحب میں نے عسہ روپے فی صد کے آم کھائے لیکن حقیقت ہے کہ یہ آم ان آموں سے بدرجہا بہتر ہیں" جب صاحب موصوف عادل آباد تشریف لے گئے تو دوسرے سال پھر وہاں سے طلب فرمایا لیکن آم نہ آنے کی وجہ سے روانہ نہ کیے جا سکے واقعی یہ آم بے انتہا لذیذ ہیں۔ بہت سوں نے اس کا تخم لگایا پھل آئے۔ نمونہ وہی رنگ وہی لیکن کھانے میں وہ مزہ نہ رہا ممکن ہے کہ زمین کی تاثیر ہو۔

دہلی

تضمین بر غزل اُستادی فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور

اے فصیح الفصحا، اے ہمہ دانِ دہلی — شاعرِ نغز بیاں عظمت و شانِ دہلی
خالقِ شعر و ادب روحِ روانِ دہلی — بلبلِ گلکدۂ خلد فشانِ دہلی
آج روتے ہیں تجھے پیر و جوانِ دہلی — ڈھونڈتی ہے تجھے چشمِ نگرانِ دہلی
سچ کہا تو نے یہ اے مرثیہ خوانِ دہلی — "یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی"

لکھنؤ پہونچا جو کوئی شیوہ بیانِ دہلی — ہوئی رنگوں میں کچھ گرم فغانِ دہلی
بٹ گئی چار طرف جنسِ گرانِ دہلی — رہ گیا نام ہی دہلی کا ازآنِ دہلی
منتشر ہو گئے سب نام ورانِ دہلی — بن گئے وقت کے بیٹے پدرانِ دہلی
الغرض ہو گیا تاراج جہانِ دہلی — "لے گئے لوٹ کے سب شوکت و شانِ دہلی
پوربی پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی"

اب کہاں ہے وہ جو دلی کی تھی پہلے صورت — نہ وہ شعریت پیشیں نہ وہ رومانیت
نہ وہ رنگینیٔ خلوت نہ شکوہِ جلوت — نہ وہ محفل نہ وہ ساقی، نہ وہ دورِ عشرت
دلی والوں کی تھی دنیا سے الگ اک ہیئت — نئے ایوانوں میں رہنے کی ہے انکو عادت
جنتِ کہنہ میں ممکن ہی نہیں ان کی کھپت — "دلی والوں کے لئے تازہ نئے کی جنت
لے گئے سر پہ ملک تحفۂ مکانِ دہلی"

باغِ دہلی میں جب اقبال کی تھی فصلِ بہار — غنچۂ گل میں تھا مہتاب و ثریا کا وقار
ہر مکاں خلد تھا، ہر ایک گلی تھی گلزار — خاک کے ذروں سے تھی بارشِ رنگ و انوار
برگ اور بار میں کیا کیا تھے نمو کے آثار — قطرے قطرے میں تھی جولانیٔ کہسار
ہائے وہ دن کہ نہ تھا سر فگنی سے سرو کا — "رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش اطوار
سروِ آزاد تھا، ہر ایک جوانِ دہلی"

وہ مکاں جن کے دریچے بھی تھے حوروں کے عذار — اور وہ بام، وہ در، جلوہ بکف ضو بکنار
گوہر و لعل و جواہر کا وہ ہر سو انبار — جگمگایا ہوا ماحول، فضائیں بیدار
نظر افروز لبِ نہر چراغانِ بہار — صاف شفاف وہ سڑکیں وہ درختوں کی قطار
قاف در قاف تھا آئینۂ ہر راہ گذار — "عارضِ صاف تھا ہر ایک مصفا بازار
چشم پر جلوہ تھی ہر ایک دکانِ دہلی"

آئے دہلی کی طرف زندہ دلانِ پنجاب   سمٹ آیا اسی گوشے میں جہانِ پنجاب
مہ رخ و ماہ جبیں ماہ وشانِ پنجاب   جانِ پنجاب ہی پہنچ آئی بجانِ پنجاب
کوئی شاعر کوئی مردِ ہمہ دانِ پنجاب   کہیں صنّاع کہیں نغمہ گرانِ پنجاب
گرمیِ بزم تھے آتش نفسانِ پنجاب   "گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب
گُل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی"

ہمیں دہلی کی سنانی ہے وہ رودادِ شباب   اور پھر قصۂ افسردگیٔ دورِ خراب
پھر تغیر کے بتانے ہیں ہمیں کچھ اسباب   سازِ بشکستہ کو لانا ہے قریبِ مضراب
وہ سرافرازی و سطوت کا چمکتا ہوا خواب   وہ نظارے کا فریب اور نگاہوں کا سراب
پھر اس اندھیر کا فطرت سے بھی لینا ہے جواب   "اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہیں طولِ حساب
بس یہی ہو گا کہ ہم اور بیانِ دہلی"

جامع مسجدِ دہلی ہے بہت رفعت مند   اس کے ہونے سے ہوا ذوقِ عبادت دوچند
خلد میں روح رہے شاہجہاں کی خورسند   کیا عمارت ہے دل افروز دل آرا دلبند
انقلاباتِ جہاں سے اسے پہونچے نہ گزند   یہ دعا عرش پہ اللہ کو بھی ہو گی پسند
رفعتِ مسجدِ اقصیٰ سے ہوا اس کا پیوند!   "یا خدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند
کعبے والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی"

یادِ دہلی کی وہ مرحوم فضا آتی ہے   یاد کیا آتی ہے ماضی کی بلا آتی ہے
جھومتی اور گرجتی جو گھٹا آتی ہے   نوحہ زن نوحہ گر و نوحہ سرا آتی ہے
خون میں ڈوبی ہوئی موج ہوا آتی ہے   بوئے بربادیِ خاکِ شہدا آتی ہے
نہ فقط خاک سے آوازِ بکا آتی ہے   "آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے
کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی"

ہے ادب فطرتِ دہلی میں ازل سے پنہاں   کبھی خالی نہ رہا اہلِ ادب سے یہ مکاں
نیّر و غالب و آزردہ گئے سوئے جناں   سائل و بیخود و شاعر تو ہیں موجود یہاں
نام لیوا ابھی تیرے آج ہیں مشہورِ جہاں   وہی دہلی کی فصاحت وہی دہلی کی زباں
بہ ادب عرض کروں گا کہ غلط تھا یہ گماں   "نیّر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغ اب ہیں یہ غنیمت ہمہ دانِ دہلی"

سیماب اکبرآبادی

میں نے بھی محبت کی

اگر محبت اسی کا نام ہے تو کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی محبت کی لیکن کس سے؟ اس سے جس کے سامنے اظہارِ محبت تو کجا، محبت کی نظر سے بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسے میں نے ہزاروں میں انتخاب کیا تھا۔ اور جب اُسے دیکھا بھی نہ تھا، اس کی ترنم ریز آواز کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ وہ جاں بخش صدا نہ میں نے چنگ و رباب میں سنی اور نہ انسانوں اور طیور میں۔ اس کا پہلا ہی لفظ جو میرے کانوں میں پڑا، دل کے راستے سے گزر کر میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس آواز کو میں "محبوبانہ آواز" کہتا ہوں کیونکہ اس کے تجزیہ کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ جب سے وہ صدا میرے من میں بسی ہر صدا کا معیار بن گئی۔ جو آواز بھی میں سنتا، اس کا اپنے کانوں میں رچی ہوئی آواز سے غیر شعوری طور پر مقابلہ کرتا۔ لیکن وہ صدا اسی لب و دہن کے ساتھ مخصوص تھی۔

جب میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا، کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ یہ قد اور یہ نقشہ ازل سے میرے دل میں بسا ہوا ہے۔ اسی کو میری روح تلاش کر رہی تھی، لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔ جب ایک بار اسے پالیا، تو پھر سے کھو کیسے سکتا تھا۔ وہی میرے دل کا مکین، اور زندگی کا سہارا ہو گیا۔ اپنا خیال میں اس کے بغیر کر نہیں سکتا تھا۔

اب میرے لئے اپنے آپ کو گم کرنا آسان ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے یہی کیا اور اسی کی آنکھوں سے دیکھنے اور اسی کی زبان سے کہنے لگا۔ لیکن اس کا بھی مجھے علم نہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ہی دیکھ رہا ہوں، میں ہی بول رہا ہوں۔

میں اکثر اس کے سامنے حاضر ہوتا۔ اور جب تک وہاں ہوتا، مکان اور زمان کی قیدوں سے آزاد رہتا۔ اور جب جدائی کی گھڑی آتی اسے ہزار کوششوں سے ٹالتا۔ لیکن جب خود وہاں سے جانے کا حکم ملتا، تو چپکے سے اٹھ کر چلا جاتا۔ کہاں جاتا؟ یہ میں نہیں جانتا۔ جی تو چاہتا کہ کسی دور دراز مقام پر چلا جاؤں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لئے۔ راستہ کے برابر ہو جاؤں۔ لیکن یہ بھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں ایک کل کا پرزہ تھا۔ اسی کے چکر میں گھومتا رہتا۔ میری مرضی یا ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اس حسنِ معصوم نے، جب سے میرے دل میں گھر کیا، میری روح کو بیدار سا کر دیا۔ اور سب سے پہلے محبت کے معنی مجھے سکھائے۔ "محبت وہیں ہوتی ہے جہاں جسمانی وصل کی گنجائش نہ ہو"۔ پھر کائنات کے راز بھی کچھ کچھ کھلنے لگے۔ میرا جسم اور دماغ معطل سا ہو گیا تھا، لیکن روح کو سیریں حاصل تھیں۔

اس حسنِ غیور کی میں چپکے چپکے پرستش کرتا رہا۔

نہاں رکھا ہوں درد کو لوہو کے گھونٹ پی : کہتا نہیں کسی سے کہ بیتاب ہو گیا

حضوری سے میں اکثر شادکام رہتا، لیکن لبِ اظہار بند تھے۔ اور میں کچھ ایسا قانع بہ ہیچ بھی ہو گیا تھا کہ اس کی ضرورت بھی کم محسوس کرتا۔ برہمن بت کی پوجا کرتا ہے۔ لیکن کبھی یہ جتانے کا خیال اس کے دل میں نہیں آتا کہ میں ایسا کرتا ہوں۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا۔ یہ نہیں کہ میں اس کے اظہار سے معذور تھا، بلکہ یہ کہ اس کا اظہار کرنا، میں اپنے جذبۂ پرستش کی توہین سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے موقع بھی عطا کئے لیکن میں اپنے حقیر تحفے کو اس کی نذر کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔

اس محبت نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ درد کی کسک، آنکھوں کی نمی، دل کی دھڑکن اور اس کے معاوضے میں مجھے اپنے آپ سے لے لیا۔ یہ سودا مجھے بہت سستا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس کا ڈر تھا کہ اس خاموش پرستش میں بھی کوئی رقیب نہ پیدا ہو جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں خود غرضی کی بو آتی ہے، لیکن اس خود غرضی سے میں ابھی تک

باہر نہیں ہوا تھا۔ غالباً یہی رشک ہے کہ جب میں اسے دوسروں پر نظر عنایت کرتے دیکھتا، تو اپنے آپ کو بڑا بےکس محسوس کرتا۔

اس کے سراپا کا میں کیا حال بیان کر سکوں گا۔ اس قامتِ رعنا کو اگر سرو کہوں تو ظاہر ہے کہ یہ محض شاعری ہوگی۔ سرو میں وہ خوبی کہاں۔ اس کی چشمِ فتاں کو "نرگسِ بیمار" سے تشبیہ دینا عبث ہے۔ نرگس بےنور ہے اور پھر اس میں وہ خمار آلودہ پن، وہ نیند کا متوالا انداز کہاں ہے، جس کے اثر سے میری روح میں بجلیاں دوڑنے لگتی ہیں۔ اس کی چال کو کبک دری کی چال کہنے سے مجھے شرم آتی ہے۔ ہاں میر تقی میر کو اسی طرح کی کوئی جھلک نظر آگئی تھی، جس پر یہ برجستہ شعر کہہ گئے۔

ان گل رخوں کے قامت لہکے ہیں یوں ہوا میں
جس رنگ سے لہکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

اس قامت کشیدہ اور اس چال کے ساتھ، اس کا زمین پر قدم رکھنا مجھے ناگوار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا جو قدم اٹھے، میرے سر میری آنکھوں پر ہو۔

عرصہ کی خاموش پرستش کی آبرو، کمبخت دل نے ایک دفعہ کھو دی۔ اس کے شانوں کو چھو لیا، اس کے لبِ لعلین کو مس کر دیا، اس کی زلفوں کو سنوار دیا۔ وہ مجھ سے خفا سا ہو گیا۔ اس غم سے مجھے آج تک نجات نہ مل سکی۔

یہ راز کہ اس کو بھی مجھ سے محبت تھی یا نہیں، میں نے کبھی حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کافی تھا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ میری روح کی گہرائیوں میں بسا ہوا تھا اور میں بھی اس کے دل کے گوشے میں پڑا ہوا ضرور تھا۔ اس کے دل میں میری قدر کا جذبہ بھی تھا، ممکن ہے اس میں محبت کا شائبہ بھی ہو، یا نہ ہو۔ "عشق اول در دلِ معشوق" کی حقیقت ابھی مجھ پر منکشف نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری پرستش اگر اس کے دل کے گوشے میں، ذرا سا بھی لگاؤ نہ پیدا کر سکی، تو یہ میرے جذبۂ ناتمام کا قصور ہے۔ اس پر میں جس قدر بھی جلوں کم۔ لیکن اس کے نازک اور پاکباز دل کو میں جذبات سے اس قدر عاری نہیں سمجھتا!۔

اس کے دلِ معصوم کی میں اتنی قدر کرتا تھا کہ، اپنی محبت کا فسوں پڑھ کر اسے کانٹوں میں گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے اسی طرح چاہنا چاہتا تھا جس طرح وہ تھا۔ اور یہی میری حیات کا مقصد نظر آتا تھا۔ خدا سے دعا تھی کہ اسے طراز دوام عطا کرے۔

عبدالقادر سروری

سائنس کے کرشمے نگار (مارچ سنہ ۴۰ء) کی رائے

اس کتاب میں سائنس کے بعض ایسے مسائل کے متعلق دلچسپ و مفید معلومات یکجا کر دی گئی ہیں، جن کا جاننا، ہر شخص کے لئے ضروری ہے، مثلاً ہوا، پانی، بجلی، طیران وغیرہ، یہ مقالات سب ماہرین فن کے لکھے ہوئے ہیں اور زبان و اسلوبِ بیان کے لحاظ سے بہت سہل و سادہ ہیں، ابتدا میں ڈاکٹر زور کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد میر حسن ایم اے کا مقدمہ جو اس مجموعہ کے مرتب ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو درساً درساً پڑھائی جائے۔

ساقی (مارچ سنہ ۱۹۴۰ء) کی رائے

یہ سب مضامین لائق پروفیسروں کے لکھے ہوئے ہیں اور عام معلومات کے لئے ان کا مطالعہ ضروری اور بہت مفید ثابت ہوگا۔ زبان آسان اور پیرائۂ بیان عام فہم ہے۔ ایسی علمی کتابوں کی ہماری زبان میں کمی ہے امید ہے کہ اس سلسلے کی اور کتابیں شائع کر کے ادارہ ادبیات اردو اپنے لئے امتیاز خاص کرے گا۔

ان دیکھی دیوی کے گیت

دیوی۔ گونج تیرے گیتوں کی من میں یوں لہراتی ہے
جیسے پاک پوتر ندی بن میں بہتی جاتی ہے
دیوی تیرے گیت ہیں جیسے مندر میں لوبان جلے
یا اس دل کا دھواں ہے جس پر گیان کا اگنی بان چلے
دیوی تیرے گیت ہماری اس دنیا کی گیت نہیں
یہ تو کوئی اور لگن ہے کام لوبھ کی پریت نہیں
تیری آنکھیں جل مندر ہیں تیرے آنسو موتی ہیں
اس مندر میں پریم کی پریاں چندرہار پروتی ہیں

حفیظ جالندھری

غزل

مستی بھری نگاہ کا ساغر پلا کے دیکھ
پھر میکشوں کے ظرف کو تو آزما کے دیکھ

دنیا کو انتظار ہے پھر انقلاب کا
محشر خرامیوں سے قیامت اٹھا کے دیکھ

اے دوست پھر تبسم رنگیں کا واسطہ!
میرے جہان ہوش کو رنگیں بنا کے دیکھ

کلیاں مری امید کی بن جائیں کاش پھول
اے جان نو بہار مجھے مسکرا کے دیکھ

زاہد ہماری رندی و مستی پہ تو نہ جا
گر ہو سکے تو زہد کا پردہ اٹھا کے دیکھ

کھلتا ہے کس طرح سے نیا پھول باغ میں
اک تیر ناز اور جگر پر چلا کے دیکھ

سرمایۂ بہار ہے زخم دل عظیم
اس گلستاں کو ایک نظر تو بھی آ کے دیکھ

عظیم (عثمانیہ)

گل بوٹے

حال ہی میں ہمیں اپنے ایک دوست کی عقد خوانی کی "خانگی" تقریب میں شرکت کی عزت حاصل ہوئی، "خانگی" اس لئے کہ اس میں صرف ایک درجن نوشہ کے عزیز و احباب شریک تھے، دوسری وجہ اس تقریب کے "خانگی" ہونے کی یہ تھی کہ دولہا میاں عقد کے بعد تناول ما حضر فرما کر دولہن کو اپنے پیچھے موٹر یا میانہ میں لئے برات کے ساتھ باجے اور تاشہ کے ذریعہ اپنی عقد خوانی کا "اعلان" اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کے عوض دولہن کو اسی کے گھر میں اپنے خسر بزرگوار کی حفاظت اور ضمانت میں چھوڑ کر "بے رنگ" گھر لوٹنے والے تھے۔

شام کے کوئی پانچ بجے ہم سب معہ نوشہ میاں خانۂ عروس پر نازل ہوئے، چونکہ تقریب "مخصوص" تھی اس لئے عقد کے بعد صرف "عصرانہ" ہونے والا تھا، کچھ تو ہماری "وقت کی پابندی" گھر والیوں اور کچھ قاضی صاحب کے دیر سے آنے کی وجہ سے عقد خوانی میں "تھوڑی سی" دیر ہوگئی، یعنی ٹھیک ساڑھے نو بجے خطبہ عقد ختم ہوا، اس کے بعد قاضی صاحب نے آدھے سے زیادہ چھوارے مصری بادام اپنے رومال میں باندھ لئے اور باقی کچھ کم آدھے نوشہ میاں سلمہ پر نچھاور کئے گئے، چونکہ سب کی آنتیں "قل ھو اللہ" کی تلاوت کر رہی تھیں اس لئے ہم سب لگے چھوارے مصری چبانے! بادام کا مغز نکالنا اس وقت "جوئے شیر" لانے سے کم نہ تھا!! کیونکہ بھوک کی شدت کی وجہ سے ہمارے دانتوں نے ان کو چبانے یا پھوڑنے سے صاف انکار کر دیا تھا!!

جب ایک نہایت "خوش رنگ" صاف ستھرا سرخ مدرے کا "خوشبودار" "صورت" "غربلی" دسترخوان ہمارے سامنے آتا جانے لگا تو جان میں جان آئی اور ہم اپنے دوست کے خسر نامدار کی فیاضی اور دریا دلی کے قائل ہوتے گئے کہ باوجود "پیار پانی" کے معاہدہ کے موصوف ہمیں روایتی "ما حضر" سے سرفراز فرمانا چاہتے ہیں، مگر ہماری ساری امیدوں کا خون ہوگیا اور ہم پر "یاس و حرمان" کا ہمالیہ ٹوٹ پڑا جب ہم نے دیکھا کہ دسترخوان پر "کافی" کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں آدھی پیالی سے کچھ زیادہ چائے کی "سروس" شروع ہوگئی، چائے کے ساتھ کوئی آدھا پونڈ نمکین بسکٹ، دو عدد موسمبی، دو عدد سنترے اور پاؤ پونڈ کھٹے انگور ہم سب کے حصہ میں آئے سچ ہے!

"وہی ملتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے"!!

چائے نوشی کے بعد ہم نے سمجھا کہ "دعوت عصرانہ" ختم ہوگئی مگر "الداعی" نے موسم کی سختی کا خیال کرکے دوسری فیاضی یہ کی کہ ہم سب کو آئسکریم سے بھی "سیراب" فرمایا، اگرچہ کہ "عصرانہ" کا وقت گزر جانے کی وجہ سے آئسکریم مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھی پھر بھی ہم نے کچھ کم ایک اونس برف زدہ خالص شیریں دودھ نوش جان کیا! آئسکریم کھانے یا پینے کے بعد "کولڈ ڈرنک" کی خواہش بیدار ہوئی، جب پینے کو کچھ مانگا تو نہایت صاف و شفاف عثمان ساگر کا "آب خالص" جو شرمندۂ برف نہ ہوا تھا مرحمت ہوا، خالص دودھ اور اس پر خالص پانی پی کر ہم نوشہ میاں سلمہ اور ان کے "دریا دل" خسر بزرگوار کا، جو اپنے داماد سے شرما کر سامنے نہیں آرہے تھے، شکریہ ادا کرکے ٹھنڈے ٹھنڈے رات کے کوئی گیارہ بجے بخیر و خوبی گھر لوٹے!!

ایک دن صبح سویرے ہم ٹہلنے کے لئے جا رہے تھے، دروازے کے بیچوں بیچ ایک مرد معقول سے آمنا سامنا ہوا، دیکھتے ہی انہوں نے بڑے ادب سے جھک کر کوئی ایک درجن چھوٹے چھوٹے سلام کئے اور ایک کاغذ پیش کیا۔

"یہ کیا ہے"؟ ہم نے پوچھا

"حضور للہ اس کاغذ کو ملاحظہ فرمائیں! یہ بندہ کی عرضی ہے"!!

ہم نے لے کر دیکھا تو بہت ہی صاف خط میں لکھا تھا "اردو غرض" پر جو ہمارے باغ میں حال ہی میں خالی ہوئی ہے عرضی گزار کو مامور کیا جائے۔

"یہ درخواست تمھیں کس نے لکھ دی"؟ ہم نے دریافت کیا۔

"غریب پرور! خانہ زاد ہی نے لکھی ہے"!! بڑے ادب سے جواب دیا

"بھئی زبان تو تمھاری بہت صاف ہے مگر کاغذ کو "قاغذ" کیوں بولتے ہو"؟

"خدا حضور کو سلامت رکھے! فدوی کے پڑوس ایک پروفیسر رہتے ہیں وہ "قاغذ" ہی فرمایا کرتے ہیں۔ اسلئے غلام بھی "قاغذ" بولا کرتا ہے"!!

ہم نے کہا "نہیں جی! بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے!! کوئی پروفیسر کاغذ کو "قاغذ" کبھی نہیں بول سکتا"!!!

"حضور کے سرِ اقدس کی قسم! فدوی "صبوں صبوں" جھوٹ نہ بولے گا!! اگر یہ غلط ثابت ہو تو حضور اپنے "چپڑاسی" سے دھکے دلوا کر خانہ زاد کو نکلوا دیں۔"

"یہ "صبوں" کیا بلا ہے"؟ ہم نے پوچھا

"غریب پرور یہ بھی فدوی نے پروفیسر صاحب ہی سے سنا ہے۔ زمانہ کے ساتھ زبان بھی بدل رہی ہے حضور! جب دہلی کے ریڈیو والے "ڈکبنی کشتی" "وزیر بچاؤ" "بھی فرنٹ" وغیرہ وغیرہ بول سکتے ہیں تو ایک اہل زبان اور وہ بھی اردو کا پروفیسر! کاغذ کو "قاغذ" سچ کو "صبوں" اور چپراسی کو "چپڑاسی" اگر بولے تو کیا برائی ہے سرکار"!!

باغباں

ایک غریب جذامی سے!

بتا اے جذامی دکھاتا ہے کیوں دل　　جہاں سب ہی اندھے ہوں رنج سے حاصل
یہ مانا کہ دنیا نہیں تیری دنیا　　امیروں کی دنیا رئیسوں کی دنیا
یہ مانا کہ ہے تو ہی قسمت کا ہیٹا　　بنایا گیا ایک مفلس کا بیٹا
بجا ہے کہ راحت نہیں تیری ساتھی　　ترستا ہے کہ خوشیاں نہیں تیری باقی
ترا سب کچھ ہی بھر گئی سب کچھ سہے جا
بہر حال سہنا ہے سہنا پڑے گا

کہوں کیا کہ دنیا کے یہ رہنے والے　　برائی کے دریا میں یہ بہنے والے
یہ آدم کی بے درد اولادِ انساں　　خدائی کے مالک یہ مغرور شیطاں
یہ ماریہ یعنے سرمایہ والے　　ضمیر و دل کے گندے گناہوں کے پالے
تجھے اک نظر بھی نہ دیکھیں گے اصلا　　تری لاش تک نہ پھینکیں گے حاشا
کہ ڈر ہے انھیں لگ نہ جائے مرض یہ
نہ عیاشیوں سے چھڑائے مرض یہ
بھلا دے بھلا دے تو سب کو بھلا دے　　تجھے رب نے بھولا تو رب کو بھلا دے
تری خونچکاں زندگانی ہے سب کچھ
تری دکھ بھری یہ کہانی ہے سب کچھ

سلیمان اریب

بلند فطرتوں سے!

سوزنگ سے دل کے افسانے غیروں کو سنائے جاتے ہیں — پھر اپنی نگاہِ الفت کے حق ہم پہ جتائے جاتے ہیں
جب اپنی ادائے خود بیں کو دنیا سے چھپانا ہوتا ہے — بے باک نگاہیں رکتی ہیں پردے سے گرائے جاتے ہیں
اے عظمتِ دل کے دیوانو تم نے بھی کبھی یہ سوچا ہے — کس طرح محبت والوں کے اسرار چھپائے جاتے ہیں؟
معلوم نہیں جب اوروں کی رفعت کا انھیں احساس نہیں — کس واسطے اپنی رفعت کے افسانے بنائے جاتے ہیں
احساس اگر ہے دیکھ تو لیں وہ خود بھی اپنی ظلمت کو — کیوں بزمِ حریفاں میں اگر وہ شمع جلائے جاتے ہیں؟
کس رنگ کے ہیں انوارِ ازل اے کاش انھیں معلوم تو ہو — جو خاک کی گندی بستی کے نغمات سنائے جاتے ہیں
اک حوصلہ و گرمیٔ سفر جب اپنی فطرت ہی میں نہیں — کیوں ہٹ کر چلنے والوں کے قدموں پہ گرائے جاتے ہیں
ہنگامہ پسندی تھم تھم کر تاثیر مٹائے دیتی ہے — وہ سمجھے ہوئے ہیں دنیا پر ہم رنگ جمائے جاتے ہیں
اک کھیل نیا سوجھا ہے انھیں تا دور ہوا پنی بے رنگی — آتی ہے ہنسی کج بحثوں پر جو بات بنائے جاتے ہیں
اے حاملِ دردِ علم و عمل اے زخمیٔ تیرِ عقل و نظر — اس بزم سے اٹھ ہر وقت جہاں فتنے سے جگائے جاتے ہیں
کہہ دے کوئی ان سے اہلِ نظر رکھتے ہیں نگاہیں اونچی ہی — جو ذوقِ یقیں کم رکھتے ہیں سر اپنا جھکائے جاتے ہیں

باقی (عثمانیہ)

محبت کی چھاؤں (نگارِ لکھنؤ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی رائے)

مرزا ظفر الحسن بی اے کے بارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے مرزا صاحب حیدر آباد کے نوجوان ادیبوں میں سے ہیں اور ایک خاص انداز تحریر کے مالک ہیں" ہلکا ہلکا مزاح اور صاف صاف تنقید" یہ ہے اصل روح ان افسانوں کی جو بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی۔

ان افسانوں کی تحریری غایت جو کچھ ہو لیکن چونکہ ان کا تعلق عہد حاضر کی معاشرت سے ہے اس لیے ہمارے لٹریچر میں سامان تفریح ضرور موجود ہے۔

مغربی تصانیف کے اردو تراجم (نگار مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی رائے).

میر حسن ایم اے کی تالیف ہے اور بڑے کام کی چیز ہے اس میں انھوں نے سنہ ۱۸۰۰ء سے لے کر اس وقت تک جتنے تراجم مغربی تصانیف کے اردو میں ہوئے ہیں، ان سب کی مکمل فہرست پیش کر دی ہے، اس موضوع پر اس وقت تک کوئی کتاب موجود نہ تھی۔

"باتیں!"

"تم نے تو ہمارے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا!"

"آؤں تو کس لئے؟"

"پہلے کیوں آتے تھے؟"

"آپ کی خاطر"

"تو میں تو اب بھی زندہ ہوں"

"لیکن آپ کی دوشیزگی جو فنا ہو چکی"

"تو کیا تمھیں میرے کنوارپن سے محبت تھی؟"

"شاید"

"پھر وہ بےغرض محبت کیا ہوئی؟"

"بےغرض تو دنیا میں کوئی کام بھی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ دنیا کا قیام بھی کسی غرض ہی سے وجود میں آیا ہوگا"

"وہ کیا؟"

"ہم دن کا کام ختم کر کے دماغی عیاشی چاہتے ہیں اور کچھ نہیں تو سینما میں بےجان تصویروں سے ہی دل بہلاتے ہیں ایسا ہی جب خدا فرشتوں کی صحبت اور ان کی یک رنگ پارسائی سے تنگ آگیا تو اس نے دنیا کا اسٹیج بنا دیا جہاں اس کی ادا آموزی میں ہر روز نت نئی تمثیلیں ہوتی ہیں اور کردار اس کی ہدایت سے کٹھ پتلیوں کی طرح ناچا کرتے ہیں"

"تو یہ — تو کیا خدا بھی اک بازی گر ہے"

"ہاں اس میں کیا شک"

"تم تو مذہب سے بالکل دور ہو گئے سنا ہے اب تم نماز بھی نہیں پڑھتے"

"نماز کیوں پڑھوں۔ یہ تو اسی وقت ممکن تھا جب آپ نے میری نارسائی کا خیال کیا ہوتا اب — کہ آپ ہونٹوں کی عفت جسم کی عصمت کھو چکیں — پارسائی کا مطالبہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا!! اور ایسی نماز بھی کس کام کی کہ پڑھی جائے واسطے اللہ کے لیکن دماغ میں تصور ہو اس کے اک بندے کا۔ اس سے تو یہ اچھا کہ کبھی رات کے بیکراں سناٹے میں جب دوری کا خیال ستائے تو بےساختہ خدا یاد آجائے"۔

"اچھا۔ میں ذرا نماز پڑھ لوں"

"کوئی دعا میرے لئے بھی"

"یہ التجا کروں کہ اے خدا اک دیوانے کو عقل سلیم دے"

"آپ دور چلی گئیں جیسے دعائیں افق کے پار جاتی ہیں اب کوئی عقل سلیم لے کر ریگزاروں میں خاک اڑاتا پھرے تو کیا!؟"

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

تاریخ گولکنڈہ ۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے۔ ال ال بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور بسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی کا تمدن" بھی عنقریب شایع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ با تصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت عہ

لمحۂ رنگین

(اپنے دوست مسٹر رام نارائن ماتھر کی شادی کے موقع پر)

کھلتی ہوئی کلیوں میں دل کی دھڑکن کو سمو کر لایا ہوں
مہتاب کی کرنوں میں ننھے تاروں کو پرو کر لایا ہوں

جاگی ہے بہاروں کی دنیا، وہ پھول کنول کے کھلتے ہیں — اب ذوقِ جنوں کے ہاتھوں ہی سے چاکِ گریباں سلتے ہیں
سرشار نگاہوں نے الٹا فطرت کے حسیں رخ سے آنچل — ہر سانس پیامِ مستی ہے، پیمانے لبوں سے ملتے ہیں

پھولوں کی جوانی میں بس کر بہکی ہوئی سانسیں گاتی ہیں — اس عالمِ شعر و جوانی میں ساغر کی کھنک بن جاتی ہیں
تکمیلِ تمنا جنتی ہے، بیدار امنگوں کی کلیاں — فردوسِ محبت کو چھو کر مستانہ ہوائیں آتی ہیں

میخانۂ ہستی کے ہنگامے، خود ہی ہو گئے گم پینے میں — جاگے ہوئے ارمانوں نے لی بے تاب سی کروٹ سینے میں
برسات کے کافر موسم میں جو درس سکوں بن جاتا ہے — اس کیف حیات آفروز کی لہریں بہتی ہیں اب جینے میں

اے دوست تجھے یہ "لمحۂ رنگیں" ذوقِ محبت سکھلائے
اس جرعۂ مستی کا دھارا، ہر سانس سے تیری مل جائے

مبلکش

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی

نگار (مارچ ۱۹۴۴ء) کی رائے

مجموعہ ہے شاد عظیم آبادی کے ان خطوط کا جو سید ہمایوں مرزا بیرسٹر اور ان کی بیگم کے نام لکھے گئے تھے، ان کی ابتدا شاد کی عمر کے پچاسویں سال سے ہوئی ہے اس لئے ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک پختہ کار شاعر وانشور کے خطوط میں ہونا چاہئے، ان مکاتیب سے نہ صرف شاد کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بہت سے شاعرانہ نکات بھی سامنے آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی یہ خدمت اردو ادب میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔

ساقی (مارچ ۱۹۴۴ء) کی رائے

ان خطوط میں دل کھول کر شاد مرحوم نے باتیں کی ہیں، بہت سی خانگی باتوں کا بھی ذکر ہے۔ . . . .

یہ خط تیس سال کے عرصے پر محیط ہیں، آخری خط انتقال سے دو ہفتے پہلے کا ہے۔ پہلے خط سے لے کر آخری خط تک شاد کی دو بڑی آرزوئیں تقریباً ہر خط میں درج ہیں، حیدرآباد جانے کی آرزو اور اپنے استاد کی سوانح عمری کی تکمیل۔

ڈاکٹر زور نے ان خطوط کو مرتب کرکے چھاپا ہے، شاد کے متعلق ان میں بیش بہا معلومات یکجا ہیں اس لئے قابلِ قدر ہے۔

غزلیں

(دیارِ نبیؐ میں)

بَری ہو کے اندیشۂ بیش و کم سے
ہم آسان گزرے حدودِ حرم سے

سماں مسجدِ خیف کی برکتوں کا
بڑا خوب نظّارۂ جامِ جم سے

کریں گے وہ کیا لے کے عیشِ دو عالم
جو عشاق گردیدہ ہیں اُن کے غم سے

عطا پاش از بسکہ تھی رحمت اُن کی
ولی بن کے چمکے خطا کار ہم سے

ہمیں بھی ملے حسرت اے کاش حصّہ
درِ حضرتِ حق کے فیضِ اتم سے

۲

فنا ہے بقا مسلکِ عاشقی میں
اگر رونما ہو دیارِ نبیؐ میں

کبھی دیکھ لو گے خود اپنی گلی میں
جو کچھ ہم ہیں ٹھانے ہوئے اپنے جی میں

خوشا ربطِ ناز و نیازِ محبت
کہ یہ جنگ میں ہے نہ ہے آشتی میں

ہمیں بھی ہے ناز اپنی جانبازیوں پر
جو وہ فرد ہیں شیوۂ دلبری میں

سفر جب نہ ہو پھر مدینہ سے حسرت
وہ کب آئیں گے دن تری زندگی میں

۳

بہ ملکِ تمنا بہ صد طرفہ کاری
ترا شوق کرتا ہے شہریاری

ترے در پہ عشاق اے شاہِ خوباں
غلامانہ کرتے رہیں جاں نثاری

تری نذر کو لائے ہیں نقدِ جاں ہم
بہ صد عذر خواہی بصد شرمساری

ترے دور میں سخت مشکل ہے ساقی
کہ باقی رہے رسمِ پرہیزگاری

شرف رکھتی ہے بادشاہی پہ بے شک
مدینے کی حسرت غریب الدیاری

حسرت موہانی

(یہ مقالہ اردو کانفرنس میں پڑھا گیا تھا جو بصدارت نواب کمال یار جنگ بہادر بتاریخ ۲۳ جنوری ۱۹۴۰ء بلدۂ حیدرآباد میں منعقد کی گئی تھی)

صحافت اور اردو

انسان ایک حیوان ناطق ہے۔ بقائے حیات کے لئے اُس کا اولین فرض اپنی جان اور مال کی حفاظت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس فرض کی تکمیل کے لئے انسان میں تجسس کا مادہ بھی قدرت نے ایسا ودیعت کیا ہے کہ خطرات سے بچنے کے لئے وہ ہمیشہ اپنوں اور غیروں کے حالات اور واقعات معلوم کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس کی یہ پیاس کبھی بجھتی نظر نہیں آتی۔ اسی تجسس کے باعث آدم کو بہشت چھوڑنا پڑا اور رفتہ رفتہ یہی چیز انسانی ترقی کا سنگِ بنیاد قرار پائی۔ تہذیب و تمدن کی طرف انسان کا ہر قدم دراصل اسی جذبۂ تجسس کے تحت اٹھتا گیا اور آج بھی دنیا کی ساری ترقی اسی تجسس کی رہینِ منت ہے۔ غرض انسانی فطرت کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہے بلکہ انسانی دماغ کی ساخت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ کد و کاوش اور تجسس اس کی غذا ہے۔ یہیں سے دراصل اخبارات کی ابتدا ہوتی ہے۔

ابتدائی زمانہ میں جب صحافت موجودہ ترقی پذیر صورت میں نہیں تھی تو خبروں کی اشاعت کے مختلف طریقے تھے۔ عموماً مسافرین اور سیاح ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بادشاہ کے پاس یا دار الخلافہ میں خبریں سرکاری ذرائع سے فراہم کی جاتی تھیں۔ حکومت کی جانب سے جو احکام صادر ہوتے تھے وہ اعلانات یا فرامین شاہی کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں مشتہر کئے جاتے تھے یا فوری خبریں پہنچانے کے لئے کبوتروں یا ہرکاروں سے کام لیا جاتا تھا۔

یوں دیکھا جائے تو صحافت مشرق کی پیداوار ہے جو مغرب کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال قبل دنیا کا پہلا اخبار چین سے نکلا جو (پیکن گزٹ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ آج کل کے اخبارات کی طرح نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک سرکاری جریدہ کی تھی جس کا مقصد شاہی فرامین اور احکامات کی اشاعت تھا۔ یہی صحافت کی بنیاد ہے جس پر آج اتنی سربفلک عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحافت کی ابتدا کا سہرا چین کے سر ہے لیکن اس میں قابلِ ذکر ترقی ازمنہ وسطیٰ کے بعد شروع ہوئی۔ قسطنطنیہ کے ترکی قبضہ کے بعد وہاں کے عالموں کی جماعت سارے یورپ میں پھیل گئی جس نے تھوڑی مدت میں عیسائی ممالک سے جہالت کو دور کیا۔ اس زمانے میں جب یورپ اپنے عہد بربریت سے نکل کر تمدن کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ طباعت نے جنم لیا۔ اس کا ایجاد ہونا تھا کہ توسیع علم کا ایک نیا باب کھل گیا اور صحافت جو طباعت کے بغیر ایک جسد بے روح تھی از سر نو زندہ ہوگئی۔ صحافت اور طباعت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ طباعت کے طریقوں میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ صحافت بھی ابتدائی منازل طے کرنے لگی۔ آج مشینری ہی پر اخبار کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔

تمدن جدید کی بنیاد جمہوریت پر قائم ہے اور جمہوریت میں ہر شخص کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ہر انفرادی رائے سے دراصل اس رائے عامہ کی تشکیل ہوتی ہے جس پر جمہوریت کی عالیشان عمارت کھڑی ہے۔ اس لحاظ سے رائے عامہ کے تشکیل کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں اخبارات سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ کسی ملک کی صحافت اس ملک کے

احساسات اور جذبات کی ترجمان اور دہاں کی سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور علمی حالت کی مظہر ہوتی ہے۔ صحافت کی ترقی پذیر صورت ہی پر ملک کی ترقیوں کا انحصار ہے۔ صحافت ایک جادو ہے جس کے بول میں خیر و شر کی بجلیاں روپوش ہیں۔ اس لئے اخبارات کا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے جو اخبار نویسی شوق یا روزگار کی خاطر اختیار نہیں کرتے بلکہ ان کے دل میں قومی خدمت کی تڑپ ہوتی ہے اور وہ اس پیشہ کو پیشہ کی خاطر نہیں بلکہ اسی جذبہ خدمت گزاری کی خاطر قبول کرتے ہیں اور آخر وقت تک ان کے اس جوش میں فرق پیدا نہیں ہوتا ورنہ حق اور صداقت کی تائید میں جتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اتنا کسی دوسرے پیشہ میں کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن ساتھ ہی جہاں انسان اپنے اس فرض سے گریز کرنا چاہے اور اپنے ضمیر کی آواز کا ساتھ دینا چھوڑ دے اس کے لیے زندگی اتنی ہی آسان بھی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اردو صحافت کے متعلق کچھ کہیں ہم مختصراً صحافت کے فرائض پر نظر ڈالیں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

صحافت کا اولیں فرض خبروں کا جمع کرنا ان کو شائع کرنا اور ان پر رائے زنی کرنا ہے۔ اخبار در اصل ایک تاریخ ہے جو روزآنہ لکھی جاتی ہے۔ جس طرح تاریخ دنیا کے اہم واقعات بادشاہوں کے جنگ وجدل کے قصے اور ان کے کارناموں کا ذخیرہ ہوتی ہے اسی طرح اخبارات میں روزآنہ کے واقعات کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ تاریخ اور اخبار میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر کی جگہ کتب خانوں کی الماریاں ہیں تو ثانی الذکر کا مقام پنساری کی دکان ہے۔

اے ئے جے بلیر نے اخبار کے فرائض کی یوں توضیح کی ہے "ان کے کیا فرائض ہیں۔ میرے نزدیک لوگوں کو ایسے واقعات اور حالات سے واقف کرانا ہے کہ دنیا میں زمان ومکان اور ماحول کا فرق باقی نہ رہے جن کے بغیر انسان میں وسیع النظری پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک روزآنہ کا اخبار پڑھنے والا بڑی حد تک دنیا کے اہم واقعات سے واقف رہتا ہے جو نہ صرف خود اس کے ملک میں واقع ہوتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں اور رفتہ رفتہ وہ غیر ارادی طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دنیا میں باوجود نسلی، جغرافی، سیاسی، سماجی، مذہبی و تعلیمی امتیازات کے مقاصد میں کتنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جو لوگ اخبار نہیں پڑھتے وہ وسیع النظر نہیں ہو سکتے۔ ان کی نظریں اپنے ماحول سے آگے نہیں جاتیں اس طرح اخبارات کو بڑی تعلیمی و تدریسی اہمیت حاصل ہے انسان کے خیالات میں ان سے وسعت پیدا ہوتی ہے اور مختلف قوموں میں یکجہتی پیدا کرنے میں یہ بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔"

بہرصورت اخبار احتیاجات انسانی کے رفع کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور اس سے تین مختلف فرائض متعلق کئے جا سکتے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ اخبار کا ایک اور فرض یہ بھی ہے کہ وہ کاروبار کی ترقی کا بڑا ذریعہ ہے۔

حالات اور واقعات کی اشاعت کو اگر صحافت کا مقصد قرار دیا جائے تو دنیا میں اس کا وجود کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ مینار، کتبے، پتھر پر کندہ کی ہوئی عبارتیں اور اسی قسم کے بہت سے طریقے صحافت کے ابتدائی نقوش ہیں۔ ہندوستان میں اب تک یہ چیزیں ماضی کو بے نقاب کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں صحافت کی طرف پہلا قدم عہد مغلیہ کی واقعہ نویسی ہے۔

اس زمانے میں واقعہ نویس خصوصیت سے حکومت کے مختلف صوبوں میں مقرر کئے جاتے تھے تاکہ بادشاہ کو ان علاقوں کے واقعات اور حالات سے اطلاع دیتے رہیں اسی طرح عمائد سلطنت کے بھی اپنے واقعہ نویس ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی بھیجی ہوئی خبریں عام معنوں میں مشتہر ہو جاتی تھیں۔ واقعہ نویس اپنی حد تک بہت آزاد تھے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد واقعہ نویسی کو بھی زوال آگیا اور انگریزوں کے حکمران ہونے تک ہندوستان میں صحافت سوئی ہوئی تھی۔

۱۷۸۰ء میں ہندوستان میں پہلا اخبار (بنگال گزٹ) جاری ہوا اس کے بعد انگریزوں کی کوشش سے اور بھی اخبار نکلے۔ ۱۸۱۶ء میں گنگادھر بٹاچار نے پہلا بنگالی اخبار جاری کیا۔ ۱۸۱۸ء میں سرام پور کے عیسائی مشنریوں نے (دگدرشن) نام کا ایک اخبار جاری کیا۔ جو انگریزوں اور بنگالی دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ دیسی زبانوں میں بنگالی نے سب سے پہلے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۸۳۵ء تک اخبار جاری کرنے میں حکومت کے قوانین کی وجہ سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب اس سال پریس کو آزادی حاصل ہوئی تو صحافت میں بھی ترقی ہونے لگی۔ اردو میں سب سے پہلا اخبار آزاد کے والد باقر حسین صاحب نے دہلی سے (اردو اخبار) کے نام سے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا یہ ایک ادبی پرچہ تھا اس میں خبریں شایع نہیں ہوتی تھیں۔ غالب، مومن، ذوق اور دیگر شعرا کی طرح غزلیں شایع ہوتی تھیں۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رام نے لاہور سے (کوہ نور) جاری کیا جس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا۔ اس کے بعد ہفتہ میں دو اور پھر تین بار شایع ہونے لگا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اور اس کی جگہ دوسرے اخباروں نے لے لی۔ منشی نولکشور جن کے اردو زبان پر بڑے احسانات ہیں اسی اخبار میں ملازم تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۹ء میں (اودھ اخبار) جاری کیا۔ اس کی بیشتر خبریں انگریزی اخبارات سے ترجمہ کی جاتی تھیں۔ اس کا کوئی سیاسی مسلک نہیں تھا۔ اور ہمیشہ دامن بچا کر چلنے کا عادی تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اور اس کے بعد روزآنہ ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا قابل ذکر اخبار لاہور کا "اخبار عام" ہے جس کو پنڈت مکند رام نے جاری کیا جو پہلے کوہ نور میں ملازم تھے یہ حقیقی معنوں میں اخبار تھا۔ اس کی قیمت بھی بہت کم تھی۔ اور حکومت اور پبلک دونوں میں یہ مقبول تھا۔ یہ پہلا اخبار ہے جس نے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا۔

جس طرح اردو زبان کی ترقی اور اشاعت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ اسی طرح اردو صحافت کو آگے بڑھانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے زیادہ کوشش کی۔ منشی ہرسکھ رام منشی نولکشور، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور پنڈت تربھوان ناتھ سپرو ہجر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے ممتاز صحیفہ نگاروں میں ہیں۔ اس زمانہ میں سرسید کی شخصیت تمام صحیفہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے سرسید نے ۱۸۶۲ء میں لٹریری اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنا ڈالی جس کا ترجمان (علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) تھا جس میں سرسید نے ہر موضوع پر سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی مضامین لکھے ۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا جس نے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونک دی اس کے مشہور مضمون نگار محسن الملک اور مولوی چراغ علی تھے۔ منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا جو اردو کا پہلا مزاحیہ

اخبار ہے اور جس کے مزاحیہ نگاروں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس پرچہ کی بڑی خصوصیت آزادیٔ تحریر تھی۔ اردو کا یہ پہلا اخبار ہے جو خبروں کے ساتھ ایک مستقل پالیسی کے تحت شایع ہوتا تھا۔ قومی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد کا یہ حامی تھا اس کے ساتھ ہی مذہبی معاملات میں تنگ نظر تھا۔ اور بعض وقت مبتذل مذاق پر اتر آتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں اکبر الہ آبادی، احمد علی شوقؔ، پنڈت تربھوان ناتھ سپرو ہجرؔ، احمد علی کسمنڈوی، پنڈت جوالا پرشاد برقؔ، نواب سید محمد آزاد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے ایک اور اخبار (ہندوستانی) کے نام سے جاری ہوا۔ یہ پہلا اخبار ہے جس میں سیاسی معاملات اور حالاتِ حاضرہ پر باقاعدہ تنقید و تبصرہ کیا جاتا تھا۔ اس کا معیار بھی بلند تھا۔ انیسوی صدی کے اواخر کی ایک اور بڑی ہستی جس کی زندگی اردو صحافت کے سنوارنے میں گذری ہے مولانا شرر کی ہے۔ ان کی صحافتی زندگی کی ابتدا پنڈت نولکشور کے اودھ اخبار کی نائب ادارت سے ہوتی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار (محشر) جاری کیا۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں رسالہ "دلگداز" سنہ ۱۸۹۰ء میں "مہذب" ہفتہ وار سنہ ۱۹۰۸ء میں رسالہ "پردۂ عصمت" اور اس کے بعد رسالہ "اتحاد" اور "العرفان" ان کی ادارت میں شایع ہوئے۔ شرر نے ہر قسم کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی، ادبی۔ اردو ادب کی شرر نے جو مختلف النوع خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ ادب اردو کا ایک زرین باب ہے۔

سنہ ۱۸۸۷ء میں لاہور سے (پیسہ اخبار) جاری ہوا جس کے ایڈیٹر اور مالک منشی محبوب عالم تھے۔ جنھوں نے اپنے اخبار کا چندہ کم رکھ کر اردو صحافت میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اس میں کثرت سے اشتہارات شایع ہوتے تھے۔ تجارتی اور کاروباری نقطۂ نظر سے یہ بہت کامیاب اخبار تھا۔ قدیم اردو صحافت کے تذکرہ کو ختم کرتے ہوئے ہم مختصراً ان شخصیتوں کا ذکر کریں گے جنھوں نے اردو صحافت کے ارتقا میں مدد دی ہے۔ ان میں قابلِ ذکر محمد حسین آزاد ہیں جو کچھ دنوں اخبار (اتالیق پنجاب) کے نائب مدیر تھے۔ یہ ایک سرکاری اخبار تھا جس کے مدیر اعلیٰ ماسٹر پیارے لعل آشوب تھے۔ دوسری قابلِ ذکر ہستی پروفیسر وحید الدین سلیم کی ہے جو سرسید کے ادبی معتمد تھے سرسید کی وفات کے بعد انھوں نے ایک رسالہ (معارف) کے نام سے جاری کیا اور علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے یہ مدیر بھی رہ چکے ہیں سلیم نے اردو صحافت کی نمایاں خدمت مسلم گزٹ لکھنؤ کی ادارت کے زمانے میں انجام دی جب کہ کانپور کی مسجد کے قضیے کے وقت انتہائی بے باکی سے انھوں نے حکومت کی پالیسی پر اعتراضات کئے۔ جس کی وجہ سے انھیں ادارت سے سبکدوش بھی ہونا پڑا۔ بعد میں سلیم (اخبار زمیندار) کے چیف ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے تھے لیکن جب اخبار کی پالیسی کی وجہ سے اس کی ضمانت ضبط کر لی گئی تو انھوں نے اخبار سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں "الہلال" ہمدرد، زمیندار اور "خلافت" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی وجہ سے اردو صحافت نے اعلیٰ معیار حاصل کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ اردو صحافت اور اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ الہلال اردو کا مقبول ترین اخبار رہا ہے۔ جس نے اپنے پڑھنے والوں کے دلوں پر وہ گہرے نقوش

چھوڑے ہیں کہ اس کی یاد ابھی تک محو نہیں ہوتی ہے۔ الہلال مصری صحافت کا آئینہ دار تھا اس کے مقالات بہت ہی بلند پایہ ہوتے تھے اس نے اردو میں ایک نئے اسلوب بیان کی ابتدا کی جو مولانا ابوالکلام آزاد کا خاص اسٹائل ہے "ہمدرد" اردو کا وہ پہلا اخبار ہے جس میں اخبار کی ساری خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ مولانا محمد علی نے "ہمدرد" کے ذریعہ صحافت کی جو خدمت کی ہے اس کے احسان کا بار اردو زبان پر ہمیشہ رہیگا۔ "ہمدرد" اردو اخبارات کے لئے ایک نمونہ تھا۔ اس کی خبریں اس کے اداریئے اس کے مقالات انگریزی اخبارات پر سبقت لے جاتے تھے۔ مولانا محمد علی کی سیاسی مصروفیتوں اور پبلک کی بے التفاتیوں کی وجہ سے "ہمدرد" ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہا۔ لیکن آخر وقت تک وہ آزادی اور حریت کا علمبردار تھا۔ اردو صحافت میں ایثار کا مجسم نمونہ اگر کوئی اخبار ہے تو وہ "زمیندار" ہے جو مولانا ظفر علیخاں کے جوش عمل اور جذبہ ایثار کا مظہر ہے۔

"خلافت" نے تحریک خلافت کے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن اس تحریک کے سرد پڑنے کے بعد خلافت کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اس زمانہ کے ایک اور صحیفہ نگار مولانا سید جالب ہیں جو "ہمدم" لکھنؤ کے مدیر تھے اور جن میں ایک اخبار نویس کی جملہ خصوصیتیں جمع تھیں۔

ان اخباروں کے علاوہ آج کل اردو میں بیسوں اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں۔ لاہور اردو صحافت کا مرکز ہے اور جو خدمت صحافت کی لاہور انجام دے رہا ہے وہ اردو صحافت کا ایک درخشاں باب ہے۔ اردو صحافت کی اس مختصر تاریخ کے بعد ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت اردو میں کوئی اخبار کل ہند اہمیت کا نہیں ہے اور نہ "الہلال" یا "ہمدرد" کے پایہ کا ہے علاوہ ازیں جس طرح اردو صحافت ابتدا میں اردو کے مایہ ناز ادیبوں اور مصنفین کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنے کارناموں سے اردو ادب اور زبان کو مالا مال کیا ہے اتنی ہی آج کل ایسے لوگوں کی کمی ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں اور اردو صحافت میں تنزل کی یہ کیفیت کیوں پیدا ہوگئی ہے اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ سردست ہم اردو صحافت کی بعض عملی دقتوں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو صحافت ابھی دیگر متمدن ممالک کی صحافت کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے اس میں سب سے بڑی دقت طباعت کی ہے۔ جب تک موجودہ طباعت کے طریقوں میں تبدیلی نہ ہو اردو صحافت کا ترقی کرنا مشکل ہے حیدرآباد اور برطانوی ہند میں ٹائپ کی ایجاد کے متعلق کافی تجربے کئے جاچکے لیکن تعجب ہے کہ کسی مقام کے ٹائپ نے عام مقبولیت حاصل نہیں کی اور اردو اخبارات کی طباعت میں کوئی سہولت پیدا نہ ہوسکی۔ یا تو یہ ایجادیں اتنی قیمتی ہیں کہ اخبار کے مالک انھیں خرید نہیں سکتے یا بجائے خود ان ایجادوں سے موجودہ طباعت کی مشکلات کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ اس کے بغیر اردو صحافت کو نقصان پہنچے گا۔ آج کل جب اردو زبان خود سیاسیات حاضرہ کا ایک آن بوجھ مسئلہ بن گئی ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی مقبولیت اور اشاعت کے لئے زیادہ سے زیادہ موثر تدابیر اختیار کی جائیں جن میں سب سے پہلے طباعت کا نمبر ہے۔

اس کے بعد خبروں کے جمع کرنے کی باری آتی ہے۔ یہ اردو صحافت کی بدقسمتی ہے کہ اردو پریس کے لئے کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں ہے۔ ہندوستان میں جو ایجنسیاں کام کررہی ہیں وہ یا تو باہر کی ہیں یا ایسی ہیں کہ انھیں اردو صحافت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اردو کا کوئی روزنامہ ایسا نہیں ہے جسے کل ہند اہمیت حاصل ہو۔ اپنے شہر یا صوبہ سے نکلتے نکلتے تک وہ باسی ہوجاتا ہے اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہمارے اخبارات خبروں کے لئے انگریزی اخبارات کے محتاج ہیں۔ اردو کا شائد ہی کوئی ایسا اخبار ہوگا جس کے نمائندے کم از کم ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہوں۔

اردو صحافت ایک ترقی پذیر صورت اسی وقت اختیار کرسکتی ہے جب کہ اشتہارات اس کا لازمی جزو بن جائیں۔ اخبار کے منجملہ اور فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کاروباری اور تجارتی اغراض کو پیش نظر رکھے۔ کیونکہ اشتہارات پر اخبار کی زندگی اور موت کا دارومدار ہے۔

اردو صحافت کی ترقی کے لئے صحافتی کانفرنسوں کے انعقاد کی بڑی ضرورت ہے۔ ہر ملک میں اس قسم کی مجلسیں صحافت کی جان ہوتی ہیں۔ باہمی تبادلۂ خیال سے آپس کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجاتا ہے اور ملک کے اہم مسائل پر مختلف نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ اور اپنی فلاح و بہبود کے متعلق بہت سی تدابیر سوچی جاسکتی ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے حیدرآباد کی موجودہ صحافت پر بھی ہم ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ اس وقت حیدرآباد میں سب سے مقبول ترین اور ہر دلعزیز اخبار (رہبر دکن) ہے جو صحیح معنوں میں ملک کے جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے۔ علاوہ ازیں یہ بہت ہی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی کتابت اور طباعت بہترین ہوتی ہے اور اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ پہلا اردو اخبار ہے جو بالالتزام خبروں کے ساتھ سیاسیات حاضرہ کی اہم شخصیتوں کی تصویریں شائع کرتا ہے۔ اس میں عربی اخبارات کے ترجمے شائع ہوتے ہیں اور لندن میں اس کا ایک اپنا خصوصی نامہ نگار بھی ہے۔ حیدرآباد کے اردو اخبارات میں رہبر دکن کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور حکومت کے نزدیک اس کی بڑی وقعت ہے۔

(پیام) (صبح دکن) (مشیر دکن) (صحیفہ) (نظام گزٹ) بھی حیدرآباد کے روزنامے ہیں۔ پیام کے ایڈیٹر اردو کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار ہیں۔ قاضی صاحب کو صحافت کا وسیع تجربہ ہے۔ آپ "ہمدرد" کی مجلس ادارت میں بھی رہ چکے ہیں لیکن بدقسمتی سے حیدرآباد میں آپ کی صحافت کو مقبولیت کی سند حاصل نہ ہوسکی جس کے مختلف وجوہات ہیں "صبح دکن" بھی ملک کا ایک مقبول اخبار ہے جو اہل ملک کے خیالات کا آئینہ دار ہے "نظام گزٹ" بھی ابھی ہفتہ وار سے روزآنہ ہوا ہے مشیر دکن بھی کافی ہر دل عزیز ہے لیکن یہ زیادہ تر ہندؤں میں پڑھا جاتا ہے اس کی پالیسی معتدل ہے۔

"صحیفہ" ایک قدیم روزنامہ ہے۔ اس پر مذہبی رنگ غالب ہے۔ تعجب ہے کہ اس اخبار نے ابھی تک ملک میں اپنے لئے کوئی خاص جگہ پیدا نہیں کی۔

روزناموں کے ذکر کے ساتھ "وقت" مرحوم کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ حیدرآباد کا یہی وہ اخبار تھا جس نے

ملک میں اخبار نویسی کے ذوق کو عام کیا اور اتنا عام کیا کہ ملک کا ہر پڑھا لکھا شخص اخبار بین بن گیا۔ ملک میں جو سیاسی شعور اور بیداری "وقت" نے پیدا کی وہ حیدرآبادی صحافت کا ایک زرین کارنامہ ہے "وقت" ہی وہ اخبار تھا جس نے آزادئ تحریر کی صحیح معنوں میں علمبرداری کی ہے جس نے صحافت کی اعلیٰ ترین معیار کو برقرار رکھا اور جس کی آواز زبان خلق بن کر ملک کے گوشہ گوشہ سے گونج اٹھتی تھی" "وقت" کے ملک پر بڑے احسانات ہیں۔ اس نے ملک میں عمل کی روح پیدا کی۔ اس نے اہل ملک کے جائز حقوق کی حفاظت اور حکومت کی پالیسیوں پر اس کی صحیح اور مخلصانہ تنقیدیں اب بھی دوسرے اخبارات کے لئے دلیل راہ ہیں۔ ....

.... "وقت" کے دوبارہ اجرا کی اجازت ہی اہل ملک کے بے چین قلوب کو مطمئن کر سکتی ہے۔

ہفتہ وار اخبارات میں قابل ذکر "رعیت" اور "اقبال" ہے۔ "رعیت" دیہی ترقیوں اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے ساتھ سیاسیات میں کانگریسی ذہنیت کا ترجمان ہے۔ "اقبال" سکندرآباد کا پہلا ہفتہ وار ہے۔ جس نے ایک تھوڑے عرصہ میں اپنی آزادئ تحریر کی وجہ سے ملک میں کافی اہمیت پیدا کر لی ہے۔

حیدرآبادی صحافت کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہاں بجز ایک دو اخبارات کے خبروں پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ حکومت کی عنایتوں سے جملہ اخبارات کو "اسوشی ایٹیڈ پریس اور رائٹر کی خبریں بہم پہنچائی جاتی ہیں لیکن خود ملک میں خبروں کے جمع کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اضلاع کی خبریں عام طور پر جلسوں اور عہدہ داروں کے تبادلوں کی روئداد میں ہوتی ہیں اور وہ بھی بعد از وقت روانہ کی جاتی ہیں۔ ان خبروں کے بھیجنے والے عام طور پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اخبار میں اپنا نام شائع کرانے کے خیال سے خبریں بھیجتے ہیں۔ صرف ایک "اعظم نیوز سروس" ہے جس کے نمایندے اضلاع کے اہم مقامات پر ہیں۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ خود اخبار کے نمایندے بھی اضلاع پر متعین رہیں جو فوراً وہاں کی اہم خبروں کو بلا تاخیر روانہ کریں۔ تعجب یہ ہے کہ خود دارالسلطنت میں کسی اخبار کے پاس مقامی نمایندے نہیں ہیں۔ دکن نیوز ایجنسی ہی تمام اخبارات کو خبریں بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ایجنسی "حیدرآباد پریس سروس" ہے۔ ہمارے پاس کا ہر اخبار مقامی خبروں اور حکومت کے فراہم کردہ تاروں کی وجہ سے ایک دوسرے کا مثنیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اخبار پڑھنے والا دوسرے اخبار سے تقریباً بے نیاز رہتا ہے۔ جس شہر سے چھ سات روزنامے نکلتے ہوں وہاں خبروں کی اشاعت کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت کا نہ ہونا تعجب خیز ہے۔

حیدرآباد یا بیرون ہند کے اخبارات کی تعداد اشاعت بھی محدود ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اخبارات کی قیمت زیادہ ہے۔ اتنی ہی قیمت میں انگریزی اخبارات دگنا تگنا مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر اخبار کی قیمت اس کے حجم کی مناسبت سے رہے تو اس کی اشاعت بھی کثیر ہو سکتی ہے۔ "وقت" روزآنہ دس دس پندرہ پندرہ ہزار تک شائع ہوا ہے محض اپنی قیمت کی وجہ سے۔ حیدرآباد میں ایک زمانہ میں اخبارات کو حکومت کی جانب سے مالی امداد بھی دی جاتی تھی گو اس میں ترمیم ہوگئی ہے لیکن پھر بھی بعض اخبارات کے ساتھ حکومت کی خاص رعایت اس کی جانبدارانہ پالیسی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں مزید نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

حیدرآباد کی صحافت کی ترقی کے لئے ایک انجمن صحافت کی

کی سخت ضرورت ہے اس خصوص میں اب تک متعدد مرتبہ کوشش بھی کی گئی لیکن مزید کوشش کی ضرورت ہے۔

اپنے مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں ایک اور چیز کے متعلق آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ صحافت جتنی آسان ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ محض اس کی آسانی کی وجہ سے لوگ جنھیں کوئی روزگار نہیں ملتا اس پیشہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس پیشہ کی ذمہ داریوں کو اٹھا نہیں سکتے۔ ایسے لوگ جنھیں کوئی باقاعدہ تعلیم نہ ملی ہو جو سیاسیات کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں صحافت کے فرائض کو کبھی انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ایسے حضرات اس پیشہ میں قدم رکھیں جن کے دل میں قومی خدمت کی تڑپ ہو اور جنھوں نے ضروری تعلیم حاصل کی ہو۔ آج ایسے ہی لوگوں کی کمی کی وجہ سے صحافت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو ایسے اخبارات کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

اردو صحافت کو جنم لئے ہوئے ایک سو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ ایک صدی تک اس پر اس طرح خود فراموشی کی کیفیت کا طاری رہنا کیا ارباب اردو کے لئے دعوت فکر و نظر نہیں ہے؟ کیا حالات کا فوراً جائزہ لے کر اس کی بہتری کی کوئی صورت نہیں نکالی جا سکتی؟

محمد بدر الدین خاں شکیب

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ سپاس جناب امیر از علامہ اقبال مرحوم ۲۰ صفحات قیمت ۱ر
۲۔ ختم نبوت اور قادیانیت (علامہ اقبال مرحوم کا ایک مقالہ) مرتبہ میر حسن الدین ۴۴ صفحات قیمت ۴ر
۳۔ ریزۂ مینا (مشہور افسانہ نگاروں کے پچاس افسانوں کا مجموعہ) مرتبہ شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر ساقی ... صفحات قیمت عال
۴۔ سوانح حیات سبھاش چندر بوس از رگھوبنس چوپڑا ۱۱۲ صفحات۔
۵۔ سوانح حیات موجد طب جدید (احمد دین مرحوم کے حالات) از دوست محمد ۲۷۲ صفحات
۶۔ چشم عنکبوت (افسانہ) از فضل مرزا ۳۲۰ صفحات۔
۷۔ انگلینڈ کی تاریخ از ڈاکٹر بی پی منور مدار ۲۵۹ صفحات
۸۔ چہار قانون (آٹھواں ایڈیشن) از مرزا فریدوں بیگ ۴۴۰ صفحات۔
۹۔ قانون اسٹامپ (جلد دوم) از گردہاری لال ۱۷۹ صفحات۔
۱۰۔ کرشمات پھٹکری از علی بشیر ۴۰ صفحات۔
۱۱۔ راز نسواں (علاج نسواں) از عزیز ایم اے ۹۶ صفحات۔
۱۲۔ مصباح الحکمت (دوسرا ایڈیشن) از محمد فیروز الدین ۱۳۲۰ صفحات۔
۱۳۔ جامع الحکمت جلد دوم از محمد حسن قریشی ۱۳۲۰ صفحات۔
۱۴۔ بہتر دیہات (دیہات سدھار) از ایف۔ ایل۔ برائن ۴۳۹ صفحات۔
۱۵۔ بنیادی قومی تعلیم از ڈاکٹر ذاکر حسین ۲۴۴ صفحات
۱۶۔ روپ متی اور باز بہادر (تاریخی ڈراما) از محشر عابدی قیمت عہ۔
۱۷۔ ماہ و انجم (افسانے) از کوثر چاند پوری قیمت ۱۲ر
۱۸۔ تاج شاہی عشق کے قدموں میں (تاریخی افسانے) قیمت عہ
۱۹۔ تاریخ اسلام (تین جلد) از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی قیمت لیہ
۲۰۔ صراط الحمید جلد اول (سفرنامہ مقامات مقدسہ) از محمد الیاس برنی قیمت عال
۲۱۔ نبض (نبض کی حقیقت) از حکیم عبد اللطیف ۲۰۴ صفحات۔
۲۲۔ ہندوستان کی تہذیب کی تکمیل از کالیداس کپور ۵۰ صفحات قیمت ۸ر
۲۳۔ سوشلزم (اشتراکیت کی تاریخ) فریڈرک اینگلز کی کتاب کا ترجمہ ۶۴ صفحے قیمت ۶ر
۲۴۔ مضامین فراق از خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی ۲۶۰ صفحات قیمت عہ
۲۵۔ کاغذ کی ناؤ (مختصر ڈرامے) از صاحبزادہ میکش ۱۲۰ صفحات قیمت عہ
۲۶۔ دادا بھائی نوروجی (مختصر سوانح) از ظہیر الدین احمد ایچ سی ایس ۱۶ صفحات قیمت ۲ر
۲۷۔ محمد حسین آزاد (سوانح حیات) از جہاں بانو بیگم ایم اے ۲۰۰ صفحات قیمت عال۔

حیدرآباد کی مچھلی

حیدرآباد کی مچھلی اصل معنوں میں مرل ہے جس کو بنگال میں سور۔ اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں "سول" یا "سولی" کہتے ہیں۔ یہ مچھلی ہندوستان میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ گدلے پانی میں رہتی ہے لیکن دوسری جگہ صاف پانی میں بھی بکثرت ملتی ہے۔

اس کی دو بڑی اور دو چھوٹی قسمیں یہاں پائی جاتی ہیں ایک جس کے اوپر پھول نما سفید دھبے ہوتے ہیں۔ "پھول مرل" کہلاتی ہے۔ اور دوسری جس کے اوپر سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں "کالی مرل" کہتے ہیں۔ اس کی چھوٹی قسموں کو "پھول ڈھوک" اور "دہیڑ ڈھوک" کہتے ہیں لیکن ان دونوں کو عموماً غریب لوگ ہی کھاتے ہیں۔ یہ مزہ میں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہوتیں۔

"مرل اس وجہ سے یہاں زیادہ مرغوب ہے کہ یہ بہ کثرت کے ساتھ ملتی ہے اور تھوڑے پانی کے اندر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ علاوہ اس کے یہ انڈے بند پانی میں دیتی ہے۔ اور وہیں اس کے بچے بھی نکلتے ہیں۔ لیکن یہ صورت دوسری مچھلیوں کے ساتھ نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ وہ انڈے صرف بہتے پانی یا بڑے تالابوں میں ہی دیتی ہیں۔

دوسری وجہ اس کے پسند کئے جانے کی یہ ہے کہ پانی کے باہر بھی یہ مچھلی کافی دیر تک زندہ رہ سکتی ہے۔ اور جب بازار میں اس کو پکڑ کر لاتے ہیں تو اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ مرتی نہیں پائی اور زندہ حالت میں تازہ ملتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں کانٹے زیادہ نہیں ہوتے اور کھانے میں تکلیف نہیں ہوتی لیکن بعض دوسری مچھلیوں میں کانٹے بہت ہوتے ہیں اور لوگ انھیں پسند نہیں کرتے۔

اب تک جو مچھلیاں دستیاب ہوئی ہیں ان کی مختلف قسموں کی تعداد (۵۲) ہے جن میں سے ان مچھلیوں کا ذکر کرنا ہی مناسب ہوگا جو عام طور پر ملتی ہیں۔

"مہاسیر" دراصل سب سے زیادہ لذیذ مچھلی ہے لیکن یہاں کمیاب اور نہایت مشکل سے ملتی ہے۔ یہ پہاڑی ندیوں میں اور گہرے پانی میں رہتی ہے۔ اس لئے چھلکے نہایت بڑے ہوتے ہیں۔ اور ان کے بٹن تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ یہاں کی تمام مچھلیوں میں سب سے بڑی ہے اور اکثر اس کا وزن کئی من تک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو "مہاسیر" کہتے ہیں۔

دوسری مچھلی جو عموماً برسات میں جب کہ پانی زیادہ ہوتا ہے اکثر ملتی ہے "روہو" کہلاتی ہے۔ اس کے چھلکے بڑے ہوتے ہیں اور ہر چھلکہ کے اوپر سرخ یا قرمزی رنگ کا ایک دھبہ پایا جاتا ہے۔ یہ بھی نہایت لذیذ مچھلی اور ہر طرح مرل سے بہتر ہوتی ہے۔ لیکن پکڑنے کے بعد دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی اس لئے جب اس کو منڈی تک لاتے ہیں تو اکثر اس میں بو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔

ایک اور مچھلی جس کو یہاں عموماً "پڑد" کہتے ہیں۔ اس کا گوشت نہایت ملائم ہوتا ہے۔ اور اس کو انگریز نہایت پسند سے کھاتے ہیں۔ اکثر اس کے گوشت کے نرم ہونے کی وجہ سے یہ (   ) بھی کہلاتی ہے۔ یہ مچھلی صاف اور گہرے پانی میں رہتی ہے۔ اور اکثر موسم برسات ہی میں منڈی میں آتی ہے۔

بام مچھلی سانپ کی شکل کی ہوتی ہے اور اس کی پیٹھ پر تیز کانٹوں کی ایک قطار پائی جاتی ہے۔ اس کی تین اقسام

ملتی ہیں۔ جو رنگ اور مختلف نشانیوں کی وجہ سے شناخت کی جاسکتی ہیں۔ یہ مچھلی عموماً غریب لوگ کھاتے ہیں اس لئے کہ ذائقہ کے لحاظ سے کچھ اچھی مچھلی نہیں۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ اکثر اس کے گوشت اور پیٹ کے اندر کیڑے ہوتے ہیں۔ جو اگر زندہ حالت میں انسان کی آنتوں میں چلے جائیں تو نقصان کا باعث ہوں گے۔ اس لئے ہمیشہ نہ صرف اسی مچھلی کے لئے بلکہ تمام مچھلیوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کو خوب پکانا چاہیے تاکہ کیڑے مرجائیں ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ یہ نقصان پہونچائیں گے۔

دوسری چند عام مچھلیوں کے صرف نام ہی بتانا کافی ہوگا۔ یہ "چیل مچھلی" کرٹنا۔ بچھو مچھلی، سنگھی، معروف، پٹن روپ چھال اور پرکلیاں وغیرہ ہیں۔

چیل مچھلی بکثرت ملتی ہے اور بالکل چپٹی ہوتی ہے۔ یہ اس لئے زیادہ پسند نہیں کی جاتی کہ اس میں کانٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں اب تک صرف چھوٹی قسم کی مچھلی ملی ہے۔ لیکن ہندوستان کے بعض حصوں میں اس کی بڑی قسم بھی ملتی ہے جو اکثر دو فٹ تک لانبی ہوتی ہے "موہ" کہتے ہیں اور اکثر شوقین حضرات مینڈک کے چارہ سے اس کو پکڑتے ہیں۔ لوگ نہایت شوق سے اس کے پیٹ کے حصہ کو کھاتے ہیں۔

سنگھی، کرٹنا، اور بچھو مچھلی ٹکل میں ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ان کے سامنے کے حصہ پر مونچھیں پائی جاتی ہیں۔ اور سر کے قریب دو تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ بچھو مچھلی کے کانٹے نہایت تیز ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی اسے ہاتھ لگانے کا اتفاق ہوا ہو تو اس کے نام کی اہمیت اور موزونیت آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ یہ ہاتھ لگاتے ہی اپنے بچاؤ کے لئے کانٹوں سے حملہ کرتی ہے اور ہاتھوں کو گھائل کر دیتی ہے۔ زخم گہرے ہوتے اور اکثر مشکل سے بھرتے ہیں۔ یہ مچھلیاں بند اور بہتے پانی میں یکساں طور پر ملتی ہیں۔

معروف بھی نہایت لذیذ مچھلی ہے اور گھر کے اندر حوض میں رکھی جاسکتی ہے اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے جسم پر چھلکے نہیں پائے جاتے۔ اور منہ کے قریب "مونچھیں" ہوتی ہیں۔ غذائیت کے لحاظ سے یہ "مرل" سے بھی بہتر ہے۔ اور اکثر بنگالی گھرانوں میں اس کا شوربہ ان کمزور لوگوں کو دیتے ہیں جنھیں مقوی اور زود ہضم غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

"پٹن" بھی ایک کافی بڑی اور مزے دار مچھلی ہے۔ یہ صاف اور گہرے پانی میں ملتی ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ مشہور ہے کہ اس کو کھانے سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے۔ اور اس قسم کی کوئی خرابی اس کو کھانے سے نہیں ہوتی۔

"روپ چھال" اور مختلف "پرکلیاں" سفید اور چمک دار ہوتی ہیں۔ یہ تالابوں کے کنارے کم پانی میں کثرت کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اچھی ہیں کہ ان میں فاسفورس کی مقدار بمقابلہ بڑی مچھلیوں کے زیادہ ہوتی ہے۔

"تنبو" مچھلی کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ سانپ کی شکل کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اوپر کانٹے نہیں ہوتے۔ یہ کمیاب ہے۔ اس کے اوپر زرد رنگ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ جو اتنا چکنا ہوتا ہے کہ مچھلی کو ہاتھ سے پکڑنا غیر ممکن ہے۔ اس کے متعلق مختلف قصے ہیں لیکن دراصل ان کی کوئی اہمیت نہیں اور طبی لحاظ سے بھی اس میں کوئی خاص جزو نہیں پایا جاتا گرچہ

ایک عام قاعدہ ہے کہ جو چیز مشکل سے دستیاب ہوتی ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی خاص بات لگا دی جاتی ہے۔

مچھلی ہر جگہ کثرت کے ساتھ بطور غذا استعمال کی جاتی ہے۔ اور دنیا کے ہر حصہ میں لوگ اس کو پسند کے ساتھ کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب تو اکثر جگہ اس کو بجائے گوشت کے ترکاری میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ آسانی کے ساتھ ہضم ہو جاتی ہے اور بیماروں کو بھی کھانے کے لئے دی جاتی ہے۔ اس میں ایسے غذائی اجزاء موجود ہیں جو خاص طور پر دماغ اور جسم کے لئے مفید ہیں۔ اس میں پروٹین بہ کثرت ہے۔ اور اس کے علاوہ فاسفورس، کیلشیم یعنی چونے چری اور لوہے کے عناصر بھی داخل ہیں۔ وٹامن یا حیاتین ( ) اور ( ) اور ( ) بھی موجود ہیں۔ اصل جزو پروٹین ہے جو انسان کی بقاء اور طاقت کو قایم رکھنے کے لئے نہایت اہم ہے۔ یہ خاص طور پر بڑھتے ہوئے بچوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لئے ایک نہایت اہم چیز ہے۔ اس لئے کہ جسم میں جو کچھ کمی یا کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ وہ پروٹین کے ذریعہ ہی پوری ہو سکتی ہے۔

دوسری چیز وٹامن ( ) ہے یہ بھی نہایت لازمی جزو ہے اور اس کی کمی دودھ، دہی، گھی، انڈوں اور خصوصاً مچھلی کے تیل سے پوری کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مچھلی کے جگر کے تیل میں اس کی مقدار کافی ہوتی ہے۔ وٹامن ( ) بھی کافی مقدار میں مچھلی کے تیل کے اندر موجود ہوتی ہے۔

فاسفورس دماغ اور ہڈیوں کے لئے اور کیلشیم خاص طور پر ہڈیوں، ناخنوں اور دانتوں کے لئے لازمی چیز ہے۔ ورنہ یہ حصے کمزور رہیں گے۔ لوہے کی ضرورت خون کے لئے ہے۔ ورنہ انسان کمزور اور بیماریوں کا شکار ہوتا رہے گا۔

مچھلیوں کی تعریف دراصل بنگالیوں سے پوچھنی چاہیے۔ اس لئے کہ وہ اس کے نہایت والہ وشیدا ہیں۔ اور کسی بنگالی کا کھانا اس وقت تک پورا نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ مچھلی کسی نہ کسی صورت میں اس کے دسترخوان پر موجود نہ ہو۔

میں دو بنگالی کہاوتیں یہاں بیان کرتا ہوں ان سے بخوبی معلوم ہو سکے گا کہ بنگالیوں کے نزدیک مچھلی کی کیا اہمیت ہے۔ ایک کہاوت یہ ہے:-

بھیتو بنگالی۔ ایک ٹکڑو ماچ پیلے
ایک تھالا بھات کھیلے پھیلے

یعنی یہ کہ ایک بھات یا خشکہ کھانے والا بنگالی مچھلی کے ایک ٹکڑے کو صرف دیکھ کر ہی بھات کا ایک پورا مشقاب ہڑپ کر سکتا ہے۔

مچھلی بنگالیوں کو اتنی مرغوب ہے کہ جب بڑی بوڑھیاں کسی عورت کو دعا دیتی ہیں تو یہ کہتی ہیں۔

"چیرو کال۔ اے بستری ہواسے۔ تھاکو۔ تو ماچ بھات جنیو با جائے تھاک" یعنی اے سہاگن عورت تیرا شوہر زندہ رہے اور تو ہمیشہ مچھلی اور بھات کھا کر خوش وخرم رہے۔

بنگالیوں میں یہ قاعدہ ہے کہ بیوہ عورتیں مچھلی نہیں کھا سکتیں اور مچھلی صرف سہاگن عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ دعا تک میں مچھلی داخل ہو گئی ہے۔

میرے اکثر بنگالی دوست ہیں اور جب کبھی ان سے کھانے کی بابت ذکر آیا ہے اور یہ دریافت کرنے کا اتفاق ہوا کہ دنیا کے کھانوں میں سب سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے۔ تو سب یہی کہتے ہیں کہ "ماچھ کھو ب بھالو چھے" یعنی مچھلی

نہایت اچھی چیز ہے۔ ان کا یہ کہنا واقعات پر مبنی ہے۔ اگر بنگالیوں کی غذا سے مچھلی نکال دی جائے تو دراصل کوئی خاص تقویت کی چیز ان کے کھانے میں نہیں رہتی اس لئے کہ ان کی غذا کا دوسرا اہم جزو صرف بھات یا چاول ہے۔ جس میں غذائیت تقریباً بالکل نہیں پائی جاتی۔

مچھلی نہایت عمدہ اور جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن کے ذریعہ یہ تازہ حالت میں بہ کثرت اور سستے داموں مل سکے تاکہ لوگ اس کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں استعمال کرسکیں۔

حیدرآباد میں مچھلیاں مختلف قسم کی اور بکثرت ملتی ہیں اس لئے کہ یہاں تالاب اور جھیلیں بہت زیادہ ہیں اور ندیاں بھی کئی ہیں۔ اگر صحیح اصول پر ان کی نگہداشت کیجائے تو گاؤں والوں کو ایک عمدہ غذا آسانی کے ساتھ مل سکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرکار کی آمدنی میں بھی کافی اضافہ ہوسکتا ہے۔ حیدرآباد کسی طرح بنگال یا مدراس سے میٹھے پانی کی مچھلیوں کی فراوانی میں کم نہیں۔ اس بارے میں بشرط فرصت میں پھر کبھی کچھ عرض کرسکوں گا اور یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کس طرح ایسی تدابیر عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ جس سے ہماری یہ خواہش اور ضرورت پوری ہوسکے۔

(تقریر حیدرآباد ریڈیو) **محمد رحیم اللہ**

ٹینس

ٹینس کی ابتدا تقریباً ستر سال قبل انگلستان میں ہوئی ایک عرصہ تک اس کا شمار مردانہ کھیلوں میں نہیں ہوا۔ بلکہ یہ ایک تفریحی ورزش خیال کی گئی۔ جامعوں اور پبلک اسکولس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی اور اس کی خوبیوں کو نہیں پہچانا درآں حالیکہ اس کھیل کے لئے کسی بڑے میدان کی ضرورت نہیں۔ اس میں وقت کم صرف ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے میلان و قویٰ کے موافق ورزش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ برابری کے مقابلے میں کھلاڑیوں کو فٹ بال یا ہاکی سے زیادہ محنت و جانفشانی کرنی پڑتی ہے ہاکی و فٹ بال کی طرح اس کھیل میں گیارہ کھلاڑیوں کا جمع ہونا ضروری نہیں ہوتا بلکہ دو یا چار کھلاڑی جمع ہو کر اپنی مرضی کے موافق ورزش کرسکتے ہیں۔ نہ صرف کھلاڑیوں بلکہ تماشہ بینوں کے لئے یہ ایک دلچسپ کھیل ہے اگر اس کھیل میں کوئی نقص ہے تو یہ ہے کہ اس پر اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی اس کھیل کے فوائد اور خوبیوں سے واقفیت ایک عرصۂ دراز کے بعد ہوئی یہاں بھی اس کی ابتدا انگریزوں ہی نے کی اور شروع میں زیادہ تر بوڑھے ہی ایک تفریحی ورزش کی طرح اس کو کھیلا کرتے تھے اور جوانوں اور بچوں کو اس طرف راغب کرنا تو کجا اس کھیل سے منع کیا جاتا تھا چنانچہ خود میرا تجربہ ہے کہ جب میں مدرسۂ عالیہ میں تعلیم پاتا تھا تو مسٹر برنٹ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم بوڑھے ہوجاؤ اس وقت اس کھیل کو کھیلنا۔ انگلستان میں تو سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے اس کھیل نے عام مقبولیت حاصل کرلی اور آب تو اس کھیل کو تقریباً ہر ملک نے خاص اہمیت دی ہے۔

لیکن ہندوستان نے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ خاص کر یہاں کی جامعوں اور مدارس میں اس کی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

ٹینس کے موجدوں نے اس کو مقبول عام بنانے کی خاطر ایک ٹورنمنٹ کی ابتدا سنہ ۱۸۷۷ء میں کی جو اب ومبلڈن ٹورنمنٹ کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے تو اس میں صرف انگریز کھلاڑی ہی حصہ لیتے رہے اور انہیں کو کامیابی ہوتی رہی جن میں قابلِ ذکر اے ڈبلیو گور اور دو ہار ٹی بھائی ہیں جنھوں نے اپنے کھیل کے معیار کو بہت بلند کیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے اسٹریلین اور امریکن کھلاڑی پیش پیش آنے لگے چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک دو اسٹریلین کھلاڑی وائلڈنگ اور نارمن بروکس نے سب پر برتری حاصل کی سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ کے سبب یہ ٹورنمنٹ موقوف رہا اور سنہ ۱۹۱۹ء میں جب جاری ہوا تو پھر ایک اسٹریلین کھلاڑی پیٹرسن نے اس چمپین شپ کو جیتا سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۱۹۲۱ء میں ٹلڈن کی جو امریکن ہیں شہرت شروع ہوئی اور ہر دو سال انھوں نے دنیا کے ٹینس کے تمام بہترین کھلاڑیوں کو شکست دی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ٹینس کا موجودہ اسٹیڈیم جہاں یہ ٹورنمنٹ کھیلا جاتا ہے تیار ہوا کیونکہ پبلک کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ پرانا اسٹیڈیم کافی نہ ہوتا تھا۔ جدید اسٹیڈیم کا سینٹر کورٹ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہاں تقریباً بیس ہزار کی تعداد میں تماشائی بیٹھ سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں پھر پیٹرسن نے یہ ٹورنمنٹ جیتا اور سنہ ۱۹۲۳ء جانسٹن نے جو امریکن کھلاڑی ہیں۔ فرانس نے سنہ ۱۹۲۱ء سے دنیا کا ایک بہترین کھلاڑی پیدا کرنے کی کوششیں شروع کیں جو سنہ ۱۹۲۴ء میں بار آور ہوئیں اور اس ملک کے تین کھلاڑی بروترا، لاکاسٹ اور کوشے نے یکے بعد دیگرے چھ سال تک ومبلڈن چمپین شپ میں کامیابی حاصل کی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ٹلڈن نے پھر یہ ٹورنمنٹ جیت لیا اور سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک امریکہ کے ہی کھلاڑی جیتتے رہے۔ لیکن سنہ ۱۹۳۳ء کے بعد سے ایک انگریز کھلاڑی فرو پیری نے تین سال تک فوقیت حاصل کی اور جب وہ پیشہ ور ہو گئے تو پھر امریکہ کے کھلاڑی وائنز، ڈانلڈ بج نے چمپین شپ جیتا۔ ڈانلڈ بج گزشتہ سال تک چمپین رہے لیکن چونکہ اب وہ بھی پیشہ ور ہو گئے ہیں اس لئے اس سال کے نتیجہ کے متعلق کوئی پیش خیالی کرنا دشوار ہے۔ اس ٹورنمنٹ کے علاوہ جس ٹورنمنٹ نے اس کھیل کو بین الاقوامی حیثیت اور اہمیت دی وہ ڈیوس کپ ہے۔ اس کی ابتدا امریکہ میں سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ومبلڈن کی طرح اس میں کوئی کھلاڑی شخصی طور پر حصہ نہیں لے سکتا بلکہ ہر ملک اپنی ٹیم شریک کر سکتا ہے جس میں کھلاڑیوں کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر مقابلہ پانچ میاچز کا ہوتا ہے جن میں چار سنگلز اور ایک ڈبلز کا کھیل ہوتا ہے۔ اس ٹورنمنٹ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آخری کھیل اس ملک میں ہوتا ہے جہاں پچھلے سال کپ گیا ہو۔ ابتدا میں اس ٹورنمنٹ میں صرف تین ممالک امریکہ، انگلستان اور اسٹریا حصہ لیتے تھے اور پہلے دو سال تک امریکہ نے اس میں کامیابی حاصل کی لیکن سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک انگلستان نے اپنی برتری قائم کی اور سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک اسٹریلیا نے وائلڈنگ و نارمن بروکس کی مدد سے اس کپ کو اپنے ملک میں رکھا۔ یہ ٹورنمنٹ بھی گزشتہ جنگ کے دوران میں موقوف رہا اور جب سنہ ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا تو پھر اسٹریلیا نے اس کو جیتا۔ جنگ کے بعد سے اس ٹورنمنٹ میں شریک ہونے والے ممالک کی تعداد بڑھ گئی اور سنہ ۱۹۲۲ء میں بیس سے زائد ہو گئی۔

۱۹۲۰ء میں امریکہ نے ٹلڈن، جانسٹن اور ولیمس کی مدد سے یہ کپ حاصل کیا اور ۱۹۲۶ء تک کامیاب دفاع سے اپنے یہاں رکھا۔ لیکن فرانس کی ٹینس کے عروج کے ساتھ جس کے بانی وہاں کے چار بندو قچی یعنی بروترا۔ لاکاسٹ۔ کوشے اور بریناں تھے ۱۹۲۶ء میں ڈیوس کپ بھی اس ملک میں پہلی مرتبہ آیا اور ۱۹۳۳ء تک فرانس ہی میں رہا۔ فرانس کی کامیابی نے انگلستان کو جوش دلایا اور ۱۹۲۶ء میں اس ملک نے منظم تیاری شروع کردی تھی۔ کئی ٹینس کورٹ بنوائے گئے ٹینس کے معلمین غیر ممالک سے بلوائے گئے اور کم سن کھلاڑیوں کا انتخاب کرکے ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور ان میں سے جو بہتر پائے گئے۔ ان کو دنیا کے سفر پر بھیجا گیا تاکہ وہ مختلف ممالک میں ٹینس کھلیں اور تجربہ حاصل کریں آسٹن، پیری اور ہیوز نے اس سفر سے پورا فائدہ اٹھایا جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آسٹن جن کو میں نے ۱۹۲۵ء میں ایک ٹورنمنٹ میں نہایت آسانی سے ہرایا تھا سفر سے واپسی کے بعد مجھ سے کہیں بہتر کھلاڑیوں کو شکست دینے کے قابل ہوگئے تھے۔ منظم تیاری ہمیشہ بار آور ہوتی ہے۔ چنانچہ انگلستان کی اس تیاری کا پھل وہاں کی انجمن کو ۱۹۳۳ء میں ملا جب کہ پیری، آسٹن اور ہیوز فرانس کو شکست دے کر اکیس سال کے بعد ڈیوس کپ کو اپنے ملک میں واپس لائے۔ یہ کپ انگلستان میں ۱۹۳۶ء تک رہا۔ جب پیری پیشہ ور ہوگئے تو ان کا موزوں جانشین نہ مل سکا اور کپ بھی امریکہ چلا گیا، جہاں ڈانلڈ بج جیسے کھلاڑی موجود تھے۔ اور اب تک یہ کپ وہیں ہے۔ فرانس اور انگلستان کی ناکامیابی کا سبب یہ ہوا کہ انھوں نے کم سن کھلاڑیوں کی منظم تیاری میں ویسا جوش نہیں دکھلایا جیسا کہ ابتدا میں ظاہر کیا تھا، جس سے وہاں کے اچھے کھلاڑیوں کے جانشین مہیا نہ ہوسکے۔

ہندوستان نے ڈیوس کپ میں ۱۹۲۱ء سے شرکت کرنی شروع کی۔ پہلے ہی سال ان کی ٹیم فائنل تک پہنچ کر ہاری اور ۱۹۲۴ء میں اسے سمی فائنل راونڈ میں شکست ہوئی۔ یہ ابتدا ایک نمایاں مستقبل کا پتہ دے رہی تھی لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہی دو سال ہندوستان کی ٹینس کی تاریخ میں درخشاں ہیں حالانکہ مقابلتہً اس کھیل کو اب زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان سے اعلیٰ معیار کے کھلاڑی کیوں نہیں نکلتے اور ہندوستانی ڈیوس کپ ٹیم کا نتیجہ سابقہ نتیجے سے بہتر کیوں برآمد نہیں ہوتا۔ بعض کا خیال ہے کہ ہندوستانی ٹیم کی سابقہ کامیابی کا سبب یہ تھا کہ یورپ کی ٹینس کا معیار اس وقت کم تھا اور چونکہ یہ اب بڑھ گیا ہے اس لئے اگرچہ ہندوستانی کھلاڑیوں کا معیار سابقہ ہندوستانی کھلاڑیوں سے بہتر ہے تاہم ڈیوس کپ میں کامیابی کے قابل نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر تجربہ کار کھلاڑی اس خیال سے اختلاف کرے گا خاص کر اگر اس نے سلیم، جیکب اور فیضی جیسے کھلاڑیوں کے کھیل کو ان کے عروج کے زمانہ میں دیکھا ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بلجیم نے واشرد واشیرن جیسے کھلاڑی اب تک پیدا نہیں کئے اور ان کھلاڑیوں کے باوجود ہندوستان کی سابقہ ٹیموں نے بلجیم کو ہرایا۔ اس سے اس وقت کے اور حالیہ معیار کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی ٹینس کا عام معیار پہلے سے بہتر ہوگیا ہے اور زیادہ کھلاڑی پیدا ہو رہے ہیں لیکن یہاں کے کھلاڑیوں کا معیار سابق کے اعلیٰ کھلاڑیوں سے کم ہے اس کی کئی وجوہ ہیں جس میں سے ایک یہ ہے کہ سابق کے کھلاڑیوں نے اپنی ٹینس کو

یورپ میں رہ کر ترقی دی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ ترقی کے لئے جو سہولتیں اور مواقع یورپ میں ہیں وہ ہندوستان میں نہیں مل سکتے۔ آل انڈیا لان ٹینس اسوسی ایشن نے ابھی تک اسی کو کافی سمجھ رکھا ہے کہ ہندوستان کی ٹیم ہر سال ڈیوس کپ ٹورنمنٹ میں شریک کردی جائے اور اس کے لئے یہاں کے اچھے کھلاڑیوں کا انتخاب ہو۔ اس اصول سے مجھے اختلاف ہے کیونکہ کسی ملک کا مطمح نظر صرف شرکت ہی نہیں بلکہ ڈیوس کپ کا حاصل کرنا بھی ہونا چاہیے۔ اس کے لئے کئی سال کی تیاری کی ضرورت ہے لہٰذا اگر وہ ابھی سے شروع کردی جائے تو ممکن ہے کہ آئندہ پانچ یا سات سال میں کوئی مفید نتیجہ نکلے۔ اسوسی ایشن نے بالآخر اب اس کو محسوس کیا ہے اور حال ہی میں جو آئندہ کا پروگرام شایع کیا گیا ہے وہ نہایت مفید معلوم ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ اگر میں بھی چند تجاویز پیش کروں تو ممکن ہے کہ سودمند ثابت ہوں اور ٹینس کی ترقی کا باعث ہوں کم عمر لڑکوں کے لئے ہر پراونس و اسٹیٹ میں ٹورنمنٹ منعقد کئے جائیں جس میں اٹھارہ سال اور اس سے کم عمر کے کھلاڑی شریک کئے جائیں۔ آل انڈیا اسوسی ایشن کی جانب سے بھی اسی قسم کا ٹورنمنٹ ہو اور اسمیں جو کامیاب رہے اس کو آل انڈیا بوائے چمپین کا لقب دیا جائے۔ اس ٹورنمنٹ کے شرکا وہی ہوں جن کو کہ پراونشل یا اسٹیٹ اسوسی ایشن نے نامزد کیا ہو اور ہر ٹینس اسوسی ایشن کو چار یا اس سے کم کھلاڑیوں کو نامزد کرنے کا اختیار دیا جائے۔ شرکا کے قیام اور خور و نوش کے اخراجات کا بار آل انڈیا اسوسی ایشن برداشت کرے اور سفر کے اخراجات پراونشل یا اسٹیٹ اسوسی ایشن اٹھائے۔ ایک کمیٹی تجربہ کار کھلاڑیوں کی بنائی جائے جو اس ٹورنمنٹ کے ہر کھلاڑی کے کھیل کا اندازہ لگائے اور اس کے اختتام پر چار ہونہار کھلاڑیوں کا انتخاب کرے۔ اس کمیٹی کے لئے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ کامیاب کھلاڑیوں ہی کو منتخب کرے کیونکہ ممکن ہے کہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے کھیل میں آئندہ ترقی کی گنجائش نہیں منتخب شدہ کھلاڑیوں کو ایک اچھے ٹینس کے معلم کے سپرد کیا جائے اور انہیں ایک سال تعلیم دلائی جائے جس کے بعد انھیں آل انڈیا چمپین شپ میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ جو بھی اس ٹورنمنٹ میں اچھا کھیلیں ان کی تعلیم جاری رکھی جائے اور جن کی ترقی محدود ہو گئی ہو ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس تنظیم کی ابتدا سے تین سال بعد منتخب شدہ کھلاڑیوں کو چار ماہ کے لئے یورپ روانہ کیا جائے لیکن انھیں ڈیوس کپ یا ومبلڈن میں نہ شریک کیا جائے بلکہ وہاں کے چھوٹے ٹورنمنٹوں میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ اس سے میرا منشاء یہ ہے کہ یہ کھلاڑی وہاں کے موسم کے عادی ہوں اور بڑے کھلاڑیوں کو کھیلتا دیکھ کر تجربہ حاصل کریں۔ اس سفر سے واپسی کے بعد پھر ان کی تعلیم جاری رکھی جائے اور آئندہ سال ڈیوس کپ ٹورنمنٹ میں ٹیم شریک کرکے ان کھلاڑیوں کو یورپ بھیجا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی تنظیم سے امید افزا نتائج برآمد ہوں گے ممکن ہے کہ میری بعض تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں رقمی دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن یہ دشواریاں ناقابل عبور نہیں۔ بشرطیکہ ہندوستانی انجمنیں اور رؤسا اس میں حصہ لیں۔

(باقی آئندہ)

سید محمد ہادی

محبّت

محبّت باعثِ تخلیقِ آدم
محبّت تخمِ موجوداتِ عالم

محبّت شمعِ بزمِ انبیا ہے
محبّت خضرِ راہِ ربِّ اکرم

محبّت مشعلِ راہِ طریقت
محبّت مسلکِ اقطابِ اعظم

محبّت شیوۂ اربابِ تسلیم
محبّت حاصلِ ماہِ محرم

محبّت رہنمائے پارسایاں
محبّت بحرِ عرفاں ہے مسلّم

محبّت سروِ بستانِ ریاضت
محبّت زخمِ اہلِ دیں کا مرہم

محبّت اضطرابِ دردِ ایوبؑ
محبّت فقرِ ابراہیم ادہم

محبّت نصفتِ نوشیروانی
محبّت فیض و جود و بذلِ حاتم

محبّت نارِ ابراہیم آذر
محبّت نذرِ اسمٰعیل اکرم

محبّت داستانِ کوہکن ہے
محبّت قصۂ مجنونِ پُرغم

بقائے دہر کا رازِ نہفتہ
وجودِ خلقتِ خلد و جہنم

زمین و آسماں و دشت و بستاں
اسی لفظِ محبّت سے ہے قائم

نہ ہوتی گر زمانے میں محبّت
خدائی کا نہ ہوتا کوئی محرم

بنا کے خلق کا مقصد اثیمہ
محبّت ہی محبّت ہے مسلّم

لطف النساء بیگم صاحبہ اثیمہ

بچوں سے

ایک ماہ بعد ہم آپ سے مخاطب ہیں۔ یہ پرچہ شاید آپ غور سے نہ پڑھیں کیونکہ ہر ایک امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگا۔ بھئی مارچ اور اپریل کا مہینہ بڑا سخت ہوتا ہے اکثر امتحانات انہی مہینوں میں ہوتے ہیں۔ آپ میں سے بعض تو فارغ ہو گئے ہوں گے اور بعض ابھی مصروف ہوں گے کوشش کیجئے کہ آپ میں کا ہر ایک امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو۔ جو کوئی سب رس کی بھائی یا بہن اپنی جماعت میں اول رہیں وہ ہمیں اطلاع دیں۔ ہم ان کے نام خوشی کے ساتھ سب رس میں شایع کریں گے۔ امتحانات سے فراغت پانے کے بعد امید ہے کہ آپ پھر اسی انہماک کے ساتھ سب رس کی طرف متوجہ ہوجائیں گے۔ اور پھر گرما کی تعطیلات بھی ہیں ان تعطیلات میں آپ کا جو نظام العمل رہے گا اس کی نقل ہمارے ہاں بھیج دینا۔ دیکھیں آپ ان تعطیلات میں اردو کی کیا خدمت کرتے ہیں۔ کہاں کہاں جلسے کرنے والے ہیں اور کتنے اچھے اچھے مضامین سب رس کے لئے لکھنے والے ہیں۔

آپ کی انجمن تو بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ مہینہ میں کئی بار جلسے ہوتے ہیں وہاں کئی ایک سب رسی بھائیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ تقریریں ہوتی ہیں بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ ۲۵ فروری سنہ ۱۹۴۰ء کو بھی ایک جلسہ ہوا تھا طلبہ نے اپنے مختلف مضامین پڑھ کر سنائے بعض تو بڑے اچھے مضمون تھے۔ آپ کے اکثر مضمون نگار بھائیوں نے بھی مضامین پڑھے مثلاً عارف علی انصاری۔ خدا بخش وغیرہ۔ خدا بخش نے مبتدی افسانہ نگار ایک مقالہ پڑھا اور محی الدین علی نے جذبۂ حب الوطنی اور عارف علی نے شکر سازی اور عبدالمجید نے تعلیم اور کھیل وغیرہ پر اپنے مضمون سنائے۔ پھر برہان الدین نجم نے اردو پر ایک بڑی عمدہ نظم سنائی جس کو طلبہ نے بہت پسند کیا وہ کسی موقع پر سب رس میں شایع ہوجائے گی اردو سے متعلق ایک اور مضمون محمد علی عادل نے محسنین اردو سنایا۔

ایک مہینے کے لئے جلسے ملتوی کر دیے گئے ہیں اس کے بعد اس انجمن کا ایک سہ ماہی جلسہ ہونے والا ہے جس کو کامیاب بنانے کے لئے اراکین ابھی سے کوشش کر رہے ہیں۔ اس موقع پر شاید ایک ڈرامہ بھی ہو۔ غرض اسی طرح کی دلچسپیاں رہیں گی۔ موقع کھونا نہیں۔ یہ جلسہ اپریل کے آخر میں یا مئی کے شروع میں ہوگا۔ اخبارات تو آپ سب پڑھتے ہی ہوں گے اگر گھر میں اخبار نہ آتا ہو تو امتحانات کے بعد یعنی اپریل کے آخر ہفتہ کے اخبارات کسی مطالعہ گھر میں دیکھ لینا۔ تاریخ مقام اور دوسری تفصیلات اخبارات میں شایع ہوجائیں گی اور اگر جب تک سب رس شایع ہوجائے تو بہت آسانی ہے اس میں اطلاع چھپ جائے گی۔ گزشتہ وقت جو معمہ شایع ہوا تھا اس کے انعام کے مستحق اعجاز علی (گرامر اسکول) قرار پائے وہ انعامی کتاب دفتر سے حاصل کریں۔

معین الدین احمد انصاری

لطیفے

۱۔ انسپکٹر جماعت میں سوال کرتا ہے "گدھا سرت کو میں کیا ہے"؟

خالد نے کہا "فعل"

انسپکٹر۔ "اس کی گردان کرو"

خالد:۔ "وہ گدھا، وہ گدھے، تو گدھا، تم گدھے" اس کے بعد خاموش ہوگیا۔

انسپکٹر:۔ "آگے"

خالد:۔ جناب اس کے چار ہی صیغے ہیں!

سید خواجہ معین الدین

۲۔ والد:۔ تمھارے ماسٹر صاحب کیسے آدمی ہیں۔

لڑکا:۔ اچھے آدمی ہیں لیکن کبھی کبھی جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔

والد:۔ وہ کیسے۔

لڑکا:۔ وہ کل کہتے تھے کہ ۵ اور ۵ دس ہوتے ہیں اور آج کہتے ہیں کہ ۴ اور ۶ دس ہوتے ہیں۔

دھرم رام پرشاد (متعلم)

مولوی صاحب کی بیوی نے افسانہ لکھا

مولوی صاحب کی بیوی کو کتابیں اور رسالے پڑھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ کئی رسالے جاری تھے۔ ہر مہینے کچھ نہ کچھ کتابیں ضرور آتی تھیں۔

ایک رات کی بات ہے کہ مولوی صاحب کھانے سے فارغ ہوکر سگریٹ اڑا رہے بیٹھے تھے، اور بیوی ایک نئی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھیں۔ یکایک مولوی صاحب کچھ سوچ کر اچھل پڑے، پھر بیوی کی طرف مخاطب ہوکر کہا "سنا تم نے؟"

بیوی نے مولوی صاحب کے جواب میں صرف "جی؟" کہا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہوگئیں۔ مولوی صاحب بولے "تم جب اتنی کتابیں اور افسانے پڑھتی ہو تو خود بھی تو کچھ لکھا کرو!"

بیوی نے کتاب میز پر ڈال دی اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئیں۔ انھیں خود بھی افسانہ نویسی کا بڑا شوق تھا، جب میاں کی بھی شہ پائی تو پھر کیا تھا! میاں نے پیشین گوئی بھی کی کہ ان کی بیوی نہ صرف اپنی نوعیت کی اچھی، بلکہ ایک مشہور عالم افسانہ نویس ثابت ہوں گی۔ میاں کی زبانی اپنی ہونے والی شہرت کا حال سن کر بیوی پھولی نہ سماتی تھیں۔

چنانچہ دوسرے ہی دن سے افسانہ کی تیاری شروع ہوگئی۔ خوبصورت جلد، اور عمدہ کاغذ کی ایک بیاض منگوائی گئی، فونٹین پن خاص طور پر خرید آگیا، صورت پر ذرا اکڑ بھی زیادہ پیدا ہوگئی، اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی افسانہ لکھنے بیٹھ گئیں۔ آٹھ، دس رسالے سامنے رکھ لئے، شاید اس لئے کہ موقع نہ بنے تو ایک آدھ افسانہ آج خواہ چرا کر ہی لکھیں، مگر ضرور لکھیں۔

پلاٹ سے پہلے عنوان پر غور و فکر شروع ہوئی۔ خدا خدا کر کے عنوان ذہن میں آیا۔ خوشی سے اچھل پڑیں، اور جھٹ سے اسے لکھ لیا۔ اتنے میں مولوی صاحب بھی باہر سے آئے۔ آتے ہی بیوی سے پوچھا۔ "کیوں، افسانہ لکھا؟"

"اے ہے، ابھی تو بیٹھی ہوں! عنوان تو ہوگیا ہے، اب صرف افسانہ باقی ہے سو یہ کون بڑی بات ہے!"

میاں نے بھی عنوان دیکھا۔ بے انتہا خوش ہوئے، اور کہا "بھئی عنوان تو خوب ہے! افسانہ بھی کچھ ایسا ہی لکھو تو بات ہے!" بیوی ایک وقار سے بولیں "ہو جائے تب دیکھ لینا!" اور پھر افسانہ لکھنے میں مشغول ہو گئیں۔

یہ اِدھر افسانہ لکھ رہی ہیں، اُدھر میاں اُدھر دیوان خانے میں بیٹھے دوستوں سے کہہ رہے ہیں کہ "بیگم آج افسانہ لکھ رہی ہیں۔ عنوان تو لکھ ہی ڈالا! واللہ خوب ہوا ہے حالانکہ یہ پہلی کوشش ہے!" دوست سب جانتے تھے،

پھر بھی، ہنسی کو ضبط کر کے، کہا "مولوی صاحب، تو پھر ہمیں بھی ضرور دکھانا!"

مولوی صاحب خوش ہو کر بولے "ضرور، ضرور!"

ایک "مگر مولوی صاحب یہ تو بتایئے کہ کونسے رسالے میں چھپوایئے گا؟"

مولوی صاحب "بھئی، تم ہی بتاؤ کہ کونسے رسالہ میں چھپوایا جائے؟"

دوسرا "مولوی صاحب، میرا تو خیال ہے کہ "ساقی" "ہمایوں" یا "سب رس" میں چھپوایا جائے کیونکہ وہ بہت مشہور پرچے ہیں!"

تیسرا "ارے لاحول ولا! یہ تو صرف بڑ ہے! ورنہ یہ اُردو پرچے بھی بھلا کوئی پرچے ہیں کہ جن میں آپ کی بیوی کا افسانہ چھپایا جائے میرا تو خیال ہے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے "ٹائمس آف انڈیا" (Times of India) یا "السٹریٹڈ ویکلی" (Illustrated Weekly) میں چھپوا دیا جائے!"

غرض، ہر ایک کی ایک ایک رائے تھی کہ اتنے میں ایک اور صاحب آ دھمکے۔ انھوں نے جو یہ قصہ سنا، تو یہی سنائی کہ "واہ صاحب، خوب رہی! محنت کریں ہم اور مشہور ہوں رسالے! بھلا کیا ضرور ہے کہ رسالوں میں ہی چھپوایا جائے۔ مولوی صاحب کچھ ایسے کنگال، محتاج تھوڑی ہیں کہ بیوی کے افسانہ پر کچھ روپے بھی نہ صرف کر سکیں۔ سچ پوچھئے تو، مولوی صاحب، میری رائے یہ ہے کہ ایسے افسانہ کی اگر صحیح معنوں میں قیمت بڑھانی ہے تو بس اُسے کتابی صورت میں شائع کرا دیجئے، پھر دیکھئے کہ شہرت کے ساتھ دولت بھی آپ کی بیوی کے قدم چومتی ہے یا نہیں!"

مولوی صاحب کو بات پتہ کی لگی، لہذا پھول کر کپّا ہو گئے، اور ادھر ان مسخروں نے بھی ارادہ کر لیا کہ مولوی صاحب کی بیوی کا افسانہ چھپوا کر ان کا اور ان کی بیوی کا ایک نیا مذاق اڑایا جائے۔

مولوی صاحب گھر میں آئے تو بیوی کو افسانہ لکھنے میں مشغول پایا۔ خوشی سے کہا "لاؤ تو دیکھیں!"

آدھے سے زیادہ لکھ چکی تھیں، بولیں "اُے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، ذرا پورا تو ہو لینے دیجئے!"

اور لیجئے، پورا بھی ہو گیا۔ مولوی صاحب نے دیکھا۔ جی کھول کر تعریف کی، دوستوں سے کرائی، بیوی کو سنائی، اور طے پا ہی گیا کہ افسانہ کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

دوسرے دن پھر دوست آئے، بڑی خوشی سے پھر دکھایا، ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے ایک نے کہا "واللہ، مولوی صاحب، خوب افسانہ ہوا ہے۔ حقیقت میں افسانہ اسے کہتے ہیں!"

ایک نے بن دیکھے ہی کہہ دیا" مولوی صاحب، اگر کچھ اصلاح وغیرہ کی ضرورت ہو تو یہ بندہ حاضر ہے!"

تیسرا" میں کتاب کا سرورق اپنے ڈرائینگ ماسٹر دوست سے تیار کرادوں گا!"

چوتھا" مولوی صاحب اگر خاکسار کو اس قابل سمجھیں تو مقدمہ میں لکھ دوں گا!" مولوی صاحب خندہ پیشانی سے بولے" کیوں نہیں، ضرور، ضرور!"

ایک اور بولا" مولوی صاحب چھپائی کا کام میرے ذمے!" آخری صاحب اٹھے اور بولے" مولوی صاحب کہاں اس جنجال میں پھنس کر آپ اس افسانہ کی مٹی پلید کرنے چلے ہیں! مجھ سے پوچھئے تو نہ میں اس میں اصلاح کی ضرورت سمجھتا، نہ سرورق کی، نہ مقدمہ کی، اور نہ چھپائی کی! سب سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ ایک اعلان نکال دیجئے کہ میری بیوی نے ایک شاہکار افسانہ لکھا ہے، اور بس! جس کو ضرورت ہو، وہ آپ آکر نقل کرلے گا، ورنہ جھک مارے!"

غرض مولوی صاحب سب کی سنتے گئے، اور خوش ہوتے گئے۔ گھر میں آکر بیوی سے دوستوں کی تعریف کا ذکر کیا اور مسکراتے ہوئے بولے" مختصر یہ ہے، بیگم کہ میں اور تو ہی کیا، ایک دنیا اس افسانہ کو نایاب سمجھتی ہے! اور میرا خیال ہے کہ چھپنے کے بعد تمھارے افسانہ کی قیمت ۱۴؍ رکھی جائے۔ امید ہے کہ ہاتھوں ہاتھ کتاب فروخت ہوگی!"

مولوی صاحب نے اپنے اس خیال کو دوستوں پر بھی ظاہر کیا،

ایک نے کہا" مگر مولوی صاحب چودہ آنے قیمت تو بہت ہوگی، کیونکہ افسانہ تو بالکل مختصر ہے!"

دوسرے نے جواب دیا" تو یہ کون بڑی بات ہے! اس کی ترکیب یوں ہوسکتی ہے کہ افسانہ کو موٹے حروف میں لکھواکر کتاب کا حجم بڑھادیا جائے!" سب نے یک زبان ہوکر مان لیا کہ" ترکیب تو خوب ہے!"

تیسرا" مگر مولوی صاحب کتابوں کی تعداد کیا ہوگی؟ میں سمجھتا ہوں، ایک ہزار کافی ہے!"

چوتھا" ایک ہزار تو ہندوستان میں پڑھنے والے ہی نہ ہوں گے، اور آپ ایک ہزار کتابیں چھپائیں گے! بھئی حماقت کی بھی انتہا کردی!"

تیسرا" اس میں حماقت کی کیا بات ہے؟ ایک ہزار پڑھنے والے نہیں، تو نہ ہوں۔ کتابیں سڑ تھوڑی جائیں گی! اب نہیں تو آئندہ نسلوں کے کام آئیں گی۔ آخر، ایسی چیزیں بار بار تھوڑی نصیب ہوسکتی ہیں!"

چوتھا" ہاں بھئی، یہ بھی ٹھیک کہی!"

شکر ہے کہ سب مرحلے طے ہوگئے، اور اب ایک صاحب نے (جن کے ذمہ چھپائی کا کام تھا) مولوی صاحب سے کہا کہ وہ چالیس روپے دے دیں تاکہ جلد سے جلد کتاب چھپائی جاسکے۔

مولوی صاحب روپیہ دے کر گھر میں آئے، اور بیوی سے کہا" بھئی، سنا تم نے؟ کتاب کی قیمت چودہ آنے طے ہوگئی ہے، تو اب یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ سات آنے تمھارے، اور سات آنے ہمارے!"

بیوی ٹھنک کر بولیں" اے، واہ! یہ اچھی بات ہے! ہماری محنت کدھر گئی؟"

مولوی صاحب کہنے لگے" اور ہمارے پیسے کدھر گئے؟"

کہا" ایسے کیا پیسے ہوگئے ہوں گے! زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ روپیہ ہوئے ہوں گے! سو کتاب کی قیمت آنے پر میں دے دوں گی!"

مولوی صاحب اچھل کر بولے "کیا کہا؟ کہیں اسی خواب میں نہ رہنا! پورے چالیس روپیہ اٹھے ہیں۔ پورے چالیس روپیے! سمجھیں؟"

آثار ایسے تھے کہ شاید تکرار کی نوبت آجاتی، مگر آخر میں مولوی صاحب ہی نے یہ کہہ کر بیوی کو خاموش کردیا کہ "اچھا بھئی، تمھارے نو آنے اور ہمارے پانچ آنے!"

اب مولوی صاحب کے پاس سنہری چھوٹی سی خوبصورت جلد کی کتابیں آگئی ہیں۔ مولوی صاحب ہاتھ میں ایک کتاب لئے گویا اچھل رہے ہیں، اور جو ان کے پاس آتا ہے اس کو بڑے شوق سے دکھاتے ہیں۔ لوگ ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھتے ہیں، اور سرورق یا لکھائی کی تعریف کرتے ہوئے واپس کر دیتے ہیں، مگر کوئی خریدتا نہیں! ۔ کیوں؟ ـــ

جوہر کی قدر جوہری جانے! ۔ انھیں کیا خبر کہ افسانہ کس پایہ کا ہے! ۔ افسوس ہے کہ ہمیں بھی پورا پڑھنے کا موقعہ نہ ملا، البتہ پہلے ہی جملوں کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غضب کی جدت ہوگی۔ تمطراز ہیں:-

"ایک چوہا، باڑی، بازی پھر رہا تھا......"

مولوی صاحب کے اس نادر افسانے کے جتنے نسخے شایع ہونے تھے وہ سب کے سب مولوی صاحب کی الماری میں نہایت سلیقہ سے جمے ہوئے ہیں۔ البتہ چند نسخوں کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب اور ان کی بیوی نے تحفۃً اپنے اپنے خاص احباب کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ مولوی صاحب نے اخباروں میں افسانے کے اشتہارات بھی دیئے مگر افسوس ہے کہ سب بے سود!

ادھر مولوی صاحب کی بیوی کو افسانہ ناکام ثابت ہونے کا ملال تھا، تو ادھر مولوی صاحب کو اپنے چالیس روپیہ جانے کا افسوس ــ ایک دن مولوی صاحب کی بیوی کو لوگوں کی اس بدمذاقی پر غصہ آیا تو پوری کتابیں صحن میں ڈال کر آگ لگادی۔

افسانہ کی خاک اڑ چکی ہے، اس واقعہ کو عرصہ گزر چکا ہے، اور شاید بیوی کے لئے افسانہ کی ناکامی کا ملال بھی پرانا ہوگیا ہو، مگر مولوی صاحب کو اب بھی اپنے چالیس روپیوں کا داغ ہوگا کے افسانہ سے زیادہ ایک حقیقت معلوم ہوتا ہے!

صاحبہ مہدوی

کوشش

آج کا دن نہ کیجئے ضائع — کیجئے کل کے واسطے ساماں
حیف اگر ہم نے آج کچھ نہ کیا — ہوگا حاصل نہ کچھ بجز حرماں
رنج و غم کا شکار اگر ہو جائے — دل شکستہ مگر نہ ہو انساں
یہ نہ سمجھے کہ کچھ نہیں حاصل — غیر اندوہ و حسرت و حرماں
شبِ تاریکِ غم میں ہیں اکثر — لوگ مصروفِ نالہ و افغاں
خون کے آنسوؤں سے تر ہے زمیں — اور ہے آنکھوں سے سیلِ اشک رواں
چاہیے اُن کو یہ سمجھ رکھیں — صبحِ عشرت ضرور ہوگی عیاں
خاتمہ اس غم و الم کا ہے — نہیں رنج و الم یہ بے پایاں
تخم ریزی ہم آج کرتے ہیں — کل ہے امیدِ آمدِ باراں
ہمت اپنی اگر نہ ہاریں ہم — مشکلیں ہو رہیں گی سب آساں
کھیت پر گر برس پڑیں اولے — پھر دوبارہ رہیں گے ہم کوشاں
کرتے ہیں آج طے بیاباں ہم — کل ہے امیدِ سبزہ بُستاں
چاہیے تم کو اے جواں مردو! — کھوئیں ہرگز نہ اپنی عزت و شاں
ہو دلیرانہ زندگی میں بسر — ہے جواں مردوں کو یہی شایاں
رہتے ہیں جس طرح میانِ غلاف — تیغِ مسلول و خنجرِ برّاں

فتح محنت کے ساتھ ہے فیاضؔ
جس طرح ساتھ جیب کے داماں

ابوالفیض فیاض (دیرکنڈہ)

نظام الملک آصفجاہ اوّل اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصفجاہ اول کے مجمل حالات مستند واقعاتِ زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں ادارہ دوسرے سلاطینِ آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔
اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہیے۔
مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم اے ایل ایل بی (ریسرچ اسکالر) قیمت ۴ر

چوہے ماموں

رمیش سہ پہر کو مدرسے سے واپس آکر کچھ تھوڑا بہت ناشتہ کرنے کے بعد ٹینس کھیلنے چلا جاتا۔ جو اس نے ابھی ابھی شروع کیا تھا۔ ٹینس کھیل کر گھر آتا اور ۸ بجے تک اسکول کا کام کرتا پھر کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹے تک اخبار میں مقامی خبریں پڑھتا یا کسی دلچسپ اور نصیحت آمیز کہانی سے اپنا دل بہلایا کرتا اور جب گھڑی نو بجاتی تو وہ سونے کے وقت کا لباس پہن کر سو جایا کرتا تھا۔

ایک روز رمیش کے دوست نے کہا "رمیش آج کل ایک اچھا کھیل آیا ہوا ہے جس کی کہانی ہم اپنی انگریزی کتاب میں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دیکھنے چلوگے۔ رمیش نے کہا" اچھا چلو" غرض رمیش کھیل دیکھ کر آیا اور سونے میں دیر ہو گئی۔ گیارہ بجے تھے رمیش نے ہر چند سونے کی کوشش کی۔ مگر نیند نہ آئی۔ بارہ بج گئے پھر بھی اس کو نیند نہ آئی۔ جب وہ نیند سے بالکل مایوس ہوگیا تو اس نے ایک کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کیا۔ ایک بجا پھر دو بجے رمیش کتاب ہی پڑھتا رہا۔ اس کے کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ صرف میز پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ ہر روز رمیش صبح کے لئے ایک گلاس میں دودھ رکھ لیا کرتا تھا۔ کوئی تین کا عمل ہوگا۔ ایک آواز کان میں آئی رمیش نے ذرا بھی دھیان نہ دیا۔ پھر دوبارہ اسی قسم کی آواز آئی اور ساتھ ہی چیزوں کے گرنے کی گھڑگھڑاہٹ بھی سنائی دی۔ اس وقت رمیش کی آنکھ لگ رہی تھی گھبراہٹ سے جلد اٹھ بیٹھا آنکھوں کو ملتا ہوا ادھر اُدھر دیکھنے لگا مگر کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکا۔ اس نے خیال کیا کہ میں ضرور کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اطمینان ہونے کے بعد سوگیا۔

دوسرے روز جب رمیش حسب معمول سویا تو پھر آواز آئی مگر رمیش کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ دودھ کم ہے رمیش نے خیال کیا کہ نوکر نے کم رکھا ہوگا۔ پھر اس نے اطمینان کرنے کے لئے نوکر سے پوچھا "کیوں کیا بات ہے رات کیوں تم نے میرے لئے دودھ کم رکھا" نوکر گھبرا گیا اس کی بھی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ رمیش نے کبھی اس سے اس قسم کے سوال نہیں کئے تھے کہنے لگا۔ "حضور! میں نے تو گلاس پورا بھرا ہوا رکھا تھا" رمیش خاموش ہوگیا اور مدرسہ چلا گیا۔ رمیش نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا کہ معلوم کرے کیا بات ہوسکتی ہے مگر وہ بالکل معلوم نہ کرسکا ایک ہفتہ اسی طرح گزرا۔ کبھی دودھ کم ہوتا اور کبھی آوازیں آتیں جس سے اس کی آنکھ کھل جاتی۔

ایک رات رمیش نے اپنے کمرے کی بجلی جلا رکھی اور سوگیا۔ نیند اسے بالکل نہ آئی پھر اس نے کتاب لے کر پڑھنا شروع کیا۔ یکایک ایک آواز آئی۔ اس نے دیکھا ایک سیاہ چیز گلاس کے طرف بڑھی آ رہی ہے۔ پھر دوبارہ اس نے دیکھنے کی کوشش کی تو نظر نہ آئی۔ اور غائب ہوگئی پھر نہ تو آواز آئی اور نہ وہ سیاہ چیز دکھائی دی۔

صبح رمیش اسی کشمکش و پیچ میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھر کی بلّی "چوہے ماموں" کو منہ میں دبائے کمرے سے نکل رہی ہے۔ رمیش کی سمجھ میں آیا کہ یہی حضرت رات میں مجھے دکھائی دیئے اور فوراً رفوچکر ہوگئے تھے۔ رمیش کو دوبارہ ایسا سابقہ نہ پڑا۔ مگر جب کبھی "چوہے ماموں" کا خیال آتا تو وہ اپنی ناسمجھی اور نادانی پر ہنستا اور خوب ہنستا۔

راجہ جیتندر پرشاد جوہر

ننھا بچہ

بھائی بہنو! دنیا میں بہت سی عجیب چیزیں ہیں لیکن کبھی آپ نے یہ بھی خیال کیا کہ انسان کے بچہ سے زیادہ بھی کوئی عجیب چیز ہے؟ نہیں۔ کیوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ کوئی اتنا بے بس پیدا نہیں ہوتا اور انسان سے زیادہ کسی اور کو اپنی ابتدائی زندگی میں یار و مددگار کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں، ماں باپ (خاص طور پر ماں) بچہ کی ابتدائی زندگی کے نگہبان و رہبر و معلم ہیں لیکن ہماری آج کل کی زندگی نے جس کو چاہے آپ مصنوعی زندگی کہیں، حالات بدل دئے ہیں۔ بے شک قدرت نے بقائے زندگی کے لئے بہت سے انتظامات کر رکھے ہیں لیکن جب سے انسان قوانینِ قدرت کے راز دریافت کرنے کی کھوج میں لگ گیا ہے اور اس کو قدرت سے جنگ کرنی پڑی ہے، چاہے وہ قدرت پر کتنا ہی قابو حاصل کر نا جائے مگر ہماری معاشرتی زندگی کے قدیم ڈھانچہ پر یکے بعد دیگرے ایسی کاری ضرب لگی ہے کہ اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی روز بروز پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ خاندان ملت میں اور ملتیں قوم میں جذب ہو رہی ہیں۔ قوم انسانی برادری کا دامن پکڑ رہی ہے۔ ذاتی فرائض اور ذمہ داریاں، قومی فرائض اور ذمہ داریاں بن گئی ہیں۔ ماں باپ کی جگہ مدرس نے لی تھی اب مدرس حکومت کا ایک کارندہ بن گیا ہے۔ بچہ ماں باپ کی ملکیت سے نکل کر قوم کی بہترین ملک اور سرمایہ ہو گیا ہے۔

اگر آپ کو کسی قوم کی تہذیب اور شائستگی کا معیار معلوم کرنا ہے تو اس کے بچوں کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت کے انتظامات دیکھئے، انگلستان یورپ اور امریکہ کی حکومتیں تو اپنے بچوں میں اتنی دلچسپی لیتی ہیں کہ ان کی اور ان کی ماؤں کی نگرانی میں ایک دوسرے کو مات کرتی ہیں۔ ہر حکومت ہر سال اپنے بچوں کی ترقی اور سکھ چین کے لئے برابر قوانین بناتی اور طرح طرح کے انتظامات کرتی رہتی ہے۔ ان کی بہتری پر روپیہ خرچ کرنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ کسی انگریز نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر کسی نے بچوں پر روپیہ صرف کرنے میں ذرا بھی بخل کیا تو قوم کو بڑا بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ جو انگریز روپیہ کو بچوں سے زیادہ سمجھتا ہے وہ ہرگز انگریز کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ ان ممالک کے پیشواؤں اور حکومتوں کو خصوصاً جنگ عظیم کے بعد یہ راز معلوم ہو گیا ہے کہ ملک کی ترقی اور بچوں کی صحت تعلیم و تربیت میں ایک خاص قسم کا تناسب ہے اور بلا لحاظ ذات پات اور مذہب اور ملت ہر بچہ برابر ہے۔ جس قدر بچوں کے دماغ روشن اور جسم مضبوط ہوتے ہیں اسی قدر ملک کی دولت ثروت اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ دس بارہ برس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بچوں کے حقوق کے متعلق منشور یعنی چارٹر ترتیب دئے گئے۔ خواتین کی بین الاقوامی کونسل نے ۱۹۲۲ء میں سب سے پہلا منشور اطفال ترتیب دیا۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت تفصیل سے یہ بتلایا گیا ہے کہ بچہ کے کم سے کم حقوق کیا ہیں۔ یہ منشور اس قسم کا قرار دیا گیا ہے کہ مقامی حالات کے مدنظر مناسب ترمیم کے بعد یہ ہر قوم کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے۔

بہتیری قوموں نے اس کو منظور کر لیا ہے لیکن جہاں تک میرا علم ہے ان اقوام میں ہندوستان کا نام شریک نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ لیگ اقوام نے صرف اس منشور پر اکتفا نہیں کیا۔

اس نے بچوں کی سیوا کے لئے ایک مستقل کمیٹی قایم کردی جس کا فرض یہ ہے کہ بچوں سے متعلقہ قوانین اور ضوابط یکجا کرے ان کے نفاذ وغیرہ کے بارے میں مواد فراہم کرے، بالک سیوا کی مقامی اسکیمات اور مسایل کی چھان بین اور بین الاقوامی اہمیت کے معاملات پر توجہ کرے اور کانفرنسوں وغیرہ میں سوچ بچار کے لئے پیش کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ بچہ کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم ہوجانے کے باعث ہر ملک پر جا ہے اس کی حالت کتنی ہی گری ہوئی ہو، بڑا بھاری اثر ہوا۔ ایسے ممالک میں جہاں پہلے سے کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا وہاں بھی زیادہ جدوجہد شروع ہوگئی اور مردہ تحریکات میں جان پڑ گئی۔ ممالک متحدہ امریکہ نے اپنے وسیع محکمہ تعلیمات کو اس اہم کام کے لئے ناکافی سمجھ کر ایک خاص محکمہ اطفال (Children Born) قایم کیا۔ اگر چند پیش پیش ممالک ہی کی کیفیت پیش کی جائے تو بہت وقت درکار ہوگا اس لئے میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ ذرا تفصیل سے صرف انگلستان ہی کے اس بنیادی قانون کا ذکر کروں جس کا اثر نہ صرف سلطنت برطانیہ بلکہ اور ممالک پر بھی ہوا۔

یوں تو تعلیمی ضوابط خصوصاً جب کہ وہ جبری کر دئے جائیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پھر بچوں کی حد تک چنداں تشویش کی ضرورت نہیں ہے لیکن انگلستان نے ابتدائی تعلیم مفت اور جبری کرنے کے تقریباً چالیس سال کے بعد یہ محسوس کیا کہ . . . . . مقصد تعلیم کے لئے صرف یہ عمل کافی نہیں ہے چنانچہ سنہ ۱۹۰۸ء میں قانون اطفال منظور و نافذ ہوا جس کے بموجب ہر وہ شخص قابل سزا قرار دیا گیا جو بچہ کو کافی غذا اور کپڑا نہ دے، اس کا علاج نہ کرائے اور رہائش کا معقول انتظام نہ کرے۔ اگر والدین اپنی غفلت کی پاداش میں سزا پاجائیں تو ایسی صورت میں ان کا بچہ کسی اور کی سرپرستی میں دیا جائے لیکن اس کے اخراجات کا بار والدین ہی پر ڈالا جائے، اگر والدین نشہ باز ہوں یا مجرمانہ خصلتیں رکھیں تو بچہ کو ان سے علحدہ کرکے صنعتی مدرسہ میں روانہ کیا جائے جن کے قیام اور اخراجات کے متعلق مزید قوانین ہیں۔ اس کے علاوہ بچہ سے برے برتاؤ اور غفلت کو قابل دست اندازی پولیس، انتظامی کمیٹی یا انجمن ہی کو قرار نہیں دیا بلکہ ہر ہمدرد شخص کو والدین اور سرپرستوں وغیرہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مجاز گردانا گیا۔ چودہ برس سے کم عمر کو تمباکو فروخت کرنا، چاہے وہ کسی دوسرے ہی کے لئے ہو۔ ۱۴ برس سے کم عمر سے کوئی چیز رہن لینا۔ پانچ برس سے زیادہ عمر کی تعلیم میں مانع ہونا، پانچ برس سے کم عمر کو ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر کوئی نشہ کی چیز دینا یا شراب خانوں میں آنے دینا، قابل سزا قرار پایا اور باشندگان حیدرآباد کے لئے جہاں سات آٹھ ہزار سے زیادہ ہٹے کٹے فقیر موجود ہیں یہ امر زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اگر کوئی بچہ بھیک مانگے تو اسی قانون کے بموجب والدین یا سرپرست کو قابل سزا ٹھیرایا گیا۔ اب تک میں نے جو کچھ حکومت کی کارروائیوں کے بابت عرض کیا اس سے محض یہ نتیجہ نکال لینا کہ ماں باپ رہی سہی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گئے ہرگز صحیح نہ ہوگا۔

ان پر درحقیقت، سماج (Society) کے رکن ہونے کی حیثیت سے اور زیادہ ذمہ داری عاید ہوجاتی ہے اور جو لاولد ہیں وہ بھی اتنے ہی بچہ کی فلاح بہبود کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن حکومتوں نے بچے کی

فلاح و بہبود کو تمام تر اپنے ذمہ لیا وہ نہ صرف واقعات
اور حالات سے مجبور ہوگئی تھیں بلکہ نوع انسان کے خدمت
گزاروں نے، جن کی آئے دن مثالیں انگلستان یورپ
و امریکہ ہی کے افراد پیش کرتے رہتے ہیں، انجمن قائم کرکے
اپنے ہم قوم اور حکومت دونوں پر اپنی خدمت گزاری سے
ثابت کر دکھایا کہ کس قسم کے انتظامات اور قوانین لازمی اور
ضروری ہیں۔ شاید آپ نے سنا ہو کہ ایک بین الاقوامی انجمن
محافظ اطفال (Save the children)
کے نام سے قائم ہے جس کا مستقر جنیوا میں ہے، اس کا مقصد
یہ ہے کہ بلا لحاظ سیاسی یا مذہبی عقائد، جس ملک میں بھی ہو بچوں کو
خرچ کی تنگی اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے۔ یہ ایک بالکل خانگی انجمن
ہے جس نے سنہ ۱۹۱۹ء سے اب تک تین کروڑ روپیہ سے
زیادہ چندہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے فراہم کرلیا ہے۔
اس کی شاخیں سلطنت برطانیہ اور ایسے ممالک میں پھیلی ہوئی
ہیں جہاں انگریز آباد ہیں۔ اس کی پینتیس (۳۵) شاخیں دوسرے
ممالک میں بھی قائم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا اس کی کوئی شاخ
ہندوستان میں بھی ہے، بہرحال ہمارے ملک میں اس کی
شاخ قائم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہیے۔ اس کے
علاوہ درجنوں انجمنیں ایسی ہیں جو معذور یا غریب بچوں کی
مدد کرتی ہیں بیمار بچوں کو بعد صحت تازہ ہوا اور اچھی غذا
کا موقع دیتی ہیں اور حکومت سے مدد لئے بغیر اپنے نیک فرائض
کو انجام دیتی ہیں۔ میرے ہم پیشہ سننے والوں کی زیادہ
دلچسپی کا باعث غالباً انگلستان کی وہ انجمنیں ہوں جو نادار بچوں کو
تعطیلات میں سیر و سیاحت کراتی ہیں۔ ایک انجمن
(Children's Fresh Air Mission)
کے نام سے ہی اس کا مقصد ظاہر ہے۔ اسی قسم کی دوسری
انجمن Children Country Holiday Fund
ہے۔ ابتدائی مدارس کے ساتھ ساتھ نگہبان کمیٹیاں ہیں جن کے
اراکین نہایت مستعدی سے ان تمام فرائض کو پوری طرح انجام
دیتے ہیں جو فرض شناس اور تعلیم یافتہ والدین کو دینے
چاہئیں۔ اب میں ایک اور خانگی انجمن کا ذکر کرکے اس سلسلہ کو
ختم کرتا ہوں۔ یہ فرانس کی مشہور خانگی انجمن Caisse
(des Ecoles) ہے۔ اس کی حیثیت بالکل خانگی
ہے۔ لیکن یہ محکمہ صفائی یعنی بلدیہ سے مل جل کر کام کرتی ہے۔
اس کے صدر وغیرہ اکثر اراکین صفائی یعنی بلدیہ ہوتے ہیں اور
محکمہ صفائی کی طرف سے اس کے حسابات کی تنقیح ہوا کرتی ہے۔
یہ نادار اور مفلس بچوں کو غذا بہم پہونچانے کے علاوہ ان کے
لئے کپڑے لتے کا انتظام کرتی ہے۔ بچوں کے لئے خاص شفا
خانے قائم کرتی اور حمام خانے بناتی ہے۔ تعطیلات میں ان کو
صحت بخش مقامات کی سیر کراتی ہے۔ یہ شہر پیرس کے ہر
محلہ میں قائم ہے جن محلوں میں نادار بچوں کی کثرت ہے وہاں
ایک مستقل تنخواہ یاب عملہ رکھا جاتا ہے۔ جو صبح سے شام تک کام
کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس عملہ کی تنخواہ برائے نام ہوتی ہے۔
کیونکہ وہی لوگ اس خدمت کو اچھی طرح سے انجام دیتے ہیں جو
ایثار کا مادہ رکھتے ہیں اور محض بچوں کی سیوا کو روپیہ آنہ
پائی کے معاوضہ سے زیادہ اہم تصور کرتے ہیں، مدارس میں
بچوں کو جب گیارہ بجے وقفہ ملتا ہے تو اس انجمن کے کارپرداز
مدرسہ کے تالار یعنی ہال کے ڈسکوں پر دسترخوان بچھا کر،
کھانے کا کمرہ بنا دیتے ہیں۔ ہر بچے کے لئے دھات کے برتن
چمچے اور نیپکن رکھ دیے جاتے ہیں۔ اسی تالار میں ایک طرف

ہاتھ دہونے کے سیلابے ۱۰ سے ۲۰ انچ اونچے نصب رہتے ہیں جن میں بچے کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دہوتے ہیں جو بہت کمسن ہوں ان کے منہ ہاتھ خدمت گذارہ دھلاتی ہیں صابن تولال وغیرہ بھی انجمن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ مدرسہ کا عملہ کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ ہر بچہ کو ابلا ہوا گوشت یا قیمہ اور ترکاریاں دی جاتی ہیں اور یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر قسم کی ترکاریاں بدل بدل کر دی جائیں۔

خدمت گارہ کا فرض ہے کہ بچوں کو پیٹ بھر کھانا کھلائے لیکن اس کے ساتھ اس کی نگرانی رکھے کہ بچے جھوٹا کھانا چھوڑ کر نہ اٹھ کھڑے ہوں عموماً بچے اپنے ساتھ گھر سے دودہ یا شربت لاتے ہیں۔ لیکن جو اس کی بھی استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کی سربراہی انجمن کرتی ہے۔ کھانے پینے کا جو سامان خریدا جاتا ہے اس کی مشیر طبی نگرانی کرتا ہے۔

اس انجمن کے تمام اخراجات چندہ سے چلتے ہیں۔ محلہ کا ہر شخص کچھ نہ کچھ مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اراکین انجمن جلسے اور نمائش وغیرہ کرکے اچھی خاصی رقم فراہم کر لیا کرتے ہیں مثلاً پیرس کے ایک محلہ کی انجمن نے عارضی طور پر محکمہ صفائی سے افتادہ اراضی حاصل کرکے اس پر نمائش گاہ قائم کی اور کامیابی کے ساتھ کافی رقم جمع کر لی۔ میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

۱۔ بچہ بلالحاظ مذہب، ملک اور قوم کی حیات کے مد نظر محض والدین یا سرپرست کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کا دخل ضروری ہے

۳۔ محض ابتدائی تعلیم کا لزوم ناکافی ہے۔

۴۔ حکومتی احکامات کی تکمیل بلا غیر سرکاری امداد، پوری نہیں ہو سکتی۔

لہذا میری درخواست ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص طبقۂ نسواں اس مسئلہ پر خاص طور پر توجہ فرمائے۔ موجودہ انجمنیں جن کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ اپنے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا کریں۔ ایسی خواتین جو موجودہ انجمنوں میں شریک نہیں ہیں ایک نئی انجمن محض بالک سیوا۔ بہبودی اطفال کے لئے قائم فرمائیں۔ محلہ محلہ اس کی شاخیں کھولیں۔ بچوں کو غفلت۔ ظلم و آوارگی سے بچائیں اور ان کو اپنی کم سنی کے زمانے کو اطمینان اور خوشی سے بسر کرنے کا موقع دیں تاکہ وہ آئندہ چل کر اچھے شہری اور وفادار رعایا بنیں اور ہماری بہنیں یہ ثابت کر دیں کہ پردہ نشین خواتین بھی انسانیت اور خدمت گزاری میں یورپ کی آزاد منش خواتین سے پیچھے نہیں ہیں۔

(تقریر حیدرآباد ریڈیو)

سجاد مرزا

اخبار اور رسالے

بچو! تم میں سے بہت سے ایسے لڑکے ہوں گے جو اخبار کے معنی نہ سمجھتے ہوں گے، سنو، اخبار خبر کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے خبروں کا ذخیرہ یا مجموعہ اخبار کہلائے گا۔

اخبار کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جو اخبار ہر روز شائع ہوتا ہے اس کو روزنامہ کہتے ہیں۔ جو ہفتہ میں دو بار نکلتا ہے۔ اُس کو سہ روزہ کہتے ہیں۔ جو ہفتہ میں صرف ایک بار نکلتا ہے اُسے ہفتہ وار کہتے ہیں۔ جو شخص اخبار کو مرتب کرتا ہے۔ اس کو مدیر یا ایڈیٹر کہتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک چیز اور ہوتی ہے۔ جس کو اردو میں جریدہ یا رسالہ اور انگریزی میں "میگزین" کہتے ہیں۔ یہ مہینہ میں ایک بار نکلتا ہے۔ اس میں ادبی، اخلاقی، معاشرتی، تاریخی تمدنی اور بہت سے مفید اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔

یہاں تک پڑھنے کے بعد تمھیں شوق پیدا ہوا ہوگا کہ اخبار اور رسالے کے کچھ تاریخی حالات بھی تمھیں معلوم ہو جائیں اس لئے مختصراً ان کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۷۸۰ء میں جاری ہوا تھا۔ جس کا نام "گورنمنٹ گزٹ" تھا لارڈ وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ہکی نامی شخص نے "ہکی گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جو مدت تک نکلتا رہا۔ سنہ ۱۷۸۲ء تک ہندوستان میں صرف گیارہ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے چھ انگریزی زبان میں نکلتے تھے۔

اردو کا سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے مولوی اکرام علی صاحب نے جاری کیا لیکن اس میں کچھ لوگوں کو اختلاف ہے۔ کہتے ہیں کہ اردو اخبار کی ابتدا پہلے پہل ہندوستان میں مولوی محمد باقر صاحب دہلوی نے کی۔ بہرحال ان دو اخباروں میں سے کسی ایک کو پہلا ماننا پڑے گا۔

رسالہ کی ابتداء مرزا پور سے ہوئی جس کو ایک پادری صاحب نے نکالا۔ اس رسالہ کا نام "خیر خواہ ہند" تھا جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کے اخبارات میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور نت نئے اخبار اور رسالے نکلنے لگے۔ لوگوں میں اخبار بینی کا شوق بڑھتا گیا۔ اس وقت کوئی شہر ایسا نہ ہوگا۔ جہاں سے کوئی اخبار یا رسالہ نہ نکلتا ہو۔ لیکن اب تک عوام کو اخبارات و رسائل سے بہت کم شوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اخبارات اور رسالے ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ اور جو نکلتے ہیں وہ مالی مشکلات کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتے۔

دیگر ممالک کے مزدور بھی اخبار خرید کر روزآنہ پڑھتے ہیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غیر ممالک کے اخباروں کی تعداد اشاعت لاکھوں کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے لئے۔ اخبار یا رسالے

ضروریات زندگی میں شامل ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں اخبار یا رسالے کا خریدنا ایک قسم کی فضول خرچی سمجھی جاتی ہے۔ یہ خیال ہمارے لئے بہت ہی خطرناک ہے۔

اخبار یا رسالہ کا مطالعہ بڈھوں اور بچوں دونوں کے لئے برابر ہے۔ اس کے پڑھنے سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہر ملک کی نئی نئی خبریں معلوم ہوجاتی ہیں۔ دلچسپ اور سبق آموز افسانے دیکھنے میں آتے ہیں ہر ملک کے مشہور لوگوں کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ زبان درست ہوجاتی ہے۔ غرض بے شمار فائدے ہیں اگر تم اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ نہیں کرتے تو یقیناً غلطی کرتے ہو۔ لہٰذا تمھیں لازم ہے کہ اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا ضروری سمجھو۔ اگر تم اخبار یا رسالہ خرید کر نہیں پڑھ سکتے تو اپنے شہر کے کسی کتب خانے میں جاکر رسالے پڑھا کرو۔

رمن راج سکسینہ (سٹی کالج)

خبر کیسے پھیلی

شاہ اورنگ زیب کا منشا
تھا دکن پر چڑھائی کرنے کا
اس سے پہلے کہ بات چلے کی
بادشاہ کی زبان پر آتی
شہر میں سارے ہوگیا چرچا
ہونے والا دکن پہ ہے حملہ
سخت تشویش بادشاہ کو ہوئی
بات لوگوں میں کس طرح پھیلی!
ہوا معلوم کھوج کرنے پر
اس کا بانی ہے قلعہ کا نوکر
بادشاہ نے طلب کیا فوراً
اور پوچھا یہیں بتا فوراً
تجھ کو کس طرح سے ہوا معلوم
تو نے کس بات سے لیا مفہوم
ہاتھوں کو جوڑ کر یہ اس نے کہا
"مجھ سے بے شک قصور آج ہوا
وضو کے وقت، صبح بہر نماز
آپ کا تھا حضور خاص انداز
آپ نے رخ دکن کی سمت کیا
اور موچھوں پہ ہاتھ کو پھیرا
میں ارادہ سمجھ گیا کیا ہے
ہونے والا دکن پہ حملہ ہے"

شور عابدی (گلبرگہ)

ننھے خاں کی شادی

بڑی آرزو تھی ماں کو اپنے منتوں مرادوں والے بیٹے کے سہرے کے دیکھنے کی' بڑے ارمان تھے باپ کو اپنے اکلوتے "ننھے" کی شادی رچانے کے — آخر خدا خدا کرکے وہ دن آہی گیا' ننھے خاں کے سہرے کے پھول کھل ہی گئے — اب کیا تھا تمام محلے میں ایک شور مچا ہوا تھا کہ جمعدار کے چہیتے بیٹے ننھے خاں کی شادی قرار پاگئی ہے۔ تاریخ کا مقرر ہونا تھا کہ گھڑا گھڑی اور راتوں رات تیاریاں شروع ہوگئیں اور آخر وہ وقت سعید آہی گیا جب ننھے خاں نے ماں باپ کے سایہ میں سرکو سہرا بندھوایا' گھوڑے پر سوار ہوکر دلہن کے گھر چلے — جمعدار کی خاطر برات میں کثیر مجمع تھا۔ جمعدار اپنے "ننھے" اور مجمع کی کثرت کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور اپنے بڑی بڑی گھنی مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی میں انھوں نے انیون کی گولی بڑی کھالی تھی — اور اس کا نشہ' جمعدار کی خوشی پر سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا۔ غرض برات تاشہ اور بینڈ کی کان پھوڑنے والی آوازوں کے ساتھ دلہن والوں کے گھر پہونچ ہی گئی —

چلنوں اور پردوں کی آڑ سے لوگ دولہا کو جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ "سالوں" نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ سوال و جواب ہونے لگے' بہت کچھ گلفشانیاں ہوئیں آخر کار دولہا میاں نے ہار مان کر پچاس روپیہ دے ہی دیئے۔ کرتے کیا "ساری خدائی" اک طرف کا معاملہ تھا۔ مہمانوں کا ہجوم بڑھتا گیا' کوئی جمعدار کو مبارک باد دیتا تو کوئی دولہا میاں کو' کوئی دولہن کے باپ اور بھائیوں کو —

غرض شادی کی بزم زوروں پر تھی — شہر کی مشہور رقاصہ مشتری جان گارہی تھی ع

یہ بزم خوشی اور یہ شادی مبارک

دولہا میاں مسند پر اکڑے ہوئے بیٹھے تھے' منہ پر سہرے کی "جھالر" پڑی ہوئی تھی۔ دست حنائی میں رستی لئے اپنے چہرے کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے —

قاضی صاحب تشریف لائے اور بادام مصری کا فیصلہ کرکے چلتے بنے۔ اب "صبح تا نصف النہار" کی باری تھی۔ یہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی — زنانے میں ہم لوگوں کو اس کی اطلاع برابر آرہی تھی — غرض خوشی کی گھڑیاں گانے بجانے' مبارک بادیوں اور کھانے کی گڑبڑ اور سلامیوں کی حیرانی میں ختم ہوگئیں۔ اور اب دلہن کی رخصتی کا وقت آیا — تمام گھر میں شور مچا ہوا تھا کہ دولہا' دلہن کی رخصتی کے لئے آرہا ہے۔ سالے شرمائے ہوئے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے تو دولہا کے بھائی غرور میں چور ٹہل رہے تھے۔ آخر دولہا کے بھائی تھے نا —

"چھپنے والے ہٹ جاؤ دولہا میاں آرہے ہیں" کی آواز کے ساتھ دولہا میاں ریشمی منڈپ کے سایہ میں ٹھمکتے ٹھمکتے آتے نظر آئے' بڑی بوڑھیاں' نوجوان لڑکیاں' بچے بچیاں غرض کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب کے سب دولہا میاں کو دیکھنے کے لئے ایک پر ایک گرے جارہے تھے۔ دولہا میاں اپنا ساڑھے تین فٹ کا قد لئے چوڑی دار پائجامہ پہنے دستار لگائے اور قد سے لانبا سہرا باندھے چلے آرہے تھے — شوخ مراسن نے دور سے دولہا کو جو دیکھا تو ہنس کر ساتھ والی سے بولی

"دولہا ہے مٹھی بڑو چندی کا گڑا ہے" غرض بڑی
نزاکت سے دولہامیاں مسند پر بیٹھ ہی تو گئے" والان
میں پہنائے ہار" کے گیت کے ساتھ دولہا کا رسم شروع
ہوا۔ رسم کے ختم ہوتے ہی ماں نے اٹھ کر جھٹ چٹ بلائیں
لیں۔ دولہامیاں ایک ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے
تھے اور سب دعائیں دے رہے تھے۔

یہ تو تھا دولہامیاں کا حال' ادھر بے چاری دلہن رضیہ
روتے روتے نڈھال ہوگئی تھی۔ کبھی ماں سے لپٹ کر روتی
تو کبھی بہنوں سے۔۔۔ دلہن کے باپ محبوب خاں نے
اپنی "نورچشمی" کو سینے سے لگا کر بہت کچھ ہمت دلائی
اور طیش میں آکر کہہ دیا کہ "بیٹی تجھے ذرا بھی تکلیف پہونچی
تو جان دے دوں گا"۔۔۔

غرض خاں صاحب نے روتے ہوئے اپنی بیٹی کا ہاتھ
ننھے خاں کے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔ باہر گڑبڑ ہورہی تھی۔
دولہامیاں دلہن کو ساتھ لئے لئے بیانڈ باجے سدیوں کے
ناچ اور آتشبازی کی روشنی میں اکڑتے اکڑاتے چلے جارہے
تھے۔۔۔ میری دلی دعا ہے کہ میری سہیلی رضیہ ہنسی خوشی
رہے اور اپنی اولاد کا سہرا دیکھے۔

ہمت

بلقیس میر حسن علی خان

"ہر کاری کہ ہمت بستہ گردد اگر خاری بود گلدستہ گردد"

ہمت ایک ایسی صفت ہے جس کی بدولت ادنیٰ
درجے کے لوگ۔ اعلیٰ درجے کے شاعر، حکیم، فلاسفر، بادشاہ
وزیر وغیرہ بن گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں ہے
جس کو انسان کی ہمت فتح نہ کرسکتی ہو۔

بہت سے لوگ دنیا میں ایسے گزرے ہیں کہ جن میں
ذہانت وجودت معمولی تھی۔ مگر ہمت اور محنت سے یہی
لوگ علامۂ عصر بن گئے ہیں۔

ہمت ہی کی مدد سے بڑے بڑے کام انجام پاتے
ہیں۔ گو ابتدا میں وہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور
پست ہمت لوگ اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور کہتے
ہیں کہ" دیکھو چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ جس کام کی
ان میں قابلیت نہیں اُس کے پیدا کرنے میں اپنی اوقات
ضائع کرتے ہیں"۔
ایسے پست ہمت اور سست لوگوں کی باتوں کا
کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اور اپنے کام میں مشغول
رہنا چاہیے۔

انسان کی شرطِ زندگی ہمت ہے۔ بقول شخصے:۔

"گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو! لیکن جو ہمت ہو تو ہو"

اکثر اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ پہلی دفعہ لوگ ناکام ہوتے
ہیں۔ لیکن اس ناکامی سے ہمت نہ ہارنا چاہیے اور نہ
مایوس ہونا چاہیے۔ بلکہ ہمت اور استقلال کے ساتھ
کوشش کئے جانا چاہیے۔ کیونکہ ناکام وہی ہوتا ہے جو کام
کرتا ہے۔ اور گرتا وہی ہے جو دوڑتا ہے۔

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے"

معصومہ بیگم

تنقید و تبصرہ

اعجاز نما قرآن مجید مترجم و مفسر۔ اردو ترجمہ از محمد اشرف علی صاحب۔ تھانوی مقدمہ و تفسیر از آغا رفیق صاحب بلند شہری۔ ۸۴ صفحات' ناشر حافظ سید وزیر حسن نقاش مدیر رسالہ مینو انجمن جدید دہلی

اس قرآن مجید کے مقدمہ میں خدا کے وجود کے دلائل' مذہب اسلام کی حقیقت' نبوت کی تشریح' وحی کی تعریف اور اس کے اقسام وغیرہ قرآن مجید کی خصوصیات' قرآن کے اعمال وظائف' قصص امثال' تاریخ اور فضائل وغیرہ کو مختصر مگر دلنشین پیرایہ میں سمجھایا گیا ہے' مقدمہ کے آخر میں مضامین قرآن مجید کی مفصل فہرست درج ہے یہ مقدمہ ۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے اس کے بعد قرآن مجید مترجم شروع ہوتا ہے ترجمہ سلیس اور واضح ہے' حاشیہ پر مصر کے مشہور عالم علامہ فرید آبادی کی تفسیر "بیان الفرقان کامل" کا ترجمہ آغا رفیق صاحب نے پیش کیا ہے۔ باوجود ان ساری خوبیوں کے اس قرآن مجید کا ہدیہ صرف (عہ ۱۱ر) ہے۔ "س"

شمع ہدایت از عبدالصمد سراج الدین صاحب۔ صدر سلم نوجوانان صوبہ گلبرگہ (۶۵) صفحات۔ ناشر سعید الدین بی اے ایس سی۔ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ پریس۔ حیدرآباد۔

یہ مجموعہ ہے چند چھوٹے چھوٹے اصلاحی اور اخلاقی مضامین کا' جن میں مسلمانوں کو آیات قرآنی کی روشنی میں ان کی ترقی کے راز بتائے گئے ہیں اور فلاح و بہبود کے طریقے پیش کئے گئے ہیں' آخر میں کلام الٰہی کی ہدایتوں کا ترجمہ بھی درج ہے۔ "س"

بہار عید۔ از سید خوندمیر صاحب تمکین ۱۶ صفحات۔ قیمت ۱ر مطبوعہ نظام دکن پریس حیدرآباد۔

یہ چھوٹی سی کتاب مجموعہ ہے چند نفیس قطعات و عیدیوں کا جن کو جناب تمکین نے اپنے عزیز و احباب کے لئے عیدین کے موقعوں پر لکھے تھے۔ اکثر عیدیاں عاصمانہ ہیں اور اس قابل ہیں کہ بچوں کو پڑھائی جائیں۔ "س"

صد برگ تمکین (ہفت رنگی) از سید خوندمیر صاحب تمکین ۲۰ صفحات قیمت چار آنے مطبوعہ حمایت دکن پریس حیدرآباد۔

سات رنگ کی اردو فارسی رباعیوں کے اس مجموعہ کا آغاز حمد باری سے ہوتا ہے' دوسرے رنگ میں آں حضرت کی نعت ہے' تیسرا رنگ موعود خلیفۃ اللہ سے متعلق ہے' چوتھے میں فنا و بقا کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے' پانچواں رنگ اصلاح عمل پر مشتمل ہے چھٹے میں دنیا کی دو رنگی کا ماتم ہے اور ساتویں میں قوم کی زبوں حالی پر اظہار تاسف کیا گیا ہے۔ ہر رنگ میں کئی رباعیاں کہی گئی ہیں۔ ان کی تشریح سید قطب الدین صاحب پالن پوری نے کی ہے۔ "س"

اسلام (دینی اور دنیوی ترقی کا صحیح راستہ بتاتا ہے) از عبدالحفیظ خاں صاحب۔ ۴۹ صفحات مطبوعہ دارالطباعت رہبر (حیدرآباد)

یہ رسالہ انجمن علم و عمل کی جانب سے لکھوایا گیا ہے' یہ انجمن جس کے صدر نشین نواب سر نظامت جنگ بہادر ہیں' مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنانا چاہتی ہے' اسی مقصد کے تحت تین سو روپے انعام مقرر کر کے اس رسالہ کے عنوان پر مضامین لکھوائے گئے اور انتخاب کے لئے ایک ایک کمیٹی کے حوالہ کئے گئے جس کے اراکین نواب سر نظامت جنگ بہادر' نواب ناظر یار جنگ بہادر اور نواب اکبر یار جنگ بہادر وغیرہ تھے۔ اس کمیٹی نے زیر نظر مقالہ کو پسند کیا' یہ دلچسپ پیرایہ میں لکھا گیا ہے اور مختصر تنقید بھی ہے' ضرورت ہے کہ ہمارے نوخیز لڑکے اور لڑکیاں اس دینی اور دنیوی ترقی کے صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ "س"

شادی کی جاتی ہے۔ از مائل انبالوی۔ (۴۰ صفحات قیمت ۲ر پتہ مائل انبالوی۔ مشن کالج۔ انبالہ چھاؤنی۔

یہ ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس کا پلاٹ ٹینی سن کی نظم "دوڑا" سے لیا گیا ہے' اس ڈرامہ کا مقصد یہ ہے شادی کرائی نہیں جاتی بلکہ

کی جاتی ہے" محترمہ شکنتلا کماری نے اپنی تنقید میں بہت صحیح لکھا ہے کہ ڈراما نگار مکالمہ کے لئے حکیم احمد شجاع کی زبان کا رنگ ضرور دیکھیں گے اور پریم چند کی کتابیں بھی ضرور پڑھیں، مکالمہ میں جان نہ ہونے کی وجہ سے "ڈرامہ" "فسانہ" بنکر رہ گیا ہے اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ جناب مائل دوسرے ایڈیشن میں اس کے مکالمہ کو درست کریں اور اس کی قیمت ایک ربع کردیں۔ "س"

ادب لطیف کا ڈراما نمبر بابت سنہ ۱۹۳۹ء مرتبہ چودہری برکت علی بی۔ اے و مرزا ادیب بی۔ اے حجم ۲۰۶ صفحات قیمت ۱۲ر پتہ مکتبہ اردو لاہور۔

"ادب لطیف" کا یہ خاص نمبر تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں پانچ قابل ادیبوں کے مقالے ہیں "ڈراما کی مختصر تاریخ"، "ڈراما اور تعلیم" اور "ڈراما فنی نقطۂ نظر سے" پڑھنے کے قابل ہیں، پہلے مقالہ میں ڈراما کی مختلف منزلیں بتاتے ہوئے ڈراما کی دلچسپ تاریخ چند صفحوں میں قلمبند کردی ہے دوسرے میں ڈراما کی تعلیمی حیثیت پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تیسرے میں ڈراما کے فن پر قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے حصہ میں سترہ ڈرامے ہیں جن میں ہر قسم کے مختصر عمدہ ڈرامے ہیں۔

تیسرے حصہ میں چند منظوم ڈرامے ہیں، ان میں "گزری ہوئی رات" "ضیغم ہندوستان" "گل و شاعر" "فلسفیانہ اور روح پرور نظمیں ہیں، بحیثیت مجموعی یہ ڈراما نمبر اس قابل ہے کہ ڈراما اور فن ڈراما نویسی سے دلچسپی رکھنے والے اس سے اپنے اپنے کتب خانہ کی زینت بڑھائیں، ادارۂ ادب لطیف نے بڑی کاوش اور محنت سے اس نمبر کو مرتب کیا ہے اور ہندوستان کے مشہور مقالہ نگاروں اور ڈراما نویسوں کے رشحات قلم سے اس کو زینت دی ہے۔ اردو ڈراما کی اس خدمت کے لئے ادارہ موصوف مستحق مبارکباد ہے۔ "س"

ادب لطیف کا افسانہ نمبر بابت سنہ ۱۹۳۹ء مرتبہ چودھری برکت علی بی۔ اے و مرزا ادیب بی۔ اے حجم ۲۰۵ صفحات قیمت ۱۰ر پتہ مکتبۂ اردو لاہور۔

ادارۂ ادب لطیف کی عالی ہمتی قابل تحسین ہے ڈراما نمبر کے صرف تین مہینے بعد اس نے یہ خوبصورت اور دلچسپ "افسانہ نمبر" شائع کیا ہے، ڈراما نمبر کی طرح اس کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصہ میں چند مقالے ہیں جن میں "افسانہ نگاری کا تاریک پہلو" خاصہ کی چیز ہے، اس میں قابل مقالہ نگار نے افسانہ نگاروں کو چند نہایت مفید مشورے دئے ہیں، اسی طرح ایک اور مقالہ "جدید افسانہ" بھی اچھے مشوروں سے مملو ہے دوسرے حصہ میں (۱۹) افسانے ہیں جو ملک کے مشہور افسانہ نگاروں سے لکھوائے گئے ہیں، محترمہ سحر صاحبہ کا افسانہ "دلہن اماں" اس قابل ہے کہ نفس پرست بوڑھے اس سے عبرت حاصل کریں، اردو رسائل کے اڈیٹر حکیم احمد شجاع صاحب کا افسانہ "معجزات ادارت" ضرور پڑھیں، یہ واقعہ ہے کہ اکثر اردو رسالے ایسے ہی مضامین سے بھرے ہوتے ہیں جیسا کہ حکیم صاحب نے لکھا ہے۔ تیسرے حصہ میں دو منظوم افسانے "شاہی مزدور" اور "ے" بھی قابل مطالعہ ہیں۔ یہ "افسانہ نمبر" اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے اور قیمت میں بہت سستا ہے۔ "س"

یاد چکبست ۔ مرتبہ پنڈت آنند نراین ملا۔ انڈین پریس لمیٹیڈ الہ آباد میں چھپی قیمت ندارد۔ کتاب اچھی ہے۔ سر ورق نہایت ہی جاذب نظر۔ مجلد۔ ۱۰۲ صفحات کا ایک منظوم و نثری گلدستہ ہے۔ مؤلف نے بڑے ہی اہتمام و سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔

۱۲ فروری سنہ ۱۹۳۹ء کو یوم چکبست منایا گیا تھا۔ اس خصوص میں جو تقاریر و نظمیں پڑھی گئیں ان سب کو ایک جگہ مجتمع کرکے اپنے ذوق ادب کا ثبوت دیتے ہیں۔ جلسہ کا آغاز خود چکبست کی نظم "خاک ہند"

سے ہوا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے انسان چکبست کو اچھی طرح سمجھ جا سکتا ہے۔ اس کے ہر پہلو پر اس کے مطالعہ سے روشنی پڑتی ہے۔ چکبست سے متعلق ہر قسم و ہر نہج کے معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ مختلف نامہ نگاروں کے لکھے ہوئے مضامین اس شیرازہ کی بندش اور حسن ترتیب میں شامل ہیں۔

اس کو ادبی دنیا بخوبی جانتی ہے کہ چکبست کا درجہ اردو شاعری میں کس قدر بلند ہے اور پھر جب وہ انیس سے متاثر ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا انیس ہی کا رنگ جھلکتا ہے انیس کے ہی تیور پائے جاتے ہیں تو پھر اس فیصلہ میں تو شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ چکبست کوئی معمولی شاعر نہیں ہے۔ غالب میر یا انیس کے ہمپایہ ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ جبکہ ڈاکٹر گراہم بیلی کی نظر میں بھی انھیں تینوں شعراء پر رعد رعہ کے اٹھتی ہیں اور ان کے حیطۂ تخیل میں ان تینوں سے بہتر کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے نظم انسانی زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں ایک خاص امر جو ملحوظ ہے وہ یہ کہ کہیں یکسانیت نہیں۔ بلکہ نثر کے بعد نظم اور نظم کے بعد نثر کے قوس و قزاحی سلسلہ نے اس کی دلچسپی و جاذبیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ مشاعرہ کی نظموں کا وجود بھی اس شیرازہ کی ایک اہم کڑی ہے جس سے مکرر کا لطف آتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس موقر و دلچسپ مجموعہ نے بزم ادب میں ایک حسین اضافہ کر دیا۔ کتاب بہر نوع رنگین و دلنشین حسیات کی سرمایہ دار ہے۔ "ج"

رسالہ پیام نسواں:۔ اردو ادب میں رسائل کا وجود ایک تفریحی عمل پیدا کرتا ہے۔ کتاب میں یکسانیت رہتی ہے۔ رسالہ گوناگوں دلچسپیوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پیام نسواں ایک [illegible] لکھنو سے نکلتا ہے۔ چندہ سالانہ (عما)

۳۰ صفحات اس کی کائنات ہے۔ کتابت وطباعت پاکیزہ کاغذ اچھا ہے سرورق پر کنول انگڑائیاں لے رہا ہے۔

مختلف موضوع پر کم و بیش ۱۶ مضمون ہیں جس میں مسز وجے لکشمی پنڈت کی "دلچسپ" واقعی بہت دلچسپ ہے۔ علاوہ اس کے دو افسانے اور ایک تاریخی مضمون درحقیقت اس ذری سی جان کے لئے بہت ہیں۔ تین چار صفحے بچوں سے بھی مخاطب ہوتے ہیں۔ یہ بڑی آپا کا حصہ ہے۔ آخری میں دستکاری کے بھی نمونے شامل ہیں۔ نیز مشہور شعراء نے اپنی اپنی نظموں سے اس کی رونق کو بڑھا دیا ہے۔ غرض عما کے قلیل چندہ میں یہ اردو ماہنامہ نسوانی دنیا کے لئے برا نہیں۔ "ج"

جنوری ۱۹۴۰ء کے خاص نمبر

"ساقی" ۴۰۴ صفحات عہ رسالہ ساقی اردو کے بہترین رسالوں میں سے ہے اور یہ اپنے ہر خاص نمبر میں مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے سابق ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے کسی نہ کسی مشہور انگریزی تصنیف کا ترجمہ کراکے شائع کرتا ہے، اس دفعہ شیکسپیر کی شہرہ آفاق تمثیل "رومیو جولیٹ" کا ترجمہ تقریباً ۹۰ صفحوں میں شائع کیا گیا ہے۔ بعد کے صفحات میں اردو کے مشہور ادیبوں اور شاعروں مثلاً حسن نظامی، فانی، مرزا محمد سعید، قاضی عبدالغفار، وزیر حسن، علی منظور، ایم اسلم انصار ناصری، عابد حسین، حجاب امتیاز علی، عظیم بیگ چغتائی، صادق الخیری، اور ماہر القادری وغیرہ کے رشحات قلم پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سالنامہ معنوی حیثیت سے اردو کے اکثر سالناموں سے بہتر ہے۔ اگرچہ کہ ظاہری رونق اور آب و تاب کے لحاظ سے بعض دوسرے سالنامہ اس سے بہتر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاہد صاحب اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کے لئے مضمونوں اور نظموں ہی میں ایسی رنگا رنگی اور دلچسپی پیدا کی جائے کہ سادہ اور رنگین تصویروں کے بغیر بھی اہل اردو اپنے رسالوں اور کتابوں سے لطف اندوز ہونے

کی عادت ڈالیں۔ یہ ایک مستحسن کوشش ہے۔

اس سالنامے کا حصۂ نثر جس معیار تک پہنچ سکا ہے افسوس ہے کہ حصۂ نظم اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

"نگار" ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ نگار کا سالنامہ "نظیر اکبرآبادی" کی حیات اور کلام کے لئے وقف کر دیا گیا ہے، نگار نے اب تک جو خاص نمبر شائع کئے ہیں۔ ان کی خصوصیت رہی ہے کہ پورا مجموعہ ایک خاص موضوع کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے یہ ایک اچھا خیال ہے۔ لیکن بعض دفعہ اس کی وجہ سے ایک خاص دبستان خیال کے اہل ذوق ہی دلچسپی لے سکتے ہیں دوسروں کے لئے ایسی کوششوں میں دلچسپی کے سامان مفقود رہتے ہیں

نظیر اکبرآبادی اردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں اور انکی شہرت اور قدر و منزلت جیسی کے چاہئے ابھی نہیں ہوئی، جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اور اہل اردو زندگی کی حقیقتوں اور زمانے کی تلخیوں کو عریاں دیکھنے کے عادی ہوتے جائیں گے نظیر کا کلام بھی صحیح معنوں میں روشنی میں آتا جائے گا اور اس وقت نگار جیسی کوششوں کی سچی قدر کی جائے گی۔

افسوس کی بات ہے کہ اس کام میں اردو کے اچھے لکھنے والوں نے حصہ نہیں لیا اور یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ نظیر کے شایان شان نظر نہیں آتا۔

اس میں نظیر اکبرآبادی کی جو تصویر دی گئی ہے وہ اس تصویر سے بہت گھٹیا درجے کی ہے جو اس سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ اس میں اتنا تصنع ہے اور فن تصویر کی خوبیوں کا خیال اتنا رکھا گیا ہے کہ خود صاحب تصویر کی شخصیت دھندلی ہو گئی۔ بہتر ہوتا کہ اس تصویر کے ساتھ نظیر کی وہ قدیم قلندرانہ وضع کی تصویر بھی شائع کی جاتی۔

نیاز نے نظیر کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن اس خاص نمبر کے بہت کم مضمون نگار ایسے ہوں گے جن کے نتائج قلم خود نیاز کے معیار تک پہنچ سکے ہوں گے۔

بہر حال یہ ایک ایسی کوشش ہے جو آئندہ کام کرنے والوں کے لئے خام مواد کا کام دے گی۔ بہتر ہوتا کہ نظیر کے اس غیر مطبوعہ کلام کا کافی حصہ اس نمبر میں شائع کیا جاتا جو نیاز صاحب کو دستیاب ہوا ہے اور جس کو وہ یقیناً چھاپنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی اشاعت سے قبل اس کا اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ اس میں سے کتنا کلام خود نظیر کا ہے اور کتنا الحاقی۔

"ہمایوں" ۱۰۱ صفحات ۱۲؍ اس خاص نمبر میں سات چھوٹی بڑی تصویریں ہیں۔

ہمایوں کا سالگرہ نمبر اس کے گزشتہ خاص نمبروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میاں بشیر احمد صاحب کو آج کل سیاسی محفلوں اور اردو کی تبلیغ و اشاعت کے کام سے اتنی دلچسپی ہو گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ اب ہمایوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہیں اور اگر توجہ بھی کرتے ہیں تو اردو انجمنوں اور اردو کے متعلق ہر جار کی خبریں جمع کرنے اور ان کو شائستگی سے پیش کرنے کی حد تک۔

اس نمبر میں ان کا ایک مضمون جو کشمیر سے متعلق ہے بہت دلچسپ اور مفید معلومات پر مبنی ہے۔

حصۂ نظم میں علی منظور صاحب کی نظم فاتحہ سالانہ خاصے کی چیز ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی نظم سب رس کے جنوری نمبر میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

"جدید اردو" کلکتہ ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍۔ جدید اردو کا یہ خاص نمبر بنگال کے متعلق معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ عہد حاضر میں صوبہ بنگال کو اہمیت حاصل ہے وہاں اردو کی اشاعت اور ترقی کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے اور سالنامہ اس قسم کی کوشش کے لئے ممد و معاون

ثابت ہوگا۔

اردو کتابت وطباعت کے لحاظ سے بنگال ابھی بہت پیچھے ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود خاص اہتمام کے اس خاص نمبر کا ظاہر کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے۔ اس میں رضا علی صاحب وحشت کا مضمون اردو کا تعلق بنگالے سے اگرچہ مختصر ہے لیکن قابل مطالعہ ہے۔

افسوس ہے کہ اصل موضوع سے متعلق "جدید اردو" کو کافی مضمون اصول نہ ہوسکے اس لئے اس میں غیر متعلق مضامین بہت سے نظر آتے ہیں۔

بنگال کے مشہور شاعر انقلاب قاضی نذرالسلام کی تصویر۔ مختصر حالات اور ان کی نظموں کے ترجمے اس خاص نمبر کے خاصہ کی چیز ہے۔ ٹیگور کے بھی ترجمے نظر سے گزرتے ہیں۔ احسن احمد صاحب اشک اپنی اس کوشش کے لئے قابل مبارکباد ہیں توقع ہے کہ وہ آئندہ ایک ایسا نمبر شایع کریں گے جس میں زیادہ تر صوبہ بنگال ہی کے اردو لکھنے والوں کا حصہ ہوگا اور اس طرح سے وہیں کے گزشتہ اور موجودہ اردو ادب کی پوری ترجمانی ہوسکے گی۔ ق

"صبح امید" بمبئی (۹۴) صفحات قیمت ۸؍ عبدالحمید خاں صاحب بوبیرے بمبئی میں اردو کے ایک اچھے خدمت گزار ہیں، انھوں نے یہ سالنامہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اس کا سرورق رنگین اور نہایت دیدہ زیب ہے اس میں بھی چند اچھی تصویریں ہیں مضامین بھی دلچسپ ہیں اس لحاظ سے کہ بمبئی سے کوئی اچھا اردو رسالہ شایع نہیں ہوتا اور اردو کی کتابت اور طباعت بھی ابھی بہت پیچھے ہے وہاں کا یہ سالنامہ قابل قدر ہے۔ ق

"عالمگیر" ۲۰۰ صفحات قیمت ۴؍ یہ سالنامہ عالمگیر کے گزشتہ خاص نمبروں کی طرح اچھا ضخیم ہے اس میں متعدد رنگین اور سادہ تصویریں بھی دی گئی ہیں لیکن اس کی کتابت اور طباعت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔

اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۱۔ علمی وادبی مقالات جس میں ۸ مضمون ہیں۔ ۲ افسانے اور ڈرامے جس میں ۱۴ لکھنے والوں نے حصہ لیا ہے ۳ منظومات جس میں ۳۲ اصحاب کے نتائج فکر شامل ہیں۔ حامد حسن قادری، ابوظفر ندوی، ایم اسلم، ماہر القادری، جلیل، جگر، امجد، روش، ظفر علی خاں، اور پروفیسر سالک اس سالگرہ نمبر کے مشہور لکھنے والے ہیں۔ ق

"ادبی دنیا" (۲۰۸) صفحات قیمت ۴؍ اس سال کے جملہ سالناموں میں تصویروں، کتابت وطباعت اور دیدہ زیبی کے علاوہ مضامین کے لحاظ سے بھی ادبی دنیا کا یہ سالنامہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس کا حصہ نظم حصہ نثر سے بہتر ہے اتفاق کی بات ہے کہ اس میں بھی نظیر اکبرآبادی کے متعلق ظہیرالدین احمد صاحب کا ایک اچھا مضمون شامل ہے۔ خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کی رنگین تصویر "عقیدت تمام" فن کاری کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ پایہ کی ہے۔

میراجی اور صلاح الدین احمد صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس آب وتاب کا سالنامہ شائع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی قسم کی کوششوں سے ہماری زبان کی عظمت اور اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ق

"ہندوستانی" اس کتاب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ اور یہ اصل میں ان چھ تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے "ہندوستانی" کیا ہے کے

سوال پر چھ مختلف اصحاب نے مختلف تاریخوں میں کی تھیں۔ ہر تقریر سے پہلے مقرر کی ایک اچھی سی تصویر بھی شامل کی گئی ہے۔ جو غالباً ریڈیو اسٹیشن ہی میں لی گئی تھی۔

پہلی تقریر ڈاکٹر تاراچند کی ہے جو ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے معتمد کی حیثیت سے کئی سال سے کوشاں ہیں کہ اُردو اور ہندی کے درمیان ایک زبان ہندوستانی ایسی نکل آئے جو دونوں کے لئے قابل اطمینان ہو لیکن یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اہلِ اُردو اور اہلِ ہندی کسی سمجھوتے کی طرف مائل ہوں۔ لیکن یہاں سمجھوتے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہاں تو ہر فریق اپنا بول بالا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک سیاسی زبان ہندوستانی کے رواج کی کوشش کیسے سرخرو ہو سکتی ہے۔

اس تقریر کے اکثر مطالب صحت ذوق پر مشتمل ہیں لیکن آخر میں تہذیب اور زبان کو علیحدہ ثابت کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کے ماننے کے لئے بہت کم لوگ راضی ہوں گے۔

دوسری تقریر ڈاکٹر مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اُردو کی ہے اور انھوں نے بسم اللہ کے ساتھ ہی یہ کہدیا کہ "ہندوستانی کا لفظ آج کل جھگڑوں کا چھتہ بنا ہوا ہے اب آل انڈیا ریڈیو نے اس چھتے کو چھیڑا ہے تو اسے ڈنک سہنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے"۔ پھر لفظ ہندوستانی پر بحث کرتے ہوئے اس زبان اور خیال کی مخالفت کی ہے جو پہلے لکچر میں ڈاکٹر تاراچند نے پیش کی تھی۔

تیسری تقریر بابو راجندر پرشاد کی چوتھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی پانچویں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی اور چھٹی آصف علی صاحب بیرسٹر کی ہے۔ اور ان سب میں ایک دوسرے کے بیانات کا تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور کوئی ایک تقریر ایسی نہیں جو اس مسئلہ کو حل کر سکے۔ البتہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے لفظوں کے استعمال اور املا کے بارے میں جو مشورے دئے ہیں وہ سب سے زیادہ عملی اور مفید ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ خیالی باتوں۔ نظریوں اور اصولی بحثوں سے زیادہ عمل سے طے ہو گا اور عمل کے لئے جو شرائط اور خصوصیتیں درکار ہیں ان کا جس زبان کے بولنے والے زیادہ لحاظ رکھیں گے وہی کامیاب رہے گی۔ اور اسی کا نام ہندوستانی ہو جائے گا۔ ق

"**ارمغان جذب**" یہ پنڈت راگھویندر راؤ صاحب جذب وکیل عالیپور کی دلچسپ رباعیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ چند سال پیشتر جناب جذب صاحب کی رباعیوں کا پہلا حصہ رباعیات جذب کے نام سے شائع ہوا تھا۔ زیر نظر مجموعے میں جو رباعیاں شامل ہیں وہ زیادہ تر سنسکرت شاعروں اور خاصکر راجہ بھرتر ہری کے خیالات سے متاثر و ماخوذ ہیں۔ بھرتر ہری وہی سنسکرت شاعر ہے جس کے منظومہ ترجمے سے علامہ اقبال نے اپنی کتاب بالِ جبریل کا آغاز کیا ہے

اردو زبان میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے خیالات اور معلومات کے پیش کرنے کی بہت کچھ ضرورت ہے اور خوشی کی بات ہے کہ جناب جذب نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ماہر القادری صاحب نے بڑی محنت سے لکھا ہے اور اس میں سنسکرت شاعروں سے متعلق نہایت تفصیل سے معلومات پیش کی ہیں۔

"**رسولِ پاک**" میں مولوی عبدالواحد صاحب سندھی جامعی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ دہلی نے بتایا ہے کہ رسول پاک کون تھے۔ کیسے تھے۔ اور آپ نے کیا سکھایا۔ یہ کتاب بچوں کے لئے نہایت سلیس شگفتہ اور آسان زبان

میں لکھی گئی ہے۔

کتاب رسولِ پاک میں حضرت پیغمبر اسلام کی زندگی کے متعلق ایسی ضروری مختصر اور سادہ باتیں بیان کی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بچے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ بچے اس کتاب کو بہت شوق سے پڑھیں گے۔ ق

جوہر تخلیق سید محمد علی حشم صاحب داعی پوری کی ایک طویل مثنوی ہے جو شاہنامہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ حشم صاحب کو فردوسی کی اس زندہ جاوید کتاب کے مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے ان کو شاہنامہ کی تقلید میں لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا چنانچہ یہ مثنوی اسی شوق کا نتیجہ ہے۔ اس میں شاہنامہ ہی کی بحر میں شاہنامہ کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اس مقصد میں مصنف بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اردو زبان میں فارسی کے شہکاروں کے ترجمے قدیم دور کے بعد معدوم سے ہو چکے ہیں اور اب زمانے کے حالات کے پیش نظر توقع بھی نہ تھی کہ کوئی ایسی کامیاب کوشش کرے گا لیکن بقول سعدی ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است ۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب حشم صاحب نے فردوسی کی کامیاب تقلید کر کے عہد قطب شاہیہ و عادل شاہیہ کے ادبی ترجموں کی یاد تازہ کر دی ورنہ اردو ادب سے دوسری زبانوں کے شہکاروں کے ایسے طویل منظوم ترجمے رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ ق

ہلال و صلیب :- تالیف جناب ایم اسلم کراؤن تقطیع (۲۸۰) صفحہ مجلد قیمت عاں ملنے کا پتہ اُردو اکاڈمی لوہاری گیٹ لاہور یا مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد

ایم اسلم کا نام اردو ادب میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ آپ کے افسانوں اور مضمونوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ارباب صلیبی کے ہیرو سلطان صلاح الدین ایوبی کی یہ سوانح عمری بھی آپ کے زور قلم اور مورخانہ تحقیق و تلاش کا نتیجہ ہے۔ اس میں سلطان کی ابتدائی تربیت، ترقی اور بیت المقدس پر پرستاران صلیب کی یورشیں اور ان کے مقابلے تمام مسائل تفصیل اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ اسلام کے ہر طالب علم کو ضرور مطالعہ کرنی چاہیے۔ سید محمد

سیرت سید احمد شہید :- تالیف جناب سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کراؤن تقطیع (۴۶۴) صفحات مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ نامی پریس لکھنو یا مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد۔

یہ ہندوستان کی پہلی تحریک جہاد و تنظیم کے بانی مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی اور آپ کے رفقائے کار کی محققانہ سوانح حیات ہے اور اس سے تحریک جہاد و تنظیم مسلمانان پر بھی اچھی طرح روشنی پڑتی ہے جو آپ نے شروع کی تھی۔ ابتدا میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی دیوبندی و مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریظیں مختلف عنوانات سے شریک ہیں جو کتاب اور موضوع کتاب پر سیر حاصل بحثیں ہیں۔ یہ کتاب بہت تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ سید محمد

عصر نو :- یہ مجموعہ چھوٹی سائز کے ۲۰ صفحات پر چھپا ہے۔ اس کے مصنف محمد صدیق صاحب ضیا ہیں جنہوں نے عہد حاضر کے مختلف رجحانات کو مصنف مختلف بندوں کی صورت میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یعنی پہلا بند حرف الف پر ختم ہوتا ہے۔ تو دوسرا ب پر، اور تیسرا ت پر، یہ ترتیب اگرچہ جدت کے لئے اختیار کی گئی ہے لیکن تکلفات باردہ ہی شمار کی جائے گی۔ شاعر اپنے کلام کو اس قسم کی قید و بند سے جتنا زیادہ آزاد رکھے گا اتنا ہی اس کے اسلوب میں قوت

اور طرز میں بے ساختگی پیدا ہو گی ۔

جناب ضیا، اچھے شاعر اور منکر معلوم ہوتے ہیں

یورپ کی خونی سیاست :۔ یہ کتاب گاہ دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس کے مصنف سید تصور حسین ایم اے، بی۔ ٹی ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحات ہیں سرورق پر یورپ کا نقشہ دیا گیا ہے جس میں لڑائی کے محاذ دکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مولف نے جنگ بلقان سے لے کر موجودہ جنگ عظیم تک یورپ کی تمام سیاسی قلابازیوں کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اسکے آغاز میں مصور حسین صاحب نظم مراد آبادی نے ایک مقدمہ لکھا ہے اور اصل کتاب ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں بعض یہ ہیں ۔

خونی بادل جنگ عظیم سے پہلے ۔ انقلاب روس۔ ورسیز کا صلحنامہ۔ ورسیز کے بعد میونگ سے پہلے ۔ اور میونگ کے بعد وغیرہ ۔ یہ مفید اور پر از معلومات کتاب ہے ۔

اسلامی مصوری :۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ڈی لٹ پیرس نے اوسط تقطیع کے (۶۲) صفحات میں اسلامی مصوری کی ایک مختصر تاریخ شائع کی ہے جس میں یونان، روما۔ چین ۔ ہندوستان اور عرلبنان وغیرہ میں قبل اسلام کے فنون کی ترقی کے تذکرے کے بعد مسلمانوں کے عہد کی ترقی فنون کو بڑی خوبی سے بتایا ہے ۔ یہ کتاب بہت ہی مفید اور ضروری معلومات سے معمور ہے ۔ اور ایک اچھوتے موضوع پر لکھی گئی ہے ۔ جس پر اردو تو کیا دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کوئی مواد نہیں ہے ۔

اسلامی کوزہ گری :۔ اسلامی مصوری کی طرح ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے اسلامی کوزہ گری کے موضوع پر بھی ایک سیر حاصل کتاب تحریر کی ہے ۔ اس کے ساتھ چند بڑی خوبصورت تصویریں بھی ہیں ۔ اور یہ پہلی کتاب سے زیادہ بسیط اور ضخیم ہے یہ ایسے اچھوتے اور اہم موضوع ہیں کہ ان سے متعلق کتابیں لکھکر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اپنی اہل ادب پر احسان عظیم کیا ہے ورنہ یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ مشرقی چیزوں سے متعلق اکثر مضامین اور کتابیں انگریزی یا دوسری زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے ۔

اسلامی مصوری اور اسلامی کوزہ گری دونوں کے کتابت طباعت بھی نفیس ہے ۔ اور توقع ہے کہ سنجیدہ ذوق رکھنے والے ان سے ضرور مستفید ہوں گے ۔ ق

اردو دانی کی پہلی کتاب ۔ اس کتاب کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نے اپنی خاص نگرانی میں مولوی اظہار الدین صاحب سے مرتب کرایا ہے اور ادارۂ ادبیات اردو کے مجلس امتحانات اردو دانی کے نصاب میں اس کو شامل کیا ہے۔ یہ کتاب جدید ترین اصول تلفظ شناسی کے مطابق لکھی گئی ہے ۔ اس میں ایک سو نو تصویریں اور ۹۰ صفحات ہیں ۔ ادھر کچھ عرصے سے ملک میں تعلیم بالغان کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے جس کی تکمیل کی طرف ہر بہی خواہ اردو کو متوجہ ہونا چاہیئے ۔

تعلیم بالغان کی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ بالغوں کی ضرورت اور حالت کے مطابق کتابیں تیار نہ کی جائیں ۔ بچوں کے قاعدے اور درسی کتابیں ان کے لئے غیر مفید ثابت ہوتی ہیں ۔ اور اردو میں ایسی کتابیں موجود نہیں جو اس ضرورت کی تکمیل کر سکیں اسلئے یہ اردو دانی کی پہلی کتاب یقیناً تمام ہندوستانیں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی اور اس موضوع کی دوسری کتابوں ...

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

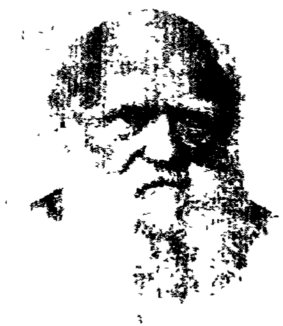
نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰ M
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۵)
مئی سنہ ۱۹۴۰ء

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی بی، اس، سی
معین الدین احمد انصاری

جلد ۳ — بابت مئی سنہ ۱۹۴۰ء — شمارہ ۵

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر "دفتر ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد

چارلس داروین | ایبسن | تولستوی

اداریہ

شاعر شعر اور مشاعرہ ....؟! مشاعرے یقیناً عوام میں ایک پاکیزہ ادبی ذوق پیدا کرسکتے ہیں، اگر ان کی تعمیری افادیت سے کام لیا جائے اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ادب کے صحیح رجحانات کا عکس پیش کرسکیں۔ مشاعرے کی محفلوں میں جس کثرت سے عوام شریک ہوتے ہیں، شاید ہی کسی ادبی محفل میں ان کی اتنی کثیر تعداد نظر آتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نثر سے زیادہ نظم دلوں پر اثر کرتی ہے۔ دنیا کے ہر ادب میں شعری لطافتوں کا عنصر، مرکز توجہ رہا کیا ہے۔ چونکہ اردو ادب کی اولین بنیاد، شعری کارناموں پر رکھی گئی ہے اور ہر زمانے میں شعر و نغمہ کی ہم آہنگی، بربط ادب کا سب سے زیادہ شیریں ساز پیدا کرتی رہی ہے، اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب، خواہ اس کا رجحان کچھ بھی ہو، شاعری کے بغیر بے کیف بلکہ نامکمل رہے گا ----- اب سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر رات جو ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوتی ہے، کیا وہ اردو کی ترقی، یا اہل اردو کے ذوق کی پاکیزگی میں کسی قسم کا اضافہ کرتی ہے؟ ہمیں اندیشہ ہے کہ محفل آرائیوں کے اس بڑھتے ہوئے جنون کا حاصل، ترنم اور واہ سے زیادہ نہیں، اور اس ترنم میں کوئی ساز زندگی ہوتا ہے اور نہ اس واہ میں اثر پذیری کا کوئی دیرپا نقش۔

حسن کاری برائے حسن کاری کا پرانا راگ اب زندگی کے ہنگاموں میں ایک بے معنی آواز ہے۔ اب درد و سوز، تنہائی کی راتوں اور جدائی کے لمحوں پر نچھاور کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ زندگی کا دیوتا اسے اپنے گلے کا ہار بنا رہا ہے۔ اب فرضی معشوق سے زیادہ، حیات نو کی بنیاد، دل کی دھڑکنوں اور آنکھوں کے آنسوؤں کی مستحق ہے۔ اب وقت نہیں ہے کہ ہمارا شاعر اپنی صلاحیتوں سے ذہنی تعیش کا کام لے اور دوسروں کے دماغوں سے سوچ کر ہوائی قلعے بنائے۔ بلکہ اسے زندگی کا نقیب بن کر آواز بلند کرنی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ شاعر، جس کا نغمہ "جزو پیغمبری" سمجھا جاتا ہے اپنے مفلوج دماغ کی گندگی اچھال کر کس طرح معیار اخلاق کو پست تر کر رہا ہے۔ ملک و قوم میں بیداری کی روح پھونکنے کی بجائے، کس طرح زندگی کو موت کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل رہا ہے۔ اور اپنی ہرزہ سرائی سے کس طرح اپنا اور دوسروں کا عزیز وقت ضائع کر رہا ہے۔

اکثروں کو ان لوگوں سے اختلاف رہا ہے جو جذبۂ محبت کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کرتے ہیں اور ادب سے محبت کے عنصر کو نکال دینا چاہتے ہیں۔ کیا محبت کی چنگاری دل کی گہرائیوں سے نکالی جاسکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ زندگی کی حدوں سے ادب کی حدوں کو ملانے والے کیوں سایوں کا شکار کھیل رہے ہیں! جہاں دل ہے وہاں محبت ہے، اس لئے جب تک سینے میں دل رہے گا، ہمارا ادب بھی غیر شعوری طور پر محبت کے ساتھ رہے گا ---- محبت کے خلاف یہ جو بغاوت ہے وہ اصل میں ایک ردعمل ہے جس کو پست معیار محبت نے پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ صرف محبت ہی ایک ایسا موضوع نہیں ہے جس کے لئے انکھوں کو سرخ آلود کیا جائے۔ کیا محبت سے ہٹ کر ہمارا شاعر کچھ بھی نہیں سوچ سکتا، اور کیا فرضی محبت کے بے سر و پا افسانوں کی فرسودگی میں اب کوئی لذت باقی رہی ہے؟ ہمارے بے شمار شاعر دنیا میں کتنے "قیس عامری" اور "فرہاد کوہکن" ہیں جو اب بھی "آوارہ و مجنونے و رسوا سر بازارے" ہو کر پھرا کرتے ہیں۔ یہ عشقیہ شاعری کا سارا ردیف وار دیوان اصل میں مصنوعی جذبات کا ایک دفتر بے معنی ہے جو دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اگر واقعی دل نے محبت کی چوٹ کھائی ہے اور زبان پر اس چوٹ سے آہ پیدا ہوئی ہے تو نئے قافیوں کی تلاش میں کروٹیں لے لے کر بستروں کو شکن آلود کرنے والے' زندگی سے قریب ہیں' لیکن یہ کیا ہے کہ اخباروں میں "اہم خبر" بن کر کوئی طرح مصرعہ چھپا اور الہام' ردیف و قافیہ میں سمٹ کر غزل بن گیا ــــ گیسوؤں کی پیچ میں الجھے ہوئے خیالات کا یہ طومار ہمارے ادب کی پیشانی پر ایک مکروہ داغ ہے۔ کیا ہمارے شاعر کی آنکھیں ابھی تک شب فراق کے ڈر سے دن میں تارے گنا کرتی ہیں۔ کیا رزم گاہ دنیا میں ابھی تک زہریلی گیس اور بم بار طیاروں کی بجائے' تیر و سناں کی کارفرائی ہے۔ کیا ٹیلیفون' ٹیلیگراف اور ریڈیو کی ایجادات کے بعد نامہ بری کے لئے کبوتر کی ضرورت باقی رہی ہے اور کیا اب بھی سارے جہاں کے معشوق محلوں میں دنیا کا سفر کر رہے ہیں ــــ آخر یہ کونسی دنیا کی باتیں ہیں جن کو ہمارے شاعر گاگا کر اور رو رو کر سنایا کرتے ہیں۔ معلوم نہیں فطرت اور حقیقت سے دُور' شاعروں کا یہ کارواں' رقیبوں سے بچتے ہوئے اور فرضی معشوقوں کی یاد میں کدھر جا رہا ہے۔

پامال مفروضوں کی دنیا میں رہنے والے خوش فکرے' روندے ہوئے خیالات کے بازی گر ــــ اور بات بات پر زندوں کے لئے مردوں کی سند مانگنے والے خود ساختہ نقاد ــــ ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور ان کی دنیا کدھر جا رہی ہے!

یہی کاروان جب مشاعروں میں آتا ہے تو سطحی تصور محبت کی تخریبی آوازیں گونجتی ہیں اور بے فکروں کے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے واہ وا کی آوازیں بلند کرواتی ہیں۔ حالی کے بعد سے اقبال تک اور اقبال کے بعد سے آج تک' ہمارے شعری ادب نے کافی ارتقائی مدارج طے کر لئے ہیں اور حیدرآباد میں بھی نوجوان شاعروں کی ایک ایسی وقت شناس جماعت پیدا ہو گئی ہے جو فطرت اور زندگی کی ترجمانی کے لئے تیار نظر آتی ہے۔ یہ جماعت اگرچہ مختصر ہے لیکن اس نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں اور دماغوں پر کافی اثر ڈالا ہے۔ وہ جامعۂ عثمانیہ کی تربیت یافتہ ہے جو ایک ایسے سنگم سے نکلی ہے' جہاں مشرق و مغرب کے فکری دھارے ملتے ہیں۔ اس مکتب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماضی سے اپنی وابستگی کو برقرار رکھتے ہوئے برق رفتار مستقبل کا ساتھ دے رہی ہے ان کی شاعری اس دنیا کو جہاں ایک لوٹ مچی ہوئی ہے' آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈال کر ایک مہکنے والا گلزار پیدا کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور یہی ہمارے موجودہ ادب کا اصلی رجحان ہے۔ اس رجحان کا مرکز وہ احساس ہے جو ہر دھڑکتے دل میں رہ رہ کر کروٹ بدل رہا ہے۔ غریبوں کی آہوں' کچلی ہوئی روحوں کے نالوں اور بھوکوں کے آنسوؤں میں اب دنیا کی عشرت گاہیں تاریک ہوتی جا رہی ہیں۔ حسینوں کی دمکتی ہوئی پیشانیوں سے زیادہ اب زندہ لاشوں کے جھلسے ہوئے چہرے' آنکھوں سے آسودگی کی نیند چھین رہے ہیں۔ بھوکے اور مفلس ملک کا شاعر اب معشوق کی صراحی دار گردن میں ہاتھ ڈالے چاندنی رات کا جوبن نہیں لوٹ سکتا بلکہ اسے دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں پتھر پھوڑنا ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے وہ نوجوان جو مال کی ڈھلتی ہوئی چھاؤں کو اپنے بھیانک مستقبل کی طرف لے جانا نہیں چاہتے' مشاعروں کی طرف بھی توجہ کریں اور ان سے روح میں بیداری پیدا کرنے کا کام لیں۔ یہ فرض' آج کل اور بھی بڑھ جاتا ہے' اس لئے کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مشاعرہ ہمارے ہر قومی اجتماع کا تفریحی مشغلہ بن گیا ہے' جس کو سیاسیات کے تھکے ہوئے دماغ' تسکین قلب کا نسخہ سمجھ کر' استعمال کرتے ہیں' اگر وہ اسی طرح مشاعروں کو چاٹ کے

گھونٹوں میں پی جائیں گے اور سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیں گے تو ہمیں خوف ہے کہ خود وہ شاعروں کی پھٹی ہوئی پیاسیں اور پھولی ہوئی رگیں، عصر حاضر کی فکر و تخیل کا کوئی اچھا ورثہ آنے والی نسلوں کے لئے نہ چھوڑ سکیں گی۔

اس نقارے کی آواز جتنی جلد ختم ہو اچھا ہے ———

گیت

گیت، شاعری کے اس اسلوب کا نام ہے، جو بحر اور الفاظ کے ذریعے سے غنائی کیفیت پیدا کر سکے، ہر زبان میں ایسے گیت لکھے جاتے رہے ہیں، جو ذوق نغمہ کی تشنگی بجھا سکیں ——— ہندوستانی موسیقی میں ہندی سے بہت کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جب اردو زبان میں گیت لکھے جانے لگے تو ہندی گیتوں کا ان پر کافی اثر پڑا تاہم یہ ایک اچھی ابتدا تھی، جس کی وجہ سے اردو کو نئے نئے شعری سانچے ملنے لگے اور اس طرح ہمارے طربیہ ادب کی ایک ضرورت پوری ہونے لگی۔

ہندوستان میں ریڈیو، گویا فلم اور گراموفون کی ایجادیں گویا موسیقی ہی کے لئے ہوئی ہیں۔ اور ان تینوں اہم ایجادوں سے زیادہ تر، گانے اور گوانے کا کام لیا جاتا ہے۔ موسیقی کے اس طوفان نے جو ان ایجادوں کے سہارے اٹھا، غنائی شاعری کا بھی ایک طوفان برپا کر دیا۔ غزلوں سے تو خیر دفتر کے دفتر بھرے پڑتے تھے البتہ "چلتے ہوئے" گیتوں کی ضرورت تھی، چنانچہ اس کمی کی تلافی کے لئے بھی دفتر کھل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ ہیں اور چند خیالات جن کے ذریعے سے ذرا سی تبدیلی کے بعد ہر موقع کے لئے ایک گیت تیار ہو جاتا ہے اور اس گیت کو "خیال خاں" اور "بھیرویں بائی" ہندستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے اہل ذوق، ریڈیو اسٹیشنوں اور گراموفون اور فلم کمپنیوں کی اس برستی ہوئی دولت سے تنگ آ گئے ہیں لیکن کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا ہے کہ ان کی وجہ سے ہماری زبان، ہماری معاشرت اور ہماری جدید نسل کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے۔ فلم اور ریڈیو اور گراموفون کی موسیقی کس طرح چپکے چپکے ذہنیتوں پر اپنا پرتو ڈال رہی ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی کی زبان سے اگر آپ "تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا" سنیں تو آپ کیا کہیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہماری شاعری نے جنسی میلانات کی گندگی کو موسیقی میں بھی اچھالا ہے اور چونکہ شعر اور نغمہ کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہمارے گیت بھی ادنیٰ شہوانی احساسات کے مظہر بن گئے اقبال نے کہا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور عورت بھی وہ عورت نہیں جس کو مشرق نے "دیوی" کہا ہے بلکہ وہ عورت جس کے نام ہی سے گناہ کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ فنون لطیفہ کی نشو و نما، آخر کثافتوں میں کیوں ہو رہی ہے اور مشرقی تہذیب جو ذرا سی انسانی لغزش پر بھی کفر کا فتویٰ صادر کرتی ہے، کس طرح اس بے حیائی کو گوارا کر رہی ہے؟

اقبال اپنے ایک دوسرے شعر میں کہتا ہے۔

نفس کو کرتا ہے اپنی نوا سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

موسیقی کا یہ معیار اتنا بلند ہے کہ وہاں تک نے نوازی کے تصور کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی، لیکن ہم اپنی شاعری اور موسیقی کو ظاہری طور پر تو اس ذہنی برہنگی اور نیاز و ناز کے بازاری معاملات سے بچا سکتے ہیں ——— ہندوستانی موسیقی کے فن سے قطع نظر جو خود بھی اپنی انفرادیت کھوتا جا رہا ہے اور دوسرے مکاتیب موسیقی کا اثر قبول کرتا جا رہا ہے، ہماری غنائی شاعری ہمارے تصور حسن کاری کی کوئی ثقہ مثال نہیں ہے، اس لئے جس طرح شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر ایک اخلاقی احتساب کی ضرورت ہے،

اسی طرح گیتوں پر سے بھی بے حیائی کی گرد صاف کرنا چاہئے اور ان کے ذریعے جنسی خواہشات کو گدگدانے کی بجائے زندگی میں ایک ایسی تڑپ پیدا کرنے کا کام لینا چاہئے جو روح کو پاکیزہ بنا سکے ورنہ شائد فنون لطیفہ کی یہ ارزانی ہندوستان کے ذوق نغمہ کی متاع لطیف کو ارزاں بنا دے گی

اردو کے قاعدے | گزشتہ چند سال سے جہاں اردو اہل میں اردو کے تحفظ اور استحکام کا خیال پیدا ہو گیا ہے اردو سکھانے کے کئی قاعدے بھی لکھے گئے ہیں ان میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کی کوششیں خاص کر قابل ذکر ہیں وہاں سے دس بارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں جو دیدہ زیبی اور کتابت وطباعت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں بعض قاعدوں میں اچھی اچھی تصویریں بھی دی گئی ہیں اور بعض کے سرورق رنگین ہیں بچوں کے قاعدوں کے علاوہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے اپنی بول چال کا لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے نہایت کم قیمت قاعدے چھاپے گئے ہیں جو صاحبزادہ سعید الظفر صاحب سابق پرنسپل لکھنو کالج کے مرتبہ ہیں یہ سب کوششیں قابل قدر ہیں اور جو لوگ اس عہد کشمکش میں زیادہ سے زیادہ اصحاب کو اردو پڑھا لکھا بنانا چاہتے ہیں وہ ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اردو دانی کی پہلی کتاب | جامعہ ملیہ کی ان کوششوں کے سلسلے میں اس کتاب کا ذکر بھی ضروری ہے جس کو جدید ترین اصول تعلیم کے مطابق مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج نے اپنی ذاتی نگرانی میں مولوی اظہر الدین صاحب سے مرتب کرایا ہے۔ اس کے دو حصے اب تک چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا حصہ قلیل عرصہ میں بہت کچھ مقبولیت حاصل کر چکا ہے اس میں (۱۰۹) تصویریں ہیں اور قیمت صرف ڈھائی آنے رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ دوسرا حصہ ذرا بڑا ہے اور اس کے پڑھنے کے بعد اخبار اور سادہ تحریریں آسانی سے پڑھ لی جا سکیں گی، اور تعلیم بالغان کے سلسلہ میں اگر اتنی بھی کامیابی حاصل ہو سکے تو بہت کافی ہے۔ اس کی قیمت ۴ر ۶ر ہے۔

اجلاس مجلس امتحانات | مجلس امتحانات کا ایک جلسہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۰ء کو دفتر نظامت تعلیمات میں مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مجلس امتحانات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل امور طے پائے۔

(۱) امتحانوں کی تاریخیں اور وقت (۲) ممتحنوں کا تقرر۔
(۳) امتحانوں کے مرکز اور عمارتیں (۴) مجلس مبصرین کا قیام۔
(۵) امتحانوں کا انتظام (۶) سندوں کی طباعت۔

اس دفعہ امرداد میں چھٹیاں نہ ہونے اور بعض نصابی کتابوں کے بروقت نہ ملنے سے، امیدواروں کی سہولت کے لئے مجلس نے امتحانات کی تاریخیں ۱۰ ار اور ۱۲ر مہر ۱۳۴۹ف تک بڑھا دیں اور شرکت امتحان کی درخواستیں ۵ر امرداد تک قبول کئے جانے کا تصفیہ ہوا۔

"ادارہ"

نوٹ:-
دوسرے شعبوں کی روئدادیں آئندہ شمارہ میں درج ہوں گی۔

مُراسَلات

(مراسلہ نگار اصحاب کی رائیوں سے مجلسِ ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(۱)

اپریل کا "سب رس" کل وصول ہوا' جس کے صفحہ ۳۳ اور ۳۴ پر ایک مضمون (رائج اردو کی اصلاح) کو پڑھ کر میرا ادبی وجدان پہروں تلملاتا رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ حیرت ہے کہ ایسا غیر ذمہ دارانہ مضمون کس طرح آپ نے شائع کر دیا اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ "ادارہ ادبیات اردو کے شعبۂ زبان کی مجلس' مروج تحریری زبان کی اصلاح کر رہی ہے" تو پھر تحدا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مضمون نگار نے جس اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہے اس کے لحاظ سے اب "اختلاف" کو "پھوٹ" "انتخاب" کو "چناؤ" "اضطراب" کو "گھبراہٹ" "روح" کو "آتما" "محبت" کو "پریم" لکھا اور بولا کریں گے' اور اس طرح عربی اور فارسی کے وہ تمام الفاظ جو اردو کا ناقابلِ انفکاک عنصر اور گرانقدر سرمایہ بنے ہوئے ہیں' اردو سے خارج کر دئے جائیں گے۔

انتہا یہ ہے کہ مضمون نگار صاحب "افسانوں" کو بھی نکال دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔ فریاد۔۔۔!

اردو کے دشمنوں اور آریائی تہذیب کے زندہ کرنے والوں نے جو اسکیم سوچی تھی کہ "اردو چونکہ قرآن پاک سے ہندوستانیوں کو قریب کرتی ہے' اس لئے اس زبان کو برباد کر دینا چاہئیے"۔ اس کو حیدرآباد میں پورا کیا جا رہا ہے۔ اس ذہنی مرعوبیت کی آخر کوئی انتہا ہے!

خدا کے لئے اس فتنہ کو رد کیجئے' اور اگر آپ کے ادارہ سے غلطی ہوگئی ہے' یا اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو اس کو بدل دیجئے یہ نہ ہو کہ "غلطی" پر اصرار کر کے' بہت سی غلطیاں جمع ہو جائیں یقین ہے کہ آپ میری گزارش پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ بہرحال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا' اب آپ کی باری ہے! امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے

مخلص

ماہر القادری

(۲)

اپریل سنہ ٦٠ء کے "سب رس" میں محترم ضیاالدین کی ایک مختصر تنقید شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے اصلاح زبان اردو کے سلسلہ میں بعض رائج الفاظ اور ترکیبوں وغیرہ کو ناقابل استعمال قرار دے کر ان کی بجائے بعض دوسرے الفاظ وغیرہ کو استعمال کرنے کی سفارش کی ہے۔ محترم موصوف کی تنقید سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں عربی و فارسی الفاظ اور ترکیبوں سے کچھ چڑ سی ہے لیکن پُر لطف بات یہ ہے کہ خود انھوں نے اپنی تنقید سے بیشتر جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس میں کثرت سے عربی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کو استعمال کیا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتے تو شاید ان کی تحریر میں کچھ جدت پیدا ہو جاتی۔

میرے نزدیک اصلاح کے یہ معنی نہیں کہ وہ ترکیبیں اور الفاظ وغیرہ جن کو ہم آسانی سے ادا کر سکتے ہیں ان کو بھی محض اس لئے ترک کر دیا جائے کہ وہ عربی و فارسی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ گفتگو اور تحریر کے لئے وہی الفاظ سب سے زیادہ موزوں ہیں جن کے لکھنے اور ادا کرنے میں سہولت ہو۔ زبانوں کے رائج شدہ الفاظ اور ان کا اختلاف اسی بات کا پتہ دیتے ہیں کہ بولنے والوں نے ہمیشہ اپنی تحریر و تقریر کی سہولت کو پیش نظر رکھا ہے۔

بھلا بتلائیے کہ آسانی کار، مجلس ادارت، فلاح و بہبود، شعبۂ زبان اردو، اہل ملک، جدید، ہر ماہ وغیرہ میں ایسی کونسی برائی ہے جس کی وجہ سے محترم ضیاء الدین نے ان کی بجائے دوسرے الفاظ کے استعمال کی سفارش کی ہے۔ اب ذرا خود محترم کی تحریر کو ملاحظہ فرمائیے کہ محترم نے فارسی ترکیبوں اور عربی الفاظ سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

محترم نے اپنی تنقید کی تمہید میں فارسی ترکیبوں اور الفاظ کی خوب بھرمار کی ہے۔ ذیل میں مثال کے طور پر بعض چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

فارسی ترکیبیں:- شعبۂ زبان۔ اہل قلم (محترم نقاد اہل ملک کو ناقابل استعمال قرار دیتے ہیں لیکن اہل قلم ان کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے) زیر تنقید۔ صاحب مضمون۔ نقطۂ نظر۔

عربی الفاظ:- ادارہ ادبیات۔ اصلاح۔ شعبہ مجلس جلسہ۔ طے۔ تحریر۔ رائج۔ طرف۔ توجہ۔ مقصد۔ تجویز۔ توضیح تمثیل۔ تنقید۔ مضمون۔ شائع۔ عام۔ قلم۔ اہل۔

یہ عربی الفاظ صرف ایک کالم کی سات سطروں سے لئے گئے ہیں۔ کیا ان کو زبان اردو سے خارج کرنے کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ عربی ہیں؟ اور ایک غلطی محترم نے یہ کی کہ شمارہ کو عربی لفظ شمار کر لیا۔ محترم نے زیادہ توجہ سے کام نہیں لیا۔

میرا مقصد کسی کی خامیاں ظاہر کرنے سے سوائے اصلاح کن جراحی کے اور کچھ نہیں۔

شمارہ فارسی لفظ ہے اور نمبر کی بہ نسبت زیادہ فصیح ہے۔ رہا نمبر کا پہلے سے رائج ہونا تو یہ اس کی فصاحت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہزارہا انگریزی الفاظ پہلے سے مستعمل رہے ہیں لیکن موزوں الفاظ ملنے کے بعد وہ ترک کر دیے گئے مثلاً یونین بجائے بزم اتحاد۔ یونیورسٹی بجائے جامعہ۔ ایڈیٹر بجائے مدیر وغیرہ۔

عبدالقدوس

اُردو زبان اور تفسیر قرآن کے نام سے ایک اہم کتاب کی تالیف ہو رہی ہے جس میں ان تمام مصنفین و مولفین کا ذکر ہوگا جنھوں نے اردو زبان میں قرآن عزیز کی کوئی خدمت انجام دی ہے۔ پس اس امر کا اعلان کیا جاتا ہے کہ جن حضرات نے اردو میں قرآن عزیز کی کوئی مستقل تفسیر لکھی ہے یا کسی دوسری زبان کی تفسیر کا ترجمہ کیا ہے یا کسی تفسیری موضوع پر کوئی ضخیم کتاب لکھی ہے۔ وہ اپنا مختصر سا تذکرہ اپنی کتاب کے ہمراہ روانہ فرمائیں تاکہ درج کرنے کا موقع ملے۔ امید کی جاتی ہے کہ ارباب علم و ادب توجہ فرمائیں گے۔

سید صبغۃ اللہ بختیاری

(دارالسلام۔ عمرآباد شمالی ارکاٹ مدراس)

دفتری معلومات

از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس صفحات (۵۶) قیمت ۶ر

یہ ایک مفید کتاب ہے جس کے پہلے باب میں دفاتر کے عام طریق کار۔ دوسرے میں حسابی معلومات۔ تیسرے میں ملازمت سرکار عالی کے متعلق احکام و ضوابط سلیس زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں۔

ہر ملازم و غیر ملازم سرکار کو ان باتوں سے واقف ہونا چاہیے۔

نگارستان چغتائی

"مصور مشرق خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی بہت بڑے حسن کار اور زندہ جاوید مصور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب بھی ہیں۔ آپ ابتدا ہی سے "سب رس" کے معاون ہیں۔ چنانچہ سب رس کا سرورق آپ ہی کے موئے قلم کا نتیجہ ہے اور آپ نے ایک اور دیدہ زیب سرورق روانہ فرمایا ہے جو آپ کے مخصوص اعلیٰ تخیل کا شاہکار ہے۔ آپ کی رنگین تصویریں بھی سب رس میں چھپ چکی ہیں اور فن مصوری سے متعلق مضمون بھی۔

آپنے بکمال مہربانی اپنے ادبی نگارستان کے چند ورق روانہ فرمائے ہیں جو سب رس کے شماروں کی زینت کا باعث ہوں گے اس نگارستان چغتائی کا ایک صفحہ اس شمارے میں پیش کیا جاتا ہے۔"

ادارہ

شاہ کار

تمام کائنات تکمیل پاچکی تھی۔

خالق اپنی تخلیق میں سے ایک شاہکار کا انتخاب کرنا چاہتا تھا۔

سب کائنات اُس کے سامنے تھی۔

پر وہ کوئی انتخاب نہ کر سکا۔

خالق نے کہا میرا نمائندہ میری نمائندگی کرے گا۔

شاہ کار کا انتخاب آدم کے سپرد کردیا گیا۔

آدم کی اس سرافرازی پر فرشتے سجدہ بجالائے۔

ساری کائنات پر ایک روشنی پھیلتی اور سمٹتی دکھائی دی۔

خالق کا فرستادہ اپنی نمائندگی کا حق ادا کرنے میں آج تک مصروف ہے

پر باوجود اپنی ان تھک کوشش کے وہ اپنے خالق کی تخلیق میں سے کوئی شاہ کار انتخاب نہ کرسکا

چغتائی

پیشۂ وکالت

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں پیشۂ وکالت پر کچھ مختصر سی تقریر کروں۔ ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی اس پُر اصرار فرمائش کو میں نے قبول تو کر لیا ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا میری تقریر پورے پندرہ منٹ میں ختم ہو سکے گی یا نہیں لیکن بہرحال سولھویں منٹ پر میری تقریر مکمل ہو یا نہ ہو ختم ضرور ہو جائے گی اس لئے میں کوشش کروں گا کہ میں نامکمل طویل تقریر کے بجائے مختصر سی مکمل تقریر کر سکوں اور یہ تقریر کیا ہو گی چند اشارات ہوں گے جو پیشۂ وکالت کے سراپا پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے ورنہ اس پیشہ پر پوری گفتگو کے لئے وقت کافی نہیں ہے۔

ہر انسانی سوسائٹی اپنے بقا، قیام و استحکام کے لئے افراد کے باہمی تعاون کی محتاج ہے سوسائٹی کے تمدن اور معاشرتی ضروریات کی وسعت اور پھیلاؤ کے مطابق تعاون و تعاون کے ذرائع و طریقے، شعبہ و مدات بھی بڑھتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ جب سوسائٹی کے افراد کا باہمی تعاون اپنے مختلف شعبوں اور ذرائع کے تعلق سے ایک مستقل سلسلۂ عمل بن جاتا ہے تو سوسائٹی کے افراد میں ایک طرف تو ایسے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں جو باہمی تعاون کی خاص خاص شاخوں کو اپنے ذمہ لے لیتے ہیں اس طرح تعاون کی ہر شاخ ایک مستقل پیشہ بنتی جاتی ہے اور دوسری طرف اس مسلسل اور مستقل عمل کے تعلق سے حقوق و فرائض کے تصورات پیدا ہوتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ سوسائٹی کا قانون یا قانون کے ماخذ بن جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے تمدن اور معاشرت کا پورا شیرازہ انہی پیشوں اور ان کے باہمی تعلقات سے بنتا ہے۔ پیشوں کے یہ مختلف شعبے جتنے باہم مربوط اور مستحکم ہوں گے اتنی ہی وہ سوسائٹی قوی اور اعلیٰ ترین ہو گی گویا پیشے ہی سوسائٹی کے وجود، بقا، قیام و استحکام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کا ہر شعبہ اپنی اپنی جگہ پر انسانی جسم کے اعضاء کے مشابہ ہے۔ جس طرح اعضاء کا نقص یا کمزوری کم و بیش پورے جسم یا مجموعی ہیئت انسانی کو بدنما کر دیتی ہے اسی طرح سوسائٹی کے پیشوں میں سے کسی پیشہ کی کمزوری پوری سوسائٹی پر اثر ڈالتی ہے۔

وکالت کا پیشہ سوسائٹی کے حقوق و فرائض کی نگہداشت سے تعلق رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ حقوق اور فرائض کی نگہداشت سوسائٹی کے وجود اور بقا کے لئے نہایت ہی اہم اور ضروری ہے اس لئے جو گروہ اس شاخ تعاون سے تعلق رکھتا ہے وہ خود بخود سوسائٹی میں ایک اہم اور اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔ سوسائٹی اپنے حقوق و فرائض کا نفاذ ایسے گروہ کے ذریعہ سے کرتی ہے جس کو قوت دی جاتی ہے یا حاصل ہوتی ہے اور یہ شعبہ حکومت کہلاتا ہے اس شعبہ کے ساتھ تعاون کرنے والا اور حقوق و فرائض کے نفاذ یعنی انصاف کرنے میں مدد دینے والا گروہ وکلاء کا ہے۔

اس بیان سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ پیشۂ وکالت بحیثیت پیشہ کے ملک کا سب سے اہم ضروری اور اعلیٰ ترین پیشہ ہے لیکن وہ سوسائٹی کے تمدن اور معاشرت کی رفعت، عظمت و وسعت کے لحاظ سے ہر سوسائٹی میں عزت کا مختلف معیار رکھتا ہے یعنی ہر سوسائٹی کے تمدن و معاشرت کی مناسبت سے اعلیٰ و ارفع یا کمزور و پست ہو سکتا ہے اسی لئے ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی ریاستوں کے پیشۂ وکالت کو یورپ یا انگلستان کے پیشۂ وکالت سے سوائے اسمی مشابہت کے کوئی واقعی و حقیقی مشابہت بہت ہی کم ہے۔ چونکہ زمانۂ موجودہ میں ہمارا کوئی خاص و مختص تمدن نہیں ہے ہم ایک ایسے تمدن کی پیروی کر رہے ہیں جو نہ کبھی ہمارا تھا اور نہ ابھی ہمارا ہوا ہے اس لئے گویا ہم

ایک نقلی اور بے جان تمدن کے تعلق سے اپنی سوسائٹی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ پیشۂ وکالت ہو یا کوئی اور پیشہ اصلی متمدن اقوام کے پیشوں سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو ایک نقل کو اصل سے ہوتی ہے۔

بہت قدیم تمدنوں میں بھی جیسے کہ یونان اور روم کے تمدن تھے یا جیسے کہ ہندوستان کا تمدن تھا وکالت کے کچھ علامات و نشانات تو ملتے ہیں مگر پیشۂ وکالت کی وہ عظمت وہ وقار اور وہ اہمیت اس زمانہ کے تمدن میں نظر نہیں آتی جو موجودہ تمدن میں پیدا ہو گئی ہے اس لئے کہ قدیم تمدن میں اس کی گنجائش بہت کم تھی۔

فقۂ اسلام میں بھی وکیل اور وکالت کا ذکر آیا ہے لیکن کسی زرخیز اور زرکش پیشہ کی شکل میں اس کا وجود اسلام میں ایسا نمایاں نہ تھا جیسا کہ اس زمانہ میں ہے۔ موجودہ تمدن کی وسعت نے ایک طرف تو پیشوں میں وسعت اور کاروبار میں مصروفیت اور دوسری طرف حقوق و فرائض میں اس قدر پیچیدگی اور پھیلاؤ پیدا کر دیا ہے کہ ان پر ہر شخص اپنی مصروفیتوں کے ساتھ قابو نہیں پا سکتا ہے اس لئے حقوق و فرائض کی نگہداشت و حکومت سے استمداد کے لئے پیشۂ وکالت کی موجودہ مستقل شکل ناگزیر طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ یہ پیشہ ایک کامیاب پیشہ ور کے لئے جس قدر منفعت بخش اور عزت و وقار کا باعث ہے اسی قدر مشکل ترین سخت محنت طلب اور صبر آزما بھی ہے۔ محنت، صبر و تحمل، راستبازی، خوش اخلاقی، خوش بیانی، ذاتی وجاہت، ذہانت اور اچھی صحت ان سب کا یکجا ہو جانا مشکل ہے اور ایک شخص اچھا وکیل نہیں بن سکتا جب تک کہ کم و بیش یہ سب خوبیاں اس میں موجود نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت دوسرے پیشوں کے وکالت کا پیشہ اختیار کر لینا تو آسان ہے لیکن اس میں کامیاب ہونا مشکل ہے۔ سب سے بڑی مشکل جس سے اس پیشہ کے مبتدیوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے صبر آزمائی ہے جس کے لئے تجربہ کار و کامیاب وکلا نے کم سے کم پانچ سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال کا اندازہ لگایا ہے اور یہ مدت ہر شخص کے مخصوص حالات کے اعتبار سے کم اور زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایک وکیل کو صوفیاء کی اصطلاح کے مطابق توکل علی اللہ کے پورے مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وہ امتحانی دور ہے جب کہ وکیل کا کردار بنتا یا بگڑتا ہے اور اسی منزل میں بہت سے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور جو آگے نکل بھی جاتے ہیں تو ان میں سے اکثر وہ ہوتے ہیں جن کا کردار بگڑ چکا ہے وہ اس قابل نہیں رہتے کہ عام سطح سے اوپر جا سکیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں وکیل کو کم سے کم ممتنانہ پر سخت سے سخت مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے اور یہی وہ وقت ہے جب کہ اس کو موکلوں سے اور موکلوں کو اس سے ابتدائی سابقے پڑتے ہیں۔ وہ اپنی متاع ہنر پہلی دفعہ بازار عمل میں پیش کرتا ہے ایسے بازار میں جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ جنس موجود ہے اور اگر کسی وجہ سے وہ ناپسند آئی تو پھر ساری عمر اس کی قیمت نہیں لگتی۔

ایک طرف افکار دنیوی کا ہجوم، آمدنی کی قلت، اخراجات کی زیادتی، پوزیشن نبھانے کا خیال، بیوی بچوں کی فرمائشیں، قرض خواہوں کے تقاضے دوسری طرف دماغی مصروفیات، علمی مباحث، قانونی موشگافیاں، اوقات کی پابندی، موکلوں کی خوشنودی، مزاج کا خیال، دن دن بھر عدالتوں کی حاضری، رات رات بھر مقدمات کی تیاری یہ ایسے سخت رگڑے ہیں کہ یا تو قلعی کھل جاتی ہے یا جوہر اس طرح نمایاں ہو جاتے ہیں جس طرح کہ خاک آلودہ سونے کے منجھنے اور تپنے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ مصائب کے اس طوفان سے وہی بچ کر نکل سکتا ہے جس کی اللہ مدد کرے ورنہ ڈوب جانے کا خطرہ ہر آن لگا رہتا ہے اور اگر کہیں ڈوبنے سے بچ بھی گئے تو پھر کسی دوسرے کام کے قابل رہ جانا مشکل ہے۔

کام کے قابل نہ رہ سکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عموماً مبتدی اپنی مشکلات
سے مجبور ہو کر بُری عادتوں کے شکار ہو جاتے ہیں اور خدا داد
ذہانت خطرناک راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بُری
عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں اور اگر ابتدا میں مواخذہ سے بچ بھی
گئے تو آگے چل کر خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے کیونکہ اعلیٰ کردار کی قوت
جو گویا اس پیشہ کی ریڑھ کی ہڈی ہے اوٹ ہو جاتی ہے جس کے
نتیجہ میں موکل بد اعتقاد حاکم بدظن اور ہم پیشہ بے اعتناء ہو جاتے
ہیں اس لئے ناکامی یقینی ہے۔

یہ ابتدائی امتحانی دور کامیابی سے گزار لینے کے بعد
مبتدی اس قابل ہو جاتا ہے کہ صحیح معنی میں وکیل کہلا سکے ورنہ
جس نے کالی شیروانی اور سفید دستار پہن لی وکیل کہلانے لگا
خواہ وہ اس پیشہ کے ابجد ہی سے ناواقف ہو۔

پیشۂ وکالت کی انجام دہی میں تین سب سے بڑے
محاذ ہیں جن پر فتح پانے کے بعد کہیں کامیابی کی صورت نظر
آسکتی ہے۔

اوّل موکل کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ۔
دوسرے حکام کی عظمت و احترام کا کامل لحاظ اور
تیسرے ہم پیشہ افراد کے ساتھ خوش خلقی اور یگانگت کا خیال۔
عزت و وقار نفس کو قائم رکھ کر صبر و تحمل اور پوری اخلاقی و
دماغی قوتوں کو صرف کر کے تن دہی اور ایمان داری کے ساتھ
عمل کرنے سے ان تینوں دشوار گزار گھاٹیوں کو کامیابی کے ساتھ
عبور کرنے کی توفیق مل ہی جاتی ہے۔

ایک وکیل کی کامیابی یہ ہے کہ قابلیت، اہلیت اور
نیک نامی کی شہرت کے ساتھ وافر آمدنی پیدا کر سکے۔ بلا شبہ
مقدمات میں کامیابی بھی ابتدائی زمانہ وکالت میں ایک وکیل
کی قابلیت و اہلیت کا ذریعۂ شہرت ہو سکتی ہے لیکن صرف مقدمات
کی کامیابی فی نفسہ کسی وکیل کے لئے دلیل قابلیت و اہلیت
نہیں ہے۔ قابلیت و اہلیت کا اظہار وکیل کے طریقۂ کار سے
ہونا چاہیے اور قابلیت و اہلیت صرف بر محل ذہانت اور مقدمہ
میں محنت کے ساتھ مکمل تیاری سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ذہانت
اگرچہ بڑی حد تک ایک فطرتی عطیہ اور خدا داد وصف ہے لیکن
محنت اور غور و فکر کی عادت سے بھی ذہانت پیدا ہو سکتی ہے۔

پیشۂ وکالت میں کامیابی کے لئے محنت ہی سب سے
مقدم اور اہم چیز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیک کرداری
و نیک نامی اسی کو نصیب ہوتی ہے جسے ہار جیت اور جلب منفعت
سے قطع نظر محض اپنے فرائض کی ادائی میں لطف آتا ہو۔ ایک
وکیل کو مقدمہ کے واقعات کو اپنے اوپر اس طرح طاری کر لینا
چاہیے کہ گویا یہ ساری واردات خود اپنے اوپر گزر رہی ہے جب یہ
سمجھ لیا جائے تو پھر سمجھا دینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔
کوئی چیز سمجھائی نہیں جا سکتی جب تک کہ خود اس کو سمجھ نہ لیا گیا ہو
اور اگر وکیل الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف اور گفتگو کے صحیح طریق
سے بھی آشنا ہے تو پھر کسی چیز کی محتاجی نہیں رہتی۔ کوئی اُسے جادو بیان
کہتا ہے تو کوئی داستان گو گر وہ کسی خطاب یا عتاب کی پرواہ
نہیں کرتا وہ ایک مجاہد ہوتا ہے جو جیتے تو غازی اور ہارے تو
شہید! چھوٹے اس کی ریس کرتے ہیں، بڑے اس کی عزت اور
برابر والے اس کا لوہا مانتے ہیں۔

کتنا لطف آتا ہوگا اس شخص کو جو ایک حق بات دوسروں تک
پہنچاتا ہے محض اس لئے کہ ایک مظلوم کی دادرسی ہو یا ایک حق دار
کو اپنا حق مل جائے۔ ہر اچھے وکیل کی یہی خواہش اور یہی عمل ہونا
چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی رہنا چاہیے کہ دور شوق
میں جھونک کر اس طرح آگے نہ نکل جائے جو زلت قدم کا باعث ہو جائے۔
کامیابی کی دُھن میں بعض اوقات وکلا اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دینے

لگتے ہیں اور اس لئے وکالت کے صحیح مسلک سے ہٹ جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ (نادانستہ ہی سہی) لیکن یقینی طور پر بدکرداری کو شیوۂ وکالت سمجھ لیتے ہیں اور بالآخر :-

"چو از قومی یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را"

کے اصول کے مطابق بعض کی بدکرداری پورے پیشہ کی بدنامی کا باعث ہوجاتی ہے۔ اس زمانے میں جھوٹ کو اتنا فروغ حاصل ہوگیا ہے کہ کم و بیش ہر پیشہ میں بدنام کنندگان نکونامے چند موجود ہیں لیکن عوام کے ذہن میں پیشۂ وکالت نے گویا پورے جھوٹ کی مناپلی حاصل کر رکھی ہے اور یہ خیال اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ بعض نہایت ہی محتاط اور مذہبی خیال کے مبتدی یا امیدواران پیشۂ وکالت بھی اس خیال کی صحت سے کم از کم انکار کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ چونکہ پیشۂ وکالت میں داخلہ کے لئے کوئی معیار شرافت و اخلاق کا نہ تو مقرر ہے نہ مقرر کیا جا سکتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کے وجود سے جو شرافت و اخلاق سے پہلے ہی سے مبرا ہیں پیشہ کی بدنامی باعث تعجب باقی نہیں رہتی ہے ورنہ فی نفسہٖ پیشہ میں اس کے لئے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ وکیل کا کام صرف یہ ہے کہ واقعات کے متعلق موکل کی ہدایت اور مہیا کردہ ثبوت پر قانون کو متعلق کرکے اپنے موکل کے لئے انصاف حاصل کرے۔ واقعات کا بنانا بگاڑنا نہ تو وکیل کا کام ہے نہ اس کی ضرورت لیکن جو کوئی شخص مذہب اور اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو اس کو کوئی پیشہ کسی بدکرداری سے روک نہیں سکتا ہے اس لئے ایسے پیشہ میں جس میں دوسروں کے نام سے یا دوسروں کے لئے کام انجام دیا جاتا ہے ایسے بدکردار اشخاص کے داخل ہونے کے لئے بہت کافی گنجایش نکل آتی ہے جو دوسروں کے لئے جرم اور گناہ کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے ہیں پس پیشہ بحیثیت پیشہ کے جھوٹ کو فروغ دینے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ بعض ناعاقبت اندیش پیشہ وروں کا ذاتی عمل پیشہ کی خفت و ذلت کا باعث ہوجاتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں نہایت تامل اور افسوس ہوتا ہے کہ جہاں کہیں پیشۂ وکالت اس بدشہرت کو برداشت کر رہا ہے ہاں یہ سمجھنا چاہیئے کہ خود سوسائٹی بھی ناپاک ہو رہی ہے جس نے ایسا ثمر پیدا کیا اس لئے کہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں جملہ پیشے فی نفسہٖ سوسائٹی کی بنیاد اور اس کے اجزا ہیں گویا ایک درخت ہے جس کے ثمر اس کے پیشے ہیں اور ہر درخت اپنے پھلوں ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ نہایت مختصر اور دھندلا سا خاکہ پیشۂ وکالت کا ہے جو اس نہایت تنگ وقت میں میں آپ کے سامنے پیش کر سکا ہوں جس سے پیشہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ایک پیشہ خواہ کتنا ہی پاک و صاف و پر عظمت و قابل قدر ہو لیکن پیشہ وروں کا ہجوم آب حیات کو بھی اس طرح میلا اور گدلا کر دیتا ہے جس طرح کمبھ کے میلے میں جاتریوں کی کثرت تربینی کے مقدس صاف اور شفاف پانی کو وقتیہ طور پر قابل کراہت بنا دیتی ہے۔ مگر کیا اس سے اس مقدس پانی کی تقدیس میں کوئی کمی آجاتی ہے؟

وقت ہوتا تو میں اس پیشہ کے خد و خال کو نمایاں کرکے اس کی ہمہ گیر افادیت پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرتا لیکن وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختصر طور پر شاید کہہ دینا کافی ہوگا کہ ایک وکیل قوم کا مقتدر رونمائندہ رسالہ فرد اور سب سے اچھا شہری سب سے بہتر سیاس قوم و ملک کا بے جگر فداکار اور کامیاب ترین انسان بنانے میں دنیا کا کوئی دوسرا پیشہ پیشۂ وکالت کی رہبر ہو سکتا ہے مختصر یہ کہ انسان کو انسان اور مفید ترین

ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے اس پیشہ نے کس قسم کے اشخاص کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے تیار کیا ہے اس کی تمثیل کے لئے آپ

امریکہ کے شہرۂ آفاق پرسیڈنٹ لنکن۔

جمہوریہ فرانس کے سابق پرسیڈنٹ ایم۔ پوئنکار۔

انگلستان کے سابق وزیراعظم مسٹر اسکوئیتھ (بعد ازاں لارڈ آکسفورڈ)

ہندوستان کے سابق وائسرائے لارڈ ریڈنگ۔

سابق صدراعظم باب حکومت سرکارعالی ۔ سر علی امام

سر تیج بہادر سپرو
سر این۔ این سرکار } سابق لا ممبران گورنمنٹ آف انڈیا

چودھری سر محمد ظفراللہ خاں حالیہ لا ممبر

سر سی۔ پی۔ راماسوامی ایر دیوان ٹراونکور

مسٹر راج گوپال چاری وزیراعظم مدراس

سی۔ آر داس
پنڈت موتی لال نہرو } آنجہانی

اور

سب سے آخر میں ہندوستان کے لیڈروں میں سے سب سے زیادہ مفید ترین وجود مہاتما گاندھی پر نظر ڈال سکتے ہیں۔

اکبر یار جنگ

(حیدرآباد ریڈیو سے نشر کیا گیا)

شاعر ......!!

چوم آتی ہے قدم عرش کے پرواز مری
گونجتی ہے چمن خلد میں آواز مری

کس نے بلبل کو سکھائے یہ فغاں کے انداز
فاش کس نے کئے خاموشیٔ گل کے سب راز

زلف لیلیٰ ہے مرے دم سے پریشاں اب بھی
نجد میں قیس کا ہے چاک گریباں اب بھی

ہیں نفس میں مرے فرہاد کی آہیں محفوظ
اور تخیل میں ہیں شیریں کی ادائیں محفوظ

مری رنگین بیانی ہی کا ہے یہ اعجاز
آج تک دہر میں زندہ ہیں جو محمود و ایاز

مرے رنگین ترانوں سے فضائیں رنگین
دم سے روشن ہے مرے شاہد قدرت کی جبیں

کسی رنگین تخیل میں جو کھو جاتا ہوں
کیف حوروں کی نگاہوں سے چرا لاتا ہوں

حسن اور عشق کے نغمے جو کبھی گاتا ہوں
رنگ و بو بن کے دو عالم میں بکھر جاتا ہوں

اختر ۱۱۰۱۱۰ آہ

گُل بُوٹے

دہلی کے ایک فلسفی بیان کرتے ہیں کہ ایک "وفادار شوہر پرست" بیوی نے شوہر کی وصیت کو حرف بہ حرف پورا کرنے کا "ریکارڈ" توڑ دیا! اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ موصوف ایک رات اپنی آدھی رات کی تفریح کے سلسلہ میں کسی قبرستان میں سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک تازہ بنی ہوئی مزار پر بہت سے پھول بکھرے پڑے ہیں، سرہانے بجلی کی قندیل روشن ہے اور اس کے پہلو میں ایک سفید پوش نازنین بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔

فلسفی کو بڑا تعجب ہوا کہ اس "دورِ نو" دنیا میں بھی بعض ایسی وفا شعار بیویاں موجود ہیں جو اپنے چاہنے والوں کے مزاروں آدھی رات کے وقت پنکھا جھلا کرتی ہیں اور گرمیوں کی گرم راتوں میں لحد کے اندر اپنے خیال میں ٹھنڈی ہوا پہنچا کر انھیں محو خواب رکھتی ہیں۔ ہمارے فلسفی کی فلسفیانہ ذہنیت نے دریافت حال پر مجبور کیا، نازنین کے قریب جاکر آپ نے پوچھا۔

"محترمہ! کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ اس مزار میں کون خوش نصیب محو خواب ہے اور آپ کے پنکھا جھلنے کا باعث کیا ہے"؟ نازنین نے ایک نگاہ غلط انداز آپ پر ڈالی اور پھر اسی سرگرمی سے اپنے کام میں مشغول ہوگئی! مگر ہمارے فلسفی نے تو سبب دریافت کئے بغیر واپس ہونے کی قسم کھالی تھی!!! ہاتھ بڑھا کر پنکھا تھام لیا! آپ کی اس حرکت پر نازنیں آگ بگولہ ہوکر آنکھوں سے آگ برسانے لگی، ایک جھٹکے سے پنکھا کھینچ لیا اور پھر جھلنے میں مصروف ہوگئی!!

اب تو فلاسفر صاحب اپنا سارا فلسفہ بھول گئے اور لگے نازنین کی خوشامد کرنے کہ خدا کے لئے پنکھا جھلنے کا سبب بتائیے!

نازنین نے صرف آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا، فلسفی نے جو اس طرف نظر ڈالی تو دیکھا کہ ایک بوڑھیا پان کی تھیلی کھولے پان پر پان لگائے جارہی ہے، اس کے پاس جاکر آپ نے سوال کیا۔

"نانی اماں! کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ وہ خاتون اس آدھی رات کے سمے مزار پر پنکھا کیوں جھل رہی ہیں؟ نانی اماں نے ایک آہ بھر کر کہا" بیٹا کیا بیان کروں، صدمہ سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، اس لڑکی کا بیاہ ہوکر کچھ کم برس ہوتا ہے، میاں بی بی میں بڑی محبت تھی، اس کا میاں کیا کڑیل بانکا جوان تھا موذی پلیگ دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کرگیا! تین دن کے بخار میں اللہ کو پیارا ہوگیا!! مرتے وقت اپنی چاہنے والی بی بی کی خدمت اور اس کی جوانی کا خیال کرکے اس نے وصیت کی کہ جب تک قبر کی مٹی گیلی رہے دوسرا بیاہ نہ کرنا! اس لڑکی کے رشتہ کا ایک بھائی آج ہی ولایت سے پاس ہوکر آیا ہے اور کل ملازمت کے سلسلہ میں کہیں دور جارہا ہے، اس نے اپنی بہن کی جوانی پر ترس کھاکر اپنی جوانی کی قسمیں دے کر اس کو اپنے ساتھ نکاح کرنے پر راضی کرلیا ہے مگر ابھی قبر کی مٹی گیلی ہے! لڑکی نے ٹھان لیا ہے کہ ساری رات پنکھا جھل کر صبح تک قبر کو سکھا دے، بڑی نیک بخت لڑکی ہے! وہ اپنے چاہنے والے شوہر کی وصیت بھی پوری کرنا چاہتی ہے اور ساتھ ہی اپنے بھائی کی درخواست بھی نامنظور کرنا نہیں چاہتی اللہ چاہا تو ان دونوں کا کل بیاہ ہوجائے گا"!!

ایک بزرگوار حسب عادت شام کی تفریح کے لئے باہر جانے کو تھے کہ آپ کی بیگم نے آپ کو ایک خط دے کر کہا کہ اسٹامپ لگاکر ڈاک میں ڈال دیں، اتفاق سے اس وقت آپ کے پاس ایک بھی اسٹامپ نہ تھا اور ڈاک خانہ بند ہوچکا تھا، بڑی سوچ بچار کے بعد آپ کے "ذہن رسا" میں آخر ایک تدبیر آہی گئی

اور آپ چہل قدمی کے لئے نکل پڑے! جب پوسٹ بکس کے پاس پہنچے شام ہو چکی تھی ادہر ادہر دیکھا کوئی "رہرو" قریب نظر نہ آیا، آپ نے جیب کے سے خط ڈبے میں جھونک دیا اور مسکراتے ہوئے گھر لوٹے۔

آپ کی ہر وقت کی "بھول" کا خیال کر کے بیگم نے پوچھا "خط ڈالا یا نہیں"؟

آپ نے بڑی متانت سے جواب دیا "ہر چند تلاش کی۔ مگر اتفاق دیکھو ایک اسٹامپ بھی قلمدان میں نہ نکلا! بفضلہ تعالیٰ زندگی کی اکثر ضرورتیں یوں ہی فراہم ہو جاتی ہیں، مگر بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو خواہ مخواہ خریدنا ہی پڑتا ہے، ان ہی میں کمبخت یہ ڈاک کے اسٹامپ بھی ہیں! خیر میں نے بڑی ترکیب سے تمھارا خط ڈاک میں ڈالا ہے"!!

بیگم نے تعجب سے پوچھا "خط ترکیب سے کس طرح ڈاک میں ڈالا جاتا ہے"؟

ارشاد ہوا "تم بڑی احمق ہو! میری کوئی بات نہ تمھاری سمجھ میں آتی ہے اور نہ تم کبھی قابلیت کی قائل ہوتی ہو!! سنو! خط ڈبے میں ڈالتے وقت میں نے ترکیب یہ کی کہ پہلے ہر طرف اچھی طرح دیکھ لیا کہ کوئی مجھ کو بغیر اسٹامپ لگائے خط ڈالتے ہوئے تو نہیں دیکھ رہا ہے!! جب اطمینان ہو گیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے جھٹ سے خط صندوق میں ڈال دیا!!! اس کو تم میری "ہوشیاری" نہ کہو گی تو کیا "بے وقوفی" "سمجھو گی"؟

"باغبان"

تاثرات

جاں بہ ہوائے لامکاں، جسم بہ عرصۂ حیات
میری یہی ہے زندگی، میری یہی ہے کائنات

واقفِ سوز و درد ہوں، ساز ہے میری زندگی
میرے ہی دم قدم سے ہے، کارگہِ تنوعات

شورشِ آب و گِل پہ تو، سمجھا مدارِ زندگی
محرمِ راز کے لئے، مرگ ہے زینۂ حیات

کم نگہی نے کر دیا، تجھ کو اسیرِ رنگ و بُو
ایسی حقیر تو نہ تھی، تیری متاعِ واردات

حرّیت سکوں نواز! تیرے نصیب میں کہاں
قلب اگر ٹھہر گیا، بند ہوئی رہِ نجات

واقفِ کفر و شرک ہے، پر نہ کھُلا یہ تجھ پہ راز
کس کے رہینِ حکم ہیں، میرے دلی تاثرات

اپنے مقام پر اگر، تیرا گزر ہو نکتہ چیں!
صبح تری ہو روزِ عید، شام تری شبِ برات

بشیر النساء بیگم بشیر

?

میرے دوست نے انتہائی جوش کے عالم میں کہا۔

"جلا ڈالو اپنا سارا کلام فنا کر دو اپنی ساری فرسودہ نظمیں آگ لگا دو ان ساری بیاضوں کو جو تم نے بڑی محنت سے مرتب کی ہیں اور عہد کر لو کہ آئندہ سے کوئی شعر نہ لکھو گے ہاں وعدہ کرو کہ ایک مصرع بھی نہ کہو گے۔ مہمل ہے یہ سب کلام۔ فضول ہے ہماری ساری شاعری۔ بالکل لغو، بالکل واہیات بلکہ اتنا ہی کافی نہیں، یہ سارے دواوین، یہ سب کلیاتیں، یہ لمبی لمبی مثنویاں یہ بڑے بڑے قصائد، یہ عجیب و غریب مراثی جن کو تم اب تک پڑھتے رہے ہو پھونک دو ان سب کو۔ ان میں سے ایک بھی چیز اس قابل نہیں کہ دنیا میں باقی رہے۔ کاش منظومات کے یہ بیہودہ دفاتر دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتے یا پیدا ہوتے ہی فنا ہو جاتے، کیڑوں کی طرح، برساتی کیڑوں کی طرح۔ کیونکہ ان کی اہمیت کیڑوں، برساتی کیڑوں سے ذرا بھی زیادہ نہیں۔"

میں نے کہا خیر تو ہے۔ یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں!

انھوں نے چیخ کر جواب دیا:۔

"میں نے دیکھ لیا ہے ہاں میں نے دیکھ لیا ہے۔ اصلی شاعری کو، شاعری کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ لیا ہے۔ میری آنکھوں پر سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ میری دنیا بدل گئی ہے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ میں پھنکا جا رہا ہوں۔ میں جلا جا رہا ہوں مجھے اب معلوم ہو گیا ہے کہ شاعری کہتے کسے ہیں۔ شاعری وہ نہیں ہے جو تمھارے پاس کے موٹے موٹے دیوانوں، گلدستوں اور زریں انتخابوں میں نظر آتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ لاکھ بار نہیں۔ وہ شاعری اس لئے کی گئی ہے کہ شاعری کا جمال جہاں آرا کسی کے نظر نہ آسکے۔ اصلی شاعری پر ایک موٹا پردا پڑا رہے اور انسان دھوکے میں ہمیشہ دھوکے میں رہے۔ میں کہتا ہوں پھونک دو اس شاعری کے کثیف پردے کو۔ جلا دو اس لعنتی بے معنی دفتر کو جس کو شیطان نے صدیوں سے اپنے ذلیل مقاصد کا آلہ بنا رکھا ہے۔ غور تو کرو یہ بادۂ گلرنگ، یہ ساقیٔ مہوش، یہ رقیبِ روسیاہ کتنی لغو باتیں ہیں۔ یہ حسنِ مجازی، یہ عشقِ حقیقی، یہ دار و رسن، یہ طور و کلیم کیسی عظیم حماقتیں ہیں۔ یہ سب باتیں شیطان کا دھوکہ ہیں بہت بڑا دھوکہ۔ ہمارے سب شاعر انھیں دھوکوں میں مبتلا رہے ہیں اور ان سب بدبختوں نے لاکھوں انسانوں کو اپنی طرح دھوکے میں رکھا ہے۔ شاعری دل کی چیخ، دل کی پکار ہے نہ کہ گل و بلبل کی حکایت، ہجر و وصل کی داستان ——— میں اب ان دھوکوں میں نہیں آسکتا۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ شاعری کو اس کے اصلی روپ میں اور میری آنکھیں کھل چکی ہیں ہمیشہ کے لئے ———" میں ششدر رہ گیا۔ اڑتے اڑتے عرض کیا۔

"آخر آپ نے کہاں تک دیکھا ہے؟ کس طرح دیکھا ہے؟ کچھ تو ارشاد ہو" فرمانے لگے:۔

"جی ہاں میں نے دیکھ لیا ہے یقیناً دیکھ لیا ہے ——— اس شاعر کے کلام میں جو دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا شاعر ہے وہ جو تخریب کا علمبردار اور انقلاب کی تلوار ہے، وہ جو مادرِ گیتی کا سینہ چاک کرنا چاہتا ہے، وہ جو دنیا کو تباہ کر کے سکونِ دل حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ جو تہذیب و تمدن کا دشمنِ جانی اور کسان اور مزدور کا محبِ صادق ہے، وہ جو دولت مندوں کی کھال کھینچ کر مفلسوں اور بے نواؤں کو پہنانا چاہتا ہے، وہ جو سرمایہ داروں کے لئے عزرائیل کا قائم مقام ہے، وہ جس کی زبان پر انقلاب کا نعرہ اور جس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے، وہ جس کا ایک ایک لفظ کوہ آتش نشاں اور جس کی ایک ایک سطر برقِ تپاں ہے، وہ جو اپنے بے باک تخیل سے دنیا کو بدل سکتا ہے زمین کو آسمان بنا سکتا ہے ذروں کو پہاڑوں سے اور قطروں کو سمندروں سے ٹکرا سکتا ہے۔ اس کے قلم میں وہ طاقت ہے جو کسی آندھی کسی بھونچال کسی طوفان میں بھی نہیں۔ وہ زمانے کا نجات دہندہ، حق کا پھریرا اڑانے والا تہذیب و تمدن کی لعنتوں سے دنیا کو پاک کرنے والا شاعر

نذرالاسلام ہے جس کے نام ہی سے کائنات لرزہ براندام ہو جاتی ہے"

میں نے سراپا علامت استفہام بن کر کہا "نذرالاسلام! کیا وہ اتنا بڑا شاعر ہے؟

دوست نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور کہا:۔

"ہاں ہاں وہ اتنا بڑا شاعر ہے۔ اور بڑا کیا معنی دنیا میں وہی تو ایک شاعر ہے ـــ سب سے پہلا اور سب سے بڑا۔ اگر یقین نہ آئے تو یہ لو اس کے کلام کا مجموعہ دیکھ لو۔"

میں نے کتاب ہاتھ میں لی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اوراق الٹنے لگا ـــ میں پڑھتا گیا۔

باغی، اندھا دیوتا، ستارۂ تخریب، مزدور، نعرۂ انقلاب۔

میری آنکھوں پر سے بھی پردہ ہٹنے لگا، میرا خون کھولنے لگا، مجھے ایک نئی دنیا نظر آنے لگی میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "نذرالاسلام میں تیرے ساتھ ہوں، مجھے جہاں چاہے لے چل"

میں نے دیکھا سیاہ بادل میں ایک عظیم کڑک ہوئی ایک ہولناک بجلی چمکی اور نذرالاسلام کی چیخ سنائی دی "ادھر آ۔ اے بزدل ادھر آ۔ میں تجھے جوانمرد بناؤں گا۔ تجھے دکھاؤں گا کہ میں مادر گیتی کا سینہ کس طرح چاک کرتا ہوں"

میں نے دیکھا کہ میں نذرالاسلام کے ساتھ بجلی کے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا ہوں ـــ تیزی سے بہت تیزی سے۔

نیچے کوہِ آتش فشاں آگ اگل رہے تھے۔ سمندروں میں طوفان برپا تھا۔ آندھی سے جنگل اور بھونچال سے شہر ویران ہو رہے تھے۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی میں نے دیکھا کسان اور مزدور دوڑ رہے ہیں۔ بھاگے بھاگ جا رہے ہیں۔ جلا رہے ہیں۔ بڑی بڑی سر بہ فلک عمارتوں کو تباہ کر رہے ہیں بڑی بڑی مسجدوں اور مندروں کو فنا کر رہے ہیں ان سب کو جو ان کے مقابلے میں آتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ غریب کسان جن کی غربت پر رحم آتا تھا، وہ فاقہ زدہ مزدور جن کے دیکھنے سے ہمدردی پیدا ہوتی تھی اب بڑے زبردست قزاق اور ڈاکو بن گئے ہیں۔ نہ وہ بوڑھوں پر رحم کرتے ہیں نہ بچوں پر۔ نہ عورتوں کی چیخوں کا ان پر کچھ اثر ہوتا ہے نہ بیماروں کے کراہنے کا۔ ایک مست ہاتھی کی طرح وہ دوڑ رہے ہیں ـــ ہر چیز کو روندتے ہوئے نذرالاسلام نے میری طرف دیکھ کر کہا "اے بزدل دیکھا یہ تماشا؟ اب مجھے سکون نصیب ہوا۔ اب مجھے میری شاعری کا صلہ مل گیا۔ اب یہ دنیا برباد ہوئی اور اب ایک جہانِ نو پیدا ہوگا جس میں نہ کوئی چھوٹا ہوگا نہ بڑا، نہ کوئی شاہ ہوگا نہ گدا، نہ کوئی امیر ہوگا نہ فقیر۔ اب انسانیت کو مساوات کی دولت مل گئی اب مجھ جیسے شاعروں کی ضرورت نہیں رہی۔"

میں نے کہا ٹھیرو ذرا ٹھیرو یہ کیا نظر آ رہا ہے؟

میں نے دیکھا کہ کسان تختِ شاہی پر چڑھ بیٹھا ہے اور مزدور کے سر پر تاجِ شاہی جگمگا رہا ہے اور ساری مخلوق جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہے۔

وہی افلاس، وہی فاقہ، وہی نکبت، وہی غربت، وہی بے چینی، وہی بے اطمینانی۔ اور سب سے بڑھ کر وہی عدم مساوات۔ اور ـــ

نذرالاسلام؟ احمد ـــ میرے دوست؟

محمد جلال الدین اشک (عثمانیہ)

کتابۂ ضمیر پسند

ایسے اس باغ میں کھلتے ہیں خوشامد کے پھول
خندہ آمادہ ہو جیسے کوئی دل گبر و ملول

دیکھ کر اس کو بہارِ گزراں روتی ہے
زہرخند آہ بناوٹ کی ہنسی ہوتی ہے

فصلِ گل سے نہیں ان پھولوں کو بالکل سروکار
یہ تو ہیں گلشنِ ملت کی خزاں کے آثار

قومِ افسردہ دل ایسے ہی کھلاتی ہے پھول
مرثیے دورِ خزاں میں ہیں بہاراں کے اصول

جب تصنع کی ندامت کا ہٹایا پردہ
دل گرفتہ نظر آئے یہ خزاں پروردہ

کاش یہ پھول نہ کھلتے چمنِ ملت میں
یہ چمن کاش نہ آتا نظر اس صورت میں

آہ کس کس پہ خوشامد کے ہیں کیا کیا اثرات
کاش کرنا ہی پڑی مجھ کو یہاں راز کی بات

ہو اگر مردہ ضمیروں پہ خوشامد کی زد
شرف و مجدِ سیادت کی بھی ہو داد و سند

سید اُس کو یہ کہے میر بنا دے وہ اسے
پاس ہے فرطِ خوشامد میں سیادت کا کسے

کہیں چھپتا ہے وہ انساں جو خوشامد زدہ ہے
خودنما اس کے تفاخر کا ہر اک شعبدہ ہے

اہلِ دولت کا یہ دستور خوشامد طلبی
وہ بہانہ ہے خجل جس سے ہے خود بے سببی

مجھ کو آتا نہیں اے دوست خوشامد کرنا
ایسے موقع پہ میں چاہوں گا خوشی سے مرنا

میں جو لیتا نہیں اوروں کی خوشامد کا اثر
علم کا ہے یہ طفیل اور اب وجد کا اثر

نہیں آئینِ خوشامد سے مرا دل آگاہ
ہیں تصنع سے بری میرے اصول دلخواہ

دُور مجھ سے درِ اعیانِ خوشامد زدہ ہے
میرے رہنے کے لئے خاص وہ عرفاں کدہ ہے

جس میں انسان خوشامد طلب آتا ہی نہیں
میں خوشامد کی ضرورت کبھی پاتا ہی نہیں

ملک میں لائقِ تبلیغ عمل میرا ہے
درِ عرفاں کدہ پر میں نے یہ لکھوایا ہے

کوئی انساں کسی انساں کی خوشامد نہ کرے
آدمیت سے رہے خواہ جیئے خواہ مرے

سید علی منظور

مشاہیر کے خطوط

مکرمی،

آپ کا عنایت نامہ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ میرے پاس پہونچا۔ اس کا جواب لکھنے سے میں اس وجہ سے قاصر رہا کہ میں نے حیدرآباد کی ملازمت کا تصفیہ نہیں کیا تہا اور مجھکو امید تھی کہ آخر فروری لیتے آج کل میں وہاں ہوتا۔ لیکن شاید آپ نے سُنا ہوگا کہ بڑودہ سے میں سیدھا اپنے والد کے پاس بغرض مشورہ چلا گیا اور تعمیل اس سبب سے کرنی پڑی کہ اسی زمانہ میں ہائی کورٹ الہ آباد میں ایک ہندوستانی جج کے تقرری کی خبر محقق معلوم ہوئی بلکہ جب میں الہ آباد پہونچا تو معلوم ہوا کہ رپورٹ روانہ بھی ہوگئی اور حکام ہائی کورٹ نے میرا نام تقرری کے لئے اس لئے نہیں لکھا کہ اون کو خیال تھا کہ مجھکو گورنمنٹ انگریزی کی نوکری منظور نہیں ہے۔ اس سبب سے یہ ضرورت پیش آئی کہ قبل اس کے کہ وائسرائے اس معاملہ ججی ہائی کورٹ کا فیصلہ کریں میں اپنے تئیں ہائیکورٹ کی ججی لینے پر آمادہ اور راضی تبلاؤں۔ چنانچہ ایک چھٹی اس مضمون کی میں نے گورنمنٹ کو لکھی ہے اور وہ ہائی کورٹ کو واسطے رائے کے بھیجدی گئی اور چند روز میں وہ مع رائے کے یہاں واپس آوے گی اور پھر تقرری کا فیصلہ ہوگا۔ اس عرصہ میں یہہ چاہتا تہا کہ اگر ہائی کورٹ کی ججی بالفعل نہ ملے تو ضرور سرکار آصفیہ کی نوکری مستقل کرلینی چاہئے اس لئے کہ نواب صاحب نے میرے لئے عمدہ تنخواہ اور نہایت عمدہ پنشن قرار دی تھی۔ لیکن میرے والد جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمیشہ سے میرے سرکار انگریزی کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کو ناپسند کرتے ہیں اور باوجود میری گفتگو کے انھوں نے یہہ رائے قرار دی کہ نواب صاحب کو اطلاع دیدینی چاہئے کہ حیدرآباد میں مستقل ملازمت کا ارادہ نہیں ہے۔ آخر کار میں نے نواب صاحب کی خدمت میں ایک عرضی اس مضمون کی لکھ بھیجی۔ اور اب سب امر فیصل شدہ ہوگیا۔

جسٹس سید محمود کا خط مولوی حسین عطا اللہ مددگار معتمد عدالت کے نام

نواب گورنر جنرل بہادر نے میرے والد کو ممبر ایک بڑے کمیشن کا جو واسطے درستی انتظام تعلیم تمام ہندوستان کے لئے مقرر ہوا ہے اور جس میں بمبئی اور مدراس اور میسور اور پنجاب غرض کہ ہر ممالک سے ممبر انگریز و ہندوستانی آرہے ہیں) مقرر کیا تھا۔ چند مخالفت رائے کے سبب سے میرے والد نے اوس کمیشن کو چھوڑ دیا اور پھر مجھ کو بلا کر ممبر کمیشن مقرر کردیا۔ میرے والد جیسا کہ شاید آپکو معلوم ہو گورنر جنرل کی کونسل میں ممبر دوبارہ ہوئے ہیں اور ان کا ذاتی کام قانونی اس قدر ہے کہ جمیں میری مدد کی ضرورت ہے۔ پس بالفعل مجھکو یہاں شدت سے کام ہے اور اس کمیشن میں میرے ممبر ہونے کے سبب سے اور بھی کام میں کثرت ہے۔ میں نے نواب صاحب سے اجازت چاہی ہے کہ تا صدور احکام گورنمنٹ آف انڈیا (دربارہ باز انتقال میرے خدمات کے) مجھکو اجازت بطور رخصت مرحمت فرمائیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا مجھکو بخوشی واپس لے گی بلکہ اس کمیشن میں ممبر کرنا درحقیقت واپس لینا ہے۔ پس میری واپسی خدمات کا حکم صادر ہوجائیگا۔ مگر تاہم میرا ارادہ ہے کہ صرف بطور ادائی مراسم رخصت و برائے اظہار اس احسانمندی کے جو میرے دل میں نواب صاحب کے ذاتی عنایات سے پیدا ہوئی ہے اور نیز احباب سے ملنے کے لئے اس کمیشن کے کام سے فارغ ہوکر ماہ اپریل یا مئی میں چند روز کے لئے حیدرآباد آؤنگا۔ امید کہ آپ سے بھی مسرت ملاقات حاصل کرلے گی۔ آپکا اور مولوی محمد صدیق صاحب کا اخلاق اور عنایت مجھکو ہمیشہ یاد رہیگی گو کہ اب حیدرآباد میں میری ملازمت نہ ہوگی۔

دربارہ کاغذات وغیرہ کے۔ سب کاغذات جو میرے لئے مرتب ہوئے تھے اونمیں کاغذات اصل سرکاری دفاتر کے بہت کم ہیں۔ وہ سب مولوی مہدی علی صاحب کے پاس بھجوادئے جائیں گے۔ آپ ان سے مانگ لیجئے۔ چند کاغذات وغیرہ جو خاص میرے لئے لکھے گئے تھے ان کو میں پھر ایک دفعہ پڑھنا چاہتا ہوں۔

حقیقت میں میرے دل میں بہت خیالات دربارۂ طرز انتظام عدالت وکوتوالی قائم ہوگئے ہیں اور ان سب کو بہ ترتیب لکھ کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس کمیشن کے کام سے ذرا مہلت ملی تو اُس یادداشت کو مکمل طور پر تیار کروں گا۔ فی الحال جس قدر کاغذات و گشتیات متعلق دفاتر ہیں اور وہ میں نے آپ سے مستعار لی تھیں وہ سب مولوی مہدی علی صاحب آپ کو واپس دے دیں گے۔ اور جو کاغذات خاص میری مدد کے لئے آپ نے تحریر فرمائے تھے وہ میں تھوڑے عرصہ کے بعد واپس کروں گا اگر آپ کو تکلیف یا ہرج نہ ہو۔

مجھ کو اس بات کا نہایت رنج ہے کہ میرا مستقل طور پر حیدرآباد میں رہنا نہ ہوا۔ لیکن درحقیقت اگر مجھ کو ہائی کورٹ کی ججی مل جائے تو اس کے مقابلہ میں جو تنخواہ کہ حیدرآباد میں مجھ کو مل سکتی تھی وہ کم ہے اور قطع نظر بھی ہائی کورٹ کے مجھ کو ملک اودھ میں پانچ سات سال کے بعد کمشنری کی توقع ہے۔ لیکن جہاں تک میری ذاتی خواہش تھی وہ حیدرآباد کے انتظام میں شرکت کی تھی اور درحقیقت جس قدر عمدہ انتظام وہاں ہوسکتا ہے کسی ہندوستانی ریاست میں ممکن نہیں ہے۔ اور چونکہ سلمانی ریاست ہے اس کے انتظام میں سعی کرنے کی میری دل سے ہمیشہ خواہش تھی۔

افسوس ہے کہ یہ امید پوری نہ ہو سکے گی گو کہ کچھ وجہ نہیں ہے کہ اگر نواب صاحب توجہ فرماویں نواب بھی کیوں عمدہ انتظام نہ ہو سکے۔ مگر چند اصول انتظام کے اختیار رکھئے بغیر انتظام ممکن نہیں ہے۔ بہرحال اپنے خیالات اور آرا اپنی یادداشت میں انشاءاللہ مفصل ظاہر کروں گا اور آپ بھی شاید اس کو دیکھیں گے۔

جب تک یہ تعلیم کا کمیشن یہاں اجلاس کرے گا جب تک مجھ کو یہاں رہنا لازم ہے۔ مولوی محمد صدیق صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز پہونچے۔ امید ہے کہ بفضلہ تعالیٰ آپ بخیریت ہیں۔

خاکسار

محمود

غزل

نہیں دو اشک بھی صدقہ کروں کیا درد فرقت پر
الٰہی تھک گیا میں زور دے دے کر طبیعت پر

گئے وہ دن کہ آتی تھی محبت تیری صورت پر
ہماری اب یہ صورت ہے کہ مرتے ہیں محبت پر

یہ دنیا ہے یہاں آفت رسیدوں کی کمی کیا ہے
بہت ایسے ہیں رو دیتے ہیں جو نام محبت پر

تری محفل کی باتیں اس طرح خوش ہو کے سنتا ہوں
سراپا گوش ہو جس طرح کوئی ذکر جنت پر

کسی کی یاد آئی ہم کو اپنا دل بھی یاد آیا
بہت سچ ہے کہ ہر شئے یاد آتی ہے ضرورت پر

خبر کیا تھی کہ پانی بن کے بہہ جائے گا آنکھوں سے
کیا تھا ہم نے تیرا دوستانہ دل کی ہمت پر

طبیعت آپ کی ہم سے نہیں ملتی خدا حافظ
نہ ہوگا صبر تو ہم جبر کر لیں گے طبیعت پر

ابھی تک تو تری رفتار کا عالم نظر میں ہے
ابھی تک تو نہیں ہے اعتقاد اپنا قیامت پر

محبت میں تو ذلت اے صفیؔ ہے نام عزت کا
وہ کیوں جیتے ہیں جو مرتے ہیں اپنی شان و شوکت پر

صفیؔ اورنگ آبادی

جدید ادب

ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے زندگی کی سطح پر جو لہریں اٹھتی رہتی ہیں وہ ادب پر بھی اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ادب کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ زندگی کی تعبیر بھی کرتا ہے ادبی عمل کے لئے سوسائٹی دریا کی تہ کی طرح ہے جس پر انسانی زندگی کا دھارا بہتا رہتا ہے۔ کبھی ادب اس دھارے کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی اس کا رخ بدل دیتا ہے۔

مشاہدۂ ادب ایک مخصوص طبقہ اور گروہ کی سرگرمیوں اور جذبات وخیالات کا ترجمان تھا۔ قدیم یونانی تہذیب کا ادب اعلیٰ طبقہ کا ادب ہے اس میں پست طبقے۔ غلاموں اور عورتوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ سامراجی رومی ادب طبقۂ امراء کی نمائندگی کرتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے یورپی ادب میں اس طبقہ کی رزم و بزم کی داستانیں درج ہیں۔ پیدائش دولت کے ذرائع کی باگ جس طبقہ کے ہاتھ میں رہی وہ زندگی کی ساری سماجی قوتوں پر چھایا رہا۔ ادب بھی ایک سماجی قوت ہے۔ اور یہ بھی صدیوں تک صاحب اقتدار طبقہ کا آلۂ کار بنا رہا۔ اس میں کبھی دیوی دیوتاؤں کی برتری اور انسانی کمتری کے گیت گائے گئے تو کبھی تلوار چمکنے کے مناظر پیش کئے گئے۔ کبھی یہ حسن وعشق کی ٹھنڈی چھاؤں میں پرورش پاتا رہا۔ تو کبھی دنیا سے بیزارگی اور زندگی سے گریز کے سبق پڑھاتا رہا۔ انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا کے ساتھ اس کا بھی ارتقا ہوا جاگیری نظام میں امراء داد عیش دیتے تھے۔ اور غریب تنگ دستی اور پسماندگی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اور شاعر اور ادیب زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ کر امیروں کی عیش بھری زندگی سے ادب کا مسالہ جمع کرتے تھے۔ جاگیری نظام کی جگہ جب سرمایہ دارانہ نظام نے لی تو سماج اور معاشرت کی قدیم بندشیں ٹوٹنے لگیں۔ صنعتی انقلاب ہوا تو خاندان کی مشترکہ زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا اخلاق و آداب کے نئے معیار قائم ہوئے۔ محبت اور شادی بیاہ کا فلسفہ بدل گیا اونچے طبقہ کے اوقات جو جاگیری نظام میں بیکاری میں گزرتے تھے۔ اب حصول دولت کے لئے وقف ہو گئے۔ ادب اور سیاست کی باگ متوسط طبقہ کے ہاتھ میں آئی۔ معاشی تعلقات کی اس تبدیلی سے ادیب بھی متاثر ہوئے اب ادب میں متوسط طبقہ کی سماجی سرگرمیوں کا ذکر ہونے لگا۔ زندگی سے قریب ہو کر نئے نئے موضوعوں پر لکھا جانے لگا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا شکنجہ جب زیادہ سخت ہونے لگا اور پیدائش دولت کے ذرائع محدود ہو کر ایک ہی طبقہ کے ہاتھ میں آگئے تو دولت اور حصول دولت کے خلاف ایک نئی تحریک ادب میں شروع ہوئی۔ یہ انیسویں صدی کا رومانی ادب ہے۔ یہ "ادب صرف ادب کے لئے" کی تحریک تھی۔ جس میں ادب کے حسن کارانہ پہلو پر زیادہ زور دیا گیا۔ شعراء مادی زندگی کی حقیقتوں سے گھبرا کر فطرت کے لازوال چشموں کی طرف دوڑے اور وہاں اپنی پیاس بجھائی۔ ادھر سو سال سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو تحریک تھی۔ اس نے ادب کو طبقۂ متوسط کے ہاتھ سے چھین کر ادنیٰ طبقہ کے ہاتھ میں دے دینے کا بیڑا اٹھایا۔

اب ادب کا نظریہ یہ تھا کہ وہ زندگی کے لئے ہے۔ اور اس کا مقصد صرف جماعتی مفاد ہے۔ زندگی کا رومانی پہلو یکسر ختم ہو گیا۔ مذہبی تصورات اور حسن کارانہ جذبات ادب کے مضمون سے مٹا دئے گئے۔ طبقاتی کشمکش کی لہریں ادب میں بھی اٹھتی رہیں۔ اور جب طبقاتی جنگ ختم ہوئی تو ادب بالکلیہ ادنیٰ طبقے کے ہاتھوں میں آگیا۔ انسانی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اخلاق کے اصول و آئین بدل گئے مذہب اس تمدنی زندگی سے

رخصت ہو گیا اور اب ادب ایک انقلاب کا پیغامبر تھا۔ جو ساری دنیا کو ایک نئے نظام زندگی کی طرف آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس معاشی نظام کے خلاف ایک اور تحریک اٹھی جس نے اس کی مقبولیت پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک دیا۔ یہ فاشستی تحریک تھی جس نے اشتراکیت اور جمہوریت کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ فاشزم کے اس اثر کو دیکھ کر سنہ ۱۹۳۵ء میں میکسم گورکی کی سرپرستی میں دنیا کے سارے ادیبوں کی ایک کانفرنس پیرس میں ہوئی جس میں یہ طے ہوا کہ ادیبوں کی ایک بین قومی انجمن بنائی جائے، جو عالمی تہذیب و معاشرت کو فاشزم کے اثر سے بچائے۔ شہری حقوق کی آزادی اور ادیبوں کے معاشی مفادات کی نگہداشت کرے اور ان جلاوطن ادیبوں کی جو فاشستی ممالک سے نکال دئے گئے تھے۔ مدد کی جائے۔ دوسری کانفرنس سنہ ۱۹۳۶ء میں لندن میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ تحریک کو زیادہ عملی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عالمی تہذیب و تمدن کی ایک انسائکلوپیڈیا تیار کی جائے۔ اور اس میں مشرق و مغرب کی تہذیب پر تفصیلی کام کیا جائے۔ اور جدید فلسفۂ انسانیت کی تفسیر کی جائے۔ اور جو انسانی علوم کے تمام شعبوں یعنی سائنس۔ سیاسیات۔ معاشیات اور جمالیات پر حاوی ہو۔ اس تجویز پر بڑی بحث ہوئی ایچ۔ جی۔ ویلز نے اس کی بڑی مخالفت کی اور اس کی عملی دشواریوں کو گنایا۔ اور کہا کہ اس کام کے لئے تقریباً تیس کروڑ پونڈ خرچ کرنے ہوں گے جس میں تین جنگی جہاز خریدے جاسکتے ہیں۔ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔

کیونکہ اس کے بعد ہی اسپین کی جنگ شروع ہوگئی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں پھر تیسری بار یہ کانفرنس میڈرڈ میں ہوئی۔ اس میں فاشستی مظالم اور دست درازیوں کے خلاف مشترکہ طور پر جذبات نفرت کا اظہار کیا گیا۔

جدید ادب کی ان تحریکوں سے ہندستانی ادب بھی متاثر ہوا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین۔ جدید ادب کی علمبردار ہے اس میں متوسط طبقہ کے ایسے نوجوان ادیب شامل ہیں جنھیں موجودہ نظام زندگی میں معاشی آسودگی کا موقع نہیں ملا اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ سامراجی اور سرمایہ دارانہ قوتوں کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جائے اور ماضی کے خلاف منتشر پاروں کو جوڑ کر حال کے ساتھ ملایا جائے۔ اور ایک مشترکہ قومی معاشرت کی تشکیل کی جائے۔ اس تحریک نے بہت سارے بے روزگار نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ مزدور کسان اور غریب طبقے کی معاشرتی زندگی اس ادب کا موضوع ہیں۔ اس گروہ کا شاعر سرمایہ داری کے خلاف مزدور کی زبان میں انقلاب کا نعرہ لگاتا ہے۔ اگرچہ کہ عملی طور پر وہ کسان اور مزدور کی جد و جہد سے بہت دور ہے۔ اس طرح اصل میں وہ اپنی زندگی کی ناکامی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر اس میں اپنے مقصد سے متعلق خلوص بھی پیدا ہو جائے۔ اور وہ اپنے بیان میں فن کارانہ ضبط بھی حاصل کرلے۔

جنگ عظیم کے بعد سے دنیا ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ معاشی تباہی طبقاتی جنگ ہر طرف سے ہراس اور ناامیدی کے بادل امنڈ امنڈ کر آرہے ہیں۔ بیکاری اور بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔ مزدور پریشان اور سیاست داں گھبرائے ہوئے۔ اس پر ہر وقت عالمگیر جنگ کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ بین قومی اتحاد کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ اور قومیت کا بھوت امن عالم کی دھجیاں اڑانے بڑھا چلا آرہا ہے۔ جمہوریت جو بڑی امیدوں کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ اب فاشزم کے حملوں سے اپنا وقار کھو بیٹھی ہے۔ جمہوری ممالک کے ادیب اور شاعر زندگی کی اس بے یقینی اور معاشی نظام کو دیکھ رہے ہیں۔ زندگی کی تنقید

کے لئے ان کے قلم کی نوک تیز ہوگئی ہے۔ مگر ان کے دماغ کوئی ایسا حل پیش نہیں کرسکتے جو عملی امن کا ضامن ہو۔ وہ موجودہ نظام کے اس لئے قائل نہیں کہ وہ فرد کی آزادی کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اس کے مخالف اس لئے ہیں کہ وہ انسانی دماغ اور روح کی تربیت اس طرح کرنا چاہتا ہے۔ جس میں اکثریت کا فائدہ ہو۔ چاہے وہ اکثریت بالکل ہی کودن اور جاہل ہو۔ جمہوریت کا ادب ایک مضطرب اور بے چین دل و دماغ کا ادب ہے۔ اور تعمیری پہلو کی بہ نسبت اس کا تنقیدی پہلو زیادہ زبردست ہے ادب جدید کا علمبردار میکسم گورکی کہتا ہے۔ کہ "ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کجروی کو ظاہر کرتا اور اس کی خام کاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بناتا ہے۔ ادب کی بے کلی اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے۔ اور اسے جس روش پر چاہے لے جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے۔ مگر موجودہ دور کے معاشرتی اور سیاسی انتشار نے ادب میں بھی انتشار پیدا کردیا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا یہ دور بڑی کشمکش اور بے چینی کا دور ہے۔ سماجی قوتیں اور معاشی و سیاسی تحریکیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ ایک طرف سامراجی قوت ہے جو غریبوں کے خون پسینہ سے اپنے سطوت و جبروت کی نذر لے رہی ہے۔ دوسری طرف جاگیری نظام ہے۔ جہاں زندگی صدیوں پہلے کی طرح اب بھی رینگ رہی ہے۔ جمہوریت نے سیاست کی کمزوریوں کو واضح کردیا ہے۔ اشتراکیت ساری دنیا کو سبق دے رہی ہے۔ انسانیت کا روحانی پہلو مادی پہلو پر قربان کردیا گیا ہے۔ اس کا ردعمل فاشسٹی تحریک نے کیا ہے۔ جو ہوس ملک گیری میں ساری دنیا کے امن اور تہذیب و تمدن کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہے۔ اب ادب کا فرض یہ ہے کہ وہ انسانیت کو اس کشمکش اور گمراہی سے نکال کر بلند مقام پر پہنچائے۔

مشرق صدیوں پہلے مغرب کو اپنی روحانیت سے نور پہنچا چکا ہے۔ اب بھی دنیا کے دو بڑے شاعر اقبال اور ٹیگور مشرق ہی نے پیدا کئے ہیں۔

اس سے ساری کشمکش اور بے چینی کا حل مغرب کو اقبال کے یہاں مل سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس نوع کے خیالات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرے۔ جو پروفیسر میکنزی نے اپنی کتاب "عمرانی مطالعہ کی تمہید" میں بیان کئے ہیں۔ کامل انسان کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت سے آگاہی ہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت کی ضرورت ہے۔ جیسے یوں کہنا چاہئے کہ یہ معمہ حل کرنے کے لئے ہم نور و حرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ عہد حاضرہ کے معاشی مسائل کا فہم و ادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہمیں آج رسکن، کارلائل اور ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ضمیر کو زیادہ مستند اور سمت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں معلم سے زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ جو شاعری اور رہبری کی دوگانہ صفات رکھتا ہو۔ عہد ماضی کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انھوں نے ہمیں اسقدر ژرف نگاہ بنادیا ہے کہ ہم مظاہر فطرت میں انوار ربانی کا مطالعہ کرسکتے ہیں اب ہم ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں اس فصاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفات الہی کے جلوے دکھائے۔ ہائنے نے ازراہ تفنن اپنے آپ کو روح القدس کا سپاہی کہا تھا۔ اس میں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو درحقیقت روح القدس کا سپاہی ہو۔ جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین ہمارے روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے تو ہمیں صرف راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملے گا بلکہ ایک ایسا ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہوجائے گا جو تمام خیالات تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

اشفاق حسین

خانہ بدوش

بڑی پرانی بات ہے شاید چالیس سال گزر گئے ہوں کہ لمباڑوں کا ایک ٹانڈا آکر پان گاؤں میں ٹھہرا۔ وہی پان گاؤں جو بالاگھاٹ کے دامن میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور جہاں کے خزانے مشہور ہیں نہ صرف خزانے بلکہ آم بھی اور ساتھ ہی یہاں کی طاقت بھی۔

لباڑا قوم کو حکومت نے جرائم پیشہ شمار کیا ہے۔ جب انھوں نے اپنے گھر کندھوں سے اتار کر زمین پر گاڑے گئے کہ گاؤں میں ہل چل مچ گئی۔ لوگ اپنی پونجیاں سمیٹنے میں مصروف نظر آنے لگے۔ زیورات روپیے پیسے وغیرہ کو دیگچی ہانڈی یا گھڑے میں بھر کر کسی نے اپنے گھر میں حجرہ کے کونے میں گاڑ دیا اور کسی نے باہر دروازے کے قریب اس طرح دفن کر دیا کہ گھر میں گھسنے والے کا پہلا قدم پڑے تو وہ دفینہ پر ہو۔ ایسے لوگ واقعی ہوشیار تھے ان کی دولت کبھی چوری نہ گئی البتہ کرلے کاٹنے کئے خزانے اکثر چلے گئے۔ ہمیشہ لمباڑوں کا ٹانڈا گاؤں سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ کھیتوں پر سے غلہ اور گھر سے خزانہ غائب ہونا بالکل معمولی بات تھی۔

فیضو پولیس کا جمعدار یہاں کے تھانہ پر متعین تھا۔ نیا نیا آیا تھا لیکن تھا جہاں دیدہ۔ سیکڑوں چوروں کو اس نے جیل کی ہوا کھلا دی تھی۔ اس نے بھی ٹانڈا کے آنے کی خبر سنی لیکن کیا مجال کہ ماتھے پر ایک بل بھی پڑی ہو۔ اس نے چند گاؤں والوں کو فراہم کیا اور کچھ جمعیت بھی منگوالی۔ ٹانڈا کے پڑاؤ کے قریب آبادی کے کنارے ایک مکان میں سب کو لئے ہوئے چھپ گیا۔

رات کے دو بج رہے تھے دس بارہ لمباڑے اپنے پڑاؤ سے نکلے ایک آگے آگے چل رہا تھا اور کچھ کہتا بھی جاتا تھا شاید سردار ہو۔ فیضو نے دیکھا کہ وہ گلی کی طرف مڑ رہے ہیں۔ فوراً اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکل کر انھیں گھیر لیا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد سب لمباڑوں کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے تھے وہ تھانہ کی کوٹھڑی میں بند۔ اس آواز پر دوسرے دس پندرہ لمباڑے آئے اور وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملے فیضو نے آگے بڑھ کر ان کی عورتوں کو بھی گرفتار کر لیا اور تلاشی پر ہزاروں روپیہ کا سونا زیورات کی شکل میں برآمد ہوا۔ لمباڑے اور مارواڑیوں سے زیادہ دولتمند، دن بھر غریب مزدور، جنگل سے ایندھن لانے، چکی ٹاکنے، جانور چرانے، بوجھ ڈھونے اور رات بھر سرمایہ دار۔ رات کے ابتدائی حصہ میں عیش مناتے اور پچھلی پہر سے سرمایہ دار بننے کے لئے غریب کسانوں کا خون چوسنے والے ہونکوں کا بھی خون بہانے سے نہ چوکتے۔ سب فیضو کی گرفت میں تھے۔

صبح ہوئی اور یہ ٹانڈا اپنے جانور گاؤں ہی میں چھوڑے ہاتھ میں ہاتھ ملائے تھانہ سے تعلقہ کی طرف جا رہا تھا۔ مردوں کے جسم پر سفید دھوتیاں تھیں اور عورتوں کے جسم پر ایک بڑا لہنگا جیسے کسی ملکہ کا گون اس لہنگے پر ایک اوڑھنی، لہنگے پر گول گول چھوٹے بڑے آئینے ٹنکے ہوئے اور اوڑھنی پر بیل بوٹے کڑھے ہوئے۔ ان پر خوردار دوپہر کے غصیلے آفتاب کی کرنیں پڑ کر لہنگے کے حسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔ صبح سے ٹانڈا چل رہا تھا۔ آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا۔ گرد وغبار بھول بن گئے تھے۔ عورتیں چلائیں "ہم بھوکے ہیں لہذا کھائیں گے۔ مرد ذرا کی ذرا دوسرے درخت کے نیچے بیٹھیں تو بہتر ہے۔" "اگر بھاگ جائیں تو" فیضو نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

گو ملزم کو آرام پہنچانا جرم ہے لیکن فیضو یہ بھی جانتا تھا کہ بھوکے کو کھانا کھلانے میں کتنا ثواب ہے۔ اور یہاں تو صرف کھانے کی اجازت دینی تھی۔ اس نے خدا کے حکم کی تعمیل کی۔

تمام آدمی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بھونا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ دور ـــــ دوسرے درخت کے نیچے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دو تین عورتیں اپنے مردوں اور پولیس کے سپاہیوں کو بھونا ہوا گوشت لا لا کر دے رہی تھیں۔ سب سیر ہو گئے۔ فیفو حیران تھا کہ یہ آیا کہاں سے۔ سب ہی متحیر تھے انھوں نے لمباڑوں سے پوچھا۔

"ہم کیا جانیں، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں" ان کا سادہ سا جواب تھا۔ فیفو نے عورتوں سے پوچھا لیکن انھوں نے چپ سادھ لی۔ البتہ ایک نوجوان البیلی اور چلبلی لمباڑن نے کہا "اگر خفا نہ ہو تو کہہ دوں"

فیفو نے وعدہ کر لیا۔

لمباڑن نے کہا "ہم ندی میں ضرورتاً ٹھہر گئے تھے۔ ایک گلہ بھی وہاں چر رہا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے ایک ایک بکرا اپنی رانوں کے درمیان دبا لیا اور چلتے بنے۔ انہیں کا گوشت آپ کی ضیافت کا سامان تھا"

فیفو دل میں کہنے لگا چور چوری کرنے سے نہیں جو کتا بنٹے کی گرہ اور انسان کی فطرت میں تبدیلی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ یہ بھیڑوں کا خون ہوا بیچارے کا۔ پچاس آدمی سیر ہو چکے۔ کتنی بھیڑیں نہ کٹ گئی ہوں گی۔ غریب چرواہا! ـــــ اونہہ! میں بھی بھوکا تھا۔ جانے دو اس الزام کو اس کی کوتوالیانہ فطرت عود کر آچکی تھی۔

اکبر صدیقی

شاخسانۂ محبت

حقیقت میں ہیں درد و غم کے خزانے ۔۔۔ مری تیرہ ساما نیوں کے فسانے

غم نامرادی ہو یا سوزشِ دل ۔۔۔ یہ سب کچھ محبت کے ہیں شاخسانے

سناتا ہوں میں بے خودی میں کسی کو ۔۔۔ محبت کے راگ اور غم کے ترانے

کوئی غم سے نالاں ہے خنداں ہے کوئی ۔۔۔ محبت کے بھی ہیں عجب کارخانے

ہوئے کامیابی کے جب بند رستے ۔۔۔ تو یاد آ گئی تیری راہیں دکھانے

جو وہ کہہ رہے ہیں جو میں سن رہا ہوں ۔۔۔ مرا دل ہی سمجھے مرا دل ہی جانے

ذرا اشکِ غم کر کسی پر نچھاور ۔۔۔ لٹا دے محبت کے اے دل خزانے

ہجومِ تمنا سے ہے تنگ آ کے آخر ۔۔۔ کہیں کس سے ہم وسعتِ دل بڑھانے

اگر مہرباں ہم پہ صیاد ہوتا ۔۔۔ قفس میں بناتے کئی آشیانے

ہر اک لختِ دل پر ہیں ان کی نگاہیں ۔۔۔ محبت کے جلوے ہیں کتنے سہانے

دکھا اپنی تاثیر اے جذبِ الفت ۔۔۔ اجل آئی ہے ان کے در سے اٹھانے

وہ چاہیں سکونِ محبت تو اے تاج ۔۔۔ ہزاروں ہیں حیلے ہزاروں بہانے

قاری تاج الدین زنظامیہ

کلامِ غالب اور ضلع و رعایت

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی ؛ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا میں نے سن کر عرض کیا کہ جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت ۔ اسدؔ اور شیر اور بت اور خدا اور جفا اور وفا میری طرز گفتار نہیں"۔

گو مرزا صاحب کے قبل جو اساتذہ گزرے ہیں ان کا بھی یہی حال تھا کہ ضلع و رعایت کو بہت ہی مبتذل سمجھتے تھے چنانچہ مرزا سوداؔ نے بھی اپنے معاصرین پر ایسے ضلع بولنے پر طعن و تشنیع کی لیکن ان اساتذہ کی طرح مرزا غالبؔ کا کلام بھی ضلع کے الفاظ سے خالی نہیں ۔ چند اشعار دیوانِ غالب سے پیش کئے جاتے ہیں جن میں مرزا صاحب نے ضلع، رعایت اور لفظی مناسبت کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ؛ آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دوسرے مصرع میں گویا کا لفظ خاموش کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔

اور ایک شعر ہے ؎

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ؛ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس شعر میں عرض و جوہر ضلع کے الفاظ ہیں۔

اس کے بعد کی غزل کا مطلع ہے ۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا ؛ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یہاں طرح کی جگہ ہر رنگ محض تصویر کے مناسبات میں سے ہونے کی وجہ سے استعمال کیا گیا ہے محاورہ میں اس قسم کا تصرف فصحا کے نزدیک درست نہیں۔

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذتِ درد ؛ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اس شعر میں کام کا لفظ لب و دنداں کے ضلع کا لفظ ہے ۔

پھر الف ہی کی ردیف میں ایک غزل ہے ۔ نیستاں کا چراغاں کا دہقاں وغیرہ

ایک شعر ہے ۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ؛ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اس میں غالبؔ نے صورت کا لفظ ہیولیٰ کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی ؛ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

گریہ کے ساتھ ٹپکنے کی مناسبت ظاہر ہے ۔

شعر ہے ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

یہاں حالِ زار کے لفظ کی بجائے کاروبار استعمال کیا گیا ہے بعض شارحین کا خیال ہے کہ کار بمعنی زراعت اور بار بمعنی ثمر ہی استعمال ہوتے ہیں لہذا کاروبار ہے گل کے مناسبات سے ۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف کی فی الحقیقت یہی غایت تھی ۔

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ ؛ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

اس شعر میں گرفتگیٔ خاطر کے بدلے گرفتاریٔ خاطر استعمال ہوا ہے۔ اور یہ غالبؔ زنداں کی مناسبت سے ہے اور شرح کے معنی کھولنے کے ہیں یہ لفظ تنگ کی مناسبت سے ہے ۔

اسی غزل کا مقطع ہے ؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

یہاں مرزا غالب دل و جان کا ضلع بڑی خوش اسلوبی سے بول گئے ہیں

(ب) کی ردیف میں ایک غزل ہے جس کی ردیف موجِ شراب ہے اور قافیے صبا، بقا، خوشا وغیرہ اس کا مقطع ہے ۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

پہلے مصرع میں اڑنے کا لفظ دوسرے مصرع کے لفظ بال کی مناسبت سے لائے ہیں۔

حسنِ غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد والی غزل مرزا نوشہ کی

دال کی ردیف میں مشہور غزل ہے۔ اس کا ایک شعر ہے۔

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا ؛ نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

پہلے مصرع میں عرض اور جوہر ضلع کے الفاظ ہیں۔

عارف کے مرثیہ میں ایک شعر ہے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

فلکِ پیر کی جو مخاطبت ہے محض جواں کی مناسبت سے ہے حالانکہ اس موقع پر غیر ضروری اور بے محل ہے اس لیے کہ اس قسم کے تخاطب سے آسمان کے جور و ستم کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر پیر و جواں کا ضلع کہنا مقصود نہ ہوتا تو یوں کہتے ؎

اے چرخِ جفا پیشہ جواں تھا ابھی عارف
یا اے چرخِ جفا کیش الخ

بکِ قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

یہاں شاعر یکِ قلم کا لفظ صفحہ کی رعایت سے لایا ہے۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی ؛ یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

اس شعر میں زبانِ اہلِ زباں، مرگ، خاموشیِ بزم و روشن زبانی یہ سب شمع کے ضلع کے الفاظ ہیں مگر سب کے سب بہت بے ساختگی سے نکلے ہیں تصنع کا شائبہ بھی نہیں حقیقت میں اس قسم کی ضلع گوئی ایک بڑی صنعت ہے۔

(ت) کی ردیف میں ایک شعر ہے۔

چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

پہلے مصرع میں چشمِ ما روشن دلِ ما شاد کو شاعر نے خوب بیان کیا ہے۔

اس میں صنعتِ معنوی و صنعتِ لفظی دونوں ہیں۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے ؛ پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اس شعر کے پہلے مصرع میں کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم پر مطلب تمام ہو گیا تھا لیکن مصرع پورا کرنے کے لئے کچھ بڑھانے کی ضرورت تھی اور ایسی ضرورت پر جو لفظ زیادہ کئے جاتے ہیں، محض بے مزہ اور بھرتی کے ہوتے ہیں۔ مثلاً اس مصرع کو یوں بھی کہہ سکتے تھے۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اے ہم نشیں

یا اس طرح کہ۔ کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم میں کیا کہوں

دوسری صورت میں یعنی کیا کہوں کو مصرع کے آخر میں مکرر کہنے سے حسنِ کلام بڑھ جاتا تھا جیسے کہ مرزا غالب ہی کے ایک شعر میں ہے۔

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو ؛ یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

لیکن ان سب الفاظ کو چھوڑ کر مصنف نے مصرع یوں کہا۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے

یہاں "اندھیر ہے" محض تاریکی کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔

صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

درد کے واسطے صاف کا لفظ کہا گیا ہے۔ یہ بھی ایک ضلع کی مثال ہے۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اس شعر میں دو چار ناچار کے ضلع کا لفظ ہے۔

(ن) کی ردیف میں ایک مطلع ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ؛ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

یہاں خاک و پتھر کا ضلع بول گئے ہیں۔

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

سینہ اور بخیۂ میں جو ضلع ہے پر لطف ہے۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا ؛ دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

گویا دہن کی مناسبت سے ہے۔

گر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے　　وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

غبار اور خاک میں مناسبت ہے اور حسن سے خالی نہیں۔

(و) کی ردیف میں ایک غزل عداوت ہی کیوں نہ ہو محبت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا دوسرا شعر ہے۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا

ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

پہلے مصرع میں رنگ دوسرے مصرع کے نقش کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

اس غزل کا مقطع ہے۔

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

پہلے مصرع میں بجائے فتنہ خو کے خوب رو یا تند خو یا کوئی اور لفظ بھی رکھا جاتا تو بھی مصرع موزوں ہوتا لیکن غالب نے یہاں فتنہ خو دوسرے مصرع کے لفظ قیامت کی رعایت سے استعمال کیا ہے۔ اور لفظ "اٹھتے" بھی قیامت کی مناسبت سے ہے۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو ÷ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانو

دوسرا مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا ؎

اے کاش کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانو

لیکن کلمۂ تاسف ہیہات مرزا غالب نے پانو کا ضلع ہونے کی وجہ سے استعمال کیا ہے۔

پھر اسی غزل کا مقطع ہے۔

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو ÷ پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

شیریں سخن خسرو کے ضلع کا لفظ ہے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

دوسرے مصرع میں سنگ دل کی جگہ بے وفا بھی موزوں ہو سکتا تھا لیکن سنگ آستاں کی مناسبت سے شاعر نے سنگ دل کو "بے وفا" پر ترجیح دی۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے　　بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

قبلۂ حاجات مسجد کے ضلع کا لفظ ہے۔ گر محاورہ کا لفظ ہے ضلع گوئی اگر محاورہ کے حدود کے اندر کی جائے تو حقیقتاً پر لطف صنعت لفظی ہے۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

ہمدم کا لفظ نالہ کی مناسبت سے ہے ورنہ یہاں "ناصح" کا لفظ بھی کھپایا جا سکتا تھا۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی

دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

بیٹھ کا لفظ خرام کے واسطے لایا گیا ہے۔ اسی طرح دھونا اور ڈوبنا جوش گریہ کے ضلع کے الفاظ ہیں۔

کی اس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا ÷ آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

پہلے مصرع میں گرم دوسرے مصرع کے لفظ ٹھنڈا کی مناسبت سے باندھا ہے۔

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ÷ ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

جی جلے کا محاورہ دوسرے مصرع کے لفظ "جلنے" کی رعایت سے ہے۔

آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ÷ تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

کھل جانا آنکھ و سر نامہ دونوں کے ضلع کا لفظ ہے۔

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے ÷ نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

نبض بیمار کو دود چراغ کشتہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور تشبیہ بلا شبہ بہت بدیع ہے۔ اس لئے کہ متحرک کی تشبیہ متحرک سے ہے۔ اطبا کے پاس حالت نزع کی نبض کے لئے دودی کی اصطلاح مشہور ہے۔ اس لئے کہ عربی میں دود کہتے ہیں کیڑے ([illegible]) کو لہذا یہاں دود چراغ کشتہ میں دودی نبض سے لفظی مناسبت موجود ہے۔

پیکر عشاق ساز طالع ناساز ہے ÷ نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے

عشاق یہاں ساز کے ضلع کا لفظ ہے۔ اہل فارس کی موسیقی میں عشاق ایک راگ کا نام ہے۔

دست گاہِ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا ؛ یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

دست گاہ و پا انداز میں دست و پا کا ضلع ہے۔

کس روز تہمیں نہ تراشا کئے عدو ؛ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

"تراشا" اور "آرے" میں مناسبت ہے۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دوسرے مصرع میں صبا کی بجائے ہوا کا لفظ ہوس کی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ؛ ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

لکھنے اور قلم میں ضلع ہے۔

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ ؛ شاہ دیندار نے شفا پائی

دین و دنیا کا ضلع کہا ہے۔

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

یک قلم کے لفظ میں دو رعایتیں ہیں ایک تو خط قلم سے لکھا جاتا ہے۔ دوسرے رخسار پر قلم ہوتے ہیں۔

بے خودی بسترِ تمہید فراغت ہو جو
پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

تمہید کے لغوی معنی بچھانے کے ہیں یہ بستر کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ اسی طرح فراغت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں اور یہ پُر ہونے کے مناسبات میں سے ہے۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

آشنا کا لفظ محیط کے مناسبات میں سے ہے۔ آشنا پیراک کو کہتے ہیں اور محیط کو فارسی میں دریا کے معنی پر باندھتے ہیں۔

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سودا کرنے کا محاورہ جنوں کی مناسبت سے باندھے ہیں۔

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

دوسرے مصرع میں لفظ "جا نکلتی ہے" پہلے مصرع کے لفظ تنگی کی مناسبت سے صرف ہوا ہے مگر بہت بے ساختگی سے۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ ؛ نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

مدعی مدعا علیہ مقدمہ اور روبکار سب ضلع کے الفاظ ہیں۔

(ی) کی ردیف میں ایک اور غزل میں اسی قسم کے مناسبات استعمال ہوئے ہیں۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ؛ گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ؛ زلف کی پھر سررشتہ داری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب ؛ اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ؛ آج پھر اس کی روبکاری ہے

عدالت و فوجداری سررشتہ داری گواہ و حکم اور مقدمہ اور روبکاری سب الفاظ ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی ؛ جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ دل شعلۂ محبت سے خالی ہے اور اس پر جی جلتا ہے یعنی جی کڑھتا ہے کہ دل افسردہ ہے۔ شعلۂ محبت کی ہوس میں جو جی جلا اور کڑھا اتنا خود شعلۂ محبت سے نہیں جلتا یعنی اتنا آزار محبت میں نہیں ہوتا۔ حاصل یہ کہ یہ مجمع باعث تکلیف و آزار ہے کہ مرا دل محبت سے خالی ہے یہاں جی جلنے کا محاورہ شعلہ کی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے اس لئے کہ جی جلنا کڑھنے کے معنوں پر ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی ؛ سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

سایہ کے ساتھ پڑنے کا لفظ بہت مناسب استعمال ہوا ہے۔ وقت پڑنے کے محاورہ کا استعمال نہایت برمحل اور پڑنے کے ساتھ سایہ کی مناسبت بہت ہی خوب ہے۔

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

"تاکے ہے" مے اور تاک کی مناسبت سے استعمال کیا ہے ورنہ ڈھونڈھے ہے محاورہ میں ہے۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

دل و جان کا ضلع کہا ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

سفینہ کا لفظ بحر کی مناسبت سے ہے، اس لئے کہ یہاں سفینہ دیوان و بیاض کے معنوں پر ہے۔ قصائد میں سب سے پہلا قصیدہ منقبت میں ہے اس کی تشبیب کا دوسرا شعر ہے۔

مستیٔ باد صبا سے ہے بعرض سبزہ ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار

عرض و جوہر کا ضلع باندھا ہے۔

پھر اسی قصیدہ کا شعر ہے ؎

سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم سرنوشت دو جہاں ابر بیک سطر غبار

اس شعر میں غبار و ابر اور سطر و سرنوشت ضلع کے الفاظ ہیں۔

جوہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازش مژگاں و دگرسو غم خار

جوہر آئینہ کو مژگاں سے اور خار سے تشبیہ دیا کرتے ہیں اس مناسبت سے مژگاں اور خار کے الفاظ دوسرے مصرع میں لائے ہیں

دیدۂ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتو شوق
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

دوسرے مصرع میں خط کا لفظ کف معنی کی رعایت سے لائے ہیں۔ کیونکہ سرشار ہے فی الحقیقت ساغر جو دیدۂ دل سے استعارہ ہے نہ کہ خط ساغر۔ راقم کا لفظ بھی خط کی مناسبت سے معلوم ہوتا ہے۔

مجھ پہ فیض تربیت سے شاہ کی منصب مہر و مہ و محور کھلا

مہر و مہ و محور میں لفظی مناسبت ہے۔

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

کھلنے کا لفظ طبیعت کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے۔

تم کرو صاحب قرانی جب تلک ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

لفظ صاحب قرانی کو طلسم روز و شب کی مناسبت سے لائے ہیں۔

پھر کہا ہے ؎

جان ہیں ہوتی گر یہ شیرینی کوہکن باوجود غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

کوہکن کی مناسبت سے لفظ شیریں استعمال ہوا ہے۔ چوتھے مصرع میں یکتا جان کی جگہ یکتا مان بھی موزوں تھا لیکن اسی مصرع کے "جان دینے" کے لفظ کی مناسبت سے "جان دینے میں اس کو یکتا جان" کہا ہے۔

آم کی تعریف میں جو مثنوی ہے اس کا ایک شعر ہے۔

صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم

پروردہ مربہ کو بھی کہتے ہیں ضلع کہنے کے لئے یہ شعر کہا ہے۔

اس میں ایک اور شعر ہے ؎

رونق کارگاہ برگ و نوا نازش دودمان آب و ہوا

برگ و نوا سے ساماں کے معنی بھی نکلتے ہیں اور برگ درختاں و نوائے مرغاں کا بھی ایہام ہے

بہادر شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ ہے اس کا ایک شعر ہے۔

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

عقدہ کشائی اور لفظ ڈھیل میں کس قدر مناسبت ہے کہ ڈھیل دینے ہی سے گرہ کھلتی ہے۔ خوب ہی کہا ہے۔

سہرے کا ایک شعر ہے ؎

ساتے دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

دوسرا مصرع یوں بھی موزوں ہو سکتا ہے۔

تب گندھا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

لیکن بنا سہرے کی مناسبت سے ہے۔

ایک رباعی ہے ؎

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

تیسرے مصرع میں ایہام ہے یعنی ہاتھ اٹھانا بمعنی مارنا بھی اور قطع تعلق کرنے کو بھی ہاتھ اٹھانا کہتے ہیں۔

ایک اور رباعی کا دوسرا شعر ہے ؎

یہ یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں ÷ غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

یہاں لفظ گویا پر ایہام ہے

ضلع و ایہام گوئی شعرا میں زمانہ قدیم سے مروج ہے۔ اردو شاعری میں ولی کے زمانے میں بھی اس قسم کی صنعت لفظی مستعمل تھی۔ فارسی کے جلیل القدر شعرا بھی بعض جگہ ضلع و لفظی رعایت کہہ گئے ہیں اگر اس قسم کی مثالیں ان کے کلام سے دی جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جاتا ہے سعدی علیہ الرحمہ جیسے قادر الکلام کا شعر ہے جس میں آج سے تقریباً سات سو سال قبل شاعر نے ضلع کہا ہے۔ اور بہت خوب۔

سعدی بلب دریا دردانہ نمی یابی
در کام نہنگاں رو گر می طلبی کامے

پہلے مصرع میں لب دریا دوسرے مصرع کے لفظ کام (جو دو معنوں میں مستعمل ہے) کی مناسبت سے مستعمل ہوا ہے۔

فغانی کا ایک شعر ہے۔ جس میں شعلہ شمع کا کیا خیال کیا گیا ہے۔

از دیدہ چوں بہ شمع رخت کردہ ام نگاہ
از دل ہزار شعلۂ پنہاں بر آمدہ

حضرت حافظ علیہ الرحمہ کا شعر ہے۔

گر مطرب حریفاں ایں پارسی بخواند
در رقص حالت آرد پیرانِ پارسا را

پہلے مصرع میں پارسی دوسرے مصرع کے لفظ پارسائی مناسبت سے ہے۔ اسی غزل میں ایک اور جگہ بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے۔

خوبانِ پارسی گو بخشندگانِ عمر اند
ساقی بدہ بشارت پیرانِ پارسا را

ولی دکنی کے کلام سے ایہام و ضلع کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں

مذہب عشق میں تیری صورت ÷ دیکھنا ہم کو یہیں جائز ہوا

دیکھنا اور عینین میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔

موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

پہاڑ سے فوراً کوہ طور کی طرف خیال جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں پہاڑ ہونے کا محاورہ باندھا ہے۔

(باقی آئندہ)

محمد قطب الدین

محبت سے پہلے

ابھی اختر نہ تھا میں مبتلائے درد محبت میں
مگر پھر بھی تغیر ہو چلا تھا میری حالت میں

پسند آنے لگی تھیں پرسکوں تنہائیاں مجھ کو
نہ بھاتی تھیں جہاں والوں کی بزم آرائیاں مجھ کو

مجھے دنیا کے ہنگاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی
یہاں کے بے مزہ کاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی

مگر آغوشِ فطرت میں عجب آرام ملتا تھا
مناظر کی محبت میں عجب آرام ملتا تھا

پہونچتا تھا میں پو پھٹنے سے پہلے دور دریا پر
نمودِ صبح کے منظر کو دیکھوں تاکہ جی بھر کر

فلک پر چودھویں کا چاند جب ہوتا تھا جلوہ گر
تو یہ جی چاہتا تھا باغ میں پھرتا رہوں شب بھر

بوقتِ شام جب شور و شغب معدوم ہوتا تھا
کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا

میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ساون کی یہ سب راتیں
مرے دل کو سنانا چاہتی ہیں کام کی باتیں

ہوائے گلستاں جب ناز سے اٹھلا کے چلتی تھی
تو قلب و روح میں اک دھیمی دھیمی آگ جلتی تھی

تڑپتا تھا میں قمری کی نوائے جانستاں سن کر
کلیجہ تھام لیتا تھا صدائے "پی کہاں" سن کر

ادائے مست سے جس وقت کوئل کوک اٹھتی تھی
تو اس کے نشتریں نغموں سے دل میں ہوک اٹھتی تھی

گھٹا گھر گھر کے آتی تھی تو ہر ہر رگ پھڑکتی تھی
دلِ سرشار کے ارمان کی چھاتی دھڑکتی تھی

وہ ارماں کیا تھے کیسے تھے یہ مجھ کو خود نہیں معلوم
نہ ان کی ماہیت ظاہر نہ ان کا منتہا معلوم

تمناؤں کی اصلیت سمجھ میں ہی نہ آتی تھی
ان ارمانوں کی نوعیت سمجھ میں ہی نہ آتی تھی

یہ حالت تھی کہ بس آٹھوں پہر خاموش رہتا تھا
کسی گہری سہانی فکر میں مدہوش رہتا تھا

تصور کی فضاؤں میں رہا کرتا تھا میں ہر وقت
کسی دریا کی لہروں پر بہا کرتا تھا میں ہر وقت

بنائی تھیں تخیل نے کئی رنگین دنیائیں
کہ جن میں دل دماغ اور روح عیش بیکراں پائیں

میں دن رات آہ اک موہوم مستقبل میں رہتا تھا
اسی موہوم مستقبل کے قصے دل سے کہتا تھا

چھپی ہوتی تھی غمگینی مرے رنگیں خیالوں میں
بھری ہوتی تھی غمگینی مرے رنگیں خیالوں میں

مزا آتا تھا بے حد عشق پر خوں کے فسانوں میں　محبت کی حدیثوں میں جنوں کی داستانوں میں

غنائی شاعری سے ہوگئی تھی گہری دلچسپی　ہوئی پہلے نہ ہو آئندہ اتنی گہری دلچسپی
کوئی باجا بجاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا　رسیلے گیت گاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا
سناتی تھی مجھے جس طرح موسیقی سناؤں کیا　رلاتی تھی مجھے کس طرح موسیقی سناؤں کیا
حواس و ہوش پر وارفتگی سی چھائی رہتی تھی　طبیعت پر شباب افروز مستی چھائی رہتی تھی
نشہ میں چور سی رہنے لگی تھی خوابناک آنکھیں　چمکتی تھیں امنگوں کی ضیا سے تابناک آنکھیں
مرے سینہ میں تھی آباد حسیات کی دنیا　ہمیشہ مضطرب رہتی تھی یہ جذبات کی دنیا
جوانی کا لہو میری رگوں میں گنگناتا تھا　بہت پر کیف لیکن ایک مبہم گیت گاتا تھا

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ آفت آنے والی ہے
محبت قہر بن کر روح پر چھا جانے والی ہے

اختر انصاری

غزل

وہ دن بھی خوب تھے، کیا لطف کا زمانہ تھا　کہ ہم نے دوری احباب کو نہ جانا تھا
عزیب خانہ تھا صد رشک گلشن فردوس　امید و بیم کا پہلو بھی والہانہ تھا
کہیں بھی آنکھ ملاتے تو نشہ آجاتا　جدھر نگاہ اٹھاتے خمار خانہ تھا
خیال میں ہے وہ کیف بہار کی تعبیر　کہ جس کا خواب، محبت کا اک فسانہ تھا
کئے تھے عہد وفا کے جنھوں نے خود صد حیف　انھیں کو پاس وفا ہم سے آزمانا تھا
جو جانتے بھی نہ تھے رسم و راہ غربت کی　دیار غیر میں ان کو ہی بھول جانا تھا
ہوئی خبر یہ خزاں میں کہ زندگی کی بہار　نوید عیش نہ تھی غم کا اک بہانہ تھا

سمجھ سکے بھی تو مقبول آہ یہ سمجھے
کہ زندگی کا تجاہل بھی عارفانہ تھا

سید مقبول حسین احمدپوری

بھلائی ہوئی کہانی

"بہن بہن ذرا یہاں آنا تو" منتظم صاحب کی بیوی نے برابر والے مکان سے آواز دی۔ "آئی بہن آئی" اماں نے یہاں سے جواب دیا۔

میں کالج کا پورا اپنے کمرے میں سگریٹ کے کش لگاتا، بیٹھا "صنوبر کے سایے" پڑھ رہا تھا، چنچل بی بی بابو نچال کی طرح دوڑتی ہوئی آئی۔ کتاب اور سگریٹ ہاتھ سے چھین کر ایک طرف پھینک دیا، وہ بدحواس تھی۔ بڑی لجاجت سے بولی "بھائی جان اٹھو، بیچاری کو بچھو کاٹ گیا" میں نے پوچھا "کس کو کون بیچاری کیا بکھو، صاف صاف کہو" کہنے لگی "حورا کو کاٹا ہے منتظم صاحب کی بیٹی میری سہیلی کو"

حورا ... منتظم صاحب کی بیٹی ...... وہ معصوم لڑکی ...

ایک مرتبہ اتفاقاً میری اس کی آنکھیں چار ہوگئی تھیں، شرما گئی تھی وہ . . .

میرا دل دھڑکنے لگا، میں نے کہا "تو میں کیا کروں" "تو کیا کرو گے؟ بچھو اتارو" اتنے میں اماں بھی آگئیں، انھوں نے سہارا دیا "ہاں اور کیا کرو گے، بچھو اتارو، اٹھو جلدی کرو، بٹیا مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے حورا" میرا دل اور دھڑکنے لگا، میں نے اپنی حالت کو چھپاتے ہوئے اعتذار کیا "مگر اماں میں نماز روزے کا تو پابند نہیں، جو میری زبان میں تاثیر ہو، اترے گا نہیں تو خواہ مخواہ کو شرمندگی ہوگی"

"روزہ نماز کے پابند نہ ہوئے تو کیا ہوا، اللہ کا کلام ہی تو ہے، تاثیر کہاں جائے گی" اماں نے استدلال کیا اور حکمانہ انداز میں بڑے پیار سے بولیں "چل اب باتیں نہ بنا، اٹھو جلدی جا" میں نے تامل کیا تو بی بانے جھٹ سے میرے سر پر ٹوپی رکھ دی، پاؤں میں سلیپر پہنا دیے اور کھینچتے ہوئے باہر لے چلی، میں نے اسے روکا "ارے ٹھیر تو ایسی بھی کیا جلدی ہے، جاتا ہوں" تو اس نے روہانسی ہوکر بڑے خلوص سے کہا "نہیں بھائی جان مری جارہی ہے۔ میری حورا دیر نہ کرو"

ہمارے اور منتظم صاحب کے مکان کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی اور اس قربت اور دیرینہ ہمسائیگی کے باعث ہمارے اور ان کے تعلقات نے عزیزداری کا رنگ اختیار کرلیا تھا، دیوار سے ہمیشہ سیڑھی لگی رہتی تھی، جس پر چڑھ کر اماں اور بی بی منتظم صاحب کی بیوی اور بیٹی سے باتیں کیا کرتیں تو خیر! اماں نے اطلاع دی "بہن تمنے آرہا ہے" میں دروازے پر ٹھٹکا تو ملازمہ نے پردہ اٹھا کر کہا "آئیے میاں" میں ہمت کرکے مکان میں داخل ہوا، سامنے ہی برآمدے میں حورا لپٹی لپٹائی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ مجھ سے کچھ بن نہ پڑتا تھا، اماں نے اوپر سے للکارا "عمل پڑھو، سوچ کیا رہے ہو" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں دریافت کیا "کہاں کاٹا ہے" ملازمہ نے ترجمانی کی "انگلی کو ہاتھ کی کاٹا ہے میاں (مردہ بچھو کو دکھاتے ہوئے) یہ دیکھئے کتنا بڑا ہے موذی، جب سے کیا کیا نہ کیا، دوائیں لگائیں لاکھ لاکھ جتن کیے لیکن وہ تو الٹا چڑھتا ہی جاتا ہے، بی بی بڑا آفریں ہے تحمل کررہی ہیں" میں نے حورا سے مخاطب ہوکر کہا "ہاتھ دیکھئے" لیکن اس نے ٹس سے مس نہ کیا، میں نے پھر کہا "ہاتھ دیکھئے" لیکن اس نے اب بھی نہ دیا، شدت تکلیف سے اس کا سانس پھول رہا تھا، تاہم وہ برداشت کیے بیٹھی رہی، اب ملازمہ سے نہ رہا گیا اس نے کہا "بی بی ہاتھ کیوں نہیں دیتیں آپ" اور جھک کر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا........ لیکن ادھر میرا حال ..... عمل پڑھنا بھول گیا..... مجھے کچھ یاد نہ آرہا تھا، میری پیشانی عرق آلود ہوگئی، میں نے بوکلاہٹ کو چھپاتے ہوئے ہونٹ ہلانا شروع کیے جو شاید ہل بھی نہیں رہے تھے اور دوسرا ہاتھ جو کانپ رہا تھا اس کے نرم اور گداز بازو پر پھیرنے لگا، چند لمحوں بعد اس کے نازک ہاتھ کو اپنے پنجے کی گرفت سے آزاد کرکے بولا "ہاتھ جھٹکئے" دوسری بار کہا "ہاتھ جھٹکئے" لیکن اس نے اب بھی نہیں جھٹکا ملازمہ پھر بولی "بی بی ہاتھ جھٹکئے نا" جب بھی عمل نہیں کیا گیا تو اس نے بڑھ کر حورا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دو تین جھٹکے دے کر چھوڑ دیا، میں نے دوبارہ ہونٹ ہلائے اور انگلی پر دم کیا پھر ہاتھ چھوڑ کر جھٹکنے کو کہا اس لئے ستانہیں تو اب کے

..نا نے خود اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دو تین جھٹکے دینے کے بعد اپنا فرض ادا کرتے ہوئے پوچھا "کہیے اترا؟" خاموش، میں نے دوبارہ پوچھا، سہ بارہ پوچھا لیکن وہاں ایک خاموشی سب کا جواب تھی، حورا کے اس مسلسل خاموش رہنے سے اماں کو زبان ہلانے کا موقع ہی تو ملا بولیں "بیٹی بولتیں کیوں نہیں، اس میں شرمانے کی کیا بات ہے" میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرے ہاتھ کی گرمی کا اثر تھا یا اس کی ماں کی دعا کی تاثیر کہ وہ بہت ہی مہین آواز میں جس کو غالباً میرے اور ملازمہ کے سوا دوسرا نہ سن پایا ہوگا بولی "اتر رہا ہے" میری باچھیں کھل گئیں خدایا تیرا شکر...... مجھے ہرگز اس کامیابی کی توقع نہ تھی کیونکہ مجھے اب تک عمل ہی نہ یاد آیا تھا، میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب میرے سامنے عمل کے حروف ناچ رہے تھے، میں نے اب سچ مچ عمل پڑھنا شروع کیا، انگلی پر پھونک ماری اور بازو پر ہاتھ پھیرا اور دو تین جھٹکے دے کر امید و بیم کی کشمکش میں دریافت کیا "اب کیا حال ہے" معلوم ہوا کہنی تک اتر آیا ہے، اب میں جلد جلد عمل پڑھتا اور حال پوچھتا دو تین بار کے عمل پڑھنے سے تکلیف تقریباً رفع ہو گئی، میں نے بڑی نرمی سے پوچھا "اب تو نہیں رہا" تو اس شرم و حیا کی پوٹ نے جواب میں کہا "اب بالکل نہیں رہا، البتہ انگلی کی اگلی پور میں جلن ہو رہی ہے" میں نے اس کی ہتھیلی کو جانے کیوں دباتے ہوئے تسلی دی "کچھ نہیں اب اتر گیا سمجھئے، جلن بھی جاتی رہے گی" اور ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، میں نے پالا مار لیا تھا۔ فاتحانہ دیوار کی طرف گردن اٹھائی، ہونٹوں پر کامیابی اور خوشی کی مسکراہٹ لیے ہوئے اماں اور بی بی بھی مسکرا پڑیں لیکن میری مسکراہٹ دفعتاً زائل ہو گئی...... مجھے جانا تھا وہاں سے، میں نے پلٹ کر اس کی ماں کو سلام کیا اور اجازت طلب کی، انھوں نے کمرے سے تشکر اور محبت بھرے الفاظ میں دعائیں دیں اور اب میں نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ کھونکی ٹوکا "لیکن بیٹا یہ کہاں چلے ٹھیرو تو سہی، کچھ کھا پی کر جانا" میں وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھتا تھا بولا "جی نہیں، کیا ضرورت اس کی" اس پر انھوں نے کہا "واہ یہ بھی خوب رہی، پہلی مرتبہ تو گھر آئے ہو وہ بھی محسن بن کر پھر کیا بغیر کھائے پیئے ہی چلے جاؤ گے، نہ بیٹیا یہ تو کبھی نہ ہوگا" لیکن میرے بار بار کے انکار سے آخر انھوں نے ہار مان اندر سے گلوری اور الائچیاں بھیج دیں، پان لیتے ہی میں ان کے مکان میں تھا اپنے مکان میں ہو گیا۔ بی با گویا میری پیشوائی ہی کو کھڑی تھی مجھ سے لپٹ گئی اور ہنستے ہوئے بولی "بھائی جان کیا مارا ہے تم نے بھائی جان کا بچھو عمر بھر نہیں بھولیں گی وہ" میں نے دل میں خوش ہو کر گرد کھا دے کو ناخوش ہو کر اس سے جھٹک دیا "چل چڑیل آئی کہیں کی اس کی نند"

چار مہینے بعد...... جب کہ میں فارغ التحصیل ہو گیا تھا بی با میرے کمرے میں آئی اسی شوخی اور شرارت کے ساتھ جو اس کی فطرت ہے، ہنستی، ناچتی اور کہنے لگی "لاؤ نورے کا ہاتھ" میں نے اس کے اس فقرے کو بے موقعہ سمجھ کر کہا "باؤلی تو نہیں ہو گئی" "مجھے باؤلی سمجھتے ہو" اس نے تن کر کہا "تو جاؤ میں جاتی ہوں اور جو خوشخبری سنانے آئی تھی نہیں سناتی" اور اب جانے ہی والی تھی کہ میں نے اس کے بشرے کو دیکھ کر اسے لپک کر پکڑ لیا اور پھسلانے لگا "نہیں میری دانا و فرزانہ بہن، تجھے باؤلی کون کہہ سکتا ہے، میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا، اچھا بتا تو وہ خوش خبری کیا ہے" لیکن وہ اب بتانے کیوں لگی تھی۔ مجھ سے خوب خوب خوشامدیں کروائیں۔ وعدے لیے اقرار مانگے تب کہیں جا کر ہاتھ چھوڑنے کو کہا اور "حورا بھابی!" کہہ کر بھاگ گئی۔

چار مہینے بعد...... آج کا دن میری زندگی کا سب سے بڑا دن تھا، میں نے اپنے مقصود کو پا لیا تھا، زندگی کی سب سے

بڑی تمنا کو' میری خوشی کی انتہا نہ تھی خیر خدا خدا کرکے رات آئی' رسم رسوات کے بعد آدھی رات گئے بی بابجے تجلہ' عروسی تک گھسیٹ لے گئی۔ دروازے پر پہنچ کر میری پیٹھ میں چٹکی بھری اور اندر دھکیلتے ہوئے بولی "جاؤ' بچھو آ آرو" اور باہر سے دروازہ بند کرلیا' میں منہ کے بل گرتے گرتے سنبھل کر کھڑا ہوا تو آنکھوں میں نور سا آگیا وہی میری بے رونق کوٹھڑی' وہی میرا بے آب و رنگ کمرہ لیکن اب وہ اور کسی کا حریم ناز تھا' حورا میری جانِ آرزو کا۔

"سہاگن مسہری" پر جس پر ریشمی مچھر دان کے کونے الٹ دیئے گئے تھے' حورا خوشبوؤں اور خوبصورتیوں کی پوٹلی بنی بیٹھی تھی' میں نے اسے مخاطب کیا' نہیں بولی' چھیڑا' نہیں بولی گدگدایا نہیں بولی میں تنگ آگیا' مجھے اس پر محبت آمیز غصہ آرہا تھا' میں سوچنے لگا کہ اب کیا ترکیب کی جائے' دو لمحوں تک چپکا بیٹھنے کے بعد جیسے سچ مچ بچھو نے ڈنک ماری ہو میں نے اچھل کر کہا "ہائے بچھو!" تیر نشانہ پر بیٹھا حورا جس نے مارے شرم کے اپنے آپ کو گٹھڑی بنائے رکھا تھا' بے تحاشا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لال مدرے کی چادر اس کے سر سے نیچے آرہی اور گہرے سرخ رنگ کی دلکش ساڑی کا آنچل جس نے اس کے حسین چہرے کو چھپائے رکھا تھا سر سے ڈھلک گیا اس کے چہرے کو پریشانی اور اضطراب نے اور حسین کردیا تھا' وہ مجھے دیکھ رہی تھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے' ان آنکھوں سے جن میں سچی محبت پڑی جھلک رہی تھی اور فدایانہ شوہر پرستی کا حقیقی جذبہ کروٹیں لے رہا تھا' وہ بہت حسین نظر آرہی تھی اتنی کہ مجھے بعد کو پھر کبھی نظر نہ آئی۔۔۔ میں بڑھا ایک والہانہ ایک مجنونانہ انداز میں اور اس کو اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگالیا' اس کے جسم سے وفا اور سپردگی کی بو آرہی تھی' میں نے اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر اپنی حقیر مگر دائمی محبت کی مہر ثبت کردی۔

چار مہینے بعد۔۔۔۔۔۔ رات کا آخری پہر ہوگا' حورا نے مجھے جگادیا' میں نے نیند کا لطف اٹھاتے ہوئے پوچھا "کیا صبح ہوگئی" "صبح تو نہیں ہوئی' ہوا چاہتی ہے لیکن مجھے بچھو نے کاٹا ہے اس نے آپ کو زحمت دی" "کب کاٹا" "ابھی ابھی" "کہاں ہے" "نہیں معلوم" میں ہڑبڑا کر اٹھا اور بچھو کو تلاش کرنے لگا' ابھی میں نے لحاف وغیرہ بھی پوری طرح اٹھا کر نہ دیکھے تھے کہ حورا مسہری پر بیٹھی بیٹھی گر پڑی' میں نے لحاف چھوڑا اسے سنبھالا" ارے ارے حورا!" لیکن وہ بے ہوش ہوگئی تھی اور اس کی دانتی جم گئی تھی' میں نے اسے بہت جھنجوڑا لیکن وہ بے سدھ ہی رہی' میرا دل ڈوبنے لگا' میں اس کو اسی حالت میں چھوڑ بھاگا ہوا اماں کے پاس گیا۔ انھیں اٹھایا اور سارا واقعہ کہہ سنایا ذرا دیر میں گھر کا گھر جاگ اٹھا' سب ہمدردی کر رہے تھے اور اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ مجھے کچھ نہ سوجھا میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلانے نوکر دوڑایا۔۔۔۔۔۔ پو پھٹ رہی تھی ڈاکٹر آیا اور اس نے بغور حورا کا معاینہ کیا' کبھی آلہ لگایا' کبھی پپوٹے کھولے' کبھی جلد کی رنگت دیکھی' پھر پوچھا "سانپ نے کاٹا ہے انھیں کتنی دیر ہوئی" میں آنکھیں پھاڑ نفی میں سر ہلایا "نہیں ڈاکٹر بچھو نے کاٹا ہے' ڈیڑھ ایک گھنٹہ ہوا" "بچھو نے کاٹا ہے" اس نے یقین نہ کرتے ہوئے سوال کیا" اور صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہوا' نہیں نہیں بچھو نہیں ہوسکتا" میں نے اسے یقین دلایا" بچھو ہی نے کاٹا ہے ڈاکٹر اور صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہوا" اس نے کہا "اچھا تو بچھو کہاں ہے" میں نے کہا "نہیں ملا وہ غائب ہوگیا' ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا' میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا میں نے ڈاکٹر کی شیروانی کا دامن پکڑ کر مسترحم لہجے میں بچوں کی طرح استفسار کیا" اب کیا ہوگا ڈاکٹر" اس نے مایوسانہ لہجہ میں موت کے آگے سپر ڈالتے ہوئے جواب دیا" خدا کی مرضی بچنے کی کوئی

امید نہیں" ...... میرا دماغ ماؤف ہوگیا...... میں نے حورا کے سر کو اپنے زانو پر لے لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیشانی سہلانے لگا، میری آنکھوں سے دو گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر گرے، اس نے آنکھیں کھول دیں اور نیم باز آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں اس کا نام لے کر پکارا "حورا!" وہ مجھے پہچاننے میں کامیاب ہوگئی، اس کے چہرے پر ایک سرمدی خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایک بیکس عالم میں مجھ سے سرگوشی کی "پیارے خدا حافظ فراموش نہیں کرنا اپنی حورا کو" پھر وہ خاموش ہوگئی اور کچھ وقفہ سے صرف اتنا کہہ سکی۔

"وہ عمل نہیں پڑھیں گے آپ"

سلیمان اریب

سلام

آنکھوں میں آرزوئے شرارت لئے ہوئے
دل کو فریب ذوق محبت دیئے ہوئے

رقصاں جبین حسن پہ طوفان آرزو
سہمی ہوئی نگاہ سے خاموش گفتگو

شوخی میں شرم شرم میں شوخی ملی ہوئی
ہونٹوں پہ اک ذرا سی ہنسی کھیلتی ہوئی

ہر ناز میں نیاز کا پہلو لئے ہوئے
پتلی سی انگلیوں کو ذرا خم کئے ہوئے

کچھ اس ادا سے ہاتھ اٹھا ہے سلام کو
میخوار جیسے جھوم کے لیتا ہے جام کو

ابرو کے خم پہ ہاتھ گیا جا کے رک گیا
گردن ہلی تو یوں ہی سا کچھ سر بھی جھک گیا

اک غم نصیب عشق کو بہلا رہے تو ہیں
کچھ دیر کے لئے مجھے سمجھا رہے تو ہیں

ان کے لئے مگر یہ بعید از قیاس ہے
کس درجہ میرا دل بھی محبت شناس ہے

میں نے فریب کھائے ہیں ایسے ہزار ہا
یہ کھیل وہ ہے کھیل لیا ہے جو بار ہا

اے حسن کج کلاہ تجھے جانتا ہوں میں
اس طرز کے سلام کو پہچانتا ہوں میں

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

بزدل

(موپساں کا ایک شاہکار)

سوسائٹی میں وہ "حسین سگنولس" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا پورا نام "ا واکمونتی گنتران جوسف دی سگنولس" تھا۔ وہ یتیم تھا لیکن والدین کی وراثت نے اسے کافی امیر بنا دیا تھا۔ وہ ایک قبول صورت اور وجیہہ نوجوان تھا جس کسی سے گفتگو کرتا اس کو اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ خاندانی نجابت و شرافت اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ باریک مونچھوں اور قدرتی گھنگریالے بالوں نے اس کی شخصیت کو دلکش اور بے حد جاذب نظر بنا دیا تھا۔ انہیں وجہ سے وہ بہت جلد صنف نازک کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔

رقص گاہ میں ہمیشہ اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے حلقہ میں "ہنس مکھ" ہونے کی وجہ سے کافی مقبول تھا۔ وہ ابھی تک کنوارا تھا اور ایک خوش حال و اطمینان بخش زندگی بسر کر رہا تھا۔ ڈوئل لڑنے اور بہادرانہ مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے وہ بہت شہرت حاصل کر چکا تھا۔

ایک شام کو ناچ کے بعد اس نے دو معزز خواتین اور ان کے شوہروں کو آئسکریم پر مدعو کیا۔ ابھی انہیں رستوراں میں بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ سگنولس نے محسوس کیا کہ ایک شخص عمداً ایک خاتون کو لگاتار گھور رہا ہے۔ خاتون کافی جھینپ گئی اور شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں آخر کار اس نے اپنے شوہر سے شکایتاً کہا۔

"وہاں ایک شخص کھڑا میری طرف دیر سے گھور رہا ہے۔ میں اس سے واقف نہیں ہوں، کیا وہ آپ کا شناسا ہے؟"

اس کے شوہر نے جو ان باتوں سے بے خبر اپنی آئسکریم کھانے میں مشغول تھا لاپروائی سے شخص مذکور کی طرف نظر اٹھائی اور "نہیں تو" کہہ کر پھر آئسکریم کھانے میں مشغول ہو گیا۔

خاتون نے غصے کے لہجہ میں جواب دیا "دیکھو تو وہ میری آئسکریم کا لطف بدمزہ کر رہا ہے"۔ شوہر نے پھر اسی بے پروائی سے کہا "ایسی باتوں کی پروا نہ کرو۔ ہم اگر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف متوجہ ہوا کریں تو ہمیں اور معاملات کے لئے فرصت بھی نصیب نہ ہو گی"۔ لیکن سگنولس کو یہ کب گوارا تھا کہ کوئی اس کے دوستوں کے لطف میں بدمزگی پیدا کرے وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا، یہ اس کا فرض تھا کہ معاملات کو سلجھائے یا دوستوں کا انتقام لے کیونکہ بہر حال وہ میزبان تھا، اور صرف اسی کی دعوت پر اس کے احباب نے رستوراں میں آنے کی تکلیف گوارا کی تھی، وہ شخص مذکور کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

"جناب آپ اس معزز خاتون کی طرف ایسی نگاہوں سے گھور رہے ہیں جو بے حد قابل اعتراض ہے، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا، آپ کو خبردار کئے دیتا ہوں کہ آپ ایسی ناجائز حرکت سے باز آئیں"

"مجھے اپنی ہی حالت میں چھوڑ کر چلے جائیے، جائیے"

"خبردار" سگنولس نے غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا "ورنہ میں سختی سے پیش آنے پر مجبور ہو جاؤں گا"۔

اس شخص نے صرف ایک لفظ زبان سے نکالا۔ ایک غیر شریفانہ گالی، جس کی گونج سے سارے رستوراں میں تہلکہ مچ گیا، رستوراں کے سب لوگ تقریباً چونک گئے۔ تمام حاضرین جن کی پشت ان کی طرف تھی پلٹ کر دیکھنے لگے، تین بہرے تو لٹو کی طرح گھوم کر گرتے گرتے بال بال بچ گئے۔ بے خبر خواتین تو اپنی جگہ سے ایسی اچھلیں گویا کوئی چھٹی ہو اور ایک مشین کی طرح خود بخود پلٹ گئیں۔

ہر طرف سناٹا چھا گیا، یکایک ایک تڑاخ سی آواز سنائی دی۔ سگنولس نے فریق مخالف کے چانٹا رسید کیا تھا۔ ہر شخص بیچ بچاؤ کے لئے کود پڑا، ڈوئل لڑنے کے لئے اپنے اپنے پتہ کے کارڈ تبدیل کر لئے گئے۔

جب سگنولس گھر پہنچا تو بے چینی کے ساتھ کمرے کے چکر

کاٹنے شروع کئے غصہ سے مغلوب ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ واقعات کی اس قدر جلد تبدیلی پر غور کرے۔ اس کے دماغ میں صرف ایک خیال چکر لگا رہا تھا ــــ ڈوئل اس نے اپنا فرض ادا کیا، تمام لوگ اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں گے، اس کی بہادری کی تعریف کریں گے، اسے مبارک باد دیں گے، وہ دماغی انتشار سے مغلوب ہو کر اپنے آپ چلا کر کہنے لگا "وہ بھی کتنا وحشی تھا"

وہ بیٹھ گیا اور آئندہ کے متعلق سوچنا شروع کیا، صبح ہوتے ہی اس کو "مددگار" ڈھونڈھتے ہوں گے، اس کو کسے انتخاب کرنا چاہئے؟ اس نے دل میں سوچنا شروع کیا کہ اس کے ایسے کتنے دوست ہیں جو با اثر اور مشہور ہیں، آخر کار اس کی نظر انتخاب مارکوئس۔ ڈی لا ٹورنائس اور کرنل بورڈن پر پڑی جو معزز بھی تھے اور شجیع بھی۔ یہ انتخاب بہترین رہے گا، تمام اخبارات میں ان کی وجہ سے دھوم مچ جائے گی، وہ بہت پیاسا تھا، اس نے لگا تار تین گلاس پانی کے پی ڈالے اور پھر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنا شروع کیا، اگر وہ اپنے آپ کو بہادر ثابت قدم اور دھن کا پکا ثابت کر دکھائے تو شاید فریق ڈر کر معافی مانگ لے۔

اس نے اپنی جیب سے فریق مخالف کا کارڈ نکالا، اور میز پر پھینک دیا، اس نے تیسری مرتبہ کارڈ پڑھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے وہ ایک مرتبہ رسٹوراں میں اور دوبارہ راستے کی برقی روشنی میں پڑھ چکا تھا، کارڈ پر صرف

جارج لابل
۱۵ "ریزمونسی"

لکھا ہوا تھا، اس نے ان الفاظ کے مجموعے کو غور سے دیکھنا شروع کیا جو اس کو عجیب و غریب دکھائی دے رہے تھے "جارج لابل"! یہ کون ہوگا؟ اس کا کیا پیشہ ہوگا؟ وہ اس معزز خاتون کی طرف کیوں گھور رہا تھا؟ کیا یہ ایک غیر شریفانہ فعل نہ تھا کہ ایک اجنبی یکایک ایک شخص کی زندگی میں اتنا جلد انقلاب پیدا کر دے صرف اس لئے کہ شاید اس کو عورتوں کی طرح گھورنے میں لطف آتا تھا؟ سگنولس نے دوبارہ چلایا "وہ عجیب وحشی تھا"

وہ ساکت کھڑا رہا، ابھی تک اس کی نظریں کارڈ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کے خلاف اس کے دل میں حقارت کے جذبات پیدا ہوئے، ایسا غصہ جس میں نفرت کی آمیزش تھی یکایک اس کی نظر ایک چاقو پر پڑی جو میز پر کھلا پڑا تھا، اس نے چاقو اٹھا لیا اور عمداً اس کارڈ میں گھونپ دیا ــــ گویا وہ اُس شخص کو زخمی کر رہا تھا،

تو آخر کار اس کو لڑنا ہی پڑے گا! تلوار اچھی رہے گی یا پستول؟ تلوار سے ایک حد تک اسے نقصان تھا، پستول کی وجہ سے ممکن ہے کہ فریق مخالف دست بردار ہو جائے، تلوار سے ڈوئل لڑنا بہت کم ہلاکت خیز ہوتا ہے کیونکہ سپر ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے دونوں صرف زخمی ہو سکتے ہیں، پستول زندگی اور موت کا جوا ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ شاندار کامیابی حاصل کر سکے۔

"مجھے ثابت قدم رہنا چاہئے" وہ سوچنے لگا "اس سے فریق مخالف ڈر جائے گا"! اس کو خود اپنی آواز سے خوف ہونے لگا، اس نے اپنے آپ میں بے حد کمزوری محسوس کی، اس نے پانی کا ایک اور گلاس ختم کیا، شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر جانے کی تیاری کرنے لگا، بستر پر لیٹ کر اس نے روشنی گل کر دی اور آنکھیں بند کرلیں۔

"میرے پاس معاملات سلجھانے کے لئے کل کا پورا ایک دن باقی ہے، مجھے آج رات آرام سے سو جانا چاہئے ...... اس کو مطلق نیند نہیں آئی، ذہنی اضطراب سے وہ سو نہ سکا بلکہ بے چینی سے بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔

اس کو دوبارہ پیاس محسوس ہوئی وہ پانی پینے کے لئے اٹھا یکایک اس کے دل میں ایک خوف ناک شبہ گزرا "کیا یہ ممکن ہے کہ میں ڈر گیا ہوں؟" اس کا دل ایک خفیف آواز کے ساتھ ہی کیوں دھڑکنے لگتا ہے؟ جب گھڑی بجنے کے قریب تھی تو صرف اس کے اسپرنگ کی حرکت کے ساتھ ہی اس کا دل اندر بیٹھتا ہوا معلوم ہوا، اس کے کئی منٹ تو صرف سانس لینے میں لگے، اس پر کمزوری کا بے حد غلبہ تھا، اس نے دل میں یہ سوچنے کی کوشش کی "کیا مجھے کسی طرح کا خوف یا اندیشہ ہے؟"

نہیں! اسے ڈرنا نہیں چاہیے کیونکہ وہ واقعات کو اختتام تک پہنچانا چاہتا تھا، وہ بغیر کسی پس و پیش کے لڑنے پر آمادہ تھا لیکن پھر بھی اس کا دل اس قدر مضطر اور پریشان ہونے لگا کہ وہ اپنے آپ سے بے ساختہ سوال کر گیا! کیا یہ ممکن ہے کہ وہ کسی سے ڈر گیا ہو؟ اور یہ شبہ ــــ یہ خوفناک خدشہ اس کے دل میں سما گیا۔

اگر کوئی اس سے زیادہ قوی تر خوف اس کی بہادری کو کچل دے تو؟ وہ مقام مقررہ پر یقیناً جائے گا۔ اس کی حیثیت اسے مجبور کرے گی، لیکن اگر وہ وہاں بے ہوش ہو جائے یا لڑکھڑا جائے تو؟ وہ اپنی حیثیت، شہرت اور عزت کا خیال کرنے لگا۔ اس نے یکایک یہ ارادہ کیا کہ اپنی صورت آئینہ میں دیکھے، اس نے چراغ روشن کیا۔ وہ اپنے چہرے کے عکس کو مشکل سے شناخت کر سکا گویا وہ کسی اجنبی کا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی نظر آئیں، وہ آئینہ کے سامنے کھڑا رہا۔ یکایک بجلی کی طرح ایک خوفناک خیال اس کے دل میں پیدا ہوا "پرسوں اس وقت تک شاید وہ مر جائے" اور اس خیال کے آتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"پرسوں اس وقت تک شاید میں مر چکا ہوں گا۔ یہ شخص جو میرے روبرو آئینہ میں کھڑا ہے۔ یہ "میں" جو اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ رہا ہوں، شاید پرسوں تک زندہ نہ رہوں گا" کیا یہ ممکن ہے؟ میں جو اپنا عکس اب دیکھ رہا ہوں اور زندہ محسوس کر رہا ہوں ــــ چوبیس گھنٹے کے بعد شاید بستر مرگ پر آنکھیں بند کئے پڑا ہوں گا۔ بے جان ــ ایک سرد نعش کی طرح۔"

وہ مڑا! اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کی بے جان نعش بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ موت کا سرد اور آہنی پنجہ اس کے گلے پر ہے۔ اب اس کو اپنے بستر سے بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ اور اس خوف کو دور کرنے وہ سگریٹ پینے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ایک سگار جلایا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس کو سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ نوکر کو بیدار کرے۔ لیکن اس نے ہاتھ فوراً روک لیا۔ "اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں ڈر گیا ہوں" اور بجائے گھنٹی بجانے کے اس نے خود ہی انگیٹھی سلگائی۔ کوئلے ڈالتے وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ خوف سے کانپ رہے تھے، اس کا سر چکرانے لگا، اس نے اپنے دماغ میں ایک ہیجان سا محسوس کیا، اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا، اس نے کھڑکی کے پردے چھوڑ دیئے۔

چمک دار اور سہانا دن نکل رہا تھا، سورج کی کرنیں سارے شہر پر پھیل رہی تھیں، ادھر سگنولس کے دل میں بھی نئے نئے جذبات اور امیدیں پیدا ہونے لگیں۔

وہ کتنا بے وقوف تھا کہ واقعات کے رونما ہونے سے قبل ہی خوف کو اپنے دل میں جگہ دیا اس سے قبل ہی کہ اس کے مددگار جارج لالا سے ملاقات کراتے ــــ قبل اس کے کہ اسے یہ معلوم ہو کہ آیا اسے لڑنا بھی پڑے گا؟۔ اس نے غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے، اور ایک مصمم ارادے کے ساتھ گھر سے باہر نکلا۔ اور وہ راستہ بھر سوچتا رہا۔ "مجھے مستعد رہنا چاہیے ــــ کامل مستعد مجھے یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ

مجھ میں ذرا بھی خوف و ہراس نہیں ہے" راستہ میں اس کی اس کے مددگار دوستوں مارکوئس اور کرنل سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اس سے تفصیلی بحث شروع کردی "کیا تم نے ڈوئل لڑنے کا مصمم ارادہ کرلیا؟" کرنل نے سوال کیا

"ہاں! مصمم ارادہ" — اس نے جواب دیا۔

"اور کیا پستولوں سے؟" کرنل نے پوچھا۔

قطعی!

کن قواعد پر عمل ہوگا؟ مارکوئس نے سوال کیا۔

بیس قدم کا فاصلہ ہوگا — مقررہ اشارہ پر — ہاتھ اٹھیں گے۔ اور گولیوں کا تبادلہ ہوگا، اس وقت تک کہ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی بری طرح مجروح ہوگیا ہو" سگنولس نے کہا۔

بہترین شرائط ہیں" کرنل نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "تم ایک بہترین نشان انداز ہو۔ پھر واقعات تمھارے ہی موافقت میں ہیں۔"

اور وہ علحدہ ہوگئے، سگنولس گھر لوٹا اور ان کا انتظار کرنے لگا، وہ بہ مشکل کچھ دیر حالتِ سکون میں بیٹھا رہا، لمحہ بہ لمحہ اس کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اس کے ساتھ پیر اور بدن متواتر کانپ رہے تھے، اس کا حلق سوکھ گیا تھا، زبان ہانپ رہی تھی۔ گویا نکل پڑنے کو ہے اس نے ارادہ کیا کہ لنچ کھائے — لیکن کھا نہ سکا، پھر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شراب سے اپنی کمزوری دور کرے، اس نے شیشہ سامنے رکھ لیا اور متواتر چھ جام چڑھا گیا، اس کو ایسا معلوم ہورہا تھا گویا اس کا سینہ جل رہا ہے اور دل اندر ہی اندر بیٹھ رہا ہے، وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا" بس تھوڑی دیر میں سنبھل جاؤں گا"!

لیکن ایک گھنٹہ کے بعد وہ شیشہ خالی تو کرچکا تھا مگر دل کی بے چینی اور بے قراری لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جارہی تھی اور کمزوری پہلے سے بہت زیادہ تھی، اس نے پاگلوں کی سی حرکتیں شروع کردیں کبھی زمین پر لوٹنے لگ جاتا، کبھی ہنستا، کبھی اڑتا، رات ہوگئی۔

دروازہ پر کوئی گھنٹی بجا رہا تھا لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ جاکر دروازہ کھولے اور اپنے مددگاروں کا استقبال کرے، اس نے ان سے گفتگو کی نہ سلام کیا اور نہ اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلا شاید اس کی آواز کی تبدیلی سے وہ لوگ اس کی کمزوری کا اندازہ لگالیں۔

سب کام تمہارے حسب خواہش ٹھیک ہوگیا" کرنل نے کہا" تمھارے فریق مخالف نے پہلے تو شرائط قبول کرنے سے انکار کیا لیکن بعد کو راضی ہوگیا، اس کے مددگار دو فوجی ہیں۔"

شکریہ" اس نے کہا،

مارکوئس نے کہا" ہمیں اجازت دیجئے۔ ہم یہاں زیادہ نہیں ٹھیر سکتے، ابھی ہمیں بہت کام کرنے ہیں، اول تو ہمیں کسی قابل ڈاکٹر کو تلاش کرنا ہوگا کیونکہ ڈوئل تو تب ہی ختم ہوگا جب کوئی نہ کوئی مجروح ہوجائے، اور تم جانتے ہو کہ گولیوں کا زخم بہت مہلک ہوتا ہے، اس کے علاوہ اطراف واکناف میں کوئی ایسی جگہ بھی تلاش کرنی ہوگی جہاں وقتِ ضرورت مجروح کو لے جانا پڑے اور ان سب انتظامات کے لئے کم از کم دو تین گھنٹے درکار ہیں، سگنولس نے دوبارہ کہا "شکریہ" اور وہ دونوں چلے گئے۔

جب وہ دوبارہ تنہا رہ گیا تو اس نے محسوس کیا کہ گویا وہ پاگل ہورہا ہے جب اس کے نوکر چراغ جلا چکے تو وہ میز پر خطوط لکھنے بیٹھا اور جب وہ کاغذ پر یہ الفاظ لکھ چکا کہ یہ میرا آخری وصیت نامہ ہے، تو اس میں مستقبل کے واقعات سوچنے کی ہمت نہ رہی، وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

ہاں! تو وہ لڑے گا — وہ کسی طرح اس ڈوئل سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ خود لڑنا چاہتا تھا، اس کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ لڑے، لیکن اس کے دلی ارادہ کے باوجود وہ اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس کڑی آزمائش میں پڑے، اس نے کوشش کی کہ اپنے ذہن میں ڈوئل کا نقشہ کھینچے — اپنا اور

اپنے حریف کے مقابلہ کا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اس کے دانت بجنے شروع ہوئے، اس نے خیال کیا کہ وہ تھوڑی دیر مطالعہ کرے اس نے میز پر سے دلرڈ کی کتاب " ڈوئل کے قواعد " اٹھالی پھر کہنے لگا " کیا میرے فریق مخالف کو پستول سے لڑنے کی کافی مشق ہے ؛ کیا وہ کوئی مشہور مشاق ہے ؟ میں کیسے جان سکوں گا ؟

اس کو یاد آیا کہ اس کے پاس مال کی ڈائرکٹری تھی اس نے اسے شروع سے آخر تک چھان ڈالی لیکن کہیں بھی جارج لامل کا ذکر نہیں تھا، اگر وہ مشاق نہ ہوتا تو ایسے خوفناک ہتیار سے لڑنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ؟

اس نے اپنے ہتیار کی پیٹی کھولی اور اس میں سے ایک پستول باہر نکالا وہ بہترے کے ساتھ نشان اندازی کی مشق کرنا چاہتا تھا، اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا، لیکن وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا، اور ہتیار بھی اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا

اس نے اپنے آپ سے کہا " یہ ناممکن ہے، میں ایسا نہیں لڑ سکتا " اس نے پستول کے سیاہ، خوفناک اور ہلاکت خیز سوراخ کی طرف نظر ڈالی وہ اپنی بے عزتی کا خیال کرنے لگا، لوگ سے طعنے دیں گے، دوست احباب اس پر قہقہے لگائیں گے، عورتیں اس سے نفرت کرنے لگیں گی، اخبارات اس کا مذاق اڑائیں گے. اور دنیا اسے " بزدل " کے نام سے پکارے گی۔

وہ ابھی تک پستول کی طرف دیکھ رہا تھا، پستول اتفاقاً بھرا ہوا تھا اس بات کو معلوم کرکے اسے دلی مسرت محسوس ہوئی۔ ــــ خدا معلوم کیوں ؟ اگر وہ فریق مخالف کے روبرو ذرا بھی لڑکھڑا جائے یا ہچکچائے تو یہ بات اس کی عزت کے خلاف ہوگی۔ اس کی تمام شہرت خاک میں مل جائے گی۔ چاروں طرف اس کی بدنامی اور رسوائی ہوگی، ہر کوئی اسے " بزدل " پکارے گا۔ اسے سوسائٹی سے نکال دیا جائے گا، اس کی شہرت پر داغ لگ جائے گا اور وہ سوچنے لگا " میں ایسی ذلت برداشت نہیں کرسکتا " لیکن پھر بھی یکایک اس میں دلیری عود کر آئی ــــ ابھی یہ خیالات اس کے دل میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس نے اپنی زبان کھولی، پستول کی نالی کو حلق تک اندر داخل کیا اور ــــ گھوڑا دبا دیا۔

جب پستول کے دھماکے کی آواز سے اس کے ملازم کی آنکھ کھلی تو وہ آقا کے کمرے میں بھاگا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا مالک مردہ پڑا ہوا تھا، سرخ خون کی دھاریں اڑ کر ان الفاظ کے نیچے ایک سرخ نشان ڈال رہی تھیں۔

" یہ آخری وصیت نامہ ہے "

(ترجمہ) **محمد حبیب اللہ اوج**

ارمغانِ جذب :۔ یہ جذب صاحب کی ایک سو رباعیوں کا مجموعہ ہے آغاز میں حضرت ماہر القادری کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، جس میں شاعری کے پہلوؤں پر ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے، رباعیاں ناصحانہ اور کسی حد تک حکیمانہ رنگ میں ہیں، بعض رباعیاں تو خاص طور پر دلکش اور داد و تحسین کی مستحق ہیں۔ **شاہکار مارچ ۱۹۴۰ء**

(۲) جذب صاحب حیدرآباد کے ایک وکیل ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فطرتِ انسانی کے اس تاریک پہلو نے جس سے ہر وقت وکیل کو واسطہ پڑتا ہے، ان کے احساس کو بہت روشن کردیا ہے ان کی رباعیاں زیادہ تر اخلاقی ہیں، اور خاص اثرات کے تحت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابتدا میں جناب ماہر القادری کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے مختلف پہلوؤں سے جذب کی رباعیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ **نگار مارچ ۱۹۴۰ء**

تفاوتِ راہ

دکن کے اردو نواز اداروں میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کو ایک نمایاں شہرت حاصل ہے اس ادارہ کے زیرِ اہتمام نہ صرف اردو علم و ادب کی بہتر سے بہتر کتابیں نشر ہو رہی ہیں بلکہ اس کے زیرِ سرپرستی مشہور خواتینِ دکن کی ایک علمی انجمن بھی قائم ہے، چنانچہ اس انجمن کی بدولت آج وہاں کی خواتین بھی حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ خدمت علم و ادب میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔

حال میں بزمِ خواتین کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے "سب رس" کا خواتین نمبر نذرِ دکن کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، جس میں دکن کے متعلق خواتینِ دکن کے مضامین اور نظمیں درج ہیں، اس مجموعہ میں شروع سے لے کر آخر تک جتنے مضامین اور نظمیں ہیں سب کا معیار بلند ہے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہماری خواتین میں بھی اب علم و ادب کا صحیح اور سلجھا ہوا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔

کتاب کے شروع میں محترمہ مسز ہمایوں مرزا کا مضمون "دکن میں سلاطینِ اسلام کی آمد" درج ہے۔ محترمہ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ مضمون بھی ان کی پختہ کاری کا ایک نمونہ ہے، ممتاز جہاں بیگم کا ایک محققانہ مضمون "دکن کے چند نادر اشعار" بہت محنت سے لکھا گیا ہے، موصوفہ نے اس مضمون میں دکن کے مختلف شاعر بادشاہوں کے مختصر سوانحِ حیات کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ قمر النساء بیگم صاحبہ کا تاریخی مضمون "مکہ مسجد کا سنگِ بنیاد" بہت دلچسپ ہے، تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ نے "وطنیت" کے موضوع پر اس خوبی سے لکھا ہے کہ انہیں داد دینی پڑتی ہے، صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ کا مضمون "دورِ آصفی کے مثنوی گو شعراء" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، محترمہ نے اپنے اس مضمون میں دکن کے مثنوی گو شعرا کا تذکرہ لکھا ہے شعراء کے مختصر سوانحِ حیات کے ساتھ ساتھ ان کا کلام بھی درج ہے مضمون کا انداز بیان اور طرزِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ نفسِ مضمون سے متعلق موصوفہ کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔

ان مضامین کے علاوہ باقی سب مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، کتاب کے حصۂ نظم کا معیار بھی اچھا خاصہ ہے، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے اپنی غزل میں قوم اور ملک کی خستہ حالی اور زمانہ کی موجودہ تباہ کن روش پر نہایت خوش اسلوبی سے قابلِ قدر خیالات کا اظہار کیا ہے، کچھ عرصہ ہوا محترمہ "ولی کے تخیل" پر ایک نہایت گراں پایہ مضمون لکھ کر ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں اس غزل پر بھی انھیں بزمِ ادب کی طرف سے پہلا انعامی کپ دیا گیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے "سب رس" کے اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں جس محنت ہمت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے، ہم اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خواتینِ دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لائق ہے۔

تاجور نجیب آبادی شاہکار لاہور ستمبر ۳۹ء

(۲)

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سب مضامین خواتین کے لکھے ہوئے ہیں ہر مضمون اپنی جگہ خوب ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دکن کے متعلق ایک بڑا ذخیرہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مساعی قابلِ داد ہیں کہ اس نے خواتین کی ایک بڑی جماعت میں ادبی رجحانات پیدا کر دیئے ہیں "شاعر" کے ناظرین اپنی خواتین کے لئے "نذرِ دکن" کی ایک ایک جلد منگا دیں تاکہ وہ بھی دکن کی اس بیداری سے متاثر ہو سکیں۔

اعجاز صدیقی شاعر آگرہ اگست ۳۹ء

(۳)

سب رس کا یہ خواتین نمبر "نذرِ دکن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ دکن کی تعلیم یافتہ و انشاپرداز خواتین کے دکن کے متعلق

علمی و ادبی و تاریخی مضامین نظم و نثر اس میں درج کئے گئے ہیں اور یہ مجموعہ مضامین بہت دلچسپ و قابلِ دید ہے۔

ایم اشفاق حسین صدیقی رہنما مرادآباد واگست ۳۹ء

(۴)

عہدِ عتیق کی زندہ جاوید روایات سے قطع نظر عصرِ حاضر کی زندہ مثال "نذرِ دکن" اس بات کی شاہد ہے کہ صنفِ نازک کو قدرت نے وہ تمام جواہرات علمی و خصوصیات ادبی کس قدر وسیع پیمانہ پر ودیعت فرمائے ہیں، جس کو "حضرت مرد" اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ نذرِ دکن ایک ادبی شاہکار ہے جو کلیتہً ادب نواز خواتین دکن کے رشحاتِ قلم اور کاوشِ دماغی کا شاندار نتیجہ ہے جس میں نہایت پاکیزہ اور بلند پایہ نظموں کے علاوہ مختلف عنوانات پر مفید مضامین بھی شامل ہیں جو نہایت عالمانہ و فاضلانہ حیثیت لئے ہوئے ہیں، اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ صنفِ نازک کے جذبات کس قدر لطیف اور حسیات کتنے پاکیزہ ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "فرقۂ ناقص العقل" قوم و ملک کے لئے ادبی حیثیت سے کس قدر مفید ہے۔ ہم دکن میں اس نسوانی ذوق ادب کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں جو درحقیقت سلطان العلوم حضور خسرو دکن کی علم پروری و ادب نوازی کا پرتو ہے اور محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کو قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں جنھوں نے اس کلام کو مجموعی حیثیت سے شایع کرکے اربابِ ذوق پر بالعموم اور اپنی جنس پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ **حامد شاہجہاں پوری ماہ نیم ماہ دہلی نومبر ۳۹ء**

(۵)

نذرِ دکن ان ۸۰ مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو خواتین دکن نے زیادہ تر حیدرآباد دکن کے متعلق لکھے ہیں، اس کی مرتبہ سکینہ بیگم ہیں اور ناشر ادارۂ ادبیات اردو ــــ مجموعہ میں کئی مضامین دلچسپ، مفید اور پراز معلومات ہیں۔ حیدرآباد دکن کی اکثر مضمون نگار خواتین نے اس میں شرکت کی ہے۔ **رازق الخیری عصمت دہلی جنوری ۴۰ء**

(۶)

ادارۂ ادبیات اردو جس سرگرمی اور محنت سے اردو کی نشر و اشاعت کر رہا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے موجودہ دور میں جب کہ اردو کے لئے حیات و موت کا سوال درپیش ہے ادارۂ ادبیات اردو جیسے مخلص اداروں کا وجود بہت غنیمت ہے، ادارہ ادبیات اردو متعدد مفید اور گراں پایہ کتابیں شایع کرچکا ہے چنانچہ یہ کتاب بھی اسی کے زیرِ انتظام شایع ہوئی ہے کتاب میں دکن کی نامور اہل قلم خواتین کے اسّی کے قریب مضامین نظم و نثر درج ہیں ہر نظم اور ہر مضمون حیدرآباد کے کسی نہ کسی شعبے سے متعلق ہے کتاب میں پانچ تصویریں بھی ہیں محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی یہ کوشش نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی۔

مرزا ادیب بی اے۔ ادبِ لطیف لاہور جنوری ۴۰ء

(۷)

نذرِ دکن ایک خاتون کی مرتب کی ہوئی ہے۔ خواتین دکن کے مضامین نثر و نظم کا مجموعہ متعلق دکن ہے، مضامین سب ایک سطح کے نہیں بعض یقیناً قابلِ قدر ہیں، صفحہ ۵، پر جو غزل ہے وہ اپنی معقولیت کے اعتبار سے دوسروں کے لئے ایک نظیر اور سبق ہے۔ **عبدالماجد دریابادی صدق لکھنؤ ۱۵ اگست ۳۹ء**

(۸)

میری رائے ہے کہ اس کی نکاسی فوراً موقوف کردی جائے۔ تمام جلدوں کا انبار کرکے نذرِ آتش کیا جائے اور راکھ کو کھاد میں ملاکر کسی ثمر آور درخت کی تقویت کے لئے استعمال کیا جائے۔

ایک ریڈر عمرانیات۔ اردو دہلی جنوری ۱۹۴۰ء

مذکور بالا سات مبصروں کی رایوں کے ساتھ آٹھویں رائے کا مقابلہ کیجئے تو تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔ **"رہ نورد"**

سوئٹزر لینڈ کی دیہاتی زندگی (بسلسلۂ گذشتہ)

ایک عام خیال ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ یورپ والوں میں ہمدردی کا مادہ نہیں ہوتا اس لئے کہ وہاں کی زندگی بالکل میکانی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ممالک میں اور بڑے بڑے شہروں میں بھی یہی کیفیت ہو لیکن کم از کم ہمارے ایک تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ یورپ میں ہمدردی پائی جاتی ہے تو ایسی بے لوث کہ ہندوستان میں اب آج کل مشکل سے دستیاب ہوگی۔ بین قومی کانگریس کے دوران میں جب میں زیورخ جانے والا تھا تو ایک بات کا بڑا تردد تھا۔ میری اہلیہ کی طبیعت خراب تھی اور خیال تھا کہ ان کا میرے ساتھ زیورخ جانا تکلیف مالایطاق ہوگا۔ خصوصاً اس لئے کہ وہاں میں کانگریس کے کاموں میں مشغول رہوں گا پھر انھیں تنہا چھوڑنا بھی ایک قابل غور مسئلہ تھا۔ یوں تو ہوٹل والے بالکل اپنوں کی طرح پیش آتے تھے تاہم اس کی ضرورت تھی کہ کوئی بی بی ایسی مل جاتی جو زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گزارے ظاہر ہے کہ ہمارا ملاقاتی خاندان تو کوئی تھا نہیں، لیکن ہوٹل کے مالک ھوائیزرمان صاحب نے اپنی ایک جان پہچان خاتون کو جن کا نام (Frau Sutter) تھا میری اہلیہ سے لا ملایا اور میرے پیچھے وہ بیچاری پورے پورے دن میری اہلیہ کے ساتھ نہیں، یعنی صبح کو آتیں، کچھ کام کاج، مثلاً کروشیہ وغیرہ کا سامان اپنے ساتھ لاتیں اور برابر ہمارے یہاں شام تک رہتیں اور شام کو چلی جاتیں۔ میں زیورخ سے ایک آدھ مرتبہ آیا تو خیال ہوا کہ انھیں کسی قسم کا معاوضہ دیا جائے، لیکن میری اہلیہ نے کہا کہ وہ پیشہ ور نرس نہیں ہیں بلکہ محض ہمدردی کی خاطر ایسا کر رہی ہیں۔ ۱۱ ستمبر کو زیورخ سے قطعی واپس آ جانے پر ان سے اور ان کے شوہر اور پورے خاندان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے شوہر کا سگار، سگریٹ بنانے کا ایک کارخانہ (Oaderkallweil) نامی گاؤں میں ہے اور (Boniswil) کی ایک پہاڑی پر چھوٹا سا خوبصورت مکان ہے جہاں سے پوری جھیل نظر آتی ہے۔

ان کی (Mercedes) گاڑی میں پوری جھیل کا چکر لگایا معلوم ہوا کہ جھیل کے آخر میں ہماری کینٹن آرگاؤ ختم ہو جاتی ہے اور لوسرن کی کینٹن شروع ہوتی ہے اور چونکہ سوئٹزرلینڈ میں ہر کینٹن کے معمولی قوانین جداگانہ ہوتے ہیں اس لئے آدھی جھیل کے کنارے پر قوانین کے ایک سلسلے کا نفاذ ہے اور آدھی پر دوسرے کا۔ ہم ایک گاؤں (Beinwill) ہو کر گھر آئے جہاں سگار سازی کے تقریباً بیس کارخانے ہیں۔ ہمارے مہربان میزبان نے بتایا کہ سوئٹزرلینڈ میں تمباکو کی پیداوار مطلق نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان، جاوا، امریکہ وغیرہ سے آتا ہے تاہم سوئس اپنے ہی سگار بناتا ہے اور نفع ہوتا ہے۔ عزم کا یہ عالم ہے کہ سوٹر صاحب کی ایک لڑکی جو اس سے پہلے کبھی اپنے چھوٹے سے ملک سے باہر نہ گئی تھی اس نے انگریزی سیکھنے کے خاطر انگلستان میں ایک پرادلس کے یہاں گورنس کی ملازمت کر لی تھی، چنانچہ وہ پہلی مرتبہ اپنے ملک سے اور پہلی ہی مرتبہ ہوائی جہاز میں اڑ کر انگلستان گئی۔ غرض مسز سوٹر نے جو اپنے گھر کی کھاتی پیتی ہیں محض حسبۃً للہ میری اہلیہ کی تیمارداری اور ہم نشینی کی اور میری واپسی پر کئی مرتبہ مجھ سے ملنے اور دیکھنے کے لئے آئیں اور اپنے پورے خاندان کو لائیں۔ ہم ان کا کسی طرح پوری طور پر شکر یہ ادا نہیں کر سکے۔ ہمارے یہاں عام طور پر اس حیثیت کے لوگوں کو اپنی آرام طلبی اور عیش سے کیا پرواہ ہے جو محض صلۂ رحم کی طور پر خدمتِ خلق کریں!

زیورخ سے واپسی پر بھی میں تقریباً ہر روز کسی نہ کسی گاؤں کا چکر لگاتا تھا اور اس ملک کی معاشی ترقی کے پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کرتا۔

۱۲ ستمبر کو (Sarmanstorf) نامی گاؤں گیا

راستے میں نیل کا ایک دلچسپ پتھر دیکھا جس پر ۱۵۹۰ء کی تاریخ کندہ تھی اور گاؤں میں ۱۶۶۰ء کی ایک صلیب سڑک کی ایک طرف نصب تھی۔ یہاں سے کیتھولک آبادی شروع ہو جاتی ہے چنانچہ گرجا نقاو بڑا اور بتوں سے بھرا ہوا تھا۔ حسب معمول گاؤں میں بجلی سے چلنے والے کئی چھوٹے چھوٹے کارخانے تھے۔ بعض بڑے بڑے شہتیر کاٹنے کے کارخانے جہاں درد ھیا کا بڑے سے بڑا تنا (بعض تنے ۴۰، ۴۰ ۵۰، ۵۰ فٹ طویل ہوتے ہیں) چار پانچ منٹ میں کٹ جاتا ہے بعض دیا سلائی کی ڈبیاں بنانے کے کارخانے اور بعض مصنوعی تنکوں کی ٹوپیوں کے کارخانے۔ گاؤں بس کارخانوں سے بھرا ہوا تھا۔

۹ر ستمبر کو (Niederhallwil) گیا جہاں ہمارے مہربان سونز صاحب کا سگاروں کا کارخانہ ہے۔ اس گاؤں میں زیادہ سے زیادہ ۳۰، ۴۰ مکانات ہوں گے لیکن علاوہ سگار کے کارخانے کے ہلکی سستی لکڑی کی کرسیاں اور آلات کشاورزی بھی بنتے ہیں۔

۱۲ر ستمبر کو قصبہ (mee s) گیا جو اس نواح کا سب سے بڑا قصبہ اور یہاں کے اعتبار سے بمنزلہ ایک "شہر" کے ہے۔ آبادی نہایت مرفہ الحال ہے اور یہاں پھلوں کے جام، لکڑی کی چیزیں اور سگاروں کے کارخانے ہیں۔

۱۴ر ستمبر کو یہ انکشاف ہوا کہ خود ہمارے گاؤں میں ایک ایسا کارخانہ ہے جس کے مال کی نکاسی ہندوستان اور امریکہ تک میں ہوتی ہے، یعنی جمع تفریق کی مشین کا کارخانہ۔ میں بطور خاص وقت مقرر کرا کر اسے دیکھنے گیا۔ مشین کے پرزے نہایت درجہ باریک اور نفیس ہیں اور لاکھوں کروڑوں کی جمع تفریق چشم زدن میں کر دیتے ہیں اور کیا مجال ایک غلطی بھی ہو جائے۔ میں نے کلکتہ، بوئنے نوس ایریس اور آسٹریلیا تک کے لئے صندوق تیار دیکھے۔ کارخانے میں نہ غل تھا نہ غبار بلکہ نہایت درجہ خاموشی سے کام ہو رہا تھا۔ لطف یہ ہے کہ تمام کارخانے میں صرف ۳۵ لوگ ملازم تھے ہر شخص کے سامنے ایک چھوٹی سی مشین تھی اور اپنے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ حقیقت میں غور کیا جائے تو سوئستان کی ترقی کا راز زیادہ تر گھریلو صنعتوں پر ہے لیکن ایسی صنعتیں نہیں جن کی بنیاد ہاتھ کے چرخے دستی کھڈے پر ہو (اس لئے کہ سوئس جانتے ہیں کہ دست کاری کسی طرح سے کلوں کی بنائی ہوئی اشیا سے مقابلہ نہیں کر سکتی) بلکہ ایسی صنعتیں ہیں جس کا اساس چھوٹی چھوٹی مشینیں ہوں جن سے انسانی محنت بچے اور خام پیداوار کو آسانی سے کام میں لایا جا سکے۔ علاوہ Reen (Affersuil) کے جہاں شہرۂ آفاق ہندستی فرم (Volkart Brothers) کا مرکز ہے یا (Baden) کے جہاں Diesel Engines بنتے ہیں، سوئستانی صنعتوں کے مراکز یہی گاؤں اور قصبے ہیں جہاں لکڑہارے نے آرہ کشی کی چھوٹی سی برقی مشین خریدی ہے تو چمار کے پاس مختصر سی برقی مشین جوتے سینے کی ہے اور لوہار کے پاس برقی بھٹی اپنے اوزار بنانے کے لئے ہے، جو لاتعداد پھل پیدا ہوتے ہیں ان کے لئے گاؤں گاؤں کارخانے ہیں جہاں انھیں ٹینوں میں بند کیا جاتا ہے اور جام کی شکل میں منتقل کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گاؤں گاؤں اور گھر گھر مرفہ الحال نظر آتا ہے۔

۱۶ر ستمبر کو زیورخ کا جو اخبار (Neue Zuercher Zeitung) ہے اور جو سوئستان کا سب سے بڑی اشاعت والا اخبار ہے اس کی طرف سے ٹیلیفون آیا کہ میں حیدرآباد کے حالات لکھ کر بھیجوں۔ میں نے وعدہ کر لیا اور ۱۵ر ستمبر کو یعنی اپنی روانگی سے ایک روز پیشتر یہ مضمون بھیج دیا (یہ حالات اس اخبار کی اشاعت ۱۹ر اکتوبر میں طبع ہوئے اور میں نے ان کا انگریزی ترجمہ حیدرآباد بلیٹن کی اشاعت ۱۵ر نومبر ۱۹۳۸ء والی اشاعت میں چھپوا دیا ہے۔)

۱۵ر ستمبر کو اس دیہات میں میرے قیام کا آخری دن تھا، یہاں سے

۴ ۱/۲ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پرانی گڑھی (Hillfiron) نامی دیکھنے گیا۔ پہاڑ پر چڑھائی اور اترائی نہایت سخت تھی۔ کال سترہویں صدی کی ہے اور گرجا ۱۵ء کا بنا ہوا ہے۔ پہاڑ پر جاتے ہوئے نہایت لطیف مناظر سامنے آتے ہیں۔ چوٹی پر سے تین قصبے یعنی (Dichthan Villemerg) اور (Wohlan) ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے نقشے پر بنے ہوں اور تین اہم جنگوں یعنی ۱۳۵۶ء، ۱۷۱۲ء، اور ۱۸۴۷ء کی اہم جنگوں کے میدان ایسے کھلے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی تاریخی نقشے پر۔ افسوس ہے کہ اتوار کی وجہ سے کا سل بندگی گو اس کی نفیس فصیل، خندق اور لوہے کے مضبوط دروازے دیکھے۔ گیارہ بجے بریسٹن برگ سے چلا تھا اور ڈیڑھ بجے واپس آگیا۔ راستے میں پیاس لگی تو ایک کاشتکار کے گھر پانی پیا۔ پانی شیشے کے گلاس میں ایک بچے نے لا کر دیا اور ایک صاف ستھری طشتری میں سیب اور ناشپاتی کی بھی تواضع ہوئی۔ واپسی میں ایک سوئس بی بی اور ان کے دو بچوں کا ساتھ ہوا جو یہاں سے ۹ کلومیٹر پر ایک گاؤں پیدل جا رہی تھیں اور شام کی وقت واپسی کا قصد تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے سوال کیا کہ آپ ریل یا دوسری سواری میں کیوں نہیں جاتیں تو جواب دیا کہ ریل بدلنی پڑتی ہے، وقت اتنا ہی صرف ہوتا ہے پھر سواری کی کیا ضرورت ہے!! یہ ہے یہاں والوں کی تندرستی اور عزم کی حالت۔ شام کے وقت اسباب باندھا۔ آج موسم نہایت اچھا تھا۔ خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کچھ اس لئے اور کچھ سر ملکم کیمبل کو دیکھنے کی غرض سے تقریباً ۲۰۰ لوگوں نے یہاں کھانا کھایا۔ ۱۹ ستمبر کو ایک مہینے کے قیام کے بعد (جب ہر شخص نے مالک ہوٹل سے لے کر نفل تک ہمہ تک بعد آرام پہونچانے کی کوشش کی تھی) ہم نے بریسٹن برگ کو خیرباد کہا اور موٹر کے راستے ایک گھنٹے میں زیورخ پہونچ گئے۔

ہارون خاں شروانی

غزل

مجھ کو مدت سے غم چارہ گری ہے ساقی
ہر نفس اک گلۂ کم نظری ہے ساقی

پھر ہوئی گوہرِ نایابِ معانی کی تلاش
سرکشی ضامنِ عالی نظری ہے ساقی

زندگی تھی کہ تھا گردابِ مصائب۔ توبہ
بس کہ اب آرزوئے بے خبری ہے ساقی

کاٹے کٹتی نہیں برسات کی لمبی راتیں
بادہ تسکیں دہ دردِ جگری ہے ساقی

جوئے خوش رَو کے کنارے یہ جیسے بزمِ نشاط
کتنی پرکیف نسیمِ سحری ہے ساقی

میں خم آشام ہوں آداب کا پابند نہیں
وقت و موسم فقط اک دردِ سری ہے ساقی

لطف افزا ہے سرِ شام کی بوندا باندی
توبہ کو آرزوئے جامہ دری ہے ساقی

دلبری کے جو خصائص ہیں تجھے حاصل یاں
ملتفت ہم سے تری کم نظری ہے ساقی

سنتے ہیں باغِ جوانی میں بہار آئی ہے
تیرے رندوں کے لئے خوش خبری ہے ساقی

عبدالعزیز فطرت
(راولپنڈی)

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ عجائبات ہندوستان بالتصویر (نادر شاہ کے حالات) از احمد حسین خان ۲۰ صفحات قیمت عالی

۲۔ خیابان (مجموعۂ کلام) از محمود اسرائیلی (۲۰۶) صفحات

۳۔ معین المنطق (فن منطق سے متعلق) از محمود حسن ۱۲۸ صفحات قیمت ۸/

۴۔ گن ڈاگ ٹریننگ بالتصویر (شکاری کتوں کی تعلیم وغیرہ) از اے مجید قیمت ۲/

۵۔ ہوائی قلعے (افسانے) از اوپندر ناتھ اشک قیمت عہ

۶۔ گیت مالا (بریت کے گیت) از صلاح الدین احمد میراجی ۹۴ صفحات قیمت ۲/

۷۔ معین سخن (مجموعۂ کلام) از نواب معین الدولہ بہادر ۲۲۸ صفحات

۸۔ شمع ہدایت (مذہبی تقاریر) از عبدالصمد سراج الدین ۶۵ صفحات

۹۔ اسلام (اصلاحی مضمون) از عبدالحفیظ خاں ۳۴ صفحات

۱۰۔ شب چراغ (افسانے) از صادق ضیا قیمت ۸/

۱۱۔ حسن کار (فنون لطیفہ پر بحث) از صادق ضیا قیمت ۲/

۱۲۔ صبح مشرق (مجموعۂ کلام) از صادق ضیا ۲۰۴ صفحات قیمت عال

۱۳۔ اشرف الجواب شفاء المرتاب (مواعظ) از علی محمد ۲۵ صفحات قیمت ۸/

۱۴۔ بزم جمشید ملفوظات (مولانا اشرف علی تھانوی) مرتبہ وصل بلگرامی ۸۴ صفحات قیمت ۵/

۱۵۔ الاسفار من برکات (مولانا اشرف علی تھانوی کا سفر نامہ) مرتبہ وصل بلگرامی ۱۵۲ صفحات قیمت ۱۲/

۱۶۔ حکایات رومی منترجمہ مرزا انعام شاہ لبیب ۴ صفحات

۱۷۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ڈاکٹر عبدالحق ۲ صفحات

۱۸۔ معلومات سائنس از آفتاب حسن خاں وغیرہ ۱۹۹ صفحات

۱۹۔ دو کہانی (کہانی) از سید احسن ایم اے ۲ صفحات قیمت ۴

۲۰۔ سر سید احمد خاں (مختصر سوانح) از ظہیر الدین احمد ۱۶ صفحات قیمت ۲/

۲۱۔ اسٹالن (صدر سوویٹ روس کی سوانح عمری) مترجمہ تبریزی از فیروز آبادی قیمت ۱۲/

۲۲۔ گل نو (افسانے) از ایم اسلم ۲۵۰ صفحات قیمت عمر

۲۳۔ انڈین میوزک (راگ راگنیوں کی سرگمیں) از ایم محتشم قیمت عالی

۲۴۔ انوار اختر (مجموعۂ کلام) از محمد اختر نگینوی ۲۶۰ صفحات قیمت عہ

۲۵۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا مذہب از شبیہ الحسن قیمت ۵/

۲۶۔ تفسیر حیات دوسرا ایڈیشن (افسانے) از ایم اسلم قیمت عالی

۲۷۔ کارزار حیات (تفسیر حیات کا دوسرا حصہ) از ایم اسلم قیمت عالی

۲۸۔ اونی دست کاری از النساء امۃ اللہ ۸۰ صفحات قیمت عہ

۲۹۔ نوجوان ویتھر کی داستان غم (گوئٹے کی کتاب کا ترجمہ) ۲۰۸ صفحات قیمت

۳۰۔ نسیم عرفان (بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ) از منشی بشیشور پرشاد منور قیمت عالی

۳۱۔ کالی داس از چودھری بے کرشن ایم اے ۱۵۰ صفحات قیمت عہ

۳۲۔ پھول اور کانٹے (افسانے) از گوپال متل قیمت ۲/

۳۳۔ دانہ و دام (افسانے) از راجندر سنگھ بیدی قیمت عمر

۳۴۔ سرمایہ داری از عبداللہ ملک قیمت ۲/

۳۵۔ صبح الہام (مجموعۂ کلام) از حیدر دہلوی قیمت ۳

۳۶۔ تاریخ مسلم لیگ (مسلم لیگ یعنی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی مکمل داستان) از مظہر انصاری بی اے قیمت عال

۳۷۔ النور (ناول) از فیاض علی قیمت عال

۳۸۔ دسہرہ بالتصویر (بچوں کا ڈرامہ) از محترمہ خدیجہ بیگم ۲۶ صفحات۔

۳۹۔ شاہنامۂ اسلام (تیسری جلد) از حفیظ جالندھری قیمت ۳

۴۰۔ یادگار جگر (مجموعۂ کلام) از بہادر لال جگر ۱۱۲ صفحات

۴۱۔ مرقع عالم (جغرافیائی نقشے) از شرف الدین قادری قیمت عال

۴۲۔ تفسیر سورۂ والشمس از حمید الدین قیمت ۸/

۴۳۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں از ابوالحسنات مرحوم ۱۳۴ صفحات قیمت ۱۴/

۴۴۔ تاریخ اخلاق اسلامی (قرآن و احادیث کی اخلاقی تعلیم پر تبصرہ) ۲۷۶ قیمت عمر

۴۵۔ گوتم بدھ بالتصویر (بچوں کا ڈرامہ) از محترمہ خدیجہ بیگم ۲۴ صفحات

۴۶۔ نور جہاں بالتصویر (بچوں کا ڈرامہ) از محترمہ خدیجہ بیگم ۲۶ صفحات

۴۷۔ ہندو ادیب (اردو کے ہندو ادیب اور شاعروں کا تذکرہ) از اظہر کاکوروی ۵

۴۸۔ افکار سیاسی (ہندوستانی سیاست پر تبصرہ) از قاضی محمد عبدالرؤف

۴۹۔ انی جے نیا (گوئٹے کے ڈرامے کا ترجمہ) از ابوالعلم دبیر ۷ صفحات قیمت

۵۰۔ خم کیفی (نظمیں اور مقالے) از پنڈت کیفی دہلوی ۷ صفحات قیمت ۴

۵۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام مرتبہ ندوۃ المصنفین دہلی ۲۴۴ صفحات قیمت عمر

۵۲۔ علم بدن (حفظان صحت کے اصول) از ڈاکٹر لیسین صدیقی ۲۰۰ قیمت

۵۳۔ مجدد اعظم (سوانح مرزا غلام احمد صاحب قادیانی) از بشارت احمد ۲۷۶ قیمت

۵۴۔ داستان عجم (شاہنامہ فردوسی پر تبصرہ) از نواب نصیر حسین خاں خیال۔

ہمزاسدہ علیٰ ۱۱

حالاتِ حاضرہ

روس اور فنستان کا معاہدہ۔ ۱۳ مارچ کو روس اور فنستان کے درمیان ایک صلح کی قرارداد ہوگئی جس کے بعد فریقین نے لڑائی موقوف کردی۔ اس معاہدے میں اسٹالن نے فنستان سے بڑی سخت شرطیں منوالی ہیں۔ یہ ان شرطوں سے کہیں زیادہ سخت ہیں جو روس کی طرف سے چند روز پہلے پیش کی گئی تھیں اور جن کے ماننے سے فنستان نے انکار کردیا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کی رو سے فنستان نے روس کو ہانگو کا علاقہ اور بندرگاہ (۳۰) سال کے لئے دے دیا۔ روس یہاں اپنا بحری مرکز قائم کرے گا۔ فنستان اب اس بات کا پابند ہے کہ وہ بحر شمالی میں جنگی جہاز، طیارے یا آبدوز نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ خلیج ائمس، جھیل لڈوگا کے ساحل، شمالی جزیرہ نما اور مشرقی فنستان کا کچھ حصہ روس کو دیا گیا ہے۔ نیز روس کو ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اس کا مال پٹ سامو سے ہوکر ناروے تک جاسکے گا اور اس پر فنستان میں کوئی محصول عاید نہیں کیا جائے گا۔

برطانوی کابینہ۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں برطانوی کابینہ میں حسب ذیل تبدیلیاں ہوئیں:۔

لارڈ چیٹ فیلڈ وزیر مدافعت مستعفی ہوگئے۔ سر سیموئیل ہور وزیر ہوائیہ، سر کنگسلی وڈ لارڈ پریوی سیل، اور لارڈ وولٹن وزیر اغذیہ مقرر ہوئے۔ ونسٹن چرچل بحری وزارت کے علاوہ کمیٹی آف سروس منسٹرس کی صدارت بھی کریں گے۔ مسٹر ہڈسن وزیر جہاز رانی اور مسٹر ٹراؤبن چانسلر آف ڈچی آف لنکاسٹر مقرر ہوئے ہیں۔ مسٹر راسبوتھم صدر مجلس تعلیمی، اول ڈی لاوار فرسٹ کمشنر آف ورکس، مسٹر ڈبلیو، ایس، ماریسن پوسٹ ماسٹر جنرل، سر وکٹر وارنڈر سکریٹری پارلیمان مالیات امارت بحریہ اور سر ایڈورڈ گرگ سکریٹری مالیات دفتر جنگ مقرر ہوئے ہیں۔ داخلی امور کی کمیٹی جو تمام اندرونی مسائل پر غور کرتی ہے، اس کے سر کنگسلی وڈ صدر نشین رہیں گے۔ نیز وہ کمیٹی اغذیہ کے صدر نشین رہیں گے۔ سر جان سائمن حسب سابق معاشی پالیسی کی کمیٹی کے صدر نشین رہیں گے۔ وزارت ہوائیہ میں لارڈ ریورڈیل سر سیموئیل ہور کے مددگار رہیں گے۔ وزیر مدافعت کا عہدہ حذف کردیا گیا۔

فرانسیسی حکومت۔ برطانوی کابینہ کی تبدیلیوں سے پہلے فرانس کی حکومت بھی بدل گئی چنانچہ اب ایم دلادیر کی بجائے ایم رینائو وزیر اعظم ہیں۔ مسیو رینائو نے دارالوکلا میں تقریر کرتے ہوئے اپنے مسلک کی وضاحت کی۔ ان کے بعض الفاظ بہت معنی خیز اور اہم ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنا مقصد یہ بتایا کہ "فرانس کی ساری قوت کو مجتمع کرکے کام میں لانا ہے تاکہ جنگ پوری قوت کے ساتھ لڑی جائے اور ایک شاندار فتح حاصل ہو۔ نیز غداری کا خواہ وہ کسی سمت سے ظاہر ہو، سر کچلا جائے گا۔

معاشی جنگ:۔ ۲ اپریل کو مسٹر چیمبرلین نے دارالعوام میں ایک اہم تقریر کی جس میں موجودہ حالات پر کافی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا "اتحادی غیر جانبدار ملکوں کے حقوق کا بہت زیادہ لحاظ کرتے رہے ہیں لیکن جرمنی نے ان ملکوں کی جان و مال کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔۔۔۔۔۔۔ ہم غیر جانبداروں کے حقوق کا احترام کرتے ہیں اور ہم کو ان کی دشواریوں کا پورا علم ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے اتحادی اپنی پوری قوت کیساتھ معاشی جنگ جاری رکھیں گے۔ اب تک ناروے، سویڈن، آئسلینڈ، بلجیم، ہالینڈ اور ڈنمارک سے تجارتی راضی نامے طے پاچکے ہیں۔ جو راضی نامے اسپین، یونان اور ترکی سے ہوئے ہیں" وہ زیادہ اہم ہیں۔

مسٹر چیمبرلین نے دوران تقریر میں بتایا کہ ان تمام راضی ناموں کی رو سے جو انگریزوں نے اب تک طے کئے ہیں جرمنی کی درآمد پر زیادہ

تحدید عاید ہوگئی ہے چنانچہ غیر جانبدار ملکوں کی پیداوار اب جرمنی کو بہت کم جائے گی۔ اسی سلسلہ میں وزیر اعظم نے کہا "ہمارے پاس سب سے بڑا حربہ خریداری کا ہے۔ ہم جرمنی کی ہمسایہ مملکتوں کی وہ ساری اشیاء خریدیں گے جو جرمنی کو جاتی ہیں"۔

ہر ہٹلر کی تقریر۔ مارچ کے مہینے میں ہٹلر نے کشتگان جرمنی کی یادگار تقریب میں ایک طویل تقریر کی۔ سپاہی کو قوم کی زندگی کا محافظ بتاتے ہوئے ہٹلر نے کہا "ہم رائش کی حفاظت میں اپنے پرانے دشمنوں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور اس مقصد کے لئے آج جرمنی بالکل متحد ہے۔ ہماری تاریخ میں پہلی مرتبہ پوری جرمن قوم خدا کے سامنے اس التجا کے لئے پیش ہو رہی ہے۔ اس جد و جہد میں رحمت نازل کرے۔

دوران تقریر میں ہٹلر نے کہا "اپنے بہادروں کی یادگار تقریب منانے کا حق دنیا کی کسی قوم کو جرمنوں سے زیادہ حاصل نہیں۔ ... ہمارا ہر آدمی پوری قوم کی بقا کے لئے اپنی جان دینے پر ہمیشہ سے تیار رہا ہے۔ پچھلے زمانے میں ہمارے سپاہیوں نے جو بہادری دکھلائی وہ اس سے کم نہ تھی جس کی توقع آج ہم سے کی جا رہی ہے۔ ہم آج بھی انہیں کارناموں اور بشرط ضرورت انہیں قربانیوں کے لئے تیار ہیں .... جرمن قوم کو کبھی شکست نہیں دی جا سکتی، کیونکہ اس قوم کا اتحاد خون پر مبنی ہے اور وہ طبقہ، نسل اور پیشہ سے بلند و برتر ہے"۔

بیس لاکھ آدمی:- اپریل کے ختم تک برطانیہ میں ۲۰ لاکھ آدمی نیشنل سروس ایکٹ کے تحت اپنے کو رجسٹر کر دالیں گے۔ ایسے اشخاص جن کی عمر پہلی جنوری سنہ ۱۹۴۱ء تک ۲۵ سال کی ہوگئی تھی اپریل کے پہلے ہفتہ میں رجسٹر ہو چکے ہیں اور دوسرے اشخاص جن کی عمر اس سے ایک سال زیادہ ہے اواخر اپریل تک رجسٹر ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سال نو کے اوائل میں ایک شاہی اعلان کے ذریعہ یہ قرار پایا تھا کہ یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء تک جن اشخاص کی عمر ۲۰ سال ہوگی وہ فوجی خدمت کے لئے رجسٹر کئے جائیں گے۔

نازی پروگرام:- یورپ فتح کرنے کے متعلق نازیوں نے ایک دہ سالہ پروگرام بنایا ہے، سب سے پہلے اس پروگرام کی اطلاع چک پولیس کو ہوگئی تھی جب کہ پراگ پر سنہ ۱۹۳۹ء میں حملہ ہوا تھا۔ اب انگلستان کی وزارت معلومات کی طرف سے اس نازی پروگرام کا راز فاش کیا گیا ہے اور وہ پروگرام یہ ہے۔

"آسٹریا اور چکوسلواکیہ سنہ ۱۹۳۸ء میں فتح۔ پولستان اور ہنگری سنہ ۱۹۳۹ء میں۔ رومانیہ، یوگوسلاویہ اور بلغاریہ سنہ ۱۹۴۰ء میں، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، یوکرین اور شمالی فرانس سنہ ۱۹۴۱ء میں فتح کئے جائیں گے اور اس کے بعد اسکانڈی نیویا اور پرتگال کی باری آئے گی اور برطانیہ سنہ ۱۹۴۳ء سے پہلے فتح ہوگا۔

ہندوستان

حکومت ہند کا موازنہ:- سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء کا پورا خرچ ۸۶ کروڑ ۴۸ لاکھ روپیہ تک پہنچتا ہے۔ جملہ آمدنی ۸۶ کروڑ ۶۷ لاکھ روپیہ اور بچت ۱۹ لاکھ روپیہ ہوگی۔ بچت کی رقم مالگزاری کے محفوظ فنڈ میں منتقل کی جائے گی۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کی آمدنی تقریباً ۸۵ کروڑ ۴۳ لاکھ روپیہ ہوگی اور خرچ کا اندازہ ۹۲ کروڑ ۵۹ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ جس سے ۷ کروڑ ۱۶ لاکھ روپیہ کا خسارہ واقع ہوتا ہے۔ اس کی تلافی کے لئے مزید محاصل عاید کئے جائیں گے چنانچہ شکر کے محصول میں ۲ تا ۴ فیصدی کا اضافہ کیا گیا اور پٹرول کا محصول ۱۰ فی گیلن سے بڑھا کر ۱۲ فی گیلن مقرر کیا گیا ہے۔

والیان ریاست اور ان کی معاہداتی حیثیت حسب دستور وائسرائے بہادر نے ایوان والیان ریاست کی سالانہ میقات کا افتتاح کیا جو مارچ کے مہینے میں منعقد ہوئی حضور وائسرائے نے اپنی تقریر میں اس بات پر بہت زور دیا کہ والیان ریاست کو وفاقی اسکیم سے اتفاق کر لینا چاہیے۔ ایوان نے

ایک قرارداد کی شکل میں اس کا جواب دیا جس کو جانسلر ہمام سنگھ ناڈگر نے پیش کیا۔ اس قرارداد میں یہ زاویہ نگاہ پیش کیا گیا کہ

"ہندوستان کے ہر آئندہ دستور میں ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ اور ان کی بقائے خود مختاری کی پوری ضمانت اور تحفظ اور جو حقوق ان کے معاہدات' اسناد' تہنا موں سے پیدا ہوتے ہیں ان کی موزوں صراحت ہونی چاہیے اور کسی وحدت کو وہ درجہ نہ دیا جائے کہ جس کی وجہ سے وہ دوسروں پر مسلط ہو سکے یا ان حقوق و تحفظات میں مداخلت کرے جن کی انہیں ضمانت دی گئی ہے۔ نیز یہ کہ تمام جماعتوں کو ان کے واجبی حقوق کا مناسب یقین دلایا جائے۔"

قرارداد میں اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ دستور ہند کی ترتیب سے متعلق ہر گفت و شنید میں خواہ وہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء سے جداگانہ ہو یا اس قانون کی نظر ثانی ہو' ریاستوں اور ایوان کے نمائندوں کو ان کی اہمیت اور تاریخی موقف کے مطابق آواز حاصل ہونی چاہیے اس کے علاوہ ایوان کا یہ زاویہ نگاہ بھی اہم ہے کہ ایسی کوئی ہمہ گیر اسکیم جس کی رو سے تاج اور ریاستوں کے تعلقات پر اثر پڑے اور بغیر ریاستوں کی آزاد رضامندی کے تحویل اقتدار عمل میں آئے یا اس کی وجہ سے ایسی تبدیلیاں عمل میں آئیں جو ریاستوں کے حقوق اور مفادات پر ان کی رضامندی کے بغیر اثر انداز ہوں' ان کے لئے ناقابل قبول ہوگی۔"

کانگریس کا سالانہ جلسہ:- کانگریس کا ۵۳ واں سالانہ جلسہ اس مرتبہ رام گڑھ میں منعقد ہوا اور مولانا آزاد نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مطبوعہ خطبہ تقسیم کر دیا گیا کیونکہ بادل کی گرج' بجلی کی چمک اور موسلا دھار بارش نے کانگریس کے نئے صدر کو خطبہ پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ چنانچہ خطبہ کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا وہ پڑھ لیا گیا ہے۔ مولانا کا خطبہ کافی طویل ہے لیکن اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس میں وہی پرانی باتیں ہیں جن کو مسٹر گاندھی اور دوسرے کانگریسی رہنما کئی بار کہہ چکے ہیں۔ خطبہ میں مولانا نے کانگریس کی ان تمام کارگزاریوں کا ذکر کیا ہے جو سنہ ۱۹۲۳ء سے جب کہ مولانا پہلی مرتبہ کانگریس کے صدر ہوئے تھے' اب تک ظہور میں آئی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء کے حالات کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے' اس کے بعد کانگریس کے مطالبہ اور آخر میں اقلیتوں کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے مولانا نے خاص طور پر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ ان کو اپنی قلت کی وجہ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے حقوق کوئی غصب نہیں کر سکتا۔

مخالف مصالحت کانفرنس:- رام گڑھ میں جہاں کانگریس کا سالانہ جلسہ ہوا' وہاں سوبھاش بابو نے مخالف مصالحت کانفرنس کا ایک علیحدہ جلسہ کیا اس جلسہ میں خود انھوں نے خطبہ صدارت پڑھا۔ اپنے خطبہ میں سوبھاش بابو نے بنگال کی بڑی ستائش کی اور ہندوستانیوں کو "عمل" کی تلقین کی۔ پھر کانگریس کی خوب برائی کی اور کہا کہ "اس زمانے میں ہمارا اصل کام سامراج کا خاتمہ کرنا اور ہندوستانی باشندوں کے لئے قومی آزادی حاصل کرنا ہے۔ جب آزادی حاصل ہو جائے تو قومی تعمیر کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور وہ ہماری تحریک کا اشتراکی پہلو ہے۔ ہماری اس منزل میں تیاری وہ ہوں گے جو سامراج سے غیر مصالحانہ لڑائی لڑیں گے۔"

آخر میں سوبھاش چندر بوس نے اس بات پر بہت زور دیا کہ اگر کانگریس برطانوی حکومت سے کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ہماری جماعت اس سے لڑے گی اور اس لئے سامراج سے جنگ کرنے کے لئے ہمیں مستقل آلات پیدا کرنا ہے۔ اب ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر کانگریس کی مجلس عاملہ قومی جدوجہد شروع نہ کرے تو پھر دوسروں کو ایسا کرنا پڑے گا۔"

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس :- اس مرتبہ مسلم لیگ کا ۲۷ واں سالانہ جلسہ لاہور میں ہوا۔ مسٹر جناح نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم لیگ کے آئندہ مسلک کو کھول کر بتایا اور اپنے مطالبات صاف صاف بیان کر دیے۔ جناح نے کہا کہ "اگر برطانوی حکومت ہماری پسند اور رضامندی کے بغیر کوئی اعلان کرے تو مسلمان اس کی مزاحمت کریں گے۔ اس بارے میں کوئی غلطی نہ ہونی چاہیے۔" اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اپنی طاقت کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ کریں۔ جناح نے ایک اہم اعلان یہ کیا کہ برطانیہ عربوں کے قومی مطالبات پورے کر دے نیز ہندوستانی فوجیں جو سمندر پار بھیجی جاتی ہیں، ان کو کسی مملکت کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔

جناح نے مسٹر گاندھی کو دعوت دی کہ وہ ہندوؤں کے نمائندے کی حیثیت سے اہم مسائل کے تصفیہ کے لئے ان سے گفتگو کریں۔ اس کے بعد جناح نے برطانوی حکومت کو مشورہ دیا کہ "اگر برطانوی حکومت اس نیم براعظم کے باشندوں میں امن و اطمینان کا قیام چاہتی ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو خود اختیار قومی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے۔" اس کے بعد مسٹر جناح نے صاف طور پر کہا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قبول نہیں کی جا سکتی۔ پھر قانون حکومت ہند ۳۵ء پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ غیر فطری اور مصنوعی عمومی طریقوں سے قومیں ایک نہیں بن سکتیں۔ برطانیہ کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ہندوستان کا مسئلہ بین فرقہ جاتی نہیں بین قومی ہے۔

کل ہند ریاستی مسلم لیگ :- مسلم لیگ کے اجلاس کے ساتھ اس سال لاہور میں کل ہند ریاستی مسلم لیگ کا پہلا جلسہ بھی ہوا۔ سردار محمد اورنگ زیب خاں نے اس کی صدارت کی اور اس میں متعدد ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے جو اس کانفرنس کے داعی تھے، اپنی تقریر میں کہا کہ گرل ہنر کانفرنس سے پہلے کانگریس اور لیگ کی سرگرمیاں صرف برطانوی ہند تک محدود تھیں لیکن اس کے بعد کانگریس نے اپنا مسلک بدل دیا۔ اور اپنی سرگرمیوں کو ریاستوں میں بھی پھیلا دیا۔ اس کوشش میں کانگریسی رہنماؤں کا واحد مقصد یہ تھا کہ ریاستی سیاسیات میں اثر حاصل کیا جائے تاکہ وفاقی اسمبلی میں کانگریس کو ریاستوں کی تائید حاصل ہو۔ ریاستی مسلم لیگ کا بڑا مقصد یہ ہے کہ کانگریس کی طرف ریاستی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی جو تدبیریں کی جائیں، ان کا جواب دیا جائے۔

گاندھی جی کا بیان :- گاندھی جی نے ۳۰ر مارچ کے ہریجن میں مسٹر جناح کو مخاطب کر کے ایک بیان شائع کیا ہے جس کا عنوان "قائداعظم کو میرا جواب" ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میرا نقطۂ نظر ہمیشہ واضح ہے۔ مجھے ہندو ہونے پر فخر ہے لیکن میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک ہندو کی حیثیت سے کبھی کسی کے پاس نہیں گیا۔ میرا ہندو مت پیمانوں کا طالب نہیں۔ خلافت کے ساتھ میری تائید غیر مشروط تھی۔ میں سیاسی (اس کے مسلمہ مفہوم میں) نہیں ہوں لیکن میں نے قائداعظم یا کسی اور سے جو کچھ بھی گفتگو کی وہ کانگریس کی جانب سے تھی جو ایک ہندو نظام نہیں ہے۔ کیا ایک ہندو نظام ایک مسلمان عالم کو اپنا صدر بنا سکتا ہے اور کیا اس کی مجلس عاملہ میں (۱۵) ارکان میں سے (۴) مسلمان ارکان ہو سکتے ہیں؟"

———— ح س۔

عہد حاضرہ میں اسلامی ممالک کی سیاسی ترقیاں

تقریباً ربع صدی سے قومی ترقی کا عام جذبہ انقطاع عالم میں پایا جارہا ہے۔ مغرب میں یوروپین ممالک مشرق میں جاپان اور نئی دنیا کے امریکہ کو راہ ترقی پر گام زن ہوئے تقریباً ایک صدی کا عرصہ ہوا لیکن اس ربع صدی میں ان ممالک نے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کر لیے البتہ اس دوڑ میں کچھ نئے شرکا بھی آخر ربع صدی سے پائے جاتے ہیں۔ ان میں پانچ اسلامی ممالک اور ہندوستان ہے منجملہ ان پانچ اسلامی ممالک کے ترکی اور ایران بقیہ تین سے آگے رہے۔

ان دو آگے رہنے والوں میں اول نمبر ترکی کا اور دوسرا ایران کا ہے۔

اس ربع صدی کی ترقی سے پیشتر ترکی یورپ کا مرد بیمار مانا جاتا تھا۔ یوروپین ممالک نے جنگ عظیم کے بعد اس کے حصے بخرے کر لیے تھے۔ ملک میں پیسہ نام دنشان کو نہ تھا۔ گورنمنٹ ممالک یورپ کی کروڑوں روپیوں کی مقروض تھی۔ عیش و عشرت اپنے پورے مدارج طے کر چکا تھا۔ امرا کے حرم مشہور تھے۔ پادشاہوں کے حرم ایک مستقل آبادی کی حیثیت رکھتے تھے جن کی نگرانی کے لیے خواجہ سرا مقرر کئے جاتے تھے۔ ذرا ذرا سی بدگمانی پر انسانوں کی جان لی جاتی تھی۔ عورتیں شلجم بھاجی کی طرح بازار میں بکتی تھیں۔ رشوت کی انتہائی گرم بازاری تھی۔ سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ صوفیوں کا حال قال مشہور تھا جو عجیب و غریب وضع کا لباس پہن کر ناچا کرتے تھے۔ نہ تجارت تھی نہ زراعت۔ افلاس تھا نہ نکبت تھی۔ غرض کہ وہ سب کچھ تھا جو ایک قوم کی بربادی کے لئے اس کی انتہائی ترقی کے بعد فطرتاً ہر قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسی قوم کا نقشہ ہے کہ جس کے نام سے کسی زمانے میں یورپ کے زبردست سے زبردست فرمانروا کانپ اٹھتے تھے۔ جس طرح ہر کمال کو زوال ہے اسی طرح انتہائی پستی کے بعد قوم پھر ترقی کرتی ہے۔ کمال و زوال کو انفرادیت و شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کا اثر پوری قوم پر ہوتا ہے۔ ہاں البتہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی اچھے دل و دماغ کا انسان ان کو ایک تنظیم کی شکل میں لے چلتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ قوم کی حالت نزاع میں ایک مرد مجاہد اٹھتا ہے اور ربع صدی کی انتہائی کوشش سے اس مردہ قوم کو یورپ کی سربرآوردہ قوموں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کل کے یورپ کے خونخوار درندوں کو بھی اس کی طرف دیکھنے کی مجال نہیں۔ اس کا ایک پوزیشن ہے۔ قوت ہے۔ مانع کی نہ سہی مدافعت کی تو ہے۔ اس کو بنانے اور سنوارنے والے کا نام یورپ کی اقوام بھی عزت سے لیتی ہیں۔ اور اس کا شمار دنیا کے مشہور کامیاب ڈکٹیٹروں میں کیا جاتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ یہ وہاں کا باشندہ تھا اپنے گرد و پیش کے حالات اور اپنی قوم کی حالت سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی کامیابی کی دلیل آج کل کی ترکی قوم ہے۔

یہی حال ایران کا بھی تھا بلکہ اس سے بدتر۔ شاہان ایران فرانس میں پڑے ہوئے قومی دولت کو لٹایا کرتے تھے جو کچھ بچی کھچی دولت تھی وہ پیشوایان قوم کے ہاتھ میں تھی جو انسانوں کے دل و دماغ دونوں پر قابض تھے۔ مذہب کو ایک پیچیدہ معمہ بنا کر رکھا گیا تھا جس کے سلجھانے والے یہی ٹھیکہ داران مذہب تھے۔ کیفیت وہی تھی جو یورپ کی کلیساؤں کے اقتدار کے زمانے میں تھی۔ نہ سڑکیں تھیں نہ راستے محفوظ تھے۔ لوٹ مار کی گرم بازاری تھی۔ مسلمان ایک

دوسرے کے دشمن تھے۔ ترک و ایران کی اخوت کا کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا یہاں بھی ایک مصلح قوم پیدا ہوا اور قوم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ دونوں شعار اسلامی سے کوسوں دور ہیں گویا اس ترقی سے پیشتر اُن میں شعار اسلامی موجود تھا۔ تھا اور ضرور تھا لیکن کب تھا؟ اس انقلاب کے وقت کیا حالت تھی۔ اسی شعار اسلامی کی خواہش نے افغانستان کو بام ترقی سے قعر مذلت میں ڈھکیل دیا ورنہ اس زمانے میں اس کا وجود بڑی سے بڑی قوم کو لرزہ براندام کر دیتا۔ ہندستان بھی اسی دوڑ کا ساتھی ہے لیکن چونکہ یہاں کے لوگ مذہبی شعار کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے اس نوبت پر ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ پہلے اپنے عیوب کو رفع کیا جائے۔ اگر خدا نے مصطفی کمال اور رضا شاہ سے اچھا دماغ دیا ہے تو کیوں نہیں مسلمانان ہند کی ڈکٹیٹری ہاتھ میں لے لی جاتی۔ صرف ڈھائی صفحہ کے مضمون سے ۲۵ سالہ محنت اور قربانیوں کو خاک میں ملانا کونسی عقل مندی ہے۔ گم کردہ راہ کا دوسروں کو راہ بتلانا کتنی عجیب بات ہے۔ ان خاصان خدا کی وقعت کسی اور قوم کی نظر میں چیونٹی بھر سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ان کے دل میں تمام عالم کا درد ہے۔ واقعات کو غیر جانب دارانہ رنگ میں پیش کرنے اور اس پر قوم کو غور کرنے کی دعوت دینے کا یہ وقت نہیں ہے دوسروں کی ضرورت وہ خود جانتے ہیں۔ وہ آزاد ہیں۔ ان کو دنیا میں سانس لینے کا حق حاصل ہے۔ یہ جاننے کی چیز ہے اور اب بھی جاننے کا وقت ہے۔ اس کے بعد اس قدر جاننے کی بھی مہلت نہ ملے گی۔ دنیا کے سامنے اپنے عیوب کا دفتر کھولنے سے کیا حاصل اگر ان کو ہم اپنا سمجھتے ہیں اگر اپنا نہ سمجھتے ہوں تو ان کو اپنے نقطۂ نظر سے کیوں دیکھا جاتا ہے۔ یہ اعتراض یورپ کی کسی اور قوم پر کیوں نہیں کیا جاتا۔ اگر درد ایسا ہی شدید ہے تو وہاں تبلیغ کا کام زیادہ مفید ہوگا۔

منصور

سیر گولکنڈہ :- اس دلچسپ کتاب میں گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو فسانوں کی شکل میں محفوظ کر دئے گئے۔ قطب شاہیوں کی مختصر تاریخ اور قطب شاہی آثار کی موجودہ حالت کا نقشہ بھی کھینچ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے "رسالہ اردو" میں لکھا ہے۔

"یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور نہ وہ لطف اور کیفیت ہے جو اس کتاب میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے۔ اس میں اس زمانہ کے بادشاہوں، شعرا اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جس سے دلکشی بڑھ گئی ہے۔"

۱۶ افسانے۔ ۱۲ تصاویر۔ ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۵/

ٹینس میں (میرے تجربے)

ٹینس میں اعلیٰ معیار پر پہنچنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک کھلاڑی کا صرف اچھا کھیلنا کافی نہیں بلکہ اس کو اپنے میں بعض خصوصیات کا پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ میں نے ٹینس کسی سے نہیں سیکھا اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تلخ تجربات نے مجھے سکھلایا۔ اگر میں اپنے تجربوں کو بیان کروں تو ممکن ہے کہ ہونہار کھلاڑی ان سے فائدہ اٹھائیں اور اس قسم کے تلخ تجربات سے محفوظ رہیں۔

مقابلہ کے وقت ایک کھلاڑی کو کھیل سے کم از کم تین گھنٹے قبل کھانا کھانا چاہیئے۔ کھیل کے وقت پیٹ کا بھرا یا بالکل خالی رہنا دونوں صورتوں میں کھلاڑی کے کھیل پر برا اثر کرتی ہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کا تو خیال رکھا کہ مقابلہ سے فوری قبل کھانا نہ کھاؤں لیکن ایک مرتبہ اتفاق سے بھوکا رہ کر کھیلنا پڑا جس کا نتیجہ سن لیجئے۔

ومبلڈن ٹورنمنٹ میں تھامس نامی کھلاڑی سے میرا مقابلہ تھا۔ یہ کھیل سلسلہ میں دوسرا رکھا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہمارا میاچ تین بجے شروع ہوگا اس لئے گیارہ بجے کھانا کھایا لیکن یہ اندازہ غلط نکلا اور میاچ چار بجے کے قریب شروع ہوا پہلے دو سٹ تو خیریت سے گزرے جن کو میں نے حاصل کیا۔ تیسرے سٹ میں جب میرے چار اور مخالف کا ایک گیم تھا بھوک کی شدت سے پیٹ میں درد اٹھا اور میرے لئے چلنا پھرنا دشوار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں تیسرا اور چوتھا سٹ ہار گیا۔ پانچویں سٹ کے شروع ہونے سے قبل میری نظر تماشہ بینوں میں ایک دوست پر پڑی جن سے میں نے خواہش کی کہ وہ ایک پیالی چائے اور چند بسکٹ میرے لئے لادیں۔ جب تک وہ چائے لائے مخالف کے تین گیم بن چکے تھے۔ کورٹ کے بدلنے وقت میں نے بسکٹ کھاکر چائے پی۔ اس غذا نے مجھ میں نئی جان ڈال دی۔ میرے کھیل میں تغیر پیدا ہوگیا اور میں نے سٹ کو حاصل کرکے میاچ جیت لیا۔ اس وقت سے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اگر کھانا کھائے ہوئے دیر ہوگئی ہو تو کھیل شروع ہونے سے قبل بسکٹ اور چائے کا استعمال ضرور کرلیتا ہوں۔

ایسے کھلاڑی کے لئے جو ٹورنمنٹوں میں حصہ لیتا ہو ایک سے زیادہ ریاکٹس اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور سب ریاکٹس ایک ہی بیالنس اور ایک ہی وزن کے ہونے چاہیئں تاکہ جب ضرورت کے وقت ریاکٹ بدلا جائے تو کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ ابتدا میں ناتجربہ کاری کے سبب میں دو مختلف وزن کے ریاکٹس اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کیمبرج کے ایک ٹورنمنٹ کے فائینل میں میرا اور ڈانلڈ رنھم کا مقابلہ ہوا اسکور جب کہ سٹ آل اور میرے چار اور ان کا ایک گیم تھا میرا ریاکٹ ٹوٹ گیا اور مجھے اپنا وزنی ریاکٹ استعمال کرنا پڑا چونکہ میں تھکا ہوا تھا اس وزنی ریاکٹ سے کھیلنے میں دشواری معلوم ہوئی میرے کھیل میں تغیر پیدا ہوگیا اور مجھے شکست اٹھانی پڑی۔ اس سبق کو میں نے کبھی نہیں بھولا اور ہمیشہ ہم وزن ریاکٹس ساتھ رکھا کرتا ہوں۔

جس کھلاڑی کے دل پر مخالف یا مجمع کا رعب چھا جائے وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے بہتر سے بہتر کھلاڑی سے مقابلہ ہو تو اس کو اپنے برابر کا تصور کرنا چاہیے اور کھیل میں اپنے کو اس قدر محو کردینا چاہیئے کہ مجمع کا اثر دل پر نہ پڑے میں اپنی کم سنی میں ان دونوں کا اثر لیا کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جیتا ہوا میاچ بھی ہار جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ

ایک مرتبہ حیدرآباد ٹورنمنٹ میں میں عابد رضوی سے جو اس وقت یہاں کے بہترین کھلاڑی تھے کھیل رہا تھا۔ ہم دونوں ایک ایک سٹ بنا چکے تھے اور آخری سٹ میں میرے میاچ جیتنے کے لئے صرف دو پوائنٹ کی کمی تھی۔ عین اس وقت مجھے حیرت سی ہوئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور ایسے بڑے کھلاڑی کو میں کیسے ہرا رہا ہوں۔ اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ میرا کھیل بدل گیا اور میں میاچ بھی ہار گیا۔ دوسرے سال جب پھر اسی کھلاڑی سے مقابلہ ہوا تو میں نے اپنے سبق کو یاد رکھ کر اس خیال کو پیدا ہونے نہ دیا اور کامیاب ہوا۔ متعدد مرتبہ ٹورنمنٹوں میں حصہ لینے سے میں مجمع کا عادی ہو گیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ کثیر مجمع میرے کھیل کو بہتر بنانے میں مدد دینے لگا۔

جس طرح مخالف کا رعب شکست کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح اس کو کمزور اور حقیر سمجھ کر کھیل میں لاپروائی برتنا بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ چونکہ اکثر کھلاڑی اس قسم کی لاپروائی کرتے ہیں اس لئے میں اپنے چند تجربات کو بیان کر کے اس غلطی کی اہمیت بتانا چاہتا ہوں۔ حیدرآباد ٹورنمنٹ کے فائنل میں کرنل علی رضا اور میں اور جنرل قادر یار جنگ اور جواد حصہ لے رہے تھے۔ ہمارا جوڑ ان سے بہتر سمجھا جاتا تھا چنانچہ پہلے دو سٹ ہم نے بہت آسانی سے حاصل کئے کرنل علی رضا نے جو اس ٹورنمنٹ کے معتمد تھے اس خیال سے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے تشریف لانے سے قبل میاچ ختم ہو جائے گا کھیل کو تھوڑی دیر کے لئے روک دیا۔ دوبارہ جب کھیل شروع ہوا تو ہم نے طول دینے کے خیال سے لاپروائی برتی اور ایک سٹ ہار دیا۔ چوتھے اور اور پانچویں سٹ میں ہم نے اپنا اصلی کھیل کھیلنا چاہا لیکن بگڑا ہوا کھیل نہ بنا اور ہمارے مخالفین کی ہمتیں بھی بڑھ گئی تھیں انھوں نے میاچ جیت لیا۔ اسی طرح کیمبرج کا واقعہ ہے کہ یونیورسٹی ٹورنمنٹ میں وان ایلی اور میں جیاپمن اور لاؤری کے مقابلہ میں کھیل رہے تھے۔ آخر الذکر دونوں کرکٹ کے بلوز تھے اور مزاحاً اس ٹورنمنٹ میں حصہ لے رہے تھے۔ ہمارا جوڑ ان سے بہت بہتر تھا انھیں خوش کرنے کے لئے ہم نے پہلا سٹ ہار دیا۔ جب دوسرا شروع ہوا تو ہمارا عمداً بگاڑا ہوا کھیل بن نہ سکا اور مخالفین کو میاچ جیتنے کے لئے ایک پوائنٹ رہ گیا۔ ہماری صورتیں فق ہو گئیں کیونکہ ہم اس ٹورنمنٹ کو دو مرتبہ متواتر جیت چکے تھے خدا نے خیر کی کہ اسی وقت بارش ہونے لگی اور کھیل روکنا پڑا۔ دوسرے روز اسی اسکور سے میاچ شروع ہوا لیکن ہم نے احتیاط برتی مخالفین کا جوش بھی کم ہو گیا تھا اور ہم میاچ جیت گئے۔ اس میاچ کے بعد سے کبھی میں نے ٹورنمنٹ میں لاپروائی برتنے کی جرأت نہیں کی۔ ایک اور واقعہ بھی پیش کرتا ہوں جس میں مخالف کی حقارت اور لاپروائی سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ ویسٹرن انڈیا ٹورنمنٹ کے فائنل میں رنگراؤ کا اور میرا مقابلہ تھا۔ صبح جب میں نیند سے چونکا تو طبیعت ناساز معلوم ہوئی۔ میں نے فروٹ سالٹ پی لیا اس نے ضرورت سے زیادہ اپنا اثر دکھلایا اور میں بے حد ناتوان ہو گیا۔ جب میاچ شروع ہوا تو سب نے میرے کھیل میں بین فرق محسوس کیا اور میں بھی اپنے تیار کئے ہوئے منصوبے پر عمل نہ کر سکا۔ میری کمزوری سے رنگراؤ نے جو نہایت تجربہ کار تھے پورا فائدہ اٹھایا اور پہلا سٹ دو پر حاصل کیا دوسرے سٹ میں بھی ان کے پانچ اور میرے تین گیم بنے تھے اور ان کو میاچ جیتنے کے لئے ایک پوائنٹ باقی تھا۔ رنگ راؤ نے دوسرے سٹ کے شروع میں چائے منگوائی تھی جو اس وقت آئی۔ میرے مخالف نے خادم سے کہا کہ ٹھیر جاؤ ابھی میاچ ختم کر کے پیتا ہوں" اس جملے نے مجھے صدمہ پہنچایا اور خدا نے بھی میری مدد کی کیونکہ

اس کے بعد سے میرے کھیل میں عجیب و غریب تغیر پیدا ہوگیا اور میں نے نہ صرف اس سٹ کو ۵-۷ پر جیتا بلکہ تیسرا سٹ بھی آسانی سے جیت گیا اور ان کی چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی۔

بعض کھلاڑیوں کو اپنا اصلی کھیل کھیلنے میں دیر لگتی ہے اور بعض کھیل شروع ہوتے ہی اپنے فارم میں آجاتے ہیں۔ کھلاڑی کو اس بات کا عادی ہونا چاہیے کہ ابتدا ہی سے اصلی کھیل کھیلے ورنہ ہار جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ چنانچہ ومبلڈن کے تیسرے راؤنڈ میں اسی نقص کے سبب جبر نجبوا اور میں نے اپنے سے بہتر جرمن جوڑ یعنی فان کرام اور لورنی کو ہرایا اور ٹورنمنٹ میں ایک سنسنی پیدا ہوگئی۔ اگر ہم تیسرا سٹ ہار جاتے تو میاچ بھی ہاتھ سے جاتا رہتا کیونکہ ہمارے مخالف اپنے اصلی فارم میں آگئے تھے۔

ایسا کھیل جو بالکل صحیح اصول پر کھیلا جائے ہمیشہ کامیابی کا ذریعہ نہیں بن سکتا ایک کھلاڑی کو چاہیے کہ وہ اپنے مخالف کی خامیوں کا پتہ لگا کر اس کے مطابق اپنے کھیل کو بدلے اور اس بات کا خیال رکھے کہ جیتا ہوا کھیل نہ بدلا جائے لیکن ہارتے وقت ہمیشہ کھیل کا طریقہ بدل دیا جائے خواہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہو وہ خلافِ اصول ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی یاد رہے کہ مخالف کی کمزوری سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب کہ اچانک حملہ کیا جائے اور اس کو پیش قیاسی کا موقعہ نہ دیا جائے۔ ویسٹرن انڈیا ٹورنمنٹ کے سمی فائینل میں ٹوماناگا نامی ایک جاپانی کھلاڑی سے میرا مقابلہ تھا۔ باوجودیکہ میرا فارم اچھا تھا اور میں اصول کے مطابق کھیل رہا تھا میرا مخالف گیم بنائے جا رہا تھا اور مجھے کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی میں نے کئی طریقے بدلے لیکن وہ کارگر نہ ہوئے یہاں تک کہ ان کے پانچ اور میرے دو گیم بنے ایک مرتبہ اتفاقیہ طور پر میں نے گیند کو آہستہ مارا اور وہ مخالف کے کورٹ میں سروس لائین کے قریب گری۔ اصولاً یہ ایک ناقص اسٹروک ہے کیونکہ مخالف اس کو جدھر چاہے مار کر پوائنٹ حاصل کر سکتا ہے لیکن ٹوماناگا نے گیند کو کورٹ سے باہر مارا۔ دفعتاً مجھے خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کے کھیل میں یہ نقص ہے کہ وہ آہستہ اور جال کے قریب والی گیند کو کھیلنے کا طریقہ نہیں جانتے ہیں۔ اپنے اس خیال کی صحت کو جانچنے کے لئے میں نے دوسری مرتبہ عمداً گیند کو آہستہ سے جال کے قریب ڈالا اور انھوں نے پھر اس کو باہر مارا اور میرے خیال نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔ اگرچہ کہ میرا یہ طریقہ اصولی کھیل کے منافی تھا لیکن میری کامیابی کا انحصار اسی پر تھا اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا اور نہ صرف پہلا سٹ بلکہ میاچ جیت گیا۔

یہ ایک غلط خیال ہے کہ ٹینس میں ایک کھلاڑی کا اتنا دم دار اور مضبوط ہونا ضروری نہیں جتنا کہ فٹ بال یا ہاکی میں ہونا چاہیے کیونکہ فٹ بال اور ہاکی میں ہر کھلاڑی کا جب کہ گیند اس کے پاس نہ ہو دم لینے کا وقفہ ملتا ہے اور کھیل کی مدت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوتی ہے لیکن ٹینس کے کھلاڑی کو اتنا وقفہ نہیں ملتا اور برابری کا میاچ تین گھنٹوں تک بھی جاری رہتا ہے۔ اس لئے کھلاڑی کا تندرست اور دم دار ہونا ضروری ہے اور دم بنانے کے لئے اس کو روزآنہ صبح و شام ورزش کرنی چاہئے۔ اور بعض لذتوں مثلاً میٹھا چٹپٹا، سگریٹ، نشہ کی چیزوں اور سینما سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ سادتھ ہیامٹن ٹورنمنٹ کے فائینل میں ہینز جو کینیڈین ڈیوس کپ کے کھلاڑی تھے مجھ سے کھیل رہے تھے۔ یہ میاچ دو بجے شروع ہوا اور پانچ بجے ختم ہوا۔ پورے پانچ سٹ کھیلے گئے اور ہر سٹ میں تقریباً

دس گیم ہوئے۔ غالباً مجھے اس لئے کامیابی ہوئی کہ میں ان سے کم عمر اور زیادہ دم دار تھا۔ اسی طرح ہالینڈ کے انٹرنیشنل ٹورنمنٹ کے فائینل میں راما سوامی اور میں نے فان لینپ اور ٹمر کو جو ہالینڈ کے ڈیوس کپ کھلاڑی تھے سوا تین گھنٹوں کے سخت مقابلہ کے بعد ہرایا فان لینپ کی عمر زیادہ تھی اسلئے وہ بالکل تھک گئے تھے مقابلوں کے دوران میں کبھی کبھی غیر معمولی واقعات پیش آجاتے ہیں۔ تجربہ کار کھلاڑی ان کی پروا نہیں کرتے لیکن کمسن کھلاڑی ان کا اثر لے کر اپنا کھیل بگاڑ لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ خود ان کے حق میں برا نکلتا ہے۔ اس سبق کو میں نے نہایت ہی تلخ تجربہ کے بعد سیکھا۔ مِیزر جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے کرئنس کلب کے سمی فائنل میں مجھ سے کھیل رہے تھے۔ اسکور جب کہ سٹ آل اور میرے پانچ اور ان کے چار گیم تھے اور مجھے میاچ جیتنے کے لئے صرف ایک پوائنٹ باقی تھا اس وقت میں نے ایک اسماش کیا جس کے واپس ہونے کی مطلق توقع نہیں ہوسکتی تھی اور مجھے بھی یقین ہوگیا تھا کہ میں نے میاچ جیت لیا۔ میزر نے دوڑ کر گیند کو واپس لوٹایا لیکن وہ گیالری میں جاتی ہوئی جال سے ٹکرائی اور بجائے گیالری میں گرنے کے تار پر سے پھسلتی ہوئی میرے کورٹ میں گری اور میں دیکھتا رہ گیا۔ اس غیر معمولی واقعہ نے میرا دل ایسا توڑا کہ اس کے بعد سے میں نے ایک پوائنٹ بھی حاصل نہیں کیا۔

ایک کھلاڑی خواہ وہ دنیا کا بہترین کھلاڑی ہی کیوں نہ ہو اگر کھیل کو صحیح اسپرٹ کے ساتھ نہ کھیلے تو وہ قابل عزت نہیں ہوتا اسپورٹسمن وہی ہے جو ہار جیت دونوں صورتوں میں صحیح جذبہ دکھلائے صحیح جذبہ دکھلانے کے سبب کوئی کھلاڑی اگر میاچ بھی ہار جائے تو پروا نہیں کرنی چاہئے مدراس ٹورنمنٹ کا واقعہ ہے کہ محمد حسین اور میں سرٹوریو اور ڈالبانو اطالوی کھلاڑیوں سے سمی فائنل میں کھیل رہے تھے ہم نے پہلا سٹ ۶۔۰ پر حاصل کیا تھا اور دوسرے میں ہمارے پانچ اور مخالف کے دو گیم بنے تھے اور ہم کو میاچ جیتنے کے لئے ایک پوائنٹ بنانا تھا۔ محمد حسین نے سروس کی جو ٹھیک گری اور ڈلبانو نے باوجود اس کو واپس کرنے کی کوشش کے اس کو نہ لے سکے۔ امپائر نے میچ کے اختتام کا اعلان کیا لیکن ڈلبانو بگڑ گئے اور تیار نہ رہنے کا عذر کرکے پھر سروس کرنے کی خواہش کی۔ ہم نے امپائر سے استدعا کی کہ وہ ہمارے مخالفین کی خواہش پوری ہونے دیں۔ چنانچہ کھیل شروع ہوا اس واقعہ نے ہم پر برے حد اثر کیا اور ہم نہ صرف وہ سٹ بلکہ میاچ ہار گئے لیکن ہمیں یہ تشفی ہوئی کہ اخلاقی فتح ہماری رہی۔

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا) **سید محمد ہادی**

مغربی فلم ہندوستان میں

ہندوستان جیسے ملک میں تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے شام کا وقت گزارنا ایک دشوار سا مسئلہ ہے۔ اس ملک میں تفریحات کی وہ کثرت نہیں جو یورپ اور امریکہ میں ہے۔ محض دوستوں سے ملنا ملانا ہی ایک ایسا مشغلہ تھا جس سے شام کا وقت گزر سکتا تھا۔ سینما اس وجہ سے بہت مقبول ہوا کہ اس بہانے وقت گزارنے کی ایک اور ترکیب ہاتھ آئی۔ جو لوگ دفتروں سے تھکے ماندے آتے تھے۔ انھیں سینما میں تفریح اور وقت گزاری کا موقع ملتا تھا۔ ہوتے ہوتے سینما سستا ہو گیا اور مزدور پیشہ طبقہ کے لوگ بھی کثرت سے سینما جانے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ امریکہ میں بھی صنعت فلم سازی گہوارۂ طفلی میں تھی اس زمانے میں ایک ایک دو دو ریل کے چھوٹے چھوٹے مذاقیہ یا جذباتی فلم بنتے تھے جو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی ایک عجوبہ تھے چارلی چپلن کی شہرت کا اسی زمانے میں آغاز ہوا اس دور کے فوراً بعد ہی سیریل تیار ہونے لگے۔ یہ ٹھگی، ڈکیتی اور بدمعاشی کے طویل افسانے تھے۔ یا جنگل کی فرضی طول طویل داستانیں جو قسط وار سینماؤں میں دکھائی جاتیں۔ ایک قسط دیکھنے کے بعد ناظرین کو دوسری قسط دیکھنے کی خواہش ہوتی۔ اور سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔ ایڈی پولو وغیرہ اس قسم کی فلموں کے مقبول عام ایکٹر تھے۔ ٹارزن کا قصہ ان سیریل فلموں میں بہت پسند کیا گیا اور اس کے بعد سے جنگل کے متعلق اس قسم کے قصے بہت پسند کئے جانے لگے۔

ہندوستان میں چونکہ بے کاری اور فرصت کی فراوانی ہے۔ اس لئے سیریل فلم یہاں بہت زمانہ تک مقبول رہے۔ لیکن امریکہ کی مصروف زندگی میں وہاں کے کاروباریوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ہر قسط ہر ہفتہ دیکھ سکیں۔ چنانچہ وہاں بہت جلد ایسے فلم تیار ہونے لگے جن میں پورا قصہ ایک ہی نشست میں دیکھا جا سکے۔ اور فلم ڈیڑھ دو گھنٹہ میں ختم ہو جائیں ایسے فلموں کے لئے انھوں نے چند ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو — جن کو پبلک پسند کرنے لگی تھی — بہت شہرت دی طرح طرح سے ان کا پروپگنڈا کیا تاکہ ان کی شہرت کی بنیاد پر ان کے فلم مقبول ہوں۔ امریکہ کی فلم کمپنیوں نے ان اداکاروں کے لئے "سینما اسٹارس" یعنی اختران سینما کا لقب تجویز کیا۔ یہ تجویز بہت کامیاب رہی اور چارلی چپلن، ڈگلس فیربنکس، روڈالف والنٹینو، نگری ولما نیکی وغیرہ کے نام دنیا بھر میں مشہور ہو گئے ان اداکاروں کے فلموں نے رفتہ رفتہ ہندوستان میں بھی بہت مقبولیت حاصل کر لی۔

اس عرصہ میں دو اہم وجوہات کی بناء پر امریکہ میں فلموں کا معیار بلند ہونے لگا پہلی تو یہ کہ یورپ اور امریکہ کی تھیٹروں کے بہترین اداکار تنخواہوں کی بیشی کی وجہ سے سینما میں کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ فرانسیسی اسٹیج کی مایہ ناز ایکٹرس سارا برنرڈ بھی پردۂ سینما پر نمودار ہوئی چونکہ اسٹیج کے یہ اداکار نہایت اعلیٰ درجہ کے ادبی اور ڈرامائی شاہکاروں میں کام کرنے کے عادی تھے اس لئے ان کی خاطر بہت ہی اعلیٰ معیار کے قصے چنے گئے۔ جو زیادہ تر ادبیات عالیہ یا تاریخی واقعات پر مبنی تھے۔ دوسری وجہ امریکن خاموش فلموں کے معیار کی بلندی کی یہ تھی کہ بہت سے ڈائرکٹروں نے سینما کی اہمیت اس حیثیت سے محسوس کی کہ یہ فنون لطیفہ میں ایک نئے فن کا اضافہ ہے۔ اس میں مناظر کی

دلکشی و عظمت اور فوٹوگرافی کی ترقی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی اداکاری کے ذریعہ جذبات کا اتار چڑھاؤ دکھانے کی جو صلاحیت ہے وہ کسی اور فن میں نہیں چنانچہ ان ڈائرکٹروں میں سے D. W. G(riffith) (Cecil B. de Mille) اور (King Rider) نے چند ایسے فلم پیش کئے جو نہ صرف سینما بلکہ فنون لطیفہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ یورپ میں اس قسم کے فلم مشہور روسی ڈائرکٹر (Eisenstein) اور جرمن ڈائرکٹر (Robert Wiene) نے بنائے۔ اس قسم کے فلموں میں سے عالی شان مناظر کے فلم ہندستان میں بہت مقبول ہوئے۔ مثلاً (Ben Hur) (Uncle Tom's Cabin) وغیرہ

ہندوستان میں ان فلموں کی مقبولیت دیکھ کر امریکہ کی فلم ساز کمپنیوں نے ہندوستانی مارکٹ کے لئے مشرقی قصوں کے فلم بنانے شروع کئے۔ ان میں Thief of Bagdad ہے کہ ہندستان میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ غالباً کسی اور امریکن فلم کو نہیں حاصل ہو سکی جنگ عظیم کے بعد جب انگریزوں کا تسلط مصر کے علاوہ عراق اور فلسطین پر بھی ہو گیا تو امریکن فلم کمپنیوں نے ایسے فلم بنانا چاہے جو نہ صرف ہندستان میں پسند کئے جائیں بلکہ ان ملکوں میں بھی ان کی قدر ہو۔ چنانچہ یہ دیکھ کر روڈالف والنٹینو کو مشرق میں پسند کیا جاتا ہے انھوں نے (Sheik) اور (Son of Sheik) کے نام سے دو فلم تیار کئے جنھوں نے مشرق میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً بہت مقبولیت حاصل کی۔

اس دوران میں ہندستان میں صنعت فلم سازی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن جو فلم تیار ہوتے تھے۔ ان کا معیار اس قدر گرا ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ لوگ ان کو دیکھنا تضیع اوقات بلکہ عیب سمجھتے تھے۔ ہر طرح کی نئی خرابیاں ان خاموش ہندستانی فلموں میں موجود تھیں۔ کسی طرح یہ فلم باہر سے آنے والے فلموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور اسی لئے آئے دن نئی نئی ہندستانی فلم کمپنیاں قائم ہوتیں اور ٹوٹتی رہتیں۔

سنہ ۱۹۲۹ء سے یورپ اور امریکہ میں بولتے ہوئے فلموں کا رواج عام ہوا۔ شروع شروع میں ان فلموں میں موسیقی کی بھرمار تھی اور مغربی موسیقی سے ہندستان کے کان ناآشنا تھے ساتھ ہی ساتھ ایک امریکن تلفظ سمجھنے میں ہندوستان تو ایک طرف بلکہ انگلستان کے لوگوں کو بھی کافی تکلیف ہوئی۔ اس لئے کچھ زمانے تک ہندستان میں ان بولتے ہوئے فلموں کے مقابلہ میں امریکہ ہی کے خاموش فلموں کو ترجیح دی جاتی رہی۔ لیکن جب امریکہ میں خاموش فلموں کی تیاری بالکل رک گئی تو چارو ناچار ہندستانی سنیماؤں کے مالکوں کو صوتی آلات نصب کرنا پڑے۔ پھر بھی امریکہ کے بولتے فلموں کو بجز کلکتہ اور بمبئی کے جہاں یوروپین اور اینگلو انڈین آبادی کثیر تعداد میں موجود ہے، اور کہیں خاموش فلموں کی سی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی۔

لیکن بیرونی بولتے ہوئے فلموں کو بہت جلد ہندستانی بولتے فلموں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا اس مقابلہ میں بیرونی فلموں کو شکست فاش ہوئی۔ ہندستانی گانوں نے ہندستان کے سینما کے ناظرین کے بڑے طبقے کا دل موہ لیا۔ ابتدائی ہندوستانی بولتے فلموں مثلاً "لیلیٰ مجنوں" "شیریں فرہاد" اور "پورن بھگت" وغیرہ کو ایسی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہندوستان میں صنعت فلم سازی بہت تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ ہندستانی فلموں کی اس مقبولیت کا خاص باعث گانا ہے۔

چونکہ مغربی موسیقی سے ہندوستانیوں کے کان بالعموم نامانوس ہیں اور اپنی موسیقی کے سوا انھیں باہر کے کسی ملک کی موسیقی زیادہ پسند نہیں۔ اس لئے ہندستانی فلموں نے ہندستان کے مارکٹ کے بڑے حصہ پر تصرف کر لیا اور ہندستان کی صنعت فلم سازی رفتہ رفتہ بیرونی ملکوں کو میدان سے باہر کر رہی ہے۔

امریکہ اور انگلستان کی فلم کمپنیاں ہندستان کے مارکٹ کو کافی اہمیت دیتی ہیں۔ سینما کی قصہ نگاری کے متعلق جو کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ ان میں قصہ نویسوں کو اکثر یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ مشرقی قصوں میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ہندستان میں ان کا کیا اثر ہوگا۔ بولتے ہوئے فلموں کے رواج کے بعد سے ہندستان میں مغربی فلم دیکھنے والی پبلک محدود ہوگئی۔ عموماً صرف یوروپین یا اینگلو انڈین بالالتزام مغربی فلم دیکھتے ہیں۔ اور ان کے بعد پھر تعلیم یافتہ ہندستانیوں کا کچھ حصہ اس دوران میں ہندستان کے متعلق جو فلم بنائے گئے ان میں اس کا خیال رکھا گیا کہ وہ یوروپین اور اینگلو انڈین ناظرین کو پسند آئیں اور اس کے علاوہ پروپگنڈا اور ہندستان کے مناظر و زندگی کی بوالعجبی کے باعث برطانیہ اور دوسرے انگریزی بولنے والے ممالک میں بھی پسند کئے جائیں چنانچہ سگار اور سرحد کی لڑائیوں وغیرہ کے متعلق اکثر فلم انگلستان اور امریکہ میں تیار کئے گئے مثلاً (Lives of Bengal Lancer) (Drums) اور (Elephant-boy) وغیرہ عموماً ان فلموں کی وہی ذہنیت ہے جو کپلنگ کے ناولوں کی ہے۔ ان فلموں نے ہندستان سے زیادہ انگلستان میں مقبولیت حاصل کی۔ اور دوسرے ملکوں میں جن کے پاس ایشائی نوآبادیات ہیں مثلاً فرانس، ہالینڈ وغیرہ میں بھی ان فلموں کی بہت قدر ہوئی۔

مگر ۱۹۳۷ء میں جدید دستور کے نفاذ کا اثر ہندوستان کے فلم سنسروں پر پڑا ایک فلم (Gungadin) جو مذکورۂ بالا فلموں کی قسم سے ہے ہندوستان میں ممنوع قرار پایا اس کی وجہ سے امریکہ کی فلم کمپنیوں کو اس کا احساس ہوا کہ اب جو فلم وہ ہندوستان کے متعلق بنائیں اس میں ہندستانیوں کے جذبات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے پہلے بھی امریکن فلم کمپنیوں نے ایسے فلم بنائے تھے جس میں ہندستانیوں کی زندگی اور معاشرت کو بلا تعصب اچھی روشنی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس قسم کا ایک فلم (Son of India) تھا جس میں Ramon Novarro نے کام کیا تھا بہرحال (Gungadin) دکھانے کی ممانعت کے بعد سے امریکہ اور انگلستان کی فلم کمپنیوں نے محسوس کیا ہے کہ ہندستان کے متعلق فلم بنانے کے لئے ایسے قصے چنے جائیں جنھیں ہندوستانی بھی ناپسند نہ کریں چنانچہ اب امریکہ میں ایک فلم (The Rains Came) تیار ہو رہا ہے۔ جو اسی نام کے ایک مشہور ناول پر مبنی ہے اس ناول میں ہندستانیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک انگریزی فلم کمپنی نے ہندوستانی ڈائرکٹر عذرا میر کی ایک تاریخی کہانی کو فلم بنانے کے لئے انتخاب کیا ہے۔

مغربی فلموں میں سے ہندوستان میں سب سے زیادہ امریکہ کے فلم مقبول ہیں پھر انگلستان کے لیکن دنیا بھر کے بہترین فلم جرمنی، فرانس اور روس میں تیار ہوتے ہیں اور یہ فلم شاذ و نادر ہی ہندستان آتے ہیں مغربی فلموں میں سب سے زیادہ مقبولیت جنگ کے فلموں کو حاصل ہے اور پھر کچھ اعلیٰ درجہ کے ناچ گانے کے فلموں کو۔ مغرب کے معاشرتی فلم بالعموم ہندستان میں مقبول نہیں اگر کوئی اداکار نہ ہو تو اچھے سے اچھا

معاشرتی فلم ہندستان کے ناظرین کی توجہ جذب نہیں کرتا چنانچہ (Mr. deeds goes to loton) جس سے بہتر نفسیاتی اور طنز آمیز فلم شاید ہی امریکہ نے تیار کیا ہو ہندستان میں مقبول نہیں ہوا۔

امریکہ کے فلموں کی ہندستان ہی میں نہیں دنیا بھر میں بہت مانگ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ والے اپنے فلموں کا معیار کبھی ضرورت سے زیادہ بلند نہیں ہونے دیتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ کی فلموں کا معیار بر اعظم یورپ کے فلموں کے مقابلہ میں بہت گرا ہوا ہے۔ امریکہ کا فلم دیکھنے والا طبقہ اصل میں کاروباری یا مزدور پیشہ طبقہ ہے۔ جو دن بھر کی محنت کے بعد وقت گزاری کے لئے فلم دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ضرور ہے کہ فلم دلچسپ اور باعث تفریح ہو جس کو دیکھ کر تھکا ماندہ کاروباری کچھ دیر کے لئے اپنی پریشانیاں بھول جائے۔ یہی وجہ امریکن فلموں کی مقبولیت کی ہے۔ فنی حیثیت سے صرف اداکاری اور فوٹوگرافی تو ان فلموں میں ہوتی ہے اور کچھ نہیں، قصوں میں عموماً جان نہیں ہوتی اور اکثر و بیشتر امریکن فلموں کے قصے حقیقت اور نفسیات کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ یورپ میں جہاں کا تمدن مقابلتاً زیادہ قدیم ہے اور جہاں فنون لطیفہ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے سینما محض تفریح نہیں بلکہ ایک فن لطیف بھی ہے۔ فوٹوگرافی کی حد تک بھی یہ فلم امریکہ کے فلموں سے بہتر ہوتے ہیں اور چونکہ اداکاری کی بنیاد نفسیات پر ہوتی ہے اس لئے یورپ کے فلموں کا معیار امریکہ کے مقابلہ میں بہت بلند ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے (Sileau ha - Annabelda) یا (Huey Emmil) یا (Conrad Veidt) یا (Jannings) کو یورپ کے بنے ہوئے فلموں میں دیکھا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان فلموں میں ان کی اداکاری کا معیار اس کے امریکن فلموں کے مقابلہ میں کس قدر بلند ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اعلیٰ درجہ کے فلموں میں قصے کی بنیاد حقیقت نگاری، نفسیات اور بے ساختہ پن پر ہوتی ہے اور اداکاروں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ برخلاف اس کے امریکہ میں محض اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ قصہ عوام الناس میں مقبول ہو۔ اس تجارتی نقطۂ نظر کی وجہ سے امریکن فلموں کے قصوں کا معیار وہی ہو جاتا ہے۔ جو معمولی ناولوں کا ہے۔ اس اعتبار سے انگلستان کے فلموں کا معیار امریکہ کے فلموں سے بھی گرا ہوا ہوتا ہے۔

خاموش فلموں کے زمانہ میں یورپ کے بنے ہوئے فلم اکثر ہندوستان آتے تھے۔ اور مقبول ہوتے تھے۔ چنانچہ اطالوی فلم ساز کمپنی (Unione Cinematog ha- phica Italia -) کا بنایا ہوا فلم (Ruovadis -) ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ اکثر جرمن فلم بھی یہاں بہت پسند کئے گئے لیکن جب سے بولنے ہوئے فلم بننا شروع ہوئے ہندوستان میں یورپ کے فلموں کی مانگ نہیں رہی۔ ہندوستان کے فلمی ناظرین یورپ کے فنون لطیفہ سے بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ چار سال قبل ایک یورپی فلم (Don quixote) جو مشہور ہسپانوی ناول نگار (Cervantes) کے ناول سے ماخوذ تھا۔ ہندستان آیا اس کو مشہور جرمن ڈائرکٹر (Pelast) نے تیار کیا تھا اور مشہور روسی مغنی (Challiaphine) نے اس میں ہیرو کا پارٹ کیا تھا اور لطف یہ کہ مکالمہ بھی انگریزی میں تھا پھر بھی اس فلم کو ہندوستان میں بالکل پسند نہیں کیا گیا اسی طرح حال ہی میں انگریزی مکالمہ کے ساتھ Such a guitry

کا عجیب و غریب فلم Roman duntrich
(Cuu) یعنی "ایک دہوکہ باز کی سرگزشت" یہاں آیا تھا۔ اس انوکھے فلم میں یہ جدت تھی کہ مصنف ایک فرضی قصہ لکھتا جاتا ہے اور قصہ کے واقعات پردہ سینما پر اسی ترتیب سے نظر آتے ہیں۔ بجائے مکالے کے فلم کے مصنف کی آواز واقعات کی تشریح کرتی جاتی ہے۔

جن یوروپی فلموں کے ساتھ انگریزی مکالمہ کو شریک نہیں کیا گیا اور ان کی زبان فرانسیسی یا جرمن ہے، ان کا ہندستان میں پسند کیا جانا اور بھی زیادہ مشکل ہے اور ایسے فلم یہاں بالکل کامیاب نہیں ہوتے۔ حالانکہ ان فلموں میں ہمیشہ اس کا التزام کیا جاتا ہے کہ اصلی مکالمہ کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی پردہ سینما پر بتائیں۔

یورپ کے فلموں میں فرانسیسی فلم خصوصیت سے لاجواب ہوتے ہیں ان کے قصوں میں باوجود انتہائی نفسیاتی باریکیوں کے ایک عجیب طرح کا انوکھا پن اور بانکپن ہوتا ہے۔ اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ گزشتہ دو تین سال کے عرصہ میں بہترین فلم کونسے ہیں تو وہ دو چار فرانسیسی فلموں (lan carn
Kakram) یا (et-duval
eue dehique) کا نام لینا پڑے گا۔ جرمن یا زیادہ صحیح الفاظ میں اسٹریوی فلم اپنے معیار اور دوسری تمام خوبیوں کے لحاظ سے فرانسیسی فلموں سے کچھ ہی کم ہیں۔ بعض جرمن فلم جو ہٹلر کی آمد سے پہلے تیار ہوئے تھے۔ مثلاً (Kau Vada schaft) اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بے مثل ہے۔ اس فلم میں کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والے فرانسیسی اور جرمن مزدوروں کی دشمنی اور دوستی کا قصہ بہت با اثر طریقہ پر دکھایا گیا تھا۔ جرمن اور اسٹریا کے (Aus cheuse) کے بعد سے اس قسم کے فلم بننا بند ہو گئے ہیں اور اب جرمنی میں یا تو پروپگنڈے کے فلم بنتے ہیں یا جذباتی فلم۔

جہاں تک قصہ کی حقیقت نگاری کا تعلق ہے جدید ہندستانی فلمیں امریکن فلموں سے پیچھے نہیں امریکن فلموں کے قصوں کی خامیاں ہم پر اس قدر آسانی سے واضح نہیں ہو سکتیں جس قدر کہ ہندوستانی فلموں کی۔ ہندستان کی بعض فلم کمپنیاں اصلاح معاشرت سے متعلق ایسے فلم تیار کر رہی ہیں جو ہر طرح قابل تعریف ہیں۔ اخلاقیات کی تعلیم و تبلیغ ہمیشہ سے مشرقی ادبیات کا مرکز رہی ہیں۔ چنانچہ ہندستانی فلم اب بھی امریکہ کے فلموں کے مقابلہ میں بہت خام ہیں۔ اداکاری اور فوٹوگرافی میں ہندستانی ابھی امریکہ سے بہت پیچھے ہیں۔ اداکاری میں تصنع بہت پایا جاتا ہے۔ اور اس کی ایک وجہ مکالے کی خرابی ہے۔ ہندستانی فلموں کے مکالے میں وہ قدرتی سادگی اور پرکاری و بے ساختہ پن نہیں ہوتا جو مغربی فلموں کے مکالمے کی جان ہے۔ جب تک مکالمہ نگار پوری طرح مدد نہ پہنچائے اداکار اپنا کام بخوبی انجام نہیں دے سکتے کاش ہندستانی فلم ساز کمپنیاں یورپ و امریکہ کی کمپنیوں کی اتنی تقلید اور کریں کہ مکالمے کا معیار بلند کریں اور ساتھ ہی ساتھ اداکاروں کو اس کی ہدایت کریں کہ ان کی ایکٹنگ میں تصنع کو بالکل دخل نہ ہو اور ان کی ہر جنبش اور ہر حرکت بالکل قدرتی اور اصلی معلوم ہو۔ یہی مغربی فلموں کے کمال کا سب سے بڑا راز ہے۔

(حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے پڑھا گیا) **عزیز احمد**

انتظار

گئے ہو اپنے کام کی خاطر
سکھ، آنند، آرام کی خاطر
یا اس جگ میں نام کی خاطر
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

ہر صورت گھر بار بھلا تھا
گھر کا ہر آزار بھلا تھا
قصبہ کا بازار بھلا تھا
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

میں دکھیا ہوں پریت کی ماری
نینن میں ہے رین گزاری
آؤ! آؤ! تم پر واری
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

تم سے اپنی قسمت جوڑی
من کو توڑا آشا توڑی
کیسی ہے یہ پریت نگوڑی
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

بادل چھائے برکھا لائے
ندی اُمڈی، نالے آئے
سکھیوں نے مل گیت ہیں گائے
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

بارش کا پھر موسم آیا
ہریالی نے رنگ جمایا
بدل گئی دھرتی کی کایا
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

کھیتوں پر چھائی ہے جوانی
رقص میں ہے موتی سا پانی
جاگ اٹھی جنگل کی رانی
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

ڈونگر، ڈونگر، مور پکارے
سینہ میں اک برچھی مارے
آؤ! آؤ! پریتم پیارے
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

کب تک ندیا بہتے دیکھوں
پریم کہانی کہتے دیکھوں
جیا دوارے رہتے دیکھوں
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

ندی کا مٹیالا پانی
نالوں کی بدمست روانی
فطرت کی مغرور جوانی
دیش سے کیوں پردیس سدھارے

النسب کلیانوی

بچوں سے

گرمی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مدرسوں کو چھٹیاں ہیں۔ آپ سب امتحانوں سے فارغ ہو گئے ہوں گے۔ کیا مصروفیات ہیں؟

اس مہینہ کا پرچہ تو آپ غور سے پڑھیں گے۔ بعض مضمون بہت اچھے ہیں۔ "ش کی شورش" خوب مضمون ہے آپ میں سے اکثر اس مضمون کو پسند کریں گے۔

آپ کی انجمن (شعبۂ طلبہ) کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ ۱۶ر اپریل ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں چند ضروری باتوں کا تصفیہ ہوا۔ ایک انعامی تقریری مقابلہ ۹ ر مئی کو منعقد ہوگا۔ عنوان کا اعلان ایک گھنٹہ قبل کیا جائے گا۔ انعام میں اچھی اچھی کتابیں دی جائیں گی۔ ایک تحریری مقابلہ بھی عنقریب ہونے والا ہے۔ عنوان کا اعلان پندرہ روز پیشتر کیا جائے گا۔ ان مقابلوں میں ہر طالب علم شریک ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ آپ میں کا ہر ایک اس میں حصہ لے گا۔ انعامی ادبی معمہ بھی نکالا جائے گا۔ جن کو ان کاموں سے دلچسپی ہے وہ معتمد "شعبۂ طلبہ" ادارہ سے خط و کتابت کریں۔ اس پرچہ میں ایک انعامی معمہ شائع ہو رہا ہے دو انعامات رکھے گئے ہیں۔ معمہ بڑا دلچسپ ہے۔ امید کہ آپ اس طرف توجہ کریں گے اور معمہ کا حل ۲۰ر مئی تک ہمارے پاس بھیج دیں گے۔

بچوں میں خط و کتابت جاری ہے ایک نیا خط وصول ہوا ہے اسے ہم شائع کرتے ہیں جو طلبہ ان سے خط و کتابت کرنا چاہتے ہیں وہ شوق سے انھیں لکھ سکتے ہیں۔

"میرا محبوب مشغلہ ٹکٹ اور دیا سلائی کے لیبل جمع کرنا ہے۔ میرے پاس جرمنی، اٹلی، فرانس، سیلون، حیدرآباد اور انگلستان وغیرہ کے ٹکٹ ہیں۔ میں سب ہی بھائیوں سے تبادلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

دھرم رام پرشاد... دھرم ونت ہائی اسکول حیدرآباد دکن

عارف علی انصاری غوث محی الدین بمکان سجادہ صاحب روضہ شیخ محلہ شیخ روضہ گلبرگہ سے خط و کتابت کریں۔ دونوں کا مشغلہ ایک ہی ہے۔

تحریری مقابلہ سے متعلق اعلان اخبارات میں پڑھ لیجئے۔ ہم ہماری اکثر خبریں اخبارات کے ذریعہ آپ تک پہنچاتے ہیں تاکہ آپ کا مطالعہ اور معلومات وسیع ہوں۔ اضلاع کے طلبہ شعبۂ طلبہ سے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہتے ہوں تو معتمد شعبہ سے مراسلت کریں۔

معین الدین احمد انصاری

صحیح حل پر انعام

اول شمس العلماء حافظ ڈپٹی ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کی سوانح حیات صفحات (۲۰۵) مفت دی جائے گی دوم۔ حیدرآباد کے متعلق مشہور ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے تاثرات "اندرون حیدرآباد" نامی مختصر کتاب۔ حل اڈیٹر ضمیمہ سب رس خیریت آباد حیدرآباد کے پتہ پر بھیجیں۔ انعام کا تصفیہ دو مرتبہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ کتابیں ٹکٹ آنے پر بذریعہ ڈاک بھیج دی جائیں گی۔

شرکت کے لئے "شعبۂ طلبہ" ادارۂ ادبیاتِ اردو کا رکن یا ضمیمہ کا خریدار ہونا ضروری ہے۔

سہل انعامی معمہ

اردو کے ایک سرپرست کا ہشت حرفی نام بتلاؤ کہ جس کے ابتدائی نصف حصے کے لفظ سے مثال کے معنوں کا لفظ بنتا ہے۔ اور ما بقی نصف حصے سے تعریف کیا گیا اور ایک بغیر میم کے معنی پیدا ہوں۔ اس نام کے پہلے چوتھے اور آخری حرف سے بہرہ کے معنی نکلتے ہیں۔ چوتھے چھٹے اور ساتویں حرف سے ترس کے ہم معنی لفظ بنتا ہے۔

بتاؤ اس سرپرست اردو کا کیا نام ہے۔

سید خدا بخش سلیم
(دار العلوم)

(تقریری مقابلہ۔ بتاریخ ۹ مئی شام کے پانچ بجے احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں ہوگا)

محمدؐ ہمارے

خدا کے حبیب اور رسولوں کے پیارے — فرشتوں کے مالک پیمبر ہمارے
محمدؐ کا رتبہ بھلا کون جانے — وہ ہیں آسمانِ نبوت کے تارے
گو دنیا میں آئے ہیں لاکھوں پیمبر — محمدؐ مگر حق کو ہیں سب سے پیارے
خدا کی اماں اُس پہ رہتی ہے ہر دم — محمدؐ کو جو دل سے ہر دم پکارے
خدا بھی ہے اس کا خدائی بھی اس کی — خدا جس کو "محبوب" کہہ کر پکارے
نہ کیوں ناز قسمت پہ اپنی کریں ہم — محمدؐ کے ہم ہیں محمدؐ ہمارے

لطیف النسا بیگم ایم اے

فٹ بال کی آپ بیتی

میرا "وطن انگلینڈ ہے" میں نے جس گھر میں جنم لیا ہے اس کو "جانسن اسپورٹ کمپنی" کہتے ہیں۔ اب چونکہ میری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے اور اعضار رعشہ پر بڑھاپے نے حملہ بول دیا ہے جس کی وجہ میں صحیح طور پر اپنی تاریخ اور وقتِ پیدائش بتانے سے معذور ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ میں ایک کھیلنے کی چیز ہوں اور بلحاظ جسم موٹا اور بلحاظِ وزن کم۔ حقیقت میں میں ایک ربڑ کی تھیلی ہوں اور میری زندگی کا انحصار ہوا پر ہے۔ جس طرح تم اپنے آپ کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے چھتری اور جوتے کا استعمال کرتے ہو اسی طرح کرۂ ارض کے پتھروں اور کانٹوں سے جو میری تکلیف کا باعث ہیں بچانے کے لئے میرے آقا نے مجھ پر چمڑے کا خول چڑھا دیا ہے۔

جب میرے آقا کی فہم و دانش پر حرص و ہوس نے غلبہ پایا تو اس نے محض اپنے ذاتی مفاد یعنی میری زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کی غرض سے مجھ کو ہندوستان بھیجنے کا تہیہ کرلیا اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں عنقریب ہندوستان بھیجا جانے والا ہوں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جس کے دو اہم اسباب یہ تھے کہ ایک تو ہندوستان کی دید کی خوشی اور دوسرے اپنی نجات کا خیال مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے وطن کی جدائی کا بھی بے حد ملال تھا۔ دوسرے دن مجھ کو نہایت تزک و احتشام سے ہندوستان جانے والے جہاز پر سوار کردیا گیا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں جہاز ہندوستان کے مشہور شہر "عروس البلاد" بمبئی کی بندرگاہ پر آ لگا یہاں سے میرا پارسل شہر کی مشہور دکان جہاں سے اسپورٹس کا کم و بیش سامان شہر میں مہیا کیا جاتا تھا لے جایا گیا۔ دکان کے مالک نے مجھے تسلی و تشفی دیتے ہوئے شیشہ کی الماری میں بند کرکے ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے کہ ہر راہرو میرے دیدار

لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ اب میں نے یہ خیال کیا تھا کہ میری تکلیفوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن ابھی قسمت کا لکھا پورا نہ ہوا تھا کہ ایک نئی آفت مجھ پر یہ آئی کہ اسکول میں میری طلبی ہوئی جہاں مجھ کو ایک "فزیکل ٹرینڈ" ماسٹر کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔

اس اسکول کے لڑکے ہر روز شام میں مجھے اپنے پیروں سے کھیلتے تھے اور اس کھیل میں انھیں خوب لطف آتا تھا۔ کبھی تو مجھے اوپر کی طرف پھینک دیتے اور میں فضا میں چکر لگانے کے بعد دھڑام سے نیچے گر پڑتا اور ابھی میری سابقہ حیرانی و پریشانی دور ہونے بھی نہ پاتی کہ کوئی اور میرے سر پر لات کس دیتا اور پھر مجھے چار و ناچار اوپر کی راہ لینی پڑتی۔ غرض جب کبھی میں اپنی ان سابقہ تکالیف کا خیال کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایک وقت وہ بھی یاد ہے جب کہ حد سے زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور جب مجھ میں ان تکالیف و مصائب کے برداشت کی طاقت نہ رہی تو اپنی زیست سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ڈسمبر کی ۲۰ تاریخ کو ہمارے اسکول کی ٹیم اور شہر کے ایک دوسرے اسکول کی ٹیم کا مقابلہ ہوا جس میں مجھے نہایت کاری ضرب لگی جس کے صدمہ سے میرا پیٹ پھٹ گیا اور تمام ہوا خارج ہو گئی۔ چونکہ میری زندگی کا دارومدار محض ہوا پر ہے اور جب ہوا خارج ہو گئی تو میں بالکل از کار رفتہ ہو گیا۔

جب میری حالت بالکل اپاہج کی سی ہو گئی تو اسکول کے گیمس سکریٹری صاحب نے مجھے ایک ایسے تاریک کمرے میں بند کر دیا جو تمام بوسیدہ اور از کار رفتہ سامان سے بھرا پڑا تھا۔ اس کال کوٹھڑی میں تقریباً ایک مہینہ گزارنے کے بعد اس تمام بوسیدہ اور فرسودہ سامان کے ساتھ نیلام کرنے کے لئے بازار لیجایا گیا جہاں مجھ کو صرف دو آنے کے عوض ایک اجنبی شخص کے سپرد کر دیا گیا۔ اس شخص نے مجھے اپنے گھر لیجاکر میری درستی کے لئے اپنی تمام تر سعی صرف کر دی مگر میری شومئی قسمت کے آگے اس بے چارے کی کچھ پیش نہ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی محنت بالکل رائیگاں جا رہی ہے تو مجبوراً اس نے بھی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں پھینک دیا۔ اور اب تک میں وہیں پڑا ہوا ہوں۔ کیا آپ کو میری اس حالت کس مپرسی پر رحم نہیں آتا؟

محمد عبد القادر فاروقی
(رسالت نگر)

ٹامس باٹا

سب رس کے بھائیو، تم نے باٹا کے جوتے تو ضرور پہنے ہوں گے اگر نہیں پہنے ہیں تو نام تو ضرور سنا ہوگا لیکن تم نے اس امر کا کبھی خیال نہیں کیا کہ اس کا مالک کون تھا اور اس نے اپنی کمپنی کو کس طرح وسعت دی آج ہم اس کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھتے ہیں۔

اس کمپنی کا مالک ٹامس باٹا تھا جس کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے، ٹامس کی زندگی کے چند دن عجیب پریشانیوں میں گزرے لیکن وہ ان پریشانیوں سے ذرا بھی پست ہمت نہ ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ترقی کریں۔ چنانچہ چیکوسلواکیہ میں اس کے باپ کا ایک چھوٹا سا جوتوں کا کارخانہ تھا اور اسی پر تمام گھر کی گزر اوقات ہوا کرتی تھی ٹامس جب چھ برس کا ہوا تو وہ اب اپنے باپ کے ساتھ مل کر جوتے بنانے لگا۔ اور اس کے بنائے ہوئے جوتے عموماً پورے سائز کے نہایت عمدہ ہوتے تھے۔ پہلے پہل اسے اس کے باپ نے کارخانہ میں جو خدمت دی تھی وہ گاہکوں کو جوتے تھلانا اور انھیں پہنانا، اتارنا وغیرہ تھی جس کا معاوضہ اسے ایک "پینی" ملتا تھا۔ وہ ان پیسوں کو بنک میں جمع کرتا تھا۔ اس کے بعد جو اسے خدمت دی گئی وہ جوتے بیچنا تھا۔ اور ٹامس گلے میں جوتے لٹکائے ہوئے چیکوسلواکیہ کے گلی کوچوں میں فروخت کرتا ہوا پھرا کرتا تھا۔ اور کسی کو گمان تک بھی نہ تھا کہ یہ آئندہ چل کر دنیا کے مالداروں میں شمار ہونے والا ہے۔ لیکن جب ٹامس کچھ بڑا ہوا تو اس کے باپ نے اُسے اپنے گاؤں کے باہر دوسرے تاجروں کے ہمراہ جوتے فروخت کرنے کے لئے بھیجا، اسی شوق کے عالم اور بیرونی سفر نے اس کے دل میں بڑے بڑے خیالات موجزن کر دیئے اور وہ اپنی آئندہ زندگی کے منصوبے باندھنے لگا، اس کے مصمم ارادوں نے بالآخر اس کے منصوبوں کو کامیاب بھی کر دیا۔ جب اس کی عمر دس سال کی ہوئی تو اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ٹامس اور اس کا بھائی دونوں والد کے ساتھ زیادہ محنت سے کام کرنے لگے۔ لیکن جب کبھی کاروبار سرد پڑ جاتا تو فاقہ کشی کی نوبت آتی۔ اور جب باٹا چودہ برس کا ہوا تو تمام کاروبار اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیئے۔

اس نے صرف پانچویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ لیکن عمر کے چودھویں سال اسے تعلیم ترک کرنی پڑی اس کا خیال تھا وہ کچھ اچھی تعلیم حاصل کرے لیکن کاروبار سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی اسکول سے بہت عمدہ اور کامیاب ٹریننگ حاصل کر چکا تھا۔ پہلے جب ٹامس جوتے فروخت کرتا تھا تو دن بھر کی آمدنی چھ پینی ہوا کرتی تھی لیکن ٹامس کے ہاتھ میں کاروبار آنے سے آمدنی بڑھ گئی۔

ٹامس کو اس کی والدہ بہت چاہتی تھی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی تو اس نے ٹامس کے لیئے دو سو فلارن (جو وہاں کا سکہ ہے) چھوڑے۔ جب یہ پیسے ٹامس کے ہاتھ لگے تو اس نے خیال کیا کہ کاروبار کو بڑھایا جائے لیکن والد کے

کہنے سے مجبور ہوگیا کیونکہ وہ کارخانے کو وسعت دینے کا حامی نہ تھا، اسی غصہ کے عالم میں گھر چھوڑ کر اس نے اپنی بہن کے گھر کی راہ لی جو وہاں سے چند میل دور رہا کرتی تھی بہن کی مالی امداد اور کچھ ذاتی سرمایہ سے اور کچھ قرض لے کر اس نے جوتوں کا بہت بڑا کارخانہ کھول دیا لیکن قرض داروں کے روزمرہ تقاضوں اور عدالتی جھگڑوں سے دیوالیہ ہوگیا۔ اب وہ پھر باپ کے پاس چلا آیا اور اب باپ کے ہمراہ کام کرنے لگا۔ جب سے کارخانہ کی آمدنی اور مال کی کھپت میں اضافہ ہونے لگا تو اس نے ہر جگہ اس کی شاخیں قایم کردیں۔ اور اب وہ اتنا مال دار ہوگیا تھا کہ دنیا کے بڑے مال داروں میں اس کا شمار ہونے لگا ترقی اور محنت اس کا نام ہے۔

لکھنؤ کے سفیدے

عبدالمجید خان یوسف زئی

میں ہمیشہ سے محمود کو ایک کنجوس، بخیل اور خود غرض سمجھتا تھا لیکن جب میری اس سے سر راہ ملاقات ہوئی اور اس نے مجھ سے سلام علیک کے بعد کہا "میں نے کچھ لکھنؤ کے سفیدے آپ کے یہاں بھجوائے ہیں قبول فرمائیے" تو مجھے اس کی سچی دوستی کا بالکل یقین ہوگیا اور مجھے اپنی گزشتہ رائے پر بے حد نادم ہونا پڑا۔

" اس کی کیا ضرورت تھی" میں نے شکریے کے طور پر کہا۔

بھئی لو اس میں بات ہی کونسی تھی لکھنؤ تفریحاً گیا تھا کچھ اپنے گھر کے لئے لایا تھا اس میں سے کچھ آپ کے ہاں بھجوائے ہیں۔ ہاں چھ مختلف قسم کے ہیں میری آنکھیں کھل گئیں۔ کتنا شریف دوست ہے کہ اتنے سارے آم میرے ہاں بھجوا دیئے واقعی سچے دوست ایسے ہوتے ہیں "کل دوپہر غریب خانے پر کھانا تناول فرمایئے" میں نے کہا۔ اور جیسی مجھے امید تھی۔ اس نے میری دعوت قبول کرلی۔

میں یہ سوچتا ہوا گھر جانے لگا کہ کچھ آموں کی تو جیلی بنے گی تھوڑے سے آموں کا مربہ ڈالا جائے گا اور باقی دعوت میں کام آئیں گے میں نے اسی خیال سے راستے ہی میں جیلی بنانے کا سامان خرید لیا کہ گھر جا کر تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

راستے میں دس، پندرہ دوستوں کی پارٹی ملی انھیں بھی دوسرے دن آموں کی دعوت دے دی اور دل ہی دل میں محمود کو دعائیں دیتا ہوا آموں کی نفیس خوشبو کے خیال میں گھر جانے لگا۔ چونکہ درمیان میں خالہ زاد بھائیوں کا مکان تھا اس لئے انھیں بھی دعوت دینے ٹھیر گیا "کہاں ہاتھ مارا" انھوں نے کہا مسٹر محمود نے حال ہی میں ایک باغ خریدا ہے اس کی پہلی فصل ہمارے یہاں بھیجی ہے "ضرور آیئے" میں نے کہا، اور جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ آم بالکل دکھائی نہیں دے رہے ہیں، میں نے خیال کیا کہ شاید سارے آم نوکر نے احتیاط سے کمرے میں رکھ دیئے ہوں گے۔ میں نے اُسے آواز دی اور اس سے پوچھا کہ " وہ آم کہاں ہیں جو محمود صاحب نے بھجوائے ہیں" "سرکار وہ تو رومال میں بندھے ہوئے باہر ہی سیکل پر ہیں" چھ قسم کے اتنے سارے آم اور سائیکل پر؟ میں نے چلّا کر کہا "دیوانہ تو نہیں ہوگیا" میں کہہ رہا ہوں وہ چھ قسم کے آم کہاں ہیں "جی وہ چھ ہی تو ہیں" "چھ قسم کے؟ چھ! چھ!

سرکار رچھو، "انگلیوں سے گن کر بتاؤ ؟" اس نے اپنا پورا ہاتھ اور دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی بتائی یعنی جن کے نصف تین ہوتے ہیں" جی سرکار" یہ نہ پوچھئے کہ دوسرے روز دعوت کے لئے کتنے آم اور کتنی جیلی خریدنی پڑی

بہرحال محلے کے ساہوکار کا اب تک مقروض ہوں، محمود کے متعلق اب میری وہی رائے جو پہلے تھی۔

محمد علی عادل

ڈک وٹنگٹن

لنکا شائر میں ایک غریب لڑکا ڈک وٹنگٹن رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے کوئی رشتہ دار ایسا نہ تھا جو اس کی مدد کرتا۔ اس کے پاس صرف ایک بلی تھی۔ جسے اس نے بڑی محنت اور محبت سے پالا تھا۔ وہ محنت مزدوری کرتا، اس طرح دو چار پیسے مل جاتے ان سے اپنا پیٹ پالتا۔ خالی وقت بچتا تو اپنی بلی کے ساتھ کھیلتا۔

اب وٹنگٹن نے سوچا کہ کچھ کمانا چاہیے لیکن دقت یہ تھی کہ لنکا شائر میں کوئی کام نہ تھا۔ اس لئے لندن چلا گیا اور ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گیا۔

یہ سوداگر خود تو بہت نیک آدمی تھا۔ مگر اس کی باورچن بہت بد مزاج تھی۔ وہ وٹنگٹن کو ایک تو کھانا اچھا نہ دیتی تھی۔ دوسرے اس کے سونے کے لئے اسے وہ کمرہ دیا تھا جس میں چوہے ہی چوہے تھے۔ خدا بھلا کرے وٹنگٹن کی بلی کا۔ جس کی بدولت اس کے دن آرام سے کٹ گئے ورنہ وہاں اس کا سونا ناممکن ہو جاتا۔

ڈک وٹنگٹن کا آقا بہت بڑا سوداگر تھا۔ سمندر میں اس کے جہاز چلتے تھے۔ لاکھوں کا کاروبار تھا۔ مگر وہ مغرور نہ تھا بلکہ بہت ہمدرد تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جب میرا جہاز روانہ ہونے لگے تو میرے ملازم جو مال چاہیں اس میں رکھ دیں۔ وہ دوسرے ملک میں فروخت ہو جائے گا تو اس کی قیمت ان کے حوالے کر دی جائے گی۔

غریب نوکروں کے لئے یہ بہت بڑی رعایت تھی۔

ایک دن سوداگر کی بیٹی ایلس نے وٹنگٹن سے کہا "دیکھو آج ہمارا جہاز حبشیوں کے ملک میں جانے والا ہے۔ تم اس میں کیا بھیجو گے"؟

وٹنگٹن بولا "میرے پاس کیا ہے جو بھیجوں، میں تو غریب آدمی ہوں"۔

"کچھ تو بھیجنا چاہیے۔ ممکن ہے تمہیں اسی سے فائدہ پہنچ جائے"۔

ڈک وٹنگٹن بولا "میرے پاس تو صرف ایک بلی ہے"

"وہی بھیج دو"

ڈک نے بلی جہاز کے کپتان کے حوالے کر دی اور جہاز روانہ ہو گیا۔ اب ڈک کو بڑی تکلیف ہونے لگی۔ جب تک بلی تھی اس وقت تک چوہے بلوں میں دبکے دبکائے پڑے رہتے تھے۔ مگر جب وہ چلی گئی تو چوہوں کو خوف نہ رہا۔ باغی سپاہیوں کی طرح اکڑ اکڑ کر چلنے لگے یہاں تک کہ ڈک کے لئے رات کو سونا مشکل ہو گیا۔

آخر کیا کرتا۔ ایک رات تنگ آ کر مکان سے نکل بھاگا کہ چلو لنکا شائر ہی چلیں۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ گرجا کے گھنٹے بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈک کو ایسا

معلوم ہوا گویا گرجے کا گھڑیال کہہ رہا ہے۔

ٹن ٹن ٹن

ڈک وٹنگٹن۔ لارڈ میئر آف لنڈن

لارڈ میئر آف لنڈن بڑا بھاری عہدہ ہے، اور یہ بہت دولتمند آدمی کو ہی ملتا ہے۔ ڈک وٹنگٹن بھوکا مر رہا تھا مگر اس کے کان گھڑیال کی زبان سے یہ لفظ برابر سن رہے تھے۔

ٹن ٹن ٹن

ڈک وٹنگٹن۔ لارڈ میئر آف لنڈن

دو تین دفعہ اس نے گھڑیال کی ٹن ٹن کے پردہ میں یہ لفظ سنے۔ مگر پھر سوچنے لگا۔ میں کیسا بے وقوف ہوں جو گھڑیال کی ٹن ٹن کا مطلب کچھ کا کچھ لے رہا ہوں۔ لیکن وہ چلنے لگا تو گھڑیال کی آواز پھر آئی۔

ٹن ٹن ٹن

ڈک وٹنگٹن۔ لارڈ میئر آف لنڈن

وٹنگٹن رک گیا۔ اور اس نے لنکا شائر جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ ادھر جہاز حبشیوں کے ملک میں پہنچا۔ تو حبشی بادشاہ نے کپتان کی دعوت کی۔ لیکن جب دسترخوان پر بیٹھے اور رکابیوں سے کپڑا ہٹایا گیا تو ان کی ان میں چوہے جھپٹے اور روٹیاں اٹھا کر یہ جا وہ جا غائب ہو گئے۔ بادشاہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور چپ ہو گیا۔ کپتان نے پوچھا "کیوں؟ کیا بات ہے"؟

بادشاہ نے جواب دیا "ہر روز یہی ہوتا ہے"۔

کپتان بولا۔ تو کوئی تدبیر کیوں نہیں کرتے؟

بادشاہ بولا "بیسیوں تدبیریں کیں۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ چیتے منگوائے، شیر منگوائے۔ لیکن یہ کمبخت چوہے ہیں کہ باز نہیں آتے"۔

کپتان نے پوچھا۔ آپ کے پاس کوئی بلی نہیں!

اس ملک میں بلی ہوتی نہ تھی۔ بادشاہ نے حیران ہو کر سوال کیا "وہ کیا ہوتی ہے"؟

کپتان نے جہاز سے بلی منگوا کر دکھائی اور فرش پر چھوڑ دی۔ اس نے آتے ہی اس تیزی سے چوہوں کا شکار شروع کیا کہ بادشاہ خوش ہو گیا اور بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگا۔

بولا "یہ تو میری سب سے بڑی تکلیف کا علاج ہے۔ اسے کتنے میں بیچ سکتے ہو؟

کپتان نے پوچھا آپ کیا دیتے ہیں؟

"سونے کے چھ تھیلے لوگے"؟

کپتان نے منظور کر لیا۔

جہاز واپس آیا تو سوداگر نے بلی کے فروخت ہو جانے کا معاملہ سنا وہ بہت خوش ہوا اور ڈک وٹنگٹن کو سامنے بلا کر بولا۔

"ڈک تمہاری بلی بک گئی"۔

ڈک کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے رکتے رکتے پوچھا "کس قیمت پر؟"

"وہ سونے کے چھ تھیلے پڑے ہیں یہ بلی کی قیمت ہے"۔

ڈک کو یقین نہ آیا حیرانی سے بولا "جناب" "میں مذاق نہیں کرتا وہ سونے کے چھ تھیلے تمہارے ہیں"۔

ڈک خوشی سے پھول گیا۔ اور بولا "یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔

اس کے چند سال بعد ڈک وٹنگٹن کی شادی اسی سوداگر کی بیٹی ایلس کے ساتھ ہو گئی اور وہ لارڈ میئر بن گیا۔ اس وقت اس کو گرجے کا گھڑیال یاد آیا جو کہتا تھا "ٹن، ٹن، ٹن۔

ڈک وٹنگٹن لارڈ میئر آف لنڈن

(ترجمہ) عزیز سید النساء بیگم شہزادی

کتاب پڑھنے کا فائدہ

"جس سے پارسائی حاصل ہو، اخلاق کی اصلاح ہو، وہی کتاب ہے۔ جس سے ہمت بڑھے، عوام کو فیض پہنچے اور نفسانی خواہش مٹ جائے، وہی کتاب ہے"۔

قدیم زمانہ میں چھاپے خانوں کا وجود نہ ہونے سے کتابیں نایاب تھیں، قلمی نسخوں کا رواج ہونے سے کتابوں کا مکمل طور پر لکھ رکھنا مشکل کا باعث تھا اس لئے کتابوں کا دستیاب ہونا نہایت دشوار تھا مگر جب سے چھاپے خانوں کی ایجاد ہوئی ہے کتابیں نہایت ارزاں ملتی ہیں۔ اس لئے غریب سے غریب اور نادار سے نادار بھی کتابوں کا ذخیرہ کر سکتا ہے۔

اب ہم کتابوں کے فائدوں کی طرف نظر کرتے ہیں "اگرچہ کتابیں استادوں کی طرح تلقین تو کرتی ہیں مگر ہمیں سزا نہیں دیتیں اور نہ سختی سے پیش آتی ہیں، اور نہ ہم پر خفا ہوتی ہیں وہ ہمیشہ وعظ و تلقین کے لئے مستعد رہتی ہیں۔ اگر ہم کسی مضمون کے مطالعہ میں مصروف ہوں اور ہمیں کہیں شک پیدا ہو تو وہ بغیر چھپائے حقیقت کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ اور اگر ان کے مطالب ہماری سمجھ میں نہ آئیں تو وہ ہم سے ناراض نہیں ہوتیں۔ اور نادان سمجھ کر مذاق نہیں اڑاتیں۔ اس لئے علمی کتابوں کا ذخیرہ تمام دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں بہترین نعمت ہے۔ جس کو سچائی، خوشی، عقل و فراست حاصل کرنے کی تمنا ہو اس کو لازم ہے کہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھے"۔

(رچرڈ دبری [illegible])

مطالعہ کے شوقین تصور کرتے ہیں کہ کتابیں ہماری دوست ہیں اس موقع پر "پٹرارک" نامی عالم نے کہا ہے کہ "میرے مکان میں جو دوست ہیں ان کی صحبت سے مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے، وہ مختلف ملکوں سے آئے ہیں، عمر کے لحاظ سے بھی مختلف عالم ہیں ہیں، ان میں بعض سیاست دانی میں مشہور ہیں، بعض نے بہادری کا تمغہ حاصل کیا ہے۔ بعض کو علم کی فضیلت کی عزت نصیب ہوئی ہے، میں اپنی ضرورت پر ان کو اپنا ہم نشین بناتا ہوں اور حاجت پوری ہونے پر ان کو فوراً روانہ کر دیتا ہوں، وہ میرے ہر سوال کا مکمل جواب صبر و استقلال کے ساتھ دیتے ہیں، بعض پرانے زمانے کی تاریخ سمجھاتے ہیں، بعض قدرت کے نظاروں سے واقف کرتے ہیں، بعض یہ نصیحت کرتے ہیں کہ زندگی کیسی گزارنی چاہیئے، موت کے وقت کس قدر بشاش رہنا چاہئے، بعض اپنی زندہ دلی کے سبب میرے غموں کو کھو کر امید بندھاتے ہیں، بعض میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں، بعض نفس کی شیطنت سے باز آنے کے وسیلے بتاتے ہیں، اور بعض عجیب و غریب فنون کی تعلیم دیتے ہیں، اگر ان کی اچھی باتوں پر عمل کیا جائے تو مصائب سے نجات ملتی ہے، ان کے ان بڑے احسانوں کے معاوضہ میں ان کو اپنے مکان میں ایک پر سکون جگہ دی جائے تو کافی ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کی اور کچھ طلب نہیں ہوتی"۔

انگلستان کا ایک عالم کہتا ہے کہ "کتابیں اپنے محبت کرنے والوں کے ساتھ وفادار دوست، ناصح شفیق، زندہ دل رفیق، سچے بہی خواہ کی طرح پیش آتی ہیں"۔

انگلستان کا ایک شاعر سودے کہتا ہے کہ "ان مصنفوں کی صحبت میں جو مشہور ہو گزرے ہیں اپنا وقت صرف کرتا ہوں، میں جدھر نظر کرتا ہوں ادھر بے مثال شاعر اور فطرت شناس ادیب استادہ رہتے ہیں، میں ان کو اپنا یار جانی تصور کرتا ہوں"

کتابوں کے مطالعہ سے جوانی میں نصیحت اور بڑھاپے میں تفریح طبع حاصل ہوتی ہے۔ ناامیدی پیدا کرنے والے

جنگل میں بھی وہ ہمیں ڈھارس بندھاتی ہیں اور اتفاقی حادثوں کو ہمارے ذہن سے بھلا دیتی ہیں۔ اپنے احباب کی چڑچڑاہٹ کر اور کینہ کے سبب ہمیں بعض اوقات بیزاری ہوتی ہے مگر کتابوں کی صحبت سے بیزاری کی بجائے بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے۔

کتابوں کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والوں کے دلوں پر مختلف کتابوں کے پڑھنے سے الگ الگ اثر ہوا کرتا ہے۔

انگلستان کے بڑے عالم کارلائل کا قول ہے کہ "کتب خانہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔"

یونان کے مشہور ادیب سسرو کی رائے ہے کہ "وہ مکان جو کتابوں سے خالی ہو بے روح جسم ہے"۔ اور یہ لازمی نہیں ہے کہ کتابوں کا مطالعہ عالم، فاضل ہی کریں بلکہ ہر کس و ناکس اس کے مطالعہ سے مسرت حاصل کرسکتا ہے۔

مطالعہ سے مراد پڑھنا' پڑھانا نہیں ہے اس لئے فریڈرک ہارسن نے کہا ہے کہ نظم و نثر کے مضامین کا مطالعہ زندگی کے کاروبار کے لئے بےحد مفید ہے۔"

میکالے گورنر جنرل ہند کا معتمد اور مشہور قانون داں تھا' یہ انگریزی میں کئی دیوانوں اور تاریخ کی کتابوں کا مصنف ہے۔ اس زمانہ میں یہ مشہور انشاءپرداز مانا گیا ہے۔ اگرچہ حکومت و شہرت' فہم و فراست میں کسی طرح کم نہیں تھا مگر اس کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ اس کو مطالعہ کتب سے بے انتہا مسرت حاصل ہوتی تھی اور یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ قدیم عالموں کا کس قدر معتقد تھا اور اس کے دل میں ان کی کیا کچھ وقعت تھی۔ کیونکہ میکالے خود ایک جگہ کہتا ہے کہ "ان کے اشاروں اور کتابوں سے تلاش صداقت کی مجھے عادت ہوئی ہے اور ان کے بلند خیالوں سے تقویت نصیب ہوئی۔ بہرحال مجھ پر ان کے بڑے احسان ہیں۔" مگر ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ دوسروں کی تصنیفوں کے مطالعہ سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ سب سے بالاتر ہے۔"

گبن ایک نامور مورخ گزرا ہے جو "تاریخ عروج و زوال سلطنتِ روما کا" مصنف ہے اس کی زرین رائے تھی کہ "مجھے ہندوستان کی ساری دولت حاصل ہونے پر بھی اتنی مسرت حاصل نہیں ہوتی جس قدر کتابوں کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔"

مختلف مضامین کا مطالعہ دل و دماغ پر مختلف اثرات پیدا کرنے کا باعث ہے۔ تاریخ سے دنیا کا تجربہ' علم حساب سے عقل کی زیادتی' علم اخلاق سے ذاتی فرائض علم الکلام و منطق سے بحث کرنے اور گفتگو کرنے کی قوت حاصل ہوتی ہے' علم الاشیاء' علم کیمیا' علم الابدان وغیرہ سے خیال کی قوت بڑھتی ہے۔

ہم غذا کی مختلف چیزوں کو مختلف طریقوں پر استعمال میں لاتے ہیں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ذائقہ لے کر پھینک دیتے ہیں' بعض ایسی ہیں کہ ان کو صحیح وسالم کھا لیتے ہیں۔ اور بعض چبا چبا کر ہضم کر جاتے ہیں۔ اسی طرح مطالعہ کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ بعض کتابوں میں دلچسپ حصوں کا مطالعہ الف سے والسلام تک کافی ہے اور بقیہ حصوں کے مطالعہ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ بعض کتابوں میں مطالعہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور بعض ایسی ہیں کہ شروع سے آخر تک ان میں غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کی حاجت ہوتی ہے چنانچہ پہلی قسم میں قصے کہانیاں اور دوسری میں تاریخ کا شمار ہوتا ہے اور تیسری قسم میں تصوف اور اہل دل کی کتابیں شامل ہوسکتی ہیں۔

بعض بیماریاں ایسی ہیں کہ بعض قسم کی ورزشوں سے ان کا دفیعہ ہوسکتا ہے۔ تیراندازی چھاتی اور پھیپھڑے کی بیماریوں کے لئے مفید ہے' دردسر کے لئے گھوڑے کی

سواری واقع ہے۔ اسی طرح مختلف مضامین کا مطالعہ دل و دماغ کے بعض حصوں کے لئے تقویت کا سبب ہوسکتا ہے۔ دل کی یکسوئی کے لئے علم حساب کی مشق جاری رکھیں کیونکہ پراگندہ دماغ کسی حساب کو حل نہیں کرسکتا' اور صحیح جواب کی تلاش میں بار بار عمل کرنا پڑتا ہے' یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے صحیح الدماغ بننے کی کوشش کرے گا۔ عقلی نبوت کی فکر میں اضافہ کرنا چاہیں تو علم منطق کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ آزادانہ تقریر کی خواہش رکھنے والوں کے لئے قانون بنانے والوں کی شرحوں اور نظریوں کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

اب ہم ذرا مطالعہ کے مقصد کی طرف نظر کرتے ہیں۔ بے مغز بحث کی غرض سے یا ہر کتاب کا صحیح مضمون سمجھنے کے لئے یا بیکار مضامین سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ہرگز مطالعہ نہیں کرنا چاہیے مگر یہ یاد رہے کہ جس مضمون کو ہم نے پڑھا ہے اس کو سچائی کی کسوٹی پر کس کر سچائی پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مطالعہ سے عقل میں اضافہ ہوگا اور دلچسپی بھی ہوگی۔ خلوت نشین کو کتابوں سے ضرور دلچسپی ہوگی۔ کاربرآری کے وقت عقل کا امتحان ہوگا اور کوئی بڑا کام علماء کی رائے و مشورہ یا امداد کے بغیر کبھی انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔

کتابیں وہ ہیں جو خیالات کو ہمیشہ باقی رکھنے کے مقصد سے تحریری شکل میں لائی گئی ہیں۔ ان میں (۱) عالیہ (۲) دائمی دو قسم کی کتب ہیں۔ سفر کے حالات' دلچسپ واقعات' بحث و مکالمے' قصے اور افسانے حالات موجودہ کی تعریفات سے بھری ہوئی کیفیات' یہ تمام پہلی قسم میں شامل ہوسکتی ہیں۔ اور عقل (گیان) میں اضافہ کرنے والے مضامین دوسری قسم میں داخل ہوسکتے ہیں۔

ہر مصنف کے خیالات کو لفظ جانچ پڑتال کے ساتھ پڑھنے' طریقہ استعمال اور ظاہری و معنوی مطلب کو سمجھنے کے معنی ہیں مطالعہ۔ ہر کتاب کو بار بار مطالعہ کرکے اس کے خاص حصوں پر نشان لگا دینے سے ان حصوں کو ضرورت پر آسانی سے نکال سکتے۔

انسان خواہ گوشہ نشین ہو یا صحرا نشین ذوق مطالعہ ہو تو وہ شاد و شاداں رہے گا' کیونکہ کتابیں مسرت بخشتی ہیں۔ بیزاری دور کرتی ہیں۔ غم و غصہ کو پاس پھٹکنے نہیں دیتیں۔ ان فوائد عظیم کو جان کر بھی بعض بچوں کو مطالعہ کا ذوق بالکل نہیں ہوتا ایسے بچوں کو چاہیے کہ ذوق مطالعہ بڑھا کر کتابوں میں جو آب حیات ہے اس کا مزہ چکھیں۔

راگھوندر راؤ جذب

اقبالؔ فردوس میں تھے .... میں نے دیکھا

(حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

برسات کی رات تھی۔ جھم جھم مینہ برس رہا تھا۔ کوندا لپک لپک کر کچھ عجیب منظر پیدا کر رہا تھا میں بانگِ درا پڑھ رہا تھا ...... تھوڑی دیر میں بانگِ درا میرے سینے پر تھی اور میں کسی دوسرے عالم کی سیر میں مصروف تھا ...... فردوس بریں اپنی خوبصورت اور روح پرور آغوش میں مولانائے رومؔ، حافظ شیرازیؔ، حالیؔ، فردوسی طوسیؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، حضرت عمر خیامؔ، حضرت شیخ سعدیؔ کو لئے ہوئے تھا، یہ سب کے سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں فرشتہ نے اطلاع دی کہ ہم اس فردوس میں ایک انسان کو لائے ہیں جو بڑا لسان اور خدا سے شکوہ کرنے والا تھا اس کے اٹھ جانے سے ہندوستان کے طول وعرض میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔

مولانا روم نے اس فرشتہ سے فرمایا، اے فرشتے! مجھے اس شخص کے پاس لے چل تاکہ میں اُسے دیکھوں غرض مولانا بہشت کے دوسرے حصے میں آئے جہاں اقبال مقیم تھے۔

اقبال نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا نے فرمایا کیا تم ہی ہندوستان کے اقبال ہو؟ کیا شکوہ اور جوابِ شکوہ جس کا آسمانوں میں چرچا ہے تم ہی نے لکھا ہے؟ کیا اب بھی شاعری کا وہ رنگ باقی ہے۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں تھا؟

اقبال نے کہا، شکوہ اور جوابِ شکوہ میں نے ہی لکھا ہے، ہندوستان کی حالت کا تذکرہ کرنے سے زخمِ جگر تازہ ہو جاتا ہے وہاں قوموں میں اتحاد کا نام نہیں۔ شاعری کا فن اب رسوا ہو گیا ہے۔ جس شاعر کو دیکھو اپنا کلام سنہری جلد کے ساتھ شائع کرانے کا آرزومند رہتا ہے۔ میں نے اپنی تمام زندگی قوم کی خدمت میں بسر کی مگر میرے وہاں رہنے تک تو اُن لوگوں نے مجھے نہ سمجھا۔ حال کا حال معلوم نہیں، میں نے آپ کی تقلید میں زندگی بسر کی۔ مولانا نے فرمایا اقبال! اپنے چند اشعار سناؤ، اقبال نے عرض کیا، آپ کے آگے میں کیا اور میری ہستی کیا، خیر حکم کی تعمیل کرتا ہوں، ہندوستان کی حالت سے متاثر ہو کر میں نے یہ شعر لکھا ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اور بعد میں فارسی میں ترجمہ کر کے سنایا، مولانا نے بہت تعریف فرمائی۔ اتنے میں غالبؔ، حافظؔ، فردوسیؔ، خیامؔ، حالیؔ وغیرہ اقبالؔ سے باری باری ملے۔ اقبال فردوس میں تھے۔ میں نے دیکھا۔ مولانا روم نے فرمایا میری مثنوی کے متعلق لوگ کیا رائے رکھتے ہیں۔

اقبال نے کہا لوگ ایمان رکھتے ہیں کہ اس سے بہتر مثنوی نہیں لکھی جا سکتی، غالبؔ نے آگے بڑھ کر کہا کیوں نہ ہو چیز ہی ایسی ہے۔

اقبال نے کہا آپ کے کلام کے دنیا میں دوست بھی ہیں اور دشمن بھی، غالبؔ نے فوراً کہا میں نے ہی تو کہا تھا ؎

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

حضرت خیامؔ نے کہا غالباً لوگ میرے متعلق کوئی ٹھیک رائے

نہیں رکھتے ہوں گے کیونکہ عام طور سے مشہور ہے کہ میں نے دنیا کو مے خواری کی تعلیم دی۔

اقبال نے کہا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں سارا یورپ آپ کا مرید ہوگیا ہے۔

حضرت خیام نے فرمایا یہ گورے میرے فلسفہ کو کیا جانیں؟

اقبال نے حافظ سے کہا آپ کو لوگ بہت یاد کرتے ہیں اور یہ شعر تو لوگوں کی زبانوں پر ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

فردوسی نے بھی برسبیل تذکرہ اپنے شاہنامہ کا ذکر کیا۔

اقبال نے کہا شاہنامہ سے آپ کا نام دنیا میں روشن ہے اور رہے گا۔

حالی نے اقبال کے سر پر فرط مسرت سے ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ اقبال مجھے بہت رنج ہوا تم اس قدر جلد ہمارے پاس آگئے۔ جدید شاعری کا پایہ ہم نے رکھا تھا تم نے اس پر عمارت کھڑی کی' اقبال نے مسدس حالی کی مقبولیت کا ذکر کیا اور بالآخر حضرت سعدی تشریف لائے' اقبال نے کہا آپ کو سب لوگ بیجا سعدی کہتے ہیں اور آپ کی کتابیں گلستاں بوستاں تو ایسی ہیں کہ فارسی ادب میں تو ان کی نظیر شاذ ہی مل سکے' کئی زبانوں میں آپ کی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور دنیا آپ کو بہت بڑا آدمی کہتی ہے۔

اتنے میں ایک گھنٹہ کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ جب بیدار ہوا تو صبح کاذب کا وقت تھا اور یہ صدا آرہی تھی ؂

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اشرف حسین عابدی

سیر کی تیاری

مری امی جانی ادھر آئیے — ذرا میرے کپڑے بدل جائیے
ذرا آئیے چھوڑ کر اپنا کام — مجھے بابا لے جاتے ہیں "باغ عام"
کہاں ہے وہ پھولوں کی صدری مری — جسے کی تھی کل آپ نے استری
لگا دیجے جلدی ذرا گھنڈیاں — نئی شیروانی مری ہے کہاں
مرے اچھے حافظ ذرا آ ادھر — مری کالی جوتی کو پالش تو کر
بس اب جیب میں رکھ لوں اپنا قلم — بس اب ہو گئے امی جاں بس ہم
بڑا چست و چالاک ہوشیار ہوں — ہوا جلد کتنا میں تیار ہوں
مجھے پیار اب آپ کریں ذرا — مری امی جانی کا حافظ خدا

شاہ صاحب!

جب کبھی پیری، مریدی کا تذکرہ ہوتا ہے، مجھے فوراً محی الدین شاہ صاحب ہلالی مرحوم یاد آتے ہیں۔ خدا بہشت نصیب کرے، بہت دلچسپ اور کسی قدر سادہ لوح آدمی تھے۔ بہ نسبت مریدوں کے، شاہ صاحب کی "مریدنیوں" کی تعداد زیادہ تھی۔

شاہ صاحب کا معمول تھا کہ ہر سہ ماہ کو اپنے مریدوں کے پاس دورہ کرتے، اس طرح مریدوں کی بیعت کو مستحکم اور اپنی مٹھی گرم کیا کرتے، ہر مرید کے پاس چار دن مہمان رہتے، مرغن غذائیں اڑاتے اور چلتے وقت کچھ تلقین کرکے پانچ روپے اینٹھ لیتے۔

یوں تو بے تکلف احباب، شاہ صاحب سے اکثر مذاق کیا کرتے تھے، مگر جو انوکھا مذاق، مرزا صاحب نے کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

حسبِ معمول شاہ صاحب دورہ پر تشریف لے گئے، مرزا صاحب کو مذاق سوجھا، فوراً ایک خط، شاہ صاحب کے بڑے بیٹے قمر الدین کی جانب سے، شاہ صاحب کو اس مضمون کا تحریر کیا۔

"قبلہ و کعبہ! آپ جاتے وقت والدہ کو خفیف بخار آ رہا تھا، آپ تشریف لے جانے کے دوسرے روز بخار زیادہ ہو گیا، شام کو طاعون کی گلٹی نمودار ہوئی، ہر چند علاج کرایا گیا، مگر بے سود ہوا، آخر وہی ہوا، جو منظورِ خدا تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ خط دیکھتے ہی فوراً تشریف لائیں۔" قمر الدین"

شاہ صاحب، امی محض تھے، آپ کا سینہ بے کینہ علم سینہ بہ سینہ سے معمور تھا۔ الغرض آپ کے ایک مرید نے خط پڑھ کر سنایا، خط کا سننا تھا کہ شاہ صاحب عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔ مرید کے گھر میں پیرانی ماں (شاہ صاحب کی بیوی) کا ماتم برپا ہو گیا۔ شاہ صاحب کو فوراً تشریف لانے کا جملہ سننا گوارا نہ تھا۔ شاہ صاحب کو غم اس بات کا تھا کہ بغیر دورہ ختم کئے ناشاد و نامراد مکان لوٹنا ہے، جس میں ان کا کثیر مالی نقصان تھا۔ غرض اس خبرِ وحشت اثر کے سنتے ہی، بادلِ ناخواستہ شاہ صاحب نے "ناندور" کا ٹکٹ لیا۔ گاڑی ٹھیک نو بجے شب "ناندور" پہنچی، ریل سے اتر کر شاہ صاحب نے یہ خیال کرکے کہ کوئی استقبال کو آیا ہوگا، چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ مگر جب کسی کو، سوائے حیرت اور پریشانی کے، نہ پایا تو مجبوراً پا پیادہ مکان کو چل کھڑے ہوئے۔

اسٹیشن کے راستہ ہی میں ایک قبرستان ہے جس میں شاہ صاحب کا "ہڑواڑہ" ہے۔ شاہ صاحب اس خیال سے کہ فاتحہ خوانی کرلوں، سیدھے قبرستان پہنچے، اپنے "ہڑواڑہ" میں ہر چند تلاش کی، مگر کوئی تازہ قبر نظر نہ آئی، البتہ تھوڑے فاصلہ پر کسی کی ایک تازہ قبر تھی، شاہ صاحب کے دل میں یہ خیال گزرا کہ، ہو نہ ہو یہی میری بیوی کی قبر ہے، آنکھوں میں آنسو بھر لائے، فاتحہ پڑھا، بعد فراغت "طریقت کدہ" کا رخ کیا۔ جب مکان قریب آیا تو آپ چلا چلا کر رونے لگے، اتفاقاً آپ کے ایک مرید بھی وہیں مل گئے اور اپنے پیر و مرشد کو روتا دیکھ کر، آپ کی اتباع میں (جو جزوِ ایمان ہے) خود بھی رونے لگے۔ بہ ایں ہیئت کذائی، یہ دونوں بزرگوار (پیر و مرید) مکان پہنچے۔ آوازِ گریہ و زاری سن کر، شاہ صاحب کے بیٹے قمر الدین باہر نکل آئے، والد بزرگوار کی ریشِ مبارک کو آنسوؤں سے تر دیکھ کر، خود بھی بغیر وجہ دریافت کئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے "طریقت کدہ" میں بھی ایک کہرام بپا ہو گیا، اسی طرح

روتے ہوئے شاہ صاحب مکان میں داخل ہوکر دالان میں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک تو بیوی کے غم سے دنیا نظروں میں سیاہ تھی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا تھا، دوسرے سونے پر سہاگا، آپ نے آنسو خشک کرنے کے لئے رومال کو آنکھوں سے لگا رکھا تھا، اس لئے بیوی پر نظر نہ پڑی۔ مگر جب بیوی روتی ہوئی نزدیک آئیں، تو شاہ صاحب ایک خوفناک چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے۔

شاہ صاحب کو اکثر "حال" آتا، اور "الہام" ہوا کرتا تھا، عالم بے خودی میں آپ سے ایسی ہی حرکتیں سرزد ہوا کرتی تھیں۔ گھر والوں نے خیال کیا کہ شاید شاہ صاحب کو الہام ہوا ہے، اس لئے بدحواسی کو معمولی حرکت سمجھ کر، آپ کے ہوش میں آنے تک انتظار کرتے رہے۔ غرض، شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں اور سہمی ہوئی نگاہوں سے بیوی کو دیکھنے لگے۔ بیوی نے رونے کی وجہ دریافت کی، قریب تھا کہ شاہ صاحب پھر ڈر جائیں، مگر آپ نے حواس بجا کر کے لاحول پڑھتے ہوئے، زبانِ فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا "تمہاری خبرِ مرگ سن کر رو رہا ہوں۔" بیوی نے یہ سن کر بصد مایوسی پوچھا کہ "کیا جو، ابھی آپ کو الہام ہوا ہے، اس میں جبرئیلؑ نے میرے مرنے کی خبر دی ہے (خوش عقیدہ مریدوں میں یہ بات مشہور تھی کہ شاہ صاحب پر وحی آتی ہے۔ معاذ اللہ!) شاہ صاحب، بیوی کی اس سادگی اور خوش اعتقادی کا کیا جواب دیتے! خط نکال کر بیٹے کو دکھایا، مگر بیٹے نے خط کے لکھنے سے انکار کیا۔ اب شاہ صاحب کا خیال اپنے ناعاقبت اندیش دوستوں کی جانب ہوا، اپنے گریۂ* بے محل اور بدحواسی پر ندامت کی ہنسی، ہنسنے لگے۔

جب پیرانی ماں پر اصل حقیقت منکشف ہوئی تو جیتے جی اُن رونے سے وہ شاہ صاحب پر سخت برہم ہوئیں، شاہ صاحب کے دوستوں کو، کوسنے اور شاہ صاحب کو بے نقط سنانے لگیں۔

شاہ صاحب بھلا کب خاموش رہنے والے تھے، ایک تو دورہ کی ناکامیابی اور مالی نقصان کا غم، دوسرے اپنی ندامت کا غصہ، آپ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیوی رات کی رات میکہ چلی گئیں۔ سسرال میں جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو لوگوں کی ہنسی کی انتہا نہ تھی۔

صبح ہوتے ہوتے، شاہ صاحب کی خبرِ حماقت طاعون کی طرح تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ فرطِ ندامت سے شاہ صاحب ایک ماہ تک "طریقت کدہ" سے باہر نہ نکلے۔ جب پیرانی ماں کے دل کا بخار کم ہوا تو بیٹے کے اصرار پر مکان آئیں۔

مرزا صاحب کے خط کا یہ اثر ہوا کہ شاہ صاحب نے ہر ایک خط پر، چاہے کسی کا لکھا ہوا ہو، اعتماد کرنا چھوڑ دیا۔ چنانچہ آپ دورہ پر تھے، کہ خسر صاحب کا انتقال ہوگیا، مسلسل تین خط آئے، مگر آپ نے یہ کہہ کر "کمبختوں نے پہلے تو جورو کو مار دیا، اب سسرے کو زندہ درگور کر رہے ہیں" بغیر دورہ ختم کئے واپس نہ ہوئے۔

راقم الحروف کو شاہ صاحب سے ملاقات کرکے ایک زمانۂ دراز ہوگیا، پرسوں تانڈور سے ایک صاحب کا خط آیا کہ شاہ صاحب واصل بحق ہوگئے، مگر مجھ کو اس خط پر اعتماد کرنے میں بقول شاہ صاحب کے تامل ہے۔

محمد غوث محی الدین کلیم

* گاؤں کی عورتیں بہت توہم پرست ہوتی ہیں۔

شین کی شورش

شہنشاہ بانو بیگم .... دولہ کی ماں

شوکت مرزا .... شیراز کے شاہزادہ کا نام

شمشاد بانو بیگم .... شام کی شہزادی

شجاعت مرزا .... دولہ کے باپ کا نام

شمشیر مرزا .... شام کے بادشاہ کا نام

شیراز کے شاہزادہ کی شادی شام کی شہزادی سے مقرر ہوئی، شعبان کی ششم کو تاریخ ٹھہری، شادی کا ذکر ہر اخبار میں شائع کیا گیا اور سب احباب کی دعوت شام میں دی گئی، شیراز کے کئی لوگ بہت پہلے ہی سے شادی دیکھنے کے لئے شعبان کے شروع ہی میں شام کو چلے گئے تھے شیراز کے شاہزادہ یعنی شوکت نے شام کے ایک عظیم الشان محلہ میں ایک شاندار محل تیار کروایا محل کو ہر قسم کی شاندار چیزوں سے آراستہ کیا گیا، شریفہ بانو بیگم نے ایک شب محافظ کو بلوا کر کہنے لگیں۔ کھانے کا انتظام تمہارے سپرد ہے فہرست لکھ کر لاؤ، محافظ نے جلد جلد فہرست تیار کرکے حاضر خدمت کی شریفہ نے فہرست میں شیر مال، شربت، شامی، شکرپور، شیر برنج، شیر قورمہ، شوربا، وغیرہ وغیرہ بھی شریک کردیئے، شادی کے کچھ دن پہلے شیراز کا شاہی خاندان شام کو چلا۔ کئی روز بعد شاہی خاندان شب کو شام کے آٹھ بجے پہنچا شمشیر مرزا نے شام میں ہر قسم کا انتظام کرایا، شام بھر میں شور مچا ہوا تھا، شمشیر مرزا نے شیراز کے شاہی خاندان کا شاندار استقبال کیا وہ شام کے شہر کے بڑے دروازے پر ٹھہرا ہوا تھا، دروازہ بھی شیشم سے بنا ہوا تھا جب شیراز کا شاہی خاندان شام کے شیشم کے دروازے کے قریب آیا تو خوشی خوشی شمشیر مرزا، شجاعت مرزا کے ساتھ شامیانہ کے نیچے جو شاہ شیراز کے لئے دیا گیا تھا اشرفیاں لٹاتے ہوئے داخل ہوا۔ شمشیر مرزا نے شام کے کھانے کی دعوت اپنے ہاں دی، شجاعت مرزا اور شوکت مرزا نے دعوت کو شوق کے ساتھ قبول کر لیا، شام میں شمشیر مرزا نے ہمیشہ سے زیادہ روشنی بھی کرائی، شمشاد بانو بیگم یعنی "دلہن" خوش تو تھی مگر رواج کا لحاظ کرکے کچھ کچھ شرما رہی تھی، شہر بھر میں شور اور خوشی مچی ہوئی تھی، شوکت کا شوفر شوکت کی شورلیٹ موٹر میں شور مچاتا ہوا، شہنائیاں کرتا ہوا شان سے چلا رہا تھا، شاہ اور دلہن کے محل پر روشنی بہت تھی یعنی ایک طرف چاند تھا تو دوسری طرف سورج کئی شریف لوگ روشنی دیکھنے کی غرض سے اپنے اپنے مکانوں سے نکل کر روشنی دیکھ رہے تھے جب چاند اور سورج پر نظر پڑتی تھی تو آنکھیں بند ہو جاتی تھیں، ایسی شور وغل میں شادی کا روز آگیا، تماشائیوں کا کوئی شمار نہ تھا کئی باجے شادیانے، شہنائی، تاشے بھی بج رہے تھے، شادی کے بعد شجاعت مرزا اور شوکت مرزا نے شیراز کو جانے کے لئے شمشیر مرزا سے اجازت لی۔ شمشاد بانو بیگم کو بھی ساتھ لے گئے، شیراز کے کئی لوگ شمشاد بانو بیگم کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھے جب شاہی خاندان شیراز کو آیا تو سب لوگ بہت شاد ہوئے کئی روز کے بعد خداوند کریم نے شاہزادہ اور شاہزادی کو اولاد نرینہ عطا فرمایا، اس کو دیکھ کر شاہی خاندان کے لوگ بہت شاد ہوئے اور سب نے مل کر چھوٹے شاہزادے کا نام شرافت مرزا رکھا۔

میر تہور علی

تنقید و تبصرہ

خمخانہ ۔ از جناب گورسرن لال صاحب آزاد توکلی آصفجاہی حجم ۲۱۲ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت عہ مطبوعہ شمس المطابع پریس حیدرآباد دکن۔

خمخانہ جناب آزاد توکلی کے کلام کا دلچسپ مجموعہ ہے جس میں غزلیات اردو و فارسی، قصائد، مخمس فارسی، سہرے، قطعاتِ تاریخی، رباعیات و نظمیں سب ہی ہیں۔ ابتدا میں جناب مہر نرسنگ چند صاحب اگزامنر آف اکونٹس سررشتہ کروڑگیری کا دلچسپ مقدمہ اور نرامن کنتوری صاحب کا ریویو ہے۔

ہندوستان میں اس وقت کائستھ قوم ہی صحیح معنوں میں ہندو مسلم تہذیب کی آئینہ دار اور اس کا سنگم ہے۔ اس قوم نے اپنے آپ کو ہر قسم کی افراط و تفریط سے محفوظ رکھا۔ اردو زبان کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہے اس کا صحیح اندازہ کائستھ قوم کی زبان اور ذوقِ ادب کو دیکھنے کے بعد ہوتا ہے۔ آزاد کا تعلق حیدرآباد کے ایک مشہور کائستھ خاندان سے ہے۔ اردو اور فارسی کے آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔

آپ نے زیرِ نظر مجموعہ میں ہر صنفِ شعر پر طبع آزمائی کی ہے۔ تخیل اور شاعرانہ بلند پروازیوں کے ساتھ ساتھ وحدانیت کی آمیزش آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ کا ذوقِ شعری بہت ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو اردو کو ایک اجنبی زبان سمجھنے لگے ہیں، زیرِ نظر مجموعہ شمعِ ہدایت کا کام دے گا اور ہمیں امید ہے کہ ملک میں آزاد کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

تحفۂ بسنت ۔ از منشی تلوک چند محروم بی اے۔ حجم ۲۹ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۲ر ناشر ڈی آر سورج بلرام ساہنی راولپنڈی۔

محروم اردو کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور ایک زمانہ سے اردو زبان اور ادب کی خدمت میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں بسنت کے متعلق آپ کی (۱۲) دلکش نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں بہ اعتبار زبان، مضامین و تخیل یہ نظمیں بہترین اور پڑھنے کے قابل ہیں۔
(اشس)

راجہ دسرتھ ۔ باتصویر حجم ۱۶ صفحات
مہاتما گوتم بدھ ۔ باتصویر حجم ۲۴ صفحات
نورجہاں ۔ باتصویر حجم ۳۶ صفحات
} از محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ معلمہ ماڈل پرائمری سکول

محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ معلمہ ماڈل پرائمری اسکول حیدرآباد نے تین چھوٹے چھوٹے ڈرامے مرتب کئے ہیں۔ جن کو عبدالقادر اینڈ سنس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد نے تین دیدہ زیب باتصویر کتابوں کی صورت میں شایع کیا ہے یہ ڈرامے اصل میں بچوں کے ایکٹ کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں اور اسی لئے ان کے اندازِ تحریر اور کتابت و طباعت میں شگفتگی پیدا کی گئی ہے تینوں کتابیں باتصویر ہیں۔ چونکہ یہ ڈرامے ماڈل پرائمری اسکول میں اسٹیج کئے جا چکے ہیں اس لئے اس میں اصل ایکٹنگ کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ کامیاب کوشش ہے اور اس پر مصنفہ اور ناشر دونوں قابلِ مبارکباد ہیں۔

دادا بھائی نوروزجی ۔ از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب حجم ۴۶ صفحات قیمت ۸ر
نواب عماد الملک ۔ از مولوی نسیم محمد صاحب حجم ۴۴ صفحات قیمت ۸ر

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہوئے ہیں اس سے قبل اس سلسلہ کی دوسری کتابوں نظام الملک آصفجاہ اول، ارسطو جاہ، اعظم الامرا، سر سید احمد خاں اور سالار جنگ اعظم کے حالاتِ زندگی کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ دادا بھائی نوروزجی ہندوستان کے بہت بڑے پارسی قوم پرست اور مدبر تھے مولوی ظہیر الدین احمد معتمد شعبۂ تراجم نے ان کے حالات نہایت شگفتہ اور سلیس زبان میں مرتب کئے ہیں۔

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی عالم و فاضل ہونے کے علاوہ مدبر اور مدبر بھی تھے وہ آخری عمر تک سیاسی سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے بچے رہے۔ انھوں نے حیدرآباد کو ایک ایسی دولت سے مالا مال کر دیا جس سے رہتی دنیا تک ان کا نام اس ملک کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ یہ علم و فضل کی وہ دولت ہے جو دائرۃ المعارف، کتب خانہ آصفیہ

نظام کالج اور جامعہ عثمانیہ کی شکل میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے تعجب ہے کہ اب تک ان کی کوئی شایانِ شان سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ ادارہ کی تحریک پر مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپٹی ایڈیٹر نے ان کے سوانح حیات بڑے قرینے سے مرتب کئے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ ایک مبسوط و مکمل سوانح حیات کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔

دو ڈاکٹر :۔ از "سند باد جہازی" حجم ۰۸ صفحات قیمت ۸ر ناشر اردو اکیڈمی لاہور

ابھی ابھی اردو اکیڈمی لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں پنجاب کے دو لیڈروں ڈاکٹر سیتہ پال اور ڈاکٹر عالم کے حالاتِ زندگی درج ہیں جن کو سند باد جہازی نے قلم بند کیا ہے اس کا مقدمہ کرشن چندر ایم اے نے لکھا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب زیادہ تر مزاحیہ ہے مصنف نے محض خشک حالات نگاری نہیں کی بلکہ چلتے ہوئے انداز میں سیاسی زندگیوں کی کشمکش اور اضطراب کو بڑے ہی لطف سے بیان کیا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر سیتہ پال اور ڈاکٹر عالم دونوں پنجاب کے مشہور و مقبول لیڈر رہ چکے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب بہت مقبول ہوگی اور اس کی تقلید میں دوسرے لیڈروں کے متعلق بھی اسی طرح یک گونہ مزاحیہ اور شگفتہ انداز کی کتابیں لکھی جائیں گی۔

بولتا قاعدہ :۔ از مولوی شیخ چاند محمد صاحب بی اے ۔ قیمت ۲ر

معہ شیخ چاند محمد صاحب بی اے سابق استاد اردو و فارسی راجکمار کالج راج کوٹ۔ چھوٹی تقطیع پر با تصویر چھپا ہے۔ اس کو جدید طریقہ پر مرتب کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے ا۔ ب۔ ت پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ علم صوت کے مطابق بچہ حروف سے واقف ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی شکل کو پیش کرتے وقت یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کم لفظوں میں زیادہ معنی معلوم ہو جائیں۔ اور بچے جلد زبان سے واقف ہو جائیں۔ اس کی قیمت بہت ہی کم یعنی (آدھا آنہ) ہے۔

انوکھا قاعدہ :۔ از مولوی مرزا عبد الحمید صاحب بی اے بی ٹی (علیگ) قیمت ۴ر ناشر برقی پریس آگرہ۔

جس کو مولوی مرزا عبد الحمید صاحب بی اے بی ٹی علیگ نے مرتب کرکے برقی پریس آگرہ سے شائع کیا ہے۔ یہ بڑی تقطیع پر چھپا ہے اور اس کے ساتھ ایک بڑے کاغذ پر کلید اردو بھی شامل ہے جس میں اردو حرفوں کے ملنے کی خصوصیات بڑی تحقیق سے بیان کی گئی ہیں اس قاعدہ میں اردو حروف اور ان کے جوڑوں کو اس باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ قاعدہ بچوں کی جگہ ماہرینِ صوتیات کے لئے زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ اس کی قیمت چار آنے ۴ر بہت زیادہ ہے۔

افی جے نیا :۔ از ابو القلم دبیر صاحب حجم ۷۰ صفحات قیمت ۱۰ر پتہ ابو القلم دبیر صاحب۔ دبیر پورہ حیدر آباد۔

گوئٹے کا غیر فانی شاہکار ہے جس کا ترجمہ ابو القلم دبیر صاحب نے کیا اور نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں شائع کیا ہے۔ یہ ڈرامہ گوئٹے کے فاوسٹ کے بعد یورپ کے مقبول ترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ترجمہ اچھا کیا گیا ہے۔ لیکن ابتداء میں ڈرامہ اور اس کے مصنف سے متعلق ایک معلومات آفریں مقدمہ کی ضرورت تھی۔

لیڈر :۔ از نفضل حق صاحب قریشی دہلوی حجم ۴۶ صفحات قیمت ۳ر ناشر بزم تہذیب ادب۔ دہلی

بزم تہذیب ادب دہلی کے ایما و اشارے سے نفضل حق قریشی دہلوی نے یہ ڈرامہ اردو ہندی تصفیہ سے متعلق لکھا ہے اور اس کو اینگلو عربک کالج کے ہال میں تین شب تک اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے اس کو مصنف نے گاندھی جی کے نام معنون کیا ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اردو کی جڑیں کھودنے کا کام انہی کی جان توڑ کوششوں کی وجہ سے انجام پا رہا ہے۔

اس ڈرامے کا پیش لفظ نیاز فتح پوری صاحب نے لکھا ہے جس میں اس ڈرامے کے متعلق صحیح رائے دی ہے کہ اس سے تاریخ ادب اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ڈرامہ واقعی قابل تعریف ہے اور اہلِ ہند اس کو جتنا زیادہ اسٹیج پر پیش کریں اچھا ہے۔ قیمت بہت کم یعنی صرف تین آنے رکھی گئی ہے۔

کاغذکی ناؤ:۔ از صاحبزادہ مسکین حجم ۲۰ صفحات قیمت عہ ناشر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد۔

مجموعہ ہے صاحبزادہ مسکین کی چھ نثری تمثیلوں کا جن میں سے پہلے دو کاغذکی ناؤ اور قیدی دو ایکٹ کے ہیں اور بقیہ چار تماشائے اہلِ کرم، سندر، بھیک اور گناہ ایک ایک ایکٹ کے۔ یہ سب غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں۔ ان کے ذریعہ سے انسان دوستی کے احساسات کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب ڈرامے سوائے گناہ کے طبعزاد ہیں۔ گناہ قاضی نذرالاسلام کی نظم طوالُف سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اور ریڈیو کے ڈراموں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ اردو کو اب ایسی ہی جدید طرز کی کتابوں کی ضرورت ہے۔

اندھا دیوتا:۔ از احسان علی شاہ صاحب بی اے حجم ۱۱۲ صفحات قیمت ۱۲/ ناشر اردو اکیڈیمی لاہور۔

افسانوں کے ترجمے جن کو اردو اکیڈیمی لاہور نے شایع کیا ہے۔ اس کے مرتب احسان علی شاہ صاحب بی اے ہیں لیکن یہ منظوم افسانے تین مختلف اصحاب کے ترجمہ کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ازابیلا کا ترجمہ خود احسان علی شاہ صاحب نے، لیمیا کا عبدالرحیم صاحب شبلی بی کام نے اور دی ایو آف سینٹ اگنیز کا ترجمہ مرزا ادیب صاحب بی اے نے کیا ہے۔ یہ تینوں اردو کے اچھے صاحب ذوق اور پختہ انشا پرداز ہیں۔ اور انھوں نے بڑے سلیقہ سے انگلستان کے اس "پراسرار شاعر" کی عالی شان نظموں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ کوشش قابل مبارکباد ہے اور توقع ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ احباب کا یہ مثلث اسی طرح اردو کو مشہور انگریز شاعروں کے کلام سے مالامال کرے گا۔ اس کتاب میں کیٹس کے مختصر لیکن مفید سوانح حیات بھی شامل ہیں۔ لیکن اس شاعر کی تصویر نہیں دی گئی ہے۔ توقع ہے کہ دوسرے اڈیشن میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

کالیداس:۔ از جے کرشن صاحب ایم اے حجم ۴۴ صفحات۔

سرزمین ہند کے شاعر اعظم کالی داس کی شہرت گزشتہ دو ہزار سال سے قائم ہے لیکن اس کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ جے کرشن صاحب ایم اے ایل ایل بی نے اس کام کی تکمیل کر کے اردو کی ایک اچھی خدمت کی ہے۔ انھوں نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں شاعر کے حالات درج ہیں جو کافی تلاش و تجسس کے بعد جمع کئے گئے ہیں۔ دوسرے میں کالیداس کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور تیسرے میں اس کے ڈراموں اور نظموں کو کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

تینوں حصے محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہیں۔ اور خاص کر آخری حصہ بہت ہی دلچسپ اور مفید ہے۔ شکنتلا اور وکرم اور وسی اور دیگر نظموں اور ناٹکوں کے اردو ترجمے بڑی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ اور جیسا کہ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ یہ کتاب عام طور پر مقبول ہوگی۔

پدمنی کے افسانے:۔ از مولوی محمد احتشام الدین صاحب دہلوی ایم اے حجم ۸۴ صفحات۔

جس کو مولوی محمد احتشام الدین صاحب دہلوی ایم اے (علیگ) نے لکھ کر شایع کیا ہے۔ اس موضوع پر مولف نے پندرہ سال قبل لاہور کے رسالہ بہارستان میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ لیکن جو کچھ رسالہ میں شایع ہوا تھا اس سے یہ مجموعہ سہ چند سے کم نہیں۔ احتشام الدین صاحب نے بڑی تحقیق کے ساتھ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ چتوڑ کی رانی پدمنی اور سلطان علاءالدین خلجی کے عشق و اشتیاق کی داستان محض من گھڑت اور تاریخی نقطۂ نظر سے قطعاً غلط ہے مولف نے قدیم ترین ماخذوں کے مطالعہ اور چھان بین میں دقت نظر سے کام لیا ہے اور ان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے اور جیسا کہ انھوں نے

لکھا ہے کہ یہ کام دراصل یونیورسٹی کے قابل پروفیسروں اور محققوں کے کرنے کا تھا۔

اردو کے ہندو ادیب:۔ از جناب ناظر کاکوروی۔ ناشر انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جناب ناظر کاکوروی نے اردو کے ہندو ادیبوں پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جس کو انوار بک ڈپو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کی عہد حاضر میں بے حد ضرورت تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولف نے وقت کی ایک ضرورت کو پورا کیا اور ایک مختصر تذکرہ مرتب کر دیا۔ لیکن یہ ابھی نامکمل ہے۔ اس میں کئی ہندو شاعروں اور ادیبوں مثلاً لچھمی نارائن شفیق۔ بالاجی تاراچند۔ جیند دلال شاداں گردھاری پرشاد باقی۔ بہاری لال رمز۔ سیتل پرشاد خرم۔ نرسنگھ راج عالی۔ راجیشور راؤ اصغر اور دکن کے دیگر متعدد ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہی نہیں ہے۔

اس کے آغاز میں چار اصحاب کے دیباچے اور آخر میں متعدد غیر ضروری ضمیمے دئے گئے ہیں جن سے کتاب کا حجم تو بڑھ گیا ہے لیکن اصل موضوع سے متعلق معلومات میں اضافہ نہیں ہوا۔ توقع ہے کہ اس تذکرہ کو سامنے رکھ کر خود ناظر صاحب یا کوئی اور صاحب ایک مکمل کتاب مرتب کریں گے۔

بربط ناہید:۔ از محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے (عثمانیہ) حجم ۱۶۴ قیمت عہ پتہ دفتر رسالہ شہاب دبیرپورہ حیدرآباد۔

یہ حسین و جمیل کتاب مجموعہ ہے۔ جہاں بانو بیگم ایم اے کے خطوط کا جو موقع بموقع ماہنامہ شہاب میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت بھی ان خطوں کا طرز نگارش بتاتا تھا کہ یہ کس کی نزادش قلم ہیں اور اب بھی کہ مصنفہ نے ایک دلفریب فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ "ایک دنیا اس دلفریب غلطی میں مبتلا تھی اور ہے کہ ناہید میرا قلمی نام ہے"۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پردہ میں کون ہے اور لطف یہ ہے کہ ج نقوی ایک حد تک پردہ باقی رکھنا چاہتی ہیں لیکن ان کی تمہید اور خطوط کی عبارتوں میں یہ پردہ جگہ جگہ اٹھنے یا گرنے لگتا ہے۔

بربط ناہید عہد حاضر کی نسوانی تحریروں کا ایک نفیس نمونہ ہے۔ اب تک عورتوں کی طرف سے مردوں نے فرضی خطوط لکھے اور لیلیٰ کے خطوط جیسے مجموعے شایع کئے تھے۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ اب مردوں کو صنف نازک کی ترجمانی کی ضرورت نہیں یا یوں کہئے کہ عورتیں اب مرد ترجمانوں سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔ نسوانی سینہ میں جذبات کا جو اتار چڑھاؤ رہتا ہے، اس کی آئینہ داری مرد سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ جس پر اپنی جنس کی کثافت کا زنگ چڑھا رہتا ہے۔ اس کے لئے تو کسی نسوانی قلم ہی کی ضرورت ہے۔ اور بربط ناہید کی مصنفہ نے اپنے خطوط کی رعنائی اور رنگینی کے ذریعہ سے ثابت کر دیا کہ واقعی صنف نازک کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنا اور عہد حاضر کے تعلیم یافتہ بتان طناز کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اس مجموعہ رنگا رنگ کے مطالعہ کے بعد نہ معلوم ان زاہدان خشک اور پروفیسران بر خود غلط کے چہروں کا کیا رنگ ہو جو عورتوں کی تعلیمی ترقی انشا پردازانہ کمال کا اب بھی اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔

صراط الحمید:۔ یعنی سفرنامہ مقامات مقدسہ مولوی محمد الیاس برنی صاحب ایم اے ایل ایل بی۔ مطبوعہ مطبع برقی اعظم جاہی حیدرآباد صفحات ۲۰۸ قیمت عہ

اس کتاب کا پہلا اڈیشن شوال ۱۳۴۶ھ میں شایع ہوا تھا اور اتنا مقبول ہوا کہ بہت جلد ختم ہو گیا اب دوسرا اڈیشن شایع ہوا ہے جس میں مولف نے پہلی کتاب کی بہت سی خامیاں دور کر دی ہیں اور جگہ جگہ اضافے بھی کئے ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب پہلے کے مقابلے میں بہت نکھر گئی گویا کہ نئی ہو گئی ہے۔

مولوی الیاس برنی صاحب کی طرز تحریر نہایت شستہ و شگفتہ ہوتی ہے

ادارہ درج کیا ہے' وہ ایک تربیت یافتہ مدرس

ہیں ــــــ کی طرح نوجوانوں کی نفسیات سے بخوبی

واقف ہو صفحہ ۱۵۴ تحریر میں تختگی کے ساتھ ساتھ زندگی

بھی پائی جاتی ہے۔ ۳۹۵ M مزاح نگاری سے بھی کام لیتے ہیں

توقع ہے کہ ان کے یہ افسانے ہی سے پڑھے جائیں گے۔

تقلقہ :۔ جدید طرز کی اصلاحی اور سیاسی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ

از ابوالعلا چشتی حاجی لقلق' مطبوعہ آزاد پریس لاہور۔ صفحات ۲۰۰ قیمت ۲

حاجی لقلق پہلے ابوالعلا چشتی کے نام سے عام طور پر سنجیدہ مضامین

ہند پہنچنے تک کے واقعات پر لکھی گئی ہے۔ اس سفرنامہ میں سب سے

بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مقامات مقدسہ کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا

ہے اور بقول مولف دل کو حضوری کا لطف آتا ہے' اہل ذوق

اس کو بڑے شوق سے پڑھیں گے' اور لطف اندوز ہوں گے' چند

مقامات کی عکسی تصویریں بھی اس سفرنامے میں شامل ہیں۔

یورپ کے تاثرات :۔ مرتبہ محمد بدرالدین خاں شکیب بی اے

ایل ایل بی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس صفحات ۱۹۰ قیمت عہ

اس کتاب میں ہندوستان کے پچیس مشہور و معروف اصحاب

کے وہ مشاہدات اور تجربے درج ہیں جو انھیں سفر یورپ کے اثنا میں حاصل

ہوئے' بدر شکیب حیدرآباد کے سربرآوردہ نوجوان ادیبوں میں سے

ہیں ادب اور صحافت سے ان کو ایک عشق سا ہے' یہ انھوں نے ایک جدت

کی ہے کہ مختلف اصحاب سے ان کے سفر یورپ کے مشاہدوں کو قلم بند

کرا لیا' اس کام میں ان کو بڑی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی اور جیسا کہ

ان کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے ان کو اس سلسلہ میں مخالفتوں اور

دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور اکثروں کے بیانات ان کو خود ہی

قلمبند کرنے پڑے لیکن اس محنت و مشقت سے جو ثمرہ ملا

ہے وہ واقعی تعریف کا مستحق ہے' یورپ کے مقابلہ میں ہندوستان

کی پستی کے صحیح اسباب دریافت کرنے کے لئے بدر شکیب صاحب کی

بے چین طبیعت نے کامیابی حاصل کی ہے' یقین ہے کہ یہ کتاب ہندوستان

کی قومی تعمیر و تشکیل کے سلسلہ میں مددگار ثابت ہوگی اور اس کو پڑھ کر

اہل فکر اصحاب کئی طرح کے سبق حاصل کریں گے۔ جن پچیس اصحاب کے

اس مجموعے میں بیانات شامل ہیں ان میں سے اکثر کو اپنے اپنے

میدان عمل میں یگانہ سمجھا جا سکتا ہے' ان بیانات کی موجودگی میں

ضرورت نہ تھی کہ مرتب اپنے دیباچہ کے ساتھ ساتھ اور دو اصحاب

سے پیش لفظ اور تعارف لکھواتے' ان کا دیباچہ ہی کافی تھا۔

کیونکہ وہ خود اردو دنیا میں اپنی پہلی کتاب

" نظر کے دھوکے" کی وجہ سے بخوبی متعارف ہیں اور

اپنے افسانوں اور صحافتی مضمونوں کی ذریعہ سے

دکن کی اردو دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

اور اردو کو ان سے بہت سی توقعات وابستہ

ہیں۔

برگ سبز (یعنی علم میراث پر ایک عقلی مقالہ) مولفہ خواجہ احمد الدین مرحوم

مطبوعہ دفتر امت مسلمہ امرتسر صفحات ۴۰ قیمت ۲ر

مجلس امت مسلمہ مفید مذہبی ادب کی اشاعت میں مصروف ہے۔

اس کی طرف سے ایک ماہنامہ البیان شائع ہوتا ہے اور اسلام سے متعلق تبلیغی

ادب مفت تقسیم کیا جاتا ہے' یہ کتاب بھی اسی مجلس نے شائع کی ہے'

اس میں علم میراث کے متعلق نہایت مفید اور ضروری معلومات درج

ہیں اور جیسا کہ اس کی "تقریب" میں جناب اصغر بی اے نے لکھا۔

"حق العباد کا معاملہ بڑا نازک ہے' ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھانے

[illegible]

موضوعوں پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ کچھ عرصے سے اردو میں صنف

رباعی کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے' اس صنف کی مقبولیت زیادہ

قیمت درج نہیں۔

اردو زبان کی اب تک کئی فرہنگیں لکھی گئیں۔ لیکن ایک زندہ اور ترقی پسند زبان کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کی آئے دن نئی نئی فرہنگیں شایع ہوتی رہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان کی مکمل فرہنگ بالفت اب تک لکھی ہی نہیں گئی۔

خویشگی صاحب نے اپنی اس فرہنگ میں اردو زبان کے صرف ان الفاظ کو پیش کیا ہے جو ہندوستانی الاصل نہیں ہیں' یہ ایک جدت ہے اور عہد حاضر میں جب کہ اردو زبان سے غیر ملکی اثرات کو دور کرنے کے لئے علم جہاد بلند کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خود اہل اردو بھی متاثر ہوگئے ہیں اور اپنی زبان میں قطع و برید شروع کردی ہے . . . . . .

روز بروز یہ اندیشہ بڑھتا جا رہا ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں اپنے اسلاف کے اردو کارناموں کے سمجھنے سے قاصر ہوجائیں گی۔ اس وقت زیر نظر فرہنگ جیسی کتابیں بہت مفید ثابت ہوں گی' اس کے مرتب نے بہت ہی محنت کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے' کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اسی طرح اردو کے ٹھیٹ ہندوستانی الفاظ کی بھی ایک فرہنگ مرتب کردیں' اس سے یہ معلوم ہوگا کہ گزشتہ نسلوں نے غیر ملکی الفاظ کے ساتھ ساتھ ٹھیٹ ہندوستانی الفاظ بھی کثرت سے استعمال کئے تھے' یہ اور بات ہے کہ گزشتہ ۲۵' ۳۰ سالوں میں اردو والے اپنے اصلی رجحان کو چھوڑ کر عربیت اور فارسیت کی طرف مائل ہوگئے تھے' اگر عہد حال کے اہل اردو اپنے بزرگوں کی پوری میراث سے واقف ہوں اور اس کے استعمال پر قادر ہوجائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں دوسری زبانوں سے نئے الفاظ (خواہ وہ جلد مند ۹) کے ہوا) مامد مدفارسی عربی کے) لینے کی ضرورت پڑے۔

کہ مصنف نے ایک دلفریب فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ "ایک دنیا اس دلفریب غلطی میں مبتلا تھی اور ہے کہ ناہید میرا قلمی نام ہے"۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پردہ میں کون ہے اور لطف یہ ہے کہ ج نقوی ایک حد تک پردہ باقی رکھنا چاہتی ہیں لیکن ان کی تمہید اور خطوط کی عبارتوں میں یہ پردہ جگہ جگہ اٹھنے یا گرنے لگتا ہے۔

بر لطف ناہید عہد حاضر کی نسوانی تحریروں کا ایک نفیس نمونہ ہے۔ اب تک عورتوں کی طرف سے مردوں نے فرضی خطوط لکھے اور لیلیٰ کے خطوط جیسے مجموعے شایع کئے تھے۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ اب مردوں کو صنف نازک کی ترجمانی کی ضرورت نہیں یا یوں کہئے کہ عورتیں اب مرد ترجمانوں سے بے نیاز

افکار سیاسی:- از قاضی محمد عبدالرؤف صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ صفحات ۲۰۴ قیمت ۸ مطبوعہ عہد آفرین پریس حیدرآباد

ہندوستان آج کل جس دور سے گزر رہا ہے وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اس ملک کا ہر طبقہ سیاسی شعور سے محروم نہ رہے۔ سیاسی شعور اور عام بیداری کے بغیر کوئی قوم یا ملک ترقی نہیں کرسکتا اور یہ چیزیں پیدا نہیں ہوسکتیں جب تک کہ سیاست کے تاریخی پس منظر سے آگاہی نہ ہو اور یہ نہ معلوم ہو کہ قانون اور دستور کے ارتقا میں مختلف قوموں اور جماعتوں کی ذہنی توتوں نے کس طرح سے حصہ لیا ہے' اس اہمیت کا لحاظ کرکے عبدالرؤف صاحب نے بارہ مضامین لکھے جو اخباروں میں شایع ہوچکے ہیں اور اب ان کو کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے' یہ سب مضمون دلچسپ اور مفید ہیں اور ان کا مطالعہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لئے ضروری ہے۔

بنگاری بابو اور دیگر سائنسی افسانے:- مولفہ حبیب احمد صاحب صفحات ۱۰ قیمت ۸ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد۔

حبیب احمد صاحب سائنس کے صاحب ذوق معلم اور مولف ہیں اور انشا پردازی سے خاص شغف رکھتے ہیں' اس سے پہلے ان کی کئی کتابیں مختلف موضوعوں پر چھپ چکی ہیں اور اب انھوں نے سائنسی معلومات تخیل اور ایجادات سے متعلق دلچسپ چھوٹی چھوٹی کتابیں

ادارہ ...درج کیا ہے، وہ ایک تربیت یافتہ مدرس
ہیں ...کی طرح نوجوانوں کی نفسیات سے بخوبی
واقف ہو...صفیہ ۱۵۳ تحریر میں پختگی کے ساتھ ساتھ زندگی
بھی پائی جاتی ہے۔ ۲۹۵ ۸۸ مزاح نگاری سے بھی کام لیتے ہیں
توقع ہے کہ ان کے یہ افسانے ...ی سے پڑھے جائیں گے۔

تقلقہ:۔ جدید طرز کی اصلاحی اور سیاسی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ از ابوالعلا چشتی حاجی لقلق، مطبوعہ انگار پریس لاہور، صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۲ر

حاجی لقلق پہلے ابوالعلا چشتی کے نام سے عام طور پر سنجیدہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ بعد کو مزاحیہ مضمون لکھنے لگے اور اب مزاحیہ شاعری میں شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے رنگ سے متاثر ہیں اور اس مجموعہ لقلقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس رنگ کو ترقی دے کر اپنے لئے ایک انفرادیت پیدا کرلی ہے اردو میں مزاحیہ شاعری کی کمی ہے، مزاح کو ژٹل گوئی سے بچانا بہت مشکل ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ حاجی لقلق اس کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

انوار اختر:۔ سید محمد اختر صاحب اختر نگینوی کا تیسرا دیوان مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ، بڑی سائز ۲۵۶ صفحات قیمت درج نہیں۔

اختر نگینوی صاحب داغ کے اچھے اور پرگو شاگردوں میں سے ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو دیوان "نظم دل افروز" ۱۳۱۹ھ میں اور "ضیائے اختر" ۱۳۲۲ھ میں چھپ چکے ہیں اب ان کے فرزند سید محمد غضنفر صاحب کاظمی نے ان کا یہ تیسرا دیوان مرتب کرکے شایع کیا ہے، اس کے آغاز میں مرتب کی تصویر کے علاوہ خود شاعر کی بھی تین مختلف زمانوں کی تصویریں شامل ہیں، آخر کے تقریباً تیس صفحات مختلف اصحاب کی تقریظوں اور قطعات تاریخ پر مشتمل ہیں، اختر صاحب خاص دلی کی ٹکسالی زبان کی تقلید کرتے ہیں اور ان کا کلام زیادہ تر اسی سطح نظر کا نتیجہ ہے، اکثر غزلیں بہت طویل اور دو غزلہ

وسہ غزلہ ہیں، زبان کی چاشنی اور تغزل کا لطف اس مجموعہ کی اہم خصوصیت ہے۔

یادگار جگر:۔ یعنی مجموعہ کلام منشی رنگ بہادر لال جگر آنجہانی مرتبہ پانڈے سرسوتی پرشاد مطبوعہ آسی پریس گورکھپور صفحات ۵۶+۵۶ قیمت ۸ر

ابتدائی ۵۶ صفحات میں جگر مرحوم سے متعلق مختلف اصحاب کے مضامین اور خیالات درج کئے گئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر ایک کامیاب اور قابل وکیل تھے، اصلاح معاشرت ان کے پیش نظر تھی اور اپنے وقت کا زیادہ حصہ آریہ سماجی تحریک کی امداد اور ترقی کے لئے صرف کرتے تھے۔ فارسی اور اردو زبانوں کا اچھا ذوق تھا۔ اور اردو شاعری سے بھی دل بہلا لیتے تھے، اس مجموعہ میں ان کی ۲۹ غزلیں شامل ہیں جو خوش ذوقی اور لطف زبان کا اچھا نمونہ ہیں، ان کے مرتب سرسوتی پرشاد صاحب نے لکھا ہے کہ جگر ان کے ماموں تھے اور ان کے ننہال کے آخری چشم و چراغ تھے دوران علالت میں جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تو اپنے ادبی افکار کے قلمی نسخوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا تھا، اتفاق کی بات ہے کہ بچا کھچا حصہ سرسوتی پرشاد صاحب نے محفوظ کرلیا اور اس کو اب یادگار جگر کے نام سے چھاپ دیا ہے، اس کے لئے وہ اردو دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

رباعیات حیدر:۔ مرتبہ انور حیدری دہلوی، مطبوعہ مشرقی پریس دہلی صفحات ۱۲۵ قیمت ۸ر

اس چھوٹی سی کتاب میں جناب حیدر صاحب دہلوی کی سو سے زیادہ رباعیاں شامل ہیں، جن میں شراب و شباب، حقایق و معارف، برکات وطن، اردو، شاعر، شہدا اور آثار وطن جیسے موضوعوں پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ کچھ عرصے سے اردو میں صنف رباعی کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے، اس صنف کی مقبولیت زیادہ

حضرت امجد حیدرآبادی کی رباعیوں کے مجموعوں کی اشاعت سے شروع ہوئی' اس سے قبل محض رباعیوں کے مجموعوں کی اشاعت کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی' حیدر صاحب کی رباعیوں میں زمانے کے اقتضا کے مطابق جگہ جگہ سیاسی رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔

جوہر تمثیلات:- از راگھو یندر راؤ جذب وکیل عالمپوری مطبوعہ رفاہ عام برقی پریس آگرہ صفحات ۳۲ قیمت ۴؍

اس کتاب میں جناب جذب عالمپوری نے سنسکرت کی کتاب ورش تانت ستک مصنفہ کوسم دیو کا شلوک وار اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے جو نواب طلعت اللہ خاں صاحب رئیس کرنول کی سرپرستی میں چھپا ہے اس پر پنڈت امرناتھ مدن صاحب ساحر دہلوی نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ "مجھے ان کی زباں دانی اور دہلی کے ادیبوں کی زباں دانی میں کوئی قابل لحاظ تفاوت معلوم نہ ہوا۔"

سنسکرت میں زمانۂ قدیم میں جو تمثیلیں رائج تھیں ان میں سے صرف سو تمثیلوں کا انتخاب کوسم دیو نے کیا تھا جس کو اب جذب صاحب نے اردو نظم میں منتقل کیا ہے' یہ ایک مبارک کوشش ہے اور اس میں مترجم نے اصل خیالات کی رفعت کے ساتھ ساتھ اردو کی سلاست کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

جذبات وفاداری اور عہدہ داروں کا عمل:- از محمد شمس الدین صاحب صدیقی مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس صفحات ۴۶ و ۱۰۴ قیمت درج نہیں۔

یہ دو رسالے مولوی شمس الدین صاحب منصف وظیفہ یاب کی تالیف ہیں جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ہیں اور جن کے بیسیوں چھوٹے چھوٹے رسالے اب تک شائع ہو کر پسند کئے جا چکے ہیں' مولوی صاحب کی اکثر تحریروں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کی نسلوں کو اسلاف کی خوبیوں سے واقف کرایا جائے اور ان خصوصیتوں اور خوبیوں کی طرف ت[...] کے بزرگوں نے ترقی حاصل کی تھی [...]

پہلا رسالہ "جذبات وفاد[اری]" [...] مختلف مضمونوں کا مجموعہ ہے [...] شائع ہوئے تھے ان میں [...] سے متعلق ایسے واقعات [...] حیدرآباد کی قدیم تاریخ کی [...]

دوسرے رسالے [...] قسم کے مفید مضمون شامل ہیں قیمت [...] حیدرآباد کی تاریخ لکھنے والوں [...] ان میں انھوں نے بہت سی چشم دید یا [...] سنی ہوئی ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جو تاریخوں [...]

گل نو:- افسانوں کا مجموعہ از ایم اسلم مطبوعہ [...] صفحات ۳۵۰۔

ایم اسلم صاحب پنجاب کے مایۂ ناز ادیب اور مصنف ہیں [...] متعدد کتابیں شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں جن میں خاص کر "گناہ کی راتیں" اور "مرزا جی" قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حال ہی میں پنجاب کے محکمہ تعلیم کی طرف سے ان کی ایک کتاب "تفسیر حیات" پر گراں قدر انعام دیا گیا ہے' زیر نظر کتاب ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کو ملک دین محمد اینڈ سنس نے شائع کیا ہے' کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے' افسانے بھی اچھے ہیں لہذا اسلم صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کا مقبول ہونا ضروری ہے۔

"مق"

نوٹ:- ناشرین و مصنفین کو اپنی کتابوں پر تبصرہ کے لئے تقاضہ کے خطوط روانہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر کتاب پر جلد یا دیر سے ضرور تنقید چھاپی جاتی ہے۔

[...]معنوی ایک حد تک پردہ باقی رکھنا چاہتی ہیں [...] خطوط کی عبارتوں میں یہ پردہ جگہ جگہ اٹھنے [...]

[...] عہد حاضر کی نسوانی تحریروں کا ایک نفیس [...] کی طرف سے مردوں نے فرضی خطوط سے [...] ایسے مجموعے شائع کئے تھے۔ لیکن اس [...] ثابت ہوتا ہے کہ اب مردوں کو صنف [...] کہئے کہ عورتیں اب مرد ترجمانو[ں] [...]

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

سب رس

ہیں
...جب ...آصفیہ ۱۵۳
...خبار ...شیپ برطانیہ ۳۹۵۰۸۱
...شاہی ...ون نمبر ۲۲۰۹
...دہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
...بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
...سب رس علاوہ ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد (۳) شمارہ (۶)
جون سنہ ۱۹۴۰ء

جلد (۳) جون سنہ ۱۹۴۰ء شمارہ (۶)

خواجہ حمیدالدین شاہد کے اہتمام سے عظیم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد سے شائع ہوا

سر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنۃ کی وفات

مہاراجہ یمین السلطنۃ کے انتقال نے حیدرآباد سے مشرقی تہذیب کا آخری نصب العینی پیکر چھین لیا۔ مہاراجہ کی ذات ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتی تھی ایسے زمانے میں جب کہ نئے تمدن کے برقی قمقموں نے قدیم روایات کے فانوسوں کو جھٹلا دیا ہے ایک کافوری شمع کی طرح ہمارے دلوں میں اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کی یاد دلاتے تھے۔ ان کا وجود نہ صرف ماضی کی ایک عظیم الشان نشانی تھا، بلکہ وہ جدید نسل کے لئے مستی کردار کا ایک سبق تھے۔ جو کتاب مغلیہ تہذیب کی تاریخ پیش کرتی ہے، اس کا آخری باب گویا مہاراجہ کی آخری سانسوں کے ساتھ ختم ہوگیا۔

مہاراجہ کی زندگی کا ہر پہلو ایک مستقل تفصیل کا محتاج ہے۔ ان کی زندگی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھی۔ ان کی بخشش غریبوں کے لئے سہارا۔ ان کا اخلاق دلوں کو موہنے والا، ان کا ذوق حسن کاری، ان کی روح کی طرح لطیف، ان کا ہر سانس، نغمۂ عمل وہ کبھی ایک امیر کی طرح اپنی خاندانی عظمت کا نقشہ کھینچ دیتے اور کبھی ایک فقیر کی طرح فقیروں میں گھل مل جاتے۔ وہ "شاد" ان سے ملنے والے شاد —— ایوانِ شاد کی سکون پرور ہنگامہ آرائیوں کی صدائیں ابھی تک حیدرآباد کی فضاؤں میں گونج رہی ہیں۔ ایوانِ شاد اصل میں مشرق و مغرب کا مرکزِ امتزاج تھا۔ مشرق کی روایتیں وہاں —— مغرب کی فراخ دلیاں بھی ایک حد تک۔

مہاراجہ اردو کے بڑے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے ذوق تصنیف و تالیف کی کئی نشانیاں، کتابوں کی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔ ان کی تحریروں کا زیادہ تر حصہ تصوف پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے آپ کو صوفی منش بتاتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا مسلک "صلح کل" تھا۔ وہ فرقہ پرستی کے ادنیٰ تعصبات سے بلند و بالا تھے۔ ان کا خدا "برہمن کے نزدیک" رام "اور مسلمان کے نزدیک" اللہ "تھا۔ وہ "اللہ" اور "رام" میں کوئی فرق نہ پاتے تھے۔ ان کی شاعری میں ان عقائد کے جابجا عکس جھلکتے ہیں۔ ان کے عقائد سے قطع نظر ان کی تحریروں پر اگر ادبی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے تو ان میں روانی اور نغمگی کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ وہ اردو کو عزیز رکھتے تھے اور اس زمانے میں جب کہ اردو اور ہندی کی بحث نے فرقہ پرستوں کے لئے ایک نئی رزم گاہ کھول دی ہے۔ ان کی اردو نوازیوں کی جیسی کچھ اہمیت تھی ظاہر ہے۔ اردو ادب میں ان کی تحریروں کا اگرچہ کوئی بلند مقام نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اس امر کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان کا اردو کو اپنے ذوق نگارش کے لئے انتخاب کرنا ہی بہت کافی تھا۔

مہاراجہ آنجہانی ہر حیدرآبادی کے دل میں اپنے لئے جگہ رکھتے تھے۔ ہر حیدرآبادی ان کی عزت کرتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک امیر تھے بلکہ اس لئے کہ "حیدرآبادی قومیت" اور حیدرآبادی روایات کی وہ ساری خصوصیات ان میں موجود تھیں، جو ایک حیدرآبادی کو حیدرآبادیوں کے نزدیک قابلِ عزت بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ حیدرآباد کی رعایا انھیں اپنا ہمدرد پاتی تھی۔ وہ اہل حیدرآباد کو اپنے عزیزوں کی طرح چاہتے تھے۔ حیدرآباد کی عزت میں اپنی عزت سمجھتے تھے۔ حیدرآباد کی مصیبت پر ان کی پیشانی پر بل پڑجاتے تھے۔

ایسی ہستی کا ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجانا ایک عظیم نقصان ہے۔ جس کی تلافی ہوتی نظر نہیں آتی۔

میکش

اداریہ

ہمارے لئے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ سب رس اور اس کے ضمیموں "بچوں کا سب رس" اور "سب رس معلومات" کی مقبولیت میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، ہر قسم کے معاونوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی ترتیب و اشاعت کو بہت پسند کیا جا رہا ہے اس کا ایک ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ معاصر "نیرنگ خیال" نے اپنے اس سال کے سالنامہ میں (جہاں اپنی سالانہ روایات کے مطابق اردو کے بہترین ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کی خدمات کے اعتراف میں خطابات دیئے ہیں) مدیر سب رس کے لئے "مدیر اعلیٰ" کا خطاب تجویز کیا ہے۔

اس ماہ وقت کی کمی کی وجہ سے تنقید و تبصرہ کے صفحات حذف کر دئے گئے ہیں۔ آئندہ شمارے میں زیادہ کتابوں پر تنقیدیں شائع ہو جائیں گی۔ اس دفعہ نذر دکن سے متعلق "حضرت مخلص" کا ایک پرجوش مضمون متعدد خواتین و اصحاب کی فرمائش پر شائع کیا جا رہا ہے۔ چونکہ صاحب موصوف کی تنقیدیں اکثر رسائل خاص کر ساقی دہلی میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں اس لئے اس کو پہلے جگہ دی گئی ہے ورنہ اس سے پیشتر کے وصول شدہ کئی مضمون اس موضوع سے متعلق دفتر میں موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں کئی اہل قلم اصحاب نے خطوں کے ذریعے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن یہاں صرف دو خطوں کے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر صدق لکھنؤ طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود پر خاص طور پر نظر رکھتے ہیں، اور ہمیشہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اس طبقہ کو ترقی کی دھن میں بے راہ روی سے بچنا چاہیے۔ وہ جدید نظریۂ ترقی و آزادیٔ نسواں کے سخت مخالف ہیں اور صنف نازک کی بیجا حمایت اور حوصلہ افزائی کو پسند نہیں کرتے اس لئے انکی رائے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنے ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تنقید کی آگ دیکھی۔ واقعی آتش زبانی کے لحاظ سے "آگ" ہی ہے۔ دل شکن بھی۔ حوصلہ شکن بھی"

ساتھ ہی محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کے ایک عنایت نامہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ موصوفہ حیدرآباد کی مشہور اور نغز گفتار شاعرہ ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

"یہ محض حاسدانہ جذبات کی زیادتی ہے، اور اس کا سبب ادارے کی عام مقبولیت ہے۔ ......ادارے اور شعبۂ نسواں کی بنیادیں نہ صرف مستحکم ہو رہی ہیں بلکہ ان کا استقرار بقائے دوام حاصل کر رہا ہے۔ چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ خلوص کی قدر کے لئے بدخواہی و خود غرضی کا وجود ضروری ہے۔ بہرحال کوئی چیز تو ہے جس کی خاطر! یہ انسانوں کو انسانیت اور اخلاق سکھانے والے، اپنی انسانیت سے ہاتھ دھو بیٹھنے پر تلے ہیں۔ افسوس تو اس سی لاحاصل پر کیجئے جو بدنامی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ میں تو اس طرف متوجہ ہونا بھی تضیع اوقات سمجھتی ہوں......"

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا!

ادارے کی خبریں

اس مہینے ادارے کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس معتمد فینانس (نائب صدر ادارہ ادبیات

سید محمد اعظم صاحب ایم اے کینٹب منصرم ناظم تعلیمات، مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کینٹب نائب ناظم تعلیمات، پروفیسر مجید صدیقی ایم اے ایل ایل بی، پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی، پروفیسر عبد القادر صاحب صدیقی ایم اے اور ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی نے شرکت کی۔ ۱۹۳۹ء کی سالانہ روداد اور ادارہ کی سرگذشت کی اشاعت کا تصفیہ کیا گیا۔ ادارہ کے حسابات کی باضابطہ تنقیح عمل میں آئی اور آڈیٹر صاحب نے ادارہ کے دفتر کی باضابطگی اور حسابات کی صفائی پر بڑی مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ۱۹۴۰ء کی آخری شش ماہی کے لئے مطبوعات کا انتخاب کیا گیا اور ادارہ کی بعض شاخوں کے قیام کی توثیق عمل میں آئی۔

ادارہ کے **شعبۂ نسواں** کی مجلس انتظامی کا بھی ایک جلسہ ۳ اپریل کو منعقد ہوا جس میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ سارہ بیگم صاحبہ، محترمہ جیلانی بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ عزت بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر اور محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد اعزازی شعبہ نے شرکت کی۔ اس مجلس میں بھی حسابات پیش کئے گئے اور ان کے صاف ہونے کی تصدیق کی گئی۔ مدرسۂ تعلیم البالغات، اجلاس عام اور کانسرٹ وغیرہ مسائل سے متعلق تصفیے عمل میں آئے۔ معلوم ہوا کہ مدرسہ بالغات میں اوقات کی پابندی اور درس و تدریس میں باقاعدگی ہے۔ مسز محمد یونس صاحب پابندی سے آتی ہیں پکوان میں طالبات دلچسپی لے رہی ہیں۔ حالت امید افزا ہے۔ مدرسے کے لئے ایک کتاب الرائے رکھنے کا تصفیہ ہوا تاکہ مدرسہ کے معاینہ کو آنے والے اپنے تاثرات قلمبند کرسکیں۔

ادارہ کی شاخیں برابر سرگرم عمل ہیں۔ کلیانی میں [illegible] اپریل کو ایک کامیاب جلسہ ہوا۔ اور بتایا گیا کہ ادارہ کے امتحانات کے سلسلہ میں مولوی عبد الکریم صاحب نے اسعد عالم اور اردو دانی کی تعلیم دینا شروع کر دی ہے۔ اس شاخ کے صدر مولوی محمد رحمت اللہ صاحب ایم اے ایل ایل بی، معتمد مولوی عطاء اللہ صاحب عطا، شریک معتمد مولوی محمد عبد الکریم صاحب، رکن نشریہ مولوی غلام معین الدین صاحب اور رکن مراسلات و خازن مولوی محمد تاج الدین صاحب ہیں۔ اس جلسہ نے دار المطالعہ کے قیام کے بارے میں بھی تصفیہ کیا۔

پربھنی، محبوب نگر، گلبرگہ، کپل، اور عثمان آباد وغیرہ کی شاخیں بھی برابر کام کر رہی ہیں۔ آئندہ مہینے سے سب رس کے چند صفحات شاخوں سے متعلق معلومات کے لئے وقف کر دیئے جائیں گے۔ جملہ شاخوں کے معتمدین براہ کرم اپنی اپنی مصروفیتوں سے متعلق ایک مختصر لیکن جامع نوٹ روانہ فرمائیں تاکہ من وعن شائع ہو سکیں۔ شاخوں کے جلسوں کی جو رودادیں دفتر میں وصول ہوتی رہتی ہیں وہ اس طرح لکھی ہوتی ہیں کہ ان کو شائع کرنے کے لئے انھیں دوبارہ لکھنا پڑتا ہے۔

شعبۂ طلبہ ادارہ کا یہ شعبہ بڑی سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔ اس کا کتابچہ معلومات رنگین سرورق کے ساتھ نہایت دیدہ زیب چھپا ہے۔ طلبہ دفتر سے مفت طلب کر سکتے ہیں۔ اس شعبہ کے معتمد اور سب رس کی مجلس ادارت کے رکن مولوی معین الدین صاحب انصاری کو (جو بچوں کے سب رس کے ایڈیٹر ہیں) اس ماہ صوبۂ میدک کی طلبہ کانفرنس منعقدہ محبوب نگر میں صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے وہاں جو خطبہ پڑھا وہ جلسہ میں مطبوعہ شکل میں تقسیم کیا گیا تھا اور اب اس شمارہ میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں طلبہ کے لئے بڑی کام کی باتیں درج ہیں۔ توقع ہے کہ طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اشاعت اردو کے لئے دورے اس مہینے ادارہ

کی طرف سے چند اصحاب نے مختلف مقامات کے دورے کئے۔ اور لوگوں کو اردو کی تعلیم، مطالعہ خانوں اور شاخوں کے قیام اور ادارہ کے اردو امتحانات کی ترویج کے لئے آمادہ کیا۔ اس سلسلہ میں پہلے مولوی حفیظ صدیقی بی اس سی (رکن مجلس ادارت سب رس و مدیر سب رس معلومات) کا سفر آندھرا دیس خاص کر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے سفر کی تفصیلی رپورٹ مرتب کرلی ہے جو آئندہ شمارہ میں شایع ہوگی۔

مولوی شیخ رحیم الدین صاحب (نائب صدر شعبۂ طلبا ادارہ) نے بھی ظہیرآباد، چرک پلی اور بیدر اور اس کے اطراف واکناف کا میاب دورہ کیا۔ حمید الدین شاہد مہتمم مدیر سب رس نے صوبہ میدک کی طلبہ کانفرنس کے سلسلہ میں محبوب نگر کا سفر کیا کئی روز قیام کرکے وہاں کی شاخ ادارہ کا کام دیکھا اور صوبہ میدک کے مختلف مقامات میں ادارہ کی شاخوں کے قیام کی کارروائی کی۔

"ادارہ"

تاریخ گولکنڈہ

(مبصرین کی نظر میں)

مولفہ جناب عبد المجید صدیقی ایم اے ایل ایل بی استاذ تاریخ جامعۂ عثمانیہ

علاوہ مقدمہ کے کتاب پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ دکن کے اس حصہ میں سلطنت کا آغاز کیونکر ہوا، دوسرے حصے میں اس کے استحکام اور تیسرے میں اس کے عروج سے بحث کی گئی ہے چوتھا حصہ زوال سے متعلق ہے اور پانچویں میں گولکنڈہ کی تمدنی، سیاسی و علمی تاریخ بیان کی گئی ہے عمارات وسلاطین قطب شاہی کی گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں، کتاب بہت مفید اور تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری نگار مئی

یہ قطب شاہی دور حکومت کی مفصل تاریخ ہے جس کو مرتب نے پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، حصہ اول میں سلطنت کی تاسیس حصہ دوم میں سلطنت کا استحکام حصہ سوم میں سلطنت کا عروج حصہ چہارم میں سلطنت کا زوال حصہ پنجم میں گولکنڈہ کے تمدن پر سیر حاصل بحث موجودہ تحقیق و تلاش کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اور حصوں کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے تاریک سے تاریک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اردو زبان کی مروجہ تاریخوں میں اس تاریخ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس دور کی معاشرت اور حالات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، قطب شاہی دور حکومت کا ذکر تاریخ ہند لکھنے والوں نے بہت مختصر الفاظ میں کیا ہے۔ اس کی ایک وسیع تاریخ ہے جس کے ہر دور کے مد و جزر میں تمدن کی بڑی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں جس کا خوش گوار تمدن دو سو سال تلنگانے کے رہنے والوں کو گرویدہ کئے ہوئے تھا۔ قابل اور لایق مرتب نے اردو زبان میں گولکنڈہ کی جامع اور مفصل تاریخ لکھ کر بڑا احسان کیا ہے، امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے نہایت محظوظ ہوں گے۔

رہنما مرادآباد اپریل

جنابِ میکش کی خدمت میں

(شادی خانہ آبادی کی تقریب میں)

دہر میں دو پاک روحوں کا دوامی اتصال
زندگی کی کشمکش کو فتح کرنے کے لئے
جستجوئے منزلِ تکمیل میں دو ہمسفر
شوق کی پیچیدہ راہوں سے گزرنے کے لئے
دو نظر افروز جلووں کا مقدس اجتماع
غیرتِ مہر مبیں بن کر ابھرنے کے لئے
عقد کیا ہے! اک نیا احساسِ تکمیلِ حیات
آرزوؤں کے نئے سانچے میں تشکیلِ حیات

اختر

نذرِ میکش

(تقریبِ خانہ آبادی کی خوشی میں)

حیاتِ خانۂ شادی کا باب بن کے رہی
تلاشِ نغمۂ سکون رباب بن کے رہی
نگاہِ ساقی کی میکش نوازیاں مت پوچھ
کہ میکدے کی ہر اک شئے شراب بن کے رہی
تمام عمر محبت کے خواب دیکھے تھے
تمام عمر محبت کا خواب بن کے رہی
کسی کی لغزشِ پیہم ارے معاذ اللہ
کسی کی جنبشِ بندِ نقاب بن کے رہی
وہ ایک چیز جو پنہاں تھی چشمِ ساقی میں
سرورِ مستیٔ عہدِ شباب بن کے رہی
حیا کو نازِ مبارک، وفا کو عہدِ وفا
کہ پھر وفا ہی حیا کا جواب بن کے رہی
شرارِ نغمۂ ہستی کی جلوہ فرمائی
قرارِ شورشِ چنگ و رباب بن کے رہی
کلی کلی کو مبارک نظر پیامِ بہار
کلی کلی کی تمنا گلاب بن کے رہی

نظر

تصویر دیکھ کر

یہ نگاہِ حشر ساماں، یہ جوانی کی پھبن
ڈر رہا ہوں وقت سے پہلے قیامت آ نہ جائے

تیرے ہونٹوں کے تبسم نے اسے دہرا دیا
وہ فسانہ جو کہا جائے مگر سمجھا نہ جائے

تو نے کیوں لعنوی شکن زلفوں کو برہم کر دیا
میکدوں پر پھر کہیں ساون کی بدلی چھا نہ جائے

میری للچائی نگاہوں کو پریشاں دیکھ کر
مجھ کو یہ ڈر ہے تری تصویر بھی شرما نہ جائے

دل کی خواہش ہے کہ ساری عمر دیکھے جائیے
عقل کہتی ہے تری تصویر کو دیکھا نہ جائے

تو ہی فرما دے کہ پھر مجبور انساں کیا کرے!
زندگانی میں اگر جذبات سے کھیلا نہ جائے

بحرِ ہستی میں ہیں دھوکے کی چٹانیں زیرِ آب
تیری امیدوں کی کشتی بھی کہیں ٹکرا نہ جائے

میری آہِ گرم سے موجِ ہوا ہے بے قرار
تیرے نوٹو کی جبیں پر بھی پسینہ آ نہ جائے

مجھ کو آتا ہے ترس تیری جوانی دیکھ کر
تو بھی اس منزل میں میری طرح ٹھوکر کھا نہ جائے

ماہر القادری

کیفِ جاوید

آ گئے لو آ گئے وہ آ گئے
چاندنی بن کر فضا پر چھا گئے

جب بھی گزری رات کو بادِ نسیم
دل یہ سمجھا آ گئے وہ آ گئے

کاش مایوسی کی حد ہوتی کوئی
تیرے گلدستے بھی اب مرجھا گئے

میں کسی کا ہائے کیا شکوہ کروں
میرے ارماں مجھے تڑپا گئے

جانے کیا نظروں نے میری کہہ دیا
ہنس رہے تھے یا ابھی شرما گئے

گو رہے وہ زینتِ آغوشِ شب
دل یہی سمجھا کہ دھوکا کھا گئے

تم نہ آئے حسبِ وعدہ رات کو
ہنستے ہنستے پھول بھی کمھلا گئے

میں نے دامن میں لیا قیصری انھیں
اشک بن کر گود میں جو آ گئے

قیصری

رائج اردو کی اصلاح

(مراسلات کا جواب)

مئی کے سب رس میں دو مراسلے میرے مضمون "رائج اردو کی اصلاح" سے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مراسلہ جناب ماہر القادری صاحب کا ہے جو ایک معروف شاعر ہیں چنانچہ آپ کا اسلوب اور استدلال بھی شاعرانہ ہے۔ تحریر مرا بہ مشاعرہ کہ بردہ۔ جو بحث چھیڑی گئی ہے وہ تو ٹھنڈے دل سے غور چاہتی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "اگر یہ خبر صحیح ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ زبان کی مجلس مروج تحریری زبان کی اصلاح کر رہی ہے تو پھر بخدا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ مجھے اس شعبہ سے جو تعلق رہا ہے اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہاں یہ خبر صحیح ہے۔ ہم اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماتم کو ہم روک نہیں سکتے۔

میں نے اردو کو آریائی زبان کہا تھا۔ آپ نے شاید اس کو آریہ سماجی پڑھ لیا اور قرآن کا ذکر کرنا ضروری خیال فرمایا۔

دوسرا مراسلہ جناب عبدالقدوس صاحب کا ہے۔ آپ کی تحریر سنجیدہ اور مدلل ہے۔ ادارہ اختلاف کے باوجود آپ کی رائے کا احترام کرنے پر مجبور ہے۔ آپ جیسے اصحاب ہمارے صحیح مخاطب ہیں۔ ادارہ نے غیر ضروری فارسی اور عربی لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال کو چھوڑ دینا تجویز کیا ہے۔ یہ اجمال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ اردو زبان بہت سی زبانوں کے میل سے بنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سے لفظ ایک ہی معنوں کے آ گئے ہیں اور آتے جا رہے ہیں۔ اگر دو یا زیادہ لفظ تقریباً ہم معنی ہوں لیکن پورے پورے ہم معنی نہ ہوں اور ان میں معنوں کے کوئی پہلو مختلف بھی ہوں تو ایسے لفظ زبان کو ترقی یافتہ اور مال دار بناتے ہیں اور خیال کے اظہار میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً امیر، غنی اور مال دار یا دانا، عقل مند، اور ہوشیار کہ ان کے معنی قریب ہیں لیکن ایسے بالکل ایک نہیں کہ ایک دوسرے کا بدل ہوں۔ ان لفظوں کو کوئی غیر ضروری نہیں کہہ سکتا۔ چاہے وہ کسی زبان سے آئے ہوں۔ لیکن بعض لفظ ایسے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کا بدل ہوتے ہیں مثلاً درخت اور جھاڑ اسکول اور مدرسہ مسرت اور خوشی۔ ایسے لفظوں کا وجود دو عملی پیدا کرتا ہے اور نو سیکھ کو خصوصاً بہت دقت ہوتی ہے کہ دو میں سے آخر کس کو استعمال کرے۔ ان سے زبان دھنی نہیں بلکہ الٹا بوجھل اور مشکل بنی جا رہی ہے۔ اب اردو زبان کو پھر سے ٹکسالی بنانا ضروری ہو گیا ہے۔ ایسے لفظوں کی چھان بین ہوتی رہنی چاہئے۔ اور جن کے بالکل ہم معنی زیادہ رائج لفظ موجود ہوں ان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً دیکھنا چاہیے کہ "نیا" کے ہوتے "جدید" کی، اور "عورتیں" کے ہوتے "نسواں" کی کیا ضرورت ہے۔

ترکیبوں کا معاملہ لفظوں سے بہت زیادہ اہم ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اجنبی زبان کا لفظ تلفظ کے لحاظ سے جوں کا توں یا کچھ بدل کر ہماری زبان میں کھپ سکے۔ اور ضرورت سے لیا گیا ہو مثلاً ریل۔ یا بے ضرورت ہو لیکن بعد میں استعمال کی کثرت سے اپنے لیے جگہ پیدا کر لے مثلاً ممبر، کالج، ایڈیٹر۔ لیکن

ترکیب کا قاعدہ ہر زبان کا علیحدہ ہوتا ہے۔ اور قواعد زبان کی بنیاد ہیں۔ کوئی زبان آزاد اور مستقل ہو نہیں سکتی جب تک اس کے قواعد آزاد اور مستقل نہ ہوں۔ اس کی مثال آزاد اور غلام ملک کی ہے۔ آزاد ملک میں اول تو پردیسی کے آنے پر روک ٹوک ہوتی ہے۔ پھر آنے کے بعد اس کو رائج قانون کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے ساتھ اپنا ذاتی قانون لائے۔ غلام ملکوں میں بعض آزاد ملکوں کے باشندوں کے لئے خاص قانون بلکہ خاص عدالت ہوتی ہے۔ ملک آزاد ہوتے ہی سب سے پہلے اس ذلت کو دور کرتا ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ اگر اردو کو اپنا ایک مستقل وجود بنانا ہے تو اس کے قواعد علیحدہ ہونے چاہیں۔ اور ان قواعد کا اطلاق تمام لفظوں پر ہونا چاہیے چاہے وہ کسی زبان سے آتے ہوں۔ اگر ان لفظوں کو اردو میں رکھنا ہے تو ان سے اردو قواعد کی پابندی کرانی ہوگی۔ مثلاً اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ مؤنث کو "ان" یا "ین" لگانا ہے۔ تصویر کا لفظ یا تو اردو کا ہے یا نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو اردو میں استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہے تو اس کی جمع تصویریں ہوگی نہ کہ تصاویر۔ اس طرح اضافت کی علامت اردو میں 'کا' 'کی' 'کے' ہے۔ نتیجہ اور ظلم کو اگر اردو میں استعمال کرنا ہے تو ان کی اضافت "ظلم کا نتیجہ" ہوگی۔ بعض ترکیبوں کو بے شک مستثنیٰ کرنا ہوگا۔ ایسی ترکیبیں جو تلمیح یا استعارے وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں یا جو بمنزلہ ایک واحد لفظ کے سمجھی جاسکتی ہیں یا جو اصطلاح بن گئی ہیں مثلاً شیرِ خدا، صاحب دل، فنونِ لطیفہ ایسی ترکیبیں جائز رکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں جاری رکھا جاسکتا کہ اردو لکھتے وقت جہاں دو فارسی الاصل یا عربی الاصل لفظ نزدیک آئیں ان کے بیچ میں اردو کی بجائے 'و' اور کا کی کے کی بجائے زیر دھر دیا۔ مثلاً اخبار اور رسالے نہ لکھ کر اخبار و رسائل لکھنا یا فنون لطیفہ کے خزانے نہ لکھ کر خزائن فنون لطیفہ لکھنا۔ اور یہ اس کثرت اور دیدہ دلیری سے ہوتا ہے گویا کہ اردو میں حرف عطف دو ہیں "اور" اور "و" اور اضافت کی علامت کا کی کے کے علاوہ زیر بھی ہے۔ اگر ان کو باقاعدہ اردو میں شامل کرنا ہے تو بسم اللہ پھر لکھ کر پھر بھی لکھیے اور ڈھیر ترکیبوں کو بھی صحیح سمجھئے۔ ورنہ تہیہ کرلیا جائے کہ ایسی نئی نئی ترکیبیں نہیں بنائیں گے جو اردو کے قواعد سے میل نہیں کھاتیں۔

اب ظاہر ہے کہ سوال آسانی اور دشواری کا نہیں بلکہ دوعملی کے خاتمہ کا اور زبان کی آزادی استقلال اور غیرت کا ہے۔ عربی اور فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے مجھے چڑ ہوتی تو اتنے عربی اور فارسی لفظ اور ترکیبیں میری زبان پر نہ آتے لیکن بحث میری ذات سے نہیں۔ میں ایک اصول اور وہ بھی ایسا اصول پیش کر رہا ہوں جس کو ادارۂ ادبیات اردو نے طے کیا ہے۔ میری حیثیت صرف پیش کرنے والے کی ہے۔ اگر میں اس اصول کی خلاف ورزی کروں تو اس سے اصول کا غلط ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر یہ اصول آپ کو تسلیم ہے تو اس کی روشنی میں میری ناچیز تحریر پر مشق ناز فرمائی کیجائے۔ میری گردن تسلیم خم پائیے گا۔

شمارہ بے شک عربی نہیں۔ بس ہیچ مداں کو خود حیرت ہے کہ اسے کیسے عربی لکھ گیا۔ ممکن ہے کہ یہ نمبر سے زیادہ فصیح ہو لیکن اعتراض قایم ہے کہ نمبر کے ہوتے اس کو گڑھنے کی ضرورت کیا تھی۔ نمبر ہماری زبان میں اس قدر گھل مل گیا ہے کہ ان پڑھ سے ان پڑھ بھی اس کو سمجھتا ہے۔ اس کو نکالنا

گوشت سے ناخن کا نکالنا ہوگا۔ اور ایسے لفظ کہیں آپ کے ہمارے نکالے نکلتے ہیں۔ یونین اور یونیورسٹی اور ایڈیٹر تو نمبر سے ہزار گنا کم رواج پائے ہوئے تھے لیکن خود جامعۂ عثمانیہ کے طالب علم بزم اتحاد یا جامعہ یا مدیر نہیں کہتے۔ جب کہیں گے وہی یونین یونیورسٹی اور ایڈیٹر یہی حال عربی اور فارسی کے سہل اور رائج الفاظ کا ہے۔ اگر ان کا بدل ان سے زیادہ سہل اور رائج نہ ہو تو ان کو نکالنے کی کوشش کا بھی یہی انجام ہوگا۔ البتہ ان الفاظ کو رعایا بن کر رہنا چاہیے نہ کہ حاکم

خلاصہ یہ کہ غیر زبانوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کر کے اردو کو ایک مستقل زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اب رہا ادارہ کے دوسرے رکنوں کا یا میرا ذاتی عمل تو ہم کوشش تو ضرور کریں گے کہ جو کہیں اس پر خود عمل کر کے دکھائیں لیکن عادتیں پختہ ہو گئی ہیں چھوٹتے چھوٹیں گی۔

ضیاء الدین انصاری

غزل

گلوں سے پی رہا ہوں میں بغرض نہیں ہے جام سے
حلال جب ملے تو واسطہ مئے حرام سے

معیتیں مصیبتیں ہیں عیش نا تمام سے
"خمار مستقل" نہ لے۔ "نشاط کم قیام سے

بچو سیاستِ الم میں اُس ہجوم عام سے
جہاں ستم کو جانچنے لگے ہوں فہم خام سے

ہزار اہتمام سے ہزار احترام سے
چلا ہوں بت کدہ کی سمت مسجد الحرام سے

مری پرستشِ دلی میں چند خامیاں سہی
مگر جبینِ بندگی لگی ہوئی ہے کام سے

حلاوتِ الم کی تلخیاں بدل کے رہ گئیں
لب و زباں پہ کیف چھا رہا ہے تیر زہر نام سے

خزاں کی جھاڑیوں سے اُس طرف ہے کشتِ زعفراں
تو اپنی ابتدا تو کر گل کے اختتام سے

رواں دواں ہے زندگی کے ساتھ ساتھ عقل بھی
یہ نشہ سوار بے خبر ہے مصرفِ لگام سے

گرفتِ غم سے بھاگنا۔ گرفتِ غم کا سامنا
قفس کی تیلیوں میں آ رہا ہوں گل کے دام سے

افق کی سرخ بدلیوں پہ عکس ڈالتے ہیں وہ
مجسمے بنا رہی ہے رات مل کے شام سے

نثار ہو رہا ہے سادگی پہ حسنِ یاسمن
وہ آ رہے ہیں سیر کے لئے اس اہتمام سے

وہ پرسشِ نظر کہ دل دو نیم ہو کے رہ گیا
نظر کو یاد کر رہا ہوں۔ تیغ بے نیام سے

گزر رہے ہیں سیکڑوں تری نظر سے بے خبر
مرے لئے ہی بجلیاں سی گر رہی ہیں بام سے

عجب نہیں جو گفتگو کے بعد اور بے بڑھے
"پیام" تک تو آ چکا ہے سلسلہ "سلام" سے

محرکِ غزل ہے شاد مجھ کو اس کی ہر ادا
نہیں ہے میری شاعری شراب لالہ فام سے

شاد عارفی

غزل

دل مائلِ فریاد ہے معلوم نہیں کیوں
ناشاد سا ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں

ہر جہد کا، ہر جبر، ہر اقدام کا حاصل
اک فطرتِ آزاد ہے معلوم نہیں کیوں

میں شوق سراپا ہوں، محبت ہوں سراپا
مجھ پر تری بیداد ہے معلوم نہیں کیوں

وہ جنس وفا کوئی بھی خواہاں نہیں جس کا
سرمایۂ ایجاد ہے معلوم نہیں کیوں

انسان جسے "احسنِ تقویم" کہا ہے
مجموعۂ اضداد ہے معلوم نہیں کیوں

دنیائے محبت کی تباہی کا خلاصہ
اک لمحۂ برباد ہے معلوم نہیں کیوں

فرہاد کی محنت کا صلہ وائے مقدّر
خونِ سرِ فرہاد ہے معلوم نہیں کیوں

آ دیکھ، تری یاد میں اک بزمِ تماشا
ہر "اشکِ جگر زاد" ہے معلوم نہیں کیوں

جو نالہ گزرتا تھا سرِ عرش سے اک دن
وہ زیرِ لبِ فریاد ہے معلوم نہیں کیوں

برباد ہوا تھا میں تری راہِ طلب میں
اب خاک بھی برباد ہے معلوم نہیں کیوں

ہے ہے وہ سنا کر مجھے اک شوخ کا کہنا
"دیکھو جسے ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں"

سب کچھ تو اثر بھول گیا جوشِ جنوں میں
کہنا ترا بس یاد ہے "معلوم نہیں، کیوں ؟!"

مرزا جعفر علیخاں اثر

نذر دکن تنقید کی آگ میں

کوئی صاحب ہیں ـــــ مسٹر جعفر حسین۔ جنھوں نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جو جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کے رسالۂ اردو میں شایع ہوا ہے۔ صاحب مضمون کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر"۔ "پی۔ ایچ ڈی" اور "استاد عمرانیات" کے سابقے اور لاحقے دیکھ کر خیال ہوا تھا کہ یہ مضمون علم و ادب کی چیز ہوگا مگر پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میدان میں موصوف کچھ ایسے ہی "ڈاکٹر" ہیں جیسے کوئی کمپاؤنڈر حسن اتفاق سے ڈاکٹر بن بیٹھے۔ وجہ یہ ہے کہ موصوف تنقید کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہیں معلوم ہوتے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دنیائے علم و ادب میں "آگ" لگا کے تنقید کو تنقیص نہ بناتے۔ ہم سے پوچھئے تو یہ "آگ" ان کے دل کی آگ ہے۔ جو علمی یا ادبی شئے نہیں۔ نری ذاتی چیز ہے۔ جسے رسالۂ اردو کے ممتاز صفحات میں منظر عام پر نہیں آنا چاہئے تھا۔ موصوف نے زبردستی یہ آگ کیوں بھڑکائی ایک دلچسپ سوال ضرور ہے۔ جسے ہم سے زیادہ ان کے سوانح نگار صاف کریں گے!

مضمون نگار صاحب کی تنقیص، تو یہ! تنقید خواتین دکن کے ان مختلف مضامین پر ہے۔ جو انھوں نے رسالۂ "سب رس" کے لئے لکھے تھے۔ اور جو "ادارۂ ادبیات" سے ایک جگہ شایع ہوئے ہیں۔ چند مختلف مضامین کا ایک جگہ شایع ہونا ایک مستقل تصنیف کی خصائص اور درجہ نہیں رکھتا۔ وہ ایک ایسا گلدستہ ہوتا ہے جس کی ساخت میں گوناگون پھول پتیوں سے کام لیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے وہ بجائے خود ایک چیز ہوتا ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا بھی چاہئے۔ مگر مضمون نگار صاحب نے اس پر جس شد و مد سے اظہار خیال فرمایا وہ ایک غیر ضروری اپچ بن کر رہ گیا ہے۔ جس کے ہاتھوں وہ "عمرانیات" کے "پی ایچ ڈی" کے علاوہ کسی ادبیات کے بھی سند یافتہ بن گئے ہیں!

تو ہاں، جیسا اوپر ظاہر کیا گیا۔ "نذر دکن" میں خواتین دکن کے مختلف مضامین ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ چیز ہے کہ حیدرآباد میں تعلیم نسواں ابھی ابتدائی دور میں ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں صاحب مضمون جیسے "کوڑ مغز"۔ "عربی و فارسی سے ناواقف"۔ اور "گنوار اور جاہل" (اپنی یہ تصویر موصوف نے خود اتاری ہے!) مرد کار ہوں۔ وہاں کی خواتین اپنے ابتدائی ذوق علم و ادب میں کس طرح دفعتہً "براونٹی بہنیں" بن جائیں گی۔ یہ چیز نادانستہ طور پر خود مضمون نگار صاحب کے ذہن میں بھی آتی ہے۔ کیونکہ بزعم خود وہ بھی خواتین دکن کو دنیائے ادب میں "مشق" کرتے رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ "نذر دکن" بھی تو ایک مشق ہی ہے جسے ملک کی ایک خاتون نے مرتب و پیش کیا ہے۔ یہ کس نے کہا کہ یہ مجموعہ ادب اردو کا شہ کار ہے۔ جس پر مضمون نگار صاحب اس قدر آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو انھیں خود محسوس ہوگا کہ ایک چیز ہے۔ (Appreciation) اور ایک چیز ہے (Crticism) مرتب "نذر دکن" نے جب اپنی ادبی بہنوں کے مضامین ملک کے سامنے پیش کئے تو صاف طور پر کہہ دیا کہ یہ مجموعہ خواتین دکن کی "پہلی عملی" کوشش ہے۔ مگر مضمون نگار صاحب کو اتنا غصہ ہے کہ یہ

اعتراض انھیں سجھائی نہیں دیتا۔ پھر مرتب اس علمی کوشش پر تنقید نہیں کر رہی تھیں بلکہ اس کا (Appreciation) لکھ رہی تھیں۔ جیسے موصوف اپنی "کوڑ مغزی" سے تنقید سمجھ بیٹھے۔ اسطرح اگر مرتب نے تعارف کتاب میں اپنی ادبی بہنوں کو وسعت قلب سے سراہا تو کیا ایسا گناہ کیا؟ دیکھئے مہربان! چونکہ آپ نے خود اپنی زبان سے اپنی "جہالت" کا اعتراف فرمایا ہے۔ اس لئے آپ کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ادب آئینۂ زندگی ہوتا ہے۔ اور گو ہندوستان کی نسوانی زندگی آج ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے پھر بھی اپنی نسلی خصوصیات کے باعث مروت، انکسار، اور تواضع کی ایک نمایاں شئے ہے۔ مرتب کتاب ایک ہندی خاتون ہیں۔ وہ جس طرح اپنی محفلوں میں دوسری ہمجولیوں سے مروت، انکسار، اور تواضع سے ملتی جلتی ہیں۔ ایک کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے بھی نظر آتا وہ وہی رہیں گی جو وہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "نذر دکن" کے تعارف میں ان کا (Appreciation) ایک رنگ لئے ہوئے ہے جو ان کی شرافتِ نفس کی دلیل ہے۔ گر آپ اپنی نفسانیت کی وجہ سے اس کو "خوشامد"۔ "چاپلوسی" اور نہ معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

رہا صاحب مضمون کا یہ اعتراض کہ محبوبیہ گرلز ہائی اسکول کی بعض طالبات نے اپنے ناموں میں بدعت کی ہے۔ اور یہ اُن کی طفلانہ حرکت ہے تو یہ بات خود موصوف کی علمیت پر حرفِ آخر ہے۔ معلوم ہوتا ہے مضمون نگار صاحب یہ نام دیکھ کر شاید اس وجہ سے چیں بجبیں ہو گئے کہ اسم

معرفہ میں انھیں کوئی معنی نظر نہیں آتے! نہ جاننا بھی مزے کی چیز ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ مزے دار یہ ہے کہ انسان کچھ نہ جانے۔ پھر بھی یہ سمجھے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے! اس معاملہ میں موصوف بھی ایسے ہی ذہنی مغالطہ میں ہیں۔ مثلاً ان کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ "کبریٰ اقبال، انوار اللہ" جیسے نام نہ قابلِ قدر ہیں۔ نہ مقبول ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ مغرب زدگی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ قبول اور نا قبول کا فیصلہ زمانہ کیا کرتا ہے! یہ ضروری نہیں کہ "عمرانیات" کے ایک "پی۔ ایچ ڈی" کی سمجھ میں ایک بات نہ آئے اور اسے مقبول نہ ہو تو وہ بات ہی سرے سے مہمل بن جائے۔ یا سارا زمانہ اس کی قدر نہ کرے۔ یہاں ہم کیا یہ پوچھ سکتے ہیں کہ خود صاحب مضمون کا نام "جعفر حسین" کیسے "مقبول" اور "قابلِ قدر" ٹھیرا؟ حالانکہ ان کا نام صرف "جعفر" یا "حسین" بھی ہو سکتا تھا۔ فرمائیے کیا یہ بھی مغرب زدگی ہے! مشفق!

سنئے بات یہ ہے کہ عربوں کا طریقہ ہے کہ انساب کی حفاظت و نمائندگی کے لئے وہ ایسے نام رکھتے ہیں۔ ثبوت میں خود آپ کا نام اس طریقے کی بے معنی تقلید ہے۔ حالانکہ یہ نام عرب میں جعفر بن حسین ہوتا جس سے نسب کا بھی پتہ چلتا۔ گو آج یہاں "جعفر حسین" سے یہ بات لاپتہ ہے! اس رواج کو دیکھتے یہ بھی ایک کوشش ہے جو مستورات اپنے ناموں میں اپنے افرادِ خاندانی کی طرف نسبت دیتی ہیں۔ اس لئے باور کیجئے کہ یہ مغرب زدگی نہیں! دوسرے مدارس وغیرہ میں عموماً ایک ہی نام کی کئی لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انھیں ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے بھی ایسا ہوتا ہے۔ یوں یہ نام اکثر

ادبی دنیا میں بھی آجاتے ہیں۔ لیکن صاحبِ مضمون ان پر معترض ہیں۔ اور اپنی دانست میں یہ سمجھ کر خوش ہیں کہ انھوں نے کوئی بڑی "ریسرچ" فرمائی ہے!

مضمون نگار صاحب نے کچھ اسی قبیل کے اور بھی اعتراض فرمائے ہیں کہ مضامین میں عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ ہیں۔ ترکیبیں بھونڈی ہیں۔ مضامین کا کوئی معیار نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس سلسلہ میں وہ ایک جگہ حالیؔ مرحوم پر بھی منہ آئے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ایسے اعتراضات ان سے متعلق ہی نہیں۔ انھیں کرنے ہی نہیں چاہیئے تھے۔ وہ "عمرانیات" کے آدمی ہیں۔ ادب دوسری چیز ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں ان کی یہ بھول قابلِ معافی ہے۔

امید ہے کہ خواتینِ دکن بھی انھیں معذور خیال کر کے درگزر فرمائیں گی۔ بات یہ ہے کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی یہ اعتراض فرما دیئے ورنہ انھیں خود اپنی کم سوادی کا اعتراف ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جواب دینے کا بھی کوئی موقع نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بجائے جواب دینے کے اخلاقاً انھیں یہ مشورہ دے دینا زیادہ مفید ہوگا کہ چونکہ انھیں تنقید و تبصرہ کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے وہ کچھ کتابیں اصولِ تنقید پر ملاحظہ فرمائیں تاکہ نظر میں وسعت اور قلب میں حوصلہ مندی پیدا ہو۔ کیونکہ تنقید بڑے ظرف کی چیز ہے۔ پھر ہم یقین دلاتے ہیں کہ اپنی "کوڑ مغزی" کے باوصف ایک دن نام خدا وہ کچھ بن جائیں گے! مگر اس دوران میں انھیں یہ مقولہ بھی عنوانِ زندگی بنانا ہوگا کہ:۔

ایاز قدرِ خود بشناس!

آخر میں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ چونکہ صاحبِ مضمون نے اپنا مضمون بارہ تیرہ صفحات پر پھیلا کر بھی باقی رکھا ہے۔ اس لئے ہم نے بھی یہ چند سطر ابھی بطور "مشتے نمونہ" پیش کی ہیں۔ پورا مضمون شایع ہو لے تو انشاء اللہ پوری پوری خدمت کی جائے گی جس کا ابھی سے وعدہ!! ...

مخلص

خواب گاہ

مرحبا! اے دوست دن کے خاتمہ پر میری آغوش میں تمھاری آمد موجب راحت ہوگی۔ میری اس چار دیواری میں تمھاری تفریح کے لئے سامان موجود ہے۔ آؤ مجھ سے بغل گیر ہو جاؤ۔

یہاں اپنے تفکرات سے آزاد رہو۔ ان کو نکال پھینک کر جیسے سانپ کینچلی پھینک دیتا ہے اور صبح صادق تک آرام و سلامتی کی چھاؤں میں چین مناؤ

دیکھو! خواب شیریں کا کیا بے بہا پر یہ تمھارے لئے فراہم کیا گیا ہے۔ اس خواب گاہ کا خمار آلود سماں تمام رات خوش بودار پھولوں کی طرح تم کو مست و بےخود بنا دے گا۔ کبھی تمھارے سرہانے منڈلائے اور کبھی تمھارے خوابیدہ آرام قلب کو گرمائے گا۔۔۔۔۔۔

تم اس کشتی خواب میں ساحل امن کو سدھارو۔ اے معزز مہمان۔ اے تن خستہ کی جان۔ آ۔۔۔۔۔ جلد آ۔۔۔ دن ختم ہو چکا۔ تجھے خوشامدید کہنے کو آرام و سکون منتظر ہیں۔

مطیع الرسول

ہمارے ملک کی قومی زبان

جو صاحبانِ علم ہیں اب ترجمانِ علم واقف ہیں ان تمام سے یہ رازدانِ علم
کس ملک میں نہیں ہے گہر ریز کانِ علم ضوپاش ہر دیار میں ہیں صاحبانِ علم

ہے قاہرہ کی شرط نہ لندن کی قید ہے
بحر العلوم راس کی مانند زید ہے

میں مانتا ہوں علم ہے اللہ کی صفت ہے اس کی ہر صفت سی ضیا گیر ہر جہت
مختص اک اپنی قوم سے کرکے یہ کرمت انفصال مطلقہ کی کروں کیسے منقصت

ہر قوم بہرہ یاب ہے فیضانِ علم سے
گوہر بکف نکلتے ہیں سب کانِ علم سے

انگریز کہہ رہا ہے کہ میں ہوں جہانِ علم دعویٰ عرب کو ہی کہ بڑھی مجھ سے شانِ علم
کہتا ہے پارسی کہ مجھی سے ہے آنِ علم ہر قوم کی زبان ہے گویا زبانِ علم

بے شک متاعِ علم ہر اچھی زبان ہے
اردو ہمارے ملک کی قومی زبان ہے

فیض اس زبانِ مشترکہ کا ہے چار سُو ممتاز اس سے گلشن دہلی کی ہے نمو
پنجاب کی بہار اسی سے ہے سرخرو باغ دکن میں اس کا اثر جانِ رنگ و بو

سی۔ پی سے ہے اس کو نہ یوپی سے بیر ہو
اردو سرورِ جان و دلِ نکتہ سنج ہے

علی منظور

ز۔خ۔ش اور اُن کی شاعری

محترمہ زاہدہ خاتون شروانیہ (ز۔خ۔ش مرحومہ)

ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھیں جن پر طبقۂ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ دنیائے ادب کی یہ نوزائیدہ کلی بن کھلے ہی مرجھا گئی اور وہ بن بیاہی ابتدائے شباب ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ان کی جوانامرگ نے اردو علم و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اتنی کم عمری میں ان کی حیرت انگیز قادر الکلامی طبقۂ نسواں کے لئے باعث صد افتخار تھی۔ ان کی نظمیں مستقبل کے لئے ایک بہت بڑی شاعرہ کا پتہ دیتی تھیں۔ اے وائے، یہ بلبل اپنا درد بھرا لیکن سریلا راگ الاپ ہی رہی تھی کہ صیادِ اجل کے ایک ہی تیر نے چمن کی رونق چھین لی۔ حسرت رہ گئی کہ اسے کچھ دیر اور چہچہاتا دیکھتے، لیکن فانی انسان کی ہر خواہش بر نہیں آتی۔

۱۹۲۲ء میں ان کی وفات پر ادیبِ جلیل سید سجاد حیدر یلدرم نے جو دلخراش نالے بلند کئے ہیں، اس کا ایک ایک لفظ دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔

"وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفاں پاش نغمے قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے، یکایک خاموش ہوگئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں، مگر عندلیب ہمیشہ کے لئے ساکت۔"

"وہ حقیقت طراز گر شیریں آواز سراپردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز سوگوار ہیں کہ ان کی مشاطہ ان کو دل آویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی۔

"وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس ہی میں جی اور اس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اس کے صحن خانہ پر حسرت بار رہا، اس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دستِ انساں کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا۔ لیکن خود اس کے قلب منور نے ایک شمع روشن کی، جس نے اسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمع تخیل!

"وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں "خاک نشیں ز۔خ۔ش" کہا کی، آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے۔

"خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل بود"

باوجود جستجوئے بسیار و تلاش بلیغ مرحومہ کے تفصیلی حالات زندگی ہمیں دستیاب نہ ہوسکے۔ تعجب اور افسوس ہے کہ اس دور کے تمام تذکرے خصوصاً خواتین کے تذکرے اردو کی سب سے بڑی شاعرہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ اور بھی زیادہ قابلِ افسوس ہے۔ یہ امر کہ اس بے مثل شاعرہ کے عزیز اقربا اور اس کے جاننے پہچاننے والوں میں سے کسی نے بھی اس طرف اب تک کوئی توجہ نہیں کی۔ خود مرحومہ نے بھی کبھی اپنا پورا نام ظاہر نہیں کیا، اور شہرت طلبی سے ہمیشہ گریزاں رہیں۔ "خاک نشیں، الفقیرۃ الفانیہ ز۔خ۔ش (علی گڈھی)" کے سوا انھوں نے کچھ نہ لکھا۔ اگرچہ وہ نزہت تخلص کیا کرتی تھیں، اور اسے اپنے کلام میں اکثر جگہ باندھا بھی ہے، لیکن اشاعتی کلام میں اس کو بدل کر ز۔خ کر دیا کرتی تھیں ؎

نزہت بے نوا ہے ہدیہ بدست ؂ ہو قبولِ جناب سلطانی

حمد میں ایک شعر ہے جس میں نزہت کو ز۔خ کر دیا ہے۔ ع

ہر وقت ہے لب زن رخ پہ یہ ہے اے بار خدا اندکو ترا

مرحومہ، نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکم پور کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ نواب صاحب مرحوم کے نام نامی سے کون محب وطن ہے جو واقف نہیں۔ قومی معاملات اور تعلیم سے ان کی گہری دلچسپی نہ صرف علی گڈھ بلکہ سارے ہندوستان میں شہرت رکھتی تھی۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور اسلام کے سچے شیدائی تھے۔ لائق بیٹی نے اپنے فاضل باپ سے یہی اعلیٰ جذبات اور پاک تخیلات ورثے میں پائے اور ان کو اشعار کے بے مثل دلنشیں سانچے میں ڈھال کر حقوق نسواں کی حمایت اور ان کی اصلاح کا پورا پورا حق ادا کیا۔

مرحومہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئیں اور بچپن ہی میں عزیز و شفیق ماں سے جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ لیکن اولاد پر جان چھڑکنے والے باپ نے اس طرح دل داری اور دلدہی کی کہ انھیں اس صدمہ کا احساس نہ ہونے پایا۔ چنانچہ خود انھوں نے اپنی ایک نظم (نثر کا شجرہ خطاب) میں اس کا اظہار کیا ہے؎

تھی نظر سے دور اک معصومہ، اک حور جناں
میں سمجھتی تھی کہ میرا باپ ہی ہے میری ماں

تعلیم نسواں کے سچے حامی باپ نے خود اپنی بیٹی کی تعلیم تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایرانی معلمہ فرخندہ بیگم صاحبہ خواہر آغا کمال الدین سنجر ان کی استانی اور اتالیق تھیں جنھوں نے مرحومہ کی فارسی کی ابتدا اور تکمیل کی۔ وہ خود بھی بلند پایہ شاعرہ تھیں اور ان کے بھائی استاد سنجر فارسی کے مشہور قادر الکلام شاعر تھے۔ کلام اللہ، حدیث، تفسیر اور دیگر علوم دینی کی مرحومہ کو نہایت باقاعدہ تعلیم دی گئی تھی۔ عربی سے بھی وہ بہ خوبی واقف تھیں۔ فارسی میں ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ان کا فارسی کلام ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں اور احادیث نبوی گویا ان کے کلام کا زیور ہیں۔

اردو کی خوش قسمتی ہے کہ مرحومہ کی متفرق نظموں کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں "آئینۂ حرم" کے نام سے پہلی بار ۱۹۲۶ء میں دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شایع ہوا۔ پھر چند سال کی قلیل مدت کے اندر ہی ۱۹۲۷ء میں اس کا دوسرا اڈیشن نکلا۔ اردو دنیائے صحافت سے جو حضرات واقف ہیں، بخوبی جانتے ہیں کہ کسی شاعر کے مجموعۂ کلام کا اتنی قلیل مدت میں دو بار چھپ جانا، اس کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کی کتنی زبردست دلیل ہے۔

آئینۂ حرم میں مرحومہ کی کل گیارہ نظمیں شامل ہیں جن میں سے ایک فارسی ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اور کئی نظمیں راقمہ کی نظر سے گزری ہیں۔ ایک تو اردو کا وہ مشہور سپاسنامہ ہے جو اردو کے محسن اعظم اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی بارگاہ میں جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ ان کی دو نظمیں "جوش محبت" اور "تحفۂ درویش" سالنامہ کاروان ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئیں۔ "تہذیب نسواں" "شباب اردو" "ہمایوں" "استانی" اور دوسرے رسائل میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے، راقمہ بشرط فرصت ان پر بھی اظہار خیال کا ارادہ رکھتی ہے۔

زاہدہ خاتون کی شاعری پیشہ ورانہ یا رسمی شاعری نہیں اور نہ محض تفنن طبع کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعری درحقیقت ایک حساس دل کی پکار، ایک دردمند قلب فگار کی دھڑکن اور ایک چشم گریاں کے ٹپکتے ہوئے آنسو ہیں، درد و اضطراب کے وہ بے اختیار نالے اور آہیں ہیں جو زبان قلم سے نکل کر شعر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انھوں نے غزل کے خارزار میدان سے اپنا دامن بچائے رکھا اور فضول تک بندی اور قافیہ پیمائی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔ حب نبوی، میاں بیوی کی محبت، تعلیم نسواں، حقوق نسواں، اصلاح نسواں اور کیف سرمدی کے متعلق اپنے گہربار تخیل سے شعر کے موتی صفحۂ قرطاس پر بکھیرے ہیں۔ ان کا کلام

کے لئے وہ کسی تحسین اور ستائش کی طالب نہ تھیں، چنانچہ بعض تقاریب کے موقع پر ان کا نام و نشان ظاہر کئے بغیر ہی پڑھی گئیں۔

"آئینۂ حرم" میں بعض نظموں پر تشریحی نوٹ ہیں، جو بجائے خود اردو نثر نگاری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ نثر میں بھی وہ ایک طرز خاص اور ایک اچھوتے اسلوب بیان کی مالک تھیں۔

اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے والد محترم کے نام پر کیا ہے قطع نظر اس خلوص و محبت اور درد اور تڑپ کے جو اس کے ایک ایک لفظ سے ہویدا ہے، طرز ادا اور طرز بیان کی لطافت ملاحظہ ہو

"یہ آنسوؤں کی لڑی، یہ درد کی تڑپ، یہ سوزش کی آہ، ہاں، ایک فریادی کا استرحام، ایک ناشاد کی نوحہ گری ایک زخمی کی چیخ، یعنی کتاب "آئینۂ حرم" اسلام کے اس سچے شیدائی تعلیم نسواں کے اس زبردست حامی کے نام نامی سے منسوب و معنون کی جاتی ہے جس کا فیضان تربیت اس مجموعۂ پریشان خیال کی تشوید و تنشید کا معنوی سبب ہے اور جس کی قوی محبت وراثتی اثر و نسبی خصوصیت کے طور پر خاکسار مصنفہ کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے یا دوسرے لفظوں میں "کل شیئ یرجع الیٰ اصلہ" کے عام اصول کی متابعت میں دریا کے سامنے قطرہ، خورشید کے حضور ذرہ، گلشن کے پاس پھول "گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ" کا فخریہ کلمہ پڑھتے ہوئے اپنی سعی بے حقیقت کو ہدیتاً پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ میرے جان سے زیادہ پیارے والد ماجد دام ظلہٗ العالیٰ اس نذر محقر کو خوشی کے ساتھ شرف قبولیت بخشیں گے ؎

ہمتم بدرقۂ راہ کن، اے طائر قدس
کہ دراز است رہِ منزل و من نو سفرم!"

اس مجموعہ میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے ان کی پہلی نظم "تقدیم تہنیت لندم" سنہ ۱۹۱۴ء کی نظم کردہ ہے اور آخری "ترادہ" سنہ ۱۹۲۰ء کی گویا اس طرح یہ مجموعہ ان کی شعر گوئی اور نغمہ سنجی کی چھ سالہ مختصر مدت تک حاوی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال پہلے مرحومہ کی شاعری شروع ہو چکی تھی، افسوس ہے یہاں اس کی ابتداء کے متعلق صحیح زمانہ کی یادداشت ہمارے پاس موجود نہیں۔

زاہدہ خاتون کی رگ رگ میں سچی اسلامیت سرایت کئے ہوئے تھی۔ صحیح اسلامی تعلیمات سے ان کا دل منور تھا، اور اس نور سے وہ اپنی دوسری بے کس اور جاہل بہنوں کے قلوب کو روشن کرنا چاہتی تھیں۔ وہ ان عقائد باطلہ کی سخت مخالف تھیں جو قدیم رسم و رواج کے پابند جاہلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ "آئینۂ حرم" کے عنوان سے انھوں نے جو طویل مسدس لکھا ہے جب اسلام حقوق نسواں کی پاسداری، اور اصلاح نسواں کا بہترین آئینہ ہے۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو، طبقۂ نسواں کی زبوں حالی اور بے زبانی کا نقشہ کھینچا ہے، قاری کو بے اختیار اقبال کے شکوہ کی یاد دلاتا ہے۔

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر　　لب چوپستہ لب شہد فشاں سے بہتر
صبر شیون سے شکیبائی فغاں سے بہتر　　دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شئے کے لئے حد ہے معین لوگو
ضابطِ درد ہو کب تک جگر زن لوگو

پھر آگے طبقۂ نسواں کی بے کسی اور بے بسی کی کیسی سچی تصویر کھینچی ہے ؎

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم　　خستۂ جور ہیں ہم کشتۂ بے داد ہیں ہم
تختۂ مشق سناں بازیٔ صیاد ہیں ہم　　آدمی کا ہے کو ہیں پیکر فولاد ہیں ہم
ہائے یہ ظلم کہ بے جرم چلائیں خنجر
اس پہ یہ حکم کہ فریاد نہ آئے لب پر

ہم کو کیا علم کہ کیا شئے ہے مزا دنیا کا　　نہ یہ معلوم ہے خوشی نام ہے کس چڑیا کا

آہ بے جرم ہمیں صنف قوی نے ناکا تختۂ مشق بنایا ستم بے جا کا
آج انساں کے فضائل سے ہیں دونوں محروم
ایک تفسیر ''جہول'' ایک تفسیر ''ظلوم''

بار ہیں دہر پہ ناخواستہ مہماں کی طرح پھر گرا کی طرح۔ برف زمستاں کی طرح
وحشی و جاہل و بے علم ہیں حیواں کی طرح دائم الحبس ہیں ہم قاتل انساں کی طرح
بے حس و حرکت۔ بے بس و سرافگندہ
بچہ در دستِ جواں۔ مردہ بدستِ زندہ

اس سے تشبیہ نہ دو بےکسی نسواں کو رخصت سیر چراگاہ ہے جب حیواں کو
ہے قفس میں بھی یہ سکھ بلبل خوش الحاں کو یاد کر سکتی ہے رو رو کے گل خنداں کو
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

پھر ان حضرات کرام کی خبر لی ہے جو اپنے مطلب کے لئے قرآن کریم کی اس آیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (الآیہ) کے لفظ "قوّام" کا ترجمہ "آقا" "سرکار" کرتے ہیں ؎

حرفِ عزت سے نہیں کان ہمارے آگاہ سرنوشت رخ نسواں ہے یہی ذلت کی نگاہ
کہتے ہیں اپنے تفوق کا ہے قرآں گواہ مصحفِ رب پہ یہ بہتان عیاذاً باللہ
کون یہ کہہ کے بنے کشتنی و قابل دار
ترجمہ کیجئے نہ "قوّام" کا آقا۔ سرکار

اسی مسدس میں انھوں نے آگے چل کر پوری طرح نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے کہ ایک جاہلہ' دنیا اور دین کے کاروبار تو رہے ایک طرف' خود امور خانہ داری ہی کے لئے کس قدر ناموزوں ہوتی ہے۔ کس طرح اس کا گھر گندہ اور ناپاک رہتا ہے۔ کس طرح اس کے بچے حسن تربیت سے محروم رہتے ہیں اور کس طرح ایسا گھر مختلف امراض کا آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ جب تک بیوی تعلیم یافتہ نہ ہو' یہ ممکن نہیں کہ وہ قومی معاملات میں میاں کے ساتھ ہمدردی رکھے' اور ہو سکے تو ان کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے ؎

ماتم ترکی و ایراں ہے وہاں جا ہو رہی یاں بچھے چھیتڑے اور شغل ہے بخیہ گری
شیر ہے معرکہ آرا ہے وہاں مرد جری دیکھ کر غوک کو یاں "ہائے مری ہائے مری"
شوق طیارے میں اڑنے کا شب و روز وہاں
ریل کے نام سے اٹھتا ہے یہاں دل میں دھواں

پھر اسلام کی شوکت رفتہ کی یاد دلائی ہے کہ کس طرح اس عہد میں مسلمان سربلند و مفتخر تھے' اور آج یہ دن ہے کہ نکبت و بدبختی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اس کا سبب' وہ حقوق نسواں کا غصب کر لینا' اور نور علم سے انھیں محروم کر دینا سمجھتی ہیں۔ وہ آزادی نسواں اور جائز حقوق نسواں کا مطالبہ کرتی ہیں اور سمجھاتی ہیں کہ اسی راستے سے ہماری نجات ہو سکتی ہے۔ آزادی نسواں سے ان کی مراد ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ پردہ سے بے نیازی حاصل کر لی جائے' یا عورتوں کو تھیٹر یا سینما بازی کی آزادی مل جائے ؎

شوق نظارۂ تھیٹر و بازار نہیں مقصد حریت علم یہ زنہار نہیں
حکم برداری شوہر سے بھی انکار نہیں بخدا پردہ دری کی بھی روادار نہیں
ہے حیا بادشہ علم کے سر کا افسر
قول مشہور ہے "العلم حجاب الاکبر"

نہ آزادی نسواں سے ان کی مراد مردوں سے حقارت یا نفرت کا برتاؤ ہے ؎

آئے گا ہم کو نہ اس فرقے سے نفرت کا خیال نور احمد نے کیا جس میں نزول اجلال
بے وفائی کے تصور سے تنفر ہے کمال یہ تو با ایں ہمہ بیداد و تظلم ہے محال
دل پاکم بہ لب پر گلہ۔ اے مرد رشید
گرگ آلودہ دہانے است کہ یوسف ندرید

حقوق نسواں سے مراد ان کے یہاں جائز اسلامی حقوق جائز اسلامی تعلیم اور جائز اسلامی آزادی ہے، جسے جاہل ظالم اور ناسمجھ مردوں نے خود اسلام کا نام لے لے کر غصب کرلیا ہے۔

"عالم نسواں میں انقلاب" کے عنوان کے تحت جو نظم لکھی ہے اس میں بتایا ہے کہ خود حضرت پیغمبر اسلام (امی وابی فداک) کو عورتوں کا کتنا پاس و لحاظ تھا، ان کی بھلائی اور بہتری کا آپ کتنا خیال فرماتے تھے۔ ضرورت ہے کہ شرع محمدی کے پیرو، خود اپنے آقائے دو جہاں کے اتباع میں عورتوں کی تعلیم اور ان کی حریت کی طرف متوجہ ہوں۔ آخر میں مردوں پر ایک ہلکا سا طنز بھی کیا ہے ؎

اس بیاں کو "شرع کی تعریف" کہنا ہے غلط
جیسے یہ کہنا کہ "بے جانوں" کا یہ اعلان تھا

صوبۂ پنجاب میں لڑکیوں کو محروم الارث کرنے کا جو شریعت سوز رواج قائم تھا، اس کو ۱۹۱۵ء میں قانونی استحکام بخشنے کی تجویز تھی، مرحومہ نے اخبارات کے ذریعہ مردوں کو غیرت دلائی ؎

ایسا بھی کیا حیات دو روزہ پہ پھولنا ہر دل میں کچھ تو دغدغۂ ساعت جزا
ہم بے زبان پردہ نشینوں کی سوز آہ اے مسلمو! خدا کے غضب سے ڈرو ذرا
کہتے تھے تم تو "مرد ہیں عورات کے وکیل" سچے ہو گر تو حق وکالت کرو ادا
اک فرقۂ ستم زدہ کے واسطے بھی آج سرکار کے حضور میں جا کر ہو لب کشا
روکا تھا ہم کو حق طلبی سے اسی لئے اس ستبدا کی ایسی غم آگیں خبر بھی کیا
دیکھو شکست شرع پہ اچھا نہیں سکوت
نازل نہ ہو کہیں غضب حیّ لا یموت

مسلم لیڈیز کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۶ء کے لئے جو نظم انھوں نے لکھی تھی اس کا آخری شعر ہے ؎

ہمیں یارب حمیت دے۔ رگ غیرت میں حرکت دے
عمل کا شوق و رغبت دے۔ عمل میں خیر و برکت دے

اسی لیڈیز کانفرنس کے ایک اور اجلاس میں انھوں نے "مہذب" بہنوں کی خوب خبر لی ہے جو تہذیب کے معنی سمجھتی ہیں شعائر اسلام کا ترک کر دینا ؎

بہنو! خدا کے واسطے اٹھو نماز کو رگڑو در خدا پہ جبین نیاز کو
ہیہات! اپنے ہاتھ سے کرتی ہو بند تم روزے نہ رکھ کے خلد کے دروا باز کو
برقعہ بہن کے شوق سے نکلو ضرور تا سمجھو غنی ثبوت سے اس کے جواز کو
مل جائے گا خدا انھیں شوہر کی چاہ سے سمجھو ذرا حقیقت عشق مجاز کو
قصے کہو نہ طفل سے ابطال غرب کے از بر کراؤ سیرت شاہ حجاز کو

"دام فریب" کے عنوان کے تحت ایک نظم ہے، پوری مرصع پاکیزہ خیالات اور حکمت سے قطع نظر صرف روانی اور محاورات کی نشست اور برمحل استعمال ملاحظہ ہو ؎

بہن! یاد رکھ دست حسرت ملے گی سیانوں کے کہنے پہ گر تو چلے گی
جہنم میں جھونک اے بہن یہ فتیلے انھیں کی طرح ورنہ تو بھی جلے گی
یہ تعویذ کیا پار بیڑا کریں گے بھلا ناؤ کاغذ کی کیونکر چلے گی
فقیروں کی پوجا جو کی زر کی دھن میں فقیری ہی چھاتی پہ کودوں دلے گی
سلامت رہے نقش جلتا ہوا یہ تری ہر بلا اس عمل سے ٹلے گی
میاں پاؤں دھو دھو کے تیرے پئے گا جو تو پاؤں دابے گی پنکھا جھلے گی
دعائیں جو تو لے گی بوڑھے بڑوں کی تو دودھوں نہائے گی پوتوں پھلے گی
مرے ڈھب پہ لانے کی کیوں بحث و تبر ہے
نہ یاں دال اے پیر ستم کی گلے گی

ذیل کے فارسی اشعار میں اسلام کی کتنی سچی تعریف کی ہے۔

طاعتش اسلام ما، عشق رخش ایمان ما
روضۂ فردوس ما، خاک رہش اکسیر ما
ما و دست و دامن پیر خمستان حجاز
نیست یاران طریقت! غیر ازیں تدبیر ما!

جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے موقع پر اردو کی طرف سے انھوں نے جو سپاس نامہ زندہ کنندۂ علم و فن اعلیحضرت سلطان العلوم کی بارگاہ میں پیش کیا تھا، اردو ادب میں اپنی آپ نظیر ہے۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو پر جو قیامت گزری اور جس بے کسی و بے بسی کا اسے سامنا کرنا پڑا، اور آخر میں حضور نے کس طرح اس کی دست گیری فرمائی، اس کا ذکر انھوں نے بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے اور حق یہ ہے کہ اردو کی منت شناسی اور سپاس گزاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے ؎

آخر در محسن تک قسمت مجھے لے آئی — ہاں تجھ کو بشارت ہو اے ذوق جبیں سائی
جس کس کے قلم روشن ہے اسم شریف اس کا — ہے نام خدا جس میں نورینہ کی یکجائی
ہے آج بصد زینت ہر کان کا آویزہ — عثمان علی خاں کا آوازہ یکتائی

عثماں کی "حیا" نے کی آ کر مری غم خواری
دیکھی نہ گئی اس سے یہ ذلت و رسوائی

کی بن کے "غنی" آخر شاہانہ ادا ظاہر — اک جامعہ کی یعنی تاسیس ہی فرمائی
جاں اس نے نو بخشی میرے تن مردہ میں — پھر زندہ کیا اس نے اعجاز مسیحائی

آخر میں اپنی ہیچمدانی اور دعوائے زباں دانی و مشق سخن آرائی سے ناواقفیت کا اظہار کتنے انکسار اور فروتنی سے کیا ہے ؎

قاصد ہوں اک اردو کی اے شاہ نہیں مجھ کو
دعوائے سخن دانی و مشق سخن آرائی

نہیں زاہدہ، جب تک اردو زبان زندہ ہے، جب تک جامعہ عثمانیہ قائم ہے، جب تک زندہ کنندۂ علم و فن، سلطان العلم و شعر و سخن کا نام نامی تاریخ میں روشن ہے، یہ ناممکن ہے کہ تمھاری سخن دانی اور سخن آرائی کا اعتراف نہ کیا جائے۔ ادب اردو میں تمھارا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا کہ تم نے تنہا وہ فریضہ ادا کر دیا جو پوری دنیائے اردو کا فریضہ تھا، جس کے جذبات کی تم نے اس دل نشیں انداز میں ترجمانی کر دی!

"جوش محبت" کے پہلے بند میں لندن کی لفظی تصویر کھینچی ہے۔ دوسرے بند میں مشہور زمان رائٹر ایجنسی کے مالک کی خودکشی کے واقعہ کو نظم کیا ہے کہ کس طرح اس نے اپنی محبوب بیوی ایڈیتھ کی وفات پر اپنی جان دے ڈالی۔ جوانی کی ترنگوں کو جان لیتے سنا ہے لیکن ایک مرد معمر کا اپنی بیوی پرستی ہونا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ؎

لیتی ہیں گر جان جوانی کی ترنگیں — یاں نوجہ یہ ہونا ہے سنی مرد معمر
بے مثل ہے یہ واقعۂ زوج پرستی — نادر ہے یہ تمثیل وفاداری شوہر

اللہ کو پیاری ہے زن و شو کی محبت
دنیا کے لئے ہے یہی شئے باعث رحمت

آگے چل کر عشق حقیقی کے نازک نکات کھول کھول کر بتائے ہیں اور "مدرسہ مہر و وفا کے طلبا" کو مقصود رسی کی راہیں سجھائی ہیں ؎

ناکامی و حرماں میں بہت سہل ہے مرنا — ہیں مرد وہی جی کے جو الفت کو نبا ہیں
ہمت ہے شجاعت سے کریں ضبط محبت — سوز تپ فرقت سے پھکیں اور نہ کراہیں
پہنچیں گے وہی منزل مقصود تک اکثر — جو راہ رو جادۂ تسلیم و رضا ہیں

آخری بند میں سچے عشق اور سچی محبت کی حمد و ثنا ملاحظہ ہو ؎

آرام دل و جاں ہیں الام محبت — ہے اہل بقا کشتۂ صمصام محبت
جا پہلے زباں پاک کر آ، لوٹ رہا ہے — ظاہر ہے بمقدس ہے نہ لے نام محبت
ہے راہبر عشق حقیقی تر احرماں — طوبیٰ لک طوبیٰ لک ناکام محبت
کر پیشکش خدمت محبوب نہ ہرگز — جب تک نہ ہو پختہ ثمر خام محبت

ہے منتظم محفل امکاں غم الفت
ہے ماحصل ہستی انساں غم الفت

"تحفۂ درویش" میں آپ کو ایک ایسی صوفیانہ اور عارفانہ صدا ملے گی جو صرف چند ہی قدسی نفوس کا حصہ ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ دو شعر نہ صرف دنیائے نسواں، بلکہ تمام عالم انسانی کے لئے اپنے اندر ایک مستقل پیغام رکھتے ہیں ؎

نمونۂ خط ز۔خ۔ش مرحومہ

۱۶ آخر در محسن تک قسمت سے مجھے آئی + ہان تجھکو بشارت ہو۔ اے ذوق جبین سائی

۱۷ جون شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اسکا + ہے نام خدا جس مین "نورین" کی یکجائی

۱۸ ہے آج بصد زینت ہر کان کا آویزہ + عثمان علی خان کا آوازۂ یکتائی

۱۹ عثمان کی جو "حیا" نے کی آکر مری غمخواری + دیکھی نہ گئی اس سے یہ ذلت و رسوائی

۲۰ کی بن کے "غنی" "آخر" شاہانہ ادا ظاہر + اک خامہ کی یعنی تاسیس سے فرمائی

۲۱ جان از سر نو بخشی۔ میرے تن مردہ مین + پھر زندہ کیا اسنے۔ اعجاز مسیحائی

۲۲ خواہان ترقی ہو۔ رخشندہ ہے مستقبل + اے حال قنوط افزا ماضی ہو تمنائی

۲۳ اے روز سیہ کر بس۔ اپنا کہین منہ کالا + کافور ہو اب تو بھی ہان اے شب تنہائی

* * *

۲۴ قاصد ہون اک اردو کی۔ اے شاہ انہین مجھکو
دعواے زبان دانی۔ مشق سخن آرائی

بقلم خود
ز۔خ۔ش (علی گڈھ)

رونے دھونے سے جان کھونے سے کہیں بنتے ہیں کام دیوانی
دردِ دل دردآفریں کو سنا گر گزر جی میں ہے جو کچھ ٹھانی

ان اشعار میں کیسی روحانی بلندی، کیسا نورانی سوز و گداز، اور کیسا پاکیزہ تخیل ہے ؎

مایۂ اشک یاں بضاعتِ مور ہیچ واں شوکتِ سلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا پہلے کر جان و دل کی قربانی
بے خبر پہلے نقش کر دل پر عظمتِ بارگاہِ یزدانی

آخری شعر ہے ؎

دیں ہے الفت وطن فغانستان عرف مجنوں ہے پیشہ حسانی

کاش افغانستان کے باشی مجنوں نام کے ایسے حسانی جن کا دین الفت ہوتا، خاک دانِ ہند میں اور دو چار پیدا ہوئے ہوتے!

اس مجموعہ کی آخری نظم میں انھوں نے اپنے بچپن اور اپنے شفیق اور پیارے باپ کی محبت آمیز تربیت کا نہایت دلفریب نقشہ کھینچا ہے۔ ان گریزپا، مگر تخیل فریب دنوں کو یاد کرکے جو کبھی واپس نہیں آئیں گے، کتنی حسرت اور یاس سے کہتی ہیں ؎

یوں مرے پیشِ نظر ہے ابتدائی زندگی یاد تھی جس طرح آدم کو بہشتی زندگی
وا دریغا! دن دہاڑے کل جہاں کے سامنے میرا گنجِ عیش لوٹا راہزنِ ایام نے
لوٹ آ، اے عشرتِ ایامِ طفلی لوٹ آ پھر مجھے اک بار بس اک بار اپنا منہ دکھا

بچپن گزر گیا، جوانی ایسی ہستیوں کے لئے بے کیف ہوتی ہے، موت کا خیال آتا ہے، ہائے، شفیق و مہربان باپ کے جذبات کا پاس و لحاظ ہونے کے باوجود زبان سے نکل ہی گیا ؎

مہر سے گرچہ تیرا پاس ہے بابائے پدر کہہ رہا ہے دل زبانِ بے زبانی سے مگر
"ہو جدا العقوبے یوسف نہ زنداں کے لئے پھل نہ مہجورِ شجر ہو طلقِ انساں کے لئے
جب کہوں میں خیرباد اس عالمِ حق پوش کو
روح چل دے سونپ کر قالب تری آغوش کو!"

قدرت کو یہی منظور تھا کہ اس صوفی منش زاہدہ کی بات رکھی جائے، محفل ادب سونی ہو جائے اور اردو کا چمن اس عندلیب خوش الحان کے عرفانی نغموں سے ہمیشہ کے لئے محروم!

اپنی مختصر مگر مبارک زندگی میں وہ اپنے آپ کو ہمیشہ "الفیرۃ الفانیہ" لکھا کیں، آج ان کا جسم فنا ہو گیا، لیکن ان کی زندۂ جاوید روح ہمیشہ کے لئے اپنی بے کس بہنوں میں احساسِ برتری و ترقی پیدا کرنے کے لئے زندہ ہے۔ انھوں نے اپنی ناپائیدار مگر درخشاں زندگی کی چھبیس[۲۶] سے زیادہ بہاریں نہ دیکھیں، لیکن اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے سدا بہار رہے، وہ اپنے آپ کو ہمیشہ "خاک نشیں" لکھا کیں، آج ان کا جسم خاک نشیں نہیں ہے لیکن ان کی پاک روح حضرت سیدۃ النساء کے ساتھ باغِ جناں میں گلگشتِ خرام ہے!

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

معین النساء بیگم

نوٹ:- اس مضمون کے لئے بعض مفید مشوروں اور مرحومہ کی چند مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظموں کے لئے راقمہ مرحومہ ز۔خ۔ش۔ صاحبہ کی پھوپی زاد بہن مخدومہ و محترمہ انیسہ خاتون بیگم ہارون خاں شیروانی کی سپاس گزار ہے۔

وہ بھی سچے تھے

"تو بگاڑ کیسے ہوا؟" بڑی بی نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔ "ہم سے نہ کہوگی؟"

"کہنے میں تو کچھ ہرج نہیں" رضیہ بولی۔ "لیکن جب بات یاد آتی ہے تو کچھ ملال سا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بھی سچے تھے۔"

"بچی!" بڑی بی بولی۔ "تم تو معموں میں باتیں کرتی ہو۔ کچھ صاف صاف کہو تو پتہ بھی چلے۔"

بڑی بی ایک دقیانوسی خیالات کی بوڑھی عورت تھی۔ لڑکیاں بالیاں اس کی باتیں بہت شوق سے سنتیں اور خوب ہنستیں۔ رضیہ کے میکے والوں کے یہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ جب سے رضیہ شوہر کے ہاں سے آئی تھی بڑی بی کو وجہ معلوم کرنے کی بڑی کرید لگی رہتی جب آتی یہی ذکر لے بیٹھتی۔

رضیہ بولی۔

"بڑی بی! یہ تو میری بپتا کی کہانی ہے۔ کوئی افسانہ تو ہے نہیں جو تم پوچھ رہی ہو۔"

بڑی بی بولی

"بیٹی رضیہ! خیر سے ایک بچی کی تو تم ماں ہوگئیں۔ لیکن عقل نہ آئی تمھیں۔ دوسرے سے دکھ درد کی کہنے سے بھڑاس نکل جاتی ہے غم ہلکا ہوجاتا ہے۔"

اتنے میں ماما ایک طشتری میں چھالیا لے آئی۔ رضیہ بولی۔

بڑی بی! سروتا لو اور یہ چھالیا تو کاٹ ڈالو"

"ہاں یہ ٹھیک رہےگی" بڑی بی طشتری پکڑ کر بولی۔ "میں چھالیا کاٹوں گی تم ذری یہ قصہ کہہ دو تو گویا اب میل ملاقات تو بند ہی ہے۔"

"ہاں!" رضیہ نے جواب دیا۔ "بند ہی سمجھو!"

"اور بچی کو بھی بھول گئے کیا!" بڑی بی نے نجمہ کی طرف جو کھلونوں سے بیٹھی کھیل رہی تھی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو!" رضیہ بولی۔ "اسے تو کبھی کبھی بلوا لیتے ہیں۔"

"دیکھو بیٹی!" بڑی بی نے کہا۔ "ہوشیار بیٹھو ذرا کہیں چھین کر ہی نہ لے جائیں۔ پھر صورت دیکھنے کو بھی ترسوگی سمجھ لیا نا۔"

"پگلی ہو تم تو!" رضیہ نے ہنس کر کہا۔ "چھین کر کیسے لے جائیں۔ ان کی بچی ہے میرے پاس رہے یا ان کے پاس ایک ہی بات ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو" بڑی بی نے کہا۔ "لیکن وقت کیسے کٹتا ہے؟"

"نجمہ جو ہے میری" رضیہ نے محبت بھری نگاہوں سے بچی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو اس سے ہی فرصت نہیں۔ کبھی نہلانا ہے۔ کبھی کپڑے پہنانے ہیں پکانا' پلانا' کھلانا۔ آنکھ جھپکتے وقت گذر جاتا ہے پھر یہ محلے کی لڑکیاں آجاتی ہیں۔ کسی کو قرآن مجید پڑھاتی ہوں کوئی سینا پرونا سیکھتی ہے۔ مزے سے دن گذر جاتا ہے۔"

نجمہ نے جو اپنا نام سنا تو ماں کی گود میں آ بیٹھی۔ رضیہ اسے سینے سے لگا کر بولی۔

"بلا سے! آ نہیں آتے تو نہ آئیں۔ میری نجمہ تو میرے پاس ہے۔ بس ناراضگی تو یہی ہے کہ ہم ماں بیٹی بھی کیوں جل نہ مریں۔"

"اے توبہ کرو بیٹی!" بڑی بی بولی۔ "یہ تم نے کیا کہا۔ "جل مریں تمھارے

دشمن!"

اور رضیہ ہنس کر بولی۔

"تو اور کیا؟ غصہ بھی تو اس بات کا ہے۔ ناراضگی بھی تو یہی ہے"

"کچھ تیز مزاج ہوں گے" بڑی بی نے کہا۔ "بیٹی! پہلے ہی سوچ سمجھ لینا تھا۔ یہ تو تمھاری دوسری شادی تھی نا" رضیہ ایک آہ بھر کر کہنے لگی۔

"نصیب ہی کچھ ایسے لے کر آئی ہوں کہ دو گھڑی کا سکھ بھی نہیں۔ خدا جنت نصیب کرے۔ ان کے (پہلا شوہر) تو گھر قدم رکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ نکاح کے بعد رخصت ہی میں دو سال گزر گئے۔ شہر میں وبا پھیلی انھوں نے بھی جنت کی راہ لی۔ لو! یہ تو پہلی شادی کا قصہ رہا۔ نہ سسرال دیکھے نہ شوہر سے بات کرنی نصیب ہوئی اور بیوہ ہو گئی۔ خدا اباجان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنھوں نے تعلیم دلوائی اور تربیت کا پورا پورا خیال رکھا ورنہ زندگی کے یہ چار دن کاٹنے بھی دشوار ہو جاتے۔ سال بھر منحوس۔ سبز قدم۔ بدنصیب سبھی کچھ کہلوایا۔ لیکن کب تک خاموش رہتی تنگ آمد بجنگ آمد۔ پھر جو کسی کی زبان سے کوئی بیہودہ لفظ سنا تو وہ ڈانٹ بتلائی کہ پھر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تم جانو! میں منحوس کیوں ہوئی۔ کیا شہر میں وبا میرے کارن پڑی۔ تو خیر! میری سہیلی کلثوم خدا اسے اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ اپنے گھر آباد تھی۔ شادی کے بعد وہ عموماً مجھ سے ملنے آیا کرتی۔ اس کے میاں بھی ساتھ ہوتے۔ میں ان سے کچھ یوں ہی سا پردہ کرتی......

"کیا کہا؟" بڑی بی نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "رضیہ! تم غیر محرموں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ کسی نے مت بھی نہ دی تمھیں بیٹی! پردہ تو عورت کی زینت ہے۔ پردے سے تو عورت کی عزت ہے۔ اللہ رحم کرے ہم لوگوں پر۔ میرے تو اس نئی پود کی لڑکیوں کے لچھن دیکھ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جسے دیکھو شتر بے مہار ہر جگہ موجود۔ پردے سے یہ چھوکریاں تو ایسے متنفر ہیں جیسے یہ بھی کوئی وبائی بیماری ہے جو چھونے سے آچمٹے گی۔ اور پھر ان مردوں کی غیرت تو دیکھو! موؤں کو شرم بھی تو نہیں آتی۔ گھر والیوں کو مجمع عام میں یوں سجا بنا کر ساتھ لیے پھرتے ہیں گویا بڑا ہی ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ اور تو اور یہ شریف زادیاں بھی اپنے میاں کے دوستوں سے یوں بے حجاب ہو کر ملتی ہیں گویا رشتے میں ان کے ماموں لگتے ہیں۔ ہائے توبہ! یہ بے حیائی۔ یہ بے عزتی بھی اندھی تقلید نے مسلمانوں کو لے ڈوبی۔ میرا بس چلے تو میں تو آج فتویٰ دلوا دوں کہ جن گھرانوں کی عورتیں بے پردہ ہیں کوئی مسلمان ان سے رشتہ ناطہ نہ کرے۔"

"سچ ہے!" رضیہ نے جواب دیا۔ "اس ہمارے ملک میں جہاں ہمیں غیر اقوام سے واسطہ پڑتا ہے ایک مسلمان عورت کے لیے پردہ لازمی چیز ہے۔ لیکن کلثوم کے میاں کوئی غیر تو تھے میرے بھی قرابت دار تھے۔ خیر! شادی کے کچھ عرصہ بعد اللہ میاں نے کلثوم کی گود ہری کر دی اور اس کے ہاں ایک خوبصورت بچی ہوئی۔ اس بچی کا نام انھوں نے طاہرہ رکھا۔

اللہ کی مرضی! طاہرہ ابھی تین ایک سال کی ہوئی تھی کہ کلثوم نے دنیا سے منہ موڑا۔ اب طاہرہ کے ابا ننھی سی جان کو ہر وقت سینے سے لگائے پھرتے لیکن وہ کاروباری آدمی تھے آخر بچی کو اس کے ننھیال بھیج دیا۔ ادھر مجھے بھی بیوہ ہوئے تیسرا سال جا رہا تھا۔ کلثوم کے مرنے کے بعد وہ ہمارے یہاں بہت کم آنے جانے لگے۔"

"اور بچی کو تو بالکل بھول گئے ہوں گے" بڑی بی نے پوچھا۔

"توبہ کرو بڑی بی!" رضیہ بولی۔ "بچی پر تو وہ جان چھڑکتے تھے تو خیر ساون رت تھی۔ کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ماما نے آکر ان کے آنے کی اطلاع دی۔"

"کن کے آنے کی؟" بڑی بی نے پوچھا۔

"اے توبہ! رضیہ بولی" طاہرہ کے ابا کی۔ انہی کا تو ذکر کر رہی ہوں۔ وہ اندر آکر ماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئے۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اماں کسی کام سے کوٹھے پر چلی گئیں۔ میں نے طاہرہ کی خیر خبر پوچھی تو وہ ہنس کر بولے۔

"تمہیں طاہرہ سے بہت محبت ہے رضیہ؟"

"ہے تو سہی!" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا

وہ اچانک بولے

"طاہرہ کی ماں بنوگی؟"

میں یہ سن کر جھینپ سی گئی، وہ بولے

"شرم کیسی! جواب دو!"

میں نے ہولے سے کہا۔

"امی جانے!"

دو روز بعد میرا ان سے نکاح ہوگیا۔ میرا نیا گھر خوب آراستہ تھا۔ نوکر چاکر، ماما، موٹر بھی کچھ موجود تھا۔ دو چار روز بعد مجھ سے کہنے لگے۔

"تم کہو تو میں طاہرہ کو یہاں لے آؤں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"شکر ہے آپ کو طاہرہ یاد تو آئی۔ اتنے دن خاموش کیوں رہے۔ آج ہی جاکر لے آیئے۔ میں اس کے لئے ابھی ایک کمرہ تیار کئے دیتی ہوں۔"

میرا اتنا اشتیاق دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور موٹر پر سوار ہوکر اسے لانے کے لئے چلے گئے۔ میں نے ان کے آتے آتے اپنے سونے والے کمرے کے ساتھ کا کمرہ طاہرہ کے لئے سجا دیا اور ماما کو اچھا کھانا تیار کرنے کو کہا۔ ظہر سے پہلے وہ طاہرہ کو لے آئے۔ میں دوڑ کر سیڑھیوں پر جا کھڑی ہوئی اور طاہرہ جب اوپر آئی تو میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ لیکن وہ مجھ سے ہٹ کر اپنے ابا کے پاس چلی گئی۔ دس بیس روز میں طاہرہ کچھ مجھ سے مانوس ہوگئی۔ وہ مجھے آپا کہتی۔ خدا کی قسم مجھے اس بچی سے بڑی محبت تھی لیکن وہ مجھ سے کچھ علیحدہ علیحدہ رہتی۔ خاص کر جب اس کے ابا گھر پر ہوتے تو گویا وہ مجھے بھول ہی جاتی۔ ایک روز میں نے اسے گود میں لے کر پوچھا۔

"طاہرہ! تمہیں مجھ سے پیار ہے یا ابا سے؟"

وہ میری گود سے اتر کر ابا کے پاس چلی گئی اب انھوں نے پوچھا

"طاہرہ! تم میری بیٹی ہو یا آپا کی؟"

"آپ کی!" طاہرہ نے ہولے سے جواب دیا

"نا بھائی!" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے

"آدھی میری آدھی آپا کی ٹھیک ہے نا!"

لیکن طاہرہ نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔ اس سے میرے دل کو کچھ ٹھیس سی لگی۔ وہ نظروں سے بھانپ گئے اور ہنس کر بولے۔

"سیانی ہوگی تو خود ہی سمجھ جائے گی!"

میں کیا کہتی خاموش ہو رہی۔

طاہرہ کو میرے پاس آئے کچھ اوپر دو سال ہو چکے تھے کہ اللہ نے مجھے نجمہ دی۔ طاہرہ جتنی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی اتنا ہی نجمہ سے پیار کرتی۔ ایک روز میں نے طاہرہ سے پوچھا

"طاہرہ! تمہیں نجمہ سے پیار ہے"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"نجمہ کو کھلونے دیا کروگی؟"

"ہاں!" اس نے پھر اسی طرح بھولے پن سے کہا۔

"مجھے بھی کھلونے دوگی" میں نے ہنس کر پوچھا

"نہیں!"

میں ہنسنے لگی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ طاہرہ مجھے نجمہ سے بھی پیاری تھی! انہی دنوں شہر میں ایک تھیٹر آیا۔۔۔۔۔۔۔

"یہ تھیٹر کیا ہوتا ہے" بڑی بی نے تعجب سے پوچھا۔

رضیہ ہنس کر بولی۔

"پھر بڑا نہیں۔ تمہی ابڑ کہو"

بڑی بی سر دونا ہاتھ سے رکھ کر بولی۔

"رضیہ! توبہ کرو! میں کوئی کرسٹان تھوڑے ہی ہوں جو ناپاک الفاظ بھی میں نے یاد کر رکھے ہوں"

"ناپاک الفاظ کیسے!" رضیہ نے ہنستے ہوئے پوچھا

"ناپاک نہیں تو اور کیا" بڑی بی نے جواب دیا" جیسے کرانی لوگ ناپاک ویسے ان کی زبان ناپاک۔"

رضیہ نے ہنس کر کہا۔

"تم جنھیں کرانی کہتی ہو۔ یہ بھی تو اہل کتاب ہی ہیں۔ تم نے انھیں ناپاک کیسے کہہ دیا"

"ناپاک نہیں تو اور کیا؟" بڑی بی بولی۔" میں نے سیکڑوں بار انھیں کتوں کا منہ چومتے دیکھا ہے۔ رضیہ! میں تو تمھیں بہت سمجھ دار لڑکی سمجھتی تھی۔ لیکن تمھیں تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتہ نہیں آتا"

یہ سن کر رضیہ خوب ہنسی پھر کہنے لگی

"تو بڑی بی شہر بھر میں بھی تو سیکڑوں کتے ہیں پھر تو اللہ میاں کے فرشتے یہاں بھی نہ آتے ہوں گے۔"

"اس میں شک ہی کیا ہے؟ بڑی بی نے جواب دیا۔ فرشتے آتے ہوں تو شہر میں یہ آئے دن ہیضہ کیوں پڑے۔ طاعون کیوں پھوٹے۔ تم نے مذہب کی کوئی کتاب پڑھی ہو تو تمھیں ان مسائل کی بھی خبر ہو۔ تو خیر! شہر میں وہ پھر بڑ آیا۔ (تھوک کر) باوضو بیٹھی تھی اب وضو بھی کرنا پڑا۔"

"تو گویا!" رضیہ نے کہا۔ "انگریزی لفظ زبان پر آنے سے وضو بھی ٹوٹ جایا کرتا ہے اے بڑی بی! یہ مسائل کہاں سے سنے تم نے؟"

"بیٹی!" بڑی بی بولی۔" یہ بال دھوپ ہی میں سیاہ نہیں کیے ہیں نے۔ چلو چھوڑو اس قصے کو پھر ہوا کیا؟"

"تو ان کے ابا ایک رات تماشا دیکھنے گئے۔ جاڑوں کے دن تھے ہم لوگ سوتے تھے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ دیکھا تو کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی تو مکان کا شمالی حصہ جلتا ہوا نظر آیا۔ میری چیخ پکار سے نوکر بھی جاگ اٹھے۔ میں نے بچہ کو تو گود میں لیا پھر جھنجوڑ کر طاہرہ کو اٹھانے لگی۔ تم جانو! پانچ چھ سال کی بچی کی نیند کیسی ہوتی ہے وہ کہاں اٹھتی تھی میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اور چلا کر کہا۔

"طاہرہ! آؤ میرے ساتھ! مکان میں آگ لگ گئی بھاگو!"

لیکن وہ بھاگ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔

میں لپک کر دروازے پر پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ اور آوازیں دینے لگی لیکن لڑکی نے دروازہ نہ کھولا۔ پھر میں نے نوکروں کو پکارا۔ لیکن اس "شور شرابے" میں میری آواز کون سنتا تھا۔ آگ بالکل قریب پہنچ چکی تھی دھوئیں سے میرا دم بھی گھٹنے لگا تھا اتنے میں موٹر کی آواز آئی۔ پھر وہ بھاگے بھاگے اوپر آئے اور آتے ہی پوچھا۔

"میری طاہرہ!"

"غسل خانے میں!" میں نے کہا۔ "بھاگئے جلدی۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر رکھا ہے۔"

اس وقت تک لوگوں نے آگ پر قابو پا لیا تھا۔ میں مکان سے نکل کر سڑک پر کھڑی تھی اتنے میں ماما آئی میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ کہ انھوں نے لاتیں مار کر غسل خانے کا دروازہ توڑا۔ لیکن طاہرہ غریب دم گھٹ جانے سے مری پڑی تھی۔ اس کے ابا اسے گود میں لے کر وہیں بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ لوگوں نے زبردستی

واں سے نکالا۔ ورنہ نصیب دشمناں انھیں بھی گزند پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ نقصان کا تو انھیں ذرہ بھر بھی ملال نہ تھا۔ لیکن بیٹی کی موت نے انھیں سخت نڈھال کردیا۔ طاہرہ کا جنازہ اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ بچی سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ تمام دن گھر بیٹھے بیٹی کو یاد کرتے اور روتے۔ بہت روز اسی طرح گزر گئے اس تمام عرصے میں نہ مجھ سے کچھ کہا سنا نہ نجمہ کو گود میں لیا۔ ایک روز میرے پاس آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر کہنے لگے

"رضیہ! اگر طاہرہ کی ماں زندہ ہوتی تو اسے جیتے جی مرنے کے لئے نہ چھوڑ جاتی!

"خیر! جو ہوا سو ہوا؟"

پھر انھوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف پھینکا اور کہا

"یہ لو! گھر بیٹھے تمھیں دوسو روپے ماہوار مل جایا کریں گے۔ تمھاری مرضی ہے یہاں رہو یا میکے چلی جاؤ!"

اتنا کہہ کر چلے گئے سات آٹھ روز تو میں وہیں رہی۔ لیکن اس عرصہ میں انھیں ایک بار بھی نہ دیکھا۔ آخر اٹھ کر میکے چلی آئی ہوں واقعہ کو سال سے کچھ اوپر ہونے کو ہے۔ بنک سے ہر مہینے دوسو روپے نجمہ کے نام آجاتے ہیں۔ لو! یہ ہے قصہ! اب تو خوش ہو تم؟

بڑی بی ایک آہ بھر کر بولی

"بیٹی صبر کرو! غم غلط ہوگا تو آپ ہی چلے آئیں گے"

"ان کی مرضی ہے!" رضیہ نے جواب دیا "لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جو محبت مجھے نجمہ سے ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اب جو میں سوچتی ہوں تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ بھی سچے تھے!!"

ایم اسلم

حُسنِ سرِ راہ

نہ پوچھ! کس سے ہوئی تھی مری نگاہ دوچار
نہ پوچھ! کس نے اُلٹ دی بساطِ صبر و قرار

نہ پوچھ! مجھ سے وہ دلکش ادائے جلوۂ ناز
قدم قدم پہ فدا تھی مری نگاہِ نیاز!

خرد کی شام تھی منت کشِ صباحِ جمال!
ریاضِ طور تھا ہر ذرۂ غبارِ خیال!

نفس نفس میں تھا رقصاں ترانۂ گلپوش
رگوں میں دوڑ رہی تھی تجلّیٔ خاموش

سنک رہا تھا فضاؤں میں حُسن کا سیلاب
جھلک رہا تھا غنائی شباب کا ہر خواب

خدا فریب تھا منظر، بہار کی سوگند!
جنوں پسند نگاہوں کے پیار کی سوگند!

کاوش

حیدرآباد کی چیخ پکار

ایک اجنبی یا ایک ملکی دیہاتی کے لئے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز اور اس سے زیادہ ہیبت ناک کوئی اور شے نہیں ہوتی جس قدر کہ حیدرآباد کی چیخ پکار۔ میرے قابل ذکر دوست مسٹر ہیبت خاں ہمیشہ اس کا تذکرہ فرمایا کرتے ہیں کہ ان کے یہاں تشریف لانے کے بعد کامل ایک ہفتہ گزرنے تک اس چیخ پکار کی گونج ان کے دماغ سے گئی اور نہ انہیں اطمینان کی نیند نصیب ہوئی۔ اس کے برخلاف نواب چھمن لکھنوی اس کو نغمہ ہائے شیریں کے نام سے موسوم کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کو بلبل ہزار داستان کی خوش الحانی اور دنیا کی تمام نغمہ سنجیوں پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک عجیب و غریب شخص سے مجھے ایک خط وصول ہوا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں خط کے حسن و قبح سے بحث کروں یا اس پر کوئی تنقیدی نظر ڈالوں' ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے بجنسہٖ اس کی نقل درج کی جاتی ہے۔

"مکرمی بندہ! السلام علیکم۔ میں ایک بیکار شخص ہوں اور ہر ایسی خدمت کے لئے تیار ہوں جس سے مجھے اکلِ حلال مل سکے۔ میں نے بہت سی ایسی تدابیر سوچ رکھی ہیں جن سے کروڑہا روپیہ بغیر مشقت اور جاں سوزی کے پیدا کیا جا سکتا ہے' لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ گورنمنٹ مری طرف متوجہ نہیں ہوتی' بلکہ مجھے ایک جنونی' اور خیالی' سمجھتی ہے' اس لئے حکومت کی اس حوصلہ شکنی اور عوام الناس کی سرد مہری کی وجہ نہ تو میں خود ہی دولتمند بن سکتا ہوں اور نہ اپنے ملک کو ہی مالا مال کر سکتا ہوں' اب میں چند ایسے مشورے جو ایک خاص تحریک سے متعلق ہیں اور جو آپ کے راز سربستہ کی طرح میرے دل میں پوشیدہ تھے آپ کے پاس لکھ بھیجتا ہوں اگر آپ مہربانی فرما کر میرے زریں خیالات کی تائید فرماتے ہوئے حیدرآباد اور سکندرآباد کی میونسپلٹی بورڈ میں میری سفارش فرما دیں تو شاید مجھے کوئی معقول مشاہرہ مل سکے۔

یہ عہدہ جس کا میں اب تذکرہ کرنے والا ہوں' صدر ناظم چیخ پکار حیدرآباد و سکندرآباد کے نام سے موسوم ہوگا' کیونکہ اب تک اس کے لئے نہ کوئی قوانین وضع ہوئے اور نہ کوئی قواعد مرتب کئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس اہم خدمت کے لئے میں نہایت ہی موزوں ہوں کیونکہ میرے شش نہایت ہی قوی ہیں اور میں نے حیدرآباد کی تجارت اور صنعت و حرفت کا مطالعہ نہایت غور و تعمق سے کیا ہے' اس کے علاوہ میں فن موسیقی کا ماہر بلکہ یکتائے دہر ہوں۔

حیدرآباد کی چیخ پکار دو بڑے شعبوں پر منقسم ہو سکتی ہے ایک زبانی دوسرے آلوں کی۔

آخر الذکر میں آج کل بالکل بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک معمولی متنفس کو بھی اس بات کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ گھنٹوں پیتل کے برتن یا لوہے کے توے زور زور سے بجاتے ہوئے بیچنے کے لئے سڑکوں پر گھومے اور اس طرح آسایش عامہ میں مخل ہو۔ یا فوجی چھاؤنیوں میں وقت بے وقت بجنے والی بگل کی آواز اس قدر ڈراؤنی اور کرخت ہوتی ہے کہ اس سے بسا اوقات بچوں اور صنفِ نازک کے دل دہل جاتے ہیں۔ ڈھول بیچنے والے میں ایک خفیف موسیقی پائی جاتی ہے لیکن ہم اس کو گاہے ماہے سنتے ہیں۔ اس لئے میں نہایت زور شور سے یہ تحریک کرتا ہوں کہ اس قسم کے کسی موسیقی آلے کو اس وقت تک استعمال میں نہ لایا جائے۔ جب تک کہ میں اس کے تال اور سُر ٹھیک نہ کر لوں اور اس کے استعمال کا

اجازت ضرور دوں تاکہ میں اس امر کی اچھی طرح آزمائش کر لوں کہ ان آلات کی آواز کس حد تک میں عوام کے کانوں کو خوش گوار معلوم ہوتی ہے اور کب سمع خراش؟

مگر اس سے بھی بڑھ کر قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہاں زبانی شور بکثرت مروج ہے اور وہ اس قدر پر وحشت اور مہمل ہوتا ہے کہ کوئی نیا شخص اس سے نہ کوئی مطلب اخذ کر سکتا ہے اور نہ کچھ اس کے معنی سمجھ سکتا ہے اس لئے وہ ہمارے شہر کو ایک پُر شور مقام سمجھتا ہے۔ گویا جب وہی بیچتا ہے تو ہی ..... کی آواز نکالتا ہے جو اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اس سے ہمارے دانت بجنے لگتے ہیں۔ لکڑیاں بیچنے والا کسی خاص انداز پر قائم نہیں رہتا، کبھی نہایت درشت لہجے میں چیخ اٹھتا ہے اور کبھی نہایت تیز طریقے سے، کبھی نہایت بلند اور کبھی نہایت پست۔ میوے والے میں بھی یہی بات دیکھی گئی ہے اور یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہ صرف موز لے موز یا انگور لے انگور پکارتا ہے اور دوسرے میووں کے نام نہیں لیتا حالانکہ اس کے پاس انجیر، سیب اور سنترے وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے اس قسم معاملات میں میرا اہم خیال ہے کہ میں ایسے چلر فروشوں کے سڑکوں پر آنے سے پیشتر ہی ان کی آوازوں میں ترنم اور نغمہ سنجی پیدا کروں، اور ان کے شور کو ان کے اشیائے فروختنی کی نسبت سے ترتیب دوں اور اس امر کو بطور خاص ملحوظ رکھوں کہ وہ شخص ہرگز سب سے زیادہ نہ چیخے جو سب سے کم قیمتی اشیاء فروخت کرتا ہے جس کی مثال "تاگے کا پنڈا پیسہ، پیسہ" یا "پیسے میں آٹھ سوئیاں پیسے میں آٹھ سوئیاں" سے دی جا سکتی ہے۔ جن کی نسبت میں یہی کہا کرتا ہوں کہ "ایں چہ شوریست کہ در گرد شہر می بینم"

بعض آخرالذکر چلر فروش معمولی اشیاء کے فروخت کرنے میں اس قدر چیختے اور چلاتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے ایک ملاقاتی نازک دماغ دوست نے ایک میوہ بیچنے والے سے بالمعاوضہ قول لیا کہ وہ دوبارہ ان کے دروازہ پر سے نہ گزرے گا، لیکن اس معاہدہ کا کیا نتیجہ نکلا؟ دوسرے ہی دن علی الصباح اس کے دوسرے ہم پیشہ ان کے دروازے پر سے اس امید پر کہ کچھ فروخت ہو نہایت ہی کرخت آواز سے "کھوپرے لے کچا کھوپرا ...... قوبانیاں لے قوبانیاں ...." پکارتے ہوئے یکے بعد دیگرے گزرنے لگے۔ ہمارے شہر کی چیخ پکار میں دوسرا نقص یہ ہے کہ نہ ان کے لئے کوئی وقت ہے اور نہ ساعت۔ صبح سے شام اور شام سے پھر رات تک یہی ہنگامہ آفرینی اور یہی شور محشر بپا رہتا ہے۔

میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ میرا یہ مضمون بہت جلد اخبارات میں شائع کر دیا جائے اس لئے کہ اس کا تعلق بہت کچھ تجارت سے ہے اس کی تاخیر سے سخت مالی نقصان ہونے کا احتمال ہے لیکن بہر طور یہ عجلت بے معنی نہ ہو جیسا کہ آشفتگی کے موقع پر بغیر کچھ سوچے سمجھے آگ آگ کہہ کر چیخنے میں ہے۔ میں اس لئے کہتا ہوں کہ عوام کا بھی وتیرہ رہا ہے۔ ایک خون ریز جنگ کی خبریں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آناً فاناً میں خوف زدہ کر دیتی ہے۔ افواج کی نقل و حرکت کی اطلاعیں فرانسیسی اخبارات میں اس قدر جلد جلد شائع ہوا کرتی ہیں کہ پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن گھر کے دروازہ تک پہنچ گئے، اس لئے میں اس کا بھی بیڑا اٹھانے کو تیار ہوں کہ افواج کی نقل و حرکت، قیام، شکست اور فتح کی خبروں کے اندراج میں خاص امتیاز قائم کیا جائے، جرمنی فوج کی خبریں ایک طرح شائع کی جائیں اور امریکی یا جاپانی خبریں دوسری طرح۔

اسی ضمن میں میں ان ترکاری والیوں کو بھی کبھی نظر انداز نہ کروں گا جو ترکاریوں کے موسم میں ہماری سڑکوں پر عجب اودھم مچا رکھتی ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر نا قابل معافی اس لئے ہیں کہ

ان کا مال ٹھنڈا ہو کر خراب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا شور موسیقی سُر لئے ہوئے ہوتا ہے جو تھوڑی دیر کے لئے پُراثر بھی ہوتا ہے چنانچہ "ملائی کا برف" بیچنے والے کی آواز بغیر موسیقی کے نہیں ہوتی یا میں جب کبھی "بڈھی کے بال" والی غمگین آواز سنتا ہوں تو بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا، خود آپ کا حافظہ ایسی بہت سی دردناک آوازوں کو یاد دلائے گا جن کے تان کا اتار چڑھاؤ ایک خاص تاثرانگیز طریقہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

میری مسرت کی اس وقت کوئی انتہا نہیں ہوتی جب میں "قلفی ملائی" کی سریلی صدا سنتا ہوں لیکن افسوس یہ آواز جو بلبل خوشنوا کی ترنم ریزی سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتی ہے، سال میں دو ماہ سے زیادہ نہیں سنائی دیتی، اس لئے مجھے خیال ہوتا ہے اور میں نہایت سنجیدگی سے غور کرنے لگتا ہوں کہ پکارنے کی یہی خوش گوار طرز سب کے لئے کیوں نہ استعمال کرائی جائے اسی طرح یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ ایک نہایت باقاعدہ شہر میں ایسے مسخرے کس حد تک قابلِ درگزاشت ہیں جنھوں نے اپنے اسلاف کی رواج دی ہوئی بولیوں کو چھوڑ کر اس غرض کے لئے خاص خاص نظمیں یا اشعار موزوں کر لئے ہیں مثلاً چورن یا اوڑھنی رسو بیچنے والے۔

مجھے یہاں اس نوعیت کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو موجودہ شور پسند نسل میں عموماً رائج ہے ان کی چیخ پکار سے نہ صرف سمع خراشی اور سوہانِ روح ہوتا ہے بلکہ عوام کے لئے ان کی بولیاں مہمل اور لغو ہوتی ہیں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے نامکمل جملے کہتے ہیں جو بالکل ناقابل فہم ہوتے ہیں زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ لوگ صرف لہجے سے پہچان جاتے ہیں کہ کونسی چیز بک رہی ہے ورنہ کوئی بھی لفظ سمجھ میں نہیں آتا، چنانچہ اکثر میں نے گاؤں سے آئے ہوئے لڑکوں کو دیکھا ہے کہ وہ گُڑیاں خریدنے کے لئے لکڑیاں بیچنے والے کے پیچھے دوڑتے ہیں یا قوانچہ والا سمجھ کر چھری چاقو تیز کرنے والے کے پاس دوڑ کر آتے ہیں۔ اس قبیل میں سے بعض شور اس قدر بے وقوفی سے کئے جاتے ہیں کہ وہ سوائے ان کے ہم پیشہ لوگوں کے سب کے لئے ایک لاینحل معمہ ہوتے ہیں، یہ کیسے معلوم ہو کہ ایک گھنٹی بجانے والا شکر کے کھلونے فروخت کرنے والا ہوگا اور اوے، اوے کی آواز نکالنے والی ایک سوئیاں دھاگا بیچنے والی ہوگی۔

چونکہ اس قماش کے لوگوں میں ایجاد و اختراع کا مادہ یا دماغی صلاحیت تقریباً ناپید ہوتی ہے اس لئے میں اس کو نہایت مناسب تصور کرتا ہوں کہ ایک سمجھ دار اور باذاق آدمی اس چیخ پکار کی صدارت کے لئے منتخب کیا جائے جو ایسے لوگوں کو ہرگز سڑکوں پر چیخنے کی اجازت نہیں دے گا جس کی آواز میں ترنم اور موسیقیت نہ پائی جائے اور نیز ایسے اشخاص بھی اس کے مجاز نہ گردانے جائیں گے جن کی آواز عوام کے غل و غش اور ٹانگوں اور جھٹکوں کی گھڑگھڑاہٹ پر حاوی ہو کر مختصر اور صاف صاف جملوں میں خوش گواری کے ساتھ ہمارے کانوں تک نہ آسکے اس لئے میں نہایت خاکساری کے ساتھ خود کو اس خدمت کے لئے پیش کرتا ہوں، اگر اس طرح میری حوصلہ افزائی کی جائے گی تو میں اور بھی اسی قسم کی بلکہ اس سے بھی عمدہ عمدہ تدابیر کو جو میرے خانہ ہائے دماغ میں خزائن اجنبہ کی طرح مستور ہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا، جس سے خلایق عامہ کو بہت کچھ منفعت و آسایش کی توقع ہو سکتی ہے۔

راقم الحروف بہی خواہ ملک و قوم "سرمستِ نغمال"

محمد ابراہیم

محبت کا مزار

اس خوب صورت جھیل کے کنارے، ان آم کے درختوں کے گھنے سایے میں، ان مرغزاروں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی خوبصورت سنگ بستہ قبر ہے، جس کے متعلق اس نواح کے ذرہ ذرہ کی زبان پر خون رلانے والی درد انگیز داستان لکھی ہوئی ہے، سال میں ایک مرتبہ جب ان آم کے درختوں میں مور آتا ہے تو ہواؤں کے جھونکے صبح و شام دونوں وقت نہایت فیاضی کے ساتھ اس قبر پر پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اور خوش نما جھیل جو ہر سال برسات کے پانی سے لبالب ہوجاتی ہے اس کی شفاف سنہری لہریں نہایت بے تابی کے ساتھ قبر کے کنارے کو چھو آتی ہیں۔ گاؤں کی عقیدت مند دوشیزائیں اپنے مقدس دامنوں میں انواع و اقسام کے پھول لئے آتی ہیں، اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس خوبصورت قبر کے سبز غلاف پر بکھیر دیتی ہیں۔ پھر وہ اپنی پرنم پلکوں سے قبر کے پائین حصہ کو بوسہ دے کر چلی جاتی ہیں، اس خوب صورت جھیل والی قبر کا محافظ جواں عمر مگر نحیف الجسم شخص پایا گیا، جو وہیں قبر کے قریب ایک گھاس کی چھوٹی سی جھونپڑی میں زندگی کے دن گزار رہا ہے، اس کے دن اور رات کا زیادہ تر حصہ قبر کے پاس آنسو بہاتے ہوئے کٹ جاتا ہے، منو شکل و صورت کے اعتبار سے برا نہ تھا، اس کا سرو جیسا قد استداد زمانہ کے باعث قدرے جھک گیا تھا، اس کے جھریوں دار چہرے پر غم کے آثار پائے جارہے تھے، اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں کے اطراف ہلکی سی سیاہی پھیلی ہوئی تھی، منو اس گاؤں کے ایک شریف متمول گھرانے کا منظور نظر تھا، اس کی زندگی کا ابتدائی زمانہ نہایت راحت و مسرت کے ساتھ کٹا۔

اس قبر کی سنگین آغوش میں سونے والی لڑکی "نازو" منو کی محبوبہ تھی، نازو کا باپ شیرو، منو کے کھیتوں کی رکھوالی پر متعین تھا، اس کے رہنے کے لئے منو کے باپ نے اپنے ہی مکان کا ایک علیحدہ حصہ دے رکھا تھا، شیرو دن بھر کھیتوں کے پاس پڑا رہتا، اس کی بیٹی نازو اس کے لئے دونوں وقت کھانا لے جاتی اور دن کا بقیہ حصہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیل کود میں بسر کرتی جب وہ چند مہینے کی بچی تھی، اس کی ماں اسے اپنے شوہر کی آغوش میں سونپ گئی تھی۔

نازو فطرتاً ذہین، سنجیدہ مزاج واقع ہوئی تھی، گو وہ زیادہ حسین نہ تھی، لیکن ناک نقشہ کے اعتبار سے منو جیسے فطرت پرست انسان کے خیالوں پر چھا گئی، وہ اپنی مستانہ وار اداؤں کے ساتھ منو کے دل میں گھر بنا گئی یہ دونوں کبھی کبھی کھیتوں کو مل کر جاتے، وہاں خوب پانی اور پھولوں سے کھیلا کرتے، پھر دونوں لڑتے جھگڑتے اور آپ ہی آپ من بھی جاتے، سچ تو یہ ہے قدرت نے انھیں ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا تھا، ابتدائی دور شباب کی منزل سے گزرا۔ انھوں نے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس کی، ان کی معصوم آنکھوں سے ایک ملکوتی جذبہ نمایاں ہوکر از دیاد محبت کے باعث امنڈنے لگتا، نازو اب حسن و شباب کی ملکہ بنی ہوئی منو کے خیالات و احساسات پر چھانے لگی، اس کی دلی آرزو تھی کہ نازو کے دل پر حکمرانی کرے، وہ اسے چاہتا تھا، اتنا ہی جتنا کہ نازو اسے چاہتی تھی، اس کے جذبات ہمیشہ نازو کی محبت سے کھیلا کرتے لیکن دنیا والوں کی تنگ نظری کو کیا کہا جائے جو محبت کو گناہ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کا ملاپ، ان کی محبت ظالم سماج کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی، بزرگوں نے ان کے حرکات و سکنات پر نکتہ چینی کی، اور پھر منو کے والدین نے ان کا ملنا جلنا قطعاً منع کر دیا مگر ان کے دل میں محبت تھی۔ انھیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہ آتا۔ ان کے محبت آشنا دل، اپنے بزرگوں کی نظریں بچا کر اپنی بے ہنگام تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتے۔

ایک سال منو کے آموں کے درختوں میں کثرت کے ساتھ بہار آئی، جس کی نگرانی و حفاظت کے لیے ناز و اور اس کے باپ کو متعین کیا گیا۔ منو کبھی کبھی ناز و سے ملنے کے لئے بےتاب ہوکر چھپے چھپے رات کے وقت جایا کرتا۔ ایک رات جب کہ فضا چاند کی نقرئی بارش میں بھیگی ہوئی پُرکیف تھی، منو کا دل ناز و کی شوقِ ملاقات سے تڑپ اٹھا، وہ فوراً اپنے گھر سے نکل پڑا۔

ناز و کا بڈھا باپ نیند سے مغلوب ہوکر خراٹے بھر رہا تھا اور ناز و دل کی نامعلوم تڑپ سے بےتاب ہوکر جاگ رہی تھی آم کے خشک شدہ پتوں میں اس نے کھڑکھڑاہٹ سی محسوس کی، وہ چونک اٹھی اور راستہ کی جانب نظر کی، دفعتاً اس کی نورانی آنکھیں چمک اٹھیں، کون؟ اس کی زبان سے خوشی کا کلمہ نکلا "منو! اتنی رات گئے" آنے والے نے کوئی جواب نہ دیا۔ دبے پاؤں قریب آکر اس کی کلائی پکڑی "چلو یہاں سے" اس جھیل کے پاس" مدھم آواز فضا میں تھرآئی، محبت کے دو گنہگار قیدی اپنے دلوں میں جذباتِ محبت کا بےبہا خزانہ لئے ہوئے جھیل کی طرف بھاگ نکلے۔ ان کے دل احساسِ گناہ سے زور زور سے دھڑک رہے تھے، لبِ جو وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئے، چاندی کی کرنیں میں بھیگی ہوئی نورانی کرنیں ان پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ حسن و محبت کا دیوتا ان پر سایہ کئے ہوئے تھا، ان کے دل ایک دوسرے کی شرابِ محبت میں سرشار سے ہو گئے تھے۔ منو کے جذبات میں بڑی زور و شور کے ساتھ ہل چل مچی ہوئی تھی، اس کے آغوش میں سب کچھ تھا اس نے استوار محبت کی خاطر پیمان وفا باندھا۔ اور کئی پرجوش گرم بوسوں سے اس کے رخساروں اور پیشانی کو عرق آلود کر دیا۔

بالآخر منو کے دل نے جذبات اور فضا سے متاثر ہوکر گناہ کا ارتکاب کیا، ایسا گناہ جس کی تلافی غیر ممکن ہے۔ اس نے حسن کی نازک پنکھڑیوں کو چوما اور مسل کر پھینک دیا۔ شرابِ محبت پینے کے بعد بلوری شیشے کا توڑ دینا آہ کتنی توہینِ الفت ہے جس عشق و محبت کے ہاتھوں اپنی "شکست کی آواز" پر آنسو بہاتا ہوا گھر روانہ ہوا، یہ تھا محبت کا انجام، جو جذبات سے مغلوب ہوکر منو کے ہاتھوں ہوا۔

محبت کا راز بھی کہیں چھپ سکتا ہے، گناہ کا پیالہ آخر چھلک اٹھا۔ دنیا کی نظروں نے انھیں مجرم جانا، اور یہ تاڑ لیا کہ ناز و ایک دن ضرور ماں بنے گی اس کے بڈھے باپ نے اپنی بیٹی کی یہ حالت معلوم کرکے بہت رنج و تاسف کیا، اور اسے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا۔

ناز و، عورت تھی، عورت گناہ کرکے کبھی کبھی پشیمان ہو جاتی ہے، وہ اپنی بدنامی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی رہی، منو کے باپ نے بالآخر بیٹی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اور اپنے بیٹے کو گناہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر کسی عزیز کے پاس ناگپور بھیج دیا۔ بڈھا شیرو اپنی بدنامی کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ موت کا شکار ہو گیا۔ اب ناز و دنیا میں تنہا رہ گئی، شاید مصائب کی کڑیاں جھیلنے کے لئے۔ وہ اپنے آپ کو انتہا درجہ کی بدقسمت اور گنہگار تصور کر رہی تھی، زندگی کی قیمت اس کی نظروں میں قابل وقعت نہ تھی، اس کا دل خودکشی پر مجبور تھا۔ لیکن "ضمیر کی پکار" نے ہمیشہ ناز و کو اس خونیں ارادے سے باز رکھا۔ وہ سخت مصیبت میں گرفتار تھی۔ چند دنوں میں اس کے گناہوں کا راز افشا ہوگا۔ اور ایک جیتی جاگتی "گناہ کی تصویر" اس کی گود میں نظر آئے گی، اس نے چند خطوط منو کے پاس روانہ کئے۔ لیکن منو نے اس کی جانب کوئی توجہ کی اور نہ خط کا جواب دیا، اس نے ارادہ کر لیا کہ کسی طرح وہ منو کے پاس جائے گی جس کی سبب اسے یہ تکلیف لینا پڑے گا۔ ناگپور اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کا پتہ دریافت کرکے رہی، منو جو کبھی اس کا تھا، شہر کی رنگین فضاؤں اور دلچسپ سوسائٹی میں الجھ کر اب بالکل بدل چکا تھا، اور ساتھ ساتھ اس کے خیالات بھی اس نے ناز و کی پریشانی و مصیبت کا اندازہ

گانے کے بعد بھی اپنی مجبوریوں کی آڑ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اور پھر اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

نازو کا دل پیہم صدمات کی وجہ سے مجروح ہو چکا تھا خلاف توقع اس نے اپنے محبوب کو انکاری صورت میں پایا، اس کا نازک دل محبت کی یہ کھلی توہین برداشت نہ کر سکا، وہ اپنے آپ کو اس مطلب پرست دنیا سے نجات دلانا چاہتی تھی، مگر قدرت نے اس کے ذمہ ایک معصوم بچہ کی جان رکھ چھوڑی تھی اس کے ضائع کرنے میں وہ گنہگار سمجھی جائے گی، انتہا درجے کے رنج و غم کے عالم میں وہ ناکام اپنے گاؤں لوٹی۔ اور اپنے رشتہ کی ایک ضعیفہ کے پاس پناہ لی۔

ایک ہفتہ کے بعد اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا لیکن مرا ہوا۔ دو دن تک نازو بے ہوش رہی مرے ہوئے بچے کے زہریلے اثرات اس کے جسم میں سرایت کر گئے تھے، مرنے سے پہلے تب وہ کسی قدر ہوش میں آئی، اس کی سوکھی ہوئی زبان پر منو کا نام تھا، مرنے والی کی یہ انتہا درجہ کی خواہش تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے محبوب کو دیکھ سکے لیکن آہ ایسا نہ ہو سکا۔ وہ اپنے دل میں امید و حسرت کا ایک زبردست خزانہ لئے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے آغوش میں سو گئی۔ دنیا مرنے کے بعد کسی کی قدر کرتی ہے یا اپنے تغافل نما اداؤں پر پشیمان ہوتی ہے۔ یہی حال نازو کا ہوا۔ کہا جاتا ہے اس طرح کا شاندار جنازہ آج تک اس گاؤں میں کسی کا نہیں نکلا۔

منو نازو کے مرنے کے چند ہی دنوں بعد اپنے وطن آیا، اس کے والدین کسی عارضہ میں مبتلا ہو کر اچانک مر گئے۔ اب منو اداس اور تنہا رہنے لگا۔ واقعات نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا۔ ضمیر نے اسے سخت ملامت کی جیسے وہ کوئی زبردست گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ دفعتاً وہ بیمار پڑ گیا، ایسا کہ صحت مند ہونے کے بعد بھی وہ اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکا۔ پاگلوں کی سی حرکتیں اس سے سرزد ہونے لگیں اب اس کی زبان پر ہمیشہ نازو کا نام جاری تھا۔ ایک دن کیا جی میں آیا کہ بیٹھے بیٹھے اس نے جنگل کی راہ لی اور پھر وہیں کا ہو رہا۔ نازو کو مرے ہوئے پانچ بہاریں بیت چکیں۔ مگر اب تک منو اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کی تلافی نہ کر سکا۔

صابر کوسگوی

غزلیں

کھلے جس سے گلہائے امیدواری　　سواری تری ہے کہ بادِ بہاری
جزافزائشِ غم جدا ہو کے تم سے　　ہمیں کیا ملا حاصلِ اشکباری
رضا تیری ثابت ہے میری خوشی سے　　مقدم بہ آئینِ خدمت گزاری
خود ان پر نہیں روشن اے کاش ہوتی　　جو ہے ان کی فرقت میں حالت ہماری
وہ قائم ہیں خوئے تغافل پہ اب تک　　نہ کام آئی حسرت مری بے قراری

(۲)

مصیبت بھی راحت فزا ہو گئی ہے　　تری آرزو رہنما ہو گئی ہے
یہ وہ راستہ ہے دیارِ وفا کا　　جہاں بادِ صرصر صبا ہو گئی ہے
میں درماندہ اس بارگاہِ عطا کا　　گنہگار ہوں اک خطا ہو گئی ہے
ترے رنجبوران محبت کی حالت　　ترے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے
پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرت　　جب اس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے

(۳)

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے　　تمنا کی فصلِ بہار آ رہی ہے
حرم سے ہوا خوشگوار آ رہی ہے　　دوائے دلِ بے قرار آ رہی ہے
ترے کہنہ ملبوس کی دھجی دھجی　　پئے راحتِ جاں بکار آ رہی ہے
کہوں حال کیا اس کی جاں پروری کا　　جو کعبہ سے خوشبوئے یار آ رہی ہے
ہوس دل کی ان سے جدا ہو کے حسرت　　سراسیمہ واشکبار آ رہی ہے

(مرسلہ معین الدین)　　حسرت موہانی

دکن میں اسلامی تعمیر کاری

ماہرین و محققین نے ہندوستانی اسلامی فن تعمیر کی طرزوں کے بے شمار نام بتائے ہیں جو یا تو کسی سلطنت کے نام پر ہیں یا کسی شہر کے نام پر۔ چنانچہ ان کا معتدبہ حصہ دکن سے وابستہ ہے جو آج بہمنی شاہی۔ برید شاہی۔ نظام شاہی۔ عادل شاہی۔ قطب شاہی مغل وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اور ہر ایک طرز ہند کی تاریخ فن تعمیر کے اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

حقیقتاً کسی ملک کی تمام تہذیب و تمدن کا انحصار بھی ان تعمیرات پر ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ' اگر مسلمانوں کی تہذیب کا ہندوستان میں صحیح جائزہ لینا چاہو تو ان کے بنائے ہوئے مقبروں مسجدوں' محلات اور قلعہ جات کو دیکھو جو ابھی تک موجود ہیں۔

علاؤالدین خلجی کی فتح دکن مشہور ہے جس کی یاد میں اس نے قلعہ دولت آباد میں ایک مسجد اور ایک منار تعمیر کیا۔ مینار آج فتح مینار یا چاند مینار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو دور سے نظر آتا ہے غرض کہ یہ ابتدائی عمارات دکن میں عہد اسلامی کی شمار کرنی چاہئیں۔

مگر جب سب سے پہلے بہمنی سلطنت کا قیام گلبرگہ شریف میں مستقل طور پر ہوا جس کی ابتدا علاؤالدین حسن گنگو سے ہوئی تو اس نے ابتدا میں ایک قلعہ بنوایا اور ایک جامع مسجد ۷۶۹ھ میں تعمیر کی جو ابھی تک صدیوں کے دست برد کے باوجود سلامت ہیں۔ اس مسجد کا معمار رفیع بن شمس بن منصور قزوینی تھا۔ یہ عمارات اسلامی فن تعمیر ہند کی اولین یادگاریں ہیں۔ اگر آج یہ خدانخواستہ مٹ جائیں تو اسلامی فن تعمیر کی بہت بڑی کڑی گم ہوجانے کا اندیشہ ہے، جن کو ہم اسلامی ہندوستانی فن تعمیر کے ارتقاء کی حیثیت سے دکن میں ہی مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ یہ ابتدائی آثار خالص اسلامی فنون کے اصولوں پر ہیں جن کے اصل نمونے آج بھی عراق و عجم و توران میں موجود ہیں۔

بہمنی سلطنت جب حسن آباد (گلبرگہ) سے محمد آباد (بیدر) میں منتقل ہوئی تو وہاں سلاطین بہمنی نے تعمیرات کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور نئی نئی عمارات بنا کر چار چاند لگا دئے جو اس وقت تمام عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ان میں خصوصیت سے قابل ذکر احمد شاہ ولی بہمنی کا روضہ ہے اور اس کے گنبد کے اندرونی کتبات سے عیاں ہے یہ نقش و نگار شکر اللہ قزوینی کے تیار کئے ہوئے ہیں جس کا نام اس گنبد کے اندر مکتوب ہے۔ یہ تمام کتبات رسم الخط کے اعتبار سے نسخ، کوفی، ثلث اور طغرہ کی طرزوں پر مشتمل ہیں اور ان کی مثال آج بہت کم ملتی ہے۔ اس قسم کا کام اول مصر و عرب کی عمارات میں ہوا۔ اس کے بعد سمرقند کی عمارات میں نظر آتا ہے اور یہاں بیدر میں یہی نقش و نگار اسی عمدگی سے محفوظ ہیں۔ بیدر میں خواجہ محمود گاواں شہید کے مدرسہ کی طرز تعمیر بالکل سمرقند کے قدیم مدارس و مساجد کی سی ہے اس کی دیواروں پر کاشی کاری کی شان اس کے حسن کو دو بالا کر رہی ہے۔ اس طرح بیدر میں برید شاہی عمارات میں علی برید کا مقبرہ اپنی الگ شان رکھتا ہے جو بلند کرسی پر مکعب نما صورت میں مع اعلیٰ گنبد کے کھڑا ہے۔ اس کے اندر چاروں طرف کھلے کمان دار در ہیں جن کے اندر دیواروں پر کاشی کاری ہے جو عام طور پر عمارتوں کے اندر کم نظر آتی ہے۔ پھر اسی کاشی کاری میں فارسی رباعیات میں چاروں طرف کتبات ہیں جن کا رسم الخط نسخ اور نستعلیق کے رہین ہے۔

اگرچہ بیجاپور اس وقت ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہے مگر مجموعی حیثیت سے اس کا دکن کے اسلامی فن تعمیر میں ضرور شمار ہے۔ وہاں ابراہیم عادل شاہ کا مقبرہ، مسجد اور محمد عادل شاہ کا گول گنبد قابل ذکر ہیں خصوصیت سے موخر الذکر اپنی فنی خوبیوں کے

اعتبار سے بول یا بولی گنبد کے نام سے ضرب المثل ہے۔ اور اصحاب فن حیران ہیں کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا گنبد بغیر کسی اندرونی گنبد کے اپنے اتنے بڑے قطر اور ارتفاع کے ساتھ صدیوں سے صحیح و سالم کس طرح کھڑا ہے۔ اس کا مقابلہ روما کے پانتھیوں سے کیا جاتا ہے مگر وہ بھی اس کی بلندی اور محیط کو نہیں پہونچتا۔

قطب شاہی سلاطین کا پایہ تخت گولکنڈہ تھا جو دراصل پہلے بہمنی سلطنت کا ایک صوبہ تھا سلطان قلی قطب شاہ متوفی سنہ ۹۵۰ھ نے اس کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے سلاطین نے بھی خاص قطب شاہی فن تعمیر سے اس مقام کو بہت فروغ دیا۔ یہاں کے مقابر کے شاندار گنبدوں کی وجہ سے اس طرز کا نام قطب شاہی مشہور ہوگیا ہے۔ شاہان قطب شاہیہ کی دو عمارات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کی مثال تمام عالم میں کبھی نہیں ملے گی چنانچہ ان میں ایک تو چار مینار کی مشہور عمارت ہے جو اس وقت تمام دنیا میں حیدرآباد کا صحیح ملکی نشان بن چکی ہے اس کی فنی اور ظاہری خصوصیات کو مدنظر رکھ کر تاجدار دکن نے اپنے سکہ جاریہ اور ڈاک کے ٹکٹوں پر اسی کی تصویر اپنا امتیازی نشان تجویز کیا جس طرح تمام عالم میں مصری ابوالہول اور اہرام مصری مصر کے نشان بن چکے ہیں۔ اس کی بنا سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۹۹۹ھ میں رکھی اور اس کی تکمیل سنہ ۱۰۰۰ھ میں ہوئی جو لفظ یا حافظ سے ماخوذ ہے اس کی استرکاری ملک کے صحیح بہی خواہ نواب سالار جنگ بہادر نے سنہ ۱۳۰۰ھ میں از سر نو کی۔ سلاطین قطب شاہیہ نے اسی ماحول کو دیکھ کر اس کے گرد چار سوق ارفع کمانداز قایم کیا۔ اس دور کی دوسری عمارت جو فن تعمیر میں بین الملی درجہ رکھتی ہے، وہ بادشاہی عاشور خانہ ہے جسے سنہ ۱۰۰۲ھ میں سلطان قلی قطب شاہ نے تعمیر کرایا اور بعد ازاں عبداللہ قطب شاہ نے سنہ ۱۰۶۰ھ میں دیواروں پر کاشی کاری کرائی۔ چونکہ سلاطین قطب شاہیہ ائمہ معصومین سے عقیدت رکھتے تھے اس لئے حسنین علیہ السلام کی عزاداری کی خاطر ایسے عاشور خانے قایم کئے آج اگر اس ضمن میں کچھ لکھنا مقصود ہوگا تو اسی عاشور خانے کا تذکرہ لابدی ہوگا کیونکہ اس سے قبل ایسی کوئی عمارت ہمیں نہیں ملتی اس سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح علم بٹھاتے اور اٹھاتے تھے کس طرح بادشاہ وقت ایسے موقعوں پر برآمد ہوتے اور کس طرح سوزخواں سوزخوانی کرتے غرض کہ ابھی تک یہ قدیم علم مع ان سلاطین کے اسماء کے کتبات کے موجود ہیں۔ یہ تمام نظم و نسق اس تعمیر میں مضمر ہے۔

مغلوں کا دور دکن میں دراصل اورنگ زیب سے شروع ہوتا ہے اور تعمیرات کے ضمن میں کوئی خاص امر قابل بیان نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اس دور کی ایک خصوصیت مابہ الامتیاز نظر آتی ہے وہ اورنگ آباد میں رابعہ دورانی دلرس بانو بیگم زوجہ اورنگ زیب کا مقبرہ ہے اگر تاج محل آگرہ یعنی مقبرہ والدین اورنگ زیب کے متعلق لکھنے والے محقق کو اس کے بیان کی تکمیل مقصود ہو تو اس کے لئے اس روضہ کا مشاہدہ لازمی ہوگا جو بالکل تاج محل آگرہ کی نقل ہے اگرچہ اس سے ادنیٰ ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تاج کا معمار احمد لاہوری تھا تو ہمیں ایک گونہ مسرت ہوگی کہ یہ روضہ دلرس بانو اس کے لڑکے عطاء اللہ کا تعمیر کردہ ہے جس کا نام روضہ کے دروازہ پر پیتل میں کندہ ہے۔

مغلوں کے بعد آصف جاہی دور میں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں مگر سلطان العلوم کی مساعی جمیلہ قابل صد فخر و مباہات ہیں جن میں عمارت عدالت العالیہ شفاخانہ، سٹی کالج وغیرہ بہت عمدہ ہیں مگر تیھسر گٹی کا نو تعمیر شدہ بازار زیادہ اہم ہے جس کا مقابلہ غیر ممالک کا سیاح لندن کی ایجنٹ اسٹریٹ اور وینس کے

سنٹ مارکو کے سامنے کے مکانات سے کرے گا۔ اسی طرح عمارت جامعہ عثمانیہ جو اس وقت بفضل ایزدی پایۂ تکمیل کو پہونچکر اس ملک کی تاریخی عمارات میں ایک معتدبہ اضافہ ثابت ہو رہی ہے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث نظیر نہیں رکھتی غرض کہ جس طرح یہ جامعہ تعلیمی اعتبار سے بالکل امتیازی صورت رکھتی ہے اس طرح فنی اعتبار سے بھی اپنی آپ نظیر ہے۔ اس عہد میں ... مصری اور ہسپانی طرزوں کے بھی بہترین نمونے یہاں ملتے ہیں آقائے ولی نعمت سلطان دکن نے اپنی ذات کے لئے ایک مسجد مصری طرز پر تیار کروائی ہے جو باغ عامہ میں ہزارہا زائرین کا مرجع ہے اس کو دیکھکر مصر کی مساجد کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، وہی صفائی۔ وہی پہل دار گنبد۔ وہی نازک طاقچے غرض کہ تمام مصری لوازمات موجود ہیں۔ اس مسجد کے قریب دوسری ہسپانی طرز کی عمارت میں وہی گھر یا محرابیں اور وہی گچ میں نفیس نقش و نگار نظر آئیں گے۔

اگر یورپ کی تمام جدید ترایجادات تعمیرات کا انہیں روایات پر صحیح مشاہدہ مقصود ہو تو ہندوستان سے سفر کر کے یہاں آکر یہاں کے جدید مکانات کو دیکھنا چاہئے۔ یعنی وہی مکعبیت (Cubism) جس کا انحصار زیادہ تر ری انفورسڈ کنکریٹ پر ہے اور وہی فلش سسٹم ہے

اخیر میں نہایت فخر سے کہنا چاہیے کہ قدیم۔ قرون وسطی و جدید فن تعمیر کی تمام طرزیں اپنے اصلی روپ میں نظر آئیں گی جو دیگر حصص ہند میں نہیں ملیں گی غرض یہاں تمام تاریخ فن تعمیر ابتدا سے لے کر آج تک مسلسل اپنی اعلیٰ حالت میں مشاہدہ و مطالعہ میں آئے گی اور یہ سب خوبیاں سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے عہد زرین کی بہترین یادگاریں ہیں۔

عبداللہ چغتائی

غزل

ہم بزم میں تیری کبھی آیا نہ کریں گے
اظہارِ وفا سے تجھے رسوا نہ کریں گے

ہو جاتی کچھ اور بھی وحشت میں ترقی
آغاز میں انجام کو سوچا نہ کریں گے

اک دھن میں پہونچ جائیں گے منزل پہ اپنی
دیوانے تری راہ میں بھٹکا نہ کریں گے

مرضی جو یہی ہے تری اے رنگ خموشی
شکوہ کبھی تجھ سے لب گویا نہ کریں گے

جب طاقتِ دیدار نہیں طالبِ دیدار
بھولے سے ترے سامنے آیا نہ کریں گے

مٹ جائے نہ اشکوں سے کہیں داغِ محبت
مایوس محبت کبھی رویا نہ کریں گے

کیا ہو نہ ملے پھر بھی اگر منزلِ مقصد
یہ سوچتے میں حال گدا یا نہ کریں گے

یہ عہد ہے میخانہ میں ساقی سے ہمیں کا
پی جائیں گے لیکن کبھی بہکا نہ کریں گے

میر حسن علیخان تمیز

حسین تعارف

(ایک بیلڈ (Ballad) مسوری کی پہاڑیوں میں)

"پلاٹ" بکھرے ہوئے ہیں مرے فسانوں کے
وہاں مسوری سے کچھ دور ۔ کوہساروں میں
وہاں دیہات کے معصوم ماہ پاروں میں
وہاں خموش گر دل نشیں نظاروں میں
حسین نظم کے عنوان پائے جاتے ہیں

عروس صبح کی انگڑائیوں میں رقصِ شباب
شعاع مہر کی رعنائیوں میں رنگ شراب
سنہرے چاند کی پرچھائیوں میں حسن کا خواب
قسم ہے ایسی بہاریں کبھی نہیں دیکھیں

وہاں کا منظرِ جنت بدوش کیا کہنا!
وہاں کا نغمۂ فردوس گوش کیا کہنا!
وہاں فرشتوں کا رقصِ خموش کیا کہنا!
کوئی کسانوں کا چھوٹا سا گاؤں بستا ہے

وہیں پہ رقص کناں جوئے بار کی جانب
وہیں پہ نغمہ بہ لب آبشار کی جانب
وہیں پہ وادئی فردوس زار کی جانب
وہاں پہاڑی پہ میں نے کسی کو دیکھا ہے

حسین انچے پہ افشاں سی جھلملائے ہوئے
حنائے شوخ کفِ ناز میں لگائے ہوئے
سفید ساری پہ توس قزح بنائے ہوئے

بساطِ راہ پہ اس طرح چل رہی تھی وہ
کہ جیسے سیر میں مصروف ماہ تاباں ہو
جلو میں زہرۂ زریں قدم بھی رقصاں ہو
فضاؤں میں متحرک ربابِ پنہاں ہو
بڑی ادا سے وہ جانِ ادا خراماں تھی

کبھی کلائی کو آنچل سے اپنے موڑ لیا
کبھی تو تالی بجانے کو ہاتھ جوڑ لیا
کبھی تو راہ کا رنگین پھول توڑ لیا
کچھ اس طرح تھی خراماں حسینۂ معصوم

کہ جیسے حسن کے ہر رسم و راہ سے محروم
کہ جیسے جلوہ کسی جلوہ گاہ سے محروم
کہ جیسے ایک جوانی گناہ سے محروم
غرض کہ میں نے یہ پوچھا تمہارا نام ہے کیا؟

تمھیں کو لوگ بہشتِ خیال کہتے ہیں؟
تمھیں کو زہرہ و پرویں جمال کہتے ہیں؟
تمھیں سے لوگ محبت کا حال کہتے ہیں؟
دیا یہ مجھ کو ذرا مسکرا کے اس نے جواب

نہ جانے پوچھا ہے کیا کیا۔ رکو! بتاتی ہوں!
یہاں پہاڑی پہ میں گھومنے کو آتی ہوں!!
میں اپنے گاؤں میں چمپا پکاری جاتی ہوں!!!

وہی جو گاؤں میں اک شاہکارِ فطرت تھی
سلام! اصل میں نا واقفِ "محبت" تھی!!

سلام
(مچھلی شہری)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

(مولوی مشتاق حسین کا خط
مولوی حسین عطاء اللہ کے نام)

جناب مخدومی و مکرمی سلمکم!

تسلیم۔ آج رمضان کی اکیسویں تاریخ ہے اور مجھ کو رمضان کے آخر پر جو ایک سخت ضرورت ادائے زر امانت کی پیش آنے والی ہے اوس کا زمانہ بہت ہی قریب رہ گیا اور ہر ایک ضرورت پر جس کا اظہار میں اپنے سابقہ عریضہ میں کرچکا ہوں یہ ضرورت مقدم ہے یہ رقم چار ہزار کلدار کی ہے اور اوس کے بعد دوسرے نمبر پر میرا بنگلور کا سفر ہے اسی سفر میں مجھ کو گورنر صاحب مدراس اور چیف جسٹس صاحب سے بھی ملنا ہوگا جہاں وہ ہوں گے اور جس کے مصارف کا تخمنہ ایک ہزار روپیہ میں نے بہت ہی اعتدال کے ساتھ لکھا ہے یہ ضرورت اگرچہ ادائے امانت کے مقابلہ میں دوم نمبر کی ہے لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک ذریعہ اس بات کا ہے کہ آئندہ محمد احمد کے مصارف سے مجھ کو سبکدوشی حاصل ہو جسکے بعد میری آمدنی میرے مصارف کے لئے اچھی خاصی طرح کفایت کرے گی سب سے مقدم ہے نمبر ۳ پر میرے باقی اور قرضوں کی ادائی ہے اور وہ بھی سب ایسے ہیں کہ اپنے اپنے وقت ادا پر وہ بھی میرے لئے سوہان روح ہوں گے۔

یہ مجھ کو کامل یقین ہے کہ آپ کی اور جناب رائے صاحب کی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوا ہوگا لیکن تاہم نتیجہ ایک امر تقدیری ہے اور اوس پر کسی کا قابو نہیں ہے لہذا میں بہت ہی مشکور ہونگا اگر بمجرد ملاحظہ عریضہ ہذا مجھ کو تار پر نتیجہ سے اطلاع مل جاوے تار میں کاتب کا کوئی نام جو آپ مناسب سمجھیں کفایت کرے گا اور مکتوب الیہ محمد عصمت اللہ بی اے امروہہ ٹیلی گراف آفس۔

اگر امید منظوری ہے تو یہ لکھنا کفایت کرے گا کہ "حکیم صاحب کی فیملی خیریت سے ہے" اور بصورت مایوسی یوں لکھ دیجئے کہ "یہاں کے کالج سے آپ کو سارٹیفکٹ نہیں مل سکتا" یاس میں بھی ایک قسم کی راحت ہے میرا یہ عریضہ آپ کو غالبًا ۱۱ مارچ کو ملے گا مطابق ۲۵ رمضان اور اوسکے دوسرے روز امید ہے کہ آپکا تار کسی نہ کسی طرح کا مجھ کو مل جاوے گا۔ اوسوقت بصورت مایوسی میں کوئی دوسری فکر اسی　　کے انتقال وغیرہ کے شروع کروں گا تاکہ عید کے تعطیل میں میں اوس طوفان کا مقابلہ کرسکوں جو کہ پیش آنے والا ہے لوگوں کو خوشی ہے کہ رمضان اب عنقریب ختم ہوگا اور عید آوے گی اور میرا خون خشک ہو رہا ہے۔

جناب رائے صاحب کے خدمت میں بھی مضمون یہی ہے اور اگر اس عرصہ میں آپ کو کوئی قطعی جواب مرحمت فرما دیا ہو جو کہ مجھ کو ۲۵ رمضان سے پیشتر ہی مل سکے گا تو پھر کسی تار کے ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں اس تکلیف دہی کی جسکے سوا کوئی چارۂ کار مجھ کو نظر نہ آیا معافی چاہتا ہوں اور خداوند تعالیٰ جل شانہٗ سے آپ کی خیر و عافیت اور کامیابیوں کا خواہاں ہوں۔ والتسلیم

خاکسار

مشتاق حسین

کونین

تقریباً ۳۰۰ سال قبل کا ذکر ہے کہ جنوبی امریکہ سے "ارائیو" نامی ایک شخص سیر و سیاحت کو نکلا دوران سفر میں اس کو دلدلی زمین، پہاڑ اور مرطوب ہوا سے گزرنا پڑا جس کی وجہ سے اس کو جاڑے کے ساتھ بخار آیا اور وہ ایک نالے کے کنارے درختوں کے سایہ میں بے یار و مددگار پڑا رہا۔ مسلسل دو روز تک وہاں خوب آندھی اور طوفان رہا جس کی وجہ سے نالے کے کنارے اکثر درخت اکھڑ کر نالے میں گر پڑے۔ تیسرے دن آندھی کے اختتام پر "ارائیو" کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے نالے کا گدلا پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی اور اسی نالے کے کنارے پڑا رہا۔ ہر روز نالے کا گدلا پانی پینے کی وجہ سے اس کے بخار کا بہت تھوڑے عرصہ میں استیصال ہو گیا اور پھر وہ اپنے پروگرام کے مطابق سفر کرنے لگا۔

جب "ارائیو" سفر سے گھر لوٹا تو اس نے وہ تمام باتیں اپنے گھر والوں سے بیان کیں جو اس کو دوران سفر میں پیش آئی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ کس طرح ایک قسم کے درخت کے نالے میں گرنے سے نالے کا پانی گدلا ہو گیا۔ جس کو پی کر اس نے بخار سے نجات حاصل کی۔ دوسرے دن "ارائیو" کے باپ نے اس نالے کا پتہ لگا کر یہاں سے گدلا پانی ایک گھڑے میں بھر کر گھر لایا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد "ارائیو" کی والدہ مرض ملیریا میں مبتلا ہو گئی تو اس کو بھی یہی پانی پلایا گیا جس سے اس کو صحت ہو گئی علاوہ ازیں انھوں نے آس پاس کے دیگر بخار کے مریضوں کو بھی یہی پانی پلایا جس سے ان کا بخار بھی جاتا رہا۔

جب گھر لایا ہوا پانی ختم ہو گیا تو "ارائیو" کر اس نالے پر گیا گر اس مرتبہ نالے کا پانی بالکل صاف و شفاف تھا کیونکہ نالے میں پڑے ہوئے پہلے کے درختوں کی تمام چھال نکل گئی تھی لہذا اس نے اس قسم کے درختوں کا سراغ لگایا اور ان کی چھال نکال کر گھر لے گیا۔ گھر جانے پر جب اس نے چھال کو پانی میں ڈال دیا تو اس پانی کا رنگ بھی نالے کے سابقہ پانی کی طرح میلا ہو گیا تھا جب "ارائیو" اور اس کے پڑوسیوں کو اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ یہ پانی ملیریا کے لئے مجرب ہے تو انھوں نے اس کو اپنے ہی تک محدود رکھا۔

۱۶۲۸ء میں اسپین کا ایک زمیندار کاونٹ سنکوناع اپنی بیوی کے یہاں آیا اس کی بیوی نہایت ملنسار اور ہر دلعزیز تھی۔ یہ غریبوں پر بہت مہربان تھی اور اکثر اوقات ان کی مدد بھی کرتی تھی۔ اتفاقاً بیگم کاونٹ مرض ملیریا میں مبتلا ہو گئی اور روز بروز مرض بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ مقامی لوگوں نے بیگم سے چھال کی خوبیاں بیان کیں اور چھال اس کے حوالہ کر دی۔ جب بیگم کاونٹ نے چھال کا پانی استعمال کیا تو "ارائیو" کی طرح اس کا بخار بھی جاتا رہا۔ اور بیگم کاونٹ بھی چھال کی خوبیوں کی معترف ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد جب اسپین کے لوگ یہاں آئے تو بیگم کاونٹ نے انھیں اس کی خوبیوں سے آگاہ کیا۔ اس کے چند سال بعد یعنی ۱۶۳۳ء میں بیگم کاونٹ اسپین واپس گئی اور اپنے ساتھ چھال بھی لیتی گئی۔ کیونکہ اسپین میں ملیریا کی عام شکایت تھی۔ چونکہ سب سے پہلے اسپین میں اس چھال کو کاونٹ

سنکونا لے گیا تھا اس لئے اسپین میں یہ سنکونا کی چھال کے نام سے مشہور تھی اور آئندہ چل کر اسی نام سے ساری دنیا میں بھی مشہور ہو گئی۔ سنکونا کے درخت زیادہ تر پیرو، ایکوپڈور اور کوہ انڈیز کی ڈھلانوں پر سطح سمندر سے ۳۰۰۰ تا ۹۰۰۰ کی بلندی پر پیدا ہوتے ہیں اسی درخت سنکونا کی چھال سے "کونین" تیار کی جاتی ہے۔ جو آج کل ملیریا کے اندفاع کے لئے بہ کثرت استعمال ہوتی ہے۔

پہلے پہل ہندوستان میں اس درخت کو ۱۸۳۵ء میں ڈاکٹر رئیلے لایا تھا اور اسی نے ہندوستان میں اس کی کاشت کی بنیاد رکھی۔ پہلی مرتبہ اس کے صرف ۲۰ یا ۴۰ درخت حاصل ہوئے مگر ۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۸ء میں اس کی کاشت ۶۴۴۳ ایکڑ زمین پر کی گئی مگر چائے اور کافی کی طرح زیادہ نفع دینے والی ثابت نہ ہوئی جس کی وجہ سے اس کی کاشت پر زیادہ لوگوں نے اپنی توجہ مبذول نہ کی۔

مذکورہ بالا سوانح عمری اس "کونین" کی ہے جس کو آج کل ہم لوگ ملیریا کے انسداد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جس کا مزہ کڑوا ہوتا ہے مگر حلق سے اترتے ہی ہماری امداد پر تل جاتی ہے۔

محمد عبد القادر فاروقی

مغربی تصانیف کے اردو تراجم

مرتبہ جناب میر حسن صاحب ایم اے۔ اردو زبان میں سنجیدہ تصانیف کے آغاز کے ساتھ ہی مغربی زبانوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اور اس وقت اس میں ان تراجم کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے، لایق مولف کی تلاش و تحقیق سے جہاں تک پتہ چل سکا ہے، انھوں نے اس کتاب میں ان ترجموں کو جمع کر دیا ہے، فورٹ ولیم کالج کے زمانہ اٹھارویں صدی سے اس وقت تک چار دور قائم کئے ہیں اور ہر دور کے ماتحت اس عہد کی انفرادی اور جماعتی کوششوں یعنی اشخاص اور علمی اداروں کے تراجم کا ترتیب کے ساتھ ذکر ہے، ابتدائی دور کے ترجموں پر مختصر تبصرہ اور بعض کے نمونے بھی دیدیئے ہیں، مختلف فہرستوں خصوصاً سجاد مرزا بیگ کی الفہرست میں کافی ترجموں کا ذکر ہے لیکن اس استیعاب کے ساتھ یہ پہلی کوشش ہے اور بڑی حد تک کامیاب ہے، یہ موضوع ایسا ہے کہ ممکن ہے کچھ ترجمے مرتب کے علم میں نہ آ سکے ہوں، جن کے اندراج کی بعد میں گنجائش باقی ہے، کتاب کے شروع میں ایک مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے۔ معارف اعظم گڈھ

مئی ۱۹۴۰ء

اردو مثنوی کا ارتقاء

جس کے مصنف عبد القادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ استاد ادب اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہیں اس کتاب کو بھی ادارہ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے جس کی قیمت عہ ہے۔

مصنف نے کتاب کو مختلف ابواب میں منقسم کر کے مثنوی کا درجہ اس کے ابتدائی اور متوسط اور جدید دور پر جامع اور مفصل بحث کی ہے اور سابق بادشاہوں کے عہد میں ان کی ارتقائی کیفیات کو مثالیں دے کر سمجھایا ہے، یہ ایسی جامع اور مکمل تصنیف ہے جس کا مطالعہ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے از بس ضروری ہے، اس کے لایق اور قابل مصنف اپنی تحقیق کے لئے قابل صد ستائش ہیں۔

رہنما مراد آباد

اپریل ۱۹۴۰ء

صنعتی انقلاب انگلستان کے اثرات

انقلاب و ارتقا ہم معنی الفاظ نہیں۔ ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ سب سے بڑی چیز جو ان دونوں میں مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انقلاب یکایک ہوجاتا ہے اور اس کی پیشین گوئی اور وقت کا تعین بہت مشکل ہے اس کے برخلاف ارتقا ایک تدریجی ترقی کا نام ہے۔ جس سے ہر شخص باخبر رہتا ہے اور اس کی ابتدا و انتہا کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس تشریحی تمہید کے بعد جب ہم صنعتی انقلاب انگلستان کی وجہ تسمیہ پر غور کرتے ہیں تو بڑا تعجب ہوتا ہے کیونکہ یہ صنعتی انقلاب جو انگلستان میں اٹھارویں صدی میں واقع ہوا نہ تو کوئی آسمان سے برسی ہوئی چیز تھی اور نہ چند دنوں یا مہینوں کی پیداوار۔ حقیقت یہ ہے کہ سالہا سال کے گزر جانے کے بعد بھی یہ پایہ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔ اس کی ابتدا سنہ ۱۷۵۰ء سے ہوئی جب کہ ایسی ایجادیں شروع ہونے لگیں جن کی مدد سے انگلستان کی صنعتوں کو بہت جلد فروغ و ترقی ہوئی۔ اور کہیں پچاس سال کی مدت میں یہ اس قابل ہوا کہ اس کے لئے لفظ تکمیل کچھ صحت کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بعض معاشئین کے خیال میں تو یہ انقلاب ایک لا متناہی عرصہ تک جاری رہا اور بعض کے خیال میں اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور اس زمانہ کی ہر وہ ایجاد جو صنعتوں کے لئے فائدہ مند ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قبول تعین مدت سو سال کی ہے جو سنہ ۱۷۶۰ء سے (جب کہ کوئلہ سے تپانے کا طریقہ ایجاد ہوا) شروع ہو کر سنہ ۱۸۴۰-۶۰ء (جب کہ پہلی بار پہلی بڑی ریلوے اسکیم روبہ عمل لائی گئی) میں ختم ہوتی ہے۔

جب اصل واقعہ یہ ہے تو اسے انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں نہ اسے ارتقا ہی کے نام سے موسوم کیا جائے؟ تاریخ عالم کے مشہور انقلابات کو لیجئے اور ان کا مقابلہ اس سے کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کہاں تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انقلاب فرانس سنہ ۱۷۸۹ء سب سے اچھی مثال ہوگی۔ اس کی پوری عمر چند ماہ سے زائد نہ تھی۔ اس کی پیشین گوئی کسی نے کی ادنیٰ کو قبل وقوع اس کا گمان تھا۔ لیکن انگلستان کے صنعتی انقلاب کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بایں ہمہ اسے بھی انقلاب کہا جاتا ہے۔ کیوں؟

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اسے ٹون بی Toynbee نے غلطی سے انقلاب کا نام دیا۔ غالباً اس کو اس کے ہمہ گیر دور رس اور ان گنت اثرات کی وجہ سے انقلاب کہا جاتا ہے۔ بعض معاشئین تو انگلستان کی ہر ترقی کو اس پر محمول کرتے ہیں انگلستان کی کثرت دولت کا سبب اس کو قرار دیتے ہیں۔ اس کی وسعت مملکت کا ذریعہ اسی کو بتلاتے ہیں اور یہاں تک کہ ان کے خیال میں علوم و فنون کی ترقیاں اور تہذیب و تمدن کا ارتقا اسی کا نتیجہ ہے۔

بالفاظ دیگر صنعتی انقلاب انگلستان اپنے اثرات کے باعث ہی انقلاب کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے اثرات جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے بہت ہی دیرپا، دور رس اور ان گنت تھے چنانچہ زندگی کا ہر پہلو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے اثرات سے متاثر ہوا۔ اور مملکت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو اس کے اثر سے بچ سکا۔

مختصر یہ کہ اس کی بدولت صنعت پارچہ بافی اپنے معراج کمال کو پہونچ گئی۔ نئی نئی ایجادوں کی وجہ سے کم قیمت اور کم وقت میں بہتر و نفیس کپڑا تیار ہونے لگا۔ حرکت دینے والی قوت (Motive power) میں جو تغیرات وایجادات ہوئیں وہ بھی صنعتوں کی ترقی کے لئے بیحد ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ اس وقت ہم سات قسم کی قوتوں سے واقف ہیں (۱) انسان (۲) جانور (۳) پانی (۴) ہوا (۵) بھاپ (۶) گیاس (۷) برق۔ صنعتی انقلاب تک صرف اول الذکر چار قوتوں سے دنیا روشناس تھی۔ لیکن آخری تین قوتوں کا انکشاف جو انقلاب ہی کے باعث رونما ہوئیں، موجودہ مشنری کو معرض وجود میں لایا۔

لوہے اور کوئلہ کی صنعت نے بھی بیحد ترقی کی جب لوہے کو کوئلے سے تپانے کا طریقہ معلوم کر لیا گیا تو اس صنعت کی ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی۔ لوہا اور کوئلہ خود ایک دوسرے کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئے۔

علاوہ ازیں چینی اور مٹی کے برتنوں (China Earthenware) کی صنعت نے بھی بہت کچھ ترقی کی۔ کیمیاوی تجربات (chemical processes) بھی ترقی سے محروم نہ رہے کلورین گیاس کے انکشاف نے کپڑوں کی صفائی میں بڑی سہولت پیدا کر دی۔ جس کی مدد سے رنگوائی وغیرہ آسانی سے ہونے لگی۔

ان کے علاوہ حمل ونقل کے طریقوں میں بھی بہت سی مفید تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ سڑکیں اور نہریں نہ صرف درست کی گئیں بلکہ نئے نئے تعمیری کام بھی کئے گئے۔

انگلستان کا یہ حقیقی انقلاب بذات خود اور تین انقلابات کا پیش خیمہ بنا۔ اول یہ کہ صنعتی و معاشی نقطۂ نظر سے اس نے انگلستان میں موجودہ معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ جس کو نظام سرمایہ داری کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے انگلستان کے تجارتی مسلک کی بھی کایا پلٹ کر دی۔ جس کی وجہ سے پرانے "نظام تجارت" (Merchantalism) کی جگہ "عدم مداخلت" (Laisse Faire) نے لے لی۔ تیسرے یہ کہ یہ صنعتی انقلاب زرعی انقلاب کا بھی محرک ہوا جس کے تحت زمین داری و کاشتکاری میں نئے نئے اصول رائج کئے گئے۔

اس انقلاب کے چند برے نتائج بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً گاؤں ویران ہونے لگے۔ شہر آباد ہوتے گئے۔ جس کی وجہ سے صفائی کا کم خیال رکھا جانے لگا اور مشینوں کی بدولت بے روزگاری عام ہوتی گئی۔ مزدوری بھی کم دی جانے لگی۔ عورتوں اور بچوں سے زیادہ کام لیا جانے لگا۔ اموات خصوصاً بچوں کی اموات کا اوسط بڑھنے لگا۔ کارخانہ جات نے گھریلو صنعت پر فوقیت و تسلط پاتے ہی "خاندانی" زندگی کو تباہ کر ڈالا۔ اور سب سے زیادہ اس انقلاب نے مزدور اور آقا میں ایک لامتناہی جنگ چھیڑ دی جس کا حل دنیا اب تک معلوم نہ کر سکی۔

لیکن مجموعی حیثیت سے یہ انقلاب بہت سود مند ثابت ہوا۔ اس کی بدولت انگلستان میں ایک متوسط طبقہ پیدا ہوگیا جو انگلستان کی ترقی کا بڑی حد تک ضامن ہے۔ اس انقلاب ہی کی بدولت انگلستان کی دولت، ثروت، سطوت، وسعت، تجارت، صنعت و حرفت اور تمدن و معاشرت میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس کو دنیا کے سب سے بڑے ممالک میں شمار کیا جانے لگا۔ بعض کم فہموں نے انگلستان کی تجارتی ترقی کو

حقارت کی نظر سے دیکھا اور نپولین نے تو اہل انگلستان کو ایک "تجارت پیشہ گروہ" کے ادنیٰ نام سے یاد کیا۔ مگر یہ یاد رہے کہ انگلستان کی اس تجارتی ترقی ہی نے اس کو نپولین کے مقابلے میں کامیابی عطا کی۔

آغا محمد بیگ

تفسیر بیان للناس

قرآن مجید کی بے شمار تفاسیر کے ہوتے ہوئے بظاہر کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ تھی لیکن ذرا تامل کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً ہر تفسیر تفسیر قرآن ہونے کی بجائے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور معتقدات کی تفسیر ہے۔ ہر مصنف نے آیات قرآنیہ کو اپنے ہی مذہب کے ائمہ واجلہ کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے (الا ماشاءاللہ) قرآن کو کہ قول الٰہی ہے، آیات قرآنی اور صحیفہ فطرت (کہ فعل الٰہی ہے) کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی تصنیف کو اس کے مصنف کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔ بس یہی ضرورت تھی جو محرک ہوئی تفسیر پیش نظر کے وجود میں آنے کی۔ قدما میں بھی خال خال ایسے لوگ نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے احول کے لحاظ سے نہایت قابل قدر تفسیریں لکھیں، لیکن چونکہ قرآن ایک مخصوص ماحول کا پابند نہیں۔ کسی خاص فرقہ کے خیالات کا آئینہ دار نہیں۔ کسی متعین زمانہ اور محدود ملک کی ضرورتوں کا متکفل نہیں اس لئے ضرورت تھی کہ عصر حاضر تک کی ترقی علوم و تجارب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ایک عمیق مطالعہ تمام کائنات انسانی کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس اس تفسیر میں یہ چھ خصوصیتیں ہیں جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) اس کے مخاطب بلا لحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔

(۲) اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو۔

(۳) ترجمہ میں سب سے پہلے اصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۴) اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے جو محکمات سے واضح ہے۔

(۵) اس کے ساتھ ہی سنت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے۔

(۶) قانون وراثت کا احیا۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا دبیز۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ باوجود ان تمام ظاہری و باطنی محاسن کے قیمتیں نہایت مختصر یعنی:- منزل اوّل صفحات ... مجلد سنہری (۳ روپے) منزل دوم (عہ) منزل سوم (عہ) منزل چہارم (عہ) منزل پنجم (عہ) منزل ششم (عہ) منزل ہفتم (عہ)

منگانے کا پتہ

دفتر امت مسلمہ امرتسر

ناروے کا حشر

اِس خطا پر اُسے مارا کہ خطا وار نہ تھا

اگر موجودہ جنگ میں جرمنی کے طرز عمل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اتحادیوں پر سامراج کا الزام لگانیوالا جرمنی خود ہوس ملک گیری کا شکار ہو رہا ہے۔ اس نے کبھی طاقتور ملکوں پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کی بلکہ ہمیشہ کمزور اور بے بس قوموں کا خون چوسا جو ملک پہلے ہی سے نازی اِستبداد سے خائف ہو کر غیر جانبداری کا اعلان کر چکے تھے اور جنہوں نے کبھی جرمنی کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا جرمنی نے "خوے بد را بہانہ بسیار" کے مصداق کوئی نہ کوئی بہانہ ان پر قبضہ کرنے کے لئے تراش ہی لیا اور ان پر چڑھ دوڑا۔ بالکل یہی طرز عمل جرمنی کا ناروے کے ساتھ بھی رہا۔ اس پر یہ الزام لگا کر کہ وہ صحیح معنوں میں غیر جانب دار رہنے کے قابل نہیں ہے جرمنی نے اسے اپنے آغوش عافیت میں لے لینے کا تہیہ کرلیا۔

جنگ یورپ کی ابتدا کے ساتھ ہی ناروے نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا اور اس نے قولاً و فعلاً انتہائی احتیاط کے ساتھ غیر جانبداری کے تمام قوانین کی پابندی بھی کی۔ اپنے سمندر کو متحاربین کی ساری جائز جہاز رانی کے لئے کھلا رکھا۔ اور وہ برطانیہ اور جرمنی ہر دو کے ساتھ تجارت کرتا رہا۔ لیکن اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناروے کے مغربی ساحل یعنی ناروے کی تنگنائے یا محفوظ راستہ میں سے جرمن جنگی اور دیگر جہاز ناروے اور سویڈن کے سمندروں میں سے اتحادیوں کی ناکہ بندی کے باوجود گذرنے لگے۔

اس راستہ کا وجود اور ناروے کی غیر جانبداری اتحادیوں کے لئے بہت نقصان رساں اور جرمنی کے لئے بہت ہی فائدہ بخش ثابت ہوئی۔ جرمنی اس طریقہ سے گویا اتحادیوں کی ناکہ بندی کو شکست دینے میں ایک حد تک کامیاب ہو رہا تھا۔ چنانچہ ناروے کی اس غیر جانبداری کا نتیجہ یہ تھا کہ ناروے سے مختلف قسم کا خام مال اور خاص طور پر خام لوہا جرمنی پہنچ رہا تھا۔ یہ اتحادیوں کو کس طرح گوارا ہوتا۔ انہوں نے اس کو روکنا چاہا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اتحادیوں نے ناروے کے سمندر میں بعض مقامات پر اچانک سرنگیں بچھادیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض بڑے جرمن جہاز اس سمندر میں ڈوب گئے لیکن اتحادیوں کے سرنگ بچھانے کی وجہ سے ناروے کی حکومت کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ اتحادیوں کے مقاصد کو نہ سمجھ سکا ناروے نے اسے بین قومی قانون اور غیر جانبداری کی بالجبر خلاف ورزی پر محمول کیا اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی چنانچہ اس نے اتحادیوں سے مطالبہ کیا کہ سرنگیں فوراً صاف کردی جائیں۔

ابھی ناروے کی حکومت اس احتجاج میں مصروف تھی کہ جرمنی نے شاید اس خیال سے کہ ناروے اس رنجش کی بنا پر جو اس میں اور متحدین میں پیدا ہوگئی تھی اس کا ساتھ دیگا، اپنی فوجیں آگے بڑھادیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ تھا کہ متحدین کا یہ حربہ کہ ناروے کے سمندر میں اچانک سرنگیں بچھادی گئیں، بہت کارگر ثابت ہوا لیکن اتحادیوں کی اس کارروائی پر جرمنی کو ایک اچھا بہانہ مل گیا۔ ۹ر اپریل کو جرمن فوج کی اعلیٰ کمان نے اعلان کیا کہ ڈنمارک اور ناروے کے خلاف جو کارروائیاں جاری ہیں ان کا ازالہ کرنے اور ان دونوں پر کسی مخالف حملہ کا سدباب کرنے کی غرض سے جرمنی ان دونوں ممالک کو اپنی حفاظت میں لینا اپنا فرض سمجھتا ہے اس کے بعد ہی ڈنمارک اور ناروے پر اچانک حملہ کر دیا۔ ڈنمارک نے تو صرف بارہ گھنٹے کے اندر ہی جرمنی کی ماتحتی قبول کرلی اور اتحادی بھی اس کو بچا نہ سکے۔ البتہ ناروے پر حملہ کے ساتھ ہی

ناروے کی حکومت نے اجتماع عام کا حکم دیدیا اور اپنے ملک کی حفاظت کرنے کا تہیہ کرلیا۔

ناروے کی فوج ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ جرمن فوج اس طریقہ جنگ سے جس کو جرمن زبان میں (Blitzkrieg) (وہ جنگ جو بجلی کی طرح ہو یعنی مختلف سمتوں سے پوری طاقت کے ساتھ شروع کردی جائے اور ایسا اچانک حملہ کیا جائے کہ دشمن بالکل بے بس ہوجائے اور اس کو سنبھلنے کا بھی موقع نہ مل سکے) کہا جاتا ہے، کام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی اہم مقامات پر اپنا قبضہ جمالیا اس کے بعد ہی اتحادیوں نے ناروے کو کامل امداد دینے کا فیصلہ کیا اور اپنی فوجیں روانہ کیں۔ ناروے کی فوج برطانوی افواج سے مل گئی اور جنگ باقاعدہ طور پر جاری ہوگئی ابتداً مقابلہ میں جرمنوں کو پسپائی ہوئی لیکن بعد میں جرمن فوج نے کافی اہم مقامات پر قبضہ حاصل کرلیا۔

ناروے کی شکست کے بعد دارالعوام میں اس پر جو مباحثہ ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج اتحادیوں نے روانہ کی تھی وہ پوری طرح تربیت یافتہ نہیں تھی۔ زیادہ تر نوجوان سپاہی تھے جن کے پاس حربی سامان تھا اور نہ اغذیہ کا کافی ذخیرہ۔ دوسرے یہ کہ جرمنی کا ہوائی حملہ اس قدر سخت اور شدید تھا کہ اتحادی افواج اس کی تاب نہ لاسکیں تیسرے یہ کہ جس واحد جنگی جہاز پر سامان حرب اور مدافعتی آلجات ناروے بھیجے جارہے تھے اسے جرمنی نے ڈبو دیا مسٹر لائیڈ جارج نے حکومت کی اس پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ " برطانوی افواج کی پہلی قسط جو ناروے روانہ کی گئی تھی منتخب سپاہیوں پر مشتمل ہونی چاہیئے تھی۔ حکومت کے پاس منتخب سپاہی تھے۔ برطانیہ نے ایک علاقہ وار بریگیڈ روانہ کیا جس کو کوئی زیادہ ٹریننگ حاصل نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی فوج کا مقدمتہ الجیش تھا جس کو ایک دشوار فریضہ انجام دینا تھا اور جس پر ساری فوج کا انحصار تھا۔ ہمارے پاس فوج اور بحریہ میں اجتماعی اور متحدہ کارروائی ہونی چاہیئے تھی ہمارے پاس ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں تھی۔ ہم نے ایک ایک ہوائی پڑاؤ حاصل کرنے کے موقع کا جوا کھیلا۔ یہ مہم انگلستان کے لئے بے انتہا اہم تھی لیکن اسے ناتربیت یافتہ غیر پختہ کار دیہاتی فوج کا تابع بنایا گیا۔ اور وہ بھی فوج اور بحریہ کے ماین کسی اجتماع کے بغیر"

دراصل ناروے کی شکست کی یہی وجوہات تھیں۔ وزیراعظم پر حزب الاختلاف کی اس تنقید کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناروے کی شکست کے ساتھ ہی مسٹر چیمبرلین نے استعفاء دیدیا اور مسٹر چرچل نے حکومت سنبھالی۔ اب آگے دیکھئے کیا ہونے والا ہے۔

محمد جلال الدین جعفر

حالاتِ حاضرہ

ترکی اور شام کا معاہدہ:۔ اپریل کے مہینے میں ترکی اور شام کے مابین ایک "معاہدہ حسن جوار" طے پایا یہ اصل میں ایک پچھلے معاہدہ کی تجدید ہے جس کی مدت اپریل میں ختم ہو رہی تھی ۔ نئے معاہدے کے ساتھ بہت سے اہم تہہ ناموں کی بھی تکمیل ہوئی۔ اس معاہدے کی رو سے اسکندرونہ کو ترکی کا ایک جز تسلیم کیا گیا ہے اور شام میں جو ترک مقیم ہیں ان کو شام کے ملکی حقوق عطا کئے گئے ہیں۔

یہ معاہدہ حربی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی رو سے ہر ملک کو فوجی ضرورت کے لئے دوسرے کی اراضی کے استعمال کا حق مل گیا ہے۔

عراق کی نئی وزارت:۔ نوری پاشا السعید کی وزارت نے اپریل کے پہلے ہفتہ میں استعفیٰ دے دیا۔ اور رشید عالی بک گیلانی رئیس دیوان شاہی کی صدارت میں دوسری کابینہ بن گئی۔ رشید عالی بک پہلے بھی ایک مرتبہ وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ اس نئی وزارت کی دو خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں عراقی پارلیمان کی تمام سیاسی پارٹیاں شریک ہیں اور دوسری یہ کہ نئے وزیروں میں چار سابق وزیر اعظم بھی ہیں۔

میثاق سعد آباد:۔ کہا جاتا ہے کہ میثاق سعد آباد کو ایک فوجی معاہدے کی شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایران اور ترکی اس کے اصل محرک ہیں لیکن افغانستان روس اور جرمنی کے دباؤ کی وجہ اس میں شرکت کرنے سے پس و پیش کر رہا ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان اتحادیوں کی طرف مائل ہے اور وہ ترکی اور ایران کی رائے سے اختلاف نہیں کرے گا۔

ترکی کمانڈر ان چیف کی تقریر:۔ ابھی چند روز ہوئے مارشل فوزی چقماق کمانڈر ان چیف افواج ترکی نے دیار بکر کے فوجی معائنہ کے بعد ایک اہم تقریر کی۔ انھوں نے پہلے تو ترکوں کی تاریخی شجاعت اور موجودہ عسکریت کا ذکر کیا پھر قبائلی نوجوانوں کی فوجی تربیت اور جنگی قابلیت کی بہت ستائش کی اور کہا "میرے دل کو اس سے بڑی تقویت اور تسلی ہوتی ہے کہ میری قوم کا بچہ بچہ وطن کی حفاظت کیلئے تیار ہے۔ جو لوگ ہم کو مرد بیمار کا خطاب دیتے تھے ان کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اب دنیائے اسلام ایک بے جان جسد نہیں بلکہ ایک زبردست فاعل طاقت ہے۔۔۔۔۔

ہم کسی پر غاصبانہ دست برد کو پسند نہیں کرتے اور نہ کسی سے لڑنا بھڑنا چاہتے ہیں لیکن اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو چین سے لیکر مراقش تک ایک آگ پھیل جائے گی اور یہ ہمارے دشمنوں کو خاک سیاہ کردے گی۔ میثاق سعد آباد کے شریک تو ایک دوسرے کی امداد کے پابند ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی ایسی اسلامی طاقتیں ہیں جو بوقت ضرورت اسلام کی پشت پناہ بن کر کھڑی ہو جائیں گی۔ ہندوستان میں سلطنت حیدرآباد، مشرق اقصیٰ میں شام و جمہوریہ آذربائیجان واقع ہیں جو اسلام کے نام پر ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ شمالی افریقہ میں بھی بیداری پیدا ہو گئی ہے اور نہ صرف طرابلس، الغرب اور مراقش بلکہ تیونس بلغاریہ اور حبش کے

مسلمانوں میں بھی روح عمل کام کر رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ایران اور روس:۔ ایران اور روس کے مابین ایک معاہدہ تجارت وجہاز رانی طے پاگیا۔ چونکہ ایران او رسوویٹ کی مشترک سرحد دو ہزار کیلومیٹر سے زیادہ ہے، اس لئے دونوں مملکتوں کو ایک عرصہ سے باہمی امداد وتعاون کی خواہش تھی اور دونوں کو یہ فکر تھی کہ دوستانہ تعلقات اور معاشی ترقی کے وسائل میں وسعت پیدا کی جائے۔ اس نئے معاہدہ کی رو سے دونوں مملکتوں کے معاشی تعلقات ٹھوس بنیاد پر قائم ہوگئے ہیں۔

رومانیہ کی حکومت:۔ ۱۱ مئی کو رومانیہ کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن وزیر اعظم ایم، ٹاٹارس کیو نے شاہ کیرول کے ایما پر نئی حکومت قائم کرلی۔ یہ نئی حکومت صرف چند تبدیلیوں کے بعد قائم ہوئی ہے اور اس میں وزیر خارجہ ایم، گافنسو بھی شامل ہیں۔ نئی حکومت بالکل غیر جانبداری کے مسلک پر قائم ہے۔

اطالیہ:۔ اطالوی بحری بیڑوں نے ۱۵ اپریل سے بحیرۂ روم میں موسم بہار کی مشقیں شروع کردیں، غالباً اس کارروائی کا مقصد جرمنی کو مدد دینا اور اتحادیوں کو متنبہ کرنا تھا۔ چنانچہ سینیور گیاڈا نے ایک مضمون میں فرانس پر الزام لگایا ہے کہ وہ معاہدہ ورسائے کے بعد سے اطالیہ کے خلاف مسلک پر کاربند ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ بحیرۂ روم پر اطالیہ کا حق ہے اور کوئی دوسری قوم اس حق سے استفادہ نہیں کرسکتی۔

چند دنوں بعد اطالیہ نے جزائر ڈوڈے کینیز میں اپنی بحری اور ہوائی طاقتیں جمع کرلیں اور یوگوسلاویہ سے پرخاش شروع کردی چنانچہ اب یوگوسلاویہ بہت خطرہ میں ہے۔ نیز سینیور مسولینی نے فرانس سے بھی حسب ذیل مطالبے کردیے ہیں اور ان کی تکمیل کو وہ "فاچستی وقار" کے لئے بہت ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) فرانسیسی بندرگاہ جبوتی پر مساوی نگرانی (۲) نہر سوئز کے بورڈ میں دو نشستیں اور (۳) تیونس میں اطالوی حقوق کی وسعت۔

ڈنمارک اور ناروے:۔ جرمنی نے ۹ اپریل کو ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کردیا۔ ڈنمارک نے بارہ گھنٹے کے اندر جرمنی کی ماتحتی قبول کرلی۔ ناروے پر بھی بالکل اچانک حملہ ہوا تھا۔ جس وقت جرمن فوجیں ڈنمارک اور جنوبی ناروے میں داخل ہوئیں اس وقت جرمن سپاہیوں کو لے کر ناروک کی بندرگاہ میں پہنچ گئے جو ناروے کے بالکل شمال میں ہے اور ناروے کی تمام بندرگاہوں پر ایک ہی وقت میں قبضہ کرلیا۔ ناروے کی حکومت دارالسلطنت آسلو سے شمال کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوئی۔ ایک منظم فوج کا مقابلہ قزاقانہ جنگ سے کیا جانے لگا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ناروے ہٹلر کی ہوس ملک گیری کا شکار ہوگیا۔

ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ:۔ جرمنی نے ۱۰ مئی کو ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ تینوں پر حملہ کردیا۔ ہٹلر نے حسب عادت اس تازہ اقدام کا الزام بھی اتحادیوں اور ہالینڈ اور بلجیم ہی کے سروں پر رکھنے کی کوشش کی۔ اس لئے کہا کہ ان ملکوں کی غیر جانبداری برائے نام ہے اور وہ اتحادیوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس کے ثبوت میں

ہٹلر نے مثلاً بلجیم کا طرزِ عمل پیش کیا کہ اس نے اپنی جرمنی سرحد کو مستحکم کرلیا اور فرانسیسی سرحد کو غیر محفوظ چھوڑ دیا۔ بہرحال چند بہانے تراش کر ہٹلر نے وسطِ یورپ کی ان کمزور مملکتوں کو اپنی ہوس ملک گیری کا شکار بنایا۔

ہالینڈ اور بلجیم نے اتحادیوں سے مدد طلب کی اس نئے محاذِ جنگ کی غیر معمولی اہمیت کے مدنظر اتحادی ان چھوٹی مملکتوں کی مدد کو دوڑے لیکن '' - [illegible] ۔'' ایک ایسا حربہ ہے کہ مدافعت کرنے والے سنبھل نہ سکے اور ۱۵ مئی کو ہالینڈ نے اطاعت قبول کرلی۔ ہالینڈ کے سپہ سالار جنرل ونکلمان نے فوج کے نام احکام نشر کرتے ہوئے کہا کہ اب ہالینڈ کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند ہی روز میں ہالینڈ پر جرمنی کا مکمل قبضہ ہوگیا اور ہٹلر نے اپنی طرف سے ہالینڈ کا کمشنر بھی مقرر کردیا۔ بلجیم میں ابھی جنگ جاری ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ختم ہو رہا ہے۔

فرانس پر حملہ:۔ مئی کے تیسرے ہفتہ میں جرمن فوجیں مَیژنیو لائن کے ایک حصے کو توڑ کر شمالی فرانس میں داخل ہوگئیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے فرانس کی حکومت میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ ایم۔ رینا ڈ تو حسب سابق صدر اعظم ہیں اور ساتھ ہی وزیر جنگ بھی۔ مارشل پے تیان کو نائب صدر اعظم بنایا گیا ہے۔ ایم۔ دلادیر وزیر خارجہ، ایم۔ ماندل وزیر داخلیہ، ایم۔ رالن وزیر نو آبادیات اور ایم۔ لیبولن ہابنی وزیر تجارت مقرر ہوئے ہیں۔

مسٹر چیمبرلین کا مسلک:۔ ناروے کے بعد انگلستان میں حکومت پر سخت تنقیدیں کی گئیں خصوصاً مسٹر لائیڈ جارج نے مسٹر چیمبرلین کے مسلک کی بڑی مذمت کی۔ جنگ کے بارے میں دارالعوام میں ایک معرکہ کا مباحثہ بھی ہوا۔ اس میں حزب الاختلاف کے اراکین کے علاوہ خود حکومتی جماعت کے اکثر افراد نے مسٹر چیمبر کے مسلک سے ناراضگی ظاہر کی اور حکومت پر بہت کچھ ملامت کی مسٹر چیمبرلین، چرچل اور لارڈ ہیلی فکس نے تقریریں کیں لیکن اس سے مسٹر ایٹلی اور سر آرچی بالڈ سنکلیر وغیرہ کی تشفی نہ ہوسکی۔ مسٹر ہور بلیشا سابق وزیر جنگ اور مسٹر المیری سابق وزیر خارجہ جیسے حکومتی جماعت کے افراد نے بھی حکومت کی سخت مخالفت کی۔ غرض قوم نے حکومت کے موجودہ مسلک کو پسند نہیں کیا اور حکومت میں تبدیلی پر زور دیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ مئی کو مسٹر چیمبرلین مستعفی ہوگئے۔

انگلستان کی نئی حکومت:۔ مسٹر چیمبرلین کی جگہ مسٹر چرچل نے لی۔ یہ اکثریتی جماعت ہی کے رکن ہیں اور چونکہ انھیں اصرار اور عمال کی بھی تائید حاصل ہوگئی ہے، انکی حکومت سے بہت سی توقعات ہیں۔ اب برطانیہ کی قومی کابینہ بن گئی ہے جس میں عمالی لیڈر مسٹر ایٹلی اور احراری لیڈر سر آرچی بالڈ سنکلیر بھی شامل ہیں۔ اب کابینہ جنگ حسب ذیل افراد پر مشتمل ہے:۔

وزیر اعظم اور وزیر مدافعت ۔ مسٹر ونسٹن چرچل
لارڈ پریوی سیل ۔ مسٹر سی۔ آر۔ ایٹلی
لارڈ پریسیڈنٹ آف دی کونسل۔ مسٹر نویل چیمبرلین

وزیر خارجہ　　- لارڈ ہیلی فیاکس
وزیر بلا قلمدان　　- مسٹر آرتھر گرین وڈ

وزیر اعظم اور کابینہ جنگ کے دیگر اراکین نے ۱۲ مئی کو شاہ انگلینڈ کے سامنے حلف اُٹھایا بعد میں ذیل کے اشخاص کا تقرر بھی ہوا مگر یہ کابینہ جنگ میں شریک نہیں ہیں۔

سر جان سائمن　　- لارڈ چانسلر
سر چارلس کنگس لے وڈ - چانسلر آف دی اکس چیکیر
سر جان انڈرسن　　- ہوم سکریٹری
مسٹر ہربرٹ ارلین　　- وزیر سپلائی
مسٹر ڈف کوپر　　- وزیر معلومات
سر اینڈرو ڈنکن　　- صدر بورڈ آف ٹریڈ
مسٹر ایل ۔ یس ۔ امیری　　- سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا
وغیرہ

ح ۔ ص

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج کی کتابیں

گلشن گفتار:- شعرائے اردو کا قدیم ترین تذکرہ جس کو مولوی سید محمد صاحب ام اے نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہو صفحات ۴۰ ، قیمت ۱۲ر

مثنویات میر:- میر تقی میر کی تمام مثنویوں کو ترتیب و تصحیح کے ساتھ شایع کیا گیا ہے صفحات ۲۳۴ قیمت عال

ابتدائی فارسی:- براہ راست طریقۂ تعلیم کے مطابق فارسی کی صرف و نحو ۔ قیمت ۱۲ر آنے ۔

یادگار ولی:- اردو شاعری کے ابو الآبا ولی اورنگ آبادی کے جشن دو صد سالہ کے مقالوں کو نہایت سلیقہ سے شایع کیا گیا ہے متعدد نایاب تصویریں اور ولی کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے ۔ صفحات ۲۰۲ قیمت عال ۔

اربابِ نثر اردو:- فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں کا محققانہ تذکرہ ۔ اردو نثر کے ارتقا کی مکمل تاریخ قیمت مجلد عاں روپے ۔

پروفیسر عبد القادر صاحب سروری کی کتابیں

اردو مثنوی کا ارتقا:- مثنوی اردو شاعری کی سب سے زیادہ اہم صنف ہے ۔ اور اب تک اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی تھی ۔ پروفیسر سروری صاحب نے کئی سال کی محنت اور تحقیق کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے ۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا ۔ قیمت عاں ۔

دنیائے افسانہ:- افسانہ نگاری کے اصول اور مبادی پر سیر حاصل بحثیں ۔ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ پر مستند تصنیف یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ دوبارہ شایع کرنا پڑا ۔ صفحات ۲۲۰ قیمت صرف عہ ۔

کردار اور افسانہ:- افسانوں میں کردار پیدا کرنے کے اصول ان کی اہمیت نوعیت وغیرہ پر اردو کی پہلی اور واحد کتاب ۔ صفحات ۲۳۲ قیمت عہ

تاثراتِ سفرِ یورپ

۲۹ راگست تا ۱۹ رستمبر

گو کانگریس کا افتتاح ۲۹ راگست کو ہونے والا تھا لیکن چونکہ میرے پاس اطلاع آچکی تھی کہ مجھے مشرقِ اقصیٰ کے اموریہ کا رکن بنایا گیا ہے اور اس کا جلسہ ۲۸ راگست کو ہونے والا تھا اس لئے اسی تاریخ کو صبح کے وقت برلیسٹن برگ سے زیورخ چل دیا اور زیورخ میں ہوٹل نیٹون میں ٹھیرا۔ یورپ کی عام طور پر اور سوئزرلینڈ کی خصوصاً تنظیم کی یہ کیفیت ہے کہ یورپ کی روانگی سے پہلے حیدرآباد ہی میں زیورخ کے ہوٹلوں کی مکمل فہرست مل گئی تھی جس میں نہایت تفصیل سے کمروں کی کیفیت، کرایہ، ہوٹلوں کا محل وقوع، کھانے کے اوقات غرض ہر ایک چیز لکھی ہوئی تھی، اور خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ جلد از جلد ہوٹل مطلوبہ کی نشان دہی کی جائے۔ غرض ہوٹل پہونچتے ہی مطلق کوئی دقت نہیں ہوئی اس لئے کہ میرے لئے وہاں ایک کمرہ مختص تھا۔ دوسری پر لطف بات یہ ہے کہ جب میں پیرس میں تھا اسی زمانے میں مجھے مشرقِ اقصیٰ کے اموریہ کی رکنیت کی اطلاع ہوئی تھی، اور اس اطلاع کے ساتھ اس عظیم الشان عمارت کا مکمل نقشہ بھی بھیج دیا گیا تھا جس میں اموریہ اور کانگریس کے اجلاس ہونے والے تھے اس نقشے میں ہر کمرے پر نمبر پڑے ہوئے تھے اور یہ لکھا ہوا تھا کہ کانگریس کے کونسے شعبہ کا کس نمبر کے کمرے میں اجلاس ہوگا کانگریس کے جملہ اجلاس سوئزرلینڈ کی اعلیٰ فنی تعلیم گاہ (Technische Hochschule) میں ہونے والے تھے۔ کہنے کو تو یہ ایک "اسکول" ہے لیکن اس کی حیثیت ایک فنی جامعہ کی ہے۔ جس میں تمام ملک کے ... طلبہ تعلیم پاتے ہیں اور ۱۹۳۲ء میں یہاں سے ۱۰۰ طلبہ نے فنی طیلسان حاصل کیا تھا۔ یہ اس ملک کی تعلیم گاہ ہے جس کی آبادی نصف کروڑ بھی نہیں اور جس کا رقبہ ہمارے

(زیورخ اور بین الاقوامی تاریخی کانگریس)

تین اضلاع کے برابر ہوگا۔

مشرقِ اقصیٰ کے اموریہ کا اجلاس ۲½ بجے ہوا۔ جس طرح انجمن اقوام مختلف اموریوں میں منقسم تھی اسی طرح بین الاقوامی کانگریس بھی متعدد اموریوں میں منقسم ہے اور ہر اموریہ کا مقصد یہ ہے کہ کسی خاص شعبۂ تاریخ میں جو تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اس میں باہمی تعلق پیدا کیا جائے اور تحقیقات کو آگے بڑھایا جائے۔ اس "اموریہ مشرقِ اقصیٰ" میں بالفعل ہندوستان شامل کر لیا گیا ہے۔ اموریہ کے اس جلسے کے لئے میں نے کئی تحریکیں اس کی معتمد ڈاکٹر اولیویا میک لاظن صاحبہ کے پاس بھیج دی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ اس وقت تک مغربی مورخوں نے اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات کا غلط اندازہ کیا ہے اور بجائے اس کے اسلام کو ایک عالمگیر تحریک تصور کیا جائے اسے محض تاریخ عرب یا تاریخ ایران کا ایک عہد سمجھا جاتا ہے۔ اس پر بہت بحث ہوئی اور تقریباً سب ہی اراکین نے حصہ لیا جن میں سے ڈاکٹر کروم (Kromm) ولندستان ڈاکٹر ٹمپرلے (Temperley) صدر کانگریس مس میک لاظن (Mechaerlan) اور فادر ہیراس (Father Heras) ممتاز تھے۔ ایک قرارداد منظور ہوئی کہ جو ممالک اس اموریہ سے متعلق ہیں یعنی مشرقِ اقصیٰ اور ہندوستان، اس میں اسلام کے جو تمدنی اثرات پڑے ہیں انھیں کافی اہمیت دی جائے اور کانگریس کی طرف سے جو الیہیات تاریخی (Historical Bibliography) ہر سال ترتیب دی جاتی ہے اس میں اسلامی اثرات کا خاص عنوان قائم کیا جائے۔ میری تحریک پر یہ بھی قرار پایا کہ سالنامے میں غیر یورپی

زبانوں کی کتابوں کا اندراج بھی کیا جائے اور علاوہ اصلی رسم الخط کے ان کتابوں کے نام لاطینی رسم الخط میں بھی لکھے جایا کریں۔

شام کے وقت مجھے صدر کانگریس ڈاکٹر ٹیمبرلے کا خط ملا جس میں مجلس علمیہ کانگریس کی شعبۂ منتظم (غیر یوروپی ممالک کی تاریخ) کی مدد کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ دفتر کانگریس سے کانگریس کے متعلق جملہ کاغذات مل گئے یعنی تمام ارکان کی فہرست مع زیورخ کے پتے کے، کانگریس کے جملہ شعبہ جات کا پورا پروگرام، زیورخ کی کتاب رہنمائی اور ملخصات مقالہ جات کی کتاب جو دو جلدوں میں ہے اور مجموعی حجم ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام کاغذات ایک بڑے لفافے میں نہایت سلیقے سے بند تھے۔ دفتر میں جو رضاکار اور رضاکارنیاں کام کر رہی تھیں ان میں سے اکثر تین زبانیں یعنی جرمن، فرانسیسی، اطالوی بے تکلف بولتی تھیں اور ہر رکن سے انتہائی خلق سے پیش آتی تھیں۔ ایک سے میں نے کہا کہ رضاکاروں کو تو بڑی مصروفیت ہو گی تو مسکراتے ہوئے جواب ملا کہ زیادہ تر مصروفیت تو ختم ہو چکی اب تو آرام کا زمانہ ہے!

۲۸ راگست کو کانگریس کے افتتاح کا دن تھا۔ تمام ارکان شہر کے گرجا سینٹ پیٹر میں جمع ہوئے جو تیرھویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں اغلباً اسلامی اثرات کی وجہ سے کسی قسم کی تصاویر یا بت نہیں ہوتے نہ کھڑکیوں میں کسی قسم کی رنگین تصاویر ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت اس گرجا کی بھی تھی جس میں سوائے ایک ارغن کے اور کوئی "گرجائیت" نظر نہ آتی تھی۔ کانگریس کا افتتاح خدا کی حمد سے ہوا جس کی ابتدا ہوتے ہی جملہ حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے اور جب تک ارغن پر اس کے نغمے نکلتے رہے سب کھڑے رہے۔ سب سے پہلے پروفیسر ناب ہولتسر (Nabholz) نے جو سوئٹزرلینڈ کی انتظامی کمیٹی کے صدر تھے، سوئٹزرلینڈ کی تینوں سرکاری زبانوں یعنی جرمن، فرانسیسی اور اطالوی میں خوش آمدید کہا اس کے بعد ہیر ایتر (Etter) نے جو سنہ ۱۹۳۹ء میں سوئٹزرلینڈ کے صدر ہو گئے تھے۔ اور سنہ ۱۹۳۴ء میں وزیر داخلہ تھے، حکومت کی طرف سے جرمن میں تقریر کی، بعد ازاں صوبہ زیورخ کی حکومت کے صدر ڈاکٹر ہا فنر (Haffner) نے سواگت کیا اور سوئیسانی مجلس مدارس کے صدر ڈاکٹر روہن (Rohn) نے جرمن میں چند الفاظ اور ڈاکٹر ہاولڈ (Hawald)، ریکٹر جامعہ زیورخ نے تینوں سرکاری زبانوں میں ارکان کو خوش آمدید کہا اس کے بعد صدر کانگریس ڈاکٹر ٹیمبرلے نے اپنا ایڈریس پڑھا جس کے بعض حصے جرمن میں بعض فرانسیسی میں بعض اطالوی میں اور بعض انگریزی میں تھے۔ اپنے خطبے کے انگریزی حصے میں انھوں نے دو مرتبہ میرا نام لیا اور یہ کہ ہم کل ہند کے نمائندوں یعنی قادر ہیرا اس اور پروفیسر شروانی کو یہاں دیکھ کر نہایت مسرور ہیں اور میں بطور خاص ایک خالص ہندوستانی پروفیسر شروانی کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ان کی تقریر کے آخر میں پھر خدا کی حمد گائی گئی اور جلسہ تقریباً ڈیڑھ بجے برخاست ہوا۔

رات کے وقت انجمن مورخین قدیم (Society of Antiquaries) کی طرف سے جامعہ کی عالی شان عمارت میں ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں تقریباً تمام مندوبین شریک تھے۔ انجمن کے صدر ڈاکٹر لارگیادر (Largiader) نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں مندوبین کا خیر مقدم کیا جس کا جواب جماعتوں کی طرف سے

جامعۂ گوٹنگین کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر برانڈی (Brandi) نے دیا۔ معلوم ہوا کہ کانگریس میں دنیا کی ۰۰ قوموں کی طرف سے ۰۰۰ نمائندے آئے ہیں اور ہندوستان کی جامعات کلکتہ، بمبئی، ناگپور، دہلی، لاہور اور عثمانیہ نے اپنے نمائندے بھیجے ہیں جن میں سے بمبئی اور عثمانیہ کے نمائندوں کو کل ہند کی طرف سے مندوب ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں نے ہر مجمع میں اس بات کی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ مندوبوں سے ذاتی تعلقات پیدا کروں تاکہ میرے ذریعے سے ہماری سلطنت ابد مدت حیدرآباد اور ہماری جامعہ عثمانیہ کے متعلق لوگوں کو زیادہ واقفیت حاصل ہو۔ اس خاص عثمانیہ میں میں جامعہ ویلز کے پروفیسر ٹرے ہارن (Treharne) لاہور کے پروفیسر وارڈ (Ward) اور جامعۂ ڈمر یو (امریکہ) کے پروفیسر ٹریکیٹ (Trickett) سے ملا۔ موخر الذکر سے معلوم ہوا کہ شہر نیویارک میں پانچ جامعات ہیں، جن میں سے ایک میں ۳۶ ہزار، دوسرے میں ۱۳ ہزار اور باقی تین میں اوسطاً ۵/۵ ہزار طلبہ پڑھتے ہیں، گویا صرف شہر نیویارک میں تقریباً ساٹھ ہزار طلبہ جامعی تعلیم پا رہے ہیں!! ہمارے حیدرآباد میں صرف ڈیڑھ دو ہزار طلبہ جامعہ میں شریک ہیں اور اس پر بھی ابھی سے بے روزگاری کا غلغلہ ہے! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

۲۹ راگست کو کانگریس کا پہلا کاروباری دن تھا اور آج زیادہ تر وہی مقالے پڑھے گئے جنہیں زیادہ اہم یا زیادہ نزاعی سمجھا گیا۔ میرا مقالہ صبح کے وقت دوسرا تھا۔ چونکہ اس کا موضوع "اسلامی سیاسی فلسفہ اور اس کی حیثیت نظام سیاسیات میں" تھا اس لئے اسے شعبہ ۱۲ ("خیالات، فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادبیات کی تاریخ") میں رکھا گیا۔ اس شعبہ کی صدارت ڈاکٹر کرن (Kern) نے کی جو سوئٹسان کے ذخیرہ کاغذات سرکاری کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ مجھ سے پہلے صرف ایک صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا جس کے لکھنے والے ڈاکٹر زیلنسکی (Zielinski) پولستان کے بڑے ماہرین تاریخ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مجھے اپنا مقالہ پڑھنے میں چالیس منٹ لگے۔ اس کے بعد سوالات کی بوچھار ہوئی۔ مباحثے میں حسب ذیل علماء نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر گھوشل (Ghoshal) (کلکتہ)؛ پروفیسر لامونٹے (Lamonte) (سنسناٹی، امریکہ)؛ ڈاکٹر سپیئر (Spear) (دہلی)؛ پروفیسر بوکھورسٹ (Bokhorst) (پریٹوریا، جنوبی افریقہ)؛ پروفیسر وارڈ (لاہور)؛ ڈاکٹر ابراہیم حسن (قاہرہ)؛ ڈاکٹر ووڈمار (Wodmar) (سوئٹسان)۔

خدا نے میری مدد کی اور ایک ایک سوال کا حسب دلخواہ جواب دیا۔ مباحثے کے اختتام پر بہت سے مندوب میرے پاس آئے اور میرا مقالہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

شام کے وقت زیوریخ کا کتب خانہ عامہ دیکھنے گیا جہاں اس زمانے میں مشہور مذہبی مصلح زونگلی (Zwingli) کے آثار کی نمائش ہو رہی تھی۔ اس نمائش میں حسب ذیل اشیاء خاص طور پر دلچسپ نظر آئیں۔ زونگلی کے خطوط، مارٹن لوتھر کے نام اور کرینمر اور لیڈی جین گرے کے خطوط اس کے نام۔ اس کے علاوہ زونگلی کی ہمعصر تصاویر، اس کی نشان کی ہوئی کتابیں، کپڑے وغیرہ بھی مرکز توجہ بنے ہوئے تھے۔ زونگلی کی شخصیت ہمارے لئے دلچسپ ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے اسلامی توحید سے متاثر ہو کر سوئٹسان کے ایک بڑے حصے کو مسیح پرستی، بت پرستی اور آثار پرستی سے نجات دی تھی۔

(باقی آئندہ) **ہارون خاں شروانی**

نئی کتابیں

۱۔ مطالعۂ حافظ (حافظ کے کلام پر تبصرہ) از احتشام الدین ایم اے حجم ۱۶۰ صفحات قیمت عہ ۴ر

۲۔ نظارے (افسانے) از کرشن چندر ایم اے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت عہ۔

۳۔ جذباتِ وفاداری (دکن کے وفاداروں کا تذکرہ) از مولوی شمس الدین صدیقی وظیفہ یاب منصف حجم ۴۴ صفحات۔

۴۔ عہدہ داروں کا عمل (مجموعہ مضامین) از مولوی شمس الدین وظیفہ یاب منصف حجم ۱۰۴ صفحات۔

۵۔ بنگاری بابو اور دیگر افسانے (سائنس کے مسائل افسانوں کے لباس میں) از حبیب احمد فاروقی حجم ۸۵ صفحات قیمت ۸ر

۶۔ مقاصد الاسلام حصہ اول دوسرا ایڈیشن (اخلاق و تمدن پر تبصرہ) از نواب فضیلت جنگ مرحوم حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۴ر

۷۔ وطن دار (رہنمائے پٹیل پٹواری) از کاشی ناتھ راؤ وکیل حجم ۸۶ صفحات۔

۸۔ مضمون نگاری مرتبہ اخلاق دہلوی حجم ۶۴ صفحات قیمت ۱۰ر

۹۔ مبادی اللغات (اردو کا مختصر لغت) از فیض محمد بی اے حجم ۴۹۶ صفحات قیمت عہ ۴ر

۱۰۔ نغمۂ عندلیب (افسانہ) از لالہ گوبند سنگھ حجم ۲۳۰ صفحات

۱۱۔ کلام رونق از منشی پیارے لال رونق حجم ۱۰۷ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۲۔ حیات سلطانی (سلطان جہاں بیگم مرحومہ بیگم بھوپال کے حالات) از محمد امین زبیری

۱۳۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت از سید شمسی ایم اے حجم ۳۰۴ صفحات قیمت عالی

۱۴۔ رہنمائے صحت (صحت کے اصول) از مہانند ایڈیٹر رسالہ کرانتی لاہور حجم ۶۰۰ صفحات قیمت عالی

۱۵۔ علاج الامراض دوسرا ایڈیشن (حکیم محمد شریف خاں مرحوم کی بیاض کا ترجمہ) حجم ۹۵۶ صفحات قیمت صہ

۱۶۔ مجربات سلطانی حصہ سوم (مجرب نسخے) از حکیم محمد یار خاں حجم ۲۴۰ صفحات قیمت عالی

۱۷۔ معمولات و مجربات بالتصویر (مشہور اطبا کے حالات اور ان کے مجربات) از حکیم محمد شریف حجم ۴۴ صفحات قیمت عہ

۱۸۔ معمولات طب (مجرب نسخے) از حکیم عبدالرحیم حجم ۱۳۰ صفحات قیمت عہ

۱۹۔ رہنمائے کلوروفارم (کلوروفارم اور ایتھر کا استعمال) از حکیم خواجہ رضوان احمد حجم ۴۰۰ صفحات قیمت لے

۲۰۔ طبیب اطفال (بچوں کی بیماریوں کا علاج) از حکیم عبدالحفیظ حجم ۲۱۶ صفحات قیمت عہ ۸ر

۲۱۔ مغلوں کا مد و جزر از خواجہ محمد شفیع حجم ۶۰ صفحات قیمت ۶ر

۲۲۔ مشاغل حمید (معاشی اور تاریخی مضامین) از ابوالمنصور حمید مرحوم حجم ۱۶۲ صفحات

۲۳۔ آبدوز سرنگ از فیض محمد بی اے حجم ۴۰ صفحات قیمت ۶ر

۲۴۔ پانی کی کہانی خود اس کی زبانی از فیض محمد بی اے حجم ۵۲ صفحات قیمت ۶ر

۲۵۔ لیڈر (ڈرامہ) از فضل حق قریشی دہلوی حجم ۴۸ صفحات قیمت ۳ر

۲۶۔ سیرت المہدی (مرزا غلام احمد قادیانی کی سوانح عمری) از مرزا بشیر احمد ایم اے حجم ۳۰۸ صفحات

۲۷۔ مہاتما کرشن اور ان کی تعلیم (ساتواں ایڈیشن) از لالہ لاجپت رائے حجم ۲۶۸ صفحات

مرزا سیف علیخاں

باتیں

"کیا مجھے جگانے آئے تھے۔ میں تو بہت دیر سے جگ رہی ہوں۔ تم تو ایسے آئے جیسے کوئی چور۔ رات کو باہر نہ نکل سکے اور پکڑے جانے کے خوف سے صبح ہوتے ہی سامنے آجائے اور اپنی خاموشی سے کچھ ایسا اظہار کرے" "اب جو سزا آپ تجویز کریں، میں حاضر ہوں"

"جی ہاں اب حاضر ہوں، جو سزا آپ تجویز کریں"

"سزا ـــ اچھا، آئندہ ایسی باتیں نہ ہوں گی۔ اتفاق تو ہم اس لئے آزاد ہیں کہ وہ دورہ پر گئے ہوئے ہیں اور ان کی ماں اپنی اک بیٹی کے یہاں ہیں ورنہ تم نے تو کوئی کسر اپنی محبت کو رسوائے عالم کرنے میں اٹھا نہیں رکھی ـــ محبت، محبت اس لفظ کو سنتے سنتے ہمارے تو کان پک گئے یہ تو بیکاروں کا شغل ہے تم کیوں اپنے وقت کو اس بے سرے راگ میں رائگاں کرو، کچھ کام کرو کام، اور بیکار باتیں بنانا ختم۔"

"لیکن محبت ہی کا جذبہ جد و جہد کی تحریک کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن جب محبت کا کوئی صلہ نہ مل پائے تو اس کی طرف راغب ہی نہ ہونا چاہئے۔"

"رغبت اور چاہت کا سوال اپنے بس کی بات تو نہیں"

"لیکن اک جوان مرد کو اتنا بے بس و لاچار تو نہیں ہونا چاہئے۔"

"ابھرنے کی برابر کوشش کر رہا ہوں لیکن اگر اک گرتے ہوئے سر کو حسین بازوؤں کا سہارا مل جاتا تو شاید اس کوشش میں کامیابی کی زیادہ توقع ہوتی۔"

"تم نے وقت کی قدر نہ جانی"

"وقت کی قدر ـــ یہ لیجئے اس کا اظہار، یہ بندے نذر کو لایا ہوں، یہ آپ کے چمپئی رخساروں کو چوما کریں گے"

"وہ نہیں ہیں تب ہی تو تم کو یہ کہنے کا موقع مل گیا، لاؤ رکھے لیتی ہوں لیکن اک شرط پر کہ اب تم ایسی باتیں نہیں کروگے۔

"کیسی باتیں"

"یہی پیار اور محبت کی باتیں۔ یہ ہم غیروں سے سننا نہیں چاہتے اور نہ ہی نذریں قبول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہم تمھارے لئے ایک ہی سزا تجویز کرتے ہیں کہ آئندہ تم ہم سے ملنے بھی نہ آیا کروگے"۔

"اجازت"

"اچھا ـ ارے یہ تم ہاتھ جوڑے کیوں کھڑے ہو کیا ہمارا کوئی قصور کیا ہے تم نے؟"

"جی ہاں۔ جب سے آپ مسلمان ہوئی ہیں، میں کافر ہو گیا ہوں"

"کیا کسی ہندی لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔ قومیت کا یہی اک نادر تصور تو تمھارے جدت پسند دماغ میں سما گیا ہے"

"اب اسی تصور کی تشکیل کرنے جا رہا ہوں"

"میں شریمان جی کو آشیرباد دیتی ہوں"

"شریمتی جی ـــ تو سنئے!!"

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

بچوں سے

بہت سے بھائیوں اور بہنوں نے اپنی گرمائی تعطیلات کی مصروفیات سے ہمیں مطلع کیا ہے۔ اکثروں نے اردو کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کئی بھائیوں نے اضلاع میں شعبہ طلبہ کے قیام کے لئے کوششیں کی ہیں یہ اپنے ارادوں میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ اگر آپ میں کا ہر ایک اسی قسم کی کوشش کرے تو یقیناً مستقبل بڑا شاندار رہے گا۔ اکثر طلبہ بڑی بے چینی سے شعبہ طلبہ کے دستور کا انتظار کر رہے تھے اب وہ مکمل ہو کر شایع ہو چکا ہے۔ اس میں نہ صرف شعبہ کے اغراض و مقاصد شرائط اور طریق کار ہیں بلکہ ادارہ کے قیام کی تاریخ اور معلومات اور طلبہ کے لئے ادارہ نے جو کتابیں شایع کی ہیں ان کی تفصیلات بھی شامل ہیں اس کا دیدہ زیب سرورق ہے اور خوبی یہ ہے کہ اسے شعبہ ہی کے ایک رکن نے تیار کیا ہے ہر خریدار کو مفت بھیجا جا رہا ہے۔ جن کے پاس ابھی نہیں پہونچا ان کے پاس بھی جلد سے جلد بھیج دیا جائے گا۔ طلبہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اپنے دوست احباب کی ایک مفصل فہرست ایسے طلبہ کی جنھیں ایسے کاموں سے دلچسپی ہے روانہ کریں ہم ان کے پاس بھی بھجوا دیں گے سب رس کا ہر خریدار شعبہ کا رکن تصور کیا جائے گا بشرطیکہ وہ درخواست شرکت کی خانہ پری کر کے ہمارے پاس بھیج دے۔ چندہ تو براہ راست ہم کو وصول ہوتا ہے اور ہر وہ طالب علم جو ایک روپیہ (بلدہ) سالانہ چندہ یا ایک روپیہ آٹھ آنے (اضلاع) سالانہ چندہ روانہ کرے اسے سب رس مفت دیا جائے گا۔ اس طرح سے آپ تمام خریداران سب رس سے درخواست کی خانہ پری کر کے روانہ فرمائیں اور شعبہ کے ہر کام میں برابر دلچسپی لیتے رہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ آئندہ اپنی زندگی میں ناکام رہیں۔

اس پرچہ میں زیادہ تر تاریخی مضامین چھپے ہیں اس لئے کہ آپ انھیں ان تعطیلات میں غور سے پڑھیں اور نہ صرف ہندوستان کی بلکہ غیر ممالک کی بھی تاریخ سے واقف رہیں۔ گزشتہ پرچہ میں "شبن کی شورش" جو مضمون چھپا تھا اس کی تعریف میں اکثروں نے خطوط لکھے ہیں۔ اسی قسم کے مضامین بھیجئے سب رس ضرور شایع کرے گا۔

گزشتہ پرچہ میں ایک سہل انعامی معمہ شایع ہوا تھا۔ بہت کافی تعداد میں حل وصول ہوئے جن میں سے مندرجہ ذیل بھائیوں اور بہنوں کے حل بالکل صحیح تھے۔ ۱۔ حبیب شمس ۲۔ حسن بانو فخرالدین ۳۔ عارف علی انصاری ۴۔ حبیبہ حبیب الرحمن ۵۔ عبدالجبار تاجر ۶۔ زہرہ ہاشم علیخاں ۷۔ حامد علیخاں یوسف زئی۔ مندرجہ ذیل دو نے قریب ترین صحیح حل روانہ کئے ہیں گر یہ مقابلہ میں شامل نہیں کئے گئے (۱) راشد سلطانہ (۲) حمید خاں۔ قرعہ اندازی کے بعد حبیب شمس انعام اول کے اور عارف علی انصاری دوسرے انعام کے مستحق قرار پائے۔ یہ اپنی اپنی کتابیں دفتر سے حاصل کریں۔ معمہ کا صحیح حل "نذیر احمد" ہے۔ اس قسم کے انعامی معموں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

معین الدین احمد انصاری

سلطنتِ آصفیہ کس طرح قایم ہوئی؟

بھائیو اور بہنو! کیا تم کو یہ معلوم ہے کہ آصفجاہی خاندان جس کے ہمارے موجودہ بادشاہ ساتویں آصفجاہ اور دسویں فرمانروا ہیں، حیدرآباد میں کب سے حکومت کر رہا ہے؟ اور اس سے پہلے کون حیدرآباد پر حکومت کرتا تھا؟ آؤ آج ہم تم کو یہ بتائیں کہ اس خاندان کے سب سے پہلے بادشاہ کون تھے اور ان سے پہلے کون حکومت کرتا تھا۔

۱۷۰۷ء میں اعظم شاہ دہلی کا بادشاہ ہوا لیکن چونکہ اس کے تینوں بھائی اس کے خلاف تھے اس لئے تینوں نے اس سے لڑکر اس کو تخت سے اتار دیا۔ اس کو تخت سے اتارنے کے بعد یہ تینوں پھر آپس میں لڑنے لگے کہ کون بادشاہ ہو۔ اس لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں سے ایک بھائی "جہاں دار شاہ" بادشاہ بنا۔ یہ اچھا بادشاہ تھا۔ اس لئے دو مشہور بھائی سید عبداللہ اور سید حسین نے اس کے بیٹے فرخ سیر کو جہاں دار شاہ کے خلاف کرکے ان دونوں کو لڑایا اور فرخ سیر کو تخت پر بٹھادیا۔

فرخ سیر نے سید عبداللہ کو قطب الملک کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنادیا اور سید حسین کو امیرالامراء کا خطاب دے کر اپنی فوج کی سپہ سالاری دے دی اور ان کے علاوہ چونکہ چین قلیج خاں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا اس لئے ان کو بھی نظام الملک کا خطاب دے کر دکن کا صوبہ دار بنادیا۔ لیکن امیرالامراء اور قطب الملک نواب نظام الملک بہادر کے اس لئے خلاف ہوگئے تھے کہ ان کو دکن جیسا بڑا صوبہ دیا گیا تھا۔ اس لئے دونوں نے بغیر بادشاہ کی اجازت کے حضرت آصفجاہ بہادر کو مرآباد کا صوبہ دار بنادیا اور امیرالامراء خود دکن کا صوبہ دار بن گیا۔ اس پر فرخ سیر بہت برہم ہوا لیکن دونوں بھائیوں نے فرخ سیر سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی بجائے شاہزادہ رفیع الدرجات کو بادشاہ بنادیا۔ ساتھ ہی نظام الملک آصفجاہ کو مالوے کا بھی صوبہ دار کر دیا۔ رفیع الدرجات کے انتقال کے بعد انھوں نے اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو شاہجہاں ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ بہت جلد مرگیا اور اس کے بعد جہاں دار شاہ کے بڑے بیٹے کو محمد شاہ کا خطاب دے کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

جب محمد شاہ کی دادی نے، جو ایک عقلمند ملکہ تھی، یہ دیکھا کہ بادشاہ کے پاس اب کچھ اختیار باقی نہیں رہا ہے اور اب وہ خود کچھ نہیں کرسکتا تو نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر سے کہا کہ اب تم دکن کو چلے جاؤ اور اس کی حفاظت کرو۔ یہ سن کر نواب نظام الملک بہادر برہان پور کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں امیرالامراء کے بھتیجے عالم علیخاں سے

لڑائی لڑی اور اس کو شکست دی۔ یہ خبر سن کر امیر الامراء محمد شاہ کو ساتھ لے کر دکن کی طرف چل پڑا لیکن چونکہ بہت سے لوگ اس کے خلاف تھے اس لئے کچھ امیروں نے سازش کرکے اس کو مار ڈالا۔ جب نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر نے دیکھا کہ سلطنت کا ایک دشمن مار ڈالا گیا تو فوراً محمد شاہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا اس کے بعد قطب الملک گرفتار کر لیا گیا اور محمد شاہ نے نواب نظام الملک بہادر کو وزیر اعظم بنا کر دہلی بلا لیا۔

جب نظام الملک آصفجاہ بہادر دہلی پہنچے تو وہاں کی رعایا کو حکومت کے خلاف پایا۔ اس پر انھوں نے دکن کی حالت درست کرنے کی خاطر شکار کے بہانے سے دکن کا رخ کیا۔ ۱۷۲۴ء میں دکن پہنچے اور آصفجاہی حکومت کی بنیاد ڈالی اور قلمرو دکن کے پہلے آصفجاہ بنے۔

اب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہماری سلطنت کی بنیاد حضرت نواب نظام الملک بہادر آصفجاہ اول نے ڈالی تھی۔ آؤ اب ہم سب مل کر دعا کریں کہ خداوند تعالیٰ سلطنت حیدرآباد کو ہمیشہ قایم و دائم رکھے اور ہمارے پیارے بادشاہ کو بھی بڑی عمر عطا فرمائے آمین

مصطفیٰ کمال خاں شروانی

بچوں کیلئے قابل عمل باتیں

جو بات سچی ہو۔ وہ سنا دو
نہ دل میں اندیشہ۔ کوئی لاؤ

جو کھیلو بھائی بہن سے بچو
کسی کو ہرگز نہ تم ستاؤ

ہے تندرستی ہزار نعمت
صحت کو جیسے بنے بچاؤ

نہ عیب جوئی کرو کسی کی
نہ جھوٹے الزام تم لگاؤ

بڑوں کی طاعت کیا کرو تم
ہوں چھوٹے الفت سے پیش آؤ

ملے گی دولت رہے گی راحت
جو پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤ

ہے علم کی بس یہی نصیحت
کسی کے دل کو نہ تم دکھاؤ

محمد کریم الدین خاں علم

فرانسیسی بچے

"آؤ سلیم!" ہم نے سلیم کو اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا" آج ہم تمھیں بڑی مزے دار باتیں سنائیں گے۔"

"کوئی کہانی یا قصہ؟" سلیم نے ہم سے دریافت کیا۔

"نہیں جی!" ہم نے جواب دیا۔

"خوش گپی؟" سلیم نے پھر سے پوچھا۔

"وہ بھی نہیں" ہم نے کہا۔" بلکہ ہم تمھیں آج یورپ کی سیر کرائیں گے۔ اور یورپ کے ایک ایسے ملک میں لے جائیں گے جو دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت مقام مانا جاتا ہے"

اب سلیم سوچنے لگا کہ آخر وہ کونسا مقام ہے۔ ہم نے بھی اسے کچھ مہلت دی کہ وہ اپنے دماغ کا امتحان لے۔ جب دو تین منٹ گزر گئے اور سلیم نے کچھ نہ کہا تو ہمیں خیال ہوا کہ شائد وہ نہ جانتا ہو۔ اس لئے ہم نے اس سے پوچھا "کیوں! کبھی "فرانس" کا نام سنا ہے؟"

سلیم چونک پڑا اور کہنے لگا" ہاں سنا تو ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت مقام ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ ایک شہر نیویارک نامی، جو امریکہ میں ہے، سب سے زیادہ خوبصورت ہے؟" "ٹھیک ہے" ہم نے جواب دیا" لیکن وہ صرف بڑی بڑی خوبصورت عمارتوں کی حد تک ہے۔ وہاں انسان کی صناعی نے اپنے جوہر بتائے ہیں۔ تو یہاں قدرت کی صناعی اپنے بے مثل نمونے پیش کرتی ہے۔ تمھیں سچ بتاتے ہیں ہمیں فرانس سے زیادہ محبت، فرانسیسی بچوں سے ہے۔"

"اچھا!" سلیم نے متعجب ہوکر گویا اپنے آپ میں کہا" اس کی کوئی وجہ؟" "بات یہ ہے سلیم! ان کی زندگی ایسی پُرلطف ہوتی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں" ہم کہنے لگے" بعض مرتبہ تو خیال ہوتا ہے کہ کاش! ہم وہیں پیدا ہوتے اس ملک کی آب وہوا، اور اس سے زیادہ وہاں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ ہر بچہ ہمیشہ خوش وخرم نظر آتا ہے۔ فرانس میں بچوں کی تعلیم کی طرف بڑی توجہ دی جاتی ہے۔ تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ فرانس میں ہزاروں مدارس اور کالج ہیں۔ صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لڑکوں کو بچپن ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔ فرانس کے بعض بڑے بڑے شہروں میں دست کاری کے کئی مدارس قایم ہیں۔ یہاں لڑکوں کو ادب اور سائنس کے علاوہ دست کاری کی ایسی عمدہ تعلیم دی جاتی ہے کہ آگے چل کر یہی بچے بڑے بڑے صناع اور کاریگر نکلتے ہیں۔"

"یہاں تعلیم فرانسیسی زبان میں ہی دی جاتی ہے؟" سلیم نے ہم سے سوال کیا" ہاں! ہاں" ہم نے جواب دیا" بے شک انھیں تعلیم خود ان کی مادری زبان میں دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے کئی مدارس اور ہیں جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے۔

سچ تو یہ ہے سلیم! کہ کسی ملک کی نوجوان نسل ہی پر اس ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ فرانس کے متعلق تم کبھی کسی کتاب میں پڑھو تو معلوم ہوگا کہ یہاں کی یہی ننھی منھی مخلوق ترقی کرکے ملک کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوتی ہے۔"

"ان کی مدرسہ کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟" سلیم نے ہم سے دریافت کیا۔ "بڑی مزے دار" ہم نے بھی اس میں دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "بہت پر لطف فرانس کے کسی مدرسہ میں جاکر تم دیکھو تو تمھیں وہاں کی دنیا کچھ اور ہی نظر آئے گی۔ تمھیں ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم "جنت ارضی" میں ہو۔ مدرسہ کی عمارت کسی ایسے کھلے مقام پر ہوگی جہاں کی آب و ہوا پاک صاف ہو۔ عمارت سے لگے ہوئے خوبصورت چمن تمھیں دکھائی دیں گے، کھیلوں کے لئے وسیع میدان ہوں گے۔ یہ ہر حال وہ سب کچھ ہوگا جو ہمارے مدارس میں نہیں ہوتا۔ یہاں کے مدارس کے لڑکے وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ اور صفائی کا انھیں اتنا خیال ہوتا ہے کہ پوچھو نہیں۔ مدرسہ سے قریب ایک اور عمارت ہوتی ہے جہاں لڑکے رہتے سہتے ہیں۔ اس عمارت کو "اقامت خانہ" کہتے ہیں۔ لڑکوں کو ہر چھٹی میں تعلیمی تفریح کرائی جاتی ہے۔ لڑکے مزے مزے سے سائیکلوں جاتے ہیں۔ اور خوب کھیلتے کودتے ہیں۔ اکثر انھیں دریائے سین کے کنارے تفریح کے لئے بھجوایا جاتا ہے۔ جہاں وہ خوب تیرتے ہیں۔ اور کھانا وغیرہ کھاکر واپس ہوتے ہیں تم نے پیرس کا نام تو سنا ہوگا نا! یہ شہر اسی دریا پر واقع ہے۔ پیرس جیسا خوبصورت شہر دنیا بھر میں تمھیں کہیں نہ ملے گا۔ یہاں بھی مدارس اور کالج ہیں جہاں ہر قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اکثر انگوروں کے بغیچوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور پیٹ بھر کر انگور کھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے والدین کے ہی باغ ہوتے ہیں۔ جامعہ آکسفورڈ اور جامعہ کیمبرج کے قائم ہونے سے قبل یہاں ایک جامعہ "سُربان" نامی قایم ہوئی تھی۔ یہاں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں تمام دنیا کے طلباء آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے قیام کے بعد اس کی اتنی قدر باقی نہیں رہی لیکن اب بھی طلباء کی کافی تعداد یہاں مصروف تعلیم ہے۔

خیر یہ تو بڑے بڑے شہروں کے بچوں کا ذکر تھا۔ اب ان بچوں کا حال سنو جو کسی چھوٹے سے گاؤں یا قصبہ میں رہتے ہیں۔ تعلیم یہاں گو بہت عام ہو چکی ہے۔ لیکن بعض گاؤں ایسے بھی ہیں جہاں سرکاری مدرسے یا کالج نہیں۔ یہاں کے بچے عموماً زراعت اور کاشت کاری میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ صبح سویرے یہ لوگ کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور شام کے وقت جب کہ سورج ڈوبتا ہوتا ہے گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔ فرانس کے جنوب مغرب میں ایک بڑا پہاڑی سلسلہ ہے۔ جو ہسپانیہ سے فرانس کو جدا کرتا ہے۔ اسے "پرانیز" (Pyrenees) کہتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے

دامن میں بسنے والے بچے بڑے نڈر اور بہادر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنا وقت زیادہ تر انگوروں کے بیلچوں میں گزارتے ہیں یہ لوگ گھوڑے کی سواری میں بھی بڑے شاق ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہاں کے بچے ٹولیاں بنا کر پہاڑوں پر چڑھتے ہیں۔ اور دل بھر کر کھیلتے کودتے ہیں۔ کیونکہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں ـــــ عجیب زندگی ہوتی ہے ان کی بھی"

"بھئی واقعی آج تو آپ نے بڑی عمدہ باتیں بتائیں" سلیم نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ہاں تو آگے کچھ اور سنائیے" "نہیں جی۔ اب ختم کرو۔ پھر کبھی اس کا سلسلہ قائم رکھیں گے۔ ہمارے سر میں بہت درد ہو رہا ہے:"

سلیم ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور ہم ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئے۔

عزیز رضوی

ـــــــــــــــ یہ مضمون نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا

بچہ اور چاند

سنا ہے کہ توس قزح کے کنارے
جہاں ہیں رواں برق کے تیز دھارے
جہاں سیر کرتے ہیں ننھے ستارے
جہاں ٹوٹ کر شب کو گرتے ہیں تارے
وہیں چاند! کہتے ہیں تو حکمراں ہے

جہاں اچھے منظر انوکھے سماں ہیں
جہاں پر رواں دودھ کی ندیاں ہیں
جہاں پر چمکتی ہوئی بجلیاں ہیں!
جہاں بادلوں کے بڑے کارواں ہیں
وہیں چاند! کہتے ہیں تو حکمراں ہے

وہ چاندی کے پھولوں کا باغ جناں ہے
جہاں کا ہر اک ذرہ ذرہ جواں ہے
زمیں جس کی تاروں بھرا آسماں ہے
سنا ہے کہ اس کا تو ہی باغباں ہے
وہیں چاند کہتے ہیں تو حکمراں ہے

تری اوڑھنی سرخیاں ہیں شفق کی
تری سیر گاہیں بلندی افق کی!

مسیح الدین خاں متین

شوق

شوق ایک غیر معمولی خواہش، یا کسی چیز کے حصول میں انہماک، اور کسی چیز یا بات سے گہری دلچسپی کا نام ہے۔

تقریباً ہر انسان کو کسی نہ کسی بات کا شوق ہوتا ہے، کسی کو اچھے کپڑے پہننے کا تو کسی کو اچھا کھانا کھانے کا، کسی کو پڑھنے اور کتابیں و رسائل جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے تو کسی کو روپیہ جمع کرنے کی فکر گھلائے رکھتی ہے، یہ تو عام شوق ہیں، جس کا ہر شخص کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے۔

لیکن بعض شوق خاص اور شخصی ہوتے ہیں، جیسے ٹکٹ جمع کرنا، یا جانوروں کے انڈے جمع کرنا، بعض تصاویر جمع کرتے ہیں، بعض کو پرانی چیزیں، پرانی کتابیں پرانے سکّے وغیرہ کی دھن رہتی ہے۔ بعض ماچس کے تصاویر جمع کرتے ہیں، بعض چاکلیٹ وٹافی یں کی نوٹوز جمع کیا کرتے ہیں۔

اپنے شوق کی وجہ سے انسان اس چیز کے حصول کی کوشش کیا کرتا ہے کوشش اور محنت کی وجہ سے اس چیز کا کافی ذخیرہ جمع ہوجاتا ہے اور یہ ایک دلچسپ چیز ہوجاتی ہے۔

شوق کسی خاص آدمی کا ورثہ نہیں، بڑے بڑے آدمی ایسے شوقوں کے حامل ہوئے ہیں، یورپ میں تو بڑے بڑے بادشاہ اور امرار کو ایسی چیزوں کا شوق ہے اور وہ اپنی مطلوبہ چیزوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں جب ہی تو ان کے عجائب خانے بھی قابل دید اور نایاب ہوتے ہیں۔

ہمارے پاس بھی بچوں کو ٹکٹ (اسٹامپ) جمع کرنے کا بہت شوق ہے، اسی طرح بعض بچوں کو عید کارڈ اور موزگرام اور فوٹوز وغیرہ جمع کرنے کا شوق ہے، میرے بھائی کو بادشاہوں کی تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے ان کے پاس ان تصاویر کا ایک دلچسپ البم بن گیا ہے۔ اسی طرح میری بڑی بہن کو خوش نما پتھر بڑے پسند ہیں جہاں کہیں کوئی چھوٹا اور خوش نما پتھر نظر آجائے وہ اسے خوشی سے اٹھالیتی ہیں، ان کے بچپن کے جمع کئے ہوئے پتھر اب تک ہیں۔ آج سے اٹھارہ انیس برس پہلے جب ایلورہ، اجنٹا کی سڑکیں تیار ہورہی تھیں تو گار کے بے شمار خوش نما پتھر نظر آتے تھے اور انھیں جو بھی سفید و خوش نما پتھر نظر آجاتا وہ اسے اٹھالیتیں۔

مجھے بھی ایک شوق ہے، اور وہ "ڈیوک اینڈ ڈچس آف ونڈسر" سے ان کے غیر معمولی واقعات کی بنا پر دلچسپی ہے، اسی بنا پر میں ان کی تصاویر جمع کرتی ہوں۔ چنانچہ میرے پاس ان کے فوٹوز کا جو بڑی کوششوں اور تلاش سے جمع کی گئی ہیں، ایک البم تیار ہوگیا ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی جنھیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بھی اس البم کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

یورپ والے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے بہت محنت اور کوشش کرتے ہیں، دولتمند بے حساب روپیہ صرف کرتے ہیں، اپنے شوق کی تکمیل کے لئے دور دور کے ملکوں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے ہیں، اور اپنے مطلب کی چیزیں حاصل کرلیتے ہیں۔

اسی طرح سب رسی بہن بھائی آپس میں اپنے شوق کی چیزوں کا تبادلہ کریں تو ان کی چیزوں میں کئی گنا اضافہ ہوسکتا ہے۔

کبریٰ اقبال

فصیلِ بیدر

(ایک نیم تاریخی ڈرامہ)

پہلا منظر۔

(علی برید شاہ اپنے کمرہ میں مسند نشین ہے)

علی برید شاہ۔ (پکارتا ہے) سپاہی۔

سپاہی۔ (کمرے میں آکر) جی حضور ارشاد۔

علی برید شاہ۔ کسی دربان کو وزیر اعظم کے گھر روانہ کرو اور کہو کہ "بادولت نے طلب کیا ہے"۔

سپاہی۔ (فرشی سلام کرکے) حضور کے حکم کی ابھی تعمیل کی جاتی ہے۔

(سپاہی چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

سپاہی۔ (بادشاہ کے کمرے میں آکر) عالی جاہ وزیر اعظم تشریف لائے ہیں۔

علی برید شاہ۔ ان کو یہاں بلا لاؤ۔

سپاہی۔ (باہر جاکر) سلطان عالی شان آپ کو یاد کر رہے ہیں۔

وزیر اعظم۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

(وزیر اعظم کمرے میں داخل ہوتا ہے)

وزیر اعظم۔ (قدمبوس ہوکر) حضور نے مجھ کو کس لئے طلب کیا ہے۔

علی برید شاہ۔ (متانت سے) تم اس وقت جاؤ اور علمائے سلطنت کو بادولت کے پاس آنے کی دعوت دو۔

وزیر اعظم۔ (سنجیدگی سے) حضور کے حکم کی ابھی تعمیل کی جاتی ہے۔

(وزیر اعظم چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

سپاہی۔ (بادشاہ کے کمرے میں آکر)

حضور تمام علما آچکے ہیں۔

بادشاہ۔ کیا وزیر اعظم نہیں آئے؟

سپاہی۔ وہ بھی آگئے ہیں اور باہر ٹھیرے ہیں۔

علی برید شاہ۔ اچھا جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

(سپاہی چلا جاتا ہے)

(بادشاہ کپڑے پہن کر باہر جاتا ہے تمام علما سلام کرتے ہیں)

علی برید شاہ (سلام کا جواب دے کر متانت سے کہتا ہے) میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ لوگوں سے ایک اہم بات پوچھوں .... وہ یہ ہے کہ زندوں کی حفاظت زیادہ ضروری ہے یا مردوں کی۔

تمام علما۔ (کچھ دیر بعد بادشاہ کو فتویٰ دیتے ہیں) عالی جاہ مردوں سے زیادہ زندوں کی حفاظت ضروری ہے۔

علی برید شاہ۔ (وزیر اعظم سے) تم جاؤ اور بادولت کا یہ حکم نافذ کردو کہ میری سلطنت میں جتنے مقبرے اور گنبدیں ہیں سب توڑ دئے جائیں اور ان کے پتھروں سے ایک فصیل بیدر کے اطراف جلد از جلد تعمیر کردی جائے تاکہ مصیبت کے وقت میری سلطنت اور رعیت کی حفاظت ہو سکے۔

وزیر اعظم۔ عالی جاہ! آپ کے ارشاد کے مطابق آج ہی تمام سنگین عمارتیں مسمار کردی جائیں گی۔

(بادشاہ چلا جاتا ہے)

غلام مجتبیٰ قمر (بیدر شریف)

محمود گاواںؒ

کشمیر جنت نظیر کے مغرب کی طرف وسط ایشا میں ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے جس کو ایران کہتے ہیں۔ ایران کی سرزمین نے جہاں حافظ و سعدی جیسے بلند پایہ نامور اہلِ سخن پیدا کئے ہیں وہیں پر دنیا کی سیاست میں طوفان برپا کرنے والے خواجہ محمد جیسے بیدار مغز سپوت نکالے۔ خواجہ محمد محمود گاواں کے نام سے مشہور ہے۔ اس بیدار مغز وزیر نے ایران کے صوبہ گیلان میں ۱۴۲۰ء میں جنم لیا تھا۔ خواجہ ایران کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ تھا مصائب زمانہ سے تنگ [illegible] ہند کا رخ کیا۔ ہندوستان کی سرزمین تب اس نے اپنے لئے کشمیرِ دکن کا نقطہ انتخاب کیا۔ اس وقت محمد شاہ دکن پر حکومت کر رہا تھا اس کے آنے کے بعد محمود گاواں کو وزارت کے عہدے پر سرفراز کیا۔ گاواں کی بیدار مغزی اور شاہ وقت کی اعلیٰ قدری نے گاواں کے پوشیدہ جوہر کو چمکا دیا۔ اس کی بہادری علم دوستی سیاست وغیرہ کے اچھے صفات کے لئے دفتر درکار ہے۔

اور تواریخ اس کی شاہد ہیں، اس کے علاوہ خود بیدر اپنی زبانِ حال سے اس کی تعریف کے گیت گا رہا ہے۔ موجودہ شہر بیدر سے کچھ فاصلے پر ایک نہایت پُرفضا مقام پر یہ ہیرا دفن ہے گو اس سادہ مزاج ولی صفت کے مزار پر دنیاوی جاہ و حشم نہیں اور نہ اپنا اونچا گنبد دکھا کر سیاحوں کے دلوں کو راغب کرتا ہے لیکن اس کا سادہ سا مزار حساس طبیعت رکھنے والوں کے لئے شمع ہدایت کا کام کرتا ہے۔ اور دنیا کی بے ثباتی کا درس دیتا ہے۔ باوجود سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک ہونے کے اس نے اپنے رہنے کے لئے کوئی شاندار محل بنا کر فضول خرچی نہ کی بلکہ اسی پیسے کو کارِ خیر میں صرف کر کے آنے والوں کے لئے مثال قائم کی چنانچہ اس کی قبر ایک سادہ چھوٹی سی دیوار سے گھری ہوئی ہے۔ جو سات فٹ کی ہے۔ جس پر موجودہ حکومت کی طرف سے ایک سنگ تربت نصب کیا گیا ہے۔

اطراف کے مناظر سوہانِ روح ہیں۔ آس پاس کے درخت اپنی زبان سے اس اعلیٰ دماغ ماہر کا ماتم کر رہے ہیں۔ الغرض اس مدبر کی قبر دیکھنے کے بعد فوراً غالب مرحوم کا یہ مصرع یاد آتا ہے۔

”خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں“

اقبال احمد صدیقی
(نلنگہ ضلع بیدر)

لہ بیدر (حیدرآباد کا ایک ضلع)

گرمی

کپڑے گرم اُتارو بھائی — سردی گئی اور گرمی آئی
گرمی کے ہیں چار مہینے — خوب بہیں گے سب کے پسینے
آتی چلیں جب گرم ہوائیں — گھر سے باہر کیونکر آئیں
کیسے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے — دیکھ کے پانی غم غم کرتے
سرخ ہوئے ہیں پھول سے چہرے — باغ میں لالہ پھولے جیسے
چڑیاں چوں چوں بول رہی ہیں — گرمی سے منہ کھول رہی ہیں
چوپائے بھی دھوپ کے مارے — بیٹھ گئے ہیں چھاؤں میں سارے
ڈھونڈ رہی ہیں بھینسیں ساری — ٹھنڈک، سایہ، کیچڑ، پانی
بڑھتی چلی ہے پیاس کی شدت — زوروں پر ہے دھوپ کی حدت
چلتے مسافر بیٹھ گئے ہیں — سوئے ہیں کچھ لیٹ گئے ہیں
جنگل میدان آگ کی چادر — شعلہ نما ہیں کنکر پتھر
چمک رہے ہیں ریت کے ذرے — جیسے بکھائے کوئی شرارے
جھونکے پیہم گرم ہوا کے — جھلس رہے ہیں منہ کو آ کے
سوکھ گیا دریا کا کنارا — اور اترا ہے پانی سارا
اوپر سورج شعلہ فشاں ہے — نیچے زمیں بھی آتش دان ہے

سید یعقوب (جنگل گوڑہ)

خدا جھوٹ نہ بلوائے

شہر کی مسرت فضا میں پہنچ جانے کے چند ہی روز بعد لٹ لٹا کر کھکہ ہوگیا۔ وہ جیب جو کبھی نانبائی کے تنور کی طرح ہمیشہ گرم رہا کرتی تھی اب کسی قالب مردہ کی طرح سرد ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح شہر کی اس ہاہو شور و غل سے دیوانہ وار کسی چھوٹے سے گاؤں کی طرف بھاگ جاؤں جہاں کی زندگی میں تصنع نہیں جو زندگی فطری زندگی ہے لیکن پاس ٹوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ نہ معلوم ایسے برے وقتوں میں دوست احباب عزیز اقارب کہاں مر گئے۔ اتفاق سے کبھی کوئی مل جاتے ہیں تو علیک سلیک کے بعد ہی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ "کہاں ٹھیرے ہو اور کب جاؤ گے"۔ یہ سوال کچھ ایسا معنی خیز ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر ان کے اخلاق کریمہ سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس آڑے وقت میں حاتم دوراں بن سکیں گے۔
لیکن امید کا چراغ ناامیدی کے تیز سے تیز جھونکوں سے کبھی گل نہیں ہوتا۔ دن بھر ٹھیلہ گاڑی کی طرح شہر میں چکر لگاتا رہتا ہوں۔ امید بندھ جاتی ہے کہ خدائے عرش بریں من و سلویٰ کے کرشمے کی طرح اب بھی کوئی نیا معجزہ تبلانے والا ہے۔

ایک دن یوں ہی خدا سے لو لگائے نام پلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے ایک دوست مل گئے جو گلبرگہ جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سفید سفید چمک دار سکوں کو دیکھ کر بس رال ہی تو ٹپک پڑی ان سے مل کر میں نے اپنی دوستی اور محبت کے بڑے بڑے بلند آہنگ دعوے پیش کئے۔ اور آخر میں کہا۔

" دوست تمہارے ساتھ اسباب بہت ہے لاؤ تمہارا ٹکٹ میں خرید لوں"۔

میرا دوست مسکرا رہا تھا ــــ میرے ہاتھ میں چاندی کے چار سکے بڑے جگمگا رہے تھے۔ ایک مدت کے بعد روپیوں کو ہاتھ میں پکڑتے ہی جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ تیر کی طرح تیزی سے ٹکٹ گھر پہنچا۔ ٹکٹ خریدا اور نو آنے ہاتھ میں دبائے باہر آیا۔ دوست نے جب باقی پیسوں کا مطالبہ کیا تو صرف چار آنے میرے ہاتھ سے اس کے ہاتھ میں گرے اور پانچ آنے میں نے اپنی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑ لئے تھے۔ دوست نے ایک معنی خیز نظر سے میرے بشرے کا مطالعہ کیا۔ میرے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ ریل نے سیٹی دی اور میرا دوست مجھے خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ میں اسٹیشن سے باہر چلا آیا۔ میرا دل خوشی سے بانسوں اچھل رہا تھا۔ پانچ آنے آج میرے لئے پانچ روپے سے زیادہ قدر کے تھے۔

پانچ آنوں میں پورا ایک دن بھی تو نہ گزر سکا۔ پھر دنیا کسی فوٹوگرافر کے ڈارک روم کی طرح اندھیری

نظر آ رہی تھی۔ دن تمام شتر بے مہار کے طرح پھر۔ سر شام عابد روڈ پر ایک بجلی کے کھمبے سے سہارا لے کر سگریٹ کی نبض دیکھنے لگا۔ تانگہ والوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا جو آتا پوچھتا۔

"کہاں جائیں گے صاب ؟"

تنگ آکر اور اپنی لوٹیڈ کی شیر دانی کی عزت بر قرار رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا۔

"نہیں نہیں! میں "ویکا جی" جا رہا ہوں"

یہ بات گئی گزری ہوگئی۔ میں آدھے گھنٹے تک وہیں اطالوی مجسمے کی طرح کھڑا رہا۔ وہ کمبخت تانگے والا بھی ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اور تانگے والا آیا اور وہی سوال جو ان کی گھٹی میں پڑا ہے دہرایا۔

"کہاں جائیں گے صاب ؟"

قبل اس کے میں کچھ جواب دیتا۔ پہلے بدمعاش تانگے والے نے کہا۔

"چپ رہ، صاب ویکا جی جا رہے ہیں"

اس نے کچھ اس انداز بلکہ اکھڑپن سے یہ جملہ ادا کیا کہ تمام تانگے والوں میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ میری غصہ سے بری حالت ہوئی جا رہی تھی سر سے پیر تک غصہ سے کانپ رہا تھا لیکن غصہ کو کڑوی دوا کی طرح پی گیا۔ اگر میں کوئی پولیس انسپکٹر ہوتا یا کم از کم جمعدار ہی ہوتا تو بدمعاش کی وہ درگت بناتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا لیکن ـــــ خدا کو منظور نہ تھا اس لئے حضرت ایوب علیہ السّلام کے صبر کو یاد کرتا ہوا وہاں سے ٹل گیا۔

سامنے ایک پرانے اور جگری دوست ملے۔ ان سے افلاطونی قسم کی محبت تھی انھوں نے "عزیز کمپنی" چلنے کی دعوت دی۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے صبح سے ایک کھیل تک اڑ کر منہ میں نہ گئی تھی۔ خواہ مخواہ کے عذر و حیلے کے بعد خوشی خوشی ان کے ساتھ ہو گیا۔ خوب سیر ہو کر کیک پیسٹری، آیسکریم وغیرہ جیم دئیے۔ جب وہ بل دے رہا تھا تو میں نے عمداً اپنی خالی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پورے لکھنوی انداز میں کہا۔

"ایں قبلہ یہ کیا غضب کر رہے ہیں آپ! بل میں ادا کروں گا"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جانے دو یار تکلف کو"

میں جان کی لاکھوں پائے کا ورد کرتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ پیلی پگڑی والا دوست ملا۔ اس نے منی آرڈر آنے کی بشارت دی۔ سر سے پیر تک بجلی دوڑ گئی۔ خوشی سے بے اختیار زبان سے نکلا۔

"اے خطوط رساں! جی چاہتا ہے کہ تیرا منہ چوم لوں۔ تجھے اپنے دل میں بٹھالوں روز دیوتا کی طرح تجھے پوجوں۔ تو منی آرڈر نہیں لایا بلکہ میرے لئے پیغام زیست لایا ہے تو خطوط رساں نہیں فرشتہ ہے ـــــ"

میرے ایک دوست نہ معلوم میری اس وارفتگی کا کب سے مطالعہ کر رہے تھے ان کی مسکراہٹ ہنسی سے قہقہہ میں تبدیل ہو گئی اور ان کے قہقہے نے میرے قصیدہ کا ٹینٹوا دبا دیا۔

خیر ہم اور وہ وہاں سے نکلے۔ اب میں مور کی طرح اکڑتا اکڑتا چلا جا رہا تھا ویکا جی کے سامنے کھڑے ہو کر ایک فاتحانہ نظر ان بدمعاش تانگے والوں پر ڈالی۔ وہ مرعوب ہو کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ویکا جی کے صحن میں داخل ہوتے ہی میں کارل مارکس کی طرح حزب اشتراکی نہ رہا بلکہ اپنی گزشتہ بیچارگی کا بدلہ نکالنے کی غرض سے اپنی سرمایہ داری کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ میرا دوست گا رہا تھا۔

جنت میں بھی یاد آئیں گے یہ چند مہینے

ابراہیم جلیس

خطبۂ صدارت

(جو طلبہ کانفرنس صوبہ میدک حیدرآباد دکن میں بروز چہارشنبہ ۲۹ رمئی سنہ ۱۹۴۰ء بمقام محبوب نگر پڑھا گیا)

سب سے پہلے مجھے اس خداوند قدوس کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے ہم کو شکر گزار بندوں میں شامل کیا۔ بانیان کانفرنس کا مخلصانہ شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے اس اہم کانفرنس کا صدر مجھے منتخب کیا ہے۔ یہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں آج ایک ایسی کانفرنس کی صدارت کر رہا ہوں جو ان کے لئے منعقد کی جا رہی ہے جن سے آئندہ ملک کو بہت زیادہ توقعات ہیں۔ اور جن کی خوبی یا خرابی پر ملک و ملت کی خوبی یا خرابی منحصر ہے۔

معزز طالب علمو! یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک ایسے زرین دور میں پھل پھول رہے ہیں جس کے فیض کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہے اور جہاں ہمیں وہ وہ سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں جو شاید ہی کہیں اور ہوں بشرطیکہ ہم صحیح طور پر ان سے استفادہ کریں اور باہمی فلاح و بہبود کے نیک خیالات کو اپنے دل و دماغ میں پیدا کرتے رہیں۔

سلطنت حیدرآباد کا اور عہد عثمانی کا سب سے بڑا اور درخشاں کارنامہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے۔ اس سے میری مراد جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ اس کا بڑا مقصد یہی ہے کہ ہم میں اپنی زبان کی سچی محبت پیدا ہو۔ دوسری زبانیں بولنے والے اس کی تباہی کے درپے ہیں مگر اردو مٹائے نہیں مٹ سکتی کیونکہ وہ ہندوستان کی سب جلیل القدر قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے مقصد کو پورا کریں اور اس زبان کی اشاعت اور ترقی کی ممکنہ کوشش کریں۔ جہاں تک ہوسکے ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ تحریر و تقریر کے وقت غیر زبانوں کے الفاظ استعمال نہ کریں۔ ہماری زبان سب زبانوں سے زیادہ آسان زبان ہے۔ اس میں ویسے سخت اور بھدے الفاظ نہیں جو غیر زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے سیکھنے کے لئے کافی وقت درکار ہے مگر غیر زبان دان اصحاب بھی بغیر کسی مشکل کے اردو بول لے سکتے ہیں۔ اردو زبان میں بہت ساری دوسری زبانوں کے الفاظ آگئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ آسان الفاظ ہماری زبان میں موجود ہیں اس لئے دوسری زبانوں کے مشکل الفاظ سے ہم کو قطعی پرہیز کرنا چاہیئے۔ طالب علموں کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ وہ صحیح اردو بولیں۔ غلط الفاظ کے استعمال نے بھی زبان کی خرابی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ طالب علموں کا یہ فرض ہے (اگرچہ تلخ ہی سہی) کہ جہاں کوئی غلط الفاظ استعمال کرے اسے صحیح الفاظ سے آگاہ کردیں۔

ادنی طبقہ کے اکثر ملازمین غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ جہاں دوسری زبانوں کی طرف سے تعلیم بالغان کا کام شروع ہوگیا ہے وہاں اردو داں اصحاب اور خاص کر طالب علموں کی طرف سے بھی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ بڑی عمر کے لوگ اردو سیکھیں لکھیں اور پڑھیں۔ اگر ہم چھٹی کے زمانے میں یا فرصت کے وقت اپنے ملازموں اور محلے کے ان پڑھ لوگوں کو اردو پڑھانا اپنا فرض منصبی سمجھیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی سعادت ہوگی جس پر ہم جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد ملک میں عام علمی بیداری پھیلی اور کئی ایک انجمنوں اور اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ ہم کو چاہیے کہ ان سب کی مدد کریں جو واقعی اردو کی کچھ خدمت اور حفاظت کر رہی ہیں اس کے علاوہ ان سب اخبارات و رسائل کی مدد کرنا ہمارا اولین فرض ہے جو اردو کی اشاعت اور توسیع کی کوشش کر رہے ہیں۔

طالب علم ابھی سے ملک کے حالات سے دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ طلبہ کو باہر کی دلچسپیوں میں کبھی حصہ نہیں لینا چاہیئے اور اپنی تعلیم کی طرف ہمیشہ متوجہ رہنا چاہیے۔ مگر یہ ہر وقت اور ہر جگہ کے لئے صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ قوم اور ملک کی آئندہ ترقی کی باگ ڈور ہم طلبہ ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر طلبہ ابھی سے ملک کی حالت کا مطالعہ نہ کریں تو آئندہ ان کی زندگیوں میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں گی اور وہ ملک کی آئندہ ترقی کے لئے کسی طرح سے بھی کارآمد نہیں ثابت ہو سکتے۔ اگر ہم مدرسہ کی چار دیواری ہی میں رہیں تو ہم دنیا کے واقعات سے واقف نہیں ہوں گے جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ہم تعلیم ترک کر کے کسی سیاسی جماعت کے روح رواں ہو جائیں بلکہ طالب علموں کو چاہیے کہ اپنی تعلیم پر زیادہ زور دیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی سیاست سے بھی تھوڑا بہت واقف رہیں تاکہ آئندہ زندگی کے لئے تیار ہو سکیں۔

اس کے علاوہ دوسری قسم کی غیر درسی دلچسپیوں میں حصہ لینا بھی طلبہ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ نمائشوں سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر تعلیمی نمائشیں بھی ہوتی رہتی ہیں جن سے درسی کتابوں کے مطالعہ میں بہت مدد ملتی ہے۔ سینما دیکھنا بھی طالب علموں کے لئے مضر ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن انہیں ایسے فلم دیکھنے چاہئیں جو ان کی درسی کتابوں سے متعلق ہوں۔ ایسے فلم زیادہ تر انگریزی میں ہوتے ہیں مثلاً اکثر فلم مشہور مصنفوں کے لکھے ہوئے ناولوں اور قصوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور انہیں میں سے بعض نصاب میں بھی شامل ہیں۔ طلبا کی زندگی ایک خاص نظام نامہ کے تحت ہونی چاہیے طالب علم کو اپنے تمام کام وقت مقررہ پر کرنے چاہئیں ایسی صورت میں اس کی زندگی ایک پابند اور کامیاب زندگی کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کا نظام نامہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دن بھر وہ درسی کتابوں ہی کو پڑھتا رہے۔ ایسی غیر درسی دلچسپیوں میں حصہ لینا اور ایسی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی اس کے لئے نہایت ضروری ہے جو اس کے اخلاق کو سنوارے اور جن کی وجہ سے اس کی معلومات میں اضافہ ہو۔

مدرسوں میں بعض مضامین مضمون اختیاری کی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر ان سے ہر طالب علم کا واقف ہونا ضروری ہے۔ مثلاً عربی و فارسی جن کا کئی سو سال ہندوستان میں بول بالا رہا مگر افسوس ہے کہ اب ہم ان زبانوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اس صورت میں ایک طالب علم کا فرض ہے کہ وہ خانگی طور پر اس کا مطالعہ کرے ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس کا ہماری زندگی سے کس قدر قریبی تعلق ہے۔ مگر یہ مضمون بھی ہر طالب علم کو نہیں پڑھایا جاتا اور اس کی شاخوں مثلاً نباتیات و حیوانیات وغیرہ کو مضمون اختیاری کہا گیا ہے۔ اس لیے ہم کو عام معلومات کی کتابیں پڑھنی چاہئیں تاکہ ان سے ہم ان ساری باتوں سے واقف ہو جائیں جو مدارس میں نہیں بتائی جاتیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہم کو جس وقت کی خبریں اسی وقت ملتی رہیں اور معلومات کا دائرہ وسیع ہو۔ مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اسی پر اکتفا کرنے سے زیادہ ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ ہم اسی مضمون سے متعلق دوسرے مصنفوں کے خیالات سے بھی واقف نہ ہوں۔ اس صورت میں بھی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

طلبہ کو چاہیے کہ اپنی ایک مستحکم برادری قائم کریں یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ طلبہ میں آپس میں اتحاد و اتفاق ہو۔ اس وقت تک ہم ترقی نہیں کر سکتے جب تک ہم کو ایک دوسرے سے واقفیت نہ ہو اس کے بغیر دنیا میں ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ہم ایک دوسرے

کے تعاون اور ہمدردی کے ذریعہ سے اپنے کاموں کو بہت زیادہ سہل بنا سکتے اور اپنی دلچسپیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ طلبہ میں باہمی ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن اقوام میں اتفاق و اتحاد تھا وہی دنیا پر غالب رہیں۔ اور جہاں کہیں نفاق پیدا ہوا وہ قومیں نیست و نابود ہو گئیں۔ کوئی خوبی نہیں پیدا ہو سکتی جب کہ طلبہ میں ایک دوسرے کی محبت نہ ہو اور ایک دوسرے کا لحاظ نہ ہو۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں ۃ اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

محبت اور اتفاق اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب کہ ہم ایک دوسرے سے واقف رہنے کی کوشش کریں اور آپس میں ہمدردی سے پیش آئیں۔

طلبہ کو اپنی علمی و ادبی صلاحیت بڑھانے کے لئے تحریری اور تقریری مقابلوں میں شریک ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان مقابلوں میں شریک ہونے کی وجہ سے تحریری مشق پختہ ہو جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ طلبہ کو خود اپنی جانب سے اس قسم کے مقابلے منعقد کرنے چاہئیں اور ساتھ ہی انعامات وغیرہ دیکر ایک دوسرے کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ سے ترقی کے میدان میں ایک دوسرے کی ریس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔

مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا ذوق بھی طلبہ میں شروع سے ہی پیدا ہونا چاہیے۔ مضمون نگاری ایک خاص مشغلہ ہے جس میں وہ لطف آتا ہے جو شاید ہی کسی اور شغل میں آتا ہو۔ ہم کو ایسے مضامین یا کتابیں لکھنی چاہئیں جن سے دوسروں کو کچھ فائدہ پہنچے۔ غیر مفید کتابیں شائع کرکے شہرت حاصل کرنا سخت معیوب بات ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے مضمون نگار مصنف اور انشا پرداز مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثروں کو طالب علمی ہی کے زمانے سے اس قسم کا شوق تھا اور اسی زمانے سے اگر ہم مشق رکھیں تو آئندہ چل کر ہم میں سے بعض بڑے مصنف بھی بن سکتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں نے بتایا ہے عام مطالعہ کا شوق بڑھایا جائے۔ درسی کتب کے بعد سب سے زیادہ توجہ ہم کو اسی طرف کرنی چاہیئے۔ ہماری ذہنی نشو و نما کے لئے کتابیں بہت کام آتی ہیں۔ بڑے بڑے مقررین جن کو اب ہم دیکھ رہے ہیں ان کا مطالعہ طالب علمی ہی کے زمانے میں بہت وسیع تھا۔ وہ اچھی اچھی کتابیں پڑھتے تھے اور دوسرے مصنفوں اور مضمون نگاروں کے خیالات اور طرز تحریر سے واقف ہو کر خود اسے سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہماری تحریریں اور تقریریں دونوں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب کہ ہم ہر مشکل لفظ یا ترکیب کے معنی سمجھیں اور اسے پھر اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

دماغی محنت کے بعد ایک طالب علم کو سیر و تفریح کی سخت ضرورت ہے۔ اس کی یہ تفریح بھی ایک بڑی حد تک اس کو فائدہ پہنچا سکتی ہے اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور طالب علم میں سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور سفر کے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں کے طلبہ تعطیل کے دن کبھی اپنے گھر میں نہیں رہتے بلکہ پکنک کے لئے باہر نکل جاتے ہیں۔ ایک تو تبدیل آب و ہوا ہو جاتی ہے، دوسرے انھیں اس سیر و تفریح سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ جب بڑی چھٹیاں ملتی ہیں اور مدرسے کا کام بھی زیادہ نہیں رہتا اس وقت طلبہ اگر دور دور کے مقامات کا دورہ کریں تو بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس وقت ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ دوسری جگہوں کے طلبہ کے ساتھ تعلقات استوار رہوں اور ایک دوسرے سے واقفیت ہو۔

(باقی آئندہ)

معین الدین احمد انصاری

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۴۵۰ م
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۷)
جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

سب رس

جلد ۳ بابت جولائی سنہ ۱۹۴۰ء شمارہ ۷

فہرست مضامین

لیڈی حیدری

لیڈی حیدری کی وفات نے ہندستانی خواتین میں ایک ایسی جگہ خالی کردی ہے جو اپنا ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ لیڈی حیدری نہ صرف اپنی خاموش مصروفیات سے بلکہ اپنی ذات سے بھی ایک مخصوص امتیاز کی مالک تھیں۔ ان کا ہر سانس جذبۂ ایثار اور ذوقِ عمل کی گرمی لئے ہوئے تھا۔ انھوں نے خواتین میں بیداری پیدا کی اور اس بیداری کو ملک و قوم کی امداد میں استعمال کیا۔ حیدرآباد کے گزشتہ پچیس سال کی نسوانی سرگرمیوں کا تذکرہ اپنے ہر صفحہ پر ان کا نام رکھتا ہے۔ ان کا جذبۂ ہمدردی فرقہ، نسل اور وطنیت کے محدود دائروں سے بلند و بالا تھا۔ انسانیت کی بقا ان کے پیش نظر تھی۔ اسی جذبہ کے تحت لیڈی حیدری کی زندگی، زندگیوں کی سنوار میں گزری۔ کون نہیں جانتا کہ لیڈی حیدری نے اہلِ حیدرآباد کو زلزلوں کی تباہیوں اور جنگ کی خونریزیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اور ہر دفعہ ان کی قیادت میں حیدرآبادی خواتین نے قابلِ اعانت انسانوں کے لئے ایثار و ہمدردی کا خراج ادا کیا۔

اپنے شوہر سر اکبر کی طرح وہ بھی ہندستان کی مشترکہ قومیت کی قائل تھیں۔ اس زمانے میں جب کہ مذہب کے سہارے ذاتی مفادات کے ہتھیار امن و سکون کو خون آلود کر رہے ہیں، ہندستان کو ہر اُس انسان کی ضرورت ہے جو انسانیت کی بنیادوں پر اپنے تفکر اور عمل کی تعمیر کرتا ہے۔ مذہب سکونِ زندگی کا نام ہے، اس سے اضطراب بے لذت پیدا کرنا مذہب کی توہین۔ سر اکبر اور لیڈی حیدری کے تخیلات اور اعمال کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں ایک صحیح راہِ عمل ملتی ہے۔ ایسی راہِ عمل جہاں دلوں پر کدورت کا غبار نہیں اڑتا بلکہ اس میں سکون کی لہر اٹھتی ہے۔

لیڈی حیدری زندہ نہیں ہیں، لیکن ان کے کارنامے زندہ رہیں گے۔ ”سب رس“ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی خدمت میں اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ اُسے توقع ہے کہ لیڈی حیدری نے حیدرآبادی خواتین میں جو احساس پیدا کر دیا ہے، وہ مستقبل کی تعمیر کرتا رہے گا اور یہی تعمیرِ مستقبل اصل میں لیڈی حیدری کی یادگار ہے جس کو زمانے کا دھارا کبھی نہیں مٹا سکتا۔

مسکش

اظہارِ عقیدت

محترمہ لیڈی حیدری مرحومہ کی وفات پر اظہارِ تعزیت کے لیے ۵ رجون کو حیدرآباد لیڈیز اسوسی ایشن کے زیر اہتمام جو عظیم الشان جلسہ محترمہ بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اس میں یوں تو کئی معزز خواتین نے تقریریں کیں لیکن صدر نشین صاحبہ کے خطبۂ صدارت اور محترمہ سروجنی نائیڈو صاحبہ کی تقریر کا اقتباس ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ اور اس جلسہ میں جو قرار داد تعزیت منظور ہوئی وہ بھی آخر میں درج ہے۔

خطبۂ صدارت

"آج ہم سب اس جلسۂ تعزیت میں اس لئے شریک ہوئے ہیں کہ لیڈی حیدری مرحومہ جو ہمارے طبقہ کی روحِ رواں تھیں اور ہماری سوسائٹی کی صدر اور ہماری بہترین رہنما تھیں ان کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کریں۔ مرحومہ کی موت ایک ایسا سانحہ ہے جس کو حیدرآباد کی خواتین کبھی بھول نہیں سکتیں۔ مرحومہ میں جو اوصاف اور نیکیاں تھیں ان کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہماری بچیوں کے لئے ماں کا دل رکھتی تھیں اور بڑی بوڑھیوں کے لئے غمگسار بہن تھیں۔ ان کو اپنے طبقہ کی ترقی اور بہبودی دل سے مطلوب تھی۔ انھوں نے اپنی جنس میں علم و عمل کی تازہ روح پھونک دی تھی۔ ان کے اعلیٰ اخلاق و نیک اوصاف کے لحاظ سے وہ دوسروں کے لئے شمعِ ہدایت تھیں۔ بہت سے مفید کام انھوں نے ایسے کئے جو ہمیشہ ان کی یادگار رہیں گے مثلاً محبوبیہ گرلز اسکول جس میں ہماری لڑکیاں انگریزی تعلیم و تربیت حاصل کرتی ہیں ان کی زندہ یادگار ہے۔ اس کے سوا وہ تعلیم نسواں کی کمیٹی کی صدر تھیں۔ وہ اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتی تھیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۸ء میں جب طغیانی آئی اور سیکڑوں خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے تو آپ نے مصیبت زدگاں کی امداد کے لئے بڑی مشقت اٹھائی جس کے صلہ میں قیصر ہند کا تمغہ پایا۔ اسی طرح سے طاعون و انفلوئنزا کے زمانہ میں آپ نے خلقِ خدا کی خدمت کی۔"

"حیدرآباد کی خواتین میں جو میل جول اتحاد و شائستگی پائی جاتی ہے اس کی بنیاد ایک بڑی حد تک مرحومہ نے ڈالی تھی ہمارے خاندان سے ان کے قدیم مراسم تھے اور نواب عماد الملک مرحوم ان کو بچپن سے چاہتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔ وہ ایک قابلِ نمونہ بیوی تھیں جنھوں نے اپنے عالی قدر شوہر کا ہر کام میں ہاتھ بٹایا اور عمر بھر ان کی مونس و غمخوار رہیں اور تقریباً (۵۰) برس کی محبانہ زندگی کے بعد اپنے شوہر کے سامنے رحلت کیں۔"

"موت تو فطرت کا ایک آئین ہے جو ہمیشہ سے یوں ہی چلا آ رہا ہے یوں ہی چلا جائے گا۔ جو پیدا ہوا ہے اس کو موت لازم ہے۔ البتہ جو لوگ اپنی نیکیاں دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں وہ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ مرحومہ میں جو خوبیاں تھیں اور جو احسانات انھوں نے حیدرآباد پر کئے وہ کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔

بیگم مہدی یار جنگ بہادر

لیڈی حیدری کی توصیف

لیڈی حیدری دو بڑی اقوام ہندوستانی اور عرب کے حقیقی اوصاف کی آئینہ دار تھیں ان کی سچی رحمدلی احسان، ادائی فرض بے لوث خدمت برداشت کی بے انتہا قابلیت، ادراک او رحمیت یہ سب باتیں ملک کی روایات.... کے بالکل مطابق تھیں. ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنے ورثہ میں جاہ و جلال، کامل وفاداری، بے دریغ سخاوت، قوت ارادی پیغمبر اعظم صلعم اور اپنے آبا و اجداد سے پائی تھیں ان کے گھر کے دروازے ہر کس و ناکس کی مہماں نوازی کے لئے کھلے ہوتے تھے بلکہ ان کے درد مند دل کا دروازہ ہر مفلس و بیکس اور مصیبت زدہ کی خاطر مدارات کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ شعلۂ جاں بخش "" ہندوستانی نسوانیت کا کنول اور عورتوں کی بے تاج شہزادی تھیں اور وہ ایسی زبردست شخصیت کی حامل تھیں کہ ہر زمان و مکان میں غیر معمولی تسلیم کی جاتی تھیں .... طغیانی رود موسیٰ نے پہلی مرتبہ انھیں ایثار اور طاقت کی کسوٹی پرکسا. جب کہ وہ ایک نہایت جوان اور حسین مسلم خاتون تھیں عوام کے لئے ان کے ذاتی جذبات کی اہمیت نے قدامت پسند زمانہ کے نکتہ چینوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا. پلیگ اور انفلوئنزا کے پُرآشوب زمانہ میں انھوں نے دن رات کام کیا اور ڈاکٹروں اور نرسوں کا ہاتھ بٹانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور امدادی کاموں کے لئے رضا کار جمع کئے. بہار اور اڑیسہ کے زلزلہ کے مصیبت زدگاں کو ان کی سرگرم کوشش نے حیدرآباد سے ہزاروں روپے جمع کر کے بھیج کر نجات دلائی مرحومہ کی سچی خدمت گزاری کی یہ دلیل ہے کہ گزشتہ سپٹمبر میں جب کہ وہ بالکل بیمار اور کمزور تھیں اپنی ریاست کے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے خواتین سے اپیل کی کہ وہ امداد میں دریا دلی سے کام لیں .... ہزاروں عمارتیں چونے اور پتھر کی موجود ہیں جو لیڈی حیدری کی زندگی کی شاہد ہیں انھوں نے اس ریاست میں کئی اداروں کو قائم اور فروغ دیا اگر ہم بحیثیت ایک غیر منقسم نسوانیت کے اپنے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں اور اپنی محبت و کچی کوشش سے ظاہر کریں تا کہ ہندوستانی خواتین کے مستقبل اور خدمت مخلوق کے خواب جو وہ دیکھا کرتی تھیں صحیح نکلیں.

سروجنی نائیڈو

قرارداد تعزیت

تیس برس سے زیادہ مدت تک مرحومہ ہماری مختلف کوششوں کا مرکز بنی رہیں۔ وہ ہماری قوتوں کا سرچشمہ تھیں. اور ہماری صادق دوست اور سب سے دانشمند مشیر تھیں انھوں نے اپنے ذاتی کردار کا نمونہ پیش کر کے ہم کو یہ بتایا تھا کہ خلق خدا کی خدمت صحیح معنوں میں کس طرح کرتے ہیں اور ایثار و قربانی کس کو کہتے ہیں. اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ ہمارے سامنے وفا شعاری صداقت اور عالی ہمتی کا علم بلند کرتی ہیں۔

ہم ان کی اعلی شخصیت کی وجہ سے آپس میں متفق رہے اور ہم اس کا تہیہ کرتے ہیں کہ آئندہ بھی ان کے نام سے آپس میں میل جول اور اتحاد برقرار رکھیں گے. ہمارے جذبات تشکر محض ان کی تعریف کرنے یا دعا کرنے تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے سب حرکات و سکنات سے ظاہر ہوں گے۔ انھوں نے ہمارے سامنے جو نصب العین پیش کئے ان کو ہم ہمیشہ محفوظ کریں گے اور انھوں نے اپنی زندگی میں جن جن کاموں کا بیڑا اٹھایا اور جن کے اتمام کی ان کو تمنا تھی ان سب کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

لیڈی حیدر نواز جنگ مرحومہ

موت سے زیادہ کوئی چیز یقینی نہیں ہے۔ یہ آئین فطرت کا ایسا اٹل قانون ہے کہ کسی عنوان بھی انسان اس سے نہیں بچ سکتا یوں ہزاروں لوگ دنیا سے اٹھ جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کی یاد جو اپنے پیچھے بے مثل کارنامے اور نیکیاں چھوڑ جاتے ہیں کسی طرح دل سے محو نہیں کی جا سکتی۔

لیڈی آمنہ بھی ان زندۂ جاوید ہستیوں میں سے تھیں جن کی محبت شائستگی کے نقوش حیدر آبادی خواتین کے دلوں پر نقش فی الحجر ہیں۔ مرحومہ اپنے والہانہ جذبۂ خدمت خلق کے باعث خواتین میں ضرب المثل رہیں۔ لیڈی حیدری کا خاندان اپنی ملکی و قومی خدمت کے باعث نہایت ہی ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے۔ آپ ہندوستان کے مشہور و معروف فرد طیب جی کی دختر نیک اختر تھیں اور ملک و قوم کی خدمت گزاری کا جذبہ ورثے میں ملا تھا جو خداداد صلاحیت کے باعث بہت خوشگوار طریقہ پر عملی جامہ پہن سکا۔ آپ کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس کی کوششوں سے ہندوستان کی نسوانی دنیا نے کروٹ بدلی تھی اور اور جس کی ایک ممتاز خاتون بیگم شریف علی نے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کی تھی۔

مرحومہ نے اپنے عزیز شوہر کی جو خدمات سر انجام دیں اور ان کی زندگی کی تعمیر میں جو نمایاں حصہ لیا وہ ہندوستان میں یادگار رہے گا۔ مرحومہ کی ہستی سر اکبر حیدری کے لئے وفا شعار و خیر خواہ بیوی اور شفیق و مہربان ماں کی سی تھی جس کے باعث ان کی خانگی زندگی جنت کا نمونہ بن گئی۔

لیڈی حیدری نے سر اکبر کے ہر کام میں ممکنہ امداد کی اسی خوش گواری اور ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملکی و قومی خدمات نہایت اطمینان اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔

لیڈی آمنہ ان خصوصیتوں کی مالک تھیں جو ایک کامیاب اور ہر دل عزیز خاتون کی وجہ امتیاز ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ خواتین ہر کام میں ان سے امداد چاہتی تھیں اور کشاں کشاں ان کی دلکش کی طرف کھنچی جاتی تھیں۔

انھیں امور خانہ داری سے بے حد لگاؤ تھا۔ انھوں نے نہ صرف نظری اعتبار سے اس کا مطالعہ کیا تھا بلکہ عملی طور پر بھی گھریلو کاروبار خود انجام دیتی تھیں۔ مرحومہ کی خوش سلیقگی سے متعلق ترکی کی مشہور خاتون خالدہ ادیب خانم نے جن بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی سلیقہ شعار زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

وہ ہمیشہ مصروف رہتی تھیں کبھی تو اپنے ملازموں کو باقاعدگی اور حسن تربیت کا درس دیتی دکھائی دیتیں تو کبھی اپنے خاص کمرے میں بیٹھیں سینے پرونے یا مطالعہ میں غرق نظر آتیں۔ انھوں نے اپنی روزمرہ زندگی کا نظام نامہ کچھ اس انداز سے مرتب کیا تھا کہ بہت کم اس میں بے ترتیبی پیدا ہوتی تھی۔

لیڈی آمنہ ہر ضرورت پر مردانہ وار اپنے آپ کو پیش کرتی رہیں چنانچہ سنہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی سے جب ہزاروں گھر برباد اور لاکھوں انسان بے خانماں ہو گئے تو آپ نے ان مصیبت زدوں کی ہر طرح مدد کی اور طغیانی کی تباہ کاریوں کا بڑی حد تک ان ہی کی کوششوں سے انسداد ہو گیا۔ اسی جانفشانی اور انسان دوستی کے صلہ میں مرحومہ کو قیصر ہند کا ممتاز تمغہ عطا کیا گیا آپ کی زندگی میں بیسیوں مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے خدمت خلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ بے مثل کارنامے نسوانی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

مرحومہ نے علم و ادب کا بھی نہایت ہی شائستہ ذوق پایا تھا۔ آپ کو نسوانی طبقہ کی نئی پود سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ ان کی

نسواں کی خاطر ہمیشہ فکرمند رہا کرتی تھیں۔ مدارس نسواں کا معائنہ کرنا آپ کے فرائض میں داخل ہوگیا تھا۔ اس طرح نسوانی اداروں کو ان کے زرین ہدایات اور بیش بہا مشوروں سے استفادہ کرنے کا موقع ہاتھ آتا تھا۔ جب ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی طرف سے علم دوست خواتین کا پہلا اجتماع لیڈیز السوسی ایشن کلب میں منعقد ہوا تو اس کا افتتاح مرحومہ ہی کی صدارت سے ہوا انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں چند مفید مشوروں سے خواتین کو مستفید کیا جو ہمیشہ کے لئے کار آمد ہیں۔ مرحومہ کا یہ خطبۂ صدارت ہمیشہ کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوگا کیونکہ اس میں انھوں نے اپنے وسیع تجربوں کی بنا پر انجمنوں اور اداروں کے قیام و استحکام سے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں وہ ہر وقت اور ہر ملک میں پیش آتی ہیں اور اگر مرحومہ کے مشورہ پر عمل کیا جائے تو ناکامی کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر یہ خطبۂ صدارت ذیل میں درج ہے۔ جو مارچ ۱۹۳۹ء کے سب رس میں شائع ہوا تھا۔

شیخ رحیم الدین (ظہیر آبادی)

خطبۂ صدارت محترمہ لیڈی حیدری صاحبہ

معزز خواتین!

علم و ادب کی ترقی کے واسطے ایسی بزموں اور انجمنوں کی ضرورت ہے جو ملک کے ادبی ذوق کو بڑھائے، اس کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے میں صحیح رہنمائی کریں اور مصنفین و مؤلفین کی دماغی قابلیتوں کو عرصۂ ظہور پر لانے کے ساتھ ساتھ ان کی نشر و اشاعت اور طباعت و فروخت کی موانعات و مشکلات سے انھیں نجات دیں۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے قیام کا بنیادی مقصد یہی ہے۔ میں خوش ہوں کہ ادارۂ مذکور اپنے فریضے کو نہایت عمدگی سے انجام دے رہا ہے۔ اور اب تک کئی مفید ادبی کتابیں ملک کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ امید ہے کہ اس میں اور ترقی ہوگی۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اب اس ادارہ نے چند خواتین پر مشتمل ایک انجمن بنام شعبۂ نسواں قائم کی ہے۔ جس کا اہم مقصد حلقۂ اناث میں ذوقِ علم و شوقِ عمل اور ادبیات اردو کا لطیف و سنجیدہ مذاق پیدا کرنا ہے۔ توقع کہ یہ شعبہ اپنے مقاصد میں کامیاب اور ہماری خواتین کے لئے مفید و کار آمد ثابت ہوگا۔

شعبۂ نسواں حیدرآباد میں اپنی نوعیت کی پہلی انجمن ہے یہ حیدرآباد کی ایک خوش قسمتی کی علامت ہے کہ ادارہ کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی ہے۔

آپ جانتی ہیں کہ اردو ہندوستان کی پیداوار اور یہاں کی مروجہ و مشترکہ زبان ہے۔ اگرچہ زبان برابر ترقی کرتی چلی جا رہی ہے اور ایک صدی کی بہ نسبت دوسری صدی میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری حاصل کر رہی ہے لیکن اب بھی ضرورت ہے کہ اس کو وسیع سے وسیع تر بنایا جائے۔ تاکہ موجودہ زمانہ کی علمی و ادبی ضرورت کو پورا کرنے کی اس میں قابلیت و استعداد پیدا ہو سکے اور ہمارے سرمایۂ علم و ادب میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے۔

اگرچہ ہماری گورنمنٹ یہ کام انجام دے رہی ہے۔ مگر علاوہ گورنمنٹ کی توجہ کے قوم کے افراد نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کا بھی فرض ہے کہ اس میں حصہ لیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک ایسے اہم شعبہ میں حیدرآباد کی اکثر بیویاں کام کرنے کو تیار ہیں مجھے امید ہے کہ یہ کام جاری رہے گا۔ ترقی کرے گا۔ اور ملک کی خواتین زیادہ تعداد میں اس میں شریک ہوں گی۔ اور گرمجوشی سے حصہ لیں گی۔

صاحب عزم اور قابل کار اصحاب نے اصلاح و ترقی کے واسطے اب تک جتنی بھی کوششیں کی ہیں ان سے ہماری بہنیں اسی وقت استفادہ کر سکتی ہیں جب کہ وہ اشتراک عمل کریں۔

چند باہمت خواتین نے اس ادارہ کے ذریعہ تہیہ کر لیا ہے کہ ترقی پرور اعلیٰ خیالات گھر گھر پہنچائیں۔ اور آپ گھر بیٹھے ان سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ اب یہ آپ کا کام اور آپ کے فیصلہ پر منحصر ہے کہ اس چھوٹے سے ادارہ کو کس طرح ترقی دیں اور اور کیونکر بام عروج پر پہنچائیں۔ آپ چاہیں۔ تو اس کو بڑا سا بڑا ادارہ بنا سکتی ہیں۔ اور دنیا پر ثابت کر دے سکتی ہیں کہ علمی میدان میں خواتین بھی پیچھے نہیں رہ سکتیں۔

میں چاہتی ہوں کہ اس موقع پر کارکنان ادارہ سے بھی یہ کہوں کہ انجمنیں بنتی ہیں ادارے قائم ہوتے ہیں۔ مگر جلد از جلد ان کی گرم رفتاری میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کی ابتدا تو شاندار ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سعی و عمل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری و بد مذاقی انہیں پست ہمت اور سست کار بنا دیتی ہے۔

لیکن جو لوگ مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔ کوئی وقت کوئی تکلیف ان کی پائے استقامت کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔ پس آپ کو بھی کسی وقت دامن استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اپنے ارادوں اور مقاصد میں عزم بالجزم محنت و مشقت اتحاد و اتفاق۔ خلوص و صداقت اور ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ ادارہ کا شعبۂ نسواں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو اور روز افزوں ترقی حاصل کرے۔

نوٹ — یہ رسالہ چھپ چکا تھا کہ محترمہ لیڈی آمنہ حیدری صاحبہ کی وفات کی اطلاع ملی یہ سانحہ ایسا نہ تھا کہ سب رس اس تذکرے کے بغیر چھاپ دیا جاتا۔ اس لئے اداریہ کے صفحات میں مرحومہ کے متعلق جو مضمون بہ عجلت ممکنہ مل سکے شامل کر رہے ہیں۔ تصویر کے لئے ادارہ مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری معتمد خاص سر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم کا شکر گذار ہے۔ جن کی وجہ سے جلد مرحومہ کی یہ خاص تصویر حاصل ہو سکی۔

اس شمارے میں ادارہ کی خبریں اور دیگر معلومات شامل نہ ہو سکیں لیکن دو مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک مولانا مسعود علی محوی کا مرثیہ یحییٰ پاشا مرحوم ہے جس پر ایک تمہید بھی ہے یہ تمہید اور مرثیہ دونوں بہت اعلیٰ پایہ کے ہیں لیکن دیر میں وصول ہونے کی وجہ سے افسوس ہے کہ رسالہ کے آخری صفحات میں درج ہیں۔ دوسرا خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کا افسانہ "سرنشت" ہے۔ چغتائی دنیائے اسلام کے واحد مصور اور ہندوستان کے چوٹی کے حسن کار سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن سب رس اب ان کو ایک بلند مرتبہ ادیب کی حیثیت سے بھی روشناس کر رہا ہے۔

گزشتہ شمارے میں سید علی منظور صاحب کی نظم کا ایک مصرعہ غلط چھپ گیا تھا صحیح مصرعہ یہ ہے ع "سی پی ہے کہ اس کو نہ پیالے سے لگا ہے" اسی طرح محمد ابراہیم صاحب انجینیر کے مضمون کے آخر میں "ماخوذ" کا لفظ ہوتا چھوٹ گیا تھا۔ "ادارہ"

سرشت

یہ ایک دھندلی سی شام کا واقعہ ہے جو تپتے ہوئے صحراؤں کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔ شام کے سکوت میں جب کان کسی آہٹ سے چونک اٹھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ تھکے ہارے آہو اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے جو ادہر اُدہر بکھرے پڑے تھے ایسے نظر آتے تھے جیسے پرندے پر تولے بستیوں سے دُور اوپر ہی اوپر اڑے چلے جا رہے ہوں۔ ہوا میں خنکی اور نمی آ چلی تھی۔ یہ شام محنت مزدوری کرنے والوں کے لئے کافی سے زیادہ دلبستگی کا سامان ساتھ لائی تھی۔ شہر کا یہ حصہ گو بلند عمارتوں اور شاہی مقبروں سے چنا گیا تھا مگر بستی کے رہنے والے نہ تو اسے اپنے رہنے کی جگہ اور نہ ان تہذیب کے نشانوں کو اپنی شایان شان سمجھتے تھے۔ وہاں نخوت نام کو نہ تھی اور جو کچھ تھا وہ ایک وجدانی کیفیت تھی یہ جگہ قبائل کے لوگوں نے جو زمانے کی نیرنگی سے یہاں آبسے تھے اپنے لئے چن لی تھی انھوں نے یہ انتخاب اپنے لئے رحمت حق تصور کیا تھا وہ بُرا بھلا دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے یا نہیں انہیں وہاں کچھ راحت نظر آتی تھی یا نہیں اس کا سوال ان کے درمیان موجود نہ تھا وہ اصول کے پابند نیک سیرت سیدھے سادے انسان تھے ان کی پیشانیاں نور کی مانند چمکتی تھیں اور جو وہاں رہتا تھا ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ایک دوسرے کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔

شہر کی بڑی بڑی کشادہ سڑکوں اور گاؤں کی تنگ پیچ دار پگڈنڈیوں سے آنے والوں کی نگاہیں ان بلند رفیع الشان عمارتوں اور گنبدوں پر پڑتی تھیں اور ان مقبروں میں اتر جاتی تھیں جہاں بادشاہ اور بادشاہوں کی اولاد آرام فرما رہی تھی —— بستی کی طرف آنے والوں کو یہ خوشی تھی کہ ان کے آرام کی ساعت دن بھر کے واقعات اور قصے کہانیاں کہنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ جو آتا تھا ایک ہی مرکز کی طرف چلا آتا تھا وہ ایک دوسرے کے شانوں پر ہاتھ رکھے بازوؤں میں بازو ڈالے گھڑی دو گھڑی اس قلندر کا تماشا دیکھنے کھڑے ہو جاتے تھے جو اس گرد و نواح میں اکثر جگہ کاٹتا رہتا تھا۔ ہر شام کو بستی میں تماشا کرنا قلندر کا معمول تھا وہ آج بھی حسب معمول تماشا کرنے میں محو تھا۔ وہ دنیا بھر کی شکایتیں پیٹ بھرنے کے لئے کر رہا تھا کوئی اسے یہ کہنے کی بھی تو جرات نہ رکھتا تھا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو آخر تمہارا کیا مقصد ہے قلندر کی آنکھوں میں سوائے جوش اور سرخ سرخ ڈوروں کے کچھ نہ تھا۔ اس کی تمام شکایتیں جو اس کو دنیا کے خلاف تھیں ہزار چیخ پکار کے بھی تسکین کا باعث نہ بنتی تھیں اور جو وہ شکایت کے طور پر کہتا تھا محض پیٹ پالنے کا ڈھب معلوم دیتا تھا۔ اس کے کردار کا اگر سرسری نظر سے بھی مطالعہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس مصیبت کا خود ہی باعث بنا ہے۔۔ پسینے سے شرابور میلے کچیلے کپڑے اسے حقیر ثابت کرنے کے لئے کچھ کم ثبوت نہ تھے اور وہ جو تماشا کرتا تھا ایسا نظر آتا تھا کہ سب کچھ اس کی عادت میں شامل ہو گیا ہے —— ایک چھوٹی معصوم لڑکی ذرا دور کھڑی آنے جانے والوں کی بجائے اپنے مالک کا منہ تک رہی تھی۔ وہ اس ٹوہ میں تھی کہ اس کے لئے اس کے مالک کا کیا حکم ہے۔ اس کے سر کے بال سرحدی

بچوں کی طرح کٹے ہوئے چمکتی ہوئی پیشانی پر اس کی معصومیت کا یقین دلاتے رہتے تھے اس کے ہاتھ میں ایک ساز تھا۔ دیکھنے میں بالکل ٹوٹا ہوا ناکارہ۔ مگر جب وہ اسے اپنے مالک کے حکم سے چھوتی تھی تو اس میں سے نغمے نکلتے تھے۔ درد اور کرب سے بھرے ہوئے۔ دل چھید دینے والے سینہ میں ہیجان پیدا کرنے والے وہ ایسے نغمے تھے جنہیں سمجھنے اور برداشت کرنے کے لئے ذہانت درکار تھی۔ اور اس خوشی سے جو اس سے پیدا ہوتی تھی اس سے لذت اندوز ہونے کے لئے دل کا احساس مند ہونا ضروری تھا۔ لڑکی ایک پُر سوز گیت گا رہی تھی مجمع پر عجیب بےخودی طاری تھی۔ ایک اندھا لوگوں کو دکھیلتا ٹٹولتا ہوا ہجوم میں داخل ہوا اور آواز پر بے بسی ظاہر کرتے ہوئے جیسے کوئی یاد اس کے اندر جاگ اٹھی ہو بولا گانے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ دو یہ پُر درد آواز دکھ پہنچانے والی ہے۔ مجمع میں اور بھی اضافہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔ آنے والوں نے تماشا دیکھنے والوں نے اندھے کو برا بھلا کہتے بےدردی سے باہر دھکیل دیا۔ اندھے کی اندر کی دنیا روتی تھی خدا نے اس کی بینائی چھین کر اسے ایک ایسی نعمت بخش دی تھی جس کا اظہار اس کے پاس موجود نہ تھا۔ کسی نے دور کھڑے کھڑے جو قلندر کو مدت سے جانتا تھا کہا "آج قلندر پہلے سے مختلف نظر آتا ہے"۔ لڑکی برابر گا رہی تھی تماشا دیکھنے والوں نے اس قدر شور مچا رکھا تھا کہ کچھ سنائی نہ دیتا تھا لیکن اسے گانے میں ذرا بھی تساہل نہ تھا وہ اس وقت یقیناً ایک ماہر مغنی کی طرح اس بخشش سے جو اسے قدرت کی طرف سے ملی تھی اپنے گانے میں دنیا کی تنگ دلی کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ وہ وہی کچھ کہتی تھی جو قلندر کا مقصد تھا۔

قلندر دیکھنے میں تندرست، نوجوان سب کچھ نظر آتا تھا اس کے سفید سیاہی مائل بال، بڑی بڑی پھٹی پھٹی آنکھیں گرد و غبار سے اٹا ہوا چہرہ ان سب میں ایک تمکنت کا نشان موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جس کے ضائع ہوجانے کا غم اسے اس دنیا میں چین نہ لینے دیتا تھا۔ اس کی نگاہیں جب ہجوم پر اٹھتی تھیں فوراً جھک جاتی تھیں اور اس طرح کچھ کہتا نظر آتا تھا گویا ہر کوئی اس کی اندرونی کیفیت اور داستانِ حیات سے واقف ہے مجمع اور بھی بڑھ گیا تھا قلندر کی آواز میں درد اور پشیمانی کا احساس جمع ہوگیا تھا۔ ہر ایک جو اس کی حرکات سے واقف تھا محسوس کر رہا تھا کہ ہم نے اس کو سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ وہ قلندر تھا اس میں قلندری شان چمک اٹھی تھی اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تدبر کے لہجے میں بولا "مجھے بستی بستی پھرتے اور شہر شہر سرگردانی کرتے برسوں گزر گئے کہیں بھی اس عذاب سے جس سے میں نجات حاصل کرنی چاہتا ہوں چھٹکارا نہ ہوسکا۔ بھائیو میں ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہوں جسے میری موجودہ ذلت بھی ختم نہیں کرسکتی۔ میں گلیوں کوچوں اور بازاروں میں گداگری کرتا پھرتا ہوں۔ میں نے بھلا دیا ہے کہ میں کیا تھا کیا ہوں اور کہاں سے آیا تھا اور کیا کر رہا ہوں۔ مہینوں بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال مارا مارا پھرتا ہوں مجھے کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی میں کسی کو پہچانتا ہوں باوجود ہزار کوشش کے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو ہے وہ مجھے جانتا ہے اور مجھ سے میرے اعمال سے میرے خاندان سے کچھ نہ کچھ اس کا تعلق ہے — یہ بچی میری لڑکی ہے میں نے اسے بڑی محنت سے پالا ہے۔

برسوں سے لوگ یہی سمجھتے چلے آئے ہیں کہ میں نے اس کو اس کے ماں باپ سے جدا کیا ہے۔ میں ظالم نہیں ہوں۔ کسی کی اولاد کو اس سے چھین کر بھیک مانگنے کا ذریعہ بنانا بہت بڑا پاپ ہے۔ میں نے لوگوں کو جو مجھے بھیک دیتے اور حقارت سے دیکھتے ہوئے میرے پاس سے گزرتے ہیں اکثر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے "یہ لڑکی کتنی اچھی کتنی معصوم ہے نامعلوم اس گنوار کے ہاتھ کہاں سے لگی ہے" میں ہر طرح سے دیانت سے لوگوں کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ میری لڑکی ہے میں نے اسے بڑی محنت سے پالا ہے ——

قلندر کی واضح گوئی پر مجمع میں سے کبھی کبھی تہقہوں کی آواز ایک شور کی صورت میں اٹھتی تھی مگر قلندر کی بلند آہنگ آواز سب پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی دھن میں جو چاہتا کہے جاتا تھا "لوگو یقین جانو میں نے اسے اس طرح سے کھڑے ہو کر ناچنا، گانا کچھ بھی نہیں سکھایا۔ یہ اس کی سرشت اور فطرت ہے دیکھو میری بچی قانون وراثت کا نمونہ ہے وہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔" میری بچی" کوئی نہیں جانتا اس نے ابھی کیا کچھ بننا ہے۔ جب یہ ننھی سی جان بلک رہی تھی اور رات کی سیاہی میں اس کی معصوم پیشانی چمک رہی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دے کر سلا دیا تھا۔ اور کہا تھا میں تیری حفاظت کروں گا اس وقت معصوم کی محبت نے میرے تمام وحشیانہ خیالوں کو دور کر دیا تھا میری سرشت بدل ڈالی تھی اس وقت میری آنکھوں میں ایک نور تھا۔ "غیرت غیور کو تک رہی تھی" مسرت انگیز شعائیں ہم دونوں کے اردگرد رقص کرتی نظر آتی تھیں"۔ — قلندر نے پھر اپنی نظریں جن میں محبت اور احساس چمک رہا تھا لڑکی پر ڈالیں لڑکی نے بھی اپنی غمگین آنکھوں کو اپنے مالک کے جواب میں اپنے مالک کی طرف اٹھا دیا۔ وہ زخم خوردہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔" لوگو' دنیا والو، اولاد کی محبت تمھارے ہی لئے نہیں ہم غریبوں کا بھی حق ہے۔ یہ میری بچی ہے میں نے اسے بڑی محبت سے پالا ہے" قلندر کا بڑا سا سر جھک گیا۔ تھوڑی دیر تک اس پر خاموشی طاری رہی ——

"یہ میری لڑکی ہے اس کا کوئی نام نہیں" بغیر ماں اور نام کے ایک معصوم اور مشکوک لڑکی" اس کی آواز اور گانے میں اس کی ماں کا سا لوچ اور خوش گواری ہے وہ اس کی ماں تھی اس کے الفاظ کتنے شگفتہ کتنے شیریں تھے کہ" یہ دوشیزہ ماں ہے اور یہ ماں دوشیزہ بننے کی تمنا میں زندہ ہے" میرا نام و نسب میرا خاندان ان سب نغموں کی یاد یہ میری لڑکی باقی رہ گئی ہے اس کی ماں جس نے میرے دل و دماغ پر فتح پائی تھی کبھی مسرت اور راحت کا گہوارہ تھی۔ مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے جب اس لڑکی ناچتی اور گاتی ہے۔ اندھے نے ٹھیک کہا تھا" اس لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دو" اسے ضرور کوئی دکھ پہنچا ہوگا۔ وہ دکھی تھا اس نے ضرور کسی سے محبت کی تھی۔ کتنے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اندھے، لولے فقیر اور گداگروں میں بھی دل ہے —— میں نے مہینوں نہیں برسوں سوچا تھا کہ اسے کیسے فروخت کر دوں اسے کسی کو دے ڈالوں تاکہ اس کی پرورش اچھی طرح ہو اور وہ بہتر زندگی بسر

کر سکے۔ میرا ماضی اور مستقبل دونوں ختم ہو چکے ہیں۔ یہ اپنی ماں کی یاد ہے۔ اس سے دکھ بھی ہے اور تسکین بھی۔ یہ میری بچی ہے۔ میں نے اسے بڑی محبت سے پالا ہے۔"

"عورت کتنا خوبصورت تصور ہے وہ ہمیشہ اپنی فطرت سے جنگ کرتی ہے اور اپنی ہی فطرت سے محبت کرتی ہے۔ اس لڑکی کی ماں کو میں نے زندگی کا ساتھی چنا تھا عورت کو عورت کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کا موقع انسان کو بہت کم ملتا ہے جب وہ خود اس سے محبت کرتا ہے تو وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اور اس کی محبت کا کیا ثبوت ہے۔ اور جب کبھی ہم عورت پر کھل کر تنقید کرتے ہیں تو وہ گزرے ہوئے واقعات کے آئینے میں ہمیشہ عریاں نظر آتی ہے ـــــ یہ لڑکی اپنی ماں کی محبت کی یاد ہے ـــ عارضی ہو یا دائمی عورت ہمیشہ اپنی حفاظت مرد کی آغوش میں پاتی ہے وہ رحم چاہتے وقت اپنے آپ کو مرد سے زیادہ کمزور ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ جب میں اس لڑکی کی ماں کی محبت میں گرفتار ہوا تو وہ سیرا کی مشہور ترین رقاصہ تھی میں اس کی پہلی ہی نظر میں ایک ناقابل برداشت آرزو میں الجھ گیا تھا۔ میں خود سیرا کا رہنے والا ہوں۔ وہ سیرا کے پاس کے ایک گاؤں سے آئی تھی۔ کبھی اس بات کی نوبت نہیں آئی تھی کہ میں پوچھوں کہ وہ کون تھی اور کیوں اس طرح شہر کے بازاروں میں آکر گانے لگی تھی اور کس طرح گانے کی شہرت اسے حاصل ہوئی تھی۔ اس کے ہاں امیر، غریب ہر قسم قسم کے لوگ آتے تھے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی کسی کو وہاں دیکھ کر برداشت نہ کرتا تھا۔ اور جب میں اس کے ہاں جاتا بہت کچھ تو کیا وہ ایک لفظ تک بھی نہ کہتی اور نہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی کبھی کبھار اگر دیکھنے کی جرأت بھی کرتی تو میری نظر اٹھنے سے پہلے ہی وہ دوسری طرف دیکھنے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتی اس کی گفتگو میں کوئی خاص بات اور دلکشی نہ تھی یہ لوگ پھر بھی اس کے دلدادہ تھے۔ وہ بہت سادہ دل واقع ہوئی تھی اور یہی صفات جو اس کے اندر بہت زیادہ موجود تھیں اس کے معصوم ہونے کا یقین دلاتی رہتی تھیں۔ لیکن جہاں تک میری ذہانت کا تعلق ہے اس کی عجز و انکسار میں ایک مجنون جذبہ گھات لگائے میری طرف تکتا رہتا تھا۔ مجھے اس سے گہری محبت ہو چکی تھی اور میں اس کا اظہار کرنے میں کبھی چوک نہ کرتا تھا اور وہاں کی قابل نفرت فضا کے باوجود اور خود اس کی لغزشوں کے ہوتے ہوئے اس کی جدائی گوارہ نہ رکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں روز اس کے ہاں آنے جانے لگا تھا۔ اور اس نے بھی اپنی تمام شہرت کو میری جسمانی خوبصورتی پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میرا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا اور وہ محض ایک گانے والی تھی۔ میری تمنا نے اس کے تمام عیوب کو اپنے آپ میں چھپا لیا تھا۔

"دنیا میں ایک ہی عورت گزری ہے جس کو میں نے کھلے الفاظ میں کہا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ یہ الفاظ میں نے اس عورت کو کہے تھے جس نے ایک دنیا کا دل اپنی مٹھی میں بند کر کے ان کی قیمت لگائے بغیر انھیں مسل دیا تھا۔ وہ عورت تھی۔" ایک خوش گوار خواب خوبصورت کپڑوں میں

ملبوس رنگین جسم؟"

"سیرا کے شہزادے تو نے ایک رقاصہ کو کتنا بڑا افتخار بخشا ہے اس کا عیش و آرام حیات و موت سب کچھ تو ہی ہے وہ تیری ہے وہ تیرے ہی لئے رہے گی" یہ الفاظ اس نے ایک روز بڑے جوش اور تمکنت سے مجھے کہے تھے اس کی خادمہ پاس ہی کھڑی تھی۔ نہیں معلوم بانو اس کے ہاں کب سے تھی وہ ایک غلام نسل سے تھی اسے سوڈان سے لایا گیا تھا۔ خادمہ نے اس کی طرف آنکھوں کو کچھ سہمے سہمے اٹھایا تھا۔ پھر رقاصہ اپنے جذبات سے مجبور بہت کچھ کہے جاتی تھی۔ وہ بولی بانو تو اس کیفیت سے نہیں گزری میں ایک رومان کی صورت میں دنیا کا سیاہ و سفید دیکھ رہی ہوں"۔۔۔ جب کبھی میں افسردہ ہو جاتا تو وہ میرے غم کو اپنے دلکش نغموں سے خوشی میں بدل دیتی۔ وہ اپنے نغموں سے مجھ میں اس طرح تبدیلی پیدا کر دیتی جس طرح خالق نے مٹی کے تودے میں نغموں کے ذریعے زندگی بخشی تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے جو چاہتی کر دیتی تھی وہ جب کبھی مجھ سے لپٹ جاتی اس وقت میری خاندانی عزت، دولت اس کے قدموں میں پڑی اس کے رحم کو اپنا نگہبان تصور کرتی۔ تم اپنے تصور کو کہاں تک اس عورت کے سمجھنے میں بلند کرو گے جس نے میرا دل لے لیا تھا۔ وہ میری محبوبہ تھی میں اسے دل سے چاہتا تھا۔ وہ خوشی جسے ایک توانا لطفِ زندگی سے تعبیر کرتا ہے اس کے متبسم لبوں پر رقصاں رہتی تھی وہ روشنیاں جسے ہم نور اور تجلی کہہ کر پکارتے ہیں اس کے خوب صورت بالوں میں سے جھانکتی دکھائی دیتی تھیں میں نے اسے اپنی زندگی کا سہارا سمجھا تھا۔ یہ اس کی لڑکی ہے یہ وراثت کے خون میں نہائی ہے میری معصوم بچی میں نے اسے بڑی محبت اور محنت سے پالا ہے"

"میری اور میری محبوبہ کی زندگی بہت مسرت سے گزر رہی تھی کہ ایک روز میں نے اپنے آپ کو کچھ غمگین سا پایا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ میں کیا کھو گیا ہوں اور جو میں کھو گیا تھا وہ اپنی یادداشت سے تلاش نہ کر سکتا تھا۔ اب میری محبوبہ بھی میرے اندر وہ قوت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوتی تھی جو کچھ عرصہ پہلے میرے رگ و خون اور جذبات میں رواں تھی۔ میں اس کے ظاہری حسن اور نمائش پر اپنی خاندانی شرافت اور اپنی یہ خوبی کو جو مجھے ورثہ میں ملی تھی قریب قریب ختم کر چکا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میں کیا تھا اور کیا ہوں کیونکہ میری دیکھنے اور سوچنے کی قوتیں اس قدر ناکارہ ہو چکی تھی کہ میں روز روشنی میں اس کی سیاہ کاریوں کو برداشت کرنے لگ گیا تھا۔ میں اس کے لئے سب کچھ دے چکا تھا۔ مگر اس کا اپنا جذبہ جس میں ایک لہر سی آئی تھی ختم ہو کر اب کسی اور طرف بہہ گیا تھا۔ خادمہ بانو مجھے ہمیشہ اس کی محبت کا یقین دلاتی رہتی تھی مگر وہ بانو ہی تھی جس نے میری محبوبہ کو مجھ سے جدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ باوجود ہزار کوششوں کے بھی میں اپنے آپ کو اس شیطانی ماحول سے نہ نکال سکا۔

یہ دیکھو میرے دائیں رخسار پر ایک گہرا سا نشان ہے یہ چھری کا نشان ہے یہ میری محبوبہ کے آشنا کا لگایا ہوا ہے۔ جس نے میری عزت پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جسے میری محبوبہ ہزار بار چومتی تھی اور اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔

"میں ایک سوداگر کا بچہ ہوں میں کبھی سیرا کا شہزادہ کہلاتا تھا۔ میرے باپ نے ملک ملک کی سیر کی تھی۔ اس نے مجھے بہت اچھی طرح پرورش کیا تھا میں نے اس ماں کا دودھ پیا ہے جس کا باپ جنگ میں مارا گیا تھا۔ سیرا وہ سرزمین تھی جہاں کی مائیں اپنے بچوں کو راہ حق میں قربان ہونے کے لئے پالتی ہیں اور وہ اپنے دودھ پیتے بچوں کو جہاد کی کہانیاں سناتی ہیں ——— لوگو شورت کرو قلندر کی مامتا جاگ اٹھی ہے اس پر خاندانی روایات اور وطن کی یاد نے غلبہ پالیا ہے اس نے اس سرزمین پرورش پائی ہے جہاں کے لوگ ایک بات کے سوا کچھ نہیں جانتے ان کا مرنا راہ حق میں مرنا ہے ان کا جینا اپنے الفاظ کے پاس کے لئے جینا ہے۔ جب میں جوان تھا سیرا کی ساری مخلوق مجھ سے محبت کرتی تھی میں نے یہ زخم اپنی محبوبہ کی غداری کی وجہ سے کھایا تھا۔ اس میں میری غیرت کا سوال تھا۔ آہ میری غیرت کو ختم کرنے میں میری محبوبہ نے کس قدر فریب اور مکر سے کام لیا تھا۔ دنیا کی ہر مسرّت اور لذت غم کی طرح مہلک ہے اور گزشتہ کی یاد بھی مہلک ہے وہ ایسی ہی مہلک ہے جیسے کسی بدسرشت کی سرشت"۔ لڑکی نے اپنا چہرہ اس کی طرف جھکا رکھا تھا۔ اس کی نیم جان آنکھیں پھٹی پھٹی نظر آرہی تھیں وہ بے حس و حرکت کھڑی مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

روز اپنی داستان حیات بیان کرنا قلندر کا معمول ہو گیا تھا۔ لوگ اس کی چرب زبانی کو روزی کا ذریعہ سمجھتے تھے مگر اس کے دل کی کیفیت کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہتا ہے اور کس لئے بیان کرتا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ لڑکی حسب معمول اس کے سامنے کھڑی تھی وہ اس کی بھولی بھٹکی یاد میں اضافہ کرنے میں مدد دیتی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا وہ اس کی لڑکی تھی۔

آج کی شام یقیناً ایک انوکھی شام تھی۔ بستی والوں کا غیر معمولی اجتماع ہو گیا تھا انھوں نے آج قلندر کی داستان میں بہت گہری دلچسپی لی تھی۔ قلندر بولا "اندھا سچ کہتا تھا کہ "گانے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ دو" وہ ضرور کسی ضرب شدید سے تڑپ اٹھا تھا اس نے ضرور کسی سے محبت کی تھی۔ اس کے دل کو یقیناً ٹھیس پہنچی تھی ——— کتنا اچھا گاتی ہے کتنی خوبصورت اور دلکش اداؤں سے ناچتی ہے۔ یہ بالکل ماں کا نمونہ ہے۔ اس کے ہر فعل میں ماں کی سرشت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کی ماں میری محبوبہ تھی"۔ "بازار میں بیٹھنے والی" ——— قلندر کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی اس کے بھاری زبردست ہاتھ لڑکی کی گردن میں حمائل تھے۔ وہ اپنی لڑکی ایک ایک کو دکھلاتا پھرتا تھا۔ وہ بولا "اس کی ماں میری محبوبہ تھی۔ میں نے اس سے محبت کی ہے۔ وہ مجھے ایسی ہی عزیز تھی جیسے محبوبہ عزیز ہوا کرتی ہے۔ اسے مرے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔ جس طرح میں اس کی زندگی کا باعث تھا اسی طرح اس کی موت کا باعث ہوں۔ اس کی موت طبعی موت کا سبب نہ تھی وہ قتل کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اور وہ قتل میں نے خود کیا تھا۔ میں اس کا قاتل ہوں اس نے میری خاندانی شرافت، میری عزت، میری غیرت، میرے احساسات، میری دولت، میری ہر چیز کو قتل

کر دیا تھا۔ وہ واجب القتل تھی۔" بازاری عورتیں محبت کی قیمت وصول کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ابھی تک محبت کا معیار قائم نہیں ہوا۔"

" اس کی موت ایک راز تھا یہ راز میں نے برسوں سینہ میں چھپا رکھا تھا اور آج بھی انتہائی کوشش کی تھی کہ یہ راز دنیا والوں سے چھپائے رکھتا۔ مگر آج اسی قتل کا دن تھا۔ وہ میری محبوبہ تھی میں نے اس سے محبت کی تھی اور میں نے ہی اسے قتل کیا تھا۔ میں نے اسے اس طرح گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔" اور اس نے لڑکی کا گلا گھونٹ دیا۔

مجمع میں ایک شور اور ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا تھا ہر طرف سے ظالم، خونی اور قاتل کی آوازیں آ رہی تھیں۔
— ایک بولا لڑکی کے چہرے پر ابھی تک معصومیت برس رہی ہے۔
— وہ ابھی بلبل کی طرح چہچہا رہی تھی —
— اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے —
— ایک نے کہا قلندر بڑے دل گردے والا ہے اس کا یہ فعل ایک شاندار انتقام ہے۔
— ایک بڑھا جہاں دیدہ بولا — قلندر ہمیشہ قاتل اور خونی ہوتے ہیں۔ یہی ان کی سرشت ہے۔

چغتائی

گُلِ خودرو

محرک تھے فقط فطرت کے اسباب　　وجودِ ظاہری میں آ گیا میں
مری روئیدگی قدرت کی تنظیم　　نہیں شرمندۂ سعی و ادا میں
نمو میرا یہی دن رات کا دور　　ہوا کی گود میں پھولا پھلا میں
مرے بچپن کی ہمت اللہ اللہ　　شعاعِ مہر سے الجھا کیا میں
نہ فکرِ باغباں نے فکرِ گلچیں　　عجب آزاد دنیا میں رہا میں
کبھی صرصر کبھی بادِ بہاری　　یہ نرم و گرم سب جھیلا کیا میں
مجھے اندیشۂ فردا سے تھا عار　　چمن اجڑا کئے دیکھا کیا میں
یکایک اک ہوا ایسی چلی کچھ　　ہوا نذرِ طلسماتِ فنا میں
میں کملایا گرا اور خاک پر آہ　　کسی کے پاؤں نیچے آ گیا میں
مرا افسانہ بالکل مختصر ہے　　بنا خود اور خود ہی مٹ گیا میں

مقاماتِ بدیعی کا ایک مقامہ

ادب عربی کی گوناگوں اقسام سے ایک قسم "مقامات" ہے اس سے مراد وہ دلچسپ فرضی افسانے ہیں جو مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ بدیع الزماں ہمدان کے ایک فاضل اجل بزرگ گزرے ہیں جن کی مشہور و معروف کتاب "مقامات بدیعی" ہے۔ صاحب مقامات کا اصلی نام احمد بن الحسین بن یحییٰ بن سعید الہمدانی ہے ان کی نظم و نثر و رسائل و قصائد و مقامات علمی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین عالی اور طرز بیان موثر ہے۔ الفاظ میں شوکت اور کلام میں جدت ہے۔ خصوصاً مقامات علمی ذخائر کا معدن اور ادبی معلومات کا مخزن ہیں۔ انھوں نے ۳۸۰ھ میں عالم شباب میں پہلے ابوالحسن بن فارس سے تلمذ حاصل کیا پھر صاحب بن عباد سے استفادہ کیا اور ۳۸۲ھ میں نیشاپور پہنچے جہاں انھوں نے چارسو مقامات لکھے ان میں سے اس وقت صرف پچاس سے کچھ زیادہ موجود ہیں۔ بعدازیں وہ ہرات آکر تادم مرگ یہیں رہے اور ۳۹۲ھ میں چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اب ہم یہاں "مقامہ قریضیہ"[۱] کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ جس میں صاحب مقامہ نے عیسیٰ بن ہشام کو راوی اور ابوالفتح اسکندری کو بحیثیت ہیرو دکھایا ہے۔

مقامہ قریضیہ

عیسیٰ ابن ہشام راوی، ہیں میں سفر کے قصد سے نکلا لیکن اثنائے سفر میں جرجان[۲] کے انتہائی مقام تک پہنچ گیا۔ میں نے زمانہ کے نشیب و فراز کے خوف سے بخیال احتیاط کچھ اراضیات خریدیں اور ترقی زراعت کے لئے مختلف راہیں نکالیں اور مختلف اصلاحات و انتظامات کئے۔ اور اپنے سرمایے کو تجارت میں لگایا اور ایک دوکان بھی کھولی اور تجارت کو فروغ دینے اور تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے اپنے ہم پیشوں سے یارانہ پیدا کیا۔ میں اپنے مکان کو صرف دو وقت یعنی صبح اور شام جایا کرتا تھا اور درمیانی وقت دوکان میں گزارتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم شعر و شاعری پر کچھ بحث کر رہے تھے اتفاق سے قریب ہی ہمارے سامنے ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کی خاموشی سے کبھی تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہماری گفتگو کو سمجھتا ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ غالباً ناواقف ہے۔ بہرحال ہماری گفتگو نے طول کھینچا اور خوب گرماگرم بحثیں ہوئیں۔ یہ سن کر اس نوجوان نے کہا "آپ اصحاب کی نہایت معقول تقریریں رہیں واقعی آپ لوگوں نے کلام کی خوبی کو پالیا ہے۔ اگر آپ اصحاب کی اجازت ہو تو اس بارے میں میں بہت بہتر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہوں اور اس کی حقیقت کو میں اس طرح واضح کرسکتا ہوں کہ گونگا بھی لطافت و فصاحت کلام کی وجہ سے سننے لگے اور بزکوہی پہاڑیوں سے اتر آئیں" یہ سنتے ہی میں نے کہا "مولینا! ہمارے قریب تشریف لائے کیونکہ آپ نے تو ہمیں اپنی سحر بیانی سے مسخر کرلیا ہے۔ بس اب مہربانی فرماکر تقریر شروع فرمایئے جس کی آپ نے ابھی ابھی توصیف کی ہے۔" نوجوان سامنے بڑھا اور کہا

---

[۱] وہ مقامہ جو شعر و شاعری سے متعلق ہے۔

[۲] تاتاری شہر

"جناب! آپ مجھ سے سوالات کرتے جائیے اور میں ان کے جوابات دیتا جاؤں گا جس کو سن کر آپ بہت محظوظ ہوں گے۔" تو پھر ہم نے کہا "اچھا بتائیے امرؤ القیس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" اس نے کہا "امرؤ القیس[1] وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے اشعار میں محبوب کے شہروں اور میدانوں میں ٹھہرنے اور معشوق کے فراق میں جو تکالیف و مصائب جھیلیں ان کا ذکر کیا ہے اسی نے سب سے پہلے گھوڑوں کی صفات بیان کیں اور اس نے شعر گوئی کو کبھی اپنا پیشہ اور کسب زر نہیں دیا اور نہ کبھی کسی توقع میں اس نے شعر کہے، اس کو دیگر شعراء پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ اس نے کسی معاوضہ یا صلہ کی خاطر زبان نہیں کھولی اور اس نے کبھی کسی تحریص و ترغیب کی امید میں قلم کی جولانی دکھائی۔" پھر ہم نے کہا "نابغہ[2] (　　　) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے" اس نے کہا "نابغہ جب کسی سے عداوت رکھتا ہے تو تند کلامی پر اتر آتا ہے اور جب اس کو کسی شخص سے خاص انس و دلچسپی ہوتی ہے تو اس کی مدح میں رطب اللسان رہتا ہے اور جب اس کا کسی قوی شخص سے مقابلہ ہو جاتا ہے تو معافی کا خواستگار ہوتا ہے لیکن اس کا کلام بالکل برمحل اور برجستہ ہوتا ہے"۔ اس کے بعد ہم نے پوچھا "اچھا زہیر[3] کے بارے میں کچھ خیالات کا اظہار فرمائیے" اس نے کہا "وہ ایک فطری شاعر ہے اور کلام پر اس کو بے حد قابو ہے تخیل کے ساتھ ہی جادو کی طرح الفاظ کے سانچے پیش ہو جاتے ہیں۔" پھر ہم نے سوال کیا "طرفہ کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائیے" اس نے کہا "وہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ اور ادب شعری کا مخزن و معدن۔ شاعر تو چل بسا لیکن اب تک کسی نے اس کے کلام کے معانی اور دقیق مضامین کو نہیں سمجھا۔" "اچھا تو" ہم نے کہا "جریر اور فرزدق کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں نیز یہ بتائیے ان میں سے کس کو اولیت حاصل ہے" اس نے کہا "جریر کو نسیب و تشبیب میں خاص ملکہ ہے اور وہ کثیر الکلام ہے برخلاف اس کے فرزدق کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں استحکام و تمکنت زیادہ نمایاں ہے۔ اور وہ عموماً تفخر کا عادی ہے اور جریر نہایت تکلیف دہ ہجو کہتا ہے۔ اور جب کبھی اپنے قبیلے کی لڑائیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو انتہائی مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اور فرزدق بہ نسبت جریر کے زیادہ مطالب بیان کرتا ہے اور اپنی قوم کے مکارم و محاسن کو بالکل واضح کر دیتا ہے جریر جب تشبیب پر اتر آتا ہے تو جذبات کو برانگیختہ کر دیتا اور جب کسی کی مذمت کرنی چاہتا ہے تو بس اس کے لئے موت ہی ہے اور جب تعریف و توصیف پر آمادہ ہو جاتا ہے تو آسمان پر چڑھا دیتا ہے اب فرزدق کو لیجئے۔ فخر گوئی میں مہارت تامہ رکھتا ہے اور عیب گوئی کی طرف مائل ہوتا ہے تو بالکل ہی گرا دیتا ہے اور جب ستائش کی سوجھتی ہے تو کامل اوصاف بیان کر دیتا ہے" اس کے بعد ہم نے شعرائے متقدمین اور متاخرین کے بارے میں رائے دریافت کی۔ اس نے کہا "متقدمین کا کلام نہایت نپا تُلا اور جامع و مانع اور پُر از معلومات ہوتا ہے اور متاخرین کے کلام کی ساخت نہایت لطیف اور نازک خیالی پر مبنی ہوتی ہے۔" پھر ہم نے خواہش کی "کیا آپ اپنے کچھ طبعزاد اشعار سنائیں گے اور اپنے ذاتی حالات کا تعارف کرائیں گے" تو اس نے کہا "اچھی بات ہے۔ بیک وقت آپ کی ان دونوں فرمائشات کی تعمیل کئے دیتا ہوں۔" کہنے لگا "کیا تم مجھے نہیں دیکھتے کہ میں ایک پرانی چادر اوڑھے ہوئے ہوں اور سخت تکالیف جھیل رہا ہوں۔ مجھے زمانہ سے سخت عداوت ہے۔ اور سخت سے سخت مصائب جھیلنے آمادہ ہوں۔ آج میں موسم گرما کے عود کرنے کی آرزو کرتا ہوں تاکہ مجھے جاڑے کی شدت محسوس نہ ہو۔ آہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ میں نے ایک عرصہ تک خوشحال اور امن و امان کی

---

[1] جاہلیت کے زمانے کا مشہور شاعر [2] نابغہ [3] جاہلیت کے زمانے کا ایک شاعر

زندگی بسر کی ہے۔ اور یہ نوجوان ایک زمانہ میں ذی عزت اور صاحب ثروت تھا اور مسرت کی زیباتی اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے دارا اور کسریٰ کے شاہی محلات میں خیمے نصب کئے تھے۔ افسوس ہے کہ خوش حالی اور اقبال کا زمانہ افلاس اور ادبار سے پلٹ گیا ہے اور اب ثروت و دولت کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے اور اس وقت تک ہلاکت کا دور دورہ ہے۔ آپ یقین مانئے اگر میری ضعیف بیوی جو اس وقت قصبہ "سُرّی من رأی"[1] میں بقید حیات ہے نہ ہوتی اور میرے بچے جو جبل البصری کے قریب جوار میں مقیم ہیں اور جو سب کے سب فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتا تو اے سردار! میں ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کر کے اپنی جان عزیز کو قربان کر دیتا۔"

عیسیٰ ابن ہشام کہتے ہیں "میرے پاس جو کچھ بھی اس وقت موجود تھا اس کے نذر کر دیا اور رو رو کے رخصت ہوا۔"

اس کے بعد میں حالت تذبذب میں پڑ گیا کہ آیا میں نے اس کو کہیں دیکھا ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے سامنے کے دو دانتوں کی وجہ سے میری سمجھ میں آگیا کہ یقیناً وہ اسکندری ہی ہو گا۔ ہم نے اس کو اس وقت دیکھا تھا جب کہ وہ بچہ سا تھا لیکن اب وہ اچھا خاصا گبرو ہو گیا ہے۔ میں پیچھے پیچھے اس کی طرف بڑھا اور اس کی کمر پکڑ کر کہا "کیا تو ابوالفتح نہیں ہے۔ کیا ہم نے تجھ کو ایام طفلی میں پرورش نہیں کیا تھا اور ایک عرصہ تک تو ہمارے ہاں قیام پذیر نہیں تھا؟ ہاں یہ تو بتا "سُرّی من رأی" میں تیری کونسی بڑھیا رہتی ہے" یہ سن کر وہ ہنس دیا اور کہا۔

"افسوس ہے دنیا بہت مکار اور فریبی ہے لیکن تو اس کے دھوکے میں ہرگز مت آ اور کبھی ایک ہی حال پر قائم مت رہ بلکہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تو بھی اپنی روش بدل دے۔"

سید امین الدین حسینی

---

[1] بغداد کے قریب بدھ تھا ہے

ٹوٹے ہوئے تارے

حسن کو عشق کئے دیتا ہوں — لے تجھے درد دئے دیتا ہوں
مستیٔ چشم اے معاذ اللہ — جب سے دیکھا ہے گویا پی لی ہے
تعینات کی حد سے گزر ہی جاتا میں — کسی نے شانہ پکڑ کے کہا کہ "نہیں"
ٹوٹ کر گر رہے ہیں یہ تارے — یا مری بے کسی پہ آنسو ہیں
کھائی تو ہے قسم نہ دکھاؤ مگر شراب — نیت خراب ہے مری نیت خراب ہے
کبھی ہنس کے، کبھی تیور بدل کے — چھپائے جا رہا ہوں بے بسی کو
آرزو کروٹیں بدلنے لگی — چوڑیاں بج کے کیا خموش ہوئیں
اس شخص کی حسرت بھی دیکھی ہے کبھی تو نے — رو بھی جو نہیں سکتا ہنس بھی جو نہیں سکتا

سلیمان اریب

ستونتی

خون — خون — خون — اندھے کا، لنگڑے کا — نہیں — آہ نہیں — آنکھوں والے کا، ہاتھوں والے کا، ایک تندرست و توانا نوجوان کا۔ تو غیروں کے لئے ہے اور غیر تیرے ہیں۔ دے خوب دے، پیٹ بھر کر دے، اے ان داتا! کھیتوں سے، باغوں سے، زمینوں سے، اگل، اتنا اگل کہ اغیار اپنے گودام بھر لیں — بھر چکے۔ اور ان کے خزانے معمور ہو جائیں — معمور ہو چکے۔

اور

پہنا، اتنا پہنا کہ پھر ان کی کوئی ہوس باقی نہ رہے۔ ان کو، ان کے بچوں کو، ان کے وطن والوں کو اور پھر سمندر سے دور، جانوروں کی کھال پہننے والے پرندوں کے پر اوڑھنے والے بھی محروم نہ رہیں۔ لیکن —

ترسا، تڑپا، مار، فنا کر، برباد کر — ان کو جو تیرے ہیں، تیرے چاہنے والے ہیں۔ پیدا ہوئے بھی یہیں اور مریں گے بھی یہیں۔ آہ اے ہندوستان! طوقِ غلامی میں جکڑے ہوئے ہندوستان!! سپوتو، ہونہارو، جاں نثارو! — آزادی — چیخو، چلاؤ، پکارو، شور مچاؤ، گڑگڑاؤ، رو دو۔

مگر

یہ نہ کہو کہ ہم بھوکے ہیں، ننگے ہیں، مفلس ہیں، ناچار ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ تمہارے گرو، مہاتما اور اولیا نے یہی کہا ہے کہ نفس کو مارو — پھر — مغرب کے گرو گنتھال کی تقلید کرو، اللہ کا شکر بجا لاؤ۔

ہماری امیدوں سے بڑھ کر نظرت دور پہاڑی پر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہی ہماری منزل تھی۔ کہنے کو تو وہ بالکل قریب تھی لیکن معشوق کے وعدے کی طرح دور۔ رات ہو چکی تھی، خطرہ زیادہ تھا۔ میں اور لطیف شراب سے سرشار دیوانوں کی طرح قدم اٹھا رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہماری تکان دور کر رہے تھے۔ خوف ہمارے قدموں کو دونی کر رہا تھا۔ راستے کے دونوں طرف خاردار اور خطرناک جھاڑیاں تھیں، ان میں دور دور موٹے موٹے درخت ڈاکوؤں کی طرح کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ رات اس قدر کالی تھی کہ منہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہم دونوں کسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ لطف یہ کہ اس بحث میں نہ لطیف کی دلچسپی نظر آ رہی تھی اور نہ میں اس پر غور کر رہا تھا۔ دونوں نیچی گردنیں کئے ہوئے تھے۔ رفتار کی تیزی کے ساتھ ساتھ ہماری آوازیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ آنکھیں کبھی راستے پر رہتی تھیں تو کبھی بازو پر، کبھی پیچھے پھر جاتیں۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر ہم چونک پڑتے تھے۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ بنتے تھے۔ جنگجو سپاہیوں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ کی تاریکی، دوری، سنسان تنہائی کا عالم، جنگلی راستے کا سفر اگرچہ ہم دونوں کو خوف زدہ بنا رہا تھا مگر کوشش یہ کر رہے تھے کہ ایک دوسرے پر خائف ہونے کا شبہ نہ ہو۔ ہاں ہم بحث کرتے ہوئے جا رہے تھے، ایسی بحث جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ ہمارے جملے جو زبان سے نکل رہے تھے بالکل بچوں کے سے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے، خوف سے بھرے ہوئے، اصلیت سے دور اور وہ بھی لبوں پر آ آ کر رک جاتے تھے۔ یکایک لطیف ٹھہر گیا اور بولا۔ ز — ز — زاہد بھیا وہ دیکھو دیکھو — سفید سی چیز کیا ہے۔ اس کے یہ جملے میرے لئے ملک الموت کی آواز سے بڑھ کر تھے۔ میں پسینے میں ڈوب گیا تھا، ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے، دل کی دھڑکن گھڑی کی ٹک ٹک سے بھی بڑھ کر تھی، جسم میں لرزہ تھا۔ میں نے

اُس چیز کو جس کی طرف لطیف نے اشارہ کیا تھا' دیکھنے کی بہت کوشش کی' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر' رگڑ رگڑ کر دیکھا۔ مگر میری ہمت نے جواب دے دیا تھا کچھ نہ سجھائی دیا۔ لطیف نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "وہ دیکھو تو ـــــ کیا تمھیں نظر نہیں آتا ـــــ بنتے ہو ـــــ بے وقوف کہیں کے۔" وہ گالیاں دے رہا تھا' دے رہا تھا' برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میرے کان بہرے تھے۔ میرا دماغ بیکار تھا۔ لطیف نے کہا "کیا تم نہیں دیکھتے؟" اب اس کی آواز میرے کانوں میں بجلی کی طرح کوندی۔ میں نے کہا "کیا کیا" لطیف نے کہا۔ بھیا! تم تو بالکل مسٹر چیمبرلین بن رہے ہو۔ ہٹلر کی گرج کو ہندوستانیوں کی معمولی بھوک ہڑتال سمجھ کر انجان بن رہے ہو۔ وہ دیکھو تو سامنے سفید سی چیز کیا ہے' آگے بڑھ کر دیکھیں چلو" میں نے اپنے کوٹ اور جسم کو جھٹکتے ہوئے کہا ـــــ "ہاں چلو"۔ ہم دونوں بالکل اس طرح آگے بڑھے جس طرح مسٹر چیمبرلین اور ہیلی فاکس دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے بڑھے تھے ـــــ تھوڑی دور چل کر ہم نے دیکھا کہ وہ چیز بالکل ساکت' سنگِ مزار کی طرح کھڑی ہے' مگر ہے بالکل سفید۔ لطیف نے کہا "بھیا! یہ سچ مچ بھوت ہے" بھوت کا نام سنتے ہی میری حالت ہو بہو ایسی ہو گئی جیسی آج کل مسلمانوں کی ہے۔ میں نے کہا "لطیف! یہ تو اور بھی غضب ہوا۔ اب تو یہ کم بخت ہمیں ہی قتل کیے بغیر نہ رہے گا" میری سانس پھولی ہوئی تھی اور منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے "جل تو جلال تو' صاحب کمال تو' آئی بلا کو ٹال تو" ہم دونوں نے اس کا ورد شروع کیا اور دل کی ڈھارس بندھا کر بادلِ نخواستہ اس چیز تک پہنچنے کی کوشش کی۔ لطیف نے ڈرتے ڈرتے اپنا بید اس کے سر پر مارا۔ مگر وہ چیز ٹس سے مس نہ ہوئی۔ نہ اس نے آہ کی اور نہ ہمارا مقابلہ کیا' وہ کرتی کہاں سے' وہ تو تھا حقیقت میں میل کا پتھر۔ یہ تھی اس قوم کے دو افراد کی بہادری جس کی دلیری کی دھاک دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اور جس کے افسانے زبانوں پر ہیں۔ اس وقت جو خفت ہمیں ہوئی شاید ہی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

ہاں ہم چلے جا رہے تھے' بحرِ ندامت میں ڈوبے ہوئے اپنی نامردی پر تاسف کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ پاؤں ہلکے ہو گئے تھے۔ سارا خوف رفو چکر ہو گیا تھا اور منزل بھی قریب تھی۔ کوئی ایک فرلانگ پر ہمیں خطرہ کی روشنی سی نظر آئی۔ وہ ریلوے لائن تھی۔ اس سے کوئی ایک دو فرلانگ پر ہماری قیام گاہ تھی ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ خوشی کے آثار ہمارے خوف زدہ چہروں پر سورج کی کرنوں کی طرح نمایاں تھے۔ وہی دل جس میں کبھی ناامیدی' خوف و ہراس جان کے خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی اب اس میں مسرت کی خاموش لہریں کھیل رہی تھیں اور کشاکش زندگی کا پتہ دے رہی تھیں۔ اب ہم پر ایک سکوت طاری تھا' سرد ہوا کے جھونکے متوالی آنکھوں کو نیم باز کر رہے تھے' ہم مدہوش تھے کہ سامنے کے درخت پر سے الو کی آواز نے ہمیں جگا دیا۔ میں نے کہا "لطیف! خدا خیر کرے۔ معلوم نہیں پھر ہمیں کونسی آفت سے دوچار ہونا ہے"۔ زاہد بھیا! آپ تو بڑے وہمی نکلے' خدا کی قسم اس مٹھی بھر جانور نے تو وہ بات کہی کہ

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

اس کی آواز نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیا' مگر آپ نے اس سے برا شگون لیا" "نہیں جی! برا شگون کیسا' یہ تو تجربہ ہے خیر چلو' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"! ابھی ہم ریلوے لائن پر پہونچے نہ تھے کہ کسی نے آواز دی "کون!" اس آواز نے ہمارے رہے سہے اوسان خطا کر دیے۔ یہ محسوس ہوا کہ کسی نے پاؤں پکڑ لیے۔ بمشکل میں نے پوچھا "تم کون ہو؟" "میں پولیس کا سپاہی ہوں"۔ "اتنی رات کو یہاں کیوں آئے ہو؟" میرا یہ جملہ ایسا رعب دار تھا کہ پولیس کے سپاہی نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی افسر ہے۔ اس نے کہا "صاحب! مجھے ایک لاش کی حفاظت کرنی ہے جو یہاں موجود ہے"۔ میں نے حیرت سے کہا "کس کی لاش؟ کیا کسی دہاتی کا خون ہو گیا' کیا ہم اسے دیکھ سکتے

ہیں؟" اس سوال کا جواب وہ دینے سے رکا۔ لطیف نے کہا "کیا اس نے خودکشی کرلی؟" "جی ہاں صاحب! ریل کی پٹڑی پر لیٹ گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں اور گردن جدا ہوگئی ہیں"۔ آہ ـــــ مرنے والے کی لاش کو ہم نے دیکھا، چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ شناخت نہ ہو سکی۔ قدآور، خوبصورت نوجوان، مشکل سے چھبیس تیس سال کی عمر ہوگی، دنیا سے چل بسا۔ ہم بید مجنون کی طرح کانپ رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس سونے والے پر نثار ہو رہی تھی۔ ساری فضا خاموش تھی، تاریکی میں، باڑ کے قریب ـــــ آہ وہ لاکھوں انسانوں کے حسن سے معمور ہستی، حالتِ بے کسی میں بے خبر پڑی تھی، آہ ـــــ اس پر کوئی آنسو بہانے والا، اس کی جوانا مرگی پر ترس کھانے والا کوئی موجود نہ تھا ـــــ ہاں اگر کوئی تھا تو وہی آفتوں کا مارا پولیس کا سپاہی اور ایک ریلوے کا ملازم۔ یہ دونوں سردی سے کانپ رہے تھے۔ ہم نے ان کی حالت زار اور ان کی تنہائی پر رحم کھایا، ایک بیڑی کا بنڈل اور ایک دیاسلائی کی چھوٹی ڈبیہ جنہیں کہ پولیس کے سپاہی نے ان کو لیتے ہوئے ہمارا شکریہ ادا کیا اور کہا "صاحب! دس روپے کی خاطر یہ تمام آفتیں جھیلی ہیں۔ مرنے والا تو مرگیا۔ مگر ہم زندہ رہ کر اس مردے سے کیا کم ہیں۔ اس ویرانے جنگل میں تمام رات کاٹنی ہے، کھانا ہے نہ پانی، میری بیوی بچے راہ تکتے ہوں گے۔ ان بیچاروں کو کیا خبر کہ ان کا باپ کس آفت میں مبتلا ہے۔ اگر صبح ہونے تک زندہ رہے تو خیر ورنہ اسی مردہ کے ساتھ ہم بھی اس جنگل میں مردہ ہو رہیں گے۔ آہ پیٹ"۔ ـــــ کہہ کر اس نے ایک آہ کھینچی اور میرے آنسو نکل پڑے۔ ان بیچاروں کی کس مپرسی ہم سے دیکھی نہ گئی۔ ہم انھیں خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

سردی بڑھ رہی تھی، ہمارے تمام خیالات منجمد ہو چکے تھے۔ اور ہیبت ہمارے سامنے مرگھٹ کے بھوتوں کی طرح ناچ رہی تھی۔ مختلف قسم کے خیالات موجوں کی طرح آتے اور جاتے تھے مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ہم دونوں رات کی تاریکی میں لپٹے ہوئے چور کی طرح گاؤں میں داخل ہوئے۔ کتوں نے ہمارا استقبال کیا اور وہ ادھم مچایا کر الاماں۔ اب تو ہماری جان میں جان آگئی تھی۔ کتے تو کیا شیر بھی ہوتا تو اس کا مقابلہ کرتے، ہم نے ان کی بھونک کی پروا نہ کی، ڈراتے دھمکاتے ہوئے ایک گلی کے پیچھے آئے جہاں ایک دوسرے سے لگی ہوئی کئی جھونپڑیاں تھیں اور ان میں پہنچنے کے لئے کئی پگڈنڈیاں۔ گائے اور بیلوں کا گوبرا ور پیشاب کی بدبو دماغ کو خراب کر رہی تھی۔ دہاتی بیچارے آنگنوں میں چبوتروں پر، ادھر ادھر کمبلوں میں لپٹے پڑے تھے ہم ان تمام جھونپڑیوں پر سے گزرتے ہوئے ایک سیدھی گلی میں پہنچے جو بالکل کشادہ تھی اور وہ صرف آنے والے سیاحوں کی آنکھوں میں مٹی جھونکنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں کہہ دیں کہ یہاں بھی دیہات سدھار اسکیم زوروں پر ہے۔ ایک بڑے گھر کے برابر میں ایک چھوٹی جھونپڑی تھی جس کا دروازہ چھالیہ کے پتوں کا بنا ہوا اور کھلا ہوا تھا۔ مٹی کے تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، بچہ رو رہا تھا۔ ماں اس کو جھوٹی امیدیں دلا دلا کر منا رہی تھی۔ ہم وہاں ٹھہر گئے۔ بچہ ضد کر رہا تھا۔ اس شور سے دو تین اور بچے جاگ اٹھے۔ انھوں نے اٹھتے ہی کہا، اماں ـــــ ابا ـــــ ان، اون ـــــ ان معصوموں کا تڑپنا دیکھ کر ہمارے دلوں پر بجلی گری اور خودکشی کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ضرور اسی مقتول کے بچے ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود فاقوں میں زندگی کاٹتا تھا۔ بچے گھر کے باہر آتے اور باپ کو نہ پاکر مایوس جاتے تھے۔ ماں نے بچوں کا تڑپنا دیکھ کر اپنا دامن پھیلا دیا اور کہا کہ اے بھگوان! ایسی جندگی کا ہے کی، پرماتما! میرے پتی کو بھیج دے، ان کو گئے ہوئے تین مہینے گزر گئے ابھی تک نہیں پلٹے"۔ وہ رو رہی تھی۔

بچوں نے ماں کی آہ وزاری کی تاب نہ لاکر چلانا شروع کیا۔ اسوقت گویا حشر برپا تھا۔ ہمارے کلیجے پھٹ رہے تھے، آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میں دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ بچوں نے مجھے دیکھا اور روتے ہوئے میری طرف دوڑے۔ ابا — ابا — ادئی — ادئی۔ میں نے انھیں گود میں لے لیا، وہ خوش تھے۔ میرا کلیجہ پاش پاش ہورہا تھا۔ میں نے لطیف کو آواز دی اور کہا کہ جو میوے ہم نے شہر سے خرید کر لائے ہیں ان بچوں کو دو۔ لطیف نے تمام چیزیں بچوں کو دے دیں۔ ماں نے گھر کے اندر سے پوچھا، "کون ہو جی تم؟" میں نے کہا "بہن! میں تمہارا بھائی ہوں۔ نرنیدر نے یہ پھل بچوں کو دینے کے لئے کہا تھا۔" "کیا وہ اچھے ہیں؟ شہر ہی میں ہیں؟" نرنیدر کی بیوی نے جوش مسرت سے پوچھا۔ میں نے کہا "ہاں بہن! وہ شہر ہی میں ہیں" "کیا انھیں نوکری مل گئی جی"؟ "فی الحال تو ایک ساہوکار کے ہاں ملی ہے"۔ میں نے لفظوں کو تولتے ہوئے اطمینان دلانے کے لئے کہا۔ "بھگوان دیا کرو، میرے پتی پر!" عورت نے نہایت دردمندانہ انداز میں کہا۔ "کیا آپ لوگ لطیف اور ساہد صاحب ہیں؟" عورت نے پوچھا — میں نے کہا "ہاں ہم دونوں ہیں — اچھا تو اب آپ آرام سے لیٹ جایئے۔ رات بہت ہو گئی ہے، نرنیدر کل صبح آجائیں گے" میں نے یوں ہی کہا۔ "اچھا" عورت نے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

ہم دونوں وہیں کھڑے رہے، میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا۔ حالت متغیر ہورہی تھی۔ دو بج چکے تھے، ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، میں پچھتا رہا تھا کیوں نرنیدر کی بیوی کو دھوکے میں رکھا؟ کیوں اس حادثے کی اطلاع نہ دے دی، یہی سوچ رہا تھا۔ نیلی چھت کے فادر انسانی کمزوری پر ہنس رہے تھے، ہلکے ہلکے ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ میں ان کی بے راہ روی پر غور کر رہا تھا۔ لطیف نے اس سکوت کو توڑا اور کہا کہ آپ نے بہت بڑا گناہ کیا۔ میں نے کہا "وہ کیا؟" — اس نے جواب دیا: "بہتر تھا کہ آپ نرنیدر کی بیوی کو اس حادثے کی اطلاع دے دیتے"۔ "ہاں بھئی! یہی سوچ رہا ہوں، لیکن ان کا تڑپنا مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ بھوک سے نڈھال بیوی بچے، جب اس حادثے کی خبر سنیں گے۔ اور کیا خبر کہ وہ نرنیدر ہی کی لاش ہے" میں نے دھیمی آواز سے کہا۔ "ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، خیر چلئے، تھوڑی دیر لیٹ رہیں" ہم دونوں اپنے گھر پہنچے، آواز دی، دروازہ کھلا۔ اماں نے پہلے تو ہے ہے میرے بچے کہہ کر گلے سے لگا لیا اور پھر ایسی ڈانٹ دی کہ ہم دم بخود ہوگئے۔ جواب تو نہ دے سکے۔ بچھونے پر لیٹ رہے، دماغ پریشان ہورہا تھا۔ نیند کا پتہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ آخر آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ نرنیدر، زخمی نرنیدر، خون میں ڈوبا ہوا، سامنے کھڑا ہے اور انگلی سے اپنی بوسیدہ جھونپڑی کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہا ہے۔ "ساہد بھیا! او دیکھو ان ننھی سی جانوں کو — " میں نے کہا "کیا کہتے ہو نرنیدر!" "نہیں بھیا! یہ بچے تیرے ہیں، ان کو تیرے سپرد کرتا ہوں، میری برادری کے بھروسے پران کو نہ چھوڑنا"۔ میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نرنیدر کو پکڑنا چاہا اور کہا "تم جاتے کہاں ہو نرنیدر"۔ اس نے ایک آہ کھینچی اور جھونپڑی کی طرف دیکھتے ہوئے غائب ہوگیا۔ میں نیند سے بیدار ہوگیا اور بچھونے ہی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ مجھے اس وقت نرنیدر کی محبت کا احساس ہوا۔

کاش میں اس کی زندگی میں اس کی قدر کرتا۔ کہاں نرنیدر ایک ہندو نوجوان، کہاں ایک مسلمان دوست آہ — موجودہ دور کے ہندو مسلم اس نکتے کو سمجھیں، سچ ہے کہ جو خلوص و ہمدردی دہاتیوں میں

ایک دوسرے سے ہوتی ہے وہ شہریوں میں کہاں ـــــ مگر وہ بھی آج اس مرض میں مبتلا ہیں اور مرض بڑھتا جاتا ہے۔ علاج کی جگہ مضر دوا دی جارہی ہے۔

کتوں کی واویلا کم ہوگئی تھی، ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی، تاروں کا قافلہ غائب تھا بوڑھا چاند زردی مائل چہرہ لئے اپنے شباب رفتہ کا نوحہ کررہا تھا سرد ہوا کے تھپیڑے زندگی کی ہل چل کی خبر دے رہے تھے، عورتیں بیدار ہوہو کر گھروں سے باہر نکل رہی تھیں، کچھ جھاڑو دے رہی تھیں، کچھ عورتیں آنگنوں کو گوبر سے لیپ رہی تھیں۔ فرض شناس کسان، بیلوں کو لئے ہوئے کندھوں پر ہل رکھے کھیتوں کو جارہے تھے۔ مگر آہ ـــــ آج وہ سچی مسرت جو اکثر دیہات میں نظر آتی ہے ناپید تھی۔

نریندر کی بیوی بھی ہزاروں امیدوں اور ارمانوں کی دنیا لئے ہوئے باہر آئی، آنگن کو صاف کیا۔ گوبر کے پانی کا چھڑکاؤ کرکے اس پر چونے کے بیل بوٹے بنائے۔ گھر کے برتن دھو دھاکر قرینے سے جوڑ دیئے۔ ہانڈیوں کو ٹٹولا تو پاؤ بھر چنے کا آٹا ملا وفا کی پتلی، اپنے پتی کی سیوا کرنے والی دیوی اپنے شوہر کے لئے پکوڑی پکانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ کیونکہ آج اس کے بھاگ کھلے تھے۔ افلاس کی لعنت، فاقوں کی نوبت دور ہوتی نظر آرہی تھی اس لئے کہ اس کے پتی کو شہر میں نوکری مل گئی تھی جس کی خبر رات میں، میں اور لطیف نے دی تھی۔ آج اس کے بھر مسرت میں ارمانوں کی لہریں، موجوں کی صورت میں تبدیل ہورہی تھی، اس کے سینے میں ایک تلاطم برپا تھا۔ ذرا سی آہٹ بھی اس کے پتی کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ اس نے جھٹ اپنے بالوں کو صاف کیا، کنگھی کی، تیل ڈالا، چوٹی پر پھول لگائے اور چولھے کے پاس آکر پکوڑی پکانے میں مشغول ہوگئی ـــــ آہ جھوٹی دنیا ـــــ موہوم امید ـــــ خوفناک خوشی۔

مترا، نریندر کی بیوی کی سہیلی تھی، وہ کنویں پر جارہی تھی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ کنتی کے گھر میں چولھا جل رہا ہے اور آنگن صاف ہے اس کو حیرت ہوئی، آواز دی، کنتی باہر آئی، مترا نے پوچھا "بہنا! بھگوان تجھے کُس (خوش) رکھے۔ کیا بھیا پردیس سے آگئے؟" "نہیں بوا وہ آج آنے والے ہیں، کل رات میں لطیف اور ساہو صاحب آئے تھے، اور ان کے دیئے ہوئے پھل پھول دے گئے۔ انھوں نے کھبر (خبر) دی کہ وہ سویرے آنے والے ہیں"، کنتی نے خوش خوش ہوکر جواب دیا "سہاگ بنا رہے تیرا، کنتی آرجو میں تھیں تیری، بہنا تو تو پھکر (فکر) میں ڈوب گئی تھی اور سوکھ کر کانٹا ہورہی تھی۔ تجھے دیکھ کر میرا جی روتا تھا۔ پانی لینے کنویں پر جارہی ہوں، کھیت کو جانا ہے۔ بھیا کے آنے کی کھبر (خبر) دے گی کہ نہیں۔" مترا نے کہا اور چلی گئی۔

کہر پڑ رہی تھی، سورج دیوتا جاڑے کی وجہ سے پہاڑی ہی میں ابھی تک منہ چھپائے پڑے تھے۔ دھان کے پودے دانوں سے لدے، سہرا باندھے ہوئے دولھا کی طرح کھڑے تھے، کسانوں کے دل بلیوں اچھل رہے تھے۔ کوئی کھلیان صاف کررہا تھا، کوئی کھیت کا پانی بہانے کے لئے ہاتھ میں پھاوڑا لے کر نالیاں بنا رہا تھا، کہیں کھیت کٹ رہے تھے۔ کہیں دہاتی گیت گائے جارہے تھے۔ کمبلوں میں لپٹے ہوئے کسان کھیتوں کے پانی میں کھڑے ہوئے سبزی کی طرح لہلہا رہے تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ لیکن وہ اس بات سے بالکل بے خبر کہ کوئی پردہ ان دونوں کے درمیان حائل ہے۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ہم بھائی ہیں۔ جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ان کے دماغوں کو مست کررہی تھی اور نسیم سحر دلوں کو تازگی

بخش رہی تھی۔ سوہن کے دل سے کہر کی طرح کہر غائب ہو چکی تھی۔ سورج دور پہاڑیوں کے دامن میں چمک رہا تھا۔ لال لال، پیلی پیلی ساڑیوں میں لپٹی ہوئی کنواری لڑکیاں، پگڈنڈیوں اور مینڈھوں پر سے سبز پریوں کی طرح تھرکتی ہوئی کھیتوں میں جا رہی تھیں۔ چرواہا جانوروں کو فرقہ ساز لیڈروں کی طرح ادھر ادھر جمع کر رہا تھا۔ کنتی کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ وہ گھر سے باہر آتی تھی، ادھر ادھر دیکھتی تھی غائب ہو جاتی تھی۔ آج اس کا بناؤ سنگار گاؤں کی عورتوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ وہ اس کو دیکھتی تھیں، ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ کہہ لیتی تھیں —— آہ سماج کے بھیڑیئے کبھی کسی کو خوش حال دیکھنا نہیں چاہتے۔

دھوپ پھیل گئی تھی، گھر میں بیٹھے ہوئے کسان کھلیان میں جمع ہو کر خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ کوئی حقہ جلا رہا تھا، کوئی بیڑی پی رہا تھا۔ میں گھر سے باہر آیا اور چبوترے پر بیٹھ گیا۔ نریندر کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور اس کی شبیہ میری آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ روتے روتے میری آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ نریندر کی جھونپڑی کی طرف میری نگاہ جاتی تھی، طوفانِ غم امنڈ آتا تھا، اس کے بچے باہر آتے تھے، دیکھتے تھے، کوئی باپ کو لینے کے لئے راستہ پر جا کھڑا ہوتا تھا۔ کنتی ننھے بچے کو گود میں لے کر ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ بچے روٹی، روٹی، کہہ کر چلا رہے تھے۔ ماں انھیں یہ کہہ کر بہلا رہی تھی کہ "بابو آتے ہوں گے ان کے ساتھ کھانا" —— عورتیں کھیتوں کو کھانا لے جا رہی تھیں۔ کنتی نے مجھے دیکھا، بچوں کو لے کر میرے پاس آئی، اس کو دیکھ کر میرا پیمانۂ صبر چھلک گیا، بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ ننھی ننھی صورتیں کبھی مجھے دیکھتیں اور کبھی اپنی ماں کو حیرت سے تکتی تھیں۔ آخر کنتی نے کہا "بھیا! وہ نہیں آئے، نہ جانے کل سے میری بائیں آنکھ کیوں پھڑک رہی ہے، ساری رات بُرے بُرے خواب آتے رہے، کیا بات ہے، تم تو رو رہے ہو بھیا! کچھ تو بولو۔ کیا میری تقدیر پھوٹ گئی؟" "نہیں کچھ نہیں بہن —— میری آنکھیں درد کر رہی ہیں۔" میں نے سسکتے ہوئے یہ جملہ ابھی ختم بھی نہ کیا تھا کہ گاؤں کا گڈریا ہانپتا، کانپتا، چلاتا ہوا پہنچا، اس کی زبان پر یہ لفظ تھا۔ "کون —— کون (خون)"۔ کھیتوں سے کسان دوڑے گاؤں کے لڑکے، لڑکیاں اور عورتیں اس کے ارد گرد جمع ہو گئیں۔ میں بھی دوڑا ہوا پہنچا اور پوچھا "کس کا خون" "بابو جی، بابو جی، بابو جی —— نر —— نریندر بھیا!!" کنتی نے بھی سنا، ننھے بچے سمیت نیچے گر گئی۔ بچے رو رہے تھے۔ گاؤں میں کہرام سا مچ گیا۔ میں نے جھٹ چھوٹے بچے کو اس کی گود سے جدا کیا اور اماں کے حوالے کر کے لطیف کو لے کر ریلوے لین کی طرف دوڑا۔ گاؤں کی عورتوں نے کنتی کو ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی مگر اس کو غش آگیا تھا۔ ادھر پولیس پہنچی اور خودکشی کی وجہ دریافت کر رہی تھی۔ لوگ حیران تھے۔ کوئی کچھ، کوئی کچھ، جو منہ میں آتا وہ کہتا تھا —— میں حیران تھا، میرے ہاتھ پاؤں کی طاقت جا چکی تھی، اتنے میں کسی نے آواز دی کہ کنتی بے ہوش ہے، میں دوڑا —— کنتی کو ہوش میں لانے کے لئے بہت کچھ کر ڈالا، کئی منٹ کے بعد کنتی نے ہوش سنبھالا اور میری طرف دیکھ کر کہا "بھیا! بچے تیرے تیرے (ذمے) کرتی ہوں، بھگوان —— ایک ہچکی آئی اور اس کی روح کو پرواز کر گئی۔

میں زندہ ہوں، مسلمان ہوں، نریندر کے بچے میرے پاس ہیں، اماں انھیں پال پوس رہی ہیں۔ سماج کے افراد انھیں طعنے دیتے ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے —— آہ نریندر کی موت ظالم سماج کے تقاضوں اور اپنے افلاس کی سبب سے ہوئی

عبدالواسع عمری

عثمانیہ کالج اور جامعہ عثمانیہ کی چند پرانی باتیں

بروز پنجشنبہ یکم ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) کو عثمانیہ کالج کا افتتاح ہوا۔ جس کو آج کامل اکیس سال ختم ہو چکے ہیں جو لڑکے اس وقت نو مولود یا کم سن ہوں گے وہ آج ایم اے اور "ایم ایس سی" میں زیر تعلیم ہیں کالج کی پرانی باتیں ان کے لئے دلچسپی کا موجب ہو سکتی ہیں اس لئے ان کی صراحت اس موقع پر بے محل نہیں ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا منشور خسروی (رائل سانڈ) ۶ ر ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) کو نافذ ہوا تھا کالج کے افتتاح کے پہلے جو امور پبلک کے سامنے آئے وہ دو امور تھے۔

(۱) دارالترجمہ کا قیام (۲) مدرسہ دارالعلوم (کالج) اورنگ آباد کے شرقی مدرسہ میں انگریزی جماعتوں کا قیام۔

دارالترجمہ کا دفتر توپ کے سانچہ کے اس مکان میں تھا جس میں ایک عرصہ تک عثمانیہ پریس قائم تھا۔ اور آج کل دفتر نظامت آثار قدیمہ ہے۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے مقرر ہوئے تھے مولوی صاحب اس خدمت کے پہلے صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات تھے[1] مترجمین کی حیثیت سے جن اصحاب کا تقرر مختلف ماہوار سے ہوا تھا ان کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) قاضی محمد حسین صاحب	ریاضی کے ترجمہ کے لئے
(۲) قاضی تلمذ حسین صاحب	تاریخ کے ترجمہ کے لئے
(۳) سید ہاشمی فرید آبادی	تاریخ کے ترجمہ کے لئے
(۴) چودہری برکت علی مرحوم	سائنس کے ترجمہ کے لئے
(۵) مولانا عبدالماجد دریابادی	فلسفہ کے ترجمہ کے لئے
(۶) الیاس برنی صاحب	معاشیات کے ترجمہ کے لئے

مجھے جہاں تک یاد ہے یہی چھ اصحاب پہلے پہل مامور ہوئے تھے اس کے بعد مترجموں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان مستقل مترجموں کے علاوہ بعض دوسرے اصحاب سے بھی یہی کام لیا جاتا تھا جن میں مولوی عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر اور مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

اسی زمانہ میں وضع اصطلاحات کی کمیٹیاں بھی ہوتی تھی اس کے ارکان میں مولوی حمید الدین مرحوم سابق صدر دارالعلوم مولوی وحید الدین سلیم، مرزا مہدی خاں کوکب اور عبدالرحمن خاں صاحب وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

دارالترجمہ میں اس کے بعد بہت کچھ تغیرات ہوئے ناظر مذہبی کی حیثیت سے مولوی صفی الدین مرحوم کا تقرر ہوا۔ مترجموں کے زمرہ میں ظفر علی خاں، مسعود علی صاحب محوی، رضا علی صاحب، مولانا عبداللہ عمادی وغیرہم کے تقررات ہوتے گئے چند سال کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کو اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی پر (۱۰۰۰) ماہوار کے ساتھ منتقل کر دیا گیا۔

[1] مولوی عبدالحق صاحب جب پہلے پہل حیدرآباد آئے تو نواب ممتاز یار الدولہ نے مدرسہ آصفیہ کی صدر مدرسی پر آپ کا تقرر کیا تھا۔ بارہ سال آپ یہاں صدر مدرس رہے اس کے بعد آپ معتمد عدالت امور عامہ میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے پھر سررشتہ تعلیمات میں منتقل ہوئے مشغلی مہتممی تعلیمات کے بعد صدر مہتمم ہوئے اس زمانے میں (۱۰۰۰) ماہوار تھی دارالترجمہ میں (۱۵۰۰) پر تقرر ہوا تھا

اور دارالترجمہ کی نظامت پر مولوی عنایت اللہ کا تقرر ہوا۔ جوش ملیح آبادی ناظر ادبی کی حیثیت سے مامور کئے گئے۔ حضرت نیمی مرحوم اور نظام شاہ لبیب تصحیح کے لئے تھے۔ کتابوں کی طباعت اولاً دارالطبع سرکار عالی میں ہوتی تھی۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ کا علحدہ پریس قائم کر دیا گیا۔

سنہ ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم (کالج) اس مکان میں تھا جو دفتر مالگزاری کے بازو ہے اور اس وقت کورٹ آف وارڈز کا دفتر ہے۔ دارالعلوم میں اس وقت عربی کی جماعتیں عالم فاضل اور کامل اور فارسی کی جماعت دبیر کے علاوہ منشی اور مولوی کے نام سے بھی دو جماعتیں تھیں۔ ان کی تعلیم دو سال کی ہوتی تھی اور یہ جماعتیں گویا فارسی اور عربی کی میٹرک کی جماعتیں تھیں۔ عثمانیہ کالج کے قائم ہونے کے پہلے طلبہ کی فراہمی کے لئے انگریزی کی تعلیم ضروری تھی اس لئے دارالعلوم کالج میں دو جماعتیں خاص طور سے قائم کی گئیں تاکہ ان طلبہ کو انگریزی کی تعلیم دی جائے جنھوں نے منشی، مولوی یا عالم و دبیر میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ انگریزی تعلیم کے لئے ایک جماعت تو وہ تھی جس میں ایسے طلبہ کو لیا گیا تھا جو کچھ انگریزی سے واقف تھے دو چار کتابیں ختم کر لی تھیں اور دوسری جماعت ان طلبہ کے لئے مخصوص کی گئی جن کو ابتدا سے انگریزی کی تعلیم دینی تھی۔ اول الذکر جماعت کی تعلیم کے لئے احسن عباس صاحب مامور کئے گئے اور ثانی الذکر کی لئے سری کنیٹ صاحب کا انتخاب ہوا۔ ان طلبہ کے لئے خاص طور پر وظایف بھی منظور کئے گئے تھے۔ اور کئی مرتبہ طریقۂ تعلیم اور مدارج کی ترقی دیکھنے کے لئے مختلف اصحاب آ کر معائنہ کرتے رہے ایک مرتبہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین بھی تشریف لائے تھے اور انھوں نے لڑکوں کا امتحان بھی لیا تھا۔

پہلی جماعت جو ایک سال میں میٹرک[1] کا امتحان دینے والی تھی اس میں چھ سات طلبہ زیر تعلیم تھے جن میں سے عبدالمجید صاحب صدیقی مددگار پروفیسر عثمانیہ کالج اور احمد بن عبداللہ صاحب لکچرار سٹی کالج کے نام مجھے یاد ہیں۔ دوسری جماعت دو سال میں میٹرک کا امتحان دینے والی تھی اس میں بیس پچیس طلبہ شریک تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔

عزیز الرحمن صاحب لکچرار اورنگ آباد کالج، نرسنگ راؤ صاحب اڈیٹر رحمت، ابوالفتح نصراللہ صاحب صدر مدرس، رام چندر راؤ صاحب وکیل، عبدالقادر صاحب، ممتاز الحق صاحب، وکٹیشور راؤ (مقطعہ دار بورگل) ابوالفتح نصراللہ صاحب، ہدایت احمد صاحب، عبدالغنی صاحب، راقم وغیرہ۔

یہ تمام وہ طلبہ تھے جو یا تو فارسی کی اعلیٰ جماعت دبیر یا عربی کی جماعتوں عالم و فاضل میں زیر تعلیم تھے، یہ طلبہ روزآنہ پانچ گھنٹے انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اورنگ آباد کے مشرقی مدرسہ میں بھی اس طرح ایک جماعت قائم ہوئی تھی وہاں یوسف الدین صاحب مہتمم کتب خانہ عثمانیہ کالج، کلیم الدین صاحب انصاری وکیل، ڈاکٹر نجمل حسین وغیرہ انگریزی کی تعلیم پاتے تھے۔

اسی زمانہ میں جامعہ عثمانیہ کا دفتر بھی قائم ہو گیا مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل اورنگ آباد کالج، مہتمم مقرر ہوئے تھے، اس خدمت کے پہلے وہ مددگار معتمد تعلیمات تھے۔ عثمانیہ کالج کے افتتاح سے چند روز پہلے پروفیسروں اور مددگاروں کے نام اخباروں میں شایع ہو گئے تھے۔

---

[1] میٹرک کے امتحان میں صرف انگریزی کے دو پرچوں کا امتحان شامل تھا باقی گروپ معاف تھے۔

پہلے پہل جن اصحاب کا تقرر ہوا تھا ان کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) مسٹر ولنکر	بحیثیت پروفیسر انگریزی	اس کے پہلے وہ چیف انسپکٹر مدارس و معتمد کمشنر امتحانات تھے۔	
(۲) قاضی محمد حسین صاحب	پروفیسر ریاضی	دارالترجمہ میں مترجم تھے۔	
(۳) بالو امرت لعل تہیل	مددگار پروفیسر	دارالعلوم میں پروفیسر سائنس تھے۔	
(۴) چودہری برکت علی صاحب	مددگار پروفیسر کیمیا	دارالترجمہ میں مترجم تھے	
(۵) وحید الرحمن صاحب	مددگار پروفیسر طبیعیات	جدید تقرر ہوا تھا۔	
(۶) جمیل الرحمن صاحب	مددگار پروفیسر تاریخ	دارالعلوم میں پروفیسر تاریخ تھے	
(۷) ہارون خاں شروانی	" "	جدید تقرر ہوا تھا۔	
(۸) محمد الیاس برنی صاحب	مددگار پروفیسر معاشیات	دارالترجمہ میں مترجم تھے۔	
(۹) خلیفہ عبد الحکیم صاحب	مددگار پروفیسر فلسفہ	جدید تقرر ہوا تھا۔	
(۱۰) سید غلام نبی صاحب	مددگار پروفیسر عربی	دارالعلوم ہائی اسکول کے پرنسپل تھے۔	
(۱۱) سید اشرف صاحب ہاشمی	" فارسی	دارالعلوم میں پروفیسر تھے۔	
(۱۲) عبد الحمید خاں صاحب	" فارسی	جدید تقرر ہوا تھا۔	
(۱۳) مولوی وحید الدین سلیم	" اردو	ایضاً	
(۱۴) سری کنٹیا صاحب	" کنٹری	دارالعلوم میں مدرس تھے۔	
(۱۵) ساشتری صاحب	" مرہٹی	جدید تقرر ہوا تھا	
(۱۶) ستیا راؤ صاحب	" تلنگی	"	
(۱۷) عبد الواسع صاحب	مددگار پروفیسر دینیات	ملازم پروفیسر دارالعلوم	

اسی کے ساتھ دارالعلوم یا شعبہ دینیات عثمانیہ کالج کے لیے چند جدید تقررات بھی ہوئے تھے۔ اور بعض قدیم پروفیسر باقی رکھے گئے تھے۔ ان دونوں کے ناموں کی بھی صراحت کی جاتی ہے تاکہ معلوم ہوسکے کہ اس شعبہ میں کون کون قدیم سے آئے ہیں اور کن کا تقرر مابعد ہوا ہے۔ مولوی حمید الدین صاحب اس شعبہ کے صدر بدستور رہے۔

دارالعلوم کے قدیم اساتذہ جو باقی رہے	جدید اساتذہ جن کا تقرر ہوا
۱۔ مولوی حمید الدین صاحب بی اے صدر	مفتی مولوی عبد اللطیف صاحب
۲۔ مولوی عبد القدیر صاحب	مولوی مناظر احسن صاحب گیلانی
۳۔ مولوی سید شبیر علی صاحب	مولوی محمد یونس صاحب، فرنگی محلی
۴۔ مولوی سید شاہ مصطفیٰ صاحب قادری	
۵۔ مولوی سید ابراہیم صاحب	
۶۔ مولوی عبد الحی صاحب	
۷۔ مولوی سید احمد حسین صاحب	
۸۔ مولوی خواجہ شرف الدین صاحب	

عثمانیہ کالج کے لئے آغا منزل اور رستم منزل کے مکانات کرایہ پر لئے گئے کچھ فرنیچر جدید تیار کرایا گیا اور باقی ضروریات کے لئے دارالعلوم کا فرنیچر منتقل ہوا۔ کتب خانہ[1] اور سائنس کے آلات بھی اولاً دارالعلوم کے ہی لئے گئے، اس کے بعد ان میں اضافہ ہوتا گیا۔

پنجشنبہ یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ کو صبح کے دس بجے کالج کے افتتاح کا وقت مقرر کیا گیا۔ مجلس صاحب کے دستخطی دعوت نامے جاری ہوئے تھے۔ (سنا گیا کہ اس دعوت نامہ کا کوئی نسخہ دفتر مجلس میں موجود نہیں ہے)

---

[1] دارالعلوم کالج کا کتب خانہ اولاً صرف دو چار الماریوں میں محفوظ تھا اور اس سے کوئی استفادہ بھی نہیں کرتا تھا۔ جب دارالعلوم شہر کے باہر منتقل ہوا تو ملا عبد القیوم مرحوم کا کتب خانہ جو غالباً پانچ چھ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا خریدا گیا تھا۔ اور کتب خانہ کی جدید تنظیم ہوئی تھی، یہی کتب خانہ عثمانیہ کالج میں منتقل ہوا۔

رفقائے جامعہ عثمانیہ اور اعلیٰ عہدہ داران سرکاری کے نام یہ دعوت نامے تقسیم ہوئے تھے۔ درباری لباس یا علمی لباس میں آنے کی استدعا کی گئی تھی۔ فارم کے ذریعہ ان طلبہ کے نام درج رجسٹر ہوئے تھے جو نئے کالج میں شرکت کی خواہش کی تھی، ان طلبہ کو بھی کارڈ دئے گئے تھے تاکہ ان کو داخل کیا جائے۔ امراء میں صرف نواب جان خاناں بہادر تشریف لائے تھے۔

انتظام جلسہ افتتاح کے لئے مسجل صاحب اور ان کے دفتر کے چند اشخاص، اہلکاروں کے قطع نظر بطور خاص دارالعلوم کے تین لڑکے والنٹیر کی حیثیت سے لئے گئے تھے یعنی نظام الدین صاحب (حال ڈاکٹر نظام الدین) عبدالشکور مرحوم اور راقم الحروف۔

مہدی یار جنگ بہادر جو سید راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات کے علی گڑھ چلے جانے کے باعث معتمد و ناظم تعلیمات تھے[1] صدر جامعہ عثمانیہ کالج کے فرائض انجام دینے کے لئے مقرر ہوئے تھے مہمانوں کا استقبال صدر صاحب کرتے تھے کچھ دور پہونچانے کے بعد یہ کام میرے اور میرے بھائی مرحوم عبدالشکور کے ذمہ ہوتا تھا ہم دونوں مہمانوں کو جلسہ کے کمرہ میں پہونچاتے تھے، وہاں نشست کا انتظام مسجل صاحب اور نظام الدین صاحب کے ذمہ تھا۔ ہر کرسی پر نام چسپاں کیا گیا تھا۔

جلسہ کے لئے آغا منزل کا وہ ہال منتخب ہوا تھا جس میں کیمیا کا درس ہوا کرتا تھا یعنی شمال رویہ اوپر کا بڑا ہال۔

جلسہ کا پروگرام حسب ذیل تھا:-

(۱) قرأت

(۲) فرمانِ خسروی — سر اکبر حیدری (بحیثیت معتمد تعلیمات)

(۳) تقریر افتتاح — مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب (صدر یار جنگ بہادر) بحیثیت معین امیر جامعہ

سنا گیا کہ اس نظام العمل کا بھی کوئی نسخہ دفتر مسجل میں نہیں ہے یہ اور دعوت نامہ دونوں ہارون خاں صاحب شروانی کے پاس محفوظ ہیں جو ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

معین امیر جامعہ کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہو گیا۔ اور مہمان رخصت ہو گئے۔

مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد ونکر صاحب نے انگریزی ادب پر لکچر دیا جو بی اے کی جماعت کا پہلا درس تھا۔

اس جماعت میں شریک ہونے والے طلبہ کی صحیح تعداد مجھے یاد نہیں ہے البتہ یہ یاد ہے کہ ان کی تعداد اسی سے زیادہ اور سو سے کم تھی۔ جو طلبہ اس جماعت میں شریک ہوئے ان میں سے بعض نام مجھے یاد ہیں۔

(۱) طلبہ دار العلوم:-

عبدالمجید[1] صدیقی (پروفیسر عثمانیہ کالج)۔ احمد[2] بن عبداللہ (لکچرار سٹی کالج) عزیز[3] الرحمن (لکچرار اورنگ آباد کالج) ابو[4] الفتح نصر اللہ (صدر مدرس ورنگل)، نکیشور[5] راؤ (منقطعہ دار بودگل) وغیرہ

(۲) اورنگ آباد کے طلبہ:-

یوسف[1] الدین صاحب (مہتمم کتب خانہ عثمانیہ کالج) کلیم[2] الدین صاحب انصاری وکیل۔ انیس[3] الدین احمد صاحب وکیل وغیرہ

(۳) دیگر مدارس کے میٹرک کامیاب طلبہ:-

خواجہ نعمت[1] اللہ خاں (صدر مہتمم تعمیرات نزل) حبیب[2] علی صاحب، حبیب[3] زین صاحب، فضل[4] اللہ احمد صاحب (مہتمم گشتی کتب خانہ) وغیرہم

(باقی آئندہ)

نصیر الدین ہاشمی

---

[1] نواب مہدی یار جنگ بہادر جو اس زمانہ میں سید مہدی حسین بلگرامی تھے، نائب معتمد فینانس تھے اس خدمت سے وہ معتمد و ناظم تعلیمات ہوئے تھے۔

گُل بُوٹے

ایک کرم فرما نے دعوت دی کہ ان کے "لے پالک" کی خانہ آبادی کی تقریب میں ہم ان کے ساتھ ماحضر تناول کریں۔

بیاہ کے دن مغرب کے بعد ہم دعوت میں پہونچے' صحن میں ایک شامیانہ کے نیچے بہت سی کرسیاں اور صوفے بڑے سلیقہ سے جمائے گئے تھے اور ان کے بیچوں بیچ تخت پر نوشہ میاں سلمہٗ کی مسند لگی تھی' مہمان آنے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی دولہا میاں قدم رنجہ نہیں ہوئے تھے۔ ایک دوسرے شامیانہ میں دسترخوان چنے جا رہے تھے' کوئی سو ڈیڑھ سو مہمانوں کے کھانے کا انتظام ہوگا۔ مکان بجلی کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ہم نے میزبان صاحب کی فراخدلی کی دل ہی دل میں خوب داد دی کہ وہ اپنے "لے پالک" کا بیاہ اس شان سے کر رہے ہیں اور جی کھول کر ارمان نکال رہے ہیں۔

شامیانہ کے اندر داخل ہوتے ہی جب صاحب خانہ ہمارے استقبال کو آگے بڑھے تو ہم نے مصافحہ کے بعد انھیں مبارکباد دی اور کہا "اللہ پاک آپ کو اس کا اجر دے گا کہ آپ اپنے "لے پالک" کا بیاہ اس فیاضی سے کر رہے ہیں"۔

ہمارے میزبان نے ہم سے بغلگیر ہو کر شکریہ کے بعد کہا۔

"آج کی تقریب میں آپ کو بڑا لطف آئے گا' ایک انوکھا بیاہ ہم آپ کو آج دکھائیں گے"۔

اس نرالے بیاہ کو دیکھنے کے شوق میں ہمارے پیٹ میں چوہے کودنے لگے ہم نے پوچھا۔

"آپ کا مطلب ہم کچھ نہیں سمجھے' آخر یہ انوکھا بیاہ ہے کیا بلا؟"

بے تکلفی سے فرمایا۔

"تم نے ابھی دیکھا کیا ہے' دنیا کے ساتھ سب رنگ بدل رہے ہیں' کبھی شیر بکری کو تم نے ایک گھاٹ پانی پیتے دیکھا ہے؟"

ہم نے جواب دیا "نہیں' البتہ سرکس میں سہمی ہوئی بکری کو شیر کے ساتھ کھڑا ہوا تو ضرور دیکھا ہے"!

میزبان صاحب مسکرا کر بولے "اجی جناب! سرکس میں بکری کو نشیلی چیزیں کھلا کر شیر کے ساتھ کھڑا کر دیا کون کمال ہے"!!

ہم نے عرض کیا "تو آج آپ ہمیں شیر بکری کا بیاہ دکھانے والے ہیں"!

قہقہہ مار کر فرمایا "یار تم تو نرے گاؤدی نکلے! عقل تو تمھیں چھو تک نہیں گئی!! بھلا کہیں شیر بکری کا بیاہ بھی ہوا ہے"؟

ہم بہت چکرائے' ذہن پر جتنا زور ممکن تھا ڈالا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا' اتنے میں توپ کی گرج نے آٹھ بجنے کا اعلان کیا' اس آواز کی ساتھ ہی بینڈ' تاشے اور قسم قسم کے باجے بجنے لگے' "دولہا آرہا ہے" کی صدائیں بلند ہوئیں' آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی روشنی کے ساتھ دور سے ایک "پالکی" آتی نظر آئی۔ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ اس زمانہ میں دولہا میاں موٹر میں آنے کی بجائے "پالکی" میں کیسے آرہے ہیں۔

جب پالکی ذرا نزدیک آئی تو نوشہ میاں کو دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آنکھیں مل مل کر ہم نے پالکی کے اندر بہت غور سے جو دیکھا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک "ابلق" کتا کارچوبی جھول اوڑھے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے "ہز ماسٹرز وائس" کے کتے کی طرح پالکی میں بیٹھا ہوا ہے' یہ منظر دیکھ کر ہمیں اپنی نظر کو نظر لگ جانے کا اندیشہ ہوا! میزبان صاحب ہمارے بازو ہی کھڑے مسکرا رہے تھے' ہماری پریشانی کو دیکھ کر فرمایا۔

"ہم نے کہا نہ تھا کہ تم نرے احمق ہو! احمق!! تمھیں تو

شیر بکری کے بیاہ کی سوجھی تھی!!! بھلا کہیں شیر بکری کا بیاہ بھی تم نے ہوتے دیکھا ہے! تم بھی کیا یاد کروگے آج تمھیں ہم ایک انوکھا بیاہ دکھلاتے ہیں! ارے میاں ہم نے آج وہ کر دکھایا ہے جس کو تمھارے فرشتے بھی نہ کرسکیں!! رہتی دنیا تک ہماری یہ یادگار قائم رہے گی، کچھ سمجھے تم"؟

ہم نے اپنے "نرے احمق" ہونے کو تسلیم کرکے کہا،

"آپ کی باتیں تو آج ہمارے لئے پہیلیاں ہیں کچھ صاف صاف کہئے تو سمجھیں کہ آخر آج یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہمیں تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، واقعی آج ہماری عقل رفوچکر ہوگئی ہے"۔

مہربان میزبان نے قہقہہ لگا کر فرمایا۔

"تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم آج "گھن چکر" بن گئے ہو! اچھا تو اب بھی تمھاری سمجھ میں کچھ نہ آیا"؟

"گر سمجھے تو یہ سمجھے کہ اب تک کچھ نہیں سمجھے"!

ہم نے کہا "کیا خاک سمجھ میں آئے گا! کچھ سمجھنے کی بات بھی تو ہو"!!

بڑے طنز سے وہ بولے "سمجھنے کے لئے سمجھ بھی تو ہو! ارے تم اتنا نہیں سمجھے کہ ہمارا لاڈلا "سکندر" دولہا بنا پالکی پر چڑھا کیوں آرہا ہے! سنو! ہم نے آج اس کا بیاہ رچایا ہے!! تم کہوگے یہ کیا حماقت ہے، ایک کتے کی اس دھوم دھام سے شادی کیوں کی جارہی ہے"؟

ہم نے جواب دیا "یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں! آخر یہ ستم ظریفی کیا ہے"؟

ہنس کر فرمایا "اب بھی تم کچھ نہیں سمجھے؟ سنو واقعہ یہ ہوا کہ بیگم جب کبھی ہم سے لڑتیں جھگڑتیں تو کہتیں ہماری زندگی کتے بلی کی ہوگئی ہے، جہالت تو کرتیں خود اور بناتیں ہمیں "کتا"! ایک دن اسی طرح لڑائی ہو رہی تھی اور بیگم باربار کہہ رہی تھیں کہ کتے، بلی کی زندگی سے ناک میں دم آگیا ہے!! ہم نے زچ ہو کر کہا، بیگم! تم تو بلی سے بھی گئی گزری ہو!! بلی میں جتنی سمجھ ہے تم میں اتنی بھی نہیں! اگر کسی بلی کو سدھا کر کتے سے بیاہ دیا جائے تو چاہے وہ ہسپتال میں کسی بچہ کا سر کیوں نہ چبا ڈالے مگر وہ ہرگز اس طرح بات بات پر نہ لڑے گی جس طرح کہ تم الجھتی ہو، بگڑتی ہو، جھگڑتی ہو اور زبان چلاتی ہو"!!

بیگم نے چلا کر کہا "جب تم بلی کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو تو کسی "سمجھ دار" بلی سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے"!

ہم نے کہا "بیگم! ذرا سوچ سمجھ کر بولو!! تم اپنے محترم شوہر کی جناب میں یہ کیا کہہ رہی ہو، ہم انسان ہو کر بلی سے بیاہ کریں!! ہماری بلی تو تم ہی ہو!!! بلی کا بیاہ تو ایک دن ہم کتے سے کر دکھائیں گے"!

"یہ سنتے ہی بیگم نے پھر چیخ پکار شروع کردی اور بولیں۔

"اگر تم کتے کا بیاہ بلی سے کر دکھاؤ تو سمجھوں کہ تم اپنے وقت کے "لقمان" ہو! اس دن سے اگر تمھاری "باندی" بن کر نہ رہوں تو کہنا"!!

"ہم نے جواب دیا "انشاءاللہ ایک دن ایسا ہی ہوگا! بلی کی ہٹ تمھاری "تریاہٹ" کے آگے کچھ بھی نہیں!! اس کو سدھا سکتے ہیں مگر تم سے تو بس خدا ہی بچائے"!!!

ہمارے اس "ریمارک" پر بیگم اور بپھریں تو اپنی کنیزی کے نوشتہ کے علاوہ ایک ہزار روپے کی شرط بھی لگا دی، بازھنے کو تو ہم نے شرط باندھ لی مگر کتے بلی کے "سنجوگ" کی ہمیں بڑی فکر لگ گئی، دوچار روز اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد ہمارے "ذہن رسا" میں ایک تدبیر آئی، ہم نے کتے بلی کے دو دو چھوٹے چھوٹے بچے خریدے اور ان دونوں کو اکٹھا رکھ کر

پالنا شروع کیا۔ جب انھوں نے کچھ ہوش سنبھالا تو آپس میں لڑنے لگے، اب ہم نے زیادہ وقت ان کی تربیت میں صرف کرنا شروع کیا۔ ایک چھوٹا سا چابک لے کر سرکس کے ماسٹر کی طرح ہم انھیں روز سدھانے' جہاں یہ دونوں لڑے کہ ہم نے چابک رسید کیا' دونوں تلملا کر رہ جاتے۔ ایک بڑا پنجرہ ہم نے ان دونوں کو رکھنے کے لئے بنایا۔ چابک کے ڈر سے ان کا لڑنا تو بہت کچھ کم ہوگیا مگر ایک دوسرے سے دور دور رہتے۔ اب ہم نے ترکیب یہ کی کہ ایک ہی برتن میں دونوں کے لئے دودھ' بالائی' روٹی' بسکٹ' گوشت وغیرہ رکھنا شروع کیا' یہ تدبیر کارگر ہوئی اور چند ہی دن میں دونوں میں خاصی دوستی ہوگئی۔"

"کتے بلی کی ان بن دنیا جہان میں مشہور ہے مگر ہم نے دونوں میں یگانگت پیدا کردی' چند مہینوں کے بعد اس ملاپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری "فیروزہ خانم" کے دو بچے ہوئے' مگر یہ انوکھے سنجوگ کے بچے بھی انوکھے نکلے! بچوں کے چہرے ہو بہو "سکندر" جیسے اور جسم "فیروزہ خانم" کا سا' گویا کہ بلی کے دھڑ پر کتے کا سر لگا ہوا ہے' انھیں دیکھ کر مارے خوشی کے ہم بچوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے! ان بچوں کو گود میں اٹھالیا اور ان کے ماں باپ کے ساتھ دوڑتے ہوئے بیگم کی طرف چلے اور دور ہی سے بیگم! بیگم!! چیخنے لگے۔

بیگم مشین پر کپڑے سی رہی تھیں' ہمیں سکندر اور فیروزہ خانم کے ساتھ گود میں کچھ اٹھائے ہوآتا دیکھا تو سینا چھوڑ کر اٹھ گئیں کہ یہ کیا آفت آئی! جب ہم نے کتے کے سر اور بلی کے جسم والے بچوں کو بیگم کے سامنے ڈالا تو ان کے ہوش اڑگئے۔

"بیگم کو پریشان دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہو رہی تھی' ہم نے تن کر کہا "لائیے ہزار روپے اور باندی بنے رہنے کا اقرارنامہ! کتے بلی کے سنگم کے نتیجہ کو ذرا غور سے دیکھنا!!"

"ایک عرصہ سے وہ کتے بلی کے ملاپ کو دیکھتی آرہی تھیں اب ان بچوں کو دیکھ کر فرطِ ندامت سے گردن جھکالی اور چپکے سے کہا۔

"آپ جیتے میں ہاری' بے شک حیوان بھی تربیت سے انسان بن جاتا ہے! آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے کہ انسان کو اور خصوصاً عورت کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے' میری ہی جہالت کی وجہ سے یہ سارے جھگڑے ہوا کرتے تھے اور ہماری زندگی کتے بلی کی سی ہوگئی تھی مگر جب کتے بلی میں بھی تربیت کے اثرات یگانگت پیدا کرسکتے ہیں تو بڑی شرم کی بات ہے کہ ہم انسان ہو کر ان حیوانوں سے سبق نہ لیں! انشاء اللہ اب کبھی آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہوگی' آج سے میں آپ کی بیگم نہیں باندی بن کر رہوں گی!!"

"ہم نے بیگم کو آبدیدہ دیکھ کر گلے سے لگالیا اور کہا۔

"خدانخواستہ "باندی" بنے آپ کی بلا! ہم تو آپکو بیگم ہی رکھیں گے"!!

"اس واقعہ کو کوئی چھ مہینے ہوتے ہیں' بیگم اپنے قول کی سختی سے پابندی کررہی ہیں' ہماری زندگی اب نہایت خوشگوار ہوگئی ہے' ہمارے لاڈلے "سکندر" اور پیاری "فیروزہ خانم" نے مل جل کر ہماری زندگی سنوار دی' آج ہم ان دونوں کا بیاہ رچاکر اپنی مسرتوں سے بھری نئی زندگی کا جشن منارہے ہیں"!!

باغباں

شفق

عروسِ شفق کا گلابی سا آنچل ـــــ سنہری شعاعوں کی گرد اس کے جدول
وہ صہبا کی شوخی وہ مینا کی چھل بل ـــــ مئے لالہ گوں کی چھلکتی سی چھاگل
وہ آکاس دیوی کی رنگین صورت
وہ سانچے کی ڈھالی سُبھی ایک مورت

مصوّر نے پھولوں سے رعنائیاں لیں ـــــ عنادل کے نغموں سے رنگینیاں لیں
بتانِ سمن بر سے کچھ شوخیاں لیں ـــــ کسی کی جوانی سے بیتابیاں لیں
کھنچا تب کہیں بے نظیر ایسا نقشہ
جبینِ فلک کا کہیں جس کو قشقہ

ہے دریا رواں اک نئے آتشیں کا ـــــ فلک پر ہے نقشہ بہشتِ بریں کا
پشیماں سا چہرہ کسی نازنیں کا ـــــ نمایاں ہے گویا لہو آتشیں کا
افق پر گلستاں کی رنگینیاں ہیں
عیاں دستِ قدرت کی گلکاریاں ہیں

کفِ پائے رنگیں کی رنگت ہے ساری ـــــ شگفتہ ہے گردوں پہ پھولوں کی کیاری
ہواؤں پہ دریائے آتش ہے جاری ـــــ ہے اربابِ دنیا پہ حیرت سی طاری
کفِ گل فروش آسماں کا ہے دامن
فضائیں بنیں نور سے رشکِ ایمن

وہ شمعِ محبت کا جاں سوز شعلہ ـــــ جبینِ فلک کا وہ گلنار غازہ
وہ لالے کی کیاری وہ پھولوں کا تختہ ـــــ جسے دیکھ کر ہو گلستاں کو سکتہ
نزاکت سے چھنتی ہیں رنگین کرنیں
پسِ پردہ جیسے تبسّم کی موجیں

محبوب الٰہی خاں سحرؔ (رہنگوی)

تاثراتِ سفرِ یورپ (بسلسلۂ گزشتہ)

زیورخ کے خاص کتب خانے میں اس وقت سات لاکھ کتابیں ہیں اور ۲۴۰ پڑھنے والوں کے لئے مکمل انتظام ہے۔

شام کے وقت زیورخ کی تاریخی انجمن کی طرف سے ایک عشائیہ تھا۔ اس کے دوران میں ہندوستانی جامعات کے مندوبین (جن کی تعداد ۵ ہے) ایک جگہ جمع ہوئے اور حال کی قائم شدہ (All India Historical Associati) کی بابت تبادلۂ خیالات کیا قرار پایا کہ ہندوستان کی تاریخی الببلیوگرافی (Bibliography) کا کام فوراً شروع ہو جانا چاہئے تاکہ زیورخ ہی میں بیٹھ کر اس مقصد کے لئے تاریخ ہند کی تقسیم کر کے ایسوسی ایشن کے سامنے پیش کر دی جائے۔

اگلے دن کانگریس کی طرف سے اس نواح کی مشہور پہاڑی چوٹی (Rigi Kulm) کو اکسکرشن جانے والا تھا جس کے لئے ارکان نے کل ہی ٹکٹ لے لئے تھے۔ ۸ بجے صبح چل کر شام کے سات بجے واپسی عمل میں آئی۔ زیورخ سے (Goldau) معمولی ریل میں گئے راستہ نہایت پر لطف کٹا۔ جگہ جگہ سربفلک الپائی چوٹیوں کے وسط میں جھیلیں، ہماری ریل کبھی ان کے کنارے پر چلتی تھی کبھی جھیلیں ایک نظر میں نظر آتی نہیں، غرض Goldau تقریباً ایک گھنٹے میں پہونچ گئے۔ وہاں سے ایک خاص قسم کی ریل پہاڑ پر چڑھتی ہے یہ ریل پہاڑ پر تقریباً ۴۵ درجہ زاویہ پر جاتی ہے یعنی اوپر چڑھنے کے لئے چکر نہیں لگاتی بلکہ تقریباً سیدھی چڑھ جاتی ہے۔ راستے میں کئی مرتبہ ریل بادلوں میں ہو کر چلی پہاڑ کی چوٹی پر ایک گھنٹے میں پہونچ گئے۔ اوپر نہایت درجہ سردی تھی، بادل آتے تھے جاتے تھے اور نہلاتے تھے پہلے ہم نے کوشش کی کہ کوہ برفان نظر آتے لیکن بادلوں کی وجہ سے کبھی کبھی ایک اڑتی ہوئی دھوپ سی نظر آتی اور بس۔ نے Rigi کی چوٹی سے نیچے دیکھو تو جھیل زیوگ (Zug)، جھیل لوسرن (Lucerne)، شہر لوسرن، روس ناخ (Russnacht) (جہاں چند سال ہوئے ملکۂ بلجیم موٹر کے ایک حادثے میں کام آئی تھیں) یہ سب مقامات بالکل ایک نقشے کی طرح پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ کبھی چوٹیوں پر بادل کبھی چوٹیاں صاف اور جھیلوں پر بادل غرض عجیب و غریب منظر تھا۔ یہاں چوٹی پر ایک بڑا ہوٹل ہے اور معلوم ہوا کہ لوگ خاص طور پر یہاں رات کو رہتے ہیں اور صبح کے وقت برفانی چوٹیوں پر سورج نکلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ہم نے لنچ اسی ہوٹل میں کھایا۔ اس سیر کے دوران میں کئی مندوبین سے ملاقات اور باتیں ہوئیں۔ لنچ پر میری ہی میز پر مشہور و معروف پروفیسر ایڈکاک (Adcock) (جو Cambridge Medieval History کے اڈیٹر ہیں) اور پروفیسر اودن (پروفیسر ناٹنگھم یونیورسٹی کالج) بیٹھے تھے ان سے بہت دیر تک دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ ان کے بعد پراگ (صدر مقام چیکوسلوواکیہ مرحومہ) کے پروفیسر ستلوکل (Stloukal) سے باتیں رہیں۔ یہ کہتے تھے کہ میں بہت جلد پراگ واپس جا رہا ہوں اس لئے کہ چیکوسلوواکیہ اور جرمنی میں جو جھگڑا چل رہا ہے وہ ایسی نازک حالت کو پہونچا ہے کہ شاید بہت جلد جنگ چھڑ جائے۔ بے چارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ بہت جلد بغیر جنگ کے ان کا ملک یوروپی تدبر کی قربان گاہ پر چڑھ جائے گا۔ واپسی میں (Goldau) کے قدرتی پارک کا معاینہ کیا جہاں ہرن، بارہ سنگھے، چیتل اور بہت سے دوسرے جنگلی جانور بالکل آزادانہ پھرتے دکھائی دئے۔ یہ جانور انسان سے اس قدر مانوس تھے کہ وہ سمجھ لیتے کہ ان کے پاس مونگ پھلیاں یا دوسری مزے دار چیزیں ہیں تو چلتے چلتے جیبوں میں

منہ ڈال کر ٹوٹ لیتے۔

رات کے وقت یہاں کی مختلف تجارتی انجمنوں نے سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو مندوبوں کو کھانے پر بلایا تھا مجھے جو دعوت آئی تھی وہ یہاں کی ایک نہایت ہی قدیم تجارتی انجمن (Zumft zum Waag) یعنی "انجمن ترازو" کی طرف سے تھی۔ یہ انجمن چھ سو سال پرانی ہے اور اس کا اپنا دائرہ اور مباحثہ خانہ ہے۔ کھانے پر میرے ایک طرف بخارسٹ (رومانیہ) کے پروفیسر براتولیسکو (Bratulescu) اور دوسری طرف لوزان (سوئٹزرلینڈ) کے پروفیسر لاسیر (Lasserre) تھے۔ بخارسٹ کے پروفیسر صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کی جامعہ میں اس وقت ۲۰ ہزار طلبہ ہیں جو دس شعبہ جات میں منقسم ہیں جن میں سے ایک نہایت اہم شعبہ عیسوی دینیات کا بھی ہے۔ کہتے تھے کہ رومانیہ میں مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہے اور کئی اضلاع ایسے ہیں کہ ان میں مسلمان ہی مسلمان آباد ہیں۔ نیز پارلیمنٹ کے بعض ارکان بھی مسلمان ہیں۔ پروفیسر لاسیر نے ہندوستان کے معاملات میں نہایت دلچسپی لی اور جامعہ عثمانیہ کے حالات بہت دیر تک پوچھتے رہے۔ منجملہ دوسری باتوں کے وہی ایک سوال جو ہر جگہ مجھ سے پوچھا جاتا تھا یہاں بھی دریافت کیا گیا یعنی یہ کہ گاندھی جی کا طرز عمل کیا ہے اور نیشنل کانگریس آخر کیا چاہتی ہے۔ کھانے کے بعد سوئٹزرلینڈ کی چاروں سرکاری زبانوں یعنی جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور رومانش میں گاؤں والوں کے گانے ہوئے۔ جو چیز سوئٹزرلینڈ پہونچ کر ایک اجنبی کو خاص طور سے حیرت میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے بولنے والے، جو سوئٹزرلینڈ سے باہر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں، اس ملک میں شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ ملک کی آبادی صرف ۴۲ لاکھ ہے اس کے ہر سو باشندوں میں سے ۷۲ جرمن، ۲۰ فرانسیسی، ۶ اطالوی اور ایک رومانش زبان بولتا ہے۔ اکثر تو ایک ایک صوبے میں ایک ہی ایک زبان بولی جاتی ہے لیکن بعض کینٹن ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہے اور (St. Gallen) میں تو تین زبانیں یعنی جرمن، اطالوی اور رومانش سرکاری زبانیں ہیں اور تینوں میں تمام قوانین طبع کئے جاتے ہیں۔ کھانا رات کے بارہ بجے ختم ہوا۔

۳۱ اگست کو شعبہ "تاریخ ممالک بیرون یورپ" کا میں صدر تھا اور میرے معتمد پروفیسر ٹرپ (Tripp) (شپرنگ فیلڈ، امریکہ) تھے۔ میں نے افتتاح شعبہ کے وقت ایک تقریر کی اور اس میں ڈاکٹر ٹیمپرلے کا شکریہ ادا کیا کہ انہی کی کوشش سے کانگریس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چین اور ہندوستان کے مندوب آئے ہیں اور کانگریس کی حیثیت واقعی بین الاقوامی ہوگئی ہے۔ میری صدارت میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے۔

ڈاکٹر گھوشل: "کمبوج کی ایک مخصوص طرز تعمیر"

فادر ہیراس: "موہنجوداڑو اور منو تور کے افسانے پر روشنی"

ڈاکٹر ستیہ: "سلطنت ختن زیر سیادت گدھ"

ڈاکٹر اڈوانی: "سندھ کے میران تالپور کے زمانے کے تعزیری قوانین"

ان پر علاوہ مقالہ نویسوں کے حسب ذیل ارکان نے مباحثے میں حصہ لیا:۔

پروفیسر وارڈ (لاہور)، ڈاکٹر وڈمار (سوئٹزرلینڈ)، ڈاکٹر

لوئی ان Treumann (زیورخ) ڈاکٹر کروم Krom (لائیڈن) ڈاکٹر فابر Faber (وائنا) جلسے کے بعد ڈاکٹر ہوشی ننگ Hu-Shi سے ملاقات ہوئی جو کانگریس میں چین کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ پیکنگ کی جامعہ فوجن کے صدر ڈاکٹر چن یوان Dr Chen-guan (President of the Fu-yen Univer Pe) جو خود عیسائی ہیں، مسلمانوں اور چینیوں کے تعلقات کی تاریخ پر تحقیقات کر رہے ہیں جو شخص اسلام کی بابت کچھ معلوم کرنا چاہے وہ انھیں لکھ کر دریافت کرلے۔

۲ ستمبر کو صبح کے وقت ڈاکٹر ٹیمپرلی صدر کانگریس کا مقالہ "انگلستان اور ترکی آزادی کا عقیدہ از ۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۳ء" تھا۔ عمارت کا سب سے بڑا ہال (Auditorium maximum) بالکل بھرا ہوا تھا۔ تقریباً تین سو چار سو مندوبین ہوں گے۔ مقالہ پڑھے جانے کے بعد میں نے تقریر کی اور یاد دلایا کہ "خلافت" کے پیش پا افتادہ مسئلے سے انگلستان نے ہندوستان کے ۱۸۵۷ء کے واقعات کے دوران میں کس طرح کام نکالا اور سلطان سے فرمان حاصل کیا کہ مسلمانان ہند کو برطانیہ کے خلاف جنگ آزمانہ ہونا چاہیے۔ دوپہر کو برطانوی مندوبین نے ہندوستانی نمائندوں کو زیورخ کے مشہور ریستوران Zimmerleute میں لنچ دیا۔ دعوت نامہ پروفیسر پوسٹن (Posten) کے دستخطوں سے (جو پیٹر ہاؤس کیمبرج میں تاریخ کے لکچرار اور برطانوی مندوبین کے معتمد تھے) پروفیسر ویبسٹر (Webster) کی طرف سے تھا (جو جامعہ لندن کے پروفیسر اور برطانوی مندوبین کے صدر تھے)۔ مجھے اس لنچ پر مشہور آفاق مورخ G. P. Gooch کے پہلو میں جگہ

بٹھایا گیا تھا۔ آپ کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی ہے لیکن مستعد اور تگڑے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے ڈیڑھ گھنٹہ نہایت دلچسپ گفتگو رہی۔ اسلامی سیاسی فلسفہ، ہندوستانی سیاسیات، حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کی بابت تبادلۂ خیالات ہوا۔ گوچ صاحب انگلستان کے مشہور جریدہ (Contemporary Review) کے مدیر ہیں اور انگلستان کی زندگی میں ان کی ایک خاص حیثیت ہے۔ غرض یہ صحبت نہایت دلچسپ رہی۔

رات کے وقت جامعۂ زیورخ کے شعبہ طب کے صدر پروفیسر مایر برگ (Mayerburg) اور ان کی اہلیہ نے جملہ مندوبین کو اپنے عظیم الشان مکان موسومہ "جہاز" Schiff پر، جو زیورخ سے چھ سات میل کے فاصلہ پر جھیل کے کنارے واقع ہے، بلایا تھا۔ سب لوگ ایک خاص مقام پر جمع ہوئے اور وہاں سے نہایت آرام کی مخمل کے گدے دار کرسیوں والی بسوں میں چلے راستے میں جھیل کے چاروں طرف مختلف گاؤں کی برقی روشنی کی جگمگاہٹ بڑا ہی لطف دے رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان کیا تھا ایک نوادر خانہ تھا۔ پورا مکان تقریباً تین سو برس کا پرانا ہے اور بڑے ہال میں اس لئے بجلی نہیں لگائی گئی ہے کہ بجنسہ وہی حالت قایم رہے جو دو ڈھائی سو سال پیشتر تھی۔ اس کمرے میں اسباب بھی یا تو اسی زمانے کا ہے ورنہ اس زمانے کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ کرسیاں، میزوں، ارغن باجے، سقفی تصاویر، کھڑکیوں، فتیل سوزوں اور شمع دانوں، غرض ہر چیز پر تاریخی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے Goethe نے چند روز اس مکان میں قیام کیا تھا۔ پہلے دو سو سال پہلے کی موسیقی ہوئی، پھر بیسیوں قسم کے فواکہات، پیسٹری اور طرح طرح کی

اشیاء سے تواضع کی گئی۔ اس صحبت میں بہت سے علماء سے ملاقات ہوئی جن میں شاید سب سے ممتاز جامعۂ زیورخ کے رکٹر ڈاکٹر ہاولدطیہ Howald اور صوبہ بازل کے ناظم کا عذات سرکاری ڈاکٹر روٹ Roth تھے۔ باوجودیکہ اول الذکر ایک جلیل القدر عہدے پر فائز ہیں لیکن انتہا درجہ کے منکسر المزاج ہیں۔ ان سے تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو رہی انھیں میں نے اپنی جامعہ کے خصائص بتائے اور حیدرآباد کی ترقیوں کا ذکر کیا۔ دونوں صاحبوں سے جو گفتگو رہی اس سے حسب ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

(۱) سوئٹزرلینڈ میں (جس کی آبادی صرف ۴۰ لاکھ ہے) سات جامعات ہیں جس میں سے ہر ایک میں ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ تک طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ (۲) ہر جامعہ میں منجملہ دوسرے شعبوں کے ایک شعبہ دینیات بھی ہے جس میں اس مذہب کی تعلیم ہوتی ہے جو اس مخصوص کینٹن کے لوگوں کا مذہب ہوتا ہے اور جہاں دو مذہب رائج ہیں وہاں دونوں مذہبوں کی دینی تعلیم دی جاتی ہے (۳) جامعۂ بازل میں زیادہ تر طلبہ طب اور دینیات لیتے ہیں اس لئے کہ اس جامعہ نے ان مضامین میں اختصاص پیدا کیا ہے۔ (۴) اس سوال کا کہ سات جامعات سے ہزاروں فارغ التحصیل طلبہ آخر کیا کرتے ہیں؟ یہ جواب ملا کہ اول تو ان میں سے بہت سے دیہات میں کھپ جاتے ہیں اس لئے کہ سوئٹزرلینڈ میں شہری اور دیہاتی زندگی میں بہت کم فرق ہے اور طیلسانی گاؤں میں جاکر اپنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے؛ دوسرے بہت سے غیر ممالک میں جاکر اپنا نام پیدا کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ زیورخ جیسے دور افتادہ مقام پر بھی ہندوستانی تفرقوں کی ایک مختصر سی جھلک نظر آگئی۔ کئی روز پہلے یہ طے پایا تھا کہ ۴ ستمبر کو صبح نو بجے ہندوستانی مندوب جمع ہوکر تاریخ ہند کی مجوزہ (Bibliography) کے متعلق تبادلۂ خیالات کریں گے۔ پونے نو بجے میں نے وہائٹ ہیڈ (Whitehead I.C.S) وارڈ Ward (لاہور) سپیر Spear (دہلی) اور ویشپانڈے (ناگپور) سے مشورہ کیا اور کہا کہ مناسب ہے کہ ہم سب صدر کانگریس ڈاکٹر ٹیمپرلی کی تقریر میں جائیں اور مشورہ شام تک ملتوی کر دیا جائے۔ ہر شخص نے اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ وہ باقی ماندہ دو اراکین یعنی فادر ہیراس (بمبئی) اور گھوشل (کلکتہ) سے کہہ دیں گے۔ اور میں نے خاص طور پر اس پیام بری کی سپیر کو ہدایت کر دی۔ میں، وارڈ اور وہائٹ ہیڈ اطمینان سے ڈاکٹر ٹیمپرلی کی تقریر کو سنتے رہے۔ جب ہم ہال سے نکلے تو معلوم ہوا کہ گھوشل کے کہنے سے ہم تین کے علاوہ باقی مندوبوں نے کمیٹی کر لی اور روداد کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ Bibliography کے مقاصد کے لئے تاریخ ہند کی ایسی تقسیم کی گئی ہے کہ قدیم ہندوستان کی سرحیوں سے ایک صفحہ بھرا ہوا ہے، "اسلامی" عہد کے لئے چار سطریں اور عہد حالیہ کے لئے صرف ایک سطر کافی سمجھی گئی ہے۔ گویا کہ سب سے اہم عہد قدیم قرار دیا گیا تھا اور عہد وسطیٰ کی حیثیت محض ثانوی تصور کی گئی تھی۔ جب یہ روداد میرے دستخطوں کے لئے دی گئی تو میں نے اس پر سخت ترین احتجاج کیا اور کہا کہ اول تو تاریخ ہند کی "ہندو" "مسلم" اور "برطانوی" ادوار میں تقسیم بالکل خلاف اصول ہے۔ بلکہ تقسیم "قدیم" "وسطیٰ" اور "حالیہ" عہدوں میں ہونی چاہئے۔ جیسا حیدرآباد میں مدت سے ہوتا رہا ہے۔ دوسرے میں نے اصولی احتجاج کیا اور Spear سے کہا کہ آپ نے اپنے متعلق یہ کام لیا تھا کہ کمیٹی ملتوی کرا دیں اور آپ خود اس میں شریک ہوئے۔ اگر کمیٹی ملتوی نہیں ہوئی تھی تو ہم سے کہہ دیا جاتا۔ ہم ٹیمپرلی کے لکچر سے

چلے آتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ گھوشل نے کمیٹی ملتوی کرنے پر آمادگی نہیں ظاہر کی اور فادر ہیراس بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ میں نے صاف کہا کہ اگر تاریخ ہند کے تینوں ادوار کو کم از کم مساوی حیثیت نہ دی گئی تو میں کسی قسم کا تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بہرحال میری تحریک پر سوائے گھوشل اور فادر ہیراس کے سب تین بجے از سر نو جمع ہوئے۔ فادر ہیراس کو تو کہیں جانا تھا، گھوشل آئے نہیں۔ باقی وحاہٹ ہیڈ، سپیئر وارڈ اور ڈیشپانڈے نے میری صدارت میں تاریخ ہند کو از سر نو تقسیم کیا۔ سپیئر نہایت نادم تھے۔ بہرحال یہاں بھی خدا نے میرا ساتھ دیا۔

اگلے دن میں اس نمائش میں گیا جو ناظم صاحب ذخیرۂ کاغذات سرکاری نے مندوبین کانگریس کے لئے کی تھی۔ ہر اہم یا دلچسپ کاغذ نہایت سلیقے سے میز پر چسپاں تھا اور اس پر سیلولائڈ کا خول چڑھا دیا گیا تھا تاکہ انگلیوں کے نشان نہ لگیں۔ نمائش عجیب و غریب تھی اس میں سنہ ۱۸۰۰ء تک کے شہنشاہی فرامین موجود تھے۔ سب سے پہلا فرمان یکم جولائی سنہ ۸۱۵ء کا شہنشاہ لوئی اول کا تھا۔ پھر تقریباً ہر شہنشاہ کے فرامین، شاہان انگلستان اور شاہان فرانس کے خطوط، مختلف کینٹنوں کے باہمی اتحاد کے دستاویزات، سنہ ۱۲۹۱ء والا اوری Uri شوئیتز Schwyz اور زیورخ کے درمیان شہرۂ آفاق معاہدہ، لوتھر، کالوِن اور زونگلی وغیرہ کی تحریریں، غرض ایک بیش بہا ذخیرہ تھا جو نظروں کے سامنے آیا۔ اس کے بعد نائب ناظم صاحب خاص طور پر مجھے نیچے کے حصے میں زیورخ اور مختلف کینٹنوں کے قوانین اور فرامین کا ذخیرہ دکھانے لے گئے۔ ہر چیز اس قدر تہذیب و ترتیب سے رکھی تھی کہ گو سیکڑوں برس کے پرانے کاغذات رہیں لیکن ایک منٹ میں جو کاغذ چاہو نکال لو۔ یہ سب ذخیرہ بارہویں صدی کے ایک گرجا میں رکھا ہوا ہے جس کے اندرونی حصے میں کاغذات کے ذخیروں کے لئے پانچ منزلیں بنائی گئی ہیں۔ ایک کمرہ مطالعہ کے لئے مخصوص ہے تاکہ تاریخی تحقیقات کرنے والے ان کاغذات سے مستفید ہو سکیں۔

یہاں سے میں زیورخ کے ایوان مجالس (Rath-haus) دیکھنے گیا جہاں گویا زیورخ کی پارلیمنٹ نشست کرتی ہے۔ یہ عمارت نہایت نفیس ہے، اور اس میں مقامی وزارت، ایوان زیریں، ایوان بالائی وغیرہ کے کمرے دیکھے جو اعلیٰ پیمانے پر مزین ہیں پوری عمارت سنہ ۱۶۹۴ء کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے چینی کے آتش دان، اس کا فرش، اس کے ٹھوس اور بھاری دروازے جن پر نفیس کام کئے ہوئے قبضے لگے ہوئے ہیں، یہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شام کی نشست میں میں نے "سلطان صلاح الدین ایوبی پر امیر شکیب ارسلان کا مقالہ سنا۔ ساڑھے پانچ بجے کانگریس کا جلسہ عام تھا جس میں ڈاکٹر لیری تئے (Lhéritier) (پیرس) ڈاکٹر نابہولتز Nabholz (زیورخ) اور ڈاکٹر ٹیمپرلے نے تقریریں کیں۔ اس کے بعد آئندہ صدر پروفیسر لیلینڈ Leland (امریکہ) کی کرسی نشینی ہوئی اور انھوں نے فرانسیسی زبان میں ایک مختصر سی تقریر کی۔

۴ ستمبر کو ساڑھے نو بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک تاریخی علوم کی بین الاقوامی کمیٹی (Internatio-nal Committee of Historical Society) کا جلسہ تھا جس میں ہندوستان کی طرف سے میرا انتخاب ہوا ہے تمام ماموریوں کی روداد یں پڑھی گئیں اور منظور ہوئیں۔ جو قرار داد میں نے مشرق اقصیٰ کے ماموریے میں

منظور کرائی تھی وہ بھی پاس کی گئی۔ میں نے کمیٹی کے سامنے بیان کیا کہ اس ہفتے میں ہندوستانی ہندولوں کی دو مجلسیں تاریخ ہند کو مختلف ادوار میں منقسم کرنے کے لئے ہوئی ہیں اور یہ سب مسئلہ (Indian Historical Association) کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

شام کے وقت زیورخ کا عظیم الشان نوادرخانہ دیکھنے گیا۔ اس نوادرخانے میں ۸۰ کمرے ہیں۔ جن میں سے مشکل سے ۳۵ کمرے چار گھنٹے میں دیکھ سکا۔ میں اس سے پہلے بیان کرچکا ہوں کہ سوئٹسان کے اکثر گرجاؤں میں نہ بت ہیں نہ تصویریں اور میں سوچا کرتا تھا کہ آخر رومن کیتھولک زمانے کی تصویریں اور مجسمے کہاں چلے گئے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سب یہاں زیورخ کے نوادرخانے میں رکھ دئے گئے ہیں۔ بعض اشیاء ایسی تھیں جن پر مشرق اور اسلامی تمدن کا اثر صاف نظر آتا تھا، جیسے بالکل عربی وضع کے آفتابے، سلفچیاں، رحلیں، وغیرہ، اور اس بھولے ہوئے عہد کی یاد تازہ ہوتی تھی جب تمام سوئٹسان پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور یہ اثرات ایسے دیرپا تھے کہ حکومت چلے جانے کے صدیوں بعد بھی عیسائی سوئٹسان پر قائم رہے۔

۵ ستمبر کو میں نے کانگریس کے نئے صدر پروفیسر لیلینڈ، مس میک لاغلن اور فادر ہیرس کو اس جلسے کی روداد روانہ کی جس میں میری تحریک پر تاریخ ہند عہد وسطیٰ اور عہد حالیہ کی تقسیم (Bibliography) کے اغراض سے کی گئی تھی۔

اس دن یہاں کا سب سے بڑا گرجا (Gross-munster) دیکھا جس کے بعض حصے بارہویں اور تیرہویں صدی کے بنے ہوئے ہیں اور جس کے سامنے کھڑے ہو کر مشہور عیسائی مصلح زونگلی نے تثلیث کے بجائے اعلائے کلمۂ توحید کیا تھا۔ ۹ ستمبر کو ہم زیورخ سے جنیوا روانہ ہو گئے۔

ہارون خاں شروانی

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں، اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنوں کا تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت (عہ/) سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

پریت نامہ

ایک قدیم کتاب میر عبدالغنی تخلص غنی کی منظوم تصنیف میرے پاس ہے جس کا نام پریت نامہ ہے۔ کاغذ، سیاہی، سرخی اور سب سے بڑھ کر خطِ نسخ کی تحریر اور زبان کے اعتبار سے اس کو ایک قدیم تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ خوش خط لکھی گئی ہے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس زمانہ کی تصنیف ہے مصنف کہاں کے باشندے تھے۔ کتاب کے آخر کتابت کا سنہ ہی نہیں لکھا گیا البتہ یہ عبارت درج ہے "تمت تمام شد پریت نامہ تصنیف میر عبدالغنی۔ دوہرہ چہل۔ ابیات دو صد و چہل"۔

یہ نظم بطور ترجیع بند کے ہے۔ چند ابیات کے بعد ایک دوہرہ ہے۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر بند کا آغاز سلسلہ وار حروفِ تہجی سے ہوا ہے۔ کتاب کرم خوردہ تھی کسی نے اطراف حاشیہ پر کاغذ جوڑ کر کتابی صورت میں درست کیا۔ قدیم زبان کے خواہشمندوں کی خاطر ذیل میں نمونتاً چند ابیات لکھے جاتے ہیں۔

(الف)

اللہ باج اور نا نہیں کوئی　　سانچا ساجن سائیں ووئی
الا اللہ لاشریک وہی ہے　　رب وہ سب کا پاک سہی ہے
قدرت اس کی بڑی عظیم ہے　　سب کے دل کا وہی علیم ہے
اُس کا حکم ہے سب پر قادر　　اس کی پریت ہے سب میں نادر
ثنا صفت سب اس کوں سوہے　　اس کے حکم سب کچھ ہووے
ایک پیا اللہ کوں چھاجے　　صفت ثنا سب اس میں کاجے
نیکی جس کوں بخشے وو ہی　　کرم کرے جس پاوے سوہی
سب کا وہی ہے سرجن ہارا　　دل کا کفر جو توڑے سارا
ثنا اس کی کرنے خاطر　　نور ظہور میں کیتا حاضر

ظاہر ناؤں محمد لیتا　　ایک پیا تب ثابت کیتا
دین نبی کا ڈنکا باجیا　　کفر جو سب ہے دل کا بھاجا
اصحاب کبار مشہور ہیں سارے　　نور نبی سوں ناہیں نیارے
نور نبی کا علی ہے پیارا　　قتل کفر کا کرنے ہارا
نبیم ولایت ایک ہی جانو　　علی ولی سوں ہے کر مانو
نبی علی کوں جو کوئی بوجھے　　نبیم ولایت اس کو سوجھے
بیان پریت کا کر ہر ٹھاؤں　　پریت نام رکھیا ناؤں

(دوہرہ)

ظاہر کیتا آپ کوں وہ پریت سنک ہوئے
کر کر لنکا آپنا اور بھٹکا ہو کر جوئے

پہلا بند سولہ بیت کا ہے دوسرا بند نو بیت کا ہے اس کے بعد کسی بند کے چھ کسی کے سات اور کسی کے نو ابیات ہیں سب سے آخر کا بند پانچ بیت کا ہے۔ قدیم اردو میں فارسی عربی الفاظ جس طرح روزمرہ بولے جاتے اسی طرح ان کو نظم کیا جاتا تھا۔ لغت کے لحاظ سے تلفظ، کے صحت کی طرف بہت کم توجہ ہوتی تھی۔ اس نظم میں بھی ایک ہی لفظ کو کہیں از روئے لغت صحیح لکھا گیا اور کہیں روزمرہ تلفظ کے موافق نظم کیا گیا مثلاً حکم کا لفظ کہیں بضمتین اور کہیں بضم اول وسکون ثانی استعمال کیا گیا۔ لفظ "وہی" جو دراصل "ووہی" کا مخفف ہے بعض شعر میں "ووہی" اور بعض میں "وہی نظم ہوا۔ ممکن ہے کہ عدم واقفیت معنے کی وجہ مجھ سے کہیں کہیں یائے معروف و مجہول کے لکھنے میں غلطی ہوئی ہو کیونکہ اصل تحریر میں اس کا لحاظ نہیں ہے اور یہ اغلبا زمانہ مابعد کی ایجاد ہے۔

(ب)

بڑھا پریت میں اپنا ناؤں　　دہرا ہے کئی کئی ہر ٹھاؤں
اول نور جو کیتا ظاہر　　اس کا ناؤں رکھیا ظاہر

ظاہر پاک محمدؐ ناؤں	نور اسی کا ہے ہر ٹھاؤں
محمدؐ ناؤں سو اپنا لیتا	اس سوں خلقت پیدا کیتا
اس کی پریت ہر سب میں دیکھو	بھیں خلقت مانہیں پیکھو
اپنا آپیں کھیل بنایا	پریت میں اپنا میل جنایا
بنا عناصر پتلا کریا	روح اپس کی اس میں بھریا
کیا حکم وہ اس پر جاری	پریت بڑھا کر دیتا یاری
وہی حکم ہے وہی بڑہائی	نیکی کرلے نہ کر برائی

(دوہرہ)

ہر گھٹ آپیں آپ ہی اور گھٹ گھٹ پیم لگائے
پرگھٹ کیتا آپ کوں وہ قدرت آپ جگائے

(ت)

تحقیق اللہ بوجھو دل میں	بوجھیں وہی کہ بوجھ ہے جن میں
بوجھ جو پاوے سوہی بوجھے	اس کے من میں وہی سوجھے
تن میں من میں دل میں سوہی	سب جا دیکھو سوہی ہے وہی
پریت بھری ہے سب میں ظاہر	نور دہی ہے جگ میں ظاہر
پریت جس کے من میں سوجھے	پیو اپس کا وہی بوجھے
میرا پیو ہے جگ کا میتا	جگ میں پریت اپنی دیتا
پریت پیو کی سب میں میٹھی	پریت وہی سب جگ میں ڈیٹھی

(دوہرہ)

جت دیکھو تت پریت سوں وہ کیتا اپنا ناؤں
ظاہر پرگھٹ ہوے رہا ہے سب ہی ٹھاؤں ٹھاؤں

(ی)

یہا حرف ہیں سب ہی جانو	سب میں بھری پریت پہچانو

حرف حرف میں پریت بھری ہے	مورت ہوکر پریت کھڑی ہے
جت ہیں دیکھو تت ہیں مورت	ہوکر اکڑ ہی بگڑی صورت
صورت وہی ہے مورت اوہی	دیکھیں وے جس پریت ہے سوہی
پریت پیو کی دل میں دھریے	نس دن سمرن پیو کی کریے
سونا جاگے پیو کوں بھاوے	پیو اسی کن دوڑیا آوے

(دوہرہ)

مورت بوجھو آرسی جو پریت مانجی جائے
دیکھے پیو کوں وے سکھی جو پریت سانچی جائے

(دوہرہ)

ایک حرف ہے پیم کا جو صفت میں دیکھے سوئے
نبی علی کی پیم سوں دے اپنے بنیے جوئے

دنیا میں جو کرے بڑائی	اپنے حق میں کرے برائی
دنیا نہیں ہے آخر رہتی	نس دن ندی تیرہ ہوی بہتی
غفلت میں جو غفل بڑھاوے	سیانا ہوکر برا کہاوے
سیاں پینے میں نس دن جاگے	پیو بن نیند سو کیوں کر لاگے
کہاوے آپس آپ سیانا	غنی کہے وے کھرا ایانا

(دوہرہ)

لاگی جن کے پیم کی سو سلگے ہردے ساتھ
سلگ اوٹھے جو پیم سوں اور گھٹے ہی پیم نہ ناتھ

محمد کریم الدین خاں
(قاضی پیٹھ)

نذرِ دکن ——— حسد کی آگ میں

یہاں کسی کو کسی سے روشناس کرنے کی ضرورت نہیں کہ کس نے لکھا ——— اور کیا لکھا۔ اور یہ کس مضمون کا جواب ہے کیونکہ اس سلسلہ کو کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔

تو ہاں ——— عرصہ دراز سے ہمارے گوش گزار کیا جا رہا تھا کہ نذرِ دکن پر کسی محترم ادیب نے ایک بڑی زبردست تنقید لکھی ہے ——— ایک دہکتی ہوئی آگ سے معمور تنقید ——— اس کو منگوا کر ضرور پڑھو ——— مگر ہم نے اس کو سرے سے بے مصرف سی چیز سمجھ لی تھی۔ کیونکہ مہذب الفاظ میں وہ صرف گالیاں ہی تو ہوں گی۔ اور جلے پھپھولے۔ جس کا مداوا ہمارے بس میں نہیں۔

پہلے پہلے تو یہ آگ ——— یہ خصومت و حسد کی ملی جلی چنگاریاں کتنبہ کے ایک گوشہ میں دبی رہیں۔ بارہا دل میں خیال آیا کہ وہاں پر ایک آتش فرد انجن بھیج کر اس کو نارِ خلیل میں تحلیل کر دیا جائے۔ لیکن راکھ کے ڈھیر میں پانی کا اثر بھی کہاں ہوتا ——— ہم کو تو ان شعلوں سے کھیلنا تھا، آگ کے سرد پڑ جانے میں وہ شمر بت کہاں جو اس کے بھڑک اٹھنے میں ہے۔ بعض وقت قلم کو جذبات کا ترجمان بنانا بھی کتنی خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ واقعی یہ آگ کی فلاسفی ایک غور کرنے کی چیز ہے۔ اس کی نوعیت کا عقدہ کھل جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوہِ طور نہ جلتا، موسیٰ بے ہوش نہ ہوتے تو آج دنیا سرمہ سے محروم رہ جاتی۔ جل اٹھنا بہت امید افزا پہلو ہے۔ اور جو اس جلتی ہوئی چیز کو دور سے کھڑے ہوئے دیکھتے ہیں ——— ان کی آنکھوں کو تو صرف تماشہ سے غرض ہے۔

پہلی بوالعجبی تو یہ کہ انجمن ترقیٔ اردو کا ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والا رسالہ اور اس مضمون کی ابتدا ایک ہندی دوہے سے ——— ہاں اب اس کو کیا کہوں ؎

اوروں کی بری بات تو بھاتی نہیں ان کو
پر اپنی برائی نظر آتی نہیں ان کو

خیر ——— یہاں تک تو بدنما سی بری نہ تھی ——— اور نہ اتنی خطرناک ——— لیکن اب آگے بڑھیئے ——— دیکھنا یہ ہے کہ حملہ کرنے والے کے پاس کچھ مدافعت کا ساماں بھی ہے یا نہیں۔ گو ہم کو ان کی ادبی شخصیت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اصلاح کا بیڑا وہی اٹھاتا ہے جو واقعی اتنی قوت رکھتا ہو۔ جو ایک زبردست عالم و ادیب ہو۔ شبلی جیسے مورخ و ادیب کی آزاد نے غلطیاں درست کیں۔ آج آزاد کی ایک دنیا معترض ہے۔ غالب کو جب لوگ سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں تو اس پر مشکل پسند ہونے کا الزام تھوپ دیتے ہیں۔ میر کی سادگی پر پھبتیاں ہیں۔ تو پھر آپ ہم کس گنتی میں ——— ارے آپ کیوں ——— یہ تو ہم ہیں جن کی کچھ وقعت و بساط نہیں۔

کتاب تو اس میں شک نہیں ——— سراپا عیب ہے۔ اور عیب بیں نظروں کے لئے تو اس کا ایک ایک لفظ قابل ملامت ——— اس کے لکھنے والے سب لائق گردن زدنی۔ اور یوں بھی ہم کتنے پانی میں ہیں یہ آپ جانتے ہیں۔ ہم اپنی اپنی غلطیوں کو خود آپ ہی آپ محسوس کرتے رہ جاتے، مگر قلم ایک دشمنِ ادب کے ہاتھوں میں پہنچنے کے لئے مچل رہا تھا۔

چلئے ہماری یہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔ ہمارے حقیقی جوہر اب کھلنے لگے۔ آج تک نذر دکن کی اتنی شہرت نہ ہوئی تھی جتنی اب ہوگئی ہے — آپ نے کام تو خوب کیا — اس سلسلہ میں آپ کی بھی شہرت ہوگئی — لیجئے مبارک۔

خوشامد ایک مکروہ فعل ہے اور اس کا قبول کرنا انتہائی اخلاقی کمزوری — لیکن کسی کتاب پر تنقید لکھتے وقت حوصلہ افزائی سے کام لینا پڑتا ہے۔ غالباً آپ کو کبھی کسی وقت تمہید لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ورنہ یہ میرا ایمان ہے کہ کوئی کتاب بھی معرض وجود میں نہ آتی — کتاب میں کوئی عیب ہو تو تمہید لکھتے وقت اس کو دانستہ نظر انداز تو نہیں کیا جاتا۔ لیکن تنقید و تمہید کے وقت ہاتھ میں قلم ہوتا ہے تلوار نہیں ہوتی۔

اور یوں تو کوئی ذی روح بھی عیب سے خالی نہیں۔

خیر سے یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ آپ سراپا ہنر ہیں — افلاطون تو آپ ہیں نہیں — حالانکہ اس کا بھی مقولہ تھا۔ "سب کچھ جاننے پر بھی میں کچھ نہیں جانتا"۔ اور پھر طرفہ یہ کہ صحافت کی دنیا میں جب کبھی آپ نکلے ہیں تو حجاب کا پردہ لئے ہوئے نہ جانے اس کا سبب کیا ہے۔ کیوں کھلے بندوں تشریف لانے سے آپ گھبراتے ہیں۔ یہ میدانِ جنگ بھی نہیں میدان صحافت ہے، ادب کی جولانگاہ میں قدم رکھنا بھی تو ڈرتے ڈرتے؟ واقعی — آپ کی اس فطری کمزوری کا ہمیں بہت احساس ہے۔ کاش اس ضمن میں ہم آپ کی کچھ مدد کر سکتے! مگر — یہ "کاش" کی بھی ایک نرالی شخصیت ہے۔ خیر ان ماضی تمنائی کی گتھیوں کو تو رہنے بھی دیجئے۔

ہم مانتے ہیں۔ ہم کو کب انکار ہے اس نظریہ سے، کہ دشمن یا حاسد کا وجود کسی قسم کی بھی اصلاح کے لئے کتنا ضروری ہے۔ آپ کی اس مخلصانہ مذمت اور پُر خلوص گالیوں کا ہمارے پاس جواب ہی کیا ہے، ہمیں تو جتنی دعائیں یاد تھیں ہم نے اسی دربان کو دیدیں جس نے آپ کے مضمون کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ ہم سب سچے دل سے آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ حقیقت میں آپ کا وجود نہ صرف نعمت، بلکہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہم بعض وقت تو یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اگر آج آپ نہ ہوتے تو ہم کہاں جاتے۔ ہمارا تو کہیں ٹھکانا نہ بھی نہ ہوتا۔ لیکن آپ کی یہ ہمت شکن، حوصلہ کو پست کر دینے والی ہدایتیں، آپ کی تنگیٔ نظر الٹے اور امنگوں کو بھڑکا رہی ہے۔ ہر ناکامی کے بعد حوصلہ بڑھتا جاتا ہے سب کچھ لکھنے، سننے اور بولنے پر بھی قلم تشنہ ہے کہ؎

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اب رہا یہ کہ تعریف بدل ہوتی ہے، یا جس کی تعریف ہوتی ہو اس کی یہ تمنا بھی رہتی ہے کہ آج تم ہماری تعریف کر دو کل ہم تم کو اس کا معاوضہ دیدیں گے — خوب مگر آپ کب اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں؟ آ تو چکے ہیں آپ بھی اس سنسار میں۔ وہ دن دور نہیں کہ لوگ آپ کی بھی تعریفوں کے پل باندھیں۔ مگر تعریفوں سے خاندان نہیں پلتے — اس کا اطمینان رکھئے۔

ہمیں اس کا کب اعتراف نہیں ہے کہ ہمیں بقول آپکے، ادب کی دہلیز پر برسوں جبیں سائی کرنی پڑے گی۔ ہمیں عمر نوح و خضر جو ملی ہے مگر تب بھی ہم ناقص العقل کہاں اس انتہا کو پہنچ سکتے ہیں جہاں آپ ہیں۔ مگر ہم اتنی بلندی پر پہنچنا بھی نہیں چاہتے جہاں سے گر جانے کا اندیشہ لگا ہوا ہو۔

لیکن ــــ شاید اس کو تسلیم کرنے سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ کوئی مصور ایکدم پہلی ہی مرتبہ تو اپنا شہ کار پیش کرنے سے رہا۔ اور نہ کوئی کاریگر اپنی پہلی ہی صنعت پر آپ سے داد تحسین حاصل کرسکتا ہے۔ طفل کتب تو سب ہی رہتے ہیں۔ حسن و قبح کی تمیز کیسے ہوگی جب تک کوئی چیز معرض وجود ہی میں نہ آئے۔ مگر ــــ کہاں آپ کی قابلیت کا مقابلہ ــــ اور ہم لوگ جن کی زبان بھی درست نہیں ــــ جن کو بات بھی کرنے کا سلیقہ نہیں ــــ لیکن ایک سوال ہے آپ سے ــــ اگر اس کا جواب بن پڑے تو دیجئے ــــ تعریف کہاں نہیں ہوتی۔ کس کی نہیں ہوتی ــــ یہ صرف بچارے "دکن" میں رہنے بسنے والوں کی تعریف سے آپ کیوں اتنے گریزاں ہیں؟ اور محض اسی کی ادبی خدمات سے آپ کو کیوں خدا واسطے کی دشمنی ہوگئی ہے؟ میری سمجھ میں تو بس ایک ہی بات آتی ہے ــــ اور میری سمجھ ہی کتنی ــــ یعنی یہ کہ "اس کے نمک کی تاثیر" آپ کیا کریں گے ــــ آپ مجبور ہیں ــــ یہ بدنصیبی تو اس کا پیدائشی حق ہے۔ غالباً ہندوستان کی وسعتوں میں آئے دن شائع ہونے والی کتابوں میں کبھی کسی کی تعریف و توصیف نہیں ہوتی ــــ ہند و بیرون ہند کے رسائل آپ نے کبھی دیکھے نہیں شاید۔ جو اپنی ہی آپ تعریفوں سے سپٹے پڑے ہیں ــــ جب کسی کی تعریف کرنا بدعت ہے اور ایسا ہی ادبی کفر تو نہ جانے پھر "چند ہمعصر" لکھنے کا مفہوم کیا تھا۔ تعریف بدل جو ہوتی ہے، اس خطرہ کی گھنٹی سے سب کو آگاہ ہوجانا چاہیئے تھا ــــ

ہم تو اب تک یہ سمجھے تھے کہ انجمن ترقی اردو نے اردو کی ترویج میں بڑے ہی حوصلہ سے کام لیا ہے۔ اور اس کے سیر حاصل کارنامے دنیائے ادب میں جنس کی کوئی تخصیص نہیں رکھتے۔ مگر اب اس کی تنگ نظری دیکھ کر ندامت ہوتی ہے۔ کہ نام بڑا اور درشن اتنے چھوٹے کہ نسوانی لٹریچر کا فروغ بھی دیکھنے کی اس میں تاب نہیں۔

آپ کی ذات سے تو ہم کو دلچسپی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی ادبی ہمدردی بھی ہوگئی ہے ــــ گو ہم کو ادب سے دور کا بھی تعلق نہیں ــــ افسوس ہوتا ہے واقعی یہ دیکھ کر کہ دنیا اتنے قابل ادیب کو اب تک کیسے بھول گئی تھی ــــ مگر آپ نہیں جانتے ــــ دنیا میں قدر شناس بہت کم ہیں۔ کہاں آپ کی بلند پایہ نامہ نگاری ــــ کہاں وہ ہندی کے زبردست ترجمے ــــ تشبیہ اور استعاروں ہنگاموں سے مملو و مرصع عبارت اور کہاں ہم جیسے حشرات الارض ــــ برابری کا دعویٰ ہوتا تو ہم کچھ کہتے بھی۔ آسمان ادب کے درخشندہ ستاروں کا ذروں سے بھلا کیا مقابلہ ــــ جو چمکنے میں بھی آسمانی ضیا پاشیوں کے محتاج ہوں ــــ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ ہر ذرہ کو آپ اپنی طرح آفتاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی ڈاکٹری کو ہم کیا ــــ ایک دنیا مانتی ہے۔ لیکن آپ تو بڑے ماہر عمرانیات ــــ ماہر طب بھی نہیں ــــ کہ ہم یہ کہہ کر صبر کریں۔ کہ "بھئی کیا کریں انھیں تو ہر جگہ کیڑے ہی نظر آتے ہیں" ــــ لیکن اب یہ عقدہ کھلا کہ فقط ڈاکٹری کا جراثیم سے گہرا تعلق ہے۔ اور ان کی جدائی گوشت سے ناخن کی جدائی سے کسی طرح کم نہیں۔

اس کتاب کی نکاسی کو بند کردینے کی نسائی التجا اور غالباً ــــ دل ہی دل میں یہ بددعا کہ ــــ

نذرِ دکن میں تو کیڑے پڑے ہیں لیکن حسد اچھا نہیں ہوتا۔ حاسد کی تنگ نظری تو مشہور ہے — مگر واقعی اس سے خوشی بھی ہوتی ہے کہ نذرِ دکن ایک ذریعہ بن گئی آپ کی ہر دلعزیزی اور شہرت کا — "کھاد" بنانے والے کو اس نے سروِ چراغاں بنا دیا۔

(باقی آیندہ)

جہاں بانو بیگم

غزل

عمرِ فانی کو حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں
تھی وہ مشتِ خاک جس کو اک جہاں سمجھا تھا میں

اب کھلا محرومیٔ جاوید ہے تقدیرِ عشق
ہر شکستِ آرزو کو امتحاں سمجھا تھا میں

چار تنکے تھے نشیمن کے گرا اے ہم صفیر
وائے نادانی انھیں اپنا جہاں سمجھا تھا میں

اپنے ہی ذوقِ نظر کا کھیل تھی بزمِ حیات
اُف رے نافہمی کہ اس کو جاوداں سمجھا تھا میں

ہم صفیرو کچھ نہ پوچھو ذوقِ بربادی مرا
کوندتی بجلی کو اپنا پاسباں سمجھا تھا میں

لا سکا وہ بھی نہ شامِ ہجر تابِ ضبطِ غم
ایک دل تھا جس کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

حسنِ بے پروا سے تھی مجھ کو امیدِ التفات
برق کو خرمن کا اپنے پاسباں سمجھا تھا میں

اُن کی بزمِ ناز میں بھی دل کی دل میں رہ گئی
گرچہ ہر اشکِ چکیدہ کو زباں سمجھا تھا میں

اپنی ہی امواجِ ہستی کا مسلسل عکس تھا
اے ظفر اب تک جسے اپنا جہاں سمجھا تھا میں

محمد مظفر الدین ظفر (عثمانیہ)

نفسی تحقیقات

آج سے کوئی پندرہ سال قبل ایک پروفیسر طبعیات مسلم یونیورسٹی نے سائنٹفک سوسائٹی کے ایک علمی جلسہ میں مندرجہ بالا عنوان سے تقریر کی تھی۔ قبل اس کے کہ اصل مضمون حوالہ قلم کیا جائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جلسہ کے ماحول اور حاضرین کی ذہنی کیفیت کا کچھ ذکر کیا جائے۔

اس جلسہ کے متعلق جو اعلان کیا گیا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ پروفیسر صاحب "نفسی تحقیقات اور موجودہ روحانی میلان" کے عنوان سے تقریر فرمائیں گے، جس کے اختتام پر ایک کہنہ مشق پروفیسر طلسمات روحانی قوت کا اظہار کریں گے بالخصوص ان کی دو حیرت انگیز چیزیں ایک تو روپے کا معلق رقص اور دوسرے پوشیدہ اشیاء کو انتقال فکر سے پہچاننا، ایسی ہیں جو طبعی قوتوں کے علاوہ کسی اور پوشیدہ قوت کے وجود کا ثبوت دے رہی ہیں، اگر کوئی صاحب طبعی نقطۂ نظر سے ان کی صراحت فرمائیں تو اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس اعلان میں ایک خاص کشش تھی اس لئے وقتِ مقررہ سے پیشتر ہی طبعیات کا لکچر ہال حاضرین سے اپنی انتہائی گنجائش تک پر ہو گیا تھا۔ وقتِ مقررہ پر پروفیسر صاحب نے اپنی دلچسپ تقریر کا آغاز روح کے ایک دائمی اور غیر فانی مسئلہ سے کیا، انھوں نے اس کی صراحت کی کہ اقلیم مذہب میں روح ایک ناقابلِ حل معمہ ہے، قرآن پاک میں بھی اس کی طرف نہایت مختصر اور بلیغ اشارہ "قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" کی آیت سے کیا گیا ہے لیکن یہ ٹھیک طور پر نہیں معلوم کہ اس امر کا مطلب کیا ہے۔

پروفیسر موصوف نے پھر اس بات کے سمجھانے کی کوشش کی کہ شعورِ انا اور نیم شعورِ انا کا باہمی تعلق کیا ہے، دماغ کے تمام دھندلے تاثرات اس نیم شعور کے بحرِ بیکراں میں غرقاب رہتے ہیں حتیٰ کہ اُن مخصوص مظاہر کے آنکھوں سے اوجھل اور طاقِ نسیاں کے حوالہ ہونے کے باوجود بھی جب کبھی وہ ایک متماثل واقعہ یا خیال سے متعلق ہو جاتی ہیں تو فوراً دھندلی سی روشنی میں آجاتے ہیں

انتقالِ فکر کی تشریح ذیل کی تمثیل سے ہو سکتی ہے، حیات نسلِ انسانی یعنی انسان کے شعوری اور نیم شعوری اعمال ایک ایسے وسیع سمندر سے مربوط کئے جا سکتے ہیں جس میں شعور کو چند علحدہ سطحِ سمندر سے اُبھرے ہوئے جزائر سے اور نیم شعور زندگی کو سمندر کے مسلسل ساحل سے دکھایا جائے، اسی طرح مختلف اشخاص اگرچہ اپنے شعوری وظائف میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی نیم شعوری حیثیت میں ایک دوسرے سے باہم منسلک ہوتے ہیں، اس لئے نیم شعوری کیفیت کو خاص طور پر ترتیب دینے سے ایک شخص سے دوسرے شخص تک بغیر کسی طبعیٔ وسیلہ کے انتقالِ فکر کا امکان ہے۔

روح کا محققانہ مطالعہ حال ہی سے شروع ہوا ہے، برطانیہ عظمیٰ کی سائیکیکل ریسرچ سوسائٹی نہایت حیرت انگیز کام کرتی رہی ہے، اس نے روحوں اور محیر العقول ظواہر کے متعلق بہت سے مشاہدے کئے ہیں، اس سوسائٹی کی کارگزاریوں کی ضخیم جلدیں نہایت اہم ریکارڈ ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اس قدر فرصت کہاں کہ وہ ان کے مطالعہ کے لئے

وقت نکالے، اس لئے ذیل کی چھ مختصر اور قابل مطالعہ کتابوں کے دیکھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

۱۔ سائکیکل ریسرچ۔ مصنفہ ڈبلیو۔ ایف۔ بیرٹ، ایف، آر، ایس۔ یہ ایک بہترین چھوٹی کتاب ہے جس کو ہوم یونیورسٹی سوسائٹی نے شایع کیا ہے، اس کتاب میں اس سوسائٹی کی نفسی تحقیقات کے نتائج کا خلاصہ دیا گیا ہے، بالخصوص اس کے دو باب (۱) بغیر آنکھوں کے دیکھنا (۲) روحانیات کے طبعی ظواہر، ہراُس شخص کو پڑھنی چاہئیں جو روح کے مسئلہ کو سمجھنے اور حل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو

۲۔ ریمنڈ، یا حیات و ممات مصنفہ سر آلیور لاج ایف، ایس۔ یہ کتاب اس قابل شخص کی تصنیف ہے جو ایک شہرہ آفاق اور تجربہ کار سائنس داں ہے، اس کے عزیز ترین فرزند ریمنڈ لاج کی موت پر لکھی گئی ہے، اس کتاب میں موت کے بعد "یاد" اور "محبت" کی بقا کی تائید میں تعجب خیز مثالیں ملتی ہیں۔

۳۔ انسانی شخصیت اور جسمانی موت کے بعد اس کی بقا، مصنفہ ڈبلیو۔ ایچ۔ مَیرس، مصنف موصوف سوسائٹی مذکورۂ بالا کا صدر رہ چکا ہے۔ یہ کتاب نفسی تحقیقات کے متعلق مستند سمجھی جاتی ہے۔

۴۔ عالم راز، مصنفہ کونن ڈائیل، یہ وہی مصنف ہے جس نے شرلاک ہوم جیسا لافانی ناول لکھ کر عالمگیر شہرت حاصل کی ہے، سر ڈائیل اپنے آخری وقت میں روحانیات کا معتقد ہوا، اس کے عزیز ہیرو شرلاک کے زبردست مادہ پرست ہونے کے باوصف مصنف موصوف کے عقاید کا ایک دم پلٹا کھانا ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ اس ناول میں اس نے نہایت پُراثر طریقہ سے دہم پرست مشہور سائنس داں پروفیسر چالنجر کے کیرکٹر کا خاکہ کھینچا ہے جو ابتدا میں ایک دہریہ تھا لیکن بالآخر روحانیت کو اس کی ناقابل تردید شہادت کی وجہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۵۔ سائنس کی سات بیہودگیاں، مصنفہ جان فِم اس میں ایک اور بیہودگی یعنی روحوں اور بھوتوں کی فوٹوگرافی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ سر کونن ڈائیل اس عقیدہ کا زبردست مؤید ہے، لیکن ابھی یہ ایک راز سربستہ ہے

۶۔ رالف۔ یہ سنہ ۲۶۶۰ء کا ایک قصہ ہے جس کو ہیوگو جرنس بیاک ایف، آر، ایس نے لکھا ہے، اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آج جو ناممکنات ہیں وہ ممکن ہے کہ کل ایک معمولی اور روزمرہ کی چیز ہو جائے۔ دنیا کے موجودہ حالات کا مطالعہ نہایت عمیق نظر سے کر کے مصنف نے سات صدیوں کے بعد ہونے والے واقعات کی حکیمانہ طریقہ سے پیشین گوئی کی ہے۔ لیکن یہ محض زمانۂ آئندہ کی خیالی تصویر نہیں بلکہ یہ سائنٹیفک قیاس ایک منظر ہے آج سے ۷۰۰ سال بعد کی دنیا کا، جو اس سائنس داں کے معلومات حاضرہ کے ظل کو ظاہر کرتا ہے۔ سائنس کی ترقی ایک اسراع کے ساتھ ہو رہی ہے، اگر یہی رفتار باقی رہی تو یہ فرض کرنا واجبی ہوگا کہ جن چیزوں پر آج نقاب پڑا ہوا ہے وہ کل بے نقاب ہو جائیں گی اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ سائنس کا قانون ترقی یہی ہے، پچھلے زمانے کے معمے موجودہ زمانہ کی روزمرہ گفتگو ہے اس لئے یہ بالکل ناممکن نہیں کہ روح اور زندگی کا معمہ چند صدیوں کے بعد نہایت واضح اور صاف ہو جائے۔

اس کے بعد صاحب موصوف نے حاضرین کی توجہ

اس امر کی طرف منعطف کرائی کہ وہ خود بھی اس دلچسپ راز کی تحقیق کریں، بھوتوں اور محیر العقول واقعات کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائیں، اس قسم کے مشتبہ مقامات پر خود جائیں اور لوگوں سے نہایت آزادی کے ساتھ اس بحث میں تبادلۂ خیالات کریں، وہ تمام اہم تاریخی روایتیں جن میں روحانی قوتوں کا تذکرہ ہو ایک جگہ جمع کریں۔ جوگیوں صوفیوں اور ولیوں کے حیرت انگیز واقعات نہایت حزم و احتیاط اور غور و خوض سے جمع کئے جائیں اس طرح ہم آنے والی نسلوں کے لئے نفسی تحقیقات کے متعلق ایک صحیح نظریہ قائم کرنے کا سامان بہم پہنچا سکیں گے۔

ایک ماہر طبیعیات کو حسب ذیل اہم نکتہ حل کرنا چاہئے۔

آیا کوئی غیر طبعی قوتیں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں ؟

اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو کیا وہ اس عالم میں اپنا کام کر رہی ہیں ؟

ایک دفعہ بھی اگر ہم ان غیر طبعی قوتوں کے وجود کو سائنٹفک شہادت کی بنا پر تسلیم کریں (نہ کہ محض اعتقاد اور مذہبی ایمان کی بنا پر) تو انسان کی کتاب ترقی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔ خواہ اس سے کہ یہ چیز کسی سمت میں بھی ہماری رہبری کرے لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ اس سے ہم زیادہ محتاط اور دور اندیش ہو جائیں گے اور جب تک کہ ان عامل قوتوں کے اصل اصول اچھی طرح منضبط نہ ہو جائیں ہمارا اعتقاد مائل بہ وہم و قیاس ہو گا۔

مندرجہ بالا پرجوش اور بسیط تمہید کے بعد پروفیسر صاحب نے ایک خوش آیند چشمک کے ساتھ اس جہاں دیدہ پروفیسر طلسمات کا تعارف مضطرب حاضرین جلسہ سے کرایا، یہ ضعیف شخص ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس کے سامنے والی میز پر پانچ والٹ والا برقی لمپ پندرہ سو بتی طاقت کی خیرہ کن روشنی بکھیر رہا تھا، اگرچہ اس کے چہرے پر تقاضائے سن سے جھریاں پڑی ہوئی تھیں لیکن اس پر ذہانت کی چمک دکھائی دے رہی تھی، اس کے پیچھے اس کا مددگار کھڑا ہوا تھا۔

ہمارے پروفیسر صاحب اس کو کرتب کلب میں دیکھ آئے تھے، انھوں نے روپے کو معلق رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا اور نیز یہ بھی دیکھا تھا کہ اس بوڑھے شعبدہ باز نے اپنے ساتھی کو بذریعہ ہپناٹزم معمول بنا کر اس پر ایک بلانکٹ اڑا دی تھی اور مختلف اشیا کو حاضرین سے لے کر اپنے معمول سے ان کے نام نہایت صحت کے ساتھ معلوم کرائے تھے۔ ان واقعات نے پروفیسر طبعیات کے دل میں ایک تجسس پیدا کر دی، انھوں نے اس کو سائنس کے لئے ایک راست چیالنج سمجھا، مگر ان کی ایم۔ ایس۔ سی اور آنرز کے طلبا نے بوڑھے شعبدہ باز کے ہتھکنڈوں کا بھانڈا پھوڑا۔ طبعیات کے ہال کی نہایت چمکیلی روشنی میں حاضرین کے بڑے حصے نے اس خرانٹ پروفیسر صاحب کے تمام پوشیدہ حیلی وسائل اور ہاتھ کی صفائی، کو دیکھ لیا۔

تماشہ کے اختتام پر پروفیسر صاحب نے ایک خاص قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ حاضرین کو پھر اسی حالت تذبذب میں چھوڑ دیا کہ آیا یہ غیر طبعی قوتیں بھی فی نفسہ اپنا وجود رکھتی ہیں ؟

محمد ابراہیم

بادۂ شباب

حقیقت عشق کی اس طرح محکم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیازِ عشرت و غم ہوتی جاتی ہے

اِدھر میں جس قدر محوِ تماشا ہوتا جاتا ہوں
اُدھر وہ زلف برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

مرے رونے پہ اور وہ ہنس پڑے ہائے ادائے محرومی
سنبھل اے دل کہ تاثیرِ فغاں کم ہوتی جاتی ہے

یہ کیوں پھر خانۂ دل میں ہوئی آہٹ سی اک پیدا
یہ کیا آواز تھی جو خود ہی مدھم ہوتی جاتی ہے

ہجومِ یاس کے صدقے کہ اس کی بے نیازی سے
کسی کی بے رُخی بھی لطفِ پیہم ہوتی جاتی ہے

کرم اے سوزِ الفت ہائے ظالم کیا قیامت ہے
بھڑکا جاتا ہے سینہ آنکھ پرنم ہوتی جاتی ہے

مری حالت پہ ہنسنے والے اکثر رو بھی دیتے ہیں
مری افسردگی تقدیرِ عالم ہوتی جاتی ہے

حقائق جس قدر نظروں میں عریاں ہوتے جاتے ہیں
یہ ہستی اور مبہم اور مبہم ہوتی جاتی ہے

کسی کے بھول جانے سے نظرؔ اتنا پریشاں ہے
کہ جیسے ساری دنیا اس سے برہم ہوتی جاتی ہے

نظرؔ

میری رانی

پہلے پیکان محبت سے تھا دل پہلو میں
خون کی گنگا نہایا تو بنا رنگ محل
چپکے چپکے کوئی اس رنگ محل میں آیا
بجلیاں کانوں میں سینے پہ وہ آڑی ہیکل
آتشِ حسن سے گلنار، بھبھوکا چہرا
عید ملتا ہوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل
بول اٹھے چمنِ داغ میں خوش رنگ کنول
رُخ کے پرتو سے چھپے نور کا لے کر آنچل
غم نے بڑھ کر اُسے پہنا دیا ان پھولوں کا ہار
نازنیں فرق پہ اک تاجِ زر افشاں رکھا
حسرتیں آکے حضوری میں زمیں بوس ہوئیں
نازک ارمانوں نے داماں نہ گریباں رکھا!
یاس نے آکے سلامی دی بڑی شوکت سے
آس نے اس کے حضور آپ نگہداں رکھا!
راج کرنے لگی اقلیمِ جنوں پر رانی
میری بلقیس نے اندازِ سلیماں رکھا!
کم نظر تو اسے کہتے ہیں فغاں کی بانی
وہ ہے فی الاصل مرے رنگ محل کی رانی!!

مختار صدیقی

مے باقی و ماہتاب باقی

چند نئی کتابیں

مضامین محمد علی حصہ اول و دوم کچھ دن ہوئے مکتبہ جامعہ نے مضامین محمد علی کا حصہ اول شایع کیا تھا۔ اس مجموعہ میں آپ بیتی، مسائل ملی، مسلمان اور قومیت، مسلمان اور کانگریس، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ وغیرہ وغیرہ پر مولانا محمد علی مرحوم کے بصیرت افروز مضامین تھے۔ اب مولانا کے مضامین کا یہ دوسرا حصہ شایع ہوا ہے۔

اس حصہ کو بھی جناب پروفیسر محمد سرور صاحب بی۔ اے آنرز (جامعہ) فاضل معزز نے مرتب فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ اس ہنگامہ خیز دور کی پوری تاریخ ہے جو ۱۸۵۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۰ء پر ختم ہوتا ہے۔ سرسید نے کانگریس کی مخالفت کس بنا پر کی؟ وہ مسلمانوں کو تمام تحریکوں سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے؟ اسلامی سیاست کا یہ مسلک آخر کار کیا رنگ لایا؟ مسلم لیگ کا قیام کیسے اور کہاں عمل میں آیا؟ لیگ انگریز کی دوستی سے ہٹ کر کیوں کانگریس سے ہم نوا ہونے پر مجبور ہوئی؟ اور پھر کس طرح دونوں کی راہیں الگ الگ ہوئیں؟ قیمت مجلد حصہ اول عہ دوم عہ

جوہر اقبال۔ علامہ اقبال بحیثیت ایک شاعر نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں مشہور تھے۔ چنانچہ ان کے باکمال شاعر ہونے کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت ہے کہ ان کی اکثر نظموں کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

"جوہر اقبال" علامہ اقبال کی زندہ جاوید اور بے مثال شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک مفید کتاب ہے۔ اس میں ہندوستان کے چوٹی کے ارباب علم و فضل ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر مولوی عبد الحق، مولانا سید سلیمان ندوی، مہاتما گاندھی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور خواجہ غلام السیدین کے مضامین اور پیغامات جمع ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہو گیا اور اب یہ دوسرا ایڈیشن ارباب علم کی خدمت میں پہلے سے زیادہ خوشنما طریقہ حاضر ہے۔ قیمت مجلد عہ

تاریخ مسلم لیگ (از مظہر انصاری بی اے (آنرز)) اردو زبان میں اپنے رنگ کی پہلی کتاب مسلم لیگ اور مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ۔ اس کتاب میں مسلم لیگ کے قیام کے وقت سے موجودہ دور تک کے مکمل سیاسی حالات درج ہیں۔ تمام بڑی بڑی شخصیتوں اور ان کے اہم اور تاریخی کارناموں کا حال ہے۔ زبان سلیس اور شگفتہ، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ، کپڑے کی خوش نما اور مضبوط جلد قیمت مجلد عہ۔

صدر دفتر:۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔

شاخیں:۔ (۱) جامع مسجد دہلی (۲) لوہاری دروازہ، لاہور (۳) امین آباد لکھنؤ (۴) پرنسس بلڈنگ ۳۰ جے جے استپتال بمبئی

مقامی ایجنسی:۔ کتاب خانہ، عابد شاپ، حیدرآباد دکن۔

دیگر ایجنسیاں:۔ (۱) اقبال بک ڈپو، ہیر بھور، مہندرو، پٹنہ (۲) سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور

مجھے نقلی ہٹلر بنایا گیا تھا

(ہینس ہلر کے حیرت انگیز انکشافات)

ہٹلر کی طرح میں بھی آسٹریا میں پیدا ہوا۔ میں اس شخص سے جو آج جرمنی کے سیاہ و سفید کا مالک ہے صرف ایک سال چھوٹا ہوں۔ جب میں ریڈ کرس برگ کی گلیوں میں جو یوگوسلاویہ کی سرحد کے قریب ہے، کھیلا کرتا تھا تو مجھے بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ میری پوری زندگی ایک دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں ہوگی جو اس وقت برناؤ (جوکہ باویریا کی سرحد کے قریب ہے) کی گلیوں میں کھیلتا تھا۔

میرا باپ ایک لوہار تھا۔ اور چاہتا تھا کہ میں بھی اپنا آبائی پیشہ اختیار کروں لیکن مجھے اس کے پیشہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں ہمیشہ اپنے باپ کی دکان میں آگ سلگانے جی چرایا کرتا تھا۔ میں کسی جنگل یا کھیت میں درخت کے نیچے لیٹ کر اپنے مستقبل پر غور کیا کرتا تھا۔ یہی میرا پسندیدہ شغل تھا۔ لیکن خدا کی قدرت ہے کہ جس مستقبل کا میں خواب دیکھا کرتا تھا، وہ خواب ہی ہوگیا۔ اور میرا مستقبل خوابی مستقبل سے بالکل ہی جدا نکلا۔

میری پندرہ برس کی عمر تھی جب میرا باپ راہئی عدم ہوا۔ میری ماں ایک جرمن عورت تھی۔ جو کچھ تھوڑی بہت پونجی اس نے جمع کی تھی اس کی مدد سے وہ مجھے اپنے رشتہ داروں کے پاس باویریا لے گئی۔ وہاں ایرچ ریسیل مایر سے، جو ایک بوزہ کش کا لڑکا تھا، میری ملاقات ہوئی۔ یہ دوستی چند سال بعد عجیب وغریب پھل لائی کیونکہ ایرچ ہی کی وجہ سے ہٹلر میری طرف متوجہ ہوا۔

دن گزرتے گئے اور میں دوسرے غریب نوجوانوں کی طرح محنت مزدوری کرکے اپنا اپنی ماں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ اتنے میں جنگِ عظیم شروع ہوگئی میں نے جرمن فوج میں ملازمت اختیار کرلی۔ اور چار سال تک مغربی مورچہ پر لڑتا رہا۔ میں اپنے آپ کو نہ تو بہت ہی اچھا سپاہی ثابت کرسکا اور نہ بہت خراب۔

بہرحال میں جس حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوا تھا، اسی حیثیت سے واپس آیا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ میرے پھیپھڑے گیسوں سے قدرے متاثر ہو چکے تھے۔ جب میں جنگ کے بعد باویریا واپس ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری والدہ نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے مجھے رکھنے سے انکار کردیا۔ اس لئے مجھے مجبوراً میونخ کی راہ لینی پڑی۔

اب میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ میونخ میں ہٹلر مزدوروں کی پارٹی کا مشہور لیڈر بن چکا تھا۔ اس کی پارٹی میں اس وقت تک صرف بیس ارکان تھے۔ اور ایرچ ان میں سے ایک تھا۔ وہ اکثر مجھ سے ہٹلر کا ذکر کیا کرتا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے سیاست سے کچھ دلچسپی نہ تھی اس لئے مجھ پر اس کی باتوں کا اثر شروع شروع میں نہ ہوا۔ لیکن آخر سنہ ۱۹۲۲ء میں وہ غالب آگیا اور مجھے اس نے ہٹلر سے ملنے پر راضی کرلیا۔ میں بھی ہٹلر کی پارٹی میں شریک ہوگیا۔ مجھے ہٹلر پر اعتماد تھا۔ اور میں اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار تھا۔

ہٹلر کے مخصوص ساتھیوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ تھا۔

اور جوں جوں ہٹلر طاقتور ہوتا جاتا، یہ حلقہ بھی اہم ہوتا جاتا تھا۔ اس حلقہ میں جولیس شیرک بھی شریک تھا جو کہ نازی پارٹی میں نمبر (۵۳) کے نام سے مشہور تھا اور جس نے ہٹلر کے لئے اپنی جان گنوائی۔ یہ شخص ہٹلر کا سب سے زیادہ وفادار ساتھی تھا۔ اس کی وفاداری کا صلہ چند سال بعد اس کو موت کی سزا کی صورت میں ملا۔ اس حلقے میں دوسرے افراد بھی شامل تھے۔ مثال کے طور پر ایرنسٹ روہم جس نے باوجود اپنی بدکرداری کے ہٹلر کی بہت مدد کی اور ہملر جو اس زمانہ میں بھی ہٹلر کا دست راست تھا، اس کا بڑا مددگار رہا۔ میں ہٹلر کی پارٹی میں شامل رہا۔ اس وقت ہٹلر کی اتنی طاقت بڑھ گئی تھی کہ ہم سب جانتے تھے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ضرور جرمنی کا سب سے زبردست شخص بن جائے گا۔ ہم اس دن کا بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔

آخر کار وہ دن آ پہونچا جس نے میری کایا پلٹ دی۔ ۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء کو میں اور ایرچ ایک شراب خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ہملر داخل ہوا۔ اس زمانہ میں بھی آج کل کی طرح اس کا سب سے بڑا کام ہٹلر کی جان کی حفاظت کرنا تھا۔

"ہینس میں نے تمہارے متعلق ہٹلر سے گفتگو کی تھی وہ تم سے ملنا چاہتا ہے" ہملر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے تعجب سے دریافت کیا "کس چیز کے متعلق آپ نے ان سے گفتگو کی تھی"۔ "اس کے متعلق وہ خود ہی تم سے سب کچھ کہہ دے گا۔ آؤ میرے ساتھ چلو وہ تمہارا انتظار براؤن ہوس میں کر رہا ہے"۔

اتنا کہہ کر مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ جب ہم براؤن ہوس پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ ہٹلر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہٹلر میری طرف غور سے دیکھنے لگا گویا کہ اس نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں پھر سر ہلاتے ہوئے ہملر سے کہنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے تھے میں نے اس پر پہلے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔ "ہینس روشنی کی طرف منہ کرکے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو جاؤ"

میں دل ہی دل میں بہت متعجب ہو رہا تھا کہ اتنے میں ہملر نے اپنی جیب سے کنگھی نکالی اور میرے بال درست کئے۔ ہٹلر نے ایک دفعہ پھر سر ہلایا اور کہنے لگا "بالکل ٹھیک ہملر اب صرف مونچھوں کی کمی ہے"۔

اب ہٹلر اپنی کرسی پر سے اٹھ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا ہملر اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "ہینس ایک وفادار رضاکار ہے ہٹلر اس کو معلوم ہے کہ ہماری ساری تحریک کا دار و مدار تم ہی پر ہے مجھ کو بہت افسوس ہوگا اگر وہ ہمارا کہنا نہ مانے"۔ میں ہملر کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

اس نے اپنی عینک اتار لی اور اس کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے آہستہ سے مجھ سے کہنے لگا "ہینس! رات کس نے ہٹلر کی جان پر حملہ کیا"۔ میں چاہتا تھا کہ اس واقعہ پر اپنے غصہ کا اظہار کروں کہ اس نے مجھے بات کرنے سے روک کر کہا "نہ تو یہ حملہ پہلا ہے اور نہ آخری۔ ہمارے دشمن جانتے ہیں کہ ہم کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہٹلر کا قتل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہٹلر کی جان کی

حفاظت کرو۔ ہمیں ہم چاہتے ہیں کہ تم ہٹلر بن جاؤ" میں تعجب سے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا میں اب تک اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا تھا۔ "آپ چاہتے ہیں کہ میں فیورہر بن جاؤں لیکن میں کس طرح بن سکتا ہوں۔ میں سمجھا نہیں" اس دفعہ ہٹلر خود بول اٹھا "ہمیں ہم چاہتے ہیں کہ تم پبلک میں میری جگہ لو تم پبلک میں ظاہر کرو کہ تم ہٹلر ہو۔ یہ صرف ہمارے دشمنوں کو بے وقوف بنانے کے لئے کرنا پڑ رہا ہے۔"

میں نے بغیر کسی حجت کے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ اس وقت میں ہٹلر کے لئے ہر قسم کی قربانی پر تیار تھا۔

اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ فوراً اپنا مکان خالی کر دوں۔ اور حکم دیا گیا کہ میونچ کے باہر ایک چھوٹے سے محل میں جہاں خود ہٹلر بھی رہتا تھا آ کر بس جاؤں۔ میرے تمام دوستوں کو یہ کہہ دیا گیا کہ میں پارٹی کا ضروری کام کرنے گیا ہوں مجھے ہٹلر جیسی مونچھیں رکھنے کو کہا گیا۔ میرے بال ہٹلر کے بالوں کی طرح رنگ دئے گئے۔ مجھے ہٹلر کی ہر حرکت کی نقل کرنا سکھایا جانے لگا میں نے اس کے اٹھنے، بیٹھنے چلنے، پھرنے اور سلام کرنے کے طریقوں کو غور سے دیکھا اور نقل کرنے کی کوشش کی۔ اب ہٹلر نے میرا امتحان لینے کا ارادہ کیا۔ ہٹلر جیسا کوٹ پہنا کرتا تھا ویسا ہی کوٹ اور ہٹلر کی ایک ہیٹ لے آیا۔ ہم دونوں ایسی جگہ سڑکوں اور بازاروں میں پھرنے کے لئے گئے جہاں ہم کو یقین تھا کہ ہٹلر کے بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوگی اگرچہ میں بہت گھبرایا ہوا تھا لیکن میں اس امتحان میں کامیاب رہا۔ ہر ایک ہٹلر کا جاننے والا جو مجھے راستہ میں ملتا مجھے فیورہر سمجھ کر سلام کرتا ان کے دل میں ذرا بھی شک و شبہ پیدا نہ ہوا۔

میرا کوٹ، ہیٹ، اور مونچھیں بالکل ہٹلر کی سی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہٹلر کا دن رات کا ساتھی ہٹلر میرے ساتھ تھا۔

صرف ایک ہی دفعہ میرا بھانڈا پھوٹنے لگا تھا اور وہ بھی ایک لڑکی سے۔ وہ ہٹلر کو نہ جانتی تھی لیکن مجھ سے اچھی طرح واقف تھی کیونکہ میں اپنی نئی خدمت شروع کرنے سے پہلے اس کے ساتھ کئی ہفتوں تک رہ چکا تھا میں اور ہٹلر ایک شراب خانے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ وہ ملی۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا لیکن میں بالکل متوجہ نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے گفتگو نہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کو اپنی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا۔ "کیا تم اس کو جانتے ہو؟" ہٹلر نے مجھ سے دریافت کیا اور جب میں نے اس کا اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگا۔

"تم اس سے آئندہ کبھی نہ ملنا جو زندگی اب تم کو گزارنی ہے اس میں عورت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

بے چاری لڑکی۔ اس کے بعد میں نے کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس نے مجھے تلاش کیا لیکن چونکہ میں اپنا پہلا مکان چھوڑ چکا تھا اس لئے وہ مجھے نہ پا سکی۔ آخر کار میں نے ایک ایر چج کے ہاتھ اس کو کہلا بھیجا کہ چونکہ میں اس کی اب پرواہ نہیں کرتا اس لئے آئندہ اس سے کبھی نہ ملوں گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بعد میں اس نے ایک مال دار شخص سے شادی کر لی۔ میں اب بھی کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ کیا وہ کبھی مجھے یاد بھی کرتی ہوگی۔

مجھے اب ہر وقت ہٹلر کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور سلام کرنے کے طریقوں کی مشق کرنی پڑتی تھی۔ بعض دفعہ

رات کو ہٹلر ہمارے پاس آجاتا اور میں ہٹلر اور وہ اکھٹے کھانا کھاتے ہٹلر کی غذا با وجود اس کے دبلے پتلے ہونے کے اس زمانے میں بھی کافی تھی لیکن ہٹلر اس وقت بھی آج کل کی طرح بہت کم غذا کھایا کرتا تھا۔

اس سال میں نے کئی دفعہ عوام میں ہٹلر کی جگہ لی لیکن نہ تو میں کبھی عوام کے زیادہ نزدیک ہی ہوا اور نہ کبھی کسی اہم جگہ پر لوگوں کو دہوکا دیا۔ ہٹلر اس زمانے میں ایک دلی جوش کے ساتھ نازی پارٹی کے طاقت میں آنے کے لئے کوشش کیا کرتا تھا۔ آخرکار وہ وقت آن پہونچا جب کہ نازی پارٹی جرمنی میں طاقتور ہوگئی اور میری جان پر پہلے حملے کے ساتھ میرا اصلی امتحان شروع ہوگیا۔

جولائی ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا ہٹلر جنرل ہنڈن برگ کی پریسیڈنسی کی مخالفت کر رہا تھا۔ یہ ایک بہت دلیرانہ کام تھا۔ فیورر پھر جرمنی کا دورہ کر رہا تھا۔ اُس کو بعض بعض دفعہ دن میں چھ چھ مرتبہ تقریریں کرنی پڑتیں تھیں لیکن وہ بالکل نہیں تھکتا تھا۔ اُس کو بیریوتھ میں تقریر کرنے کے بعد اپنی آخری تقریر (۳۰) جولائی کو نورمبرگ میں کرنی تھی اس زمانے میں یہ افواہ مسلسل گشت لگا رہی تھی کہ انٹی فاسسٹ لیگ جو کہ زیادہ تراشتراکیوں پر مشتمل تھی، ہٹلر کی جان پر نورمبرگ میں حملہ کرنے والی ہے۔ اس لئے مجھ کو جلوس کی دوسری موٹر میں جس میں عموماً ہٹلر بیٹھا کرتا تھا بٹھایا گیا۔

جولیس سٹیچر جس نے کہ بعد میں یہودیوں پر سخت مظالم ڈھائے اگلی موٹر میں تھا۔ دوسری سڑک سے ہٹلر نورمبرگ کو اکیلے جا رہا تھا۔

(ترجمہ) سلیم احمد خاں لودھی

مرقع سخن (جلد اول)

یہ دکن کے پچیس ۲۵ شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبا، فارغین اور اہل قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعراء کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہمعصر دکنی اور شمال کے شعراء کے نام دیدیے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایان دکن اور قدردانان ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔

صفحات (۳۹۲) تصاویر (۵۴) قیمت مجلد (ﷺ)

حالاتِ حاضرہ

بلجیم کا حشر

بلجیم کے شاہ لیوپولڈ نے ۲۸ مئی کو ہٹلر کی اطاعت قبول کرلی اور اپنے وزیروں کے مشورے کے خلاف جرمنی سے جنگ ترک کردی۔ لیوپولڈ کی اس حرکت سے اتحادیوں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا کیونکہ اس کے بعد شمالی علاقے میں دشمن سے لڑنے کے لئے صرف برطانوی اور فرانسیسی فوجیں رہ گئیں۔ ۱۴ مئی کو جرمن فوج اتحادی فوجوں کے درمیان گھس آئی اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلجیم کی لڑائی نازک صورت اختیار کرنے لگی اور ان حالات میں لیوپولڈ نے اتحادیوں کو مطلع کئے بغیر ہتیار ڈال دئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اتحادیوں کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن دنیا کی اور مملکتوں کے علاوہ خود بلجیم کی حکومت شاہ لیوپولڈ کے اس فیصلے کو بہت بری نظر سے دیکھتی ہے چنانچہ بلجیم کے وزیراعظم ایم۔ پریوتے اپنی ایک لاسلکی تقریر میں اعلان کیا کہ ملک لیوپولڈ کے اس فیصلے کا پابند نہیں ہوسکتا اور بلجیم کے لوگ برابر لڑتے رہیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ لیوپولڈ نے ہٹلر سے سازش کرلی تھی اور اسی وجہ سے عین موقع پر جب کہ اتحادی فوجیں دشمن سے گھری ہوئی تھیں، اس نے ہتیار ڈال دئے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز کی کشمکش کے بعد بلجیم پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا۔

اطالیہ کا اعلانِ جنگ

۱۰ جون کو رات کے بارہ بجے مسولینی نے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا اور اپنے سیاسی حلیف ہٹلر کے ساتھ میدان میں کود پڑا۔ اس نے پلازا وینیزیا کے چھجے سے پندرہ منٹ تک اطالویوں کو مخاطب کیا اور اتحادیوں کی زیادتیوں کا ذکر کرکے اپنے ارادے ظاہر کردئے۔ اس نے کہا کہ میں صرف اتحادیوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور ہمیں اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اس نے صاف اعلان کردیا کہ ہم سوئٹزرلینڈ یوگوسلاویہ، یونان، ترکی اور مصر پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعلان صرف ہٹلر کی اتباع ہے جو مسولینی کا سیاسی مرشد ہے یہ ایک خیال باطل ہے کہ آمروں کے پنجے سے یورپ کی چھوٹی مملکتیں محفوظ رہیں گی۔ اب شمالی افریقہ میں لڑائی ہو رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کی آگ مصر کو بھی اپنے شعلوں میں لپیٹ لے گی۔

روس اور بالٹک کی مملکتیں

جون کے پہلے ہفتے میں روس نے لیتھونیا پر یہ الزام لگایا تھا کہ سرخ فوج کے کئی سپاہی غائب کردئے گئے اور اس سلسلے میں کوئی ۲۶۴ آدمی ولنا میں گرفتار بھی ہوئے۔ سوویٹ کا یہ الزام سیاسی مصلحت سے خالی نہیں تھا چنانچہ چند ہی روز بعد ایک نیا گل کھلا۔ ۱۵ جون کو سوویٹ حکومت نے لیتھونیا کے نام ایک یادداشت روانہ کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ لیتھونیا میں سوویٹ فوجوں کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیتھونیا کی حکومت مستعفی ہوگئی اور اس کی جگہ ایک نئی حکومت قائم ہوگئی۔ وزیر خارجہ اجدسیا ...

پولیس کے صدر اسکو کاس کو جو روس کے مخالف تھے ماخوذ کر لیا گیا اور سوویٹ فوجیں لیتھونیا میں جمع ہونے لگیں۔

اسی طرح سوویٹ فوجیں لٹویا میں بھی داخل ہوگئیں۔

سوویٹ جنگی جہاز ریگا میں داخل ہوئے اور مسلح موٹریں اور دبابے شہر میں کئی جگہ متعین کردئے گئے۔ لٹویا اور لیتھونیا کے ساتھ استونیا کو بھی ایک الٹی میٹم دے دیا گیا اور آخرالذکر نے بھی روس کی شرطوں کو مان لیا۔

ترکی کا مسلک

۱۴ رجون کو ترکی پارلیمان کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں اس صورت حال پر غور کیا گیا جو اطالیہ کی شرکت جنگ سے بعد پیدا ہوئی ہے اور ترکی کا آئندہ مسلک کیا ہونا چاہئے۔ اور اس سلسلے میں روس اور ترکی کے تعلقات پر بھی بحث ہوئی۔ اس اجلاس نے یہ فیصلہ کیا کہ ترکی اب بھی غیر جانب دار رہے گا۔ روس اور ترکی کے درمیان قریب تر اشتراک عمل کی کوشش کی جارہی ہیں اور ادہر ترکی اور جرمنی کے مابین چالیس لاکھ اسٹرلنگ کے تجارتی راضی نامے پر بھی دستخط ہوگئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ترکی میں فوجی تیاریاں بھی جاری ہیں تاکہ مسولینی یا کسی دوسرے دشمن کی دست درازی کی صورت میں ترکی بہ ترکی جواب دیا جاسکے۔

مصر

مصر کا مسلک ترکی مسلک کے تابع معلوم ہوتا ہے چنانچہ وزیر اعظم مصر نے اعلان کیا ہے کہ مصر اس وقت تک جنگ میں شریک نہیں ہوگا جب تک کہ اطالیہ اس پر فوج کشی نہ کرے۔

جاپان اور یورپی جنگ

جون کے پہلے ہفتے میں جاپان کے وزیر اعظم ایڈمرل یونائی نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ جاپان یورپی جنگ سے الگ رہے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر امریکہ بحرالکاہل میں اپنی فوجیں اکٹھا بھی کرے تو جاپان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ جہاں تک ولندیزی شرق الہند کا تعلق ہے جاپان سٹراریٹیا کی پیش کردہ پالیسی پر قائم ہے۔

فرانس کی نازک صورت حال

بلجیم پر جرمن قبضے کے بعد سے جرمنی کا پورا دباؤ فرانس پر پڑنے لگا۔ اگرچہ اتحادیوں نے دشمن کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن اس کے باوجود دشمن اپنے دبابوں، طیاروں دہوئیں کی چادروں کے ساتھ برابر آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ ۱۴ رجون کو جرمن فوجیں پیرس میں داخل ہوگئیں۔ فرانس کے صدر اعظم رینانے فرانسیسیوں کو خوب ہمت دلائی اور وہ خود بھی فوج میں شامل ہوگئے لیکن مقابلہ ایک زبردست دشمن سے تھا۔ وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اور فرانس کی حکومت کو بوردو میں منتقل کردینا پڑا۔ ایم۔ رینانے پریسڈنٹ روزولٹ سے امداد کی پرزور اپیل بھی کی لیکن اس سے پہلے کہ امریکہ شرکت جنگ سے متعلق کوئی فیصلہ کرسکے فرانس میں حالات ہر روز پلٹا کھا رہے تھے۔ ۱۶ رجون کو ایم رینا کی حکومت مستعفی ہوگئی اور مارشل پیتاں نے نئی حکومت بنالی۔ نئے وزیر اعظم نے صورت حال کے لحاظ سے یہ فیصلہ کیا کہ جرمنی سے صلح کرلی جائے۔ چنانچہ انھوں نے ہٹلر سے صلح کی شرطیں بھی مانگیں۔ لیکن وزیر خارجہ ایم۔ بودان نے اپنی نشری تقریر میں کہا کہ فرانس صرف باعزت صلح کی صورت میں ہتھیار ڈال سکتا ہے ورنہ جنگ برابر جاری رہے گی۔ صلح کی شرطیں طے کرنے کے لئے ۱۷ رجون کو ہٹلر اور مسولینی نے میونخ میں گفتگو کی اور اس کے بعد جرمنی کی طرف سے فرانس کو جواب دیدیا گیا۔ ہٹلر نے گفتگو کرنے کے لئے

فرانسیسی سفرا طلب کئے ہیں تاکہ ان کو صلح کی شرطیں بتائی جائیں
۱۹ جون کو فرانسیسی کابینہ نے سفرا کا تقرر کر دیا ہے۔
معلوم نہیں ان کے سامنے صلح کی کیا شرطیں پیش کی جائیں گی۔
کہا جاتا ہے ہٹلر فرانس کی غیر مشروط اور کامل اطاعت چاہتا ہے۔

دوسری طرف برطانیہ نے فرانس کے سامنے کامل اتحاد اور یگانگت کا ایک پیش کش کیا ہے۔ اب یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ فرانس برطانیہ کے ساتھ "پیمان وفا" کی تجدید کرکے اتحادی محاذ کو قائم رکھے گا یا ہٹلر کی شرطوں کو تسلیم کرے گا۔

ہٹلر کی شرطیں

فرانس نے ہٹلر سے صلح کی شرطیں دریافت کی ہیں اور اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ہٹلر کی کیا شرطیں ہوں گی یا اس نے کیا شرطیں پیش کر دی ہیں لیکن اس موقع پر ہٹلر کی ان شرطوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جن کا تذکرہ ایچ، جے، یا کچن نے ترکی کے ایک اخبار میں مارچ سنہ ۴۰ء کو کیا تھا۔ صلح کی یہ شرطیں حسب ذیل تھیں۔

(۱) چیکوسلواکیہ اور پولستان جرمنی کے قبضے میں رہیں گے۔
(۲) انگلستان کو اسکانڈی نیویا میں عمل دخل کی اجازت نہ ہو گی۔
(۳) مالٹا، جبل الطارق اور سنگاپور کا تخلیہ کر دیا جائے۔
(۴) جرمنی کو اس کی نو آبادیاں واپس مل جائیں۔
(۵) وسطی یورپ کے جرمن مسلک میں کسی کو دخل دینے کا حق نہ ہو گا۔

انگلستان پر حملے

فرانس سے فارغ ہونے کے بعد یقینی تھا کہ جرمن انگلستان کی طرف توجہ کرتے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دشمن کے طیاروں نے انگلستان کے مشرقی اضلاع پر بمباری شروع کر دی جن میں ایسکس کیمبرج شائر سفوک۔ لنکن شائر۔ نارتھمپٹن اور چند دوسرے شہر بھی شامل ہیں۔ ٹیمس کے دہانے پر خوب گولہ باری ہوئی لیکن ان حملوں سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔

مسٹر چرچل کی تاریخی تقریر

۱۸ جون کو مسٹر چرچل نے دارالعوام میں ایک نہایت اہم اور تاریخی تقریر کی۔ اس میں انہوں نے فرانس کے اس نقصان کا تذکرہ کیا جو اسے بلجیم میں اٹھانا پڑا اور پھر اپنی قوم کو ایک متحدہ محاذ پیش کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ اگر ضرورت ہو تو ہم تنہا اور کئی سال تک لڑیں گے۔ نیز یہ کہا کہ " آج اس جزیرے میں ایک بڑی طاقت جمع ہے۔ اس میں ہماری بہترین تعلیم یافتہ فوجیں ہیں...... اس جزیرے میں اس وقت ساڑھے بارہ لاکھ سے زیادہ سپاہی تیار ہیں ان کے علاوہ مقامی رضا کار بھی ہیں جن کی تعداد پانچ لاکھ ہے اور اس کے علاوہ سمندر پار قلمروؤں سے آئی ہوئی فوجیں بھی ہیں......" اس کے بعد مسٹر چرچل نے کہا کہ اگر دشمن برطانیہ پر حملہ کرنا چاہے تو اس کے لئے بہت سی دقتیں ہیں۔ برطانیہ کا طاقتور بیڑا دشمن کے فوجی جہازوں کو برطانیہ کے ساحلوں تک پہنچنے بھی نہیں دے گا۔ "پہلے تو دشمن کو ہماری بچھائی ہوئی سرنگوں کا سامنا کرنا ہوگا اور اگر وہ سرنگوں کو صاف کرکے راستہ بھی پیدا کرلے تو وہ ہمارے بحریہ کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتا...... اب ہماری جنگی ہوائی طاقت نسبتاً جرمنی سے زیادہ ہے اس لئے ہمیں یقین ہے کہ پہلے کی بہ نسبت اب ہم زیادہ کامیابی کے ساتھ جنگ جاری رکھ سکتے ہیں"
اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے

مسٹر چرچل نے کہا کہ ہمارے ہموطن پارسی، پونا کے بہادروں کی طرح اپنے کو مقابلہ کا اہل ثابت کریں گے۔ ہمارے تمام فوجی ماہروں کا مشورہ ہے کہ ہم جنگ جاری رکھیں کیونکہ آخری فتح کی بہت کچھ توقع ہے۔ قلمروؤں کے وزرائے اعظم نے بھی ہمارے فیصلے سے اتفاق کیا اور آخر تک ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔

آخر میں مسٹر چرچل نے کہا "دشمن کا سارا غیظ وغضب اور اس کی پوری طاقت اب ہماری طرف رخ کرے گی۔ ہر ہٹلر کو اس بات کا علم ہے کہ وہ اس جزیرے میں یا تو ہم کو شکست دے گا یا پھر خود ہار بیٹھے گا۔ اگر ہم اس کا مقابلہ کرسکیں تو سارا یورپ آزاد ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔۔

اگر ہم ناکام رہیں تو پھر ساری دنیا جس میں امریکہ وغیرہ سب شامل ہیں اور جو ہم کو بہت زیادہ عزیز ہیں ایک نئے تاریک دور سے گزریں گے۔ ہم کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے، ہم کو اس طرح عمل کرنا چاہئے کہ اگر برطانوی دولت مشترکہ اور ہماری سلطنت ایک ہزار سال تک قایم رہے تو اس کے بعد بھی لوگوں کی زبان سے یہ نکلے کہ یہ انگریزوں کی سب سے زیادہ کٹھن گھڑی تھی۔

ح ۔ ص

نئی کتابیں

۱۔ پھول اور کلیاں (ٹیگور کے افسانے) مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری ۲۴۰ صفحات قیمت عہ
۲۔ ناخوانده مہمان (مزاحیہ افسانے) از سید بادشاہ حسین ۱۴۵ صفحات قیمت عہ
۳۔ کاروان خیال (افسانے) مرتبہ فیروز اینڈ سنز ۲۴۷ صفحات قیمت عہ
۴۔ مسلمان کیا کریں (مضامین) مرتبہ ابوسعید بزمی ایڈیٹر مدینہ ۳۰۴ صفحات قیمت عال
۵۔ تحفے (افسانے) از محترمہ حجاب امتیاز علی ۲۹۶ صفحات قیمت عہ
۶۔ مردم دیدہ (سات مشاہیر کے حالات) از چراغ حسن حسرت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۵ار
۷۔ باغ دلکشا (مشاہیر دکن کے حالات) از سید عباس حسین صمصام شیرازی قیمت عـہ
۸۔ نور ایمان (سولھواں ایڈیشن) از سید خیرات احمد ۴۹۸ صفحات
۹۔ خوفناک دنیا (جزائر بورنیو کے چشم دید حالات) از ڈاکٹر سید محمد علی شاہ سبزواری ۲۵۴ صفحات
۱۰۔ پیام راحت (روحانیات) از بھاگ مل سینی ۲۶۸ صفحات
۱۱۔ تحریک آزادی (ہندوستان میں تحریک آزادی کی تاریخ) از ٹیکا رام سوکھان ۱۲۰ صفحات
۱۲۔ انسان کی پوشیدہ طاقتیں از پنڈت جگدیش چندر ۱۰۴ صفحات۔
۱۳۔ زخمیوں کی پہلی امداد (چھٹا ایڈیشن) از مرزا ظفریاب حسین ایم، بی، بی ایس ۱۸۵ صفحات
۱۴۔ نوین سنگیت رامائن (ڈراما) از ماگھر مل بی اے ۱۴۶ صفحات

بقیہ صفحہ ۔۔۔ ملاحظہ ہو

پروپیگنڈا

"پروپیگنڈا" لفظ کی شکل اور آواز اتنی وڈاڈنی اس لئے ہوگئی ہے کہ اس کے معنی بہت ہی مبتذل ہوگئے ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جو اپنے خیالات کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہے وہ اپنے اس خیال کے لئے پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر جو آپ کے بچوں کے لئے نارنگی اور ٹماٹر کا عرق تجویز کرتا ہے وہ حیاتین کا پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ وہ اشتہار دینے والے جو خاص موٹروں کا اشتہار بڑے بڑے پوسٹروں سے دیتے ہیں وہ اُن موٹروں کے لئے پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ہمارا قرآن شریف اور اس کی تفسیر خدا کے وجود اور اس کی خوبیوں کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے جلسے پروپیگنڈا ہیں۔ اگر کسی شخص کو کوئی اچھا خیال آتا ہے یا وہ کوئی نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو جو الفاظ وہ اس خیال کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے اور جن الفاظ میں وہ سمجھاتا ہے وہ درحقیقت پروپیگنڈا ہے اپنے خیالات کا۔ اس لئے پروپیگنڈا کو روکنا بلکہ بالکل ختم کر دینا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے بالکل ناممکن ہے اور خطرناک بھی۔ جب ہم پروپیگنڈا سے تھک کر اس کا خاتمہ کر دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو ہمارا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سفید جھوٹ جو ہمارے سامنے نہایت عمدہ تراشے ہوئے صداقت نما الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور ان سے زیادہ سادے اور سلیس لفظوں میں سچ اور صرف سچ ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جتنا ممکن ہو سکے سب لوگ سچ ہی کا پروپیگنڈا کریں۔

پروپیگنڈا اس لئے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض قوموں کے رہنماؤں نے جھوٹ کو اپنا ہادی اور رہنما بنا لیا ہے۔ وہ پروپیگنڈا کو اپنے ہر طرح کے خیالات کے بڑھانے اور ہر دلعزیز بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انسان ایک حیوانی فطرت کا مالک ہے اسے سوچ سمجھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اسی لئے جب وہ ایک نظریے کو اپنی قوم کے لئے یا خود اپنے لئے اچھا سمجھتے ہیں تو اسے قوم کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہر ایک ذریعہ اختیار کرتے ہیں خواہ وہ ذریعہ اچھا ہو یا برا۔ جھوٹ تو ایک معمولی سے جملے میں بولا جا سکتا ہے مگر سچ بولنا اتنا آسان نہیں سچ کا اظہار ایک معمولی جملے میں کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔

قوموں اور جماعتوں کے رہنما جب چاہتے ہیں کہ کسی کام کو پورا کریں اور عوام کی پوری مدد انھیں حاصل ہو تو وہ جانتے ہیں کہ معمولی سی اور سادہ زبان میں اگر اپنے نظریے کا پورا مطلب بیان کریں گے تو وہ عوام کے دلوں کو بھڑکا نہیں سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لیڈر اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے غلط اور صحیح سب طریقوں کو روا رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا کام نکل آئے۔ ان کی نگاہ تو صرف نتیجہ اور ان کے بیان کے اثر پر ہوتی ہے۔

آج کل جھوٹ کا سب سے بڑا پروپیگنڈا کرنے والا ہٹلر ہے۔ اس نے اپنی سوانح میں پروپیگنڈا پر تقریباً ایک باب

لکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ عوام ہر چیز کے متعلق ایک صاف شفاف تراشا ہوا خیال آسان سے آسان زبان میں چاہتے ہیں۔ انہیں بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال وہ یہ دیتا ہے کہ سیاست دانوں اور قانون کے ماہروں اور اخبار نویسوں کو یہ نہ کہنا چاہئیے تھا کہ جرمنی پر پچھلی جنگ عظیم کا پورا الزام نہیں لگایا جا سکتا دوسری قوموں کا بھی اس الزام میں ضرور حصہ ہے۔ بلکہ اخبار نویسوں کو کہنا یہ چاہئیے تھا کہ گزشتہ جنگ عظیم کا الزام سارا کا سارا دوسری قوموں پر ہے۔ جرمنی الزام سے بالکل بری ہے۔ گو یہ بات سچائی سے بہت دور ہے۔ لیکن انھیں ہر حالت میں اسی پر اصرار کرنا چاہئیے تھا۔

دراصل اس کا اصول یہ ہے کہ انجام اگر اچھا ہے تو اس کے حصول کا طریقہ خود بخود اچھا ہو جاتا ہے۔ اور جھوٹ ایک معاشری نقطۂ نظر کو حاصل کرنے کے لئے بلا تامل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کا نتیجہ لوٹ مار، بے انصافی، سیاسی کشمکش، زندگی کی غیر اطمینانی اور آخر کار جنگ ہے۔ جرمن قوم کی شکایتیں بجا ہیں، بجا تھیں، بجا رہیں گی۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ ان شکایتوں کا سچا پروپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا وہ بجائے ان کی حالت سدھارنے کے اسے اور ابتر کرتا گیا۔ انھوں نے اپنی قسمیں توڑیں معاہدوں کو پس پشت ڈال دیا، اور بے ایمانی کو اپنا اصل اصول قرار دیا۔ اس طرح دنیا نے ان پر بھروسہ کرنے سے انکار کر دیا اس غلط پروپیگنڈا سے خود انھوں نے اپنا ہی نقصان کیا اور بس۔

دستاویزات لکھی جاتی ہیں، افراد میں سمجھوتے ہوتے ہیں، ہم چک پر دستخط کرتے ہیں شہادت سننے کے بعد جج اپنا فیصلہ لکھتا ہے، عہدہ قبول کرتے ہوئے بعض فرائض اپنے ذمے لیتے ہیں۔ لیکن وقت پڑنے پر اگر ہم ان سب باتوں سے انکار کر جائیں اور ان کاغذات کو محض ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں تو بتائیے دنیا کیسے چلے۔ افراد سے بڑھ کر بین قومی معاہدوں کا یہی حال ہے۔ اگر ان کی قدر و قیمت گرا دی جائے اور انھیں بھی ردی کاغذ سمجھ لیا جائے تو پھر دنیا کی تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا۔ قسم توڑنا سب طرح کی خرابی، جرم اور گناہوں کی جڑ ہے۔ کوئی معاشری معیار اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک ہم بلا رکے اور رو کے سچائی پانے اور دینے کی ان تھک ترکیبیں نہ کرتے رہیں۔ انصاف ڈھونڈنا اصل میں سچائی کو ڈھونڈنا ہے۔ اور جس دن کسی قوم یا جماعت نے جھوٹ کو سچ کا سا فروغ دیا اسی دن سے اسی قوم کی تباہی شروع ہوئی۔

آج کل آزادی کا غل مچ رہا ہے۔ ہر شخص آزادی کا خواہاں ہے۔ لیکن آزادی پر بھی کچھ نہ کچھ بندشیں عائد ہوتی ہیں۔ اگر اسکیمیں بنانے کی آزادی اور عام اجازت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی سونے کی کانوں کے حصے بیچنے شروع کر دئے جائیں جن کا خیر سے وجود ہی نہ ہو۔ یا یہ اشتہار دیا جائے کہ گنے کا دھواں پھیپھڑوں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ اگر جلسے کرنے اور عام مجمع کرنے کی اجازت ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھا کر مقرر کر دینے کے لئے جلسے شروع کر دئے جائیں۔ اور اس غرض کے لئے انجمنیں بننے لگیں۔ ہڑتال کرنے کی آزادی سے یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ مزدور سرمایہ دار سے بگڑ کر کلیں توڑ پھینکیں یا اور پرزے بے کار کر دیں۔

لیکن ایک آزادی جس پر کوئی بندش نہیں۔ کم ازکم جمہوری ملکوں میں تو نہیں ہے۔ وہ آزادی۔ اخباروں کی آزادی اور اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہے۔ اسی آزادی کو اتنا آسان بنایا گیا ہے کہ اگر کوئی خطیب یہ کہنے کے لئے بھی کھڑا ہو کہ ہندوستان کی حکومت ملک کو لوٹ رہی ہے اور انگریز اپنی غرضوں کو حاصل کرنے کے لئے ملک کو برباد کر رہے ہیں تو بھی پولیس وہاں اس لئے نہیں بھیجی جاتی کہ خطیب کو ایسا کہنے سے روکے بلکہ اسی لئے کہ لوگوں کو خاموش رکھے تاکہ وہ خطیب کی تقریر کو اچھی طرح سے سن سکیں۔

پروپگنڈا کبھی اتنی خراب صورت اور معنی نہ اختیار کرلیتا اگر پروپگنڈا کرنے والوں سے یہ کہہ دیا جاتا کہ وہ اپنے نام اور دوسری شناخت کی چیزیں نہ چھپائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ جو جھوٹ پھیلانے والے ہیں نہ اتنے امیر ہوتے نہ اتنے بہادر اور نہ اتنے ہمت والے۔ اگر انہیں پوری روشنی میں عوام کے سامنے منہ در منہ جھوٹ بولنا پڑتا تو وہ ہمت ہی نہ کرتے۔ جھوٹ کا پروپگنڈا کرنے والا ہمیشہ تاریکی اور گمنامی پسند ہوتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔

عاصمۃ الرحمٰن

نئی کتابیں

(سلسلہ صفحہ ۷۵)

۱۵۔ فتح مصر (افسانہ) از محمد صادق حسین صادق ۴۲۶ صفحات

۱۶۔ قسمت کا شکار (انگریزی ناول کا ترجمہ) از پنڈت تیرتھ رام فیروز پوری ۳۰۴ صفحات

۱۷۔ تاریخ انجمن ہند اودھ (تعلقداران اودھ کی تاریخ) از شیخ صدیق احمد ۵۹۵ صفحات

۱۸۔ ادبستان دوسرا ایڈیشن (ادبی مضامین) از خلیقی دہلوی ۱۵۲ صفحات

۱۹۔ ہندوستان کی جڑی بوٹیاں از محمد عبداللہ ۵۱۲ صفحات

۲۰۔ نیا قانون انکم ٹکس از رام لال کمار بی اے، ایل ایل، بی ۱۲۵ صفحات

۲۱۔ مضامین اسلم۔ از ایم۔ اسلم ۲۰۸ صفحات

۲۲۔ نسخہ جات ہومیوپیتھی (دوسرا ایڈیشن) از کوشی رام ۳۰۲ صفحات

۲۳۔ جدید اردو شاعری (دوسرا ایڈیشن) از محمد عبدالقادر سروری پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۳۰۶ صفحات

۲۴۔ مجموعہ کلام شعرا کرام در شان اہلبیت علیہ السلام از حکیم سید ہاشم علی ۱۴ صفحات

۲۵۔ کام ورتی شاستر از پنڈت ٹھاکر دت شرما ۴۶۸ صفحات

۲۶۔ سفرنامہ مقامات مقدسہ از سید محمد جواد مہتمم تعلیمات نلگنڈہ ۱۶۰ صفحات قیمت عہ

۲۷۔ کلید عرائض نویسی (حصہ سوم) از دولت رام ستھی ۱۱۶ صفحات۔

۲۸۔ مسولینی کی آپ بیتی مترجمہ سید بادشاہ حسین قیمت عہ

۵۰۴ صفحات جلد

قدیم دراوڑی تہذیب

ایک عرصے تک لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستان میں تہذیب اور تمدن پھیلانے والی قوم آریہ ہے اور اس سے پہلے یہاں سیاہ فام وحشی لوگ بستے تھے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آریوں سے پہلے ہندوستان میں جو باشندے آباد تھے اور جو دراوڑی کہلاتے ہیں اس ملک میں اپنے تمدن کے گہرے نقوش چھوڑتے ہیں۔ یہ لوگ کسی زمانے میں پورے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے اور ان کی حکومتیں کافی مستحکم اور منظم تھیں۔ لیکن آریاؤں کے وحشی اور نیم متمدن گروہوں نے ان کو شمال سے جنوب کی طرف ڈھکیل دیا اور وہ یہیں آباد ہو گئے۔ اگرچہ یہاں بھی ان کو پوری طرح چین کبھی نصیب نہ ہوا اور شمال سے برابر حملے ہوتے رہے۔

یہ لوگ ٹامل، تلگو، کنڑی اور ملیالم زبانیں بولتے تھے اور یہ زبانیں اس وقت تک مروج ہیں۔ سب سے زیادہ قدیم ادب ٹامل زبان میں پایا جاتا ہے۔

دراوڑی لوگوں کے متعلق محققین میں زبردست اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ بحرِ روم کے ساحل سے سوپوٹامیا اور بلوچستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ قدیم ٹامل ادب سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں جسے ایک نامعلوم مدت گزری بحرِ ہند ایک بڑا برِاعظم تھا جو ایک زبردست طوفان کی وجہ سے غرقاب ہو گیا۔ عبرانی روایات کے طوفانِ نوح سے اس امر کی تصدیق اور تائید ہوتی ہے ماہرینِ علم طبقات الارض بھی اس بات سے متفق ہیں اور انھوں نے بہت سارے ثبوت دئے ہیں کہ قدیم زمانے میں آسٹریلیا سے آفریقہ تک خشکی کا ایک وسیع حصہ پھیلا ہوا تھا جو بعد میں غرق ہو گیا۔ اور اس طرح اس برِاعظم کی جگہ ایک بحرِ اعظم نے لے لی۔

آریاؤں کے ہندوستان آنے سے پہلے ہی دراوڑیوں نے قابلِ لحاظ تمدنی ترقیاں حاصل کر لی تھیں۔ ان کی قدیم ترین زبان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ٹامل ہے اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ و لسانیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگرچہ بعد میں سنسکرت سے ٹامل متاثر ہوئی لیکن حقیقتاً یہ سنسکرت سے بالکل آزاد ہے اور اپنی ایک علٰحدہ حیثیت رکھتی ہے اس کی صرف و نحو سنسکرت سے مختلف ہے اور اس کی قدیم ترین بلند پایہ کتب بھی سنسکرت الفاظ سے پاک ہیں۔

دراوڑیوں نے اپنے عہد میں عظیم الشان ترقیاں کی تھیں۔ کیا بہ لحاظِ فنونِ لطیفہ اور کیا بہ لحاظِ مذہب ـ حقیقت میں مذہب اور اس کے معتقدات ہی وہ چیزیں ہیں جن سے قدیم زمانے کی نسلوں کا بڑی حد تک ایک دوسرے سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ محققین نے ثابت کیا ہے کہ آریاؤں کے بہت سے دیوتا دراوڑیوں سے مستعار لئے گئے اور سنسکرت فلسفہ بھی ٹامل فلسفے سے متاثر ہوا۔ چنانچہ آریائی دیوتا مثلاً

ورونا اور رودرا دراوڑی دیوتا ہیں۔ اسی طرح کالی، شیو اور وشنو بھی دراوڑی ہی ہیں۔ عقیدہ تناسخ بھی آریاؤں کے پاس دراوڑیوں ہی سے لیا گیا ہے۔ لیکن باوجود دیوتاؤں کے عقیدہ رکھنے کے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی اقوام ایک قادر مطلق پر بھی یقین رکھتی تھیں۔

تمدنی لحاظ سے دراوڑیوں نے بہت ترقی کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے باضابطہ اصول حکومت ترتیب دئے تھے۔ اور ملک میں امن وامان قایم کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ ان کے ہاں آریاؤں کے برخلاف پجاریوں کے بعد بجائے جنگجو طبقے کے کسانوں کا نمبر تھا اور فوجی لوگ صناعوں سے کم تر تصور کئے جاتے تھے۔

آریہ جس وقت ہندوستان میں داخل ہوئے ان کی حالت نیم وحشیوں کی سی تھی۔ اور دراوڑی متمدن کہے جا سکتے تھے۔ آریہ تازہ دم شمال سے آئے تھے انھوں نے ہندوستان کی قدیم دراوڑی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مفتوحین کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا تاکہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکیں چنانچہ ویدوں، شاستروں اور خصوصاً منوسمرتی میں ان لوگوں کو بہت برا کہا گیا ہے اور ایسے احکام دئے گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ کسی قسم کا علم حاصل کر سکتے تھے اور نہ ہی انھیں دولت جمع کرنے کا حق تھا۔ وہ مجبور کر دئے گئے تھے کہ شہر یا گاؤں کے باہر زندگی بسر کریں اور فاتح قوم کی خدمت غلاموں کی طرح کریں ان کو چنڈال (ذلیل) اور داس (غلام) کا خطاب دیا گیا تھا اور کہنا چاہیئے کہ یہی جذبہ نفرت و حقارت چھوت چھات کی بنیاد ہے۔ وہ گاؤں کے کنوؤں سے پانی نہ ے سکتے تھے اور اگر ان کا سایہ کسی برہمن پر پڑ جاتا تو برہم اپنے آپ کو ناپاک تصور کرنے لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ خود ان لوگو میں احساس پستی پیدا ہو گیا اور یہ وہ نقصان رساں احسا ہے جو ساری قوم کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ وہ خو اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے اہل علم اور محقق بھی ابتدا میں ان کو ایک وحشی اور غیر متم قوم تصور کرتے تھے۔ لیکن جدید اکتشافات نے ان کی آنکھ کھول دی ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس زمانے میں دراوڑی تہذیب پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھ ہڑپا (پنجاب) اور موہنجدارو (سندھ) م محکمہ آثار قدیمہ نے بہت سی تحقیقات کی اور زمین کے دف سے جو چھپے ہوئے حالات معلوم ہوئے ان کی بدولت ہند کی تاریخ کئی ہزار سال اور پیچھے چلی گئی۔

حیدرآباد کے محکمہ آثار قدیمہ نے بہت سی چیزیں ز زمین سے نکالی ہیں جن سے دراوڑی تہذیب اور تم پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ذریعوں سے مع ہوتا ہے کہ دراوڑی قوم قدیم زمانہ میں مصر، شام ا چین سے تجارت کرتی تھی۔ چنانچہ بابل کے کھنڈروں بہت سی ہندوستانی چیزیں ملتی ہیں جن میں سے ایک کا نام "سندھو" ہے اسی طرح مصر کی محفوظ لاشیں ہند ململ میں لپٹی ہوئی دستیاب ہوئی ہیں جو اس بات ثبوت ہے کہ ہندوستان اس قدر قدیم زمانے میں جب یورپ سو رہا تھا اس قدر تہذیب یافتہ اور متمدن تھا۔

رابعہ بیگم

دانتوں کی اہمیت

" دہن ہی راہِ تندرستی ہے" اس کے لئے سب سے زیادہ توجہ درکار ہے۔ خراب دانت ہی پائریا اور دیگر امراض کا باعث ہوتے ہیں۔ تمام ڈاکٹر مریض کا علاج شروع کرنے سے پہلے مریض کے خراب مسوڑوں کا علاج کرتے ہیں۔

گٹھیا (وجع مفاصل) کی بیماری مسوڑوں کے مواد (پیپ) سے ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ خراب مسوڑوں سے پیپ نکل کر پیٹ میں جاتی ہے۔ جس سے ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے۔ بدہضمی کے علاوہ دیگر خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ مواد کے شکم تک پہونچنے گلے کے غدود خراب ہوجاتے ہیں۔

آج کل تو اکثر لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ گلے کے غدود کے پک جانے سے گٹھیا کا بخار آتا ہے جو دل کو بھی تباہ کردیتا ہے۔

ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ دانتوں کی خرابی سے بینائی میں نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ کبھی تو بصارت ہی جاتی رہتی ہے یا کمزور ہوجاتی ہے۔ دانتوں اور مسوڑوں کی بروقت خبرگیری سے بصارت دوبارہ حاصل ہوجاتی ہے۔ یا کم ازکم کچھ درست ضرور ہوجاتی ہے۔

اکثر لوگ دانتوں سے بے پروائی برتتے ہیں۔ اس لئے کم عمری ہی سے سلسلہ بول اور دیگر لاعلاج امراض میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔

حال ہی کا واقعہ ہے کہ سکندرآباد میں دو ایسے مریض میں نے دیکھے ہیں کہ دانتوں کی عدم توجہی کی وجہ سے اُن کے نیچے کے پورے جبڑے تباہ ہوگئے تھے۔

سوسائٹی میں منہ کی بدبو کو نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ دانتوں کی بیماری نہ صرف صحت ہی کو برباد کردیتی ہے بلکہ ساتھ ہی شکل و صورت کو بھی بدنما بنادیتی ہے۔

دانتوں پر توجہ کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔ تندرستی سے بہرور ہونے کے لئے ہر شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ دانتوں کو متعدد مرتبہ صاف کیا کرے۔ یوں تو بازار میں سیکڑوں منجن اور دانت صاف کرنے کے برش بکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کارآمد نہیں۔ جب تک کہ دانتوں اور مسوڑوں کے درمیان سے میل (Tartar) دور نہ کرسکیں۔ جب تک کہ دانتوں کے درمیان میل (شل سمٹ) رہے دانتوں کو صاف کرنے والے ادویات کچھ فائدہ نہیں پہونچاسکتے۔

دانتوں کی خرابی سے بعض دفعہ انسان کے

مسوڑے پلپلے ہو جاتے ہیں۔ اُن سے مواد نکلتا ہے۔ دانتوں کی جڑیں نکل آتی ہیں۔ مسوڑوں کی لکیریں مٹ جاتی ہیں۔ دانتوں کی چمک دمک غائب ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈا پانی پینے سے سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

بوسیدہ دانتوں سے تو اور ہی قسم کی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بیماری دانتوں کی تہہ تک جا پہونچتی ہے۔ اور جب دانت کی جڑیں خراب ہو جاتی ہیں۔ تو جبڑے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کو ان تکالیف سے بچنا ہو تو اس کو چاہیئے کہ شروع ہی سے دانتوں کی حفاظت کرے۔ اور اگر دانت زیادہ خراب ہو چکے ہوں تو پھر ان کو نکلوادیں۔ بعد میں سیکڑوں تکلیفیں اٹھانے سے بہتر ہے کہ خراب دانت ہی نکلوا دیں۔

(ترجمہ) **حفیظہ جمال**

بچّوں اور بچیوں کیلئے کتابیں

ادارۂ ادبیات اردو نے بچوں اور بچیوں کے لئے بڑی دلچسپ مفید، دیدہ زیب اور کم قیمت بالتصویر کتابیں شائع کی ہیں جن کا ہر اس گھر میں ہونا ضروری ہے جہاں بچے (ملک کے ہونہار اور مستقبل کے بنانے والے) پرورش پا رہے ہیں۔

۱۔ نظام الملک آصف جاہ اول از شیخ چاند ایم اے قیمت ۴ر
۲۔ سرسید احمد خاں از ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے اچ سی اس قیمت ۲ر
۳۔ سرسالار جنگ اعظم از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۶ر
۴۔ اعظم الامرا ارسطو جاہ از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی قیمت ۶ر
۵۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۶ر
۷۔ اردو دانی کی کتابیں دو حصے زیر نگرانی مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے قیمت ۲ر ۶ اور ۲ر ۶ پائی
۸۔ سوتیلی ماں از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسوان ادارہ قیمت ۴ر
۹۔ من کی بیتا از محترمہ لطیف بیگم صاحبہ ایم اے قیمت ۸ر
۱۰۔ پانی کی کہانی از فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۶ر
۱۱۔ آب دوز اور سرنگ از فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۶ر

سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیں

جلوہ کی گیارہ گھڑیاں

"مجھے جگتیال میں ایک عزیز کی شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ وہاں "جلوہ" کی رسم میں ایک گیت سنا جو جلوہ کی گھڑیاں" کے نام سے موسوم ہے۔ بجنسہٖ بھیج رہا ہوں۔"

پہلی گھڑی سر نہاو کر پھول پہنی جوڑا ڈال کر — تن سے خوشبو لاؤ کر پھول پہنی چندہ مشتری
دوسری گھڑی پاؤں پائے جنا گھنگرو جو بجتے رم جھما — گھنگرو کی صنعت کیا کہوں پاؤں پہنی چندہ مشتری
تیسری گھڑی ڈنڈ کے کڑے مانگی کے موتی یوں جڑے — چونسر سناراں یوں گھڑے اس مول میں کا بن دھری
چوتھی گھڑی ڈنڈ بازو بن' بازو سے اپنے کس بن — ریشمی ڈوریاں پہ گوہر نازک کمر میں شاہ پری
پانچویں گھڑی کان بالیاں ہسلیوں سے جھکتے موڑیاں — موڑیوں کی صنعت کیا کہوں کان پہنی چندہ مشتری
چھٹی گھڑی زر کی کمر' کر سبوں سے بیٹھے یہہ گوہر — ریشمی ڈوریاں گوری گوالن سانولی
ساتویں گھڑی سر تاج کر مانگ لائی پیشانی اوپر — کانوں میں کلساں پہن کر بدلائی چندہ مشتری
آٹھویں گھڑی شوآ و کر دہک دہک گلے سے لاو کر — لاو کر من بھاؤ کر خوش فور ہے خوش پری
نویں گھڑی پھول کی کلی کملائے جائے گی شاہ پری

. . . .

دسویں گھڑی مستی لگی' اماں سے بیٹی جا ملی — اماں نے رو رو یوں کہے بیٹی جو ہوگئی پرگھری
گیارویں گھڑی حیا سے لئے آئی پیا کے سامنے — دو ہاتھ جوڑ خدمت کری گوری گوالن سانولی

محمد جمال الدین حیدر

بچوں سے

دنیا میں جہاں خوشی ہے وہاں رنج وغم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ گرمی کی اتنی طویل تعطیلات کے ختم ہوجانے اور مدرسے کھل جانے پر ہم سب کتنے خوش تھے مگر ہماری یہ خوشی رنج میں تبدیل ہوگئی اور ہم نے اپنے ملک کی ایک قابل احترام ہستی کو کھودیا۔ ملک کا کون وہ فرد ہے جو لیڈی آمنہ حیدری کے کارناموں سے واقف نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ملک کی خواتین کو بیدار کیا اور ان میں شائستگی اور علم وادب کا ذوق پیدا کیا گو وہ اب اس دنیا میں نہیں مگر ان کے اعلیٰ کارنامے رہتی دنیا تک طبقۂ نسواں میں یادگار رہیں گے۔ ان کی زندگی سے ہر ایک بہن کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ وہ ایک بہترین ماں اور اپنے مصروف کار شوہر کی بھی خدمت گزار تھیں۔ انھیں مرتے دم تک اپنے چاہنے والے شوہر سر اکبر حیدری کا خیال رہا۔ اسی وجہ سے ہر ایک انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔



اور انھوں نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور جذبۂ خدمت گزاری کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں کافی شہرت حاصل کی۔ یہ ادارہ کے شعبۂ نسواں اور اسی طرح کی دوسری نسوانی مجلسوں اور انجمنوں کی سرپرست اور مدد و معاون تھیں۔ ان کی رحلت پر ہم اور خصوصاً طبقۂ نسواں جتنا بھی رنج کرے کم ہے۔ ہم اپنے ادارہ کے سرپرست سر اکبر حیدری کی خدمت میں اپنے گہرے رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے لیڈی آمنہ حیدری مرحومہ کی تصویر چھاپ رہے ہیں۔

معین الدین احمد انصاری

سر جگدیش چندر بوس

بنگال کے شہر ڈھاکہ کے قریب ایک گاؤں میں ۳۰ر نومبر ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام بھگوان چندر بوس تھا۔ جو فرید پور کے ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فرید پور میں کئی چوروں نے ملکر لوٹ مار شروع کردی۔ جس سے وہاں کے لوگ سخت پریشان ہو گئے۔ بھگوان چندر بوس نے بہ حیثیت ڈپٹی مجسٹریٹ وہاں پہونچ کر کئی چوروں کو گرفتار کیا اور ان میں سے ایک چور کو سخت اور طویل سزا دی۔ اس طویل قید کے ختم ہونے کے بعد چور نے مجسٹریٹ صاحب سے آکر کہا۔ "اب مجھے کوئی بھی نوکر نہ رکھے گا۔ ایسی صورت میں میں اپنی زندگی کس طرح گزاروں؟"

بھگوان چندر بوس نے اس مایوس و پریشان آدمی کو یہ کہتے ہوئے اطمینان دلایا کہ وہ گھبرائے نہیں اور وہ اسے اپنے پاس نوکر رکھ لیں گے۔ کام صرف اتنا ہوگا کہ روزانہ بچے کو مدرسہ سے لایا کرے۔

۱۸۶۹ء میں بھگوان چندر بوس ترقی پاکر علاقہ بردوان کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں اس علاقہ میں سخت قحط پڑا۔

آپ نے اس وقت رعایا کی بے حد امداد فرماکر اپنی رحم دلی و غربا پروری کا ثبوت دیا۔ قحط کے چند دنوں بعد بھگوان چندر بوس سخت بیمار ہو گئے۔ آپ کے ہونہار فرزند سر جگدیش چندر بوس ان دنوں کلکتہ میں زیر تعلیم تھے۔ بھگوان چندر بوس بیمار ہوکر کلکتہ چلے گئے۔ جگدیش بہت کم سن تھے۔ ایک روز جب جگدیش چندر بوس مدرسہ سے واپس آئے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے والد سے پوچھا کہ "آج میں نے مدرسہ سے واپس آتے وقت جھاڑوں پر ایک قسم کی کھیاں دیکھیں ان سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ کیا وہ آگ پر اڑتی ہیں؟" جگدیش کے اس سوال پر بھگوان چندر بوس بہت خوش ہوئے۔ اس لئے کہ اس سوال سے جگدیش کی کھوج کرنے والی طبیعت کا پتہ چلتا تھا۔ سولہ[16] سال کی عمر میں جگدیش سینٹ جیویر کالج میں شریک ہوئے۔ اسی کالج سے آپ نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر جگدیش کا ارادہ انگلستان جانے کا ہوا۔

بھگوان چندر بوس کی بھی یہی خواہش تھی لیکن جگدیش کے بڑے بھائی کی اچانک موت نے اس ارادہ کو اس سال پورا نہ ہونے دیا۔

تھوڑے دن بعد جگدیش چندر بوس کی ماں نے جگدیش سے کہا کہ وہ فوراً انگلستان چلے جائیں۔ رہا روپیہ کا سوال وہ اپنا زیور فروخت کرکے انھیں دیں گی۔

والدین کے اصرار پر جگدیش اسی سال انگلستان روانہ ہوئے۔

جگدیش چندر بوس نے انگلستان جاکر سب سے پہلے

ڈاکٹری کی تعلیم شروع کی۔ لیکن صحت خراب ہوجانے کے باعث آپ کو مجبوراً ڈاکٹری کی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ چار سال تک کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ ہندوستان واپس آئے۔ یہاں آپ کا شاندار استقبال ہوا۔

جس زمانے میں آپ لندن میں لکچر دے رہے تھے اس وقت آپ کی پروفیسر فاسٹ سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر صاحب اور جگدیش میں بہت محبت تھی جب جگدیش لندن سے ہندوستان واپس ہونے کا ارادہ کر رہے تھے اس وقت پروفیسر فاسٹ نے جگدیش کو لارڈ کیمبرے کے یہاں لے جاکر ان سے آپ کا تعارف کرایا اور ان سے ایک چٹھی لارڈ رپن کے نام دلائی۔ اس چٹھی کا مقصد جگدیش کو ہندوستان میں اعلیٰ عہدہ دلانے کا تھا۔

جگدیش ہندوستان آئے تو لارڈ رپن کے یہاں پہنچ کر یہ چٹھی انھیں دی۔ انھوں نے جگدیش سے اعلیٰ عہدہ دینے کا وعدہ کیا۔ چند دنوں بعد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے جگدیش کو طلب کیا اور کہا کہ پراونشیل سروس میں جو جگہ خالی ہے اگر آپ چاہیں تو آپ کا تقرر کردیا جائے گا۔ لیکن جگدیش نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا

چند دنوں بعد جب لارڈ رپن نے جگدیش کا نام گزٹ میں نہیں دیکھا تو فوراً ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن سے جگدیش کو جگہ نہ دینے کے بارے میں جواب طلب کیا۔

ڈائرکٹر نے جگدیش چندر کو طلب کیا اور لارڈ رپن کا خط بتلایا۔ جگدیش چندر بوس نے آخر کار اس عہدہ کو مجبوراً قبول کرلیا۔

آپ نے اس عہدہ پر تین سال تک نہایت ہی محنت و ایمان داری سے کام کیا۔ آپ کی کارگزاری کو دیکھ کر وہاں کے پرنسپل نے آپ کو شعبۂ سائنس کا صدر مقرر کیا۔ ان دنوں سائنس کی لیبرٹری نہایت خراب حالت میں تھی۔ جگدیش نے اپنی اعلیٰ قابلیت کے باعث تجربہ خانہ کو کیا سے کیا کردیا۔ پرنسپل صاحب آپ کے اس کام سے بہت خوش ہوئے۔

آپ نے ۱۸۹۵ء میں ایک مضمون "برق" لکھا جو جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شایع ہوا۔ بعد میں آپ نے "برق" پر کئی مضامین لکھے جو انگلستان کے سائنٹفک رسالوں میں بھی شایع ہوئے۔ ان مضامین کو رایل سوسائٹی نے بہت پسند کیا۔ اور آپ کو اسی سلسلہ میں "ڈاکٹر آف سائنس" کی ڈگری دی گئی۔

جگدیش چندر بوس نے اپنے تجربوں سے یہ ثابت کیا کہ درختوں میں بھی جان ہے۔ وہ بھی ہماری طرح سکھ دکھ محسوس کرسکتے ہیں۔ آپ کے ان تجربوں کو ہندوستان والوں نے تو مان لیا۔ لیکن لندن کے لوگوں نے نہ مانا۔

آپ نے اپنے تجربوں کو ثابت کرنے کے لئے

ایک مشین ایجاد کی جس کا نام "اسونٹ ریکارڈر" ہے اس مشین کو لے کر آپ لندن گئے اور وہاں کے لوگوں کے سامنے اپنا تجربہ ثابت کر دکھایا۔ پروفیسر سی پرڈ اور فرنس ڈاورن نے ان کے ایجادات کی بڑی تعریف کی۔

جب جگدیش امریکہ گئے تو وہاں پر بھی ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ آپ کو نیویارک کی اکاڈیمی آف سائنس نے بھی دعوت دی۔

ہندوستان آنے کے بعد بھی جگدیش کی کئی تقاریر متعدد مقامات پر ہوئیں۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کی جانب سے آپ کو سی، آئی، ای کا خطاب ملا اور اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء کے دربار میں سی، ایس، آئی کا اعزاز عطا ہوا۔

انگلستان سے واپس ہونے پر آپ کو بنگال گورنمنٹ کی جانب سے "نائٹ ہڈ" بنایا گیا۔

آپ کو ہندوستان کے آثار قدیمہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ آپ نے یہ شوق اپنی چھٹیوں میں پورا کیا۔

آپ نے اپنے تجربہ خانہ کی بنیاد سنہ ۱۹۱۷ء میں رکھی۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ کی نئی ایجاد کرس کوگراف نے بس کو پروفیسر والر نے ۔ ۔ ۔ پسند نہ کیا۔ لیکن آپ نے ایک قابل سائنس دانوں کی کمیٹی کے سپرد اپنی نئی ایجادات کر دیں اس کمیٹی نے ان ایجادات کی بہت تعریف کی اور لارڈ چمسفورڈ نے بھی ان ایجادات کی تعریف کی۔ وہ ایک سچے ملکی تھے اور ہندوستان کے لئے انھوں نے بہت کچھ کیا۔ اپنے والد کی طرح رحم دل تھے۔ غرض سر جگدیش چندر بوس ہزاروں خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ کے اچانک انتقال سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔

رام راج سکسینہ
(متعلم آل سینٹس ہائی اسکول)

خاموشی

۱۔ خاموشی تمام انسانی نیکیوں کی بنیاد ہے۔
۲۔ خاموشی دیوتاؤں کی صفت ہے۔
۳۔ خاموشی عقلمندی کی دلیل ہے۔
۴۔ خاموشی اہل اللہ، مستقل مزاج اور بہادروں کی نشانی ہے۔
۵۔ خاموشی اپنی معلومات میں اضافہ کرنا اور دوسروں کی نگاہ میں مدبر و محترم رہنا ہے۔
۶۔ خاموشی محبت پیدا کرتی ہے۔
۷۔ خاموشی رعب قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔
۸۔ خاموشی بے وقوف کے سوال کا ٹھیک جواب ہے۔

عثمان بن احمد الصعار

چھاپہ خانہ

چین کے باشندے حضرت مسیح کی پیدائش سے ۵۰ برس پہلے ہی اور ہندوستانی لوگ تیرہویں صدی عیسوی میں چھاپنے کے فن سے واقف ہو گئے تھے۔

متحرک ٹائپ (سیسہ وغیرہ کے ڈھلے ہوئے حروف) سے چھاپنے کی ابتدا یورپ میں ہوئی۔ متحرک ٹائپ سے چھاپنے کے فن کو سب سے پہلے ایک ڈلندیزی نے ایجاد کیا اور بعضوں کا خیال ہے کہ یہ کام جان گٹن برگ (Johann Gutenberg) نامی ایک جرمن شخص کا ہے، حقیقی موجد کوئی بھی ہو لیکن جرمن قوم نے سب سے پہلے اس کو رائج کیا۔

جان گٹن برگ پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کا ابتدائی پیشہ ہیرے اور جواہرات کا تراشنا تھا۔ اس فن میں اس نے مہارت حاصل کی اور شہرت پائی۔

ایک مرتبہ تاش کھیلنے کے دوران میں اس کو ویسے ہی ٹھپے بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے لکڑی کے ایک ٹکڑے پر چند نشانات کندہ کئے۔ پھر نشان کی ہوئی لکڑی کے سوا لکڑی کا باقی حصہ کاٹ دیا۔ ان نشانات پر روشنائی لگائی اور اس کو کاغذ پر چھاپا۔

اس نے یہ محسوس کیا کہ معمولی لکڑی اس کام کے لئے ناموزوں ہے۔ اس لئے کہ وہ جلد خراب ہو جاتی ہے لیکن بعد میں اس نے دریافت کر لیا کہ سیب کے درخت کی لکڑی اس کام کے لئے زیادہ کارآمد ہو سکے گی۔ اسی طرح اس نے ایک تصویر بنائی اور اس کے نیچے الفاظ لکھے۔ ان الفاظ کو کاٹ کر ان پر روشنائی لگائی اور کاغذ پر چھاپا۔ روشنائی کو گاڑھی اور زیادہ مفید بنانے کے لئے اس میں کالک اور تیل ملا دیا۔ گٹن برگ نے اپنی ایجاد کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد تمام واقعات اپنے دو دوستوں سے کہہ ڈالے۔ اس کے دوستوں نے اس کام میں بڑی مدد دی ان تینوں نے مل جل کر کئی مہینے کام کیا تو بمشکل ایک کتاب چھپ سکی جو ساٹھ صفحوں کی تھی۔

اس زمانہ میں کتابیں چھپا نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ صاحبان علم و فضل کتابیں صاف کئے ہوئے چمڑوں پر لکھا کرتے تھے۔ جب انھیں جان گٹن برگ کی اس ایجاد کی اطلاع ملی تو بڑا اچنبھا ہوا۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ اتنی قلیل مدت میں ایک کتاب کیسے چھپ سکتی ہے۔

گٹن برگ نے ان تجربوں کے بعد بائبل چھاپنا شروع کیا۔ اس نے پہلے لکڑی کی چھپائی کے سانچے بنائے جب چاقو سے ان سانچوں پر

حروف کندہ کرنا چاہا تو لکڑی ٹوٹ گئی اور اس کی ساری محنت اکارت گئی اس ناکامی کے بعد اُس نے غور کیا کہ اگر متحرک ٹائپ چھاپنے کے لئے استعمال کیا جائے تو بڑی سہولت ہوگی اور وقت بھی بچ جائے گا۔ اس نے لکڑی کے حروف کاٹے اور جماکر الفاظ بنائے، ہر نئے لفظ کے لئے حروف کی ترتیب نئے سرے سے ہوتی تھی' ان حروف کو روشنائی بار بار لگائی جاتی تھی اس لئے ان میں نرمی پیدا ہوگئی اور لفظ زیادہ واضح اور دیر تک قائم رہنے لگے۔

وہ اور اُس کے ساتھیوں نے اُس فن کو اور ترقی دی۔ مختلف طریقے اختیار کرنے کے بعد حروف کے دھاتی سانچے تیار کرلئے گئے اس کی مدد سے گٹن برگ نے بائبل پانچ برس کی کوششوں کے بعد سنہ ۱۴۵۵ء میں چھاپی۔

سب سے پہلے روم میں چھاپہ خانہ قائم ہوا اور سنہ ۱۴۷۰ء میں ایک فرانسیسی جنسن Jenson) نے وینس میں چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اس کے بعد فرانس، اسپین، ہالینڈ اور سوئزرلینڈ میں چھاپے خانے قائم ہونے شروع ہوئے۔ ولیم کیکسٹن (William Coxtan) نے سنہ ۱۴۷۶ء میں سب سے پہلے انگلستان میں چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اور ایک کتاب ٹرائے (Troy) کی تاریخ شائع کی اس کے بعد وہ لندن آیا اور وہاں بھی ایک چھاپہ خانہ قائم کیا اور "شطرنج کا کھیل" کتاب چھاپی سنہ ۱۸۰۰ء میں آہنی چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ جو چھاپہ خانہ کی پہلی ترقی پائی ہوئی صورت تھی اور سنہ ۱۸۱۴ء میں دخانی چھاپے خانوں کا رواج ہوا۔

موجودہ زمانہ میں تو چھاپنے کا فن بے حد ترقی کرگیا ہے۔ قدیم زمانے میں چھاپنے کا کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ جو بہت وقت طلب اور دشوار تھا۔ دخانی اور برقی قوت نے اس مشکل کو آسان کردیا اور اس فن کو سہل اور تیز رفتار بنا دیا ہے۔ اسی طرح چھاپنے کی مشین میں برابر تبدیلی اور ترقی ہوتی گئی۔

اس فن نے علوم و فنون کے پھیلانے میں اور جاہلیت کے ملیا میٹ کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ ہمارے زمانے میں کتابوں اور رسالوں کی اتنی زیادتی اسی فن کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ اگلے وقتوں میں جب کہ چھاپنے کا رواج نہ تھا، گنتی کی کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ تعداد میں کمی اور محنت میں زیادتی ہونے کی وجہ سے کتابوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے صرف دولت مند اشخاص اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ غریب اور مفلس جن کی تعداد ان مٹھی بھر امیروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، اس دولت سے محروم تھے اور جاہل اور ان پڑھ رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔

چھاپنے کے فن کی ترقی نے تھوڑی سی محنت صرف کرکے زیادہ کتابیں چھاپنے کے قابل بنا دیا۔

جس سے لاگت بہت کم ہوجاتی ہے۔ قیمت میں غیرمعمولی کمی ہونے سے کتابوں کی پہنچ غریبوں کے ہاتھوں تک ہونے لگی اور علم کی دولت انھیں بھی آسانی سے میسر آنے لگی۔

اگر اخبارات کو چھاپہ خانہ کی پیداوار کہا جائے تو نامناسب نہیں ہے۔ اخبارات ہر روز ہزاروں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور دنیا کے ہر حصے کی خبروں سے عوام کو باخبر رکھتے ہیں بہذب اور ترقی یافتہ دنیا کو چھاپہ خانے نے صرف اخبار کی ہی کے ذریعہ سے جتنا فائدہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔

محمد سید جواد

برکھا رت

برکھا کی اب رت ہی آئی ‎ ‎ کالی کالی بدلی چھائی
بجلی چمکی بادل گرجا ‎ ‎ ندی نالے ایک ہیں ہرجا
آتے نظر نہیں نور کے پارے ‎ ‎ دن میں سورج رات میں تارے
نظروں سے اب ہو گئے اوجھل ‎ ‎ سب کے اوپر چھا گئے بادل
مینہ نے بسائی اک نئی دنیا ‎ ‎ کیڑے پتنگے ہو گئے پیدا
خشک زمینیں مینہ کو ترسیں ‎ ‎ رم جھم رم جھم بوندیں برسیں
باغ اور بن کا جوبن نکھرا ‎ ‎ ناچے مور اور بولے پپیہا
اب ہے ہوا میں اچھی ٹھنڈک ‎ ‎ پانی پر ہیں بولتے مینڈک

دیکھیں چلو برکھا کی بہاریں
پانی کی ہیں زور پہ دھاریں

محمد عبدالسلام ذکی

روؤں نہ تو کیا کروں

ایک بچہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا رُو رہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ اے بچے تو کیوں روتا ہے؟ اس نے جواب دیا۔

ابھی پاپڑ والا باہر پاپڑ بیچ رہا تھا۔ میں نے اماں جان سے پیسہ مانگا۔ انھوں نے پیسہ نکالنے میں دیر کی اور پاپڑ والا چلا گیا۔ میں نے کئی دن سے پاپڑ نہیں کھائے تھے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ روؤں نہ تو کیا کروں

میں بوٹی کھانے کو مانگتا ہوں امی جان کہتی ہیں ابھی تو چھوٹا ہے۔ تیرا معدہ نازک ہے تو اس کو ہضم نہ کر سکے گا۔ میں ایک سیر کا باٹ تو اٹھا لیتا ہوں۔ لیکن بوٹی کھانے کو نہیں ملتی۔ پھر روؤں نہ تو کیا کروں۔

ابھی اور سنئے ابا جان روز انڈے تل تل کر کھا جاتے ہیں۔ مجھے کبھی کھانے کو نہیں دیتے۔ مانگتا ہوں تو ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ اسے بچے نہیں کھاتے۔ اس سے گرمی ہو جاتی ہے۔ میں ہمیشہ انڈے کو ترستا ہوں۔

اب روؤں نہ تو کیا کروں

بھائی جان کو بخار آیا تو اماں جان نے لیمونیڈ کی میٹھی بوتل منگوا دی۔ میں اس میں سے ذرا سا مانگتا ہوں تو مجھے کہہ دیتی ہیں کہ تجھ کو بخار تھوڑا ہی ہے اور مجھے نہیں دیتیں۔ اب میں روؤں نہ تو کیا کروں۔

آپا سے روز کہتا ہوں کہ پیپل کا پتہ توڑ کر مجھے ایک بین بنا دو۔ جب رحیم بین بجاتے ہیں پیں پیں کی آواز نکالتا ہے تو میرا دل بھی بجانے کو ترستا ہے۔ لیکن آپا جان بنا کر نہیں دیتیں۔

اب روؤں نہ تو کیا کروں

جب میں آنکھ مچولی کھیلنے جاتا ہوں تو حمید ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں وہ جھٹ سے دوسرے کو بتا دیتا ہے۔ ہمیشہ پکڑا جاتا ہوں۔ وہ مجھے چور بناتے ہیں۔

اب میں روؤں نہ تو کیا کروں

میں رات کو جب سوتا ہوں تو میری بہن جاگتی رہتی ہے۔ اور میرا تکیہ سر کے نیچے سے کھسکا لیتی ہے اور میرا سر رات بھر رگڑے کھاتا رہتا ہے۔

پھر روؤں نہ تو کیا کروں

دو سے دس تک پہاڑا مجھے فر فر یاد ہے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں دس تک نہیں سولہ تک یاد کرو۔ یاد کرتے کرتے میری کنپٹیاں تھک گئیں رٹتے رٹتے میں طوطا بن گیا۔ پھر بھی سولہ تک یاد نہ ہوا۔

اب روؤں نہ تو کیا کروں

میرے پاس حکایات شیریں نہیں ہے۔ دو چار روز تو مولوی صاحب ڈانٹتے رہے۔ اور روز آہستہ سے کان پکڑ کر بنچ پر کھڑا کر دیتے ہیں کلاس بدلنے تک مجھے کھڑا رہنا پڑتا ہے۔

پھر روؤں نہ تو کیا کروں

عید آرہی ہے۔ سب کے پاس ربڑ کے بوٹ ہیں۔ میرے پاس چمڑے کی جوتی ہے۔ سب کے پاس سلک کے کوٹ ہیں میرے پاس بس کھادی کی ایک قمیص ہے۔ سب کے پاس ستاروں کی ٹوپیاں ہے۔ میرے پاس صرف پرانی ایک کنٹوپ ہے۔ جس کا پھندنا بھی کل قیوم نے توڑ دیا ہے۔

حضرت اب روؤں نہ تو کیا کروں

محمد عبدالشکور (میٹرک نکرت)

بابا

مجھ کو ہیں پیارے بہت بابا مرے
کس قدر آرام ہے ان سے مجھے

اچھی سی اچھی کھلاتے ہیں غذا
کس قدر احساں ہے مجھ پر باپ کا

پالنے کے واسطے مجھ کو، کڑی
کرتے ہیں وہ نوکری سرکار کی

کام سے فرصت نہیں دن بھر انھیں
صبح سے لے شام تک محنت کریں

ناشتہ کھا کر جو وہ کالج کو جائیں
رات کو آکر کہیں آرام پائیں

جاگتے کٹتی ہے ان کی رات بھی
میں اگر بیمار پڑ جاؤں کبھی

ہوش اڑ جاتے ہیں جو آئے ہوئے
چار سو پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

ان کے بوتے سے ہو ممکن جس قدر
خرچ کرتے ہیں مری تعلیم پر

عید کو سلواتے ہیں کپڑے نئے
اور عیدی بھی ہیں وہ دیتے مجھے

کہتے ہیں پھر مجھ کو لپٹا کر گلے
سو برس تجھ کو خدا جیتا رکھے

لطیف النساء بیگم

نظام ساگر

مدتوں سے میرے دل میں یہ خیال' پیدا ہورہا تھا کہ حیدرآباد کا مشہور و معروف "تالاب" نظام ساگر" دیکھنے جاؤں۔ گو میں اس کو ایک بار دیکھ آیا تھا مگر دل میں آرزو دوبارہ سہ بارہ دیکھنے کی تھی اور میں موقع کا منتظر تھا۔

میرے چند مہمان لاہور سے آئے ہوئے تھے شاید انھوں نے اس کا نام سنا ہوگا وہ مجھ کو مجبور کر رہے تھے۔ کہ میں ان کو اس تالاب کے دیکھنے سے محروم نہ رکھوں اور دوسرے میرا بھی یہ فریضہ تھا کہ اگر کوئی غیر آئیں تو میں حیدرآباد کے مشہور مقامات انھیں دکھاؤں۔

جب دن مقرر کرلیا گیا اور وہاں ٹھہرنے کے لئے اجازت سرکاری بنگلہ کی لے لی گئی تو ہم جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اتوار کے دن جب ہم تیار ہو گئے تو بارہ بجے کے کھانے کے بعد موٹر میں اسباب باندھ کر کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب گھر سے نکلے اگرچہ وقت ٹھیک دوپہر کا تھا۔ مگر بارش کا موسم ہونے کی وجہ سے آسمان پر گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ جب ہم کوئی دس میل طے کرچکے تھے تو ہمیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہمارے ساتھ پانی کی دو صراحیاں تھیں یہ موٹر کی ہل چل کی وجہ سے ایک کا پیندا (نیچے کا حصہ) نکل گیا اب پانی بہنے لگا ہم نے موٹر روکی اور صاف کرنے کے بعد دوبارہ چلے ہم نے چار بجے تک کوئی تیس میل طے کرلئے تھے بارش کی وجہ سے سڑک خراب ہوگئی تھی اس لئے ہمیں موٹر آہستہ چلانی پڑی ساڑھے چار بجے ایک گاؤں اکنا پیٹھ ملا۔ جو دیکھنے سے بڑا معلوم ہوتا ہے اور وہاں ایک چھوٹا بازار بھی ہے۔ موٹر کو روک کر ہم نے وہاں کچھ چبینا اور مٹھائی خریدی۔ کوئی پانچ بجے وہاں سے چلے اور پچھتر میل طے کرنے کے بعد پوچارم نامی ایک تالاب پر پہنچے جو حیدرآباد کا ایک مشہور تالاب ہے سورج غروب ہورہا تھا۔ اور اس کا یہ منظر بہت اچھا تھا۔ اس تالاب کی ایک بہت بڑی چادر بنائی گئی ہے جس کے اوپر سے پانی گرتا ہے اور اتفاق سے بارش زیادہ ہونے کی وجہ سے چادر کے منظر کا نظارہ بہت ہی اچھا اور بھلا معلوم ہورہا تھا۔ تالاب کے کنارے ایک سرکاری بنگلہ بنا ہوا ہے اور اس میں بیٹھ کر ہی ہم تالاب کا پورا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ رات کا کھانا ہم نے تالاب کے کنارے کھایا۔ اس کے بعد ہم نے گراما فون لگایا۔ اور کوئی بارہ بجے تک سنتے رہے چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور تالاب پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی' پانی میں ہمارا عکس صاف دکھائی

دے رہا تھا۔ میں اب سونے چلا اور دوستوں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ چادر کے پانی کا شور بہت تھا۔ حالانکہ تین اور میرے ساتھیوں نے سونے کی بارہا کوشش کی مگر ہم کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسرے روز ہم اٹھے اور جونہی میں نے ایک چادر کی طرف نظر کی تو ایک اونچا مکان دکھائی دیا۔ بنگلہ کے مالی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اور ایک سرکاری ڈاک بنگلہ بنایا گیا ہے اب ہم نے یہ طے کیا کہ اس کو دیکھیں۔ خیر منہ ہاتھ دہونے کے بعد ہم اس بنگلہ پر پہونچے اور وہاں سے جب ہم نے نظر دوڑائی تو تالاب اور چادر کے اس وقت کے منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور کوئی دو گھنٹے تک اس کا لطف اٹھاتے رہے۔

نظام ساگر پوچارم سے چھبیس میل ہے گیارہ بجے دن کے ہم نے پوچارم کو خیرباد کہا۔ اور بارہ کے قریب ہم یلا ریڈی نامی ایک گاؤں میں پہونچے وہاں بھی ایک چھوٹا سا تالاب ہے بارش کافی ہونے کی وجہ سے پانی سڑک پر آگیا تھا۔ اور ہماری موٹر پانی کو چیرتی ہوئی بڑھ گئی۔ اور ہم ساڑھے بارہ بجے نظام ساگر پہونچے میں اور میرے دوست تالاب پر گئے اور تیرتے رہے ڈیڑھ بجے ہم ڈاک بنگلہ پہونچے جس کی عمارت دو منزلہ ہے اور بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ ہے کھانے کے بعد سو گئے اور چار بجے ہم ساگر منظر (Sagarview) پہونچے ایک اونچے ٹیلے پر چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہے۔ اس میں نظام ساگر کے بننے کے وقت کی تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ اس بنگلہ میں ہم نے شام کی چائے پی اور ایک میل سے مزید راستہ طے کرنے کے بعد اس کے دوسرے کنارے پر پہونچے وہاں بھی ایک چھوٹا بنگلہ ہے اور اس کے سامنے چمن بندی کی گئی تھی اور راستہ تالاب تک بنایا گیا ہے۔ وہاں ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ ایک میرے دوست شاعر تھے اور موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ شاعری ہوئی اس کے بعد گانا۔ دو بجے ہم گھر واپس ہوئے اور سو گئے۔

دوسرے روز صبح مجھے ایک دوست نے تالاب چلنے پر مجبور کیا۔ اور جب یہ طے پا گیا تو ہم صبح کی چائے کے بعد تالاب پر پہونچے۔ اور کوئی بارہ بجے تک پانی اور تالاب کے دیگر مناظر کا لطف اٹھاتے رہے پھر ڈاک بنگلہ پہونچے اور کھانے کے بعد دل کشا نامی ایک مقام پر جو نظام ساگر سے کوئی چھ میل ہے گئے۔ یہ مقام واقعی بہت اچھا ہے اور ایک مصنوعی جنگل دور تک چلا گیا ہے اور اس میں سے گزر کر ہم تالاب کے کنارے پہونچے۔ جنگل کے دونوں جانب پانی ہے۔ چائے پی اور کوئی آٹھ بجے شام تک اس جگہ کا لطف حاصل کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ گراموفون بھی بجاتے رہے۔ جب ہم واپس ہوئے تو چاندنی

چھٹکی ہوئی تھی۔ اور ہم نے آدھا راستہ تو موٹر میں طے کیا اور باقی پیدل۔ رات کے کھانے کے بعد میرے بعض احباب تالاب پر گئے مگر میں چونکہ نیند سے بیتاب ہو رہا تھا مجبوراً واپس ہوگیا۔

دوسرے روز ہم ایک بڑے حوض پر پہونچے نظام ساگر کا پانی اس میں جمع کیا جاتا ہے اور اس کی گہرائی دو فیٹ سے لےکر نو فیٹ تک ہے میرے بعض دوستوں کو تیرنا نہیں آتا تھا مگر وہ بھی کم پانی ہونے کی وجہ سے حوض میں اتر گئے بارہ بجے تک خوب تیرے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم کوئی دو بجے با دلِ ناخواستہ حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے۔ اس طرح حیدر لاہور کے دوستوں نے بھی ان تالابوں کی سیر کا خوب لطف اٹھایا۔

جتیندر پرشاد جوہر

اُستاد

وہ سیکل پہ آتے ہیں استاد اپنے
کڑے آج کل سے بھی تیور ہیں ان کے
بھیانک ہے کیا شکل دیکھو تو ان کی
چڑھا لی ہے عینک جو آنکھوں پہ کالی
ارے آج ماتھے پہ بل بھی پڑے ہیں
کھلے ناک کے نتھنے۔ تیور چڑھے ہیں
لئے ہاتھ میں بید کی ہیں چھڑی بھی
کرے خیر ہاتھوں کی اپنے خدا ہی
الٰہی سنائیں گے کس طرح ان کو
سبق بھولے جاتے ہیں ہولوں میں ہم تو
اتر کر وہ آتے ہیں سیکل سے اب تو
شکور ان کی کرسی کو جلدی جھٹک دو
ذرا دوڑ کر لانو ڈوبی بی جانی
کٹورے میں بابا کے ٹھنڈا سا پانی
چلو دوڑ کر لائیں دینی کتابیں
کسی طور سے بھائی جاں کو بلائیں
وہ آئیں تو آئے گی کم آج آفت
نہیں تو بس اب آگئی اپنی شامت
ہے غصہ ہی بے ڈھب کچھ حضرت کا اپنے
خدا سارے بچوں کو محفوظ رکھے

لطیف النساء بیگم

ہمّت

بلند ہمت انسان بہادروں کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا اثر مقناطیسی ہوتا ہے۔ لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں خواہ وہ موت کی طرف کیوں نہ لے جائے۔ جن لوگوں نے جراُت کی انھوں نے عالم شباب کو پہنچنے سے پہلے ہی دنیا کو ہلا دیا۔ یہ امر تعجب میں ڈال دیتا ہے کہ ہمت نے آغاز اور تحمل کے ساتھ نوجوانوں کو بھی کیا سے کیا بنا دیا۔ سکندر ۲۰ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا اور جب ۳۳ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا تو وہ ساری دنیا کو فتح کر چکا تھا۔ جولیس سیزر صرف نوجوان تھا لیکن اس نے ۸۰۰ شہر فتح کیے، ۳۰۰ قوموں کو مغلوب کیا، تین ملین آدمیوں کو شکست دی اور بہت بڑے مقرر اور سیاست داں کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ واشنگٹن ۱۹ سال کی عمر میں اڈجوٹنٹ جنرل بنایا گیا، ۲۱ برس کی عمر میں سفیر بنا کر فرانس روانہ کیا گیا اور ۲۲ برس کی عمر میں ایک کرنل کی حیثیت سے اس نے اپنی پہلی ہی جنگ میں فتح پائی۔ لافیئٹ کو ۲۰ سال کی عمر میں تمام فرانسیسی فوج کا جنرل بنایا گیا تھا۔ شارلے من ۳۰ برس کی عمر میں فرانس اور جرمنی کا مالک بن گیا تھا۔ گیلیلیو کی عمر بمشکل ۱۸ سال کی تھی جب اس نے پیسا کے گرجا میں حرکت کرنے والے شمع کو دیکھ کر اصول کشش کا پتہ چلایا۔ پیل ۲۱ برس کی عمر میں پارلیمنٹ کا رکن بن گیا۔ گلاڈسٹن ۲۲ برس کی عمر میں پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا اور ۲۴ سال کی عمر میں وزیر مالیہ کے درجہ کو پہنچ گیا۔ الزبتھ بیارٹ براؤننگ نے ۱۲ سال کی اور ڈاکی کونسی نے ۱۱ سال کی عمر میں یونانی اور لاطینی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ رابرٹ براؤننگ نے ۱۱ برس کی عمر میں شاعری شروع کی جو کم درجہ کی نہ تھی۔ کاؤلے جو وسٹ منسٹر ایبے میں آرام کی نیند سو رہا ہے ۱۵ سال کی عمر میں اپنی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ لوتھر کی عمر ۲۹ سال کی تھی جب اس نے بشپ کے دروازے پر اپنا مشہور مقالہ لٹکا کر اسے دعوتِ فکر و نظر دی اور پوپ کا مقابلہ کیا۔ نلسن نے ۲۰ برس کی عمر سے پہلے ہی برطانوی بحریہ میں لفٹنٹ کا درجہ حاصل کیا۔ جنگِ عظیم میں ٹرافالگر کے مقام پر جب اس کے کاری زخم لگا اور اس نے جان دیدی تو اس وقت اس کی عمر صرف ۴۷ برس کی تھی۔ کورٹیز نے ۲۶ سال کی عمر میں میکسیکو فتح کیا اور کلائیو نے ۳۲ برس کی عمر میں ہندوستان میں برطانوی اقتدار قائم کر دیا۔ ایک بہت بڑے فوجی کمانڈر ہانی بال نے اپنی ۳۰ سال کی عمر میں کینے کے مقام پر روم کی جمہوریت کے پرخچے اڑا دئے۔ نپولین کی عمر اُس وقت ۲۷ برس کی تھی جب اس نے اٹلی کے میدانوں میں آسٹریا کے تجربہ کار سپہ سالار کو

یکے بعد دیگرے شکست دی اور اپنی بہادری کا لوہا منوا کر چھوڑا۔

اسی طرح بعض لوگ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں بھی اسی قسم کی ہمت اور اولوالعزمی کے نمونے دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں مثلاً وکٹر ہیوگو اور ولنگٹن نے ۷۰ برس کی عمر میں عروج حاصل کیا۔ گلاڈسٹن نے ۸۴ برس کی عمر میں انگلستان پر اپنی حکومت کا سکہ بٹھایا اور اپنی علمی و ادبی قابلیتوں سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

شکسپیر کہتا ہے "جو شخص شہد کی مکھیوں کی ڈنک زنی کے خوف سے شہد کے چھتوں کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دیتا اس کو کیا حق حاصل ہے کہ شہد کی شیرینی سے اپنے لب و دنداں کو لذت یاب کرے" بہت سارے ہونہار نوجوانوں نے صرف اس وجہ سے کہ ان میں کام کے آغاز کرنے کی ہمت نہ تھی نہ اپنے مفید مطلب کوئی کام کیا اور نہ دنیا کے۔

فیثاغورث کہتا ہے "ایسا کام جس کو تم اچھا سمجھتے ہو فوراً کر گزرو اور اس کی مطلق پروا نہ کرو کہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ نہ کسی کی تعریف سے خوش ہو نہ کسی کی نکتہ چینی سے آزردہ"۔ وکٹر ہیوگو کہتا ہے "معمولی مشکلات کا مقابلہ کرکے انسان بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔ ایسے بہت سارے دھن کے پکے گمنام بہادر ملیں گے جنھوں نے خواہشاتِ نفسانی اور اخلاقی کمزوریوں کی یورش کا مردانہ وار مقابلہ کرکے اپنے آپ کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ دنیا میں ایسی بہت ساری شریفانہ اور حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں جن کو ظاہر بیں آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ شہرت کے انعام و اکرام سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ زندگی کے مصائب اور مایوسیوں کے میدان جنگ میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے والے ہیرو کہلاتے ہیں۔"

(ترجمہ)

حمید شاہد

محنت کا پھل

امجد علی خاں نے اپنے لڑکوں کی پرورش بڑے ہی ناز و نعم کے ساتھ کی تھی اور انھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا اس لئے کہ یہی وہ حامد اور محمود تھے جن کی پیشانی پر امجد علی خاں کی آیندہ نسلوں کے نام کھدے ہوئے تھے۔ حامد اور محمود ابھی چار پانچ ہی سال کے ہوئے تھے کہ ان کی "بسم اللہ" بڑی دھوم دھام سے کی گئی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے اچھے استاد اور اتالیق مقرر کئے گئے۔

چند سال گھر میں خانگی طور پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ دونوں اسکول میں داخل کر دئے گئے ابتدا میں ان پر والدین استاد اور اتالیق کی کافی نگرانی رہی۔ ایک تو خاندانی اثرات دوسرے بہترین تعلیم و تربیت کی وجہ سے حامد اور محمود مدرسہ میں کافی امتیاز رکھتے تھے۔ جماعت کے لڑکوں اور ہم چشموں میں ان کی کافی عزت ہوا کرتی تھی اساتذہ بھی انھیں عزیز رکھتے تھے کیوں نہ

رکھتے جب کہ ان کا شمار اچھے ہوشیار اور ذہین طالب علموں میں تھا۔ علاوہ ازیں ہر سال اعلیٰ درجہ کے ساتھ کامیاب ہوکر بڑی جماعت میں ترقی حاصل کیا کرتے تھے۔

یہ دونوں بھائی ایک ہی جماعت میں تعلیم پاتے تھے والدین اور اتالیق نے ہائی اسکول کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد ان پر نگرانی کم کردی۔ اب ان دونوں بھائیوں نے گھر والدین اور اتالیق کی جکڑ بندیوں اور دیکھ ریکھ سے کافی سے زیادہ آزادی حاصل کرلی تھی محمود گو حامد سے صرف ایک ہی سال چھوٹا تھا لیکن بڑا ہی عقلمند اور سمجھ دار واقع ہوا تھا وہ بڑے بھائی سے نہ صرف تعلیمی حالت میں اچھا تھا بلکہ محمود کے اخلاق اور کردار بھی حامد سے کہیں اچھے تھے۔ ادھر حامد روز بروز بری صحبتوں میں پڑ کر بدچلنی اور آوارگی کا شکار ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بری صحبت اور طبیعت میں آوارگی پیدا ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ حامد کو تعلیم اور مدرسے سے بھی نفرت ہوگئی اور وہ تعلیمی اوقات میں بھی مدرسے سے غائب ہوجانے لگا اساتذہ اور والدین نے اس کو بہتیرا سمجھایا منایا لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ سنتا بھی کیوں اب تو اس کو سینما، تھیٹر، ہوٹلوں اور دوسری بری چیزوں کی عادت پڑ گئی تھی۔ بری صحبتوں میں رہ کر اس کو تو میلوں کی سیر اور برے کاموں کے کرنے ہی میں عیش اور لطف زندگی حاصل ہوتا تھا۔"

محمود مدرسے کے اوقات کے بعد بھی اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہا کرتا تھا۔ حامد والدین اور استادوں کے برا بھلا کہنے پر مجبوراً اپنے نصاب کی کتابوں کی کچھ ورق گردانی کرلیتا یہاں تک کہ یہ دونوں بھائی میٹرک کے آخری امتحانی سال کی جماعت میں آگئے۔ محمود تو دوست احباب اور دیگر تمام مصروفیتوں کو ترک کرکے امتحان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ اس کو تو اپنی کتابوں کے مطالعہ اور امتحان کی تیاری کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ لیکن حامد کی آنکھوں کا پردہ اس وقت بھی نہ اٹھا اس کو دوست احباب کے ساتھ مارے مارے پھرنے اور لغویات نے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ وہ اپنی تعلیم یا امتحان کی تیاری کا خیال کرسکتا اس کی عقل پر تو پتھر پڑ چکے تھے بھلا وہ کیوں ان چیزوں کا خیال کرتا۔

رفتہ رفتہ دن گزرتے گئے یہاں تک کہ میٹرک کا سالانہ امتحان سر پر آگیا محمود کو اپنی محنت پر پورا پورا بھروسہ تھا کہ وہ ضرور کامیاب ہوجائے گا۔ حامد کو تو اس کی فکر ہی نہ تھی دونوں نے امتحان دے دیا۔ جب نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ محمود پوری جامعہ میں اول آیا ہے اور حامد امتحان میں پاس ہونا تو درکنار کسی ایک مضمون میں بھی پاس نہ ہوسکا۔ ایک طرف تو محمود کی شاندار کامیابی پر ہر شخص اس کو مبارک باد دے رہا تھا ماں باپ اور عزیز و اقارب خوشیاں منا رہے تھے دوست احباب اور اساتذہ اس سے بہت خوش تھے۔ دوسری طرف ہر ایک حامد کو لعنت ملامت کر رہا تھا ماں باپ تمام عزیز اساتذہ اور دوست احباب اس پر مضحکہ اڑا رہے تھے۔ دیکھا آپ نے حامد کا کتنا بڑا نقصان ہوا اور اس کو سب کی نظروں میں ذلیل و خوار ہونا پڑا محمود نے چونکہ دل لگا کر محنت کی تھی اس لئے اس کو اپنی "محنت کا پھل" ملا۔ بچو محنت ہی وہ شے ہے جو انسان کو دنیا میں باعزت اور ہر کام میں ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچاتی ہے اور ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ برباد کسی شخص کی محنت نہ

مرثیہ یمین السلطنۃ

ایک مرتبہ میرے ایک کرم فرما نظیری نیشاپوری علیہ الرحمہ کی ایک غزل کا یہ مصرع لے کر آئے۔

"حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم"

اور اس پر غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا کہ ایسے استاد کی ایسی غزل پر غزل لکھنا اپنے آپ کو ہنسوانا اور رسوا کرنا ہے مگر وہ برابر اصرار کرتے رہے مجبوراً غزل لکھنی پڑی۔ یہ غزل سرمہاراجہ یمین السلطنۃ کی کئی صحبتوں میں پڑھی گئی۔ ایک شب ایک قوال نے اسے گا کر سنایا۔ وقت کی بات تھی اس غزل کے ذیل کے اشعار سے سرمہاراجہ بے حد متاثر ہوئے۔

میانِ پختہ کاراں بود بحثِ خویشتن داری
نہ او ترکِ جفا کرد و نہ من ترکِ وفا کردم
شنید م نالہائے بے نوایاں زود می شنود
ذہین را بستم و نائے گلو را بے نوا کردم
مذاقِ دل نمی شد آشنائے تلخئ دوراں
بایں دارو ئے تلخش رفتہ رفتہ آشنا کردم

اور جب قوال اس مقطع پر پہونچا۔

بصحرائے عدم آباد بر ہر نقشِ پا محوی
بیاد کارواں ہائے گزشتہ نالہا کردم

تو مہاراجہ پر سخت رقت طاری ہو گئی اور صحبت میں سناٹا سا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ محوی صاحب آپ کا مقطع کیا ہے ایک پورا اور موثر مرثیہ ہے۔ گزشتہ عزیزوں دوستوں اور ملنے والوں کی صحبتیں اور جلسے یاد آ گئے اور دل بے قابو ہو گیا۔ آپ نے یہ شعر کس وقت لکھا ہو گا اور یہ اثر کس طرح پیدا کیا ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے جو اثر ہوا وہ جناب والا کے حساس اور پُر درد دل کا کرشمہ تھا۔ اس پر مراثی کے متعلق گفتگو ہونے لگی اسی ضمن میں میں نے عرض کیا کہ مرثیہ گوئی میں اہلِ عرب اہلِ عجم سے بہت بڑھے ہوئے ہیں اور ان کے بعض مرثیوں کے دو ایک شعر سنائے جو اس وقت مجھے یاد آئے۔ اور عرض کیا کہ فارسی ادب بڑی حد تک شخصی مراثی سے خالی ہے جناب والا کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ ہندوستان کے فرماں روا خاندانوں مثلاً غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں مغلوں میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ اور ایسے امرا گزرے ہیں جنھوں نے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شاعروں کی نہایت دریادلی اور فیاضی کے ساتھ پرورش اور سرپرستی کی تھی اور جس کی تعریف اور مدح میں ان کے سیکڑوں قصیدے موجود ہیں مگر ان کے مرنے پر کسی ایک شخص کے مرثیہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ سلطان محمود غزنوی کے درباری شعرا کی تعداد دو سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے مگر اس کے مرنے پر فرخی کے ایک مختصر مرثیہ کے سوائے کسی شخص کا مرثیہ نہیں ہے۔ مہاراجہ نے دریافت فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ میں نے بہ تفصیل وجوہ بیان کیے جو بخوف طوالت بطور اختصار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

اوّل:۔ یہ کہ قدیم شعرا اور خصوصاً وہ شعرا جو دوسرے ممالک سے اکثر درباروں میں داخل ہوتے تھے پیشہ ور شعرا ہوتے تھے یعنی ان کی معاش کا ذریعہ شاعری ہوتا تھا۔ مدح میں خوشنودی اور صلے کی امید ہوتی تھی اور اسی طمع میں وہ لکھی جاتی تھی۔ مردہ شخص سے اس کی کیا توقع ہوسکتی تھی۔

دوسرے:۔ یہ کہ امرا اور خصوصاً بادشاہوں میں باپ بیٹوں میں عموماً صفائی نہ ہوتی تھی اس لئے شعرا گزشتہ بادشاہوں کا مرثیہ لکھنے میں پس و پیش کرتے تھے۔

تیسرے:۔ یہ کہ مرثیہ بغیر دلی خلوص محبت اور بے طمعی کے نہیں لکھا جاسکتا اور یہ ظاہر ہے کہ کتنے آدمیوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔

سر مہاراجہ یہ سن کر بے اختیار بول اٹھے کہ ایسی حالت میں ہم جیسے لوگ کس شمار میں ہیں اور ہمیں کیا امید ہوسکتی ہے کہ ہمارے بعد ہمیں کوئی یاد کرے گا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب والا کی ہر دلعزیزی اور شعرا نوازی ایسی نہیں ہے کہ کوئی شخص خصوصاً طبقۂ شعرا آپ کو بھول جائے۔ فرمایا کہ آپ اپنی ذات سے اس کا وعدہ کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا اس شرط سے کہ آپ بھی اس کا وعدہ فرمائیں۔ فرمایا اگر میں آپ کے بعد زندہ رہا جس کی کوئی امید نہیں ہوسکتی تو میں بھی جیسا مجھ سے ہوسکا اپنا وعدہ وفا کروں گا۔ ہمارے باہمی وعدوں کی مختصر تاریخ یہ ہے۔ اس قرار داد کے مطابق جو رطب و یابس لکھا گیا ہے وہ نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔

محوی

مرثیہ سر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنۃ سورگ باشی

بند اوّل

بیک گردش تہ و بالا جہانست   زمیں گردندہ تر از آسمانست
بہ ہر خانہ ست برپا شور ماتم   بہ ہر جا زور مرگ ناگہانست
نہ در امن ست ز و درویش مسکیں   نہ از وے بے خطر شاہ شہانست
برابر میکند شاہ و گدا را   یکے پیشش قوی و ناتوانست
چہ جوئی راز مرگ زندگانی   کہ آں بالاتر از وہم و گمانست
ہزاراں موج و گرداب بلا ہا   بہ پیش کشتی عمر روانست
نہ دنیا ہست منزل گاہ مقصود   نہ آں جائے قیام جاودانست
چو از خاکست باید خاک گشتن   ہر انساں را کہ در ایں خاکدانست
چہ گویم با تو دل آزاری مرگ   کہ شب کوتہ دراز ایں داستانست
ز آزارش دل ناداں چہ نالی   کہ آں حکم خدائے انس و جانست

بہ حکمِ او سرِ طاعت نہادن — وجوبِ عام و فرضِ خاصگانست
چہ جائے سرزنش گر آشنائے — بہ ہجرِ آشنائے نوحہ خوانست
مگو آں مرد کافر، ایں مسلماں — کہ ایں علمِ خدائے غیب دانست
درِ دیر و کلیسا و حرم را — چو نیکو بنگری یک آستانست

مشو منکر کہ قولِ صادقانست
کہ بعدِ ایں جہاں ہم یک جہانست

(بندِ دوم)

مہاراجہ چو عزمِ آں جہاں کرد — جہانے در غمش آہ و فغاں کرد
گلستاں بود از وے منزلِ شاد — خزاں از رفتنش آں گلستاں کرد
لبے رخسارۂ گلگون و شاداب — غمِ او زرد تراز زعفراں کرد
مژہ در چشم نوکِ نیشتر شد — نفس اندر گلو کارِ سناں کرد
مدام اندر سفر یک کارواں داشت — چگونہ ایں سفر بے کارواں کرد
ہمیشہ در حضر با دوستاں بود — ندانم چوں کنار از ددستاں کرد
بہ اندازِ وفاداراں دل و جاں — نثارِ خدمتِ شاہِ زماں کرد
ز فطرت مایلِ بذل و سخا بود — بوسعِ خویش بذلِ بے کراں کرد
چو سرمستِ تصوف بود، شبہا — بخلوت میکشی با میکشاں کرد
بہارے بود بزمِ اہلِ فن را — چو او بگذشت ایں گلشن خزاں کرد
ہزاراں نونہالانِ دکن را — دبیر و شاعرِ شیریں زباں کرد
بہ ہر ملک ست شورِ نوحۂ او — نہ تنہا ماتمش ہبتدوستاں کرد
موحد بود، و از یزداں عجب نیست — اگر آتش براو باغِ جناں کرد
چو در دل دہشتِ روزِ جزا داشت — دعائے بخششِ او می تواں کرد

دعائے دردمنداں مستجابست
نزولِ رحمتِ حق بے حسابست

(بندِ سوم)

چہ می پرسی مہاراجہ چہا داشت — نشانِ مجد و آثارِ علا داشت

بجاں ہمدرد ہر یک آشنا بود چو در پہلو دلِ درد آشنا داشت
بایں دریا دلی بذل و سخاوت ز دستِ کوتہ خود نالہ ہا داشت
نمی داد ار بقدر ہمت خود ز روئے سایلِ مسکیں حیا داشت
عطایش پردہ پوشِ ہر خطا بود پئے ہر یک خطا چندیں عطا داشت
اگر خواہی بپرس از بے نوایاں کہ چون ست کرم بر بے نوا داشت
سخن را سر پرست و قدر داں بود نگاہِ نکتہ بیں، فکرِ رسا داشت
فدائے علم و شیدائے ہنر بود مذاقِ شعر از عہدِ صبا داشت
اگر از دل نہ در بندِ خدا بود چہ ساں الفت بہ مردانِ خدا داشت
بشکرِ نعمتِ الطافِ شاہی زباں وقفِ دعائے پادشا داشت
ز خودی بر دہم آہن دلاں را مگر خاصیتِ آہن ربا داشت
بسے چوں محویؔ آشفتہ خاطر بہی خواہ و محبِ بے ریا داشت
سپرہائے دعائے دردمنداں بہ ہر مشکل پئے ردِ بلا داشت
ولے در جنگِ مرگ زندگانی نہ حرز امن از تیرِ قضا داشت

زِ نیکی در جہاں نام و نشاں یافت
پس از مردن حیاتِ جاوداں یافت

(بند چہارم)

بہ ہر بزمیکہ ممتاز و متیں بود بہارا چو در آں کرسی نشیں بود
مدیحِ مصطفٰےؐ حمدِ خدا کرد گمانم ایں کہ از اہلِ یقیں بود
بہ آئینِ قدیمِ شہ پرستی بعزمِ راسخ و رائے رزیں بود
مروت بود گر شخص مجسم یمین السلطنۃ دست یمیں بود
دلِ بیمار۔ زومی یافت تسکیں بہ گفتارش شفائے انگبیں بود
بہ مہماں داری و بیکس نوازی امیرِ بے مثال و بے قریں بود
قبولِ دعوتش از ہر کہ و مہ سزاوارِ ہزاراں آفریں بود
خموشی، سرگرانی، کج ادائی چو خوباں ہر ادایش دل نشیں بود
بد و نیکش چو بر خلق است روشن چہ گویم آں چناں و ایں چنیں بود
بقولِ شہ بساطِ اولیں را یکے از مہرہ ہائے آخریں بود
ترا دانے کہ در جاں کندنی ہست دمِ آخر نگاہِ واپسیں بود
زمیں می خواست گیرد در کنارش فلک در فکرِ غسلِ آتشیں بود
زمیں مغلوب گشت و چرخ غالب چو برتر از زمیں چرخِ بریں بود
پئے ہر بادہ کش تا بود ساقی شرابِ خوشش دلی در ساتگیں بود

نہ آں بادہ ست در ساغر نہ ساقیست
اگر باقیست ذکرِ خیر باقیست

مسعود علی محوی

فنِ انشا پردازی

اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب۔ مضمون نگاری اور انشا پردازی کے راز اور فنِ تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں ہر قسم کے موضوعوں پر لکھنے کی ترکیبیں اور انشا پردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل۔ اوسط تقطیع ۱۱۶ صفحات قیمت (عہ)

تنقید و تبصرہ

سلطان محمود غزنوی ۔ جس کو مولوی محمد حبیب صاحب بی اے اکسن پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے انگریزی میں لکھا تھا اور اب اس کا ترجمہ ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کی طرف سے شایع ہوا ہے ۔ اس کے مترجم مولوی سید جمیل حسین صاحب ایم اے علیگ ہیں ۔ یہ کتاب کے ایک سو اٹھائیس صفحات میں چھپا ہے ۔ اور چار ابواب پر مشتمل ہے ۔ لیکن پہلا اور چوتھا باب اصل موضوع سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا اس لئے مصنف نے اس میں عام سطحی معلومات پیش کر دی ہیں ۔ درمیانی دو باب اصل کتاب کی جان ہیں اور ان میں حبیب صاحب نے سلطان محمود کے عہدِ حکومت، معرکہ آرائیوں اور کارناموں کی نوعیت اور اہمیت اور اس کی سیرت سے متعلق نہایت محنت سے معلومات یکجا کر دی ہیں

یہ پوری کتاب صرف اس نظریہ کی تبلیغ کے لئے لکھی گئی ہے کہ بعض ہندی مسلمانوں نے سلطان محمود کو اولیا اللہ کے مرتبہ پر پہنچانے کی جو کوشش کی ہے اس کو غلط ثابت کریں اور یہ دکھائیں کہ محمود ایک دنیادار بادشاہ تھا اور اس نے اپنے حملوں کا مقصد اسلامی خدمت نہیں بلکہ مال و دولت کی لوٹ قرار دیا تھا۔ انھوں نے اپنے دیباچہ میں اپنی صفائی کے لئے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ

"نہ معلوم مجھے اس عظیم الشان فاتح کے ساتھ کسی جذبہ ہمدردی نے متاثر کیا یا نفرت نے لیکن کچھ دنوں سے بعض ہندی مسلمانوں کا رجحان اس طرف ہو گیا ہے کہ محمود کو اولیاء اللہ کے مرتبہ پر پہنچا دیں ۔ ان حضرات کو البتہ اس کے کارنامے اور حکمت عملی کی تحقیق ناگوار گزرے گی میں اپنی صفائی میں صرف ایک بات عرض کرتا ہوں مذہبی اعتبار سے اسلام احکام قرآنی اور سنت رسول صلعم کی پیروی کا نام ہے ۔ اگر سلطان محمود اور اس کے عمال سلطنت صراط مستقیم سے بھٹکے تو یہ ان کی بدقسمتی ۔ ہم بتوں کے پرستار نہیں ہے۔"

اس صفائی اور معذرت کے باوجود اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض واقعات کے بیان میں مولف نے اتنے اجمال سے کام لیا ہے کہ بحث تشنہ رہ جاتی ہے اور پڑھنے والا واقعہ کے دوسرے پہلو سے واقف ہونے نہیں پاتا ۔ یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اس سے زیادہ مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے ۔ اور اچھا ہوگا خود حبیب صاحب شرح و بسط کے ساتھ سلطان محمود کی زندگی پر نظر ڈالیں ۔

تاریخ جنوبی ہند ۔ از مولوی محمود خاں صاحب محمود (مصنف تاریخ سلطنت خداداد میسور و نادل حیدر علی) یہ کتاب متوسط تقطیع کے چار سو بیس صفحات پر بنگلور سے شایع ہوئی ہے ۔ اور ایسے محققانہ انداز میں لکھی گئی ہے کہ اردو زبان میں اس پائے کی شاید ہی چند اور تاریخیں ہوں ۔ اس میں جگہ جگہ نقشے اور تصویریں بھی شامل ہیں جنوبی ہند سے مصنف کی مراد ہندستان کا وہ حصہ ہے جو موجودہ مملکت حیدرآباد کے زیادہ تر جنوب میں واقع ہے ۔ اور اسی حصہ کے ہندو مسلم سیاسی تعلقات کی پانچ سو سالہ تاریخ اس کتاب میں درج کی گئی ہے اس کے علاوہ زمانہ قدیم سے لے کر انگریزی قبضہ تک اس حصہ ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان کو بھی پیش کیا گیا ہے ! اس کتاب کی ترتیب پرانی طرز کی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جو معلومات درج ہیں وہ اتنی زیادہ اور ایسی اہم ہیں کہ آج تک اس حصہ ملک کی کوئی تاریخ اتنی پر از معلومات نہیں لکھی گئی ۔ اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کی تاریخ کیسی عظیم الشان کتابوں کا موضوع بن سکتی ہے ۔

جدید جغرافیہ پنجاب از سندباد جہازی ۔ یہ کتاب پنجاب کے مشہور مزاحیہ نگار کا نتیجۂ قلم ہے ۔ ان کی دوسری کتابوں کیلے کا چھلکا اور دو ڈاکٹر وغیرہ پر اس سے قبل تبصرہ کیا جا چکا ہے ۔ اس میں مولف نے بڑی جدت سے کام لیا ہے اور جغرافیہ کے نام سے پنجاب کی موجودہ سیاست پر ایک مزاحی

تبصرہ قلم بند کردیا ہے۔ مزاح کی آڑ میں سند باد جہازی صاحب نے بعض مشہور شخصیتوں کے حالات و خیالات پر آزادی سے حملے کئے ہیں۔ اور ہنسی ہنسی میں اکثر کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ زندہ شخصیتوں پر تنقید کرنے کا یہ بڑا اچھا طریقہ ہے اور اس کے ذریعہ سے تلخی پیدا کئے بغیر بہت کچھ اصلاح کی توقع ہے۔ لیکن اس قسم کی تحریروں میں ہمیشہ اس امر کا امکان رہتا ہے کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیالات اور توہمات کی بنا پر تصویروں کا ایک ہی رخ پیش کرے گا اور اپنے ہم خیالوں اور اپنی جماعتوں کے لیڈروں کی بیج سرائی سے باز نہیں رہ سکے گا خواہ وہ مدح سرائی مزاح کی آڑ ہی میں کیوں نہ کی گئی ہو۔ بہرحال یہ جدت ضرور قابل داد ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم

از ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری بی ایچ ڈی (لیسٹر) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علیگڑھ۔ یہ کتاب بڑی سائز کے پچاس صفحات میں چھپی ہے۔ اور اس میں سب سے پہلے وارد ھا اسکیم پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم اور نصاب اسلامیات جیسے موضوعوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی کش مکش کے دور میں اس قسم کے کتابوں اور رسالوں کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب ہی پر آئندہ ان کی حیثیت اور قوت کا دارومدار رہے گا۔

ڈاکٹر افضال صاحب نے کافی غور و فکر کے بعد اپنی تجویزیں مرتب کی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک آزاد اور زندہ قوم کے بنانے کے لئے اس کی تعلیم میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

اس اثنا میں وارد ھا اسکیم سے متعلق متعدد تنقیدیں اور تبصرے شائع ہوچکے ہیں۔ لیکن کسی نے اس تعمیری نقطۂ نظر سے اس اسکیم پر نظر نہیں ڈالی تھی جیسی کہ زیر نظر کتاب میں نظر آتی ہے اس میں وارد ھا اسکیم کے متوازی ایک دوسرا اسکیم پیش کیا گیا ہے۔ جس پر آیندہ ہر اس مجلس کو غور کرنا پڑے گا جو اہل ہند کے لئے کوئی مشترکہ نظام تعلیم مرتب کرنا چاہے گی۔ اس کتاب کا مطالعہ تعلیمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

سیاست

(علوم سیاسی و اجتماعی کا سہ ماہی رسالہ) مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ناشر عبدالقادر اینڈ سنس مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس صفحات ۱۴۰ قیمت سالانہ عہ روپے۔

اس رسالے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سیاسی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو صاف و سلیس زبان کے ذریعہ سے اردو داں طبقے تک پہنچایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوا ہے اسے اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس علمی پایہ کے مجلے کے اب تک دو شمارے چھپ چکے ہیں اور دونوں شماروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مدیر کو ترتیب و تالیف کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل ہے اور وہ اردو میں ایک ایسا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں جو یورپ کے علمی رسالوں کا ہم پایہ بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اہل اردو اس کی قدر کریں۔ جو لوگ اردو رسائل کے معیار کے شاکی رہتے ہیں اس رسالے کو پڑھ کر اپنے خیالات میں ضرور تبدیلی کرلیں گے۔

نظام ادب

ششماہی رسالہ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس صفحات ۱۰۵ قیمت سالانہ عال

نظام کالج حیدرآباد کا بہت قدیم تعلیمی ادارہ ہے اور یہاں سے اس سے قبل بھی رسالے شائع ہوچکے ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ جاری نہ رہ سکے اب پھر نظام ادب کے نام سے ایک ششماہی رسالہ جاری ہوا ہے جو وہاں کے اردو اور فارسی پروفیسر صاحبان کے زیر نگرانی شائع ہوا ہے۔ اس وقت اس کا پہلا شمارہ پیش نظر ہے جس کے مضامین اور نظمیں ایک اچھے مستقبل کا پتہ دے رہی ہیں۔ جس رسالے کی مجلس مشاورت میں آغا حیدر حسن صاحب جیسے مشہور و معروف ادیب شامل ہوں اس کی کامیابی اور ترقی میں کوئی شبہ کی گنجائش

نہیں ہونی چاہیئے، ہمیں توقع ہے کہ آغا صاحب ذاتی دلچسپی لے کر نظام کالج کے اس اردو ترجمان کو ضرور پروان چڑھائیں گے۔

اردو مثنوی کا ارتقاء از پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ایل ایل بی استاذ ادبیات اردو جامعۂ عثمانیہ۔ یہ کتاب بڑی سائز کے ایک سو تراسیں صفحات پر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اور دس ابواب پر مشتمل ہے اس میں اردو شاعری کی ایک اہم صنف مثنوی پر بڑی محققانہ اور شرح و بسط سے نظر ڈالی گئی ہے۔ پہلے بتایا گیا ہے کہ اصناف شعر میں مثنوی کا کیا درجہ ہے۔ پھر اردو مثنوی کے اولین نمونوں اور طویل تر مثنویوں کی تاریخ اور خصوصیتیں درج کی گئی ہیں۔ چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب میں قدیم مثنویوں کے سنہری زمانے کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ اور بیجاپور اور گولکنڈہ میں اس صنف سخن کو جس طرح عروج حاصل ہوا اور جو کوششیں کی گئیں ان سب پر محققانہ بحثیں کی گئیں ہیں۔ بعد کے تین باب مغلیہ عہد اور اردو ادب کے دور متوسط کی مثنویوں اور مثنوی نگاروں کے تذکرہ پر مشتمل ہیں ان میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں وہ اردو شاعری کی تنقید میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس دور سے متعلق اگر مولف اور زیادہ لکھتے تو بہتر ہوتا کیونکہ معلوم ہوتا ہے اس بارے میں انھوں نے بڑی تلاش و جستجو کی اور کافی معلومات حاصل کی ہیں۔

دسویں باب میں جدید دور میں مثنوی کی صنف کس طرح مستعمل ہے اور اس میں ترقی کے کیا امکانات ہیں ان کو بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ کتاب ایسی ہے کہ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ خود شاعروں کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

تاریخ ادب اردو :- اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی اگرچہ اس موضوع پر دو چار کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔ واقعہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اردو ادب کی کوئی تاریخ اس سے قبل لکھی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ کیونکہ گزشتہ ربع صدی میں اردو کتابوں، شاعروں اور ادیبوں سے متعلق ایسی نئی نئی معلومات حاصل ہوتی جارہی تھیں کہ اس وقت جو بھی کوشش کی جاتی وہ نامکمل رہتی۔ اب اردو کی گزشتہ تاریخ بڑی حد تک بے نقاب ہوچکی ہے۔ اور بہت سی ایسی کڑیاں مل گئی ہیں جن کی مدد سے ایک مربوط و مسلسل تاریخ مرتب کرلی جاسکتی ہے۔ اسی سہولت کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو نے زیر نظر تاریخ مرتب کرائی ہے۔ لیکن یہ عالموں اور فاضلوں کے لئے نہیں بلکہ عوام اور طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے تاہم جب تک کوئی مبسوط اور ضخیم تاریخ شایع نہ ہو یہی کتاب خواص و عوام سب کے لئے کام دے گی۔ یہ چھوٹی سائز کے ایک سو چھتیس صفحات میں چھپی ہے۔ اور تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے میں زبان اردو کی ابتدائی تاریخ اور اردو ادب کا قدیم دور پیش کیا گیا ہے جس میں قدیم مذہبی اور ادبی کوششوں کے علاوہ قطب شاہی عادل شاہی اور مغلوں کے عہد کے اردو ادب کو ولی اور ان کے معاصرین کی خدمات کے تذکرے تک اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دفتری معلومات :- از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس مصنف سرسید احمد خاں اور دادا بھائی نوروزجی وغیرہ۔ یہ چھوٹی سی کتاب ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سند یافتہ اصحاب بھی

جب کسی سرکاری دفتر کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہیں تو دفتر کے روز مرہ کے طریقہ کار سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کچھ ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی لیاقت اور اسناد پر فقرے کسنے کا موقع مل جاتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کی غلطیوں سے کسی کی قابلیت کے جانچنے کی کوشش ہی غلط ہے یہ ایسی باتیں ہیں کہ دفتروں میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد ایک معمولی فہم و فراست کا آدمی بھی ان سے بخوبی واقفیت حاصل کر لے سکتا ہے لیکن اس عبوری دور کی مشکلات پر قابو پانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی دفتر میں داخل ہونے سے پیشتر ہی یہ معلومات حاصل کر لی جائیں۔ اور اسی لیے زیر نظر کتاب مرتب کی گئی ہے جس کو ادارہ ادبیات اردو نے شایع کیا ہے۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ کئی جلدوں میں بھی یہ کتاب ختم نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن مولوی ظہیر الدین احمد صاحب نے اپنے طویل تجربوں سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اور ضروری معلومات کو نہایت مختصر سی جگہ میں پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں دفاتر کے عام طریقۂ کار سے متعلق پچیس اہم عنوانات پر معلومات قلم بند کی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں عام حسابی معلومات درج ہیں۔ اور تیسرے میں ملازمت سرکار عالی کے متعلق احکام و ضوابط ہیں۔ اس میں بھی تقریباً پچیس عنوانوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت اہم ہے اور سلیس و سادہ زبان میں اور دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف اُن لوگوں کے لئے ضروری ہے جو دفتر میں ملازمت کے خواہاں ہیں بلکہ ان کے لئے بھی جو اس وقت دفتر میں ملازم ہیں۔

اے گائیڈ ٹو انگلش ٹرانسلیشن (تین حصے)

مولفہ نقش عالمی صاحب مطبوعہ مارواڑی پریس اول ۲۵ صفحات ۵ر دوم ۸۰ صفحات ۸ر سوم ۹۶ صفحات عہ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا نسبتاً مشکل ہے اور مدرسوں کے طالب علموں کے لئے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن میں ان کی اچھی رہبری کی جائے۔ نقش عالمی صاحب خود استاد ہیں اور انھیں ترجمہ کرانے میں جن زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ان سے واقف ہیں اپنے تجربہ کو ملحوظ رکھ کر انھوں نے یہ کتابیں لکھی اور چھپوائی ہیں ان کے مطالعہ سے طالب علموں کو ضرور فائدہ پہنچے گا انگریزی کے ساتھ اردو الفاظ اور عبارتوں کو چھاپنے کے لئے جو اردو ٹائپ استعمال کیا گیا ہے وہ بہت بھونڈا ہے اور طالب علم اس کو دلچسپی سے نہیں پڑھ سکیں گے دوسری طباعت میں اگر اردو کے اچھے ٹائپ کو استعمال کیا جائے تو یہ عیب دور ہو سکے گا۔

متاع حمید

یعنی ابو المنصور حمید مرحوم بی اے عثمانیہ کے معاشی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ مطبوعہ عہد آفرین پریس صفحات ۱۶۳ قیمت درج نہیں۔

ابو المنصور حمید صاحب جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتوں میں سے تھے جو طالب علمی ہی سے مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اپنے حاصل کئے ہوئے علم کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے وہ معاشیات اور تاریخ کے طالب علم تھے اور ان کے مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر موت کا شکار نہ ہوتے تو اردو زبان کی اچھی خدمت کرتے، ان کے دوست مولوی عبد الوہاب صاحب بی اے بی ای کی یہ کوشش قابل داد ہے کہ انھوں نے اپنے دوست کے ان مضامین کو چھپوا دیا۔

"ق"

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰ ۸۹
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۸)
اگست سنہ ۱۹۴۰ء

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبد الحفیظ صدیقی بی' ایس سی
معین الدین احمد انصاری

جلد (۳) بابت اگست سنہ ۱۹۴۰ء شمارہ (۸)

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا



عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
سب رس معلومات کے مدیر



معین الدین احمد انصاری
بچوں کے سب رس کے مدیر

اداریہ

اس مہینے یعنی اگسٹ کی ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ تاریخوں کو ادارہ ادبیات اردو کے اردو امتحانات (اردو دانی، اردو عالم، اردو فاضل، خوش نویسی) پانچ مختلف مرکزوں حیدرآباد، گلبرگہ، پربھنی، کلیانی اور کشتگی میں لئے جا رہے ہیں۔

پہلا یعنی اردو دانی کا امتحان اُن لوگوں کے لئے قائم کیا گیا ہے جو مدرسوں میں تعلیم نہیں پا سکتے اور جو اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ بچوں کی الف، بے۔ کی کتابیں ان کے لئے ناموزوں ہیں۔ ایسے لوگوں کو پڑھا لکھا بنانے کے لئے ادارہ نے اردو دانی کی پہلی اور دوسری (دو الگ کتابیں) ملک کے مشہور ماہر تعلیم مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے کی نگرانی میں مولوی اظہر الدین صاحب مدرس عثمانیہ ٹرنینگ کالج بلدہ سے لکھوا کر شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں ممالک محروسہ سرکار عالی کے علاوہ برطانوی ہند میں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ مسٹر جے ایس ولیمس صاحب بی اے۔ سی ٹی صدر شعبۂ اردو کرانسٹ چرچ ہائی اسکول بمبئی نے لکھا ہے:۔

"دیکھ کر از حد خوشی ہوئی کہ کتاب مذکور نہایت محنت سے لکھی گئی ہے اور موجودہ تعلیمی اصولوں کے مطابق ہے۔ مبتدیوں کو لکھنے پڑھنے میں بھی سہولت ہوگی۔ اور میرا ارادہ ہے کہ اس کو اپنے اسکول کے نصاب میں داخل کروں۔ اور صوبۂ بمبئی کے دیگر یوروپین اسکولوں میں بھی اس کے پڑھائے جانے کی تحریک کروں۔"

اردو دانی کے امتحان میں (۱۶۵) امیدوار شریک ہوئے ہیں۔ جن میں متعدد عورتیں بھی شامل ہیں۔ بلدہ میں عورتوں کی تعلیم کے لئے ادارہ کے شعبۂ نسواں کی سرپرستی میں ایک مدرسہ تعلیم بالغات قائم ہے۔ جس کی نگرانی محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں کے ذمہ ہے۔ اس امتحان میں ہندو امیدوار بھی کثرت سے شریک ہیں۔ اس کا تحریری امتحان۔ بروز شنبہ ۱۷ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کو دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک لیا جائے گا اور زبانی امتحان دو سے ساڑھے چار تک۔

اردو عالم کے امتحان میں بھی ہندو اور مسلمان اور مرد اور عورتیں سب شریک ہیں۔ اس کے امیدواروں کی تعداد (۴۷) ہے۔ یہ امتحان جمعہ ۱۶ اگسٹ کو تین بجے سہ پہر سے شروع ہوگا۔ شنبہ اور یکشنبہ کو روزانہ دو دو پرچے ہوں گے۔ اردو فاضل کے امتحان میں بھی اسی طرح ہندو مسلمان اور مرد اور عورتیں شریک ہیں۔ یہ ۱۶ اگست جمعہ کو صبح نو بجے سے شروع ہو کر ۱۸ اگست کو ختم ہوگا۔

خوش نویسی کا امتحان جمعہ کو تین سے ساڑھے پانچ تک لیا جائے گا اس کے امیدواروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کا امتحان پہلی دفعہ لیا جا رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خطاطی اور کتابت کے امتحان میں کوئی امیدوار شریک نہیں ہوا۔

ان امتحانات کے سلسلے میں کشتگی کے مرکز سے اول آنے والے امیدواروں کے لئے دو علمدوست اصحاب مولوی احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری لنگسگور اور مولوی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر ہمسا گتیے نے بغیر کسی فرمایش کے تمغے دینے کا پیش کش کیا ہے۔ جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اردو پڑھنے لکھنے کا شوق بڑھانے کے لئے اس قسم کی ہمت افزائیاں بہت کامیاب ثابت ہوں گی۔

درخواست شرکت اور فیس داخل کرنے کی تاریخ گزر جانے کے بعد کئی اصحاب کی درخواستیں وصول ہوئیں جن کو افسوس ہے کہ قبول نہیں کیا جا سکا۔ ایسے امیدواروں کو آئندہ امتحان میں بروقت شرکت کی کوشش کرنی چاہئے۔ ۲۰ اگست کے بعد سے درخواست شرکت کے مطبوعہ فارموں کی پھر سے اجرائی شروع کی جائے گی اور فیس اور درخواست داخل کرنے کی تاریخ کا متعاقب اعلان کیا جائے گا۔ ان امتحانات کی مجلس انتظامی حسب ذیل اصحاب

متشکل ہے۔

صدر۔ مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ

نائب صدر۔ مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے (کنٹب) پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد

معتمد۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ال ال بی۔ اردو لکچرار جامعہ عثمانیہ

ارا کین

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مولوی غلام ربانی صاحب بی اے بی ٹی۔ پرنسپل چادرگھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد

مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے۔ ایچ سی یس۔ محاسب محکمہ ریلوے حیدرآباد۔

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ اردو لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن۔

مس تیبی سندی۔ بی اے (آنرز) لندن صدر مہتممہ تعلیمات حیدرآباد دکن

مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی (آنرز) بیرسٹرایٹ لا

مولوی ملا فخر الحسن صاحب بی اے۔ بی ٹی اردو لکچرار کلیہ تعلیم المعلمین حیدرآباد

پنڈت نرسنگ راؤ صاحب ایڈیٹر رعیت۔

ان امتحانات کی سندیں ادارۂ ادبیات اردو کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر کے دستخط سے اجرا کی جائیں گی اس وقت تک جملہ امیدواروں کے ہال ٹکٹ ان کے پتوں پر ارسال کر دیئے گئے ہیں۔ جن کو اب تک نہ پہنچے ہوں وہ دس اگست تک دفتر کو اطلاع دیں۔

ادارہ کے شعبے ادارۂ ادبیات اردو کا کام جن دس بارہ شعبوں پر منقسم ہے وہ برابر سرگرم کار ہیں سب رس میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ان کی تفصیلی رودادیں شایع نہ ہو سکیں۔

شعبۂ نسواں کا ایک جلسہ ۵ جولائی کو منعقد ہوا جس میں معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ کے علاوہ رابعہ بیگم صاحبہ سارہ بیگم صاحبہ بشیر النساء بیگم صاحبہ جہاں بانو بیگم صاحبہ اور لطیف النساء بیگم صاحبہ نے شرکت کی۔ مدرسہ بالغات جو ماہ تیر میں بند کر دیا گیا تھا اس کے دوبارہ کھلنے کی اطلاع دی گئی اور نئی میقات سے اردو دانی کے دوسرے حصے کی تعلیم کا آغاز کرنے کا تصفیہ ہوا۔ لیڈی حیدری مرحومہ کے انتقال پر اظہار ملال و تاسف کیا گیا اور انجمنان حیدرآباد کی طرف سے جو جلسہ منعقد ہو رہا تھا اس میں شعبہ کی طرف سے بھی قرار داد تعزیت روانہ کی گئی۔ اوائل اگست میں بیگم مہدی یار جنگ بہادر کی صدارت میں مدرسہ بالغات کی امداد کے لئے ایک کانسرٹ منانا طے پایا۔ چنانچہ اس کے جملہ انتظامات مکمل بھی ہو گئے تھے لیکن پھر جنگ کی وجہ سے اس کو ملتوی کر دینا پڑا۔ مجلس عاملہ کی رکنیت کے لئے مستعد اور کار پرداز خواتین کے انتخاب کے سلسلہ میں فاطمہ بیگم صاحبہ بنت غلام پنجتن صاحب کو شریک کرنے کی تحریک منظور ہوئی۔

شعبۂ زبان :- ۱۳ جون کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں پروفیسر ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر جعفر حسن، نواب مرزا سیف علی خاں صاحب، مولوی قاضی عبدالغفار صاحب اور ڈاکٹر راحت اللہ خاں معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ مندرجۂ ذیل تحریکیں باتفاق منظور کی گئیں۔

(۱) اس ادارے کی رائے میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی افادیت اور کارگزاری کو بڑھانے اور عوام کو اس کے کاموں سے زیادہ روشناس کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دارالترجمہ کے تیار کردہ تراجم پر تبصرے شائع کئے جائیں اس مقصد کے تحت دارالترجمہ سے اس کی مطبوعات طلب کی جائیں۔

(۲) مقامی اردو اخباروں میں عام طور پر صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے ترجمے میں یکسانیت نہیں پائی جاتی مناسب ہے کہ ایسی اصطلاحوں کے ترجمے کو معیاری بنایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مروجہ اصطلاحوں کو جمع کرنے کا کام ضیاء الدین انصاری صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔ مجلس میں ان پر غور کرنے کے بعد ان کی اشاعت عمل میں لائی جائے گی۔

(۳) دفتری اردو زبان کی اصلاح سے متعلق کافی مواد جمع

ہوجانے کے بعد اس پر غور کر کے مقامی جرائد کو متوجہ کیا جائے تا کہ صحیح معنوں میں عملی طور پر اصلاح زبان کی طرف قدم اٹھایا جاسکے۔

شعبۂ شعراء و مصنفین دکن :۔ ۲۹ جون کو اس کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ کے علاوہ نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر زور نے شرکت کی جسب ذیل امور طے پائے شعراء و مصنفین دکن سے دلچسپی رکھنے والے مزید اصحاب کو اس شعبہ کا رکن بنایا جائے قلمی یادگاریں جمع کی جائیں علمی و ادبی آثار کی حفاظت اور کتبوں کے لگانے کی طرف مزید توجہ کی جائے۔ دکن کے شعراء اور مصنفین کی اردو کتابوں کو اشاعت کی غرض سے منتخب کر کے صدر مجلس ادارہ میں پیش کیا جائے۔ مرقع نثر کی تکمیل کی طرف اصحاب متعلقہ کو توجہ دلائی جائے۔

دوسرے شعبوں کی رودادیں اور کتب خانہ سے متعلقہ عطیوں کا اعلان آئندہ شمارے میں درج رہے گا۔

ادارہ کی شاخیں یوں تو ادارہ کی جملہ شاخیں اپنے فرائض کو خوبی سے انجام دے رہی ہیں اور بعض نئے مقامات کی شاخوں کے قیام کی درخواستیں وصول ہو رہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ان سب کا تذکرہ یہاں نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ صرف پربھنی کی شاخ سے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد کی کوششوں سے اس شاخ کو چند اچھے علم دوست اصحاب مل گئے ہیں جو برابر سرگرم عمل ہیں۔ بالخصوص مولوی سید عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری و مولوی محمد فاروق صاحب اچ سی اس روم تعلقدار شاخ کے کاموں میں عملی اور گہری دلچسپی لے رہے ہیں چنانچہ ۱۰ رمئی کو ایک جلسہ مولوی سید عارف الدین حسن صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں ادارہ کی شاخ کے لئے حسب ذیل اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر ۔ مولوی محمد فاروق صاحب بی اے اچ سی ایس۔ **نائب صدر** مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے ال ال بی۔ **معتمد** حمید اللہ خاں صاحب شیدا **شریک معتمد** ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب۔ **کتب خانہ دار** مولوی سید عبدالرحیم صاحب **خازن** صالح بن محمد صاحب **اراکین** مولوی سید عارف الدین حسن صاحب مولوی ذوالفقار علی بیگ صاحب، مولوی عبدالرزاق صاحب مولوی مغل بیگ صاحب۔ یہ سب اصحاب پربھنی میں ایک اچھے دار المطالعہ کے قیام اور اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کی تیاری کے سلسلہ میں قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

"ادارہ"

اطلاع

جن خریدار اصحاب کے چندے ختم ہو گئے ہیں ان کو مطلع کر دیا گیا تھا مگر بعض نے اب تک کوئی جواب نہیں بھیجا۔ ایک ماہ اور انتظار کر کے ستمبر کا رسالہ ان کے نام ایک سال کے لئے وی پی کر دیا جائیگا امید کہ وہ وی پی حاصل کر لیں گے اور دفتر کو اخراجات ڈاک کا نقصان برداشت کرنا نہ پڑے گا۔

مہتمم مدیر سب رس

افتتاحی تقریر

"طلبہ کانفرنس صوبہ میدک کی صدارت سب رس کی مجلس ادارت کے ایک رکن معین الدین احمد انصاری نے کی تھی۔ چنانچہ ان کا خطبہ صدارت سب رس کے گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اس تقریر کا اقتباس شائع کیا جا رہا ہے جو نواب بہادر یار جنگ بہادر نے اس کانفرنس کا آغاز کرتے ہوئے کی تھی اور جس کو دکن نیوز نے محفوظ کر لیا تھا۔"

برادران عزیز مکرم! جب آپ نے طلبہ کانفرنس کی افتتاح کی خواہش کی تو میں نے خوشی سے قبول کیا۔ آپ مجھے ایک طالب علم کے سوا کچھ نہ سمجھیں۔ ہم سب طالب علم ہیں۔ ہر علم والے سے دوسرا علم والا زیادہ ہے۔ میں ہمیشہ ایک چیز کہتا رہا ہوں آج پھر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ امام فخر الدین رازیؒ کی لوحِ مزار پر ایک قطعہ لکھا تھا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں ؎

هرگز دلِ من ز علم محروم نہ شد — کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال درس خواندم شب و روز — معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اس جلسے کی صدارت میرا ایک بھتیجا کرے گا۔ ان کے والد ظہور الحسن (اللہ اس کو تقرب اعلیٰ عطا کرے) نے میرے قلب میں ایک دہکتی آگ روشن کر دی۔ وہ ایک شعلہ تھا مجسم شعلہ۔ ایک طوفان تھا سر سے پاؤں تک طوفان۔ اتنے بے قرار طبیعت آدمی شاید کسی نے اپنی عمر میں دیکھا ہو۔ اگر وہ رہتا تو اس کا نام سرِ فہرست رہتا۔ مرحوم ظہور الحسن مدنی نواب کا جب انتقال ہوا تو یہ بالکل بچے تھے۔ آج طلبہ کانفرنس کی صدارت وہ لڑکا کر رہا ہے جس کے باپ نے طلب علم میں اپنی جان دیدی۔ وہ یورپ جاتے ہوئے اجمیر شریف میں بنگلہ سے گر کر شہید ہوئے۔ آج اس کے فرزند کو اس مقام پر صدارت کرتے دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر مدنی نواب کا قلب کام کر رہا ہے۔ خدا کرے وہ اپنے نانا نواب رفعت یار جنگ مرحوم کی تربیت کا بہترین نمونہ ثابت ہو۔ میں آپ سب کو ایسے اچھے صدر کے ملنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ان کا خطبہ صدارت ہم سب کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ میں ان سے صدارت کی درخواست کرتا ہوں۔ ہمارا مستقبل تمام تر طلبہ پر منحصر ہے۔ ایک سوال میرے سامنے ہمیشہ پیش رہا ہے۔ جس کو آج کے صدر بھی اپنے خطبہ میں پیش کریں گے۔

میں ان طالب علموں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہوں کہ وہ ہماری مجلس میں طالب علموں کی حیثیت ہی سے شریک ہوتے ہیں۔

میں بہ مسرت تمام اور خدا کا نام لے کر اس کانفرنس کی افتتاح کرتا ہوں۔

بہادر یار جنگ

فریب

زر دار کہتا ہے میں غریب کی ذہنیت کو خوب جانتا ہوں۔
بادشاہ کہتا ہے میں ملکوں کی تاریخ بدل دینے پر قادر ہوں۔
شاعر سمجھتا ہے فطرت کے تمام اسرار اس کے سامنے عریاں ہیں۔
سنگ تراش اپنے آہنی قلم سے پتھر دل کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال دینے پر قدرت رکھتا ہے۔
جسے دیکھو وہ یہ جانتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے
پر جو جانتا ہے وہ یہ جانتا ہے
کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔

چغتائی

غزل!

اک برق تجلی نے میری تعمیر کے ٹکڑے کر ڈالے
تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے

پایا نہ تھا جب تک اس بت کو میں اپنی پرستش کرتا تھا
ہاتھ آ گئی جب اصلی صورت تصویر کے ٹکڑے کر ڈالے

بھولا ہوا جب تک تھا چپ تھا جب آ گئی اس کو یاد وطن!
بس ایک ہی جست میں قیدی نے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

غم میں مرا غمخوار آ ہی گیا رونے پہ اسے پیار آ ہی گیا
تدبیر نے میری قسمت سے تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے

افسانۂ غم کہنے کے لئے سوچے تو بہت کچھ تھے امجد
اک تیز نظر نے ظالم کی تقریر کے ٹکڑے کر ڈالے

امجد

گاؤں کو جاتے ہوئے

السّلام اے ہمنشیں اب گاؤں کو جاتا ہوں میں
شہر کے آباد ویرانے سے گھبراتا ہوں میں

رو رہی ہوگی کوئی معصوم میری یاد میں
ہو رہی ہوگی فضا مغموم میری یاد میں

لوگ دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ زہرا جبیں
کچھ دنوں سے کیا سبب ہے کس لئے اندوگیں

ماں نے لوگوں سے کہا ہوگا کہ یہ بیمار ہے
دل کی دھڑکن کا اسے کچھ روز سے آزار ہے

چومنے کے واسطے پھولوں سے قدموں کا شباب
کھیت کی مغموم راہیں ہوں گی وقفِ اضطراب

لے کے ہونٹوں میں مری شیریں ادا کے نام کو
شبنمیں آنسو بہاتی ہوں گی کرنیں شام کو

چومنے کے واسطے لچکیلی تانوں کی مٹھاس
ہو رہے ہوں گے در و دیوار غمگیں اور اداس

ہمنشیں پہنچوں گا جونہی سادہ کلیوں کے قریب
پھول کی مانند کھل جائے گی میری غم نصیب

آنکھ پُر نم اور دل میں آتشِ بے دُود ہے
دوست جانے دے مجھے اب روکنا بے سُود ہے

الطاف مشہدی (لاہور)

محسوسات

وہ داستانِ جو خونِ وفا سے لکھی گئی
تم سے سُنی گئی نہ مجھی سے کہی گئی

اے بے قرارِ شوق، مرے خوش نصیب دل!
دھڑکن کی آڑ سے تجھے آواز دی گئی

فردا کی فکر ہے نہ گزشتہ کا کوئی غم
اب بے خودی کا دور ہے وہ آگہی گئی

اس شوخ کو بٹھا کے تصور کی بزم میں
بے تابیٔ خیال کی تصویر لی گئی

کس کو خبر مریضِ شبِ غم نے کیا کہا؟
کروٹ کے ساتھ آخری ہچکی سُنی گئی

اُس جانِ آرزو کی ندامت بھری نگاہ
محشر میں دادخواہ کے ہونٹوں کو سی گئی

اے یادِ دوست! تیری نوازش کا شکریہ!
اک بے نوا کے واسطے تکلیف کی گئی

یہ زورِ برق و باد، یہ غمناک سی فضا
شاید کہیں بنائے نشیمن رکھی گئی

فریاد اے محبتِ مجبور کے خدا!
وہ کیا کرے کہ جس سے خوشی چھین لی گئی

بس وہ کہ تم کو سونپ دئے جان و دل تمام
تم وہ کہ تم سے مجھ کو تسلی نہ دی گئی

ماہرؔ ازل کے روز جو بٹنے لگے نصیب
قسمت میں میری مرگِ مسلسل لکھی گئی

ماہر القادری

غریب شاہ

وہ شہر کے قریب ایک ویران قبرستان میں رہا کرتا تھا۔ قطب شاہی عہد کے اس لاوارث شہر خموشاں میں، ایک ٹوٹا ہوا مقبرہ اس کی جائے پناہ تھی۔ لوگ اسے فقیروں کے ایک عام لقب "غریب شاہ" سے جانتے تھے۔

صدیوں کا اجڑا ہوا قبرستان یوں بھی ہیبتناک بن جاتا ہے، اس پر اضافہ یہ کہ اس کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی خبریں مشہور تھیں۔ کوئی اسے شیطانوں کا مسکن بتاتا تھا، اور کسی کو یہاں بھوت، پریت، جنات، چڑیل غرض ہر نظر نہ آنے والی مخلوق نظر آتی تھی۔

میں نے جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا، وہ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا۔ چہرے پر جھریاں پڑنے لگی تھیں اور منہ سے دانت جھڑ رہے تھے۔ رات کی سنسان خاموشی میں وہ راستے سے سوال کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ سوال دنیا کی ناپائیداری سے متعلق ایک گیت تھا، جسے اس کی درد بھری آواز کے اتار چڑھاؤ نے اور بھی موثر بنا دیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کشکول اور دوسرے ہاتھ میں "یکتارا" تھا جس کو وہ رہ رہ کر چھیڑتا جاتا۔ یکتارے کی ترنم ریزی، خود اس کی آواز کا درد، نظم کا موضوع اور رات کی سنسان فضا نے مل جل کر اس کے گیت کو ایک فردوسی نغمہ سا بنا دیا تھا۔ یہ مبالغہ نہیں کہ اس کی لے سن کر، بوڑھے، جوان اور بچے سب ہی پر ایک بے خودی سی طاری ہونے لگتی۔ عورتیں تو دور ہی سے اس کی صدا سن کر اپنے اپنے بچھونوں میں اٹھ بیٹھتیں اور نہایت عقیدت سے اس کا سوال سنتیں۔ جب تک اس کی لے سنائی دیتی، مائیں اپنے بچوں کو، بیبیاں اپنے شوہروں کو اور گھر کی دوسری تمام عورتیں ہر کس و ناکس کو خاموش رہنے کی تاکید کرتیں، غریب سے غریب عورت بھی، خدا جو مقدور دے، اس کو دینا، ثواب سمجھتیں گویا وہ اپنی آواز کے پیچھے ساری کمزوریوں کو کھینچ لیے جاتا تھا۔

اس کی عادت عجیب تھی کہ وہ پیسہ دھیلا لینے کے لئے اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا، جو کچھ دینا ہوتا اسے وہیں پہنچا دیا جاتا، جہاں یہ سوال کرتا کھڑا رہتا۔

اس طرح اس کو ہر روز اتنا مل جاتا تھا، کہ کسی اور فقیر کو مہینے بھر میں ہزار ہا منتوں اور سماجتوں کے بعد بھی مشکل سے ملتا ہوگا۔ گویا اس کا یکتارا اور اس کی آواز اس کا قیمتی سرمایہ تھے، جن کے بل بوتے پر وہ بےفکری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے پاس دو تین کتے چند بلیاں، اور کئی پرندے مثلاً چنڈول، بیا، بلبل اصیل مرغ وغیرہ، ہر وقت پلتے رہتے۔

اپنے مقام کو صاف ستھرا رکھنے اور دیواروں کو طرح طرح کے نقش و نگار سے رنگنے کا بھی اسے بہت شوق تھا۔ اس کے محراب ہر وقت گلدانوں اور تشتریوں سے سجے رہتے۔ اس ویران قبرستان میں اور اجڑے مقبروں کے درمیان یہ جگہ ریگستان کا مرغزار معلوم ہوتی تھی۔

غریب شاہ کہنے کو تو، پھٹے پرانے کپڑے پہنا رہتا، لیکن اس کا کھانا پینا، اور شوق ذوق، ایسے بہت سے خوش حال لوگوں سے بھی بڑھا چڑھا تھا، جو اس کو بھیک دیا کرتے تھے۔

اس کی افیون کا خرچ ہی روزانہ سات آٹھ آنے ہوتا تھا۔

ایک آدھ دفعہ کسی نے اس سے کہا تھا۔

" غریب شاہ، تم بھیک کیوں مانگتے ہو، صحیح سالم اور تندرست آدمی ہو، محنت یا نوکری کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے جواب دیا۔

" ہم محنت مزدوری کریں؟ بابا فقیر ہیں، کسی کے غلام نہیں، غلامی وہ کرتا ہے، جس کو بیوی بچے ہوں۔ ہم تن بہ تقدیر ہیں، بھیک لیتے اور دینے والے کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔ فقیر کی دعا رد بلا۔"

اس کو اپنے پیشہ کے احترام کا کس قدر خیال تھا، اس واقعہ سے ظاہر ہوگا کہ اس زمانے میں اطراف دور تک پانی کے نل نہیں تھے۔ کبھی کبھی بہشتی پانی نہ لاتا تو، عذاب نازل ہوجاتا تھا۔ لوگ غریب شاہ کی خوشامد کرتے، اور ایک ایک گھڑے پانی کے لئے ایک ایک آنہ نذر کرنے تیار ہو جاتے، لیکن وہ اصول کا فقیر، ٹس سے مس نہ ہوتا، نہ مروت سے اور نہ لالچ سے۔

غریب شاہ نے اپنی آواز اور یکتارے سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لئے پھیری کا جو وقت مقرر کیا تھا، وہ بہت موزوں تھا۔ وہ رات کے نو بجے اور بارہ بجے کے درمیان نکلتا باقی دن بھر میں کام کاج سے جو وقت بچا رہتا، وہ سونے اور جانوروں کی دیکھ بھال میں صرف ہوجاتا۔ یہی اس کے بڑے مشاغل تھے۔ کبھی کبھی، دمنے، پرانے قصوں کی کتابیں لے بیٹھتا۔ اس کے پاس "طلسم ہوش ربا" "الف لیلہ" "گل بکاؤلی" جیسی کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا، جن کو وہ دہرا دہرا کر پڑھتا تھا۔ غرض افیون کھانا، یکتارے پر گانا اور قصے پڑھنا اس کی لطیف دلچسپیاں تھیں۔ یکتارے پر گانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ وقت کے مناسب ایسا سر لاتا کہ منکر بھی سر ہلانے لگتے۔ قصے ہم نے اس سے بہت سنے، کبھی کوہ قاف کی پریوں کے کبھی سنگلدیپ کے راجوں کے، کبھی آسمانوں کے اور کبھی زمینوں کے، لیکن یہ قصہ جو اس نے ایک خاص حالت میں بیان کیا تھا، وہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔

ایک روز ہم، رات کا کھانا کھانے کے بعد ٹہلتے ٹہلتے غریب شاہ کے پاس گئے۔ وہ کچھ مغموم سا دکھائی دے رہا تھا، ہم کو آتا دیکھ کر، اسے کچھ خوشی ہوئی اتفاقی بات ہے کہ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہماری دلچسپی کے لئے، غریب شاہ ادھر ادھر کے قصے بیان کرنے لگا۔ قصہ گوئی پر اس کی طبیعت کو آمادہ دیکھ کر، ہم نے کہا۔

" غریب شاہ، آج کوئی ایسا قصہ سناؤ، کہ کبھی نہ سنا ہو۔ تمھارے جن، پری اور دیوؤں کے قصوں سے تو سیری ہو گئی۔"

" اس پر وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اپنی یکتارے جیسی گونج پیدا کرنے والی آواز میں کہنے لگا۔"

" کیا قصہ سناؤں۔" پھر تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ آج اپنے ایک ساتھی فقیر کا قصہ سناتا ہوں لیکن ذرا دردناک ہے۔"

" میں نے کہا۔ یہی چاہیے اس وقت طبیعت کچھ اسی طرح کی چیز سننا چاہتی ہے لیکن ہو سچ مچ قصہ۔"

" اچھا سنئے۔" تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

" اسی شہر میں ایک فقیر رہتا تھا...... وہ میرا ساتھی اور دوست تھا صورت شکل کا وہ بہت سیدھا تھا۔ اور نہایت جامہ زیب۔ ہمارے گروہ کے فقیروں کی عادت کے مطابق وہ رات کو دس گیارہ بجے "بستی" کو نکلتا اور یکتارے پر گا کر مانگتا۔ جب وہ "بستی" کو جاتا، تو زرد عمامہ سر پر سجاتا اور

بال بال کو سنوار کر ایسا معطر کرتا کہ قریب سے گزرنے والے سبحان اللہ پڑھنے لگتے۔ اس کو خدا نے ایسا گلا بخشا تھا کہ تان سین بھی سنتا تو سر دھننے لگتا۔ جب وہ سوال کرتا ہوا راستے سے گزرتا، تو ایسا معلوم ہوتا کہ ابدی نغمے زمین پر اتر رہے ہیں، راستہ چلنے والے اپنا کام چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔

ایک روز وہ حسب معمول "بستی" سے واپس ہوتے ہوئے سوال کرتا امیروں کے ایک محلے سے گزر رہا تھا، یہ سردیوں کی ایک اندھیری رات تھی، اور کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ راستے تمام سنسان پڑے تھے، اور مشکل سے کوئی یکا دکا راہ رو دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ ایک بڑی ڈیوڑھی کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے رکا، تو اسے ایک دروازے کے کھلنے کی آواز آئی، اور

"لیتے جاؤ، سائیں جی" کی باریک سریلی آواز کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت ہاتھ، دروازے سے باہر نکلا اس ہاتھ کی نزاکت اور اس کے نئے جوڑے کی چمک سے فقیر کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ فقیر کا یہ دستور تھا کہ، پیسہ دھیلا اسے وہیں پہنچا دیا جاتا، جہاں وہ کھڑا سوال کرتا تھا، لیکن اس وقت، اس ہاتھ کی نزاکت کو دیکھ کر، اور اس شیریں صدا کو سن کر، اس کے پیر ڈگمگا گئے اور اپنے اصول قاعدے کا اسے کچھ خیال نہ رہا سیدھا دروازے کی طرف بڑھا جوں ہی وہ دروازے کے قریب پہنچا، کمرے کی روشنی میں وہ بوٹا سا قد اور وہ من موہن مورت بھی اسے نظر آ گئی۔

فقیروں کو ایسے ہوش ربا نظاروں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے، لیکن وہ شکل و شمائل کچھ اور ہی چیز تھی۔ فقیر نے بھیک لینے جب ہاتھ بڑھانا چاہا، تو دل کی ایک بے تابو حرکت نے اس کا سر بھی جھکا دیا، اور اس نے بجائے پیسہ لینے کے، اس خوبصورت ہاتھ کا ایک بوسہ لے لیا۔

یہ حرکت اس سے سرزد تو ہو گئی، لیکن فوراً ندامت اور خوف نے اسے گھیر لیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا، اور شاید بھاگ جانا چاہتا تھا، لیکن بھاگنا اس کے بس کی بات نہ تھی تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ پٹ ذرا اور کھلا، اور اب وہ پورا جلوہ نظر کے سامنے تھا۔ وہ ہاتھ اندر کھنچنے کی بجائے اسی طرح رکا رہا۔ بلکہ اس میں فقیر کو ایک رعشہ کی سی کیفیت بھی محسوس ہوئی۔ فقیر ہاتھ کے اس اشارے کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پچھلے تجربوں نے اسے ہمت دلائی کہ "اب" یا "کبھی نہیں"۔ اس نے فوراً ایک جست کی اور کمرے کے اندر تھا۔

وہاں وہ حسین مورت ساکت و سامت کھڑی تھی۔ فقیر نے اسے چھو کر دبا کر اطمینان کرنا چاہا، تو اس میں ہلچل پیدا ہوئی۔ وہی ہاتھ بمشکل ہونٹوں تک اٹھا، اور خاموش رہنے کی تاکید ہوئی جن لوگوں کی پچھلی کوئی زندگی نہیں ہوتی، وہ بڑے منچلے بھی ہوتے ہیں اور جلد باز بھی۔ جلد بازی شیطانی کاموں میں رحمت ہوتی ہے۔ اسی لئے فقیر نے بغیر کچھ کہے سنے اپنا سر اس نازنین کے قدموں پر رکھ دیا۔ اس جسم کو حرکت ہوئی اور وہ دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی، ...... تھوڑی دیر بعد اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے دو نازک ہونٹوں سے یہ آواز نکلی جو ستارے کے بولوں سے زیادہ شیریں تھی۔

"اب جاؤ ــــ کل اسی وقت ...... ضرور"

فقیر کے لئے یہ سب اس قدر جلد جلد اور بے توقع واقع ہو گیا کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کی زبان سے، صرف اس نازنین کا آخری لفظ ہی بے اختیار نکل گیا۔

"ضرور۔"

وہ بادل ناخواستہ باہر نکلا۔ اور باولوں کی طرح اس ڈیوڑھی، اس کے درو دیوار اور راستے کو گھورتا، نہ معلوم کتنی ٹھوکریں کھاتا، اپنی قیام گاہ کو پہنچا۔

اس کی رات بڑی الجھن میں کٹی کہ آخر ان واقعات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ کبھی وہ اسے ایک خواب سمجھتا، اور کبھی دھوکا۔ غرض اُس اور یاس کے درمیان صبح ہوئی۔ اس کا دل تو بہت چاہتا تھا کہ کوئے دلدار کا ایک دفعہ طواف کر آئے کہ شاید ادھر سے کچھ اشارا مل جائے، لیکن اس نازنین کی قطعی ہدایت کے خیال نے اس کے قدم تھام لئے۔ دن بھر وہ بغیر کھائے پیے سوچتا پڑا رہا۔ کبھی اس نازنین کے حسن ملیح کا اور اس کے مرتبہ کا خیال کر کے، اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا کبھی اپنی اور اس کی حیثیت کا فرق اسے یاد آتا تو وہ اس پورے معاملہ کو ایک جال اور ایک دھوکا سمجھنے لگتا۔

بہرحال اسی ادھیڑ بن میں شام ہوئی، اور وہ ابھی سے جانے کی تیاری کرنے لگا صاف ستھرے کپڑے پہنے، ہر روز سے زیادہ خوشبو لگائی اور سر اور داڑھی کے بالوں کو سنوارا تین چار گھنٹوں تک اس مقام پر مارے مارے پھرنے میں جو خدشہ تھا وہ اگر نہ ہوتا، تو شاید وہ فوراً اس آستانے پر پہنچ جاتا۔ پھر بھی وہ دو گھنٹہ پہلے گھر سے نکل گیا، اور چکر ہی کاٹتا بارہ بجے کے قریب وہاں پہنچ کر، اس در سے تھوڑی دور دیوار کے سایہ میں دیوار ہی سے لگا تصویر بنا کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کی آمد و رفت اب ختم ہو چکی تھی، پھر بھی کبھی دکے راہ گیر کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی، تو زمین اس کے پیروں تلے سے نکل جاتی۔ [illegible] وقت گھنٹہ پل گھنٹہ گذر ہی گیا۔ آخرکار وہ در نہ کھلا فقیر اٹھ جانے کے خیال سے تھوڑی دیر اسی طرح

چپکا کھڑا رہا۔ پھر ایک چھوٹا سا خوبصورت سر باہر نکلا، تو وہ آگے بڑھا اور جلدی سے کمرے میں گھس کر کواڑ بھیڑ دئے۔

یہاں اسے کچھ اور ہی نقشہ نظر آیا۔ وہ نازنین سر سے پیر تک ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی آمادۂ سفر کھڑی تھی، ایک مختصر سی گٹھڑی اس کے بغل میں تھی جس میں اس کا اثاثہ تھا۔ فقیر کو دیکھتے ہی اس نے دبی آواز میں کہا۔

"چلو، جلد یہاں سے نکل چلو وقت کم ہے"

فقیر کے لئے یہ چیز بھی خلاف توقع تھی، اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کہاں؟"

جواب ملا۔

"یہاں سے دور، پھر باتیں ہوں گی"

اس جواب کے بعد کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں تھا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ اس نازنین نے کمرے کے کواڑ آہستہ سے بند کر دئے۔ اور رات کی تاریکی میں دونوں ایک طرف کو روانہ ہو گئے۔ فقیر کو اپنے گھر کی طرف رخ کرتے شرم آ رہی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں تھا۔ راستہ میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ اگر کوئی راہ گیر مل جاتا، تو وہ نازنین فقیر کے پیچھے اس طرح آ جاتی کہ تاریکی میں کوئی مشکل سے تمیز کر سکتا۔ اسی طرح وہ اس مقام کے قریب پہنچ گئے جہاں فقیر رہا کرتا تھا۔ فقیر کو جاڑا سا محسوس ہو رہا تھا، اس کے دانت بج رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب بخار چڑھ آئے گا۔ بدقت تمام اس نے زبان کھولی۔ اور پوچھا "کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟"

"تمہارے مقام کو" نازنین نے بے تکلف جواب دیا۔

"لیکن وہ ......" فقیر نے عذر کرنا چاہا۔

"اس وقت تو وہی سب کچھ ہے' پھر دیکھ لیں گے۔"

تھوڑی دیر میں وہ فقیر کے اجڑے مقام تک پہنچ گئے۔

ہر طرف پرسکون سناٹا طاری تھا' لیکن فقیر کا دل جذبات کے طوفان میں تھپیڑے کھا رہا تھا۔ جب وہ دروازے کا قفل کھولنے کے لئے بڑھا تو قفل کی آواز بھی اس کے دل کی دھڑکن تیز کر رہی تھی۔ بہرحال دروازہ کھلا' اور وہ نازنین کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ اور کواڑ بند کردئے پھر اس نے بتی جلائی۔ کمرہ روشن ہونے کے بعد نازنین نے کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی اور سب سے پہلی بات جو اس کی زبان سے نکلی یہ تھی کہ

"کس قدر خاموش مقام ہے۔ ایسا جیسا ہم چاہتے تھے۔"

اپنا برقعہ اتارے بغیر ہی وہ ایک طرف بوریے پر بیٹھ گئی۔ فقیر کو بدحواسی میں دری بچھانے کا تک خیال نہ رہا۔ حیرت میں کبھی وہ اس حسن کی دیوی کو اور کبھی اپنے اجڑے شبستان کو دیکھتا تھا۔ آخر اس نے ہمت کرکے کہا۔

"آپ کے نازک پیروں کو یہاں تک آنے میں بہت اذیت ہوئی۔"

"آرام کا خیال ہی ہوتا تو گھر سے نکلتی کیوں۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی' سو تمھاری صدا میں مل گیا۔ اسی کے پیچھے کھنچ کر آرہی ہوں۔ آگے خدا جو دکھائے۔"

"یہ آپ کی عنایت ہے۔"

"فقیر نے لجاجت سے کہا۔

"یہ مقام تو اچھا ہے .... لیکن یہاں' اس شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں اپنی کہانی تو فرصت سے کہوں گی۔ اب وقت نہیں گنوانا چاہئے۔"

تھوڑی دیر سوچ کر اس نے پھر کہا۔

"بمبئی سنتے ہیں بڑا شہر ہے۔ پھر یہاں سے بہت دور بھی ہے۔"

فقیر بچپن میں ایک دفعہ گھر سے بھاگ کر بمبئی جا چکا تھا کچھ دن محنت مزدوری سے بسر کرنے کے بعد گھر کا آب و دانہ اسے کھینچ لایا تھا۔ وہ نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ اس نے جواب دیا۔

"بڑا غدار شہر ہے .... وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا' میں بچپن میں اسے دیکھ چکا ہوں۔"

"بس وہی ہماری پناہ گاہ ہے۔ میرے ساتھ کچھ روپیہ اور اپنا زیور ہے۔ تھوڑے دن گزر ہی جائیں گے۔ پھر خدا رزاق ہے۔"

روپیہ اور زیور کا نام سن کر' فقیر کو اور بھی اطمینان ہوا۔ اب وہ دوزخ میں بھی جانے کے لئے تیار تھا۔ یہاں شہر میں اس کا تھا ہی کون' جس کو چھوڑنے کا اسے غم ہوتا۔ نوجوانی' یار جانی' روپیہ' زیور اور بمبئی کی سیر۔ مزے کا سماں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس نے کہا۔

"اگر ہم صبح یہاں نہیں کرنا چاہتے' تو وقت نہیں کھونا چاہیے۔ اب دو بج چکے ہوں گے۔ صبح گاڑی چھوٹتی ہے ..... لیکن سواری؟"

"مل جائے تو اچھا ہے' نہ ملے تو فکر نہیں۔ آخر یہ پاؤں ہیں کس روز کے لئے آزادی کے راستے میں تھکان بھی راحت ہے۔"

یہ طے ہوتے ہی فقیر نے جلدی جلدی اپنا اسباب سمیٹا اور کام کی چیزوں کو گٹھڑی میں باندھ لیا۔ کچھ بچا کھچا روپیہ جو ایک کونے میں گاڑھ رکھا تھا' نکال کر وہ بھی رومال کے پلو میں باندھ لیا اور تیار ہو گیا۔

اس نازنین کی اسے فکر تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اس کو سواری بھی مل سکتی تھی۔ کیونکہ کئی جھٹکے والے اس کے شناسا تھے، لیکن اس وقت ان کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے وہ پا پیادہ روانہ ہوئے۔

جب وہ اسٹیشن پہنچے ہیں، تڑکا ہو رہا تھا۔ گاڑی کے آنے تک، دونوں ایک گوشہ میں چھپے بیٹھے رہے۔ آخر گاڑی بھی دَن دَن کرتی آگئی، نیقر نے پہلے اس نازنین کو زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا۔ پھر خود آپ، دوسرے ڈبے میں جا بیٹھا اس طرح یہ جوڑا بھاگنے والوں کی جنت کی طرف روانہ ہوا۔

ریل کو بمبئی پہنچنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ چند گھنٹوں میں وہ وہاں اتر گئے اور آبادی سے دور، ایک اجڑی بستی میں چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔

وہ نازنین جو نیقر کے ساتھ بھاگ آئی تھی، اس ڈیوڑھی کی پروردہ لڑکی تھی بیگموں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اس کا طرز، بات چیت کا انداز منجھ گیا تھا۔ اس نے سن شعور سے لے کر بھاگنے کے روز تک، کبھی اچھا سلوک نہیں دیکھا تھا اسے روپیہ پیسہ ملتا تھا، لیکن آزاد زندگی جو ایک نوجوان عورت چاہتی ہے اس سے وہ محروم تھی اسی لئے بھاگ نکلنے کے لئے موقع کی تاک میں تھی۔ لیکن مشکل اس بات کی تھی کہ بکس جائے تو کہاں جائے۔ فقیر کا سوال، وہ اکثر سن چکی تھی۔ اور سچ پوچھو تو، اس پر لٹو ہو گئی تھی، لیکن فقیر کی اس روز کی جراُت نے اس کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اور اس نے سوچا کہ جب آزاد ہونا ہی ٹھیرا تو فقیر کا ساتھ بھی کیا برا ہے۔ پھر یہ فقیر شکل نوجوان تھا اور لڑکی کی عمر بھی سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ جوانی دیوانی مشہور ہے۔ گھر کی روز روز کی بدسلوکیوں نے، اسے یہ بھی سوچنے کا موقع نہ دیا کہ وہ جس کے پلے پڑ رہی ہے، آخر وہ کس قماش کا آدمی۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مرد ہے، نوجوان ہے، اور طرحدار ہے۔ پھر جادو کی آواز بھی رکھتا ہے۔ عورت فلسفی نہیں شاعر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو تصفیہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔

فقیر کی اول اول کی گرمجوشیوں نے، اس نازنین کے دل سے گھر کا غم بھلا دیا۔ وہ اب آزادی اور زندگی کا لطف اٹھا رہی تھی۔ فقیر کو چین کی زندگی میسر آئی، تو وہ بھی عاقبت کا خیال خدا کو سونپ کر، مزے سے دن گزارنے لگا۔

لیکن اس طرح زندگی کب تک نبھی ہے۔ آمدنی کوڑی کی نہیں، ٹھاٹ امیروں کا سا۔ رفتہ رفتہ ان کا جمع جتھا کم ہونے لگا، فقیر کو جب اس کی فکر ہوئی، تو ہاتھ پاؤں ہلانے کی بجائے، الٹا، اس نازنین سے الجھنے لگا۔ کئی دفعہ جھڑپ ہو گئی لیکن وہ محبت کی ماری اپنا ہاتھ کبھی نہیں روکتی تھی۔ اس پر بھی فقیر کو قناعت نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ ٹھیرا آزاد منش، چھیلا، جہاں گرد بارہ گھاٹ کا پانی پیا ہوا۔ ایک عورت کی محبت اور آرام کی زندگی بھی اس کی عادتیں نہ بدل سکی۔ آخر ایک رات جب وہ نازنین میٹھی نیند سو رہی تھی، اس نے اس کا سارا بچا کھچا زیور سمیٹ لیا، اور اسے سوتا چھوڑ کر، اپنے شہر کی راہ لی۔ لیکن یہ اس کی جوانی کی بھول تھی اس وقت اس بے مہر کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وہ بے کس، جس نے اس کی خاطر سارا دھن من لٹا دیا، ایک اجنبی بستی میں، کس کی ہو کر رہے گی۔ جوانی کے نشے اور دل کے کھوٹ کے سبب اس نے اس کی اور اس سے بڑھ کر اس کے محبت بھرے دل کی کچھ قدر نہ کی۔ اور ٹھکرا کر چلا گیا۔ .... لیکن اب ! ..... اب وہ اسے بہت یاد آتی ہے۔ پر کیا کر سکتا ہے .... اب ایک جگہ

بیت چکا ہے۔"
یہ کہتے کہتے غریب شاہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اب بارش بھی تھم چکی تھی، اور میرا حلق بھر گیا تھا، اس لئے میں یہ کہتا ہوا اٹھا، اور گھر کی راہ لی۔
"غریب شاہ یہ قصہ سب قصوں سے بڑھ گیا۔ اب رات بہت ہو گئی۔ چین سے سو رہو۔"

عبدالقادر سروری

غزل

سارے جہاں کو بھول جاؤں یاد فقط وہی رہے
دل ہو غموں میں شاد کام لذتِ زندگی رہے
عشق سے خوں ہو دل مگر لب پہ دعا یہی رہے
کشمکشِ حیات سے تیرے مریض چھوٹ جائیں
عشق کی نامرادیاں ہیں مری کامیابیاں
ہو نہ وفا سے بدگماں اچھا نہ سن مری فغاں
ہو گئے سب سے بے خبر ہے وہ دل اور نہ وہ نظر
ہاں پھر اسی طرح ذرا سامنے آ نقاب اٹھا
ہجر کے غم فنا ہوئے کاہشِ شوق مٹ گئی
راحت و رنج کی حدیں دور ہوں یا ملی رہیں

ہوش رہے نہ زاہدہ اور نہ بے خودی رہے
ہوش کے ساتھ ساتھ اگر تھوڑی سی بیخودی رہے
میری خوشی ہو پائمال اس کی خوشی خوشی رہے
فکر یہ ہے کہ دل رہے اور نہ درد ہی رہے
تو نہ ستم سے باز آجائے کہ زندگی رہے
میں ہوں اسی میں شادماں جس میں تری خوشی رہے
قید جو تھے تو تھے رہا چھٹ کے تو قید ہی رہے
زورِ شباب ہو فزوں حسن میں دلکشی رہے
اب یہ دعا ہے عمر بھر عالمِ بے خودی رہے
دل میں ترا خیال ہو اور نظر پھری رہے

وقتِ اخیر زاہدہ آنے کا ہے یہ مدعا
چاہتے ہیں کہ بعدِ مرگ حسرتِ زندگی رہے

زاہدہ خاتون

(مرسلہ مولانا عبدالماجد دریابادی) بیگم علیق الزماں صاحب (لکھنؤ)

ندی کنارے

اسی ندی کے کنارے رینی پر ان ہی شفاف لہروں کی سطح پر ان ہی صنوبر کی ٹہنیوں پر ایک ایسی الم انگیز داستان لکھی گئی ہے جو آج بھی گاؤں کے بچے جوان اور بوڑھے کی زبان سے دہرائی جا سکتی ہے۔ کئی دنوں پہلے کی بات ہے۔ اسی ندی کے کنارے ایک خوبصورت بستی آباد تھی جس نے گھٹتے گھٹتے معدوم ہو کر گاؤں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اُس وقت کا حکمران ایک قدیم وضع کا رحم دل انصاف پسند ہونے کے علاوہ مدبر بھی واقع ہوا تھا۔ ہمیشہ اس کے دل میں پرجا کی بہبودی اور بھلائی کا خیال بندھا رہتا تھا، اس کے عہد میں گاؤں کا ہر طبقہ خوشی و خرمی کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا آبادی کے ایک کونے میں کسانوں کا خوشحال گروہ آباد تھا جو اپنے چوپایوں کی نگہداشت اور کھیتوں کی تیاری میں ہمہ تن مشغول رہتا تھا۔ بدھوا نامی کسان ان سب کاشتکاروں کا بزرگ اور سردار مانا جاتا متمول ہونے کے علاوہ پٹیل پٹوار لوں تک اس کی رسائی تھی۔ تنگو اس کا اکلوتا لڑکا تھا جس کو وہ جان کے برابر عزیز رکھتا تھا۔ تنگو بچپن سے ہی آزادانہ زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس کے باپ نے گائے بکریوں کی رکھوالی کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ چوپایوں کو لے کر ندی کنارے چلا جاتا اور سورج کے ڈوبنے تک ادھر اُدھر کھیلوں میں لگا رہتا۔ تنگو کو ندی کنارے بہت سے ہم عمر لڑکے لڑکیاں کھیلنے کے لئے مل جاتیں۔ اُسے ایک غریب کسان کی لڑکی بھدرا کے ساتھ کھیلنے کی عادت سی ہو گئی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ پانی بھرنے ندی کے کنارے آیا کرتی اور سارا دن وہ تنگو کے ساتھ کھیل کود میں لگی رہتی دونوں مل کر ندی کے کنارے ریت کے گھروندے بنا کر کھیلتے۔ پھر خود ہی روٹھ کر ایک دوسرے کے گھروندے توڑ ڈالتے، پانی اچھالتے اور مختلف سمت منہ پھلائے دور جا بیٹھتے۔

تنگو کبھی بھدرا کو مغموم دیکھ کر بے چین سا ہو جاتا اپنے حرکات پر پشیمان ہو کر دل میں کہنے لگتا، میں نے ناحق بھدرا کا گھروندا بگاڑ دیا۔ اور اسے برا بھلا کہا اس پر پانی اچھالا مجھے اب چل کر اس سے معافی مانگنی چاہئے۔ نہیں، نہیں، یہ میرا قصور نہیں پھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگتا۔ میں بھدرا سے کبھی معافی نہیں مانگ سکتا۔ تنگو ایک غلط انداز نظر سے معصوم بھدرا کی طرف دیکھتا، جو ریت کے ڈھیر میں پیر دھنسائے بیٹھی ہوئی تھی ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی اُس نے ایک کنکر اٹھایا اور مسرت آمیز لہجہ میں چیخ کر کہنے لگا ہیرا مل گیا ہیرا — اب بھدرا چپ کیسے رہتی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی "تنگو! مجھے دکھاؤ کیسا ہے۔ وہ ہیرا بہت قیمتی ہے وہ" تنگو دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا — تنگو دکھاؤ نا کیسا ہے وہ ہیرا، بھدرا نے التجائی لہجہ میں کہا۔ نہیں، تنگو نے کسی قدر اکڑ کر کہا۔ ہم تمھیں نہیں دکھائیں گے، تم مجھ سے چھین لو گی۔ "تنگو بھیا" اس نے منت کے ساتھ کہا، دور ہی سے دکھاؤ میں تمھارے قریب نہ آؤں گی" "اب تم مجھ سے کبھی نہ روٹھو گی"، تنگو نے اس سے دریافت کیا۔

کبھی نہیں میرے اچھے تنگو — سادہ لہجہ میں بھدرا نے جواب دیا۔ تنگو نے اب مٹھی کھولی۔ ایک معمولی پتھر کا ٹکڑا اس کی ہتھیلی پر سورج کی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ تنگو اور بھدرا اب خوشی خوشی پانی میں نہانے ندی کی طرف دوڑ آئے اور بڑی دیر تک موجوں سے کھیلتے رہے۔ سورج کے سروں پر آنے تک وہ برابر پانی میں ڈبکیاں لگاتے رہے۔ آخر بھوک اور تھکن سے مجبور ہوکر آموں کے گھنے سایہ میں پہونچ کر وہ کھانے میں مصروف ہوگئے۔

دھوپ کی تیزی بتدریج بڑھتی گئی۔ تنگو اور بھدرا آموں کی ڈالیوں پر بیٹھ کر خوب جھولا جھولتے رہے یہاں تک کہ سورج شفق کی وادیوں میں پہونچ کر گہرا سرخ ہو جاتا تب وہ دونوں خوشی خوشی اپنی گایوں پر بیٹھ کر گھروں کا راستہ لیتے۔

دن گزرتے گئے ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ بچے جوان اور جوان بڈھے ہوگئے۔ اسی ندی کے کنارے عہد طفلی کی داستان کے مدھم حروف جو بھدرا اور تنگو کے دلوں پر نقش تھے اب وہ ایک دوسرے کے دلوں پر اچھی طرح کندہ تھے۔

ایک روز تنگو ندی کنارے بھدرا کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کی پرشوق نگاہیں گاؤں کے راستہ پر لگی ہوئی تھیں۔ دو دن ہوئے اس نے بھدرا کا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خیال کیا کہیں بھدرا کے دشمن بیمار نہ ہوں۔

دور سے اس نے گاؤں کے راستہ پر کسی کو آتے دیکھا اگر اس کی نگاہیں دھوکا نہ دیں اس نے خیال کیا وہی ہوگی اور وہ تھی اس کا خیال صحیح نکلا۔ اس نے بھدرا کو ندی کی طرف آتے دیکھا جو کندھے پر پانی کا گھڑا لئے ہوئے کسی خیال میں ڈوبی ہوئی آرہی تھی۔ اس کی نگاہیں زیادہ تر زمین کے ذرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تنگو فوراً پیپل کے بڑے تنے کی آڑ میں چھپ گیا۔

وہ پوشیدہ طور پر بھدرا کے حرکات و سکنات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ بھدرا غیر معمولی مغموم سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پانی کے کنارے آئی۔ اس نے پہلے پانی کی موجوں کو ہٹا کر خوب جی بھر کے پانی پیا۔ منہ دھو ڈالا اور پانی کی شفاف سطح میں چہرہ دیکھ کر بکھرے ہوئے بال ٹھیک کرنے لگی۔ اب تنگو درخت کی آڑ سے نکل آیا — اور بغیر آواز کئے وہ بھدرا کے پیچھے آکر پانی اچھالنے لگا۔ بھدرا خوفزدہ ہوکر پیچھے مڑ کر دیکھی۔ خلاف توقع اپنے محبوب کو قریب پاکر اس کا کھلایا ہوا چہرہ چمک اٹھا۔

"تنگو دو دن تک کہاں رہے تم" بھدرا نے اس سے دریافت کیا۔ "یہی تو میں تم سے پوچھنے والا تھا۔" "ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔" بھدرا نے پانی بھرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھاری راہ دیکھتے تھک گیا۔" اس نے قریب آکر بھدرا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — "ہوں" بھدرا نے گھڑا سر پر اٹھا لیا —

"بھدرا! تم بڑی سنگ دل ہو دو دن تک صورت بھی نہیں دکھائی۔" "کیسے صورت دکھاتی" بھدرا نے جواب دیا، "وہ لوگ مجھے دیکھنے آئے تھے۔" اب وہ ریت پر اپنا گھڑا رکھ کر بیٹھ گئی۔ "دیکھنے کیوں؟" تنگو کا دل دھڑکنے لگا۔

"شادی جو ہوگی" — "شادی!" تنگو نے بے چین ہوکر سوال کیا "کب — کس سے؟" "ندی پار والے گاؤں کے مکھیا کے نوکر سے؛ وہاں ان کے بہت سے کھیت ہیں"۔ "کیا تم سچ مچ

شادی کرو گی بھدرا" ـــــ تنگو نے مایوسانہ لہجہ میں اس سے سوال کیا۔ کیوں نہ کروں گی' بھدرا نے شوخ لہجہ میں جواب دیا' جوان جو ہو گئی ہوں"۔

"آہ بھدرا تم واقعی سنگ دل ہو۔ میں تمھارے بغیر بے موت مرجاؤں گا، رحم کرو میرے حال پر رحم کرو۔ آہ اب کیا ہوگا۔"

"دل گرفتہ نہ ہو تنگو" بھدرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" میں تم سے صرف مذاق کر رہی ہوں۔ میں مرتے دم تک تمھاری رہوں گی۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے علحٰدہ نہیں کر سکتی۔ مگر صرف موت!!

" کیا تم سچ کہہ رہی ہو بھدرا"۔ اس نے اپنی محبوبہ سے شک اور یقین کے ملے جلے لہجہ میں کہا ہاں ! بالکل سچ کہتی ہوں"۔

"مگر کیا بات ہے مجھے یقین نہیں آتا؟"

" یقین کیوں نہیں آتا؟ جب کہ ہماری محبت کی گواہ اس ندی کی موجیں ہیں۔ یہ چاند' یہ ستارے' یہ ہوائیں' یہ شفق کی سرخیاں اور کائنات کا ذرہ ذرہ ہے۔"

تنگو اب بھدرا کے خوبصورت بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کہنے لگا "پھر ہم بے خوف ہو کر ان سب سے الگ ایک نئی دنیا بسا ئیں گے"۔ ہاں اب مجھے جانے دو۔ ماں میرا انتظار کرتی ہوگی" پھر کب ملوگی؟ ـــــ تنگو نے اس کا بازو تھام کر اٹھاتے ہوئے کہا ـــــ کل صبح ـــــ بھدرا چپ چاپ گھڑا اٹھا کر گاؤں کی جانب روانہ ہوئی۔ تنگو کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

تنگو رات بھر بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ندی کے کنارے پہونچ گیا۔ یہاں پہونچ کر اس کے دل کو کچھ سکون ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں راستہ پر لگی ہوئی تھیں۔ سورج افق مشرق سے بلند ہوچکا تھا۔ مگر تاحال بھدرا نظر نہیں آئی' انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی تڑپانے والی ہوتی ہیں۔ تنگو کے دل میں بے شمار خیالات کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ آنکھیں راہ تکتے تکتے تھک گئی تھیں۔ اور اب وہ مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبا چلا جارہا تھا۔ اس نے خیال کیا شاید آج وہ نہ آئے گی۔ عاجز ہو کر نیم کے گھنے سایہ کے نیچے لیٹ گیا۔ درخت کے ٹھنڈے سایہ اور ندی کی پرکیف ہوا نے اسے بہت جلد نیند کی آغوش میں سلادیا۔ کافی دیر کے بعد اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے دیکھا بھدرا اس کے پیروں کے پاس غمگین بیٹھی ہے۔

" بھدرا"! ایک مسرت آمیز آواز اس کے منہ سے نکلی۔ بھدرا رو رہی تھی۔ اس کی نرگسی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے تھے"۔ بھدرا کیا بات ہے"۔ تنگو نے حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا ـــــ "شادی طے ہوگئی" اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

" تیری شادی طے ہوگئی' آہ اب کیا ہوگا" شدت غم سے وہ تھر تھرا رہا تھا۔ اور بھدرا بھی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔

تنگو پریشانی کے عالم میں اپنے گھر چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ آہ خدا اب کیا ہوگا' اس نے دیوانگی کی حالت میں کہا' بات طے ہوگئی! ـــــ بیٹا! ـــــ آرام کرو ـــــ میں اس سے اچھی دلہن تیرے لیے بیاہ لاؤں گی۔ اس کی ماں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

تنگو سو گیا تھا اس نے خواب میں دیکھا ندی کی لہریں بڑے زور شور کے ساتھ اٹھ اٹھ کر ساحل کی بڑی چٹانوں سے

ٹکرا رہی ہیں۔ بھدرا کے والدین اس کی شادی کرنے کی غرض سے ندی کے اس پار ناؤ میں بیٹھ کر جا رہے ہیں۔ بھدرا رنگین لباس میں مغموم بیٹھی ہوئی ہے اس کی نگاہیں ندی کے ساحل پر لگی ہوئی ہیں۔ جہاں اس نے عہد طفلی کے رنگین لمحات گزارے تھے۔ ناگاہ ایک زبردست لہر آئی اور ناؤ چٹان سے ٹکرا گئی ـــــ آہ ـــــ تنگو نے اس وحشتناک خواب سے متاثر ہو کر ایک دلدوز چیخ ماری، سارے گھر کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے ـــــ اور اس کی دیوانگی پر آنسو بہانے لگے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا ندی کی طرف چل دیا "میں ابھی تجھے بلاؤں سے نجات دلاتا ہوں" اس نے دیکھا کچھ لوگ ناؤ میں سوار ہیں۔ دفعتاً اس کی نگاہیں بھدرا کے چہرے پر جا پڑیں جو ان سب سے الگ ناؤ میں بیٹھی ہوئی بے اختیار آنسو بہا رہی تھی یکبارگی اس کی زبان سے نکلا۔ بھدرا!! اور ندی میں پھاند کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بھدرا نے جواب دیا۔ "تنگو میں بھی آتی ہوں" اور وہ بھی بے تحاشہ ندی میں کود پڑی کوئی نصف لمحہ بعد دونوں لاشیں ایک دوسرے سے وابستہ سطح آب پر نظر آئیں۔ اور قبل اس کے کہ انھیں نکالا جائے وہ ایسی غائب ہوئیں کہ صدیاں گزر گئیں آج تک پتہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دونوں دیوتا تھے۔ دنیا والوں کو محبت کا سبق دینے کے لئے آئے تھے۔ اور پھر مقررہ وقت پر دونوں ندی میں سما گئے۔

آج بھی جنوبی ہند کی مشہور ندی **"تنگ بھدرا"** ان کی نہ مٹنے والی محبت کی داستان آہستہ آہستہ سناتی ہوئی اس طرح بہہ رہی ہے جیسے کسی قابل عظمت جنازے کے ساتھ ایک مغموم جلوس رواں ہوتا ہے۔

صابر کوسگوی

غزل

وارفتگیٔ دل نے چلن ہی بدل دیا — گویا مزاج چرخ کہن ہی بدل دیا
اب ہے ہر ایک درد میں پہلو نشاط کا — دل نے مذاق رنج و محن ہی بدل دیا
دیکھیں سفر میں اس کی طرف کیا اٹھا کے آنکھ — غربت نے رنگ صبح وطن ہی بدل دیا
منصور خاک دار و رسن سے عذر کرے — جب مدعائے دار و رسن ہی بدل دیا
ہم کو تو زندگی سے بہت کچھ امید تھی — دست قضا نے جامۂ تن ہی بدل دیا
نیرنگ کیا کیا یہ ہوائے بہار نے — بیٹھے بٹھائے رنگ چمن ہی بدل دیا

کیا بیسویں صدی کی منور ہے یہ غزل
تم نے تو اس میں طرز سخن ہی بدل دیا

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

عثمانیہ کالج اور جامعہ عثمانیہ کی چند پرانی باتیں (بسلسلۂ گزشتہ)

عثمانیہ کالج کے افتتاح کے باعث دارالعلوم کالج کا جو مکان کرایہ پر لیا گیا تھا وہ خالی کر دیا گیا۔ اور دارالعلوم کی کالج کی جماعتیں یعنی کامل (دو سالہ) فاضل (دو سالہ) عالم (ایک سالہ) دبیر (ایک سالہ) اس طرح یہ چھ جماعتیں عثمانیہ کالج میں شعبۂ دینیات کی حیثیت سے منتقل ہو گئیں۔ مولوی و منشی اور انگریزی کی اسپشل جماعت جو دارالعلوم کالج میں باقی تھیں ان کو شہر میں منتقل کر دیا گیا گویا ہائی اسکول دارالعلوم باقی رہا اور دارالعلوم کالج کا نام و نشان معدوم کر دیا گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں اس نے عثمانیہ کالج کا قالب اختیار کر لیا۔ عثمانیہ کالج کا شعبۂ دینیات جو دارالعلوم کی باقی ماندہ جماعتوں پر مشتمل تھا بتدریج جدید قالب میں منتقل ہو گیا۔ غالباً چھ یا سات سال کے بعد پوری طرح شعبۂ دینیات کی کلاسیں ایف۔ اے، بی اے، اور ایم اے قائم ہو گئیں اور عالم فاضل، کامل ختم ہو گئے۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو طلبہ دارالعلوم عثمانیہ کالج کے شعبۂ دینیات میں منتقل ہو گئے تھے ان کی کامیابی کے بعد (جو قدیم نصاب میں ہوتی تھی) جو اسناد دئے گئے ان میں ان طلبہ کو طلبہ جامعہ عثمانیہ لکھا گیا ہے۔ اس طرح وہ عثمانی طلبہ کہے جا سکتے ہیں۔

چونکہ عالم اور دبیر کی جماعتوں میں تاریخ اسلام کیمیا اور طبعیات کا درس بھی شامل تھا اس لئے ان کی تعلیم کے لئے عثمانیہ کالج کے پروفیسر یعنی جمیل الرحمن صاحب، وحید الرحمن صاحب اور چودھری برکت علی صاحب ہی کما حقہٗ مقرر ہوئے تھے۔

عثمانیہ کالج کی صدارت پر ایک عرصہ تک کسی کا تقرر نہیں ہوا، ناظم تعلیمات ہی اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اس طرح مہدی یار جنگ اور پھر راس مسعود صاحب اس کے صدر رہے۔

مولوی حمید الدین[1] صاحب بی اے ایک دو ماہ تک شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کنارہ کشی اختیار

---

[1] مولوی حمید الدین مرحوم، علامہ شبلی کے قریبی عزیز تھے، الہ آباد یونیورسٹی سے دارالعلوم کالج کی صدارت پر (حماۃ الست) ماہوار سے آئے تھے۔ مولوی صاحب عربی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ خصوصاً تفسیر قرآن میں بڑی مہارت تھی۔ مولوی وحید الدین سلیم اپنے تقرر سے پہلے کئی ماہ تک مولوی صاحب کے مہمان رہے تھے اور اسی مہمانی کے زمانے میں ان کا تقرر عثمانیہ کالج میں ہوا۔ مولانا حمید الدین راقم کے نانا کے مکان کے ایک حصہ میں کرایہ سے مقیم تھے، اس لئے مولانا اور مولوی سلیم سے میری اچھی ملاقات تھی وہ مجھے اپنا شاگرد تصور کرتے تھے۔ گو کہ میں نے کوئی کتاب ان سے نہیں پڑھی اور نہ کوئی درس لیا۔

کرلی اور الٰہ آباد واپس ہوگئے، مولوی صاحب موصوف کو خیال تھا کہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے قیام وغیرہ میں عملی حصہ لیا تھا اس لئے انھیں صدر عثمانیہ کالج بنایا جائے گا۔ جب وہ صدارت عثمانیہ کالج پر مامور نہیں کئے گئے تو دل برداشتہ ہوکر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد ایک عرصہ تک شعبہ دینیات کے صدر کی جگہ خالی رہی اس کے بعد مولوی عبدالقدیر صاحب کا تقرر اس خدمت پر ہوا۔

راس مسعود صاحب کی واپسی کے بعد وہ نظامت تعلیمات کے ساتھ عثمانیہ کالج کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے مگر ظاہر تھا دونوں کام ایک شخص کے بس کے نہیں تھے بالآخر عثمانیہ کالج کی صدارت پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا تقرر ہوا اور وہ پٹنہ کے کالج سے طلب کئے گئے۔

اگرچہ ڈاکٹر صدیقی صاحب باہر سے طلب ہوئے تھے مگر ان کو حیدرآباد سے خاص تعلق تھا۔ ان کے دادا مختار الملک کے زمانے میں ناظم فوجداری تھے، والد بھی سررشتہ عدالت میں مامور تھے، چچا سالار جنگ کے اسٹیٹ میں تحصیلدار تھے، صدیقی صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی ابتدائی تعلیم ہائی اسکول تک انھوں نے گلبرگہ میں پائی تھی۔

قبل اس کے کہ مزید صراحت صدارت وغیرہ کے متعلق کروں کچھ دوسرے حالات کا تذکرہ ضروری ہے، جو اس کے پیشتر ہوئے تھے۔

عثمانیہ کالج کے افتتاح کے بعد اس کے انتظامات، تنظیم، اوقات درس وغیرہ کے متعلق مختلف کمیٹیاں ہوتی تھیں جس میں مامور شدہ اساتذہ شریک ہوتے تھے اور ان کی صدارت کے فرائض مسٹر ولنکر کے ذمہ ہوتے تھے کیونکہ وہ سینیر پروفیسر تھے۔ ان کمیٹیوں کے تمام کام اردو میں ہوا کرتے تھے۔

"کالج یونین" کے متعلق بھی ایک مرتبہ بحث پیش ہوئی جس طرح دارالعلوم کے فرنیچر، آلات سائنس، کتب خانہ سے عثمانیہ کالج کے لئے استفادہ کیا گیا اسی طرح دارالعلوم کی "انجمن ثمرۃ الادب" "کالج یونین" کے لئے خوان یغما ثابت ہوئی۔ اس کا کتب خانہ جس میں اس وقت تک کی شایع شدہ اردو کی جملہ کتابیں موجود تھیں "یونین" کے کتب خانے کو دے دیا گیا۔ عبدالمجید صدیقی اس کے آخری معتمد مقرر ہوئے تھے، فخر یار جنگ کی صدارت میں اس کا یہ آخری جلسہ سالانہ ہوا تھا۔

"انجمن ثمرۃ الادب" دارالعلوم کی انجمن تھی، اس کی معتمدی کے فرائض کئی سال تک راقم کے ذمہ تھے، انجمن سے ایک ماہوار رسالہ ثمرۃ الادب بھی شایع کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ دارالعلوم میں انگریزی جماعتیں قایم ہوچکی تھیں گویا جامعہ عثمانیہ کا عملی ظہور ہوچکا تھا اس لئے اس رسالہ کے جو مقاصد مقرر کئے گئے تھے ان میں سے بعض کی صراحت یہاں ضروری ہے۔

(۱) عثمانیہ یونیورسٹی کے لایق اساتذہ کی تحقیقاتوں کی اشاعت تاکہ اہل ملک اس سے فائدہ حاصل کرسکیں اور ان کو یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہماری تعلیمی مشین کس رفتار سے چل رہی ہے۔

(۲) طلبہ کے خیالات کا ملک کے سامنے پیش کرتے رہنا تاکہ اولیاء کو اپنے اقربا کی تعلیمی ترقی کا وقتاً فوقتاً علم ہوتا رہے اور ہمارے اہل ملک پر ظاہر ہوتا رہے کہ ہماری یونیورسٹی طلبہ کو صرف کتابیں پڑھا کر اسناد ہی نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ ان کو علمی تلاش و تجسس کا بھی خوگر بناتی ہے۔

ان مقاصد سے واضح ہوسکتا ہے کہ عملاً دارالعلوم اور اس کے اساتذہ اور طلبہ نے جامعہ عثمانیہ کا کام شروع کردیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو مادر جامعہ کے فرزند تصور کرتے تھے۔

رسالہ ثمرۃ الادب کے یہ مقاصد صرف تحریری نہیں تھے بلکہ

رسالہ میں ایسے مضامین شایع بھی ہوتے تھے چنانچہ چودھری برکت علی ابوامرت لال سہیل، اور پروفیسر جمیل الرحمن صاحب کے متعدد مضامین اس رسالہ میں شایع ہوئے تھے جن کو تحقیقی مضامین قرار دینا ضروری ہے۔

یہ میں لکھ چکا ہوں کہ عثمانیہ کالج کے لئے دارالعلوم بلدہ اور اورنگ آباد کے مشرقی مدرسہ میں طلبہ تیار ہوتے تھے، اس کے علاوہ بعض دیگر مدارس سے بھی اسکول فائنل کامیاب طلبہ شریک ہونے لگے اور جب کہ بی اے کھل گیا تو بعض نظام کالج کے طلبہ نے بھی اسی کالج میں اپنا نام شریک کرا دیا۔ اس قسم کے طلبہ میں محمد علی خاں صاحب (پروفیسر نظام کالج) اور سید یٰسین علی خاں صاحب (انجنیر ریلوے) یوسف الدین صاحب (مدرس مدرسہ فوقانیہ نامپلی) غالباً ظہیرالدین صاحب تیج سی ایس وغیرہم ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کالج سے بھی کئی حیدرآبادی طلبہ یہاں آ کر شریک ہوگئے جن میں ڈاکٹر میر سیادت علی (مددگار معتمد عدالت وامور عامہ) ڈاکٹر ولی الدین (مددگار پروفیسر عثمانیہ کالج) صلاح الدین (مددگار پروفیسر عثمانیہ کالج) وغیرہ شامل ہیں، غالباً میر اکبر علیخاں صاحب بھی علیگڑھ ہی سے واپس آئے تھے۔

دارالعلوم ہائی اسکول سے کئی سال تک برابر وہ طلبہ آتے رہے جو مولوی اور منشی کی کامیابی کے بعد صرف انگریزی کے پرچہ میں کامیابی حاصل کرکے عثمانیہ کالج میں شرکت کرتے تھے۔ ایسے طلبہ میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر منور علی، انتظار الدین انجنیر، ابوالنصر فتح اللہ مرحوم تیج سی ایس وغیرہ کئی نامور طلبہ شامل تھے۔

جامعہ عثمانیہ کا پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۳۲۹ف / ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ (۱۱۹) امیدواروں نے اپنے نام بھیجے مگر امتحان میں (۱۱۶) طلبہ شریک ہوئے جن میں سے (۹۱) طلبہ کامیاب ہوئے اس زمانے میں باہر کے طلبہ بھی شریک امتحان ہوتے تھے۔ اس لئے جو طلبہ کالج سے شریک ہوئے تھے وہ (۹۷) تھے باقی طلبہ عثمانیہ کالج سے غیر متعلق تھے۔ ان (۹۷) طلبہ کے منجملہ (۸۰) نے کامیابی حاصل کی تھی۔

تحریر کی رو میں میں بہت آگے نکل گیا مجھے تو افتتاح کے دن کی کچھ اور باتیں لکھنی ہیں۔ خیر ان کی صراحت یہاں کردی جاتی ہے۔ کیونکہ ہمارے مضمون کو کوئی تسلسل تو ہے نہیں چند پرانی باتوں کا اظہار مقصود ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے باعث اس وقت طیلسانیوں کے "گون" اور "ہڈ" نئی چیز نہیں ہیں، لیکن افتتاح کالج کے دن جب بعض مہمان اور پروفیسران کالج اسی علمی لباس میں آئے تو ہمارے لئے ایک نئی چیز معلوم ہورہی تھی، سیاہ گون اور رنگ برنگ کے ہڈ ایک خاص سماں پیدا کر رہے تھے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ کالج کے افتتاح کے دن مکان وغیرہ جھنڈیوں سے آراستہ کیا جاتا مگر آراستگی کی جانب کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ اخباری نمایندے بھی غالباً ایک دو کے سوا زیادہ نہیں تھے۔

عبدالحمید خاں صاحب کا تقرر تو ہوچکا تھا مگر وہ غالباً جلسہ کے دن حاضر نہیں تھے، خلیفہ عبدالحکیم صاحب، وحیدالرحمن صاحب

اور جمیل الرحمٰن صاحب کئی ماہ تک ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے۔

اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو ابتداً دارالعلوم ہی کی بورڈنگ عثمانیہ کالج کے لئے استعمال کی گئی اس کے بعد مسرت منزل کا مکان بورڈنگ کے لئے دیا گیا اور وحیدالرحمٰن صاحب اس کے نگران کار مقرر ہوئے

سر اکبر جب حیدرآباد سے بمبئی کی صدر محاسبی پر چلے گئے۔ اور راس مسعود صاحب بھی رخصت پر گئے تو ان دونوں کے وداعی جلسے کالج کی جانب سے آغا منزل میں ہوئے تھے۔ سر اکبر کے رخصتی جلسہ میں جو تقریریں ہوئیں ان میں کالج کی ایک دو تقریروں کے علاوہ سید خورشید علی صاحب نے بھی تقریر کی تھی۔ اور بطور خاص لیڈی حیدری کا شکریہ ادا کیا تھا۔

کالج میں کئی سال تک مسلسل میلاد کے جلسے نہایت شاندار پیمانہ پر ہوتے رہے، اس قسم کے جلسوں کے انتظامات وحیدالرحمٰن صاحب نہایت سلیقہ سے کرتے تھے۔

قبل ازیں میں نے صراحت کردی ہے کہ کالج میں "یونین" قائم کرنے کے متعلق بحث مباحث ہوئے تھے، مجھے یہ نہیں معلوم کب "یونین" قایم ہوئی، جہاں تک مجھے معلومات ہیں، ابتدائی سال تو یہ قائم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ جس مرتبہ یونین کی صدارت میر سیادت علی خاں کو ملی تھی (غالباً دوسری صدارت تھی) انھوں نے اپنے خطبہ میں دارالعلوم وغیرہ کی تفصیلی صراحت کی تھی۔ اور ان کا خطبۂ صدارت خاص طور پر پسند کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب کے زمانے میں بعض وجوہ سے مولوی عبدالواسع صاحب شعبۂ دینیات میں منتقل ہوگئے اور ان کی جگہ دینیات لازمی پر مولانا مناظر احسن صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔

خواجہ نعمت اللہ خاں صاحب (صدر مہتمم تعمیرات نرمل)

وہ پہلے عثمانی ہیں جن کو سرکار عالی نے یوروپین وظیفہ عطا فرمایا خواجہ صاحب جامعہ سے صرف ایف اے کی کامیابی کے بعد وظیفہ حاصل کرکے یورپ گئے تھے۔

اسی زمانے میں کالج کے پروفیسروں کو بھی تعلیمی فرصت اور رخصت کا حق منظور ہوا تھا۔ اس سے استفادہ کرکے خلیفہ عبدالحکیم صاحب، وحیدالرحمٰن صاحب اور عبداللطیف صاحب یورپ گئے تھے۔ اول الذکر اور آخر الذکر ڈاکٹری کی ڈگریاں لے کر واپس ہوئے، خلیفہ صاحب کی جگہ مولوی عبدالباری صاحب کا عارضی تقرر ہوا تھا۔

کئی سال تک مسلسل ایک نہ ایک پروفیسر کا انتقال ہوتا رہا۔ سب سے پہلے مولانا محمد یونس فرنگی محلی کا انتقال ہوا، پھر سری کنٹیا، چودھری برکت علی، مولوی عبدالواسع، مولوی شبیر علی، مولوی اشرف شمسی، مولوی سلیم وغیرہ وغیرہ تقریباً دس بارہ اساتذہ یکے بعد دیگرے انتقال کرتے رہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب غالباً تین چار سال کے بعد واپس ہوگئے ان کی جگہ عبدالرحمٰن خاں صاحب کا تقرر ہوا، خاں صاحب اس کے پیشتر نظام کالج میں طبعیات کے پروفیسر تھے، جامعہ عثمانیہ سے بحیثیت رکن کمیٹی اصطلاحات وغیرہ آپ کا تعلق شروع سے تھا۔ آپ کے زمانے میں کالج میں جو جو اصلاحات ہوئیں، ترقیاں ہوئیں، انتظامات ہوئے، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اور نہ مجھے پوری طرح ان کا علم ہے۔ البتہ ایک بات جس کو کوئی شخص فراموش نہیں کرسکتا وہ یہ ہے کہ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ کے فارغ التحصیلوں کی سرپرستی

کرکے ان کو کالج میں امور فرمایا ان کو یوروپین وظائف دلائے اور بعد واپسی پروفیسری کی خدمتوں پر تقرر فرمایا۔ غالباً ہندستان کی جامعات میں ایک عثمانیہ یونیورسٹی ہی ہے جہاں اس کے اپنے فرزند بہ تعداد کثیر پروفیسر، لکچرار اور ریڈر کی خدمت پر مامور ہیں۔

اب اور کہاں تک تفصیل پیش کی جائے ممکن ہے اس میں بہت سی باتیں لوگوں کو معلوم ہوں مگر آیندہ تاریخ کے لئے ان کا مرتب ہوجانا مناسب ہے، کیا فرزندان عثمانیہ کالج کم ازکم اپنے جامعہ کے جملہ فرزندوں کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش کریں گے؟ جامعہ کے جشن سیمین کے موقع پر (جس کے لئے ابھی سے تیاری کرنی چاہیئے) ایسی فہرست نہایت ضروری ہے۔

نصیرالدین ہاشمی

روحِ فغفور

دخترِ خواجگی روحِ غارت گری ... موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
جہل وافلاس کے تخت پر جلوہ گر ... کچھ بجاری ادھر کچھ بجاری ادھر
وہ شب اندام وہ قبر کی تیرگی ... میرے گھر میں وہ کل یک بیک گھس گئی
ناچتی کودتی شور کرتی ہوئی ... میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوئی
پرچم غم ہوا میں نچاتی ہوئی ... مسکراتی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی
ایڑیوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی ... خون پی پی کے گرتی سنبھلتی ہوئی
موت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دمبدم ... اے مری ہم نفس اے مری ہم قدم
تیرے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ... کونسی وہ ادا ہے جو مجھ میں نہیں
کیا میری کاکلوں میں بلائیں نہیں ... کیا تنفس میں میرے وبائیں نہیں
کیا مجھے جوعِ ارضی نے پالا نہیں ... کیا یہ انسان میرا نوالا نہیں

پشت گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں روحِ فغفور ہوں

مخدوم

خون خوار تہذیب

سنہ ۱۹۳۰ء میں جبکہ میں یورپ گئی تھی۔ مجھے یورپین اقوام کے بعض خصائص نے نہ صرف اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ بلکہ دوران سفر میں بعض وقت حسرت پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کی بعض خوبیاں کسی طرح ہماری ہندوستانی معاشرت میں اختیار کی جاسکتیں۔ اور ہم ان پر عامل ہوسکتے!!! مثلاً پابندی اوقات۔ مشاغل علمی و عملی و تفریح وغیرہ میں التزام اور انہماک۔ اصول حفظانِ صحت کی پابندی۔ اور سونے جاگنے، اٹھنے، بیٹھنے، لکھنے پڑھنے غرض تمام مشاغل حیات میں انتہائی صفائی اور با اصولی۔ آقا و ملازمین کے تقسیم فرائض۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے طور طریق وغیرہ بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر غور و خوض کرنے کا مجھے تمام دورانِ سفر میں اتفاق رہا۔ اور واپسی کے بعد اپنے ملک اپنی قوم اور خاص اپنے گھر کی وہ تمام کوتاہیاں جن میں مجھے اصلاح کی ضرورت نہایت شدت اور شدومد کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی میری آنکھوں میں عرصہ تک خار بنی رہیں۔ اور بے ساختہ دل چاہتا تھا کہ کم از کم اپنے گھر میں ہی کسی طرح یوروپین اقوام کے وہ تمام محاسن جمع کردوں جنہوں نے مجھے ایک حد تک فریفتہ کرلیا تھا۔ اس وقت یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی ہوئی یا نہیں۔ لیکن یہ لازمی امر تھا کہ مرورِ زمانہ سے رفتہ رفتہ اس اکراہ میں کمی آتی گئی۔

مگر ایک عجیب و غریب بات اس ضمن میں قابل ذکر یہ ہے کہ اس وقت اگر مجھے ہندوستانی معاشرت کا کوئی قبح و نقص ناگوار گزرتا ہے اور اس سے کچھ ناپسندیدگی پیدا ہوتی ہے تو فوراً بجلی کی تیزی سے ان مہذب قوموں کی موجودہ "خونخوار تہذیب" کا ایک موہوم مگر بیحد ڈراؤنا نقشہ نگاہ کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جس کے خوفناک مظاہرے نے آج کل یورپ میں قیامت صغریٰ برپا کر رکھی ہے۔ اور یورپ تو خیر ہلاکت و خوں ریزی کا میدان و وحشت بنا ہی ہوا ہے۔ مگر اس سے ہزاروں میل فاصلے پر بسنے والی قوموں اور ملکوں کے اطمینان خاطر اور قلبی آسائشیں ان مدعیان علم و تہذیب کی باہم دست و گریبانی اور خون آشامی کی وجہ سے عنقا ہوچکی ہیں۔ معاذاللہ

مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ۔

اور اب ان لوگوں کے چشم دید اوصاف و محاسن کا خیال آتے ہی حالیہ تباہ کاریوں کے خفیف ترین تصورات سے دل میں لرزہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور نفرت کا احساس معاً رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے۔ کیا یہ وہی قوم و ملک ہیں جنہوں نے گویا علم و تہذیب کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اور جو آج عقل و سائنس کے معراج کمال پر پہونچی ہوئی ہیں؟ جن کی علم و تحقیقات نے تمام دنیا کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردی ہے۔ جن کی ایجاد و اختراع کے سامنے بڑے بڑے مشرقی ممالک کے سر نگوں ہوگئے اور دنیا کے تمام بازار ان کی مصنوعات سے مالا مال ہوکر اپنی صنعت کاریوں کے لئے سرد ہوگئے؟ کیا یہ وہی ہیں جن کی اندھی تقلید نے خصوصاً ہم ہندوستانیوں

مجنوں بنا کر اپنی ہر خوبی اور اپنے اسلاف کی روایات خیر سے روگرداں اور باغی کر دیا ہے۔ اور وہ نہ صرف خود بالکل مغربی ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ اپنی بیوی بہن اور بیٹیوں پر بھی یہی جادو چلانا زینا عین ایمان سمجھتے ہیں۔ انہی کی ریس میں اپنے مذہب سے دور ہو گئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی طرح اس حیاتِ دو روزہ کی رنگا رنگی اور خودی کے بھنور میں پھنس کر حیات بعد الممات کے خیال کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا ہے!۔

آج کل مغرب جس ہیبتناک مقتل کا نمونہ بنا ہوا ہے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کو روحانیت نہ سہی مگر انسانیت سے شمہ بھر بھی کچھ واسطہ ہے!۔ یہ تمام دنیا کی آزادی کا عموماً اور ہندوستانی آزادی کا خصوصاً دعویدار اور علمبردار ہر تن جس طرح یکے بعد دیگرے چھوٹی قوموں کو ہوائی بموں اور مشین گنوں کے ذریعہ بے ڈکار ہضم کرتا چلا جا رہا ہے۔ کیا اسی کا نام تہذیب و انسانیت ہے؟۔ اس دشمنِ انسانیت کا اس طرح کمزور قوموں کو اپنی بڑھی ہوئی جنگی قوتوں سے مغلوب و مفتوح کرنا ہمارا بتائیے کس اصول تہذیب و آئین و شائستگی کی رو سے جائز ہو سکتا ہے!؟۔ روحانیت اور مذہب کو تو چھوڑیئے کہ اس کا تو نام ہی ان لوگوں کے خلافِ شان ہو گیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ درندگی وحشت اور بے آئینی کا زمانہ کوئی اور آ سکتا ہے۔ سب سے زیادہ ہنسی اس وقت آتی ہے جب کہ جرمن ریڈیو کی طرف سے بیچارے مظلوم غریب کس مپرس جاہل بے تہذیب ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی کے بے پناہ جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں پر یہ مظالم ہوئے ہیں اور وہ ہو رہے ہیں ان کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے اور ویسا کیا جاتا ہے۔ ان بیچاروں کو صدیوں سے غلام بنا رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ان شیطانوں سے پوچھئے کہ بھائیو! تم نے اپنی ہمسایہ بے گناہ چھوٹی قوموں کے ساتھ کیا کیا؟۔ ان کو کن خطاؤں کی پاداش میں پیس کر رکھ دیا۔ اور ان کا نام دنیا کے نقشہ سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اب ان کا صفایا اور تیا پانچا کرنے کے بعد تم کو ہندوستان یاد آ رہا ہے۔ بقول شاعر

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

ہندوستانی لاکھ گئے گزرے جاہل نادان سہی۔ مگر کمزور و بے گناہ ممالک کے ساتھ آپ کا یہ حسن سلوک دیکھنے کے بعد آپ کو اپنا ہمدرد اور ناصح مشفق تو سمجھنے سے رہے۔!!!! بھیڑیے کی دوستی کا غریب بکریاں کس طرح یقین کریں۔ بی بی بلائی بخشو۔ مرغا بے دُم کا ہی بھلا۔ ہم بے تہذیب گنوار ہندوستانی ایسی تعلیم یافتہ مہذب قوموں سے بدرجہا بہتر ہیں جن کی خونخواریوں اور علم و عقل کے کمال نے انسانی خون کو اتنا ارزاں کر دیا ہے کہ اس کی ندیاں بہانے کے بعد بھی ان خون آشاموں کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ جن کی تباہ کاریوں نے ان وحشی قزاقوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت کو مات کر دیا۔ جن کے افسانے ہم سنتے آئے تھے۔ ہمارا سو سو سلام ہے اس مردم خور تہذیب و شائستگی کو اور علم و کمال کی اس معراج کو جس پر پہونچ کر ہمارے اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ اس خون آشام تہذیب کے محاسن ہمارے سامنے سانپ اور شعلے کے حسن کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جو بظاہری دلفریبی کے ساتھ ہی ساتھ جاں ستاں اور قاتل ہے۔ ہم لوگوں کو چاہیئے کہ مغربی اقوام کے

ان بدترین حالات و اعمال سے سبق حاصل کریں اور اپنی روایات کو نظر استحقار سے دیکھنا چھوڑ دیں۔ خاص کر تہذیب جدید نے روحانیت کو انسانیت سے جدا کرکے جو بدترین مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان پر پورے طور سے کماحقہ غور کریں کہ اس ایک نکتہ میں بے شمار باریکیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ جنگ نہیں بلکہ عذاب الٰہی ہے جو خدا سے دور اور خودی سے قریب اقوام پر نازل ہوا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ اس پُرفتن زمانے میں اپنے اعمال و افکار و اقوال کی خبر لیں اور اس جنگ سے مفید سبق سیکھیں۔

علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی بابت فرمایا تھا؎

دیار مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

آج اس کی صحت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

اینسہ ہارون بیگم شروانیہ

غزل

دل کا جب غم شعار ہی نہ رہا　　دل کا پھر کچھ شمار ہی نہ رہا
اس کرم کا بھی کچھ ٹھکانہ ہے　　کوئی امیدوار ہی نہ رہا
ہوسِ آشیاں ہو کیا مجھ کو؟　　عہدِ برق و شرار ہی نہ رہا
میری قدرت تری رضا! گویا　　کچھ مجھے اختیار ہی نہ رہا
غم میں خوش ہوں تو وہ سمجھتے ہیں　　غم مجھے ناگوار ہی نہ رہا
آپ نے اب نقابِ رخ الٹا　　جب کوئی ہوشیار ہی نہ رہا

نعمتِ درد کیا ملی تابش؟
کچھ ہمیں سازگار ہی نہ رہا

مسعود الحسن تابش

حالی اور مقدمۂ شعر

زندگی کی طرح ادب بھی ارتقا، کی ایک پہیلی ہے۔ لہذا کسی ادبی تحریک کی ابتدا اور انتہا کا صاف وصریح طور پر تعین کرنا بڑا ہی نازک مسئلہ ہے۔ بسا اوقات محض سہولت کی خاطر کسی ایک مقام سے کسی ادبی تحریک کی ابتدا کرنی پڑتی ہے اور کسی ایک نقطہ پر لاکر اسے ختم کرنا پڑتا ہے۔ جدید اردو شاعری کا یہی حال ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۴ء میں اس کی ابتدا ہوئی جبکہ کرنل ہالرائیڈ (ناظم تعلیمات پنجاب) کی تحریک اور محمد حسین آزاد کی بے لاگ کوششوں کی بدولت ایک خاص نوعیت کے مشاعرے لاہور میں ہونے لگے۔ جن میں شعرا کی طبع آزمائی کے لئے بجائے طرح مصرعوں کے موضوعوں کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کا لحاظ کرتے یہ ایک انقلابی قدم تھا اور اس میں شک نہیں کہ بانیان مشاعرہ نے اردو نظم میں نئی راہیں نکالنے اور مغربی ادب کی وساطت سے اردو شاعری میں وسعت پیدا کرنے کے خیال سے یہ انوکھا تجربہ کیا تھا جو کامیاب بھی رہا۔

اس مشاعرے کے موضوعوں کا خاصہ اندازہ ہمیں محمد حسین آزاد اور خصوصاً حالی کی ابتدائی مثنویوں سے ہوتا ہے جو بعد کو "مجموعۂ نظم حالی" کے عنوان سے دوسری نظموں کے ساتھ علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔ غالباً یہ مثنویاں محمد حسین آزاد کی مثنویوں سے زیادہ مقبول ہوئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آزاد کی مثنویوں سے نسبتہً بہتر بھی ہیں۔ کچھ دنوں بعد شعرا کا یہ دنگل بکھر گیا۔ حالی نے علیگڑھ کی راہ لی جہاں ان کی شاعری نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ آزاد لاہور ہی میں رہے لیکن نظم کو چھوڑ کر نثر کا میدان لیا جس میں انہوں نے وہ بات پیدا کی جو ان کی نظم میں نہیں۔

حالی کی مثنویوں کے عنوانات ہیں "برکھارت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف۔ سرخیوں کے علاوہ ان مثنویوں کا اسلوب بھی صاف بتا رہا ہے کہ یہ قدیم شعرا اور ان کی قدامت پسندانہ روش کے خلاف بغاوت کا ایک کھلا اعلان تھا۔ یہ نظمیں جو آج کسی قدر روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہیں، اس زمانے میں بہت مقبول ہوئیں اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اس لئے کہ ملک کا بدلا ہوا مذاق اور ماحول ان کے موافق تھا۔ ایک حیثیت سے حالی کے دو پیشرو (غالب اور نظیر) ان کے لئے زمین بھی ہموار کر چکے تھے۔ لیکن حالی غالب کے شاگرد تھے، اس لئے غالب کا اثر حالی کی روش اور ان کی ابتدائی کوششوں پر پڑنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یادگار غالب، مرثیہ غالب اور دیوان حالی کی بعض غالب نما غزلیں اس کا روشن ثبوت ہیں البتہ نظیر اکبرآبادی کا انہوں نے کوئی اثر لیا یا نہیں، اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ حالی کے وسیع مطالعے سے (جس کا ثبوت ان کے لکھے ہوئے "مقدمہ شعر و شاعری" سے ملتا ہے) بعید بھی نہیں کہ انہوں نے نظیر سے کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کیا ہوگا۔ لیکن صاف اعتراف سے وہ غالباً اس لئے ہچکچائے کہ خوش ذوق حضرات غریب نظیر کو حال حال تک ایک تک بند اور بازاری شاعر ہی سمجھتے رہے۔

لیکن مرزا غالب یا لاہور کی تحریک نے حالی کو حالی نہیں بنایا۔

حالی کی نئی شاعری اور ان کی بےنظیر شہرت کا مدار تمام و کمال علیگڑھ کی تحریک سے وابستہ ہے، جس کے بانی اور روحِ رواں خود سرسید تھے۔ سرسید ہی نے انھیں اُکسایا اور چمکایا اور حالی نے بھی نہایت خلوص کے ساتھ ان کا ساتھ دیا۔ حالی کی وہ مقبولِ خاص و عام نظم جسے ان کی زندگی کا حاصل کہنا چاہیے (یعنی مسدس مدو جزر اسلام مطبوعہ ۱۸۷۹ء) سرسید ہی کی عظیم شخصیت سے دوچار ہونے کے بعد لکھی گئی تھی۔ خود اس نظم کے دیباچہ کے بعض مقامات حالی کی بے پایاں عقیدت کا جو انہیں سرسید سے تھی، کھلا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہر متعلم ادب کو دیباچہ اور مسدس غور سے پڑھنا چاہیے۔ ادبی اور تاریخی حیثیت سے ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے

حالی کو مرے کوئی پچیس چھبیس سال ہوتے ہیں اس ربع صدی میں اردو ادب نے بہت کچھ ترقی کی۔ بہتیرے پرخلوص خدمت گزار اور ادیب پیدا کئے، اور نامساعد حالات کے باوجود ہماری زبان نے بہت کچھ مقبولیت اور ہمہ گیری حاصل کی۔ لکھنؤ اور دہلی کے قدیم حصاروں کو توڑ کر اردو نے اب کئی ایک مستقل مراکز اپنے طور پر قائم کرلئے ہیں، جن میں پنجاب اور دکن خاص طور پر بڑے سرگرم صوبے ہیں جہاں کسی نہ کسی روپ میں اردو کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے کی عملی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب ثمرہ ہے ان خدمت گزاروں کی بےلاگ کوششوں کا جنھوں نے ابتداً علیگڑھ کو علیگڑھ اور لاہور کو لاہور بنایا۔ ان دونوں مقامات کی تحریکوں کا سرگرم رکن حالی تھا جو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھا تنقید نگار اور نثر کار بھی تھا، گو اس میں شک نہیں کہ اس کی نثر کی اہمیت محض افادی اور معلوماتی ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس نے ایسی کتابیں نثر میں یادگار چھوڑی ہیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں یادگارِ غالب لوگ برابر شوق سے پڑھتے رہیں گے، جب تک غالب سے دلچسپی برقرار ہے۔ حیاتِ جاوید اس وقت تک پڑھی جائے گی جب تک کہ سرسید کی پرخلوص خدمات کی یاد ملت کے دلوں میں تازہ ہے اور اس برتر ہستی کے سوانح حیات کے تفصیلی مطالعے کی امنگ تجسس پسندوں کو تلاش اور تحقیق کی طرف مائل کرتی رہے گی۔ مقدمہ شعر و شاعری اس وقت تک غور و فکر کے ساتھ جب تک کہ اردو شاعری کے جدید رجحانات اور اس کے کارکنوں کی خدمات کو جانچنے اور آنکنے کا سودا متعلمین ادب کے دلوں میں موجزن رہے گا۔

ادبی اور تاریخی زاویۂ نگاہ سے مقدمہ اور مسدس بہت اہم ہیں اور ہر متعلم ادب کو جسے حالی سے دلچسپی ہے، یہ دونوں کتابیں غور سے پڑھنا چاہیے۔ نظم و نثر کے یہ دو پاکیزہ مرقعے نہ صرف حالی کے معتقدات اور اصلاحی نظریوں کا نچوڑ ہیں، بلکہ ان سے اس زمانے کی عام حالت، ادبی ذوق، اور سماجی تخیلات کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مقدمہ پہلے پہل دیوان حالی کے ساتھ چھپا تھا۔ یہ بذاتِ خود ایک جدت تھی یا ضرورت، یا ضرورت اور جدت دونوں۔ مشرقی ادب میں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ البتہ انگریزی ادب کی طویل داستان میں دو ہی مثالیں اس قسم کی ملیں گی۔ ایک "ورڈز ورتھ" کی جس نے اپنی نظموں کے ساتھ ایک طویل دیباچہ اپنے شاعرانہ نظریوں کی توضیح میں لکھا تھا۔ دوسری مثال "برنارڈشا" کی ہے جو اپنے ڈراموں کے ساتھ ضخیم دیباچے لکھا کرتا ہے جن میں وہ اپنے فنکارانہ اور تخلیقی پہلوؤں کی خود تنقید یا صفائی پیش کرتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس کے دیباچے بعض اوقات اس کے ڈراموں سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

حالی کا مقدمہ بھی دلچسپ نہ سہی لیکن اہم ضرور ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان کے اپنے زمانے میں دلچسپی سے پڑھا گیا ہو۔ بہر حال اس کی تنقیدی اہمیت نہ سہی تاہم تاریخی اہمیت ضرور ہے اس میں حالی نے نہ صرف اردو شاعری کے بعض اصناف پر تنقیدی نظر ڈالی ہے بلکہ اس تنقید کی لپیٹ میں بہت کچھ مفید معلومات، نظریے اور اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں۔

مقدمہ مباحث کے لحاظ سے صاف و صریح طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں جو تقریبًا تیس پینتیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، شعر و شاعری پر تمہیدًا بحث کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ شاعری ایک وہبی چیز ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی۔ شعر گوئی کی پہلی شرط ہے موزونیٔ طبع اور تاثیر اور جاذبیت شعر کی اہم ترین خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر شعر میں اصلیت بھی ہو تو شعر جادو بن جاتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ پہلے حصے کے ابتدائی اوراق میں شعر کی جاذبیت اور حسن قبول سے بحث کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرق و مغرب میں سدا سے شاعروں کی کتنی قدر و منزلت رہی ہے۔ کس طرح شعرائے عرب اپنے جوشیلے اشعار سے اپنے قبیلوں کو گرماتے اور جنگ پر آمادہ کرتے تھے۔ شعرائے عجم میں رودکی نے کس طرح اپنی جادو بیانی سے امیر وقت کو ہرات سے ترت بخارا لوٹنے پر اکسایا، کس طرح بائرن کی نظم ترکوں کے خلاف دولِ مغرب کو ابھارنے اور یونانیوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اسی ضمن میں دو باتیں اور بتائی ہیں۔ وہ یہ کہ شاعری کا اخلاق اور سوسائٹی سے گہرا تعلق ہے۔ شاعری کے معینِ اخلاق ہونے کے بارے میں خود حالی کے یہ الفاظ دلچسپی سے خالی نہیں "شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں .... مانا کہ شعر براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین و تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب کہہ سکتے ہیں۔"

"اب رہ گیا دوسرا مسئلہ یعنی سوسائٹی اور شعر میں کس قسم کا ناتہ ہے؟ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں سوسائٹی کا مذاقِ فاسد شاعری کو بگاڑتا ہے، پھر شاعری سوسائٹی کا ناس کرتی ہے۔ اور اس طرح بدی کا یہ دائرہ پھیلتا جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ اور شاعری کے ذریعے قوم و ملت کی رگوں میں تیر جاتے ہیں۔ لہذا سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اس کے محدود ہو جانے سے ملک کو پہنچتا ہے وہ اس کے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔ جھوٹ اور مبالغہ جب شعرا کا شعار بن جاتا ہے تو اس کا اثر مصنفوں کی تحریر اور فصحا کی تقریر اور خواص و عوام کے روزمرہ اور بول چال پر بھی پڑتا ہے"۔

ان حالات میں شاعری میں تبدیلیاں کیں بلکہ اپنے انوکھے مقدمے کے ذریعے اپنے نظریوں اور اصلاحی تجاویز کو مدلل پیرایے میں پیش کیا۔

دوسرے حصے میں جو کم و بیش پچھتر صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، شعر کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے حالی نے شاعری کا جدید تصور پیش کیا ہے۔ یہ حصہ پہلے حصے سے زیادہ اہم ہے۔ اصل میں مقدمے کا یہ حصہ کالے اور ملٹن کے تصور اور توصیف شعری پر ٹکا ہوا ہے اور انہی دو مغربوں کے اقوال کی روشنی میں محاسنِ شعر کو جانچنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ سب سے پہلا سوال جو اس ضمن میں اٹھایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ شاعری ہے کیا؟ اس کا جواب بھی مکالے کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ مکالے کا خیال ہے کہ "شاعری ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مصور، بت تراش اور اداکار کی نقل شاعر کی نسبت بظاہر کامل تر ہوتی ہے...... لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک یہ تینوں اس فن کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے ...... نفس انسانی کی باریک، گہری اور رنگا رنگ کیفیتیں صرف الفاظ ہی کے ذریعے ظاہر کی جا سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔"

اس کے بعد شاعری کی تین اہم شرطوں (تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ) سے بحث کرتے ہوئے شعر کے حقیقی محاسن کا حالی نے جائزہ لیا ہے اور اس موقع پر ملٹن کے مقولے کی روشنی میں محاسن شعر کے تین اہم عناصر بیان کئے ہیں۔ ملٹن کی رائے میں شعر وہی ہے جو (۱) سادہ ہو (۲) جوش سے بھرا ہو (۳) اور اصلیت رکھتا ہو۔ اس کے بعد شرح و بسط کے ساتھ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے بتایا ہے کہ "سادگی سے خیال اور اسلوب دونوں کی سادگی مراد ہے۔ دنیا کے تمام مقبول شاعروں کا کلام ایسا ہی دیکھا گیا ہے۔ ان کے کلام کی ہر ذہن سے مصالحت اور ہر دل میں گنجایش ہے...... ہومر، شکسپیر اور سعدی کی عالمگیر مقبولیت کا راز اسی میں ہے۔" اصلیت سے مراد یہ ہے کہ "خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہو جو حقیقتاً وجود رکھتی ہو۔ محض خیالی بندی جیسی کہ متاخرین کی شاعری، نہ تو عام پسند رہی اور نہ ہونے کی مستحق ہے......"

اب رہ گیا ایسا کلام جس میں یہ تینوں خوبیاں سرے سے نہ ہوں، سو حالی کے نزدیک ہمارے شعرا کا بیشتر کلام اس سے داغ دار نظر آئے گا۔ اور انہی وجوہ کی بنا پر حالی نے اپنی نئی شاعری میں اصلاحی تجاویز کو بروئے کار لانا ضروری سمجھا۔ اس ضمن میں حالی کے یہ چند ریمارک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) قدیم شاعری موجودہ حالات میں پنپ نہیں سکتی۔

جن حالات میں مشرقی شاعری نے ترقی پائی، اب باقی نہیں رہے۔ سائنس اس کی جڑ کاٹ رہا ہے اور سویلیزیشن، اس کا طلسم توڑ رہی ہے...... لہٰذا شاعری میں اسی کو قدم رکھنا چاہیے جس کی فطرت میں یہ ملکہ ودیعت کیا گیا ہو۔ شاعر بننے کے لئے سب سے اول سبق استعداد ہے پھر کائنات و سرشت انسانی کا گہرا مطالعہ اور اس کے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور ان کے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا۔

(۲) جھوٹ اور مبالغے سے پرہیز سچا شعر کہنے کی صلاح اس لئے نہیں دی جاتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے بلکہ اس لئے کہ تاثیر جو شعر کی علتِ غائی ہے، وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی۔ پھر یہ کہ علوم و معارف کی ترقی جو آج کل دنیا میں ہو رہی ہے، وہ جھوٹی شاعری کو کبھی پنپنے نہیں دے گی۔

(۳) زبان اردو کی درستی و صفائی:۔ شعر کی زبان معیاری ہوتی ہے۔ اس لئے زبان کی اصلاح و درستی کا کام شعرا کا فرض ہے۔ اردو زبان میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ البتہ نئی ضروریات کے مدنظر اس میں وسعت اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ قومی ہم آہنگی کے لئے اردو سے موزوں تر کوئی زبان ہندوستان میں نہیں۔

آخری حصے میں (جو تقریباً سو صفحوں پر مشتمل ہے) شاعری کا تین اہم صنفوں پر طویل تبصرہ اور اصلاحی تجویزیں ہیں۔ یہی حصہ مقدمے کی جان اور حالی کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں اور اس کے فن کارانہ نظریوں کا نچوڑ ہے۔ حالی کے کٹر مخالفین بھی اس کو پڑھنے کے بعد اس کی علمی قابلیت اور نظر کی گہرائی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ حصہ محض ایک متعلم ادب کی نسبت ان لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہوگا جو شعر و سخن میں دخل رکھتے ہیں۔

جنہیں فن سے دلچسپی ہے وہ تفصیل چاہیں گے، اور تقاضائے فن بھی یہی ہے۔ پھر خلاصے کی ضرورت؟

ابوظفر عبدالواحد

پنگھٹ پر!

صبح دم رام رام پنگھٹ پر
مسکرا یا سلام پنگھٹ پر

ایک طرفہ بہار رہتی ہے
ہمنشیں صبح شام پنگھٹ پر

شوخ و چنچل کنواریوں کا ہجوم
اک حسیں ازدہام پنگھٹ پر

دلگی، کھیل، قہقہے باتیں!
یہی رہتا ہے کام پنگھٹ پر

ہمنشیں! دل سے کرنا پڑتا ہے
حسن کا احترام پنگھٹ پر

حسن کی بادشاہی رہتی ہے
عشق ہے کس غلام پنگھٹ پر

کیف ہی کیف ہے یہاں ساقی
آج ہو انتظام پنگھٹ پر

آؤ ڈھونڈیں گے پھر نظارہ
سب سے اونچا مقام پنگھٹ پر

شام غم دور دیکھ آئے ہیں
سارے ماہ تمام پنگھٹ پر

سب ہیں لیکن نظر نہیں آتا
میرا ماہ تمام پنگھٹ پر

جس کے دم سے قیام پایا ہے
عاشقی کا نظام پنگھٹ پر

سوتے فتنے جگاتے جاتا ہے
جس کا ہر ایک گام پنگھٹ پر

جس کے ماتھے پہ سرخ بندیا ہے
دعوتِ لطف عام پنگھٹ پر

گاؤں میں جس کو رادھا کہتے ہیں
جس کا رادھا ہے نام پنگھٹ پر

شور، دیکھو وہ کون آنکلا
ہاں، وہی لالہ فام پنگھٹ پر

شور عابدی دگلبرگہ

گُل بُوٹے

جب سے ہمارے گھر میں بیاڈمنٹن کا شوق چرایا ہے شام بہ دور شام کو بڑی چہل پہل رہتی ہے، اندر جگہ نہ ہونے سے مجبوراً ہم نے باہر بیاڈمنٹن کورٹ بنایا اور شام کے ملنے والوں کو خیرباد کہہ دیا۔ گیٹ کے مقابل پرانے نل خرید کر نصب کئے اور ان کے درمیان تار کی جال بنا کر اس پر بیلیں چڑھا رہے ہیں، یہ اس لئے کیا کہ بیاڈمنٹن کھیلنے وقت جب سواریاں آتی ہیں تو پھٹ سے گیٹ کھل جاتا ہے اور کھیلنے والیاں تھوڑی دیر کے لئے بے پردہ ہو جاتی ہیں۔

ہماری بہنوں کے پردہ کا بوجھ تو مدت ہوئی بقول اکبر الٰہ آبادی ہماری عقلوں پر جا پڑا ہے، مگر بعض کھلاڑی بہنیں راستہ چلنے والوں کے سامنے کھیلتے کودتے ذرا شرماتی ہیں، ان ہی کی خاطر ہم تاروں کو قسم قسم کی بیلوں سے منڈھ رہے ہیں۔

رنگ برنگ کی خوبصورت پھولوں کی بیلیں فراہم کرنے میں ہمیں بڑی محنت اٹھانی پڑی، یہاں تک کہ جب کبھی ہم باہر نکلتے ادھر ادھر کی دیواروں پر اور خانہ باغوں کے اندر نظریں دوڑاتے اور جہاں کہیں کوئی اچھے پھولوں کی بیل نظر آئی کہ ہم نے اس کا پودا مالی کو انعام دیکر حاصل کیا یا گھر والوں سے مانگ لیا۔

یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ایک دن کسی مکان کی دیوار پر آسمانی رنگ کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھولوں کی بیل دیکھ کر ہم بلا تکلف مکان کے اندر داخل ہو گئے، ہمیں دیکھ کر ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا، ہم نے اس سے مکان کے مالک کا نام پوچھا تو جواب ملا

"جی بیگم صاحب کو کہاں سے آئے بولوں"!

ہم نے کہا "بیگم صاحبہ کو نہیں تمہارے سرکار کو سلام بولو اور یہ ہمارا کارڈ دو"!

وہ بولا "سرکار ہمارے پچھلے مہینہ گزر گئے بیگم صاحب ہیں"! ذرا سوچ کر ہم نے کہا "اچھا تو بیگم صاحبہ سے کہنا سامنے کی دیوار پر آسمانی رنگ کے پھولوں کی جو بیل ہے اگر اس کا ایک پودا وہ ہمیں مرحمت کریں تو بڑی عنایت ہوگی"!

لڑکا دوڑتا ہوا بیگم صاحبہ کو ہمارا پیام دینے گیا اور کوئی پانچ منٹ کے بعد آ کر بولا۔

"چلئے بیگم صاحب آپ کو گول کمرے میں بیٹھو بولی ہیں"۔

ہماری محتاط طبیعت نے کچھ دیر کے لئے ہمیں موٹر سے اترنے نہ دیا، مگر کچھ تو نئی بیل لینے کے شوق میں اور کچھ بد اخلاقی کے خوف سے ہم خراماں خراماں لڑکے کے ساتھ ہو لئے۔

گول کمرہ بڑے سلیقے اور قرینے سے سجایا گیا تھا ہر چیز سے نفاست اور ستھرے مذاق کا ثبوت ملتا تھا، جب ہم نے کمرے کی چیزوں کو غور سے دیکھا تو ہمیں اس کمرے کی دنیا ہی نرالی نظر آئی جس رنگ کے پھولوں کی بیل ہم نے باہر کی دیوار پر دیکھی تھی کمرے کی ہر چیز اسی رنگ کی تھی، چھت، دیواریں، پردے، صوفے، قالین، بجلی کے چراغ، تصویروں کے فریم، گلدان، غرض یہ کہ ہر چیز آسمانی تھی، ہمیں اپنی شیروانی کے رنگ پر افسوس ہو رہا تھا کہ کمرے سے میل نہیں کھا رہا تھا!

اس آسمانی رنگ کی دنیا میں ہم ابھی کھوئے ہوئے ہی تھے کہ

سامنے کے دروازے کا پردہ ہٹا اور بیگم صاحبہ رونق افروز ہوئیں ہم اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے، ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ بیلوں کے ایک "بھکاری" کی اس طرح عزت افزائی ہوگی! ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ غالباً بیگم نے مالی کو بیل کے پودے نکالنے حکم دیا ہوگا اور اس کے پودے نکالنے تک اخلاقاً ہمیں کمرے میں بٹھایا ہوگا۔

بیگم صاحبہ قدم رنجہ فرماتے ہی ہم سرو قد تعظیم کے لئے اپنی ساری پریشانیوں کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور بڑے ادب سے جھک کر انھیں سلام کیا۔

"تشریف رکھئے" بیگم صاحبہ کی نقرئی آواز کمرے میں گونجی، تب کہیں ہمیں کچھ ہوش آیا۔ اس ارشاد کی تعمیل میں ہم صوفہ پر بیٹھ گئے، ہمیں بٹھا کر بیگم صاحبہ بھی ہمارے روبرو بیٹھ گئیں، اب جو ہم نے بیگم صاحبہ پر نظر ڈالی تو وہ بھی آسمانی دکھائی دیں، نیلی بنارسی ساڑی زیب بدن تھی، کانوں میں نیلم کے خوبصورت بندے، ناک میں فیروزہ کی کیل، سینہ کے کھلے ہوئے گلے میں نیلے نگوں کی مالا، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں دو چار فیروزہ اور نیلم کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں نیلا سنہری سینڈل تھا۔

بیگم صاحبہ نے بیٹھتے ہی کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کو نیلے پھولوں کی بیل کے پودے چاہئیں؟"

ہم نے جواب دیا "جی ہاں! آپ کی بیل کے پھول بڑے خوبصورت ہیں اگر اس کا ایک پودا ہمیں عنایت ہو تو بڑی نوازش ہوگی"!!

"ضرور! شوق سے!! ایک کیا دو تین لے جائیے! اس کا بساط ہی کیا ہے، مگر یہ بیل ہے بڑی نازک! پودے جمنے تک سایہ میں رکھئے"!

بیگم صاحبہ نے مالی کو حکم دیا کہ دو چار پودے احتیاط سے نکال کر ہماری موٹر میں رکھ دے۔ ہم نے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا اور اٹھنے لگے تو فرمایا۔

"بیٹھئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے! ابھی تو مالی گیا ہے"!!

ہم نے بیٹھتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ کو آسمانی رنگ بہت پسند ہے، اس مکان کی تو ساری دنیا آسمانی نظر آتی ہے"!

ہمارے اس جملہ پر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں اور عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! مجھ کو نیلے رنگ سے بہت محبت ہے، آپ کو کونسا رنگ پسند ہے"؟

"اس ناچیز کو بھی یہی رنگ پسند ہے، ایک نجومی نے تو نیلے رنگ کو بہت مبارک بتایا ہے"۔

"ارے کیا سچ"؟ بیگم صاحبہ نے آنکھوں میں کچھ عجیب چمک پیدا کرتے ہوئے پوچھا "مجھ کو بھی ایک نجومی نے ہمیشہ نیلا لباس استعمال کرنے کی تاکید کی تھی"۔

"عجیب اتفاق ہے"! ہم نے تعجب سے کہا۔

"مرحوم کو بھی، اللہ پاک انھیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے، نیلا رنگ بہت پسند تھا، آج انھیں جنت کو سدھارے ایک مہینہ ہوتا ہے (آہ بھر کر) خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں! ان کے چہلم کو ایک ہفتہ باقی ہے، اگر زحمت نہ ہو تو چہلم کے فاتحہ میں ضرور آئیے"!

ہم نے اخلاقاً کہہ دیا ضرور حاضر ہوں گے۔ آنکھوں پر نیلا ریشمی رومال پھیرتے ہوئے بیگم صاحبہ نے آبدیدہ ہو کر کہا "نیلی بنارسی ساڑیاں مرحوم کو بہت پسند تھیں، مہینہ میں دو چار عمدہ نیلی ساڑیاں وہ میرے لئے خرید لاتے تھے اور مجھ کو

پہنا کر "میری آسمانی حور" کہہ کر میرا منہ چوم لیا کرتے تھے، اسی لئے میں نے ان کے سوگ میں ان کے پسندیدہ رنگ میں اپنے کو رنگ لیا ہے"۔

اس وقت مالی نے اطلاع دی کہ بیل کے پودے ہماری موٹر میں رکھ دیے گئے ہیں، ہم نے بیگم صاحبہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے جانے لگے تو بیگم صاحبہ نے اصرار سے کہا۔

"دیکھیے! بھولنا مت!! مرحوم کے چہلم میں ضرور آنا! اپنا پتہ چھوڑ جائیے، دعوت کا کارڈ بھیج دوں گی"

ہم نے کارڈ پر اپنا پتہ لکھ کر بیگم صاحبہ کو دیا اور دعوت کا پیشگی شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

دوسرے ہی دن ہمیں نیلے رنگ کا ایک نہایت خوشنما دعوت نامہ ملا، "دنیا فانی ہے" سے کارڈ کا مضمون شروع ہوا تھا اور آخر میں "سوگوار" کے بعد بیگم صاحبہ کا نام جلی قلم سے لکھا تھا۔

دعوت کے دن ہم کوئی نو بجے دن کے مرحوم کے مکان پہنچے، صحن میں ایک بہت بڑا شامیانہ تانا گیا تھا جس میں صاف ستھرے فرش پر مہمان جمع ہو رہے تھے اور شامیانہ کے سرے پر ایک صاحب کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، کوئی بیس پچیس دعوتی قرآن مجید کے پارے لئے بیٹھے تھے، ہم بھی ایک طرف پارہ لے کر تلاوت میں مصروف ہو گئے، جب ہم نے پارہ ختم کر کے نظر اٹھائی تو کوئی سو سوا سو مہمان آ چکے تھے، اکثروں نے پارے ختم کر لئے تھے، چار چھ جو تلاوت میں مصروف تھے وہ بھی جلد جلد پڑھ کر سیدھے ہو بیٹھے تھے، اتنے میں استقبال کرنے والے صاحب مجلس میں آئے اور ہم سب سے مخاطب ہو کر بولے

"مرحوم کی روح فاتحہ کی منتظر ہے! سب حضرات فاتحہ پڑھ کر روح کو شاد کریں"!!

سبھوں نے فاتحہ پڑھی اس کے بعد موصوف نے فرمایا کہ ہم سب مل کر مرحوم کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں، چند قدم پر قبرستان تھا جہاں مرحوم ایک خوبصورت لحد کے اندر قیامت کی نیند سو رہے تھے، ہم سب نے مل کر مرحوم کی آرام گاہ پر پھولوں کی چادر چڑھائی اور فاتحہ پڑھ کر اٹھ رہے تھے کہ ان ہی صاحب نے ہمارے کان میں کہا،

"بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ ماحضر تناول کئے بغیر آپ تشریف نہ لے جائیں"!

ہم نے آہستہ سے کہا "بہت اچھا! بیگم صاحبہ کو ناراض کر کے ہم کیسے جا سکتے ہیں"!!

بہت سے مہمان کچھ نہ کچھ عذر کر کے چلتے بنے، کوئی بیس پچیس دعوتی رہ گئے، جب ہم قبرستان سے واپس ہوئے تو کھانا تیار تھا۔ بڑے سلیقہ سے دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، رکابیاں، ڈشیں، گلاس سب کے سب آسمانی رنگ کے تھے، سب مہمانوں کے ساتھ ہم بھی دسترخوان پر بیٹھ گئے، دسترخوان پر ہم نے جو نظر ڈالی تو کھانوں کی قسمیں دیکھ کر ہمیں بڑی پریشانی ہوئی کہ کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں، ہمارے بازو ایک بزرگوار بیٹھے تھے انہوں نے چپکے سے کہا،

"معلوم ہوتا ہے قدیم روایت کی پوری پابندی کی گئی ہے"!

ہم نے پوچھا "قدیم روایت سے آپ کا مطلب کیا ہے"؟

ارشاد ہوا "چہلم کی دعوت میں پورے چالیس قسم کے کھانے ہوتے ہیں کہ مرحوم کی روح کو سیری ہو"!

اس نرالی روایت کو سن کر ہمیں ہنسی آنے لگی، ہم نے کہا، "عجیب بات ہے! کیا مرحوم کی روح بھی اس دسترخوان پر

موجود ہے"؟

ہمارے اس طنز پر وہ بزرگوار بگڑ کر فرمانے لگے۔

"ذرا غور سے دیکھنا! کتنی قسم کی چیزیں آپ کے سامنے رکھی ہیں!! ان چیزوں کے دسترخوان پر رکھنے کا مطلب یہی ہے!! آج کی روشنی کے نوجوان اس کو مانیں نہ مانیں، مگر ہمیں تو یقین ہے کہ مرحوم کی پاک روح بھی اس وقت ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہے"!

بات بڑھتی دیکھ کر ہم نے چپ سادھ لی اور چپکے سے کھانوں کا ہم نے جو شمار کیا تو واقعی چالیس قسم کی چیزیں دسترخوان پر موجود تھیں، مرحوم کی روح ہمارے ساتھ کھائے کہ نہ کھائے مگر ہم نے تو خوب جی بھر کر مزے مزے کی چیزیں نوش جان کیں اور بیگم صاحبہ کو ہزاروں دعائیں دیں کہ اللہ پاک انھیں نظر بد سے بچائے اور ایسی ہی پر تکلف تقریبیں کرنی نصیب کرے!

کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کی جانب سے جو صاحب میزبانی کر رہے تھے ہم نے اُن سے کہا کہ ہماری جانب سے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کریں اور ان کی خدمت میں ہمارا سلام پہنچا دیں۔

وہ بولے" ابھی آپ نہیں جا سکتے! بیگم صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں"۔

یہ سن کر دو چار تعزیتی جملے ہم نے یاد کر لیے، جب سب مہمان جا چکے تو بیگم صاحبہ نے ہمیں اسی گول کمرے میں یاد فرمایا جس میں ہم نے پہلی دفعہ بیگم صاحب سے نیاز حاصل کیا تھا، بیگم صاحبہ کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھیں، جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بیگم صاحبہ اُٹھ کھڑی ہوئیں، ہم نے آداب عرض کرتے ہوئے کہا

"اللہ پاک مرحوم پر رحمت نازل کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، مرحوم کا چہلم واقعی آپ نے بڑے سلیقے اور دریا دلی سے کیا، مرحوم کی روح آج آپ سے بہت خوش ہوئی ہوگی"۔

یہ کہہ کر جب ہم نے بیگم صاحبہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ ہم نے ہلکی سی مسکراہٹ رقص کرتی دیکھی، ہم بہت چکرائے کہ یہ کیا ماجرا ہے! آج بھی بیگم صاحبہ نیلی زرین ساڑی پہنی ہوئی تھیں، کانوں میں وہی نیلمی بُندے اور گلے میں لاکٹ تھا جس میں مرحوم کی چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔

مسکراتے ہوئے بولیں" جب آپ کو آج کی دعوت پسند آئی تو ہمیں ہماری محنت کی خاطر خواہ داد مل گئی! آپ نے کچھ کھایا بھی ہے یا صرف دیکھتے ہی رہے"؟

ہم نے کہا" سچ تو یہ ہے کہ کھانوں کی قسمیں دیکھ کر بھوک مر گئی اور طبیعت سیر ہو گئی! کھایا کم مگر دیکھا بہت"!!

اس جواب سے بیگم صاحبہ خوش ہو کر کہنے لگیں۔

"ہم آپ کو آج رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دیں گے"!

ہم نے پوچھا" یہ کس تقریب میں"؟

مسکراتے ہوئے فرمایا" آپ نے سنا ہوگا" شادی و غم توام ہوتے ہیں، اس کی مثال بھی آج دیکھ لیجئے"!

ہم نے عرض کیا" غمی کی اس تقریب کے بعد ہماری سمجھ میں نہیں آتا خوشی کی کیا تقریب ہوگی"!

کچھ جھینپتے ہوئے کہا" آپ میرا مطلب نہیں سمجھے، خدا بخشے مرحوم کو بڑے نیک دل انسان تھے!! میری جوانی پر رحم کھا کر مجھ سے جدا ہوتے وقت وصیت کی تھی کہ ان کے چہلم کے بعد دوسرا بیاہ کر لوں! اگر آج مرحوم کی وصیت پر عمل نہ کروں تو ان کی روح کو کس قدر ملال ہوگا!! وہ کبھی مجھ سے ناخوش نہیں ہوئے! انھیں زندگی میں کبھی میں نے دکھ نہیں دیا انھیں اب مرنے کے بعد خدانخواستہ کیسے رنجیدہ کروں!! اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ آج ہی شام کو عقد کر لوں"!!!

"باغبان"

میر احمد علیخاں شہید دہلوی

سلطنت مغلیہ کا باغ تاراج، اوراق گل پریشان، بلبلان چمن آوارہ گرد ہو رہے ہیں کچھ مشرق کی جانب کچھ مغرب کی طرف، ایک کا منہ دکن کی سمت اٹھتا ہے۔

طائر مصروف پرواز ہے شمال سے جنوب تک راہ کے تمام مصائب جھیلتا گردش ایام کے تھپیڑے کھاتا دکن پہنچتا ہے، تھکا ماندہ طائر سب سے اونچے قصر پر گر پڑا، سنتے ہیں نواب سکندر جاہ بہادر کا عہد اور راجہ چندو لال کا محل تھا، کہ خدا کی دور رس نگاہیں کنگرے پر بیٹھے ہوئے پرندے کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچتی اور اندرونی کیفیات بھانپ لیتی ہیں، صورت سے عیاں ہے کہ خاک نجابت کے ذرات باد حوادث کے ہاتھوں سرگرداں ہیں؛

دانہ ڈالا جاتا ہے ــــ طائر ــــ انسان سے مانوس اور معارف پروری کا بھوکا ــــ طائر نیچے اترا، قدر دانی اور ہمت افزائی کے آثار نظر آئے، اطمینان کا سانس لیا اور یہیں کا ہو رہا،

میر احمد علی خاں نام، شہید تخلص، سید جعفر علی خاں بہادر کے فرزند، ان کے جد اعلیٰ سید سادات خاں بہادر مرغشی جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند کے امرا میں تھے۔

سادات خاں بہادر کی بیٹی محمد فرخ سیر بادشاہ دہلی کے نکاح میں آئیں اس لحاظ سے مراتب میں اضافہ سید سلابت خاں خطاب اور ــــ داروغگی توپخانہ کی خدمت پر مامور ہوئے جس زمانے میں سادات بارہہ نے محمد فرخ سیر بادشاہ کو گھیر لیا تو خان مذکور لڑتے بھڑتے چاندنی چوک تک پہنچے اور دو بیٹوں سمیت حق نمک ادا کیا۔

خان موصوف کے باقیات میں ذہن بیٹے رہے۔ ذوالفقار جنگ، سیف خاں، اور سید حسین خاں، سلطان ابراہیم کی جنگ کے وقت ذوالفقار جنگ قطب الملک کے ساتھیوں میں تھے ہمارے ہیرو حضرت شہید کا سلسلہ ذوالفقار جنگ موصوف تک منتہی ہوتا ہے،

سنہ ۱۱۳۳ھ فردوس آرامگاہ کا نکاح گوہر النساء (سادات خاں مذکور الصدر کی بیٹی) ــــ سے ہوا اس کے سوا خود ذوالفقار جنگ کی بیٹی بھی فردوس آرامگاہ کے حبالۂ عقد میں آئیں اور صاحبہ محل کہلائیں (یہ شہید کی دادی تھیں) ان مناسبات کے مدنظر ذوالفقار جنگ اول چار ہزاری منصب بخشی گیری احدیاں بعدہ بخشی گیری چہارم پر سرفراز ہوئے۔ اس زمانے میں حمید الدین خاں عالمگیری کا انتقال اور انھیں ان کی جگہ ترقی دی جاتی ہے۔

فردوس آرامگاہ کو مذکور الصدر ہر دو بیگمات سے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس لئے دونوں نے مرزا احمد بہادر یعنی احمد شاہ کو پال لیا۔ سنہ ۱۱۶۱ھ ہنگامۂ نادری فرو کرنے کے لئے شاہزادہ مذکور ذوالفقار جنگ کی اتالیقی میں اعتماد الدولہ وزیر و صفدر جنگ میر آتش وغیرہ کے ہمراہ مقرر کئے گئے، اسی اثناء میں فردوس آرامگاہ نے بمرض استسقا وفات پائی اور احمد شاہ تخت نشین ہوئے نئے بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی منصب ہشت ہزاری و ہشت ہزار سوار حضرت نظام الملک بہادر سے منتقل کر کے انھیں بخشا سید سادات خاں ذوالفقار جنگ خطاب عطا ہوا اور گفتگو میں شاہ موصوف "نانا بابا" سے مفتخر

فرماتے تھے۔

صاحب "محبوب الزمن" اس کے خلاف شہید کا سلسلہ نواب سربلند خاں بہادر، دلاور جنگ، مبارز الدولہ مبارز الملک صوبہ دار گجرات سے ملاتے ہیں۔ پچھلے دنوں تعطیلات میں تقدس مآب حضرت مولانا سید رستم علی صاحب کے خزینۂ نوادر میں شہید کا ایک قلمی اردو دیوان نظر آیا، یہ ان کے کسی شاگرد غلام مصطفےٰ مسندوری سنہ ۱۲۷۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ شہید سنہ ۱۲۹۲ھ میں فوت ہوئے اس لحاظ سے یہ نسخہ شہید کے حین حیات لکھا گیا، بہت ممکن ہے خود شاعر کی نظر سے بھی گزرا ہو۔ کہیں کہیں حواشی پر کاتب نے شاید استاد کے مشورے سے اغلاط کو صاف و صحیح کیا ہے، خط صاف ہے ۲۰۲ صفحات کا حجم کل غزلیات ۲۴۱ ہیں رباعیات، قطعات مزید براں خاتمہ اس عبارت پر ہوتا ہے "بفضلہ تعالیٰ شاہد کتاب ہذا یعنی دیوان اول حضرت استاد اکمل سخندان بے بدل حضرت میر احمد علی صاحب الموسوی المتخلص بہ شہید ساکن شاہجہان آباد عرف دہلی بمقام بلدہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد از خط شاگرد حضرت معز مسمیٰ بہ غلام مصطفیٰ خاں مسندوری بتاریخ ہشتم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۷۰ھ النبوی صلعم باتمام رسید" اس صفحہ کے عقبی حصہ پر دوسرے قلم سے وزیر کی ایک رباعی و قطعہ اور شہید کے بعض سنہ ۱۲۷۳ھ کے تاریخی قطعات ہیں۔

اس دیوان کے دیباچہ میں شہید نے اپنے خانوادہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "سید سادات خاں بہادر ذوالفقار جنگ کو کہ نقیر کے دادا اور احمد شاہ ابن محمد شاہ کے نانا تھے سر دربار خطاب سے "نانابابا" کے یگانہ و ممتاز کیا اور خدمت سے امیر الامرائی یعنی میر بخشی گیری کے باقدر و اعزاز کیا" دوسری جگہ فرماتے ہیں "اور محل "صاحبہ محل" کا کہ نقیر کی دادی اور احمد شاہ کی ماں اور شاہ عالم بادشاہ کی چچی تھیں محل پادشاہی میں داخل ہے"

صاحب محبوب الزمن نے سادات خاں بہادر یا مذکورۂ بالا اعزازات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات جن کا ذکر محبوب الزمن میں ہے، یہ شہید سے ایک غیر متعلق ذات ہے۔ ہر دو ہم عصر و ہم عمر تھے اور ایک مرتبہ انھیں بھی حضرت نظام الملک سے منتقل ہو کر منصب ملا تھا شاید یہی وجہ التباس ہے ورنہ سربلند خاں کے خاندان میں سلسلہ امارت ان کی اولاد پر ختم ہو جاتا ہے بخلاف اس کے ذوالفقار جنگ کا خانوادہ کمپنی کے عہد تک معزز و محترم تھا جیسا کہ خود شہید کہتے ہیں۔ "خویش و اقارب عاصی کے سوا اس جاگیر کے فرو فرد نقد ماہوار سے برکت اندوز اور دربار میں حاضر ہیں"

موضع ترآئینہ اور کوٹ قاسم وغیرہ انہیں کے خاندان کی جاگیرات تھیں جو منجملہ دیگر املاک شاہی کمپنی کے قبضہ میں آئیں۔

شہید کو شاید خانگی حالات سے مجبور ہو کر دہلی چھوڑنا اور حیدر آباد بسانا پڑا، حیدر آباد اس وقت مرکز اہل کمال بنا ہوا تھا لوگ ہر طرف سے راہیں مسدود پاتے اور دکن کا رخ کرتے یہاں قدر دانیاں پہلے ہی سے چشم براہ رہتی تھیں۔ آتے ہی ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتے، اور اسی زمانے کے لئے کیا مخصوص ہے۔ اب بھی سرکار فیض آثار حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا آفتاب کرم اپنی گہربار و زرپاش کرنوں سے انصائے عالم کو منور کر رہا ہے دنیا کا ہر ذرہ بقدر خود اکتساب نور میں مصروف ہے۔

حیدر آباد پہنچ کر شہید کی آہ رسا فیاض زماں مہاراجہ چندو لال بہادر کے کانوں تک پہنچتی ہے مہاراجہ کی زر بخشی کے متعلق شاید اتنا کہنا کافی ہوگا کہ "جہاں" چندو لال کا حیدر آباد کہا کرتے تھے" تو پھر بھلا شہید ہی کیوں محروم رہتے۔ اس لئے مہاراجہ دھیراج خلعت الرشید مہاراجہ چندو لال کے مصاحبین کی مالا میں یہ درنایاب بھی پرو دیا گیا۔

سنہ ۱۲۴۴ھ نواب ناصر الدولہ بہادر مغفور نے جلوس کے موقع پر تمام امراء و اہل کمال کو بلایا، ان میں شہید بھی تھے سب کا نصیبہ جاگا۔ اضافہ خلعت اور مصاحبت سے سرفراز ہوئے مگر قسمت کی افتاد بیچارے شہید کچھ محروم سے رہے اس واقعہ کا ذکر بہت حسرت و یاس سے کرتے ہیں "جب نواب ناصر الدولہ ابن سکندر جاہ نے سنہ ۱۲۴۴ھ میں جلوس فرمایا تو ریاست پر بیٹھتے ہی منصبداروں کو بلایا اور مخلع کیا اور مخاطب و مصاحب بنایا، فقیر بھی حسب الطلب دربار میں آیا اور اضافہ خلعت و قربت وصحبت سے فائدہ اٹھایا اگرچہ چشم پوشی سے زمانہ بے دید کی یا نامساعدت سے بخت ناسعید کی ناسعادت دنیوی حاصل ہوئی بہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ بدولت اس کے نوالہ خشکے کا پاؤ ٹکڑا روٹی کا روکھا سوکھا کھا کر ساتھ عزت و راحت کے ٹھنڈے پانی کا گھونٹ پی کر بال بچوں سمیت آرام سے پاؤں پھیلائے سوتا ہوں اور اگر جاگتا ہوں تو اس کا شکر نعمت اور اس کے حق میں دعا نثار کے سعادت یاب دارین ہوتا ہوں ہمیشہ ہو اقبال اس کا اور قائم رہے اجلال اس کا۔"

صاحب محبوب الزمن لکھتے ہیں کہ اس موقع پر انھیں امیر الشعراء کا خطاب بھی ملا حالانکہ خود شہید اس معاملہ میں حرفِ حسرت بہ لب ہیں۔ بلکہ "اضافہ خلعت و قربت وصحبت" کا اعتراف تو خود انھوں نے بھی کیا ہے اب کسر صرف خطاب ہی کی تھی جس پر بخت ناسعید یا زمانہ بے دید مورد طعن ٹھیرا۔ اس کے علاوہ ان کے شاگرد غلام مصطفےٰ خاں نے بھی ان کے نام کے ساتھ اس خطاب کا الحاق نہیں کیا، بنابریں اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ کم از کم سنہ ۱۲۷۰ھ تک امیر الشعراء نہ تھے، بہرحال امیر الشعرا نہ سہی ناصری منصبدار ضرور تھے، جیسا کہ فرماتے ہیں" اور سرکار فیض آثار میں نواب آصفجاہ دام اقبالہٗ کے ارث پر بزرگوں کی کہ قدیم سے یہاں وارد تھے توسل بہم پہنچایا، شکر خدا کا کہ شاعر اور منصبدار ہی کہلایا اور اس کا نعم البدل پایا" سید نصیر الدین قادری المعروف شاہ نصیر سے شاعری میں تلمذ تھا۔

شہید کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آج سے ایک صدی قبل وہ زبان استعمال کرتا ہے جس کے بنانے کی سعی کی جارہی۔ عربی و فارسی کے موٹے موٹے نامانوس لغات سے ہمارے شاعر کا دامن پاک ہے وہ ہر جگہ نہایت سہل تراکیب خالص اردو الفاظ اور ٹھیٹ ہندستانی محاورات استعمال کرتا ہے۔ مثلاً

دل سے ہم تو ہاتھ دھو بیٹھے ہیں پر واقف ہیں لوگ
یوں نہ گھبرا اے شہید یک دم ہزار امید ہے

یا مثلاً

اکثر گئے ہیں کھاٹ سے دہاں خون چاٹ کے
قائل ہیں تیغ ابروئے قاتل کی کاٹ کے

یا

سخت کیوں ہو نہ مریض غم ہجراں تیرا
بس ہرا ایک سوچ کے ہو جس کے بدن کی لکڑی

اس کے علاوہ شہید کے کلام کی ایک ممتاز صفت سادگی ادا ہے اچھے شعر کی ایک یہ تعریف بھی ہے کہ سامع کے منہ سے، سنتے ہی بےساختہ واہ نکلے اور یہ چیز بغیر سادگی کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ شہید کا سارا دیوان دیکھ جائیے کہیں کوئی شعر نہ ملے گا جسے سادگی ادا کے معیار سے ساقط کیا جائے۔ وہ دقیق فلسفیا مسائل بھی ایک چٹکی بجاتے حل کرتا ہے مثلاً

یوں منزل جہاں ہے گزر گاہ عارضی ؛ آکر گھڑوں کو پھر تے ہیں جیسے لگ کے گھاٹ

بعید الفہم تشبیہات سے کوسوں دور ہے بدیسی مشابہات کو ہاتھ نہیں لگاتا ایرانی گل و بلبل، نو روز و بہار سے اسے کوئی مطلب نہیں۔ وہ جب کہتا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنی بات اپنی چیز اپنا مال۔ اس کی بلبل کوئل ہے اس کی بہار بسنت، اس کی آتش عشق آتش کدۂ فارس کی ممنونِ کرم نہیں بلکہ یہ وہ ہندستانی آگ ہے جو فی الواقع بلا تمیز مرد و زن مردہ و زندہ انسانوں کو جلا دیا کرتی تھی۔

تھی پس از مرگ تف غم سے مری ہر پسلی
جوں بھڑکتی ہوئی ہندو کی چتا کی لکڑی

شہید کے لئے اپنا سیدھا سادہ "شادیانہ" اغیار کے چنگ و رباب سے زیادہ سامعہ نواز ہے۔

لیتے احسان اجل ہم مگر اس شرط کے ساتھ
شادیانے اگر آ کے ترے در کے بجتے

ہندوستان میں تقاریب کے موقع پر یہ رسم اب بھی جاری ہے۔ خالص ہندستانی تشبیہات کے استعمال نے شہید کے کلام میں جدت سی پیدا کر دی ہے مثلاً (شاید کسی نے باندھا ہو)

نکتہ سنجی کی تو پھینک اس سے ہے وابستہ شہید
کیوں نہ خامہ کو کہوں اہل سخن کی لکڑی

یا

نہ ہے بسنت نہ ٹیسو نہ بن کو آگ لگی
شہید عشق کے شاید کفن کو آگ لگی

آس و نراس کے موقع پر دل کا اضطراب سب ہی نے باندھا ذرا شہید کی ندرت ملاحظہ ہو ؎

پھر اب مجھے زمین پہ دیتا ہے ٹکیاں
لیجا کے تا فلک دلِ مضطر زمین سے

گر ہوں فلک سے ایک تڑپ میں زمین پر
پھر دوسری تڑپ میں فلک پر زمین سے

ہمارا شاعر جم و کسریٰ کے افسانے نہیں گاتا بلکہ اسے راجہ اندر سے انس ہے۔

خاکساری نقش پا کی طرح حاصل کر شہید
راجہ اندر کی سواری کا سنگاسن چھوڑ دے

وہ رستم و سہراب یا روئیں تن و اسفندیار کے سہارے نہیں جیتا بلکہ ؎

کوئی ہیرا من کا پٹھا اب کہیں ملتا نہیں
ورنہ سنگل دیپ کا بچہ یہ انتر بید ہے

شہید کا کلام برجستگی و روانی میں اپنی مثال آپ ہے آورد کا کہیں نام نہیں ہر طرف آمد ہی آمد نظر آئے گی کہیں کسی قسم کی جھجک تصنع یا بناوٹ کا پتہ نہیں معلوم ہوتا ہے شاعر کد و کاوش سے قطعاً بے نیاز ہے جو بات کہتا ہے وہ خود ہی موزوں ہوتی اور شعر کا جامہ پہنتی جاتی ہے، مثلاً

اماں! کدھر کے چار قل واعظ بھی قائل ہو گیا
کان میں جوں ہی صدائے خندۂ قلقل گئی

شہید آج تو شیخی بنی ہوئی بگڑی
ملے تو اٹھ کے وہ ہم سے پہ شرمگیں سے ملے

دربار پر پہنچنے کے بعد جن جھڑکیوں اور نوازشوں سے عاشق کی تواضع کی جاتی ہے اسے باندھا تقریباً سب ہی نے مگر ذرا شہید کی آواز پر کان لگائیے۔

بولے ہو چیں بہ جبیں حلقۂ در کے بجتے
کیوں رے مردود! پھر آیا تو گجر کے بجتے

لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد وامق و عذرا سے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے شعرا نے کیا کیا زمین آسمان کے قلابے نہ ملا دیئے۔ اور پھر بھی کوئی ایسی بات بہت کم کہہ سکے جسے حق پسند قلوب قبول کریں۔ شہید صرف ایک ہی بات کہتا ہے

مگر ایسی جو دل میں اتر جائے۔ بہت سادی نہایت معمولی مگر سچی ؎

لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا گزرے ان کا کیا مذکور
میرا آن کا ذکر الفت طرفہ قصہ اب کا ہے

کسی مسئلہ میں مناظرہ کی انتہائی شدت کو آپ کا ایک نقرہ جتنا جلد ختم کردے گا کوئی مدلل بات نہیں کرسکتی "اچھا بھئی چھوڑو اب گئی گزری" لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے افسانوں کی اہمیت گھٹانے کے لئے اس سے زیادہ کامیاب شعر کم ملے گا۔

اکثر تشبیہات ایسی اچھوتی اور نازک استعمال کی ہیں کہ ان کی تحلیل شعر کا خون کرنے کے مترادف ہوگی۔ شلاً

ابروؤں میں تیرے سرول کا جھکا رہتا ہے
شیشہ اک طاق میں کعبہ کے دھرا رہتا ہے

یا

وہ دیکھے ہے منہ صبح اٹھ آرسی میں
چمن آئینہ میں اُگا جا رہا ہے

دلِ عاشق سے اٹھنے والے دھوئیں کی مختلف تشبیہات شعرائے باندھی ہیں مگر خالص ہندستانیت شہید کی بندش میں نظر آئے گی۔ ؎

یوں دھوئیں کی ہیں لٹیں شعلۂ داغ دل پر
سر پہ جوگی کے کھلا جیسے جٹا رہتا ہے

ہوا سے درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی وجہ جو کچھ شہید بیان کرتے ہیں وہ شاید ہی کسی اور کی سمجھ میں آئی ہو ؎

خاک ہے زیرِ شجر کون سے کرتا لی کی
نال سے برگ ہیں جو شاخِ شجر کے بجتے

شہید کے دیوان میں بہت کم اشعار ایسے ملیں گے جنھیں پڑھ کر آپ کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نہ کھیل جائے۔

قدرت زبان کا یہ عالم ہے کہ ٹ، ڈ، ڑ جیسے ثقیل اور مشکل قوافی میں بھی شہید بند نہیں۔

جس طرح سالن میں مناسب نمکینی اس کو لذیذ بنا دیتی ہے اسی طرح شہید کے کلام میں شوخی و لطافت کی چاشنی عجیب مزا دیتی ہے۔ یہ دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت اردو دنیا میں ایک مفید باب کا اضافہ کرے گی۔

قدسی صفات حضرت سید رستم علی صاحب ڈیوڑھی مستقیم الدولہ جھنہ بازار کے پاس آپ بھی اس کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

سید مجتبیٰ حسین نوگانوی

دفتری معلومات

:- از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس صفحات ۷۶ قیمت ۱۲/

یہ ایک مفید کتاب ہے جس کے پہلے باب میں دفاتر کے عام طریق کار، دوسرے میں حسابی معلومات تیسرے میں ملازمت سرکار عالی کے متعلق احکام و ضوابط سلیس زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ ہر ملازم و غیر ملازم سرکار کو ان باتوں سے واقف ہونا چاہیے۔

جنگل کا قانون

ایک خوب صورت اور زرخیز وادی کے عین درمیان ایک تنہا پہاڑی کھڑی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وادی کی واحد حکمراں ہے۔

اُس کے تین طرف نہایت ہی ڈھلوان چٹانیں ہیں۔ البتہ چوتھے رخ پر ایک راستہ کافی کشادہ لہراتا ہوا پہاڑی کے سب سے اونچے حصہ تک جا پہونچتا ہے۔

"بادل" ایک بوڑھا سال خوردہ بوربچہ ایک بڑی انجیر کی ٹہنی کے قریب جو زمین کو چھو رہی ہے لیٹا ہوا ہے۔ انجیر کا درخت بازو سے گزرتے ہوئے راستہ پر پورا چھایا ہوا ہے۔ بادل وہاں تڑکے ہی سے دھوپ کھانے کے لئے آکر لیٹ رہا تھا۔ بھوک کے نہایت ہی شدید حملوں کو بھلانے کے لئے کبھی اس کروٹ اور کبھی اُس کروٹ ہو جاتا۔ راستہ پر اس کی پُر امید نگاہیں لگی ہوئی تھیں کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا آنکلے۔ آج اسے شکار ملنا چاہیے تاکہ پیٹ کا دوزخ بھرے۔

بہتے ہوئے نالہ کے شفاف پانی سے وہ اپنا پیٹ بھر چکا تھا جو راستہ کے تقریباً متوازی خرام ناز اور ایک خوش گوار شور کے ساتھ چلا جاتا تھا لیکن بادل کے پیٹ میں کئی دنوں سے ایک دانہ بھی اتر کر نہ گیا تھا۔ فاقہ کشی کی موت اس کی نظروں میں چھائی جا رہی تھی۔ ایک طرف ضعیفی اس کی فراہمی غذا کی قوتوں کو فنا کرتی جا رہی تھی اور پھر اس فاقہ کشی نے اس کے رہے سہے حواس بھی منتشر کر دیے تھے۔ اب بادل کیا تھا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ وہ خوبصورت داغ دار ریشم نما کھال جس پر اس کو ناز تھا سخت اور خار دار ہو چکی تھی۔ پیٹ پیٹھ کو آلگا تھا۔ پنجے پُر آماس اور درد سے آلودہ تھے۔ چلنا اور کھڑا رہنا ایک بار تھا۔ بڑی مصیبت سے وہ اس جگہ آن کر ایک کونہ میں پڑ گیا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ پہاڑی جنگلی جانوروں کا وطن ہے۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے وہ اس راستے یقیناً پہاڑ پر آئیں گے۔ "تاکہ اپنی اپنی آرام گاہوں میں بسیرا لیں ——" پس ان جانوروں میں سے صرف ایک آہ کاش صرف ایک میرے پیٹ کی وسعتوں کو بھر دے۔") بادل نے سوچا کہ اگر آج رات تک اس نے ایک جانور کا شکار نہ کیا تو بس صبح تک اس کی موت ہے۔

آفتاب عالم تاب دن بھر کے سفر سے تھک کر مغرب کی طرف آرام کو چلا۔ بادل نڈھال وبے حال راستہ کی طرف نگاہ لگائے سوچنے لگا کہ "اب جلدی یہ راستہ جانوروں کی آمد سے بارونق ہو جائے گا مجھ کو چاہیے کہ نہایت تدبیر اور احتیاط سے اپنے شکار پر حملہ کروں اس کے بعد اسے کھینچکر جھاڑیوں میں فوراً لے آؤں اور پھر ——" اس نے آج کی ہونے والی پر تکلف دعوت کے خیال پر اپنے ہونٹ چاٹے۔ بادل نے تمام وقت اپنے ہونے والے شکار کے متعلق خوب نقشے جمائے

"ہر چیز بڑی احتیاط اور سرعت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ایک ذرا سی غلطی بھی اسے شکار سے محروم کر دے گی۔ کیونکہ پھر دوسرے جانور بھی باخبر ہو جائیں گے اور پھر —— موت تو ہے ہی۔"

آخرش کارزار کا وقت قریب آیا۔ بادل نے ان تمام آداب شکار کو ملحوظ رکھتے ہوئے سانس روکلی

اور دیکھ رہا جو سالہا سال کے تجربے نے اسے سکھا دیے تھے۔ ان کی صحت اور غلطی پر اس کی بقا اور فنا کا انحصار تھا۔ اس نے اپنی پرانی ہڈیوں کے ڈھانچے کو بے گوشت پنجوں اور رانوں پر سکیڑ لیا اور راستہ کی طرف آنکھیں جما دیں۔ آخرکار جانوروں کے کاروان کا ہراول آن پہونچا۔ بادل نے ہر گزرتے ہوئے جانور کو غور سے دیکھا اس نے غور کیا کہ کونسا جانور اس کے حملہ کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ بھوک اگرچہ اسے فوری حملہ پر اکسا رہی تھی لیکن اس نے اس جذبہ کو پوری قوت سے روکا کیونکہ اب اس کی وہ شہزوری پنجوں کی قوت اور ناخنوں کی تیزی ایک افسانہ بن کر رہ گئی تھی عقل کا تقاضا تھا کہ ابھی انتظار کرنا چاہیے تاکہ کوئی ایسا جانور نظر آئے جو نسبتاً آسانی سے حاصل ہو سکے۔

جانور ایک ایک کرکے گزر گئے لیکن کوئی جانور ایسا نہ گزرا جس سے اس کی کامیابی کی توقع وابستہ ہو سکتی تھی۔ وہ جوا نہیں کھیلنا چاہتا تھا تیقن اس کی سب سے بڑی موجودہ پالیسی تھی۔ پہاڑی کے نیچے بھیڑیوں کے بھونکنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اب یہ بھیڑیے ہی بادل کے ٹوٹے ہوئے دل کی آخری امید تھے۔ لیکن بادل پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی۔ یہ بھیڑیے بڑے پلید جانور ہیں۔ بوڑھا اگر جوان اور طاقتور بھی ہو تو بھیڑیوں پر حملہ کرنے سے پہلے دو وقت اپنے ارادہ پر سوچ بچار کر لیتا ہے۔ بادل کے دل میں گزشتہ لڑائیوں کی یاد اب تک تازہ تھی۔ کئی دفعہ اس نے ان سے زکیں اٹھائیں اور زخموں کے نشان تو اب تک اس کے جسم پر موجود ہیں۔ بھوک اسے مجبور کر رہی تھی کہ ایک آخری بار قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ اور دوسری طرف ناطاقتی اسے موت کے منہ میں جانے سے روک رہی تھی۔ ان بھیڑیوں کے بھی گزر جانے کے بعد اس کی شکم سیری کے مواقع درجۂ صفر پر آ جائیں گے۔ اپنی بےبسی پر اسے رونا آ گیا۔

یکایک ایک ہلکی سی آواز کسی بھیڑئے کی دور سے سنائی دی بادل کی مردہ آرزوئیں جاگ اٹھیں وہ سنبھل کر بیٹھا اور راستہ کے موڑ پر آنکھیں گاڑ دیں۔ ایک تنہا لیکن غیرمعمولی جسیم بھیڑیا موڑ سے گزر کر سامنے آیا۔ یہ بادل کا آخری موقع تھا۔ اس نے گھات لگائی اس امید سے کہ اب پیچھے بھیڑیے نہیں آ رہے ہیں یہ اگر اکیلا ہی ہے تو مار لوں گا۔ غرض اب غذا یا موت۔

جوں ہی بھیڑیا اس کے قریب آیا بادل اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کرکے اس کی پیٹھ پر ایک گٹھڑی کی طرح جا گرا۔ اس بے خبر حملہ نے بھیڑئے کو بالکل ہراساں کر دیا۔ وہ ایک طرف کو بری طرح گرا۔ لیکن اتنا وقت پھر بھی اسے مل سکا کہ اس غیرمتوقع آفت کی خبر اپنے ساتھیوں کو ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ کر دے اور اس کے بعد وہ زندگی کے لئے لڑنے لگا۔

بادل کے دانت بھیڑئے کی گردن پر تھے اور ناخن کھلے پیٹ کے اندر دھنس رہے تھے۔ بھیڑئے کے لئے بھی آخر موت و زیست کا سوال تھا اس نے بادل کی گرفت سے آزاد ہونے کی پوری کوشش کی لیکن بادل اس شکار کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ اس کے دانت نرخرے کے اندر پہونچ گئے۔ ناخنوں نے پیٹ کی آنتیں نکال دیں۔ چند لمحوں میں وہ بھوک کی لعنت سے آزاد ہو گیا اس نے اپنی کوششیں دوچند کر دیں۔ امید کی آخری کرن نے اس میں کافی توانائی پیدا کر دی۔

لیکن بھیڑئے کی چیخ نے چار بھیڑیوں کو مطلع کر دیا تھا۔ وہ اس کی مدد کو آن پہونچے چاروں طرف بادل کو گھیر کر وہ اس پر بری طرح حملہ آور ہوئے۔ لیکن بادل اپنے کام میں مصروف رہا۔ پھر جب کہ اس نے بھیڑئے کا پوری طرح خاتمہ کر دیا تو اسے اب اپنی سلامتی کے لئے لڑنا تھا۔ ایک خوفناک گرج کے ساتھ وہ ان چاروں پر حملہ آور ہوا۔ کبھی ایک پر برستا کبھی دوسرے پر حملہ کرتا لیکن ہر حملہ میں اس کی قوت اور ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اور بھیڑئے مسلسل حملہ کر رہے تھے۔ پھر جنگ کے شور نے دوسروں کو بھی آگاہ کر دیا اب بادل بھیڑیوں کی فوج کے درمیان تنہا گھرا تھا جو اس کی تکا بوٹی کر رہے تھے۔ اس کی طاقت سرعت سے زائل ہو رہی تھی۔ کئی دفعہ وہ جھلایا ہوا میں قلابازیاں لگائیں۔ کاٹا دھمکیاں دیں اور بار بار پشت سے حملہ آور ہونے والوں کی گرفت سے آزاد ہوا۔ لیکن سب بے سود تھا۔ خون اس کے جسم سے فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔ گو دشمنوں کے جسم بھی لہو لہان تھے لیکن یہ کوئی تسلی کی بات نہ تھی۔

آخرکار اس نے پسپائی کا فیصلہ کر لیا اور بھیڑیوں کے حلقہ سے ایک تیز جست لگا کر علٰحدہ ہو گیا۔ زخموں کی تکلیف سے بے قرار ہولناک چیخیں مارتے ہوئے اس نے ایک بڑی چٹان کے پیچھے پناہ لی اور قریب کی جھاڑیوں میں جس کو چند جنگلی بیلوں نے بہت گنجان بنا دیا تھا آ گرا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بھیڑئے ایسے خطرناک مقام تک اس کا پیچھا نہ کریں گے۔ اس نے اپنے خون آلود زخموں کو چاٹا اور شور مچاتے ہوئے بھیڑیوں کی طرف زور زور سے گرجیں لگائیں۔ تاکہ ان کو پیچھا کرنے سے روکے۔ بھیڑیوں نے آنے کی ہمت نہ کی۔ اب وہ حملہ سے محفوظ تھا۔

لیکن ہر سانس اب اس کے پھیپھڑوں کو کاٹتے ہوئے جانے لگی۔ اس نے زخموں میں شدت کا درد محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بوٹی بوٹی اور ہڈی ہڈی کسی نے چبا ڈالی ہے۔ زخموں کی بڑھتی ہوئی تکلیف بھوک پر بھی غالب آتی نظر آتی تھی۔ اور تھوڑے ہی فاصلہ پر اس کا جائز شکار اس کے قوت بازو کی کمائی رکھی ہوئی تھی۔ جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔

شام کی ہلکی روشنی کی جگہ اب تاریکی لے چکی تھی بھیڑیوں کا کھسیانہ گروہ بکتا جھکتا پہاڑی کی چوٹی پر جا چکا تھا اور ہر جگہ اب خاموشی مسلط تھی۔

بادل نے اپنے کھوئے ہوئے حواس ایک آخری جد و جہد کے لئے مجتمع کئے۔ کچھ نہ کچھ اسے اپنے پیٹ میں ڈال لینا چاہیے۔ درد کی ہلکی کراہوں کے ساتھ وہ جھاڑی سے نکل کر باہر تازہ ہوا میں پہونچا۔ ناقابل احساس درد کی حالت میں اس نے اندھیرے میں اپنے شکار پر ایک نظر ڈالی۔ بڑھتی ہوئی کمزوری سے وہ جنگ کر رہا تھا۔ کچھ قدم اور آگے بڑھائے گئے لیکن ہر ہر قدم ایک قیامت تھی۔ صرف بھوک تھی جو اسے کھینچ رہی تھی۔ بہت سی منزلوں میں اس نے یہ تھوڑا فاصلہ طے کیا اور آخرکار منزل مقصود پر پہونچتے ہی بیدم ہو کر بھیڑئے کے جسم پر گر پڑا اب گوشت کو پھاڑنے کی بھی سکت اس میں نہ رہی تھی۔ بار بار اس نے اپنے دانت بھیڑئے کے پھٹے ہوئے پیٹ پر جمائے لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم عظیم ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے آ رہا اور سانس اکھڑنے لگی۔ اس کا سر آگے کی طرف اپنے آخری شکار پر گر پڑا اور آخرکار یہ لیے جگر روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

ابھی سورج پوری طرح طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مردارخوار پرندوں کی ایک ٹکڑی ہوا میں منڈلانے لگی۔ اور پہاڑی کے مختلف حصوں سے جانوروں کی صدائیں کسی دعوتِ عام کا اعلان کرنے لگیں بہت جلد فاتح و مفتوح ان مفت خوروں کی غذا بن جائیں گے۔

" یہ جنگل کا قانون ہے کہ کمزور فنا ہوتا کہ طاقتور زندہ رہے۔"

(ترجمہ)

محمد نجم الدین انصاری

غریب نوجوان

سرمایہ دارِ دُنیا   با اختیارِ دُنیا
ہنگامہ بارِ دُنیا   نفرت شعارِ دُنیا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہر دل کی غمگساری   ہر غم پہ اشکباری
احساس کا بھکاری   احساس کا پجاری
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہر دم سنورنے والو   پھولوں پہ مرنے والو
کانٹوں سے ڈرنے والو   بچ کر گزرنے والو
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

میری جواں امیدیں   خوابِ جناں امیدیں
ہوں کامراں امیدیں   ایسی کہاں امیدیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

عیش و طرب کے بندو   جام و سبو کو پوجو
راتوں کو دن بناؤ   کیوں میرا حال پوچھو
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

یہ چاندنی، یہ تارے   یہ سین، یہ نظارے
القصہ عیش سارے   مجھ سے رہیں کنارے
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

سب مسکرا رہے ہیں   چرکے لگا رہے ہیں
تسکین پا رہے ہیں   کس کو بنا رہے ہیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

یہ خوشگوار صبحیں   یہ کیف بار موجیں
یہ "پی کہاں" کی جاہیں   سازِ طرب نہ چھیڑیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہوش و خرد سے ہارا   دیوانگی کو پیارا
ناکامیوں کا مارا   بے آس بے سہارا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

یہ کون گا رہا ہے   عالم پہ چھا رہا ہے
بے خود بنا رہا ہے   کچھ یاد آ رہا ہے
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

طوفاں میں بہنے والا   ہر جبر سہنے والا
کچھ بھی نہ کہنے والا   خود دار رہنے والا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہر تان دلنشیں ہے   معصوم ہے، حسیں ہے
صد کوثر آفریں ہے   میرے لئے نہیں ہے
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

سحر رام پوری

بے گناہ مجرم

"میرا موکل ایک شریف اور غریب آدمی ہے تمام لوگ اس کی دیانتداری اور نیک چلن سے واقف ہیں۔ پولیس کے عاید کردہ الزامات سراپا غلط اور بے بنیاد ہیں چنانچہ میرے موکل کا بیان اس حقیقت کو بے نقاب کردے گا۔" وکیل نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا وکیل کا جملہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ حاکم عدالت اور تماشائیوں کی نگاہیں ملزم پر پڑیں جو دنوغم سے حیرت اور پریشانی کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔

"تم اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر تمام حالات من وعن بیان کرو تاکہ تمھارا انصاف کیا جائے۔" حاکم عدالت نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار میں ایک غریب وبیکس ٹانگہ والا ہوں" ملزم نے حلف اٹھاتے ہوئے کہا "ایک روز میں تاج محل ہوٹل کے قریب شام کے وقت اس امید میں کھڑا تھا کہ شاید کوئی سواری ادہر آنکلے اور میں دو چار آنے اور کمالوں۔ تاکہ اس سے میرے دن بھر کے بھوکے معصوم بچوں اور بیوی کے لئے کھانے کچھ سامان خرید لوں میں بہت دیر تک انہی خیالات میں ڈوبا رہا۔ آخر کار مایوسی اور ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑا اور میں گھر لوٹنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی" یہ ٹانگہ تمھارا ہے" "جی ہاں میرا ہے کہاں چلوگے" میں نے پیچھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور دیکھا کہ دو شخص انگریزی لباس پہنے ہوئے میرے پیچھے کھڑے ہیں۔

"کیا تم ہمارے ساتھ مغربی گھاٹ تک چلوگے" ان میں سے پہلے نے کہا جناب مجھے کوئی عذر نہیں لیکن اس وقت شام ہوچکی ہے جاڑے کا موسم ہے علاوہ ازیں راستے کے نشیب وفراز اور گنجان جھاڑیوں کے خونخوار درندوں کا خوف مجھے روک رہا ہے۔

"جنگل اور اس کے جنگلی جانوروں کا کچھ خوف نہ کرو ہم محکمہ جنگلات کے عہدہ دار ہیں کسی کام کی وجہ سے ہمارا اسی وقت وہاں جانا نہایت ضروری ہے ہماری موجودگی میں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی" دوسرے نے پانچ روپیہ کا نوٹ میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا پانچ روپیہ کا نوٹ دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگرچہ کہ سفر لانبا اور موسم ناقابل برداشت ہے تاہم میری محنت کا صلہ بھی تو کچھ کم نہیں قدرے توقف کے بعد میں نے رضامندی ظاہر کی اور وہ دونوں سوار ہوگئے۔ اب ٹانگہ مغربی گھاٹ کی طرف روانہ ہوا آبادی کے آخری ناکہ پر پہنچ کر میں نے اپنے ٹانگہ کا نمبر اور مسافروں کی تعداد نوٹ کرا دی۔ شہر کے باہر ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے میں سردی کی تاب نہ لا سکا اور میرا جسم بید کی طرح کانپنے لگا۔ آسمان پر تاریکی چھائی ہوئی تھی فضا میں گھرے ہوئے کالے کلوٹے پہاڑ کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے گھوڑے کی رفتار بھی سفر کی دوری اور وحشتناک فضا سے کسی قدر سست ہوگئی تھی۔

"کیا تم سردی محسوس کر رہے ہو" ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہاں جناب سردی اس بلا کی ہے کہ میرے نحیف وناتوان جسم میں اس کے برداشت کی سکت نہیں" میں نے گھوڑے کو ہانکتے ہوئے کہا۔ "یہ پہن لو" ایک نے اپنا اوورکوٹ دیتے ہوئے کہا میں نے کوٹ پہن لیا۔ ہم شاید ایک آدھ گھنٹے میں منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "انشاءاللہ ضرور" دوسرے نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا میں برابر گھوڑے کو ہانک رہا تھا لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے جارہے تھے میری دہشت میں اضافہ ہورہا تھا۔ بارے خدا خدا کرکے ہم ایک ایسے مقام پہنچے جہاں کا منظر نہایت خوفناک تھا۔ راستے کی دونوں جانب گنجان

درختوں کا بن گھرا تھا۔ اس میں کہیں کہیں پہاڑیوں کے پیچ وخم کھاتے ہوئے سلسلے دکھائی دیتے تھے۔ جن میں سے خوفناک درندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اس روح فرسا منظر سے میری وحشت و اضطراب میں اور اضافہ ہوا وہاں خون اگتا تھا اور وحشت برستی تھی "گاڑی کو روک دو"۔ ان میں سے ایک نے کہا اور یہ کہتے ہوئے کہ "تم یہاں ٹھیرے رہو ہم ابھی آتے ہیں" دونوں ٹارچ کی روشنی میں بن میں داخل ہوئے اور فوراً میری نظروں سے غائب ہوگئے۔ اب میرا خوف و ہراس اور بڑھتا گیا۔ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں پیدا ہونے لگے۔ کبھی میرا ضمیر مجھ کو لعنت کر رہا تھا اور کبھی اپنے پیشہ پر غصہ آ رہا تھا کبھی بچوں کی یتیمی اور بیوی کی بیوگی کا خوف ستا رہا تھا۔ خدا جانے میں انہی خیالات میں کب تک ڈوبا رہا۔ آخر کار درختوں سے انسانی گفتگو کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد وہی دونوں آدمی آتے ہوئے دکھائی دئے۔ قریب پہنچ کر ایک نے کہا "کیا تم انتظار کر رہے ہو ہمیں ذرا دیر ہوگئی" میں خوف و ہراس کا مجسمہ بنا کھڑا تھا جواب دینے کی کوشش کی لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ اب پھر دونوں ایک غیر مانوس زبان میں گفتگو کرنے لگے اسی اثنا میں ایک دیو ہیکل طویل قامت انسان کمبل کی گھٹڑی سر پر لئے نزدیک پہنچ گیا اور ان کے اشارے سے ٹانگہ پر رکھ کر روانہ ہوگیا۔

"دیکھو ٹانگہ والے اس پوٹلی میں کچھ میوہ اور سامان ہے ہم کسی ضروری کام کی وجہ سے اسی وقت واپس نہیں ہوسکتے اسے احتیاط کے ساتھ مسٹر سعید امین جنگلات کے گھر پہنچا دینا" کروڑ گیری کے ناکہ پر اگر محصول طلب کیا جائے تو ادا کر دینا"۔ ان میں سے ایک نے دس روپے میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا آبادی کی طرف روانہ ہوا۔ میرے دل سے خوف و ہراس کافور ہوگیا میں بہت مسرور تھا کبھی یہ خیال آتا کہ اتنی کثیر رقم سے میرے بگڑے ہوئے کام بن جائیں گے کبھی یہ خیال کرتا کہ میں اپنے معصوم بچوں کے لئے کپڑے اور بیوی کے لئے کچھ زیور خرید لوں گا۔ غرض اس قسم کے خیالی پلاؤ پکاتا ہوا تیز تیز چلا جا رہا تھا کہ "ٹانگہ روکو" دو کی دل شکن آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کسٹم آفس کا پہرہ دار اور پولیس کانسٹبل جس کا تھانہ محصول خانہ سے متصل تھا میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ نزدیک پہنچ کر محصول خانے کے جوان نے کہا اس گھٹڑی میں کیا ہے؟ "جناب اس میں کچھ پھل اور سامان ہے جو مسٹر سعید امین جنگلات کے گھر پہنچانا ہے" میں نے ٹانگہ سے اترتے ہوئے جواب دیا۔

امین جنگلات کے پھل ...... تو کچھ بہتر ہوں گے ہمیں بھی دو ایک کھلا دو" پولیس کانسٹبل نے کہا اور دونوں پوٹلی کے بند ڈھیلے کرنے لگے۔ بند کھول کر اوپر سے گھاس پھوس ہٹایا۔

"ہیں یہ کیا مسٹر سعید کی لاش" کسٹم آفس کے جوان نے چونک کر کہا۔ "کیا کہا مسٹر سعید امین جنگلات کی لاش" میں متعجب ہوکر دیکھنے کے لئے آگے بڑھا اور جب واقعی لاش دکھائی دی تو مجھ پر غشی طاری ہوگئی اور میں دھم سے زمین پر آ رہا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے علم نہیں جب مجھے ہوش آیا تو میں خود کو پولیس کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا ان کا ایک افسر کچھ نوٹ کر رہا تھا۔ اور لوگوں کا ہجوم مجھے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑ رہا تھا۔ میرے مالک اور آقا یہ ہے میری سچی دردبھری داستان" ٹانگہ والے نے پیشانی اور چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

حاکم عدالت نے ملزم کو بے گناہ قرار دے کر پولیس کو اصلی ملزموں کی تلاش کا حکم دیا۔

محمد عبدالکریم (کلیانی)

تنقید و تبصرہ

حسن و عشق :- مرتبہ محمد صدیق صدفی خیرآبادی چھوٹی تقطیع ۴۰ صفحات قیمت ۴ر فی جلد۔ یہ اصل میں ایک بیاض ہے جس میں مصنف نے حسن اور عشق کے موضوعوں پر اپنی پسند کے مختلف اشعار جمع کر دیے ہیں اس طرح کے کئی مجموعے اس سے پہلے بھی چھپ چکے ہیں اور یہ مجموعہ بھی ان اصحاب کے لئے قابل مطالعہ ہے جو حسن اور عشق کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مشاہیر شعراء کے منتخب اشعار کو ایک جگہ دیکھنے کے خواہش مند ہوں۔ محمد صدیق صاحب کا ذوق اچھا ہے اور انھوں نے بڑے سلیقہ کے ساتھ بہت سے دلچسپ شعر ایک جگہ کر دیے ہیں۔

الہاماتِ شاد :- مرتبہ عبدالمالک آروی ۳۲ صفحات قیمت ۸ر یہ چھوٹی سی کتاب سلسلۂ مطبوعات طاق بستان آرہ کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں شاد عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی اور محاسن شعری پر ایک تاریخی و ادبی تنقید پیش کی گئی ہے، اس میں مصنف نے بہت سرسری طور پر عظیم آباد کے اس مشہور شاعر کے متعلق معلومات قلمبند کی ہیں اور جیسی کہ چاہیے تحقیق و تفتیش نہیں کی گئی۔ اس اثنا میں شاد سے متعلق متعدد اہم کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن کا مطالعہ کرنا شاد پر کچھ لکھتے وقت نہایت ضروری ہے۔ خاص کر چند ماہ قبل ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شاد کے مکتوبات کا جو ۳۰۰ صفحے کا مجموعہ شایع ہوا ہے اس میں شاد کے متعلق اتنی معلومات شامل ہیں کہ اگر الہاماتِ شاد کے مصنف صرف اسی کتاب کو دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے تو ان کی یہ کتاب اتنی تشنہ نہ رہ جاتی اور شاد کے متعلق وہ ایک مبسوط کتاب پیش کر سکتے۔

مقدمہ زندگانی محمد :- مولفہ محمد حسین ہیکل و مترجمہ محمد حسین عرشی چھوٹی تقطیع ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۰ر

دفتر امت مسلمہ امرتسر کی طرف سے مذہبی موضوعوں سے متعلق کچھ عرصہ سے اچھی کتابیں شایع ہو رہی ہیں جن میں تعلیماتِ قرآن، مطالعۂ حدیث، برہان القرآن اور اسلام اور حریت و مساوات جیسی کتابیں قابلِ ذکر ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس میں ان نوجوانوں کے لئے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہلِ مغرب کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان بزرگوں کے لئے جو عہدِ رسالت کے بعد کی تصنیفات کو بے خطا سمجھے ہوئے ہیں بڑی مفید اور کام کی باتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب اصل میں عربی میں لکھی گئی اور مصر میں چھپی تھی اور اتنی مقبول ہوئی کہ پہلا ایڈیشن پریس ہی سے تین ہزار سے زائد کی تعداد میں فروخت ہو گیا اور بقیہ سات ہزار جلدیں تین مہینوں میں ختم ہو گئیں۔ بعد کو ایران میں آقا ابوالقاسم پائندہ ایرانی نے اس کا ترجمہ ایرانی زبان میں بھی شایع کیا اور اب اردو میں چھپا ہے۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا۔

آزادی کی نظمیں :- مرتبہ سبط حسن صاحب ۱۹۲ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۸ر۔ یہ کتاب انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے شایع ہوئی ہے اور اس میں اردو شاعروں کی ان تمام نظموں کو ایک جگہ کر دیا گیا ہے جن میں اسلوب بیان اور پرواز خیال کے لحاظ سے شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے اور شگفتگی شاعری کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے نوجوان شاعر اس قسم کی شاعری کی طرف خاص توجہ کر رہے ہیں، اس مجموعہ میں غالب، آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، سرور جہاں آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، چکبست، حسرت موہانی سے لے کر عہد حاضر کے متعدد جواں سال شاعروں تک کے کلام سے انتخابات جمع کر دیے گئے ہیں۔ نوجوان شعراء کے کلام میں شدت اور تلخی کا پیدا ہونا ضروری ہے، جوانی ہی وہ موسم ہے جس میں جذبات کا سمندر اپنی پوری تلاطم خیزیوں کے ساتھ موجزن ہوتا ہے اور زمانے کا اقتضا اس سیلاب کو جس طرف چاہے بہالے جاتا ہے۔

(باقی)

"ق"

شعرائے عثمانیہ (ادارۂ کی ایک اہم کتاب)

یہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے چھبیس ممتاز شعرا کا کلام اور اس پر مختصر تبصرہ ہے شعراء کے کلام کے انتخاب میں دقت نظر سے کام لیا گیا ہے۔ ان شعرا میں بعض ایسے ہیں جو دکن سے باہر بھی مقبول ہیں اور بعض مقامی طور پر ہی روشناس ہیں۔

اس مختصر تذکرہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کے شعراء ہندوستان کے دیگر ادبی مراکز کے خیالات اور رجحانات کے دوش بدوش چل رہے ہیں اور اغلب نہیں کہ وہ ان ہی شعرار کی صف میں جلد از جلد آجائیں جن کی شاعری بہر اعتبار دوسروں سے ممتاز ہے چونکہ جامعہ عثمانیہ کے شعرار کی پیداوار قدیم و جدید تعلیم کے امتزاج سے ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں زندگی پائی جاتی ہے اور فرسودگی بہت کم ہے۔

شاعر مئی سنہ ۴۰ء

اس سے پہلے کی تین جلدوں میں عہد حاضر سے پہلے کے شعرار کا حال درج کیا گیا تھا۔ اس مجموعے میں جامعہ عثمانیہ دکن کے چھبیس فارغ التحصیل شعرار کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا انتخاب کلام دیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد موجودہ دور شاعری میں کتنی ترقی کر رہا ہے۔

نگار مئی سنہ ۴۰ء

انتخاب تقریباً سب ہی صنفوں پر مشتمل ہے یعنی اس میں حسن و عشق، شعر و شباب رزم و بزم، حمد و نعت اور تاریخ و سیاست ہر نوع کا کلام موجود ہے بعض عنوانات بالکل نئے ہیں مثلاً تاروں کا مدرسہ، سلطانہ رضیہ میدان جنگ میں۔ تاج محل کو دور سے دیکھ کر، ساغر جہاں گیر، آواز قدم، نیا پل اور شام آسمان کی زبان سے وغیرہ۔ شعرائے عثمانیہ میں زیادہ تر تعداد نوجوان شاعروں کی ہے اس واسطے تقریباً سارے انتخاب میں شباب اور زندگی کی روح چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ دکن کے نوجوانوں کو کتنے اچھے پیرایہ پر تربیت دے رہی ہے اور وہاں فارغ التحصیل طلبا کتنے صاف اور سلجھے ہوئے دماغوں کے مالک ہیں۔

ترتیب کے سلیقے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نمایاں طور پر قابل لحاظ ہے کہ ایڈیٹروں نے ہر شاعر کی خصوصیات کلام پر الگ الگ نوٹ بھی لکھ دیئے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ حسین و جمیل مجموعہ ارباب شعر و ادب سے تحسین و آفرین حاصل کرے گا اور ادارۂ ادبیات اردو کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوگا۔

البیان جولائی سنہ ۴۱ء

شعرائے عثمانیہ مرقع سخن کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے ۲۶ پرانے طالب علموں کے کلام کا انتخاب تھوڑی تنقید کے ساتھ چھپا ہے۔ کتاب ادارۂ ادبیات کی دوسری مطبوعات کی طرح خوش مذاقی سے شائع کی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے اور ظاہری شکل و صورت بھی کتاب دیکھ کر اسے پڑھنے کو جی چاہتا ہے

جامعہ جولائی سنہ ۴۱ء

مجھے نقلی ہٹلر بنایا گیا تھا

(ہنس لرکے حیرت انگیز انکشافات)

تمام پارٹی میں گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی ہم سب نے قتل کے متعلق افواہیں سُن رکھی تھیں لیکن ہماری پارٹی کا کوئی ممبر بھی اس کے متعلق تفصیلات معلوم نہ کر سکا تھا۔ جینو برگین داخل ہوئے تو میں بہت بے چین ہو رہا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کس وقت قتل کر دیا جاؤں گا۔ جن سڑکوں پر سے ہم گزر رہے تھے وہ مشتعل لوگوں سے پُر تھیں۔ میں لوگوں کے سلاموں کا جواب دیتا ہوا ہر شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہر دم یہی ڈر تھا کہ کہیں بندوق کا فیر مجھے ٹھنڈا نہ کر دے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے جلوس کے آگے کچھ جھگڑا سا شروع ہوا اس لئے ہماری موٹروں کو رک جانا پڑا۔ ہماری پارٹی کے بہت سے ممبر جو ایسی ہی ضرورت کے لئے جگہ جگہ متعین کر دئے گئے تھے جھگڑا چکانے کو دوڑتے ہوئے آئے۔ موٹروں میں سے بھی ہمارے کئی ساتھی ان کی مدد کے لئے اتر گئے۔ میں غور سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا خدا جانے کیا ہونے والا تھا۔ اس زمانے میں ایسا جھگڑا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن میرے دل میں نہ جانے اُس وقت کیسے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ آخر جس چیز کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا۔ میں نے اتفاق سے اپنے سامنے کے مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی میں حرکت سی ہوتی ہوئی دیکھی اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک رائفل کھڑکی میں سے باہر نکالی جا رہی ہے۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو ایک طرف ہٹا لیا میری جان تو بچ گئی لیکن میں زخمی ہوگیا۔ ادھر رائفل نے ایک زور کی آواز کی اور ادھر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے کوئی چیز زور سے میرے کندھے پر دے ماری ہو مجھے اب تک یاد ہے کہ مجھے اس وقت جان بچ جانے پر کتنی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنا دوسرا ہاتھ زخمی کندھے پر رکھ دیا اور زخمی بازو کو ایسا اُٹھا دیا کہ عوام نے سمجھا کہ میں نازی سلام کر رہا ہوں لیکن میرے لباس کو خون لگ چکا تھا اور جو لوگ کہ مجھ سے نزدیک تھے انھوں نے دیکھا کہ ان کا ہونے والا "فیورہر" زخمی ہو چکا ہے لیکن اکثر لوگ جھگڑے کو دیکھنے میں مشغول تھے اور انھوں نے مجھے زخمی دیکھا بھی تو انھوں نے جب ہٹلر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا تو یہی سمجھا کہ ان کی نظر نے ان کو دھوکا دیا۔ "کیا تم بری طرح زخمی ہوئے ہو کیا ہم اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتے" ہٹلر نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا میں نے جواب دیا "میں بالکل اچھا ہوں" اس وقت تک جھگڑا ختم ہو چکا تھا اس لئے ہماری موٹریں آگے بڑھیں۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہماری پارٹی کے چند ممبر اس مکان میں داخل ہوئے جس سے مجھ پر گولی چلائی گئی تھی۔ جس شخص نے مجھ پر فائر کیا تھا وہ کرٹ ہیسلر نامی ایک نوجوان طالب علم تھا۔ عام طور پر یہ مشہور کر دیا گیا کہ ہٹلر کے باڈی گارڈوں نے اس کو اپنے کمرہ میں مردہ پایا اور وہ اپنی ہی رائفل کی گولی سے زخمی پایا گیا۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے ہیسلر نے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن وہ ہماری پارٹی والوں کے ہاتھ پڑ گیا انھوں نے اس کو اتنی لاتیں ماریں کہ وہ بے چارہ مرگیا۔ اس اثنا میں میرا جلوس اس ہال کی طرف جا رہا تھا جہاں

ہٹلر کی تقریر ہونے والی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مجھے ایک چھوٹے سے دروازے سے لے جاکر چھپا دیا گیا۔ ہٹلر ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے انھوں نے میری جگہ اس کمال سے لی کہ کسی کو شک تک نہ ہوا۔

مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچا یا گیا جہاں ہماری پارٹی کے ایک ڈاکٹر نے میری مرہم پٹی کی میں سمجھتا تھا کہ ہٹلر اس شخص کو ضرور دیکھنے آئیں گے جس نے اپنی زندگی تک ان کے لئے خطرے میں ڈالی تھی لیکن میرے اس شوق کو جس سے میں ہٹلر کی اطاعت گزاری کیا کرتا تھا بڑا دھکا پہنچا جب مجھ کو معلوم ہوا کہ ہٹلر مجھ کو بغیر دیکھے ہی چل دئیے۔

چاہے اصلی ہٹلر سفر کر رہا ہو یا نقلی اوس کی جان کی بہت سخت حفاظت کی جاتی ہے یہ اس وجہ سے نہیں کہ نقلی ہٹلر کی جان پیاری ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ ایک ڈکٹیٹر کی جان پر حملے کا قوم پر بہت اثر پڑتا ہے۔ جب کبھی فیورہر کہیں تقریر کرتے ہیں تو ہملر خود یا ان کا چنا ہوا اسٹارم ٹروپرس کا کوئی کرنل۔ پولس افسر اور ہٹلر یوتھ موومنٹ کے مقامی لیڈر سے مل کر فیورہر کی حفاظت کے جملہ انتظامات کرتا ہے ہٹلر یوتھ موومنٹ کے اراکین سے سڑکوں کو پُر کر دیا جاتا ہے پولس کو ان تمام حفاظتوں کی تفصیلی اطلاع دے دی جاتی ہے جو کہ فیورہر کی جان بچانے کے لئے ضروری ہیں۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر کو جرمن کا چانسلر نامزد کر دیا گیا تو وہ اپنے تمام دوستوں کے ساتھ برلن روانہ ہوگیا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہٹلر کے عہد میں جرمنی کس شاندار طریقہ پر ترقی کر رہا ہے۔ مجھے ایک ایسی بلڈنگ میں رکھا گیا جہاں جولیس شیرک جو کہ ہٹلر کا خاص ڈرائیور تھا اور کارل ارنیسٹ جو کہ ایک اسٹارم ٹروپر تھا رہتے تھے ارنسٹ اور میں نے ایک چھوٹا سا شراب خانہ پسند کرلیا تھا جہاں کی شراب تو اچھی تھی لیکن زیادہ مجمع نہیں رہتا تھا ایک روز ہم دونوں نے رات کا کھانا ایک جگہ کھانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر اپنے کمرے میں اُس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ دوادوڑ دو پہر کی معیت میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا "نہیں مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ نہیں آسکتا تھا مجھے گورنگ کا حکم ملا ہے کہ دو قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہو جاؤں۔" دوسرے روز صبح اہل برلن ریش اسٹاگ کی بلڈنگ کے جلا دئیے جانے کا مشتعل ہوکر ایک دوسرے سے ذکر کر رہے تھے لیکن اس وقت بھی میں نے رات کے واقعہ کو کچھ اہمیت نہ دی میں ابھی اپنے کپڑے بھی پوری طرح بدلنے نہ پایا تھا کہ ارنسٹ میرے کمرے میں داخل ہوا اس کا چہرہ متوحش اور زرد تھا میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا اور سمجھ گیا کہ کوئی وحشت ناک چیز اوسکو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھلا رہی ہے میں نے اس سے دریافت کیا کہ پہلے تو اُس نے انکار کر دیا پھر کہنے لگا "نہیں میں جانتا ہوں کہ تم پر اعتبار کیا جاسکتا ہے میں جانتا ہوں کہ جو چیزیں تم دیکھتے ہو یا سنتے ہو ان کا کسی سے ذکر تک بھی نہیں کرتے جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں اگر تم نے اُس کا کسی سے بھول کر بھی ذکر کیا تو یاد رکھو کہ تمہاری اور میری موت یقینی ہوگی" تب وہ سانس لینے کے لئے ٹھیر گیا اور پھر کہنے لگا "نہیں میں نے ہی رات ریش اسٹاگ کو آگ لگائی تھی" یقیناً تم پاگل ہوگئے ہو میں اس کا یقین ہی نہیں کرسکتا تم اور ایسی غداری۔ ناممکن ہے" میں نے

اوسکو تعجب سے گھورتے ہوئے کہا اس نے جواب دیا "نہیں نہیں نہیں یہ غداری نہیں ہے مجھے احکامات ہی ایسے ملے تھے ۔ یہ گورنگ اور گوبلس کے احکامات تھے" "اس نے آخری جملہ بہت آہستہ کہا" "میں تمہارا یقین نہیں کر سکتا" میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "یقیناً تم بہت پی گئے ہو وہ پاگل تھوڑے ہی تھے جو ایسے احکامات دیتے" تب اُس نے مجھے پورا قصہ سنایا وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ گورنگ اور گوبلس سے آخرالذکر کے دفتر میں ملا وہاں اُن کو صاف صاف الفاظ میں ریش اشاگ کو آگ لگا دینے کا حکم دیا گیا ۔ ہنیس ایک اسٹارم ٹروپر نے ان کو مایع فاسفورس آگ لگانے کے لئے لاکر دی اور اس نے ان کو ایک خفیہ زیر زمین راستے سے ریش اشاگ تک پہنچایا اس کے بعد ارنسٹ چلا گیا تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہٹلر نے ایک اعلان کے ذریعہ اشتراکیوں کو اس واردات کا ذمہ دار ٹھیرایا اور قانون کے اس حصہ کو جو آزادی پریس اور تقریر کا ذمہ دار تھا ختم کر ڈالا اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا ۔ قوم میں غصہ کی لہر دوڑانے کے لئے ایسی ہی واردات کی ضرورت تھی اس حادثہ نے قوم کو ان تمام سخت قوانین کے لئے تیار کر دیا جو کہ بعد میں بنائے گئے میں نہیں سمجھتا کہ ہٹلر کم ازکم اس وقت تک اس بات سے واقف تھا کہ اس ہی کی پارٹی کے اراکین اس حادثہ کے ذمہ دار ہیں

اس حادثہ کے کچھ عرصہ بعد میری چھ سالہ زندگی کا جو کہ میں نے "نقلی ہٹلر" کی طرح گزاری سب سے عجیب و غریب واقعہ پیش آیا مجھے ٹھیک تاریخ تو یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تقریباً نصف مارچ گزر چکا تھا ۔ ہماری پارٹی کے زمانہ قیام میونخ میں کیپٹن ارنسٹ روہم ایک لال بالوں والی رقاصہ کا گرویدہ ہو گیا تھا ۔ روہم اکثر اُس عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا اور جب وہ ہٹلر کے ساتھ برلن آیا تو ہم کو بہت تعجب ہوا جب ہم نے دیکھا کہ وہ رقاصہ بھی جس کا نام زیلنک تھا اس کے ساتھ آئی۔

ایک روز دوپہر کو مجھے چانسلری میں آنے کا حکم ملا وہاں میں نے ہٹلر کو اپنا انتظار کرتے ہوئے پایا اس نے مجھ سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آج رات کے نو بجے تم ایک بند موٹر میں اس پتہ پر جاؤ" انھوں نے مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا دے دیا جس پر ایک عورت کا پتہ لکھا ہوا تھا پھر ہٹلر کہنے لگا "وہاں تم کو ایک عورت ملے گی تم اُس کے ساتھ یہاں واپس آؤ گے اور بڑے دروازے سے داخل ہو گے اور میرے حکم تک وہیں ٹھیرو گے"۔ میں دل ہی دل میں تعجب کرتا ہوا ہٹلر کا بھیس بدلنے لگا "ایک عورت کو فیورر کے دفتر میں رات کو لانے والا ہوں" یہی خیال میرے دل میں بار بار آرہا تھا میں نے اپنی عمر میں کبھی ہٹلر کو کسی عورت کو اچھی طرح ملتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ۔ آخر کیوں "نقلی ہٹلر" کو ایک عورت کے لانے کے لئے احکامات دئے جارہے ہیں یہ سوال میں اپنے دل سے بار بار کر رہا تھا لیکن میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جس عورت کو میں چانسلری لے جارہا ہوں وہ زیلنک یعنی روہم کی پرانی معشوقہ تھی ہم دونوں آپس میں کبھی کبھار بات کرتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں "اصلی ہٹلر" نہیں ہوں میرا تعجب انتہا کو پہنچ گیا جب میں نے دیکھا کہ چانسلری خلاف معمول بجلی کی روشنی سے منور تھی۔ دو پہرہ داروں کی بجائے چار موجود تھے ۔ ہماری موٹر بجائے لوہے کے بڑے دروازے کے اندر داخل ہونے کے باہر ہی کھڑی ہو گئی ہم دونوں اتر پڑے اور چانسلری کے دروازے

تک پیدل گئے میں جانتا تھا کہ روہم کو اس واقعہ کی ضرور اطلاع ہو جائیگی کیونکہ ایڈمنڈ جو کہ روہم کا ایک عزیز دوست تھا ہمارے بالکل قریب سے گزرا۔ جب ہم ہٹلر کے خاص کمرے میں پہنچے تو میں اور زیادہ متعجب ہوا۔ کیونکہ زیلنک بالکل نہیں گھبرائی بلکہ اس نے اپنا لمبا کرتا اتار دیا ہٹلر کی کرسی کو آگے کھینچا اور ریڈیو کا بٹن دبا دیا۔ اتنے میں ہٹلر داخل ہوا اور کہنے لگا "تم میرے احکامات تک یہیں انتظار کرو" تقریباً پانچ گھنٹے تک میں کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اس اثنا میں میں نے کئی سگریٹ پیئے ہزار ہا قسم کے خیالات میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے میں کبھی کبھی زیلنک سے جو کہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی کچھ بات بھی کر لیا کرتا تھا۔ آخر ہٹلر دوبارہ داخل ہوا اور زیلنک سے کہنے لگا "تم اب جا سکتی ہو" اور پھر مجھ سے کہنے لگا تم ان کے ساتھ پھاٹک تک جاؤ وہاں اپنے آپ کو ظاہر کرو لیکن باہر مت جاؤ" جب میں گیٹ پر پہنچا تو زیلنک ہٹلر کی بڑی موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی مجھے یقین ہے کہ اُسوقت میں نے روہم کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔

تین راتوں کے بعد وہی واقعہ پھر دہرایا گیا لیکن جب زیلنک چانسلری میں داخل ہوئی تو ہٹلر نے اس سے پوچھا "کیا اُس نے تم سے دریافت کیا تھا" اُس نے جواب دیا "تم کیا امید کرتے تھے۔ میں نے اس کو سچ سچ کہہ دیا کہ میں یہاں دفتر میں گھنٹوں رکھی گئی اور پھر بغیر کچھ کہے سنے واپس کر دی گئی لیکن وہ یقین ہی نہیں کرتا تم جانتے ہو وہ کیسا شخص ہے وہ ہر چیز پر شبہ کرتا ہے" "اگر تم سے دوبارہ پوچھا جائے تو سچ سچ سب کچھ کہہ ڈالو" ہٹلر نے جواب دیا اس دفعہ زیلنک کو پھٹنے تک ٹھیرایا گیا اس مرتبہ میں اُس کو پھاٹک تک چھوڑنے گیا میں نے وہاں دوبارہ روہم کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تیسری دفعہ پھر میں زیلنک کو چانسلری لانے کے لئے بھیجا گیا۔ اس دفعہ جب ہم داخل ہوئے تو ہم نے بلا شک و شبہ روہم کو دیکھا اس کے چہرے سے غصہ اور حسد کے آثار نمایاں تھے اس نے غالباً خیال تک بھی نہیں کیا کہ اصلی ہٹلر نہیں بلکہ وہ نقلی "اس کی معشوقہ کے ساتھ جا رہا ہے زیلنک نے بھی اس کو دیکھا اور گھبرا سی گئی چانسلری میں داخل ہوتے ہی وہ کھسیانی بلی کی طرح ہٹلر کی طرف بڑھی اور کہنے لگی "میں آج آخری دفعہ یہاں آئی ہوں اگر تم چاہتے ہو تو مجھے قید کر دو مجھے بالکل پروا نہیں" ہٹلر ہنسا اور کہنے لگا "ہاں یہ آخری دفعہ ہے زیلنک۔ آج تم یہاں سے جانے کے بعد ویانہ کی گاڑی میں سوار کرا دی جاؤگی" تب وہ اُس کی طرف بڑھا اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا "تم کو اپنی زندگی کا یہ حادثہ بھلا دینا پڑے گا۔ تم اس کو ایک ایسا واقعہ تصور کرو جو کبھی ہوا ہی نہیں"

اس کے بعد میں نے کبھی اس کو نہیں دیکھا لیکن اس کے متعلق گسٹاپو کی بہت سی رپورٹیں دیکھیں کیونکہ ہٹلر کے احکامات کے تحت اس کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی کچھ عرصہ بعد گسٹاپو نے رپورٹ دی کہ وہ بہت پینے لگ گئی ہے اور پی کر بعض بہکی بہکی باتیں کرتی ہے جب میں نے مثل کو آخری دفعہ دیکھا تو اس پر سرخ سیاہی سے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "ارسے ڈگٹ" یہ الفاظ گسٹاپو اس وقت استعمال کرتی ہے جبکہ کسی شخص کی موت کی وجہ سے مثل ختم کر دی جاتی ہے۔ ہٹلر نے دوبارہ اس واقعہ کا مجھ سے ذکر تک بھی نہ کیا مجھے نہیں معلوم کہ آیا ہٹلر کو اُس عجیب و غریب ڈرامے کی جو اس کے نام سے اس کے دفتر میں کھیلا گیا تھا اطلاع تھی یا نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس سے بے خبر تھے یہ بھی غالباً ان متعدد حادثوں میں سے ایک تھا جن میں کہ نازی ماہر ہیں۔ یہ ہٹلر گورنگ اور گوبلیس کی سازش ہٹلر اور روہم کے تعلقات خراب کرنے کے لئے تھی اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہٹلر اور روہم دونوں بے وقوف بنائے گئے۔ ہٹلر گورنگ اور گوبلیس میں سے کوئی بھی ہٹلر اور روہم کی دوستی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہٹلر صرف ان ہی پر اعتبار کرے۔ روہم کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ بقول زیلنک کے "ہر شخص پر ہر قسم کا شبہ کرتا تھا" زیلنک کی چانسلری آنے جانے کے بعد ہٹلر اور روہم کے تعلقات دن بدن خراب ہوتے گئے۔

سلیم احمد خاں لودھی (اورنگ آبادی)

اڈگر والیس

انگریزی زبان کے ادیبوں میں اڈگر والیس ہی ایک ایسا ادیب ہے جس کی تصانیف نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اس کے سحر نگار قلم سے فسانے، صحافتی مضامین اور ڈرامے سرعت رفتار کے ساتھ نکلے اور اس طرح اس نے بے اندازہ دولت پیدا کی۔ آخری زمانے میں اس کی آمدنی ڈھائی لاکھ ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی لیکن رقم وصولی سے پہلے خرچ ہو جایا کرتی۔ اتنی دولت پیدا کرنے کے بعد بھی وہ مرتے وقت سات لاکھ ڈالر کا قرضدار تھا۔ اور یہ قرضہ صرف دو سال کی قلیل مدت میں اس کی کتابوں کی قیمت سے ادا کر دیا گیا۔ وہ انتہا سے زیادہ مُسرف اور پکا جواری تھا اور اپنے اخراجات کی بڑھتی ہوئی فہرست کے لحاظ سے وہ محنت بھی ایسی ہی کیا کرتا تھا۔ اس کو صرف بحیثیت ادیب شہرت پانے کی تمنا تھی اور اس شہرت کی تحصیل کے لئے وہ اپنی جان ہتیلی میں لئے کام کر رہا۔

اڈگر اپنی ماں کا دوسرا بچہ ۱۸۷۵ء میں گرین وچ (انگلستان) میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں ایک غیر معروف اداکارہ اور طوائف تھی۔ اسی لئے اس کے باپ کے نام سے کوئی واقف نہیں۔ پالی رچرڈ ایک بیوہ تھی اور اس کی گذر بسر تھیٹر میں اداکاری کی آمدنی سے بدقت تمام ہوتی تھی۔ وہ اور اس کے دونوں بچے اسی حقیر آمدنی پر پرورش پاتے رہے۔ واقعات بھی کچھ ایسے پیش آتے رہے۔ اڈگر کی پیدائش کو مخفی رکھنے پر مجبور رہنا پڑا۔ اس کی محرم راز سوائے اس کی دایہ کے اور کوئی نہ تھی۔ حتیٰ کہ اڈگر کا باپ بھی ولادت سے لاعلم رکھا گیا۔

پالی بچہ کی پیدائش سے ایک ہفتہ بعد اس کو بپتسمہ کرانے کے لئے ایک کیتھولک پادری کے پاس گئی۔ وہاں اس نے بچہ کے باپ کا نام رچرڈ ہوریشیو اڈگر بتلایا لیکن کلیسا کے دفتر میں اس نے بجائے اس نام کے والٹر والیس لکھوا دیا۔ پھر اس نے اڈگر کو بلنگس گیٹ کے ماہی گیر فری مَن کی بیوی کے حوالے کر دیا جس نے پانچ شلنگ فی ہفتہ پر اڈگر کی پرورش کی۔

یہ اڈگر کی خوش قسمتی تھی کہ جارج فری مَن اور اس کی بیوی بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ ان کے دس بچے چار کمروں والے مکان میں پرورش پا رہے تھے اور جب پالی رچرڈ نے مسز فری مَن سے اپنی ناداری اور غربت کا حال سنایا تو مسز فری مَن نے اڈگر والیس کو بھی اپنا گیارھواں بچہ سمجھا

اڈگر نے اپنے شفیق سرپرست کے زیر سایہ تھوڑا بہت علم حاصل کر لیا اور بارھویں سال کی عمر میں نیوگنٹن کارڈرے کے مطبع میں نوکر ہو گیا یہ اس کی پہلی اور طویل ملازمت تھی ورنہ اس نے دوسری ملازمتیں چند دن کر کے چھوڑ دی تھیں۔

ایک دفعہ اس کی ملاقات ایک ملاح سے ہوئی اور پندرھویں سال میں اس نے ایک گرمزلی کے دام کشتی پر جہازی باورچی کے ماتحت سال بھر تک کام کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دئے۔ دسمبر کا مہینہ تھا، موسم خراب تھا اور دام کشتی بحر شمالی کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ مچھلیوں کی بدبو نے اور بدحواس کر دیا تھا، اڈگر والیس نے اپنی بحری بیماری اور ملازمتی ناقابلیت کو انتہائی طور پر چھپانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ساتھیوں میں مقبول بھی نہ ہوا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ بحیثیت باورچی کے

معاملے میں بالکل کورا تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اس نے الپین کا ایک تختہ اپنے ساتھ رکھ کر ان کے توہمات کی خلاف ورزی کی تھی۔

جب دو مہینے بعد دام کشتی گرمزبی پہنچی تو اس نے ساتھیوں کو خیرباد کہہ دیا اور پیادہ پا لندن کی راہ لی۔ وہ نان بائی کی دوکان سے روٹی چرالیتا اور ملازمین کے مکان میں سوجاتا۔ غرض روٹی اور پانی کے سہارے وہ تین ہفتہ تک چلتے رہنے کے بعد لندن پہنچا۔ جب مسز فری مَن نے اس کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا اور وہیں رہنے پر مجبور کرنے لگی لیکن اڈگر تلاش معیشت میں سرگرداں تھا اس لئے وہ ایک اسٹرکار کے معاون کی حیثیت سے کلاکنن میں نوکری کرنے لگا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اپنے مستقبل کو نہایت دھندلا، تاریک اور غربت زدہ دیکھا۔ کشتی کتب خانہ اس کی تشنگی علم کو نہ بجھا سکا۔ اس لئے اس نے پھر ایک بار اپنی قسمت آزمائی چاہی گو مسز فری مَن نے ہزار التجائیں کیں لیکن وہ ان سب کو ٹھکراتے ہوئے رائل وسٹ کنٹ رجمنٹ میں سات سال کے معاہدے پر بھرتی ہوگیا۔

اس نئے سپاہی کو فوجی زندگی موزوں ثابت ہوئی۔ ابتداءً اس کو غذا بھی اچھی ملتی رہی اور وہ برابر کام کرتا رہا۔ اس کی لاغری دور ہونے لگی۔ چند مہینے بعد اس نے طبی علمے میں منتقل ہونے کی درخواست دی جو منظور ہوگئی اور اس کو آلڈرساٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

آلڈرساٹ لندن سے قریب ہونے کی وجہ سے نوجوان اڈگر ہوا اپنے آپ کو ڈرامہ نگاری کے میدان کے لئے تیار کررہا تھا اپنی دولت موسیقی ہال اور رقص گاہوں میں خرچ کرنے لگا۔ اس موسیقی اور نغموں میں مسرت محسوس کی۔ اب وہ اکثر و بیشتر ریل میں راستوں پر اور ہر جگہ اپنی دل بہلائی کے لئے مشہور نظموں پر اپنی لکھی ہوئی نظمیں گنگناتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کی نظمیں فوجی بے خانوں میں ہر وقت سنائی دینے لگیں۔ اس نے ایک نغمہ لندن میوزک ہال کے ہیرو آرتھر رابرٹس کے لئے لکھا جو قابل یقین طور پر منظور ہوگیا اور اڈگر نے اس کو سازوں پر سننے کے لئے لندن جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے اپنے عہدہ دار سے رخصت چاہی اور اس نے انکار کر دیا۔ ایک دن دوپہر میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے فوجی کیمپ سے روانہ ہوا اور پانچ دن تک لندن میں رہ کر اپنے تصنیف شدہ نغموں کو لندن کے میوزک ہال میں پانچ پونڈ جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا خرچ کرکے سنا اور جب دوبارہ فوجی کیمپ پر واپس ہوا تو اس کو غیر حاضری کی علت میں چار دن قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

چند مہینے بعد اس کو اردلی درجہ دوم پر ترقی دی گئی اور پھر جنوبی افریقہ جانے والی پلٹن میں اس کا بھی انتخاب کیا گیا ۱۸۹۶ء میں بغاوت کے آثار پیدا ہورہے تھے۔ اگرچہ اس کے تین سال بعد تک جنگ کا آغاز نہ ہوا لیکن جیمسن کی تباہ کاریوں اور شورشوں نے برطانیہ کے خلاف بوئروں کے جذبات میں کافی ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

نوجوان اردلی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کو سائمنس ٹاؤن ہاسپٹل پر رہنا پڑے گا تو اس کو سخت تکلیف ہوئی کیونکہ وہاں اس کے ذمہ مکان اور طبی اشیاء کی صفائی تھی اس کا معاوضہ اس طرح ہوا کہ دواخانے کے سامنے اصلاح سازوں کی دو کانوں اور قحبہ خانوں کے آگے ویرانی

مشن روم تھا جس کا معزز پادری ولیم کالڈی کاٹ تھا اس کا ایک معمولی کتب خانہ بھی تھا جہاں کتابیں مطالعہ کے لئے دی جاتی تھیں معزز پادری کی بیوی سیارَی رین کالڈی کاٹ اچھے دل و دماغ کی عورت تھی۔ اس نے اڈگر سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اس کے لئے وہ قابل مطالعہ کتابیں انتخاب کرتی اور اس کی نظمیں سن کر اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ یہ پہلا خاندان تھا جہاں اڈگر کو تہذیب اور تمدن کا گہرا رنگ نظر آیا۔ وہ اب نہایت اطمینان کے ساتھ جب جی چاہتا گھر میں گھومتا رہتا۔ وہ کالڈی کاٹ کی موجودگی میں کچھ بے چین سا رہتا۔ وہ کسی معمولی سپاہی وغیرہ سے زیادہ خلا ملا رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن سیاری این اور اس کی لڑکی کی صحبت میں اس کے خیالات بہت بلند رہتے اور اسی کو اپنی ترقی کے امکانات بھی نظر آتے۔ خاص طور پر آئی وی اٹھارہ سال کی دوشیزہ اس کی باتوں پر ہمہ تن گوش بن جاتی۔ اڈگر اس کے لئے غیر معمولی شخصیت بن گیا تھا۔ وہ اس کو ایک بڑا مفکر تسلیم کرتی۔ اڈگر نے اپنی ترقی کا ایک قدم اور بڑھایا اس نے افریقی اخباروں کو اپنے چند مضامین فروخت کئے جس سے آئی وی کو اور بھی یقین ہو گیا کہ وہ واقعی مفکر اور عالی دماغ ہے۔ یہ دوستی بڑھتی گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں نے شادی کے عہد و پیمان کر لئے۔

اس کی زیادہ شہرت اس وقت ہوئی جب کہ انگلستان کا مشہور فسانہ نگار اور شاعر رڈیارڈ کپلنگ جنوبی افریقہ پہنچا اور اس کے استقبال پر اڈگر والیس نے جو نظم کہی وہ کیپ ٹائمز میں شایع ہوئی۔ اس سے بھی بہتر موقع اس کو اس وقت ملا جب کہ اس کو سٹی کلب میں کپلنگ کے الوداعی جلسہ میں ڈنر میں مدعو کیا گیا۔ نوجوان سپاہی کی زبان سے کپلنگ اپنی تعریف میں قصیدہ سن کر بہت متاثر ہوا لیکن چلتے ہوئے جو نصیحت کی وہ حوصلہ افزا نہ تھی اس کے آخری الفاظ تھے۔ "خدا کے واسطے ادب کو اپنا پیشہ نہ بناؤ۔ ادب شاہد رعنا ہے لیکن بیوی کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔" کپلنگ کی نصیحت بیکار ثابت ہوئی۔ کپلنگ سے دوستی کرنا پارلمنٹ کے اراکین، مدیران جرائد اور پروفیسر سبھوں سے دوستی کرنے کے مترادف تھا اڈگر نے کپلنگ کی واپسی کے بعد اس کو خط لکھا کہ اگر میرا مستقبل مجھے موقع دے (اور یقیناً مستقبل نے اس کو موقع دیا اور اس نے کر دکھایا) تو میں صرف ادب ہی کی بدولت وہ چیز حاصل کروں گا جس کی دنیا تمنی رہتی ہے۔

باقی آئندہ۔ **اکبر صدیقی**

آج کل کے اُردو رسالے

اردو کے حالیہ دَور کو اگر رسالوں کا دَور کہا جائے تو بیجا نہیں۔ کیونکہ گذشتہ دس سال اردو صحافت کے لئے جتنے سازگار ثابت ہوئے ہیں ادب کی کسی اور صنف کے لئے نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں قدیم رسالوں کے علاوہ بعض ایسے اچھے جدید رسالے جاری ہوئے ہیں جن کی وجہ سے ہماری زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہوگئی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اگر کسی زبان کی شگفتگی، قوت اور زندگی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے رسالوں ہی کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے کسی ملک و قوم کا ثقافتی رتبہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر اُردو پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے صحافتی نقطۂ نظر سے اس اثنا میں اتنا عروج حاصل کیا ہے کہ ہندوستان کی کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی!

آج کل کے اُردو رسالوں کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے دس عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنے ۱۔ علمی و ادبی اداروں کے ترجمان ۲۔ مقبول عام ماہنامے ۳۔ مخصوص علمی و ادبی مقاصد کے رسائل۔ ۴۔ سستے عام پسند رسالے ۵۔ نسوانی رسالے ۶۔ بچوں، اور طلبہ کے رسالے ۷۔ کالجوں کے میگزین۔ ۸۔ مذہبی مجلے ۹۔ طبی رسالے اور ۱۰۔ قانونی رسائل۔

ان میں سے ہر عنوان اس قابل ہے کہ اس پر ایک علحدہ تقریر کی جائے۔ یا مضمون لکھا جائے۔ آج کی اس مختصر سی صحبت میں اس کا بھی موقع نہیں کہ ان سب عنوانات کے تحت جو رسالے شامل ہوسکتے ہیں ان کے نام بھی بتادئے جائیں۔ اس لئے اس وقت صرف چند رسالوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے وہ رسالے قابل ذکر ہیں جو علمی یا ادبی اداروں کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہورہے ہیں۔ ان میں اُردو دہلی۔ معارف اعظم گڈھ۔ اورنٹیل کالج میگزین لاہور۔ جامعہ دہلی۔ ہندوستانی الہ آباد۔ سب رس حیدرآباد۔ نیا ادب لکھنو۔ مجلہ تحقیقات علمیہ۔ اور مجلہ طیلسانین حیدرآباد۔ قابل ذکر ہیں۔

اُردو، اورنٹیل کالج میگزین، ہندوستانی، مجلہ تحقیقات علمیہ اور مجلہ طیلسانین سہ ماہی ہیں اور بقیہ ماہوار۔ سہ ماہی رسالوں میں چونکہ زیادہ تر علمی اور تحقیقاتی مضمون اور مقالے ہی چھپ سکتے ہیں اس لئے یہ عوام میں مقبول نہیں ہونے پاتے۔ ان کے پڑھنے والے خاص خاص علم دوست اصحاب ہوتے ہیں اور اسی لئے ان کے معیار کو بلند رکھنا پڑتا ہے۔ رسالہ اردو اور مجلہ طیلسانین عثمانیہ کے ارباب کار اپنے پرچوں کو مقبول بنانے کی خاطر ان میں بعض ایسے ادبی اور تنقیدی مضمون اور نظمیں بھی شامل کردیتے ہیں جن کا علمی معیار اس قسم کے سہ ماہی رسالوں کے شایان شان نہیں ہوسکتا۔ ہندوستانی اورنٹیل کالج میگزین اور مجلہ تحقیقات علمیہ اس لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ اول الذکر میں علوم شرقیہ اور خاص کر فارسی ادب، اور موخر الذکر میں سائنس، علوم جدیدہ، اور تاریخ سے متعلق معیاری مضمونوں اور مقالوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

اس نوعیت کے ماہناموں میں معارف، تاریخ و معارف اسلامیہ کا ایک بے نظیر پرچہ ہے۔ جامعہ میں علوم عمرانی

اور سیاست حاضرہ پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔
سب رس مضامین کے تنوع اور شگفتگی پر زور دینے کے علاوہ اردو ادب کے ذوق کو ہمہ گیر بنانے میں کوشاں ہے اور نیا ادب صحیح معنوں میں اردو کے نئے ادب کا نمایندہ ہے۔

۲- ہماری تقسیم کے پیش نظر دوسری نوعیت کے رسالوں میں وہ مقبول عام ماہنامے شامل ہیں جو اپنے مدیروں کی شخصیت یا اپنی اشاعت کی قدامت یا مضامین کی رنگا رنگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی فہرست میں نگار لکھنو۔ ساقی دہلی۔ زمانہ کانپور۔ ہمایوں، ادبی دنیا، اور ادب لطیف لاہور۔ شہاب حیدرآباد۔ شاہکار، نیرنگ خیال، اور عالمگیر لاہور۔ ندیم وسہیل گیا۔ جدید اردو کلکتہ۔ تصویر رامپور۔ اور شاعر آگرہ بالترتیب شامل کئے جا سکتے ہیں۔

پہلے چار رسالوں کو اردو کے مقبول ترین ماہناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نگار اپنے مدیر کی بے باک رائے اور رنگین تحریروں کی وجہ سے، ساقی انگریزی ادب عالیہ کے نفیس ترجموں اور اچھے افسانوں کے باعث، اور زمانہ اپنی قدامت اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کے نقطۂ خیال کا ترجمان ہونے کے سبب اپنی اپنی جگہ انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ ہمایوں، شاہکار، ادبی دنیا اور ادب لطیف اپنے مدیروں کے پاکیزہ ذوق انتخاب اور کتابت و طباعت کی نفاست کی وجہ سے قابل دید ہیں جو اصحاب انگریزی رسالوں کی دیدہ زیبی کے مقابلہ میں اردو رسائل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ لاہور کے ان رسالوں کو دیکھیں تو اپنے خیال میں ضرور تبدیلی کرلیں گے۔

شہاب حیدرآباد کا ایک پرانا رسالہ ہے جس میں طبقۂ نسواں کی علمی و ادبی قوتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ شاعر آگرہ اسکول کے شاعروں کا بڑا اچھا ترجمان ہے۔ نیرنگ خیال اور عالمگیر بھی دیدہ زیب پرچے ہیں جو زیادہ تر اپنے خاص نمبروں اور سالناموں کی وجہ سے مقبول ہیں۔ ندیم، سہیل، جدید اردو اور تصویر گیا، کلکتہ، اور رامپور کے قابل ذکر رسالے ہیں جو ان مقامات میں اردو ادب کے ذوق کی کامیاب اشاعت کر رہے ہیں۔

۳- ہماری تقسیم میں تیسرا نمبر ان علمی رسالوں کا ہے جو کسی مخصوص مقصد کے تحت شایع ہو رہے ہیں۔ ان میں المعلم حیدرآباد۔ نئی زندگی گجرانوالہ۔ حیدرآباد ٹیچر، سب رس معلومات، اور سیاست حیدرآباد۔ اور ہمارا مستقبل لکھنو۔ بہت نمایاں ہیں۔ المعلم اور حیدرآباد ٹیچر، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے مدارس کے استادوں کے لئے نکالے جاتے ہیں اور فن تعلیم و تدریس کے متعلق اردو زبان میں بڑی اچھی معلومات کا اضافہ کر رہے ہیں۔ سیاست سیاسی و اجتماعی علوم کا سہ ماہی مجلہ ہے جس میں اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ سے اردو داں طبقہ میں مقبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سب رس معلومات اصل میں ماہنامہ سب رس کا ضمیمہ ہے۔ اور ان نوجوانوں کے لئے علحدہ شایع کیا جاتا ہے، جو مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

اور ٹھوس علمی و حکمی معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ نئی زندگی اور ہمارا مستقبل اصلاحی اور سیاسی رسالے ہیں اور اسی سال جاری ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت ظاہر کرتی ہے کہ یہ کافی مفید اور مقبول ثابت ہوں گے۔ کیونکہ عہد حاضر میں اہل اردو سیاسی معلومات کی تحصیل کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے ہیں۔

۴۔ چوتھی قسم کے رسالے وہ ہیں جو بالعموم پنجاب سے سستے داموں میں عوام کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں اور جو علمی و ادبی خدمت سے زیادہ عوام کے ذوق کی خاطر مرتب کئے جاتے ہیں۔ ان میں بازاری اور سینما کے اشتہاروں کی بھی کثرت ہوتی ہے لیکن اشتہاروں کی وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ رسالے غیر مفید ہیں۔ ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سستے داموں کی وجہ سے جز معاش لوگ بھی ان کو خرید سکتے ہیں اور اس طرح اردو ادب کا ذوق ہر طبقہ میں نشو و نما پا سکتا ہے۔ ان رسالوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو محض فلم اور سینما کے رسالے اور دوسرے وہ رسالے جو لاہور سے مست قلندر، اشیاء، خضر راہ، تندرستی، موج بہار وغیرہ ناموں سے شائع ہوتے ہیں۔

۵۔ ہماری تقسیم میں پانچویں قسم عورتوں کے رسائل کے لئے مخصوص ہے۔ اس خصوص میں یہ رسالے قابل تذکرہ ہیں۔ عصمت دہلی۔ زیب النساء لاہور۔ انیس نسواں دہلی۔ پیام نسواں لکھنو۔ ناہید حیدرآباد۔ تنویر بیبی اور سہاگ لاہور۔ یہ سب ماہنامے ہیں۔ ان میں عصمت اور انیس نسواں بہت ممتاز ہیں۔ پہلا علامہ راشد الخیری کی یادگار ہے۔ اور تیس سال سے پابندی سے نکل رہا ہے۔ دوسرے پرچے کے مدیر شیخ محمد اکرام، مخزن کی ادارت میں سر شیخ عبدالقادر کے شریک کار رہ چکے تھے اس لئے وہ بہت سلیقہ سے یہ رسالہ شایع کر رہے ہیں۔ ناہید رسالہ شہاب حیدرآباد کا ضمیمہ ہے۔ بقیہ نسوانی رسائل بھی قابل مطالعہ ہیں۔

(۶) چھٹی نوعیت کے رسالوں میں ان پرچوں کو شریک کیا گیا ہے جو بچوں، بچیوں، اور مدرسوں کے طلبہ کے لئے نکالے جاتے ہیں۔ ان میں بنات اور پیام تعلیم دہلی۔ بچوں کا سب رس حیدرآباد۔ سعادت لاہور۔ آصفیہ میگزین اور تلمیذ حیدرآباد قابل ذکر ہیں۔ بنات بھی عصمت کی طرح راشد الخیری مرحوم کا نکالا ہوا ماہنامہ ہے۔ جو بچیوں کے لئے تیرہ سال سے باتصویر شائع ہو رہا ہے۔ پیام تعلیم جامعہ ملیہ کی طرف سے اور بچوں کا سب رس ادارۂ ادبیات اردو سے شایع ہوتے ہیں اور دونوں بچوں اور بچیوں میں بہت مقبول ہیں۔ آصفیہ میگزین مدرسہ آصفیہ حیدرآباد اور تلمیذ مدرسہ فوقانیہ نامپلی کے طلبہ کے سہ ماہی رسالے ہیں۔

۷۔ اردو کے ساتویں قسم کے رسالے وہ ہیں جو مختلف کالجوں سے زیادہ تر سہ ماہی شائع ہوتے ہیں۔ ان میں علیگڈھ میگزین، مجلۂ عثمانیہ، نظام ادب، دی پاس نورس، الموسی، اور مجلۂ عثمانیہ کالج ورنگل کا تذکرہ ضروری ہے۔ اول الذکر دو رسالے ہندوستان کی دو مشہور جامعات یعنے مسلم یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کے ترجمان ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نظام ادب نظام کالج حیدرآباد اور دی پاس اسمٰعیل کالج جوگیشوری سے

نکلتے ہیں ۔ اور دونوں کا معیار قریب قریب یکساں ہے ۔ الموسیٰ حیدرآباد کی مشہور درسگاہ سٹی کالج کا پاکیزہ اور دیدہ زیب مجلہ ہے ۔ نورس اور رنگ آباد کالج اور موخرالذکر ورنگل کالج کے طلبہ کے سہ ماہی مجلے ہیں ان دونوں کو خاص توجہ سے مرتب کیا جاتا ہے

ہماری تقسیم کے مطابق اردو رسائل کی باقیہ تین قسمیں مذہبی، طبی، اور قانونی رسائل پر مشتمل ہیں ۔ ان تینوں قسم کے رسالوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی صحبت میں ہم ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم نے جن سات قسم کے رسالوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی کسی طرح سے مکمل نہیں سمجھا جاسکتا ۔ کیونکہ یہ تو ایک تعارفی تقریر ہے اور اس میں اردو کے موجودہ رسالوں پر تبصرہ کرنا یا ان کی تاریخ بیان کرنا تو کجا قلت وقت کی وجہ سے بہت سوں کے نام بھی نہیں لئے جا سکے ۔ اور انہیں رسالوں کے نام لئے گئے جو ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں آتے ہیں اور جن کا مجھے پابندی کی شاعاکرنے کا موقع ملتا ہے۔

(تقریر حیدرآباد لاسلکی نشرگاہ)

سید محی الدین قادری زور

اردو دانی کی پہلی کتاب

یہ کتاب حرف شناسی کے لیے بہترین ہے اور بالکل جدید اصولوں پر مرتب کی گئی ہے جس سے بچے، بالغ، بوڑھے، بہت جلد اُردو الفاظ پر عبور حاصل کر سکتے ہیں، اس میں تصاویر کے ذریعہ الفاظ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، تصاویر کی تعداد (۱۰۹) ہے گو یہ بات نئی نہیں لیکن مرکب الفاظ کے جوڑوں کو ذرا سا فصل دے کر الفاظ کی ہیئت ذہن نشین کرانے کا جو طریقہ اس میں دکھایا ہے وہ بالکل جدید ہے ہر قسم کے قاعدے تمام ہندوستان میں رائج ہونے چاہیں ۔ **شاعر مئی سنہ۴۰ء**

اس زمانہ میں پڑھنے سے زیادہ پڑھانا محنت و ذہانت چاہتا ہے اور اس لئے فن تعلیم کو آج کل بڑی اہمیت دی جاتی ہے اُردو سکھانے کی یہ پہلی کتاب مدرس مدرسہ خیریت آباد نے اسی فنی حیثیت سے لکھی ہے ۔ **نگار مئی سنہ۴۰ء**

یہ ایک قاعدہ ہے جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے شعبۂ امتحانات کے نصاب کے لئے تیار کیا گیا ہے، خصوصیات اس قاعدے کے حسب ذیل ہیں ۔

(۱) مختلف تصویریں قانون تلازم کے مطابق دی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ الفاظ کی شکلیں ذہن نشین ہوجائیں (۲) ہر لفظ کے بول کو الگ الگ لکھا ہے تاکہ مبتدی کو سہولت ہو (۳) الفاظ کی تحلیل کر کے حرفوں کی پوری شکلیں اور ان کے جوڑوں کی شکلوں کی وضاحت کی گئی ہے (۴) رسم الخط ایسا استعمال کیا ہے کہ حرفوں کی اصل حتی الامکان اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور (۵) ذخیرۂ الفاظ کو جملوں میں بار بار استعمال کیا گیا ہے تاکہ خوب مشق ہو جائے ۔ یہ قاعدہ اس لحاظ سے بہت مفید ہے ۔ **جامعہ جولائی سنہ۴۰ء**

"پائریا"

پائریا ایک ایسا مرض ہے جس سے بے اعتنائی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اس سے انسان کی عام صحت متاثر ہوجاتی ہے اور وہ بآسانی گٹھیا (وجع مفاصل) بدہضمی اور Appendicitis کا شکار ہوجاتا ہے۔ تنفس پر بھی اس سے اثر ہوتا ہے اور حلق کی سوجن کی کہنہ بیماری اسی سے ہوتی ہے۔ دانتوں کی صحت کا خیال نہ رکھنے اور پائریا کا علاج نہ کروانے سے نتیجتاً پھیپھڑوں پر چھالے آجاتے ہیں اور پھیپھڑے خراب ہوجاتے ہیں۔

کسی کے مسوڑے بگڑ گئے ہوں، یا دانت خراب ہوگئے ہوں تو اس کی صحت بگڑنی شروع ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر مسوڑوں کا علاج ہوجائے تو صحت دوبارہ حاصل ہوسکتی ہے۔

پائریا کی نشو ونما کیونکر ہوتی ہے؟ دوبارہ جب دانت نکلتے ہیں تو اس وقت سے لیکر عمر کے ہر دور میں یہ بیماری پیدا ہوسکتی ہے۔ یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کی بنا پر "پائریا" ہوسکتا ہے۔ خاص کر کیلشیم Calcium اور حیاتین Vitamins کی کمی۔ دانتوں کی بے ترتیب ساخت، دانتوں کے اندر کھرونڈ Tartar جم جانے، غذا کو اچھی طرح سے نہ چبانے، اور کافی آرام نہ لینے، ریاضت جسمانی کے نہ ہونے، اور تازہ ہوا کے نہ ملنے سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند اسباب ہیں جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے۔

مثلاً غذا میں بے اصولی۔ شراب نوشی یا سگریٹ نوشی کے عادی ہونے سے اور بعض اوقات اگرچہ کہ بہ ظاہر دہن بالکل پاک وصاف رکھنے پر بھی پائریا و دیگر امراض دانتوں کی بیماریوں کے ساتھ ساتھ پیدا ہوجاتے ہیں۔

پائریا کی ابتدائی حالت میں پہچان مسوڑوں پر خفیف سی بے توجہی سے دانتوں کے اطراف میل کی تہہ جم جاتی ہے۔ اور اکثر مسوڑوں سے خون بہنے لگتا ہے۔

پائریا دوسرے درجہ میں مسوڑے پلپلے ہوجاتے ہیں۔ ان پر سوجن آجاتی اور سرخ ہوجاتے ہیں۔ معمولی ٹھیس پر خون نکلنے لگتا ہے۔ اگر مسوڑوں کو دبایا جائے تو پیپ اور خون نظر آتا ہے۔ منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔

آخری حد پر تو مسوڑے حد سے زیادہ پلپلے ہوجاتے ہیں۔ اور بکثرت خون اور پیپ نکلتا رہتا ہے۔ دانتوں کی جڑیں باہر آجاتی اور دانت ہلنے لگتے ہیں اور سخت تکلیف سی ہوتی ہے۔ حد سے زیادہ بدبو آنے لگتی ہے۔

اگلے وقتوں کی بہ نسبت آج کل پائریا کا مرض زیادہ عام ہے۔ اس کا سبب پروٹین Proteins اور کاربوہائیڈریٹ Carbohydrates کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ اور ایسی غذاؤں کی کمی جن میں حیاتین Vitamins اور ارگن Roughage نمکوں اور Organis کی کمی ہو استعمال کرنا ہے۔ غذا میں سڑی گلی چیزیں نہ ہونی چاہیئے۔

آج کل کی پر ہنگامہ زندگی، زندگی کے مصائب یا

پرجوش کیفیات، ریاضت جسمانی کی کمی، اور صاف ہوا کے نہ ملنے سے یہ مرض پھیل رہا ہے۔

اگر حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں نیز بچوں کو ٹھیک غذا دی جائے تو بچوں کے دانت اور ہڈیوں کے مضبوط ہونے کی ابتدا ہی سے بنیاد پڑیگی اور بیماری کا دفعیہ ہو جائے گا۔ عورتوں کی صحت بنابریں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اس دوران میں دہن اچھا نہ رہے تو غذا برابر نہ کھائی جاسکے گی۔ نیز دودھ پلانے کے زمانے میں بھی اگر ماں کا دہن صاف نہ رہے تو بچے کی صحت کے لئے مضر ہے۔

ڈاکٹر مس یم پاڑوگر

(جولائی کے سب رس میں مس یم پاڑوگر کا مضمون "دانتوں کی اہمیت" غلطی سے حفیظ جمال کے نام سے شائع ہوگیا ہے جو دراصل ترجمہ ہے)

محمد حسین آزاد

ہونہار مولفہ نے ایم اے کے امتحان کے لئے مولانا محمد حسین آزاد پر یہ قابل قدر مقالہ لکھا تھا، جسے ادارۂ ادبیات اردو نے کتابی شکل میں شائع کردیا ہے۔ اس میں آزاد کے سوانح، ان کے علمی وادبی خدمات وکمالات اوران کے تصانیف پر تبصرہ ہے، سوانح کے حصہ میں ان کے جو حالات تلاش وجستجو سے مل سکے ہیں جمع کردئے گئے ہیں، تبصرہ کے حصہ میں ان کے ادب دانشا پر بڑی حد تک خوش مذاقی سے تبصرہ ہے۔ ہونہار مولفہ نے بڑے حسن مذاق اور سلیقہ سے کتاب لکھی ہے اور اس سے اردو میں آزاد کے متعلق ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

معارف جون سنہ ۴۰ء

ادارۂ ادبیات اردو

اردو ادب میں مولانا محمد حسین آزاد کی ہستی نہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے توجہ کے لائق ہے بلکہ ان کی شخصیت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ سیرتی مطالعہ کے لحاظ سے غدر کے بعد مرزا سودا کے علاوہ اگر کوئی ادیب ہمیں اپیل کرتا ہے تو وہ آزاد مرحوم ہیں غالباً حیدرآباد کی یہ کتاب اس بے نظیر ادیب کے حالات زندگی کے متعلق پہلی کوشش ہے جسے محترمہ جہاں بانو بیگم نقوی ایم اے نے تالیف کیا ہے۔ اس سوانح عمری میں نہ صرف آزاد کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں بلکہ ان کی تصانیف اور کلام پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے انداز بیان نے اکثر جگہ آزاد مرحوم کو قاری کے لئے ایک جیتی جاگتی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی مورت بنا دیا ہے۔

ادبی دنیا جون سنہ ۴۰ء

تاریخ کی کتابوں میں ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ ان کا انداز بیان بالعموم خشک اور غیر دلچسپ ہوتا ہے، زیر نظر کتاب "محمد حسین آزاد" کے متعلق بھی تبصرہ نگار کا یہی خیال تھا لیکن مطالعہ کرنے سے یہ خیال غلط ثابت ہوا، کتاب میں آزاد مرحوم کی زندگی کے حالات بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ دئے گئے ہیں۔ آزاد کی سیرت نگاری کا فرض سب سے بڑھ کر پنجاب پر عائد ہوتا ہے مگر اس بات پر رشک ہوتا ہے کہ یہ شرف دکن کی ایک خاتون کو حاصل ہوا۔

البیان جولائی سنہ ۴۰ء

ممالک متحدہ کے صدر کا انتخاب

ممالک متحدہ امریکہ کی صدارت کا عہدہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ دستور مملکت کی رو سے عاملہ کے پورے اختیارات صدر ہی کے تفویض ہوتے ہیں دنیا بھر میں غالبًا یہی ایک ایسا عہدہ ہے کہ جس کے حصول کے لئے ہر طرح کی جائز اور ناجائز کوشش کی جاتی ہیں اور ہر چوتھے سال جب کہ صدر کے انتخاب کا زمانہ آتا ہے، گھر گھر کی رونق ایک ہنگامے پر موقوف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر کے انتخاب کا سوال اور اس انتخاب کے طریقۂ کار کا مطالعہ بعید دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ممالک متحدہ کے دستور میں اس چیز کی ممانعت نہیں کہ کوئی صدر انتخاب کے لئے ایک سے زیادہ مرتبہ کھڑا نہ ہو، لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس مملکت کی تاریخ میں اب تک کسی شخص کا انتخاب دو سے زیادہ مرتبہ نہیں ہوا، اور جارج واشنگٹن نے جو نظیر قائم کی تھی اس پر اب تک برابر عمل ہوتا رہا۔

اس مملکت کے دستور سازوں نے عاملہ کو مقننہ سے آزاد اور علحدہ کرنے میں بڑی دانائی سے کام کیا، اس کی بدولت صدر کی ایک خاص حیثیت ہو گئی ہے اس لئے کہ وہ مقننہ کے ماتحت نہیں ہے۔ دستور سازوں نے صدر کے لئے بالواسطہ طریقۂ انتخاب تجویز کیا ہے جو کسی قدر پیچیدہ ہے۔ دستور میں صدر کے انتخاب کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مجلس قانون ساز کی ہدایت کے مطابق ہر ریاست چند انتخاب کرنے والوں کا تقرر کرے گی اور ان انتخاب کرنے والوں کی تعداد مجموعی طور پر سناتیوں اور نمائندوں کی اس تعداد کے مساوی ہوگی جو اس ریاست کی طرف سے کانگریس میں موجود ہوں۔ لیکن ان انتخاب کنندوں کے تقرر میں ان لوگوں کو کوئی موقع نہیں مل سکے گا جو سناتی یا نمائندے ہوں یا ممالک متحدہ کے اور طور پر سرکاری عہدہ دار ہوں"۔ مثلاً اگر کسی ریاست کی طرف سے کانگریس میں دو سناتی اور چار نمائندے بھجوائے گئے ہوں تو اس ریاست کو حق ہوگا کہ اپنی طرف سے چھ انتخاب کرنے والوں کا تقرر کرے ان انتخاب کنندگاں کا تقرر شہریوں کی رائے دہی سے راست یا بلا واسطہ طریقے پر ہوتا ہے۔ اس طرح مختلف ریاستوں کے انتخاب کنندوں سے مجموعی طور پر ایک حلقہ انتخاب (Electoral College) تشکیل پاجاتا ہے۔ جس میں رایوں کی جملہ تعداد (۵۳۱) ہوتی ہے۔ صدر کے انتخاب کے لئے ان میں سے کم از کم ۲۶۶ رائیں ضروری ہیں۔

غالبًا اس طریقۂ انتخاب سے دستور سازوں کا مقصد یہ تھا کہ صدر کے انتخاب میں انتخاب کنندگان اپنے اختیار تمیزی سے کام لیں، لیکن جیسا کہ لارڈ برائس کہتے ہیں یہ ایک عجیب بات ہے کہ حکومت کے ابتدائی عشرات ہی سے ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں نے صدارت کے لئے اپنے امیدوار نامزد کر دینے شروع کر دئے اور منتخب شدہ انتخاب کنندگاں کا فرض صرف اتنا رہ گیا کہ نامزد کئے ہوئے امیدوار کا صدارت کے لئے انتخاب کریں۔ یہ نامزدگی صرف صدر ہی کی حد تک نہیں رہی بلکہ سیاسی جماعتیں حلقۂ انتخاب کے امیدواروں کو بھی نامزد کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ہر انتخاب میں ان سیاسی جماعتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جو امیدوار کسی سیاسی جماعت کی

طرف سے بحیثیت انتخاب کنندگاں کھڑے کئے جاتے ہیں ان کا یہ لازمی فریضہ ہے کہ وہ منتخب ہو جانے کے بعد صدارت کے لئے صرف اسی امیدوار کا انتخاب کریں جو اس جماعت کی طرف سے نامزد کیا گیا ہو۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ نومبر کے انتخاب کے بعد جب کہ انتخاب کنندگان چنے جاتے ہیں، ہر شخص کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ آئندہ صدر کون شخص ہوگا اور بالآخر ۴ مارچ کو جب کہ منتخب شدہ صدر اپنے عہدے کا جائزہ لے لیتا ہے، اس کی طرف دار سیاسی جماعت اپنی کامیابی پر خوشیاں منانے لگتی ہے۔

آج کل اس انتخابی مہم کا سب سے پہلا زینہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے سیاسی فرقوں کی تنظیم شروع ہو جاتی ہے اور ہر فریق اپنے اپنے نمایندوں کا تقرر کر لیتا ہے۔ ان سیاسی جماعتوں کا اجتماع ہمیشہ جون یا جولائی میں ہوتا ہے اور اس میں صرف وہی لوگ شریک ہوتے ہیں جو مملکت کے مختلف حصوں سے نامزد ہو کر آتے ہیں یا پھر ایسے لوگ حصہ لیتے ہیں جو ایک ذیلی انتخاب کے ذریعے چن لئے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہر ریاست کے مندوبین کی تعداد اس کے سناتوں اور نمائندوں کی مجموعی تعداد کی دوگنی ہوتی ہے اور عمومی جماعت (Democratic National Convention) کی تشکیل تو اب بھی اسی اصول پر مبنی ہے۔ لیکن جمہوری جماعت کے مندوبین ان قاعدوں کے تحت چنے جاتے ہیں جو سنہ ۱۹۲۳ء میں بنائے گئے تھے۔ ان قاعدوں کی رو سے "ہر ریاست کو زیادہ سے زیادہ چار مندوبین کے انتخاب کا حق ہوتا ہے، اور اگر اس ریاست میں کانگریسی حلقے (Congressional Districts) بھی ہوں تو ہر ایسے صوبے کی طرف سے دو مندوبین بھجوائے جا سکیں گے، اور اگر وہ ریاست پچھلے صدارتی انتخاب کے زمانے میں جمہوری (Republican) نقطۂ خیال کی ہو گئی تھی تو مزید تین مندوبین کا تقرر ہو سکے گا۔ نیز ہر کانگریسی صوبے کی طرف سے ایک اور مندوب کا بھی تقرر ہو سکے گا، بشرطیکہ پچھلے انتخاب میں اس صوبے کی ....ا رائیں جمہوری نمایندوں کو حاصل ہوئی ہوں"۔ اس طرح ہر ریاست کو ایک ایسی وحدت تصور کیا جا سکتا ہے جس کا فریضہ صرف یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے لئے امیدواروں کو نامزد کر دے اور ظاہر ہے کہ جس ریاست کی آبادی جتنی زیادہ ہوگی اس کا اثر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ریاست کو کم اور کسی کو زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے گو نظریہ کے لحاظ سے تمام ریاستیں مساوی درجہ رکھتی ہیں۔

اگرچہ صدر کا انتخاب راست طور پر رائے دہی کے ذریعے عمل میں آتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ منتخب شدہ صدر کو یقینی طور پر عوام کی کثرت کی تائید حاصل ہے کیونکہ اگر کسی ریاست میں ایک جماعت کو تھوڑی سی اکثریت حاصل ہو تو اسی جماعت کو اس ریاست کی طرف سے پورا حق انتخاب مل جاتا ہے چنانچہ جو مندوبین صدر کا انتخاب کرنے کے لئے چنے جاتے ہیں، وہ اسی جماعت کے رکن ہوتے ہیں اور ریاست کے باقی افراد کی جو اس کثرت کے مقابلے میں ہار جاتے ہیں، اب کوئی آواز باقی نہیں رہتی اور ان کی مرضی کے خلاف کسی صدر کا انتخاب ہو جاتا ہے مختصر یہ کہ ممالک متحدہ میں تو عوام کی رائے اتنی اہمیت رکھتی ہے اور نہ ریاستوں کی تعداد۔ بلکہ سب سے زیادہ اہمیت صرف انتخاب کنندوں (Electors) کو حاصل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی امیدوار نومبر کے انتخاب میں اپنے مخالف آراء کی کثرت کے باوجود صدر منتخب ہو سکتا ہے۔ یہ چیز بظاہر بالکل لغو بھی اور ناقابل عمل معلوم ہوتی ہے لیکن بات یہ ہے کہ ممالک متحدہ میں اس طریقے کا انتخاب صرف اس وجہ سے کامیاب رہا ہے کہ وہاں صرف دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ اگر آج ممالک متحدہ میں دو کی بجائے تین جماعتیں کھڑی ہو جائیں تو اس انتخابی طریقے میں معتدبہ تبدیلی کرنی پڑے گی۔

حفیظ صدیقی

اثرِ انقلاب

ماحولِ دلگداز جو ہے "غمِ اثر" یہ پھول　　منظر اسی کا ورنہ کبھی خوش گوار تھا
گلشن میں ایک "نرگسِ حیراں" کو چھوڑ کر　　دیدار اس کا سب کے لئے کیف بار تھا
اپنے حسین تبسمِ عشرت نواز سے　　ہمرازِ خندۂ چمن روزگار تھا
ہر شان اس کی حسن کی آئینہ دار تھی　　ہر جلوہ اس کا ذوق کا سرمایہ دار تھا
مسرور اس کی دید سے تھی سب کی چشمِ شوق　　مانوس اس کے رنگ سے ہر گلعذار تھا
تصویر اس زمانہ کی ہے اب کوئی تو دیکھ　　کس درجہ دلفریب یہ اے حسن کار تھا
گنبد میں آج "یاس فزائے مزار" ہے　　کل گلستاں میں "زیب دہ شاخسار" تھا
یاد اس کی داستانِ جمال آہ کس کو ہے　　کیا جانئے کون اس کا سوانح نگار تھا
اتنا پتہ تو دیتا ہے آج انقلابِ دہر　　گلچین بھی اس کے حسن پہ دل سے نثار تھا

یہ پھول اب جو حسرتِ قبرِ شکستہ ہے
سرمایۂ نشاطِ عروسِ بہار تھا

سید علی منظور

مسافر

سورج ڈوبا، بڑھا اندھیرا　　ہُو کا عالم چپ سی دنیا
رات اندھیری منزل دور

جاگ اٹھے ہیں شب کے مسافر　　راہ پہ اپنی چل نکلے پھر
رات اندھیری منزل دور

تارا ٹوٹا، جی گھبرایا　　کچھ یاد آیا، جی بھر آیا
رات اندھیری منزل دور

سوجوں میں ہے خواب کا منظر　　سست ہوائیں، مست معطر
رات اندھیری منزل دور

گھر گر آئے، بادل کالے　　فلک پہ چھائے، بادل کالے
رات اندھیری منزل دور

بجلی چمکے، بادل گرجے　　پروا سنکے، ساون برسے
رات اندھیری منزل دور

جھوم رہے ہیں، بادل کالے　　چڑھے ہوئے ہیں، ندی نالے
رات اندھیری منزل دور

جھینگر پھرتے، شور مچاتے　　جنگل سارا سر پہ اٹھاتے
رات اندھیری منزل دور

مجھ کو رستہ، کون بتائے　　دے کے سہارا، کون بچائے
رات اندھیری منزل دور

بھول گئے ہیں میرے پاؤں　　کون ہے اپنا، کس کو دکھاؤں
رات اندھیری منزل دور

محمد مظفر الدین ظفر عثمانی

بچوں سے

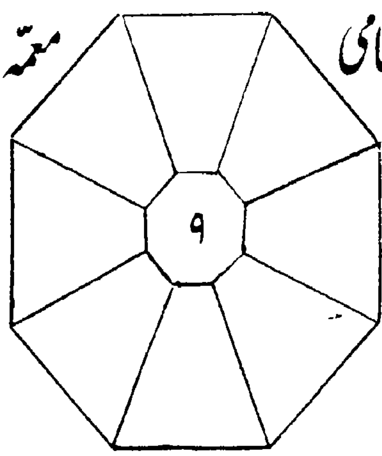
اس پرچے میں بعض اچھے اچھے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی کا ہے جو سب رس کے ایک اچھے مضمون نگار ہیں ان کے مضامین دلچسپ اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ عبدالقادر فاروقی کا ایک مضمون لاسلکی کا موجد شائع ہوا ہے۔ ان کے مضامین بھی سب رس میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پُراز معلومات بھی ہوتے ہیں۔

اس پرچے میں دو انعامات کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ ایک تو محمود علی اکبر کا ایک انعامی معمہ شائع ہو رہا ہے جسے ۲۵ تاریخ تک حل کر کے روانہ کر دیجئے انعام میں ایک اچھی کتاب دی جائے گی مرزا محمد نوید نے ایک انعامی کتاب بھیجی ہے۔ اس کتاب کا نام لینن ہے کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ انھوں نے یہ خواہش کی ہے کہ سب رس کی طرف سے کسی عنوان کا اعلان کیا جائے۔ لینن کو آپ سب جانتے ہوں گے پس اسی کی سوانح حیات ۲۵ تاریخ تک لکھ بھیجئے۔ جن کا مضمون سب سے اچھا رہے گا انھیں "لینن" انعام دی جائے گی۔ سوانح عمریاں لکھنے کی بھی عادت ڈالنی چاہئے۔ سوانح عمریاں لکھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ دیکھیں لینن کی سوانح عمری کون اچھی لکھتا ہے۔

شعبہ طلبہ کی جانب سے ایک مباحثہ ۲۴ اگست ۱۹۴۰ء کو ہونے والا ہے جس میں مدرسوں کی طرف سے کئی جماعتیں اس مقابلہ میں شریک ہو رہی ہیں۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ اپنے اسکول کی طرف سے آئیں اور اگر آپ کو مدرسہ کی جانب سے نہ بھیجا جائے تو اس صورت میں بھی آپ خانگی طور پر اپنی ایک پارٹی بنا کر شریک ہو سکتے ہیں۔ پارٹی دو طلبہ پر مشتمل ہو گی ایک عنوان کی مخالفت کرے گا اور دوسرا موافقت میں تقریر کرے گا۔ فی کس ۸ر فیس شرکت ادا کرنی ہو گی۔ مقابلہ ۲۴ اگست کو ۴½ بجے احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں ڈاکٹر زور صاحب کی صدارت میں ہو گا۔ مقررین کا ½۳ بجے آجانا ضروری ہے۔ عنوان کا اعلان ایک گھنٹہ پہلے کیا جائے گا۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیئے جائیں گے۔ یکم ہفتہ تک فیس اور درخواست شرکت روانہ کر دیجئے۔

معین الدین احمد انصاری

انعامی معمہ



ان خانوں میں ایسے ہندسے خوش خط لکھے جائیں کہ ہر طرف سے جن کو پڑھنے پر جملہ (۲۰) ہوں۔

محمود علی اکبر مشیر

سچّی کہانی

(ایک نئے طرز کا خط)

پیارے دوست!

بہت روز ہوئے تمھیں کوئی خط نہیں لکھا تم حیران ہوں گے کہ خلاف معمول میں نے کیوں چپ سادھ رکھی ہے بات یہ ہے کہ اس اثناء میں ایک کہانی تیار کر رہا تھا جو اب تمھیں سنا رہا ہوں۔ یوں تو تم نے بہت سی کہانیاں سنی ہوں گی لیکن یہ اپنی طرز کی بالکل نئی ہے۔

کہتے ہیں کسی دریا کے کنارے ایک بہت ہی بڑا اور پُر رونق شہر آباد تھا۔ اس شہر کا نام "چین آباد" تھا۔ اس شہر کے تقریباً سب باشندے دولت مند اور خوشحال تھے۔ اس شہر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو زندگی کی تلخیوں کی شکایت کرے۔

شکایت و شکوہ کیوں کرتے جب کہ ان کی زندگی میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ اس شہر کا حاکم بہت ہی نیک دل اور منصف مزاج تھا۔ اسے رعایا سے بے انتہا محبت تھی اور ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک رہتا تھا۔ وہ اپنی رعایا سے ان کے ماں باپ کا سا سلوک کرتا تھا۔

انسان کے لئے موت یقینی ہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن حاکم اجلاس پر بیٹھا بیٹھا مر گیا۔ یہ سانحہ رعایا کے لئے بہت ہی سخت تھا۔ کئی دن تک شہر میں صف ماتم بچھی رہی۔ ساری رنگ رلیاں خواب و خیال ہو گئیں۔ بچہ جوان بوڑھا سب ہی نوحہ کناں دکھائی دیتے تھے۔ ان کے سروں پر غم کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ وہ اپنے رنج و الم کو کسی طرح بھی بھلا نہ سکے۔ یوں تو سبھوں نے آہ و زاری کی لیکن ایک کمسن لڑکے کو بہت زیادہ قلق ہوا۔ اس کا غم اتنا بڑھ گیا کہ آنسو تک بھی خشک ہو گئے۔ کئی دن تک وہ شہر میں ادھر ادھر پھرتا رہا، لیکن چین نہ آیا۔ حتیٰ کہ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے شہر کو خیرباد کہا۔ اور دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ سامنے ایک زخار دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔ اس لڑکے نے ارادہ کیا کہ دریا کے اس پار جاکر اپنی زندگی کا آغاز کرے لیکن اطراف میں کہیں کوئی کشتی دکھائی نہ دی۔ اس نے دریا کے کنارے کنارے چلنا شروع کیا۔ کوئی دس قدم بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ ایک کشتی دکھائی دی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس کشتی کا کون مالک ہوگا؟ سامنے ایک قد آدم گھنا درخت تھا۔ اس سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ یہ لڑکا لپک کر اس پودے تک پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا آخری سانسیں

لے رہا ہے۔ اس بوڑھے نے لڑکے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور صرف ایک لفظ "ارادہ" کہا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ لڑکا حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آواز آئی۔

ستاروں سے پرے اپنے لئے منزل بنا لو تم
کہ ہو اوجِ ثریا بھی تمہارے دلستانوں میں

لڑکا غیر ارادی طور پر کشتی میں بیٹھ گیا اور زور زور سے اسے چلانے لگا جب کشتی چلاتے چلاتے تھک جاتا تو کوئی اچھا سا راگ چھیڑ دیتا۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

دریا کا پاٹ بہت ہی چوڑا تھا۔ اس دریا کا عبور کرنا بہت ہی خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ دریا میں جگہ جگہ گرداب اور بھنور تھے۔ جس میں اس سے پہلے بہت سی کشتیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ لڑکا دریا کے تیز و تند موجوں کے سینہ پر سوار برابر چلا جا رہا تھا۔ نہ تو وہ طوفانی موجوں ہی کو خاطر میں لاتا تھا اور نہ گرداب ہی سے ڈرتا تھا۔

رفتہ رفتہ شام ہونے لگی۔ لڑکے کے پاس جو چراغ تھا وہ بہت ہی چھوٹا اور دریائی سفر کے لئے ناکافی تھا۔ جب زیادہ اندھیرا چھانے لگا تو اس نے اپنی کشتی کا لنگر ڈال دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اندھیری رات میں سفر کرنا جنون ہے۔ جب صبح اس کی آنکھیں کھلیں تو چٹان کے اوپر ایک بڑا سا چراغ دکھائی دیا۔ یہ لڑکا چراغ پاکر مارے خوشی کے پھول گیا اور چراغ لے کر پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کشتی کھینے لگا۔ اب اس کی کشتی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ بھی اسے اپنے سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ پورا دن وہ مصروف سفر رہا لیکن اس کی تیز رفتاری میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پایا۔ خاور مشرق نے دور دریا کے اس پار پانی میں اپنا عروسی چہرا چھپالیا اور رات نے اس کی حکومت کا جائزہ لے لیا۔ اس کی روشنی بہت کافی تھی۔ اس لئے اس نے اپنا سفر اسی رفتار کے ساتھ جاری رکھا۔ آدھی رات گئے ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ اور مشرق کی طرف سے ایسی زبردست لہر آئی کہ کشتی الٹ جاتی لیکن لڑکا بڑا ہی عقلمند تھا اس نے کچھ اس ترکیب سے کشتی کا رخ پھیر دیا کہ وہ الٹنے سے بچ گئی۔ ان مشکلات نے لڑکے کے حوصلوں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی اس کا ارادہ اٹل اور حوصلے بہت بلند تھے۔ دنیا کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اسے اپنے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کے پاس سفر کا پورا سامان موجود تھا۔ پتوار مضبوط، کشتی درست، ہمت اور ارادہ راسخ اور چراغ روشن تھا پھر وہ سفر کیوں نہ جاری رکھتا۔

تمام رات اس نے اپنی کشتی کھینے میں گزار دی۔ رات کی تاریکی کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے دماغ میں مایوس کن خیالات پیدا ہوتے تھے۔ لیکن اس کا دل کہتا تھا ہر رات کے بعد دن کا نکلنا یقینی امر ہے۔

صبح کا ستارہ جھلملانے لگا۔ اور آسمان کے

سب تارے یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگے۔ دریائی پرندوں نے نغمہ سرائی شروع کی اور خاور مشرق کی نرم ونازک ابتدائی شعاعوں سے پانی میں بھانت بھانت کے رنگ پیدا ہونے لگے یہ منظر اتنا دلکش اور حسین تھا کہ لڑکا محوِ نظارہ ہوگیا۔ اور اسی عالم خود فراموشی میں ایک ایسا میٹھا راگ چھیڑ دیا کہ گاتے گاتے بے ہوش ہوگیا۔

بہت دیر بعد جب لڑکے کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں سے پتوار چھوٹ چکے ہیں۔ لڑکا اپنے کئے پر بہت پچھتا تا رہا لیکن غلطی کے بعد کفِ افسوس ملنے سے کیا حاصل۔ دانشمندی تو نقصان کی تلافی کرنے میں ہے۔ لڑکا تھا بڑا ہی عقلمند اس نے اپنے ہاتھوں ہی سے پانی کھینا شروع کیا۔ اتفاق سے ہوا موافق تھی کچھ دیر تک تو کشتی آگے کی طرف بڑھتی رہی لیکن کب تک۔

دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدل گیا۔ ہوائیں سناٹا بھرنے لگیں۔ دریا میں تلاطم پیدا ہونے لگا۔ موجوں میں تو پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور طاقت پیدا ہوگئی۔ اور ان موجوں نے گرداب کی صورت اختیار کرلی۔ ایسے وقت میں بھی لڑکے نے اپنی منزل کا خیال اپنے دل سے جانے نہیں دیا لیکن یوں سمجھتا رہا کہ یہ بھی ان حادثات کا ایک تتمہ ہے جو اس کو ابتدائے سفر سے پیش آرہے تھے۔

طوفان سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ صورتِ حال اس قدر نازک ہوگئی تھی کہ اب اس پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی اس نے دامنِ امید کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ تدبیریں سوچتا رہا۔

اب لڑکا تیز و تند طوفان کے سینے پر اپنی کشتی کھے رہا تھا۔ طوفانی موجوں نے کشتی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی پانی اندر داخل ہو رہا تھا۔ لڑکا اس مصیبت سے بچ نکلنے کی بساط بھر کوشش کر رہا تھا لیکن کسی طرح کامیابی نہ ہوتی تھی۔

چراغ گل ہو چکا تھا لیکن دل کا چراغ پہلے سے بھی زیادہ روشن تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن دماغ کی روشنی اس پر دھیان دینے نہ دیتی تھی۔ وہ اپنے دل و دماغ کی روشنی میں اپنے خیالات کی دنیا کو تو بغور دیکھ رہا تھا لیکن دریائی راستہ کو نہ دیکھ سکا اور اس کی کشتی ایک سیاہ سخت چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔

اب لڑکا پانی میں تیر رہا تھا۔ اس نے امکان بھر کوشش کی لیکن ہاتھ پاؤں جواب دے چکے تھے۔ اس نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ یارب مجھے اس مشکل سے پار لگا دے اس وقت میرا سوائے تیرے کوئی مددگار نہیں۔ اس نے یہ الفاظ پوری طرح ختم بھی کرنے نہیں پائے تھے کہ وہ ایک چٹان سے جا لگا۔

اس چٹان پر چڑھ کر سب سے پہلے دو رکعت نماز اپنے مالک کی شکر گزاری میں ادا کی۔

جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے۔ تو اس نے ان چوڑے چوڑے تختوں کو باندھ کر ایک چوڑا سا تختہ بنا لیا جو مچھیروں کے تختہ کا سا تھا۔

اب وہ اس تختہ پر منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے۔ جب پہنچ جائے گا تو پوری کہانی لکھوں گا۔ ابھی تو یہ اس لڑکے کی پہلی منزل ختم ہونے کو ہے۔ دوسری منزلوں کے واقعات کا انتظار کرو۔

شیخ رحیم الدین (ظہیر آبادی)

آموں کا مزہ

عظمت اور خسرو تھے دو لڑکے
اک گاؤں کے باہر رہتے تھے
دونوں تھے شیطان کے بھائی
کام تھا ان کا مار کٹائی
اک دن اپنی ٹولی لے کر
جا پہنچے اک باغ کے اندر
دیکھتے کیا ہیں پیڑ کھڑے ہیں
پیڑوں کے نیچے آم پڑے ہیں
ان سب کو جو سوجھی شرارت
پھر کیا تھا بس آئی قیامت
پہلے پہلے پڑے جو پائے
پھر کچھ ڈھیلے مار گرائے
آم مزے لے لے کر چکھے
کچھ کھائے کچھ جیب میں رکھے
اتنے میں رکھوالا آیا
ان کو دیکھ بہت جھلایا
سب نے مل کر اس کو مارا
کیا کرتا تنہا بے چارا
اب تو رکھوالا چلایا
دوسرے رکھوالوں کو بلایا
دوڑتے کچھ لوگ اور جو آئے
لڑکے دیکھ انھیں گھبرائے
رکھوالوں نے ٹھیک بنایا
شیطانی کا مزہ چکھایا
مار پڑی دل میں شرمائے
ڈنڈے کھا کر گھر کو آئے

محمودہ ندیم اللہ

سوتیلی ماں

رشید بستر مرگ پر پڑی ہوئی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ یکایک اس کی نظر مسعود پر پڑی جو کسی خیال سے رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا۔ رشیدہ نے مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسعود میری ننھی کا خیال رکھنا"۔ مسعود چونک پڑا۔ اس کی آواز گلے میں رک گئی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ دو غمگین آنسو بے اختیار گر پڑے۔ "خدا حافظ" رشیدہ نے دم توڑتے ہوئے کہا ۔۔۔ گر مسعود پھر بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک ہچکی کے ساتھ رشیدہ اس دنیائے فانی سے چل بسی۔ اپنی ایک یادگار چھوڑ کر ۔۔۔ گھر میں کہرام مچ گیا ۔۔۔ ننھی شاکرہ دنیا سے بے خبر کھیل میں مصروف تھی جب چیخوں کی آواز سنی تو ڈر کے مارے سہم گئی اور دوڑتی ہوئی ماں کے پاس گئی کہ ماں کی گود میں پناہ لے گر آہ ماں تو چل بسی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔۔۔ مسعود نے اس کو بہلانے کی ناکام کوشش کی ۔۔۔ آخر وہ روتے روتے تھک کر سو گئی۔

دن گزرتے گئے اور مسعود کا غم بھی گھٹتا گیا۔ مسعود اب زیادہ تر دوستوں میں رہتا۔ کیونکہ جب کبھی وہ گھر میں آتا تو رشیدہ بے اختیار یاد آجاتی اور پھر شاکرہ اپنی ماں کے باتیں پوچھتی ۔۔۔ دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ دوسری شادی کرلے تاکہ اس کا رنج وغم مٹ جائے گر مسعود نے انکار کر دیا ۔۔۔ آخر کب تک انکار کرتا۔ دوستوں کے اصرار نے شادی کرنے پر اسے مجبور کر دیا ۔۔۔ تھوڑے دن بعد شاکرہ کے لئے "نئی ماں" آہی گئی ۔۔۔ شاکرہ آج بھی کھیل میں مصروف تھی۔ آہ اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کے لئے دنیا بدل چکی ہے۔ نادان لڑکی یہ سمجھی کہ جو ماں اتنے دن سے کہیں چلی گئی تھی اب واپس آگئی ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے ماں کے پاس گئی اور مسکرا کر کہنے لگی "ماں تم اتنے دن سے کہاں گئی تھیں"۔۔۔ ماں چپ تھی ۔۔۔ کوئی جواب نہ ملا۔ ننھی لڑکی نے پھر دریافت کیا ۔۔۔ جمیلہ نے جھڑکی کے ساتھ کہا "میں تیری ماں نہیں ۔۔۔" غریب لڑکی سہم کر کانپنے لگی ۔۔۔ بھاگی بھاگی مسعود کے پاس گئی اور کہنے لگی "ابا اماں کہتی ہیں کہ میں تیری ماں نہیں"۔

مسعود کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔۔۔ شاکرہ کو بہلاتے ہوئے اس نے کہا "نہیں وہ برابر تیری ماں ہیں" ۔۔۔ بھولی لڑکی مسعود سے چمٹ گئی ۔۔۔

جمیلہ اب پورے گھر کی مالک تھی ۔۔۔ ہر کام اس کے حکم سے ہوتا۔ وہ جو چاہتی کرتی ۔۔۔ معصوم شاکرہ اس کے نزدیک کنیز سے بھی بدتر تھی ۔۔۔ وہی شاکرہ جو سات سال تک اپنی ماں کی گود میں ناز و نعم سے پلی اور جس کے لئے کنیزیں نوکر تھیں آج خود دوسروں کی لونڈی بنی ہوئی تھی وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے گھر کا کام کرتی تھی۔ کبھی کوئی کام خراب ہوجاتا تو جمیلہ مار مار کر نیم مردہ کر دیتی ۔۔۔ مسعود کی آنکھوں پر نئی دلہن کی پٹی بندھی ہوئی تھی ۔۔۔ بہرحال جو کچھ کرتی

کم تھا کیونکہ آخر "ماں" تھی ـــ مسعود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا مگر اُف تک نہ کرتا۔ نئی دلہن کی محبت کے نشے میں چُور تھا ـــ یہ وہی شاکرہ تھی جس کو مسعود ایک منٹ کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہ دیتا تھا مگر نہ معلوم اب وہ محبت کیا ہوگئی تھی ـــ نئی دلہن کو پاتے ہی کیسا رنگ بدل گیا۔ غریب شاکرہ صبح پانچ بجے اٹھتی اور رات کے دس بجے سوتی۔ دن بھر کام کرتی مگر پھر بھی سختی اور بُرا سلوک ـــ اس کو دو دو وقت کھانا نہ ملتا۔ شاکرہ جس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اب "تصویرِ غم" بن گئی تھی ـــ چھوٹی سی جان اور یہ مصیبت۔ آہ خدا۔ گرمیوں کی ایک دلفریب شام کو مسعود کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ یکایک کسی خیال سے چونک پڑا۔ فوراً اندر گیا اور جمیلہ سے کہنے لگا کہ چلو تیاری کرو کل رشیدہ کی برسی ہے۔ بھلا جمیلہ اور یہ کام ـــ اُس نے صاف کہہ دیا میری طبیعت ٹھیک نہیں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ مگر مسعود نے بہت کچھ اصرار کے بعد زبردستی اس کو راضی کر لیا۔ تیاری شروع ہوئی ـــ باری آئی غریب شاکرہ کی ـــ پورا کام اس کے سپرد ہوا۔ ماں کی برسی معصوم بچی کے ہاتھوں تمام رات غریب شاکرہ کام کرتی رہی ـــ دوسرا دن آیا مگر پھر بھی شاکرہ کو فرصت نہ ہوئی۔ بھوکی پیاسی وہ کام کرتی رہی دوپہر میں جمیلہ نے شاکرہ کو برتن دھونے کے لئے دئیے۔ اتنے بہت برتن وہ کیسے اٹھا سکتی۔ ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ پھوٹ گئے، شاکرہ مارے ڈر کے کانپنے لگی مگر سنگ دل جمیلہ کو رحم نہ آیا۔ اس نے بُری طرح مار پیٹ کی۔ غمزدہ، بھوکی اور ناتوان لڑکی اس کی تاب نہ لا سکی اور ایک جگر گداز چیخ کے ساتھ گر پڑی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی ـــ

مسعود بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ غریب لڑکی اپنی پیاری ماں کی آغوش میں جا چکی تھی ـــ مسعود کے قدم نہ اٹھ سکے ـــ جمیلہ خوش تھی جیسے کہ اس کی پرانی امید بر آئی ہے ـــ تھوڑی دیر بعد جمیلہ نے ایک چیخ ماری ـــ مسعود سنگ دل اور بیوی کا غلام مسعود چونک کر کمرے میں بھاگا لیکن جمیلہ ختم ہو چکی تھی ایک کالا ناگ اس کے پاؤں پر لپٹا ہوا تھا ـــ انسان نہ سہی مگر حیوان نے تو غریب شاکرہ کی موت کا بدلہ لیا ـــ مسعود رنج و غم سے سہم کر کھڑا ہوا تھا۔

بلقیس محسن علیخاں

بلّی

آہا! میں نے پالی بلّی — کیسی اچھی بھولی بھالی
میاؤں میاؤں کرکے آتی — کھیل اور کود کے دل بہلاتی
بھیا! اس کو گود میں لے لو — ڈرتے کیا ہو شوق سے لے لو
کیسی میں نے پالی بلّی — پیاری پیاری نازک بلّی

سید خواجہ معین الدین فائز

بلبن

۱۲۳۶ء میں جب سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہوا تو اس کے بعد ۱۲۴۶ء تک کوئی مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی۔ التمش کے بعد رکن الدین، رضیہ سلطانہ، بہرام اور مسعود یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوتے رہے۔ جن کا دَور نہایت ہی مختصر رہا۔ اور تاریخ میں کچھ زیادہ اہم نہیں۔ ان کے زمانے میں ملک مغلوں کے حملے کی وجہ سے بدامنی کا شکار تھا۔ بالآخر ۱۲۴۶ء میں اُمرا نے شمس الدین التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کو تخت دہلی پر متمکن کیا۔ یہ نہایت سادہ لوح، درویش صفت اور نرم دل بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے ایک دانشمند اور مدبر غلام الغ خاں (جس نے بعد میں غیاث الدین بلبن کا لقب اختیار کیا) اپنا وزیر بنایا۔

بلبن سلطان التمش کا ایک ترکی غلام تھا۔ اس کی پرورش و تربیت التمش ہی کے دربار میں ہوئی تھی۔ یہ آہستہ آہستہ ترقی کرکے اس عہدہ تک پہنچ گیا۔ اس کو رضیہ سلطانہ کے زمانے میں شکاری کے عہدہ پر مامور کیا گیا تھا۔ ہانسی اور ریواڑی کا علاقہ اس کو جاگیر میں دے دیا گیا تھا۔ اسی نے سلطان ناصر الدین محمود کو تختِ دہلی پر بٹھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ بلبن وفادار، جفاکش، محنتی اور ایمان دار شخص تھا۔ "اگر سلطان ناصر الدین محمود کو بلبن جیسا جابر تشدد پسند وزیر نہ ملتا تو بہت ممکن تھا کہ سلطنتِ دہلی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔"

۱۲۴۶ء میں جب نیلہ کوہ کار نے بغاوت کی تو اس نے دریائے راوی عبور کرکے اس کی سرکوبی کی۔ اور اسی سلسلہ میں اس نے میسور اور انھقسنور کی بھی تسخیر کی۔ اس کی واپسی کے بعد سلطان محمود نے ۱۲۴۹ء میں بلبن کا عقد اپنی بیٹی کے ساتھ کر دیا۔ ۱۲۵۱ء بلبن نے گوالیار، چندیری، مالوہ اور نروار کی تسخیر کی۔ اس مہم میں شیر خاں بھی اس کا ہمرکاب تھا۔

"رشک و حسد کے دیو شہرت اور مرتبہ کے سائے میں چلتے ہیں۔" اسی طرح جب بلبن کا ستارہ عروج پر تھا اور جب یہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا تو دوسرے امراء اس کے بڑھتے ہوئے عروج کو دیکھ کر حسد کرنے لگے۔ ان حاسدوں کا سرگروہ عماد الدین ریحان تھا۔ یہ اکثر اوقات بادشاہ کو بلبن سے بھڑکا دیتا تھا۔ آخر کار جب بادشاہ اچھ اور ملتان کی چڑھائی سے واپس آ رہا تھا تو اس نے بادشاہ کو بلبن سے بدظن کر دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

۱۲۵۳ء میں بلبن عہدۂ وزارت سے معزول اور جلا وطن کر دیا گیا۔ بلبن کے جاتے ہی تمام لائق اور تجربہ کار عہدہ دار بدل گئے۔ اور ان کی جگہ بلبن کے مخالفین نے لی۔ جو نہایت نالائق و نااہل ثابت ہوئے۔ محمد جنیدی وزیر مقرر ہوا۔ اور عماد الدین اپنے عہدہ سے ترقی کرکے کلید برداری کے منصب

مامور ہوا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ اور تمام مفتوحہ علاقوں کو آزاد ہوتے دیکھ کر بادشاہ نے محسوس کیا کہ بلبن کے بغیر ملک میں امن و چین قایم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ دوسرے ہی سال ۱۲۵۴ء میں پھر قلمدان وزارت اس کے حوالہ کر دیا گیا۔

۱۲۵۵ء میں قتلغ خاں نے بغاوت کی۔ جو اودھ کا حاکم تھا۔ بلبن نے اس بغاوت کو فرد کیا۔ اور قتلغ خاں سے اطاعت کا وعدہ لے کر دہلی واپس ہوا۔ ۱۲۵۷ء میں مغلوں نے ملک پر حملہ کیا۔ اس دفعہ مغلوں نے دیکھا کہ ان کے مقابلے کے لئے پہلے ہی سے ہندستانی فوج تیار ہے اور سرحد پر باضابطہ چھاؤنیاں قائم ہیں جس میں ایک منتظم فوج رکھی گئی ہے۔ تو وہ بغیر لڑے بھڑے واپس ہوئے۔ اور اسی سال چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے جو اس زمانے میں مغلوں کا سردار تھا دوستی کی خاطر دربار دہلی میں اپنا ایک سفیر روانہ کیا۔

بلبن نے مغلوں کے ارادے کو پہچان کر تمام چھاؤنیوں سے فوج کو دارالخلافہ میں طلب کرکے سلیقہ سے اس طرح جمایا کہ جدھر نظر پڑتی فوج ہی فوج نظر آتی تھی ونیز شاہی جلوس اس تزک و احتشام سے نکالا گیا کہ مال و دولت اور فوج کی کثرت دیکھ کر مغل سفیر دنگ رہ گیا۔

۱۲۶۶ء میں سلطان ناصر الدین محمود کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اور نہ سوائے بلبن کے کوئی امیر اس سلطنت کے لئے اہل تھا۔ اس لئے ۱۲۶۶ء میں الغ خاں نے سلطان غیاث الدین بلبن کے لقب سے تخت دہلی پر جلوس کیا۔ وہ اسی نام سے تاریخ میں زیادہ مشہور ہے۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔

سابق وزیر کے بادشاہ ہوتے ہی تمام اندرونی بدنظمیوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اس نے فوج کی تنظیم نئے سرے سے کی۔ اور لائق اور تجربہ کار لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ اس نے عدل و انصاف کی اتنی سختی سے پابندی کی کہ اس کے دوست و اعزہ تک اپنے تصور کی سزا پانے سے بچ نہ سکے۔

اس کے زمانہ میں محکمہ ڈاک کا بھی قیام عمل میں آیا۔ اس نے یہ محسوس کرکے کہ جو علاقے سلطنت دہلی سے دور دراز واقع ہیں ان کی خبریں دارالخلافہ کو بڑی دیر سے وصول ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی بغاوت ہو جائے تو اس کا بروقت سلطنت دہلی انتظام نہیں کرسکتی۔ اس نے اس خوبی سے انتظام کیا کہ تمام علاقے چاہے قریب ہوں یا بعید اپنی اطلاعیں نہایت سہولت کے ساتھ مرکزی حکومت کو پہنچا سکتے تھے۔ اور اس لئے حکومت ان کی بروقت انسداد کرسکتی تھی۔

حاکم بنگال طغرل خاں نے یہ جان کر کہ سلطان غیاث الدین بلبن ملک کی اصلاحات میں منہمک ہے۔ اور دوری مسافت کی وجہ سے فوج کشی میں دشواری پیش آئے گی، علم بغاوت بلند کردیا اور سنار گاؤں میں اپنی خود مختاری کا اعلان بنام

مغیث الدین کردیا۔

بادشاہ نے پہلے دو سردار اس کی سرکوبی کے لئے بھیجے۔ لیکن دونوں کو بھی شکست ہوئی۔ تو یہ خلجی سردار مطمئن ہوگیا کہ بادشاہ اُدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ مگر بادشاہ یہ عہد کرکے کہ جب تک وہ طغرل خاں کا سر قلم نہ کرے گا چین نہ لے گا۔ خود ایک کثیر فوج کے ساتھ بنگال کا رُخ کیا۔ سفر کی مشکل، مسلسل بارش اور طوفان کی تکالیف سہتا سنار گاؤں پہنچا۔ طغرل خاں نے یہ سن کر راہِ فرار اختیار کی۔ بلبن نے اسے گرفتار کرکے قتل کردیا۔ اور تمام باغیوں کو گرفتار کرکے سولی پر لٹکا دیا۔ اور پند و نصیحت کے بعد اپنے بیٹے بغرا خاں کو یہاں کا حاکم مقرر کرکے واپس ہوا۔ اس طرح اندرون ملک بدامنیوں کا قلع قمع کرکے چین بھی نہ لینے پایا تھا کہ ۱۲۸۵ء میں منگولوں کے حملے کی خبر ملی۔ سندھ اور ملتان پر سلطان بلبن نے اپنے بڑے لڑکے محمد کو حاکم مقرر کیا تھا۔

شہزادہ محمد بھی اپنے باپ کی طرح نہایت شائستہ اخلاق، منتظم و مدبر شہزادہ تھا اس کی علم پروری و بہادری کے افسانے مشہور ہیں۔ چنانچہ اس کے پاس امیر خسرو اور میر حسن جیسے مشہور شعرا رہتے تھے۔ کئی دفعہ منگولوں نے حملہ کرکے شکستیں اٹھائیں لیکن تیمور خاں کی سرکردگی میں انہوں نے تیسری دفعہ نہایت زور و شور سے حملہ کیا۔ اس دفعہ بھی انہیں پسپا ہونا پڑا۔

اسی جنگ میں بوڑھے سلطان پر رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یعنی اس کا نوجوان بیٹا محمد اس جنگ میں کام آیا۔ یہ شہزادہ اپنی حفاظت کا خیال نہ کرکے دور تک اُن کا تعاقب کررہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فوج سے بچھڑ گیا۔ منگولوں نے اسے تن تنہا پاکر مقابلہ کی جرأت کی۔ اور پلٹ پڑے۔ شہزادہ کو بچ نکلنے کا موقع تو حاصل تھا مگر اس کی شجاعت نے اسے لڑنے پر مجبور کیا۔ اور وہ لڑتے ہوئے مارا گیا۔

اس عظیم الشان حادثہ نے ہر کس و ناکس کو خون کے آنسو رُلائے۔ اور ضعیف بلبن کو اپنے جوان بیٹے کی جدائی کا بے حد اثر ہوا۔ وہ دن میں اپنا دبدبہ و شان و شوکت برقرار رکھنے دربار کیا کرتا تھا۔ لیکن رات میں اپنے نوجوان اور بہادر بیٹے کا ماتم کیا کرتا تھا۔ آخر کار اس حادثے نے بلبن کو مرض الموت میں گرفتار کر دیا۔

سلطان بلبن نے یہ دیکھ کر کہ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے گا اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال سے اپنی تیمار داری کیلئے بلوایا۔

بغرا خاں نے یہ دیکھ کر کہ سلطان کی حالت اتنی نازک نہیں جتنی کہ سمجھتا تھا۔ شکار کے بہانہ سے بنگال واپس ہوا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ بغرا خاں کی واپسی کی یہ وجہ ہوئی کہ بغرا خاں اپنے کو شاہی جھمیلوں اور سلطنت کی الجھنوں سے دور رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے بادشاہ سے بہانہ کرکے بنگال کی راہ لی۔ اس سے اسّی سال کے بوڑھے سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے بستر مرگ پر شہزادہ محمد کے

بیٹے خسرو کو اپنا جانشین بنانے کی وصیت کرکے دنیا سے ۱۲۸۶ء میں راہی ملکِ عدم ہوا۔

یہ ایک وفادار، محنتی، جفاکش، عدل پسند، بہادر، ایمان دار اور منتظم بادشاہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سخت گیر ضرور تھا مگر اس کی سختی اور ناصر الدین محمود کی نرمی دونوں نے ملکِ سلطنت کے انتظامات کو مستحکم بنانے میں بہت مدد دی۔ باغیوں اور سازشیوں سے بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ باغیوں کو سزا دینے میں بلبن نے سختی اس لئے روا رکھی کہ دوسروں کو بغاوت کی جرأت نہ ہو۔

اس نے جس طریقہ سے ہندوستان کو مغلوں کے حملوں اور دوسری آفات سے بچایا اور ملک میں امن وامان قایم کیا وہ تاریخ ہند میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سید محمد علی باقری

شہری زندگی

شہری زندگی شہریوں کے لئے آرام دہ ہے۔ اور دیہاتی زندگی دیہاتیوں کے لئے باعثِ سکون لیکن شہروں میں جو سہولتیں ایک انسان کو میسر ہیں وہ دیہاتیوں کو نصیب نہیں۔ شہری زندگی میں انسان کے لئے تجربوں کا ایک بڑی کتاب کھلی ہوئی ہے۔ ایک شہری کے لئے جو سہولتیں مہیا ہیں ان کا یہاں ہم مختصراً جائزہ لیں گے

(۱) شہری زندگی میں انسان کو متمدن، تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ اشخاص سے سابقہ پڑتا ہے علماء اور صاحبانِ بصیرت کی صحبت میسر آسکتی ہے۔ مختلف ممالک کے علماء وہاں آتے ہیں۔ اور ان کی تقاریر وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان بہت سی عقل کی باتیں سیکھ سکتا اور خود کو ایک روشن خیال آدمی بنا سکتا ہے۔

(۲) تعلیم حاصل کرنے کے کافی ذرائع مہیا رہتے ہیں۔ ہر علم و فن کی تعلیم زمانے کی رفتار کے ساتھ دی جاتی ہے۔

(۳) ہر انسان کے ساتھ دکھ بیماری لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے بڑے بڑے دواخانے ہوتے ہیں۔ اور ایک سے ایک ماہرِ فن ڈاکٹر اور حکیم کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(۴) رہنے کے لئے ہوادار بڑے بڑے مکانات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جہاں انسان اپنی صحت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

(۵) دولت پیدا کرنے کے کافی ذرائع موجود رہتے ہیں۔ ایک لائق اور محنتی شخص کے لئے گویا

خزانے کا منھ کھلا رہتا ہے۔

(۹) روزآنہ کئی ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی زندگیاں زمانے کی رفتار کے ساتھ بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اور ایک سمجھ دار انسان کے لئے ان واقعات کو دیکھ کر سبق لینے کے بہت سے مواقع رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے دیہاتی زندگی میں یہ سہولتیں اور آرام میسر نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ دیہات کی آب و ہوا بمقابل شہر کی آب و ہوا کے پاک و صاف ہوتی ہے۔

لیکن شہریوں کی بہ نسبت دیہاتی زندگی میں بڑی مصیبتیں ہیں۔ وقت پر علاج کے لئے حکیم یا وید قابلِ اطمینان نہیں ملتے جو حکیم یا وید گاؤں میں رہتے ہیں اُن کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے وہ بڑے لالچی ہوتے ہیں۔ بعض قبرستان آباد کرنے کا ٹھیکا لیتے ہیں۔ سخت افسوس ہوتا ہے کہ دیہاتی عورتوں مردوں اور بچوں کی تکالیف کا کوئی معقول اور تسلی بخش علاج نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص تحقیقات کرے تو یہ ضرور ثابت ہو جائے گا کہ دیہات میں شرح اموات شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ دیہاتیوں کی زندگی خود ایسی ہوتی ہے کہ ان کو موت کا شکار بنا دیتی ہے۔

میرے خیال میں شہری زندگی ان امور کے مدنظر دیہاتی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔

رفعت اللہ بیگ

لاسلکی کا موجد

لاسلکی کی ایجاد کا سہرا مارکونی کے سر ہے۔ یہ دنیا کی وہ عظیم الشان ایجاد ہے جس سے آج ساری دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ لاسلکی بحر و بر میں تعلق قائم رکھنے کا اہم ذریعہ ہے اور ایک ملک کا دوسرے ملک سے ربط قائم رکھتا ہے اور ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے نشر گاہوں کی مختلف تفریحات سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ سب دنیائے سائنس کے انمول موتی مارکونی کی محنت اور دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جس نے اس کو ایک ادنیٰ کھلونے اور تجربہ گاہ کے معمولی انکشاف سے بلند کر کے ایک عظیم الشان ایجاد بنا دیا۔

مارکونی ۱۸۷۴ء میں اٹلی کے ایک قصبہ "بلوگ" میں پیدا ہوا۔ یہ بہت ذہین و ذکی تھا۔ لڑکپن ہی سے اس کے مزاج میں تلاش و تجسس کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جب مارکونی کی عمر ۱۴ برس کی ہوئی تو اس کا شوق اختراعات و ایجادات میں بیحد بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اپنی اولین ایجاد کا تجربہ ۱۸۹۵ء میں اس نے خود اپنے گھر پر ہی کیا تھا۔ اس نے اپنے مکان میں ۳۰ فٹ کے فاصلہ پر ایک گھنٹی نصب کی اور اپنی والدہ کو بتایا کہ گھنٹی محض شعاعوں کی مدد سے بجتی ہے۔ یہی لاسلکی کا پہلا زینہ تھا جو آج کل آپ کے سامنے

ریڈیو کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کے بعد اس نے اس گھنٹی کو ایک میل کے فاصلہ پر سے بجوایا اور پھر انگلستان گیا جہاں وہ اس کو ۹ میل کے فاصلے سے بجوانے میں کامیاب ہوگیا۔ جب اس نے اپنے اس تجربہ کی بناء پر یہ اعلان کیا کہ وہ بہت جلد بحر اوقیانوس کے پار بغیر سلسلۂ تار برقی کے اپنے پیامات بھیجیگا تو آسمانِ سائنس کے درخشاں ستاروں نے اس کے بیان کو مضحکہ خیز ٹھیرایا اور مارکونی کو فاترالعقل کہا۔ مگر اس نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی اور برابر کوشش کرتا رہا۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں حکومتِ اٹلی نے مارکونی کو اٹلی بلایا اور اس کی نگرانی میں لاسلکی اسٹیشن قائم کیا یہاں مارکونی کو بہت زیادہ کامیابی ہوئی سنہ ۱۹۰۸ء میں دو ہزار میل سنہ ۱۹۱۰ء میں ۶ ہزار میل اور سنہ ۱۹۱۸ء میں انگلستان اور آسٹریا کو خبریں بھیجی جانے لگیں۔

مارکونی کا مطمح نظر یہی تھا کہ اس نے جس چیز کی بنا ڈالی ہے اس کی خاطر اپنے آپ کو وقف کردے اور ہمیشہ اس کی جستجو میں لگا رہے۔ چنانچہ وہ اپنے عزمِ راسخ اور سعیٔ پیہم کی بدولت اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں اس نے نوبل پرائز حاصل کیا۔ اس کے بعد اس کی عزت و وقعت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی اور ہر طرف سے آفرین و تحسین کی صدائیں آنے لگیں۔ اور اب ہر شخص کی زبان پر اسی مارکونی کا نام تھا۔ جس کے اس اظہارِ خیال پر کہ وہ دنیا کے ممالک کا لاسلکی کے ذریعہ ربط پیدا کردیگا۔ بڑے بڑے محققین اور سائنس دانوں نے اس کو دیوانہ اور پاگل ٹھیرایا تھا۔

لاسلکی کے موجد اعظم مارکونی نے دنیا کے لئے سہولتوں اور آسائشوں کے دروازے کھول دینے کے بعد ۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کو شہر روم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ بلاشبہ یہ مارکونی ہی تھا جس نے لاسلکی کے غیر محدود فوائد و امکانات پر غور کرکے رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گیا۔

محمد عبدالقادر فاروقی

صحبت

دنیاوی زندگی میں کسی شخص کے اخلاقی، تہذیبی یا معاشرتی درجات کو دیکھنا یا جانچنا منظور ہو تو اس کی صحبتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات کہلانے کے باوجود بُری صحبتوں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، بلکہ اپنی صحبت کے مطابق کام کرتا یا زندگی بسر کرتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص نہایت ہی شریف اور متمدن ہو اور اتفاق یا بدقسمتی سے اس کو چوروں اور ڈاکوؤں کی صحبت میں رہنا پڑے تو فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ ضرور چوری کرے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم یہ کہتے کہ انسان اپنی شرافت کو کام میں لاتا اور بُری صحبت کے رہنے کے باوجود اچھے کام کرسکتا ہے۔

ہر انسان کسی نہ کسی کی صحبت میں رہنے اور زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے کیونکہ بغیر صحبت یا ماحول کے کوئی شخص بھی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس لئے ہر فردِ بشر کو چاہیے کہ وہ اپنے لئے اچھی سے اچھی صحبت کو پسند کرے یعنی مہذب، شریف اور تجربہ کار شخصیتوں کی صحبت کو اختیار کرے، تاکہ اس کی آئندہ زندگی آرام وچین سے گزرے۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

سیّد علی نقی نقوی

آداب

چلنے میں جلدی نہ کرو کہ کم عقلی کی علامت ہے۔ اور نہ زیادہ دیر ہی کرو کہ علامت کسل ہے۔ متکبروں کی طرح خراماں نہ چلو۔ اور نہ عورتوں اور مخنثوں کی طرح اتراؤ۔ آگے پیچھے بہت نہ دیکھو۔ ہمیشہ آگے کو سر نہ جھکائے رکھو کہ غلبۂ فکر کی علامت ہے۔ سواری میں بھی اعتدال نگاہ رکھو۔ پاؤں لمبے کرکے نہ بیٹھو۔ بادشاہ استاد یا ماں باپ کے سوا کسی کے سامنے دو زانو نہ بیٹھو۔ سر کو زانو اور ہاتھوں پر نہ رکھو کہ علامت حزن وفکر ہے۔ گردن ٹیڑھی نہ کرو۔ حرکاتِ عبث سے احتراز کرو۔ ناک اور منہ میں انگلی نہ ڈالو۔ انگلی کے جوڑوں سے آواز نہ نکالو۔ جمائی اور انگڑائی سے احتراز کرو۔ آب دہن اور آب بینی اس طرح پھینکو کہ حاضرین سے کوئی اس کو دیکھے نہ اس کی آواز ہی سنے اور قبلہ کی طرف پھینکنے سے محترز رہو۔ اور ہاتھ یا آستین یا دامن سے نہ پونچھو۔ جب کسی مجلس میں جاؤ تو اپنی جگہ سے نیچے یا اُس سے اوپر نہ بیٹھو اگر غلطی سے اپنی جگہ پر نہ بیٹھو تو واقف ہونے کے بعد اپنی جگہ پر واپس آجاؤ۔ حرم وخدم کے سوا کسی کے سامنے اپنے ہاتھوں اور چہرے کے سوا بدن کا

کوئی حصہ ظاہر نہ کرو۔ ناف سے لیکر زانو تک جو حصہ ہے اس کا قضائے حاجت یا غسل یا اور کسی ضرورت کے سوا برہنہ کرنا حرام ہے۔ لوگوں کے سامنے سونے سے احتراز کرو۔ چت لیٹ کر سونے سے بھی اجتناب کرو خصوصاً جب خرّاٹے مارتے ہو اگر کسی مجلس میں خواب غلبہ کرے تو وہاں سے اگر ممکن ہو تو اُٹھ آؤ ورنہ کسی خیال سے نیند کو دفع کرو اگر تمام لوگ سونے لگیں تو تم بھی اِن کی موافقت کرو۔ یا وہاں سے چلے جاؤ خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح رہو سہو کہ لوگوں کو تم سے نفرت اور زحمت نہ ہو۔

(ترجمہ) سیّد سلطان محی الدین قادری

بارش کا دن[۱]

دن سرد ہے ابر گھر کے آیا ————— برسات کا بندھ گیا ہے تانتا
اٹھتی ہیں گھٹائیں کالی کالی ————— چلتی ہیں ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی
انگور کی بیل چڑھ رہی ہے ————— بوسیدہ کھنڈر پہ بڑھ رہی ہے
جھونکوں سے ہوا کے زرد پتے ————— شاخوں سے ہیں کھڑکھڑا کے گرتے

دن سرد ہے ابر گھر کے آیا
برسات کا بندھ گیا ہے تانتا

ہے میری حیات کا یہی حال ————— تاریکیٔ غم کا بچھ گیا جال
اور یاس کے سرد سرد جھونکے ————— ہر سانس کے ساتھ ہیں وہ چلتے
ماضی کا خیال آرہا ہے ————— بچپن کا زمانہ جارہا ہے
سودائے مآل ہے جو سر میں ————— ماضی کی بہار ہے نظر میں

دن سرد ہے ابر گھر کے آیا
برسات کا بندھ گیا ہے تانتا

اے دل تو کیوں دھڑک رہا ہے ————— ہر سانس پہ کیوں جھجک رہا ہے
مایوس نہ ہو اُدھر نظر کر ————— تاریک و خنک گھٹا کے اوپر
خورشید فلک پہ ہے نمودار ————— ہے جس کی جلو میں روح انوار
تاریک فضائے یاس تیری ————— چھٹ جائے گی ایک دن وہ یوں ہی

تقدیر سبھی کی ہے مقدّر
ہے ساتھ خوشی کے غم مقرر

احمد محی الدین رؤف

۱؎ یہ نظم لانگ فیلو کی نظم (Rainy Day) سے ماخوذ

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۔ ۸۸۳۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۹)
ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۳ بابت ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء شمارہ ۹

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اداریہ

ادارۂ ادبیات اردو نے جو اردو امتحانات قائم کئے ہیں وہ مقررہ تاریخوں میں پانچ مردانہ اور تین زنانہ مرکزوں میں لئے گئے۔ ہر مرکز کے لئے ادارہ کی طرف سے ایک ایک صدر نگرانکار صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہر مرکز میں باضابطگی، اوقات کی پابندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ یہ اہم کام تکمیل کو پہونچا۔

شہر حیدرآباد میں مردوں کے لئے سٹی کالج اور خواتین کے لئے زنانہ ہائی اسکول نامپلی امتحانات کے مرکز تھے۔ اول الذکر میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری معتمد مجلس اردو امتحانات اور موخرالذکر میں محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسوان نے صدر نگرانکار کے فرائض انجام دیئے۔ گلبرگہ میں عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج میں امتحان لیا گیا چنانچہ پروفیسر سید محمد صاحب معتمد شعبہ شعرا و مصنفین دکن گلبرگہ کو پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی معتمد شعبہ تاریخ دکن اور عبدالحفیظ صاحب صدیقی مدیر سب رس معلومات کلیانی کو، مولوی فیض محمد صاحب پربھنی کو اور مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی کنشگی کو بہ حیثیت صدر نگران کار بلدہ سے تشریف لے گئے۔ اور اضلاع کے نسوانی مرکزوں کا انتظام وہیں کی خواتین کے ذریعہ سے کرایا گیا۔ ان سب اصحاب نے اپنے اپنے مرکزوں کی تفصیلی روداویں مرتب کرکے روانہ کی ہیں جو سب رس کے آئندہ شمارے میں امتحانات کے نتائج کے ساتھ شایع کی جائیں گی۔ اضلاع میں ادارہ کے امتحان بہت مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر جگہ متعدد لوگوں نے عدم واقفیت کی بنا پر ان امتحانات میں شریک نہ ہو سکنے پر تاسف کا اظہار کیا اور آئندہ امتحان میں نہ صرف اپنی بلکہ قرب وجوار سے بھی امیدواروں کی شرکت کی توقع ظاہر کی۔ اضلاع کے مرکزوں میں متعدد اصحاب نے مذکورہ بالا صدر نگران کار صاحبان کا بڑی خوشی سے ہاتھ بٹایا اور انتظامات کے کام کے علاوہ ان کی خاطر تواضع اور مہمان داری میں بھی فیاضی دکھائی۔ ادارہ کی سرگرمیوں کے متعلق بھی ہر جگہ کئی اصحاب نے معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا چنانچہ ان کی خواہش پر تقریروں اور گفتگو کے ذریعہ سے ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد وطرز کار کی وضاحت کی گئی جس کی بنا پر ادارہ کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ مسرت کا مقام ہے کہ اضلاع میں لوگوں کو اردو زبان اور ادب سے خاص دلچسپی ہے اور اس کی ترقی اور توسیع کے لئے ہر شخص مستعد نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید معلومات آئندہ شمارے میں درج کئے جائیں گے۔ جس کو صحیح معنوں میں **"اردو امتحانات نمبر"** سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ زیر نظر شمارہ مکمل ہو چکا تھا جب کہ اضلاع کے مرکزوں کے صدر نگران کار صاحبان نے بلدہ واپس ہو کر اپنی تفصیلی رپورٹیں ادارہ کے دفتر میں روانہ کیں۔ ان روداوں میں ان سب اصحاب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے جنھوں نے اس مفید کام میں ادارے کے نمائندوں کی رضاکارانہ طور پر امداد کی۔ امتحانوں میں اول آنے والوں کو انعامات عطا کرنے کے بارے میں گزشتہ شمارے میں جو تذکرہ کیا گیا تھا اس کے سلسلے میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ کنشگی کے مرکز سے اردو دانی کے امتحان میں اول آنے والے امیدوار کو مسٹر رستم جی مناجر نے ایک تمغہ دینے کے لئے مبلغ پانچ روپے

روانہ فرمائے اور ادارہ کے مدرسہ تعلیم بالغات سے اول آنے والی امیدوارہ کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ایک انعام عطا فرمائیں گی۔

ادارۂ ادبیات اردو کی روز افزوں سرگرمیوں اور کتب خانہ میں کتب و رسائل کے اضافہ کی وجہ سے موجودہ عمارت ناکافی ہوتی جا رہی ہے اور اس کے لئے ایک شایان شان عمارت کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اس مہینے بھی ادارہ کے علمی ذخیرے میں بڑا اچھا اضافہ ہوا متعدد نادر کتابیں خریدی گئیں اور اس کے علاوہ پروفیسر سید محمد صاحب نے گلدستۂ جوہر، سیلاب دکن، طفل اشک، جذبات توفیق، دیوان عمر، سوانحعمری امام جنگ، مجلس ہفت ملوک، لیلیٰ مجنوں اردو قلمی، رسالہ مالگزاری نمبر ۵ و ۶، کتابیں اور خواجہ نصیر الدین صاحب لکچرار گلبرگہ کالج نے اپنی کتاب "اکبر" کے دو سو نسخے اور دہ مجلس کا ایک قلمی نسخہ ادارہ کو بطور تحفہ عنایت کیا ادارہ نے تصفیہ کیا ہے کہ ان کی کتاب کی فروخت سے جو رقم وصول ہوگی اس سے شاخ گلبرگہ کے دار المطالعے کے لئے ضروری کتب خرید کر روانہ کی جائیں۔

ادارہ

سب رس کتاب گھر کی بعض کتابیں

۱۔ قطب نامہ مجلد از غواصی ۱۲/
۲۔ پھول بن از ابن نشاطی ۱۲/
۳۔ قصۂ بے نظیر مجلد از عزلتی ۴/
۴۔ کلام الملوک مجلد سلاطین دکن کا فارسی کلام ۱۲/
۵۔ سیف الملوک و بدیع الجمال مجلد از غواصی
۶۔ جدید اردو شاعری از پروفیسر عبد القادر سروری
۷۔ تنقیدی مقالات مجلد از ڈاکٹر زور ۴/
۸۔ یورپ کے تاثرات از بدر شکیب
۹۔ نظر کے دھوکے از بدر شکیب
۱۰۔ محبت کا فسانہ مجلد از ل۔ احمد
۱۱۔ ادب اور زندگی از مجنوں گورکھپوری
۱۲۔ آغاز ہستی از مجنوں گورکھپوری ۱۵/
۱۳۔ میری جد و جہد مجلد
۱۴۔ ضمیر از عبد الرحمن خاں سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ ۱۲/
۱۵۔ تنوطیت از ڈاکٹر ولی الدین
۱۶۔ اکبر اعظم از خواجہ نصیر الدین لکچرار گلبرگہ کالج
۱۷۔ ارباب نثر اردو از پروفیسر سید محمد
۱۸۔ اردو شہ پارے مجلد از ڈاکٹر زور ۴/
۱۹۔ زہری بیگم از طیبہ بیگم مرحومہ
۲۰۔ دھوئیں کی پھانسی ۱۰/
۲۱۔ جنون و حکمت ۱۲/
۲۲۔ کسان ۲/
۲۳۔ ستمبر کا ۴/
۲۴۔ مجوزہ بکا القصاحت ۴/

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں مرحوم اردو کے اُن چند شاعروں میں سے تھے جنھوں نے اپنے قلب و دماغ کی غیر معمولی قوتوں کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ان سے پہلے محمد قلی قطب شاہ، ولی اورنگ آبادی، مظہر جان جاناں، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب، محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کو یہ شرف حاصل ہو چکا تھا اور ان کے ہم عصروں میں صرف اقبال اور جوش کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن اقبال اور جوش دونوں کو زمانہ نے اتنا موقع دیا کہ وہ اپنی کوششوں کو دیر تک جاری رکھ سکے اور جوان کے سامنے ہی بار آور ہوئیں۔ لیکن عظمت کی شاعری کا نیر اقبال پوری طرح طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ موت کے سیاہ بادلوں نے اس کو اپنے اندر چھپالیا۔ تاہم مختصر سے عرصہ میں عظمت مرحوم نے شعر و سخن کی جو کچھ بجلیاں چمکائیں وہ قدیم طرز سخن کی متوالی آنکھوں کو خیرہ کئے بغیر نہ رہیں۔

عظمت اللہ خاں ایک حساس اور درد مند شاعر اور صاحب ذوق ادیب ہونے کے علاوہ ایک اچھے مفکر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بھی تھے۔ اس لحاظ سے اردو شعراء میں صرف علامہ اقبال مرحوم کو اُن پر فضیلت دی جاسکتی ہے۔ ورنہ قلب و دماغ کی اتنی وافر قوتیں اردو کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔

تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات کی کتابوں کا مطالعہ اور درس و تدریس عظمت مرحوم کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ انگریزی ادب اور اردو ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ اس موضوع سے متعلق ان کے مضامین اعلیٰ پایہ اور معیاری تنقید نگاری کے بہترین نمونے سمجھے جاسکتے ہیں۔

اسلوب تحریر کے علاوہ ان کا طرز گفتگو بھی اتنا دلکش تھا کہ اہلِ ذوق ان کی صحبت سے کبھی سیر نہ ہونے پاتے تھے۔ دفتر ہو یا گھر، ہر جگہ صاحبانِ فضل و کمال اور طلبہ ان کو گھیرے رہتے تھے۔ وہ اگرچہ کسی کالج کے پروفیسر نہ تھے لیکن کالجوں کے اکثر طلبہ ان سے خانگی طور پر مستفید ہوتے رہتے۔ [illegible] اور محنتی طالب علموں کی بڑی قدر افزائی [illegible] تھے۔

حسنِ اتفاق ہے کہ مجھے ان کے شریفانہ کردار کے مطالعہ کا [illegible] اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ان کے جیسے عالم درست بہت کم دیکھے ہیں۔ اعلیٰ قابلیت، ذاتی وجاہت اور عہدہ دارانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق اور سچی ہمدردی خلق ان میں نظر آتی [illegible] میں دکھائی نہ دی۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ دلی سے نکل کر انھوں نے حیدرآباد کو اپنا سچا وطن بنالیا تھا۔ وہ اُن عہدہ داروں میں سے نہ تھے جو حیدرآباد صرف کمانے کے لئے آتے ہیں۔ اور اہل حیدرآباد کی طبعی مروت اور انتہائی سادگی سے بے جا فائدہ اٹھانے کے باوجود ان کو کسی کام کا اہل نہیں سمجھتے اور اپنے دماغ سے اپنی برتری کا احساس کبھی دور نہیں ہونے دیتے۔

عظمت اللہ خاں مرحوم کی درد مند طبیعت ان کی اکثر نظموں میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہندستانی عورت کو جو مظلومیت کا مجسمہ اور مرد کی ستم رانیوں کا اکثر شکار رہتی ہے اپنی شاعری کا اہم ترین موضوع بنایا۔ اور اس

موضوع پر جو نظمیں لکھیں ان میں ایسی پتے پتے کی باتیں بتا گئے ہیں جن کی طرف ان سے پہلے کسی اردو شاعر نے توجہ نہ کی تھی۔ ہماری سماج کا یہ سب سے بڑا عیب ہے کہ مرد کی تمام تباہ کاریاں تو معاف کردی جاتی ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر خرابی عورت کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ نقطۂ نگاہ کی یہی وہ غلطی ہے جس کی وجہ سے ہمارے اخلاق و عادات کو گھن سا لگتا جارہا ہے۔ ہر نوجوان لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح کسی شریف لڑکی کو اپنے جذبات کی بھینٹ چڑھائے۔ اور اس مقصد کی خاطر وہ ایسے ایسے فریب اور اتنی ریاکاری سے کام لیتا ہے کہ ناتجربہ کار لڑکیاں دھوکے میں آجاتی ہیں اور اس کے مصنوعی اظہار محبت پر یقین کرلیتی ہیں۔ ہر وہ نوجوان مرد قابل معافی سمجھا جاتا ہے جو شریف پردہ نشین لڑکیوں کو اپنی تاک جھانک کے ذریعہ سے یا دنیا بھر کے بدنما طریقے استعمال کرکے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ لڑکی فوراً بے حیا اور بدتمیز اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے دی جاتی ہے جس سے اگر کبھی سہواً بھی ایسی حرکت کیوں نہ سرزد ہوئی ہو۔ غرض عظمت مرحوم نے اس موضوع پر بجائے اخلاقی اور ناصحانہ انداز میں خیال آرائی کرنے کے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جو بہت موثر ہے۔ ان کی ایک نظم جس کے یہ ابتدائی دو بند ہیں، بڑے بڑے واعظوں اور مصلحوں کی خطیبانہ تقریروں سے زیادہ اثر رکھتی ہے ؎

نہ بھلے کی تھی نہ برے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمہیں عشق کا ہی جو دھیان تھا تمہیں میری جاں اگر نہ تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے

بہت اپنی چاہ جتا جتا مرے دل کو موہ کے لے لیا
مرے واسطے یہ بہشت تھی تمہیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے

اسی طرح اور چار نظمیں یعنی

(۱) وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے۔
(۲) مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا۔
(۳) دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگائیے۔
(۴) تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

اسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور اردو شاعری کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی زبان کی شیرینی، تخیل کی بلندی، اسلوب کی گھلاوٹ اور مضامین کی حلاوت ایسی نہیں کہ کوئی ان کو ایک بار پڑھے اور بار بار نہ پڑھنا چاہے۔ اگر عظمت مرحوم ان مذکورہ پانچ نظموں کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو بھی ان کا شمار اردو کے ان مخصوص شاعروں کی صف اول میں ہوتا جنھوں نے فطرت کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ صرف یہی پانچ نظمیں اردو کے ایسے سیکڑوں شاعروں کے ضخیم سے ضخیم دیوانوں پر بھی بھاری ہیں جنھوں نے شاعری محض قافیہ پیمائی کی خاطر کی اور جن کی غزلوں نے قوم کے نوجوانوں کے کثیف جذبات کو ابھارنے کے سوائے اور کوئی اچھا کام انجام نہیں دیا۔

ان پانچ نظموں کے علاوہ برکھارت کا پہلا مینہ، وطن، موہنی مورت موہنے والی، پیارا پیارا گھر اپنا وغیرہ ایسی پاکیزہ نظمیں ہیں جو عظمت جیسے نازک خیال شاعر ہی کے قلم سے نکل سکتی تھیں۔ ان میں خیالات اور جذبات کے اظہار میں جو کاوش کی گئی ہے حد درجہ قابل داد ہے۔ انوکھی تشبیہوں کے

استعمال میں تو ان کو بڑا کمال حاصل تھا اور ساتھ ہی لفظوں اور ترکیبوں کو وہ اس خوبی سے مصرعوں میں بٹھاتے تھے کہ ان کی نظموں کا ہر بول سریلا معلوم ہوتا ہے۔

ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت اس کا سریلا پن ہے۔ وہ ہندی عروض سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انھوں نے اس نقطۂ نظر سے شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شاعری کے عنوان سے ان کا جو مضمون اس مجموعہ میں شریک کیا جا رہا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ فن عروض میں انھوں نے ایک اجتہادی شان حاصل کر لی تھی۔ اس موضوع سے متعلق ان کے خیالات اور نتائج پر کسی اور موقع پر بحث کی جائے گی۔ اس وقت صرف اس واقعہ کا اظہار کافی ہے کہ امیر خسرو کے بعد اگر کسی اردو شاعر نے عروض میں غیر معمولی جدتیں پیدا کیں تو وہ عظمت ہی تھے۔ ان کی بعض نظموں کی بحریں اور شکلیں اردو کے لئے نئی ہیں۔ انھوں نے نئے نئے ترکیب بند اختیار کئے۔ اور اپنی شاعری کو مطالب و معانی اور ترتیب و اسلوب دونوں کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک بالکل نئی سوغات بنا کر پیش کیا۔

اردو میں ہندی لفظوں اور بحروں کا استعمال عظمت ہی کی شاعری کی وجہ سے مقبول ہوا۔ ان سے پہلے اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے بھی اس طرف کچھ توجہ کی تھی لیکن ان کے کلام کے سوقیانہ حصے نے ان کی اس خوبی کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ لیکن عظمت نے اپنی پاکیزہ نظموں کے ذریعہ سے اس خصوصیت کو اس خوبی سے چمکایا کہ آج کئی اردو شاعر مثلاً۔ جوش، حفیظ، ساغر اور حامد اللہ افسر وغیرہ انہی کے رنگ میں لکھ کر مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں نے ایک ایسی شاہراہ بنا دی جس پر اب آسانی سے ہر شاعر گامزن ہو سکتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کی نظمیں جب پہلی دفعہ منظر عام پر آنے لگیں تو نوجوانوں کے علاوہ بعض پختہ مشق شاعروں پر بھی ان کا اثر پڑنے لگا۔ چنانچہ سلیم اور جوش سب سے پہلے ان سے متاثر ہوئے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ سلیم نے جو آخر عمر میں پھر شاعری کی طرف توجہ کی اس کے اسباب میں سے ایک اہم وجہ عظمت اللہ خاں کی انہی ولولہ انگیز نظموں کی اشاعت تھی، جن کو پڑھ کر اس بوڑھے ادیب میں پھر سے جوانی کی ترنگیں موجزن ہو گئیں۔ حالانکہ سلیم نے سالہا سال سے شعر و سخن کا مشغلہ ترک کر دیا تھا۔

افسوس ہے کہ یہ رباب اس قدر جلد ٹوٹ گیا۔ لیکن اس سے جو نغمے پیدا ہوئے وہ دیر تک باقی رہیں گے۔ اور نئے نئے نغموں کی تخلیق کا باعث ہوں گے۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا عظمت مرحوم کی شاعری کی صحیح عظمت بے نقاب ہوتی جائے گی۔ اور خاص کر عہد حاضر میں اردو اور ہندی کو ملا کر ایک ہندستانی زبان بنانے کی جو کوشش کی جا رہی ہیں، وہ اگر کامیاب ہو گئیں تو عظمت کا کلام اس "ہندستانی" کا قدیم ترین نمونہ سمجھا جائے گا، اور وہ اس قومی زبان کے اولین شاعر مانے جائیں گے۔ یوں تو اب بھی ان کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کو اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو اردو ہے، اور ناگری میں لکھا جائے تو ہندی۔ کیا تعجب ہے کہ ہندی ساہتیہ سمیلن جو آج قدیم دکنی شاعروں کے کلام کو ہندی رسم الخط میں چھاپ کر اپنے ادبی خزانہ میں اضافہ

کر رہی ہے، کل عظمت مرحوم کے کلام کو بھی چھپوالے۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ کلام ناگری رسم الخط میں منتقل ہونے کے بعد خود ہندی شاعری کو بھی مالا مال کر دے گا۔

(مقدمہ مجموعۂ کلام عظمت مرحوم)

سید محی الدین قادری زورؔ

ایک رخصتی شام

(بلیا میں کہی گئی)

رُخِ شام بے طرح سنولا رہا ہے — تجلی میں ظلمت کا دور آ رہا ہے
شفق میں گھلی جا رہی ہے سیاہی — دھواں سا بیاباں پہ منڈلا رہا ہے
یہ محسوس ہوتا ہے ویران گردوں — زمیں کی طرف کو جھکا جا رہا ہے
برستا ہے شاخوں سے کاجل ہی کاجل — جو سایہ ہے گہرا ہوا جا رہا ہے
دکھائی نہیں دے رہی عمر گھٹتی — مگر وقت بڑھتا نظر آ رہا ہے
فسوں ایسا پھونکا ہے افسردگی نے — چراغِ بشاشت بجھا جا رہا ہے
خبر دے رہے ہیں تنک تاب ذرّے — ستاروں کے ہنسنے کا وقت آ رہا ہے
ہر اک شے کو کالا کفن دے کے گردوں — اندھیرے کے گنبد میں دفنا رہا ہے
بھنچی جاتی ہیں ظلمتوں سے ضیائیں — فضاؤں کا دل ڈوبتا جا رہا ہے
تجلّی کی رہتی یہ موجیں بجھاتا — اندھیرے کا دریا چڑھا جا رہا ہے
سفر سے تھکی نہر کے آئینے میں — درختوں کا فوٹو لیا جا رہا ہے
ہے جھونکوں کی رفتار سے صاف ظاہر — ہواؤں کو دھندلا نظر آ رہا ہے
یہ سیلی ہوئی جھاڑیوں میں ہیں جھینگر — کہ جنگل کوئی راگنی گا رہا ہے
ہے ڈوبا ہوا سوچ میں ذرّہ ذرّہ — سمجھ میں مگر کچھ نہیں آ رہا ہے

احسان دانش

محمد حسین آزاد اور آب حیات

اردو کے اس مایۂ ناز ادیب کی ولادت ۱۰ ذی حجہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۳۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش "ظہور اقبال" سے نکلتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد کے آبا و اجداد شاہ عالم کے زمانہ میں ہمدان (ایران) سے براہ کشمیر ہندوستان آئے۔ اور خاک ہند ایسی دامنگیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ آبا و اجداد کا پیشہ اجتہاد تھا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے بہت سے مجتہد اس خاندان میں پیدا ہوئے۔

آزاد مولوی محمد باقر مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ جو خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کے دلی دوست تھے۔ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلا اردو اخبار نکالنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں انھوں نے نکالا۔ اس کا ذکر آزاد نے آب حیات کے صفحہ ۲۲ پر کیا ہے۔ اس کا نام "اردو اخبار" ہفتہ وار تھا۔ اس کی اب کوئی کاپی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ غدر میں ضبط ہو گیا تھا۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر مرحوم کو محض اس الزام پر شہید کر دیا گیا کہ انھوں نے مسٹر ٹیلر کو بجائے اپنے ہاں پناہ دینے کے باغیوں کے حوالہ کر دیا۔ آزاد مغلوں کے معزز خاندان کی ایک بے مثل یادگار تھے۔ ان کی والدہ ایرانی النسل تھیں۔

اولاد۔ آغا محمد طاہر صاحب فلسفۂ الہیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ آزاد مرحوم کے ہاں ۱۵-۱۶ بچے پیدا ہوئے اکثر بڑھے۔ جوان ہوئے۔ پروان چڑھے مگر قریب قریب سب آنکھوں کے سامنے خاک کا پیوند ہو گئے۔ لیکن ان میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی رہ گئے تھے۔ لڑکے کا نام انھوں نے محمد ابراہیم رکھا تھا۔ یہ غالباً ذوق سے انتہائی محبت کا نتیجہ تھا۔ محمد ابراہیم پنجاب میں منصفی کے عہدہ پر مامور تھے۔ باپ کے دس سال بعد ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔ کثیر الاولاد تھے۔

آزاد کو ان بچوں سے انتہا درجہ محبت تھی۔ اپنی اکلوتی لڑکی سے تو آزاد مرحوم کو گویا عشق تھا۔ انہوں نے ان کو بڑے شوق سے عربی فارسی کی تعلیم دی تھی۔ وہ نوشت و خواند میں ان کا دست و بازو تھیں۔ ایک روایت کے بموجب "نصیحت کا کرن پھول" انھیں مرحومہ کی تصنیف ہے۔ ان کی شادی ریاست پٹیالہ کے خلیفہ نامہ ایک مشہور و معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ اس ہونہار لڑکی کا انتقال عین عالم شباب میں ہو گیا جس کا انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ جنون کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ جس کے مرنے پر انھوں نے یہ الفاظ کہے تھے۔

"میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا۔"

آغا محمد ابراہیم کے بچوں میں سے اکثر کا انتقال عالم شباب میں ہو گیا۔ ان میں سے اب یہ باقی ہیں۔ آغا محمد طاہر، آغا محمد باقر ایم اے۔ آغا محمد اشرف ایم اے۔ آخر الذکر اس وقت کیمبرج میں اردو کے لکچرار ہیں۔

آزاد بلا کے ہنس مکھ اور زندہ دل تھے۔ نگاہوں سے متانت رعب اور نور کی بارش ہوتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے ان کے ضمیر کا خلاصہ معلوم ہو جاتا تھا۔ زبان میں وہ جادو، باتوں میں وہ سحر اور مٹھاس۔

انداز بیان میں ایسی شگفتگی وگیرائی کہ صحبت میں کوئی تھوڑی دیر بیٹھے تو اس پر ایک محویت طاری ہوجائے۔ بذلہ سنجی ذکاوت وذہانت میں آپ اپنا جواب تھے۔ طبیعت کی شگفتگی نے انھیں ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کی تقریر کا جادو سننے والوں کے قلوب کو موہ لیتا تھا۔ ان کی تحریر میں جو کشش ہے اس میں ان کی تقریر کا عکس صاف طور پر نمایاں ہے۔ اسی ترنم و شعریت کا یہ ایک خوش گوار پرتو ہے۔ طبیعت میں انتہائی غیرت تھی۔ ان کی تصنیفات کی شہرت ومقبولیت ان کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی۔ یہ اپنی تعریف سننا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جو شہرت سے بھاگنا چاہتا اور مقبولیت سے دور دور رہنا چاہتا ہے شہرت ومقبولیت اس کو خود ڈھونڈ نکالتی ہے۔ مشہور ہوجانا کچھ اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ شیکسپیر کہتا ہے بعض لوگ خود بڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پیدا ہوجانا ہی ایک شہرت ہے۔ بعض اپنی خداداد قابلیتوں سے مشہور ہوجاتے ہیں۔ اور بعض مفت کے بڑے بن جاتے ہیں۔ لیکن آزاد کی شہرت ان کی ذہنی کاوشوں کا ایک درخشاں نتیجہ تھی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے بہت گزر گیا ہے کہ تعریف سن کر مجھے غصہ آتا ہے۔"

آزاد مرحوم کی طبیعت انتہا درجہ محنت پسند واقع ہوئی تھی۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس پر ان کے عیش و اطمینان سے بسر کرنے کا دھوکا ہوسکے۔ ساری عمر ملک و قوم کی قلمی خدمت پر کمربستہ رہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کے نقطۂ نظر سے "آزاد زود رنج تھے۔ ان میں رشک وحسد بھی تھا" لیکن جہاں تک میرا خیال ہے جو ذکی الحس ہوتا ہے وہ انتہا درجہ کا ذی حس بھی ہوتا ہے۔ ع

اے روشنئ طبع تو برمن بلا شدی

ان کی طبیعت میں انتہائی نفاست تھی۔ صفائی کے خوگر تھے۔ لباس میں سادگی اور وضع داری ہمیشہ ملحوظ رہتی تھی۔ ان کی انتہائی کسر نفسی اور کسر المزاجی کا ثبوت ان کے ان خطوط سے ملتا ہے جو انھوں نے اپنے شاگردوں کے نام لکھے۔

کھانے میں بھی نفاست و پاکیزگی کو بڑا دخل تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ذائقہ کا بھی بڑا خیال تھا۔ خوش خوراک تھے۔ سبزی ترکاریاں بڑے شوق سے کھاتے۔ پودینہ کی چٹنی ان کے ہر دسترخوان پر رہتی۔ غالب کو آم پسند تھے تو آزاد تربوز بہت شوق سے کھاتے تھے۔ آم بھی انھیں پسند تھے مگر تربوز کے بعد۔ جب ان پر جنون کے آثار ظاہر ہونے لگے تو تربوز کھا کر نمک اور کالی مرچیں بہت کھاتے تھے۔ گوشت کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس وہم میں کہ جانور کی بجائے مجھے آدمی کا گوشت کھلاتے ہیں۔

آزاد کی آزادی:۔ آزاد واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔ چمنستان ادب کے اس سرو آزاد نے ہمیشہ سماج کے نمائشی ڈھکوسلوں سے اپنی زندگی الگ تھلگ بسر کی۔ کسی قسم کی ملکی یا قومی تحریک، انجمن، ایسوسی ایشن کے ممبر نہیں ہوئے۔ نہ کسی درباری مدح سرائی سے اپنے قلم کو آلودہ کیا۔ قومی و ملکی کام ان کی زندگی کی روح رواں تھے۔ ان کے علم وادب کی شہرت، ان کے کارناموں کی مقبولیت محض ان کے ذاتی جوہر اور اصلی معیار کی وجہ سے ہوئی۔ ہمیشہ نمود و نمائش سے پرے ہٹ کر انھوں نے زندگی بسر کی۔ نام نہاد

لیڈری اور نمائشی ممبرشپ کی پیچیدگیوں میں کبھی خود کو انہوں نے نہیں الجھایا۔ ایک خط میں سرسید کو یہ شعر لکھتے ہیں جس سے ان کی غیورئ طبع کا اندازہ لگتا ہے ؎

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے
مگر ہوا نہ گوارا یہ بار سر لیتا

آزاد کا بچپن اور لڑکپن جتنا بے فکری و خوش حالی میں بسر ہوا اتنا ہی جوانی کا زمانہ پہاڑ کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا غدر کے وقت یہ بمشکل ۲۶، ۲۷ برس کے تھے کہ جلا وطنی نے قدم چومے اور یہ چل پڑے۔ دہلی سے لاہور گیا آئے کہ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ پھر تو سفر ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ کلکتہ کسی سرکاری کام پر بھجوائے گئے۔ پھر کابل و بخارا کا سفر کیا۔ دوبارہ پھر ایران کا سفر کیا۔ واپس جب لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ اور مر کے ہی اٹھے۔

میجر فلر نے انھیں کسی لسانی شبہ کو دور کرنے کی غرض سے بلوایا۔ ملاقات کے بعد ان کی علمیت و قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اردو فارسی عربی کی تعلیم پر ان کا تقرر ہو گیا۔ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھیں ہندوستان میں سب سے پہلی مرتبہ شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے پانچسو روپے سالانہ قلمدان کا خرچ ملتا تھا لیکن یہ انھوں نے نہیں لیا۔ بلکہ اس رقم سے مستحق طالب علموں کو وظیفے دیئے۔ چنانچہ اب تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے بہتر بن ایم اے کو ایک نقرئی "آزاد مڈل" ملتا ہے۔

آزاد کی زندگی ایک مصائب و آلام کا سلسلہ تھی۔ جسمانی و روحانی دونوں اذیتوں سے ان کا دامنِ حیات مالامال تھا۔ بواسیر ایک کہنہ مرض بن کر انھیں لاحق ہو گئی تھی۔ ایران کے سفر میں اونٹ سے گر پڑے تھے۔ پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس بے سر و سامانی میں علاج معالجہ کہاں۔ پسلی تو نیچر کے کرشموں سے جڑ گئی۔ لیکن ایک گرہ جو باقی تھی وہ مدت العمر باقی رہی۔

دیوانگی:۔ ان کی درخشاں زندگی کا نہایت ہی عبرتناک پہلو ہے۔ کبھی کبھی باتیں کرتا۔ تختی کے ذریعہ روحوں کو بلانا۔ غرض آخر عمر میں تو بالکل ہی فاترالعقل ہو گئے تھے۔

پہلے ذوق سے پھر حکیم آغا جان عیش سے تکمیل ادب کی۔ دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ خصوصاً منشی ذکاء اللہ مرحوم، میجر سید حسن بلگرامی، مولٰنا سید ممتاز علی مرحوم، ڈاکٹر لائٹنر، اور حکیم ناصر نذیر فراق قابلِ ذکر ہیں۔ آخرالذکر کو ان کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔

انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔ آبحیات، نیرنگِ خیال (۲ جلد)، کنتوبات آزاد، دیوانِ ذوق، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، نگارستانِ فارس، سیرِ ایران، فلسفۂ الٰہیات، سپاک و نمک، نصیحت کا کرن پھول، نظمِ آزاد، ڈرامۂ اکبر۔

علاوہ اس کے بچوں کے لئے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے اپنی ہمہ گیر مقبولیت کا سکہ بٹھا دیا۔

آبحیات:۔ آزاد کا ایک مہتم بالشان اور لافانی شاہکار ہے۔ جس کی ضخامت ۵۵۲ صفحے ہیں۔ اس تذکرے میں شعراء اور مصنفین کے حالات بھرے پڑے ہیں۔ مگر شعراء کے نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہ تذکرہ اردو زبان کا بالکل انوکھا اور جدید تذکرہ ہے۔ اس کی زبان ایک الہامی زبان ہے۔ اس کو پڑھتے ہی

طبیعت چاہتی ہے اور پڑھو۔ آزاد کا قلم خیالات کی روانی میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

یہ طرز جدید کا سب سے پہلا تذکرہ اور اپنے وقت کے سارے تذکروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آبحیات کی تنقیدیں اور آبحیات کا تنقیدی پیرایہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر اس کے پیرایۂ تنقید میں کوئی سقم ہے تو اس قدر کہ اس میں تنقیدی زبان کی بجائے افسانوی زبان استعمال کی گئی۔ اب رہی واقعات اور جزئیات کی صحت تو اس کے لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد سے جو شعراء کے تذکرے کے پہلے مدون تھے، مورخانہ انداز اور اتنی شدید صحت کی توقع رکھنا خلاف عقل و انصاف بلکہ ایک زیادتی ہے۔

آبحیات کی زبان نہیں جادو ہے، سحر ہے، افسون ہے اردو کے کسی اور انشا پرداز یا ادیب کی زبان میں یہ کشش و گیرائی نہیں، نہ مولانا حالی کے ہاں یہ شوخی و ظرافت ہے، نہ سر سید کے ہاں یہ رنگینی و لطافت ہے، نہ اکبر کے ہاں یہ علمی وقار و متانت ہے۔ نہ نذیر احمد کے ہاں یہ اختصار و زور بیان ہے، نہ منشی ذکاء اللہ کے پاس یہ حسن و نزاکت کی دنیا ہے۔ غرض مختصر یہ کہ آزاد کا بانکپن اور ان کے قلم کا جادو بس انہیں کا حصہ تھا۔ ادب کا یہ تبسم انہیں کے سر کا سہرا بن کر رہ گیا۔

اردو زبان میں آبحیات کی زبان کو ایک خاص نمایاں و ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ حسن نظامی صاحب کہتے ہیں "آبحیات شعراء کا تذکرہ بھی ہے اور بزم مشرق کی آخری بہار کا فسانہ بھی"۔ شبلی مرحوم آزاد کی وفات پر ندوہ کے ماتمی جلسہ میں آبحیات کو بغل میں دبائے ہوئے آئے اور فرمایا "آج جس شخص کا ماتمی جلسہ ہے اس کی اس تصنیف کو میں نے ۸۰ مرتبہ پڑھا"

اس تذکرے کی مقبولیت اور کیا ہوگی اس سے بڑھ کر اس کے آٹھ دس اڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملے اور ان کا مترنم توازن، خوبصورت آسان ترکیبیں، سریع الفہم تشبیہیں، مصور الفاظ، نرم و شیریں انداز بیان، نتھری ہوئی دہلی کی زبان۔ یہ کاغذی نقوش اپنے اندر اتنی جاذبیت و محویت رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں کھو جاتا ہے۔ اس کی زبان کی موسیقیت اور ترنم ریزیاں دل و دماغ کو مست و سرشار کر دیتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ کہیں ابتذال و سوقیانہ پن نہیں۔ غرض آبحیات ایک گیتائے شعراء ہے۔ جس میں دنیائے شاعری کے درخشندہ ستارے آزاد کے قلم سے جینے لگے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کا ذکر انھوں نے آبحیات میں کر دیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید ہو گیا اور جس کا ذکر بھولے سے نہیں آیا وہ ان کے آبحیات سے محروم رہ گیا۔ آزاد نے یہ ایک ایسا ادبی نغمہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے کہ دنیائے ادب ان کے اس ادبی احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اور یہ ان کی بلند پایہ ادبیت کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

آخر اس عالم محویت، جنون و بے خودی میں ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام سنہ ۱۳۲۸ھ کو آزاد قید ہستی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ لاہور کو ان کی جائے مزار ہونے کا اعزاز رہے گا۔ مولانا حالی نے جو تاریخ وفات لکھی ہے اس کے اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

آزاد وہ دریائے سخن کا در یکتا
جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ
جو اس کے قلم سے دم تحریر ہے ٹپکا

ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر
چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں
تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا
صحت میں علالت میں اقامت میں سفر میں
ہمت بھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا
آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اسے رب کا
تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ "ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا"

آزاد کا درجہ اردو ادب میں۔

مہدی الافادی کہتے ہیں "آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ اور پروفیسر آزاد کا درجہ بہ حیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے آسان نہیں ہے۔"

دنیائے ادب نے انھیں زبان اردو کا مسلم الثبوت استاد تسلیم کر لیا ہے۔ مولانا حالی ان کا کلمہ پڑھتے رہے۔ مولانا شبلی نے "خدائے سخن" کہہ کر پکارا، نذیر احمد و ذکاء اللہ وغیرہ نے ان کی خوبیوں کو بارہا سراہا، وہ اپنے وقت کے ایک عدیم المثال نثار، جادو بیان، انشاء پرداز ہی نہیں بلکہ ایک زبردست نقاد بھی سمجھے جاتے تھے۔ اور ایک عرصہ تک وہ اس میدان کے تنہا شہسوار تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی انفرادی حیثیت میں فرق آتا گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے کھلم کھلا انھیں مورخ یا نقاد کہنے سے انکار کر دیا۔ ہاں ان کے سحر کار قلم کا طلسم ہوشربا باقی ہے۔ وہ کسی سے نہ ٹوٹ سکا، نہ ٹوٹ سکتا ہے، نہ ٹوٹے گا۔

ہمارے نزدیک آزاد کا تذکرہ سب سے پہلا تذکرہ ہے جو اپنی تنقیدات کے لحاظ سے "معلم تنقید" ہے۔ گویا ان کی تنقیدیں پڑھ پڑھ کر لوگ تنقید کرنا سیکھتے ہیں۔ آزاد سے پہلے تنقید کا عدم اور وجود برابر تھا۔ آزاد تنقید کے روح القدس یا بابا آدم ہیں تنقید کا پیرایہ ان کے ذہن رسا کی میراث ہے۔ آزاد کی تنقید اگر معرض وجود میں نہ آتی تو یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ نقادوں کے قلم میں تنقید کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا۔ سچ پوچھئے تو تنقید کی داغ بیل آزاد نے ہی ڈالی ہے۔ اور باقی سب ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

نیرنگ خیال کی شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں غالب کو ان دو جملوں میں جتنا سمجھا گئے ایک دفتر بھی اتنا نہیں کر سکتا۔ "غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ واہ سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔" بتائیے کچھ ٹھکانا ہے اس تنقید کا؟

آزاد کا درجہ اردو ادب میں کیا ہے اس کی تشریح کے لئے ہم نواب صدر یار جنگ بہادر کا یہ فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ "اردو میں انشاء پرداز اب تک ان سے بہتر نہیں ہوا۔ انھیں کی نثر اردو میں ایسی ہے کہ جتنی بار پڑھی جائے لطف ادب حاصل ہو۔"

شاید آزاد کے لئے ہی کسی نے یہ کہہ دیا تھا

کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

نہ یہ سوانح نگار ہیں نہ مورخ، نہ مذہبی مصنف ہیں نہ ناول نویس وہ محض انشا پرداز ہیں اور بس۔

جس شاعری کا جھنڈا لئے ہوئے ہندوستان کے مشہور ترین شعراء آگے بڑھ رہے ہیں سب سے پہلے وہ حالی نے نہیں، آزاد نے بلند کیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اپنی زبان اور اپنے ادب کی خدمت پر اپنے ہوش و حواس اپنی صحت اور اپنی زندگی کو قربان کردیا علامہ شبلی اپنے کمالات کے باوجود آزاد کا ادب کرتے اور فرماتے تھے۔ "آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

جہاں بانو بیگم

غزل

ان لبوں پر میرا نام آہی گیا — نالۂ ناکام، کام آہی گیا
سارے عالم کو بھلادے جس کی یاد — یاد پھر وہ لالہ فام آہی گیا
آئے وہ کچھ اس خرامِ ناز سے — دور میں رنگین جام آہی گیا
وہ جو آئے سو بہاریں آگئیں — زندگانی کا پیام آہی گیا
مر مٹے ہم اپنی شمعِ حسن پر — عشق میں پروانہ کام آہی گیا
جذبِ الفت کا تقاضا دیکھنا — وہ نگارِ خوش خرام آہی گیا
اللہ اللہ! یہ محبت کی کشش! — کوئی پھر بالائے بام آہی گیا
شامِ وعدہ تھا یہ اعجازِ وفا — کھینچ کے وہ بدر تمام آہی گیا
دیکھ کر بولے وفا کو بزم میں — لیجئے دل کا غلام آہی گیا

ابن ندیم وفا

اُف وہ خواب

آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں اماں سرہانے کھڑی ہیں۔ ان کا ہاتھ میری پیشانی پر ہے۔ اور ان کی انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں لیمپ کی مدھم روشنی رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کونوں کونوں منہ چھپائی پھر رہی تھی۔ میز پر ایک کھلی ہوئی کتاب کے ورق ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے خشک پتوں کی طرح کھڑکھڑا رہے تھے۔ میں اپنی ماں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے وہ میرے کمرہ میں کیا کر رہی تھیں؟ میری طرف اس طرح گھبرائی ہوئی نظروں سے کیوں دیکھ رہی تھیں؟ "آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ کیا ہوا آپ کو؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا اور پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔ "مجھے" انہوں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیا ہوا۔ میں تو اچھی بھلی۔ میں پوچھتی ہوں۔ تجھے کیا ہوا؟" میں نے اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ پسینہ میں شرابور ہو گئی تھی۔ زبان خشک تھی۔ دایاں ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ "مجھے کیا ہو گیا؟" میں سوچنے لگی۔ لیکن مجھے کسی تبدیلی کا احساس نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اماں نے میرے برابر بیٹھ کر دلاسا دیتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟" "مجھے نہیں معلوم" میں نے آہستہ سے کہا۔ لیکن پھر سوچنے لگی "آخر کیا بات ہوئی۔ اماں کو اتنی تشویش کیوں ہے؟ —" اماں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ "کوئی برا خواب دیکھا ہے کیا؟" میرے حواس پھر کام کرنے لگے۔ "کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تم چیخ رہی تھیں۔ مجھے پکار رہی تھیں۔ تمھیں خیال نہیں؟" —

اماں کی متجسس آنکھیں میری طرف لگی تھیں۔ "میں چیخ رہی تھی۔ اماں کو پکار رہی تھی — میں خواب دیکھ رہی تھی" میں نے سوچنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد حافظہ کے پردہ پر کچھ دھندلے دھندلے نقوش ابھر آئے۔ میں نے اماں سے کہا "کچھ نہیں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ خواب۔ شاید دیکھا ہوگا۔" اماں نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ اور یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں "ناٹ کے نیچے نہ سو۔ اپنا پلنگ وہاں سے ہٹا لے۔" میں نے "اچھا" کہا۔ لیکن پلنگ نہ ہٹائی۔ میں نے سوچا۔ اسی جگہ سو رہوں تو شاید وہ خواب اچھی طرح یاد آ جائے۔ اُف وہ خواب۔ "میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں اماں اندر آئیں۔ "بیٹی تیرے ماموں آئے ہیں۔ چل ان سے مل" میں کپڑے درست کرتی اٹھی۔ اماں نے مجھے سر سے پیر تک ایک نظر دیکھا۔ کہنے لگیں "یہ کپڑے بدل ہی دو"۔ میں نے دل میں سوچا "نہ جانے کیا مصلحت ہے؟" اور دوسرے کپڑے پہن لئے۔ "کہاں ہیں وہ؟" میں نے اماں سے پوچھا۔ "دیوان خانے میں" اماں نے میری طرف سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اکیلے" میں نے اپنے اطمینان کے لئے پوچھا۔ "ہاں۔ ہاں"۔ اماں تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئیں۔ میں دیوان خانے تک گئی۔ ماموں جان کوئی غیر آدمی نہ تھے۔ مگر میرے قدم جیسے من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے پردہ اٹھایا اور اندر چلی گئی۔ ماموں جان کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں نہایت ادب سے سلام کیا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "ادھر آؤ نا بیٹی"۔ میری وحشت اب کچھ دور ہوئی۔ میں نے ماموں جان کو غور سے دیکھا۔ یورپ میں رہ کر ان کی جسمانی حالت میں کافی سے زیادہ تغیر ہو گیا تھا۔ رنگ بھی خاصا نکھر آیا تھا۔ خیالات کا حال مجھے نہیں معلوم — لیکن۔ لیکن ..... میں جو آزادی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے لگی تو

میں نے دیکھا ماموں جان سے ذرا پرے ایک نوجوان سوٹ بوٹ پہنے۔ مسکراتا بیٹھا تھا۔ میری کا ہے کو کبھی ایسی شامت آئی ہوگی۔ میں نے آنچل سے اپنا منہ لپیٹ لیا۔ اور روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ اماں شاید میری منتظر ہی کھڑی تھیں "کیا ہوا؟" "کیا ہوا" انہوں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ "کچھ نہیں" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ماموں جان بھی آگئے۔ "دیکھو آپا اتنا پڑھ لکھ کر بھی آپکی لڑکی نئر بیلی اور پرانے خیال کی ہے۔" اماں کو مجھ سے پہلے ہی سے شکایت تھی۔ اب جو ماموں جان نے ناراضی کا اظہار کیا۔ مجھ پر ہی برسنے لگیں۔ "میں تو تنگ آگئی ہوں۔ اللہ رکھے۔ اب سولھواں سال ہے۔ لیکن اپنے بھلے برے کی تمیز نہیں۔ اسے خود اپنی سدھ نہیں۔ گھر ہو باہر ہو، وہی ہلکی سیدھی سادھی ساڑیاں پہنتی ہے۔ نہ سنگار نہ کچھ نہ کیا۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر اس ناشکری بچی نے نہ جانے دل میں کیا سوچا ہے۔" اور میری طرف متوجہ ہوکر "بی بی ابھی سے کیوں رو رہی ہو؟" میں اور بھی زور سے رونے لگی۔ "رونے کے دن تو آگے آرہے ہیں۔" اتنا کہہ کر اماں چپ ہوگئیں۔ ماموں جان نے کہا "آپا اس کے ابا کا کیا خیال ہے؟"۔ "ارے ان کو فکر ہوتی تو کیا بات تھی۔ بس وہ ایک اپنے بھائی کا بچہ مل گیا ہے گھر بیٹھے۔ بس جب دیکھو اسی کا نام "میں اپنی بیٹی دوں گا تو اسی کو دوں گا" مانتی ہوں بچپن ہی میں دونوں کی نسبت ہوچکی ہے۔ لیکن اب میری بیٹی بڑی بڑی جماعتوں میں کامیاب ہوچکی ہے۔ اور پھر صورت شکل ہزاروں میں ایک ہے۔ تم دیکھتے رہنا۔ بڑے بڑے گھرانوں سے پیام آئیں گے۔" "کیوں نہیں ضرور" ماموں جان نے کہا۔ اور آہستہ سے کہنے لگے "بیٹی — ابھی جسے تو نے دیکھا ہے۔ پسند ہے تجھے۔ وہ تو بس دیوانہ ہوگیا۔ اگر تو کہے "ہاں" یا گردن ہلا دے تو ہمارا ذمہ ہم یہ بات پکی کئے دیتے ہیں۔" میں ایسا محسوس کررہی تھی جیسے کوئی مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ میں نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا۔

"آپ لوگ مجھے مار ڈالیں گے" کہتے ہوئے میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تکیہ پر منہ رکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اماں میرے کمرے میں آئیں۔ سنجیدہ بن کر پوچھنے لگیں۔ "آخر یہ ڈھونگ کس لئے ہے؟" اور مجھے غیر متاثر دیکھ کر نرم لہجہ میں کہنے لگیں "بیٹی تو جانتی ہے۔ ہم سب تیرے بھلے کے لئے ہی کہتے ہیں۔ یہ لڑکا تین چار سو ماہوار کماتا ہے۔ شریف ہے تو پڑھی لکھی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ اگر تیری جگہ کوئی دوسری ہوتی تو بغیر پوچھے گچھے ہی سب کچھ طے ہوجاتا۔ بول تیری کیا مرضی ہے" میں نے اماں کے پیر پکڑ لئے — "آپ خدا کے لئے اکیلی چھوڑ دیجئے مجھے میں اب آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ جائیے — جائیے خدا کے لئے —" — "سمجھی" اماں نے تند و تیز لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "اس نکھٹو لڑکے کا خیال ہے شاید — صورت نہ شکل — کمائی نہ دھمائی — اور تو اسے پسند کرتی ہے۔"

صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ادب اور لحاظ نے اماں پر تالا لگا رکھا تھا۔ صبر کی آخری بوند بھی چھلک پڑی تو میری زبان میری نہ رہی۔ "اماں آپ اتنی حریص اور ظالم کیوں ہوگئی ہیں — وہ جس سے میری نسبت بچپن ہی میں ہوچکی ہے۔ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میری جدائی میں روتا ہے۔ میری ہی امید پر وہ زندہ ہے۔ میں اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کرسکتی۔ میں ان لڑکیوں میں نہیں ہوں جو محبت کو کھیل سے بڑھ کر نہیں سمجھتیں آج کسی سے محبت کی، کل کسی سے۔ مجھے جتنا خیال ہے، اسی قدر دوسرے کا ہے میری زندگی۔ امداس کی کچھ بھی نہیں۔ میں خوش رہوں۔ اور وہ دنیا کی ٹھو

کھاتا پھرے۔ یہ میں کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔" اماں دم بخود تھیں۔ "محبت۔ اری یہ سب مردوں کے دھوکے ہیں"۔ "جی نہیں اماں۔ یہ سب ہماری دھوکا بازی ہے۔ ہم جب کسی کے ساتھ دھوکا کرنا چاہتی ہیں تو الزام سارا دوسرے کے سر تھوپتی ہیں۔ ہم میں استقلال نہیں اماں۔ ہم عورتیں کمزور دل کی ہوتی ہیں۔ گر میں بتا دوں گی کہ رشتہ ایک مرتبہ جڑتا ہے۔ دل ایک مرتبہ لگتا ہے۔ اور کنواری لڑکی کی محبت پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔

اور اس کا وعدہ اسے اپنی جان سے عزیز۔ اماں میں اسے قول دے چکی ہوں۔ میں اسی سے شادی کروں گی۔ بس میں کہہ چکی"۔ "بکواس بند کر بدتمیز" اماں نے غصہ سے کہا اور چلی گئیں۔

ہندستانی لڑکی لاکھ تعلیم یافتہ ہو۔ آزاد خیال ہو۔ والدین کے حکم سے سرتابی کرنے کی قوت اس میں نہیں آتی۔ میں نے کھانا پینا چھوڑا۔ ہنسنا بولنا چھوڑا۔ اپنے کمرہ میں مقید ہوگئی۔ مگر کسی کا دل نہ پسیجا۔ سب میری جبری شادی پر تلے ہوئے تھے۔ اماں نے بات چیت ترک کر دی تھی۔ انھیں اب شادی کی تیاریوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی۔ اسی نوجوان سے میری نسبت قرار پائی۔ اور اب شادی بھی مقرر ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں میرے پہلے منگیتر نے مجھے پوچھ کر بھی نہ دیکھا۔

اس نے میرے متعلق کیا سوچا۔ نہ جانے اس کا اب ارادہ کیا ہے؟۔ میری بیوفائی کا رونا روتا پھر رہا ہوگا۔ لیکن وہ مجھ سے ملا کیوں نہیں۔ میں لاکھ بے وفا سہی۔ مجھے اگر میرے وعدے یاد دلائے جاتے۔ معصوم محبت کے پیمان دھرائے جاتے۔ میں مجبور ہو جاتی۔ میں اس کے لئے سب کچھ کرتی۔ انہیں خیالات میں گم تھی کہ کئی عورتیں میرے کمرے میں گھس آئیں مجھے کپڑا دھکڑ کر دلہن بنایا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ یکے بعد دیگرے چلی گئیں۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر ایک لمحہ کی بھی دیری ہوتی تو میں دوسرے کی ہو جاؤں گی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے ایک بڑا چاقو نکالا۔ کلمہ پڑھا۔ اور اپنے سینے میں بھونک لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں چیخیں مار رہی تھی۔ اماں۔ اماں کہہ کر پکار رہی تھی۔"

رات ہی کو سوچ چکی تھی کہ صبح اٹھتے ہی اماں سے اپنا خواب کہہ دوں گی۔ اور شاید اماں مان جائیں۔ صبح تک میں رنگین خوابوں کی دنیا میں گھومتی رہی۔ صبح کو اماں نے مجھے بیدار کرتے ہوئے کہا۔ "مسکرا کیوں رہی تھی۔" میں شرما کر چپ ہو رہی۔

رشید قریشی

ایک رومان

کسی دور کے رشتہ کی وہ میری بڑی بہن تھیں — قد میں مجھ سے کچھ چھوٹی لیکن عمر میں بڑی۔ ان کی شادی بھی ہو چکی تھی — جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت میں لڑکپن سے گزر کر ابھی احساسات کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور میرے ذہن میں اس سوال نے کافی اہمیت پیدا کر لی تھی کہ مرد عورتوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں یا عورتیں مردوں سے؟ لیکن اس کا جواب میری وسعت فہم سے ورے تھا!

میری نظروں میں رہنے والے خاندان کے سارے بیاہے مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں چند اطمینان بخش نتائج حاصل کر لئے تھے وہ یہ کہ ہر عورت مرد کی مطیع ہوتی ہے اور مرد بھی اس کا رفیق ہوا کرتا ہے۔ ہر عورت کسی نہ کسی مرد اور اسی طرح مرد بھی کسی نہ کسی عورت سے بیاہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ان نتائج نے میرے شوق تجسس کو بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔

محبت کا مفہوم ابھی میرے حلقۂ ذہن کا اسیر نہ ہوا تھا۔ اپنے گھر کے لوگوں کی زندگیاں بھی کسی خصوصیت کی طرف اشارہ نہ کر سکی تھیں میں یہ سمجھتا تھا کہ بچپن کے ہمجولیوں کو "میاں اور بیوی" کا لقب دے کر عمر بھر کے رفیقوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور بس!!

بیاہ ہو جانے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھیں جو ہمارے گاؤں سے کچھ دور تھا۔ جس گاؤں میں وہ رہتیں وہاں ہر سال ایک بہت بڑا میلا لگتا جس میں ہم سب شریک ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس واقعہ کا ذکر میں آگے کروں گا اس سال سے پیشتر بھی متعدد مرتبہ میں اس میلے میں شریک ہو چکا تھا۔ اور جس سال یہ عجیب واقعہ ہوا اسی کے بعد سے آج تک میں نے اس میلے میں شرکت نہیں کی۔

دس سال ہوئے جب کہ متعدد دعوتی خطوط کے بعد گھر کے اور افراد کے ساتھ میں نے اس میلے میں شرکت کی ان کے گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ اس میلے میں شرکت کی غرض سے آنے والے ہمارے خاندان کے بہت سے لوگ انہیں کے ہاں قیام کرتے کیونکہ ان کا گھر بہت بڑا تھا اور وہاں بڑا آرام بھی ملتا۔ وہ ایسی خوش اخلاق واقع ہوئی تھیں کہ مکان کے ہر حصہ میں لوگوں کے بھر جانے کے باوجود ہر نئے آنے والے کو خوش آمدید اور نہایت خندہ پیشانی سے کسی نہ کسی طرح ان کے ٹھیرنے کا انتظام کر دیتیں۔

وہ بے حد خوبصورت تھیں اور ان کا ہنس مکھ دلکش چہرہ آج تک میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے ہر ایک سے ہمدردی اور تواضع سے پیش آنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ چند گھنٹوں کی یکجائی میں ہر نئے آدمی پر اپنی شخصیت کا اثر جمانا انہیں کا کام تھا۔

وہ جب کبھی ہمارے گاؤں کو آتیں جہاں ان کے والدین رہا کرتے تھے تو ضرور ہمارے بھی گھر آتیں اور مجھ سے متعلق ایک خاص بات ان میں یہ بھی تھی کہ ضرورتاً یا اکثر یونہی [illegible] رہنے کی کوشش کیا کرتیں۔ ان کے اس تبسم اور غیر معمولی التفات سے میں شرم اور غیرت کے مارے پریشان [illegible] ان کی موجودگی تک میں مکان سے

باہر ہی رہتا ـــــ آج مجھے ان کے اس التفات کا سبب معلوم ہو چکا ہے لیکن اب ....

جس وقت ہم لوگ ان کے گھر پہونچے وہ اور لوگوں کے انتظامات میں مصروف تھیں جونہی ان کی نظر ہم پر پڑی وہ سب کام چھوڑکر ہمارے پاس آئیں اور ہنس ہنس کر ہر ایک سے ہمارے گاؤں اور گھر کے حالات پوچھنے لگیں۔ ان کے بھائی بھی ساتھ تھے جو اپنے گھر کے واقعات سناتے رہے اس تمام عرصہ میں وہ برابر ٹکٹکی لگائے میری جانب دیکھتی رہیں عجیب جذبات سے مغلوب ہوکر جب دوسری جانب دیکھتے دیکھتے غفلت میں ایک آدھ بار ان پر نظر ڈالتا تو وہ برابر متبسم چہرے سے مجھے یوں گھورتیں گویا اس پورے وقت میں وہ مجھ ہی سے مخاطب رہی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے دقیقہ سے مجھے بھی سوالات کا ہدف بنایا جاتا لیکن میں اکثر مختصر جوابات سے انھیں ٹال دیا کرتا۔ مگر مجھے اپنی اس بے رخی کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ اس مرتبہ پہلی بار میں نے ان کے چہرے پر ایک خاص جذبہ اور حزن کی لہر محسوس کی جس کا پہلے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کرتا تھا ـــــ حتیٰ کہ میں بھی اپنے دل میں ایک نئے جذبہ کی تخلیق کو محسوس کرنے لگا۔

بہ ہزار کوشش میلے کی دلچسپیوں میں شریک ہونے کے بہانے میں ان کے بھائی کے ہمراہ باہر نکلا۔ راستہ میں ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں لیکن اب میں ان کے سمجھنے سے بھی عاری ہو چکا تھا۔ میرا دھیان اب کسی اور طرف تھا ـــــ چنانچہ میلہ اس میں شریک ہونے والے ہزارہا آدمی ـــــ کھیل کود، تماشے دکانوں اور راستوں کی آرایش ـــــ غرض کوئی چیز میری توجہ اپنی جانب منعطف نہ کراسکی اپنی اس حالت کے متعلق میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کرسکا صرف یہ کہ مجھ میں ایک بے چینی تھی اور ساتھ ہی ایک ہلکا سا خوف کہ گھر جاکر پھر مجھے انہیں کا سامنا کرنا ہے مگر اب کی بار آرزو کی ایک ہلکی سی خلش بھی دل میں پنہاں تھی۔

گھر آنے کے بعد ہم نے اپنے اسباب کو ایک جانب قرینے سے رکھا ہوا پایا۔ دالانوں میں صاف فرش کیا گیا تھا مغرب ہو چکی تھی جس کی وجہ سے گھر کے ہر حصے میں لمپوں اور قندیلوں کی روشنی نظر آرہی تھی۔ تنہا ہونے کے خیال سے میں نے ایک دور کا کمرہ اپنے لئے پہلے ہی سے منتخب کرلیا تھا اس لئے آتے ہی میں نے اپنے ہی کمرے کا رخ کیا ـــــ وہاں بھی صاف فرش اور بستر تیار تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا میز تھا جس پر چند کتابیں بکھری پڑی تھیں ـــــ ایک کرسی تھی۔ دوسرے جانب ایک سوٹ کیس رکھا تھا اور بس!

کپڑے اتار کر میں نے میز کا رخ کیا یہاں الٹ پلٹ کر دیکھنے سے عظیم بیگ چغتائی کی کولتار نظر آئی اور ساتھ ہی "آرسین لوپن" کے کارناموں کا ایک تذکرہ بھی ہاتھ آیا میں نے کہا چلو تفریح کا سامان تو ہاتھ آیا اور پہلے آرسین لوپن کے کارناموں ہی کو دیکھنے لگا۔

پہلے تو میں نے چاہا تھا کہ چونکہ کھانے کا وقت قریب تھا اس لئے کھانے سے فراغت پاکر ہی ان کتابوں کو دیکھ ڈالوں لیکن جب دو تین ورق اسی خیال میں دیکھ ڈالے تو اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ سارے خیالات گم ہوگئے اور میں اس میں محو ہوگیا اور اسی کے سنسنی خیز واقعات کی تصویر الفاظ کے پیکر میں میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگی۔

ناول کی دلچسپی نے آنے جانے والوں کے شور و غل کو بھی مدھم کردیا تھا میں اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی سے اس وقت

باخبر ہوا جب کہ آنے والے کے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے گئے۔

آدمی کو غافل پاکر اچانک اسے آگاہ کرنا یا پیچھے سے آکر کسی کی آنکھیں بند کرنا یہ سب میرے خیال میں انتہائی بھونڈے مذاق کی مثالیں ہیں ـــــ غور تو کیجئے کہ جس شخص کی آنکھیں بند ہوں وہ بند کرنے والے کے ہاتھوں کی بو، سردی اور ایسی ہی دوسری چیزوں سے کتنا نالاں رہتا ہے۔

میں پیشانی پر بل ڈال کر لڑا لیکن وہاں پھر ان کو دیکھکر مجھے حیرت ہوئی اور ساتھ ہی کچھ پریشانی بھی ہونے لگی۔ اس نیم جا سکوت سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے سوال کیا۔

"آپ کس لئے تشریف لائی ہیں؟"

بجائے اس کے کہ کسی ضروری کام یا اپنی موجودگی کی کوئی اور وجہ بتا کر وہ مجھے مطمئن کرتیں عجیب حرکات کرنے لگیں اور کہنے لگیں (آنکی کل کی تقریر سے یہی ایک ناتمام جملہ مجھے یاد رہ گیا)

"تم بھی عجیب بھولے .... تمھیں تو کسی چیز کا علم ہی نہیں!"

یہ کہتے کہتے آگے بڑھ کر انھوں نے میرا ایک بوسہ لے لیا۔

انتہائی شرمندگی اور ایک نامعلوم بوجھ کے اثر سے میرے لب گویا پیوست ہو گئے تھے۔ میری قوتِ گویائی اور قوتِ تخیل ان کی مسلسل تقریر کے آگے بیکار ہو چکی تھیں۔ میرے ہاتھ اور پیر بے انتہا وزن ہو گئے حتیٰ کہ ان کے اس بے حجابانہ طرزِ عمل کی مدافعت کرنے کا بھی مجھے ہوش نہ رہا۔

وقت اور موقعہ کی نزاکت کا احساس انھیں ہی ہوتا تو ہوتا مجھے تو پہلے ہی لوگوں کی آمد و رفت کا خیال نہ تھا۔ وہ اپنی موجودہ حرکت کے خطرے سے اسی وقت آگاہ ہوئیں جب کہ ان کا شوہر ـــــ ایک کینہ پرور، انتقام پسند، سخت گیر اور ظالم شخص جیسا کہ میں پہلے سن چکا تھا۔ وہاں آچکا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے وہ اسی غیظ و غضب کی حالت میں واپس چلا گیا۔ انھوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میرا ایک اور بوسہ لیا اور کمرے سے نکل گئیں۔

میں اسی وقت باہر نکلا اور میرے گاؤں واپس ہونے والے ایک کسان کی بنڈی کے ذریعے صبح تک گھر پہونچ گیا۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میں نے خبر سنی کہ زہر کھلا کر میری بہن کی جان لی گئی۔ مجھے ان کی جلد بازی، مجبوری اور ان کے اس بوسہ کی قیمت کی گرانی کا خیال عمر بھر ستاتا رہے گا۔ وائے محرومی!!

سید ابوالفضل

فتح آباد پر ایک نظر

میں منگلے گاؤں کسی کام کی وجہ سے جارہا تھا کہ راستہ میں فتح آباد ملا یہ مقام تاریخی لحاظ سے اہم ہے۔ اس لئے چند گھنٹے یہاں ٹھیرا اور آثار قدیمہ دیکھے۔ یہ مقام سلسلۂ بالاگھاٹ کی چوٹی پر واقع ہے۔ تعلقہ مومن آباد کا ایک قصبہ ہے۔ اس کا پہلا نام دھارور ہے اور اب بھی بعض لوگ دھارور کہا کرتے ہیں۔ سدی عنبر نے اس کو فتح کرکے فتح آباد نام رکھا۔ یہ قصبہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہاں پانی کی سخت تکلیف ہے۔ تالاب کے کنارے جو آبادی ہے اس کو قصبہ کہتے ہیں اس آبادی کے کنارے ایک مسجد ہے جس میں ۲۰ کھم پتھر کے لگے ہوئے ہیں۔ کتبہ حسب ذیل ہے۔

این عمارت در عہد خلافت.........

محمد نظام شاہ سلطان .... باشد

فتح باد تیار شدہ متولی محمد علی العشرین شعبان

اس مسجد کی جانب شمال دوسرے تالاب کے کنارے دوسری مسجد ہے جس کا کتبہ حسب ذیل ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

خادم شرع متین کرد از کمال صدق جاں

مسجدی احداث بہر مقدم صاحب دلاں

ہاتف طبع سخن پرور بگوش ہوش گفت

موجب اسباب فضل دیں بگو تاریخ آں

بانیٔ مسجد خادم شرع عبدالوہاب سنہ ۱۰۱۹ھ

اس قصبہ کو سدی عنبر نے فتح کرکے بالکلیہ نظام شاہیہ کے زیر سلطنت لالیا۔

دوسرے تالاب کی جانب شمال جو آبادی ہے اس کو پیٹھ کہتے ہیں۔ بیوپاریوں کی دکانیں وغیرہ سب اسی جگہ ہیں۔ یہ قصبہ تجارتی لحاظ سے اہم ہے۔ اس قصبہ کا محصول کروڑگیری سالانہ کافی ادا ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ اس مقام پر آمد و رفت کے ذرائع بالکل مہیا نہیں ہیں۔ اس آبادی کی جانب شمال جامع مسجد ہے جس میں چونے کا فرش کیا ہوا ہے۔ لیکن اب کہیں کہیں چونا نکل گیا ہے۔ اس مسجد کی دیوار کے نیچے ایک کنواں ہے۔ مسجد کا دروازہ چھوٹا ہے۔ کتبہ درج ذیل ہے۔

اللہ محمد علی

زغیب آوردہ شد تاریخ مسجد
بکن تحقیق از مصراع اول

ذکی بشمار اماں لفظ تحقیق
بود مصراع اول لفظ اول

بنا می کرد....... مسجد
زفیض فائض فضل مفضل

پہلے مصرع میں جو لفظ "زغیب" ہے وہ اس مسجد کی تاریخ کا لفظ ہے جس سے پتہ چلا کہ یہ مسجد سنہ ۱۰۱۹ھ میں بنی ہے۔ جامع مسجد کے تقریباً ۴ فرلانگ کے فاصلہ پر جانب مغرب قلعہ واقع ہے۔ قلعہ کا بالاحصار انتہائی دانشمندی سے بنایا گیا۔ کیونکہ قلعہ کی تینوں جانب پہاڑ کے درّے واقع ہیں۔ صرف جانب مشرق بطرف آبادی پہاڑ نہیں ہے اسی لئے یہ قلعہ کا راستہ بنا ہوا ہے۔ پہاڑ کے درّے کو غنیم کسی طریقہ سے عبور نہیں کرسکتا۔ اگر وہ عبور بھی کرلے تو قلعہ میں جانے کے لئے خندق حائل ہوجاتی ہے۔ خندق کا عرض تقریباً ۴ سو فٹ ہے اگر اتفاق سے خندق کو غنیم عبور کرلے تو بالاحصار ہے اور بالاحصار کے اندر پھر اور خندق بنائی گئی ہے جس میں اب بھی

پانی بے شمار ہے اس حصہ کے تمام لوگ اسی خندق کا پانی پیتے ہیں۔ دشمن یہاں آکر یہیں کا ہو رہتا ہے قلعہ کے اندر جا نہیں سکتا اس قلعہ کو عالمگیرؒ کے بعد کبیر خاں نے از سرِ نو تعمیر کیا۔ سنا جاتا ہے کہ اس قلعہ کو ہندوؤں نے تعمیر کیا۔ لیکن اس کی تحقیق نہ ہو سکی۔

ف۔ قلعہ کے دروازہ پر کتبہ لکھا ہوا ہے لیکن اتنا اونچا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔

ف۔ قلعہ کے اندر جانے کے بعد بائیں جانب تین لادنیاں سلسلہ سے بنی ہوئی ہیں۔ ایک لادنی کے چھت پر نقش و نگار عجیب طریقہ کا بنایا گیا ہے۔ اور رنگ بھی دیا گیا ہے لیکن رنگ اب تک اڑا نہیں۔ رنگ سیاہ اور نیلا نظر آتا ہے۔ دوسری لادنیاں مختلف ڈیزائن کی ہیں

ف۔ قلعہ کے دروازے پر ایک برج پر کتبہ لکھا ہوا ہے۔

این ...... بنام .... جلہ انام

در .... زملک نام

، ارزیجہ ...... برابر پڑھا نہیں گیا

ف۔ قلعہ کے دروازے کے قریب ایک اور برج ہے جس کو شاہ برج کہتے ہیں۔ اس برج پر ہاتھ کے دائیں اور بائیں پنجے کے نشانات ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں دو پہلوان رہتے تھے انھوں نے کسی کا خون کیا اور ہاتھ خون میں بھر کر اپنے ہاتھ کی نشانی دیوار پر لگادی اور مر گئے۔ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے معلوم نہیں لیکن زبانِ زد عوام و خواص ہے اب بھی جہاں یہ نشان ہے دو جگہ دو پنجے کی حد تک سیاہ نظر آتی ہے۔

ف۔ قلعہ کے وسط میں حضرت سید عیسیٰؒ صاحب کی درگاہ ہے۔ دروازے کے باہر جالی چونے سے بنی ہوئی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ حضرت قبلہ کا جسم شریف یہاں اور سر مبارک اپلائی تعلقہ منجلے گاؤں میں ہے۔ آپ لڑتے لڑتے یہاں آئے اور شہید ہو گئے۔

ف۔ درگاہ کے کچھ دور کے فاصلہ پر جانب مغرب ایک دروازہ ہے دروازہ سے گزرنے کے بعد اندر کی جانب، لادنیاں ہیں۔ ان لادنیوں میں اب بھی اگر زمین کھودی جائے تو بارود نکلتی ہے۔ ان لادنیوں میں سے ایک لادنی سے سرنگ جانب جنوب ملی گئی ہے۔ ایک آدمی اچھی طرح سے جا سکتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ بارود خانہ تھا۔ ان لادنیوں کے بالمقابل ایک کالی کوٹھڑی ہے۔ اس کوٹھڑی کے عقب میں ایک حوض ہے جو کہ تقریباً ۹ فٹ چوڑا اور ۲۵ فٹ لمبا ہے۔ اس کے قریب کنواں بھی ہے۔ اس حوض میں زمانۂ بارش میں دو طرف سے مغرب کی جانب سے پانی آتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں ہوا کہ پانی کہاں سے آتا ہے۔ حوض کے بالمقابل جانب مغرب ایک لادنی کے اندر کنواں نظر آتا ہے۔ اس کنوئیں کے اندر سے سرنگ چلی گئی ہے جس کا پتہ تقریباً دو میل کے فاصلہ پر جانب جنوب و مغرب ایک برج پر ملا ہے۔

ف۔ درگاہ کے جانب مغرب ایک مسجد ہے جس کے پیچھے حوض ہے جو تقریباً اچھا ہے۔ صرف صفائی نہیں ہے۔ فرش چونے کا بنا ہوا ہے اس حوض میں مغرب کی جانب سے ایک نل آیا ہوا ہے اور جانب جنوب سے ایک۔ اس حوض کے جانب جنوب اور ایک حوض۔ ا نٹ اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ جس میں جنوب کے طرف سیڑھی کے بازو ایک جالی کے نمونہ کی چادر بنائی گئی ہے۔ وسط حوض میں ایک گڑھا نظر آتا ہے معلوم یہ ہوا کہ یہاں فوارہ تھا اس حوض کے اوپر نالیاں بنی ہوئی ہیں اور کچھ چھوٹے چھوٹے حوض بھی ہیں۔

ان چھوٹے چھوٹے حوضوں کے جانب جنوب تقریباً ۱۰ قدم کے فاصلہ پر محل ہے جس کو آئینہ محل کہتے ہیں۔ اب یہ محل منہدم ہوگیا ہے۔ لیکن کچھ کچھ آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔
اس محل کے جانب مغرب باورچی خانہ کے دو کمرے ہیں۔ ان کمروں کے گنبدوں پر سوراخ بھی ہیں جو کہ دھواں جانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ کمرے میں چولھے بھی بنے ہوئے ہیں۔ باورچی خانہ کے جانب جنوب اور ایک عمارت ہے اور اس کو نعمت خانہ کہتے ہیں۔ آئینہ محل کے جانب مغرب دو حوض ہیں اس حوض پر چھت بنی ہوئی ہے۔ اب بھی ان حوضوں میں سے ایک حوض میں پانی رہتا ہے اور ایک حوض میں سے سرنگ جانب مشرق اور شمال جاتی ہے۔
اس میں ایک آدمی اچھی طرح سے جا سکتا ہے۔
ف۔ آئینہ محل کے نزدیک ہی جانب شمال مسجد واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہی مسجد ہے۔ مسجد بہترین کاریگری کا نمونہ ہے اور یہ اپنی صنعت میں اپنی آپ نظیر ہے دروازہ پہ کتبہ لکھا ہوا ہے جو کہ حسب ذیل ہے۔

در عہد نظام شاہ عالمی مقدار　　آں شاہ جہاں پناہ خورشید لقب
بانی بنائے خیر شد سنجر خاں　　آں منبع خلق ولطف... واوبا
تاریخ بنائی خیر اکبری خواہی　　از قبلۂ... عجز واخلاص طلب

اگر حکومت کی جانب سے ان کتبوں کی دیکھ بھال ہوئی تو بہتر ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ انقلاب زمانہ کی وجہ سے یہ بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔ اور بھی یہاں آثار قدیمہ بہت سے ہیں لیکن میں جلدی میں ان سب کو دیکھ نہ سکا اور اتنے تنگ وقت میں جو کچھ بھی دیکھ سکتا تھا دیکھ لیا۔ انشاءاللہ اگر کسی وقت جانا ہو تو یہاں کے حالات مفصل لکھوں گا۔

ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد نیر

غزل

تیری الفت نے جس کو مارا ہے　　اس کو کب زندگی گوارا ہے
جی رہا ہوں فراق جاناں میں　　وعدۂ وصل کا سہارا ہے
رخ روشن سے نور چھنتا ہے　　حسن کے آسماں کا تارا ہے
خود فریب حیات کے ہاتھوں　　ہم کو مرنا بھی اب گوارا ہے
آسماں پر شفق پھلے پھولے　　خونچکاں آنکھ کا اشارا ہے
دل میں اٹھتے ہیں ولولے لاکھوں　　ہر نفس برق ہے شرارا ہے

زندگی، زندگی بنا دے عظیم
لب جاں بخش کا اشارا ہے

عظیم حیدرآبادی

سری ناگناتھ مہاراج کا مندر

ہندوستان میں بارہ جوترلنگ ہیں جو مقدس مانے جاتے ہیں ان میں سے تین لنگ ممالک محروسہ میں موجود ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) پرلی ضلع بیڑ (۲) ایلورہ ضلع اورنگ آباد (۳) اونڈہ تعلقہ ہنگولی ضلع پربھنی۔

قدیم واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لنگ کی ابتدا اونڈہ سے ہوئی ہے۔ اس مقام کا سابقہ نام "دوارکا بن اورامرک" تھا جو بعد میں اونڈہ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ قصبہ تعلقہ ہنگولی میں واقع ہے۔ مقام پرفضا اور پہاڑیوں سے گھیرا ہوا ہے۔ اس دیول کے مختصر واقعات یہ ہیں کہ کورو اور پانڈو کی جنگ سے کچھ سال قبل تخمیناً اب سے پانچ ہزار سال قبل کورو جب بن باس ہوئے تو اونڈہ ہی میں ان کا مقام ہوا۔ مقام شاندار و دلچسپ ہونے کی وجہ قیام طویل رہا۔ اس وقت یہ مقام چاروں جانب پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے یہاں ایک تالاب بھی تھا جو "امرک" تالاب کے نام سے موسوم تھا۔ گائیں روزآنہ پہاڑیوں پر چرنے جایا کرتیں۔ ایک گائے تالاب میں تیر کر جاتی اور ایک مقام پر ٹھیر جایا کرتی حسب معمول دودھ نکالا جاتا تو نہ نکلتا۔

بھیم نے جس کی قوت ایک ہزار ہاتھی کے برابر تھی اپنی روحانی قوت سے تالاب کا پانی خارج کیا۔ اخراج آب سے تمام دنیا میں روشنی پھیل گئی رات نظر نہ آتی تھی۔ رشی لوگ جن کا استھان ان ہی پہاڑیوں پر تھا نہایت پریشان ہوئے۔ خدا سے دعا کی کہ یہ کیا معاملہ ہے مگر پتہ نہ چل سکا۔ وشنو اور برہم دیو نے تمام دنیا کا چکر لگایا۔ مگر روشنی کا پتہ نہ چلا سکے۔ بالآخر رشیوں نے پھر خدا سے دعا کی۔ ندا آئی کہ جس جگہ روشنی ہے اس جگہ بھیم کے ہاتھ سے بھاگرتی ندی کی ریت ڈلوائی جائے اور اس کے بارہ حصے کئے جائیں ایک حصہ اسی جگہ رہے اور مابقی دوسرے مقامات پر تقسیم کر دیے جائیں ایسا کرنے پر روشنی کم ہو گئی۔

اس وقت بھی تہ خانہ میں یہ ریت کا لنگ موجود ہے جس کی زیارت صرف اہل مذہب ہی کر سکتے ہیں۔

ویرم راج پسر کلاں نے اس جگہ تعمیر دیول کا حکم دیا اور عمارت ہیتی دیول تعمیر ہوئی اس کا معمار "ولشوکرم" تھا۔

اصل دیول نقشی پتھر اور نصف چونے اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو مرتبہ اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس دیول سے متصل جانب مشرق ایک چٹان بھی اس زمانے کی موجود ہے۔ جانب جنوب ایک باؤلی ہے جس کے پانی سے مشہور ہے کہ ہڈی گل جاتی ہے۔ بیج کی پیداوار اور جڑی بوٹی کے لئے یہ مقام مشہور ہے۔ زائرین و معتقدین مختلف اور دور دراز مقامات سے ہر سال پچیس ہزار سے زیادہ آتے ہیں۔

معاش:- بہ موضع پرلی جاگیر تعلقہ بسمت نگر میں واقع ہے۔ انعامات تعلقات جینور و ہنگولی میں ہیں۔ یہ معاش عطیہ شاہان مغلیہ ہے۔ سند تانبے کے پتھر پر دی گئی ہے جو اب تک موجود ہے۔ علاقہ برار تعلقہ باسم سے ایک ہزار نقد معاش ہے۔ پیشوا نے ایک قیمتی ہار جڑاوی نذر دیا ہے۔

مسز عبدالقادر حسینی
(اورنگ آباد)

بوڑھا ڈاکٹر

بوڑھا ڈاکٹر برسات کی بچپچاتی ہوئی گرمی سے گھبرا کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ برسات کا آخر زمانہ تھا جس طرح ہر موسم کے بدلنے سے پہلے فضا بہت سہانی ہو جاتی ہے اسی طرح آج بھی تھی۔ باہر صحن میں وہ ہوا میں ایک ہلکا پن محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا جس طرح بڑھاپے کی آمد سے پہلے سر میں کہیں کہیں سفید بال بھلے معلوم ہوتے ہیں اسی طرح سردیوں سے پہلے کا یہ موسم بھی بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ اور اس اچھے طریقہ سے ٹھٹھرا دینے والے جاڑے کی آمد سے انسان کو خبردار کرتا ہے۔

بادلوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے بارش کی آمد کی خبر دے رہے تھے۔ برسات کے آخر میں بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بہت ہوتی ہے۔ آج بھی بجلی گھڑی گھڑی چمک رہی تھی۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ کل بارش ضرور ہوگی۔ بارش ہونے سے پہلے معلوم نہیں کیوں اس کے کندھے میں ہلکا سا درد ہوتا تھا۔ آج بھی اسے وہی پرانی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے برسات میں باہر جانا اس کے لئے بہت مضر ثابت ہوتا تھا۔ وہ اکثر خوشگوار موسم میں بھی شام کو بہت تھکا ہوا رہا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی مضبوط جوان ڈاکٹر گاؤں میں اس کی جگہ لے لے۔

وہ دن قریب آ رہے تھے جب اس کو کام بالکل چھوڑ دینا پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ گھر بیٹھ جائے وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کی جگہ لے لے تاکہ گاؤں کے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ شہر سے ڈاکٹر کو بلانا بہت مشکل تھا۔ اور لوگ بھی ایسا ڈاکٹر چاہتے تھے جس سے وہ اچھی طرح واقف ہوں۔ ایک نیا ڈاکٹر چند روز ہوئے گاؤں میں آ کر رہا تھا۔ شاید آہستہ آہستہ لوگ اس سے مانوس ہو جائیں۔ مگر فی الحال اس کی لیاقت پر بھروسہ کرنا مشکل تھا۔

بڈھا ڈاکٹر پتھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ سگریٹ پیتے ہوئے ڈاکٹر خورشید (نئے ڈاکٹر) کے متعلق سوچنے لگا۔ چند مہینے ہوئے کچہری کے ایک افسر (سراج الدین) کے ساتھ وہ شہر سے آیا تھا۔ ان کی صرف ایک بچی تھی جس کے متعلق خورشید نے کہا تھا کہ اسے گٹھیا کا مرض ہونے کا خطرہ ہے۔ جب سے ان کی بیوی اس سے بہت خفا تھیں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر خورشید کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھیں۔ مگر خود سراج الدین نے ڈاکٹر خورشید سے فرمائش کی تھی کہ وہ بچی کا خیال رکھا کرے۔ کیونکہ وہ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔

" وہ ہم کو بہت پیاری ہے اگر اس کو کچھ ہو گیا تو ہماری زندگی تباہ ہو جائے گی"۔ سراج الدین نے کہا۔

ڈاکٹر خورشید بڈھے ڈاکٹر کے ساتھ بہت عزت سے پیش آتا تھا۔ اسی لئے اور بھی بڈھے ڈاکٹر کو وہ بہت پسند تھا۔ " یہ مت سمجھئے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں اس لئے شہر میں کسی ہسپتال میں مجھے جگہ نہیں ملی۔ بلکہ وہاں اتنے سارے مریضوں کا چارج ہم کو ایک دم سے مل جاتا ہے کہ ہم ان کو بے جان تصور کرنے لگتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس سے تجربے میں بالکل اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں گاؤں میں آ گیا ہوں"۔

بڈھے ڈاکٹر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور کہا کہ

اسے اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ ایک جوان ڈاکٹر چند روز میں اس کی جگہ کے لئے تیار ہو جائے گا۔

ان چند مہینوں کے اندر وہ ڈاکٹر خورشید سے بہت دفعہ مل چکا تھا اور اس کو یہ معلوم کرکے اطمینان ہوتا تھا کہ گاؤں کے اکثر لوگوں نے اسے بلانا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ وہ دن قریب آرہے ہیں جب وہ آرام سے گھر میں بیٹھ سکے گا۔

بڈھا ڈاکٹر جلے سگریٹ آخری حصہ صحن میں پھینک کر اندر چلا گیا۔ جب وہ صبح کو اٹھا تو زمین بالکل تر تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ آسمان کالے بادلوں سے بالکل ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ سماں ایسا تھا کہ چند گھنٹوں میں موسلا دھار بارش ہونے والی ہے۔ بڈھا ڈاکٹر دل ہی میں کہنے لگا "خدا کرے آج مجھے کہیں جانا نہ پڑے ورنہ مر ہی جاؤں گا۔ کچھ ایسی بات ہو جائے کہ آج کوئی بیمار نہ پڑے۔"

دس بجے کے قریب وہ خط لینے کے لئے ڈاک خانے گیا۔ سڑکیں کیچڑ سے دلدل بنی ہوئی تھیں۔ راستہ چلنے والوں کے پاؤں ٹخنوں تک کیچڑ میں دھنسے جا رہے تھے۔ ڈاک خانہ اس کے گھر سے صرف دس قدم پر تھا۔ مگر وہ واپس آیا تو تو اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔ ہوا اس قدر ٹھنڈی تھی کہ خون جما جا رہا تھا۔ گھر آکر اس نے دریافت کیا کہ اسے کوئی بلانے تو نہیں آیا تھا۔ کیونکہ ایسے ہی وقت میں لوگ زیادہ بیمار پڑتے ہیں ایک تو موسم کی خرابی دوسرے برسات میں وہ زیادہ تر گھر سے باہر نہیں نکل سکتے کچھ کام نہ ہونے کی وجہ سے معمولی بیماری اور درد بھی بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اور بے ضرورت ڈاکٹروں کو تنگ کرتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ برسات میں لوگ زیادہ تر وہم کی بیماری میں مبتلا رہتے ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال سراج الدین کی بچی کی طرف گیا۔ اگر اسے آج کچھ ہوا تو ڈاکٹر خورشید اسے دیکھنے جائے گا انھوں نے اسے ہی اس بات کی تاکید کی تھی۔ دوپہر کو اسے خیال ہوا کہ آج کسی کو بھی کچھ نہ ہوگا۔ مگر تین بجے کے قریب ایک آدمی گھبرایا ہوا آیا۔ "آپ کو نجم الدین صاحب بلا رہے ہیں"۔

"کیا بات ہے کس کی طبیعت خراب ہے"؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "ان کے لڑکے نے اپنی ٹانگ توڑلی ہے باغ میں کھیل رہا تھا۔ ایک پتھر کو سرکانے لگا وہ سرک کر اس کی ٹانگ پر آگرا جلدی چلئے خون بہت بہہ رہا ہے۔"

"ہاں تم چلو میں ابھی آیا۔" ڈاکٹر نے کہا

اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی بڈھا ڈاکٹر رنجیدہ ہوکر سوچنے لگا کہ اس کی ٹانگ بھی آج ہی ٹوٹنی تھی معمولی موچ ہوتی تو ایک دن کے لئے رک سکتے تھے۔ مگر اب تو جتنی جلد ہو سکے وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ نجم الدین کا گھر وہاں سے پانچ میل تھا۔ اور ڈاکٹر خورشید کے گھر سے صرف دو میل۔ ڈاکٹر خورشید کو کیوں نہیں بلاتے"؟

"وہ کہتے ہیں کہ بارش بہت ہو رہی ہے وہ بغیر سواری کے نہیں آسکتے۔" نوکر نے کہا۔

"اچھا تم چلو میں آیا۔ تم جب تک بچے کی ٹانگ گرم پانی سے اچھی طرح دھو۔ اس طرح کہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ پھر سلا دینے کی کوشش کرو۔ میں جتنی جلدی ہو سکے آنے کی کوشش کروں گا۔"

ڈاکٹر نے گرم مفلر اچھی طرح گلے کے گرد لپیٹا گرم کوٹ اور اور اس پر برساتی پہنی۔ اور گھوڑے پر سوار ہوکر چل کھڑا ہوا۔

راستے میں ہی اندھیرا ہونے لگا تھا مگر گھوڑا بغیر ٹھوکریں کھائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر خورشید کے متعلق سوچنے لگا ایسا ڈاکٹر کس کام کا جو موسم کی خرابی کا عذر کرکے مریضوں کو دیکھنے نہ جائے۔ ڈاکٹر کو اس کی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا اسے یہ سوچ کر راحت ہوتی تھی کہ گاؤں میں کوئی اس کی جگہ لینے کو آگیا ہے۔ اس کو خبر نہیں تھی کہ وہ کتنے دن کا مہمان ہے۔ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی اس کے کانوں میں گھسنے لگی۔ اس وقت اس کو اپنی کمزوری کا بہت احساس ہو رہا تھا۔

برسات میں رات بھی جلدی ہو جاتی ہے۔ ابھی وہ آدھا راستہ بھی پار نہ کرسکا تھا کہ اندھیرے کی وجہ سے کچھ سجھائی نہ دینے لگا۔ اسے کچھ لوگ سڑک صاف کرتے ہوئے دکھائی دئے۔ "میری واپسی تک یہ سڑک بالکل ٹھیک کر دینے کی کوشش کرو۔" اس نے ایک سے کہا۔

"کیا آپ ہیں ڈاکٹر صاحب؟ ہم یہ بڑی سڑک جب تک ضرور ٹھیک کر دیں گے۔ اور ڈاکٹر خورشید بھی آپ کے پیچھے آرہے ہیں"

بڈھے ڈاکٹر نے جب یہ سنا تو اس کو بہت حیرت ہوئی اور امید کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔ ڈاکٹر خورشید کا گھر وہاں سے بہت دور تھا۔ ڈاکٹر نے دل ہی میں اس کی ہمت کی داد دی۔ بارش کیچڑ اور اندھیرے کے مارے راستہ چلنا دشوار تھا۔ "شاید سراج الدین کی لڑکی کو دیکھنے جارہا ہے۔" اس نے سوچا۔

اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر اس سے جاملے۔ وہ اس کے قریب تھا۔ "آپ کہاں جارہے ہیں۔" ڈاکٹر خورشید نے پوچھا۔

"نجم الدین کے پاس ان کے لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔" بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے تم کو بلایا تھا۔"

"جی ہاں بلایا تھا ان سے تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ اب سراج الدین صاحب کی لڑکی بیمار ہے وہاں جانا تو ضروری ہے"

"ہاں وہاں ضرور جاؤ ان کی ایک ہی بچی ہے اگر وہ مرگئی تو بہت برا ہوگا۔" بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔

"اگر معاملہ نازک ہوا تو آپ کو بھی آنا پڑے گا۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"میرا اس بچے کے پاس رہنا زیادہ ضروری ہے۔" بڈھے ڈاکٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"وہاں تک پہنچنا دشوار ہے۔ راستے میں دلدل میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے ورنہ بچے کی ٹانگ بیکار ہو جائے گی۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب آپ کا رات کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔ سویرا ہونے تک ٹھیرنا پڑے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے آج رات میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔" بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔ "اور تم بھی نہیں رک سکتے۔ بچاری بچی کی جان خطرے میں ہے۔"

"مگر ہمارا ان تک پہنچنا بھی ناممکن ہے۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔ بوڑھا ڈاکٹر ہنسا اور کہنے لگا۔ "جب خدا اتنے برے موسم میں معصوم بچوں کو اتنی تکلیف دے سکتا ہے تو ہم بھی ان تک پہنچ سکتے ہیں۔" اور کچھ کہے بغیر گھوڑے کی باگ سنبھالی اور چل کھڑا ہوا۔ "ٹھیرئے میں بھی ساتھ چلوں گا۔" ڈاکٹر خورشید نے پکارا۔

بڈھے ڈاکٹر نے اسے بھی پیچھے بٹھالیا "جب گھوڑا

گرنے لگے تو ایک دم سے کود جانا۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کی باگیں تھامیں۔ اور چل پڑا۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ بارش اور ہوا کی تندی کی وجہ سے گھوڑے پر توازن قایم رکھنا دشوار تھا۔

"یہ اچھا ہے کہ ہوا چل رہی ہے بادلوں کو اُڑا لے جائے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔" کانوں کو اچھی طرح ڈھکا ہے یا نہیں؟

ہاں ڈھک لیا ہے۔ میں ساتھ چائے لایا ہوں آپ پئیں گے؟

"اتنی ہوا اور بارش میں سے گذرتے ہوئے چائے پینا مضر ہے۔" بڈھے ڈاکٹر نے کہا" نجم الدین کے پاس جاکر پئیں گے۔"

ڈاکٹر خورشید خشک ہنسی ہنسا۔" ہم آج رات تو کہیں بھی نہیں پہنچ سکیں گے"۔

"پھر تم آئے کیوں"؟ بڈھے ڈاکٹر نے ذرا ترشی سے کہا۔ جہاں تک آپ چلیں گے میں ساتھ چلوں گا۔ ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"اچھا تو چلو نجم الدین کے پاس"

آخر دلدل میں گھوڑا ڈگمگانے لگا۔ بارش خوب زور سے ہو رہی تھی۔ سردی کے مارے گھوڑا بھی کانپ رہا تھا۔ بوڑھے ڈاکٹر نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور ایک پُرانا ٹاٹ اور کمبل جو ساتھ تھا اسے اڑھایا۔ اور دونوں پیدل چلنے لگے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ڈاکٹر خورشید نے کہا" اب اُجالے کا انتظار کریں تو بہتر ہے۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرا نجم الدین کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

ڈاکٹر خورشید نے آہستہ سے کہا" عجیب آدمی ہے۔ مگر کیسے جائیں گے کیا اُڑ کر پہنچیں گے۔"

"نہیں چلیں گے۔ تم آج تک دلدل میں نہیں چلے؟

"نہیں۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

تو اس بات کا خیال رکھو کہ پاؤں آہستہ سے مگر مضبوطی کے ساتھ زمین پر رکھو۔ گھبراؤ نہیں زیادہ مشکل نہیں پڑے گی۔ مگر جلدی جلدی چلنے کی کوشش نہ کرنا۔" پھر بوڑھا ڈاکٹر ذرا سوچ کر کہنے لگا" یا تم یہیں ٹھیر جاؤ۔"

"نہیں میں چلوں گا۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

بارش کسی طرح رُکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ان دونوں کے جوتوں کے ساتھ منوں مٹی چمٹ گئی تھی جس سے چلنا اور بھی دشوار تھا۔ سردی کے مارے ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ گئی تھیں۔ بوڑھا ڈاکٹر خاموشی سے آگے آگے چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد ڈاکٹر خورشید ہانپنے لگا۔ ننگے پاؤں چلنا زیادہ بہتر ہے میرے جوتے بہت بھاری ہوگئے ہیں۔" اس نے کہا۔" ننگے پاؤں چلنا بہت خطرناک ہے" بوڑھے ڈاکٹر نے کہا۔

ڈاکٹر خورشید کو اس سے تسلی نہیں ہوئی وہ بیدلی سے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ ابھی بہت دور نہ گیا تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ ایک گڑھے میں گر گیا جو کیچڑ اور پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اور بے بس ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

(باقی آیندہ)۔

معتصمۃ الرحمن

نذرالاسلام اور میرے دوست

میرے دوست حضرت اشک نے بنگالی زبان کے مشہور شاعر قاضی نذرالاسلام کے متعلق ایک دلچسپ نوٹ لکھا ہے جو سب رس میں شایع ہوا۔ چونکہ اس میں ایک خاص قسم کا اثر ہے' جو ہر پڑھنے والے کے دماغ پر پڑتا اور نذرالاسلام سے متعلق اُسے تذبذب میں ڈالدیتا ہے' اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک علمی رائے کو جو ایک خاص انداز سے قائم کی گئی ہے' اور جو نذرالاسلام جیسے بلند پایہ شاعر کی حد تک محدود نہ ہونی چاہیے اقتضائے حال کے مطابق کچھ آگے بڑھاؤں۔

جس وقت حضرت اشک نے کسان کے سر پر جگمگاتا ہوا تاج دیکھا' اور عدم مساوات کی اگلی سی محفل گرم پائی' اور جس وقت آپ کے سامنے نذرالاسلام کی شاعری اور ان کے دوست کی تحسین ایک علامت استفہام بن گئی' وہی درحقیقت ایک معرکے کا وقت تھا۔ وہی بلند ساعت تھی جب کہ وقت کے بہتے ہوئے دھارے میں نذرالاسلام کا پیغام پہلی دفعہ کامیاب ہوا تھا۔ اس وقت میرے دوست کو یہ دیکھنا چاہیئے تھا کہ زمانے میں ایسا کون انقلاب آیا کہ شہنشاہیت، امارت، نااتفاقی، تحقیر و تکبر اور عدم مساوات کی دنیا تھوڑے دنوں کے لئے غریب انسانوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے؟ اس پر کس طرح ایسے انسان قابض ہوگئے جو مدتوں سے حق و صداقت' اور سچی محنت کی نمایندگی کر رہے تھے' اور جن کو زمانے نے زبردستی ٹھکرا کر مظلوم و بیکس بنایا تھا' جن کی عظمتیں دولت اور استبداد کے ہاتھوں پامال ہو رہی تھیں اور جن کی اہمیتوں کو مدتوں سے زمانہ تسلیم نہیں کر رہا تھا؟ انھیں مدہوش ہو جانے کی بجائے دیکھنا چاہیئے تھا کہ غلط تعبیروں کی دنیا میں کیا طوفان تغیر آیا ہے اور اب کس طرح چیزیں اپنی اصل روشنی میں جگمگا رہی ہیں؟

تاج کوئی نمایش کی چیز نہیں، بلکہ درحقیقت وہ انسانیت کی فلاح و بہبود، امن و اتحاد، حق و انصاف کی ایک درخشاں اور باعظمت اور قابل احترام نشانی ہے۔ بادشاہ کے سر پر ہو یا کسان کے سر پر' انسانیت نے اس وقت تک اس کی عزت کی جب تک یہ امن و انصاف کا کفیل بنا رہا' اور جب کبھی اس میں کوئی کمی ہوئی' ایک نذرالاسلام پیدا ہوا اور اس نذرالاسلام نے اُسی تاج کو دوسرے شخص کے سر پر رکھ دیا جو اس وقت انسانیت کے ایک کثیر حصے کی نمایندگی کر سکتا تھا۔ مصر و بابل کی تاریخ تمدن سے لے کر آج تک کئی نذرالاسلام پیدا ہوئے۔ میرے دوست کے مشاہدے کے وقت جب کسان کے سر پر تاج آگیا تو یہ انسانیت کی مظلوم آواز اور بیکسوں کی اُن دعاؤں کا نتیجہ تھا جو شاعر نذرالاسلام کی زبان سے ادا ہوتی رہتی۔ کسان کے بادشاہ بن جانے کے یہ معنی نہیں ہیں' جس طرح میرے دوست نے خیال فرمایا ہے کہ وہ جبر و اختیار دولت اور زمین کا مالک بن گیا' بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ محنت اور حقیقی عظمت نے اعتبار اور تسلیم کا وہ بلند ترین مقام حاصل کر لیا ہے جو اس کا پیدائشی حق ہے اور جو مدتوں تک اس سے غصب کیا جاتا رہا۔ کسان اور مزدور کی یہ فتح حق و صداقت کی فتح اور سرمایہ داری کی شکست' نادار ظلم اور فوقیت کی شکست ہے۔ یہ تھوڑے ہی دنوں کے لئے حاصل کیوں نہ ہو' وقت اور زمانہ ان مبارک

ساعتوں پر صدیوں تک نازکرتا رہے گا۔

نذرالاسلام درحقیقت اسی نہج کا آرزومند ہے۔ وہ عظمت اور صداقت کو اپنے اصل مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں وہ انسان کی بلند ترین تمناؤں کی نمایندگی کررہا ہے جو حالات زمانہ کے لحاظ سے ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسا انقلاب چاہتا ہے جو سیلاب کی طرح آئے اور ایک کافی مدت تک دنیا کو خس وخاشاک سے پاک کردے۔ وہ یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ اس کی کسی تمنا کو بقائے دوام حاصل ہورہا ہے یا نہیں، کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ کائنات میں دوام درحقیقت تغیر کا دوسرا نام ہے۔ ہمیشہ کے انقلاب اور تغیر کو ازل اور ابد کہتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی ایک تغیر ہے، بلندسے پست، اور پست سے بلند۔ ہماری دوسری زندگی بھی شاید اس نشیب وفراز سے معمور ہو! جو شاعر پستی سے ابھر کر بلندی کا پیغام دے، اسے یہ کہکر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے بعد پھر پستی ہوگی۔ غلام یہ سمجھ کر آزادی کا طالب نہیں ہوتا کہ اسے پھر ایک نہ ایک دن غلام ہونا ہے۔ اس خیال کی یہ مثال ہوئی کہ ہم سمندر کی عظمت کو صرف ان موجوں کے ذریعے جانچیں جو ابھرتی ہیں، اور جو گرگر کر پھر بلند ہونے کی طاقت رکھتی ہیں انھیں سمندر سے علحدہ کوئی چیز قرار دیا جائے۔ دریا کا اتار چڑھاؤ مکمل دریا ہے۔ نہ اتار ہے اور نہ چڑھاؤ!

میرے دوست نے براہ راست تو نہیں لیکن لگے لپٹے اپنے نوٹ میں شاید اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بلند ترین شاعر وہ ہے جو ازل اور ابد کے راگ گائے محبت اور فطرت کے نغمے الاپے، عشق اور حسن کے دریا میں غوطے لگائے۔ چونکہ ان کے نزدیک نذرالاسلام تخریب، انقلاب، زلزلہ، آگ، بھونچال، سیلاب، بغاوت اور جہاد کا ذکر کرتا ہے، اس لئے وہ بلند پایہ شاعر نہیں ہے۔ یہاں میرے دوست سے یہ عرض کرنا ہے کہ بعض بلند ہستیاں تصورات سے نہیں حقائق سے بحث کرتی ہیں اور جانچی بھی جاتی ہیں۔ حقیقت خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو تصور کے مقابلے میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے حقیقت کا درجہ ازل اور ابد کی موہوم فضا سے زیادہ بلند ہے۔ گلشن کے نغمہ سرا، دور خزاں میں رہ کر بہار کے ترانے نہیں گاتے، بلکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہار ایک عارضی چیز ہے، اسی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ خیام اور حافظ کی ترنگیں یہی آواز دے رہی ہیں کہ ایک ساعت کی موجودہ خوشی، موہوم نعمتوں کی صدیوں سے زیادہ مغتنم ہے۔ جب اقبال کہتا ہے۔ لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را۔ جب غالب دعوت پکارتا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

تو ان سب میں دراصل نذرالاسلام کی روح بول رہی ہے وہی حقیقت پرستی وہی دعوت انقلاب وایثار و آزادی۔

آپ دیکھئے تصورات کی دنیا، حقیقت کی دنیا سے بالکل الگ چیز ہے۔ جو لوگ تصورات کی دنیا میں گم رہتے ہیں وہ درحقیقت انسانیت کے ایک جز پر حکومت کرتے ہیں۔ اگر ایک زخمی شخص سے یہ کہہ دیا جائے کہ وہ آیندہ صحت کا تصور کرتا رہے اور اپنے زخم پر کوئی مرہم نہ رکھے تو اس کا صحت مند اور مطمئن ہونا معلوم۔ آفتاب گو زمین سے بہت بلند ہے اور ہمیشہ درخشاں ہے، لیکن مغرب کے

بعد جب وہ ہم سے جدا ہوتا ہے تو آفتاب نہیں رہتا، ہم اپنے آپ کو آفتاب سے دور محسوس کرتے، تاریکی دیکھتے اور صبح کا انتظار کرتے ہیں۔ جب تاریکی سے اجالا پھیلتا ہے تو صبح کا لطف آتا ہے اور ہر صبح تازہ دکھائی دیتی ہے۔ نذرالاسلام بھی ایمان بالغیب رکھنے کے ساتھ ساتھ رہتی دنیا کا پرستار ہے، وہ شدت کے ساتھ حقیقت پرست ہے، وہ افلاس، غربت، بے حسی، بدنفسی کی دنیا میں رہ کر ازلی محبت، ابدی حسن، معشوق، جبرئیل، میکائیل، جنت بلکہ خدا کے تصور کو تھوڑی دیر کے لئے ایک دور کی چیز سمجھتا ہے۔ وہ انتقام چاہتا ہے۔ ایسا انتقام جو ہمیشہ برائیوں کا سر کچل دے اور نیکی کو فتحمند بنائے۔

ہم قدرت کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ ہم پر حکومت کرتی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ ہم اس کے پراسرار قوانین کے سامنے گر جائیں اور اپنی انفرادیت گم کردیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو قدرت کو ہمیں پیدا کرنے میں اتنی زحمت اٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟ اس اسپرٹ کو آپ الحاد کہیئے یا جذبۂ انتقام، یہ نذرالاسلام کی اسپرٹ ہے۔ وہ خدا کو غلاموں کا آقا نہیں سمجھتا، بلکہ وہ زندہ اور باکمال اور اس کی طرح ترقی پسند انسانوں کا پیدا کرنے والا سمجھتا ہے۔ وہ ایسے خدا کو مٹا دینا چاہتا ہے جو انسان سے، ہر چیز سے احساس آزادی مٹا دے۔ اس کا دوسرا نام "آزادی" ہے۔ اس آزادی کے لئے وہ ہر چیز کی قربانی چاہتا ہے اور اس انقلاب کو پکارتا ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کی مدد کی ہے۔ وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ برائی پھر پیدا ہوگی۔ اس کا کلام ہمیشہ انسانوں کو آزادی، انقلاب اور انتقام کی دعوت دیتا رہے گا، اور ہمیشہ ہمیشہ یہ بتاتا رہے گا کہ انسان فطرتاً ایک مجاہد، ایک مرد غازی ہے جو قدرت کی ہر چیز اور برائیوں کی ہر کوشش سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ اس اعتماد پر کہ خدا نے اس میں آزادی کے حصول اور اس سے کام لینے کی جو صلاحیتیں دی ہیں وہ کائنات سے زیادہ مغتنم ہیں۔ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے تیار ہو جاتا ہے، خواہ اس قربانی میں موجودہ انسانی زندگی کا سارا انتظام ہی کیوں نہ بگڑ جائے اور چاروں طرف سے موت ہی موت کیوں نہ نظر آئے۔ یہ ہے نذرالاسلام کا دوام یہ ہے اس کی اہمیت اور یہ ہے اس کا پیغام! اس "نعرۂ بے باک" کی نظیر ادب میں شاید مشکل ہی سے مل سکے۔

جو لوگ فرط محبت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں۔ اب یہ زمین اپنے کو انہیں کے سپرد کر دی گی۔ میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن میں یہ خاک پاک لپٹ گئی ہے آج مظلوموں اور بے کسوں کے خون میں رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا اب تمام پابندیوں اور بندشوں کو پھینک دو۔ فلک کج رفتار کو چاہئے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے ہمارے سر پر چاند اور ستارے پھول بن کر برس پڑیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

اردو کی نئی کتابیں

(۱) بغداد کا جوہری (افسانہ) از اشرف صبوحی دہلوی قیمت عمہ پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

(۲) آدم خور (آدم خواروں کے حالات) از مرزا عظیم بیگ چغتائی قیمت عہ پتہ دفتر کتابت۔ جودھ پور

(۳) شہدا (کربلا کے واقعات) از مرزا فدا علی خنجر حجم ۱۶۲ صفحات قیمت ۱۰ر پتہ مرزا محمد احمد۔ منصور نگر۔ لکھنو

(۴) یورپ کی حکومتیں از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری و مظہر انصاری حجم ۲۱۶ صفحات قیمت عہ پتہ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

(۵) پریمی (افسانے) از راحت آرا بیگم۔ حجم ۱۲۸ صفحات قیمت عمہ پتہ از مصنفہ معرفت کامرشیل بینک کلکتہ۔

(۶) کشتگان فریب (افسانہ) از حاجی نبی احمد حجم ۱۶۵ صفحات ۸ر مرتبہ از مصنف۔ درزی چوک بریلی

(۷) شب کی بکا۔ (افسانے) از راحت آرا بیگم حجم ۱۲۰ صفحات پتہ تاج کمپنی۔ لاہور

(۸) غنچہ افسانہ " " " " " " ۱۶۰ " " " " " " "

(۹) بانسری کی آواز " " " " " " ۱۶۰ " " " " " " "

(۱۰) سائنس کی انوکھی کہانیاں از ڈاکٹر محمد قدرت خدا حجم ۳۰۴ صفحات قیمت ۱۲؍ پتہ ماڈرن بک ایجنسی۔ کالج اسکوائر کلکتہ

(۱۱) کلام الملوک (بہمنی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کا کلام) مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے حجم ۱۱۲ صفحات پتہ سب رس کتاب گھر حیدرآباد

(۱۲) ۱۰ امان ہند کی حیات سیاسی از محمد مرزا دہلوی حجم ۲۵۶ صفحات قیمت عہ پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

(۱۳) حسینؑ ابن علیؑ (امام حسینؑ کی نفسیاتی حیثیت) از نکہت شاہجہاں پوری قیمت ۸ر پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار۔ لاہور

(۱۴) خبطی (ناول) از محمد علی واحدی قیمت ۸ر پتہ انوار بکڈپو۔ لکھنو

(۱۵) آزادی کی نظمیں مرتبہ سید سبط حسن اڈیٹر نیا ادب قیمت عمر پتہ حلقۂ ادب۔ مال روڈ۔ لکھنو

(۱۶) محبت کے افسانے (چند عشقیہ مقالوں کا مجموعہ) از الطاف حسین رشدی پتہ محمد سعید خاں آزاد۔ جامع مسجد بیاور (راجپوتانہ)

(۱۷) اصطلاحات پیشہ وراں (دس پیشوں کی اصطلاحیں) از ظفر الرحمن حجم ۲۳۷ صفحات قیمت عہ پتہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

(۱۸) ہندوستان میں برطانوی حکومت (حکومت کے اقتصادی پہلو اور اس کے مالی حالات) از ڈاکٹر زین العابدین احمد قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

(۱۹) مسلمانوں کی تعلیم از ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری قیمت ۸ر پتہ از مصنف ابرار منزل مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ

مرزا سیف علیخاں

کیا آپ مہذب ہیں؟

یہ ہماری فکر اور ہمارے غور کی کم مائگی کا ایک واقعی ثبوت ہے کہ روزانہ بول چال میں ہم بعض ایسے الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ جن کے حقیقی معنوں سے ہم بالکل نا واقف ہوتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ وہ اس دور میں اس کثرت و شدت سے برتے جاتے ہیں، شائد اس سے قبل وہ کبھی نہ ہوئے تھے۔

آپ یقین مانئے کہ عہد قدیم میں جس کو ہم مذہبی جنون کا ایک دور سمجھتے ہیں خدا، دین یا شیطان کے الفاظ اس دیوانگی سے استعمال نہیں کئے جاتے تھے جس فراخدلی سے ہم آج مہذب، تمدن، وطن، کلچر، مساوات، آزادی، اخوت، حریت، نیچر، محبت، ادب، آرٹ اور نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔ اگر اس زمانے کے اخبار و رسائل کو خواہ وہ کسی زبان میں شایع ہوتے ہوں اکٹھے کیجئے اور اُن سرخیوں پر نظر دوڑائیے جن کے برتنے پر ان کی اشاعت ہے تو یقیناً آپ میرا منشا سمجھ جائیں گے۔ یہ سرخیاں جو حقیقت میں عوام کے رجحانات کا عکس ہیں، جتنی بے معنی ہوں گی اسی قدر جاذب نظر اور پر جوش بھی۔ اور اسی نسبت سے قابل مدیر کی بلند پروازی کا ثبوت ہوں گی۔ یہ سب اس لئے ہے کہ ہم روزانہ زیادہ سہل نظر بنتے جا رہے ہیں۔ سماج میں سطحیت کی ہر روز مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ اور ہم نے زندگی کی مصروفیتیں اتنی سر سے اونچی کر لی ہیں کہ ہمارے یہاں کسی بات پر سوچ بچار کے لئے وقت نہیں ہے۔ پھر بازار میں تیار اور ریڈی میڈ اشیاء کی اتنی فراوانی ہے، اور بے چارے خریدار کو اس قدر کم فرصت ہے کہ وہ مشکل سے ان کو پرکھ سکتا ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ مارکٹ میں ان تجارتی نمائندوں اور مہذب ایجنٹوں کی کمی نہیں جو ہر فرسودہ مال کو ناتجربہ کار گاہکوں کے آگے "اصلی" کہہ کر ٹھونستے جاتے ہیں۔

اور باتیں تو چھوڑئیے تہذیب و تمدن کا مفہوم جتنا مبہم ہمارے ذہن میں ہے اسے دیکھ کر بعض وقت تو مجھے ان الفاظ کے بامعنی ہونے پر ہی شبہ ہونے لگتا ہے۔ فلاں شخص مہذب ہے یا فلاں سوسائٹی مہذب ہے جس سے عموماً ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ اس فرد یا افراد کے گروہ میں بعض ایسے قوانین کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے، جن کو ایک مقام اور ایک زمانے کے انسانوں نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔ اور ان سے عمداً یا سہواً انحراف کرنے والا بد تہذیب اور غیر مہذب۔

ان معنوں میں اگر تہذیب ہے تو وہ کسی میونسپل کارپوریشن یا مجلس وضع قوانین کے دستور العمل سے زیادہ ہماری نظروں میں وقعت نہیں رکھے گی۔ اور نہ اس کے تصنع کی بابت کوئی شبہ کیا جا سکے گا۔ میں نے سنا ہے کہ مغرب میں بعض ایسے کلب ہیں۔ جو اپنے مخصوص قواعد و ضوابط رکھتے ہیں۔ جب تک آپ وہاں ہیں، اُن کے پابند ہیں۔ اور اگر آپ نے انہیں دیدہ و دانستہ توڑا یا ان کی خلاف ورزی کی تو ممبری سے خارج کر دئے جائیں گے یا کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

ٹھیک یہی حال مجھے ہماری مہذب سوسائٹیوں کا معلوم ہو رہا ہے جہاں یہ ایک بدبختی ہے کہ ان سے انحراف کی صورت میں آپ کا نام تو خارج نہیں کیا جاتا لیکن نام نہاد شرکار کے نشانِ ملامت ہونے کا جرمانہ ضرور ادا کرنا ہوتا ہے۔

اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ مہذب گروہ جو اپنے سوائے تمام سترپوش افراد کو برہنہ تصور کرتا ہے۔ خواہ مخواہ آپ کو اپنی سوسائٹی کا ممبر سمجھتا ہے۔ ایسی تہذیب جو محض چند اشخاص کی پسند ناپسند کی پیداوار ہو جتنی بھی کم پائدار سمجھی جائے بجا ہے اور جس قدر بھی عجائبات سے پُر ہو مناسب ہے۔

اسی تہذیب کے چند مترادف شائستگی فیشن کلچر اور انسانیت بھی ہیں۔ شائد کوئی ادیب یا ماہر عمرانیات یہ کہہ بیٹھے کہ میں الفاظ کو غلط استعمال کر رہا ہوں۔ لیکن رونا تو یہی ہے کہ کچھ مجھے بھی ان الفاظ کے معنی کا علم ہے۔ گر کیا کیا جائے کہ لغت اور ادب میں کسی لفظ کا ایک مفہوم ہوتا ہے لیکن مہذب دنیا اس کو انہی معنوں میں استعمال کرنے کی نہ تو پابند ہے اور نہ مجبور کی جاسکتی ہے۔ اور جن معنوں میں وہ آج کل ان الفاظ کو استعمال کر رہی ہے۔ وہی میرا مبحث ہیں۔ مثال کے طور پر آج اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ وہ مہذب ہے یا غیر مہذب تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ وہ اس سوال بند کے مقابل "ہاں" یا "نہیں" درج کرتا جائے۔ اور پھر اس خانہ پُری کے بعد اس کے متمدن یا غیر متمدن ہونے کا انحصار "ہاں" یا "نہیں" کے تناسب پر منحصر ہوگا یقیناً یہ ایک عمرانیاتی سے زیادہ حسابی عمل ہے اور سادہ سہ اصولی مساوات پر مبنی۔ یعنی اسے دیکھنا ہوگا کہ

(۱) کیا اس کی شیروانی کی کاٹ وہی ہے یا تقریباً ویسی ہی ہے جو شام کے پانچ اور ۱۰ بجے رات کے درمیان عابد شاپ سے لیکر آل سینٹ جمنازیم ہال کی سڑک پر نظر آتی ہے (کالر کی اونچائی۔ کمر اور آستین و دامن کا محیط تصفیہ کن نقاط ہیں)

(۲) کیا اس کے بے داغ پاجامہ کی استری میں شکن تو نہیں ہیں۔ اور کیا پائچوں کا نچلا حصہ بوٹ کی ایڑی سے ہوتا ہوا لاپروائی سے سڑک جھاڑنے میں کوتاہی تو نہیں کرتا۔

(۳) کیا وہ سگریٹ کے دھوئیں سے حلقے بنا سکتا ہے۔

(۴) کیا وہ شام کے وقت ٹوپی پہننے کے دقیانوسی رواج کا عادی تو نہیں۔

(۵) کیا اس کی ٹوپی کی اونچائی ۲½ — ۳½ سے کم تو نہیں ہے اور عموماً اس کا زاویہ کیا ہوتا ہے۔

(۶) کیا خدانخواستہ اس کی آنکھیں چشمہ کے استعمال سے ناآشنا تو نہیں ہیں۔

سر کے بالوں کی نسبت دو مکتب خیال ہیں۔ اتنا تو شکر ہے کہ کم از کم دو نقاط نظر تو موجود ہیں۔ مثلاً

(۷) کیا اس کے سر کے بال لاپروائی سے بکھرائے جاتے ہیں (یہ طبقہ عموماً شاعر ہوتا ہے)

(۸) کیا اس کے بال نہایت جانفشانی اور اہتمام سے جمائے جاتے ہیں (یہ گروہ عموماً شاعر پسند ہوتا ہے)

(۹) کیا اس کو کسی "—" یا "—" کی کوئی چھبتی ہوئی نظم یاد ہے۔ اور کیا وہ اس نظم کو اسی لے اور ترنم میں دہرا سکتا ہے۔ یا اگر ضرورت ہو تو کیا وہ "خود اپنی" کوئی نظم سنا سکتا ہے۔

(۱۰) کیا اسے جو نظمیں یاد ہیں ان کے عنوان "وطن" "آزادی" "محبت" "عریانی" "اس سے خطاب" "جوانی" یا ایسے ہی مترادفات سے ملتے جلتے ہیں۔

(۱۱) وہ مہینے میں کتنے ڈرامے اور فلم دیکھتا ہے۔ اور کیا وہ کم از کم ان خواتین و حضرات سے واقف ہے۔

سانیال، سہگل، موتی لال، بروا، نجم الحسن، اشوک کمار، سریندر، کنن بالا، آما، ملینا، جمنا، راج کماری، دیوکا رانی، سینا، مایا بنرجی، شانتا آپٹے۔ اور کیا وہ ان کے سوانح حیات ان کی اداکاری اور متعلقہ فلم کمپنیوں سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔ اور اگر ضرورت داعی ہو تو ان پر عالمانہ بحث کرسکتا ہے۔

(۱۲) آیا اس کو ہالی وڈ کی ڈائرکٹری از بر ہے۔ اور کیا وہ کسی فلمی رسالے کا باضابطہ خریدار ہے۔ یا کم از کم کبھی کبھی خرید لیتا ہے۔

(۱۳) کیا وہ مقامی نگار خانوں کی ہر تبدیلی سے قبل از قبل باخبر رہتا ہے۔ اور کیا مروجہ فلموں پر اس کی رائے سوسائٹی کے مذاق کا ساتھ دیتی ہے۔ اور کیا وہ آنے والے کھیلوں کے متعلق پیش گوئی کرسکتا ہے۔

(۱۴) کیا وہ ہر سال کرکٹ ٹورنمنٹ کا موسمی ٹکٹ خریدتا اور بلاناغہ تماشبینوں کے خیمے میں حاضر رہتا ہے (اس بارے میں کھیل کے حسن و قبح سے باعلم ہونے کی چنداں ضرورت نہیں) البتہ جب کبھی وہ چیرز دیتا ہے تو کیا اس کی تصفیق زیادہ مہذب شامیانوں کے ساتھ ہم پر اترتی ہے۔ یا نہیں۔

(۱۵) کیا وہ دنیا کے یا کم از کم ہندوستان کے اچھے کھلاڑیوں کے نام ایک سانس میں دہرا سکتا ہے۔ اور کیا اس کو معلوم ہے کہ اس موسم میں کس کا اسکور زیادہ رہا اور کس قدر۔

(۱۶) کیا وہ عموماً شام میں ٹینس کے مخصوص لباس میں نظر آتا ہے (کھیلتے رہنے یا کھیل سے واقف ہونے کی کوئی ایسی ضرورت تو نہیں البتہ ٹینس کے بلوں کے مختلف تجارتی نام اور ان کی قیمتوں سے باخبر رہنے کی شرط ضروری ہے۔)

(۱۷) کیا وہ ٹوئیڈ، ہنادا، سلک، سرج وغیرہ کی مختلف اقسام سے واقف ہے اور ان کے بازاری نرخوں سے کم و بیش واسطہ قریبہ رکھتا ہے۔

(۱۸) کیا وہ تاش کے تمام دلچسپ کھیل جانتا ہے۔

(۱۹) کیا وہ آرٹ، محبت، آزادی یا ایسے ہی مضامین سے متعلق برجستہ چٹکلے گھڑ سکتا ہے اور ان کو کسی بڑے آدمی سے موسوم کرسکتا ہے۔

(۲۰) کیا وہ ان الفاظ کا محل استعمال جانتا ہے
"عیش" "لطف" "زندگی" "محبت" "آزادی"

شاید یہ تفصیل آپ کی نظروں میں طویل ہوگئی ہو لیکن مجھے یقین ہے بعض احباب ابھی اس فارم میں شرائط کا اضافہ چاہتے ہوں گے اور سچ پوچھئے تو یہ فہرست مزید اضافہ کی اس لئے بھی محتاج ہے کہ سوسائٹی کے یہ غیر تحریر یافتہ ضوابط بہ تعداد کثیر ہیں۔ اور ان کا جاننا خود ایک مستقل "علم" ہے اور چونکہ اس باب میں میرا نقد علم نہایت کوتاہ ہے اس لئے اس فہرست کو تشنہ چھوڑتا ہوں اس خیال سے بھی کہ بچشم بددور اس میں آئندہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

مہندر راج سکسینہ

طرزِ نشاطِ زندگی

(The Character of a Happy Life) کا منظوم ترجمہ

حقیقت میں وہ کتنا خوش نصیب انسان ہے عباسؔ
نہ پہنا طوق جس نے اپنی گردن میں غلامی کا
رہا کرتا ہے جس کو زندگی میں راستی کا پاس
حوادث کے مقابل راست بازی جس کا ہے شیوہ

(۲)

رکھا کرتا ہے قابو میں سدا جو خواہشات اپنی
ہمیشہ جو رہا کرتا ہے مرنے کے لئے تیار
رہی جس کو امورِ دنیوی سے کامل آزادی
نہ رنجِ لعن و طعن اس کو، نہ حبِّ مال و زر زنہار

(۳)

چہ میگوئیوں سے لوگوں کی جس کو کچھ نہیں مطلب
ضمیر پاک اس عالم میں ہے جس کا بڑا رہبر
خوشامد کر کے کوئی جس سے لے سکتا ہے دولت کب
عدو و افلاس سے بھی فتح پا سکتا نہیں جس پر

(۴)

برائی سے کہ خوش بختی سے رتبہ جس نے پایا ہے
حسد اس پر نہیں کرتا نہ بیجا مدح کا حامی
دول کی جو سیاسی نت نئی چالوں سے کورا ہے
ہے نیکی کے طریقوں سے بخوبی جس کو آگاہی

(۵)

ہے شغلِ روز و شب جس کا عبادت حق تعالیٰ کی
عطیوں سے زیادہ ہے جو طالب فضلِ مولیٰ کا
صدیق منتخب کے ساتھ یا پڑھ کر کتاب اچھی
جو دن کی خاطریں یوں کر کے خوش کرتا ہے دل اپنا

(۶)

یہی انسان آزادی کا حامل ہو کے ہے خوشحال
امید اس کو ترقی کی نہ خوف اس کو تنزل کا
نہ رکھنے پر بھی کچھ شے ہے حقیقت میں وہ مالا مال
اراضی کا نہیں، ہے بلکہ اپنے نفس کا آقا

سید اسد اللہ عباسؔ

گُل بُوٹے

ہمارے ایک عزیز کو ساون کی کالی گھٹاؤں میں بڑے شکار کی سوجھی، کوئی چھ ہفتوں سے شکار پارٹی کی تیاری ہو رہی تھی، آخرکار جو دن مقرر ہوا تھا اس کے دو دن پہلے ہی سے جھڑی لگی ہوئی تھی، ہمیں بھی ساتھ چلنے کہا گیا، پانچ شکاریوں میں چھٹے ہم شکار دیکھنے والے تھے، بارش کی وجہ سے ہم کچھ اَن منانے لگے تو ہمارے عزیز کی بیگم صاحبہ کا ارشاد ہوا "آگ برسے یا اولے پڑیں ہمیں چلنا ہی ہوگا" اس "نادر شاہی" حکم کی اگر ہم تعمیل نہ کرتے تو ہماری عزیز بہن کے روٹھنے بگڑنے اور خفا ہونے کا ڈر تھا۔

اس تقریب میں ہماری بیچاری بارہ سال کی "منی" شبو رلیٹ بھی آفت میں مبتلا ہوئی، یہ غریب اس قدر بھیگی کہ اس کے نئے رنگ اور پرانی ٹاپ کی خاصی گت بن گئی، جانا تو بہت سویرے ٹھیرا تھا مگر ہم ناشتہ کر کے فرصت سے کوئی نو بجے نکلے، شکاریاں ہم سے پہلے نکل گئے تھے، راستہ بخیر و عافیت طے ہوا، جب شکار کے مقام سے قریب پہونچے تو دور ہی سے ہمارے عزیزوں کی موٹریں نظر آئیں، شکاری غائب تھے اور اور ہماری بہنیں "نادر شاہی" بہن کے پیچھے پیچھے کنٹہ پر چہل قدمی کر رہی تھیں، ان سے معلوم ہوا کہ شکاری شکار کی جستجو میں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہے ہیں۔

پندرہ بیس منٹ کی چہل قدمی کے بعد ہماری یہ شکار کی شوقین بہنیں تھک کر چور ہو گئیں اور چلیں مسافر بنگلے کی طرف! مسافر بنگلہ اس مقام سے کوئی پچاس ساٹھ قدم ہوگا، ہانپتی کانپتی بڑی مشکل سے وہاں پہونچیں، کوئی پلنگ پر لیٹ کر کراہنے لگیں اور کوئی آرام کرسی پر گر کر دونوں ہاتھوں سے سر دابنے! کسی نے پیر دبوانے شروع کئے تو کسی کی کمر پر چپی ہونے لگی!! کسی کے پیٹ میں درد ہونے لگا تو کسی کو نان ٹلنے کا شبہ ہوا!! غرض یہ کہ تھوڑی دیر کے لئے مسافر بنگلہ ہسپتال بن گیا۔ سب سے پہلے ہماری "نادر شاہی" بہن زمین کو لات مار کر اٹھ بیٹھیں اور چلیں کھانے پکانے کا انتظام کرنے باورچی خانے کی طرف! ان کا اٹھنا تھا کہ سب کی سب مارے ڈر کے اٹھ بیٹھیں اور لگیں ان کا ہاتھ بٹانے، اس اثنا میں باورچی نے مرغ کے سالن کو بگاڑ دیا تھا ایک بہن نے بڑی نفاست سے اس کو سدھارا، بگڑتے بگڑتے یہ سالن کچھ ایسا سنبھلا کہ آج تک بس زبان پر اس کا چٹخارہ رہ گیا!

اچھا ہوا کہ ہماری سب بہنیں خیر و خوبی سے بنگلے میں آگئی تھیں، کچھ ایسی موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ اگر وہ باہر رہتیں تو کیا عجب ہے کہ پانی اور ہوا کے زور سے کنٹہ میں جا پڑتیں، ہمیں تو ان کی صحت پر رشک آتا ہے، دن بھر اور سوتے دم تک دس بیس مرتبہ کریم اور پوڈر لگا جائیں مگر کیا مجال ہے کہ کبھی ہاتھ دکھنے کی شکایت کریں! واقعی صحت ہو تو ایسی ہو!!

بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے سب کی سب سہمی جا رہی تھیں، چلنا پھرنا تو کیا اپنی جگہ چپ بیٹھے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو"! کا ورد تھا، ہر گرج اور کڑک پر آنکھیں بند اور اوسان خطا ہو جاتے تھے، چیخیں مار مار کر ایک دوسرے کو لپٹ جاتی تھیں، چونکہ شکاری اپنے ساتھ موٹر لے گئے تھے اس لئے کچھ اطمینان تھا، اتنے میں

کیا دیکھتے ہیں کہ شکاری خود بارش کے شکار بن کر خالی ہاتھ عجیب وضع سے بیرنگ آ رہے ہیں، ان کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور وہ بھیگی چڑیاں بن گئے تھے، ہم سب نے تولیوں سے ان کے جسموں کو اچھی طرح پونچھا، بھیگے کپڑے بدلے اور آگ سے خوب سینکا تب کہیں شکاریوں کی جان میں جان آئی۔

اب بارش تھم گئی تھی، طوفان کے بعد سکون ہوگیا تھا، کھانے کے بعد کوئی پانچ بجے ہم سب ٹہلنے کنٹے کی طرف چل پڑے، شکاری بھی بندوقوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ہو لئے، راستے میں درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نظر آئے، ایک شکاری نے دن سے فائر کر دیا اور سامنے بیچارا ایک غریب چھوٹا سا بٹیر ڈھیر ہو کر رہ گیا، اسی طرح آدھی درجن بٹیر بڑی خوبصورتی سے شکار ہوئے نکلے تو تھے بڑے شکار کے لئے گر قسمت میں بٹیر ہی لکھے تھے، چاء کے ساتھ ان کے کباب نے بڑا مزہ دیا، کوئی سات بجے ہم سب گھر لوٹے۔

ایک شکاری کا مکان راستے میں پڑتا تھا، مکان خالی تھا کیونکہ چند روز سے وہ ہماری "نادر شاہی" بہن کے مہمان تھے راستے سے ہٹ کر کوئی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ان کا مکان تھا۔ وہاں سے انھیں کچھ سامان لینا تھا، ہم سب کو باہر ہی ٹھہرا کر وہ سامان لانے اندر گئے، تھوڑی دیر کے بعد ہمیں مکان کے پچھلے حصے سے شور وغل کی آوازیں آنے لگیں، ہم سب کے سب بندوقیں لئے دوڑے، دیکھتے کیا ہیں کہ صاحب خانہ اور ان کے نوکر اندھیرے میں لکڑیوں سے دالان میں کسی چیز کو مار رہے ہیں، دوڑتے دوڑتے دور ہی سے ہم نے چلا کر پوچھا تو فرمایا "اژدہا ہے اژدہا"!!

خدا خیر کرے! واقعی ایک بہت بڑا سانپ پڑا ہوا نظر آیا، شکاریوں نے صاحب خانہ سے کہا آپ ہٹ جائیے ہم ابھی مارے دیتے ہیں، چنانچہ چاروں شکاریوں نے نشانہ تاک کر باڑھ چلائی اور ہم نے ٹارچ کی روشنی "اژدہے" پر جو ڈالی تو بے ساختہ سب کے سب قہقہے مارنے لگے، ایک موٹی سی مونج کی رسی بل کھائی ہوئی دالان کے اس سرے سے اس سرے تک پڑی ہوئی تھی، اور صاحب خانہ بیچارے شرم کے مارے سر جھکائے ایک طرف کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ایک بزرگوار کو بندوق کے شکار کا شوق ہوا، اپنے ایک دوست سے نشانہ بازی کے طریقے سیکھنے شروع کئے، ہفتوں مشق ہوئی مگر "روز اول" کا مضمون رہا، آخر آپ کے دوست نے تنگ آ کر ایک تدبیر نکالی، جب کبھی آپ نے کسی شکار کو دیکھ کر بندوق اٹھائی اور نشانہ لیا کہ ساتھ ہی آپ کے دوست کی بندوق بھی سیدھی ہوئی ادھر آپ نے فائر کیا اور ادھر آپ کے دوست نے بھی آواز ملا کر فائر کر دیا اور شکار نیچے آ رہا، آپ کو اپنی بندوق کی آواز میں دوسرے فائر کی خبر نہ ہوئی اور اپنے زعم میں یہی سمجھتے رہے کہ شکار آپ ہی نے مارا، غرض یہ کہ اس طرح آپ کے دوست کو آئے دن کی نشانہ بازی کی مشق کرانے سے نجات ملی مگر شکار برابر ہوتا رہا اور آپ خود کو بڑا شکاری سمجھنے لگے، اس اثنا میں سیکڑوں شکار پارٹیاں ہوئیں اور آپ کے دوست کی چابک دستی سے سب کی سب کامیاب رہیں۔

ایک دن ہمارے بزرگ کو بڑے شکار کا شوق ہوا، اپنے شکاری دوست اور دو بھانجوں کو ساتھ لئے ایک جنگل میں پہنچے، خوش قسمتی سے دو چار نیل گائے اور چار چھ ہرن دوڑتے اور چوکڑیاں بھرتے تھوڑے فاصلہ پر سامنے سے

گزرے، ان کو دیکھتے ہی آپ نے بندوق سنبھالی مگر اتنے میں وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے، دوست کی رائے ہوئی کہ آپ اور وہ اور آپ کے دونوں بھانجے کچھ فاصلے سے ایک ہی طرف بیٹھیں کیونکہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھنے میں گولی لگ جانے کا اندیشہ تھا، چنانچہ اسی طرح دونوں پارٹیاں گھات میں بیٹھ گئیں، اتنے میں کچھ ہرن آتے نظر آئے، بزرگ نے فوراً بندوق اٹھائی ادھر آپ کے دوست نے حسب عادت آپ کے ساتھ بندوق ملائی دن، دن، دن تین فائر ہوئے اور چار ہرن زمین پر آرہے، آپ کے بھانجوں کو فکر ہوئی کہ بندوقیں چار، شکاری چار مگر فائر تین کیوں ہوئے؟ چپکے سے ماموں جان کی بندوق کا جو امتحان لیا تو دونوں نالیاں کوری اور صاف نظر آئیں! گویا تینوں بندوقوں سے ایک ایک فائر ہوا تھا، اس حساب سے دو ہرن آپ کے دوست نے اور دو دونوں بھانجوں نے مارے تھے، یہ راز کھلتے ہی دونوں بھانجے ماموں کے سر ہو گئے اور لگے مذاق اڑانے!

واقعہ یہ ہوا کہ ہرن سامنے آتے ہی ماموں گھبرا کر بندوق میں کارتوس ڈالنا بھول گئے، دوست نے فائر کرنے کو جو کہا تو بغیر کارتوس کے بندوق چلا دی جب بھانجے تنگ کرنے لگے تو آپ ذرا گرم ہو کر بولے،

"کیا بک بک کر رہے ہو! کچھ بڑوں کا بھی لحاظ ہے! ہر وقت وہی بیہودہ مذاق!!"

بھانجوں نے عرض کیا" مذاق کی کوئی بات نہیں ہے یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ تین فائر ہوئے چار ہرن مرے، ان میں سے دو آپ کے دوست نے مارے اور دو ہم نے، مگر آپ کا فائر کدھر گیا"؟

ہنستے ہوئے فرمایا "کیا خوب! ایک فائر سے دو ہرن کیسے مرے؟ ہرن نہ ہوئے مرغابیاں ہوئیں"!! بھانجوں نے کہا "مگر آپ کی بندوق تو صاف ہے! ہرن کس چیز سے مرا؟" ارشاد ہوا " لونڈے ہو نا آخر! چار دن کے شکاری اور لگے ہم سے بحث کرنے!! ذرا تجربہ کار شکاریوں سے پوچھو! شاید تمھیں معلوم نہیں!! ولایتی بندوق بھری بھی چلتی ہے اور خالی بھی!!!

ایک "خاں صاحب" بیرسٹری کی ڈگری لانے ولایت سدھارے اور ایک فیملی میں سکونت اختیار کی، آپ صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند ہیں، اکثر ہندوستانیوں کی طرح "بتان فرنگ" کی پرستش کو آپ نے اللہ کی بندگی پر ترجیح نہیں دی، پانچ وقت کی نماز برابر وقت پر ادا کرتے رہے۔

ایک روز کالج سے واپسی کے بعد آپ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے کہ مالک مکان کی نوجوان لڑکی جو آپ سے ذرا بے تکلف تھی کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹانے لگی، آپ نے "ہوں! ہوں!!" کہا تو وہ سمجھی اپنی زبان میں اندر بلا رہے ہیں! جھٹ سے دروازہ کھول کمرے میں گھس آئی!! خاں صاحب پر جو نظر پڑی تو اس نے دیکھا کہ وہ کچھ عجیب و غریب حرکتیں کر رہے ہیں، یہ دیکھنا ہی تھا کہ ماں کے پاس دوڑی آئی اور کہا۔

"مسٹر خان بڑا اچھا آدمی تھا"!!

ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پوچھا "تمہارا مطلب کیا ہے؟ آخر اس کو ہو کیا گیا ہے"؟

لڑکی نے افسوس کا اظہار کر کے کہا" معلوم نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے! اس کی دماغی حالت کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت وہ کمرے میں عجیب عجیب حرکتیں کر رہا ہے!! کبھی کھڑا ہوتا ہے، کبھی بیٹھ جاتا ہے، کبھی اوندھا پڑ جاتا ہے، کبھی جھک جاتا ہے اور ساتھ ساتھ کچھ کہتا بھی جا رہا ہے"۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا' لڑکی کے ساتھ وہ خاں صاحب کے کمرے پر آئی اور دروازہ کھٹکھٹایا' اس اثنا میں خاں صاحب نے نماز ختم کر دی تھی دروازہ کھولا تو ماں بیٹی کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ماجرا ہے ؟ آپ دونوں کچھ پریشان سی معلوم ہوتی ہیں"!

ماں نے آپ کو غور سے دیکھ کر دریافت کیا" ابھی ابھی آپ کیا کر رہے تھے"؟

جواب دیا" نماز پڑھ رہا تھا"!

ماں نے کہا" میری لڑکی نے آج تک کسی مسلمان کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا' آپ کو اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر خود بھی پریشان ہوئی اور مجھ کو بھی حیران کیا! وہ یہ سمجھی کہ خدانخواستہ آپ پر" جنون" کا دورہ پڑا ہے"!!

اسی سلسلے میں ہمارے خاں صاحب کو ایک واقعہ " ہائیڈ پارک" میں بھی پیش آیا' ہوا یہ کہ ایک روز آپ عصر کی نماز سبزہ زار پر پڑھ رہے تھے کہ اسکول کے لڑکوں نے آپ کو گھیر لیا اور آپ کی نقل و حرکت کو غور سے دیکھنے لگے! جوں ہی آپ نے نماز ختم کی اور ان کی طرف پلٹے سب کے سب بے تحاشا بھاگے ــــ ! بھاگتے جاتے تھے اور پلٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں آپ ڈنڈا لئے ان کا پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں!!۔

"باغبان"

غزل

میں طوفاں پہ چھاتا چلا جا رہا ہوں
سفینہ بڑھاتا چلا جا رہا ہوں

محبت پہ چھاتا چلا جا رہا ہوں
میں پردے اٹھاتا چلا جا رہا ہوں

وفاؤں سے اپنی جفا کا طریقہ
کسی کو سکھاتا چلا جا رہا ہوں

محبت غلط اک فریب ایک دھوکا
جسے آزماتا چلا جا رہا ہوں

دلِ غمزدہ کو میں ان آنسوؤں سے
دلاسا دلاتا چلا جا رہا ہوں

مرا ساتھ دیں گے مرے اشک کب تک
یہی آزماتا چلا جا رہا ہوں

میں خود اپنی ہستی کو اپنے ہی ہاتھوں
بناتا مٹاتا چلا جا رہا ہوں

وہ رہ رہ کے اُتنے ہی یاد آ رہے ہیں
میں جتنا بھلاتا چلا جا رہا ہوں

وہ اب مجھ سے نظریں چرانے لگے ہیں
میں آنکھیں بچھاتا چلا جا رہا ہوں

کوئی درس لے یا نہ لے اس سے زاہد
فسانہ سناتا چلا جا رہا ہوں

زاہد حیدری

برار

(تاریخی نقطۂ نظر سے)

برار کا قدیم نام ودربھا ہے۔ مہابھارت میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ نل اور دمینتی کے افسانے کا بھی برار سے گہرا تعلق ہے۔ دمینتی ودربھا کے راجہ کی لڑکی تھی اور نل مالوہ کا راجہ تھا۔ اس افسانے کا بعد میں فیضی نے فارسی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ ودربھا کی حکومت کا صدر مقام موجودہ بیدر رہا یا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکومت دکن کے اچھے خاصے حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔

راجہ اشوک کے انتقال کے بعد دکن میں آندھرا یا ستواہن خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ جس کا صدر مقام پیٹھان تھا۔ برار کا سارا علاقہ اس حکومت کے تحت آگیا۔ آندھرا خاندان نے تقریباً چار صدی تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ سلطنت روما کے ساتھ آندھرا خاندان کے سیاسی اور تجارتی تعلقات تھے۔ جن کا ثبوت قدیم رومن تحریروں سے ملتا ہے۔

آندھرا خاندان کے زوال کے بعد واکاٹک خاندان، اہیر خاندان اور چلوکیہ خاندان نے برار میں اپنی حکومت قائم کی۔ پانچویں صدی عیسوی میں چلوکیوں نے تقریباً سارے دکن کو اپنے زیرنگیں کرلیا تھا۔ چار صدی کی حکومت کے بعد راشٹرکوٹوں نے چلوکیوں کو نیچا دکھایا لیکن دسویں صدی عیسوی میں چلوکیوں نے پھر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرلیا۔ اور برار پر ان کا تسلط قائم رہا۔ چلوکیوں کا سب سے بڑا راجہ پلاکیشن دوم گذرا ہے۔ جس نے گجرات اور مالوہ کو بھی اپنا باجگذار بنایا تھا۔ اس نے ہوش وردھن سے دریائے نربدا کے کنارے جنگ کی اور اس کو شمالی ہند واپس جانے پر مجبور کیا۔ اس کے زمانے میں چلوکیہ خاندان کے بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ سنہ ۶۲۵ء میں ایران کے بادشاہ خسرو دوم نے پلاکیشن دوم کے دربار میں اپنی سفارت بھیجی۔ اجنٹہ کی ایک دیواری تصویر میں اس سفارت کے پلاکیشن دوم کے دربار میں پہنچنے کا منظر نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ اجنٹہ کی خانقاہ اس راجہ کے زمانہ میں آباد تھی اور اس کی بیشتر تصاویر مکمل ہوچکی تھیں۔

راشٹرکوٹوں میں کرشن اوّل بڑا زبردست راجہ گذرا ہے چلوکیوں کے وارث کی حیثیت سے راشٹرکوٹوں نے برار پر اپنا تسلط جمایا۔ ایلورا میں کیلاش کا مشہور مندر کرشن اوّل کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ راشٹرکوٹوں کے زوال پر مغربی چلوکیوں نے دکن میں پھر غلبہ حاصل کیا اور کلیانی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس خاندان کے ایک سردار نے دیوگری کو مرکزی حکومت سے آزاد کرلیا۔ اور ایک نئے خاندان کی بناء ڈالی جو یادو خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان نے برار اور دکن کے بیشتر حصہ پر علاءالدین خلجی کے حملہ تک حکومت کی۔

اب ہم تاریخ کی اس منزل پر پہنچ گئے جب کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی میں ایک عنصر نے اپنی جگہ پیدا کرلی تھی۔ ہماری مراد ہے ترکوں کے شمالی ہند پر تسلط قائم کرنے سے۔ ترک حکمرانوں میں علاءالدین خلجی بڑا حوصلہ مند تھا جس زمانہ میں وہ کڑہ مانک پور کا حاکم تھا اس نے دیوگری کی بے شمار دولت کے افسانے سنے تھے۔ اس کی نچلی طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کی شہرت اور قوت میں اضافہ ہو۔ چنانچہ اس نے سنہ ۱۲۹۴ء میں وندھیاچل کو پار کیا۔ دیوگری کے راجہ نے مقابلہ کیا لیکن اسے شکست ہوئی راجہ نے بہت سا روپیہ بطور تاوان ادا کیا اور ایلچ پور کا شہر علاءالدین کے حوالے کردیا۔ راجا نے سلطنت دہلی کو خراج دینے کا بھی

وعدہ کیا۔ علاؤالدین نے ایلچ پور میں اپنا سفیر مقرر کیا اور راجہ کو اس کا ملک واپس کر دیا۔ علاؤالدین کی پالیسی آئندہ بادشاہ ہونے کے بعد بھی یہی رہی کہ دکن اور جنوبی ہند کو بجائے سلطنت دہلی میں براہ راست ملحق کرنے کے صرف اپنی بالا دستی تسلیم کرائے۔ اور حکومت کی ذمہ داری وہیں کے والیان ملک پر رہنے دے۔ وہ چاہتا تھا کہ خراج کے ذریعہ اپنی سلطنت کی مالی حالت کو مستحکم کرے تاکہ سرحد پر منگولوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

علاؤالدین خلجی کے انتقال کے بعد دیوگری کے راجہ نے سلطنت دہلی کو خراج دینا بند کر دیا۔ چنانچہ قطب الدین مبارک شاہ نے دیوگری پر حملہ کیا۔ اور راجا کے سارے علاقہ کو جس میں برار بھی شامل تھا سلطنت دہلی میں ملحق کر لیا۔ کچھ عرصے بعد محمد بن تغلق نے دیوگری کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ دولت آباد کے صدر مقام بننے سے ظاہر ہے برار کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

لیکن محمد بن تغلق کے آخری زمانہ میں جب ملک کے ہر گوشہ میں بدنظمی پھیل گئی تو دکن کے امرا نے اپنے میں سے ایک تجربہ کار امیر اسمٰعیل مخ کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ اس حکمران کے تحت سلطنت دہلی کے تمام علاقے جن میں برار بھی شامل تھا آزاد ہو گئے۔ اسمٰعیل مخ نے جو بہت بوڑھا تھا امرا کے مشورں سے ظفر خاں کو حکومت کا سارا کام سپرد کر دیا۔ ظفر خاں نے محمد بن تغلق کے عہد میں دکن میں نظم و نسق قائم کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دئے تھے اس واسطے اس کا تمام ترکی امرا پر بہت اثر تھا۔ ظفر خاں نے سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کیا۔ اور ۱۳۴۷ء میں خاندان بہمنیہ کی بنا ڈالی۔ گلبرگہ کو اس نے پایہ تخت بنایا۔ بہمنیوں کے زمانہ میں دکن کو آٹھ اطراف میں تقسیم کیا گیا تھا جنہیں اس زمانہ کے صوبے سمجھنا چاہئے۔ ان اطراف میں ایک طرف برار کی بھی تھی۔ بہمنی خاندان کے آخری زمانہ میں برار میں گاول اور ماہور کے قلعداروں کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے تھے۔ چنانچہ محمود شاہ دوم بہمنی کے عہد حکومت میں گاول کے قلعہ دار عماد الملک نے برار میں خود مختار حکومت قائم کر لی اور مرکزی بہمنی حکومت سے اپنے تئیں آزاد کر لیا۔ اب برار میں عماد شاہی حکومت کی بنا پڑی۔ اس زمانہ میں گولکنڈہ میں قطب شاہی احمد نگر میں نظام شاہی، بیجا پور میں عادل شاہی اور بیدر میں برید شاہی خاندان برسر اقتدار ہوئے اور بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ عماد شاہی خاندان نے برار پر ۸۵ سال حکومت کی۔ عماد الملک کے بعد علاؤالدین عماد شاہ، دریا عماد شاہ، اور برہان عماد شاہ نے حکومت کی۔ آخرالذکر کے عہد میں نظم و نسق میں انتشار پیدا ہو گیا تھا اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے برار کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا

یہ زمانہ وہ ہے جب کہ شمالی ہند میں اکبر اعظم نے سلطنت مغلیہ کو مستحکم کر لیا تھا ۱۵۹۱ء اکبر اعظم نے دکن کے سلاطین کے نام پیغام بھیجے کہ سلطنت مغلیہ کی بالادستی تسلیم کریں۔ سوائے سلطان خاندیس کے دوسرے سلاطین نے باجگذار بننے سے انکار کیا۔ چنانچہ مغلوں اور دکن کے حکمرانوں کی کشمکش کا آغاز ہوا ۱۵۹۳ء میں مغلیہ افواج نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا لیکن چاند سلطانہ کی دلیری اور استقلال کے آگے ان کی ایک نہ چلی ۱۵۹۶ء میں مغل فوجوں نے پھر یورش کی۔ چاند سلطانہ نے کمالِ دوراندیشی سے مصلحت اس میں سمجھی کہ مغلوں سے صلح کر لی جائے اور چنانچہ اس نے برار کا علاقہ حوالہ کر کے نظام شاہی سلطنت کو عارضی طور پر مغلوں کے تسلط سے بچا لیا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ملک عنبر نے برار کے بیشتر حصے کو مغلوں سے

آزاد کرالیا تھا۔ ملک عنبر کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے مغلیہ سلطنت کا اقتدار تسلیم کرلیا اور منصب و مراتب قبول کرکے صلح کرلی۔ شاہ جہاں کے عہد میں نظام شاہی سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا اور دکن کے مغلیہ علاقوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں ایک صوبہ برار کا تھا جس کا صدر مقام ایلچ پور قرار پایا۔ شہزادہ اورنگ زیب ان چار صوبوں کا حاکم اعلیٰ مقرر ہوا۔ بادشاہ ہونے پر اورنگ زیب نے پورے دکن کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا۔ اس کے انتقال کے بعد دکن میں مرہٹوں کا زور بڑھ گیا اور عملاً نظم و نسق سلطنت مغلیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اورنگ زیب پورے ہندوستان کو ایک مستحکم مرکزی حکومت کے تحت لانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس طرح اس ملک کے مرکز گریز رجحانوں پر قابو حاصل ہوسکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے مذہب و ملت کے کسی امتیاز کو نہ مانا۔ سرحد کے مسلمان قبائل اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے ساتھ اس طرح پیش آیا جس طرح راجپوتوں اور مرہٹوں کے ساتھ۔ اس کے عہد حکومت میں مرہٹوں سے آویزشوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا۔ سیواجی کے بیٹے سمبھاجی اور اس کے بعد راجارام کی بغاوتوں سے برار برابر متاثر رہا۔ اور نظم و نسق میں انتشار کی کیفیت رہی۔ اورنگ زیب کے بعد دکن میں مرہٹوں کا زور شور بڑھ گیا۔ فرخ سیر کے سپہ سالار امیر الامراء حسین علی خاں نے دکن (جس میں برار شامل تھا) کے تمام علاقوں میں مرہٹوں کے چوتھ اور سردیش مکھی کے حق کو تسلیم کرلیا۔ گویا عملاً دکن کا نظم و نسق سلطنت مغلیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

لیکن نظام الملک آصفجاہ اول نے شکر کھیڑا کی جنگ کے بعد ۱۷۲۴ء میں دکن میں اپنا تسلط قائم کیا۔ اس جنگ کے بعد دکن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ شکر کھیڑا برار میں واقع ہے۔ نظام الملک آصفجاہ اول نے اس کا نام فتح کھیڑا رکھا۔ یہ مقام آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ جنگ شکر کھیڑا کے بعد سے آج تک برار پر خاندان آصفجاہی کو حقوق اقتدار حاصل ہیں۔

نظام علیخاں آصف جاہ دوم کے عہد حکومت میں جنگ اودگیر اور جنگ کھرڈلا کے بعد بھونسلا اور پیشوا کو برار کے بعض اضلاع کے حقوق مالگذاری حاصل ہوگئے تھے۔ لیکن جب انگریزوں نے آرتھر ولزلی کے تحت مرہٹوں کی متحدہ افواج کو شکست دی تو برار سے مرہٹہ عمال کو خارج کردیا گیا۔ اور بھونسلا اور پیشوا کو برار کے حقوق سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں فرانسیسی سیاح موسیو تھے وے نو نے برار کے علاقہ کا سفر کیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ یہ علاقہ سلطنت مغلیہ کے نہایت زرخیز ترین حصوں میں شمار ہوتا ہے لیکن اٹھارویں صدی میں مرہٹوں کی یورشوں کے باعث برار کے نظم و نسق میں انتشار پھیل گیا تھا اور یہاں کی مالگذاری بہت کم رہ گئی تھی۔ آصفجاہی خاندان کے تحت برار کی آمدنی بمقابلہ پہلے کے بڑھنا شروع ہوئی اور توقع تھی کہ اچھے نظم و نسق کی بدولت یہاں کی زمین سونا اگلنے لگے گی۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ انگریزی حکومت نے برار کو اپنے نظم و نسق کے تحت لیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدے کی رو سے سرکار نظام نے اس انگریزی فوج کے اخراجات کی کفالت اپنے ذمہ لی تھی۔ جو ان کے علاقہ میں متعین ہوگی۔ چونکہ کچھ عرصہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی حالت قابل اطمینان نہ رہی تھی اس لئے مجبوراً انگریزی

افواج کے اخراجات کی پابجائی انگریزی حکومت سے قرض لے کر کی جاری تھی۔ ۱۸۵۰ء میں قرض کی رقم ۵۴ لاکھ تک پہنچ گئی۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کے ایماء پر سرکار نظام اور حکومت ہند میں معاہدہ ہوا جس کی رو سے برار کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام دے دیا گیا۔ لیکن اس پر سرکار نظام کے حقوق تعدداً بدستور قائم رہے۔ اس معاہدہ میں طے پایا کہ برار کی آمدنی سے قرضہ کی ادائی کی جائے اور اعانتی افواج کی تنخواہوں کا خرچ نکال کر جو رقم بچے وہ حساب کے بعد سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائے۔ لیکن معاہدہ کی اس دفعہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ اور حسابات کی صفائی مد نظر نہ رہی ۱۸۶۰ء میں غدر کے بعد جدید معاہدہ کے ذریعہ برار کی حوالگی کی تصدیق کی گئی۔ اس وقت سے ۱۹۰۲ء تک برار کی دستوری اور انتظامی حیثیت میں فرق پیدا نہیں ہوا۔

لارڈ کرزن نے ۱۹۰۲ء میں سرکار نظام سے برار کے متعلق ایک نیا معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے حکومت ہند کو برار کا دوامی پٹہ حاصل ہو گیا اور یہ علاقہ صوبہ متوسط میں انتظامی اغراض کے لئے شریک کر دیا گیا۔ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے مطابق برار کا علاقہ برطانوی حکومت کو حوالہ یا تفویض Assign کیا گیا تھا لیکن ۱۹۰۲ء کے معاہدہ کے مطابق یہ علاقہ اجارہ یا پٹہ Lease پر دیا گیا ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کا جو قانونی فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ ۱۹۰۲ء کے معاہدہ سے سرکار نظام کی قانونی حیثیت جہاں تک کہ سیاسی اور انتظامی حق کا تعلق ہے بہ نسبت پیشتر کے زیادہ متعین ہو گئی۔ ۱۹۰۲ء کے معاہدہ کے مطابق حکومت ہند نے سرکار نظام کے شاہی اقتدار اور برار کے حق ملکیت کو تسلیم کیا اور ۲۵ لاکھ روپے سالانہ بطور پیشکش دینے کا وعدہ کیا۔

گذشتہ ربع صدی میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی خارجی حکمت عملی زیادہ تر مسئلہ استرداد برار سے متعلق رہی۔ جنگ عظیم کے بعد جب کہ برطانوی حکومت کو کچھ فراغت حاصل ہو چکی تھی اعلیحضرت بندگان اقدس نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں مسئلہ برار کی دستوری نوعیت کو جو دستاویزی شہادتوں پر مبنی تھی واضح فرمایا۔ پچھلی جنگ عظیم میں ممالک محروسہ نے حکومت برطانیہ کی ہر طرح سے امداد کی تھی اور اس کے علاوہ ویسے بھی خاندان آصفجاہی نے حکومت برطانیہ کے ساتھ ہمیشہ جس دوستی اور اتحاد کا ثبوت دیا ہے اس کی بناء پر توقع تھی کہ استرداد برار کے مطالبہ پر از سر نو غور کیا جاسکے گا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بجائے اس کے حقوق بالادستی کا دوسرا غیر متعلق مسئلہ چھیڑ دیا گیا۔ دس سال کا زمانہ گزر گیا اور بالآخر نومبر ۱۹۳۳ء میں لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند حیدرآباد تشریف لائے۔ اور شاہی دعوت کے موقع پر مسئلہ برار کے متعلق اطمینان بخش اعلان فرمایا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۳ء اس مسئلہ کے متعلق فرمان مبارک شرف صدور لایا۔

"ہز ایکسلنسی وائسرائے بہادر کے میری ریاست سے روانہ ہو جانے سے قبل اور با اعتراف اس اعلان کے جو انہوں نے اسٹیٹ بنکوٹ کے موقع پر فرمایا ہے میں ان جدید انتظامات کے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو سرکار عظمت مدار کے ساتھ حالیہ گفت و شنید کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں وفاقی دستور قائم ہونے پر میرے ملک برار کے آئندہ نظم و نسق کی نسبت عمل میں آئیں گے۔ میری رعایا کو ان تدابیر کے تفصیلی اعلان کا سخت انتظار رہیگا۔ جن کی رو سے میرے ملک برار کا نظم و نسق اس خطۂ ملک کے ساتھ جو بنام ممالک متوسط

موسوم ہے، بہ مثل ایک صوبہ واحد کے ہوگا جس کا نام ممالک متوسط و برار رہے گا۔ اور برار پر میری سلطنت عملاً اس طرح ہوگی کہ اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہ رہے گی۔"

سنہ ۱۹۳۳ء کے معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ برار کا علاقہ اعلیحضرت ہی کے زیر اقتدار رہے گا۔ گو نظم و نسق کی اغراض کے لئے وہ صوبہ متوسط کے ساتھ شریک کر لیا جائے گا۔ برار میں جہاں کہیں انگریزی جھنڈا لہرائے گا وہاں اعلیحضرت کا جھنڈا بھی اس کے ساتھ بلند کیا جائے گا۔ اعلیحضرت آئندہ سے "ہز اکزالٹڈ ہائینس دی نظام آف حیدرآباد اینڈ برار" کا موروثی خطاب اختیار فرمائیں۔ اور آپ کے ولیعہد "ہز ہائینس دی پرنس آف برار" کہلائیں گے۔ گورنر صوبہ متوسط و برار اعلیحضرت کے مشورے کے بعد مقرر ہوا کریگا۔ اور اعلیحضرت کو حق ہوگا کہ برار کے ان معاملات کے متعلق جو ریاست حیدرآباد کو متاثر کرتے ہوں یا جن سے حیدرآباد کو دلچسپی ہو اپنے خیالات کی نمائندگی کے لئے ایک ایجنٹ مقرر فرمائیں۔ اس معاہدے کی رو سے اعلیحضرت کے نام کا خطبہ برار میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اور دربار بھی منعقد ہو سکتا ہے۔ اور اعلیحضرت اپنے برار کی رعایا کو خطابات بھی عطا فرما سکتے ہیں جس کے لئے وائسرائے سے مشورہ ضروری ہوگا۔ اس کے علاوہ اس معاہدے کے ذریعہ یہ بھی صاف ہوگیا کہ جس فوجی امداد کا وعدہ برار سے وابستہ تھا وہ حسب حال قائم رہے گا۔ اور انگریزی حکومت حسب سابق ۲۵ لاکھ کی رقم سالانہ ادا کرتی رہے گی۔

یوسف حسین خاں

(یہ تقریر لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کی گئی)

صیّاد

یہ کہہ رہی ہے مری چشم خونچکاں صیاد
بہار خود بھی ہے عبرت کی داستاں صیاد

اسیر دام بنا، ذبح کر، میں حاضر ہوں!
رہے نہ دل میں تمنائے امتحاں صیاد

لگی وہ چوٹ سی دل پر کہ آہ کیا کہئے!
قفس میں ہوں نہ سنا حالِ گلستاں صیاد

بہار گردشِ رنگِ طرب ہے، غور سے دیکھ!
مجھے مٹا کے رہے گا نہ شادماں صیاد

رہا اسیرِ قفس میں، مگر چمن میں رہا!
مری نگاہ میں ہے رازِ آشیاں صیاد

وہ غم نصیب ہے کاوشؔ کہ سرزمینِ چمن
ہوئی ہے اس کے مقدر سے آسماں صیاد

کاوشؔ

تنقید و تبصرہ

سفرنامہ مقامات مقدسہ ۔ از مولوی سید محمد جواد صاحب بی اے بی ٹی (علیگ) مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ حجم ۱۰۶ صفحات کاغذ عمدہ چھپائی صاف ستھری۔ قیمت درج نہیں۔ مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد۔ ملنے کا پتہ۔ غلام دستگیر صاحب۔ تاجر کتب چارکمان عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

اس سفرنامے میں مولوی سید محمد جواد صاحب نے سمندر کے راستہ سے عراق اور وہاں سے ایران اور خشکی کے راستے سے واپسی ہندوستان کے اپنے سفر کے حالات نہایت سادہ زبان میں بیان کئے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے میں دقت تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ کتاب کے آخر میں آٹھ صفحوں کا ایک غلط نامہ لگا یا گیا ہے مگر بار بار غلط نامہ سے مدد لینا دشوار ہے امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ غلطیاں درست کر دی جائینگی۔

اس سفرنامے کے ایک باب میں عراق فلسطین اور ایران کے مدرسوں کا حال لکھا ہے۔ اس میں جناب مولف نے مدرسوں کا اسٹاف ان کی تنخواہیں، لڑکوں اور جماعتوں کی تعداد، مدرسہ کے اوقات اور اس کی عمارت اور دستی مشاغل پر طائرانہ نظر ڈالی ہے اس باب میں جناب مولف اپنے فنی نقطۂ نظر سے وہاں کے طریقۂ تعلیم پر ناقدانہ نظر ڈالتے تو زیادہ بہتر ہوتا اس اعتبار سے یہ باب مزید تفصیل کا محتاج نظر آتا ہے۔

اس میں مقامات مقدسہ کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے جس میں ہندوستان سے ایران، عراق اور شام کو جانے کا خشکی کا راستہ بتا دیا گیا ہے۔ ایران کے حالات میں رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں جو اصلاحیں ہوئی ہیں اور ہر جہتی ترقی کی جو شاہ راہیں وہاں کھل گئی ہیں ان کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے غرض یہ کہ یہ سفرنامہ اپنے اندر تمام کی دلچسپیاں رکھتا ہے اور زائرین کے لئے اچھا رہبر ثابت ہو سکتا ہے۔

"س"

سائنس کی انوکھی کہانی اس کے مصنف ڈاکٹر محمد قدرت خدا صاحب ڈی ایس سی (لندن) ڈی آئی سی ایم ایس سی کلکتہ ہیں اور مترجم مولوی رشید احمد صاحب ندوی، اس کتاب کو مصنف نے اعلیٰحضرت سلطان العلوم شہریار دکن کے نام معنون کیا ہے اور اس میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں سے استفادہ کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف یا مترجم کی نظر سے حیدرآباد کی وہ کتابیں نہیں گزریں جو سائنس کے موضوعوں پر طبقۂ فوقانیہ کے طلبار کے لئے لکھی اور چھاپی گئی ہیں کیونکہ اس کتاب میں بعض بڑی مشکل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو غالباً اعلیٰ جماعتوں کی کتابوں کے لئے وضع کی گئی ہوں گی۔ یہ ۲۳۰ صفحات میں چھپی ہے اور قیمت عہ رکھی گئی ہے۔ اس میں سات باب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) علم ہیئت (۲) طبقات الارض (۳) عالم نباتات (۴) حیات حیوانات (۵) داستان عضویات (۶) شئے مادہ کی مختلف کہانیاں (۷) علم کیمیا کی ابتدا۔

ان سب عنوانات کو دیکھ کر نواب شمس الامرا کے سلسلۂ شمسیہ کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے جس میں تقریباً انہی عنوانوں پر طالب علموں کے لئے مفید معلومات اردو میں منتقل کر دی گئی تھیں۔

نازی ازم مصنفہ عبدالرحیم شبلی بی کام ۸۳ صفحات قیمت ۲ر موجودہ سیاسی حالات کے پیش نظر جرمنی کی اس مشہور تحریک کے متعلق اردو معلومات منتقل کرنے کی ضرورت تھی جس کی تکمیل کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کو دارالادب پنجاب نے شایع کیا ہے لیکن کتابت و طباعت اور کاغذ موضوع کے شایان شان نہیں ہے مصنف نے پندرہ ابواب میں اس کتاب کو تقسیم کیا ہے اور نازیت کی پیدایش سے اب تک اس کے سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس کا افتتاحیہ مولانا ظہور امرتسری سابق ایڈیٹر زمیندار نے قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب سرسری مطالعہ کے لئے مفید ہے لیکن اس کے بعد بھی یورپ کی اس اہم تحریک کے متعلق ایک

مکمل اور مبسوط کتاب کی اردو میں کمی رہ جاتی ہے کیونکہ اس میں نازی طرز حکومت اور نازیوں کے خطرات کے متعلق جیسا چاہئے نہیں لکھا گیا۔

مقدمۂ تاریخ دکن از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ ۱۴۴ صفحات متوسط تقطیع قیمت عہ

حیدرآباد میں اگرچہ گذشتہ ربع صدی سے علم و فضل اور تصنیف و تالیف کی طرف خاص طور پر توجہ کی جارہی ہے لیکن اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جو اس عظیم الشان سرزمین کی مکمل تاریخ سمجھی جاسکے خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر صدیقی صاحب نے اس کام کا آغاز کیا ہے اور اس کے مقدمہ کے طور پر یہ مبسوط کتاب شایع کی ہے جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب ان کی پوری تاریخ مکمل ہو کر منظر عام پر آجائے گی تو ملک کی کتنی بڑی خدمت ہوگی۔ اس مقدمہ میں انہوں نے اس سرزمین کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور ہر حکمران کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی ہیں اس طرح سے مختلف خاندانوں کے تقریباً سات سو افراد اس کتاب کے ذریعہ سے روشناس ہوگئے ہیں۔ اس کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی شامل ہے جس کو سلیمان اریب صاحب نے مرتب کیا ہے اور یہ ایسا مکمل ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی محنت اور دیدہ ریزی کی گئی ہے۔

اس کتاب کو پروفیسر صدیقی نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے میں دور قدیم کے دس حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں۔ دوسرے حصے میں دور وسطیٰ کے آٹھ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔ تیسرے میں دور عالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابان کرناٹک، کرنول، سدھوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے۔ ابتدا میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں تاریخ دکن پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ مقدمہ بجائے خود دکن کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ یہ کتاب پروفیسر مرزا حسین علی خاں صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے اور جب پوری مکمل تاریخ شایع ہو جائے گی تو محرک اور مرتب دونوں کے نام تاریخ دکن کے خدمت گذاروں کی حیثیت سے کبھی بھلائے نہ جاسکیں گے۔ اس کو ادارۂ ادبیات اردو نے متوسط تقطیع نہایت نفیس اور پاکیزہ شکل میں شایع کیا ہے۔

پریمی افسانوں کا مجموعہ از راحت بیگم صاحبہ کلکتہ صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

راحت بیگم صاحبہ کلکتہ کے مشہور عالم شمس العلماء کمال الدین احمد صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ یس کی صاحبزادی ہیں اور بنگالی ہونے کے باوجود اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ ان کے افسانے رسائل میں بھی شایع ہوتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بڑی میں ان کے چار افسانے شایع ہوئے ہیں جن میں بعض خود نوشت ہیں اور بعض ترجمہ۔ راحت بیگم صاحبہ کا اسلوب سلیس ہے تصنع اور تکلف سے وہ دور رہتی ہیں جذبات بھی ماحول اور فضا اور فطرت کے مطابق ہیں۔ اس کا پیش لفظ حکیم محمد یوسف صاحب ایڈیٹر رسالہ نیرنگ خیال نے لکھا ہے کتاب بڑی تقطیع پر اچھی چھپی ہے اور ایک بنگالی خاتون کے افسانوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اہل اردو اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

پریم رس ڈاکٹر محمد عباس علی خاں صاحب لمعہ حیدرآبادی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ٹیگور کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ حکیم محمد یوسف حسین صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور نے لکھا ہے اور کتاب بھی انہی نے اپنے اہتمام سے لاہور میں چھپوائی ہے۔

ابتدا میں مصنف کا ڈیڈیکیشن ہے جس میں اس مجموعہ کو علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے نام معنون کیا گیا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مصنف کے خیالات میں زندگی اور زندہ دلی اقبال ہی کے فیض سے پیدا ہوئی ہے۔

جیسا کہ دیباچہ میں ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال نے لکھا ہے

"ملک کے ہزاروں نوجوانوں نے ٹیگور کے ادبی رنگ کو اپنا بنانے کی کوشش کی ہے مگر ان میں سے کسی کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر لمعہ کی ذات مستثنیات سے ہے۔ آپ کی یہ ادبی کاوش ٹیگوریت کا جامہ اس خوبی سے اوڑھے ہوئے ہے کہ اگر ڈاکٹر لمعہ کا نام بعض عبارتوں کے نیچے سے خارج کردیا جائے تو ان پر ٹیگور کی تحریر کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان بھر میں ڈاکٹر لمعہ کو ہی سر رابندر ناتھ ٹیگور کی روحانی شاگردی کا فخر حاصل ہے تو اسے ایک حقیقت سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر لمعہ ادیب کے علاوہ ایک اچھے نظم گو شاعر بھی ہیں چنانچہ ان کے کلام کا کچھ نمونہ از خصوصیات سخن پر تبصرہ ادارۂ ادبیات اردو کے مشہور تذکرہ مرقع سخن جلد دوم میں شایع ہو چکا ہے اور معلوم ہوا ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ بھی آج کل زیر طبع ہے اور قریب میں شایع ہو کر منظر عام پر آجائے گا۔ اگرچہ ان کی نثر میں بھی ایک طرح کی ادبی حلاوت موجود ہے لیکن اظہار خیال کے لئے انہوں نے ٹیگور کی تقلید میں جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ نوجوانوں میں لاکھ مقبول سہی لیکن اردو ادب کے موجودہ رجحانات میں کسی مفید صنف کا اضافہ نہیں کرتا اور لمعہ جیسے صاحب غور و فکر ادیبوں کو دیکھ کر نوسیکھ انشا پردازوں کے اس راہ میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہے اگر ان مضامین کی جگہ ڈاکٹر لمعہ افسانوں کے ذریعہ سے اپنے تاثرات کو پیش کرتے تو یقین ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا۔

بہر حال یہ کتاب پریم رس اس قسم کے دوسرے تخیلی مجموعوں کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے اور ادب لطیفہ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بڑی نعمت ثابت ہوگی۔

خواب بیداری از سید یوسف حسین صاحب زیدی مطبوعہ جواں نظامی پریس لکھنو۔ چھوٹی سائز ۹۲ صفحات قیمت ۶ ر آنے۔

یہ اصل میں اخوند ملا فتح علی شیرازی کی مشہور فارسی کتاب خواب شگفت کا ترجمہ ہے۔ ملا فتح علی ایران کے ایک ممتاز انشا پرداز تھے انہوں نے یہ کتاب اپنے ملک کی اصلاح اور اپنی غافل قوم کو بیدار کرنے کے لئے لکھی تھی۔ ان کو ایرانیوں میں جو جو عیب نظر آتے تھے وہ سب مترجم کے خیال میں ہندوستانیوں میں بھی موجود ہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کر کے شائع کیا ہے۔ ترجمہ کامیاب ہے اور کہیں ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی کتاب دوسری زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ خود اردو میں بھی اس قسم کی اچھی کتابیں لکھی جائیں۔ حال ہی میں حیدرآباد سے اسی طرح کے موضوع پر ایک کتاب "شیطان کا انتقام" شائع ہوئی ہے جس کے بعض مضامین زیر نظر کتاب خواب بیداری سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ لیکن شیطان کے انتقام کا مقصد مذہبی اصلاح سے زیادہ اخلاقی اور سماجی خرابیوں کی طرف تلخ اور طنزیہ طریقہ پر متوجہ کرنا ہے۔ اس کے برخلاف خواب بیداری میں مذہبی تعصبات اور خاص کر اسلامی فرقوں کے آپس کے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زیدی صاحب کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے اور اس کی قدر اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے یہ کتاب لکھنؤ میں لکھی اور شایع کی ہے جہاں کچھ عرصے سے دو بڑے اسلامی فرقوں کے آپس میں ناخوشگوار تعلقات پیدا ہو گئے ہیں۔

"ق"

طریقے پر کاربند رہنے کی آزادی ہونی چاہئے" کانگریس کی اس عجیب و غریب قرارداد کے چند ہی روز بعد یعنی ۷ جولائی کے اجلاس عالمہ نے نئی دہلی میں ایک اور قرارداد منظور کی۔ اس اشاعت میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ "برطانیہ ہندوستان کی کامل آزادی کا اعلان کر دے۔ اور اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر نظام کی ایک عارضی قومی حکومت قایم کرے جس پر مرکزی مقننہ خنداں کے اراکین کو اعتماد ہو اور جس کو صوبہ جات میں ذمہ دار نیز زندگی کے سب سے قریب ترین تعاون حاصل ہو"۔ ان دونوں قراردادوں اگر آپ دیکھیں کانگریس کے مسلک کی وضاحت ضرور ہو گئی ہے کے بعد ایک معمولی فہم کا انسان بھی یہ کہہ دے گا

انگلستان تشدد کو چھوڑ کر اب عملی طور پر انگریزوں کی مدد نہ صرف اس شرط پر کہ انگریز ہندوستان کو

ثنا خیں ۔ جامع

ہفتہ میں شایع ہوا ہے اس میں گورنر جنرل نے اپنی کونسل کی توسیع اور جنگ کے ختم ہونے پر ہندوستان کو مستعمراتی درجہ عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن معلوم نہیں کہ اس سے یہ گتھی سلجھ سکیگی یا نہیں۔

فرانس کی شکست ۔ ۲۲ جون کے دن فرانس نے جرمنی کے ساتھ صلح کر لی اور ہٹلر کی تمام شرطوں کو مان لیا۔ اس کے ایک دو روز بعد ہی اطالیہ کے ساتھ بھی صلح کا اعلان ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی جنرل اسٹاف کے غلط مشوروں اور آپس کے سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے فرانس کو مجبوراً صلح کر لینی پڑی اور اسے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن شکست کی وجوہات چاہے کچھ ہی ہوں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آزاد ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا اور فرانس کی سرزمین جس نے نپولین جیسے بہادر پیدا

کئے تھے، اب مارشل پیتان جیسے رہنماؤں کو ہاتھوں آمری استبداد کا شکار ہو گئی۔

اس شکست کا فرانس پر سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ وہاں کی حکومت میں تبدیلی شروع ہو گئی۔ ایم، لبرون کی جگہ مارشل پیتان فرانس کے صدر ہو گئے اور ایم، لاوال کے تحت نئی حکومت تشکیل پاگئی۔ شکست کے بعد فرانس کی حکومت نے سب سے پہلے ملک کے دستور کی طرف توجہ کی چنانچہ فرانس کے نئے وزیر اعظم ایم، لاوال نے قومی اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کی کہ مملکت فرانس کے لئے ایک نیا دستور بنانے کا مارشل پیتاں کو کامل اختیار دیا جائے۔ اس قرارداد کو فرانس کی اسمبلی اور سینیٹ دونوں نے منظور کر لیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مارشل پیتاں کو دستور سازی کا کامل اختیار مل گیا اور اس طرح فرانس کی تمام جمہوری روایتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ موجودہ حالات کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عملی طور پر اب سینیٹ اور اسمبلی دونوں کا اثر ختم ہو گیا اور مارشل پیتان ہی فرانس کے "سب کچھ" ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کی زندگی میں جو جمہوریت کی بڑی علم بردار تھی، اب ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو اس کی کایا پلٹ دیں گی۔ اس سلسلے میں یہ خبر قابل غور ہے کہ مارشل پیتاں بلا شرکت غیرے خود دستور سازی کریں گے اور دستور تیار ہونے تک تنہا حکومت کریں گے۔ جب دستور تیار ہو جائے تو وہ اپنی ہی قایم کردہ نئی اسمبلی سے اس کی توثیق کروالیں گے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مارشل پیتان اس سرزمین کے سپوت ہیں جس میں روسو جیسے مفکر پیدا ہوئے تھے۔ مگر آج ان کی قیادت، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں رفتہ رفتہ آمریت قایم کر دے گی۔

برطانیہ اور فرانس ۔ فرانس کے شرائط صلح قبول کر لینے سے پہلے برطانیہ نے اس کے سامنے کامل اتحاد اور یگانگت کا ایک پیشکش کیا تھا لیکن مارشل پیتان کی حکومت نے اپنے پرانے رفیق کا ساتھ نہ دیا اور جرمنی سے ایسی صلح کر لی کہ فرانس کی آزادی بالکل ختم ہو گئی، فرانس کی یہ حرکت انگریزوں کے لئے بہت صبر آزما تھی کیونکہ اب انہیں ہٹلریت کا تنہا مقابلہ کرنا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اس نازک موقع پر اپنی بڑائی کا ثبوت دیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جن مقصدوں کے لئے جنگ شروع کی گئی تھی ان کی خاطر وہ تنہا لڑیں گے اور اسی فیصلے اور مصمم ارادے میں انگریزوں کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

فرانس کی کمزوری سے ظاہر ہے کہ انگریزوں کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے سامنے ایک بڑا سوال فرانس کے بحری بیڑے کا تھا۔ فرانس اپنے جرمن آقاوں سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ برطانیہ سے کئے ہوئے وعدوں کے خلاف اس نے بہت سے کام کئے۔ مثلاً یہ کہ جرمن ہوابازوں کو جو فرانس میں قید تھے، فرانسیسی حکومت نے جرمنی کے حوالے کر دئے حالانکہ ان کے متعلق یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ برطانیہ کے حوالے کئے جائیں گے۔ اس قسم کے طرز عمل سے انگریزوں کو بڑا اندیشہ یہ تھا کہ ہٹلر فرانس کے بحریہ پر قبضہ کرلے گا اور پھر اسے برطانیہ کے خلاف استعمال کرے گا۔ اگرچہ ہٹلر نے فرانس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فرانسیسی بیڑے کو برطانیہ کے خلاف استعمال نہیں کرے گا لیکن اس کے وعدوں کی اصلیت معلوم تھی اور جرمنی کا اس بیڑے سے فائدہ اٹھانا یقینی تھا۔ لیکن انگریزوں نے اس موقع پر بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ ان کے پاس یہ یقین کرنے کے کافی اسباب تھے کہ جرمنی اپنے وعدے کا پابند نہیں رہے گا۔ اسی لئے انہوں نے

فرانس کے بحری بیڑے کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کی اور اس کے لئے ان کو ایک سخت کارروائی کرنی پڑی۔ انگریزوں نے بعض فرانسیسی جہازوں پر تو قبضہ کر لیا مگر دوسرے جہازوں پر جنھوں نے برطانیہ کی شرطیں نہیں مانیں، آتشبازی کی اور ان کو تباہ کر دیا۔ اس طرح دشمن کو فرانسیسی بیڑے سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملا۔

برطانیہ کی صورت حال۔ فرانس کو ختم کرنے کے بعد ہٹلر نے انگلستان کی طرف توجہ کی اور کم و بیش روزانہ جرمن ہوائی جہاز انگلستان پر حملے کرتے ہیں لیکن حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ انگریز بھی ہر قسم کے مقابلہ کے لئے اچھی طرح تیار ہو گئے ہیں۔ پہلے تو یہ تھا کہ بہت سی انگریزی فوجیں فرانس میں مصروف تھیں لیکن اب وہ برطانیہ واپس آگئی ہیں اور انگریزوں کی پوری توجہ برطانیہ کی مدافعت کی طرف ہو گئی ہے۔ صرف مدافعت ہی نہیں بلکہ اب برطانوی ہوائی جہاز جرمنی اور اس کے نئے فتح کئے ہوئے ملکوں پر بھی کامیابی کے ساتھ بم برساتے ہیں۔ برطانیہ اپنے وسیع ذرائع کی بدولت روز بروز طاقتور ہوتا جاتا ہے اور اس کی جنگی تیاریاں اب بڑی حد تک اطمینان بخش ہیں۔ اس وقت انگریزوں کے پاس پندرہ لاکھ تربیت یافتہ اور مسلح فوج ہے۔ اور شاہی ہوائیہ بھی بہت منظم ہے جس کی طاقت اور برتری کا ثبوت روزانہ مل رہا ہے۔ بڑی جنگی تیاریوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ مصمم ارادہ کہ کامیابی حاصل ہونے تک برابر لڑتے رہیں گے، سلطنت برطانیہ کے لئے بہت خوش آئند ہے، کیونکہ جو قوم کسی مقصد کے حصول کے لئے پکا ارادہ کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مقدور بھر کوشش بھی کرتی ہے، اس کو صرف کامیابی ہی کی توقع کرنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انگریزوں کے لئے بہت صبر آزما وقت ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اب تک اپنی بڑائی کا ثبوت دیا ہے اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ ان کا عزم بالجزم ہی ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔

مشرق کا اصول منرو۔ ۲۹ جون کو جاپان کے وزیر خارجہ مسٹر اریٹا نے اپنی ایک نشری تقریر میں یہ اعلان کیا کہ جاپان مشرق بعید اور جنوبی سمندروں کی حد تک اصول منرو پر عمل کرے گا۔ اصل میں جاپان یہ چاہتا ہے کہ مشرق میں ایک جدید نظام قایم کرے۔ چنانچہ مسٹر اریٹا کے یہ الفاظ قابل غور ہیں ”مشرقی علاقے اور جنوبی سمندروں کے ملک جغرافی، تاریخی، نسلی اور معاشی اعتبار سے آپس میں ایک خاص رشتہ رکھتے ہیں اور ان ملکوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دینا بالکل قدرتی چیز ہے .... جاپان کو توقع ہے کہ مغربی ملک مشرقی ایشیا میں اپنے موقف کے استحکام کی کوشش نہ کریں گے۔

غالبًا یہی وجہ ہے کہ جاپان نے چین میں اپنی سرگرمیاں بڑھا دی ہیں اور مشرقی ایشیا پر پوری طرح چھا جانا چاہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے فرانسیسی ہند چین میں جاپان کا عمل دخل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

برما کی سڑک اور جاپانی کابینہ۔ جاپان میں امیر البحر یونائی کی کابینہ نے ۱۶ر جولائی کو استعفیٰ دے دیا اور حکومت میں دوبارہ فوجی عنصر غالب آ گیا۔ یعنے شہزادہ کونائی اب پھر وزیر اعظم بن گئے۔ نئی کابینہ میں یوسکی متسوکا وزیر خارجہ، امیر البحر یوشیڈا وزیر بحریہ اور لفٹنٹ آئیکٹو وزیر جنگ مقرر ہوئے ہیں۔ شہزادہ کونائی اور مسٹر متسوکا کے برسر اقتدار آنے کے معنی جیسا کہ چینیوں کا خیال ہے، یہ کہ جاپان اب فاشستی بن رہا ہے

یہ صحیح ہو یا غلط، اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب مشرق میں زرد خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاپان یورپ کی موجودہ صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کو مغرب میں مصروف دیکھ کر جاپانیوں نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور برما کی سڑک کو بند کر دینے کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ نے جاپان کے ساتھ اس سڑک سے متعلق ایک راضی نامہ طے کر لیا اور برما کے جس راستے سے چین کو سامان روانہ ہوتا تھا اسے فی الحال تین مہینے کے لئے بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان کی نئی حکومت مشرق بعید میں من مانی کارروائی کرنے پر تل گئی ہے اور اب جاپانیوں کو غالباً میدان اتنا صاف نظر آرہا ہے کہ وہ امریکہ کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ برما کی سڑک کے بند کر دیئے جانے کو مسٹر کارڈل ہل نے ناپسند کیا تو اس پر جاپانیوں نے کہا کہ ہمیں امریکہ کی مخالفت کا ڈر نہیں۔ موجودہ صورت حال ایسی ہے کہ صرف ممالک متحدہ امریکہ ہی جاپان کے ارادوں میں کچھ مزاحمت کر سکتا ہے کیونکہ مشرقی اور مغربی اصول منرو میں تصادم کا قوی امکان ہے لیکن معلوم نہیں کہ امریکہ بحر الکاہل میں اپنی بڑائی کا ثبوت دے گا یا خاموشی اختیار کرے گا اگر امریکہ نے اس موقع پر کسی قسم کی کمزوری دکھائی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جاپانیوں کو جنوب میں پھیلنے کا موقع مل جائے گا اور بحر الکاہل کے امن میں خلل پڑ جائے گا۔

روس اور رومانیہ پہلے چند روز سے بلقان کے حالات بڑی اہمیت اختیار کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس، اطالیہ اور جرمنی تینوں مل کر بلقان کی مملکتوں کو آپس میں تقسیم کر لینا چاہتے ہیں چنانچہ ایک طرف یہ اندیشہ ہے کہ جرمنی اور اطالیہ ہنگری کے ذریعہ کوئی نیا گل کھلائیں گے اور دوسری طرف یہ خطرہ ہے کہ روس برابر آگے بڑھتا جائے گا۔ فی الحال روس کی کارروائی صرف اتنی تھی کہ اس نے جون کے آخر ہفتہ میں رومانیہ کو ایک الٹی میٹم دے کر اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومانیہ کی حکومت ۲۸ جون کو مستعفی ہو گئی اور اس کی جگہ جو نئی حکومت آئی اس نے روس کے مطالبات مان لئے چنانچہ روس کو رومانیہ کے دو علاقے یعنے بسارے بیا اور بکووینا مل گئے اور اس طرح مملکت روس کی سرحدیں کچھ اور آگے بڑھ گئیں۔ اس موقع پر یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کارروائی کے متعلق اسٹالن اور ہٹلر میں پہلے سمجھوتہ ہو گیا تھا اور ہٹلر نے رومانیہ کی نئی حکومت کو جو نازیوں کی طرف دار ہے، یہ مشورہ دیا تھا کہ رومانیہ بغیر لڑے اپنے دونوں علاقے روس کے حوالہ کر دے دوسری طرف ہنگری اور یوگوسلاویا بھی ہٹلر کے بل بوتے پر رومانیہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ رومانیہ کا کچھ علاقہ ان دونوں کی بھی نذر ہو جائے۔

مسٹر روزولٹ کی نامزدگی۔ ممالک متحدہ امریکہ کے صدر کا انتخاب ہر چوتھے سال ہوا کرتا ہے اور ملک کی عمومی اور جمہوری دونوں سیاسی جماعتیں انتخاب کے لئے اپنے اپنے نمایندوں کو نامزد کرتی ہیں۔ اس مرتبہ بھی حسب روایت جون اور جولائی میں کافی سرگرمی رہی اور ان دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے مسلک کی وضاحت کی کہ ان کا نامزد کردہ صدر اسی مسلک پر کاربند ہوگا۔ جمہوری جماعت نے ملک کے موجودہ نظم و نسق پر الزامات لگائے اور اعلان کیا کہ وہ جنگ کے بالکل خلاف ہے۔ عمومی جماعت نے بھی اپنے خارجی مسلک کی وضاحت کی اور کہا جاتا ہے کہ امریکہ کو جنگ سے الگ رکھنے کا وعدہ کیا عمومی جماعت اس دفعہ مسٹر روزولٹ کو تیسری بار صدر بنانا چاہتی ہے چنانچہ مسٹر روزولٹ اب پھر صدارت کے لئے نامزد کئے گئے ہیں۔ اگرچہ رائے دہی سے پہلے مسٹر المر رپان وغیرہ نے اعتراض کیا کہ کسی شخص کا تیسری مرتبہ انتخاب نہ ہونا چاہئے۔ مگر یوں کہنا چاہیے کہ مسٹر روزولٹ متفقہ طور پر نامزد کر دئے گئے اور انھوں نے امیدواری قبول بھی کر لی۔

(ح - ص)

موجودہ جنگ اور دنیائے اسلام

اسلام اپنی ضرب المثل اخوت اور گوناگوں خوبیوں کی بنا پر ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں اسلام کے پیرو اور خدائے وحدہٗ لاشریک کے پرستار موجود نہ ہوں۔ قطب شمالی کے سرد اور برفیلے ممالک میں بھی مسلمان ہیں اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی اذان کی آواز گونجتی ہے۔

مسلمان سب سے زیادہ جن علاقوں میں آباد ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

افغانستان (آبادی ایک کروڑ) ایران (ایک کروڑ پچاس لاکھ) عراق (تیس لاکھ) شام (تیس لاکھ) سعودی عرب، یمن (ایک کروڑ بیس لاکھ) فلسطین (آٹھ لاکھ پچیس ہزار) جاپان و چین (چھ کروڑ) اور ہندوستان (آٹھ کروڑ بیس لاکھ) افریقہ مصر (ایک کروڑ پچاس لاکھ) لیبیا اور الجیریا (۶۲ لاکھ ۷۳ ہزار) ترکی (ایک کروڑ پچاس لاکھ) اور البانیہ وغیرہ میں۔

ترکی ۔ یورپ کی واحد اسلامی مملکت (البانیہ کو چھوڑتے ہوئے) ترکی ہے جو مرحوم اتاترک کی مدبرانہ سیاست کی بدولت سنہ ۱۹۱۴ء کے مرد بیمار سے آج یورپ کی طاقتور سلطنت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ گو مصطفیٰ کمال انتقال کر گئے لیکن ان کے جانشین عصمت انونو کی قیادت میں ترکی برابر ترقی کر رہا ہے۔ اگرچہ پچھلے چند دنوں سے ترکی بعض آسمانی بلاؤں کا شکار رہا لیکن ان مصیبتوں سے ترکوں کے حوصلے کم نہیں ہوئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے نازک زمانے میں جبکہ ترکی میں زلزلے اور طوفان نازل ہو رہے تھے، ترکوں کے سامنے جنگ یورپ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ترکی نے اس نازک دور میں بھی اپنی سیاست کی کشتی کو کامیابی کے ساتھ چلایا یا کم از کم اب تک چلا تا رہا۔

موجودہ جنگ میں اس کی پالیسی مرنجان مرنج کی رہی ہے یعنی یہ کہ وہ کسی یورپی طاقت سے ناخوشگوار تعلقات پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ سب کو خوش رکھنا چاہتا ہے یہ بلقان کی اہم ترین مملکت ہونے کی حیثیت سے اور درۂ دانیال کے محافظ ہونے کی بنا پر یونان، روس، جرمنی، اطالیہ اور برطانیہ بھی اس سے بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ جب فرانس برطانیہ اور ترکی کے درمیان پچھلے سال معاہدہ پر دستخط ہوئے تو ترکی روس کا بھی برابر حلیف رہا۔ موجودہ جنگ میں گو وہ بظاہر برطانیہ کا طرفدار ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ غیر جانبدار ہے۔ اس کا ثبوت وہ معاہدہ ہے جو جرمنی اور ترکی کے درمیان حال میں طے پایا۔

حال میں برلن ریڈیو نے یہ افواہ اُڑائی تھی کہ روس نے ترکی کو الٹی میٹم دیا ہے لیکن خود اس کی تردید ماسکو کے ریڈیو نے کر دی اور ساتھ ہی وزیر اعظم ترکی نے پارلیمان کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی تردید کر دی

ایران ۔ مرحوم مصطفیٰ کمال کا سب سے بڑا کارنامہ میثاق سعدآباد تھا جس نے تمام اسلامی ممالک کو ایک رشتہ میں جکڑ دیا۔ ترکی اور ایران کے درمیان حال میں جو ریلوے لائن کا افتتاح ہوا ہے اس میثاق کا عملی ثبوت ہے۔ ایران اپنے تیل کے ذخائر کی بنا پر بیرونی ممالک کی خود غرضانہ نظروں کا شکار بنا ہوا ہے۔ ان ممالک میں روس کا نمبر پہلا ہے۔

جس سے ایران کو ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا ہے۔ حال ہی میں عساکر ایران کو مخاطب کرتے ہوئے جلالۃ الملک رضا شاہ پہلوی نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی جس میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ ایران بیرونی حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب دے گا۔

چونکہ ایران اور عراق میں معاہدات کی بنا پر تیل کا اجارہ برطانیہ کو دیا گیا ہے اس لئے یہی دو ایسے ممالک ہیں جن پر بیرونی حملہ کا اندیشہ ہے۔

افغانستان ۔ شاہ ظہیر شاہ کے دورِ حکومت میں یہ ملک ترقی کر رہا ہے۔ گو یہ ملک موجودہ جنگ سے بالکل الگ تھلگ ہے لیکن ہندوستان اور اس کے درمیان واقع ہونے کی بنا پر یہ خاص اہمیت رکھتا ہے عام طور پر یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں اشتراکیت کا سیلاب افغانستان کے راستے ہندوستان میں نہ آجائے لیکن اس کے سدِ باب کے لئے برطانوی حکومت نے سرحد پر زبردست انتظام کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ میثاقِ سعد آباد کا اہم رکن ہونے کی حیثیت اگر کوئی اس کو چھیڑ بیٹھے تو گویا وہ ساری اسلامی دنیا کو اپنا مخالف بنا لے گا۔

مصر ۔ بحیرۂ روم کے مالک اور سوئز کے حکمران کی حیثیت سے مصر کو موجودہ جنگ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ جنگ کی ابتدا کے بعد ہی احتیاطاً اس کا راستہ بند کر دیا گیا اور آج کل بحیرۂ روم میں جہازرانی کی آمد و رفت رُکی ہوئی ہے۔ برطانیہ کا ایک بڑا بیڑا یہیں موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی فوج بھی آج کل یہیں کیمپ ڈالے ہوئے ہے۔ مصر پر برطانیہ کا اقتدار ہے لیکن اسے اندیشہ اپنے دوسرے پڑوسی یعنی اطالیہ سے لگا رہتا ہے۔ چنانچہ جس وقت یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ فرانس اطالیہ کو شام دینے کے لئے تیار ہے اگر وہ ٹیونس و کارسکا کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائے۔ اس خبر سے مصر کے اندیشوں کو اور تقویت پہنچ رہی تھی اس لئے کہ اس لحاظ سے مصر تین طرف سے اطالیہ سے گھر جاتا ہے گو مسولینی نے اعلان جنگ کے وقت یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ مصر پر حملہ نہیں کرے گا لیکن آمروں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں مصر میں برطانوی علاقہ پر تو اطالیہ کا حملہ ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں مصر پر بھی اطالوی عقاب کا سایہ نہ پڑ جائے لیکن برطانوی بحری بیڑہ اور اس کی کثیر افواج کا مقابلہ کرنا اطالیہ کے لئے آسان کام نہیں ہے۔ چند سال قبل مسولینی نے خود کو محافظ اسلام، ظاہر کیا تھا گو اس کی اسلام دوستی کا ثبوت حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کے بعد ہی مل گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سے اسلامی ممالک پر قبضہ کا خواہشمند ہے کہ بحیرۂ روم جس کو وہ "ہمارا سمندر" کہتا ہے اطالیہ کے قبضہ میں آجائے۔

مراقش ۔ اور الجیریا بھی ہٹلر اور مسولینی کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مسولینی شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے اس بنا پر وہ طرابلس میں افواج جمع کر رہا ہے تاکہ مصر اور ٹیونس پر حملہ کر سکے۔ اطالیہ کی دست درازیوں کو روکنے کے لئے "اتحادِ عرب" کی تجویز عملی جامہ پہننے کو ہے چنانچہ حالیہ اطلاعات مظہر ہیں کہ عراقی فوجی افسر یمنی افواج کو قواعد سکھا رہے ہیں۔ عراق اور نجد میں بھی خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے ہیں اس اتحاد کا مرکز مصر ہے۔

فلسطین ۔ گو ایک عرصہ تک برطانیہ سے برسرِ پیکار رہا لیکن اب برطانیہ کی بدلی ہوئی پالیسی نے فلسطینی عربوں کے دل موہ لئے ہیں چنانچہ تمام عرب اس وقت برطانیہ کا ساتھ دے رہے ہیں اور اس کی فتح کے خواہشمند ہیں۔

جلال الدین جعفر

اڈگر والیس (بسلسلۂ گذشتہ)

اس مقصد کی تحصیل کے لئے وہ فوج سے بعجلت ممکنہ علحدہ ہونے کی کوشش کرنے لگا اور ہر وہ موقع جو خدمت اڈ کے لئے اس کو ملتا کام میں لاتا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اٹھارہ پونڈ ادا کر کے فوجی ملازمت سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے تو اس نے ۱۲ / مئی ۱۸۹۹ء کو یہی ترکیب کی اور اپنے چال چلن کا ایک صداقت نامہ حاصل کر کے مہذب اور شریف انسان کی حیثیت سے کالڈی کاٹ کے گھر اٹھ آیا اور چار مہینے تک وہیں ٹھیرا رہا۔ لیکن اس کی مصروفیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بہت کم وقت گھر پہ رہتا۔ رات کی آخری آنے والی گاڑی سے وہ اپنے قصبہ میں آ جاتا اور صبح کو پہلی جانے والی گاڑی سے اپنی نظموں اور مضامین کا پلندہ بغل میں دابے جنوبی افریقہ کے مختلف اخباروں کو دینے کے لئے روانہ ہو جاتا۔ لیکن انہیں دنوں میں کالڈی کاٹ نے جو اپنی لڑکی کی وجہ متفکر اور اس شادی کا مخالف تھا ایک نیا روڑا اٹکا دیا۔ ابھی اڈگر نے اس میدان میں قدم بھی نہ جمانے پائے تھے کہ کالڈی کاٹ نے نسبت توڑ دینے کی غرض سے دونوں کو دو سال تک علحدہ رہنے کا حکم دے دیا۔ اس زمانے میں اڈگر اپنے کو اس کے قابل بنا رہا تھا اور آئی وی بھی اس کوشش پا رہی تھی۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں جب کہ بوئر کے خلاف لڑائی کا اعلان ہوا تو اڈگر کو ریوٹرس نے مغربی علاقے کے نامہ نگار کی خدمت پیش کی اور اس کے بھاگ کھل گئے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی توجہ زیادہ تر طویل بیانیہ افسانوں پر صرف کی۔ یہ افسانے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے جن میں "ڈیلی میل" بھی شامل ہے۔ جنگ میں اس نے کئی مہینے گذار دیئے اور ہر شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ جنگ بالکل ختم ہو گئی۔ اڈگر بھی تین مہینے کی رخصت لے کر انگلستان چلا گیا تاکہ اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کرے۔ وطن میں اس کی یہ آمد خوشگوار نہ ہوئی جوں ہی وہ لندن پہنچا اس کو فری من کے انتقال کی اطلاع ملی اور اس کی کتاب جو اس احتیاط اور فخر کے ساتھ لکھی گئی تھی ناکام رہی کیونکہ اس سے اڈگر کو صرف پندرہ پونڈ ملے لیکن اس کے لندن آنے سے اس کے ملاقاتیوں میں "ڈیلی میل" کے اڈیٹر ٹام مارلو کا اضافہ ہوا۔ اس نے "ڈیلی میل" کے لئے جنگ سے متعلق چند طویل مضامین بھیجنے کی فرمائش کی۔ کوئی نصف درجن مضامین نے مارلو کو یقین دلا دیا کہ اب زیادہ آزمائش کی ضرورت نہیں اس لئے اڈگر کو نامہ نگار مقرر کر لیا۔

اپریل ۱۹۰۱ء میں اڈگر کیپ ٹاون گیا اور آئی وی سے شادی کر لی۔ انھوں نے اپنا ہفتۂ عسلی منانے کے لئے کیپ ٹاون کے مضافات میں ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ انتخاب کیا۔ پھر اڈگر اپنے کام پر چلا گیا۔ لڑائی بے لطفی کے ساتھ ہوتی رہی۔ اور اڈگر نے صحیح واقعات جنگ برطانیہ تک پہنچائے اور خوف زدہ عوام کو جنگ کی تفصیلات اور برطانوی نقصانات کی صحیح تعداد بتلا دی گیا۔ اور لارڈ کچنر نے اس پر اسرار خبر رسانی کو جو لندن کی گلی گلی میں پہنچ جاتی اور وہاں سے دشمنوں تک بھی معلوم ہو جاتی، احتسابی ذرائع سے بالکل بند کر دینا چاہا لیکن اڈگر ہمیشہ اس احتسابی گرفتاری سے باہر رہا۔ دوسرے اور اخباروں نے اس کے مضمون سے اقتباسات لینے شروع کئے اور حوالہ دیتے وقت وہ اس کے نام کے ساتھ خوشامدانہ الفاظ لکھنے لگے۔

اپریل سنہ ۱۹۰۲ء تک یہ ضروری ہوگیا کہ بوئر لیڈر معاہدۂ امن پر دستخط کردیں۔ ان کے نمایندے ۱۵ مئی کو "ویری نگنگ" میں "خیمۂ امن" پر جمع ہوئے۔ لارڈ کچنر نے معاہدۂ امن کی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے تمام نامہ نگاروں کو کیمپ سے باہر کردیا تاکہ گذرنے والے واقعات پر وہ نکتہ چینی نہ کرسکیں اور ساتھ ہی خیمے کے اطراف پہرہ دار بھی مقرر کردئے تاکہ "دیوارہم گوش دارد" کا خطرہ رہنے ہی نہ پائے۔ لیکن دو ہفتے کے سکوت کے بعد "ڈیلی میل" نے معاہدہ کے امکانات اور اس کی ترقی کے متعلق ایک تفصیلی اطلاع شائع کی۔ اور کسی کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اتنی رازداری کے باوجود اطلاع باہر کیسے گئی۔ جب "ڈیلی میل" نے اس دل خوش کن امن کی اطلاع شائع کی تو دوسرے اخبار جن کے ادارے مختلف پیشین گوئیوں کے حامل تھے برہم ہوگئے اور انھیں اس بات کا یقین نہ آیا جب دوسرے دن "بالفور" نے معاہدہ امن کا اعلان کیا تو سمجھا لیا کہ "ڈیلی میل" نے دفتر جنگ کے اہلکاروں کو معتدبہ رقم بطور رشوت دے کر یہ خبریں حاصل کی تھیں۔

لیکن حقیقت نہ اتنی دل خراش تھی اور نہ اتنی سادہ جب دوسرے نامہ نگار "خیمۂ امن" کے اطراف چکر لگا رہے تھے تو اڈگر نہایت معصومانہ انداز میں ریل میں بیٹھا کیمپ کے مضافات میں پھر رہا تھا۔ ریل "خیمۂ امن" کے قریب سے ہوکر گذری یہاں اڈگر نے اپنے ایک دوست کو متعین کردیا تھا اور تین مختلف رنگ کی دستیاں اظہار کے لئے مقرر کی تھیں سرخ دستی بیکاری کی علامت تھی، نیلی ترقی پذیری کی اور سفید دستی اس بات کی علامت تھی کہ معاہدۂ امن پر دستخط ہوچکے ہیں جب دوست "خیمۂ امن" کی ڈیوٹی ختم کردیتا تو باہر آکر اڈگر کو حالات سے آگاہ کردیتا۔

اڈگر پبلک کی نظروں میں بحیثیت ممتاز نامہ نگار اور حکومت کی نظر میں مجرم بنا ہوا کیپ ٹاؤن آگیا۔ اس کے پاس شاندار اطلاعیں تھیں اس لئے وہ ایک نئے اخبار "رانڈ ڈیلی میل" کا بمشاہرہ دو ہزار پونڈ سالانہ ایڈیٹر بن گیا۔ یہ اخبار جوہانسبرگ سے جاری ہوا تھا۔ اڈگر کی ابتدائی آمدنی اٹھائیس پونڈ تھی اور اب شادی مرگ کردینے والی رقم ایک ایسے شخص کے لئے جس کی عمر صرف ستائیس سال ہو بیحد اہمیت رکھتی تھی لیکن نو مہینے بعد یہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ وہ ہمیشہ کامیابی کی دھن میں مختلف تجاویز سوچتا رہتا۔ اس نے اپنی کامیابی کے لئے کافی مواد حاصل کرنے میں اپنی دولت نہایت دریادلی سے خرچ کردی تھی اور بڑی بڑی تنخواہیں رکھنے والا خارجی نامہ نگاروں کا عملہ قائم کیا تھا اس طول کے زمانے میں اس نے نہایت آرام و اطمینان سے زندگی گذاری۔ ایک بڑی عمارت اپنے قیام کے لئے کرایہ پر لی۔ اس نے اپنی دولت گھوڑ دوڑ وغیرہ میں بھی بڑی بے دردی سے خرچ کی۔ لیکن آخر کار اڈگر کو "رانڈ ڈیلی میل" کے مالک سے لڑ کر جنوبی افریقہ چھوڑنا پڑا۔ جنوبی افریقہ چھوڑتے وقت وہ تاجروں اور ملاقاتیوں کا سیکڑوں کا قرضدار تھا۔ جوہانسبرگ کا سنہری موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور وہ پھر مفلس کا مفلس رہ گیا۔

وطن کی طرف بحری سفر دل خوش کن نہ تھا اس کی ایک کم سن لڑکی اسی اثنا میں انتقال کرگئی۔ اڈگر کے پاس صرف اسی پونڈ تھے اور اس میں سے بھی اس نے کچھ رقم تاش کھیل کر گنوادی اور میاں بیوی دونوں اپنی حالت پر ماتم کرتے ہوئے صرف چھ شلنگ کے مالک بنے گھر پہنچے۔ اب اس کا اثاثہ صرف ایک ڈراما "سے سل رھوڈز" تھا

جس پر وہ لگاتار محنت سے کام کر رہا تھا۔ اڈگر نے اپنی گھڑی بارہ پونڈ میں رہن رکھی اور ڈل وچ میں ایک کمرہ میں مقیم ہوگئے۔ دوسرے دن اڈگر مارلو سے ملا جس نے پندرہ پونڈ فی ہفتہ کی ایک جائداد نامہ نگاری "ڈیلی میل" پر اس کا تقرر کردیا۔ اڈگر کے جذبات پھر بیدار ہوگئے وہ اب فلیٹ اسٹریٹ میں اٹھ آیا۔

ابتدائی چند ہفتوں میں اس کی ملاقات پالی رچرڈ سے ہوگئی۔ اس کی اکلوتی لڑکی کا انتقال ہوچکا تھا اور اب پالی تن تنہا غریب و خستہ حال ہوگئی تھی۔ اگرچہ بیس سال سے اس نے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا اور نہ دیکھنا چاہتی تھی اور اسی امید پر اڈگر نے بھی ماں سے کہدیا تھا کہ مجھ سے کسی قسم کی امید رکھنے کی ضرورت نہیں۔ چند مہینے بعد وہ سفری کمپنی کا اداکار بن کر براڈ فورڈ پہنچی جہاں اس کی صحت نے جواب دے دیا۔ اس کو وہیں دواخانے میں داخل کردیا گیا جہاں اس نے کس مپرسی کے عالم میں انتقال کیا، اس کے داماد نے اس کے آخری مراسم ادا کئے اور اس کی انجیل بطور یادگار اڈگر کے پاس بھیج دی گئی۔ ماں کی موت کے جاں گداز واقعہ نے اڈگر کو بے حد متاثر کردیا اور وہ اپنے طرز عمل پر ملامت کرنے لگا۔ اس نے اپنی ماں کو بہت دیر بعد پہچانا اس کو خودداری کے امتحان میں کامیاب پایا جس نے اڈگر کے نفرت آمیز الفاظ آخری وقت میں سنے اور لندن سے نکل کر موت و حیات کی کشمکش میں پڑگئی۔

اڈگر نے اپنی نامہ نگاری کے دوران میں مختلف ممالک دیکھے۔ کناڈا، اسپین اور بلجیم کانگو بھیجا گیا جہاں اس نے اس بڑے ملک کی ظالمانہ افعال کی تحقیقات کی۔

اس کا دوسرا تجربہ بہترین بہ شکل ایک مہینے کا ہوگا کہ بالک چوری کے سلسلہ میں مراکو گیا اسی اثنا میں اس کا ڈراما "سے سل رھوڑز" پیش کیا جانے والا تھا جس سے اڈگر کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن جب وہ لندن پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ بمشکل چھ راتیں چل سکا ہے۔ اس کے لئے یہ بیحد سخت صدمہ تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس ڈرامے کی آمدنی سے مالی مصائب دور ہوجائیں گے کیونکہ ابھی تک وہ حسب معمول آمدنی سے زیادہ صرف کر رہا تھا۔

وہ فلیٹ اسٹریٹ سے ناٹنگ ہل میں منتقل ہوگیا۔ یہاں اس نے ایک ناول لکھا جس میں سراغ رسانی کے سلسلے میں لندن کی خفیہ پولیس کام کر رہی تھی۔ لیکن افسانہ کا پس منظر سیاسیات تھا۔ اس زمانے میں آئی ڈی کی خود بخت ویرٹر کا انتظام کرتی اور اڈگر بچے کو گود میں لئے لکھنے میں مصروف رہتا۔ وہ اپنی کتاب "چار عادل" پر تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا اور جب ناشر کو مسودہ فروخت کرنے میں کوئی سہولت نظر نہ آئی تو اس نے خود ہی تالس پریس سے شائع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ کتاب کی تشہیر کے لئے ایک ہزار پونڈ کی کثیر رقم رکھی اور اس معمائی افسانے کے صحیح حل پر پانچ سو پونڈ کا انعام مقرر کیا۔

کتاب کی اشاعت کے تین مہینے بعد اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کتاب کی بکری اچھی ہو رہی تھی لیکن اس سے زیادہ اشتہارات کے بل آرہے تھے اور مطبع والے الگ ناخوش تھے اور اپنا حساب صاف کرالینا چاہتے تھے ان قرضوں سے بے باق ہونے کے لئے اس کو دو ہزار پونڈ کی اور ضرورت تھی جس میں اس کے فائدہ کا ایک پیسہ بھی شامل نہ تھا اور انعامی رقم کا مسئلہ الگ پریشان کر رہا تھا

تا اس برس میں ہزاروں حل آچکے تھے جن میں کئی ایک صحیح بھی تھے ۔ کتاب کے پڑھنے والے غضبناک ہو کر خطوط لکھ رہے تھے اور "جبّار عادل" کو ایک ذلیل دھوکا سمجھ رہے تھے ۔ لوگوں نے "ڈیلی میل" کے دفتر میں بھی خطوط ڈالے ۔ الفرڈ ہار مسورتھ نے اخبار کی نیک نامی کے خیال سے اڈگر کی تنخواہ ایک ہزار پونڈ پیشگی دے دی اور اس طرح اڈگر دیوالیہ ہوتے ہوتے بچ گیا ۔

اس طرح اس کو "میل" کے دفتر میں کام کرنے کا موقع ملا لیکن ابھی سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ اس کی لاپروائی کی وجہ سے بے بنیاد خبروں کی بنا پر اخبار کو دو مقدموں میں کثیر نقصان برداشت کرنا پڑا اور ہارمسورتھ نے فیصلہ کر لیا کہ "میل" کے صفحات کو اڈگر کے رشحات قلم کا مرہون منت ہونے کی ضرورت نہیں ۔ اڈگر پھر مفلس ہو گیا اور عام طور پر یہ مشہور ہو گیا کہ وہ ایک خطرناک اور ناقابل اعتبار نامہ نگار ہے ۔ فلیٹ اسٹریٹ کا ہر دروازہ اس پر بند ہو گیا ۔

مہینوں گذر گئے لیکن اس کو کوئی کام نہ ملا اور اس کی میز ناقابل اشاعت مضامین اور افسانوں سے لد گئی اور اس بے روزگاری کے عالم میں اڈگر اور اس کی بیوی میں اختلاف پیدا ہونے لگا ۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں قسمت نے پھر پلٹا کھایا ۔ اتفاقاً اس کی ملاقات ایک ایڈیٹر مسٹر تھروڈن سے ہوئی جس نے اڈگر کا ایک افسانہ قبول کیا اور مختصر افسانے لکھنے کی نصیحت کی ۔ ایک دن تھروڈن لندن برج کو جانے کے لئے ایک بس میں سوار ہوئی اور اتفاق کی بات کہ اس بس میں اڈگر بھی تھا ۔ مزید برآں اس کو اڈگر کی بازو والی نشست پر جگہ مل گئی ۔ وہ اصلاعات کانگو کے جلسے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا اثنائے گفتگو میں اس نے اس ملک کے چند قصّے مسز تھروڈن کو سنائے جن کو اس نے یا تو سنا تھا یا بچشم خود دیکھا تھا ۔ مسز تھروڈن نے کہا "تمہارے پاس سب کچھ ہے مواد، کردار، رنگ، روغن، محو حیرت بنا دینے والی چیزیں، پھر کس چیز کی کمی ہے ۔ میرے ہفتہ وار داستاں گو کے لئے چند افریقی قصّے لکھ دیا ۔"

افسانوں کا یہ سلسلہ "سانڈرس آف دی ریور" نہایت کامیاب ثابت ہوا اور اڈگر نے یہ سمجھ لیا کہ ایک ایسا سرچشمہ اس کے ہاتھ آگیا ہے جو کبھی نہ خشک ہوگا ۔ اس نے کانگو کی نامہ نگاری کے دوران میں کئی یادداشتیں رکھ چھوڑی تھیں اور اب انھیں چیزوں کو اپنے خیال کی مدد سے کام میں لا رہا تھا ۔ قومیں، قبیلے، رسم و رواج، محاورے، توہمات، دیومالا اور کانگو زبان سے اس کی یادداشتیں بھری پڑی تھیں اور چونکہ یہ تمام حقیقتیں اس کے سامنے تھیں اس کو من گھڑت میں بھی دیر نہ لگتی تھی ۔

اڈگر پھر دولتمند تھا ۔ لندن کی تماشہ گاہوں اور گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں لوگوں کی نظریں اس پر اٹھنے لگیں ۔ آئی وی اس کے برعکس ان چیزوں سے متنفر تھی ۔ اڈگر کی تلون مزاجی نے عورتوں کی خوشامدانہ اور مضطربانہ آرزوؤں کا جواب دیا اور ان گنت عارضی معشوقوں سے آئی وی متوحش ہو گئی حتیٰ کہ ان کی عارضی اور عام فطرت بھی اس پر ظاہر ہو گئی ۔ طرفہ یہ کہ اس کی [illegible] اڈگر کی خواہش پر یہ کہنے کے لئے ٹیلیفون پر بیٹھ جاتا تھا کہ اڈگر گھر پر نہیں ہے حالانکہ وہ سامنے آرام کرسی پر لیٹا ہوا سگریٹ کے ملتے بادل چھوڑتا رہتا ۔ باقی آئندہ ۔

اکبر صدیقی

چائے کی سرگذشت

دنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا نہیں جہاں چائے مہمان نوازی کا لازمی عنصر نہ ہو۔ اگنس ریپلیر Agnes Repplier کے الفاظ میں "چائے امیروں کی دوست اور غریبوں کی عزیز ہے" چائے پینے میں جو لمحات صرف ہوتے ہیں وہ ہماری زندگی کے بہترین لمحات ہوتے ہیں۔ چائے ایک مجسم شاعری اور بذات خود ایک رومان ہے۔ جس کی سرگذشت یہاں مختصر الفاظ میں بیان کی جائے گی۔

چائے کی ابتدائی تاریخ پوشیدہ ہے۔ لیکن عام طور پر روایات یہ ہیں کہ اس کے انکشاف کا سہرہ شہنشاہ چن ننگ Chinnung کے سر ہے جو سنہ عیسوی کے تین ہزار سال پہلے کا آدمی ہے۔ اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ چین کی زرعی ترقی بڑی حد تک اسی کی بدولت ہوئی۔ اس کا ایک قول مشہور ہے کہ چائے شراب سے کئی گنا بہتر ہے اس لئے کہ نشہ آور نہیں۔ ... یہ پانی سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں جراثیم نہیں ہوتے۔ کنفیوسش Confucius بھی چائے کی تعریف میں کچھ کم رطب اللسان نہ تھا اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ تاکید کی تھی کہ اگر کوئی آکر کہے کہ وہ پیاسا ہے تو اس کو بغیر معاوضہ کے ایک چائے کی پیالی دیدو۔ چائے کے متعلق قدیم چینی ادب بھرا پڑا ہے لیکن کین لنگ Kein lung نے جو چوتھی صدی عیسوی کا مشہور اہل قلم تھا اس پودہ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ نیز چینی مورخ لو یو Lu yu بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے جو غالباً ساتویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانہ کا آدمی ہے۔ اس پودہ کا سائنٹفک مطالعہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کا جوشاندہ تیار کرنا شروع کیا۔

کین سنگ لکھتا ہے "اپنی فرصت کے وقت اس طرح تیار کئے ہوئے مشروب کو نوش فرمائیے جو آپ کے رنج و ملال کی پانچوں وجوہات کو دور کردے گا۔ اس مشروب کے پینے سے جو اثرات دل و دماغ پر مرتب ہوتے ہیں انھیں الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا بلکہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے"

اسی طرح لو یو نے چائے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "یہ جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہے دل کو سکون پہنچاتی ہے تھکان دور کرتی اور خیالات میں بیداری پیدا کرتی ہے کاہلی کو دور کرتی اور جسم کو ہلکا بناتی ہے۔ رنج و ملال کے خیالات اس سے دور ہو جاتے ہیں"

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ چائے کا پودا سب سے پہلے کس سرزمین پر پیدا ہوا بعض کا خیال ہے کہ یہ پودا چین میں جنم لیا اور بعض اسے ہندوستان کی پیداوار بتاتے ہیں لیکن یہ چین کی پیداوار ہو یا ہندوستان کی یہ بات تو یقینی ہے کہ صرف چینی ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے چائے کے فوائد اور افعال کا انکشاف کیا۔

اس کے متعلق بہت معلومات نہیں کہ چینیوں نے سب سے پہلے اس درخت کو کہاں سے حاصل کرکے اپنے پاس کاشت شروع کی۔ اس لئے کہ اس وقت چین میں جن چائے کے پودوں کی کاشت ہوتی ہے ان کی قسم اس سے بالکل مختلف ہے جس کی زمانہ قدیم میں کاشت کی جاتی تھی۔ علم نباتات سے

ہیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سدا بہار پودے جن کا تعلق خاندانِ کیمیا Camellia سے ہے چین ہندوستان اور برما کے پہاڑی حصوں میں اُگتے ہیں۔ اور جہاں تک تاریخ ہماری مدد کرتی ہے اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شان اسٹیٹ Shan state کے باشندوں نے عرصہ دراز تک اس پودہ کی کاشت کی گو وہ لوگ بحیثیت مشروب اس کے فوائد اور خواص سے قطعی طور پر ناواقف تھے۔

سنہ عیسوی کے اوائل میں اہلِ چین نے بہت بڑے پیمانہ پر چائے کی تجارت شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد چائے کا پودا جاپان بھی پہنچ گیا اور جاپانیوں کو دسویں صدی تک چائے پینے کی عادت پڑگئی۔ اس کے بعد کسی حد تک دنیا میں اہلِ چین اور جاپان دو ایسی قومیں تھیں جو چائے کی عادی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ پرتگال نے سب سے پہلے یورپ میں چائے نوشی کی ابتدا کی۔ لیکن ٹھیک طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں ولندیزیوں نے بحیثیت مشروب اسے یورپ میں مقبولِ عام کیا۔ کارنیلیس باٹرلو Cornelius Bottrloe نامی جامعہ لیڈن کے ایک پروفیسر نے سنہ ۱۶۴۳ء میں چائے کے فوائد پر سب سے پہلی کتاب تصنیف کی تاکہ لوگ اس نئے مشروب کے خواص اور فوائد سے پوری طرح واقف ہوجائیں۔ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر تک یورپ چائے سے اچھی طرح آشنا نہ تھا لیکن جب اسٹیٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ لندن میں چائے کے نمونے پہنچ گئے تو اس وقت اس کی باقاعدہ تجارت شروع ہوگئی لیکن اس کے بعد بھی انگریز ایک عرصہ تک چائے کے استعمال کو بے جا عیش پسندی سمجھتے رہے لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا چائے پینے والوں کی تعداد بڑھتی گئی چنانچہ سنہ ۱۸۱۹ء تک سلطنت برطانیہ کے کم و بیش تمام باشندے چائے کے عادی ہوگئے۔ اور عام طور پر فی شخص ایک پونڈ کے حساب سے چائے کا خرچہ ہونے لگا۔

چائے کا سب سے پہلا انگریز تاجر تھامس گاروے ہے اور یہی شخص ہے جس نے سب سے پہلے چائے خانہ کی ابتدا کی۔ گاروے نے سنہ ۱۶۶۰ء میں چائے کی تعریف میں ایک انوکھا اشتہار شائع کیا تھا جو اب تک برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیمیل پیپی Samuel pepys اور اس کی بیوی ان لوگوں میں سے ہیں جو سب سے پہلے گاروے کی ترغیب کا شکار ہوئے۔ پیپی کی ڈائری میں ۲۵ ستمبر سنہ ۱۶۶۰ء کی تاریخ یہ الفاظ درج ہیں "میں نے ایک چائے کی پیالی منگوائی ہے جو ایک چینی مشروب ہے اور جس کو میں نے اب تک نہیں پیا۔"

چائے کے متعلق سب سے پہلا اشتہار لندن گزٹ کی ڈسمبر سنہ ۱۶۵۸ء والی اشاعت میں شائع ہوا جس میں ایک شخص تھامس ایگل Thomes Eagle نے اعلان کیا کہ "بہترین چائے کا ایک پارسل اتفاقاً میرے ہاتھ لگا ہے جو تیس شلنگ فی پونڈ کی قیمت پر حاصل کیا جاسکتا ہے" اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں انگلستان کا صرف متمول طبقہ ہی چائے کو استعمال کرتا ہوگا۔

جو تین شلنگ فی پونڈ کی قیمت برداشت کرکے اسے خرید سکتا ہو۔

عہد وکٹوریہ کے ابتدائی زمانہ یعنی ۱۸۳۲ء تک چائے کوئی قیمتی چیز نہ رہی بلکہ خاص و عام میں بحیثیت چینی مشروب کے مقبول ہوگئی۔ لیکن اس وقت تک بھی اس کی تجارت صرف چینیوں ہی کے قبضہ میں رہی۔ اس کے ایک سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی چائے کی تجارت کا ٹھیکہ ختم ہوگیا اور خود ہندوستان میں اس کی کاشت شروع ہوئی۔ ابتداً یہ شبہ تھا کہ اس کی کاشت ہندوستان میں کامیابی کے ساتھ نہ ہو سکے گی۔ گو ۱۷۸۰ء میں دو ماہرین نے اس کی کامیابی کا یقین بھی دلایا تھا البتہ ہندوستان میں چائے کی کاشت پر تجربے ضرور کئے گئے چنانچہ کرنل کڈ نے سر جوزف بانکس کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ اس کے باغ کنین Canton سے لائے ہوئے چائے کے پودے بہت سرسبز اور شاداب ہو رہے ہیں اور اسی سال وارن ہیسٹنگ Warren Hasting نے بھوٹان کے جارج باگل کے پاس اُمن Ajson کی چائے کے چند بیج روانہ کئے پھر آٹھ سال بعد خود سر جوزف بنکس نے بنگال میں بڑے پیمانہ پر چائے کی تجارت کے متعلق تحقیقات کی لیکن یہ تمام کوشش کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی اور جس وقت تک آسام میں دیسی چائے کے درختوں کی کاشت کا انکشاف نہیں ہوا اس وقت تک تجارتی پیمانہ پر چائے کی ابتدا نہ ہو سکی۔

۱۸۲۰ء میں مسٹر ڈیوڈ اسکاٹ کمشنر آسام نے کلکتہ کو چائے کی چند پتیاں روانہ کیں جن کے متعلق سمجھا گیا تھا کہ وہ جنگلی چائے کے پودوں کی ہیں ان میں کی بعض ابھی تک ہنائین سوسائٹی Hinnaem Society لندن کے نباتیاتی ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔ بلاشبہ یہ ان ہی پودوں کی پتیاں ہیں جن کی کاشت آسام میں آج بھی ہوتی ہے۔ یہ پتیاں ڈاکٹر ورلچ Dr. Wallich کو جو اس وقت کلکتہ کے نباتیاتی باغ کے سپرنٹنڈنٹ تھے بھیجی گئی تھیں۔ چودہ برس کی تحقیق کے بعد یہ ماہر نباتیات اس نتیجہ پر پہنچا کہ اصلی چائے کا پودہ حقیقت میں آسام ہی کی پیداوار ہے۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ ولیم بنٹنک کی حکومت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ چین سے پودوں کی فراہمی اور ہندوستان میں اس کی کاشت کے موزوں ترین مقام کے مسائل پر غور کرے ابھی دیسی پودوں کی کاشت کا مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ اس کمیٹی نے ایک گشتی کے ذریعہ اس قسم کی آرا طلب کیں جن سے یہ پتہ چلے کہ ہندوستان کے کس مقام پر چائے کی کاشت کامیاب طریقہ سے ہو سکتی ہے اور اپنے ایک کارکن مسٹر جی جے گارڈن کو چین روانہ کیا تاکہ وہ اپنے ساتھ چائے کے بیج اور کچھ کاشتکاروں کو بھی لیتے آئیں۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس وقت تک بھی کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ آسام میں چائے کی کاشت کی جائے اور چین کے بھیجے ہوئے وفد سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ ہندوستان اور چین کے درمیان چائے کے بیجوں کی بڑے پیمانہ پر تجارت شروع ہوگئی۔ بالآخر چند سال بعد اس چیز کا انکشاف ہوا کہ آسام کے پہاڑی علاقہ میں بھی اس کی کاشت ہو سکتی ہے۔

یہ پودے امتحان کے لئے ڈیوڈ اسکاٹ کے ذریعہ ماہرین نباتیات کے پاس دوبارہ بھیجے گئے۔ لیکن ان لوگوں نے اس بات کو تسلیم کرنے میں شبہ ظاہر کیا کہ آیا ان کی کاشت کے لئے ہندوستان کی فضا موافق ہے۔ کمیٹی کی گشتی ملنے پر کپتان جان کنس نے جنھیں آسام کی وادی کا چارج دیا گیا تھا۔ اور جو دیسی پودوں کے متعلق نہ صرف اچھی طرح واقف تھے بلکہ خود بھی چائے کا استعمال کیا کرتے تھے۔ اس گشتی کو ایک نوجوان افسر لفٹنٹ کارلٹن مقیم سیڈیا کے پاس روانہ کردیا۔ کارلٹن نے فوراً ہی (۸ر نومبر ۱۸۳۴ء) چائے کے ساتھ اس کے پھلوں اور بیجوں کے نمونے بھی کلکتہ روانہ کردئے۔ یہاں اس کا اچھی طرح امتحان کیا گیا اور اب یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ اسی قسم کے پودے ہیں جن کی چین میں کاشت ہوتی ہے۔ مسٹر گارڈن کو چین سے واپس بلا لیا گیا اور کمیٹی نے آسام کو اس کی کاشت کا مرکز قرار دیا جہاں ایک سال کے اندر ہی بہت بڑے پیمانہ پر اس کی کاشت ہونے لگی۔ اس کے بعد ہندوستان میں چائے کی خفیہ تاریخ۔ اس کی مقبولیت اور مخالفت اور اس کے کاشتکاروں کی ان تھک محنت بذاتِ خود ایک رومان ہے۔

۱۸۳۶ء کے بعد جب کہ پہلی مرتبہ کلکتہ میں چائے کے پودے بھیجے گئے تھے اس کی صنعت باوجود گوناگوں مشکلات کے برابر ترقی کرتی گئی اور اس طرح بڑے تجارتی پیمانہ پر اس کی کاشت کی بنیاد پڑ گئی۔ آج سے کوئی ایک سو سال پہلے آسام کے ایک ماہر نباتیات نے چائے پر مضمون تحریر کئے تھے۔ ان کی بدولت ہندوستانی چائے ساری دنیا کے باشندوں کی زندگی کا اہم جزو بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں لاکھوں آدمی اسے روزانہ ایک مشروب کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں لوگ اپنی دوسری مصروفیتوں کے باعث اس چیز کو بھول جاتے ہیں کہ معمولی سے پودے نے انسان کی روزمرہ سماجی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کردیا ہے آج بھی یہ معمولی پودا انسانی زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور چائے ہماری موجودہ تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔

محمد جلال الدین جعفر

مکتبہ اردو لاہور کی سیاسی کتابیں

کمپنی کی حکومت ہندوستان کے صد سالہ دورِ پُر آشوب کی لرزہ خیز داستان! گبن اور کارلائل کا اندازِ بیان! خون کھولا دینے والے حوادث تاریخ ــــ ادب ــــ تنقید! مصنفہ کامریڈ باری عہ ر

ترکی جمہوریہ ترکی کے متعلق مستند اور تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔ مع سوانح حیات کمال اتاترک۔ سید ضمیر احمد ہاشمی عه

ماتاہری گذشتہ جنگ عظیم کی سب سے مشہور جرمن جاسوسہ کے سوانح حیات دلچسپی اور رنگینی کے لحاظ سے کتاب اپنا ثانی نہیں رکھتی خلیل احمد ۸ر

آہنگِ رزم ہندوستانی زبان میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ شجاعت اور غیرت کے جذبات ابھارنے والی کتاب سوئم اڈیشن وقار انبالوی قیمت ۸ر

پاگل شہرہ آفاق مصنف خلیل جبران کا یہ پاگل دنیا کا عظیم ترین انسان ہے۔ اس کی کہاوتیں اور کہانیاں ہماری زندگی کی تفسیریں ہیں۔ مترجمہ بشیر ہندی ۸ر

کارل مارکس سوشلزم کو سائنٹیفک شکل دینے والے بزرگ کے مکمل حالات و تعلیمات از کامریڈ باری ۶ر

سٹالین موچی کا بیٹا ایک عظیم الشان شورائی جمہوریت کا کیونکر وارث بن گیا مکمل سوانح مترجمہ اشرف خاں عطا ۶ر

شہنشاہ حبشہ مسولینی اور ہیلے سلاسی کی لرزہ خیز خونی داستان ڈرامائی انداز میں۔ اختر اوریوی ایم اے ۶ر

سرمایہ داری اصل میں کیا ہے؟ غریبوں کا خون کیسے چوسا جا رہا ہے بیسیوں ضخیم کتابوں کا نچوڑ ...... اردو میں پہلی تصنیف۔ عبداللہ ملک ۶ر

سوشلزم کارل مارکس کے دستِ راست فریڈرک اینگلز کی شہرہ آفاق تصنیف جو دنیا کی ہر معروف زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ مترجمہ کامریڈ باری ۶ر

کمیونسٹ مینی فیسٹو (اشتمالی منشور) کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کا وہ مشترکہ منشور جسے کمیونسٹوں کے نزدیک بائبل کا درجہ حاصل ہے۔ کمیونسٹوں کا پروگرام۔ کامریڈ باری ۶ر

انقلاب فرانس شاہ پسندوں اور انقلابیوں میں تصادم عوام کی بغاوت۔ ہر پہر میں انقلاب آنے کو تھا۔ کہ سرمایہ داروں نے اس انقلابی لاوے کا رُخ کس طرف؟ نیا اڈیشن کامریڈ باری ۶ر

عصمت انونو ٹرکی کے موجودہ ڈکٹیٹر اور ملک کے سب سے بڑے مدبر کے سوانح حیات ترکی کی جدید ترقیات کے مفصل حالات مترجمہ اشرف خاں عطا ۶ر

لینن بیسویں صدی کے سب سے بڑے انقلابی جوان مرد کے سوانح حیات جس نے روس کو آزاد کرایا۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف قیمت عه

ماہنامہ ادبِ لطیف!

ہر شخص جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس حقیقت کا معترف ہے کہ ہندوستان میں ادب لطیف ہی وہ تنہا ادبی رسالہ ہے جسنے اردو ادب کی ترقی و فروغ میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔

مضامین کے لحاظ سے بہترین اور قیمت کے لحاظ سے ارزاں ترین

ادب لطیف کے مستقل خریداروں کی خدمت میں سالنامہ اور افسانہ نمبر بالکل مفت پیش کئے جاتے ہیں ــــ

چندہ سالانہ چار روپے چار آنے نمونہ کا پرچہ ۵ر کا ٹکٹ بھیج کر طلب کریں ــــــــ ! مینیجر ادب لطیف لاہور

نہرست کتب مفت طلب کریں

بچوں سے

گذشتہ مہینے میں جو معمہ شائع ہوا تھا اسکے حل کافی تعداد میں وصول ہوئے۔

صحیح حل بھیجنے والے حسب ذیل ہیں:۔

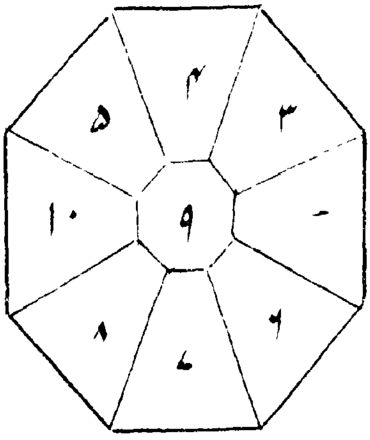
سید آصف علیخاں ۔ سرہری ۔ محمد ابراہیم ۔ رفعت النسا بیگم سید غلام دستگیر ۔ صابر حسین خاں ۔ اختر سلطان ۔ آصف اقبال ۔ حبیب سلطانہ ۔ غوث محی الدین ۔ محمد ظہیر الدین:۔

قرعہ اندازی کے بعد "سید آصف علیخاں" انعام کے مستحق قرار پائے وہ محمود علی اکبر مشیر کی لکھی ہوئی کتاب دفتر سے حاصل کریں۔

اگست کے پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ تیس کی سوانح حیات لکھ بھیجیں بجائے اس کے "محسنین اردو" ایک مضمون لکھ بھیجے جو دو صفحوں سے کم اور تین صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔ اچھے مضمون کو نہ صرف انعام دیا جائے گا بلکہ وہ اکتوبر کے سب رس میں شائع بھی کیا جائے گا۔

١٩ اگست کو شعبہ طلبہ ادارہ ادبیات اُردو کی جانب سے ایک بین مدارسی تقریری مقابلہ احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں شام کے چار بجے منعقد ہوا ۔ ہال طلبہ سے بھرا ہوا تھا ۔ اس مقابلہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول چادرگھاٹ ، دارالعلوم ، دارالشفاء ، مفید الانام ، آل سینٹس ہائی اسکول اور مدرسہ عالیہ کے طلبہ سرکاری طور پر شریک تھے ۔ حکم صاحبان ڈاکٹر زور صاحب ، لطیف احمد فاروقی صاحب اور عبد القیوم صاحب باقی تھے ۔ ۵ بجے مقابلہ شروع ہوا اور بڑا کامیاب رہا ۷ بجے کے قریب نتیجہ سنایا گیا مجید احمد فاروقی (دارالشفا) اول سید یعقوب حسین قادری (مفید الانام) دوم ، علی محمد حسین خسرو (مدرسہ عالیہ) سوم رہے ۔ لطیف فاروقی صاحب نے ڈھل راؤ (آل سینٹس) کو اور باقی صاحب نے شمس الدین (دارالعلوم) کو انعامات دیئے ۔ انعامات کی تقسیم ادارہ کی کوئی خاص تقریب کے وقت عمل میں آئے گی ۔ شعبہ طلبہ کے انتخابات عنقریب عمل میں آنے والے ہیں ۔ جلد جلد رکن بنتے اور بناتے جائیے ۔ خریداروں کا صرف کرین بھر کر بھیج دینا کافی ہے شعبہ طلبہ کا دستور دفتر ادارہ سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

معمہ کا حل یہ ہے۔

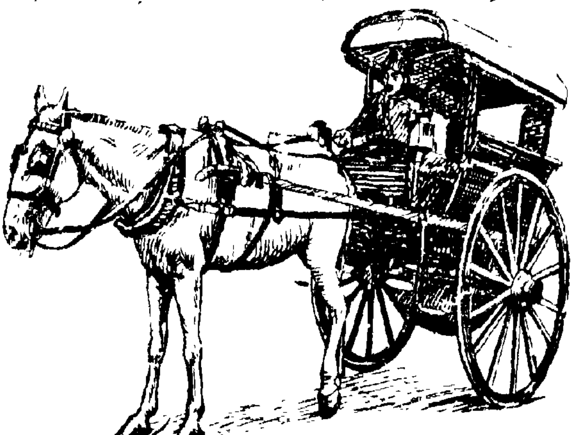


اس ماہ ادارہ کی جانب سے اُردو امتحانات منعقد ہوئے ۔ کافی تعداد میں امیدواروں نے اس میں شرکت کی ۔ یہ امتحانات نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ اضلاع میں بھی اکثر مقامات پر ہوئے ۔ ایک ماہ بعد نتیجہ نکلے گا دیکھنا ان میں سے سب رس بھائی کتنے کامیاب ہوتے ہیں۔

معین الدین احمد انصاری

جھٹکا

ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں عام طور پر غریبوں کو دو طرح کی سواریاں ملتی ہیں۔ ایک تو ایسی ہے کہ جس میں جانور نہیں جوتے جاتے بلکہ جانور کی جگہ ایک انجن ہوتا ہے جو تیل سے چلتا ہے اس سواری کو موٹر بس کہتے ہیں۔ بیس پچیس آدمی تک اس میں بیٹھ سکتے ہیں اور یہ



سواری اور دوسری سواریوں سے تیز چلتی ہے مگر اس میں عیب یہ ہے کہ مسافروں کو ان کے گھروں تک نہیں پہنچاتی بلکہ انھیں چوراہے کا صدقہ بنا کر وہیں چھوڑ دیتی ہے اور بقیہ منزل خود مسافر کو اپنا سامان پیٹھ پر لاد کر پیدل طے کرنی پڑتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چلنے سے پہلے اس کے پیچھے سے اتنا دھواں اٹھتا ہے کہ پورا رستہ دھواں دھار ہو کے رہ جاتا ہے۔

دوسری سواری ایسی ہے جس میں باہر کی طرف ایک جانور جتا رہتا ہے اور اندر ایک آدمی بیٹھا رہتا ہے۔ اس سواری کا نام جھٹکا ہے۔ یہ بڑی قدیم، تاریخی اور روایتی ہے۔ اس کے تین عنصروں میں سے ایک تو خود جھٹکا ہے دوسرے وہ جتا ہوا جانور جو ٹٹو کے نام سے مشہور ہے اور تیسرا جھٹکے والا یعنی وہ آدمی جو سامنے بیٹھا ہوا ٹخ ٹخ کر کے اسے چلاتا ہے۔

اس سواری کا نام جھٹکا شاید اس لئے پڑا کہ اس میں بیٹھنے والے کو جھٹکے پر جھٹکے کھانے پڑتے ہیں۔ جھٹکے کی تصویر موٹے لفظوں میں اس طرح کھینچ سکتے ہیں کہ یہ لکڑی کا ایک بڑا سا چوکور ڈبہ ہے، جس کے نیچے ایک لوہے کا ڈنڈا اڑا کر دو پہیوں پر کس دیا ہے۔ دھوپ اور پانی کے بچاؤ کے لئے اوپر ایک چھت اور ہوا کے لئے پہلوؤں میں دو روشن دان بنا دئیے ہیں۔ سواری کے چڑھنے اترنے کے لئے پیچھے ایک پٹ کی کھڑکی ہے اور ادھر ادھر سے دو لمبی لکڑیاں سامنے کی طرف نکلی ہوئی ہیں جنھیں برکل کہتے ہیں۔ ان برکلوں کے بیچ میں ٹٹو کو چمڑے کے تسموں سے

کس کر دو انکڑوں میں اٹکا دیا جاتا ہے۔

یہ ٹٹو بھی خاص قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی شکل وصورت دم دار تارے سے بہت ملتی ہے۔ اسلئے کہ اس کی بناوٹ میں دم کا حصہ زیادہ اور ٹٹو بہت کم ہوتا ہے۔ چلنے سے پہلے وہ سکڑتا ہے اور اپنی دُم کو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں زور سے دبا لیتا ہے۔ ٹٹو کی اس حرکت سے بیٹھنے والے کو ایک ایسا جھٹکا لگتا ہے جس سے ایک طرف تو اس کے سر کا اگلا حصہ جھٹکے والے کی پیٹھ سے ٹکراتا ہے اور دوسری طرف پچھلا حصہ کھڑکی کے کنارے سے ٹکر کھاتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹٹو کی رفتار ٹھیک ہوجاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیٹھنے والے کے صرف دونوں بازو جھٹکے کے ادھر اُدھر کے روشن دانوں سے رگڑے پہ رگڑے کھاتے رہتے ہیں۔

بیٹھنے والے کے جھٹکوں اور حرکتوں کا دارومدار ٹٹو کی چال پر ہے۔ ٹٹو جس طرح چال چلتا ہے بیٹھنے والا بھی اسی ڈھب کے جھٹکے کھاتا ہے۔ مثلاً جب ٹٹو لہریا چلتا ہے تو بیٹھنے والا دائیں بائیں جھوکے کھاتا چلا جاتا ہے اور جب ٹٹو دُلکی چلتا ہے تو بیٹھنے والا اس طرح آگے پیچھے ہلتا ہے جس طرح مکتب کے بچے بغدادی قاعدہ پڑھتے وقت حرکت کرتے ہیں۔ بعض وقت چلتے چلتے ٹٹو کو بھوک لگتی ہے یا شاید اپنا گھر یاد آجاتا ہے تو بجائے آگے چلنے کے پچھلے پاؤں واپس ہونے لگتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دولتیاں بھی جھاڑتا ہے جو جھٹکے کے اگلے حصے یعنی پنکھے پر لگتی ہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میدان جنگ میں بم باری ہورہی ہے۔ اس حرکت سے اکثر کھڑکی کھل جاتی ہے چونکہ یہ اندر بیٹھنے والے کے لئے تکیے کا کام دیتی ہے اس لئے کبھی اس کے کھلتے ہی، وہ کھڑکی میں سے پھسلتا ہوا سڑک پر دھڑام سے گر پڑتا ہے۔ بعض جھٹکے والے گدیوں پر موم جامہ منڈھ کر، نشستوں پر رکھ دیتے ہیں تاکہ دولتیوں سے بم باری کرنے کی حالت میں کھڑکی کھل جائے تو بیٹھنے والے کو پھسلنے میں سہولت ہو اور وہ آسانی کے ساتھ مع گدی کے سر کے بل گر پڑے۔

اپنے دبلے پتلے ٹٹو کی طرح جھٹکے والا بھی نہایت غریب اور مفلس مگر بڑا باتونی اور بڑا حاضر جواب ہوتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے ایک جھٹکے والا پتھر گٹی پر کھڑا ہوا آواز لگا رہا تھا۔ ایک سواری نام پلی اسٹیشن کو، آؤ صاحب آؤ، کہاں جائیں گے سرکار آئیے بیٹھئے، ہوا کی طرح لے چلوں گا ہوا کی طرح، ایک صاحب آئے اور پوچھا کیا لو گے۔ جواب دیا، تقصیر آپ سے زیادہ کیا لینا ہے، بس بیٹھ جائیے، بس کا کرایہ دیدیجئے، اللہ چاہے تو آپ کو بس سے پہلے پہنچا دوں گا۔ پوچھا، آخر کتنے پیسے، منہ سے تو بولو۔ جواب دیا، بس وہی دو آنے پیسے اور کیا۔ اس نے کہا ایک بات کہتے ہیں، دیکھو ایک آنہ دیں گے اور نام پلی کے موڑ پر اتر جائیں گے، بولو، کیا بولتے ہو۔ جھٹکے والے نے کہا کہ تقصیر!

یہ ایک آنے کے پیسے بھی کیوں دیتے ہیں۔ حفاظت سے رکھیئے بال بچوں کے کام آئیں گے، میرے ٹٹو کی دم پکڑ کے بھاگتے چلو تو مفت پہنچ جائیں گے۔

اس ہیرا پھری میں اگر کوئی اللہ کا بندہ مل گیا تو وہ فوراً اسے جھٹکے پہ بٹھا، ٹٹو سے یہ کہتا ہوا آگے بڑھا، ہاں بیٹا چلو، ناک کی سیدھ پر ٹخ ٹخ، ٹخ، ہمارے سرکار کو بس پہنچنے سے پہلے پہنچاؤ ٹٹو اس کی ٹیکاری پر دم دبا کر چل کھڑا ہوتا ہے اور یہ اپنا چابک ہیے میں اڑا دیتا ہے۔ پیا گھومتا جاتا ہے اور چابک میں سے کٹ کٹ، کڑ کڑ کی آوازیں رستہ چلنے والوں کے لئے الارم کا کام دیتی ہیں کہ ہوشیار، خبردار، سامنے سے ہٹ جاؤ، ورنہ کسی ٹکر وکر کے ہم ذمے دار نہیں۔ ادھر جھٹکے والا جھٹکے نشین سے مزے مزے کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حالات اور واقعات بیان کرتا ہے جو اس کے باپ دادا سے سینہ بسینہ چلے

چلے آ رہے ہیں اور دنیا کی وہ وہ تازہ خبریں سناتا ہے کہ بس معلوم ہوتا ہے کہ گویا رپوٹر کی ایجنسی اس کے گھر کی کسی کوٹھری میں سمٹ آئی ہے۔ کبھی اپنے ٹٹو کی تعریف میں خیالی گھوڑے سرپٹ دوڑاتا ہوا کہتا ہے۔ تقصیر! یہ ٹٹو ایسا ویسا نہیں، ہوائی گھوڑے کی نسل سے ہے۔ فراٹے بھرتا ہوا، ہوا سے باتیں کرتا ہوا، کیسا تراٹ جا رہا ہے۔ دیکھئے نا، لبوں کیا مقابلہ کر رہا ہے۔ لوگاں باگاں بولتے تھے کہ بساں نکلیں گے تو جھٹکے قبرستان کو پہنچ جائیں گے اور ٹٹو قصائی کی دوکان پر لٹکتے نظر آئیں گے، گر واہ رے میرے خواجہ، تیری بھی کیا شان ہے۔ تقصیر تیل بند ہو جائے تو دیکھنا بساں بند ہو جائیں گے مگر اللہ چاہے تو ہمارے جھٹکے اسی طرح زوروں پر چلتے رہیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ
(بہ اجازت حیدرآباد ریڈیو)

لطیفہ

ایک دیہاتی دوست سے ایک شہری دوست نے کہا کہ میں نے شہر میں ایک ریل گاڑی دیکھی ہے جس میں ہم بیٹھتے ہیں اور گاؤں کو آتے ہیں۔ اس کا رنگ کالا ہے اور اس کے منہ سے دھواں نکلتا ہے۔ یہ سننے کے بعد دیہاتی دوست کو بھی خواہش ہوئی کہ وہ بھی اسے دیکھے۔ اور دوسرے ہی دن وہ صبح شہر گیا جس وقت اسٹیشن پہونچا اس وقت اسٹیشن پر کالے رنگ کا گارڈ کالے کوٹ پتلون میں سگریٹ پیتے ہوئے ٹہل رہا تھا اور اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ یہ دیہاتی سمجھا کہ یہی گاڑی ہے اور وہ اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔

حسین شریف درد

دنیا کے سات عجائبات

یوں تو دنیا خود ایک عجائب خانہ ہے لیکن اس عجائب خانے میں سے میری نظر میں سات چیزیں عجائبات کہلانے کی مستحق ہیں۔

(۱) ماؤنٹ ایورسٹ (۲) تاج محل (۳) دیوار چین (۴) پیسا کا ترچھا مینار (۵) آبشار نیاگرا (۶) رصد خانہ گرینوچ (۷) اہرام مصر۔

اب میں ان سب کا تفصیلی ذکر نیچے درج کرتا ہوں۔

(۱) ماؤنٹ ایورسٹ:۔ یہ ایک پہاڑ کی چوٹی ہے اس پہاڑ کا نام ہمالیہ ہے جو دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے اس کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ انتیس ہزار دو فٹ یعنی ساڑھے ۵ میل اونچی ہے اور سال کے بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہے اتنی بلندی تک پہنچنے کے لئے کئی لوگوں نے کوششیں کیں جن میں امریکہ و پولینڈ کی جماعتیں مشہور ہیں اس پر چڑھنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کے حسب ذیل اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ یہاں بہت زیادہ سردی ہوتی ہے دوسرا سبب یہ ہے کہ اس پر چڑھنے والوں کو جو دقتیں پیش آتی ہیں اسے وہیں کے لوگ جانتے ہیں اگر برف پر گر جائیں تو پھر کبھی نہ اٹھ سکیں تیسرا سبب ہوا کی لطافت ہے وہاں کی ہوا اتنی لطیف ہے کہ چڑھنے والے کو آکسیجن کا ڈبہ ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ چوتھا سبب برف کی گہرائی ہے کبھی کبھی برف کے بڑے بڑے تودے لڑھکتے ہوئے نیچے آجاتے ہیں۔

(۲) تاج محل:۔ ہندوستان کی جنت نشانی آج سے نہیں بلکہ ڈھائی ہزار برس پیشتر سے مشہور ہے یہاں کی زراعت صنعت و حرفت کا دور دور شہرہ تھا یوں تو شروع ہی سے ہندوستانی تاریخی واقعات مشہور ہو چکے تھے لیکن سترہویں صدی بہت مبارک ہے اسی صدی میں جہانگیر و شاہجہاں ہندوستان کو جنت نشان ...... بنا رہے تھے۔ جہانگیر و نورجہاں کی محبت بھری زندگی ختم ہوگئی اب ممتاز محل و شاہجہاں کی محبت مشہور ہوگئی تھی ان دونوں کی محبت نے جہانگیر و نورجہاں کی محبت کے افسانے لوگوں کے دلوں سے بھلا ڈالے اور اپنا قبضہ جما لیا واقعی ان دونوں کی محبت نورجہاں و جہانگیر کی محبت سے زیادہ گہری نکلی لیکن فلک کج رفتار کو کسی کی بھلائی اچھی نہیں دکھائی دیتی۔ ممتاز محل کو عدم آباد آنے کی دعوت ملی وہ جاتے ہوئے وصیت کر جاتی ہے کہ میری قبر پر ایک ایسا مقبرہ بنانا جس کی مثل کہیں نہ ملے خدا جانے کس ماہر تعمیرات نے اس عمارت کا نقشہ بنایا تھا کہ اس کے سامنے سے گزرتے ہی ہم اپنے آپ کو سلطنت مغلیہ کے دور میں محسوس کرتے ہیں اور شاہجہاں کو معمار بھی ایسے ملے کہ گویا قدرت نے ان معماروں کو صرف اسی کے لئے پیدا کیا تھا یہ عمارت سرتا پا سنگ مرمر کی ہے نفاست و کاریگری نے اس کی

خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے ہیں یہ عمارت فن تعمیر میں اول درجے کی سمجھی جاتی ہے۔

(۳) دیوار چین :- یہ عظیم الشان دیوار چین کی شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ تقریباً پانچسو میل تک چلی گئی ہے یہ زمین پر ۲۵ اور پہاڑوں پر ۱۵ فٹ بلند ہے اور اتنی چوڑی ہے کہ چار سوار اپنے گھوڑے ملا کر دوڑا سکتے ہیں یہ ایک تو دیوار کا کام دیتی ہے اور دوسرے مورچے کا۔ بہت مضبوط ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں اس کا کئی جگہ ذکر آیا ہے کہ " سکندر اعظم نے چینیوں کو شمالی باشندوں کی دستبرد سے بچانے کے لئے یہ دیوار تعمیر کی تھی کہا جاتا ہے کہ یہ دیوار شمالی باشندوں کے ہاتھ قیامت کے قریب ٹوٹ جائے گی " چنانچہ یہی ہوا یعنی سال ڈیڑھ سال پیشتر جاپانیوں نے اسے توڑ دیا اس دیوار کا قرآن میں " سد سکندری " نام بتلایا گیا ہے لیکن تاریخ میں سکندر کے وہاں تک پہنچنے کا کوئی پکا ثبوت نہیں ہے۔

(۴) پیسا کا ترچھا مینار :- پیسا PISA اٹلی میں ایک مقام کا نام ہے یہیں یہ مینار سات منزلہ بنا ہوا ہے اس کے اطراف کئی بلند مکانات بنے ہوئے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ترچھا ہی بنایا گیا تھا اور اس کے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں اس کو اگر تصویر میں دیکھا جائے تو جا مٹری کے لحاظ سے یہ مینار سطح زمین کے ساتھ ۴۰ درجے کا زاویہ بناتا ہے اس کی پانچویں منزل سے سارے شہر پیسا اور گرد و نواح کے مواضع ہتیلی میں نظر آتے ہیں اس عمارت کی تصویر دیکھنے سے بنانے والوں کی دماغی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۵) آبشار نیاگرا :- یوں تو اس آبشار سے بھی بلند آبشار دنیا میں موجود ہیں دریائے زیمبزی (افریقہ) کا آبشار وکٹوریہ ۳۶۰ فٹ بلند ہے خود ہندوستان میں میسور کا آبشار گروسپا جس کو وہاں کے لوگ " سیوا سمندرم واٹر فالس " کہتے ہیں ۳۰۰ فٹ سے زیادہ بلند ہے لیکن نیاگرا میں پانی کی جتنی مقدار آتی ہے اتنی دنیا کے کسی آبشار میں نہیں اس کی ایک دھار ½ میل چوڑی ہے۔ اور یہ ۱۶۷ فٹ کی بلندی سے گرتا ہے اس میں اتنا زیادہ پانی آنے کی وجہ یہ ہے کہ دریائے سینٹ وارنس پانچ بڑی بڑی جھیلوں سپیریر، ہیورن، مشگن، ایری، انٹریو میں سے گزرتا ہے ان کا مجموعی رقبہ صوبہ پنجاب کے برابر ہے جھیل ایری سے جھیل انٹریو میں داخل ہوتے وقت دریا کا پانی ۱۶۷ فٹ کی بلندی سے گرتا ہے اس آبشار سے امریکہ میں جھیلوں کے علاقے کے شہروں میں روشنی کی جاتی ہے اور تنہا اس کی ایک دھار ۵۰۰ گھوڑوں کی طاقت رکھتی ہے

(۶) رصد خانہ گرینوچ :- لندن کے قریب ایک رصد خانہ ہے یہ دنیا میں سب سے بڑا رصد خانہ ہے یہاں سے اجرام فلکی کی رفتار وغیرہ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے مشہور جغرافی خطوط طول بلد کا مرکزی دائرہ اسی رصد خانے پر سے گزرتا ہے۔ اس لئے اس دائرے کو مرکز مان کر مشرق و مغرب میں

خطوط طول بلد کھینچے جاتے ہیں۔

(۷) اہرام مصر۔ مصر پر کل ۲۶ چھوٹے بڑے خاندانوں نے حکومت کی ہے ان میں سے ۱۹ خاندانوں کے مقبرے مصر میں موجود ہیں یہ کل ستر کی تعداد میں مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں ان میں اٹھارویں خاندان کے مقبرے بہت مشہور ہیں مصر میں سونے کی کثرت تھی اتنی کثرت کہ اب اگر وہی کان شاہ فاروق کی حکومت کو مل جائے تو حکومت مصر دنیا میں متمول ترین حکومت ہو جائے اس لئے اکثر مقبروں میں سونا ہی سونا نظر آتا ہے قاہرہ سے دریائے نیل کے کنارے کنارے ۶ میل تک اٹھارویں خاندان کے مقبرے ہیں اور ایک مصری بادشاہ (جو اسی خاندان سے تھا) کے مقبرے میں سے اتنی سونے کی چیزیں نکلی ہیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں صرف اس کی لاش پر سے ۱۴۳ چیزیں نکلیں جن میں سے صرف دولوہے کی تھیں اور باقی سب سونے کی اس بادشاہ کا نام توت عنخ آمون تھا قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کو مرنے کے بعد اس کے اعمال کے مناسب راحت ملتی ہے وہ تعویز گنڈوں کے بہت معتقد تھے مردوں کی لاشوں کو مسالے لگا کر محفوظ کرنے میں یہ لوگ ماہر تھے۔ بادشاہوں کی لاشوں کو سونے سے منڈھا جاتا تھا اور اسی طرح مردے کی شبیہ تیار کی جاتی تھی کہ اصلی اور نقلی میں فرق کرنا ناممکن ہے اہل مصر اسی طرح کے بہت سے مجسمے تیار کر کے مقبروں میں کھڑا کر دیتے تھے اور ان مجسموں کو مردے کا ہمزاد قرار دیا گیا تھا مقبروں میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں۔ ایک الگ کمرے میں ان ملازمین کو مار ڈالا جاتا تھا جو مردے کو پسند تھے وادی شاہان مصر میں ایک وادی ہے جس میں چھوٹے بڑے کل ۲۰ حکمران ابدی نیند سو رہے ہیں ان میں سے ایک توت عنخ آمون بھی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے مسافر رات یا دن میں جب چاہیں ان مقبروں کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ رات بھر روشنی سے جگ مگ جگ مگ کرتے رہتے ہیں۔ فقط

محمد فیروز الدین صدیقی (نظام کالج)

بچوں اور بچیوں کیلئے کتابیں

۱۔ نظام الملک آصفجاہ اول از شیخ چاند ایم اے قیمت ۴ر

۲۔ سر سید احمد خاں از ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس قیمت ۲ر

۳۔ سر سالار جنگ اعظم از مولوی فیض محمد صاحب بی اے بی ٹی قیمت ۶ر

۴۔ اعلم العلما از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی قیمت ۶ر

۵۔ داوا بھائی نوروجی از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایچ سی ایس قیمت ۶ر

۶۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے بی ایڈ قیمت ۶ر

۷۔ اردو دانی کی کتابیں پہلا حصہ زیر نگرانی مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے قیمت ۲ر۶پ

۸۔ سونیلی ماں از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبہ نسوان ادارہ قیمت ۴ر

۹۔ من کی بتیا از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے قیمت ۸ر

۱۰۔ پانی کی کہانی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے بی ایڈ قیمت ۶ر

۱۱۔ آب دوز اور سرنگ از فیض محمد صاحب بی اے بی ایڈ قیمت ۶ر

ہمارا سفر

میں اور میرے ایک دوست مقبول حسین چمن افضل گنج میں چہل قدمی کر رہے تھے جس کی بہار کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو تفریح کا شوق ہو۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک ایسے خوشگوار مقام پر پہنچے جہاں نشستیں وغیرہ تھیں ہم دونوں بیٹھ گئے وہ منظر کچھ ایسا تھا کہ ہم دونوں پر خاموشی چھاگئی اس خاموشی کے قفل کو مسٹر مقبول نے اس طرح توڑا۔ بھائی احمد خاں میرے دل میں ایک خیال سما رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا خیال ہے مسٹر مقبول نے کہا بھائی خاں صاحب ایک عرصۂ دراز سے سفر کلیانی شریف کا خیال ہے مگر مجبور ہوں کہ کوئی ساتھی نہیں میں نے کہا ساتھی کی کیا ضرورت ہے جب کہ آپ موٹر اور ریل میں سفر کرتے ہوں مسٹر مقبول نے کہا ہاں بھائی یہ تو صحیح ہے مگر میرا خیال بائیسکل پر سفر کرنے کا ہے میں نے کہا کہ بسم اللہ حاضر ہوں مقبول نے فرمایا آپ کی ہمت افزائی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اچھا تو کل صبح چلنا چاہیے میں نے کہا آپ سفر کی تیاری کر لیجئے اور بیسکلوں کا انتظام بھی صبح چلینگے مختصر یہ کہ سیکل وغیرہ کے انتظام کے بعد صبح چھ بجے کے قریب ہم دونوں نے حیدرآباد سے کلیانی شریف کی راہ لی۔ تقریباً ۹ بجے کا وقت ہوگا کہ ہم راجیندر نگر پہنچ گئے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد اور ایک چھوٹا سا آبدار خانہ تھا۔ ہم مسجد میں جاکر ناشتہ سے فارغ ہوئے مسٹر مقبول نے کہا کہ بھائی خاں صاحب موسم گرما ہے زیادہ ٹھیرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ دھوپ بہت سخت ہو جاتی ہے میں نے کہا اچھا بھائی چلو تھوڑا راستہ طے کرنے کے بعد دھوپ کی شدت کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی مگر ہم اپنے صبر و استقلال کو برقرار رکھتے ہوئے اور راستے کے بڑے بڑے گھنے درختوں کے سایہ سے گذرتے ہوئے دن کے ۲ بجے کے قریب سداسیو پیٹھ پہنچے۔ آدھا گھنٹہ آرام لینے کے بعد پھر چلنے لگے ہم کچھ میل گئے تھے کہ ایک موضع ملا نام مجھے یاد نہیں وہاں ایک شخص ملا اس سے ہم نے پوچھا کہ یہاں سے ظہیرآباد کتنے میل ہوگا کئی میلوں کا فاصلہ بتایا جسے سن کر بھائی مقبول بڑے پریشان ہوئے خدا خیر کرے ایسے سفر کا۔ بہرحال ٹھیک ۸ بجے رات ظہیرآباد پہنچے یہاں پہنچنا تو خصوصاً میرے لئے دوزخ سے جنت میں داخل ہونا تھا۔ یعنے شب بھر کا قیام قرار پایا میں اور مسٹر مقبول کوئی ۹ یا ۱۰ بجے کے قریب کھانا کھا کر بیٹھے تھے کہ ادھر سے ایک پنڈت صاحب کا گذر ہوا۔ ہم نے شرکت تناول کی دعوت دی دولقموں سے شرکت فرمائی ختم تناول کے بعد پنڈت صاحب کے ساتھ ہم نے آرام کیا۔ راستہ کی تھکن نے ہم کو مردہ بنا دیا تھا۔ اس کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت صاحب غائب ہیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ پنڈت صاحب مسٹر مقبول کے جیب سے ایک کرنسی نوٹ مبلغ (صہ) روپیہ لے کر بھاگ گئے ہیں

مسٹر مقبول نے کہا جو کچھ خدا کو منظور تھا ہوگیا زیادہ رنج سے کیا فائدہ۔ میں نے کہا کہ بھائی مقبول آپ یہ سمجھ لیجئے کہ مصیبت پریشانی جو کچھ بھی ہو ہم کو اپنا ارادہ پورا کرنا ہے خدا کے فضل سے تقریباً ۱/۲ ۲ بجے کلیانی شریف پہنچے۔ کلیانی شریف میں پہنچنے کے بعد مسٹر مقبول نے کہا کہ

بھائی صاحب اشنان کر لینا چاہیئے کیونکہ (۶۰) کوس کا سفر ہم نے طے کیا ہے غسل کے بعد مسٹر مقبول اپنے چچازاد بھائی کے دولت خانہ پر مجھے ساتھ لے گئے جو کہ مدرسہ انجمن اسلامیہ کے مدرس تھے اس کے علاوہ وہ شاخ ادارۂ ادبیات اردو کلیانی شریف کے مددگار مہتمم بھی ہیں انہی کے پاس ٹھہرے رہے۔ تناول طعام کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی اثناء گفتگو میں مسٹر مقبول کے بھائی مسٹر تاج الدین صاحب نے کہا کہ جناب احمد خاں صاحب ہمارے پاس ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ قائم ہوئی ہے جس کو سن کر...... خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی کھانے کے بعد چہل قدمی کے لئے باہر نکلے تو دیگر مناظر نے مسرت میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا وہ کیا تھا مسٹر تاج کئی بالغان کے ساتھ تعلیم و تلقین میں مصروف تھے دار المطالعہ کا معائنہ کیا گیا جس میں ادارہ کی چند کتب نظر سے گذریں۔ گویا شب تمام ایسے مشغول میں گذری۔ بہرکیف صبح کے ناشتہ سے فراغت پائی۔

تقریباً ۱۲ بجے کا وقت ہوگا کہ مسٹر مقبول کی طبیعت چشمہ کی سیر کی طرف مائل ہوئی۔ ہم بھی مسٹر مقبول کی مدد کے لئے تیار ہوگئے آخر کار مسٹر مقبول چشمہ پہنچے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد مقبول نے ایک ایسی سرنگ لگائی جس کو خان جی کہتے ہیں میں اور میرے دوست مسٹر تاج و دیگر تماشائی حیرت و تعجب کر رہے تھے چشمہ کے اطراف و اکناف سے واہ واہ کی صداؤں کا شور اس قدر گونجا کہ حاضرین نے کانوں میں انگلیاں رکھ لیں۔ واہ بھائی چشمہ کی سیر بھی خوب رہی۔ اور خوب رہا ہمارا سفر۔ یہاں سے نکلے ایک دوسرے موضع کو پہنچے جس کا فاصلہ کلیانی شریف سے تقریباً ۲ میل ہے وہاں کے مناظر کچھ عجب تھے جو کہ تحریر سے باہر ہیں۔ غرض مجھکو اور میرے دوست مسٹر مقبول کو دیہاتی زندگی بہت ہی پسند آئی پھر جلد واپس ہونیکا قصد ہوا عجب حالت رہی مختصر یہ کہ مسٹر تاج مع طلباء انجمن طلباء ادارہ ادبیات اردو مع مدرسین مدرسہ بالغان تقریباً نصف میل تک ہمارے آئے شکریہ ادا کرنیکے بعد ہم واپس ہوئے اور ہمیں یہ راز معلوم ہوا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے بہتر ہے۔

احمد خاں

جانوروں کی عمریں

جانوروں کی عمر مقررہ ہوتی ہے اور پودے ایک خاص عمر میں مر جاتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل جانوروں کی عمر سے آپ بھی واقف ہو جائیے۔

خرگوش	کی عمر	۵ سال	ہوتی ہے
بکرے	〃	۱۲ 〃	〃 〃
بلی	〃	۱۳ 〃	〃 〃
کتا	〃	۴۰ 〃	〃 〃
بکری	〃	۱۵ 〃	〃 〃
گائے	کی عمر	۲۵ سال	ہوتی ہے
سور	〃	۱۰ 〃	〃 〃
گھوڑا	〃	۲۷ 〃	〃 〃
اونٹ	〃	۴۰ 〃	〃 〃
ببر	〃	۴۰ 〃	〃 〃
ہاتھی	〃	۱۰۰ 〃	〃 〃
مگرمچھ	〃	۳۰۰ 〃	〃 〃
تامبل	〃	۳۵۰ 〃	〃 〃
وہیل (مچھلی)		۵۰۰ 〃	〃

(ترجمہ) **مس اقبال باسط علیخان**

جھوٹ کی سزا

امتحان کے دن قریب تھے اور محرم کی چھٹیوں کا آغاز تھا۔ اور لطف یہ کہ میٹرک کا ہمارا امتحانی سال۔ کچھ تو ہمیں اپنی کامیابی کا خیال اور کچھ تو کیا ــــ بلکہ ہم سے بھی زیادہ ہمارے والدین کو ہماری تعلیم کی طرف توجہ تھی ــ

ہم رات دن امتحان کی تیاری میں گم سم رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے اس انہماک کے دیکھنے والوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہم اس سال کامیاب ہو کر ہی رہیں گے۔

ہم علی الصباح بیدار ہو جاتے تھے اور کتاب ہماری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی اکثر اوقات ناشتہ کرنے کا وقت بھی گذر جاتا مگر ہم کو ہماری دھن تھی۔ کھانے پینے کا تو امتحان دینا نہیں تھا کہ فوراً وقت پر یا وقت کے پہلے کھا پی لیتے۔ بلکہ پڑھنے لکھنے کا رات بھی بہت دیر تک پڑھا کرتے۔ غرض ہماری اس طرز تعلیم سے والدین تو کیا ہمسایہ تک خوش تھے۔

ایک دفعہ میری ہم جماعت بہن اور میں دونوں مل کر الجبرا کے ایک ہی سوال پر غور کر رہے تھے اور حقیقت یہ تھی کہ سوال بہت اہم تھا اور ہماری استانی صاحبہ نے اس کے سمجھانے میں اپنا بہت سا عزیز وقت بھی صرف کیا تھا۔ مگر اس پر بھی ہم کو اس کے حل کرنے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آ رہی تھیں ہم اپنی غلطی کا احساس نہیں کرتے تھے۔ اسی غور و فکر میں تھے کہ دور سڑک پر یک بیک شور و غل اٹھا۔ ہم نے اس جانب کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اسی شور و غل نے ہمیں بے چین سا کر دیا اور ہم نے مجبوراً دریچہ سے باہر جھانک کر دیکھا تو کیا تھا!

ایک مجمع کثیر تھا۔ چھوٹے بڑے جمع تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا تو کوئی زور زور سے چیخ رہا تھا۔ آوازیں فضائے بسیط میں گونجتی تو تھیں مگر صاف طور پر سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر مچھلی مارکٹ قائم کیا گیا ہے۔ ہم بے ساختہ ہنس رہے تھے مگر یہ سمجھ نہ سکتے تھے کہ آخر بات کیا ہے۔

اتنے میں خادمہ ہمارے کمرے میں آئی۔ میں نے اس سے پوچھا "خادمہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ خادمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا! حضور! یہ سب لوگ ایک بوڑھے فقیر کو ستا رہے ہیں۔ اب اس فقیر کو راستہ چلنا تک دشوار ہو گیا ہے۔ جہاں کہیں فقیر ملجاتا ہے دو چار بچے مل کر اس کو ستاتے ہیں ہم نے اس کے ستائے جانے کا سبب دریافت کیا تو خادمہ نے کہا۔" یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایکدن اس فقیر نے اپنا گھر صاف کرنے کی غرض سے صفائی کی مزدورنی سے جاروب حاصل کی تھی۔ اور جب اس مزدورنی نے اپنی جاروب کا مطالبہ کیا تو بوڑھے فقیر نے جاروب کے دینے سے انکار کر دیا۔ مزدورنی تھی ہوشیار۔ فوراً صفائی کے جوان کو بلا لائی۔ جوان نے فقیر کو ڈانٹنا شروع کیا۔ محلہ کے چار لوگ بھی جمع ہو گئے۔

بالآخر یہ طے پایا کہ فقیر کی خانہ تلاشی لیجائے۔ چنانچہ خانہ تلاشی لی گئی اور پتہ لگ گیا کہ جاروب ایک پرانی چٹائی میں لپیٹ کر چھت پر بحفاظت تمام رکھی گئی تھی۔ راز کا فاش ہونا ہی تھا کہ اس دن سے اس محلہ کے بچے بوڑھے سب لوگوں نے اس کا نام "جھاڑو" رکھدیا۔ اور اب تک بھی یہی نام چلا آ رہا ہے۔ جہاں کہیں بیچارہ

نظر آجاتا ہے۔ بچے بوڑھے جوان سب اس کے پیچھے ہو جاتے ہیں اور ایسا ہی اچھا خاصہ ایک مجمع ہو جاتا ہے۔ حضور! اللہ میاں نے اس بوڑھے فقیر کو اس جھوٹ کی سزا غالباً اس طرح دی ہو کہ وہ دنیا میں دوسروں کے لئے بھی عبرت کا نمونہ ثابت ہو سکے۔

اس واقعہ کے سنتے ہی ہم دونوں بہت ہنسے اور خاص طور پر ہم نے اس فقیر اور اس مجمع کے دیکھنے کے لئے دوبارہ اسی دریچہ سے باہر جھانکا تو نہ وہ مجمع کہیں ہی تھا اور نہ وہ بوڑھا فقیر ——

سعیدہ خاتون

وطن والوں سے

نرالی ہیں ہوائیں آج دنیا کی فضاؤں میں — زمانہ گھر گیا ہے آج گونا گوں بلاؤں میں
عزیزانِ وطن یہ وقت غفلت کا نہیں اٹھو — زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے دیکھو
تمہیں سے اس کی عزت ہے تمہی سے اس کی وقعت ہے — تمہارا نام ہے اس میں تمہاری اس میں شوکت ہے
کبھی یہ اتحادِ باہمی ہونے نہ پائے کم — کہ ہے نظمِ نظامِ قوم ملت اس سے مستحکم
نفاقِ باہمی جس قوم میں یکسر ہوا پیدا — تباہی کے سوا اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا
تمہارے سامنے ہر دم رہے تصویرِ آزادی — سراسر ہو تمہاری زیست اک تفسیرِ آزادی
خبر ہے زندگی کا راز کچھ کرنے میں پنہاں ہے — تغافل کیش انساں بھی کوئی انساں میں انساں ہے
زمانہ غافلوں کا ساتھ ہرگز دے نہیں سکتا — کہ لطفِ کاوش ذوقِ عمل کا نام ہی جینا
جو رسوائی کا باعث ہو عمل ہے ایسا نادانی — "چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

وطن کے نام کی سوگند ہے تم کو وطن والو
نئے سر سے نظامِ زندگانی کو بدل ڈالو

غلام محی الدین خان کیف (عثمانیہ)

ملاح کا بیٹا

کسی گاؤں میں ایک ملاح رہا کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنی بیوی اور بچے کو کشتی میں سیر کو لے جاتا تھا۔ ایک شام وہ انھیں دریا کی سیر کروا رہا تھا ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی موجیں کنارے سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں ملاح کنارے سے بہت دور نکل چکا تھا یکایک کشتی بھنور میں آ کر الٹ گئی وہ تو کسی طرح نکل گیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی اور کمسن بچہ ڈوب گیا۔ رات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی سورج کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی بیچارے ملاح کے لئے صرف موجوں کی آواز اور پرندوں کی پکار باقی رہ گئی۔ اس کا بیٹا چندن ڈوبا نہیں تھا بلکہ پانی کے تھپیڑوں سے کنارے پر آ گیا اتفاقاً ایک دوسرے ملاح کی نظر اس پر پڑی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گیا وہ صرف بیہوش ہو گیا تھا تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ گیا۔ اس ملاح کا کوئی بیٹا نہ تھا صرف ایک بیٹی موہنی تھی وہ چندن کو اپنے بچے کی طرح پالنے لگا۔ اور چندن بھی اس کو اپنا باپ سمجھتا تھا۔ اس واقعہ کو کئی سال گذر گئے اب چندن اچھا بڑا ہو چکا تھا وہ کرایہ پر اپنی کشتی چلایا کرتا تھا۔ گاؤں میں میلہ تھا کنارے پر خوب چہل پہل تھی چاندنی رات تھی چندن اور موہنی کشتی میں سیر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ جب وہ واپس ہوئے تو کنارے پر ایک بوڑھا روتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ دونوں اس بوڑھے کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کنارے کے اس پار جانا چاہتا تھا کسی نے اس کی پوٹلی چرا لی جس میں اس کی کل چیزیں تھیں۔ بوڑھا بولا بابا میرا کوئی نہیں میں تنہا ایک جھونپڑی میں رہتا ہوں یہ سن کر چندن نے کہا آؤ ہم تمھیں اپنے گھر لیے چلتے ہیں۔ تم وہاں اپنے گھر کی طرح رہنا وہ اس کو اپنے گھر لایا اور باپ سے کہنے لگا۔ یہ بہت دکھی ہیں ان کا کوئی نہیں ہے ہم انھیں اپنے پاس رکھیں گے۔ موہنی بوڑھے کے پاس بیٹھ گئی چندن کشتی لے کر چلا گیا موہنی کے باپ نے اس بوڑھے سے پوچھا۔ تم کون ہو کیا تمھارا کوئی نہیں بوڑھا بولا کئی سال ہو گئے میں کرایہ پر اپنی کشتی چلایا کرتا تھا ایک روز میں اپنی بیوی اور بچے کو کشتی پر سیر کروا رہا تھا کہ کشتی الٹ گئی اور وہ دونوں ڈوب گئے اب میرا کوئی نہیں۔ موہنی کے باپ نے پوچھا کیا تمھارے بچے کے گلے میں کوئی چیز تھی؟ بوڑھے نے چونک کر کہا ایک چاندی کا تعویذ اسکے گلے میں تھا کیا تمھیں اس کا کوئی پتہ معلوم ہے موہنی کی ماں نے وہ تعویذ لا کر دکھایا جو چندن کے گلے میں پایا گیا تھا۔ بوڑھا تعویذ کو دیکھکر کہنے لگا یہ وہی ہے۔ بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے۔ ملاح نے کہا وہ تمھارا ہی بیٹا تھا جس نے تمھیں یہاں لایا وہ اب آتا ہی ہوگا۔ دور سے چندن کی کشتی دکھائی دی جب وہ نزدیک آئی تو بوڑھا دوڑ کر اپنے بیٹے سے لپٹ گیا۔ پھر موہنی کے باپ نے چندن کو سارا قصہ سنایا وہ بھی اپنے باپ سے مل کر بہت خوش ہوا چندن کی شادی موہنی سے ہو گئی اور وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

صغرا امس عبدالرحیم

خوف

رات کے کوئی دس بجے کا وقت ہوگا میں پڑھنے سے فارغ ہوکر اپنے کمرہ میں چارپائی پر لیٹی تھی ۔ خیال ہوا کہ ابھی تو صرف دس بجے ہیں چلو کسی اور کتاب کا مطالعہ کریں میز سے ایک رسالہ اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد میری آنکھ سامنے والی کھڑکی پر پڑی کیا دیکھتی ہوں دو بہت ہی ڈراؤنے ہاتھ میری جانب بڑھ رہے ہیں میں پہلے ہی سے بلا کی ڈرپوک ہوں بہت گھبرائی غور سے دیکھنا شروع کیا تھوڑی دیر میں ایک صورت بھی نظر آنے لگی میں جھٹ رسالہ پھینک لحاف اوڑھ لی آنکھیں خوف سے بند کرلیں ڈر کا یہ عالم تھا کہ آواز نکالنا دوبھر تھا بھاگنا چاہتی تھی لیکن باہر جانے کا دروازہ کھڑکی کے بالکل قریب تھا ۔ آنکھ بند کر کے سو جانے کی کوشش کرتی مگر جہاں سے آنکھ بند کی بس وہی صورت نظر آتی طرح طرح کے خیالات دماغ میں چکر لگا رہے تھے ۔ ادھر اسکول کا ڈر کیونکہ ۹ بجے کے اسکول ۔ امتحان کا زمانہ ۔ رات کے کوئی چار بجے خدا خدا کر کے میری آنکھ لگ گئی سویرے ہی ۔ عارفہ نے آکر جگایا اٹھو آپا جان کب تک سوتی رہوگی میں اٹھی اور پھر سے کروٹ بدل کر سو گئی نہ معلوم کتنے دفعہ عارفہ نے آکر جگایا ۔ آخر تنگ آکر بیچاری اسکول روانہ ہوگئی ۔ میری آنکھ ساڑھے گیارہ کے قریب کھلی ۔ بھوک بید لگ رہی تھی ۔ جلد منہ دھوکر امی جان کے پاس گئی امی جان تعجب سے کہنے لگیں ۔ کیوں تم اب تک اسکول نہیں گئیں ۔ میں نے خیال کیا اگر رات کا واقعہ بیان کیا جائے تو ایک بزدلی ظاہر ہوگی بہتر ہے کہ کوئی حیلہ بنادیا جائے میں نے کہا امی آج سر میں بہت درد تھا جس کی وجہ سے ناشتہ کیا اور نہ اسکول گئی ۔ خیر امی نے جو کچھ بچا تھا منگوایا وہاں سوائے دال خشکے کے اور کچھ نہ تھا بھوک کے وقت ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے ۔ جلد ناشتہ سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آئی اور سوچنا شروع کیا کہ امی کو تو ایک حیلہ بنا دیا کل ٹیچر کو بھی کچھ حیلہ بنادینگے لیکن عارفہ سے کیا کہیں ورنہ وہ شریر ہمارے دیر سے اٹھنے کو امی سے کہدے گی ۔ خیر اس کے لئے بھی ایک ترکیب سوچ لی ۔ ایک بجے عارفہ اسکول سے آئیں میں نے فوراً بلایا اور کہا دیکھو بھئی یہ تمھارے امتحان کا زمانہ ہے ۔ اگر صبح کا واقعہ تم امی سے کہدوگی تو میں تمھیں کسی قسم کی مدد نہیں دوں گی بیچاری پڑھنے میں بہت کمزور تھی بہت گھبرائی اور کہنے لگی میں ہرگز بیان نہ کرونگی آپ اطمینان رکھئے اس دن سے میں نے امی جان سے کہکر دوسرا کمرہ لے لیا پھر اب تک ویسا ڈراؤنا واقعہ پیش نہیں آیا ۔ یہ قصہ پڑھ کر بہنیں ہماری بہادری پر خوب ہنسیں گی ۔

مس نور فاطمہ بیدنور العلی

دیہاتی زندگی

شہروں کے عالیشان محلوں میں رہنے والے بھلا کیا جانیں کہ دیہات والے مناظر قدرت کی دلچسپیوں سے کس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔

شہری تو ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں عیش اور صرف عیش ہی کا دورہ ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ پیدا کس لئے کئے گئے ہیں ـــ ان کا مقصد آفرینش کیا ہے۔ وہ تو صرف پیدا ہوتے ہیں اور جب جوان ہوتے ہیں تو خود کو عیش اور مسرت کے بے پایاں سمندر میں ڈھکیل دیتے ہیں ـــ پھر مر جاتے ہیں ـــ ایک معمولی انسان کی طرح۔ زندگی کا تو یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے برخلاف اس کے دیہاتیوں کو اپنے فرائض کا کس قدر احساس ہے جس کے رہنے کے لئے بانس کی جھونپڑی تک میسر نہیں ہوتی۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ دنیا میں صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی محنت کا ثمرہ اپنے ہی ہاتھوں سے دوسروں کو کھلائے اور خود نہ کھائے۔ تمام دن محنت شاقہ کے بعد اس کو چند روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ملتے ہیں ـــ یہی اس کی غذا ہوتی ہے لیکن وہ انہیں سوکھے ہوئے ٹکڑوں کو کھا کر ہم سے زیادہ خوش رہتا ہے ـــ کیوں ـــ محض اس لئے کہ وہ دنیا اور اس کے عارضی تفکرات سے کوسوں دور ہے ابھی صبح بھی نہیں ہونے پاتی کہ غریب دیہاتی اپنی نیند کا پورا پورا مزہ لے چکتے ہیں کچھ دیر تو وہ خود کو مناظر قدرت کی دلچسپیوں میں گم کر دیتے ہیں پھر اپنے کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں ـــ دور سے لہلہاتا ہوا کھیت ان کو خوش آمدید کہتا ہے ـــ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ قدرتی مناظر کے سچے پرستار ہوتے ہیں۔ وہ محنت کرتے ہیں اور یہی ان کی تفریح، ورزش اور محنت ہوتی ہے۔

انکی زندگی بالکل سادہ ہوتی ہے مگر وہ لوگ خلوص کے پتلے ضرور ہوتے ہیں۔ ان کا انتقام بہت خوفناک ہوتا ہے مختصر یہ کہ وہ شہریوں سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں

محمد رفیع الدین فاروقی آرزو

لڑکپن پڑا سو رہا ہے خبر کچھ نہیں ہے
زمانہ کسے کہتے ہیں کیا وہ جانے
نہ شب کی خبر ہے نہ دن کی خبر ہے
زمیں پر ہو پتھر کہ لعل و جواہر
چمن ہو کہ صحرا کسی کا نہیں غم
ہے معصوم صورت تو ہے پاک سیرت
ہے بیداغ دل اس کا یا آئینہ ہے
نظر میں کشش ہے اداؤں میں لچک ہے
لڑکپن کی باتیں ہیں رونق کچھ ایسی

وہ مدہوش بچہ وہ خاموش بچہ
کوئی بھی ہو سچا کوئی بھی ہو جھوٹا
کہیں ہو اندھیرا کہیں ہو اجالا
نہیں جانتا وہ برا اور اچھا
نہ جینے کی خواہش نہ مرنے کا کھٹکا
ہے لاریب اس پر خدا ہی کا سایہ
جو رخسار گل ہے تو لب اس کا غنچہ
اسے پیار کرتا ہے اللہ کا جلوہ
کہ ان کو کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔

علی حسن رونق

حساب کا پرچہ

[illegible] فاروقی

ٹھیک بارہ بجکر تیس منٹ پر گھنٹی بجی اور حساب کا پرچہ ختم ہوا۔ حساب میرا ایک ایسا غیر دلچسپ مضمون ہے کہ میں نہ کبھی اس میں کامیاب ہوا اور نہ ہوں گا۔ میرا دل دھک دھک رہا تھا کیونکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ میں حساب کے پرچہ میں کیا کرکے آ رہا ہوں۔ پرنسپل صاحب کی مہربانی کہئے یا میری حسابی قابلیت کہ میں نے میٹرک کے آزمائشی امتحان میں بہت اعلیٰ درجہ کے نمبرات حساب میں حاصل کئے۔ خیر میں خوب دھکے کھاتے ہوئے کمرۂ امتحان سے باہر نکلا اور نکلنے کے ساتھ ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ہر لڑکے کے کرنے کے سامنے اپنے سوالوں کا پرچہ رکھ دیا اور جسکے حاشیہ پر جوابات درج تھے اور لگا پوچھنے "دوست دوست چوتھے سوال کا جواب چودہ صحیح ہے نا اور دسویں کا جواب سات بٹے دس ہے ($\frac{7}{10}$) ذرا دیکھئے تو آپ پاس کیا آیا ہے۔ اور وہاں جامیٹری کے [illegible] میں دو [illegible] کٹ جاتے ہیں کیوں ان صاحب کو اپنی پڑی تھی انھوں نے دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لڑکے کھڑے ہیں وہاں پہنچ کر جوابوں کو جو ملاتا ہوں تو میرے جوابات بالکل غلط نکلے۔ جوابات ملا رہے ہیں تو اس طرف اس انداز سے کودے جیسے میں نے انھیں پکڑ لیا تھا اور میں ان کے پیچھے لپکا جیسے انھیں پھر پکڑنا ہے۔ خیال کیا کہ چلو جامیٹری تو صحیح ہوگی نظر اٹھی تو دیکھا ایک صاحب زمین پر اپنی انگلی سے جامیٹری کی شکل بنا رہے ہیں اور ان کو بیس پچیس لڑکے گھیرے ہوئے ہیں میں جو دوڑ کر سب کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہوئے گرا تو سیدھے اس شکل پر جو زمین پر بنائی جا رہی تھی۔ اتفاق سے ان صاحب کی انگلی جس سے کہ وہ شکل بنا رہے تھے ہمارے سینڈل کی ایڑی کے نیچے آگئی اور میرا خیال ہے کہ ان کی انگلی کی اچھی خاصی پتلون نما استری ہوگئی ہوگی "ارے" کہہ کر انھوں نے انگلی کھینچی اور میری طرف غصے سے دیکھنے لگے۔

"او ہو معاف فرمائیے" بدحواسی میں میرے منہ سے نکلا اور پھر شکل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب میں نے شکل کی طرف دیکھا تو ہمارے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے کیونکہ میرا مسودہ بالکل اس سے بالکل مختلف تھا۔

پیچھے سے آواز آئی "رفیق"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مظفر منہ کھولے میری طرف بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"مار دیا خان۔ مار دیا ارے ہاتھ ملا" اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "پانچ سوال کے کر آیا ہوں R ہیں تو نے کتنے سوال صحیح کئے؟" میں نے منہ بنا کر اپنا پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے زور زور سے سب جواب پڑھے اور بڑی متانت سے بولا۔

"ارے یہ تو سب غلط ہیں اب تک میری نظر لڑکیوں کی طرف نہیں پڑی تھی میں نے خیال کیا چلو دیکھیں ان عورتوں میں سے کسی کا جواب میرے جواب سے ملتا ہے یا یہ بھی مردوں کی طرح حساب میں کوری نکلتی ہیں۔ مگر کانوں نے یہی سنا کہ "آپکا جواب غلط ہے" اب میں بڑا سٹپٹایا نتیجہ نکلنے پر اچھا میں نام کا شائع نہیں ہوا والد محترم کا غصہ پھر ابھرا دوستوں کے حملے اور سب سے بڑھ کر پرنسپل صاحب کی طرف سے ہماری اچھی خاصی ضیافت تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی اس بدحواسی سے اندر سے نکلی کہ مجھ سے آ ٹکرائی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر کر تیرنے لگا اور اب میں اسے ڈانٹنے ہی والا تھا اس نے خوشی سے کہتے ہوئے زمین پر سے پرچہ اٹھا لیا "ارے چوتھے نمبر کا جواب تو بالکل صحیح ہے دسویں کا جواب بھی صحیح۔ اور جامیٹری کا [illegible] بھی ملتا ہوا ہے" میں نے مارے خوشی کے جلدی سے پرچہ ہاتھ سے لینے کے لئے اس کی ساڑی کا پلو کھینچ ڈالا اور ساڑی جو کاندھے پر کانٹے سے لگی تھی اس طریقہ سے نیچے کھسک گئی جیسے ہم [illegible]

تو دونوں کا جامیٹری [illegible] میں بہت گھبرایا مگر اس نے کہا "خیر جانے دیجئے میرے اور آپکے جوابات ملتے ہیں" ہم دونوں کامیاب ہو جائیں گے۔" یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی [illegible] میں گھنٹہ بجا اور ہم دوسرے پرچہ کیلئے کمرہ امتحان میں داخل ہو گئے۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو ہم دونوں کا نام [illegible] تھا [illegible] شادی ہو گئی [illegible] ہم دونوں کامیاب ہو [illegible]

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس۔

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۴
نشان ٹپہ برطانیہ ۲۹۵۰ M
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۱۰)
اکتوبر ۱۹۴۰ء

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
معین الدین احمد انصاری

جلد ۳ بابت اکتوبر ۱۹۴۰ء شمارہ ۱۰

تصویریں

۱۔ کتبہ مرقد شاہ نصیر دہلوی ۲۔ سید علی منظور حیدرآبادی

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا ۔

اردو امتحانات کے نتیجے

۱۶ تا ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو ادارہ کی طرف سے جو اردو امتحانات لئے گئے تھے۔ ان کے نتائج کی تفصیل یہ ہے۔

مرکز بلدہ سے **امتحان اردو دانی** میں کل ۳۶ امیدوار شریک ہوئے۔ جن میں سے ۲۹ حاضر رہے۔ اور یہ سب کے سب کامیاب ہوئے ان میں ایک نے امتیاز حاصل کیا۔

امتحان اردو عالم میں کل ۲۳ امیدواروں نے شرکت کی جن میں سے ۲۰ حاضر تھے۔ گیارہ امیدواروں نے کامیابی حاصل کی۔ نتیجہ ۵۵ فیصد سے زیادہ رہا۔

امتحان اردو فاضل میں نو (۹) امیدوار شریک اور چار کامیاب ہوئے نتیجہ ۴۴ فی صد رہا

امتحان خوشنویسی میں پانچ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے چار حاضر تھے۔ تین کامیاب ہوئے ان میں سے ایک نے درجۂ اول حاصل کیا

زنانہ مرکز بلدہ سے **امتحان اردو دانی** میں گیارہ طالبات شریک اور کامیاب ہوئیں۔ جن میں سے چھ نے امتیاز حاصل کیا اور ایک تو پورے امتحان میں اول آئی۔ اور انعام کی مستحق قرار دی گئی۔

امتحان اردو عالم میں آٹھ طالبات شریک اور سات حاضر تھیں۔ جن میں سے پانچ کامیاب ہوئیں۔ اور دو نے درجۂ اول حاصل کیا۔ نتیجہ ۷۱ فی صد رہا۔

امتحان اردو فاضل میں دو طالبات نے شرکت کرکے کامیابی حاصل کی۔ جن میں سے ایک پورے امتحان میں اول آئی اور طیبہ بیگم مڈل کی مستحق قرار پائی۔

مرکز پربھنی سے **امتحان اردو دانی** میں ایک امیدوار نے شرکت کرکے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

امتحان اردو عالم میں پندرہ امیدواروں نے شرکت کی جن میں سے چودہ حاضر تھے۔ اور تیرہ کامیاب ہوئے۔ ایک نے درجۂ اول حاصل کیا اور پورے امتحان میں اول آیا۔ نتیجہ ترانوے فیصد رہا۔

امتحان خوشنویسی میں ایک امیدوار نے شرکت کی لیکن ناکام رہا۔

مرکز گلبرگہ سے **امتحان اردو دانی** میں پندرہ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے دس حاضر تھے۔ نو کامیاب ہوئے اور ایک نے امتیاز حاصل کیا۔ نتیجہ نوے فیصد رہا۔

امتحان اردو عالم میں چودہ امیدوار شریک اور نو کامیاب ہوئے اس طرح نتیجہ چونسٹھ فیصد رہا۔

مرکز کلیانی سے **امتحان اردو دانی** میں تیس امیدوار شریک اور انتیس حاضر تھے۔ جن میں سے پچیس کامیاب ہوئے اور دو نے امتیاز حاصل کیا۔ نتیجہ ۸۶ فی صد رہا

امتحان اردو عالم میں نو امیدوار شریک اور پانچ کامیاب ہوئے۔ نتیجہ ۵۶ فیصد رہا۔

زنانہ مرکز کلیانی سے **امتحان اردو دانی** میں دو طالبات نے شرکت اور کامیابی حاصل کی۔

مرکز گشتگی سے **امتحان اردو دانی** میں انسٹھ امیدوار

نے شرکت کی جن میں سے بیالیس حاضر تھے۔ اکتالیس امیدوار کامیاب ہوئے۔ تین نے امتیاز حاصل کیا۔ جن میں سے ایک مستحق انعام قرار پایا۔

امتحان اردو عالم میں تین امیدوار شریک تھے جن میں سے ایک کامیاب اور مستحق انعام قرار دیا گیا۔ نتیجہ ۳۳ فیصد رہا۔

امتحان خوشنویسی میں چار شریک اور دو کامیاب ہوئے۔ ایک مستحق انعام قرار دیا گیا۔ نتیجہ پچاس فیصد رہا۔

زنانہ مرکز گشتگی سے **امتحان اردو دانی** میں گیارہ طالبات شریک ہوئیں جن میں سے دس حاضر اور کامیاب ہوئیں۔ اور ایک مستحق انعام قرار پائی۔

بہ حیثیت مجموعی جملہ امتحانات کے کامیاب طلبہ کا اوسط یہ رہا

اردو دانی — ایک سو چوبیس حاضر۔ ایک سو اٹھائیس کامیاب۔ پندرہ بدرجۂ امتیاز۔ نتیجہ چھیانوے فیصد۔

اردو عالم — اڑسٹھ حاضر۔ چوالیس کامیاب۔ تین بدرجۂ اول۔ نتیجہ پینسٹھ فیصد۔

اردو فاضل — گیارہ حاضر۔ چھ کامیاب۔ تین بدرجۂ دوم۔ نتیجہ پچپن فیصد۔

خوش نویسی — نو شریک۔ پانچ کامیاب۔ ایک بدرجۂ اول نتیجہ ۵۵٫۵ فیصد۔

جملہ امتحانات کے نتیجے درج ذیل ہیں۔

اردو فاضل

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

مرکز	داخلہ نمبر	نام	درجہ کامیابی
بلدہ	۹	بلقیس بانو .... (مستحق انعام طیبہ بیگم مڈل)	دوم
"	۲	غوثیہ بیگم	دوم
"	۱۱	محمد مختار احمد (بی ایس سی)	دوم
"	۷	علی حسن	سوم
"	۱	سید کلیم اللہ حسینی (منشی فاضل)	سوم
"	۴	مظہر الدین احمد قریشی	سوم

اردو عالم

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

مرکز	داخلہ نمبر	نام	درجہ کامیابی
پربھنی	۳۵	اشرف الدین نیفی .... (مستحق انعام ادارہ)	اول
بلدہ	۶۱	عصمت النساء بیگم	اول
"	۶۸	محمودہ بیگم	اول
کلیانی	۱	محمد مخدوم	سوم
"	۲	سید قادر	دوم
"	۳	غلام معین الدین	سوم
"	۵	محمد عبد الکریم	دوم
کشتگی	۱۰	لبشپا مستحق انعام کشتگی معطیہ (مولوی احمد عبد اللہ صاحب لنگسکوہ)	سوم
گلبرگہ	۱۱	شیخ احمد	دوم
"	۱۵	سید ضیاء الدین	سوم
"	۱۶	محمد عبد الحمید	دوم
"	۱۷	محمود احمد انصاری حسرت	دوم
"	۱۸	محمد جعفر	سوم



کتبہ مرقد شاہ نصیر دہلوی
منجانب ادارۂ ادبیات اردو



سید علی منظور حیدرآبادی

مرکز	داخلہ نمبر	نام	درجہ
گلبرگہ	۱۹	سید النصیر علی	دوم
،	۲۰	محمد عمر خاں خیام	سوم
،	۲۱	نیاز علی خاں نیاز	دوم
،	۲۳	محمد عبد الرشید	دوم
پربھنی	۲۴	حمید اللہ خاں شیدا	دوم
،	۲۶	مرزا نذیر بیگ	دوم
،	۲۷	محمد یٰسین جلالی	دوم
،	۲۹	محمد ناصر	دوم
،	۳۰	امین الدین احمد	دوم
،	۳۱	وجاہت علی	دوم
،	۳۲	سید صدر الدین ہاشمی	دوم
،	۳۳	غلام محمد یوسف	دوم
،	۳۴	غلام حسن صدیقی	دوم
،	۳۶	سید عبد الرزاق جعفری	دوم
،	۳۸	احمد بن محمد	دوم
،	۳۹	محمد اختر حسین فاروقی اختر	دوم
بلدہ	۴۴	خواجہ خلیل الدین احمد	سوم
،	۴۵	ابو الحسنات محمد الحسینی	سوم
،	۴۷	محمد عبد الکریم	سوم
،	۴۹	سید خواجہ محمود قریشی	دوم
،	۵۰	محمد اعظم صدیقی	دوم
،	۵۱	محمد غوث الدین داؤدی	سوم
،	۵۲	میر حبیب علی امدادی	دوم
،	۵۳	غلام غوث (بی ایس سی)	دوم
،	۵۶	محمد سرور دکھنی	سوم
،	۶۰	محمد رفیع الدین	سوم
بلدہ	۶۷	محبوب فاطمہ	دوم
،	۷۰	غوثیہ منیر الدین	دوم
،	۷۱	ولی النساء بیگم	سوم
کلیانی	۷۲	محمد تاج الدین	دوم
بلدہ	۷۴	میر یٰسین علی	سوم

خوش نویسی

مرکز	داخلہ نمبر	نام	درجہ
بلدہ	۶	ابو سعد سید اسمٰعیل سید .... (مستحق انعام ادارہ)	اول
گنٹکل	۹	کریم داد خاں .... (مستحق انعام گنٹکل معطیہ مولوی محمد حسین صاحب مہتمم سائکل)	دوم
بلدہ	۳	محمد عبد المجید خاں قائم خانی	سوم
،	۵	شیخ احمد	سوم
گنٹکل	۸	سدرامیا	سوم

اردو دانی

حسب ذیل امیدوار بدرجۂ امتیاز کامیاب ہوئے ہیں اور ان کے ناموں کی ترتیب نشانات محصلہ کے لحاظ سے کی گئی ہے ان سب کو ادارہ کی طرف سے ایک ایک سلیس اردو کتاب بطور انعام دی جائے گی۔

مرکز	داخلہ نمبر	نام
بلدہ	۱۴۳	امجدی بیگم۔ (مستحق انعام عطیہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ)
گنٹکل	۱۶۴	کریم داد خاں (مستحق انعام عطیہ جناب احمد عبد اللہ صاحب)
بلدہ	۱۴۶	عزیز بیگم ....
،	۱۴۷	جانی بیگم ....
پربھنی	۱۲۴	سید شمس الضحیٰ ....
بلدہ	۱۳۷	ثریا سلطانہ ....
،	۱۴۵	رفیع النساء بیگم ....
،	۱۴۴	سعید النساء بیگم ....

گلبرگہ	۱۵۳	شوکت علی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	بلدہ	۱۷	محمد عثمان علی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کنگی	۱۳۲	ینکن گوڑا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	کلیانی	۱۱۰	مہادیو سنگھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
”	۱۲۳	محمد جعفر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	کنگلی	۵۰	محمد نظام الدین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کلیانی	۹۸	عبدالقادر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔			

حسب ذیل امیدوار کامیاب ہیں۔ اور ان کے نام بلحاظ نشان داخلہ درج ہیں۔

۱	میر محبوب علی	۲۵	محمد عبدالواحد	۴۹	عزیزہ بیگم	۸۵	لسبتیا
۲	ین جی پاپناٹکر	۲۶	محمد عبدالستار	۵۱	ہنمنت راؤ ٹپواری	۸۶	وٹھیا ارلی کٹی
۳	سید حامد حسین	۲۷	محمد عبدالجبار خاں	۵۴	نارائن گوڑا	۸۸	لنگیا
۴	سید عزیزاللہ حسینی	۳۰	سید رزاق علی	۵۵	سید پاشاہ	۸۹	وٹھیا
۵	محمد فقیر	۳۱	محمد بی بی	۵۶	محبوب پیراں	۹۲	محمد مرتضیٰ
۶	وینکٹ رنگیا	۳۲	اختر النساء بیگم	۵۷	سید احمد حسینی	۹۳	محمد مستان
۷	شیخ عبدالباسط	۳۴	محمد غوث	۵۸	سید محی الدین پیراں	۹۴	محمد عبدالکریم
۹	نارائن سوامی	۳۵	محمد عبدالغفور	۵۹	گووند گوڑا	۹۵	کلپا
۱۰	محمد قاسم	۳۶	محمودہ بیگم	۶۲	گربیا	۹۹	عبدالعزیز
۱۱	یعقوب خاں	۳۷	شریفہ بیگم	۶۳	شاہ حمید	۱۰۰	امان اللہ خاں
۱۲	محمد جعفر	۳۸	سعادت النساء بیگم	۶۴	شیخ حمید	۱۰۱	شیخ احمد
۱۳	محمد عمر	۳۹	آمنہ بی	۶۵	زلیخا بیگم	۱۰۲	محمد اعظم
۱۴	غلام دستگیر	۴۰	صغرا بی	۶۷	این گوڑا	۱۰۳	محمد ریاض الدین احمد
۱۵	عثمان شریف	۴۱	فاطمہ بی	۶۸	وٹھوبا گوڑا	۱۰۴	مرزا طاہر بیگ
۱۶	شیخ شہاب الدین	۴۲	خواجہ بی	۶۹	شیخ دادے	۱۰۵	شنکر گیرنی
۱۸	سید محمود علی	۴۴	محمد اکبر	۷۵	نرنجیا	۱۰۶	محمد عبدالحمید
۱۹	اچھمیا	۴۵	گل داد خاں	۷۶	بندیا	۱۰۷	رام لال
۲۱	محمد عبدالستار خاں	۴۶	رام چندر راؤ	۸۰	اریا سوامی	۱۰۸	اقبال احمد
۲۲	محمد عبدالرحیم خاں	۴۷	حفیظہ بی	۸۱	صدرالدین	۱۱۱	محمد معین الدین
۲۴	محمد قطب الدین	۴۸	محمد مرتضیٰ خاں	۸۳	میراں صاحب	۱۱۲	محمد امام الدین

۱۱۳	سید رفیع الدین	۱۲۳	زاہدہ خاتون	۱۳۴	فقیرپا	۱۴۹	محمد عبدالشکور
۱۱۴	محمد عبدالغفور	۱۲۵	اننت راؤ	۱۳۵	سیون گوڑا	۱۵۰	محمد عبدالغنی
۱۱۵	محمد سبیل اللہ خاں	۱۲۷	ونایک راؤ	۱۳۶	سنگنگوڑا	۱۵۱	شیخ محبوب
۱۱۶	محمد عنایت اللہ خاں	۱۲۸	محمد عبدالحفیظ	۱۳۸	سید قمر محی الدین	۱۵۵	محبوب علی
۱۱۷	مرزا محمد بیگ	۱۲۹	یلپا	۱۳۹	ہنمنت راؤ	۱۵۹	شیخ لاڈلے
۱۱۹	اللہ بخش	۱۳۰	اریگوڑا	۱۴۰	خواجہ حسیم الدین	۱۶۰	محمد حسین
۱۲۰	نذیرالدین	۱۳۱	لعل محمد	۱۴۱	فاطمہ بیگم	۱۶۱	محمود حسن
۱۲۲	بی کریمہ خاتون	۱۳۳	لبگوڑا	۱۴۲	پاشا بیگم	۱۶۲	لعل احمد

۱۶۵ حسینی بیگم

انعامات

اردو دانی میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونے والے کل امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے ایک ایک سلیس اردو کتاب بطور انعام دی جائے گی۔ اس طرح اس سال اس امتحان کے (۱۵) امیدوار انعام کے مستحق قرار پائے۔ جن کے نام کامیاب امیدواروں کی فہرست کی ابتداء میں درج ہیں۔

دوسرے امتحانوں میں ادارہ کی طرف سے صرف اُس اول آنے والے امیدوار کو انعام دیا جائے گا جس نے درجۂ اول میں کامیابی حاصل کی ہو۔ اور جس کو کسی اور معطی کی طرف سے انعام نہ مل رہا ہو۔

اس امتحان کے انعام یافتہ امیدواروں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔	اردو فاضل	بلقیس بانو	مستحق طیبہ بیگم مڈل	(عطیہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ)
۲۔	اردو عالم	اشرف الدین فیضی	مستحق انعام ادارہ	
۳۔	” ”	بستیا	مستحق انعام اشتکی	(عطیہ مولوی احمد عبداللہ صاحب لنگسگور)
۴۔	خوش نویسی	ابوسعد سید اسمٰعیل سید	مستحق ” ادارہ	
۵۔	” ”	کریم داد خاں	مستحق انعام کشتگی	(عطیہ مولوی محمد حسین صاحب ہمناگر)
۶۔	اردو دانی	امجدی بیگم	” ” ”	(عطیہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ)
۷۔	” ”	کریم داد خاں	” ” ”	(عطیہ احمد عبداللہ صاحب لنگسگور)
۸۔	” ”	آمنہ بی	” ” ”	(عطیہ مسٹر بسم بی صاحبہ کشتگی)

ادارہ کا کتب خانہ دوسرے شعبوں کی طرح ادارہ کا شعبۂ کتب خانہ بھی روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ گزشتہ مہینے میں متعدد قلمی اور مطبوعہ کتابیں خریدی گئیں اور مختلف علم دوست اصحاب نے بھی کئی قلمی و مطبوعہ کتابیں اور رسالے بطور تحفہ ادارہ کو عطا کئے جن میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے مدیر مسئول رسالہ حیدرآباد ٹیچر نے اس رسالے کے ۳۰ شمارے عنایت فرمائے ان میں چند سالوں کی جلدیں تو مکمل ہیں اور جو شمارے کم ہیں ان کی فہرست آخر میں درج کی جا رہی ہے جو اصحاب فائل نہ رکھتے ہوں براہ کرم ادارہ کو تحفتہً یا قیمتاً عنایت فرمائیں۔

دوسرے عطیوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) مولوی تراب علی خاں صاحب باز۔ چلبلا رسالہ

(۲) خواجہ حمید الدین شاہد رسالہ مخزن

(۳) مولوی سردار محمود خاں صاحب خالدی انتخاب لاجواب و دیگر رسائل کی دو جلدیں۔

(۴) مولوی شمس الدین صاحب خلف نواب عزیز نواز جنگ بہادر آرائش محفل۔

(۵) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ نظام علیخانی حصہ اول و دوم۔ شیر جنگ۔ میر عالم۔ تریاہٹ۔ دیومالا۔ ڈاکٹر صاحب۔ اور دیگر ۳ رسائل۔

(۶) مولوی کاظم علی صاحب برق مولوی۔ نظم شہید مذاق عشق۔ جواہر الاشعار اور تسہیل المعمہ۔

(۷) مولوی میر عباس علی صاحب نبیرہ حضرت میر مومن صاحب قبلہ۔ قلمی نسخہ جات۔

ضرورت ہے ادارہ کے کتب خانہ کے لئے حیدرآباد ٹیچر سہ ماہی کے حسب ذیل شماروں کی۔

جلد (۱) مکمل۔ جلد (۲)، شمارہ (۱) و (۲)۔ جلد (۳) شمارہ (۲)۔ جلد (۴) شمارہ (۱) جلد (۷) شمارہ (۳) جلد (۹) شمارہ (۴)۔ جلد ۱۰ شمارہ (۱)۔ جلد ۱۲ شمارہ (۴)

ادارہ

غزل

جو کیا تم نے سب بجا نکلا — جو کیا ہم نے ناسزا نکلا
ظلم تیرا ہو میری مظلومی — جو ہوا حد سے وہ سوا نکلا
یوں تو ہونے کو سب ہوئے مجنوں — کوئی مجھ سا نہ دوسرا نکلا
چاک کر ڈالا نامۂ عصیاں — تیری رحمت کا آسرا نکلا
دیکھ مر جائیں گے جہاں دونوں — تو جو پردہ سے اک ذرا نکلا
حاصل جد و جہد عمر عزیز — ایک نالہ سو نارسا نکلا
نہ رکی میری فطرت آزاد — دل میں جو تھا وہ لب پہ آ نکلا
عمر کی صرف عیش اور دم مرگ — کیا ہوا منہ سے جو خدا نکلا

صفیہ بیگم قمر

کلیانی

اس مرکز کے انتظامات اور نگرانی کے لئے پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی اور حفیظ صدیقی مدیر سب رس معلومات نے کلیانی کا سفر کیا۔ موخر الذکر نے اپنے سفر کی یہ روئداد قلمبند کی ہے۔ (سب رس)

۱۵ اگست کو ساڑھے تین بجے حیدرآباد سے روانہ ہوئے اور رات کے آٹھ بجے ہمنا آباد پہنچے۔ اور مسافر بنگلے میں قیام کیا۔ دوسرے روز یعنی جمعہ ۱۶ اگست کو صبح کے نو بجے کلیانی کا قصد کیا اور دس بجے تک پہنچ گئے۔ کلیانی میں مولوی عبدالکریم، غلام معین الدین، قاضی الدین، تاج الدین، نیر الدین صاحبان اور مسٹر رگھو راؤ بی اے (عثمانیہ) نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم کلیانی کے مسافر بنگلے تک پہنچائے گئے۔ چونکہ مدرسہ وسطانیہ کلیانی کی عمارت جس میں امتحانات لئے جانے والے تھے مسافر بنگلے سے بہت قریب تھی اس لئے سب سے پہلے ہم مدرسہ روانہ ہوئے تاکہ امیدواروں کی نشستوں کے متعلق انتظامات کا معائنہ ہو سکے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ادارے کی شاخ کے کارکنوں نے جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں، تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ یعنی مدرسہ کے ایک بڑے ہال میں نشستوں کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا اور امیدواروں کے نام اور رول نمبر کی چٹھیاں بھی میزوں پر چسپاں کر دی گئی تھیں حتیٰ کہ ہال کے باہر ایک گھنٹہ بھی مہیا کیا گیا تھا تاکہ امتحان کے شروع اور ختم ہوتے وقت اسے استعمال کیا جا سکے۔ اس انتظام کی خوش سلیقگی کو دیکھ کر ہمیں عبدالکریم صاحب کا جو ہمارے ادارے کی شاخ کے نائب معتمد اور اس کی روح رواں ہیں، شکریہ ادا کرنا پڑا کہ انھوں نے ہمارا بہت سا کام ہلکا کر دیا۔ امتحان گاہ کے اس معائنہ کے بعد ہم مسافر بنگلہ واپس ہوئے۔

تھوڑی دیر کے بعد مولوی عطاء اللہ صاحب عطا تشریف لائے۔ موصوف نواب صاحب کلیانی کے منتظم پیشی اور ادارۂ ادبیات اردو کلیانی کے معتمد ہیں۔ ان کے آنے کے بعد ادارے کے دوسرے کارکن جو ہمارے ساتھ تھے دوسرے انتظامات کے لئے ہم سے رخصت ہوئے لیکن اور لوگ جن میں مقامی عہدہ دار اور مدرسہ کے اساتذہ شامل ہیں ہم سے ملنے کے لئے آتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے ہم نے مولوی عطاء اللہ صاحب کے ساتھ جامع مسجد کا قصد کیا اور ڈیڑھ بجے تک نماز جمعہ سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام لیا اور پھر ۲½ بجے کے قریب امتحان گاہ پہنچ گئے کیونکہ اردو عالم کا پہلا پرچہ ۳ سے ۶ تک تھا۔ جب ہم لوگ امتحان گاہ پہنچے تو وہاں اردو عالم کے پورے ۹ امیدوار اور مدرسہ کے چند اساتذہ نگرانکاروں کے فرائض انجام دینے کے لئے موجود تھے۔ ان میں مرزا محمد بیگ، میر نذیر الدین، بابو راؤ اور رگھو راؤ صاحبان قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ کے ایک چپراسی کو بھی ہم نے بھتہ دے کر مقرر کر لیا تھا۔ تین بجنے میں پانچ منٹ کم تھے کہ ہال کے دروازے کھول دیے گئے اور امیدواروں سے کہا گیا کہ آ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ ٹھیک تین بجے گھنٹہ بجا اور ہم نے پرچہ ہائے سوالات کا سر بمہر لفافہ اٹھایا۔ سب سے پہلے ہم نے دو امیدواروں کو لفافہ دکھلایا اور ایک کاغذ پر ان کے دستخط لے لئے۔ پھر لفافہ چاک کر کے پرچے تقسیم کر دیے۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے کے قریب تمام امیدوار

پرچے ختم کر دیئے اور ہم نے ان کی جوابی بیاضوں کو ایک لفافہ میں بند کر کے اس پر ادارے کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد ہم مسافر بنگلہ واپس ہوئے جہاں مولوی عطاء اللہ اور مدرسہ کے بہت سے اساتذہ اور ادارے کے کارکن ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

ان لوگوں کے ساتھ ہم بات چیت میں مصروف تھے کہ نواب صاحب کلیانی کے پاس سے ایک چٹھی آئی۔ اس میں ہفتہ کے دن دوپہر کو پترانت کے تالاب پر ہماری دعوت کی اطلاع تھی لیکن اس خیال سے کہ ہفتہ کے روز دو امتحان ہیں اور ہم کو دوپہر میں صرف ایک گھنٹہ ملتا ہے، ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ دعوت کا وقت بدل دیا جائے لیکن جو لوگ اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے کہا کہ پترانت کا تالاب بالکل قریب ہے اور ہم وقت پر واپس آ سکتے ہیں۔ مگر دقت یہ تھی کہ ہم کو کھانے کے بعد فوراً واپس ہو جانا پڑتا اور نواب صاحب سے بات چیت نہ ہو سکتی۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوا کہ ابھی شام میں جا کر نواب صاحب سے ملاقات کر لی جائے اور ان کو ہماری مصروفیت سے آگاہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم عطاء اللہ صاحب کے ساتھ قلعہ پہنچے۔ یہاں کلیانی کے منصف مولوی رحمت اللہ صاحب جو ایک عثمانی طیلسان ہیں، موجود تھے۔ ان سے گفتگو ہوتی رہی پھر تھوڑی دیر بعد نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چونکہ نواب جمال الدین حسن خاں صاحب والی اسٹیٹ کلیانی پروفیسر صدیقی صاحب کے شاگرد ہیں، انھوں نے اپنے استاد کی بڑی تعظیم اور آؤ بھگت کی۔ بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں اور رخصت ہوتے وقت نواب صاحب نے ہفتہ کی دعوت کے متعلق کہا کہ ہم کو کھانے کے بعد ہی رخصت کر دیا جائے گا اور ہماری مصروفیت میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ قلعہ سے رخصت ہوئے اور مسافر بنگلہ پہنچ کر آرام کیا۔

دوسرے دن یعنی ۱۱ر اگست کی صبح کو بعض مقامی حضرات اور مدرسے کے اساتذہ سے جو ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے، بات چیت رہی۔ ۹ بجکر ۴۵ منٹ پر ہم امتحان گاہ میں داخل ہوئے۔ آج کا دن بڑی مصروفیت کا تھا کیونکہ اردو عالم کے دو پرچوں کے علاوہ اردو دانی کا بھی امتحان تھا۔ ہم نے نگران کار صاحبین اور مولوی عبدالکریم صاحب وغیرہ کی مدد سے ہال میں جوابی بیاضیں رکھ دیں۔ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہال کے دروازے کھول دیئے گئے۔ تمام امیدوار ہال میں داخل ہوئے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ٹھیک دس کو گھنٹہ بجا اور ہم نے پرچہ ہائے سوالات تقسیم کر دیئے۔ اردو عالم کے پورے نو امیدوار موجود تھے اور وہ پرچہ حل کرنے میں مصروف ہو گئے لیکن امتحان اردو دانی کے امیدواروں کے ساتھ تھوڑی بہت دقت اٹھانی پڑی کیونکہ ان میں بعض بچے بھی شریک تھے جو جوابی بیاضوں پر لکھی ہوئی ہدایتوں کو بھی مشکل سے سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے ان کو ہدایات پڑھ کر سمجھا دی گئیں اور اس کے بعد وہ پرچوں میں لگ گئے۔ اس امتحان میں جملہ ۳۲ امیدوار شریک تھے جن میں سے صرف ایک غیر حاضر رہا۔ باقی ۳۱ میں سے دو لڑکیاں تھیں اور ان کے لئے ایک علیحدہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا جس کی نگرانی کلیانی کے مدرسہ نسواں کی معلمہ نجم النساء بیگم صاحبہ نے کی۔ اردو دانی کا پرچہ تحریری ۱۲ بجے تک تھا چنانچہ اس وقت اردو دانی کے تمام امیدواروں سے پرچے وصول ہو گئے۔ ایک بجے تک اردو عالم کے امیدواروں نے بھی اپنے پرچے ختم کر دیئے۔ ہم نے ان علیحدہ علیحدہ لفافوں میں

(اردو دانی برائے ذکور اور برائے اناث اور اردو عالم) ان پرچوں کو بند کرکے ان پر مہر لگادی۔ اس وقت تک مولوی عطاء اللہ صاحب ہمارے پاس آگئے تھے۔ ایک بجے کے قریب ہم ان کے ساتھ بذریعہ موٹر کار بیرانت کے تالاب کو روانہ ہوئے۔ تالاب کے سامنے ایک قدیم عمارت میں دعوت کا انتظام تھا اور نواب صاحب کے ساتھ انکے مصاحبین اور بہت سے مقامی عہدہ دار موجود تھے جن کی تعداد تقریباً چالیس ہوگی۔ ہمارے جانے کے فوراً بعد دسترخوان چن دیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو نواب صاحب نے ہمیں رخصت کیا اور ہم جلد ہی امتحان گاہ پہنچ گئے۔ دوپہر میں حسب معمول اردو عالم والوں کے لئے پرچے تقسیم کردیئے لیکن اس وقت اردو دانی کے ۱۳ امیدواروں کا بھی زبانی امتحان تھا۔ لڑکیوں کا امتحان تو معلمہ صاحبہ نے لیا اور لڑکوں کا امتحان پروفیسر صدیقی صاحب نے۔ امتحان کے لئے تمام امیدواروں کو ایک کمرے میں بٹھادیا گیا اور اس سے متصل دوسرے کمرے میں ممتحن صاحب اور ترمل راؤ صاحب مدرس بیٹھے رہے۔ اس کمرے میں ایک ایک امیدوار داخل ہوتا اور اسے امتحان کے بعد دوسرے دروازے سے باہر روانہ کیا جاتا۔ غرض دوپہر کے یہ امتحانات بھی خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہوکر جب ہم مسافر بنگلہ پہنچے تو مولوی رحمت اللہ صاحب منصف ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ نواب صاحب سے یہ وعدہ تھا کہ کشتی رانی کے لئے ہم تالاب پر شام میں دوبارہ جائیں گے لیکن چونکہ اس وقت بارش ہو رہی تھی، ہم تالاب نہ جا سکے۔ مسافر بنگلہ پر منصف صاحب ہی سے بات چیت ہوتی رہی۔ انھوں نے دوسرے روز یعنی ۱۰ اگست کی شام کو چائے پر مدعو کیا۔ کچھ عرصہ بعد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل تشریف لائے۔ ان سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے ۱۰ اگست کی شام کو اپنے پاس کھانے کی دعوت دی۔

۱۰ اگست کی صبح کو آٹھ بجے کے قریب حضرت خواجہ شہ سوار کی درگاہ پر زیارت کی غرض سے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو مسافر بنگلہ پر مدرسہ کے چند اساتذہ اور ادارے کے کارکن ہمارے منتظر تھے۔ ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد سب رخصت ہوئے اور ہم ناشتہ سے فارغ ہوکر امتحان گاہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اس وقت مولوی عبدالکریم صاحب آئے اور دوپہر کے کھانے پر اپنے پاس مدعو کیا۔ جب ہم امتحان گاہ میں داخل ہوئے تو تمام امیدوار موجود تھے۔ حسب طریقہ پرچے تقسیم کردئے گئے اور ایک بجے تک امیدواروں کی تمام بیاضیں وصول ہوگئیں تو ان کو سربمہر لفافہ میں بند کرکے بنگلہ واپس آئے۔ پھر مولوی عبدالکریم صاحب کی دعوت سے فارغ ہوکر ۱-۵ تک امتحان گاہ پہنچے اور حسب معمول دو بجے سے امتحان شروع ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد عطاء اللہ صاحب آئے اور پروفیسر صدیقی صاحب ان کے ساتھ قلعہ تشریف لے گئے تاکہ نواب صاحب کے قدیم کتب خانہ اور اسلحخانہ کا معائنہ کرلیں۔ راقم الحروف امتحان گاہ میں ٹھیرا رہا اور جب امتحان ختم ہوا تو پرچوں کو لفافوں میں بند کرکے ان پر مہر لگادی اور بنگلہ واپس آیا۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر صدیقی صاحب منصف صاحب کے بنگلہ پر ہیں۔ میں بھی موٹر میں وہیں چلا گیا۔ وہاں مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کلیانی، کلیانی کے سرکاری ڈاکٹر اور مدرسہ کے چند اساتذہ موجود تھے۔ چائے کے بعد تھوڑی دیر تک ادارہ کے بارے میں گفتگو رہی۔ سات بجے عبدالکریم صاحب اور غلام معین الدین صاحب ہمارے پاس آئے اور آٹھ بجے کے قریب

وہاں ان حضرات کے ساتھ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل کے یہاں پہنچے۔ موصوف سے کھانے پر اور اس کے بعد بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بنگلہ پر تاج الدین صاحب اور مولوی نذیر الدین صاحب ہمارے منتظر تھے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد نذیر صاحب نے جو ایک اچھے مشق شاعر ہیں، اپنا کلام سنایا۔

۱۹ اگست کی صبح رحمت اللہ صاحب آئے اور ہم ان کے ساتھ مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کے مکان پر گئے ان کے پاس دعوت تھی۔ وہاں سے واپس ہوئے تو بنگلہ پر ادارے کے کارکنوں اور مدرسہ کے اساتذہ کے علاوہ مولوی عطاء اللہ صاحب وغیرہ بھی موجود تھے ان تمام حضرات کے ساتھ ہمارا ایک گروپ فوٹو لیا گیا اور پھر صرف ادارے کے کارکنوں کے ساتھ ایک اور گروپ ہوا۔ اس کے بعد ہمیں ادارے کا دفتر اور کتب خانہ دکھلایا گیا۔ جو بہت باضابطہ اور منظم حالت میں تھا۔ اس کے بعد ہم نے سب کو خدا حافظ کہا اور عازم حیدرآباد ہوئے۔

کلیانی میں ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیاں وہاں کے بے لوث کارکنوں کی بدولت جاری رہتی ہیں۔ ان میں سے مولوی عبدالکریم صاحب نائب معتمد اور مولوی عطاء اللہ صاحب شعبہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو ادارے کا کام بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ادارے کے صدر مولوی رحمت اللہ صاحب بھی ایک اچھے کارکن ہیں۔ عبدالکریم صاحب میں کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے کی صلاحیت بہت اچھی ہے۔ چنانچہ ان ہی کا اثر ہے کہ تاج الدین، غلام معین الدین، قاضی الدین، نیر الدین اور نزل صاحبان وغیرہ جیسے لوگ اردو کے کام میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ لوگ کلیانی سے باہر بھی جاتے اور اردو اور ادارہ کی خدمت کرتے ہیں چنانچہ قریب کے ایک مقام ہنگوپہ سے ایک امیدوار کلیانی آیا تھا اور اس نے اردو عالم کا امتحان دیا۔ ان سب لوگوں کے علاوہ نواب صاحب کلیانی ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں جنھوں نے ادارے کی سرپرستی قبول کرلی ہے۔ موصوف سے کلیانی کا ہر بچہ اور بوڑھا خوش ہے۔ اور آپ کے اخلاق کا یہ حال ہے کہ اپنے استاد کو رخصت کرنے کے لئے اپنے محل سے قلعہ کے باہر والے دروازے تک اتر کر آتے تھے۔ یوں تو عام طور پر کلیانی کے لوگ بہت خوش خلق اور ملنسار ثابت ہوئے لیکن نواب صاحب کی سادہ طبیعت اور خوش خلقی سراہنے کے قابل ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے امتحانات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس سے بہت سی توقعات ہیں۔ اور فائدوں کے علاوہ سب سے بڑی بات ہمارے خیال میں یہ ہے کہ ان امتحانات کی وجہ سے اردو کا ذوق پھیل جائے گا۔ جو بات ہم نے کلیانی میں خاص طور پر محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان امتحانات کی وجہ سے عوام میں اردو پڑھنے کا شوق بہت عام ہو رہا ہے اور آئندہ بہت زیادہ امیدواروں کے شریک ہونے کی توقع ہے۔ اس امتحان کا اثر صرف کلیانی تک محدود نہیں بلکہ قرب جوار کے مقامات میں بھی اس کا اثر پڑا ہے اور اب ہر شخص ادارے کے نام اور اس کے کام کے علاوہ اردو کی اہمیت سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آئندہ سال ہنگوپہ سے تین امیدوار صرف اردو عالم میں بیٹھیں گے اور اس طرح ہنگوپہ کو بھی امتحان کا مرکز بنانا پڑے گا۔ اسی طرح مرکزوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور ادارے کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا جائے گا۔

حفیظ صدیقی

کشٹگی

کشٹگی شہر حیدرآباد سے کافی دور واقع ہے اور وہاں پہنچنے کے لئے راستہ بھی دشوار گذار ہے چنانچہ ریل کے علاوہ کئی جگہ بس تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ لیکن الف صدیقی صاحب بی اے مصنف مشاہیر قندھار دکن نے اس ہفتخواں کو بڑی زندہ دلی سے طے کرلیا اور اردو کی خدمت کے لئے طویل سفر کی زحمتیں گوارا کیں۔ (سب رس)

راستہ کی سہولتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ملاء سے پہلے پہنچا لیکن بارش کی وجہ سے موٹروں کی آمد و رفت بند تھی۔ سید ذاکر علی صاحب مہتمم تعلیمات اور تحصیلدار صاحب و منصف صاحب کپل کی کوششوں سے مجھے بروقت کشٹگی پہنچنے میں آسانی ہوئی۔ جمعہ کے دن صبح میں کشٹگی پہنچ گیا۔ انسپکٹر صاحب آبکاری لنگسگور و سنیئے صاحب آبکاری مہتمم ساگر ڈاک بنگلہ میں منتظر تھے۔ قیام و طعام کا انتظام بھی صاحبان موصوف ہی نے کردیا تھا۔ امتحان سہ پہر سے شروع ہونے والا تھا اس لئے صبح ہی مدرسہ کی عمارت دیکھی اور امیدواروں کی نشستوں کا انتظام کردیا۔ اس سلسلے میں مولوی خواجہ معین الدین صاحب صدر مدرس اور مولوی سید شاہ عبدالرزاق صاحب مدرس نے قابل ذکر امداد کی۔ اردو عالم میں تین امیدوار شریک تھے لیکن صرف دو حاضر رہے۔ پرچوں کی تقسیم کے وقت بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل بی منصف کشٹگی بھی تشریف لائے اور امتحانات سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ دوسرا دن اردو دانی کے امتحان کا تھا۔ ستر امیدوار شریک تھے لیکن تریسٹھ حاضر رہے۔ جن میں اناث کی تعداد دس تھی اور ان کا انتظام بیگم عبدالکریم صاحبہ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ صبح آٹھ بجے ہی سے قرب و جوار کے مقامات سے امیدوار اپنے اپنے اساتذہ کے ساتھ آنے شروع ہوئے اور دس بجے تک ہال بھر گیا۔ امیدواروں میں سولہ سال کی عمر سے (۶۵) سال کی عمر تک سب ہی شریک تھے۔

پرچہ بروقت تقسیم کردیا گیا۔ خواجہ معین الدین صاحب صدر مدرس۔ سید شاہ عبدالرزاق صاحب۔ قاضی محمد حسین صاحب بی اے سب انسپکٹر آبکاری کسلی اور مرزا انوار اللہ بیگ صاحب ڈرائینگ ماسٹر مدرسہ کشٹگی و اہلیہ عبدالکریم صاحب چیچک برار (زنانہ ہال) نے نگران کاری کے فرائض انجام دئے۔

اس دن یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ ان اساتذہ نے جنھوں نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں دلچسپی لی تھی اور غیر اوقات میں شام کے سات سے دس تک ان لوگوں کو پڑھایا تھا۔ ارباب تعلیمات نے باز پرس کی اور اسی بناء پر صدر مدرس صاحب نے امتحان کے لئے مدرسہ کی عمارت دینے میں بھی پس و پیش کیا۔ یہاں کے رجحان اور شوق کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ پبلک کی موجودگی میں ادارہ کی ایک شاخ یہاں قائم کردی جائے اسی خیال سے چار بجے مدرسہ ہی میں مقامی معززین و عہدہ داروں کو زحمت دی گئی لیکن وقار علی صاحب منتظم کوتوالی نے اس خیال کو عملی جامہ پہننے سے باز رکھا اور جلسوں کے امتناعی احکام روانہ کردئے۔ مجبوراً ہم نے خاموشی اختیار کرلی چار بجے پرچوں کے ختم ہوجانے کے بعد جناب منصف صاحب تشریف لائے اور اس جلسہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ادارہ کی شاخ کے قیام کو ضروری قرار دیا اور فرمایا کہ حکومت کا کروڑہا روپیہ محض اپنی رعایا کو تعلیم یافتہ

بنانے پر صرف ہو رہا ہے اگر کوئی ادارہ حکومت کا ہاتھ بٹائے تو اس کی کوشش بنظر استحسان دیکھی جائے گی۔ دیگر مقامی عہدہ داروں نے بھی اس خیال کی تائید کی اور امتحان کے آخری دن یعنی ۱۲ مہر کو چار بجے دوبارہ مقامی معززین و عہدہ داران کو شرکت کی زحمت دی گئی۔ تعلیم کی تحصیل پر میری ایک مختصر سی تقریر ہوئی میں نے ادارہ کی شاخ کے قیام پر زور دیتے ہوئے اردو امتحانات کی طرف توجہ دلائی اور ادارہ کی شاخ کا قیام عمل میں آیا جس کی صدارت جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل بی نے قبول کی اور لسٹپا صاحب ساہو معتمد مقرر کئے گئے اور حسب ذیل اراکین۔

۱ ۔ جناب اشرف حسین صاحب منصرم تحصیلدار
۲ ۔ جناب خواجہ معین الدین صاحب صدر مدرس
۳ ۔ جناب عبدالمجید صاحب سررشتہ دار
۴ ۔ جناب عبدالکریم صاحب چیچک برار
۵ ۔ جناب سید شاہ عبدالرزاق صاحب مدرس
۶ ۔ جناب کریم داد خاں صاحب ساہو
۷ ۔ جناب قاضی محمد حسین صاحب بی اے سب انسپکٹر آبکاری

مندرجۂ بالا اصحاب نے ادارہ کے امتحانات کے سلسلے میں اس سے قبل بھی نہایت فراخدلی سے حصہ لیا اور خاص طور پر احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری لنگسگور، قاضی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر سید شاہ عبدالرزاق صاحب مدرس اور محمد حسین صاحب انسپکٹر ہنمن ساگر نے امیدواران امتحان کی دامے، درمے، قدمے، سخنے غرض کہ ہر طرح مدد فرمائی۔ مسٹر رستم جی متاجر آبکاری کشتگی نے بھی ادارہ کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا خواتین میں اول آنے والی خاتون کے لئے پانچ روپیہ کا تمغہ دیا ہے۔

رات کے دس بجے جناب منصف صاحب نے معززین اور مقامی عہدہ داروں کو اپنے پاس مدعو کیا تاکہ ادارہ کے مقاصد کی تشہیر ہو سکے۔ اس محفل میں میں نے ایک نظم "پڑھو اور پڑھاؤ" کے عنوان پر سنائی اور ایک گھنٹے تک ادارہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس کی زندگی کے تفصیلی واقعات سنائے اس کے بعد جناب منصف صاحب نے بھی اپنی پُر مغز تقریر میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا اور کہا کہ ہمارے دیہات کے اساتذہ کے لئے اچھا مشغلہ ہاتھ آیا ہے اور پبلک کو بھی۔ اب وہ بیکار وقت گزاری کی بجائے پڑھائیں گے اور پڑھیں گے اور اپنی قوم کے معیار کو بلند سے بلند تر کر دیں گے۔ اس محفل میں منتظم صاحب کوتوالی نے شرکت نہ کی البتہ ناظر صاحب تعلیمات جو اتفاقاً دورہ پر آئے ہوئے تھے شریک تھے۔ وہ بھی ادارہ کے کام سے متاثر تھے۔ موجودہ شوق کا اندازہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ امتحان میں کشتگی کے امیدواروں کی تعداد تین سو سے متجاوز ہو جائے گی۔

دو شنبہ کا دن یعنی ۱۳ مہر ہماری واپسی کا دن تھا۔ مقامی معززین اور عہدہ دار سب ہی ڈاک بنگلہ میں ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے تشریف لائے ان میں منتظم صاحب کوتوالی بھی شریک تھے۔ شاید خیال کرتے ہوں آئی بلا آسانی سے ٹل رہی ہے۔ میں منتظم صاحب سے معذرت چاہتے ہوئے ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے کاموں میں ہاتھ بٹایا اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔

اکبر صدیقی

پربھنی

۱۰ اردیبہشت کی صبح پربھنی پہنچا۔ اسٹیشن پر مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد صاحب شاخ ادارۂ ادبیات اردو سے ملاقات ہوئی۔ ادارہ نے میرے ٹھیرنے کے لئے انتظام کیا تھا لیکن میں نے چونکہ اپنے بھائی مولوی خیر الدین صاحب وکیل پربھنی کے پاس ٹھیرنے کا وعدہ کرلیا تھا، اس لئے وہیں ٹھیرا رہا۔

امتحانات کا مرکز مدرسہ فوقانیہ ضلع پربھنی مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں مولوی ابرار حسین صاحب صدر مدرسہ نے نشستوں کا انتظام فرمادیا تھا۔ نگرانی کے لئے ہر پرچہ میں ایک مدرس صاحب تشریف لاکر میرا ہاتھ بٹاتے رہے۔ اس کے علاوہ مولوی عارف الدین صاحب (علیگ) مہتمم آبکاری اور مولوی عبد الحی صاحب بی اے (عثمانیہ) مددگار مہتمم آبکاری نے اپنی عنایت سے نگرانی میں حصہ لیا۔

انہیں ایام میں مجھے پربھنی کے اکثر لوگوں سے ملنے اور وہاں کی علمی و ادبی دلچسپیوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ پربھنی میں "بزم رنداں" ایک کلب ہے، یہ حقیقت میں عوام کا ایک نمایندہ کلب ہے جس میں ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر حیثیت کے لوگ رکن کی حیثیت سے شریک ہیں چھوٹے بڑے کے فرق سے یہ بزم بے نیاز ہے۔ اس کلب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں عام بزموں کی طرح کھیل اور گپ شپ ہی نہیں بلکہ زیادہ تر علمی چہل پہل بھی رہا کرتی ہے تعلیم بالغان کا انتظام ہے، ابتدائی طبی امداد کی تعلیم ہوتی ہے، علمی مباحث ہوتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں۔ غرض ہر طرح کی تحریک رہتی ہے۔ پربھنی کی سونی اور بے جان دنیا میں اسی ایک مقام پر زندگی اور اخوت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ بھی یہیں قائم ہے۔ بزم کے تقریباً سب اراکین اس کے بھی رکن ہیں۔ شاخ کے صدر مولوی محمد فاروق صاحب بی اے (عثمانیہ) سوپلین ہیں، نائب صدر مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے (عثمانیہ) امین کروڑگیری اور معتمد حمید اللہ خاں صاحب شیدا ہیں۔ اراکین میں مولوی عارف الدین صاحب، مولوی عبد الحی صاحب مددگار آبکاری اور عبد الحکیم صاحب ملت انسپکٹر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب حضرات ادارہ کے مقاصد کو بر لانے کی پوری سعی کرتے ہیں اور اسے یقیناً اپنی زندگی کا ایک ضروری کام تصور کرتے ہیں۔ مولوی جلال الدین صاحب اشک نے اردو عالم کے طلبا کو باقاعدہ طور پر تعلیم دی اور اپنی سرکاری مصروفیت کے باوجود ان طلبا کو کافی وقت دیا۔ اب موصوف کی دلچسپی سے اردو فاضل کی جماعت کا کام بھی شروع ہوگیا ہے۔ سائنس اور عام معلومات کے مولوی مظفر الدین صاحب بی ایس سی (عثمانیہ) کے درس بہت مفید ثابت ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو امتحانات سے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو یکساں طور پر گہری دلچسپی ہے۔ ان حضرات نے اس خصوص میں جو دلچسپی لی وہ ادارے کی نظروں میں ہر طرح سے لائقِ ستائش ہے۔

یہ تو ادارہ کی شاخ سے متعلق عام باتیں تھیں۔ لیکن میں خصوصیت کے ساتھ ادارے کے ایک بہت ہی خاموش مگر نہایت جوشیلے اور باعمل کارکن مولوی عارف الدین صاحب (علیگ) مہتمم آبکاری پربھنی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ موصوف ایک زندہ دل، ملنسار اور حقیقی طور پر عملی آدمی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ باتیں بہت کرتے ہیں اور کام کم لیکن ان میں یہ خصوصیت ہے کہ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن کام بھی اس کا ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ موصوف نے ادارے کی شاخ کے قیام اور طلبا کی تعلیم کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ نادار طلبا

کے لئے کتابیں فراہم کریں۔ ان تمام حضرات سے مدد دلوائی جو اس کام کے لئے موزوں تھے۔ موصوف نے یہ دیکھا کہ محض کتابی علم معلومات میں اضافہ نہیں کرسکتا۔ اس لئے شاخ میں ایک دارالمطالعہ قائم کیا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب میں نے مطالعہ کی میز پر کوئی بیس اردو اور نصف درجن انگریزی رسالوں اور اخباروں کو دیکھا۔ انھوں نے صرف اخباروں ہی کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ اس امر کی بھی نگرانی رکھتے ہیں کہ لوگ اردو اخبار اور رسائل پڑھیں اور ان پر بحث و مباحثہ بھی کریں۔ کسی کی علمی مشکلات کا حل تلاش کرنا ان کا روز کا مشغلہ ہے۔ اس طرح سے اردو کا صحیح ذوق پیدا کرنے (جو ادارے کا ایک خاص مقصد ہے) کے سلسلے میں موصوف ہر طرح لائق مبارکباد ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آپ ہر وقت ادارے کے مقاصد کو بر لانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ موصوف نے مجھے اور ادارے کی شاخ کی کابینہ کے جملہ ارکان کو ایک پر تکلف دعوت بھی دی جس کا شکریہ ضروری ہے۔

پربھنی کے کام کرنے والوں کی فہرست نامکمل رہے گی اگر میں شاخ کے جوشیلے معتمد حمید اللہ خاں صاحب شیدا کا ذکر نہ کروں۔ شیدا صاحب ایک جوان صالح ہیں اردو لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے زراعت پر ایک کتاب بھی لکھی جو بہت اچھی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے جو اگر مکمل ہو جائے تو یقیناً ایک اچھا کام ہوگا۔ ادارہ کے یہ ایک پر خلوص کام کرنے والے ہیں۔ ان کی خدمت قدر کے قابل ہے۔

پربھنی میں عام طور پر اردو بولی جاتی ہے اور ہر مذہب اور فرقے کے لوگ مرہٹی کے ساتھ ساتھ بے تکلف اردو بولتے ہیں۔ عوام میں اردو سے دلچسپی ہے چنانچہ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ دوران ملاقات میں بیشتر حضرات نے ادارہ سے متعلق اپنی کافی معلومات اور اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔ امتحان کے سلسلے میں پرلی اور قندہار سے بھی امیدوار آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی کہا کہ ہمارے پاس اردو سے لوگوں کو بے حد دلچسپی ہے اور اگر امتحانات کا ہمیں پہلے سے علم ہوتا اور ان کا معیار معلوم ہو جاتا تو ہمارے پاس سے ایک کثیر تعداد میں امیدوار شریک ہوتے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے ضلع کے دوسرے تعلقوں اور قصبوں والوں کے بھی کچھ تاثرات آپ کو معلوم ہیں تو کہنے لگے "ہمارا جہاں تک تعلق ہے ہم نے یہی دیکھا کہ سب لوگ ادارہ کے امتحانات کو بہت اچھا سمجھ رہے ہیں ہم کو اس کی بڑی ضرورت تھی ہمارے لئے اپنی قابلیت کا معیار معلوم کرنے اور اردو درست کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا"۔

دوران گفتگو میں میں نے پوچھا "یہ کیا بات ہے کہ اردو عالم میں تو تعداد زیادہ ہے اور اردو دانی میں کم؟" اس کا جواب ملا "یوں تو اردو دانی میں شریک ہونے والے امیدواروں کی تعداد زیادہ ہے لیکن مرکز چونکہ اتنا دور تھا کہ ان امیدواروں کے لئے اخراجات برداشت کرنا ناممکن تھا۔ اسی لئے شریک نہ ہوئے"۔ میری رائے میں اگر ایسے امیدواروں کے لئے قریب قریب مرکز رکھے جائیں اور ایک شخص دورہ کرکے امتحان لیتا جائے تو مناسب ہوگا۔

ایک صاحب کی تجویز ہے کہ اردو عالم اور اردو دانی یا کم از کم اردو دانی کے امتحانات سال میں دو مرتبہ ہوں یہ تجویز ادارہ کے لئے لائق غور ہے۔

امیدواروں کی عام رائے یہ ہے کہ سیپارۂ دل

اور سائنس کے کرشمے کا مطالعہ ان کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا اس لئے ان کے مضامین میں ربط نہیں ہے اور دوسرے ان میں سے اکثر حصوں کا معیار بلند ہے اور ایسے مقامات کے رہنے والوں کے لئے جہاں ہر قابلیت کا آدمی تعلیم کے لئے مل نہیں سکتا ان کتابوں کا مطالعہ بہت مشکل ہے۔ چنانچہ یہ حال دیکھ کر میں نے "سائنس کے کرشموں" پر کوئی دو گھنٹہ تک تقریر کی اور اس کے مختلف اجزا کو امیدواروں کی استعداد کے مطابق واضح کیا۔

آخر میں میں مظاہر الدین سلمہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے قیام پربھنی کے زمانے میں ہر طرح کی مدد پہنچائی اور امتحان کے کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

ادارہ کی شاخ کی جانب سے جو پھول پہنائے گئے اور متعدد حضرات نے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کی جو تکلیف گوارا فرمائی میں اس کے لئے بے حد ممنون ہوں۔

فیض محمد صدیقی

مرکز نسواں بلدہ

حیدرآباد میں امتحانات ادارہ کے نسوانی مرکز کے لئے مدرسہ فوقانیہ نامپلی کا انتخاب ہر طرح سے موزوں ثابت ہوا۔ مس جلسن کے ہم ممنون ہیں کہ از راہ عنایت اپنے مدرسہ کو اس موقع پر استعمال کرنے کی اجازت دی اور مس جیسی نندی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنی مہربانی سے ہمارے لئے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی

مقررہ نظام العمل کے مطابق ۱۶ر، ۱۷ر اور ۱۸ر اگست کو اردو امتحانات بپابندی وقت عمل میں آئے۔ اردو دانی کے نو، اردو عالم کے دس اور اردو فاضل کے دو امیدواروں نے شرکت کی۔

امتحانات کی نگرانی میں مسز عبدالقادر سروری نے تینوں دن حصہ لیا۔ ۱۰ر اگست کو مسز انوار اللہ اور اسی دن سہ پہر میں مسز ورانی نے بھی مدد کی اور اردو دانی کا زبانی امتحان بھی انہی دونوں نے لیا۔ ادارہ کی طرف سے ہر سہ خواتین کی خدمت میں ان کی مخلصانہ اعانت اور دلچسپی کی قدر کرتے ہوئے دلی شکریہ پیش کرتی ہوں۔

امسال صرف اردو دانی کے امتحان میں حیدرآباد اور اضلاع سے ۱۶۵ امیدوار شریک ہوئے تھے۔ امتحانات کے قیام کے ساتھ ہی ان کی یہ مقبولیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے امتحانات کی اہمیں ضرورت تھی۔ ادارہ کے وہ ارباب جو امتحانات کے قیام کے ذمہ دار ہیں خاص طور پر قابل مبارکباد ہیں کہ ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری کردی۔

ان کا یہ اقدام سب کے لئے عام طور پر اور ان امتحانات کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا جنھیں ان امتحانوں کی عدم موجودگی میں مولوی عالم اور فاضل وغیرہ کے امتحانات کے لئے دوسرے صوبوں کو جانے کی زحمت اور صرفہ برداشت کرنا پڑتا۔

معتمد صاحب شعبۂ امتحانات کو ان کی سعی و کوشش اور امتحانات کی کامیابی پر جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے ایک قلیل مدت میں ان کے شعبہ نے اپنے قیام کے مقصد کو جس خوبی و کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے وہ قابل تحسین و تقلید ہے۔ (کاش ہمارے لئے ان کا یہ جوش عمل، بیداری کا پیام بن جائے!)

سکینہ بیگم

گلبرگہ شریف

میں ۹ مہر ۱۳۴۹ف کو شام کے چار بجے گلبرگہ پہنچا۔ امتحانات کے لئے عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کی عمارت میں جو انتظامات کئے گئے تھے تفصیل سے دیکھ لئے۔ اگلے روز سے امتحانات شروع ہوئے۔ مرکز گلبرگہ میں اردو دانی کے امیدواروں کی تعداد (۱۵) اور اردو عالم کے امیدواروں کی (۱۴) تھی۔ اردو دانی کے امیدواروں میں پانچ غیر حاضر تھے۔ دریافت کرنے سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان میں سے بعض چپراسی ہیں جنھیں اپنے عہدہ داروں کے ساتھ انہی دنوں دورے پر جانا پڑا اور امتحان میں حاضر نہ ہو سکے۔ اردو دانی کے تقریباً تمام امیدوار ادنیٰ ملازمین اور اہل حرفہ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی مدرسے کا طالب علم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ سب بالیقین اڈلٹس تھے۔ ایک امیدوار کی عمر تو ساٹھ سال سے بھی رسیدہ تھی۔ اس کا شوق دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو معمر اور بالغوں میں تعلیم پھیلانے کے بڑے اچھے امکانات ہیں۔ اردو دانی کے امیدواروں کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادارے کا یہ امتحان تعلیم بالغان کے سلسلے میں بہت ہی مقبول اور سود مند ثابت ہو گا۔

اردو عالم کے (۱۴) امیدوار برابر حاضر تھے۔ اور سب نے امتحان کی معقول تیاری کی تھی۔ تقریباً تمام امیدوار ہر پرچے کو آخر وقت تک محنت سے لکھتے رہے۔ کوئی امیدوار ایسا نہیں نظر آیا جو وقت مقررہ سے آدھا یا پاؤ گھنٹہ پہلے پرچہ ختم کر کے اُٹھ گیا ہو۔ ادارے کی شاخ گلبرگہ کے معتمد مولوی محمود حسین صاحب نے ان امیدواروں کو تیار کرایا ہے۔ اور بہت دلچسپی اور شوق سے انھیں پڑھایا ہے۔

گلبرگہ کی شاخ بہت عمدگی سے کام کر رہی ہے۔ اس کی طرف سے ایک مطالعہ خانہ بھی قائم ہے۔ یہ سب کچھ اس کے مخلص اور سرگرم معتمد مولوی سید محمود حسین صاحب کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار گلبرگہ شریف سے جو ادارے کے سرپرست بھی ہیں ملاقات ہوئی۔ صاحب موصوف نے ادارے کے مختلف امور دریافت فرمائے اور اس کی ترقی و توسیع کے بارے میں اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا۔ مولوی سید جمیل حسین صاحب تعلقدار، مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل، ملک شرف الدین صاحب میونسپل انجنیئر اور دیگر کئی سرکاری عہدہ داران اور چند اصحاب سے بھی ملاقات کا موقع ملا اور ادارے کے اغراض و مقاصد کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ سب کو ادارے کا ہمدرد اور اس کی کوششوں کا قدر داں پایا۔

جناب مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی عنایات خاص طور سے قابل تشکر ہیں۔ صاحب موصوف نے ہر طرح سے مدد فرمائی۔ کالج کے اساتذہ میں سے مولوی خواجہ نصیر الدین صاحب اردو لکچرار اور مولوی احمد عبدالعزیز صاحب لکچرار معاشیات دونوں نے نگرانی کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ مولوی محمود حسین صاحب معتمد شاخ ادارہ نے بھی شروع سے آخر تک میرے ساتھ رہ کر ہر طرح میری مدد فرمائی جس کے لئے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔

سید محمد

حیدرآباد

حیدرآباد کے مرکز کلیۂ بلدہ میں حسب ذیل امیدوار شریک تھے۔

(۱) اردو نویسی ۹ (۲) اردو عالم ۲۵
(۳) سند اردو دانی ۳۶ (۴) خوشنویسی ۶

صدر کلیہ نے اپنی عنایت سے نہ صرف عمارت کے استعمال کی اجازت عطا فرمائی بلکہ نشستوں، میزوں اور دواتوں کا بھی انتظام فرمایا۔ مولوی سعید احمد خاں صاحب، مسٹر رام چندریا، مسٹر شنولکر، مولوی غلام رسول صاحب اور مولوی عبدالرحمن شریف صاحب مددگاران کلیہ نے نہایت مہربانی سے، نگرانی کے سہ آزما کام میں مجلس کا ہاتھ بٹایا۔

جناب مولوی سید علی اکبر صاحب، صدر مجلس امتحانات نے ۱۱ اگست کی صبح کو مرکز کا معائنہ فرمایا اور بیش بہا مشورے عنایت کئے۔

جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، معتمد اعزازی ادارہ امتحان کے پورے اوقات میں، مرکز میں تشریف فرما رہے اور مولوی حمید الدین صاحب شاہدؔ مہتمم ادارہ و مدیر سب رس نے انتظامی اور دفتری کاموں میں بیش بہا مدد فرمائی۔

اس مرکز کے ہر امتحان کے تمام امیدواروں نے جس باضابطگی اصول اور اوقات کی پابندی، شریفانہ رویہ اور لب و لہجے کا اظہار کیا وہ نہایت قابل تعریف تھا۔

۱۵ اگست کو ختم امتحان کے بعد تمام معاونین امتحان نے چائے نوش کی۔

عبدالقادر سروری

جلسہ شاخ کشتگی

خوشی کی بات ہے کہ کشتگی کے علم دوست حضرات نے بغیر کسی تحریک کے ادارہ کی شاخ قائم کر کے اپنی اردو دوستی اور جذبۂ عمل کا ثبوت دیا۔ اس سلسلہ میں جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے منصف بطور خاص قابل مبارک باد ہیں۔ کہ انھوں نے شاخ کے قیام میں ذاتی دلچسپی لی اور اپنی صدارت میں مسٹر چندیا پٹیل تحصیلدار، مسٹر لسٹپا ساہو اور قاضی محمد حسین صاحب جیسے پرجوش اصحاب کی مفید صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع دیا۔ (سب رس)

۱۲ مہر ۱۳۴۹ف کو بصدارت جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے۔ ایل ایل بی۔ منصف تعلقہ کشتگی۔ ادارہ کی شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ ادارہ کے امتحانات کے صدر نگران مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی بی اے بھی موجود تھے۔ چونکہ اس وقت تحصیلدار صاحب اور دیگر اصحاب مستقر پر موجود نہ تھے۔ اس لئے بتاریخ ۲۲ مہر ۱۳۴۹ف بصدارت جناب منصف صاحب ممدوح ایک تجدیدی کمیٹی کا انعقاد ہوا۔ اور متفقہ طور پر مندرجۂ ذیل عہدہ داران اور اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے۔ ایل ایل بی منصف کشتگی۔
نائب صدر۔ جناب مسٹر چندپا صاحب پٹیل بی ایس سی (عثمانیہ) تحصیلدار تعلقہ کشتگی۔

معتمد ـ مسٹر لسٹیا صاحب ساہو تعلقہ کشتگی۔

اراکین مجلس انتظامی

(۱) مولوی خواجہ معین الدین صاحب (۵) مولوی عبدالرزاق صاحب
(۲) " عبدالمجید صاحب (۶) " میر جمال علی صاحب
(۳) " واجد علی صاحب قصد (۷) " ایریداوماں صاحب ساہو
(۴) " سید اشرف حسین صاحب (۸) " نور اللہ بیگ صاحب
(۹) قاضی محمد حسین صاحب بی اے عثمانیہ

بعد کو حسب ذیل تحریکات پیش اور بہ اتفاق آرا منظور ہوئیں۔

۱ ـ اردو دانی اور اردو عالم میں شریک ہونے والے امید واروں کے لئے تعلیم کا باضابطہ انتظام کیا جائے۔

۲ ـ فی الحال جناب لسٹیا صاحب ساہو کا مکان جو مطبع خانہ کے قریب واقع ہے ادارہ کی تعلیم گاہ کے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

۳ ـ ایسے اساتذہ کی رضاکارانہ خدمات حاصل کی جائیں جو بہ طیب خاطر غیر اوقات مدرسہ میں تعلیم دے سکیں۔

۴ ـ جناب لسٹیا صاحب کے مکان میں ایک دار المطالعہ بھی قایم کیا جائے۔ جہاں اردو ادب کی ہر مفید کتاب مطالعہ کے لئے رکھی جائے۔

۵ ـ حسب ذیل حضرات نے از راہ کرم اردو دانی اور اردو عالم کے امید واروں کو تعلیم دینے کے لئے اپنی اعزازی خدمات پیش فرمائیں۔

(۱) جناب پنڈت بلونت راؤ صاحب کھاٹے (۴) مولوی عبدالمجید صاحب
(۲) " چندپا صاحب پٹیل (۵) " عبدالرزاق صاحب
(۳) مولوی خواجہ معین الدین صاحب (۶) " قاضی محمد حسین صاحب بی اے (عثمانیہ)

۶ ـ نادار امید واروں کی ضروریات تعلیم کی فراہمی کے لئے یہ طے پایا کہ اراکین شاخ ادارہ و دیگر حضرات ماہانہ (۳) روپیہ چندہ ادا کریں۔ اس سے کم چندہ بھی قابل وصول ہوگا۔ اور اس کا ایک باضابطہ رجسٹر رکھا جائے۔

لسٹیا
(معتمد شاخ کشتگی)

پربھنی میں ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیاں

ادارہ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے زیر اہتمام عالیجناب مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری کی صدارت میں ایک غیر معمولی جلسہ ہوا ابتدا میں جناب صدر نے شرکائے امتحانات ادارہ ادبیات اردو کو نہایت ہمدردانہ نصیحت کی اور فرمایا کہ "جب تم کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لو تو اس کو انتہائی کوشش سے کامیاب بناؤ اور پایۂ تکمیل کو پہونچانے کی کوشش کرو اور جب کہ تم ادارے کے امتحانات میں شریک ہو رہے ہو تو ان کو محنت کرکے کامیاب کرو تاکہ تمہاری وجہ سے زبان و ادب کو تقویت پہونچے اور ادارہ کے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل ہو"۔

یہ کہتے ہوئے موصوف نے اردو فاضل سنہ کی جماعت کا افتتاح فرمایا۔ زاں بعد حمید اللہ خاں شیدا معتمد شاخ پربھنی نے ادارۂ ادبیات اردو کے اعلیٰ مقاصد اور اس کے طرز کار اور شعبہ جات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ قابل مبارکباد ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے اس نازک دور میں ملک کی عام ضروریات اور اہل ملک کے بڑھتے ہوئے جذبات عمل کو دیکھ کر آغاز کار کے لئے

اپنے پُرخلوص مطلبوں سے اس کی بنیاد رکھی۔ ان حضرات میں خاص طور پر پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی اور دکن کے مایۂ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ ملک کے نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں میں تصنیف اور تالیف کا شوق بڑھایا جائے اور حیدرآباد کی علمی اور عملی کوششوں کو اجتماعی شکل دی جائے اور جو نوجوان علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں ان کی صحیح رہنمائی کی جائے اور ان کی تصنیفات اور تالیفات کو زیور طبع سے آراستہ کیا جائے اور ان کی علمی اور عملی قوتوں کو بروئے کار لایا جائے۔

چنانچہ ادارے نے اس مقصد عظیم میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد مقامی شاخ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ خوش قسمتی سے پربھنی میں ادارہ کی شاخ قائم ہو گئی ہے۔ موجودہ صورت میں مقامی شاخ نے ۴ شعبہ جات قائم کئے ہیں شعبہ امتحانات، شعبہ تقریر، شعبہ شاعری، شعبہ تحریر۔ اور ان کی تفصیل بتلاتے ہوئے شرکت کی درخواست کی جس پر متعدد حضرات نے شرکت فرمائی۔

اس کے بعد مرزا نذیر بیگ صاحب نذیر نے اپنا مسدس سنایا جو موصوف نے دور حاضرہ کے عنوان سے لکھا ہے جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ ازاں بعد مادر جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز ادیب، شاعر حضرت جلال الدین صاحب اشک نائب صدر نے نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ اور آب حیات اور اس کے مصنف پر بہترین لکچر دیا

فی الوقت جماعت اردو فاضل میں ۱۲، اردو عالم میں ۱۲، خوشنویسی میں ۵، اور اردو دانی میں دس طلبہ نے شرکت کی ہے۔ توقع ہے کہ سالانہ امتحانات کے نتائج کے بعد بہت زیادہ طلبہ شریک ہوں گے۔

مولوی عبدالحی صاحب بی اے عثمانیہ مددگار مہتمم آبکاری اور مولوی عبدالباری بی اے ایل ایل بی انسپکٹر آبکاری نے معاشیات اور تاریخ پر لکچر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مدرسہ فوقانیہ پربھنی کے اساتذہ بھی کچھ ایثار سے کام لے کر تھوڑا سا وقت صرف کریں تو طلبہ کے لئے بڑی آسانی ہوگی۔ اس کے بعد شاہ ذیجاہ کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کی گئی اور جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

حمید اللہ خاں شیدا

(معتمد شاخ پربھنی)

تاریخ ادب اردو۔ ادارۂ ادبیات اردو نے طلبہ اور عوام کے لئے ایک تاریخ ادب اردو مرتب کر کے شائع کی ہے جو تین حصوں اور ([illegible]) صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو کی اتنی مختصر تاریخ اب تک شائع نہیں ہوئی تھی اس میں آٹھ سو سے زیادہ مضمون، کتابوں اور رسالوں کے متعلق ضروری معلومات شامل ہیں۔ ہر اردو جاننے والا اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ قیمت بہت ہی کم یعنی [illegible] رکھی گئی ہے۔
سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد سے طلب فرمائیے۔

گلبرگہ میں اردو کی تعلیم

عامۃ الناس کی فلاح و بہبود کا خیال کوئی نیا نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک لوگ اپنے طور پر مخلوق خدا کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن خدمتوں میں بھی فرق ہے۔ بعض ذاتی منفعت کے لئے خدمت خلق کے درپے ہوتے ہیں۔ بعض نام و نمود کے خاطر دوسروں کی آگ میں کودتے ہیں۔ لیکن تیسرا طبقہ ان سب سے جدا قوم کی ترقی کے لئے خدمت کرتا ہے۔ اس کے افراد اپنے پہلو میں دردمند دل رکھتے ہیں۔ اور قوم کے بے غرض محسن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی ہی ہستیوں کے زیر اثر گلبرگہ میں ادارہ کی شاخ قایم ہوئی جس کے قیام کا سہرا مولوی محمود حسین صاحب (عثمانیہ) کے سر ہے۔

موصوف گلبرگہ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادارہ کے اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا اور اردو زبان کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔

پہلے پہل انھوں نے ادارہ کے قیام کے لئے ایک مونہار سے کام لیا۔ یعنی محمود حسین صاحب کی کوششوں سے اصغر علی صاحب کی شکل میں ایک شمع روشن ہوگئی جس نے آہستہ آہستہ اردو کے بہت سے پروانے اپنے گرد جمع کر لئے۔

اس طرح ۲۴ اسفندار ۱۳۴۹ف سے ادارہ کی امتحانی جماعتوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ چند دنوں تک مولوی صاحب کے مکان پر درس و تدریس جاری رہی بعد میں ان کے ایک دوست نے اپنا دیوان خانہ اس کے لئے مرحمت فرمایا۔ لیکن طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یہ دیوان خانہ بھی ناکافی ثابت ہونے لگا۔ جس کی وجہ سے محلہ کا ایک عاشور خانہ (جو سوائے ماہ محرم کے ہر وقت خالی رہتا ہے) اہل محلہ سے درخواست کرکے مانگ لیا گیا۔ عاشور خانہ بہت خستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی مرمت کے لئے اہل محلہ سے چندہ کی درخواست کی گئی بعض سادہ لوح حضرات نے تو حالت سکر میں مولوی صاحب سے غیر مہذب گفتگو کی لیکن انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ اور اپنا کام کرتے چلے گئے۔ بعض نادار لڑکے جو کسی صورت سے بھی کتابیں نہیں خرید سکتے تھے ان کو کتابیں دلوائیں اور کئی لڑکوں کی امتحانی فیس بھی اپنی جیب سے ادا کرنی پڑی۔

جملہ طلبائے ادارہ ادبیات اردو شاخ گلبرگہ کی مولوی محمود حسین صاحب نے حقیقی معنوں میں تن من دھن سے خدمت کی ہے جس کے شکریہ کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کے جذبۂ ایثار میں استحکام بخشے اور ادارہ کی شاخ کو دن دونی رات چوگنی ترقی نصیب کرے۔

ادارہ کے ساتھ ایک دار المطالعہ کا قیام بھی ضروری تھا تاکہ لوگوں میں ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے لیکن مالی حالت ابتر ہونے کی وجہ سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی محمد یوسف صاحب تاجر عطر۔ یعقوب علی ہاشم صاحب تاجر و منیجر کرشل ٹاکیز نے حتی الامکان چندہ دے کر اس مبارک کام کی انجام دہی فرمائی۔

احسان فراموشی ہوگی اگر اس سلسلہ میں ہم نواب غوث یار جنگ بہادر مولوی نصیر الدین صاحب نظامی لکچرار کالج گلبرگہ، مولوی عبدالکریم صاحب مددگار دسطائیہ سوکن لیدہ اور مولوی محمد عمر صاحب سررشتہ دار صدر مہتمی تعلقات کا شکریہ ادا نہ کریں نواب صاحب معزز نے ہمیشہ ہماری ڈھارس بندھائی۔ اور وقتاً فوقتاً قیمتی مشوروں سے ہمیں سرفراز فرمایا۔ مولوی نصیر الدین صاحب نے عروض جیسے ادق مضمون کی تعلیم اپنے ذمہ لی، مولوی عبدالکریم صاحب نے سائنس کا پورا نصاب بڑی عمدگی سے ختم کرایا اور مولوی محمد عمر صاحب نے دفتری معلومات کی عملی تعلیم دی۔

نیاز علیخاں نیاز

نوبل پرائز

ہمارے لئے یہ خبر نہایت ہی مسرت خیز ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے ایک قدیم رفیق اور ادارہ کے شعبۂ زبان کے سرگرم رکن ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کو نوبل پرائز کمیٹی نے مشاہیر ماہرین سائنس میں سے اس سال کے انعام کے لئے منتخب کیا ہے۔

یہ وہ اعزاز ہے جو دنیا کے صرف اعلیٰ ترین ماہرین ہی کو مل سکتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے نہ صرف وہ فرد جس کو یہ انعام دیا جاتا ہے بلکہ اس کی پوری قوم اور ملک کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے

ادارہ کے شعبۂ زبان کا گزشتہ اجلاس اپنے اس مایۂ صد افتخار رکن کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کر چکا ہے۔ اور اب سب رس کی مجلس ادارت بھی اپنے پرخلوص جذبات کے اظہار کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو دلی مبارکباد دیتی ہے۔

ناظرین سب رس کو یاد ہوگا کہ علامہ اقبال سے متعلق ڈاکٹر صاحب کا بسیط مضمون سب رس کے صفحات پر شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

ادارہ

غزل

کچھ تو مجھے اے جلوۂ جاناں نہ بنا دے | اپنا نہ بنا آپ سے بیگانہ بنا دے
در پردہ مئے حسن کا مستانہ بنا دے | پردہ نہ اٹھا اور مجھے دیوانہ بنا دے
افسانہ طلب حسن ہے اس کا مجھے ڈر ہے | ظالم مری ہستی کو نہ افسانہ بنا دے
آئینۂ رخ سے تری ہٹتی نہیں آنکھیں | یہ ذوقِ نظر مجھ کو نہ تجھ سا نہ بنا دے
میں منتظر اس موسمِ گل کا ہوں جو مجھ کو | گلچینِ بہارِ رُخِ جانانہ بنا دے
دل کب سے ہے مشتاق ترا بادِ بہاری | آ اور بھی دیوانے کو دیوانہ بنا دے
میخانہ جو آنکھوں کو بنا رکھا ہے ساقی | مستی کو مری حاصلِ میخانہ بنا دے
پھر شوقِ تماشا لئے جاتا ہے کسی سمت | پھر ذوقِ طلب مجھ کو تماشا نہ بنا دے

دل پھیر دیا اس نے جلیل آج یہ کہہ کر
دیوانہ ہے مجھ کو بھی نہ دیوانہ بنا دے

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

فرصت کا استعمال

انسان کے لئے آرام لینا نہایت ضروری ہے۔ لیکن آرام سے مراد کاہلی نہیں بلکہ مشاغل کی ایسی تبدیلی ہے جس سے ہم کو تفریح حاصل ہو، ہمارے دماغ میں تازگی پیدا ہو اور تندرستی قائم رہے تاکہ ہماری کارکردگی میں اضافہ ہو

تفریحی مشاغل | فرصت کے گھنٹوں میں مذہبی اور خانگی فرائض بھی داخل ہیں یہ فرائض مختلف اشخاص کے لئے مختلف حیثیت رکھتے ہیں، اور بعض کے لئے کم اور بعض کے لئے زیادہ ہیں۔ لیکن یہ کتنے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں ان کو انجام دینے کے بعد بھی انسان ایسے مشاغل کے لئے جو اس کی تندرستی قایم رکھنے معلومات میں اضافہ کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا باعث ہوتے ہیں وقت نکال سکتا ہے۔ ان مشاغل میں تفریحی مشاغل یعنی (Hobbies) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موسیقی، فوٹوگرافی، مصوری، معموں کو حل کرنا ڈاک کے ٹکٹ کا جمع کرنا اور اسی قسم کے دوسرے تفریحی مشاغل نہ صرف ہماری زندگی کی لذت کو بڑھاتے ہیں بلکہ ہمارے ذہن کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔ فرصت کے گھنٹوں میں انگلستان کے مشہور وزیر اعظم گلاڈسٹون کو درخت کاٹنے اور پوسٹ کارڈ لکھنے کا شوق تھا۔ اور دنیا کے مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر بلیرڈز کھیل کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے موجودہ زمانہ میں ایران کے بادشاہ رضا شاہ کا تفریحی شغلہ موسیقی ہے۔ اس قسم کے کثرت سے اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ میں آج ایسے مشاغل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو عام طور پر مفید اور ضروری ہیں۔

ورزش جسمانی | ایسے اشخاص کو جو دماغی کام کرتے ہیں یا بند جگہ کام کرتے ہیں کام سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے کھلی ہوا کی فکر کرنی چاہئے حیدرآباد جیسے بڑے شہر میں کھلی ہوا کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ گزشتہ چند سال سے محکمہ آرائش بلدہ اور محکمہ بلدیہ کی توجہ اس طرف مبذول ہے اور جا بجا عوام کے لئے تفریح گاہیں بنائی گئی ہیں نیز ہمارے شہر میں کھیل کے میدانوں کی جو کمی ہے اس کو پورا کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ قدیم یونانیوں کا ایک مقولہ یہ ہے کہ آدمی اس وقت تک جوان رہے گا جب تک کہ وہ کھیلتا رہے گا۔ بعض کھیل مثلاً ٹینس اور بیاڈمنٹن ایسے ہیں جن میں انسان عالم جوانی گزرنے کے بعد بھی حصہ لے سکتا ہے۔ پیراکی اور چہل قدمی کے لئے بھی عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ اگر روزانہ کام سے پہلے یا بعد کوئی شخص نصف گھنٹہ تیر لیا کرے یا تین چار میل کھلی ہوا میں چہل قدمی کرلے تو صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کو کسی اور ورزش کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہر شخص تیرنا نہیں جانتا اور جو لوگ جانتے ہیں ان کے لئے پیراکی کے موقعے کم ہیں۔ لیکن جوان بوڑھے، مرد عورت، امیر غریب سب پیدل چل سکتے ہیں۔

جب کوئی شخص گھر سے ٹہلنا ہوا نکلے تو اس کا دماغ گھر یا ملازمت یا پیشہ کی فکروں سے خالی رہنا چاہئے۔ اگر ایک یا دو ہم مذاق دوست اس کے ساتھ ہوں تو ایسی فکروں سے نجات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کھیل کو ٹہلنے پر اسی لئے ترجیح حاصل ہے کہ کھیل کے دوران میں فکروں کو بھلا دینا زیادہ آسان ہے۔

رسم ورواج کی وجہ سے ہندوستان میں عورتوں اور خصوصاً پردہ نشین عورتوں کی صحت کا مسئلہ خاص طور پر محتاج توجہ ہے۔ خدا ان آٹے کی گرنیوں کا بھلا کرے کہ گھر میں چکی پیسنا بھی اب موقوف ہوگیا ہے۔ عورتوں کے لئے خاص تفریح گاہیں اور کلب بھی موجود نہیں ہیں اگر ہیں بھی تو صرف متمول عورتوں کے لئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ عورتوں کے لئے

ورزش اور کھلی ہوا کے موقعے بہم پہونچانے کی جانب خاص توجہ کی جائے۔

باغبانی | باغبانی بلالحاظ سن وصنف سب کے لئے بہترین مشغلہ ہے جن عورتوں کو باہر جانے کا کم موقع ملتاہے ان کے لئے سینے پرونے اور گھر کے دوسرے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد باغبانی تفریح طبع کا اچھا ذریعہ ہے۔ باغبانی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ گھر کا احاطہ وسیع ہو صحن اگر مختصر بھی ہو تو اس میں باغبانی کے لئے گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ پھولوں سے گھر کی رونق بڑھتی ہے اور اگر ترکاری کی بھی پیداوار ہو تو اس سے گھر کے خرچ میں کفایت ہوتی ہے۔

اخبار بینی اور کتب بینی | جیسے جیسے تعلیم میں ترقی ہورہی ہے ویسے ویسے لوگوں میں اخبار پڑھنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو مقامی اور بیرونی سنسنی خیز خبروں کے سوا دوسری عام خبروں سے دلچسپی ہوتی ہے البتہ جب سے کہ جنگ کا آغاز ہوا ہے جنگ کی خبریں لوگ شوق سے پڑھنے لگے ہیں جس کا ایک اچھا نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان خبروں کے سلسلہ میں وہ مختلف ملکوں کے جغرافیہ طرز حکومت اور دوسرے حالات سے واقف ہوتے جارہے ہیں۔ یورپ میں مزدور بھی اخبار خرید کر پڑھتے ہیں لیکن ہندوستان میں اخبار کے خریدار کم اور پڑھنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔

ہماری ریاست میں روزآنہ اور ہفتہ واری اخبار اور ماہواری رسالوں کی کمی نہیں ہے لیکن ان میں دیہی باشندوں کی دلچسپی کا مواد بہت ہی کم ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کے مضامین ایسے ادق اور ان کی زبان ایسی مشکل ہوتی ہے کہ معمولی لکھا پڑھا ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ دیہی اور کم تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے خاص اخباروں کی ضرورت ہے مگر ایسے خاص اخبار جاری بھی ہوجائیں تو عام افلاس اور بے توجہی کے سبب ان کی کافی خریداری میں شک ہے کچھ اسی قسم کے وجوہ کی بناء پر بعض غیر ممالک میں وال پیپر یعنی دیواری اخبار کا طریقہ جاری کیا گیا ہے کسی گاؤں یا محلہ کے چند پرجوش اشخاص اپنی ایک کمیٹی بناکر ہفتہ واری دیواری اخبار نکالتے ہیں یہ ایک بڑی تقطیع کے کاغذ پر ہاتھ سے لکھا ہوا ہوتا ہے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو بعض دفعہ تو (Cuttings) ...... یعنی چھپے ہوئے اخبارات اور رسالوں کے تراشے جو ناظرین کے لئے دلچسپ یا سبق آموز ہوں اس پر چپکا دیئے جاتے ہیں۔ ان پڑھ بھی خاکے اور تصویریں دیکھ کر کچھ لطف اٹھاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر خواندگی کی طرف مائل ہوتے ہیں اگر اس قسم کا دیواری اخبار کسی مرکزی مقام مثلاً گاؤں کی چاوڑی میں لٹکا دیا جائے اور ان پڑھوں کو پڑھ کر سنایا جائے تو میرے خیال میں ایک عمدہ تعلیمی خدمت ہوگی اور گاؤں کی مردہ فضا میں زندگی کی ایک لہر دوڑنے لگے گی۔

جس کسی کو طالب علمی کے زمانہ میں تفریح کے طور پر کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں ہوا اس کی تعلیم کو ادھورا سمجھنا چاہئے۔ لیکن یہ ایسی کمی ہے جس کی تلافی کے لئے عمر کی قید نہیں ہے تنہائی میں کتاب سے بہتر اور کوئی رفیق نہیں ہوسکتا۔ ہر ترقی یافتہ زبان میں ایسی کتابوں کا جن کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اس کے مطالعہ کے لئے انسان کی عمر کافی نہیں ہے۔ اس پر آئے دن نت نئی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ نئی کتابوں کے انتخاب میں ایسے دوست احباب سے جو

ان کو پڑھ چکے ہوں مشورہ کر لینا یا ان پر اخباروں اور رسالوں کی تنقید سے رہبری حاصل کرنا مناسب ہوگا۔ عوام کے لئے موزوں اور سستی کتابیں ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں بکثرت شایع ہو رہی ہیں۔ خانگی کتب خانہ ایک بڑی نعمت ہے۔ لیکن کتابیں کتنی ہی سستی کیوں نہ ہوں بہت کم لوگ وہ تمام کتابیں خرید سکتے ہیں جن کو پڑھنے کے وہ خواہشمند ہیں۔ یہ ضرورت عام کتب خانوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ حیدرآباد میں متعدد کتب خانے اور مطالعہ گھر قایم ہو گئے ہیں لیکن اضلاع میں کتب خانوں کی کمی ہے اور جس طرح بڑودہ میں گشتی کتب خانے قایم کئے گئے ہیں اسی طرح ہماری ریاست میں دیہات کے باشندوں کے لئے کتب خانے قایم کرنے کی ضرورت ہے۔

علمی جلسے اور مشاعرہ | معلومات میں اضافہ کرنے اور خیالات میں بلندی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے کے لئے علمی جلسوں میں شرکت نہایت مفید ہے اور جن حضرات کو شعر و شاعری کا ذوق ہے ان کے لئے مشاعرہ ایک اچھا مشغلہ ہے بشرطیکہ اس میں اعتدال سے کام لیا جائے۔

سینما | سینما نہ صرف تفریح بلکہ اضافۂ معلومات کا ذریعہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اداکاری اور معلومات کے نقطۂ نظر سے فلم اچھا ہو بہت سے ایسے فلم ہیں جن سے ہم کو دوسرے ممالک کی طرز معاشرت اور تاریخ و جغرافیہ کے متعلق مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں یا کسی غیر زبان میں ہم کو اپنی استعداد بڑھانے اور اس کا صحیح تلفظ اور لہجہ سیکھنے میں مدد دیتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سینما کے دیکھنے سے آنکھوں پر بار پڑتا ہے اور بند جگہ دو ڈھائی گھنٹے بیٹھے رہنا صحت کے لئے بھی مضرت رساں ہے۔ البتہ کبھی کوئی اچھا فلم دکھایا جائے تو اس کو ضرور دیکھنا چاہئے۔ اور مہینہ میں ایک دو دفعہ سینما جانے سے صحت پر بھی برا اثر نہیں پڑ سکتا۔

لاسلکی | لاسلکی زمانہ حال کی ایک حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اور فرصت کے اوقات کو مفید طریقہ پر اور لطف سے گزارنے کا بہترین ذریعہ ہے خصوصاً ہندوستانی عورتوں کے لئے جن کو تفریح کے لئے یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے گھر سے باہر جانے کا کم موقع ملتا ہے۔ اس ایجاد کی بدولت ہم گھر بیٹھے موسیقی کے علاوہ تازہ ترین خبریں اور مشہور مصنفین اور مدبرین وغیرہ کی تقریروں کو سن سکتے ہیں۔ لاسلکی کی اہمیت کا لوگوں کو کبھی اس قدر احساس نہیں ہوا تھا جس قدر کہ موجودہ جنگ کے آغاز سے ہوا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب نہ صرف دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس بلکہ مقامی لاسلکی نشر گاہ میں بھی علمی مضامین پر تقریروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی دلچسپی کا پروگرام دیہاتیوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اگر اسی طرح ہماری ریاست میں نہ صرف اردو بلکہ تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں دیہاتی پروگرام نشر کیا جائے اور کم از کم ہر تعلقہ کے مستقر کے لئے ایک لاسلکی سٹ مہیا کیا جائے تو اس سے دیہات سدھار کے کام میں بڑی مدد ملے گی۔ اکثر جاہل لوگ نشہ کا استعمال محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے لئے اور دلچسپیاں نہیں ہیں۔ سماجی اصلاح کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعہ سے عوام کی دلچسپیوں میں اضافہ کریں اور ان کے لئے تفریح طبع کا موزوں سامان مہیا کریں۔

قومی کام | وہ لوگ قابل احترام ہیں جو اپنے فرصت کے گھنٹوں میں

ایثار سے کام لے کر کوئی قومی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ہندوستان کی معاشی اور تعلیمی پستی کے مدنظر تعلیم یافتہ اشخاص کا فرض ہے کہ ایسی تحریکات کے لئے جن پر ملک کی ترقی کا دار و مدار ہے تھوڑا بہت وقت دیا کریں ان میں بہت سی ایسی بھی تحریکات ہیں مثلاً تعلیم بالغاں اور تنظیم دیہی کی تحریکات جن میں ملازمین سرکار بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

تعطیلات کا مصرف | فرصت کے اوقات میں چھٹی کے دن بھی شامل ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن اپنے پیشہ یا ملازمت کی فکروں کو بھول کر آرام لینا اور دوسری مصروفیات سے اپنی تکان دور کرنا ضروری ہے۔ ورنہ زندگی اپنی یکسانیت کی وجہ سے بے مزہ ہو جاتی ہے اور صحت کے بھی متاثر ہونے کا اندیشہ ہے سرکاری ملازمین کو دوسری تعطیلات کے علاوہ ہفتہ میں ایک دن چھٹی ملتی ہے لیکن اکثر خانگی ملازمین کو چھٹیاں کم ملتی ہیں مغربی ممالک میں ہر اتوار کو قانوناً تمام دکانیں اور کارخانے بند کئے جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہوگا اگر اس قسم کا قانون ہمارے ہاں بھی جاری کیا جائے۔

انگلستان میں ویک اینڈ یعنی ہفتہ کی سہ پہر سے پیر کی صبح تک کی چھٹی کا ہر شخص شوق سے منتظر رہتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے ارزاں ریل کے ٹکٹ سے استفادہ کرکے اکثر شنبہ کو کسی ساحلی یا اور کسی دلفریب مقام کو جاکر پورے ہفتہ کی تکان کھیل، پیراکی، مچھلیوں کے شکار دلکش مناظر کے مشاہدے اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل سے دور کرتے ہیں اور دوشنبہ کو اپنے کام پر تازہ دم واپس ہوتے ہیں جو لوگ اپنے مستقر سے کسی وجہ سے باہر نہیں جا سکتے وہ وہیں کسی تفریح گاہ میں اپنا دل بہلاتے ہیں۔ چنانچہ اتوار کے دن ہر شہر کے باغوں اور دوسری تفریح گاہوں میں ہزاروں کی تعداد میں مخلوق نظر آتی ہے۔ اور اکثر لوگ تعطیل میں یا جب کبھی فرصت ملے فٹ بال یا کرکٹ میاچ دیکھنے سے نہیں چوکتے۔ اس طرح ہفتہ میں ایک دن تعطیل منانے کے علاوہ اپنی آمدنی میں سے کچھ روپیہ ہر مہینہ بچا کر اکثر لوگ موسمی تعطیلات میں یا اگر ان کو موسمی تعطیلات نہ ملتی ہوں تو رخصت کے حق سے استفادہ کرکے دلچسپ مقامات کی سیر و سیاحت کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو کرسمس کے زمانہ میں جب کہ ریلوے کمپنیاں ٹکٹ میں رعایت کرتی ہیں تاریخی اور دوسرے قابل دید مقامات کی سیر کا اچھا موقع ملتا ہے۔ لیکن عام طور پر اس قسم کی رعایت سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اپنے خویش و اقربا سے ملنے یا شادی غمی میں شریک ہونے کے لئے دوسرے مقامات کو جایا چاہتے ہیں۔ تعطیل منانے کا شوق بہت کم ہندوستانیوں میں پایا جاتا ہے۔

کنٹربری کے اسقف اعظم نے کیا خوب کہا ہے کہ کسی انسان کی تعلیم اور کلچر کی جانچ محض اس سے نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فرائض کس طرح انجام دیتا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنی فرصت کے اوقات کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جاپان اور مغربی ممالک کی قوموں کی ترقی کا راز یہی ہے کہ وہ کام کے وقت پوری دلچسپی اور انہماک سے کام کرتے ہیں اور فرصت کے وقت ایسی تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں جس سے ان کو زندگی کا حقیقی لطف ملتا ہے اور ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ملک کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم نہ صرف مدرسوں میں طالب علموں کو فرصت کا صحیح استعمال سکھائیں بلکہ جہاں تک ہو سکے عام لوگوں کو بھی اس کے فائدوں سے واقف کرائیں۔

سید علی اکبر

(نوٹ) یہ تقریر ۲۸ اگست ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد لاسلکی اسٹیشن سے نشر کی گئی۔

بوڑھا ڈاکٹر

(سلسلہ گزشتہ)

"تم اٹھنے کی کوشش مت کرو۔ ٹھیرو میں ابھی آیا" بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔ پہلے اس نے ڈاکٹر خورشید کے جوتے اتارے تاکہ وہ مضبوطی سے زمین پر پاؤں جما سکے۔ پھر اس کو سہارا دیکر کھڑا کردیا۔ "اچھی طرح پاؤں جماؤ ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں گر پڑیں اب سامنے والے پتھر پر جوتے صاف کرکے پہن لو۔ اور آہستہ آہستہ چلو۔"

جب وہ دونوں پھر چلے ہیں تو ان کے پاؤں چھ چھ انچ دلدل کے اندر جا رہے تھے۔ اس طرح چلنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر خورشید کے پاؤں بری طرح دکھنے لگے۔ ایک ایک قدم اٹھانا اس کے لئے دوبھر تھا۔ اور بوڑھے ڈاکٹر کا ساتھ دینے کے لئے اسے تیز بھی چلنا پڑتا تھا۔

بہت دیر کے بعد آخر بوڑھا ڈاکٹر ٹھیرا۔ اور ڈاکٹر خورشید ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا۔ "یہاں سے سراج الدین کے گھر کی طرف سڑک مڑتی ہے۔ مگر چڑھائی بہت ہے۔ بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ نجم الدین کے پاس چلو۔ وہاں سے راستہ صاف ہے۔ اور شاید تم یہاں سے راستہ بھی بھول جاؤ۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔ "اب چلئے کھڑے ہونے سے خون جمتا ہوا معلوم ہو رہا ہے"

آخر وہ لوگ ایک تپلی سی گلی میں داخل ہوگئے۔ یہاں میدان کی نسبت گرمی تھی۔ یہاں آکر ڈاکٹر خورشید کی حالت سنبھل گئی۔

آخر وہ نجم الدین کے گھر پر پہنچ گئے۔ کمرہ بہت گرم تھا۔ بوڑھا ڈاکٹر تھک کر آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کا سانس ٹھیک نہیں ہوا۔ ڈاکٹر خورشید الگ بیٹھا ہانپ رہا تھا جب بوڑھے ڈاکٹر کا سانس ٹھیک ہوا تو کہنے لگا "جوتے اتار کر صاف کرلو۔" ڈاکٹر خورشید فرمانبردار بچے کی طرح کہنا ماننے لگا۔ نجم الدین نے ڈاکٹر کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ پاس ہی پلنگ پر لڑکا لیٹا کراہ رہا تھا۔ یہ نجم الدین کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس گلی میں رہتا تھا۔ اگر ذرا اور دور ہوتا تو ان دونوں کا وہاں تک پہنچنا دشوار تھا۔ آخر بوڑھے ڈاکٹر نے اطمینان سے کوٹ اور مفلر اتار کر پٹیاں باندھنے کی تیاری شروع کردی۔

"نجم الدین صاحب ڈاکٹر خورشید کے لئے تین چار پیالی گرم چائے بنوا دیجئے انھیں سراج الدین کے پاس جانا ہے۔ ان کی بچی سخت بیمار ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"اس بچی کا معلوم نہیں کیا حشر ہوگا جب دیکھو بیمار رہتی ہے۔ اور ماں باپ کی اکلوتی بھی ہے۔" نجم الدین نے کہا۔

"ان کا تبادلہ شہر میں ہوگیا ہے وہ آج کل میں جانے والے تھے۔ مگر بچی کی بیماری کی وجہ سے ٹھہر گئے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کے لڑکے کی ٹانگ کو زیادہ چوٹ نہیں آئی انشاءاللہ جلدی اچھی ہوجائے گی۔ صرف چند روز تک گھر میں بیٹھنا پڑے گا۔ چائے تیار ہے" بڈھے ڈاکٹر نے ڈاکٹر خورشید سے کہا۔ جو خاموشی سے آرام کرسی پر لیٹا چائے دان کو تک رہا تھا۔ جلدی سے پی لو ورنہ ٹھنڈی ہوجائے گی۔ ڈاکٹر خورشید نے کچھ کہے بغیر چائے پینی شروع کردی۔ تم یہ لمبا گرم کوٹ نہ پہنو تو بہتر ہے۔ ٹانگوں سے چمٹا رہے گا۔ اور چلنا مشکل ہوجائے گا چلنے کی تھکن سے تم خود بخود گرم ہوتے رہوگے۔ اور یہ اپنا کیس گلے میں ڈال لو تاکہ دونوں ہاتھ خالی رہیں۔ اور اس کا تسمہ اونچا کرکے باندھو تاکہ وہ گھڑی گھڑی تمہاری ٹانگوں کو

نہ لگے تمھارے جوتے بہت نازک ہیں اور کیچڑ بھی اندر آتا ہے میرے جوتے پہن لو۔" جب تک ڈاکٹر خورشید چلتے پیتا رہا بوڑھا ڈاکٹر برابر کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ تاکہ اس کا خیال تھکان کی طرف نہ جائے۔

جب وہ جانے لگا تو ڈاکٹر نے کہا بیٹا ہمت سے کام لو۔ خورشید پلٹ کر مسکرایا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے اوزار گرم پانی میں ڈالے۔ اتنی دیر میں نجم الدین نے پلنگ کی چادر بدلوائی اور لڑکے کی ٹانگ کے قریب لمپ رکھوایا تاکہ زخم اچھی طرح دکھائی دے۔ ڈاکٹر نے پٹیاں باندھنے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو خوب ملا تاکہ ان میں گرمی پیدا ہو جائے اور جیسے ہی اس نے ہڈی کو اپنی جگہ پر لانے اور بچے کی چیخ پکار اور آتا پائی کے دوران میں وہ پسینے میں نہا گیا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں ہسپتال لیجا کر اکس رے نہ کروانا پڑے آخر گھنٹہ بھر کی کشمکش کے بعد ہڈی جگہ پر بیٹھی تو ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند پٹیاں مضبوط باندھ کر آخری پٹیاں باندھنے کا کام اس نے دوسروں پر چھوڑ دیا۔ اور خود بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب بچے کے آرام کا سب انتظام ہو چکا تو وہ بھی فرش پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا اچھا ہو کہ اسے اب اٹھنا نہ پڑے تھکان سے اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اسے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ڈاکٹر خورشید کھڑا ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔" لڑکی کا برا حال ہے آپ کا جتنی جلدی ہو سکے چلنا ضروری ہے۔" اس نے کہا۔

"آخر ہوا کیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"لڑکی معلوم ہوتا ہے کہ آخری سانس لے رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے جتنی جلدی ہو سکے ہسپتال لے جانا چاہیے۔ مگر اس کی ماں کہتی ہے کہ اگر اسے گھر سے لے جایا گیا تو وہ رو رو کر جان دیدے گی۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟" بوڑھے ڈاکٹر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "کیا بتاؤں۔ آپ چلیں تو شاید کچھ کام بن جائے۔"

اچھا چلو یہاں کھڑے کھڑے باتیں کرنے سے تو صرف وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس نے گرم کوٹ پہنا مفلر لپیٹا اور پھر دونوں چل کھڑے ہوئے بارش تھمنے کا نام نہ لیتی تھی اور ہر طرف اندھیرا گھپ تھا۔ مگر وہ دونوں چلتے رہے۔ ان کو صرف اتنی خبر تھی کہ یہاں سے اگر سیدھے چلے چلیں تو سراج الدین کا گھر آدھا میل ہے۔

"میں آگے چلوں گا مجھے راستہ معلوم ہے۔" خورشید نے کہا۔ پھر ان کو اسی پرانی دلدل کا سامنا کرنا پڑا۔ بوڑھا ڈاکٹر خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں چڑھائی آنے والی ہے۔

چڑھائی کے بعد ہی ایک دم سے ڈھلوان آیا۔ بوڑھے ڈاکٹر کا پاؤں پھسلا تو ڈاکٹر خورشید پر گرا جو اس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی بانہہ تھام لی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر بوڑھے ڈاکٹر کو بارش کے شور میں کچھ سنائی نہ دیا۔ خورشید نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چیخ کر کہا۔ "سراج الدین کا گھر آگیا ہے وہ دیکھئے سامنے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ بوڑھے ڈاکٹر نے سر اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ اس وقت سر اٹھانا بھی اسے بھاری مشقت معلوم ہو رہی تھی۔ تھکان کے مارے اس کا سر بھاری ہو گیا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ جھکتا جا رہا تھا۔ "بس بیٹا چلے چلو۔" اس نے کہا اور ڈاکٹر خورشید کا ہاتھ تھام لیا۔

بوڑھے ڈاکٹر کو وہ بہ مشکل تمام سراج الدین کے گھر تک پہنچا سکا۔ چار دن تک اسے خبر نہیں ہوئی کہ وہ کہاں ہے۔

پانچویں دن جب وہ صبح کو اٹھا ہے تو خورشید اور سراج الدین اس کے پلنگ کے پاس کھڑے تھے۔

بوڑھے ڈاکٹر نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی شکل ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی بیٹی اب بالکل اچھی ہے۔"

"ہاں بالکل اچھی ہے اور آج تو صبح سے باتیں بھی کر رہی ہے۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"اور میں آپ کا کسی طرح شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔" سراج الدین نے کہا۔

"میرا شکریہ آپ کیوں ادا کرتے ہیں سب کام تو انھوں نے کیا۔" بوڑھے ڈاکٹر نے خورشید کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس نوجوان ڈاکٹر پر فخر کر رہا ہے کہ اس سے اس کی امید بر آگئی۔ مجھے اس میں اب کسی طرح کا شبہ نہیں رہا کہ تم سب ذمہ داریاں اٹھا سکتے ہو۔"

معتصمۃ الرحمٰن

یہ آنسو !!؟

کیوں آج تیری چشم سیہ غم نواز ہے؟!

کیوں آج تیرے ناز میں رنگِ نیاز ہے!!
فطرت نے کس لئے تجھے ناشاد کر دیا!

دنیائے انبساط کو برباد کر دیا!
نومیدیوں سے دامنِ امید بھر دیا!

کیوں وقفِ نالہ بربطِ ناہید کر دیا!

(سانیٹ)

ٹپکے مژہ سے اشک گرانبار کس لئے؟
بے قدر ہو گئے درِ شہوار کس لئے؟

کس کو خبر تھی رنج ہے اس سن کے واسطے!
وہ مختصر سا عیش تھا اس دن کے واسطے!

دیوی مسرتوں کی اور آہوں سے ہمکنار!
آہوں سے ہمکنار، کراہوں سے ہمکنار!

پروردۂ بہار ــ نصیب خزاں! غضب!!
مرہونِ غم، تبسمِ عشرت فشاں غضب!!

عزیز جہاں بیگم ادا

تنقید و تبصرہ

کشتگان فریب :۔ از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی۔ چھوٹی سائز ۱۲۵ صفحات قیمت ۸ رآنے۔ ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایون

یہ ناول کے طرز کا ایک افسانہ ہے جس میں قدیم موضوع محبت کے غیر فانی ہونے کو بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ زبان اور بیان دلچسپ ہے۔ لیکن ترتیب اور کتابت و کاغذ وغیرہ اچھا نہیں ہے۔ اس کو دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی چھپی ہوئی کتاب ہے۔ مصنف نے پیری و مریدی کے سلسلے میں بعض نام نہاد مرشد جاہل اور کم فہم عوام کو جو نقصان پہنچاتے ہیں ان کا نقشہ کھینچنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

فلاح مسلم :۔ از غوثی شاہ صاحب قادری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ درمیانی سائز کا چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں مسلمانوں کی فلاح سے متعلق قرآنی آیتوں کی مدد سے مفید معلومات قلمبند کر دی گئی ہیں۔ اس میں اہل اسلام کی باہمی تنظیم کے علاوہ بے ہودہ رسم رواج کی اصلاح کے لئے بھی مفید مشورے دیئے گئے ہیں۔

علامہ اقبال اور قرآن کریم :۔ یہ بھی ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس کو شرکت ادبیہ منہاس روڈ امرتسر نے شایع کیا ہے۔ اس میں اقبال کی مختلف فارسی نظموں سے ایسے اشعار منتخب کر کے مختلف عنوانوں کے تحت جمع کر دئے گئے ہیں جن میں شاعر مرحوم نے قرآن کا ذکر کیا ہے، یا قرآن کے مطالب کو پیش کیا ہے۔ اشعار کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ تمہید اور تشریح بھی لکھ دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کوشش دلچسپ ہو گئی ہے۔

دُرِ نجف حصہ اول :۔ از سید عزیز حیدر صاحب شاکر بلگرامی۔ یہ بھی چھوٹی سائز کا ایک رسالہ ہے، جو نواب عنایت جنگ بہادر کی سرپرستی میں شایع ہوا ہے۔ اس میں حضرت علی اور اہل بیت کرام کی منقبت اور سلام وغیرہ درج ہیں۔ شاکر صاحب کا کلام اس سے پہلے بھی ایک چھوٹے سے مجموعہ میں شایع ہو چکا ہے۔ زیر نظر رسالہ میں بعض سلام قابل مطالعہ ہیں۔ لیکن اس میں سر مہاراجہ یمین السلطنت کا بھی ایک مشہور سلام صفحہ پندرہ پر چھاپ دیا گیا ہے۔ کیونکہ پورا مجموعہ جناب شاکر کے کلام ہی پر مشتمل ہے اس لئے درمیان میں ایک اور شاعر کے سلام کو شامل نہیں کرنا چاہئے تھا چونکہ یہ حصہ اول ہے۔ اور ممکن ہے کہ نواب عنایت جنگ بہادر کی دلچسپی کی وجہ سے دُر نجف کے دوسرے حصے بھی شایع ہوں اس لئے آئندہ اس قسم کی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

چمنستان :۔ یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو قصر شاعر دہلی کی طرف سے اسی مہینہ سے شایع ہوا ہے۔ اس کے مرتب آغا سرخوش قزلباش دہلوی ہیں جو افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کی یادگار کے طور پر اس کو نکال رہے ہیں۔ سرخوش آغا شاعر مرحوم کے فرزند ہیں اور ان کی ادبی قابلیت سے توقع ہے کہ یہ رسالہ کامیاب رہے گا۔ اس کے پہلے شمارہ میں خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، بہزاد لکھنوی، اور کیفی دہلوی کے مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔ اگر یہی معیار قائم رہے تو کوئی تعجب نہیں کہ چمنستان ایک کامیاب رسالہ ثابت ہوگا۔

سیر گولکنڈہ طلبہ کے لئے :۔ یہ کتاب سیر گولکنڈہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جو طالب علموں کے لئے چھاپا گیا ہے۔ اس میں بہت سے ایسے حصے حذف کر دیئے گئے ہیں جنکا مطالعہ طلبہ کیلئے غیر ضروری تھا اور قیمت بھی طلبہ کی خاطر تقریباً نصف رکھی گئی ہے۔ یہ اصل میں نیم تاریخی افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس کے مطالعہ کی وجہ سے سرزمین حیدرآباد کی قدیم تاریخ سے دلی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

(ق)

رقاصہ

مدن پور ایک چھوٹی سی ریتیلی ندی کے کنارے خوبصورتی کے ساتھ ۲۰۰۔۲۵۰ مکانوں کو لئے ہوئے آباد تھا برسات کے چار مہینے یہ ندی لبالب رہتی۔ گاؤں والے اپنی سہولت کے مدنظر ہر سال ندی پر ناؤ کا بندوبست کر لیتے کیونکہ ندی کے اس پار ایک بڑا شہر حیدرآباد واقع تھا۔ جہاں ہر ضرورت کی چیز مہیا ہو سکتی اس مرتبہ مصطفےٰ نامی لڑکے کو پانچ روپے ماہانہ پر ناؤ کھینے کے لئے ملازم رکھا گیا۔ مصطفےٰ ماہی گیر کا لڑکا تھا۔ گزشتہ طاعون کے زمانے میں اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس نے گاؤں کے ملا یٰسین کے پاس کریما' آمدن' قرآن شریف کے دو تین پارے اور محمد اسمٰعیل صاحب کی اردو کی تیسری کتاب تک تعلیم پائی تھی صورت شکل کے اعتبار سے مصطفےٰ برا نہ تھا، اس کے قویٰ مضبوط سینہ کشادہ ہونے کے علاوہ تنومند واقع ہوا تھا، ماں باپ کے مرنے پر اسے اپنے ہی ایک رشتہ دار کے کھیتوں پر متعین رہنا پڑا، لیکن بدہنگامی کی باعث دو تین مہینے ہی میں وہاں سے علحٰدہ کیا گیا۔ چند دنوں تک تو وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لیتا لیکن اکرام علی نمبردار کی مہربانی سے اُسے دو چار مہینے تک پانچ روپے کی مستقل آمدنی ہو گئی۔

چند دنوں سے خیرآباد شہر میں "وائیٹ سٹی" کے نام سے ایک سرکس کمپنی آئی ہوئی تھی، جس میں شیر' ہاتھی' گھوڑے' بندر سبھی جانور تھے۔ پھر دوسرے کمالات طلسمی کرتب' کامک ناچ گانا' ساری دنیا کی دلچسپیاں سمٹ کر سرکس کے بڑے پنڈال میں جمع ہو گئی تھیں' لوگ بہت دور دور سے اس تفریح گاہ میں حصہ لینے کے لئے جمع ہوتے۔

کئی دن سے مصطفےٰ نے یہ سن رکھا تھا کہ خیرآباد میں ایک بڑی سرکس آئی ہوئی ہے جہاں ہاتھی شیر اور بندر ناچتے ہیں' تعجب کے ساتھ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح تماشا دیکھ لینا چاہئے۔ وہ اپنے گاؤں والوں سے جو تماشا دیکھ کر گھروں کو آنے کے لئے اس کی ناؤ میں سوار ہوتے' بڑی حسرت و اشتیاق کے ساتھ ان ہاتھی اور بندر کے ناچ کے متعلق دریافت کرتا' لوگ مزے لے لے کر اس کھیل کی تعریف کرتے مصطفےٰ یہ سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا۔

مس شیریں کمپنی کی مشہور رقاصہ تھی' اس کا حُسن و شباب دل موہ لینے والا' اس کی نرگسی آنکھیں میکدہ بر دوش' اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹ ہمیشہ تبسم کا خزانہ لئے ہوئے ہوتے' اس کی آواز میں بلا کا لوچ تھا' جو نغموں میں تحلیل ہو کر سامعین کو حد درجہ متاثر کر دیتا' کمپنی کا ہر فرد اس کے ادنیٰ اشاروں پر آنکھیں اور دل فرش راہ بنانے کا متمنی رہتا' اور سرکس کا مالک مسٹر فیروز تو اسے اپنے دل کی ملکہ سمجھنے لگا تھا۔

شیریں کبھی کبھی شام کے فرحت افزا لمحات میں ندی کے کنارے ٹہلنے کے لئے فیروز کے ساتھ موٹر سے آتی اور ایک آدھ گھنٹہ ان پُرکیف فضاؤں میں کیف و نغمہ کا حظ اُٹھا کر مسرور و مخمور روانہ ہوتی۔

ایک دن شیریں اور فیروز کافی دن رہے' ندی کی طرف نکل آئے' انہوں نے اپنی کار بالکل پانی کے قریب لا کر کھڑی کر دی مصطفےٰ ندی کے کنارے اپنی ناؤ کے سایہ میں ریت پر لیٹا ہوا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا' موٹر کے ہارن کی آواز کے باوجود بھی وہ جوانی کی سرشار نیند سے بیدار نہ ہو سکا' فضا رنگینوں میں ڈوبی ہوئی کیف آلود تھی ندی کی روانی عجیب

مستانہ اداؤں کے ساتھ خوش گوار منظر پیش کر رہی تھی دفعتہً شیریں کے دل میں "ندی کی سیر" کی خواہش پیدا ہوئی اس نے فوراً اپنے دل میں پیدا ہونے والی خواہش کا اظہار فیروز سے کردیا، جس کے لئے وہ ہمہ تن تیار ہوگیا'

اے لڑکے! فیروز نے مصطفٰے کو جگانے کے بعد کہا' کیا تم اس وقت ہم کو ندی کی سیر کرا سکتے ہو مصطفٰے آنکھوں میں نیند کا بے پناہ خمار لئے ہوئے تعجب خیز نظروں سے ان کی طرف چند ثانیوں تک دیکھتا رہا۔

سنتے ہو جی' شیریں نے دل کش لہجہ میں کہا' ہمیں "ندی کی سیر" کراؤ گے؟

مصطفٰے اپنی جگہ سے اٹھا "حضور"! اس کی زبان سے نکلا۔ دوڑ کر اس نے ناؤ کے بند کھول دئے جس کو ایک بڑی چٹان کے ساتھ مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔

"آیئے سرکار"! نوجوان ملاح نے ناؤ کے پائیدان کو جھکا کر کہا' شیریں اور فیروز ناؤ میں سوار ہو گئے کائنات کا ذرہ ذرہ رنگینیوں میں ڈوبا ہوا کیف آلود منظر پیش کر رہا تھا' ندی کی شوخ سنہری موجیں نہایت بے تابی کے ساتھ اٹھ اٹھ کر سکون و مسرت کی تلاش میں کھوئی جا رہی تھیں ندی کے اس پار کوئی چرواہے کا لڑکا رسیلی آواز میں میٹھے گیت گا رہا تھا شاید ج

"آ شوخ سنہری موجوں سے ہم دل کی نیا کھیویں گے"

نغمے آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہوکر کائنات کو مدہوش بنا رہے تھے' مصطفٰے کے ہاتھ تیزی کے ساتھ چپو گھمانے میں مصروف تھے' بعض وقت اس کی مشتاق نگاہیں اس خوبصورت چہرے تک پہنچنے کی کوشش کرتیں' جس پر ان کالے کالے بالوں کی لٹیں نہایت گستاخی کے ساتھ طمانچے لگا رہی تھیں'

اس کا ساتھی ایک بھدے جسم کا کریہ المنظر چہرہ لئے ہوئے ادھیڑ عمر کا شخص تھا' وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملفوف تھا' ایک موٹا سا خوشبودار چرٹ اس کے ہونٹوں کی گرفت میں تھا'

مصطفٰے نے ایک ہی نظر میں دونوں کا جائزہ لے لیا' اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی' اس نے خیال کیا' یہ حسین گل اندام لڑکی' اس بڈھے بدنما انسان کے ساتھ کیوں چمٹی ہوئی ہے' اسے کیوں اس شخص کی صورت اور صحبت سے ڈر اور کراہت معلوم نہیں ہوتی پھر وہ یہ خیال کر کے چپ ہو رہا' شاید یہ اس کا باپ ہو۔

کشتی کو واپس لے چلا' اس کے بدصورت ہم راہی نے کہا' جب کہ سورج مغربی وادیوں میں لڑھک رہا تھا' وہ دونوں ریت پر کود پڑے' شیریں نے ملاح کو کچھ دام دینے چاہے لیکن فیروز نے بڑھ کر مصطفٰے کی ہتیلی میں ایک چمکدار روپیہ رکھ دیا' جس کو فوراً اس نے قمیص کی میلی جیب میں ڈال لیا۔

کیا نام ہے تمھارا - شیریں نے اس سے دریافت کیا'

مصطفٰے :-

پھر وہ دونوں سرعت کے ساتھ اپنی موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوئے' مصطفٰے ایک عجیب مسرت کن حالت میں موٹر کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ گنگناتا ہوا اپنی ناؤ کو گاؤں والے گھاٹ کی طرف لے جانے لگا مسرت و کامرانی میں ڈوبا ہوا ایک دل کش نغمہ اس کی نوک زبان تھا۔

دوسرے اور تیسرے دن بھی مصطفٰے کو اسی حسین عورت اور اس کے بدشکل ساتھی کی سیر کے معاوضہ میں ایک ایک روپیہ اجرت ملتی رہی' وہ روز شام کے وقت ان دونوں کی

آمد کا منتظر رہتا آج بھی مصطفیٰ دیر تک ان دونوں کا انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج کی چمکیلی کرنیں ماند پڑنے لگیں، چاروں طرف فضا میں سکوت اور تاریکی پھیلی جا رہی تھی، مصطفیٰ نے خیال کیا آج وہ ہستیاں مجھے خوش قسمت تصور کرنے کا موقع نہ دیں گی، چاند مشرقی افق سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا، اس کی کیف و نور میں بھیگی ہوئی کرنیں سطح آب پر تھرا رہی تھیں، مصطفیٰ نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر انگڑائی لی، اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اسے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی "وہ آگئے" اس نے مسرت کے لہجے میں کہا، اور موٹر کی طرف رخ کیا اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا موٹر میں صرف لڑکی بیٹھی ہوئی ہے "آپ کی والدہ" مصطفیٰ کچھ کہتے کہتے رک گیا،

'میرے والد' لڑکی کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا۔

'وہ ـــ وہ جو روز آپ کے ہمراہ آیا کرتے ہیں نا' مصطفیٰ نے ڈرتے ڈرتے جملے کی تکمیل کی، وہ میرے باپ نہیں ہیں، شیریں کار سے اتر پڑی، مصطفیٰ خاموش ہو گیا، کوثر میں بھیگی ہوئی نورانی کرنیں، بڑی آب و تاب کے ساتھ پانی کی سطح پہ شعلہ باری کا منظر پیش کر رہی تھیں 'کیا ہوتے ہیں وہ آپ کے' مصطفیٰ نے پھر شیریں سے ناؤ میں بیٹھنے کے بعد سوال کیا، وہ اس سرکس کمپنی کے مالک ہیں، جو ان دنوں شہر میں ٹھیری ہوئی ہے'

"سرکس کے مالک' مصطفیٰ نے کسی خیال کے تحت جملہ کو دہرایا' وہی جہاں ہاتھی اور شیر ناچتے ہیں" بھولے بھالے انسان کا یہ جملہ سن کر شیریں کھلکھلا کر ہنسی،

"مصطفیٰ! تم نے کبھی انھیں ناچتے دیکھا ہے" شیریں نے بالکل اس کے قریب آ کر اس کے کندھے چھو کر کہا، نہیں' اس کے چپو چلانے والے ہاتھ رک گئے" اور مڑ کر یاس آمیز لہجے میں کہا، میرے پاس ان کا ناچ دیکھنے کے لئے اتنی زیادہ رقم نہیں، مصطفیٰ کے اس جملہ نے حسین رقاصہ کو کافی متاثر کیا' میں تمھیں یہ ناچ دکھا سکتی ہوں' اس نے کہا'

'آپ دکھا سکتی ہیں' مصطفیٰ کی آنکھیں غیر معمولی خوشی کے اظہار کے لئے چمک اٹھیں۔

'ہاں کیوں نہیں' شیریں نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ انگریزی حروف لکھے اور کہا' اس کے دکھانے سے گیٹ والے تمھیں اندر چھوڑ دیں گے،

کوئی پیسے نہیں مانگے گا' مصطفیٰ کاغذ کے پرزے کو اپنی جیب میں رکھ کر بولا۔

نہیں' شیریں نے جواب دیا' مسکراہٹ کی شوخ و شنگ دوشیزہ اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی تھی' رات میں ضرور آنا' میں تمھارا انتظار کروں گی' اس نے رخصت ہونے وقت کہا' مصطفیٰ تمام رات سرکس کے کھیل' کرتب' ہاتھی اور شیر کے کمالات دیکھتا رہا ـــ اس کے بعد اس نے شیریں کے رقص کے کمالات حیرت و انبساط کی نظروں سے دیکھے' اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا' جذبات کا ایک طوفان اس کے سینے میں امنڈ رہا تھا' کھیل کے ختم ہوتے ہی وہ گاؤں کو لوٹنے کے ارادے سے دروازے کی طرف روانہ ہوا' اس عرصے میں سرکس کے ایک ملازم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا' اجی صاحب! بائی جی' آپ کو بلاتی ہیں 'بائی جی کون؟' اس نے حیرت سے پوچھا

وہ جو ہوٹل میں بیٹھی ہیں' مصطفیٰ کی نظریں ہوٹل تک

پہنچیں' اس نے شیریں کو اپنا منتظر پایا' طلسمی طاقت خودبخود اسے شیریں تک کھینچ لے گئی۔

مصطفےٰ! دیکھا تم نے ہانسیوں کا ناچ' شیریں نے تبسم ہو کر کہا' شرارت کی پریاں اس کی آنکھوں میں ناچ رہی تھیں' وہ ایک رنگین فاخرہ گون پہنی ہوئی تھی' سچ مچ وہ ایک پری معلوم ہو رہی تھی'۔

مصطفےٰ پر فطرتاً کچھ شرم کا جذبہ غالب آگیا۔ تمہارا ناچ ــــ وہ کہتے کہتے رک گیا تمھیں پسند ہے۔

ہاں۔

بیٹھ جاؤ یہاں' اس نے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔

کچھ کھاؤ گے؟ ــــ بھوک نہیں ہے۔ شیریں نے ہوٹل کے ملازم سے کچھ کہا' چند لمحوں کے اندر میز میووں' کیک بسکٹ اور چار کے سامان سے سج گئی' آج تمھاری دعوت ہے' شیریں نے کچھ محبت کے ملے جلے لہجہ میں کہا' وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

میری' مصطفےٰ نے حیرت و مسرت کے درمیانی لہجے میں اپنی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا ہاں ہاں' شرماؤ نہیں' شیریں نے انگور کا ایک بڑا خوشہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا'

تمھاری شادی ہو گئی ہے نا' شیریں نے ایسا سوال کیا' جس سے مصطفےٰ کی کشادہ پیشانی عرق آلود ہو گئی'

نہیں' اس کی نظریں زمین کے ذرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔

پھر تمھارے گھر میں کون رہتا ہے۔

کوئی نہیں مصطفےٰ نے جواب دیا' میں تنہا رہتا ہوں

تنہا کیوں؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں

سب روٹھ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے" الفاظ کو ادا کرتے ہوئے مصطفےٰ کی آنکھیں ڈبڈبائیں' وہ آنسو پونچھ کر گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

چلے تم ــــ شیریں نے کچھ متاثر ہو کر کہا'

ہاں صبح ہو رہی ہے'۔

کل پھر آؤ گے؟

کل پھر ــــ مصطفےٰ کی زبان سے نکلا مگر روز ــــ روز ــــ

تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا مصطفےٰ۔ تم بلا خطر اندر داخل ہو سکتے ہو' میں پہرے والے سے کہہ دوں گی

مصطفےٰ بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل پڑا' ندی پہنچنے تک سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا' چند لمحوں تک وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ آہ کتنی خوبصورت' کتنی اچھی ہے وہ۔ سچ مچ پری معلوم ہوتی ہے' خدا جانے میرے حال پر وہ اس قدر مہربان کیوں ہے۔ شاید میری غربت پر اسے کچھ ترس آگیا ہوگا' مگر میرا دل اس کے لئے اتنا کیوں بیتاب ہے۔ کیا میں اس سے محبت کر سکتا ہوں ــــ نہیں ــــ وہ بے حد خوبصورت اور مالدار عورت ہے ــــ ہم غریبوں کو ایسے خیالات زیبا نہیں ــــ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' وہ تمام دن کھویا ہوا سا رہا۔ اس کے سر میں خفیف سا درد بھی ہونے لگا۔ آج اس کا جی مطلق کام کرنے کو نہ چاہا ــــ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی اس نے اپنے گھر کی راہ لی ــــ رات نہایت کرب و اضطراب کے ساتھ کٹی' وہ حیران تھا' کہ اس کا دل اس قدر کیوں بے چین ہے۔ اس نے خیال کیا' آہ اب کیا ہوگا' محبت اسی تڑپ' بے چینی' آنسو' اور آہوں کا نام ہے تو

یہ سب میرے لئے ناقابل فہم اور قوت برداشت سے باہر ہیں

علی الصبح وہ اپنے گھر سے چل پڑا' اور ندی کی طرف روانہ ہوا' اس کے قدم کسی نامعلوم طاقت سے متاثر ہو کر جلد جلد اٹھنے لگے' اس نے دور سے ندی کے پار کوئی سیاہ چیز دیکھی' اس کی نظر اگر دھوکا نہ دے' یہ ضرور کسی کی موٹر ہے قریب پہنچنے پر اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ اس موٹر میں مصطفٰے کی نگاہوں نے رنگین ملبوسات میں لپٹا ہوا مجسمۂ نور دیکھا۔ یہ دلفریب منظر دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا۔ شیریں ہمہ تن اس کے لئے منتظر بیٹھی تھی' مسرت میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی آہ اس کی زبان سے نکلی۔

مصطفٰے کل رات کہاں رہے' اس کی محبوبہ نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

مصطفٰے چپ چاپ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا' اس کی پلکیں آنسوؤں میں تر ہو گئی تھیں ارے — تم اتنے اداس کیوں ہو؟ شیریں نے اس کا بازو تھام کر کہا' لو رات تم کیوں نہیں آئے' بخار آ گیا تھا — اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں پر انگلیوں کو پھیرتے ہوئے کہا'

بخار — شیریں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا' پھر تم نے دوا پی۔

"دوا پینے سے کیا ہوگا"؟ — خدا جانے یہ جملہ مصطفٰے نے کس حالت میں ادا کیا —

اچھے ہو جاؤ گے۔

پھر'

اچھے ہو کر شادی کر لو۔

ہوں' مصطفٰے نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا — شیریں اس کے مغموم چہرے سے دلی کیفیات کا جائزہ لیتی رہی' اس اثنا میں کمپنی کا مالک فیروز شیریں کی تلاش میں ادھر آنکلا — اور شیریں کو بادل ناخواستہ اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا — تمام دن مصطفٰے کی طبیعت خراب رہی۔ شام ہوتے ہوتے اسے خوب بخار چڑھ آیا' گھر پہنچ کر اس نے روٹی پکائی اور نہ بازار سے کچھ خرید کر کھایا' رات بھر اس پر بے ہوشی کا عالم طاری رہا۔ دو دن تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ بخار کی شدت سے اس پر نقاہت کے حملے ہو رہے تھے' تیسرے دن بخار نے اس کے اوپر کچھ رحم کیا' مصطفٰے نے آنکھیں کھولیں اسے تشنگی سی محسوس ہونے لگی' آہستہ سے اس نے اپنے بستر سے اٹھ کر تین دن کا رکھا ہوا پانی اٹھا کر پی لیا تب کہیں اسے قدرے سکون نصیب ہوا۔ دنیا میں کوئی میرے دکھ درد کا شریک نہیں' موت اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اب مجھے دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں' وہ کچھ دیر تک ان ہی خیالوں میں الجھا رہا۔ کمزوری دماغ کے باعث اس پر کچھ نیم غشی سی طاری ہو گئی' مکان کی گندگی' فرش کی بے ترتیبی' لباس کی گندگی اور اس پر بیماری و بے کسی نے مصطفٰے کو زندگی سے بیزار بنا دیا تھا' دفعتہً مکان کا دروازہ کھلا — رحمت کا فرشتہ محبت و ایثار کا پتلا' شریف رقاصہ کے بھیس میں داخل ہوا' شیریں حسین و جمیل شیریں' عیش و مسرت کی فضاؤں میں پلی ہوئی تھی' سرود و نغمہ کی روح رواں امیروں اور سرمایہ داروں کے دلوں کا سکون' تماشائیوں کی مشتاق نگاہوں کی مرکز جس کے سینے میں دل تھا — اور دل درد احساس سے لبریز۔ اس نے دیکھا مصطفٰے بے حس و حرکت' گندگی کی آغوش میں پڑا ہوا زندگی کے دن پورے کر رہا ہے' شیریں کی آنکھوں سے بے اختیار

آنسو ٹپک پڑے، آہ غریب کی دنیا، ایک بوسیدہ گھاس کا جھونپڑا، چند ٹوٹے پھوٹے برتن، کثیف میلا بستر، ایک ہمدردی کی لہر، ایک بے پناہ محبت کا جذبۂ شریف رقاصہ کے سینے میں امنڈ آیا، اس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آنکھیں — مسلسل موتی رول رہی تھیں۔

مصطفےٰ! — غیرارادی طور پر اس کی زبان سے نکلا۔ آہ — تم، اس حالت میں — دنیا پرفریب اور مطلبی ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ اور اس میں بسنے والے دغاباز جھوٹے مکار، ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہیں، آنکھوں میں آنسو نہیں لبوں پر آہیں نہیں وہ سب کے سب حسن و نغمے کے متلاشی، عیش و مسرت کے متمنی، ہوس کے بندے، دولت کے پجاری، شیطان کے مرید، سنگ دل بے وفا، صرف چند سکوں کے عوض اپنا دین و ایمان اپنا جوہر بیچنے کے لئے زندہ رہتے ہیں شیریں جذبات کی رو میں مسلسل کہے جا رہی تھی اس تاریک بدبو دار اندھیرے میں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو کہ چکاچوند کر دینے والی برقی شعاعوں میں بھی نظر نہ آسکتا تھا، دفعتہً شیریں کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا۔ مصطفےٰ نے کراہتے ہوئے کروٹ لی،

مصطفےٰ! — مصطفےٰ! شیریں کی آواز بھر آئی، وہ اس کے سرہانے کھڑی رو رہی تھی، مصطفےٰ میرے پیارے آنکھیں کھولو دیکھو میں آگئی ہوں تمہارے پاس تمہارے قدموں پر اس مطلبی دنیا کو چھوڑ کر جو چند چاندی کے ٹکڑے دے کر میری خوشی میری عصمت و عزت مول لیتی تھی، وہ جھکی، اس نے اپنی آغوش میں مصطفےٰ کا سر لے لیا، وہ چند لمحوں تک اس کے بے ترتیب بالوں اور گرم گرم ہتھیلیوں کو سہلاتی رہی۔

مصطفےٰ — اٹھو — دیکھو باہر تمہارا ڈاکٹر تمہارا انتظار کر رہا ہے بیمار کے خشک ہونٹوں پر ایک تبسم کی لہر دوڑی، اس کی پتلیاں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں، اس کی حیرت و مسرت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں شیریں جیسی پیکر محبت کی بلائیں لے رہی تھیں ایک ہفتے کے بعد سرکس کی دنیا کا شیرازہ درہم و برہم ہو کر رہ گیا، کیونکہ اس کمپنی کی جان بس شیریں تھی، جس نے اب اپنا رقص، نغمے، تبسم اور ساری خوشیاں مصطفےٰ کی دنیا کے لئے وقف کر دی تھیں، شیریں رقاصہ تھی، جس کے سینے میں شریف دل تھا، مگر آہ اس کے انتخاب کے لئے دنیا والوں کی نگاہوں نے زبردست لغزش کھائی۔

صابر کوسگوی

ڈاکٹر

کمرے میں قبرستان کی سی خموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سناٹے میں جھینگر کی کرخت آواز خموشی کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی شاہدہ دریچے میں کھڑی ہوئی گہری سوچ میں غرق باہر باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ہمایوں جو کہ شاہدہ کے لڑکے سعید کی تیمارداری کے لئے بلایا گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنی ٹوپی سے کھیلتا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی دنیا کی ساری چیزوں کو اپنے میں سمیٹ رہی تھی۔ شاہدہ نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا کہ اس سے بڑھ کر اور زیادہ بدنصیبی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر میں بچے سے جدا ہو کر ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔

"ہاں میں جانتا ہوں" ڈاکٹر نے کہا۔

شاہدہ کی آواز میں بلا کا درد تھا کپکپاتی ہوئی غم سے لبریز لہجے میں کہنے لگی کہ سعید کے بغیر میری زندگی بے سود ہے۔ وہ میرے لئے سب کچھ ہے میری جان میری خوشی میری راحت اور میری تمنا۔ مرا لخت جگر اگر مجھ سے چھین لیا گیا تو میں ایک غیر مادی خیال بن جاؤں گی اور کبھی زندہ نہ رہ سکوں گی

شاہدہ اضطراب اور دیوانگی کے عالم میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہنے لگی کہ جب سعید پیدا ہوا تھا تو میں اسے یتیم خانے بھجوا دینا چاہتی تھی لیکن میرے معبود ــ اے داور محشر ــ اس زمانے اور آج میں کتنا بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ میں اس وقت بدنیت تھی بیوقوف اور کند ذہن تھی لیکن اب میں ایک ماں ہوں۔ یہی میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں ایک ماں ہوں! وہ خوب رونے لگی۔ آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے امنڈا پڑ رہا تھا۔

بہت دیر تک خموشی رہی ــ ڈاکٹر نشستوں پہ پہلو بدلتا رہا۔ اس کی نگاہیں شاہدہ پر جمی ہوئی تھیں ــ وہ شاہدہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور موقع کا منتظر۔ شاہدہ گریہ و اضطراب کے عالم میں سانس کو درست کرتی ہوئے کہنے لگی کہ "ڈاکٹر تم خاموش کیوں ہو؟ تمہاری خاموشی میری زندگی کو متزلزل کر رہی ہے۔ ڈاکٹر! ڈاکٹر!! کیا مجھے آج بالکل مایوس ہو جانا چاہئے؟" ہمایوں نے کہا "شاہدہ میں بہت خوش ہوتا اگر کچھ امید نظر آتی ــ سچ تو یہ ہے کہ سعید کے دماغ میں پھوڑا ہو گیا ہے جو نہایت ہی مہلک اور جان لیوا ثابت ہوگا ایسے مریض بہت کم صحت یاب ہوتے ہیں۔ شاہدہ تمہیں اب اس کی جدائی کا غم برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔"

ڈاکٹر تم سچ کہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو ــ تم غلط بیانی سے کام لینے کے بڑے عادی ہو ــ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے ہمایوں"

"شاہدہ! ان بے فائدہ سوالات سے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا"

ڈاکٹر کے اس جواب پر شاہدہ نے دریچے میں سر رکھ کر خوب رونا شروع کیا۔ اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی ــ ہمایوں اپنی جگہ سے اٹھا اور شاہدہ کے قریب ہو گیا۔ وہ ساکت تھا۔ کچھ کہنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد دو لمحوں کی اجازت مانگنے کی جرأت کی۔

شاہدہ دفور غم سے بے ہوش ہوئی جا رہی تھی۔ ہمایوں آہ بھرتا ہوا سعید کے پاس گیا۔ پلنگ پر بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا۔ سعید سے پوچھنے لگا کہ کیا تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے؟ سعید نے نحیف اور کمزور آواز میں ہاں کہتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا کہ میں روزانہ خواب بھی دیکھا کرتا ہوں" ڈاکٹر نے دریافت کیا "کس قسم کے خواب؟" جس پر سعید نے کہا کہ ہر قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کئی سوالات کر ڈالے۔ سوالات کی بوچھار اس وقت ختم ہوئی جب سعید سے ڈاکٹر نے یہ پوچھا کہ کیا تم مجھے جانتے ہو۔ جس پر سعید خاموش رہا۔

ان سوالات کے بعد ہمایوں اس کمرے میں گیا جہاں کہ شاہدہ کھڑی رو رہی تھی۔ اب رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ اس تاریکی

اور سناٹے میں ہمایوں نے شاہدہ سے لیمپ روشن کرنے کے لئے پوچھا۔ لیکن شاہدہ ایک بت کی طرح خاموش تھی۔ جھینگر اسی طرح پکار رہے تھے۔ چلا جا رہا تھا بڑی بھیانک خموشی تھی۔ رات بھی بڑی مہیب اور ڈراؤنی تھی۔

ڈاکٹر شاہدہ کے قریب گیا، دیکھا تو وہ گم تھی، مجنون بنی ہوئی تھی۔ اپنی محویتوں میں اس قدر غرق تھی کہ ہمایوں نے اسے جھنجوڑ کر بیدار کیا اس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگی کہ میں کسی اور طبیب سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر نے رضامندی تو ظاہر کی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ مشورہ فضول ہوگا۔ شاہدہ ڈاکٹر کی آنکھوں میں اس کے مافی الضمیر کو دیکھ کر اور زیادہ رونے لگی۔ فرط غم سے بے حال ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت دور کہیں شادی رچائی جا رہی تھی جس کی موسیقی کی آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔

شاہدہ نے پھر ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ اگر سعید تکلیف میں ہے تو وہ خاموش کیوں رہتا ہے سارا دن خاموش رہتا ہے اور کسی چیز کی شکایت نہیں کرتا۔ اس کی گرتی ہوئی حالت سے یقین ہو رہا ہے کہ خداوند قدوس اس امانت کو ہم سے چھین لے گا۔

وہ آہ بھرتی ہوئی کہنے لگی کہ اے معبود کیا اب اس کو بچایا نہیں جا سکتا۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے ڈاکٹر سے مخاطب ہوئی۔ تم تو یہ جانتے ہی ہوں گے کہ اس کو بچانے کے لئے کیا کرنا ہوگا میں اس کو کھو نہیں سکتی اگر یہ جانبر نہ ہو سکا تو میرا عرصۂ حیات بھی تنگ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ شاہدہ رو رہی تھی۔ اور موسیقی کی آواز برابر چلی آ رہی تھی۔ گھر میں قیامت کا اندھیرا تھا۔ شاہدہ سعید کے پاس جاتی، لپٹتی اور پھر اسی طرح رونے لگتی تھی۔ وقت مشکل سے کٹ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سلسلۂ شب کبھی نہ ٹوٹے گا۔ اور کبھی پو نہ پھٹے گی۔

موسیقی جب ختم ہو چکی تو ڈاکٹر چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہدہ سے کہنے لگا کہ میں صبح آؤں گا اور تم آرام کرو۔ اس نے اپنا کوٹ پہنا دو قدم آگے بڑھا۔ پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور کہنے لگا۔

"تم سنتی ہو شاہدہ میں کل صبح آؤں گا"۔

شاہدہ خاموش تھی اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اسی حالت میں شاہدہ کے بازو بیٹھ کر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"شاہدہ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ" تم سچ کہو۔ تم نے مجھ سے کہا ہے کہ سعید میرا ہی لڑکا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا تم نے سچ کہا ہے شاہدہ؟ تم نے زندگی کے کچھ دن میرے ساتھ بھی گذارے ہیں۔ میرے احساسات اور وجدانات کا خوب اندازہ لگا سکتی ہو۔ تم سچ کہو۔ میں تم سے سچے جواب کی التجا کرتا ہوں۔ ایسے موقع پر کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ جلدی کیونکہ سعید میرا لڑکا نہیں ہے شاہدہ جلد کہئے۔ شاہدہ"۔

شاہدہ غصے میں بھری ہوئی کہنے لگی کہ ڈاکٹر سعید تمہارا لڑکا ہے تمہاری اولاد ہے۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ "افسوس کہ تم ایسے موقعوں پر بھی جھوٹ بولتی ہو۔ تقدس اور معصیت تمہارے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ میں تمہیں جانتا ہوں تم آوارہ تھیں۔ بدنیت تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میں صرف تم سے محبت کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ تمہاری وہ محبت اب جب کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں خون میں سفیدی پیدا ہو رہی ہے مجھے ایک سرمدی سرور عطا کرتی ہے۔ وہ میرے لئے ایک شعلۂ طور ہے تم جھوٹ کہہ کر اپنی ملذد قیمت اور میرے احساسات کے شکوہ کو کیوں مجروح کرتی ہو۔

شاہدہ نے کہا کہ "تمھیں میرے سچ کہنے پر بھی اعتبار نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا "شاہدہ تم بھول گئی ہو۔ میں

تم کو یاد دلانے کی کوشش کروں گا کہ بیٹے پر باپ کے جو حقوق ہوتے ہیں معین اور اقبال بھی اس کے کچھ حصہ دار ہیں جو سعید کی تعلیم کے لئے مدد کرتے ہیں، جیسا کہ میں کیا کرتا ہوں، پہلے تم جھوٹ بولا کرتی تھیں تو میں معاف کر دیا کرتا تھا لیکن اب اس وقت جب سعید بستر مرگ پڑا ہوا ہے تمہارا جھوٹ بولنا ایک جرم ہے جو ناقابل معافی ہے۔ پیاری شاہدہ وقت کی نزاکتیں بھی کیا تمہیں متاثر نہیں کرتیں۔ تم سمجھتی ہو کہ اگر تم سچ کہو گی تو میں تمہاری امداد بند کر دوں گا۔ تمہارا یہ تخیل بہت تکلیف دہ ہے۔ تم کہتا ہوں میں اتنی غرق ہو کہ کچھ اندیشۂ سود و زیاں بھی نہیں ہے یہ جھوٹ اب ناقابل برداشت بن گیا ہے۔ مجھے تمہیں اب چھوڑنا پڑے گا۔"

شاہدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب رواں تھا۔ ہمایوں کی گفتگو نے اسے بالکل مبہوت بنا دیا تھا۔ اس کی بے کسی اور اس کا الم ہمایوں کو اس کی مایوسیوں کا حال سنا رہا تھا۔ ہمایوں اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ اس کی سانس درست نہیں تھی۔ کچھ پھولی سی اور بھاری تھی۔ رقت آمیز لہجہ میں کہنے لگا، اس کی آواز میں ندامت کا سارا اثر تھا الفاظ شرمساری میں غرق تھے، وہ کہنے لگا "غصہ میں وقت اور موقع کے تقاضوں کو بھول چکا اور تمہارے زخموں پر نمک چھڑکتا رہا" لیکن پر منت بھری نظروں سے گھورتا رہا۔ اس سے سچ کہنے کی التجا کی شاہدہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں اداس اور غم کے ساتھ کہنے لگی کہ

"سعید تمہارا ہی لڑکا ہے"!

ہمایوں نے کہا — "شاہدہ میں سچ کہتا ہوں کہ اقبال کے نام تمہارا ایک خط محفوظ ہے جس میں تم نے اقبال کو سعید کا باپ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں صرف تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔

شاہدہ خاموش روتی رہی۔ ہمایوں کچھ انتظار کے بعد باہر چلا گیا اور صبح آنے کا وعدہ کر گیا۔ رات تمام وہ سوچتا رہا۔ اور اپنے ضمیر کو مسرور کرنے لگا کہ وہ حقیقت تک پہنچ نہیں سکتا۔ اس میں ترغیب کی قوت اور قائل کرانے کا اعجاز ہی نہیں ہے۔ ورنہ وہ ستم رسیدہ اور مغموم عورت کو دکھ پہنچائے بغیر راز کو جان لیتا۔

جھوٹی عورت کی خموشی نے اسے ساری حقیقت سنا دی تو اس عورت کا سچ کیا کچھ نہ بتلا سکتا تھا وہ کرب اور اضطراب کے عالم میں ساری رات تڑپتا رہا۔ (ترجمہ از چیخوف)

عابد صولت (عثمانیہ)

انقلابی شاعری کے چند پہلو

یوں تو ہر دور میں تاریخ ادب اردو نے چولے بدلے مگر غدر کے بعد سرسید ایسے اصلاح کرنے والے اور جوشیلے اشخاص نے ایک نئے دور کی طرف راستہ دکھایا جس میں سب سے پہلے حالی نے مسدس حالی لکھ کر قدم اٹھائے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ سماجی شاعری نے آنکھیں کھولیں۔ حالی نے زبان کی طرف توجہ دکھائی گو کہ ان کا انداز خطیبانہ تھا اور ان کے مسدس میں بظاہر شاعری کا کوئی حسن نہ تھا پھر بھی وہ ایک نیا انداز تھا جس کا ہمیں احسان مند ہونا پڑتا ہے لیکن بڑی خوشی کی یہ بات ہے کہ وہ زبان جس کا ماضی ہمیں اتنا ناامیدانہ معلوم ہوتا تھا بہت جلد ایک ایسے دور میں قدم رکھا جس میں اصلیت اور واقفیت کے پہلو سے اس کا دامن مالا مال ہے اس کا سہرا صرف حالی ہی کے سر نہیں ہے بلکہ اور بہت ہیں مثلاً آزاد، اسمٰعیل، چکبست، اکبر اور اقبال، ان اساتذہ کی کوشش کا اثر یہ ہوا کہ آج کل ہم کو غزلوں کی بھرمار نہیں دکھائی دیتی اور نہ اتنی ممدوح سمجھی جاتی ہے جتنی کہ وہ میر، غالب اور مومن کے زمانے میں تھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے اور موجودہ نظم کے رجحانات کے معلوم کرنے کے لئے ہم کو اپنے سماج پر بھی غور کرنا ہوگا۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں خصوصاً ان چند سالوں میں ہندوستان میں غریبی بڑھنا شروع ہوگئی مزدوروں کی مصیبتیں۔ کسانوں کے جھگڑے بڑھنے لگے اور ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ درمیانی پڑھے لکھے طبقے میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریک بڑھی جس نے ہم کو ہماری مصیبتوں اور اپنے سماج کی ابتر حالت کا احساس کرایا یعنی جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک نان کوآپریشن سنہ ۱۹۲۱ء معاشیاتی زوال سنہ ۱۹۲۹ء اور سنہ ۱۹۳۰ء۔ تحریک حکم نافرمانی سنہ ۱۹۳۱ء اور پھر ملوکیت اور سررشتوں کی حکومت اور اہلکاروں کے راج کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف لڑائی نے نوجوانوں کے دلوں میں انقلاب کی روح پھونک دی۔ کوئی بھی اپنے ملک کے معاملات سے جدا نہیں رہ سکتا پھر بھلا شاعری اس اثر سے کب مبرا رہ سکتی تھی جب کہ یہ مصیبتیں ہماری زندگی کا جزو اعظم بن چکی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ شاعروں نے اس سماج سے عاجز ہو کر شاعری کی خوشگوار مگر موہوم دنیا میں کھیڑوں سے دور خیالی تعیش میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ کسی نے رومانی نظمیں لکھیں تو کسی نے نیچرل شاعری میں مزہ لینا شروع کر دیا، رومانی نظم لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام جوش ملیح آبادی کا ہے جنھوں نے اپنے ابتدائی دور میں چند نہایت خوبصورت رومانی نظمیں لکھی ہیں مثلاً جنگل کی رانی، اشک ودیں، گنگا کے گھاٹ پر، جمنا کے کنارے وغیرہ اس قسم کی بڑی نظمیں ہیں۔ گو کہ انہوں نے خیالی دنیا میں ان نظموں کے ذریعہ پناہ لی ہے، نئی تشبیہیں، نئے استعارے منظر کشی نہایت سلیقہ سے دکھائی گئی ہے۔ جہاں معشوق کا خاکہ کھینچا ہے وہاں واقفیت موجود ہے، معشوق انسان ہے جنت کی حور یا کوہ قاف کی پری نہیں۔ جہاں اظہار عشق ہے وہاں نفسیات کا پہلو بھی ہے یہ باتیں صرف جوش ہی نہیں بلکہ اس دور کے تمام رومانی شعرا میں کمی بیشی کے ساتھ موجود ہیں، دوسرے رومانی شعرا میں احسان دانش، الطاف مشہدی، ساغر نظامی، فطرت واسطی وغیرہ خاص ہیں، گو کہ رومانی شاعری ہمارے لئے بہت کارآمد نہیں اور نہ زیادہ دیر رہنے والی ہے لیکن اس نے ایک ٹھہری ہوئی ندی میں طوفان پیدا کر دیا ہے۔

بعض لوگوں نے نیچرل شاعری میں پناہ لی گو کہ نیچرل شاعری انگلستان کے رومانی دور کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کی شاعری سے بہت مختلف ہے۔ پھر اس کی ایک خاص جگہ ہے۔ صفیؔ لکھنوی نے اس صنف میں سب سے زیادہ کمال حاصل کیا' ان کی نظمیں الہ آباد' لکھنو' جونپور وغیرہ نہایت عمدہ ہیں۔

لیکن اس دور کی سب سے اہم صنف سماجی شاعری ہے روزمرہ کی مصیبتوں کو دیکھ کر ہماری گری ہوئی حالت کو محسوس کر کے ہمارے اکثر شعرا نے ان حالتوں کا نقشہ اپنی نظموں میں کھینچا ہے اور اس کے بعد اس ابتری کی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور اس کا علاج بیان کیا ہے۔ گو کہ شاعری کے کمال کے لحاظ سے اقبالؔ مرحوم کا رتبہ سب سے بلند ہے گر ان کی شاعری ایک محدود فرقہ یعنی مسلمانوں کے لئے ہے جن کی ابتری کی وجہ ان کے خیال میں اسلامی اصولوں کا بھلا دینا ہے اور جس کا علاج اسلام ہے ان کی بعض نظمیں مثلاً ترانہ ہندی' نیا شوالہ وغیرہ قومی تو ہیں مگر وہ عمل کا پیغام صرف مسلمانوں کو دیتے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے اس فرقے کی صحیح گر گری ہوئی حالت کا اندازہ ضرور لیا۔

مگر بہت زیادہ تعداد میں وہ نوجوان جوشیلے شاعر ہیں جو اردو افق پر چھائے ہوئے ہیں جو ان مصیبتوں کو سمجھتے ہیں اس کی وجہ بھی جانتے ہیں اور اس کا صحیح علاج بھی بتاتے ہیں اس میں درخشاں ستارہ جوشؔ ملیح آبادی ہے' ان کی پرجوش نظمیں ہمیں اپنے مردہ سماج سے نفرت دلا کر اس انقلاب کی دعوت دیتی ہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر سے غریبی' مصیبت' تکلیف اور مفلسی کو فنا کر دے گا۔ ان کی نظموں میں اصول انقلاب کو پوری طرح سمجھنے کا اثر تو نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ وہ خود اس جدوجہد سے جو ہماری مفلس قوم آنے والے انقلاب کے لئے کر رہی ہے بہت دور ہیں۔ اور دوسرے قابل ذکر شاعر روشؔ صدیقی' مجازؔ ردولوی احسان دانشؔ' جاں نثار اخترؔ' معین احسن جذبیؔ وغیرہ ہیں۔ اردو شاعری بہت دنوں تک معشوقوں کے ناز اٹھا چکی ہے' اب وہ اس انقلاب کی رہنمائی کرنے والی ہے جو سارے سنسار پر ننگے اور بھوکے کام کرنے والوں کی حکومت قائم کر دے گی۔

یہی وہ شعرا ہیں جو تمام انقلاب کی مصیبتیں جھیلنے کو سینہ سپر ہیں ان کے خیالات غالباً کچھ اشتراکیت سے ملتے جلتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اگر قوم کا فرد فرد خوش ہو اور ہر فرد مال و دولت میں برابر ہو تو پھر ہندوستان میں امن و امان کی زندگی بسر کر سکیں گے انھیں اس بات کا یقین کلی ہے کہ ان کی یہ مفلسی صرف سرمایہ داروں کے بڑھتے ہوئے ظلم کی وجہ سے ہے۔

جوشؔ ہندوستان کی مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت کس قدر خراب ہے اور اس پر بھی ہندوستانی خاموش بیٹھے ہیں' وہ اپنی ایک نظم "ضعیفہ" میں ایک غریب اور بوڑھی عورت کی حالت بتاتے ہیں جو بہت بیمار ہے اور اس بیچاری کی کوئی خبر لینے والا نہیں ہے

اک ضعیفہ سو رہی ہے راستے میں خاک پر ۔ مُردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر
عبرت و دہشت کا خنجر ہے دلِ غمناک پر ۔ ہائے یہ بے دم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر
آہ اے کس ضعیفہ غم کی تڑپائی ہوئی ۔ ہے زمانے کی جھنجوڑی زیست کی ٹھکرائی ہوئی
خدمتِ اغیار سے فرصت کوئی پاتا نہیں ۔ ہیچ ہے ایمان غلاموں کو ترس آتا نہیں
اپنی تابِ زر سے اے سرمایہ دارو ہوشیار ۔ اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو ہوشیار

ایک دوسرے موقع پر جوشؔ ایک بہت ہی افسوسناک

اور دردناک حالت کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ایک نوعمر جوان لڑکی بستر مرگ پہ لیٹی ہوئی ہے اور اس کا علاج نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مفلس ہے غریب ہے ؎

موت کے بستر پہ اک دوشیزہ ہے لیٹی ہوئی
جس نے دیکھی ہیں ابھی چودہ بہاریں عمر کی
چہرہ گلرنگ ہے اس طرح بیماری سے فق
جھٹپٹے کے آخری لمحات میں جیسے شفق
یا تھی محو ریاں بیٹھی ہوئی ہے سرنگوں
کہہ رہی ہے کس سے مانگوں بھیک مولا کیا کروں
کیا ہوا جاتا ہے بچی کو مری دوڑو کوئی
لے سنبھلنے سے ڈھلکی جاتی ہے گردن ہوں ہی
بعد ازاں اک آخری ہچکی کمال بے بسی
مرغ جاں کی پرفشانی موت کی سنجیدگی
لاش کا چہرہ خدا معلوم کیا کہنے لگا
گر پڑی چکرا کے ماں سر سے لہو بہنے لگا
پو پھٹی اتنے میں کانپی لاش پر پہلی کرن
لاش تھی یا سو رہی تھی ہند کی ماتی دلہن

احسان بن دانش نے اسی مضمون کو مختلف طریقے سے ادا کیا ہے وہ اپنی نظم "مزدور کی جوانی" میں پہلے کشمیر کے خوش کن اور فرحت بخش مناظر کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ایک غریب مزدور کی جوانی کو اس شعر میں یوں کہا ہے ؎

دامن عسرت میں تھا نوجوانی غنچہ ریز
مفلسی کی گود میں پالی ہوئی روح شباب

الطاف مشہدی بڑے دردناک اور غمناک طریقے سے ہندوستان کی مفلسی اور غریبی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "وصیت" میں ایک ضعیفہ کے متعلق لکھتے ہیں جو بستر مرگ پر وصیت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا وصیت کرے گی۔ یہی کہ یہ ہندوستان بھوکا ہے غریب ہے اور کیوں ہے اس وجہ سے کہ اہل زر روپیہ پیسہ غریب طبقہ سے گھسیٹ لیتے ہیں ؎

خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں
ہے لہو سے جس کے رنگیں اہل زر کی آستیں

آہ یہ اس تیرہ دل مزدور کی تصویر ہے
جس کے ہاتھوں جستجو کے پاؤں کی زنجیر ہے

خورشید انصاری ایک غریب مزدور کی مفلس زندگی کا حال لکھ کر دنیا کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت بہت خراب ہے

وہ ایک شعر میں یہ صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ ایک مزدور جو صبح سے شام تک سخت محنت کرتا ہے اس کے صلے میں بجائے اس کے کہ وہ امیر ہو جائے اسے اب بھی خوف ہے۔

اللہ اللہ خوف اور انسان سے انسان کو
چند سکے مول لیتے ہیں شاید جان کو

شہاب ملیح آبادی ایک نئے انداز سے اسی مضمون کو لکھتے ہیں۔ وہ غریب اور خوبصورت بہار کے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں کہ وہ بیچاری بہار اور اس موجودہ سماج کی شکار ہے ؎

خستہ خستہ سی جوانی مردہ مردہ سا شباب
صحن بستان نظر میں ایک پژمردہ گلاب
دفتر ارماں میں ماضی کے متعلے رہ گئے
چند آہیں چند آنسو چند نالے رہ گئے

ابھی تک تو یہ شاعر ہندوستان کی اس پست اور ذلیل حالت کا بیان کر کے مزدور طبقے کو خواب غفلت سے جگا دینا چاہتے تھے وہ یہ جانتے ہیں کہ اس سماج کو اچھا بنانے کے لئے انقلاب کی ضرورت ہے اور وہ انقلاب بھی غریب مزدور اور کسان ہی کریں گے کوئی سرمایہ دار اس میں حصہ نہیں لے گا۔ شاعر کا یہ خیال ہے کہ ابھی تک یہ لوگ خواب غفلت میں ہیں اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ان کو جھنجھوڑ کر جگائے تاکہ وہ انقلاب کے لئے ہوشیار ہو جائیں۔

اسی لئے جوش اب ان کو خطاب کر کے ان کو جگانا چاہتا ہے۔ اپنی نظم "غلاموں سے خطاب" میں اسی طبقے سے مخاطب ہے اور ان کو موجودہ حالت سے آگاہ کرتا ہے ؎

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ
اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے
تو میں گرج رہی ہیں کہیں یہ خبر بھی ہے
تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام
میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے ابل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹتے مردے نکل پڑیں
تو چپ ہے ارے زمین ہلی آسماں ہلا
تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا
ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں

اسی طریقے سے یہی شاعر اپنی دوسری نظم "بیدار ہو بیدار" میں ان کو انقلاب کے لئے جگا کر تیار کر رہا ہے ؎

تونے روشِ خدمت اغیار نہ چھوڑی، اب تک رسن سبحہ و زنّار نہ چھوڑی
آشفتگیٔ اندک و بسیار نہ چھوڑی، افسوس ہے اے جنس غلامی کے خریدار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار

اب جب کہ شاعر کو یہ یقین ہو گیا کہ سب اس کی چیخ پکار سے جاگ اٹھے ہیں تو وہ اب ان کے دلوں کو انقلاب کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انقلاب کے لئے یہ مزدور پیشہ لوگ جلد از جلد تیار ہو جائیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ انقلاب سرمایہ داروں کے خلاف ہوگا لہٰذا وہ ان غریبوں کو ان کے خلاف کھڑا ہونے کے لئے کہتا ہے۔ وہ اس موجودہ سماج سے بہت نالاں ہے۔

معین احسن جذبی اپنی ایک نظم "دعوت جنگ" میں عوام کو چلا چلا کر بلا رہا ہے کہ وہ اس انقلاب میں حصہ لیں اور وہ ان کے غصے کو کسی نہ کسی طرح بھڑکانا چاہتا ہے ؎

دیکھ وہ مزدور اٹھے ہیں برائے انتقام، ہاں اٹھنا ہے تجھے سرمایہ داری کا نظام
کیوں نہیں ہوتی تری تلوار آخر بے نیام، اے سپاہی کھینچ اپنی خون فشاں تلوار کھینچ
جن کے آگے ہاتھ کانپیں ان جبینوں کو نہ دیکھ، تو ہی جلاد فلک زہرہ جبینوں کو نہ دیکھ
آسماں پرواز گڑھ کر زمینوں کو نہ دیکھ، اے سپاہی کھینچ اپنی خون فشاں تلوار کھینچ

یا ایک دوسرا شاعر وقار اس موجودہ سماج سے پریشان ہو کر اور گھبرا کر انقلاب کر بیٹھتا ہے اور وہ ان لوگوں سے جنھوں نے اس کو مجبور کر دیا ہے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اپنی نظم "انتقام" میں ان خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے ؎

بے کسی کی آنکھ ہے آئینہ دارِ انقلاب، مفلسی کے آنسوؤں میں ہیں شرارِ انقلاب
بے بسی کا درد ہے سرمایہ دارِ انقلاب، بندگی پر کھول دے راہ دیارِ انقلاب

انتقام اے انتقام اے انتقام اے انتقام
کھائیں بھی مزدور کا مزدور پر غرّائیں بھی، دن کو محنت بھی کرائیں رات کو رلوائیں بھی
بھوک سے مزدور کے بچے بھی بلکیں بائیں بھی، تف ہو سرمایہ پرستوں پر کہیں مٹ جائیں بھی

انتقام اے انتقام آ انتقام

مخدوم محی الدین اس سماج کو برباد کر دینا چاہتے ہیں اور وہ نہ صرف آدمیوں کو مدد کے لئے بلاتے ہیں بلکہ وہ تمام مہلک قوتوں کو دعوت انقلاب دیتے ہیں اور ان کی مدد سے اس ذلیل سماج کو برباد کر دینا چاہتے ہیں ؎

جاگ اٹھنے کو ہے اب خون تلاطم دیکھو، ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو
بھونک دو قصر کو گرگن کا تماشہ ہی سہی، زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہی سہی
زلزلو آؤ دہکتے ہوئے شعلو آؤ، بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ

آندھیو آؤ، جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں، کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

شاعر طرح طرح سے غریب طبقے کو انقلاب کی طرف لا رہے ہیں۔ الطاف مشہدی اب ایک ضعیفہ کے متعلق بیان کرتے ہیں جو بستر مرگ پر ہے اور اپنے بچوں سے وصیت کرتی ہے کہ ان سرمایہ داروں کے خلاف جنگ کرنا ان کے عیش و آرام کو خاک میں ملا دینا ؎

لے ہوا لے تیرگی بخت لے بزم قضا، جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نام خدا
ان سے کہنا کہ گئی ہے یہ وصیت ماں تمھیں، اہل دولت نے سلایا خاک ذلت میں تمھیں
زور بازو سے بدل دو گردش ایام کو، نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اصنام کو
کھینچ لو ان معصیت کاروں کی ردائی کا نور، توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بت ملا دو خاک میں، اب مسرت کی چمک ہو دیدۂ غمناک میں

اب شہاب ملیح آبادی نے دوسرا طریقہ استعمال کیا وہ اب انقلاب کے منہ سے کہلوا رہے ہیں۔ اپنی ایک نظم "انقلاب کی پکار"

میں وہ انقلاب کو انسان قرار دے کر کہلواتے ہیں کہ اہل زر کا سر کچل ڈالوں گا، پیس ڈالوں گا اور رگڑ دوں گا ؎

گھوم میداں کی طرف اور سو کئے اُٹھو غلام ٭ ہو رہا ہے جنگ آزادی کا خونیں اہتمام
آ رہا ہوں جھنجھناتا ہوا قاصد لئے انقلاب ٭ مجھ کو کہتے ہیں تلاطم زندگی طوفاں شباب
سر غرور و کبر نخوت کا کچل ڈالوں گا میں ٭ پیس ڈالوں گا رگڑ دوں گا مسل ڈالوں گا میں

علی سردار جعفری اپنے انقلاب یا بغاوت کو صرف سیاسی میدان ہی تک محدود نہیں کرتے۔ وہ انقلاب کے معنی صرف سیاست ہی میں آزادی نہیں سمجھتے وہ تو مذہب تہذیب سماج علم اور معاشیات میں، آزادی کو آزادی سمجھتے ہیں ؎

بغاوت میری منزل ہے بغاوت راستہ میرا ٭ بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیب تتاری سے ٭ بغاوت جبر استبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے ٭ بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے ٭ بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت غم اٹھانے سے ٭ بغاوت ان بجز انسان کے سارے زمانے سے

علی سردار جعفری کو یقین کامل ہے کہ اگر یہ انقلاب کامیاب ہو سکتا ہے تو صرف مزدور پیشہ لوگوں کی مدد سے ہوگا کیوں کہ ان ہی کے لئے یہ انقلاب ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ داری نے خدا بن کر مظالم ڈھائے ہیں۔ وہ اپنی نظم "حال اور مستقبل" میں لکھتے ہیں ؎

کہیں آپس میں اہل زر کے مذہب کی لڑائی ہے ٭ کہیں کھوٹی کھرے چاندی کے ٹکڑوں کی خدائی ہے
نہ جانے کیوں یہ دنیا قومیت کے راگ گاتی ہے ٭ یہ وہ چکر ہے جس میں آدمیت پیسی جاتی ہے
مظالم ڈھائے اس سرمایہ داری نے خدا بن کر ٭ تمدن آگیا رسم کہن کا دیوتا بن کر
جوانی ہے متاع کفر و دیں کو لوٹنے والی ٭ ہے اک جھٹکے میں زنجیر غلامی ٹوٹنے والی

یہی شاعر اب ایک گاؤں کی لڑکیوں کی مفلسی کو بیان کرتا ہے اور بڑی ہمدردی اور جوش کے ساتھ ان کی ان تمام طاقتوں کا ذکر کرتا ہے جن پر وہ حاوی ہیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہی وہ ہیں جو آئندہ اپنی ملک کی تقدیر کو بدل سکتی ہیں ؎

گردش افلاک نے گودی میں پالا ہی نہیں ٭ سختی آلام نے سانچے میں ڈھالا ہی نہیں
بے کسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب ٭ ساز ان کا سوز حسرت خامشی ان کا رباب
لیکن ان کی بستیوں کو اپنی نفرت سے نہ دیکھ ٭ ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ
اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب ٭ ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشم انقلاب
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی ہر سو کی شکن ٭ دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن

مجاز کا ایک بہت مشہور گانا ہے جس کو تمام دنیا گاتی پھرتی ہے اس میں اس نے غریبوں۔ مزدوروں اور کسانوں کو بہادر قرار دے کر ان کی ہمت بڑھائی ہے ؎

ہم وہ ہیں جو بے رخی کرتے نہیں ٭ ہم وہ ہیں جو موت سے ڈرتے نہیں
ہم وہ ہیں جو مر کے بھی مرتے ہیں ٭ آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں
لاکھ لشکر آئیں کب ہٹتے ہیں ہم ٭ آندھیوں میں جنگ کے کھلتے ہیں ہم
موت سے ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم ٭ آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

اسی شاعر کی ایک دوسری نظم ہے جس کا عنوان "اندھیری رات کا مسافر ہے" وہ اس نظم میں بڑی خوبی اور مضبوطی کے ساتھ مختلف رکاوٹوں کے متعلق لکھتے ہیں مگر یہ بھی بتلاتے ہیں کہ اگرچہ منزل مقصود بہت دور اور اندھیرے میں ہے اس پر بھی ہمت اور بہادری کا یہ عالم ہے کہ بڑھتے ہی جاتے ہیں ؎

بدی پر بارش لطف و کرم نیکی پہ تعزیریں ٭ جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
بجلی نیز کمیں ہیں خون آشام شمشیریں ٭ مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
افق پر جنگ کا خونی ستارہ جگمگاتا ہے ٭ ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے ٭ مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
حکومت کے مظاہر جنگ کے پر ہول نقشے ہیں ٭ کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں ٭ مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ہمیں چاہئے کہ جوش کا جو خیال آج کل کے لڑکوں کے

متعلق ہے وہ بھی لکھیں انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ
ان لڑکوں کو اس قسم کی باتیں لکھ کر ان کو شرم دلائیں تاکہ وہ اپنی
اس نزاکت کو چھوڑ کر انقلاب کے لئے تیار ہو جائیں سے

حسین بی تم نے نمائش کے ہر شیریں ادا مرحبا اے نازک اندامان کالج مرحبا
جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی، ناز سے نیچی نگاہیں چال اٹھلائی ہوئی
نازکی کا مقتضی پتلی چھڑی باندھے ہوئے، شوق کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے
جنگ اور نازک کلائی ہائے یہ نقدیر کے مڑ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے
پاؤں رکھتے ہو دم گلگشت کس کس ناز سے! اے میں قرباں ان میں جادو کے اسی انداز سے
شغل زینت سے اگر فرصت تمہیں ملتی نہیں، کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں کلتی نہیں

برخلاف اس کے مجاز جوان لڑکیوں کو ہدایت کر رہے ہیں
کہ سرمہ اسی چھوڑ دو اور جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ سے

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن، تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ملوکیت اور سرمایہ داری کا خاتمہ
کر دیا جائے تو پھر زندگی بیں امن و امان ہو جائے گا اور چین سے
گذرے گی ساتھیوں نے اسی لئے ابھی سے پروگرام بنا لیا ہے کہ
سب سے پہلے وہ دنیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ اس کے بعد
وہ پھر دنیا کو ایک نئے طریقے سے اور ایک نئے نمونہ پر بنائیں گے
جو بغیر ملوکیت اور بغیر سرمایہ داری کے ہو گی اور ممکن ہو تو بغیر
کردگاری کے ہو گی جوش اپنی نظم "سرمایہ دار شہریار کردگار" میں ان
تینوں کو برا بھلا کہتا ہے سے

اے بناری کے بڑے انگور اہل عز و جاہ! آدمی پر رحم کرنے کو سمجھتے ہو گناہ
اے امیر سینہ دکھانے کے بھی تم قابل نہیں، تھیلیوں میں زر تو ہے سینے میں لیکن دل نہیں
آدمی کب آدمی کی شکل کے تودے ہو تم، پشت مخلوقات پر سرطان کے پھوڑے ہو تم
اور اے غاصب حکومت دشمن لطف و کرم، موت کے جادے ہیں تیرے گیسوؤں کے پیچ و خم
ہم نے مانا یہ کہ غفلت کیش ہیں نادان ہیں، اے حکومت پھر بھی ہم حیوان نہیں انسان ہیں

اور ہاں اے ماورائے فہم ہستی اے خدا، مجھ میں ہے اقرار کا یارا نہ دم انکار کا
کون اتنا کور ہے جو انکار کر سکتا ہے کون، کس کے منہ میں دانت ہیں اقرار کر سکتا ہے کون
سنتے ہیں تو ہے کروڑوں ماؤں سے بڑھ کر شفیق، اے امیروں کے مربی شہریاروں کے رفیق
بے زروں کے غم سے کیا ہوتا نہیں تجھ کو قلق، تیرے زردار وں ہی کو کیا فقط جینے کا حق
اغنیا ہے جس خدا غافل حکومت بے عمل، بن پڑے تجھ سے تو ان تینوں کے پھندے کو نکل
کر بھی دے بے دخل ان ارباب عز و جاہ کو، آسمانوں پر خداؤں کو زمیں پر شاہ کو
اٹھ کہ یہ ہستی کا بحر بیکراں کچھ بھی نہیں، مرد کے آگے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں

اس انقلابی شاعری پر ایک گہری نظر ڈالنے سے ایک نقطہ صاف
صاف ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان شعرا میں حد سے زیادہ جوش و خروش
ہے ہم ان کے اس جوش سے انقلاب کی آگ بھڑکتی دیکھتے ہیں اور یہ آگ آہستہ
آہستہ ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں بھی منتقل ہو رہی ہے یہی نہیں بلکہ
موجودہ خرابیوں اور تکلیفوں کے خلاف لڑنے میں اپنا مصمم ارادہ ظاہر کر رہے ہیں
ان کی نظمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت ہی خوش سلیقہ ہیں طرز ادا بہت
ہی جوشیلا اور لکھنے میں کافی قابلیت اور ذہنیت سے کام لیا گیا ہے مگر باوجود ان
تمام باتوں کے شاعری کی خصوصیات کے لحاظ سے اعلیٰ پیمانے کی شاعری نہیں
کہی جا سکتی۔ اس انقلابی شاعری کی زیادہ تر نظموں میں واعظ یا مصلح کو بہت زیادہ
مداخلت ہے ان کی شاعری میں اسی لئے خطیبانہ، نغمیانہ، منادیانہ اور قاصدانہ انداز
بہت ہے یہ شاعر درحقیقت فن شاعری سے کوئی تعلق نہیں رکھتے کیونکہ فن علم میں
شور و شغب اور چیخ چلاہٹ نہیں ہوتی، ادب سے اس زمانے میں امید تھی کہ وہ
لوگوں کے دلوں میں جگہ کرے گا اور ہر دل عزیز ہو کر لوگوں کے دماغوں کو
روشن کر دے گا اور حقیقت سے آگاہ کر کے انقلاب کی طرف لائے گا شاید اپنے
جوش و خروش میں یہ شاعر اپنا مطلب خبط کر دیں گے، یہ دل سوز رقت انگیز اور
موثر تقاریر ہمارے دلوں اور دماغوں پر ایک مستقل نقش نہیں ڈال سکتی ہیں اور
نہ ہم کو کسی عمل کے لئے جھنجھوڑ سکتی ہیں۔

دوسری خرابی جو یہ شاعری پیدا کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام شاعر

جو انقلاب پر لکھ رہے ہیں وہ خود انقلاب کے پر معنی اور پیچیدہ تصورات و نظری قیاس سے بالکل واقف نہیں ہیں' سوائے چند لکھنے والوں کے بقیہ تمام شعرا انقلاب کے صحیح وجوہات کو' انقلاب کے نشو ونما اور ابھار کو واقعات کے انجام کو اور معاملات کے تعلقات کو نہیں سمجھ سکے' وہ بالکل نہیں جانتے کہ کیونکر سماج روز بروز اپنے چولے بدل رہا ہے اور یہ انقلابات کیوں ہو رہے ہیں! ان کی یہ لاعلمی جو ان کے کلام سے ظاہر ہے بہت ہی نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔

ان شاعروں کی ایک تاسف انگیز رغبت اور ہے جو ان کی شاعری کو بہت ناکامیاب بنا رہی ہے اور وہ یہ کہ وہ ان مزدور پیشہ' کسان اور غریبوں کے انقلاب کی مہلک صورت کو بہت زیادہ زور سے تاکید ا لکھتے ہیں، ہم کشت وخون' سرمایہ داروں کا قتل اور بربادی تمام موجودہ چیزوں کی خواہ ایمانداری سے یا بے ایمانی سے سنتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم اس کو سمجھیں اور ہمدردی ظاہر کریں ہمیں اس انقلاب سے ڈر معلوم ہونے لگتا ہے یعنی یہ کہ انقلاب اس ستم وظلم کو توڑتا ہے۔ انقلاب ان تمام خونی اور بین قومی جنگوں کا خاتمہ کرتا ہے' انقلاب نے مانتے امن وامان پھیلاتا ہے' غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ شاعر ہر وقت خون ہی خون کا ذکر کرتے ہیں اور بس ایک یقین دماغ میں رہ جاتا ہے کہ انقلاب کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا خون بہائے' اگر کوئی تسکین دینے والا اور صلح پسند ان کے اس کلام کو تعصب کی عینک اتار کر پڑھے اور پھر اگر وہ اس انقلاب کی لہر کو روکنا چاہے تو وہ قصور وار نہ ٹھیرایا جائے گا' انقلاب کے بھیانک نقطۂ نظر کا غیر قانونی' بے اصولی گمراہ کن اور جہالت کا ہی وہ زوردار جوش ہے جو سیاست کے میدان میں خوف اور دہشت پیدا کر دیتا ہے جو ادب کا اس حصے کی طرف لے جاتا ہے جہاں کہ مبالغہ غلو اور تعلی اور داستان اور افسانے ہیں' یہ ایک بڑی غلطی ہے جو بہت نقصان پیدا کر رہی ہے" انقلاب" کے فلسفہ کو سمجھنے کی مشکلات' عوام الناس کے جھگڑوں کی لاعلمی اور اشتراکیت کی کمزوری وغیرہ وہ غلطیاں ہیں جو سامنے نہیں آتیں۔

اپنی شاعری کو عمدہ موثر اور حقیقی بنانے کے لئے چاہئے کہ شاعر انقلابی جوش کے ساتھ ساتھ انقلابی خیالات اور انقلابی سمجھ کو بھی باہم متفق کر دے' شاعر کو یہ بھی لازمی ہے کہ وہ خود اس عمل میں شرکت حاصل کرے تاکہ وہ اس کی اہمیت معنی ومطلب کو بہ آسانی سمجھ سکے' دنیا کے مشہور انقلابی شاعر اور لکھنے والے جان کنفرڈ رالف فاکس اور کرسٹوفر کاڈول' اسپین کے انقلاب میں ان لوگوں کی طرف سے جن کے لئے وہ لکھ رہے تھے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اسی طرح ہندوستان کے شعرا کو بھی جو عوام کی طرف سے لکھ رہے ہیں اور لڑائی میں یورپ کے شاعروں کی طرح حصہ لینا چاہتے ہیں اپنے آپ کو خوب ایک دوسرے سے واقف کر لینا چاہئے' تاکہ ان کا کلام مصنوعی غیر حقیقی اور مردہ نہ معلوم ہو' ادب اور بالخصوص انقلابی ادب زندگی کی حقیقی لڑائی سے جدا نہیں کیا جا سکتا' اسی سلسلے میں یہ اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ عوام کے مقصد کی ذی شعور رسائی حاصل کرنے کے لئے انقلابی شاعر اشتراکی فلسفے کی مکمل قابلیت کے اور مقامی و زبانی مادہ اور روحانیت کو بغیر سمجھے اپنا کام نہیں چلا سکتا اگر کوئی شاعر اپنی صنعت و حرفت کے علم و ہنر اور فن شاعری کے قواعد و اصول کے عطیے کو ایسی قابلیت کے ساتھ متحد کر دے تو پھر وہ اپنے پڑھنے والوں پر ضرور ایک گہرا اور زوردار اثر پیدا کرے گا۔ اس قسم کا شاعر علم ذاتی کے عنصر اور انقلابی شور و شغب کو اپنے کلام سے نکال دے گا' وہ بجائے تباہی اور قہر کی پکار کے دوسرا اچھا اور عمدہ طریقہ عمل میں لائے گا۔ وہ ضرور اس بات کا خیال کرے گا کہ کہیں وہ اپنے اور اپنے کلام کی وقعت کو اس مردہ فلسفہ میں گم نہ کر دے کیونکہ اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے

والوں تک سچائی صداقت اور خوبصورتی سے اپنے خیالات پہنچا دے۔ وہ کوئی سماجی مصلح نہیں ہے اور نہ اس کو مختلف نظریوں میں پھنس کر پریشان ہونا چاہئے کیونکہ اس کا کام وعظ کرنا اور تلقین کرنا نہیں ہے اس لئے اس کو خطاب بھی نہ کرنا چاہئے۔ اس کا صحیح کام تو یہ ہے کہ دیکھے سمجھے اور شرح کرے۔ اس کی حقیقت اور اصلیت سطحی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ وہ سماج کے واقف اور غیر واقف رسم و رواج پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی شاعری علم حرکت سے تعلق رکھتی ہوگی۔ وہ اس متحرک دنیا سے واقف ہوگی اور ان تمام قوتوں کو پہنچانی ہوگی جو اس کو حرکت دے رہے ہیں کیونکہ وہ اسی وقت سکوت سے بچ سکتی ہے ورنہ یہ شاعری بہت جلد ساکت ہو جائے گی۔ یہ بتانا ضروری ہے تاکہ دنیا معلوم کرے اور شعراء آگاہ ہو جائیں کہ موجودہ انقلابی شاعری میں بہت نقائص ہیں جو اس کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں

ایک اور خرابی جو ہمارے چند بہت اچھے شعراء کے کلام کی خوبی کو خراب کئے دیتی ہے وہ ان کی خود پسندیگی خود غرضی اور خود بینی ہے۔ ایک شخص یا مفرد پر زیادہ زور دینا کام کو بے حقیقت بنا دیتا ہے۔ جوش ملیح آبادی غالباً اسی کے شکار ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد انقلابی شاعری ختم ہو جائے گی کیونکہ مضامین کی کمی نظر آتی ہے تمام شعراء جو انقلاب کی بابت لکھتے ہیں وہ پرانے مضامین کو دہراتے ہیں۔ قریب قریب ہر شاعر کسان، مزدور وغیرہ پر لکھ چکا ہے ان کے سامنے بس یہی مضامین ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ انقلابی شاعر مضامین میں وسعت پیدا کریں۔ اچھوتے اور انوکھے خیالات انقلابی شاعری میں پیش کریں اور جدت پیدا کرنے کی کوشش کریں ورنہ اس شاعری کا بالکل وہی حشر ہوگا جو غزل کا ہوا۔ پھر کون چبائے ہوئے نوالوں کو نگلے گا۔

انقلابی شعراء کو چاہئے کہ وہ بین الاقوامی اور بین قومی موضوعوں پر زیادہ زور دیں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کے شعراء اسپین کے مزدور پیشہ اور غریبوں کی جمہوریت سے متعلق جو فاشیت کے خلاف لڑتے لڑتے مر گئی، چین کے ان بہادروں کے متعلق جو لاکھوں کی تعداد میں اپنی آزادی کو بچانے کے لئے لڑ رہے ہیں فلسطین کے ان آزاد پسند عربوں کے متعلق جو آزادی کے دلدادہ ہیں، اپنے ان دوستوں کے متعلق جن کی اٹلی اور جرمنی میں آزادی چھین لی گئی اور ان لوگوں کے متعلق جو امریکہ اور برطانیہ عظمیٰ میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں نہ لکھیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری انقلابی شاعری کو محدود نہ ہو جانا چاہئے ایسی نظموں کی جن میں قومیت کی بو آتی ہو اور بین قومیت کی بو نہ آتی ہو ہمت افزائی نہ کرنا چاہئے۔ ایسی نظمیں جن میں تعصب کی بو آتی ہو دور ہٹا دینا چاہئے کیونکہ جیسا کہ اندازہ کیا گیا ہے پانچ چھ سال کے بعد جب کہ ہندو مسلمانوں کا تعصب خود بخود دور ہو جائے گا تو ان نظموں کی کوئی اہمیت اور وقعت نہ رہے گی۔ مثلاً آنند نرائن ملا کی مسلم لیگ کے متعلق نظمیں یا شہاب کی وہ نظم جس کا عنوان "صدر مسلم لیگ سے خطاب" ہے۔

سید علی ضامن نقوی

اڈگرویالیس

(سلسلۂ گزشتہ)

ان ملاقاتوں کا نتیجہ ظاہر تھا ان میں کسی ایک کو وہ اپنا ہمدرد و مونس بنا لیتا۔ ڈیزی جس نے ابھی ابھی تیسرے دہے میں قدم رکھا تھا ایک حسین اور دلکش دوشیزہ تھی وہ نہایت مسرور تھی اس کے برخلاف آئی وی متوقع وہ دلیری اور بے پروائی حرص ... لڑائی کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا اور اس طرح اس نے دس سال تک اپنی زندگی عیش و آرام کے ساتھ بسر کی۔

"سینڈرس" کے سلسلے نے اڈگر کی زندگی اور شہرت کو دوبارہ جلا دے دی تھی اور پھر وہ افسانہ نگار اور ایڈیٹر کی حیثیت سے ہر طرف سے اس کی مانگ شروع ہو گئی اس نے حسد و پشیمانی سے سب کا استقبال کیا اور پھر ایک فرنیسٹ اسٹریٹ میں آیا اور کئی ایک اخباروں کے دفتروں میں جا کر دیں قبول کریں جن میں سے چند اس کے آخر دم تک باقی رہیں ان گوناگوں دلچسپیوں میں گھر کر کے بعد ڈیزی اب اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھی اس کے مسودے صاف کرتی، پروف صحیح کرتی اس کے افسانے کے کرداروں اور موضوعوں پر رائے زنی کرتی آئی وی نے نہ چاہا اس کو اپنا شریک خاندان سمجھا اور صورت حال کو چند رسمی معاملات سے ہموار کر لیا۔

اڈگر کی عمر انتالیس سال کی تھی کہ جنگ عظیم پھوٹ پڑی اور انگلستان کا مشہور افسانہ نگار پھر نامہ نگار بن گیا لیکن وہ اب "ڈیلی پوسٹ" کا نامہ نگار تھا۔ اس کے مضامین جو جنگ کے دوسرے دن سے شروع ہوئے اور صلح تک جاری رہے انتہائی انہماک کے ساتھ پڑھے جاتے تھے لوگوں نے اس کے حوصلہ افزا نظریوں کی تعریف میں ہزاروں خطوط لکھے اپنے نظریوں کو تسلیم کرانے کی ایسی ناقابل تنقید قابلیت اس سے پہلے کبھی نہیں ظاہر ہوئی، جوں ہی لڑائی چھڑی ہر ایک جرمن اس کے لئے "ہن" اور لڑکے ہیرو بن گئے، یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ عوام کی رائے سے خائف تھا بلکہ وہ ہمیشہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں میں حصہ لیتا تھا یہ اس کا نفسیاتی اہم پہلو ہے جس نے اس کو بعد میں ایک کامیاب ادیب اور انشاء پرداز بنا دیا۔

جب اس کے معتمد پرنس نے ایک ٹائپسٹ کی جگہ کے لئے اشتہار دیا تو ایک بھوری آنکھوں والی اٹھارہ سالہ دوشیزہ نے مس وائولٹ کنگ کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بہت شرمیلی تھی اور اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی بوکھلاہٹ میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اڈگرویالیس کا نام اس نے کبھی نہیں سنا لیکن اس کے اظہار کا اس کو ہمیشہ افسوس رہا اور اس میں زیادہ شدت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ اڈگر کو یہ جواب ناگوار گذرا۔ اڈگر نے اس کی درخواست منظور کر لی اور اپنے نام کو غیر معروف ہی سمجھ کر دل بہلا لیا اس کے باوجود بھی اڈگر نے اس لڑکی کی کشش پالی دو گھنٹے کی غیر متعلق گفتگو کے بعد دوسرے دن صبح نو بجے کام کے متعلق کہہ لیا۔

آئی وی اور مس کنگ میں کسی قسم کی ان بن نہیں تھی وہ ہمیشہ اس کو ٹائپسٹ سے مخاطب کرتی لیکن ڈیزی اس سے متشکی تھی اور اسی شک نے تینوں کے درمیان عداوت کی ایک خفیہ رو دوڑائی۔ ان خاندانی الجھنوں میں پھنسنے کے لئے اڈگر کے پاس نہ وقت تھا اور نہ اس کو ان سے کوئی دلچسپی لیکن وہ معترف تھا کہ آئی وی کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے، وہ نہایت متین اور خاموش تھی اور اڈگر اس کی موجودگی کے باوجود عدم موجود سمجھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے ان کشیدگیوں کی طرف کوئی خیال نہیں کیا چونکہ سال پہلے جو شادی محبت کی بنا پر ہوئی تھی اب وہ ایک المیہ

بن رہی تھی آئی وی کی اطاعت شعار اور تربیت پذیر فطرت اڈگر کے جذباتی ضروریات کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی، اڈگر میں زندگی کی خواہش بہت زیادہ تھی اس غیر مادی زندگی سے اکتا کر اس نے سنہ ۱۹۱۷ء میں اڈگر سے کہہ دیا کہ اس کو آزاد کر دے دونوں کا مقدمہ چلا اور جون سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کی طلاق منظور ہو گئی چند ہفتے بعد اڈگر نے مس کنگ کے ساتھ ڈیزی سے شادی کرلی اس شادی کے بعد پانچ سال نہایت امن و اطمینان سے گذرے اس کے جذبات میں سکون پیدا ہو گیا تھا کثرت کار کی وجہ سے اس کو ان دونوں میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

اب تک اڈگر اپنی کتابیں حق تصنیف کا خیال کئے بغیر ستر اسی پونڈ میں فروخت کر دی تھیں۔ آخر کار اے پی واٹ نامی ایک شخص نے سر آرنسٹ ہاڈر ولیم سے اڈگر کا تعارف کرایا جس نے چھ ناول حقوق تصنیف محفوظ کرتے ہوئے چھاپے پہلے سر آرنسٹ کا خیال تھا کہ یہ ناکام شخص جس کی عمر اب پچاس کے لگ بھگ ہے دنیا کا ہر دل عزیز ادیب بن سکتا ہے اس نے سمجھ لیا کہ اڈگر کے کارنامے دنیا کو محو حیرت بنا دینگے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا صرف یہی واحد ذریعہ ہو سکتا ہے کہ اس سے سرعت رفتار کے ساتھ کتابیں لکھوائی جائیں اس اسکیم کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس فرم نے دس سال کے عرصے میں اس کے چھیالیس ۴۶ ناول شایع کئے اور ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی، ان تصانیف کی کثرت جو تیس سال کے عرصے میں ڈیڑھ سو کتابوں تک پہنچ گئی تھی اس کا سمجھنا ایک مشکل امر ہے دیا لیس اپنے حلقہ احباب میں انتہائی سست کاہل اور احدی مشہور تھا تیسرا درگھڑ دوڑ کے میدان میں ہر شخص اس کو دیکھتا یہ بھی عام بات تھی کہ وہ سو گز کا فاصلہ بھی ٹیکسی کے بغیر طے نہیں کرتا جیسے جیسے اس کی تصانیف

ہونے کی شہرت بڑھتی گئی لوگ اس کا مضحکہ اڑانے لگے کوئی اس کو "ہفتہ وار دیا لیس" کہتا اور کوئی "دو پہر کا دیا لیس" عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ یہ تمام تصانیف اس کے قلم کی نہیں ہیں بلکہ اس کا معتمد بھی برابر کا شریک ہے یا پھر اس نے کسی جن یا بھوت کو قبضہ میں رکھا ہے جو اس کے لئے تیزی کے ساتھ ادبی کتابیں لکھ دیتا ہے غرض یہ افواہیں کبھی نہ رکیں اس نے پانچ ہزار پونڈ کا ایک انعام بھی اس شخص کے لئے مقرر کر دیا تھا جو یہ ثابت کر سکے کہ اس کی تصانیف میں کا ایک لفظ بھی کسی دوسرے کا لکھا ہو، یہ افواہیں اس کے مرتے دم تک رہیں اور اب بھی جاری ہیں

اس تیزی سے لکھنے والے کی تحریر میں افسانوں اور ناولوں میں واقعات یا قواعد کی غلطیاں ہونا بدیہی بات تھی لیکن ان چیزوں کو نہ تو مصنف ہی نے کوئی اہمیت دی اور نہ ناشرین نے، دیا لیس کے ناولوں اور افسانوں کے موضوع ایسے مافوق الفطرت ہیں کہ پڑھنے والا آئندہ واقعات کی دھن میں پڑ جاتا ہے وہ حقایق سے دور ہو کر تشویش اور امید و بیم کی بھول بھلیاں میں جو اس کی گہری دنیا میں اس کے خیالات نے پیدا کی ہے گھومنے لگتا ہے ان تمام دہشتوں کے باوجود افسانے پڑھنے والے پر یقین اور اعتقاد راسخ کے نقوش مرتسم کرتا ہے اور اس میں ہمیشہ فتح حق اور انصاف کی ہوتی ہے کردار کے جنسی اخلاق بشمول مجرم ہمیشہ ملعون و مطعون ہوتے ہیں۔

اڈگر کہتا ہے" ہمارا موجودہ ادب گندگیوں سے اتنا آلودہ ہے کہ میں واقعتاً بیمار ہو جاتا ہوں اور اسی لئے میں ایسے افسانے لکھنا چاہتا ہوں جن کی حقیقت "معصوم قتل" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی"

اڈگر سالہا سال تک نہایت استقلال کے ساتھ ڈرامے لکھتا

اور انھیں لندن کے تعلیم یافتہ طبقے کو سمجھانا ... ذریعے لوگوں سے خوب روشناس کیا تو لیکن ... نام ... دکھایا آخر ... کامیاب ہو گیا ... اڈگر ... ڈرامہ تھیٹر ... گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ جو جذبات اس کے دل ... ان کا عوام احساس ہو گیا ہے ... سال پہلے وہ موسیقی ہال ... اپنا نغمہ ... تھا اور اس وقت ... سلسلہ ایک سال تک مختلف ... والیس کو ڈرامہ نگار بنا دیا اس کے بعد کے چند سال میں اس نے سترہ ڈرامے لکھے جن میں نصف سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔

جب ۱۹۲۹ء میں اڈگر والیس نے ممالک متحدہ امریکہ کا سفر کیا تو وہاں خانہ جنگیاں زوروں پر تھیں وہ اس دنیا کے مجرموں کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے ناول کے مجرموں سے زیادہ دہشت ناک اور جاذب نظر تھے اس نے شکاگو کا بھی ہوائی سفر کیا جہاں ایک لفٹننٹ پولیس نے اس کو اپنے سفر میں ساتھ رکھا اور پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں تبلائے اس نے جھولوں کی اس دکان کو بھی دیکھا جہاں ڈی جین اوبینین کو قتل کیا گیا تھا اور وہ گیراج بھی دیکھی جہاں سینٹ ویلنٹائن کا قتل ہوا۔ یہ مقام شہر کے شمالی حصے میں واقع ہے۔

بحری سفر کے پانچ دن اڈگر نے نہایت خاموشی اور رنج میں بسر کئے لیکن یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ کسی خاص چیز کی تخلیق میں محو ہے جب وہ لندن پہنچا تو اس نے اپنے معتمد کو بلا کر ایک ... ڈراما "آن دی سپاٹ" لکھوانا شروع کیا۔ دو ہفتے کی ... ڈراما لکھا ... ڈراما ختم ہوا اور وہ اپنی دماغی تھکن دور کرنے کے لئے بستر پر جا پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ والیس کا شاہکار اور ہمارے زمانے کا بہترین میلو ڈراما ہے۔

اڈگر کی رفتار تحریر سالہا سال کی مشق سے بہت بڑھ گئی تھی یہاں تک کہ اس کے خاص دوست بھی اس پر حیرت کرنے لگتے۔ ... نے اڈگر کے پاس ایک ہفتہ گزارا اور اس نے جمعہ کی شام سے پیر کی صبح تک مکمل ناول لکھتے دیکھا۔ اور اڈگر سے یہ سن کر اور بھی حیران ہو گیا کہ یہ موضوع زیادہ اہم نہیں ہے۔ وہ پیر کے دن ... بجے کمرے سے باہر نکلا داڑھی بڑھ گئی تھی آنکھیں کھنچ گئی تھیں وہ اس حالت میں باہر آیا اور اپنے دوست سے کہنے لگا کہ اس نے ... اسی ہزار الفاظ کا ناول ختم کیا ہے اس ناول سے جس کو اس نے ساٹھ گھنٹوں میں ختم کیا تھا چار ہزار پونڈ ملے ناول ختم کرنے کے بعد وہ دو دن تک سوتا رہا چھ سات ناولوں کے موضوع اس نے تیار کر لئے تھے مدیران جرائد فرمائشیں کرتے رہتے اور وہ بھی ... سرمایہ داری سے لے کر نوجوانوں کے گناہوں تک کو نہایت آسانی کے ساتھ سپرد قلم کر دیتا۔ وہ اپنے مضامین کی قیمتیں بہت زیادہ بتلاتا۔ ... اسٹریٹ کے احباب اچھے اچھے مضامین پر دس پانچ گنیاں دے دیتے اور وہ خاموش ہو جاتا۔ کثرت کار اس کی فطرت ثانی بن گئی تھی اسی لئے اس نے کسی مدیر کو نفی میں جواب نہیں دیا۔ اخبار کے مضامین وہ آدھے گھنٹے یا اس سے کم وقت میں لکھ دیا کرتا۔

اس کی آمدنی رفتہ رفتہ قارون بن رہی تھی اس لئے اس کا ہر کام مسرفانہ ہونے لگا اس نے دو بڑے بڑے مکانات خریدے اور ... زمین کے لئے الگ مکان خریدا کبھی کوئی دعوت اس ... قیمت ... نہ دی جاتی تھی جب تک کہ اس کے شایان شان نہ ہو

دعوتیں اکثر ہوتیں اور ہر دعوت میں کم از کم دو سو مہمان مدعو رہتے۔

اس کا محبوب مشغلہ گھوڑ دوڑ میں شرکت تھی اس نے گھوڑ دوڑ کے متعلق "اسٹار" میں کئی مضامین لکھے اس کے پاس خود کئی دوڑ کے گھوڑے تھے جو اگرچہ اپنی ذاتوں کے لحاظ سے برابر نہ تھے لیکن انہوں نے اڈگر کو گھوڑوں کا مالک بنا کر کافی شہرت دی اور "اسٹار" سے آئی ہوئی تین ہزار پونڈ کی آمدنی انھیں کے نذر ہوئی۔

وہ اپنے ڈراموں کو معاشی اصول پر چلاتا تھا لیکن ان کا افتتاح اس شان سے کرتا کہ کئی پونڈ اسی کی نذر ہو جاتے بڑی دعوت دی جاتی، ملازمین کی تنخواہیں دگنی کر دی جاتیں لیکن اگر کوئی اس سے اضافہ تنخواہ کا ملتجی ہوتا تو وہ برانگیختہ ہو جاتا اور انکار کر دیتا۔ بغیر اطلاع کے کسی کی تنخواہ بڑھا دینا اور کسی کو بغیر انعام و اکرام کے خارج کر دینا اس کے لئے بالکل معمولی بات تھی۔

زندگی کے آخری دو سال میں کثرت کار نے اس کو چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا چالیس سال سے اس کے کام کی رفتار کا یہی عالم تھا۔ اس کی ذہنی قوت ایسے درجہ پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کا خیال فطرت اور کائنات کی معمولی سی ہنگامہ آرائی پر وجد کرنے لگتا۔ اس کا مالی موازنہ جو کبھی برابر نہ رہتا تھا سنہ ۱۹۳۱ء سے بہت بگڑ گیا صرف انکم ٹیکس میں وہ بیس ہزار پونڈ کا مقروض ہو گیا۔ اس کی بزدلی اور رجائیت نے اس کو اپنے معاملات میں کسی قسم کی تنقیح و تحقیقات کی اجازت نہ دی اس کا خیال تھا کہ اس کا قرضہ اصل سے چوگنا ہوگا۔ اسی اثناء میں جب اس کو ہالی وڈ سے دعوت نامہ ملا تو اس نے ایسے سنہرے موقع کو چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا۔

وہ اپنے اس سفر پر مایوس سا تھا لیکن وہ اڈگر ... نا ... مایوسیوں اور مسرتوں کی متضاد علامتیں اس کے چہرے سے ظاہر تھیں وہ روانگی سے قبل اپنا نیا ڈرامہ "دی گرین پیاک" ختم کر دینا چاہتا تھا تاکہ مالکان تھیٹر کو دے دے۔ اس نے نہایت بے تابی اور عجلت میں اس کو ختم کیا۔ اس کی صحت کی خرابی کے باعث وایولٹ کنگ نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لئے کہا بھی لیکن اس کو اپنی تندرستی پر اعتماد تھا حالانکہ ضیابیطس اس کی ... قوتوں کو ... رہا تھا۔

وہ ... "... آف برطانیہ" کے ذریعہ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء میں اپنے ... اور ایک ملازم کے ساتھ امریکہ روانہ ہوا اور وایولٹ اپنے اکلوتے بیمار بچے ... کے علاج کے لئے انگلستان ہی میں مقیم رہی۔ اس نے دو مہینے ہالی وڈ میں گذارے اس کی بے حد عزت کی گئی اس کے چند ڈرامے جب اسٹیج پر کرنے کے لئے انتخاب کئے گئے تو وہ مزید جنوری کے آخر تک ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"دی گرین پیاک" ۹ر فروری کو پہلی بار پیش کیا جانے والا تھا اور اپنی کامیابی کا خیال کرتے ہوئے اڈگر نے ایک تقریر نشر کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پہلی ہی رات کو اڈگر نمونیا میں بیمار ہو گیا۔ تھیٹر کی پھاٹک پر اس اعلان کے لئے بڑے بڑے اشتہارات لگائے گئے اور اڈگر کو انگلستان بھیج دیا گیا۔ والٹر ہسن جو ہالی وڈ میں اڈگر کا دوست ہو گیا تھا، کرش اور ملازم ان تینوں نے اڈگر ہی کے پاس رات گذاری اور تین گھنٹے تک وہ سوئے ہوئے اڈگر کے پاس بیٹھے رہے لیکن ان تینوں میں کسی نے نہیں جانا کہ اڈگر کی روح کب پرواز کر گئی۔

ہیجسٹک سادہمپٹن کے سامنے نہایت خاموشی سے ... رہا تھا ... وایولٹ کی ... جہاز ... پہنچ

گیا تو دا بولٹ جہاز سے اتری اس کے ساتھ اڈ گر بھی تھا لیکن اس نے اپنی زندگی کا ڈرامہ ختم کر دیا تھا۔ بیرنگیریا کے عرشہ پر جہاز والوں نے لاش پر علم اتحاد اڑھا دیا اور لاش کو پھولوں سے ڈھک دیا اور کیبن میں لے آئے۔

جب جہاز بندرگاہ ساؤتھمپٹن میں داخل ہو رہا تھا اس کا علم اس کے نصف مستول تک اتر چکا تھا تمام کلیساؤں کے علم جھکا دئے گئے تھے، فلیٹ اسٹریٹ کے گھنٹے بج رہے تھے اور دھند ھم میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ اس کے اعزاز کے لئے تھا اگرچہ وہ ان تمام نمائشوں سے بے نیاز ابدی نیند سو رہا تھا۔

اکبر صدیقی

اردو کی نئی کتابیں

(۱) خلافت و سلطنت (تاریخ خلافت عباسیہ) از ڈاکٹر امیر حسن صدیقی ۱۳۷ صفحات پتہ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

(۲) تاریخ دستور حکومت ہند از ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ ۲۵۴ قیمت عالہ پتہ انجمن ترقی اردو دہلی

(۳) نیا شوالہ با تصویر (افسانے) از سید فرید جعفری قیمت عہ پتہ شانتی پربائی۔ فاطمہ اسٹیٹ۔ الہ آباد

(۴) الاکسیر جلد اول (حکیم محمد اعظم خاں کی اکسیر اعظم کا ترجمہ) ۴۰۸ صفحات قیمت للعہ پتہ دفتر المسیح۔ قرول باغ دہلی

(۵) اکسیر نورانی (دوسو مرکبات کے اجزاء اور فوائد) از حکیم نور محمد ۱۶۸ صفحات قیمت عہ پتہ از مرتب۔ رانی پورہ اندور مالوہ

(۶) خواتین دکن کی اردو خدمات از نصیر الدین ہاشمی ۲۹۲ صفحات۔ قیمت عا۔ پتہ عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن

(۷) رومان اور دوسرے رنگین افسانے مرتبہ ادارہ رسالہ رومان ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ پتہ مینجر رسالہ زیب النساء۔ لاہور

(۸) انسان کے حقوق (ایچ۔ جی ویلز کی کتاب کا ترجمہ) از ظفر قریشی بی۔ اے ۳۰۰ صفحات پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔

(۹) اردو مثنوی کا ارتقاء از پروفیسر عبدالقادر سروری ۳۴۴ صفحات قیمت عہ پتہ۔ سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد دکن

(۱۰) ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر از مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ ۵۰ صفحات پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

(۱۱) میری ہوش ربا داستان زندگی (انگریزی ناول کا ترجمہ) از مسعود جاوید ۲۸۰ صفحات۔ پتہ تعلیمی ٹریننگ پریس۔ لاہور

(۱۲) شاہان اسلام کی رواداریاں اور ہندو مصنفین از ملک فضل حسین ۱۶۸ صفحات الہ بخش اسٹیم پریس۔ قادیان

(۱۳) کلیہ عرائض نویسی جلد پنجم از دولت رام سیٹھی ۱۲۸ صفحات پتہ جنرل برقی پریس۔ جالندھر

(۱۴) جنرل روسس مع ترمیمات ۱۹۳۸ء جلد اول مترجمہ بابو کرشنا دیال ۴۱۰ صفحات پتہ آگرہ اخبار برقی پریس۔ آگرہ

(۱۵) کامل جدید موٹر سیکل گائیڈ از ایم۔ ایس۔ آغا ۴۶۶ صفحات پتہ حجازی پریس۔ لاہور

(۱۶) لطف زندگی۔ (ہندو مسلم اتحاد) از کا نشی رام چاولا ۲۱۶ صفحات۔ پتہ جنرل برقی پریس جالندھر

(۱۷) انکم ٹیکس اور مشکلات حساب از مدن گوپال ۱۳۸ صفحات پتہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور۔

مرزا سیف علی خاں

میکانی انقلاب

یوں تو مختلف فلاسفہ نے انسان کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں مگر سب سے زیادہ موزوں اور صحیح تعریف معلوم ہوتی ہے انسان ایک ہتیار والا حیوان ہے Man is an animal tools اس لئے کہ ہتیار کی تاریخ ایسی قدیم ہے جیسی کہ خود انسان کی یہاں تک کہ قدیم انسان کو خود اس کے ہتیار کی ماہیت کی نسبت سے نام دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ہم نوع انسان سے Eolithic زمانے میں دوچار ہوتے ہیں جب کہ وہ پتھر کے ہتیار استعمال کرتا تھا اس کے بعد کا زمانہ (قدیم حجری) کے نام سے موسوم ہے اس زمانے میں قدیم پتھر کے ہتیار سے انسان کام لیتا تھا اس کے بعد کا زمانہ (جدید حجری) کہلاتا ہے۔ اس زمانے کے ہتیار (قدیم حجری) زمانے کے ہتیاروں سے زیادہ اچھے اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتے تھے Reinderage کا انسان بارہ سنگھے کی سینگ اور ہاتھی کے دانتوں سے ہتیار بناتا تھا اور ان پر جانوروں کے نقش بنایا کرتا تھا جن میں بعض اب معدوم ہو چکے ہیں مثلاً Mammoth وغیرہ تھی کہ تانبے کا زمانہ آیا تو انسان نے تلوار، کلہاڑی وغیرہ بعض ایسے ہتیار بنائے جو اپنی خوبی وضع اور نفاست کے لحاظ سے اس زمانے کے ہتیاروں سے بہت کچھ قریب نہیں۔ انسان کو قدرت نے غیر مسلح پیدا کیا تھا وہ دوسری مخلوق کی بہ نسبت بہت ہی کمزور تھا نہ اس کے شیر کے سے پنجے تھے اور نہ وہ ہاتھی کا سا قوی ہیکل تھا تاہم اس کو ان سب سے عہدہ برا ہونا تھا اس نے اپنی عقل و فرا[ست] کے ہتیار کو استعمال کر کے دوسرے ہتیار تیار کئے جیسے آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مشین کی تخلیق دوسرے مشین کی مدد سے ہوتی ہے۔ ان ہی ہتیاروں کی مدد سے اس نے دوسری مخلوقات پر قابو پایا اور سب کو رام کیا یہاں تک کہ کئی ایک حیوان و نبات کے لئے اس کا وجود سم قاتل کا کام کیا چنانچہ ابھی حال میں لندن کا ایک درندہ Grey Wolf وہاں سے معدوم کر دیا گیا۔ انسان اگر یہ ہتیار صرف دوسرے جانوروں سے اپنی حفاظت کے لئے ہی استعمال کرتا تو یہ حقیقت میں اس کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا لیکن یہ ہتیار جو ایک مطیع و فرمانبردار خادم تھا اب ایک چڑچڑا مالک بن گیا انسان کا ہتیار اس کے لئے Boomerag ہو گیا۔ انسان اس کو انسان کے لئے استعمال کرنے لگا وہ تلوار جو کسی درندے پر اٹھتی تھی انسان پر اٹھنے لگی وہ خنجر جس کی پیاس ہرن اور بھیڑ کے خون سے بجھتی تھی انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہی ہتیار جو انسان کو غذا مہیا کرتا تھا انسان کو اپنی غذا بنا لیا۔ حرص و آز کی آب نے اس تلوار میں وہ جوہر پیدا کئے کہ Darius اور پھر اس کے بعد Xerxes یونان پہنچے تو ملک گیری کی طمع نے سکندر کو ہندوستان و ایران کھینچ لایا اسی تلوار نے Carthaginians اور Romans کے معرکے سر کئے۔ سارگن، حمورابی، سناچرب، اٹیلا اور ہلاکو اس تلوار کی پیداوار ہیں۔ اور بعد ازاں جب منگولوں نے بارود اور بندوق بنانا سیکھا تو اس ہتیار نے چنگیز خاں کے ہاتھوں یورپ و ایشیا کو لرزہ براندام کر دیا۔ اور پھر اسی ہتیار نے تیمور لنگ کو انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر دیکھنے اور خوش ہونے کے جنون میں مبتلا کر دیا اسی تلوار نے کہیں مجاہد کے ہاتھ میں آکر مذہب و ملت کے نام پر

لاکھوں جانیں لیں تو کہیں یہی ظالم ملک گیر فاتح کے حرص و آز کی تکمیل کا سامان بن گئی۔ کہیں Charlemagne تو کہیں Attila بن کر نظر آئی

گذشتہ صدی اور خصوصاً اس ربع صدی نے جنگ کو جو پہلے ہی سے ایک قیامت تھی۔ قیامت عظمیٰ کر دیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گذشتہ جنگ عظیم ہی میں ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا اور Justenian کے زمانے کی پلیگ سے کہیں زیادہ ہلاکتیں وقوع میں آئیں۔ موجودہ جنگ اس سے زیادہ مہیب ہے اور آئندہ جنگیں نہ جانیں کتنی زیادہ ہیبت ناک اور بھیانک ہونگی۔ یہ سب عصر حاضر کی میکانی ترقیوں کی وجہ سے جس کی تاریخ پر اب ہم روشنی ڈالینگے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ نپولین کے بے پناہ جنگی معرکوں سے تھک کر اپنی توجہ معاشری اور سیاسی مسائل کی طرف مبذول کر رہا تھا جو اب بھی اس کے سامنے موجود ہیں تو عین اسی زمانے میں سارے یورپ میں ایک نئے انقلاب کی موج دوڑ گئی۔ یہ نہ امریکہ کا سیاسی انقلاب تھا اور نہ فرانس کا جمہوری انقلاب بلکہ یہ تھا ہر ہ نئی انقلاب جس نے انسانی قوت اور زندگی کے مادی رخ میں ایک روح پھونک دی۔ یہ نئی روح اور جدید زندگی تھی سائنس داں کے غور و فکر کا نتیجہ۔ Rogers Bacon کی چھ سو سال قبل کی پیش گوئیاں رو بعمل ہی آ رہی تھیں عقل کے گوشہ نشین سائنس دانوں کی خاموش مساعی کا نتیجہ ہے کہ یہ انقلاب عوام کے سامنے آموجود ہوا۔ جس میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں ایجاد بھاپ کے انجن کی تھی اول اول جب لوہے کے پگھلانے کے لئے کوئلے کی ضرورت ہوئی تو یہ کوئلہ کانوں سے زیادہ تعداد میں حاصل کیا جانے لگا ان کانوں سے پانی خالی کرنے کے لئے سب سے پہلے Steam pumping Engine استعمال ہوا بعد میں James Watt نامی کے Glasgow کے باشندے نے جو ریاضی کے آلات بنایا کرتا تھا اس بھاپ کے انجن کو ترقی دے کر اس سے مشین کے چلانے میں مدد لی۔ اور اس قسم کا سب سے پہلا انجن Nottingham میں ۱۷۸۵ء میں روئی کی گرنیوں میں استعمال کیا گیا۔ ۱۸۰۱ء میں Trevithick نے پہلا انجن بنایا جس سے حمل و نقل کا کام لیا جاسکتا تھا ۱۸۲۵ء میں سب سے پہلی ریلوے ٹرین Stockton اور Darlington کے درمیان آمد و رفت کے لئے بنائی گئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک سارے یورپ میں ریلوں کا ایک جال بچھ گیا۔ انسانی زندگی کے جمود میں اس نئی ایجاد نے ایک غیر معمولی حرکت پیدا کر دی انسان ہفتوں کا سفر دنوں میں طے کرنے لگا۔ روس کی تباہی کے بعد جب نپولین Vilna سے Paris آیا تو کہتے ہیں اس کو باوجود عام سہولتیں مہیا ہونے کے اس سفر میں ۳۱۲ گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ معمولی مسافر تو اس سے دوگنے وقت میں بھی طے نہیں کر سکتا تھا یہ بات نہایت دلچسپی سے خالی نہیں کہ پانچویں صدی قبل مسیح سے انیسویں صدی تک انسانی حمل و نقل کے ذرائع بڑھانے اور سفر میں سہولتیں پیدا کرنے میں کوئی قابل لحاظ ترقی نہیں کی تھی۔ پیرس اور روم کا فاصلہ اٹھارویں صدی عیسوی میں مسافر اتنے ہی عرصے میں طے کر سکتا تھا جتنا کہ Rome اور Gaul کا فاصلہ طے کرنے میں وہ پہلی صدی عیسوی میں صرف کرتا تھا

یا جتنا کہ Susa اور Sardis کے فاصلہ کو طے کرنے میں ایک مسافر کو چوتھی صدی قبل مسیح میں صرف کرنا پڑتا تھا۔ جو سفر پہلے دس روز میں ہوتا تھا اب ایک روز میں ہونے لگا۔ گویا یورپ کے طول و عرض میں ریلوں کی ایجاد نے ۹ حصے کی کمی کر دی۔ اس کے ساتھ بھاپ کے ذریعہ چلنے والی کشتی بھی ایجاد ہوئی سنہ ۱۸۰۲ء میں۔ [illegible] Charlott Dundas of Clyde canal پر پہلی مرتبہ آزمائی گئی سنہ ۱۸۰۲ء میں ایک امریکی شخص Fulton ایک بڑے جہاز کا مالک تھا جس کا نام Clermont تھا۔ سب سے پہلا دخانی جہاز Phoenix جو نیویارک سے Philadelphia پہنچا امریکی تھا اور Savanah بھی پہلا امریکی دخانی جہاز تھا جس نے بحر اوقیانوس کو پار کیا تھا۔ ان تمام جہازوں کے paddle wheels ہوتے تھے جن کے ٹوٹ جانے کا بہت اندیشہ رہتا تھا Screw والے دخانی جہازوں کی ایجاد ہونے تک بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد سے سمندری سفر کے ارتقائی منازل بہت زیادہ تیزی سے طے ہونے لگے۔ ماوراء اوقیانوسی سفر جو ایک بڑی مہم سمجھا جاتا تھا اور مہینوں میں ہوتا تھا نسبتاً کم عرصے میں آسانی سے ہونے لگا۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں صرف پانچ دن میں ہوا ساری دنیا میں اسی طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے ہونے لگا۔ حمل و نقل کے ان بحری و بری ذرایع کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی میل ملاپ میں ایک اور جدید قوت شامل جس کی ایجاد کا سہرا Galvanic Volta

اور Faraday کے سر ہے مزید سہولتیں بہم پہنچائیں یہ تھی برقی قوت سنہ ۱۸۳۵ء میں برقی تار کا وجود ہوا۔ زیر آب برقیہ کے تار فرانس اور برطانیہ کے درمیان سنہ ۱۸۵۱ء میں بچھائے گئے۔ یہ ایجادیں انیسویں صدی کے لئے بہت ہی انقلابی اہمیت رکھتی تھیں لیکن حقیقت میں یہ اس بہت بڑی سائنٹفک ایجادوں کی فصل کے مقابل جو آئندہ کاٹی جانے والی تھی محض تمہید تھیں۔ لوہا جس کی مانگ اسلحہ اور مختلف مشینوں کی تیاری کے لئے بڑھتی جارہی تھی سنہ ۱۸۲۸ء میں Blast Furnace کی ایجاد کے بعد سے بڑی بڑی سلاخوں اور چادروں کی شکل میں حاصل کیا جا سکا۔ زمانہ قدیم میں فلس کاری کی غیر موجودگی کی وجہ سے انسان بھاپ کی مخفی طاقتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ معمولی Steam pumping Enjine لوہے کی چادروں کے بغیر نہیں تیار کیا جا سکتا۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں Bessemer کے قاعدے کی مدد سے لوہا ہر حالت میں پگھلایا جانے لگا اور اب برقی بھٹیوں میں سیکڑوں ٹن لوہا پگھلتا اور صاف ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے قبل کوئی جہاز دو ہزار ٹن سے زیادہ وزن کا نہیں تھا اور اب پچاس ہزار ٹن کا جہاز کوئی تعجب خیز چیز نہیں۔ یہاں ہم نے محض لوہے اور فولاد کی فلس کاری کا ذکر مثال کی طور پر کیا ہے ورنہ یہی حال تانبے سیسے اور متعدد دوسری دھاتوں کا بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی برقی قوت کو حرکی قوت۔ روشنی اور حرارت میں تبدیل کرنے کی قابلیت تانبے کے تار کے ذریعہ ایک مقام سے دوسرے مقام برق کو بھیجنے کی ہوسیں پیدا ہوئیں۔

علم کی اس گوناگوں ترقی میں فرانس اور برطانیہ سب سے پیش پیش تھے مگر اب جرمنی بھی اس طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس امر کا یہاں ذکر کر دینا ضروری ہے کہ انگلستان کی جامعات ان دنوں پاپائی اثرات کی زد میں آکر علم کو عوام تک پہنچانے سے قاصر تھیں وہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں کو بھی محض مذہبی تعلیم دے سکتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ یونانی اور لاطینی زبان کے ادبی انتخاب سے وہ بہرہ مند کر سکتی تھیں اسی طرح فرانس میں بھی تعلیم پر چرچ کا رنگ غالب تھا البتہ جرمنی جوان قیود سے نسبتاً جلد آزاد ہو چکا تھا سائنٹفک تحقیقات اور علمی سرگرمیاں کو فرانس اور انگلستان سے پہلے منظر عام پر لا سکا۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور فرانس کے سائنس داں کی ان تحقیقات سے اگرچہ کہ یہ دونوں ملک دولت مند ہونے لگے لیکن خود بیچارے موجد کو اپنی ایجاد سے کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا اس کا معمل اس کے لئے خم فلاطوں ہو گیا۔ اور اس کی کوئی قابل لحاظ ہمت افزائی نہیں کی گئی اس کے برخلاف جرمنی میں بڑے بڑے کارخانوں کے سرمایہ دار مالک سائنٹفک محقق کو نہیں بھولے۔ اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے جس کی وجہ سے جرمنی میں سائنس نے وہ ترقی کی کہ کچھ عرصے بعد سائنس کے ہر طالب علم کو جرمنی زبان کا سیکھنا ناگزیر ہو گیا۔ اور جرمنی صنعت و حرفت میں کہیں آگے نکل گیا۔

روم کے قدیم Pluto cycle نظام کا خاتمہ۔ علم و تحقیق کی عام اخوت کا احساس پیدا ہونا تحقیق و تجسس اور علمی جہان بین کا پردہ اٹھا اور شخصی مفاد کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اشاعت اشتراک عمل اور منفعت عام کی صورت اختیار کرنا یہ تھے وہ چند عناصر جو میکانی انقلاب کے لئے تازیانہ ثابت ہوئے۔ برطانیہ کی British Royal Society اور Florentine Society کا قیام بھی اسی قبیل سے ہے۔

اب برق اور بھاپ کے سوا ایک تیسری شئے کا وجود ہوا یعنی انجن میں پھیلاؤ کی قوت جو بھاپ کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھی اب ایک دھماکو آمیزہ سے حاصل کی جانے لگی۔ اس سے جو ہلکے انجن تیار ہوئے یونانی ہواباز Daedalus کے خواب کو پورا کر دکھایا یعنی انسان کا اڑنا ممکن ہو گیا۔

Smithsonian Institute Washington کے پروفیسر Langsley سنہ ۱۸۹۷ء میں ایک چھوٹا اڑنے والا مشین بنانے میں کامیاب ہوئے چند سال بعد Curtis نے کافی بڑا مشین تیار کیا امریکہ کے Wright Brothers کی کوششیں بھی اس سلسلہ میں ابتدائی اہمیت رکھتی تھیں۔ بالآخر سنہ ۱۹۰۹ء میں انسان ہوا میں اڑنے لگا۔ انیسویں صدی عیسوی میں لندن Edinburgh کا سفر ایک ہفتے میں طے ہوتا تھا اب اس عرصے میں نصف سے زیادہ دنیا کا سفر ممکن ہے۔ اس کے بعد بے تار برقی اور ریڈیو جیسی ایجادوں نے تو کم از کم کرۂ ارض کے لئے مکان و زمان کے فرق کو ختم ہی کر دیا۔ اگرچہ کہ آئن اسٹائن Einstein کا کہنا ہے کہ جب ہم

Universe کائنات سے بحث کریں تو محض وقت کہنا غلط ہوگا بلکہ Space Time کہنا چاہئے۔

یہ سارا انقلاب دنیا میں ایک صدی کے اندر اندر ہوا اور یہ انقلاب قلب ماہیت انسان کے لئے محض نعمت عظمیٰ بن کر نہیں آیا اس ابر رحمت کے آغوش میں گہر سے زیادہ بجلیاں تھیں۔ ان ایجادوں کے چمن میں گل سے زیادہ خار پنہاں تھے۔ اس علم و فن کی روشنی پر صبح قیامت کا گمان غالب آتا تھا۔ یہ انقلاب بجائے اس کے کہ ساری دنیا کے انسانوں کو انسانی اخوت کے ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا اور انسان کو alizan of the world بناتا طمع کو پہلے سے زیادہ تیز اور ہوا و ہوس کو عام کر دیا شاعر ورڈز ورتھ سے Goethe اور پھر Kipling سے Holstile اور Neetzshe میں بدل گیا۔ Gibbon نے اپنی کتاب The Decline and fall of Roman Empire میں یہ پیشن گوئی کی تھی کہ دنیا پھر کبھی چنگیز خاں اور Attila جیسے انسان پیدا نہیں کرے گی اور بربریت دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ مگر واقعات اس کے برخلاف ہیں بلکہ وہ جنگ جو اگلے زمانے میں محض ایک مقامی نزع ہوتی تھی اب ایک عالمگیر عذاب بن کر ساری نوع انسانی پر نازل ہوتی ہے۔ پھر موجودہ میکانی فتنہ سامانیاں اس کو اور بھی بدتر بنا دیتی ہیں۔

دنیا سے جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کی ان گذشتہ پچیس سالوں میں جو کوششیں ہوئی ہیں وہ سب پر روشن ہیں اور ان مساعی کی ناکامی بھی ظاہر ہے۔ ہماری رائے میں جنگ کو صرف ایک ہی طریقے سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ساری دنیا میں بیک وقت فوجی ہڑتال شروع کی جائے۔ کوئی شخص فوجی خدمت نہ کرے اور ایک World military strike کیا جائے۔ یہ بادی النظر میں ایک Utopian ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن سنہ ۱۹۰۴ء کے سوشل انقلاب کی کوششوں کے ناکام ہو جانے کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ روس Russia میں پھر سنہ ۱۹۱۷ء میں ایک انوکھا نظام یعنی مزدوروں Proletariat کی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ جب وہ ممکن ہو گیا تو یہ تجویز بھی بآسانی روبہ عمل آ سکتی ہے۔

محمد قطب الدین

مصر میں جب تک انگریزوں کا اقتدار ہے اس قسم کا اندیشہ بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن بہت ممکن ہے کہ جرمنی اور اطالیہ اور ذرائع اختیار کر کے شام میں اپنا عمل دخل حاصل کریں اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ شام میں ایک منظم اور طاقتور حکومت قائم رہے۔

(ح۔ص)

اسلامی دنیا

ترکی اور بلقان۔ گو بظاہر اطالیہ۔ جرمنی۔ اور روس کے آمر ایک دوسرے کے حلیف ہیں اور اس طرح انھوں نے اپنا ایک محور بنالیا ہے لیکن اس دوستی کی کسوٹی بلقان ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بلقان پر ان تینوں کی آنکھیں ہیں۔ جرمنی پٹرول اور تیل کے ذخائر کی وجہ سے رومانیہ پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ اس نے آئرن گارڈ کا جال رومانیہ میں ایک عرصے سے بچھا رکھا ہے۔ ادھر اطالیہ رومتہ الکبریٰ کا سنہرا خواب دیکھ رہا ہے اور وہ اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے بلقان پر قبضہ کرنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے تیسری جانب روس بلقان کو اپنے قبضے میں کرنے کی فکر میں ہے اس طرح دول محور کے ارکین بظاہر حلیف لیکن ایک دوسرے کے حریف ہیں اور بلقان کو اپنا مرکز بنا کر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

روس نے جرمنی کو راضی کر کے اور ذرا دھمکا کر بسارابیا اور بکوونیا حاصل کرلیا۔ ادھر ہنگری نے موقعہ غنیمت جان کر ڈابروجی کا مطالبہ شروع کردیا۔ تیسری طرف ہٹلر نے آئرن گارڈ کی مدد سے شاہ کیرول کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ کیرول اپنے بیٹے شہزادہ مائیکل کے حق میں دست بردار ہوگئے اور سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت رومانیہ میں وزیراعظم ایم انٹونسکیو کی آمریت ہے۔

یہ آگ اور بھڑک جاتی لیکن اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا سبب ترکی ہے۔ اطالیہ کی نظریں یونان پر پڑ رہی ہیں دراصل وہ یونان سے کار فو چاہتا ہے اس لئے محض ایک جہاز کے ڈوبنے کو بہانہ بنا کر یونان سے وہ لڑنا چاہتا تھا مگر محض ترکی کی وجہ سے یہ آگ بھی ٹھنڈی پڑ گئی اس لئے کہ چھ ماہ قبل ہی یونان ترکی اور یوگوسلاویہ وغیرہ کے درمیان معاہدہ طے پاچکا ہے جس کی رو سے یونان کی امداد کا ترکی نے وعدہ کیا تھا چونکہ اطالیہ ترکی سے لڑنا نہیں چاہتا اس لئے اس نے مجبوراً یونان کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا۔

روس اور ترکی کی بڑھتی ہوئی دوستی کو دیکھ کر جرمنی رشک وحسد سے جل اٹھا۔ چونکہ اس کی ترکی سے دوستی نہ ہوسکی اس لئے اس نے ایک اور چال چلی اور غلط طور پر یہ پروپگنڈہ کرنا شروع کردیا کہ روس ترکی سے کسی حصے کا مطالبہ کر رہا ہے تاکہ اس طرح روس اور ترکی کے تعلقات کو ناخوشگوار کردے۔ اس غلط پروپگنڈے کی تردید غازی عصمت انونو صدر جمہوریہ نے ایک حالیہ تقریر میں کی۔ انھوں نے صاف طور پر یہ اعلان کردیا کہ اگر ترکی کی داخلی پالیسی اور اقوام عالم کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات اور معاہدات کے معاملات میں دخل اندازی کی گئی تو ترکی اس کا دنداں شکن جواب دے گا۔ اگرچہ کہ غازی موصوف نے اس سلسلہ میں کسی مخصوص قوم یا ملک کا نام نہیں لیا لیکن ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ اشارہ کس کی طرف ہے

مصر۔ یاد ہوگا کہ آمر اطالیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ مصر پر حملہ نہیں کریں گے لیکن وہ آمر ہی کیا جو جھوٹ نہ بولے۔ اب اطالیہ کی نیت بدل رہی ہے اس کے تیور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مصر پر حملے کا متمنی ہے۔ اور مصر پر یہ الزام تراشا جارہا ہے کہ چونکہ وہ برطانیہ کے زیر اقتدار ہے اس لئے اطالیہ اسے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ ضیغم اطالیہ کی اسلام دوستی کا اس وقت علم ہوگیا تھا جب وہ البانیہ پر قبضہ کر چکے تھے مگر بہرحال مصر ان حملوں کے لئے تیار ہے۔

حال میں یعنی ۲۷ر اگست کو حسن صبری پاشا وزیر اعظم نے چند انتظامی مصلحتوں کے تحت اپنی کابینہ کا استعفا پیش کر دیا لیکن جلالۃ الملک شاہ فاروق نے استعفیٰ قبول کرنے کے بعد انھیں حکم دیا کہ وہ نئی کابینہ تشکیل دیں۔ چنانچہ نئی کابینہ تشکیل پا چکی ہے اور امید ہے کہ مصر کو اطالوی خطرے سے بچانے کے لئے یہ کابینہ اپنی پوری کوشش صرف کر دے گی۔ اور یہ یقینی ہے کہ اگر اطالیہ مصر پر حملہ کر دے تو مصر اور برطانیہ باہم متحد ہو جائیں گے چنانچہ اسی سلسلہ میں مصری متحرک ڈویزن حربی اہمیت کے مقامات پر پہنچ چکی ہے اطالیہ نے مصر سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے چنانچہ اسکندریہ اور نہر سوئیز پر اس کے ہلکے ہلکے حملے ہو رہے ہیں۔ لیکن مصری افواج اس کا دنداں شکن جواب دے رہی ہیں بہر حال میثاق سعد آباد کی وجہ سے بھی مصر بہت زیادہ محفوظ ہے اور مصر پر حملہ کرنا گویا ایک سوتے ہوئے فتنے کو جگانا ہے۔

شام ۔ فرانس کے جرمنی اور اطالیہ کے روبرو سر تسلیم خم کر دینے کے بعد شام اپنی آزادی کے لئے پوری پوری کوشش کر رہا ہے عوام کے رجحانات زیادہ تر ترکی کی طرف ہیں۔ چنانچہ ترکی کی حمایت میں ڈاکٹر جیلانی کی قیادت میں دمشق کے بازاروں میں زبردست مظاہرے کئے گئے۔ اور نعرے لگائے گئے کہ "شام پر فرانس کا انتداب ختم ہو گیا۔ آج سے شام آزاد ہے۔ شام کو ترکی حفاظت میں دے دیا جائے۔"

اس کے علاوہ فرانسیسی فوج کے بہت سے عرب سپاہی شام کی حدود کو پار کر کے فلسطین میں داخل ہو گئے ہیں اور آئندہ چند ہفتوں کے اندر شام میں زبردست بغاوت کا امکان ہے۔

جو لوگ شام کی بیس برس کی تاریخ اور اس کی ابتدائی حیثیت سے واقف ہیں وہ شامیوں کے اس اعلان کو کہ "اب فرانسیسی انتداب ختم ہو گیا" اور "شام آزاد ہے" غلط نہیں سمجھ سکتے۔

شام کو جنگ عظمیٰ کے بعد مجلس اقوام نے فرانسیسی جمہوری حکومت کے انتداب میں دے دیا اور انتداب یاب دول نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کو بتدریج آزادی دے دی جائے گی۔ شام نے شروع ہی سے یہ دعویٰ کیا کہ اس میں صلاحیت آزادی موجود ہے ان نے ابتدا ہی میں اپنی صلاحیت کے مظاہرے کے لئے فرانس کی ابتدائی حکومت کے خلاف ہتیار اٹھا لئے اور جتنی بڑی قربانیاں اس نے اپنی آزادی کی خاطر برداشت کیں ان سے دنیا واقف ہے۔ فرانسیسی حکومت اپنی طاقت کے بل بوتے پر شام کی اس تحریک آزادی کو دبانے میں کامیاب ہوتی رہی مگر اس مطالبہ آزادی کا گلا اپنی آخری سانس تک بھی نہ گھونٹ سکی اس نے اپنے اچانک بستر مرگ پر پڑ جانے سے قبل کئی بار وہاں کے دستور میں تبدیلیاں کیں اور اپنی موت سے کچھ ہی پہلے اس نے اس کو عراق کا مرتبہ دینے کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ لیکن آج فرانس کا تختہ الٹ گیا ہے، خود مجلس اقوام درہم برہم ہو گئی اور اس کے کئی اراکین جرمنی کے آہنی پنجے میں پھنس کر دم توڑ چکے ہیں جب یہ حالت ہے کہ نہ انتداب دینے والی مجلس اقوام باقی ہے اور نہ وہ فرانسیسی حکومت جس کو انتداب دیا گیا تھا تو پھر شام کا یہ اعلان کہ "اب وہ آزاد ہے" آئینی طور پر غلط نہیں ہو سکتا۔

جرمن عارضی صلح کے کمیشن کے ایک نمائندے کو عنقریب شام روانہ کیا جا رہا ہے تاکہ اطالوی عارضی صلح کے مطالبات کی تائید کرے۔ بظاہر یہ کمیشن اطالوی قیدیوں کو رہائی دلانے اور فوجی ساز و سامان کی فہرست مرتب کرنے کے لئے تشکیل دیا گیا ہے لیکن اس کا اصلی مقصد شام کو اطالوی مقاومت کے ناقابل بنانا ہے اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ کمیشن شام سے تمام سامان حرب۔ آئیل ٹینک سے لے کر ہوائی جہاز اور مسلح موٹروں کو منتقل کر دے گا۔ لیکن شام کے باشندے ہر قوت کے مقابلے کے لئے تیار ہیں۔

افغانستان۔ افغانستان موجودہ جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر چکا تھا۔ حال ہی میں افغانی پارلیمان کی چوتھی میعاد کا افتتاح کرتے ہوئے جلالتہ الملک ظاہر شاہ نے فرمایا کہ "موجودہ جنگ کے آغاز سے ہی افغانستان نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ حالانکہ جنگ میں شامل ہونے والے ممالک سے اس کے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ افغانستان کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ اپنے قومی مفاد کی حفاظت کی جائے" ملک ـــــــــــــ ن کو دور کرنے اور ملک کو خوش حال بنانے کی اسکیموں کا ذکر کرنے کے بعد آپ نے دنیا میں امن و امان کے قیام کے لئے دعا فرمائی۔ میثاق سعد آباد کے بعد ترکی اور افغانستان کے تعلقات نہایت ہی دوستانہ ہو گئے ہیں۔ حال ہی میں سفیر افغانستان نے ایک ملاقات کے دوران میں ایک صحافتی نامہ نگار سے کہا کہ افغانستان کی عسکری قوت میں اضافہ کرنے کے لئے ترکی پوری پوری کوشش کر رہا ہے چنانچہ اس وقت بھی کابل میں ایک ترکی عسکری مشن موجود ہے جو افغانی فوج کو موجودہ طریقہ ہائے جنگ کی تربیت دے رہا ہے ایران ترکی اور افغانستان کا یہ اتحاد قریب میں عالم اسلام کے لئے ایک اچھے مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔

ایران۔ تیل کے چشموں کی خداداد دولت سے مالامال ہونے کی وجہ سے ایران روس کی عقابی نظروں کا ایک عرصے سے شکار بنا ہوا ہے لیکن ایران کے برطانیہ کے ساتھ تیل کے چشموں کے سلسلے میں معاہدات طے ہو چکے ہیں تجارتی معاہدے کی رو سے ایرانی برطانوی آئیل کمپنی دونوں حکومتوں کی مشترکہ ملک ہے اور برطانیہ اس میں چالیس فیصدی حصص کا مالک ہے گو رسمی طور پر افغانستان اور ایران غیر جانبدار ہیں لیکن درحقیقت وہ برطانیہ ہی سے وابستہ ہیں جب سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ خلیج فارس' عراق' اور ایران اور ہندوستان میں پٹرول کے ذخائر برآمد ہوئے ہیں نازیوں اور فاشسٹوں کے لائحہ عمل میں تبدیلی ہو گئی ہے چنانچہ مشرق وسطی اور مشرق قریب پر ان ممالک کی نظریں پڑ رہی ہیں لیکن دول سعد آباد پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہیں ہے۔

عرب و فلسطین۔ عرب آمریت سے متنفر ہونے کی وجہ سے اتحادیوں کا ابتدا ہی سے ساتھ دیتے آئے ہیں۔ گو بظاہر برلن نشرگاہ نے عربوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن عرب اس کے پھندے میں نہ آ سکے۔ دوسری طرف اطالیہ نے بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ عربوں کا حلیف ہے لیکن عربوں کے سامنے البانیہ کی مثال ہے اور وہ اطالیہ کی اسلام دوستی سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔

اب یہ خبریں آ رہی ہیں کہ اطالیہ نے فلسطین اور

مصر پر حملہ شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے تمام عربوں میں آمریت کے خلاف منافرت کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اطالیہ کو اس حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اس مرتبہ عازمین حج پریشان تھے کہ کہیں موجودہ جنگ انھیں اپنے فرض کی تکمیل سے روک نہ دے لیکن حکومت حجاز نے اعلان کر دیا ہے کہ اس سال حسب معمول حج ہوگا خیال کیا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ کو جانے والی خشکی اور سمندر کی راہیں جو بحیرۂ احمر کی بندرگاہ جدہ سے گذرتی ہیں حاجیوں کے لئے محفوظ ہیں۔ سعودی حکومت ارض مقدس کو جانے والے حاجیوں کی ممکنہ امداد کرے گی۔

محمد جلال الدین جعفر

حالات حاضرہ

جنرل دوگال اور فرانس جنرل دوگال ایک ہوشیار سپاہی ہیں لیکن ان کی شہرت محض سپاہیانہ قابلیت پر مبنی نہیں بلکہ وہ اس وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے کہ انھوں نے امن کے بیس سال تک فرانس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے آلات حرب پرانے ہوگئے ہیں اور کسی دشمن کے مقابلے کے لئے نئے آلات کی ضرورت ہے۔ ان کی کتاب "فوجی مصلحت کے خلاف" Vers l' Armee de metier جو سنہ ۱۹۳۴ء میں چھپی تھی فرانس کو اس کی گہری نیند سے جگانے کے لئے کافی تھی لیکن اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ البتہ ایم۔ رینا ہی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے اس کتاب کے مطلب کو سمجھا چنانچہ انھوں نے سنہ ۳۵ء میں "فرانس کے فوجی مسائل" Le probleme Militaire francais کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کے ذریعہ فرانس کو آنے والے خطرے سے جگانے کی کوشش کی۔ انھوں نے پیشین گوئی کی کہ بلجیم پر حملہ ہوجائے گا اور یہ کہ بلجیم کی طرف سے دشمن کے حملے کا قوی اندیشہ ہے لیکن ان کی آواز صحرا میں گم ہوکر رہ گئی۔ فرانس نے مژینو لین اور اپنی شہری فوج پر پورا بھروسہ کیا اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جنرل دوگال اپنی قوم کو جگانے کی برابر کوشش کرتے رہے گو انھیں اندیشہ تھا کہ ان کی قوم بہت دیر کے بعد ان کا مطلب سمجھ سکے گی۔

بالآخر جب فرانس ہار گیا اور پیتاں کی حکومت نے نازیوں کی غلامی اختیار کرلی تو جنرل دوگال جو آج کل لندن میں ہیں میدان میں کود پڑے۔ انھوں نے آزاد فرانسیسیوں کو اپنے ساتھ اکٹھا کیا اور انگریزوں کے دوش بدوش دشمن کے مقابلے کے لئے ڈٹ گئے۔ ۱۸ جون سنہ ۴۰ء کو انھوں نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا "اگرچہ بعض فرانسیسی جنرل جرمنی دباؤ، طیاروں اور ٹینکوں کے سامنے ہمت ہار چکے ہیں لیکن ابھی فرانس ختم نہیں ہوا ہے۔ میں تمام فرانسیسی افسروں اور ان لوگوں کو جو برطانوی علاقوں میں موجود ہیں اس امر کی دعوت دیتا ہوں کہ ہمارے ساتھ اشتراک عمل کریں"۔ اس کے چھ دن بعد "فرانسیسی قومی کمیٹی" تشکیل پائی اور جنرل دوگال نے اس کے مقاصد بیان کئے اور اعلان کیا کہ وہ فتح حاصل ہونے تک انگریزوں کا ساتھ دیں گے۔ چند روز بعد برطانوی حکومت نے دوگال کو تمام آزاد فرانسیسیوں کا رہنما تسلیم کر لیا اور جنرل دوگال نے بھی یہ تہیہ کر لیا کہ سلطنت برطانیہ میں جتنے فرانسیسی رہتے ہیں یا وہ جو بعد کو آکر شامل ہوجائیں ان سب کی صحیح قیادت کریں گے چنانچہ ۸ جولائی سے اولمپیا میں "آزاد فرانسیسیوں" کی بھرتی شروع ہوگئی اور ایسے لوگ جو برطانیہ کے ساتھ اشتراک کرنے پر آمادہ تھے ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ جنرل دوگال نے اپنی ایک عام تقریر میں کہا "ہمیں یقین ہے کہ وہی ہتھیار جن کی وجہ سے پہلے دن دشمن کو کامیابی ہوئی آئندہ ہماری کامیابی کے ضامن ہوں گے۔"

اس نے چھ ہزار دبابوں اور چھ ہزار طیاروں سے ہم کو شکست دی تھی اب ایک دن ایسا آئے گا کہ ۲۰ ہزار دبابے اور ۲۰ ہزار طیارے اسے تباہ کر کے چھوڑیں گے۔"

رومانیہ کا حشر۔ پچھلے چند روز سے رومانیہ نے جرمنی کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کی اور اس کے لئے رومانیہ کو بہت سی قربانیاں بھی کرنی پڑیں چنانچہ اسے روس کو اپنا کچھ علاقہ دینا پڑا لیکن جرمنی کی یہ دوستی رومانیہ کے کام نہ آئی۔ وہ ببینوں کے جال میں پھنس گیا۔ بسرابیا اور بکوینا کھو دینے کے بعد بھی اسے چین نہ مل سکا اور اب ہنگری اور بلغاریہ نے اپنے مطالبات آگے بڑھانے شروع کر دئے رومانیہ کے وزیر دوڑے ہوئے برلن گئے کہ شاید اس نئے دوست سے کچھ کام بن سکے لیکن وہاں انھیں مایوسی ہوئی اور ان سے یہی کہا گیا کہ رومانیہ کو بلقان کے امن کے لئے ضروری قربانی کرنی چاہئے۔ ادھر ہنگری اور بلغاریہ نے ٹران سلوے نیا اور دوبروجہ کے مطالبے میں سختی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز بعد رومانیہ کو بلغاریہ کی مانگیں پوری کرنی پڑیں اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہنگری کو بھی مطمئن کرنا پڑا۔ یعنے ۳۰ اگست کو ویانا میں ایک راضی نامہ پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے رومانیہ اور ہنگری کی سرحدوں کا تعین ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ رومانیہ اور ہنگری کی جرمن اقلیتوں کا مسئلہ بھی طے پایا۔ لیکن رومانیہ میں جو کچھ ہوا وہ صرف یہی نہیں تھا کہ بہت سے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ رومانیہ کی حکومت بدل گئی اور جنرل انطونسکو نئے وزیر اعظم بنے یہاں تک کہ خود شاہ کیرول کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا ان کی جگہ کیرول کے بیٹے مائی کیل کو بٹھا دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی قربانیوں کے بعد رومانیہ نے بلقان کا امن خریدا اور بلقان کا ایک نیا اٹھتا ہوا فتنہ دب گیا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس عارضی امن کے لئے رومانیہ نے بہت بڑی قیمت ادا کی۔ مگر شاید اسے ایسا کرنا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ کمزور تھا اور کمزوروں کو محفوظ اور امن کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے اس قسم کی قربانیاں کرنی ہی پڑتی ہیں۔

بلجیم کے متعلق نازی ارادے۔ وسط یورپ میں نازی جس قسم کا پروپگنڈہ کر رہے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ بلجیم کے وجود کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلجیم کی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ اسے ایک ماتحت ریاست بنا لیا جائے گا اور اس طرح برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ایک واصل سلطنت قائم کر دی جائے گی۔ اس کے لئے غالباً ریاست فلانڈرس کی نئی تعمیر کی جائے گی جس میں بلجیم فرانس اور ہالینڈ کے علاقے لئے جائیں گے ۔ . . . .

. . . . یہ خیال بلجیم والوں کا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نازیوں کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں رہا اور اسی لئے وہ برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ایک واصل سلطنت . . . . . کے قیام کی فکر میں ہیں۔

شام اور برطانیہ۔ شام میں اس کا قدیم نظم و نسق برابر قائم ہے اور ایک بڑی منظم فوج اس کی حفاظت کے لئے تیار ہے چند روز سے یہ خبر مشہور ہو رہی ہے کہ برطانیہ شام کو تقسیم کر کے اسے اپنے اور ترکی کے درمیان بانٹ لینا چاہتا ہے لیکن یہ محض دشمن کا پروپگنڈا ہے۔ اس کے ساتھ یہ خبر بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ شاہی ہوائیہ نے باکو کے تیل کے چشموں پر حملہ کی کوشش کی۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ برطانیہ روس کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے یہ خبر بالکل خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے چنانچہ ترکی کے حالیہ سرکاری بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس قسم کی تمام جھوٹی خبریں ترکی اور روس کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے پھیلائی گئی ہیں اور ان کی حیثیت جھوٹے پروپگنڈے سے زیادہ نہیں برطانیہ اصل میں یہ چاہتا ہے کہ شام پر دشمن کا ہاتھ نہ پڑ سکے۔ مشرقی بحر روم ۔

باقی صفحہ (۵۹) پر دیکھئے۔

سب رس کتاب گھر کی بعض اہم کتابیں

۱۔ طوطی نامہ مجلد از غواصی ۱۲ر
۲۔ پھولبن از ابن نشاطی ۸ر
۳۔ قصۂ بے نظیر مجلد از صنعتی ۱۲ر
۴۔ کلام الملوک مجلد سلاطین دکن کا فارسی کلام ۱۲ر
۵۔ سیف الملوک و بدیع الجمال مجلد از غواصی ۸ر
۶۔ جدید اردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری ۸ر
۷۔ تنقیدی مقالات مجلد از ڈاکٹر زورؔ ۴ر
۸۔ یورپ کے تاثرات از بدر شکیب ۲ر
۹۔ نظر کے دھوکے از بدر شکیب ۲ر
۱۰۔ محبت کا فسانہ مجلد از ل احمد ۸ر
۱۱۔ ادب اور زندگی از مجنوں گورکھپوری ۲ر
۱۲۔ آغاز ہستی از مجنوں گورکھپوری ۱۵ر
۱۳۔ میری جدوجہد مجلد ۸ر
۱۴۔ ضمیر از عبدالرحمٰن خاں سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ ۱۲ر
۱۵۔ قنوطیت از ڈاکٹر ولی الدین ۱ر
۱۶۔ اکبر اعظم از خواجہ نصیر الدین لکچرار گلبرگہ کالج ۱ر
۱۷۔ ارباب نثر اردو از پروفیسر سید محمد ۱ر
۱۸۔ اردو شہ پارے مجلد از ڈاکٹر زور ۴ر
۱۹۔ انوری بیگم از طیبہ بیگم مرحومہ ۸ر
۲۰۔ دھوئیں کی پھانسی ۱۰ر
۲۱۔ جنون و حکمت ۱۲ر
۲۲۔ کسان ۲ر
۲۳۔ شریر لڑکا ۴ر
۲۴۔ بچوں کا انصاف ۴ر

بچوں سے

اس سے تو آپ سب واقف ہیں کہ گزشتہ ماہ ادارہ کے امتحانات نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ اکثر اضلاع میں بھی ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پہلا امتحان تھا تاہم بہت سے امیدوار اس میں شریک ہوئے اور متعدد کامیاب بھی ہوگئے چنانچہ اردو فاضل کے امتحان میں (۱۱) امیدوار شریک تھے جن میں سے (۶) کامیاب ہوئے۔ اردو عالم میں (۶۰) شریک رہے اور (۴۴) کامیاب ہوئے جن میں سے (۳) امیدواروں نے بدرجۂ اول کامیابی حاصل کی۔ خوش نویسی کے امتحان میں (۹) شریک رہے اور (۵) کامیاب ہوئے ایک بدرجۂ اول۔ اردو دانی کے امتحان میں (۱۳۵) شریک تھے اور (۱۲۹) کامیاب ہوئے اور (۱۵) امیدواروں نے بدرجۂ امتیاز کامیابی حاصل کی۔

آتش بازی

معین الدین احمد انصاری

آہا آیا ماہ شعباں
چھوٹے پٹاخے دھڑ دھڑ دھن دھاں
پھٹا وہ دھن دھن ہوا یہ پٹ پٹ
سر سر، سو سو پھس پھس چٹ چٹ
کہیں ہو گلابی کہیں ہیں چھریاں
کہیں پٹاخے کہیں ہیں لڑیاں
مرچی، بچھو، سانپ، بگولا
میں نے کیا کیا نہیں ہے مولا
تن من دھن میں آگ لگی ہے
سوکن سوکن جل کے مری ہے
انار اڑا لونڈی کنارے
پیچھے بھاگے چاند ستارے
اوہو دیکھو رنگ جھڑی میں!
قوس قزح سے بڑھ کر رنگ ہیں
سپیاری پروارے نیارے
چودھویں شب کے سب مہ پارے
یہ ہے تار پلاٹینم کا
آگ لگاتے ہی بس چمکا
اینچ رہیں اس کے آگے سارے
اللہ میاں کی بجلی کے دھارے
جونہی جلائی دیا سلائی
موذی سب کے عیب بتائی
چھی چھی تم کو ناک نہیں ہے
ناک نہیں ہے ناک نہیں ہے
خوب ہے تیری کرشمہ سازی
واہ رے میری آتش بازی
توپ، تفنگچہ، بندوق اور بم
غرض کہ کوئی چیز نہ تھی کم
شب بھر خوب رہا یہ رنگ ڈھنگ
جیسے یورپ، جرمن کی جنگ

مسیح الدین خاں متین

ادب

ادب کے معنی ہیں نیک اطوار۔ ہر چیز کے انداز کا خیال اور ہر شخص کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا جو شخص جس لیاقت و دانائی کا ہو' اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنا۔ مجمع عام میں بزرگوں کی تعظیم و تکریم کرنا وغیرہ۔ یہ سب چیزیں ادب میں داخل ہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ۔

"باادب بانصیب' بے ادب بے نصیب۔"

باادب ہمیشہ خوش و خرم رہتا ہے۔ سب لوگ اس کے مداح اور طرف دار' جملہ خویش و اقارب اس سے خوش اور راضی' غرض سب اس کے مددگار رہتے ہیں۔

یوں تو ہر انسان میں ادب کا ہونا بہت اچھا ہے مگر بچوں میں خاص کر اس کی بے حد ضرورت ہے وہ ادب ہی کی بدولت کمال حاصل کر سکتے ہیں اور سب کی نظروں میں عزیز رہتے ہیں۔ اگر ان کی طبیعت میں یہ نیک خو داخل ہوگئی اور پائدار ہوگئی تو تمام عمر ان کے کام آتی ہے۔

باادب بچوں پر استاد دل و جان سے مہربان رہتے ہیں اور ان کو شوق اور دلچسپی سے پڑھاتے ہیں۔ اور والدین بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

بے ادب اور گستاخ بچوں سے غیر تو خیر والدین تک نفرت کرتے ہیں۔ اور اکثر اوقات گھر سے بھی نکال دیتے ہیں۔ بے ادب کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

آج کل کے لڑکوں اور اکثر لڑکیوں نے گستاخی اور بے ادبی کو آزادی سمجھ رکھا ہے۔ بزرگوں کے سامنے بے باکانہ اور گستاخانہ گفتگو کرتے ہیں۔ گویا خود کو عقلمند اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اور اپنے کئے پر فخر بھی کرتے ہیں۔

آج کل کے نوجوان طالب علم ایسے ہیں کہ جہاں انھوں نے چار کتابیں انگریزی کی پڑھ لیں اور کچھ ادھر ادھر کی کتابیں دیکھ ڈالیں' بس حکیم دانا ہو گئے۔ بزرگوں کی باتوں سے انکار' مذہبی مسائل پر اعتراض' بات بات میں حجت اور تکرار کرنے لگتے ہیں۔ مگر جب ان سے بحث کی جاتی ہے اور دلیل مانگی جاتی ہے۔ تو وہ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بعض اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں اور بعض تو ایسے جہل مرکب میں گرفتار ہوتے ہیں کہ باوجود کچھ نہیں جاننے کے اپنے کو سب کچھ اور ہمہ داں خیال کرتے ہیں۔ اور "ہمچوں دیگرے نیست" کے خیال میں تباہ ہوئے جاتے ہیں۔ یہ کوتاہ بیں جس کو آزادی سمجھتے ہیں۔ وہ آزادی نہیں بلکہ جہالت ہے۔ آزادی کی نیک عادت کا تقاضا اور شرط یہی ہے کہ چھوٹے بزرگوں کا ادب کریں۔ اگر

بڑوں کی بات کا جواب دینا بھی ہو تو نہایت نرمی اور بردباری سے ان کی بزرگی کا خیال رکھ کر دیں۔ کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بزرگوں کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔

معصومہ بیگم

کاہلی کی لعنت

عزیز بچو! یوں تو دنیا میں سیکڑوں بری چیزیں ہیں لیکن جو چیز ہماری ساری زندگی کو تباہ و برباد کر دیتی ہے وہ کاہلی ہے۔ اگر یہ بری بلا بچپن ہی سے ہمارے سر ہو جائے تو پھر اس سے چھٹکارا بہت مشکل ہے۔ (the child is the father of the man) انگریزی کی پرانی مثل ہے یعنی جو عادتیں بچپن ہی سے ہماری طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ بڑے ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں اس لئے اگر بچپن ہی سے اچھی باتوں کی عادت کریں تو زندگی کامیابی کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اچھی اور بری باتوں میں تمیز نہیں کرتے وہ دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

کاہلی کا دوسرا نام موت ہے اور کاہل آدمی ہمیشہ زندہ درگور رہتا ہے۔ کھوئی ہوئی دولت محنت سے دوبارہ جمع ہو سکتی ہے، صحت کی خرابی اعتدال اور پرہیز سے دور ہو سکتی ہے، بھولا ہوا سبق یاد کرنے سے تازہ ہو سکتا ہے لیکن کیا کسی نے کھوئے ہوئے وقت کو پایا اور ضایع کئے ہوئے موقعوں کو پھر حاصل کیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کاہل آدمی کی مثال ایک ایسی گھڑی کی سی ہے جو چل تو رہی ہے مگر اس کی سوئیاں غائب ہیں اور اس طرح اس کا چلنا اور نہ چلنا دونوں برابر ہیں۔ کاہل آدمی ایک ایسے راستے پر چلتا ہے جو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور جس پر ٹھیرنے کے لئے بہت کم مقامات ملتے ہیں۔ یہ سمجھو کہ وہ سڑک نہیں بلکہ ایک ڈھلوان چٹان ہے جس پر سے پھسل کر گرنا یقینی ہے۔ جگنو کو تم نے کئی بار دیکھا ہوگا لیکن کبھی یہ بھی غور کیا کہ وہ اپنی پوری چمک کب دکھاتا ہے۔ جب وہ ہوا میں اڑتا ہے تو اسی وقت اپنی پوری چمک دکھاتا ہے اور تم اس کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہو۔ اور جب وہ کسی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے تو اس کی چمک میں کمی پیدا ہو جاتی ہے یہی حال انسان کے دماغ کا بھی ہے۔ جب انسان اپنے دماغ سے کام نہیں لیتا ہے تو اس پر ایک قسم کی تاریکی چھا جاتی ہے۔

کاہل آدمی میں دنیا بھر کی برائیاں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ مقولہ بالکل سچ ہے کہ کاہل دماغ

شیطان کی فیکٹری ہے جہاں سے ہر قسم کی برائیاں ڈھل کر باہر نکلتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح شیطان دوسروں کو بھٹکاتا ہے کاہل آدمی شیطان کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ گوئٹے کہتا ہے کہ فطرت کبھی آرام نہیں لیتی اور ہر بیکاری پر لعنت بھیجتی ہے۔ بیکاری کے سبب جتنی برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور کسی چیز سے نہیں ہوتیں۔

فرانس کے قید خانہ میں ایک قیدی کے سیدھے بازو پر یہ الفاظ گودے ہوئے تھے کہ انہی نے مجھے دھوکا دیا، حال مجھے ستا رہا ہے اور مستقبل ڈرا رہا ہے۔ بیکاری ایک ایسا جادو ہے جس سے جیل خانوں کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ کسی شہر کے ۹۰ فیصدی قیدیوں نے بیکاری کے سبب قید خانہ کی صورت دیکھی۔ جب سر ہورلیس ویرے سے اس کے بھائی کی موت کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ بیکاری نے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ ایک دفعہ ایک کاہل آدمی نے شکایت کی کہ اس کے بال بچوں کی پرورش کے لئے اسے کہیں بھی روزی نہ مل سکی۔ یہ سن کر ایک ایمان دار اور محنتی مزدور نے جواب دیا کہ روزی حاصل کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح ایک ٹیڑھا پودا بڑا ہو کر ٹیڑھا درخت ہی رہتا ہے اسی طرح ایک کاہل بچہ آگے چل کر کاہل آدمی بن جاتا ہے۔ کاہلی جب لوگوں میں پھیلتی ہے تو اس کی ابتدا

کڑی کے جالے کی طرح بودی ہوتی ہے لیکن اس کی انتہا لوہے کی زنجیروں سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت ہم کچھ بھی نہیں ہیں تو پھر بھی ہم کو کچھ بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سستی اور کاہلی اس قدر آہستہ پھیلتی ہے کہ ہم کو خبر تک نہیں ہونے پاتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ ایکا ایک ہم پر چھا جاتا ہے۔ کاہل بننا گویا مفلس بننا ہے۔ آرام انہی لوگوں کو خوش گوار اور بھلا معلوم ہوتا ہے جنھوں نے محنت کے بعد اسے حاصل کیا ہے۔ یہی آرام ان لوگوں کے لئے مصیبت کا پہاڑ بن جاتا ہے جنھوں نے اس کو بغیر محنت اور کوشش کے حاصل کیا ہو۔

کاہلی سوسائٹی کا سب سے بڑا جرم ہے۔ کسی زمانے میں انگلستان میں بیکار رہنے والوں کو عمر بھر سزائے قید بھگتنی پڑتی تھی۔ جو شخص بیکار رہتا تھا اس کے کوڑے لگائے جاتے تھے اگر دوسری دفعہ بھی وہ بیکار پایا جاتا تو اس کا کان کاٹ ڈالتے اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو جیل خانے بھیج دیا جاتا جہاں اس سے سخت سے سخت کام لئے جاتے۔

ایک مالدار نوجوان نے اپنی کالج کی زندگی ختم کرنے کے بعد تمام دنیا کا سفر کیا اور جب گھر لوٹا تو بیکاری میں اس کے دن کٹنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی دوبھر ہو گئی۔ بیکاری

تنگ آکر اس نے اپنے ایک دوست سے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کا دوست کسی کارخانے کا مالک تھا اس کو اپنے کارخانے میں لے گیا۔ کارخانے کے مزدوروں نے اپنے مالک کا اشارہ پاکر اس کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ کام پر لگا دیا یہاں تک کہ وہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔ جب مزدوروں نے اپنا کام ختم کیا اور کھانے پر بیٹھے تو وہ نوجوان بھی ان غریبوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ اور اس معمولی کھانے میں جو لذت اسے ملی وہ مزے مزے کے کھانوں میں بھی نہ ملی تھی۔ آرام کے یہ چند لمحے جو محنت کے بعد نصیب ہوئے تھے اس بیکاری کی زندگی سے بدرجہا بہتر تھے۔ اس کی یہ چال کارگر ہوگئی اور اس نوجوان نے اپنی مصروفیت کے لئے نئے نئے کام تلاش کرلئے جس کی وجہ سے اس کی زندگی مفید کاموں اور آرام و آسایش میں بسر ہونے لگی۔ (ماخوذ)

خواجہ حمید الدین

نیند تمہاری

کیسی بھولی کیسی پیاری — کیسی یہ ہے نیند تمہاری
جس دم چاہو اس کو بلا لو — جس دم روٹھے اس کو منالو
سونے والوں کی ہے راحت — اس کی تم پر ہے یہ عنایت
ہر دم رہتی ہے بے چاری — دکھ ہو تم کو یا بیماری
اس سے اپنا دل بہلاؤ — اس کو آنکھوں میں بٹھلاؤ
سچ بولو یہ جادو گرنی — تم پر کیسا جادو کرتی
کردیتی بے ہوش وہ کیسے؟ — لاتی ہے وہ ہوش میں کیسے؟
جب یہ آنے والی ہوتی — آنکھوں میں کچھ لالی ہوتی
آنکھوں میں وہ پھرتی رہتی — پلکوں میں وہ چھپتی رہتی
ایک غشی سی ہوتی طاری — یہ ہے گویا نیند تمہاری
کیسے کیسے رنگ وہ لاتی — کیسے کیسے رنگ دکھاتی

اس کے آگے سب ہیں برابر
آقا ہو وہ ہو یا نوکر

محمد باقر
(اورنگ آباد)

سنگِ مرمر

سنگ مرمر ایک خاص قسم کے سفید پتھر کو کہتے ہیں جس سے آرائش کی مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ مجسمے یعنی پتلے تراشے جاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے مکانوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بہت نرم اور نازک پتھر ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں تصویریں کھودنے اور اس کے مجسمے بنانے میں سہولت ہوتی ہے۔ مرمر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض مقامات پر ہلکے اور گہرے کالے رنگ کے پتھر بھی پائے جاتے ہیں۔ ڈیون اور ڈربی شائیر قسم کے سنگ مرمر پر دھاریاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ دھاریاں ان مقامات کی مٹی کے اثر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جہاں سے وہ نکالا جاتا ہے۔ سفید قسم کے سنگ مرمر کو کرارا کی کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ کرارا اٹلی کا ایک شہر ہے جو اس کے مغربی ساحل پر واقع ہے یہاں کا سنگ مرمر اپنی نفاست اور عمدگی کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ تمام دنیا کے مجسمے بنانے والے زیادہ تر یہیں کا سنگِ مرمر استعمال کرتے ہیں۔ اسی مقام کی بعض کانوں میں کالا اور زرد رنگ کا سنگ مرمر بھی ملتا ہے جس سے آرائش کی چیزیں بنائی جاتی ہیں ایک اور قسم کا سنگ مرمر بھی ہے جسے "سنگ سلیمانی" کہتے ہیں۔ یہ پتھر الجیریا، میکسیکو اور جنوبی امریکہ میں نکالا جاتا ہے۔ اس پتھر میں مختلف رنگ کی تہیں ہوتی ہیں۔ ایک تہہ تو دودھ جیسی سفید ہوتی ہے اور دوسری زمین سے لگ کر کالی یا رنگین ہوتی ہے۔ لوگ اس دھاری دار پتھر کو بھی مکانات وغیرہ کو سجانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نقاش اس پر تصویریں کھودتے ہیں۔ اس کی سفید، سیاہ اور رنگین دھاریاں چہرے اور لباس وغیرہ کے ابھار اور رنگ کو نمایاں کرنے اور تصویر کو کہیں گہری اور کہیں پھیکی دکھانے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ یہ آئرلینڈ، اٹلی اور یونان میں ملتا ہے۔

ہماری ریاست حیدرآباد میں بھی اچھی قسم کے سنگ مرمر کی کانیں پائی جاتی ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہماری حکومت نے حال ہی میں پچاس ہزار روپیوں کی امداد منظور کی ہے ماہرین کی امداد سے اس کی بڑی بڑی چادریں نکالی جانے لگی ہیں۔ اگرچہ اس کام کو بڑے پیمانے پر شروع کئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن پھر بھی باہر سے اس کے آرڈر وصول ہونے لگے ہیں۔

پیارے بچو! ہمارے ملک ہندوستان میں دنیا کی سات مشہور عمارتوں میں سے ایک عمارت تاج محل ہے۔ اس کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا۔

یہ عمارت دیکھنے کے قابل ہے۔ اس لئے کہ اس میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ چاندنی میں جب اس سفید عمارت پر چاند کی کرنیں پڑتی ہیں تو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور سنگ مرمر کی خوبصورتی اور عمدگی پورے بہار پر نظر آتی ہے۔

اکثر مندروں، درگاہوں اور مسجدوں میں بھی مرمر مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مندروں میں سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں اس کا فرش بچھایا جاتا ہے۔ مسجدوں میں مرمر کے منبر اور جالیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔

سنگ مرمر نہ صرف مجسمے تراشنے تصویریں کھودنے اور آرائش و زیبائش کی دوسری چھوٹی چیزیں بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا چورا اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چونا بنانے کے بھی کام آتے ہیں۔ یہ چونا عام چونے سے بہت زیادہ سفید چمک دار اور پائدار ہوتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس کے استعمال پر عام چونے کی بہ نسبت کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں آتا۔

آخر میں ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا ایک دن ہم اور ہمارے چند دوست اشرف میاں کے گھر مہمان تھے۔ اتنے میں بازو کے کمرے سے کسی چیز کے نیچے گرکر ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ہم نے اس کا سبب دریافت کیا تو اشرف میاں نے بلدی سے کہا بھائی جان شاید میرا سنگ مرمر کے پتھر کا گھوڑا گرکر ٹوٹ گیا ہے۔ یہ سن کر ہم سب ہنس پڑے اور اشرف میاں کچھ کھسیانے سے ہوگئے۔ اشرف میاں ہی پر کیا موقوف ہے وہ تو ٹھیرے کمسن طالب علم۔ ہم نے بعض بڑی عمر والوں کو بھی اس قسم کی غلطی کرتے سنا ہے۔ سنگ مرمر کا پتھر۔ شب لیلۃ القدر روز جزا کا دن۔ اور نہ جانے فصاحت کے ایسے کتنے ہی دفتر ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نہ کرے ہمارے سننے والوں میں سے کوئی ایسی غلطی کرتا ہے۔

سالم بن عمر

(ایکسلی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

بچوں اور بچیوں کیلئے کتابیں:۔

۱۔ نظام الملک آصفجاہ اول از شیخ چاند مرحوم ایم اے قیمت ۴ر
۲۔ سرسید احمد خاں از ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس قیمت ۲ر
۳۔ سرسالار جنگ اعظم از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۲ر
۴۔ اعظم الامرا ارسطوجاہ از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی ۲ر
۵۔ دادا بھائی نوروزجی از ظہیر الدین احمد صاحب ایچ سی ایس قیمت ۲ر
۶۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت
۷۔ اردو دانی کی کتابیں پہلا حصہ زیر نگرانی مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے
۸۔ سوتیلی ماں از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسوان ادارہ قیمت ۲
۹۔ من کی بیٹا از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے قیمت ... ۵
۱۰۔ پانی کی کہانی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۲
۱۱۔ آب دوز اور سرنگ از فیض محمد صاحب بی اے۔ ڈپ ایڈ قیمت ۲

خلیفۂ ماموں کی مہمان نوازی

آج سے قریب قریب بارہ سو برس پہلے خلیفۂ ماموں عراق، شام اور حجاز کے مسلمانوں کا بادشاہ تھا۔ اس کا پائے تخت بغداد کا مشہور شہر تھا۔ ماموں بہت بڑا عالم، فلسفی قاری اور قرآن کا حافظ تھا۔ اور عالموں اور شاعروں کی دل سے عزت کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ایک عالم ماموں کے محل میں مہمان رہا۔ شام کے کھانے میں پر تکلف اور چکنی چپڑی غذائیں کھانے سے عالم کو رات میں نیند نہ آئی۔ اس لئے وہ کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کو نیند نہ آتی تھی۔ پیاس سے اس کا حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنے قریب کی صراحی میں جتنا پانی تھا تھوڑا تھوڑا کرکے پی چکا تھا۔ رات گئے شاہی نوکر سو رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ محل میں کہیں کہیں چراغ جل رہے تھے۔ آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ عالم نے کسی نوکر کو جگا کر اس کی نیند کرکری کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے خود آب دار خانے کی طرف جانے لگا۔

اتفاق سے اس رات کو خلیفۂ ماموں بھی نہ سویا تھا۔ اور اپنے بستر پر پڑا ہوا کچھ سوچ بچار کر رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر عالم پر پڑی جو پانی کی تلاش میں آب دار خانے کی طرف جا رہا تھا۔ خلیفۂ ماموں بہت ہوشیار تھا وہ تاڑ گیا کہ عالم کے قریب کی صراحی میں پانی ختم ہو چکا ہے اس لئے اس نے کہا "آپ اپنی جگہ پر تشریف لے جائیے میں ابھی پانی بھیج دیتا ہوں۔" عالم کو اپنی جگہ پر واپس جانا ہی پڑا۔ اس کو اپنی جگہ پر واپس ہوکر ابھی کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ خلیفۂ ماموں پانی لیا ہوا وہاں پہنچ کر کہنے لگا۔ "پانی حاضر ہے پیجئے۔" عالم نے پانی لے کر کہا "خود آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟" خلیفۂ ماموں نے جواب دیا "یہ نوکروں کے آرام کا وقت ہے۔ سب سو رہے ہیں۔ میں نے کسی کو جگا کر اس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔" پھر عالم نے کہا "آپ نے خود مجھے کیوں پانی نہ پینے دیا۔" ماموں نے کہا "یہ میری مہمان نوازی سے دور تھا۔ مہمان کی آؤ بھگت کرنا میزبان کا خوشگوار فرض ہے۔ آپ بے تکلف پانی پی لیجئے۔ میں نہ صرف آپ کا بلکہ ساری قوم کا خادم ہوں کیوں کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔" عالم نے پانی پی کر ماموں سے کہا "تم وہ تمام فرض جو خلیفہ ہونے کے سبب تمہارے ذمے ہیں اچھی طرح انجام دے رہے ہو۔ تم مسلمانوں کے حقیقی بادشاہ ہو۔ تم ہی اپنے بزرگوں کے نام روشن کرو گے۔" اس کے بعد یہ دعا دی "خدا تمہاری عمر دراز کرے اور

حکومت کو تمہارے خاندان میں ہمیشہ کے لئے قائم رکھے۔"

پیارے بچو! تم نے ابھی ابھی سنا کہ خدمت میں بڑائی ہے۔ جو شخص اچھی طرح خدمت کرسکتا ہے وہی اچھی طرح حکومت بھی کرسکتا ہے۔ اس لئے اگر تم بھی اپنے بزرگوں، استادوں اور آقاؤں کی خدمت شوق اور دلچسپی سے انجام دو تو ایک دن دوسرے لوگ بھی خوشی سے تمہاری خدمت کریں گے۔

محمد عبدالسلام ذکی

علم

علم کے معنی کو سمجھے ہیں غلط انداز سے — روشنی پاکر بھی ہیں محروم نور کے راز سے
علم ہے اک نام راز حق سے آگاہی کا یاں — اور حق ہے نام سچ کا، ہے یہ علما کا بیاں
علم سے حاصل سچائی جس کو دنیا میں ہوئی — کامیابی زندگی میں اس کو دنیا میں ہوئی
جیسے بڑھتی ہے چمک سونے کی کندن ہو کے بہت — علم سے ہوتی ہے ویسے عقل انساں کی درست
خوبیاں انساں کی ظاہر ہوتی ہیں تعلیم سے — رہبری کرتا ہے حق ان کی جہان غیب سے
علم پاکر آدمی انسان کامل بن گئے — علم سے دنیا ملی اور وہ خدا سے مل گئے
خود نمونہ بن کے بے غرضی کا استاداں دنوں — اپنے شاگردوں کو کامل تھے بناتے ان دنوں
ایک بچہ ننھی سی جاں اور کتابوں کا یہ ڈھیر — یہ خدا کی شان ہے یا عقل انسانی کا پھیر
بات جس کو ایک لمبی یاد رکھنا ہے محال — وہ بھلا ان فلسفوں کی کیا کرے گا دیکھ بھال
ان کو رٹنا یاد کرنا پھر سمجھنا ہے ضرور — اس بچارے کی مصیبت کا ٹھکانہ بھی ہو دور
سعدی و سقراط و افلاطون جیسے رازداں — اور تلسی داس، کالی داس جیسے ودواں

طرز تعلیم نوی نے کب کئے پیدا یہاں
اب بھی جاگو آنکھ کھولو جاؤ پہلے تم جہاں

مسز برکت رائے

بہادر لڑکا

آج سے تقریباً ۶ ہزار سال پہلے سوئزرلینڈ میں ولیم ٹیل نامی ایک چرواہا رہتا تھا وہ بہت طاقتور، توانا، بہادر، چالاک شکاری اور بہترین تیرانداز تھا۔ سوئزرلینڈ کے اطراف و اکناف میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو پہاڑ پر تیزی سے دوڑتے ہوئے چڑھنے میں اس سے بازی لے جائے وہ بہت محنتی تھا اس لئے لوگ اسے چاہتے تھے۔ دنیا میں سب سے عزیز اور پیاری چیز اُسے اپنا ایک لڑکا تھا جو اس وقت دسویں سال کی عمر میں تھا۔ لڑکے کے بچپن میں ہی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ جب بھی ولیم ٹیل کسی مقام پر جاتا اس کا لڑکا اس کے ہمراہ رہتا۔ جب ولیم ٹیل آلٹرف نامی گاؤں کی پہاڑیوں پر شکار کے لئے جاتا تو اس وقت اس کا لڑکا بکریوں کی دیکھ بھال کرتا۔ آلٹرف کا گورنر ظالم، سخت اور ضدی طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ منصف حکمراں نہ تھا۔ وہ قانونی حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ جو کچھ بھی اس کی خواہش ہوتی اسی قسم کے احکام صادر کرتا۔ ایک وقت ولیم ٹیل، آلٹرف میں کچھ ضروری چیزیں خریدنے آیا اس وقت اس کی نظر ایک گڑے ہوئے بانس پر پڑی جو مارکٹ کے عین درمیان میں تھا۔ اور اس پر ایک ٹوپی بھی رکھی ہوئی تھی اس لئے بانس کے بازو آسٹرین گورنر (جو جیسلر کے نام سے مشہور تھا) ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ اور اس کے اطراف نوکروں اور سپاہیوں کا ایک طوفان تھا۔ ہر وہ شخص جو مارکٹ میں داخل ہوتا اس کا یہ فرض ہوتا کہ وہ زمین تک سلام کے لئے جھک جائے تاکہ اس ٹوپی کا احترام ہو۔ جب ولیم ٹیل وہاں سے گزرا تو اس نے صرف گورنر کو سلام کیا اور آگے جانے لگا۔

گورنر کو یہ گوارا نہ ہوا اور اس نے غصہ سے چلا کر کہا کہ "اس کتے کو پکڑ لاؤ" اس کو یہ لازم ہوگا کہ "وہ میری ٹوپی کے سامنے سلام بجالائے ورنہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے"۔ سپاہیوں نے جیسلر کے سامنے ولیم ٹیل کو لایا۔ لیکن ولیم ٹیل نے گورنر کی اطاعت سے انکار کردیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ گورنر کو صرف سلام کروں۔ لیکن میں نہ ان کے سامنے احترام کے لئے سر تسلیم خم کرسکتا ہوں اور نہ اس ٹوپی کے سامنے ایسا کرسکتا ہوں۔ ایسے فرایض تو میں صرف خدا کے ہی کے سامنے ادا کروں گا اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاؤں گا اگر ایسا ہی ہے تو میری جان حاضر ہے لیکن تم میرے ضمیر کو نہیں لے سکتے"۔ جیسلر نے گرجتے ہوئے کہا" اس کو مار ڈالو یہ بدمعاش میرے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ گارڈ کے سپاہی قریب تھا کہ ولیم ٹیل کے آنکھوں میں برچھے

چبھو دیتے کہ اتنے میں جیسلر کے چہرے پر مکارانہ ہنسی نمودار ہوئی اور اس نے تھوڑی دیر ٹھہرنے کے لئے کہا "سوئٹزرلینڈ کی یہ پہاڑیاں جہاں تیراندازی بخوبی کی جاسکتی ہے" گورنر نے کہا " اس کے لڑکے کو لے جاؤ اور اس درخت کے نیچے کھڑا کردو۔ اور اس لڑکے کے سر پر ایک پھل (میوہ) رکھ دو اور ولیم ٹیل نے (۵) تیر چلائے اور وہ اتنے مار میں اس پھل کو گرادے جو لڑکے کے سر پر ہے اگر ولیم ٹیل اس میں ناکام رہا تو اسے اور اس کے لڑکے دونوں کو فوری قتل کردو اور اگر اس نے پھل گرا دیا تو دونوں کو چھوڑ دیا جائے" اس ظالم گورنر کا یہ خیال تھا کہ ولیم ٹیل پھل گرانے کے لئے تیر چلائے گا اور ایک نہ ایک تیر ضرور اس کے لڑکے کو جاکر لگے گا۔ یا اگر ولیم ٹیل پھل اور لڑکے کی شرط سے انکار کردے تو ولیم ٹیل کو قتل کردیا جاسکے گا۔

دنیا میں کوئی بھی انسان ایسا نہیں ملے گا جو اپنے ہاتھ سے اپنے لڑکے کو مار ڈالے ولیم ٹیل کو اندیشہ تھا کہ پھل گرانے میں لڑکے کی جان نہ چلی جائے۔ "مجھے سزا دو اور میرے بچے کو آزاد چھوڑ دو اس لڑکے نے تمھیں کیا تکلیف پہنچائی ہے" ولیم نے کہا: "نشانہ باندھو یا مرجاؤ" جیسلر گورنر نے کہا " نشانہ خطا ہوا اور تم دونوں بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے ولیم نے اپنے لڑکے کو جو درخت کے نیچے کھڑا تھا یہ سمجھ کر کہ وہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ نظر حسرت سے، روتے ہوئے اور خدا سے رحم کے لئے دعا کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن ادھر اس کا لڑکا بالکل مستعد اور تیار کھڑا تھا اور باپ کے تیر کا منتظر تھا۔ لڑکے کا دل فخر کے جذبات سے بھرا ہوا تھا اور اس کے دل میں ذرا بھی خوف نہ تھا۔ ولیم نے دوبارہ اپنے لڑکے کے چہرے کو دیکھا جب کہ اس نے تیر چلانے کے لئے کمان کو اٹھایا اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے پتھرا لٹ دیا ہے لیکن لڑکا برابر مستعد اور تیار کھڑا تھا۔ لڑکے نے اپنے باپ سے کہا "سیدھا نشانہ باندھو تاکہ ہم دونوں بچ جائیں"۔ "خدا تجھ پر رحم کرے تیری ہمت نے میرے بھی حوصلے بلند کردئے" اس نے نشانہ باندھ کر تیر چھوڑا اور وہ پھل لڑکے کے سر سے دیکھتے ہی دیکھتے دو ٹکڑے ہوکر گر پڑا اور تیر درخت میں گھس گیا۔ "بہت خوب" جیسلر گورنر نے کہا "میں اپنے الفاظ پر قایم ہوں۔ تم دونوں آزاد ہو۔ میرا شکریہ ادا کرو اور چلے جاؤ"۔ "میں تمھارا شکریہ ادا نہیں کرتا" ولیم نے کہا "میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے تیر کو سیدھا چلانے میں میری مدد کی اور اس کا بھی خیال رہے کہ اگر بفرض محال وہ تیر خطا کرجاتا اور لڑکے کو جالگتا تو میرے دوسرے تیر کا نشانہ تمھارا دل ہوتا۔"

(ترجمہ)

عبدالمجید خان یوسف زئی

فخرِ قوم

(سرسید احمد خاں مرحوم)

وہ محبِ قوم تھا اسلام کا بہتر نگیں
اس کے بہتر کام پر ہوتی ہے ہر جا آفریں

سوز تھا اس کے جگر میں درد دل رکھتا تھا وہ
قوم ہی کے نام کی مالا سدا جپتا تھا وہ

ناخدا بن کر سنبھالا قوم کی کشتی کو بس
بھر دیا سب کے دلوں میں علم و فن کا اس نے رس

ہم نہ ہوتے ڈاکٹر اور نہ بنتے جج کبھی
یوں نہ عہدے پاتے اچھے اور نہ یہ بیرسٹری

رات دن رہتا تھا غم میں ہر گھڑی سالارِ قوم
ہوتی تھی ہر وقت اس پر کفر کے فتوؤں کی دھوم

جو کیا اس نے بتاؤ آج تک کس نے کیا
جس نے اپنی موت تک اصلاح میں حصہ لیا

مرنا جینا اس کا تھا بس قوم ہی کے واسطے
وہ بتائے اس نے کیسے اور بہتر راستے

رات دن روتا تھا اس کو دیکھ کر پستیٔ قوم
وہ نہ ہوتا ڈوب جاتی بالیقیں کشتیٔ قوم

بھیک تک مانگی ہے اس نے قوم ہی کے واسطے
کون ہے ایسا بتاؤ قوم پر جو مر مٹے

خط ہزاروں گالیوں کے ڈاک پر آتے رہے
مذہبی اخبار اس پر روز چلاتے رہے

اک ادارہ بن گیا پھر قوم کا دارالعلوم
روز افزوں تھے علی گڑھ کے فوائدِ باعموم

اس کے طلباء تھے وہی محمود[1]، اقبال[2]، آفتاب[3]
جن کا دورِ زندگی رکھتا نہ تھا اپنا جواب

اور یہ مرزا عزیز[4] و شوکت[5] و جوہر[6]، ظفر[7]
قوم کی خدمت میں گزری عمر جن کی سربسر

سب اسی کے خرمنِ تعلیم کے ہیں خوشہ چیں
کر لیا حاصل جنھوں نے راحتِ دنیا و دیں

مرحبا سالارِ قوم اے سیدِ عالی وقار
ساتھ ہے تیرے دعائے قوم و فضلِ کردگار

گلشنِ فردوس کا ہے بالیقیں تو ایک پھول
ہے ازل سے قدرداں تیرا یہ منصورِ ملول

محمد احمد اللہ خاں منصور

---

[1] مسٹر محمود مرحوم جج ہائیکورٹ الہ آباد خلف سرسید احمد خاں۔ [2] علامہ سر اقبال مرحوم۔ [3] صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم۔ [4] مولوی عزیز مرزا مرحوم معتمد ہوم سکریٹری حیدرآباد [5] مولانا شوکت علی مرحوم۔ [6] مولانا محمد علی مرحوم جوہر۔ [7] مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر اخبار زمیندار۔

چمنستان

"بہن موتیا دیکھا اس کا اترانا" چنبیلی نے پنکھڑیوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

موتیا "کیا ہے برا چنبلی! کیوں خیر تو ہے! کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہی ہو۔ ادھر دیکھو چاند کی معصوم کرنیں جب سطح آب پر جگمگاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی لہریں ان کو آشنان کرا رہی ہیں۔ فضا کس قدر خوش گوار ہے۔ خموشی کا راجہ ادب سے ہاتھ باندھے چاند کے دیوتا کے آگے کھڑا ہے۔ نورانی دنیا میں اتنی جاذبیت پیدا ہوگئی ہے کہ چندر راج بھی وشنو جی کا حکم بھول کر سکتے کے عالم میں محو تماشائے فطرت ہیں۔ کیا رائی اور کیا پربت دونوں سکوت کے دریا میں غرق ہیں۔ دیکھو تو گلاب کا تختہ کس قدر حسن افروز منظر پیش کر رہا ہے۔ خیر تم تو ان کی شیدائی ٹھیریں پھر یہ مزے میں کرکری کیسی؟"

چنبلی "اجی! آپ کی فصیح البیانی پر خدا کی مار" چنبلی کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ موتیا نے کہا۔

موتیا "لو اور سنو۔ جب چاند کی مستانہ کرنیں سبزہ زار پر بیتابانہ لوٹتیں ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے زمردین فرش پر روپہری بیل بوٹے بنائے ہیں۔ صدہا غنچے چٹک چٹک کر فضا کو معطر کر رہے ہیں۔ وہ دیکھو کلی بھی چٹک پڑیں" موتیا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

یہ سہانا اور دلفریب منظر کچھ ایسا دلکش اور دلربا تھا کہ تمام چمن پر "نیم بے ہوشی" طاری ہو چکی تھی۔ بھینی بھینی اور خوشبو سے معطر فضا عجیب رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ایک طرف گلاب کا عطر آگیں تختہ اپنی آن بان سے متمکن تھا۔ تو دوسری طرف موتیا اور چنبلی اپنی اپنی رعنائیوں کا جوبن دکھلا رہی تھیں۔ دائیں بازو بڑے بڑے پتوں میں باریک باریک پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے گویا قدرت کی کارگیری نے زمرد اور الماس کو ایکجا جڑ دیا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اس کو رات کی رانی کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نزاکت میں تمام پھولوں کی رانی ہے۔ رہی خوشبو وہ بھی اوروں سے کم نہیں۔ اس کے دوسری جانب چنپا اور جوہی کی کلیاں کھل کھل کر ایک عجیب منظر پیدا کر رہی تھیں۔ مدن مست کا پھول اپنی بو میں آپ مست اور اپنی جا آپ مگن ہے۔ اس کا درخت سب سے الگ تھلگ دور کھڑا مستی میں چور جھوم رہا ہے۔ "بہن موتیا مذاق کو رہنے دو، تمھیں معلوم رہے کہ اس دلفریب موقع پر ناچیز تنکے ہم ہی سے ڈنک مار رہے ہیں۔" چنبلی نے تحقیر آمیز لہجہ میں کہا۔

موتیا "اس بھری چاندنی رات کی قسم بہن

تجھے تو اس کا مطلق علم نہیں "

چنبیلی:۔ "اوہو! یہ بھی کوئی بات ہے' ذرا اپنی دائیں طرف تو دیکھو۔ ذرا خدا سے تنکے کیسی خوبروئی اور جانفزائی دکھلا رہے ہیں تھوڑی سی خوشبو کیا پائی ہے کہ دماغ عرش معلی پر چڑھ گیا ہے۔ دن بھر مرجھائے رہنے پر یہ دماغ! اور شب میں تازگی اور بالیدگی پانے پر یہ شان! غرور اور نخوت کا یہ حال ہے کہ اب بادشاہ گلاب پر بھی آنکھ مارتے ہیں۔"

موتیا:۔ "کس کی مجال جو گلاب کو آنکھ بھر کر بھی دیکھے"! موتیا کی پتیوں پر خفیف سی تیزی محسوس ہو رہی تھی۔

چنبیلی:۔ "اجی! ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے' تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسے رات کی رانی کہتے ہیں۔ رانی.........!"

موتیا:۔ "خدا غارت کرے! اسے رانی آخر کس موئی نے بنایا ہے!! بھلا اس کی ہمارے آگے کیا حقیقت ہے۔ لیس نہ صورت نہ میغر وہ سچ کہتی ہوں بہن اگر بس چلتا تو مسل ڈالتی۔"

سوسن جو بلند ہی تھی بول اٹھی:۔ "آخر بات کیا ہے جو اتنی غصے میں ہو۔ خیر تو ہے اگر کسی نے آنکھ بھر کر دیکھا ہے تو کہو۔ بھلا ایسی خوش گوار فضا میں یہ ناخوش گوار باتیں تمہیں بھلی معلوم ہوتی رہیں!"

چنبیلی:۔ "لگیں منہ دیکھی باتیں کرنے۔ ذرا اس باغ کی رانی کو تو دیکھو!"

" ذرا ٹھیرو تو۔ ابھی اس کو آڑے ہاتھوں لیتی ہوں"۔ زبان دراز سوسن یہ کہتے ہوئے پلٹی اور رات کی رانی پر برس پڑی۔

رشک و حسد کی چنگاریاں فضا میں ہر طرف پھیل گئیں۔ نرگس آنکھیں دکھلا رہی تھی۔ سنبل بھی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ غرض یہ کہ ہر جگہ رات کی رانی کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں پس ایسا خوف چھا گیا کہ کلیاں مارے ہیبت کے پھر بکھر کر پھول بن گئیں مگر رات کی رانی ہے کہ برابر اپنی اسی حالت پر قایم ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی باتوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتی۔ بلکہ اور زیادہ سنجیدگی اختیار کرلی ہے جس سے اس کی نزاکت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

باغ میں اس قدر شور مچا کہ ہر پھول پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا تھا گلاب نے بھی محسوس کیا کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا ہے۔ اس بدمزگی کو دور کرنے کیلئے گلاب کا چاروں طرف دیکھنا تھا کہ سب پر غشی طاری ہوگئی۔ اس "نیم مستانہ" فضا میں رخنہ ڈالنے والی ایک "پرستار الفت" بلبل کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پروں کی آواز سے چاندنی رات میں ایک کشش اور جاذبیت سی پیدا ہوگئی تھی اور موثر سماں بندھ گیا تھا۔ چودھویں رات کے چاند کی کرنیں گلاب کی پتیوں پر ٹھمک ٹھمک کر رقص کر رہی تھیں۔ بلاشبہ رات پر دن کا گمان

ہوتا تھا۔ بلبل کے "شوق آفریں" دل کو اس وقت کا سماں ایسا پسند آیا کہ بے تحاشہ گلاب کے تختے پر اتر پڑی۔ آدھی رات تھی —— نیند آنکھوں میں جھلا رہی تھی —— سناٹا چھایا ہوا تھا —— رات خموشی کے گیت گا رہی تھی —— کہ ایک "عالم الفت" دل میں چبھ گیا —— بے چاری بلبل اپنی حسرت بھری تمناؤں کے ساتھ "حسن مطلق" کے قدموں پر نچھاور ہوگئی۔

سید یعقوب حسین قادری

صبح باغ میں

ذرہ ذرہ چمک رہا ہے　　قطرہ قطرہ جھلک رہا ہے
دیکھو سورج جھانک رہا ہے　　پربت سے وہ تاک رہا ہے
جھاڑ، تنا اور نازک پودے　　پتلی شاخیں، ڈال وہ موٹے
مست بنے سب جھوم رہے ہیں　　گل کے ساغر گھوم رہے ہیں
پھولوں سے اس طرح لدے ہیں　　دولہ سے اشجار بنے ہیں
مرغ چمن سب نغمہ خواں ہیں　　اور ہوا میں رقص کناں ہیں
فوارے دل کھول رہے ہیں　　منہ سے موتی رول رہے ہیں

حیرت سے ہے نرگس حیراں
نور کا دریا جوش پہ طوفاں

خواجہ معین الدین

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۴۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۱۱)
نومبر ۱۹۴۰ء

سب رس

جلد ۳ — بابت نومبر ۱۹۴۰ء — شمارہ ۱۱

(فہرست مضامین)

ضروری:۔ اگر کسی مہینے کی پندرہ تاریخ تک پرچہ وصول نہ ہو تو اسی مہینے دوسرا پرچہ طلب فرمالیں۔ ورنہ فرمائش کی تکمیل نہ ہوسکے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔

اداریہ

سب رس کا چوتھا سال ایک خاص شمارہ سے شروع کیا جائے گا جو سب رس کے گزشتہ سالناموں کی طرح بالتصویر اور ضخیم ہوگا۔ کوشش کی جارہی ہے کہ یہ سالنامہ بھی سب رس کی روایات کے شایان شان ثابت ہو۔ اس میں دنیا کے جدید ترین ادبی رجحانات سے متعلق نہایت دلچسپ بالتصویر مضمون شائع کئے جارہے ہیں۔ ان مضمونوں، نظموں، اور تصویروں سے متعلق تفصیل ہمارے آیندہ شمارے میں شریک رہے گی۔ غرض یہ سالنامہ اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کرے گا۔ اور جنوری ۱۹۴۳ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوجائے گا۔ ادارۂ سب رس کئی ماہ سے اس کے لئے تیاری کررہا ہے۔

سب رس کا زیرِ نظر شمارہ مضامین کے تنوع اور افادیت کے پیشِ نظر دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اسی طرح ڈسمبر کا شمارہ بھی خاص اہتمام سے مرتب کیا جارہا ہے۔

نمودِ زندگی ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مطبوعات میں اس مہینے تین اہم کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ جن میں سب سے پہلے مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کا مجموعۂ کلام نمودِ زندگی قابلِ ذکر ہے۔ یہ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں مصنف کی تصویر اور عرض حال کے علاوہ جناب پروفیسر ڈاکٹر زورؔ صاحب کا دیباچۂ عمومی بھی شامل ہے۔ جس کی چند سطروں کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"سید علی منظور صاحب جدید حیدرآباد کے پختہ مشق اور مشہور شاعروں میں سے ہیں اور حضرت امجدؔ کی طرح ان کی شاعری کی شہرت صرف اس سرزمین میں محدود نہیں ہے۔ ان کے کمال کے قدر دان دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں۔ اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالہ میں نقل کی جاتی ہیں۔"

اور آخر میں لکھا ہے کہ :-

"یہ ایک فیض جاری ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور عہد حاضر کی سیاسی و معاشی کشمکش کے بعد بھی اس کا اثر زائل نہ ہوسکے گا۔"

فنِ تقریر عہد حاضر میں تقریر کو بہت اہمیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ اور لاسلکی کی وجہ سے تو اس فن کی افادیت میں خاص اضافہ ہوگیا ہے۔ مولوی سجاد مرزا صاحب کی فرمائش پر ادارہ نے فنِ تقریر سے متعلق ایک نہایت مفید کتاب شائع کی ہے جو چھ ابواب اور تقریباً ۱۰۰ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں بھی شامل ہیں جن کی مدد سے تقریر کرتے وقت ٹھیک طور پر کھڑے ہونے اور حرکات و سکنات کے سلسلہ میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۸ر بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔ اس کی نسبت جناب پروفیسر ڈاکٹر زورؔ صاحب نے اپنے دیباچۂ عمومی میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

اگرچہ ترقی یافتہ زبانوں میں فنِ تقریر و خطابت سے متعلق کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور آئے دن لکھی جارہی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں۔ اور یہ بھی مولوی سجادؔ مرزا صاحب کی بالغ نظری اور موقع شناسی کا نتیجہ ہے کہ زیر نظر کتاب ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے شائع کی جارہی ہے۔ ...... آخری باب اور تصویریں عہد حاضر کی انگریزی اور امریکن مطبوعات سے مدد لیکر تیار کی گئی ہیں۔ ان کی تیاری و ترتیب میں بھی مولوی سجاد مرزا صاحب نے ذاتی دلچسپی لی اور ادارہ کی خاطر خواہ مدد فرمائی۔ بہرحال یہ کتاب صحیح معنوں میں صاحب موصوف ہی کے نام معنون کی جاسکتی ہے۔

سلک گوہر | یہ ایک چھوٹا سا منظوم ڈرامہ ہے جس کو مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے ایل ایل بی نائب صدر شاخ ادارۂ ادبیات اردو پربھنی نے تصنیف کیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب شیطان کا انتقام ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکی ہے اور یقین ہے کہ یہ حسین و جمیل مختصر ڈراما بھی اہل ذوق سے ضرور خراج تحسین حاصل کرے گا۔ باکمال شاعر نے اس کی تصنیف میں چند خاص ادبی نظریوں کو پیش نظر رکھا ہے جن کی اہمیت اس ڈراما کے مطالعہ کے بعد ہی واضح ہو سکتی ہے۔ نہایت دیدہ زیب شائع ہوا ہے اور قیمت بہت ہی کم یعنی صرف چار آنے رکھی گئی ہے۔

ادارے کے شعبے | ادارہ کے مختلف شعبے برابر سرگرم کار ہیں۔ اس شمارہ میں صرف دو مجلسوں کی روئدادیں شامل کی جا رہی ہیں۔

شعبۂ نسواں | مجلس عاملہ شعبۂ نسواں کا چودھواں اجلاس ۱۰ / اکتوبر کو منعقد ہوا جس میں ذیل کی خواتین نے شرکت کی۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر لطیف النساء بیگم صاحبہ معتمد شعبہ۔ سابق اجلاس کی روئداد کی تصدیق کے بعد حسب ذیل امور کا تصفیہ ہوا۔

(۱) مدرسۃ بالغات (۲) اجلاس عام (۳) کانسرٹ (۴) انجمن طیلسانیئن کی درخواست متعلقہ نصاب تعلیم (۵) ازالہ اجلاس کے عوض سہ ماہی اجلاس (۶) دیگر امور۔

(۱) طالبات مدرسہ جو اردو دانی میں کامیاب ہو گئی ہیں ان کے لئے ایک درمیانی امتحان کا نصاب تجویز کیا گیا۔ مدرسہ کے لئے ایک معلمہ تمیدی صاحبہ کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا۔ امتحان کی کامیاب طالبات کے لئے سردست (۴) جماعتوں کا نصاب زیر غور ہے۔

(۲) اجلاس عام ماہ نومبر ۴۹ء صبح دس بجے بصدارت بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کیا جائے۔ جس میں ادارہ کی کتابوں کی نمائش بھی کی جائے گی۔ رابعہ بیگم صاحبہ شعبہ کی کارگزاری اور سہ سالہ رپورٹ پیش کریں گی۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ خواتین سے تعاون عمل کے لئے اپیل کریں گی۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ شعبہ سے متعلق نظم اور معتمد شعبہ شکریہ ادا کریں گی۔

طے پایا کہ اسی موقعہ پر ادارہ کے اردو امتحانات کی کامیاب خواتین میں اسناد اور انعامات کی تقسیم بھی عمل میں آئے تو مناسب ہے۔

شعبۂ تاریخ دکن | کا معمولی جلسہ ۲۵ / ستمبر کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر زور صاحب، خواجہ محمد احمد صاحب، سید سراج الدین احمد صاحب، محمد غوث صاحب، یم اے اور معتمد شریک تھے۔ میر محمود علی صاحب جلسہ سے کچھ پہلے آئے تھے اور اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے شرکت جلسہ سے معذرت چاہی۔ جلسہ میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کا خط پڑھا گیا۔ موصوف عہد اورنگ زیب کے تمام ماخذوں پر ایک بسیط مقالہ لکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس عہد کے محققین کی خاطر خواہ رہنمائی ہو اور ان کی خواہش ہے کہ وہ مقالہ ادارہ ادبیات کی طرف سے شائع ہو۔ یہ طے ہوا کہ کام اچھا ہے لیکن اس کی طباعت و اشاعت کا فیصلہ کرنے سے پہلے مقالہ کا مسودہ دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد رہبر فاروقی صاحب کے مؤلفہ مسودے پیش ہوئے۔ موصوف نے شعبہ تاریخ دکن کے لئے ناصر جنگ شہید، مکہ مسجد، حضرت شاہ راجو لکھے ہیں اور صلابت جنگ و مظفر جنگ پر بھی مقالے لکھنا چاہتے ہیں۔ طے پایا کہ ناصر جنگ صلابت جنگ اور مظفر جنگ کی کتابیں سلسلۂ سلاطین آصفیہ کی بجائے مشاہیر دکن کے سلسلہ میں شائع ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان کا معیار اچھا ہو۔ ناصر جنگ اور مکہ مسجد کے مقالے خواجہ محمد احمد صاحب کے سپرد کئے گئے کہ وہ پڑھ کر رائے قائم کریں۔ زاہد حسین آبادی صاحب کا مسودہ ٹیپو سلطان بھی پیش ہوا۔ یہ مسودہ بھی رائے کے لئے خواجہ محمد احمد صاحب کے تفویض کیا گیا۔ حضرت شاہ راجو کا

مقالہ معتمد شعبہ کے سپرد کیا گیا۔ آخر میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس شعبے کو زیادہ ترکس سرزمین کی تاریخ پر زور دینا چاہیے۔ یہ طے ہوا کہ دکن کو ایک وسیع مفہوم میں یعنی دریائے تاپتی سے دریائے کاویری تک سمجھنا چاہیے اور اسی وسیع سرزمین کا تاریخی مواد جمع کرنا چاہیے۔ گو آج کل ہم دکن صرف اس محدود سرزمین کو کہتے ہیں جو اس وقت سلطنت آصفیہ کی عملداری میں ہے۔ لیکن جغرافی اعتبار سے دکن ایک وسیع ملک ہے جو دریائے تاپتی سے دریائے کاویری تک پھیلا ہوا ہے۔

اس شعبہ کی طرف سے بعض مشاہیر دکن کے آثار کی تلاش وحفاظت کا کام برابر جاری ہے چنانچہ مشہور قطب شاہی امیر و سپہ سالار خیرات خاں کے گنبد واقع محلہ سلطان شاہی کی حفاظت اور احترام کے لئے محکمہ جات آثار قدیمہ، امور مذہبی اور کوتوالی سے مراسلت کی گئی کیونکہ ادارہ کو معلوم کرایا گیا کہ بعض غیر ذمہ دار لوگ اس کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ چنانچہ محکمہ امور مذہبی اور کوتوالی سے اطلاع وصول ہوئی ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔

ادارے کی شاخیں | ادارے کی شاخیں بھی شعبوں کی طرح پوری سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔ اس شمارے میں صرف دو شاخوں کی مصروفیتوں کا کچھ حال درج کیا جاتا ہے :-

شاخ پربھنی میں جشن سال نو سنہ ۱۳۵۱ف | یکم آذر سنہ ۱۳۵۱ف کو شاخ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایک جلسۂ عام بصدارت مولوی محمد فاروق صاحب تیج سی ایس دوم تعلقدار نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد کیا گیا۔ عوام کے علاوہ مقامی عہدہ دار بھی شریک تھے۔ سب سے پہلے مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری نے فرمان مبارک کو پڑھنے کی عزت حاصل کی جس کو حاضرین نے استادہ ہوکر سننے کی سعادت حاصل کی۔ مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ نے ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد پر ایک پر مغز مقالہ سنایا۔

جناب نارائن صاحب ونڈے گاؤں کر بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) نے تقریر کی۔ آخر میں جناب صدر نے ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے عوام کو اردو امتحانات میں شرکت کی طرف توجہ دلائی اور اردو عالم بابتہ سنہ ۱۳۴۰ف کے کامیاب طلبہ کو عارضی اسناد تقسیم کیں۔ مولوی عارف الدین صاحب کی طرف سے سب سے زیادہ رسائل پڑھنے والے اور سب سے زیادہ اخبارات پڑھنے والے کو دو انعامات دیئے گئے۔ اول الذکر انعام حمید اللہ خاں صاحب شیدا اور موخر الذکر تفضل حسین خاں صاحب کو ملا۔ تقسیم انعامات کے بعد مولوی عارف الدین حسن صاحب نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور "شاہ عثماں زندہ باد" کے نعرہ ہائے مسرت میں جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

شاخ گلبرگہ | مولوی محمود حسین صاحب (عثمانیہ) معتمد شاخ گلبرگہ نے سنہ ۱۳۵۱ف کا ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے روانہ کیا ہے اگر اس کو عملی جامہ پہنایا گیا تو یقین ہے کہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہو جائے گی۔ گلبرگہ کے علم دوست اصحاب سے توقع ہے کہ وہ اس تعمیری کام میں شاخ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ عوام کی معلومات کے لئے اس لائحہ عمل کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

گلبرگہ شریف میں اردو زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے اردو امتحانات کی ترویج اور ایک دارالمطالعہ عام کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اس دارالمطالعہ میں زیادہ سے زیادہ کتابوں کو جمع کرکے ایک مکمل کتب خانہ بنا دیا جائے۔ گلبرگہ شریف چونکہ ایک تاریخی مقام اور علم و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے اس لئے وہاں کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ عوام کی معلومات میں اضافہ کرنے اور ان میں تقریر کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے تقاریر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ تعلیم بالغان سے متعلق مفید

تجاویز کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہر سال عرس شریف کے موقع پر سالانہ جلسہ کرکے تقاریر اور اردو مطبوعات کی نمائش منعقد کی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب اپنی زبان کی کتابوں سے واقف ہوجائیں۔ دیہات سدھار کے سلسلے میں مختلف دیہاتوں کا دورہ کرکے دیہاتیوں میں علمی ذوق پیدا کیا جائے گا اور بالخصوص اردو دانی کے امتحان کے لئے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہوجائیں اور ناخواندگی جاتی رہے۔

سرپرست شاخ گلبرگہ شریف شاخ گلبرگہ کے علم دوست سرپرست نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار گلبرگہ نے اپنے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں صدر ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرکے اپنے مفید مشوروں سے کارکنان ادارہ کو مستفید کیا اور کتب خانہ میں کتابوں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے لئے مبلغ پچیس روپے کا عطیہ عنایت کیا جس کے لئے ادارہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ادارہ

نغمہ و فریاد

اے کیفِ سجدہ ریزی کیا مجھ کو ہوگیا ہے
ذروں سے پوچھتا ہوں یہ کس کا نقشِ پا ہے

دنیا میں آدمی کی تخلیق اور کیا ہے!
اک شعلۂ محبت سانچے میں ڈھل گیا ہے

بدمست ہورہی ہے کیفیتِ تبسم
تم نے چمن میں شاید کلیوں کو چھو لیا ہے

تنگ آکے زندگی سے مر بھی سکے نہ کوئی
آخر غمِ محبت کس درد کی دوا ہے

ہر منظرِ جہاں کو پوجا کریں گی نظریں
جب تم نے امتیازِ جلوہ اٹھا دیا ہے

اک اک قدم پہ ٹھوکر، ہر بات میں تغافل
انسان لغزشوں کا پتلا نہیں تو کیا ہے

کیا کوششوں سے ہوگا ماہر خدا پہ چھوڑو
گرداب میں ہے کشتی طوفان بڑھ رہا ہے

ماہر القادری

غزل

روزِ ازل سے آنکھ کا پردہ حجاب تھا　　تارِ نگاہ رشتۂ بندِ نقاب تھا
تسکینِ قلب میں بھی مرا اضطراب تھا　　دنیا کا انقلاب لگا ہوں میں خواب تھا
محشر میں دل جلوں کو یہ معلوم ہوگیا　　دوزخ کا نام تو فقط ان کا عتاب تھا
آنکھیں کھلی ہیں شانِ کریمی کو دیکھ کر　　حائل اگرچہ پردۂ خوفِ عذاب تھا
فصلِ بہار آتے ہی توبہ کا ٹوٹنا ؟　　میرے تو حق میں مژدۂ جامِ شراب تھا
دشمن پہ گر رہا ہے یہ بن بن کے بجلیاں!　　اب تک تو میرے دل میں مرا اضطراب تھا
اُس بے وفا کو دل جو دیا چوک ہوگئی !　　قسمت کا کیا گلہ ہے مرا انتخاب تھا
توبہ کے بعد بھی یہ رہی اپنی کیفیت!　　نشہ کی طرح آنکھوں میں ذوقِ شراب تھا
جمتی نہ تھی نگاہِ تصور میں ان کی شکل　　شوخی اُدھر تھی اور ادھر اضطراب تھا
روزِ جزا حساب ہی میں شام ہوگئی　　پیچیدہ کچھ گناہوں کا ایسا حساب تھا
دشمن کا راہ و رسمِ محبت میں کیا گلہ!　　دشمن تو خود مرا دلِ خانہ خراب تھا

داغِ جگر کو اپنے سمجھتے تھے ہم تو داغ
دیکھا عزیزؔ غور سے تو آفتاب تھا

عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

ہلالِ عید

مطلعِ تاریک پر رویت ہلالِ عید کی　　آسمانِ یاس پر ہے کہکشاں امید کی
یعنے ہم حرماں نصیبوں کی مسرت کیلئے　　اک نویدِ تازہ آئی ہے کسی کی دید کی

عظیم الدین محبت

غزل

آغازِ شوق یاد دلایا بہار نے
محشر بپا کیا دلِ بے اختیار نے

ہوتی رہیں ہزار مسرت کی یورشیں
چھوڑا نہ دل کا ساتھ غمِ روزگار نے

قصرِ امید اُن کے تغافل نے ڈھا دیا
تعمیر جو کیا تھا مرے اعتبار نے

یہ صبحِ گلستاں، یہ ضیا پاشِ آفتاب
بھیجا ہو جیسے کوئی پیمبر بہار نے

ہر انقلاب ہے مجھے درسِ حیاتِ نو
بخشی ہے وہ نظر مجھے پروردگار نے

دیکھا گیا نہ غنچہ و گُل کا شکستِ ضبط
آخر چمن میں آگ لگا دی بہار نے

دل خوگرِ خزاں ہے نظر ناقدِ بہار
انساں بنا دیا ستمِ روزگار نے

اپنی نظر بساطِ خزاں سے نہ اُٹھ سکی
پردے اٹھائے لاکھ عروسِ بہار نے

لالے کے دل میں ہو مرے سینے کا داغِ عشق
میرے چمن سے پھول چنے ہیں بہار نے

ایسی گھڑی کچھ آئی خزاں جم کے رہ گئی
ایسی گئی پلٹ کے نہ دیکھا بہار نے

گہرا بہت تھا گرچہ فسونِ خزاں کا رنگ
حسنِ چمن نکھار کے چھوڑا بہار نے

اُن کا غرور اُن کو بلندی پہ لے گیا
مجھ کو سبک کیا دلِ زود اعتبار نے

جب مجھ کو تم نے اپنی نظر سے گرا دیا
پھر آرہے ہو کیوں درِ دل پر پکار نے

احسانؔ دشمنوں پہ بھی آنے لگا ہے پیار
وہ غم مجھے دیا ہے مرے غمگسار نے

احسان دانش

ادب اور سطح پسندی

عام خصوصیت عمل کی دنیا میں، ہندوستان کی ایک عام خصوصیت بڑی دلچسپ ہے جسے ہم "تقلید و تعاقب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ہو — علمی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی، ذہنی، جذباتی — ہر چیز میں جب کسی شخص کو نمایاں کامیابی ہوتی ہے، کوئی نیا راستہ سوجھتا ہے، کوئی جدت کی جاتی ہے، تو ہم سب اس عمل، اس جدت، اور اس راستے کا پیچھا اٹھاتے اور اسی انداز سے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ "پیچھا اٹھانا" دو قسم کا ہوتا ہے" ایک یہ کہ اس کام کو دیکھ کر کچھ ردوبدل کچھ تغیر کیا جائے "کچھ جدت سے کام لے کر اسے" اپنا لیا جائے یا صرف تقلید کی جائے۔ پہلا کام کسی قدر ذہانت والوں کا ہوتا ہے دوسرا ان کا جو نرے "بدھو" ہوتے ہیں۔ اگر کسی سے یہ دونوں کام نہ ہو سکیں تو وہ سطح پسندی پر اتر آتا ہے، جو ہمارے نزدیک ذہنی اور جسمانی عمل کا ایک مہلک اور فرسودہ جزو ہے۔

نظریۂ "تقلید و تعاقب" ہمیں "تقلید و تعاقب" کا نظریہ سب سے زیادہ ادب میں نظر آتا ہے، اور اسی مناسبت سے سطح پسندی بھی۔ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، مضمون نگار، نقاد، خطاط نویس، شاعر، ہندوستان میں کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن علمی نقطۂ نظر سے اگر ان کی تقسیم و ترتیب کی جائے تو جدت پرست اور تخلیقی اہلِ ادب دو چار فی صد سے زیادہ نہ ہوں گے، باقی سب تقلید کی فہرست میں آسکیں گے۔ بظاہر یہ تنقید سخت معلوم ہوتی ہے لیکن واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو حقیقت کے نظر آنے میں دیر نہ لگے گی۔ ایک شاعر پیدا ہوتا ہے جو اپنے فطری کمال کے تحت، اظہارِ خیال کا ایک خاص میدان، ایک نیا راستہ اختیار کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ جوش کی مثال لیجئے۔ اس کا خاص میدان اس کی شبابیات اور تنقید زندگی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کئی ایک طریقوں سے جوش کی شبابیات کا عنصر ہماری شاعری کے بڑے حصے میں داخل ہو گیا ہے۔ کہیں بظاہر ہے اور کہیں پوشیدہ۔ اسی طرح اس کے انقلابی خیالات میں "تقلید و تعاقب" کی گرم بازاری نظر آرہی ہے۔ قاضی نذر الاسلام اور اُس کا انقلابی ادب اس پر ایک اور اضافہ ہے۔ اگرچہ بنگال کا یہ مشہور سخنور، اردو زبان کا شاعر نہیں، لیکن ترجموں کی وجہ سے ہی، اس کے تیز خیالات نے شعری دنیا کے ایک پُرجوش حصے کو مسخر کر لیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا، شاعری کے میدان میں "تقلید و تعاقب" کا نظریہ کئی طرح سے کام کر رہا ہے۔ لیکن جوش کی کھلم کھلی تقلید ہے۔ کہیں نذر الاسلام پر بدلے ہوئے الفاظ کا پردہ ہے، کہیں اقبال کے موضوع سے کوئی دوسرا موضوع نکالا جا رہا ہے، کہیں جوش کے انقلاب سے کسی اور طرف زد لگائی جا رہی ہے۔ یہی حال غزل گوئی کے میدان میں غالب کے اندازِ بیان کا ہے۔

نتیجے اس نظریۂ "تقلید و تعاقب" کے مختلف نتیجے پیدا ہوگئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ادب بدقسمتی سے ہر کس و ناکس کا میدان بنتا جا رہا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ادب "سستی چیز ہے" ادب کی اس مقبولیت کی وجہ، جس کا نام غلطی سے "ارزانی" رکھا گیا ہے، یہ ہے کہ ادب زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی فطرت میں ادب کو ایک لطیف اور خوش گوار شئے کی صورت میں قبول کرنے کی عام صلاحیت ہوتی ہے، اور چونکہ ادب حیات کی لطافتوں سے براہِ راست متعلق ہے، اس لئے محدود دنیا کے لوگ اسے ایک جائے پناہ سمجھ کے، اپنی روح، قلب اور دماغ کو اس کے سائے میں لے آتے ہیں۔ ادب میں پناہ ڈھونڈنے کی حد تک تو ان کی کوشش

جائز ہے، لیکن وہ اونٹ کی طرح عرب کے ڈیرے میں سر رکھ کے، آہستہ آہستہ سارے ڈیرے پر قبضہ جمانے کی سعی کرتے ہیں تو کھٹکا خیز بن جاتے ہیں۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ دوسرے علوم و فنون کی طرح ادب' گو وہ زندگی سے انتہائی قریب ہے' ایک خاص فن' ایک خاص شعبہ ہے جس میں کامیابی کے لئے فطری صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ ہمیں بہت افسوس ہے کہ نظریہ "تقلید و تعاقب" اس اصول کی خلاف ورزی کر کے ادب کو بہت نقصان پہنچا رہا ہے۔ "تقلید و تعاقب" ہمارے نزدیک اگر کسی بلند تر ادب اور ترقی یافتہ آرٹ کا کیا جائے تو برا نہیں' لیکن ہر وقت اس کا استعمال' آزادیٔ عمل کی ایک اندھی قربانی ہے۔

ادبی خودکشی اس منزل پر بعض ادب پسند حضرات کا جو کسی بےلاگ تنقید سے ہمیشہ چیں بہ جبیں ہوتے ہیں شاید یہ جواب ہو کہ ادب کی دنیا میں "بڑی شخصیت" "بڑی تحریکات" کا ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔ ہم بھی اس کے مخالف نہیں ہیں' لیکن عرض کرنا یہ ہے کہ بڑی شخصیت سے متاثر ہونا حلال' لیکن اسے اپنے اندر اس طرح حلول کرنا کہ اپنی شخصیت گھر سے نکالے ہوئے غلام کی طرح الگ جا پڑے حرام ہے۔ یہ ایک قسم کی خودکشی ہے۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ کسی بڑے اثر کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار ہی کیا جائے' تاکہ اپنی دنیا' خواہ وہ محدود اور غیر ترقی یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے دور رہے۔ اس قسم کی خودکشی کرنے والے' اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے اور اس پر فخر و ناز کرتے ہیں' اور ان کے معتقدین انہیں سراہنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

سطح پسندی اور تین طبقے ادب کی نشر و اشاعت اور عام ترقی کی حد "نظریہ تقلید و تعاقب" پھر بھی اتنا برا نہیں جتنا اس سے پیدا ہونے والی ایک اور خرابی یعنی "سطح پسندی" ہے۔ یہ ایک قسم کا گھن ہے جو ادب کے ثمردار درخت کو لگ جاتا ہے اور ہٹائے نہیں ہٹتا۔

ادب کی دنیا میں تقلید و تعاقب کی زد سے محفوظ رہنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں تخلیق کا مادہ آزاد اور فطری ہے' دوسرے وہ جو نرے اپاہج ہیں اور کوئی اپنا کام نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے درمیان جو متوسط طبقہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح "تقلید و تعاقب" کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ اس کے برعکس' ہر وقت اس کا امکان ہے کہ "سطح پسندی" کی زد میں اعلیٰ' متوسط اور ادنیٰ' تینوں درجوں کے لوگ آ جائیں۔ ادنیٰ درجے کے لوگوں کا ذکر ہی فضول ہے' البتہ متوسطین اور اعلیٰ سے بحث کی جا سکتی ہے۔

متوسطین ادب کے متوسط طبقے سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جو صرف ایک "ذہنی عشرت" اور "دماغی تفریح" میں مبتلا ہیں یہ اوسط درجے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا علم بھی "تھوڑا" ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کی شاعری کا یہ عالم ہو کہ وہ جگر اور جوش کی پیداوار پر زندگی بسر کرتا ہو' یا کسی کی تنقید کا یہ حال ہو کہ اس کی معلومات بہ مشکل آب حیات اور مقدمۂ شعر و شاعری سے آگے جاتی ہوں' تو ہم ایسوں کو متوسط طبقے ہی میں شمار کریں گے۔

ہندوستان کی ادبی دنیا میں' دوسرے ملکوں کی طرح' "متوسطین" کافی تعداد میں ہیں' لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارا طبقۂ متوسطین' اگر ایک طرف "تقلید و تعاقب" میں گرفتار ہے تو دوسری طرف وہ سطح پسندی کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے ممالک کے متوسطین' یا تو اپنی آزاد خیالی اور فطرت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں' یا خاموش رہتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح خواہ مخواہ دخل انداز ہو کر ادب کے پاک چشمے کو گندلا نہیں کرتے۔

اعلیٰ قسم کے سطح پسند اعلیٰ قسم کے "سطح پسند" ہماری گہری توجہ اور ہمدردی کے محتاج ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے علم کی وسعت موجود رہتی ہے، جو خدا داد جوہر اور اعلیٰ صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں، ان کے سامنے ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی بہت سی توقعات وابستہ رہتی ہیں۔ جب یہ لوگ ادبی عمل کی شاہراہوں سے ہٹ کر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں پر چلنے لگتے ہیں تو ان پر بڑا رحم آتا ہے۔ یہ سوانح لکھتے ہیں، لیکن سوانح نگاری کے بلند اصولوں اور لوازم سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ یہ شعر کہتے ہیں، لیکن دل و دماغ پر خاص زور ڈالنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی سطحی واہ وا سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تنقید کرتے ہیں، لیکن تنقید کے چند اعلیٰ اصول مثلاً تقابل توازن، بلند نظری اور الطاف سے کام نہیں لیتے۔ چھوٹی چھوٹی تعریفوں اور چھوٹی چھوٹی ہمت افزائیوں سے دل موہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ خدمتیں علمی نقطۂ نظر سے ادب والوں کے حق میں ایک قسم کی زہر خورانی ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں قابل لوگ زیادہ ٹھوس، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مشکل ادب پیدا کرنے کی طرف توجہ کریں، تاکہ علم و عمل دونوں سے "سطح پسندی" کے زہریلے اثرات زائل ہوجائیں۔

سطح پسندی کے چند اسباب سطح پسندی کی نوعیت واضح طور پر اس وقت سمجھ میں آئے گی جب ہم اس کے چند اسباب پر غور کریں گے۔ ہندوستان میں اور خصوصاً ہمارے ملک میں سطح پسندیا کیوں عام ہے! یہ ایک دلچسپ اور ضروری سوال ہے۔ سطح پسندی کو اکسانے والے مختلف اسباب میں سے چند قابل توجہ اور اہم ہیں۔

سب سے پہلی وجہ جسے ہم نے واضح کردیا ہے نظریہ "تعلید و تعاقب" ہے "تعلید و تعاقب" کے مدرسے سے جو لوگ تربیت حاصل کرکے نکلتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح سطح پسندی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کچھ سیکھنے کے لئے ابتداءً انسان دوسروں سے مدد لیتا ہے، دوسروں کا پیچھا اٹھاتا ہے، لیکن اس راہ عمل میں اگر وہ صرف مدد لینے اور پیچھا اٹھانے ہی کا ہوجائے تو وہ ایسے کاموں میں پڑجاتا ہے جو کم محنت، زیادہ کامیابی کم قابلیت، زیادہ نمائش، کم تکلیف اور زیادہ مسرت کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ بتدریج شخص پرست بھی بن جاتا ہے۔ اسے علم کی وسیع دنیا اور اس کے بے شمار آزاد اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ بار بار اس جگہ آتا اور اس کے اطراف گھومتا ہے جہاں ایک معین اور محدود فضا پہلے سے تیار مل جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ دوسرے چراغ سے اپنا چراغ جلاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں اندر سے روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت گم ہوجاتی ہے، اسی لئے اقبال نے لکھا ہے۔

گرگک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

عدم مطالعہ سطح پسندی کا دوسرا بڑا سبب "عدم مطالعہ" ہے۔ عدم مطالعہ سے ہماری مراد، نہ صرف کتابیں پڑھنے سے محروم رہنا ہے، بلکہ ایسی کتابیں بھی پڑھنا ہے، جو نسبتاً کم درجے کی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کی تعلیم کے تین اجزا ہیں — ایک کتاب، دوسرے زندگی، تیسرے نفس کی خود تعلیمی۔ ان میں فرق مدارج کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک انسان کی مکمل تعلیم کے لئے یہ تینوں ذرائع لازم و ملزوم ہیں۔ "عدم مطالعہ" سے ہماری مراد ان تینوں ذرائع سے محرومی ہے۔

اردو ادب میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے، لیکن جو لوگ دوسری زبانوں کے ترقی یافتہ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انھیں یہ کہتے ہوئے خوف نہیں محسوس ہوتا کہ اردو میں ابھی ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ بعض لوگ ہمارے اس خیال کے حامی

نہیں۔ وہ صرف ایک جذبۂ یعنی "زبان سے محبت" کے تحت ایسا کہتے ہیں۔ لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ "نادانی کی دوستی" ہے۔ افسانہ، ڈرامہ، سوانح، مضمون نگاری، شاعری، تنقید، ناول نویسی، خطوط نگاری، ڈائری نویسی، آپرا، یہ سارے میدان خالی پڑے ہیں۔ شاعری اور افسانے کی طرف کچھ توجہ ضرور ہے لیکن یہ بھی معیاری نہیں۔ ان حالات میں اردو ادب پر کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ موجودہ علم کے رجحانات اور جدید زمانے کے اقتضا کا ساتھ دینا چاہتا ہے تو کم از کم انگریزی ادب سے جو اس وقت دنیا کے وسیع ترین ادب میں شمار کیا جاتا ہے کچھ قریبی تعلق پیدا کرے۔ اس وقت دنیائے علم میں ہر شعبۂ علم و فن سے متعلق مستند اور معیاری کتابیں مل سکتی ہیں۔ سطح پسندی کے چنگل سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کسی بلند تر اور وسیع تر دنیا کی سیر کرے اور ادب کے چند اعلیٰ نمونوں اور شاہ کاروں سے استفادہ کرے۔

تقابل اور توازن

اس مقام پر دو قسم کے مبالغوں سے بچنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان مطالعے کی کثرت میں اپنی انفرادیت اور آزادیٔ خیال گم نہ کرے، دوسرے وہ اس طرح غیر زبان کا ہو کر نہ رہ جائے کہ اسے اپنی ہر چیز سے نفرت اور تحقیر پیدا ہو اور آہستہ آہستہ ذوق ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بعض مغرب زدہ ہستیاں اردو ادب پر اس قسم کے احسانات فرماتی ہیں۔ ان احسانات سے دور رہنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر نہایت مفید ہے کہ انسان وسعت مطالعہ کے دوش بدوش "تقابل مطالعہ" کی بھی عادت ڈالے۔ ادبی خوبیوں کا اندازہ تقابل اور توازن سے بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری ادبی دنیا میں تقابل اور توازن کا اصول زیادہ رائج نہیں ہے۔

اس میں کچھ تو مطالعہ اور ذوق کی کمی، اور کچھ "ادبی تعصب" کو دخل ہے۔

ذوق کا فقدان اور دماغی کج روی

سطح پسندی کا تیسرا اہم سبب "ذوق کا فقدان" یا "دماغی کج روی" ہے۔ ذوق اور وہ بھی ذوق سلیم ایک خداداد جوہر ہے اور اسی کی بدولت ہر شعبۂ علم و فن اپنے امتیازات رکھتا ہے۔ ادب کا بھی ایک فطری ذوق اور ایک جبلی صلاحیت ہوتی ہے جو اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ تربیت سے زیادہ قیمتی ہے۔ اگر ذوق نہ ہو تو ادب کی دنیا میں انسان "مردہ" بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ذوق ایک خداداد نعمت ہے، اسی طرح ایک زحمت بھی ہے۔ بسا اوقات ذوق ہی کے تحت کثیر اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے اور بدقسمتی سے یہ اختلاف رائے سطح پسندی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ ہماری پسند کی چیز ہے، ضروری نہیں کہ آپ کی پسند کی بھی ہو۔ کہتے ہیں، کیا ضروری ہے کہ آپ کی مرغوب کتاب یا ادبی کام ہمارے نقطۂ نظر سے بھی معیاری ہو! یہاں ایک نفسیاتی مغالطہ کام کر رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذوق اگر صحیح ہے تو ادب میں معیار اور عمدگی کا سمجھنا اتنا دشوار نہیں، اور یہ ذوق کی نیک اور خوش گوار تر بیت پر منحصر ہے۔ بہت سے صاحب ذوق ایسے ہوتے ہیں جنہیں صحیح تربیت نہیں ملتی، اس لئے ان کی خداداد صلاحیت کا ایک بہت بڑا حصہ رائگاں جاتا ہے۔ جب ایسے شخص سے سابقہ ہو تو کسی ادبی مسئلے کے حل کرنے، اور اگر وہ بدقسمتی سے سطح پسندی کے جال میں پھنس گیا ہو تو اسے اس جال سے نکالنے میں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کج دماغی کا اثر ادب پر

صاحب ذوق کے علاوہ ادبی کج دماغ بھی ہوتے ہیں۔ ان کی یہ کج دماغی نفسیاتی نقطۂ نظر سے کوئی خطرناک چیز

نہیں ہوتی، کیونکہ یہ نتیجہ ہوتی ہے انسان کی اس جبلی خاصیت کا جسے "احساسِ آزادی" کہتے ہیں۔ بعض لوگ اس مزاج کے ہوتے ہیں کہ وہ فطرت کے ہر بندش، علم، فن، تہذیب کی ہر بندش سے اپنی آزادی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کج دماغ شخص اپنے اندر آزادئی خیال کا شدید جذبہ رکھتا ہے۔ اگر اس کا یہ جذبہ اپنا کام کرتا ہے تو ادب کی دنیا میں اس کی کج دماغی اچھی چیز ثابت ہوتی ہے، اس کے برعکس اگر وہ سطح پسندی اور کاہلی کا شکار ہو تو اس کا مرض متعدی ہونے کے علاوہ لاعلاج بھی بن جاتا ہے۔ کج دماغی کی بہت سی قسمیں ہیں، اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو بحث طویل ہو جائے گی۔ مختصراً ہم اس کج دماغ کو اچھا سمجھتے ہیں جو حالی کے اس شعر پر شدت کے ساتھ کاربند ہوتا ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں!

لیکن اگر کسی ایسے کج دماغ سے سابقہ پڑ جائے جو کم درجے کی چیزوں اور گھٹیا درجے کے ادب کا حامی ہو، اور اس کے دماغ میں بلند و پست کا توازن اتنا مفقود ہو کہ وہ صحیح رائے قائم کرنے میں غلطی بھی کرے اور اصرار بھی، تو ادب کو ایک قسم کی وبا اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ذوق اور علم کا توازن بے حد ضروری ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک طرف پلہ بھاری ہونے اور دوسری طرف کم ہونے سے خطرناک سطح پسندی پیدا ہوتی ہے۔ کم علم آدمی اپنے ذوق محض سے کام نہیں لے سکتا، اسی طرح بد ذوق آدمی اپنے علم کو اپنے لئے وبالِ جان بنا لیتا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ وہ ادب کا بلند مقام بتائے، اور ذوق کا کام یہ ہے کہ انسان کو بلندی اور پستی کے امتیاز کے ساتھ اس رفعت تک پہنچا دے جس کی رہنمائی علم نے کی ہے۔

ادبی ضد | سطح پسندی کی محرک ایک قسم کی "ادبی ضد" بھی ہے جو عام طور پر بحث مباحثے کی کثرت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ زید ایک کتاب پڑھتا ہے اور کئی حالات کے تحت اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب کی مخالفت کوئی دوسرا شخص کرتا ہے، دونوں میں شدت کے ساتھ بحث شروع ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں کی دماغ ریزی کے بعد اصل مسئلہ تو ہٹ جاتا ہے اور دونوں میں ایک ضد پیدا ہو جاتی ہے کہ یا تو اپنی بات منوائے یا اس پر اتنی سختی سے قائم رہے کہ دوسرا اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ ادبی مسائل میں اگر بحث سنجیدگی اور اصول کے ساتھ ہو تو یہ وسعتِ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ مگر یہ عام تجربہ ہے کہ ان حدوں کا قایم رکھنا بحث کرنے والوں کی قوت سے باہر ہوتا ہے، اس لئے بسا اوقات ادبی بحث، انسان کے مذاق کو متلون، اور اس کی قوت توازن کو سخت متاثر کرتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسی باتوں پر سختی کے ساتھ اڑ جاتا ہے جو اصولاً سطحی ہوتی ہیں، لیکن حالات کے تحت دل و دماغ اس سے سخت متاثر رہتے ہیں۔

خارجی اسباب | ادب میں کسی امر کے پسند یا ناپسند ہونے کے چند خارجی اسباب بھی ہیں۔ فرض کیجئے میں ایک ایسے زمانے میں جب کہ زندگی نے مجھے پریشان کر دیا ہے، ایسی کتاب پڑھوں جس کے لفظ لفظ سے انتقام اور انقلاب کی آواز آ رہی ہے، لازم ہے کہ میں اس وقت اس کتاب کو بہت پسند کروں گا لیکن اگر میں اسے کسی ایسے شخص کے قلب و دماغ پر سوار کرنے کی کوشش کروں جو امن و سکون کی زندگی بسر کر رہا ہو، تو ظاہر ہے کہ انقلاب کی آواز اسے صدائے بے ہنگام معلوم ہوگی۔

جذبۂ غرض مندی | جہاں تک ہماری سرزمین کا تعلق ہے سطح پسندی کے اسباب میں نمایاں سبب ایک جذبہ ہے جسے "غرض مندی"

کہا جا سکتا ہے "غرضمندی" کئی قسم کی ہوتی ہے — دوستی کا لحاظ، مالی منفعت، نقصان کا خوف، محبت، ممنونیت، تشکر، اظہار عجز و تواضع وغیرہ۔ ہمارے یہاں شخصیتوں کی عظمت کا توازن چند اور خارجی علامات سے بھی کیا جاتا ہے جو اصلی نہیں ہوتیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ اکثر و بیشتر، ان اضافی تعلقات کی بناء پر کوئی شخص، کوئی طبقہ، کوئی خاندان بلکہ کوئی قوم، ادب کی دنیا میں چند ایسی کوششوں کی تعریف اور نشر و اشاعت پر مجبور ہو جاتی ہے جو کسی سطحی لیکن اضافی طور پر کسی "بڑے شخص" یا بڑی جماعت" کی طرف سے شائع ہوتی ہیں۔ ادب کے متعلق نظریہ یہ بجے تو نے سے دیا جلتا ہے" یہاں یہ نظریہ کارفرما ہے کہ" ادب سے کام نکلتا ہے۔"

اعتقاد

"ادبی غرضمندی" کا ایک بدلا ہوا روپ "اعتقاد" بھی ہے۔ بعض اصحاب کو بعض ادیبوں کے کارنامے اس قدر بھا جاتے ہیں کہ اس کے بعد وہ اعتقاد کی دنیا میں گم ہو کر ساری قوت تنقید و توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ادب کے ہر شعبے میں اپنی اعتقادی تمثیل ہی سے محاکمہ کرتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ انفرادی حیثیت رکھے تو برا نہیں، لیکن جہاں اعتقاد اور حسن ظن باقاعدگی کے ساتھ ایک مدرسۂ خیال بن جاتا ہے، جہاں کمزور محاکمات کو دوسروں کے دماغوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جہاں آزادئ رائے کو ٹھکرایا جاتا ہے، جہاں جماعت بندیاں ہوتی ہیں، اور ہیرو پرستی کا مذہب، رائج ہوتا ہے، وہاں ادب ایک قیدی بن جاتا ہے جسے آزادی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارنے کی مطلق اجازت نہیں ہوتی۔ حالانکہ ادب کو ایک آزاد پرندے کی طرح اڑنا چاہیئے کہ وہ فطرت کے جس مناسب مقام پر چاہے بیٹھے اور جس طرح چاہے نغمہ سرائی کرے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ادب میں "غرض مندی" کا رتبہ جب تک بلند نہ ہوگا اس وقت تک سطح پسندی اس سے دور نہ ہو سکے گی۔ بڑے ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار کی صرف یہ غرض نہ ہونی چاہیے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، اس کی شہرت بھی ہو اور مادی منفعت بھی۔ اصل شان تو یہ ہے کہ اس کے اعلیٰ خیالات سے قوم کے دل و دماغ مستفید ہوں اور مستقبل سنوارا جا سکے۔ "سستی محنت اور سستی شہرت" کے لئے ہندوستان میں بہت سے ادبی کام ہو رہے ہیں، اور بہت سے گھٹیا درجے کے رسالے اپنی غلط تعریفوں سے نہ صرف ادبی معیار کو گھٹا رہے ہیں بلکہ قوم کے مذاق کو خراب کر رہے ہیں۔

تنقید

اس سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ تنقید کا مختصر ذکر بھی کر دیا جائے، جو سطح پسندی کی نشر و اشاعت کا ایک اہم آلہ ہے فن تنقید ایک مخصوص فن ہے، اور اس کے لئے ذوق کے ساتھ علمی تبحر کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اہل قلم اپنے تھوڑے بہت ذوق کے تحت ادبی کاموں کے متعلق خام رائے ظاہر کرتے، اور غیر ذمہ دارانہ تعریف یا مذمت سے کام لیتے ہیں، وہ اپنی کم علمی سے ایک معصوم گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں جو ادب کی دنیا میں قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ بار بار ایسی تنقیدیں یا تعریفیں چھپتی ہیں جس کی آڑ میں چھوٹے چھوٹے لوگ سامنے لائے جاتے ہیں، اور اصول پرست اور اعلیٰ خیال اہل علم کو پچھلی صف میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ ادبی خدمت نہیں بلکہ ادبی منافقت ہے۔ سطح پسندی کے تحت، تعریف تو خطرناک ہوتی ہی ہے، لیکن تنقیص یا مذمت اس سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ اس کی بدولت علمی معیار اور ضوابط کو سخت دھکا لگتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ادب والوں میں اعلیٰ مطالعہ، اعلیٰ تبادلۂ خیال کے ساتھ ساتھ "حق شناسی" کا ذوق بھی پیدا کیا جائے۔

قدرافزائی جب سطح پسندی پر اعتراض ہوتا ہے تو بعض لوگ "ادبی قدرافزائی" کی بحث چھیڑتے ہیں، لیکن یہاں غور و فکر سے کام لینا ضروری ہے۔ قدرافزائی واقعی ایک قابلِ قدر چیز ہے، لیکن "قدر حاصل کرنے والے سے زیادہ" قدر بڑھانے والے پر اس کی ذمہ داری ہوتی ہے، کہ وہ مناسب اور محتاط طریقے سے ادبی اعمال کی نگہداشت کرتا رہے۔ قدرافزا شخص میں اعلیٰ اور پست ادب کو پہچاننے، وزنی اور غیر وزنی، ٹھوس اور سطحی، اصولی اور غیر اصولی ادبی مساعی میں ایک خوش گوار توازن کرنے کی اعلیٰ صلاحیت ہونی چاہیے۔ "علمی قدرافزا" خاموش طریقے پر ایک قسم کا عالمگیر محرک ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ادب کی وسیع دنیا میں اس کی تحریکات کو محدود نہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایسے امور کی حمایت کرنے کے لئے جو زیادہ تر اس کے مذاق اور سطح کے ہیں، تو اس کی حمایت "سطح پسندی" پیدا کریگی، کیونکہ اس کے بڑھائے ہوئے لوگ اس سے خوش ضرور ہوں گے، لیکن ان میں اعلیٰ عزم، احتیاط، بلند تر کوشش اور سعی مکرر کی وہ صحت بخش صفات پیدا نہیں ہوں گی جو ادبی اعمال کے لئے ازبس ضروری ہیں، بسا اوقات بے لگام ہمت افزائی کی بجائے ایک نہایت "محتاط گوشمالی" سے ادبی قابلیت نشو و نما حاصل کرتی اور ترقی پاتی ہے۔ ہمت افزائی یا قدرافزائی کے لئے عام طور پر تحسین و تعریف ہی کا ذریعہ استعمال کرنا جائز نہیں، کیونکہ آگے چل کر یہ ذریعہ کام کرنے والے کی صلاحیتوں کو محدود کر دیتا اور انھیں عام تحسین کا تابع بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس بعض وقت اس امر کی ضرورت، نہ صرف افراد بلکہ قوم تک کو لاحق ہوتی ہے کہ خوش گوار تنبیہ اور نیک ہدایت سے کام لیا جائے۔ وقتیہ تنقید کمزوریاں رفع کرتی اور ترقی کے راستے کھولتی ہے۔

جذبۂ رعب و امتیاز سطح پسندی کا ایک اور سبب وہ مرعوب کن جذبہ ہے جو انسان میں ہر وقت ابھرتا ہے۔ عنفوانِ شباب ہی سے انسان یہ کوشش کرنے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو منوائے اور سوسائٹی میں ایک امتیاز حاصل کرے۔ یہ صفت بہت اعلیٰ قسم کی ہے لیکن اس کی نشو و نما میں، خصوصاً ادب کی حد تک احتیاط کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ رعب گانٹھنے کے لئے ریا آمیز طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سے عام طریقہ بڑی بڑی کتابوں کا حوالہ دینا، چند مشہور مقولوں کو نقل کر دینا، یا بڑے لوگوں کے نظریات کا ذکر کر کے گپ بازی کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی سطح پسندی ہے، کیونکہ اس مشرب میں ادیب یہ محسوس نہیں کرتا کہ حوالے اور مقولے اور گپ بازیاں اسی وقت جچتی ہیں، جب کہ خود اس کی تحریر اور نظریات میں بلندی اور جدت ہو۔ تحریر کا انداز صاف بتا دیتا ہے کہ لکھنے والا کس مقام پر ہے۔ اگر وہ کمزور خیالات اور کمزور اندازِ بیان میں اس قسم کی چیزوں کو چسپاں کر دے گا تو صاف ظاہر ہو گا کہ ٹاٹ میں حریر کا پیوند لگایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ لوگ "ادبی کثرتِ کار" کو اپنے جذبۂ شہرت اور تسلی کا آلۂ کار بناتے ہیں۔ اگر اس کثرتِ کار میں صحیح معیار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ان کی یہ مساعی ہر قدم پر اپنا آپ مضحکہ بن جائیں گی بعض لوگ کچھ بھی نہیں کرتے، لیکن اپنا اندازِ تخاطب بہت بلند محتاط اور موثر رکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی لفاظی اور چرب زبانی سے تنقید و تبصرہ کا میدان جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے انسانوں کی مثال اس ریڈیو کی ہے جس سے اعلیٰ تقریریں نشر ہوتی ہیں لیکن خود اس میں دو چار ٹلیوں کے سوائے کچھ نہیں ہوتا۔

شانِ بے نیازی اس سلسلے میں ایک اور صفت کا ذکر ضروری ہے جو سطح پسندی کی تخلیق کرتی ہے۔ ہم اس کا نام

"شانِ بے نیازی" رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ صفت ہے جو ادیب کو علمی تنقید، اصولی گرفت اور معقول اعتراض سے بے پروا بنا دیتی ہے۔ شعر غلط کہے جا رہے ہیں، تنقید میں اوچھا پن پایا جاتا ہے، افسانے اور ڈرامے صاحب نظر اصحاب کے نزدیک معمولی درجے سے زیادہ نہیں، لیکن شاعر، نقاد، ڈرامہ نویس اپنا کام کئے جاتے ہیں اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ یہ بے حسی ایک قسم کی بناوٹ ہے، اور اس کا محرک وہی جذبۂ عجز و انتیاز ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کی سطروں میں کیا ہے ایسے اصحاب کا عموماً یہ استدلال ہوتا ہے کہ وہ "اپنی نظیر آپ ہیں"۔ یہ شاید درست ہو، لیکن ادب کی دنیا میں "اپنی آپ نظیر" کے معنی یہ تو نہیں کہ اصول، معیار اور ذمہ داری کی ساری حدوں کو نیست و نابود کر دیا جائے؟ جب تک ادیب ایسی بے حسی اور غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے وہ ایک طرح کی سطح پسندی ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر بے نیازی کی دنیا میں آجاتا ہے تاکہ ادبی کمزوریاں جو قابلِ گرفت ہوں، اور جن کا دور کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو، اس پر کوئی ذمہ داری نہ عائد کریں اور اس کا کام چلتا رہے۔

خطرے کی گھنٹی ان حالات کے تحت ہم شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ادبی ماحول میں طالب علم، فارغ التحصیل، اہل شوق اور اہل ذوق سبھی کے لئے سطح پسندی سے نجات حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ ایک خطرے کی گھنٹی ہے جو شب و روز بج رہی ہے، اگر اس کی آواز پر کان نہ لگائے گئے تو بہت دنوں کے بعد بھی ہماری ادبی قوم اپنے اصلی مقام پر نہ کھڑی ہو سکے گی۔ "تقلید و تعاقب" "سطح پسندی" اور "شدید خیالی" سب کے سب ادب کے نقصان رساں عناصر ہیں۔ ان سے ہر اہل ذوق کو دور رہنا چاہیے۔ قوم کی ادبی کوششوں کا بڑھنا بیشک ایک کار باصواب ہے، لیکن قوم کی ذہنیت اور مذاق کا سطحی ہو جانا، بہت بڑا عذاب ہے!

محمد عبدالقیوم خاں باقی

غزل

انھیں دل دے کے اب پچھتا رہا ہوں
سزا اپنے کئے کی پا رہا ہوں

انھیں در پردہ ہے مجھ سے محبت
انھیں باتوں میں دل بہلا رہا ہوں

پلا دے ساقیا ہاں پھر پلا دے
کہ پھر موجود خود کو پا رہا ہوں

وہ آئیں گے اور اب آتے ہی ہوں گے
میں اپنے دل کو یوں سمجھا رہا ہوں

گھڑی بھر دم تو لے اے اخترِ صبح
ترے ہمراہ میں بھی ... آ رہا ہوں

پلا ساقی کہیں توبہ نہ کر لوں
کہ ہشیاری میں بہکا جا رہا ہوں

شبِ فرقت میں ناصر چپکے چپکے
کسی کی داستاں دہرا رہا ہوں

اختر الزماں ناصر

دو خواب

(۱) تیس تا ساٹھ

(۳۰ — ۶۰)

تیس تا ساٹھ پر میرا تقرر ہوا تھا۔ گریجویٹ ہی تو تھا۔ بھلا میرے لئے ترقی کی کون راہ رکی ہوئی تھی۔ سکنڈ گریڈ، فرسٹ گریڈ، تحصیلداری، تعلقداری غرض جن تمام عہدوں کے لایق تھا یا یوں کہئے کہ یہ سب عہدے میرے قابل تھے۔ اور پھر ترقی کے لئے ہے ہی کن چیزوں کی ضرورت۔ ذرا سی دیانتداری اس پر افسر اعلیٰ کی خوشی اور ناراضی کا کامل لحاظ۔ بس بیڑا پار ہے۔ مجھے ترقی کیسے ہوئی یہ تو یاد نہیں رہا۔ ہاں اتنا خیال ہے کہ دیکھتے دیکھتے تحصیلدار اور پھر تعلقدار بن بیٹھا۔

تعلقداری کی شاندار عمارت میں کرسی حکومت پر متمکن ہوں۔ چپراسیاں کمربستہ ایستادہ ہیں۔ صیغہ دار باری باری سے امثلہ پیش کر رہے ہیں۔ صرف دستخط کرتے کرتے ہی میری طبیعت اکتا گئی ہے۔ پسینہ پسینہ ہو گیا ہوں۔ برقی پنکھا چل رہا ہے لیکن میری تھکن دور نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے دماغ کی گرمی کا اثر نزلہ ہوتا ہے اور جب کسی تعلقدار کا نزلہ گرتا ہے تو اپنے ماتحتین کے سوا کسی اور پر کیوں گرنے چلا۔ "عجیب بیوقوف ہو جی۔ تمھاری عقل ماری گئی ہے۔ بڑے بدو بیل ہو کچھ دماغ بھی ہے" وغیرہ وغیرہ غرض کسی پر برستے اور کسی پر قہر آلود نظریں ڈالتے ہوئے کام ختم کیا۔

مکان آکر بیٹھا ہی تھا کہ منتظم صاحب پولس نے آکر گھٹ سے سیلوٹ مارا۔ اور یہ خبر سنائی کہ ڈاکوؤں کا ایک جتھا ضلع میں گھس پڑا ہے۔ پولس ان کی گرفتاری کے لئے شب و روز حیران ہے۔ ڈاکو بہت ہی چالاک اور پختہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ اتنا سن کر میرے ہوش بجا نہیں رہے۔ فوراً منتظم صاحب سے کہا کہ چار پولس کے جوان گیٹ پر متعین کردیں اور داروغہ کو آواز دے کر تاکید کی کہ رات بھر ہوشیار رہے..... رات ہوگئی۔ پولس گیٹ پر پہرہ دے رہی ہے۔ داروغہ اور دوسرے ملازمین بھی جاگ رہے ہیں لیکن نہ معلوم کہاں سے ایک شخص میرے کمرے میں گھس آیا۔ اس کی ہیبت ناک شکل دیکھتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بارے ہمت کی اور ذرا رعب دار آواز میں کہا "ابے او تو ہے کون اور کیوں اس طرح گھس کر چلا آیا"

"میں ہوں حضور آپ کا خادم"

"ہیں..... تو... میرا خادم"

"جی ہاں..... آپ کا غلام"

میرا غلام..... آج تک تو سنتے تھے کہ مہمان بن بلائے وارد ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اب تو خادم اور غلام بھی خواہ مخواہ گلے پڑنے لگے..... تو چاہتا کیا ہے۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور صرف اپنی تجوری کھول دیجئے۔"

"ابے کیا بک رہا ہے۔ نکلتا نہیں یہاں سے۔ ورنہ ابھی داروغہ کو آواز دے کر جیل کی ہوا کھلاؤں گا۔

"دال" الف زبر دا کے منہ سے نکلنے سے پیشتر ہی خدا بخش حضور کا سر کھول دے گا" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک موٹا ڈنڈا جو بغل میں دبائے ہوئے تھا میرے سر کی طرف بڑھایا۔ میں نے کہا "بھائی بگڑ کیوں رہا ہے یوں مانگ لے کچھ دیدوں گا۔ چوری سے فائدہ۔ دنیا میں ذلیل۔ آخرت میں گنہگار"۔ یہ سنتے ہی

وہ جھٹ سے میرے سینے پر چڑھ بیٹھا اور ملامت آمیز لہجے میں کہنے لگا "یوں مانگ لے کچھ دیدوں گا۔ خیرات کی اب سوجھی جب جان پر بن آئی۔ تمھیں اور تمھارے گھر بار کو دعائیں دیتے ہوئے منت سے ساجت سے ہم نے ہاتھ پھیلائے تو جھڑکیاں دے دے کر نکال دیا۔ نوکروں سے گردنیاں دلوادیں۔ اس وقت تو تمھارے کیسہ سے ایک پائی نہ نکلی۔ اب بخشش کے لئے حاتم طائی تیار ہے۔ کون کہتا ہے چوری گناہ ہے۔ چوری ہمارا حق ہے۔ ہمارا جائز حق ہے۔ ہم چوری نہ کریں گے تو کیا بھوکے مریں گے۔ نہ ہمارے باپ دادا نے کوئی ملک چھوڑی اور نہ ہماری قسمتوں ہی میں کوئی معاش لکھی گئی۔ کوئی ہمارا پرسانِ حال نہیں۔ سوسائٹی اپنی دولت سے آپ مزے کر رہی ہے۔ تمھارے بنائے ہوئے قانون نے دولت کی تقسیم کو اپنوں ہی میں محدود کر رکھا ہے۔ لاکھ لاکھ روپے ایک ایک آدمی کے پاس اور اس کا بھائی اس کو ہاتھ لگانے کا مجاز نہیں۔ واہ رے بنی آدم کی برادری! تم جس طبقے کو چور اور ڈاکو سمجھتے ہو وہ دراصل ایک باغی طبقہ ہے جس کی آنکھوں میں آتشِ انتقام نے خون اتار رکھا ہے۔ انتہائے غضب میں جیسے نیک وبد کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ہم نہیں جانتے سچائی کس کو کہتے ہیں۔ دیانت کس پرند کا نام ہے نیکی کون جانور ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنھیں قدرت نے بہت کم سرفراز کیا!"

"صرف حواس خمسہ اور صحیح سالم بدن کے ساتھ زمین کی پیٹھ پر بوجھ بنا کر پھینکے گئے۔ ہمارے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے یہی چیزیں کافی تھیں۔ تم لوگوں نے دولت کو لوہے کی بڑی بڑی تجوریوں میں چھپا کر اور انھیں مسلح سپاہیوں کے پہرے میں رکھ کر یہ سمجھ رکھا تھا کہ اب وہ دولت محفوظ ہے۔ لیکن ہمارے چالاک ہاتھوں نے تمھارے اس زعم باطل کو مٹا دیا۔ ہم نے معصوم بچیوں کی کلائیوں سے سونے کی چوڑیاں نکال لیں۔ بے گناہ عورتوں کے گلے گھونٹ کر چندن ہار اتار لئے۔ کمزوروں پر رعب ڈال کر اپنی جیبیں گرم کیں۔ نمازیوں کے کپڑے کلیسا کا سامان چرایا۔ دیوتاؤں کے گہنے اڑائے۔ سماج کو بنی نوع سے غفلت برتنے کا خوب مزا چکھایا اور برابر چکھاتے آرہے ہیں گنہگار ہم! ہم سے مواخذہ کس بات کا۔ یہ سوال اُس کارخانے میں کیجئے جہاں مٹی، آگ اور ہوا پانی کی ترتیب دی جاتی ہے۔ یہ بات وہیں جا کر پوچھئے جہاں انسان کا مستقبل قسمت کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے...... اتنا کہہ کر وہ میرا گلا زور زور سے گھونٹنے لگا۔ میں گھبرا کر چیختا ہوا اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں مل مل لیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ سب خواب تھا۔ تکیہ کے نیچے سے اپنے تقرر کی فہمایش نکالی۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ سینے سے لگایا۔ ایسی تونگری سے تو میری غریبی اچھی۔

"تیس تا ساٹھ زندہ باد"

(۲) غنڈا

مدت سے پریشان تھا کہ غنڈے کی صحیح تعریف کس طرح کی جائے۔ بہتیرے لوگوں سے دریافت کیا کہ ان کے نکتۂ خیال میں غنڈے کا حقیقی تصور کیا ہے۔ کسی نے کہا "بنی نوع کا وہ فرد جو عام اخلاقی معیار سے گرا ہوا ہو۔" کسی نے کہا "وہ انسان جو اپنی ہوس پرستی کے لئے دوسرے انسانوں کی تباہی کا درپے ہو۔" کسی نے کہا "آدم کا وہ بیٹا جسے بچپن سے شیطانوں کی صحبت ملی ہو۔" غرض میں نے غنڈے کی بیسیوں تعریفیں سنیں اور ہر تعریف کو ان لوگوں کے حالات کے مقابل رکھ کر غور کیا جنھیں سوسائٹی غنڈوں کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ تعریف کو حالات کے ساتھ مطابقت دینے میں

مجھے سخت ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک تعریف جہاں ایک پر صادق آتی تھی وہاں دوسرے کے ساتھ اسے کوئی رابطہ نہ تھا۔

ایک رات بستر پر لیٹا لیٹا سوچ رہا تھا کہ آخر غنڈہ ہے کس صنفِ انسان کا نام۔ اسی دھن میں آنکھ لگ گئی......

عابد شاپ پر سے سگریٹ پیتا ہوا گذر رہا ہوں۔ دفعتہً ایک شخص نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ ہٹا کٹا آدمی۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ بدن پر میلے کچیلے کپڑے۔ ٹوپی پر چار چار انگل گرد جمی ہوئی پاؤں میں پھٹی ہوئی جوتی لگائے اور کہنے لگا "اے صاحب ذرا دیاسلائی تو عنایت فرمائیے"۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ جی میں تو آیا کہ اس غنڈے کو اس کی گستاخی پر ایک طمانچہ رسید کردوں...... غصے کی تو بات تھی۔

اس کو دیکھو ایک آوارہ صورت انسان۔ اور ایک گریجویٹ سے شاہراہ عام پر اسطرح شانے پر ہاتھ رکھ کر گفتگو کرنا چاہتا ہے میری سفید پوشی پر کتنا بڑا دھبہ تھا۔ سوسائٹی کی عزت کے لئے کتنی بڑی ٹھیس تھی۔ خون کے گھونٹ پیتا ہوا اس کا ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیا اور اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی راہ لی۔

باغ عامہ میں ہری ہری گھاس پر بیٹھے تفریح کرتے ہوئے چند لمحے نہ گزرے ہوں گے کہ وہ شخص پھر سامنے آدھمکا۔ اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا "حضور خفا ہو گئے آپ" میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں جب دیکھا کہ نہ کوئی ہمیں سن رہا ہے اور نہ کوئی دیکھ رہا ہے تو اس سے کہا "ابے تجھے کہیں اور دیاسلائی نہ مل سکی جو تو نے یہاں تک میرا پیچھا کیا"۔

"حضور دیاسلائی تو ہر قدم پر ایک مل جاتی ہے لیکن مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے"۔

"بول کیا کہنا چاہتا ہے" میں نے اس کو ٹالتے ہوئے کہا۔ آپ نے میرے دیاسلائی مانگنے پر بُرا مانا......

"ہاں تو"......

"اگر میں آپ کی طرح خوش لباس ہوتا تو کیا آپ اسی طرح جھڑکتے"۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "سرکار میں خوب جانتا ہوں آپ کے ہاں اس کا کوئی جواب نہیں۔ آپ نے مجھے اس قدر حقارت سے صرف اسی لئے جھڑکا کہ میری ظاہری حالت ٹھیک نہیں تھی میرا لباس میلا تھا۔ خدا نے آپ کو اعلیٰ تعلیم پانے کے لائق بنایا تعلیم نے جہاں آپ کے خیالات کو عام سطح سے بلند کیا وہاں آپ کی زندگی کا معیار بھی عام زندگی سے ہزار گنا اونچا کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ آپ نے جس قدر بلندی کی طرف پرواز کی اسی قدر پستی کے سامان بھی پیدا کئے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کرکے اپنے آپ کو ان باعزت لوگوں میں شامل کر لیا جن کے ہاتھوں میں قوم کی تنظیم و ترقی کی باگ ہے۔ جن کی تحریروں میں قانون پرورش پاتا ہے جن کی تقریروں سے انقلاب کی تعمیر ہوتی ہے۔ جانتا ہوں آپ قانون بنانا جانتے ہیں۔ اپنے مطالبات بہتر سے بہتر پیرائے میں پیش کرکے اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمیٹیوں میں زوردار تقریریں کرتے ہیں اور تحسین و آفرین کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ادھر آپ نے مطالبات لکھ بھیجے اور ادھر کام بن گیا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ نے ایوان میں تقریر کی اور اپنے مطالبات منوالئے۔ یقین مانیے۔ آپ قوم کے عضوِ معطل ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ غنڈے نہ ہوں

آپ انھیں کی ہمت پر گھر بیٹھے دھمکیاں دیتے ہیں جس حاصل شدہ حق کو آپ اپنی محنت کا صلہ تصور کرتے ہیں. وہ دراصل انھیں غنڈوں کا خوں بہا ہے ۔ غنڈے ہی سروں پر لاٹھیاں کھاتے ہیں. غنڈے ہی سینوں پر گولیوں کی بارش جھیلتے ہیں. غنڈے ہی قید کی سختیاں اٹھاتے ہیں۔ انھیں کی بدولت آپکے حقوق کی قدر قائم ہے. انھیں کے بل پر آپ آزادی کا نام لیتے ہیں۔ اور انھیں کے طفیل سے آپ کے سر پر شرافت کی سفید پگڑی برقرار ہے..... میرے بھائی! آپ کے لئے اپنی جان دینا تو بلا استثنیٰ ہر غنڈے کا طرہ امتیاز ہوا مگر آپ ہیں کہ اس سے بات کرتے ہوئے کنیاتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ ہی کی طرح دو ہاتھ، دو پیر اور دو آنکھ رکھنے والے آدمی غنڈے کیوں کر کہلائے. غنڈے کے آپ کے ہاں کیا معنی ہیں. آپ دل چیر کر دیکھنے سے تو رہے۔ یقیناً آپ کا فیصلہ ظاہری حالت پر موقوف ہے. غنڈہ آپ کے نزدیک ایک ایسا مفلس شخص ہے جس کے ہاں پہننے کے لئے کپڑے نہ ہوں. اگر ہوں بھی تو بدلنے کے لئے نہ ہوں. جس کو مفلسی سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔ آپ شرافت کو صرف لباس سے پرکھنے کے عادی ہیں۔ دیکھئے انھی گندی گندی قمیصوں کے اندر کیسے کیسے محبت بھرے دل ہر وقت آپ پر سے قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ یہی ہاتھ جسے آپ نے اس قدر حقارت سے جھٹک دیا تھا کس دلیری کے ساتھ آپ کے دشمنوں کے سروں پر تیر برساتا ہے۔ یہی بڑے بڑے بالوں والے سر جن پر میلی میلی ٹوپیاں بے پروائی کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں. کیسی شوریدگی سے جور و استبداد کی آہنی دیواروں سے ٹکراتے ہیں مگر کاش! آپ کی قوم میں کوئی غنڈہ نہ تھا۔ وہ تو وہ ہر وہ شخص جسے آپ اپنا لیا کرتے تھے شریف بن جاتا تھا۔ اب یہ دن ہیں کہ آپ اپنے ہاتھوں غنڈے بنا رہے ہیں۔ آپ کی سفید پوشی نے آپ کو ہمارے ساتھ ملنے جلنے اٹھنے بیٹھنے سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ صحبت کے اثرات ہم سے دور رہے. ہم میں جہالت اور درشتی پیدا ہو گئی۔ آج آپ اپنی بلندی سے اپنی قوم کی خاطر نیچے اتر آئیے۔ ہمارے ساتھ نشست و برخواست کو گوارا کیجئے۔ کمی بیشی۔ دولت اور افلاس کے امتیازات کو اٹھا دیجئے. پھر دیکھیئے غنڈہ ایک مہمل لفظ بن کر رہ جائے گا۔"

"حضور میں شریف النسب ہوں. چھٹے درجہ تک ابتدائی تعلیم حاصل کی. مفلسی نے آگے بڑھنے نہ دیا۔ ماں باپ کا سایہ لڑکپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ مزدوری کر کے جیتا ہوں اتنی حیثیت نہیں کہ آپ کی طرح سفید کپڑے پہنوں۔ دوسرے معنوں میں غریب ہوں۔ غنڈہ ہوں۔ میں نے آپ سے دیا سلائی مانگ کر سر راہ آپ کو ذلیل کیا۔ خدارا مجھے معاف کیجئے۔ آئندہ اگر کبھی جان پر بھی بن آئے تو کسی تعلیم یافتہ سفید پوش کو نہ چھیڑوں گا۔ مجھے معاف کیجئے، مجھے معاف کیجئے" اتنا سن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بے تابانہ کھڑے ہو کر اسے سینے سے لگا لیا...

مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی میرے شانے جھنجھوڑ رہا ہے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ میرا بھائی کھڑا کہہ رہا تھا "اٹھو بھائی اٹھو ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا۔ کب تک سوتے رہیں گے آپ!"...... میں اٹھ بیٹھا۔ اور اس خواب کو دیکھے کوئی ہفتہ بھر گذر گیا لیکن اب تک یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

"غنڈہ۔ آپ کے نزدیک ایک ایسا مفلس شخص ہے جس کے ہاں پہننے کے لئے کپڑے نہ ہوں۔ اور اگر ہوں بھی تو بدلنے کے لئے نہ ہوں۔ جس کو مفلسی سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔"

محمود قطبی

برسات

اے خوشا قسمت وہ بادل چھا گئے افلاک پر
گرمیوں کی دھوپ میں کرتے تھے جن کا انتظار!

کھلکھلاتی ندیاں بڑھ کر گلے ملنے لگیں
لہلہاتی کھیتیوں کا دیدنی ہے اب نکھار

چھوٹے چھوٹے "تاج" ہر لحظہ بنا کر ست ہے
اجلے اجلے چاندنی جیسے وہ بگلوں کی قطار

لو وہ مرجھائے درختوں نے نیا جوبن لیا
باغ کی نوخیز کلیوں نے بھی چھیڑا ہے ملہار!

سیم تن پھولوں کے منہ پھر موتیوں سے بھر گئے
برق نے انگڑائی لی جاگا وہ ابرِ نو بہار!

پھر ہواؤں نے اڑائیں نیلی نیلی ساریاں
گاؤں کی پریاں بنیں جھولوں کی پینگوں کی بہار

پھر کسی مخمور چرواہے کی بنسی جاگ اٹھی
پھر کوئی نوخیز دوڑی کھیت کو بے اختیار

یہ بھری برسات، یہ کالی گھٹا، ٹھنڈی ہوا
ساری دنیا کے لئے اے دوست پیغامِ بہار

اور ہم مفلس، پریشاں نوجوانوں کے لئے
آسمانی قہر ہے یا رحمتِ پروردگار؟!

نظر

میر الشعراء شہید دہلوی

مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نوگانوی کا مضمون (میر احمد علی خاں شہید دہلوی' مطبوعہ سب رس اگست سنہ ۴۲ء) میری نظر سے گزرا۔ چونکہ فاضل مضمون نگار کے ماخذ صرف "محبوب الزمن" اور دیوان شہید قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۷۰ھ تھے' اس لئے موصوف کو بنیادی غلط فہمی ہوئی۔ نیز شہید کے مخصوص رنگ' اخلاقی شاعری' اور بعض ضروری امور پر کچھ روشنی نہ ڈال سکے۔ شاید صاحب مضمون کی نظر سے شہید کا کلیات موسوم بہ "نظم شہید" اردو مطبوعہ سنہ ۱۳۰۹ھ نہیں گذرا[1]۔ شہید کے جس دیوان کو موصوف نے غیر مطبوعہ تصور فرمایا ہے' وہ دراصل چھپ چکا ہے۔ چنانچہ اسی غلط فہمی کو دور کرنے اور مذکورۂ بالا کمی کو پورا کرنے کے لئے' میں یہ مضمون سپرد قلم کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ' شہید راقم السطور کے حقیقی پردادا ہوتے ہیں۔

ماخذات ۔۔ شہید کے حالات' اجداد کا ذکر' اور اولاد کا تذکرہ حسب ذیل کتابوں میں ملتا ہے۔

۱۔ تاریخ دکن فارسی ڈپٹی نظر اللہ خاں خورجوی مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۸۹۱ء
۲۔ مآثر الامراء جلد دوم ۔ صمصام الدولہ شاہنواز خاں ۔۔ ۔۔
۳۔ خمخانۂ جاوید اردو لالہ سری رام ایم' اے ۔۔ ۔۔
۴۔ تزک محبوبیہ اردو غلام صمدانی خاں گوہر مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۳۱۱ھ
۵۔ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن اردو محمد عبد الجبار خاں صوفی ملکاپوری مطبوعہ سنہ ۱۳۲۹ھ
۶۔ یادگار ضیغم اردو نواب محمد عبد اللہ خاں ضیغم ۔ حیدرآباد
۷۔ دکن میں اردو ۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ۔ سنہ ۱۹۳۶ء
۸۔ سخنوران دکن ۔ مولوی تسکین عابدی صاحب ۔
۹۔ شاعر کی دنیا ۔۔ مولوی عظیم الدین صاحب محبت بی اے ۔۔ سنہ ۱۹۳۹ء

اولاد معنوی

۱۔ دیوان اول شہید دہلوی' اردو' قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۷۰ھ موجودہ کتب خانہ سید رستم علی صاحب چھتہ بازار۔
۲۔ نظم شہید' کلیات میر الشعراء شہید دہلوی اردو مطبوعہ سنہ ۱۳۰۹ھ
۳۔ دیوان شہید۔ فارسی قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۵۸ھ۔ موجودہ کتب خانہ حکیم میر نادر علی صاحب رعد قطبی گوڑہ۔
۴۔ متفرق اوراق قلمی مشتمل بر نوحہ جات' قصائد' سلام وغیرہ موجودہ کتب خانہ حکیم میر نادر علی صاحب رعد قطبی گوڑہ۔

خطاب منصب وغیرہ :۔ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب نے شہید کا خطاب "امیر الشعراء" لکھا ہے' حالانکہ شہید "میر الشعراء" سے مخاطب تھے۔ چنانچہ اس کی تصدیق تاریخ دکن سے ہوتی ہے (یہ نہایت مستند تاریخ ہے اور شہید کی زندگی میں لکھی گئی ہے) اصل عبارت یہ ہے۔

" پنجاہ سال می گذرد کہ میر احمد علی خاں شہید وارد حیدرآباد است' منصبدار و مقرب حضرت غفران منزل بود و بخلعت و خطاب میر الشعراء ممتاز و الحال ہم بدستور بعہدۂ منصبداری سرفراز" صفحہ ۱۹۹

خود شہید نے بھی جابجا خطاب کا ذکر کیا ہے۔

پھولا نہ سمایا ہے شہید آج خوشی سے بخشا ہے لقب شہ نے جو میر الشعراء کا

ہر چند کہ میر الشعراء تو ہے شہید آج لیکن نہیں سودا سے ہے اور میر سے بہتر

منصب :۔ مہاراجہ چندو لعل شاداں نے شہید کو تین روپے

[1] یہ کلیات قبلہ گاہم حضرت رعد کے اہتمام سے سنہ ۱۳۰۹ھ میں مطبع فخر نظامی حیدرآباد میں چھپا جواب نایاب تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ کے نمبر ( ) دواوین' پر محفوظ ہے۔ میرے پاس اس کا صرف ایک نسخہ رہ گیا ہے جو مضمون ہذا کے ساتھ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں داخل کیا جا رہا ہے۔ اس کلیات میں شہید کا تمام کلام ابتدائے شاعری سے وفات تک شامل ہے۔

یومیہ مقرر فرمایا تھا اور حضرت آصفجاہ رابع سے تین سو روپیہ ماہانہ منصب مقرر تھا۔ (یہ منصب تاحال جاری ہے)

ولادت، وفات۔ شہید ۱۱۹۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ۱۲۳۰ھ میں حیدرآباد آئے اور ۱۲۹۰ھ میں (۹۵) سال کی عمر میں حیدرآباد میں وفات پائی، تکیۂ گجراتی شاہ رام کوٹ میں مدفون ہیں۔ آپ نے آصفجاہ ثالث، رابع، خامس اور سادس چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔

اولاد۔ شہید کے خاندان میں تاحال سلسلۂ شاعری جاری ہے۔ چنانچہ شہید کے فرزند (راقم الحروف کے دادا) میر کاظم علی خاں شعلہ موسوی (۱۲۵۲ھ تا ۱۳۰۲ھ) فارسی اردو دونوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔ فارسی دیوان "مذاقِ عشق" کے نام سے ۱۳۱۱ھ میں چھپ چکا ہے، اردو کلام متفرق اور غیر مطبوعہ ہے۔ شعلہ کے دو فرزند، بڑے حکیم سید نوازش علی لمعہ (۱۲۸۰ھ تا ۱۳۴۳ھ) صاحب تصانیف کثیرہ تھے[1]۔ آپ کی مشہور تالیف "جواہر الاشعار" ہے۔ شعلہ کے چھوٹے فرزند نبلہ کا ہم حضرت رعد (راقم الحروف کے والد) ہیں۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف اور اس وقت بقید حیات ہیں۔

شہید کا مخصوص رنگ

شہید کی انفرادی خصوصیات کو ہم دو نمایاں عنوانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ خالص دیسی تشبیہات کا استعمال۔ ۲۔ اخلاقی موضوعات پر طبع آزمائی

۱۔ دیسی تشبیہات:۔ یہ عجیب بات ہے کہ شہید اپنے ہمعصر شعراء کے خلاف خالص ہندوستانی تشبیہات و تلمیحات استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایرانی شعراء کی پیروی نہیں کرتے۔ شہید کے گلزارِ سخن میں بلبل کے نغموں اور قمری کے نالوں کے عوض کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک سنائی دیتی ہے۔ شہید کے کلام میں ہم کو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور وامق عذرا کی بجائے۔ ہیر رانجھا، نل دمن اور رادھا کرشن کے نام ملتے ہیں۔

پھر نہ کوئل کا نشاں تھا نہ پتا پیہو کا — صبح میں نے جو کیا باغ میں نعرہ ہو کا

سچ پوچھو تو میں عشق میں رانجھا سے ہوں کامل — وہ مرتبہ حسن میں ہے ہیر سے بہتر

تم رنگِ دمن گر ہو تو میں ثانی نل ہوں — رادھا ہو جو تم میں بھی ہوں کرشن مرے صاحب

کب دل میں ترے خال کا سودا نہیں آتا — کب گانوں میں گوکل کے کنھیا نہیں آتا

شہید کے کلام میں ایران کی بہار نوروز کے عوض ہندوستان کی برکھا رت کا سماں بندھا ہوا ہے۔ وہ رستم و سام کے عوض بھیم اور ارجن، نوشیروان و جم کی بجائے رام اور کرشن، باغِ داد، قصر فریدوں، دریائے نیل اور جیحوں کے عوض۔ دہلی کے محلات اور گنگا جمنا کی مثالیں دیتے ہیں۔ غرض کہاں تک گناؤں، ہندوستانی تلمیحات، تشبیہات، رسومات تمام باتیں ہندوستانی پائی جاتی ہیں۔

ساون کی گہر بار گھٹا سر پہ کھڑی ہے — یا مانگ میں اس شوخ کے موتی کی لڑی ہے

اس ابروئے پرخم کے تصور کی کہے تاب — ارجن بھی نہ کھینچے یہ کمان ایسی کڑی ہے

خالِ رخِ روشن کا کسی کے ہے تصور — یا صبح کے تارے سے مری آنکھ لڑی ہے

ہے دیدۂ تر ابر کا دامن مرے صاحب — بھادوں کی پھیلی ہے جھڑی نہ ساون مرے صاحب

چہرے پہ ملے راکھ نہ کیوں آرسی اپنے — منھ دیکھ تمہارا ہوئی جوگن مرے صاحب

یہ کاہکشاں حلقۂ پروین ہے بنائی — یا گوری کلائی میں ہے کنگن مرے صاحب

راجہ بنسی والا زلفِ چلیپا ہو گیا — خالِ رخ کا تیرے دیوانہ کنھیا ہو گیا

شاہ آئے شرم اسے نیرنگِ الفت شہید — قصہ اس بت کو سناسیتا کا نو اور رام کا

قصے اس سے پر کرے کوئی دمن کی تصویر — گھر سے کے مجھ پر سے اتارے کوئی نل کا پتلا

سرسوں پھولی مری نظر میں — پہنی جو بسنتی اس نے پوشاک

دلی کیوں کر نہ یاد آئے — کیسے کیسے محل نسرح ناک

وہ سیر مکانِ قطب صاحب — جھرنے کا وہ لطف لذت تاک

[1] لمعہ کا مجموعۂ کلام میرے اہتمام سے زیر ترتیب ہے۔ — برق موسوی

دیدۂ تر نے مرے الٹی بہائی گنگا　　مجھ سے ملنے وہ صنم تا لبِ گنگا نہ گیا
ہر شکن آستیں کی موج ہے دریا کی شہید　　گنگا جمنا کی معاون ہیں مری آنکھیں

اچھوتی تشبیہات۔ شاید ہی ان تشبیہات کو شہید کے سوا کسی نے استعمال کیا ہو۔

اس نے کنول سے گال دیئے تجھ کو اور مجھے　　بھونرے کی طرح بے خود و شوریدہ سر کیا
لب اس کا پان کی سرخی سے لال لال ہے آج　　بہار دیکھو شفق میں عیاں ہلال ہے آج
سو گھنے کے تو اس کے کام آیا　　گوہر اشک موتیا نہ ہوا
یاد میں زلفوں کی دل رکھتا ہے کوزہ اپنا　　راجا اندر کی طرح بیٹھا نہ چھوڑا سانپ کا
مارا اپنے نفس سرکش کو کر اس موذی کو زیر　　یعنی اک رسی ہے وہ جب بانت توڑا سانپ کا
ہم تم ہوں متفق تو رہیں بے خطر مدام　　مرتی نہیں وہ گوٹ جو ہو ساتھ گوٹ کے
تکیہ جبرئیل کے پر کا ہو تو نیند آ جائے　　زانوئے یار ہو جس خاک بسر کا تکیہ
یاں ہو پل مارتے برہم شدنی بزم طرب　　یہی کہتی کف افسوس ہیں مل مل پلکیں
لبوں پہ مل کے مسی ہو نہ لال پان کھا کر　　نہ کر خونریزی عالم نہ لاش خون نہ زمانے پر

۲۔ اخلاقی شاعری۔ یہ خاص خوبی ہے کہ شہید صرف حسن و عشق کے موضوع ہی میں الجھ کر نہیں رہ گئے۔ انھوں نے بے شمار موضوعات پر نہایت آگاہی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کا خزانۂ سخن اخلاقی جواہر سے مالا مال ہے اور ایسے اشعار بہ کثرت پائے جاتے ہیں جو "مسکلمان را بکار آید و مترسلان را بلاغت افزاید" کے مصداق، ضرب المثل ہونے کی بے پناہ صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ نیز شہید نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت کامیابی سے تنقید کی ہے۔ بخوف طوالت بلا کسی تنقید کئے میں یہاں چند عنوانات قائم کر کے منتخب اشعار پیش کرتا ہوں۔

صانع و مصنوع

(وحدت الوجود۔ معارف و مشاہدہ۔ واجب و ممکن)

ذرہ کو پرتو خورشید سے ہے فیض وجود　　ہم ہیں جب تک کہ تری جلوہ گری ہے
تری تلاش میں آئے عدم سے ہم یاں تک　　وگرنہ ہستی ناپائیدار میں کیا تھا!
ظاہر میں گرچہ وہ نظر آتا نہیں مگر　　ہر چیز میں نشان ہے اس بے نشان کا
بحث کرتے ہیں عبث شیخ و برہمن دونوں　　دیر میں جو ہے وہی مسجد و محراب میں ہے
دل میں خود سوز ہے کیا طور پہ جاؤں یارب　　گھر میں جو آگ ہے کیوں پھر وہ سر طور نہیں
لاکھ پردے میں جہاں ایک بت ہرجائی ہو　　تیز کی عقل وہاں محبت لاحاصل ہے
عزم دیدار میں چارہ نہیں عاشق کو شہید　　لن ترانی بجواب ارنی حاصل ہے
کیا شرف بخشا ہے انساں کو خدا نے شیخ شہید　　سجدہ گاہ عرشیاں مٹی کا پتلا ہو گیا
مرشد کہیں مرید کہیں اہل دل بنا　　جس جا جو کچھ بنا سو وہی مشت گل بنا
کہاں ہستی کے جلوے تھے کدھر عزم مقدم تھا　　ہوئے بیدم تو سمجھے سب ظہور اپنے ہی دم کا تھا
گرچہ کہنے کو تو ممکن ہے مگر تو نے ہمیں　　قدرت واجب کا نقشہ اے بشر دکھلا دیا

جذب و محبت

(دلجوئی۔ دردمندی۔ ہمدردی۔ طاقت دل۔ پاس خاطر)

بہہ جائے لہو بن کے وہ آنکھوں سے الٰہی　　گر تیری محبت دل انساں میں نہیں ہے
آنکھیں انساں کی محبت سے ہوئی ہیں روشن　　ورنہ یہ خاک کا پتلا بخدا اندھا تھا
کچھ نکلا ہی تو افسوس گری عشق سے کام　　ورنہ افسانہ ہیں سب علم و عمل کی باتیں
داغ الفت کی بدولت جو تونگر ہیں شہید　　ان کو خوش آتی ہیں کب اہل دول کی باتیں
سطح ہستی پر رسا ہو دانش علم و عمل　　عشق کی مسند کے آگے سب ہیں پا انداز یہ
مرد عشق سے اب وہاں ہے گزر اپنا شہید　　جس جگہ جاتے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
ایک پتلا تھا خاک کا آدم!　　جان اس میں پڑی محبت سے
از بسکہ زن میں حادثہ پرورد محبت　　رکھتا نہیں کچھ دل میں بجز درد محبت
لا اسئل کی خوب ہے تفسیر مجھے یاد　　ہے نامۂ اعمال مرا فرد محبت

تار انفاس بجاتا ہے مرا مطرب عشق
نغمہ سنجو کہیں بجتا ہے ستار آپ سے آپ

اے شیخ و برہمن حرم و دیر کی تعمیر　　سچ پوچھو تو دل کی نہیں تعمیر سے بہتر
طوف دل ہر کسی کا کام نہیں　　شیخ یہ مسجد الحرام نہیں
کب ہے مجنوں پہ قید صوم و صلوٰۃ　　خاص بندوں پہ حکم عام نہیں
دل کا مرے قصر ڈھا رہے ہو　　عرش اعظم گرا رہے ہو

کعبہ جانا تو فرض ہے پر شیخ
طوف دل کا بھی حج اکبر ہے

گو قالبوں میں صورتیں ڈھلتی ہیں مگر پتلا بنا جو درد کا سو وہ بشر بنا
سلسلہ بار کا چلے ہے جو تری محفل میں پہلے جوں شمع کرے اشک مسلسل پیدا

دل گداز اپنا نہ تھا جب سخت پتھر تھا شہید
درد کا پتلا بنا جب سے میں انساں ہو گیا

رہ مقصود میں قبلہ نما کی یاں نہیں حاجت مقام عرش تک دیتا ہے یہ قلب نما پہنچا
اک جنبش دل ہے سفر عشق میں درکار آئینہ ہے پھر راستہ خشکی و تری کا
غرض فہمیدنی ہیں مستیاں اور ولولے کچھ مرے اللہ یہ جوش و خروش اک قطرۂ خوں میں

چشم دل کھول کے اندک حق و باطل سمجھا
صاف میں دل کی زباں میری زبان دل سمجھا

شکل پیمانہ جدا ہوں کبھی اک دم تجھ سے تو نہ مل پر نہیں ممکن نہ ملیں ہم تجھ سے
تجھے نگاہ مروت اگر نہیں تو نہ ہو ہمیں تو در نظر پاس آشنائی ہے

مضمون ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب کے مضمون سے پہلے بھی شہید پر دو مختصر مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ ایک مضمون مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کا ہے جو ساقی اگست ۱۹۳۵ء میں شایع ہو چکا ہے، دوسرا مضمون خود میرا ہے جو منشور ۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء (جلد ۱) میں چھپ چکا ہے۔ تاہم شہید پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ شہید کا ایک مختصر انتخاب زمانۂ حال کے مذاق کے موافق ترتیب دوں۔ دیکھئے زمانہ کب فرصت دیتا ہے!

فرصت کہاں کہ چشم تمنا کو وا کروں
میں اے شہید قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

میر کاظم علی برق موسوی
(نظامیہ طبی کالج)

نغموں کی آبادی

کوئی ساقی سے کہہ دے اب نہیں تابِ شکیبائی
بہکنا چاہتا ہوں اور بہک کر جان دے دینا
وہ چمکیں بجلیاں، وہ مور بولے، وہ گھٹا چھائی
کہ اس موسم میں رسوائی سے بچنا بھی ہے رسوائی

یہ ہواؤں کی ترنم ریزیاں، یہ برشگال
یہ گلوں کی جلوہ سامانی، شگوفوں کا جمال
آج تم کچھ اس طرح صحن چمن میں آ گئے
جیسے آئے ذہنِ شاعر میں کوئی رنگیں خیال

مجھے تسلیم ہے اے دوست تیری بزم عشرت بھی
نئی رسموں کی دنیا ہے نئی ریتوں کی دنیا ہے
کبھی تو سازِ دل کو چھیڑ، مضراب محبت سے
یہ اک نغموں کی آبادی ہے اور گیتوں کی دنیا ہے

باغ میں کچھ پھول توڑے، اور بنایا ایک ہار
آپ کے آنے کا جب دل کو یقیں ہونے لگا
وائے ناکامی نہ آئے آپ اور میں بدنصیب
ہار خود اپنے گلے میں ڈال کر رونے لگا

شاہد صدیقی

عید کی ملاقاتیں

دور سے کسی نے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ جب دونوں قریب ہوئے تو اس "سلام" کے صدقے میں کچھ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ خیر جاتے وقت میں نے دبی زبان سے کہا "معاف کیجئے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں" میرے رہرو دوست نے بھی کچھ شرم اور کچھ شرارت کے انداز میں فرمایا "اور میں بھی جناب سے ناواقف ہوں" یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

آپ کو دور سے دیکھ کر پہلے تو میں نے خیال کیا کہ آپ ہیں مجھے جب آپ کچھ آگے بڑھے تو خیال ہوا، آپ کے بڑے بھائی ہوں گے، اب جو دیکھتا ہوں تو آپ ہیں نہ آپ کے بڑے بھائی۔

"آداب عرض ہے" "خدا حافظ"۔ یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

کشمیر جا رہا ہوں لیجئے صاحب تکلیف کی کیا بات ہے۔ دو نوالے ہماری خاطر ــــ کہئے وہاں کا کیا رنگ ہوگا موسم بہار میں تو جنت بن جاتا ہے یہ لیجئے کباب ــــ گزشتہ سال لاہور میں اتنی سخت گرمی تھی کہ توبہ ہی بھلی لیکن کشمیر جب پہنچا ہوں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دوزخ کے جلے ہوئے مُردے کو جنت میں پھینک دیا ــــ ٹرین رکی تو ہم سفر "میزبان" نے توشہ دان درست کرتے ہوئے کہا "خدا حافظ جناب۔ مجھے فی الحال یہیں اترنا ہے۔ میں نے آدھی لقمی تھامے ہوئے ہاتھ کو پیشانی تک لے جا کر آدھی لقمی کو چباتے ہوئے اور سالم لقمی کو جو توشہ دان میں بند ہو گئی تھی یاد کرتے ہوئے حسرت سے جواب دیا۔ "خدا حافظ" یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

"کہو کیسی گزر رہی ہے" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا

"خدا کا شکر ہے" میں نے جواب دیا

"اوے یار کہاں وہ صحبتیں" انھوں نے ایک آہ بھر کے کہا

"جی ہاں" میں نے جواب دیا

"تم تو بالکل بدل گئے" انھوں نے کہا

"جی نہیں" میں نے جواب دیا

"سب خیریت سے تو ہیں نا" انھوں نے پوچھا

"جی ہاں" میں نے جواب دیا

میں اب بھی سوچتا ہوں کہ وہ بزرگ آخر تھے کون لیکن میرا حافظہ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

"فلاں صاحب کے صاحبزادے میرے ہم جماعت تھے۔ انھوں نے آپ کا پتہ دیا ہے"۔

آپ چاہیں تو میرا کام نکل سکتا ہے ــــ میں نے کہا ــــ کام تو کسی کا نام لئے بغیر بھی نکل سکتا تھا۔ کیونکہ وہ صاحب جن کے صاحبزادے نے آپ کو میرا پتہ دیا ہے۔ میرے ماموں کے چچا کے بھانجے کے دوست ہیں۔ یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

بہرحال "شاعر" نے سچ کہا ہے "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے" یہاں تقریب سے مراد وہ تقریب نہیں ہے جس کے لئے رقعہ کی ضرورت ہو اور جو کبھی از صبح تا نصف النہار بن کر شام تک چلتی رہے اور کبھی بعد نماز مغرب شروع ہو کر بعد نماز مغرب ہی ختم ہو نہ وہ تقریب جو کسی کتاب کی "شانِ نزول" بن کر نازل ہوتی ہے اور نہ وہ جس کو غالب نے اس طرح استعمال کیا ہے۔

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

بلکہ یہاں تقریب سے مراد وہ تقریب ہے جو "کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے"۔ اب شاید میری طرح آپ بھی سوچ رہے ہوں کہ روزانہ دن بھر جو ملاقاتیں ہوتی ہیں تو ان کی تقریب آخر کیا ہوتی ہے۔

ہے نا اس لئے کہ تقریب پوری نہ سہی کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔ دوسری ملاقاتوں کو چھوڑ دیئے۔ ان کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے مثلاً

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
صحبت غیر میں گاہے سر راہے گاہے

یا.......... اب وہ پہلی سی ملاقات نہیں
کیا ہوئی بات کہ وہ بات نہیں

یا..... اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

یا.......... تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں

ان ملاقاتوں کی بھلا کیا تقریب ؟

"کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا" البتہ اس ملاقات کا ذکر کرنا ضروری ہے جو بہرحال تقریب سے بے نیاز ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ بے روزگاری نے بیکاری پیدا کردی ہے اور بیکاری نے ملاقاتیں۔ اگر آپ بفضلِ ایزدی نوجوان ہیں لیکن بے روزگار نہیں تو پھر دیکھیئے۔ صبح سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک ملاقاتیوں کا وہ ہجوم ہوگا کہ آپ" جوئے شیر کی طرح فرصت کی تجزیہ کرنے لگیں گے۔ اور جب کبھی کچھ فرصت ملے گی خشوع و خضوع کے ساتھ اس مشہور مضمون کی تلاوت شروع کردیں گے۔ جس کا عنوان ہے۔ "خدایا مجھے اپنے دوستوں سے بچا" اور اگر خدانخواستہ آپ خود بے روزگار ہیں تو پھر آپ —— پھر آپ

میرا مطلب یہ ہے کہ" خدایا مجھے اپنے دوستوں سے بچا" آمین

بہرحال ان ملاقاتوں کی تقریب جو فکر معاش کا غم غلط کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ دروازے کو بند پا کر دستک "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے" کی تختی کو دیکھ کر ملاقاتی کارڈ اور کچھ بھی نہ پا کر "دخل در معقولات" ہوتی ہے۔

یہ ملاقاتیں تو ہوتی ہی رہی ہیں اور ہوتی ہی رہیں گی لیکن ملاقاتیں پھر عید کی ملاقاتیں!

ان میں بیزاری بھی ہے اور اشتیاق بھی۔ عیدگاہ میں خطبہ سننے کے بعد تین باتیں بہت ضروری ہیں ایک بات تو وہ ہے جس کے تصور ہی سے بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ کل ہی میں نے خریدا تھا۔ ابھی وہ ٹھوکریں کھا کر سرخرو بھی نہیں ہوا تھا اور ابھی اس کے دئے ہوئے چھالے پھوٹنے بھی نہ پائے تھے۔

"ایسے حادثات"

اس میں کوئی شک نہیں کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے ضرور ہیں اور حالی کے زمانے سے جب کہ انھوں نے بہ بانگ دہل کہا تھا۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

آج تک۔ یہ ذرا میں زیرِ لب کہنا چاہتا ہوں۔ یہی دستور چلا آتا ہے۔ دوسری بات مصافحہ ہے اور تیسری چیز "معانقہ"۔ یا اللہ معانقہ۔ معانقہ کا لفظ اتنا ہیبت ناک ہے کہ کوئی اس کے معنی سمجھے یا نہ سمجھے اس کو سن کر ہیبت ضرور کھا جاتا ہے۔ لیکن معانقہ سے مراد اگر گلے ملنا ہے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ "خالص ہندستانی" نہ سہی لیکن "خالص ہندستانی" کی بے آزار خصوصیت اس میں ضرور موجود ہے۔ اور اگر معانقہ کسی دیو پیکر کا ہم جیسے انسان کو سینے سے لگا کر اپنی قوت کا ہلکا سا مظاہرہ کرنا ہے تو میں کراہتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ

"کیونکر بنے گی ان سے بغیر التجا کیئے" اور اس کے بعد" زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا" خیر" معانقہ" کی بحث کو چھوڑ دیئے۔ اس "معانقہ و مصافحہ" کی دنیا سے نکل کر سب سے پہلے جن سے ملاقات ہوتی ہے وہ نہ مصافحہ کے لئے آگے بڑھتے ہیں نہ معانقہ کے لئے بلکہ عید مبارک کی بجائے ان کا

زبان پر وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کو سن کر یا تو بے اختیار جیب کی طرف ہاتھ بڑھتے ہیں یا پھر ہماری زبان پر بھی آجاتا ہے "معاف کرو بھائی اس وقت کچھ بھی نہیں ہے" اس "معاف کرو" میں کچھ پشیمانی کبھی حسرت اور اکثر اوقات جھوٹ ہوتا ہے۔ ویسے بھی "معاف کرو" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ کسی کو دانستہ یا نادانستہ گھونسہ مار دیں اور اس کے بعد سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ فرما دیں "معاف کیجئے" اس کا جواب نہ غیظ ہوگا نہ غصہ بلکہ "نہیں کوئی بات نہیں" جس طرح "معاف کیجئے" نہ کہنے سے کہنے والے کا مقصد دراصل "حفاظت خود اختیاری" ہوتا ہے اسی طرح "نہیں کوئی بات نہیں" دراصل ایک اخلاقی رسم ہے جس کو کہتے وقت ہونٹوں پر خواہ مخواہ تبسم کی ایک لہر آتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ موقع ملے تو ہم بھی ایک گھونسہ رسید کر کے کہہ دیں "معاف کیجئے" —— معاف کیجئے۔ میں ذرا اپنے موضوع گفتگو سے ہٹ گیا تھا مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں کی آواز بھی اگر مجھ تک آتی تو یہی آتی کہ "کوئی بات نہیں"۔ اس لئے یہ کوئی بات نہ تھی۔ اب میں ان ملاقاتیوں کو ٹال کر آگے بڑھتا ہوں۔

اس کے بعد جو ملاقات ہوتی ہے اسے نظری ملاقات کہہ سکتے ہیں۔ یعنی نظریں کپڑوں سے ملتی ہیں۔ چہرے تو روز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کپڑے اور پھر عید کے کپڑے بس یوں سمجھ لیجئے کہ ملاقاتیں اور پھر عید کی ملاقاتیں۔ "عید سپل" کا یہ فیضِ رنگین اور درزیوں کی شبانہ روز محنت کا یہ چست نتیجہ، یقیناً اس قابل ہے کہ اس سے نگاہیں معانقہ کریں۔ رنگ برنگ کا لباس۔ راستے میں کہیں عیدگاہ پلٹ لوگوں کی کوئی ٹکڑی دکھائی دیتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رمضان کے پر تکلف سامان افطار میں کسی نے جان ڈال دی ہے۔ گھر پہنچتے ہی "گھریلو ملاقات" "بیرونی" دروازے کی پہلی سیڑھی ہی سے شروع ہو جاتی ہے یعنی

شوفر جو عیدگاہ سے گھر تک وفاداری کے ساتھ موٹر چلاتا آیا تھا اب اپنی "خدمت گزاری" کو ایک فرشی سلام کے ذریعہ اس طرح ہماری آنکھوں میں جھونکتا ہے کہ ہم اسے انعام دئیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس انعام کے صلہ میں کئی دنوں تک ہماری موٹر گیالن میں بیس میل چلنے لگتی ہے۔ چلتی تو وہ ہمیشہ گیالن میں بیس میل ہی ہے لیکن چلائی جاتی ہے اٹھارہ میل۔ اس کے بعد بعضوں کو ہم بزرگ سمجھ کر اور بعض ہمیں بزرگ خیال کر کے سلام کرتے ہیں۔ احساس کمتری کے بعد ہی خیال بزرگی اور خیال بزرگی کے بعد ہی احساس کمتری۔ کبھی قدمبوسی کی پستی سے اٹھ کر دعا گوئی کے مینار پر جا بیٹھتا ہوں۔ کبھی دعا دیتے دیتے ادب سے سلام کر لیتا ہوں۔

اس دوران خانہ مصروفیت سے فرصت پا کر جب "خود خراشی" دور ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیشانی کی شکنیں شیروانی کی شکنوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

ان شکنوں کو عید کی ملاقاتوں پر غالب پا کر اطمینان کا سانس لیتا ہوں کہ نوکر کہتا ہے "کوئی آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں"۔ عطر بھری "دستی کو پسینہ پونچھنے کے لئے ہاتھ میں لے کر دیوان خانہ میں اس طرح آتا ہوں جیسے عید آتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میں ذرا غلط آگیا ہوں اس لئے الٹے پاؤں گھر میں جا کر اپنی بجائے "ایک روپیہ" کو ان سے ملنے کے لئے بھیج دیتا ہوں۔ کیونکہ میرا ملاقاتی دھوبی ہے جو نئے نئے کپڑے پہننے والوں کو غافل پا کر ان کے پرانے کپڑے جو دھلنے کے لئے آئے تھے زیب بدن کر لئے ہیں۔ ابھی اس کی اس "مغالطہ دہی" پر غور کرنے بھی نہیں پایا کہ دستک کی آواز کان میں آتی ہے۔ پھر باہر آتا ہوں معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھتا ہے تو میرا ملاقاتی امید اور یقین کے ساتھ ہاتھ پسار دیتا ہے۔ سچ ہے "دینا والا ہاتھ بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے" مجھے کوفت میں خیال بھی نہیں

رہتا کہ آج عید ہے۔ میں کہہ دیتا ہوں "کل ہی تو میں نے ڈاڑھی بنوائی تھی" پھر خیال آتا ہے "دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" یعنی اگر اسے عید کا انعام نہ دیا جائے تو کل کہنا پڑے گا" بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے" میں تو آئینہ دیکھتے ہی رہ جاؤں گا اور وہ ——— وہ تو مجھے "سرخرو" ہی کر کے چھوڑے گا۔ پھر گھر میں جاتا ہوں اور مستقبل پر سے حال کو قربان کر کے ایک روپیہ باہر بھیج دیتا ہوں۔ صندلی پردے میں سے دکھائی دیتا ہے کہ کوئی صوفے پر بیٹھا گنگنا رہا ہے اخلاق کا مکمل ثبوت دینے کے لئے باہر نکلتا ہوں۔ ماما کے صاحبزادے بلند اقبال آئینہ میں صورت دیکھ کر جھوم رہے ہیں۔ اخلاق کا مکمل ثبوت دینے کے لئے منہ پھیر کر پھر گھر میں چلا جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان ہی صاحبزادے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ " بیٹھیئے "۔ سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر نکلتا ہوں تو" گولی کھڑا ہے۔ جی میں آتا ہے گلے مل کے رو دوں پھر خیال آتا ہے کہ آج عید ہے۔ ہنس دیتا ہوں اس لئے کہ دودھ نہیں تو شیر قورمہ نہیں اور شیر قورمہ نہیں تو عید نہیں۔

ان رسمی ملاقاتوں سے گھبرا کر ارادہ کر لیتا ہوں کہ اب کبھی باہر نہ آؤں گا۔ اس لئے سمجھ لیتا ہوں بلکہ نوکروں کو بھی سمجھا دیتا ہوں کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ یہ کمال ہر شریف آدمی کو آتا ہے کیونکہ اس کے لئے "ریاضت" کی ضرورت نہیں۔ صرف مستقل مزاجی کی عادت چاہئے۔ خبر ملتی ہے کہ عزیزی اشفاق آئے ہیں۔ نوکر کہتا ہے کہ "صاحب گھر میں نہیں ہیں" اشفاق اصرار کرتے ہیں کہ" ہیں" اس اصرار کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے آپ کسی فقیر کے سوال پر کہہ دیں کہ " میرے پاس کچھ بھی نہیں "۔ آپ کی حجت اور اس کا اصرار دونوں جاری رہتے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے نہ آپ تھکتے ہیں لیکن خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کا علم غیب دانی صحیح ہے یا آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ بہرحال مجھ سے نہیں رہا جاتا چلا کر کہتا ہوں جیسے اپنے وجود کا خیال آ جائے "میں ہوں اور آ رہا ہوں"۔ چنانچہ اپنے دوست سے گلے مل کر گفتگو شروع کرتا ہوں۔ ایک قوال صاحب ستار بغل میں لئے اس طرح نازل ہوتے ہیں جیسے عین اس وقت جب کہ کوئی فطرت پرست شاعر سہانے جھرنے کے قریب بیٹھا ہو۔ اور بازو کی جھاڑی سے شیر نکل کر اسے دبوچ لے جی چاہتا ہے کہ بھائی اشفاق کو قتل کر کے خودکشی کر لوں۔ لیکن قتل جرم ہے اور خودکشی گناہ۔ اس لئے سنتا ہوں کہ

عیدگاہ ما غریباں کوئے تو ؎ انبساطِ عید دیدن روئے تو

سوچنے لگتا ہوں کہ کیا یہ قوال میری صورت دیکھ کر عید کا انبساط حاصل کرنے آیا ہے۔ لیکن بہت جلد مطلب واضح ہو جاتا ہے جب دوسری غزل شروع ہوتی ہے۔

ہو جائے غریبوں پہ عنایت کی نظر بھی

فوراً جیب میں ہاتھ پڑتا ہے اور پھر میں سنتا ہوں۔

کچھ حسن کا صدقہ مرے سرکار ادھر بھی

لیکن چونکہ اپنی قوتِ ارادی کی توہین منظور نہیں اس لئے پہلے مصرع پر عمل کرتا ہوں اور دوسرے مصرعے کا اثر نہیں لیتا مجھے یقین ہے کہ پہلے مصرع میں قوال نے مجھ سے مخاطبت کی ہے اور دوسرا مصرعہ تو شاعر نے اپنی معشوق سے کہا تھا۔

قوال کے جاتے ہی اشفاق صاحب بھی اس طرح چلے جاتے ہیں جیسے کسی نغمہ کے پیچھے روح چلی جائے۔ اس کے بعد جو گھر میں جاتا ہوں تو پھر آپ قسم لیجئے اگر میں جھوٹ بولوں کہ میں نے اپنے جھوٹ کو شام تک نباہ دیا۔ یعنی پلنگ سے اٹھا ہی نہیں۔

اب یہاں آیا ہوں آپ سے گفتگو کرنے کے لئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ ہوائی ملاقات " میرے نقطۂ نظر سے سب میں اچھی ہے اس لئے کہ اس میں نہ گلے ملنا پڑتا ہے۔ نہ مصافحہ کرنا اور نہ انعام دینا۔ شب بخیر۔

میکش

گل بوٹے

کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ موٹر کے ہارن کی "کان پھوڑ" آواز سے ہم سوتے سوتے اچھل پڑے، دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے چار شکاری بھائی چلے آرہے ہیں اور ان کے پیچھے شکار دیکھنے کی شوقین بہنیں ہنسی بولتی محو خرام ہیں۔ دو دن پہلے پچھلی دفعہ کی طرح ہمیں پھر شکار دیکھنے کی شہر سے کوئی چونسٹھ میل پر مسلسل بہتر گھنٹے کی دعوت دی گئی تھی مگر ایک ضروری کام کی وجہ سے ہم نے انکار کر دیا تھا جس پر ہماری وہی "نادری بہن" نے ہمیں بہت کچھ جلی کٹی سنائی تھیں کہ ہم نرے گاؤدی ہیں! ہمیں شکار کرنے کا شوق ہے نہ دیکھنے کا!! مجذوب کی طرح ہم گھر میں بیٹھے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ!!! اپنے مجذوب ہونے کو تسلیم کر کے ہم نے شکار پارٹی کے ساتھ جانے سے بالکل انکار کر دیا تھا مگر آنے والی بلا ٹلتی کب ہے! ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ آدھی رات کے وقت شکاری ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوں گے اور نجو کی طرح ہمیں فتراک میں باندھ لیں گے!! چار و ناچار ہم اس پر راضی ہوئے کہ بعض ضروری کاموں کی وجہ سے سویرے تو نہیں البتہ دوپہر کو نکلیں گے!! اس شرط کو سن کر ہماری "نادری بہن" آگ بگولہ ہو گئیں، آنکھوں سے چنگاریاں پھینکنے اور پھلجھڑیاں چھوڑنے لگیں! مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوئے!! مجذوب جو ٹھہرے۔

آدھی رات کی ملاقات کے بعد شکاریاں رخصت ہوئے اور چلتے چلتے ہماری نیند بھی لیتے گئے! گویا ان کا پہلا شکار ہماری "نیند" تھی!! کوئی دو گھنٹے کے بعد ہماری آنکھ لگی اور پھر صبح چھ بجے موٹر کے ہارن کی آواز نے ہمیں جگا دیا، یہ موٹر ایک شکاری نے بھیجی تھی کہ اس میں ہمارے اور ایک اور شکاری بھائی کے نوکر بھیجے جائیں اور ہم بارہ بجے تک ان کے گھر پہنچ جائیں، یہ شکاری جمعہ کو ظہر سے پہلے شکار کو نہیں جاتے، اب تو ہم لاجواب ہو گئے!

کھانے کے بعد ایک بجے کے قریب ہم ان کے گھر پہنچے، بچے اور بی بیاں اندر بیٹھ گئیں، شکاری نے شوفر کی جگہ سنبھالی اور ہم ان کے بازو بیٹھ گئے، جس موٹر میں ہم آئے تھے اس میں سامان اور نوکر بھر دئے گئے اور دونوں موٹریں چل پڑیں! دس پندرہ میل جانے کے بعد نوکروں کی موٹر جو پیچھے آرہی تھی غائب ہو گئی، بی بیاں بے چین ہو گئیں، موٹر آہستہ چلانے کی خواہش کی گئی مگر شوفر صاحب نے صاف انکار کر دیا، اتنے میں ایک آدمی ریل کے سگنل کی طرح ہاتھ اٹھائے کھڑا نظر آیا، نزدیک جب پہنچے تو اس کے ہاتھ میں کئی تیتر جن کی ٹانگیں ایک سُتلی سے بندھی ہوئی تھیں الٹے لٹک رہے تھے، پانچ تیتر کے وہ دو روپے مانگ رہا تھا ہم نے روپے کے آٹھ مانگے مگر شوفر صاحب نے جلدی کر کے بھاؤ بگاڑ دیا اور دو روپے میں پانچ خرید لئے۔

یہاں سے ایک دو میل گئے ہوں گے کہ بی بیوں کا پیاس سے بُرا حال ہونے لگا، موٹر ٹھہرانے کہا تو ہم نے مشورہ دیا کہ خاموش بیٹھیں، باتیں کئے جائیں بارش کا پانی ہوا سے اڑ کر منہ میں آئے گا اور پیاس بجھ جائے گا، جب تقاضہ بہت ہونے لگا تو موٹر ٹھہرائی گئی، شوفر صاحب بندوق لے کر شکار کی تلاش میں نکلے! پانی پی کر پان لگائے جا رہے تھے کہ نوکروں کی موٹر رینگتے گھسٹتے آہی پہنچی!! اس کو دیکھ کر بی بیوں کی جان میں جان آئی، نیچے جا کر کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکال لائے، کچھ منہ کا مزہ بدلنے کے بعد دونوں موٹریں روانہ ہوئیں۔

منزل مقصود کا جو پتہ دیا گیا تھا اس کے حساب سے چھپن میل کے بائیں جانب ہمیں مڑنا تھا مگر چھپنویں میل کے پتھر کے آگے پیچھے راستہ کا کوئی نشان نہیں تھا، شوفر صاحب بہت پریشان ہوئے، ہم نے کہا چلے چلئے جہاں راستہ بائیں جانب نظر آئے گا پلٹ جائیں گے، چھپن میل کے عوض ساٹھ میل کے پتھر کے بعد راستہ بائیں جانب مڑتا نظر آیا، یہاں دو تین آدمی بھی کھڑے تھے، بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ہی لئے آئے ہیں، یہاں سے کوئی آٹھ میل پر گاؤں ہے مگر راستہ صاف نہیں ہے، موٹریں کیچڑ میں پھنس جاتی ہیں چنانچہ شکاریوں نے اپنی ایک موٹر مسافر بنگلہ میں چھوڑ دی ہے اور بڑی مشکل سے دو موٹریں کئی آدمیوں کی مدد سے ساتھ لے گئے ہیں، راستے کی نسبت یہ وحشتناک خبر

سن کر شوفر صاحب بہت پریشان ہوئے۔ بی بیوں نے تو واپس چلنے کا مشورہ دیا۔ گاؤں والوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دو شکاری سامنے کے تالاب پر ہمارے منتظر ہیں، مجبوراً دونوں موٹریں آگے بڑھیں، کچھ فاصلہ پر ایک گڑھا نظر آیا جس پر ہاتھیوں کے شکار کے گڑھوں کی طرح پتے بچھے ہوئے تھے آہستہ سے اس پر موٹر چلائی تو سامنے کا ایک پایہ فٹ بھر اندر اتر گیا، یہاں سے نکلے تو دس قدم پر ریت میں دونوں پائے پھنس گئے، راستہ کچھ ایسا خراب نہیں تھا۔ صرف کیچڑ سے ریت، ریت سے دلدل میں پائے پھنسنے کی وجہ سے موٹر کی رفتار ذرا سست ہو گئی تھی، چار پانچ میل گھنٹے کی چال سے ہماری موٹریں چل رہی تھیں۔

جب تالاب پر ہم پہنچے ہمارے شکاری عزیز جن کے دم کے ساتھ یہ ساری برات تھی بندوق لئے ایک شکاری کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مزاج پوچھا تو فرمایا۔
"پانچ بج رہے ہیں مگر ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا اور موٹروں کے لیجانے میں اس قدر محنت کرنی پڑی کہ کچومر نکل گیا"!

یہاں دو کھاچریں بھی موجود تھیں، بی بیوں نے موٹر میں بیٹھ کر کیچڑ میں پھنستے ہوئے جانے سے کھاچر میں بیٹھنا پسند کیا اور ہم سب براتیوں کی طرح پیچھے چلنے لگے، دس بارہ آدمی موٹر کو لپٹ گئے ایک کھیت سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور تیسرے سے دلدل میں، دلدل سے نالے میں، نالے سے گڑھے میں، گڑھے سے ٹیلے پر، ٹیلے سے ریت میں، ریت سے کیچڑ میں پھنساتے، کھینچتے، چڑھاتے اتارتے میدان میں لے آئے، نوکروں کی موٹر بھی اسی طرح آسانی سے نکل آئی، اب ہم سب موٹر میں بیٹھ گئے۔

یہاں سے دونوں موٹریں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگیں، اس کے دونوں طرف کھیت تھے اور کانٹی لگی ہوئی تھی، اس کانٹی نے موٹر پر خوب "نقش و نگار" بنائے، غرض گرتے پڑتے کوئی چھ بجے گاؤں میں داخل ہوئے، گاؤں والے اپنے اپنے مکانوں اور جھونپڑیوں سے نکل کر ہمیں اس طرح گھور رہے ہیں کہ گویا ہم "عجیب الخلقت" مخلوق میں سے ہیں!

جب بالکر بار صاحب کے مکان پر پہنچے تو ہماری موٹروں کو بچے بڑے سب کے سب گھیر لئے اور ہم ایک تماشہ بن گئے، اندر داخل ہوتے ہی "نادری بہن" سامنے آئیں، یہ بے چاری تھک کر اس قدر چور ہو گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دو چار روز سے ان کے منہ میں ایک کھیل تک اڑ کر نہیں گئی ہے، ہم نے خیریت پوچھی تو اس گھڑی کو کوسنا شروع کیا جب کہ ان کے میاں نے بندوقیں خریدی تھیں، نہ بندوقیں آتیں نہ شکار پارٹیاں ہوتیں! ورنہ وہ یہ مصیبتیں جھیلتیں!! دو شکاری جو چشم بد دور ذرا گدگدے جسم کے تھے فرش پر چت لیٹے

"اب تو سر بھی مرے تن پہ بار ہے"!

زبان حال سے بول رہے تھے، نوکر کھانے کی تیاری میں ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے اور ہماری "نادری بہن" بیچ میں کھڑی احکام صادر کر رہی تھیں۔

منہ ہاتھ دھو کر ہم نے مکان کا جائزہ جو لیا تو دالان کے بیچوں بیچ دیوار پر ایک تصویر نظر آئی، اس میں ایک بزرگوار دستار لگائے شیروانی پر اور کوٹ پہنے تلوار ٹیکے کھڑے تھے ان کے سامنے جو صاحب ادب سے کھڑے تھے وہ ان کے مصاحب معلوم ہوتے تھے کیونکہ دستار کے ساتھ انھوں نے گلوبند بھی لگا رکھا تھا یہ بھی ایک موٹا سا "اور کوٹ" پہنے ہوئے تھے، ان دونوں کے بیچ میں دس بارہ سال کی ایک لڑکی گلے سے پیروں تک فراک کے جیسا "فرغل" پہنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "ڈراپ" اٹھتے ہی "حمد" گائیگی، اس کے پیچھے دو تین چھوٹے چھوٹے لڑکے کچھ بیٹھے کچھ کھڑے تھے ان کی شیروانیوں پر چھوٹے چھوٹے "اور کوٹ" بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے، سب کو موٹے موٹے "اور کوٹ" پہنے دیکھ کر ہم نے سوچا کہ کسی زمانے میں یہ مقام کشمیر یا نیلگیری سے کم ٹھنڈا نہ ہو گا، حالانکہ پچھلی گرمیوں میں جب ہم نیلگیری گئے تھے تو "اور کوٹ" کے بغیر

چار پانچ دن بغیر کسی تکلیف کے ہم نے وہاں گزارے تھے، ہم ابھی اس مسئلہ پر غور کر ہی رہے تھے کہ گانے کی ایک شوقین بہن ہارمونیم ہمارے سامنے رکھ کر گانے بیٹھ گئیں، سچ پوچھئے تو شکاری انہیں اور ہمیں اسی لئے لائے تھے کہ جب وہ شکار سے تھک کر آئیں تو گا بجا کر ہم ان کا جی بہلائیں، یہ سلسلہ کوئی ایک گھنٹہ تک رہا ہوگا کہ " نادری بہن " نے سب کو فوراً اٹھ جانے کا حکم دیا، دالان کی صفائی شروع ہو گئی۔ کئی مرتبہ جھاڑو ہوئی تب کہیں دسترخوان چنا گیا، " نادری بہن " نے کھانے بڑے مزے کے پکوائے تھے مگر ذرا مرچ تیز ہو گئی تھی، صبح سے جو لوگ بھوکے تھے خوب سیر ہو کر کھائے، ہم نے بھی مزے مزے کی چیزیں کھا کر شکاریوں کو دعائیں دیں کہ ایسی ہزاروں پارٹیاں کرنی نصیب ہوں، مگر ہمارے عزیز نے جنھیں ساون اور بھادوں میں بڑے شکار کی سوجھی تھی اعلان کر دیا کہ یہ پارٹی جاتی برسات کی آخری ہے، آتی سردیوں میں دیکھا جائے گا!

کھانے کے بعد پھر گانا شروع ہوا اور آدھی رات تک وہ تانیں لگائی گئیں کہ تان سین کی روح کو وجد آگیا ہوگا اور وہ تلملانے لگی ہوگی، آخر میں اقبال کی مشہور غزل

" کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں "!

شاہانہ کی دھن میں گا کر ہماری بہن نے سب کو محو خواب کر دیا۔

مچھر اس غضب کے تھے کہ ہمیں تو نیند آنا دشوار ہو گیا تھا، بڑی مشکل سے ایک گھنٹہ تک کروٹیں بدلنے کے بعد کچھ نیند لگی تھی کہ بازو کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں! اس کمرے میں ایک شکاری مچھر دانی تانے بڑے مزے سے سو رہے تھے مگر اب وہی " ہائے ہائے " کر رہے تھے، یہ سمجھ کر کوئی جانور ان کے کمرے میں گھس گیا ہے یا شکار خود شکاری کے پاس آگیا ہے، ٹارچ کی روشنی ان کے مچھر دان پر جو ڈالی تو اندر ایک چھوٹی لڑکی کھڑی نظر آئی، ہوا یہ کہ ان کی بیاج کی چھوکری نیند میں لوٹتے لوٹتے بڑے موقع سے ان کے مچھر دان میں گھس گئی تھی مگر اس " تقریب " میں ہماری نیند اچاٹ ہو گئی۔

اور صبح صبح کچھ آنکھ لگی تھی کہ " الارم " کی گھنٹی سر پر بجنے لگی، وہ شکاریوں کو جگانے کے لئے تھی، ایک نیند کے متوالے شکاری نے اس کو فوراً بند کر دیا مگر اب ہمیں نیند نہ آنا تھا نہ آئی، لوٹ پوٹ کر چھ بجے اٹھ بیٹھے، آنکھ کھلتے ہی ایک شکاری کو عبادت الٰہی میں مصروف دیکھ کر سارا دن خیر خوبی سے گزرنے کا ہم نے شگون لے لیا، نماز ختم کر کے انھوں نے ہارمونیم پر " بھیرویں " چھیڑ دی اور شکاری دھوم گجر سے جاتے۔ سامنے کچھ لوبیہ لاتے بچوں نے ملکر کورس گانا شروع کیا، ناشتہ کے بعد شکاری جنگل کی طرف چلے گئے اور ہم گانے بجانے میں مشغول ہو گئے۔

بارہ بجے ہوں گے کہ " نادری بہن " کے اصرار پر شکاریوں کا انتظار کئے بغیر ہم نے کھانا کھا لیا اور کوئی دو بجے شکاریوں سے ملے بغیر سب کو خدا حافظ کہہ کر دو ہی نوکروں کی موٹر میں گھر چلے، گڑھوں اور ٹیلوں پر سے ہوتے ہوئے دلدلی کھیتوں میں پہنچے، ادھر ادھر دیکھا کوئی آدمی نظر نہ آیا حالانکہ گاؤں کے پٹیل نے چھ آدمی ہماری موٹر کی " ناؤ " کو پار لگانے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، شوفر آدمیوں کی تلاش میں نکلا اور اس نے دو چار آوازیں بھی لگائیں جو " صدا بہ صحرا " ہو گئیں! بیگم بہت پریشان ہوئیں کہ بیچ جنگل میں آخر کب تک اڑے رہیں گے!! شوفر نے کھیتوں سے موٹر پار لیجانے کا خیال ظاہر کیا تو وہ مارے ڈر کے اتر گئیں، ہم بھی تو آخر " رفیق حیات " ہی ٹھیرے! ان کی تقلید کی، اترنا ہی پڑا!! دو چار قدم چل کر موٹر دلدل میں کچھ ایسی پھنسی کہ نہ آگے بڑھتی تھی نہ پیچھے ہٹتی تھی، ہم سب دلدل کے اوپر آسمان کے نیچے بھیگتے کھڑے تھے، بیگم نے پوچھا اب کیا ہوگا؟ ہم نے کہا ہوگا کیا! چار پانچ بیل کی " دھاپوش " کر کے

گاؤں والوں کو پکڑ لائیں گے' اتنے میں دور سے کچھ آدمی آتے نظر آئے' اشاروں سے ہم نے انھیں جلد آنے کے لئے کہا' اب بیگم کی جان میں جان آئی! سب نے مل کر بڑی مشکل سے موٹر کو کھیتوں سے باہر نکالا' ہم کوئی چار چھ فرلانگ موٹر کے پیچھے پیچھے چلتے رہے' جب "آفات ارضی" سے موٹر صحیح سلامت نکل گئی تو سوار ہو گئے اور کچھ دے دلا کر گاؤں والوں سے جان چھڑائی۔

ریت' کیچڑ اور دلدل کو پار کرنے میں ہمارے اندازہ سے زیادہ پٹرول جل گیا' حالانکہ نکلتے وقت فاصلہ کے حساب سے زیادہ ہی ڈلوایا گیا تھا۔ مگر اب کچھ کم دو گیالن رہ گیا تھا اور ساٹھ میل طے کرنے تھے' شوفر نے مشورہ دیا کہ کوئی آٹھ میل پر پٹرول ملتا ہے دو گیالن لینا بہتر ہوگا' اتنے میں ہمارے ایک شکاری عزیز کا نوکر سیکل پر جاتے جاتے ہم سے کہتا گیا ہمیں اجازت ہے کہ جتنا چاہیں پٹرول خریدیں کوئی تکلف کی بات نہیں ہے اس اجازت کے بعد ہماری جرأت اور بھی بڑھ گئی دو گیالن پٹرول خرید کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

اب بارش زیادہ ہونے لگی تھی' کالی گھٹائیں بھی اٹھ رہی تھیں اگر اس وقت ہماری گانے والی بہن ہوتیں تو

"برسن لاگی رے بدریا ساون کی"

ملہار کی دھن میں بڑے مزے سے گاتیں' ہمیں ساون کی ان گھٹاؤں کے حال زار پر افسوس ہو رہا تھا کہ ان سے ہم سب بیزار بیٹھے تھے' کوئی ان کی خیر منانے والا اور یہ کہنے والا نہ تھا۔

"الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے"!

گھر سے کوئی بیس پچیس میل پر ہوں گے کہ اندھیرا ہو گیا' سامنے کے آئینہ پر پانی اس قدر جم گیا کہ راستہ نظر آنا دشوار ہو گیا' جب بجلی کی روشنی والی سڑک پر آئے تو دم میں دم آیا' اندھیرے سے تو نجات ملی مگر ساتھ ہی ہماری موٹر ایک بھینس سے ٹکرائی! ہم نے شوفر کو جو ڈانٹا تو اس نے نہایت برجستہ جواب دیا! بھینس کا رنگ اور سڑک کا رنگ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مل گئے تھے کہ بھینس میں اور سڑک میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا اس لئے بھینس کو اس نے سڑک کی چڑھائی سمجھ کر موٹر اس پر چلا دی!! سید حامد گارڈ بھینس سے ڈر کر ٹائر سے لپٹ گیا! اور اس پر کی قندیل ایسی رفو چکر ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ!! اس کے بعد بفضلہ تعالیٰ کوئی حادثہ نہیں ہوا' دو بجے دن کے نکلے رات کے نو بجے ٹھنڈے ٹھنڈے۔ بخیر و عافیت بھیگی مرغیوں کی طرح گھر پہنچے۔

دوسرے دن کے پانچ بجے ہوں گے کہ اس پارٹی کے دو شکاری اپنی بیگموں کے ساتھ گھر جاتے جاتے ہم پر نازل ہوئے' شکار کا حال پوچھا تو ایک نے ان مناتے ہوئے کہا

"ایک بور بچہ ملا"!

چھٹتے ہی ان کی بیگم نے فرمایا "اور اس پر بیٹھ کر جناب میر شکاری صاحب تشریف لا رہے ہیں"!!

"باغباں"

قتلِ عام

رنگِ شفق کے نور سے دھوئی ہوئی جبیں　　خوابِ شباب و شعر کی تعبیرِ دل نشیں
دستِ خدائے حسن کا شہ کارِ آتشیں　　اک پیکرِ تجمل و دوشیزۂ حسیں
اک غم شناسِ عشق و اک آرزو نواز
کھڑکی سے پھینکتی ہے کمندِ نگاہِ ناز

طوفانِ رنگ و بو ہے فضائے بسیط پر　　دنیا ہے سیلِ نور میں غرقاب سر بسر
مسحور ہیں دماغ تو ناکام ہے نظر　　تھرا رہے ہیں اہلِ جہاں کے دل و جگر
ہر خشک و تر میں طور کا جلوہ بکھر گیا
یا چودھویں کا چاند زمیں پر اُتر گیا

بزمِ نظر میں ذوقِ کرم بار یاب ہے　　مستی بھری نگاہ سے دنیا خراب ہے
سو شوخیوں کی زد میں خیالِ حجاب ہے　　طفلی کے گلستاں میں بہارِ شباب ہے
شاعر کی آرزو ہے، مصوّر کی جستجو
مٹھی میں ہے جمالِ دو عالم کی آبرو

رنگِ رُخِ جواں میں مچلتی ہوئی بہار　　ابرو میں ماہِ نو کا تبسم ہے بے قرار
ہر جنبشِ نظر ہے مئے ناب کی پھوار　　یہ حُسنِ شعلہ بار، یہ ملبوسِ زر نگار
ہیکل گلے میں کان میں بندے پڑے ہوئے
گیسو میں پھول ہیں کہ ستارے جڑے ہوئے

دنیا کو پھونک دے گی یہی لالہ فام کیا؟　　نیرنگیٔ شباب اسی کا ہے نام کیا؟
دیتی ہے انقلابِ جہاں کا پیام کیا؟　　ہونے لگی ہے تیغ کوئی بے نیام کیا؟
لاکھوں نزاکتوں سے ہے ظالم کھڑی ہوئی
یا "قتلِ عام" پر ہے جوانی اڑی ہوئی

رشید احمد (فتنہ)

فرض کی قربان گاہ

چند نالے جن میں میری زندگی کا ساز ہے
نذر لایا ہوں ترے کیف ترنم کے لئے

شیاما پیاری۔

تم نے بارہا مجھے میری خاموشی پر چھیڑا، تنگ کیا ہمیشہ اس ٹوہ میں رہیں کہ میری خاموشی اور میری سوچ کا سبب معلوم کرسکو۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود تم اس کی تہ کو نہ پہنچ سکیں میں کس سوچ میں رہتی ہوں اور یہ "چپ کیوں سادہ لی ہے"؛ سنو گی اب بھی۔ تو لو سنو اور کان دھر کر سنو۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو زمانے کی نیرنگیوں اور سماج کی پابندیوں کے باوجود ان سے بے نیاز رہا۔ جو درحقیقت افسانہ نہیں بلکہ محبت کی بارگاہ نیاز میں ایک عقیدت مند دل کا پُرخلوص نذرانہ ہے۔

شیاما ایثار کا دوسرا نام محبت ہے۔ اپنی ہستی کو دوسرے پر مٹا دینا — اسی کو پریم کہتے ہیں۔ یہ ایک بے نفس قربانی ہے۔ گناہ نہیں۔

لیکن دنیا والے کیا جانیں کہ سچا پریم کسے کہتے ہیں۔ ان کے تنگ و تاریک دماغ میں محبت اور ہوسنا کی مترادف الفاظ ہیں۔ اس روحانی جذبہ سے وہ یکسر ناواقف ہیں جس کو بجا طور پر "پریم" کہا جا سکتا ہے۔

یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں پرورش پاتا ہے۔ وہ پاک اور منور دِیا ہے جو من مندر میں فروزاں ہو کر اپنی ضیا پاشیوں سے دنیا کی تمام چیزوں کو نورانی کر دیتا ہے۔ وہ زخار سمندر ہے جس کا شناور ساحل پر پہنچ کر اپنا دامن گوہر مراد سے بھر لیتا ہے۔ جس نے اس پاک جذبہ کا مزہ چکھا ہو اور اس کے درد کی لذت اٹھائی ہو وہی کچھ اس کی لطافت کی داد دے سکتا ہے۔ اس پاپ بھری دنیا میں جس جذبہ کو محبت کہتے ہیں وہ محبت نہیں ہوس ہے — ہوس اور نفس پرستی۔

اس لئے دنیا والوں کے دماغ میں محبت کے تصور کے ساتھ ساتھ گناہ کا تصور آتا ہے۔ ان کے خیال میں ایک کا دوسرے سے جدا رہنا ناممکن ہے۔ ان کی عقل میں یہ بات سماتی ہی نہیں کہ محبت کرنے والوں کا دامن آلائشوں سے پاک بھی رہ سکتا ہے۔ ان کے خیال میں محبت کا انجام بجز معصیت کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

شیاما تم جانتی ہو کہ میں نے اپنی ازدواجی زندگی کس طرح بسر کی۔ میرا گھر جنت الارض تھا جس میں محبت کی بے پایاں حکومت تھی۔ میں اپنے گھر کی ملکہ تھی اور ایک سچے اور نیک آدمی کی پرستار محبت۔

ہماری محبت خود ایک افسانہ ہو گئی تھی۔ لوگ مثال کے طور پر ہماری محبت کو پیش کرتے تھے۔ ہاں یہی لوگ جو آج کے دن میرے دامنِ عصمت کی دھجیاں بھی باقی رکھنا نہیں چاہتے انہیں کیا خبر کہ رادھا کا دامن پاک تھا وہ ایک ہندوستانی عورت ہے جو پتی کی ہو کر پھر کسی کی نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک احساس اور درد مند دل رکھتی ہے جو محبت کی تمام وسعتوں سے آشنا ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی لیکن جس نے پریم نگر کی پرخار و خطر وادیوں سے صرف پھول چن لئے اور کانٹوں میں اپنا دامن الجھنے نہیں دیا۔ اور خدا اس بات کا شاہد ہے۔

ہاں۔ تو ہماری محبت خود ایک افسانہ تھی۔ ہم دنیا کے شور و شر سے دور ندی کے کنارے ایک پُرفضا مقام پر رہتے تھے۔ جہاں کے خوشنما مناظر ہماری پرسکون زندگی میں ایک دلفریب ہم آہنگی پیدا کرتے۔ میری عمر کا وہ حصہ جو عموماً کشمکش میں گزرتا ہے میرے لئے راحت و سکون

اور روحانی مسرتوں کا ایک بیکراں سمندر تھا جس کی سطح پر میری کشتیٔ حیات نہایت آسودگی سے رواں تھی اور میں اپنی زندگی کا بہترین زمانہ اس خوش گوار ماحول میں اطمینان سے بسر کر رہی تھی۔

زمانہ کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا۔ نظام ہستی میں نت نئی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ پھر میری زندگی کیونکر اس سے مستثنیٰ رہتی۔ ہماری اس خوش آئند زندگی میں خلل ڈالنے والا میرا دہ جذبۂ ہیجان تھا جس نے میری زندگی میں ایک غیر معمولی ہل چل ڈالدی۔ ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ میرا سکون اضطراب سے بدل گیا۔ میرے دل میں ایک درد، ایک تڑپ پیدا کر دی جو کبھی منتِ کش درماں نہ ہوئی، اور جس کی خلش میں اب بھی میرے لئے کیف و سرور کے راز پنہاں ہیں۔

اسے تم میرا اقبالِ جرم سمجھو یا میرا رومان۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں ہی نہیں بلکہ میری زندگی کا وہ نادر تجربہ ہے جس نے مجھے دنیا کی لطافتوں، اس کے دکھ درد، اور اس کے نشیب و فراز سے روشناس کر دیا جس نے مجھے انسان کی ہستی، اس کی فطرت اس کی نفسیات اور ان کے حسن و قبح کا تجزیہ کرنے کا موقعہ دیا۔ جس نے ایک قلیل مدت مجھے ایک ناتجربہ کار لڑکی سے ایک فلسفی بنا دیا۔

سچ پوچھو تو دنیا کی کسوٹی پر ہی کھرے اور کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ شیا الیقین مانو کہ تمھاری رادھا اس امتحان میں اپنی ثابت قدمی کی وجہ سے پوری اتری۔

کرشنا میری بھاوج کا عزیز تھا اور کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی آیا کرتا۔ میرے بھائی کا تبادلہ گاؤں پر ہو گیا۔ بھابی نے کرشنا کو جوان کے ساتھ رہتا تھا میرے پتی کے حوالے کیا۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہنے لگا۔

میں کبھی خاص طور پر اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ البتہ مہمان کی حیثیت سے اس کے کھانے پینے اور آرام و آسایش کا کم و بیش خیال رکھتی۔

رفتہ رفتہ میں یہ محسوس کرنے لگی کہ وہ اکثر خاموش اور کچھ کھویا ہوا سا رہتا ہے پھر میں نے اکثر اسے میری طرف غور سے دیکھتا ہوا پایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ میں بدستور اپنے کام کاج میں منہمک رہتی۔ لیکن عورت بہت حساس ہوتی ہے۔ چند ہی دنوں میں میں نے محسوس کیا کہ میرا کام، میرا مذاق، میرا رکھ رکھاؤ غرض میری ہر چیز اس کو مرغوب ہے۔ گو اس نے زبان سے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن اس کی نگاہیں اس کی پسندیدگی کا اظہار کر جاتیں۔

عورت کی خلقت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں خود پسندی اور خود ستائی کا بڑا عیب بھی موجود ہے۔ میں نے گو بظاہر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو، لیکن دل میں اس کی قدردانی اور ستایش کی ضرور متمنی رہتی۔

بہت ممکن ہے کہ میری اس ظاہری بے توجہی نے ہی کرشنا کو میری طرف مائل کیا ہو۔ کیونکہ مردوں کی عادت ہے کہ وہ ایسی چیز کی تمنا کرتے ہیں جس کا ملنا دشوار ہو۔۔ اور شاید ہونا بھی یونہی چاہیئے کیونکہ تمنا تمنا ہی نہیں جب وہ حاصل ہو جائے۔ بہرحال کرشنا بھی ایک ایسی تمنا کا شکار ہوا جس کا حاصل کرنا نہ صرف دشوار بلکہ بالکل ناممکن تھا۔ اس حقیقت سے میں مدتوں بے خبر رہی اور اچھا ہوتا اگر ہمیشہ ہی بے خبر رہتی۔ لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ اس کو تو میری آزمایش مقصود تھی!

ہاں تو کرشنا ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ وہ میرا ہم عمر اور ہم خیال تھا اس لئے بہت جلد ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ کام سے واپس آ کر وہ گھنٹوں میرے ساتھ گزارتا۔ مدتک

کنارے اکثر ہم شام میں جاکر بیٹھتے اور مختلف عنوانوں پر گفتگو کرتے وہ ادھر ادھر کے قصے سناتا کبھی کبھی گاتا بھی۔ اس نے نہایت درد بھری اور رسیلی آواز پائی تھی۔

چھٹی کے دن وہ گھر بار کے کام میں میری مدد کرتا۔ کبھی اچھی کتابیں پڑھ کر سناتا۔ میرے پتی اس کو بہت پیار کرتے۔ اور ہمیشہ تاکید کرتے کہ اس کو تکلیف نہ ہونے پائے اسی طرح دو چار مہینے گزر گئے اور میں اس سے خاصی بے تکلف ہوگئی۔

اکثر ہم میں ان بن ہوجاتی میں اس سے روٹھ جاتی تو وہ "رادھے کرشنا بول مکھ سے" گنگنانے لگتا میں فوراً ہنس پڑتی۔ جب میں کسی بات پر بحث و دلیل لے کر بیٹھتی تو وہ مجھے طنزاً ــــ "سرسوتی دیوی جی" کہہ کر مخاطب کرتا۔

میرے پتی ایک خدا ترس، نیک اور پاک طینت انسان تھے وہ ہماری سرگوشیاں سن کر خوش ہوتے اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہتے "رادھے تو اس غریب کو اتنا تنگ کرتی ہے۔ دیکھ وہ کہیں گھبرا کر بھاگ نہ جائے"۔ میں اپنی شوخی اور طراری سے کہتی "پھر تو ان کے لئے بیڑیاں تیار کرنی ہوں گی"۔ کرشنا شرما کر آنکھیں نیچی کر لیتا۔ اس کے چہرہ پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی اور وہ کوئی بہانا کر کے باہر چلا جاتا۔

کرشنا اسم با مسمیٰ تھا اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں اس کے جذبات کی پاکیزگی اور اس کی محبت کی فراوانی کی ضامن تھیں۔ اس کی اداؤں میں بانکپن اور اس کی آواز میں ایک دلفریب کشش تھی۔ ایک ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے نے میرے دل میں بھی اس کا خیال پیدا کر دیا تھا۔ اس کی شب و روز کی خدمت۔ اس کا ادب و احترام اس کا خلوص اور اس کا مشفقانہ برتاؤ ــــ یہ ایسی باتیں نہ تھیں جن سے میں متاثر نہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں یہ باتیں گھر کر گئیں۔ اور انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میرے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہوگئی۔ گو میں نے اس وقت اس جذبہ کو محبت سے تعبیر نہ کیا تھا لیکن اس کی قربت سے میرے دل میں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی۔ ایک کیف حاصل ہوتا اور ایک بے پایاں مسرت سی محسوس ہوتی جس کو میں سمجھنے سے قاصر تھی۔

اسی اثنا میں میرے بھائی گاؤں سے واپس آگئے اور کرشنا اپنے ٹھکانے واپس چلا گیا۔ اس کے چلے جانے سے گھر بالکل سونا ہو گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کرشنا کا وجود میری زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر میری ہستی ایک بجھے ہوئے چراغ اور ایک بے نور آنکھ کی مانند تھی۔ مجھے وہ ہر وقت اور ہر لحظہ یاد آتا۔ اس کی محبت، اس کی رواداری اس کا ادب و احترام، اس کی دل لگی اور چھیڑ چھاڑ اس کی وہ دلفریب کہانیاں۔ میں نے نہ صرف گھر ہی میں اس کی جگہ خالی پائی بلکہ میرے دل میں بھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے لگی۔ میرا سکون قلب جاتا رہا۔

میرے پتی بھی اکثر اس کو یاد کرتے اور ہم دونوں اکثر اسی کی باتیں کیا کرتے۔ لیکن جب میرے پتی اپنے کام پر چلے جاتے تو میں پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ مجھے یہ کیا سودا ہوگیا ہے۔ صرف سوچنا بے سود تھا جب تک کہ اس کی مدافعت کی تدبیریں اختیار نہ کی جاتیں لیکن جو شخص محبت اور اس کی نفسیات سے ہی بیگانہ ہو وہ کیونکر اس کی تہ کو پہنچ سکتا ہے مجھے ہر وقت کرشنا کا دھیان اور کرشنا کا خیال رہنے لگا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ میری دنیا دلچسپیوں اور لطافتوں سے خالی نظر آنے لگی اور میں کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔

میرے پتی بڑے فطرت شناس آدمی تھے۔ گو میں ہر وقت

ان سے اپنے اس ہیجان کو چھپاتی رہی لیکن میرے جذبات ان سے چھپ نہ سکے۔ انھوں نے تاڑ لیا کہ کرشنا کی مفارقت مجھ پر شاق گزر رہی ہے۔ اشارۃً و کنایۃً انھوں نے کبھی مجھے اس کا طعنہ نہیں دیا۔ برخلاف اس کے وہ ہر وقت میری دلجوئی میں مصروف رہتے۔ اور اکثر کرشنا ہی کا ذکر کیا کرتے جس سے مجھے ایک گونہ سکون حاصل ہوتا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک غمخوار و غمگسار رفیق حیات کا حق ادا کر رہے تھے۔ ان کا یہ سلوک خود میرے لئے ایک تازیانہ تھا لیکن میں مجبور تھی۔

اتفاقاً اسی زمانہ میں میں بیمار ہوگئی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ دن رات کی خلش اور تڑپ نے آخر کار مجھے بیمار کر دیا۔ میرے حق میں یہ ایک غیبی اعانت تھی۔ میں تمام دن بستر پر آنکھیں بند کئے پڑے رہتی۔ مجھے اپنی سدھ ہی نہ تھی۔ چوبیس گھنٹے جو خیال دامنگیر تھا وہ کرشنا کا۔ اسی کا تصور میرا دن رات کا مشغلہ تھا۔

میری عیادت کو ایک دن بھابی آئیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ان کی والدہ جو اپنے وطن مدراس میں رہتی تھیں سخت بیمار ہوگئی ہیں۔ بھابی کرشنا کے ساتھ انھیں دیکھنے جا رہی ہیں۔

وہ رات میں نے کانٹوں پر کاٹی۔ مجھے یقین تھا کہ کرشنا مجھ سے بن ملے نہ جائے گا خصوصاً میری علالت کی خبر پا کر۔ لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ کرشنا بن ملے ہی چلا گیا اس کی بے التفاتی نے میرے جذبات کو ایک ایسی ٹھیس لگائی کہ ایک عرصہ تک میں اس سے جانبر نہ ہو سکی۔ میرے نسوانی وقار کو ایک ناقابل برداشت دھکا لگا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ عورت مرد کی نگاہ میں ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اور جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو کھلونے ہی کی طرح اس کو ٹھکرا بھی دیتا ہے۔

میری خودداری کو ایک کاری ضرب لگی تھی۔ میں نے ٹھان لیا کہ اب کبھی کرشنا سے نہ ملوں گی۔ پھر سوچتی کہ کرشنا سے میری خفگی بیجا ہے آخر اس کا قصور؟ اس کو مجھ سے واسطہ ہی کیا ہے۔ نہ رشتہ نہ ناتا۔ پھر وہ کیوں میرا خیال کرے۔ کیوں میرے دیکھنے کو بھاگا بھاگا آئے۔ اس سے یہ امید رکھنا خود میری نادانی تھی۔ غلطی میری اور قصوروار بھی میں ہی ہوں پھر گلہ کس بات کا۔ میں اگر اس کو پسند کرتی ہوں تو ضرور نہیں کہ وہ بھی مجھے پسند کرے۔ کیسی کم عقل اور نادان ہوں میں! لیکن پھر اس کی آنکھیں اس کا وہ سکوت جس پر گویائی بھی نثار تھی میرے دماغ میں ایک طلاطم برپا کر دیتے۔

اب میں بہت جلد اچھی ہوگئی۔ اور اپنے کام کاج میں مصروف رہنے لگی پھر میرا گھر تھا اور وہی میں۔ کہتے ہیں کہ قوت ارادی سے انسان بہت سی چیزوں پر قابو پا سکتا ہے۔ میں نے بھی کرشنا کے خیال کو اپنے دل سے محو کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مستقل مزاجی سے اس پر کاربند رہی اور اپنی دانست میں کامیاب بھی ہوگئی۔

یوں ہی دو مہینے گزر گئے۔ لیکن بھابی کی واپسی کے دن جوں جوں قریب آتے گئے میں نے اپنے میں ایک بے چینی محسوس کی جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا کہ بھابی واپس ہوگئیں مجھے اس کی خبر میرے پتی نے دی۔ میرا دل نہ جانے کیوں بلیوں اچھلنے لگا۔ چاہتی تھی کہ پوچھوں "کرشنا بھی آیا کہ نہیں" لیکن زبان تک یہ الفاظ نہ آ سکے۔ اس وقت مجھ پر ثابت ہوا کہ دو مہینے کی یہ کوشش بے سود ہوئی۔ میں کرشنا کے خیال کو یوں تو مٹا چکی تھی لیکن "نہاں خانۂ دل" میں ہنوز اس کی یاد باقی تھی۔

ساون کا مہینہ تھا۔ ہمارے محلہ میں ایک شادی کے موقعہ پر ہم سب وہاں مدعو تھے۔ بھابی کی چونکہ برادری تھی

کرشنا کے وہاں آنے کا امکان تھا۔ ایک اسی خیال نے مجھے ہزاروں الجھنوں میں ڈال دیا تاہم نہ جاتے بھی بن نہ پڑی۔

میں دلہن کے پاس بیٹھی پان لگا رہی تھی کہ کرشنا کے دیکھنے کا ایک موہوم سا آسرا جو دل میں تھا اس سے بھی مایوس ہو چکی تھی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی خوش نصیبی تصور کروں یا بدبختی۔ انھیں خیالات میں غرق ــــ پان بنائے جا رہی تھی۔ کہ یکایک "کیوں رادھا بہن ہمیں پان نہ دوگی" کی آواز سے چونک پڑی۔ نگاہ اٹھائی تو کرشنا سامنے کھڑا کچھ عجیب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم اس سے یوں اچانک ملنے کی خوشی تھی یا اس کی آواز کی کشش کہ میرے تن بدن میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ ہاتھ سے پان چھوٹ گیا۔ دوبارہ مانگنے پر پان کی تھالی تو بڑھا دی لیکن زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ ہر چند میں نے کوشش کی اپنی اس کیفیت کو چھپانے ہی کی خاطر کچھ بولوں یوں ہی کہہ کر ٹال دوں کہ واہ آپ نے تو مجھے ڈرا دیا" لیکن زبان نے یاری نہ کی معلوم ہوتا تھا کہ سانپ سونگھ گیا ہے۔

غرض کرشنا نے دیکھا کہ میں خاموش ہوں تو وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا "بہن اس دفعہ تو تم کو منانا ٹیڑھی کھیر ہے۔ پان ہی مل گئے یہی بڑا احسان ہے۔ اچھا ہم خود ہی چلے جاتے ہیں" اس واقعہ کے بعد گو میں وہاں دو تین دن رہی۔ لیکن کرشنا سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایک تو وہ خود اندر کم آتا، دوسرے جب وہ آتا تو میں کسی بہانے سے اٹھ جاتی۔ اس کی اچانک ملاقات نے میرے جذبات برانگیختہ کر دیئے تھے۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میری یہ سراسیمگی اس پر ظاہر ہو۔ گھر آنے پر پھر وہی اپنے کام دھندوں میں مشغول ہو گئی۔ لیکن از سر نو کرشنا کا تصور صبح شام میرے خیالات پر چھایا رہنے لگا۔

ایک دن میں بیٹھی کشن کاڑھ رہی تھی۔ پتی اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ میں نے خیال کیا بھیا آئے ہوں گے۔ ایسے وقت اور کون آ سکتا ہے۔ اس لئے پکار کر کہا "آیئے" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب، میں نے دیکھا کہ بھیا تو نہیں کرشنا چلا آ رہا ہے۔

مجھ پر پھر وہی وارفتگی چھا گئی۔ ہاتھ پیر میں رعشہ سا ہونے لگا۔ نمستے کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ آخر کرشنا نے کہا "کیا آپ مجھے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہیں گی" اس وقت میرے ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے۔ میں نے بیٹھنے کو اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

پہلے تو ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کرشنا نے مدراس جانے سے قبل نہ آنے کی معذرت کرتے ہوئے اپنی مجبوری کا اظہار کیا" تم خیال کرتی ہوگی کہ کتنا بے مروت احسان فراموش ہے کہ بن ملے چلا گیا۔ رادھا میں احسان فراموش نہیں لیکن تم کو وجوہات بتانے سے بھی قاصر ہوں۔ تم اس کو میری بے التفاتی نہ سمجھو۔ تم مجھ سے خفا ہو، تمھاری خفگی بجا ہے۔ لیکن میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ للہ مجھے معاف کر دو" وہ خاموش ہو گیا میں بھی کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مجھے ہمیشہ اپنے ضبط و استقلال پر ناز تھا۔ لیکن کرشنا کی اس التجا نے مجھے نہ جانے کیوں بے چین کر دیا۔ میری پلکیں بھیگ گئیں۔ میں شربت کا بہانہ کر کے اندر چلی آئی۔

ہاں تو شاید وہ میری اس وارفتگی کو اس سراسیمگی کی کیفیت کو اس خاموشی کو خفگی پر محمول کر رہا تھا۔ اور میں ــــ مدتوں اس پر غور کرنے اور سر دھننے کے باوجود بھی اطمینان بخش نتیجہ پر نہ پہنچ سکی کہ آخر اس وارفتگی اور ارتعاش کے کیا معنی ہیں۔

یوں ہی دن بیتا کئے۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کم ملتے۔ کرشنا نے ہمارے یہاں کا آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ مجھے خود اپنی

الجھنوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ دنیا کے دھندے لئے بیٹھتی، کہیں جاتی آتی۔ اور دل بھی تو نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو "وہی فرصت کے رات دن" کا طلبگار تھا۔ یوں بھی میں زیادہ جانے آنے کی عادی نہ تھی محفلوں سے میرا جی گھبرا اٹھتا تھا۔ اس لئے بیرونی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ میری دنیا میری چار دیواری کے اندر محدود تھی۔ "اپنا گھر سب سنسار تھا" جس میں میرے تخیل کی رنگ آمیزیوں سے مجھے سورگ سکھ کا آنند حاصل تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کرشنا کی شادی کے چرچے ہو رہے تھے۔ ہر آدمی کی زبان پر یہی ذکر تھا۔ ایک خبر نہ تھی تو مجھے۔ اور مجھے ہوتی بھی کس طرح میں نے تو گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ لیکن ایسی بات کسی طرح پھیل ہی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ میں نے اس پہلو پر اس سے قبل کبھی غور نہ کیا تھا۔ اس لئے پہلے پہل یہ خبر کسی قدر شاق گزری دل میں کرشنا کا خیال چٹکیاں لینے لگا۔ لیکن میں ایسی ناداں بھی نہ تھی کہ اپنے اور کرشنا کے فرائض کو نظر انداز کردیتی۔ تاہم وہ دن میں نے بڑی کرب و بے چینی میں کاٹا۔ پتی کے سوجانے کے بعد میں نے رات عبادت میں بسر کی اور اپنے پروردگار سے سکون قلب کی بھیک مانگی۔ اس سے التجا کی کہ مجھے نیک ہدایت دے گناہوں کی آلودگی سے دور رکھے۔ دنیا میں عزت و آبرو اور آخرت میں سرخروئی نصیب کرے۔ شیا ماتم روحانیت کی قائل نہیں۔ خواب اور ان کے روحانی تعلق سے تمھیں انکار ہے۔ لیکن یہ خواب سن کر شاید تم بھی انکار نہ کرسکو۔ دعا کر کے جب میں صبح صبح بستر پر لیٹی تو فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شاہ راہ پر میری لاش پڑی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میری بصارت، سماعت، اور احساس کی قوتیں زائل نہیں ہوئی ہیں۔ کیونکہ میں سب کچھ دیکھ، سن اور محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے ہاتھوں میں کانٹیاں ہیں۔ اس شاہ راہ سے گزر رہی ہیں۔ ان کے تیوروں سے غصہ کے آثار نمایاں ہیں۔ کچھ بڑبڑاتی بھی جا رہی ہیں۔ میری لاش کو دیکھ کر وہ میری طرف بڑھیں۔ اور کچھ بکتی ہوئی ان کانٹوں کا میرے سر کے گرد ایک حلقہ سا لگا دیا۔ ابھی یہ کچھ آگے بڑھی ہوں گی کہ ادھر سے ایک مرد آپہنچا اس کا دامن گلاب کے خوبصورت پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے میری لاش پر جھک کر نہایت احترام سے ان کانٹوں میں ایک ایک پھول لگا دیا پھول لگاتے ہوئے وہ یہ کہتا جا رہا ہے "جس طرح ان پھولوں کی مہک فضا کو معطر کر رہی ہے۔ اسی طرح تمھاری خوشبو سے سارا عالم مہک اٹھے گا۔ فضائے عالم میں تمھاری خوبیاں ایسی ہی چھا جائیں گی۔ جیسے ان پھولوں کی مہک یہاں چھائی ہوئی ہے" میرے سر پر اب بجائے کانٹوں کے پھولوں کا تاج تھا —— وہ اٹھا اور جانے لگا —— میری آنکھ کھل گئی۔

میری دعا قبول ہوگئی تھی۔ فرط خوشی سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری آتما سکھ اور آنند سے بھرپور تھی —— اور میرے خواب کی تعبیر —— یہی جو تم دیکھ رہی ہو اور ممکن ہے آگے دیکھو۔

اس دن مجھ پر ایک روحانی مسرت سی طاری رہی۔ ایک زمانہ کے بعد میرا قلب مطمئن تھا۔ دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب وہاں سکون ہی سکون تھا۔

اس واقعہ کو ابھی کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ ایک دن کرشنا میرے یہاں آیا۔ کرشنا بچپن سے ایک جگہ منسوب تھا۔ لڑکی والے اب رخصتی کے لیے جلدی کر رہے تھے۔ لیکن کرشنا کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ روز ایک نیا حیلہ ایک نیا بہانہ، بھابی —— سارا قصہ سن چکی تھیں اس لیے میں نے بیٹھتے ہی اکل

ذکر چھیڑا۔ میرے اس ذکر سے وہ کسی قدر مکدر ہوا۔ اس نے سر موڑھا لیا اور "رادھا بہن اس کا ذکر چھوڑ دو میں شادی نہیں کرسکتا۔" کہتے ہوئے اٹھ کر ٹہلنے لگا اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کشمکش کا اظہار ہورہا تھا۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بیٹھ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے جن کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ یہ وقت کمزوری کا نہ تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کررہا تھا۔ میں نے اپنے جذبات کو کچلنے کی آخری اور انتہائی کوشش کی۔ اس کی خاطر میں ہر طرح کی قربانی کرنے تیار تھی اور یہی میری آزمائش کا وقت تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ آج سے اس کی زندگی کو پُر مسرت بنانا ہی میرا نصب العین ہوگا۔ اس پر ثابت قدم رہی اور شکر ہے کہ پرماتما کی مہربانی سے حصول مقاصد میں کامیاب رہی۔

میں نے کہا "کرشنا تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا شادی کیوں نہیں کرسکتے؟۔ کوئی وجہ بھی تو معلوم ہو۔ خیر سے تم اب نوکر بھی ہو۔ کیا اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس غریب کی زندگی برباد کروگے۔ جو تمہاری جائز استری ہے۔ میں تو تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ تم ان معدودے چند مردوں میں سے ہو جو کمزور ہستیوں کی سیوا کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔" میرا نشانہ ٹھیک بیٹھا کرشنا بے چین و مضطرب ہوگیا اس کی آنکھیں نمناک اور آواز گلوگیر ہوگئی "رادھا" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں اس کا طرز اس کی بیقراری اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ میرا پرستار ہے۔ وہ اب اپنے جذبات کو چھپا نہ سکا۔ اس نے جھک کر میرے قدم چھوئے اور بےتابانہ بول اٹھا۔ "رادھا اس آستاں کی جبیں سائی کے بعد عرش کی حکومت بھی قبول نہیں۔"

تھوڑی دیر کے لئے مجھے اس انکشاف نے مبہوت کردیا۔ میری ہستی پر ایک بے خودی سی چھاگئی۔ فرط انبساط سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میرا دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ یہ کون نیکی کا صلہ تھا پھر میں سوچ رہی تھی ــــ اس نے بھی میری طرح کرب و بے چینی میں نہ جانے کتنے دن بسر کئے ہوں گے۔ نیک و بد، حق و باطل، .... کی کشمکش نے اسے بھی پریشان کیا ہوگا۔ بےخوابی کی تکلیفیں جھیلی ہوں گی ــــ مجھے اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی ــــ اب مجھے اس کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں۔ اس کا شرما کر باہر چلا جانا۔ اس کا ملنے کو نہ آنا پھر وجوہات تبلانے میں پس و پیش کرنا۔ اس کا اضطراب اس کی خاموشی ــــ

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا۔ میرا صبر و تحمل رخصت ہوگیا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ انہیں روکوں لیکن بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

اس سارے واقعہ کو ایک چشم زدن سے زیادہ وقت نہ لگا ہوگا۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں میری کائنات بدل گئی تھی میں نے خلوص دل سے دعا کی "پرماتما میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔ مجھے ثابت قدم رکھ۔"

شاید میری اضطراری کیفیت سے کرشنا کو میرے قلب کی کیفیت کا پتہ چل گیا ہو۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اس وقت کے ہیجان کا کچھ تھوڑا بہت احساس کرشنا کو ضرور ہوا کیونکہ اس کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس نے جھک کر نہایت احترام کے ساتھ میرے ہاتھ چوم لئے۔

"رادھا تم حقیقت میں رادھا ہو۔ میں شرمندہ ہوں کہ اپنی تکلیف کے خیال میں تمہارے جذبات کا خیال نہ رکھ سکا۔ مجھے نہ اس کی توقع تھی۔ نہ اس کا علم مجھے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہے۔"

وہ چپ ہوگیا میں نے بہ ہزار دقت اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس کو شادی پر آمادہ کرنے کی ایک نئی تجویز پیش کی "کرشنا میری بڑی آرزو ہے کہ ایک چھوٹی سی بھاوج بیاہ لاؤں۔ بھیا کی جب شادی ہوئی ہے میں بالکل ذرا سی تھی۔ کیا تم میری آرزو پوری نہ کروگے۔ اگر تم کو میرا ذرا بھی پاس ہے تو تم یقینی میری خوشی کو سب چیزوں حتیٰ کہ اپنے جذبات پر بھی مقدم سمجھو گے۔"

یہ محبت کا ایک انوکھا اور نیا معیار تھا۔ لیکن حالات کا لحاظ کرتے مناسب اور بہترین معیار۔ وہ اس کو رد نہ کر سکا۔ اس کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ دار تھا جس سے ایک زبردست کش کش کا پتہ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اُمنڈ آئیں۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا "رادھا! جس میں تمہاری خوشنودی۔ تم واقعی پرستش کے قابل ہو۔ آج سے تم میری دیوی ہو۔ اور میں تمہارا پجاری۔ تمہارے نام کی مالا جپنا میری زندگی کا مقصد رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

اس نے دوبارہ میرے پاؤں چھونے چاہے لیکن میں نے یہ کہہ کر باز رکھا "کرشنا مجھے ثابت قدم رہنے دو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے!"

ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہیں میرے چہرے پر اٹھیں۔ ان میں پرستش یاس اور محرومی کا ایک عجیب طلسم بھرا تھا۔ جس کے آگے میری آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔

وہ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑا رہا پھر بیساختہ اس کے منہ سے نکلا "بیڑیاں اسی لئے بنوائی تھیں کہ آزاد کر دو؟!" ——وہ پلٹا اور دروازہ کی راہ لی —— پھر اسے میں نے نہیں دیکھا۔

ایک مہینے بعد اس کی شادی ہوگئی میرے پتی اس زمانے میں بیمار تھے۔ اس لئے ہم شریک نہ ہو سکے۔ اس میں بھی خدا کی مصلحت ہوگی۔ وہ ضرورت سے زیادہ اپنے بندہ کو آزمانا نہیں چاہتا!

اس کی شادی کی تفصیلی کیفیت میں نے بعد کو سنی لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میرا وہ ہیجان فرو ہو گیا تھا۔ اور اور اس کی جگہ سکون نے لی تھی۔ وہ سکون جو ایک زبردست ہنگامہ یا طوفان کے بعد طاری ہوتا ہے۔ "جس دل میں اکھنڈ آنند کا نواس رہتا ہے اس میں دنیوی دکھوں کا گزر نہیں ہوتا۔" ہم نے گیتا میں پڑھا تھا۔ اس کی صداقت کا اندازہ مجھے اب ہوا۔

میں اس سطح پر پہنچ چکی تھی جہاں دکھ اور سکھ میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ جہاں رنج و راحت بے معنی الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ میں ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ میں نے آتما سکھ کی دعا مانگی تھی مجھے آتما سکھ مل گیا تھا۔

غیر متزلزل ارادہ، بے لاگ محبت، ایثار و قربانی نے جہاں مجھے سکون قلب بخشا وہاں مجھ میں فکر و تجسس، طلب و جستجو سوچ اور بچار کی خو بھی ڈال دی۔ جب انسان چوبیس گھنٹے سوچنے اور غور کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو خاموشی اس کی عادتِ ثانیہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس یہی وجہ میری خاموشی کی ہے —— مجھے خاموشی میں وہ لذت حاصل ہے جو کسی کو گویائی میں بھی میسر نہیں!

شیاما یہ ہے وہ داستان جس کو تم سننے کے لئے بے قرار تھیں۔ میں نے بلا کم و کاست سب کچھ تمہیں بتا دیا۔ اب اس پر تمہیں تنقید و تبصرہ کا اختیار ہے۔

کہتے ہیں کہ تاریکی کے بعد اجالا، رنج کے بعد راحت اور ہنگامہ کے بعد سکون لازم و ملزوم ہیں۔ مری تلخ کامیوں کی تاریکی میں میری رہنمائی کے لئے جوش کے یہ اشعار مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ انہی کی روشنی نے اس بھیانک تاریکی میں میری دستگیری اور رہبری کی تھی۔ اس لئے انہی پر اپنے اس طویل خط کو ختم کرتی ہوں کہ یہی میرا سرمایۂ حیات ہیں!

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر
سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو کہ دل ہو آئینہ
ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

وہی تمہاری

رادھا!

سکینہ بیگم

عثمانیہ کالج اور جامعہ عثمانیہ کی چند پرانی باتیں

جولائی اور اگست کے "سب رس" میں مندرجہ بالا عنوان پر میرا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں چند اور باتیں قابل تذکرہ ہیں لیکن قبل اس کے کہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے گزشتہ قسطوں کی بعض غلطیوں اور فروگزاشتوں کا ازالہ ضروری ہے۔

افتتاح عثمانیہ کالج کا سنہ ہجری ۱۳۳۷ تو صحیح شائع ہوا مگر عیسوی سنہ ۱۹۱۹ کی بجائے ۱۹۰۹ شائع ہو گیا ہے اس طرح منشور خسروی کا سنہ عیسوی ۱۹۰۸ نہیں بلکہ ۱۹۱۸ ہے اور جامعہ عثمانیہ کا پہلا امتحان ۱۹۲۱ میں ہوا تھا۔

بابو امرت لال صاحب سابق مددگار پروفیسر ریاضی کے نام کے ساتھ "سہیل" لکھ دیا گیا، دراصل ان کا خاندانی نام "سبل" ہے اسی طرح مرحوم مولٰنا سید اشرف صاحب ہاشمی کی بجائے "شمسی" ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر رضی الدین کے متعلق میں نے یہ لکھا تھا کہ انھوں نے دارالعلوم سے منشی کے امتحان میں کامیابی کے بعد عثمانیہ میٹرک کے صرف انگریزی گروپ میں کامیابی حاصل کر کے عثمانیہ کالج میں شرکت کی تھی لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ منشی کی کامیابی کے ساتھ ہی انھوں نے عثمانیہ میٹرک کے جملہ گروپ کا امتحان دیا تھا اور امتحان میں اول آئے تھے، اور یہ امتیاز انھوں نے جامعہ کے سارے امتحانوں میں برقرار رکھا اور اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کی علمی اور طبیعیاتی غیر معمولی قابلیت کے اعتراف کے طور پر مشہور جرمن قومی نوبل انعام ملنے والا ہے۔ جو نہ صرف جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد یا ہندوستان کے لئے باعث فخر ہے بلکہ ساری دنیائے اسلام کے لئے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب پہلے جواں سال مسلمان ہیں جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا

میں نے انتصار الدین صاحب کو دارالعلوم کا طالب علم بتایا تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہ دارالعلوم کے طالب نہیں تھے۔

اگلی قسط میں یہ لکھا گیا تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے تین پروفیسر ابتداً ایک ہی مکان میں سکونت رکھتے تھے، یہ "اصحاب ثلاثہ" پروفیسر وحید الرحمن صاحب، پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی تھے، جمیل الرحمن صاحب نہیں۔

کالج یونین کے سلسلہ میں یہ سن لیجئے کہ یونین کے پہلے صدر عبدالستار صاحب ایم اے پرنسپل چنچل گوڑہ ہائی اسکول۔ اور پہلے سکریٹری عبدالمجید صاحب بی اے ایل ایل بی منتظم فوج تھے۔

عثمانیہ کالج میں بی اے اور بی ایس سی کے بعد فوراً ہی ایم اے اور ایم ایس سی کی جماعتیں قائم نہیں ہوئیں بلکہ چند سال کے وقفہ کے بعد ان جماعتوں کا انتظام کیا گیا، پہلے سال جن طلبہ نے بی اے اور بی ایس سی میں کامیابی حاصل کی تھی ان میں سے چند طلبہ کو دیگر ہندوستانی جامعات میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظایف دیئے گئے تھے۔ وہ طلبہ جنھوں نے ان جامعات میں اپنی اعلیٰ کامیابی سے امتیاز حاصل کیا تھا حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر سید حسین، پروفیسر صلاح الدین، پروفیسر عزیز الرحمن وغیرہ۔

اگلی قسط میں اس امر کی صراحت ہو چکی ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے یورپ جانے والے طالب علم خواجہ نعمت اللہ صدر مہتمم تعمیرات ہیں، جن کو انٹرمیڈیٹ کی کامیابی کے بعد سرکاری وظیفہ ملا تھا۔ اس زمانہ میں انگلستان کی کسی یونیورسٹی نے "جامعہ عثمانیہ" کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس لئے خواجہ نعمت اللہ صاحب نے وہاں شرکت کے لئے یہ درخواست کی تھی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور بعد امتحان شریک کیا جائے۔ چنانچہ ان کی شرکت اسی طرح ہوئی

جب تک عثمانیہ کالج توپ کے سانچہ کے مکانوں میں رہا اس وقت تک طلبا کے کھیل کا میدان عارضی طور پر درگاہ عبدالرحیم شاہ کا عقبی حصۂ زمین رہا جہاں گزشتہ سال انجمن اتحاد المسلمین کا اجلاس ہوا تھا۔ "گیمس" کے نگرانکار یا مہتمم مولوی الیاس صاحب برنی ناظم دار الترجمہ تھے جو اس زمانہ میں معاشیات کے مددگار پروفیسر تھے۔

پروفیسر قاری قطب الدین صاحب جامعہ عثمانیہ کے وہ پہلے طالب علم ہیں جن کو سکندرآباد کی مجلس میلاد نے بہترین مضمون کے صلہ میں طلائی تمغہ دیا تھا۔ اس زمانہ تک جامعہ عثمانیہ کے کسی طالب علم کو باہر سے یا خود جامعہ سے کوئی تمغہ نہیں ملا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کے کئی طالب علموں نے یورپ میں تعلیم پائی اور پا رہے ہیں۔ اس موقع پر ان چند طالب علموں کا نام لیا جاتا ہے جن کو کسی نہ کسی خصوص میں اولیت کا شرف حاصل ہے اور ان میں سے بعض بہت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر میر سیادت علی
۲۔ ڈاکٹر میر ولی الدین
۳۔ ڈاکٹر سید حسین
۴۔ ڈاکٹر رضی الدین
۵۔ ڈاکٹر زور
۶۔ ڈاکٹر مقبول علی
۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ
۸۔ پروفیسر سید محمد علیخاں
۹۔ میر اکبر علی خان بیرسٹر
۱۰۔ خواجہ نعمت اللہ خاں
۱۱۔ سید یٰسین علی خاں
۱۲۔ ظہیر الدین احمد

فرزندان جامعہ سے جامعہ میں ملازم ہونے والے سب سے پہلے شخص مولوی یوسف الدین صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ ہیں، جن کو بی اے کی کامیابی کے بعد اس خدمت پر مامور کر دیا گیا۔

اور اساتذہ کے زمرہ میں شامل ہونے والے سب سے پہلے شخص عبدالمجید صاحب صدیقی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد دو بول دختران جامعہ کے متعلق بھی کہنا ضروری ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے سب سے پہلے جس خاتون نے بی اے کی ڈگری حاصل کی وہ نوشابہ خاتون دختر مولوی عبدالحق صاحب سابق مددگار صدر ناظم کوتوالی اضلاع ہیں جنھوں نے کلیہ اناث کے قیام ہونے کے پہلے سال یعنی ۱۳۳۳ف (۱۹۲۴ء) میں کامیابی حاصل کی تھی، اور کلیہ اناث قائم ہونے کے بعد پہلی خاتون درۃ البیضاء بیگم ہیں جنھوں نے ۱۳۳۵ف میں بی اے پاس کیا۔ مجدی بیگم اہلیہ مولوی جمیل حسن صاحب ایچ سی ایس وہ پہلی خاتون ہیں جو بی اے میں جامعہ بھر میں اول آئیں۔ جامعہ سے یورپ جانے والی خواتین میں اولیت مسز جمال الدین اور مسز زین یار جنگ کو حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے مجھے تعلیمی تعلق بہت کم رہا ہے، اس لئے تفصیلی حالات کا تذکرہ میں کرنے سے قاصر ہوں، یہ کام کسی طیلسان کا ہے، چونکہ اس قسم کی کسی نے کوشش نہیں کی تھی میں نے مختصراً یہ خاکہ پیش کر دیا۔ اگر جامعہ عثمانیہ کی جوبلی سے پہلے کوئی باہمت شخص اس طرف توجہ کرے تو یہ اس کا خوش گوار فرض ہوگا۔

نصیر الدین ہاشمی

تنقید و تبصرہ

اس مہینے کی مطبوعات میں ایک چھوٹی سی کتاب سپاس جنابِ امیر از مرحوم علامہ سر اقبال قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم کو چند دوسری نظموں اور رباعیات کے ساتھ تصدق حسین صاحب تاج نے شایع کیا ہے۔ اور ماہر القادری صاحب سے ان پر ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی لکھوا کر شامل کیا ہے۔ موصوف نے اقبالیات پر ایک کتاب بنام معتاح قرآن مجید شائع کی تھی۔ یہ ایک مسدس ہے جس میں مسلمانوں کو قرآن خوانی کا صحیح ذوق پیدا کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اکثر بند دلچسپ ہیں اور اقبال کے مسدس شکوہ اور جواب شکوہ کا رنگ ان میں جھلکتا ہے۔

جوہر آئینۂ عجم :۔ از سید کریم الدین و ابوالمحاسن متین۔ قیمت دس آنے۔ آئینۂ عجم مشہور فارسی ادیبوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو جماعت ہشتم کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب اس کی شرح ہے جس میں ہر مضمون سے پہلے مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ آسان اور معنی خیز ترجمہ بھی لکھا گیا ہے اور آخر میں امتحانی سوالات بھی طلبہ کی سہولت کے لئے بطور نمونہ درج کر دیئے گئے ہیں۔ ابوالمحاسن متین صاحب نے اس سے پیشتر بھی اس قسم کی شرحیں لکھ کر شایع کی ہیں جو طلبہ کے لئے سہولت کا باعث ہوئیں۔ اس قسم کی کوششیں قابلِ قدر ہیں اور یقین ہے کہ متین صاحب اسی طرح اپنے دوستوں کی مدد سے علم و ادب کی خدمت جاری رکھیں گے۔

طلسم عمل :۔ از سید مجتبیٰ حسن صاحب بی اے مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

شروع کیاہے اس کا یہ پہلا حصہ ہے اور اس میں چاروں خلفائے راشدین کے حالاتِ زندگی سلیس زبان میں تحقیق سے درج کئے گئے ہیں۔ جو لوگ اپنے بچوں کے لئے کام کی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے خوش ہوں گے۔

اسلامی تعلیم :۔ مولفہ ظہیر احمد عثمانی۔ ناشر کتابخانۂ سعادت لاہور قیمت ۲/ یہ کتاب بھی چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس میں اسلام سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔

ہندستانی تہذیب کی تکمیل :۔ مصنفہ کالی داس صاحب کپور ایم اے ایل ٹی۔ ناشر نولکشور پریس لکھنؤ۔ قیمت آٹھ آنے۔

کپور صاحب نے گزشتہ سال لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے اس عنوان کی چھ تقریریں کی تھیں اب ان تقریروں کو کچھ اضافہ کے ساتھ کتاب کی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔ کپور صاحب کا اسلوب بیان سادہ ہے۔ اردو ہندی کے درمیان ایک مشترک زبان رائج کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے ان میں اس قسم کی کتابیں معاون ثابت ہوں گی۔ ایسی ہی کتابیں باہمی نااتفاقی کی آگ ٹھنڈی کرنے میں مدد پہنچاتی ہیں اور ہندستانی تہذیب کے بنانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو برابر کا حصہ لیا ہے اس کی تشریح کرتی ہیں۔ کتاب میں چند تاریخی تصویریں بھی شریک ہیں۔

پیامِ کیف :۔ از مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڑھ مطبوعہ معارف پریس قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

احسان احمد صاحب اعظم گڑھ کے قریب ایک دیہات کے باشندے ہیں اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ پیامِ کیف میں ان کی منتخب نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس کو انھوں نے اپنے بھائی مرزا سلطان احمد صاحب ایم اے ایل ایل بی ڈپٹی کلکٹر کے نام معنون کیا ہے۔ احسان صاحب اصغر گونڈوی سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے کلام میں بھی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو اصغر مرحوم کا طرۂ امتیاز تھیں۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش ہیں۔

یہ شورشیں دلِ بےتاب کے فسانے کی — رہی ہیں رہیں گی ازل سے رہیں گی تا ابد
یہ صورتیں ہیں فقط ان کے مسکرانے کی — بہار لالہ و گل جلوۂ مہ و انجم
بس ایک دیر ہے ان کے نظر اٹھانے کی — یہ جان محوِ تجلی یہ گل ہو غرقِ نشاط

فضائے عرصہ کونین دیکھتا ہوں میں کہ اس میں کتنی ہے وسعت مرے تماشے کی

خفیہ خط و کتابت :- مصنفہ سید خواجہ صاحب وکیل ہائیکورٹ مطبوعہ شمسی مشین پریس حیدرآباد۔ قیمت ایک روپیہ۔

سید خواجہ صاحب حیدرآباد کے ایک قدیم وکیل اور مصنف ہیں۔ ان کی بعض کتابیں چھپ بھی چکی ہیں جن میں حدائق مملکت عثمانیہ قابل ذکر ہے۔ اس میں مصنف نے مختصر سی جگہ میں تاریخ دکن سے متعلق بہت سی ضروری معلومات درج کر دی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ایک نادر موضوع پر لکھی گئی ہے اور دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

خواتینِ دکن کی اردو خدمات :- مولفہ نصیر الدین ہاشمی صاحب ناشر سید عبدالرزاق تاجر کتب۔ قیمت دو روپے۔

مولوی ہاشمی صاحب حیدرآباد میں عرصہ سے نسوانیات پر کام کر رہے ہیں۔ یہ موضوع ایسا دلچسپ ہے کہ آدمی کام سے نہیں تھکتا اور خاص کر ہاشمی صاحب تو طبقۂ نسواں سے متعلق ایسے ایسے پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں جن کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی۔ خواتین دکن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی صاحب کی نظر کتنی دور دور تک پڑتی ہے اور انھوں نے کیسی کیسی مخفی اور گمنام خواتین کو پردہ کی چار دیواری سے باہر لا کر منظر عام پر پیش کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کوشش طبقۂ نسواں میں بہت مقبول ہوگی۔ اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سرزمین دکن میں اردو کی خدمت اور ترقی کے لئے ہر مذہب اور فرقے کی خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ خاص کر عہد حاضر میں تو حیدرآباد کی علمی و ادبی چہل پہل میں خواتین کا بڑا حصہ ہے۔

خیال آفریں دماغ :- از عرش تیموری ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس قیمت ۸ آنے۔

عرش تیموری صاحب رسالہ افادہ حیدرآباد کے مدیر اور مشہور شاعر مرزا نظام شاہ لبیب کے فرزند ہیں۔ اس سے قبل ان کی ایک چھوٹی سی کتاب قلعہ معلی کی جھلکیاں چھپ چکی ہے۔ اور وہ ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے بھی روشناس ہو چکے ہیں۔ خیال آفریں دماغ ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس میں تجزیاتی و تحلیلی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر انسانی کردار پیش کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ نوجوان مصنف کے دماغ کی خیال آفرینیاں جھلکیں دکھا رہی ہیں۔ کتاب اہتمام سے پاکیزہ چھاپی گئی ہے۔ توقع ہے کہ اگر عرش صاحب کی ادبی مصروفیتیں اسی طرح جاری رہیں تو

مددگار صدر ناظم کوتوالی انسلاع ہیں۔ جنھوں نے کلیہ اناث سے ۱۳۳۳ف یعنی ۱۹۲۴ء میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور کلیہ اناث قائم ہونے کے بعد پہلی خاتون درۃ البیضا بیگم ہیں جنھوں نے ۱۳۳۵ف میں بی اے پاس کیا۔ مجیدی بیگم اہلیہ مولوی جمیل حسن صاحب ایم سی ایس وہ پہلی خاتون ہیں جو بی اے میں جامعہ بھر میں اول آئیں۔ جامعہ سے یورپ جانے والی خواتین میں اولیت مسز جمال الدین اور مسز زین یار جنگ کو حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے مجھے تعلیمی تعلق بہت کم رہا ہے اس لئے تفصیلی حالات کا تذکرہ میں کرنے سے قاصر ہوں، یہ کام کسی طلبان کا ہے، چونکہ اس قسم کی کسی نے کوشش نہیں کی تھی میں نے مختصراً یہ خاکہ پیش کر دیا۔ اگر جامعہ عثمانیہ کی جوبلی سے پہلے کوئی باہمت شخص اس طرف توجہ کرے تو یہ اس کا خوش گوار فرض ہوگا۔

نصیر الدین ہاشمی

جام طہور :- از خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی ناشر تاج کمپنی لاہور۔

اثر صہبائی حضرت امجد کی طرح اردو کے رباعی گو شاعر ہیں۔ بیس برس کی عمر سے رباعی لکھنی شروع کی ہے اور خیام کا اتنا مطالعہ کیا ہے کہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی رباعیات کا پہلا مجموعہ

جام صہبائی ۱۹۳۲ء کے آغاز میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان پر اقبال اور ٹیگور کا اثر پڑھنے لگا چنانچہ زیرِ نظر مجموعہ جام طہور میں اس اثر کی جھلکیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ رباعیات کے آخر میں متعدد چار مِتی قطعے بھی درج ہیں۔

فریادِ قرآن :۔ از محمود اسرائیلی۔ ناشر ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید شاخ بمبئی۔ یہ ایک مسدس ہے جس میں مسلمانوں کو قرآن خوانی کا صحیح ذوق پیدا کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اکثر بند دلچسپ ہیں اور اقبال کے مسدس شکوہ اور جواب شکوہ کا رنگ ان میں جھلکتا ہے۔

جوہر آئینۂ عجم :۔ از سید کریم الدین و ابوالمحاسن متین۔ قیمت دس آنے۔ آئینۂ عجم مشہور فارسی ادیبوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو جماعت ہشتم کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب اس کی شرح ہے جس میں ہر مضمون سے پہلے مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ آسان اور معنی خیز ترجمہ بھی لکھا گیا ہے اور آخر میں امتحانی سوالات بھی طلبہ کی سہولت کے لئے بطور نمونہ درج کر دیئے گئے ہیں۔ ابوالمحاسن متین صاحب نے اس سے پیشتر بھی اس قسم کی شرحیں لکھ کر شایع کی ہیں جو طلبہ کے لئے سہولت کا باعث ہوئیں۔ اس قسم کی کوششیں قابلِ قدر ہیں اور یقین ہے کہ متین صاحب اسی طرح اپنے دوستوں کی مدد سے علم و ادب کی خدمت جاری رکھیں گے۔

طلسم عمل :۔ از سید مجتبیٰ حسن صاحب بی اے مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ کتاب جو بڑی سائز کے ڈھائی سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اصل میں امریکہ کے ماہرِ تعلیم اور فلسفی مسٹر ڈیل کارنیجی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اس میں معاشرت اور زندگی کو کامیاب بنانے کے رازہائے سربستہ کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اہلِ ہند مغربی ممالک کی بعض خوبیوں اور کامیابیوں کے اسباب سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اب تک مغربی زبانوں کے جو ترجمے اردو میں شایع ہوئے۔ وہ زیادہ تر ادبی محاسن کے ترجمان تھے، اور ادب میں شاعر افسانہ نگار یا ادیب بے باکی کے ساتھ زندگی کے بھلے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو پیش کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام اور ایسے لوگ جن کی علمی و اخلاقی نشو و نما کی تکمیل نہ ہوئی ہو بھٹک جاتے ہیں اور مغربی زندگی کے خراب پہلوؤں ہی کی تقلید کو باعث کامیابی سمجھتے ہیں۔ جو سنجیدہ اصحاب اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے عہد حاضر کی ترقی کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جدید نسلوں نے یورپ اور امریکہ کی تقلید میں بہت سی برائیوں کو بھلائیاں سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ مشرقی زبانوں میں مغرب کی ایسی کتابوں کے بہت کم ترجمے ہوئے ہیں۔ جیسی کہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔

یہ کتاب چھ حصوں پر منقسم ہے اور ہر حصہ نہایت ہی مفید نفسیاتی اور اخلاقی موضوع پر لکھا گیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی انسان بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے سے اپنے حلقۂ اثر کو کیونکر وسیع بنا سکتا ہے۔

کتاب میں بعض جگہ انگریزی ناموں کا غلط تلفظ درج ہے اور ابتداء میں صرف مترجم کا دیباچہ ہی کافی تھا۔ ایک سے زیادہ اصحاب سے تعارف یا اظہار لکھوانا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سریلے بول :۔ یعنی مجموعۂ نظم محمد عظمت اللہ خاں بی اے مرحوم قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

یہ تقریباً دو سو پچیس (۲۲۵) صفحات پر دیدہ زیب اور صاف

پاک شایع ہوا ہے۔ اس کی سائز بھی اقبال اور جوش کی کتابوں کی طرح رکھی گئی ہے۔ اور مصنف کی ایک تصویر اور خط کا عکس بھی شامل ہے۔ ابتدا میں دیباچہ اور حالاتِ زندگی کے علاوہ خود عظمت مرحوم کا ایک مضمون بھی درج ہے جو شاعری پر لکھا گیا ہے۔ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد سے اب تک کسی اردو شاعر نے اپنے کلام کی وضاحت کے لئے ایسا اچھا مقدمہ نہیں لکھا تھا۔

اردو میں ہندی لفظوں اور بحروں کا استعمال عظمت ہی کی شاعری کی وجہ سے مقبول ہوا۔ ان سے پہلے اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے بھی اس طرف کچھ توجہ کی تھی لیکن ان کے کلام کے سوقیانہ حصے نے ان کی اس خوبی کو نمایاں نہ ہونے دیا لیکن عظمت نے اپنی پاکیزہ نظموں کے ذریعہ سے اس خصوصیت کو ایسی خوش اسلوبی سے چمکایا کہ آج کئی اردو شاعر۔ مثلاً جوش، حفیظ، ساغر اور حامد اللہ افسر وغیرہ انہی کے رنگ میں لکھ کر مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں نے ایک ایسی شاہ راہ بنا دی جس پر اب آسانی سے ہر شاعر گامزن ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے کا عرصے سے اہلِ ذوق کو انتظار تھا اردو دنیا کو عظمت زبیدہ بیگم کا مرہونِ منت ہونا چاہیے کہ ان کی وجہ سے یہ مجموعہ اب شایع ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔

تنہائی

تارے گردوں پہ جھلملاتے ہیں — گویا ہیرے ہیں جگمگاتے ہیں
نرم جھونکے ہوا کے آتے ہیں — سبز پودے بھی لہلہاتے ہیں
دنیا خاموش رات کالی ہے — اک مرا دل خوشی سے خالی ہے

لو وہ مشرق کے کوہساروں پر — آبشاروں پہ سبزہ زاروں پر
بکھریں بہار ہا ہے چاند — سارے عالم پہ چھا رہا ہے چاند
اک حسیں غمزدہ کی سی صورت — پڑ گئی پھیکی چاند کی صورت
دنیا خاموش لوگ سوتے ہیں — پر جو ہیں غمزدہ وہ روتے ہیں

یاد گزری ہوئی بہاروں کی — بیٹھ کر چھاؤں میں ستاروں کی
کرتا جاتا ہوں روتا جاتا ہوں — گویا اک راگ گنگناتا ہوں

محمد منظفر الدین ظفر (عثمانیہ)

جادوگری

(۱)

تری باتوں میں سحر سامری ہے
نظر میں کیا بلا جادوگری ہے
سمایا اس کا وہ رگ رگ میں جیسے
اترتی شیشۂ دل میں پری ہے

(۲)

تکلم اک ادائے نغمہ زا ہے
خموشی ایک تصویرِ ادا ہے
زسرتاپا ہے تو جادو کا پتلا
تجھے کیا زیب دیتی خودسری ہے

(۳)

چلے تو اک قیامت سر پہ ڈھائے
اگر بیٹھے تو سو فتنے اٹھائے
بچے دل کس طرح جادو سے تیرے
تری ہر ہر ادا جادو بھری ہے

(۴)

تری دوری ہو یا قربت ستم ہے
نظر میٹھی بھی حق میں دل کے سم ہے
تو ہے جانِ محبت، جانِ عالم
تجھے زیبا جہاں میں سروری ہے

(۵)

تری رعنائیاں غارت گرِ دیں
تری بے باکیاں شب خوں زنِ چیں
غضب ہے موجِ طوفاں تیوریوں کی؛
ترا فرمان حکمِ نادری ہے

(۶)

ہنسی سے بجلیاں دل پر گراتا
نظر سے خرمنِ ہستی جلاتا
چلا آتا ہے جب تو جھم جھماتا
پکار اٹھتا ہے دل "جادوگری" ہے

عبدالقادر سروری

ادبِ لطیف

آدمیوں میں جس طرح ایک صنفِ لطیف ہوتی ہے، ادب میں ادبِ لطیف بھی ایک صنف ہوتا ہے۔ اور جس طرح صنفِ لطیف کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا اسی طرح ادبِ لطیف کو ــــ کم سے کم میں تو نہیں سمجھ سکا، اور جو کچھ دیکھا اور سمجھ سکا، اس کا خلاصہ غالباً یہ ہے کہ چند نہایت مہمل جملوں کو بڑے سلیقہ سے پیش کرنے کی کوشش کا نام "ادبِ لطیف" ہے۔

جو رتبہ شاعری میں غزل کا ہے وہی نثر نگاری میں "ادبِ لطیف" کا ہے۔ لیکن جس طرح ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں آکر غزل نے اپنا رتبہ گرالیا اسی طرح "ادبِ لطیف" نے بھی ما و شما سے منہ لگ کر اپنی بگاڑ لی۔

تقریباً ہر لکھنے والا اس پر نظرِ عنایت کرتا ہے، اور خصوصاً یہ اعتماد ہو جانے کے بعد کہ وہ بھی (اپنی دانست میں) ایک بڑا لکھنے والا ہے، کچھ تو غالباً اس لئے کہ ادبِ لطیف کو ہم نے بہت آسان سمجھ رکھا ہے، اور کچھ اس لئے کہ یہ بہت مختصر ہوتا ہے، اور ہم بغیر کسی محنت کے اس پر مشقِ ستم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی سوجھی کہ میں بھی ادبِ لطیف عرض کروں۔ اس سلسلہ میں خود ادبِ لطیف کی تعریف وغیرہ سے ابتدا کی جاتی ہے!

(۱) ادبِ لطیف وہ ادب ہوتا ہے جس کا لکھنا "سمجھنے" سے زیادہ آسان ہوتا ہے اور جس کا "سمجھنا" نہیں "لکھنے" سے زیادہ آسان!

(۲) یعنے ادبِ لطیف میں عموماً جذبات زیادہ سمجھے لئے جاتے ہیں، الفاظ کم ہوتے ہیں، مطلب سطحی ہوتا ہے، اور مقصد لایعنی!

(۳) ادبِ لطیف ان اجزائے جملیہ کو کہتے ہیں جو نتیجہ ہوتے ہیں کسی ادیب یا شاعر کے ہیجانِ قلبیہ، جنونِ دماغیہ، تصورِ عقلیہ اور عاداتِ شستیہ کا! ــ ان اجزائے جملیہ کے ارکان لاینفک زیادہ تر ہوتے ہیں (!!!۔ ؟؟؟۔ ــــ) یعنے نقطہ دار الف، نقطہ دار ہمزہ اور بے نقطہ لکیر، یہ دونوں تینوں حروف بھی ان ہی کے لئے ایجاد ہوئے ہیں۔ ادبِ لطیف کے دوسرے نام "شہ پارے" اور "تخیلات" وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

(۴) "آہ، واہ، ہیں، اُف، افسوس، تُف" وغیرہ ــــ یہ چند اہم اسکرو ہیں جو ادبِ لطیف کو فٹ کرنے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

یہ تو ہوئی ادبِ لطیف کی تعریف۔ اب مختلف عنوانات کے تحت اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اگرچہ آپ نے اکثر رسالوں میں ادبِ لطیف کے تخیلاتِ عالیہ دیکھے ہوں گے، لیکن یہاں کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا ادبِ لطیف دوسروں کے ادبِ لطیف سے بالکل مختلف رہے۔

اب سوچ یہ ہے کہ ادبِ لطیف کو شروع کس عنوان سے کیا جائے۔ چونکہ "عورت" انسانی زندگی، اور خود ادب کا بھی ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے شروع کیا جائے۔

(۱) عورت :-

اے عورت !!! ــــ تو عورت ہے !!! ــــ بس اور کیا عرض کریں !!! ــــ باقی سب خیریت !!! ــــ ہماری طرف سے وہاں سب بڑوں کی خدمت میں قدمبوسی اور چھوٹوں کی خدمت میں دعا عرض کر دینا !!! ــــ

(۲) عشق :-

جہاں عورت ہو، وہاں عشق نہ ہو !؟ ایسا ہو سکتا ہے؟ ــــ آہ !! ــــ اگرچہ یہ آہ کا کونسا موقعہ ہے؟؟؟ ــــ

آہ پیارے، میں تجھے دل و جان سے چاہتی ہوں، اور اس کی اطلاع تو تجھے پہلے بھی دی جا چکی ہے !! ــــ میں نہیں چاہتی کہ تو کبھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو، اور تو نے بھی براہ کرم نہیں چاہا کہ مجھے

چھوڑ کر کہیں جائے!!۔۔۔ کہا جا سکتا تھا کہ ہماری محبت غیر فانی تھی! ۔۔۔ مگر آہ! ظالم حکومتوں نے کب کسی کو چین لینے دیا ہے!!۔۔۔ بادشاہ کا بیٹا کوریا کے جنگلی بھیڑیے ہیں!۔۔۔ آہ، پر یتیم! تو بھی انہیں کے منہ میں جانے پر مجبور ہے!۔۔۔ جا!۔۔۔ میری بہترین تمنائیں تیرے ساتھ ہیں!!۔۔۔ میں نے تجھے روکنے کی بہتیری کوشش کی مگر تو تو بنا ہی جنگ کے لئے تھا، پھر تیری ذہنیت تجھے کس طرح چین سے بیٹھنے دیتی!۔۔۔ اس لئے جا!!۔۔۔ لیکن خدا کرے جس طرح پیٹھ دکھا کر جا رہا ہے پھر منہ دکھانے نہ آئے!۔۔۔ جا!۔۔۔ نکل جا!! پیارے!!!۔۔۔

میں تجھے نہ دیکھوں، نہ دیکھوں!
میں تجھ سے نہ ملوں، نہ ملوں!
تو مجھے نہ دیکھے نہ دیکھے
تو مجھ سے نہ ملے نہ ملے
لیکن ہم دونوں میں محبت تو ہو جائے
کیوں کہ
محبت ہی
ایک ایسی
شئے ہے
کہ
جس کو ہو جانا چاہئے
کیونکہ
اس کی حقیقت "بلینک ورس"
سے زیادہ پُر لطف ہے!!!
آہ محبت کی خیالی دنیا!!!۔۔۔ اور نوجوانوں کی تمنا!!!۔

میں نے جس چمن کی جس روش پر قدم رکھا، پھولوں کو تیری شناگری میں محو پایا۔ لالہ تیرے گل عارض کی تعریف کرتا تھا، نرگس تیرے جسم نازک کی، غنچہ یاسمین تیری ناک کی، سنبل تیری زلف کی، شاخ گل تیرے بازو کی، تخم حنا تیرے دانتوں کی ۔۔۔ غرض، ہر ایک نے اپنی اپنی مناسبت سے تجھے پسند کر لیا ۔۔۔ لیکن آہ! "کلین شیو" (clean shave) کے بدعہ میں اور تجھ میں اتنی مناسبت پیدا ہو گئی، پھر بھی نہ تو میری تعریف کرتی ہے نہ پسند کرتی!۔۔۔ افسوس!!!۔۔۔

یہ چند قبریں ہیں!۔۔۔ یہیں میرے باپ دادا دفن ہوئے تھے!۔۔۔ میں بھی دفن ہوں گی، اور بہت سے لوگ بھی دفن ہوں گے! ۔۔۔ مگر آہ پریتم! نہیں معلوم تم کہاں دفن ہو گے!۔۔۔ کیا اچھا ہوتا جو میں اپنی آنکھوں سے تمہاری پیاری قبر دیکھ سکتی!!۔۔۔ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم دونوں میں کون پہلے مرے گا!!۔۔۔ وائے ناکامی شوق!!!۔۔۔

---

(۳) آدمی :-

آدمی بنتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد!!۔۔۔

یہ شعر تو محض ناول نویسوں کے اسٹائل پر لکھ دیا گیا ہے، جس طرح وہ ناول کا ہر باب شروع کرنے سے پہلے لکھنا غالباً ضروری سمجھتے ہیں، ۔۔۔ کہنے کا مطلب ہمارے یہ تھا کہ "آدمی" پر بھی کچھ "ادب لطیف" کی "جھلکیاں" چھوڑیں یا چند تخیلاتِ فاسدہ کا اظہار کریں :-

آدمی کس سے بنا؟ ۔۔۔ مٹی سے!۔۔۔ مٹی کس سے بنی؟ زمین سے!۔۔۔ زمین کس سے بنی؟ مٹی سے!!۔۔۔ آہ!!!۔۔۔

کہتے ہیں کہ آدم کے لغوی معنے "گندمی" کے ہیں۔ چونکہ حضرت آدمؑ کا رنگ دنیا میں آنے کے بعد گندمی ہو گیا تھا، آپ کو آدم کہا جاتا تھا، ورنہ آپ کا رنگ اس قدر گورا یا نورانی تھا جس کا تصور بھی مشکل ہے

اس لئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جو عورتیں یا مرد خوبصورت بننا چاہتے ہیں وہ پوڈر کریم پینٹ وغیرہ میں سر کھپانے کی بجائے جنت میں چلے جانے کی کوشش کریں؟ — آہ!! —

۶

شاہوں کا بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی — آدمی!
مفلس جو بے نوا ہے سو ہے وہ بھی — آدمی!
ماتحتوں کو ڈانٹتا ہے سو ہے وہ بھی — آدمی!
بیوی سے کانپتا ہے سو ہے وہ بھی — آدمی!
"پربھات کمپنی" میں جو بنا ہے سو ہے وہ بھی "آدمی"!

یاد رکھئے کہ یہ آخری "آدمی" "پربھات چترپٹ" ہے اور اگر اہلِ زبان کی کثرتِ استعمال سے کہیں "ر" گر گیا تو پھر "چت پٹ" ہوا "گفتگوئے ہندی" میں تو ہم سے نہ کر ؛ یہ ہماری زبان ہے پیارے!!

(۴) شاعری :-

شاعری اُن امراضِ شریفہ میں سے ہے جو ایک دفعہ لاحق ہونے کے بعد عمر بھر نہیں چھوٹتے۔ اور یہی شرطِ وفا بھی ہے! —

شعر کہنے کا بہترین موسم "جوانی کا آغاز" جذبات کا ہیجان عشق کا خفقان اور شکم پُری کے سامان کے زمانہ سے متعلق ہے۔ اور خصوصاً جب عشق میں ہجر کے داغ بھی ہوں تو پھر شاعری اور بھی زیادہ پُر لطف ہو جاتی ہے، چنانچہ اسی عشق اور داغ کی مناسبت سے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم عشق کے داغوں کو دیر سے مٹاتے ہیں رہ کے گر خود ہی مٹ جانے کو کیا کہئے!

آہ! کیا "خاصہ کی چیز" ہوتی ہے!!۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں خاصہ اور ناشتہ دونوں کی ملا کر ایک ہی چیز ہوتی ہے!!! —

بعض حضرات کو نثر کا ذوق ہوتا ہے، اور بعض کو نظم کا۔ اس لئے سارے ادب لطیف کو نثر میں پیش کرنا ایک قسم کی ناانصافی ہوگی، اس لئے کچھ حصہ نظم کا بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ وہو ہذا :—

افکارِ نو یا رباعیاتِ جرمن ڈزائن :-

کس منہ سے رباعی کی ہو تعریف بھلا! یہ دیتی ہے لکھنے پڑھنے والے کا شیلان بھگا
اس واسطے ہوتا ہے رباعی کا وزن لاحول ولا قوۃ الا باللہ

الحمد کہ اک فن ہے رباعی کہنا عورت ہے جو شاعری تو رباعی گہنا
ہے شرط کہ اس کے چار مصرعے ہوں لازم نہیں ان میں کوئی مطلب رہنا

عشق ان کا ہے کھوٹا پیور اسٹیل نہیں ہجر کی شب میں اندھیرا ہے قندیل نہیں
اتوار کے بعد پیر کو ہے کھلتا اسکول اس سے ہوا ثابت کہ پیر کو تعطیل نہیں

افسوس کہ استری ہے گر کانت نہیں کہنے کو تو من من ہے گر شانت نہیں
بے شک شب کھیلتے ٹینس ہم بھی پر کیا کریں بیاکٹ ہے گر تانت نہیں

چھوڑ و عمل و جوش کی ڈینگیں چھوڑو اور بام ترقی کے سر پہ پتھر پھوڑو
از بس کہ جو ہوتے ہیں ہینڈسم کھیلتے ہیں کاٹو کسی طرح اور تنخواہ لے لو!

ہو کر بھی قدیم یہ دنیا ہے ہر دم نئی دیکھا ابتک کئی رنگ اور ابھی دیکھنی کئی
اب آتی نہیں فلموں میں سلوچنا اکثر شاید کہ "امپریل کمپنی" بیٹھ گئی

وحشت کو یہ سودا ہے کہ جنگل جاؤں حیراں ہوں کہ کار کہاں سے لاؤں!
"تو نے مرا ایمان چھینا کر زیور" جاہنے کو "مس آشا" کہاں سے لاؤں!

آتی ہے مجھے شرم کہ بے میڈم ہوں یوں ہونے کو ہوں بارک مین ہمدم ہوں
افسوس! یہ دورِ روشن اور میں! بس کیا ہوں اپنا آپ ماتم ہوں

یوں تو طلاق لے لی پر عشق تاقیامت ہے آزادی مل گئی ہے اور دل مچل رہا ہے
بس کو تلاش ہے اب اک اور ماسٹر کی گاڑی ٹھہر گئی ہے انجن بدل رہا ہے

(۵) حقائق :-

حق تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کے لئے، کان سننے کے لئے، زبان بولنے کے لئے، ہاتھ کرنے کے لئے، پاؤں چلنے کے لئے، دل چاہئے

کے لئے جگر بھوننے کے لئے، اور گردے تلنے کے لئے دیے ہیں!!—
یہ زندگی کے حقائق ہیں!!!—

مچھلی کے بچے کو تیرنا، نوجوانوں کو عشق کرنا، اور بڈھوں کو چڑچڑانا سکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز اپنے وقت پر کام کرتی ہے!!!—

لکیر نقطہ سے شروع ہوتی ہے، دائرہ مرکز سے شروع ہوتا ہے اور پرکار ہاتھ میں گھومتا ہے!!— تو اس سے مطلب؟؟؟!—
تو جناب، سارے "ادب لطیف" ہی سے کیا مطلب ہوا ہے!؟—

ایک زمانہ تھا کہ جو عورت بالکل فاحشہ ثابت ہوتی تھی، اس کی ناک چوٹی کاٹ دی جاتی تھی، اور اب "مس" کی صرف چوٹی کاٹی جاتی ہے!!

جس طرح دیوار کا سایہ بڑھتے بڑھتے گھٹ جاتا ہے، اسی طرح سورج بھی ڈھلتے ڈھلتے غروب ہو جاتا ہے!!— آہ!!—

---

(۶) اُصولِ زندگی:-

زندگی کا سب سے بہتر اصول ہے: "آج کی مرغی سے کل کا انڈا بہتر ہے"

---

(۷) حفظِ ماتقدم:-

بیمار ہو کر دوا کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ بیماری سے پہلے ہی دوا کھاتے رہیں تاکہ بیماری آنے ہی نہ پائے!

---

(۸) اقتصاد:-

ایک ایسی قوم ہے جس میں چھوٹی سے چھوٹی لڑکی کو کرتا، ازار، یا لہنگے وغیرہ میں لپیٹ دیا جاتا ہے، اور ایک ایسی قوم ہے جس میں نوجوان سے نوجوان عورت کو صرف ایک چکانی کرتا پہنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے!— یہ اقتصادی دور ہے!!!—

---

(۹) مناظرِ قدرت:-

رات کی تاریکی!!— اور دن کی تمازت!!
آہ قدرت، تیرے مناظر!!—

---

(۱۰) تعجب:-

مہینے کی چودھویں رات تھی، سورج ڈوب چکا تھا، تارے ٹمٹما رہے تھے کہ اتنے میں چاند بھی نکل آیا!!— میں دیکھ کر متعجب ہو گئی کہ یا خدا! یہ چودھویں رات کو چاند کہاں سے نکل آیا!!!—

---

(۱۱) آپ:-

آپ، ہندی میں میرے دیوتا ہیں، اور فارسی میں میرے سرتاج اور اردو میں!— کیا کروں اردو زبان اتنی وسیع ہونے کے باوجود کوئی لفظ نہیں!!— اس لئے اردو میں تو آپ میرے "آپ" ہی ہیں!!—

---

(۱۲) عزاداری و غمگساری

مرنا ہر انسان کو ہے، اس لئے کس کا غم کس کو ہوتا ہے، پھر بھی فلاں کے انتقال کی خبر آگئی ہے اس لئے ہمیں جلسے کر کے جلد سے تعزیتی قرارداد منظور کرنی ہے!!— کوئی ہے تیار؟؟— جی ہاں، ہم ہیں! انجمن والے، رسالے والے، اخبار والے، اور اداروں کی صدارت والے!!— اور کسی کی ضرورت ہے؟!؟—!!!— جی نہیں،

فی الحال تو یہی بہت کافی معلوم ہوتے ہیں!!!۔۔۔

---

(۱۳) چادر:۔

"چادر بیوی بہت دن جئیو!!!"

---

(۱۴) ہوٹل کی تختیاں:۔

"پان کھاکر فرش و دیوار پر تھوکنا منع ہے!!"

ویسے بغیر پان کھائے تو میز اور کرسیوں پر بھی تھوک سکتے ہیں!!!۔۔۔

"آج نقد کل اُدھار!"

"براہ کرم ادھار طلب فرماکر ہمیں شرمندہ نہ کیجئے" !!! کیونکہ ادھار کے معاملے میں ہم عورت سے زیادہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں!!

---

(۱۵) اوکاسا:۔

زنانہ و مردانہ کمزوریوں کا واحد ہندوستانی و ملکی علاج!!۔۔۔ یہ رگ پٹھوں کو چست کرکے انسان میں نئی توانائی و طاقت پیدا کردیتا ہے!!۔۔۔ مردوں کے لئے سلور اور عورتوں کے لئے گولڈ طلب فرمائیے!!!۔۔۔

---

(۱۶) ترجمہ:۔ فارسی میں ترجمہ کرو:۔

جب میں اسٹیشن سے اترا تو ہوا کچھ ایسی تھی کہ طبیعت از خود گنگنانے لگی۔ یہ جو لوگوں سے سنا تھا کہ اس مقام کی آب و ہوا بہت بہتر ہوتی ہے' بالکل صحیح نکلا:۔ آہ' وہ بھینی بھینی خوش بو! وہ کھلے کھلے میدان! وہ پھول پھول بھونرے! وہ بلبلوں کا چہچہانا! وہ کوئلوں کا کوکنا! وہ صاف شفاف نہریں!!۔۔۔ آہ' یہ وہ نظارے ہیں کہ اگر ان پر شاعر کے حسن تخیل کی پرچول ہو تو ساری کائنات مجسم جنت بن جائے!

فارسی میں ترجمہ کردیا:۔

جب من از اسٹیشن اُتردم تو ہوا کچھ ایسی می بود کہ طبیعت از خود گُن گُن می کند۔ ایں جو از لوگہا شنیدہ بودم کہ آب و ہوائے اس مقام بہت بہتر است بالکل صحیح برطرف شد۔ آہ! آں بھینی بھینی خوشبو! آں اوپن اوپن گرونڈس! آں گل گل کیڑہ بزرگ سیاہ (یعنی بھونرے!) آں چہچہائے بلبل! آں کوئلوں کا کوکنا! آں صاف شفاف نہرہا!!۔۔۔ آہ! ایں آں چنیں نظارہ ہاست کہ اگر برایں ہا شاعر کے حسن تخیل کی پرچول باشد تو ساری کائنات جنت مجسم ساختہ شدہ گردد!!!۔۔۔

ماخوذ از "دکن میں فارسی"

---

(۱۷) درد:۔

دنیا کے سب دردوں سے زیادہ قابل لحاظ قوم کا درد ہے' کیونکہ یہ ایک خالص ملکی درد ہوتا ہے' جس کی قدر کرنا ہر شہری کا فرض ہے!!!۔۔۔

---

(۱۸) لیڈر:۔

قوموں کا زوال' خدا کا عذاب' برادران قوم کی اصلاح سازی' خواہران قوم سے عشق بازی' انقلاب و اتحاد' و جنگ و فساد' بدامنی و ذلت' قتل و خون' غربت و لعنت' یوں تو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں' لیکن یہ سب جاکر جہاں ختم ہوجاتے ہیں وہ صرف لیڈر کی ذات ہے!!۔۔۔

کھانا فراغت سے مل رہا ہے' زبان میں بھی اثر پیدا ہوتا جارہا ہے' حرکات میں بھی خوبی و پسندیدگی کا امکان ہے!۔ اور کوئی ضروری کام بھی نہیں!!۔ اسی لئے سوچتا ہوں کہ کسی قوم کا

لیڈر بن جاؤں یا کسی فلم اسٹار کا عاشق! — خدایا تو ہی بتا کہ ان دونوں میں کون قابلِ ترجیح ہے؟؟ — آسانی کے لحاظ سے تو لیڈری معلوم ہوتی ہے، لیکن ہر دلعزیزی کے اعتبار سے ایکٹری!! — مگر ایکٹری کے لیے ڈائرکٹری کی محتاجی ہے، اور لیڈری کے لیے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں، صرف چند قوم کے نعروں پر سر دھننے والے کافی ہیں!!! —

برادرانِ قوم، شخصی حکومتوں نے تمہاری جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں، تمہارے حقوق چھین لیے گئے ہیں، ذہنیتوں کو غلام بنا دیا گیا ہے!! — تم پر ظلم ہو رہا ہے، ظلم!!! — سمجھو یہ کونسی زبان کا لفظ ہے!! — نہ سمجھو گے تو پچھتاؤ گے اے دنیا جہاں والو، تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!!! —

لیکن ہم کریں کیا؟

استبدادیت کو توڑ دو، شخصی حکومت کا خاتمہ کر دو، حق تلفی کرنے والوں کو کچل ڈالو!! — قوم اور وطن کے لیے بیوی بچوں کو وقف کر ڈالو، اور جتنی دولت اور جائداد ہے اسے بھی قوم کے نام پر اڑا دو!! — اور جب یہ سب اڑا اڑا کے کافی ہو جاؤ تو پھر خود آگے بڑھو اور قوم کو بھی آگے ڈھکیلو۔ قوم کے لیے مٹ جاؤ، یا قوم کو مٹا دو! بہرحال دنیا میں کچھ کام کرو، ورنہ کم سے کم ہماری طرح نام کرو! ....

کیوں جی! سننے میں تو الفاظ بڑے زوردار معلوم ہوتے ہیں!۔ لیکن یہ سب کریں کس طرح؟۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا!! —

ہاں ہاں، بھائیو، تمہاری سمجھ میں نہیں آنے میں ہی ہمارا فائدہ ہے! — چلو آؤ!! — یہ وقت تمہاری سمجھ سے کام لینے کا نہیں!! بلکہ تمہارے سر اور ہماری سمجھ مل کر کام بنائے گی!!

اندھے کے پاؤں کا فائدہ لنگڑے کو ہوگا، اور لنگڑے کی آنکھوں کا فائدہ اندھے کو! — غرض، ایسے ہی بھائی چارہ سے تم فائدہ اٹھا سکو گے!! اس لیے تم اپنا مال، دولت، عزت و آبرو، اہل و عیال، چال چلن غرض سب کچھ ہمارے لیے وقف کر دو! — پھر ہم تمہارے لیے وقف ہیں!! — آؤ، ہمارا ساتھ دو!! — ہم، یعنے قوم اس وقت تمہاری ہی مدد کے محتاج ہیں! — اگر تم ہماری مدد کرو گے تو گویا اپنی آپ مدد کرو گے! — اور اس کے کیا معنے ہوتے ہیں، وقت آنے پر تمھیں خود بخود معلوم ہو جائیں گے! — اس وقت ہم دشمن کے نرغہ میں ہیں! — اسے فنا کر دو! — پھر تم آزاد ہو! — تمہاری حکومت آزاد ہے! تمہاری راحت آزاد ہے! — آہ! وہ وقت بھی کیسا ہوگا جب آفتاب سوا نیزہ پر اتر آئے گا!۔ زمین تانبے کی ہوگی، آسمان فولاد کا ہوگا! نہ بیٹا ماں کو پوچھے گا، نہ ماں بیٹے کو پوچھے گی! اس وقت تک ہر شخص آزاد ہوگا، ہر شخص بادشاہ ہوگا، شخصی حکومتوں کی نعشیں کچل دی جائیں گی، اور اس کی جگہ جمہوری حکومت کا نقشہ گلی گلی نظر آئے گا!!! — کہو، اب بھی ساتھ دینے میں کوئی تامل ہے!؟؟ —

جی نہیں، اب ہم ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں!! — افسوس ہے کہ اب تک ہماری عقلوں پر جالا آ گیا تھا۔ اب ہم نے انھیں بالکل صاف کر دیا ہے! — فرمائیے، کیا ارشاد ہوتا ہے؟ —

سنو، سب سے پہلے بادشاہت کا خاتمہ کر دو! —

پھر دشمن کو مار بھگاؤ! —

لیکن یہ کس طرح کریں شہ بیان جی؟

جی ہاں، مولانا ہم بھی تو یہی سوچتے ہیں!

پہلے دین و مذہب کے نام پر اپنے ہی چند بھائیوں کا گلا کاٹو، پھر جب کافی فساد ہو جائے، اور آدمیوں کی ایک کثیر

تعداد مرجائے، تو حکومت کی بد انتظامی اور ظلم ثابت کردو! اور جب حکومت میں اس کے قصور اور غلط طریقہ کا احساس پیدا ہوجائے تو اس کو زیر کرکے اپنے حقوق منوالینا بلکہ حکومت چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں!

جی ہاں، مولانا ہم سمجھ گئے!

جی ہاں مہاتما ہم بالکل سمجھ گئے!

چنانچہ رپورٹ آئی کہ فلاں جگہ جھڑپ ہوگئی، فلاں مقام پر فساد ہوگیا، دو سو مرے، پانچ سو زخمی ہوئے، اور بہ فضلہ سو پچاس زندہ بھی ہیں، وہ تو خدا خوبی یہ تھا کہ پولیس نے عین وقت پر مداخلت کرکے صورت حال کو قابو میں لے لیا، اور مدد بہم پہنچائی، ورنہ پانچ، دس پر ہی ہنگامہ ختم ہوگیا ہوتا!!—

پنڈت جی، ہم ڈوب گئے!!

حضرت ہم فنا ہوگئے!!

اچھا اچھا، پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں!—

آیندہ احتیاط کرو!! اتنے ہی نقصان پر گھبرا جاؤ تو آیندہ حکومت کیسے حاصل کروگے؟— یاد رکھو کہ ہر فائدہ کے لئے نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے، اس لئے قوم کو بچانا ہے تو قوم کے لئے جان بھی دینا ہوگا!!— صبر واستقلال کے بغیر کام نہیں چلے گا!!—

لیکن، شری مان، ہم پر بے جا ظلم ہو رہا ہے، ہم مدرسوں سے ہڑتال کر دینا چاہتے ہیں!!

حضرت، ہماری مسجدوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے، اس لئے ہم احتجاجاً نمازیں ملتوی کر دینا چاہتے ہیں!!—

مارو دشمنوں کو!!— لیکن یہ ظاہر نہ ہونے دو، کیوں کہ یہ ایک آپس کی بات ہے!! ورنہ سب کو آپس میں متحد ومتفق ہو کر ہی کام کرنا اور ایک متحدہ محاذ ومتحدہ پلیٹ فارم قائم کرنا چاہیے ورنہ بغیر پلیٹ فارم کے ریل پر کیسے سوار ہو سکو گے!!!

لیکن اب تک جو ہم نے یہ سب قربانیاں کیں اس کا نتیجہ ہمیں کیا ملا؟

حکومت!

کیا حکومت اسی کا نام ہے، مہاشے، کہ نہ فوج قبضہ میں ہو، نہ دولت، نہ خارجی اختیارات!! بس، آپس ہی میں لڑ مریئے!!

آج آپس میں لڑنے کے قابل ہوئے ہیں، تو کل دشمن سے بھی لڑنے کے قابل ہوجائیں گے!!— دھیرے، دھیرے ہی کوئی چیز حاصل ہوتی ہے!!—

غرض، استبدادیت کے ٹکڑے کرنے کے لئے، آدمیوں کے ٹکڑے کرتے ہوئے کافی مشق ہوگئی ہے!!— اور اب استبدادیت مٹی کہ شخصی حکومت مری!!— پھر آزادی ہے، حکومت خود اختیار ہے، لوگ ہیں، اور مولانا و مہاتما ہیں!! اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے؟؟—

الحمدللہ، کہ بادشاہت کی غلامی سے ہٹے، اور غلاموں کی غلامی میں آگئے!!!— آہ، انقلابی دور کے درخشاں کارنامے!!

ہمیں افسوس ہے کہ یہ ٹکڑا "ادب لطیف" کے عام سائز سے بہت بڑھ گیا ہے!! ناظرین چشم پوشی کریں!!—

شاکر

ناقابل اشاعت مضامین کی فہرست

(حسب ذیل مضامین نظم و نثر سب رس میں شایع نہیں ہو سکتے)

ان کا خط
نوائے سروش
غزل عاشق
چل دیا (غزل)
زندگی کا مقصد
جامعہ عثمانیہ کے طلباء سے خطاب (نظم)
پتنگ و پتنگہ
دوزخ کی سیر
مدک گزٹ
واعتصمو بحبل اللہ جمیعا
غزل حضرمی
میرے لئے (غزل)
صحرا کی کہانی طائروں کی زبانی (نظم)
ترانۂ دور حاضر (نظم)
دور ساغر (غزل)
عالم عشق کا افسانہ (نظم)
شاعر سے خطاب (نظم)
بربادِ تمنا
خاموش ہے
دیوانہ بنا دے (غزل)
آفتاب (نظم)
تیتری

آنسوؤں کا پانی (غزل)
نغمۂ سحری (نظم)
تیرے بغیر (نظم)
جل پریاں
تصورات
عرش (نظم)
حسن (نظم)
کتاب عشق کا پہلا سبق (نظم)
دہقان سے خطاب (نظم)
استقلال (نظم)
بلبل کی کہانی خود اس کی زبانی (نظم)
رقاصہ (نظم)
قدامت پرست شاعر سے (نظم)
پی گیا (غزل)
آکے دیکھ (غزل)
ہوشیار (نظم)
گریۂ عید (نظم)
تمنا (نظم)
تاثرات نکہت (نظم)
آباد کرتے ہیں (غزل)
نا بانی نہیں جاتی (غزل)
اردو مؤتمر کے مہمانوں کا خیر مقدم (نظم)

عید قرباں (نظم)
مرنے والے سے خطاب (نظم)
قوس قزح اور شاعر (نظم)
احساس شباب (نظم)
پیارے (غزل)
چاہتا ہوں (غزل)
صدمات شدید زلزلہ بلدی (نظم)
مبارک ہو (غزل)
دنیا ئی بسائیں (نظم)
کوش تھا (غزل)
دنیا (غزل)
ستانے والے (غزل)
محبت (نظم)
غزل حبیب
کیوں (غزل)
آشیانے کی (غزل)
غمخواریاں ہیں (غزل)
بکار ہے (غزل)
وہ کوسوں بھاگتے ہیں نعرۂ اللہ اکبر سے (نظم)
امواج شمیم (غزل)
معاملات (نظم)
ذوق بربادی (غزل)

جل جانے کا (غزل)
آشنائی کی تو ہم نے کی (غزل)
پوچھتے کیا ہو (غزل)
دیکھ کر (غزل)
کیف و شباب میں (غزل)
محبت کا حسرت کا (غزل)
ہستی (نظم)
دیکھا (غزل)
واسطہ نہیں (غزل)
پی گیا (غزل)
ٹوٹ رہا ہے (غزل)
نشاط زندگی (نظم)
فریب نما (غزل)
زندگی کی ایک شام (نظم)
نغمۂ شباب (غزل)
دکن سے خطاب (رباعی)
ذکر جاناں کر رہا ہوں (غزل)
جذبات آرزو (نظم)
ہوس رانی کو (غزل)
تیرے بغیر (غزل)
اتاترک (نظم)
آہ صغرا (نظم)
مرگ نوجوانی (نظم)
تاناشاہ کے مزار کے سامنے (نظم)
پھول کی سی زندگی (نظم)

غذا کس طرح ہضم ہوتی ہے

اگر ہماری غذاؤں کی ایک مکمل فہرست مرتب کرکے اس پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ (۱) نائٹروجنی مثلاً پروٹینڈس یا پروٹین (گوشت۔ مچھلی۔ انڈا۔ دال وغیرہ) یہ غذائیں خاص طور پر توانائی پیدا کرتی ہیں اور ان سے حرارت بھی پیدا ہوتی ہے (۲) غیر نائٹروجنی غذا۔ اس کی تین ذیلی قسمیں ہوتی ہیں

الف۔ چربی یا روغنیات مثلاً گھی۔ مسکا۔ تیل اور چربی وغیرہ ان سے صرف حرارت پیدا ہوتی ہے۔

(ب)۔ کاربوہائیڈریٹ۔ مثلاً گیہوں۔ نشاستہ۔ شکر۔ چاول۔ ترکاریاں وغیرہ۔ ان سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور توانائی بھی مگر بہت کم۔

(ج)۔ نمک۔ مثلاً کلورائیڈس سلفیٹس۔ نائٹریٹس۔ فاسفیٹس۔ وغیرہ غرض جو اشیاء رات دن استعمال کرتے ہیں حسب ذیل اہم اجزا پر مشتمل ہوتی ہیں پروٹینڈس۔ روغنیات۔ کاربوہائیڈریٹ۔ اور نمک یہ غذائی اجزا جب انسان کے ہضمی نظام (منہ۔ حلق۔ معدہ۔ اثنائے عشری۔ آنت اور معائے مستقیم۔) سے گزرتے ہیں تو ان میں ہضمی عرقوں کے شریک ہو جانے سے مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ان ہی تبدیلیوں کو غذا کا ہضم ہونا کہتے ہیں غذا کے ہضم ہونے سے توانائی۔ حرارت خون پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کی بقا اور اس کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔

ہضمی نظام۔ غذا پہلے منہ میں اچھی طرح چباتے ہیں اور اس عمل کو "چبانا" کہتے ہیں۔ اس سے غذا کے علحدہ علحدہ اجزا باہم مل جاتے ہیں اور اس کے ساتھ لعابی غدود سے لعاب جس میں ٹائلین ہوتا ہے اور جس کا عمل قلویانہ ہوتا ہے غذا میں شریک ہوجاتا ہے پھر غذا حلق کے ذریعہ اندر جاتی اور معدہ میں پہنچ جاتی ہے منہ سے معدہ تک پہنچنے کے دوران میں ہاضمہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

معدے میں چند غدود پائے جاتے ہیں جن سے گسٹرک عرقوں کا افراز ہوتا ہے یہ عرق ہائیڈروکلورک ترشہ اور چند خمیری مادوں مثلاً پپسن وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان عرقوں سے غذا پر حسب ذیل عمل ہوتا ہے۔

الف۔ پروٹینڈس۔ اس کے بعض اجزا پر ازاد ہائیڈروکلورک ترشہ اور پپسن کے عمل سے حل پذیر پپ ٹون تیار ہوتے ہیں۔

(ب) روغنیات۔ معدے کی حرارت کی وجہ سے گھل جاتے ہیں

ج۔ کاربوہائیڈریٹ۔ اس کا کچھ حصہ لعاب کے ٹائلین کے عمل سے حل پذیر شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

د۔ حل پذیر نمک۔ جذب ہونے کے لئے بالکل تیار رہتے ہیں اس طرح کچھ کچھ ہضم شدہ غذا معدے سے اثنائے عشری میں پہنچتی ہے اس حالت میں غذا کو "چائم" کہتے ہیں۔ غذا کو اس حالت کے اختیار کرنے تین گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔

اثنائے عشری میں دو نہایت اہم عرق داخل ہوتے ہیں

(۱) عرق لبلبہ۔ اس کا عمل سوڈیم کاربونیٹ کی وجہ سے قلویانہ ہوتا ہے اور یہ تین ذیلی اقسام پر مشتمل رہتا ہے۔

الف۔ اسٹپ سن۔ (ب) امی لاپ سن۔ (ج) ٹرپ سن

(۲) عرق پت یا صفرہ۔ یہ بھی قلویانہ ہوتا ہے

الف۔ بقیہ پروٹینڈس۔ عرق لبلبہ کے ایک جز یعنے ٹرپ سن کے عمل سے حل پذیر پپ ٹون میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

ب۔ گھلی ہوئی چربی۔ صفرے کے عمل سے یہ چربی قطروں کی شکل میں بٹ جاتی ہے اور ان قطروں پر عرق لبلبہ کے پہلے جز یعنی اسٹپ سن کے عمل سے چربی ترشہ اور گلیسرین پیدا ہوتے ہیں اور یہ سوڈیم کے نمک سے مل کر حل پذیر صابن میں تبدیل ہوجاتے ہیں

جس کو "صابن کا عمل" کہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ذرات جن کو "جائل" کہتے ہیں لمفاٹک نظام کے خاص اعوئیہ لیاک ٹیل کے ذریعہ جذب کئے جاتے ہیں۔

ج۔ نشاستہ اور دوسرے کاربوہائیڈریٹ صفرے کے اثر سے حل پذیر شکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور عرق لبلبہ کے دوسرے جز یعنی امی لاپ سن کے زیر عمل دوسرے کاربوہائیڈریٹ بھی حل پذیر شکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

د۔ حل پذیر نمک

غذا کے ہاضمہ کے لئے غذائی اجزا کا حل پذیر ہونا اور ان کا جذب ہونے کے قابل بن جانا مقصود ہوتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ غذائی اجزا حل پذیر حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ یہ حل پذیر غذا آنت کی انگشت نما ساختوں کے ذریعہ جذب ہونا شروع ہوتی ہے۔

اثنائے عشری سے غذا حل پذیر حالت میں آنت کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اثنائے عشری میں غذا کی تحلیل کے لئے چار گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔

آنت میں بھی دو قسم کے عرق پائے جاتے ہیں۔

(۱) ایرپ سن (۲) نکٹس انٹری کس

(الف) حل پذیر پپ ٹون۔ عرق ایرپ سن کے عمل سے سادہ امائنو ترشہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(ب) نشاستہ۔ نکٹس انٹری کس کے عمل سے حل پذیر شکروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ج۔ کچھ حصہ ذروں میں تبدیل شدہ چربی کا موجود رہتا ہے۔

د۔ پانی اور حل پذیر نمک

اب غذا بالکل حل پذیر حالت میں اور جذب ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔ آنت کی انگشت نما ساخت میں خونی شریانوں کا ایک جال پایا جاتا ہے اور ان کا تعلق جگر بابی نظام سے ہوتا ہے۔ یہ شریانیں حل شدہ غذائی مادہ کو جذب کر کے جگر بابی نظام کے ذریعہ جگر کو لے جاتی ہے۔ جگر غذائی مادوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جہاں سے جسم کے مختلف حصوں کو غذا پہنچائی جاتی ہے۔

معائے مستقیم میں عملی طور پر انجذاب کا عمل بالکل نہیں ہوتا اور یہاں سے فضلہ براز کے ذریعہ خارج ہوتا ہے۔ فضلہ میں کچھ حصہ غیر ہضم شدہ غذا کا اور زیادہ تر غیر جذب شدہ غذائی حصے کا جو سلفائیڈس اور مختلف اقسام کی بدبودار گیسوں پر مشتمل ہوتا ہے پایا جاتا ہے۔

محمد مختار احمد

جہاں اتفاق سے جائے وہیں قیام بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے رہنے کے لئے کوئی مکان نہیں بنوایا۔ بلکہ اپنے ساتھ ایک صندوق رکھنے لگا جسے آگے آگے ڈھکاتا ہوا چلتا اور جب رات ہو جاتی تو اسی میں گھس جاتا۔

وحشی جانوروں سے اس نے یہ سیکھا کہ کھانا پکانے اور برتن وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کچا گوشت ناخنوں سے کاٹ کر کھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا طرز عمل یہی تھا۔ اور سوائے ان صورتوں کے جب وہ کسی دعوت میں شریک ہوتا۔ یا خاص مجمع میں مدعو کیا جاتا۔ اسی طرح ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھاتا۔

کتوں سے اس نے یہ سبق سیکھا کہ سنجیدگی متانت یا پابندیٔ رسوم کی کوئی ضرورت نہیں تمام مطالب اور مقاصد پورا کرنے کے لئے آزادی اور بیباکی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ لوگ دیوجانس کی ان حرکتوں کو حیرت سے دیکھتے تھے لیکن خود دیوجانس دوسروں پر افسوس کرتا تھا کہ لوگ اس کے اصول پر عمل کیوں نہیں کرتے۔

کلبی کی عادت تھی کہ کبھی دن کو اپنے ساتھ ایک قندیل لے کر نکلتا تھا اس پر اگر لوگ پوچھتے کہ یہ کس ضرورت سے ہے تو جواب دیتا کہ مجھے اپنے ایک ہم مشرب کی تلاش ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کو آواز دیتا اور اپنے پاس جمع کرتا۔ جب سب آجاتے تو ڈنڈا لے کر سب کو منتشر کر دیتا۔ اور کہتا "مجھے انسان کی تلاش ہے اور تم میں سے کوئی انسان نہیں ہے" اس کے جواب میں اگر کوئی کہتا کہ پھر آدمی کسے کہتے ہیں۔ تم نے کبھی کسی آدمی کو دیکھا ہے تو کہتا "نہیں میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا البتہ اسپارٹا میں چند بچے دیکھے ہیں"۔

دیوجانس کا یہ جواب ٹھیک ہوتا اگر وہ انسانی حقیقت سے بھی واقفیت رکھتا۔ لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقوال صرف اوہام تھے اور وہ لوگوں کے معائب پر ان کے محاسن سے زیادہ غور و خوض کیا کرتا تھا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ لوگوں نے اس کو دیکھا بتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ مانگ رہا ہے اور ایک کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا تو دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور دوسرا بھی کچھ نہیں بولتا تو تیسرے کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ بھی خاموش رہتا ہے تو چوتھے کو دیکھنے لگتا ہے لوگوں نے پوچھا "تم ان سے کیا چاہتے ہو"؟ کہنے لگا میں لوگوں کے پاس اپنی کوئی خواہش لے کر جاتا ہوں تو وہ بھی انہیں بتوں کی طرح بے حس و حرکت رہتے ہیں اسی لئے میں ان بتوں سے التجائیں کر کے لوگوں سے مانگنے اور نہ پانے کا خوگر ہو رہا ہوں۔

اس کی یہ عادت تھی کہ موسم گرما میں جب سخت گرمی پڑنے لگتی تو دوپہر کے وقت خوب گرم ریت پر اور شدید سردی میں برف کی چٹانوں پر لوٹتا۔ لوگ پوچھتے "یہ کیوں" تو کہتا "اس سے مجھے سردی و گرمی برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے گی"۔

وہ ذی ثروت اور دولتمندوں کی بے انتہا تحقیر کرتا خطیبوں اور مقررین کو سمجھاتا کہ یہ رعایا کے غلام ہیں۔ افلاطون اور اس کے تلامذہ کے لئے اس کی رائے یہ تھی کہ وہ سب کے سب فضول خرچ تھے۔ اس کا قول تھا کہ بادشاہوں کے تاج ایسے ہیں جیسے شیشے کے برتن اور شہرت پسندی صرف دیوانوں کا شیوہ ہے وہ کہا کرتا کہ جب میں دنیا کے حکام فلاسفہ وغیرہ کو دیکھا کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ واقعی انسان اپنی عقل و ادراک کے لحاظ سے جانوروں سے بالاتر ہے۔ لیکن جب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ جو وحی الہام تعبیر رؤیا کے مدعی ہیں یا ان لوگوں پر نظر پڑتی ہے جو مال و جاہ حاصل کرنے

کے بعد متکبر و مغرور ہو جاتے ہیں تو خیال کرتا ہوں کہ انسان سخت مجنون ہے اور اس لحاظ سے حیوانوں سے بھی زیادہ پست و ذلیل۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا چلو سے پانی پی رہا ہے اس نے اپنا چوبی پیالہ پھینک دیا اور کہا" یہ بچہ مجھ سے زیادہ ہشیار اور صاحب بصیرت ہے"۔

وہ اس شخص کی بہت زیادہ تعریف کرتا جو شادی کے لئے تیار تو ہوتا مگر شادی نہ کرتا کیونکہ اس کے نزدیک جو جوانی میں شادی کر لیتا ہے وہ عجلت کرتا اور جو انحطاط کے بعد آمادہ ہوتا ہے وہ تاخیر کر دیتا ہے اس لئے دونوں میں سے کوئی بھی اسے پسند نہ تھا۔

وہ ایک روز بازار میں کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا دیکھا تو پاس ایک متنفس بھی نہ تھا گانا بجانا شروع کر دیا پھر تو لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک یہ حالت دیکھتا رہا اس کے بعد سب کو لعنت و ملامت کرنے لگا۔ کہ افسوس ہے تم ایک لغویات کے لئے تو میرے گرد جمع ہو گئے لیکن میرے زرین نصائح کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔

دیو جانس ان لوگوں کا سخت مخالف تھا جو موسیقی میں مہارت رکھتے تھے وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ لوگوں کے خصائل میں اصلاح، عادات میں استقلال تہذیب میں استقامت پیدا کریں ان کو جوش اور لطف اندوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے چند روز میں یہ بیکار ہو جاتے ہیں۔

وہ علمائے فلکیات اور اہل رصد کا بھی بڑا مخالف تھا اور کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کا حال تو معلوم نہیں اور آسمان اور اجرام سماوی کے حالات جاننے کے مدعی ہیں۔

خطیب اور واعظ حضرات سے بھی بیزار تھا۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے بخیلوں کا بھی دشمن تھا ان کی نسبت اس کی یہ رائے تھی کہ ظاہر میں تو ان پر زہد و قناعت کے آثار ہوتے ہیں لیکن دل میں صرف مال جمع کرنے اور دنیا کی حرص ہوتی ہے جو لوگ معابد میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ اور باہر نکل کر خرافات میں جاتے ہیں ان سے بھی اسے سخت نفرت تھی وہ کہتا تھا" ایسے تو بہت سے لوگ میں نے دیکھے ہیں جو مذاق اور فضولیات میں اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں مگر انسانی فضائل اور اخلاقی کمالات حاصل کرنے میں ایک منٹ بھی صرف نہیں کرتے"۔

ایک روز دیو جانس ایک شخص کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے روانہ ہوا اور عظیم الشان محل کی جانب جا نکلا۔ یہ محل نہایت آراستہ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اس پر سونے کا کام بھی تھا۔ جب اس نے تمام محل کی سیر کر لی اور اسے نہایت صاف ستھرا پایا تو اپنے ساتھی کے منہ پر تھوک دیا اور کہا" مجھے تھوکنے کی ضرورت تھی۔ معاف فرمائیے۔ آپ کے منہ سے زیادہ مجھے اس کام کے لئے کوئی میلی جگہ نظر نہ آئی۔ جہاں تھوک سکتا"

ایک روز دیو جانس ایسی جگہ جا پہنچا جہاں لڑکے کھیل رہے تھے۔ خود بھی وہیں کھڑا ہو گیا لڑکوں نے اسے گالیاں دے کر نکال دیا۔ چلا تو آیا لیکن ان سب کے نام بھی لکھ لیا تاکہ شہر میں گشت کر کے اعلان کرے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس کے فقر و فاقہ پر ملامت کرنی اور شرم دلانی شروع کی۔ اس نے کہا فقیر ملامت کا مستحق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جو مالدار ہیں اور رات دن گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اچھی چیز وہ ہے جو سستی ہو میں نے بسا اوقات سنگ مرمر کی تصویریں دیکھی ہیں جو ہزاروں روپیے میں فروخت ہوتی ہیں۔ لیکن ایک من گیہوں کے مقابلے میں ان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا جو ایک روپے میں آجاتا ہے۔

ایک روز وہ حمام میں گیا دیکھا کہ پانی بہت میلا ہے۔ حمام والے سے پوچھا "جو شخص یہاں نہاتا ہے وہ اپنا بدن کہاں جا کر پاک کرتا ہے؟"

ایک روز لوگ اسے شاہ فیلیس کے پاس پکڑ لائے فیلیس نے پوچھا "تم کون ہو؟" جواب دیا "تمہاری طرح ایک جاسوس" اس نے اس فقرے کو بہت پسند کیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اس کا قول تھا کہ حکما کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تمام چیزیں ان کے قبضے میں ہیں وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ ہر چیز خدا کی ہے اور یہ لوگ خدا کے محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ سکندر اس کی ملاقات کو گیا اور دیکھا کہ وہ دھوپ میں بیٹھا ہے اور اس کا صندوق بھی سامنے پڑا ہے۔ سکندر نے اس کے پاس جا کر کہا کہ میں سکندر ہوں۔ وہ بولا میں دیوجانس کتا ہوں۔ سکندر نے کہا تم مجھ سے ڈرتے نہیں ہو اس نے کہا "تم نیک ہو یا بد" اس نے جواب دیا "نیک" کہنے لگا "تو پھر نیک آدمی سے کیوں خوف کروں" سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم اپنی کوئی حاجت میرے سامنے پیش کرو میں پوری کروں گا۔ اس نے جواب دیا "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تم نے دھوپ روک لی ہے" اس نے کہا "ہم دونوں میں کون زیادہ بے پرواہ ہے ایک کمبل اور ایک گھڑی والا یا وہ شخص جو اپنی وسیع سلطنت اور عظیم الشان حکومت پر قانع نہیں ہے بلکہ بقیہ دنیا کو قبضے میں لانے کے درپے ہے اور مفت میں اپنی جان کو خطرات میں ڈال رہا ہے۔" سکندر کے رفقا بہت متعجب ہوئے خاص کر جب انہوں نے دیکھا کہ باوجود اس شخص کی بیباکی اور جرأت کے سکندر کے دل میں کچھ اور عزت بڑھتی جا رہی ہے سکندر نے اس کو محسوس کیا اور اپنے رفقا کو مخاطب کر کے کہنے لگا "اگر آج میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس ہوتا۔"

دیوجانس ایک جہاز کا سفر کر رہا تھا دریائی ڈاکو آئے اور اسے پکڑ لے گئے۔ اور جزیرہ کریٹ میں ایک غلام کی صورت سے بیچنے لگے اس نے ایک موٹے شخص کو دیکھا جو اچھی وضع اور لباس میں تھا کہنے لگا مجھے اس کے ہاتھ بیچو اس کو ایک معلم اور مودّب کی ضرورت ہے اس شخص کا نام زیناڈس تھا۔ دیوجانس اس شخص کی طرف بڑھا اور کہا "آپ مجھے خرید لو میں تمہیں تعلیم دوں گا اور ادب سکھاؤں گا۔" زیناڈس نے کہا "تم کیا جانتے ہو؟" بتایا "میں تہذیب تربیت کے اصول سے واقف ہوں" آخر کار زیناڈس نے خرید لیا۔ جب اسے لے کر چلا تو دیوجانس نے کہا "میں تمہارا غلام تو ہو گیا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا۔" زیناڈس نے اسے اپنے لڑکوں کا معلم مقرر کیا دیوجانس نے بڑی کوشش سے ان کی تعلیم و تربیت کی اور انہیں شعر گوئی حکمت، پہلوانی شکار اور تیر اندازی وغیرہ سکھائی۔ اور قناعت کرنے اور موٹا کپڑا پہننے کی ترغیب دی۔

ایک روز ایک شخص اس کے پاس آیا جو اسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ دیوجانس نے کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ جو شخص شیر کو کھلاتا پلاتا ہے وہ خود شیر کا قیدی ہے شیر اس کا قیدی نہیں ہوتا۔"

ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ کھانے کے لئے کونسا وقت مناسب ہے اس نے کہا "اگر تم مالدار ہو تو جب چاہو کھاؤ اور فقیر ہو تو جب مل جائے وہی وقت مناسب ہے۔"

اس کی عجیب عادت یہ تھی کہ بجائے سر کے پاؤں میں خوشبو لگاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے تو جواب دیا کہ سر میں خوشبو لگانا فضول ہے کیونکہ وہ ہوا کے ساتھ پھیل کر ضائع ہو جاتی ہے اور آدمی اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر پاؤں میں لگائی جائے تو اس سے ہر وقت فائدہ پہنچ سکتا ہی

ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر میری ملاقات کو نہ آؤ گے تو میں تمہیں قتل کروں گا۔ اس نے کہا یہ تو کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ ایک معمولی سا زہریلا کیڑا بھی یہ کام کرسکتا ہے۔

ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ حکام ایک چور کو سزا دے رہے ہیں جس نے سرکاری خزانے سے ایک برتن چرایا ہے۔ دیوجانس نے کہا "بڑے بڑے چور چھوٹے چور کو سزا دے رہے ہیں"۔ جب اسے کوئی ضرورت ہوتی اور کسی کے پاس مانگنے جاتا تو اس سے کہتا تھا کہ "تم نے مجھ سے پہلے کسی اور کو بھی دیا ہے یا نہیں۔ اگر دیا ہے تو اسی طرح مجھے بھی دو اور نہیں دیا تو مجھی کو وہ پہلا شخص قرار دو جسے تم اپنی عمر میں سب سے پہلے کچھ دینے والے ہو"۔

وہ کہا کرتا تھا کہ شہوت مصائب کی جڑ ہے۔ جملہ معبود کے مظاہر ہیں۔ پیٹ زندگی کا وبال ہے۔ عشق بیکاری کا مشغلہ ہے۔ بڑھاپا اور افلاس دونوں بلا ہیں۔ اور دنیا میں سب سے بہتر چیز آزادی ہے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ لوگ اندھوں اور لنگڑوں کو دیتے ہیں اور فلاسفہ کو نہیں دیتے اس کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ وہ لوگ ڈرتے ہیں کہ کسی روز اندھے یا لنگڑے نہ ہوجائیں مگر فلسفی ہونے کا انہیں ذرا بھی خوف نہیں۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ہی تو کھوٹے روپئے بنایا کرتے تھے کہا جب تمہاری طرح تھا لیکن اب میں اس مرتبہ پر پہنچ گیا ہوں جسے تم عمر بھر حاصل نہیں کرسکتے۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص تیر چلا رہا ہے اور کبھی اس کا تیر نشانہ پر نہیں لگتا۔ دیوجانس نے جاکر اپنا سر نشانہ کی جگہ لگا دیا اور کہا کہ کہیں اور تو مجھے خوف ہے کہ تیر نہ لگ جائے لیکن یہاں تو میں اطمینان سے رہ سکتا ہوں۔

لوگوں نے اس سے کہا تم بازاروں میں کیوں کھاتے پھرتے ہو کہا جس طرح گھر میں بھوک لگتی ہے اسی طرح بازار میں بھی لگتی ہے۔ لوگوں نے کہا یہ عادت تمہاری کتوں کی طرح ہے۔ اس نے کہا کتے تم ہو جو کھانے والے کے پاس جمع ہوگئے ہو۔

وہ کہتا تھا جو لوگ وعظ اور نصیحت کرتے ہیں اور خود اس پر عمل نہیں کرتے وہ آلات موسیقی کی طرح ہیں جن سے نہایت دل خوش کن نغمات نکلتے ہیں لیکن خود وہ بے شعور اور بے حس ہیں۔

لوگوں نے اس سے کہا جب تم مرو تو کہاں دفن کریں کہا جنگل میں ڈال دینا لوگوں نے کہا درندے کھا جائیں گے۔ کہا میرے پاس ایک لکڑی رکھ دینا۔ اگر کوئی کھانے آئے گا تو بھگا دوں گا۔ لوگوں نے کہا مرنے کے بعد بھی تم ایسا کرسکو گے جواب دیا میں کچھ نہ کرسکوں گا تو مجھے کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی پھر اس کی فکر کیا کہ میں کہاں دفن ہوں گا۔

دیوجانس کے اس قسم کے نوادر کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔ ۹۰ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ مشہور یہ ہے کہ جس روز سکندر کا انتقال ہوا اس روز اس نے بھی وفات پائی۔ موت کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ گائے کا ایک پیرا کھا گیا اور اسے ہضم نہ ہوسکا اور مرگیا بعض کہتے ہیں خود اس نے اپنی سانس روک لی تھی۔ یونانیوں نے اس کی قبر پر ایک کتے کا مجسمہ بنا دیا تھا اور اس کی مختصر سیرت بھی قبر پر لکھ دی تھی۔

شبیر احمد (کوٹی) اومتی جبلپور

رومانیہ کی ایک غیر سرکاری ڈائری

(شاہ کیرول کس طرح تخت سے دست بردار ہوئے)

۱۹۳۹ء

۲۵ر اگست۔ رومانیہ کی حکومت نے ہنگری کے ساتھ ایک معاہدہ عدم اقدام طے کرنا چاہا۔ ہنگری کی حکومت اس کے لئے تیار نہ تھی کیونکہ رومانیہ کے ایک لاکھ سپاہی اس کی سرحد پر جمع ہوگئے تھے۔

۸ر ستمبر۔ سینماؤں میں جرمن وزرا کی تصویریں بتائی گئی تھیں جن پر لوگوں نے خوب شور مچایا۔ حکومت نے اس قسم کے مظاہروں کو منع کر دیا۔

۱۵ر ستمبر۔ پولستان کے شکست خوردہ وزراء آنے لگے۔

۲۰ر ستمبر۔ وزیراعظم کالی نسکو بخارسٹ میں قتل ہوئے۔ آئرن گارڈ کے ۲۹۲ آدمی مارے گئے اور باقی لوگ باغی قرار دئے گئے اس قتل کے لئے جرمنی نے برطانیہ کو ذمہ دار ٹھیرایا حالانکہ آئرن گارڈ کے آدمیوں نے جو نازیوں کے زیر اثر تھے اس کا ارتکاب کیا تھا۔

۷ر اکتوبر۔ رومانیہ اور ہنگری اس بات پر راضی ہوگئے کہ ہر ملک اپنی اپنی سرحد سے فوجیں ہٹالے۔

۹ر نومبر۔ شاہ کیرول نے بلجیم اور ہالینڈ والی امن کی اپیل سے اتفاق کیا۔

۱۰ر نومبر۔ یہ اعلان ہوا کہ رومانیہ میں پولستان کے ۴۶ ہزار شہری ۲۲½ ہزار فوجی اور ۱½ افسر ہیں۔

۱۳ر نومبر۔ جرمنی سے ہر کلاڈیوس کے تحت ایک معاشی مشن بخارسٹ آیا۔ رومانیہ نے جانوروں کی برآمد بند کر دی۔

۲۲ر نومبر۔ نیشنل ایکانمی کے وزیر نے جو جرمن مشن کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا، استعفیٰ دے دیا۔ کلاڈیوس کو چھوڑ کر یہ مشن جرمنی واپس ہوا اور رومانیہ نے اپنی خام پیداوار جرمنی بھجوانے کا وعدہ کیا۔

۲۳ر نومبر۔ کابینہ مستعفی ہوگئی۔ ٹاٹارسکو نے نئی حکومت بنائی۔

۷ر دسمبر۔ رومانیہ اور جرمنی کے درمیان جو حمل و نقل ہوتی تھی، روسی پولستان میں اس پر پابندیاں عائد ہوگئیں۔

۱۱ر دسمبر۔ جرمنی کے ساتھ ایک تجارتی راضی نامہ پر دستخط ہوئے۔ اس کے ذریعہ لیئی اور مارک میں شرح تبادلہ مقرر ہوئی۔ اور رومانیہ سامان حرب کے معاوضہ میں جرمنی کو ہر مہینہ ایک لاکھ تیس ہزار ٹن دینے پر آمادہ ہوا۔

۱۹۴۰ء

یکم جنوری۔ شاہ کیرول نے رومانیہ کے مسلک کو واضح کیا کہ عدم اقدام پر مبنی ہوگا لیکن "اپنی ہر چیز کی رومانیہ حفاظت کرے گا"۔

۶ر جنوری۔ شاہ کیرول نے ایک تقریر میں کہا بسارےبیا رومانیہ کی ملک ہے۔ وہ اس کی حفاظت کریں گے۔

۱۸ر جنوری۔ کلاڈیوس مزید بات چیت کے لئے دوبارہ بخارسٹ آیا۔ رومانیہ کی سرحد کے قریب سوویٹ پولستان میں جرمن فوجیں بڑی تعداد میں جمع ہونے لگیں۔

۲۱ر جنوری۔ جرمنی کے لئے رومانیہ سے جو تیل جاتا ہے اسے روس نے فنستان کے لئے لے لیا۔

۲۷ر جنوری۔ رومانیہ نے برطانیہ کو سرکاری طور پر اطلاع دی کہ جرمنی کو جو تیل روانہ کیا جاتا ہے اس کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا جائیگا۔

۱۰ر فروری۔ شاہی فرمان کے ذریعہ برآمد کی جانے والی اشیاء پر محصول عائد ہوا (تیل پر ۱۳ فیصد)

۲۶ر فروری۔ جرمنی کو جو اشیاء روانہ کی جاتی تھیں اور جن میں تیل بھی شامل ہے ان پر ریل کا کرایہ ۱۲ سے ۹۰ فیصد تک بڑھا دیا گیا۔

۸ر مارچ ۔ شاہ کیرول: "ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ اپنی سرحدوں کی جن پر ہمارا تاریخی حق ہے برابر حفاظت کریں گے۔"

۱۷ر مارچ ۔ وزیر اعظم ٹاٹارسکو ایک نشری تقریر میں: "ہمارا سب سے بڑا کام اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ اور اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے بادشاہ کی قیادت میں ملک اندرونی لحاظ سے کافی طاقتور ہوگیا ہے اور ہمارے خارجی مسلک کا بھی یقین ہوگیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے لئے کوئی قربانی بھی بڑی نہ ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ہماری قسمت بدل جائے لیکن ہمارے ملک کی سرحدیں نہیں بدل سکیں گی۔"

۱۸ر مارچ ۔ کلاڈیوس پھر بخارسٹ آیا۔ وزیر خارجہ گافن سو نے سینٹ میں کہا: "ہم اپنی دولت کو کسی دوسرے کی جنگی اغراض کے لئے صرف نہیں کریں گے۔

۲۰ر مارچ ۔ نازی فلم "دوزخ کی آگ" جس میں پولستان کی تباہی بتائی گئی تھی بخارسٹ میں دکھلایا گیا۔

۲۱ر مارچ ۔ کلاڈیوس نے مزید تجارتی مراعات کا مطالبہ کیا اور حکومت کو اطلاع دی کہ رومانیہ کے تجارتی مسلک میں مسلسل تبدیلی اب جرمنی کو پسند نہیں۔

۲۳ر مارچ ۔ رائٹر کا بلقان والا نمائندہ جس نے ان مطالبات کو الٹیمیٹم کا نام دیا تھا' رومانیہ سے نکال دیا گیا۔

۱۶ تا ۱۹ر اپریل ۔ مدافعت اور اندرونی حفاظت کی مزید تدابیر

۲۷ر اپریل ۔ شریک جنگ ملکوں کی مطبوعات کا داخلہ بند

۳ر مئی ۔ بخارسٹ میں پانچویں کالم کے بعض افراد کا راز فاش ہوگیا جنہوں نے پولستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کا بھیس ڈال لیا تھا۔ بعض جرمن گرفتار بھی کئے گئے۔

۴ر مئی ۔ راتوں میں ڈینیوب کی جہازرانی بند کردی گئی۔

۱۱ر مئی ۔ حکومت مستعفی ہوگئی۔ ٹاٹارسکو نے ایک اور حکومت بنائی جس میں وزیر خارجہ گافن سو ہی رہے۔

۲۰ر مئی ۔ تمام غیر ملکی جو پہلی دسمبر سے اب تک رومانیہ آئے اور جنہوں نے اجازت نامے حاصل نہیں کئے تھے' ان کو ۳۰ر مئی تک چلے جانے کا حکم دیا گیا۔

۲۳ر مئی ۔ ۳ لاکھ محفوظ فوج بلائی گئی اور اب مسلح فوج کی تعداد ۱۳ لاکھ تک پہنچ گئی۔

۲۴ر مئی ۔ پلواسٹی پر جرمنی سے جو تیل کے خالی ڈبے آئے ان میں پانچویں کالم کے لئے آلات حرب پائے گئے۔

۱ر جون ۔ گافن سو نے استعفیٰ دیا اور اس کی جگہ گی گورتو وزیر خارجہ بنا۔

۶ر جون ۔ لندن میں برطانیہ کے ساتھ ایک تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے۔

۲۶ر جون ۔ سویٹ حکومت نے ایک الٹی میٹم کے ذریعہ مطالبہ کیا کہ بسارے بیا اور شمالی بکووینا کے علاقے روس کو دے دئے جائیں۔ بسارے بیا پر دن تمام متعدد روسی طیارے پرواز کرتے رہے۔

۲۷ر جون ۔ رومانیہ نے روسی مطالبات مان لئے۔ روسی فوجوں نے دوپہر تک سرحدوں کو پار لیا۔

۲۸ر جون ۔ رات میں فوجوں کو تیار رہنے کا حکم ملا۔ گافن سو نے ایک اور حکومت بنائی۔

یکم جولائی ۔ وزیر خارجہ ارگی ٹوانو نے موجودہ یوری صورت حال کے لحاظ سے رومانیہ کا آئندہ مسلک معین کیا اور ۱۴ر اپریل ۱۹۳۹ء کو اتحادیوں نے جو ضمانت دی تھی اسے کالعدم سمجھ لیا۔ فوجیں ہنگری کی سرحدوں پر جمع ہونے لگیں اور ہنگری نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

۳ر جولائی ۔ جرمن وزیر بخارسٹ آیا اور حکومت کو اطلاع دی کہ جرمنی فی الحال رومانیہ کی فوجی امداد نہیں کر سکتا۔

۴ر جولائی ۔ حکومت مستعفی ہو گئی۔ گی گورڈ نے نئی کابینہ بنائی جس میں مانوس کو (آئرن گارڈ کا رکن) وزیر خارجہ بنا۔

۶ر جولائی ۔ چالیس برطانوی باشندے جو تیل کے چشموں سے برطرف کئے گئے۔ استنبول روانہ ہوئے۔ وزیر اعظم گی گورڈ: "یہ بات بالکل صاف ہے کہ اب رومانیہ کا خارجی مسلک محور کے زیر اثر ہے" اس اعلان کی تصدیق ان کارروائیوں سے ہوئی جو یہودیوں اور دوسری قلتوں کے خلاف اختیار کی گئیں۔

۱۰ر جولائی ۔ میونخ :۔ ہنگری کے نمائندوں یعنی ٹلے کی اور چاکی نے ہنگری کے رومانیہ پر حقوق کے بارے میں ہٹلر، ربن تراپ اور چیانو کے ساتھ بات چیت کی۔ رومانیہ میں آئرن گارڈ کا لیڈر ہوریا سیما گرفتار ہوا۔

۱۷ر جولائی ۔ بڈاپسٹ واپس ہوتے ہوئے چاکی نے کہا کہ ہنگری کے امن پسند ارادوں سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

۲۵ر، ۳۰ر جولائی ۔ بلغاریہ کے وزیر اعظم فی لاف نے اعلان کیا کہ سالس برگ میں اطالوی، جرمن اور بلغاری نمائندوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ ڈینیوب کے امن کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ رومانیہ کے اخباروں میں "سالس برگ کی آمریت" پر خوب طعن کیا۔

۲۸ر جولائی ۔ ڈینیوب میں برطانوی جہازوں کے روک دئے جانے اور برطانوی باشندوں کے نکال دئے جانے پر حکومت برطانیہ نے رومانیہ کے خلاف احتجاج کیا۔ اور رومانیہ کے جہازوں کو اسکندریہ پر جوابا گرفتار کر لیا گیا۔

۲۰ر اگست ۔ کرائی ویا میں رومانیہ اور بلغاریہ کے درمیان مفاہمت کی گفتگو شروع ہوئی۔

۲۱ر اگست ۔ کرائی ویا میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے جنوبی دوبروجہ بلغاریہ کو واپس ملا اور رومانوی باشندے رومانیہ واپس آ گئے۔

۲۴ر اگست ۔ رومانیہ اور ہنگری کے درمیان بات چیت منقطع ہو گئی۔ شاہ کیرول نے فوجوں کو جمع ہو جانے کا حکم دیا۔

۲۷ر اگست ۔ رومانیہ کے ایک طیارے نے ہنگری کے ایک طیارے پر ڈبرک زن کے مقام پر حملہ کیا۔

۲۹ر اگست ۔ ربن تراپ اور چیانو نے ہنگری اور رومانیہ کے نمائندوں سے بات چیت کی۔ اس گفتگو میں روس شریک نہیں تھا۔

۳۰ر اگست ۔ ویانا میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے "رومانیہ اور ہنگری کی سرحدوں کا قطعی طور پر تعین ہوا۔" ہنگری کو ٹرانسلوے نیا میں ۴۵ ہزار مربع میل کا رقبہ دے دیا گیا۔ یہ معاہدہ محوری ملکوں کی ایما سے ہوا تھا اور چونکہ رومانیہ نے ان ملکوں کی بات مان لی تھی اس لیے رومانیہ کو آئندہ کے لئے ضمانت دی گئی اب اس کے ۱۹۱۲ء والے رقبے پر مزید دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔

۱ر ستمبر ۔ رومانیہ کا سرکاری بیان "ویانا کانفرنس کچھ ایسے حالات میں منعقد ہوئی کہ رومانیہ کو ناگزیر طور پر اپنے علاقے کی قربانی کرنی پڑی کیونکہ اس وقت رومانیہ کی زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش تھا اور وہ اپنے کو دشمنوں سے گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جو نقصان ہم کو برداشت کرنا پڑا وہ بہت تکلیف دہ ہے لیکن بہر حال ہماری حفاظت کی جو ضمانت ملی ہے وہ ہماری قربانی کا بدلہ سمجھی جا سکتی ہے"

۴ر ستمبر ۔ بخارسٹ کی اطلاعوں سے معلوم ہوا کہ خوبی کوو دینا اور سویٹ رومانوی سرحدوں کی حفاظت نازی فوج کرے گی۔

۵ر ستمبر ۔ شاہ کیرول نے رومانیہ کے دستور کو منسوخ کر دیا۔ پارلیمان برخواست کر دی اور معاملات کے طلاقت: دانساں جنرل انٹونسکو کو تمام قسم کے اختیارات دے دیے۔

۶ر ستمبر ۔ شاہ کیرول نے ولی عہد شہزادہ مائیکل کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گئے اور سوئٹزرستان کی راہ لی۔ جنرل انٹونسکو نے اعلان کیا کہ رومانیہ اور محوری ملکوں کے تعلقات بہت استوار رہیں گے۔

نازیوں کو تیل کی ضرورت

ہر سال جرمنی کو (بشمول آسٹریا، چکوسلواکیہ اور نازی پولستان) تقریباً ۸۰ لاکھ ٹن تیل کی ضرورت ہے۔ فرانس ۷۰ لاکھ، اطالیہ ۳۵ لاکھ، رومانیہ ۱۹ لاکھ، ہالینڈ ۱۲ لاکھ، ڈنمارک ۹ لاکھ، بلجیم ۷ لاکھ، ناروے ۶ لاکھ، سوئٹزرلینڈ ۵ لاکھ اور ہنگری اور یوگوسلاویہ ۵ لاکھ ٹن تیل خرچ کرتے ہیں۔ گویا ان تمام ملکوں کے لئے مجموعی طور پر ہر سال دو کروڑ ۶۵ لاکھ ٹن تیل درکار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان ملکوں میں اتنا تیل پیدا نہیں ہوتا اور اس کے لئے یورپ کو زیادہ تر باہر سے درآمد کرنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود جرمنی میں تیل کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے لیکن یہ مقدار کسی صورت میں ۵۰ لاکھ ٹن سالانہ سے زیادہ نہیں اور فی الحال اس میں کسی اضافہ کی بھی توقع نہیں۔ البتہ رومانیہ یورپ کا واحد ملک ہے جہاں سب سے زیادہ تیل پیدا ہوتا ہے چنانچہ یہاں ہر سال ۶۰ لاکھ ٹن تیل نکالا جاتا ہے۔ اب تک تو رومانیہ اپنے تیل کی برآمد سمندری راستوں سے کرتا رہا مگر اب سمندری راستے اتنے محفوظ نہیں رہے کہ رومانیہ کے تیل کی معتدبہ مقدار جرمنی اور اٹلی تک پہنچ سکے گو اب رومانیہ کے نازی اثر میں آجانے کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ رومانیہ کے پورے تیل کو جرمنی کی طرف لے جانے کی کوشش کی جائے۔ رومانیہ کے علاوہ نازیوں کو البانیہ، فرانس اور ہنگری سے بھی تیل مل سکتا ہے لیکن ان ملکوں کی مجموعی پیداوار ۱۰ لاکھ ٹن سے زیادہ نہیں۔

بہر حال بہتر سے بہتر حالات میں نازیوں کو ہر سال ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن سے زیادہ تیل نہیں مل سکتا۔ لیکن بعض اوقات جرمنی نے اور ذرائع سے بھی تیل حاصل کیا ہے چنانچہ جو غیر جانبدار یورپی ملک باہر سے تیل منگواتے تھے اس کی کچھ مقدار نازیوں کے ہتھے بھی چڑھ گئی۔ مثلاً اسی سال کے ابتدائی پانچ مہینوں میں ممالک متحدہ امریکہ نے ۳۸ ½ لاکھ ٹن تیل اسپین کو بھجوایا تھا اور اس کی کچھ مقدار نازیوں تک بھی پہنچ گئی۔ لیکن چونکہ اگست کے مہینے سے برطانیہ نے جرمنی کے ساتھ اور ملکوں کو بھی جو نازی اثر میں ہیں، اپنے محاصرے میں شامل کر لیا ہے اس لئے اب غیر یورپی ملکوں کے راستے کسی قسم کی امداد جرمنی تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اب رہا روس جو ۳ کروڑ ٹن تیل پیدا کرتا ہے تو یہ مقدار خود روس کے لئے مشکل سے کافی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک کو اپنا تیل نہیں دے سکتا۔ تیل کی اس محدود فراہمی کے ساتھ ساتھ جرمنی کو اور بھی دقتوں کا سامنا ہے کیونکہ شاہی ہوائیہ عرصے سے جرمنی کے تیل کے ذخیروں اور اس سے متعلق مشنری کو تباہ کرنے کی کوشش میں ہے اور اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی میں نئے تیل کی فراہمی مشکل ہو گئی ہے اور پرانے تیل کا ذخیرہ بھی ختم ہو رہا ہے۔

اسی موقع پر مشرق قریب میں اطالیہ کی ہلچل پر بھی غور کیا جانا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ عراق ۴۰ لاکھ ٹن تیل پیدا کرتا ہے جو ایک پائپ لائن کے ذریعہ شام اور فلسطین کے راستے بحر روم کے ساحلوں تک پہنچتا ہے اور ایران میں ایک کروڑ ٹن سے زیادہ تیل نکلتا ہے اگر ان دونوں ذرائع پر قابو حاصل کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ نازیوں کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی چنانچہ اطالیہ نے مشرق قریب میں جو ہلچل شروع کی ہے اس کی صریح وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ جرمنی تک تیل پہنچایا جائے کیونکہ تیل کے ان ذخیروں تک دریائے دانیال کے راستے تو رسائی نہیں ہو سکتی کیونکہ ترکی اور روس کے ساتھ مڈبھیڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے اسی لئے اطالیہ نے بحیرۂ قلزم اور سویز پر قبضہ جمانے کی فکر کی ہے لیکن یہ راستے بھی آسانی کے ساتھ اختیار نہیں کئے جا سکتے کیونکہ یہاں اب تک برطانوی بحریہ چھایا ہوا ہے۔ اگر کسی طرح عراق کے ذخیرے تک اطالویوں کی رسائی ہو بھی جائے تو نازی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے کیونکہ پہلے تو تیل کے اس ذخیرے کو آسانی کے ساتھ تباہ کیا جا سکے گا اور پھر پائپ لائن بھی بہت جلد توڑ دی جا سکے گی۔

حالات حاضرہ

ہندوستانیوں کی غذا ۔ کونور کے تجربے کونور میں مسئلہ تغذیہ سے متعلق جو انجمن قائم ہے اس کو اب تک ہندوستانی ریسرچ فنڈ اسوسی ایشن کی مالی امداد حاصل رہی ہے۔ نیز بعض خیرخواہوں کے عطایا اور چندوں سے بھی اس کے کام میں بڑی مدد ملی ہے۔ اس سلسلے میں راجہ صاحب پارلک میڈی کا ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۲۶ء میں انجمن کو دیا تھا۔ اس انجمن نے کرنل مک کیاریسن کے تحت جو کونور کے تجربہ خانوں کے پہلے ناظم ہیں، غذاؤں پر بہت سی تحقیقات کیں اور ہندوستانیوں کے لئے بڑا کارآمد مواد فراہم کیا۔

پہلے پانچ سال کے عرصے میں غذاؤں کے امتحان اور تجزیہ پر بڑی توجہ کی گئی ہے چنانچہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر کوئی ساٹھ امتحان اس سلسلے میں کئے گئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی غذاؤں کی خرابیاں معلوم کی جائیں اور بہتر غذاؤں کی سفارش کی جائے۔ اس انجمن نے محکمہ زراعت کے تمام شعبوں کو بھی اپنی مفید رپورٹ کے نسخے روانہ کئے ہیں تاکہ کاشتکاروں اور عوام کو اس سے فائدہ پہنچے۔

ہندوستان کی کیمیاوی دوائیں ہندوستانی کارخانوں میں اب پہلی مرتبہ کلوروفارم، کلسیم لیاک ٹیٹ اور کاربالک ترشہ تیار کیا گیا ہے جس کے نمونے محکمہ میڈیکل اسٹورز میں امتحان کی غرض سے روانہ کئے گئے۔ اور کاربالک اور کرسلک ترشے تو بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ ایک بنگالی کارخانے نے کلوروفارم تیار کیا ہے اور کلکتے میں اس کا امتحان کیا جا رہا ہے۔ ایک اور بنگالی کارخانے نے ان ایس تھنک اینھر بھی تیار کیا ہے جو کافی اچھا ثابت ہوا۔ ایک ہندوستانی کارخانہ ایسا ہے جو ہر مہینے دس ٹن کے حساب سے گندھک کا ترشہ تیار کر رہا ہے اور ضرورت پڑے تو کارخانہ اسی مشنری سے ماہانہ ۳۰ ٹن ترشہ بھی تیار کر سکتا ہے۔ اس کارخانے میں ایک سال کی ضرورت کے موافق خام اشیاء بھی کافی مقدار میں موجود ہیں۔

مشرق کی جنگی امداد دلی میں مشرقی ملکوں کی ایک کانفرنس اکتوبر کے مہینے میں ہو رہی ہے جس میں جنگی ضروریات سے متعلق عام پیداوار کی فراہمی کا باضابطہ انتظام کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ منسٹری آف سپلائی مشن کا بھی کام ہوگا جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ملکی دفاع اور برطانیہ کی جنگی امداد کے سلسلے میں بڑے پیمانے اور زیادہ منظم طور پر سہولتیں فراہم کی جائیں اور خصوصاً مشرق قریب اور مشرقی سولستر کے لئے فوجوں کی فراہمی ہو۔ مجلس اقوام کے مشہور ادارے انٹرنیشنل لیبر آفس نے ہندوستان کو دنیا کے بارہ بڑے صنعتی ملکوں کا ایک رکن تسلیم کیا تھا اور اب اس ملک سے جتنی ہو سکے صنعتی امداد حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ سپلائی مشن کو جو پانچ یا چھ اراکین پر مشتمل ہے اور جس کے صدر سر الکزنڈر راجر ہیں، تقریباً پندرہ فنی مشیروں کا تعاون بھی حاصل رہیگا۔ یہ مشن پورے ہندوستان کا دورہ کر کے تمام ہندوستانی کارخانوں کا معائنہ کرے گا اور حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کو مشورہ دیگا کہ کس طرح صنعتی پیداوار کو بہتر طریقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس مشن کو منسٹری آف سپلائی نے مقرر کیا ہے۔

ایسٹرن گروپ کی اس کانفرنس میں جسے سپلائی مشن کی امداد بھی حاصل رہے گی آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جنوبی افریقہ، جنوبی روڈیشیا، برما، ہانگ کانگ، لنکا، ملایا وغیرہ کے نمائندے شرکت کریں گے۔ ان کے ساتھ ہندوستانی نمائندے بھی شریک رہیں گے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرق کے یہ تمام ملک جنگی امداد میں منظم طور پر مل کر حصہ لیں۔

لبنسرام ۔ چند روز ہوئے مسٹر ای۔ جے۔ ہنگل نے مدراس سے ایک نشری تقریر کے دوران میں کہا کہ برطانیہ پر محاصرے کا الزام جرمن پروپگنڈے سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا اصل میں جرمنی جغرافی لحاظ سے خود محصور ہے اور اس کی یہی حالت رہیگی تاوقتیکہ وہ پورے یورپ پر قابض نہ ہو جائے۔" ۱۹۱۴ء سے پہلے کسی وقت جرمنی کا محاصرہ کیا گیا یا نہیں اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے اور اگر ۱۹۱۹ء کے بعد جرمنی کا محاصرہ ہوا تو اس سے فرانس کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے نتیجہ کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاصرہ بالکل بے اثر رہا۔ اب رہی یہ بات کہ آیا ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کو محصور کرنے کی کوشش کی تو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر اسے جرمنی کے لبنسرام کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ جرمنی ایک عرصے سے اپنے علاقے کی توسیع کا خواہاں رہا ہے تاکہ اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زیادہ جگہ میسر آسکے۔ اس طرح کی خواہش دوسرے ملکوں اور قوموں کو بھی ہو سکتی ہے۔ پولستان اور چکوسلواکیا کے باشندے بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو لبنسرام کے معنٰی ایک نئے نظام عالم کے ہیں۔ جرمنی کے اس مطالبے کے صریح معنی یہ ہیں کہ ناتسیوں کے سوا دنیا کی کسی دوسری قوم کو آزاد رہنے کا حق نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

جاپان اور محور کا معاہدہ ۔ چندی روز ہوئے برلن میں جرمنی، اطالیہ اور جاپان کے درمیان دس سال کے لئے ایک فوجی، سیاسی اور معاشی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے میں جاپان نے یورپ میں جرمنی اور اطالیہ کی قیادت تسلیم کر لی اور ادھر جرمنی اور اطالیہ نے مشرق میں جاپان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

پروفیسر لاسکی اور ہندوستان ۔ "ڈیلی ہیرالڈ" کی ایک حالیہ ۔ ۔ ۔ ۔ اشاعت میں پروفیسر ہیرلڈ لاسکی نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی پیچیدگی سے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں موجودہ کابینہ کے لیبر ممبروں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور پچھلے ستمبر سے ہندوستان کے متعلق برطانیہ کا جو طرز عمل رہا ہے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان کو توقع ہے کہ آزاد ہندوستان جنگ میں برطانیہ کی جو مدد کر سکے گا وہ بہت زیادہ قیمتی ہوگی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مسٹر ایمری کے اعلان کو آخری اور قطعی نہیں سمجھنا چاہیئے، وہ آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔" ہم کو چاہیئے کہ پورے ہندوستان کی ایک کابینہ بنائیں جو مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہو اور جس کے فرائض بالکل عاملہ کے ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح برطانوی کابینہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کابینہ کے دو اہم کام ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ برطانیہ کی جنگی امداد میں خوب دل کھول کر حصہ لے اور دوسرے یہ کہ نیا دستور بنانے کے لئے ایک دستوری کنونشن کا قیام عمل میں لائے یا پھر برطانیہ کے ساتھ اس معاملہ میں بات چیت کر سکے۔"

"اس دستوری کنونشن کے لئے ہر صوبے کی مقننہ سے نمایندوں کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو اس کے لئے صوبوں میں نیا انتخاب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مسلمان اور اچھوت ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتے تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ وہ کسی تیسری آزاد شخصیت مثلاً ممالک متحدہ کے صدر کو اپنا ثالث بنائیں اور اس کا جو بھی فیصلہ ہو اس پر پابند ہو جائیں اگر ہندوستانی ایسا کر سکیں تو ہم کو چاہیئے کہ جنگ ختم ہونے کے ۱۲ مہینے کے اندر پارلیمنٹ کے ذریعہ ایک نیا دستور منظور کریں۔"

بلقان کی صورت حال ۔ رومانیہ کی سیاست سے جو پیچیدہ

کھایا ہے اس کے بعد کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اور مسولینی بلقان میں اپنا اثر بڑھانے کی برابر کوشش کر رہے ہیں چنانچہ رومانیہ کو ختم کرنے کے بعد بلغاریہ میں نازیوں کی ہلچل اسی بات کا ثبوت ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بلقان کی سب سے اہم مملکت یعنے ترکی اب ہر بیرونی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے اور اس نے اعلان بھی کر دیا ہے کہ اگر نازیوں نے ترکی کا رخ کیا تو ان کی ہر قسم کی پیش قدمی کو قوت کے زور سے روک دیا جائے گا۔ ترکی اور یونان کے درمیان ان کی جغرافی نزاکت کے پیش نظر حال میں بات چیت بھی ہوتی رہی ہے۔ بعض معتبر حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ترکی اور یونان کے مابین فوجی اتحاد کا ایک معاہدہ طے پا جائے گا۔ جنوب مشرقی یورپ میں حالات کچھ ایسے تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ اس کے متعلق کسی قسم کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہٹلر کے لئے بلقان میں اور آگے بڑھنا دشوار ہے کیونکہ اب اسے ایسی مزاحمت کا سامنا کرنا ہوگا، جس کا اسے یورپ کے اس گوشے میں اب تک تجربہ نہیں ہوا۔

جاپان اور برما کی سڑک۔ اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں برما کی سڑک کھول دی گئی اور ظاہر ہے کہ اس کے بہت دور رس نتائج نکلیں گے۔ سب سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سڑک کے کھل جانے سے چین کو امریکہ سے قرضے وغیرہ حاصل کرنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت ہند نے جاپان کو ہندوستان سے غیر خالص لوہا حاصل کرنے کا جو اجازت نامہ دیا تھا وہ کالعدم ہوگیا۔ چونکہ چین کے دوسرے تمام راستے یکے بعد دیگرے بند ہوگئے تھے اس لئے اب ۷۲۶ میل کی یہ سڑک چین کے لئے ایک نعمت ثابت ہوگی کیونکہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے لین دین کرنے اور راہ و رسم بڑھانے کے لئے اسے پھر ایک اچھا راستہ مل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ جاپان کو کسی طرح پسند نہیں ہو سکتا۔ جاپان نے اپنا غصہ یوں ظاہر کیا کہ اس سڑک پر خوب بم باری کی۔ لیکن سڑک پر بم برسانے کا اثر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند گھنٹوں کے لئے آمد و رفت روک دی جائے اور اس سے بڑھ کر جاپان کو کچھ اور شرارت کرنے کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی قسم کی ہلچل کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ایک طرف برطانیہ اور امریکہ کو اپنا دشمن بنائے گا اور دوسری طرف روس بھی اس کے لئے کچھ کم خطرناک ثابت نہ ہوگا۔

(حفیظ صدیقی)

۷۳

سب رس کتاب گھر کی بعض اہم کتابیں

۱۔ طوطی نامہ مجلد از غواصی ۱۲/ ؎

۲۔ پھولبن از ابن نشاطی ۱۲/ ؎

۳۔ قصہ بے نظیر مجلد از عشقی عا/

۴۔ کلام الملوک مجلد سلاطین دکن کا فارسی کلام ۱۲/ عا/

۵۔ سیف الملوک و بدیع الجمال مجلد از غواصی عا/

۶۔ جدید اردو شاعری از پروفیسر سید عبدالقادر سروری عا/

۷۔ تنقیدی مقالات مجلد از ڈاکٹر زور ۱۲/ ؎

۸۔ یورپ کے تاثرات از بدر شکیب عہ/

۹۔ نظر کے دھوکے از ؍؍ ؍؍ عہ/

۱۰۔ محبت کا فسانہ مجلد از ل احمد عا/

۱۱۔ ادب اور زندگی از مجنون گورکھپوری عہ/

۱۲۔ آغاز ہستی از مجنون گورکھپوری ۱۵/

۱۳۔ نمو زندگی از سید علی منظور عہ/

۱۴۔ ضمیر از عبدالرحمن خاں سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ ۱۲/

۱۵۔ قنوطیت از ڈاکٹر ولی الدین عا/

۱۶۔ اکبر اعظم از خواجہ نصیر الدین لکچرار گلبرگہ کالج ۸/

۱۷۔ ارباب نثر اردو از پروفیسر سید محمد عا/

۱۸۔ اردو شہ پارے مجلد از ڈاکٹر زور ۱۲/ ؎

۱۹۔ انوری بیگم از طیبہ بیگم مرحومہ عہ/

۲۰۔ دھونیں کی پھانسی ۱۰/

۲۱۔ جنون وحکمت ۱۲/ ؎

۲۲۔ کسان ۲/

۲۳۔ شریر لڑکا ۴/

۲۴۔ بچوں کا انصاف ۴/

بچوں سے

گزشتہ مہینے کے سب رس میں اور مقامی اخبارات میں اردو امتحانات کا نتیجہ شایع ہوا تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان امتحانوں میں کافی تعداد میں امیدواروں نے شرکت کی غالباً یہ امتحانات دوبارہ اگست سنہ ۴۱ء میں ہوں گے تاریخ کا اعلان متعاقب کیا جائے گا۔ ان امتحانات کے اسناد عنقریب تقسیم کئے جائیں گے۔ اسی موقع پر ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ شعبۂ طلبہ کی جانب سے جو تقریری مقابلہ منعقد ہوا تھا اس کے انعامات بھی تقسیم کئے جائیں۔ اس کے بعد جنوری میں شعبہ طلبہ سنہ ۴۱ء کی مجلس انتظامی کے انتخابات عمل میں آئیں گے۔ اسی لئے جلد از جلد رکن بنتے اور بناتے جائیں تاکہ آپ کو بھی بحیثیت رکن انتخاب کے لئے رائے دینے کا حق حاصل رہے آپ خود بھی مجلس کی رکنیت کے لئے کھڑے ہو سکیں۔ دستور العمل دفتر ادارہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس سے پہلے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آپ سب ایک مضمون "تحسین اردو" لکھ بھیجیں جن کا مضمون سب سے اچھا رہے گا انھیں انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ بہت سے مضامین وصول ہوئے۔ جس میں عبدالحمید (کولا پوری) کا مضمون انعام کے قابل ہے وہ مرزا محمد انور صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب "لنین" دفتر سے حاصل کریں۔

مرزا محمد انور صاحب نے لکھا ہے کہ وہ مضامین پر انعامات دینے سلسلہ قایم رکھیں گے اس کے لئے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کہ آپ سب ان کے انعامات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس مہینے میں دیوالی بھی ہے اور عیدالفطر بھی' ہم سب رسی بہنوں اور بھائیوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اس پرچہ میں ہر دو سے متعلق مضمون چھپ رہے ہیں۔ راجہ جیتندر پرشاد صاحب جوہر نے ایک اچھا مضمون "پریم کی دیوالی" لکھا ہے۔ آپ کو اردو سے بڑی محبت ہے۔ سب رس کے لئے آپ اکثر مضامین بھیجتے رہتے ہیں۔ ایک اور سب رسی بھائی کی نظم عید سے متعلق چھپ رہی ہے۔

ہمارے فائیل میں بہت سے مضامین اور نظمیں ہیں۔ اس مرتبہ ہم نے ان سب کو پڑھ کر دیکھا۔ جو قابل اشاعت مضامین اور نظمیں نکلیں ان کی فہرست اس پرچہ میں شایع ہو رہی ہے۔ بقیہ کی فہرست آیندہ پرچے میں شایع ہو گی۔ بھائی بہنیں ٹکٹ بھیج کر اپنے مضامین حاصل کر سکتے ہیں ورنہ وہ ضایع کر دیے جائیں گے۔

معین الدین احمد انصاری

بڑے گھر کی شادی

شادی کے معنی خوشی کے ہیں خواہ وہ خوشی کسی قسم کی ہو۔ مگر ہمارے ہاں یہ لفظ عموماً بیاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اسی خوشی پر ہماری زندگیوں کی خوشی کا انحصار ہے۔ اگلے زمانے میں یہ ہوتا کہ دلہا دلہن کے خانگی حالات، ان کا رجحان ان کی تعلیم، ان کے خیالات ان کے عادات غرض ان کی ہر بات پر کامل غور کیا جاتا اور ہر چیز میں موافقت ڈھونڈھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ خود دلہا دلہن کو اختیار رہتا کہ چاہیں منظور کریں اور چاہیں منظور نہ کریں۔ اگر وہ انکار کر دیتے تو ہرگز والدین کو رنج و ملال نہ ہوتا۔ جب سب طے ہو لیتا تو عام محفل میں شرعی احکام انھیں سنا دئیے جاتے اور علی الاعلان طرفین سے ان کی پابندی کا وعدہ لے لیا جاتا۔ تاکہ ایک دوسرے کے حقوق بے وجہ پامال نہ کئے جائیں۔ غیرت وحمیت وعدہ خلافی کے مانع ہے۔ اسلام میں مہر اس وجہ سے مقرر نہیں کیا جاتا تھا کہ ایک اجنبی لڑکی کی جان، مال، آزادی شوہر کے ہاتھ بک جائے بلکہ اس کی آیندہ زندگی کے لئے اس بہانے کچھ سرمایہ جمع ہو جائے۔

یہی وہ عمدہ اصول اور اعلیٰ خیالات ہیں، جو میاں بیوی میں روز افزوں محبت اور اتحاد پیدا کرتے ہیں۔ اور یہی شادی کا بہترین مقصد اور نتیجہ ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل ہم میں کس طرح کی شادی ہوا کرتی ہے اور اس کا ہمارے اخلاق و تہذیب پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

کیا دکن کیا ہندوستان، ہر جگہ مسلمانوں کی شادی کا ایک عجیب ڈھنگ ہے۔ غیر قوموں کے بہت سے غیر ضروری رسم و رواج مسلمانوں میں داخل ہو گئے ہیں جن کے بغیر کوئی شادی شادی نہیں ہو سکتی۔

غریبوں کے ہاں اتنا پیسہ ہی کہاں جو ان رسموں کو پورا کر سکیں۔ دل کی تمنائیں دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔ مگر اس سے یہ ہوتا ہے کہ مفلسی زنجیر پا بن کر افلاس و فلاکت کے راستہ میں قدم روک لیتی ہے۔

البتہ امیروں کے ہاں کی شادی قابل دید و قابل ذکر ہے۔ ماں باپ کا چشم و چراغ جہاں چار پانچ برس کا ہوا فکر دامنگیر ہوئی۔ چو طرف خیالات دوڑنے لگے۔ بے جا عداوت اور ذاتی خصومت نے بہت سے شریف گھروں کے دروازے بند کر دیئے اور حرص نے دولت و ثروت کا لالچ بتا کر آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ شریف و رذیل اور اچھے اور برے کی پہچان نہ رہی۔ کمسنی ہی میں دو معصوموں کی آیندہ زندگی کا فیصلہ ہو گیا۔ کم سن بچے سن شعور کو پہنچنے تک سب باتوں سے بے خبر رہے اور جب ہوش سنبھالا تو آنکھ کھلی کہ ان کی آزادی، ان کی مسرت، ان کی خوشی کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے ہو چکا ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ اگر ذرا بھی

انکار اور ناراضگی کا اظہار ہو تو نافرمان، گستاخ۔ شوخ اور بے ادب کے معزز خطابوں کے علاوہ رہی سہی امیدوں کا بھی خون ہو جائے۔

نوجوان کی جان عذاب میں پڑ گئی کہ کیا کیا جائے۔ تعلیم بالکل الگ، خیالات بالکل مختلف اور طبیعتیں بالکل متضاد۔ انکار ممکن نہیں۔ بڑوں کا ٹھیرائی ہوئی بات میں ناراضگی کیسی۔ نہ آنکھ سے دیکھا نہ کان سے سنا۔ کچھ ہی ہو کرنا ہی پڑے گی اور اگر بعد کو معدہ ہضم نہ کرے تو پھر کسی دوا کی تلاش کرلینا۔ ماں باپ کی تجویز نہیں قضا و قدر کا قطعی حکم ہوگیا۔

مگر جو لوگ عقل سلیم رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ایک انتخاب کا سلب کرلینا کس قدر مضرت رساں ہے۔ بہت سی کمینہ حرکات اور ناجائز افعال کا ارتکاب محض اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ انھیں آپ اپنا انتخاب کرنے کا مجاز کرنا تو کجا ان سے صلاح و مشورہ تک نہیں لیا جاتا۔ اور پھر طرہ یہ کہ ماں باپ کو دعویٰ بھی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں۔

غرض جس دن کا ماں باپ کو مدت سے انتظار تھا وہ قریب ہوتا گیا۔ برسوں سے مہینوں کی نوبت آئی۔ یہاں تک کہ بیاہ کا دن تاریخ مقرر ہوگئی۔ شادیانے بجنے لگے۔ رسمیں شروع ہوگئیں۔ ساہوکاروں کی مراد برآئی۔ مکان رہن، زیور گروی۔ گوسیے گا رہے ہیں، طوائفیں ناچ رہی ہیں۔

غرض منجے ساچق وغیرہ اور دنیا بھر کی رسمیں ادا کی گئیں۔ خوشامدیوں نے تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔ پھر کیا تھا کچھ تو آبائی اعزاز کا خیال، کچھ ناموری کی ہوس، کچھ سخاوت کی داد۔ سب نے مل کر کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ ارادہ کرلیا کہ جہاں تک ہو سکے ایک بھی رسم نہ چھوٹنے پائے اور معلوم ہوجائے کہ ہم بھی ان کے ہم پلہ ہیں بلکہ کچھ زیادہ۔

افسوس! انھیں یہ نہیں سوجھا کہ چار دن کے بعد زیور بک جائیگا، معاش بند ہوجائے گی اور گھر چھن جائے گا۔ زندگی تلخ اور جینا محال ہوجائے گا۔ اور کوئی ایک بھی نہ ہوگا کہ ان کے افلاس و تباہی پر ہمدردی کے دو آنسو بہائے۔

مگر انھیں اتنی مہلت کہاں کہ ان باتوں کو سوچیں۔ کل کا دن عقد کا ہے۔ صبح سویرے کوئی چھ بجے سواری بڑے تکلف سے نکلی۔ کئی دنوں کے تھکے ماندے نیند سے چونک اٹھے۔ اور چھوٹے بچے باجوں کی دہشت ناک آواز سے خوف زدہ ہوکر ماؤں کے سینوں سے لپٹ گئے۔ دولہا گلی کوچوں سے ہوکر شاہ راہ پر پہنچا اور شہر کی گشت لگاتے ہوئے دلہن کے مکان پر آموجود ہوا۔ سالے جو پہلے سے منتظر تھے انھوں نے فوراً کواڑ بند کرلئے۔ فقرے کسے جانے لگے۔ ذلیل اور ناشائستہ الفاظ زبان پر آآکر مزا دینے لگے۔ بڑے بوڑھے سب کھڑے سن رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

افسوس کہ ایسی ایسی فضول رسمیں جب ہماری تفریح اور دل لگی ٹھیریں تو ہمارے اخلاق نہ بگڑیں تو کیا ہوں۔

غرض بڑے جھگڑے کے بعد روپے گن دیئے اور سالے نے دروازہ کھولا۔ دولہا اندر داخل ہوا اور مسند پر بڑی شان و شوکت سے جلوہ افروز ہوا۔ قدرتی حسن کو تصنع کے بیدرد ہاتھوں نے ایسا بگاڑا کہ خدا کی پناہ۔ زرق برق شیروانی، سر پر دستار وطرہ۔ زریں جوتا۔ غرض ان سب چیزوں نے دولھے کی ہئیت بگاڑ دی، مگر اس صرفِ کثیر اور بے لذت گناہ پر بھی وہ انتہا درجہ خوش ہیں اور ہر ایک کی پُرشوق نگاہیں دولھے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اب قاضی صاحب کے آنے کی دیر ہے تو وہ آتے آتے آخر بڑی دیر میں تشریف لائے۔ اور اپنے ساتھ دو چار طفیلی بھی لائے۔ مہر کا مسئلہ پیش ہوا۔ دل میں تو سب کچھ منظور مگر منہ پر انکار کہ اس قدر نہ ہوگا اور اُدھر سے اصرار کہ اس سے کم کیا ہو۔ بناوٹی غصہ، تُو تُو میں میں۔ جب دونوں تھک گئے تو خود بخود تصفیہ ہوگیا۔ دولھے نے دستخط کر دیئے اور جو سچ پوچھو تو ایک کوڑی بھی دینے کا ارادہ نہیں۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے نکاح باندھا اور بادام مصری کی بارش شروع ہوئی۔ اس وقت کا سماں بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔ بوڑھے بچے بن جاتے ہیں اور نہایت بے تکلفی سے بادام مصری لوٹتے ہیں۔ نہ خود داری کا پاس اور نہ چھوٹوں کا خیال۔ ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوجاتا ہے۔ کھانے دانے کے بعد جس پر بے دریغ روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے .... اور دوسری فضول رسمیں بھی ادا کی جاتی ہیں کہ جن کا سلسلہ ہی ختم نہیں ہوتا اور تب کہیں جاکر اس شادی خانہ آبادی کی نہیں بلکہ خانہ بربادی کی تکمیل ہوتی ہے۔

—— نہیں معلوم ہم کب بیدار ہوں گے۔

آصف احمد (عثمانیہ)

پریم کی دیوالی

"امی امی کدہر ہو کہاں گئیں" کہتی ہوئی پریم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرنے لگی۔

موہنی۔ پریم ادہر آؤ۔ میں یہاں ہوں۔کیا کہنا چاہتی ہو، کیوں اسکول نہیں گئیں؟

پریم۔ امی آج تو اتوار کی چھٹی ہے۔ دیکھو امی تم ہرسال پٹاخے لاکر دیتی ہو نا۔

موہنی۔ ہاں بٹیا وہ دیوالی کے روز لایا کرتے ہیں۔ پریم اچھا تو بتاؤ دیوالی کب ہے۔ مجھے ابھی لادو۔

موہنی۔ نہیں اچھی بٹی ہوکر ایسی ضد نہیں کرتے دیوالی تو آنے ہی والی ہے اس مرتبہ تم کو زیادہ پٹاخے لاکر دوں گی۔ پریم کے چہرے پر کچھ خوشی تھی اور کچھ ناراضگی۔ باہر چلی گئی۔ دیوالی کا دن آیا۔ پریم کو اس دن بھی چھٹی تھی۔ صبح اٹھی اور جلد جلد امی کے پاس پہنچی پھر کہا "میری اچھی امی بتاؤ آج تو دیوالی کا دن ہے پٹاخے کہاں ہیں۔" موہنی نے کہا "ہاں آج دیوالی کا دن ہے لو تمھارے لئے پٹاخے لے آئی ہوں انہیں جلاؤ اور خوب جلاؤ۔ رات کو جلانا بڑا لطف دیگا۔ اگر ان کو دن میں جلائیں تو سارا لطف جاتا رہیگا۔" پریم نے جواب میں تو اچھا کہا مگر دل نہ مانتا تھا۔ آدھے سے زیادہ تو دن میں ہی جلادئے اور تھوڑے سے رات کے لئے رکھ چھوڑے۔ جب رات آئی تو پریم کے گھر میں بجلی کی روشنی کی گئی تھی اور اس کے گھروندے میں نئی نئی گڑیاں اور کھلونے سجائے گئے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا ہوگیا۔ پریم اپنے بچے ہوئے پٹاخے جلانے لگی۔ بچی تو تھی ہی وہ جلاتے جلاتے ایسی خوشی میں آگئی کہ اپنے آپ کی خبر نہ رہی۔ ایک پٹاخہ اپنے ہاتھ میں ہی جلادیا اور اس کی چنگاری سے کپڑے جلنے لگے۔ موہنی نے جب پریم کو اس حالت میں دیکھا تو "ہائے کیا کروں، لٹ گئی، برباد ہوگئی" کہتی ہوئی اس کے پاس آئی، پریم بے ہوش ہوگئی تھی۔ موہنی نے اور آدمیوں کو بھی بلایا۔ آگ بجھادی گئی۔ پھر اس کو ہسپتال..... لے گئے۔ کئی دن تک پریم کو وہاں پر ہی رکھا گیا۔ جب وہ پوری طرح سے اچھی ہوگئی تو اس کو گھر لایا گیا۔ اسی طرح سال بھر گزر گیا۔ پھر دیوالی آئی۔ موہنی نے پیاری پریم کو بلایا اور کہا پریم اس مرتبہ پٹاخے نہ جلاؤ گی؟

پریم۔ امی کیا میں وہ دن بھول سکتی ہوں جب کہ میں پٹاخوں ہی کی وجہ سے جل گئی تھی۔ اس دفعہ میں نہیں جلاؤں گی۔ موہنی نے کہا شاباش تجھے اب عقل آئی، میں نے پہلے ہی کہا تھا اس وقت تم مانتی ہی نہ تھیں۔ پریم نے کہا جانے بھی دو امی آدمی کو کہو وہ جلائے گا۔ اور میں دیکھوں گی۔ موہنی بولی اچھی بات ہے یہ ٹھیک ہے آدمی جلاتا ہے اور تم دیکھنا قریب نہ جانا۔ پریم دیکھو

امی وہ اناّر کیسا اچھا ہے، پھولجھڑی کتنی رنگین ہے۔ اور دیکھو دیکھو پیاری اوپر گئی آسمان کی طرف۔ رنگ برنگ کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ امی میں یہاں سے ہی دیکھتی رہوں گی۔ ہاتھ نہ لگاؤں گی۔

جتیندر پرشاد جوہر

عید کا چاند

کیا سبب ہے کہ خوشی چھائی ہے
آج دنیا میں بہار آئی ہے

مسکراہٹ ہے لبوں پر آتی
کیوں صبا پھرتی ہے آج اِتراتی

ننھے بچے بھی تو روتے نہیں آج
عید کے شوق میں سوتے نہیں آج

نئے کپڑے ہیں نیا ہے جوتا
کل ہر اک شخص بنے گا دولہا

عیدگاہ شوق سے کل جائیں گے سب
شکر خالق کا بجا لائیں گے سب

ہے ہر اک دل پہ مسرت چھائی
اور یہ بات زبان پر جاری

یہ دن اللہ نے دکھلایا ہے
عید کا چاند نظر آیا ہے

بنارسی لال

چند نیازیں اور اُن کے پکوان

حیدرآباد میں نذر و نیاز کثرت سے ہوتی ہیں اور ہر نیاز یا فاتحہ کے لئے خاص پکوان مقرر ہے اور اس دن وہی پکوان ہوتا ہے۔ اگرچہ نئی تعلیم پانے والے گھرانوں نے انھیں ترک کردیا ہے اور پہلے کی بہ نسبت اب ان کا رواج بہت کم ہوگیا ہے لیکن پھر بھی حیدرآباد میں یہ نیازیں بکثرت ہوتی ہیں۔ میں اپنے سب رسی بہن بھائیوں کی دلچسپی کے لئے ذیل میں چند مشہور نیازوں کا ذکر کرتی ہوں امید ہے کہ دوسرے مضمون نگار بھی اس سلسلے میں اپنی معلومات سے مستفید فرمائیں گے۔

محرم:-

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ محرم کا فاتحہ شہیدانِ کربلا کے نام سے ہوتا ہے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی شربت بنایا جاتا ہے اور اس کا سلسلہ ۱۲ محرم تک بکثرت اور اس کے بعد اربعین تک بھی جاری رہتا ہے۔ اس فاتحہ کے خاص پکوان یہ ہیں۔ کھچڑی، شربت، روٹ، چونگے، پتی حلیم اور نقل اور سکہ کمہ۔

داؤد پیغمبر کا مالیدہ:-

جمادی الثانی کی ۲۴ تاریخ کو داؤد پیغمبر کا مالیدہ بنتا ہے۔ اسے روا، شکر، اور گھی ہم وزن ڈال کر بناتے ہیں اور یہ اس قدر چکنا ہوتا ہے کہ زیادہ نہیں کھایا جاتا۔

رجب کے کونڈے:-

رجب میں بھی ۲۲ تاریخ کو حضرت امام جعفر صادقؑ کے نام سے فاتحہ ہوتا ہے اور اس کو کونڈوں کی نیاز کہتے ہیں۔ اس نیاز کا مخصوص پکوان پوریاں، کھیر، گھوڑے اور تیلی ہے۔ پوریاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک حلوے کی اور دوسری سوکھے میوے کی اور گھوڑے دراصل میٹھی چکولیاں ہوتی ہیں۔ اس مہینے میں مختلف گھروں میں مختلف تاریخیں مقرر ہیں۔ لیکن ۲۲ تاریخ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

مُردوں کا فاتحہ:-

ماہ شعبان میں ۱۴ تاریخ کو لوگ اپنے مرے ہوئے عزیز و اقارب کے نام سے فاتحہ دلواتے ہیں اور اس کا خاص پکوان ہتولی اور روٹی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس تاریخ کو مرے ہوئے عزیزوں کی روحیں گھر میں آتی ہیں اور اس لئے اس دن پٹاخے یا کسی قسم کی دوسری آتشبازی چھوڑنے سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ روحیں پٹاخوں کے ڈر سے بھاگ جاتی ہیں۔ لیکن یہ تو سب توہمات ہیں۔

یہ نیازیں تو خاص مہینوں اور خاص تاریخوں سے متعلق ہیں لیکن بعض نیازیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے کوئی مہینہ یا تاریخ مقرر نہیں۔ یہ نیازیں مرادوں یا منتوں کے پورا ہونے پر کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک سہ منی ہے جو حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کے نام سے ہوتی ہے۔ اس کو سہ منی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں تین چیزیں ایک ایک من کی رکھی جاتی ہیں یعنی دہی روٹی، اور قورمہ اس پکوان میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ قورمہ میں کوئی ہڈی نہ ہو۔ اس پر بھی اگر کسی شخص کے کھانے میں ہڈی نکل آئے تو اسے بہت نیک بخت سمجھا جاتا ہے اور یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خود ویسی ہی نیاز کرے اگر صاحب قدرت نہ ہو تو آدھی یا پاؤ نیاز بھی کر سکتا ہے۔

اسی قسم کی دوسری نیازیں بھی ہیں مثلاً بی بی کی صحنک جو حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے نام سے ہوتی ہے۔ اور منت کے کھجور کی نیاز بھی اکثر گھروں میں کی جاتی ہے۔

حبیبہ حبیب الرحمٰن

مولوی صاحب کی دعوت

گزشتہ چہارشنبہ کا واقعہ ہے شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے ہم سب لوگ بنگلے پر بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں چھوٹے بھائی جان دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے" سنئے سنئے مولوی صاحب آئے ہیں" "کہاں ہیں" ہم لوگوں نے پوچھا" نیچے باوا جان سے باتیں کررہے ہیں" چھوٹے بھائی جان نے کہا۔ مدت سے مولوی صاحب تشریف نہ لائے تھے اور ہم مولوی صاحب کو دیکھنے ترس رہے تھے۔ خدا نے مولوی صاحب کو ڈھکیل کر بھیجا —— مولوی صاحب کی شادی ہوئے دو ماہ گزرے تھے انھوں نے شادی میں ہم لوگوں کو دعوت بھی دی تھی مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ہم لوگ نہ جا سکے۔ اس لئے ہم کو مولوی صاحب کی دلہن کو دیکھنے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ ہم نے فوراً والدہ صاحبہ سے اجازت لی اور مولوی صاحب کے ہاں کہلا بھیجا کہ جمعہ کو وہ اپنی دولہن کے ساتھ تشریف لائیں اور کھانا وغیرہ بھی یہیں کھائیں۔ مولوی صاحب نے دعاؤں اور شکریہ کے ساتھ ہماری دعوت قبول کرلی۔ جمعہ کے دن کا ہم بے چینی سے انتظار کررہے تھے مولوی صاحب کی دولہن کو دیکھنے کی آرزو رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ خدا خدا کرکے جمعہ آیا۔ صبح سے ہم لوگ بنگلہ پر کھڑے چلمنوں کی آڑ سے "مولوی صاحب کی سواری" کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے —— کوئی ساڑھے دس بجے ہوں گے، ہمارا دل خوشی سے اچھل پڑا جب ہم نے دیکھا کہ ایک زنانی ٹانگے کے سامنے مولوی صاحب ہاتھ میں ایک بڑی کشتی لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹانگہ پھاٹک میں داخل ہوا اور سارے بنگلے میں شور مچ گیا۔" ارے مولوی صاحب کی دولہن آئیں" چھوٹے بھائی جان ادھر سے دوڑے کہ مولوی صاحب کا استقبال کریں، باجی اور میں ادھر سے گرتے پڑتے بھاگے کہ مولوی صاحب کی دولہن کو اتاریں —— غرض ہم لوگوں نے مولوی صاحب کی دولہن کی تعظیم کی اور بہت احترام کے ساتھ ان کو بنگلہ پر لائے۔ والدہ صاحبہ، ہم اور مولوی صاحب کی دولہن ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ مولوی صاحب نیچے کے حصے میں والد سے گفتگو کرنے لگے۔ مولوی صاحب کی دلہن ہوں گی یہی کوئی سولہ سترہ سال کی۔ گوری تو نہیں البتہ کافی کھلا رنگ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، موزوں ناک نقشہ، بہرحال مولوی صاحب کی دولہن کافی نمکین تھیں۔ ہم نے سنا تھا کہ مولوی کو دولہن بیحد پسند ہے اور ان کو اپنی دولہن پر ناز ہے کئی مرتبہ بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی جان کے سامنے مولوی صاحب نے اپنی دولہن کی سلیقہ مندی اور اطاعت کی بڑی تعریف کی تھی —— اب مولوی صاحب کی

دولہن کو جو دیکھا تو ہم نے ایک حد تک مان لیا کہ مولوی صاحب کا اپنی خوبصورت دولہن پر ناز کرنا بجا ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کے لئے مولوی صاحب بھی اوپر تشریف لے آئے۔ میں اور باجی نے مولوی صاحب کو بڑے ادب سے سلام کیا اور مولوی صاحب نے دعائیں دیں اور نہایت شفقت سے گفتگو کرنے لگے مجھے فوراً وہ وقت یاد آگیا جب کہ آج سے کوئی چار سال پہلے ان ہی مولوی صاحب سے ہماری روح کانپتی تھی اور معمولی معمولی غلطی کے لئے سزا ملتی تھی۔ باجی نے پڑھتے پڑھتے میری طرف دیکھا کہ گوشمالی۔ بڑے بھائی جان سے کسی نے کہہ دیا تھا تو بڑے بھائی جان نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ نے سنا چار مینار دھوپ اور پانی سے خراب ہو رہا تھا تو اس پر لال اطلس کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے کیا یہ صحیح ہے اور مولوی صاحب نے غصے میں آکر کہ ان سے مذاق کیا جا رہا ہے بھائی جان کو پیٹ ڈالا ـــ مگر اب وہی مولوی صاحب تھے کہ ہم سے اتنی شفقت سے گفتگو کر رہے تھے۔ چار بجے مولوی صاحب اور ان کی "دولہن کو چائے پلانے کے بعد پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور اماں نے دولہن کے ہاتھ میں سلامی دی مولوی صاحب خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے اور ساتھ ہی کنکھیوں سے اپنی دولہن کو دیکھ رہے تھے۔

مولوی صاحب نے اپنی دولہن کی کچھ سرسری تعریف بھی کی۔ بے چاری دولہن جھینپ رہی تھی۔ غرض شام کے کوئی چھ بجے مولوی صاحب اور ان کی دولہن اپنے گھر کو سدھارے جاتے وقت مولوی صاحب نے ہم لوگوں کو بہت کچھ دعائیں دیں ـــ مولوی صاحب کے جانے کے بعد ان کے اور ان کی دولہن کے متعلق بہت کچھ باتیں ہوئیں۔ کسی نے کہا کہ مولوی صاحب تو پچاس برس کے اور دولہن اتنی جوان ـــ والدہ نے مولوی صاحب کی "دولہن کی طبیعت کی تعریف کی ہم لوگوں نے ناک نقشہ کی، بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی جان نے مولوی صاحب کی قسمت کی، مگر ایک منہ پھٹ ماما نے صاف کہہ دیا ـــ "مٹی پڑو دونوں کا کچھ جوڑا نہیں ہے" "چلو چپ بیٹھو" باجی نے ماما کو ڈانٹ بتائی۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے جو کشتی لائی تھی اس کو کھولا گیا تو اس میں مٹھائی اور آم تھے۔ انھوں نے ناحق تکلیف کی ـــ مولوی صاحب تو اپنی دولہن سے بہت خوش خدا جانے دولہن بھی خوش ہے یا نہیں ہماری دلی دعا ہے کہ مولوی صاحب اور ان کی دولہن ہمیشہ خوش رہیں

سیدہ حسن علیخاں

اطلاع :- جن خریداروں کے چندے ختم ہو چکے ہیں۔ براہ کرم وہ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں یا دفتر کو وی پی کرنے کا آرڈر دیں۔ اگر ایک ہفتہ کے اندر کوئی جواب نہ ملے تو رسالہ وی پی کردیا جائے گا۔ وی پی حاصل کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا۔

محنت اور کوشش

اس پُر آشوب زمانے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری پستی کی وجہ کیا ہے۔ ہماری جہالت کے اسباب کیا ہیں۔ ہم کیوں ذلت و گمنامی کے غار میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہم کیوں دنیا کی نظروں میں ذلیل اور ناکارہ ثابت ہو رہے ہیں۔ آج ہم کیوں دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں سب سے پیچھے ہیں۔ اگر دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے بچپن کے حالات پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں اکثر غریب تھے۔ لیکن آخر میں اپنی محنت کے پھل سے کچھ سے کچھ ہوگئے۔ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جو محنت و کوشش کے آگے غیر ممکن ہو۔ جس نے محنت و کوشش کی اس نے اس کا پھل بھی پایا۔ مثلاً چند نام پیش کئے جاتے ہیں۔

ہومر۔ یونان کا شاعر جو دنیا میں مشہور ہے آج دنیا اس کو سب سے بڑا شاعر سمجھتی ہے۔ گر اس کے بچپن کی حالت یہ ہے کہ اس کا باپ معمولی کسان تھا اور بڑی مشکل سے گزر بسر کرتا تھا۔

ورجل۔ اٹلی کا بہت ہی بڑا آدمی تھا۔ آج اٹلی والے اس کا نام لے کر فخر کرتے ہیں لیکن یہ ایک تلی کا بیٹا تھا۔

شکسپیر۔ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر اور فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک قصائی کا بیٹا تھا۔

نپولین اعظم۔ ایک معمولی سپاہی کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن مرتے وقت فرانس کا بادشاہ تھا۔

جوزیفائن۔ ایک تمباکو فروخت کرنے والے کی لڑکی تھی جو اپنی قابلیت سے فرانس کی ملکہ ہوگئی۔

جنرل گرانٹ۔ ایک غریب چمار کا لڑکا تھا۔ لیکن اپنی محنت و کوشش سے حکومت امریکہ کا صدر (بادشاہ) منتخب ہوا۔

کیتھراین۔ جو شاہی فوج میں ایک خادمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ روس کی ملکہ بن بیٹھی۔

غرض کہ اس قسم کے سیکڑوں لوگ غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ لیکن جب مرے تو دنیا کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ شاید بعضوں کا خیال ہوگا کہ وہ زمانہ دوسرا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

ترکی کے مصطفیٰ کمال، اٹلی کے مسولینی......
......کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ کون تھے؟ مصطفیٰ کمال مرحوم (جو اتاترک یعنی ترکوں کے باپ کہلاتے ہیں) ایک معمولی سپاہی زادہ تھے۔ مسولینی ایک لوہار کا لڑکا ہے....... رضا شاہ پہلوی ایران کا بادشاہ ایک معمولی سپاہی تھا۔ اور چین کا چانگ کائی، روس کا اسٹالن، برطانیہ کے میکڈانلڈ، بالڈون، چمبرلین۔ جو یکے بعد دیگرے سرکار برطانیہ کے وزیر اعظم ہوگئے یہ کیا تھے؟ یہ بھی ایک معمولی درجہ کے آدمی تھے لیکن اپنی انتھک کوششوں اور محنتوں سے ان لوگوں نے اپنی عزت اور اپنے اقتدار کو اتنا بڑھایا کہ آج دنیا کی حکومتیں ان کے سامنے اپنا سر جھکا رہی ہے۔ اس لئے اپنے ارادوں کو بلند رکھو۔ ہمت سے کام لو۔ محنت اور کوششوں سے کمال پیدا کرو تو ضرور محنت اور کوشش کا پھل تم کو بھی ملے گا۔

محمد تاج الدین

نافرمان فرشتہ

جھم جھم مینہ برس رہا تھا۔ اور پانی کے ننھے ننھے قطرے کنول کے پتوں پر ناچ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک پارہ ہے کہ رہ رہ کر تھرک رہا ہے۔

ایسے وقت ایک ننھا فرشتہ آسمان سے جھانک رہا تھا۔ اسے ہزاروں، لاکھوں بجلی کے چراغ جگمگ کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ننھے فرشتے کے دل میں خوبصورت دنیا کی سیر کا خیال ہوا۔ دوڑ کر ایک دوسرے فرشتے کے پاس گیا۔ اور کہا "دوست! دیکھتے ہو۔ آج دنیا کتنی بھلی دکھائی دے رہی ہے" دوست نے کہا "ہاں۔ دنیا دور ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ نزدیک جاکر دیکھو تو وہ بڑی ہی خراب ہے۔" ننھا فرشتہ یہ سن کر کسی قدر پریشان ہوگیا۔ اور سوچنے لگا کہ آخر دنیا قریب سے بری کیوں ہوگی۔ جب اسے ان باتوں پر یقین نہ آسکا تو وہ دوڑتا ہوا اپنے دوسرے دوست کے پاس گیا۔ اس نے کہا "کیوں بھئی تم ہانپ کیوں رہے ہو۔ کیا کوئی ضروری کام ہے؟" ننھا فرشتہ اس وقت اس سے کچھ کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ البتہ تھوڑی دیر دم لے کر کہا "آپ نے سنا۔ ابھی میرے ایک دوست یہ کہتے تھے کہ دنیا دور ہی سے اچھی ہے لیکن اسے نزدیک جاکر دیکھو تو بڑی خراب ہے۔ کیا یہ سچ بات ہے؟" یہ سن کر ننھے فرشتے کا دوست کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے کہا "ہاں۔ دنیا بڑی خراب جگہ ہے" لیکن ننھا فرشتہ یہ سن کر خاموش نہ رہ سکا۔ اس کے دل میں دنیا کی سیر کا خیال چٹکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے چین ہوکر کہا "لیکن یہ آپ نے کیسے معلوم کرلیا کہ دنیا نزدیک سے بہت خراب ہے" جب فرشتے نے دیکھا کہ وہ کسی طرح خاموش نہیں رہتا تو اس نے اپنا دنیا کے سفر کا واقعہ سنانے لگا۔ فرشتے نے کہا "آج سے سو سال پہلے کا ذکر ہے اسی طرح جیسے مجھے ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ چلو آج دنیا کو ذرا نزدیک سے دیکھ آئیں۔ یہ خیال کرکے میں اسی وقت دنیا کی طرف چل پڑا۔ اور تھوڑی دیر میں ایک عالیشان محل کی چھت پر اتر گیا۔ وہ محل کسی بڑے بادشاہ کا تھا۔ جب میں اس کے اندر داخل ہوا۔ تو وہاں مجھے کئی خوبصورت خوبصورت چیزیں دکھائی دیں۔ محل کے دروازے اور اس کی دیواروں پر رنگا رنگ کے بیل بوٹے اور ہیرے جواہر لگے ہوئے تھے۔ اور بجلی کی روشنی سے سارا محل جگمگ جگمگ کررہا

تھا۔ کمروں میں نرم نرم صوفوں پر کچھ انسان بیٹھے خوشیاں منا رہے تھے۔ یہ سن کر ننھے فرشتے نے کہا "پھر اتنی اچھی دنیا خراب کیوں ہے؟" فرشتے نے کہا "ابھی یہ قصہ تو سن لو۔ اس کے بعد تم جو چاہو پوچھو۔ میں اس کا جواب دوں گا" اس کے بعد فرشتے نے کہا "ہاں تو اس عالیشان محل کو اچھی طرح دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اور پھر وہاں سے شہر کی سیر کو نکل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ اتفاق سے مجھے بہت سے انسان دکھائی دیے اور ایک بوڑھا میرے قریب سے گزرا۔ یوں تو اس کی عمر کوئی زیادہ نہیں تھی۔ مگر کمزوری کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر میں رعشہ پڑ گیا تھا۔ وہ کمزور انسان اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لکڑیوں کا ایک وزنی گٹھا سنبھالے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اسی وقت کہا "کیوں بھائی تم نے اتنا وزن کیوں اٹھا لیا ہے؟" یہ سن کر کمزور انسان نے کہا "بھائی ہم غریب ہیں۔ اگر وزن نہ اٹھائیں تو کھائیں کیا؟ الٰہی محنت مزدوری سے جو کچھ مل جاتا ہے بس اسی سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پلتا ہے" یہ کہہ کر غریب انسان تو چلا گیا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دنیا میں ہمدردی کا نام نہیں وہاں امیر آدمی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور غریبوں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اس لئے یہ دنیا بڑی خراب ہے"

یہ قصہ سنا کر وہ تو اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ننھا فرشتہ چپ چاپ وہاں سے واپس ہو گیا اب وہ ان باتوں پر غور کرنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دوست اس کو دنیا کی سیر سے اس لئے منع کر رہا ہے کہ وہاں غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس نے خیال کیا۔ میں تو غریب نہیں ہوں۔ مجھے غریبوں سے مل کر کیا کرنا ہے، اور ساتھ ہی آسمان سے نکل پڑا۔ اڑتے اڑتے تھوڑی دیر میں وہ ایک اچھے سے شہر میں جا پہونچا۔ اچھے اچھے مکانات اور محلات دیکھے۔ خوبصورت خوبصورت باغوں کی سیر و تفریح کی۔ اور اس کے بعد ایک محلے میں داخل ہوا۔ اتفاق سے وہاں چند اوباش لڑکے کھیل رہے تھے۔ یہ بھی آخر بچہ ہی تھا۔ اس لئے بچوں کا کھیل دیکھنے کے لئے رک گیا۔ دل میں خواہش ہوئی کہ چلو ان کے ساتھ مل جل کر کھیلیں۔ مگر ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں ایک لڑکے نے کہا "آؤ دوست چور کا کھیل کھیلیں۔ خاموش کیا کھڑے ہو۔"

ننھا فرشتہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کی منہ مانگی مراد پوری ہوئی تھی۔ پھر وہ جلدی سے ٹوپی، جوتا، اتار کھیل میں لگ گیا۔ اس واقعہ کے بعد سے ننھے فرشتے کا دل برے لڑکوں کی صحبت میں ایسا لگ گیا کہ پھر وہ آسمان کو بالکل ہی بھول گیا۔ اور بچپن سے چوری کی

کھیل کھیل کر جب وہ بڑا ہوا تو پکا چور ہوگیا۔ اور کئی دفعہ جیل کی ہوا کھائی۔

عزیز بچو! ننھے فرشتے کی کہانی سے تم کئی سبق لے سکتے ہو۔ ایک تو یہ کہ بری صحبت میں بیٹھنے سے آدمی کیا فرشتہ بھی چور اور بدمعاش ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو بڑوں کا کہا نہیں مانتے انھیں فرشتے کی طرح زک اٹھانی پڑتی ہے۔

اور تیسرے یہ کہ فرشتے دنیا میں غریب آدمیوں کا برا حال دیکھ کر اُسے خواب سمجھتے ہیں۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ ہمیشہ نیک اور اچھی صحبت اختیار کریں بڑوں کا کہا مانو اور غریبوں اور محتاجوں کی مدد کیا کرو تاکہ تمھاری دنیا فرشتوں کے نزدیک ایک اچھی جگہ کہلائے۔

افضل عابدی

مناجات

ہو علم اور ہنر سے ہر مرد و زن کا چرچا
یارب رہے ہمیشہ ملکِ دکن کا چرچا

اس ملک کی زمیں کو حاصل ہو ایسی نعمت
بھولے ہر ایک انساں چرخِ کہن کا چرچا

ہو اتفاق و الفت ملکِ دکن میں ایسی
صادق ہو جس کے آگے اک جان دو تن کا چرچا

پیدا ہوں پھر دکن میں ثانیٔ میر و غالب
تازہ ہو پھر جہاں میں باغِ سخن کا چرچا

دارائے ہفت کشور یارب ہوں شاد عثماں
ہوتا بہ چرخِ ہفتم شاہِ دکن کا چرچا

تیری زبانِ مبارک مقبول یہ دعا ہو
معصوم ہو جہاں میں تیرے سخن کا چرچا

سید عباس حسینی معصوم

شہنشاہ اورنگ زیب

شہنشاہ عالمگیر کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ ان کا اصلی نام غازی محی الدین اورنگ زیب ہے۔ ہندوستان پر سیکڑوں بادشاہوں نے حکومتیں کیں۔ لیکن اورنگ زیب کا نام بہت مشہور ہوا۔ بچپن ہی سے یہ بہت ذہین تھے۔ جب یہ بیس برس کے تھے تو ان کے والد شاہ جہاں نے ان کو دکن کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور وہاں کے سارے انتظامات ان کے سپرد کر دیے انھوں نے اس چھوٹی سی عمر میں دکن کا بہت اچھا انتظام کیا۔ دولت آباد پہنچ کر بہت سارے قلعے اور عالی شان عمارتیں بنوائیں بڑے بڑے بازار اور شہر آباد کئے' ہماری ریاست کا مشہور شہر اورنگ آباد ان ہی کا بسایا ہوا ہے۔ اور ان ہی کے نام سے مشہور ہے۔ جب باپ کا انتقال ہوا تو باپ کی جگہ بیٹے نے تخت سنبھالا اور شہنشاہ ہند کہلائے۔ اس وقت عالمگیر کی عمر چالیس برس کی تھی۔ ان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد ان کے دوسرے بھائی بادشاہت کے لالچ میں ان سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ایک عرصہ تک بھائی بھائی میں خوب لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن آخر میں جیت اورنگ زیب کی رہی۔ لڑائیوں سے فرصت پاکر یہ اپنی سلطنت کے انتظام اور توسیع کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس کے لئے عالمگیر کو بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں لیکن آخر میں ہمیشہ فتح اورنگ زیب ہی کو نصیب ہوئی۔

عالمگیر کے زمانے میں مغلوں کی سلطنت خوب پھلی پھولی ان کا ستارا خوب چمکا۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک سارے ہندوستان پر اس مغل شہنشاہ کا جھنڈا لہراتا تھا۔ عالمگیر کو صرف ملک فتح کرنے کا ہی شوق نہ تھا بلکہ وہ ملک اور رعایا کی بھلائی کے لئے خوب جی کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے عالمگیر کو اپنا کام دوسروں پر چھوڑنے کی عادت نہ تھی وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی خود ہی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے ان کا سارا وقت ملک کی بہتری کی نئی نئی اور اچھی اچھی تدبیریں سوچنے میں گزرتا۔ لوگوں کی فریاد خود سنتے اور خود انصاف کرتے ان کے زمانہ میں ہر امیر اور غریب چین سے زندگی بسر کرتا تھا۔ بادشاہ کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ خود پڑھے لکھے تھے اور پڑھے لکھوں کی قدر کرتے تھے ان کے دربار میں اچھے اچھے آدمیوں کا جمگھٹ رہتا۔ لیکن بچو تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اورنگ زیب کو کھیل کود کا بالکل شوق ہی نہ تھا ــــ نہیں۔ اورنگ زیب تو بہت بہادر تھے وہ مردانہ کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ شاہ جہاں ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ عالمگیر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ مست ہاتھی لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہاتھی بگڑ گیا۔ ایک ہڑبڑ مچ گیا۔ ایک یہاں بھاگا' ایک وہاں بھاگا۔ لیکن اورنگ زیب اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ستون کی طرح وہیں کھڑے رہے۔ ہاتھی ان ہی کی طرف لپکا لیکن اورنگ زیب نے اس ہاتھی کا بڑی مردانگی سے مقابلہ

کیا اور بچ گئے۔ یہ تو صرف چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ان کی زندگی ایسے بہت سارے واقعوں سے بھری پڑی ہے۔ جب تم بڑے ہو گے تو خود کتابوں میں پڑھ لو گے۔

اورنگ زیب نے اکیاس برس حکومت کی اور نواسی سال کی عمر میں ہندوستان کے اس سب سے بڑے شہنشاہ نے انتقال کیا۔ خلد آباد کی چھوٹی سی بستی میں یہ شہنشاہ ہمیشہ کے لئے سنگ مرمر کی ایک قبر کے نیچے سو رہا ہے۔

چاروں طرف سنگ مرمر کی چار دیواری ہے۔ قبر کے قریب ایک کتبہ ہے جس پر اس شہنشاہ کا نام کندہ ہے۔ اور دوسرا ایک سیاہ پتھر ہے جس پر کتبہ لکھا ہوا ہے۔ قبر کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا درخت قبر پر سایہ کئے ہوئے ہے کہنے کو تو اورنگ زیب کو مرے ہوئے آج تین سو برس ہو گئے لیکن ان کا نام اور کام آج تک زندہ ہے اور رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

صفی اللہ
(چادر گھاٹ ہائی اسکول)

ناقابل اشاعت مضامین اور نظمیں

حسب ذیل مضامین اور نظمیں بچوں کے سب رس میں شائع نہیں ہوں گے۔ مضمون نگار بھائی اور بہن ٹکٹ بھیج کر اپنے مضامین اور نظمیں حاصل کر سکتے ہیں۔

مضامین:۔ میری حکومت۔ مدرسہ کا پہلا دن۔ ان آنکھوں نے کیا دیکھا۔ ایک قصہ۔ سلور جوبلی۔ کام کی باتیں۔ سچی کہانی۔ جھوٹ کی سزا۔ قاضی صاحب۔ میری کہانی۔ بچپن اور جوانی۔ کھیل کی ضرورت۔ گدھے کی کہانی اسی کی زبانی۔ میں سوچتا ہوں۔ طالب علم کے اخلاق۔ پابندی رسوم۔ ایک وفادار گھوڑا۔ غریب ہی بہتر ہیں۔ بھوت۔ ہمارا سفر۔ پارسا شہزادہ۔ ایک غریب کی داستان۔ ہوا اور سورج کی لڑائی۔ ناگپور کا سفر۔ ماں باپ۔ ہمارے تعلقات۔ بچہ۔ ایک بندر اور بلی کی کہانی۔ فضیلت علم۔ ایک بچہ کا خواب۔ مسلمانو غفلت کی نیند سے جاگو۔ بے وفا کے نام۔ کاش میں اس زمانہ میں پیدا ہوتا۔ نشہ۔ مرزا کا کوا۔ ایک عجیب افسانہ۔ نشہ بازی۔ معظم جاہی مارکٹ۔ ایک دن کا روزنامچہ۔ جنون کا شہزادہ۔ اخلاق۔

نظمیں:۔ ننھی چڑیا۔ علم کے دیوتا سے۔ قانون۔ حسد حسمد۔ غزل۔ پیاری ماں کی جدائی۔ بچہ۔ نعمت ہے۔ غزل۔ طلباء سے خطاب۔ پروانہ۔ بارش۔ جوش دکن سوز فرقت۔

(باقی آئندہ)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰ ہد
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۱۲)
ڈسمبر ۱۹۴۰ء

سب رس

جلد ۳ — بابت ڈسمبر ۱۹۴۰ء — شمارہ ۱۲

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ نعمت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا

اداریہ

اس شمارے کے ساتھ سب رس کا تیسرا سال ختم ہو جاتا ہے آیندہ شمارہ چونکہ چوتھے سال کا پہلا شمارہ ہونے کی وجہ سے سب رس کا سالگرہ نمبر ہوگا اس لئے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ اس کے تمام تر مضامین ریڈیو سے متعلق ہوں گے جو اور تصویریں بھی بہت زیادہ ہوں گی۔ یہ سالنامہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں ناظرین سب رس تک پہنچ جائے گا۔

سال کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سب رس کی ترتیب میں بھی کئی اہم تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ اب تک سب رس کے ساتھ بچوں اور طلبا کا حصہ بھی شریک رہتا تھا لیکن ۱۹۴۱ء سے یہ حصہ سب رس میں شریک نہ رہے گا۔ بلکہ مستقل طور پر ایک علحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہوا کرے گا۔ اس طرح آیندہ سے سب رس میں صرف وہی علمی و ادبی مضامین نظمیں اور افسانے شریک رہیں گے جن کا معیار بلند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ شمارہ کے صفحہ ۶۵ اور اس اشاعت میں تقریباً ایسے بیسیوں مضامین نظم و نثر کی فہرست درج کر دی گئی ہے جو سب رس کے پیش نظر معیار پر نہیں اتر سکتے اور جو آیندہ کے بلند تر معیار کے لحاظ سے ہمارے لئے بے کار ہو گئے۔ ان کے مصنفین و مولفین اگر چاہیں تو ٹکٹ روانہ کر کے یہ مضامین واپس طلب کر سکتے ہیں۔

آیندہ سے مضامین اور نظمیں اور غزلیں روانہ کرتے وقت ہمارے قلمی معاونین کو اعلیٰ معیار کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ہوگا۔ سب رس کے علاوہ جو اصحاب بچوں کے سب رس کے لئے مضامین ارسال کرنا چاہتے ہوں وہ اصل مضمون کے علاوہ لفافے ہی پر اس کی وضاحت فرما دیں۔ بچوں اور طلبہ کے سب رس میں وہی مضمون درج ہو سکیں گے جو ہماری نئی پود کے لئے کسی نہ کسی طرح سے مفید اور قابل مطالعہ ثابت ہوں گے۔ اس کے لئے مضامین بھیجتے وقت نوسکیہ مضمون نگار حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی ہر تحریر اشاعت کے لئے روانہ نہ کریں بلکہ کافی مشق و محنت کے بعد جو بہترین مضمون لکھا گیا ہو اس کو روانہ کریں۔

سب رس کی ترتیب میں ایک نمایاں تبدیلی یہ کی جا رہی ہے کہ شذرات اور ادارہ کی خبریں مضامین نظم و نثر کے آخر میں درج ہوں گی۔ اسی طرح حالات حاضرہ، نئی کتابوں کی اطلاعیں اور مطبوعات موصولہ پر تنقید یں التزام کے ساتھ آخری حصہ میں شریک رہیں گی۔ بہ حیثیت کی افسانوں، نظموں اور مفید مضامین کی فراہمی کے لئے خاص طور پر انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ علمی و ادبی مقالے بھی نہایت اعلیٰ پیمانے کے منتخب کئے جائیں گے۔ اس طرح سے توقع ہے کہ سب رس کا یہ سالیہ ایک خاص نا ئیدہ ثابت ہوگا۔

اس شمارے میں ادارے کے شعبۂ نسواں کے سالانہ جلسۂ عام کی تقریریں اور روئداد بھی شریک کی گئی ہیں۔ اس جلسہ میں حیدرآباد کی اکثر و بیشتر علم دوست اور اہل ذوق خواتین نے شرکت کی اور ان کی دلچسپی کے لئے ادارے نے اپنی مطبوعات اور دیگر علمی و ادبی ذخیرے کی خاص نمائش ترتیب دی تھی جس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اکثر مشہور خواتین کی قلمی تحریریں اور بیسیوں خطوط کے مرقعے وغیرہ پیش کئے گئے تھے۔

ادارے کے دوسرے شعبے بھی برابر کام کر رہے ہیں۔ شعبۂ زبان کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۲ مہر ۱۳۵۰ف منعقد ہوا تھا جس میں مولوی قاضی عبد الغفار صاحب، پروفیسر ضیاء الدین صاحب انصاری، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، مولوی سید محمد صاحب، نواب مرزا سیف علی خاں صاحب اور ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب نے شرکت کی۔ حسب ذیل امور طے پائے۔

(۱) یہ شعبہ اپنے رکن ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کو نوبل پرائز عطا کئے جانے پر انتہائی مسرت کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) دفتری اردو کے مسئلہ کو فی الحال ملتوی رکھا جائے۔

(۳) دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے مراسلہ کا جواب طلب کیا جائے۔

(۴) مدرسہ گونگے بہروں کے نام کی تبدیلی کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی تحریک پیش کی گئی۔ اور طے پایا کہ سررشتہ تعلیمات سے استدعا کی جائے کہ اس کا نام "اندھوں، بہروں اور گونگوں کا مدرسہ" رکھا جائے۔

(۵) محاوروں کی فہرست پروفیسر ضیاء الدین صاحب انصاری کے سپرد کی گئی تاکہ ان کی تشریح کے بعد شاعت عمل میں لائی جائے۔

(۶) دکھنی محاوروں سے متعلق مولوی جمال الدین حیدر صاحب کی مرسلہ دوسری فہرست نظر ثانی کے لئے قاضی عبدالغفار صاحب کے سپرد کی گئی۔

(۷) جمال الدین حیدر صاحب کو سب سے زیادہ دکنی محاورے اور کہاوتیں ارسال کرنے کے صلہ میں اس سال کے انعام میں مبلغ دس روپے کی مطبوعات ادارہ دی گئیں۔

(۸) شعبہ کے جلسوں میں مسلسل عدم شرکت کی بنا پر مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا نام رکنیت سے خارج کیا گیا۔

(۹) محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے سے عورتوں کی کہاوتیں جو کثیر تعداد میں انھوں نے جمع کی ہیں بذریعہ مراسلہ طلب کی جائیں۔

ادارے کے کتب خانہ میں ہر مہینے متعدد بیش قیمت کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ خریدی ہوئی کتابوں کو چھوڑ کر ذیل میں صرف عطیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نواب خواجہ اسداللہ خاں صاحب نے اپنے والد مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کی حسب ذیل کتابیں عنایت کیں جن میں سے اکثروں پر خود مہاراجہ کے دستخط اور ہدایتیں موجود ہیں۔

(۱) سفر شادنگر (۲) سفر نامۂ گلبرگہ (۳) جام جہاں نما (۴) سیر و سفر (۵) سیر پنجاب (۶) سیر آصف نگر (۷) آنکھ والا آنکھ والے کی تلاش میں (۸) ترانۂ شاد (۹) نغمۂ شاد (۱۰) کرشن کلا (۱۱) نور چشم (۱۲) گیان درپن (۱۳) نغمۂ مستانہ (۱۴) مجموعہ مناجات (۱۵) قومی لیڈر (۱۶) مثنوی سرو جوبار (۱۷) مثنوی آئینۂ وجود۔

مولوی عبدالرحمن صاحب مفید وکیل ہائیکورٹ نے اپنی دو کتابیں حبیب الیلاد اور قصیدہ بردہ سعید ترجمہ مفید عطا کیں۔

بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور صاحب نے تمدن، النساء، اشاعت اسلام وغیرہ کے کئی مختلف شمارے اور کتاب مظہر الاخلاق عنایت کی۔ ناظم صاحب ادارہ کی جانب سے ان سب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اس مہینے اردو امتحانات کی تعلیم کے لئے مختلف مقامات میں انتظام کیا گیا۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے تعلیم و تنظیم کا کام تن دہی سے انجام دے رہے ہیں جس سے توقع ہے کہ بہت جلد اس کام میں خاطر خواہ ترقی ہوگی۔ فی الحال حسب ذیل مقامات پر تعلیم کا انتظام ہو چکا ہے:۔

(۱) درسگاہ ادبیہ بیگم بازار (طبقۂ نسواں کے لئے بھی علحدہ انتظام ہے) (۲) درسگاہ شرقیہ یاقوت پورہ (۳) ادارہ علوم شرقیہ وکٹری پلے گراؤنڈ بیرون پل چادر گھاٹ (۴) مدرسہ تعلیم بالغات اڈیکمیٹ (۵) یتیم خانہ انیس الغربا نامپلی (۶) مکان بلقیس بانو صاحبہ (برائے نسواں) کنگ کوٹھی روڈ (۷) صحت منزل بارہ گلی (اردو عالم برائے نسواں)

"ادارہ"

محسوسات

بہار بن کے محبت نے جب پیام دئے
نسیم صبح نے پھولوں کے ہونٹ چوم لئے
تمہیں خبر بھی نہیں ہے مری نگاہوں نے
حریم ناز کے پردے اٹھا کے چھوڑ دئے
مجھے معاف کرے، شانِ رحمتِ باری
گناہ میں نے کئے اور بے شمار کئے
زمانہ موت سے اب اس قدر نہیں ڈرتا
ارے! یہ کس نے محبت کے راز کھول دئے
بہار، اوس، ہوا، موجِ نو، سرودِ ہزار
کسی نے بھی نہ چمن میں گلوں کے چاک سئے
خفا نہ ہوں تو میں اُن کی نگاہ سے پوچھوں
مجھے خمار سا رہتا ہے کیوں بغیر پئے
وہ خود بھی کہنے لگے دیکھ کر مری حالت
نہ اس طرح کوئی بے تاب ہو کسی کے لئے
کس اہتمام سے دیکھا مجھے جزاک اللہ!
کہ اک نگاہ میں نشتر ہزار توڑ دئے
خزاں بھی آئی مرے سامنے بہار بدوش
ترے تصورِ رنگیں نے خوب کام کئے
یہ کیا کہا کہ "ہم آئیں گے صبح ہونے دو"
مریضِ شامِ الم، صبح تک جئے نہ جئے
مرا فسانہ بھی اک یادگار ہے ماہرؔ
کہ میں نے موت کے اس زندگی کے کام لئے

ماہر القادری

پی اور جی

دنیا اور دنیا والوں کو — مذہب کے سب رکھ والوں کو
آنکھ دکھا اور جام چڑھا جا — نام بتا اور جام چڑھا جا
پینا ہے تو پی کر جی
جینا ہے تو پی کر جی
"پی" کی نظریں گھول کے پی لے — جے ساقی کی بول کے جی لے
پی لے پی لے جتنا چاہے — جی لے جی لے جتنا چاہے
پینا جینا ہے آ پی
جینا ہے تو پی کر جی
من کی چنتا منہ موڑے گی — دکھ کی ناگن دم توڑے گی
نشے میں آشا جھومے گی — تاروں کی چتون چومے گی
پینے والے جلدی پی
جینا ہے تو پی کر جی
پیمانے کی ریت مٹا دے — میخانہ ہونٹوں سے لگا دے
پھر یہ موسم کب آئے گا — آئے گا کیا ترسائے گا
اب "پی" بھی پی اور تو بھی
جینا ہے تو پی کر جی

الطاف مشہدی

ہمدرد

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھیں کرّوبیاں

عید کی شب تھی۔ اور نصف شب بھی تو گزر چکی تھی۔ آرام طلب نرم و گداز بستروں پر پڑے نیند کے مزے لے رہے تھے شہر کی گوناگوں دلچسپیوں میں یک گونہ کمی ہو چکی تھی۔ شہر سے دُور...... کچھ فاصلے پر...... ندی کے کنارے...... ایک شراب خانہ آباد تھا۔ جس کی سرگرمی میں ہنوز کوئی فرق نہ تھا۔ شرابی گروہ در گروہ بیٹھے مئے گلرنگ و گلنار کے مزے لوٹ رہے تھے۔

یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک شخص نقاہت یا کمزوری کی وجہ آہستہ آہستہ قدم بڑھائے مئے خانے کی طرف آرہا تھا...... یہ فقیر تھا...... جس کے بشرہ سے ظاہر تھا کہ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے تنگ آچکا ہے .... اس کا چہرہ بھوک کی شدت سے پژمردہ ہو چلا تھا۔ وہ اپنے پاس چند پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا جن سے اس نے اپنا جسم ڈھانک رکھا تھا...... کچھ نہ رکھتا تھا۔ ... وہ دن بھر امید کی روشن شمع تلے گھومتا رہا ...... مگر شہر کے ہنگاموں میں اس غریب کے لیئے ایک ٹکڑا روٹی کا میسّر نہ آسکا۔ ...... اب بھی وہ آشا کا سہارا لئے شراب خانے کی طرف روانہ تھا۔

فقیر مئے خواروں کے ایک گروہ کے سامنے رُکا...... اور نحیف آواز میں اس نے دست سوال بلند کیا "بابا کچھ خدا کی راہ میں دینا"۔

دفعتاً تمام شرابی فقیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے لگے...... فوراً ہی ایک لرزتی آواز سنائی دی...... "جا بابا کوئی اور خانہ ڈھونڈ" اور ساتھ ہی ایک دلکش قہقہہ فضا میں بلند ہوا......

اک تیر تھا...... جو کہ فقیر کے دل پر لگا ...... وہ چکرایا ...... سنبھلا ...... اور آگے بڑھا ...... یہ اس کے لیئے کوئی نئی بات نہ تھی ...... فقیر تمام شراب خانہ چھان مارا مگر کوئی بھی اس کے حالِ زار پر ترس کھانے والا نہ تھا...... وہ مئے خانہ پر آخری اور مایوسانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے واپس ہوا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر شرابخانہ کے ایک گوشہ پر رُکی جہاں ایک شخص بیٹھا جام پر جام چڑھا رہا تھا فقیر کی امید بندھ گئی اور کامیابی کی جھلک اس کی پیشانی پر نمایاں تھی ...... وہ بڑھا...... اس شخص کے پاس پہونچ گیا...... اور وہی سوال اس نے دہرایا" بابا کچھ خدا کی راہ میں دینا"

وہ شخص کچھ دیر تک مخمور نگاہوں سے فقیر کو دیکھتا رہا...... اور پھر فوراً ہی شراب سے بھرا ہوا پیالہ فقیر پر انڈھیل کر کہنے لگا...... "یہ لے تو بھی پی" اور اٹھ کر چلا گیا......

فقیر شراب میں شرابور کھڑا تھا...... کبھی وہ اپنے کو...... کبھی بھیگے ہوئے کپڑوں کو...... اور کبھی زمین پہ کی گری ہوئی شراب کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ایک کتا دوڑتا ہوا آیا اور گری ہوئی شراب کو چاٹنے لگا......

کچھ دیر تک فقیر اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتا رہا...... پھر یکایک کسی خیال سے چونکا اور اپنے بھیگے ہوئے دامن

پیالے میں شراب نچوڑنے لگا ------- کچھ دیر بعد -------
وہ نچوڑی ہوئی شراب کو اپنے منہ سے لگانا ہی چاہتا تھا کہ
اس کی نگاہ کتے پر پڑی ----- جو ملتجانہ نگاہوں سے
فقیر کو دیکھ رہا تھا ------- فقیر جھکا اور شراب کا پیالہ
کتے کے سامنے رکھ کر خود لڑکھڑاتا آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور
چلنے کے بعد فقیر کو محسوس ہوا کہ اس کا پاؤں کسی سرد شئے
پر پڑا تھا ------ وہ جھکا ------ سیدھا اٹھا ------
اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ تھا ------ امید کی ٹمٹماتی شمع
یکبارگی پھر سے روشن ہو گئی۔ فقیر کا چہرہ دفور مسرت
سے تمتما اٹھا ------ وہ وہاں سے چل پڑا۔ فقیر اپنے
ہاتھ میں روٹی لئے نان بائی کی دوکان کے سامنے کھڑا
تھا ------ اور وہ اس سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانا
چاہتا تھا کہ ------ اس کی نظر پھر اسی کتے پر پڑی۔ جو
نان بائی سے آنکھ بچا کر روٹی چرانے میں مصروف تھا ------
گر ظالم نان بائی نے اسے دیکھ لیا اور ایک لاٹھی اس
زور کی رسید کی کہ ------ کتا چکرایا ------ اور کچھ دور
جاکر گرا ------
فقیر بے تحاشا کتے کی سمت دوڑ پڑا ------ اور
اسے اٹھانے کے لئے جھکا ------ مگر کمزوری یا فاقہ
کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا ------ اور کتے کے بازو
گر پڑا ------ کتے نے شدتِ درد سے اپنا منہ کھول
دیا ------ ایک کمزور ہاتھ اٹھا جو لرز رہا تھا ------
دفعتاً کتے کے منہ میں روٹی پڑی ------ اور ایک
جھٹکے سے ہاتھ نیچے گر پڑا ------ کتے کا منہ ہمیشہ
کے لئے کھلے کا کھلا رہ گیا ------ اور
فقیر بے حس و حرکت پڑا تھا ------ دُور
فضا میں ایک پر درد نغمہ بلند ہوا۔

دھن والوں کی دنیا ہے یہ
نردھن کے ------ بھگوان

اس کے بعد

ہوائیں بند تھیں ------ فضا پر سکوت
چھایا ہوا تھا ------ آسمان پر بادل چھا
چکے تھے۔ ------ ندی کا پانی موجیں
بن بن کر ------ کناروں سے ٹکرا رہا
تھا۔

احمد علی خاں بدر

غزل

اب کے جنوں میں چاک گریباں نہ ہوسکا
کچھ اہتمام جشنِ بہاراں نہ ہوسکا

جینا طویل، خواب پریشاں نہ ہوسکا
خوش ہوں کہ دل کے درد کا درماں نہ ہوسکا

شکرِ جفائے یار سے فرصت نہیں ملی
دل وقفِ شکوہ سنجیٔ دوراں نہ ہوسکا

راہِ درازِ عمر اسیری میں کٹ گئی
لیکن دماغ عادیٔ زنداں نہ ہوسکا

حق بینیٔ نگاہ کے قربان جائیے
خاشاک پر گمانِ گلستاں نہ ہوسکا

اے وجدؔ کارہائے نمائش کئے نہیں
مجھ سے بھی تو کار نمایاں نہ ہوسکا

سکندر علی وجد

خطبۂ صدارت

محترمہ بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر

(جو شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کے اجلاس عام منعقدہ ۴ نومبر ۱۹۴۰ء کو لیڈیز کلب بشیر باغ روڈ میں پڑھا گیا) "سب رس"

معزز خواتین ۔ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کا یہ دوسرا سالانہ اجلاس ہے۔ اس کی صدارت کے لئے ارکان شعبہ نے مجھ کو جو منتخب کیا اس کی میں ممنون ہوں اس کا پہلا عام اجلاس دو سال قبل فروری ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا جس میں غالباً آپ میں سے کئی خواتین شریک تھیں اور اس طرح آپ نے ہمارا ساتھ دیا اور اس کام سے اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

یہ ادارہ تقریباً دس سال سے کام کر رہا ہے۔ اور اس عرصہ میں زبان اردو کی مختلف طریقوں سے اس نے خدمت کی ہے۔ منجملہ اس کے اس نے کئی ایک کتابیں تصنیف و تالیف کر کے ملک کے سامنے پیش کی ہیں۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ملک کی خدمت کرنے میں عورتوں کا بھی حصہ لینا ضرور ہے، ورنہ وہ خدمت پوری طرح انجام نہیں پا سکتی۔ جس طرح گاڑی کا وزن سنبھالنے کے لئے دونوں پہیوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہر نومبر ۱۹۳۸ء میں ادارۂ ادبیات اردو میں شعبۂ نسواں کا اضافہ کیا گیا اور اس شعبہ نے جس جوش اور سرگرمی سے کام کیا وہ قابل تعریف ہے۔ اس قلیل عرصہ میں یہ شعبہ حسب ذیل کتابیں تصنیف کر کے ملک کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔

(۱) نذر ولی ۔ یعنی ولی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق اور تبصرہ۔

(۲) نغمۂ دکن ۔ یعنی دکن سے متعلق اس ملک کی خواتین کی نظم و نثر کا مجموعہ۔

(۳) من کی بتیاں ۔ مصنفہ لطیف النساء بیگم صاحبہ جس میں متوسط طبقہ کی خواتین کے معاشرتی حالات درج ہیں۔

(۴) سوتیلی ماں ۔ اس کتاب میں رابعہ بیگم صاحبہ نے ہماری اجتماعی حالت اور اس کی کمزوریاں اور نقائص ظاہر کئے ہیں۔ اور اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے کے راستے بتائے ہیں۔

(۵) محمد حسین آزاد ۔ اس میں جہاں بانو بیگم صاحبہ نے آزاد کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اور ان کی تصنیفات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور کتابیں بھی زیر تالیف و طباعت ہیں۔

اس سے زیادہ خوشی کی یہ بات ہے کہ اس شعبہ کی جانب سے ایک مدرسۂ تعلیم بالغات اڈیکمیٹ میں قائم ہوا ہے۔ اس مدرسہ کا قیام ۱۹۳۹ء میں رابعہ بیگم صاحبہ کے مکان میں عمل میں آیا جس میں وہ اور سارہ بیگم صاحبہ مل کر تعلیم دیتی اور نگرانی کرتی ہیں۔ اس مدرسے نے تھوڑے عرصہ میں جو کامیابی حاصل کی وہ قابل مبارکباد ہے۔ اس میں سے سات طالبات جو ادارۂ ادبیات اردو کے امتحان اردو دانی میں شریک ہوئی تھیں وہ سب کامیاب ہوئیں۔ بلکہ ان میں سے ایک تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں سب سے

اول آئی اور تین نے امتیاز حاصل کیا۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ نصاب کی کتابیں امتحان سے صرف ایک ماہ پہلے مدرسے کو حاصل ہوئیں میں کارکنانِ مدرسہ کو ان کی اس محنت اور جانفشانی پر دلی مبارکباد دیتی ہوں جس سے انھوں نے یہ تری خدمت نمایاں کامیابی کے ساتھ انجام دی۔

ان پڑھ عورتوں کو لکھنا پڑھانا اور تعلیم یافتہ خواتین کو ادبی مشغلوں کی طرف راغب کرنا اور اہل قلم خواتین کی مدد کرنا یہ ایسے کام ہیں جن کی طرف اس شعبہ کی بڑھتی ہوئی سرگرمی اور اس کی مختلف ضرورتوں کے لئے اس کا قلیل سرمایہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے اور اس کے ارکان بھی بہت کم ہیں۔ اور یہ ملک کی اعزازی خدمت کرنے والا شعبہ آپ لوگوں کی ہر طرح کی اعانت کا محتاج ہے۔ لہذا میں امید کرتی ہوں کہ آپ لوگ سب مل کر اپنی مدد سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائیں گی

رقم جمع کرنے کے لئے شعبہ کی جانب سے عنقریب ایک کانسرٹ ہونے والا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ..... آپ سب لوگ مع اپنے دوست احباب کے اس کانسرٹ میں شرکت فرما کر شعبہ کی عملی طور پر مدد کریں گی ادارہ ادبیات اردو نے بعض امتحانات قائم کئے ہیں۔ مثلاً اردو عالم، اردو فاضل وغیرہ۔ ان امتحانات میں جن مستورات نے کامیابی حاصل کی ہے ان کو انعامات تقسیم کرنے کی خواہش مجھ سے کی گئی ہے۔ جس کو میں نے خوشی سے قبول کیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں یہ انعامات تقسیم کروں، میں ان امتحانوں کے فوائد اور ان کی اہمیت کے بارے میں چند الفاظ کہنا چاہتی ہوں۔ ہمارے ملک میں اب تک اردو زبان میں کوئی سند نہیں دیجاتی تھی اور جو لوگ اس زبان میں اچھی لیاقت اور استعداد رکھتے تھے ان کے پاس کوئی سند نہ ہونے کی وجہ سے ان کی لیاقت مستند نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب ان امتحانوں اور اسناد کے مقرر ہونے سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ اس کے سوائے لوگ ملک سے باہر جا کر اردو کے امتحانات دینے کی [illegible] اور خرچ میں کفایت ہوئی۔ امید ہے کہ ان اسناد کی وجہ سے بعض مستورات کو کسب معاش اور حصول ترقی میں بھی مدد ملے گی۔ اس طرح یہ امتحانات ملک اور اہل ملک دونوں کے لئے مفید ہیں۔ لہذا اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کو ایک سرکاری حیثیت دی جائے۔

خواتین! آج کل زمانہ ایسے کاموں کے لئے جو خلوص نیت کے ساتھ محض ملک کے فائدہ کے لئے کئے جائیں ناموافق ہے۔ اور ہم کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا مگر میں امید کرتی ہوں کہ ادارۂ ادبیات اردو اور خصوصاً اس کا شعبۂ نسواں اپنی متفقہ اور انتھک کوششوں سے سب مشکلات کو دور کر کے اپنے اعلیٰ مقاصد میں خدا کی مدد سے کامیاب ہوگا۔

شعبۂ نسواں کی رکنیت کے قواعد و ضوابط کے لئے معتمد شعبہ سکینہ بیگم رحمت اللہ کوہ نور کریم آباد جوبلی ہل سے مراسلت کیجیے

خطبۂ استقبالیہ

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں

محترمہ صدر صاحبہ اور معزز خواتین!

میں نہایت مسرت کے ساتھ آپ کا خیر مقدم ادا کرتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو شعبۂ نسواں کی سالانہ رپورٹ سنانے کا شرف حاصل کرتی ہوں۔ ہمیں اس کا افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر جس کی توضیح یہاں چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتی قبل ازیں سالانہ اجلاس عام کا بروقت موقع ہم کو حاصل نہ ہو سکا۔

شعبۂ نسواں کا انعقاد نومبر سنہ ۱۹۴۳ء میں عمل میں آیا تھا اس کی مجلس ابتداء میں جو صرف چار افراد، صدر معتمد و دو ارکان محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ و لطیف النساء بیگم صاحبہ پر مشتمل تھی رفتہ رفتہ حسب ذیل ارکان محترمہ سارہ بیگم صاحبہ و محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر۔ محترمہ جیلانی بیگم صاحبہ۔ محترمہ امیر بیگم صاحبہ، محترمہ خورشید بیگم صاحبہ اور حال ہی میں تصدق فاطمہ بیگم غلام حسن صاحبہ نے اپنی شرکت سے مجلس شعبہ کو ممنون فرمایا اور علاوہ چندۂ شرکت سالانہ مبلغ ٥ روپے کے ان میں سے بعض ارکان ماہانہ اختیاری امداد سے بھی شعبہ کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔

محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ۔ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر بہ حیثیت معاونین شعبہ شریک کار ہیں۔

مجلس شعبہ کے اجلاس مہینے میں کم از کم ایک بار یا بصورت ضرورت منعقد کئے جاتے ہیں۔ ہمارا پہلا اجلاس علم ۲۶ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۷ھ واقع حیدرآباد لیڈیز ایسوسی ایشن کلب مرحومہ لیڈی حیدری صاحبہ . . . . اور بیگم مہدی یار جنگ بہادر کی مشترکہ صدارت میں منعقد ہوا جس کی روداد سے اکثر ناظرات سب رس باخبر ہوں گی۔

میں یہاں اس امر کا اظہار فریضۂ امتنان و حق قدرشناسی خیال کرتی ہوں کہ اجلاس مذکورہ کے موقع پر بیگم صاحبہ امیر حسن نے اپنی دلپذیر تقریر میں ہمارے مقاصد کی تائید اور جذبات عمل کی تحسین فرماتے ہوئے قیام زنانہ کتب خانہ کے لئے چندہ ٥ روپے کا عطیہ عنایت کیا اور کتب سے مدد دینے کا وعدہ فرمایا۔ نیز بیگم صاحبہ ہمایوں مرزا نے اپنی امداد و اعانت کے وعدہ سے مترقب فرمایا اور خود ادارے نے سیکڑوں نسوانی کتابیں اور رسالے اس کتب خانہ کے لئے جمع کر لئے ہیں اور روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کتب خانے کا افتتاح عمل میں نہ آسکا جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی موزوں مقام میسر نہ ہو سکا اور اب تعمیر کے لئے سرمایہ موجود نہیں ہے۔ سرکار نے تعمیر مکان کی امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔ امید ہے کہ چند ماہ میں ہم افتتاح کتب خانہ میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اور یہ نسوانی کتب خانہ حیدرآباد میں اپنی آپ نظیر ہوگا۔ شعبۂ نسواں کا اساسی مقصد چونکہ ادبیات اردو کی ترقی ہے اس ضمن میں شعبۂ ہذا نے اپنے اجتہاد عمل کو برابر جاری رکھنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کیں۔ اور باوجود اس کے کہ مضمون بالا بدقسمتی سے عام رجحان ضروری توجہات حقیقی دلچسپی جاذب قلب و خیال کشش و دلبستگی سے محروم ہے میں کہنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ شعبۂ نسواں نے اتنے قلیل عرصہ میں باوجود ناموافق حالات کے معدودے چند اعضاء و ارکان کے ساتھ ایک ہمت افزا کامیابی حاصل کی۔ ازاں جملہ

پہلے میں شعبۂ نسواں کی تصانیف سن کی تھا۔ سوتیلی ماں، نذر کنہ نذر و لی۔ محمد حسین آزاد کو آپ سے متعارف کراتی ہوں جو اس اثناء میں طبع ہو کر پبلک میں روشناس ہو چکی ہیں۔ چند تصانیف زیر طبع ہیں۔ جو عنقریب شائع ہو جائیں گی۔ دوسرے تمام مدارس تعلیم بالغات ہے چونکہ اکثر اوسط اور اس سے کم طبقات میں باوجود میلان اور دلی رجحان کے معاشی اور معاشرتی مشکلات کے باعث ضروری تعلیم کی بھی تحصیل کے مواقع میسر نہیں آ سکتے۔ اس لئے شعبۂ ہذا کی ایک یہ اسکیم بھی تھی کہ غیر مستطیع نادار عورتوں کو کم از کم زبان اردو کی عام طور پر اتنی تعلیم اور ضمناً امور خانہ داری مثلاً ضروری حساب، سلائی۔ دست کاری، پخت و پز سے اس قدر واقفیت کروائی جائے کہ وہ اپنے خانگی کاروبار کو جس میں ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا راز بھی مضمر ہے، بہتر عنوان سے سرانجام کر سکیں۔ اور بہ وقتِ ضرورت بہ مصداق "بھرے کا سنگھار اور بھوکے کا آدھار" ذریعۂ روزی بنا کر اپنی معاشی حالت درست کر سکیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے مدنظر اجلاس ماہانہ کے تین جلسوں میں غور و فکر کے بعد یہ قرار داد منظور کی گئی کہ ہر محلے میں ایک ایسا مدرسہ قائم کرنے کی کوشش ہونی چاہیے جو مقاصد بالا کے لئے مفید ہو۔ سر دست میرے مکان کے ایک حصے میں اس قسم کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس کا تعارف کسی قدر تفصیل کے ساتھ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس امر کا اظہار کرنا چاہتی ہوں کہ مدرسۂ شعبۂ نسواں سلطان العلوم حضرت ظل سبحانی کی سالگرہ ہمایونی کے یوم مسعود غرۂ رجب المرجب ۱۳۵۸ھ م ۱۷ اگست ۱۹۳۹ء روز پنجشنبہ واقع محلہ اڈیکمیٹ پیکر وجود میں آیا جس کی ابتدا قرأت سے اور انتہا نظم تہنیت از بشیر النساء بیگم بشیر پر ہوئی۔ تعلیمی شوق کا یہ بین ثبوت تھا کہ پہلے ہی دن تیس کم سن و بالغ طالبات موجود تھیں۔ ... میں جو کہ مقصد تعلیم بالغات سے تھا۔ ذی شعور ۱۲ طالبات منتخب کی گئیں اور ہفتے میں تین بار چند گھنٹوں کے لئے ... صاحبہ کی زیر نگرانی تعلیمی کام شروع کر دیا گیا۔ ہفتہ میں ایک بار ملکہ بیگم صاحبہ نے سوزن کاری کے لئے اور پہلے ہی دن محبوب النساء بیگم بنت محمد یونس نے کھوان کے لئے اپنی مستقل امداد سے شعبہ کو ممنون کیا۔

زنانہ معلم کی طرح یہ بی خانسامان حمید بی نے بڑی حد تک ضرورت پوری پوری مدد پہنچائی ہے۔ مفت تعلیم کا انتظام ہی نہیں بلکہ سامان نوشت و خواند کے کیا گیا ہے ادارۂ ادبیات" کی امداد کے ساتھ شعبۂ ہذا جملہ مصارف کا بار جس کا تخمینہ لگا جس ... ہوتا ہے برداشت کر رہا ہے۔ ایک حیثیت سے مدرسہ کی حالت کو امید افزا نظر آتی ہے کہ مدرسہ کی حاضری گری ہوئی ہے گو ... خانہ داری پابندیوں کی شکار عورتوں سے اس قدر بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

مدرسے کے کام سے متعلق بعد معائنہ محترمہ بیگم نظر جنگ بہادر اور محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر نے اظہار پسندیدگی فرما کر ہمت افزائی کی۔

اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتہ میں مدرسہ ہذا کی ... طالبات نے امتحان اردو دانی ادارۂ ادبیات اردو میں شرکت کی اور آپ یہ سن کر خوش ہوں گی کہ ان میں سے ایک امجدی بیگم بنت محمد غوث صاحب جملہ (۲۹) امیدواران اردو دانی مرکز بلدہ و بیرون میں سب سے اول آئیں اور انعام بلدہ عطیہ سکینہ بیگم صاحبہ کی مستحق گردانی گئیں۔

عزیز بیگم بنت محمد غوث صاحب رفیع النساء بیگم سعید النساء بیگم بنت ابوالحسن صاحب نے بدرجۂ امتیاز کامیابی حاصل کی اور

ادارہ سے ایک ایک اردو کتاب کے انعام کی مستحق قرار پائی فاطمہ بیگم بنت محی الدین پاشا بیگم بنت داود صاحب اور حسینی بیگم نے کامیابی حاصل کی یہ تینوں اس لئے لائق ستائش ہیں کہ اپنی اور جان توڑ محنت کی وجہ سے زائد از لیاقت امتحان میں کامیاب ہوئیں۔ اور تعلیم بالغات کے نصاب کی کتابیں شایع ہوکر بمشکل ایک ماہ قبل مل سکی تھیں۔ اس وقت تک مروجہ نصاب کی کتابیں زیر تعلیم تھیں۔

میں اس سلسلے میں سارہ بیگم صاحبہ کا ذکر خصوصیت سے ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ یہ انہیں کی اصولی تعلیم اور باوجود عدم صحت ان کی پوری پوری محنت و توجہ کا حاصل ہے جس کے سب ارکان شعبہ نہایت ممنون ہیں۔ افسوس کہ مسلسل علالت کے باعث دو ڈھائی مہینے سے مدرسہ ان کے فیضان سے محروم ہے۔

سہولت کار کے پیش نظر حال ہی میں وسط ستمبر سے ایک مستقل ذمہ دار معلمہ حمید بی کا تقرر کیا گیا ہے۔

فروری ۴۹ء میں مدرسہ اناث بزم اقبال چلکل گوڑہ کا معاینہ کیا گیا جہاں دینیات کے ساتھ اردو تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ معاینہ سے یہ بات پائی گئی کہ طالبات بہت زیادہ تقریباً ۶۰ ہیں صرف ایک معمولی شخصیت و قابلیت رکھنے والی معلمہ گنجایش مکان بالکل ناکافی اس صورت میں کیا اطمینان بخش نتیجہ خیز تعلیم کی توقع ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ارکان شعبہ نے جس میں بہت زیادہ حصہ سکینہ بیگم صاحبہ کا ہے، نظامت تعلیمات سے معتدبہ رقم مبلغ چالیس روپیہ کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر افسوس پوری پوری کامیابی نہ ہوسکی۔ صرف بارہ روپیہ ماہانہ کی امداد منظور ہوئی اب مدرسہ مذکورہ معتمد شعبۂ نسواں کی زیر نگرانی قدرے سہولت کے ساتھ کام کرسکے گا۔

چوتھے محلہ اڈکمیٹ میں اس امر کے تجربہ سے کہ وہاں لڑکیوں کی تعلیم کا قطعاً انتظام نہیں ہے اور اکثر ملازمین سرکار متعلقہ جامعہ عثمانیہ تعمیرات کار سرکاری کی وجہ سے وہاں قیام کرنے پر مجبور ہیں۔ مدارس سے دوری اور دیگر سہولتیں فراہم نہ ہونے سے ان کی لڑکیاں حصول تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔

ایک مدرسہ اناث کی سخت ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ نظامت تعلیمات میں اس کی تحریک پیش کی گئی ہے جو زیر غور ہے۔

گو ہماری بڑی خواہش و کوشش ہے کہ یہ دونوں مدرسے شعبے ہی کی زیر سرپرستی و زیر نگرانی رکھے جائیں مگر اعزازی کام کرنے والوں کے بہم نہ پہنچ سکنے اور رقمی نقصان کی وجہ سے یہ ارادہ صورت پذیر نہ ہوسکا۔ مجھے امید ہے کہ شعبہ اپنے جوش عمل کو بحد امکان بیدار رکھنے کی کوشش کرے گا اور جذبۂ کار اور درد قومی سے مملو احساسات رکھنے والی خواتین سے بھی مترقب ہوں کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شعبۂ ہذا کے ساتھ امکانی تعاون کرکے اسے ممنون فرمائیں گی۔ ادارۂ ادبیات اردو اپنی دس سالہ سرگزشت شایع کررہا ہے۔ جس میں ادارہ کے مختلف شعبوں شاخوں اور دیگر مصروفیات کا تفصیلی تذکرہ درج ہے۔ اس شعبہ میں شعبۂ نسواں کی خدمات اور اس کے متعلق مکمل معلومات درج ہیں۔ یہ سرگزشت عنقریب شایع ہوکر منظر عام پر آجائے گی اور اس کے مطالعہ سے یہ واضح ہوجائے گا کہ ادارہ نے ملک اور اہل ملک میں علمی ذوق اور ذہنی بیداری پیدا کرنے میں کس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور بالخصوص حیدرآباد کی خواتین میں علمی و ادبی چہل پہل اور ذوق عمل پیدا کرنے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے چونکہ انفرادی کوششوں سے زیادہ اجتماعی کوششیں بارآور ثابت ہوتی ہیں، اس لئے میں تمام خواتین سے استدعا کرتی ہوں کہ وہ جلد از

جلد شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کی رکن بن جائیں اور اپنی قابلیتوں کو ایک مرکز پر لاکر ملک اور اہل ملک کو مستفید ہونے کا موقع دیں۔ شعبۂ نسواں ہی ایک ایسی بزم ہے جہاں سے خواتین کی تصنیفات اور ان کی قلمی کاوشوں کو زیور طبع سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علمی و ادبی کاموں میں صحیح مشورہ دے کر ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ خواتین کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کی مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ غرض اپنے طبقہ کی ہر جہتی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لے کر خوش گوار نتیجے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میں محترمہ بیگم مہدی یار جنگ بہادر کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے آج کرسی صدارت اور تقسیم انعامات کو قبول فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے۔ اب میں شاہ ظل اللہ اور خانوادۂ آصفیہ کے لئے بصدق دل دعا کے ساتھ اپنی رپورٹ کو ختم کرتی ہوں کہ بار الٰہی ہمارے سلطان اور سلطنت کو تا دیر سلامت اور ممتاز رکھے۔

مى کند ما نقطاء دعائے دلبرا آمین بگو

نذر دکن کے متعلق رائیں

ادارۂ ادبیات اردو کو ایک نمایاں شہرت حاصل ہے۔ اس کے زیر سرپرستی مشہور خواتین دکن کی ایک علمی انجمن بھی قائم ہے۔ اس انجمن کی بدولت آج وہاں کی خواتین بھی حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ خدمت علم و ادب میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ بزم خواتین کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے سب رس کا خواتین نمبر "نذر دکن" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں شروع سے لے کر آخر تک جتنے مضامین اور نظمیں درج ہیں سب کا معیار بلند ہے۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہماری خواتین میں بھی علم و ادب کا صحیح اور سلجھا ہوا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں جس محنت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے ہم اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لائق ہے۔

شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی مدیر شاہکار لاہور ۱۹۳۹ء

اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سب مضامین خواتین کے لکھے ہوئے ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ خوب ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کس قدر قابل داد ہیں کہ اس نے خواتین کی ایک بڑی جماعت میں ادبی رجحانات پیدا کر دئے ہیں۔ "شاعر" کے ناظرین اپنی خواتین کے لئے "نذر دکن" کی ایک ایک جلد منگا دیں تاکہ وہ بھی دکن کی اس بیداری سے متاثر ہو سکیں۔

جناب اعجاز صدیقی شاعر آگرہ اگست ۱۹۳۹ء

نذر دکن ان ۲۹ مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو خواتین دکن نے زیادہ تر حیدرآباد دکن کے متعلق لکھے ہیں۔ مجموعہ میں کئی مضامین دلچسپ، مفید اور پر از معلومات ہیں۔

مولانا رازق الخیری عصمت دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

اُردو کی لاج

(شعبۂ نسواں" ادارۂ ادبیات اردو کے اجلاس عام کے موقع پر)

زہے نصیب! ہمارا یہ شعبۂ نسواں
ادارۂ ادبیات کا ہے روحِ رواں

ترقیوں پہ ہیں کیا کیا ترقیاں اس کی
سنائی دیتی ہے ہر سمت داستاں اس کی

ہے اس کے پھولوں سے تزئینِ گلستانِ ادب
اور اس کے تاروں سے روشن ہے آسمانِ ادب

کیا وہ کام ہے چھوٹی سی عمر میں اس نے
معمّروں کو بھی شرمندہ کردیا جس نے

کئی کتابوں سے دنیا کو روشناس کیا
زبانِ اردو کو اس نے نکوا ساس کیا

ہے آج چوتھی نومبر کو اس کی سالگرہ
خدا کرے کہ ہو ہر سال یوں ہی سالگرہ

نہیں دکن کے زن و مرد ادب حلقہ بگوش
ادارۂ ادبیات میں ہوں دوش بدوش

بلادِ ہند میں اُردو کا بول بالا ہو
دکن کی شمع سے چاراور" پھر اُجالا ہو

"شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجا مری یارب قبول ہو جائے!

— ۲ —

دھڑکتے دل سے حقیقت بھی کچھ بیاں کردوں
دبی زبان سے کچھ شکوۂ زباں کردوں
عیاں ہے سب پہ جو حالت ہے آج اردو کی
یہ اب ادیبوں کے ہاتھوں ہے لاج اردو کی
برائے اردو ہے درکار آپ کا احساں
کہ اتحاد سے ہوتی ہیں مشکلیں آساں
زبان ایک کرشمہ ہے زندگانی کا
ادب وسیلہ ہے فطرت کی ترجمانی کا
زباں کی قدر میں خود اپنی قدر دانی ہے
زباں کے رشتے سے مربوط زندگانی ہے
جو اس کا آپ کو اندیشۂ زیاں نہ رہے
تو آپ کی یہ زباں آپ کی زباں نہ رہے
زباں نہ ہو تو ادب کا کوئی وقار نہیں
ادب نہ ہو تو زباں کا کہیں شمار نہیں
صعوبتوں سے مگر تنگ دل نہ ہوں رہرو
"کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو"
مجھے یقین ہے جب تک ہے یہ دکن باقی!
جیے گی اردو کہ اردو کا ہے وطن باقی!

بشیر النساء بیگم بشیر

شعبۂ نسواں

(تقریر اجلاس عام)

صدر محترم اور میری عزیز بہنو!

میں سب سے پہلے اس معبود حقیقی کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں جس کی بے پایاں رحمت کے صدقے سے آج ہم کو پھر عالم صحت و سلامتی میں ایک جگہ جمع ہونے اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کا دوسرا اجلاس عام منانے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ حقیقت میں یہ ہماری بہت بڑی خوش نصیبی ہے ورنہ سے

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

میرا دوسرا خوشگوار اور مبارک فریضہ اپنی مسلمان اور ہندو بہنوں کی خدمت میں ان کے قومی تہواروں دیوالی اور عید الفطر کی مبارکباد پیش کرنا ہے۔ دعا ہے کہ خدا کرے ہم اور ہماری نسلیں صدیوں تک اسی اتحاد و یگانگت کے ساتھ مل جل کر عیدیں منائیں اور اپنی ملکی روایات کو اپنے عمل سے استوار و برقرار رکھیں۔ آمین! اس کے بعد میرا سب سے آخر اور سب سے اہم فرض آپ کی توجہ کو اپنی عرضداشت کی طرف منعطف کروانا ہے۔ خدا کرے کہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز آپ کے دلوں پر اثر کرے سے

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

میری عزیز بہنو! یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جسم اسی وقت تک زندہ ہے یا زندہ کہلانے کا مستحق ہے جب تک کہ اس میں حس باقی ہے۔ اگر خدا نہ کرے کسی وجہ سے قوت احساس سلب ہو جائے یعنی جسم میں حس باقی نہ رہے تو وہ جسم ہرگز زندہ نہیں اور نہ زندہ کہلانے کا مستحق رکھتا ہے۔ بالکل یہی حال ہماری قومی اور اجتماعی زندگی کا ہے۔ اور ہماری قومی و اجتماعی زندگی کا انحصار ان احساسات پر ہے جن سے ہماری علمی جد و جہد اور ادبی ذوق پیدا ہوتا اور جاری رہتا ہے۔ اگر خدا نہ کرے ہمارے احساسات دھیمے پڑ جائیں تو ہماری علمی و ادبی جد و جہد بھی ختم ہو جائے گی اور اگر ہماری ادبی جد و جہد ختم ہوئی تو سمجھو کہ ہماری قوم کو زندہ اور بیدار قوم کہلانے کا حق بھی نہیں رہا۔

یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ قدرت کی جانب سے ہر متنفس پر کچھ نہ کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور نوع انسانی کے ہر فرد بشر کو مختلف حقوق ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ماں باپ کے حقوق اولاد کے حقوق، یہاں تک کہ ہمسایوں کے حقوق وغیرہ۔ اسی طرح قوم اور ملک کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں اور ان کو دیانت داری سے ادا کرنا ہر فرض شناس انسانیت پسند انسان کا مذہبی قانونی اور اخلاقی فرض ہے۔

قوم اور ملک کے فرائض و حقوق کے ضمن میں جو خدمات ہم پر عاید ہوتی ہیں ان میں سب سے اہم خدمت زبان کی ہے کیونکہ جب تک زبان زندہ ہے قوم مر نہیں سکتی۔ زبان وہ آب حیات ہے جو قوموں کو زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔ قوم اور ملک کی حقیقی ترقی زبان اور ادب کی ترقی میں مضمر ہے۔ قوموں کا وقار زبان ہی سے باقی رہتا ہے۔ اسی کے دامن عاطفت میں قوموں کا علم، قوموں کا ادب، قوموں کی روایات اور قوموں کا تمدن پیدا ہوتا، پلتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔

اردو ہماری قومی زبان ہے۔ ہمارے ملک اور قوم کا وقار اسی سے وابستہ ہے۔ ہمارا ملکی و قومی تمدن، علم و ادب

اور قومی روایات سب اسی کے دم سے باقی ہیں۔ اگر کسی شخص نے کسی غیر زبان کے توسط سے کوئی امتیاز یا کسی خاص قسم کی فضیلت حاصل بھی کرلی تو اس سے وہ احساس کمتری لوٹ نہیں سکتا جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہم خود اپنی زبان کو وسعت دے کر ذریعۂ علم و کمال بنا ئیں اور اس کے ذریعے سے اپنے قومی علم و ادب کو اوج ترقی پر پہنچائیں تو اس سے ایک خاص قسم کا احساس برتری جذبۂ خودداری اور ایک پرعظمت حس وقار پیدا ہوگا جو قومی زندگی اور ادبی حیات کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب ہمارے اہل وطن میں ملک و وطن کے وقار کے ساتھ اپنی قومی زبان کو ترقی دینے کا خیال بھی پیدا ہوگیا ہے اور کچھ عرصے سے خواتین میں بھی احساس خودداری کے آثار نمایاں ہیں۔ لیکن جہاں قوم میں زندگی کی چہل پہل دیکھ کر خوشی ہوتی ہے وہاں یہ کہتے ہوئے دل دکھتا ہے کہ ہم نے ابھی تک اس جدوجہد میں بہت تھوڑا عملی حصہ لیا ہے

ادارہ ادبیات اردو کی نسبت آپ نے ابھی صدر محترمہ اور صدر شعبہ کے خطبہ اور رپورٹ سے مفصل معلومات حاصل کی ہیں مجھے اس کا ذکر صرف اس لئے کرنا ہے کہ اردو کے نام کے ساتھ اس کا نام نہ لینا کھلی احسان فراموشی ہوگی۔ یہ وہ ادارہ ہے جو گزشتہ دس سال سے مسلسل اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارہ کی ان تمام گراں خدمات کی تفصیل کے لئے جو اس نے مختلف طریقوں سے متواتر انجام دی ہیں ایک ضخیم جلد درکار ہوگی۔ چنانچہ خود شعبۂ نسواں کا وجود اس ادارہ کی ایک ادبی کوشش کا ثبوت اور اس کی ادب پرستی کا زیر بار احسان ہے۔

اس ادارہ نے تصنیف و تالیف اور ترجموں کی صورت میں جو ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ بھی آپ کے پیش نظر ہیں اور آپ کی بہنوں نے اس سلسلے میں جو مقدور بھر حصہ لیا ہے وہ بھی آپ کے سامنے موجود ہے۔

میری معزز بہنو! ہمارے شعبہ کا مقصد زندگی کے ہر محل میں اردو کو زندہ رکھنا اور اپنی قومی زبان کو ترقی دینا ہے۔ اس شعبہ نے جو کچھ خدمات اب تک انجام دی ہیں آپ نے انھیں خطبۂ صدارت اور شعبہ کی دو سالہ روداد میں تفصیل سے سنا ہے اب عرض یہ ہے کہ شعبۂ نسواں آپ کی عملی امداد کا محتاج ہے۔ جب تک ملک کی تعلیم یافتہ اور ادب نواز خواتین زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی رکن بن کر عملی طور پر ہمارے ساتھ تعاون کار نہ کریں گی یہ شعبہ حقیقی معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔ اور اس کی حقیقی ترقی اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ تصنیف و تالیف کا کام وسیع پیمانے پر انجام پانے لگے۔ ہر محلے میں مدارس تعلیم بالغات قائم ہوجائیں ہر لکھی پڑھی خاتون اس شعبہ کی رکن بن جائے اور عہد کرے کہ وہ کم از کم دو جاہل یا ان پڑھ خواتین کو اردو لکھنا پڑھنا سکھا دیں گی۔ زنانہ دارالمطالعہ قائم ہوجائے جس کے ذریعے گشتی کتب خانوں کی طرح ادبی اور علمی کتابیں اور خواتین کے مفید مطلب رسالے گشت کروائے جائیں۔

میری بہنو! ان مقاصد کی تکمیل کے لئے شعبہ اپنے میں اتنی ہمت پاتا ہے نہ سرمایہ۔ یہ تو ادارہ کا احسان ہے کہ وہ اب تک زندہ بھی رہ سکا۔ کیا یہ ہم عورتوں کے لئے شرم کی بات نہیں کہ ہم اپنا ایک واحد ادبی شعبہ بھی اپنے بل بوتے پر نہ چلا سکیں۔ کیا قوم اور ملک کی خدمت ہم پر فرض نہیں ہے

کیا اپنی قومی زبان کو زندہ رکھنا اور اس کے ذریعے سے اپنے تمدن وغیرہ ہی کو نہیں بلکہ اپنے باکمال اسلاف کے کارناموں کو بھی اجاگر کرنا ہمارا فریضہ نہیں؟ کیا اردو کی زندگی کے لئے ہم اپنی حیات کے کچھ ایام وقف نہیں کر سکتے؟ کیا اپنے ادب کی ترقی کی خاطر ہم تھوڑی سی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے؟ شعبۂ نسواں کی ساری تمنائیں، ساری امیدیں اور ساری کامیابی آپ کی ایک نظر کرم پر منحصر ہے۔ اٹھیے اب کروٹیں لینے کا وقت نہیں رہا۔ ایسا نہ ہو کہ زمانے کی کروٹیں ہمیں پیس کر رکھ دیں۔ ہوا ناموافق ہے اور وقت نازک اگر ہم نے اب بھی کچھ نہ کیا تو پچھتانا پڑے گا۔

آپ جس طرح سے مدد دے سکتی ہوں دیجیے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ ساری کی ساری بی بیاں آج سے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو جائیں یا درس و تدریس کا کام شروع کر دیں اگر فی صدی ایک صاحب ہمت خاتون شعبہ کی مدد پر کمربستہ ہو جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے شعبہ کا پرچم اقبال ہر جگہ جگمگاتا نظر آئے گا۔ اگر ایک ایک محلہ کی دو دو خواتین بھی مدرسۂ بالغات کی نگرانی اور مدد کے لئے آمادہ ہو جائیں تو شعبہ ہر طرح ان کا ہاتھ بٹائے گا اور قدمے، قلمے، سخنے ہر قسم سے مدد دے گا۔

اسی طرح دار المطالعہ کے لئے بھی آپ اپنی ممکنہ مدد سے شعبہ کو زیر بار منت ہونے کا موقع عطا فرمائیے۔ ادارہ کے ماہنامے سب رس کے خریدار بن جائیے اگر آپ نہ بن سکتی ہوں تو کم از کم ایک ایک خریدار مہیا کر کے اپنی ادبی دلچسپی کا ثبوت دیجیے۔

اب میں آخر میں اس دعا پر اپنی تقریر ختم کرتی ہوں۔

"پروردگار تو ہمیں ملک و قوم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرما۔ بارالٰہا ادارۂ ادبیات اردو کو اس کی شاخوں کو کامیابی کی درخشانیوں کے ساتھ مدتوں تک قائم رکھ اور ہم اور ہماری نسلیں اپنی زبان کی علمی و ادبی خدمت کے لئے اسی طرح برسوں تک جمع ہوتی رہیں۔"

لطیف النساء بیگم

غزل

یوں یاد اُنھیں کر غم دنیا سے گزر جا	اک بار اسی بزم تمنا سے گزر جا
اے ذوقِ نظر پردۂ اسرار اٹھا دے	اے شوقِ طلب عالمِ بالا سے گزر جا
آنکھوں میں سما جائیں گی گلشن کی بہاریں	اک کیف کے عالم میں جو صحرا سے گزر جا
قبضہ میں ہو دل ان کے تو لب بھی ہیں کشادہ	اے حرفِ تمنا لبِ گویا سے گزر جا
اے برقِ نظر پھونک دے ارمانوں کا خرمن	اک بار تڑپ کر مری دنیا سے گزر جا
کیا لطفِ نظر جب کوئی آنکھوں میں بسا ہو	سو بار تو کعبہ و کلیسا سے گزر جا
ہو جائے گا دنیائے محبت میں معتبر	مرضی ہے اگر وعدۂ فردا سے گزر جا
پھر دیکھ لے مستی میں وہ نوخیز جوانی	پھر آنکھ اٹھا ہوش کی دنیا سے گزر جا
جانے دے یقیں کیوں ہو ندامت میں ندامت	خاموش ہیں وہ شکوۂ بیجا سے گزر جا

میر حسن علیخاں تمکین

اظہارِ تشکر

(سالانہ اجلاس شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے خطبۂ صدارت اور دیگر تقریروں کے آخر میں معتمد صاحبہ شعبۂ نسواں کی وہ مختصر تقریر بھی درج کی جاتی ہے جو انھوں نے اس جلسہ کے اختتام پر کی تھی۔ (سب رس)

محترم صدر صاحبہ و معزز حاضرین!

معلوم ہوتا ہے کہ قسامِ ازل نے میری ہستی کو اظہارِ تشکر ہی کے لئے وقف کر دیا ہے کیونکہ اس دفعہ پھر یہی کام میرے سپرد ہوا ہے۔ گو آج کے جلسے کا یہ بہترین کام ہے اور مجھے اپنی ممنونیت کا پورا پورا احساس ہے لیکن حیران ہوں کہ کن الفاظ میں اور کس زبان سے اپنی شکرگزاری کا اعتراف کروں۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں اس وقت جن جذبات کو محسوس کرتی ہوں ان کا بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ الفاظ میں صحیح طور پر ان کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ لیکن تعمیلِ حکم کے آگے مجبور ہوں۔

مجھے اپنی صدر صاحبہ کا حکم ہوا ہے کہ شکریہ ادا کروں۔ پہلے بیگم مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے باوجود بے شمار مصروفیتوں کے ہمارے اجلاس کی صدارت قبول فرمائی۔ آپ کی رہنمائی ہی ہمارے لئے باعثِ صد فخر ہے۔

آپ سب خواتین کی ممنون ہوں کہ باوجود عید کی مصروفیتوں کے ہمارے اجلاس میں شرکت کرکے اس کو رونق بخشی اور اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ آپ سب کی خدمت میں عید کی مبارک باد اور اپنا پُرخلوص شکرانہ پیش کرتی ہوں۔

رقیہ بیگم صاحبہ کی خاص طور سے ممنون ہوں کہ آج تلاوتِ قرآن مجید سے ہم کو محظوظ فرمایا۔

ڈاکٹر مس آنہ پوپ اور ان تمام خواتین کی ممنون ہوں جنھوں نے مختلف طور پر ہماری مدد کی اور اپنے تعاون سے جلسہ کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔

اربابِ ادارہ کی خدمت میں بھی دلی شکریہ پیش ہے کہ انھوں نے مطبوعات و دیگر سامان مہیا کرنے میں ہماری خاطر خواہ مدد کی جس کے بغیر شاید اجلاس نامکمل رہ جاتا۔

آخر میں سلطان العلوم و خانوادۂ شاہی کی سلامتی کی دعا پر ختم کرتی ہوں۔

سکینہ بیگم

سب رس کتاب گھر سے نسوانی ادب سے متعلق جملہ کتابیں طلب کی جا سکتی ہیں۔ علم دوست خواتین کو اکثر شکایت رہتی ہے کہ ان کے مطالعہ کے قابل کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ ادارہ کوشش رہا ہے کہ طبقۂ نسواں کے لئے ہر طرح کی علمی و ادبی سہولتیں حاصل ہو سکیں۔

فیضی کے منشآت

(لطیفۂ فیاضی)

آج سے ڈھائی سال قبل، جس وقت جولائی سنہ ۱۹۳۸ء کے معارف میں "لطیفۂ فیاضی" کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون نظر سے گزرا، تو محترم مضمون نگار کی خواہش پر اس کو مفصل لکھنے کا ارادہ کیا، حالات کی تلاش و جستجو جاری تھی کہ ایک مہینہ نکل گیا لیکن مضمون مرتب نہ ہو سکا۔ جب اسی سال کے ستمبر کا پرچہ آیا تو اس میں سید بادشاہ حسین صاحب کی لکھی ہوئی تفصیل دیکھی، خیال ہوا کہ اپنے ارادہ سے باز آجاؤں، اور جو کچھ لکھ چکا ہوں، اسے ادھورا چھوڑ دوں، لیکن غور و مقابلہ کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس کی تکمیل جس نہج سے میں نے شروع کی ہے، بہرحال کر دینی چاہیے کہ اس مخطوطہ سے جو میرے پیش نظر ہے، اس کتاب کے بالتفصیل مطالعہ کی بہت کم ضرورت باقی رہے گی اور اس کے مولف کے حالات حتی الامکان مطالعہ میں آجائیں گے۔

اس وقت کی محنت کو اب ایک طویل عرصہ کے بعد ناظرین کی نذر کر رہا ہوں۔

اتفاق کی بات ہے کہ جب پہلی مرتبہ یہ کتاب نظر سے گزری تھی، تو اس کی خصوصیات سے متاثر رہا۔ اسلامی طب کے عنوان سے میں نے جو کتاب لکھ کر شائع کی ہے، اس کے سلسلہ میں سیکڑوں کتابیں نظر کے سامنے آئیں، اور گزر گئیں "لطیفۂ فیاضی" بھی اسی موقع پر دیکھی تھی، اور معارف میں اس کا سرسری ذکر آنے سے قبل ہی، اپنی کتاب میں نہایت اختصار کے ساتھ ایک نوٹ صفحہ (۱۰۵) پر اکبری اطبا، کے ذیل میں حکیم نورالدین عبداللہ عین الملک کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ میں نے ان حکیم صاحب کے حالات "آثار خیر" کے مولف کے اعتماد پر اپنی کتاب میں درج کیے تھے، مگر افسوس کہ التباس کی وجہ سے اس میں غلط فہمی باقی رہ گئی، چنانچہ اس مضمون کے سلسلہ میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ نام اور بہت سی مولفہ کتابیں جن کا شمار کرایا گیا ہے، وہ الگ الگ لوگوں کی ہیں: ناموں اور خطابوں کے ایک ہونے کی وجہ سے ایک ہی شخص کی سمجھی گئیں۔

اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ لطیفۂ فیاضی کا مرتب حکیم نورالدین محمد عبداللہ ہے، جیسا کہ خود اس نے فیضی کے لطیفوں کی ابتدا و تمہید میں اس۔

"بادیہ پیمائے بادیہ سخن سنجی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نورالدین محمد عبداللہ
حکیم عین الملک کہ بہ نسبت آبائے کرام از خاک پاک
شیراز است۔"

کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس لطیفۂ فیاضی کا دوسرا جزو "منشآت" ہے جو خود مولف کے رقعات پر مشتمل ہے؛ اس کی ابتدائے تالیف میں، مرتب نے جو شعر لکھے، اور مصرعۂ تاریخ درج کیا ہے، اس موقع پر کہتا ہے ؎

زرتیغش جستم سالِ تاریخ   گُفت "انشائے نورالدین احقر"

اس سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ شاید اس کا تخلص احقر ہو، یا یہ کہ صرف بطور قافیہ استعمال کیا گیا ہو۔

اس باب میں نورالدین نے تمہید کے بعد ایک خط میں، جو ڈھاکہ صوبہ بنگالہ سے غرہ شعبان سنہ ۱۰۳۴ھ کو لکھا گیا تھا، اپنا نام نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک المسمی بہ شمس الدین علی شیرازی لکھا ہے۔ ان ہی لطایف کا ایک اور ناقص نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں نظر پڑا، جس میں ایک مقام پر یہ عبارت درج ہے:۔

"تمام شد ایں نسخہ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نسخہ است علی
ید الضعیف اقل العباد واحد الصمد، نورالدین محمد
ابن عبداللہ حکیم ولد حکمت پناہ حکیم عین الملک عفا عنہم
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رقم یافت ۴ محرم سنہ ۱۰۱۱ھ روز یکشنبہ من

مقام احمد نگر۔"

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ناقص نسخہ حکیم عین الملک اول کے پوتے اور نورالدین محمد عبداللہ عین الملک دوم کے بیٹے کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور اس کا نام بھی نورالدین تھا، اور ۱۱۵۳ھ میں روشن اختر محمد شاہ سریر آرائی حکومت تھا۔ مزید تفہیم کے لئے سمجھئے کہ حکیم عین الملک اول تخلص شیرازی اکبر کے دور میں تھے، اور ان کا نام شمس الدین علی تھا، اور عین الملک دوم کا نام نورالدین محمد عبداللہ تھا، جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں رہے ہیں۔

ہمارے مذکورہ بالا بیانات کی تائید کے لئے ابوالفضل کے رقعات کی جلد دوم کا ایک خط ملاحظہ فرمایا جائے جو حکیم عین الملک اول اور ان کے بیٹے کے اسماء کی وضاحت کرتا ہے۔ ابوالفضل نے یہ خط حکیم موصوف کے اس خط کے جواب میں لکھا ہے، جو انھوں نے اپنے دنیاوی تعلقات کے ترک اور عزلت گزینی کے ارادہ کے اظہار میں لکھا تھا، چنانچہ خط کا سرنامہ اور اس کا اقتباس یہ ہے:-

"بحکمت پژوہ شمس الدین علی ملقب بحکیم عین الملک نوشتہ
آن حضرت خیراندیش را دیگا بیرضای خود و
جستجوئے مرضیات خویش سرگرم داراد......
کارگزاران قضا و قدر، چون بلباس تعلق کہ سرمایۂ
انتظام این مجمع انسی ست، آوردہ اند، در سرانجام
آن کمال سرگرمی و کوشش بتقدیم رسانند تا ہنگامیکہ
خلعت تجرد زستند، از ہیچ حادثہ فتورے در مسرت
خانۂ خاطر راہ نہ دہند، و چون طلیعۂ اقبال یعنی مقدم نور
کہ باحتمال معنی فساد ورباسب نہ پردازد، در وسعد کشادہ
پیشانی و شگفتہ خاطر باید شتافت و باتدبیر ناقص ارکین

مناسب در ہرمادشیۂ تجربے کہ بخاطر رسد اندوختن دقائق ان مناسب خود را از آگاہی اسباب باز داشت و ہمین عبداللہ محمد فرصت را غنیمت دانستہ و خود را بخلاف نسبادہ و شغلے از گراں اوقات بدو داشتن مقدمات علمی و رشتہ پیرا آستین اخلاق کل مصروف گرداند و با برادران طریق عطوفت مرعی داشتہ از دولت ہر وجہ وا رسد برخوردار گردد ۔۔۔۔ والعاقبۃ بالخیر۔"

مرتب لطائف فیضی نے اپنی تصانیف "الفاظ آلادوبہ" الاطبا" میں بھی اپنا ہی نام درج کیا ہے البتہ سب سے رشید و سے داست تو ایفیت موجود ہے اس میں "شیرازی" کے ساتھ نسب کا بھی حوالہ "بہ طریق تو شیخ" سے کیا ہے۔ ان مذکورہ بیانات سے روایت ہوتا ہے کہ مولف "لطیفہ فیضی" کا نام نورالدین محمد عبداللہ ہی تھا۔ ہم اس مضمون اور اس کے متعلقات کی تکمیل کے لئے حکیم عین الملک اول اور دوم دونوں کے حالات لکھیں گے۔

"آثر الامرا" سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم عین الملک اول آگرہ کے مورخین کے ہاں عزیز تر تھے وار شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر کے دور میں تھے اور وہ بڑے بڑے باکمال جنھیں علوم و فنون میں استادانہ منصب حاصل تھا، اس کی بارگاہ کے حاشیہ نشین تھے۔ حکیم عین الملک جو اپنے فنی کمالات کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب بھی تھے، ان میں شامل رہے۔ دربار میں ان کی بڑی عزت تھی، اور لوگوں کے دلوں میں اپنے خلق و مروت کے باعث جگہ پیدا کر لی تھی، ابتداء لاہور پر مامور ہوئے بعد میں ابوالمظفر علی عادل شاہ والی بیجاپور (دکن) کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ حین سفر دکن ہی کے "اشدیہ" نامی ایک موضع میں آخرت کی راہ لی۔ ان کی سرشت شیراز کی خاک پاک سے تھی ان کی طرف سے

---

۱ دیکھئے انشائے شیخ فن انشاء فارسی نمبر ۔ قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

سلسلۂ نسب مولانا جلال الدین محقق دوانی پر منتہی ہوتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ طبابت کے فرائض سے زیادہ تر ملکی معاملات میں مصروف رہنا پڑا۔ چنانچہ ۹ھ جلوس اکبری میں چنگیز خاں نامی ایک امیر کے مقابلہ کے لئے بھیجے گئے جس نے احمد آباد میں بغاوت کی آگ پھیلا رکھی تھی۔ یہاں سے اکبری اقبال کی بدولت فتح و فیروزی کے ساتھ لوٹے اور جشن کش لینے پر نے آگرہ آکر بادشاہ کی ملازمت کی۔

پھر ۱۸ھ جلوس میں شہنشاہ کے فرمان کے ہوتے ہوئے گجرات جاتے نظر آتے ہیں جو اعتماد خاں کی تسلی اور دلاسے کے لئے صادر ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر اپنی حسن تدبیر اور میر ابوتراب کی مدد سے اس کو حاضر آستان شاہی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

جلوس کے ۱۹ ویں سال جب کہ شہنشاہ اکبر مشرقی حصص کی سیاست میں مصروف تھا، تو حکیم صاحب کو بھی رکاب سعادت کی عزت بخشی تھی۔ اس کے بعد ہی انھیں عادل خاں بیجاپوری کے پاس دکن بھیجا گیا۔ ۲۲ھ جلوس میں لوٹ کر سلطانی بارگاہ میں حاضری دی اور صدر و سنبھل کی فوجداری سے افتخار پایا۔

اکبری جلوس کے جب چھبیسویں سال کا آغاز ہوا تو عرب بہادر اور نیابت (دیانت) خاں نے بغاوت کی۔ اس موقع پر پھر حکیم عین الملک کا انتخاب کیا گیا، اور یہ مہم سر کرنے کے لئے امتثال امر میں چل پڑے۔ بریلی پہنچ کر، اپنی حسن تدبیر سے اطراف و اکناف کے جاگیرداروں کو جمع کر کے قلعہ کو مستحکم کیا، اور ان دونوں باغیوں پر چڑھ آئے۔ ان لوگوں نے ان کو اپنے طرف کرنا چاہا لیکن کسی فریب میں آئے بغیر انھیں شکست دی۔ ان ہی کارہائے نمایاں کے صلہ میں، اسی سال صوبۂ بنگالہ کی صدارت سے عزت پائی پھر ۲۸ھ جلوس میں بخشی گری صوبہ آگرہ سے سرفرازی پائی۔

خان اعظم جب دکن کی مہم کے لئے روانہ ہوا، تو اکبر نے عین الملک کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اثنائے سفر میں خان اعظم نے حکیم صاحب کے جاگیری پرگنہ ہندیہ (ہنڈیہ) میں کچھ رد و بدل کی تو یہ ناراض ہو کر بغیر کسی اجازت کے ۳۳ھ جلوس میں بادشاہ کے پاس دارالسلطنت پہنچے چونکہ یہ بے طلب آئے تھے، اس لئے حاضر دربار ہونے کی اجازت نہ ملی۔ تحقیق حال کے بعد سلام کا حکم ہوا، اور پرگنہ مذکور پھر ان پر بحال کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد روانگی کی اجازت ملی، اور راجہ علی خاں والی خاندیس کے پاس سفارت کر نے گئے۔ یہیں سے اپنی جاگیر لوٹے، اور یہاں پانچ ماہ تک بیمار رہ کر جلوس شہنشاہی کے چالیسویں سال ۲۰ ذی الحجہ کی شب کو ۱۰۰۳ھ میں انتقال کیا۔[1]

ملا عبدالقادر صاحب منتخب التواریخ، جلد سوم میں بعض شعراء ان کا حال لکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنکھوں کے علاج میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، اور کبھی کبھی فکر شعر بھی کیا کرتے تھے۔ دوائی تخلص تھا، چند شعر نمونہ کلام کے لئے پیش ہیں۔

ہیچ درمانے نہ شد پیدا دلا بیمار عشق ✽ درد بیدرمان عشق است این کہ تدبیرش نداشت
در شب زلف سیاہش خواب گم دارد دل ✽ بوالعجب خوابے پریشانے کہ تعبیرش نداشت

خیز اے دل کہ یار در جنگ ست ✽ زندگی نزد عاشقاں ننگ ست
عاشقاں را براہ سر بازی ✽ ہر قدم صد ہزار فرسنگ ست
وسعت آباد کارخانۂ عشق ✽ بر سپاہ محبتم تنگ ست
بس دراز است دست ہجر مگر ✽ چہ کنم پائے بخت من لنگ ست

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم کلکتہ صفحہ (۴۰۲)

ملا نے بدایونی نے حکما کے ذیل میں بھی ان کا حال لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ علم و فضل میں ان کا رتبہ بہت بڑھا ہوا تھا، جب یہ دکن جا رہے تھے تو ملا عبدالقادر بھی لاہور سے، انھیں تھوڑی دور تک پہنچانے گئے۔ حکیم صاحب نے خواجہ نظام الدین احمد کے باغ میں پہنچ کر چند شعر اپنے ان کو بطور یادگار دیے تھے۔

ابوالفضل ۱۰۰۴ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ۔

"حکیم عین الملک در ہند بہ زنت ہستی بربست تمہید
قدر دان آمرزش درخواست و فرزندان را
(یعنی مغفرت کی دعا کی)
خسروی عاطفت برنواخت۔ از نیک مردان دنیا بود
در برآمد کار مردم سخت کوشید [1]:

ان کی ایک تالیف ہماری نظر سے گزری، جس کا نام "فوائد الانسان" ہے۔ یہ شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر لکھی گئی ہے، اور نام بھی خود بادشاہ نے رکھا ہے۔ ساری کتاب منظوم ہے اور تین سال کے عرصے میں ۹۹۵ھ میں لکھی چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"شکر خدائے را کہ کمترین بندگان درگاہ و ضعیف ترین ملازمان ایں بادشاہ جہاں پناہ ابوالمظفر شاہ جلال الدین محمد اکبر، مخلص فدائی و دعائی، از روئے معتقدی بیان آں شدہ، و امور بہ آں گشتہ کہ خواص و کیفیت آنچہ نام آوران جہاں، و اکابر و اعیان دانایان، از غذا و دوائے مشہور میان مردم در بلدان معتبرہ عرب و ایران و توران و روم و (فرنگ) ہندوستان، کہ بخوردن و آشامیدن آں عادت بوان داشتہ باشند، بکوتاہ ترین لفظے بعرض رساند
(ایضاً)

...... و بعد چونکہ خاصیت ایں فوائد است موقوف است، بہ معرفے کہ آں از رشحہ فیض بادشاہ عالم پناہ حاصل شد، عز نضرہ استفاضہ شدہ، چہ وقت مسائلت اسم کتاب، جواب فرمودند کہ (سوال)
شدہ اسمش فوائد الانسان "

از اتفاقات حسنہ آں کہ تمام ایں مصرعہ کہ افادہ فرمودہ بودند، تاریخ تالیف ایں کتاب (۹۹۵ھ)۔"

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں، جو کتاب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں

شکر حق گو دوائی از علم دہاں   کہ بنام خدایگان جہاں
نسخہ ثبت بنظم آوردی   درد دیرین خود دوا کردی
ہر چہ شہ گفت آں چناں گفتی   فدیہ و ثنائے شہ سفتی
نگرم چوں بامر اکبر شاہ   گشت بر نظم ایں گہر آگاہ
وقت خود را سہ سال پروردم   از گہر سہ ہزار آوردم
از غذا و دوائے خلق جہاں   جمع کردم، فوائد الانسان
یاد در خود چو بخت شہ دیدم   نام آں را ز شاہ پرسیدم
داد پاسخ کہ مصرعیست رواں   شدہ اسمش فوائد الانسان
اسم و تاریخ ہر دو فہمیدم   مصرعے کاں ز شاہ بشنیدم
ناظم ایں گہر دوائی تو   درد و بندگی فدائی تو

طبقات اکبری صفحہ (۳۸۹) پر بھی ان کا مختصر ذکر موجود ہے۔ مآثر الامرا میں تفصیل دی ہے، شروع میں حالات میں نے اسی سے لکھے ہیں۔

(باقی آئندہ)

معین الدین رہبر فاروقی

[1] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۶۷۱، کلکتہ

تاثرات سفر یورپ

از جنیوا ← → تا حیدرآباد

(۱۹ ستمبر تا ۷ اکتوبر)

(یہ تاثرات کی آخری قسط ہے۔ اس کی دلچسپی اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان و پاکستان ہوئے تھے، اس گفت و شنید کا جو اس جھگڑے سے پہلے ہوئی تھوڑا بہت پرتو ان لوگوں پر بھی پڑ رہا تھا جو اس زمانے میں یورپ سے مشرق کی طرف جا رہے تھے)

ہم ۱۹ ستمبر کو زیورخ سے چلے۔ میرے پاس زیورخ سے برن ہوکر جنوا تک کا ٹکٹ تھا جس میں ایک خرابی تو یہ تھی کہ راستے میں دو جگہ ریل بدلنی پڑتی اور دوسرے میں چاہتا تھا کہ جس راستے سوئیٹستان آیا ہوں اس سے مختلف راستے سے واپس جاؤں۔ زیورخ کے ٹکٹ گھر والوں نے کہا کہ ہم آپ کا ٹکٹ سرحدی اسٹیشن کیاسو Chiasso تک بدلے دیتے ہیں وہاں سامان وغیرہ کا معاینہ ہوتا ہے آپ وہاں اطالوی ٹکٹ گھر پر اپنا ٹکٹ بدلوا لیں۔ الغرض ہم زیورخ سے سوا نو بجے چلے۔ راستے میں جب چیکنگ کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ایک ٹکٹ کیاسو سے جنوا تک کا نہیں ہے۔ بیچارے سوئس کنڈکٹر نے فوراً زیورخ ٹیلیفون کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ ٹکٹ غلطی سے ٹکٹ گھر پر رہ گیا ہے اور اگلی گاڑی سے کیاسو بھیجا جا رہا ہے۔ ریل سوئیٹستان کے بہترین حصوں میں گزرتی ہوئی جھیل لوسرن، اندرمات، برف پوش کوہستان، بلینزونا، نفیس ترین کوہی وادیوں اور دریاؤں کو عبور کرتی ہوئی لطیف مناظر سے گزرتی ہوئی بڑھتی چلی گئی۔ راستے میں سنٹ گوتھارڈ کا عظیم الشان ٹنل پڑا جس میں ریل پوری رفتار سے پندرہ منٹ رہی۔ یہ ٹنل جرمن اور اطالوی بولی کی گویا حد فاصل ہے۔ ٹنل میں گھسنے سے پہلے جرمن ہی جرمن کان میں پڑتی ہے اور نکلنے پر اطالوی ہی اطالوی۔ یہاں سے سوئیٹستان کی کینٹن ٹیچینو Ticino شروع ہوتی ہے جس کی سرکاری زبان اطالوی ہے، ملک وہی، انتظامات وہی، تخیلات وہی، بولی میں فرق۔ راستے میں جھیل لوگانو نے جس کے قریب مشہور و معروف گاؤں لوکارنو واقع ہے، سفر کی خوبصورتی میں چار چاند لگادیئے۔ شام کے چھ بجے کے قریب سرحدی اسٹیشن کیاسو آیا جس کا ایک حصہ سوئیٹستان اور ایک اٹلی میں واقع ہے یعنی دونوں ملکوں کی سرحد بیچ اسٹیشن میں ہوکر گزرتی ہے۔ اطالوی ٹکٹ گھر پر گیا اور وہاں اپنا ٹکٹ غلطی سے زیورخ بھول آنے کا ذکر کیا اور سوئس کنڈکٹر نے جو ٹیلیفون کیا تھا اس کا بھی بیان کیا۔ جواب ملا کہ ہم نہیں جانتے، یا تو آپ رات بھر انتظار کیجئے ورنہ نیا ٹکٹ خریدیئے۔ ہم نے رات کیاسو میں گزارنا زحمت ہی زحمت سمجھا اور بجائے راستہ کھوٹا کرنے کے نیا ٹکٹ خرید لیا۔ ملان پر گاڑی بدلی۔ کیاسو کے بعد سے اطالویوں کا ہجوم اور ان کی بدتمیزیاں شروع ہوگئی تھیں لیکن ملان سے جنوا تک تو بس میدان حشر تھا۔ تمام مسافر ریل کے برآمدوں میں کھڑے تھے اور چیخ چیخ کر گفتگو کر رہے تھے اور ادھر سے ادھر جانا بس تکلیف مالایطاق کے برابر تھا۔ ہم بمشکل تمام لوگوں سے ہٹنے کی خوشامد کر کر کے کھانے کے کمرے میں گئے اور ملان سے

جنیوا ایک دو گھنٹہ میں سے زیادہ تر وقت وہیں گزارا۔ یہاں جنیوا
رات کے بارہ بجے پہونچ گئی۔ اسٹیشن پر ہوٹل والے مکھیوں
کی طرح چمٹ گئے آخر ہم ایک شخص کے کہنے میں آ گئے جس کی
ٹوپی پر Hotel de Roma لکھا ہوا تھا لیکن جو ہمیں
ایک بالکل ہی مختلف ہوٹل لے گیا جس کا نام (Hotel
Continental) تھا۔ دس بجے رات کے چلے ہم پانچ منزل سیڑھیاں
چڑھنے کے بعد ہوٹل آیا۔ ہمیں کمرہ پانچویں منزل پر ملا۔ یہ ہوٹل
نہایت ناقص نہ پلنگ ٹھیک نہ صفائی۔ لیکن آدھی رات
سامان ساتھ، پانچ منزل نیچے آنا اور پھر پچاس سیڑھیاں چڑھنا
اور اس پر بھی یہ یقین نہیں کہ دوسرا ہوٹل کیسا ملے گا۔ بس نہ جائے
رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق صبر کیا اور رات وہیں قیام
کیا۔

۲۰ ستمبر — جنیوا

صبح کے وقت جنیوا کا شاہی محل دیکھنے گیا جس میں
شاہ اٹلی آتے ہیں تو رہتے ہیں۔ یہ تعمیر سترھویں صدی کی ہے
جو اتحاد اٹلی سے پہلے جمہوریہ جنیوا کے زمانے میں کسی امیر کے
رہنے کا ایوان تھا۔ اس میں بعض مجسمات و تصاویر نہایت
لطیف ہیں، خصوصاً جو مٹی سے کلا ہوا شہنشاہ آگسٹس کا مجسمہ
وان ڈائک (Vandyke) گوید و رینی (Guido
Reni) روبنز (Rubens) واسکی (Velas-
quez) اور دوسرے بڑے بڑے نقاشوں کی تصاویر
دیکھنے کے قابل ہیں، نیز بعض کمروں میں لکڑی کی پچی کاری کا
جو فرش کیا ہوا ہے وہ بے حد نفیس ہے اور دور سے بالکل
قالین معلوم ہوتا ہے۔ پورا محل نہایت مزین و مذہب ہے
یہاں سے چل کر جنیوا کی جامعہ کا عالی شان ایوان دیکھنے گیا جس کے
کتب خانے میں دو لاکھ کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ اس کا ایوان
۱۶۲۳ء میں بنا تھا۔ اس جامعہ میں حسب ذیل شعبہ جات
ہیں۔ قانون، طب، ریاضی، طبعیات، فلسفہ، تاریخ، السنہ
[illegible] ہیں۔ جامعہ کے متعلق ایک نباتاتی باغ، ایک رصد گاہ اور
نوادرخانہ، ایک موالید ثلاثہ کا ذخیرہ بھی ہیں۔ شام کو [illegible]
[illegible] کے ساتھ جنیوا کی سیر کی۔ سب سے پہلے یہاں کے
مشہور قبرستان کیمپو سانتو تالیانو (Camposanto Staglieno)
گئے جہاں جنیوا اور اٹلی کے بعض نہایت ممتاز شہریوں کی قبریں
ہیں۔ ان میں شاید سب سے ممتاز قبر میزینی کی ہے جس کے پاس ان
کے ساتھی دفن ہیں۔ اس قبرستان میں خاص بات یہ ہے
کہ ان قبروں پر نہایت نفیس مجسمے سنگ مرمر سنگ موسیٰ اور
سنگ سیاہ کے بنے ہیں۔ مجسمے اکثر ان لوگوں کے نہیں بلکہ تمثیلی
مجسمے ہیں۔ مثلاً کسی قبر پر زندگی اور موت کی کشمکش دکھائی
گئی ہے کسی پر روحوں کا آسمان پر چڑھنا کسی پر فرشتوں کا
استقبال کسی پر پسماندوں کا رنج وغیرہ۔ اور ہر ایک مجسمہ ایسی
مہارت سے بنایا گیا ہے کہ گویا بس جان ڈالنے کی کسر ہے۔
یہ قبرستان [illegible] ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے اور جگہ جگہ سرو کے درختوں
[illegible] کی قطاروں، نفیس روشوں اور چاروں طرف والا [illegible]
کی وجہ سے باوجود ہزاروں قبروں کے چاروں طرف پھیلے ہونے کے
انسان بعض وقت بھول جاتا ہے کہ میں قبرستان میں کھڑا
ہوں اور کسی بڑے امیر کے محل کا دھوکا ہونے لگتا ہے
یہاں سے ہماری نہایت آرام دہ موٹر کوہ ریگی (Righi)
کی چوٹی پر گئی جہاں سے پورا شہر گویا نقشے کی طرح پھیلا
نظر آتا ہے، خصوصاً بندرگاہ کا منظر نہایت ہی عمدہ ہے۔
اس کے بعد ہم جدید شہر میں ہو کر نکلے جس کا مرکز جنگ عظیم کے

شہداء کی یادگار ہے۔ یہ حصہ بالکل عصری ہے اور غیر مکمل ہے اور جلد جلد اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔

۱۲ ستمبر کو ہمارا جہاز چلنے والا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے وقت ضائع کرنے کے بجائے لگے ہاتھوں یہاں کی دو قابل دید عمارات دیکھ لیں۔ صبح ہی میں یہاں کے نادر گرجا (D. Annunziata) کو دیکھنے گیا۔ باہر سے یہ گرجا بالکل بے مرمت اور کھنڈر سا معلوم ہوتا ہے لیکن اندر ایسی ایسی تصویریں، لکڑی اور سنگ مرمر کے مجسمے، سونے چاندی کا پانی چڑھا ہوا کام، ایسی دلفریب ہے کہ جن کو دیکھنے سے تعلق ہے اور جنیوا والوں کا یہ کہنا کہ اس جیسا گرجا دنیا میں نہیں ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ میری کتاب میں لکھا تھا کہ یہ ۱۲۲۸ء کا بنا ہوا ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ اس کی بنیاد ۱۲۲۸ء کے گرجا کی بنیاد پر رکھی گئی ہو لیکن موجودہ عمارت تمام و کمال نشاۃ ثانیہ کے نمونہ کی ہے اور تیرھویں صدی کے ابتداء میں نشاۃ ثانیہ کے اصول پھیلے نہیں تھے۔ اندرونی تزئین میں جنیوا کے بڑے بڑے امیر خاندانوں نے حصہ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے یہ گرجا نہ دیکھا اس نے گویا جنوا میں کچھ نہ دیکھا۔ یہاں سے اٹلی کی تاریخ حالیہ کے نوادر خانے کو دیکھنے گیا جہاں میزینی، گاریبالدی کا وورٹر، وکٹر عمانوئیل دوم، اور ہمبرٹ اول کی ذاتی اشیاء، عصری اخبارات کے نمونے اور دوسری نہایت دلچسپ اشیاء کی نمائش ہے۔ یہ نمائش میزینی کی پیدائش گاہ میں واقع ہے اور اتنی بڑی ہے کہ اسے پورے طور پر دیکھنے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہوتے۔ ایک ایک چیز دلچسپ ہے اور اٹلی کے اتحاد اور آزادی کی تاریخ اس نمائش کے چپہ چپہ سے عیاں ہوتی ہے۔

واپس آکر اسباب وغیرہ ٹھیک کر کے جو پہلے سے درست کر دیا تھا، بسم اللہ کہہ کر جہاز پر پہونچا۔ اتفاقاً جہاز وہی تھا جس پر چار ماہ پیشتر یورپ گیا تھا۔ چنانچہ جہاز کے ہر ملازم نے حتی الامکان آرام پہونچانے میں دریغ نہیں کیا۔ جنیوا سے نیپلز تک جہاز برابر اطالوی ساحل کے محاذ پر چلتا رہا اور ساحل سے اس قدر قریب کہ بعض مرتبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زقند لگاؤ تو ساحل پر پہونچ جاؤ گے۔ صبح ٹھیک گیارہ بجے ہم نیپلز پہونچے۔ چونکہ چار ماہ پیشتر جب ہم نیپلز آئے تھے تو یہاں کا مشہور آفاق نوادر خانہ قلت وقت نہیں دیکھا تھا اس لئے موقع کو غنیمت جان کر جہاز سے اتر کر سیدھا نوادر خانہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ نوادر خانہ نہ دیکھتا تو ارمان رہ جاتا اس لئے کہ اس میں پومپئی اور ہرکولانیم کے تمام مجسمے، پومپئی کی نادر اشیاء، عجیب و غریب پچی کاری کے فرش (جو خدا جانے کیسے ہو بہو اپنے محل وقوع سے یہاں لے آئے گئے ہیں) دیواری تصاویر جو مکمل حالت میں منتقل کر دی گئی ہیں، سب کی سب یہاں موجود ہیں۔ نگار خانہ بھی نہایت نفیس ہے اور منجملہ دوسرے مصوروں کے بیلینی (Belline)، الگریکو (Elgreco)، تشیان (Titian) اور دوسرے اساتذہ کی بنائی ہوئی تصاویر قابل دید ہیں۔ قدیم یونانی پچی کاری کا کام، پچی کاری میں انسانوں، مکانوں، جانوروں اور لڑائیوں (خصوصاً سکندر اعظم اور ایشیائیوں کے مابین جنگ) ایسی ہیں کہ دل سے محو نہ ہوں گی۔ بڑے ہال میں فرش پر ایک دھوپ گھڑی دیکھی جس پر دیوار کے ایک سوراخ سے روشنی آتی ہے اور اس کے ذریعے سے سال کے ہر مہینے اور ہر روز دوپہر کا وقت معلوم ہوتا ہے۔

جہاز نیپلز میں چار گھنٹہ ٹہر کر ٹھیک تین بجے چل دیا ہمارے ساتھ ایک صاحب مراکش کے رہنے والے محمد المکی الناصری بھی تھے جو ۲ طلبہ کو لے کر قاہرہ جا رہے تھے تاکہ وہاں کی جامعہ میں ان کی خواندگی کی تکمیل ہو سکے۔ خود پیرس اور جنوا کی جامعات کے تعلیم یافتہ ہیں اور عنقریب ایک اسلامی جریدہ تطوان (مراکش) سے نکالنے والے تھے جس کا مقصد یہ ہوگا کہ ممالک اسلامیہ کے ساتھ مراکش کا ربط پیدا کیا جائے۔ وہ خود اور ان کے ساتھ کے اکثر طلبہ خالص مراکشی لباس پہنتے تھے۔ مجھ سے خوب ملاقات ہوگئی اور ہر روز گھنٹوں گفتگو رہتی تھی۔ چاہتے تھے کہ ہندستان اور مراکش کے درمیان ذہنی رابطہ پیدا کیا جائے۔ میں نے زیورخ میں سیاسیات اسلامی پر جو مضمون پڑھا تھا اس میں انھوں نے نہایت دلچسپی لی اور خیال ظاہر کیا کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی اور عربی میں ہونا چاہیئے۔ ان کے علاوہ جہاز میں کئی ملاقاتی بھی نکلے جن میں خاص طور پر ڈاکٹر بابر مرزا (پروفیسر جامعہ علیگڑھ) علیگڑھ کے پروفیسر شریف کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادیاں میاں افتخار الدین (صدر پنجاب کانگریس کمیٹی)، خواجہ عبدالمجید (اوکاسا والے)، سعدالدین خاں صاحب (ولد نواب عزیز یار جنگ بہادر) اور دوسرے دوست تھے۔ سب سے زیادہ جس چیز سے جہاز میں تقریباً مسلسل ہیجان تھا وہ بین قومی خلفشار تھا، دلچسپی کی غرض سے تاریخ بتاریخ اس کا بیان کیا جائے گا۔

۲۴ ستمبر۔ جہاز میں ایک اخبار (Corriere del Mare) انگریزی اور اطالوی زبانوں میں روزانہ طبع ہوتا ہے۔ اس میں دیکھا کہ انگلستان کے وزیر مسٹر چیمبرلین اور ہٹلر کے درمیان پھر گفتگو ہوئی۔ چیکوسلوواکیہ کی وزارت نے استعفیٰ پیش کر دیا اور اس کی جگہ ایک فوجی وزارت قائم ہوئی۔ چونکہ انگریز سیکڑوں کی تعداد میں جا رہے ہیں اور عام خیال ہے کہ جنگ چھڑ جائے گی۔ خدا خیر کرے۔

۲۶ ستمبر۔ بین قومی کیفیت اس درجہ نازک ہے کہ روزانہ جہازی اخبار کی ایک اشاعت کی بجائے اب یہ اخبار دو مرتبہ چھپنے لگا ہے اور مسافروں میں عام گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔

۲۷ ستمبر۔ اطالوی سومالی بندرگاہ مصوع پر کسی کو اترنے نہیں دیا گیا۔

۲۸ ستمبر۔ بین قومی حالت نہایت نازک ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جنگ چھڑ جائے گی۔ انگریز یہ کہہ رہے ہیں کہ جنگ چھڑے تو عدن کے بعد تاکہ ہم منزل مقصود تک پہونچ جائیں اور اطالوی اور جرمن کہہ رہے ہیں کہ جنگ چھڑے تو عدن سے پہلے تاکہ جہاز کسی اطالوی بندرگاہ میں پناہ لے لے۔ غرض عجب افراتفری ہے۔ آج سے دن میں چار مرتبہ خبریں چھپنے لگی ہیں جو ٹائپ ہو کر تختہ اطلاعات پر آویزاں ہو جاتی ہیں، ایک مرتبہ ایک ایک ٹائپ شدہ اطلاع کھانے کی ہر میز پر جاتی ہے۔ اور ایک مرتبہ اخبار میں چھاپی جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علاوہ قومی جوش کے مختلف مسافروں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا اور اطالوی انگریز کو انگریز جرمن کو مذاقاً چھیڑتے رہتے ہیں۔

یکم اکتوبر۔ معلوم ہوا کہ میسولینی نے بیچ بچاؤ کر دیا ہے اور چیمبرلین، والادئے، مسولینی اور ہٹلر کے مابین تصفیہ ہو گیا ہے کہ ۱۰ اکتوبر تک جرمنی چیکوسلوواکیہ کے سوڈیٹن علاقہ پر قبضہ کر لے۔ اب مسافروں کی جان میں جان آئی ہے۔

۲ اکتوبر۔ چونکہ کہا جاتا ہے کہ مسولینی نے آگے بڑھ کر جنگ رکوا دی ہے اس لئے جہاز پر خاص طور سے جابجا اطالوی جھنڈا بلند ہوا اور اسے سلامی دی گئی۔

جہاز میں ایک امریکی پادری سفر کر رہے تھے جو عیسوی تبلیغ کے لئے گنٹور (علاقہ مدراس) جا رہے تھے ان سے جامعہ عثمانیہ کے متعلق طویل گفتگو رہی۔ حالانکہ انھوں نے حیدرآباد کے اس قدر قریب ہی عمر کا بیشتر حصہ گزارا ہے لیکن انھیں یہ علم نہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ ایک غیر فرقہ جامعہ ہے۔ یہ سن کر بہت تعجب کرتے تھے کہ جامعہ میں عیسائی، ہندو، مسلمان، پارسی سب تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہی اقامت خانہ میں تمام قوموں والے رہتے ہیں۔ کہتے تھے کہ میرا خیال تو یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ میں مسلمانوں کے سوا دوسرے مذہب کا کوئی پیر نہیں لیا جاتا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے کہ ہمارے یہاں مرہٹی، کنڑی، تلنگی، اور سنسکرت کے جدا جدا شعبے ہیں اور انگریزی ہر طالب علم کو لازماً سیکھنی پڑتی ہے۔

۱۵ر ستمبر کو صبح سات بجے جہاز پورٹ سعید پر لنگر انداز ہوا۔ نیپلز سے بلکہ جنوا ہی سے ہر لحظہ گرمی بڑھ رہی تھی اور پورٹ سعید پر ہم لوگوں کو کافی تپش محسوس ہوئی۔ یورپ سے واپس آنے میں یوروپی اور مشرقی ذہنیت میں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ سوائے اٹلی کے ہر یوروپی ملک میں بازاری اشیا کی قیمتیں مقرر ہیں اور کوئی شخص کسی دوسرے کو کوئی چیز خریدنے پر مجبور نہیں کرتا۔ پورٹ سعید میں فروشندوں کی ایک فوج ساتھ لگ جاتی ہے جو بات بھی نہیں کرنے دیتی۔ شام کے وقت اسمٰعیلیہ کا خوبصورت شہر ملا جہاں شہر سوئیس کی کمپنی نے اپنے ملازموں کے لئے نہایت نفیس آرام دہ مکانات بنائے ہیں۔ [illegible] اس بات کا ہے کہ ہمیں اپنے جہاز سے جو مکانات نظر آئے اس میں سب یوروپی صورتیں تھیں، اور شاندار گاہ میں جو بچے اور نوجوان چہل پہل کر رہے تھے وہ سب کے سب یوروپی ہی تھے۔ مصری شاذ نظر آتے تھے اور جو تھے وہ نہایت مفلوک الحال۔ اسمٰعیلیہ کے بعد جنگ عظیم کی یادگار پڑتی ہے جو عین اس جگہ کے مقابل افریقی ساحل پر ہے جہاں ۱۹۱۵ء میں اتحادیوں نے ترکی فوجوں کو پسپا کیا تھا۔

رات کے دس بجے سوئیس آیا۔ اندھیرے میں سوائے برقی روشنی کے ہم کچھ نہ دیکھ سکے، لیکن سیکڑوں ہزاروں برقی قمقمے ایک عجیب بہار پیدا کر رہے تھے۔

سوئیس کے بعد تپش نہایت تیزی سے بڑھنے لگی چنانچہ ۱۹ر ستمبر کو یعنی صرف چار روز میں ۱۰ درجہ (مئی) زیادہ ہوگئی۔ جہاز پر ایک صاحب ہر دیو کھنا نامی تھے جو لاہور کے دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور کے پروفیسر تھے اور کالج کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی چھوٹی چھوٹی مشینیں خریدنے کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا (اور یہ خیال بہت کچھ حقیقت پر مبنی تھا) کہ ہمارے ملک میں نام نہاد سائنس کی جو تعلیم ہوتی ہے وہ بڑی بیش قیمت ہے اور اتنا روپیہ خرچ کرنے سے جو نتائج رونما ہوتے ہیں وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں۔ اس لئے کہ جو لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں ان میں اپنے علم کو کام میں لانے کی بالکل اہلیت نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کی تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ خواہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر ہو، طلبا اپنی معلومات کو کام میں لا سکے۔

۲۰ر ستمبر کو گرمی کی شدت ہوگئی۔ خدا کی قدرت ہے کہ صرف پانچ چھ روز پہلے جو کپڑے پہنے جاتے تھے انھیں اب ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ گرمی کل سے دو درجہ (مئی) زیادہ ہوگئی اور رات کے وقت گرمی کی شدت سے نیند نہیں آئی۔

۲ ۱/۲ بجے پریشان ہوکر عرشے پر آیا اور ایک بنچ پر لیٹ کر یوں ہی صبح کر دی۔ شام کے سات بجے اطالوی نوآبادی مصوع آیا۔ یہاں وہی یورپی آقا اور " دیسی " غلام کے درمیان تباین دیکھا۔ اطالوی آقا خوش پوش، روشن چہرہ، " متمدن "، غلام میلے کپڑے ڈالے ہوئے، بدن پر ہڈیاں ہی ہڈیاں، گرتا پڑتا، بونے قد کا افریقی۔ غرض یورپی نوآبادی کا یہ پہلا منظر ہے جو مصوع میں نظر آتا ہے۔

یوں تو جہاز میں ہر تیسرے روز ناچ ہوتا ہے، لیکن رات جو ناچ ہوا اس میں ہمارے جدہ کی ایک مسلمان دوشیزہ ایک انگریز نوجوان کے ساتھ ناچی۔ خدا جانے ہم کب تک ہر یورپی چیز کو نعوذ باللہ مسنون اور باعث نجات سمجھتے رہیں گے۔ بجائے اس کے کہ یورپ کی اچھی عادتوں اور خصلتوں کو اختیار کریں اور وہاں کی اصول پسندی، حب وطن، پابندیٔ وقت، صفائی ستھرائی وغیرہ ایسی صفات کو اختیار کریں، ہم اپنا تمدن اور اپنی تہذیب چھوڑتے جاتے ہیں اور جن خصلتوں سے یورپ اس حالت کو پہونچا ہے کہ بھائی سے بھائی جدا ہے اور ہر ملک محض ظنی مادی نفع کی خاطر دوسرے ملک کو نگلنے کی کوشش کر رہا ہے، اور روز بروز مادیت کی قربان گاہ پر از خود چڑھا جاتا ہے، ایسی خصلتوں کو آنکھ بند کرکے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے نام نہاد مسلمان بھائی تو بس یورپ کی ہر عادت کو، سوائے ان عادتوں کے جن کی وجہ سے کسی قسم کا دنیوی مفاد ہو، اختیار کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ جہاز پر کم از کم پچیس تیس ہندستانی بیبیاں تھیں، ان سب میں یہ مسلمان لڑکی ہی رہ گئی تھی کہ ایک یورپی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اور اس کا ہاتھ اپنی کمر میں لپٹوا کر ناچتی! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۹ ستمبر کو گرمی اور بھی بڑھی اور رات بھر نیند نہیں آئی۔ جہاز علی الصباح عصاب پر ٹھہرا اور گورنر جنرل حبش کی بیوی ڈچز آؤستا، جو اس جہاز پر نیپلز سے سفر کر رہی تھیں، اتر گئیں۔ عصاب ایریٹریا کا آخری بندرگاہ ہے یہاں سے فرانسیسی نوآبادی جبوتی شروع ہوجاتی ہے جہاں سے فرانسیسی ریل عدیس ابابا کو جاتی ہے۔ آٹھ بجے انگریزوں کا مستحکم جزیرہ اور پٹرول کا مرکز جزیرہ پیرم آیا اور ہم جزائر کو خیرباد کہہ کر خلیج عدن میں داخل ہو گئے۔

جہاز عدن میں ۲ ۱/۲ بجے سے رات کے نو بجے تک ٹھیرا رہا۔ جہاز کی طرف سے ایک اکسکرشن ترتیب دیا گیا تھا، میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ ہم پہلے عدن کے مشہور آفاق تالابوں کو دیکھنے گئے جو اغلباً شداد نے اپنے " باغ عدن " کی آبپاشی کے لئے بنائے تھے۔ یہ تعداد میں سات ہیں اور گو ہزاروں سال کے بنے ہوئے ہیں لیکن بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کل ہی چنائی کی گئی ہے۔ ایک نوادرخانہ بھی ہے جس میں جنوبی عرب کے حامی (Hamarite) کتبے رکھے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس میں روشنی کا انتظام نہ تھا اور کمرے میں کھڑکیاں وغیرہ کچھ نہیں جس کی وجہ سے کچھ نظر نہ آسکا۔ خدا جانے باوجود برقی روشنی نصب ہونے کے اس کے کھولنے کا انتظام کیوں ممکن نہیں جس کی وجہ سے یہ نوادرخانہ بے کسی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں سے شیخ عثمان نامی نخلستان گئے اور صحرا میں شادابی کا نمونہ دیکھا۔ راستے میں انگریزوں کے استحکامات کا نظارہ سامنے آیا۔ پہاڑ کے پہاڑ قلعہ بند کئے ہوئے ہیں، ایک زبردست لاسلکی اسٹیشن ہے اور

سمندر کے پانی سے نمک اور نائٹریٹ نکالنے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ حسب قاعدہ عرب نہایت مفلوک الحال ہیں۔ دوکانوں میں سوائے یوروپی اشیاء کے کچھ نہیں ملا۔ قہوہ خانوں میں بجائے کرسیوں کے رسّی سے بنی ہوئی چار پائیاں بچھی دیکھیں۔ مرین خوش پوش زبردست حاکم اور غریب بے یار و مددگار محکوم کے درمیان یہاں بھی تباین صاف نظر آتا تھا۔ اونٹ گاڑیوں، اونٹ چھکڑوں اور اونٹ ٹھیلوں کی سُست رفتاری کے ساتھ موٹر کی زود روی عجیب معلوم ہوتی تھی۔

خدا خدا کر کے ۳۰ ستمبر کو گرمی میں خفیف سی کمی محسوس ہونے لگی، اور اگلے دن گرمی خاصی کم ہوگئی۔ ہمارے جہاز پر داڑھی مونچھ منڈے ہوئے ایک سکھ صاحب تھے جو ۲۲ سال سے امریکہ میں مقیم ہیں اور تجارت کرتے ہیں۔ ان سے امریکہ میں ہندستانیوں کی حالت کے متعلق مفصل گفتگو رہی تھی۔ کہتے تھے کہ معاشری اعتبار سے امریکہ میں ہندستانیوں کے ساتھ بجنسہٖ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا کسی یوروپی یا امریکی کے ساتھ، لیکن انھیں کوئی سیاسی حقوق حاصل نہیں ہیں اور ۱۹۲۴ء سے پہلے جن ہندستانیوں کو امریکی شہریت مل گئی تھی وہ بھی چھین لی گئی۔ نیز اب کوئی ہندستانی امریکہ جائے تو زیادہ سے زیادہ چھ مہینے یا ایک سال رہ سکتا ہے اس کے بعد امریکہ چھوڑنا پڑے گا۔ صرف طلبہ کو دوران تعلیم میں رہنے کی اجازت ہے لیکن انھیں بھی اپنے امتحانات کے نتائج کی اطلاع حکومت کو کرنی پڑتی ہے۔ میں نے معاشری اور سیاسی تباین کا سبب دریافت کیا تو کہا کہ سبب صرف یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اس طرف توجہ نہیں کرتی اور حکومت ہند کا امریکہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، گو سال گزشتہ ایک تجارتی کمشنر کے تقرر سے حالات میں بہتری پیدا ہوگئی ہے۔ دبی زبان سے یہ بھی کہا کہ اگر ہندستانیوں کو حقوق شہریت کیا مسلسل قیام کی اجازت بھی مل جائے تو ہندستانی امریکی تجارت کا اجارہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

ہمارا جہاز ۳ اکتوبر کو علی الصباح بمبئی پہونچ جانا چاہیے تھا لیکن عدن پر غیر معمولی طور پر رُکنے کی وجہ سے رات کے آٹھ بجے پہونچا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ سمندر میں دن بھر نہایت جنبش رہی اور بہت لوگ متلی میں مبتلا رہے۔ انسان چھ ماہ یورپ میں رہ کر اپنے ملک کی نکبت اور پستی کو بھول جاتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ جیسے نیپلز، استنبول، ڈوور اور کیلے میں آسانی اور سہولت سے جہاز سے اتر گئے تھے ویسے ہی یہاں بھی ہوگا، لیکن یہاں گویا اپنے گھر اترنے میں اس قدر تکلیف کا سامنا کرنا پڑا کہ الحفیظ! پاسپورٹ دیکھنے میں اس قدر ٹرلونگ تھی کہ باید و شاید۔ اول تو خود بمبئی اترنے والے مسافر بے شمار تھے، پھر باقی سب کے سب بمبئی دیکھنے کے لئے اتر رہے تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ساحل پر سے دو سو ڈھائی سو عورتیں، مرد، بچے جہاز پر آ گئے۔ اس انبوہ عظیم کو بغیر کسی ترتیب و تنظیم کے ایک چھوٹے سے دروازے میں ہو کر گزرنا اور جہاز کے ایک برآمدے میں ہو کر جانا پڑا جس کی دوسری طرف دو انگریز نما صاحب بہادر پاسپورٹوں پر مہر لگانے میں مصروف تھے۔ ٹیکے کا سرٹیفکٹ، جس کی موجودگی پر جہاز میں اتنا زور دیا گیا تھا، کسی نے دیکھا تک نہیں جن کے پاس سرٹیفکٹ نہ تھے انھیں بے کار ٹیکے لگوانے اور جہاز کے اطالوی ڈاکٹر صاحب کی مٹھی گرم کرنی پڑی۔ جہاز سے اترے تو محصول خانے کا میدان حشر سامنے آیا۔ کئی روز پہلے ہر

سامان کو بھرنے کے لئے ایک ایک فارم دیا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ سفر کے دوران میں جتنی نئی اشیاء خریدی ہوں وہ بلاکم وکاست بقید قیمت مندرج کی جائیں۔ ہم جہاز سے پونے دس سے پہلے نہ اتر سکے اور اترتے ہی اس فارم کی پیشی ہوئی۔ تشخیص محصول میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ اب سامان کھلنے کی باری آئی۔ قلی بے چارے مسافروں سے باضابطہ مثناً طلب کرنے میں مصروف تھے اور کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ میں نے ایک پیسہ بھی دینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں ہر بکس کھولنے کے لئے تیار ہوں لیکن ناجائز پیسہ ایک بھی نہ دوں گا۔ سنا ہے کہ کئی مسافروں او عہدہ داروں کے درمیاں تو تو میں میں بھی ہوئی بہرحال یہ سماں کہیں نہ دیکھا تھا جو خاک پاک ہند میں اترتے ہی نظر آیا۔ ہوٹل پہونچتے پہونچتے سوا گیارہ بج گئے۔

ہمارے استقبال کے لئے میرا لڑکا مصطفیٰ کمال اور بھانجا الیاس ہمایوں مرزا (نبیرۂ نواب سرمد جنگ بہادر مرحوم) آئے تھے۔ دوسرے دن میں حیدرآباد روانہ ہو گیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر بہت سے احباب اور عزیز طلبہ نے خیر مقدم کیا اور اس طرح خدا تعالیٰ کی مہربانی اور حضور پرنور اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کے اقبال سے چار ماہ کا یہ سفر نیک بخیر اور کامیابی سے ختم ہوا اور جس مقصد سے مجھے مامور کیا گیا تھا وہ بحسن خوبی انجام کو پہونچا۔

ہارون خاں شروانی

رباعیات منور

ہیں کتنی سکوں پسند آنکھیں میری
کرتی ہیں مجھے بلند آنکھیں میری
اٹھنے لگتا ہوں دوجہاں سے اوپر
خود ہو جاتی ہیں بند آنکھیں میری

رخ اپنی ہوس کا موڑ دیتا ہوں میں
زنجیر طلب کو توڑ دیتا ہوں میں
پھر کوئی تمنا نہیں رہتی دل میں
جب خود کو خدا پہ چھوڑ دیتا ہوں میں

دل گرد کثافت سے ترا پاک نہیں
تو مرد خدا بلند ادراک نہیں
یہ علم یہ فضل سب منور بیکار
باتیں تو ہزاروں ہیں عمل خاک نہیں

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

"دیوانہ"

ایڈگر ایلن پو ایک ادا کار کا لڑکا تھا جو سنہ ۱۸۰۹ء میں بوسٹن میں پیدا ہوا۔ بعد میں ایک امیر سوداگر نے اس کو متبنیٰ بنا لیا اسے تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا جہاں اس نے اسٹوک نیو انگلش میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ دنوں تک ورجینیا یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھنے کے بعد یہ ایک فوجی کیڈٹ بن گیا۔ لیکن آخر و صحافت کا پیشہ اختیار کر کے ایڈیٹر ہو گیا۔ اس کی تصنیف کا بہترین حصہ جس میں نظمیں اور افسانے ہیں سنہ ۱۸۳۵ء اور سنہ ۱۸۴۵ء کے درمیان لکھا گیا۔ ذیل کا افسانہ اس کے منطقی اسلوب کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں وہ تنگدستی کی حالت میں فوت ہوا۔ مترجم

یہ صحیح ہے کہ میں عصبانی بے انتہا عصبانی انسان تھا اور ہوں۔ لیکن آپ یہ کیوں سمجھ لیں کہ میں دیوانہ ہوں بیماری نے میرے حواس نہ تو مردہ کئے ہیں اور نہ تو مردہ بلکہ وہ اور تیز ہو گئے ہیں۔ میں جنت و ارض کی سب آوازوں کو سنتا ہوں اور دوزخ کی کراہیں میرے کانوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ پھر میں دیوانہ کیسے کہلایا۔ آپ ذرا صبر سے سنیں اور غور کریں تو معلوم ہوگا کہ میں اپنی واردات اطمینان اور صحت کے ساتھ سناتا ہوں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ خیال پہلے پہل کیسے میرے دل میں پیدا ہوا۔ لیکن ایک بار جب میں نے ارادہ کر لیا تو رات دن ... بس مجھے یہی دھن تھی۔ مقصد کوئی خاص نہ تھا۔ کوئی جذبات اس کی تہہ میں نہ تھے۔ یوں کہئے تو مجھے اس بوڑھے آدمی سے ایک انس سا تھا۔ اس نے کبھی میری بدخواہی نہ کی تھی اور نہ کبھی ہتک سے پیش آیا تھا اس کے روپے پیسے کی مجھے کوئی تمنا نہ تھی۔ ہاں ایک صرف اس کی آنکھ تھی جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اس کی ایک آنکھ گدھ کی آنکھ سے بالکل مشابہ تھی۔ ہلکی نیلگوں اور اس پر ایک ملگجا پردہ۔ جب وہ میری طرف اٹھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے۔ رفتہ رفتہ میں نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ اس بوڑھے کا خاتمہ کر دوں۔ اور اسی طرح اس موذی آنکھ سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لوں۔

آپ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن ذرا میری حالت پر غور کیجئے دیوانوں کو کچھ سمجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ لیکن اس کام کو میں نے جس احتیاط تدبر دور اندیشی اور دانشمندی سے انجام دیا ہے وہ قابل دید تھا۔ میں نے جس شب اس بوڑھے کو قتل کیا اس سے ایک ہفتہ پہلے سے میں اس کے ساتھ دل جوئی سے پیش آتا رہا تاکہ اسے ذرا بھی شبہ نہ ہو اور ہر روز آدھی رات کو کھٹکا گھما کر میں اس کے کمرے کا دروازہ نہایت آہستگی سے کھولا کرتا تھا۔ اور جب دروازہ اس قدر کھل جاتا کہ میرا سر داخل ہو سکے تو پہلے میں ایک قندیل (جو چو طرف سے ایسی ڈھکی ہوئی ہوتی کہ ذرا بھی روشنی باہر نہ نکلتی) اندر بڑھا دیتا اور اس کے بعد اپنا سر داخل کر دیتا۔ آپ واقعی ہنس دیتے اگر آپ اس وقت اپنا سر ہوشیاری سے دبے دبے داخل کرتا ہوا دیکھ لیتے میں نہایت احتیاط برتتا کہ کہیں بوڑھا جاگ نہ پڑے۔ مجھے اپنا پورا سر داخل کر دینے میں تقریباً ایک گھنٹہ درکار ہوتا یہاں تک کہ مجھے بوڑھا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا صاف دکھائی دیتا کیا کوئی دیوانہ اس قدر احتیاط برت سکتا ہے۔ اور جب میں اپنا سر اچھی طرح داخل کر چکتا تو پھر قندیل کے پردے کو اس قدر ہٹاتا کہ ایک ہلکی باریک شعاع بوڑھے کی اس گدھ جیسی آنکھ پر پڑتی۔ اور یہ عمل

میں مسلسل سات راتوں تک کرتا رہا ہر دفعہ آدھی رات کو۔ لیکن ہر بار بوڑھے کی آنکھ مجھے بند نظر آئی اور میں اپنا کام انجام نہ دے سکا۔ کیونکہ مجھے اس بوڑھے سے کوئی بیر نہ تھا۔ بلکہ اس کی بھیانک آنکھ سے نفرت تھی چنانچہ ہر صبح میں بوڑھے کے پاس دلیرانہ چلا جاتا اور اس سے رات کی خیریت دریافت کرتا اور وہ نہایت متانت سے میرا شکریہ ادا کرتا اسے کیا معلوم تھا کہ ہر روز آدھی رات کو میں اس کی آنکھ کا جائزہ لیا کرتا ہوں اور وہ سوتا رہتا ہے۔

آٹھویں رات کو میں نے غیر معمولی احتیاط سے دروازہ کھولا گھڑیال کا منٹ کا کانٹا بھی اتنا آہستہ حرکت نہیں کرتا جتنا کہ میرا ہاتھ حرکت کر رہا تھا۔ میں اپنے داؤں گھات پر بڑا مسرور تھا بلکہ شاید اپنے لئے میرے منہ سے کلمۂ تحسین نکل گیا اور بوڑھے نے اسے سن لیا۔ کیونکہ وہ بستر پر فوراً اٹھ بیٹھا لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں گھبرا کر واپس ہو گیا نہیں میں واپس نہیں ہوا۔ اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ وہ دروازے کے اس کھلے ہوئے حصے کو دیکھ نہ سکتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ دروازہ کھولتا گیا۔ جب میں نے اپنا سر اندر داخل کر دیا اور قندیل بڑھا کر پردے کو کھولنا چاہتا تھا کہ میری انگلی پھسل کر اس کے ٹین کے حصے پر لگی اور بوڑھا چونک کر اٹھ بیٹھا اور چلایا "کون ہے" میں ویسے ہی دم سادھ کر خاموش کھڑا رہا۔ پورے ایک گھنٹے تک میں نے ہاتھ پیر کو ذرا بھی جنبش نہ دی۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھا ابھی نہیں لیٹا بلکہ اسی طرح آواز پر کان لگائے بیٹھا ہے۔

اس اثنا میں میں نے ایک ہلکی سی کراہ کی آواز سنی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آواز انتہائی خوف کا نتیجہ تھی کسی درد یا تکلیف کی وجہ سے یہ آواز نہیں نکلی تھی۔ میں اس سے خوب واقف ہوں۔ مجھے خود جب کہ ہر روز آدھی شب کو دنیا سوتی رہتی ہے اپنے دل کی گہرائی میں اس دہشت سے پالا پڑ چکا ہے مجھے بوڑھے کی حالت پر رحم آیا اگرچہ کہ آج کی کامیابی پر میں بہت مسرور تھا۔ میں دیکھا بوڑھا اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا ہے غالباً وہ اس آواز کی مختلف وجوہ پیش کر کے دل کو بہلا رہا تھا یہی چوہے کی آواز تھی یا ہوا کا جھونکا روشندان سے گزر رہا تھا شاید یہ تھا شاید وہ تھا لیکن سب بے سود تھا اس کا دل مطمئن نہ ہوا کیونکہ موت کا غیر محسوس سایہ اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

جب میں بہت دیر اسی طرح خاموش کھڑا رہا اور بوڑھا بستر پر نہ لیٹا تو میں نے قندیل کا ذرا سا پردہ ہٹانے کا ارادہ کر لیا پردے کو ذرا سا چھوا ہی تھا کہ ایک شعاع نکلی اور عین بوڑھے کی اس گدھ کی آنکھ پر جا پڑی۔ آہ وہ آنکھ کھلی تھی بالکل کھلی وہی ہلکی نیلگوں آنکھ اور وہی گھناؤنا منحوس پردہ جس نے میرے جسم میں غصے کی ایک لہر دوڑ دی۔

اب فرمائیے آپ جسے دیوانگی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں میں اسے احساس کی تیزی کہتا ہوں۔ آپ یقین نہیں تو سنیے اس گہری خاموشی میں میرے کانوں میں ایک ہلکی مدھم آواز جیسی کہ روئی کے گالے میں گھڑی کی آواز سے آتی ہے آنی شروع ہوئی۔ یہ آواز بوڑھے کے دل کی دھڑکن تھی جس نے میرے غصہ کو اور بھڑکا دیا جس طرح طبل کا تھاپ سپاہی کی جرات کو بڑھا دیتا ہے۔

پھر بھی میں نے ضبط سے کام لیا اور اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا یہاں تک کہ بمشکل سانس لے رہا تھا۔ میں نے قندیل کی روشنی آنکھ پر اسی طرح قائم رکھی۔ اس اثنا میں بوڑھے

کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی اونچی ہوتی گئی تیز ہوتی گئی۔ ہر لمحہ ہر لحظہ۔ آپ جانتے ہیں میں عصباتی انسان ہوں۔ اندھیری رات اور اس پرانے مکان کے بھیانک ماحول میں اس پُراسرار آواز اس بڑھتی ہوئی دل کی دھڑکن نے مجھ میں خوف و دہشت کا ایک ناقابل برداشت احساس پیدا کردیا۔ چند منٹ میں اور ٹھیرا لیکن دل کی دھڑکن بڑھتی ہی گئی "اف خدا" میں نے کہا "کیا یہ دلِ ناتواں پھٹ جائے گا"

اب مجھے ایک اور فکر ہوئی۔ کہیں دل کی دھڑکن کو پڑوسی نہ سن پائیں۔ بوڑھے کا وقتِ آخر اب آچکا تھا۔ ایک نعرۂ مستانہ کے ساتھ میں نے قندیل پھینکی اور تاریک فضا میں کود پڑا بوڑھے نے ایک وحشت ناک چیخ ماری صرف ایک چیخ۔ میں نے اسے نیچے گرا لیا اور اس کے وزنی پلنگ کو اس کے اوپر الٹا دیا۔ اس حد تک کامیابی کے ساتھ یہ مرحلہ طے کرنے پر میں بہت خوش ہوا۔ لیکن کئی منٹ تک وہ کمبخت دل کی دھڑکن چپ ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ کم از کم وہ اب دیوار کے باہر سنائی نہ دے گی۔ آخر کار یہ دھڑکن بند ہوگئی بوڑھا مرچکا تھا۔ میں نے پلنگ ہٹایا اور لاش کا معائنہ کیا۔ یہ ایک بے جان لاش تھی۔ میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا کوئی آواز نہ تھی۔ وہ مرچکا تھا اس کی آنکھ اب مجھے کبھی نہ ستائے گی۔

اب بھی اگر آپ مجھے دیوانہ خیال کرتے ہیں تو ٹھیر جایئے میں ذرا اپنا قصہ پورا کرلوں۔ جب میں آپ کو کہہ چکوں گا کہ لاش کو چھپانے میں میں نے کیا کیا احتیاطیں برتی ہیں تو آپ مجھے دیوانہ نہ کہیں گے۔ رات تھوڑی ہی باقی تھی اور کام بہت تھا میں نے دیوانہ وار سرعت سے کام شروع کیا پہلے میں نے لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے سر الگ ہاتھ پاؤں الگ سینہ و دھڑ کے کئی ٹکڑے۔ پھر میں نے فرش کے تین بڑے بڑے پتھر نکالے اور زمین گہری کرکے اس میں ان ٹکڑوں کو دفن کردیا۔ خون کا ایک قطرہ گوشت کا کوئی لوتھڑا یا ہڈی کی کوئی کرچی فرش پر باقی نہ رہی پھر میں نے ان پتھروں کو ان کی جگہ پر اس احتیاط اور دانائی سے بٹھا دیا کہ کسی انسان کی نظر ان پر شبہ نہ کرسکتی تھی۔

جب میں نے ان تمام فرائض سے فراغت حاصل کرلی تو اس وقت چار کا عمل تھا اور ابھی اندھیرے کا وہی حال تھا جوں ہی چار کی گجر ہوئی باہر کے دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ۔۔۔ دروازہ کھولنے گیا کیونکہ مجھے اب کس چیز کا ڈر تھا؟ تین۔۔۔ آدمی داخل ہوئے جنہوں نے نہایت اخلاق کے ساتھ اپنے پولیس آفیسر ہونے کا اعلان کیا۔ رات میں پڑوسی نے ایک چیخ سنی تھی جس کی بنا پر کسی ظلم و زیادتی کا اسے شبہ ہوا۔ پولیس میں اطلاع کی گئی اور یہ تین افسر مکان کی تلاشی کے لئے مقرر ہوئے میں نے خندہ پیشانی سے ان افسروں کو مکان تلاشی کی اجازت دی۔ مجھے اب کس چیز کا ڈر تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ چیخ خود میری تھی ڈراؤنا خواب ہی میں نے کچھ ایسا دیکھا تھا اور بوڑھا آدمی اپنے کام سے دیہات میں گیا ہے۔ میں نے مہمانوں کو پورا مکان بتلایا اور انہیں بوڑھے کی خواب گاہ میں لے گیا۔ ان کو اس کی تجوری بتلائی جس میں پیسہ لتا بالکل محفوظ تھا۔ اپنے اطمینان کے جوش میں کمرے میں کرسیاں بچھائیں اور انہیں سستانے کے لئے کہا اور اپنی فتح کی تکمیل کی وحشیانہ خوشی میں میں نے اپنی کرسی عین اس

مقام پر رکھی جہاں لاش مدفون تھی۔
افسروں کا اطمینان ہو چکا تھا۔ میں بالکل دلجمعی کے ساتھ ان سے عام امور پر گفتگو کر رہا تھا اور میری طرز گفتگو نے ان کے شبہات زائل کر دئے تھے لیکن ابھی تھوڑا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ مجھ پر لرزے کی کیفیت طاری ہوئی اور میرا جی یہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ اب چلے جائیں۔ میرا سر بھاری ہونا شروع ہوا اور میرے کانوں میں جیسے تیز گھنٹیاں بجنی شروع ہوئیں لیکن وہ لوگ اسی طرح بیٹھے رہے اسی طرح گپ شپ کرتے رہے۔ کانوں میں گھنٹیاں اور تیز بجنے لگیں اور زیادہ زیادہ واضح ہونے لگیں میں نے اس احساس کو رفع کرنے کے لئے اور زیادہ باتیں بنائیں لیکن وہ تیز ہوتی گئیں یہاں تک کہ میں نے محسوس کیا کہ یہ آواز میرے کانوں کے اندر کی نہیں ہے میں اب بالکل حواس باختہ ہو چکا تھا لیکن میں نے مزید باتیں شروع کیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ۔ لیکن آواز بڑھتی گئی۔ یہ ایک "مدھم ہلکی آواز تھی جیسی کہ گھڑی کو روئی کے گالے میں رکھنے سے آتی ہے"۔ میں نے گہری سانس لینے کی کوشش کی لیکن افسروں نے کوئی پروا نہ کی میں نے اور بھی تیزی سے بات چیت شروع کی تیز و تند آواز میں۔ لیکن آواز بڑھتی گئی میں اٹھا فرش پر تیزی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا لیکن آواز بڑھتی گئی "او خدا میں کیا کروں" میں نے چیخ کر کہا۔ میں کرسی کو جہاں بیٹھا ہوا تھا اس مقام پر دے ماری لیکن آواز بڑھتی گئی اور افسر اسی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے بیٹھے رہے۔ وہ مسکرا رہے تھے کیا ممکن تھا کہ انہوں نے یہ آواز نہ سنی ہو نہیں نہیں میرے خالق انہوں نے یہ آواز ضرور سن لی تھی انہیں شبہ ہوا وہ سمجھ گئے وہ میرے خوف و وحشت کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ میں نے بہت سے خیال دل میں لئے میں نے اس پر غور کیا اس پر فکر کی لیکن ہر چیز اس کرب سے زیادہ آسان تھی۔ یہ چیز اس وحشت سے زیادہ قابل برداشت تھی میں اس ریاکاری کی مسکراہٹ کو اب برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یا تو میں اب وحشت ناک چیخیں ماروں یا جان دے دوں لیکن آواز اور بڑھتی ہی گئی۔
"بدمعاشو" میں نے کراہتی ہوئی چیخ کے ساتھ کہا "زیادہ دق نہ کرو میں جرم کا اقرار کرتا ہوں ہٹاؤ ان تختوں کو یہیں یہیں سے اس کے دل کی دھڑکن کی آواز آ رہی ہے"۔

محمد نجم الدین انصاری

وضع (Convention)

اسی رسالے کے کسی پچھلے نمبر میں فیشن (Fashion) پر قلم اٹھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہ مضمون بہت سوں کو پسند آیا۔ فیشن کے سلسلے میں وضع کا ذکر کرنا ضروری ہوا۔ وضع کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ "ایک نفسیاتی مستوی ہے جو ہم اثروں کی ارادی غیر تعاملی غیر ناطق نقل سے حاصل ہوتی ہے" تعریفی الفاظ 'ارادی' 'غیر تعاملی' و 'ناطق' ہم اثروں کی یہ سب اسے ان نفسیاتی مستویوں سے متفرق کرتے ہیں جن کی ابتدا عوام کے ذہن فیشن ناطق تقلید در رسم و رواج سے ہوتی ہے۔ وضع ہماری زندگی میں ایک اثر و قابو رکھنے والا عنصر ہے۔ وہ ایک گزرتا ہوا تماشا نہیں ہے جیسا کہ فیشن۔ وہ ایک بڑی حد تک ہمارے خیالات، ہمارے عقائد اور تصورات کا ذمہ دار ہے کسی نے کہا ہے" درحقیقت ہم اپنے آپ کو یقین کرتے ہوئے پاتے ہیں اور ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ کیسے اور کیوں"۔ ہمارے پاس ہمارے عقیدے کے لئے ثبوت نہیں ہوتا اور نہ ہم ان لوگوں کی بہ نسبت جو یقین نہیں کرتے اس کی توجیہ کرنے کے زیادہ قابل ہوتے ہیں۔ وہ بصیرت نہیں بلکہ محض عقائد اور آرا کی وقعت ہے جو ان میں ہمارے اعتقاد کو بڑھاتی ہے۔ وضعیت ہم پر چھائی ہوئی ہے اور تقلید ہمارے لئے ہمارے سوچ بچار کے متعدد اصول موضوعہ (Postulates) مہیا کرتی ہے۔

بڑے طبقے کے لوگ جسمانی محنت کو ذلیل اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کوئی کھاتا پیتا آدمی پیدل بازار سے کوئی چیز خرید کر اپنے ہاتھ میں گھر لے جانا معیوب سمجھتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اسے شرم آئے گی، راستہ تمام پچھتا رہے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی جان پہچان والے جو اتّ راستے میں ملیں گے تعجب کی نظر سے دیکھیں گے اور ہنسیں گے۔ کوئی اپنی موٹر روک کر کہے گا کہ میں آپ کو گھر چھوڑے دیتا ہوں کیوں آج آپ پیدل اور سامان اٹھائے ہوئے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف ایک مزدور پیشہ اپنے اجتماعی رتبے اور وقار کو بڑھانے کی کوشش میں اپنے بچوں کو مدرسے بھیجتا ہے کیونکہ تعلیم ان عوامل میں سے ایک ہے جو اجتماعی امتیاز حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن کیوں غریب اونچے طبقے کے خیالات کو تسلیم کرتا اور ان پر چلنے کے لئے اپنے آپ پر جبر کرتا ہے؟ یہ محض اس عزت اور وقار کی وجہ سے ہے جو اس پر اونچے طبقے کی پسندیدگی اثر ڈالتی ہے۔ تموّل غریبوں پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ یہ بیچارے دولتمندوں کی عزت کرتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ دولتمند ہیں۔ ایسی خوبیاں جیسے سخاوت، نیک فطرت وغیرہ ان کے نزدیک بہت کم قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ ایسا کرنے سے غریب اپنے پیر پر خود کلہاڑی مار لیتے ہیں اور خود اپنے مفاد پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر انہیں اپنا نمائندہ منتخب کرنے کہا جائے تو وہ ایسے آدمی کی تلاش کریں گے جو شان و شوکت، دکھاؤ اور رتبہ رکھتا ہو۔ بجائے اس کے کہ خود اپنے ہی دائرے میں سے ایک کامیاب زندگی والے آدمی کو منتخب کریں۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ اجتماعی رتبے کا دولتمند شخص اپنے آپ کو آسانی سے مفلس کی پوزیشن میں رکھ کر اور ان کے احساسات اور مصیبتوں کا خیال کر کے ان کے مفادات کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ برخلاف

اس کے ان ہی کے دائرے میں کا ایک موزوں شخص ان کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے۔

عوام کے نزدیک کسی چیز کی قیمت کا بڑا لحاظ ہوتا ہے وہ کسی چیز کو خوبصورت اور اچھی سمجھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ قیمتی ہے۔ جانچنے کا معیار محض اس چیز کی قیمت ہے برخلاف اس کے ایک سستی چیز خواہ وہ اچھی ہی کیوں نہ ہو اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک قیمتی چیز بہ نسبت ایک سستی چیز کے زیادہ دیرپا ہوتی ہے، اور زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس پر زیادہ لاگت آتی ہے اور وہ زیادہ محنت سے تیار ہوتی ہے لیکن کسی قیمتی چیز کی قریب قریب نقل بھی نظر میں نہیں جچتی اگر یہ کہا جائے کہ وہ اصلی نہیں بلکہ نقلی ہے۔ ظاہر ہوا کہ کسی چیز کو اس کی قیمت کے لحاظ سے پسند کرنے کا رجحان کتنا زیادہ ہے اگر ایک بچے کو بھی کوئی چیز دکھائی جائے جو اس کے لئے خریدی جارہی ہے تو وہ اس کی خوبی یا خرابی کو دیکھے بغیر اس کی قیمت دریافت کرے گا۔ اگر اس سے کہا جائے کہ وہ چیز قیمتی ہے تو اس کی تشفی ہو جاتی ہے۔

وضعیت (Conventionality) کے دستور — جس سہولت سے مختلف ذہنی حالتوں کا پھیلاؤ ہوتا ہے ان میں فرق ہے۔ جسمی حرکات بہت آسانی سے پھیلتی ہیں۔ بعض متعدی ہوتی ہیں مثلاً جمائی لینا وغیرہ، بعض حرکتیں خاص خاص قوموں کی خصوصی اور امتیازی حرکتیں بن جاتی ہیں۔ مثلاً فرانسیسیوں کا کندھے جھاڑنا یا مونڈھے چڑھانا، اطالویوں کی خاص حرکات، یہودیوں کا ہاتھ پھیلا کر اٹھانا (ہتھیلیاں اوپر کی طرف ہوتی ہیں) امریکو

کی خاص ادائیں، چلا کر باتیں کرنا وغیرہ۔ جنوبی ہند میں حیرت کے اظہار کے لئے ہونٹ پر انگلی رکھ لینا بھی ایسی ہی خصوصیتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ بیسیوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ تمباکو نوشی متعدی ہے سب جانتے ہیں کہ ایک سگریٹ پینے والا دوسرے کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ خود بھی سگریٹ جلانے کی خواہش پر شاید ہی قابو حاصل کر سکتا ہے۔ طرز گفتگو بھی کچھ متعدی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ہکلے کے ساتھ ایک عرصے تک رہے تو وہ بھی بالکل غیر شعوری طور پر ہکلانے لگے گا۔ زبان کی ابتدا قدرتی آوازوں کی نقل کرنے سے ہوئی ہے۔ بقول فرائی (Fray) کے ہمارے اجداد نے جنگل میں ہوا کی آواز یا جنگلی پرندوں کے اڑنے کی آواز سنی ہوگی جب کہ انہیں اپنے بسیروں سے کسی وجہ سے اڑنا پڑتا ہے اور ان آوازوں کی نقل کر کے ایسے الفاظ بنائے جیسے بھنبھنانا، سرسرانا وغیرہ۔ اولین انسان جانوروں کی نقل کرتا تھا۔ مثلاً آسٹریلیا کے اقسام کے ناچ، ریچھ کا ناچ (Bear Dance) کینگرو کا ناچ (Kangroo dance) ریچھ اور کینگرو کی نقل کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ انسان نے مردے کا گاڑنا بھی جانوروں سے سیکھا ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی ہوائی جہاز کی ساخت میں پرندوں کی ساخت کے اصولوں سے مدد لی گئی ہے۔ غرض کہ انسان نے بہت ساری چیزیں اپنے ماحول سے حاصل کی ہیں۔

پیاس بہ نسبت بھوک کے زیادہ متعدی ہے۔ مشروبات اکثر قومی بن جاتے ہیں، مثلاً جرمنی میں بیر (Beer) انگلستان میں ایل (ale) اسکاچستان اور آئرستان میں

وہسکی، فرانس میں ابسنتھی (absinthe)، ساز انگریز کی برانڈی اور سوڈا، امریکیوں کے کاک ٹیل (Cocktail) وغیرہ۔ احساسات بھی متعدی ہوتے ہیں۔ یہی حال تجسس اور حرص کا ہے۔ یہ شاید ہی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ہمسایہ کو اس کے رشتہ دار کی موت پر رنج کرتے ہوئے دیکھ کر اپنے رنج کے احساس پر قابو حاصل کرے۔ یا اپنی ہنسی کو روک سکے جب کہ محفل میں باقی سب لوگ لوٹ لوٹ کر ہنس رہے ہوں۔ حرص کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں وہ بڑھتی ہی جاتی ہے کم نہیں ہوتی۔ کھوج کرنے کی خواہش بھی وہی اثر رکھتی ہے۔ مثلاً ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ اگر راستے پر معمولی واقعہ پیش آجائے تو کتنے رہرو وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ کھوج کرنے کی خواہش (Curiosity) متعدد اجتماعی یا سوشل رجحانات کی پہلی وجہ ہے۔

اگرچہ اب بھی بعض ابتدائی رسومات وغیرہ ہیں لیکن ان میں وقتاً فوقتاً حالات کے لحاظ سے تبدیلی کی جاتی ہے نئے حالات کا تقاضا ہے کہ رہائش کے طریقوں میں تبدیلی کی جائے۔ لیکن سوچنے اور محسوس کرنے کے طریقوں میں بہت کم تبدیلی کی گئی ہے۔ ادنیٰ طبقے کے افراد اعلیٰ طبقے کے افراد کی تقلید کرتے ہیں بدازیں وجہ کہ وہ ان کی عزت کرتے اور ان کا لحاظ کرتے ہیں۔ اس تقلید کا سلسلہ مقابلے کی تقلید میں ختم ہوتا ہے جو مساوی حیثیت کے افراد میں ہوتی ہے جہاں کہ رشک ہو کوئی نہ کوئی اجتماعی تبدیلی ہونی یقینی ہے ادنیٰ طبقہ اعلیٰ طبقے کی تقلید ختم کر دیتا ہے جب کہ تقلید اس کی اساسی ضروریات یا جبلتوں میں مخل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ادنیٰ طبقہ اعلیٰ طبقے کی اس بات میں تقلید نہیں کرتا کہ اپنے بچوں کو آیا کے حوالے کر دے۔ اعلیٰ رتبے کے افراد کی یہی وضع ایک گہری جڑ کی ہوئی جبلت کو توڑنے کا رجحان رکھتی ہے اور احساس ہی پر وار کرتی ہے۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ادنیٰ طبقہ مالی مشکلات کی وجہ سے ایسی تقلید نہیں کر سکتا یہ ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل وجہ قدرتی جبلت ہے۔ مختلف جماعتوں کے لوگوں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور اسلئے ان کے کاموں اور طریقوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایک مزدور کی زندگی ایک فنی شخص کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے فنی آدمی اپنے فن میں ایک عرصے کے بعد ہی شہرت اور کامیابی حاصل کرتا ہے یہ ایک وجہ ہے کہ وہ دیر میں شادی کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مزدور کے لئے کوئی فرق نہیں ہوتا اگر وہ جلد شادی کرے یا دیر سے کرے۔

اگر سوشل وقار ہی سب کچھ ہوتا تو قوم کی ترقی میں بڑی رکاوٹ ہوتی۔ ایک ادنیٰ طبقے کا معمولی آدمی محض اپنے کام کی خوبی کی وجہ سے ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں جماعتوں میں شہرت حاصل کر سکتا اور ان کی نظروں میں اچھا بن سکتا ہے۔ عام طور سے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں تقلید اعلیٰ سے ادنیٰ میں ہوتی ہے لیکن بعض اوقات اعلیٰ طبقہ ادنیٰ طبقے کی نقل کرتا ہے مثلاً بازاری گفتگو گانے وغیرہ میں بہر حال اعلیٰ طبقہ بہ نسبت ادنیٰ طبقے کے قوم کی ترقی میں زیادہ حصہ لیتا ہے۔ اس نظریے میں بعض ممالک کے حالات کے لحاظ سے تبدیلی کر کے یہ کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ طبقہ نہیں بلکہ متوسط طبقہ قوم کی ترقی میں زیادہ حصہ لیتا ہے اور یہ خیال ہندوستان کی حد تک درست ہے اگرچہ یورپ امریکہ وغیرہ میں اعلیٰ طبقہ ہی رسم و رواج کو توڑتا ترقی کی راہ صاف کرتا، اعلیٰ تخیلات اور طریقے پھیلاتا اور مجموعی حیثیت سے

سوسائٹی کو بیدار اور ترقی یافتہ بناتا ہے۔ ایک قوم کے امرا دوسری قوم کے امرا کی نقل کرتے ہیں۔ مثلاً فرانسیسی امرا نے انگریز امرا سے میدانی کھیل گھوڑ دوڑ وغیرہ سیکھے۔ انگریز امرا نے سولھویں اور سترھویں صدیوں میں اطالیہ کی معاشرت اختیار کی بعد میں انہوں نے فرانسیسی فیشن، فنون لطیفہ اور آزاد خیالی سیکھی روم نے یونان کی تقلید کی۔ یہ ہے اثر ایک بیدار اور چست امیر طبقے کا۔ اگر وہ کاہل اور روایتی بن جائے تو ترقی زمانۂ ماضی کا واقعہ ہو جاتی اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے نشو و نما کے لئے ایک پھرتیلی اعلیٰ جماعت کی موجودگی ضروری ہے۔ مساوی رتبے اور حیثیت کے لوگ ایک دوسرے پر ویسا اثر نہیں ڈال سکتے جیسا کہ متمول طبقہ متوسط اور ادنیٰ طبقوں پر ڈالتا ہے۔ اس لئے مساوی حیثیت کے افراد کی سوسائٹی میں صحیح ترقی نہیں ہو سکتی۔ اثر اور اقتدار رکھنے والے کی نقل کی جاتی ہے۔ زیادہ کامیاب افراد کی تقلید کم کامیاب افراد کرتے ہیں۔ آخرالذکر قسم کی تقلید زیادہ شعوری اور مجبوری معلوم ہوتی ہے۔

محمد سعید الدین

غزل

نہیں افسرادہ مشابہت جو ہے ان کو ماہ تمام سے
مگر ان کی ہے یہ خصوصیت کہ الگ ہیں منظر عام سے

مجھے فکر ظلمت شام کی نہ سحر کے جلوۂ تام سے
نہ وہ حال ان کے پیام کی نہ یہ واقف ان کے مقام سے

مرے حوصلوں کی نگاہباں ہیں انہیں کی شوخ نگاہیاں
مرے ولولے بھی رواں دواں ہیں انہیں کے سحر خرام سے

جو گھٹا میں برق چمک گئی ہوئی دور ظلمت بدظنی
کہ جھلک عنایت خاص کی نظر آئی رحمت عام سے

وہ کسی کی سادہ شرارتیں وہ مری نگہ کی مسرتیں
یہی زندگی کی حقیقتیں ہوئیں خوشش بقائے دوام سے

دل مضطرب کو سنبھال کے میں بہت اٹھاؤں گا فائدے
کسی مہ جمال کے سامنے کسی مہ جمال کے نام سے

دل صید میں جو بنی کسک وہی لہر باہمہ دہم ونک
کبھی آئی شاخ سے دام تک کبھی شاخ تک گئی دام سے

وہی بے نیازی چشم ادھر وہی بے قراری دل ادھر
وہ ہیں اب بھی اپنے مقام پر میں ہٹا ہوا ہوں مقام سے

یونہی طے کروں گا رہ ادب کہ ہے ناز حسن ادب طلب
مرے دیں کو ورنہ ہے ربط اب نہ قعود سے نہ قیام سے

وہ روش روش پہ نیا سماں وہ قدم قدم پہ نثار جاں
کہ شگفتہ تر مرا گلستاں ہے اسی "نسیم خرام" سے

منظور اب ہے وہ کشمکش نہ وہ میں نہ وہ بت ماہوش
دم دید میری نگاہ غش نہ ہوئی تجلی عام سے

سید علی منظور

ٹالسٹائے کا نظریۂ حسن کاری

ٹالسٹائے انسانیت کے ان رہنماؤں میں سے تھا جو اپنی فکر سے زندگی کی گمراہیوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش ایسی زندگی چاہتا تھا جو خلوص، محبت اور اتحاد و مساوات کو پرورش دے اور اس بلند نصب العین کی طرف رہنمائی کرے جو ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے یعنی ہم خدا سے قریب ہوتے جائیں۔ اس نے اپنے عہد کے سارے جمالیاتی نظریوں کو جن کی بنیاد صرف مسرت اور حسن پرستی بے معنی اور گمراہ کن ٹھیرایا۔ وہ کہتا ہے کہ ایسا آرٹ جو غریبوں کی محنت پر تعمیر کیا گیا ہو اور جس میں ان کی تسکین کا کوئی سامان نہ ہو کس طرح بلند ہو سکتا ہے۔ آرٹ کا کام تو بنی نوع انسان کی رہنمائی ہے۔ اور جس آرٹ میں یہ قوت نہ ہو اور جو صرف ایک مخصوص طبقے کی لذت پرستی کا سہارا بنا رہے وہ کیا انسان دشمن اور غریب کش آرٹ میں راہ پانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس کے عہد میں اس طرز کا آرٹ زیادہ مقبول تھا جس میں لذت پرستی کے جذبات اکسانے کی صلاحیت تھی اور جو صرف اعلیٰ طبقے کی زندگی سے اٹھتا تھا۔ اور اس میں انہیں کے ذوقِ حسن پرستی کی رعایت رکھی جاتی تھی۔ ٹالسٹائے نے آرٹ کے اس گمراہ کن تصور کی بڑے زور سے مخالفت کی اور ایسے آرٹ کے لئے اکسایا جو سب کے لئے تھا اور جو زندگی کی سطح سے نہیں بلکہ زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتا تھا۔

جب اعلیٰ طبقے نے اپنے آرٹ کا نظریہ مسرت اور حسن کی بنیادوں پر رکھا تو آرٹ کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک اعلیٰ طبقے کا آرٹ اور ایک عوام کا آرٹ۔ چونکہ عوام کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی اس لئے ان کا آرٹ کس مپرسی کی حالت میں نیچے دبا پڑا رہا۔ اور اس گمراہ کن آرٹ نے سوسائٹی میں مقبولیت حاصل کر لی اور طرح طرح کے متضاد اور تباہ کن نظریے اس آرٹ کو صحیح ثابت کرنے اور اس کی قدر بڑھانے کے لئے پیش کئے گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ حسن کے مظاہرات میں اعلیٰ ترین نمونہ ہمارے لئے فطرت ہے اور اعلیٰ ترین آرٹ بھی وہی ہے جو فطرت کی نقل کرے۔ بعض ایسے تھے جو حقیقت سے ذرا قریب تھے وہ یہ کہتے تھے کہ آرٹ کا مقصد حسن نہیں بلکہ نیکی ہے۔ اس نظریے کے تحت انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ سماجی زندگی بلند ہوتی جائے اور یہ بلندی اخلاقی جذبات کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے اور آرٹ کا کام یہ ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول میں ایک ذریعہ بنا رہے۔

ایک اسکول یہ کہتا تھا کہ آرٹ کا مقصد خارجی حسن ہے اور اس میں نیکی کی قطعی کوئی ضرورت نہیں اور حسن کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ہم آہنگی اور تناسب ہو اور جو دیکھنے والے کے دل میں مسرت پیدا کر سکے۔ یعنی حسن اور مسرت آرٹ کی لازمی شرط ہے اور حسن لذت ہی سے طے کیا جا سکتا ہے۔ فرانس میں اس نظریے کو خوب فروغ ہوا۔ اور اس کا اثر رفتہ رفتہ سارے یورپی ممالک پر پھیل گیا۔ آرٹ کو زندگی کے اخلاقی پہلو سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عریاں جذبات اور عورت اور مرد کی شہوت پرستی کے اظہار کا ایک ذریعہ بن گیا۔ جو آرٹسٹ جسم کو زیادہ اجاگر کر سکتا تھا اور جو نیکی اور بدی میں کوئی تمیز نہ کر سکتا تھا وہی سب سے بڑا آرٹسٹ تھا۔ فرانس کے مشہور فسانہ نویس موپاساں کی تصانیف پر تمہید لکھتے ہوئے ٹالسٹائے نے اس

طرز کے آرٹ پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آرٹسٹ کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔ اہمیت ہی آرٹ کی روح ہے۔ یعنی آرٹ کے لئے ضروری ہے کہ اس کا موضوع انسانی زندگی کے لئے اہم اور مفید ہو۔ اس نظریہ کے تحت آرٹسٹ اپنا مسالہ سوسائٹی کے اہم واقعات سے جمع کرتا ہے۔ مذہب، اخلاق، سیاست اور سماج ان سب حقایق کو اجاگر کرتا ہے۔ اور فن کار انہ تکمیل کے ساتھ دوسروں کے آگے پیش کرتا ہے۔ دوسرا نظریہ جمالیاتی ہے یعنی آرٹ صرف آرٹ کے لئے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ آرٹ کی روح اسلوب کی خوبصورتی میں پوشیدہ ہے۔ اس نظریہ کے تحت آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ فن سے واقف ہو اور ایسا موضوع اختیار کرے جو دوسروں پر خوش گوار اثر ڈال سکے۔ یعنی مسرت اور خوشی دے سکے۔ ایک خوبصورت لہلہاتا میدان ایک متناسب برہنہ تصویر اور جنسی جذبات کو اکسانے والے گیت فنی کارنامے ہو سکیں گے۔ تیسرا نظریہ وہ ہے جسے حقیقت نگاری کہتے ہیں۔ اس میں زندگی کی ہو بہو تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ اس نظریے کے تحت آرٹسٹ کا فرض ہے کہ ہر وہ چیز جو اسے نظر آتی ہے، اسی حالت میں اپنے آرٹ میں منتقل کرلے اس کے لئے موضوع کی اہمیت اور اسلوب کی خوبصورتی کی ضرورت نہیں مگر ان سب نظریوں سے آرٹ کا حقیقی مقصد واضح نہیں ہوتا۔ اور نہ آرٹ اور غیر آرٹ کی حدیں معین کی جا سکتی ہیں اور نہ تخلیقی قوت کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ فنی تخلیق ایک ایسی ذہنی قوت ہے جو دلوں کی گہرائیوں میں دبے ہوئے جذبات یا دماغوں میں چھپے ہوئے خیالات کو اس طرح اجاگر اور واضح کر دیتی ہے کہ یہ جذبات اور خیالات دوسروں تک منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایک فنی کارنامہ وہی ہے کہ جب وہ دوسروں کے سامنے آئے تو وہی جذبات پیدا کرے جو فن کار کے دل میں اس کی تخلیق کے وقت اٹھ رہے تھے۔ اور فن کار کے جذبات کی شدت انھیں اتنا نمایاں کر دے کہ وہ ہر ایک کی سمجھ میں آسکیں۔ آرٹ کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہماری نظروں میں وسعت پیدا کرے۔ انسانوں میں باہم مل جل کر رہنے کے جذبات کو پرورش دے۔ اور روحانی قوت میں اضافہ کر دے کہ یہی قوت اصل میں انسانی زندگی کا سرچشمہ ہے۔

(۱) اول اپنے موضوع سے اخلاقی تعلق (۲) دوسرے اسلوب کا حسن (۳) اور تیسرے خلوص۔ ان تینوں میں سے موپساں صرف آخری دو کا مالک تھا یعنی اس کا انداز بیان دلکش تھا اور اسے اپنے موضوع سے خلوص بھی تھا۔ اس میں ریاکاری نہیں تھی اور محبت و نفرت کے جذبات کی وہ صرف نقالی نہیں کرتا بلکہ اس پر یہ جذبات طاری ہوتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ وہ آرٹ کی سب سے اہم خصوصیت سے محروم تھا۔ یعنی اس کے یہاں نیکی اور بدی کا کوئی معیار نہیں ہے۔ اس نے ایسی چیزوں سے محبت کی اور ایسی باتوں کا اظہار کیا جو ناقابل اظہار اور ناقابل محبت تھیں۔ وہ شہوت پرستی کے جذبات میں ایک طرح کی لذت اور تسکین پاتا ہے اور کسانوں اور غریبوں کی زندگی کا بیان حقارت سے کرتا ہے۔ اس نے اپنے ماحول کے مطالبات کو تکمیل کی حد تک اپنے آرٹ میں جگہ دی۔ مگر چونکہ وہ ایک صاحب جوہر انسان تھا اور اس کی نظر زندگی کی گہرائیوں تک جاتی تھی اس لئے آخر آخر میں اس کا آرٹ کچھ بلند ہوتا جارہا تھا اب وہ لذت پرستی کے جذبات سے اکتا کر زندگی کے مقصد پر نظریں ڈالتا ہے۔ وہ ایک کہانی میں ایک عورت کی المناک زندگی پیش کرتا ہے۔ جس سے پڑھنے

والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہوگا. آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہے اور ہماری سوسائٹی ان حالات کی کہاں تک ذمہ دار ہے. یہاں اس کی روح اپنے ماحول سے بغاوت کرنے لگی ہے. اور وہ کسی ایسی دنیا کا متلاشی نظر آتا ہے جہاں اسے سکون نصیب ہو سکے. مگر اس سے پہلے کہ اس کا آرٹ منزل تک پہنچتا اس کی زندگی ختم ہو گئی.

ابھی تک آرٹ پر جو کچھ کہا گیا ہے اور جو نظریے پیش کئے گئے ہیں ان سے آرٹ کا حقیقی مقصد اور مفہوم واضح نہیں ہوتا. عام طور پر آرٹ کے یہ تین نظریے زیادہ مقبول اور مشہور ہیں. ایک نظریہ وہ ہے جو آرٹ میں افادہ کی تلقین کرتا ہے. اور جس میں موضوع کی اگرچہ کہ آرٹ ہمیشہ نئی چیز پیش کرتا ہے مگر کسی نئی چیز کا انکشاف ہی آرٹ نہیں ہے، اس لئے ان تین چیزوں کی ضرورت ہے. پہلے تو یہ کہ آرٹ کا موضوع انسانی زندگی کے لئے اہم ہونا چاہیے. اور پھر اس کا انداز بیان اس طرح ہو کہ سب اسے سمجھ سکیں. اور تیسرے یہ کہ آرٹسٹ اپنی تخلیق کے لئے کسی خارجی شئے سے ترغیب نہ پائے بلکہ دل کی اندرونی گہرائیوں کی آواز سے متاثر ہو کر یہ کام انجام دے. ایک مکمل فنی کارنامہ وہی ہے جس میں یہ تینوں چیزیں موجود ہوں. آرٹ میں ایسی چیز پیش کی جانی چاہیے جو ابھی تک دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی. مگر جس کی دنیا کو ضرورت تھی. دوسرے یہ کہ وہ سب کے لئے قابل قبول ہو. اور تیسرے یہ کہ وہ آرٹسٹ کے دل کی گہرائیوں سے نکلے. اگر کسی کارنامے میں یہ چیزیں نہ ہوں گی تو وہ آرٹ نہ ہوگا. اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر کارنامے میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے جو ہمارے لئے ضروری ہے. اس کا جواب یہ ہے کہ

آرٹ کے موضوع دو طرح کے ہوتے ہیں. ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ. اعلیٰ وہ ہے جو ہر انسان کے لئے ہر وقت ضروری ہے. اور جو ہر وقت ضروری ہے، وہی مفید اور اہم ہے بقسمتی سے پہلے اس اہم اور مفید نظریہ کی تشریح کی ضرورت نہ تھی. مگر آرٹ کے جدید نظریوں نے اس کی ضرورت پیدا کر دی ہے. وہی آرٹ مفید اہم اور قابل احترام ہے جو انسانوں کو قوت سے نہیں بلکہ محبت سے ملتا ہے. اور جو اس مسرت کا پردہ اٹھاتا ہے جو انسانوں کے مل جل کر رہنے سے ہوتی ہے، اور آرٹ کی گمراہی یہ ہے کہ وہ انسانوں میں تفریق ڈال دے. ادنیٰ آرٹ وہ ہے جس کا موضوع ایسا ہو جس کی انسان کو ضرورت نہ ہو. اور جو اخلاقی حیثیت سے گرا ہوا ہو اظہار خیال کی بلندی یہ ہے کہ ایسا انداز بیان اختیار کیا جائے جو سب کی سمجھ میں آ سکے. اور جو سمجھ میں نہ آئے وہ ادنیٰ ہے. ایک حقیقی فنی کارنامہ زندگی کے نئے تصور کو پیش کرتا ہے. ایسا تصور جو ابھی تک فن کار کے دماغ میں پرورش پاتا رہا ہے. اور جب اس کا اظہار کیا جائے تو دوسروں کے لئے وہ ترقی کی راہ کا نشان منزل ثابت ہو. حقیقت نگاری سے متعلق ٹالسٹائی کہتا ہے کہ "زندگی کی سیدھی راہ کا پتہ لگانے کے لئے صرف یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ واقعات گزر رہے ہیں انہیں بیان کیا جائے. دنیا برائیوں سے بھری ہے. یہاں ہر وقت خیر و شر کا تصادم ہوتا رہتا ہے. اگر صرف زندگی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی جائے تو برائیاں زیادہ واضح ہو جائیں گی، اور نیکی پیچھے چھپ جائے گی. حقیقت نگاری کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ واقعات کے ساتھ یہ بھی بیان کیا جائے کہ مستقبل کے لئے ہم کیسی زندگی چاہتے ہیں. اور حال کی برائیاں کس طرح دور کی جا سکتی ہیں. صرف راستے کی مشکلات

بیان ہی کافی نہیں بلکہ اس منزل کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جس کی طرف ہم سب بڑھے جا رہے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ موجودہ آرٹ کی گمراہی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کی بنیاد حسن اور مسرت پر رکھی جاتی ہے۔ آرٹ کی تعریف کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے مسرت کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انسانی زندگی کی ایک شرط تصور کیا جائے۔ جب ہم آرٹ کو اس نظر سے دیکھیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ صرف مسرت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایسے جذبات کا پیغمبر ہے جو زندگی کی ترقی اور انسانیت کو آگے بڑھانے کے لئے ناگزیر ہے۔ آرٹ کا عمل بھی زندگی کی طرح اہم ہے۔ وہ صرف ہماری تماشائی زندگی ہی کا پہلو نہیں بلکہ ہماری ساری زندگی آرٹ ہی کے سایہ میں پرورش پاتی رہی ہے۔ مگر ہم اسے اسی محدود معنوں میں استعمال کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اس کا کام صرف یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم زندگی کی تلخیوں سے گھبرا جائیں تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے دامن میں منہ چھپا سکیں۔ اور اس طرح ہم ان راہوں میں زندگی کا سکون تلاش کرتے ہیں جو قطعی ہلاک ہیں۔ آرٹ کا مقصد یہی ہے کہ وہ زندگی کی تعمیر اور بنی نوع انسان کی ترقی کی رہنمائی کرے۔ آرٹ کی تعمیر مسائل حیات سے ہوتی ہے۔ وہ عیش و نشاط کی محفلوں یا درس گاہوں سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

احساس اور جذبہ آرٹ کی بنیاد ہے۔ آرٹسٹ کا احساس اور جذبہ جتنا شدید ہوگا اتنا ہی وہ دوسروں کو متاثر کر سکے گا۔ اثر اندازی آرٹ کی لازمی شرط ہے۔ بلکہ اس کی بلندی کا معیار بھی اثر اندازی ہی سے ناپا جا سکتا ہے۔ اور اس کا تعلق آرٹسٹ کی دل کی گہرائیوں سے ہے۔ احساس اور جذبہ میں شدت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کا کوئی بلند مقصد پیش نظر رہے۔ ورنہ اب تک ہمارے آرٹ کا کام یہ رہا ہے کہ وہ اپنے گندے خیالات اور عریاں جذبات پھیلا کر زندگی کے بہاؤ کو روک دے۔

آرٹ کا کام بہت اہم ہے۔ حقیقی آرٹ کی مدد سے جو مذہب کی رہنمائی میں اپنا راستہ طے کر رہا ہو ہم زندگی کو زیادہ بلند اور زیادہ پُر مسرت بنا سکتے ہیں۔ اور یہ ہمارا فرض ہے کہ اس طرح کے آرٹ کو رواج دیں جو مسائل حیات کی گتھیوں کو سلجھا کر انسانیت کو نیکی اور ایثار کا سبق پڑھا سکے۔ اور جو ہمیں قوت کے ذریعے نہیں بلکہ محبت کی روشنی سے منزل تک پہونچا دے۔

(ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد سے نشر کیا گیا) **سید اشفاق حسین**

تنقید و تبصرہ

میری کہانی سنئے گا ۔ از سید علی صاحب شاکر ایم اے۔ چھوٹی سائز صفحات ۱۱۶ قیمت ایک روپیہ۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جس میں زندگی کی گتھیوں کو مزاحی پیرائے میں کھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ سے پنجاب اور شمالی ہندستان میں اس قسم کی تحریروں کو بہت مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اگر یہی رحجان باقی رہا تو اندیشہ ہے کہ آیندہ سنجیدہ طرز تحریر میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا بار معلوم ہوگا۔ لیکن شاکر صاحب نے اس مزاحیہ پیرایہ سے بے جا فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ بعض کام کی باتیں بیان کی ہیں ان کے اسلوب میں ایک خاص قسم کا چبھتا ہوا طنز ہے اور وہ اردو کے ایک اچھے طنز نگار بن سکتے ہیں بشرطیکہ اس حربہ سے وہ حد سے زیادہ کام نہ لیں ان کی زیر نظر کتاب کے ابتدائی حصہ میں کچھ ایسا ہی اثر پیدا ہوتا ہے لیکن اصل قصہ قابل تعریف اور لائق مطالعہ ہے۔

چمنستان فصاحت ۔ یعنی مجموعہ کلام سید ہمایوں مرزا مرحوم ۱۹ صفحات قیمت پانچ آنے ہمایوں مرزا صاحب ایک اچھے مصنف اور انشا پرداز ہونے کے علاوہ موسیقی اور شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں کی ہمت افزائی اور ایثار کی وجہ سے ان کی رفیقۂ حیات صغرا بیگم صاحبہ نے اردو کی خواتین انشا پردازوں میں ایک خاص حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مرزا صاحب کے کلام کا یہ مختصر مجموعہ ان کی بیگم صاحبہ ہی نے مرتب کیا ہے اور اس پر حیدرآباد کے مشہور استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے ایک مقدمہ لکھا ہے ہمایوں مرزا صاحب کی طبیعت میں روانی تھی زبان میں سادگی بیان میں صفائی اور سلیقہ۔ سادگی جدت یہ تین خصوصیتیں زیر نظر مجموعہ کلام میں نظر آتی ہیں مرزا صاحب حقیر تخلص کرتے تھے۔ ان کے چند شعر بطور مثال پیش ہیں۔

اپنے ہاتھوں سے نہ مجھ کو قتل کر ٭ اعتبار دوستی اٹھ جائے گا

صدمہ ہے تو یہ صدمہ ہے غم ہے تو یہ غم ہے
میں کہتا ہوں جو کچھ انہیں باور نہیں ہوتا

دل اس کا جو پھر جائے تو یہ قسمت ہماری ہے
مگر وعدے سے اپنے وہ ستمگر پھر نہیں سکتا

جدائی کا دن ہے قیامت کا دن ٭ الٰہی کسی طرح ڈھلتا نہیں

دستور الاصلاح ۔ مصنفہ سیاب اکبرآبادی مکتبہ قصر الادب آگرہ چھوٹی سائز ۴۴ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

مولنا سیاب نہ صرف شاعر ہیں بلکہ شاعر گر بھی ہیں ان کی سالہا سال کی کوششوں کی وجہ سے اردو شاعری میں نیا دبستان یعنی آگرہ اسکول روشناس ہوا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے شعر و سخن کی اصلاح سے متعلق مفید معلومات قلمبند کر دی ہیں۔ اصلاح کے طریقے اور شاگردی اور استادی کے آداب و لوازمات بھی بڑی خوبی سے منضبط کئے ہیں۔ اردو شاعری کی تعریف میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش سمجھی جا سکتی ہے۔ تذکرہ معرکۂ سخن کی طرح متعدد شعرائے متاخرین اور معاصرین کی اصلاحوں کے نمونے بھی درج کرکے اصلاح کا طریقہ واضح کیا گیا ہے۔ اور آخر میں شاہ حاتم کی طرح مولنا سیاب نے بھی اپنے تلامذہ کی طویل فہرستیں درج کی ہیں۔

شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

فرشتوں کی آزمائش ۔ از لبشیر قریشی بی اے صدیقی بک ڈپو لاہور چھوٹی سائز ۱۲۶ صفحات قیمت ایک روپیہ اردو میں کچھ عرصے

دنیا کے سیاسی حالات پر استعارہ کے پیرایہ میں اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے۔ اس سے پیشتر شیطان کا انتقام اور جدید جغرافیہ پنجاب ایسی ہی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ فرشتوں کی آزمائش میں بھی اسی موضوع کو ایک نئے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے موجودہ انتشار و تشویش پر نظر ڈال کر مسلمانوں کو قرآن کی مرکزیت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگرچہ مصنف کا پس منظر مذہبی ہے لیکن پوری کتاب ادبی رنگ میں لکھی گئی ہے اور آخر تک پڑھ جانے کے باوجود یہ شبہ بھی نہیں گزرتا کہ مصنف نے کسی مذہبی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے اس نقطۂ نظر سے یہ کامیاب کوشش ہے۔

پاربتی کی بہادری۔ از محمد احمد اللہ خاں صاحب منصور حیدرآبادی چھوٹی سائز ۱۰۰ صفحے قیمت چار آنے۔

منصور صاحب ایک پختہ مشق ادیب اور شاعر ہیں اور اب تک ان کی بیسیوں چھوٹی بڑی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جن میں سوانح عمری اکبر جنگ (۲) ترکی خاتون کا احسان عظیم (۳) کالج کے بیرے (۴) دیسی جواہر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ناول نگاری اور تاریخ سے ان کو خاص شغف ہے اور ان کی اسی کثرتِ تصنیف و تالیف اور انشاپردازی کی بنا پر ان کو نقاشِ سیرت لکھا جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ایک تاریخی موضوع پر نہایت ہی دلچسپ اور سبق آموز پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ خاص طور پر عورتوں اور بچوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

دھرتی ماتا۔ مصنفۂ پرل بک مترجمۂ ابوسعید قریشی بی اے ناشر مکتبۂ اردو لاہور چھوٹی سائز صفحات ۱۰۴ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ ایک غریب کسان کی داستانِ غم ہے جس میں غربت کی چیرہ دستیوں اور عادت کے جو نقشے بڑے کمال سے پیش کئے گئے ہیں اردو کے جدید معاملات کے پیشِ نظر توقع ہے کہ اس ناول کو شوق سے پڑھا جائے گا۔ یہ اگرچہ طویل ہے اور طویل ناولوں کی مقبولیت کا زمانہ گزر گیا لیکن یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔

گنجینۂ روزگار۔ مرتبۂ منشی احمد مالک قریشی مطبوعہ ... پریس گوجرانوالہ پنجاب چھوٹی سائز ۱۲۰ صفحات۔

اس کتاب میں دیسی اور انگریزی صابن بنانے کے نسخے ہیں اسی قسم کی کتابوں کی موجودہ زمانہ میں خاص طور پر ضرورت ہے تاکہ پڑھے لکھے لوگ فرصت کے اوقات میں دو چار گھنٹے کام کر کے کچھ منفعت حاصل کر سکیں۔ جو لوگ منفعت بخش مشغلوں کی تلاش میں رہتے ہیں انہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

مکار کی پونجی۔ از سید عزیز حیدر صاحب شاکر چھوٹی سائز ۴۲ صفحات قیمت چار آنے۔ یہ ایک معمولی قصہ ہے جس میں لیتھو کی چند بھونڈی تصویریں بھی شریک ہیں۔ مصنف کو اپنی تحریر کے چھپوانے کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ان کی دو چار چھوٹی چھوٹی کتابوں پر تنقید کی جا چکی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ مصنف لکھنے کے بعد خود ہی کچھ روز صبر کر کے اپنے مسودوں کی نظرِ ثانی کریں اور بعد کو شایع کرنے کی طرف توجہ کریں۔

دفترِ دیوانی و مال و ملکی سرکارِ عالی۔ رائل سائز ۱۷۰ اوراق آرٹ پیپر مطبوعہ دار الطبع سرکارِ عالی۔

یہ کتاب دفترِ دیوانی و مال و ملکی سرکارِ عالی کی طرف سے خاص اہتمام کے ساتھ آرٹ پیپر پر مجلد شایع ہوئی ہے اس کا زیادہ تر حصہ قدیم تاریخی کاغذات اور فرامین کی عکسی تصویروں پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ایک چھوٹا سا پیش لفظ ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دفترِ دیوانی میں ایک سو چھ قسم کے کاغذات محفوظ ہیں جن میں سے چند کے نمونے اس وقت شایع کئے گئے ہیں اس کے علاوہ ہر قسم اور عنوان کے کاغذات سے متعلق ایک علیٰحدہ

نفس، مکمل کتاب زیر ترتیب ہے نیز قدیم و قائع اخبار اور
نی۔ سوں وغیرہ کے اقتباسات اور نقلیں بھی مرتب ہو گئی ہیں جب
دونوں کتابیں شایع ہو جائیں گی تو ہماری معلومات میں نہایت
مفید اضافہ ہوگا۔ زیر نظر کتاب جس اہتمام محنت اور سلیقہ سے
شایع کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حیدر آباد کا یہ دفتر
نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر کام کر رہا ہے۔ اور اس کی اعلیٰ کار
کردگی کا سہرا اس کے علم دوست ناظم مولوی سید خورشید علی
صاحب کے سر ہے۔

لاسلکی دنیا۔ از میر حبیب اللہ صاحب ریڈیو انجینئر مطبوعہ
عہد آفریں برقی پریس۔ چھوٹی سائز ۱۲۵ صفحات قیمت چودہ آنے۔

ریڈیو ان دنوں ضروریات زندگی میں شامل ہو گیا ہے
واقعہ یہ ہے کہ یہ سائنس کی سب سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز
ایجاد ہے۔ اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی طرف کچھ عرصہ سے اردو
میں بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس سے قبل اس موضوع پر
دو تین کتابیں چھپ بھی چکی ہیں۔ زیر نظر کوشش بھی بہت کامیاب ہے۔
اس میں جگہ جگہ نقشوں کے ذریعہ سے لاسلکی کے اصولوں کو عام
فہم بنایا گیا ہے فنی اصطلاحوں اور عددی ضابطوں سے حتی الامکان
بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ لاسلکی جیسے مضمون کو محض لفظوں
میں سمجھانا مشکل ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی۔

آزاد حیدر آباد۔ مرتبہ مرزا مظفر بیگ صاحب چھوٹی سائز
۱۰۰ صفحات قیمت بارہ آنے۔

حیدر آباد میں عہد عثمانی کی برکات کی وجہ سے
جہاں اور بہت سی ترقیاں رونما ہوئی ہیں۔ اہل حیدر آباد
میں سیاسی شعور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کا ایک ثبوت زیر نظر
کتاب کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ اس میں کئی اصحاب کے ایسے
مضامین شریک ہیں جن میں حیدر آباد کی آئینی حیثیت اور
اس کے عام اور آئینی موقف کے متعلق تفصیلی معلومات پیش نظر ہو جاتی ہیں
ریاست کی تاریخ اور سیاسی دلچسپی رکھنے والوں میں یہ کتاب بہت
مقبول ہوگی۔ مرزا مظفر بیگ صاحب نے سیاسی ادب کا ایک
سلسلہ قائم کر کے اردو زبان اور اہل حیدر آباد کی قابل قدر خدمت
کی ہے۔

نظم اردو۔ از سید ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی مطبوعہ مظفر المطابع
لکھنو بڑی سائز ۱۲۰ صفحات قیمت دو روپے۔

ناطق صاحب ایک پختہ مشق شاعر ہیں اور انھوں نے
اصل میں مسدس کی شکل میں اردو ادب سے متعلق ستاون بند
کی نظم لکھی تھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ اس کو حاشیوں کے ساتھ
ایک کتاب کی شکل میں شایع کیا گیا۔ حاشیوں کی ترتیب میں
ناطق صاحب نے بڑی تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اردو ادب
کی تاریخ سے متعلق اس وقت تک جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان سب
سے استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک عیب بہت نمایاں ہے
اور وہ یہ کہ ابتدا میں تقریباً آدھا حصہ پیش لفظ دیباچہ تعارف
اور مختلف لوگوں کی رایوں اور تقریظوں کے لئے وقف کر دیا
گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک انڈکس یا اشاریہ کی بھی ضرورت
تھی۔ کیونکہ اس قسم کی پر از معلومات کتابوں کی قدر و قیمت اور
افادیت اشاریے کے بغیر تقریباً نصف کم ہو جاتی ہے۔

زبان دانی۔ از فضل الٰہی صاحب عارف اردو اکیڈیمی۔
لاہور صفحات ۳۰۰ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

اس کتاب میں اردو زبان کے اصول و قواعد کو ایک نئے
طریقے سے منضبط کیا گیا ہے۔ صحیح اردو لکھنے بولنے اور سمجھنے
میں اس کتاب کے مطالعہ سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ اردو الفاظ

اور محاوروں کے تلفظ اور صحیح استعمال کے متعلق اس میں نہایت ہی مفید ہدایتیں دی گئی ہیں۔ اور پوری کتاب عمدہ طرز پر مرتب کی گئی ہے اس قسم کے موضوع پر جتنی کتابیں اب تک چھپی ہیں ان سب میں یہ کتاب خاص طور پر مفید معلوم ہوتی ہے۔

لآلی منثور۔ از اکبر سہیل چھوٹی سائز ۹۶ صفحات قیمت پانچ آنے۔

یہ افسانوں اور ادب لطیف کے نمونوں کا مجموعہ ہے نوجوان مصنف کی تحریر میں زندگی اور شگفتگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسلوب میں زیادہ تر نیاز فتح پوری کا رنگ جھلکتا ہے اس کتاب کا مطالعہ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح سے گزارنے میں معاون ثابت ہوگا۔ کتابت اور طباعت بہت پاکیزہ ہے۔

نستے علیکم۔ از میم اسلم اردو اکیڈمی لاہور چھوٹی سائز صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/

میاں اسلم صاحب پنجاب کے بہت بڑے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے قلم میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک ان کی متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں ان کے اسلوب میں طنز اور مزاح کی ایسی چاشنی ہے کہ ان کا ہر تحریر بلا مبالغہ شوق و دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور یقین ہے کہ یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوگی کیونکہ اس میں جگہ جگہ ہندوستان اور خاص کر پنجاب کی سیاست سے متعلق کام کی باتیں طنز کے طور پر بیان کردی گئی ہیں۔

ادارہ

کیفِ جاوید

دل کی چوری بتا رہی ہو تم　　ہائے کیوں مسکرا رہی ہو تم

دل سے دامن بچا رہی ہو تم　　مری نظروں میں آ رہی ہو تم

جانے کیا کہہ دیا ہے غنچوں نے　　شام سے یاد آ رہی ہو تم

وہ محبت کی پہلی پہلی نظر　　ہائے کیسے بھلا رہی ہو تم

پھول کیا جانیں کیسے ہنستے ہیں　　اُن کو ہنسا سکھا رہی ہو تم

ٹوٹ جاتا ہے جب کوئی تارا
دل سمجھتا ہے آ رہی ہو تم

نواب زادہ جاوید قیصری

ہندوستان میں انگور کی پیداوار

انگور ایک ایسا میوہ ہے جو عام طور پر بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔ اسے لوگ تازہ اور خشک میوے کی شکل میں کھاتے اور اس سے چٹنیاں اور مربے بناتے ہیں۔ نیز اس کو دواؤں اور مختلف قسم کی مٹھائیوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس قدر استعمال کے باوجود ہندوستان میں اس کی پیداوار بہت محدود ہے اور اس کی کاشت کے لئے جتنا چاہیے اتنا رقبہ کام میں نہیں لایا جاتا۔ عام طور پر ایک ایکڑ کے رقبہ سے کوئی ۶ یا ۷ سو روپے کے انگور نکلتے ہیں اور بعض وقت تو یہ رقم دو ہزار تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹے پیمانے پر بھی بڑی کامیابی کے ساتھ انگور کی کاشت کی جا سکتی ہے۔ اور یہ مسئلہ ان تمام لوگوں کے غور و فکر کا محتاج ہے جو دیہات سدھار یا بے روزگاری کے سوال سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں تازہ انگور کی جس قدر مانگ ہے اس کا صرف نصف حصہ اس ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ اور خشک انگور یعنی کشمش اور منقیٰ وغیرہ کے لئے تو ہندوستان کو باہر سے درآمد کرنی پڑتی ہے چنانچہ تقریباً ۲ لاکھ ۲۴ ہزار من خشک انگور باہر سے آتے ہیں۔ ہندوستان میں اب جس قدر رقبہ پر انگور کی کاشت ہوتی ہے اگر اس کو تین گنا کر دیا جائے تو صرف اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ ملک کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اب جس قدر آمدنی زراعت سے ہوتی ہے' اس میں ۶۰ یا ۷۰ لاکھ روپیہ کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں انگور کی جتنی مقدار پیدا ہوتی ہے تقریباً اتنی ہی مقدار باہر سے درآمد کی جاتی ہے۔ اور پیداوار کے لحاظ سے دنیا کے تمام ملکوں میں ہندوستان کا چھٹا درجہ ہے۔ ہر سال ۱۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ کے انگور باہر سے آتے ہیں اور تقریباً پوری درآمد افغانستان سے ہوتی ہے۔ مالک متحدہ امریکہ' جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا سے بھی مجموعی طور پر اس درآمد کا تقریباً ۲ فیصد حصہ آتا ہے۔ ہندوستان سے انگور کی برآمد نہیں ہوتی البتہ ۳۶-۱۹۳۵ میں صرف برما کو ۲ ہزار ۲ سو من انگور بھجوائے گئے تھے۔

اس ملک میں جس قدر رقبہ پر انگور کی کاشت ہوتی ہے وہ چار ہزار دو سو ایکڑ سے زیادہ نہیں۔ اس کا نصف رقبہ تو بلوچستان ہی میں ہے اور تقریباً چوتھائی رقبہ صوبہ بمبئی میں۔ باقی رقبہ کی کاشت شمال مغربی سرحدی صوبے' مدراس' سندھ اور ریاست میسور میں ہوتی ہے۔ ۳۵-۱۹۳۴ میں تین لاکھ ۷۵ ہزار من انگور پیدا ہوتا تھا جس کی قیمت تقریباً ۲۵ لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کا تقریباً ۵۰ فیصد حصہ بلوچستان میں پیدا ہوا تھا اور ۲۶ فیصد بمبئی میں۔

ہندوستان میں ہر سال ۹،۴۴،۰۵۰ من انگور خرچ ہوتے ہیں جب کہ پیداوار صرف ۲،۷۵،۲۵۰ من ہے۔ یعنی ہر سال ۶،۶۲،۰۰۰ من تازہ انگور زیادہ درکار ہیں اور اس کے لئے مزید ۲۵۰۰ ایکڑ رقبہ کی ضرورت ہے۔ پھر خشک انگور کے لئے جو ہندوستان میں نہیں بنتے اور جو باہر سے منگوائے جاتے ہیں مزید دس ہزار ایکڑ زمین پر کاشت کی جا سکتی ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر ۱۲،۵۰۰ ایکڑ رقبہ پر انگور کی کاشت ہونی چاہیے اور چونکہ صرف ۴۲۰۰ ایکڑ رقبہ اب تک زیر کاشت رہا ہے اس لئے صرف ملک نصف

کے لیئے اس رقبہ میں کافی وسعت دی جاسکتی ہے۔ اور جب برآمد کرنے کا وقت آئے تو پھر اس میں اور اضافہ کا بھی امکان ہے۔

تازہ انگور کی پیداوار کے علاوہ جو معاشی لحاظ سے بجائے خود بہت مفید ہے، ایک کارآمد صنعت کو بھی ترقی دی جاسکتی ہے۔ یعنی انگور کو خشک کر کے محفوظ کرنا، انگور کا رس اور سرکہ تیار کرنا وغیرہ ایسی صنعتیں ہیں جن سے ملک کو گوناگوں فائدوں کی توقع ہے اور ملکی مفاد کے ان امکانات سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی کوتاہی ہے۔

عبدالصمد صدیقی

دردِ فرقت

یہی خاطر میں ہے تیری تو اس کو شاد ہونے دے ۔ تڑپ کر دردِ فرقت میں مجھے برباد ہونے دے

کلیجہ تھام لیتا ہوں تری جب یاد آتی ہے ۔ مرے محبوب یونہی نالہ و فریاد ہونے دے

محبت میں تری بھولا ہوا ہوں میں دو عالم کو ۔ تری شیریں اداؤں پر مجھے برباد ہونے دے

نہیں درد و الم سہنے کی اب تاب و تواں باقی ۔ کبیر اس زندگانی سے مجھے آزاد ہونے دے

ڈاکٹر ایس اے کبیر

مقدمۂ تاریخ دکن

یہ کتاب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پیشتر حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے متعلق تاریخی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی ہیں اس طرح مختلف خاندانوں کے سات سو افراد اس کتاب کے ذریعہ سے روشناس ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں قدیم دور کے دکنی حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں۔ دوسرے حصے میں دور وسطیٰ کے آٹھ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔ تیسرے میں دور حالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابان کرناٹک، سدھوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے۔ ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جو بجائے خود دکن کی ایک مختصر سی تاریخ ہے۔ یہ کتاب پروفیسر مرزا حسین علیخاں صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے متوسط تقطیع ۴۴ صفحات قیمت

میر مومن

عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزار ہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہود و معروف ہے۔ میر مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے۔ اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً دو سو صفحات مع تصاویر قیمت عہ (زیر طبع)

حالاتِ حاضرہ

ہندوستان کا ہوائیہ۔ پچھلے دس سال کے عرصہ میں ہندوستان نے ہوا بازی میں بڑی ترقی کی ہے چنانچہ ہر ہوائی کلب میں پرواز کے ریکارڈ قایم کرنے کے لیے بڑے شوق و انہماک کا اظہار کیا گیا اور شوقین ہوابازوں کے علاوہ تجارتی پرواز کی وجہ سے بھی ہوا بازی میں بڑی سرگرمی رہی۔ حال ہی میں ناظم ہوائیہ نے یہ بتایا ہے کہ پچھلے دس سال کے عرصہ میں ایک ہزار ہوا باز تعلیم پا چکے ہیں اور ہندوستان کے محفوظ ہوائیہ کا بیشتر حصہ ان ہی پر مشتمل ہے۔

ہندوستان میں ہوائیہ کی بنا ۱۹۳۲ء میں پڑی تھی جس کے پہلے دستے کے عہدہ داروں کی تعلیم انگلستان میں ہوئی۔ جنگ شروع ہونے کے پہلے ہندوستانی ہوائیہ جو شاہی ہوائیہ سے بالکل علحدہ ہے (۱۶) افسروں اور (۱۵۲) ہوابازوں پر مشتمل تھا اور بہت سے ہوابازوں نے شمال مغربی سرحد پر کافی مشق بھی حاصل کرلی تھی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو ہوائیہ کی توسیع ہونے لگی اور ہوابازوں کی تعلیم اور مشق کا بہت جلد انتظام ہوگیا چنانچہ رسالپور میں پرواز کی تعلیم اور انبالہ میں میکانکی تعلیم شروع ہوئی اور امیدواروں کو باضابطہ تعلیم کے بعد ہوائیہ میں بھرتی کیا جانے لگا۔ ایک رضاکار دستہ بھی بطور محفوظ ہوائیہ کے موجود ہے جو ملکی مدافعت کی غرض سے رکھا گیا ہے۔ کراچی، بمبئی، مدراس، کلکتہ اور دہلی پہلے سے پرواز کے اچھے مرکز تھے مگر ان کے علاوہ پانچ اور پرواز گاہیں بنائی گئی ہیں۔ ہندوستانی ہوائیہ کا پہلا دستہ جس میں سوائے چند فنی آدمیوں کے باقی تمام ہندوستانی ہیں اب کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہے۔ اور دستوں کی بھی تعلیم جاری ہے اور ہندوستانی ہوائیہ کی توسیع بڑے پیمانے پر عمل میں آرہی ہے۔

ہندوستان کی حربی طاقت۔ ہندوستانی فوج کی تعداد زمانۂ امن میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے اور اس میں مقامی فوجیں اور دیسی ریاستوں کی فوجیں شامل نہیں ہیں۔ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی مجموعی فوج ۱۹۳۰ء میں ۴۵ ہزار تھی۔ اس کے علاوہ نیپال بھی ۱۹ ہزار گورکھے دیا کرتا ہے۔ اس بری فوج کے علاوہ ہندوستان کا اپنا ہوائیہ بھی ہے اور ہندوستان کے وسیع ساحل پر شاہی ہندوستانی بحریہ بھی موجود ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر ایک نئی اسکیم کے ذریعہ فوج کی توسیع بھی عمل میں آرہی ہے اور پہلے ایک لاکھ آدمی بھرتی کئے جارہے ہیں۔ ہوائیہ اور مقامی فوج کو بھی بڑھایا جارہا ہے اور ہر جگہ ہندوستانیوں ہی کو عہدے دیے جارہے ہیں۔ ہوا بازی کی تعلیم کے لئے دس مرکز قایم کئے گئے ہیں جن میں ہر سال تین سو ہوا باز اور دو ہزار میکانک تیار کئے جائیں گے۔

لیکن فوجی قوت سے زیادہ جنگی ساز و سامان کی تیاری قابل لحاظ ہے۔ ہندوستان کے لاکھوں ریت کے بورے تمام انگلستان کو ہوائی حملوں سے بچا رہے ہیں لیکن ٹاٹ اور چمڑے کی صنعت اس زمانہ میں بہت اہم اور کارآمد ثابت ہورہی ہے۔ ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت بھی بہت قابل لحاظ ہے۔ ہر سال بیس لاکھ ٹن لوہے اور دس لاکھ ٹن فولاد کی اشیاء ہندوستان میں بنائی جارہی ہیں۔ اب ہندوستان میں رائفل، مشین گن، چھوٹے ہتھیار، بارود گولی، چند انچ کی توپیں غرض بہت سا جنگی سامان تیار ہورہا ہے۔ ہندوستان کی ایک طیارہ ساز کمپنی نے جس کا سرمایہ پانچ کروڑ روپے ہے بنگلور میں ایک کارخانہ قایم کیا ہے

جس میں جنگی طیارے بنائے جائیں گے۔ جنرل موٹرس اور فورڈ کی ہندوستانی شاخوں نے ہر سال پچیس ہزار موٹر گاڑیوں کی فراہمی کا انتظام کیا ہے اور بمبئی اور ہگلی میں بحری و تجارتی جہاز بھی بنائے جا رہے ہیں اس کے علاوہ ہندوستان میں کیمیاوی ادویات کی تیاری پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔

ہندوستان کا جنگی فنڈ۔ وائسرائے بہادر کے جنگی فنڈ میں جنگی طیاروں کی خریدی کے لیے ۱۵ ستمبر تک ۱۱۰ لاکھ روپے جمع ہو چکے تھے اس رقم سے شاہی ہوائیہ کے لیے تین بڑے دستے فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ جنگی فنڈ میں ۱۵ ستمبر تک جملہ دو کروڑ چار لاکھ روپے جمع ہو گئے تھے۔ اس فنڈ کے علاوہ بہت سے دوسرے فنڈ بھی ہیں جن کے ذریعے مزید رقم کی فراہمی ہوتی ہے۔ مثلاً شاہ جارج کا فنڈ جس میں ساڑھے چھ لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ لارڈ میئر فنڈ کے لیے پانچ لاکھ روپے، سینٹ ڈنس ٹن ہاسپٹل کے لیے ساڑھے تین لاکھ روپے، نئے جنگی موازنہ کے لیے پانچ لاکھ، موٹر ایمبولنس کے لیے تین لاکھ، برطانوی ریڈ کراس سوسائٹی کے لیے ستر ہزار، بچوں کے تخلیہ کے لیے دو لاکھ، شاہی بحریہ کے لیے ایک لاکھ روپے وغیرہ۔

ہندوستان کی خارجی تجارت۔ ہندوستان کا مال جو روس، سویڈن، ناروے، جرمنی، ہالینڈ، بلجیم، اسپین، اطالیہ، آسٹریا، چیکوسلواکیہ، اور ترکی کو بھیجا جاتا تھا اگست ۱۹۴۰ء سے بالکل بند ہو گیا اور ان ملکوں سے جو مال ہندوستان آتا تھا اس کی درآمد بھی اب تقریباً فسخ ہو گئی ہے۔ جون میں جملہ مال کی قیمت جو برطانوی ملکوں سے ہندوستان آیا گیارہ کروڑ پچیس لاکھ روپے تھی یہ رقم جولائی میں گیارہ کروڑ چالیس لاکھ اور اگست میں دس کروڑ بارہ لاکھ روپے ہو گئی اور جو مال ہندوستان سے برطانوی ملکوں کو بھجوایا گیا اس کی قیمت جون میں دس کروڑ ۲۰ لاکھ روپے جولائی میں تین کروڑ ۲۶ لاکھ اور اگست میں نو کروڑ ایک لاکھ روپے تھی غیر ملکوں کو ہندوستان سے جو مال بھیجا گیا وہ جون میں ۶ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے جولائی میں پانچ کروڑ پندرہ لاکھ اور اگست میں پانچ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کی مالیت کا تھا۔ اگر اگست ۱۹۳۹ء سے مقابلہ کیا جائے تو اس سال خارجی تجارت میں بہت تخفیف ہوئی۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء میں جملہ تیرہ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کے مال کی درآمد ہوئی تو اگست ۱۹۴۰ء میں صرف دس کروڑ ۱۲ لاکھ روپے کا مال ہندوستان آیا۔

کانگریس کی ستیاگرہ۔ ۱۱ اکتوبر کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے گاندھی جی کی انفرادی ستیاگرہ کی اسکیم کو منظور کر لیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ گاندھی جی ستیاگرہوں کا انتخاب کریں گے اور ہر منتخب شخص یکے بعد دیگرے انفرادی طور پر ستیاگرہ کرے گا۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ ستیاگرہ تقریر کی آزادی کے لیے ہوگی۔ ونوبا بھاوے کو گاندھی نے پہلے منتخب کیا اور انھوں نے ۱۷، ۱۸، ۱۹ اکتوبر کو مختلف جگہ سیاسی تقریریں کیں۔ ۲۱ اکتوبر کو انھیں دیولی کے مقام پر گرفتار کر لیا گیا اور قانون مدافعت ہند ۱۹۳۹ء کے تحت قید کر دیا گیا۔ اب یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں نے ستیاگرہ شروع کر دی اور گرفتار ہوتے گئے ان میں پنڈت نہرو، مسٹر پٹیل، مسٹر کھیر، پنڈت شکلا اور مسٹر بیانی بھی شامل ہیں۔ اب تک بہت لوگوں نے ستیاگرہ کی ہے اور معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

کپل وستو۔ اس مقام کا صحیح پتہ لگانے کے لیے جہاں گوتم بدھ نے جنم لیا ایک عرصہ سے کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ کارلائل اور جنرل کننگ ہیم جیسے پرانے ماہرین آثار قدیمہ نے بھی اس چیز کا پتہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ کپل وستو کس جگہ واقع تھا مگر انھیں صحیح جگہ معلوم نہ ہو سکی لیکن ڈاکٹر فیوہرر کی

کوششیں اس سلسلے میں بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ انھوں نے معلوم کیا کہ کپل وستو اصل نیپال کی ترائی میں پوکا ریلوے اسٹیشن سے کوئی ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع تھا نیز انھوں نے یہ بھی معلوم کیا کہ موضع پدریا اس جگہ تھا جہاں اب (لمبنی) باغ واقع ہے یہ باغ کپل وستو کے شمال مغرب میں کوئی ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔

کپل وستو کی نشاندہی بابو پی۔ سی کرجی نے بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ترائی کی صوبہ جاتی حکومت کے موجودہ صدر مقام یعنی تاؤلی وا سے ۲ میل دور شمال کی جانب تلاؤرا کوٹ ایک مقام ہے اسی جگہ کپل وستو واقع تھا۔ اسی مقام پر اشوک کی ایک لاٹ بھی دستیاب ہوئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ گوتم بدھ کی پیدائش اسی جگہ ہوئی تھی۔ اس لاٹ پر لمبنی کا نام کندہ ہے جسے عام طور پر ایک دیوی سمجھا جاتا ہے گر یہ نام دراصل گوتم بدھ کی ماں مایا دیوی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

کپل وستو کے متعلق سر بی۔ سی بھٹاچاری نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے حالیہ جرنل میں ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے جس کا مطالعہ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہوگا۔

حیدرآباد کا موازنہ۔ سنہ ۱۳۵۷ف کے موازنہ کی رپورٹ میں ۳۲٫۳ لاکھ روپے کی بچت بتائی گئی ہے۔ اس سال کا اندازہ ہے کہ آمدنی ۱۵٫۲۶ لاکھ روپے اور خرچ ۹۱۳٫۱۹ لاکھ روپے ہوگا۔

ہندو عورتوں کے حقوق۔ حیدرآباد کی مجلس مقننہ میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جانے والا ہے جو ہندو عورتوں کے جائداد کی حقوق سے متعلق ہے۔ اس کی رو سے ہندوؤں کے قانون وراثت میں بعض تبدیلیاں کی جائیں گی تاکہ ہندو عورتوں کو وراثت کے بہترین حقوق حاصل ہوسکیں اور جب کوئی شخص بلا وصیت مر جائے تو جائداد کی تقسیم میں اس کی بیوہ کو زیادہ مراعات مل سکیں۔ نیز سوتیلی ماں وغیرہ کو بھی نان و نفقہ کا حق ملا ہے اس کے علاوہ مسودہ کی رو سے شادی شدہ عورتوں کو خاص صورتوں میں اپنے شوہر سے علحدہ ہوسکنے اور نفقہ طلب کرنے کا بھی حق ہوگا۔ تبنیت سے متعلق جو حقوق ایک ہندو بیوہ کو حاصل رہتے ہیں ان میں بھی بڑی وسعت پیدا کی گئی ہے اور بیوہ کے حق تبنیت کے متعلق ایک مفروضہ قایم کرلیا گیا ہے کہ جب اس کے متوفی شوہر کی ہدایات اس کے خلاف نہ ہوں بیوہ برابر متبنیٰ لے سکتی ہے۔

میسور میں ابتدائی تعلیم کا مسودہ۔ میسور کی اسمبلی نے ابتدائی تعلیم کا ایک مسودۂ قانون پاس کیا ہے اور اب مقامی اداروں کی بجائے ابتدائی تعلیم کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ مسودہ کی رو سے ریاست کے ہر گاؤں میں جس کی آبادی ...۵ (ضلع میدان میں) ۳۰۰ (ضلع مال ناڈ میں) ہو اور جہاں اب تک کوئی مدرسہ نہیں ہے بہت جلد نئے مدرسے کھول دئے جائیں گے۔ اس طرح ایک ہزار نئے مدرسے کھولے جارہے ہیں۔

ہند چین کے ہندوستانی۔ ہند چین میں بہت سے ہندوستانی آباد ہیں اور ان کا روپیہ بھی اس خطہ ارض میں پھیلا ہوا ہے ان کی لاکھوں پیاسٹر کی جائداد ہے اور چاول اور ربڑ کی ہزاروں ایکڑ زمین بھی ان کی ملکیت میں ہے۔ ملک کی تجارت میں ان کا کافی حصہ ہے۔ فرانسیسی حکومت کی عنایت کی وجہ سے ہندوستانیوں نے یہاں بہت سے عہدے بھی حاصل کرلئے تھے۔ بہت سے ہندوستانی جو یہاں آباد ہیں کافی مالدار ہیں اور قرض پر روپیہ دیتے ہیں ان میں جنوبی ہند کے چیٹی زیادہ تعداد میں ہیں۔

ایمن ٹی منی کی دستیابی۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ

ہندوستان کی بعض کانوں میں ایل مینی غیر خالص حالت میں موجود ہے۔ جنگ کی ابتدا کے وقت یہ اندیشہ تھا کہ جنگی ضرورتوں کے لئے جتنی ایلومینی درکار ہے اس کی فراہمی ہندوستان میں نہ ہو سکے گی لیکن محکمۂ سپلائی نے اس کی تحقیقات شروع کی اور اب یہ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں اس عنصر کی کافی مقدار نکالی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے بعض کارخانوں کو آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اس دھات کی تخلیص کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیں چنانچہ بمبئی کے ایک کارخانہ نے اس سلسلے میں کافی دلچسپی لی ہے۔

U ۲۳۵۔ یہ کوئی آبدوز نہیں بلکہ ایک معدن کا نام ہے۔ یہ نیا معدن ایک قدرتی شے ہے جو یورانیم کی کچ دھات میں موجود ہوتی ہے اور یہ خواص وغیرہ کے لحاظ سے یورانیم سے ملتی جلتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ U ۲۳۵ کا ایک پونڈ ۵۰ لاکھ پونڈ کوئلے یا ۳۰ لاکھ پونڈ پٹرول کی طاقت رکھتا ہے۔ مشہور امریکی سائنسداں پروفیسر ڈننگ کہتے ہیں کہ اس معدن کی پانچ تا دس پونڈ کی مقدار ایک بڑے جنگی جہاز کے لئے بالکل کافی ہے اور اسے مزید ایندھن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کچ دھات کی کافی مقدار برطانیہ، امریکہ، کنیڈا، بلجیم کانگو اور جرمنی میں پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے جرمنی میں اس کچ دھات کا مشاہدہ کیا گیا اور پھر جدید تحقیقات شروع ہوئیں۔ اس کچ دھات پر ڈاکٹر لائز میٹنر نے زیادہ کام کیا تھا لیکن جب وہ جرمنی سے نکال دی گئیں تو انھوں نے کوپن ہیگن میں اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ امریکی سائنس دانوں نے ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور یورانیم کی کچ دھات سے U ۲۳۵ کو خالص حالت میں نکال لیا۔

برطانیہ کے مصارف جنگ۔ آج کل برطانیہ کے جنگی مصارف روزانہ ۹۰ لاکھ پونڈ ہو رہے ہیں۔ سر کنگسلی ووڈ نے جو برطانیہ کے چانسلر آف دی اکسچیکر ہیں۔ دارالعوام میں ایک تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ برطانیہ کے اوسط ہفتہ وار اخراجات چھ کروڑ چالیس لاکھ پونڈ ہیں اور اس امر کا امکان ہے کہ یہ مصارف اور بھی بڑھ جائیں۔

جرمنی اور یوگوسلاویہ۔ بلقان میں جرمنی کا اثر ہر روز بڑھتا جا رہا ہے۔ ۱۹ر اکتوبر کو یوگوسلاویہ اور جرمنی کے مابین جو تجارتی معاہدہ ہوا وہ اسی بڑھتے ہوئے اثر کی دلیل ہے۔ (اس معاہدہ میں یہ طے ہوا کہ جرمنی آیندہ سے یوگوسلاویہ کے ساتھ رعایتی برتاؤ نہیں کرے گا اور اشیاء کی قیمتیں مستقل قرار دینے کی بابت یوگوسلاویہ کا پورا پورا لحاظ کرے گا۔

عرب مملکتیں۔ اب چونکہ جنگ کا رخ بحر روم اور مشرق قریب کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ عرب مملکتوں کا آیندہ مسلک دنیا کی سیاست میں کافی اہم ہو گیا ہے۔ یہاں عرب مملکتوں کے تحت عراق، سعودی عرب، اور یمن کی آزاد مملکتیں آتی ہیں۔ ان کے بعد شام، لبنان اور ماورائے ٹرد ردان ہیں۔ نیز فلسطین اور عدن کو بھی ان میں شامل سمجھنا چاہیے۔ ان تمام ملکوں کا مسلک موجودہ جنگ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان میں عراق اور مصر تو برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت وابستہ ہیں اور سعودی عرب کو برطانیہ کا دوست ہی سمجھنا چاہیے۔ پھر بہت سے عربی ملک بھی معاہدۂ سعدآباد وغیرہ کی رو سے آپس میں مربوط ہیں۔ اس طرح یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تمام عرب ملکوں کی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ ہیں۔

سہ دولی پیمان اور ہنگری۔ ۲۰ر نومبر کو ہنگری نے جاپان اور محور کے سہ دولی پیمان میں شرکت کر لی۔ ہنگری کی حکومت نے اس شرکت کی وجوہات یہ بتائی ہیں کہ ہنگری اپنے ہمسایوں سے خوشگوار تعلقات قایم رکھنا چاہتا ہے۔ نیز اسے

جرمنی اور اطالیہ کے مشترک کام اور ان کے مقاصد سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہنگری کی حکومت جرمنی اور اطالیہ کی ستایش کرتی ہے کہ پچھلے دس سال سے انھوں نے پُرامن رہنے کی کوشش کی اور جاپان کے ساتھ جو پیمان ہوا وہ بھی ان کے اسی مسلک کا ثبوت ہے کہ دنیا میں انصاف اور امن قایم کیا جائے۔

ح۔ ص

اِدارہ کی تاریخی مطبوعات

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے، ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مربوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شایع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز سوا سو سے زیادہ صفحات قیمت ہے

"علاوہ مقدمے کے کتاب پانچ حصوں پر منقسم ہے پہلے حصے میں گولکنڈہ کی سلطنت کا آغاز، استحکام، عروج، زوال اور تمدنی، سیاسی و علمی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عمارات و سلاطین قطب شاہی کی گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔"

نگار مئی ۱۹۴۰ء

نظام الملک آصفجاہ اول

مولوی شیخ چاند مرحوم ایم۔ اے، ایل ایل بی (ریسرچ اسکالر) نے بانی سلطنت آصفیہ کے مکمل حالات و مستند واقعات زندگی عوام اور طلبہ کے لئے سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے تھے جس کو ادارہ نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ اس میں سلطنت آصفیہ کے قابل احترام بانی کے حالات زندگی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ یہ مرحوم شیخ چاند کی آخری تحریروں میں سے ہے مدرسہ کے طلبہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اس کو شوق سے پڑھیں گے۔ اس کتاب میں حسب ذیل عنوانوں پر نہایت مکمل اور مفید معلومات درج ہیں۔

تمہید، آبا و اجداد، ابتدائی زندگی، صوبہ سلطنت دکن کی نظامت، مراجعت دکن اور توسیع ممالک محروسہ، سیاست، شخصیت اور پالیسی، تدبر، مرہٹوں کا مقابلہ، اہل یورپ سے روابط، علوم و فنون اور فضل و کمال سے دلچسپی، اسٹیٹ

دورِ حاضرہ میں اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ نہایت نفع بخش ثابت ہوگا جن میں ایسے بزرگوں کے حالات درج ہوں جو اپنے تدبر، شجاعت، ذہانت، اخلاق اور کردار کے ذریعے ہندوستان میں یادگار زمانہ کام کر گئے اور موجودہ نسلوں کو ان کی زندگی کے حالات پڑھ کر سبق حاصل کرنا ضروری ہے صفحات ۱۰۴ مع تصویر نظام الملک آصفجاہ اول قیمت ۔/۱۲

"بانی سلطنت آصفیہ کے مکمل حالات و مستند واقعات زندگی عوام اور طلبہ کے لئے شیخ چاند مرحوم نے تحریر فرمائے تھے۔ ادارہ ادبیات اردو نے انھیں شایع کیا ہے۔"

ساقی دہلی فروری ۱۹۴۰ء

جین آسٹن

آسمان ادب کا یہ درخشاں ستارہ ۱۶ دسمبر ۱۷۷۵ء کو ہمپ شائر کے ایک قصبہ اسٹونٹن پر پورے آب و تاب کے ساتھ چمکا۔ جین آسٹن کی پیدائش کے ساتھ اسٹونٹن کی سرزمین نے ایک نیا جنم لیا اور اس کے بعد ہی یہ مردم خیز سرزمین ادبی پیداوار کے لئے گویا مختص ہوگئی۔ جین آسٹن کا باپ جارج آسٹن قصبہ کے گرجا کا پادری تھا اور اس کی ماں کینیڈ والے قصبہ میں اپنی دست کاری کے لئے مشہور تھی۔ جین کے (پانچ) بھائی تھے اور ایک بہن۔

جین نے اپنی عمر کا تہائی حصہ اسٹونٹن ہی میں گزارا۔ اور یہاں کی (۲۵) سالہ پرسکون اور خاموش زندگی میں وہ برابر اپنے آئندہ ناولوں کے لئے مواد جمع کرتی رہی۔ اپنے ایک خط میں جسے ادبی خط کہنا زیادہ بہتر ہوگا وہ لکھتی ہے کہ "اسٹونٹن کی طرح کسی چھوٹے سے گاؤں میں تین چار خاندان مل کر اپنا کام نہایت ہی پرامن اور منظم طریقے پر چلا سکتے ہیں۔" جین کی اس زندگی پر جو اس نے اسٹونٹن میں گزاری غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مطالعہ یہاں بہت وسیع اور عالمگیر رہا۔ اور اس حد کو پہونچ گیا جہاں وہ تحریر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی حد پر پہونچنے کے بعد جین کی ادبی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے ادبی کارناموں کا ایک سرسری مطالعہ واضح کر دیتا ہے کہ کوپر رچرڈسن اور کریپ نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ لیکن جس نے اس کی قوت تخیل اور طرز تحریر کو اپنے سانچے میں ڈھالا، وہ ڈاکٹر جانسن تھا چنانچہ اس کے ہر ناول اور اس کی ہر تحریر میں ڈاکٹر جانسن کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ جانسن کی جادو بیانی اور اس کی اعلیٰ تنقیدی قابلیت سے بے انتہا متاثر نظر آتی ہے۔

اپنی عمر کے (اکیسویں) سال میں اس نے "پرائڈ اینڈ پریجوڈز" مکمل کی جسے ادبی نقاد اس کا شاہکار تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ناول سے پہلے جین نے "سنس اینڈ سنسبلٹی" کو خطوط کی شکل میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے زمانہ کی گردش کہیے یا جین کی قسمت کا پھیر کہ یہ دونوں ادبی کارنامے برسوں تک گمنامی میں رہے۔ اور جب ان کے شایع ہونے کا وقت آیا تو پہلے "پرائڈ اینڈ پریجوڈز" چھپ کر عوام کے ہاتھوں میں آئی جسے جین کی ابتدائی قابلیتوں نے دراصل "فرسٹ امپریشن" کا نام دیا تھا۔ اس کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۷۹۷ء میں اس نے اپنا دوسرا ناول "سنس اینڈ سنسبلٹی" لکھا جو موجودہ شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور ۱۷۹۸ء "نارتھ انگر ایبے" مکمل کیا۔ جو حقیقت میں ایک طنزیہ ناول ہے۔ یہ ناول مسز ریڈکلف کے ناولوں کی مذمت میں لکھا گیا تھا۔ جین کے ان ناولوں کو تیار ہوئے برسوں گزر گئے لیکن خدا کے کسی بندے میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ جین کے ان ناولوں کو شایع کراتا کیونکہ جین کی مالی حالت اس وقت بہت سقیم تھی اور چند دن بعد اس نے انھیں طبع کرانے کی جو کوشش بھی کی تو اسے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔

ان تین ناولوں کی طباعت کے بعد جین کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں جین کے باپ

جارج آسٹن نے خدمت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اور اپنی جگہ اپنے بیٹے ہنری کو رکھوا دیا اور خود اپنی دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر "باتھ" کی جانب چل کھڑا ہوا۔ حب الوطنی اور وطنیت کا جذبہ اگر ازل ہی سے انسان کی فطرت کا جزو نہ ہوتا تو پھر جین کو بھی کوئی حق نہ تھا کہ وہ اسٹوین کی خاک کو چھوڑتے ہوئے آنسو بہاتی۔ جین کی آزردہ دلی اور وطن کی یاد نے اس کی ادبی زندگی میں بے کیفی پیدا کردی۔ اور بہت دنوں تک وہ اس کام سے بیگانہ رہی۔ جین اپنے باپ کی موت تک باتھ میں رہی۔ ۱۸۰۵ء میں اس کے باپ کا انتقال ہوا، اور باپ کے انتقال کے چند ہی دن بعد اپنی ماں اور چھوٹی بہن کو ساتھ لے کر اس نے ساؤتھ ہیمپٹن کا رخ کیا اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا لیکن ۱۸۰۹ء میں اس کے ایک بھائی نے اپنی ماں اور دونوں بہنوں کو چیوٹن بلالیا۔ جو ونچسٹر کے قریب ایک چھوٹا سا مقام ہے۔

چیوٹن میں اس کی زندگی خوش گوار طریقے پر گزرنے لگی۔ اور فطری قابلیتوں سے مجبور ہوکر وہ پھر ناول نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ گزشتہ بارہ تیرہ برس کا فصل کچھ کم نہ تھا۔ گویا جین نے اپنی ادبی زندگی کی پھر سے ابتداء کی تھی۔ لیکن جین میں قدرت کا یہ فیاض عطیہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ وہ جو کچھ لکھتی تھی اس میں وہی پرانی جادو بیانی وہی زور قلم اور وہی زندگی تھی۔ اور سچ پوچھئے تو اس لانبے وقفہ کے بعد اس کا درجہ اور ترقی کر گیا تھا۔ اور اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۱۶ء کے درمیان اس نے اور تین ناول لکھے۔ "مینسفیلڈ پارک" "ایما" اور "پرسوایشن" اور آخری ناول کے مکمل ہوتے ہی اس کی بے بہا زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ اور مرض دق کا شکار ہوکر اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنے چھ ناولوں میں صرف تین کو شائع ہوتے دیکھا۔ "نارتھ انیگر ایبے" اور "پرسوایشن" ۱۸۱۶ء میں اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئے۔ جب کتابیں شائع ہوکر پبلک کے ہاتھوں میں آئیں تو اس زمانے کے لوگوں نے اپنی ادبی بدذوقی کا مکمل ثبوت دیا۔ اور جین آسٹن کی کتابیں عوام میں مقبول نہیں ہوئیں۔ لیکن والٹر اسکاٹ کے تعریف کرنے کے بعد جین کی اعلیٰ ذہنی قابلیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔

جین آسٹن کے ناول پڑھنے والے سب سے پہلے اس کی جس صفت سے آشنا ہوتے ہیں وہ اس کے لکھنے کا انداز ہے جس میں وہ خود ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔ اس سے مراد ضمیر اول ہے۔ آپ اس کے کسی ناول کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ اس کے ناول کا سب سے بڑا، سب سے اعلیٰ اور سب سے اہم کردار خود اس کی ذات ہے۔ اس نے مصنف کی ذہنیت کا بڑا آسانی سے پتہ چلتا ہے خود سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جین کی دنیا جغرافی اور سماجی بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ہمیشہ محدود رہی۔ اس کے ناولوں کے کردار شہری تہذیب کے بندھنوں سے آزاد نظر آتے ہیں اور جین اپنے تمام کرداروں کو اسی ماحول میں پیش کرتی ہے۔ جس ماحول میں وہ خود پروان چڑھی۔ دوسری اہم خصوصیت اس کی کردار نگاری کی یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ ایسے کردار پیش کیے جن کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ گو کسی ناول کا

ایک آدھ کردار اعلیٰ یا ادنیٰ طبقہ سے بھی تعلق رکھتا ہے لیکن سچ پوچھئے تو اصل قصہ کی ساخت میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ جین آسٹن کے ناولوں میں محبت اور نفرت، خیر اور شر اپنے انتہائی درجے پر دکھائی نہیں دیتے نہ محبت کے فلسفے کو جین آسٹن عرش پر پہنچاتی ہے۔ اور نہ نفرت ہی کو تحت الثریٰ تک لے جاتی ہے۔ اسی طرح خیر اور شر کو دو متضاد چیزیں ہیں لیکن جین کے ناولوں میں اجتماع ضدین کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے ناولوں میں نہ وطن کی مجنونانہ وکالت در پردہ تاکید پھوٹتی ہیں اور نہ ہیرو کی بہادری میں غیر فطری عنصر شامل ہوتا ہے بلکہ قصہ دلچسپی پیدا کرتا ہوا آہستہ آہستہ پرواز کرتا ہے اور یہی ناول نگاری کی خوبی ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی نقاد یہ اعتراض کرے کہ جین کی ادبی دنیا ایک محدود دنیا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ جین اپنی ہی دنیا کی ملکہ ہے۔ وہ اپنی.... شان و شکوہ اور عظمت و وقار کے ساتھ حکومت کرتی ہے۔ جین کی اس دنیا میں کوئی آکر دیکھے کہ اس محدود کائنات میں ایک بڑے فن اور ایک بلند آرٹ کا انکشاف ہوتا ہے جو صرف جین کا حصہ ہے۔ جین آسٹن کی اعلیٰ دماغی اور ذہانت اس کی ایسی خصوصیات ہیں کہ بعض نقادوں نے اسے شکسپیر کا ہم پلہ بتایا ہے۔

قدرت کی فیاضی نے جین کو ایک نادر المثال دماغ عطا کیا تھا۔ اور اس کی یہ ساری دماغی قابلیتیں اس کی کتابوں کے ایک ایک جملے سے پھوٹ پڑتی ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے اس کے ناول بے مثل ہیں۔ پلاٹ کی تعمیر اور کردار کی بلندی اس کے ناولوں کی جان ہیں اور پھر ساتھ ہی ساتھ قصہ کو ڈرامائی رنگ دے کر پڑھنے والے کے دل کو موہ لینے میں اسے خاص ملکہ تھا۔ جین کی انہی خصوصیتوں نے انگریزی ادب میں اسے ایک خاص درجہ عطا کیا ہے۔ مشہور نقاد بریڈلے اس کے متعلق لکھتا ہے کہ "دنیا کے کسی ناول نگار نے جین سے زیادہ بہتر طریقہ پر ناول کی ابتدا نہیں کی۔ اور میرا خیال ہے کہ "پرائیڈ اینڈ پریجوڈس" کے صرف پہلے ہی باب سے اس کو وہی دوامی شہرت حاصل ہوئی جو اسے مکمل ناول سے حاصل ہوئی" حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ادب میں معدودے چند ایسے مصنفین ہیں جو ناول نگاری کے مسلمہ اصولوں سے واقف ہیں۔ والٹر اسکاٹ جیسا عظیم المرتبت ناول نگار بعض مرتبہ اپنے ناولوں میں اصول سے ہٹ جاتا ہے۔ چارلس ڈکنس اپنے ناولوں کے پلاٹ اور قصوں کی بے ترتیبی کے لئے ہمیشہ عوام اور نقادوں کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔ یہاں تک کہ تھیکرے جس نے انگریزی ناول نگاری کی حدوں کو توڑ دیا فنی لحاظ سے جین کی برابری نہیں کرسکتا۔ جین آسٹن کی ایک اور خصوصیت اس کا وہ مزاحیہ انداز ہے جو اس کے ناولوں کے پڑھنے والوں کے لئے نہایت خوش گوار ہوجاتا ہے۔ خشک سے خشک مزاج انسان بھی اس کے حسن مذاق اور اس کی مزاحیہ فطرت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "لائٹ ہیومر" کا رنگ اس کے ناولوں میں اس قدر نکھرتا ہے کہ ہم یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "لائٹ ہیومر" گویا اس کی طبیعت ثانی بن گیا تھا۔ یہ درجہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ کسی کتاب یا ناول کے مطالعہ کرنے والے کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ مصنف کے نقطۂ نظر کو اپنا نقطۂ نظر تصور کرے اور خود کو اس ماحول میں محسوس کرے جس ماحول میں کہ مصنف نے اپنے کرداروں کی تخلیق کی اور جس پر اپنے قصہ کی بنیادیں کھڑی کیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر آپ جین آسٹن کا کوئی ناول دیکھئے اس میں مزاحیہ اسپرٹ کے ساتھ ناول نویسی کی ساری خوبیاں

موجود ہوتی ہیں۔

اس کی مثال پیش کرنے کے لئے جین کے مشہور ناول "ایما" ہی کو لیجئے۔ اس قصہ کی ہیروئن ایک چالاک اور ہوشیار لڑکی ہے اس کی شخصیت دیکھنے والے کو مرعوب کرتی ہے۔ وہ اپنی قوت ارادی اور اپنی طاقتوں کے زور سے دنیا کو صحیح راستہ پر چلانا چاہتی ہے۔ یہاں تک کہ قدرت کے معاملات میں وہ دخل دینا شروع کرتی ہے لیکن اسے ناکامی کی صورت دیکھنی پڑتی ہے۔ اور یہاں وہ ان ناکامیوں سے کیسے متاثر ہوتی ہے اسے جین کی مزاح نگاری نے خوب رنگ دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایما کی شادی ہوجاتی ہے۔ اور اس کے سارے منصوبے خیالی عمارتوں کی طرح مسمار ہوجاتے ہیں۔

"پرائیڈ اینڈ پریجوڈز" میں جین نے مزاح نگاری پر اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے سارے ناولوں پر خود جین نے اسی ناول کو بے حد پسندیدہ نظر سے دیکھا غور کیجئے جب شنٹز بری جیسے سنگ دل نقاد نے یہ تسلیم کر لیا کہ "الزبتھ بنٹ" (اس ناول کا ایک کردار) جیسی خوبیوں اور فنی بلندیوں سے معمور عورت کا ہم غلام ہوں تو کیا کچھ اس کردار کی اہمیت نہ ہوگی۔ اسی ناول کا ایک دوسرا کردار کالنس انگریزی ادب کا زبردست مزاحیہ کردار سمجھا گیا ہے۔ اور وہ منظر جہاں کالنس الزبتھ سے شادی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے انگریزی ادب کا نفیس ترین اور نہایت ہی شستہ باب مانا جاتا ہے۔ جہاں فطرت انسانی کو بخوبی نہیں سمجھا جاتا وہاں مزاح کا کوئی درجہ نہیں ہوتا کیونکہ مزاح انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے۔ اس زمانے اور اس فضا میں پل کر جب کہ انسانی دماغ کا نفسیاتی تجزیہ ایک غیر ضروری زحمت سمجھا جاتا ہے جین آسٹن نے ہمارے آگے عورتوں اور مردوں کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جو بجائے خود اس کی ذہنی قوتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ انسانی ہمدردی اس نے شکسپیر سے حاصل کی، اخلاقی درس اس نے جانسن سے لئے اور قدامت پسندی اسے وراثتاً ملی۔

اپنے تمام ناولوں میں جین نے کرداروں کو خواہ وہ مزاحیہ ہوں یا سنجیدہ، بھلے ہوں یا برے، طنز اور تشنیع کی صورت میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر "ایما" کو لیجئے جس میں ہیروئن ہمیشہ غلطیوں کا شکار ہوا کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایلٹن کو سچی محبت ایما سے ہوتی ہے۔ وہ ہیریٹ کو ترغیب دلاتی ہے کہ وہ فرانک چرچل سے محبت کرے اور ہیریٹ دراصل نائٹ لے کے عشق میں برباد ہوتی ہے اور خود ایما (ہیروئن) نائٹ لے کی محبت کا شکار بنی رہتی ہے۔

"پرائیڈ اینڈ پریجوڈز" کو لیجئے آدھے ناول تک الزبتھ ڈارسی اور وکیھم کی طرف سے غلط فہمیوں میں مبتلا رہتی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ناول نگاری کا ایک ایسا نکتہ ہے جو کم و بیش ہر ناول میں پایا جاتا ہے۔ اور حقیقتاً تمام کردار غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر ہی ناول کو زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

جین کے ناول ہمیں اس کی ایک اور خصوصیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو اب تک ہمارے پیش نظر نہیں رہی۔ جین ڈرامے اور تمثیلات سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ گو یہ تحقیق نہیں کیا جا سکتا کہ کس خاص ڈرامہ نگار یا کسی خاص تمثیل نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس کے ناولوں کے مکالموں کو غور سے پڑھئے تو یہ مکالمے آپ کو ڈرامائی سانچوں میں ڈھلے نظر آئیں گے۔ اور آپ

محسوس کریں گے کہ یہ کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر لائے جاسکتے ہیں۔

"پرائیڈ اینڈ پریجوڈس" میں جس جگہ کالنس ؔ الزبتھ کو اپنا ہاتھ پیش کرتا ہے اس میں مزاح کے ساتھ ڈرامے کی اتنی خصوصیتیں اور تمثیل نگاری کے اتنے عناصر شامل ہیں کہ وہ ایک کامیاب ڈرامہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

جین آسٹن کے ناولوں کے اس مختصر سے تذکرہ کے بعد یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ طرز تحریر اور اس کے ناولوں کی فنی خوبیاں اس دور کے دوسرے لکھنے والوں سے بالکل مختلف ہیں جین گو اسکاٹ اور بائرن جیسے ادیبوں کے دور ہی میں اپنی زندگی کی منزلیں طے کر رہی تھی جنھوں نے دنیا کو اپنی رومانیت سے ہلا دیا تھا لیکن جین ان کی اس رومانیت سے بیگانہ اپنی دنیا میں مگن تھی۔ شیلے اور ورڈسورتھ کی فطرت پرستی اور وحدانیت پرستی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ جین کا دور بے چینی اور ہیجان کا دور تھا۔ اور ادھر فرانسیسی انقلاب نے فرانس کی روایات کو توڑ کر انسانی دماغوں کو گرم کر دیا تھا۔ اور اس انقلاب کے حامی اور دشمن دونوں ایک ساتھ اس ہنگامہ اور بلوے سے متاثر ہو رہے تھے۔

ایسے زمانے میں جین کا اپنی مقررہ راہ پر چلنا اس کی بڑائی کا ثبوت ہے۔ اس نے اپنی قدامت پسندی کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنے طرز کو مطلق نہیں بدلا اور سکون و اطمینان کے ساتھ ادبی خدمت میں لگی رہی۔ جین نے کئی انقلابات دیکھے۔ کئی جنگیں دیکھیں لیکن وہ ان تمام ہنگاموں سے بے اثر رہی۔ مختصر یہ کہ جین جذباتی دنیا سے بہت دور وحدانیت اور رومانیت کے نظریوں سے بے خبر سیدھے طریقے سے ادب کی دنیا میں زندگی کے دن گزارتی رہی۔ اور جذباتی دنیا کی رومانی تحریک سے کوسوں دور بھاگتی رہی گو یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ جین قدرت کی کاریگری اور نیچر کی دلفریبی سے بالکل بیگانہ ہوگئی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ورڈسورتھ کی طرح اس نے فطری شاعری کو اپنا شعار اور فطری جذبات کو اپنا مذہب بھی قرار نہیں دیا۔

غرض جین آسٹن اپنے دور کی واحد اور یکتا ہستی ہے جس پر انگریزی ادب ناز کرسکتا ہے۔ اس دور میں اس نے اپنے لئے حقیقی معنوں میں بلند ترین مقام حاصل کیا۔ اور اس مرتبہ سے اونچا اگر کوئی اور رتبہ ہوسکتا ہے تو جین اس کی بھی مستحق ہے۔ خدا کے ایسے بندے بھی اس کائنات میں موجود ہیں جو اپنے ذوق کی نہایت بری مثال پیش کرتے ہیں اور جین کو حقیر نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن اقلیت آخر اقلیت ہے۔

جنھوں نے اس کے کارناموں کے پوشیدہ نکات کو پہچانا ان کے پاس جین زبردست ادبی درجہ رکھتی ہے۔ اس کا کام دوسروں کے مقابلے میں کم سہی لیکن آنا ورنی ہے کہ اسے شکسپیر، اسپنسر، ورڈسورتھ اور اسکاٹ کے دوش بدوش کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

عزیز رضوی

اردو کی نئی کتابیں

نستے علیکم (مجموعہ مضامین) از میم اسلم قیمت عہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

کونپل (کہانیاں) از اوپندر ناتھ اشک قیمت عہ " "

راجہ اور کسان (لیو ٹالسٹائی کی کتاب کا ترجمہ) ۱؍ " "

عصمت افزنو (سوانح حیات) از ثریا اندریال ۲؍ " "

عناصر تہذیب (ولڈیورنٹ کی کتاب کا ترجمہ) قیمت ۲؍ "

عجائبات ہندوستان۔ قیمت ۲؍۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

تفسیر خودی (علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی کے حقایق و مقاصد) از عبدالرحمٰن طارق ۳۰۴ صفحات قیمت مکتبہ یادگار اقبال لاہور

فلسفۂ بیخودی (رموز بیخودی کے اسرار) از عبدالرحمٰن طارق " "

اقبال اور خدمت قرآن از عبدالرحمٰن طارق ۴۴ صفحات قیمت "

اقبال اور دختران ملت (تعلیم و تربیت نسواں پر مقالہ) از عبدالرحمٰن طارق قیمت ۵؍ مکتبہ یادگار اقبال۔ لاہور

یادگار اقبال (مجموعہ مضامین) از عبدالرحمٰن طارق ۳۰۰ صفحات قیمت عال

دفتری معلومات از ظہیر الدین احمد ایچ سی ایس ۹۶ صفحات قیمت ۱؍ سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد حیدرآباد

فرشتوں کی آزمایش (اصلاحی تمثیل) از بشیر قریشی بی اے ۲۹ صفحات قیمت عہ۔ صدیقی بک ڈپو۔ لاہور

ہماری نفسیات (از ای۔ اے۔ منڈر) مترجمہ رشید احمد مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

صدائے حرم (کہ معظمہ کے مدرسہ صولتیہ کی روداد) مرتبہ محمد اسلم ۱۰۱ صفحات حافظ ضیاء الدین احمد۔ قرول باغ۔ دہلی

صفات القرآن (قرآن مجید کے اغراض و مقاصد) از سید منظور احسن ۲۱۵ صفحات قیمت ۸؍ دفتر امت مسلمہ۔ امرتسر

نشاط روح دوسرا ایڈیشن (مجموعہ کلام) از حضرت اصغر ۱۱۵ صفحات قیمت عال۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری از حبیب الرحمٰن خاں کابلی ۱۲۰ صفحات قیمت ۸؍ ہندوستانی کتب خانہ لاہور

مسلمانان عالم حصہ اول (مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ) از کے اے حمید ۱۸۶ صفحات قیمت ۲؍۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

نظم اردو۔ (اردو نظم و نثر کی تاریخ منظوم) از حکیم ابوالعلا ناطق قیمت عال صدیقی بک ڈپو لکھنؤ۔

جنگ آلودہ دنیا (موجودہ جنگ کے حالات معہ نقشے) از ویکٹیش نرائن ۱۹۰ صفحات انڈین پریس الہ آباد۔

طلسم عمل (فلسفہ نفسیات) مترجمہ سید مجتبیٰ حسن بی اے ۸۵ صفحات قیمت عہ سب رس کتاب گھر خیرت آباد

کیوں اور کیسے؟ از مرزا عظیم بیگ چغتائی ۱۰۲ صفحات قیمت ۱۲؍ سب رس کتاب گھر

خبطی (ناول) از محمد علی واحدی ۱۲۰ صفحات قیمت مہر الکار بکڈپو۔ لکھنؤ۔

چمنستان فصاحت (سید ہمایوں مرزا کا دیوان) مرتبہ صغرا ہمایوں مرزا ۹۰ صفحات قیمت عہ سب رس کتاب گھر حیدرآباد

باقیات بجنوری (مضامین خطوط اور نظمیں) از عبدالرحمٰن بجنوری قیمت ہے مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد

اضافیت (نظریہ اضافیت کی تشریح) از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی قیمت ۔ حیدرآباد دکن اور صنعت حرفت از رشید ترابی قیمت ۵؍ ترابی دار الاشاعت۔

کیف و سرور (مجموعہ کلام) از بہزاد لکھنوی قیمت عہ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

اسلام زندہ باد (دین حق کی روحانی فتوحات) مرتبہ عبدالمجید قریشی ۲۰۸ صفحات قیمت عہ سیرت بکڈپو پٹی ضلع لاہور

نشاد (اصلاحی ڈراما) از پنڈت کشن پرشاد کول ۲۲۰ صفحات قیمت عہ لیڈر پریس۔ الہ آباد۔

افکار صدیق (مجموعہ کلام) از محمد صدیق جونا گڑھی ۹۶ صفحات از مصنف جوناگڑھ۔

بقائے سخن (غزلیں اور شاعری پر تبصرہ) مرتبہ منشی للتا پرشاد شاد میرٹھی
قیمت ۱۲ مکتبہ کوچۂ جنگشن

خیال آفریں داغ (ڈراما) از عرش تیموری ۷۶ صفحات قیمت ۶
حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

شاہجہاں (شاہجہاں اور ممتاز محل کی داستان محبت) از محمد رفیق خاں
ہاشمی بک ڈپو۔ لاہور

زباندانی (اردو زبان کے متعلق ضروری معلومات) از فضل الٰہی عارف۔ ۳۲ صفحات
قیمت عہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

لالی منثور (افسانے) از اکبر حسین خاں بسمل ۹۶ صفحات قیمت سب رس کتاب گھر
خیریت آباد حیدرآباد

گنجینۂ روزگار (صابن سازی) از احمد مالک قریشی ۱۳۶ صفحات قیمت عہ
سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد

اردو کے اسالیب بیان (تیسرا ایڈیشن) از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۶۰ صفحات قیمت عہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد

تفسیر سورۂ یسین مترجمہ امین احسن ۵۰ صفحات قیمت مکتبہ جمعیۃ اعظم گڑھ

میرے شاگرد (مولانا سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں کے حالات) از سیماب
اکبرآبادی ۸۰ صفحات دفتر شاعر آگرہ

مبادی سیاسیات از ہارون خاں شروانی ۴۰۰ صفحات قیمت ۵ مکتبہ جامعہ نئی دہلی

توجہ کی کفایت شعاری از ایس اے خالق قیمت ۴ دولت حسن لائبریری
بلی ماران۔ دہلی

خلاصۃ المیزان (ریاضی کے جدید اصول) از حافظ محمد صدیق قیمت ۴ المیزان بکڈپو
شاہراہ۔ دہلی

نمود زندگی (مجموعہ کلام) از سید علی منظور حیدرآبادی ۲۱۲ صفحات قیمت عہ
سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

فن تقریر مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو ۹۹ صفحات قیمت ۱۲

سنگ گوہر (ڈراما) از محمد جلال الدین اشک ۳۲ صفحات قیمت عہ
سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد۔

صحیح طہر (مجموعہ کلام) از بہزاد لکھنوی قیمت ۸ مرکب خانہ علم و ادب۔ دہلی

ہم اور وہ (ناول) از خواجہ محمد شفیع ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۵ مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ

جیون پربھات (ناول) از ڈاکٹر ٹیگور ۲۵۶ صفحات قیمت ۹ سب رس کتاب گھر

ترکش (افسانے) از ڈاکٹر ٹیگور ۲۲۰ صفحات قیمت ۹ ،، ،،

مختصر تاریخ ادب اردو از سید اعجاز حسین لکچرار الہ آباد یونیورسٹی ۲۴۸ صفحات
قیمت سے سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔

رتنا (ناول) از سرت چندر چڑجی مترجمہ آتش قیمت ۱۲ عہ مکتبہ ابراہیمیہ

برف کا دیوتا اور دیگر افسانے از سیاح سناتی قیمت عہ ،، ،،

بیان غالب (جدید شرح دیوان غالب) از آغا محمد باقر ایم اے ۸۴۴ صفحات
قیمت سے سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔

غدر کے خطوط (افسانے) از راج آغا ۹۵ صفحات قیمت ۸ ،، ،،

مشاہیر عالم کی داستان غم (تاریخی افسانے) از آتش قیمت عہ ،، ،،

رہنائے مدینہ از الحاج مسعود علی محوی ۱۴۲ صفحات قیمت ۱۲ مکتبہ تکمیہ حیدرآباد

ہمارے بزرگ (تاریخی کہانیاں) از رشید احمد اختر ۲۱۱ صفحات قیمت ۸
کتاب خانہ سعادت۔ موچی دروازہ۔ لاہور

شرح قانون شہادت از ڈاکٹر سیادت علی خاں ۸۷۰ صفحات قیمت سے۔
سب رس کتاب گھر خیریت آباد

عربوں کی گزشتہ تجارت اور ان کی صنعت و حرفت۔ از مجیب احمد تمنائی
۸۰ صفحات قیمت ۸ مکتبہ علمیہ۔ حیدرآباد

آئندہ زمانہ (ڈراما) از فضل الرحمن ڈپٹی کنٹرولر لاسلکی نشرگاہ قیمت عہ
مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن۔

آسان اردو۔ مرتبہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد ۱۲۲ صفحات قیمت ۸
کتاب خانہ۔ حیدرآباد۔

ایثار (افسانہ) از نور الحسن ۶۷ صفحات قیمت ۸ کتاب خانہ حیدرآباد۔

لاسلکی دنیا از میر حبیب اللہ ۱۱۶ صفحات قیمت ۱۲ دارالرسل رسید طوس
چادر گھاٹ۔ حیدرآباد

گلبی کی زندگی (تعلیم کے اصول۔ ڈاس ہیوی کی تصنیف کا ترجمہ) قیمت عمہ
جامعہ ملیہ۔ دہلی

آزاد حیدرآباد (مقالات کا مجموعہ) مرتبہ مرزا مظفر بیگ۔ ۲۴۰ صفحات
قیمت ۱۲ر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

خنداں (مزاحیہ مضامین) از رشید احمد صدیقی قیمت عہ مکتبہ ابراہیمیہ

مصر کی رقاصہ (ڈراما) از احمد شاہ بخاری پطرس قیمت عہ

انگلستان کا طریقۂ حکومت مرتبہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت ۵ر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

ٹیپو سلطان (مختلف مقالات) مرتبہ ایم عبداللہ بٹ بی۔ اے قیمت عہ
مکتبہ اردو۔ لاہور

پریم کا جادو (افسانے) مترجمہ سراج الدین احمد لکھامی ۲۰۰ صفحات
قیمت عہ مکتبہ اردو۔ لاہور

دھرتی ماتا (ناول گڈ ارتھ کا ترجمہ) از ابو سعید قریشی بی اے قیمت ۱۲ر
آتشی بک ڈپو۔ لاہور

آبگینے۔ (قطعات) از اختر انصاری۔ مکتبہ اردو۔ لاہور

موت کا راگ از مرزا ادیب۔ قیمت عہ۔ آتشی بک ڈپو۔ لاہور

رنگ و بو (افسانے) از فیاض محمود۔ قیمت عہ مکتبہ اردو۔ لاہور

باغ فردوس (مجموعہ کلام) از حاجی محمد یوسف راسخ ۱۹۴ صفحات
قیمت عہ۔ بیل لائبریری۔ بیکانیر

یاد اقبال حصہ اول (نظموں کا مجموعہ) مرتبہ اقبال اکیڈیمی قیمت عہ
دفتر اقبال اکیڈیمی۔ تاج پورہ۔ لاہور

پردہ۔ (اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے) از سید ابو الاعلیٰ مودودی
قیمت عہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور

رہنمائے تاریخ اردو (تاریخ گوئی کے اصول اور قواعد) از حاجی عبدالغفور وکیل
۲۵۱ صفحات قیمت ۱۲ر از مطلعت کتراپیہ بنارس

جدید علم البلاغت (علم بیان کے متعلق) از پروفیسر عبدالمجید۔ ۲۰۰ صفحات قیمت
لالہ رام نرائن۔ الہ آباد

سیاسیات ہند ابعد غدر۔ مترجمہ سید افضل حسین ۱۵۰ صفحات قیمت عہ۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔

ناقابلِ اشاعت مضامین کی فہرست

مضامین: ملک محسن اوربن۔ اسلام اور مساوات لیڈی حیدری۔ پکار۔ اردو پر ایک نظر۔ جہریا۔ حضرت آزاد حیدرآبادی۔ میرے ایک دوست۔ میری زندگی کا پہلا دن۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ زبان۔ کپتان رابرٹ فیلکن اسکاٹ۔ قطب جنوبی کا تجسس۔ آہ دوست۔ عبادت۔ تذکرہ کرمانی مرحوم۔ آفاق۔ ہماری معاشرت وفاداران و خیرخواہان سلطنت۔ امید۔ فلسطین عربوں کا ملک ہے۔ اردو اور افسانہ نویسی۔ موت اور انسان۔ انسانی فرائض۔ ڈائری کا ایک ورق۔ ہمارا تعلیمی سفر۔ افلاطون۔ میں اداس ہوں (ادبِ لطیف) محرم میں کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ محمد شاہ داؤد۔ مجبوریاں۔

افسانے: بیکاری۔ سادھو کا راگ۔ ذرہ ذرہ۔ خواب آہ یتیم۔ ایک حادثہ۔ میرا رفیق۔ معصوم محبت۔ پاگل پریمی۔ عصمت کی دیوی۔ بدقسمت جوانی۔

کہانیاں: سنگم کا دیوتا۔ ریحانہ اور شہزادہ سانپ۔

خمسہ: خمسۂ زیبا۔ مخمس بر غزل خسرو دکن۔ مخمس بر غزل غالب۔ مخمس بر غزل رند۔

غزلیات: غزلیات شاکر۔ رونما کیا۔ بنا دے۔ غزلیات بزم ادب۔ غزلیات حاوی۔ کام جوہر۔ حاصل ہوگیا۔ غزل عاشق۔ زندگی۔ پیاری۔ خواب تھا۔ فطرت نامصور میں۔ زلف سیاہ فام بلا۔ درد لادوا دیکھتا ہوں۔ سودائی کا۔ مجبور رہوں گے۔ پیارے۔ کیسی۔ ہمدم آشنا۔ میرے ٹھکانے کو۔ دل نظر آیا مجھے۔ قابل ہے۔ محبت کیا ہے۔ ناپائیدار ہے۔ کل رات کو۔ امتحاں باقی۔ ہوکر۔ یاد آیا۔ بنا دے۔ کیا ہوا۔ راز رہنے دے۔ سفاک نماک۔ شباب آرزو میرا۔ قریب۔ کھوئے گا۔ تصویر ہوں۔ غزلیات منصور اظہار۔ فغاں میری۔ بن کر۔

نظمیں: مدح شہریار دکن۔ آمد شباب۔ آہ اتاترک مصطفےٰ کمال۔ نذر عقیدت۔ نذر از عقیدت۔ دعا نزول باران رحمت۔ مرقع سرزمیں۔ نور رسالت۔ الہامات سحر۔ یاد ہے۔ آہ گردش زمانہ۔ کب تک۔ حریت آدم۔ سلام۔ شب ماہتاب قومی ترانہ۔ نذر بے حقیقت۔ ہمت مردانہ۔ گلگشت۔ ایک دعا۔ نرگس۔ مسلم خاتون سے۔ آمد۔ پاس محبت۔ اس کی جنا بیلا ابھی تک یاد ہے۔ غازی اتاترک سے خطاب۔ پیام عمل۔ دعا ہائے دکن کی دعا۔ تنگل عثمانی میں۔ مرگ نوجوانی۔ الوداع۔ گلبرگہ۔ وہ ہے وہ وقت جب دل کو طلب کرنے پہ آتا ہوں۔ مقام عبرت۔ میری ہمسائی۔ غربت میں عید قرباں۔ ہمایوں مرزا کے مقبرے پر چند لمحے۔ ترانہ جشن سیمیں۔ قوم کے بہادر سپوت کے نام۔ انتظار۔ صبر کر۔ خواب نمگیں۔ عجیب ترعجائیات۔ خطاب از سال نو۔ تاثیر شعر۔ واردات۔ مسلمی شعریت کے پردے میں۔ تم نے۔ حدیث شباب۔ چھپا ہوا محبوب۔ شام۔ درد قوم۔ فلسفۂ ہستی۔ کسی کی دھن میں۔ مقصد حیات۔ مرد انقلابی۔ بارگاہ رب العزت میں چند گستاخیاں۔ مسدس در تعزیت اتاترک مرحوم۔ سوز مضطرب۔ کھیل۔ اقبال و ادبار۔ تا رنظر۔ قوم سے خطاب۔ تصویر شباب۔ انجام گل۔ سوجا۔ مکالمہ۔ پیغام محبت۔ زندگی۔ دل میں نے کیا دیکھا۔ اعادہ۔

قطعہ: ضبط تو بہ۔ | **ڈرامہ:** پردہ دار

رباعیات: شبابیات

بچوں سے

یہ اس سال کا آخری شمارہ ہے۔ اس میں بعض بچے اچھے مضامین شائع ہو رہے ہیں مثلاً بیدر، قوم پرستی (ڈراما) وغیرہ۔ "قوم پرستی" ضرور پڑھیے اس کے پڑھنے سے جاپانیوں کی قوم اور وطن پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ "بیدر" شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی کا لکھا ہوا ہے۔

مضمون نگار صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے بیدر میں رہ کر وہاں کے تاریخی حالات اور وہاں کی عمارتوں کا تفصیلی معائنہ کرکے اپنے خیالات کو قلمبند کیا ہے اسی قسم کا ایک اور مضمون "بیدر" بھی ہمارے پاس ہے مگر وہ بہت طویل ہے اس لئے جلد شائع نہ ہوسکا انشاءاللہ کسی قریبی اشاعت میں ہم اسے جگہ دیں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح کے اور چند مضامین حیدرآباد کے دوسرے اضلاع سے متعلق وصول ہوں تو انہیں کتابی صورت دے کر سب رسی بھائیوں کی طرف سے شایع کردیں۔ جو بھیجنا چاہتے ہوں وہ اپنے اپنے ضلعوں سے متعلق مضامین ہمارے پاس لکھ بھیجیں۔

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے سب رس کا چوتھا سال شروع ہوگا۔ آئندہ آپ کا یہ پرچہ (بچوں کا سب رس) بڑے سب رس سے علحدہ کردیا جائے گا۔

یعنی ابھی تک یہ ہوتا آیا ہے کہ بچوں کے سب رس میں جو مضامین چھپتے تھے وہ بڑے پرچے میں بھی شامل رہتے تھے اور بچوں کا پرچہ ضمیمہ کے طور پر شایع ہوتا تھا۔ مگر آئندہ سے آپ لوگوں کے مضامین بڑے پرچے میں شامل نہیں رہیں گے اور بچوں کا رسالہ مستقل طور پر علحدہ شایع ہوگا۔ توقع ہے کہ آپ لوگ خریداروں میں اس سال سے اضافہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو دس خریدار بنائے ہم اسے ایک اچھا انعام دیں گے۔ دیکھیں اس طرف کون پہلے توجہ کرتا ہے۔

اس مہینے میں پہیلیاں چھپ رہی ہیں۔ بڑی مزیدار ہیں ۱۵ر ڈسمبر تک اس کے حل روانہ کیجئے۔ صحیح حل بھیجنے والوں کے نام ہم جنوری میں شایع کردیں گے۔

غرض یہ اس سال کی آخری ملاقات ہے آئندہ مہینے میں ہم آپ سے اور آپ ہم سے نئے نئے ارادوں اور توقعات کو لئے ہوئے بات چیت کریں گے۔ اچھا خدا حافظ

معین الدین احمد انصاری

قوم پرستی (ڈرامہ)

شوشانگ...... جاپانی جہاز کا کپتان
کریم بھائی...... ہندوستانی تاجر
جمشید جی...... کریم بھائی کا ساتھی
عبداللہ...... جاپانی لڑکا جہاز کا ملازم
واٹسے...... جمشید کا نوکر

پہلا منظر

جاپانی جہاز ہندوستان سے جاپان جارہا ہے کریم بھائی اور جمشید جی باتیں کررہے ہیں

کریم ۔ کیا بات ہے! جہاز کچھ تیز جارہا ہے ؟

جمشید ۔ ہاں! محسوس تو کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔

کریم ۔ جاپانی جہازوں پر سفر کرنے کا مجھے بارہا اتفاق ہوا ہے! لیکن کبھی جہازوں کو اتنی تیز رفتار سے چلتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔

جمشید ۔ (کسی قدر پریشان ہوکر) پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

کریم ۔ نہیں! خدانخواستہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے! دیکھو! تو! کپتان کس قدر بے فکری سے گا رہا ہے! شاید بندرگاہ قریب ہے!

جمشید ۔ بھئی! جاپانی بھی بڑے غضب کے لوگ ہیں! دیکھتے دیکھتے! کیا سے کیا ہوگئے!

کریم ۔ سچ کہتے ہو! ۱۹۰۵ء کی جنگ روس و جاپان کے بعد سے کسی نہ کسی طرح جاپان! جاپان!! جاپان!!! کی صدا ہمارے کانوں میں برابر چلی آرہی ہے!

جمشید ۔ کیوں نہ آئے! کپڑا جاپانی! ٹوپیاں جاپانی! جوتے جاپانی! یاتابے جاپانی! قندیل جاپانی! صابن جاپانی! دیا سلائی جاپانی! بچوں کا کھلونا جاپانی! غرض کہ ہر بڑی سے بڑی اور معمولی سے معمولی چیز تیار کرکے جاپانی قوم دنیا بھر کی منڈیوں پر چھا رہی ہے!

کریم ۔ کیوں نہ چھائے! ہر چیز اچھی اور سستی جو دے رہی ہے! دور کیوں جائیں! اسی جہاز کو دیکھ لو! ہر چیز کس قدر خوبصورت اور سلیقے سے بنائی گئی ہے!

جمشید ۔ میں سب کچھ ماننے کے لئے تیار ہوں! مگر یہ ضرور کہونگا کہ جاپانیوں کو ابھی سلیقہ نہیں آیا!

کریم ۔ اچھا! ایسی کونسی بات آپ نے دیکھی؟ ذرا مجھے بھی بتلائیے؟

جمشید ۔ بھئی! کیا بتاؤں! میں روزانہ پھل کھانے کا عادی ہوں! ہندوستان چھوٹے آج پانچواں دن ہے! پھل نہیں ملے!

کریم ۔ (ایک لڑکے کو جو قریب ہی کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا بلاکر) کیا! تم جہاز پر نوکر ہو؟

لڑکا ۔ جی ہاں جناب! فرمائیے کیا ارشاد ہے ؟

کریم ۔ تم اردو بہت اچھی بولتے ہو! کیا تم جاپانی نہیں ہو؟

لڑکا ۔ خدا کا شکر ہے! میں جاپانی ہوں! عرصے سے اس جہاز پر ملازم ہوں! ہمیشہ ہندوستان آتا جاتا ہوں! آپ جیسے حضرات سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے! کچھ بول لیتا ہوں!

کریم ۔ جاپانی لوگ ہوتے تو بڑے ہوشیار ہیں مگر ہمارے دوست جمشید جی کو جاپانیوں سے بڑی شکایت ہے۔ وہ کہتے ہیں! انہیں سلیقہ نہیں آیا! اس لئے کہ جاپانی جہاز پر پھل نہیں ملے۔ شاید ہنکاگ کی بندرگا پر مل جائیں!

لڑکا ۔ (کسی قدر افسردہ صورت بناکر) توقع کم ہے! اچھا اجازت دیجئے بندرگاہ آگئی۔ ... (لڑکا جاتا ہے)

کریم ۔ دیکھا! جاپانی بچے کو؟ اپنی قوم کی مذمت پر تاسف کا اظہار کرکے کس قدر خاموشی سے چلا گیا!

جمشید۔ ان کی قوم اور ملک پرستی ہی تو دنیا میں ان کا نام روشن کررہی ہے!

(جاتے ہیں)

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

دوسرا منظر

بندرگاہ ہانگانگ

کریم تنہا کنارے پر کھڑا قدرتی منظر دیکھ رہا ہے شوشانگ آتا ہے!

—•—÷—•—

کریم ۔ تسلیمات عرض ہے! جناب کپتان صاحب! (مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاکر)

شوشانگ۔ آداب عرض ہے! (مصافحہ کرتے ہوئے) آداب عرض ہے! کہیے مزاج تو اچھے ہیں؟

کریم ۔ خدا کے فضل سے اور آپ کی عنایت سے اچھا ہوں! شکریہ!

شوشا۔ جہاز میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

کریم ۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ! مجھے تو خیر آرام ہی مل رہا ہے مگر میں نے کسی اور کی زبانی بھی آپ کے جہاز کی شکایت نہیں سنی!

شوشا۔ یہ آپ کی نوازش اور حسن ظن ہے جو آپ اس طرح فرما رہے ہیں!

کریم۔ میرے دوست! آپ کچھ بھول رہے ہیں! حسن ظن حقیقت ہی سے پیدا ہوتا ہے! جاپانیوں کا صرف میں ہی مداح نہیں ہوں بلکہ دنیا مداح ہے!

شوشا۔ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس کے پیش نظر کوئی نصب العین نہ ہو۔ بغیر نصب العین کے دنیا میں ترقی کرنے کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے بلا تعین منزل مقصود سفر کے لئے چل کھڑے ہونا اور منزل پر پہنچنے کی توقع رکھنا! انسان دنیا میں مرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے! اس لئے اسے چاہیئے کہ مرنے سے پہلے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کرے!

کریم۔ آپ لوگوں کا نصب العین کیا ہے؟

شوشا۔ ہماری قوم نے اپنا نصب العین شاہ پرستی

اور ملک و قوم پرستی قرار دیا ہے۔ ہمارا تن،
من، دھن اس کے لئے وقف ہے! ہم جیتے
ہیں تو قوم و ملک کے لئے جیتے ہیں! اور اگر
مرتے ہیں تو اپنے بادشاہ کے لئے مرتے
ہیں! اسی لئے ہم معراجِ ترقی کے انتہائی
زینے کے قریب تر ہوتے جارہے ہیں۔

کریم ۔ مرحبا! دنیا میں ملکی اور قومی ترقی کا راز
یہی ہے! اور دنیا میں جاپانی اس وقت
تک برابر ترقی کرتے رہیں گے جب تک
ان کا نصب العین ان کے پیش نظر
رہے گا!

شوشا ۔ (گھڑی دیکھ کر) او ہو! جہاز کی روانگی
کا وقت ہوگیا! اب چلنا چاہئے!

(جاتے ہیں)

تیسرا منظر

جہاز:—

لڑکا پھل لئے آتا ہے۔ کریم بھائی
اور جمشید باتیں کر رہے ہیں ۔

کریم بھئی! تم بھی عجیب آدمی ہو! جہاز سے
اترنے کا نام ہی نہیں لیتے! کنارے پر کیا
لطف رہا! کپتان سے بھی ملاقات ہوئی
بڑی خوبیوں کا آدمی ہے

جمشید۔ تمہیں تو جاپانیوں کی مدح سرائی کا کچھ
خبط سا ہوگیا ہے! جب دیکھو انہیں کی تعریف
کرتے ہوئے نظر آتے ہو! یہاں تو
پھل نہیں ملے طبیعت مکدر ہوئی جارہی
ہے کچھ غصہ بھی آرہا ہے! اور تم ہو کہ
تعریف کے پل باندھے چلے جارہے ہو!

کریم ۔ بھئی! چڑتے کیوں ہو! حقیقت کا اظہار
کررہا ہوں!

جمشید۔ واللہ! تم بھی عجیب آدمی ہو! اب حقیقت
کو لے بیٹھے! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مجھے
پھل نہیں مل رہے ہیں؟

(لڑکا پھلوں کا ٹوکرا سر پر لئے آتا ہے)

کریم میاں بچے! ادھر آنا!

لڑکا ۔ حاضر ہوا جناب! (بوجھ کی وجہ سے آہستہ
آہستہ آتا ہے)

کریم ۔ لیجئے جناب! آپ پھلوں کے لئے بے چین
تھے!

جمشید۔ (بچے کے سر سے ٹوکرا اتارتے ہوئے مسکراکر)
واہ واہ! بچے! تم نے بڑا کام کیا!

لڑکا۔ (ہانپتا ہوا بیٹھ جاتا ہے)

جمشید۔ کیا یہ پھل بیچو گے؟

لڑکا ۔ نہیں

جمشید۔ تو کیا اپنے لئے لائے ہو؟

لڑکا ۔ نہیں

جمشید۔ (چڑکر) لٹانے کا ارادہ ہے؟

لڑکا ۔ (مسکراکر) نہیں!

جمشید۔ (غصے سے) عجیب لڑکا ہے! بیچیگا نہیں! خود
نہیں کھائے گا لٹائے گا نہیں! پھر کیا کسی کو
دینے کے لئے لایا ہے!

لڑکا ۔ جی جناب!

جمشید۔ کسے دے گا؟

لڑکا ۔ (مسکرا کر) آپ کو!

جمشید۔ (غصے سے طمانچہ مارکر) بے وقوف ہم سے
مذاق کرتا ہے؟ (بوائے!) ادھر آؤ! کپتان صاحب
کو بلا لاؤ! ہم اس گستاخ لڑکے کو ان کے
پاس پیش کریں گے! (بوائے جاتا ہے) کہاں
ہیں کریم بھائی! ذرا کمرے سے باہر آئیے!

کریم ۔ (آتے آتے) کیا بات ہے؟ کیوں شور مچا
رکھا ہے!

(کپتان آتا ہے)

جمشید۔ (غصے سے) دیکھئے جناب! یہ آپ کے جہاز
کا ملازم لڑکا! ہم سے مذاق کرتا ہے!

شوشا ۔ کیا بات ہے؟ عبداللہ! تم سے تو مجھے ایسی
توقع نہ تھی! اور ہاں! تمہیں جہاز پر دیکھ کر
مجھے تعجب ہو رہا ہے! تم تو استعفا دے کر
چلے گئے تھے!

(کریم اور جمشید لڑکے کا نام عبداللہ سن کر
تعجب کرتے ہیں)

لڑکا ۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ان دونوں
حضرات کو جاپانیوں کے متعلق کہتے سنا کہ ان
میں ابھی سلیقہ نہیں آیا اس لئے کہ جاپانی
جہاز پر پھل نہیں ملتے۔ مجھے یہ سن کر بڑا دکھ
ہوا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی خدمت
کا استعفا پیش کیا۔ نو مہینے کی تنخواہ لی!
بازار گیا! پھل خریدے اور جلد جلد واپس
آیا! بوجھ کی وجہ سے ہانپ رہا تھا! ان
کے ہر سوال کا جواب میں نے مختصراً نہیں
دیا جسے آپنے سہواً مذاق سمجھا!

شوشا ۔ اچھا یہ بتاؤ! تم نے استعفا کیوں پیش کیا؟

عبداللہ ۔ اس لئے کہ آیندہ سے میں جہاز پر پھل بیچنے
کا کام کروں گا! تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ
جاپانیوں کو سلیقہ نہیں آیا!

جمشید۔ (عبداللہ کے قومی اور ملکی جذبے سے متاثر
ہوکر) تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ معاف کرنا
مجھے مغالطہ ہوا!

عبداللہ ۔ نہیں! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں! میں
آپ کا خادم ہوں!

جمشید۔ (جیب سے پانچ پونڈ نکال کر) یہ لو یہ تمہارے
پھلوں کی قیمت ہے!

عبداللہ ۔ (بری صورت بنا کر سر ہلاتے ہوئے) نہیں!

جمشید ۔ (یہ سمجھ کر شاید یہ کم ہے) اچھا تم ہی بتاؤ!
ان پھلوں کی کیا قیمت دوں؟

عبداللہ ۔ (خوش ہوکر) مہربانی فرما کر آیندہ یہ کسی سے
نہ کہیے کہ جاپانیوں کو سلیقہ نہیں آیا۔ یہی
ان پھلوں کی قیمت ہے!

جمشید۔ نہیں! یہ نہیں ہوسکتا! تم بڑے ایثار سے

کام لے رہے ہو! تم نے ان پھلوں پر بہت سا روپیہ صرف کیا اور بڑی تکلیف اٹھائی!

شوشا۔ مہربانی فرما کر آپ اس بچے کے تحفے کو قبول فرمالیجیے! اسے بڑی خوشی ہوگی! ورنہ وہ سمندر میں کود کر جان دے دے گا!

کریم۔ (تعجب سے) نام سے تو یہ بچہ مسلمان معلوم ہوتا ہے!

جمشید۔ مسلمان کہاں نہیں ہیں؟

شوشا۔ ہاں! ہمارے جاپان میں مسلمان بھی ہیں، بدھ بھی اور عیسائی بھی! مگر قوم اور ملک سب کا ایک ہے! مذہب کا تعلق روحانیت سے ہے! اس معاملے میں ہم سب آزاد ہیں! قوم اور ملک پرستی ہمارا نصب العین ہے!

جمشید۔ تمہاری ملک اور قوم پرستی کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ عبداللہ! میں تمہارے گراں بہا تحفے کو بڑی خوشی اور عزت کے ساتھ قبول کرتا ہوں! اور تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ جاپانیوں کو کبھی بدسلیقہ نہ کہوں گا!

عبداللہ۔ (خوش ہوکر) میں آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں!

(سب جاتے ہیں)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

حامدالدین احمد (عثمان آباد)

نئی پہیلیاں

(۱) آؤ بولے تو آتا نہیں جاؤ بولے تو جاتا نہیں شیر کے منہ میں ماتا نہیں۔

(۲) بچہ در بچہ بچہ در بچہ

محمد غوث (سٹی کالج)

(۳) ایک شجر ہے ہرا بھرا ٭ گیلا سوکھا خون بھرا

(۴) چاندی کے قلعہ میں پارے کا چشمہ پارے کے چشمے میں سونے کی کان ایسے قلعے میں نقب لگائے بے کھٹکے انسان۔

(۵) آدھا نل اور آدھا دار ٭ سپاہی کرتا دل سے پیار

محمد عبدالقیوم (متعلم)

بھلی باتیں

بھروسہ کسی پر نہ کرنا بھلا
جسے مال و دولت کا غرّہ رہا
ستانا غریبوں کو اچھا نہیں
رہی جستجو جس کے پیشِ نظر
اطاعت بزرگوں کی ہردم کرو
ہر اک کی بھلائی کے خواہاں رہو
ہزاروں جیے اور جی کر مرے
ہر اک وصف میں سب سے برتر رہو
برائی کسی کی نہ چاہی ہنر

زمانہ برا ہے برا ہے برا!
زمانے کے ہاتھوں نہ وہ بچ سکا
خطا ہے خطا ہے خطا ہے خطا
اسی کو ترقی کا زینہ ملا!
پھلو اور پھولو جہاں میں سدا
اگر چاہتے ہو تم اپنا بھلا
جیا اک وہی جو کہ مرکر جیا
مگر غم گساری ہو سب سے سوا
یہی کام اک تم نے اچھا کیا!

کنیا پرشاد ہنر (عثمانیہ)

دنیا میں سب سے پہلے

۱۔ گریہ و زاری کرنے والوں میں حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے شخص ہیں جو خروجِ جنت کے بعد پیہم چالیس روز بے آب و دانہ رہے اور مسلسل تین سو سال گریہ و زاری اور توبہ و استغفار کرتے رہے۔

۲۔ عادی عرب کا سب سے اولیں شاہنشاہ ہے جو شداد کا باپ اور چوتھی پشت میں حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں تھا جس کی حکومت تین سو سال رہی اور شام و عراق، مصر و ہندوستان تک اس کے مقبوضات پھیلے ہوئے تھے۔ احقاف پایہ تخت تھا۔

۳۔ آدم فلاح سب سے پہلا شخص ہے جس نے نباتات کی حقیقت سے اہل دنیا کو مطلع کیا یہ شخص حضرت آدم علیہ السلام کے ایک زمانے کے بعد گزرا ہے

۴ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جو ذبیح اللہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ فخر انبیا صلعم کے جدِ اعلیٰ اور خانۂ کعبہ کے سب سے اولیں متولی ہیں۔

۵۔ سب سے پہلے امریکہ کو اہل سکنڈ نیویا نے دریافت کیا اور اس کا نام ون لینڈ قرار دیا۔ یہ واقعہ کولمبس کے امریکہ پہنچنے سے چھ سو برس پیشتر کا ہے۔

۶۔ دخانی انجن سے خشکی پر گاڑیاں چلانے کی ایجاد سب سے پہلے جارج اسٹیفن سن نے کی جو نیوکاسل میں سنہ ۱۷۸۱ء کو پیدا ہوا۔

سید مراد علی طالع (بھکنڈہ)

بیدر

بیدر بہت ہی قدیم تاریخی شہر ہے۔ ہندوؤں کی پرانی اور مشہور کتاب "مہابھارت" اور فیضی کی مثنوی "نل دمن" میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ فیضی کی مثنوی بیدر کی شہزادی ہی کی منت پذیر احسان ہے مشہور مورخ فرشتہ نے بھی اس کی بہت اچھے الفاظ میں تعریف کی ہے۔ بعض انگریز مورخ بھی اس کی آب و ہوا کی ثناخوانی کرتے ہیں۔

موجودہ حالت میں بیدر ریاست حیدرآباد کے ضلع کا مستقر ہے۔ یہ شہر ایک پہاڑی پر واقع ہے جو سطح سمندر سے ۲۳۳۰ فٹ بلند ہے اس کی آب و ہوا نہایت ہی صحت بخش اور خوشگوار ہے۔ کہتے ہیں کہ جب پہلی دفعہ احمد شاہ بہمنی کا یہاں سے گزر ہوا تو اس نے اس مقام کی صحت بخش آب و ہوا کو دیکھ کر اپنا پائے تخت گلبرگہ کی جگہ بیدر کو قرار دیا۔ اور ایک بہت ہی عالیشان اور مضبوط قلعہ تعمیر کروایا۔ اس قلعہ کی چھ سال تک مسلسل تعمیر ہوتی رہی۔ بادشاہ نے بڑی ہی جانفشانی سے اس قلعہ کو آراستہ کیا۔ یہ قلعہ دکن کے ان چند مشہور اور ناقابل تسخیر قلعوں میں سے ہے جن کا بار بار دکن کی تاریخ میں ذکر آتا ہے۔ قلعہ کے اطراف ایک بہت ہی مضبوط پتھر کی فصیل بنی ہوئی ہے۔ اس فصیل کا سب پتھر سیاہ ہے۔ فصیل میں متعدد دروازے ہیں جن میں فتح دروازہ بہت بڑا اور مضبوط ہے۔ حال ہی میں اسٹیشن سے قربت کے خیال سے ایک نیا دروازہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ ان دروازوں کی ساخت قدیم طرز کی ہے جس میں بہت مضبوط کیل جڑے ہوئے ہیں۔ فصیل میں جابجا برج بنے ہوئے ہیں جن پر توپیں رکھی ہوئی ہیں۔ بیدر کی دو مشہور توپیں قلعہ کے اندر ہیں۔ ان میں سے ایک توپ فتح برج پر ہے جو رنگین محل سے قریب ہے۔ اس توپ کی لمبائی تقریباً گیارہ فٹ اور اندرونی حلقہ کی چوڑائی ایک فیٹ ۹ انچ ہے۔ اس پر سنہری حروف کندہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاسم برید شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہے اس کے قریب ہی ایک دوسری توپ ہے جس کی لمبائی تقریباً ۲۰ فیٹ ہوگی۔ یہ علی برید شاہ کے زمانے میں ڈھالی گئی تھی۔

قلعہ کی اکثر عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ رنگین محل میں اس وقت تعلقداری کا دفتر ہے اس کے علاوہ چینی محل، گگن محل، ترکش محل اور نگینہ محل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رنگین محل کی زیبائش ابھی تک قائم ہے اس کے اندر سیاہ پتھر میں سیپ کا بہت ہی نفیس کام کیا گیا ہے۔ سنگ سیاہ میں جگمگاتی سیپ کے بیل بوٹے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان محلات کے اب صرف آثار باقی رہ گئے ہیں۔ شاہی حمام کی عمارت بہت بلندی پر بنی ہوئی ہے۔ یہاں سے اطراف و اکناف کا

نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ اس حمام کی بیشتر ضروریات سنگ سیاہ ہی کی تراشی ہوئی ہیں۔ دروازوں کی چوکھٹ بھی سنگ سیاہ ہی کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کا نقش و نگار، فن کاری کا بہترین کمال ہے۔ اس حمام کے قریب ہی متعدد تہہ خانے ہیں۔ ان میں سے بعض تہہ خانوں میں روشنی داخل ہوتی ہے اور بعض بہت ہی تاریک ہیں اور بغیر روشنی کے اندر نہیں جاسکتے۔ اکثر تہہ خانے ایسے بھی ہیں جس میں تازی ہوا داخل ہونے نہیں پاتی اور تھوڑی دور جانے سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ ان میں سے بعض تہہ خانوں میں سے زمین دوز راستے بھی ہیں۔

ترکش محل سے متصل سولہ کھم کی مسجد ہے اس کو سلطان علاؤالدین نے اپنی شہزادگی کے زمانے میں بنوایا تھا۔ اور شہزادہ بہ نفس نفیس ہر جمعہ خطبہ پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن شہزادہ نے اپنے خطبہ میں بادشاہ کے عدل و انصاف کی تعریف کررہا تھا ایک عرب سوداگر نمازیوں سے اٹھ کر شہزادے سے کہا کہ وہ سر منبر جھوٹ بول رہا ہے شہزادے نے وجہ دریافت کی۔ اس سوداگر نے کہا کہ بادشاہ نے ایک عرصے سے اس کے گھوڑوں کی قیمت ادا نہیں کی شہزادے نے عرب سوداگر سے معذرت چاہی اور بادشاہ سے اس کی ساری رقم دلوادی۔

کہتے ہیں شہنشاہ اورنگ زیب نے بھی اپنی شہزادگی کے زمانے میں بیدر فتح کرنے کے بعد اسی مسجد میں شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا

مدرسہ محمود گاواں

محمود گاواں

ہندوستان کے ان چند نامور وزیروں میں سے تھا جنہوں نے ملک و مالک کی خدمت میں اپنی عمریں گذار دیں اور ملک میں علم و ہنر کی لہریں دوڑا دیں۔ محمود گاواں کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس کی وفاداری، اطاعت گذاری اور بے نفسی اس کے نام کے ساتھ زندہ رہے گی۔ یہ بڑا ہی علم دوست وزیر تھا خود ایک زبردست عالم اور اہل علم کا قدرداں تھا۔ اس نے اپنی ساری آمدنی جو اس کو عہدہ وزارت سے حاصل ہوتی تھی علم و ہنر کی ترویج کے لئے وقف... کردی تھی۔ اور خود تجارت کی آمدنی پر زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی سادہ زندگی تاریخ کے صفحات پر طلائی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس علم دوست شخص نے اپنے ذاتی خرچ سے ایک عدیم نظیر مدرسہ تعمیر کروایا تھا جو آج تک بھی باقی ہے۔ اس مدرسہ کا ایک مینار بجلی کے گرنے سے منہدم ہوچکا ہے۔ دوسرا مینار اور عمارت ابھی تک موجود ہے آشتور میں سلاطین بہمنیہ کی گنبدیں ہیں۔ یہ گنبدیں ایرانی طرز تعمیر کی یادگار ہیں۔ ان گنبدوں میں احمد شاہ بہمنی کی گنبد سب سے بڑی اور عالیشان ہے۔ اس کے اندرونی حصہ میں سرتاقدم سنہری حروف اور سیپ کے خوشنما

بیل بوٹوں میں آیات و قطعات کندہ ہیں۔
دروازوں پر بھی سیپ سے آیتیں اور فارسی قطعات لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے اندرونی کتبات کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیبایش و نقش و نگار شکراللہ قزوینی کی رہین منت ہیں

شہر کے مغرب کی طرف برید شاہوں کی گنبدیں ہیں۔ ان میں علی برید کی گنبد قابل دید ہے۔ یہ گنبد ربع زمین پر بنائی گئی ہے۔ اس کی گنبد بھی بہت بلند ہے اس کا مقبرہ بھی سنگ سیاہ کا بنا ہوا ہے۔ کاشی کاری نے اس کے حسن میں چار چاند لگادئے ہیں۔ اس گنبد کے اندرونی حصے میں بھی اوپر سے نیچے تک فارسی قطعات و رباعیات اور آیتیں کندہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان مقبروں کے اطراف کبھی عالیشان باغ تھے۔ ان کے قریب یہی اطراف جوانب میں متعدد عمارتیں اور خانقاہیں تھیں جن میں مسافروں کی رہایش اور طعام کا انتظام کیا جاتا تھا۔

اس سے کچھ اور فاصلے پر سعادات کا چشمہ ہے یہ سید سعادات نامی بزرگ کے مقبرے کے قریب ہی ہے اور ان ہی کے نام سے موسوم ہے یہاں ہر روز معتقدین کا اژدحام رہتا ہے اس چشمہ کا پانی بہت مفرح ہے۔ اس میں گندگ اور لوہے کے اجزاء شامل ہیں برید شاہی گنبدوں کی دوسری طرف کچھ فاصلہ پر ایک دوسرے بزرگ حضرت گنج نشینؒ کا مزار ہے۔

جنوب مشرق کی سمت ایک اور چشمہ ہے جس کو فرح باغ کہتے ہیں۔ اس چشمہ کے بہت اندر ایک مندر ہے اور اس کے اوپر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے قریب ایک اور عمارت ہے جو توے کی شکل میں بنی ہوئی ہے جسے حبشی کا توا کہتے ہیں۔

فرح باغ کے راستے میں ایک اور بزرگ حضرت ابوالفیضؒ کا مزار ہے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے ملتا ہے۔ ہر سال بڑی دھوم دھام سے آپ کا عرس ہوتا ہے شہر کے بیچوں بیچ ایک عمارت سرخ پتھر کی بنی ہوئی ہے جو چوبارہ کہلاتی ہے۔

دھوبی کے مکان میں ایک بہت ہی چھوٹی گنبد بنی ہوئی ہے جو وہاں کی ایک بہترین نشانی مانی جاتی ہے۔ اس کو عام طور پر "سوا ہاتھ کی گنبد" کہتے ہیں۔ یہ گنبد تمام و کمال بیدر کی بڑی عالیشان گنبدوں کی نقل ہے۔

آبادی سے بہت دور ایک اور چشمہ ہے جو "پاپناش" کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ رامچندر جی اور ان کی بیوی سیتا کا یہاں سے گذر ہوا تھا یہاں کے ہندو اس کو بہت ہی مقدس سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس چشمہ میں اشنان کرنے سے تمام گناہ دھل جاتے ہیں

شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی

دیہاتی اور گھڑی

گولڈ اسمتھ بہت مالدار تھا ایک روز جب وہ راستے سے گذر رہا تھا ایک چور نے اس پر حملہ کردیا اور قریب تھا کہ وہ گولڈ اسمتھ کو مار ڈالتا لیکن اتنے میں ایک غریب دیہاتی آپہنچا۔ اس نے اپنی لاٹھی سے چور کو دے مارا اور چور کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گولڈ اسمتھ نے دیہاتی سے کہا کہ میرے پاس اس وقت کچھ روپے پیسے نہیں ہیں تاکہ میں تمھیں انعام دے سکوں۔ لیکن میرے پاس ایک گھڑی ہے جو تمھیں انعام دیتا ہوں۔ گولڈ اسمتھ نے یہ کہہ کر اپنی گھڑی نکالی اور اس غریب دیہاتی کو دے کر اپنے گھر چلا گیا۔ دیہاتی گھڑی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور وہ گھنٹوں اس کی آواز کو سنتا رہا اور بہت دیر تک وہ سکنڈ کے کانٹے کو پھرتا ہوا دیکھتا رہا۔

دوسرے روز جب گھڑی بند ہوگئی تو وہ بہت پریشان ہوا کیونکہ وہ کوک بھرنا نہیں جانتا تھا۔ دیہاتی کو بہت رنج ہوا اور افسوس سے کہنے لگا کہ وہ (یعنی گھڑی) مرگئی۔ پھر اسے خیال ہوا کہ یہ مردہ گھڑی آخر کس کام کی ہے اور وہ فضول سمجھ کر ایک مہاجن کے پاس گیا۔ مہاجن نے دیہاتی کو گھڑی کے معاوضے میں پچاس (۵۰) روپے دیے کیونکہ گھڑی کی قیمت دوسو (۲۰۰) روپے سے زائد تھی دیہاتی جو بہت ایماندار تھا مہاجن سے کہنے لگا "جناب یہ آپ کے پچاس روپے ہیں اسے لے لیجئے کیونکہ یہ گھڑی مرگئی ہے۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے" لیکن مہاجن اس کے اس بھولے پن پر ہنسا اور کہا کہ روپے رکھ لو اور چلے جاؤ۔

دیکھو ایماندار لوگ ایسے ہوتے ہیں اور لوگ ان کے بھولے پن سے فائدہ اٹھاتے ہیں (ترجمہ)

پست و بلند

درخت کے تنے کے پاس پڑے ہوئے سوکھے پتے اپنی بدنصیبی پر آہیں بھر رہے تھے۔

— ہم کسی وقت اپنی اونچائی اور بلندی پر کتنے خوش تھے اب — کہہ کر وہ اوپر دیکھنے لگے۔

— درخت کی چوٹی پر کچھ پتے مارے غرور کے جھوم رہے تھے۔ انھوں نے اوپر سے کہا۔

— تم اوپر کیا دیکھ رہے ہو؟ اب تم کبھی اتنی بلندی پر پہنچ سکوگے؟

نیچے گرے ہوئے اور سوکھے پتے خاموش ہوگئے —

کچھ دن بعد بلندی پر کے سوکھے پتے بھی نیچے گرگئے —

انھوں نے جو مٹی میں منہ چھپایا تو پھر کبھی اوپر نہ آسکے —

محمد عبدالقادر فاروقی (حمایت نگر)

پیام

دیس کے پھلنے پھولنے والو — تم بھی پھر کچھ کرکے دکھا دو
سونے کا اب وقت نہیں ہی — خود جاگو اوروں کو جگا دو
علم کی شمع لے کر پھر تم!! — ذرّے ذرّے کو چمکا دو
ڈوب رہی ہے قوم کی نیّا — آؤ آؤ پار لگا دو!
جاگ گئی ہے دنیا ساری — "تم بھی جاگے" سب کو بتادو
آپس میں یہ لڑنا کیسا! — آؤ پریم کے گیت سنادو
گاکر نغمہ آزادی کا! — سینوں میں اک آگ لگادو
ہے وطن کا جھنڈا اونچا — بڑھو! بڑھو! اوروں کو بڑھادو
بھاتی نہیں اب تم کو غلامی — قوم کا بگڑا کام بنا دو!

عظیم قادری صدف

اِحسان فراموش

ایک بھوکی لومڑی جنگل میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ ایک جگہ شکار جو نظر آیا تو فوراً ٹوٹ پڑی۔ کھاتے کھاتے اتفاق سے ایک ہڈی اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس کو نگل جانے یا باہر نکالنے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن ہڈی نہ نکلنی تھی نہ نکلی پریشان و بے تاب دریا کے کنارے نکل گئی جہاں پر ایک سارس کھڑا نظر آیا۔ بڑے ادب اور نرمی سے لومڑی اس کے قریب پہنچی۔ اور اپنی تکلیف کو بیان کیا۔ کہا کہ حلق سے ہڈی کسی طرح سے نکال دیجئے بڑی مہربانی ہوگی۔

سارس نے لومڑی کی درخواست قبول کرلی۔ لومڑی نے منہ کھولا۔ اور سارس نے اپنی لمبی اور نوکدار چونچ اس کے حلق میں ڈال کر ہڈی باہر نکال دی۔ ہڈی کے نکلتے ہی لومڑی خوش خوش جانے لگی۔

سارس نے کہا "بی لومڑی تم بڑی احسان فراموش ہو۔ چلتے چلتے کم از کم شکریہ تو ادا کر جاتیں۔"

لومڑی نے کہا "میاں سارس شکر مانو جو تمہاری گردن منہ میں آنے کے بعد میں نے چبا نہیں ڈالی۔

دتاتری راؤموُلے (مدرسہ برہمن ضلع اننت ناگ)

مفلِس

میں ہوں غریب و بے نوا امیر کہتے ہیں گدا
ہوں مفلسی میں مبتلا کسی سے کیا کروں گلا
نہ کوئی غمگسار ہے نہ کوئی راز دار ہے
نہ کوئی میرا یار ہے کلی بھی مجھ کو خار ہے
نہ کوڑی میرے پاس ہے نہ جینا مجھ کو راس ہے
نہ جگ کی جھوٹی آس ہے شکستگی ہے، یاس ہے
ہے مجھ کو زندگی حرام ہے بدنصیب میرا نام
کوئی لباسِ تن نہیں!
مردں بھی تو کفن نہیں

سردار علی الہام

سینما بینی کے نقصانات

آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے بچے بوڑھے جوان سب کے سب سینما دیکھنے کے بڑے شوقین ہیں۔ سینما کا سب سے زیادہ اثر کم سن لڑکوں پر ہوتا ہے۔ جب دیکھو وہ سینما ہی کے متعلق باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر وقت سینما ہی کی دھن لگی رہتی ہے کلاس میں جہاں کوئی گھنٹہ خالی ہوا کہ سینما کا ذکر خیر چھڑ گیا۔ بجائے سینما کے تذکرے میں وقت ضایع کرنے کے اگر ہم اپنا سبق یاد کریں یا اچھی اچھی اور مفید باتیں کریں تو فائدہ بھی ہوگا اور جی بھی بہلے گا۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے اور گذرا ہوا وقت پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ تو پھر ہم کیوں اپنا وقت غیر مفید باتیں کرکے گنواتے ہیں؟ ہم کو چاہیے کہ کسی وقت بیکار نہ رہیں کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہنا چاہیے۔ قیمتی وقت کو اچھے کاموں میں گذاریں۔ ہم میں سے اکثر اخبار پڑھتے بھی ہیں تو صرف سینما کے اشتہاروں کی غرض سے ہم کو چاہیے کہ اخبار میں اپنے ملک اور غیر ممالک کی خبروں کو پڑھیں اور سمجھیں۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے بڑوں سے پوچھیں کثرت سے سینما دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری عزیز آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں اور پھر عینک لگانے کی ضرورت ہوتی ہے آنکھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ بہر حال قسم قسم کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اس کے علاوہ عینک خریدنے میں آپ کے روپے بھی الگ خرچ ہو جاتے ہیں۔ سینما دیکھنے کا دوسرا نقصان پیسوں کی بربادی ہے اگر آپ وہی پیسے کسی بھوکے غریب کو دے دیں تو اس بیچارے کا پیٹ بھی بھر جائے گا اور ثواب بھی ملے گا یا ان پیسوں کی عمدہ عمدہ کتابیں خرید لیں تو ان کے پڑھنے سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہونگی۔ سینما دیکھنے کا تیسرا نقصان یہ ہے کہ ہمارے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں بتایا کیا جاتا ہے؟ یہی کہ بے ہودگی کیسے کی جاتی ہے چوری کس طرح کی جاتی ہے۔ ایسے فلم دیکھنے سے ہم کو بھی وہی باتیں کرنے کی خواہش ہوتی ہے

ابھی چند سال ہی کا واقعہ ہے کہ حیدرآباد دکن میں ایک "بنگالی بابو" نے آکر لوگوں کو طرح طرح سے دق کرنا شروع کیا تھا۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ صرف چند لڑکوں کی شرارت تھی۔ دیکھا آپ نے کہ ان لڑکوں کو اتنی ہمت ہو گئی کہ سارے شہر کو پریشان کر دیا۔ ان بنگالی بابو نے طرح طرح کے نئے نئے طریقوں سے لوگوں کو ستایا تھا آخر یہ سب باتیں کہاں سیکھیں؟ یہی سینما دیکھنے سے بہر حال سینما دیکھنے سے ہمارے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم کو چاہیے کہ سینما دیکھنا ترک کر دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بالکل سینما دیکھنا ہی چھوڑ دیں یہ تو ناممکن سی بات ہے ہاں اگر کوئی ایسا کرے تو بڑی اچھی بات ہے

ہم کو چاہیے کہ ہینے دو مہینے میں اگر کوئی اچھا کھیل آجائے تو دیکھ لیں بعض بھائیوں کا تو یہ حال ہے کہ ہر جمعے کو "دن کا کھیل" دیکھا کرتے ہیں اور ایک بھی کھیل ہمارے دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اگر ہم جنگل پکچرز یا وہ پکچرز جن میں سائنس کی ترقیاں اور ایجادیں دکھائی جاتی ہیں دیکھیں تو بہتر ہے۔ بہرحال ہم کو چاہیے کہ اس بری عادت کو جلد از جلد ترک کر دیں

شہاب الدین خاں

چاندنی رات

چھپکے ہوئے ہیں تارے ۔ یہ ننھے ننھے پیارے
یہ "چاند" جگمگاتا ۔ بادل میں منہ چھپاتا!
پھر آگیا وہ باہر ۔ لاتا وہ نور گھر گھر
یہ چاند چودھویں کا ۔ مالک ہے کل زمیں کا
اک نور کی پری ہے ۔ جو عرش پر کھڑی ہے
صورت دکھا رہی ہے ۔ افشاں لٹا رہی ہے

تاریکیاں ہٹائیں ۔ خاموشیاں مٹائیں
گلشن میں نور بکھرا ۔ پھولوں کا رنگ نکھرا
سب پر ہے نور چھایا ۔ ہے نور ہی کا سایہ
دریاؤں کے کنارے ۔ اترے ہوئے ہیں تارے
ہے نور کی یہ کشتی ۔ پانی میں چلتی پھرتی
اک کھیل ہو رہا ہے ۔ منہ چاند دھو رہا ہے
یاد آئیں گی یہ باتیں ۔ تاروں بھری یہ راتیں
ہے نور کی نشانی!
کیا رات ہے سہانی!

محمد عبدالحمید شاذ

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

	صفحات	قیمت آنہ	روپیہ
من کی بیتا	۸۰	۸	
سرگزشت غالب	۲۴	۸	
نظام الملک	۳۸	۴	
تاریخ گولکنڈہ	۲۳۰	۸	۳
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۲۸		۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	۴	
سرسید احمد خاں	۱۶	۲	
سرسالار جنگ	۴۸	۶	
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴	۱
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۴	۱
اقبال نمبر	۱۶۸	۴	۱
سائنس کے کرشمے	۱۱۲		۱
رسائل طبیہ			
شعرائے علمائیہ	۲۳۰	۱۲	۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸	۲
دادا بھائی	۱۶	۲	
اردو نامہ	۲۰۰		۲
ارسطو جاہ	۹۵	۶	
عماد الملک	۴۰	۶	
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۶	۲
" دوسری کتاب	۵۶	۶	۲
[illegible] آزاد	۲۰۰		۲
[illegible] ناز	۱۲۰	۴	۱
[illegible]		۸	
[illegible] تاریخ دکن	۱۳۲		۱
[illegible] کی کہانی	۴۸	۶	

	صفحات	قیمت آنہ	روپیہ
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۴	
ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۸	
ہوش کے ناخن	۹۴		
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹		
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۴۸	۸	
متاع سخن	۱۲۴	۱۲	
کیف سخن	۱۲۲	۱۲	
بادۂ سخن	۱۲۷	۱۲	
سراج سخن	۱۵۲	۱۲	
ایمان سخن	۱۴۰	۱۲	
فیض سخن	۱۴۴	۱۲	
مرقع سخن جلد اول صفحہ (۴۰۰) ۵۰ تصاویر			
" " دوم " "			
نقد سخن	صفحہ ۱۷۵		
نذر ولی	۹۴۲	۸	
گریہ و تبسم	۱۹۴		
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴		
من کی دنیا	۱۴۵		
مدراس میں اردو	۱۵۶	۸	
محرم نامہ	۱۱۴		
نذر دکن	۱۰۴	۴	
روح غالب	۲۲۰	۸	
عاصم	۲۰۰	۴	
دفتری معلومات		۴	
آبدوز کشتیاں اور سرنگ		۲	
اردو مثنوی کا ارتقا		۴	